جنوری تا جون ۱۹۹۱ء
۵۷-۶۲
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری

۵۷ ــــ ۶۲

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ: ستاون تا باسٹھ
قیمت: ڈیڑھ سو روپے

قیمت فی شمارہ: پچیس روپے
سالانہ: ۳۰۰ روپے ہند
۶۰ ڈالر ایشیا۔ ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپواکر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

الف

خدابخش لائبریری
جرنل
پٹنہ

حرفے چند

عارب

نعت

نادر مطبوعات:

اردو کدھر:

اردو ادب:

اردو دانشوری:

تازہ دانشوری:

مشرق وسطیٰ کے سفرنامے:

مسلمان اور سائنس:

قرآنیات:

اے گرفتار ابوبکر و علی:

اسلام اور ھندو مت:

سکھ مت:

اورنگ زیب:

بابری مسجد، رام جنم بھومی دستاویزات:

تقسیم کی طرف:

مشرقی کتب خانے:

کتابخانۂ خدابخش:

حصہ انگریزی:

حرفِ چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے
یے کوئی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر
گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔
ے جرنل کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے،
ں سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشمولات سے بہت کچھ فائدہ
ں کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت کے نہ رکھ لے۔

ـــــ ع م ب

جگر کی یہ نعت محترمی یونس سلیم صاحب کا تحفہ ہے۔ شاعر نے یہ نعت یونس صاحب کے والد مرحوم یوسف صاحب کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔ ہم اس کے موجودہ مالک کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ نعت اب تک ہمارے لیے اٹھا رکھی تھی۔ غالباً یہ اب تک چھپی نہیں۔ اور عکس تو یقیناً نہیں!
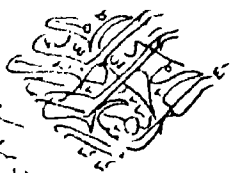
تواریخ نادر العصر

منشی نول کشور

مقدمہ

ڈاکٹر انوار الحسن
شعبہ علوم شرقیہ (عربی و فارسی)
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

مشرقی علوم و فنون کی دنیا میں منشی نولکشور کی ذات محتاج تعارف نہیں کیوں کہ انھوں نے انیسویں صدی کے ہندوستان میں اپنی انتھک کوششوں اور بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف علوم و فنون کی ایک دیرپا شمع روشن کی بلکہ اس ملک کی صنعتی ترقی کی طرف بھی بنیادی اور تعمیری قدم اٹھایا۔ ان کے مشہورِ عالم نولکشور پریس کی شاخیں نہ صرف ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں بلکہ لندن میں بھی قائم تھیں۔ لکھنؤ میں ان کا قائم کردہ "اپر انڈیا پیپر مل" شمالی ہندوستان میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ تھا۔ ان کی صنعتی اور تعمیری صلاحیتیں بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تھیں۔ ان کا دارالتصنیف ہندوستان میں اپنی نوعیت کا ایسا واحد ادارہ تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کتنی ہی ساہتیہ اکادمیاں مل کر بھی مدتوں میں وہ کام انجام نہیں دے سکتیں جو ان کی دارالتصنیف سے انجام پا چکے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی اور پنجابی زبانیں اُن کے پریس کی رہین منت ہیں۔ انھوں نے ان زبانوں کے قیمتی ادبی سرمایوں کو زمانہ کی دستبرد سے بچا کر لوگوں تک پہنچایا، اور اس طرح اشاعت علم کی عظیم خدمت انجام دی۔ لائبریریوں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کا قیام اور ان کی امداد منشی جی بڑی فیاضی اور دریا دلی سے کرتے تھے۔ غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی اعانت اور اہل علم کی قدردانی، عزت اور ان کے مرتبہ کا احترام کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ پیش نظر کتاب "تواریخ نادر العصر" اگرچہ ان کی ایک مختصر تالیف ہے لیکن کئی اعتبارات سے اس کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے۔ انھوں نے قدیم ماخذوں اور عینی شہادتوں کی بنیاد پر اودھ کی یہ مختصر تاریخ مرتب کی ہے۔ ابتدا میں پس منظر کے طور پر ہندو مذہب اور ہندوستانی باشندوں کے بارے میں بھی مختصر بحث کی گئی ہے۔ ہندوستانی مذہبیات کا ذکر مفید اور معلومات افزا ہے۔ لکھنؤ کی قدیم عمارتوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں کا بیان بہت کچھ عینی شہادتوں پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں نولکشور پریس کی داغ بیل ڈالی تھی اور ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ ہی میں واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی لڑی گئی۔ بیگم حضرت محل کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انگریز حکمرانوں نے واجد علی شاہ کی فوجوں کو شکست دی۔ انھیں تخت و تاج سے محروم کیا۔ مٹیا برج کلکتہ میں لے جا کر بند کر دیا اور اودھ کی خوش حال ریاست پر خود قبضہ کر لیا۔ منشی جی موصوف نے لکھنؤ کی تباہی، زبوں حالی اور بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہاں کی تاریخی عمارتوں کی مسماری ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ تک جاری رہی اور منشی جی موصوف ان کے چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات میں بڑا وزن اور وقار ہے۔

لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں کب اور کہاں اور کتنے سرمایہ سے تعمیر ہوئی تھیں ان کی تفصیل اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ ان دنوں اتر پردیش کی پیداوار کتنی تھی' بازار کا نرخ کیا تھا؟ اور صوبہ کی اہم تاریخی چیزیں کیا تھیں؟ ان بیانات سے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی "نادر العصر" درحقیقت "نادر العصر" ہے جو اگرچہ اس غرض سے نہیں لکھی گئی تھی لیکن اب اس کی اہمیت اور ندرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب "گذشتہ لکھنؤ" شائع ہوئی تھی جو لکھنؤ کے بارے میں ان کی بے شمار یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی ہند دہلی نے اس کا TRANSLITERATION ہندی میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح بعض اور زبانوں میں گذشتہ لکھنؤ کے ترجمے چھپ چکے ہیں لیکن "نادر العصر" کو اس سلسلہ میں جو اوّلیت حاصل ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔

منشی جی کے طرزِ تحریر پر اس دور کی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ وہ عربی و فارسی الفاظ کے بے تکلف استعمال پر قادر ہی نہیں عادی تھے۔ اس وقت کی اردو نثر میں عام طور پر وہ صفائی' روانی اور سادگی نہیں جو بعد میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی جد و جہد سے رفتہ رفتہ پیدا ہوئی۔ اسی لیے "نادر العصر" کی عبارتوں میں بھی کھردراپن موجود ہے' اور ۱۸۶۲ء کی تصنیف میں آپ اس سے زیادہ کیا امید کر سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ اور صوبہ اودھ کے بارے میں سماجی و تاریخی بیانات جتنے اچھے معتبر اور مستند "تاریخ نادر العصر" میں ملتے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں نظر آتی ہے۔ اس ضرورت کے تحت "نادر العصر" کی پرانی شراب کو نئے پیمانے میں پھر سے پیش کیا جا رہا ہے۔

O

حضرت امیر حسن نورانی نے اس سلسلے میں جو معتبر و مفید سطور رقم فرمائی ہیں ان کے مطالعہ سے منشی نو[لکشور] کا مرتبہ متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ ان کی تحریر درج ذیل ہے:-

کسی انسان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا نام اور علم و دانش لازم و ملزوم سمجھے جائیں او[ر] ایک کے ساتھ دوسرے کا خیال غیر ارادی طور پر آ جائے۔ ایسا خیال جو مختلف علوم و فنون کی ہزاروں کتابوں کے تصور[ات] میں تبدیل ہو کر دل و دماغ کو روشن کر دے' اور ایک انبساط انگیز کیفیت کا احساس پیدا ہو جائے۔ ایسی ہستیاں شاذ و [نادر] ہوتی ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ منشی نولکشور ایک ایسی ہی ہستی کا نام ہے' جس کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ [منشی] نولکشور مشرقی علوم و فنون کے محافظ' اور اردو زبان و ادب کے بڑے محسن تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی [جتنی خدمت] کی اتنی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ ان کا مطبع علمی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور

رویج ان کا رہین منت ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی آبرو بڑھائی اور اس کے خزانے میں اتنا اضافہ کیا
۔ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی"

تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انھوں نے طباعت و اشاعت اور ان کی متعلقہ صنعتوں کو اس وقت فروغ
ا جب صنعت وحرفت جمود و تعطل کا شکار تھی۔ کتابوں کی تجارت کو ہندوستان میں پہلی بار انھوں نے بڑے پیمانہ پر جدید
مولوں اور منظم طریقوں سے ترقی کی راہ پر چلایا۔ کتابوں کی تجارت میں درآمد و برآمد کا سلسلہ شروع کیا۔ ایران افغانستان جیز
لستان اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ان کے مطبع کو شہرت حاصل ہوئی۔ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے ان کی عظیم
دمات کا اعتراف کیا۔ ان کی بدولت ایسی نادر ونایاب کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن کی مدد سے علوم وفنون کے سلسلہ ارتقا
ی تاریخی کڑیوں کو مربوط کرنے میں مدد ملی۔ اودھ اخبار کا اجراان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ فنِ خطاطی کو انھوں نے نئی زندگی
بخشی۔ ملک کی صنعتی ترقی میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں' وہ اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی
سرگرمیوں نے آنے والے زمانہ پر گہرا اثر ڈالا۔

منشی نولکشور جنوری ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں ثانوی تعلیم کے لیے آگرہ کالج میں داخلہ لیا
پانچ سال تعلیم حاصل کی' دو سال اخبار سفیر آگرہ میں صحافت کی تربیت حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں اڈیٹر کوہ نور کی
دعوت پر لاہور گئے' اور چار سال اخبار اخبار کوہِ نور اور اس کے مطبع میں کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور
سے آگرہ واپس آئے۔ اور ۱۸۵۸ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے اور مطبع قائم کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار جاری کیا
س وقت وہ اکیس برس کے ہو چکے تھے۔ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر انسٹھ سال تھی
ن کو صرف ۳۷ سال کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ زمانہ مسلسل جہد عمل کا زمانہ تھا۔

۳۷ سال کی مختصر مدت میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار کو ۴ صفحات سے ترقی دے کر ۲۴ صفحات تک
پہنچایا اور خاص نمبر ۴۸ صفحات پر شائع ہوتے تھے' اردو کے بلند پایہ ادیب' انشا پرداز اودھ اخبار سے وابستہ
تھے اور بہت سے اہلِ ذوق اس ادارے میں زیرِ تربیت تھے جو مستقبل میں نامور ہوئے۔

مطبع کو انھوں نے اتنی ترقی دی کہ سارے ایشیا میں اس کا کوئی مقابل نہ تھا۔ ۳۷ سال میں عربی فارسی
سنسکرت اور اردو کی چار ہزار سے کچھ زیادہ کتابیں شائع کیں۔ بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی زندگی میں
صرف مطبع کے اندر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ تین سو مشین میں تین سو ہینڈ پریس چلاتے تھے۔ کانپور کے مطبع میں

دسو آدمی کام کرتے تھے۔ بیس ہزار روپیہ کا کاغذ ہر ماہ صرف ہوتا تھا۔ مطبع کا سالانہ ڈاک خرچ پچاس ہزار روپیہ تھا۔ ملازمین کی تنخواہ پندرہ ہزار ماہوار تھی۔ اس کے علاوہ بیواؤں یتیموں اور غریب طالب علموں کی امداد کے لیے کئی سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ جب منشی نولکشور کی وفات ہوئی اس وقت ان کی جائداد کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ تھی[1] اور جب کام شروع کیا تھا اس وقت سرمایہ کی کمی کے باعث صرف ایک ہینڈ پریس پر کام شروع کیا تھا۔ وہ ریٹائر ہونے والے ملازمین کو پنشن دیتے تھے یہ طریقہ ان کے وارثوں نے بھی باقی رکھا۔ وہ عالموں، پنڈتوں اور سب ہی دانشوروں کا احترام کرتے تھے۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے علمائے نے ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے ان کی علمی خدمات اور امداد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مدرسۃ العلوم (محمڈن کالج علی گڑھ) کو انھوں نے گرانقدر عطیات اور کتابیں تحفۃً میں دیں۔ مطبع نولکشور کے سب سے بڑے عالم و مترجم طویل عرصہ تک مطبع میں کام کرنے کے بعد اپنے تجربات اور مہارت علوم اسلامیہ کے باعث مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس حدیث کے مسند پر فائز ہوئے اور دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے۔ منشی نولکشور نے مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کی یلغار سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور بڑے پرآشوب دور میں مشرقی علوم کے اثاثہ کی حفاظت کی۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہ کرتے تو ہمارا قیمتی سرمایہ ضائع ہو جاتا۔ ان کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر کیا گیا۔ ان کی سرگرمیوں کا اثر قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔

منشی نولکشور کو بجا طور پر مشرقی علوم و فنون کا محسن اعظم کہا جاتا ہے۔ اگر انھوں نے ہر علم و فن کی غیر مطبوعہ کتابیں نہ شائع کی ہوتیں تو یقیناً مختلف علوم کی تعلیم و ترویج میں دشواری پیش آتی ترقی تعلیم میں تیز رفتاری اور بیداری پیدا ہونا بہت مشکل تھا۔ انھوں نے ایک طرف مذہبی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر معیاری مذہبی کتابیں طبع کرائیں، ان میں وہ سب ہی مذاہب و مسالک شامل ہیں، جن کے پیرو ہندوستان میں آباد ہیں، خاص طور پر ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سنسکرت زبان میں تھیں۔ ان کے قدیم مستند مخطوطے حاصل کر کے طبع کرائے اس کے بعد ان کے ہندی میں ترجمے کرائے جن میں مہابھارت رامائن، اپنشد، وید وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی اشاعت کے ساتھ سنسکرت کے ان فارسی ترجموں کی طرف آ

---

[1] اودھ ریویو بابت ماہ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ ادب اردو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ی جو بیشتر مغلیہ دور کے فضلاء نے کیے تھے۔ فیضی کا ترجمہ مہابھارت بہت مشہور ہے۔ اس کے اٹھارہ حصے
یں جن کو مطبع نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ رامائن کے متعدد فارسی تراجم طبع ہوئے جن میں
رامائن مسیحی، رامائن امر پرکاش وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ منشی نولکشور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے ہندو مذہب
کی کئی سو چھوٹی بڑی کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے شائع کیے کیوں کہ اس زمانہ میں اردو ہی ایک ایسی زبان تھی
جو سارے ملک میں رائج تھی، خاص طور پر شمالی ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت اسی زبان کو ذریعہ اظہار
خیال بنائے ہوئے تھی، بول چال کی زبان بھی اردو تھی۔

مسلمانوں کا مستند مذہبی لٹریچر زیادہ تر عربی میں اور کچھ فارسی زبان میں تھا۔ منشی نولکشور نے پہلے عربی
زبان میں مطبوعہ کتب کے نسخے حاصل کیے اور اس کے بعد غیر مطبوعہ مخطوطات تلاش کیے، اور ان کو ماہرین فن کے
سپرد کیا تاکہ اگر کوئی کمی بیشی یا خامی ہو تو درست کر دیں۔ اس طرح ہر کتاب صحت کی کرا کے شائع کی بلکہ اکثر کتابوں پر
مفید حواشی کا اضافہ کرایا۔ ان عربی کتب کے فارسی ترجمے بھی طبع کرائے۔ یہ ترجمے ایران اور ہندوستان میں بہت
عرصہ قبل ہو چکے تھے مگر طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ان کے مسودات مختلف کتب خانوں اور عالموں کے
پاس محفوظ تھے ان سے ضمناً یا عاریتاً حاصل کر کے طبع کرائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمام مستند کتابوں کو اپنے
شعبۂ تصنیف و ترجمہ کے دانشوروں کے ذریعہ اردو زبان میں منتقل کرایا۔ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ صرف
کیا۔ حدیث، تفسیر، اور فقہ کی شاید ہی کوئی مستند کتاب ہو جس کا ترجمہ اردو میں شائع نہ کیا ہو بعض مشہور کتابو
کی شرحیں بھی لکھوائیں۔ اس کے علاوہ اسلامیات پر کئی اچھی کتابیں خود مرتب کرائیں۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم
کتاب "تفسیر مواہب الرحمٰن" ہے۔ جو قرآن شریف کی اردو زبان میں سب سے بڑی تفسیر ہے اور ۳۰ ضخیم جلدو
پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی تفسیر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی شاذ و نادر نظر آئے گی، اس کے بعد اسلامی علوم کے ہر
فن کی صدہا کتابیں شائع کیں۔ جو پہلے عوام و خواص کی دسترس سے باہر تھیں۔

منشی نولکشور نے علامہ فیضی کی مشہور عالم بے نقط تفسیر قرآن شائع کی جس کا نام سواطع الالہام ہے۔
کا مستند نسخہ ان کو کلکتہ کے کسی تاجر نوادرات سے حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح عربی زبان میں تاریخ کی مستند کتاب
طبری کا فارسی زبان میں ترجمہ کئی سو سال پہلے ایران کے سامانی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اس کی مستند قلمی نقل
مختلف کتب خانوں میں موجود تھیں۔ لیکن اس کو پہلی بار منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا، اس میں ان کو شروع اور

انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں تمام اسلامی علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں بکثرت شائع کیں۔ ان کا مدارس اور مکاتب کی رونق میں اضافہ ہوا۔ نصابی کتابوں کی کثرت نے تحصیل علم کا شوق رکھنے والے طلبا کے ہمت میں اضافہ کیا۔ مصنف "اردو کے ہندو ادیب" نے لکھا ہے کہ:

ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے اور نہ اس گراں بہا احسان سے کبھی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ اسلامی درسیات اور اردو ادبیات اور دیگر مذہبی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں منشی نولکشور سی آئی اے کی جو درخشاں خدمات مسلّم ہیں وہ بحیثیت مجموعی کوئی مسلمان (انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے) سرانجام نہ دے سکا۔[۱]

منشی نولکشور اسلامی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ اور ان کے دل میں اس کے لیے نہایت محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے مطبع کو اسلامی علوم کا عظیم مرکز بنا دیا تھا جہاں تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت رکھنے والے علما بیٹھ کر کتابوں کی صحت، ترجمہ اور حاشیہ نویسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور جہاں تفسیر مواہب الرحمٰن، صحاح ستہ، فتح الباری، فتاویٰ عالمگیری، فتح القدیر، ہدایہ اور احیاء العلوم جیسی بلند پایہ کتابیں شائع ہوئیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

سب سے آخر میں لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور اکثر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، قصے، افسانے اور داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اس کی کوششوں کی ممنون ہیں۔[۲]

اسلامی علوم پر مطبع نولکشور نے عربی، فارسی اور اردو میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اس کی شائع کی ہوئی کتابوں کے باعث اسلامی ممالک میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ عربی اور فارسی کی کتابیں چین، ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، حجاز اور مصر و شام میں بکثرت منگوائی گئیں۔ ان ممالک کے کتب خانوں میں نولکشوری مطبوعات موجود ہیں اور ان ممالک کا تعلیم یافتہ طبقہ منشی نولکشور اور ان کے مطبع سے واقف ہے۔ فارسی زبان کے ممتاز محقق ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے لکھا ہے کہ:

---

[۱] اردو کے ہندو ادیب از ناظر کاکوروی صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ نوا پبلک ڈپو لکھنؤ ... [illegible]

یونیورسٹی، اسکول اور کالج کے طلبا کو شاید منشی نولکشور جی کی خدمات کا پورا اندازہ نہ ہوگا۔ مگر جن لوگوں نے درس نظامی حاصل کیا ہے اور عربی مدارس میں تعلیم پائی ہے ان کو پورا احساس ہوگا کہ نحو، صرف، منطق فلسفہ، فقہ، اصول، ادب، ہیئت، لغت، عروض جیسے سبھی علوم کی بے شمار کتابیں مطبع نولکشور نے شائع کر کے استادوں اور شاگردوں، دونوں کی مشکلوں کو حل کر دیا۔[1]

پروفیسر موصوف نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

دنیا کے جس ادارے یا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا چلن ہوگا وہاں مطبع نولکشور کی مطبوعات بھی ضرور ہوں گی۔ مجھے ایران، افغانستان، ترکی جیسے ممالک کے کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ اس مطبع کی کتابیں کس اہتمام سے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔۔۔۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی، فارسی اور اردو میں جتنی کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوئی ہیں، اتنی غالباً کسی ملک میں شائع نہ ہوتی ہوں گی۔۔۔۔ اس پریس سے اس وقت فارسی کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں، جبکہ خود فارسی بولنے والے ملکوں میں شاید پریس کا رواج بھی نہ تھا۔[2]

منشی نولکشور نے ہندی، سنسکرت، گورمکھی اور مرہٹی زبان کی کتابیں بھی شائع کیں۔ ہندو مذہب کی سب ہی اہم کتابوں کو نہایت اہتمام سے شائع کیا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں درج کی جا چکی ہے۔ وہ سب ہی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ قرآن مجید کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں وہ طہارت کا اتنا خیال رکھتے تھے قرآن کے بوسیدہ پتھروں کو یا تو دریا کے کنارے دھلواتے تھے یا ان کے دھوئے ہوئے پانی کو ایک پاک حوض میں جمع کر کے دریا میں ڈلوا دیتے تھے۔ طباعت کا کام مسلمان کارکن انجام دیتے اور ان کے لیے پاک اور باوضو ہونا ضروری تھا۔ کاغذ رکھنے کی جگہ عرق بید مشک اور گلاب کا چھڑکاؤ کراتے تھے۔ ان کے اس احترام و اہتمام سے لکھنؤ کے عوام و خواص سب ہی واقف تھے۔ آج بھی قدیم علمی گھرانوں میں یہ روایت مشہور ہے۔ راقم الحروف نے دو معتبر سن رسیدہ ملازمین مطبع کی زبان سے سنا ہے۔ مؤلف اردو کے ہندو ادیب، نامی کاکوروی نے بھی لکھا ہے اسی طرح وہ عالموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔

منشی نولکشور نے سکھوں کی سب سے بڑی اور مقدس کتاب گرنتھ صاحب اور جنم ساکھی بھی طبع کرائیں۔ اسکا[3] توریت، انجیل (عہد نامہ قدیم و جدید) کے اردو ترجمے طبع کرائے۔ لیکن ان کتابوں کی بازار میں مانگ کم تھی اس لیے

---

[1] ماہنامہ "نیا دور" نولکشور نمبر بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۹۸۔ [2] مرزا لطیف بیگ مہتمم دفتری خانہ مطبع نولکشور متوفی ۱۹۶۴ء

[illegible]

ان کی اشاعت محدود رہی۔ قومی یک جہتی کے لیے اس وقت عوامی اداروں کے علاوہ حکومت نے بڑے پیمانہ پر جو تحریکیں چلائی ہیں ان پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن منشی نولکشور نے تن تنہا اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر بھاری ہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے مختلف طریقوں سے کوشش کی۔ دونوں مذاہب سے ایک دوسرے کو واقف کرانے کے لیے' دونوں کی مذہبی کتابیں ان کی پسندیدہ زبانوں میں طبع کرائیں۔ کاروبار کے سلسلے میں دونوں مذاہب کے کارکن شانہ سے شانہ ملاکر کام کرتے تھے کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ وہ علما اور صوفیا' کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بقول ناظر کاکوروی مرحوم:

چند ممتاز ہندو بزرگوں کی زبانِ مبارک سے یہ بھی سنا ہے کہ جو احترام بزرگانِ دین کا منشی نولکشور کرتے تھے وہ بہت سے مسلمان بھی نہیں کرسکتے تھے' اور یہ واقعہ بھی ہے کہ کلامِ پاک کی اشاعت میں منشی نولکشور کی خدمات آئینہ درخشاں ہیں۔[1]

اودھ اخبار کے ذریعہ انھوں نے ملک و قوم کی بہت خدمت کی' ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے لیے جو تحریک ہوتی تھی اودھ اخبار اس کی خوب تشہیر کرتا تھا۔ دونوں قوموں کے تہواروں کے موقع پر خاص نمبر شائع ہوتے تھے۔ مضامین اور نظمیں لکھنے والے ادیب و شاعر ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ اس اخبار کے اڈیٹر ہندو بھی رہے اور مسلمان بھی۔ سب سے زیادہ مشہور و مقبول اڈیٹر رتن ناتھ سرشار تھے جن کے زورِ قلم کا نتیجہ فسانۂ آزاد کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس ضخیم فسانہ کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اودھ اخبار نے اردو زبان و ادب اور صنفِ صحافت کی جو خدمت کی اسے کسی دور میں بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔

منشی نولکشور نے پہلی بار مضامین کا معاوضہ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اخبار کے نامہ نگار اور نمائندے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں متعین کیے' اس میں بھی ان کو اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے خدمتِ خلق اور احیاءِ علوم' طباعت و اشاعت وغیرہ کے جو منصوبے بنائے تھے ان کو اپنی زندگی میں تکمیل تک پہنچایا۔ وہ کاروباری آداب سے بھی خوب واقف تھے' اور ملک کی تہذیبی اور ثقافتی ضروریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی دلچسپیاں کاروباری زندگی تک محدود نہ تھیں' وہ علم دوست و عالم شناس تھے۔ صاحب کمال فنکاروں کے بڑے قدردان تھے ان کے مطبع میں ہر علم و فن کے ماہرین کا اجتماع تھا۔ سب کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا۔ سب کو فکرِ معاش سے آزاد رکھ کر ان کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے سماجی خدمات نہایت خلوص سے انجام دیں۔ ان کی کوشش سے لکھنؤ میں جلسۂ تہذیب کا قیام عمل میں آیا تھا جو ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بن گیا۔ اس انجمن

---

[1] اردو کے ہندو ادیب حاشیہ صفحہ ۱۸۴۔ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جلسوں میں وہ تقریریں کرتے تھے، اور حق بات کہنے میں حکومت کی خفگی کو بھی نظرانداز کردیتے تھے۔ اس کا اندازہ
دھ اخبار میں ان کی شائع شدہ تقاریر و تبصروں سے ہوتا ہے۔ حکومت یوپی کے حکام خاص طور پر ان کے مشوروں
ے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ملک کے متعدد والیانِ ریاست اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ ان کو وزارت اعلیٰ کی کرسی
ویض کردیں لیکن انھوں نے اپنے لیے خدمت ملک و قوم کا جو منصوبہ بنایا اور جس پر عمل پیرا تھے اس کو کسی قیمت پر
بوڑنا گوارہ نہ تھا۔ مہاراجہ جے پور کی پیش کش کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے۔

علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ مرزا غالب سے ان کے تعلقات کا حال علیحدہ عنوان سے
یا جاچکا ہے۔ غالب ان کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کے لیے ایک خط کا اقتباس پیش نظر ہے جو غالب نے مردان علی
ں رعنا کے نام لکھا تھا کہ:

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے بہت خوبصورت، اور خوش سیرت، سعادت مند اور
معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔"

ھنؤ کے علما، اہلِ دانش اور شعرا سے بھی ان کے مراسم تھے۔ اور ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ذوق و شوق سے شرکت
رتے تھے۔ میر انیس کی مجالس میں خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ خود مطبع میں انھوں نے مشاعرے کی محفلیں منعقد
رائیں۔ ان کے مشاعروں میں نواب مظفر علی خاں اسیر "سابق وزیر دربار اودھ" بھی شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور اودھ
ے دوسرے نوابین اور روٴسا سے خوشگوار مراسم قائم تھے۔ اور ان میں سے بعض کی مدد سے نادر و کمیاب کتابوں کے
طوطے حاصل کرتے تھے۔ علما فرنگی محل سے بھی روابط قائم تھے، مذہبی کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں ان کے مشوروں
ے استفادہ کرتے۔ بعض علما، ان کے مطبع سے بھی وابستہ رہے۔ مولانا فخرالدین فرنگی محلی سے خاص دوستانہ رسم و راہ
ھی انھوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف کیمیائے سعادت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا جس کا دیباچہ خود منشی نولکشور نے تحریر کیا تھا۔

منشی نولکشور چاہتے تھے کہ علوم و فنون کے بیش بہا ذخیروں اور قدیم تہذیبی یادگاروں کو
ندہ رکھا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں سرکاری اور نجی کتب خانوں کو جو نقصان پہنچا تھا
س کو انھوں نے خود دیکھا تھا۔ وہ انتزاع سلطنت اودھ، اور شاہی خاندانوں کے مصائب سے بہت متاثر
تھے۔ جب مطبع کا کاروبار شروع کیا تو ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مختلف ذرائع سے نادر و کمیاب مخطوطات تلاش
رکے ان کی اشاعت کا انتظام کریں، خاص طور پر ان مذہبی، اخلاقی اور تاریخی غیر مطبوعہ کتابوں پر زیادہ توجہ کی،

طلبا پریشان رہتے تھے عام طور پر کسی ایک استاد یا طالب علم کے پاس کوئی قلمی نسخہ ہوتا تو دوسرے حسب ضرورت
کی نقل کر لیتے تھے۔ جس میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ منشی نولکشور نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے قدیم مخطوطات
مسودات حاصل کرنے کے لیے جد و جہد شروع کی اس سلسلہ میں ان کو شاہانِ اودھ کے پس ماندگان اور بعض علمائے
کرام کے ذریعہ بہت سے مسودات ملے جن کو انھوں نے خرید لیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات
جہاں کسی اہم مخطوطے کا پتہ چلا اس کے حصول کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج کر اس کو خرید لیا۔ بعض اہلِ علم نے
عوام فائدے کے خیال سے بلا معاوضہ اپنے مخطوطات دے دیے۔ مؤلف جیون چرتر نے لکھا ہے کہ:

"اس سمے (وقت) چھاپہ خانہ کم ہونے سے پرانی کتابیں ہر علم و فن کی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی تھیں۔ آپ
نے ان کا کھوج کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے امرا متوسلان خاندان شاہی کے کتاب خانوں اور جہاں
سے مل سکیں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بہم پہنچائیں۔۔۔۔۔ تن من دھن لگا کر اپنے مطبع میں
چھپوائیں جن کے ناموں کی فہرست ایک بڑی کتاب ہے۔[1]

منشی نولکشور کی اس جد و جہد کی بدولت نادر و نایاب مسودے ضائع ہونے سے محفوظ رہے اور طبع ہو کر اہلِ ذوق
اور تشنگانِ علوم کو آسانی سے دستیاب ہوئے۔ منشی نولکشور کے فراہم کیے ہوئے بیشتر مخطوطات ان کی زندگی میں
شائع ہو گئے تھے اور کچھ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض طباعت و اشاعت سے محروم رہے
اور مطبع کے محافظ خانہ کی زینت بن گئے۔[2]

وہ اودھ اخبار کے بانی اور مدیر اعلیٰ تھے۔ اردو زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کے معیار
کو بلند کیا۔ حق گوئی اور بے باکی اس کی اہم خصوصیت تھی۔ خطرہ مول لے کر منشی نولکشور حکومت کے غلط کاموں
پر تنقید کرتے تھے۔ اودھ اخبار کے صفحات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر شعبہ کے لیے کام کے اوقات
مقرر کر لیے تھے۔ اسی وقت اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کتب خانے اور مطبع کی کارگزاری دیکھنے کے بعد اودھ
اخبار کے لیے کافی وقت صرف کرتے۔ ان کے علاوہ اپنی دیہاتی اور شہری جائداد کے معاملات بھی دیکھا
کرتے تھے۔ خیال کرتے تھے "کام زیادہ اور آرام کم" یہ ان کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً پچیس فنون
کی چار ہزار کتابیں طبع کرا کے شائع کیں۔

---

[1] جیون چرتر منشی نولکشور صفحہ ۶، مطبوعہ نولکشور پریس۔ [2] اودھ ریویو' ماہ فروری ۱۸۹۵ء۔ و تاریخ ادب اردو

تحفہ کرنیل ایبٹ

TOHFAH COLONEL ABBOTT.

یعنی واسطے یادگار نامی جناب کرنیل سانڈرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کے

منشی نولکشور پرنٹر مطبع نے مختصر کیفیات ہند تواریخ اودہ تا عہد واجد علی شاہ مسمی

تواریخ نادر العصر

مع حالات عمارات شاہی و نقشہ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنیل صاحب ممدوح الیہ جس سے محلے محلے کے حدود اور بعد مسافت

سڑکون اور عمارات کا بآسانی دریافت ہو بعجلت تمام واسطے پیشکش صاحب ممدوح الیہ کے تالیف و ترتیب کیا

مقام لکھنؤ مین

کارگزاران مطبع منشی نولکشور مؤلف نسخہ ہذا کے اہتمام سے چھپا

سنہ ۱۸۶۳ء

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

نقشہ
ملک اودھ
حسب تقسیم قسمت کمشنریہای حال
پیلی بھیت
شاہجہان پور
خیرآباد
سیتاپور
بہرائچ
تلسی پور
بلرام پور
فرخ آباد
ہردوئی

تبت
بھوٹان

ھو المستعان

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیع قبول روزیش باد

راقم الحروف ہیچمیز نول کشور جامع اوراق ناظرین اولی الابصار کی خدمت مین گزارش کرتا ہی کہ جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ہیچمدان ملک پنجاب سے شہر اکبراباد مین پونہچا بعد چندے یعنی اخیر ۱۸۵۸ء لکھنؤ کا اتفاق ہوا یہان جناب فیضماب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کی ملازمت کیمیا خاصیت سے جو ہوشیارپور متعلقہ پنجاب کی ڈپٹی کمشنری سے عہدہ جلیلۂ کمشنری و سپرنٹنڈنٹی قسمت لکھنؤ متعلقۂ صوبہ اودہ پر تشریف لائے تھے ساعت سعید مین عزت و امتیاز حاصل کی بسکہ پنجاب مین مطبع متعلقہ راقم کا حسن اہتمام قدردانی حکام سے مشہور تھا فرط عنایت جناب صاحب ممدوح سے باوجود کم بضاعتی کے اسباب و آلات کلکتے سے یہان لایا اوسوقت سے آج تک باوجود نشیب و فراز زمانے خاص خاوندی جناب محتشم الیہ کے سبب سے یوماً فیوماً ترقی رہی بلکہ موقع احتمال ضرر مین برعکس فائدے حاصل ہوئے اب کہ ۱۸۶۳ء مین صاحب محتشم الیہ پانچ برس کے بعد آسایش روحانی و صحت بدنی کے لیے پندرہ مہینے کی رخصت لیکر عازم ولایت ہونے لگے صاحب

موصوف کے احباب کیا صاحبان ذوی رتبہ کیا روسا و عمائد شہر کو
جدائی اونکی بہت شاق گذری اس تقریب مین سپاس نامے پڑھے
گئے دعوتین ہوئین لہذا بقول آنکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست حقیر نے
بھی موقع مناسب سمجھکر ہفتے عشرے کے اندر یہ عجالہ تالیفات قدیمہ
سے انتخاب کر کے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھاکر اس بضاعت
مزجات کو پیشکش خدام عالیمقام کیا کہ تا تشریف آوری بطور یادگار تعوذ
بازوی روزگار رہے اور اس نام نامی سے مجکو اور میرے مطبع کو
تبرک حاصل ہو گر قبول افتد زہے عز و شرف چنانچہ قبل اظہار مطلب
اولا حالات تشریف آوری صاحب محتشم الیہ کے ہندوستان مین اور
کارگزاریہای عظیمہ بعد اسکے ذکر سپاس نامونکا جو روسا و عمائد نے
جس عنوان سے کے ساتھہ پیش کیے بگزارش حقیقت حال اور اخیر مین
قصائد و قطعات جو صاحب ممدوح کی مدح مین اس مطبع کے متوسلون نے
موزون کیے ہین سکھے اگرچہ ہدیہ محقر اتحاف کے قابل تھا لیکن

کند ہر کس بقدر خویشتن منت گزاریہا
زیاران تحفۂ دیگر ز مظہر جانسپاریہا

کرنیل ایس اے ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنو

LIEUT.-COLL. S. A. ABBOTT,

COMMISSIONER, LUCKNOW DIVISION.

Health, long life and prosperity may attend his retirement now and ever.

حال ابتدائے آمد جناب کرنیل ایس ای ایبٹ صاحب بہادر کا ہندوستان مین

۱۸۲۲ء مین کرنیل صاحب موصوف بعہدۂ انسائین ولایت سے داخل کلکتہ ہوے
دوسرے سال اسی عہدے پر مقرر ہو کر ہمراہ ۴۲ رجمنٹ ہندوستانی پیچ کو
بھیجے گئے چند روز کے بعد وہان سے تبدیل ہو کر ۱۵ رجمنٹ ہندوستانی مین مقرر ہوے
اور اسی فوج کے ساتھ ۱۸۲۴ و ۱۸۲۵ء مین شجاعوالی کی لڑائی مین موجود
رہے جب بھرتپور لاھی گڑھی فتح کی گئی اوسوقت صاحب موصوف چند کمپنی کے
افسر تھے بعد اس لڑائی کے صاحب ممدوح رسالہ مین پہلی رجمنٹ کے مترجم ہوے ۱۸۲۶ء
مین ماتحت کرنیل سر ہنری لارنس صاحب مرحوم کہ اوسوقت مین کپتان تھے
محکمۂ پیمایش کے اسسٹنٹ مقرر ہوے چنانچہ اسیوقت سے تا وفات کرنیل لارنس صاحب
دونون صاحبون مین دوستی چلی آئی صاحب موصوف نے جنکو عہدہ لفٹنٹ کا ملا
ضلع گورکھپور و الہ آباد کی پیمایش کی ۱۸۳۰ء مین بندوبست کا محکمہ اونکے
متعلق ہوا اور اونھون نے ضلع کانپور و جونپور و کسیقدر ضلع بنارس و ضلع جالون
واقع بندیل کھنڈ کو پیمایش کیا اور جب ۱۸۴۲ء مین تخفیف مصارف کے
سبب سے گورنمنٹ نے کل پیمایش کے محکمے کی تخفیف کی صاحب موصوف نے اوسوقت
مین عہدۂ کپتان پایا تھا افسر کمسریٹ باختیار مجسٹریٹی ہمراہ کیمپ گورنر جنرل کے
واسطے بلنے اوس فوج کے جو کابل سے لوٹی آتی تھی فیروزپور کو جاتا تھا مقرر

ہوے ۱۸۴۳ء مین جب کیمپ ٹوٹا صاحب موصوف بعہدۂ ایڈیکانگ
یعنی مصاحب لارڈ ایلن برا صاحب گورنر جنرل کی مقرر ہوکے ہمراہ حشم الیہ
کلکتے کو گئے ماہ اکتوبر سنہ مذکور مین صاحب موصوف ماتحت کرنیل
رچمنڈ صاحب بہادر سی بی اجنٹ گورنر جنرل اضلاع غربی و شمالی کے
اسسٹنٹ مقرر ہوی اور ماہ جون ۱۸۴۴ء تک ضلع لدھیانا وفیروزپور
اونکی تعلق رہا اس ۱۸۴۴ء مین ۱ دن سپاہی پلٹن نی جو سندہ کو جاتی
تھی بغاوت کی اور خوف اس بات کا ہوا کہ سکھونکا ارادہ حملہ کرنیکا
ہی دہنے کنارے دریاے ستلج کے ایک فوج خالصہ کی جاکر مقیم ہوئی
تھا چونکہ رات کیوقت اونکی سردار مارے گئے وے لوگ لاہور کو ارادہ
بغاوت سی پھری ہوے واپس آئے چند روز بعد صاحب موصوف کو حکم
پیمایش و بندوبست ضلع کیتھل کا ہوا مگر اختتام اسکا ہونہ سکا بوجہ
حملۂ ثانی سکھون کے کہ جو ماہ دسمبر ۱۸۴۵ء مین ہوا اوسوقت براڈفٹ
صاحب نے خاص چٹھی لکھکر صاحب موصوف کو طلب کیا کہ آکے
انصرام رسد فوج جو جمع ہو رہی تھی کرین صاحب بہادر سب انتظام
اوسکا کرکے پچاس کوس گھوڑے پر سوار ہو جناب گورنر جنرل بہادر
سے انبالے مین جا ملے اوسوقت خبر پہونچی کہ سکھونکی فوج دریاے
ستلج کے پار اوتر آئی ہے تب صاحب موصوف کو حکم ہوا کہ کسولی

پہاڑ پر جا کے فوراً ۹۲ رجمنٹ اور ایک نمبر فیوزیلیرس پلٹن لے آوین
اوسیوقت بہ تعمیل حکم صاحب موصوف گھوڑے پر سوار ہو کر شام
کسولی پہاڑ پر جو ۴۵ میل تھا پہونچے اور دوسری صبح فوج کو
ہمراہ لیکر روانہ ہوے اور تھوڑے عرصے مین کمپ گورنر جنرل
مین داخل ہوے اس بروقت مدد فوج سے ہارڈنگ صاحب بہادر
نے دشمن کا مقابلہ مقام فیروز پور مین کیا اور میجر براڈفٹ صاحب
و صاحب موصوف بھی لڑائی پر مصروف رہے مگر ایڈیکانک یعنی
مصاحب گورنر جنرل کہلایا کیے تبکی اور فیروز پور کی لڑائی مین
منجملہ ۱۳ افسر ۵ مصاحب گورنر جنرل کے جو لارڈ ہارڈنگ صاحب کے
ہمرکاب تھے کام آئے اور میجر براڈفٹ صاحب بھی اونمین سے
ایک مصاحب تھے جو مارے گئے اور ۵ مصاحب گھایل ہوئے کہ منجملہ
اونکے صاحب موصوف بھی ایک زخم رسیدہ تھے یعنی صاحب موصوف
کو ایک گولی بائین ہاتھ سے ہو کر نکل گئی اور ایک کاندھے کی تلے سے پیٹ کی
پسلی مین جا گڑی چھہ ہفتے تک صاحب موصوف اس درد و تکلیف
مین فیروز پور مین مقیم رہے جب صحت ہوئی تب حکم ملا کہ دیہات مین جا کر
تدبیر رسد کی کرین اس کارگزاری کی تعریف کی رپورٹ ولایت مین
ہوئی اور تب کپتان صاحب بہادر کو عہدہ بریوٹ میجر کا ملا صاحب موصوف کو لارڈ ہارڈنگ

گورنر جنرل نے ایک تمغہ اور لقب انریری ایڈیکانگ یعنے
انریری مصاحب کا عطا فرمایا اور وہ لقب آج تک سب صاحبان
گورنر نے جو بعد لارڈ ہارڈنگ مقرر ہوئے برقرار رکھا۔
ابعد انصرام بندوبست ضلع کتھیل و لڈوا سیجر صاحب ۱۸۴۷ع
مین ضلع انبالہ مین مقرر ہوئے جب سکھون کی دوسری لڑائی
ہوئی صاحب موصوف اسی ضلع مین مقرر تھے وہ بھی وقت
نہایت آزمایش و بیدار مغزی و بہادری کا تھا کہ ۱۸۴۹ع مین ہوشیارپور
کے عہدہ صاحب ضلع کیواسطے مقرر ہوئے اور اس ضلع مین عرصہ تک رہے
صاحب موصوف نے کمال رفاہ و آسایش رسانی خلائق سے
نئے انتظام انگریزی کو اوسی ضلع مین جمایا یہ صاحب ہی کا کام تھا
اور وہان سے تھوڑے دنون کے بعد بوجہ ناسازی مزاج
پندرہ مہینے کی رخصت لیکر ولایت کو تشریف لیگئے ماہ فروری
۱۸۵۲ع مین مراجعت فرمائی ۱۸۵۷ع مین بلوہ ہوا چنانچہ ۱۸۵۷ع
و ۱۸۵۸ع کی بابت صاحب ممدوح کی مفصل کارگذاریان پنجاب کی رپورٹ
مین مندرج ہین اوس ایام غدر کا انتظام ایسا عمدہ کیا کہ نہ آسایش
رعایا مین خلل آیا نہ دست تصرف باغیان سے اوس ضلع کو ضرر پہنچا
کمال بیدار مغزی و بہادرانہ طریق سے ضلع ہوشیارپور کا انتظام

برقرار رکھا کہ آنزوے ستلج کے سب ضلعون مین آتش فساد و نائرہ بلوہ مشتعل تھی اور گرد و پیش مین غدر کے نیتجے سے یعنے لوٹ مار و خون خرابے سے حشر برپا تھا مگر صاحب موصوف کے انتظام و اخلاق و غریب پروری سے جون تک نہ مری کرنیل سر ہنری لارنس صاحب بہادر چونکہ چیف کمشنر اودہ تھے میجر ایبٹ صاحب بہادر کو قائم مقام کمشنر لکھنؤ فرما کر تار برقی سے خبر بھیجی تھی لیکن تار کو باغیون نے متصل شہر دہلی ہنگامۂ غدر مین کاٹ ڈالا تھا اس سبب سے خبر نہ پونہچی جبکہ ۱۸۵۸ء مین سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر چیف کمشنر ہوے اوسی عہدہ کمشنری لکھنؤ پر مستقل فرمایا اور ماہ اپریل مین لکھنؤ تشریف لائے اب لکھنؤ مین تشریف لائے ہوے پورے پانچ برس ہوے اور اسی جگہ عہدہ کرنیلی کا حاصل کیا اُس زمانۂ پرآشوب غدر مین اس عہدے پر لکھنؤ مین وُتی افروز ہوے تھے کہ شہر اوجاڑ پڑا تھا اکثر مقامات پر آدمیونکی لاشون کی بو سے دماغ سڑتا تھا خلق اللہ رمیدہ بھی اپ ڈر سے کانپتے تھے نواح مین باغیون کی لوٹ مار غدر سے حشر برپا تھا اور آواز توپ و تفنگ سے افسران انگریزی

شب و روز مستعد بجنگ رہتے تھے چنانچہ خاص تدابیر صاحب
موصوف نے اس قسمت کی قسمت کو بیدار کیا رفاہ پسندی
اور آرام دہی سے رعایا کو تسکین دی اور آبادی مین توجہ
فرمائی غرض عدل و رحم صاحب موصوف کا بیان کی حد سے باہر
ہے جنکے خوف و خطر اپنے وطن کو آسئے خانہ آباد و دولت روز افزون
سے آبادی شہر ہوئی شہر کی لوٹ اور ڈاکہ اور چوریون کا انسداد
کیا گیا غرض پانچ برس رفاہ و آسودگی خلائق مین ایسی توجہ
کی کہ آج کے دن صاحب موصوف کے محامد او صاف کو
یاد کرکے فرط جدائی کا قلق سہا نہین جاتا ۔
غرض ابتداء آمد ہندوستان مین اس ۱۸۶۳ء تک
۴۴ برس ہندوستان مین رہے خدا آسائش روحانی و جسمانی
نصیب کرے اب سن شریف صاحب محتشم الیہ کا ۶۲ برس کا ہے ۔
اس بیان سے جانا چاہیے کہ صاحب محتشم الیہ نے کیسی کیسی دشواریان
سہین ابتدائے آمد ہندوستان سے اہم کامون کی انجام دہی یادگار
اس ۴۴ برس مین جس جس مقام پر رہے رفاہ خلائق و کار سرکاری کو
اپنی آسائش پر مقدم سمجھے اور خصوص اس پانچ برس کی کمشنری مین
۱۰ لاکھ آدمیونکو الطاف و رحم دلی و انصاف صاحب ممدوح یادگار رہیگا فقط

کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کا رخصت پر ولایت کو تشریف لیجانا

ای خرم از فروغ رخت لالہ زار عمر باز آ کہ رفت بی گل رویت بہار عمر

مارچ کی ۲۴ تاریخ سہ شنبہ کو ۳ بجے چتر منزل مین تقریباً ای سپاس (جناب معلی القاب کرنیل سانڈرس الکس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ) کے مجلس شاہزادون نوابون امیرون ساہوکارون اور نامی گرامی رئیسون اور صاحبان جلیل القدر کی منعقد ہوئی مگر چونکہ انعقاد مین عجلت ہوئی اسلیے ہزارون امرا و روسا کو عدم صحت تحقیق روز کے سبب سے خبر نہ پہنچی کمال حسرت ہی پیر بھی سب صاحب قریب ایکہزار کے تشریف فرما تھے مکان کی عالیشانی اور فضا اور سامان کے بیان کی یہان گنجایش نہین ہے عقیدت و ارادت جناب محتشم الیہ سے شہر کے جملہ روسا و عمائد و عوام الناس کا دل بکمال تمنا شاکر تھا سبب محتشم الیہ آسایش دہی و رفاہ رسانی و فراغ بخشی و عدالت نوشیروانی کا متنفس مداح تہا چنانچہ آرزومندون نے ذریعہ اس حصول ملازمت و ادای شکریہ کا نواب محسن الدولہ بہادر کی تحریک سے پاکر اپنی اپنی تمنا پر کامیابی حاصل کی اور جلسہ عام مین سپاسنامہ مندرجہ ذیل پڑہا گیا

نقل سپاس نامہ از جانب شہزادگان

و روسا و عمائد شہر لکھنؤ

سپاس نامہ بخدمت کرنیل سانڈرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ و انزری ایڈیکان جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر ویسرائے کشور ہند خلد اللہ ملکہ از طرف جملہ شاہزادگان و عزیزان خاندان شاہی و رئیسان و مہاجنان وغیرہ ساکنان شہر لکھنؤ خاص کے نواب محسن الدولہ بہادر نے پیش کیا +

جو کہ بعد فتح لکھنؤ و دفع باغیان و تسلط سرکار دولت مدار گورنمنٹ انگلشیہ در روز اجلاس فرمائی آپکے عہدۂ کمشنری لکھنؤ پر جو جو اخلاق و محبت و قدر دانی و شفاعت پروری و عدل گستری نسبت ہم لوگون کے آپ کی جانب سے ظہور مین آئین ادائے شکریہ مین اوسکے ہم لوگون کی زبان قاصر ہے آپ کی بیدار مغزی و معاملہ فہمی کی نسبت تعریف و توصیف کرنے کی کیا حاجت انفصال مقدمات سے ظاہر ہے آپ کے انصاف و عدل سے کوئی شخص شاکی کسیطرحکی حق تلفی کا نہین ہے بلکہ واضح ہے بعد ایام غدر کے اس شہر تباہ و برباد کو اپنی عنایت سے اور ہم لوگونکی قدر دانی و دلجوئی سے از سر نو آباد کیا ہر فرد بشر آپ کی محبت و اخلاق سے راضی

و ثنا گری ہے آپکے عہد معدلت مہد مین ہر طرح کا چین و آرام رہا اس خطۂ
جلیلہ کا بخوبی بندوبست و انتظام رہا جابجا باشندگان شہر کو آپ نے قرقی
و ضبطی سے بچایا مظلومون کو ظالمون کے پنجے سے چھوڑایا حق سے
باطل کو جدا کیا عدل گستری و رعایا پروری سے ہر کہ و مہ کو مطمئن
و دلشاد کیا جس سے ہم سب آپ سے بدل راضی و ممنون و شاکر ہین
ہم لوگون کو آپ کی مفارقت سے بوجہ تشریف بری ولایت کے
بتقریب رخصت کے جو کچھہ رنج و ملال ہے زبان قلم تحریر مین اوسکے
لال ہے لیکن کچھہ اختیار نہین بجز اسکے کہ حق سبحانہ و تعالے ہمیشہ
آپ کو اپنے حفظ و امان مین رکھے و بخیر و عافیت تمام منزل مقصود کو
پونہچاوے اور جلد آپ کی ملاقات مسرت آیات بترقی جاہ و حشم ہم
لوگون کو مسرت اندوز کرے تر صدکہ تا زمان مفارقت بدستور مثل ہمیشہ کی
شفقت و محبت و عنایت و عاطفت بہ نسبت ہم لوگون کے مرعی
و مبذول رہے فقط مرقوم ۴ ماہ مارچ ۱۸۶۳ء روز سہ شنبہ
اوسکو سماعت فرما کر جناب معلی القاب صاحب معزی الیہ نے موافق رسم مستمرہ استادہ
ہوکر جواب سپاسنامہ مین فصاحت و بلاغت سے حوالہ زبان گوہر فشان کر کے
آویزہ گوش ہوش اہل دربار فرمایا وہ بھی برج درج گوہر بار ہی بسکہ ہجوم خلائق سے حضار جلسہ
اوسکے سننے کی تمنا بدل ہی رہی اسواسطے حسب الایما صاحب محتشم الیہ پریذیڈنٹ مطبع نے باواز بلند سنایا

جواب سپاسنامہ از جانب کرنیل سانڈرس ایکسن اسٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ مخاطب بنواب محسن الدولہ بہادر و شاہزادگان و امرایان و رئیسان شہر لکھنؤ

ای صاحبو پانچ برس کا عرصہ گذرا کہ راقم حسب الطلب صاحب نیک صفات سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر جنکی یاد یقین ہے کہ آپ سب صاحبون کو ہوگی بعہدۂ جلیلۂ کمشنری قسمت لکھنؤ کے پنجاب سے اس جگہ آیا اسی عرصے مین شہر لکھنؤ باغیان سے صاف ہوا یہ باغیان ایسے نمکحرام تھے کہ سرکار گورنمنٹ سے جسنے سو برس تک اونکی پرورش کی برخلاف ہوے اور تمام ملک ہندوستان مین علم بغاوت بلند کیا شہر لکھنؤ مین بکثرت مورچہ و ناکہ بندیان جو ویرانگی تھی رعایاے شہر فرار ہوگئی اور شہر بعد فتح فوج سرکاری کے ہاتھ بدمعاشان و ڈکیتان سے غارت ہوتا رہا بلکہ یہ صورت عرصے تک رہی اور بعد واپسی رعایا بدقت و بمشکل تمام امن و انتظام ہوا الا لوٹ دیر تک موقوف نہوئی اسلیے صاحبان جو آپ نے نسبت ہمارے سپاسنامے مین تحریر فرمایا ہے کہ ہاتھ ظالمون سے بچایا اوس سے آپ کی یہی مراد ہے جو بالا لکھا گیا آپ شاہزادگان و امرایان و رعایای شہر لکھنؤ نے جو توصیف محنت راقم انتظام و انصاف گستری مین فرمائی ہے مین نہایت خوش ہوا اور یہ امر

جو آپ صاحبان فرماتے ہین کہ ہمنے راستی کو باطل سے علحدہ کیا آئین
ہمارے فہم کی بہت زیادہ توصیف ہوئی یقین ہے آپ صاحبان کو کہ سبب
نہونے رعایاے ہندوستان کے انصاف گستری مین نقصان عظیم واقع ہے
علاج یہ ہے کہ ہر ایک آپ صاحبان مین سے اولاد خاص و عام کو ترغیب
تعلم علوم دین و نیک راہی و شوق راست گفتاری مین کوشش و امداد فرماوین
اور بڑی امداد یہ ہے کہ آپ صاحبان خود بجاے کارندگان و مختاران کے
اپنے امورات و کاروبار مین اپنی اوقات و توجہ مبذول کرین اکثر آپ صاحبون
مین سے اہالیان کمیٹی صفائی ہین نہایت بہتر ہوگا اگر آپ سب صاحبان واسطے
فوائد مشترکۂ عام کے توجہ بلیغ فرماوین اور تدابیر نیک واسطے صحت و آسایش
و رفاہ کے تجویز کرین کہ یہ امر منتج فوائد عظیم ہوگا و انتظام دار الانصاف ہی مین
بہی آپ کی امداد و کوشش سے فوائد و بہتری ہو سکتی ہے آپ صاحبان
اگر واسطے تقرر اسیسری یا جوری وغیرہ کے طلب فرمائے جاتے ہین تو
اوسکو تکلیف تصور کرتے ہین ہمارے راے مین یہ تجویز باعث بہتری آپ
صاحبان کا ہے کیونکہ اس وسیلے سے آپکو اپنی راے پر اعتماد و بھروسا
حاصل ہوگا اور ظاہر ہوگا کہ انتظام عدالت نہ صرف بطور ضابطہ ہے بلکہ
واسطے گواہی دینے خاص و عام کو کہ صاحبان مجسٹریٹ و جج بہادر انصاف
و درستی فرماتے ہین اور اسلیے کہ آپ اونکو تجویز منصفانہ مین امداد فرماوین کہ

یہ مفید ہر ایک صاحبون و خاص و عام کے ہوگا ہماری نہایت خوشی ہے
کہ آپ صاحبان مین سے جتنے صاحب آنریری مجسٹریٹ مقرر کیے جاوین
چند عرصہ گذرا کہ یہ امر تجویز ہوا تھا یقین ہے کہ آسواسطے ملتوی رہا کہ اسکا
انتظام پنجاب مین جہان اجرا ہوا امتحان دیکھا جاوے ہمکو یقین ہے
کہ پنجاب مین یہ انتظام بہت مفید ہوا امید ہے کہ ہمکو موقع مبارکبادی
دینے کا درباب جلد بننے سڑک آہنی کے آپ صاحبون کو ملے کہ اس
سڑک سے شہر لکھنو و کانپور و دہلی و کلکتہ ایک ہو جاینگے اور اس سڑک
سے آپ صاحبون کو نہایت فائدہ ہوگا کہ آپ قدر و منزلت زمانہ مین کے
اور دور آرایش سامان مین کوشش تمام بیش قدمی کرینگے اور پہلے سے بڑھینگے
اہی شاہزادگان و نواب صاحبان و رئیسان لکھنو مین شکر دلی ادا کرتا ہون
کہ آپ نے اس طرز شائستہ سے مجھے دعای بہبودی دی اور میری
مراجعت کی آرزو فرمائی یقین رہے آپ صاحبان کو کہ ہمارا دل لکھنو مین
ہے اور ہم نہایت رنج سے واسطے گونہ آرام لینے اپنے وطن کے
شہر سے جدائی کرتے ہین الا ہماری آرزو ہے کہ اگر زندہ رہے اور
اس عرصہ پندرہ یا بیس مہینے مین صحت حاصل ہوگئی تو ایک مرتبہ آپ
صاحبان کے پاس مراجعت کرینگے اور اس سپاسنامے مین جو آپ نے
بیانات مہربانی آمیز تحریر فرمائے ہین اسکا ہم بہت شکر ادا کرتے ہین

اور ہماری دعا ہے کہ آپ سب صاحبان تندرست و کامیاب ترقی دولت مین

از مولف

صاحب ممدوح کے محامد ذاتی و صفاتی عدل و قابلیت و خلق و حلم و قدر دانی
ہرگز محتاج بیان نہین +

چلتے چلتے اونکی توجہ بیجا اور رفاہ پسندی اور عنایت جو عائد حال
خاص و عام رہی تمہ اوسکا اونکے سپاسنامے سے آشکار ہے یعنی جو
امور کہ مفید اور باعث انتظام و بہتری خاص و عام کے ہین اونکی یاد پیرایہ
پند و نصائح مین دلائی جسپر عمل فرمانا نتیج آسودگی و بہبود خاص و عام ہے +
یہ سب دلسوزی اور توجہ اونکے عہدے سے بڑھکر محض نیکذاتی خلقی کا
موجب ہے سرکار کا کام ایسا کیا کہ انصاف مین نوشیروان پر سبقت لیگئے
رعایا پروری ایسی کہ ماں باپ بہی کرتے حفظ مراتب وساوہ کہ قیامت تک
اونکو نہ بہولینگے +

ملک اودہ کے زہے طالع کہ یہان سب حکام عادل اور رعایا پرور
اور نیکنام ہین حسن خلق مین یکتای روزگار ممدوح خاص و عام ہین دیکھو
آسمان پر بہت ستارے منور ہین قدرت خالق سے ہر ایک کے
فائدے مقرر ہین لیکن دن کو آفتاب کا جواب نہین رات کے وقت
نامی ماہتاب نہین شعاع مہر سے میوون مین پختگی آتی ہی چاندنی اثمار کا

رُس بڑھاتی ہی اسطرح صاحب موصوف اپنے صفات مین انجاب ہین
زبرہوزری کے آفتاب شب امید کے ماہتاب ہین—

الغرض بعد رسم سپاس کے صاحب والاشان سوار ہوے اور مجلس
برخاست ہوئی او سوقت کے افسوس اور حسرت کا حال لوگون کے
دل سے پوچھنا چاہیے مگر ان صاحب ممدوح الوصف کے امید
بازآمد سے البتہ تسکین قلق مہاجرت ہے—

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

۲۰ مارچ کو بتقریب رخصت صاحب ممدوح کی جناب فیضماب نواب
محسن الدولہ بہادر رئیس اعظم لکھنو نے روشنی و آتشبازی کے ساتھ
بڑی دہوم دہام سے دعوت کی سبحان اللہ نواب صاحب کا
کیا کہنا شہر کی ابرو ہین سرکار کے دولتخواہ حکام کے رضا جو ہین

الحاصل صاحب معزی الیہ کی جدائی کا قلق ایک زمانے کو ہے
اور سب دست بدعا ہین کہ مع الخیر والمراد بعد اتمام رخصت کے
پھر اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس خطے کو غیرت ارم
اور دیدار فیض آثار سے منور فرما دین آمین—

بسفر رفتنت مبارکباد بسلامت روی و باز آئی

قطعہ حسب حال عقیدت مؤلف از نتائج طبع سلیم مرزا ابراہیم

ای فلک افسوس کیون کرتا ہی ہی یہ امتحان
سوچ اتنا او ستمگر تو کہان او ہم کہان

کونسا احسان کیا تہا جسکی یہ پاداش ہی
ایسے محسن سی جو آئی لفظ رخصت بر زبان

واقعی قسمت ہم ہی تہی یہ جو پہنچی قدم
ہای ناکامی یہ کیا سامان نظر آیا یہان

جوش بیتابی یہ کہتا ہی کہ ہو غفلت گزین
جب نہ آئی گل نظر کیا ہی سیر بوستان

آرزو ایما یہ کرتی ہی کہ چلیی ساتہ ساتہ
ورنہ لطف زندگی ہو جائیگا خواب گران

عالم ایجاد مثل گوشۂ تاریک ہی
رنج فرقت سی نظر مین دن ہی شام بیکسان

وہ بکان جسم مین محسن کی ذات پاک تہی
کسطرح بہجیوین کہ جوش غم سی اوٹہتا ہی دہوان

یاد آتی ہین ہمین وہ روز آغاز ورود
جبکہ تہا ملک اودہ ممنون احسان خزان

آدمی ناپید گہر تاراج ویران ملک دشت
ہر در و دیوار سی پیدا صدای الامان

داد دی ہمت کہ آباد دیکہکر دلمین جو رحم
کر دیا جیتی ہوئی بستی کو گلزار جنان

ہر غریب عاجز و محتاج پر بخشش ہوئی
بچ گئین جانین ہوا دلشاد خیل بیکسان

ہر امیر و صاحب عسرت نی پایا اک عروج
خوش ہوی سینون مین دل آئین دعائین بر زبان

عمل جو ا صاحب کمشنر کی زیادہ عمر ہو
یعنی وہ کرنیل ایبٹ رونق ہندستان

مل گئی جاگیر جو جویان تعلقدار تہا
فیصلہ ہونی لگی ہر سو نکی جہگڑی ہر زمان

تہی جو ظالم اونکو پاداش عمل اپنی ملی
عاجزونکی شکر کرنی کو ہوئی گویا زبان

کثرت سامان راحت سی تہا یہ وقت یاد
یعنی اکدن اس چمن پر آئی گی باد خزان

[illegible]
سنتی رہ جاتی ہی بیہوش [illegible]

آئی اشک چشم استقبال اُن کے لیے	لب ہوئی اندوہ سے مصروف فریاد و فغان
ہر اسیر دوست آیا بہر استفسار حال	یون کہا صاحب نے تہا کس نے ای نکتہ بیان
اس لیے چندی برائی سیر دنیا عزم ہے	جلد آئین گی بشرط خیریت ای مہربان
بسکہ تہا اک مین بہی بندہ ولی غمخوار گہر	دل ہوا مانند بسمل سوز فرقت سے تپان
بی تامل بر زبان آئی یہ اشعار دعا	یا الٰہی تا کہ ہے بنیاد کاخ آسمان
یا الٰہی تا کہ ہے بنیاد ہستی کو بقا	یا الٰہی تا کہ ہے سر پر یہ نیلی سایبان
اقتدار و عزت و اقبال صاحب کا رہے	مدعی ہون زرد رو جس طرح ہو برگ خزان
جلد پہر تشریف لائین تا یہ غم جاتا رہے	آئی پہر پابوس کو کوسون سے خیل دوستان
لکہنؤ مین دہوم ہو ہر سو مبارکباد کی	ہو سلامی در پہ ہر ہر طفل و ہر ہر پیر و جوان
مین قصیدہ مدح کا اکثر پڑہون با طبع شاد	دیکہون ان آنکہون سے لطف بزم خیل دوستان

ای قلم بس رنج فرقت سے نہین دل کو قرار
جوش غم کثرت پہ ہے کر اختصار داستان

ایضاً

دریغا کہ یہ دور لیل و نہار	نہین ایک صورت پہ رکہتا بہار
کبہی کچہہ کبہی کچہ کبہی کچہ ہی رنگ	زمانہ نہین قابل اعتبار
اگر چہ ہی دن کو بلبل ہنسے ہین	تو ہی شب کو شبنم کی چشم اشکبار
کوئی چشم تر یاد احسان سے ہے	کسی جا ہی عزم سفر آشکار

غرض تا کجا شکوۂ انقلاب — گذر اس سے ای خامہ کر اختصار
رقم کر مضامین رخصت بہی چند — کہ دل مثل سیماب ہے بیقرار
وہ محسن کہ جس سے ملین راحتین — وہ حاکم جو تہا عادل روزگار
وہ سردار جسکی کہ در سے کبہی — نہ محروم اوٹہا کوئی امیدوار
غریبون پہ احسان امیرون پہ لطف — اب ایسا کہان صاحب باوقار
اور وہ بعد تاراج اک دشت تہا — ہوا فیض سے اوسکے پہر نوبہار
وہ مجرم جو مایوس تہی زیست سے — قصور اونکے بخشے گئے بار بار
رہا کون باقی وہ صاحب غرض — نہین جسکے نخل تمنا مین بار
فدا اون پہ اور اونکی الطاف پہ — یہ کرنیل ایبٹ ہین جو نامدار
الٰہی رہے عمر و دولت سدا — یہ جب تک کہ ہے ہستی روزگار
بڑہی اور بہی اوج اقبال مین — ملی دشمنون کو دل داغدار
کہانتک بیان لطف و اوصاف ہون — زیادہ ہی قید سخن سے شمار
مری پرورش کا جو آیا خیال — ہوئی صورت مطلع نامدار
وہ احسان کیے جنکی کچہ حد نہین — کہانتک اوا شکر ہو بار بار
تمنا تو یہ تہی کہ تا زندگے — جدا اسے کسی دم نہو آشکار
ہمین یون ہی ممنون احسان سدا — مگر حیف ای گردش روزگار
[illegible] — [illegible]

وہ دل جسمین لبریز تہا جوش شوق | وہ جان تہی محبت سی جو بیقرار
اونہین یہ نظر آئی شکل سفر | بجز آہ و افسوس کیا اختیار
الہی لبوں اب ہی سے یہے آرزو | کہ جسدم چلیں صاحب باوقار
ترا سایہ فضل اونپر رہے | سب تجھے سونپتا ہون مری کردگار
برآئیں مرادین جو کچھ دلمین ہین | موافق رہے دور لیل و نہار
بہت جلد تشریف لائین یہان | کہ دل دوستون کی ہون پر بہار
رئیس و مصاحب آکر سپہر نند دین | سنین کو شادی کی غل بار بار
قدم سے ملین آنکہین احباب و دوست | خوشی سی ملین صاحب نامدار
تہہری قلم ختم مطالب ہوا | دعا لکہہ ہمیشہ رہے اقتدار

قصیدہ از نتائج طبع شاعر سحر بیان شیرین زبان منشی غلام احمد صاحب شایان

گلستان سی ہوتی ہی رخصت بہار | خزان نکہت گل ہی کہاتی ہی خار
یکیس شاخ ہر گل کی رخصت ہی آج | کہ بلبل ہی گل کی روش دلفگار
گلون کو ہی کیا ای صبا بیکلی | دل عندلیب آج ہے داغدار
پریشان ہین قمریان باغ مین | رخ سرو سی ہی عیان انتشار
بنا غمکدہ گلشن لکہنؤ | اوتار اعروس چمن نی سنگار
بہت تنگ ہی یوسف گل کا حال | گریبان و دامن ہین سب تار تار

ری غنچۂ دل کو تھی بستگی　　یہ بول اوٹھا اک بلبل بیقرار

شایان اوڑ رکیون ہی پھر یکا رنگ　　ہاک دل یہ ہاین آج صدمی ہزار

یان کیا کرون حال نیرنگ چرخ　　کہ ہی اسکی ہاتھون سی سینہ فگار

ہن کا تھا جو باعث رنگ و بو　　ملا جسکی گلگشت سی افتخار

سی دیکھکر نو عروسان باغ　　سماتی نہ جامی مین تھی زینہار

ہی ہوتا کر لگا یا جو ہاتھ　　ملی اوسکو آب ور شا ہوار

نا ہاتہ ملتی ہی اوسکی لیے　　ولایت کو ہوتی ہین وہ اب سوار

بیعت جو ہی اندنون کچھ علیل　　اسی سی وہ رخصت کی ہین خواستگار

ہا بخش عالم اونہین دی شفا　　عروسانہ صحت رہی ہمکنار

سنکر گل افشانی عندلیب　　یہ مین گویا ہوا اوس سی بی اختیار

نا ہی آویزۂ گوش ہو　　وہ نام مبارک جو ہی ذی وقار

یتی ہی بلبل ہوا نغمہ سنج　　وہ کرنیل ایبٹ ہین عالی وقار

عازم ہین لندن کی اسکا ہی غم　　اونہین جلد پھر لائی پروردگار

سنکر کہا مین نی ای مشت پر　　تری گلفشانی پہ دل ہی نثار

ہی یہی فکر لائی یہان　　نہین تجسی بہتر کوئی غمگسار

ی جب سی یہ لکھنؤ مین خبر　　یہ آنکھون سی اشکون کا باندھا ہی تار

امر ہاین ہر طرف مدح خوان　　یہ صاحب حقیقت مین ہین نامدار

ریا وہ ریاض عدالت کو رنگ | خلش کر سکا گل سے ہرگز نہ خار

وہ م عدل عیسائی اہل ہند | کسی مین تفاوت نہ تھا زینہار

رقم لوح دل پر ہین ساری علوم | ہنر سب طرح کی ہین اونپر نثار

ریاضی کو اونسی بہت رنگ و بو | ستارون کا ہی اونگلیون پر شمار

بھلا کیا ہو وصف تکلم بیان | نفس رشک موج نسیم بہار

زمین پر ہی پیش نظر سیر چرخ | نظر کی ہین سیار و ثابت نگار

شرف اونسی حاصل ہی ہر علم کو | دبیر فلک عقل پر ہی نثار

عجب علم پیمایش اونکو ہی یاد | حساب زمین کھینچ قلم آشکار

بنایا ہی نقشہ جہان کا عجیب | کہ آئینہ سے ہے حال آئینہ وار

کیی ہین قوانین نو اختراع | سند سی ہر اک قول ہی پایدار

سخاوت مین حاتم کا ہی ذکر کیا | لحد مین ہی قارون کا سینہ فگار

مروت مین نہ فقر شجاعت مین فرد | ملا اونسی دونون کو ہی اقتدار

دل افواج دشمن کا چور رنگ ہو | جو تلوار کھینچین وہ م کارزار

ہرن بنکی شیر فلک آی پیش | اگر عزم فرماوین نکلیں شکار

صفت اونکی گھوڑونکی اب ہو رقم | صبا ہر قدم پر ہی جنکی نثار

نہایت ہین شایستہ خوش قدم | زمین پر چمکتی ہین وہ برق وار

ہوا سی ہین سرعت مین چالاک تر | نہ سایی کو پہونچی پری زینہار

نہین اونکی مثل ہوا ہر یا ہی تخت	سلیمان کا حاصل ہی عز و وقار
زبان لائق مدح شایان کہان	کرون اونکی تعریف کیا آشکار
خدا اونکو پہر لائی با عز و جاہ	دعا ہی یہی اپنی پروردگار
پہر آباد ہو گلشن لکھنؤ	پہر آئین ولایت سی مثل بہار
قلم دی نہ مضمون فرقت کو طول	مناسب دعا پر ہی اب اختصار
فلک پر ہے جبتک مسیحا کا در	زمین پر مہ و مہر ہین نوربار
یہ جبتک کہ قائم ہی ارض و سما	نمایان ہین دنیا مین لیل و نہار

یہ کرنیل ایبٹ بہادر مدام
رہین زندہ با دولت پایدار

قطعہ تاریخ

رخصت کرنیل ایبٹ صاحب بہادر
کمشنر لکھنؤ منکلام محمد مردان علیخان
رعنا اہلکار سرکار کپورتھلہ

ہین فخر فرنگ کرنیل ایبٹ صاحب	گلگشت وطن کو ہند سے پا در رکاب
تہی قسمت لکھنؤ کے فرمان فرما	عدل و کرم و خلق سے وہ عرش جناب
باندھی ہی ہوا عدل نے اونکی ایسی	مقدور نہین توڑ سکی ایک حباب

ایسی ہین وہ سیر چشم چشم بد دور
حاتم کو رہا اونسی سدا چشم حجاب

خلقت مین ہی اونکا اسقدر خلق عمیم
مداح غریب ہے ہین سبے تا نواب

اب اونکی فراق مین ہی ہے مردم چشم
دریا کوزی مین ہے کہ ہی چشم پرآب

دلسوز دلی کی جدائی مین آج
دل آتش دوری سی ہی ہو رنگ سیماب

اسدرجہ مشایعت ہوئی عالم گیر
قدسی بھی چلے آ رہے تا حد الباب

جبتک ہی جہان مین رسم مدحہ آمین
فرخندہ خلق رہ رہین یا وہاب

رعنا کی دعائیہ ہے تاریخ سفر
بالخیر کہ لکھنؤ مین وہ آئین شتاب

۱۸۶۴

ابتدای عالم

بقول اہل ہند خدای تعالی نے اول برہما کو ابو البشر پیدا کیا اور کل مخلوق برہما سے عالم ظہور مین آئے اور تمام عالم برہما سے شائع ہوے جن سے ہر چار بید ملو ہین تفصیل اونکی اور کتابون مین بشرح موجود ہی

ہندوستانکے ہندو راجون کا سلسلہ

اس ملک کی سلطنت ہندو راجاؤن کی ہمیشہ سے سورج بنسی اور چندر بنسی راجاؤن کے خاندان مین رہی لیکن اگلے زمانے کے ہندو راجاؤن کا حال ٹھیک ٹھیک پتہ وار معلوم نہین ہوتا اور اونکے سال سمبت و مدت سلطنت کا کچھ پتہ نہین اور نہ کبھی کسی زمانے مین ہندو راجاؤن مین سے ایک خاندان ایسا رہا کہ کسی زمانے تک اقسام تحریری وکوائف پایا جاے اور ہند مین طوائف الملوکی ابتدا سے معلوم ہوتی ہی یہ بات ضرور مان سکتے ہین کہ ہر ایک راجا چھوٹی چھوٹی

ملوست پر دولت و حشمت ہند سے متمکن و قانع تھا اور کسی نوع کی
محتاجی نتھی — اگرچہ اس ملک کے رہنے والے عموماً ہندو کہلاتے رہے
ور کہلاتے ہین لیکن اختلاف طریقے مذہبی و عقائد سے صدہا مذہب
جداجدا بن گئے اور اسی وجہ سے بھی ایک فریق نے تعصب سے
دوسرے فریق کے ذکر کو اپنی تصنیفات مین دخل نہ دیا بلکہ خلاف ہی
لکھتے رہے اس سبب سے بھی مغالطۂ عظیم واقع ہوتا ہی علاوہ اسکے
مت کچھ ذخیرے علوم کے ضائع ہو گئے رہا سہا جو کچھ کہین بنا بگڑا ملتا ہی
وسکے سمجھنے کا علم دشوار اس ہندوستان مین دو بڑے مذہب نے
رواج پایا ایک مذہب برہمنون کا جو اسوقت مین ہندوستان مین
وسکے اصول پر عموماً عقائد اور پابندی ہی دوسرا بدھ کا ان دونون
ذہب والون مین حد کے مرتبہ تعصب ہا بدھ کے مذہب والون نے
رہمنون کی کتابین خاک مین ملائین اور برہمنون نے بدھ والون کی
تھیان غارت کین یہان تک کہ مسلمانون نے دونون کو نیست و نابود
کر دیا مثل چھاپے کے آگے کوئی حکمت ایسی نتھی کہ ایک ایک ہزار ہزار
جلد باقی رہین اب کوئی حال ٹھیک ٹھیک نہین معلوم ہوسکتا مگر مختصر یہ
ہند کا پہلا دار السلطنۃ کوشل دیس یعنی اجودھیا عرف اودھ جہان
راجہ رام چندر اوتار فرمانروا تھے اونکا حال تصریح رامائن وغیرہ کتابون سے

مشہور ہی اونکے بعد اب تک ہند مین دو خاندان راجاؤن کے مشہور
اور معتبر ہین اول سورج بنسی دوم چندر بنسی سلسلہ ان دونون کا برہماجی
منتہی ہوتا ہی سورج بنسی مین برہما سے ایک طبقے کے ۰۸ راجہ اور دوسرے
طبقے کے ۳۵ راجہ ہوے اور چندر بنسی کا برہما سے مختلف سلسلے کے
۱۳۱ راجہ کا شمار ہی اور دار الحکومتہ ہر ایک کا اپنے اپنے زمانے مین مختلف
مقامات پر رہا راجگان دہلی یعنی اندر پرست ہستنا پور کا خاندان راجہ پانڈو
سے ہی جنمین راجہ نامی اول جدشٹر ہوے اونکا کارنامہ مہابھارتھ مین
مشہور و موجود ہی اور زمانہ راجہ جدشٹر کو تخمیناً پانچ ہزار برس گذرے راجہ
موصوف سے راجہ کھیمن تک ۰۳ پشت حکومت اس خاندان مین رہی
بسرونام وزیر راجہ کھیمن کو قتل کرکے مالک سلطنت کا بنا ملک اجودھیا
سب اوسکے قبضہ تصرف مین تھا پسر راجہ بسرو سے بکرماجیت تک مختلف
۴۲ راجاؤن نے راج کیا راجہ بکرماجیت فرمانروای ہند تھا تختگاہ اوسکی
اوجین تھی عدل اور نیکنامی اور رعایا پروری اور بخشش مین ضرب المثل
اور سمبت اوسکا آج تک رائج ہی اس راجہ سے راجہ پتھورا تک ۷۴ راجہ
گذرے یہ راجہ پتھورا ہند کا اخیر راجہ تھا عہد راجہ جدشٹر سے زمانہ راجہ پتھورا
تک پانچ ہزار چار سو آٹھ سال مین ایک سو بیس برس راجاؤن نے
حکمرانی کی اور راجہ پتھورا کے بعد علاء الدین غوری ہند پر تسلط ہوا فقط

راجہ رام چندرجی کے بعد راجہ جدشٹر راسی دور کلجگ مین بکرماجیت و
بھوج ہندوستان کے راجاؤن مین یادگار ہین

علم کا بیان

سب مورخون کا اسپر اتفاق ہی کہ تمام علوم پہلے ہند مین موجود تھے اور ایسے
اہل یونان و مصر نے اور اونسے اہل یورپ نے حاصل کیے باوجود
کثرت حکما کے سکندر بھی ایک حکیم ہند سے لیگیا تھا سب علم نادر اور
طرح طرح کی حرفت اور صنعت پران اور بیدون مین بھری ہوئی تھی
مگر زبان اونکی شنسکرت مشکل اور دقیق ہی فقط اور اس زمانے مین بھی
اکثر علوم کا چرچہ بنارس اور کشمیر وسوای ریاست ہندوستانی مین قدیم ایسے
سنسکرت کا استعمال ہی مگر تعلیم و تعلم باقاعدہ کم

ہنود کے مذہب کا طریق

مدت دراز سے ایک ایک کا مذہب اور طریق اہل ہند کا چلا آتا ہی اور یہ اونکے
سخت پابند ہین ہندو اگر دوسرا مذہب اختیار کرے ہوسکتا ہی لیکن مذہب
ہنود مین نہین آسکتا ہی اور دوسرا مذہب والا ہرگز ہندو نہین ہوتا ہی
رسوم و عبادت ہزارون برس سے ایک طرح پر چلی جاتی ہی منجملہ اونکے

ن باتین قابل ذکر کے ہین ۱ اس مذہب والے ایک شادی کے سوا
دسری شادی جبتک کہ زوجہ اوسکی زندہ ہی نہین کرتے ہین ۲ کھانا
ی کے ساتھ غیر برادری کے اور بے نہائے نہین کھاتے شراب اور
شت بکری کا کچھ ہندو کھاتے ہین اور کل گوشت کو تمام ہندو نہین کھاتے
۱ سواے ہندو کے جو اپنے طریق کا ہوتا ہی غیر مذہب والے سے شادی
ہین کرتے ۴ مردے کو آگ مین جلاتے یا دریا مین بہاتے ہین ۵
ب رشتہ یعنی زنار اکثر اور سر پر چوٹی کل ہندو رکھتے ہین ۶ شوہر کی لا
کے ساتھ عورت خوشی خوشی ستی یعنی جل جاتی ہی مگر یہ رسم سرکار نے بالکل
بتوقف کروادی غرض ایسی ایسی بہت سی خصوصیتین رسمی و مذہبی ہین جنکے
وہ ایک طور پر پابند ہین یہان عام اہل ہنود کا ذکر نہین اونمین بعضے ایسے
ہی ہین جو بے نہائے کھانا کھاتے ہین اور راجہ کئی کئی شادی بھی کرتے
ہین اگرچہ اڑھائی ہزار برس پیشتر ہند مین ایک مذہب بدھ کا تھا
گر یہ بھی مذہب ہنود سے تھا اور اب اس مذہب بودھ سے چین اور برہما
کا ملک آباد ہی اور خال خال ہندوستان مین بھی ہین لیکن وہ بودھ
ہین سراوگی و چینی بودھ مذہب ہی کے پیرو ہین اور اس مذہب والے
معتقد ہین ۲۴ اوتار کے ہین اس زمانے کے ۱۲ اوتار کے قائل ہین جسمین سے
بسا اوتار کا کلنکی کہ جسکا سنبھل مراد آباد مین قرار دیتے ہین ظہور باقی ہی

مدت ناتمام اور دنیا کی عمر کروروں برس بتلاتے ہین اور کسی نبی اور کتاب
آسمانی اور طوفان نوح کے قائل و مقر نہین لیکن چارون بید کتاب آسمانی
ہین فقط پرانے وقت کی رسم و راہ علم و ہنر مذہب کی پابندی سے عہد سے
زیادہ تر میان دوآب یعنی گنگا جمنا کے درمیان ہین شمار ہوسکتے ہین

ہند کا حال

ہند دنیا کے ملک کا مجموعہ ہی پہاڑ سرد ہین میدان گرم ہی جانور چرند پرند
مین پیدا ہوتے ہین میوے نباتات اور معدنیات طرح طرح کے بکثرت
ہین جنس غلہ ہر قسم کی پیدا ہوتی ہی اور ہر شی بہ نسبت اور ملکون کے ارزان
ہوتی ہی موسم جاڑا گرمی برسات مقرری ہی مگر کوہستان مین جاڑا اور
برسات بہت اور میدان مین خصوص دکھن مین پورب تک گرمی بشدت
امراض وبائی اور فصلی بخار ولرزہ اور ہیضہ برسات مین اور بخار وغیرہ موسم
گرما مین شائع ہوتا ہی مگر طبیب بھی ویسے ہی اور دوائین ہر قسم کی جابجا
ملکون مین مہیا ہین سرکار کے دار الشفا بھی موجود فقط اور دریاؤن کی
کثرت اور شادابی سے یہ سرزمین تمام دنیا مین باغ ہمیشہ بہار ہی

باشندہ

ہند کے باشندے ۱۴ کرور آرام طلب اور کاہل عیش دوست خود پسند

ہوتے ہین اور اس عادت کے سوا یہ بھی صفت ہی کہ مہمان نواز خلیق صاحب کرم
صاحب علم و بیر دستکار بھی اکثر ہوتے ہین مگر تمام ہند مین مدہ دیس
جو بنارس سے دہلی اور ہمالہ سے آگرہ تک ہی اسلئے عمدہ مشہور ہی کہ
بہ نسبت اور ملک کے یہان علم و ہنر آدمیت رونق تکلفات زیادہ ہین
عمومًا باشندے ہند کے راہ و رسم ملاقات اور احسان سے جلد آشنا
ہوجاتے ہین غربت اور انکسار بھی اونکی طبیعتون مین ہی یہان اون
حرامزادون اور بدذاتون کا ذکر نہین ہی کہ جنھون نے غدر مین اپنا منہ
کالا کیا ہی یا جو وحشی اور جنگل کے باشندے ہین اور ہند کے ہر خطے اور
ملک کی وضع لباس اور زبان ایسی جدا ہی کہ ایک دوسرے کی بولی اکثر
سمجھ نہین سکتے

جدول معدنیات ہند

نمبر شمار	جنس	تعداد مقامات	تفصیل مقامات
۱	آہن مع فولاد	۲۴	آشام اسلام نگر اودے پور بیربھوم بہار بندیل کھنڈ نرمل علاقہ اندور دکن سندھ سلہٹ سکیت منڈی سیام

نمبر شمار	جنس	تعداد مقامات	تفصیل مقامات
			کچھار کچھ کوٹ کھاری شملہ گوالیر محال باج گزار شرقی منی پور میسور مندراس ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال
۲	ابرک	۳	بہار محال باج گزار شرقی ناگپور خرد
۳	بلور	۲	بہار کشمیر
۴	پھٹکری	۳	جی پور کالا باغ کچھ
۵	جست	۱	اودے پور
۶	رانگ	۲	سیام نیپال
۷	زبرجد	۲	نیپال ناگپور خرد
۸	سیسہ	۵	جودھپور سیام مارواڑ ناگپور خرد نیپال
۹	سرمہ	۲	گورنگی جہلم پنجاب ناگپور خرد
۱۰	شورہ	۴	اودے پور پٹیالہ ترہت سارن
۱۱	طلا	۹	آشام اٹک سیام کناٹ کوہ کماون محال باج گزار شرقی ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال
۱۲	عقیق	۳	بہار برودہ علاقہ جمو

جنس	تعداد	تفصیل مقامات
کوئلہ سنگ	٦	بیربھوم رانی گنج بنگالہ کشمیر محال باج گزار شرقی نربدا ناگپور خرد
گندک	٢	اودے پور نیپال [illegible]
مس	٨	اودے پور جے پور سیام کماؤن کشمیر مندراس نیپال نلور مندراس
مروارید	٢	نوگیوان مندراس سورت
مومیائی		سننے مین آتا ہے کہ بعض لوگون نے دریای اٹک و جہلم مین خود زمین و پہاڑ سے نکالی اور مفید پائی
نمک	٤	جے پور پنڈ دادن خان پنجاب سکیت منڈی کالا باغ
نیلم	١	سیام
ہرتال	١	نیپال
ہیرا	٦	بیراگڑہ سیام شاہ آباد بہار کنتور مندراس کرپ ایضاً ناگپور خرد
یشب	١	سیام
یاقوت	١	ایضاً

شاہان اسلام

ہند مین اول سکندر پادشاہ آیا پھر سنہ ۱۳ ہجری مین عمر خلیفہ دوم کا سردار
سندھ اگر پھر گیا اور بعضی تاریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ فتح کرکے چلا گیا
سنہ ۹۳ ہجری مین حجاز کا سردار آیا سنہ ۱۰۰۱ع سے محمود غزنوی نے
پچیس سال مین ۱۲ مرتبہ ہندوستان پر یورش کیا اکثر شہرون کو
تباہ اور تاراج کیا سنہ ۱۱۹۰ع سے قطب الدین غلام شاہ علاء الدین
غوری ہند پر متسلط ہوا اوسی سے سلطنت شاہان اسلام کی ہند مین
مستقل ہوئی قطب الدین سے ابراہیم لودی تک ۲۸ پادشاہ مختلف
ہوے اور ناصر الدین بیسوان پادشاہ تھا اوسکے ایام سلطنت مین
سنہ ۱۳۹۸ع مین امیر تیمور دہلی کو فتح اور غارت کرکے صوبہ چھوڑ کر پھر گیا
سنہ ۱۵۲۵ع مین بابر شاہ تیمور کے پروتے نے ابراہیم لودی پر فتحیاب
ہوکر ہند مین سلطنت کی بنیاد ڈالی فقط مسلمانون کی سلطنت مین یہ
خاندان تیموریہ سب سے پچھلا تھا امیر تیمور گورگان صاحب قران
ولد امیر طراغان نسل چنگیز خان سے تھے سنہ ۷۳۶ ہجری کو شہر
مردار ترکستان مین پیدا ہوے سنہ ۷۷۲ ہجری مین بمقام بلخ تخت پر
بیٹھے ۳۵ برس ۱۰ مہینے ۲۵ دن ایران و خراسان و ترکستان و
بخارا و روم و شام و تاتار و ہندوستان مین تنہا شہنشاہی کرکے

۷۲ سال کی عمر مین وفات پا کے سمرقند مین دفن ہوے بہادر شاہ ۳۲ پشت
مین ۱۲ سال براے نام تخت نشین رہکر بالزام غدر ۹۹ برس کی عمر مین بمقام
جزیرۂ رنگون سرکار برطانیہ کی قید مین زندان ہستی سے نجات پائی
عاقل اور خدا شناس کو یہ مقام عبرت کا ہی امیر تیمور سے
بہادر شاہ تک ۳۲ پشت مین پورے پانچ سو برس سلطنت رہی
ہندو راجاؤن مین جیسا بکرماجیت راجہ باہمہ صفت موصوف و نیکنام
ہوا ہی ویسا ہی اس خاندان مین موافق زمانے کے اکبر بادشاہ بھی نہایت
نیک و نامی ہوا اس بادشاہ کے فیلخانے مین پانچ ہزار ہاتھی اور اصطبل
مین دس ہزار گھوڑے خاصے کے بندھتے تھے اور اوسکا ڈیرہ دو تیسرا
کمخواب کے فرش اور موتی ٹکا ہوا پردون کا سفر کے وقت اڑھائی
کوس کے گھیرے مین کھڑا ہوتا تھا ہر سالگرہ کو سونے کا تلادان
کرتا اور اوسوقت سونے کا بادام اپنے دربار مین لٹاتا جسپر بھی وہ رعیت
کے ساتھ سیدھا سادہ تھا آٹھ پہر مین ایک وقت کھانا کھاتا
گوشت سے پرہیز کرتا کسی جاندار کے آزار کا روادار نہین تھا صرف نام
کو مسلمان تھا لیکن دل وجان سے وہ آفتاب کی پرستش کرتا تھا
اتوار کے روز اوسکی ساری عملداری مین جانور کی جان مارنے کی منا ہی
تھی رعیت اوسکو اسقدر چاہتی تھی کہ لوگ جیتے جی اوسکی درگاہ بنا نشین

انتے اور نذرین چڑھاتے تھے اُنکی سلطنت مین ایکسو بائیس برس کیہون کہتا تھا اور دو من چودہ سیر جو اس ریاست کا آخر زمانہ بہادر شاہ ابوظفر رہتا تھا ہو

قطعات تاریخ بہادر شاہ از محمد مردان علیخان صاحب عنایت الہ سرکار کپور تھلا

مپرس احوال این دنیا که چونست
چه آغازش دگر هم دیگر انجام

کجا اسکندر و جمشید و ضحاک
کجا اسفندیار و رستم و سام

مگر از نیک و بد باقیست نامی
تو خواهی نیکنامے شو که بدنام

بچرخ نیلگون رنگ وفا نیست
مگر معکوس و خالی صورت جام

غنیمت دان دو روز عمر نادان
بسر گرد د گرت با عیش و آرام

شہ تیمور چینگیزے نژاد
شنیدستے که بودش بخت ورام

همه در سایهٔ هیبت جلالش
ز چین و هند و فارس روم و شام

هنودان هند وحشی بودند و رامش
همه ترسا و گبر و اہل اسلام

بترکستان سمند شاہے او
زده در هفصد و هفتاد و دو گام

ز تیمور ابتدا بر بو ظفر ختم
بهند آمد شمار بست و سه نام

شمار سال عمر سلطنت گشت
ازین رو پنج صد ای نیک فرجام

ز ابراهیم لودی باز چون کرد
ظهیر الدین بابر هند را رام

هزار و پانصد و بست و شش از سال
چه سال از سال عیسی بود هنگام

غرض سه صد و سی یک سال ازین رو
شمار کام رانی گشت ایام

بعد شاه عالم عهد شاهی
هزار و یکصد و هفتاد و سه بود
ز تخت و تاج شاهی ماند تا هم
مگر چون صد فزود آخر شد آخر
۱۲۷۳
شد از آب جفا کشت غدر سبز
هزار و دو صد و هفتاد و سه بود
پس از یک سال شاه انگلستان
هنوز آن شاه شاهان حکمراست
نگیر آمد بهادر شه چو در رزم
دلاوری که شد شوریده و شور
گرت واگوش شنوا چشم بیناست
شده طالع ز مغرب شد بمشرق
مقام ترس و عبرت خوف و بیم است
من و تو هر دو را کار از قضا است
دگر مخروش ای رعنا که آمد
چه دید نگون شه بیکس قضا کرد

بعهد کمپنی چون کرد انعام
مذهب‌ها دهی هر خاص و هر عام
نشان نام باقی با صد اکرام
نشان شاهی هم از کمپنی نام
برنگ سبزهٔ بیگانه ناکام
که گشته از بغاوت شاه بدنام
گرفت از کمپنی احکام حکام
که حکمش باد در هر ملک مادام
برنگون رفت آخر با صد آلام
شده آغاز شورش را چه انجام
شنو نظمم ببین احوال ناکام
شد این روز سیه را زود تر شام
گر آغاز آن شود این باشد انجام
دگر خواب و خیال فکر و اوهام
بگو من از بحر شورم شور کهرام
بهادر شاه غازی بو ظفر نام
۱۲۷۹

ایضاً

شاہ بیکس چو رفت از دنیا — بیکسی کرد بر سرش ماتم

دید رعنا چو دشت را خالی — گفت بشگافتہ غزال ارم

۱۲۷۹

ایضاً

بہادر شاہ چون سوی ارم رفت — کہ بروی نام شاہی گشت اتمام

چنین رعنا رقم زد سال فوتش — بہادر شاہ غازی خلد خدام

۱۲۷۹

ایضاً

چون ز دنیا رفت سوی خلد از حکم قضا — یادگار شاہ ترکان چغتا کج کلہ

کرد رعنا بہر تاریخ وفاتش این خطاب — بوظفر غازی بہادر شہ بہشت آرامگہ

۱۲۷۹

ایضاً

رفت از دہلی سوی رنگون چو شاہ بوظفر — شادمان گشتند بہر دعوتش ارباب خلد

رخت بست از ملک مشرق چون سوی خلد برین — گفت رعنا سال فوتش مشرق ارباب خلد

۱۲۷۹

ایضاً

رہی بست و سہ سال تک بادشاہی — گرو تھی کہ تھی وہ برات چغتہ

ہوا خاتمہ بوظفر پر تو گویا — ہوئی سلطنت سے نجات چغتہ

۱۸۶۲ء

ایضاً

دار فانی مقام عبرت ہی — کیا کوئی اوس سے آ دل کو لگائے

دیکھ رعنا سرای فانی سے — شاہ بیکس نے رخت باندھا ہے

۱۲۷۹

جدول حال اورنگ نشینان از عہد تیمور تا بہادر شاہ

نام بادشاہ	ولدیت	تاریخ ولادت	محل ولادت	مقام جلوس	تعداد عمر روز جلوس	تاریخ جلوس	مرض الموت	تاریخ وفات	محل دفن	مدت عمر	مدت سلطنت
امیر تیمور	ولد امیر طراغائی اولاد چنگیز خان	۲۵ شعبان ۷۳۶ سہ شنبہ	شہر مردار خطہ کش نزد کوہ [illegible]	شہر بلخ	۳۵ سال ۲۷ یوم	۲۲ رمضان ۷۷۱ چہار شنبہ	تپ محرقہ ہفت روز ماندہ	۱۷ شعبان ۸۰۷ شب چہار شنبہ	سمرقند	۷۱ سال ۱۱ شہر ۲۰ یوم	۳۵ سال ۱۰ شہر ۲۵ یوم
جلال الدین میران شاہ	ابن تیمور	۱۲ ربیع الآخر ۷۶۵ پنجشنبہ	سمرقند	میان سمرقند آذربائیجان	۳۸ سال ۸ شہر ۳ یوم	۱۷ شعبان ۸۰۷	در جنگ مرزا	۲۴ ذیقعدہ ۸۱۰	تبریز	۴۱ سال ۷ شہر ۱۲ یوم	۳ سال ۳ شہر ۷ یوم
سلطان محمد مرزا	ابن میران شاہ	۳ ذی حجہ ۸۰۰	نامعلوم	سمرقند	۹ سال ۲ شہر ۲۴ یوم	۲۴ ذیقعدہ ۸۱۰	عارضہ جسمانی	۳۰ ذی حجہ ۸۵۵	خطہ کش	۵۵ سال	۴۵ سال ۱ شہر ۵ یوم
سلطان ابوسعید مرزا	ابن سلطان محمد مرزا	۱۳ رجب ۸۳۰	سمرقند	غزنین	۲۵ سال	۳۰ ذی حجہ ۸۵۵	در جنگ حسن بیگ شہید شد	۱۲ رجب ۸۷۳ شنبہ	نواح سمرقند	۴۳ سال	۱۷ سال ۶ شہر ۱۲ یوم
عمر شیخ مرزا	خلف چہارم سلطان ابوسعید	۳ ذی حجہ ۸۶۰	سمرقند	ولایت اندجان و فرغانہ	۱۲ سال ۶ شہر ۳ یوم	۱۲ رجب ۸۷۳ دو شنبہ	از بام افتاد و مرد	۱۳ رمضان ۸۹۹ دو شنبہ	سمرقند	۳۸ سال ۹ شہر ۱۰ یوم	۲۶ سال ۱ شہر ۲۲ یوم

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ	ابن سلطان عمر شیخ مرزا	۶ محرم ۸۸۸	ولایت فرغانہ	خطاکش	۱۱ سال ۸ شہر ۱۹ یوم	۲۵ رمضان ۸۹۰ شنبہ	تپ	۶ جمادی الاولیٰ ۹۳۷	کابل	۴۹ سال ۴ شہر	۳۷ سال ۸ شہر ۱۱ یوم
نصیر الدین محمد ہمایون	ابو بابر بادشاہ جنت آشیانی	۴ ذیقعدہ ۹۰۳	ارک شہر کابل	آگرہ	۲۳ سال ۴ شہر ۱۴ یوم	۶ جمادی الاولیٰ ۹۳۷	از بام افتاد	۱۳ ربیع الاول ۹۶۳	در مقبرہ ہمایون	۴۹ سال ۴ شہر ۹ یوم	۲۵ سال ۱۰ شہر ۵ یوم
ابو النصر جلال الدین محمد اکبر شاہ	ابن محمد ہمایون	۵ رجب ۹۴۹ یکشنبہ	در حصار امرکوٹ	کلانور	۱۳ سال ۹ شہر ۲۰ یوم	۲ ربیع الآخر ۹۶۳ جمعہ	عارضہ جسمانی	۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴	مقبرہ سکندرہ	۶۴ سال ۱۱ شہر ۷ یوم	۵۱ سال ۲ شہر ۹ یوم
نور الدین محمد جہانگیر	ابن محمد اکبر شاہ	۷ ربیع الاول ۹۷۷ چہارشنبہ	فتح پور سیکری	اکبرآباد	۳۷ سال ۲ شہر ۱۴ یوم	۱۴ جمادی الاخری ۱۰۱۴ یکشنبہ	ضیق النفس	۲۸ صفر ۱۰۳۷ یکشنبہ	باغ نور جہان واقع لاہور	۵۹ سال ۱۱ شہر ۱ یوم	۲۲ سال ۸ شہر ۱۴ یوم
محمد شہاب الدین شاہجہان	ابن جہانگیر بادشاہ	سلخ ربیع الاول پنجشنبہ	لاہور	لاہور	۳۷ سال ۲ شہر ۲۲ یوم	۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ دوشنبہ	درد گردہ و تپ محرقہ	۲۶ رجب ۱۰۷۶ دوشنبہ	اکبرآباد روضہ تاج گنج	۷۶ سال ۴ شہر ۶ یوم	۳۲ سال ۲ شہر ۲۲ یوم
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ	بن شاہجہان	۲۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ یکشنبہ	صوبہ گجرات	نواح اکبرآباد	۳۹ سال ۶ شہر ۵ یوم	غرہ جمادی الاخری ۱۰۶۸	عارضہ جسمانی	۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ جمعہ	مقبرہ زین الدین شاہ در اورنگ آباد	۹۰ سال ۳ یوم	۵۰ سال ۵ شہر ۲۷ یوم

اعظم شاہ	بن عالمگیر پادشاہ	۱۲ شعبان ۱۰۶۳	دکن	متصل اورنگ آباد	۵۵ سال ۳ شہر ۶ یوم	۴ ذی حجہ ۱۱۱۸	در جنگ بہادر شاہ در چاجو مرد	۸ ربیع الاول ۱۱۱۹	مقبرہ ہمایون پادشاہ	۵۵ سال ۷ شہر ۶ یوم	۳ شہر ۱۰ یوم
بہادر شاہ شاہ عالم خلد منزل	بن عالمگیر پادشاہ	سلخ رجب ۱۰۴۳	دکن	کابل	۷۵ سال ۶ شہر ۱۰ یوم	۱۰ محرم ۱۱۱۹	عارضہ جسمانی	۱۸ محرم ۱۱۲۴	درگاہ خواجہ قطب الدین	۸۰ سال ۲ شہر ۱۸ یوم	۵ سال ۸ یوم
معز الدین جہاندار شاہ	بن بہادر شاہ	غرہ شوال ۱۰۷۲ چہارشنبہ	دکن	لاہور	۵۲ سال ۳ شہر ۱۸ یوم	۱۸ محرم ۱۱۲۴ جمعہ	فرخ سیر قید گشت	۲۹ محرم ۱۱۲۵	مقبرہ ہمایون پادشاہ	۵۲ سال ۳ شہر ۲۵ یوم	۱۱ شہر ۵ یوم
فرخ سیر پادشاہ	پسر عظیم الشان بہادر شاہ شہید	غرہ محرم پنجشنبہ ۱۰۹۸	دکن	نواح اکبرآباد	۲۶ سال ۱۱ شہر ۲۳ یوم	۲۳ ذی حجہ ۱۱۲۴ جمعہ	سید حسین علی خان اسیر کردہ کشت	۹ رجب ۱۱۳۱	مقبرہ ہمایون پادشاہ	۳۳ سال ۳ شہر ۱۰ یوم	۶ سال ۳ شہر ۱۰ یوم
ابوالبرکات شمس الدین	پسر رفیع الشان بن بہادر شاہ	۱۷ رمضان ۱۰۸۳	دہلی	اکبرآباد	۴۷ سال ۶ شہر ۲۳ یوم	۹ ربیع الآخر ۱۱۳۱	تپ دق	۹ رجب ۱۱۳۱	مقبرہ ہمایون پادشاہ	۴۷ سال ۱۰ شہر ۲ یوم	۳ شہر ۹ یوم
رفیع الدولہ	پسر رفیع الشان بن بہادر شاہ	۲۰ رمضان ۱۰۸۳	نواح اکبرآباد	اکبرآباد	۴۷ سال [illegible]	۶ رجب ۱۱۳۱	خلیہ کوکنار	۱۷ ذیقعدہ ۱۱۳۱	ایضاً	۴۸ سال ۱ شہر ۲۲ یوم	۳ شہر ۲۸ یوم

محمد شاہ پادشاہ	ابن بہادر شاہ	۱۴ ربیع الاول ۱۱۱۴		اکبرآباد بہشت کردہ	۷ شہر ۲۴ یوم	۱۱۳۱	عارضہ	۱۱۶۱	نظام الدین	۱ شہر ۲۴ یوم	۵ شہر ۱ یوم
ابوالنصر مجاہد الدین احمد شاہ	بن محمد شاہ بادشاہ	۱۷ ذی الحجہ ۱۱۳۸	شاہجہان آباد	پانی پت	۲۲ سال ۴ شہر ۱۳ یوم	غرہ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۶	بسبب کشیدن میل در چشم	۱۰ شعبان ۱۱۶۷ روز سہ شنبہ	مقبرہ ہمایون پادشاہ	۲۸ سال ۲۳ یوم	۴ سال ۲ شہر ۱ یوم
محمد عزیز الدین عالمگیر ثانی	بن معز الدین جہاندار شاہ	غرہ محرم ۱۰۹۹	صوبہ ملتان	دہلی	۶۸ سال ۷ شہر ۱۰ یوم	۱۰ شعبان ۱۱۶۷	از قلعہ فیروز آباد افتاد	۱۸ ربیع الآخر ۱۱۷۳	ایضاً	۷۴ سال ۳ شہر ۷ یوم	۵ سال ۸ شہر ۸ یوم
علی گوہر شاہ عالم پادشاہ	بن عالمگیر ثانی	۲ جمادی الاولی ۱۱۳۱	دہلی	کہتولی متصل عظیم آباد	۴۲ سال ۳ یوم	۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳	عارضہ جسمانی	۷ رمضان	درگاہ خواجہ قطب الدین	۹۰ سال ۴ شہر ۶ یوم	۴۸ سال ۴ شہر ۳ یوم
ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ		۲۸ رجب ۱۱۷۳	ریان مکہن	دارالخلافہ شاہجہان آباد	۴۸ سال ۱ شہر ۹ یوم	۷ رمضان ۱۲۲۱	اسہال دودم	۲۷ جمادی الاخری ۱۲۵۳	ایضاً	۸۰ سال	۳۱ سال ۱ شہر ۱۹ یوم
ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ		۱۱۸۰	شاہجہان آباد	ایضاً	۶۳ سال	۱۲۵۳		۱۲۷۹	رنگون	۹۹ سال	۲۶ سال

خاتمہ بالخیر

تسلط سرزمین انگلستان کا بیان

زمانۂ اکبر شاہ مین یوروپ سے اس ملک مین پہلے پہل پرتگالی اور فرانسس بطریق سوداگری آتے جاتے تھے انگریزون نے جب دیکھا کہ پرتگال اور فرانسیس وغیرہ فرنگستانی آدمی ہندوستان مین جاتے ہین اور یہان کی تجارت سے بڑا فائدہ اوٹھاتے ہین تو پھر ان آفت کے پرکالون سے کب چپ چاپ رہا جا سکتا تھا ان لوگون نے بھی اپنے مال کے جہاز روانہ کیے اور ۱۵۹۹ء مین لندن شہر کے اندر بہت سے انگریزون نے آپس کے ساجھے مین روپیہ اکٹھا کرکے اس ملک مین سوداگری کرنے کیواسطے ایک کوٹھی مقرر کی اور دوسرے ہی سال وہان کے بادشاہ سے کئی شرطون پر اس بات کی اپنے نام سند لکھوالی کہ سوائے ہم ساجھیون کے دوسرا کوئی انگریز ہندوستان مین جاکر سوداگری نہ کرنے پاوے لیکن جب اس ملک مین ان لوگون نے اپنا عمل اور دخل کرنا شروع کیا تب ۱۸۱۳ء مین انکو تجارت کرنے کی منا ہی ہوئی بلکہ تجارت کا اذن عام ہوگیا روک ٹوک جاتی رہی اور تب کمپنی ایک سرکار کہلانے لگی انگریزی زبان مین ساجھیون کو کمپنی کہتے ہین اسلیے ان ساجھی سوداگرونکا نام بھی ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا

جب انگلستان مین یہ کمپنی کھڑی ہوئی تو اوسوقت یہان اکبر بادشاہ تخت
پر تھا ہندوستان مین پہلے پہل انگریزون کی کوٹھیان سنہ ۱۶۱۱ء
مین سورت احمد آباد کھمبھات اور گھوگھے مین جاری ہوئین اور سنہ ۱۶۵۲ء
مین بنگالے کے اندر ہگلی شہر مین اور اوسکے دو برس کے بعد مندراج
مین بھی جاری ہوگئی سنہ ۱۶۶۴ء مین پرتگال کے بادشاہ سے بمبئی کا
ٹاپو لیا گیا اور سنہ ۱۶۹۸ء مین بنگالے کے صوبےدار نے کلکتہ گوبندپور
اور چھوٹانٹی یہ تینون گانو انگریزون کو دیدیے اور کلکتے مین ایک قلعہ
بھی جسکا نام اب فورٹ ولیم ہے بنانے کی اجازت ملی اوس زمانے مین
یہ کلکتہ کل شہر جھونپڑونکا ایک گانو تھا سنہ ۱۷۵۶ء مین بنگالے کے
صوبےدار نواب سراج الدولہ نے اس بات پر کہ انگریزون نے
ہمارے ایک آدمی کو جو ڈھاکے سے کچھ خزانہ لیکر بھاگا تھا پناہ دی
ناخوش ہوکر کلکتہ چھین لیا اور ایک سو چھیالیس انگریز کو جو اوسوقت
وہان موجود تھے ایسی ایک تنگ و تاریک کوٹھری مین جسکی وسعت
بیس فٹ مربع سے زیادہ نہین تھی اور جسکو اب تک یہ لوگ بلیک ہول
یعنی کالی بل پکارتے ہین بند کردیا کہ دوسرے دن اون مین سے کل
تیئیس ۲۳ جیتے نکلے تب آخر کو یہ خبر سنتے ہی کرنل کلائو صاحب مندراج
سے نو سو گورے اور پندرہ سو تلنگے لیکر کلکتے مین آئے کلکتہ بھی لیا

اور پھر مرشد آباد پر چڑھائی کر دیا تب ۱۷۵۷ء کی ۲۳ جون کو مقام پلاسی

کی لڑائی مین سراج الدولہ کی فوج نے جو ستر ہزار سے کم نہین تھی

شکست کھائی نواب بھاگا اور اُسی روز گویا ہندوستان مین انگریزی

عملداری کی نیو جم گئی پھر تھوڑے دن پیچھے ۱۷۶۵ء مین شاہ عالم بادشاہ

نے جو اُسوقت دلی کے تخت پر تھا صوبہ بہار بنگالا اور اُڑیسہ ان تینون

صوبون کی استمراری دیوانی کا پروانہ کمپنی کے نام لکھدیا کہ جس سے دو

کرور روپیہ سال کی آمدنی کا ٹھکانا ہو گیا اور وزیر آصف الدولہ نے رہیلون

کی لڑائی مین مدد لینے کیواسطے ۱۷۷۵ء مین بنارس کا علاقہ بالکل انکے

حوالے کیا اُس زمانے مین ہندوستان کی بادشاہت کا عجب حال تھا

آپس کی پھوٹ اور ہمیشہ کی لڑائی جھگڑائی کے باعث تیمور کا خاندان

تحس نحس ہو رہا تھا بادشاہ شطرنج کے مہرے کیطرح لوگون کے ہاتھ

مین ترکرمات ہو چکا تھا یہان تک کہ ۱۷۳۹ء مین ایران کے بادشاہ

نادرشاہ اور پھر تھوڑے روز بعد احمد شاہ درانی نے جو پہلے نادرشاہ کے

امیرون مین تھا ایسے ایسے سخت حملے اس ملک کے اوپر پے در پے کیے

کہ رہا سہا زور بھی دلی کے بادشاہ کا جاتا رہا سلطنت مین کچھ ذرہ دم نہین

باقی تھا صوبے دارون نے بادشاہ کی اطاعت بالکل چھوڑ دی سلطنت

اپنی سمجھی جسکے باپ دادا نے کبھی چپا بھر زمین پر دخل نہ پایا تھا اُسنے بھی

ہندوستان کی بادشاہت پر دل ووڑا یا الغرض ادھر تو دکھن کے
صوبے دار نظام الملک نے حیدرآباد مین اپنی حکومت جمائی اور ادھر
نواب وزیر نے اودھ کے صوبے کو اپنا ملک سمجھا اگرے تک مرہٹون
نے لوٹ مار مچار کر دھینگا دھینگی سے چوتھ لینا شروع کیا اور سکھون کا
حملہ سرہند تک ہونے لگا بھرتپور کے جاٹ بھی ہیکڑ بنے ہوے تھے
رہیلکھنڈ کے رہیلے جدا خود مختار ہو گئے تھے بادشاہ اگرچہ براے نام دلی
کے قلعے مین پڑا تھا لیکن وہان بھی اُسے کوئی بیٹھا رہنے نہین دیتا تھا
یعنی اُسکی یہ نوبت تھی کہ آج ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا کل کسی دوسرے
نے اُسکا سر کاٹ کر سکہ خطبہ اپنے نام جاری کر لیا ابھی تلوار کا لہو نہین
سوکھنے پایا کہ تیسرے نے اُسکو بھی موت کا جامہ پہنایا اور تاج بادشاہی
اپنے سر پر رکھا کبھی بادشاہ مرہٹون کی قید مین پڑ جاتا تھا اور کبھی رہیلون
کے پنجے مین گرفتار رہتا غرض ۱۷۰۷ء تک کہ جب اکبر کے پوتے کا بیٹا
اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ مرا ۱۷۵۹ء تک یعنی شاہ عالم کے روز اول
جلوس تک ترپن ۵۲ برس کے اندر بادشاہ اور احمد شاہ چھوڑ کے چودہ بادشاہ
دلی کی تخت پر بیٹھے اور اگر انمین سے محمد شاہ کی سلطنت کے تیس برس
نکال ڈالو تو صرف تیئیس برس مین تیرہ بادشاہ گذر گئے پس اب سوچنا
چاہیے کہ جہان براے نام تخت اور تاج کے لیے ایسی چھین جھپٹ اور

نو بج کھسوٹ سے بچے گی وہان کی سلطنت کسطرح قائم رہیگی اسلیے سدا سے یہ
دستور چلا آیا ہے کہ جب خالق رب العالمین دیکھتا ہے کہ اب بادشاہ سب بڑے
بندون کی پرورش اور نگہبانی نہین کر سکتا اور جس کام کے لیے اسکو
مقرر کیا تھا اُسے چھوڑکر یہ عیش و عشرت اور ظلم و بدعت کرنے لگا تب
اوس بداقبال بادشاہ کو دفع کرکے جو کوئی اس کام کی لیاقت رکھتا ہے
اوسکو اپنی قدرت اور طاقت کے زور سے تخت کے اوپر بٹھا دیتا ہے اسمین
کچھ شک نہین کہ جو اس حالت مین انگریز لوگ ہندوستان کو نہ لیتے تو
فرانسیس یا فرنگستان کا کوئی دوسرا بادشاہ اس ملک کو اپنے قبضے مین
کرلیتا اور اگر شاید وہ بھی نہ لیتا تو پھر کوئی دوسری قوم سندھ پار سے
آکر اس ہندوستان کی بادشاہ بن جاتی اور اپنے خاندان کی نیو جماتی
تیمور کی اولاد سے بادشاہت نکل چکی تھی ملک کے فضل و کرم سے ہندوستانیون
کے دن اچھے تھے جو انگریز یہان آئے گویا سوکھے ہوے کھیت پھر
لہلہائے الغرض پہلے تو حیدر علی کے بیٹے ٹیپو نے ان انگریزون
کے ساتھ دشمنی پر کمر باندھی اور بیٹھے بٹھائے لڑائی اُٹھائی حیدر علی
میسور کے راجا کا نوکر تھا موقع پاکر اُسکا سارا ملک لے بیٹھا ٹیپو کا یہ ارادہ
ہوا کہ انگریزون کو دکھن سے نکال دیوے اور ابھارا اُسکو فرانسیسون نے
تھا کئی برس کی لڑائی مین آخر کو ۱۷۹۹ء مین شہر رنگ پٹن کے

حملے کے درمیان وہ انگریزی سپاہیون کے ہاتھ سے مارا گیا اور ملک
اُسکا بہت سا سرکار کے اختیار مین آیا اُنھین دنون مین سرکار کو مرہٹون
کی طرف سے کھٹکا پیدا ہوا فرانسیسون کو وہ بھی نوکر رکھنے لگے تب لارڈ
ولزلی صاحب نے جو اُسوقت یہان کے گورنر جنرل تھے اُنکے پیشوا
باجی راو سے دوستی کرنا چاہا اُسنے اُسوقت تو دولت راو سیندھیا کے
بہکانے سے نمانا لیکن جب جسونت راو ہلکر نے اُسپر چڑھاو کیا تب سرکار
سے قول و قرار کرلیا اور بندیل کھنڈ کا علاقہ بھی دیدیا یہ سُنکر سیندھیا
بگڑا اور اُسنے چاہا کہ ناگپور والے سے ملکر کچھ فساد اُٹھاوے لیکن ادھر تو
لارڈ لیک صاحب نے ڈیگ اور لسواری اور دلی اور اُدھر جنرل ولزلی نے
اسائی اور ارگانو کی لڑائیون مین ہلکر اور سیندھیا کے دانت ایسے کھٹے
کیے کہ آخر کو ۱۸۰۳ء مین ناگپور کے راجا نے تو کٹک کا ضلع اور سیندھیا نے
بالکل انتربید یعنی گنگا اور جمنا کے بیچ کا ملک انگریزون کو دیکے اپنا پیچھا
چھڑایا پھر تو اس نئے ملک کے ہاتھ لگنے سے انگریزون کی عملداری
دلی تک پہنچ گئی وہان اس زمانے مین شاہ عالم بادشاہ قلعے کے اندر سیندھیا
کی قید مین پڑا تھا لارڈ ولزلی نے اُسکو قید سے چھڑا کر گذارے کیواسطے
ایک لاکھ روپیہ مہینے سے کچھ اوپر اُسکی تنخواہ مقرر کردی پھر تھوڑے
روز بعد نیپالیون نے اپنی حد سے قدم باہر نکالا اور بڑھتے بڑھتے و

کا گنڈے تک پہنچ گئے سبب پہاڑ سے اتر کر ترائی مین انگریزی رعیت کو تنگ کرنے لگے تو سرکار نے انکو بھی نصیحت دینا مناسب سمجھا سنہ ۱۸۱۶ ع مین ملکون کے قلعے پر انکی فوج کو شکست دیکے کالی ندی سے پچھم طرف کے پہاڑ تو اپنے دخل مین کر لیے اور پورب طرف کے انکے پاس رہنے دیے اگرچہ باجی راو نے اپنی مصیبت کے وقت مین انگریزون سے قول قرار کر لیا تھا لیکن دل مین انکے ساتھ دغا کی نرد کھیلا چاہتا تھا یہان تک کہ اسنے تاریخ ۶ نومبر سنہ ۱۸۱۷ ع کو پونا کے درمیان رزیڈنٹی مین آگ لگا دی اور انگریزی سپاہی جو تھوڑے سے وہان رہتے تھے انکا مقابلہ کیا اور ادھر سے سیندھیا کا بھی ایک خط نیپال کے راجا کے نام لکھا پکڑا گیا کہ جس سے اوسکی جانی دشمنی انگریز کے ساتھ ثابت ہو گئی پنڈارون نے بھی قریب پچیس ہزار سوار کے اکٹھا ہو کر سارے ملک مین لوٹ مار مچا رکھی تھی بلکہ کے کاردار بھی سرکار کے مخالفون کی طرفداری کرتے تھے امیر خان ٹونک والا اپنے پٹھانون کے ساتھ راجپوتانے کو تباہ کر رہا تھا یہان دیکھا چاہیے خدا کی قدرت اور مرضی کو کہ اگرچہ اسوقت مین ہر ایک طرف ہلچل پڑ گئی تھی اور سارے ہندوستان مین فساد کی آگ بھڑکتی چلی تھی مگر لارڈ ہیسٹنگ صاحب جو اس زمانے مین گورنر جنرل تھے انھون نے اس ہوشیاری کے

ساتھ سبکا بندوبست کرلیا اور اپنی فوج کو چارون طرف اس ڈھب سے
دوڑادیا کہ ادھر تو سیندھیا کو جو کچھ سرکار نے فرمایا سب مان کر راجپوتانے
سے اپنا اختیار بالکل اٹھالینا پڑا اور اُدھر امیرخان نے اپنا توپخانہ
سرکار کے حوالے کردیا باجی راو پیشوا نے بھی سرکاری خزانے سے
آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن لیکر بٹھور مین گنگا کو سینا اختیار کیا اور ہلکر کی فوج نے
مہید پور مین شکست کھاکر سرکار کی اطاعت دل وجان سے قبول کی پھر
ناگپور کا راجا اپنے قصور کے ڈر کے مارے اپنا ہی ملک چھوڑکر بھاگ گیا
چنانچہ سرکار نے اُسکا کچھ تھوڑا سا ملک لیکر باقی اسکے وارثون کو دے ڈالا
پنڈارے اسقدر قتل ہوے کہ نام کو بھی باقی نرہے جو کچھ جیتے بچے وہ لوٹ مار
چھوڑکر کھیتی باری کرنے لگے الغرض ۱۸۱۹ء مین مرہٹون کی لڑائی بالکل
فتح کے ساتھ ختم ہوگئی اور سب طرف سے امن چین کی راہ کھلی کابل کی لڑائی
کے وقت سندھ کے امیرون نے کرانچی اور ٹھٹھا سرکار کو دے ڈالا تھا
اور سندھ ندی کی راہ سے محصول اٹھا لینے کا اقرار کئی باتون کے
ساتھ سرکار سے کیا تھا لیکن دغا کرکے اپنے قول قرار سے پھر گئے تب
۱۸۴۳ء مین سرکار نے انکو بھی اُس ملک سے خارج کرکے وہان بالکل اپنا
عمل دخل کرلیا بعد اسکے ۱۸۴۵ء کے اخیر مین سکھون نے ستلج پار اتر کر
سرکار پر چڑھائی کردی لیکن آخر کو جیسا کیا ویسا پھل پایا پہلے تو سرکار نے

۱۸۴۶ء میں انکا صرف جالندھر دوآب اور ستلج کے اس پار کا ملک ضبط کر لیا
اور قصور معاف کر کے دلیپ سنگھ کو لاہور کی گدی پر بحال رکھا لیکن پھر بھی
جب یہ لوگ لڑائی بھڑائی سے باز نہیں آئے اور بہت عرصے تک لڑتے
رہے تب ۱۸۴۹ء میں سرکار نے بالکل انکا ملک ضبط کر کے اپنی عملداری میں
شامل کر لیا اور دلیپ سنگھ کو پنجاب سے نکالکر گذارے کے لیے دس ہزار روپیہ
مہینا اوسکا مقرر کر دیا اب اس طرح اٹک سے کٹک تک بالکل انگریزی عملداری
ہی اور ہمالیہ سے سمندر تک انھیں کا ڈنکا جاری ہی بلکہ پورب اور پچھم میں
ہندوستان کی اصلی سرحد سے بھی زیادہ انکی عملداری بڑھتی چلی

غدر کا حال

سبب برپا ہونے غدر ۱۸۵۷ء کے بہت کچھ صاحبان انگریز بہادر نے لکھے ہیں
اور خلاف آن باتفاق انکے اہل ہند نے بھی اسباب اسکے تحریر کیے ہیں
غرض تقدیر الٰہی ہونہار بات تھی جو ہوئی مگر غدر میں تین قسم کے لوگ تھے
۱ عام لوگ بانی غدر کے اور باغی سرکاری فوج کے تھے ۲ سرداران
باغی مثل شاہ دہلی اور بیگم اودھ اور نانا پیشوا مع لواحقین وغیرہ کے جو
اپنے اسلاف کے ملک و مملکت سے محروم اور اسکے مدعی تھے ۳
بیکار اور نوکری پیشہ اور اوباش اور وہ لوگ جنکا پیشہ رہزنی تھا فقط

لیکن سرکار کی قدرت اور نیت سے اس مواد فاسد کو جڑ سے ایسا دفع کیا کہ اب ہندوستان مین اسکا اثر باقی نہین ہی

ذکر عہد دولت ملکۂ معظمہ شہنشاہ انگلند و ہند خلد اللہ ملکھا

سنہ ۱۸۵۸ء مین ملکۂ معظمہ یعنی کوئین وکٹوریا نے اس ملک کا انتظام کمپنی سے لیکر اپنے ایک وزیر کے سپرد کر دیا اور انکے مدد کیواسطے بارہ صاحبان جلیل الشان کی ایک کونسل بھی مقرر کر دی اسی وزیر کا لقب سکرٹری اف اسٹیٹ فار انڈیا ہی سارا انتظام وزیر کے اختیار مین ہی وہی صاحبون کو اس ملک کے عہدون پر مقرر کر کے وہان سے بھیجتا ہی اور یہان پر گورنر جنرل کو باتفاق رای کونسل اختیار دے رکھا ہی گورنر جنرل کے تحت مین مندراج و بمبئی کے گورنر اپنی اپنی کونسل سمیت اور آگرہ او پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور بنگالے کے ڈپٹی گورنر اور اودھ اور ناگپور کے چیف کمشنر مقرر ہین اور پھر سوا پنجاب کے چارون گورنرون کے زیر حکم چار چار صدر دیوانی اور صدر نظامت عدالت اور چار بورڈ ریونیو اور انکے تابع ہر ایک ضلع مین کمشنر و جج مجسٹریٹ کلکٹر وغیرہ اپنا اپنا کام کرتے ہین پنجاب اور اودھ اور ناگپور صوبون مین صدر دیوانی و نظامت کی جگہ جودیشل کمشنر اور بورڈ کی جگہ فینانشل کا تقرر ہی

اور کمشنر کے نیچے اکثر ضلعون مین حاکم ضلع ڈپٹی کمشنر کہلاتے ہین کلکتہ

مندراج بمبئی مین انگریزون پر نالشات سننے کے واسطے عدالت

سپریم کورٹ مقرر ہی کلکتہ مندراج بمبئی ان تین احاطون کیواسطے کمانڈر انچیف

ولایت سے مقرر ہوکر آتے ہین لیکن کلکتہ والا کمانڈر انچیف دونون پر غالب

ہی اسوقت ہندوستان مین فوج گورہ اسّی ہزار سے کم نہین ہی فقط

رونق تازہ

سرکار کے عمل سے جابجا سڑک اور ریل اور تار برقی اور چوکی تھانہ اور ضلعبندی

اور آمدورفت بلامزاحمت اور اجراے کشتی و جہاز و نہر اور انتظام ملک

کے امن اور دارالشفا و مطابع اور اخبار ارد و زبان اور انگریزی اور

مدرسہ اور ڈاک اور معافی محصولات اکثر اشیا سے اب ہند مین

رونق اور امن و آسایش بدرجہا زیادہ ہی زراعت کی بھی ترقی ہی مگر یہ

کیفیت سرکاری علاقون تک ہی رجواڑون کا حال کم کم بدلا ہی اور اب

روز بروز بدلتا جاتا ہی چونکہ اکثر تجارت اہل یورپ کے ہاتھ مین ہی اور

اشیاے ولایتی کے آگے اشیاے ہند بیقدر ہوگئین سوا اسکے ہند

مین نوکری پیشہ بہت لوگ ہین جو اکثر بیکار ہین اسی وجہ سے تمام باشندے

ہند کے صورت آسودگی کما حقہ نہین رکھتے مالدار اور امرا لگتار ہر روز انہی

اور عیاشی کے سبب اپنے دخل و خرچ کا انتظام کم رکھتے ہیں اس وجہ سے جلد تباہ ہو جاتے ہیں فقط

جدول ریاستہای ہندوستانی

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۱	اودیپور	۱۱۶۰۰	۱۲ لکھ ۵۰ ہزار	یہ ریاست قدیم ہے نوشیروان نے اپنی بیٹی کی ہندی ۔۔۔ وثمہ راجستان
۲	الور	۳۵۰۰	۱۸ لکھ	والی ریاست جوان سرکار سے اس سال مسند نشینی و اختیار عطا ہوئے واقع راجستان
۳	اندور	۸۰۰۰	۱۲ لکھ	انتظام اچھا والی ہوشیار
۴	اجی گڑھ	۰	۳ لکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۵	ارچھا	۰	۷ لکھ	ایضاً صدر شہری ہے
۶	بانسوارہ	۱۵۰	۲ لکھ	جنوب اودے پور
۷	برودہ	۲۴۰۰۰	۷۰ لکھ	ملک زرخیز اور آباد والی عاقل و صاحب اختیار
۸	بسہر	۰	۱ لکھ	
۹	بجاور	۰	۱۲ لکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۱۰	بوندی	۲۲۰۰	۱۰ لکھ	شہر لاق دید ہے اور کٹاری یہاں کی مشہور ہے
۱۱	بہاولپور	۲۰۰۰۰	۲۵ لکھ	انتظام خیریت والی حال بیدار مغز

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۱۲	بھوپال	۷۰۰۰	۲۵ لکہ	والیہ بڑی عاقل و ہوشیار انتظام قابل تعریف
۱۳	بھرت پور	۲۰۰۰	۲۰ لکہ	ملک آباد والی صغیر سن
۱۴	بیکانیر	۱۷۰۰۰	۲۰ لکہ	والی مہذب اور لائق و نام آور
۱۵	پٹیالا	۵۰۰۰	۲۵ لکہ	ملک آباد رعیت آسودہ اہلکار بڑے لائق والی ہوشیار
۱۶	پنا	۰	۴ لکہ	ہیرے کی عمدہ کان یہین ہے
۱۷	پرتاب گڑھ	۱۵۰۰	۳ لکہ	شجر کمیاب آب سراب
۱۸	ترابوانکور	۵۰۰۰	۴ لکہ	ملک سیر حاصل زر ریز ہے
۱۹	ٹونک	۱۸۰۰	۱۰ لکہ	حاکم حال بہت دیندار و متشرع
۲۰	جودھپور	۳۵۰۰۰	۷۱ لکہ	باشندے یہان کے افیونی اور والی شوقین خوش اوقات انتظام اہلکار رسمی
۲۱	جی پور	۱۵۰۰۰	۸۵ لکہ	والی عاقل بیدار مغز اہلکار لائق انتظام غنیمت
۲۲	جیسلمیر	۱۲۰۰۰	۱ لکہ	شہر اجاڑ باشندے کم
۲۳	جیند	۰ ۰ ۰	۵ لکہ	والی مدبر و منتظم اہلکار اچھے
۲۴	چارکھاری	۰	۴ لکہ	عرف چرکھری والی صغیر سن
۲۵	چھترپور	۰	۳ لکہ	
۲۶	چمبا معہ سکیت منڈی	۰	۵ لکہ	آب و ہوا اصل علی

نمبر	نام ریاست	وسعت رقبہ میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۲۷	دتیا	۰	۱۰ لکھ	واقع بندیل کھنڈ
۲۸	دھارا	۱۰۰۰	۴ لکھ ۵۰ ہزار	دارالحکومت راجا بھوج و باجی راو پیشوا والی پونا
۲۹	دھولپور	۱۶۲۵	۷ لکھ	انتظام و اہلکار بہی والی فاضل ولیعہد قابل
۳۰	دیواس	۰۰	۴ لکھ	محلات قلعہ و مسجد تالاب مقبرہ حسین تماشا قابل دید
۳۱	دونگرپور	۱۰۰۰	۴ لکھ	جھیل پر بند سنگ مرمر قابل دید
۳۲	ریوان	۱۰۰۰	۲۰ لکھ	انتظام ضعیف اہلکار کم والی عالی خش مجرا نمرد
۳۳	رامپور	۷۰۰	۱۱ لکھ	ملک سیراب بسیر حاصل انتظام چست والی آگاہ بن مذاق
۳۴	ساونت واڑی	۱۰۰۰	۲ لکھ	ملک کوہ و جنگل و بیہڑ تسلط سرکار کا راجا کو بعد منہائی صرف کے باقی ملتا ہی
۳۵	سروہی	۳۰۰۰	۱ لکھ	سروہی کی تلوار مشہور ہی
۳۶	سمتھر		۴ لکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۳۷	سکم	۱۶۰۰	۰	کوہ دارجلنگ مشہور مذہب بدھ آدمی بلا خرچ
۳۸	فریدکوٹ	۰	۲ لکھ	قریب فیروزپور پنجاب ہی
۳۹	قرولی	۱۹۰۰	۵۰۰۰۰	والی صاحب حوصلہ
۴۰	کہلوار	۱۶۰۰	۱ لکھ	صدر بلاسپور رہالہ پنجاب کوہ پر فضا و دلکشا
۴۱	کپورتھلا	۰	۱۰ لکھ	ملک آلودہ ترت شاہ اہلکار خبر حراثانی آپس [illegible]

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۴۲	کچھی	۲۰۰۰	۸ لکہ	جنگل بجھیل آب شور برسات عالم آب بیچ
۴۳	کشمیر جمبو	۲۵۰۰۰	۵۰ لکہ	والی عاقل باقتدار سرکار مرحوم ملک آباد جا
۴۴	کشن گڑھ	۷۰۰	۴ لک	
۴۵	کوٹا	۶۵۰۰	۳۵ لکہ	ثلث علاقہ ظالم سنگھ کو جسنے نابالغی راجہ کیا سرکار نے دلادیا وہ جھالراپاٹن ہے
۴۶	کوچی	۲۰۰۰	۵ لکہ	عرف کوچین اب تحت سرکار ہے شہر او کے محلات عمدہ
۴۷	کولاپور	۳۵۰۰	۵ الکہ	کوہستان میں لب دریا ہے
۴۸	گوالیر	۳۳۰۰۰	۸۰ لکہ	علاوہ جاگیرات کے تازہ بڑھایا آسودہ ملک آباد جم والی مدبر جزل سرالال صاحب افوج مشہور
۴۹	گڑھوال	۴۵۰۰	۱ لکہ	ملحقہ بسائرو کوہستان
۵۰	مالیر کوٹلہ		۲ لکہ	قدیم خاندان ہے
۵۱	منی پور	۷۵۰۰	۱ لکہ	باشندہ معتقد دیوی برہنہ و جنگلی کوہ کثیر تسا
۵۲	میسور	۲۷۰۰۰	۷۰ لکہ	تسلط سرکار
۵۳	نابھہ	۵۵۰۰	۷ لکہ	والی عاقل ہے راج پنجاب میں ہے
۵۴	نیپال	۸۰۰۰۰	۳۲ لکہ	سرکار سے عہدنامہ و آشتی ہے

اودہ

تواریخہاے ہندو عموماً کتب سنسکرت سے مستنبط ہے کہ قدیمی نام اسکا اوتر کوشل ہے اور ابتداے آبادی منوجی موجد اصول دہرم شاستر سے بتاتی ہین اور دفتر شاہی اور انگریزی مین صوبہ اودہ لکہا جاتا ہے اور قدیم سے اودہ یعنی مقام اجودہیا دار الامارۃ و حاکم نشین رہا اور ہندو لوگ مولد و دار السلطنت مہاراجہ رام چندر جی سے خاص اودہ اور اوسکے مضافات کو ایک مہاتیرت جانتے ہین عہد سلطنت مہاراجہ رام چندر مین اودہ کا دار السلطنت اجودہیا تہا کہ جسکا طول ایک سو اٹہائیس کوس اور عرض چہتیس کوس تہا یہ ملک بسبب کثرت دریا اور ندیون کے ہندوستان کا گویا ایک باغ تہا کثرت آبادی و زراعت و مردم شماری و پیداواری و آمدنی مین ہندوستان کی اور بلاد سے جو اکثر مقابلہ ہوا سب باتون مین صوبہ اودہ کو ترجیح رہی پہاڑ بالکل نہین زمین ہموار اس ملک مین لاجورد کی کان ہے اور یہان کا لاجورد نہایت عمدہ اور صاف ہے —

زراعت یہانکی نیشکر جاول افیون تو مشہور ہے باقی ہر قسم کی پیداوار اور بہول پہل فرودن اور زائد اب انگریزی زمانے مین نیل رسکی افیون کی زراعت کثرت سے ہو چلی ہے قبل تسلط اہل اسلام بطور خود یہانکے لوگ اپنا گذران قناعت سے کرتے تہے انقلاب عملداریون سے

کچھ کچھ چل چل ہوتی رہی تھی بخصوص اخیر زمانہ تیموریہ مین بہت بڑا نشیب و فراز
ہوا جو تواریخون سے خود معلوم ہوگا اب عہد انگریزی مین ہر ضلع تعلقہ داری
مین ایسا بندوبست ہوگیا ہے کہ سرکار کو اب کسی نوع کا دغدغہ نہین اور
ہمیشہ سے اس ملک مین معافی اور شکنجے بہی بہت سے ہے کہ اوس سے
گذارہ یہانکی خلائق کا ہوتا تہا دعاگو حاکم وقت رہتے تہے اور اپنی قسم
کے کمالات حاصل کرتے تہے اب اکثر معافیان اور جاگیرین چین جیا
ہین بڑے دریا و ندیان اس ملک کے بیشمار کیے گئے ہین گنگا گہاگرا
گومتی راپتی سرجو وہ جو کا اور بہی بعض ندیان ہین جو بارہون مہینے روان
رہتی ہین مالگزاری کا بندوبست عہد شاہی مین اور اس زمانے مین
بہی نصفی کا ہے اور اب بندوبست پختہ بہی کئی ضلعون مین ہوگیا تو بہی
قریب قریب ہے بندوبست بحال ہے رعایا اور ملک کی آبادی
اور بہتری ملائم بندوبست کے سبب سے متصور ہے ۔ محاصل یہانکا
اگرچہ پختہ ڈیڑہ کرور کا عہد شاہی مین مشہور ہے مگر کبہی ایک کرور بہی داخل
خزانہ نہوا اگر اب جو مالگزاری کا بندوبست سرسری کیا گیا ہے البتہ قریب
ایک کرور ۲ لاکہ ہے سوا سے لسکے اور آمدنی ملاکر کل مبلغ یک کرور ۲۵ لاکہ
اسقدر ہین اس ملک مین اب سرکاری فوج بہی اکثر ہے اور پولس کے
بندوبست سے جنگی سپاہ کو زیادہ تر امداد اور کام کے دینے کی ضرورت

مین ہوتی ۔ اس زمانے مین دار الحکومت لکھنؤ کی حدود یہان اوتر
ن طرف نیپال کی ترائی ہے اور دکن گنگا اور راوسپار کانپور کا ضلع جانب
شرق گورکھپور اور جونپور اور غرب فرخ آباد اور شاہجہان پور ب اس ملک
مین قبل ۱۲۳۳ھ چار کمشنری تہین اب صرف تین کمشنری رہ گئین لکھنؤ
خیرآباد فیض آباد ان تینون کمشنری کے ضلع ضلع کی مختصر یہہ کیفیت
ہے قسمت لکھنؤ کا پہلا ضلع

لکھنؤ

یہہ ضلع دار الحکومت اس صوبے کا ہے یہ شہر لب گومتی دکن رویہ
آباد ہے گومتی کی دونون طرف آبادی سے تخمیناً تین لاکھ آدمی کی
بستی ہے ۸۰ درجہ ۱۵ دقیقے امتد عرض ۸۰ درجہ ۵۰ دقیقہ پورب طول
مین دار الامارۃ کلکتے سے گوشۂ شمال اور مغرب کی طرف بسا ہوا ہے ۔
اصل نام اسکا لکشن ناوتی بتلاتے ہین ۔ اور بعضے لوگ ایسا بھی کہتے
ہین کہ نمیشارن جہان سوت جی ساٹھہ ہزار منیتون یعنی زاہدون کے
ساتھہ جلسے مین پران سناتے تھے اسی مقام پر تھا اصلی نام اسکا لکشن
ناوتی ہے ۔ اور بعضے لچھمن پور کہتے ہین اصل دونون کی ایک ہی ہے
یعنی مہاراج لچھمن برادر خرد راجہ رام چندر جی نے بسایا شہر لکھنؤ کی دار الحکومت
ہونیکا دعوی ہر چند جلوس نواب آصف الدولہ نے ہے جسکو عرصہ اتنی برسکا

ہوا ہے مگر مدت مدید سے یہ شہر زبس معظم اور مشہور شہر ہا سے اودھ سے تھا فی زمانہ تا جہان شہر لکھنؤ آباد ہے اوس مقام پر ۴۲ دیہات آباد تھے جنکے نام اسماے محلات سے جو اونکی جگہہ آباد ہین معلوم ہوتے ہین اور ماباقی دیہات کے نام و نشان مفقود ہو گئے ہین اور بجز کتب قدیمہ اور کسی علامت سے اونکے نام دریافت ہو نہین سکتے تا وقت شہر لکھنؤ وہ بلند مقام متصل پل پختہ کے ہے جہان ایک مسجد نامزد شاہ پیر محمد صاحب موجود ہے اور جسکو بنام لچھمن ٹیلہ مشہور کرتے ہین اس جانب یعنی بجانب ٹیلہ مذکور کے ایک گانون بنام لچھمن پور آباد تھا اور اوسی گانون کے نام سے یہ شہر لکھنؤ مشہور ہوا۔ ایک قدیم روایت ہے کہ شہر اجودھیا جبکہ خاندان راجپوتان سورج بنسی اس شہر مین حکمران تھے ایسا بڑا وسیع شہر تھا کہ آبادی شہر اجودھیا سے جواب آباد ہے شہر لکھنؤ تک بلا فاصلہ آباد تھا۔ یہ روایت اس وجہ سے قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ لچھمن جی جو آباد کنندہ لچھمن پور کے تھے بہائی سری رام چندر کے تھے جنہون نے اجودھیا کو آباد کیا تھا اور یہ دونون بہائی کبھی جدا نہوتے ہے اس نظر سے ظن غالب ہے کہ دونون نے آبادی اپنے اپنے شہر کی بہی متصل ایک دوسرے کی ہو غالب ہے کہ آبادی لچھمن پور کی برہمنون کی تہی اور چند خاندان شیخ جو سنہ ۱۱۶ھ مین ہمراہ فوج سید سالار

غازی میان برادرزادہ محمود غزنوی انکو مغلوب کرکے خود انکے ملک پر
متسلط ہوگئے تھے اوس وقت مین اہل اسلام اس ملک مین آئے تھے
گو اب ہر ایک خاندان اہل اسلام بیان کرتا ہے کہ وہ ہمراہ فوج سپہ سالار کے
یہان آئے ظاہرا اونکی آمد اور قیام اس ملک مین بتدریج ہوا ہوا اور غالب
کہ سو برس کے عرصے سے آبادی اونکی یہان قرار پائی ہو یہ خاندان شیخ
جو ہمراہ سپہ سالار کے آیا تھا اونہون نے ملک مین بڑی عظمت و شان
پیدا کی یہانتک کہ فوج مین سے اونکے خاندان کے کئی شخص علاقہ صوبہ داری
پر ممتاز ہوگئے تھے اول ان لوگون نے تجویز تعمیر قلعے کی کری اور یہ
قلعہ استحکام مین بہت مشہور ہوا اور یہ قلعہ اوس مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جہان اب
قلعہ مچھی بہون مشہور ہے — اور روایت اسطرح پر مشہور ہے کہ اوسکی تعمیر ایک
اہیر کے ذمے تھے جسکا نام لکھنا تھا اس وجہ سے اوسکو قلعہ لکھنا کہتے
تھے اور چونکہ یہ خاندان شیخ بہت ذی رتبہ تھا اور کثرت اشخاص اوسمین
تھی اسلیے اوسکے گرد و پیش مین اکثر آبادی ہو گئی اور یہ دونون آبادی
کے نام یعنی لچھمن پور اور لکھنا کے نام سے مخلوط ہو کر لکھنؤ ہو گیا اب یہ امر
تحقیقاً معلوم نہین ہوتا کہ یہ نام لکھنؤ اس آبادی کا کب کہا گیا مگر اسمین شک
نہین کہ یہ آبادی قبل از عہد اکبر شاہ بنام لکھنؤ مشہور تھی شیخان لکھنؤ ایک قصہ
اثبات بزرگی اس شہر کا بیان کرتے ہین کہ جب ۹۴۸ھ مین ہمایون بادشاہ

واسطے جنگ شیر شاہ بادشاہ جونپور کے جو بعد ازان شہنشاہ دہلی ہو لیا تھا
اور اثناے راہ مین بمقام لکھنؤ چار گھنٹے استراحت فرمائی تھی باوجودیکہ
فوج شکست خوردہ و دل شکستہ تھی اور ایسے وقت مین جا یا بھی فرمانبردار نہین
رہتی مگر تاہم اس عرصے قلیل مین فوج مذکور سے واسطے شہنشاہ کے دس ہزار
روپیہ اور پچاس راس اسپ بہم پہونچا سکتے تھے اس قصے مین ہر چند مبالغہ
مگر یہ بات ظاہر ہے کہ اوس زمانے مین بھی شہر لکھنؤ آباد و مالدار تھا غرض کہ
زمانہ آصف الدولہ سے تا عہد واجد علی شاہ آبادی بڑہتی گئی بلکہ کسی زمانے
مین آدمیون کا بن مشہور تھا اور عہد سلطنت مین پانچ لاکھہ سے زیادہ سکونت
بتاتے ہین اس شہر مین کتنی سڑکین بہت سے کٹرے اور ٹولے اور
محلے آباد ہین جس محلے مین شیخ مینا صاحب کی درگاہ تھی اب وہ محلہ تو مسمار
ہو گیا لیکن درگاہ موجود ہے اکثر لوگ شب پنجشنبے کو فاتحہ کے واسطے وہان جاتے ہین
سوا اسکے اور بھی زیارت گاہ اہل ہنود و اہل اسلام کی ہین جنکی تفصیل طول ہے
باغات اس شہر مین اکثر اور میوہ جات ہر قسم کے نہایت تحفہ انبہ وخربزہ
اور کوسے مشہور ہین کوچے یہان کے تنگ اور غلیظ مگر اب صفائی
شہر کے لیے کمیٹی سے تدارک ہوتا جاتا ہے اور اب سڑکین بھی وسیع اور
فراخ نکلی ہین اور نکلتی جاتی ہین اور اب بھی اس ٹوٹی پھوٹی حالت پر شہر کو
کسی بلند مقام سے دیکھا جاوے تو جہانتک نظر جاوے وہانتک درخت

ع مینار گنبد اور عالی شان مکانات اور بعض جگہ بنی ہوئی سنہری حسیا
لر پڑتی ہین ۔ حسین اباد اور چوک مین اچھی رونق ہوتی ہے ۔ عہد
ہی مین مجاعون تک کے بدن پر دو شالے اور حلال خورون کے
ون مین ٹاٹ بافی جو تی موجود تھی بچکے گھر مین جو سلے پر توا بھی نہ تھا وہ
ی بازار مین سج بن کے پہرتے تھے لفافہ تو اس شہر کا مشہور ہوا ابھی تک
یان کے امرا اور رؤسا اور اہل وثائق سے شہر کی شان و شوکت کچھ
شتے نمونہ از خروارے باقی ہے ۔ ہر قسم تجارت کی جنس موجود مگر یہ
لداری سے پہلے بادشاہی مکانات کے بڑی طیاریان رہتی تہین
زینہ اور سجاوٹ دیکھکر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی تھی جہاڑ کنول شیشہ
ور دیگر تکلفات کا کیا بیان ہو قصر جمشید کی شان و شوکت اوس سے
یان ہو فرح بخش مبارک منزل باندا اسن موتی محل شیش محل حسین اباد
ستب خانے لائق دید تھے اب بھی جو کچھ مسماری و منہدمی سے محفوظ رہی
جسکا بیان آخر مین زیر کیفیت مکانات کے درج ہو گا قابل دید ہین
محرم یہان کا مشہور عالم ہے امام باڑے ایام محرم مین نور کے تختے نظر
تے ہین خصوصًا حسین اباد ۔ لوگ لکھنو کے تراش و خراش بول چال
مین اور شہرون کی زبان کو اپنے برابر نہین جانتے بلکہ عمومًا اتفاق ہے
ہ جیسا یورپ مین فرنچ ویسا ہی ہند مین لکھنو ہے ۔ میلے بھی بہت کثرت

سے ہوتے ہین مثل عیش باغ اشنو کا میلہ سوم جلسہ زجندی ہے باقی حال
باشندون کا آخر مین لکھا جائیگا اس ضلع مین اگرچہ چھوٹے چھوٹے
قصبے بہت ہین مگر کاکوری کرسی ملیح آباد کاکوری کے مسلمان رئیس
بڑے نامور خدمات سرکاری پر اکثر جگہہ ممتاز اور عموماً اس قصبے کے
لوگ فارسی عربی مین مہارت کامل رکھتے ہین نواح شہر کی زمینداری مین
البتہ فائدہ آمدنی ترکاری و سبزی کی بہت زیادہ اور ہر موسم کی چیزین
فصل سے آگے اس شہر مین اکثر فروخت ہوتی ہین دار الحکومت عمل
انگریزی مین بدستور لکھنو ہی قرار پایا صاحب چیف کمشنر بہادر اسی
جگہہ پر تشریف رکھتے ہین اس ضلع کے تعلقہ دار بھی اکثر شہر کی نزدیکی کے
سبب سے خوش وضع و پر تکلف ہین ـــــ زمین اس ضلع کی اوسط
درجے کی ہے ـ حضور تحصیل لکھنو کرسی موہن لال گنج ملیح آباد
یہ چار تحصیل ہین ـ
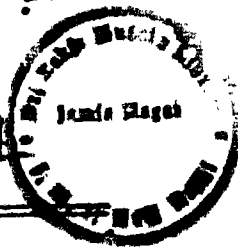
دوسرا ضلع دریاباد

اسکا صدر مقام لکھنؤ سے ۱۰ میل نواب گنج بارہ بنکی مین ہے یہ ایک قصبہ مختصر سا ہے اب ایک سراے پختہ نئی زیر اہتمام اہلکاران سرکاری تعمیر ہوئی ہے آب و ہوا اس ضلع کی بہت اچھی زراعت پر فلاحت ہے تعلقدار بھی اس ضلع کے نامی گرامی رعایا خوش اور اکثر تعلقہ دار اہل اسلام سے ہین جنگل کم ندیان اور جھیل سے سارا ضلع سیراب اور مقام ستر کھیہ مین ایک میلہ بھی ہر سال ہوتا ہے اور اب لکھنؤ سے نواب گنج ہوتے ہوے فیض آباد تک سڑک پختہ طیار ہو گئی ہے اور ایک اسکول بھی زیر اہتمام ضلع کے جاری ہے اور اس ضلع مین تحصیل ہاے مفصلہ ذیل یہ ہین نواب گنج حضور تحصیل رودولی دریاباد رام نگر +

تیسرا ضلع راے بریلی

یہ مقام لکھنؤ سے ۴۵ میل جانب مشرق مائل جنوب واقع ہے قصبہ پرانا مکانات کہنہ اور یہ ضلع قبل از تجویز جدید مقام کمشنری بیسواڑہ بھی رہا ہے زمین عموماً اچھی اور ہر طرح کی قابلیت زراعت اور تعلقہ دار بڑے بڑے ہین اور آسودہ اور مرفہ الحال ہین لیکن ہندو خصوص

راجپوت کثرت سے ہین شاہزادہ سہدیو سنگہ خلف سردار شیر سنگہ مہاراجہ پنجاب کو اس ضلع مین جاگیر عطا ہوئی ہے اسلیے وہ بھی یہان رہتے ہین اور بعض بعض انگریز جو اس ضلع مین تعلقدار ہین اونھون نے نیل اور پنبہ کی زراعت مین توجہ کی ہے رائے بریلی ڈلمؤ مہارا جگدیز گڑہ یہ چار تحصیل ہین +

چوتھا اونام

لکھنؤ سے ۳۰ میسل جنوب اسکے گنگا اوسکے پار کانپور ہے صدر مقام اسکا اونام ہے بندوبست پختہ سے رفاہ رعایا برایا ہوا ہے تعلقہ داری بہت کم ہندو مسلمانکی آبادی ہے برہمن اور راجپوت زیادہ ہین عموماً اوسط درجہ کی زمین خاص مقام اونام شیخون کا آباد کیا ہے شاید یہ پرانے خاندان شیخون سے ہین اور اب بھی اونکے خاندان سے لوگ موجود ہین اس ضلع کا انتظام بہت اچھا اور رعایا کمال خوش حضور تحصیل اونام نواب گنج پوروا صفی پور یہ چار تحصیل ہین +

قسمت خیر آباد

ضلع ہردوئی

مقام ضلع کا خاص ہردوئی لکھنؤ سے ۰ ۸ میل ہے یہ ضلع بہت وسیع ہے
حدود غربی ملحق ہین فرخ آباد اور جنوبی حد گنگا سے ملتی ہے اس ضلع
کی زمین متوسط آدمی بھی عموماً اچھے اور بانگر جہان کے چور مشہور
ہین اسی ضلع مین واقع ہے اس ضلع مین اچھے اچھے قصبے
بلکہ بطور شہر آباد ہین سندیلہ بلگرام شاہ آباد گوپامئو کٹیاری
لیکن ضلع کا دار الحکومۃ بہت خراب موقع پر آباد ہے اہل محلے
کو بوجہ نہونے گہرونکے تکلیف ہوتی ہے لیکن اب آباد ہوتا
جاتا ہے جنگل بھی اکثر واقع ہین اور بہت کچھ نیلام بھی ہو گئے
اور اونمین آبادی ہوتی جاتی ہے ہندو و مسلمان دونون مذہب
کے رئیس آعظم تعلقہ دار ہین چودہری حشمت علی رئیس سندیلہ
اور راجہ ہردیو بخش کٹیاری کے بڑے عالی نژاد اور نامور ہین
سوا انکے اوٗر اوٗر بھی رئیس تعلقہ دار خصوصاً اہل اسلام سے
زیادہ تر باوضع اور پرتکلف ہین اب اس ضلع مین مدرسہ
حاکم ضلع کے اہتمام سے اجرا ہے اور ترقی پر ہے ہیڈ ماسٹر
اور مدرسون کی لیاقت قابل تعریف ہردوئی حضور تحصیل
شاہ آباد سندیلہ بلگرام یہ چار تحصیل ہین +

دوسرا سیتاپور

مقام دار الحکومۃ کمشنری و ضلع کا ہے خیرآباد سے جانب شمالی ۶میل لکھنؤ سے ۶۰میل ہے حکام کی نیک نیتی سے اس ضلع مین یوماً فیوماً برکت ہے تعلقدار اور رئیس قدیمی سے یہ ضلع گلزار ہے زمین بہت اچھی گنجایشی کئی قصبہ نامی مثل خیرآباد باری لسوان رامپور اور ضلع کے صدر مقام سے کچھ فاصلے پر مصرکھ اور اوسکے قریب نیمسار ہین یہ دونون مقام متبرک اور پرانے ہین اور نیمسارن وہ مقام ہے جہان سوت جی نے پران سنایا گومتی اوسکے تلے بہتی ہے اسکے نزدیک ایک حوض برہماورت نام کا ہے اسکا پانی اندر ہی اندر جوش کھاکر ایسا چکر کھاتا ہے کہ آدمی کو مقدور نہین کہ اوسمین غوطہ لگاسکے یہی وہ مقام مہنود کے نزدیک ہے کہ انقلابات زمانہ سے جب بید اور پوتھیان علوم و فنون کی جو ضائع ہوگئین تھین اس مقام پر اونکی از سرنو ایجاد ہوئی اور حضرات رشیان کلش پاک باطنون کی رہنمائی سے پھر علوم اور پرانی سنسکرت کی پوتھیون کا ظہور ہوگیا اوسکے قریب ایک سرچشمہ ہے کہ وہ گومتی مین ملتا ہے ایک گز چوڑا اور چار انگل گہرا ہے جب برہمن پوجا کرتے جانور

ہون کا سامان اوسمین چھوڑ رکھے ہین اوسکا نشان نہین ملتا
پر بھی اکثر عقائد مذہبی کی وجہ سے باتین مشہور ہین نیمسارن
مصرکھ کا ہر سال مین جب کوئی پرب ہوا میلہ ہوتا ہے اور
معمولی میلہ ہر سال بڑی دھوم سے ہوتا ہے کئی سال سے
حاکم ضلع اور صاحب کمشنر کی عنایت سے خیرآباد کے مقام پر ایک
میلہ ہوتا ہے اس مین گھوڑے اور مویشی کثرت سے بکنے کو
آتے ہین اور یہ قصبہ خیرآباد بہت قدیمی اور اکثر رئیس یہان کے
مامور اور سرکاری خدمتون پر مامور ہین مکا خیاط کا امام بارہ
مشہور ہے نیشکر کی زراعت بہت اور کئی مقامون پر کھنڈسال
بھی ہے بسوان مین قالین بنائے جاتے ہین اور تماکو بھی اچھا
ہوتا ہے اور محمود آباد کی ریاست اس ضلع مین بڑی ہے یہ
چار تحصیل کے مقام ہین حضور تحصیل سیتاپور بسوان
باڑی مصرکھ +

تمسیر الکھیم پور

لکھنؤ سے فاصلہ تخمیناً ۶۰ میل سیتاپور کے اوتر ۲۴ میل پر
دارالحکومۃ ضلع ہے شمال اور غرب مین بہت بڑی حدود اسکی
پیلی بھیت اور شاہجہان پور اور بریلی اور مشرق مین بہرائچ

اور دریاباد کا ضلع ہے تعلقدار اور راجہ پور اسنے پور بسنے ہین
زمین متوسط جنگل بکثرت اور شکاری جانور اس جنگل مین بہت
اور جانب شمالی ضلع مین بیماری ہمیشہ رہتی ہے اور گوکرن ناتھ
مہادیو کا مقام اس ضلع مین بہت متبرک گنا جاتا ہے دو میلے بہی ایک
سال مین ہوتے ہین اور معتقد صدہا کوس سے آتے ہین
حضور تحصیل لکھیم پور علی گنج محمدی یہ تین تحصیل ہین +

چوتھا بہرایچ

لکھنؤ سے ابفاصلہ ۸۰ میل اوتر کی جانب ہے اس ضلع مین
بڑا علاقہ تعلقہ داری راجہ کپورتھلہ یعنی علاقہ بونڈی و درگاپور
اور بھی بڑے بڑے تعلقدار ہین حد شمالی اس ضلع کی نیپال سے
ملتی ہوئی ہین یہ ضلع گھاگھرا اور راپتی ندیون کی وجہ سے
بالکل سیراب جنگل کی کثرت وگرنٹ بھی بہت ہے اور پیداوار
سب قسم کی ہے لیکن دھان بکثرت پیدا ہوتا ہے سرجو
اس ضلع کے تلے بہتی ہے سید سالار مسعود غازی کی درگاہ اور
رجب سالار کا مقبرہ اسی جگہ ہے سنتے ہین کہ رجب سالار
تغلق شاہ کے بھائی تھے اور سید سالار مسعود غازی کے حال مین اختلاف
ہے صحیح قول یہ ہے کہ قوم کے سید لیکن سلطان محمود غزنوی سے

قرابت رکھتے تھے اور بعض کا یہ قول ہے کہ پٹھان تھے لیکن شہید
غرض درگاہ اونکی اہل عالم کی زیارت گاہ ہے سال مین ایک بار
لا ہوتا ہے دور دور سے لوگ میناؤن کے ہمراہ آتے ہین کتنے ہی
باج بیوپاری بھی آتے ہین اقوام ارزال لال لال نیزون کے ساتہ
اور مین ڈفالی گاتے بجاتے ساتہ لیکر اپنی اپنی بستیون سے نکلتے
ہین غرض جیٹھ کا پہلا اتوار اس میلے کا دن ہے عقائد مذہبی و جہالت
سے معتقدین انواع و اقسام کی حرکات سے اس میلے مین شریک
ہوتے ہین صدر تحصیل بہرائچ حسام پور نان پارہ یہ تین
مقام ہین +

تیسری کمشنری فیض آباد

پہلا گونڈہ

دار الحکومۃ ضلع کا ہے لکھنؤ سے فاصلہ ۷ میل فیض آباد سے
۴۴ میل شمالی ہے ـ گھاگرا کے کنارے کنارے یہ ضلع گورکھپور
تک آباد ہے پیداوار ہر قسم روئی و نیل کی زراعت کے لائق
زمین بہت ہے مہاراجہ دگبجے سنگہ صاحب بہادر بلرام پور کا
تعلقہ اسی ضلع مین اور ایک حصہ تعلقداری مہاراجہ مانسنگہ صاحب
بہادر قائم جنگ یعنی علاقہ تلسی پور بھی ہے ـ جنگل افتادہ بھی ہے

بڑے بڑے تعلقہ سوائے مہاراجہ بلرام پور و مہاراجہ مانسنگہ صاحب
بہادر کے بہت کم ہین آب و ہوا اچھی و مفرح ہے ۔ یہ مقامات
تحصیل ہین حضور تحصیل گونڈہ اوترولہ سعد اللہ نگر طرگنج

فیض آباد

لکھنؤ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ضلع کا دار الحکومتہ اب گھاگھرا
واقع ہے پرانا شہر دار الامارتہ اودہ مقام بنگلہ کے نام سے
۳ کوس کے فاصلہ پر آباد ہے یہ مقام ہندؤن کے عقائد مین
بڑا متبرک ہے دیس دیس کے مذہبی معتقد اس مقام پر آتے
ہین کیونکہ مولد و دار الحکومتہ مہاراجہ رام چندجی کا ہے مرتاضون
کی اب بھی کثرت ہے ہنومان گڑھی اسی مقام پر ہے اب سرکار
سے مذہبی امور مین مراعات ہین ہر سال رام نومی یعنی چیت
کی نومی کو بڑا ھی میلا ہوتا ہے مہاراجہ مانسنگہ صاحب بہادر قائم جنگ
اور اونکے خاندان سے اکثر مقامات گھاٹ اور دیو استھان
یادگار ہے انہون بھی مہاراجہ صاحب کی اعانت سے اسکول
اور ایک مدرسہ آموزش مذہبی فرائض کا جاری ہے جسکا مصارف
ہزار روپیہ ماہواری مہاراجہ موصوف نے اپنی ہمت عالی پر لیا ہے
فیض آباد کے قریب دو بڑی قبرین ہین طول اونکا سات سات

آٹھ آٹھ گز سے کم نہین عوام اونکو حضرت شیث اور حضرت نوح سے منسوب کرتے ہین اور ہر پنجشنبہ کو اکثر لوگ وہان جاکر فاتحہ پڑھتے ہین — اور بعضون کے نزدیک رتن پور مین کبیر جولاہے کی قبر ہے یہ شخص سلطان سکندر لودی کے عہد مین تھا بنارس کے مقام مین عقائد ہنود مین عبادت کرتا رہا فقرا کے نزدیک موحد صاحب کمال تھا چنانچہ اوسکے طبعزاد اکثر دوہرے اہل مذاق کے وردزبان ہین — شجاع الدولہ کے عہد کی آبادی بہت تباہ ہے ہین اور اب لکھنؤ سے اوترکر صوبہ اودہ مین یہ شہر ہے ملک سیراب اور ہر قسم کی پیداواری وزراعت ہوتی ہے مہاراجہ مان سنگہ بہادر کا صدر علاقہ اس ضلع مین ہے اور یہ چار مقامات تحصیل ہین فیض آباد اکبرپور دوستپور بیرتی پور +

سلطان پور

یہ ضلع شرقی وجنوبی حد فیض آباد سے بفاصلہ ۴۰ میل اور لکھنؤ سے بہ فاصلہ ۸۰ میل واقع ہے متوسط کیفیت ضلع ہے اور اشخاص ورعایا اچھے اور بڑے تعلقدار اس ضلع کے راجہ مادھو سنگہ صاحب بہادر گڑہ اٹھیی کی ہین زمین بہت اچھی قابلیت ہر قسم کی گومتی اور کئی ندیان اس ضلع مین ہین اور مقامات تحصیل

یہ ہین حضور تحصیل سلطان پور امیٹھی انعونا مومن گنج

پرتاب گڑہ

یہ ضلع لکھنؤ سے بفاصلہ ۱۲ میل واقع ہے ضلع کا دار الحکومتہ بیلا گھاٹ ہے جنوب الہ آباد شرق جونپور حد اِین بلکہ صوبۂ اودہ کی شرقی حد اس ضلع کی حدون پر ختم ہے یہ ضلع سب طرح سے اچھا رعایا آباد تعلقدار شریف وخوش اور بندوبست پختہ ہوتا جاتا ہے اور یہ مقامات تحصیل ہین حضور تحصیل بیلا گھاٹ پٹی بلکھر بہار سلون +

انتباہ

یہ کیفیت نہایت ہی مختصر ہے دوسری کتاب مفصل حالات ملک اودہ مین عنقریب طبع ہونے والی ہے اوس سے مشرح معلوم ہوگا — عہد شاہی مین یہ انتظام اضلاع تھا صرف سرسری طور پر نظامت کبھی چار کبھی پانچ اور اون کے نیچے سے چکلہ دار ہوتے رہے اور مالگزاری کا انتظام تو کبھی نتھا اب سرکاری عملداری مین ہر جگہ آبادی وزراعت کی کثرت اور فضل الٰہی سے تولید وتناسل حضرت بنی آدم کی بھی افزایش الّٰلھم زِد فزِد یوماً فیوماً مزید +

نواب سعادت خان برہان الملک

صوبہ داران اودہ کی ریاست کا مورث اعلی یہہ نواب ہوے کہتے ہین کہ اصلی نام اس
نواب کا میر محمد امین بن میر نصیر نیشاپوری زمانۂ دولت بہادر شاہ ۱۱۲۰ء شاہجہان آباد
مین آیا اور عہد دولت محمد شاہ ۱۷۳۸ء مین جبکہ دہلی مین ہنگامۂ نادرشاہی ہوا تہا
تو اوسوقت مین اتفاقات و انقلابات سے مقرب درگاہ بادشاہ ہوگیا بلکہ
خدمتین پسندیدہ اس سے ایسی وقوع مین آئین کہ مترصد عہدۂ وزارت کا تہا
چنانچہ اوسوقت مین عملداری اودہ مین ہر مقام پر بے انتظامیان ہو رہین تہین
واسطے انتظام صوبہ اودہ کے مامور ہوکر آئے اور عہدۂ سابق بہی بدستور بحال
رہا اس صوبے مین اوسوقت پشتہا پشت سے خاندان شیخ نواب عبدالرحیم خان
جو عہد اکبری مین صوبہ دار تہے زمیندارانہ اس صوبے پر قابض و متصرف تہے
بلکہ اس صوبے کی آمدنی بالکل خورد و برد تہی اور زمانہ کا رنگ دیکہکر در پردہ
سرکش ہو رہے تہے جبکہ نواب برہان الملک اس صوبے مین پہونچا تو لکہنو
مین آکر ٹہہرا اور بوجہ سد راہ ہونے شیخ زادون کے کنارہ شہر مین بہی دخل
نہو سکا اور کئی مہینے تک ناکامون کے اکبری دروازے کی جنوبی جانب
خیمہ زن رہا اور کوئی تدبیر موافق حال نہوئی تو عیاری کو کام مین لایا شیخزادون سے
رابطۂ اتحاد بڑہایا کہ خیال عداوت بالکل مخالفون کے دل سے مٹایا بعد چند

سعادت خان برہان الملک

ایک جشن مین شہزادونکی دعوت کا اذن عام دیا چنانچہ وہ جمیعت کثیر سے ساتھ
ہزار آدمیون کے ساتھ مہمان ہوے یہ موقع اور قابو پاکر کمین گاہ سے
افواج سوارون کے حملہ آور ہوا اور ساری جماعت کو مع اونکے سردارون کے
اوسی جگہ ٹھکانے لگایا اور پھر سارے صوبے مین قابض ہوکر انتظام مہمات
مین نام آور ہوا ۔ ایک روایت ہے کہ شیخون نے داب حکومت اور سیاست
دکھلانیکے واسطے محلہ مین دروازے پر شمشیر برہنہ لٹکا دی تھی کہ جب پادشاہ یا
کا صوبہ دار یا حاکم صوبہ داری اودہ پر مختار و مامور ہوکر آتا تھا تو اپنی دلیری اور
شجاعت سے اوسکو تنگ کرتے تھے اور اوس سے اوس تلوار کا
سلام لیا کرتے تھے ٭

٭ جب برہان الملک کا قبضہ اور تصرف شہر مین کماحقہ ہوا فوراً اوس تلوار
کو پھکوا دیا اور بعد اوسکے سب کہنگئے اس صوبے پر مسلط رہا اوس زمانے
مین پچاس لاکھ روپیہ محاصل صوبہ تھا اور عہد برہان الملک مین صوبے کی
یہ حدین تھین ۔ دکھن گنگا ۔ شمال دریاے ریتی و ترائی نیپال
۔ شرقی صوبہ عظیم اباد ۔ مغربی شاہ اباد محتہ فرخ اباد سنہ ۱۱۵۱ ہجری مین
شاہ جہان اباد دہلی مین بعد ہنگامہ نادر شاہ وفات پائی اور شاہجہان اباد
مین بیچ محلہ میرکان لکھنؤ مین شہزادونکی حکومتگاہ تھی شاید یہی ہون کے متصل
واقع تھا اب تو نام بھی نشان ـــــ

قطعہ تاریخ

مین فن ادب راجہ جی شاگرد ایسکے زمانے مین کا پرداز تہا
ہوئی جب کہ تمام کتاب امجد عمر ادیب مرگ کی ہاتھون ابتر پڑا تاریخ کی جو فکر شایان
ہو سال اسم بہی اوسکی اظہر قلم نے ڈال لفظ علی کر عدد کہی اسم سعادتخان سے باہر

مرزا محمد مقیم ملقب بلقب نواب صفدر جنگ

باپ اس نواب کا نواب جعفر علی خان داماد ہمشیرزادہ نواب برہان الملک کا تہا
نواب برہان الملک کی صوبہ داری نسبت اور صوبہ دارون اودہ مین زیادہ استحکام
سے رہی اسواسطے اونکے خاندان مین اس صوبہ نے زیادہ تر قیام
پکڑا اور اپنا نقشہ جمالیا بعد انتقال برہان الملک کے ۱۱۵۱ ہجری مین
نواب صفدر جنگ قائم مقام برہان الملک کے حضور بہادر شاہ شاہجہان آباد
سے ہوا اور وزارت کا منصب بہی حاصل کیا یہ نواب بڑا ہی دلیر اور صاحب
تدبیر تہا اور مقرب بادشاہ دہلی رہا جب احمد خان ابدالی کی شورش ہندوستان
مین ہوئی اور مثل نادر شاہ کے ہندوستان مین آکر ایک تہلکہ ڈال دیا تہا
ہمراہ لشکر شاہی برفاقت شاہزادہ احمد صفدر جنگ نے وہ داد شجاعت دی
کہ اور بہی مقرب درگاہ ہوا اور بعد فتح یابی کے شاہزادہ موصوف معہ صفدر جنگ
دہلی کی جانب روانہ ہوا کہ راستے مین خبر وفات محمد شاہ کی معلوم ہوئی یہ خبر
اضافہ ہوئی تہی کہ صفدر جنگ نے چتر شاہی احمد شاہ کے سر پر لگا کر ع

نواب منصور علیخان صفدر جنگ

سے ارکین دولت درگاہ جو ہر کاب شاہزادہ تہے بہون سنے نذرین تخت و تاج کی دین

کہ اس جلدی مین عہدۂ وزارت حاصل ہوا لیکن اکثر امرا و ارکین سلطنت کہ جو

پشتہا پشت سے مقرب درگاہ تہے اس خدمت وزارت صفدر جنگ سے

ناخوش ہوسے اور درپی استیصال صفدر جنگ تہے لیکن صفدر جنگ کا

عروج تہا کسی دشمن کی پیش نگئی بلکہ سنہ ۱۱۶۱ ہجری مین کمال اولوالعزمی سے

محمد خان بنگش افغان کو فریب سے قتل کرا اپنا قبضہ اور دخل کرلیا راجہ نول راے کو

اپنا نائب مقرر کر کے اس جگہہ پر چہوڑ کر خود صفدر جنگ روانہ شاہجہان اباد

ہوا چند روز کے بعد پٹہانون نے یورش کی اور راجہ نولراے اوسی

ہنگامے مین کام آئے اور یورش کی خبر پاتے ہی صفدر جنگ نے

باعانت سورج مل جاٹ راجہ بہرتپور و مرہٹہ وغیرہ کی جمعیت کثیر کے ساتہہ

پہر مقابلہ پٹہانون کا کیا پٹہانون کے افسر احمد خان و رستم خان برادر

قائم جنگ کے تہے اس ہنگامے مین لاکہون آدمی کا کشت و خون ہوا

اور رستم خان مارا گیا او صفدر جنگ سلامت کو جا کر شاہجہان اباد کو پہر گیا

اور بقیہ فوج بمشکل سے جانبر ہوکر روانہ الہ اباد ہوئی پہر اودہ اور فرخ اباد ان

دونون صوبون مین روہیلہ گردی سے روز حشر نمودار تہا سارا ملک تاراج

ہوگیا شہر بنارس بچ گیا وہان کے مہاجنون نے شہر کی حفاظت

اور بچانیکے واسطے دو کرور روپیہ پیشکش کیا کر روہیلون کی بدانتظامی اور

طمع نفس سے لکھنو کا انتظام جاتا رہا اور شیخ معز الدین نے اپنے قبضے اور تصرف مین کر لیا ساکنان لکھنو اور نواح اوسکے نے آکر پٹھانون کو تہ تیغ کیا اور عمارات پر بخوبی مسلط ہو گئے اور صفدر جنگ کو اطلاع دی کہ یہ وقت ہے کہ روہیلون سے عوض لیجے چنانچہ صفدر جنگ نے باجی جی بھاو وہار اوکہ جمعیت کثیر اسی ہزار آدم مین تہی اونکی معیت سے احمد خان وغیرہ روہیلون فرخ اباد کے اس مار گیتا یا اور کر خوب ہی خبر لی اور مرہٹون نے کہ معاون صفدر جنگ تھے اور واسطے صلح کرا دینے احمد خان روہیلے کے صفدر جنگ سے دونون طرفسے دو کرور روپیے نقد پائے اور اپنا ملک کو لوٹ گئے اور الہ اباد اور اودہ کے صوبے کا انتظام و تسلط خاطر خواہ کرکے صفدر جنگ پہر شاہجہان اباد کو لوٹ گیا بسکہ ارکین سلطنت و امرائے حضوری بادشاہ نے صفدر جنگ کیطرفسے بادشاہ کو آشفتہ کر رکہا تہا صفدر جنگ تنگ ہوکر اپنے ملک مقبوضہ مین چلا آیا اور ۱۵ برس تک اس صوبہ اودہ مقام فیض اباد دار الحکومت کی سیر کی ۱۱۶۷ء مین وفات پائی او فیض اباد مین لاش اوسکی سپرد زمین ہوئی او وہانسے شاہجہان اباد مین درگاہ شاہ مردان کربلا کے دفن کی گئی اور استخوان اونکی کربلا بہجوائی گئی تاریخ نوالاتی بارہ وفات منصور علیخان آہ وای مدت پاست بیس برس **تنبیہ** صفدر جنگ زمانے مین سلطنت اسلام ہند کا زور پہر زور گہٹتا گیا ہر ایک صوبہ دار بجای خود حاکم و نواب ہو بیٹہا مرہٹون اور جاٹون اور سکہون نے بہ اعجباز شورش کیں تمام ہندوستان پامال بے انتظامی ہو گیا اور ہنود نے لاکہون بندگان خدا کا کشت و خون ہوا تہا خوب رستے بیچ کہا

بیان جنگ میر قاسم خان ناظم بنگالہ با انگریزان

نواب شجاع الدولہ بہادر کو جو سرکوبی سرکشان بندیل کھنڈ کو و ن سے لگی ہوئی
تہی اس مرتبہ باحسن الوجوہ عمل مین آئی یعنی وہ سر الوپ نیچے اسوقت ناگاہ
میر قاسم خان ناظم بنگالہ نے کہ انگریز کے ہاتہون سے شکست پائی تہی اونے
نواب شجاع الدولہ بہادر کو اپنا مددگار اسطرح سے بنالیا کہ اگر آپ میری دستگیری
کرین لاکہہ روپیہ کوچ اور پچاس ہزار مقام دونگا اور بعد فتح کے یہہ مسترد عہد ہوا
تہا کہ صوبہ عظیم اباد کہ ۹ لاکہہ کی جگہہ ہے مع ایک کرور روپیہ نقد تواضع مین صاحب الدولہ
بہادر تمہارے فرزند کی بخوشی دونگا نوابصاحب بہی اس معاملے پر راضی ہو کر مستعد
دستگیری حال ہوئے حاصل مدعا تو درکنار تمامی سرمایہ و جواہرات نقد و جنس کروڑہا
روپیہ کے نوابصاحب کے تصرف مین آئی اور میر محمد قاسم خان اونکی سختیون
سے یہانتک تنگ ہوئے کہ حصول مدعا اور مال متاع سے دست بردار ہو
اور بواسطہ فتح علیخان اپنی گلو خلاصی کرکے پریشان و زرگار رو ہیلے کے ملک
مین چلے گئے نواب شجاع الدولہ نے اوسوقت چاہا کہ ملک بنگالہ اپنے قبضہ
تصرف مین آجائے فوج بہی کثیر ہمرکاب تہی شجاعت نے ہاتہہ پاون نکالے
انگریزون نے بصلاح وقت نواب ممدوح سے پیغام صلح کا دیا کہ عالیجاہ بنیاد
آویزش و فساد کا تہا درمیان سے گیا تمہارے اور ہمارے درمیان خیر انخواہ ہستہ

وئی امر کہ مبنی فساد یا عناد کا ہو نہین ہے اسصورت مین مناسب ہے کہ سلسلہ
رسم اتحاد و محبت کا جاری ہے قول و اقرار کی پاسداری ہے دوست و
دشمن جانبین سے طرفین مین دوست و دشمن سمجھے جائین اور صوبہ عظیم آباد
کا جو عالیجاہ سے نامزد صاحبزادہ عالی مرتبت سے کیا ہے اوس سے
ہمکو بھی کسیطرح دریغ و انکار نہین ہے چنانچہ راجہ بینی کہ اسوقت مین کارپرداز و مدارالمہام
اس سرکار کا تھا بنظر خیر خواہی طرح مصالحہ و دفع فساد کی ڈالی لیکن نواب سالار جنگ
و مرزا علیخان و میر نعیم خان وغیرہ کہ ہواخواہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے تھے
برہم زن اس معاملہ اور مصالحہ کے ہوے نوبت توپ و تفنگ کی آئی اور شعلہ
آتش جدال و قتال آسمان سے گذرا منصور جدا شکست تھی نوابصاحب نے
عین معرکے مین یہ چاہا کہ ہاتھی سے اوترکر گھوڑے پر سوار ہون ہاتھی کو
فیلبان نے بٹھلا دیا فوج کو بلا تامل یہہ ہمن نشین ہوا کہ نواب ممدوح نے
زخم کاری کھایا قدم میدان سے ہٹایا اور راجہ بینی بہادر دل شکستہ نے پہلے تو
دس بارہ ہزار فوج ہمراہی اپنی سے خوب میدان کارزار گرم کیا مگر اوسوقت
یہہ خیال مین آیا کہ شجاعت پٹھانونکی دیکھا چاہیئے کہ وہ اسوقت خاص مقام
کیا کار نمایان کرتے ہین اور شجاعت دکھاتے ہین جنگ سے کنارہ کش
ہوا کہ فوج افغان وغیرہ نے عین وقت پر دغا دے آپ کو بے سردار سمجھکر
بھاگ گئے اور اپنے ولی نعمت کا خزانہ جو رتھ پر بار تھا خوب لوٹا ع مال حرام بود بجای

حرام سفت و آخر کار شکست فاش نصیب نواب ہوئی شجاعت اور تدبیر سب خراب
ہوئی پانچ سو آدمی خان سے تھے کہ دوا نالے وہیلہ ہوئے اور انگریز مظفر و منصور
لکھنو میں آئے تاریخ اس معاملہ کی مرزا رفیع متخلص بسودا نے کیا خوب کہی
کل مغل پون ۱۱۷۷ القصہ نواب شجاع الدولہ بادرملک روہیلہ مین چلے آئے
سوائے حافظ رحمت خان کے کسیکو غمخوار نپایا وہان سے بمشورہ خان کو
فرخ آباد مین آئے احمد خان بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا استقبال کیا
اپنے گہر مین لایا تواضع و مدارات موافق مزاج اور لائق مرتبہ ظہور مین آئی
اور بصلاح عماد الملک بہادر پینتالیس ہزار مرہٹہ واسطے کمک اور امداد نواب
موصوف حسب الطلب آیا تہا چالیس ہزار کوچ اور بیس ہزار بمقام روپیہ مقرر
تہا المختصر پہر کوڑہ جہان آباد مین انگریزون سے نوبت صف آرائی کی
آئی بعد کشت و خون بسیار انجام کار وہی دن پیش آیا وہ زبردست رہے
یہہ زیر بار شکست ہوئے ناچار نواب ممدوح بصلاح وقت دو انگریزون کو
کہ پہلی لڑائی مین ہاتہہ آگئے تہے اونکو قید سے آزاد کر کے بہت سے گہوڑے
ہاتہی اور جواہر گرانبہا اور اشرفیان نقد دیکر احسانمند کیا اور بدرخواست
مصالحہ طرف لشکر مقابل کے روانہ کیا اور آپ بہی چند سوار سمیت جانب
لشکر انگریزی قدم زن ہوئے اونہون نے جو خبر پائی کہ نواب صاحب آتے
لشکر مین آتے ہین باستقبال پیش آئے اور بڑے اعزاز و اکرام

اپنے مقام پر لاے یہ صورت مصالحے کی قرار پائی کہ ایک روپیہ مین
چند آنہ حاصلات ملک سے داخل خزانہ انگریزی ہوا کرین اور ملک پر بہ
نواب صاحب بہادر بدستور قابض اور متصرف رہین القصہ نواب صاحب بہادر
راضی و خوشی کشتیان جواہرات وغیرہ بطریق تواضع سرکار انگریزی سے لیکر
داخل لشکر ہوئے اپنے قلمرو پر بدستور اختیار حاصل ہوا یہ معاملہ سنہ ۱۱۷۹ ہجری
مین گذرا لیکن اس معرکے مین بہت مال نقد و جنس عماد الملک بہادر کا تلف
اور ضائع ہوا تھا اوسکی عوض مین نواب صاحب بہادر نے گیارہ لاکھہ کا
ملک اپنی قلمرو سے جدا کرکے سند اوسکی عماد الملک بہادر کو ارسال کی تھی
اونکی ہمت نے قبول نکیا پہیر دی اور بخوشی خاطر روانہ شاہجہان آباد کو
ہوئے نواب صاحب بہادر باغواے بعض مشیران ناعاقبت اندیش راجہ
بینی بہادر کی طرف سے دل مین ملال رکھنے لگے اور استیصال اوسکا
منظور نظر تھا چنانچہ بعد چندے لکھنؤ مین تشریف لاے اور بہانے سے
اوسکو اپنے ہمراہ لیا اور بصلاح ایلچ خان کارپرداز کہ اوس ریاست مین نہایت
ذی مرتبہ و صاحب اقتدار تھا بلکہ لکھنؤ مین آج تک ایلچ خان کا میدان و مسجد
مشہور ہے سنہ ۱۱ ہجری مین سلائی اوسکی آنکھون مین پہیری گئی تاریخ ضیاے
چشم و اہی اور اوسی سن مین شادی آصف الدولہ بہادر یحیی خان عرف مرزا امانی
کی ساتھہ شمس النسا بیگم دختر خانخانان خلف قمر الدین خان وزیر محمد شاہ کے

نواب شجاع الدولہ بہادر

ہوئی جو بیس لاکھ روپیہ اس شادی میں صرف ہوا تھا۔

نواب شجاع الدولہ بہادر

مخاطب جلال الدین محمد شجاع الدولہ بہادر ابو المنصور خان ہاشم جنگ فدوی
احمد شاہ بادشاہ سنہ ۱۱ ہجری میں ۲۲ برس کی عمر میں مسند نشین صوبہ اودہ مقام
فیض آباد میں ہوئے مادہ تاریخ مسند نشینی — رونق مسند ماہ وزارت
اسی نواب کے زمانے میں انگریزونکی قدرت واقتدار نے ترقی پائی
جوانی عمر و نشہ حکومت کے تقاضے سے ابتدا میں عیاشی و تن پروری
میں مشغول تھا اور اسی سبب سے بعض عمائد و اراکین کی یہہ مشورت
ٹھہری کہ اس نواب کو حکومت سے خارج کرکے نواب محمد قلیخان برادرزادہ
صفدر جنگ کو کہ الہ آباد میں مقیم تھا بلاکر مسند حکومت پر نصب کریں نواب
بہو بیگم صاحبہ نے کہ اونکا اقتدار بہت تھا اس ارادہ بیجا سے اراکین
ریاست کو باز رکھا اور اوسوقت سے نواب شجاع الدولہ نے آئین
ریاست داری کو کارفرمایا اور پردہ غفلت کا گوش ہوش سے اوٹھایا
اور اسی زمانے میں سلطنت دہلی میں فتور پر فتور برپا ہوتے جاتے تھے
ملازمان درگاہ اور اراکین سلطنت نے نالائقی سے سلطنت کو ایک کھیل
بنا رکھا تھا جسکا ذرا بھی قابو ہوا بادشاہ کو نچا سے پھرے چنانچہ عماد الملک
و دیگر وزرائے سلطنت وغیرہ نے شاہزادہ علی گوہر شاہ عالم کو عداوت سے

خارج کرنا چاہا اور اس سبب سے شاہزادہ مذکور الہ آباد مین مقیم رہتے تھے کہ اس عرصے مین احمد شاہ درانی بادشاہ دہلی کی امداد کے لیے مرہٹہ بہاؤ راؤ وغیرہ کے مقابلے کے واسطے پھر ہندوستان مین پہنچا واضح ہو کہ ان مرہٹون نے بجمعیت کثیر و جم غفیر قریب بیس پچیس لاکھ کے دہلی کو گھیرا تھا اور مرکوز خاطر تھا کہ دہلی کو فتح کر کے تخت و تاراج کرین کہ احمد شاہ درانی بارادہ کمک اور امداد شاہ دہلی کے آیا اور حسب ایما سے احمد شاہ درانی دیاس ناموس اسلام کے شجاع الدولہ و دیگر صوبہ داران شاہی احمد شاہ کے لشکر مین پہنچے اور باتفاق یکدیگر ان سب نے خوب ہی مرہٹون کا پانی پت کے مقام پر مقابلہ کیا آخر مرہٹون کی کس سے پرہ سے کچھ نہ ہو سکا اور جم غفیر نے راہ فرار لی اس فتح نمایان سے احمد شاہ درانی و شجاع الدولہ بہادر کی خدمت انسب پذیر ہوئی بلکہ سلطنت کو کچھ استحکام ہو گیا۔ بعد اس ہنگامے کے بادشاہ سے رخصت ہو کر نواب مذکور اپنی دار الریاست صوبہ اودہ مین لوٹ آیا اور رعایت و داد گستری و معدلت پژوہی مین ہمعصران مین مشہور تھا یہ نواب نیک نہاد و دلیر و شجاعت مین اسم بامسمی تھا رفاہ خلائق مین حتی الوسع کوشش کرتا اور اس نواب کے عہد مین صوبہ اودہ بالکل خرخشے مخالفون سے پاک ہو گیا اور ریاست با استقلال سمجھی گئی اوس زمانے مین اقبال نواب سے

مرہٹون کی لڑائی اور ہنگامہ و سرکشی کی کیفیت دیگر سوانح مین مفصل تحریر ہے

اس صوبے کی حد زیادہ بڑھ گئی غرب اَودھ و شرق مین مرزاپور اور
الہ آباد کا صوبہ بھی شامل صوبۂ اودھ ہو گیا اس نواب کے عہد ریاست مین
چند لڑائیان و فتوحات تازہ بر روی کار آئی جس سے ریاست مین روز بروز
زوال و تنزل ہوتا گیا اور یہی سبب ہوا کہ ریاست جدید تھی جسقدر
محفوظ رہی غنیمت سمجھتے رہے لیکن اسمین شک نہین کہ یہ نواب دلیر و باہمت
اور اوس زمانے کا مدبر سمجھا گیا تھا

ریاستہای بندیل کھنڈ کی شورشین

اس صوبے کی چھوٹی چھوٹی ریاستین تھین زمانہ کا رنگ دیکھکر ہر ایک
رئیس خودسر ہو گیا سارے صوبے مین غدر ہو گیا اور بعضے بعضے رئیسونے
خود لشکر نواب شجاع الدولہ سے ہنگامہ کارزار گرم ہوا کہین سے فتح اور کہین
شکست ہوئی لیکن انتظام قرار واقعی نہو سکا اس لیے راجہ ہمت بہادر گوشائین
کو مع سرداران دیگر اصلاح بغاوت بندیل کھنڈ کیواسطے معین کیا بعد کشت
و خون بسیار نواب کی فوج کو ہزیمت ہوئی اور بہت سے سردار کام مین
آئے اور ہمت بہادر شکست کھا کر اودھ مین لوٹ آیا یہ معرکہ ۱۱۸۶ہجری
مین ہوا اور اس سے کسی قدر اقتدار نواب کا کم ہوتا گیا۔

+ یہ شخص مشہور رئیسون اور ارکان شاہی سے تھا۔

وقائع احمد خان بنگش فرخ آبادی و نواب شجاع الدّولہ

یہہ احمد خان وہی روہیلہ ہے جسنے نائب نواب صفدر جنگ کو تیغ
کرکے فرخ آباد مین اپنا عمل و تصرف کر لیا تہا جسکے استیصال کے واسطے
نواب صفدر جنگ نے بمعیت مرہٹون کے بہت سی کوششون کے
بعد کامیابی حاصل کی لیکن برای نام اطاعت قبول کرکے جہگڑا طی ہوا تہا
مگر درحقیقت وہ اپنی ریاست پر قابض تہا - زمانہ صفدر جنگ تا عہد
شجاع الدولہ رسم و راہ و اتحاد و اخلاص فیمابین سرکارین رہا جبکہ
نواب شجاع الدولہ سے بعضے بعضے سردار اوسکے سرکش ہوگئے تو ایک سردار
مسمی امراو گر گوسائین نواب سے منحرف ہوا احمد خان بنگش نے اوسی
سردار کو اپنے پاس جگہہ دی یہ بات نواب شجاع الدولہ بہادر کو ناگوار
گذری اونہونے امراو گر کے نکال دینے کو لکہا اوسنے درجواب اسکے
لکہا کہ وہ طلبیدہ نہین آیا اوسکا دینا خلاف مروت و محبت کے ہے
نواب شجاع الدولہ نے لشکر کشی کی اور قنوج مین فوج کا جماو ہوتا گیا اور قریب
کی سپاہ اور دوستون کی جمعیت سے دونون طرف کی جمعیت لاتعد تہی جا بجا
تہے کہ آتش ہنگامہ مشتعل ہوکر نواب نجیب* الدولہ بہادر شجاع الدولہ کے

* یہہ شخص مدبر شاہ دہلی تہا ـ

لشکر کا مدد معاون ہوا اور اس عزیمت جنگ اور حالت بیجا کو اسطرح فرو کردیا کہ اطاوہ فرخ آباد سے الگ سے ہوا دیا اور جو جو سردار افاغنہ رامپور وغیرہ سے واسطے کمک احمد خان بنگش کی آئی تھی لوگونکو اپنی اپنی ریاست پر رخصت کرادیا اور لشکر نواب شجاع الدولہ خیریت سے اپنی دارالریاست اودہ کو پہر آیا۔ ع رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت ایسے ایسے بہت سے ہنگامہ ہوسے اور کئی مرتبہ انگریزون سے بہی شکست پائی آخر کو حسب قرارداد چہ آمد نے انگریزون کو دیتے تہے اور باقی نواب صاحب کا حصہ تہا اور روہیلون سے بہی ہمیشہ تا خین حیات نواب صاحب کی نوک جہوک ہوتی رہی اور اکثر لڑائیون مین انگریزی سپاہ سنے مدد دی چنانچہ حافظ رحمت خان کی لڑائی مشہور ہے ۱۱۸۸ ہجری مین انگریزون کی مدد سے فتح پائی اور حافظ رحمت خان کا سر کاٹ گیا اور اوسی سال مین غازی الدین حیدر تولد ہوسے ۔

اس نواب سے کے عہد حکومت مین سپاہ کا انتظام اچہا نہ تہا اور سردار بہی بعض بعض بیدل ہو گئے مگر ما تحت شاہ دہلی کے سارے صوبو نمین مشہور تہا اور ہر ایک ارکین اور سردارون خود سرسے میل ملاپ بہی نہ ہا یوم مسند نشینی سے ایسے جہگڑے اور خرخشے رہے کہ ایکدن بہی آسایش نپائی انگریزون کے مددگار ہونے سے اودہ کی ریاست کمزور ہوتا گیا

بلکہ موروثی اور خود اختیاری ہوگئی اور دشمنان اندرونی و بیرونی سے نجات پائی سپاہ مین اکثر بہ سالار خواجہ سرا تہے کہان شجاعت کلاہ اور کہان فسری خواجہ سرا ؤنکی اور اوسی عہد سے عیاشی کی کثرت اس ریاست اور ارکان مین ہوتی گئی اخر زمانہ شجاع الدولہ مین اٹہارہ ہزار سوار بافسری شیخ احسان علیخان بہریچ و خواجہ اسد خان بخشی و یوسفی ان قندہاری آور کل آمدنی اس صوبے کی جب کسی وقت مین فرخ اباد بہی صوبہ اودہ سے شریک تہا دو کرور ستر لاکہ کی تہی جسمین تراسی لاکہ روپیہ بابت بہدستہ انہ کے سرکار انگریزی مین جاتا تہا - نواب شجاع الدولہ کے عہد ریاست تک بیچ محلے کا کرایہ شیخون کو دیا جاتا تہا شاید دو سو روپیہ مہینہ تہا ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین وفات پائی مدت ریاست ۱۹ سال راجہ بینی بہادر کار پرداز تہا اور بعدہ یحیی خان -

مدت ریاست نواب آصف الدولہ بہادر

۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین نواب آصف الدولہ فرزند شجاع الدولہ بہادر بعمر ۲۷ برس مقام فیض آباد مین ۲۷ برس کی عمر مین مسند نشین صوبہ اودہ ہوا قطعہ تاریخ جلوس گشت از پای آصف الدولہ رونق مسند وزارت ہند یہی نواب ہین جنکے عہد حکومت مین دار الحکومت لکہنو قرار دیا گیا فیاضی اس نواب کی مشہور و

نواب آصف الدولہ بہادر

ومعروف ہے جسکو دے مولا اوسکو دے آصف الدولہ اب تک لوگونکی
زبان پر جاری ہے نواب آصف الدولہ کی حکومت اطمینان کے ساتھہ کی
اور کوئی مخالف اونکا زبردست خلل انداز ریاست نہ تھا لکھنؤ کی آبادی اور فیاضی
وسخاوت زبان زد خلایق ہے عزل ونصب نائبون کا انگریزی کا اقتدار ہونا
بنارس وغیرہ کا ملک صاحبان انگریز کے قبض وتصرف مین آیا - امام باڑہ
رومی دروازے کی بنا سنہ ۱۱۹۹ ہجری مین دریای گومتی کا پل باندہنا سنہ ۱۲ھ
مین مرزا وزیر علیخان کی شادی کا ہونا یہ شادی اوس سج ملنے مین ایسی کی
کہ شاید ہندوستان مین کسی نے نہین کی ہو گی تفصیل اس اجمال کی یہہ ہے
کہ اگرچہ قبل از دار الحکومت ہونیکے لکھنؤ ایک وسط قصبہ شہر نما لیکن
نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت مین ازبس فیاضی وفیض رسانی کا آوازہ
بلند ہوا ہر ملک کے سوداگر عالم فاضل پیشہ ور امیدوار اس شہر مین
کثرت سے آنے جانے لگے جو کہ وہ زمانہ غدر تنزل وانقلاب خاندان
تیموریہ کا تہا روزگار ومعاش کی قلت سے ہندوستان مین سراسیمگی چہا گئی
تہی اور ادہر دکہن مین چڑہائی ہنگامہ مرہٹون اور ٹیپو سلطان کا تہا
راجستان مین ہلکر اور نواب ٹونک نے زلزلہ ڈال رکہا تہا پنجاب مین
سکہونکی شورشون سے تعصب مذہبی کا جوش تہا اس گہڑی اودہ مین
کچہہ عافیت اور امن تہی ادہر نواب آصف الدولہ کی فیاضی اور فیض رسانی

اور شہر کی آبادی اسقدر چیر ہی کہ اتنا بڑا شہر اب تک سے ہے کہ ہندوستان مین نظیر
نہین رکھتا - رومی دروازہ و امام باڑہ آصف الدولہ کا بنایا لائق دیکھنے اور تعریف
کے ہی جسکا ذکر خود تذکرہ تعمیرات پر آئیگا - پل اب تک یادگار ہے آصف الدولہ
کے زمانے مین سردار ہمت بہادر گوشائین کے حوالے میان دوآبہ کا ملک تھا
اسکی رانی اب تک بندرابن ضلع متھرا مین موجود ہے - اگرچہ آصف الدولہ کی
مسند نشینی کے ذریعے سے مختار الدولہ نائب تھا اور اس وجہ سے نہ خود نواب صاحب
کی نہ اور دیگر ارکان سلطنت کی وقعت اوسکے مزاج مین تہی آخر الامر ارکان سلطنت
باہم سازش کر کے سعادت علیخان کو مسند وزارت پر بٹھانا چاہتے تہے خصوص
بسنت علیخان کا دلی ارادہ یہی تھا کہ سعادت علیخان مسند وزارت پر بیٹھے
لیکن مختار الدولہ کے غرور و تکبر سے ہر ایک سردار ناراض تھا اور بسنت علیخان
تو دل اوس سے ناراض تھا آخر الامر قابو پا کر بسنت علیخان نے جبکہ لشکر
نواب آصف الدولہ کا اناوہ مین تھا مختار الدولہ کا کام تمام کیا اور ارادہ تھا کہ
او سید نواب آصف الدولہ بہادر کا بھی کام تمام کرے لیکن اتفاقاً ہواخواہون کے
خبر ملنے سے بچ گئے - نواب آصف الدولہ کہ اوس سے بدگمان تھا اوسکے
قتل کا حکم دیا راجہ نواز سنگہ نے فوراً ہاتھ صاف کیا اس مقام پر جہان بسنت
خواجہ سرا قتل کیا گیا سعادت علیخان بھی تہا اسلیے اوس سے بھی نواب آصف الدولہ بدگمان ہوے
اس وجہ سے سعادت علیخان عہد نواب ممدوح مین کبھی بنارس اور کبھی آگرہ

اور کبھی کلکتے مین رہتے تھے اوسی فکر مین ستے کہ موقع پاکر خود ہی وارث ریاست
ہو بیٹھیے لیکن نواب آصف الدولہ کی زندگی تک کوئی تدبیر مفید نہین ہوئی
بعد انتقال نواب ممدوح خان جہان آکر سے سعادت علیخان کا باپ با ہو الکھنؤ مین
پہونچا خلعت نیابت ملا لیکن زندگی نے وفا نکی سات دن کے بعد مر گیا پھر نیابت
کا مشورہ رہا ابو طالب خان لندنی اسمعیل بیگ خان اور مرزا جعفر یہ تین آدمی تجویز
ہوے تھے لیکن تقدیر کی کسکو خبر حیدر بیگ خان کہ نہایت افلاس نصیب تھا
متوقع نوکری سو پچاس روپے کا رزیڈنٹ صاحب بہادر کی خدمت مین
جایا کرتا تھا اونکی عنایت سے خلعت نائب حاصل ہوا اور خطاب اوسکا
نواب امیر الدولہ بہادر ہوا دیوانی کی خدمت راجہ ٹکیت رای کو مفوض ہوئی
اس شخص کا اقتدار اور نام ابتک مشہور ہے تالاب ٹکیت رای پر اب بھی
ہر سال میلہ ہوتا ہے اور جنرل مارٹین صاحب فرانسیس صاحب عمارت عجیبہ اور
رفیع رزیڈنٹ میجر پالمر صاحب کی تھی ایک نیکنامی اونکی مشہور ہے عہد آصفی
مین اونکا بھی مسکن لکھنؤ مین تھا امیر الدولہ سے بہت موافق تھے عہد و پیمان
معاملہ دوستی و اتحاد نے فیمابین مین استحکام پایا تھا اوسی وجہ سے عزل
و نصب رزیڈنٹ کا حسب استدعای امیر الدولہ ظہور مین آتا تھا اون دنون مین نائب
امیر الدولہ کا اقتدار فہرست و کارگزاری چمکی ہوئی تھی اگرچہ راجہ ٹکیت رای دانشمند تھے
لیکن ایک معاملہ خفیف مین دشمنون سے مل گئے اسی وجہ سے طبیعت نائب کا بھی جب

بہادر کی راجہ تکیت رائے سے بہی نظرون سے بہی گر کے خزانہ راجہ جہاؤ
کو سپرد ہوا اب نواب صاحب ممدوح نے پیش خود یہ تجویز فرمائی کہ راجہ جہاؤلال
کو بجائے امیر الدولہ نائب سرفراز الدولہ کا کیا جاے ہے لیکن بمقتضای عاقبت اندیشی
مصلحتاً سرفراز الدولہ کو اسبات پر کہا کہ آپ نیابت راجہ جہاؤلال کہ آدمی چالاک
ہے قبول نہ فرمائین انجام کو یہہ سارہ کچہ ہاتہ پاؤن نکالے لگا المختصر سرفراز الدولہ
کو یہہ مشورہ پسند آیا بے نائب کے کام کرنا گوارا نہ ہوا رفتہ رفتہ بواسطہ صاحب
ریذیڈنٹ کے بہر خلعت دیوانیکا راجہ تکیت رائے کو سرکار عالی سے دلوایا
چونکہ یہہ امر خلاف طبیعت نواب ممدوح کے تہا بعد ایک مہینے کے پہر معطل
کر دیا نواب ممدوح کے دل مین راجہ جہاؤلال کی کمال جگہہ تہی ۱۲۱۱ ہجری
مین لوگون نے وہ تدبیر نکالی کہ راجہ جہاؤلال کو کسی طرح یہان سے
نکالا جاے ہے کہ انکا اخراج و عزل باعث ممنونی راجہ تکیت رائے ہوگا یہانتک
عرق ریزیان اسبات مین کین کہ نواب گورنر جنرل بہادر لکہنؤ مین تشریف لائے
اور جہاؤلال کو آپ سے جدا کر کے عظیم آباد مین بہیجا لیکن اس امر کے ظہور سے
مزاج آصف الدولہ بہادر نہایت برہم اور مکدر ہوا اور یہہ بات تہیان پر لائے کہ
تغییر لباس کر کے واسطے زیارت کے اطراف کربلای معلی یا نجف اشرف کی چلا جاونگا
اور زمین و آسمان اپنے مقام سے گو ٹل جائین لیکن عہدہ نیابت کا حسن تعلق
اور تکیت رائے کو نہ دونگا آخرکار تجویز نیابت کی بنام الماس علیخان قرار پائی

اوسی زمانے مین گورنر جنرل لکھنؤ مین تشریف فرما تھے کا ور منعدگی کئی چیٹھی
ملاش فرماتے تھے کہ ایک چیٹھی نواب گورنر جنرل مارکوس کارنوالس بہادر
کی بمضمون جدم تفویض عہدہ نیابت الماس علیخان کو نکل آئی اس وجہ سے
وہ صورت جو کہ قرار پائی تھی بدل گئی تفضل حسین خان سے خلعت نیابت پایا تعجب
کرتے ہین کہ امیر الدولہ اس سرکار کا بڑا خیر خواہ تھا اتفاق کلکتہ جانیکا ہوا
اہالی گورنمنٹ نے حال سبب برہمی مزاج آصف الدولہ کا استفسار فرمایا امیر الدولہ
نے بیان کیا کہ آمدنی کی صورت قلت پر ہے اور خرچ بکثرت تیئیس لاکھ روپیہ
بابت جمعیت آپکے سرکار کو بھی دینا پڑتا ہے اور جو صاحبان انگریز بہادر نووارد
رونق افزاے لکھنؤ ہوتے ہین اونکی مہمانداری اور تواضع اور روشنی مین
لاکھون کا صرف ہوتا ہے اور انگریزی سوداگرون سے مال کا محصول نہین
لیا جاتا ہے ہزارونکا اسمین بھی نقصان ہوتا ہے اور سواے اسکے جو سوداگر
مال ولایتی لاتے ہین نوابصاحب سے یہ عرض کرتے ہین کہ یہ اشیاے
بے بہا خاص ولایت سے آپ ہی کیواسطے لائے ہین چارنا چار مول لینا پڑتا ہے
قیمت بھی انکی خاطر خواہ دینی پڑتی ہے المختصر جب تدنے سے دو آنے معاف
ہوے اور انگریزی سوداگرون سے محصول لینے کی اجازت ہوئی اور یہ
بھی حکم رزیڈنٹ کا نافذ ہوا کہ کوئی انگریز بدون واسطے رزیڈنٹ کے ملاقات
کو نواب آصف الدولہ کے پاس نہ جایا کرے چنانچہ امیر الدولہ نے اس بات کی

کامیابی کی عوض کلکتے مین ایسی افشانی کی کہ آج تک مشہور ہے اب حال راجہ

جہاؤلال کا سنیے کہ انکے جانے سے نواب آصف الدولہ بہادر کو کمال غم و رنج

پیدا ہوا یہانتک ضبط کیا کہ بیماریون نے ہجوم کیا اور وہ اسے انکار محض کی

کہتے ہین کہ راجہ جہاؤلال کے فراق مین ۲۴ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری مین جمعہ کے

دن انتقال کیا اور بہرات مکے گئے اپنے امام بارہ کلان مین کہ تعمیر فرمایا تہا دفن

ہوئے تاریخ وفات کلام ملا محمد ندیم اصفہانی استاد نواب وزیر علیخان سے

یہہ لوح مرقد پر کندہ تہی + گلشن عشرت بتاراج خزان رفت ای ندیم + شاہ استشمام

حسرت مینماید از نسیم + لکہنوئی آصفست و آسمان بی آفتاب + شہر نوبان بی مسیح

و طور سینا بی کلیم + وارد آصف عشرتی در صحن آصف باغ خلد - انبیا ہمدم سلیمان

ہمنشین آصف ندیم + نقد رحمت در کنار فرد بخشش در بغل + عاصیان را عنبر

غفاریست اعطای کریم + نقش بند کاف و نون بر تربت آصف نوشت

بہنا روح و ریحان و جنات نعیم

یہ نواب ۱۰ سال کئی مہینے کی عمر مین دنیا سے گذرے ۲۳ برس کئی

مہینے ریاست کی مدت ہوئی جناب مغفور و مبرور کا عدن مقام لقب تہا

امیر الدولہ حیدر بیگخان مختار الدولہ والیخ خان و سرفراز الدولہ حسن رضا خان و

تفضل حسین خان نائب رہے مہاراجہ تکیت رائے کو عہدہ دیوانی سپرد تہا

خطاب راجہ یہہ تہا معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج الدہراج بہادر مہاراجہ تکیت رائے

وزیر علیخان

منا جان

بہادر صلابت جنگ یہ نواب شاعر بھی ستھے آصف تخلص ہے رباعی یون ہے گر ذکر
دل مین تجھے ہو گئی ہے • پر شرط یہی کہ اودہر لگی ہے • ملنے نہ ملنے کا
تو وہ مختار آپ ہے • پر تجھکو چاہیے کہ تنگ دو لگی ہے

مرزا وزیر علیخان بہادر

بعد وفات نواب آصف الدولہ بہادر مرزا وزیر علیخان ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری
مین مسند نشین وزارت ہوئے خصلتیں ابن سعادتین زبون تہین تفضل حسین خان اور میان تحسین
علیخان وغیرہ کارندون سے صورت بگاڑ کی پیدا ہوئی یہ لوگ اپنی حفظ جان
اور آبرو کیواسطے دشمن وزیر علیخان کے بن گئے اودہر نواب سعادت علیخان
سے صاحبان صدر سے اقرار فرمایا تھا کہ بعد وفات نواب آصف الدولہ کے
مسند وزارت تمہارے نامزد ہوگی ادہر اراکین وزارت مرزا وزیر علیخان کے
دشمن ہی ستھے در پے تخریب ہوے صورت ابطال فرزندی کی تجویز
نکالی یعنی محضر بمواہیر بہو بیگم و ارکان دولت و افسران فوج وغیرہ اس مضمون کا
تیار کروایا کہ مرزا وزیر علیخان فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کا نہین ہے آخر کار
سر جان شور صاحب نے حسب قاعدہ اونکو کوٹھی بیبا پور مین دربار عام کرکے
نظر بند کیا اور چند روز کے بعد اپنی ذاتی نقد و جنس کے ساتھ بنارس کو روانہ
کیے گئے وہان مطلق العنان ہوے تین لاکھ روپیہ اسی سرکار سے اونکے معاش

کے لیے مقرر ہوا لیکن ذاتی شرارت اور جبلی فتنہ انگیزی سے راجہ چلی بہادر
رئیس منڈیل کنندہ اور گوشائین ہمت بہادر اور سرکار سیندھیا وغیرہ سے
نوشتہ وخواند رکھتا تھا اس سے اوسے کلکتے جانیکا حکم ہوا ایک دن کا ذکر ہے
کہ چیری صاحب کہ وہان کا بڑا صاحب تھا اوس سے باتون باتون مین چل گئی جانسے
ہلاک کیا جب تک سپاہ انگریزی اوسکا محاصرہ کرے بہاگا انگریزی فوج نے
اوسکا تعاقب کیا بعد سرگردانی اور پریشانی بسیار والی جیپور کا پناہ گزین ہوا
اوسنے مصلحت وقت اور دبدبے سرکار انگریزی سے مخوف ہوکر حوالے
کردیا وہان سے بحراست سرکار انگریزی کلکتے مین گیا قید مین مرگیا وہین دفن
ہوا اور اوس وقت سے زیادہ تر اقتدار سرکار ہوگیا القصہ مرزا وزیر علیخان
کو کچھ لطف مسند نشینی وزارت کا اس کشمکش مین حاصل نہوا اور نہ رعایا
کو کچھ کیفیت اونکی عدالت اور سخاوت وغیرہ کی کھلی سچ ہے جاکر بدل
دشمن جان ہوتا ہے اگر اراکین مرزا وزیر علیخان سے نہ پھر جاتے
تو یہ صورت ظہور مین نہ آتی یہ شخص اپنے عہد وزارت مین جواہرات بیجا
لکھوکہا روپیہ کا پیش از گرفتاری کوٹھون سے نکال کر ساتھ لے گیا
تھا کارپردازون نے بہو بیگم سے اس معاملے کا اظہار کیا انہون
نے یہ جواب دیا کہ وہ جو کچھ اسباب نقد وجنس وغیرہ ہمراہ
اپنے یہان سے لے گیا ہے سب ہمنے اوسکو معاف کیا فقط

نواب سعادت علیخان بہادر

ریاست نواب سعادت علیخان بہادر

جب یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علیخان بہادر مبارز جنگ
لکھنؤ سے رونق بخش بنارس ہوئے اور وہان بطرح اقامت کی بموجب
حکم آصف الدولہ بہادر کے وہ تین لاکھ روپئے سالیانہ واسطے خرچ کے
اس سرکار سے پاتے تھے لیکن سحبان زمان اور ارسطو روزگار تھے
اپنی فکر سے ایکدم غافل نہ تھے کلکتے مین جاکر صاحبان کونسل سے
دعویدار ریاست آبائی کے ہوئے اونھون نے بھی انکے دعوی کو
تسلیم کیا اور امیدوار وقت معاملہ کا رکھا آخر نواب سعادت علیخان
نظر بفضل الہی کرکے کلکتے سے پھر آئے ایام شماری مین عمر بسر
کرتے تھے رفتہ رفتہ اوس دن کی نوبت پونہچی کہ جسکی تمنا مین
جیتے تھے یعنی بعد ایک مدت کے خبر وفات آصف الدولہ اور مسند نشینی
وزیر علیخان کی مسند وزارت پر سُنی نہایت ملال ہوا اوسی بیتابی مین
بجرے پر سوار ہوکر پھر کلکتے کو روانہ ہوئے ابھی نواب صاحب
راج محل تک پونہچے تھے کہ تحریر تفضل حسین خان کی بنام مولوی علیخان
اس مضمون کی پونہچی کہ نواب بہادر یہان تشریف لائین کام دشمن کا
تمام ہوا یہ سنتے ہی نواب سعادت علیخان اولٹے قدمون راج محل سے
پھرے اور ہوا کے مانند کانپور مین ہوتے ہوئے بہار چہ شب کہ وزیر علیخان

گرفتار ہوئے اوسکے دوسرے دن صبح کو یکم جنوری ۱۷۹۸ء مطابق سوم ماہ شعبان ۱۲۱۲ ہجری بسنت کے دن بڑے تجمل و شان سے نواب سعادت علیخان داخل لکھنؤ ہوئے پہلے دولتخانے مین تشریف لائے بہو بیگم صاحبہ کو نذر دی پھر مسند وزارت پر بآئین ترزی بٹھائے گئے تاریخ تشریف آوری بنارس سے لکھنؤ مین اور تاریخ جلوس مسند وزارتکی یہ ہے

بنارس سے آنا لکھنؤ مین

از بلدۂ بنارس با جاہ و کامرانی	در لکھنؤ چو با اوج وزارت آمد
تاریخ مقدمش را جستم ز پیر دانش	گفتا بگو سعادت با صد سعادت آمد

جلوس فرمانا مسند وزارت پر

خداوند امین الدولہ در دہر	حکومت را صد و بیسال باشد
خرد سال جلوس مسندش گفت	بجاہ و حشمت و اقبال باشد

صورت تقسیم ملک اودھ کہ انگریزون کو حسب اقرار نواب سعادت علیخان نے مسند آرا ہونے کے بعد دیا اسطرح ہے

اول تفصیل ملک کہ انگریزونکو تقسیم مین ملا

فرخ آباد	محالات ریہڑ	چکلہ کوڑہ و کڑہ اٹاوہ	کہیرا گڈہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
اعظم گڈہ و چیان	تبہول	گورکہپور	صوبہ الہ آباد
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

مگر دوست دشمن کا خیال مکنون خاطر عالی تھا زبان پر نہین لاتے تھے
کہ ایسا نہو وزیر علیخان کا سا معاملہ پیش آئے فراست اور دانائی مین ارسطوی
وقت تھے نواب سعادت خان سے واجد علی شاہ تک ایسا بیدار مغز
عالی فہم عقیل کوئی صاحب مسند و تخت نہین ہوا جب سب طرف سے
طبیعت اونکی مطمئن ہوئے تفضل حسین خان کو بعہدہ وکالت کلکتہ ٹالا
اور اس انداز سے نکھرا اون کو جنسے دل کھٹکتا تھا آہستہ آہستہ سزا کو
پہونچایا نواب نصیر الدولہ بہادر جو ملقب بہ محمد علی شاہ ہوئے اور نواب
شمس الدولہ بہادر مرشدزادے کام نیابت کا کرتے تھے امیر الدولہ
بشراکت راجہ تکیت رای کار سرکار کو انتظام دیتے تھے اور نواب
سرفراز الدولہ برائے نام شریک ہوتے تھے خطاب ناظم الملک کہ
مہر مین کندہ تھا وہ بموجب حکم حضور پرنور بافتخار الملک مبدل ہوا اراے
رتن چند کہ ملازم قدیم تھا صورت انصرام جملہ امور کی اوسکے تعلق تھی
اوسی آدھے ملک سے جو انگریزون کو دیا تھا یہ صورت قرار پائی

شاہزادہ ہای دہلی مقیم بنارس کی تنخواہ	حافظ رحمت خان کی اولاد کا سالیانہ	نواب نصر جنگ احمد خان بنگش کی اولاد	معافیداران جاگیرداران و روزینہ داران
[illegible]	لک	[illegible] لک	لک
جاگیر نواب امین الدولہ	جاگیر الماس علیخان	جاگیر تفضل حسین خان	آیمہ اختر علیخان وغیرہ کی جاگیرین مقرر ہوئین
[illegible]	[illegible]	[illegible]	

انکے عہد مین پرچون کی دھوم تھی ہرکارون کو حکم ناطق تھا کہ وہ ہر بزم مین جاکر خبر زبانی عرض کرتے تھے دن رات مین اختیار تھا جب چاہین سوتے جا گتے مین عرض کرین انکے زمانے مین ہرکارہ اخبار کے بڑے کارخانے تھے رای رتن چند اخبار نویس تھا بلا کا آدمی تھا ارکان دولت کم عزرائیل سے نہین جانتے تھے بظاہر باب شوت بند تھا دستخط نواب سعادت علیخان کے مشہور ہین جب نواب نے اپنے عہد وزارت مین عدالتین مقرر فرمائین عدل و انصاف نے رونق پائی ایک دن پرچہ کچہری عدالت کا ملاحظۂ عالی مین گذرا دستخط اوسکے یہ ہین کہ فلان صاحب عدالت مثل ماکیان بچہ دارست خود نمیخورد بچگان را میخوراند تمام کاروبار وزارت کے پرچہ ہای اخبار پر تھا کیا مجال تھی ہرکارہ یا اخبار نویس کچہ خبر خلاف تحریر کرتا اگر کوئی بات خلاف ظہور مین آتی تھی سزا پاتے تھے عمارات عالی بھی اس شہر مین بہت تعمیر فرمائے ہین کہ باعث آرایش و رونق لکھنو اب تک ہین تفصیل اوسکی مکانو نکے ساتھ لکھی جاویگی ایک روایت تازہ یہ ہی کہ نواب سعادت علیخان کو تقسیم کردینا ملک کا نہایت ناگوار و شاق ہوا لیکن کیا کرین فکر اسکی ہر طرح سوہان روح تھی اسی تصور مین سے تھے بدون زور بشمشیر تدبیر وہ ملک اپنے قبضے مین آئے بہت سی خاک اوڑائی اور عرق ریزیان عمل مین

آئین یہان تک کہ وکیل لندن کو روانہ کیا اور درخواست مستاجری عام قلمرو
سرکار کی مانند سرکار کمپنی انگریز بہادر کے گذرانی اور سوال جواب نے رونق
پائی یعنی بادشاہ لندن نے درخواست نواب ممدوح کی قبول فرمائی سماعی
ہے کہ یہ شرط اوس اقبال مین لگی تھی کہ اٹھارہ کرور روپیہ پیشگی اگر داخل سرکار
فیض آثار ہوگا یہ صورت ظہور مین آئیگی ۔ نواب سعادت علیخان نے جو
ان دستخطون کی خبر پائی بہت متفکر ہوے کہ اسقدر زر کثیر خزانے مین
نہین اور اجتماع اوسکا سر دست دشوار کمال لیکن مرد صاحب ہمت و
تدبیر تھے درپی تدبیر فراہمی زر سے ہے جسطرح ہوسکا بہزار تدبیر سترہ کرور
روپیہ سترہ برس کی مدت مین جمع کیا تھا فقط ایک کرور کی تدبیر باقی
تھی وہ بھی قریب ممکن تھی مگر طالع سرکار کمپنی کا یاور تھا جس سے تدبیر اور
کوشش نواب کی مراد پر نہ پہونچی کہ یہ روایت ہے لیکن یہ نواب بڑا
اولوالعزم اور صاحب ہمت و منتظم تھا دوسری یہ بات مشہور ہے کہ
نواب سعادت علیخان بیماری سرطان مین مبتلا ہوئے مصلحتاً تبدیل
مکان کے واسطے ایک کوٹھی جنرل مارٹین صاحب سے مول لیکر دولتخانے
سے اوٹھہ آئے اور شفا پائی نام اوس کوٹھی کا فرح بخش قرار پایا اسیطرح
ایک مدت گذری اتفاقاً گورنر ولیزلی صاحب کہ نواب سعادت علیخان کے
دوست و مصاحب خاص تھے رخصت لیکر ولایت کو گئے یہ بات

اونکو بدل منظور تھی کہ کوئی ایسی بات مجھے بہتر ظہور مین آسکے کہ مقدمات
نوابصاحب درست ہوجاوین اسی خیال وفکر مین تھے کہ یہ بات تازہ
ہاتہ آگئی کہ لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر بادشاہ وقت یعنی جارج چہارم کا بڑا
رفیق ہی آج کل بوجہ بے زری کے تمام املاک اوسکی بیع ہوگئی ہے
اگر اسوقت مین نواب سعادت علیخان اونکے ساتہ کوئی سلوک نمایان
فرماوین خالی مطلب سے نہوگا چنانچہ اس معاملہ سے نواب صاحب کو
آگاہ کیا اونھون نے بھی اونکی تحریر پر عمل کیا تحفہ اور تحائف سب بہا
سے باحسن الوجوہ لارڈ صاحب بہادر سے مسلوک ہوئے کہ اونکو
نواب پر نظر عنایت ہوئی اتفاقاً صاحب ممدوح گورنر کلکتہ کے ہوئے
اور براہ رسم محبت کے نواب سعادت علیخان بہادر کو بواسطہ تحریر فرمایا
کہ ہم ہندوستان مین اسی واسطے آئے ہین کہ تمہارے مقدمون کو
بخوبی درست کرین بمقام شکر اور خوشی کا ہی نواب ممدوح اس مضمون سے
بہت محظوظ ہوئے سمجھے کہ اب مدعای دلی بخوبی کرسی نشین ہوا لیکن
شدنی سب پر افضل ہی اکثر صحبت خاص مین یہ سخن زبان پر عالم خوشی مین
آجاتے تھے کہ گورنر جنرل بہادر انشاء اللہ قریب تشریف لاتے ہین
حوصلۂ دل بخوبی اونکی عنایت سے نکل جائیگا اور نمک حرامون کو
سزا دیجائیگی کہ بہت یاد کرینگے جن لوگون کو خوف سزا تھا دلون مین

کھلنے کہ اب آفت سر پر آئی نواب ممدوح کے دشمن جان ہو گئے

ایکدن نواب صاحب تھوڑے مصاحبوں کے ساتھ سواری نالکی بجانب

دروازہ دلکشا تک ٹہلنے چلے گئے جا کر دولتخانے مین پھر آئے پہر رات

گذرے تک بخوبی عیش و عشرت کا جلسہ گرم رہا ناچ رنگ مین مصروف

تھے جواہر علیخان خواجہ سرا یا رمضان علیخان اپنے سامنے کے ہاتھ

سے گوشت کی یخنی معمولی پی کر پلنگ پر آرام فرمایا ہنوز آنکھ خواب سے

آشنا نہولی تھی کہ یکبار کچھ چونک اوٹھے تین بار حضرت عباس علمدار کا

نام زبان مبارک پر آیا اور ایک بڑے مرزا یعنی غازی الدین حیدر کو

بھی پکارا بہر صورت حالت غیر تھی وہ یخنی سم [illegible] کام تمام کر گئی

اسمین روایتین بہت کچھ ہین مصلحت وقت سے زبان قلم پر نہین

آسکتین واللہ اعلم بالصواب ۲۳ ماہ رجب سنہ ۱۲[illegible] ہجری مطابق

سنہ ۱۸[illegible]ء کو منگل کے دن پہر رات گئے چراغ حیات کا گل ہوا ۴۳ برس

[illegible] مہینے کی عمر تھی اور مکانمین خلف ارشد اپنے کے دفن ہوئے

جنت آرامگاہ اوس دن سے لقب ہوا

قطعۂ تاریخ وفات جنت آرامگاہ

[illegible] رحلت ازین عالم نمود	زینت افزا شد بفردوس برین
[illegible] شنیدم سال تاریخش زغیب	آہ شد گنج سعادت در زمین

غازی الدین حیدر بادشاہ

بعد وفات کے کئی برس تین مہینے تک نیابت رہا صاحبان رزیڈنٹ اودہ
میں یہ تھے بیلی صاحب بہادر کرنیل ولیم اسکاٹ صاحب بہادر
کرنیل کالنس صاحب بہادر کرنیل جان بیلی صاحب بہادر اور نواب
شمس الدولہ نائب اور نواب نصیر الدولہ یعنی محمد علیشاہ دیوان سے تھے
۲۴ پلٹن اور پانچ ہزار سوار بعد برطرفی ملازم سے تھے مدت ریاست کی ۱۷ سال
۹ مہینے فقط

تاریخ وفات راجہ ٹکیت رای

راجہ ٹکیت رای سخاپیشہ زمان	چون جان پاک خود بجہان آفرین سپرد
رفتم بفکر ازپی تاریخ سال او	آمد ندا ز غیب کہ فیاض عہد مرد

حال ریاست نواب غازی الدین حیدر

جب نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ ہوے نواب عنان علیخان
نے کرنیل جان بیلی صاحب بہادر کو اس سانحے سے آگاہ کیا
اونہون نے حسب ضابطہ شتر سوار بھیجکر بندیابون سے پلٹن واسطے
بندوبست کے طلب کین اور مرزا جعفر اور مرزا حاجی کو بلایا اور آپ
مع ڈاکتر ڈبلس صاحب اور کپتان فارخن صاحب کو ہمراہ لیکر نوابصاحب
کے مکان مین تشریف لائے اور جابجا پہرے واسطے حفاظت
کے مقرر کیے اور حکم دیا کہ کوئی بدون اجازت کے قدیم اندر مکان کے

رکھنے پائے محمد غلام عباس نے یہ خبر نواب غازی الدین حیدر کو پہونچادی
وہ بلباس فاخرہ ولایتی کمر مین لگائے نواب خاص محل کے مکان سے
بارہ دری مین داخل ہوئے آغا میر بھی کسیطرف سے راہ پیدا کر کے
پہونچا کرنیل صاحب بہادر نواب سعادت علیخان کے سربالین آ بیٹھے
دوشالہ کہ اوپر پڑا تھا اوٹھایا اور ڈلس صاحب نے واسطے رفع شک
دونون کنپٹیون مین نشتر دیا ایک طرف سے تھوڑا خون اور دوسری
جانب سے اندر کے چربی نکلی یہان کیا تھا باتی طبیعت مطمئن ہوئی
گفتگو رئیس بنانے کے باب مین ہوئی شمس الدولہ کا بھی نام آیا تھا
لیکن غازی الدین حیدر بہادر کا طالع زور پر تھا ۴۵ برس کی عمر مین کرنیل
بیلی صاحب بہادر اونکو کمرۂ فرح بخش مین لائے اور مسند وزارت پر
حسب آئین بٹھا کر حکم شلک کا دیا ارکان دولت نے نذرین گذرانین

تاریخ وزارت

وزیر غازی دوران و رستم آفاق ‏ ‏ رہی جلوس وزارت نمود با دل شاد
ندا رسید ز ہاتف بمن کہ تاریخش ‏ ‏ بگو سعید تو دائما وزارت باد

مرزا جعفر و مرزا حاجی کا بھی زور رہا اب آغا میر کی نیابت اوس عہد کی مشہور ہے
آغا میر نواب غازی الدین حیدر خان بہادر کے خواصون مین منسلک تھا
رفتہ رفتہ قسمت نے صورت ترقی کی دکھائی کار و بار خانگی متعلق ہوا

طبیعت چالاک تھی رنگ زمانے کا دیکھکر منشی علی نقی خان منشی رزیڈنٹ
بہادر سے رسم اتحاد بڑھائی یہان تک کہ اونکو اپنا پدر خواندہ کیا اس
درمیان مین لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر بھی لکھنو مین تشریف لائے
وفات سعادت علیخان سے نہایت ملول تھے اور کمال افسوس
فرماتے تھے اور ایسی مرضی مبارک معلوم ہوئی کہ درستی مقدمات کی
حسب نخواستہ نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کی منظور تھی تو بیب
تھا کہ صورت دلخواہ غازی الدین حیدر بہادر کی ظہور مین آئے لیکن آغا میر
نے بطمع نیابت نواب غازی الدین حیدر کو اس وادی مین نہ آنے دیا
بلکہ یہ بات بریکس ذہن نشین کی کہ ایسا نہو کہ یہ ریاست طرف شمس الدولہ کے
منتقل ہوجاسے جو حق نمک تھا وہ ادا کیا آیندہ نواب صاحب بہادر کو
اختیار ہی انکو وجہ جو نواب سعادت علیخان کو تھا کہان تھا ا
دام فریب مین آ گئے اقرار نامہ جدید پیش کر کے کرنیل بیلی صاحب رزیڈنٹ
دستخط کر دیے دوسرے دن خلعت نیابت آغا میر کو نصیب ہوا اور
معتمدالدولہ خطاب پایا مرزا حاجی کی صحبت برہم ہوئی گھر بیٹھے منتظم الدولہ
حکیم مہدی علیخان منتظم خیرآباد ہوے نو مہینے کے بعد معتمدالدولہ ساتھ
نصیرالدین حیدر کے لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر کی ملاقات کو گیا تھا
اونیر سب حال روشن تھا معتوب ہوا بلکہ اجد معاودت فرخ آباد سے

گرفتاری معتمد الدولہ کی ظہور مین آئی استنے دنون کے بیچ مین مرزا جعفر مر گئے

قطعہ

میرزا جعفر کہ دایم از امام جعفرش	حب دردل بود این بہر دو عالم ظاہر است
بہر تاریخ وفاتش چون تامل شد مرا	آمد از ہاتف ندا جعفر بنزد جعفر است

نواب غازی الدین حیدر خان بہادر نے پھر نظر مہربانی مرزا حاجی کو بلا کر اپنا مقرب بنایا اور محمد آفرین علیخان خواجہ سرا کا بھی اس زمانے مین ستارہ چمکا بڑا دور رہا میر خدا بخش انکا کارندہ تھا اوسنے کربلا بنائی بہت مشہور ہے۔

قطعہ

در ایام غازی دستور مسند	کہ ہم نام حیدر بجود و عطا است
زہی رکن اقبال او ناظر ست	جہان آفرین خوان او بد اما است
ز دربار او سید باوفا	خدا بخش ہاشم بفضل خدا است
بنا کرد چون کربلا کربلا	بچشم جہان خاک او طوطیا است
زروی بشارت خرد سال او	بگفتا کہ این نقشہ کربلا است

القصہ مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان یہ دونون نواب غازی الدین حیدر کے مشیر ہوے کچھ دنون محبت نے رنگ کھایا چین سے گذری باہم شیر و شکر سے تھے یکایک بچہ فلک نے کروٹ لی نواب ممدوح نے

معتمد الدولہ کو بھی خلعت نیابت سے سرفراز فرمایا مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان خانہ نشین ہوے بعد کچھ زمانے کے محمد آفرین علیخان مر گئے تاریخ انکی وفات کی زیب قلم ہوتی ہے۔

قطعہ

چون محمد آفرین رحلت ازین عالم نمود	مدفن او شد بخاک آستان شاہ زمن
چون شنیدم نکتہ سال تاریخ وفات	ہاتفی گفتا کہ ہی ہی کرد رحلت آفرین ۱۲۳۴

میر خدا بخش کو معتمد الدولہ نے قید کیا بیچارے نے بڑی مصیبتیں اوٹھائیں مرزا حاجی جو بیقید ستھے مع گھر بار کانپور کو نکالے گئے۔

تاریخ

میرزا حاجی کہ آن از سالہا در قید بود	ناگہان او را برون از شہر کردہ این فلک
سال حال سر آمد بشتش چون ز ہاتف جستم	گفت مرزا حاجی بیچارہ رفتہ یک بیک

بسکہ مرکوز خاطر سرکار نہ تھا اور گورنر جنرل کو بھی منظور تھا کہ اودہ کی ریاست آباد و شاد ہو اسواسطے ارکان دولت انگلشیہ نے نواب غازی الدین حیدر کو تاریخ ۵ ماہ ذیحجہ ۱۲۳۴ ہجری مطابق ۱۸۱۹ء تخت شاہی پر جلوہ افروز کیا بخطاب شاہ زمن شہرت پائی۔ تاریخ یہ ہے

بحمد اللہ کہ با اقبال و دانش	بہ تخت شہ جلوس شاہ گردید
زمین و آسمان یکسر بعیش ست	زماہی حسن می تا ماہ گردید

مبارک باد ای آفاق و عالم	طلوع آفتاب جاه گردید
آمد بگوشم زود یارب	اکہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید

اور سکہ اونکا یہ جاری ہوا

زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

نواب معتمد الدولہ کا خطاب وزیر اعظم ہوا تاریخ وزارت یہ ہے

ان شاہ زمن صاحب جود و احسان	شد جلوہ گر اورنگ مرصع جایش
وزند فہ وزیر اعظمش تسنیم خنک	کو ہست بے شمار فراست فارس
بنصفت شاہ شد قوی ہر شلہ یم	وزی جبہ وزیر شد غنی ہر مفلس
سا زو قدم شاہ خزف را یا قوت	وز خاک در وزیر زر گردد مس
ریخ سعید کرد نا سخ تحریر	شاہ اسکندر وزیر ارسطا طالس

۱۲۳۸ھ

لم اقتدار وزارت بڑھا اپنے پرائے حساد اور احدا کو دشمن سمجھنے لگا اکثر شخاص منجانان کو کانپور پہنچایا کہ ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ ر شاہ بیگم اور ولیعہد کے بیچ میں بڑے بڑے فساد اٹھا لے میر فضل علی اروغہ اور فیض النسا مغلانی کو سرکار پادشاہ بیگم سے نکلوایا بڑے ظلم و ستم ور مین آئے نوبت کشت و خون کی پہونچی تھی کہ صاحب ریذیڈنٹ بہادر اسطہ امن کے ہوسے ان کو فتح آباد میں پہونچایا وہان جا کر منتظم الدولہ سے سررابطہ اتحاد کا پیدا کیا درمیان بادشاہ بیگم اور ولیعہد بہادر کے

وہ آتش افروزیاں کین کہ جسکا بجھانا آب تدبیر سے دشوار تر تھا بنا عاجن جب
پیدا ہوے دھوبن کے شکم سے قرار دیا پادشاہ کے کئی بھائی اسکے
ہاتہ سے غریب الوطن ہوگئے بہت شہر مین نظر بند رہے اور یہ بھی بیان
اوسکا ہی کہ معتمد الدولہ لیاقت اور مروت اور اور صفتون مین بی نظیر تھا
مگر ہر کسی کو اپنی اپنی زندگی اسکے وقت مین دو بھر تھی غریبون پر جور تعدی
اسکے ظلم و ستم کرتے تھے وہ کسی کی فریاد نہین سنتا تھا مکانات
رعایا کے بجبر چھین لینا ایک بات تھی اور اسنے زمین جبریہ پر بڑے بڑے
وسیع وسیع مکان بنواے مگر رہنا بھی نصیب نہوا غرض اس نایب کی
بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کی تعریف ہی لیکن سلوک اسکا چہ عام و چہ خاص
اچھا تھا اسکے عہد عنایت مین زمانہ اچھا عیش دوست رہا لکھنو مین
آبادی ہوتی گئی اور یہ شخص شعرا کا دوست تھا اب اسکے خاندان سے
کانپور مین کئی بیبیں موجود اور وثیقہ دار سرکار ہین۔

تفضل حسین کہ بعہدۂ وکالت کلکتے مین تھا متوفی ہوا لیکن معتمد الدولہ
نے پھر عرق ریزی کرکے محمد خلیل الدین خان کو کہ مقبول سرکار مین تھا
وکیل کرلیا تقریباً کروڑ روپیہ سرکار شاہی کا سرکار کمپنی انگریز بہادر مین بمنافع
فی ہزار پانچ روپیہ داخل کرکے وثیقہ کرالیا جسکا سود اسی سال سے
حسب تفصیل ذیل وثیقہ جاری ہوا۔

نواب مبارک محل — سلطان مریم بیگم — ممتاز محل — سرفراز محل

ملازمان متعلقان مع اسامیہا نواب محل — خرچ امام باڑہ نجف اشرف — نواب بیگم زوجہ معتمد الدولا — امین الدولہ

معتمد الدولہ وزیر اعظم — زینت بیگم و عالیہ بیگم دختران معتمد الدولہ — نامعلوم

یہ پادشاہ بھی بہت نیک نیت تھا عادل ورزعیت اور سخی کمال تھے
نظم و نسق سلطنت عام تعلق معتمد الدولہ کے تھا جو روپیہ کہ نواب سعادت علی
جنت آرامگاہ سے خون جگر کھا کھا کر ذخیرہ بیرون سے جمع کیا تھا نصف
بھی زیادہ صرف عمارات شاہی مین در آیا اور ناچ رنگ تماشا مین کوڑیون
کیطرح خرچ ہوا یہ کلام سعدی کا سچ ہے ہرکہ آمد عمارت نو ساخت رفت و منزل
بدیگرے پرداخت ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ ہجری مطابق اوداکتوبر ۱۸۲۶
۵۶ برس کی عمر مین بعارضہ اسہال خونی محل مین وفات پائی امام باڑہ
نجف اشرف مین کہ لب دریا بنوایا تھا دفن ہوئے لقب خلد مکان ہوا

تاریخ وفات کی شیخ ناسخ کہتے ہے

از وفات جناب شاہ زمن	گو ہمہ عالمی ہلاک شدہ
دہر گردید بہر ما دوزخ	بہ بہشت آن جناب پاک شدہ

نصیرالدین حیدر بادشاہ

دیدہ ہا شد بہ آتش نمناک	سینہ ہا آہ دردناک شدہ
رفت داماں صبر از دستم	جیب صبر و شکیب چاک شدہ
گشت تاریخ مصرعہ استاد	ای بسا آئنہ رو کہ خاک شدہ

١٢٤٣ھ

کرنیل جان بیلی صاحب استریچی صاحب جنرل ریپر صاحب مین صاحب مازونٹ ریکٹس صاحب اس عہد مین رزیڈنٹ رہے معتمد الدولہ نائب سردار قمر الدین احمد خان مرزا حاجی محمد آفرین کارپرداز تھے اسوقت مین سات ہزار سوار اور اکتالیس پلٹن تھیں ملک کی آمدنی ایک کروڑ اسی لاکھ مدت سلطنت قریب ١٥ برس کے

بیان ریاست نصیر الدین حیدر بادشاہ

بعد خلد مکان کے ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بہ پچیس برس کے سن مین ٢٧ ربیع الاول ١٢٤٣ھ ہجری دیوالی کے دن شمع افروز کاشانہ تخت سلطنت ہوئے تاریخ اونکے جلوس کی یہ ہے۔

قطعہ

بر تو ای پادشہ فیض رسان عالم	تخت این مملکت ہند مبارک باشد
سال تاریخ جلوس طرب افزا بشنو	جاودان سلطنت ہند مبارک باشد

١٢٤٣ھ

اس بادشاہ کے دو سکے جاری ہوئے پہلا سکہ یہ ہے۔

سپہر مرتبہ شاہ جہان سلیمان جاہ	بہ ہر سکہ شاہی زدہ ز لطف الٰہ

بعد چند روز کے یہ سکہ یون بدلا گیا

سکہ زد بر سیم و زر از فضل حق ظل اللہ	نائب مہدی نصیر الدین حیدر بادشاہ

اب تک اس سلطنت مین معتمد الدولہ وزیر تھے فقیر محمد خان اور سید و خان وغیرہم رسالدار مع افسران سوار و پیادہ اس نائب کے مطیع و فرمان بردار تھے رسالہ فقیر محمد خان مین ایک ہزار آٹھ سو سوار اور رسالہ سید و خان مین ایک ہزار سات سو سوار تھے اور افسران پیادہ سوای انکے سبحان علیخان قوم کنبوہ سا مشیر تھا بڑا صاحب عقل و نیک تدبیر تھا تاج الدین حسین خان کنبوہ عمدۂ سفارت پر مامور تھا ہر ایک اپنے وقت کا ارسطو تھا لیکن بادشاہ حرکات معتمد الدولہ سے کھٹکتے تھے اسقدر قدرت بخیال برپا ہونے فتنہ و فساد فوج کے حاصل نہ تھی کہ معتمد الدولہ پر دفعۃً ہاتھ صاف کرین ہر چند ذکی و عاقل تھے بھائی آغا بھائی آغا ہر وقت زبان پر جاری تھا مگر دل مین دشمن خاندان اپنا تصور کرتے تھے ظاہر مین وزیر بروز صورتین ترقی کی نظر مین آتی تھین ایک دن پچاس ہزار روپے نقد گشت خزانہ سلطانی سے بحکم بادشاہ معتمد الدولہ کو ملا سبحان علیخان نے کہ مرد کنبوہ اور عاقبت اندیش مشیر او سکا تھا مزاج مین بہر حال دخل تھا معتمد الدولہ سے بخیال دور اندیشی یہ بات بیان کی کہ نواب صاحب یہ عنایات شاہی خالی علت سے نہین کچھ دال مین کالا ہے باعث تباہی کی ہوگی خبر شرط ہی

آپ دانا ہیں عالم عیاری سے دوسد ہیے گا قریب ہی کہ کوئی گل تازہ کھلے
ایسا نہو کہ ان روپیوں کے لینے کے عوض دینے پڑ جائیں وہ لڑکا
قیامت کا ہی مجکو اوسکا کلام یاد ہی کہ ایکدن کہتا تھا کہ وزیر علیخان سے کچھ
کرتے نبن پڑا بہت جلدی گزرا آغا میر نے فی الفور اوسکے بکشادہ پیشانی
یہ کہا کہ تم عبارت کا لکھنا خوب جانتے ہو اس مضمون سے خبر نہیں ہم
خوب اس مطلب کو سمجھتے ہیں بادشاہ کی اگر تدبیر اور چال چل گئی نوبت آ
حساب کی آوے گی اسکے سدباب میں یہ روپیہ صرف کرونگا جہان
کروڑونکا محاسبہ میرے ذمہ ہوگا یہ کون بگران ہی کہ نہ اوٹھے گا اور
اگر یہ گمان تمہارا ٹھیک ہی نہ آیا در اصل بخوشی عنایات سلطانی سے
سرفراز ہوا ہون شیرباد رہی فکر بے سود سے دل کو پریشان کرنا بیجا
ہی القصہ بادشاہ اور معتمد الدولہ بظاہر شیر وشکر تھے ایکدن بے تکلف
بادشاہ نے وزیر سے قلفیان برف کی طلب فرمائیں اس سخاوت پیشہ نے
پانچ چار حاضر کیں مشہور ہی کہ بادشاہ دیجاہ اسکی سرد مہری سے اپنے
دلمیں بہت گرم ہوے اور طلب فرمائیں ناظرین کیفیت ملاحظہ فرمائیں
کہ کیا نشۂ شراب نخوت آنکھوں میں جما تھا کہ عوض برف کے یہ حرف
زبان پر آیا کہ اسوقت اور قلفیان تیار نہیں ہیں واللہ اعلم بالصواب
یہ روایت سنی ہی اب آغا میر کی فراست اور دانائی دیکھیے کہ وہ تدبیر

مناسب رفتہ رفتہ عمل مین لایا کہ رزیڈنٹ لکھنؤ سے لیکر صاحبان سب تک
نہ رسم اتحاد بڑھایا کہ وہ سب دم اسکی محبت کا بھرنے لگے مین مددگار
تھے بہر صورت مطمئن تھا یہ بات ذہن نشین تھی کہ ہم چاہین آج پادشاہ
بنادین آخرکار غرور دولت و تدبیر نے یہ دن دکھایا نصیر الدین حیدر
پادشاہ کہان تک ضبط کرتے اسکے عزل کے درپی ہوئے چونکہ
امور خانگی مین مختار تھی رزیڈنٹ بہادر کو اس بات پر آمادہ کر لیا اور انھون نے
یہ فرمایا کہ تم معتمد الدولہ کو ہماری کوٹھی مین بھیجدو ہم گرفتار کر دینگے آپ
اس امر مین مبادرت نہ فرمائین کہ بیٹھے بیٹھے ناحق کو فساد اوٹھیگا
مختصر یہ تجویز جب قرار پائی نصیر الدین حیدر نے معتمد الدولہ کو ایک دن
دوپہر کے وقت خوشی خوشی کوٹھی رزیڈنٹی مین بھیجا کہ تمھین بڑے صاحب نے یاد کیا ہے
چونکہ آمد و رفت جاری تھی اور شدنی درپی گرفتاری تھی راز پنہان سے
آگاہ نتھا دانائی کام نہ آئی بڑی شان و تزک سے کئی ہزار سوار و پیادہ
ہمرکاب تھا کوٹھی رزیڈنٹی مین پہونچا صاحب کلان حسب سررشتہ رسم
و آئین مقررہ پیش آئے کوٹھی خاص مین جگہ دی فقیر محمد خان وغیرہ حسب قاعدہ
باہر تھے تھوڑی دیر کے بعد کچھ باتین مناسب وقت ادھر اودھر کی کرکے
اوس مقام سے باہر آئے معتمد الدولہ وہان بیٹھا تھا کہ دوسرے دروازے
سے دو انگریز جو کمین گاہ مین کھڑے تھے کہ حسب ضابطہ بہم

لیے ہوئے مانند عزرائیل کے اوسکے سر پر آپہونچے اور یہ حکم سنایا
کہ آپ بموجب حکم بادشاہ سلیمان جاہ کے قید ہوئے ہتھیار رکھدیجیے
یہ سنتے ہی چہرہ زرد ہوا روح قبض ہوئی بس کیا تھا قید ہوا کہ ایک ساعت
کے بعد صاحب کلان بہادر بھی تشریف لائے اور بہت تشفی اور دلداری
کی کہا کہ نواب صاحب یہ مقام شکر ہے جا نہیے اضطراب نہ کیجیے ہمنے آج آپکی
عزت و آبرو بچائی کہ بادشاہ کے پنجۂ قید و قہر سے چھوڑا کر اپنے پاس
رکھا وگرنہ بادشاہ تمہارا دشمن تھا بہت بری طرح پیش آتا اب جو بات کہ
تمکو منظور ہو اور بہتر سمجھو وہ کہو کہ وہ صورت عمل مین آئے معتمد الدولہ اوسوقت
آنکھون مین آنسو بھر کے اسطرح بولا کہ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا اب اس بات کا
میزان عدالت سے امیدوار ہون کہ شہ آبرو مین نہ آنے پائے صاحب کلان
بہادر نے بہت اطمینان فرمایا کہ خاطر جمع رکھو ایسا نہوگا اب فیتون کا
حال سنیے جنکو دعوی تھا کہ جہان پسینا نواب صاحب کا گریگا وہان اپنا
خون گرائینگے ہر ایک باہر اپنے مقامون پر بیٹھے تھے کہ یہ حال ہو بہو
آشکارا ہوا نہایت دست پاچہ ہوئے ادہر اودہر بغلین جھانکنے لگے
ساری رفاقت اور بہادری بھول گئے ہراسان اور پریشان ہی اپنی جان
اور مال کی خیر مناتے تھے یہان تو یہ معاملہ گذرا وہان نصیر الدین حیدر
بادشاہ خوش کہ معتمد الدولہ گرفتار ہو گیا اوسیوقت یہ حکم جاری فرمایا ابھی

متوسلان معتمد الدولہ گرفتار ہوئے اوس دن شہر مین عجب ہنگامہ برپا تھا
کہ چوبدار سلطانی پہرے لیے ہوئے ہر طرف کوچہ و برزن مین سے تھے
جہان کچھ بھی پتا پاتے تھے کہ یہ شخص آغا میر سے سروکار رکھتا تھا اوسکو
بلا تامل گرفتار کرتے تھے مکان پر چوکی پہرہ بٹھاتے تھے القصہ اوس دن
اس معاملے مین بہت لوگ گرفتار ہوے زیادہ تصریح اسکی بیکار ہے
سارے شہر مین کھلبلی مچ گئی اکثرون کے گھر مین سامان شب عاشور تھا
اب سنیے صاحب کلان بہادر نے معتمد الدولہ کو قید کر کے اجازت دی
کہ سواری نیل اپنے گھر جاے اوس وقت کا عالم کیا بیان کیا جاے دروازہ
بیلی گارد سے آغا میر کے مکان تک ایک ازدحام تھا کچھ افسوس اور کچھ
خوشی صورت قید کی مکان پر یہ تھی کہ ایک کمپنی انگریزی واسطے حفاظت
آبرو کے مامور تھی ہنڈیا وان سے آتی تھی اور ہر ہفتہ مین اوسکی بدلی بھی
ہوا کرتی تھی لیکن قید ہونے کے بعد مہاجن اور بیوپاری وغیرہ کہ جنکا
روپیہ اوسکے ذمے کثیر تھا رات دن دروازہ گھیرے رہتے تھے
اوقات خراب وخور آغا میر کی اسکے ہاتھون سے تنگ تھی یہ معاملہ
کچھ سرکاری نہ تھا صاحب کلان بہادر نے حکم دیا کہ جلد زر قرضہ کہ لازم الادا
ہی ادا کرے اور ایک انگریز بھی مامور تھا کہ اوسنے میر برشن علی کے
ہاتھون سب کا قرضہ ایک کے چار حسب دلخواہ تنخواہون سے کے دلوانے

بعد عرصے کے آغا میر عزت و آبرو میت تصدق صاحب عالیشان بہادر کے
مع زن و بچہ و مال و اسباب لکھنؤ سے کانپور کو گیا تیس لاکھ روپیہ بابت
ضمانت اور تنخواہ کے جو خزانہ ریذیڈنٹی مین جمع تھے اور وہ جملہ املاک کہ لکھنؤ مین
بنوائی تھی محاسبہ شاہی مین محسوب ہوئی مگر یہ کیون بُری بات ہوئی راوی بیان
کرتے ہین کہ اسباب اور جواہرات وغیرہ کے سوا سی چالیس پینتالیس
چھکڑے فقط اشرفی اور روپیون کے یہان سے اپنے ساتھ لیگیا
چنانچہ کانپور پہونچتے پہونچتے ایک چھکڑہ اشرفیون کا اعظم علی داروغہ نے
راہ سے گم کیا اور اسی وجہ سے باہم صورت ملال کی پیش آئی خلاصہ
اس تحریر کا یہ ہی کہ باوجود اس خرابی اور بربادی کے آغا میر نے کانپور
جاکر پچیس ہزار روپیہ کا وثیقہ تازہ سرکار انگریزی سے اپنے نام کا جاری
کروایا وہ آج تک اوسکی اولاد کو ملتا ہے اور نئے مکان میدان جوہی مین
تعمیر کروائے اب یہ روایت سنیے کہ جب آغا میر قید ہوا فیض النسا خانم نے
اور میر فضل علی جو فرخ آباد مین نکالے ہوے تھے خفیہ پھر اس شہر مین
آئے اور بواسطہ بادشاہ بیگم کے میر فضل علی نے وزارت پائی اور
اعتماد الدولہ خطاب ہوا منتظم الدولہ اور مرزا حاجی بھی بامید وزارت کانپور
سے شہر لکھنؤ مین آئے تھے لیکن منتظم الدولہ اور اعتماد الدولہ مین موافقت
نہوئی مایوس پھر گئے لیکن مرزا حاجی رفاقت منتظم الدولہ سے کنارہ

کر کے رفیق اعتماد الدولہ کے بنے پر لکھنؤ کا رہنا غنیمت جانتے تھے
اعتماد الدولہ مدار المہام تھے اس درمیان مین رتبہ اقبال الدولہ کپتان کے
بیٹے کا زیادہ ہوا عمدہ جرنیلی کا پایا کاروبار سلطنت مین بھی دخل کامل ہوا
طبیعت بادشاہ کی اعتماد الدولہ کیطرف سے پھر گئی لوگون نے یہ
ذہن نشین کر دیا کہ یہ شخص معتمد الدولہ سے در پردہ ساز رکھتا ہی تو موقوف
کیا لیکن ایسا مخمصہ مین ڈالا کہ وہ خود خانہ نشین ہوا اور تھوڑے عرصے
مین بیمار ہو کر دنیا سے گذرا اور لاش اوسکی کربلای خدابخش مین دفن
ہوئی یہ بادشاہ جیسا بڑا امیر چشم و دریا دل تھا سخاوت مین بے نظیر ہوا
چار روپیہ کا نوکر تک اس عہد سلطنت مین امیر ہوگیا مہینون تنخواہ نہین
پاتے تھے لیکن سب طرح فارغ البال تھے اپنے محلون کو اس بادشاہ
نے بڑے بڑے مرتبے اور رتبے بخشے وثیقہ اور مشاہرہ مقرر کیا

نواب ملکہ زمانیان — مخدرہ علیا — تاج محل — سلطان عالیہ اختر ملکہ زمانی —

بادشاہ محل —
مبارک

اس بادشاہ کے زمانے مین محلات مین قدسیہ محل کا اقتدار
بہت تھا اور اس محل نے بڑی سخاوت کی اور کروڑون روپیہ کا صرف
کیا سارا شہر اب تک اس محل کی سخاوت کا قائل مگر وہ بھی کسی

وجہ سے آخر کو ہیرا کھا کر قضا کر گئین۔

اس زمانے مین منتظم الدولہ حکیم مہدی علیخان کانپور سے بلا کر عہدۂ وزارت پر سرفراز ہوئے تھے نظم و نسق ملک سب دنکے تعلق قدر و منزلت کمال پیش نظر تھی حضور خطاب دیا یہ شخص منتظم اور معاملات مالی مین اپنا ثانی نرکھتا تھا اور اسکی بہت سے لوگ دشمن تھے خصوص قدیمی خائن و بے ایمان اس شخص سے جلتے تھے یہ نائب منتظم اور کفایت شعار تھا خوب ہی انصرام خدمت نیابت کیا اور اسی عہد مین حضرات کنبوہ بھی بڑے معزز اور صاحب اقتدار تھے تاج الدین حسین کی لیاقت و معاملت مشہور ہی لیکن تاج الدین حسین اسی فکر مین رہتا تھا کہ حکیم مہدیعلیخان منتظم الدولہ کو اس عہدۂ وزارت سے گرادے چنانچہ بادشاہ بیگم سے ملکر بادشاہ کی خاطر مین حکیم صاحب کیطرف سے شک ڈالا اور آخر کار وہ معتوب و معزول ہوئے جسکی تاریخ معزولی شیخ امام بخش ناسخ سے یہ ہے۔

قطعۂ تاریخ

افتاد حکیم از مراتب	تاریخ بطرز نو رقم کن
ازجای حکیم ہشت بر گیر	سنہ مرتبہ نصف نصف کم کن

رعزل اسکا باعث برہمی مزاج صاحب رزیڈنٹ ہوا اخلاف مامی انکے
بات ظہور مین آئی تھی کچھ کچھ کدورت سنے دلمین گھر کیا چونکہ پادشاہ
ہم اور عقیل کمال تھا بڑہنے ندیا لیکن پادشاہ بیگم اور داروغہ حسین علیخان
مدامانی بیگم کی صلاح سے روشن الدولہ محمد حسین خان فرزند نواب
رف علیخان سنے خلعت وزارت پایا یہ وزیر بھی سخی تھا اکثر عمارات
ی اپنی وزارت مین تعمیر کرائین اب تک کوٹھی روشن الدولہ کی
روف بہ قیصر پسند مشہور ہی تاریخ بنیاد یہ ہے
کیا رشک ارم ہے کوٹھی
ن سلطنت مین راجہ درشن سنگہ راجہ بختاور سنگہ بڑے
ی عزت و ذی اختیار تھے جنکی یادگار اسوقت مہاراجہ مانسنگہ
ادرہین وعلی ہذا راجہ درشن سنگہ غالب جنگ قوم کورمی جسکا بیٹا
جہ جی لال سنگہ بغاوت کے جرم مین بمقام لکھنو پھانسی دیا گیا
ا صاحب اختیار تھا اکثر عمارات شاہی زیر اہتمام راجہ بختاور سنگہ
یتیم ہوئین نواب سعادت علیخان سنے جو روپیہ جمع کیا تھا اور بعد
ت غازی الدین حیدر پادشاہ کے باقی رہ گیا وہ مع آمدنی ملک کے
رعیشون مین جو کچھ روپیہ رکابی ملا وہ سب اس پادشاہ سنے صرف کیا
ی سخاوت سے خیرات وسہت اور کروفر کی بو دماغ مین سمائی تھی

مزاج نہایت برق تھا آخر مین بعض بعض نمک حراموں کی سازش
سے بادشاہ بیگم اور بادشاہ مین ملال ہوا اور نوبت بفساد بھی پہنچی
اسلیے بادشاہ بیگم نے منا جانکو لیکر الماس باغ مین اقامت اختیار کی
تخم عناد کا دلون مین پڑگیا روز بروز ترقی رہی کئی ہزار آدمی جنگا
بادشاہ بیگم نے نوکر رکھے نگاہداشت جاری کی اس بات پر بادشاہ نے
اور بھی منا جان کے فرزند ہونے سے انکار محض کیا اور آئندہ الغیب عند اللہ
اشتہار دیا کہ وہ فرزند میرا نہین ہی اور انواع انواع کے معاملے پیش
آئے کہ اوسی زمانے مین بادشاہ نے بھی فرح بخش چتر منزل چھوڑکر
دلکشا مین رہنا اختیار کیا اسکے بعد بادشاہ نے اپنی عمر عیش و نشاط
مین بسر کی کوئی دشمن اندرونی و بیرونی برسر عداوت نرہا صاحبان انگریز بھی
اس بادشاہ سے موافق رہے عیاش و شکار دوست بشدت تھا اگرچہ بیحد
نازک مزاج تھا لیکن سخی و قدردان تھا اندوختہ سابق کرور ہا روپیہ صرف مین
لایا اسکے عہد سلطنت مین خاص صنعتین یہ تھین کہ اہل تجارت کو رفاہ ہوا آمدنی
بھی نہین گھٹی ملک بھی آباد رہا رعب سلطنت و داب سیاست بھی بہت تھا و
اچھے اچھے شعرا اس زمانے مین تھے اپنے مذہب امامیہ کا بہت پابند تھا بلکہ
اونھین کے عہد دولت سے اس مذہب نے لکھنؤ مین ترقی پکڑی نائب اول یہی حکیم مہدی
ہم کئی مرتبہ عہدہ وزارت سے سرفراز اور معزول ہوا بعد اسکے زمانہ روشن الدولہ کا تو

قریب تھا اسی بادشاہ کے عہد مین کوٹھی بائینر تعمیر ہوئی اور
بھی اچھی اور عمدہ عمدہ تعمیرات طیار ہوئین اور صاحب رزیڈنٹ سے
دوستی رہی گومتی کے کنارے بکثرت مکانات تعمیر ہوئے
وقت مین اکثر اوس سلطنت کے کارپرداز اور دیکھنے والے موجود
ین اور بہت کچھ بالتفصیل ہمکو معلوم ہی لیکن اختصار مین گنجایش تفصیل
ن آخر مین بیگمات نے اس شاہ جم جاہ کے ساتھ دغا کی زہر دلوا دیا اور یہ
بھی زبان زد خلائق ہی کہ دھنیا مہری نے زہر دیا اور بعضے کو یہ محمول ای
ی تہی کہ بعض حرکات اسکی ناپسندیدہ صاحب رزیڈنٹ کو ہوئین اسواسطے اسکے
الئے مین مشہور ہوا العلم عند اللہ ۔ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ع
کے دن ۲۵ برس کے سن مین وفات پائی اپنی کربلا مین کہ اونہ
اے گومتی کے تعمیر کی تھی دفن ہوئے خلد منزل لقب مشہور ہے
ت سلطنت ۱۰ برس ۵ یوم تاریخ وفات یہ ہی
ت شاہ جہان سلیمان جاہ سوی جنت ز بارگاہ اودہ
تفے گفت از سر افسوس بارم رفت پادشاہ اودہ
۱۲۶۳ھ
ل جان لو صاحب بہادر رزیڈنٹ تھے معتمد الدولہ واعتماد الدولہ
الملک سید فضل علیخان بہادر سیادت جنگ روشن الدولہ نیر الملک
بین خان بہادر قائم جنگ رکن رکین خلافت جہانداری عضد سلطنت

و شہریاری متیم جنگ مدار المہام وزیر الملک منتظم الدولہ مہدی علیخان بہادر

جلادت جنگ اقبال الدولہ بہادر پسر ظفر الدولہ بہادر معظم الملک کپتان

فتح علیخان ہیبت جنگ منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک مہاراجہ

رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ متخلص بزخمی ظہیر الدولہ صلح الملک

غلام یحیی خان متیم جنگ منیر الدولہ بہادر بعد اسکے شرف الدولہ مظفر الملک

محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ بعد اسکے رکن رکین خلافت جہاندار

اعتضاد سلطنت شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک رفیع الدولہ سپہ سالار

رستم ہند نواب امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ

یہ سب مدار المہام اور کارپرداز سلطنت تھے۔

بیان حال ریاست رفیع الدین حیدر محمد مہدی افریدین بخت بہادر عرف منا جان

صاحب رزیڈنٹ خبر وفات کی پاتے ہی بارگاہ بادشاہ مین تشریف

لائے بنظر تقدم بالحفظ پہلے ہزار سپاہی مع توپون کے واسطے

حفاظت خزانہ وغیرہ کے مامور کیے اور ممانعت آمد و رفت دوست و

دشمن کی عمل مین آئی بعد اسکے محل مین جہان نصیر الدین حیدر بادشاہ

جان بلب تھے گئے دیکھا کہ حضرت نے حسرت سے آہ سرد کھینچکر

جان بحق تسلیم کی اسوقت ہاتھ کی فصد بھی کھولی گئی مگر اونمین کیا باقی تھا

اب سنیے جب کرنیل جان لو صاحب بہادر کو یقین کامل ہوا کہ نصیر الدین حیدر
ناگاہ دنیا سے گذرے ایک کاغذ دستآویز کا شامل اس مضمون سے
کہ جو کچھ نواب گورنر جنرل بہادر ارشاد فرمائینگے ہم عہدنامۂ جدید پر
دستخط کر دینگے پاس نصیر الدولہ کے بھیجا مزین بدستخط منظوری
ہوکر آگیا ابھی یہ گفتگو کر رہی نشین مطلب ہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم مع مناجان
کے کہ بفاصلہ چار میل بارگاہ سلطانی سے الماس باغ مین تھین باوجود
ممانعت رزیڈنٹ بہادر کے با فوج کثیر بعد گذرنے تین پہر رات کے
دولت پر آپہونچین کرنیل جان لو صاحب بہادر کہ مہیا کرنے سامان
جلوس مین سرگرم تھے یہ خبر سنتے ہی سخت متحیر ہوئے اور کپتان جمس پاٹن
کو اجازت دی کہ محافظان دروازہ بیرونی کو حکم محکم دو کہ کوئی یہان بدون
اجازت نہ آنے پائے اور روشن الدولہ بہادر سے تاکید فرمائی کہ تم
در باب مقابلہ بادشاہ بیگم کا کرو اور لفٹنٹ مکیسر صاحب کو یہ فرمایا کہ تم جلد
سپاہ انگریزی منڈیانوین سے لاؤ کپتان جمس پاٹن صاحب بہادر حسب الحکم
دروازے پر آئے اور بگفتگوے ملایم مقابل سے نمایش کرنے لگے
یہ حرکت تمہاری باعث بربادی مطلب ہوگی یہ کب سنتے تھے ہاتھ
یون پر سوار تھے بزور فیل دروازہ توڑ کر مکان سلطانی مین اپنے
طرح در آئے بالکہ کپتان جمس صاحب اس کشمکش مین مجروح بھی ہوئے مگر

بتیغ زبان وہ بھی کام کرتے رہے گفتگو سے نہ باز آئے کہ دیکھو انجام اس
آجار کا بہت بُرا پیش آئیگا بمجرد یہ تو گرفتار ہوئے سپاہی بادشاہ بیگم
کے یک قلم شمشیرین کھینچے ہوئے اور توڑے بندوقون کے شہر اندرون
حجرے کے پہونچے کرنیل جان لو صاحب کو اپنے قبضہ مین کیا اور
نصیر الدولہ اور امجد علیخان اونکا فرزند اور عظیم اللہ خان اور رفیق الدولہ
اور روشن الدولہ وغیرہ ایک مکان مین نظربند تھے اور یہ لوگ ایوان شاہی مین
ہر جانب پھرتے تھے اور ہتیارون کو بدلتے تھے قریب دو ہزار آدمی
کے تھے اس شور وغل سے بادشاہ بیگم نے مناجان کو لاکر تخت سلطنت پر
بٹھا دیا اب ہر طرف ناچ رنگ کا ہنگامہ شروع ہوگیا سلامی تو پون کی
حسب قاعدہ ظہور مین آئی اوس جگہ مشعلین بیشمار روشن تھین کشمکش
حد سے زیادہ تھی کرنیل جان لو صاحب بہادر پر ایک یورش کا ہنگامہ
نازل تھا یہ کہتے تھے کہ تم حسب آئین وضابطہ کے اپنی زبان سے
مناجان کی سلطنت کا اقرار کرو مگر انکی زبان سے کب یہ کلمہ نکلتا تھا
ہرگز نہ کہا خداوند کریم نے اوسوقت صاحب بہادر کے حال پر رحم فرمایا
کہ اور لوگون نے آکر حسب الحکم بادشاہ بیگم کے اس گروہ کے پنجہ سے نجات
دلوائی اور سب مقید رہے اب جان لو صاحب بہادر جوادسکے ہاتھو تھے
حاضر ہوئے بادشاہ بیگم سے سوال وجواب شروع ہوا کہنے لگے صاحب بہادر کہ

یہ سمجھے کہ اگر سر مو ہمارے کہنے سے انکار کروگی تو انجام نہایت برا دیکھوگی اپنے ہاتھون آپ گرفتار غضب ہو یہ باتین ہو رہی تھین کہ فوج انگریزی طلب فرمودہ صاحب ممدوح کی منڈیا ؤن سے آپہونچی ہنگامہ حرب و ضرب گرم ہوا ایگنس صاحب کہ سرکار شاہی کا ملازم تھا اسکے رسالے کی توپین واسطے سلامی ہمارکباد کے آئی تھین برعکس پیش آئین بوچھار چھرون کی لال بارہ دری پر پڑنی شروع ہوئی ۔ ۴۰ آدمی بادشاہ بیگم کیطرف کے مجروح اور مارے گئے اور تین سپاہی انگریزی زخمی ہوئے ظہیر الدولہ غلام یحیی خان نے کہ اون دنون مین مقید تھے کیا جرات کی کہ اس معرکے مین کو ٹھی فرح بخش کی پشت پیچھے لب دریا کود پڑے یا دن میں جو پڑا آئی کشتی مین جا چھپے بادشاہ بیگم مع منا جان کہ ۱۴ برس کا سن اسوقت مین تھا مع امام بخش کا زندہ کے گرفتار ہوئین جو ذلت کہ ان کے پیش آئی زبان پر لانے مین غیرت اور شرم آتی ہی آخر کار چنار گڈھ مین اگر بحفاظت تمام مقید ہوئین جسقدر اس بادشاہ نصیر الدین حیدر کے جوان مرنے اور حسرت سے جان دینے کا بعد افسوس چرچا ہی اوسیقدر منا جان کی بدنصیبی کا اور بادشاہ بیگم کی کم قسمتی کا بیان زبان خلائق پر ہی یعنی یہ فرزند بادشاہ کا بخطاب نجم الدین حیدر محمد مہدی مرزا فریدون بخت بہادر جو خاص شاہزادہ ہوتا ہی معروف تھا اور حیات بادشاہ کے بے تخلف مراتب اور بیانات

محمد علی شاہ

رہتا تھا اسبب اس بات کے کہ بادشاہ کو انسے ملال کمال حاصل تھا بادشاہ بیگم
کے ساتھ تھا وہ پرورش کرتی تھین بادشاہ نے طیش مین آکر
مغضوب اور عاق کر کے باجرای اشتہار فرزندی سے خارج کردیا اوسکی
سلطنت کے حق مین بوجہ سرکار کو چشم پوشی کی ہوئی یہ انقلاب بہت
برا ہوا فقط

بیان حال ریاست نصیر الدولہ محمد علی شاہ بادشاہ

ابو الفتح معین الدین سلطان زمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ پادشاہ عم حقیقی
بادشاہ مغفور یعنی فرزند نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کو صاحب کلان بہادر
نے بعد دستخط کاغذ مذکورہ کے نظر بندی سے نکال کر تشفی تمام اپنے
پاس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ مکان تخت گاہ شاہی جلد صاف و آراستہ ہو
معاً کارپردازان نے لاشین تو دریا مین پھینک دین اور مجرہ جرون کو دہانسے
دور کر کے ایوان شاہی کو پاک کیا ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۳ ہجری کو پہر دن
چڑھے صاحب کلان بہادر نے روبرو افسران فوج کے محمد علی شاہ کو
۶۰ برس کے سن مین تخت نشین سلطنت فرمایا اور تاج شاہی حسب آئین
سر پر رکھکر بادشاہ اودہ اپنی زبان سے کہا تو مین مبارکباد کی حسب ضابطہ
سرہوئین نذرین گذرین خلعت ہوئے خاص و عام کو طمانیت حاصل ہوئی
تاریخ تخت نشینی یہ ہے

شہ عرش تمکین فلک اقتدار چو گردید پشت و پناہ ا
سروش از سر دولت آواز داد محمد علی گشتہ پیشاہ ا
۱۲۵۳ھ

اور سکہ بھی اس بادشاہ کا تاریخی ہی

بجود و کرم سکہ زد در جہان محمد علی بادشاہ ز
۱۲۵۳ھ

جسوقت دربار برخاست ہوا محمد علی بادشاہ کرنیل جان لو صاحب بہ
خلوت مین لائے اور فرمایا کہ رہنا بادشاہ بیگم کا شہر لکھنو مین مناسب
نہین ہے کسواسطے کہ یہ عورت بڑی فتنہ انگیز ہی ہردم اسکی ذات
فساد تازہ ایجاد ہوگا صاحب بہادر نے کہنا اونکا قبول کیا ۲۱ تاریخ
آدھی رات کے وقت بحراست سوار و پیادہ ہای انگریزی کانپور روا
ہوئین وہان ایک مکان مین بکمال حفاظت نظر بند ہین اور وہان سے
قلعہ چنار گڈہ مین پونہچین دو ہزار چار سو روپے ماہانہ واسطے صرف کے خزانہ بادشاہی
۲۱ محرم ۱۲۶۲ ہجری مطابق ۱۸۴۶ع کو مناجان نے انتقال کیا
وہین دفن ہوئے (زہے ہستی رفت) تاریخ وفات کی ہی دو لڑکی
چھوڑ گئے ۳ صفر ۱۲۶۳ ہجری پنجشنبہ کے دن بادشاہ بیگم نے اس
جہان فانی سے کوچ کیا (آن قضا کرد آہ) تاریخ وفات ہی
اس بادشاہ نے خوب سرانجام جز و کل امور سلطنت کا کیا اسوجہ سے کہ
تربیت یافتہ نواب سعادت علیخان کے تھے اور کار آزمودہ تھے

برادرپروری اور رفقا نوازی سے رونق پائی انتظام ملک کا بھی بحسن الوجوہ
ظہور مین آیا آمدنی کا بھی انتظام ہوا زر کثیر اپنے عہد سلطنت مین جمع کیا
اور باوجہ ضعف پیری اور کثرت امراض کے ہر چند کل کار سلطنت کا خود
کرتے تھے اس بادشاہ کے وقت مین صورت برہمی کار سلطنت مبدل
بخوش اسلوبی ہوئی لیکن باوجود اس بیدار مغزی کے نمکحرامون نے
وہ کام کیا کہ باہم متفق ہو کر تنخواہ رسالون اور پلٹنون کی دو دو اور تین تین
جگہ وصول کی اوسی رسالا و پلٹن کی تنخواہ جمع خرچ سلطانپور مین مندرج اوسی رسالے
پلٹن کی تنخواہ کاغذ خیر آباد مین اور اوسی کی تنخواہ علاقہ گونڈہ و بہرایچ مین
اور اوسی کی تنخواہ بخشیگری لکھنؤ مین پڑتی تھی لاکھون کا تغلب ہوتا تھا
ہیچ ہیچ جب کارپرداز ہی یہ کام کرین بادشاہ کیا کرے خلاصہ یہ کہ بادشاہ
بہت نیک نیت تھا کسی کام خیر کے انتظام مین بند تھا لاکھون روپیے
درگاہ حضرت عباس کی ترمیم مین صرف کیے اور درستی نہر اور روضہ
حضرت حُر کی طیاری مین خرچ کیے اور ہزار روپیہ مہینا ان ہندی لوگون
کے واسطے مقرر کیا کہ جو کربلا مین زیارت کو جاتے ہین اور متوسلونکو
بواسطۂ صدریہ وثیقہ بطور وظیفہ مقرر کیا

~~صاحبان عالی محل نواب ملکۂ جہان مخدرۂ زمانیان شہزادے اور اون کے محل~~
سلطان آرا بیگم ... ملے اسم
[illegible]

شرف الدولہ محمد ابراہیم خان —— عظیم اللہ خان —

۱۱ لعہ —— ۱۱ لعہ / ۱۰ اسرپانزر

شہزادیان —— متفرقات —

ا لعہ —— ۱۴ لعہ / ۱۲ لعہ —— لعہ

ایضاً نوٹ واسطے امام باڑہ حسین آباد ——

مہ لعہ

اور بہت سا زر وزیور اور مکانات اپنے عزیزون کو تقسیم کیے یعنی
ہر ایک کو صاحب مال اور اہل دول کر دیا محتاج دوسرے کا نرکھا
کرم پروری انکی مشہور ہی کہ منتہیون سے کمال نفرت تھی روشن الدولہ کو نیابت
نصیب نہوئی اسی تمنا مین مرگئے کیا وجہ کہ سبحان علیخان دوست انکے
کارپرداز تھے منتظم الدولہ کو فرخ آباد سے بلا کر اپنا وزیر بنایا اور منور الدولہ
کو اونکی جرنیلی دی صاحبان صدر انکی روش نیک سے بہت راضی اور
محظوظ تھے ہر خواہش صدر مین مقبول ہوتی تھی عمارت حسین آباد وغیرہ
جو کچھ تعمیر کروائی عمدہ یادگار ہے فصل مکان مین مفصل بیان ہوگا مگر موت نے
نچھوڑا تپ محرق سے ۶۸ برس کے عمر مین کام تمام کیا ۵ ربیع الثانی
۱۲۵۸ ہجری روز سہ شنبہ کو وقت رات کے انتقال فرمایا اور حسین آباد مین
دفن ہوے فردوس منزل کہلائے —

امجد علی شاہ

رنیل جان لو صاحب بہادر اور کرنیل کالفیلڈ صاحب بہادر رزیڈنٹ تھے
نایب روشن الدولہ اور منتظم الدولہ اور ظہیر الدولہ اور منور الدولہ اور پیشدست
شرف الدولہ محمد ابراہیم خان اور انکے عہد مین فوج ۴۲ ہزار پیادہ اور
تین ہزار سات سو سوار اور ملک کی آمدنی ایک کرور پچاس لاکہ روپیہ
کی تھی تاریخ وفات رفت شاہ اودہ بپاک قدس ۱۲۵۸ھ
لیکن کبر سنی کی وجہ سے حواس مین خلل تھا سارے کاروبار صاحب رزیڈنٹ
کے مشورے سے طے ہوتے تھے اور انکی سلطنت مین کوئی بات
جدید نہین ہوئی۔

بیان حال ریاست امجد علی بادشاہ

ابو المظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زمان محمد امجد علی بادشاہ
۴۳ برس ۶ مہینے ۲۰ دن کے تھے ۵۔ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ ہجری منگل کے
دن تخت نشین ہوئے رسمین معمولی عمل مین آئین تاریخ جلوس کی رحجہ
الفت رای بخشی سنے کہی۔

شاہ فلک مرتبہ امجد علی	مہر سما شرف انجم سپاہ
دادوہ عدل چو نوشیروان	ثانی دارا و سکندر بجاہ
ناصر دین دافع کفر و ظلام	وادرس عالم و ظل الہ
پنجم از ماہ ربیع دوم	ساعت فرخندہ بوقت پگاہ

ساختہ بر تخت خلافت جلوس　　　　از مدد سبط رسالت پناہ

ساختہ الفت پی تاریخ فکر　　　　تا بود ش بار دران بارگاہ

مصرعۂ برجستہ ز ہاتف شنید　　　　تاج و اورنگ مبارک بشاہ

۱۲۵۸ھ

اور سکہ اس پادشاہ کا یہ جاری تھا

بجہان زد سکۂ شاہی بتائید الٰہ　　　　ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

یہ پادشاہ کمال دیندار خدا پرست اپنے مذہب کی ترقی بہت مد نظر تھی عدالت کا کام سلطان العلما اور سید العلما کو سونپا اور انکے عہد مین سلطان العلما کا کمال دور دورہ تھا اہل ہنود اور سنت جماعت کے عروج پر حسد کرتے تھے کتنے ہندو مسلمان اور کتنے سنی شیعہ ہو گئے بازار اس امر کا گرم رہا زر زکوۃ شاہی ہر برس سلطان العلما کو سرکار شاہی سے ملتا تھا وہ اپنی راے پر جسکو چاہتے تھے تقسیم کرتے تھے مخنث یعنی ہجڑے کار م نگر مین اور جہان جہان اس شہر مین بستے تھے انکے حکم سے نکالے گئے انکے انتقال کے بعد بیچارے خانمان برباد آباد ہوے اور مدرسہ شاہی کی بنیاد ادر حضرتگنج کی سیل انکی سلطنت مین ہوئی پل آہنی بنوایا شرف الدولہ کہ عہد ولیعہدی مین نظرون سے گرے تھے انکو بعد تین مہینے کے عہدہ وزارت سے موقوف کیا اور امین الدولہ امداد حسین خان کو خلعت نیابت دیا اور منشی سے کے عہدہ سے پراکبر علیخان نواب امیر الدولہ

ب بیٹے کو مامور کیا اور دیوانی مشیر الدولہ بہادر کی چلی آتی تھی وہی بدستور
ں اور سید عنایت علیخان معین الدولہ جو بادشاہ کے ماموں تھے انکو
کی نظامت اور امور سلطنت کے مشورے کے لیے مقرر کیا بعد وفات
علیخان قطب الدین حسن خان کو پیشدستی وزارت کی ملی اور بعد انکے
ین الدولہ کو یہ عہدہ نصیب ہوا لیکن امین الدولہ اور معین الدولہ مین بصورت
موافقت کی ظہور مین آئی لوگون نے بادشاہ کا دل امین الدولہ کی
ن سے باتون مین پھیر دیا کہ مدت نے یہ دن دکھایا کہ امین الدولہ
بار ہوکر مستعفی ہوئے اور گھر بیٹھے مگر معین الدولہ کو عہدہ وزارت
یب ہوا منور الدولہ بہادر کانپور مین تھے بلا آئے خلعت وزارت کا
بلو دیا گیا کئی مہینے معین الدولہ کاروبار سلطنت مین مصروف رہے
چاہ کندہ را چاہ درپیش یہ بھی بادشاہ کی نظرون سے گرے ولمین ب
ں آیا یہ بھی گھر بیٹھے اب منور الدولہ تنہا کاروبار سلطنت کا کرتے رہے
لہ آرام طلب تھے محنتین رات دن کی گوارا نہ ہوئین عہدے سے
رول ہوئے پھر امین الدولہ بہادر اپنے عہدہ وزارت پر بدستور
م ہوئے نواب حامد علیخان اعتماد الدولہ کے خویش کو سررشتہ
بندبستی کا ہوا انکے بعد سعید الدولہ علی محمد خان فرزند میر بندہ علی کے
شدست ہوئے سعید الدولہ عجب مرد چالاک تھا ایکدن جلسہ بار مین

جملہ کلان تعلقداران و زمینداران کو طلب کر کے بہت دلجوئی اور استمالت
بیان کی کہ جس کو ضرورت روپیہ کی بصیغہ تقاوی وغیرہ درپیش ہو وہ
وہ معروضہ اپنے مہری تحصیلی چکلے کے لکھدین اور مفت خوردنی کا کیا تھا
حسب لیاقت اپنی اکثرون نے درخواستین لکھکر حوالہ کین اس شخص کی ہمت یاری
دیکھا چاہیے کہ وہ سب کو [illegible] سرکار شاہی مین پیش کر کے زر کثرت سے
حاصل کیا اور اپنے تصرف مین لایا بیچارے سب اوس سے محروم
رہے سبحان اللہ کیا گھر عالیشان تھا کہ ہزارون محتاج نواب بن گئے
کوڑی بابی دھاری وغیرہ راجہ اور دولہ اور بہادر ہوگئے سچ ہے یہ شہر لکھنؤ
چراغ شبستان ہند کا تھا اور جو سامان امارت یہان اس آخری وقت مین تھا
وہ کسی ریاست مین نہ ہوگا ایک بیان بھی قابل ذکر ہی کہ سنہ [illegible] ہجری مین
انھین کے عہد سلطنت مین نواب حسام الدولہ بہادر فرخ آباد سے کے
نواب لکھنؤ مین واسطے ملاقات بادشاہ ممدوح کے آئے تھے جس باغ مین
جو کہ ثابت مہدی اوس باغ پر قبضہ تھا اور بھی حسب الحکم شاہی فروکش ہوئے
بلکہ وہ باغ خاص اسی واسطے مقرر تھا کہ جس رئیس یا امیر جلیل القدر کی خاندان
شاہی مین سے کسی شادی ہوتی تھی اوسکو یہ باغ عنایت ہوتا تھا چنانچہ
شادی مرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ کی اور مرزا عالیجاہ اور مرزا والاجاہ
پسران وزیر الدولہ مرزا حیدر شاہ پوری کی بھی اوسی مین سرانجام پذیر ہوئی تھی

شرا سیطرح عمائد کو عنایت ہوتا تھا اور رئیس تازہ وارد بھی اوسمین اوتارا
ا تھا چنانچہ گارن صاحب بہادر سوداگر جاگیر دار کو ڈیاکاس گنج سے کے بھی
ما نہ نصیر الدین حیدر مین وارد شہر ہوئے اونکو بھی بسبب اعزاز و اقتدار
کے بذریعہ پرچہ پام میجر جان لو صاحب بہادر کے یہ باغ عنایت ہوا تھا
سی باغ مین صاحب موصوف نے لاکھ روپی صرف کر کے محرم مین
تعزیہ داری بڑی دہوم سے کی تھی وجہ اس تعزیہ داری کی یہ تھی کہ انکی
بی بی مسلمان تھی اوسکو کمال چاہتے تھے لہذا یہ خرچ گوارا کیا تھا
اور وہ بی بی بنت مرزا سلیمان شکوہ بہادر پسر محمد شاہ بادشاہ کی تھی اور
سبب اس بی بی کا انکے پاس آنے کا یہ ہوا کہ مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ جلیل
تھے زمانہ بادشاہ غازی الدین حیدر خلد مکان مین یہان تشریف لائے
تھے بادشاہ نے کمال اونکا اعزاز کیا اور مکان رہنے کو اونکے واسطے
متصل ملی گارد تاکیہ جہم سر شرک لب دریا کئی لاکھ روپیہ صرف کر کے
بنوا دیا تھا دس ہزار روپیہ ماہواری اور دو ہزار روپیہ میوہ خوری کے لیے
مقرر کر دیا تھا بعد دلجوئی اور خاطر داری کے اپنے فرزند ولیعہد نصیر الدین حیدر
کی شادی کا اونکی لڑکی کے ساتھ پیغام دیا چنانچہ بعد شرائط مرزا سلیمان شکوہ
نے وہ شادی منظور کی چنانچہ بڑی بیٹی سلیمان شکوہ کی عقد نصیر الدین حیدر
مین آئی اس شادی ہونے سے غازی الدین حیدر بادشاہ نے

پچیس لاکھ روپیہ کے نقد وجنس سے اونکے ساتھ سلوک کیا تھا بعد
چند روز کے نواب معتمد الدولہ وزیر بادشاہ نے دوسری بیٹی کے واسطے
اپنے فرزند کے ساتھ پیام شادی کا دیا مرزا سلیمان شکوہ بسبب طمع دولت
کے راضی ہو گئے شادی قرار پاگئی یہ خبر بادشاہ غازی الدین حیدر کو پہونچی
آگ ہو گئے اور دونوں سے اسقدر آزردہ ہوئے کہ جسکی شرح حد سے باہر
ہی یہانتک کہ مرزا سلیمان شکوہ کو اوسی دن شہر سے نکال دیا اور مکان
بھی اونکا کھدوا ڈالا بار بار یہ فرماتے تھے کہ ہم اس شاہزادے کو لائق
ایسا سمجھتے تھے کہ ہمکو بیٹی دیکر میرے نوکر کو اپنی بیٹی دے گا
سلیمان شکوہ جو یہاں سے نکالے گئے قریب شاہجہان آباد کے پہونچے
اوس زمانے مین اکبر شاہ ثانی کا دور تھا اونہوں نے جو یہ حال سنا
حکم دیا کہ ایسے شخص کا یہاں آنا مناسب نہین چنانچہ سلیمان شکوہ وہاں سے
پھر کر کوڑیا کاس گنج مین آئے طرح اقامت کی ڈالی گارڈنر صاحب موصوف
نہایت دولتمند تھے اسکے دام طمع مین آکر شاہزادہ موصوف نے اپنی
اوس لڑکی کی اوس صاحب کے ساتھ کردی اس عرصے مین غازی الدین
بادشاہ نے قضا کی اور سلیمان شکوہ نے نجات پائی یہان نصیر الدین
بادشاہ کو بھی اوس بی بی کے یہاں آنے کی کمال تمنا تھی بذریعہ

۱۲۳۳ہجری کو مع اوس بی بی کے لکہنو مین تشریف لائے تھے اور بادشاہ جہان
حسن باغ مین وارد ہوے اور تعزیہ داری کی تہا سن اوس باغ مین مع منصب ساما
زونق افروز ہوئے اور دوسرے دن بادشاہ کی ملاقات کو گئے تھے اور طریق
تحفہ ایک تہالی جوڑہ مع انجوبہ نگ اتیت کے ہ مع کار مطلا بہت عمدہ
دہہتر ہے گئے تھے اور اپنے نزدیک اوسکو نایاب جانتے تہے
بادشاہ کو دیا بادشاہ نے بھی بپاس خاطر اونکے بہت خوش اور محظوظ ہوکر
اوسکو قبول کیا اور تعریفین بہت زبان مبارک پر آئین یہان دستور تہا
کہ جس کسی سے بادشاہ ملاقات کرتے تہے روز اول باہم رسم تحفہ دہی کی
ادا ہوتے تہے عطردان اور کشتی وغیرہ موافق رسم کے دی جاتی تھین
دوسرے روز سامان دعوت کا ہوتا تہا اسمین خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی
چنانچہ نواب مسبوق الذکر کی تین دعوتین قرار پائین اور دوسرے ہی
دن سے مقرر ہوئین اور یہان کی شان و شوکت اور انداز دعوت چہا پیان
باہر کہانے کا یہ تہا کہ ایک عالیشان مکان میں کہ وہ سب طرح غیرقہ آلات وغیرہ
سے آراستہ ہوتا تہا اوسمین تیس گز کا لانبا اور بارہ گز کا چوڑا میز بچہتا
تہا اور اوسکے گرد ایک سو پندرہ کرسی بچہتی تھین اوسپر بادشاہ اور اعزہ
بادشاہ اور کارپرداز ممتاز اور ریذیڈنٹ بہادر مع صاحبان عالی شان
جلوہ افروز ہوتے تہے قصہ کوتاہ اوسی طرح روز دعوت لوا تمام

برتن مانند پنیر و حلوا ان و دودھ اور مٹھائی وغیرہ سب سنگ یشب کے
مشتملا جواہر نگار رکھے اور کھانون کا کیا وصف بیان ہو کہ بادشاہی
تھا وہ نواب اور سب حکام عالیشان یہ سامان دیکھکر متحیر تھے دوسرے
دوسرے مکان میں سامان ضیافت کا مہیا ہوا اسمین بھی اسیقدر
جملہ برتن اوسی انداز سے جواہر نگار سنگ یشب کے صورت میں او
لگائے گئے تیسرے دن بھی اسیقدر سامان اوتنی ہی بڑی بیز
برتن اوسی مقدار پر اور رنگ رنگ سے نہایت تحفہ عمدہ خوبصورت
کا جواہر نگار سنگ یشب کے مہیا تھے نواب ممدوح یہ سامان دیکھ
اپنے دلمین سخت متعجب اور شرمندہ ہوتے تھے شان خدا گویا
تھے حاصل کلام بعد برخاست جلسہ پانی اور کھانے اور بعد رخصت
نواب ممدوح کے امجد علی شاہ بادشاہ نے مجدالدولہ بہادر مہتمم خزانہ
کو شاباش بسبب اس حسن انتظام کے نہایت خوش اور محظوظ ہوئے
اور زبان مبارک سے بہت تعریفین کین خلعت گرانبہا سے خلعت
اوسوقت مجدالدولہ بہادر نے دست بستہ ہوکر عرض کیا کہ غلام قدیم
بادشاہ سے تین دن تک کا اقرار کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو اسیطرح
ہر روز سنگ یشب کے برتن طرح طرح کے صورت مین سنے لگایا کرے
اس عرض و بیان پر دوسر اخلعت اونکے رتبے سے کہین زیادہ

یانت و امانت مین عنایت ہواے فضول فیاضی ہمیشہ سے اس سرکار کی
ہی کچھ بھی نہین ہی — اور قدر افزائی انکو قدردانی اور واہ واہ کے مقربین
ہد یوٹ کھایا کارخانہ خدا ہین کہ اب بجنسہ امجد علی شاہ کے فرزند
امجد علی شاہ بادشاہ کو ایک پشت کے بعد شاید ایک پھول دان بھی
سنگ پشت کا میسر نہوگا مگر ان اور پشت خانون مین بعض ان بزرگ پشت
شب کے اپنے نکا ذکر البتہ نظر آتا ہی اس انقلاب و زوال پہ بخت جو تکا
خام ہی فقط — ابن زمانہ امجد علی شاہ من ولیہ الدولہ ملاذ الملک مرزا
سید علیخان بہادر فیروز جنگ یعنی والد اعلی جاہ والا جاہ کا بڑا اقتدار
اس عمل انگریزی مین تنہا ہو گئے مشہور بلقب مرزا حیدر تھے اونکی
ذ بہا ذکر اوپر آ چکا ہی عمدہ رئیس تھے —
حضرت امجد علی بادشاہ کا حال کیا لکھا جاے اس بادشاہ کے عہد دولت مین
کوئی جدیدات نہین ہوئی اور مجتہد کا زمانہ رہا اور پنجشنبہ بادشاہ کا
رفتاری سنہ ۱۲۶۳ ہجری مین ۲۶ ماہ صفر روز پنجشنبہ پانچ بجے ۴۴ برس
پانچ مہینے ۲۰ دن کے سن مین بعارضہ سرطان آٹھ دن کے درمیان مین
جہان فانی سے گذر گئے اور سید محمد خان رسالدار کی چھاونی مین دفن
ہوے جنت مکان لقب پایا تاریخ وفات کی منشی مظفر علی اسیر
شاگرد مؤلف سے یہ ہی

واجد علی شاہ

ابتدای خلافت مین نواب امین الدولہ وزارت پر ممتاز تھے لیکن عہد
ولیعہدی سے بادشاہ کا مزاج انسے درپردہ مکدر تھا اسواسطے عہدہ وزیر حشمتی
سے خیال تھا کہ کسی دوسرے کو خلعت وزارت دیا جاوے اس بادشاہ
کی عہد حکومت مین کئی باتین ظہور ہوئین جواب تک یادہین نواب امین الدولہ کا
سانحہ مولوی امیر علی کا شہید ہونا ہنومان گڑھی کا دنگا اور فساد عیاشی
غفلت نالائق اہلکارون کا دخل تعمیر قیصر باغ امین الدولہ کا قصہ کہ
بہت مشہور ہے کہ بسواری بگھی در دولت پر آتے تھے وقت صبح
شیخ فضل علی احمد خان غلام غوث خان وغیرہ پانچ جوان بدمعاش
سرک گولہ گنج مین زیر دیوار امام باڑہ نواب ملکہ زمانیان زوجہ نصیر الدین حیدر
بادشاہ بگھی سے نواب کی لپٹ گئے اور انمین سے دو شخصون نے
چالاکی امین الدولہ کو بگھی سے اوتار کر زمین پر گرادیا اور چھری سینہ پر
رکھدی اور تین آدمی قرابینین لیے ہوئے اونکے سر پر کھڑے
تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو کوئی پاس آئیگا ہم نواب کا کام تمام کرینگے
اسوجہ سے کوئی دست اندازی نکر سکتا تھا اس عرصے مین یہ خبر
عام ہوئی افسران فوج شاہی مع اراکین موقع واردات پر پونہچے
بڑے صاحب بہادر اور چھوٹے صاحب بہادر وغیرہ وہان آئے
سوائی تالیف قلوب اور طمع زر کے کچھ بن نہ آئی ۵۰ ہزار روپیہ پر

صاحب کلان بہادر نے اونکو رہنی کیا ذمہ دار ٹھہرے منگوا یا مگر
اصل مطلب اونکا معلوم ہوا دام طمع مین آ گئے نواب مجروح کو راکیا
کرامین آباد گئے تاریخ اوسکی تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیر سے یہ ہی
بوقت کینہ اوباش چند با نواب   زمانہ گفت کہ یارب ذوالجلال بخیر
اسیر سال وقوع فساد کرد رقم   رسیدہ بود بلای ولی مآل بخیر
۱۲۶۴
چنانچہ وہ سب دیہ ہاتھیوں پر رکھکر پانچون بدمعاش سوار ہوے اور
صاحب کلان بہادر کے ساتھ بیلی گارد مین گئے بحکمت عملی ہتھیار
اونسے لیے گئے گرفتار ہوئے چوتھے دن چار بجے کے بعد
اونکو اپنی کوٹھی سے نکال دیا دروازے پر ازدحام تھا اور سپاہی
سرکار شاہی جوق جوق جمع تھے جیسے وہ باہر نکلے گرفتار ہوے
مارے گئے قید خانہ دیکھا اور نواب مجروح کا علاج ڈاکٹر لوکن صاحب
نے اس حسن تدبیر سے فرمایا کہ ۱۴ دن مین غسل صحت کیا دربار شاہی
مین آئے نذر دی خلعت عملی سے سرفراز ہوے خویش خوش گھر
گئے دوسرے دن چوبدار سلطانی نے زبانی انجم الدولہ کے حکم پہنچایا
کہ آپ عہدے سے معزول ہوے سوار نہو جیئے گا اور انتظام اور
کار وبار وزارت بہ بدان عطای خلعت نواب نقی علیخان چھیا سسر
بادشاہ کے مامور ہوئے بعد تین مہینے کے خلعت وزارت پایا

چونکہ یہ بادشاہ نوجوانی مین بادشاہ ہوا اور وائین ملعوی کہا مین تقاضاے

شباب سے طبیعت مائل عیش ہوئی رفتہ رفتہ صحبت گانے بجانے

اور طوائف اور میراثی کی گرم ہوئی انجام افراط و تفریط عیش و عشرت کا

یہ ہوا کہ سوای محلات ممتاز کے کئی بیگمین اور بہت بیبیان زمرۂ متعہ اور نکاح

مین داخل اون کے سوا طوائف گانے بجانے کی خدمت پر مامور

تھین اور بوجہ ایجاد پسندی اور اختراعات شاہی سے کے ملقب بہ پس اور

پریون کے نام زد ہوئین ایک عالیشان عمارت بناکے موسوم بقیصر باغ

کی جسمین سب بیگمات بڑے بڑے سامان اور ٹھاٹھ سے بعیش و

عشرت رہتی تھین ہر ایک بیگم کا انوکھا اور نرالا خطاب اور لقب ہوتی رہا

اور نام دلربا تھا اسیطرح بھڑوے اور میراثی بھی خوشامد اور لگاوٹ سے

دخل اور قرب پیدا کر کے دولہ اور نواب اور بہادر کے خطاب سے

مخاطب ہوے اور انکو لہا روپیہ پیدا کر کے مالامال ہوگئے مگر یہ سب

کمینے اور نالائق تھے چند خواجہ سراؤن نے موافق اسلاف شاہی کے

عروج اور مرتبہ بلند پایا اونمین سے مثل حاجی دیانت الدولہ و حاجی عنبر الدولہ

کئی خواجہ سرا لائق اور وفادار با منش تھے اور علاوہ عیش دوستی

اور ایجاد پسندی اور تکلفات کے اس بادشاہ کو کچھ مرض مثل مالیخولیا وغیرہ

بھی تھا معہذا بقول حافظ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو نفی حکمت مکن از بہر دل عام چند

چنداں صاف اس بادشاہ کے قابل ذکر کے بھی ہیں گو یہ بادشاہ اسقدر

عیاش تھا مگر موافق مذہب شیعہ کے سب عورتیں نکاحی اور متاعی تھیں

بے اسکے کسی عورت نامحرم سے اس بادشاہ نے مقاربت نہ کی اور

نہ کسی کو جبر سے بیگم بنایا اُس کثرت عیش و عشرت اور عالم جوانی اور

سلطنت پر نماز پنجگانہ میں سے کوئی نماز قضا نہیں ہوئی یہ حکم ہاور

اب بھی ہی کہ اگر صبح ہوتے بھی ہم سو جائیں تو بھی زبردستی بے خوف

خطر آنکے پاس ان سب جگا دینا چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہی اور کبھی نماز اور تلاوت قضا

اور ترک نہیں ہوتی ہی — این کار از تو آید و مردان چنین کنند —

یہ بادشاہ اسقدر رحم دل و رقیق القلب ہی کہ باوجود اس قدرت سلطنت

اور زور و روز کے اس سن شباب میں کسی پر طیش اور بیرحمی نہیں کی بلکہ

گالی تک بھی زبان پر نہیں آئی نہ کسی موافق اور مخالف کو ظلم سے ستایا

نہ کسی کی جان لی — باوجود اس سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے

اس بادشاہ میں غرور و نخوت جس سے ہزاروں میں بھی کوئی امیر خالی

نہیں ہوتا نام کو نہ تھا مصرعہ کہ دولت برسی ست نگردی مردی رجیسے

یہ بڑی صفتیں خداداد تھیں ویسے ہی غفلت اور عیش کا عیب بھی تھا

مگر وہ اپنی ذات کے واسطے تھا بے عیب ذات خدا کی ہے چنانچہ

اب بسبب اعتدال قوام جوانی اور سن کے بہ نسبت سابق بہتر بھی ہے اور

وہ باتین خواب وخیال بھی ہوتی جاتی ہین - یہ بادشاہ عادل تھا کسی موافق
اور مخالف یا امیر یا بیگانے کی عدل مین رعایت نہین کی یون ہندستانی
سرکار کے اہلکار جو اپنے کام کے مالک اور مختار معین ہوتے تھے
اگر او بعضون نے کوئی حق تلفی کی تو اینکے نصیب ایک عدل بادشاہ کا
ہو مقدمہ پر الہامی بکان میر مہدی حسن متخلص شمشیر داروغہ عمارت سلطانی
بمقابلہ امانی بیگم داروغہ سرکار نواب مخدرہ عظمی ظہور مین آیا اور بادشاہ نے
عدالت فرمائی وہ مثنوی درۃ التاج مین نظم ہی - اول سال جب یہ بادشاہ
تخت نشین ہوے یہ منظور تھا کہ تمام علاقجات تحصیل سلطانی تحصیل
ہوجاین زمیدار اور تعلقدار اپنے کلا کی معرفت زر آمدنی داخل خزانہ
سلطانی کیا کرین ناظم اور چکلہ دار موقوف ہوجاین کہ یہ علاقون پر جاکر
زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہین رعیت تباہ اور نقصان سرکار بھی
ہوتا ہی لیکن اہلکارون نے کہ اونکی حاصلات لاکھون روپے کی جاتی تھی
اس حکم کو جاری نہونے دیا آغاز مین وکبس نقربی تیرون پر بنام مشغلہ سلطانی
ہمراہ رکاب سرکار بادشاہ رہتے تھے مستغیث اپنی عرضداشتین اومین
ڈالدیتے تھے اور اوسکو بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھولکر حکم لکھتے تھے
اور طبیعت بھی نہایت رسا اور چالاک تھی ترتیب فوج بھی آئین تازہ ہوتی
تھی یعنی قانون رزمیہ زبان فارسی مین موجد طبع عالی تھا تیرہ ور

بانکے دور رسالے اور اختری اور نادری دو پلٹنین تلنگون کی بموجب
ہدایت اور تعلیم بادشاہ کے کام کرتی تھین بادشاہ آپ تو امد لیتے تھے
اور روش اور بول چال سکھاتے تھے ایکدن نواب علی نقی خان نے
عرض کی کہ یہ امر خلاف مزاج صاحب ریذیڈنٹ بہادر کے ہی لہذا بادشاہ
نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا اور ایک میلہ قیصر باغ مین بہ پوشاک جوگیا
بحکم سلطانی تمام ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ ہجری کو ہوتا تھا لہذا چھوٹے بڑے
لڑکے بوڑھے امیر غریب جوگیا لباس پہنے ہوے شریک میلہ ہوتے تھے
وجہ یہ تھی کہ سفید پوش اندر قیصر باغ کے جانے نہ پاتا تھا انگریز امیر ہوگئے

تاریخ میلہ

بہ قیصر باغ چون سلطان عالم	نمودہ میلۂ رنگین و نادر
پی تاریخ این فرخندہ جلسہ	ندا آمد نشاط افزای خاطر ۱۲۶۹ھ

اس میلے کا سامان اور تکلفات اور آرایش قیصر باغ اور چہ چلے
کسیطرح بیان مین نہین آسکتے جسطرح کا بازار وہ کاندار ابھی رنگ
سکتے تھے اور بنیاد اس میلے کی یہ تھی کہ واجد علیشاہ کی چھٹی کی آرزو میں
اونکی مان نے لڑکپن مین جوگیا لباس پہنایا تھا اوسکی سالگرہ اس
لباس سے ہوتی تھی بادشاہ نے عہد سلطنت مین میلہ قرار دیا اور اس
بادشاہ کا تخلص اختر تھا افسانۂ عشق دریای تعشق بحر الفت اور چند دیوان

اور مثنویات اور رسالہ موسیقی وغیرہ تصنیف اور تالیف پادشاہ کی مطبع سلطانی مین چھپی تھی اور پادشاہ کے پانچ شاہزادے بھی اس طرح سے ہیں

ملکہ مخدرہ عظمی نواب پادشاہ محل حسینہ عرف خاص محل سے فرزند

اول مرزا نوشیروان قدر دوم فلک قدر
محمد حیدر علی بہادر مرزا جاوید علی بہادر
جو دیوانے مشہور تھے

سوم کیوان قدر
مرزا محمد جاہد علی بہادر

چہارم ملکہ آفاق تاج النسا نواب معظم بیگم صاحبہ سے
یک فرزند
فریدون قدر مرزا مہر علی بہادر

پنجم نواب حضرت محل صاحبہ سے
برجیس قدر مرزا محمد رمضان علی بہادر
یک فرزند

پہلے مرزا جاوید علی بہادر ولیعہد ہوئے ڈھائی برس کے بعد پھر مرزا محمد جاہد علی ولیعہد ہوئے اور مرزا محمد ہزبر علی بہادر جرنیل ہے ان بادشاہ کو نوابصاحب سے کمال محبت تھی اکثر گئو گھاٹ مین نوابصاحب کے مکان پر تشریف لیجاتے تھے اور دو دو دن چار چار دن وہان رہتے اور نوابصاحب کی کتخدا دو بیٹیان تھین ایک بیٹی کی شادی نواب محسن الدولہ بہادر کے فرزند کے ساتھ بڑی دھوم سے ہوئی اور دوسری بیٹی کا

کہ نواب اختر محل صاحبہ خطاب سے بادشاہ کے ساتھ عقد ہوا بڑی دھوم
اور رونق تھی روشنی نواب کے مکان تک کہ تخمیناً چار میل کا فاصلہ
ہی دو رویہ ٹٹر روشنی کے بندھے تھے اسکے پیچھے تماشائی جابجا کھڑے تھے یعنی بڑے
بڑے دروازے روشنی کے سڑک پر برج کھڑے اور گملے پیچھے
سے بندھے تھے اور عمدہ عمدہ تختیان آرائش ابرک کی برنگ وغیرہ
گلکاریان بنی ہوئی لگی تھین کہ جس سے وہ عالیشان پر تکلف معلوم
ہوتا تھا اور نواب صاحب کے مکان عالیشان مین ہر چہار طرف لب دریا کر آس پاس
اور اسی پار کمال روشنی کی دھوم تھی اور آتشبازی ہر قسم کی آرائش سے
زیادہ امیرون کے خیمہ خانہ باغ مین جابجا نصب تھے مخمل قصب سرو کشتیو پر
اور خیمون مین کم تھی سامان ہر جا جلسہ شاہانہ قابل دید تھا کہ جسکا شمہ بیان سے
باہر ہے سنہ ۱۲۶۳ھ مین عہد سلطنت واجد علی شاہ مین نواب گورنر
جنرل لارڈ ہڈینگ صاحب بہادر بعد فتح ملک پنجاب جب لکھنؤ مین تشریف فرما
ہوئے تو بادشاہ کی ملاقات سے البتہ خوش ہوئے اور ملک کی
بے انتظامی سے شاکی ہوکر بادشاہ سے فرمایا کہ کرنیل جان لو صاحب
سابق رزیڈنٹ نے اس ریاست سے عہد کیا تھا کہ درصورت فتور
و بے انتظامی اہالی سرکار انگلشیہ اس ملک کو قبضہ تصرف مین لاوینگے
اور جو منافع کہ بعد اخراجات بچیگا حوالہ خزانہ شاہی ہوا کریگا لیکن

حکام ولایت کے نزدیک یہ جو بخوبی پسندیدہ ہوئی اور اوسکو عرصہ دراز
ہو چکا اب تک سرکار انگریزی کو انواع و اقسام کی مراعات اس ریاست کی
خاطر مرعی تھی باوجود اسکے اب تک کچھ بندوبست نہو سکا اسپر بادشاہ
نے عذر کیا کہ اور دو برس کی مہلت چاہیے باایں ہمہ یہاں تو وہی عید
شب برات خواب غفلت بدستور رہا دو برس کیا کئی برس
گذر گئے پھر ولایت سے تحریک ہوئی کرنیل سلیمن صاحب بہادر رزیڈنٹ
اول نے اس ریاست کا حال مفصل مشرح تحریر فرمایا چنانچہ حسب تحریک
گورنمنٹ امرا یا بادشاہ کرنیل سلیمن صاحب بہادر نے دورہ فرماکر ایک
رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی اور اوسوقت سے اس بارہ میں متواتر تحریرات
فیما بین گورنر جنرل بہادر اور شاہ اودہ کے رہیں چنانچہ اوسی رپورٹ
کے معاینہ سے سب بے سرو سامانی معلوم ہوئی حکام ولایت کو ایما ہوا
کہ شاہ اودہ اور اوسکے خاندان کے وظائف مقرر ہوں اور انتزاع
سلطنت عمل میں آوے چنانچہ کارپردازان گورنمنٹ نے بجا آوری
اس حکم کی کی بعد سلیمن صاحب کے جنرل اوٹرم صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ
ہوئے اونھیں کے زمانے میں مولوی امیر علی صاحب شہید ہوئے
اس معرکے کا بہت طول بیان ہی مختصر یہ کہ بیٹھے بٹھائے حمیت
مذہبی سے مولوی صاحب آمادہ استیصال مندہان گڑھی کے ہوئے

اور اکثر اشتغال کے اور امداد اشخاص جو ضلع اور شہر کے نا عاقبت اندیشون
کی تھی حالت مذہبی تو مشہور ہی ہے چند ارکین سلطنت شاہی نے بہت کچھ
سمجھایا نہ مانا آخر کار ضلع دریاباد کے مقام ہنڈولا میں مسلمانون کا معرکہ
ہوا کہ جسمین فوج شاہی نے واسطے فرو کرنے اس بلوے کے سعی
موفور کی آخر کار جب مولوی صاحب نے نہ مانا تو اوپر فوج شاہی نے
قافیہ تنگ کیا اور اودھ ہندو کچھ بتعمیل حکم اور کچھ بمصلحت وقت اکثر مذہبی
تعصب سے جو جمعیت کثیر مجتمع تھے مقابلے میں ورانے اور مولوی صاحب
اور بہت سے اونکے پیرو اور ہمراہی اس معرکے مین شہید ہوے
آخر زمانہ بادشاہ مین یہ معرکہ بھی انکی بے انتظامیون پر قوی
دلیل ہو گیا غرض تقدیر کے لکھے کو امکان نہین ہی دہونا آخر الامر
۵ فروری ۱۸۵۶ء حسب الایمائے حکام ولایت موجب حکم گورنمنٹ ہند کے
سپاہ جرار گورہ و ہندستانی کانپور سے آکر لکھنؤ کا محاصرہ کیا اور
جنرل اوٹرم صاحب بہادر نے دولتسرای سلطانی پر جاکر بادشاہ کو
منشاء حکم سے اطلاع دی بادشاہ نے مصلحتاً حکم سرکاری کو تسلیم
کیا اور اسیوقت احکام قلمرو مین جاری کرائے گئے کہ آج کی
تاریخ سے اس ملک پر قبضہ سرکار انگلشیہ ہوا غرض باطاعت شاہی
جملہ ارکین و توابع و راجگان و زمینداران وغیرہ نے فرمان طاعت کی تعمیل کی

اس شہر کے رؤسا۔ وامرا بلکہ اکثر اراکین سلطنت اسوقت تک خواب غفلت میں بعض بیخبر تھے جبکہ فوج سرکار نے لکھنو کا محاصرہ کیا اگرچہ بادشاہ کو غریب گورنمنٹ سے اطلاع تھی بلکہ اہلکاران نالایق نے والی ریاست کے دل پہ یہ بات نقش کالحجر کی تھی کہ سلطان عالم ہم خیرخواہوں نے ولایت میں سب بندوبست کر لیا ہی گورنر جنرل اور دیگر حکام کیا ہیں غرض ہمیشہ سبزباغ تزویر دکھاتے رہے وقت انتزاع سلطنت محلات شاہی میں جو کہرام مچا وہ بیان نہیں ہو سکتا شہر میں گھر گھر ماتم تھا سارے شہر میں ہل چل تھی کہ کیا سے کیا ہو گیا عبرت وحسرت کے سوا کیا تھا۔ مادہ تاریخ یہی

مرگ انبوہ بہ از جشن نشاطی دارد

غرہ جمادی الثانی سنہ مذکور کہ ابتدای برہان الملک سے اتک ایک سو چالیس برس ہوتے ہیں عمل انگریزی اودھ میں ہوا۔ القصہ جملہ اراکین سلطنت کے دلون میں خداوند تعالی کے نے یہ ولولہ ڈالا کہ رہا سہا جو کچھ باقی ہی اوسکا بھی خاتمہ بالخیر ہو سب اہلکارون نے بادشاہ کو یہ صلاح دی کہ ولایت میں تشریف لیجا کر حضور ملکہ معظمہ سے داد جوئی کیجاوے ہرچند اس امر کے واسطے بادشاہ کے عزیزون اور اراکین سے ولایت جانے کے واسطے

کیا کم ستم تھے لیکن تقدیر کا اتفاق ایسا ہی تھا کہ لکھنؤ کی رونق اہلبیت کا
نام بھی مٹ جائے عزت عصمت ٹھہر گئی بالآخر مرزا محمد جواد علی بہادر برادر خورد
و مرزا ولیعہد بہادر و جناب عالیہ و محلات وغیرہ باُمید استرداد ملک موروثی
بمعہ امیر نواب منور الدولہ بہادر روانۂ کلکتہ ہوئے مہاراجہ ایشری سنگھ بہادر
رئیس بنارس بگذرانیدن نذر لائقہ اور مہمانداری سے جو شایان عہدیت
اور ریاست کے تھا انسے پیش آئے کہ قیامت تک یادگار رہیگا اور
وہانسے بادشاہ بعد طی راہ دریا ۴ شوال سنہ ایہ کو کلکتے مین پہونچکر
کو ٹھی راجہ بردوان واقع میابرج مین مقیم ہوئے اور اکثر وابستگان
شاہی مثل انجم الدولہ بہادر و حسام الدولہ و فتح الدولہ محمد رضا بیگ بتدریج
پہونچے ۲ شہر ذیقعدہ کو جناب عالیہ متعالیہ اور مرزا سکندر حشمت بہادر اور
مرزا ولیعہد بہادر و شیخ مسیح الدین خان ساکن کاکوری وغیرہ واسطے دادرسی
ناگذشت سلطنت کے بسواری جہاز روانہ لندن ہوئے اور بعد طے
منازل راہ دریای شور منزل مقصود پر پہونچے بھی گوہر مقصود ہنوز ہاتھ
نہ آیا تھا کہ آتش فساد بغاوت فوج باغی سرکاری مشتعل ہوئی اسعرصہ مین
مرزا سکندر حشمت و جناب عالیہ متعالیہ بتقضاے الہی ابجد سرت ناکامی پیرس مین
راہی ملک عدم کے ہوگئے۔

قطعۂ تاریخ

جناب عالیہ رشک مریم و بلقیس — بہم سکندر حشمت بہادر بجاہ

چو ارتحال نمودند در سواد فرنگ — دو چند گشت بعالم ظہور حسرت آہ

دربارہ مغفرتہ تاریخ سال اومیخوانم — دو پارہ قلب ہمہ از دو صدمہ جانکاہ

بعد گذرنے اس سانحے کے آٹھ یا ساڑھے نو برس کے مرزا ولیعہد بہادر حسب الطلب بادشاہ ۷ صفر ۱۲۷۳ ہجری کو ولایت سے کلکتے کو پھرے بقول حافظ —

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل — کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

بیان تفصیل سرگذشت سفر ولایت کی مملو بشکایت اور خالی از عبرت نہیں لہذا طول لاطائل جانکے قلم انداز کی وہ یہی ہے کہ بعد معزولی شاہ اودھ کوعطائے تخت یہ لکھا ہی جو مقرر ہوا تھا اور کل مال و اسباب و جایداد ضبط سرکار رہی مگر نیک نیت سر ہنری لارنس صاحب بہادر نے تخمیناً بیس لاکھہ کا جواہرات منجملہ مال شاہی سے بچا رکھا تھا جو انکو کلکتے مین دیا اور اوس سے جو بادشاہ پر قرض تھا کچھہ ادا ہوا ایک سال پانچ مہینے گیارہ دن لغایہ آخر ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری عملداری انگریزی بخوبی رہی کرنیل اوٹرم صاحب بہادر چیف کمشنر اور میجر بنکس صاحب بہادر اسکے کرنیل سر ہنری لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر تھے کہ ناگاہ نمکحرامی و حق فراموشی سے سپاہ سرکاری نے نشان بغاوت بلند کیا چنانچہ اودہ مین بھی ماہ جون ۱۸۵۷ع مین بغاوت فوج ہوئی ۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری برجیس قدر مرزا محمد رمضان علیخان کو مسند حکومت پر

بٹھا کر اپنا بادشاہ بنایا اور بدستور سلطنت قائم کی۔ تاریخ یہ ہے

رکن دین کیوان مکان ز بہ جلیل قدر انجم سپاہ

شرف الدولہ محمد ابراہیم خان نائب تھے اور ممو خان بخطاب علی
داروغہ دیوان عام ہوے اسطرح سے بہت لوگون کو خدمتین ملین
اور چکلہ دار علاقون پر بدستور مامور ہوے گورکھپور بھی شامل اس ملک
ہوگیا تھا آٹھ مہینے فوج سرکار محصور بیلی گارد سے مقابلہ رہا
باقی رئیس شہر کے سرکار سے موافق رہے جنکے سبب سے جاسوس
دیگر کار ضروری جاری تھے آخر فوج سرکاری کانپور سے آکر شجاعت
استقلال تمام انکو نکال کر کنب عالم باغ مین لے گئی مفصل ذکر اس
دیگر تالیفات مین لکھا جائیگا مگر سبب ثمرہ مہربانی اور حسن انتظام سر جان لارنس صاحب
چیف کمشنر کا تھا جنھون نے شجاعت اور وفا داری مین آپ کو
نثار کیا دوسری بار فوج سرکار مع کمک راجہ جنگ بہادر سرحد
یورش کر کے سرحد لکھنؤ مین پہونچی اور ناکہ ہندولے سے حسین
اور حضرت گنج مین کہ شہر سے پورب طرف واقع ہی در آئی ا
عبور دریاے گومتی محاصرہ مکان شاہی کا ہوا ۷ رجب ۱۲۷۴
اندر مکان کے در آئی سلخ رجب و غرہ شعبان سنہ مذکور تمام
عمل دخل ہوگیا صاحب عالم نوشیروان قدر بہادر فرزند کلان واجد علی

جو ہوا نے مشہور ہے تھے مدنہ گولی سے کہ اونکے مکان سکونت مین برستی تھین مارے گئے اور شرف الدولہ جو نائب تھے درگاہ حضرت عباس مین ملے کے اوپر مردان احمد اللہ شاہ کے ہاتھوں سے باشتباہ سازش سرکار مارے گئے

تاریخ دیا کرشن ریحان

بولا کہ وہ سب شرف ملاٹی مین	بے کھڑوکھنے رہی جو بادشاہ اوسکی سر کا

لکھنو مین عجب ہنگامہ محشر برپا تھا کہ تمام رعیت امیر غریب باوثن اعمال گھر بار اپنے چھوڑ کر بخوف جان یک بینی دو گوش خوف سرکار سے بے سامان خانہ بدوش ہو کر جنگل اور بیر ونجات مین چلے گئے وہ وقت تھا کہ شہزادیوں کو سواری ایک ڈولی کی بھی نعیت تھی اس سبب سے یہ شہر خوب لوٹا گیا اور مرزا برجیس قدر اور حضرت محل صاحبہ مان اونکی ۹ مہینے ۱۸ دن کی حکومت کرکے لکھنؤ سے کنارہ کر کے پار پہونچے وہان مرزا برجیس قدر کی اس لقب سے برجیس قدر محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ کندہ ہوئی وممو خانکو عہدہ وزارت اس خطاب سے ملا ناصر الدولہ نصیر الملک علی محمد خان بہادر منصور جنگ ناظم وعامل بھی باقی ضلعون پر مقرر ہو گئے مگر محاربے اور مجادلے مین بسر ہوئی انجامکار جمادی الاول ۱۲۷۴ ہجری صاحبان

عالیشان بہادر اوتر سے مطمئن ہوکر اودس پار گھاگرہ کے پوہنچے
و سیمینے چند روز یہان مرزا بِرجیس قدر اور اونکی مان حکومت کرکے
نواح ملک نیپال مین سے گئے اور کل ملک پر قرار واقعی بدستور
تسلط سرکار ہوا ملک سے جلد آشوب کا رفع ہونا اور آسودگی و اطمینان
سے رعایای پریشان کا آباد ہونا یہ سب نتیجہ سرکار کی چشم پوشی و استمالت
شاہی کا تھا —

یہ عجب بات ہی اس محل پر قابل ذکر ہی کہ واجد علیشاہ تو ایسے عیاش
اور کاہل و آرام طلب ہون اور اونکی ایک خادمہ حضرت بیگم نام اور دہ سالہ
فرزند ایسا بیباک اور جری نکلے جنکی نکہ توپ تلوار سے بھی نہ جھکی
اور بدعوی سلطنت سرکار سے مقابلہ اور تخالف کیا اور اب حوالی
بھوٹ مین سلامت بنی جا بیٹہیں اگرچہ بیجا بائی اور رانی جھانسی نے
مردانگی مین اور سکندر بیگم والی بھوپال تال نے ریاست اور انتظام مین
اور رانی جندہ مادر والی لاہور نے چالاکی مین اور زینت محل بیگم شاہ
باغی دہلی نے دغا بازی مین نام نکالا مگر اس بیگم لکھنو نے کہ یہان کے
مرد عیاش و آرام طلب ہوتے ہین ایسی باتون کا ظہور مین آنا تعجب
سے آرستہ ہے

بہر زن نیست و نہ ہر مرد مرد — خدا پنج انگشت یکسان نکرد

تعمیرات لکھنؤ

بنا و نقش عمارات شہریاران مین * کہ این سپہر جا مشید چون لیست و شکست
اس شہر مین عہد نواب آصف الدولہ بہادر سے ہر ایک کی عہد
حکومت و سلطنت مین مکانات عمدہ عمدہ تعمیر ہوتے رہتے
شہر کے اوتر کی طرف گومتی کے کنارے کنارے کثرت سے
مکانات شاہی موجود تھے ہنگامہ بلوے سے کے پہلے بعض بعض
مکان سرکاری کام مین آگئے پھر ایام غدر مین توپ کی زد مین
جو مکانات رہ گئے گورے اور گولیون سے بالکل مسمار
اور شکستہ ہو گئے چونکہ بعد انتظام موجودہ مرمت مین صرف
کثیر ہوتا اس سبب سے اکثر مکانات مسمار کیے گئے
اون سبھی کی احوال عبرت مآل بخیال طوالت کتاب قلم انداز کیا گیا۔ شعر
ہر بنا افتادہ مبنی خشت وہ ویرانہ * ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ
اب جس قدر تعمیرات مشہور مشہور باقی ہین حد شرقی سے بسلسلہ
اوس کا شروع ہوکر حد غربی تک تمام کیا جاتا ہے

کوٹھی بیبا پور

جسکو نواب آصف الدولہ نے سیر گاہ و شکار گاہ کے طور پر تعمیر
کروایا تھا اور وہان جاکر سیر و شکار کیا کرتے تھے مگر جنرل صاحب

رزیڈنٹ بہادر سابق لکھنؤ سے تبدیل ہوکر روانہ ہوے اور دوسرے
صاحب بجاے اونکے کارفرما ہوسے تو دوسرے نواب مقلم پرنواب وزیر
بڑے تزک و شان سے واسطے ملاقات صاحب رزیڈنٹ بہادر
کے تشریف لاے وبروقت رخصت صاحب بہادر کو اپنے ساتھ ہاتھی
پر سوار کرواکر کوٹھی رزیڈنٹی مین لیگئے اور اس امر کا تصفیہ ہوا کہ وزیر علی
کو مسند سے برخاست کرکے سعادت علیخان پسر متبنی آصف الدولہ
کو بجاے اونکے مسند نشین کرین اور یہ بات مشہور عام ہے کہ اسی مقام
مین جناب لاٹ صاحب ٹلین ہوتھ بہادر نے دربار اہالیان دربار شاہی
کا فرمایا تھا اور اسی جلسے مین وزیر علی کو حکم معزولی مسند کا سنایا تھا
اور اسی مقام سے اونکو روانہ شہر بنارس کیا تھا جو جگہ
اونکے قیام کیواسطے سرکار سے تجویز ہوئی تھی

کوٹھی دلکشا

اس کوٹھی کو سعادت علیخان نے اپنے سیر و شکار کیواسطے بنوایا تھا
اور جنگل گرد و پیش کو صاف کرا کر ایک چراگاہ مقرر اور اوس مین
جانوران شکاری مثل ہرن وغیرہ چھوڑوا دیے تھے اس کوٹھی مین
اکثر بیگمات بھی سیر کے واسطے آیا کرتی تھین

ولایتی باغ

اس باغ کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تیار کیا تھا اور اوسمین اکثر ولایتی
درخت لگائے تھے اسی وجہ سے اوسکا نام ولایتی باغ مشہور ہوا واجد علی
شاہ نے اوسکی چار دیواری کو وہ بلندی بخشی جواب موجود ہی کیونکہ اونکے
محلات اکثر وہان جاکر سیر کیا کرتے تھے اور اسکے واسطے زنانہ مکان ضرور تھا

کوٹھی مارٹین

جسکو کنسٹین ٹیا بھی انگریزی زبان مین کہتے ہین اوسکو جنرل کلاڈ
مارٹین صاحب نے تعمیر کیا تھا صاحب نے اوسکی تعمیر شروع کی
اور نقشہ نواب آصف الدولہ بہادر کو دکھلایا نوابصاحب نے نقشہ
کو پسند فرماکر خواہش اوسکی خرید فرمانے کی ظاہر کی اور دس لاکھ روپیہ
اوسکی قیمت قرار پائی مگر نوابصاحب کہ مرگئے اس معاملے کو
انجام نہونے دیا اور بعد چند روز کے جنرل مارٹین صاحب بھی فوت
ہوگئے اور یہ تعمیر ناتمام تھی مگر صاحب موصوف نے بنظر اسکے کہ کوئی حکمران آئندہ
اوسکو ضبط کرلے یہ حکم دیا تھا کہ اوسکی لاش اسی مکان مین دفن ہو
اور روپیہ اوسنے واسطے ترتیب مدرسہ کے جمع کیا ہی اوسکے سود
کی آمدنی سے یہ تعمیر اختتام کو پہونچی بیچ ہنگام مفسدہ کے سپاہ مفسدین
نے صاحب کی قبر کھودکر اوسکے استخوان وغیرہ جو باقی رہے تھے اونکو
پاش پاش اور پریشان کردیا تھا مگر بعد فرو ہونے مفسدہ کے جسم

استخوان صاحب کے جو دستیاب ہوئے دوبارہ قبر مین رکھے گئے

نہر گنگ

اس نہر کی کھدوائی نصیر الدین حیدر کے وقت مین شروع ہوئی تھی
اور زر کثیر اوس مین صرف ہوا اور علت غائی اس مطلب سے بہت
مفید اور کارآمد تھی راجہ بختاور سنگہ نے یہ امر شاہ اودہ کے گوشگزار
اور عرض کیا کہ اس نہر سے پانی گنگا کا لکھنو تک آویگا اور اوسکے
سبب سے تجارت اور زراعت کو بہت فائدہ ہوگا بلکہ اونکو ترغیب
وتحریص دیکر شروع کروایا تھا مگر چونکہ یہ امر علم سے تعلق رکھتا ہے
اور کسی صاحب انجنیر کی صلاح اور مشاورہ اسمین نہ تھا اسلیے یہ امر
اختتام کو نہین پہونچا اور اکثر ٹھیکہ داران کو جنھون نے ٹھیکہ
کندہ گی کا لیا تھا متمول کر دیا یعنی وہ لوگ روپیہ لیکر بھاگ گئے
اور اس نہر کو ناتمام چھوڑا ہنگام بلوہ مفسدین نے اسی نہر کو
اپنا اول مورچہ قائم کیا تھا

تعمیرات عہد نواب سعادت علیخان

تعمیرات مفصلہ ذیل سعادت علیخان نے تعمیر کروائی تھین تاکہ شہر غربی
جانب سے ویسا ہی آراستہ ہو جیسا کہ اونکے بھائی غازی الدین نے
شرقی جانب کو درست کیا تھا کوٹھی حیات بخش جسمین صاحب کمشنر رہا

رونق افروز ہین کوٹھی دار الشفا جس مین صاحب بکر تربہادر
تشریف رکھتے ہین کوٹھی بنگیم جس مین توپخانہ اب قائم ہے
کنکڑوالی کوٹھی جس مین برگیڈیر صاحب قیام فرما ہین کوٹھی نور بخش
جس مین صاحب ڈپٹی کمشنر فروکش ہین بادشاہ منزل جس مقام
پراب قیصر باغ طیار ہوا ہے یعنی بازار اور ٹیڑھی کوٹھی انمکانات
مین اکثر صاحبزادے رہا کرتے تھے اور جو خالی تھے وہ نوابصاحب
کے سیر و تماشا کیواسطے آراستہ رہا کرتے تھے جس مکان مین اونکے
دلمین آتا تھا اوس مین سیر و تماشا کرتے تھے اور ٹیڑھی کوٹھی
واسطے سرانجام امور ملکی کے تیار ہوئی تھی جو کام ملکی ہوتا تھا
وہ وہان درپیش ہوتا تھا ان مکانات مین سے اکثر مکانون کے
نام بلوے مین مشہور ہو گئے یعنی کوٹھی حیات بخش مین میجر ہوبرٹ صاحب
جو نہایت دلیر و شجاع تھے جان بحق تسلیم ہوے اور بیگم کی کوٹھی مین
بہت سے سپاہیان شجاعت شعار نے ہاتھ مفسدین سے
شربت ممات پیا کوٹھی نور بخش کے بالاخانے سے سر ہنری
ہولک صاحب تیسری مورچال مفسدین پر گولہ مارتے تھے اور
راستا قیصر باغ کا نکالا تھا اور اس کوٹھی پر مفسدین کے گولے
اسقدر لگے تھے کہ اب تک نشان گولونکا اوسکی دیوار پر موجود ہے

اور اسقدر کثرت سے ہے کہ گویا دیوار چھلنی ہو گئی ہے

سبطین آباد یعنی مقبرۂ امجد علی شاہ چہارم پادشاہ اودھ

جس مین اب گرجا گھر قرار پایا ہے اور جسکو عوام غلطی سے چھوٹا امامباڑہ بھی کہتے ہیں

مادۂ تاریخ

آرامگاہ ظل اللہ

۱۲۶۴

سکندر باغ

تعمیر کردۂ واجد علی شاہ جو شاہ ممدوح نے سکندر بیگم کو عطا کیا تھا اور اسی سبب سے بنام سکندر باغ مشہور ہوا اس مین کوئی چیز قابل تعریف نہین مگر یہ کہ اس مین ہنگام بلوہ سپہ سالار بہادر افواج سرکاری نے قریب دو ہزار سپاہ مفسدین کو سزا دی تھی اور اونکی لاشین بہتیری اوسی مین دفن ہوئی تھین اور بہت اوس اسی مین پڑی رہین جو شمالی اور مشرقی جانب باغ کی جاتا تھا

قدم رسول

ایک مذہبی مقام اہل اسلام کا جسکو غازی الدین حیدر نے ایک مقام بلند تیار کروا کر تعمیر کیا تھا اوس مین ایک سنگ پارہ ہے جو عرب سے ایک حاجی لایا تھا اور جسپر نقش قدم پیغمبر کے تھے ہنگام بلوہ سنگ پارہ مذکور گم ہو گیا اگر کوئی اوسکا لیجانے والا معلوم نہوا

نجف اشرف

جو بنام شاہ نجف مشہور ہی اوسکو غازی الدین حیدر نے اپنا مقبرہ بنوایا تھا اور اوسی مین دفن بھی ہوے ہین اس مقام کو یہ نام اسواسطے دیا گیا تھا کہ ایک مقام کوہ نجف ہی جسپر قبر حضرت علیؓ داماد حضرت محمد پیغمبر کی تعمیر ہی اور مشہور یہ ہی کہ یہ مقبرہ اوسکی نقل بنا ہی اور غازی الدین حیدر نے کچھ روپیہ واسطے مصارف اس مقبرے کے سرکار مین جمع کر دیا تھا جسکے سود سے خرچ اس تعمیر کی مرمت کا اور تنخواہ عملہ مقبرہ کی مثل سید وغیرہ ہوتا ہی اس مقام پر بھی سپہ سالار افواج سرکاری کو بمقابلہ مفسدین بڑی تکلیف اوٹھانی پڑی تھی اور مفسدین نے یہان نہایت سخت مقابلہ کیا تھا اس مقام پر ہنگام جنگ ۱۸۵۷ع سر ولیم پیل صاحب کی بھاری توپین آئی تھین اور دو گھنٹے تک اونکے گولے اسیر کرتے رہے اور اسی مقام پر جو گنبد پر ہوٹ صاحب نے کار نمایان کیا تھا یعنی تنہا واسطے تلاش چور راستے کی گئے تھے اور ایک کھڑکی دریافت بھی کی تھی مگر اسی عرصے مین اتفاقاً توپ کے صدمے سے دیوار شق ہو گئی تھی اور سپاہ سرکار اوس شق کے راستے سے اس مکان مین داخل ہو گئی تھی ٭

تاریخ

با حسن عقیدت نجف اشرف آ	فرمود بنا بہمند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم ز عقل	ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر

۱۲۴۲ ہجری

تعمیرات موتی محل

تعمیر کردہ سعادت علیخان شمال کی جانب احاطہ کے ہی اور موتی محل
اسواسطے نام رکھا گیا تھا کہ اس مین ایک برج بنا تھا جو بشکل موتی
کے تھا مگر اب وہ مسمار ہو گیا ہی دوسرے مبارک منزل اور تیسرے
شاہ منزل مبارک منزل غازی الدین حیدر نے کنارہ دریا پر تعمیر
کیا تھا اور شاہ منزل جہان اب پل کشتیونکا ہی اور اس منزل سے
مبارک منزل بجانب شرق تھا شاہ منزل واسطے لڑائی حیوانات کے
تعمیر ہوا تھا چھوٹے چھوٹے جانورونکی لڑائی اندر احاطہ شاہ منزل کے
ہوا کرتی تھی اور شیر وغیرہ کی لڑائی بھی اوسی احاطے مین ہوتی تھی
اسواسطے مضبوط کٹہرے اور ستونکے مابین تماشا دیکھنے والونکے لیے
تعمیر ہوئے تھے مگر لڑائی ہاتھی اور گینڈے کی دریا پار سے ان مین حضوری باغ
کے سامنے ہوا کرتی تھی کیونکہ ایسی حیوانات کی لڑائی کی سیر کے
واسطے فاصلہ بہت ضرور ہی اور شاہ اور دیگر ارکان سلطنت
بر آمدہ شاہ منزل پر سے دیکھا کرتے تھے ✢

خورشید منزل

اس تعمیر کو سعادت علیخان نے شروع کیا تھا اور غازی الدین حیدر نے ختم کیا مگر کسی خاص مطلب کیواسطے یہ عمارت نہین بنی تھی اور بعد تسلط ملک اوس مین سکونت ۳۲ رجمنٹ کا قرار پائی تھی ۔

تارا والی کوٹھی

اس تعمیر کو نصیر الدین حیدر نے بہدایت اور سر براہکاری کرنیل دلکوکس صاحب کی جو منجم شاہی تھے تعمیر کروایا تھا اور آلہ نجوم بھی اوس مین نہایت اچھے رکھے گئے تھے ۱۸۴۷ء مین کرنیل صاحب ممدوح مر گئے اور واجد علی شاہ نے عملہ صاحب مرحوم کو برخاست کر دیا اور آلہ نجوم بحفاظت رکھے گئے مگر مفسدے مین گم ہو گئے کہین انکا پتا نہ ملا اس سے گمان کیا جاتا ہے کہ مفسدین نے انکو توڑ ڈالا ہو گا مولوی فیض آباد احمد اللہ شاہ نے جنکو ڈنکہ شاہ بھی کہتے تھے اس سبب سے کہ جب وہ سوار ہوتے تھے تو انکے آگے ڈنکہ بجا کرتا تھا ہنگام بلوہ اس مقام کو قیام گاہ اپنا قرار دیا تھا اور کونسل مفسدین کی اکثر اسی مقام مین جمع ہوا کرتی تھی

میدان

جو درمیان کوٹھی مذکورا و قیصر باغ کے

واقع ہی اس میدان کی حکایت از بس حیرت آمیز باقی ہی یعنی اس میدان مین
دو گروہ صاحبان عالیشان کے جنکے ایک گروہ مین تو وہ صاحب
لوگ تھے جو راجہ دنبور یہ سے نہ بھیجے تھے اور وہ لوگ جو ملی گارد سے
بھاگ کر شہر مین گرفتار دام مفسدین ہوئے تھے اور اس مین مس
جیکس صاحبہ اور میم گرین صاحبہ اور میم ریجرز صاحبہ اور کیرو صاحب اور
سلیون صاحب تاریخ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء اور دوسرے گروہ مین قبیح باز
احسان مندی و مہمان نوازی راجہ متھولی کی جس مین مسٹر جیکس صاحب
او کپتان آرمبر صاحب او لفٹننٹ بیرنز صاحب سرجنٹ مورٹن صاحب
تاریخ ۱۶ ماہ نومبر ۱۸۵۷ء تھی قصہ بیماری و قید و ہجر میتی و ناامیدی کو ختم
کر کے مفسدون کی بیرحمی سے راہی ملک بقا ہوئے اور واسطے
یادگاران امور قبیحہ کے ایک عمارت مقابات واردات پر بنائی
گئی ہی دونون یہ واردات باعث غصہ سپاہیان مغلوب کے واقع ہوئی
تھین جب اونسے مقابلہ فوج ظفر موج جنرل ہیولوک صاحب اور سپہ سالار
بہادر افواج ہند کی کوئی بات بن نہ پڑی مگر دونون مین ترغیب اور
تائید سرگروہان مفسدین اور رئیسان اودہ کی تھی ایک ان رئیسون مین
سے یعنی راجہ جی لال سنگہ جو ایک بڑا رئیس ملک تھا اور جسکی خاطرداری
درمیان مفسدونکی بہت تھی اور جو ساتھہ گروہ اول سے کے قتل گاہ تک

گیا تھا اور ایک دروازہ قیصر باغ پر جواب منہدم ہوگیا ہی اس مراد سے چڑھا تھا کہ سیر اس واقعہ قبیحہ کا اچھی طرح دیکھے کہ کیونکر تڑپ تڑپ کر یہ لوگ جان دیتے ہین اور کارگزاری اپنی سپاہ کی کہ کسطرح اونپر ہاتھہ صاف کرتے ہین دو برس بعد اس واقعہ کے وہ بھیجہ ذیل عاطفت سرکار مین آیا اور اوسکی سرکشی پر بھی چشم پوشی کی گئی اور اوسکے دل مین یقین واثق ہوگیا کہ تحسر و تکدر واقعہ معلومہ کا اب صاحبون کے دل سے دور ہوگیا اور گویا اب وہ اپنی موت مریگا اور سب سے ملاقات ہوگی مگر انصاف نے مجرم کا پیچھا نچھوڑا اگو مدت مطلب بر آیا مگر اتفاقاً اوریکایک اوسکے سر آ پڑی اور اوس طرف سے آئی جسطرف سے اوسے بالکل اطمینان حاصل تھا یعنی اوسکے معتمد ملازم اوسکے مخالف ہوگئے اور ثبوت پر ثبوت اس امر کا بخلاف اوسکے ظاہر ہوتا گیا اور اوسکے سر پر بوجھہ اس گناہ کا بھاری کرتا گیا کہ بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء اوسی مقام پر کہ جہان یہ واقعہ ہوا تھا اس راجہ نے سزا اپنے پھانسی پائی اور بعد ازان بتاریخ ۱۲ ماہ مذکور بندہ حسین اور فتح علی کو بھی جو چند صاحبان کو اور مقامات سے گرفتار کر لائی تھی سزای پھانسی ہوئی

ایک نہایت عمدہ تعمیر عہد واجد علی شاہ کی ہے یہ تعمیر ۱۸۴۸ء مین
شروع ہوئی تھی اور ۱۸۵۰ء مین ختم ہوئی اور مع اسباب سامان
آرایش کے اس مین اسّی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا وجہ تسمیہ
اس نام کی یہ ہی کہ بادشاہان اودہ اپنی مہر وغیرہ مین لقب قیصر
کا لکھا کرتے تھے کیونکہ قیصر خطاب بادشاہ روم کا ہی اور شاہ
روم بڑا بزرگ اور نامی بادشاہ اہل اسلام ہی اس تعمیر کے بیان کرنے
مین لازم ہی کہ ایک جانب سے بیان شروع ہو اور بہتر یہ ہے
کہ دروازہ شمالی اور شرقی سے شروع ہو جو دروازہ روبرو اوس میدان
کے واقع ہی جو سامنے تارا والی کوٹھی کے تعمیر کیا گیا ہی اسی دروازے
مین سے اور بعد ازان ایک کھڑکی مین سے جواب بند ہے
بدمعاش گرفتار شدہ اپنے قید خانے مین پہونچاے گئے تھے اس
دروازے سے آگے جا کر ایک صحن وسیع روبرو دروازہ جلو خانہ
کے ہی اس صحن مین سواری اور جلو شاہی تیار ہو کر آراستہ ہوا کرتی تھی
یہانسے آگے جا کر ایک دروازہ ہی اوس پر دہ پڑا تھا اوس سے
گذر کر چینی باغ ہے اسکا نام چینی باغ اسواسطے تھا کہ اوس مین
اسباب چینی کا باغ کی آرایش کے لیے تھا وہانسے آگے جا کر
اور ایک دروازے سے گذر کر حضرت باغ ہی اس باغ کی جانب ابت

چاندی والی بارہ دری ہی اس بارہ دری مین فرش چاندی یعنی نقرہ کا تھا
اور اوسی جانب خاص مقام اور پادشاہ منزل ہی جس مین خاص کر پادشاہ
رہا کرتی تھی اس پادشاہ منزل کا بیان پیشتر ہوچکا ہی کہ اوسکو سعادت علیخان
نے تعمیر کرایا تھا اب واجد علی شاہ نے اوسکو اپنے نقشہ قیصر باغ مین شامل
کرایا تھا اوس دروازے پر جس سے گذر کر حضرت باغ کو آتے ہین
نواب علی نقی خان وزیر اس مراد سے رہتا تھا کہ ہمیشہ قریب پادشاہ
کے رہے اور ہر وقت پادشاہ کی حرکات سے خبر لیتا رہے سب جانب
جب اس مکان سے کے تعمیرات جو لکھی ہین یہ تعمیرات عظیم اللہ خان حجام
شاہی نے بنوائی تھین اور پادشاہ کے ہاتھ چار لاکھ روپے کو بیچ
ڈالی تھین ان تعمیرات مین خاص خاص محلات شاہی اور خاص محل صاحبہ رہتی تھین ز
اور بیگم نفسنہ بھی انھین تعمیرات مین رہتی تھی اور ایک اصطبل مین
جو متصل ہے قیدیان انگلشیہ کے ہفتے تک مقید تھی یہان سے
آگے چلکر ایک درخت ہی جسکے نیچے سنگ مرمر کا فرش کیا گیا ہے
اور اس درخت کے نیچے واجد علی شاہ زرد کپڑے شکل فقیران پہنکر جوگی
میلے کے دنون مین بیٹھا کرتے تھے یہانسے آگے بڑھکر لکھنی دروازہ
ہی جسکی تعمیر مین لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور اوسکے آگے چوک خاص قیصر باغ
کا ہی جسکے گرد بقدر مکانات ہین سب مین حرم شاہی رہا کرتی تھین

بجاہ گست یہان ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور اوس سے شہر والے
بغیر مزاحمت کے بار پاتے تھے اس سے آگے پتھر والی بارہ دری ہے
جس مین اب تماشا گاہ مقرر ہوا ہی اور لکھی دروازہ مغربی سے غرب
کیطرف قیصر پسند ہی جسکے گرد نصف دائرہ ملمع طلا کا بنا ہوا ہی اسکو
روشن الدولہ وزیر نصیر الدین حیدر نے تعمیر کیا تھا اور واجد علی شاہ
نے ضبط کر کے معشوق السلطان اور محل خاص کو عطا کیا تھا یہ دروازہ
بھی اوسی مقام کا سا ہی جیسا مغربی لکھی دروازہ ہی اور اس تعمیر کے نیچے کے
مکانات مین جنٹن انگلشیہ جو دہوررہرے سے آئے تھے مقید تھے
اور یہانسے قتل گاہ کو پونہچائے گئے تھے بجانب راست اس مکان
کے ایک اور جلوخانہ اوسی قسم کا جیسا بجانب مشرق بیان کیا گیا ہی
اسمین سے محلات مین گذر کر اوسکے نیچے کی جانب چلکر باہر حدود
قیصر باغ کے جو روبرو شیر دروازے کے ہی آتے ہین اس شیر دروازہ
کو نیل دروازہ بھی کہتے ہین کیونکہ اسی دروازے مین جنرل نیل صاحب
گراب کے گولے سے جو قیصر باغ کے دروازہ کی توپون سے
آیا تھا جان بحق ہوے تھے

تاریخ

دل رضوان بجنبش گفت باز کی	جو قیصر باغ را تعمیر فرمود

بصد جوشش بهارش کلک شمشیر	نوشته سال آن باغ مبارک

تاریخ نهر سنگین قیصر باغ که خطاب او چشمه حسن است ۱۲۶۹

حضرت سلطان عالم ابر جود و بحر عدل	ساحل دریای رحمت قلزم حسن صفا
نهر سنگ ابیض از حکمش بنا شد با زیب و تاب	صورت عین کرم شد چشمه نهر التفات
سال طیاری سروش غیب از شمشیر گفت	چشمه حسن آبروی منبع آب حیات

تاریخ باره دری سنگین واقع قیصر باغ ۱۲۶۹

چون حضرت سلطان عالم شاه اختر دین پناه	دامه تجلی شاه زمن خاقان تمام قیصر حشم
فرمود این باره دری سنگین بصد خوبی بنا	از بهر تشریف آوری مقدم شاه امم
از حسن نیت چونکه ند چار و ده معصوم شد	نظاره عتبات عالیات گردید بهم
آمد چو کس نهر بارت اندر آن عنوان دهد	آواز طبتم فادخلوها خالدین در هر قدم
شمشیر چون تاریخ آن پرسید از روح الامین	گفتا مکرر از ادب قیصر از قصر ارم

تاریخ باره دری نگینه والی واقع حضرت باغ ۱۲۶۹

زهی قصر صفا شد بحضرت باغ تعمیر	از امکان تنها بدنما زهر جلد برین هند
پی سالش چو جستم کلک شمشیر این رقم کرد	شد از باره دری باتمکین نگین هند

تاریخ دروازه اول قیصر باغ ۱۲۶۹

ساخت قیصر باغ چون شاه زمان	شد درش از رشک در باغ جنان
زد رقم شمشیر بر محراب آن	سال دروازه در باغ جهان

تاریخ دروازہ دوم

در باغ قیصر بلند رفیع	کہ پایندازان کیف زیاد ورند
در نیاب غلمشیر گرد چو فلک	ندا داد رضوان در باغ ہند

۱۲۴۶ ہجری

مقبرۂ سعادت علی خان

درمیان گوشۂ قیصر باغ اور چینی بازار کے دو قبرین ہین ایک تو سعادت علیخان کی جنکو بعد مرگ جنت آرامگاہ کہتے ہین دوسری اونکی بیگم مرشدزادی کی یہ دونوں قبرین ان دونونکی وفات کے بعد غازی الدین حیدر نے تعمیر کرائی تھین اس سے محبت ملشری ظاہر ہی اس مقام پر اول ایک مکان تھا جس مین غازی الدین حیدر یہ خود حین حیات رہتے تھے اور ایک بات مشہور ہے کہ جب غازی الدین حیدر تخت پہ بیٹھے تو ظاہر کیا کہ جب مین سعادت علی خان کے تخت اور محل پر قابض ہوا تو مجھے لازم ہی کہ اپنا مکان اون کو دون اسی خیال سے فوراً حکم دیا کہ جس مکان مین وہ رہتے تھے اوسکو مسمار کر کے ایک قبر سعادت علیخان کی تعمیر ہو + +

مکان چہتر منزل

جسکو نصیر الدین حیدر نے واسطے سکونت محلات حرم کے تعمیر کیا تھا اور جسکے متصل کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کیواسطے بنوائی تھی

اس مکان کا نام چھتر منزل اسواسطے قرار پایا تھا کہ اوسکے اوپر چھتر طلائی
بنے تھے اور نہ اس لحاظ سے یہ نام اوسکو دیا تھا کہ وہ چہار منزلہ ہے
جیسے بعض بعض تصور کرتے ہین اس مکان کے ایک جانب
کچہری صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی ہے اس مکان کی وہ طرف جو جانب
دریا ہے اور جسپر نشان گولہای باتواپ جنرل اوٹرم صاحب کے موجود ہین
واسطے دربار عام اور دیگر امور عامہ کے تیار ہوتا ہے

کوٹھی فرحت بخش

یہ کوٹھی عہد سعادت علیخان سے محل شاہی تھا اور واجد علی شاہ
کے اوس عہد تک مقام قیام شاہ رہا جب تک قیصر باغ تیار
نہین ہوا تھا اس کوٹھی کی وہ جانب جو بطرف دریا ہے اوسکو جنرل
مارٹین صاحب نے تعمیر کرکے نواب وزیر کے ہاتھ فروخت کیا تھا
باقی تعمیرات جو اس سے ملحق تھین اور تختگاہ سب سعادت علیخان
نے بنوائی تھین ان تعمیرات مین تختگاہ جسکو قصر السلطان کہتے تھے
اور اب یہ مکان یادگارانہ مرمت ہوکر خالی پڑا ہے وہ صرف واسطے دربار شاہی
کے آراستہ ہوا تھا اور جب کبھی نیا بادشاہ جلوس کرتا تھا تو اوسکو
صاحب رزیڈنٹ اس محل مین تخت نشین کرتے تھے اور نذر
دیتے تھے اس نذر سے مراد یہ تھی کہ سرکار گورنمنٹ نے اسکی تخت نشینی

کو منظور فرمایا اسی کوٹھی میں بادشاہ بیگم نے مناجان کو تخت پر بٹھانے
کا ارادہ کیا تھا اور جسکا حال مسٹر بابو سلیمن صاحب نے اپنی تواریخ
اودھ کی دوسری جلد میں تحریر کیا ہے اور اسی کوٹھی میں اوس وقت
جھ سیکن ہمراہی بادشاہ بیگم نے کرنیل لو صاحب رزیڈنٹ پر ارادہ
جبریہ نذر دلوانے مناجان کا حکم کیا تھا بدین لحاظ کہ اگر نذر گذر جاویگی
تو تخت نشینی مناجان کی صدر گورنمنٹ تک ثابت ہو جاے گی

کوٹھی رزیڈنسی

یہ کوٹھی بہت مشہور ہے اور اسکا بیان مفصل ضروری ہے جب نواب
آصف الدولہ بہادر دولت خانے مین رہتے تھے جسکا حال
دفعہ ۴۲ مین درج ہے صاحب رزیڈنٹ بہادر اوسکے ایک مکان
مین تشریف رکھا کرتے تھے لیکن جب نواب سعادت علی خان نے
کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کو بنوائی تو اوسکے نزدیک ایک
کوٹھی صاحب رزیڈنٹ کے واسطے بھی تعمیر ہوئی اور اول میں اس
کوٹھی رزیڈنسی میں کوئی پہرہ جنگی نہین رہتا تھا مگر جب کرنیل سلی صاحب
رزیڈنٹ مقرر ہوے تو اونکے ہمراہ ایک گارد تعینات ہوا تھا
اور ایک مکان بھی دروازۂ احاطہ رزیڈنسی کے نزدیک اوسکو اگر
سعادت علیخان نے بنوا دیا تھا اور یہ دروازہ تمام بنام بیلی گارد

دروازہ بیلی گارد مشہور ہو گیا اس تمہ کا نقشہ اور بیان گنس صاحب نے
اپنی کتاب مین اور دیگر کتب مین تفصیل بیان کیا ہی اور اب بیان
اوسکا اس مختصر مین موجب طوالت ہے

پل آہنی

یہ پل حسب الحکم بادشاہ غازی الدین حیدر کے ولایت انگلستان
سے طلب ہوا تھا مگر قبل آنے پل مذکور کے وہ آپ شتابا در نجر
بقا ہوے اور اونکے لڑکے نصیر الدین حیدر نے بعد تخت نشینی
کے سنکلیر صاحب کو جو اونکا ملازم تھا اوسکی درستی کا ٹھیکہ کر دیا
صاحب موصوف نے کچھ کوٹھیان واسطے اوسکے برپا کرنے
سبب کے ہو بروی کوٹھی ریذیڈنسی کے یہان ایک چھوٹا سا گھاٹ
اور شوالہ ایرہو ی دریا واقع ہی گلائین اور یہ کوٹھیان اب تک نمودار
ہین مگر اوس سے اسکی درستی نہو سکی اور اسی سبب سے
پل مذکور برپا نہوا تا وقتیکہ امجد علی شاہ بعد محمد علی شاہ کے
تخت نشین ہوئے اور اس بادشاہ نے ارادہ کیا
اور اپنے عزم کو ختم بھی کیا یعنے پل آہنی قائم ہو گیا

تاریخ پل آہنی از منشی ظفر علی اسیر

ان بادشاہ عادل کز حکم محکم او	گردید آہنی پل بر گومتی مودار

فرمود حکم سلطان تاریخ نظم کردم	چون حکم شاہ محکم چون عدل شاہ ہموار
	۱۲۲۲

پل پختہ

نواب آصف الدولہ بہادر نے قریب شاہ ... کے تعمیر کیا تھا

تاریخ

پل نو بنا گشت بر گومتی	بتدبیر نیک و بعقل رزین
چو از نیم خود سال از خواستم	بگفتا پل استوار و متین
	۱۲۲۶

قلعہ مچھی بھون

یہ قلعہ جسقدر سابق مین تھا جسکا نام اصل مچھی بھون ہے اوس سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے سابق مچھی بھون صرف اوسقدر تھا جسقدر بروج پختہ سڑک کے جنوب کی جانب موجود ہین اور یہی قائدہ لکھنو تھا اور بہت سی قلعہ ذو سو برس پیشتر مشہور تھا ایک مثل قدیم مشہور ہے کہ جسکے پاس قلعہ مذکور ہوگا وہی مالک شہر لکھنو ہوگا اس سالے کے شروع مین جو مختصر حال لکھنو لکھا ہے اوسمین احوال اور نام اس قلعے کا درج ہی اور وہ ٹیلہ جو راستے کے بیچ مین درمیان گھنو گھٹ قلعہ سے گنگا واقع ہی اور جسکے اوپر مسجد بنی ہوئی ہی وہ لچھمن ٹیلہ مشہور ہی اور اسی جگہ سابق لچھمن پور آباد تھا عقب مچھی بھون خاص کے ... خوب

و مغرب ایک میدان ہے جس مین توپخانے کا گودام ہی اوس مقام
پر رنگ محل اور پنج محلہ آباد تھے اور یہ پنج محلہ نہایت قدیم مکانات
شہر لکھنؤ کے تھے جنکو خاندان شیخان نے جو سابق حاکم اس
جگہ کے تھے تعمیر کیا تھا جب سعادت خان جو مورث اعلے
خاندان شاہی اس ملک کی تھے ۱۷۳۲ء مین صوبہ دار ہو کر یہان آئے
تو یہ مکانات بکرایہ جاوے ماہانہ مالکان مکانات سے
لیے تھے اور روپیہ کرایے کا اونکے عہد تک ادا ہوتا گیا مگر اون کے
وارثون نے بباعث تخلف آرای بادشاہان لکھنؤ کے اونکو
مال سرکار تصور کیا اور صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے تو البتہ
اس عمل کو جاری رکھا کہ زر کرایے کا مالکان مکانات مذکورہ کو دیا
مگر زر کرایہ ادا نہین کیا لیکن آصف الدولہ نے یہ عمل بھی ترک کیا
اور مکانات کو بالکل ضبط سرکار کر لیا یہ بات محتاج بیان کی نہین
بلکہ مشہور عام ہی کہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء مین جو فوج سرکاری اوسمین
تھی اوسنے کسطرح اس قلعے کو خالی کیا تھا اور کیونکر بیلی گارد
کی جا کر شامل ہوئی تھی اور کس حکمت و مطلب پر آری ہی اس قلعی کو
فوج سرکاری نے بروقت یہانسے نکل جانیکے اڑا دیا تھا

برا امام باڑہ

یہ عمارت گویا تعمیرات لکھنؤ مین ازہمہ بہتر و اعظم ہی اور نواب آصف الدولہ
کی سلطنت کے کارہای عظام مین سے عظیم تر مشہور ہی کہ نواب
ممدوح نے بیشمار روپیہ اسکی تعمیر مین صرف کیا ہی اور عوام مین مشہور
ہی کہ اس مین دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہی شاید اس مین کچھ
مبالغہ بھی ہو کیونکہ قول ہندیان ایسے مقام مین ہمیشہ ساتھ مبالغہ
کے ہوا کرتا ہے کارگیر اس کام کیواسطے بہت دور دور سے طلب
ہوئے تھے اور سبکو حکم ہوا تھا کہ اپنی اپنی رای سے نقشجات
واسطے اس مکان کے پیش کرین صرف تاکید یہ تھی کہ کسی عمارت
کی نقل نہو اور یہ مکان ایسا تیار ہو کہ کبھی ایسا پیشتر نہ بنا ہو
اور جتنی تعمیرات مشہورہ ہین سب سے زیادہ خوش قطع اور خوش
اسلوب ہو کفایت اللہ ایک شخص تھا جسکی تدبیر سے یہ تیار ہوا ہے
اور جیسا وہ اب موجود ہے اوس سے ظاہر ہے کہ جو شرط
نواب کی تھین اونمین کمی نہین ہوئی ہی یہ عمارت اوسیقدر مضبوط
ہی جسقدر خوبصورت اور خوش قطع ہی بنیاد اسکی بہت عمیق ہے
اور ساری عمارات مین لکڑی کا کام بالکل نہین ہے اوسکی در
وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہی اور نواب آصف الدولہ بہادر
بعد وفات کے اسی مقام مین دفن ہوئے ہین ❊

تاریخ امام بارہ کلان

کرد نواب آصف الدولہ	چون بنا جای عزم حسین بیقین
داد ہاتف خبر ز تاریخش	روضۂ امجد امام دین

۱۲۲۵

جامع مسجد

یہ عمارت متصل امام باڑے کے ہے اور لائق تعریف نہین
یہ مسجد نقل ہے اوس جامع مسجد کی جو شہر دہلی مین ہے

رومی دروازہ

یہ دروازہ بھی نواب آصف الدولہ کے وقت مین تعمیر ہوا ہے اور
مشہور ہے کہ نقل دروازۂ روم کی ہے مگر جو لوگ روم کو
دیکھہ آئے ہین وہ بیان کرتے ہین کہ ایسا دروازہ کوئی
شہر روم مین نہین ہے غالب ہے کہ نواب کو کسی شخص نے
مغالطہ دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا کہ نقل دروازۂ روم کی بنے
تو اس مین شک نہین کہ دو صد نقشہ دروازہ ہای روم
دوسرے ہی روز اوسکے سامنے پیش ہوتے یہ دروازہ
اور امام باڑہ کلان دونون اوس زمانے مین بنا شروع
ہوئے تھے کہ جب لکھنو مین قحط سالی تھی اور اسی لحاظ سے
یہ عمارات عالی شروع ہوئی تھین کہ جس سے غربا باشندۂ شہر و دیگر باز بہ

دولتخانہ

اس دروازے سے جو غرب کو چلو تو دولتخانہ یا محل قدیم لکھنو بجانب راست رہتا ہی یہ تعمیر یعنی دولتخانہ مشتمل ہے اور متعدد مکانات کے جو متصل ایک دوسرے کے ہین مگر اونمین کچھہ ہنر معمار نکا صرف نہین ہوا ہی ان مکانات مین نواب آصف الدولہ اور اونکے عملے رہا کرتے تھے جب نواب نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنو کو اپنا دار القرار ٹھہرایا تھا اور خاص محل نواب کا اوسیکے نام سے مشہور تھا یعنی جس مکانمین وہ آپ رہا کرتے تھے اوسکو آصفی کوٹھی کہا کرتے تھے مگر جب سعادت علی خان بعد اونکے مسند نشین ہوے اور مقام اپنا اونھون نے فرحت بخش مین مقرر کیا تھا تو یہ مکانات خالی رہے اور اسی سبب سے خستہ اور شکستہ ہو گئے

امام باڑہ حسین آباد

صرف یہ عمارت محمد علی شاہ سوم بادشاہ کے زمانے مین تیار ہوئی تھی اور ہر چند اس مین کچھہ کاریگری صرف نہین ہوئی ہے مگر خوش اسلوبی مین کسی اور عمارت لکھنو سے کم نہین اسکا باغ جو مربع ہی اوسکی خوشی وخوبی کو اون عمارات نے جو اوسمین بطور نمونہ تاج روضہ کے بنی ہین اور چھوٹی چھوٹی عمارات جو اوسمین ہین اونھون نے

خراب کر دیا ہی اس حسین آباد مین بڑی رونق معلوم ہوتی ہی جب اوسمیں
شبکو روشنی ہوا کرتی ہی اور جب لکھنو مین سلطنت تھی تو محرم مین
بڑی دھوم ہوا کرتی تھی محمد علی شاہ نے اپنی والدہ ارشدی کو اوسمین دفن
کیا ہے اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ اونکا جنازہ بھی اوسمین دفن ہو اور
زر کثیر واسطے تزاید رونق اس امام باڑے کے نام نہاد
کیا تھا جو داروغہ ہتمم اس امام باڑہ کا قبل از بلوے کے تھا اور
باعث اوسکے عکس کی تصویر اونکھینچنے کے اکثر صاحب لوگون سے
اوسکی ملاقات تھی مگر وہ اس بلوے مین جب لوجان متفق مفسدین
کے ہوا تھا اور ایک گروہ کا جرنیل ہوگیا تہا اور اوسکی ملاقات
نسا تھہ صاحب لوگونکے کسیطرح مانع اوسکے شامل ہونیکی نہوئی

تاریخ امام باڑہ

جناب محمد علی بادشاہ	پسندیدۂ بارگاہ اله
بصدق وصفا تعزیہ خانہ ساخت	بلند از سما تعزیہ خانہ ساخت
خرد سال جای عزای حسین	بگفتا مزار شہ تشنہ قیر

۱۲۵۳

تاریخ دروازہ امام باڑہ

شاہنشہ زمانہ و نوشیروان عصر	فرمانروای عالم امکان بود مدام
باب امام باڑہ والا بنا نمود	یارب بود قبول امام فلک مقام

...نف بگفت مصرعہ سال تاریخ	باب امام بارہ سلطان خاص عام
	۱۲۵۳

تاریخ سبیل

...شیران عصر ابوالفتح شاہ ہند	مقبول بارگاہ شہ مشرقین ہے
...بنوائی ہی سبیل تو تاریخ یہ ہوئی	اب یہ سبیل نذر جناب حسین ہے
	۱۲۵۴

تاریخ چاہ

...ب این چاہ ز شیرینی خود	شربت قند و نبات پاک ست
...ہست تر مصرع تاریخ رسید	چشمہ آب حیات پاک ست
	۱۲۵۴

تاریخ حمام

سلطان جہان خدیو با دل	سرای زمانہ شاہ عادل
حمام لطیف کرد تعمیر	تاکید نمود بہر تطہیر
تاریخ سعید ہست ظاہر	حمام لطیف حوض طاہر
	۱۲۵۴

تاریخ سڑک

خسرو ہند ابو الفتح معین الدین	رشک شاہان جہان بادشہ ہندستان
...چون سڑک ساخت بنا مصرع تاریخ بگفت	ہست این نوع سڑک جادہ راہ زمان
	۱۲۵۴

تاریخ ضریح

عرش آئین ہی یہی کہیں عالیمقام ہر	یہ روضہ حسین علیہ السلام ہے
تاریخ اس ضریح کی مطلوب جب ہوئی	بوسہ ملک ضریح قبول امام ہے
	۱۲۵۴

تاریخ سرای بن بابا

ابو الفتح منصور شاہ زمانا	محمد علی سایہ حق تعالے
رضا گفتہ تاریخ از حکم سلطان	سرای ابو الفتح شاہ معلے

تاریخ رصد حسین آباد ۱۲۵۵

چو محمد علی شہ دوران	ساخت در لکھنو رصد تیار
مکر و ساکش برسم ہندس بکر	این رصد شد بحکم شہ تیار

تالاب نہہ کھنڈہ حسین آباد ۱۲۵۴

متصل حسین آباد کی محمد علی شاہ نے ایک بڑا تالاب تیار کیا تھا جو اب سر راہ ہوگیا ہے اور متصل امام باڑی تعمیر ایک مسجد کی شروع کی تھی جسکو اونھون نے چاہا تھا کہ جامع مسجد سے بہتر بنے مگر اونکی حیات نے وفا نکی اور قبل اوسکے ختم ہونے کے وہ خود ختم ہوگئے یہ مسجد ناتیار اب تک موجود ہے مگر چونکہ اوس وقت سے اب تک مرمت بھی نہین ہوئی اور اب عرصہ اٹھارہ برس کا ہوا اسواسطے اب وہ بہت خستہ و شکستہ ہوگئی ہے امسال ۱۸۶۳ء مین نماز عید الفطر کی بہی اسی جامع مسجد مین ادا ہوئی پہلے شرف الدولہ غلام رضا خان کی کاظمین مین ہوا کرتی تھی اس بادشاہ نے ایک اور تعمیر شروع کی تھی جسکو نہہ کھنڈہ کہتے ہین اور

اور ارادہ تھا کہ اسکو سات منزل کا بنوا کر اوسکے اوپر سے سیر
تمام عمارات شاہی کی جو اوسنے میان شہر پایل بنوائی تھی کیا کرے
مگر یہ تعمیر بھی ناتیار رہگئی اور صرف چار منزل اوسکی پوری ہوئین

تاریخ جامع مسجد

شاہ ہندوستان معین الدین	فخر کسرا و قیصر و فغفور
نام نامی حضرت اعلے	بمحمد علی شدہ مشہور
مسجدے بی نظیر کرد بنا	بخدا ہست رہبری منظور
ہر منارہ عماد گردون شد	پیش گنبد نماند رفعت طور
مہتمم گشت اعظم الدولہ	جان نثار حضور شد مامور
برق موزون نمود تاریخش	مسجد جامع جدید حضور

۱۲۵۶

موسی باغ

یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تیار کروایا تھا اور جو تعمیرات
اوسمین ہین اونکو سعادت علی خان نے واسطے سیرگاہ
خاص کے بنوایا ہے اونکے وقت مین لڑائی حیوانات کی اوس
مین ہوا کرتی تھی اس نام کی روایت مشہور یہ ہے کہ ایک روز
آصف الدولہ سوار اوسطرف جاتے تھے اور سب ہمراہی پیچھے تھے
کہ وہان ایک چوپایہ یعنی موش نکلا اور نواب کے گھوڑے کی

باپ سے وہ مرگیا اوسکے مرنے سے کچھ دلمین اوسکے رنج آیا اور
اس لیے حکم دیا کہ ایک قبر اوس موش کی اوس مقام پر تیار
ہو اور باغ بہی بنے اور اوسی موش کے نام سے یہ تعمیر مشہور
ہوئی کیونکہ موش کو ہندی مین موسا کہتے ہین مگر ایک اور
روایت بہت قرین قیاس یہ ہے کہ سعادت علی نے یہ تعمیر
باہتمام ایک فرانسیس کے تیار کروائی تہی اوس مہتمم کا نام تو بہول گئے
مگر اوسکا اول کا حرف یعنی موسیو یاد رہا جسکی کثرت استعمال سے تخفیف ہوکر رہگیا

مکانات اراکین شہر

شہر لکہنو مین کوئی تعمیر ایسی نہین جسکی خوش وضعی قابل تعریف کی ہو
یا جو ایسا قدیم ہو جسکا ذکر کرنا واجب آوے

آچوک شہر کا نواب آصف الدولہ کے وقت مین تیار ہوا تہا
اور جو دو دروازے اوسکے دونون جانب ہین اونمین سے ایک
دروازہ جو جانب جنوب ہی اوسکو بہت قدیم بتلاتے ہین اوسکا
نام اکبری دروازہ ہی اور مشہور ہے کہ جب اکبر شاہ نیپال پر گئے تہے
شہر لکہنو ہوکر گئے تہے اور جب نیپال فتح کرکے آئے
یہ دروازہ یہان تعمیر کیا تہا مگر اس روایت کی صداقت
کسی کتاب تاریخ سے نہین ہوتی اور غالب ہی کہ غلط ہو کیونکہ

ایک آدمی کے نام کے سبب سے اوسکی تعمیر قرار دینا موجب تامل مگر ایک روایت قرین قیاس ہو کہ کسی صوبہ دار اودہ نے اوسکو بنوایا تھا اور جس بادشاہ کے وقت مین کہ اول صوبہ داری اس علاقی کو قرار پائی تھی اوسکے نام سے اوسنے اس دروازے کو مشہور کیا جو کہ سے اگر سجانب کانپور چلو تو دو عجیب درگاہین ملتی ہین ایک کو کاظمین کہتے ہین جسکو شرف الدولہ نے بنوایا تھا اور مشہور ہو کہ یہ درگاہ نقل مقبرہ امام موسی کاظم ہے اور دوسری کربلا دیانة الدولہ کی نقل مقبرۂ امام حسین ع کی ہی جو کربلا مین بنی ہے

تاریخ کاظمین شرف الدولہ

سنهد اقدس بنا چون شرف الدوله کرد	سایہ بفرقش شدہ بفضل شہ خافقین
از شرف شبہ اش گشتہ منور زمین	گنبد گردون از ان یافتہ صد زیب و زین
واہ چہ شرف النسا کرد اعانت بران	ہر دو شرف یافتند از قدم اشرفین
رابکہ درو داشتم در شرف از بہر شعر	صحت لفظی مگر آمدہ از مشتین
نکر شیم شبیر شدہ چون پی تاریخ سال	گفت سروش فلک گوہر کاظمین

۱۲۶۹

یہ دونون درگاہین جب تک اونمین روشنی چراغان نہو کسیطرح لائق تعریف کے معلوم نہین ہوتین اور قابل دیکھنے کے نہین بلکہ اونسی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی بد وضع عمارت بھی انسان بنوایا کرتی ہین

درگاہ حضرت عباس

ایک اور درگاہ متبرک اہل اسلام مین ہے ایک روایت مشہور ہے
کہ سعادت علیخان اسی مقام مین بیٹھے تھے کہ دیکھا ایک جونک اوسے تھے اور
اوس روز سے وحشت و بدمزاجی جو اون کے مزاج مین سابق
تھی اوسکو چھوڑ کر بہت رحم دل اور ضعیف دل ہو گئے تھے
مگر یہ روایت متعصب لوگون کی مشہور کی ہوئی معلوم ہوتی ہے

تاریخ درگاہ حضرت عباس

این گنبد جدید بناے سعادت ست

ملکہ زمانیان کا امام باڑہ

یہ امام باڑہ گولہ گنج مین بسبب وسعت اور فراخی کے مشہور
ہے یہ گویا ایک شہر ناف شہر مین واقع ہے مگر اوس مین
کوئی تعمیر لائق تعریف کے نہین

وینگفلڈ منزل

یہ عمارت عالیشان تعلقہ دارون کی طرف سے یادگار جناب سر ونگفیلڈ
صاحب بہادر چیف کمشنر اودہ بحسن اہتمام راجہ دگبجی سنگہ صاحب بہادر و مہاراجہ
مانسنگہ صاحب بہادر طیار ہوگئی ہے اسکے طیاری مین قریب دو لاکہ روپیہ کی صرف ہوئے

شہر لکھنو کے باشندون کا حال

آدمی را بچشم حال نگر
از خیال پری و دیو بگذر

بڑا خاندان شاہی ہے لگلے نواب و بادشاہون کی نسل سے اونکے بیوا در نواسا اور بیگمات وغیرہ بکثرت ہین سبکا علی قدر مراتب وثیقہ ہے عیش وعشرت سے گذران کرتے ہین

شاہ دہلی کی نسل سے اولاد جہاندار شاہ و مرزا سلیم سے بھی یہان چند شاہزادے ہین اسی سرکار سے اونکو وثیقہ و پنشن سے قوت لایموت ملتا ہے

عزیزان برہان الملک سعادتخان سے شاہزادہ ہای نیشاپوری کا بھی عالی خاندان ہے اونکے وثیقے بھی اچھے اچھے ہین سب چین کرتے ہین مگر بعض بیچارون کا وثیقہ غدر کی چپقلش مین بند ہوگیا اوس سے یک لخت فقیر ہوگئے ـ مقام افسوس ہے و عبرت

اونکے بعد امرای شاہی ہین جنکی نسل بلا واسطہ وارہی اکثر وثیقہ دار اور صاحب معاش و نوبت وغیرہ سے خوش گذران ہین آمین ہندو بھی ہین اور مسلمان بھی تو اونکے ہندو مسلمان سوداگر تاجر مہاجن بھی کروڑپتی لاکہ پتی سے لیکر ہزارپتی تک اکثر ہین اور بساکہہ اچھی گر نسبت عہد شاہی کے روزگار اونکا سست اور معاش واجبی ہے مگر غنیمت

بعد اونکے لوگ روزگار پیشہ ہین جو اس شہر یا بیرونجات اور اور ملک مین روزگار

کرکے بسر اوقات کرتے ہین

علم کی کثرت ملا فاضل اکثر عربی فارسی کا درس اور علم بیان کا شہرہ اور طبیب بکثرت

اور یہ شہر علم کی ٹکسال ہر علم و فن کا آدمی یہان ہر اور طبیعت اردو کی خوشنویس

بھی ہر خط کے جیسے علی حافظ خوش الحان ایک سے ایک اعلی

پہر اہل حرفہ اہل حرفہ ہر قسم کے دستکار صناع موجود بکثرت ہر کام مین

کماکہلتے ہین اور بہ نسبت اور شہرون کے یہان کے صناع غنیمت اسی طرح

دوکاندار بھی کہ وہ بھی ایک فرقہ ہی یہان بسبب شیعہ مذہب کے مسلمان بقال

اور حلوائی وغیرہ دوکاندار بھی اکثر ہین

اس شہر کا جوتا اور کلاہ زری وکارچوب کامدانی اور خمیرہ تماکو اور زیور مرصع

و زیور و ظروف طلا و نقرہ و کمہار و نقاش و آتشباز و چکن ساز عمدہ سے عمدہ

شہرہ دیار و امصار و دساور ہر دور دور مال جاتا ہی مگر بہ نسبت عہد شاہی کے

سب کام اب کم ہی صرف بھی کم ہی

ہندو مسلمان کے میلے بارہ مہینے اس شہر مین بکثرت اور دہوم سے ہوتے

ہتے ہین مگر بڑی دہوم دہام محرم کے عشرے مین ہوتی ہی غرہ محرم سے

م روز تک اور کہین پندرہ دن بھی ہزارون گہر مین روز مرہ مجلس تعزیت ہتی ہر

رت ہوتی شیعہ پلنگ پر نہین سوتے شادی کی رسم نہین کرتے زیور خوش پوشاک

سین پہنتے پان نہین کہاتے تعزیہ داری ہر گہر مین ہوتی ہی امام باڑے بڑے
اور اونمین آرایش اور روشنی کثرت اور مرثیہ خوانی سوز راگ اور تحت لفظ
جہان مین بی نظیر کتاب خوانی و ماتم کی انتہا — عیش باغ اور علی گنج اور
سورج کنڈ کا میلہ بہی مشہور ہی

واجد علیشاہ کے جانے سے ہزارون آدمی اور اکثر امرا و وزیر و بیگمات بہی
اونکے ساتہ کلکتے چلے گئے اسلیے رونق شہر کی بالکل کم ہو گئی جس سے
کلکتے مین اونکی ایک علحدہ آبادی تکلف اور سامان کی دلچسپ خوش
معلوم ہوتی ہی ع صدر ہر جا کہ نشیند صدرست

مرد یہان کے تماشا بین عیاش تن پرور خوش باش اکثر ہین اسلیے یہان کی
عورت کا چلن بہی کم پسندیدہ ہی کسبی ہانے مین لونڈے بازی یہان کی
مشہور ہی بہی رنڈی بازی کبہی جوا کبہی رنٹ کبہی چوری مگر اب بہی جس قدر
خیرات اور علم یہان ہی اور جگہ کم ہی — ہزارون اونمین حاجی ہین حج کربلا
اور حج ہو آئے ہین اور ہر سال صدہا ہزارہا آدمی کا قافلہ جاتا ہی

موسم یہان کے سب غنیمت مگر برسات مین فضا اور سبزہ زیادہ خوشنما ہوتا ہی
اور ہوا دلچسپ شہر کی آب وہوا ذرا اچہی نہین پانی بہی کہاری ہی جابجا نشیب
فراز و نالہ وغیرہ مگر اب صفائی ہوتی جاتی ہی قرب دریا سے سفید پوشی
زیادہ ہی — حضرت گنج و زامیدان اور بلندی پر ہی اس لیے وہان کی

اب وہاں فصاحت خوب ہی

ہندو مسلمان مین جہان شادی ہوم سے کرتے ہین روشنی آتشبازی تحت آرایش
ناچ تماشا محفل تکلف اور سامان سے ہوتی ہی بلکہ بہی اپنے اور ستار سامان سے
دہوم سے لیجاتے ہین لڑکی کی طرف سے معقدور بہر جہیز بہی دیا جاتا ہی اور
اوسکو اپنی نیکنامی جانتے ہین ہندو کی برات سے قبل سو گی نام سامان تخت کے مع
تخت آرایش وغیرہ اوٹہتا ہی وہ زیادہ تر قابل دید ہی عجیب عجیب کہلونے میوہ
قصاویر کان وغیرہ ہو بہو اصل جیسے ہوتے ہین
عہد واجد علیشاہ سے پریون کا ناچ اور زادر کہے بہار بہی کا رواج ہی ایک اندر اور
دو چار دیو اور دو چار پری بنکر فسانۂ حسن وعشق بطور قصہ کے گاتے ہین اور ایک
لطف آمیز کہانی سناتے ہین غرض گذشتہ حال عاشق ومعشوق کی صورت کر
دکہاتے ہین یہ اور کسی شہر مین نہین ہی اوسکا مجرا مدت سے مدت تک ہی
افیون اور پان کا رواج زیادہ ہی اور رنگین پوشی کا بہی اس لیے رنگریز اور حقہ والے
اور تنبولی کی دکان اکثر ہین کوئی بازار اور کوچہ اور محلہ خالی نہین نہ نیک
خاص اس شہر کی ساقن مشہور ہین اور اکثر ہر میلے مین اونکا ایک بازار ہی علیحدہ
ہوتا ہی

ساقن ایک عورت ہی جو بن سجکر دکان حقہ دہنک چرس وگا بجہ لگاتی ہی گالی
بجاتی اچہی بتکلف سے دکان کرتی ہی اکثر بازاری بانکے اور فیولی حقہ باز

دکی دکان پر حقہ افیون وغیرہ کہاتے پیتے ہین اُنکو ایک پیسے سے لیکر روپیہ تک
دیتے ہین اونمین اُنکے پچاس پچاس ہزار لاکہہ تک کی ذی مقدور بہی تہین
اب بہی سو پچاس سے پانچ سات ہزار تک کی صاحب مقدور بہت ہین اونکے
لباس زیور اور انداز پر اجنبی آدمی یہی جانے کہ یہ بہی کوئی بیگم صاحب ہین
بڑے بڑے عالیشان مکان اور محلات محلہ و بازار کہد گئے اب بہی جابجا بازار
بہت ہین مگر چوک کا گذر زیادہ رونق کا ہی ہر قسم کے دوکاندار جوہری بزاز
دوشالہ فروش جفت فروش صراف ہنڈی والے سوداگران نانبائی حلوائی عطرفروش
گلفروش سبزہ فروش وغیرہ ہر قسم کے تکلف سے بیٹہتے ہین مگر بہ بجے سے
شام تک خوب گرم بازاری اور رونق و کثرت رہتی ہی شہر کے امیر غریب بہی اکثر
سیر کو آتے ہین یہ بازار عہد اکبر شاہ کا بنا ہوا ہی اسی سے اکبری دروازہ مشہور ہی
عہد سرکار مین دو بازار کلان عریض بننے شروع ہوئے مگر آبادی و عمارت اونکی
ابہی ناتمام ہی

اس بازار اکثر اور ریون بہی قوم طوائف اکثر رہتی ہین شام کو سج بنکر باہر کمرے پر
بیٹہتی ہین اونکے ٹہاٹ اور زیور و پوشاک کا تکلف بیگمات سے کم نہین گانا
بجانا بتانا یہان کا ہند مین ضرب المثل ہی کیون نہو جہان اونکے میراثی اونکی بدولت
نواب اور رئیس ہو گئے اور وہ خود اکثر بیگمات بن گئین اور خود بادشاہ سلامت
گاتے بجاتے ہون واقعی الناس علی دین ملوکہم

اونکا مجرا معہ رسے عسہ تک ہوتا انمین اکثر لکھو تی بہی ہین ـــــ ۱۱ ھو صحیح

خانگیان کی شمادخر من فحش کی کثرت اور رجا رکم معاذ اللہ

شہر مین مسلمان اکثر ہندو او نسے کم مگر باہم اتفاق اور سلوک اور رسم

مسلمان میں سنی کم اور شیعہ اکثر انکی تفصیل ضرور نہین اسی قدر بس ہے کہ دونون

مسلمان ہین مگر مثل روس کیتہلک اور پروٹسٹنٹ کے نزاع لفظی ہے بس

ہندو عورات کی وضع خاص ہوتی ہے مگر مسلمان مرد اور ہندو مرد کی وضع لباس

سب یکسان ہے داڑہی منڈانے کا رسم علی العموم اور داڑہی رکہنا معیوب ہے

نفاست نزاکت خوشخوری خوشپوشی تکلف مکانات رسوم شادی فضول خرچی

مین یہ لکھنو ہند مین انگشت نما گویا ہند کا پارس فرانس ہے

بعد دہلی کے اردو ریختہ زبان بیان کی ہند بہر مین فصیح اور صاف وشستہ

ومستند شعر وشاعری کا چرچا بکثرت ہمیشہ جابجا مشاعرہ اب بہی ہوتا ہے ادنے ادنے

شعر ہر شاعر اگرچہ پڑہتا ہے بہت سے شعرا نامی گذرے اب بہی اکثر ہین اور صاحب

دیوان علی بدا مرثیہ گوئی مین انیس و دبیر بانی مثل مصحفی انشا میر جرات سوز

آتش ناسخ ذہین کے شاعر ہین اور اب نثر مین سرور موجود وقت

جناب مولوی ہادی علی اشک تو جامع کمالات صوری و

معنوی نظم نثر فارسی مخصوص اردو زبان ریختہ ومحاورہ مین

یکتاے روزگار ہین فقط

خاتمہ

شکر و احسان خداوند حقیقی کا کہ عجلتہً یہ چند اوراق منطبع ہوسکے تصحیح و نظر ثانی مؤلف کی نوبت نہیں پونہچی اکثر غلطی غلطنامہ سے رفع ہوسکتی ہی اور اتفاقاً اگر ناظرین با تمکین سہو وخطا کہ لازمۂ بشریت ہی پاوین معاف فرماوین ع کہ ہیچ نقش بشر خالی از خطا نبود منشی طوطا رام شایان کی توجہ سے یہ بیسرسائی تاریخون اور تلاش مطالب کے شایان تعریف ہے اور سلامت فکر خداداد پسندیدہ صاحب جوہر سا منشی گوبند پرشاد متخلص فضا خوشنویس مطبع نے بدیہی
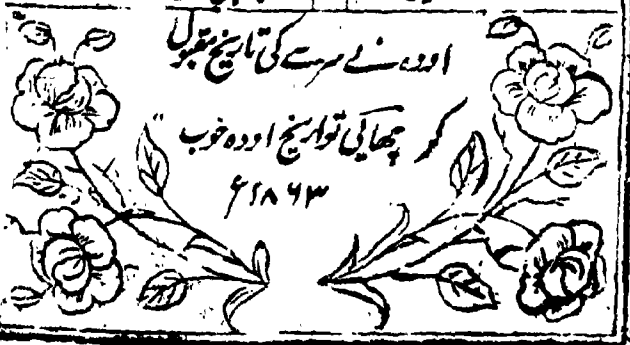
یہ ایک قطعہ تاریخ موزون کیا

چھپا احوال شاہان اودہ کا	عبارت جسکی ہی دلچسپ و مرغوب
جو ہین کرنیل ایبٹ صاحب جاہ	انھیں سے انکی ہی تالیف منسوب
خدا پھر انکو لاوے لکھنؤ مین	یہ دن فرقت کے ہوان گھڑیون سے محسوب
فضا موزون ہوی تاریخ تالیف	کہ ہو اہل سخن کو دل سے محبوب

اودہ نے سرے کی تاریخ مقبول

کر چھاپی تواریخ اودہ خوب

۶۱۸۶۳

کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟

ـــــــــــــ ڈاکٹر سروپ سنگھ

اردو کی جنگ ایک بڑی جنگ کا حصہ ہے جو ۴۷ء سے ۹۱ء تک جاری ہے۔ یہ بڑی
جنگ ہندستان کو آزاد، باوقار، دنیا میں سینہ تان کے سر اٹھا کے چلنے والا دیش بنانے والوں
اور ہنوز غلامانہ فضا میں سانس لینے والوں کے درمیان برپا ہے۔ یہ جنگ اس مہان
دیش کو سیکولر بنانے والوں اور عہد قدیم یا عہد متوسط کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کے
درمیان ہر سطح پر برپا ہے۔ اردو کی لڑائی مذہب کی لڑائی یا فرقے کی لڑائی نہیں ہے۔ یہ ایک
بنیادی سیکولر لڑائی ہے جس کی حقیقت کو ہندستان کے بنیادی شہری اچھی طرح سمجھ چکے ہیں
یہ آزاد ہندستان کے بنیادی شہریوں اور غلام ہندستان کے وفاداروں کے درمیان ایک
لمبی لڑائی ہے۔ ۴۳/۴۴ سال بیت چکے اتنے ہی اور بھی بیت سکتے ہیں۔ ڈرنے کی اور ہا
کی کوئی وجہ نہیں بس سمجھنا سمجھانا ہے جو بھی ہیں اپنے ہیں نا سمجھ ہیں غیر نہیں ہیں۔ یہ جیس
اور کتنی بڑی طاقتیں اردو کے ساتھ ہیں سروپ سنگھ اور آنند نرائن ملّا یا تارنگ یا رام لعل
دو چار نہیں سیکڑوں ہیں اور یہ اردو اردو اس لیے نہیں کرتے کہ آپ کو خوش کر
ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ان کے عقیدے کا ایک جز ہے ایمان کی ایک کڑی ہے کہ اردو کی لڑائی
ہندستان کی بقا کی لڑائی ہے ——— ادارہ

ڈاکٹر سروپ سنگھ

(گورنر گجرات)

کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں

کیا اردو والوں

کو اپنی لڑائی تنہا لڑنا ہوگی؟ جی نہیں ایسا

نہیں ہوگا۔ یہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا ہی

چاہیے۔ اور اس کے کچھ وجوہ ہیں۔ ایک

تو یہ کہ ہندوستان کے چار کروڑ اردو

بولنے والے مسلمان اور دوسرے اردو کی

ڈاکٹر سروپ سنگھ

حمایت کرنے والے کسی ایک سیاسی پلیٹ
فارم پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ چاہے آپ کچھ
بھی کیوں نہ کریں۔ انھیں ایک جگہ اکٹھا کرنا
عقل مندی بھی نہیں ہے۔ میں شہاب الدین
صاحب کی اس بات سے سولہ آنے متفق
ہوں کہ کوئی سیاسی محاذ، جو صرف مسلمانوں
تک محدود ہو، مسلمانوں کے اپنے ہی مفاد
میں نہیں ہے۔ ہمیں ان سب لوگوں کو ساتھ
لے کر چلنا چاہیے جو ہمارے ساتھ آنے
کو تیار ہیں۔ کیوں کہ یہ سوال صرف اردو
کا نہیں ہے۔ ملک کے مستقبل کا ہے۔
پنڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا:

THE CHOICE BEFORE INDIA
IS NOT BETWEEN A SECULAR
INDIA AND A HINDU INDIA;
IT IS BETWEEN A SECULAR
INDIA AND NO INDIA AT
ALL.

یہ بات انھیں اس لیے کہنا پڑی کہ
انہی دنوں پاکستان بنا تھا اور وہ لوگ
جو آج اردو کی مخالفت کر رہے ہیں وہ
یہ بھی کہہ رہے تھے کہ چونکہ پاکستان
ایک اسلامی حکومت ہے، ہندوستان
کی حکومت کو ہندو حکومت ہونا چاہیے۔
پنڈت نہرو ہی نہیں بلکہ اس دور کے دوسرے
سیاسی رہنما بھی اس بات سے واقف
تھے کہ ایسا کرنا ملک کے لیے نہایت خطرناک
ہوگا۔ اور تو اور جناح صاحب بھی اس
بات سے واقف تھے اور اسی لیے انھوں نے
پاکستان کو بھی اسلامی حکومت نہیں بلکہ
ایک سیکولر حکومت بنانے کا ارادہ ظاہر
کیا تھا۔ مگر ان کی بہت جلد موت ہو گئی
اور پاکستان کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔
ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایسے ہندوؤں
کی تعداد ہندوستان کی ساری مسلم آبادی
سے کہیں زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں
کہ اگر ہمیں ملک کو ایک ٹھیک راستے پر چلانا
ہے تو اقلیتوں کے ساتھ ہر طرح کا انصاف
کرنا ہوگا۔ ان کی تہذیبی قدروں کی حفاظت
کرنا ہوگی۔ انھیں ایسے موقعے دینے ہوں گے
جس سے وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنی زبان
میں جس طریقے سے اور جس سطح تک چاہیں
کرا سکیں۔ ہم سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ
بہت سے ہندی لیکھک بھی یہ محسوس کرنے
لگے ہیں کہ ہندی کی مددگار اگر ملک میں کوئی
زبان ہے تو وہ صرف اردو ہے اور اردو
کی حفاظت کرنا دراصل ہندی کی ہی حفاظت
کرنا ہے۔ اگر ہم ایسے لوگوں کو جو ہمارے
ساتھ اس لڑائی میں شریک ہیں بھولتے ہیں
تو غلطی کرتے ہیں۔

ملک کے سامنے ایک مسئلہ ہے جس کا حل
بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ
پنڈت نہرو کے وقت یہاں اردو کی تعلیم کا جو
پرانا انتظام تھا اس میں کچھ ترمیم کر کے
اسے ہی جاری رکھنا چاہیے تھا۔

میں پنجاب میں ایسے اسکول میں پڑھا
تھا جہاں پہلی جماعت سے دسویں جماعت
تک حساب اور سائنس کو چھوڑ کر باقی
سب مضمون اردو کے ذریعے پڑھائے
جاتے تھے۔ کالج میں ان دنوں ذریعہ تعلیم
اردو کی بجائے انگریزی تھا۔ میں نے سنا
ہے کہ یو پی میں اسکول میں اردو اور ہندی
دونوں زبانیں پڑھانے کا انتظام تھا
جو کہ میرے اسکول میں نہیں تھا
اس کا مجھے نقصان یہ ہوا کہ مجھے ہندی سیکھنے
کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اچھی بات یہ ہوتی
کہ دونوں زبانیں آٹھویں جماعت تک
لازمی قرار دی جاتیں اور ہر طالب علم کو
جس زبان میں بھی وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا
[illegible]

آزادی کے بعد اردو کی تعلیم سب جگہ کیوں ختم کی گئی۔ کیوں اس وقت کے ملک کے رہنماؤں نے ایسا ہونے دیا۔ اس پر لوگ زیادہ بات چیت نہیں کرتے مگر ظاہر ہے کہ اس سے بہت بڑا نقصان ہوا۔ خاص طور پر یہاں کے مسلمانوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ اب یہ میرا ملک نہیں ہے۔ سمجھدار ہندوؤں کو یہ فیصلہ کرنے میں کافی وقت لگا کہ مسلمانوں کے دل میں ایسا خیال پیدا ہونا نہ صرف ان کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے خطرناک ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کو بھی یہ احساس ہوا مگر شاید سب کو نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ الکشن کے وقت سیاسی پارٹیاں صرف ووٹ پر نظر رکھتی ہیں۔ اور کسی قسم کے بڑے فیصلے کرنے سے جھجکتی ہیں۔ خاص طور پر یو پی کے بارے میں میرا ہلکا سا تجربہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے سیاسی نیتاؤں سے بات کی جو اردو کا کئی بار ذکر کر چکے تھے۔ ان میں سے کچھ جنتا دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے میں کیا دقت ہے۔ جواب ملا کہ ذرا ٹھہریے اپنی حکومت آجانے تو یہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر ایسا کہیے اور بدلا کیجیے۔ جواب ملا کہ اس وقت کہنے سے شاید ہندو ووٹر ناراض ہو جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ تو الکشن کے بعد بھی ناراض ہوں گے۔ پھر میں کانگریس کے دو نیتاؤں سے ملا۔ میں نے کہا کہ یو پی میں اس بار مسلمان ووٹ لینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اردو کو یو پی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ یو پی کے کچھ جانے پہچانے مسلمان رہنما جو کانگریس سے تعلق رکھتے ہوں پردھان منتری پر زور ڈالیں۔ پھر میں نے کچھ معزز مسلمانوں سے بات کی۔ ان میں سے ایک نے یہ بات کہی۔ وہ یہ کہ ہم اپنے لیے ٹکٹ مانگنے تو جا سکتے ہیں مگر کسی بات پر زور دینا مشکل ہے۔ آخر میں میں نے دو ہندوؤں سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم کہیں گے اور زور سے کہیں گے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ ٹکٹ تو خطرے میں نہیں پڑ جائے گا۔ جواب ملا کہ ٹکٹ لے کا کیا ہو گا اگر ووٹ ہی نہیں ملے۔ فیصلہ ہوا کہ کچھ یو پی کے اردو دوست پردھان منتری سے ملیں اور انھیں اصلی حالت سے واقف کرائیں۔ اگر کچھ پارٹیوں کے لوگ اکٹھا نہ ملنا چاہیں تو الگ الگ ملیں مگر ضرور ملیں۔

اس بات چیت سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کا مسلمان اپنی مشکل اکیلے حل نہیں کر سکتا۔ اسے ہندوؤں سے مدد لینی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کو غیر سمجھنا بند کیجیے۔ وہ ملک کے مستقبل کے بارے میں اتنے ہی پریشان ہیں جتنے آپ۔ اور وہ جانتے ہیں کہ یہ صرف اسی حالت میں صحت مند بن سکتا ہے جب مسلمان اور ہندو ساتھ ساتھ چلیں۔ اسی بات کا ایک پہلو اردو ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں کہ یہ ہندوستانی زبانوں میں کئی لحاظ سے سب سے زیادہ خوب صورت اور سلجھی ہوئی زبان ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یو پی نہ صرف اردو کا گھر ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی شاید یہیں پاکستان سے بھی زیادہ محفوظ رہ سکے۔ شاید کچھ پاکستانی بھی ایسا محسوس کرتے ہوں۔

ایک بات اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچ کر اس سوال

، اپنے آپ کو دیں۔ کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ
ن گڑھ کو زیادہ نقصان ہندوؤں نے
یا ہے یا خود مسلمانوں نے۔ میری
ن یونیورسٹیوں سے ہلکی سی واقفیت
مجھے لگتا ہے مسلمانوں کے آپس
جھگڑے انھیں زیادہ نقصان پہنچا
ے ہیں بہ نسبت ہندوؤں کی دشمنی کے۔
اب آخر میں وہی

والا سوال۔ رائے کس کو دیں۔ جیسا میں
نے اوپر عرض کیا۔ رائے دینے سے پہلے
آپ سب سیاسی پارٹیوں سے بات
کریں۔ مگر بات، ہمت اور توجہ سے کریں۔
دل سے ڈر اور لالچ نکال کر کریں۔ ہو سکتا
ہے ریوپی کا معاملہ اس الکشن سے پہلے
ہی حل ہو جائے۔ کم سے کم ہماری تو یہی
کوشش ہونی چاہیے۔

اردو ادب کدھر؟

پروفیسر سید محمد عقیل

خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے، کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد — یا اظہاری! اقدامی! کیا ہے، کہاں ہے، کون اسکی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں! کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ کا ڈاکٹر عقیل کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

ادارہ

پروفیسر سید محمد عقیل
شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

اردو ادب کدھر؟

کسی بھی ادب کے متعلق ایسا سوال نہ صرف یہ کہ اس کا محاسبہ ہے بلکہ یہ بھی کہ اُس کی ارتقائی صورت
رہی ہیں، اور اب اس کے لیے جدید امکانات کیا ہیں یا یہ بھی کہ مختلف اصناف میں اُس کا آج کا فیشن کیا ہے
سمتوں میں اُس کی مختلف شاخیں پھیل رہی ہیں۔ اپنے سماجی حالات کس طرح اُس کا چہرہ بدل رہے ہیں،
ان کا اثر اس کی فکر پر کیا پڑ رہا ہے۔ بیرونی دباؤ اور اندرونی کشمکش، اس پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ
باتیں مل کر کسی ادب کے ارتقا یا تنزل کی سمتیں متعین کرتے ہیں، لیکن ان تعینات کا دائرہ کار، ماضی قریب ہی کو محیط
اسے بہت دور تک پھیلایا نہیں جا سکتا۔ ہم بھی اس مقالے میں تمام باتیں تیس چالیس برس کی مدت ہی کو
کریں گے کہ اسی سے اردو کی نئی سمتوں کا تعین مناسب ہے۔ پھر یہ بھی سمجھتے رہنا چاہیے کہ یہ محاسبہ حتمی اور آ
نہیں ہو سکتا کہ ادب میں حرف آخر کسی تفہیم کے لیے نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی ایک تفہیم ہی کی کوشش ہے۔

اردو ادب کے ساتھ ایک دلچسپ خیال ہمیشہ سے وابستہ رہا ہے کہ جب بھی ادب کی بات ہوئی۔ اُ
مفہوم پہلے شعر و شاعری ہی رہا ہے۔ شاید یہ بات اس لیے بھی ہو کہ دنیا کی تمام فکر اور تمام ادبی کاوشوں کی ابتدا
ہی سے ہوئی ہے۔ اسی لیے شاید، جتنے اصول، نظم و ضوابط کے راستے شاعری کے لیے سوچے گئے، کسی اور صنفِ
کے لیے نہیں۔ اردو کی شاعری، ادھر تیس چالیس برسوں میں خاصی انقلاب انگیز رہی ہے۔ ہئیت اور فکر،
طرح طرح کے تجربے کیے گئے ہیں۔ ہئیت میں تو تجربوں کا شمار بھی آسان نہیں ہاں فکر میں، خاصا انتشار رہا۔
کبھی فکر کا یک قلم انکار کیا گیا، کبھی فکر، شاعر کے نجی اور انوکھے تجربوں تک محدود ہو گئی اور کبھی اس میں عالمی
انتشار کو سمونے کی کوشش بھی کی گئی۔ کبھی تنہائی کا مسئلہ، کبھی بیگانگی (ALIENATION) اور کبھی بے راہ رو
لیکن کچھ ایسے بھی فکری تجربے جو وقت کی آواز ہیں جن میں تازہ کار مسائل کا دل بھی دھڑکتا نظر آتا ہے۔

جدید نظموں کی تاریخ اردو میں بہت زیادہ پرانی نہیں، زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو برس۔ جب مو

نے، شاعری کو غزل کے ماحول سے نکل کر ایک عام رجحان کی صورت اختیار کرنا شروع کیا، لیکن بیسویں صدی
زات سے ایک طرح اردو شاعری میں تقریباً نظموں کی صدی بن گئی۔ حالی کی آواز کو اقبال، عظمت اللہ خاں، جوش،
انی، سرور اور چکبست نے عملی تعبیر عطا کی اور پھر ترقی پسندوں نے فکری اور اسلوبی، تمام تجربوں میں نظم کو بام
پہنچا دیا۔ موضوعاتی نظمیں وقت کی آواز لے کر ایک طرف تمام شعری فضا پر چھا گئی تو دوسری طرف اسلوب
وں میں بھی زبردست تبدیلیاں ہوئیں، جن کے پس منظر میں انگریزی نظموں کے وہ ترجمے بھی تھے جن سے
شعری دنیا محمد حسین آزاد، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، مولوی اسمٰعیل، نادر کاکوروی، اقبال، طالب
لوک چند محروم، ظفر علی خاں اور دوسرے مترجمین نظم انگریزی کے ذریعہ متعارف ہوئی تھی۔ ترقی پسندوں
ساتھ جو دوسری لہر اسلوبیات اور فکری آزادی کی چلی وہ اپنا اسکول، میراجی، دین محمد تاثیر، یوسف،
ن۔ م۔ راشد کے ساتھ لے کر الگ ہو گئی اور جیسے ہی ترقی پسندوں کی مسائلی اور موضوعاتی شاعری میں
کے بعد کمی واقع ہوئی۔ میراجی اور راشد کے اسلوبیاتی اور فکری آزادی کے اسکول کے بطن سے نئی شاعری
شاعری پھوٹی جو تقریباً ۱۹۸۰ء تک اردو شاعری پر حاوی رہی۔ کیسے کیسے فکری اور اسلوبیاتی تجربے اس
کیے گئے؟ اس اسکول نے اپنا فکری سلسلہ فرانس کے زوال پسند شعرا (DECADENT POETS) سے جوڑا۔
اپنے نئے نظریات شاعری بنائے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ میراجی اور اُن کے قبیل کے دوسرے شعرا نے، اردو میں پہلی بار اس بات کا احساس کیا کہ شاعری
نے کے علاوہ الجھانے، متحرک کرنے کے علاوہ سکتے میں ڈال دینے ۔۔۔ کے بھی کام آسکتی ہے۔ نئی شاعری دل
وہ ذہن کو متاثر کرتی ہے ۔۔۔ نئی شاعری جذبات کے الجھاوؤں کو ٹھوس زبان میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔
جذبات کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ جذباتیت سے گریز، شاعری کے داخلی سفر کی ایک منزل ہے۔

۲۔ نئی شاعری کا عمل، اضطراب انگیزی کا عمل ہے۔ اضطراب انگیزی کے اس عمل میں وہ زبان کی
لطافت اور شیرینی کو نظر انداز کر کے ارادی طور پر ایک درشت اور بے چین اسلوب اختیار کرتا
ری کی طرف نئی شاعری کا رویہ فدویانہ اور مولویانہ نہیں ہے۔ ۔۔۔ اس کا لب و لہجہ بحثہ اور اعلیٰ اسلوب
رتا ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی ـــ نئے نام کا مقدمہ)

۳۔ اصل میں جو مسئلہ نئی نظم کے شاعر کو درپیش ہے، وہ فلسفیانہ نوعیت کا ہے اور اس سوال
ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟۔ نئی نظم کا شاعر یہ نہیں پوچھتا کہ دنیا کیا ہے؟ معاشرہ ایسا کیوں ہے؟

کیا ہے؟ وہ صرف اپنے آپ میں دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی شناخت چاہتا ہے۔ (جیلانی کامران ۔ نئی نظم کے تقاضے)

۴۔ پرانی تعلیمات کے غیر شہتر ہو جانے سے جہاں جسم کی مرکزی حیثیت قائم ہوئی ہے، وہیں موت کا خدشہ ہے۔ اس صورت حال میں اگر میں یہ کہوں کہ نئی نظم کا شاعر، موت کے خدشے اور تقدیرِ مرگ کا شاعر ہے تو غلط نہ ہوگا۔

۵۔ نئی نظم کا شاعر، تقدیرِ مرگ کو ہلاکت جسم کی شکل میں پہچانتا ہے اور ہلاکت جسم کے علاوہ اُس کی نظر دوسری ہلاکت اپنا وجود نہیں رکھتی۔ ۔ ۔ وہ جواب دیتا ہے کہ "میں فانی ہوں" اور چونکہ میں فانی ہوں ہر شے فانی ہے۔ لیکن اشیا کا فانی ہونا، میرے فنا سے بے نیاز ہے۔ میں فنا ہو جاتا ہوں، لیکن کلنڈر نہیں مرتا۔ کلنڈر فانی نہیں ہے، علاوہ ازیں، زمین بھی نہیں مرتی اور نہ قیامت آتی ہے۔ (نئی نظم کے تقاضے۔ از جیلانی کامران)

۶۔ نئی شاعری، مذہبی شعور کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، اور چونکہ پچھلے پچیس برسوں کی اردو شاعری ایسے شعور کے بغیر ہے۔ (یعنی ترقی پسند شاعری) اس لیے میں نئی شاعری کی ضرورت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔ نئی شاعری میں شاعر، کسی ادارے کی طرف سے لائی ہوئی بشارتوں کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ زندگی بخشنے والے خدا تک اپنی فریاد کو پہنچاتا ہے۔

یہ ساری باتیں موضوعی شاعری کی طرف اشارے کرتی ہیں اور ان خیالات کے تحت ۱۹۶۰ء سے لیکر ۱۹۸۰ء تک ان خیالات سے مملو نظموں کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ ان میں کہیں قدیم و جدید کی ملی جلی کیفیتیں اور کہیں خالص۔ انھیں خیالات کا تاثر ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے جو متذکرہ بالا خیالات کے تحت شاعری کرتی رہی ہے۔ جن میں، وحید اختر، خلیل الرحمان اعظمی، بلراج کومل، عمیق حنفی، کمار پاشی، عادل منصوری، محمد علوی، قاضی سلیم، بل کرشن اشک، شمس الرحمان فاروقی، فاضلی، منیر نیازی، وزیر آغا، عباس اطہر، افتخار جالب، سلیم الرحمان، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، احمد ہمدانی، احمد شمس، انور شعور، کشور ناہید، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد (اور بہت سے نام ہیں) خاص ہیں۔ ان کی تائید اور ان سے اختلاف میں بہت سے مضامین، مقالے اور انشائیے لکھے گئے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے تانیثیت کی فلسفیانہ اساس" لکھ کر اس مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ راقم الحروف نے اس موضوع سے اختلاف کیا اور ایک کتاب "نئی علامت نگاری" پیش کی، جس میں ان تجربوں کا تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر ... نے "نئے تیشے، نئے کوہکن" کے نام سے ایک اختلافی معرکہ آرا مقالہ لکھا۔ اس دور کی شاعری میں جو تجربے کیے گئے، وہ کوئی خاص نہ تھے کہ سارا زور موضوعی شاعری پر تھا۔ نظم معریٰ، جس کی ابتدا محمد حسین

نے "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" نام کی معرّیٰ نظم سے ۱۸۸۲ء کے قریب کی تھی اور جسے اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم
نے فروغ دیا تھا۔ اس کی لہر اس وقت بیٹھ چکی تھی۔ ان ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق کے
برس کے تجربے، ان کے پاس باقی تھے اور ساتھ ساتھ تلازمے (VERSIFICATION) کی صلاحیت بھی، جو
بی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی شاعری میں وہی مجاہدانہ زور ہے جو ۱۹۲۵ء سے
۱۹۴۰ء تک ترقی پسندوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہ کوشش، ترقی پسند شاعری کے مزاج سے الگ راہیں بنانے کی کوشش ہے۔

یہ تو سب ہے مگر اس کے آگے کیا ہے؟ بہت جلد یہ رنگ ماند پڑ گیا، کہ مسائل حیات، صرف تجربو
بروں سے کب تک بہلتے۔ نظم کا نیا شاعر، علامتوں کی بھول بھلیاں سے باہر نکل آیا۔ اُسے حالات بیس رہے ہر
ی کا ہر لمحہ بدلتا سین، اُس کی سانس روک رہا ہے۔ علامتوں کے بہلاوے، اُس کے دل کی باتوں کو باہر آنے
دیتے تھے، اور اُسے جیسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی اور حالات سے بیگانہ ہو کر تو خود میں محبوس ہو کر
جائے گا۔ پھر وہ کیا ہے؟ کیوں ہے اور انسانوں سے کیا اُس کا رشتہ ہے؟۔ وہ تو انسانوں کے رشتوں کے بغیر
ہ نہیں رہ سکتا، اور اس طرح، آج کا نیا نظم نگار بیگانگی سے جیسے اکتا کر، زندگی کے رشتوں، محسوسات
راور تفکیر سے کام لے کر نئی اظہاریت تلاش کر رہے ہیں۔ آج کی نظم کا کوئی بھی RANDOM جائزہ، یہ
ظاہر کر دے گا

نظم

ساری زلف کے	بیٹا، سالوں بعد
سائبان کیا ہوئے!	ولایت سے لوٹا تھا!
بن کے نیچے بیٹھ کر	اور بیٹھا یہ سوچ رہا تھا
سوچتے تھے ہم	جو سچ اُس نے اپنے بارے میں پایا ہے
گل جہاں اماں میں ہے۔!	اُن کو کیسے بتلائے گا!
م شب تمہاری دسترس میں ہے!! (مہتاب حیدر نقوی)۔	اُن کو کیسے سمجھائے گا!! (افتخار نسیم)

ان کے ساتھ ہی کچھ PRODIGETS بھی اسی کیفیت کی طرف لوٹ رہے ہیں، چنانچہ عادل منصور

• ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ: "نظم معریٰ اور آزاد نظم" ملاحظہ ہو۔

میں حنفی اور عزیز قیسی وغیرہ کے یہاں بھی ایک طرح کی مراجعت دیکھی جا سکتی ہے۔ نئی نظم، خیالات کی واپسی کے ساتھ ساتھ بہت سے تمام جھام جھنجھٹ اور حشو و زوائد سے بھی پاک ہوتی جاتی ہے کہ نیا نظم نگار ان تمام صورتوں کو محض بھرتی کی چیز سمجھتا ہے۔ محمد حسن صاحب نے کہیں یہ لکھا ہے کہ نئی نظم سے فکر کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اچھی نظمیں اور اچھے نظم نگار لفظیات کی تنزیلیں تو نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے پاس تہذیبی الفاظ اور صحبتوں کی اشاراتی زبان، نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ مگر فکر، اچھی نظموں میں باقی ہے۔ بلکہ بہ درجہ پھیلی ہوئی ہے۔ مگر یہ باتیں نئی نظموں کا UNDER TONE ہیں۔ ہاں ان نظموں کا دائرہ ضرور اکہرا ہے۔ یہ بھی ہے کہ، فوری تاثر اور فوری بیان، نئی نظموں کو یقیناً لیے ہوئے ہے جس کی وجہ فکری تجذیب عام طور پر نہیں ہے۔ فضا آفرینی اور لمحاتیت کا زور لوٹ رہا ہے۔ اور زیر لبی (UNDER TONE) کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ نئی نظمیں خواہ ترقی پسند ہوں یا جدید، وضاحتوں سے زیادہ سوچ (MUSES) کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور کسی لمحاتی اثر کے تحت، نظم نگار کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں تو بھی جوش اور سردار جعفری کی بلند آہنگی (OVER TONE) اس میں نہیں پیدا ہوتی بلکہ نئے نظم نگار کو فیض اور ن.م. راشد کے قریب کہیں دیکھنا چاہیئے۔ پھر نئے نظم نگار میں کائنات سے اپنی ذات کی طرف جھکنے کا مزاج پیدا ہو گیا ہے، جو اسے جدیدیوں سے ملا ہے۔ مگر یہ سب اس وقت فیشن بن جاتا ہے۔ جب نظم نگار ان صورتوں کو محض اوپر سے اوڑھ لیتا ہے۔ نثری نظم بھی آج کی نظم کا ایک رخ ہے۔ مگر ابھی اسے استقامت حاصل نہیں ہوئی اور نہ یہ طرزِ اظہار ابھی فیشن میں آیا ہے، اس لیے نظم کے اس تجربے پر ابھی کوئی بات کہنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ نئی نظم میں چند شاعرات کے تجربوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اردو نظم نگاری میں یہ ایک نئی ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اردو کی شاعرات ابھی اپنی گھٹی زندگی کی فضا سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ کم از کم شاعری کی دنیا میں جبکہ پاکستان میں نئی شاعرات کی ایک کھیپ کی کھیپ ہے جس میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، پروین سید فنا اور بہت سی وہ شاعرات شامل ہیں جو پاکستان سے دوسرے یورپی ممالک کو منتقل ہو گئی ہیں۔ ان میں حمیدہ رحمان، نیر جہاں، وفی بیگ کی عرفانہ عزیز، مانڈریال کی عذرا احمد، اور نیو جرسی کی رشیدہ عیاں خاص ہیں، لیکن ان میں سے زیادہ تر ابھی تجربوں کی منزلوں میں ہیں۔ کچھ نشالجیا کے تجربوں میں گھری ہیں، لیکن جو زندگی کے وسیع سمندر سے ہمکنار ہو گئی ہیں۔ ان میں تلخ، ترش و شیریں ہر طرح کے تجربے موجود ہیں۔ اردو نظموں میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے ازدواجی زندگی کے تجربے بالکل نئی صورتیں ہیں۔ ان میں تلخ نوائی بھی ہے۔ محبت کی مٹھاس بھی اور گھر سے نکل کر باہر کی فضا

ٹکراؤ اور اشتعال بھی شامل ہے۔

اب غزل کی سمت و رفتار پر بھی کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ غزل جو بیوۂ عالم بھی ہے، سندِ ہزار بیوہ بھی گردن زدنی بھی اور اردو شاعری کی آبرو بھی۔ شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ہو جو غزل کی بارگاہ میں پہنچے بغیر ایوانِ شاعری میں داخل ہوا ہو۔ مجھے غزل کے سلسلے میں بہت زیادہ کچھ اس وقت نہیں کہنا ہے صرف نئی غزل کی چند صورتوں کی طرف اشارے کر سکوں گا کہ میری ایک پوری کتاب "غزل کے نئے جہات" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ تفصیلات اُس کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ پھر اس لکچر کا کینوس بھی اتنا پھیلا ہوا ہے کہ تفصیل کی گنجائش بہت کم ہے۔ نئی غزل، اس وقت آویزش سے دوچار ہے۔ اس میں تجربے کرنے والے تو روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ موضوعات بھی آج کی نئی زندگی سے برابر آ رہے ہیں۔ اُس کی لفظیات بھی تیزی سے بدل رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا پیٹرن بھی بدلنے کی کوشش آزاد غزل کی شکل میں ہو رہی ہے۔ مدراس کے علیم صبا نویدی نے "ردِ کفر" کے نام سے آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے، اور ایک انتخاب بھی جس کا نام "قید شکن" ہے۔ شاعر بمبئی نے آزاد غزل اور نثری نظم کا ایک نمبر بھی تقریباً چار سو صفحات کا شائع کر دیا ہے، جس میں ہر طرح کے مضامین بھی ہیں اور آزاد غزل کے نمونے بھی۔ گویا غزل میں اظہار کے نئے نئے اسالیب کی کوشش، غزل کا نیا رخ ہے۔ جو لوگ، اس طرزِ غزل میں کوشاں ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اچھے تجربے تو پیش نہیں کیے لیکن شکایتوں کے دفتر ضرور کھول دیے ہیں کہ اس طرزِ غزل کو روایت پرست اور مقلدانہ ذہن کے لوگ قبول نہیں کر رہے ہیں

مگر نئی غزل ہر طرح کے تجربوں سے دوچار ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی مقبولیت کا دائرہ، نظم سے زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میڈیا میں بھی غزل کی مقبولیت بڑھی ہے۔ نئے غزل گو کی اپنی زندگی، روایتی شاعر کی زندگی سے الگ ہے، اور وہ اپنی اس زندگی کو ہر طرح سے غزل میں داخل کر رہا ہے، اور اس "ہر طرح" میں اظہار کا طریقہ نئے معاملات، نئی ترکیبیں جو کبھی کبھی ہندی شاعری سے بھی اور زندگی کے نئے برتاؤ سے آ رہی ہیں۔ سب کچھ شامل ہیں۔ پھر خود 'تغزل' کا تصور، اب نئی غزل میں بدل رہا ہے۔ غزل صحیح معنوں میں 'تنگنا' سے باہر نکلی ہے۔ اس نے وہ تمام تجربے چھوڑنے کی کوشش کی ہے جو جاگیردارانہ سماج سے اس نے رکھ رکھاؤ، وصل و ہجر کے محتاط انداز اور بیان کے اشاری طریقوں سے سیکھے تھے۔ آج کی زندگی میں انتظار کی وہ فرصت کہاں جو غالب کو تصورِ جاناں کیلئے ملی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل، اب ہر شخص کے نجی اور جذباتی تجربوں کا اظہار بننے کی کوشش میں ہے۔ اب وہ صرف PRIVILEGED CLASS ہی کا تجربہ نہیں رہ گئی۔ اسی لیے اس میں عمومیت پہلے

کی بہ نسبت زیادہ آتی جاتی ہے۔ پہلے بھی عام لوگ غزلیں کہتے تھے، مگر ہمیشہ وہ CEHOSEN FEW کے معیار اور پسند و ناپسند کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ گویا، الفاظ اور فکر تو اُن کی ہوتی تھی مگر پسند و ناپسند کا فیصلہ اور حد بندی، عام غزل گو نے، خواص پر چھوڑ دیا تھا۔ نئی غزل، اس پابندی سے باہر نکل آئی ہے۔ شاید اُس کا معیار عوامی پسند اور اُس کے اپنے نجی فیصلے بن گئے ہیں۔ اس سے ایک خرابی بھی آئی ہے کہ نئی غزل کا شاعر، معیار اور زبان کی سند، محاوروں اور الفاظ کی معنویت، سب کو چھوڑ رہا ہے۔ صرف اپنے علم اور اپنی لاعلمی کو درست مان کر چل رہا ہے۔ شاعری کے اسکول بہر حال، معیار مہیا کرتے تھے جواب کہاں رہ گئے۔ اس طرح غزل، اپنی مقبولیت تو بڑھا رہی ہے۔ مگر اس کا معیار مجروح اور مشکوک ہو رہا ہے۔ پھر تجربے، ہر طرح کی زندگی، سماج اور سنسار سے ہو رہے ہیں۔ یہ شاعری میں ایک طرح کی توسیع کی صورت ہے۔ مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے کہ غزل کی عام تفہیم (COMMON UNDER STANDING) باقی نہیں رہے گی۔ الفاظ، اشارے، علامتیں اور اظہاریت کی جو عام تفہیم تھی، جو تمام اردو دنیا میں سمجھ لی جاتی تھی۔ مقامی لفظیات بے حد انفرادی رویے اور مقامی زندگی کے تجربے، غزل سے یہ عام تفہیم چھین رہے ہیں۔ جس سے غزل کی تفہیم کی UNIVERSALITY چھن رہی ہے۔ اب تو یہ ہو کے ہی رہے گا کیونکہ اردو کا جو غزل گو، نیو جرسی، ناروے، وینی پگ، پاکستان اور لندن میں زندگی اور اس کی صورتوں کا تجربہ کر رہا ہے، اس میں، دہلی، بنارس اور لکھنؤ کی تہذیبی صورتوں اور تنگ گلیوں کا رنگ کیونکر پیدا ہوگا۔ پھر ایک منظم زندگی میں غیر منظم زندگی کے تجربات اور کیفیات کس طرح پیدا ہو سکیں گی۔ ذرا کچھ مثالیں دیکھیں:۔

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے	میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے	(افتخار عارف)
سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی	ہمارے گھر سے یہ بےگھری نہ جائے گی	(شاہین کنیڈا)
شہر نا پُرساں میں کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں	بام و در روشن ہیں لیکن راستہ ملتا نہیں	(حسن عابدی)
صبر کی تخ بھی نہ پگھلے، ہے یہی ڈر لوگو	ہے سوا نیزہ جو سورج مرے سر پر لوگو	(رشیدہ عیاں)

پھر اپنے ملک میں بھی نئے ڈھنگ سے بات کہنے کی لپک، الفاظ کی نئی تہیں اور معنوی جہتیں، روایتی تفہیم اور الفاظ کے روایتی معنوں سے الگ ہو کر، نئی صورتیں بنا رہی ہیں۔ یہ صورت بڑھتی ہی جائے گی۔ غزل سے اسی لیے جاگیر دارانہ دور کی تہذیب، اصول اور رکھ رکھاؤ سب گھٹتے جاتے ہیں۔ ہندی سے اچھی مزاولت، الفاظ کی نہ صرف نئی سطحیں اور سپوزیشنز پیدا کر رہی ہے بلکہ، تشبیہات اور استعارات میں بھی کلاسکی روایت

ے الگ ہٹ کر اپنی دنیا بنا رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں غزل کی شکل، اپنی کلاسکی اور تہذیبی شکل سے شاید بالکل
ل ہو جائے گی۔ کم از کم موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر قرائن یہی نظر آتے ہیں۔

شاعری کے دوسری اصناف میں تقریباً سناٹا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ جو دو بڑے اصناف تھے، وہ
بنافن اور اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ مثنوی کی جگہ تو بہت کچھ نظموں نے لے لی ہے۔ سردار جعفری اور کیفی نے
جمہور" اور" خانہ جنگی" کے نام سے، مثنوی کی روایتی موضوع کو بدل کر ملک کی سیاسی صورت حال پر
۱۹۴۷ء میں دو مثنویاں لکھی، جن میں سارے لوازم تو مثنویوں کے نہ تھے، مگر اسلوب مثنوی کا تھا اور مثنوی ہی
ہ کر یہ مثنویاں پیش بھی کی گئیں۔ تبدیلی یہ تھی کہ ان کا موضوع کوئی کہانی نہ تھی۔ ہاں اگر بدلتے ہوئے ہندوستان
ئے واقعات اور ملک کے سیاسی حالات کو اگر عوام کی کہانی مان لیا جائے تو، یہ مثنویاں ایک نیا رنگ لے کر آئی
تھیں مگر کسی شاعر نے ان کا اتباع نہ کیا۔ خود ان شعرا نے بھی، ان تخلیقات کے بعد، کچھ اور تجربے، مثنویوں
کے سانچے میں نہیں کیے۔ اگرچہ بیانیہ کا یہ انداز، ہندوستان کا ایک نیا سا گا (SAGA) لکھنے کے لیے اچھی خاصی
مد کر سکتا تھا اور یہ موضوع بھی نیا تھا۔ تاہم مثنوی پر زوال آ گیا۔ قصیدے کے لیے بھی یہی صورت ہوئی جن
حالات میں قصیدے لکھے جاتے تھے، وہ حالات شخصی حکومت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سردار جعفری نے ایک سیاسی
قصیدہ لکھنے کی کوشش کی تھی جس میں ممدوح عوام تھے مگر وہ چل نہ سکا۔ یہاں تک کہ فروری ۱۹۵۶ء کے ماہنامہ
"آجکل" میں شائع شدہ یہ قصیدہ، خود سردار جعفری کے کسی مجموعے میں غالباً شامل نہیں ہوا۔ قصیدہ جس
INSENTIVE کے تحت لکھا جاتا تھا، وہ INSENTIVE ہی باقی نہ رہ گیا۔ نہ وہ تہذیبی ڈھانچہ معاشرہ کا
ہے۔ ہاں صنفِ مرثیہ میں یقیناً کچھ تجربے کیے گئے ہیں اور ایک پوری کھیپ مرثیہ نگاری کی ہندوستان میں کم مگر
پاکستان میں آ گئی ہے، جو جدید مرثیے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس جدید مرثیے کی ابتدا تو جوش نے "حسین اور
انقلاب" لکھ کر کی تھی، مگر اب نئے لکھنے والوں نے اس میں خاصہ تنوع، الفاظ اور اظہاریت کے طریقوں میں پیدا
کیا ہے۔ اب مرثیوں میں قدیم اجزائے مرثیہ کا التزام نہیں ہے بلکہ، اب جدید مرثیے کو نظم اور
مرثیہ کے بیچ کی کوئی چیز سمجھنا چاہیے، جس کے چہرے میں بھی اور درمیان میں بھی سیاسی اور سماجی
صورت حال پر تنقید بھی ملتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ واقعات کربلا کی کہیں وضاحت اور کہیں اشاریت
فوق فطری صورتیں ختم کر کے نیا مرثیہ گو عموماً۔ واقعۂ کربلا کے دور رس اثرات اور نئی زندگی کے امکانات
اسوۂ حسینی سے روشن کرنا چاہتا ہے، جو بیسویں صدی کی تعقل پسندی کا نتیجہ ہے۔

کر دیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی | زندگی کیا، موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
توڑ سکتا ہے رگ گردن سے خنجر آدمی | لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتّر آدمی

ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسینؑ ابن علیؑ کا نام لے سکتا نہیں

(جوشؔ)

فیضؔ کا مرثیہ "امام" اور "آج بازار میں پا بہ جولاں چلو" اور راجہ فاضل کا مجموعہ "سرِ نینوا" اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک بہت نیا تجربہ ہے، صفدر حسین، یاور عباس، ان کے علاوہ رئیس احمد کا مرثیہ "داستانِ حرم" لفظ اور مفہوم کا ملاپ، از رئیس فروغ "امام علی" از کشور ناہید "جبر کی ریگ ہر سمت اڑتی ہوئی تھی" از عارف عبدالمتین "سلام تجھ پہ سلیح بغاوتوں کے امام" از فارغ بخاری "غم لازوال" از مخدوم منور۔ سب جدید مرثیے کی طرف نیا قدم ہیں۔ ان معنوں میں کہ روایتی مرثیہ سے ان میں ہر طرح کی تبدیلی آئی ہے۔ یہ مرثیے انسان کو جبر کے خلاف اقدام کے لیے تیار کرتے ہیں اور مقصد شہادت کربلا کو انسانیت کی تعمیر اور اس کے عزم و ہمت کو استوار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں آزادیٔ فکر کی تلاش ہے۔ یہ تمام جدید مرثیے، فن اور مقصدیت دونوں میں قدیم مرثیوں سے ایک قدم آگے ہیں۔ اگرچہ کینوس بیانیہ مرثیوں سے چھوٹا ہے۔ مگر ان میں تاثیریت ابھارنے کی بے پایاں کوشش نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو روایتی اور جدید مرثیوں کے بیچ کا تجربہ بھی کر رہے ہیں ایسے مرثیہ نگاروں میں صفدر حسین، یاور عباس، رئیس امروہوی، زیبا لکھنوی، راغب مرادآبادی، اطہر حسین جعفری خاص ہیں۔ نئے مرثیے عقلیت کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ جو آج کے سائنسی دور کا نتیجہ ہے ان میں سے نشو و زوائد ختم ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ طوالت بھی نہیں رہی جو کلاسیکی دور کے مرثیوں میں تھی کہ آج واقعہ کربلا کی عظمت کردار سامنے رہتی ہے، جرأت و مردانگی سے حالات کا مقابلہ کرنا اور ثبات قدم کے ساتھ حقیقتوں اور سچائیوں پر قائم رہنا ہی انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ گویا آج مرثیے، انسان کی عظمت کو ان راستوں سے بھی اجاگر کرنا چاہتے ہیں، جو راستے انسانی سماج کے درمیان سے بنے ہیں اور جن پر آج کا انسان چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب نثر پر باتیں کی جاتی ہیں۔ جن میں آج کے افسانے، ناول اور تنقید کو خاص طور پر مطالعے کے لیے چنا گیا ہے۔

افسانہ پورے ہندوستانی ادب کا ایک اہم جزو ہمیشہ سے رہا ہے۔ پورے مشرق میں کہانی سے جو دلچسپی رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ پنچ تنتر، ہتوپدیش اور جاتک کہانیاں ہماری اس دلچسپی کی نشانیاں

ہ۔ جہاں سے لے کر آج بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک کہانیوں کا ایک لامتناہی اور زریں سلسلہ ہے او
ایہ بیسویں صدی میں پریم چند سے ترقی پسندوں تک کا دور ابھی تک کی اردو کہانیوں کا سب سے شاندار
ر ہے۔ اس کے بعد جدید فکر سے متاثر کہانیاں ہیں جن میں علامتوں، تجرید اور لایعنی کہانیوں کی بھرمار ہے۔ جن
اہم ستون، انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، بلراج مینرا اور سریندر پرکاش ہیں باقی تقریباً
م نئے افسانہ نگار ان افسانہ نگار کے متبعین ہیں۔ انھیں کے متوازی ترقی پسندوں کی بھی دوسری کھیپ چلتی رہی
ہے۔ جن میں اقبال متین، اقبال مجید، عابد سہیل، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، ستیش بترا، رام لعل اور
دسرے لکھنے والے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے درمیان سے اپنا راستہ نکالا ہے۔ ایسے لکھنے والوں میں سلام
رزاق، انور خاں، انور قمر، ساجد رشید، حسین الحق، احمد یوسف، علی امام، کنور سین، نور پرکار اور علی محمد
بتا ہیں۔ سرحد پار بھی بہت سے نئے افسانہ نگار ادھر آٹھویں دہائی میں سامنے آئے ہیں جن میں آغا سہیل (اگرچہ یہ
انے افسانہ نگار ہیں) مرزا حامد بیگ، کوثر جمال، زاہدہ حنا، سائرہ ہاشمی، اختر جمال، شہزاد منظر، رشید امجد،
ں حسن خسرو، نجم الحسن رضوی، سمیع آہوجہ، غلام حسین نقوی، مشتاق قمر، محمد منشا یاد، مستنصر حسین تارڑ، منیر احمد
شیخ، مسعود اشعر، وغیرہ۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوشیار بھی ہیں جو کہانی کی پسند و ناپسند کی سوئی پر نظر رکھتے ہیں۔
ر جس طرف اس کا جھکاؤ دیکھتے ہیں، اسی طرح کے افسانے لکھنے لگتے ہیں۔ انھیں نہ افسانے کے موضوع سے دلچسپ
ہے نہ زندگی کے مسائل سے نہ فن افسانہ نگاری سے بلکہ وہ یہ دیکھا کرتے ہیں کہ کدھر تالی زیادہ دیر سے بج رہی
ہے، اسی طرح کا مال سپلائی کرو۔ یہ بات آج کی کہانی کے سلسلے میں لکھ دینا، اس لئے ضروری ہے کہ اس صورتحال
نے آج کی کہانی، خصوصاً، اردو کہانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے کہ اب جنیوین اور جعلی کہانی کار کا امتیاز کرنا مشکل
ہوتا جا رہا ہے۔ خیر یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر لکھ دی گئی۔

آٹھویں دہائی سے پہلے کی کہانی 'علامتی کہانی' رہی۔ اس وقت کہانی کاروں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ
لامتی کہانی ہی، اب اردو کہانی کی توسیع ہو سکتی ہے اور اسی کے ساتھ 'تجرید' کا رنگ بھی جڑ گیا۔ ہندوستان میں
لامتی کہانی، انتظار حسین، خالدہ اصغر (حسین) اور انور سجاد کی قیادت میں وارد ہوئی، جس کا سب سے پہلے
بلراج مینرا نے خیر مقدم کیا۔ "کمپوزیشن" کے نام سے انشائیہ نما افسانے لکھے، بعد کو احمد ہمیش نے "مکھی" نام کا علامتی
افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا اور پھر علامتی افسانوں کی ایک لہر ہندوستان کی اردو افسانوی دنیا میں پھیل گئی
لامتی شاعری کی طرح علامتی افسانوں نے بھی، اسد ادب کی فضا کو کافی مکدر کیا۔ ایک صورت تو یہ پیدا ہوئی کہ

ہر مندی، الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے لگا جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ یہ کام بہت آسان بھی تھا اس لیے کہ جو جی ہو لکھ
کسی مواخذے کا ڈر نہیں، کیونکہ اگر کہانی سمجھ میں نہیں آتی تو ملزم قاری ہے، لکھنے والے کا کوئی قصور نہیں۔ لایعنی
کہانیوں کی پہلے تو بڑی تعریف کی گئی اور ساری لعن طعن قاری کے حصے میں آئی۔ پھر جب نئی کہانی کے ناقدین
یہ محسوس کیا کہ قاری نا سمجھ نہیں جتنا کہ ناقدین سمجھ رہے ہیں تو یہ کہا جانے لگا کہ لایعنیت ABSURDITY
بھی ایک حسن ہے۔ اس کے تجربے مغرب میں بھی ہو رہے ہیں۔ علامتی کہانی تو ترقی پسندوں نے بھی لکھی ہے، او
"غالیچہ" و "مردہ سمندر" اس کی مثال میں پیش کیے جانے لگے۔ مگر قاری اس بہلاوے میں نہیں آیا۔ پھر یہ تھیوری
پیش کی گئی کہ ادب کا کوئی سچا قاری ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر قاری کی سمجھ میں کہانی نہیں آرہی ہے تو قصور
اُس کا ہے۔ اُسے خود کو UP TO THE MARK لانا چاہیے۔ مگر قاری بھی ہوشیار ہے۔ اُس نے علامتی کہانی کو طاق
رکھنا شروع کیا تو علامتی اور لایعنی کہانیاں صابن کے پھین کی طرح بیٹھنے لگیں۔ میزا اور رکھی والے احمد ہمیش، کہانی
کے سین سے بالکل غائب ہو گئے۔ پاکستان میں بھی خالدہ اصغر (حسین)، انور سجاد اور مرزا حامد بیگ کا چراغ بجھ
لگا۔ پھر ایک اور پھرا دیا گیا کہ علامتی افسانہ نگار سب بائیں بازو کے سیاسی لوگ ہیں۔ ہندوستان میں بلراج مین
نے دعویٰ کیا کہ وہ C.P.M سے وابستہ ہیں، اور ادھر بھی دعویٰ انور سجاد نے پاکستان میں کیا (یہ ساری افواہیں
سرگوشیوں میں پھیلائی جاتی تھیں) مگر قاری نے علامتی کہانیوں کو طاق پر رکھنے کا عمل بند نہیں کیا کہ وہ کہانی سے پہلی
شرط، تفہیم اور دوسری کہانی پن کی چاہتا تھا۔ پھر ناقدین نے بحث شروع کی کہ کہانی پن ہے کیا؟ "افسانے میں کہانی
پن کا مسئلہ" "افسانے کی حمایت میں" جیسے مضامین اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ یہ سوال اٹھایا گیا کہ:

"اگر کسی افسانے میں کہانی پن ہو تو کیا وہ افسانہ دلچسپ ہو جاتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" ہے تو کہانی پن اور دلچسپی ایک ہی شے کے دو نام ٹھہرتے ہیں۔ . . اگر اس سوال کا جواب "نہیں" میں ہے تو یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ افسانہ کہانی پن کے باوجود غیر دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ افسانہ غیر دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دلچسپ ہونا افسانے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر دلچسپ چیز افسانہ ہو۔" (شمس الرحمٰن فاروقی ــــ افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ)

یہاں قاری بھی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہ سوال کس سے کیا جا رہا ہے، اور کس کی تفہیم معرض بحث میں ہے؟ جب قاری کوئی
صاحب ذوق ہو ہی نہیں سکتا اور تفہیم، یا ترسیل، کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ ایک تخلیق وجود میں ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ
سمجھے تو پھر اوپر کے سوالوں کی ضرورت کیا ہے؟ جہاں تک "دلچسپ" اور "غیر دلچسپ" کی بات ہے۔ اس میں بھی ہماری

ِودار ہوتا ہے۔ کس کے لئے کہانی دلچسپ ہے؟ ان کے لیے جو "سچ" سوسی دنیا" پڑھتے ہیں؟ "شمع" پڑھتے ہیں؟۔
ِیں صدی" کے افسانے پڑھتے ہیں؟ اُن کے لیے جو "آستانہ" "مستانہ جوگی" یا سیکس میگزین پڑھتے ہیں؟ ظاہر
۔ ان کی دلچسپی اور "نقوش" "فنون" اور "عصری ادب" کے قارئین کی دلچسپیوں میں فرق ہوگا۔ تو پھر "دلچسپ"
'غیر دلچسپ" کا معیار قائم کرتے وقت قارئین کی صفیں بھی بنانی پڑیں گی۔ خیر، یہ بحث خاصی طوالت چاہتی ہے، مگر
سے یہ ضرور ہوا کہ قاری نے جب علامتی کہانیوں کو REJECT کرنا شروع کیا تو کہانی کار، قاری سے کٹ گیا۔
ِہانیاں صرف سیمیناروں میں ایک دوسرے کو سنانے اور مزاج المومنین کے لیے صرف لمبی لمبی بحثوں کی چیز ہو کر رہ گئی
جدید رسالوں میں کہانیاں چھپ تو جاتیں، مگر انھیں پڑھنے والے نہ تھے۔ سیمیناروں میں یہ بحثیں مدتوں چلا رکھیں
ِہانی مجھے لکھتی ہے"۔ جدید اردو افسانے کا ڈائیلما' نیا افسانہ اور روایت سے انحراف' "کہانی مجھے نہیں لکھتی"
معلوم نہیں کیا کیا۔ ان تمام کسرتوں سے ایک بات ضرور اُبھرتی کہ اگر حالات ناسازگار ہوں تو علامتی کہانی اچھی
سکتی ہے بشرطیکہ قاری، ان حالات کی طرف اشاروں کو سمجھ سکے۔ اس میں کچھ اچھی علامتی کہانیاں بھی وجود میں
، ہندوستان میں اقبال مجید کی کہانی "دو بھیگے ہوئے لوگ"، بلراج مینرا کی کہانی "وہ"۔ سریندر پرکاش کی
ی "بجوکا" سلام بن رزاق کی کہانی "کالے ناگ کے پجاری" انور خاں کی کہانی "کوؤں سے ڈھکا آسمان" عابد
ہیل کی کہانی "سوا نیزے پر سورج" رتن سنگھ کی کہانی "ڈرتی ڈری ہوا" وغیرہ۔ مگر پاکستان میں چند بہت
اچھی کہانیاں لکھی گئیں۔ ان میں انور سجاد کا افسانہ "کونپل" خالدہ اصغر کی کہانی "سواری" اور "ہزار پایہ"، زاہدہ حنا
ہانی "تتلیاں ڈھونڈھنے والی" اور بھی ایسی کہانیاں ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اسی لسٹ میں کچھ
ن کی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کا میں تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ "مقتل" والے مینرا، "کمیں گاہ" والے شفیق اور
۔" والے شوکت حیات مجھے معاف فرمائیں کہ میرے اعصاب کمزور ہیں۔

تفہیم اور کسی کیفیت اور دلچسپی سے عاری کہانیوں کو جب زیرک اور صاحب ذوق قاری نے
REJE کرنا شروع کر دیا تو افسانہ نگار بھی خاصہ پریشان ہوا۔ چند نقادوں اور سیمیناروں کے بل بوتے پر
ِکب تک جیتا رہتا کہ اس کا رشتہ عوام سے کٹ گیا۔ یہ سوال بھی اس کے دل میں پیدا ہوئے کہ وہ کس
لیے کہانیاں لکھتا ہے؟۔ اگر قاری اور عوام میں ان کہانیوں کی جڑیں نہیں، اگر ان کہانیوں کا مسالہ،
امی مسائل اور روزآنا کی زندگی سے وابستہ نہیں ہے تو یہ کہانیاں صرف نقادوں کے عجیب و غریب تجربوں
، لئے تو وہ نہیں لکھ رہا ہے اور نہ لیبارٹریوں کی بوتلوں میں بند کرنے کے لیے یہ کہانیاں ہیں، تو پھر ان کا مصرف

کیا ہوگا؟ اور یہ سوچ کر افسانہ نگار پھر تفہیم، معنویت اور عوامی مسائل کی طرف پلٹنے لگا کہ انھیں کی وہ قاری کی دنیا میں داخل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اردو کی نو بہ نو کہانی اپنے کہانی پن، اپنی دلچسپی اور اپنے سماجی مسائل کو پھر واپس لا رہی ہے۔ آج کی کہانی بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے کہ کہیں پھر وہ کسی مکڑ جال میں گرفتار ہو جائے۔ ادب میں اگر زندگی کے مسئلہ نہ رہے تو پھر اس میں کیا ہوگا۔ پھر مسئلے ہیں کہ اُبھرتے نئے چلے آتے ہیں بھی، دیرپا بھی اور تہذیبی شکست و ریخت کے بھی مسئلے۔ ایسے مسئلے بھی جن سے ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوام کے مسئلے بھی وابستہ ہیں جن کی طرف بھی کہانی کار کو متوجہ ہونا چاہیے۔ ہاں اپنے بیان کے طریقوں کو وہ جس طرح استعمال کرے لیکن اُسے اپنے قاری کی فہم اور دلچسپیوں کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ آج استعارہ، معمّے، گمشدہ کلمات (مرزا حامد بیگ)، "پہچان" (خالدہ اصغر)، کمپوزیشن اور دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، سب مٹ چکے ہیں۔ "اب قیدی سانس لیتا ہے" (زاہدہ حنا)، "ناس اور مٹی" (محمد منشا)، "کوندے" (تقی حسن خسرو)، "دارا آدمی" (احمد داؤد)، "مُخبر" (سلام بن رزاق)، "نئے ملتان کی دیمک" (علی امام)، "ریت گھڑی" (اسا...)، "تیئیس گھنٹے کا شہر" (احمد یوسف)، "فصیل" (تسنیم زیدی) اور لہر جیسے افسانوں کا مزاج بن رہا ہے اور زیادہ تر افسانے قاری اور اُس کے مسائل سے قریب ہیں۔ ایک لہر جو مزید نئے افسانہ نگاروں میں آ رہی ہے وہ یہ کہ وہ چند افسانے لکھے اور ناقدین اُسے دنیائے افسانہ کا "ایک اہم ایک معتبر نام" قرار دیں۔ یہ جذبہ اچھا جذبہ نہیں ہے۔ یہیں تک بات نہیں ہے۔ کچھ بے صبر افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو چند افسانے لکھنے کے بعد اپنے نمبر تک نکلوا چکے ہیں۔ میں اس موقع پر کوئی ناصح مشفق نہیں بننا چاہتا، مگر سوچیے کہ پریم چند کے بعد کہانیوں کا گراف اونچا ہوا ہے؟ نمبر نکلوانے والوں، اور اردو کہانیوں کے نقادوں کو برا بھلا کہنے والوں کی کتنی کہانیاں ہیں جو دلوں کو چھوتی ہیں؟ کیا پریم چند کی زندگی میں ان کا کوئی نمبر نکلا۔ یا پریم چند کے دور کے نقادوں نے ان کی زندگی میں کتنے مضامین ان پر لکھے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر، بیدی، عصمت، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے کہانی کے گراف کو کچھ اونچا کیا ہے، لیکن ترقی پسندوں کے بعد کہانی علامتوں میں ایسی کھوئی کہ کہانی کا گراف سوائے نیچے گرنے کے قطعی اونچا نہیں اٹھا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ اور جن کہانیوں نے متوجہ کیا ہے، ان میں انور سجاد کی "کونپل" حنا کی کہانی "تتلیاں ڈھونڈھنے والی"، رتن سنگھ کی کہانی۔ "وری ذری ہوا" ہے۔ ان میں بالکل نئے تجربے ہیں۔ اور ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت معلوم ہوتی۔ خصوصاً زاہدہ حنا کی کہانی ایک بار پڑھنے کے بعد مدتوں آپ کو HAUNT کرتی رہے گی۔ یقیناً میرا محاسبہ بہت...

دلپسند نہیں آئے گا، مگر مجھے بہر حال اپنے محاسبے کا حق ہے۔

ناول کی دنیا' ۱۹۵۰ء کے بعد سے افسانوں سے بہتر ہوئی ہے۔ ادھر نئے پرانے لکھنے والوں نے ناول کے فن اور اس کی پیشکش کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسندوں کے ساتھ، اردو ناول خالص رومان سے باہر نکل آیا تھا۔ ننگی حقیقتوں کے قریب ناول کو لانے میں ترقی پسندوں کی کوششیں "لندن کی ایک رات" سے شروع ہوئیں اور "ٹیڑھی لکیر" "معصومہ" "دل کی دنیا" (عصمت چغتائی)، "طوفان کی کلیاں" "باون پتے" "ایک عورت ہزار دیوانے" (کرشن چندر)، "تلاش بہاراں" (جمیلہ ہاشمی)، "آگ کا دریا" "سفینۂ غم دل" (قرۃ العین حیدر)، "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین)، "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) "راہ عمل" اور "اپنی اپنی صلیب" (صالحہ عابد حسین)، "آنگن" اور "زمین" (خدیجہ مستور) سے ہوتے ہوئے ناول کی دنیا اب ایک نئے منطقے میں داخل ہو گئی ہے۔ ادھر ناول میں کچھ علامتی رنگ بھی نمایاں کرنے کی کوشش، جوگیندر پال اور انور سجاد نے کی۔ جوگیندر پال کا ناولٹ بیانات اور نادید۔ انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" کی تفہیم آسان نہیں، علامتوں کے پردے خاصے دبیز ہیں۔ پھر بھی ناول یا افسانے میں، اگر تخلیق کار اپنے ساتھ بیانیہ کو لئے رہے، خواہ کسی شکل میں ہو تو، قاری، تخلیق کار کے ساتھ چل سکتا ہے، چاہے تخلیق کار علامتوں کے ساتھ ہی کیوں نہ چلتا ہو لیکن جس نے بیانیہ کا ساتھ چھوڑ کر خالص علامتوں اور احساس کے فکری اشاروں یا مصوری کی ذہنی صورتوں کو الفاظ کے ذریعہ یہ سمجھ کر کوشش کرنا شروع کیا کہ الفاظ، مصور کے رنگ اور لکیروں کا بدل ہیں تو بیانیہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اظہاریت بھی باقی نہیں رہ پاتی۔ ادب اور خصوصاً کہانی یا ناول بہر حال کسی واقعے سے ہی متعلق ہوتے ہیں اور واقعے میں بیان، ایک لازمی سی شے ہے۔ انور سجاد کے دونوں ناول "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ" بیانیہ سے تقریباً عاری ہیں۔ ان دونوں میں شعری اور مصورانہ، اختصار، اشاریت اور تہ داریاں اپنے عروج پر ہیں۔ یہ کہنا کہ احتجاج کو پرزور طور پر واضح کرنے کے لیے، یہ طرز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرح کا بہکاوا ہے کہ احتجاج اگر دیکھنے اور سننے والوں پر واضح نہیں ہوتا تو اس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔

ادھر اردو ناول میں تفہیم کی نئی تلاش ہوئی ہے۔ پرانے اور کچھ نئے ناول نگاروں نے، رومان اور انقلاب سے ہٹ کر بھی زندگی کے کچھ نئے روپ تلاش کئے ہیں۔ بانو قدسیہ نے ایک نئے موضوع پر ایک اچھا ناول "راجہ گدھ" کچھ سال قبل پیش کیا ہے۔ موضوع، ان معنوں میں نیا ہو جاتا ہے کہ مصنفہ نے ہیرو کے ایک خاص رجحان کو۔ POIN T۔ بنانے کی کوشش کی ہے اور انھیں صورتوں سے متاثر ہو کر گدھ 'کا علامتی نام دیا ہے کہ گدھ کو ہمیشہ مردار

ہی کھانے کو ملتا ہے۔ وہ خود شکار نہیں کر سکتا۔ راجہ گدھ کے ہیرو کو بھی ہر مرتبہ معاشقے میں یہی مسئلہ پیش آتا۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک منزل پر پہنچ کر شادی کے لئے تیار ہوتا ہے تو وہاں پر کچھ ہی حادثہ اُسے پیش آتا۔ موضوع کے اس الوکھے پن کے ساتھ بانو قدسیہ نے جو حالات اور سیاسی و سماجی صورتوں کو لپیٹ دیا ہے۔ پاکستانی زندگی کے مطالعے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور اس طرح یہ ناول اپنی افادیت باقی رکھتا ہے۔ شوکت صدیقی نے بھی جانگلوس میں ایک نئے موضوع کو اپنایا ہے، جس میں رحیم داد اور لالی کے گرد ناول گھومتا ہے۔ جیل سے فرار مجرم۔ ہر طرح کی بدعنوانیاں سماج میں پھیلاتے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ہر طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں، اور آزاد ہیں۔ دراصل کہانی کی دلچسپی یہ ہے کہ آج کی سیاسی فضا میں مجرم مزے کر رہے ہیں سوسائٹی اُن کی معاشی ترقی دیکھ کر انھیں صورتوں کو خوشحالی کی کنجی سمجھتی ہے اور اس خیال کے تحت جو سماج وجود میں آئے گا، اُس کے اعمال و افکار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، اور یہ صورت، دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ بے کرداری ہی سب سے بڑا کردار اور بے ایمانی ہی سب سے بڑا ایمان ہے، اور یہ صورت صرف ذرائع معاش کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑھتے بڑھتے ادب کی دنیا میں بھی مختلف طریقوں سے داخل ہو گئی ہے۔

انتظار حسین نے اپنے نئے ناول "تذکرہ" میں اپنے بازیافت والے اسٹائل سے ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بھی بازیافت کی ایک طرح سے توسیع ہے مگر بہرحال یہ ایک نیا مسئلہ ضرور ہے جو ہندوستان میں ختم ہو چکا ہے۔ مگر پاکستان میں روز بروز شدت پکڑتا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے مہاجرین کے بسنے بسانے کا جس میں روز بروز پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اور جس کے باعث چالیس پچاس برس بعد بھی، یہ اکھڑے ہوئے لوگ، آج بھی اکھڑے اکھڑے پھر رہے ہیں۔ اس ناول میں اسلامی طرز پر سزائیں دینے کے جو نقشے انھوں نے پیش کئے ہیں، خصوصاً چوراہے پر پھانسی دینے کا طریقہ وہ آج کی پاکستانی سماجی زندگی پر طنز بھی ہے اور بیسویں صدی کی مہذب زندگی کے لیے عبرت انگیز بھی۔ بعض باتیں جو انتظار حسین کے ساتھ بدخوابی DELIRIUM کی طرح، اُن کی ہر تحریر میں لگی ہوتی ہیں۔ وہ اس ناول میں بھی موجود ہیں۔ یعنی بلاسبب اور بے موقع ترقی پسندوں اور اشتراکیوں پر دولتیاں جھاڑنا جس سے، ناول کی رواں دواں سنجیدگی مجروح ہو جاتی ہے، اور اس کا مصرف سوائے مخالفت برائے مخالفت کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

اسی تھیم کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے دیوان بیریندر سنگھ ظفر پیامی نے اپنے حالیہ ناول "فرار" میں

لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ظفر پیامی کے ناول "فرار" کی فضا بھی انتظار حسین کے ناول سے زیادہ وسیع ہے اور موضوع کا میدان عمل بھی بڑا ہے اور ان کے نتیجے بھی بہتر ہیں۔ یہ ناول بھی ڈھاکہ سے ہندوستان اور پھر پاکستان جانے والے چند مہاجرین اور ہندوستان میں ان کے ہندو مسلم دوستوں اور واقف کاروں کو اس طرح لپیٹ لیتا ہے کہ حکومت الگ ہو جاتی ہے اور انسانی اخوت اور دوستیاں الگ اور یہی اس کا ایجابی (POSITIVE) رخ ہے کہ انسانی محبتیں اور لگاؤ سیاست کے بندھنوں اور فرقہ پرستیوں کے زہر کو نہیں مانتے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے دو ہم جماعت دوست افتخار حسین ہاشمی اور آفتاب چودھری اس ناول کے اصل کردار ہیں جو صحیح طور پر ایک مشترکہ تہذیب میں بندھ کر ایسے وقت میں بھی اپنی محبتوں کو نہیں بھولتے۔ جب پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال چکی ہیں اور افتخار ہاشمی کس طرح اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان فرار ہو جانا چاہتے ہیں مگر ناول کا فیصلہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر سحر ہاشمی کا فیصلہ ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسل کا فیصلہ ہے جو کسی مزید فرار یا ہجرت کیلئے تیار نہیں بلکہ اپنے حقوق اور فرائض سب کا فیصلہ اسی سرزمین پر رہ کر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سرزمین سب کی مشترکہ میراث ہے۔ اسکے تمام مسئلے ہندوستان کی نئی نسل کے مسئلے ہیں۔ ناول کا یہ بالکل نیا ٹریٹ منٹ ہے۔ یہ ٹریٹ منٹ حکومت کی سیاسی قومی یک جہتی کے نعرے سے الگ چیز ہے جس میں ظفر پیامی نے نئی بنتی ہوئی سوسائٹی کے خدوخال اور ان کے نئے مسائل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ناول کی دنیا میں یہ ایک نیا قدم ہے، جس کے اندازے دوسرے ہیں۔ ظفر پیامی، چونکہ خود ایک صحافی بھی ہیں۔ اس لئے ناول میں صحافیانہ اور سیاسی مسئلے بہت زیادہ دخیل ہو گئے ہیں۔ بہرحال اردو کے نئے ناول کے لیے ابھی بہت سے میدان باقی ہیں۔ کاش پریم چند کی طرح کوئی آج کے دیہات کو اپنا موضوع بنا کر آزادی کے بعد کے دیہاتوں کو پیش کر سکتا کہ ابھی یہ ایک بڑا اور دلچسپ تھیم ہے جو اردو کے ناول نگاروں کی توجہ کا محتاج ہے۔ میری معلومات کے مطابق ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں اب تک ہندوستان کے نئے دیہاتوں اور ان کے نئے مسائل کو نہیں چھوا گیا۔ ابھی تک لوگ ہندوستان کے دیہاتوں کو پریم چند ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ادب کے کسی مسئلے کے مستقبل پر کوئی رائے زنی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اندازہ یہی ہے کہ اردو ناول اور افسانے، سب شہری مزاج رکھتے ہیں اور شہروں کے مسئلے، آئندہ بھی اردو ناول کے مسئلے بنیں گے کیونکہ مغربی ادب کا بھی یہی ماڈل ہمارے سامنے ہے۔ ہارڈی اور اس کا اسکول اب انگریزی ادب سے بھی غائب ہو چکا ہے اور کم از کم اردو ہندی کے ادیبوں کے سامنے ہر وقت مغربی ادب، ادبی تحریکات اور تجربے ہی رہتے ہیں۔ اردو میں ناول

کو آنچلک بھی بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں یہ کوشش ملتی ہے مگر ہندو
کے اردو ناول ابھی تک آنچلک نہیں ہو پائے۔

اب آج کی تنقید پر کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ ترقی پسندوں نے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا تھا
وہ یہ کہ ادب کی صرف خوبیاں اور خرابیاں یا فنی نکات، سقم اور محاسن سے آگے بڑھ کر ادب کا تجزیہ اس
کیا جائے کہ کسی تخلیق کے وجود میں آنے کے محرکات کیا ہوتے ہیں۔ کیا صرف جذبوں کے فنی اور جمالیاتی اح
کے اظہار کے لیے ادب وجود میں آتا ہے یا ادیب کے گرد و پیش کے بیرونی حالات اسے ایک خاص وقت میں
سماج کی ترجمانی کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ بیرونی حالات ادیب کے اپنے سماجی اور سیاسی حالات ہی ہو
ہیں جو اس کے ذہن کو ایک خاص طور پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ کہ عوامی زندگی کے درمیان ہی
زندگی کے مسائل آتے ہیں اور وہی مسئلے ایک بڑے گھیرے میں کسی ملک و قوم کا مسئلہ بنتے ہیں۔ بیسویں
کے سماجی اور سیاسی حالات نے پریم چند کو اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے مسالہ فراہم کیا۔ اس مسا
ان حالات اور سوسائٹی کی ان خاص صورتوں کے بغیر پریم چند اور ان کے تخلیقات کا وجود ممکن نہ تھا۔ ترقی
پسندوں نے سماجی حقیقت نگاری کے اظہار پر سب سے زیادہ زور دیا۔ مجنوں گورکھپوری کی ادب اور
سے لے کر آج تک کے ترقی پسند نقادوں کا تنقید ادب کے لیے سب سے بڑا پیمانہ یہی سماجی حقیقت نگاری رہا
سماجی حقیقت نگاری زندگی کی حقیقتوں کی سماجی تجزیے کے اظہار کا نام ہے، جس کے گہرے نشانات تخلی
کی نکر پر پڑے ہیں۔ فن کے پرکھنے میں اس تجزیہ اور اس کے طریقوں کو ترقی پسند نقادوں نے اجاگر
کرنے کی کوشش کی۔ یہ طریق کار فن کار کے جمالیاتی تجربوں کا بھی جائزہ لیتا رہا ہے اور دوسری صورتوں کا
مگر اسے کسی جامد فارم کے طور پر ترقی پسند نقادوں نے اسے استعمال نہیں کیا۔ نہ کسی ہئیت یا تکنیک کے طریقے
جیسا کہ اکثر ترقی پسند تنقید پر اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ تنقید میں اس صورت
پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ بقیہ صورتیں بہت کچھ تشنہ رہ گئیں۔ لیکن نئی ترقی پسند تنقید اب دوسری صورت
کی طرف متوجہ تھے۔ ادھر دو سال پہلے مارکسی جمالیات پر اصغر علی انجینئر کی ایک اہم کتاب مارکسی جمالیات کے
نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل بھی پروفیسر ممتاز حسین نے "نئی حقیقت نگاریاں" اور نئی جمالیات
اپنی کتاب "ادبی گوشے" اور "ادبی مسائل" میں اٹھائی تھی۔ راقم الحروف کے بھی کئی مضامین، مارکس
جمالیات پر شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کی کتاب ادبی سماجیات، میں بھی تنقید کے جمالیاتی اور نا

پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ صرف جمالیات ہی ادب اور تنقید کا سب کچھ تو نہیں۔ ادھر جو نئی تنقید نئی شاعری کے سلسلے میں آئی ہے۔ اُس میں جمالیات اور ادب پر اس طرح بحث کی گئی ہے کہ جیسے اگر نقاد ادب کے جمالیاتی پہلو پر کچھ نہیں لکھتا تو وہ نقاد ہی نہیں پھر ادب کی ہیئتی صورتوں کو ہی اصل تنقید سمجھ لیا گیا ہے۔ اور یہی سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے چھٹ بھیئوں کو بھی مزہ ملا۔ وہ جو نہ سماجی حقیقت نگاری کو سمجھتے تھے اور نہ جمالیات کا درک رکھتے تھے، وہ بھی نئی صف میں شامل ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی نئی تنقید، اب ہیئتوں سے بھی الگ ہو کر متنی تنقید (TEXTUAL CRITICISM) کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔ متن ہی کو سامنے رکھ کر تخلیق کار کی تخلیقات کا جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ اور اس پر بیرونی اثرات، وقت کا فیشن یا چلن، یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اس سلسلے کی باقاعدہ کتاب شمس الحق عثمانی کی کتاب "بیدی نامہ" ہے جس میں صرف کہانیوں اور ناولوں کے متن پر ہی ساری تنقید کا انحصار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متن کی اہمیت ہے کہ وہی فن کار کا اصل کارنامہ ہے، مگر تنقید تو یہ سوال کر سکتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہیئے کہ اس متن کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا رہے ہوں گے۔ آخر اس طرح کی پیشکش کا مذاق اور مسالہ، کن صورتوں اور کن حالات میں آیا ہوگا۔ کوئی تخلیق اپنے سماجی اور تاریخی گھیرے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ یہ بنیادی بات مان کر جب تک تنقید نگار نہیں چلے گا۔ صرف فروعات سے بحث کسی تخلیق کا صحیح جائزہ نہ ہوگا۔ لسانیات کے مطالعے سے تنقید میں فی زمانہ ایک نیا رخ اسلوبیاتی تنقید کا بھی پیدا ہوا ہے۔ تخلیق کے موضوع اور مسالے کو چھوڑ کر، تنقید نگار، اُس کے پیش کرنے کے سانچوں اور اسٹائل صوتی نظام، آہنگ وغیرہ پر بحث کرتا ہے جو ہیئتی تنقید ہی کا ایک حصہ ہے۔ اب اس میں بھی تنقید نگار جب آہنگ اور صوتی نظام کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے، حروف گننے لگتا ہے۔ اور اُن حروف کی موسیقیت ہی کو صرف، فن کار کی عمدہ تخلیق کا بنیاد بتانے لگتا ہے تو یہ انتہا پسندی کی دوسری مثال ہے کہ شاعر نے حروف کا التزام کر کے غزل تخلیق نہیں کی تھی۔ یہیں سے تنقید میں ایک دوسری شاخ ساختیاتی تنقید (STRUCTURAL CRITICISM) کی بھی پھوٹتی ہے۔ اس میں وہ نقاد بھی کسی حد تک شامل ہو جاتے ہیں جو عملی تنقید کے قائل ہیں۔ اگرچہ ساختیاتی تنقید، ہیئتی تنقید ہی کے زمرے میں آتی ہے، مگر اس کا سایہ عملی تنقید پر بھی ہے۔ عملی تنقید میں اگرچہ مسالہ خاص طور پر بحث میں آتا ہے۔ پھر بہت سے نفسیاتی مسئلے بھی مگر تخلیق کی بناوٹ اور بناوٹ بھی زیر بحث آتی ہے۔ عملی تنقید، اردو میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس طرز کو باقاعدہ شروع کیا۔ راقم الحروف نے بھی کچھ کام اس سلسلے میں کیا ہے۔

تنقید کے نئے رخ میں تحقیق کے طریق کار کو بھی کچھ جگہ مل رہی ہے۔ یہ صورت غالباً ان درسی مقالوں سے

پیدا ہوئی ہے۔ جو یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں نہ اصول تنا
کی باتیں ہیں نہ نظریات تنقید کی بلکہ، تخلیق کے حسن و قبح پر ہلکی پھلکی بحثیں۔ فنی اور فکری محاسبے کے سلسلے میں کی جا
ہیں۔ مگر ان تحقیقی مقالوں کی تنقید اور ان کے نقاطِ نظر پر زیادہ بھروسہ کرنا مناسب نہیں۔ ان میں سے نوٹ ق
ادھر ادھر سے لفظاً لفظاً نقل کر لئے جاتے ہیں جس کا پتہ بعد کو چلتا ہے۔ کچھ مقالہ نگار تو ایسے دیدہ دلیر
ہیں کہ انھیں بعد کو اسی طرح شائع کر کے اردو کی اکیڈمیوں سے انعامات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ صورت حال نا
نا گفتہ بہ ہے کہ یونیورسٹی کا استاد نقاد، بالکل جعلی، نقاد ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے شعرا، دوسروں کی غزلیں مشاع
میں اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے تھے اب یونیورسٹی کے اساتذہ اور اردو کے نقاد، دوسروں کی تنقیدی کوشش
کو مقالے کی شکل میں اپنے نام سے پیش کر کے ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے استادوں کی تنقید اور ان کی ڈ
اب قطعی قابل اعتبار نہیں تنقید کی دنیا میں یہ ایک پُر دغل اور جعلی سکہ ہیں۔ اچھی تنقید اور اچھی تخلیقات اب
مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے باہر لکھی جا رہی ہیں اور تدریسی اداروں سے باہر رہ کر ہی اب اردو میں نئے
تنقیدی تجربوں کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے مدرسہ اور خانقاہ دونوں کے لیے کہا تھا کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مجھے خانقاہ کا تو کوئی تجربہ نہیں، مگر میں مدرسے کے لیے آج یہ شعر ضرور پڑھ سکتا ہوں۔ کوئی چاہے تو میری ایسی
سوچ کا بھی تنقیدی تجزیہ کر سکتا ہے۔

سید حامد
ڈاکٹر محمد حسن

خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا۔ اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟ کسی نے کہا دانشوری یعنی چہ؟ کسی نے کہا چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ کسی نے کہا:

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں　　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں، اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

ادارہ

سید حامد
ہمدرد نگر، نئی دہلی

دانشوری کی تعریف

اور
اردو میں دانشوری کی بازیابی کے امکانات

آگے بڑھنے سے پہلے اچھا ہو کہ دانشوری کے معانی، مفاہیم اور مضمرات سے بحث کر لی جائے۔

وہی لوگ دانشور ہیں جنھوں نے زندگی کی گتھیوں کو حل کرنے کی لگاتار کوشش کی ہے، جنھوں نے عالم کے بدلتے
ہوئے حالات سے خود کو باخبر رکھا ہے۔ جن کے مطالعہ کو ان کے مشاہدہ اور تجربے سے غذا ملی ہے۔ جن کا علم نرا کتابی علم
نہیں ہے۔ جن کے علم نے انھیں رائے قائم کرنے، حکم لگانے اور فیصلہ کرنے کا شعور دیا ہے؛ جن کا مطالعہ وسیع ہے
اور ملک کی ایک سے زائد زبانوں کے علاوہ جن میں مغرب کی ایک زبان بالخصوص انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور
روسی زبان پر دسترس حاصل ہے (کہ سمٹتی، پیچیدہ تر ہوتی ہوئی اور نت نئے مسائل سے لبریز دنیا سے باخبر ہونے
اور رہنے کے لیے مشرق اور مغرب دونوں سے براہ راست آگاہی ضروری ہے) جو مسائل پر ٹھنڈے دل
سے غور کرنے کی عادت ڈال چکے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذہنوں کو اوہام رسوم، موروثی خیالات اور تعصبات
سے آزاد کر رکھا ہے۔ جن کا مقصد حقیقت کو پا لینا ہے اور جس میں اس بات کی جرأت ہے کہ سچائی سے خواہ
وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں اور اسے برملا بغیر آنکھ جھپکائے بیان کر سکیں۔
دانشور تلاش حق اور اعلان حق میں کسی مصلحت یا کسی رو رعایت کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس کا ذہن سرجن کے
نشتر کی طرح ہوتا ہے جس کی دھار میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے۔ اس کے گرد نہ دھواں پھٹکنے پاتا ہے نہ دھندلکا۔
اس سورج کی شعاعیں اسی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو میں کسی نظام فکر کو
حائل نہیں ہونے دیتا نہ ان حقائق کو چھپانے یا دبانے کی کوشش کرتا ہے جن کا اظہار اس کے محبوب نظام فکر کو
تہ بنا رہا ہو۔ اس کا آلہ عقل ہے، وہ عقل جس کے ساتھ سوجھ بوجھ چلتی ہے، وہ عقل نہیں جو باریک بینی اور
موشگافی سے دل بہلاتی ہے۔ دانش کا مصدر دانستن ہے جس کے معنی ہیں جاننا یعنی کسی امر کی تہ تک پہنچ جانا۔
دانشور کبھی سطحیں نہیں ہوتا اور نہ وہ سرعت ذہن پر ناز کرتا ہے۔ سرعت فہم کے بغیر بھی انسان دانشور ہو سکتا۔

دانش اور ذہانت میں بڑا فرق ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر ذہین آدمی اُمور پر گرفت رکھتا ہو یا اس سے اصابتِ رائے منسوب کی ہی جائے ـــــــ دانش ذہانت کی بہ نسبت ادراک سے زیادہ قریب ہے لیکن دانش کے عمل میں ادراک کے عمل سے زیادہ جامعیت ہے۔ دانشور کے یہاں اشتراکِ مقاصد غیر ممنوعہ ہے۔ دانشور اصلاً موحد ہوتا ہے۔ اس کا واحد مقصد سچائی کو ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ وحدتِ مقصد پر وہ کسی مفاد کسی مصلحت کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔

دانش میں چاہے یہ مفہوم بہت واضح نہ ہو لیکن دانشور کی نگاہ ہمیشہ حال کے علاوہ مضمرات امکاناتِ مستقبل، و متوقع یا ممکن نتائج پر ہوتی ہے اور وہ ایسے اقدام سے انحراف کرتا اور کراتا ہے جو بظاہر بہت اچھا ہو لیکن جس میں امکان نتائج کے خراب نکلنے کا چھپا ہوا ہو۔ دانشوری کا ایک عنصر دور اندیشی ہوتا ہے۔

دانشوری چھوٹی چھوٹی وفاداریوں وابستگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا اُفق عالم اور انسانیت کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ کسی ایسے شخص کو دانشور نہیں کہہ سکتے شہر، ریاست یا وطن جس کی حدِ نظر ہو یا اس شخص کو جو سیاست کے دریا کا شناور ہو۔

دانش ایک حد تک تجریدی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے لیکن حکایت تجرید کو اتنا نہ بڑھانا چاہیے کہ دانش کی غیر معمولی عملی افادیت کو ٹھیس پہنچے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دانش کا عقل کی موشگافی یا تخیل کی بے مقصد بلند پروازی سے کوئی تعلق نہیں۔ دانش کے پیر سدا زمین پر ہوتے ہیں۔ اس کے قدم سوجھ بوجھ اور اعتماد کے ساتھ پڑتے ہیں اس کی نگاہ سرنگ کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی دوسرے سرے کی روشنی سے جا ملتی ہے۔

دانش کے ایوان میں نہ تیز رفتاری بار پاتی ہے نہ گھبراہٹ نہ فلسفیانہ بے نیازی دانش کے ناخن وہم لکیریں نہیں کھینچتے گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ دانشور دراصل وہی ہے جو گتھیوں کو سلجھا سکے۔

دانشور کی انگلیاں انسانی فطرت کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ انسان کے ارتقا اور زندگی کے نشیب و فراز سے باخبر ہوتا ہے۔ تاریخ پر اس کی نظر گہری ہوتی ہے تاریخیں یاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ تحریکوں کے مد و جزر اور قوموں کے عروج و زوال سے آگاہ ہونے کے لیے کسی ایک مضمون میں غیر معمولی امتیاز بھی آپ کو دانشوری کے حدود میں داخل نہیں کر سکتا۔ دانشوری کا طرۂ امتیاز آزاد انداز فکر اور مربوط نظام فکر ہے۔

اُردو زبان میں دانشور کی اصطلاح کو غیر معمولی وسعت اور تعمیم کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اگر یہ عمل روا نہ رکھا جاتا تو ہمارے دانشوروں کی تعداد آٹھ دس سے آگے نہ بڑھتی۔ اس وقت ہم وائس چانسلروں، پروفیسروں، لیڈروں، وکیلوں، ڈاکٹروں کو چھوٹتے ہی دانشوری سے متصف کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس اصطلاح کو بے دردی

کے ساتھ ارزاں کر دیا ہے۔ دراصل دانشور کے لیے مفکر ہونا ضروری ہے ہر چند کہ بڑا مفکر ان بلندیوں
لیتا ہے جہاں تک دانشور کی رسائی نہیں ہوتی۔

دانشور اور مفکر میں ایک فرق یہ ہے کہ دانشوری میں عملی اطلاق اور دیے ہوئے حالات میں فیصلہ
کرنے کی صلاحیت کے پہلو اور سوجھ بوجھ کی عقدہ کشائی آجاتی ہے۔ مفکر اپنے پرواز کے لیے
بندھن قبول نہیں کرتا۔ دانشوری میں ارضیت شامل ہے۔ مفکر کو اس کے برعکس فلک شگافی کی دھن ہو
مفکر جس نظامِ فکر کی تخلیق کرتا ہے یا جس کا وہ دلدادہ ہوتا ہے اس میں مربوطیت اور تجریدیت کی ادائیں
ہیں۔ دانشور دانش کو ارض کے قریب اور سماء سے دور رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ کسی اصطلاح کا ترجمہ کریں یا کسی مفہوم کو لفظ تراشی کے ذریعہ ایک زبان سے
دوسری زبان میں منتقل کریں یا کسی ترقی یافتہ زبان کے الفاظ کے مترادفات کسی ترقی پذیر زبان میں یا کسی ترقی یا
زبان میں ہی ڈھالیں تو آپ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے کہ منفعت یاب زبان نو تراشیدہ لفظ کو ان ہی معانی
میں رکھے گا جنھیں آپ نے اس میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان سے زیادہ خود سر اور غیور کوئی دوسرا
وجود شاید عالم آب و گِل میں نہ ہو۔ اردو والوں نے شروع میں غالباً INTELLECTUAL کے مفہوم کیلئے دانشور
کی اصطلاح ڈھالی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ پلک جھپکاتے ہی نقل اصل سے آگے بڑھ گئی۔ INTELLECTUAL
میں نہ وہ وزن ہے نہ وہ مرتبہ جو دانشور کو حاصل ہو گیا۔ INTELLECT کا ترجمہ کیجیے تو دانش کے مقابلہ میں وہ عقل
اور فراست کے زیادہ قریب ہوگا۔ دانش کا مفہوم WISDOM سے ادا ہوتا ہے۔ دانش غالباً دانستن سے
نکلا ہے۔ دانشور وہ شخص ہے جس نے دانش کو دانستہ اس کے سارے مضمرات اور تمام پابندیوں پر غور کرنے کے بعد
اختیار کیا ہے۔ جس طرح پیشہ ور کسی پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سخنور مشقِ سخن کو اپنانے والے کے لیے
استعمال ہوتا ہے، اسی طرح دانشور وہ شخص ہوا جس نے دانش کو اختیار کر لیا ہے، اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے،
جس نے دانش کے تقاضوں اس کی شرطوں اور اس کے قیود کو برضا و رغبت قبول کر لیا ہے۔

اصطلاح وضع یا ترکیب یا ساخت کے لحاظ سے دانشور کا مرتبہ انگریزی کے INTELLECTUAL سے بمراتب اونچا ہے۔
دانش سے آپ وہ مفہوم جدا ہی نہیں کر سکتے جو اسے INTELLECT سے اوپر لے جاتا ہے۔ لیکن اس وزنی اور
گرانقدر اصطلاح کو ہم نے بے دردی اور ناقدری کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص سرِ بازار
سو روپے کے نوٹ کو پانچ روپے کے نوٹ کے عوض استعمال کرنا شروع کر دے تو سو روپے کے نوٹ کی قدر و قیمت

میں کوئی کمی نہیں ہوگی البتہ آپ اس شخص کی سلامتی ہوش و حواس کے متعلق جو رائے قائم کریں گے وہ شاید ستائش
مبنی نہ ہو۔ ہم نے ہر خاص و عام کو دانشور کہنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ دانشور سوائے سوچی سمجھی نپی تلی بات کے کچھ
کچھ نہیں کہتا۔ اس کی فکر محتاط ہوتی ہے اور زبان پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے ساتھ توازن
ضبط منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کل اردو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میری زبان سے جوش بیان میں یہ بات نکل
گئی کہ اردو والے اردو کے لیے رتی بھر بھی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس بات میں تندی تھی بے احتیاطی تھی اور مبالغہ
تھا۔ ایسا سخن کسی دانشور کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جہاں تک باضابطہ تعلیمی نظام سے
الگ جتن کر کے بچوں کو گھر پر اُردو پڑھانے کا تعلق ہے اردو والوں نے غفلت برتی ہے۔ لیکن میرے الفاظ سے اس
کی تکمیل نہیں ہوئی لہٰذا اگر میرے لیے محض اس بنا پر کہ میرا تعلق ایک بڑے تعلیمی ادارے سے رہا ہے دانشور کا لفظ استعمال
کر دیا جائے تو وہ اس لفظ یا اصطلاح کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ہم نے دراصل دانشور کے لفظ کو بہت ارزاں کر دیا ہے

دانشور کے لیے ایک شئے درکار ہے جس کے بغیر کوئی فکر پیشہ انسان دانشور نہیں بن سکتا۔ یہ شئے ذہانت
ہے۔ ہمارے یہاں اس شئے کی بہت کمی ہے اسی لیے فی زمانہ ہم ایسے دانشوروں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ہمارے
یہاں جذبات کے کاروبار کے علاوہ مروتوں، رعایتوں، طرفداریوں، گروہ بندیوں کا چلن ہے۔ ہمارے زیرک، ذکی اور
باخبر اشخاص میں سے کم ایسے ہیں جو یہ سکہ ہائے رائج الوقت اپنی جیب میں نہ رکھتے ہوں۔ ان پر ایک اضافہ مکتب فکر یا آئیڈیالوجی
کا ہو گیا ہے۔ آئیڈیالوجی اکثر دیانت، اصابت، معروضیت اور انصاف کا خون کر دیتی ہے۔ دانشور ان چھوٹی باتوں،
سازشوں اور گروہ بندیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کا مزاج سازشی اور جنبہ دارانہ ہوتا ہے آسمان سے
تارے توڑ کر لا سکتا ہے، دانشور نہیں بن سکتا۔ دانشوری کے لیے کڑے ضبط اور انضباط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو
ادب میں دانشوری کی روایت کو برقرار رکھنے میں زبان کے محققین سے مدد ملی ہے۔

کُشادگی اور تعمیرِ نو :

اُردو نے گذشتہ دس سالوں میں دانشوری کے کوئی آثار اور شواہد پیش نہیں کیے ہیں۔ فضا بھی ناسازگار رہی
(۱) اُردو پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی رہی اور زبان کی بقا مشتبہ ہونے لگی۔ دل زندہ نے اردو میں غور و فکر کرنے والوں
کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دل بجھتے ہیں تو دانشوری کا دیا ٹمٹمانے لگتا ہے۔ (۲) فرقہ وارانہ فسادات اور تناؤ اور بدگمانی
کی فضا نے اہلِ اُردو کو اس یکسوئی سے محروم کر دیا جو تخلیقی اور فکری مساعی کے لیے ضروری ہے (۳) فرقہ وارانہ
اور بے اطمینانی کے دور میں کوتاہ اندیش اور قیادت طلب اشخاص ملت کو بھڑکانے کا کام کرتے ہیں۔ جذبات سے

وقت کھیلا جاتا ہے تو عقل و دانش کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ (۴) زبان کمر جھلنے لگے تو اس زبان میں
کی آزادیٔ فکر ختم ہو جاتی ہے۔ (۵) ملک کی عام فضا دیانت اور راست گوئی اور جرأت فکر کو با
اہل قلم حکومت یا اس کے اداروں کے حلقہ بگوش نہیں تو رہین منت ضرور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ا
پروانہ میں کوتاہی آنا تھی سو آئی۔

ایسا لگتا ہے کہ دانشوری کے سوتے مذکورہ بالا وجوہ سے ہمارے یہاں خشک ہو گئے ہیں۔ تو
ہیں جب بنیادیں وسیع ہوں۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھائے بغیر دانشوری کی روایت کی بازیابی
اس سے زیادہ اہم ضرورت ہے مزاجوں کو بدلنا، انھیں سطح بینی، ارزاں جذباتیت، رعایت، مروت،
جانبداری سے بچانا۔ عقل کا ہمسفر اگر ضمیر ہو تو دانشوری کا مرحلہ سر نہیں ہوتا۔ دانشور دشواریوں، مصیب
سے نہیں گھبراتا، ان کا مقابلہ وہ فلسفیانہ بے نیازی کے ساتھ کرتا ہے۔ اسے خوشی اور غم کی بے ثباتی کا
اور حوادث سے بغایت متاثر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن بظاہر بے نیاز انسان اپنے ماحول اور اپنی انسا
سے ہرگز بے تعلق نہیں ہوتا۔ دانشور لکیر کا فقیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا مقصود ہوتا ہے اصلاح اور بہ
تعلیم اور تہذیب، وہ امور کی تشریح اور تجزیہ کرتا ہے۔ اسے عوامی ڈگر پر چلانا ممکن ہی نہیں۔ چونکہ ہر نظ
کی بنا پر تجدید کا طالب ہوتا ہے، اس لیے وہ لوگ جو کسی نظام کے تحت خوب پنپتے ہوتے ہیں، دانشو
اور اس کے نقطۂ نظر کو پُرخطر سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس کا کام ایک نئے نظام، ایک نئے انداز فکر، ایک نئی دنیا کو وجو
اس لیے دانشور عام روش سے انحراف ضرور کرتا ہے یہ انحراف خواہ فروعات سے ہو خواہ اصول سے، خواہ یہ ترمیم اور
اختیار کرے، خواہ بغاوت کا علم بلند کر دے۔ یہ انحراف نظریات سے بھی ہو سکتا ہے اور طریق کار اور فیصلوں سے
اپنی فکر کو آزاد رکھتا ہے اور دوسروں کو آزادیٔ فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی بات پُرمغز اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ اس
جانا ممکن نہیں۔ وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف چاہے اس سے اپنے متاثر ہوں چاہے پرائے احتجا
رہ نہیں سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی دانشور میں یہ سب اوصاف جمع ہوں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا مقصد تو ان خصو
گنانا تھا جو ہم کسی دانشور سے منسوب کرتے ہیں۔ ان اوصاف میں دیانت، معروضیت، دور اندیشی، عملی بصیرت
نتائج کا ادراک، بے غرضی، آزادیٔ اظہار، حق گوئی، ہمدردی، جرأت اور خواہشِ اصلاح شامل ہیں۔

بیانِ ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقامِ اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

۶۔ ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر محمد حسن
پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

اردو میں دانشوری کی روایت

(تیسری اردو ریسرچ کانگریس، پٹنہ ۲۲-۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء میں پیش کیا گیا)

عقیدۂ محض کے دائرے سے الگ ہو کر اور متعین شدہ نتائج سے قطع نظر کر کے حواس کے ذریعے حاصل ہو
مشاہدات اور تجربات کو منطقی استدلال اور سائنسی ربط و ترتیب کے ساتھ کسی نتیجے تک پہنچانا اور اس کے ذریعے
کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں شرکت سے دانشوری پیدا ہوتی ہے۔

اس موضوع پر ایک طویل بحث ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں بالخصوص دانش دشمن رجحانات کی
کی گئی ہے عقل پر عشق و وجدان بلکہ عقیدے کو ترجیح دی گئی ہے پاکستان کی یہ ضرورت تھی ہندوستانی مسلمان کی مجبور
پاکستان کے اردو ادب میں دانش دشمنی کی اس روایت کا اثر ہندوستان کے اردو ادب پر بھی پڑا۔

تین قسم کی "دانش وری" اس دور میں پنپتی ہے ایک وہ جسے دانش دشمنی کی روایت کہا جا سکتا ہے۔ دوس
دانشوری تھی ہندوستانی مسلمان کے فکری احیاء کی کوشش جو دانش نہیں عقیدے کے زیر سایہ ہوئی۔ اس طرز کی ایک
دانش وری کی روایت تھی اصغر علی انجینیر کی تحریروں کی جسے نیا علم کلام کہا جا سکتا ہے اس میں مذہب اور عقیدے کی
طرح توجیہ کی گئی تھی کہ دقیانوسیت کے بجائے روشن خیالی اور سوشلزم کے لیے گنجائش نکالی جا سکے۔ تیسری روایت تھی لا
کی روایت جس کا رشتہ عقیدے سے زیادہ دانش سے ملتا تھا جس کا عکس عصری ادب کے صفحات پر نظر آئے گا۔

ہندوستان میں اردو کا چلن کم ہو گیا رسالوں کی پہنچ اور کتابوں کی رسائی محدود ہو گئی پبلشر کم بلکہ معدوم مکتب
کم بلکہ مفقود۔ ایسے میں اگر کوئی لکھنا بھی چاہے تو کیونکر لکھے اور چھاپے گا کون؟ اس صورت حال سے نکلنے کا ایک ہی راست

وہ یہ ہے کہ ایک اچھا پبلشنگ ہاؤس ہو اور اس کے گرد لکھنے والوں کا ایک گروہ ہو جو اسی مقصد سے کام کرے
ن نظریات، علوم اور تحریکات سے اردو والوں کو واقف کرائے گا اس اشاعت گھر کے کم سے کم چار بک شاپ ہوں
بلیٹن نما رسالہ۔ گجراتی میں ایک صاحب نے یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر جدید ترین موضوع پر مستند کتابوں کی تلخیص ذی علم
سا سے گجراتی زبان کے ۲۰۰ صفحات میں کر کے الگ الگ کتابچوں کی شکل میں چھاپنا شروع کی تھی اور ہر کتابچے کی قیمت
پے ہوتی تھی اور اس سلسلے میں نیوکلر فزکس سے لے کر کرکٹ تک پر کتابچے شامل تھے اس قسم کا کام اردو میں بآسانی
سکتا ہے اب بھی اردو لکھنے والوں میں سائنس میں ڈاکٹر عبید صدیقی اور ڈاکٹر رئیس احمد سماجی علوم میں پروفیسر علی محمد خسرو
محمد رشید الدین خاں جیسے اہل قلم موجود ہیں اور خود ہمارے سانیوں میں بھی علمی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں
انتظام کی۔ اور یہ انتظام کیا جا سکتا ہے اور اس کا آغاز اردو کانگریس ہی سے ہونا چاہیے۔ یقین مانیے یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔

○

رہی اردو اکادمیوں کی بات۔ یقیناً حکومت پانچ کروڑ روپیہ اکادمیوں پر خرچ کر رہی ہے یہ بھی درست ہے کہ
میوں سے کچھ فائدے بھی ہوئے ہیں کتابیں زیادہ چھپنے لگی ہیں اردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی ہے پرانی کتابوں
اڈیشن بھی چھپے ہیں مگر اردو دنیا کی ان سے صرف ایک ہی آس لگی ہوئی ہے اور وہ پوری نہیں ہوئی ہے وہ ہے اردو
م کا انتظام اور جب تک یہ نہیں ہوتا اردو کا مستقبل محفوظ نہیں اور اکادمیاں شک وشبہ کی نظر سے دیکھی جاتی رہیں گی۔
حکومت نے ان اکادمیوں کے آئین میں بہت سے حقوق دے رکھے ہیں نہیں دیا ہے تو یہی حق نہیں دیا ہے ضرورت
کی ہے کہ ان اکادمیوں کے آئین میں مناسب تبدیلی کی جائے اور ان اکادمیوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے طور پر
سکول کھول سکیں اور اپنے ذیلی دفاتر صوبے کے مختلف شہروں میں قائم کر سکیں اور وہاں بھی اس قسم کے اردو ماڈل
قائم کر سکیں بعض اکادمیوں کے پاس اتنی گرانٹ ہے کہ وہ آج بھی یہ کام کر سکتی ہیں اور یہ ہو تو اس مقصد کے لیے خصوصی
دی جائے اس کے ساتھ جن اسکولوں یا کالجوں میں اکادمی مناسب سمجھے اپنی طرف سے اردو ٹیچر مقرر کر سکے یہ اس
لسے جب تک انھیں باقاعدہ اردو ٹیچر نہ مل جائیں۔ اکادمی کے ماڈل اسکول اردو میڈیم کے بھی ہوں گے اور اختیاری
بھی اور ان میں دیگر مضامین بھی پڑھائے جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ نصاب اور اردو اساتذہ کی تربیت کا کام بھی اکادمیوں کے سپرد ہو۔ جب تک اردو تعلیم
میوں کی کارگزاری قابل اطمینان نہیں ہوتی اس وقت تک اکادمیوں پر اردو دنیا کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا۔

تازہ دانشوری

O

دانشوری پر بحث چلی

تو،

پھر یہ بھی سوال اٹھا کہ

دانشوری کچھ ہے

تو

کیا ہے،

نمونوں میں ہر سال کی دانشوری کے نمونے

ریسرچ کانگریس کے ہر جلسے میں پیش کیے جاتے تھے۔

آخری سال کے نمونے پیش خدمت ہیں:

احمد ندیم قاسمی

ایک پَل ایسا بھی آجاتا ہے

زخم پر زخم دیے جاتے ہو
نہ جھجکتے ہو نہ شرماتے ہو
زخم دینا بھی، نہ پچھتانا بھی
وار پر وار کیے جانا بھی
آمریت کی سند ہوتی ہے
تم کو معلوم نہیں ہے شاید
زخم کھانے کی بھی حد ہوتی ہے
ایک پَل ایسا بھی آجاتا ہے
زخم دیتا ہوا جلّاد کا ہاتھ
اُٹھ کے نیچے نہیں آپاتا ہے
ایک مفلوج کے بازو کی طرح
حشر تک کے لیے تھم جاتا ہے
آنے والی کئی نسلوں کے لیے
ایک عبرت کی علامت بن کر
صفحۂ وقت پہ جم جاتا ہے

مخمور سعیدی

تم چپ رہے ہم چپ رہے

جب حکم اک صادر ہوا، تم چپ رہے ہم چپ رہے
وہ وقت کچھ کہنے کا تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اب اپنی اپنی قسمتوں پر بیٹھ کر سوچا کریں
وہ فیصلہ لکھتا رہا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

تقریر اس کی آگ تھی، شعلے فضا تک بھر گئی
اور شہر سارا جل گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لٹتی رہی تھیں بستیاں، سوئے ہوئے تھے پاسباں
چاروں طرف اک شور تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

قاتل تھے وہ، کار بھی، لوٹا اسے اک بار بھی
وہ جھوٹ بولا برملا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

سر پھوڑتی پاگل ہوا کہتی تھی کوئی ماجرا
روتی رہی گھایل فضا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

منظر بھرے بازار کا، گرنا در و دیوار کا
گھر گھر قیامت تھی بپا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لفظوں کے سوداگر اٹھے، جھولی بھری چلتے بنے
سودا ہمارا ہو گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

مقتول، حرفِ التجا، سنتا تو کیا سنتا خدا
کاٹے گئے دستِ دعا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اے وائے بے جرم و خطا قتلِ عمد مخمور کا
بستی کے لوگوں نے کیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

رملی سٹیل

عصرِ حاضر میں ادب کا کردار

لام و تحیات کے ساتھ ، میرے لیے واجب ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی
ہونے والی انتظامیہ کا شکریہ ادا کروں جس نے ، اپنی ذمے داری کی
کے طور پر منعقدہ سالانہ اجلاس کی صدارت کا فریضہ میرے سر ڈال کر
موقع عنایت کیا کہ آپ سب سے مخاطب ہو سکوں ۔

ناً یہ اعزاز کسی بھی قلم کار کے لیے باعثِ افتخار ہوتا لیکن میرے
ے حیرانی کا مقام بھی ہے ۔ اس لیے کہ اپنی حیاتِ قلم کا غالب حصہ ،
کی حالت میں ، حلقے سے باہر ہی گزرا ہے ۔

سم بلاشبہ حلقے سے میرا رابطہ ، آزادی کے فوراً بعد ، ابتدائے شباب کے
ی طرح زور و شور سے شروع ہوا تھا ۔ لیکن تین ساڑھے تین برس کے
معاملے یا مجادلے میں بقول قائم چاند پوری ، یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی:

نے مجھ پہ وہ بہار رہی ، اور نہ یاں وہ دل
کہنے کو ، نیک و بد کے ، اک الزام رہ گیا

بھی تقریباً چار دہائیوں کے بعد سوچتا ہوں تو یہ الزام بھی اتنا برا
ا ۔ بلکہ اس ابتدائی رابطے کے دوران اس گمراہ نے ، مرحوم قیوم نظر
میں ، حلقے سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہو گا ۔ عین ممکن ہے کہ
ادب میں بحث و گفتگو کے آداب اور اپنے ردِعمل کو دل میں دبائے
ں بجائے ، دلیل و برہان کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنے کی تربیت
حاصل ہوئی ہو ، اور کسی حد تک وہ اندازِ نظر بھی جو ذرا دیر سے
کہ جن سے لگاؤ نہیں ، اُن سے لاگ بھی کیوں ہو ؟ اور جن سے لگاؤ

؛ صدارت ، حلقۂ اربابِ ذوق سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۰ جولائی ۱۹۹۰ء ۔

ہے ، اُن سے لاگ بھی کیوں نہ ہو ؟ جدلیاتی مطابقت کا یہ نکتہ ہاتھ لگا تو
بقول حفیظ ہوشیار پوری :

پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

چنانچہ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کی متغیر صورتِ حال میں تہذیبی
اداروں کو مستحکم کرنے کی اشد ضرورت ہے ، خصوصاً اُن اداروں کو جو
اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں اور جن کا وجود ایک جمہوری بنیاد پر طے شدہ آئین
کی صورت میں برقرار ہے ۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی آزاد ادبی حیثیت اس امر کی
متقاضی ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے اہلِ قلم ، پہلے کی طرح اس کے ساتھ اپنے
تعاون کو مضبوط بنائیں ، روحِ تغیر کو اپنے اندر جذب کریں اور مل جل کر
بلند آواز میں تہذیبی مسائل پر سوچ بچار کریں ۔

ان میں سے ایک مسئلہ آج کا موضوعِ گفتگو ہے ، یعنی عصرِ حاضر میں
ادب کا کردار کیا ہو ؟ عام طور پر اس کا تعین ایسے لوگ کرتے ہیں جنھیں
ادب کے ماضی ، حال یا مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ اُن کے جماعتی
سیاسی مفادات ، البتہ ، ادب کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی طرف
راغب ہوتے ہیں ۔ قوت حاصل ہو جائے تو اس سلسلے میں ترغیب و تحریص سے
لے کر تہدید و تعزیر تک کسی بھی وسیلۂ دست اندازی کو برتنے میں دریغ
نہیں کیا جاتا ۔ ظاہراً ہم ایک جمہوری دور سے گزر رہے ہیں ، لیکن جمہوریت
کی روایت ہمارے معاشرے میں ابھی اتنی محکم نہیں ہونے پائی کہ تحریر کی آزادی
حرص و ہوا اور خوف و خطر کے بغیر نبھائی جا سکے ۔ اصل میں جمہوری دور
میں ادب کو ایک دُہری مصیبت درپیش ہوتی ہے ، ایک تو اس دور میں جلسوں
جلوسوں کا اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور دے بھی
جائے تو لگتا ہے سیاست ، سوقیانہ پن کی شکار ہو چکی ۔ اس بازاری سطح کے
ہنگامے میں ادب کی شمولیت شرم کا مقام ہو گی ۔ دوسری طرف اس مخلوقِ خدا
کو جو سوقیانہ پن کی طرف زور و زر کے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی ہے ، کس
طرح ادب اور تہذیب کی طرف مائل کیا جائے ؟

حال ہی میں اس دوسرے مسئلے پر محترم جمیل جالبی صاحب نے ایک
ذاتی مکتوب میں اپنی تشویش کا یوں اظہار کیا ہے :

"لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب کی مؤثریت درجۂ صفر تک

پہنچ چکی ہے۔ ہمارے زمانے میں اگر کوئی ادب پڑھتا بھی ہے تو وقت گزاری یا دل بہلاوے کے طور پر۔ ایسے میں ادیب کی درد ناک آواز جو اس کے تہہ دل سے نکلتی ہے کیسے اپنا کام کر سکتی ہے؟ پرانے زمانے میں کہتے تھے "از دل خیزد، بر دل ریزد"۔ دل سے اٹھنے والی آوازوں میں تو کوئی کمی نہیں مگر اب یہ آوازیں کسی دوسرے دل پر نازل ہونے سے پہلے فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ کتابیں اور رسالے الماریوں کی زینت بن جاتے ہیں، اور ان کے مندرجات کو پڑھنے والا معدوم ہوتا جاتا ہے۔ شاید کچھ لکھنے والے تھوڑا بہت پڑھتے بھی ہوں مگر ان کی تعداد میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور تحریر کے معیار میں جو کمی آتی جاتی ہے، اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ملکی آبادی کا غالب حصہ خواندگی کی نعمت سے محروم ہے اور جو خواندہ ہو بھی چکے ہیں، وہ بھی یا تو انگریزی پڑھتے ہیں یا بہت کمال کریں تو کوئی مقبول عام قسم کا اردو روزنامہ۔ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کے۔ جو ایک دو فیصدی خواندہ لوگ بچ جاتے ہیں وہ جلدی سے ادیب بن جانا چاہتے ہیں۔ یعنی صاحبِ تصنیف۔ سوچیے تو اب میر و سودا کو، غالب و اقبال کو، راشد اور فیض کو، منٹو اور بیدی کو، عسکری اور غلام عباس کو کون پڑھے گا اور پڑھے گا تو ان سے کیا حاصل کرے گا؟ کیا اس صورتِ حال میں ہمارا ادب نشو و نما پا سکتا ہے اور کیا ہم اپنے تہذیبی معیار سے غافل ہو کر کوئی نیا کمال پیدا کر سکتے ہیں؟ اور کر بھی لیں تو کون ہے جو اس سے بہرہ ور ہو؟"

اس اقتباس میں جو قدرے طویل ہو گیا، بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن میں سے چند ایک کا تعلق ہمارے موضوع گفتگو کے ساتھ بھی ہے مثلاً موجودہ دور میں ادب کا اشیائے صرف کی طرح استعمال اور ادب کی آواز کا کارگر نہ ہونا۔ دونوں کا تعلق پڑھنے کی مقدار سے نہیں، پڑھنے کے معیار سے ہے۔ خالی خولی پڑھنے یا پڑھے جانے کے بارے میں ہمیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ الم غلم کتابیں پڑھتے رہنا بھی ایک قسم کی لت ہے جو ایک بار کسی اچھے بھلے ادیب کو لگ جائے تو پھر وہ ادب کے کام کا نہیں رہتا۔ اس لیے کہ ادب، معیار اور امتیاز اور تہذیبی شعور کا متقاضی ہے۔ ان پڑھ

معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ معاشرتی ردِعمل کے طور پر اس میں چند ایک خود گزیں لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو ہر قسم کی کتاب کو ، چاہے کسی معیار کی ہو ، خود فراموشی کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ، اور منشیات کے عادی لوگوں کی طرح ہر قسم کے کام کے لیے ، بشمولِ تحریر ، مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

عسکری صاحب نے کبھی لکھا تھا کہ پڑھنا ایک سماجی فعل ہے ۔ ان بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب ناخواندہ معاشرے کا دباؤ اسے بھی ایک انفرادی لت بنا کر رکھ دے گا جس کا سماج سے کوئی سمبندھ ہو گا تو محض اتنا کہ اب یہ فعل ایک ایسی سطح پر جا پہنچا ہے جسے کم از کم شعوری نہیں کہا جا سکتا ۔

پہلے اسی معاشرے میں ، جس میں خواندگی کی شرح اگرچہ کم تھی لیکن نیم خواندہ ہونا اور اپنے ادب سے غافل ہونا ، ایک تہذیبی کوتاہی کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔ جو لوگ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تھے یا دوسرے لفظوں میں تخلیق ادب کو اپنا سروکار سمجھتے تھے وہ اپنے معاشرے سے مخاطب بھی ہوتے تھے اور اپنے معیارِ نظر کے مطابق اس پر کڑی سے کڑی تنقید بھی روا رکھتے تھے ۔ حیرت کی بات ہے کہ جمیل جالبی صاحب نے اپنے خط میں جو کچھ حال ہی میں لکھا ہے تقریباً یہی بات ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد امیر مینائی نے کیسے رچاؤ کے ساتھ کہی تھی ۔

محفل برخاست ہے ، پتنگے رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں
بے ان کی نمود بھی کوئی دم وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

کہا جا سکتا ہے کہ یہ سماں ، کلاسیکی دانشوری کے غروب کا تھا جب کہ نئی دانشوری کا ظہور علی گڑھ میں ہو رہا تھا ۔ جس سے نہ امیر مینائی کو آشنائی تھی نہ داغ دہلوی کو رغبت ۔ بلکہ لاہور تک میں نئی دانشوری کے مغربی اساتذہ کی صحبت میں بیٹھنے والے محمد حسین آزاد بھی سخت گومگو کے عالم میں تھے کہ دماغ "نیرنگِ خیال" کی طرف دوڑتا تھا اور دل "آبِ حیات" کے طلسمات میں اسیر تھا ۔ اُدھر اکبر الہ آبادی نے جدید دانشوری کے پردے میں ، ذہنی استعمار کی بازی گری کو کارفرما دیکھ لیا تھا :

جو میری ہستی تھی ، مٹ چکی ہے ، نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا ، خیال اُن کا ، زبان میری

ممکن ہے کسی مہربان کو حیرت ہو کہ موضوعِ سخن تو عہدِ حاضر میں ادب کا کردار ہے اور بات ہونے لگی ہے اکبر الہ آبادی پر جو آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے اپنی ادبی فعالیت کا تحریری مظاہرہ کر رہے تھے ۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں ، اکبر نے جو کچھ کیا ، وہ بڑی حد تک بیسویں صدی کے اواخر کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے :

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالیسی میں اُڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اکبر کا کلام آج بھی کتنا برمحل ہے ۔ اصل میں ادب کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو یوں تو ایک خاص عہد کی کوکھ سے نکلے اور اس عہد کے افکار و اعمال پر نقد و تبصرے کا حق بھی ادا کرے لیکن اس کی خصوصیت میں کچھ ایسی عمومیت مضمر ہو جو آنے والے زمانوں میں بھی ایک فعال قوت کی طرح اپنا جاودانی تہذیبی کردار ادا کر سکے ۔ اکبر کی شاعری اور ظرافت پر مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں ، تاہم دو ایک نکتے اور بھی ملاحظہ ہوں :

کام کی بات جو کہنی ہے وہ کہہ لو ، اکبر
دم میں چھن جائے گی یہ طاقتِ گویائی بھی

درست ہے کہ طاقتِ گویائی کا ایک دم میں چھن جانا ، جیسا کہ پروفیسر وگ پڑھاتے ہیں ، دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جس گہرائی میں جا کر اکبر نے کہنے والے کے عدمِ تحفظ کا احساس دلایا ہے ، وہ محض صوفیانہ تصورِ فنا کی دین نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ اس تصور سے "کام کی بات" کا کوئی رابطہ پیدا نہیں ہوتا ۔ اتنا تو شاید مدارس میں بھی بتایا جاتا ہو کہ اکبر کے کلام پر قدغن یا سرکاری پابندی لگائے جانے کا اشارہ ہوا تھا جس کی طرف ایک شعر میں حوالہ بھی موجود ہے :

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترکِ سخن
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

شہنشاہی دور میں ایران کے ممتاز معاصر شاعر ، احمد شاملو نے مجھ سے کہا تھا کہ ''دولت از شعر وحشت می کند'' یعنی حکومت شاعری سے خوف زدہ ہے ۔ یہ بات ہم بھی اپنے تجربے کی روشنی میں جانتے ہیں کہ فیض و راشد ، منٹو اور عسکری کسی وقت بھی حکومت کے قابو میں نہیں آئے ، بعض اوقات سرکاری ملازمت میں مبتلا ہونے کے باوجود ۔ ان میں سے کسی کو نہ ریڈیو پاکستان اپنا حلقہ بگوش بنا سکا اور نہ بعد میں کوئی رائٹرز گلڈ اپنی گرفت میں لا سکا ۔ یہاں تک کہ ابھی تک اکادمی ادبیات بھی فیض کے سوا ، کسی اور کو بعد از مرگ قدر شناسی نہ دے سکی ۔ لگتا ہے کہ ادب کی دنیا میں ، سرکاری نقطۂ نظر سے ، مرحومین کو بھی غیر محفوظ نہیں سمجھا جاتا ۔

بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' کے دیباچے میں کہا تھا کہ ''شاعر کسی پارٹی کا نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ یوں تو وہ ایک عام فانی انسان ہو کر رہ جائے گا ۔'' زندگی کے کسی مرحلے میں ایک آدھ ادیب کو کسی نہ کسی پارٹی سے تھوڑی بہت مشروط ہمدردی ہو سکتی ہے ، لیکن غیر مشروط غلامی ، کسی سیاسی ، نیم سیاسی جماعت کی ہو یا ترقیاتی وسائل کی ، کسی ادیب کے شایانِ شان نہیں ۔ وہ تو پہلے سے ایک ایسے معاشرتی نظام کی اسیری کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے جو اس کے چوگرد محیط ہے ، اور جس میں رہتے ہوئے اس کا دائمی منصب یہ ہے کہ اس معاشرتی قید خانے سے اپنے تخیل کی مدد سے باہر نکلے ، اور باہر کی دنیا کا منظر سب کو دکھاتا رہے ۔ اکبر کے ''نامہ بنام اخبار اودھ پنچ'' کا ایک شعر ہے :

کی سیرِ دو عالم اک نفس میں
پھر دیکھیے تو اسی قفس میں

اقبال نے اپنے آپ کو قافلۂ بہار کا ''طائرِ پیش رس'' کہا ہے جس نے خلوتِ قفس میں رہتے ہوئے اپنا پیغام نشر کر دیا ہو ، کسی قسم کے نشریاتی ترقیاتی وسیلے کے بغیر ۔ تاہم جب مولانا محمد علی جوہر نے انھیں اپنی خلوت سے نکل کر سیاست کے میدانِ عمل میں اترنے کی دعوت دی تو اقبال نے جواب دیا کہ ''بھائی ! میں تو قوال ہوں ، گاتا ہوں کہ آپ کو وجد میں لاؤں ۔ اگر میں بھی وجد میں آ گیا تو پھر قوالی کیسے ہو گی ؟''

ٹھیک ہے کہ اقبال نے تھوڑا بہت رابطہ اہلِ سیاست سے بھی رکھا اور مسلم قومیت کے سلسلے میں بقولِ خود ''فکر و دانش کا فریضہ'' بھی انجام دیا ۔

لیکن یہ ان کے دانشورانہ اور تہذیبی کردار ہی کی ایک توسیع تھی جو
شکرِ خدا ہے ، عملی سیاست میں ہمہ وقت محویت تک نہ پہنچی ۔ جس چیز نے
انھیں اس مشغولیت کا شکار ہونے سے باز رکھا وہ ان کا مفکرانہ اور شاعرانہ
منصب تھا ، جو پاکستان نہ بھی بنتا تو اس کی حیثیت اپنی جگہ برقرار رہتی ۔
پاکستان بننے کے بعد ہم نے اقبال کو جو کچھ بنا دیا ، اس کا مقصد یہی معلوم
ہوتا ہے کہ اقبال کے متحرک وژن کو جامد بنا کے رکھ دیا جائے یعنی ان کے
ادبی اور فکری کردار کو معاشرے میں جاری و ساری رہنے سے روک دیا جائے ۔
یوں بھی یہ زمانہ ایسا تھا کہ اہلِ قلم تک کہنے لگے تھے :

مجھ سے میرا قلم چھین لو
میرے ہاتھوں میں تلوار دے دو

اس وقت لکھنے والوں کے سامنے کوئی نہ کوئی محدود یا فوری ہدف تھا ،
مثلاً تلنگانہ میں انقلاب کی امید اور اس کے نمونے پر باقی سب جگہ ایک موہوم
تمنا ۔ اس پر بھی شاید کسی کو اعتراض نہ ہو ۔ لیکن خود ہی اپنا قلم چھنوانے
میں کیا حکمت ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ بارِ گراں آپ کے بس کا روگ نہیں تو
آرام سے اسے چھوڑ دیجیے ، اور پھر جو بھی جی میں آئے سو کیجیے ۔ یوں لگتا
ہے جیسے قلم کاری بھی آپ کے لیے ایک ایسی عادت بن چکی ہے جسے اپنی
مرضی سے ترک نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی نہ کسی خارجی تشدد کی ضرورت
پڑی ہے ۔

معلوم ہوا کہ ادیب کے لیے ادب محض ایک میکانکی فعل ہو کر رہ جائے
تو نہ زندگی کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں نہ تخلیقِ ادب کے ۔ سیاسی و نیم
سیاسی جماعتوں کے رہبر یہ بات نہیں جانتے کہ جو ادیب ان کے حلقہ بگوش بن
کر رہ جاتے ہیں ، وہ ادب کی دنیا میں ہی اپنا اعتبار زائل نہیں کرتے ، ادبی
اظہار پر بھی اپنی گرفت کھو بیٹھتے ہیں ۔ تخلیقی ادب اور تبلیغاتی ادب میں
پہلا فرق یہ ہے کہ تخلیقی ادب اپنے تخلیق کار کی رگ رگ میں سمویا ہوتا ہے ،
اور تہذیب میں رچا ہوا ، جب کہ تبلیغاتی قسم کی ادب نما تحریریں کسی نہ کسی
اوپری دباؤ کے تحت لکھی جاتی ہیں جو لکھنے والے کے کام و ذہن کی آزمائش
سے آگے نہیں بڑھنے پاتیں ۔ ایسی تحریریں فرمائشی نہ بھی ہوں جیسا کہ بعض
مبلغین کرام دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے خلوص سے لکھا

ہے ، تب بھی یہ کسی نہ کسی فارمولائی ترکیب کے تحت وجود میں آتی ہیں ، اور ان میں زیادہ سے زیادہ ، ادیب کی فراست کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے یا ایک چالاک قسم کی ہنر مندی ان میں تھوڑی بہت ظاہری کشش پیدا کر دیتی ہے جیسے ٹی ۔ وی کے ڈراموں میں ۔

تبلیغاتی تحریروں سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ مبلغ محترم ابھی منزل پر پہنچ چکے ہوں اور اب دوسروں کو وہاں تک لے جانا چاہتے ہوں ۔ تبلیغ یا پرچار ، آزادی کا ہو یا استعمار کا ، اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں انسانی تجربے کی ٹامک ٹوئیاں اور شک و شبہ کی ہچکچاہٹیں شامل نہیں ہوتیں ۔ اس لیے ادیب نہ کسی حتمی بات کو قبول کرتا ہے اور نہ یقین کی اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے جس کے بعد راوی چین لکھ دے ۔ جرمنی کے جمالیاتی فلسفی لیسنگ نے لکھا ہے :

”میں تو بس کاغذ پر قلم رکھ کے سوچتا ہوں ، اگر آخر کار میرے خیالات مجھے مطمئن کر دیں تو میں کاغذ کے پرزے کو چاک کر دیتا ہوں ۔ ورنہ اسے چھپنے کو بھیج دیتا ہوں ۔“

سیاست کی دنیا محدود اور ہنگامی مفادات کی دنیا ہے ۔ اس لیے یہاں جو بھی فیصلے ہوتے ہیں ، حتمی اور اٹل ہوتے ہیں کہ جلدی میں یہی کچھ ہو سکتا ہے ۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد پراپیگنڈا ہی پراپیگنڈا ، تبلیغ ہی تبلیغ کی مدد سے فکر و دانش کی کمی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جس کے لیے ادیبوں کی ضرورت پڑتی ہے ، اور ادیب بھی کسی نہ کسی بہانے ، قومی اور ملی خدمت سے لے کر عصری شعور کی نمائندگی تک ، اس کارِ خیر میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ آپ ۱۴ اگست کے موضوع پر لکھی ہوئی ان گنت نظموں میں سے جو سرکاری رسالوں میں شائع ہوئیں کوئی ایک اٹھا لیجیے تو معلوم ہوگا ہر طرف بہار کا سماں ہے ، اور اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا ۔ اس کے مقابلے میں فیض کا ”داغ داغ اجالا“ رکھ کر دیکھیے تو فارمولائی ترکیب اور تخلیقی تشکیل کا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح ۱۹۶۵ع کے جنگی ترانوں کو دیکھیے جن کی آواز جب بھی سنائی دینے لگے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یا تو کوئی نئی جنگ ہمارے سروں پر مسلط ہونے والی ہے یا کوئی نیا مارشل لاء لگ چکا ہے ۔

درست ہے کہ ایسے ترانے لکھنے والوں نے اور ان سے بھی زیادہ ان کے گانے والوں اور گانے والیوں نے ، کسی نہ کسی سطح پر اپنا ہنگامی فریضہ انجام دیا ہے لیکن اسے ادب کا کردار انجام دینا نہیں کہہ سکتے ۔ اس لیے کہ جنگ یا مارشل لاء کے سلسلے میں ادب کا کردار یہاں تک محدود نہیں کہ اپنی قوم کا حوصلہ بڑھایا جائے یا جو کچھ بھی ہماری مرضی کے بغیر ہو رہا ہے اس پر اطمینان کا اظہار کیا جائے ۔ یہ کام تو آپ نے ایک بار انجام دے دیا ، اس بھی راگ کب تک الاپتے رہیں گے ؟ کیوں نہ ایسا شعور پیدا کرنے کی کوشش ہو جو اس قسم کے ہنگامی حالات کو پیدا ہونے سے پہلے روک سکے ؟ ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ ادب ، یکایک پینک سے بیدار ہو کر کسی وقتی نعرے میں شامل ہونے کی جگہ ، مستقل بیدار رہے اور اجتماعی بیداری کی نشوونما میں حصہ لیتا رہے ۔ عصری شعور میں جب تک بین الاقوامی شعور شامل نہیں ہوتا قومی حادثات بھی عالمی پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے اور دونوں میں جب تک تہذیبی اور تاریخی شعور پیوست نہیں ہوتا اس وقت تک صورتِ حال ایک ہی سطح پر نظر آتی ہے ۔ محدود سیاسی مفادات کی سطح پر ، جس کی مدد سے ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ، تبلیغ و تلقین البتہ جاری رکھی جا سکتی ہے ۔

آج کل تبلیغ یا پرچار کا یہی انداز ، اے آئی آر کی اردو سروس سے ہندوستان کے بہت سے اردو ادیبوں نے اپنا رکھا ہے ۔ اس سلسلے میں اب تک علی سردار جعفری ، اپندر ناتھ اشک ، رام لال ، ڈاکٹر محمد حسن ، انور عظیم ، راہی معصوم رضا اور کئی دوسرے لکھنے والوں کے اپدیش نشر ہو چکے ہیں ۔ ا[illegible] سب کا پیغام یہی ہے — پاکستان کو ، بقول ان کے ، کشمیر کے دہشت گردوں اور مذہبی جنونیوں کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے ۔ پشت پناہی تو خیر [illegible] کیا کرتے ہیں اور چاہیں بھی تو کتنی کر سکتے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر میں جن لوگوں نے اپنی آواز کا پرچم بلند کیا ہے وہ جو کچھ بھی ہیں اس کا فیصلہ کون کرے ؟ کشمیر کے عوام یا کشمیر کی عدالت ؟ بھارتی [illegible] یا بھارتی سرکار ؟ کیا اردو کے دس بارہ یا بیس پچاس ادیبوں کی سرکاری آواز کو ادبی ضمیر کی عدالت کا فیصلہ قرار دے کر وادیِ کشمیر میں ہونے والے واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے ؟

انتظار حسین صاحب کو گلہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اردو کے ادیب

ں کہہ رہے ہیں ؟ آخر ہندوستان میں اور بہت سی زبانیں اور ان گنت ادیب
جود ہیں ، ان میں سے کسی کی آواز کیوں نہیں سنائی جاتی ؟ اس کا آسان
اب تو یہی ہے کہ اردو سروس کا ہدف تو ہم ہیں اور اسی لیے صرف اردو ادیبوں
تبلیغات نشر کی جاتی ہیں ۔ لیکن یہ بھی ایک دل خراش حقیقت ہے کہ
دہ تر اردو ہی کے ادیب آسانی سے قابو میں لائے جا سکتے ہیں ، بماسوا
جندر سنگھ بیدی اورکنہیا لال کپور کے جو سؤرگ باشی ہوچکے ہیں لیکن جنھوں
ے کسی ایسی مہم میں کبھی حصہ نہیں لیا ۔ بلکہ بیدی کے بارے میں تو یہ
ی معلوم ہے کہ شیخ عبداللہ نے انھیں جموں ریڈیو سٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر
یا تھا ، جس ملازمت سے انھوں نے بخشی غلام محمد کے زمانے میں استعفیٰ
ے دیا ۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کا تعلق کشمیر کی تازہ صورتِ حال سے ہو گا
و شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پیدا ہوئی ۔ لیکن یہ سب باتیں تاریخی ہیں ،
دبی واقعہ یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے ، ست سری اکال کرے اُن کی
ادھی پر پھول برسا کریں ؛ بعد میں ایک نازک سا افسانہ "تعطل" کے عنوان سے
کھا جس میں مولوی فاروق کی تحریک استصواب کو پس منظر بنا کر ، ایک ہندو
سیاح کے قتل اور قتل کے بعد ڈل جھیل کے ایک ہاؤس بوٹ میں ایک ملی جلی
دعوت کا منظر کھینچا گیا ہے ، جس میں شامل لوگ "کشمیر کے ماضی و مستقبل
کے بارے میں لے دے کر رہے تھے ۔" مختلف تھیوریاں پیش کرتے ہوئے "ہر
شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کشمیر کی جملہ بیماریوں کا علاج اس کے پاس ہے ۔"
اس ہجوم میں صرف ایک کشمیری تھا ، غلام رضا جو چپ تھا اور جو کوئی
بات کرتا "اس کی طرف خالی خولی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ، ویسے ہی خاموش
ویسے ہی جامد ، ویسے ہی ساکت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی چاہا کہ اٹھوں اور ایک دم
چیخ کر کہوں — بولو ۔ ۔ ۔ ۔ رضا ، یا ھتز ! بولو ، تم بھی تو کچھ بولو ۔
میں نے اس کا نام ہی لیا تھا کہ اس کی نظروں کی بےرحم ٹکٹکی مجھ پر تھی ۔ ۔ ۔
میں ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ اگلے روز میں دلی میں تھا جہاں میری
طرف کوئی نہیں دیکھتا ۔"

یہ ایک حساس ادیب کا ردِ عمل تھا ۔ اسی لیے آج بھی یہ افسانہ ہم سے
بہت کچھ کہتا ہے ، جب کہ مولوی فاروق ہی نہیں ، ان کے جنازے میں شرکت
کرنے والے بھی ایک نیا جلیاں والا باغ دیکھ چکے ہیں ۔ یہ کرشن چندر کا
رومانی کشمیر نہیں ، اس کی معکوس تصویر ہے اور اُس زمانے کی ہے جب بیدی

کہنا تھا "بولو ، با ھتز ، تم بھی تو کچھ بولو ۔" اور اب کہ جس وقت
پورا کشمیر بولنے لگا تو اے آئی آر کی اردو سروس یہ پرچار کرتی ہے کہ ان
کی نہ سنو ، بھارت سرکار کی آنکھ کے تارے اردو ادیبوں کی بات سنو ۔ ارے
بھائی ، اردو سروس کی آواز میں تو اس وقت کوئی وزن پیدا ہو گا جب کشمیر
کے ادیبوں کی آزاد تحریریں وہاں سے نشر ہوں گی ۔ یوں تو کشمیر میں اردو
ادیبوں کی کمی نہیں لیکن اے آئی آر کے ذریعے ان کی آواز ہم تک پہنچنے نہیں
پاتی ، بلکہ ریڈیو پاکستان کے ذریعے بھی نہیں ۔

بیدی کا افسانہ صرف ہندوستان میں لکھا جا سکتا تھا اور اسے صرف بیدی
ہی لکھ سکتا تھا ، لیکن اختر الایمان کی ایک ایسی نظم ہے جو کہیں بھی
لکھی جا سکتی تھی اور کوئی بھی شاعر ، کم از کم پاکستان میں اسے لکھ
سکتا تھا ۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ لکھی صرف اختر الایمان نے اور وہ بھی
ہندوستان میں بیٹھ کر ۔ "سبزۂ بیگانہ" میں ایک مریض ہے جس کا علاج کسی
کے پاس نہیں اس لیے کہ سارے معالج کسی نہ کسی طرف کے جانب دار
ہو چکے ہیں :

مریض راتوں کو چلاتا ہے ، مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک ، نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے یہ ، حبس دم ہے ، خائف ہے
ستم رسیدہ ہے ، مظلوم ہے ، بچا لو اسے
مریض چیختا ہے ، درد سے کراہتا ہے
یہ ویتنام کبھی ، ڈومنیکن کبھی کشمیر

اگر یہ زخمی پرندہ صرف ویتنام اور ڈومنیکن کا نام لے کر چیختا تو
ممکن ہے اس کے خالق کو لینن انعام نہیں تو پدم شری کا خطاب ہی مل جاتا
لیکن وہ تو اپنے وقت کے مقاماتِ آہ و فغاں میں کشمیر کا نام بھی لیتا ہے ، جو
ایک انسانی تجربۂ جبر کے طور پر اب تک جاری ہے ۔ اختر الایمان کی نظم کوئی
اپدیش نہیں دیتی ، صرف نشان دہی کرتی ہے اور تجربے کی نوعیت بتاتی ہے ۔
پھر بھی ان بہت سی تبلیغاتی نظموں سے بہتر ہے جن کی ہمارے یہاں کوئی کمی
نہیں ۔ پاکستان کے شاعروں نے نظموں پر نظمیں کشمیر کے بارے میں لکھی
ہیں ، اگرچہ ہمارے معروف شعراء اس فہرست میں شامل نہیں ۔ عجیب بات ہے

کہ انھوں نے دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے خلاف اٹھنے والی آواز سے آواز ملائی ہے ماسوا کشمیر کے اور اس کے بعد افغانستان کے۔ کشمیر کی تاریخ کے نشیب و فراز تو پھر بھی نزاکتِ احساس کے ساتھ مرحوم احمد شمیم کی نظموں میں موجود ہیں لیکن افغانستان کے بارے میں اردو ادب تقریباً خاموش رہا ہے حالانکہ اب تو ماہنامہ "سوویٹ لٹریچر" تک میں ایسے افسانے چھپنے لگے ہیں جن میں مجاہدین کو مجاہدین کہا جاتا ہے، دہشت پسند اور مذہبی جنونی نہیں کہا جاتا بلکہ روسی سپاہیوں کو اپنے فوجی کمانڈروں، اخبار نویسوں اور سیاسی فیصلے کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اور شرمندگی کے ساتھ وطن واپس جاتے ہوئے۔

ممکن ہے ہماری خاموشی کی یہ توجیہہ کی جائے کہ اپنے وطن میں مسائل کی کون سی کمی ہے اور یہ بھی کہا جائے کہ ایسے مسائل پر لکھنے کا نام ادب نہیں۔ چند ایک کو شاید خاموشی کا الزام بھی قبول نہ ہو اور وہ ایسی تحریروں کا حوالہ دیں جو تبلیغاتی انداز میں لکھی گئیں۔ لیکن ایک تو کشمیر کی طرح، افغانستان کی صورتِ حال کو بھی، احوالِ وطن سے جدا نہیں کیا جا سکتا دوسرے ایسے مسائل پر کچھ نہ لکھنے کی پابندی صرف کشمیر اور افغانستان کی حد تک کیوں ہو؟ پھر جو ادیب، ادب کو جملہ عالم کے احوال و عوالم سے پاک رکھنا چاہتے ہیں، ان کی منطق کے مطابق تو اپنے یہاں کی صورتِ حال پر بھی کچھ لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ سوال یہ نہیں کہ تجرباتِ حیات سے دور رہ کر ادب کی تخلیق ممکن بھی ہے یا نہیں۔ یا فلاں فلاں تجربات پر ہمارے ادیبوں کو لکھنا چاہیے تھا اور انھوں نے نہیں لکھا، لہٰذا ان پر کوئی فردِ جرم لگائی چاہیے۔ "چاہیے" کا لفظ نقدِ ادب کے ممنوعات میں شامل ہے اس لیے کہ یہیں سے ادبی فاشزم کا آغاز ہوتا ہے جو جملہ حکومتوں کی ادبی پالیسی کا نقطۂ اشتراک ہے۔ ہماری دلچسپی اس بات سے ہے کہ ہمارے ادب میں جن تجرباتِ حیات نے کوئی دخل نہیں پایا تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارا اجتماعی تصورِ حیات کافی حد تک وسیع نہیں یا ہم اپنے تجرباتِ حیات کو اپنی شخصیت میں جذب نہیں کر پاتے؟ آخر کوئی وجہ تو ہو گی کہ ایک طرف ہمارا ادب زندگی سے بیگانہ ہے اور دوسری طرف ہمارا معاشرہ ادب سے بیگانہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں متقابل کیفیات کا آپس میں کچھ ربط ہے۔ کسی

بھی ادیب سے پوچھا جائے کہ عصرِ حاضر میں ادب کس قسم کا کردار انجام دے تو غالب اکثریت کا یک لفظی جواب ہوگا ، کمٹ منٹ ۔ یعنی ہمارے ادب کی کمٹ منٹ اپنے زمانے کے ساتھ ہے ۔ لیکن ہمارا زمانہ کیا ہے اور اس کے ساتھ کمٹ منٹ کیسے ہو سکتی ہے ؟ یہ تو مولانا حالی بھی فرماتے تھے ، چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی ۔ گویا مرغِ باد نما بن جاؤ ۔ یہ تو کوئی کردار نہ ہوا ۔ اس لیے کہ نہ تو اس میں کوئی عمل ہے نہ کسی طرح کا ڈراماتی تصادم ۔ موسم کا ایک میکانکی کھیل ہے جو ادب سے زیادہ محکمہ موسمیات سے تعلق رکھتا ہے ۔ درست ہے کہ طوق و دار کا بھی ایک موسم ہوتا ہے اور صوتِ ہزار کا بھی لیکن ادیب کے لیے یہ دونوں موسم الگ الگ نہیں ہوتے ، تھوڑے بہت مختلف ضرور ہوتے ہیں مگر پھر بھی یکجا ہو سکتے ہیں ۔ اسی طرح کمٹ منٹ کا مضمون ہے کہ زمانے کے ساتھ بھی ہے اور زمانے کے برعکس بھی ۔ عصرِ حاضر کے شعور سے پیوست بھی ہے اور عصرِ حاضر کے شعور سے متصادم بھی ۔

ہمارا زمانہ نئے علوم و فنون کا بھی ہے اور نئی بربریت کا بھی ، تکنیکی تعمیر کا بھی ہے اور برقیاتی جارحیت کا بھی ، تسخیرِ کواکب کا بھی ہے اور جنگ کو کب کا بھی ، تعلیم و تربیت کا بھی ہے اور سوقیانہ مذاق کا بھی ، عوامی جمہوریت کا بھی ہے اور تہذیبی فاشیت کا بھی ۔ ایک طرح کے امکان سے دوسری طرح کا امکان اس انداز کے ساتھ باہم پیوست ہے کہ دونوں کو جدا کر کے دیکھنا بھی محال ہے ۔ ایسے میں ادب کا کردار یک رخا نہیں ہو سکتا ۔ یوں بھی کسی ڈراماتی کردار کا تصور کیجیے : ہیملٹ یا گیلیلیو ۔ اب جو بھی ادا کار اس کردار کو ادا کرے گا ، اسے ایک تو شخصیاتی چیلنج درپیش ہوگا اور ایک تشکیلاتی ، یعنی وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شخصیت کا مکمل اظہار بھی کرے اور کسی نہ کسی طرح ایک مجموعی تشکیل میں شامل بھی رہے ۔

اسی طرح عصر حاضر میں ادب کا کردار بھی ایک دُہرا کردار ہے کہ عصری شعور کی نمائندگی بھی کرے اور عصری شعور کے مقابلے میں اپنی تہذیبی تشکیل سے بھی غافل نہ ہونے پائے ۔ ظاہر ہے کہ قیامت کا مضمون ہے ، اور کس کا حوصلہ ہے کہ تخلیقی فن کار کے سوا دونوں برابر کی قوتوں کو متوازن رکھ سکے ؟ بظاہر حد بشر سے باہر کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ انسانیت

میں ادب کے کردار کی انجام دہی کبھی آسان نہیں رہی ۔ سہل پسندوں نے سہولت کے راستے بھی نکالے ہیں اور مقبول عام ادیبوں میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ یا تو دہرے کردار کو اِکہرا بنا کر اپنے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں ، یا پھر دہرے کردار کو ایک وقت ادا کرنے کی بجائے باری باری ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یعنی تھوڑی دیر کے لیے یہ انداز دیکھ لیجیے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی

"مادام بواری" میں ایک جگہ فلوبیئر نے ادب کی دو رخی کو زبان و بیان کا المیہ بنا کر پیش کیا ہے :

"زبان ایک تڑخی ہوئی دیگچی کی طرح ہے جس پر ہم ایسی دھنیں بجاتے ہیں جنھیں سن کر بھالو ناچنے لگیں ، جب کہ ہم ہر لحظہ ستاروں کا دل موم کرنے کو ترستے ہیں ۔"

ستاروں کا دل کیسے موم ہو ، یعنی انسان کی تقدیر کیوں کر بدلے ؟ اور بھالو ناچ وہ چیز ہے جسے قبول عام کہتے ہیں ۔ تڑخی ہوئی دیگچی ہمارے وسائل اظہار کی موجودہ صورت ہے جس پر کوئی دھن بج سکتی ہے تو نہایت آسان اور مسخ شدہ ۔ ادب کا کردار یہ ہے کہ وہ تڑخی ہوئی دیگچی کو ٹھونکتا رہے اور انسانی تقدیر کو بدلنے کی آرزو سے بھی دست بردار نہ ہو ۔

جمہوریت کا المیہ بھی یہی ہے کہ مقامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ بھالو ناچ کا منظر دکھائی دیتا ہے اور قومیت کی تشکیل کے لیے آرزو بھی کی جاتی ہے ۔ لیکن یہ دہرا کھیل بے حد خطرناک ہے اور اس کے باوجود نہایت ضروری ۔ مشکل کے وقت ادب سے بھی تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اجتماعی عدم تحفظ کی فضا میں تحفظ کا احساس پیدا کرے ۔ ادب کی اپنی معصیت یہ ہے کہ اس کی بھی آرزو تو یہی ہے لیکن وہ یہ فریضہ ، تاریخ اور تہذیب کو درمیان میں لائے بغیر انجام نہیں دے سکتا ۔ ہر دور کا ادب ایک نئی کلاسیک تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن کوئی بھی نئی کلاسیک ، نئی بھی ہو اور کلاسیک بھی ہو ، یہ کام بہت مشکل ہے ، کیونکہ کلاسیک کہتے ہی اس ادب کو ہیں جو ہر دور میں نیا معلوم ہو ۔

خاتمۂ کلام کے طور پر میر کے آخری دیوان سے ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رہے ہے غش و درد، دو دو پہر تک
سرِ زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد، گم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک
قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت
پہنچنا ہے مشکل ہمیں اس کے در تک
کہاں تک اسے سر سے مارا کروں میں
نہ پہنچا مرا ہاتھ اس کی کمر تک
بہار آئی، پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک
بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

اس غزل کو آج کی صورتِ حال میں، پورے ارتکاز کے ساتھ، بار بار پڑھنے کے بعد، یہ محسوس ہوگا کہ انسانیت اور ادب کا مستقبل بڑی حد تک باہم مربوط ہے، اور ادب انتہائے کمال کو چھو کر بھی ایک مشروط پیش گوئی سے زیادہ کیا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ پیش گوئی کتنی بڑی ہے اور شرط کتنی چھوٹی:

اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ (نیو کیمپس جام شورو)

کا

شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ

تحقیق

۴۷۶ صفحات پر مشتمل ۱۹۹۰ء میں اس کا چوتھا شمارہ نکلا ہے

چوتھے شمارہ کے مشتملات

• حالاتِ زندگی (عفت بانو) • پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں (ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق) • مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں (حبیب الرحمٰن خاں شروانی، سید سلیمان ندوی، قاری ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، محمود شیرانی، ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، احسن مارہروی، راشد برہانپوری، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر مختار الدین احمد)

عکسِ تحریریں:- • ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو پر مقالہ (ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں، بخطِ خود) • اسٹڈیز ان لٹریچر کا دیباچہ (بخطِ خود)

علمی کاموں کا جائزہ:- • ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں کا مقالہ تحقیق "سید حسن غزنوی" (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں کی انگریزی تصانیف (ڈاکٹر شمس الدین صدیقی) • ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں کی چند اہم تصانیف (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں، زبان دانی و لغت شناسی کی ایک مثال (ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

جام شورو کے مخطوطات (قسط دوم) • فہرست مخطوطات ذخیرہ حکیم شمس الدین احمد حیدرآبادی و ذخائر دیگر۔ (محمد شفیع بردی)

مقالات:- • سفینہ نزہۃ المجالس (ڈاکٹر نذیر احمد) • خاندانِ جیہاں (ڈاکٹر نذیر احمد) • سندھ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی (ڈاکٹر نجم الاسلام) • اردو میں تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق توضیحی سرمایہ (مسز الماس اقبال) • پاکستانی خواتین اور اردو تحقیق (مسز رابعہ اقبال) • ایلیٹ اور سر سید احمد خاں (ڈاکٹر معین الدین عقیل) • ادنام (ڈاکٹر سہیل بخاری) • دفتر امیر اللغات (سید جاوید اقبال)

اخذ و استفادہ:- • ملفوظاتی ادب کے لیے ایک منہاج تحقیق (ڈاکٹر ریاض الاسلام)

دانشور نغز گو
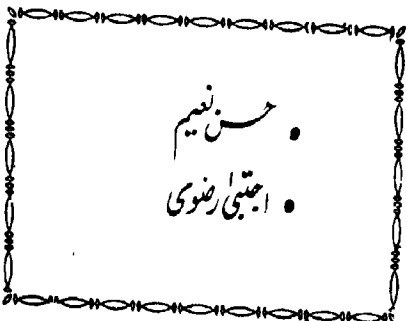
حسن نعیم
مجتبیٰ رضوی

"تازہ ترین دانشوری سے قطع نظر،

(اور تازہ سے مطلب تھا تازہ ترین!)"

اردو غزل کے عہد نو نے بھی کتنے بڑے دانشور غزلگو دیے ہیں! انھیں بھی خدا بخش نے جمع کرنا شروع کیا۔ ان غزلگویوں کی خدمت میں درخواست کرکے ان سے انکا احوال اپنے خط میں ایک غزل، تصویر اور اپنا کیا ہوا انتخاب مانگا۔ انہوں نے ممنون کیا۔ مگر کچھ نے جانے میں بہت جلد کر دی یا ہم ہی نے تاخیر کر دی۔ تصویر کے اعتراف میں جانے والوں کو سب سے پہلے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ادارہ

O

حسن نعیم

(وفات: ۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء)

میرے دادا سید شاہ غلام قاسم راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشین ہونے کے باوجود (یہ درگاہ مخدوم الملک شرف الدین یحیٰی منیری کے نسبی سلسلے کی تھی) اس دور کے سیاسی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشی بقا کے لیے مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، یہاں تک کہ خود بھی انگریزی میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کر لی تھی اور بعد میں اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کر کے کسی شعبے میں ڈپٹی رجسٹرار ہو گئے تھے۔

انھوں نے اپنے دو بیٹوں کو بغرض تعلیم لندن بھیجا، میرے والد سید محمد نعیم اور سنجھلے چچا سید عبد السمیع یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہو کر لوٹے۔ میرے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور سنجھلے ابا پٹنہ ہی میں شادی کر کے بس گئے۔ اپنی کارگزاریوں کے باعث دونوں اپنے علاقے کے عمائدین میں شمار ہونے لگے۔ دونوں ہی قومی اور ملی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ میرے والد غالباً ۲۶ء کے اواخر میں پٹنہ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں میں ۶ جنوری ۲۷ء میں پیدا ہوا اور میرا نام سید حسن رکھا گیا۔

ایک طویل علالت کے بعد ستمبر ۲۸ء[1] میں والد صاحب کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا اور پھر پریشانیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا، میری والدہ شیخ پورہ (ضلع مونگیر) چلی گئیں جہاں میری دادی کا آبائی مکان تھا اس کے علاوہ کچھ دہاں اور کچھ گیا ضلع میں ان کی جائیداد بھی تھی جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ میں سات آٹھ سال کی عمر تک شیخ پورہ ہی میں رہا اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی مجھ سے تینوں بڑے بھائی پٹنہ میں زیر تعلیم تھے اور جسٹس سید نور الہدیٰ کے یہاں رہتے تھے جو رشتے میں ہم لوگوں کے نانا ہوتے تھے۔ جج صاحب کے انتقال کے بعد والدہ خود پٹنہ آکر رہنے لگیں اور ہم سب ساتھ رہنے لگے۔

۳۸ء میں میرا اور میرے سنجھلے بھائی سید علی کا نام رام موہن رائے سیمنری پٹنہ میں لکھوا دیا گیا اسکول میں داخلے کے وقت ہم دونوں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ 'نعیم' جوڑ لیا بہت دن بعد منجھلے بھائی سید محمد نے بھی یہی کیا (بڑے بھائی تاعمر سید احمد ہی رہے لیکن اپنے بچوں کے نام کے ساتھ 'نعیم' کا اضافہ کر دیا)

---

[1] میرے سنجھلے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال ستمبر میں نہیں نومبر ۲۸ء میں ہوا تھا۔

مشکل سے تین برسوں تک ہم سب بھائی والدہ کے ساتھ قدرے سکون سے رہے، پھر اگست ۳۹
والدہ صاحبہ کا اچانک انتقال ہوگیا اور ہم سب یوں بکھرے کہ کبھی اکٹھے رہنا نصیب نہ ہوسکا۔

میں ۴۰ء میں اپنی چھوٹی پھوپھی بیگم یوسف حسین کے ساتھ رہنے کے لیے 'محلہ ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سیٹی' چ
گیا اور وہاں ۴۱ء میں میرا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہوگیا۔ وہیں سے ۴۳ء میں میٹرک پاس کر
پہلے پٹنہ سائنس کالج پھر ایک سال بعد بی۔ این۔ کالج پٹنہ میں داخل ہوا جہاں سے ۴۶ء میں آئی۔ ایس سی پا
ٹیڑھی گھاٹ کے قیام کے دوران ہی مجھے اُردو شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا، یہ محلہ دراصل صرف
قلعہ نما مکانوں پر مشتمل، گنگا کے کنارے آباد تھا جس میں ایک ہی خاندان کے افراد مقیم تھے، اس خاندان کے سر
اس وقت نواب ابراہیم حسین تھے جو میرے نئے اسکول کے سکریٹری ہونے کے علاوہ 'انجمن ترقی اُردو لائبر
پٹنہ سیٹی' کے بانی بھی تھے، ان کی شادی بھی میرے والد کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی۔ خود انھیں تو شا
سے معمولی دلچسپی تھی لیکن ان کے صاحبزادے سید اکبر حسین کو (جو بعد میں جسٹس اکبر حسین بنے) شاعری کا نہ صرف شو
تھا بلکہ خود بھی صاف ستھری غزلیں لکھ لیا کرتے تھے۔ چھوٹی پھوپھی کے دونوں لڑکوں، سید اصغر حسین اور سر
احمد حسین کا مذاق سخن بھی اعلا تھا اور اساتذہ کے بہت سارے اشعار یاد تھے۔

وہاں اکثر طرحی اور غیر طرحی نشستیں منعقد ہوتیں جن میں عظیم آباد کے برگزیدہ شعرا بھی شرکت کر
ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی غزلوں کی اس زمانے تک دھوم باقی تھی، وہ اکثر وہاں قیام فرماتے بلکہ اپنا مجم
'جلوۂ داغ' وہیں رہ کر ترتیب دیا، ان کے علاوہ عظیم آباد کے نامی گرامی شعرا میں بسمل عظیم آبادی (سرفروشی
اب ہمارے دل میں ہے)، بدر عظیم آبادی، محمود علی خاں صبا (شاگرد شاد) وغیرہ اکثر تشریف لایا کرتے، ممتاز
بسمل جودانا پور کے ایک خوش گو شاعر تھے اور زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے مدیر رہ چکے تھے وہاں بر
جانے سے پہلے مستقلاً رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا احسن مارہروی سے تلمذ حاصل کیا۔ سید شاہ رضی احمد
(مجموعہ: کشت خیال) تو خیر سے گھر کے داماد تھے اور وہیں قیام پذیر تھے۔

غرض ٹیڑھی گھاٹ کا شعری ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ میرا شاعری سے بچ نکلنا محال تھا، ویسے بڑے
سید احمد بھی نوجوانی میں شعر کہا کرتے تھے، تپش ان کا تخلص تھا اور نہایت دل کش ترنم میں شعر پڑھا کرتے
انھوں نے پروفیسر عبدالمنان بیدل اور ضمیر الدین عرش گیاوی (مصنف: حیات مومن) سے مشورہ سخن بھی کیا تھا۔
غرض پانچ چھ برسوں کے قیام کے بعد جب ۴۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا تو میرے پاس دما

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ پانچ سات مکمل اور نامکمل غزلیں بھی تھیں لیکن ان کی موجودگی کا علم صرف چند احباب کو تھا۔ علی گڑھ شروع ہی سے اُردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے چنانچہ میرے زمانے میں بھی مستند اور مشہور لوگوں کے علاوہ تازہ فکر اور نوخیز ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کا ایک قافلہ موجود تھا۔ یہی لوگ بعد میں عصری ادب کے ستونوں میں شمار ہوئے۔ ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے جن میں اکثر میں بھی شریک ہوتا تھا، ہنگامی جلسوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ایک ایسے ہی جلسے میں میں نے اپنی ایک نظم "تشنگی" پڑھنے کی جسارت کی جس میں جاں نثار اختر اور معین احسن جذبی بھی شریک تھے، خلاف توقع اس کی بہت معمولی نکتہ چینی ہوئی۔ بلکہ اس نظم کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یونیورسٹی میگزین کے سالنامہ ۴۸ء میں شامل کر لیا، یہ میری پہلی تخلیق تھی جو شائع ہوئی۔

علیگڑھ کے دوران قیام میں نے تازہ کچھ نہیں لکھا، صرف قدیم و جدید ادب کا مطالعہ کرتا رہا اور ادبی بحثوں میں حصہ لیتا رہا۔ باقی وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی اس وقت بی۔اے کے طالب علم تھے لیکن بطور شاعر اور نقاد ادب میں متعارف ہو چکے تھے، انھوں نے ایک بار رائے دی کہ میں غزلوں کی طرف خصوصی توجہ دوں اس لیے کہ ان کا اسلوب و مواد نہیں کچھ نیا نیا سا لگا، ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ باقر مہدی اور شہاب جعفری سے بھی ان ہی دنوں کی ملاقات ہے اور تب سے آج تک تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ ۴۸ء میں علیگڑھ سے بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد جب واپس پٹنہ لوٹا تو دوبارہ چند غزلیں کہیں جو وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں لیکن میرے ذہن میں کچھ تخلیقی مسائل بار بار سر اٹھاتے تھے اور مجھے اپنے کلام سے بدگمان کرتے تھے، بات یہ ہے کہ اچانک جو تبدیلیاں ہمارے سماج، مزاج اور اخلاقی اقدار میں ۴۷ء کے بعد آئی تھیں انھیں ہم محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کا اظہار روجہ غزلوں کے اسالیب اور لہجوں میں بے جان اور غیر حقیقی سا لگتا تھا، عصری صداقتوں سے غزل کو ہم آہنگ کرنے کیلیے اب ایسی تخلیقی زبان کی ضرورت تھی جس میں الفاظ، استعارات، پیکر اور علائم جیتے جاگتے نظر آئیں یہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا، اسکے لیے غزل کی کل روایت کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر تھا کہ انحراف بھی اس عظیم روایت کا ہی حصہ نظر آئے۔

اس بار میرا قیام اپنے خالو رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ کے دولت کدے پر ہوا، وہ نہایت ذی علم خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج انسان تھے، وہ بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے اور ان دنوں غالب کے فن سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہے تھے، ان کے گھر میں اکثر شام کے وقت شہر کے ممتاز دانشوروں شاعروں اور سیاسی شخصیتوں کا مجمع لگتا تھا اور گھنٹوں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں، علامہ جمیل مظہری ان کے

گہرے دوستوں میں تھے اور ان دنوں وہیں قیام فرماتے تھے، وہیں جناب شیخ فصیح الدین بلخی سے شرف نیاز حاصل ہوا، وہ ایک درویش صفت مورخ اور محقق تھے "تاریخ مگدھ" کے مصنف کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھے۔ لیکن ان کے تنقیدی کتابچے "انشاد نشاد" کی خبر صرف صاحبان نظر کو تھی۔ ان سے گفتگو کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ اُن کی نگاہ اُردو شاعری کے کلاسکی سرمایہ خاص کر غزلیہ شاعری اور اس کے رموز ونکات پر گہری اور معروضی ہے چنانچہ ۴۹ء میں سات آٹھ مہینوں تک ان کے خزانۂ علم سے فیض یاب ہوتا رہا اس وقت تک کی بیشتر شاعری کو رد کرتے ہوئے گویا ۱۹۵۰ء سے میں نے نئے شعری سفر کا آغاز کیا تب سے مسلسل لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی جنھوں نے شاہدہ یوسف کے نام سے کئی اچھے افسانے لکھے میری دونوں لڑکیوں میمونہ اور شہیرہ کی شادی ہو چکی ہے دو بیٹے ہیں ارشاد اور اشعر۔ ان میں سے ایک برسرروزگار ہے اور دوسرا ایم۔ اے کر چکا ہے۔

۵۱ء میں پرویز شاہدی جو میرے خلیرے بھائی بھی تھے مجھے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے جہاں لگ بھگ ایک سال تک سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول میں سائنس ٹیچر رہا۔ پرویز شاہدی بھی اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور مظہر امام بھی ان دنوں اس اسکول میں اُردو کے استاد تھے۔

دسمبر ۵۳ء میں کلکتہ کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کی خاطر دلّی آگیا۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر سید محمود جو مجھ سے اچھی طرح واقف تھے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ بورڈ کے چیرمین تھے، وہ مجھ پر مہربان ہوئے اور مجھے اپنا سکریٹری منتخب کر لیا۔ ۵۴ء میں جب وہ وزارت خارجہ میں وزیر مملکت ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ بطور پرائیویٹ سکریٹری وہیں منتقل ہو گیا اور ۱۹۷۰ء تک اسی وزارت سے منسلک رہا۔

دلّی میں نہ صرف میری ادبی نشوونما ہوئی بلکہ میری زندگی کے بہترین ایام وہیں بسر ہوئے، دلّی ہی دراصل وہ شہر ہے جس کی تہذیبی روایت سے آج کی غزل بھی سب سے زیادہ متاثر ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایفرو ایشیائی کانفرنس منعقدہ بنڈونگ (انڈونیشیا) میں بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوا اور پھر ۵۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب تشریف لے گئے تو اوروں کے علاوہ میں بھی ساتھ گیا۔

میرا تبادلہ دوبارہ ہندستان سے باہر ہوا پہلے ساڑھے تین برسوں کے لیے (۵۸ء تا وسط ۶۱ء) جدہ میں ہندستان کا نائب قنصل رہا اور پھر کوئی چار برسوں تک (۶۴ء سے ۶۸ء تک) نیو یارک میں انڈین مشن برائے اقوام متحدہ میں بطور اتاشی کام کیا، اس کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے کوئی پندرہ بیس ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران وہاں کی طرز زندگی اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس خیال کے تحت کہ کسی ادبی ادارے سے منسلک

ہو کر باقی زندگی صرف علمی اور ادبی کاموں کروں وزارت خارجہ سے مستعفی ہو کر ۱۹۷۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے بطور ڈائرکٹر وابستہ ہوگیا، میں نے ہی اس ادارے کا باضابطہ دفتر قائم کیا، اس کے عمارت کی تکمیل کروائی اور اس کی ادبی سرگرمیاں شروع کروائیں لیکن مجلس عاملہ کے ایک ممبر کی مستقل رخنہ اندازی سے تنگ آکر جولائی ۷۴ء میں اس سے علاحدہ ہوگیا۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے کسب معاش کرتا رہا ہوں اور اپنی شاعرانہ شخصیت کے تحفظ کی خاطر بڑی آزمائشوں سے گذرا ہوں۔

میری غزلوں کا پہلا مجموعۂ اشعار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اس کے بعد ۸۰ء میں ہندی رسم الخط میں دوسرا مجموعہ "غزل نامہ" شائع ہوا، تیسرا مجموعہ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو منتخب غزلیں ہیں "دلستان" کے نام سے ترتیب پا چکا ہے، انشاء اللہ آئندہ دو تین مہینوں میں شائع ہو جائے گا۔

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ میں نے آٹھ نو مختصر مثنویاں بھی بطور تجربہ لکھی ہیں، جو سب کی سب شائع ہو چکی ہیں انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینا باقی ہے، غزل ہی لیکن میری زندگی کا محور اور ... ہے، ادھر تین برسوں سے بمبئی میں مقیم ہوں اور نیشنل غزل سمینری کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کرنے میں منہمک ہوں، اس ادارے کے ذریعہ غزل کے سرمائے کو سلسلہ وار دوسری ہندستانی زبانوں میں منتقل کرنے اور غزل گائیکی کو صحیح خطوط پر رواج دینے کا کام کیا جائے گا چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع ہو چکا ہے۔

انتخاب کلام

دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم ـــــ بیدل کی باؤلی پہ لگا میں سبیل کیا

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو ـــــ فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو

نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے ـــــ کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو

دیار فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں ـــــ تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو

وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ پھلانگے گا ـــــ کنار آب حسن خیمۂ وفا رکھیو

یہ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے ـــــ ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

ما عدو کی جستجو میں تھا کہ اک پتھر لگا ـــــ مڑ کے دیکھا تو سناں تانے ہوئے احباب تھے

سانس لیتے ہیں ہزاروں جینے والے چند ہیں ـــــ سب دریچے آرزو کے بند دلوں پر بنا ہیں

دل کا خطرہ ہے کسی نے گر مجھے سچا کہا ـــــ فوج سلطاں چار سو تھی بس نے جو سمجھا کہا

جس کو جانا ہمنوا، وہ کھو گیا بازار میں
بن گیا اک واہمہ جس شخص کو اپنا کہا

ایک دنیا دیکھ کر لوٹا تو اب حیران ہوں
کس بنا پر میں نے ابتک قصۂ دنیا کہا

وقت ہی نا قدر ہے ایسا جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیسا کہا

میں پشیماں ہوں کہ اپنی سست فہمی سے نعیم
کیسے کیسے مسخروں کو قبلہ و کعبہ کہا

سُن اس طرح کہ شور بھی نغمہ سُنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمتِ نگاہ شب رونمائی دے

گھیرے ہیں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہر سبیل تو سب کچھ سجھائی دے

لپٹی ہے سب کے پاؤں سے زنجیرِ غم نعیم
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

مرے کلام میں سب حرف یوں شگفتہ ہیں
شگفت گل بھی نیا واقعہ لگا سب کو

نعیم ایک فقیری بچی ہے ورثے میں
اسے بھی مانگتی دنیا تو بخشتا سب کو

کیوں، ذرا سی بات پر چھوڑی وہ بزمِ دوستاں
اب ہجومِ آشنا میں عمر بھر تنہا رہو

ڈھونڈتا ہوں میں پریشاں ہو کے اس درویش کو
جس نے دی تھی یہ دعا "بیٹا سدا زندہ رہو"

ایک چادر ہے، خوشی کی، ایک گٹھڑی غم کی ہے
سر پہ دونوں کو اٹھا کر یاتری بن جائیے

لمحہ لمحہ کون دیتا ہے صدا مجھ کو نعیم
"کیجیے کچھ کام ایسا اک صدی بن جائیے"

نقوشِ پا جو سنوارے گا، اک نظر دے گا
مگر جو راہ نکالے گا رہگزر دے گا

خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
مجھی کو آکے مرے عیب کی خبر دے گا

بسر ہو یوں کہ ہر اک درد حادثہ نہ لگے
گزر بھی جائے کوئی غم تو واقعہ نہ لگے

اب تو میں ہوں خانقہ میں اور یہ ویراں صفیں
ہاؤ ہو کا دم کہاں ہے سینۂ دم ساز میں

کھو گیا تو آج بھی پاؤں کی زنجیر ہے
ورنہ ہر شے گردِ پا تھی دشت کے آغاز میں

یوں نہ غمگیں ہو کہ آخر میں بھی تیری آس ہوں
جب سے لوٹا ہوں سفر سے دیکھ تیرے پاس ہوں

لے گئے ہمسائے سب اینٹیں درودیوار کی
روز پردہ میرے ان کے درمیاں اٹھتا رہا

جب سے قبضہ میرے دفتر پہ ہوا اک دوست کا
میری چھت گرتی رہی، اس کا مکاں اٹھتا رہا

پرزے سڑکوں سے، گلی سے پتھر
تم سے بچھڑے تو اٹھایا کیا کیا

مجھ کو خط لکھنا تو یہ بھی لکھنا — تم نے کھو کے مجھے پایا کیا کیا
سب نے جاں بیچ کے دیکھیں تو حسن — مال و اسباب کمایا کیا کیا

اس سے پہلے کہ دفن ہو جاؤ — وادیٔ فن میں کچھ تو ہو جاؤ
میر و بیدل کی پیروی سے نعیم — کچھ تو دنیا میں تم بھی ہو جاؤ

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے سوا — صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے
حسن کا دربار بھی بازارِ دنیا ہے نعیم — اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

جاری ہے حکم قتل بلا مہر و دستخط — سر اپنا ہے قلم تو لہو کی رسید ہے
سب سے حسین ملک ہے خوابوں کی سرزمیں — سب سے قدیم شہر، دماغ جدید ہے
قبضے میں جس کے لفظ کا فانوس ہے نعیم — تہ خانۂ خیال کی گویا کلید ہے

یک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا — نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا
بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں — بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا
وجہِ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم — وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا
وئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا — مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا
ات شیریں سی لگی فن کے طرفداروں کو — قصہ ہر چند حسن کوہکنی کا لکھا

لا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا — تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا
ی وہ آگ کہ دیوار و در بھی جل نکلے — کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا
ڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے — بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا
ر ایک فن کی بنا مد و جزرِ دل ہے نعیم — کہ شعر و نغمہ ہیں کیا، موجِ اندروں کے سوا

کسے بتاؤں کہ وحشت کا فائدہ کیا ہے — ہوا میں پھول کھلانے کا قاعدہ کیا ہے
بیروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا — مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

ں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن — بزمِ یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

ہار باغِ تمنا ہے آرزو مندی — دگرنہ چشمۂ ویراں ہے دیدۂ تر بھی

ئی تاثیر تو فریاد کی قسمت ہو نعیم — حاکمِ وقت بدل جائے جو بہرا ہو وے

دیے جلیں کہ بجھیں، آفتاب آئے گا
یقیں کرو نہ کرو، انقلاب آئے گا

شہِ ستم کو اٹھالے گا جو سرِ نیزہ
وہ شہ سوار مرے ہم رکاب آئے گا

نشانِ فتح کسی دن ہوا میں لہرانا
مثالِ خواب، کوئی مردِ خواب آئے گا

نہ پست قد ہے، نہ کوئی بلند قامت ہے
نگاہِ شعر میں ہر لفظ اک علامت ہے

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

پہن کے دوست بھی نکلے لباسِ طرزِ حسن
وہ اپنی آن میں بے قاعدہ ہوا سو ہوا

یہی ایک جی میں ہے وہم سا یہی ایک سر میں ہے جنوں سا ہے
تجھے اس جنم میں نہ پا سکا تو کسی جنم میں نہ پاؤں گا

تو ہزار مجھ سے الگ رہے، میں ہزار تجھ سے جدا رہوں
کبھی درد بن کے جگاؤں گا کبھی نیند بن کے سلاؤں گا

ابھی اپنی خاک میں قید ہوں ابھی تو بھی دامِ بلا میں ہے
تو گلاب بن کے کھلے گا جب میں صبا کے روپ میں آؤں گا

سچ ہے اب عشق کا وہ منصبِ اعلیٰ بھی نہیں
شاہِ شمشادقداں، افسرِ بالا بھی نہیں

آگ جتنی تھی گئی اشکِ رواں کی صورت
کام کچھ شعلۂ امکاں سے نکالا بھی نہیں

وہ دیارِ جستجو کے قافلے کی جان ہے
اس کی آشفتہ سری اس عہد کی پہچان ہے

کس حوالے سے اُسے پہچانیے، الجھن ہے یہ
صوفیوں کی اس میں تو ہے، گل رتوں کی شان ہے

پہلے سچ کی صف میں بھی اک فوج رہتی تھی حسن
اب تو میں ہوں اور شہادت کا قوی امکان ہے

سونے میں جو دمک ہے وہی اس کی آبرو
پیتل میں جو چمک ہے، وہی اس کی گند ہے

آتا ہے وقتِ شام سبوچے کی سمت سے
اک ایسا ماہتاب جو بوتل میں بند ہے

غزلوں کا حسن خواب کے لہجے میں گفتگو
دوہوں کا حسن پیار کے لہجے میں پند ہے

میرے لہو کو جس نے جلایا تھا اے نعیم
وہ زہر میرے شعر میں اب جوئے قند ہے

وہ علم ہے جو سخن کو وقار دیتا ہے
وہ دردِ بخشش، جو فن کو نکھار دیتا ہے

یہ کون دل میں جلاتا ہے آتشِ اُمید
وبالِ فکر کو سر سے اتار دیتا ہے

میں اس درخت سے کم تر ہوں مرتبہ میں حسن
جو دھوپ سہہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

کچھ سخن فہم، کچھ سیاسی ہے
اپنا محبوب دلی باسی ہے

میرے شعروں میں بس گئی آخر
اس کی آنکھوں میں جو اداسی ہے

ہم گئے جس شجر کے سائے میں | اس کے گرنے کا احتمال ہوا
بس کہ وحشت تھی کارِ دنیا سے | کچھ بھی حاصل نہ حسبِ حال ہوا
جس تعلق پہ فخر تھا مجھ کو ____ وہ تعلق بھی اک وبال ہوا

دفترِ شعر میں کیا نسل و قبیلہ کی تمیز | نام اونچا ہے بس تازہ خیالوں کا یہاں
تیری تصویر چھپی جب تو مجھے علم ہوا ____ کتنا مجمع ہے ترے چاہنے والوں کا یہاں

رزو ممکن ہے نہ شرحِ آرزو ممکن نہیں | ان سے اب تک والہانہ گفتگو ممکن نہیں
ہائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا ____ خانقہ کی اس فضا میں ہاؤ ہو ممکن نہیں

پھر لا کے قید سے پریوں کو لاؤں کیسے نعیم ____ اڑیں پہاڑ تو پہلے، زمیں ہلے تو سہی

کچھ وفا کی باس، کچھ بوئے جفا کس میں نہیں | ایک دنیا دیکھ لینے کی ہوا کس میں نہیں
ہ سراسر مہر ہے، اخلاص ہے، تہذیب ہے | کچھ اگر اس میں انا ہے تو انا کس میں نہیں
وش نصیبی ہے ہوا ہوں وارثِ سوزِ حسین ____ ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

ھ میں کیا ہے، مری چادر میں ہیں کتنے موسم | تو بھی مانندِ کفِ خاک، اٹھے تو دیکھے
لم کتنا ہے گراں، روح کی قیمت کیا ہے ____ کوئی بازار میں ہر روز بکے تو دیکھے

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جلتے | کم نہیں اس کا کرم، خاک بہ سر رہنے دیا
یسا دشمن تھا کہ ہر خواب کو پامال کیا ____ نور سب کھینچ لیا، دیدۂ تر رہنے دیا
لیا مسائل تھے زمانے کے جو دنیا نے حسن ____ چھین کر ذہنِ رسا، کاسۂ سر رہنے دیا

برے کام آئی دعائے شب، نہ جوشِ بندگی ____ حادثے جتنے بھی ہونے تھے وہ آخر ہو گئے

ں سمجھتا تھا جسے اک افسرِ دربارِ دوست ____ آ کے زنداں میں کھلا وہ شخص کس دفتر میں ہے

ر اڑان ہو اونچی تو بحرِ اعظم بھی | ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے
ہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر | ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے
ں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا ____ اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

ں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں | اپنی سب روداد لکھنے کے لیے بیتاب ہوں
ں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں | ابر آئے یا نہ آئے، میں سدا شاداب ہوں

کیا سمجھ کے مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار ____ آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شورِ گلستاں — اب حرفِ غزل نوکِ سناں موجۂ خوں ہے

اشکوں میں کہاں ڈوب گیا غم کا سمندر — لفظوں میں کہاں گم وہ مرا سوزِ دروں ہے

مختصر گوئی بھی اک حسنِ تنا خوانی ہے ____ کیا ضروری ہے حسن ایک جریدہ لکھوں

دل وہ کشت آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی — سیرِ دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا اس نے جو بھی دکھ دیا ____ آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

یہ ہنر کا بھی ستارا ہے نہایت منحوس ____ ہم کِسے غیر بتائیں کِسے اپنا سمجھیں

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا — بکنے کا تھا جو مال کتابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دمِ نشاط ____ اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا

موسم سیلاب آیا، ندی نالے بھر گیا — بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا ____ جو بگولوں سے لڑا تھا، وہ صبا سے ڈر گیا

وحشت سرا سے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی ____ دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

تہذیبِ قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا ____ مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم ____ چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا — میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

پتا چلا یہ ہواؤں کو سر ٹپکنے پر ____ میں ریگِ دشت نہ تھا، سنگ صد زمانہ تھا

کچھ خطوط دست میں تھا، کچھ کتابِ نجم میں — جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی — وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجا بجا

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ ____ جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

سُنے گا ہند تو اس سے کہوں گا درد وفا — مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیاس سے اس نے حسن کہا تھا نعیم ____ میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں — کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

یہی ہجوم جو گھر کو جلانے آیا ہے ____ لگا کے آگ مجھے تمغۂ وفا دے گا

ایک دریا پار کر کے آگیا ہوں اس کے پاس ــــــ ایک صحرا کے سوا اب درمیاں کوئی نہیں

شبیہ ماہ لیے آسماں سے اترا ہے ــــ جدھر بھی جاؤں وہی دل نواز چہرہ ہے
جو تم ملو تو یہ دنیا ہے آبشار و چمن ــــ ملو نہ تم تو یہ دنیا سراب و صحرا ہے
نہ گفتگو، نہ عنایت، نہ کوئی رخصتِ جاں ــــ سرائے دل میں عجب شخص آکے ٹھہرا ہے
گذر ہی جائے گی آفات کی گھٹا بھی حسن ــــ حیات خود ہی گھڑی دو گھڑی کا پہرا ہے

ایک دنیا میں اپنے اندر ہوں ــــ اس قفس کی فضا سے باہر ہوں
حاصل صد سفر ہے بے تابی ــــ پہلے دریا تھا، اب سمندر ہوں
خس کی مانند بے نوا، بے بس ــــ ہر ہوا سے سبک سے بے گھر ہوں
سر سے پا تک لہو ٹپکتا ہے ــــ آپ اپنی انا کا منظر ہوں
مہر عبرت ہے یہ جنم میرا ــــ اگلے وقتوں کا میں پیمبر ہوں
رشک عرفی تھا میں حسن آگے ــــ اس زمانے میں سب سے کمتر ہوں

شعر کے قالب میں کچھ سوزِ دروں رہ جائے گا ــــ جتنا آنکھوں سے بہے گا، اتنا خوں رہ جائے گا
جلتا ہوں بے گناہ میں دنیا کی آگ میں ــــ اب کے حیات مانگ تو دنیا سے دوں نہ مانگ
...ں نے بھی جانا عشق کو تفریح، خوش رہا ــــ سنجیدہ ہو کے ہم تو نہایت دکھی رہے
...ے کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول ــــ سورج سے وہ نہ آنکھ لڑائے تو کیا کرے
...یا خبر تجھ کو ہوا نقش قدم سے تیرے ــــ کتنے قدموں کے نشاں خاک میں مل جاتے ہیں
...پنے ہی رُخ سے بند ہوئے راستے تمام ــــ بیدل کی ایک چال سے بے حال ہو گئے
...شعار اپنے پاس تھے کاغذ کے روپ میں ــــ ناشر نے جب چھوا تو زر و مال ہو گئے
...ر فلک سے خون کی گردش بڑھی تو ہے ــــ تھکنے لگے تھے پاؤں زمیں پر کھڑے کھڑے
...م کو بھی اے بگولو! سوئے دشت لے چلو ــــ ہم خاک ہو چلے ہیں، گلی میں پڑے پڑے
...کائنات ہی اس کی ہے، کوہ و دریا کیا ــــ میں ایک کنج میں دھونی رما کے بیٹھا ہوں
...جس کی کھوج میں سب کچھ لٹا کے نکلا تھا ــــ اسی کو جوشِ جنوں میں گنوا کے بیٹھا ہوں
...ا تو لشکرِ سلطاں سے جم کے میداں میں ــــ بلا سے مجلسِ خوباں میں بے وفا ٹھہرا

فراز کوہ سے آواز دو تو آؤں بھی — میں ہر مہم میں طلب کی شکستہ پا ٹھہرا
بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں — تمہیں بتاؤ، میں تم سے کہاں جدا ٹھہرا
مری بھی ایک صفت ہے شہاب ثاقب میں — سیاہ شب میں وہی شعلۂ نوا ٹھہرا
لکھو گے کیسے حسن خود کو صرف تم زیدی — تمہارا سارے شہیدوں سے سلسلہ ٹھہرا

جبر شہی کا صرف بغاوت علاج ہے — اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے
آگے تو زہرِ عشق میں سب زہر تھے گھلے — اب شاعری کی جان رگِ احتجاج ہے
کیا دی ہے لب کشائی کی قیمت اسے بھی دیکھ — اس دفتر نوا میں سبھی اندراج ہے
اقبال کی نوا سے مشرف ہے گو نعیم — اردو کے سر پہ میر کی غزلوں کا تاج ہے

جو تشنہ کاموں کو ساتھ لے کر تلاش آب رواں میں نکلا — سمندروں سے سوا ہے گہرا، وہ پربتوں سے کہیں بڑا ہے
ہزار پہلو سے دیکھتا ہے وہ اپنے شیشے میں آدمی کو — جو اس کو تھوڑا بھی جانتا ہے وہ ایک دنیا کو جانتا ہے

غم نہیں ممکن احساس جو ٹھہرا ہے دماغ — دل کے ساغر میں سوا خوں کے بھرا ہی کیا تھا
کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن — برگ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

ہجر، اک یاد کی خوشبو میں ہے بستے رہنا — وصل، اک تازہ گلستاں سے شناسائی ہے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے وقت ہے — ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے
تنکے تمام چمن کے بیاباں اڑا چلیں — ان جھاڑیوں کے بعد سہانا درخت ہے
اپنے جنوں کے دوست ہیں سورج بھی چاند بھی — مانا حسن نعیم ابھی دھوپ سخت ہے

جہاں پہ ایک بھی ٹیلا نظر نہ آتا تھا — وہاں سے لوگ اٹھا کر پہاڑ لائے ہیں
کٹے ہیں پاؤں تو ہاتھوں کے بل چلے برسوں — مثالِ موج ترے ہم کنار آئے ہیں

ان سے بچھڑے تو مؤذن کی صدا بھول گئے — جس کو پڑھتے تھے دمِ شب وہ دعا بھول گئے
پتے پتے کی رہی موج صبا سے یاری — پھول کب شاخ سے ہوتا ہے جدا بھول گئے

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی — اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں
ہم لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلف خیال — یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں ہیں درد کے چشمے — وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیم آنسو بہانے میں

کرو نہ دفن کہ مقتل کا نام اونچا ہو ___ لٹا دو خاک پہ لاشے کو قبلہ رو کرکے

جب تک شعور عشق ہے، پاس جمال ہے — زندان آرزو سے نکلنا محال ہے

ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار ___ دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز درد وفا ___ اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی

کوئی جیسے نوکِ سناں لیے شب و روز سر پہ کھڑا رہا ___ ہے اذیتوں کے شمار میں یہ اذیتوں کا ہراس بھی

اک مغنی کا وہ گھر تھا جس سے اٹھتا ہے دھواں — جس جگہ یہ مدرسہ ہے حسن کا بازار تھا

سر جھکا لینے سے ٹل جاتیں ہزاروں آفتیں ___ سارے ہنگامے کا باعث اپنا ہی کردار تھا

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی — دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا ___ ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

نہ وہ ملا، نہ کوئی آرزو ہے اب اس کی ___ مری طلب کو بہر حال رائگاں کہیے

ان وفاؤں کے صلے میں کچھ جفا بھی چاہیے — مجھکو جینے کے لیے تازہ ہوا بھی چاہیے

اس جہان آرزو میں زندہ رہنے کے لیے ___ آدمی کو مہرباں سا اک خدا بھی چاہیے

خیال و خواب نے افلاک سے قریں رکھا — زمیں کی سمت بھی لوٹے تو بس ہوا میں رہے

غزل تھی سب کی نوا، لیکن نام میرا تھا ___ یہ مے نوازشِ دوراں تھی، جام میرا تھا

مری ہی ضد نے کیا بادباں کو چاک مگر ___ بھنور سے بچ کے نکلنا بھی کام میرا تھا

شور دریا نہ سنو، کتبۂ ساحل کو پڑھو — ہر سخن کا یہ تقاضا ہے مرے دل کو پڑھو

اس خبرگاہ میں اک دفتر حیرت ہے وہی — قیمت علم لگانی ہے تو جاہل کو پڑھو

کتنے اوراق کھلیں منصف و شاہد کے لیے — قتل ثابت ہے مگر صورت قاتل کو پڑھو

ایک طغرا خط کوفی میں ہے وہ سب سے جدا ___ آنکھیں روشن ہوں جو اس زہرہ شمائل کو پڑھو

پو پھٹی تھی کہ شب وصل کا پیغام ملا — سو گئے خواب کی بانہوں میں جو آرام ملا

ڈھونڈتے رہیے شب و روز امیدوں کے قدم — کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا

پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی — جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا

ہم نے بیچی نہیں جس روز متاع غیرت ___ اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

سارے جہاں کی سیرِ امکان مل گیا ____ بوے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

کیا بساط خار و خس تھی پھر بھی یوں شب بھر جلے ____ دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا

یہ دل کہ قصبۂ گم نام سے مشابہ تھا ____ ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قید انا
انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا

کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیم ____ یاں وصال یار بھی ہے "اقتصادی مسئلہ"

خواب کی راہ میں آئے نہ درو بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی

اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا ____ پوچھنا دلی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

اٹھائے منت صرصر کہ ناز بادِ نسیم
ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا

چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیم ____ میانِ جام و سبو شیشہ دار ہے تنہا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات ____ نہیں ہے شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

کوئی وجہ غم نہیں ہے کسی بات کا ہے غم بھی
اسی درد گم شدہ سے کبھی رو دیے ہیں ہم بھی

وہی طالب ضیا ہو جو اٹھائے ناز ظلمت ____ وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شام غم بھی

شاید کہ مثل مہر کوئی آئے صبح دم ____ شام فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

جوے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی
جھولی میں زاد راہ نہ منزل کی گرد ہے

حیراں سا ہے برگ سبز جو سائے میں اس کے آج ____ گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے

پیکر ناز پہ جب موج حیا چلتی تھی
قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی

ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر ____ جذبۂ عشق کے ہم راہ انا چلتی تھی

دل میں اتر گئے تو اک جوے وفا پاؤ گے
موج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے

میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں ____ تم بھرے گھر میں کہاں مجھ کو بھلا پاؤ گے

جل کے ہم راکھ ہوئے ہیں کہ بنے ہیں کندن
جوہری بن کے کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں

گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا ____ کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

تو نے خزانہ دیکھ کے سر کیوں جھکا لیا ____ رہتا ہے سربلند جہاں شیش ناگ بھی

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور بھی ____ تم سے میں دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو
یہی رشتہ درد کا کم نہیں کہ شکایتوں میں سکوں ملے صف دل براں کا وہ تاج ور مری گفتگو سے خفا تو ہے
گل سایہ بن کے جیا تو ہے کوئی دن کے یورش نور میں ____ کوئی صحن شب میں تمام شب رخ یار بن کے جلا تو ہے
کوئی دشت مہرباں ہو تو سفر آساں ہے ____ ورنہ ہر پتھر ہے بھاری، ہر کنواں ویران ہے
مژدہ صبح بیاں ہے، میری غزلوں کا ظہور لمس معنی، بوسہ شعلہ رخاں سے کم نہیں
ایک طوفاں ساحلوں سے دور رکھتا ہے مجھے ____ اس سفر میں تار دامن بادباں سے کم نہیں
اک دوسرے کو دیکھ کے حسرت سے رہ گئے ____ دونوں کے ارد گرد روایت کا جال تھا
ہر سخن سے گرم تر ہے سینۂ مہر و خلوص ____ بے ہنر لوگوں کو سینے سے لگا کر دیکھیے
دل میں نہ جانے کیا رہا، مثل شرار جستجو جوش طلب کے وقت بھی، ترک طلب کے بعد بھی
تجھکو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ آمد نور کے باوجود، رخصت شب کے بعد بھی
سر میں اگر جنوں نہ ہو ملتا نہیں ہے تاج فن ____ فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی
بام خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح ____ خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے
اتنا دل نعیم کو ویراں نہ کر کے جاؤ ____ روئے گی موج گنگ جو اس تک خبر گئی
یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادباں سب ہیچ ____ افق کے پار کوئی اور ہی اتارے گا
کچھ قربتوں میں لطف تو کچھ دوریوں میں ہے ____ یاروں سے رہ قریب بھی، یاروں سے بھاگ بھی
کہاں میں، ہجرت کے مرحلوں میں، اٹھائے پھرتا غم مکاں کو
خلا سے رشتہ جڑا تو دیکھا نہ مڑ کے ساحل نہ بادباں کو
ملا نہ کوئی جو ہم نفس ہو سکوت جنگل میں ہم قدم ہو
کہیں تو لیکن ہے کوئی ایسا جو آس دیتا ہے قلب و جاں کو
کتنے برسوں میں لہو آنکھ سے ٹپکا شب بھر قرض تھا مجھ پہ بہت کاسۂ دل داری کا
میں نے الزام کی تردید میں حق گوئی کی ____ نام اونچا نہ ہوا مجھ سے رواداری کا
کوئی پہاڑ نہیں تھا جو ہم نے سر نہ کیا ملے وہ خواب کہ آرام عمر بھر نہ کیا
یہ کیوں ہوا کہ سدا اجنبی دلوں میں بسے ____ اسی کا دل تھا حسن جس میں تم نے گھر نہ کیا

بس یہی فکر کرو جلتی رہے آتش فن ——— آتش رشک سے محفل میں دھواں ہے تو رہے

نہ میرے خواب کو پیکر، نہ خدوخال دیا
بہت دیا تو مجھے موقع وصال دیا
ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر
یہ کار زیست کسی طور سے سنبھال دیا
مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی ——— مرے ہنر کو پس پشت اس نے ڈال دیا

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے
ہر ایک حرف ہوا صاحب نوا تجھ سے
زباں کشائی غم سے کھلی کتاب خیال
ورق ورق پہ کھلا رنگ مدعا تجھ سے
زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں
گلوں میں سر د پڑی آتش قبا تجھ سے
کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی
جو دیکھیئے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے
پہنچ تو جاتا سر خیمۂ وفا آباد ——— مگر ہے سست قدم عمر تیز پا تجھ سے

قصبۂ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا
کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارا دیکھوں
کوچہ ویراں ہے ستوں سوچ رہا ہے کب سے
کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستا دیکھوں
مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا ——— اس کو غم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفان طلب
مجھ پہ کیا بیت گئی رات سنا تو ہوگا
یہ بھی تسلیم کر تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے ——— تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم ——— سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

پتا نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا، کیا تھا
لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا، کیا تھا
نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا
لباس عشق بہت دل پہ تنگ تھا، کیا تھا
پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں
یہ اپنے ملک کا باسی ملنگ تھا، کیا تھا
نعیم کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں ——— وصال یار رہی خوشبو تھا، رنگ تھا، کیا تھا

مکتوب یار ہوتا تو حرف حرف پڑھتے
تحریر وقت پڑھ لی، ہم نے ادھر ادھر سے
جیسے ہی شام آئی، جوڑا بطوں کا اترا ——— جس پیڑ کے تلے تھا، اک شخص دوپہر سے

کسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلد دانش بنایا کیسے ——— کہاں سے آب رواں کو موڑا، کہاں سے باد بہار لائے

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ غم کا سرا پا کہیں نہیں

شاعر کا ہے وہ خواب، رسولوں کی آرزو — تم جس کو ڈھونڈتے ہو، وہ دنیا کہیں نہیں
سامانِ صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نسیم — وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں

میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب — کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب
گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف — وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگِ سراب

رکھیے سنبھال کے اپنا دفینۂ حسنِ نعیم — غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں — لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد

دشت پیمائی ہے میری عہدِ حاضر کا جنوں — بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں

کتنے اشکوں کے دیے جلتے رہے، بجھتے رہے — یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن — اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
ٹال دیتا ہوں غمِ یار ذرا سا ہنس کر — مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی — ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرفِ جنوں — یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

●●

مجتبیٰ رضوی (وفات: ۲۶ فروری ۱۹۹۱ء)

نام:- سید مجتبیٰ حسین رضوی، تخلص:- رضوی (ابتدائی تخلص شاعری میں تپش)، والد کا نام: سید ظہیر حسین

وطن:- چھپرہ، ولادت:- ۱۹۰۸ء چھپرہ، ابتدائی تعلیم:- گھر پر ہوئی۔

اصولی تعلیم:- ۱۹۲۳ء:- راجپوت ہائی اسکول چھپرہ، ۱۹۲۵ء میٹرکولیشن، ۱۹۲۷ء آئی اے، ۱۹۲۹ء بی۔ اے (جی بی بی کالج، موجودہ لنگٹ سنگھ کالج، مظفرپور)، ۱۹۳۸ء:- ایم اے (فارسی) پٹنہ یونیورسٹی

زندگی کے اہم واقعات:- ۱۹۲۶ء:- بڑے بھائی سید مجتبیٰ حسن کا ارتحال (دریائے [illegible] میں ڈوب کر)، ۱۹۳۰ء:- والد ماجد کا انتقال، ۱۹۲۹-۳۰ء ضلع اسکول چھپرہ میں عارضی ملازمت، ۱۹۳۰-۳۱ء:- مدرسہ سلیمانیہ میں عارضی ملازمت، ۱۹۳۱ء:- شادی، ۱۹۳۳ء:- لڑکی کی ولادت، ۱۹۳۵ء:- لڑکے کی ولادت، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۶ء:- اہلیہ کا انتقال، ۱۹۳۷ء:- قیام کلکتہ۔ صحافت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں شرکت، معریات کے مطالعے میں، ۱۹۳۸-۳۹ء:- راجندر کالج میں لکچرر (تقرری) اور تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شمولیت، ۱۹۴۴ء (اواخر):- ترک دنیا۔ گیا کی پہاڑی کے کسی غار میں طویل مراقبہ یا اعتکاف، ۱۹۴۵ء (اوائل): اعتکاف سے واپسی، ۱۹۵۴ء:- "شعلۂ ندا" کی اشاعت، ۱۹۵۷ء:- لڑکی کی شادی، ۱۹۶۰ء:- ملت کالج کی پرنسپلی، ۱۹۶۵ء:- کالج کی عظیم الشان عمارت کی تیاری اور اس میں کالج کا منتقل ہونا، ۱۹۷۱-۷۲ء:- حج و زیارت، ۱۹۷۲-۷۴ء:- ۱۹۳۴ء کے زلزلے سے مجروح شدہ ذاتی مسجد کی تعمیر جدید، ۱۹۷۵ء:- ال-ان متھلا یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر، ۱۹۷۷ء:- یونیورسٹی کے عہدے سے سبکدوشی۔

مشاغل:- مطالعہ، تصویر کشی، باغبانی، تدریس۔ شوق:- فلسفہ، معریات، روحانیات، مذہبیات والٰہیات، ادب (شاعری)، فن تعمیر، موسیقی۔ موجودہ قیام اور مشغلہ:- اپنے لڑکے مرتضیٰ اظہر رضوی، پروفیسر و صدر شعبۂ مابعد الطبعیات و منطق و فلسفہ۔ ملت کالج کے ساتھ دربھنگہ میں قیام اور ان کی ذہنی و فکری تربیت، پوتوں کی ناز برداری۔

انتخاب کلام

جہاں میں حاجت روا محبت تو حسن اک نقش مدعا ہے | مصور عشق رنگ بھر دے تو حسن بت ہے و رنہ کیا ہے

حاصل سعی موج رنگ دیکھیے لالہ زار میں | گل تھا سے آگ لگ چلی پیرہن بہار تھا

مدعیانِ ہوش و خرد سب دعا کر بیٹھتے ہی گئے آپ کا جب دیوانہ آیا وقت کا دھارا موڑ چلا

آگ ہے بجلی، آگ میں ذرے، آگ ہے سورج، آگ میں تارے ہم نے تو نری تھی شوخ نگاہی، آپ نے کیوں عالم کو جلایا

ہم پہ شریعت، ہم پہ طریقت، ہم پہ حدودِ فکر و نظر آپ چلے تو گلشن گلشن، صحرا صحرا آپ ہوئے

جل نہیں سکتا جو پروانہ بزم سے ٹل ہی جاتا ہے رشتۂ شمع تو جلتے جلتے آخر جل ہی جاتا ہے

قیس کے بعد تو خاک اڑنے لگی تھی رستے کی مجھ سے ویران نہ دیکھا گیا ویرانے کو

سرِ شوریدہ کو بالیں تو مل جائے بلا سے بتکدے کا آستاں ہے

ایک دن رندوں نے مسجد میں نماز آکے پڑھی دوسرے دن اسے میخانہ بنا کر چھوڑا

فردوس کا وہ گوشہ ہی سہی، ساقی کا جگر گوشہ ہی سہی لیکن نہ بھریں ساغر جس سے اس مینا کو مینا نہ کہو

مانا کہ سلیقہ جینے کا آتا بھی نہ ہو نادانوں کو یہ دشتِ جنوں آباد تو ہے، اللہ رکھے دیوانوں کو

سب پہ طاری ہولِ قیامت اور خوشی دیوانوں کو بارے اس نے حال تو پوچھا ہم سے پریشاں حالوں کا

سمیٹ لیتے بیک سجدہ کائناتِ شہود بقدرِ حسرتِ دل وسعتِ جبیں نہ ہوئی

چکانے قرضِ اپنا مجھ سے لے قدرت کے سوداگر کہ اس سینے میں دل باقی ہے، اس گردن پہ سر باقی

بازار میں آکر ناداں دل شہر کے کھلونوں پر مچلا اور پیرِ خرد کو کاندھے پہ اپنا بارِ نظر ڈھونا ہی پڑا
ہم تخمِ محبت جنت سے سینے میں چرا کر لے آئے اس ریت میں کیا اگتا وہ بھلا! ہاں لائے تھے بونا ہی پڑا

خداپرستی کا بیج بو کر خودی کا دل میں فروغ دیکھو یہیں سے چھوٹے خدا اگے ہیں، بڑی خطرناک یہ زمیں ہے
فغاں کہ یہ رسمِ جبہ سائی نہیں بہ مقدارِ ذوقِ سجدہ وہ کاش دل تک اتر کے رہتا جو داغ آسودۂ جبیں ہے

جس راہ میں پیچ و خم نہیں ہے اس راہ میں کیوں حرم نہیں ہے
سجدہ ہے کرشمۂ تصور مت کہہ کہ خدا صنم نہیں ہے

طلب کی ذلت و بیچارگی، معاذ اللہ مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے
ہم اٹھ کھڑے ہوئے دنیا سے جھاڑ کر دامن کہ ان بجھے ہوئے ذرات میں دھرا کیا ہے

روا ہے کیا تری دنیا میں، ناروا کیا ہے مجھے بتا کہ "یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"
یہ اتحادِ طبیعت یہ اختلافِ مزاج یہ طرفہ کاریِ رفتارِ ارتقا کیا ہے
حیات جس کو کہیں اک جنونِ گرم روی یہ کیوں ہے، اس کی غرض اس کا مدعا کیا ہے

اس دل کا تحیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا مو قلم
تمثال پہ نقطے لگا کر تصویر بدلتی چلی گئی

اک حد میں شریعت کہی گئی اک حد میں طریقت کہی گئی
انسان جو چلتا چلا گیا سب سلسلہ بدلتی چلی گئی

قدم سے دور جبیں رہی سنگ در ہو گا
فغاں کہ بے کسی سجدہ مشتہر ہو گی

طوافِ بے سجدہ کعبۂ آرزوئے نامشہود
بہت ہوئی تو جبیں قسمتِ نظر ہو گی

جہاں ہے سر سبز کشتِ ارماں اجاڑ صحرا وہاں رہے گا
ادھر کو جو بہہ رہی تھیں نہریں اب ان کے رخ موڑے جا رہے ہیں

یہ رسمِ میخانہ کیا ہے آخر کوئی تو پیرِ مغاں سے پوچھے
جو کل بنائے گئے تھے کوزے وہ آج کیوں توڑے جا رہے ہیں

تکمیل زندگی کو جنوں کا ہے انتظار
اب تک خرد حریفِ مشیت نہ ہو سکی

قطرہ کے دل کی ہوک یہ قلزم نہیں بڑا
میری امید اس کی مشیت نہ ہو سکی

بساطِ بزم مے سے کم نہیں ہے کوئے دلداری
سنبھل کر پاؤں رکھیے ہر قدم اک آبگینہ ہے

ابھی تو دل کے ٹکڑے جمع کرنے سے نہیں فرصت
گریباں کی ہزاروں دھجیاں ہیں دامن کو سینا ہے

حریمِ جلوہ کچھ اپنی خبر ہے؟
نظر کا رخ کدھر تھا اب کدھر ہے!

کلی کا مسکرانا دیکھ لے دیر
بہت گہرا یہ طنزِ مختصر ہے

اب سب کی زباں سے سن لیجے خلوت کا بیاں جلوت کا بیاں
اُف کیا کیا راز نہ فاش کیے آغوشِ جنوں کے پالوں نے

اس دل کو راہِ محبت میں جس جس نے پایا لوٹ لیا
اک تم ہی نہیں سب اپنے ہیں کیا خاروں نے گلوں نے لالوں نے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا طلسم ہست و بود
اک جنونِ ادعا ہے مدعا کوئی نہیں

دیدۂ بیدار نے توڑا طلسمِ آرزو
جلوہ گاہِ ناز میں میرے سوا کوئی نہیں

مجبور نگاہیں تکتی ہیں قدرت کے تماشے ہوتے ہیں
بنتا ہے کوئی مٹتا ہے کوئی دن ہنستے ہیں سو روتے ہیں

ہر سمت سے خطرہ ہے دل کو مانگے نہ کوئی چھینے نہ کوئی
مفت ایک پرانی پونجی کو ہم رستے رستے ڈھوتے ہیں

ہے اک انتشار سکوں میں بھی سروپا کا ہوش جنوں میں بھی
کہیں بار منتِ سنگ ہے کہیں دامِ لذتِ خار ہے

جسے ڈھونڈتے ہو وہ میہماں کہیں اور اُٹھ کے چلا گیا
جو سرائے کہنہ میں رہ گیا ہے وہ کہنگی کا غبار ہے

یہ نقوشِ رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ ان کو سمجھ نہ تو
جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغِ بہار ہے

ہے کشادہ وسعتِ دو جہاں مگر اے مکانیِ لامکاں
جو بھی احاطۂ جستجو ہے تو جستجو کا فشار ہے

بہمہ جمود و فتادگی ہے تمام دشت میں کھلبلی
دلِ رہروی جرس آشنا یہ بتا تو کس کی پکار ہے

تمہاری گر جستجو نہ کرتے تو ہم جہاں تھے وہیں پہ تم تھے
ہم اپنی منزل سے بڑھ گئے ہیں برا ہو اس ذوقِ جستجو کا

طلب کے صحرا کا ذرہ ذرہ ہے خندہ زن سعیِ رائگاں پر
صدا دے اب اے نسیمِ غفلت کہ تھک گیا پاؤں جستجو کا

مری محبت کی انتہا تھی مرے تخیل کی بت تراشی
بکھر گئی آرزو کی پونجی طلسم ٹوٹا جو رنگ و بو کا

ڈھونڈ لیتے تجھے ہم ہمتِ مرداں کی قسم
قید ہیں وسعتِ محدود بیاباں کی قسم

سرِ حد ہی میں مت جا کہ ہیں طوفانِ شکوک
حل میں رہ مجھ کو چراغِ تہِ داماں کی قسم

آج اگر بچ گئی رضوی تو یہ کل ٹوٹے گی
پھر غم کیا ہے؟ لبِ توبۂ رنداں کی قسم

اس ساز پہ نغمہ اب چھیڑو تو نالہ پیدا ہوتا ہے
موجود ہیں وہ سب تار جو تھے بس ایک نہیں ہے ٹوٹ گیا

ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے
اب اور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

ہاں سن کہ تجھے بھی ہم سے غرض محتاج نظر تھا حسن ترا
رکھی رہی شانِ استغنا آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا

دل ہے اور خودنگری ذوقِ دعا جس کو کہیں
بے خودی چاہیے وہ ہم کو کہ خدا جس کو کہیں

ہے ترے کیسۂ پندار میں ایسی کوئی چیز؟
دل کی بےتابِ محبت کا صلہ جس کو کہیں

تم سے رضوی کئی منزل ہے زمانہ پیچھے
راہرو اس کو کہو راہنما جس کو کہیں

اوچھی تھی نظر ہی جب تو بھلا ارمان تماشا کیا کرتے
ذرے کے جگر تک جا نہ سکے ہم ہمتِ صحرا کیا کرتے

رات اس نے نقاب الٹی جو ذرا سب بندِ تعین ٹوٹ گئے
وہ وہ نہ رہا ہم ہم نہ رہے اے شوق تماشا کیا کرتے

تم نے ہی چمن کو لوٹ لیا تم نے ہی نشیمن پھونک دیا
ہم شکر کی ہمت کر نہ سکے شرما گئے شکوہ کیا کرتے

جلووں سے نہ آنکھ جھپکتی ہے جلووں کو نہ آنکھ ترستی ہے
ہم نے وہ پیالہ پی ہی لیا جس میں نہ خمار نہ مستی ہے

کچھ لمحے ہیں جن لمحوں میں احساس لئے پھرتا ہے
عالم ہے ادھر جو عالم ہے ہستی ہے ادھر جو ہستی ہے

ہے روح کی حالت کندن کی جتنا ہی تپے گی نکھرے گی
غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے

چھیڑا ہی کیوں ہوائے رہِ کوئے یار نے
اندھیر کر دیا مری مشتِ غبار نے

افسردگی بھی حسن ہے تابندگی بھی حسن
ہم کو خزاں نے تم کو سنوارا بہار نے

اس دل کو شوقِ دید میں تڑپا کے کر دیا
کیا استوار وعدۂ نا استوار نے

جلوے کی بھیک دے کے وہ ہٹنے لگے تھے خود
دامن پکڑ لیا نگہِ اعتبار نے

گیسو غبارِ راہِ تمنا سے اٹ نہ جائیں
صحرا میں آپ نکلے ہیں ہم کو پکارنے

دونوں جہان کی ساری پونجی بار ہوئی گردنِ نازک پر — بردگدا کے ہاتھ میں کیونکر ان ناقوں کی مہاریں آئیں

تیرے فقیر کو رستا چلتے عزت و ذلت میں الجھانے — مندر سے پوجا کی آوازیں مسجد سے پھٹکاریں آئیں

گوشۂ عرش کا بوسہ لینے دہر سے اٹھ کر ساری پکاریں — کافر کی فریادیں آئیں غازی کی للکاریں آئیں

نامہرباں بنے تھے، مگر مہرباں رہے — چھپ چھپ کے خود وہ رہنے لگے ہم جہاں رہے

میرا دلِ شکستہ علاقہ ہے اک سوال — یعنی جو پھول شاخ سے ٹوٹے کہاں رہے

اف! یہ درازدستیِ ارمانِ مشتِ خاک — محمل میں گرد پڑتی ہے لیلےٰ کہاں رہے

ہائے اس کالبدِ خاک سے پیوندِ حیات — کس طرح ملتی ہے، کس طرح جدا ہوتی ہے

کوئی اس راہروِ غربت کی خبر لا دیتا — آہ جو دل سے نکلتی ہے وہ کیا ہوتی ہے

اک عجب عالمِ آئینہ ہے سیمائے شہود — کہ جہاں ایک نظر لاکھ ادا ہوتی ہے

دریائے بے کنار کا ساحل بنادیا — اب جستجو کو شوق کے قابل بنادیا

صحرائے جستجو میں فریبِ نگاہ نے — اپنے غبارِ شوق کو محمل بنادیا

جو وسعتیں سما نہ سکیں کائنات میں — ان کو سمو سمو کے مرا دل بنادیا

اسی امید پہ تھی لغزشِ رنداں ساقی — تھام لے گا کوئی گرتے ہوئے بازو اپنا

تند و سرشور و تنک طبع یہ فطرت جس سے — ان کو ارماں کہ نکالیں کوئی پہلو اپنا

ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے — آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

سب اپنی آنکھ کا آنسو کسی کو سونپ کر آئی — نگاہِ واپسیں اک زندگی کا قرض بھر آئی

تجلی نے کیا شرمندہ اس کو اہلِ ہمت سے — حقیقت کیوں جھکی اتنی کہ تا حدِ نظر آئی

یہ کیسا ماجرا ہے ہر مصور نقشِ حیرت ہے — تری تصویر جب کھینچی مری تصویر اتر آئی

سکوتِ منظر کے زیرِ دامن بہت سے طوفاں پل رہے ہیں — حباب ہے آئینہ ہے ساحل ہوا چلی اور حباب ٹوٹا

اداے تعمیر کہہ رہی ہے جفائے تخریب کا فسانہ — بہت سے تارے چھٹک کے نکلے کہیں کوئی آفتاب ٹوٹا

ہم اور میخانے کی امانت وہاں پہنچ جائے دل سلامت — خدا نہ کردہ جو اپنے ہاتھوں یہ شیشۂ لاجواب ٹوٹا

نظر نہیں ہے تو کون دیکھے حجاب کیسا نقاب کیسی — ادھر کھلی اپنی چشمِ بینا ادھر طلسمِ نقاب ٹوٹا

کسی کی رعنائیوں کو برہم کیا مری شوخیٔ نظر نے — تجلیاں تلملا کے نکلیں جلال آیا حجاب ٹوٹا

زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا   یہ ترجماں تو بنی تھی مگر بنا نہ گیا
ہم ان کے وعدۂ فردا کو لیکے بیٹھے ہیں   کہ جن سے آج کا وعدہ وفا کیا نہ گیا
دمِ اخیر وہ دینے لگے حیاتِ دگر   پھر ایک عمر کا احسان تھا لیا نہ گیا

زندگی نغمۂ بیداریِ احساس بھی ہے   اور وہ لوری بھی ہے جو دل کو سلا دیتی ہے
کارواں فکر کا ہے منزلِ آخر پہ تو کیا   زندگی منزلِ اول سے صدا دیتی ہے
بات بگڑے کہ بنے یہ مری بے تابیٔ شوق   تیری آواز سے آواز ملا دیتی ہے

ظہورِ بیکسی صحرا میں ہے صرف اک نشاں میرا   غبارِ کارواں ہوں دور نکلا کارواں میرا
رسائی مرگِ شوق، افتادگی ننگِ تن آسانی   بلا کی کشمکش ہے اور غبارِ ناتواں میرا
مجھے گھبرا کے دوشِ ہستیٔ جاوید پر پھینکا   کوئی دم بھی نہ اٹھا موت سے بارِ گراں میرا
چمن سے اک طرف ہوں نخلِ بے برگِ تمنا پر   ارے او برقِ رہ گم کردہ! یہ ہے آشیاں میرا

چرانے کو چرا لایا میں جلوے روئے روشن سے   مگر اب بجلیاں لپٹی ہوئی ہیں دل کے دامن سے
تنوع کچھ تو ہوا اے بلبلِ کم ذوق، ماتم کیا   اگر تعمیرِ صحرا ہو گئی تخریبِ گلشن سے
مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے جھولی میں رکھ چلنا   مسافر ہوں غرض کیا ہے مجھے صحرا و گلشن سے
مذاقِ جذبِ باطن گم ہے اب تزئینِ ظاہر میں   یہ طفلِ دشتِ ایمن گھٹ گیا تہذیبِ گلشن سے

بخشی ہیں اس خودی کو بپئے امتحانِ ظرف   پروردگاریاں مرے پروردگار نے
کب سے کیا ہے باندھ کے احرامِ بے خودی   میرا طواف گردشِ لیل و نہار نے
ہمت پہ میری پیار سے اُمڈا ہے قلبِ بحر   دھوئے ہیں پاؤں گریۂ ابرِ بہار نے
صحنِ مجاز میں بہ ہزاراں ہزار ناز   کھیلی ہے مجھ سے آنکھ مچولی بہار نے
چندیں ہزار عالمِ آشفتگی بہ دوش   اترا ہے ناز خود مرے گیسو سنوارنے
اس جام دل کو اپنی ہتھیلی پہ لے کے خود   چھلکا دیا ہے ساقیٔ کوثر نثار نے
رشکِ دوئی سے وسعتِ آغوش کر کے تنگ   بھینچا ہے مجھ کو وحدتِ کثرت شکار نے
میں کافرِ مجاز پرست حق آشنا   سمجھا کہاں کہاں سے صدا دی ہے یار نے
دیوانہ وار کفر کو ایماں کئے ہوئے   دوڑا تو ساتھ چھوڑ دیا اعتبار نے

کچھ بات تو کرتا چل اے ماجھی تو ہی اک سہارا ہے — اب کتنی دور کنارا ہے؟ اب کتنی دور کنارا ہے!
وہ کون ہے جس کو ظلم تمہارا پیار سے اپنے پیارا ہے — یہ عاشق اپنے شوق کے ہیں سب عاشق کون تمہارا ہے
جب تک نہ حریم ناز سے تم درویش کی کٹیا میں اترو — ہم تم کو پکارے جائیں گے جب ہم نے تم کو پکارا ہے
ہے شام جھما جھم تاروں سے، ہے صبح جھکا جھک کرنوں سے — یہ کس نے بال سنوارے ہیں؟ یہ کس نے روپ نکھارا ہے

برباد یہاں ناموس نظر، اے دیدۂ بینا کون کرے — اقرار تماشا کون کرے، انکار تماشا کون کرے
ہم کو نہ ہو گر یہ دربدری تو خدمتِ صحرا کون کرے — بکھرے نہ کرن تو ذرّوں کو سورج کا شناسا کون کرے
پردیسی جلووں کی خاطر یہ آگ کا سودا کون کرے — جوششِ خسِ صحرا نے کیا راہی سے وہ سکھا کون کرے
اس حرص و ہوس کے میلے میں ہم جنسِ محبت لائے ہیں — سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

خرد کی تیرگی میں آپ کا جلوہ بس ایسا تھا — کہ آدھی رات کو جیسے یکایک صبح ہو جائے
یونہی تاریخِ فطرت میں ہیں تحریکاتِ روحانی — کہ مستِ خواب کوئی چونک کر پھر جیسے سو جائے
وہی ریگِ درشتِ دہر میں لالے اگاتا ہے — جو دل کے خون سے سینچے زمیں اور جان بو جائے
ادھر رکتا ہے خامہ کاتب تقدیر کا چل کر — ادھر یہ اپنا تیور ہے کہ جو ہونا ہے ہو جائے

حسن کو دی گئی سحر، عشق کو آن دی گئی — تم سے نہ دل لیا گیا ہم سے تو جان دی گئی
دشت نے الحذر کہا، موجِ ہوا نے الحفیظ — بخشش قہر، الاماں! خاک کو جان دی گئی
پچھلے پہر مزار پر آ کے نقاب الٹ گئے — چادرِ نرمِ ماہتاب قبر پہ تان دی گئی
وعدۂ دید روزِ حشر سنتے ہیں تو نے کر لیا — تجھ سے بھلا غرورِ ناز کیسے زبان دی گئی

تماشا آسماں تک ہے، تصور آستاں تک ہے — مگر شوقِ دلِ بے تاب کیا جانے کہاں تک ہے
دلِ غاراں کی گرمی سینۂ ہندوستاں تک ہے — کہاں بھڑکے تھے شعلے اور بے تابی کہاں تک ہے
سنا ہے کاروانِ آرزو اب آستاں تک ہے — ہوائے شوق! میری خاکِ سرگرداں کہاں تک ہے؟
بھرے گا کون رنگِ خونِ دل نقشِ حقیقت میں — تمہاری داستاں بھی بس ہماری داستاں تک ہے
انڈیلے جامِ مینا گداز جلوہ اے ساقی — کہ ضبطِ تندیٔ صہبا اسی رطلِ گراں تک ہے
صلہ بے تابیوں کا مل گیا میں نے یہ خود دیکھا — کہ میرے دل کی دھڑکن اس دلِ نامہرباں تک ہے
تماشا اور تحیّر میں کوئی نسبت نہیں رضوی — کہ وہ ہے آستاں تک یہ خدا جانے کہاں تک ہے

ہر مذہب بے روح جسد ہے جذبے کی قلاشی ہے
راکھ کے تودے بجھتے ہیں، یہ کعبہ ہے وہ کاشی ہے

شرع کی قیل و قال سنی، افسانہ وجد و حال سنا
ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے

دل مردہ مفلوج ہیں رد میں کون جلے اور کون جلائے
اس ٹھنڈے ماحول میں بیجا شوق کی اخگر پاشی ہے

صانع قدرت تیرے قلم کا کیا کہنا لیکن یہ بتا
نقش بنانا نقش مٹانا یہ کیسی نقاشی ہے

اور پھر کون سی اب ہو گی ملاقات کی رات
بھیگی بھیگی یہ گنہگار سی برسات کی رات

گھومتے کٹتا ہے کوچے میں ترے دن کا دن
بیٹھے کٹ جاتی ہے چوکھٹ پہ تری رات کی رات

یوں ہیں برہم تری گھنگھور گھٹا سی زلفیں
جیسے بکھری ہوئی بپھری ہوئی ظلمات کی رات

ایسی آباد تری بزم ہے اے جان نشاط
جیسے کعبہ کی سحر جیسی خرابات کی رات

نہیں سہی مرے نالوں میں کچھ اثر نہ سہی
نظر کچھ آپ کی بے چین ہے ادھر نہ سہی

ہم الجھنوں میں پڑے عقل تار سلے کر
وہ عیش بے خبری خوب تھا خبر نہ سہی

ادا فروشی بازار طور اور حضور!
خبر بھی تو ہے مشہور معتبر نہ سہی

فدا ہو تاب بشارت مری بصیرت پر
نظر نے جن تو لیا طاقت نظر نہ سہی

کعبہ نہیں ہوا کہ کلیسا نہیں ہوا
دل آپ کے طفیل میں کیا کیا نہیں ہوا

اف وہ قمار خانہ روز ازل کی دھوم
جیتے ہیں وہاں، مگر اچھا نہیں ہوا

اس کی شگفتگی کو نئی فصل چاہئے
دل ہے وہ فتنہ جو ابھی برپا نہیں ہوا

تحلیل ہو گیا نگہ آفتاب میں
وہ ذرہ حقیر جو صحرا نہیں ہوا

خار کچھ پھول سے کم اے چمن ایجاد نہیں
کہ خلش دل کے لیے لطف ہے بیداد نہیں

نغمہ و نالہ باندازہ تاثیر اے دل
ہے ابھی خام وہ آہنگ جو فریاد نہیں

آپ کا گھر جسے انسان کا دل کہتے ہیں
کون کہتا ہے کہ آباد ہے، آباد نہیں

ہم کو کہتے ہیں جو آلودہ لذت طلبی
کیا وہ آلودہ صد لذت ایجاد نہیں

گھونگھٹ الٹو کہ تمہیں پوج کے کافر ہو جائے
دل بدبخت جو ایمان سے بھی شاد نہیں

پیچ در پیچ ہے زنجیر نظام صحرا
ایک ذرہ بھی یہاں ذرۂ آزاد نہیں

فارغ کشمکش سود و زیاں ہوں رضوی
عاشقی کیا ہے اگر گنج خداداد نہیں

دلوں کو آ کے دیکھو تو یقیں نہیں گماں ہو تم　　لبِ فسانہ ساز پر برائے داستاں ہو تم
غبار بن کے آرزو رواں دواں ہے کو بکو　　کہیں سے کچھ صدا تو دو کہاں ہو تم کہاں ہو تم
رہِ درازِ زندگی میں رہروؤں کی خیر ہو　　کہ ناقہ بد قدم ہے اور شریر ساربان ہو تم
جبیں نے کھینچ تو لیا تمہیں ضمیرِ سنگ سے　　ہجومِ سجدہ کی قسم مگر ابھی نہاں ہو تم
زبانِ گل و گیاہ کی ہے شکوہ سنج بے دلی　　یہی تمہارا باغ ہے اسی کے باغباں ہو تم

چلی بن کے اک بگولا ہجومِ گرد بیاباں سے آگے　　جو گرد تھی کارواں سے پیچھے وہ بڑھ گئی کارواں سے آگے
ہر ٹھہر شوقِ لاابالی چلا کہاں آستاں سے آگے　　یہیں ہے اک محشرِ تماشا نہ جانے کیا ہو یہاں سے آگے
دوبے اختیار ہستی خود اپنی قسمت سے بےخبر ہے　　کہ منزلِ کارواں ہے اب تک تخیلِ کارواں سے آگے
ارتی رہ گئی حقیقت پڑا رہا جستجو کا صحرا　　ٹھہر گئے ہم خدا کی مسجد بنا کے دیرِ بتاں سے آگے
کون مطلق کہاں کہ ہم نے ٹھہر کے منزل پہ بھی یہ دیکھا　　کہ گردِ آشفتگی رواں ہے حریمِ آسودگاں سے آگے

نوں کی کون سی بیتا بیاں جہاں میں نہیں　　وہ ہوک صوتِ جرس میں ہے جو اذاں میں نہیں
زل سے دل میں مشیت کے چبھ رہا ہوگا　　وہ راز جو ابھی تقدیرِ رازداں میں نہیں
عجب نہیں کہ وہی اک ہو مردِ راہ شناس　　ابھی جو راہروِ گم گشتہ کارواں میں نہیں
ہمارے خوف کی خلاقیاں خدا کی پناہ　　وہ بجلیاں ہیں نظر میں جو آسماں میں نہیں
لکھا ہوا انہی ذرات کے صحیفوں میں　　مرا فسانہ ہے لیکن مری زباں میں نہیں

وچھ مجھ سے کہ کیا ہوا رہِ جستجوئے دراز میں　　دلِ پاش پاش کو دیکھ لے جو پڑا ہے کوئے نیاز میں
ر ستوں کی بھی چھیڑ سے ترا شکوہ لب پہ نہ آ سکا　　کہ بہت رچی ہوئی گونج ہے یہ سکوتِ سینۂ ساز میں
گئی پسِ دشت و در ہمہ گیر و محکم و مستتر　　وہ خود آگہی جو تڑپ رہی تھی حریمِ نازو نیاز میں
لوہ ڈھال بھی ساقیا تجھے فکرِ شیشہ نہیں روا　　کہ ہے جان شیشہ لگی ہوئی اسی آبِ شیشہ گداز میں
سانۂ سرِ رہگذر سرِ حشر مجھ سے نہ پوچھئے　　جو گزر گئی سو گزر گئی خم و پیچ راہِ مجاز میں
نقلاب مگر ہے پھر بہ نصیبِ کوچۂ عاشقاں　　کہ میں پڑھ رہا ہوں نئے فسوں تری چشمِ فتنہ طراز میں
ود سے ہے لطیف تر کہیں گم نہ ہو وہ شہود میں　　کہ مشاہدوں سے ہے رنگ ابھی نگہِ مشاہدہ باز میں
نے چند بچ گئے وہ بنے ہیں فتنۂ آرزو　　جو پگھل گئے سو پگھل گئے نگہِ کرشمہ گداز میں

گھرا ہی طوفاں کی زد میں حرم و دیر و کنشت
ان مزاروں پہ تو مدت سے چراغاں بھی نہیں

کس نے اس انجمنِ شوق کو تاراج کیا
دل گزرگاہِ خیالاتِ پریشاں بھی نہیں

جلوہ آبادِ تصور یہ ادا کاریٔ شوق
اب تو مرہونِ فسوں سازیٔ جاناں بھی نہیں

کائنات اپنی ہمیں دے کے بھی فارغ نہیں آپ
ہم تو کچھ مدعیٔ وسعتِ داماں بھی نہیں

کب سے میخانے میں رضوی نہیں آیا ہے نظر
اس خزاں دوست کو کچھ شرمِ بہاراں بھی نہیں

زہد کی آستین ٹٹول، دیکھ کہاں صنم نہیں
سنگِ سیاہ تا گزیر، ورنہ حرم حرم نہیں

محنتِ شوق و خودسری شیوۂ سعیٔ ناتمام
مجھ پہ کرم نہ کر کہ میں گدیہ گرِ کرم نہیں

گم بھی تو ہو کہ جستجو لطفِ حیات بن سکے
اہلِ طلب وہ راہ کیا جس میں کہ پیچ و خم نہیں

وجہِ گناہ و کفر و شر وجہِ خرابیٔ نظر
تم کو گماں کہ تم نہیں ہم کو یقیں کہ ہم نہیں

شانۂ فکرِ خردہ گیر! حسن کی یوں رگیں نہ توڑ
تجھ میں مزاج دانیٔ گیسوئے خم بہ خم نہیں

فتنے جگا کے دہر میں آگ لگا کے شہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

حدیں پھیلیں نظر کی پھر بھی کم بینی نہیں جاتی
کہ ہر صورت ابھی اک آنکھ سے دیکھی نہیں جاتی

زمینِ دل بہت کچھ نرم کر دی بے قراری نے
مگر "ہم ہیں" اسی احساس کی سختی نہیں جاتی

حیاتِ جامہ زیب اور نو بہ نو جامے مگر کیا ہے؟
کہ اس برباد ساماں کی تنک رختی نہیں جاتی

مرا ذکرِ وفا لکھ کر مورخ یہ بھی لکھتا ہے
یہ اک رسمِ کہن تھی اب کہیں برتی نہیں جاتی

میں کیا منہ لے کے آؤں آپ کے آئینہ خانے میں
یہ صورت ایسی بگڑی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

تصور سے بھی آگے جستجو کی راہ جاتی ہے
وہاں کی بات لیکن پھر یہاں لائی نہیں جاتی

ہیں یہ اُس در کا پیار بھی ہے، مگر یہ اس گھر کا بار بھی ہے
ادھر کے چکتے نہیں تقاضے، اُدھر سے پیہم پکار بھی ہے

لا کے پی تھی مئے جوانی غضب تھا شیریں وہ شورہ بانی
اسی کا دو دن سرور بھی تھا، اسی کا اب تک خمار بھی ہے

راہِ دور و دراز مجھ کو دکھاتی لائی یہی تماشا
قدم قدم اجتماع بھی ہے نفس نفس انتشار بھی ہے

رے ان کے بس اک محبت خدائی کیا بندگی کہاں کی
بہت ہی نازک ہے گو یہ رشتہ مگر یہی استوار بھی ہے

سوزنِ فکر جس نے اک دن یہ رختِ تہذیب سی دیا تھا
اسی کی کاوش سے آج دیکھو یہ پیرہن تار تار بھی ہے

با فقط باؤلی نگاہیں، ظہور خود ہے خرامِ مستی
سکونِ محمل نشیں کا دشمن یہ ناقۂ بے مہار بھی ہے

رخانے میں مہر و مہ کے بہت بھیانک ہے نقشِ آدم
بلا کا سرکش، ازل کا باغی، مگر یہی شاہکار بھی ہے

دلِ محرم کا دکھ اس چشمِ نامحرم سے پہچانا
یہیں سے بات جب پھوٹی تو اک عالم نے پہچانا

انھیں ہونا تھا رسوا ہو چکے تا حدِّ رسوائی
نہ اُس عالم نے پہچانا نہ اِس عالم نے پہچانا

نگاہِ مہر یکساں سب پہ تھی مبہم سا تیور تھا
یہ ذرے دیکھتے ہی رہ گئے، شبنم نے پہچانا

دلِ آدم ہی اک سرچشمۂ رحمت ہے عالم میں
یہ رازِ آسودگی بھولی ہوئی تھی غم نے پہچانا

یہ کبر و ناز اب کیا جب سرِ بازار تم نکلے
مگر ہاں یہ کہو بہتوں نے دیکھا کم نے پہچانا

ملک محوِ تجلی، مطمئن رمزِ تجلی تھا
کہ یہ مٹی کا پتلا اُٹھ کے بولا "ہم نے پہچانا"

تجھے کس کس طرح اے نقطۂ مایوسیِ بینش
دلِ بیتاب کی بیتابیٔ پیہم نے پہچانا

تری غیرت کو آخر کیا ہوا اے نازِ خود بینی
ہے اک غوغا کہ تجھ کو عقلِ نامحرم نے پہچانا

اب اس آئینے سے آئینے روشن ہوتے جاتے ہیں
تمھیں جب دل نے پہچانا تو اک عالم نے پہچانا

...ا جو بیگانۂ طپش ہے وہ رہ شناسِ اثر بھی ہوگی؟
شجر سے جو شاخ کٹ چکی ہے وہ کیا کبھی بارور بھی ہوگی

...کال نہیں ہے اب تک تری تجلی ہے اور غیرت
وہ پردہ پوشِ چمن رہی ہے وہ پردہ دارِ نظر بھی ہوگی

...لرتِ آرزو ہے ادھر بھی تم اس پہ کرتے ہو کیا بھروسا
تمہارے جلوے کی جو امیں ہے وہی نظر پردہ در بھی ہوگی

...نظر نیستی سے باہر نکل چکی وہ نئی تجلی
یقیں مانو کہ اک نہ اک دن نصیبِ شمس و قمر بھی ہوگی

...رکریں مجھ سے اہلِ خلوت کہ میں اب اک شعلۂ نوا ہوں
جو تو چراغِ حرم ہے اب تک وہ مشعلِ رہ گزر بھی ہوگی

...تقامات ہیں سفر کے انھیں کوئی کیا بدل سکے گا
جسے پہنچنا ہے ان کے در تک وہ آرزو دربدر بھی ہوگی

...رشۂ سوزِ پاک جاناں دلوں کی پونجی بھی بن سکے گا؟
ازل سے جو رائگاں ہے اب تک وہ ضربِ غم کارگر بھی ہوگی

...ایزداں جمال ہوتا تجلّیِ لازوال ہوتا
بہت ہی دشوار یہ مہم ہے مگر کسی روز سر بھی ہوگی

...میں کچھ نرم و گرم رضوی ہمارے دل پر چمک رہی ہیں
ابھی تو گویا سحر ہوئی ہے چڑھے گا دن، دوپہر بھی ہوگی

خرد کو خانۂ دل کا نگہباں کر دیا ہم نے
یہ گھر آباد ہوتا اس کو ویراں کر دیا ہم نے

گھٹے جاتے تھے تم مینائے قلبِ اہلِ خلوت میں
تمھیں جامِ کفِ صحرا نشیناں کر دیا ہم نے

انیسِ خواجگاں تم تھے، جلیسِ خاصگاں تم تھے
مگر تم کو نصیبِ کم نصیباں کر دیا ہم نے

حریمِ ناز سے تم کو چرا لانے کے مجرم ہیں
یہ صحرا تھا اسے بھی کوئے جاناں کر دیا ہم نے

زمیں خاکستر، یک شعلہ و یم آبِ یک گریہ
یہی وہ آب و گِل ہے جس کو انساں کر دیا ہم نے
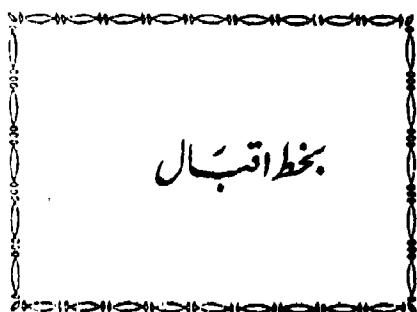
بخط اقبال

اقبال کی تحریریں بعض دوسرے اکابر کی تحریروں کی طرح جب مدوّن کرکے پیش
کی جاتی ہیں تو کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ عجلت یا خط واضح نہ ہونے کے سبب یا پڑھنے
میں (پوری طرح) نہ آنے کے باعث کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ اقبال بخطِ اقبال کی پیشکش کا یہی
مقصد ہے کہ ہر اسکالر براہِ راست اصل تک پہنچ کے خود دیکھ سکے کیا چیز کیا ہے۔ پہلی تحریر
مشہور محقق اور ہمارے کرم فرما ایرج افشار کا تحفہ ہے۔ یہ محمود افشار کی کتاب "گفتار ادبی" جلد دوم ص۶۱۲
پر موجود ہے۔ دوسری تحریر پاکستان کے درجۂ اول کے پرچے طلوعِ افکار سے ماخوذ ہے اور تیسری
کتاب نمامت۔ آخر الذکر کی اصل خدا بخش میں محفوظ ہے ——————— • ادارہ

دکتر محمد اقبال لاهوری

ر سال ۱۳۱۴ هـ ش (۱۹۳۶م) که به بمبئی و (اگره) رفته
 قصد رفتن به لاهور نیز داشتم کـه دکتر محمد اقبال لاهوری
 فارسی زبان هندی را که در آنجا سکونت داشت به بینم، ولی
 نشدم. بوسیله دکترمحمد اسحاق استادزبان فارسی‌دانشگاه
ه کتبـاً بهم معرفی شده بـودیم. نامـه‌ای با انگلیسی بـمن
ته، دعوتم کرده وکتاب (پیام مشرق) حاوی اشعار خودرا برای
فرستاده بود. با اظهار تشکر اشعار زیر راگفتم و فرستادم،
 نامه او که بخط خودش میباشد، بواسطه شخصیت مهم ادبی،
اعی و سیاسی وی کلیشه میشود. تعجب نکنید که به‌انگلیسی
ته با اینکه به‌فارسی شعر میگفته است. نامـه‌های پرفسور
اق هم تمام به‌انگلیسی میباشد. عجب‌تر آنکه پرفسور براون
یسی با من به‌فارسی مکاتبـه میکرد. یك نامه او هم بـرای
ظه خط و انشای‌فارسی وی کلیشه میشود. اسحاق و اقبال،
 هنـدی و دیگری پاکستانـی، از کشورهـای «استعمارزده»
شند وبراون از يك‌کشور آزاد. اینست نشانه‌آزادی واسارت.
شه داشتم چو ز هندوستان روم
سوغاتی سفر چه بر دوستان برم
ال) روی کرد و فراز آمد از درم
گلهای نوظهور که زی بوستان برم.
سرا شوند همه بلبلان پارس
زین نغز چامه‌ها که ز هندوستان برم.

ترجمه نامه دکتر محمد اقبال پاکستانی

ریه ۳۶

دکتر افشار عزیزم

هم‌اکنون نامه‌ای از آقای اسحاق از کلکته دریافت کردم مشعر
نکه شما برای گردش هندوستان در بمبئی هستید. بـرای
ه‌جوئی در وقت بجای اینکه توسط ایشان به شما بنـویسم،
 میخواهم که مستقیماً این نامه را بنویسم. لازم بـه‌گفتن

نیست که من مسرور از ملاقات شما خواهم بود وقتی که از لاهور میگذرید. خواهشمندم بمن اطلاع دهید کی خواهید آمـد. نظر باینکه من بزودی بایدبه (بهپال) بروم خیلی مایل هستم‌که تاریخ تقریبی مسافرت شما را به‌لاهور بدانم.

مخلص صمیمی شما محمد اقبال

Sir Mohd Iqbal, Kt
M.A., Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lah[ore]

Dated

24th Jan. 1936

Dr. Afschar,

I have just received a letter from M. Ishaque Calcutta intimating that you are in Bombay on a visit to India. Instead of writing to you through him I take the liberty of doing so direct in order to save time. It is hardly necessary for me to say that I shall be delighted to meet you when you pass through Lahore. Please do let me know when you will be coming. As I shall have to go to Bhopal soon I should like very much to know the exact date of your visit to Lahore.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

(بشکریہ ایرج افشار، تہران)

تنہائی

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابی - همیشه در طلب استی چه مشکلی داری؟
هزار لولوی لالاست در گریبانت - درون سینه چو من گوهر دلی داری؟
تپید و از لب ساحل رمید و هیچ نگفت

به کوه رفتم و پرسیدم این چه بیدردیست - رسد به گوش تو آه و فغان غمزده؟
اگر به سنگ تو لعلی ز قطره خون است - یکی در آ به سخن با من ستم زده
به خود خزید و نفس در کشید و هیچ نگفت

ره دراز بریدم ز ماه پرسیدم - سفر نصیب! نصیب تو منزلی است که نیست؟
جهان ز پرتو سیمای تو سمن زار است - فروغ داغ تو از جلوهٔ دلی است که نیست؟
سوی ستاره رقیبانه دید و هیچ نگفت

شدم به حضرت یزدان گذشتم از مه و مهر - که در جهان تو یک ذره آشنایم نیست
جهان تهی ز دل و مشت خاک من همه دل - چمن خوش است ولی در خور نوایم نیست
تبسمی به لب او رسید و هیچ نگفت

محمد اقبال

طلوع افکار (نومبر ۱۹۹۰ء) کے شکریہ کے ساتھ

ابوالکلام آزاد

○

اقبال کی طرح آزاد بھی ہماری متاعِ گراں بہا ہیں۔ آزاد کے یہ خطوط حال ہی م
خدا بخش کے ذخیرہ میں اضافہ ہوئے ہیں۔ پہلے ملک زکریا بھاگلپوری صاحب نے محمود
صاحب کو دیئے، انھوں نے کسی اور کو، کسی اور نے کسی اور کو، اور بالآخر وہاب اشرفی
نے بکمال عنایت خدا بخش کو! محمود واجد صاحب اور وہاب اشرفی صاحب نے ان خا
مکتوب نگار کا سیر حاصل تعارف کرایا ہے۔ محمود صاحب نے مزید ایک تحفہ ذکریا جا
کے مقررہ درس قرآن کے نوٹس بھی عنایت کیے ہیں جو ترجمان القرآن کے نقش اول کے ط
دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ یہ خطوط ہمارے کرم فرما ابو سلمان شاہجہاں پوری نے کراچی
شائع کردیے ہیں۔ اس ترتیب کا ابتدائی مسودہ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء کے عرصہ میں تیار ہ
مراحل سے گذرا۔ اس کے بعض حصے ہندو پاک کے چند ادبی رسائل میں بھی آئے اور اب تیس
سال بعد مکمل شکل میں شائع ہونے کی نوبت آئی ہے۔ ہمارے ایڈیشن میں کچھ تعارف نا
کی بیشی کے ساتھ ایک اہم اضافہ یہ کردیا گیا ہے کہ اصل خط بھی عکسا پیش کردیے گئے

ادا—

تقدیمِ اوّل

محمود واجد

یہ خطوط زیادہ تر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیانی وقفہ کے ہیں۔ چند خطوط اس کے بعد کے ہیں مگر ان کی حیثیت ویسی
تاریخی نہیں جیسی اس محدود وقت کی جس میں نے ان خطوط کی مدد سے متعین کیا ہے۔ تاریخ کے ساتھ سال سبھی خطوط
میں درج نہیں۔ اس لیے سلسلہ وار ان کی ترتیب ممکن نہ تھی مگر لفافہ پر ڈاک کی مہر سے کہیں کہیں تاریخیں ملیں اور
کہیں ایک آدھ تفصیل اور اس سلسلہ کی ہار رنگا جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط سنسر کی تاریخ وغیرہ۔ لیجیے جو کچھ ہے
حاضر ہے۔ مسٹر صاحب کے قول کے مطابق خطوط کا ایک ذخیرہ مسٹر احمد محمد نور سابق وزیر حکومت بہار مطالعہ کے لیے لے گئے مگر واپس نہیں کیا

تقدیم ثانی

پروفیسر وہاب اشرفی
شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی، رانچی

اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مکاتیب کا مطالعہ مقصود ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ وہ خطوط ہیں جو مولانا آزاد نے رانچی سے اپنی نظربندی کے زمانے میں مولوی محمد ابراہیم زکریا متوطن بھاگلپور کے نام لکھے ہیں۔ یہ تعداد میں ۲۴ ہیں۔ ۱۹ خطوط ملفوف بھیجے گئے ہیں اور ۵ پوسٹ کارڈ ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ان سے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے' ان کی دردمندی اور دلسوزی' غریب پروری' نکتہ سنجی' علمی و دینی شغف' اور اس معاملے میں کچھ کر گذرنے کی حکمت عملی' تدبر اور متین فکر' یہ سارے امور رانچی اور اس کے نواح سے متعلق مولانا کی مختلف علمی و دینی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے سے سامنے آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی محمد زکریا کو مولانا آزاد بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی علمی حیثیت سے آگاہ تھے۔ ان کی تنگ دستی سے ملول اور ان کی خدمت کرنے اور ان سے خدمت لینے کے باب میں خاصے متفکر تھے۔ مولانا' مولوی زکریا کے نام ایک خط میں چھوٹا ناگپور خصوصاً رانچی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"... چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم' چونکہ ایک گوشے میں واقع ہے۔ اس لیے علما کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کردی۔ اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی' دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا' نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ... غیر مترقبہ زندگی پیدا ہوگئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا' اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ آئندہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطے کی دینی پیشوائی و ریاست اسی کے ہاتھ میں رہے گی اور بالاطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماء سو کی کثرت اور دواعیۂ فساد و جہل کی مقاومت سے ہدایت و اصلاح کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا' یہاں

یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جائے اور جیسی بنائی جا سکتی ہے۔

"پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت غیرے۔"

واضح رہے کہ مولانا آزاد کی نظر مولوی محمد زکریا پر تھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے طیار ہو جائیں۔ آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے" بہر طور اہالیان رانچی اور نواح کی تعلیم و تربیت کے تحت مولانا نے ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد ڈالی اور اس جدوجہد میں البلاغ پریس کی تمام رقم صرف کر دی۔ مولانا نے اسی انجمن کے ذریعہ بہت کچھ کرنا چاہا تھا۔ ایک مثالی مدرسے کا قیام وقت کی ضرورت تھی ان کے پیش نظر ایک غیر معمولی نصاب کا خاکہ بھی تھا مولانا کیا سوچ رہے تھے دیکھیے:

"اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلۂ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہ سال بنیاد ڈالی اور مدرسے کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج عرصہ سے اصلاح نصاب کا مسئلہ مصر و ہند میں درپیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا۔ اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔"

مولانا آزاد سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اصلاح نصاب کے سلسلے میں ڈائرکٹر تعلیم بنگال نے رجوع کیا تھا۔ مولانا نے ایک جامع نصاب مرتب کیا تھا اس کی تفصیل وہ یوں درج کرتے ہیں:

"مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینیر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم چندرہ سال ہے پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے۔ اسمیں صرف و نحو عربی بالکل ختم، ادب شروع، فارسی مکمل ختم، حساب و ہندسہ ختم، ترجمۃ القرآن کامل، تاریخ ہند، تاریخ اسلام، ... اور انگریزی ادب ہے، دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب بہ نہج و اسلوب قدما، علوم القرآن، علوم حدیث، فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول توحید، علم اسرار الدین، علم اخلاق، تاریخ اسلام، تاریخ علوم عربیہ، تاریخ مذاہب طوائف اسلامیہ، معقولات قدیم ... اور انگریزی علم ادب ہے۔ اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی کا ہے۔"

مولانا اس نصاب کو صرف رانچی یا کلکتے کے مدرسے میں رائج نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے سامنے پورا ہندستان اور مسلمان معاشرہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ ایسا نصاب مرتب ہو کر تمام علاقے میں مقبول ہو جائے، وہ اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں: "اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلۂ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی کا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے"۔ افسوس اس کا ہے کہ مولانا کی قائم کردہ انجمن اور مدرسہ اسلامیہ زندہ تو ہیں

لیکن آب وتاب سے خالی' ان کے نام پر انجمن ہی کی عمارت میں ایک کالج بھی ہے لیکن بے روح۔ مولانا کا مرتب کردہ نصاب موصوف کے خط کی زینت ہے اور بس! انجمن کے قیام کے بعد مولانا ایک وسیع پیمانے کی کانفرنس بھی کرنا چاہتے تھے جس کے لیے اشتہارات' دعوت نامے' پوسٹرس بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تیار کیے تھے۔ اس ضمن میں ان کی بھاگ دوڑ' محنت اور کاوش کا اندازہ لگائیے۔ زکریا صاحب کو لکھتے ہیں:

"۱۔ جلسہ کے دعوتی خطوط اردو' انگریزی کارڈ' چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔ ۲۔ بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ۔ اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے... پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں' ۳۔ اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹرایٹ لا سے ملیے... بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے... ۴۔ وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں' نیز مظفر پور اور مونگیر وغیرہ۔ مظفر پور میں مولوی ریاض احسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی ۵۔ ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ انگریزی و عربی ہے اور آخری درجہ تعلیم تکمیل نصاب علوم دین پر مبنی ہے... یہ اجتماع صوبہ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع ہے اور ستم ہے اگر خود اسی صوبے کے علماء و اصحاب رائے اس میں حصہ نہ لیں... اس جلسے میں صوبہ بہار کے واعظین و مقررین کی خاص ضرورت ہے' یہ جلسہ تین دن تک ہوگا..."

گویا اپنی تعلیمی اسکیم کے نفاذ سے پہلے مولانا آزاد اپنے موقف کو بہار کے ذی علم حلقوں پر واضح کرنا چاہتے تھے اور ان کی رائے جاننے کے لیے بے تاب تھے: ان کی خواہش تھی کہ خواص ان کے مرتب کردہ نظام نصاب پر تنقید و تبصرہ کریں تاکہ ان کی روشنی میں وہ ایک واضح تعلیمی مشن پورے ہی صوبے میں رائج کر سکیں' یہ کانفرنس تو ضرور منعقد ہوئی ہوگی لیکن اس کے نتائج کیا نکلے؟ کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا قدیم اہالیان رانچی متعلقہ کانفرنس کے بارے میں کوئی روشنی نہیں دیتے اس ضمن میں میری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ بہرطور یہ تو وہ باتیں ہیں جن کا تعلق مولانا کے اسی خواب سے ہے جو انھوں نے چھوٹا ناگپور کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے بارے میں دیکھا تھا' یہ تو سچ ہے کہ ان کا خواب کلی طور پر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ لیکن رانچی میں آج بھی جتنی کچھ ملی سرگرمیاں ہیں دراصل ان کی بنیاد کی عقبی زمین میں مولانا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

خیر یہ تو وہ امور ہیں جن کا تعلق چھوٹا ناگپور یا رانچی سے ہے، مولوی زکریا صاحب کے نام دوسرے خطوط میں چند اور بھی پہلو ہیں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں، ایک خط میں مولانا نے علما یا ذی علم افراد کے عمومی شغف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"... آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل و طرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے، علمائے اسلام کے حالات پڑھیے، درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تصنیف و تالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمت انجام دیتی تھی، عوام کی اصلاح، وعظ و تذکیر، مستقبل کے لیے طیاری، درس و تدریس سے اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے۔ ابن جوزی مصنف، مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسۂ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ۔ علمائے اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو..."

بعض لوگ بعض شہروں یا مقاموں کے بارے میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ بنجر ہیں، لائبریریوں اور کتابوں کے فقدان کا رونا بار بار رویا جاتا ہے، اس طرح گویا وہ بہانہ جوئی سے کام لے کر تساہل کا شکار ہو جاتے ہیں اور تصنیف و تالیف کی طرف سے منھ موڑ لیتے ہیں، مولانا آزاد کے سامنے یہ عذر بے سود ثابت ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آخری چیز مشغلۂ تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری بھی ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے بجنور (کذا) اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں، ہندستان میں اسباب و سامان کا بطرز یورپ کہاں سامان ہے؟"

حالانکہ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ علمی و ادبی کاموں کے لیے بعض جگہیں بعض جگہوں پر فوقیت رکھتی ہیں مثلاً یہ کہ اردو، عربی و فارسی کے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے رانچی سے بہتر جگہ عظیم آباد ہوگی، پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ رانچی کے لوگ محض اس بنا پر تصنیف و تالیف سے باز آجائیں گے، مولانا کا مقصود یہ ہے کہ تمام تر نامساعد حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ کام کرنے کی لگن ہو ورنہ تن آسانی تو بہانے ڈھونڈھنے پر اصرار کرتی ہی ہے۔

بہرحال مولوی زکریا کے نام کچھ ایسے بھی خطوط ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض نکات معلومات عامہ کے سلسلے میں مولانا سے رجوع کرتے تھے، ایک خط میں جواباً وہ نکتہ وار اس طرح لکھتے ہیں:

"۱۔ اکبر کا اَن پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے، کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے، اس کی فطری ذہانت اور ترقی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود اَن پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔"

۲۔ جنوبی اور وسط امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں اس کا تعلق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے ... نہیں کہا جاسکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو... دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے کہ... امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض قیاسی ہے...

۳۔ ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔"

۴۔ مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دینا ہے۔"

ان چار جوابات میں تین کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن چوتھا جواب مذہب کے مقصد سے متعلق ہے۔ مولانا نے چند لفظوں میں مذہب کی غایت سمجھا دی ہے، مذہب افتراق کا نام نہیں ہے، نہ ہی افراد کو ٹولیوں میں تقسیم کرنا اس کا مدعا ہے، افراد انسانی کو باہمدگر متحد کرنا اس کا مقصود اعظم ہے۔ یہ وہ تصور ہے جس نے مولانا کو ہمیشہ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے دور رکھا اور نئے ہندستان میں قومی اتحاد کی مشعل کو بلند کرنے میں ان کا جو رول رہا ہے وہ ان کے تصور مقصدِ مذہب پر دالّ ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ مولانا کے تمام غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کراؤں خصوصاً جن سے مولوی ذکریا سے ان کے بے پایاں خلوص کا پتہ ملتا ہے اکثر خطوط میں ان کی دل دہی کی گئی ہے، مختلف طریقوں سے ان کی اعانت کا حال معلوم ہوتا ہے خصوصاً ان کی علالت کے دنوں مولانا کی پریشانی، علاج کے لیے پیسے فراہم کرنا۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں کہ سارے خطوط یا ان کے اقتباس درج کیے جائیں ہاں ایک قدرے تفصیلی خط توجہ طلب ہے کہ اس سے مولوی ذکریا کی غیر معمولی نفسی کیفیت کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور اسی تعلق سے مولانا آزاد کے دل کے نہاں خانے میں بھی جھانکا جا سکتا ہے مسئلہ ذکریا صاحب کے بوڑھاپے کے عشق کا ہے، اس وقت جب ان کی شریک حیات بہ قید حیات ہیں اولاد کی کثرت ہے اور مفلسی دامن گیر ہے۔ ذکریا صاحب بڑی معصومیت اور صفائی سے اپنے ہمدرد اور رازداں مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے دل کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں اور عقد ثانی کے بارے میں مشورہ کے طالب ہیں مولانا کا جواب نہایت دلچسپ، مدلل ہے اور خود ان کی ازدواجی زندگی کا آئینہ ہے اس لیے انتہائی اہم اور قیمتی ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا کیا اور کس طرح جواب دیتے ہیں: "پس اصل و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے.. اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور انشاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عنداللہ۔ غور کیجیے متاہل ہیں مجرد نہیں، پھر صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کی

باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و معیشت کی بے سروسامانی دوسری طرف عوائم و معالی امور و عمل کا ولولہ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پا یا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلا شبہ ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے اس کے بعد قدرتی کشاکش و کشمکش مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہو گا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے' ابھی ایک لمحہ کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سود مند نہ ہو گا سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے' وہ ایک معصوم لڑکی ہے' دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر کیا یہ بہتر ہو گا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے' جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو کوئی شکایت نہیں کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے۔

"میری شادی کو دس سال ہو گئے یقین کیجیے میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا' بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا' پھر ساتھ ہی دونوں کی جانب سے اس کے بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔"

صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔

"آپ کہیں گے دل کسی کے بس میں نہیں؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے . . . (۲) لیکن اگر ضعف عزم ساتھ نہ دے . . . اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے . . . یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہو گی۔"

کیا اب اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے کی تحلیل کی جائے؟ ہاں اسی خط کی روشنی میں مولانا کی اپنی زندگی کے بارے میں بہت سارے نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

●●

(۱)

(۱۹۱۵ء کلکتہ)[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یہ آپ نے بہرحال اچھا کیا کہ بارکپور کے تعلق سے دست بردار ہو گئے۔ حالاتِ معلومہ کے ساتھ وہاں کا قیام بے سود تھا۔ اب آپ چند دنوں توقف کیجیے کہ میں مطمئن ہو کر اپنے کاموں سے فارغ ہوں اور اس معاملہ کو مجھ پر چھوڑ دیجیے میں بوقت مناسب آپ کو بلا لوں گا۔

فقیر ابوالکلام

۲، شوال

جواب کے لیے جوابی خطوط کی ضرورت نہیں۔ آئندہ اس سے احتراز کیجیے۔

۱۔ ڈاک کی مہر سے سن اور جگہ کا تعین کیا گیا (م۔ د)

۲

۱۹۱۵ء کلکتہ

السلام علیکم ونفعنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

افسوس ہے کہ آپ آئے اور ملاقات نہیں ہوئی جہاں تک فقیر کو یاد ہے اس اثنا میں آپ کے آنے کی بالکل اطلاع نہیں ملی غالباً عدم موجودگی میں آپ آئے ہوں گے۔

دارالارشاد کا افتتاح بوجوہ ابتک معرض تاخیر میں ہے اور نظر بہ حالات غالباً بعد رمضان سلسلۂ درس شروع ہو سکے۔

آپ کے متعلق فقیر نے غور کیا ہے چاہتا ہوں کہ کوئی صورت کلکتہ میں قیام کی پیدا ہو لیکن میرا حال یہ ہے کہ ایک فکر و دماغ اور صدہا معاملات سامنے ہیں بہر حال جب طلب صادق اور فکر مستقیم ہے تو امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ سر دست تو چندے وہاں قیام ناگزیر ہے تا آنکہ یہاں کوئی صورت قرار پائے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

۳

عزیزی السلام علیکم

خط پہنچا اللہ تعالیٰ پریشانیوں سے نجات دے اور طمانیۂ خاطری کا سامان مہیا فرمائے۔ جو کچھ میرے امکان میں ہے اس کے لیے کسی یاددہانی کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ جونہی کوئی مناسب موقع ملے گا آپ کو اطلاع دوں گا۔ بالفعل صورت حال ایسی نہیں ہے کہ آپ کو آنے کے لیے لکھوں۔ فقیر ابوالکلام کلکتہ

۴

۲۶ ۱۲ ۳۲ء دہلی

عزیزی خط پہنچا۔ ترجمان القرآن کے لیے مینیجر صاحب کو کہہ دیا ہے۔ غالباً مل گیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فہم و مطالعہ قرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ضرور آپ کے لیے کوئی راہ نکالتا بشرطیکہ بحالت موجودہ اس کی صورتیں موجود ہوتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل کوئی ایسا کام میرے ہاتھ میں نہیں۔ اگر آپ کو بلاؤں تو کون سا کام سپرد کروں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا سامان کر دیا کہ آپکے لیے موزوں صورت نکل سکی تو یقین رکھیے میری جانب سے کوتاہی نہ ہوگی۔ والسلام علیکم ابوالکلام

۵

عزیزی بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ آرڈر کی تعمیل کی گنجائش ہے۔ کتاب اسی لیے چھپی ہے کہ جو خواہشمند

ہوں منگوائیں۔ کتاب مینیجر دفتر ترجمان القرآن نمبر۱ دریا گنج دہلی سے مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور کرے اور بہتر سروسامان فراہم فرمائے۔ والسلام علیکم۔ فقیر ابوالکلام ۵ ۴۴ء دہلی

(۶)

عزیزی السلام علیکم و صبحکم اللہ بالخیر

کل میں رکھشا کے لیے کہنا بھول گیا۔ یا تو خود یا بذریعہ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے کہ آج رکھشا ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے۔ ابوالکلام

(۷)

عزیزی اپنے رقعہ میں جس امر کی نسبت لکھا ہے دراصل اس کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج شام کو حاجی رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی۔ انشاء اللہ کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائے گا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا وہ آپ کی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدر دان ہیں۔ اصل معاملہ سے وہ بے خبر تھے اس لیے ان کو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی قاسم صاحب وطن میں تھے۔ ان کا نام بل میں دیکھ کر وہ اصل حقیقت نہ سمجھ سکے۔

قطع نظر اس کے آپ کا تعلق تو مجھ سے ہے پس آپ کو اس قسم کے امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے۔

افسوس کہ اسوقت مسجد سے آتے ہی میرے سر میں کل کی طرح سخت درد شروع ہو گیا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور جلد نماز عشاء سے فارغ ہو کر سو جاؤں۔ آپ کا سبق انشاء اللہ کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو اس طرح آئندہ ناغہ ہونے نہ دوں گا۔

(۸)

باسمہ تعالیٰ صدیقی العزیز السلام علیکم

تبریک عید کے لیے ممنون ہوں۔ آپ سے غافل نہیں۔ کئی کوششیں کی ہیں۔ اللہ نتیجہ خیز ثابت کرے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا میں خود بھی ممبر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ وہاں کوئی کام نہیں۔ سہروردی کو لکھنا بے سود ہے

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ رانچی ۸ شوال ۳۴ھ

(۹)

باسمہ تعالیٰ عزیزی و صدیقی السلام علیکم

آپ کے لیے ایک صورت نکلی ہے۔ کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اس میں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم

کے لیے میں روپیہ کی ایک جگہ ہے وہ آج کل خالی ہے میں نے سکریٹری کو کہ کر آپ کے لیے گنجائش نکالی ہے
اور بیس کی جگہ پچیس منظور کرایا ہے۔ مکان بھی رہنے کو مفت ملے گا۔ بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ
سکتے ہیں۔ اگرچہ اس جگہ کے لیے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجھ کو ایسا یاد پڑتا ہے کہ آپ نے انگریزی بھی پڑھی
ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا منتظمین یتیم خانہ نئی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور حنفیت کے عاشق سابق مہتمم
کو اس جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام کے مخالف تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی طریق میں
بیعت کردہ ہیں۔ بس ان جزئیات کا خیال رہے۔ آپ فوراً بھاگلپور سے روانہ ہو کر سیدھے کلکتہ پہنچیں اور مرزا احمد علی
سکریٹری یتیم خانہ کمیٹی نمبر ۳ ویسٹ پور روڈ سے جا کر ملیں اور میرا خط دکھلائیں۔
بحالت موجودہ یہ جگہ غنیمت ہے اسے منظور کر لیجیے اس کے بعد انشاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا
ہو اور تمام امور عمل میں آئیں۔ والامر بیدہ سبحانہ و تعالیٰ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ رانچی بہار ۲۲ ذیقعدہ ۳۴ھ

(۱۰)

ڈاک بنگلہ۔ رانچی ۷ اپریل ۱۹۱۵ء ۷۸۶

برادرم السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے ابھی کچھ دنوں رہنے گیا جانے کا قصد ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت آپکے شامل حال رہے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

(۱۱)

رانچی ۱۹۱۹ء

السلام علیکم

افسوس کہ آج شام کو بھی آپ حضرات سے ملاقات نہ ہو سکیگی شام کو ٹیگور نے کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ مجبوراً وہیں رہونگا
اس لیے آپ حضرات آج زحمت نہ فرمائیں اور دلشاد کو کھانے کیلیے بھیج دیں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔ ابوالکلام

(۱۲)

باسمہ تعالیٰ عزیزی الاجل السلام علیکم

تاخیر اسلیے ہوئی کہ کلکتہ سے جواب کا انتظار تھا۔ آپ کی علالت کا حال پڑھ کر نہایت قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم
فرمائے اور اس کے سوا چارہ ساز بیکساں کون ہے کہ "یجیب المضطر اذا دعاہ"
میں نے بہت کوشش کی کہ زیادہ عرصہ تک جگہ خالی رہے مگر امیدواروں کا ہجوم تھا یہ عید کے بعد وہ کوئی

انتظام کرلیں۔ بہرحال صحت مقدم ہے اور خدا کے خزانوں میں رزق کی کمی نہیں۔ انشاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا کردے گا۔ حکیم صاحب کو لکھ دیا ہے نیز دواخانہ کو لکھ دیا کہ دوا آپ کو بھیجدے اور قیمت فقیر سے وصول کرلے۔ موجودہ حالت سے مطلع کیجیے۔ خدا یار و یاور باد!

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی

(۱۳)

حبّی فی اللہ السلام علیکم

خاموشی بلاوجہ نہ تھی چاہتا تھا کہ اس موقعہ پر آپ کی پریشانیوں کے لیے کچھ نہ کچھ باعث تخفیف ہوں بعض اسباب کی بنا پر اس کی امید بھی تھی لیکن سوء اتفاق سے اب تک اسباب مطلوبہ فراہم نہ ہوئے و ماتشاؤن الا ان یشاء اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ بحمد للہ آپ کی طبیعت روبہ افاقہ ہے اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کو ضرور رانچی بلالیتا مگر جب آپ کے تمام مصالح پر غور کرتا ہوں تو سردست توقف اولیٰ انسب نظر آتا ہے پس بالفعل توقف کیجیے اور منتظر رہیے کہ آئندہ کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ شاید بہت جلد اللہ تعالیٰ بہتر صورت پیدا کردے بالفعل آپ کا یہاں آنا چنداں سودمند نہ ہوگا انشاء اللہ وقت مناسب دیکھ کر میں خود آپ کو مطلع کروں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ عرصے آپ مونگیر میں قیام کریں؟ اور آپ کے متعلقین اپنے گھر میں رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی مناسب صورت پیدا کرے؟

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۴)

۱۷-۴-۱۲ (یہ خط جیل سے چیک ہو کر بھیجا گیا ہے)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ غلطی سے پڑا رہا اور خیال یہ ہوا کہ جواب لکھ چکا ہوں۔ لیکن آج دیکھنے سے معلوم ہوا کہ غالباً جواب نہیں گیا۔ الحمد للہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہے۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اب آپ بصحت و عافیت ہیں۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی ۱۸ / اپریل ۱۷ء

(۱۵)

(نوٹ: اب طویل اور تفصیلی خطوط کا حصہ ہے ــــ ان میں ایک آدھ چھوڑ کر سبھی میں تاریخ اور مقام درج نہیں۔)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ کلکتہ کے اس تعلق کی نسبت میں نے اس لیے رائے دی کہ رانچی میں قیام کی کوئی صورت نہ تھی اور

آپ سے دریافت کیا تو آپ کے وطن و اطراف میں بھی کوئی صورت سامنے نہ آئی۔ مجبوراً خیال کیا کہ بیکاری سے بہرحال کچھ نہ کچھ معاش کی صورت کا ہو جانا بہتر ہے۔ چونکہ آپ نے بھی رضامندی ظاہر کی اسلیے میں نے مسٹر فضل دین کو لکھ دیا۔

باقی رہا ان کا مزاج، تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل طبائع کا کیا حال ہے اور پھر اختلاف طبائع ناگزیر۔ لہذا کسی کی ذاتی حالت و طبیعت سے ہمیں کیا مقصود صرف معاوضہ پر کام کر دینا ہے اور بس۔ معلوم ہے کہ دوستی و محبت کا تعلق نہیں۔

البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ صبح سے لے کر شام تک کی حاضری دفتر میں کیوں ہو؟ کام تو بظاہر کچھ بھی نہیں ہے آپ صاف صاف ان سے کہہ دیں کہ یا تو بلاقید وقت میں کام کر دوں گا یا پھر دس سے چار تک یا پانچ تک کام کروں گا۔ ان امور میں سکوت کسی طرح بہتر نہیں یہ تو معاملہ کی بات ہے ایک لمحہ میں صاف ہو جائے گی اسکو اسقدر اہمیت کیوں دی جائے

باقی رہا تنخواہ کا معاملہ تو بلاشبہ کم ہے اور اللہ اس سے زیادہ کا سامان کرے۔ لیکن سامان ہونا چاہیے۔ آپ نے کلکتہ کے میمنوں وغیرہ کی نسبت لکھا ہے میمنوں میں کون ایسا شخص ہے جن کے یہاں اس قسم کی ملازمت کی گنجائش نکل سکتی ہے ان کے یہاں تو غالباً صرف تجارتی کام ہوتا ہے۔ لہذا آپ تجسس میں رہیں اگر کوئی ایسی جگہ نظر آئے تو مجھے لکھیں۔ میں پوری سعی کروں گا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ تعلق آپ کا شخصاً مسٹر فضل دین سے ہے۔ مجھے اس خاص معاملہ کو کوئی تعلق نہیں یعنی یہ میرے کاموں میں سے نہیں ہے۔ آپ اس خیال سے اس کام کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھیں کہ میرا کام ہے۔ میں نے تو بیکاری سمجھ کر اس کو غنیمت سمجھا یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ترک کو میں پسند نہ کروں گا۔ آپ دیکھ لیں موافق طبع ہو تو کریں ورنہ بلاتامل ترک کر دیں۔ میں دونوں حالتوں میں خوش ہوں۔ یہ تمام معاملات اور امور میرے علاقہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ میرا علاقہ تو صرف اللہ کے راہ میں ہے لیکن ہاں اگر دنیوی امور میں کچھ کر سکوں شخصاً تو اس کے لیے بھی طیار ہوں۔ بہرحال میرے پیش نظر کوئی صورت اسوقت نہیں ہے آپکے سامنے ہو تو لکھیے۔ ابوالکلام

(۱۶)

عزیزی و حبی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادھر عرصہ سے مبتلائے آلام معنوی و صوری ہوں۔ علائق قلبیہ رسل و رسائل پر موقوف نہیں۔ آپ کی طرف سے نہ کبھی غفلت ہوئی ہے اور نہ اندیشہ ہو گی۔ افسوس کہ اب تک آپ کا زمانۂ ابتلا و محن ختم نہیں ہوا، اور سلسلۂ علالت جاری۔ جب بھاگلپور کے علاج سے اتنے عرصہ میں بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ جلد سے جلد سفر دہلی کا تہیہ کیا جائے۔ اس سفر کے لیے بعض ضروریات کی فراہمی ناگزیر ہوا اور جواب میں اسی لیے تاخیر ہوئی کہ ان

کی فکر در پیش تھی۔ انشاء اللہ امید ہے کہ عنقریب سامان ہو جائے گا۔ بعض اسباب سے ادھر یکے بعد دیگرے مجبوریاں پیش آتی رہیں اور بعض تازہ عادتوں نے دل کی طرح جیب کو بھی خالی رکھا۔

دوسرے خط میں آپ نے اپنے گھر کے طرز عمل کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر سخت قلق ہوا، وہذا اشد من ذاک۔ غالباً آپ کے ابتلاء و آزمائش کی تکمیل اس معاملہ پر موقوف تھی۔ جب تک الم جسمانی کے ساتھ الم قلبی مکمل طور پر جمع نہ ہو، صبر کی پوری آزمائش نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا معاملہ انسان کے لیے علائق و موثرات حیات دنیوی میں آخر ترین الم ہے اور اب یہ بھی آلام جسمانیہ کے ساتھ جمع ہو گیا۔ جب آزمائش یہاں تک پہنچ چکی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ اب اختتام کا وقت آ گیا اور انشاء اللہ آپ کا اجر صبر بھی آخری درجہ تک پہنچ کر رہے گا۔ کام جتنا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مزدوری بھی ملا کرتی ہے۔ گو یہ معاملہ نہایت ہی درد انگیز ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کچھ مزید تعیین و تفصیل کریں؟ قلب انسانی کے لیے مجرد تذکرہ و حکایت آلام میں بھی بہت بڑی تسکین رکھی گئی ہے خصوصاً جبکہ کسی غمگسار کے سامنے ہو۔

ولابد من شکوی الی ذی مروۃ یواسیک او یسلیک او یتوجع

آپ نے اپنے آنے کی نسبت بھی لکھا ہے۔ میں خود کب اس کو پسند کرتا ہوں کہ جتنا بھی آپ مجھ سے دور رہیں لیکن علاج سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے دہلی جانا لازم و الزم۔ بس اسی کا تہیہ کیجیے۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اور میں بھی انشاء اللہ بمجرد حصول ... اول حصول اس کیلیے کوشش کرونگا۔ فاللہ معکم اینما کنتم وحسبنا اللہ ونعم الوکیل ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ادھر اتفاقاً ایک ضرورت سے بعض کتب طب کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا تو گردہ کی بحث نکل آئی۔ ضعف گردہ کے جس قدر آثار و حالات لکھے ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یہ مرض بجز ضعف گردہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو شے خارج ہوتی ہے وہ گردہ کی چربی ہے۔ وہاں کے اطباء سے اس کا ذکر کیجیے۔

(۱۷)

حبی فی اللہ السلام علیکم

اللہ تعالیٰ اس عزم کو صادق و کامل فرمائے۔ آپ نے اللہ کی راہ میں محتاجوں کا انفاق کیا۔ یہ عمل عظیم انشاء اللہ ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہا انفاق قوت و عمر اللہ کی راہ میں تو اس کے دو مرتبہ ہیں۔ پہلا عزم و نیت سے تعلق رکھتا ہے دوسرا عمل سے۔ پہلی چیز ہر وقت و آن مطلوب اور ہر وقت ہمارے اختیار میں ——— اس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ رہا عملی کام تو اس میں انتظار وقت ناگزیر۔ شوق طلب کا تقاضہ یہی ہونا چاہیے کہ ایک لمحہ کی تاخیر بھی شاق گزرے۔ لیکن فہم و فکر ہی کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ انتظار کے بغیر چارہ نہیں۔ سردست آپ کے لیے مسئلہ معیشت بھی ضروری ہے۔ اور حقوق اہل و...

اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ میں ملتے جلتے رہیے۔ یہ سعی و کوشش کیجیے کہ کوئی گنجائش کہیں دوسری جگہ نظر آئے اور مجھ کو مطلع کیجیے۔

(۲) مسٹر فضل دین کے جو حالات لکھے ہیں وہ پیشتر سے معلوم ہیں مگر چارۂ کار کیا؟ باقی رہا تذکرہ تو اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ انھوں نے اسے چھاپا ہے اور اس کی تمام خرید و فروخت انہی سے متعلق ہے۔ نفع نقصان وہ جانیں۔ اگر عقل و دانش سے کام لیتے اسراف میں نہ پڑتے اپنی نادان بیوی کی پرستش نہ کرتے حالت کے مطابق خرچ رکھتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ حتی الوسع مشورہ و فہمائش میں کمی نہیں کی۔ لیکن افسوس کہ کلکتہ کا قیام غیر ضابطہ طبائع کے لیے موجب ابتلا ہے۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ قانوناً پریس پر کوئی ڈگری جاری نہیں ہو سکتی گو نہ تمت پریشانی کا موجب ہو سکتی ہے۔ آپ ان کے معاملات کو انہی پر چھوڑ دیں۔ اس بارے میں میری فہمائش بالکل بے اثر رہ چکی ہے نتیجہ کام صرف اتنا ہوا کہ بند رہنے کی جگہ پریس کا مکان کھلا رہا اور کچھ لوگ اس میں رہے۔ اور مجھے کوئی اس سے نفع نہ ہوا ورنہ ہوگا۔ نقصان جس قدر ہو خلاف امید نہیں۔ دنیا کا یہی حال ہے اس کو آپ ہم بدل نہیں سکتے۔

ایک کام ضروری ہے۔ ایک نسخہ تذکرہ درجۂ اول مجلد بہ چرم ایڈیٹر مشرق گورکھپور کے نام رجسٹرڈ بھیج دیجیے۔ انھوں نے شاید مشرق میں اشتہار چھپوایا تھا۔ اجرت اب تک نہیں دی وہ کہتا ہے کہ کم سے کم ایک نسخہ تو بھیج دو وہ بھی نہیں بھیجا جاتا۔ خط پر خط آرہے ہیں۔ بہرحال آپ بھیج دیں۔ بھیجنے سے پہلے غلط نامہ دیکھ کر قلم سے غلطیاں درست کر دیجیے گا اور غلط نامہ اگر شامل جلد نہیں تو جلد کے اندر رکھ دیا جائے۔ ابوالکلام

(۱۸)

۲۵ر نومبر ۱۹۱۹ء

یہ معلوم کر کے سخت قلق ہوا کہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ لطف فرمائے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟ آپ کو وہاں رکوانے سے مقصود یہ تھا کہ قبل از جلسۂ انجمن مقامات مشہورۂ بہار میں ایک دورہ کیا جائے اور دعوتی خطوط و کارڈ بالمشافہ لوگوں کو دیے جائیں۔ نیز اشتہارات مناسب مقامات پر چسپاں کرائے جائیں لیکن اگر آپ کی طبیعت درست نہیں تو پھر یہ تمام معاملات کیونکر انجام پائیں گے؟

اس صورت میں وہاں بھاگلپور کا کوئی اور مستعد شخص کیا اس کام کے لیے فوراً مل سکتا ہے؟ اگر آپ کے شناسا لوگوں میں کوئی ہو تو تمام مصارف انجمن ادا کرنے کے لیے طیار ہے واجرہ علی اللہ اس کے علاوہ۔

بہرحال اس خیال سے کہ وقت کم ہے، خواہ خود آپ انجام دیں خواہ کسی اور ذریعے، اصل کار کو لکھ دیا جاتا ہے۔

(۱) جلسے کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔

(۲) بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر لشانہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلد۔

اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے۔ اس کا خیال رہے کہ کارڈ کم ہیں اور صرف ان لوگوں کو دیے جائیں جو انگریزیت میں بشدت غرق ہوں ورنہ اردو خطوط۔ بھاگلپور کے لیے دس خطوط رکھے گئے ہیں اور دس پوسٹر۔ لیکن حسب ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں۔ پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں۔

(۲) اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹرایٹ لا سے ملیے۔ ڈاکٹر محمود ایک جونیر بیرسٹر اور مسٹر مظہر الحق کے داماد ہیں۔ ان دونوں صاحبوں سے کہیے کہ صرف اس قدر زحمت دینا مقصود ہے کہ بزرگان بانکی پور کی کوئی فہرست یہاں موجود نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے نام بتلایے تاکہ ان کو خطوط و کارڈ خاص طور پر دیے جائیں اور شرکت جلسہ کے لیے اصرار کیا جائے اور آپ کی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے۔ بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات بہار کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے اور ان تک پہنچایے۔

اس کے بعد پوسٹر بانکی پور پٹنہ میں بھی مناسب مقامات پر چسپاں کرانا چاہیے اور عام طور پر لوگوں سے ملنے اور دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں نیز مظفر پور و مونگیر وغیرہ۔ مظفر پور میں مولوی ریاض الحسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی اگر یہاں کا ذکر کر دیا جائیگا۔ اس بارے میں بھی ڈاکٹر محمود سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

(۴) ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ عربی انگریزی سے مرکب اور آخری درجہ تعلیم تکمیل نصاب علوم دینیہ پر مبنی۔

(۵) وقت کم ہے اس لیے تعجیل مطلوب۔ یہ اچھا ہوگا کہ اثنائے سفر میں خط و کتابت "بذریعہ پوسٹ ماسٹر" ہو۔ یعنی یہاں سے آپ کے نام کے خطوط وغیرہ ہر شہر کے پوسٹ ماسٹر کے ذریعہ جائیں۔ آپ کو ہر جگہ پوسٹ آفس میں جا کر خود دریافت کر لینا ہوگا اور اپنے نام کی ڈاک لے لینی ہوگی۔

(۶) چونکہ آپ کی علالت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو گیا اس لیے روپیہ نہیں بھیجا گیا۔ بصورت مستعدی آپ فوراً بلا ادنی تامل سفر شروع کر دیں اور خط میں پتہ لکھیں۔ مصارف کے لیے روپیہ بھیج دیا جائے گا یا مثل سابق آپ مصارف کا پرچہ بھیجتے رہیں گے اور روپیہ جاتا رہے گا۔

(۶) مزید دعوتی خطوط وغیرہ مطلوب ہوں گے تو طلب کر لیجیے گا۔

(۷) جناب مولانا محمد علی صاحب کی عدم شرکت پر کمال افسوس مگر واقعی ان کی معذوری واضح۔ لیکن شفیق نقلاء و واعظین جو ان کی خدمت میں رہتے ہیں، ان کی شرکت تو نہایت ضروری ہے۔ اگر جناب موصوف امر رمائیں تو وہ ضرور شریک ہوں گے پس اس کے لیے کوشش کیجیے۔ یہ اجتماع صوبۂ بہار کی تعلیمی اصلاح ترقی کا اجتماع عام ہے اور ستم ہے اگر خود اس صوبے کے علماء و اصحاب رائے اسمیں حصّہ نہ لیں۔

(۸) بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ زبانی بھی ان کو خاصتاً آمادۂ شرکت کیا جا سکتا ہے۔ بلا سم ابلاغ رقعہ و کارڈ۔

(۹) اس جلسہ میں صوبۂ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاصتاً ضرورت ہے۔ جلسہ تین دن ہوگا۔

(۱۰) بانکی پور میں حافظ محب الحق صاحب کا پتہ دریافت کر کے ان سے بھی خاص طور پر ملیے اور کہیے کہ آپ کی شرکت نہایت الزم و امید مزید سعی و تناصر و تعاون۔

(۱۱) ایک شخص مولوی سعیر الدین صاحب ہیں۔ ان سے بذریعہ مسٹر محمد یر سٹراٹ نا محلہ دریاپور پٹنہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ وہی شخص ہیں جو رمضان میں یہاں تھے از ہمراہیاں مولوی شرف الدین اور جمعہ کے دن اکثر آتے تھے۔ ان سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ بلکہ بہتر ہے کہ سب سے پہلے ان ہی سے ملیے اور ان ہی کے مشورہ سے لوگوں کے نام حاصل کیجیے۔ اور ان کو دعوت دیجیے اور کہیے کہ انجمن آپ کو اپنا قائم مقام سمجھتی ہے اور امید کرتی ہے کہ خود آپ انجمن کی جانب سے یہاں لوگوں سے ملیں گے اور دعوت دیں گے اور جلسہ میں لائیں گے۔

میرا ذکر کیجیے کہ اس کو اس بارے میں آپ پر خاصتاً اعتماد ہے اس جلسہ میں کلکتہ سے تمام معززین ممبران کونسل وغیرہ شرکت کے لیے آئیں گے حتی کہ ڈھاکہ سے کس قدر افسوس کی بات ہو اگر خود صوبۂ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں؟ حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے۔

ضروری خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً بذریعہ تار مطلع کیا جائے اور رقعہ وغیرہ معاً واپس کر دیے جائیں۔

(۱۹)

حبی فی اللہ السلام علیکم خط پہنچا، اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں پتہ نہ تھا جواب نہ دے سکا۔ بہرحال حالت میں تبدیلی تو ہوتی ہی ہے جب اللہ کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔ اس میں کاوش بے سود ہے آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا مظنون ہے تو پھر مولوی اکرم کے یہاں تعلق کیوں کروں؟ بلاشبہ میرے لیے نہایت خوشی کا موجب ہو اگر براہ راست آپ کے لیے کسی بہتر سامان کا ذریعہ ہو سکوں لیکن یہ چیزیں اصل کار و مقصد

بں داخل نہیں ہیں محض وسیلہ معیشت ہیں جہاں ہو ایک ہی حکم میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو وہاں آپ کے لیے بالفعل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں جس کو آپ کے لیے منتخب کروں نہیں کہا جا سکتا کہ پریس کے کام کی حالت کیا ہوگی۔ موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ کے لیے فضل دین نے آپ کو بلایا چونکہ وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اس لیے میں نے دخل نہیں دیا ورنہ تو آپ کے لیے یہ کام کوئی کام تھا نہ دفتر کے لیے واقعی ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے مولوی اکرم اخبار روزانہ نکال رہے ہیں کام اور ترقی کا بہت اچھا موقعہ ہے۔ آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔

بحالت موجودہ آپ کے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تنخواہ بھی امید ہے کہ مناسب ہوگی۔ آپ کو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی بھی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی طرح مناسب نہیں کہ اس عمدہ موقعہ کو ہاتھ سے دیں۔ فوراً اختیار کرلیں۔ انشاء اللہ موجب فلاح ہوگا۔ میں اگر کلکتہ چلا بھی گیا جب بھی بحالت موجودہ امید نہیں کہ اخبار وغیرہ کا کوئی کام پریس میں شروع ہو مجھ کو دوسری مشغولیتیں درپیش ہوں گی اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریس میں کوئی گنجائش ایسی نہ نکلے گی کہ مختلف قسم کے کام پیش آئیں پس جو صورت سامنے ہے اسے ضائع نہ کیجیے۔ بڑی اچھی بات اس میں یہ ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ ہی میں رہے گا۔ چونکہ المستشار مؤتمن۔ اس لیے جو اصلیت تھی لکھ دی گئی۔

ابوالکلام رانچی ۲ رجنوری ۳۰ء

(۲۰)

کلکتہ[1] ۲۰ رفروری ۳۰ء

حبی فی اللہ السلام علیکم

آپ کی پریشان حالیوں سے بے خبر نہیں ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے اور دارباب کی جیب خالی ہے۔ بہرحال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کیلیے سودمند ہو آپ کو اطلاع دوں گا۔

(۱) اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملکداری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسط امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں اس کا تعلق قدیم براعظموں

---

[1] اس خط کا عکس ماہنامہ "آجکل" دہلی کے "ابوالکلام نمبر" میں آچکا ہے۔

سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے قطع وجزم کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ضرور بیان کی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض ایک قیاس ہے، تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے۔ اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات، اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افرادِ انسانی کو باہم دگر متحد کر دینا ہے۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصر جواب دیا جا سکے بہت زیادہ تفصیلی بحث کی ضرورت

ابوالکلام

(۲۱)

کلکتہ۔ ۴ ۳۰ء

عزیزی آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے لیکن میں آپ کو لکھتا تو کیا لکھتا، کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر اعتماد کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کیجیے۔ کئی ماہ تک پچھلے دنوں آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش میں کمی نہیں ہوئی لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اخبار کی وہاں نکل آئی ہے جیسی کچھ بھی ہو، بہرحال ایک صورت ضرور ہے، جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے اسے غنیمت تصور کرنا چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بیکاری تو نہیں ہے۔

اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو آپ کے لیے کام دے سکے تو انشاء اللہ تغافل نہیں کروں گا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۲۲)

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کی نسبت یہ خیال اب مجھے کیوں پیدا ہوا۔ زندگی کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کر لیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و وقتی تقاضا کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ بہت سے لوگ باوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کام مدۃ العمر نہ کر سکے۔ صرف اس لیے کہ کوئی مستقل نظام عمل ان کے سامنے نہ تھا۔

آپ کے لیے جس قدر میں نے غور کیا اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ ہلاکت وقت و ضیاع قوۃ ہے۔

اخبارات بلاشبہ دعوۃ و تذکیر کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ لیکن جب تک ایک نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی شکل میں ان سے کام نہ لیا جائے اور نہایت وسیع پیمانے پر اسباب و وسائل مہیا نہ ہوں، مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتے اور محنت بکسر رائیگاں جاتی ہے۔ اوّل تو ایسا اہتمام چند در چند وجوہ سے متعذر، ثانیاً بصورت حصول، اس درجہ مشکلات و عوائق حائل کہ ان پر عبور و غلبہ شخص واحد سے ممکن نہیں جب تک جماعت نہ ہو۔

علاوہ بریں اس مشغلہ میں یارہ کر صرف سیاسیات کیلیے وقف ہونا پڑتا ہے اور علمی ذوق کو ہمیشہ کیلیے ترک کر دینا پڑتا ہے۔

آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل و طرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے۔ علمائے اسلام کے حالات پڑھیے۔ درس و تدریس، وعظ و ارشاد، اور تصنیف و تالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمات انجام دیتی تھی۔ عوام کی اصلاح و وعظ و تذکرے سے، مستقبل کے لیے طیاری درس و تدریس سے، اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے، ابن جوزی مصنف ہیں، مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں، اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسہ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ۔ علمائے اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہ ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو۔ جس کو درس دیتا، اسی اوقات میں تصنیف و تالیف اور مجامع و جوامع میں وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری۔ جب سے یہ چیز مفقود ہو گئی اور ان تینوں اجزا کو الگ الگ کر دیا گیا، واعظوں کا طبقہ الگ، مصنفین کا الگ اور معلمین کا الگ، اسوقت سے سلسلۂ ہدایت حقیقی و نشو و نمائے علم مفقود و معدوم ہو گیا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے طیار ہو جائیں۔ آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ چھتیس گڑھ، ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم۔ چونکہ ایک گوشہ میں واقع ہے اس لیے علماء کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی، اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی۔ اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوۃ و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا۔ اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے، وہ آئندہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطہ کی دینی پیشوائی و امامت اس کے ہاتھ میں رہے گی اور باطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماء سوء کی کثرت اور جاہلانہ فساد و جہل

کی مقاومت سے اصلاح و ہدایت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہ
ہے اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جا سکا ورنہ جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔

پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت
اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلہ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور یہ
کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج تیس برس سے اصلاح ند
کا مسئلہ معرض ہند میں در پیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش نا
نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔

اسی اثناء میں مدرسہ عالیہ کے اصلاح نصاب پر از سر نو تعلیم مشکل کی وجہ ہوئی اور اس کے لیے
مجھ کو ایک نصاب جامع مرتب کرنا پڑا اس بات سے مزید تحریک ہوئی اور مدرسہ کو اسی اصول پر
قائم کیا۔ ایک مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینئر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم دو دو سال ہے۔ پہلا درجہ آٹھ سال
ہے۔ اس میں صرف و نحو عربی بالکل ختم۔ ادب شروع فارسی مکمل ختم۔ حساب و مندسہ ختم۔ ترجمۃ القرآن مع تشخ مبادی
اسلام بالاجمال اور انگریزی ادب ہے۔ دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب پر نہج و اسلوب قدماء علوم القرآن
علوم الحدیث فقہ حنفی فقہ جامع اصول توحید علم اسرار الدین علم اخلاق تاریخ عام تاریخ اسلام تاریخ علوم
تاریخ مذاہب و طوائف اسلامیہ معقولات قدیم مسائل العلوم تصورات اور صرف ایک اور انگریزی علم و ادب
اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی کا۔

ابھی مدرسہ کی ابتدائی جماعتیں کھول دی ہیں عمارت آخر اپریل تک مکمل ہو جائیگی اور پھر کوشش کی
تمام جماعتیں شروع ہو جائیں۔ اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلہ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی ہی کا معاملہ
نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ اس کا انتظام ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے گا اور مصارف و فنڈ کے طرف سے پورا اطمینان

آخری چیز مشغلہ تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے کلکتہ
اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں۔ ہندوستان میں اس کے اسباب و سامان کا بجز یورپ کہاں سامان
صورت یہی ہے کہ کوئی ایک مستقل تصنیف پیش نظر رکھ لی جائے اور اس کے مواد و سامان کو فراہم کیا
اس کے لیے میں موزوں ہوں جب تک رانچی میں ہوں کتب خانہ بھی موجود ہے اور اگر کلکتہ چلا گیا جب بھی
رانچی سے قریب، نیز مشورہ و مواد کے لیے ہر طرح آمادہ و مستعد۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ کیا چندہ کی فراہمی کے لیے دورہ کرنا پڑے گا؟ تو اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ انجمن کے چندہ کی فراہمی کے جھگڑے سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس کے لیے دورہ میں تضیع وقت۔ آپ کا قیام تو یہیں رہے گا۔ لفظ وعظ سے مقصود یہ تھا کہ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو وعظ و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھے اور جمعہ کی امامت وخطابت وغیرہ اس سے متعلق ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک شخص یہاں آ جائے اور لوگوں کو اس سے شناسا کر دیا جائے۔ اس کی حیثیت یہاں ایک عالم مفتی قاضی امام جمعہ اور ہر طرح مقتدائے شہر کی ہوگی اور تمام شہر صرف اسی کی طرف رجوع کرے گا۔

یہ بات دوسرے مقامات میں بآسانی میسر نہیں آ سکتی۔ چونکہ ابھی عمارت کا کام ختم نہیں ہوا اس لیے مصارف دائمی میں تخفیف پیش نظر ہے اور سردست انجمن علاوہ مکان و اکل وشرب کے ... کے لیے طیار ہے مگر افتتاح عمارت مدرسہ کے بعد یہ رقم قطعاً للعۃ ہو جائیگی۔

بہتر یہ ہے کہ آپ سردست ایک ماہ کے لیے وقت نکالیں اور رانچی چلے آئیں۔ یہاں چند دنوں رہ کر تمام حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی طبیعت نہیں لگی تو آمد و رفت کے مصارف انجمن کے ذمہ ہونگے اور آپ واپس چلے جائیے گا۔

(۲۴)

عزیزی، السلام علیکم

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تخصیص و تعین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین کیجیے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوای و فضائل کے لیے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوت ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔ والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملہ کو نہیں بھولوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجیے اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور دعا اللہ سے مددگاری طلب کیجیے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوبات نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں۔ کب تک اس بند و قید میں گرفتاری رہیگی؟

جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے اس کو فانی و وہمی الفتون میں لگانا انسانیت و حیات کو تاراج کرنا ہے۔ طلب مفرط جس چیز کو بھی ہے انداد و طواغیت میں داخل ہے۔ فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون اور یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ احب چیز کو اس کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ انی وجہت وجہی للذی فطر السماوات والارض حنیفا اور لا احب الآفلین کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔ اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور انشاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عند اللہ۔ غور کیجیے آپ متاہل ہیں مجرد نہیں۔ پھر صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ۔ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کے لیے باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و قلت معیشت کی بے سر و سامانی دوسری طرف عوازم و معالی امور و عمل کا ولولہ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلاشبہ ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا۔ لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے۔ اسکے بعد قدرتی کشاکش و کشمکش اور مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور عجب کیا اکثر حالتوں میں یہ بھی عجب نہیں کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ ابھی ایک لمحہ کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب یہ حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سود مند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو کوئی شکایت نہیں۔ کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اس کی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے؟

میری شادی کو دس سال ہو گئے۔ یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔ صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا

میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔ آپ کہیں گے دل کس کے بس میں ہے؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے۔ دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے۔ اس کو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے وہ دل کی لگام جس طرف چاہے گی موڑ دے گی

اس بارے میں کثرت سے عواقب و نتائج پر غور و فکر، مغلوبات نفس کی ہیچ مائگی اور بے حاصلی کا تصور کثرت استغفار و دعا، اور مشغولات دینیہ انشاء اللہ نہایت سود مند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطرار التہاب کے ساتھ نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ جائے کہ طلب عشق اور اضطراب قلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی و خیالی مطلوب کے لیے کس طرح ضائع ہو رہی ہیں اور اگر یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہو جائے تو پھر یہی وجود فانی کیا کچھ نہیں کر سکتا تو پھر اس آزمائش سے نکل جانے میں ذرا رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

(۲) لیکن اگر ضعف عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ فوراً سے اگل پور چلے جائیے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔ اور جس قدر مشکلات و مہالک پیش آئیں گے ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہو گی۔ اولاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔

غرض کہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہو گی۔

والعاقبۃ للمتقین

ابوالکلام

INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE

REPLY.

M. E. Zacharias.

Tatarpur,

Bhagalpur City

INDIA

POST CARD

REPLY

M. E. Zacharias
Head master
Anjuman Tanwirul
Islam
Sadar bazar,
Barrackpur,
Cant.

BARRACKPORE
DELX
8 30 AM.
14 JUL. 15

INDIA

POST CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

POST CARD
WRITING SPACE
ADDRESS ONLY

عزیزی مولوی محمد ذکریا صاحب

محلہ تاتار پور

بھاگلپور سٹی

(بہار) Bhagalpore

JAN 32
INDIA
CARD
WRITING SPACE
ADDRESS ONLY
مولوی محمد زکریا صاحب
محلہ تاتار پور
بھاگلپور سٹی

عزیزی   السلام علیکم و صبحکم اللہ بالخیر

کل میں رکشا کے لیے کہنا بھول گیا ۔

یا تو خود یا بذریعہ موذن وغیرہ اس کا انتظام رکھیے

کہ آج رکشا ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے

ابوالکلام

عزیزی اپنے رقعہ میں جس امر کی نسبت لکھا ہے دراصل اسکا متعلق غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آج شام کو خواجہ رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگئی ان شاء اللہ کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائیگا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا وہ آپکی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدردان ہیں۔ دراصل معاملہ سے وہ بےخبر تھے اسلیے انکو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی کاظم صاحب وطن میں تھے انکا نام بل میں دیکھکر وہ اصل حقیقت نہ سمجھ سکے۔ قطع نظر اسکے انکا تعلق تو کچھ ہے۔ بس آپ کو اس قسم کے امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے

افسوس کہ اسوقت مسجد آنے سے پیشتر سر میں [illegible] کی طرح [illegible] درد شروع ہوگیا ہے۔ ارادہ تھا کہ ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور جلد نماز سے فارغ ہو کر سو جاؤں۔ اسکا تشویش [illegible]

کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو۔ والسلام

شدہ ناغہ بجز نہ روکا

بار شریف

عزیزی وصدیقی السلام علیکم آپکے لیے ایک صورت نکلی ہے

کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اسمیں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کیلیے بیس روپیہ ماہانہ

کی ایک جگہ ہے وہ آجکل خالی ہے میں نے سکریٹری کو لکھکر آپکے لیے گنجائش

نکال لی ہے اور بیس کی جگہ پچیس ۲۵ منظور کرایا ہے - مکان بھی رہنے

کو مفت ملیگا - بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ سکتے ہیں -

اگرچہ اس جگہ کیلیے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجکو ایسا یاد پڑتا

ہے کہ آپنے انگریزی بھی پڑھی ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہدیا تھا

منتظمین یتیم خانہ مذہبی اختلافات میں ناواقف ہیں اور ضعفت

کے عاشق سابق معلم کو اسی جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام

کے مخالف تھے - میں نے کہدیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی

طریق میں بیعت کردہ ہیں پس ان جزئیات کا خیال رکھیے -

آپ فوراً ونگلور سے روانہ ہوکر سیدھے کلکتہ [illegible] پہنچیں اور

۲۸۶

ڈورنڈا - رانچی

۷- اپریل -

برادرم السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے - ابھی کچھ دنوں رہنا ہے یا آنے کا قصد ہے ؟

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے -

[illegible]

میرا ذکر کیجیے کہ انکو ان تار اور میں ہم آپ پر خاصہ اعتماد ہے
اس جانب میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ
شرکت کیلیے آ گئے دہلی کے لوگ آ گئے ہے - کسقدر افسوس
کی بات ہو اگر خود صوبہ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں ؟
حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے -

ضروری — خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً
بذریعہ تار مطلع کیجیے اور رقعہ وغیرہ دستی
واپس کر دیجئے گا

---

(۲۰)

عطیہ: ایم اے- ذکریا ماٹاوی
بتوسط: محمود واحمد

کلکتہ
۲۰- فروری ۳۶ء

جناب من السلام علیکم آپ کی پریشان حالیوں سے بے خبر نہیں ہوں، لیکن مشکل یہ زمانہ بے مہر ہے اور ارباب درد کی جیب خالی ہے ۔ بہر حال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوگی کہ آپ کے لیے سود مند ہو، آپکو اطلاع دونگا

(۱) اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے ۔ کچھ ضرور نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے ۔ اسکی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت وسیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا ۔

(۲) جنوبی اور وسط امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں تعلق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے، قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو ۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے، لیکن یہ محض ایک قیاس ہے ۔ تاریخی حیثیت سے استشہاد نہیں کیا جا سکتا

(۳) ریڈ انڈینز کا اطلاق امریکہ کی وحشی اقوام پر کیا گیا ہے — اور انکی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے ۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت ونجات ہے اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دیا ہے — یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصراً جواب دیا جا سکے ۔ بہت زیادہ تفصیل و بحث کی ضرورت ہے

ابوالکلام

کلکتہ

۲۰/۳/ ...

عزیزی آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے لیکن میں
... کو لکھتا۔ ابھی تک کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر
...ار کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کر لیجیے۔ گذشتہ
... پچھلے دنوں آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش بھی کی لیکن کوئی بہتر
...ن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت رفتار کی وجہ سے
...مل آئی ہے، جیسی کچھ بھی ہو، بہرحال ایک صورت ضرور ہے
...ب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے اسے غنیمت تصور کرنا
چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بیکاری تو نہیں ہے۔
اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو
آپ کے لیے مناسب ہو سکے تو ان شاء اللہ تغافل نہیں کروں گا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

ہے شدید ضرورت یہاں اسکی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے
اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ نشیدہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص
یہاں قیام کرکے پورے خطہ کی دینی پیشوائی و رہنمائی
اسکے ہاتھ میں رہیگی اور یا چند مسلمانوں کا ایک گروہ عوام
کی ہدایت و ارشاد دین میں مشغول رہیگا۔ دور دراز مقامات میں
علماء سوء کی کثرت اور دجاجلہ فساد و جہل کی شدت سے
اصلاح و ہدایت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام
قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا
بنیاد صالح پڑ گئی ہے اور اب جس عمارت بنائی جائے
اور جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔
بس ہدایت و دعوۃ کے عمومی سلوک سے
یہی ایک گروہ عظیم اتباع و انقیاد کیلئے موجود ہے بلا
شرکت غیرے۔ اب [illegible] لازم ہے کہ [illegible] یعنی مشغلہ
زراعت و مدارس قدوری کا حال یہ ہے
مولانا حبیب الرحمن اسعدیہ کی بیان

بسم اللہ عزیزم سلام مسنون۔ جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تشخیص و تعین کرنا تو
بڑے علم کی بات ہے لیکن یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ
ہمارے احباب کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین رکھئے کہ دنیا میں انسان کا کام
حوائج و فضائل کیلئے اصلی آزمائش گاہ ہے یہ حالت ایسی تلوار اور آگ میں
کندن ہونا ہوتا ہے۔ سب بڑی آزمائش نفس و جذبات کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور
قوت ایمانی و جسمانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں والذین جاہدوا
فینا لنہدینہم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملہ کو نہیں بھولوں گا
اللہ تعالیٰ آپکو اس آزمائش میں کامیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

الف۔ ایسی حالات میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں۔

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجئے۔ انشاءاللہ عزم پیدا کیجئے اور اللہ سے
مدد کی طلب گاری کیجئے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوبات نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں
کیا کیجئے اس بند و قید میں گرفتار رہ کر چلئے! جو دل فاطر السماوات والارض کے
عشق سے متصل ہو سکتا ہے اسکو فانی و وہمی نقشوں میں لگانا ان نفیس وحیات
کو تاراج کرنا ہے۔ قلب مومن جس چیز کو بھی ہے انداد و طواغیت میں داخل ہے
فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔ اور یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔
محبت اسی کا دعویٰ ہے تو سب زیادہ احب چیز کو آگے لئے چھوڑ دینا چاہئے
لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔

پس اگر توفیق اور امکان و جسمانی راہ تو یہ ہے کہ اللہ سے دل لگا لیجیے الا بذکر اللہ
تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ انی وجہت وجھی للذی فطر السموات
والارض حنیفا اور لا احب الآفلین کا صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے ۔
اگر آپکی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الہی ضرور شامل حال ہوگی ۔ اور ان شاء اللہ
ایک جبار اکبر کا رجوع عند اللہ ۔ غور کیجیے ۔ آپ متاہل ہیں ۔ مجرد نہیں ۔
صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کش مکش سے دوچار ہیں ۔ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی
ازدواج ثانی کیلیے باعث نہیں ۔ پھر ایک طرف اولاد و قلت معیشت کی بے سروسامانی
دوسری طرف لوازم و مصارف امور و دل کا ولولہ ۔ ان حالات میں اگر یہ مسئلہ الجھایا گیا تو
کیا نتیجہ نکلے گا ؟ ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام مشکلات پر غالب
آجائیگا لیکن بہت تھوڑی دیر کیلیے ۔ اس کے بعد فوراً کش مکش و کشمکش اور مشکلات
و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے عجب نہیں
کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہوجائے ۔ یہ کشمکش زندگی کیلیے بہت بڑی مصیبت ہے ۔ تدارک
ابھی ایک کے لیے تو کوئی احساس نہیں ہو سکتا ۔ یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب حالت پیش آگئی
تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا ۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری راحت دارین کے ساتھ خود
اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے ۔ وہ ایک معصوم
لڑکی ہے ۔ دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر ۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ آپ اسکو ایک
ایسی زندگی میں ڈال دیں جسکے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی علم ہے ؟ اور ہم جانتے
ہیں کہ طمانیت و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکینگے

۱۸

جب

پھر اپنی بیوہ کا خیال کیجیے - بے شک مجھے معلوم ہے آپکو شکوہ شکایت نہیں کیا محبت و وفا کا یہی تقاضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اُسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے ؟

میری شادی کو دس سال ہو گئے - یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعًا و فعلًا ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا - باوجود ہمہ میں نے ایک صبح و شام کیلیے بھی اسکا قصد نہیں کیا اور نہ کرونگا - پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اسقدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا قائم رکھنا بہت مشکل تھا - تاہم میرے ارادے میں تزلزل نہ ہوا -

صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے - اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ ایمان

آپ کہیں گے دل کے بس میں نہیں ہے ! کون کہہ سکتا ہے جو چاہے جو کسی کے بس میں نہیں ہے - دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے اُسکو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے - وہ دل کو تھام کر جس طرف چاہیگی موڑ دیگی

نتائج

اس بارے میں کثرت کے ساتھ عواقب و نتائج پر غور و تفکر، مطلوباتِ نفس کی حیثیت کا
اور بے حاصلی کا تصور، کثرتِ استغفار و دعا، اور مشغولیاتِ دینیہ۔ ان شاء اللہ
نتائج سود مند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پوری اضطراب و التجا کے ساتھ
نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا۔ صرف اس حقیقت کی طرف اگر ایک دفعہ
پوری طرح لگ جائے کہ طلب و شوق اور اضطرابِ طلب و اشکِ چشم جیسی نعمتیں ایک
وہمی و خیالی مطلوب کیلئے کس طرح ضائع جا رہی ہیں، اور اگر یہ سب کچھ اللہ کیلئے
ہو جائے تو پھر یہ وجودِ خاک کیا کیا کچھ نہیں کر سکتا، تو پھر اس آزمائش
سے نکل جانے میں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئیگی۔

(۲) لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر
دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ کر فوراً بنگلور چلے جائیے
اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔
اور جس قدر مشکلات و مہالک پیش آئیں گے انکو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ
کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطرابِ نفس سے
بہتر ہوگی۔ اقلاً بہت سے روحانی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔
غرضیکہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے۔ یا فوراً بلا تاخیر
بنگلور جا کر اس سے نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر اختیار کی جائیگی تو سخت مضر ہوگی۔

والعاقبۃ للمتقین۔ ابوالکلام

Reference No...............

TELEGRAPHIC ADDRESS
"KHILAFAT"

نصر من اللہ وفتح قریب

کلکتہ ۱۹۲ء

مجلس خلافت صوبہ بنگال

تار کا پتہ "خلافت"

Bengal Provincial Khilafat Committee

...lam Azad. President.
...med B. L.
... Vakil High Court
...n B. L., Burdwan
...m Khan.
...madi & Zamana.
} Secretaries

...2 ZAKARIA STREET,

Calcutta..............................192

مکرمی الجلیل   السلام علیکم

مولوی محمد زکریا بھاگلپوری ایک نہایت مخلص و ساعی قومی خدمات میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب انہیں تحصیل علم کا شوق ہوا ہے اور طبیہ کالج میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ جناب پرنسپل صاحب کے نام کوئی ایسی تحریر عنایت فرما دیجئے جس میں ممکن رعایتوں کی سفارش ہو۔

مخلصکم احمد

ابوالکلام

یہ خط زکریا بھاگلپوری کے نام تو نہیں لیکن ان سے متعلق ضرور ہے۔ لہٰذا ان کے تعارف سے قبل مولانا آزاد کے قلم سے ان کا تعارف پیش خدمت ہے

——— ادارہ

زکریا بھاگلپوری کے بارے میں

محمود واجد

صوبہ بہار اور خصوصاً بھاگلپور کی سرزمین سے کسی علمی اور ادبی پودے کا جنم لے کر کامیابی سے پھلنا پھولنا حیرت سے کم نہیں۔ یہی حشر اس پودے کا ہوا جسکا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس نے کسی طرح اپنے قدم یہاں جمائے۔ اس کے سائے میں کتنوں کو پناہ ملی تشنگانِ علم و تحقیق کی پیاس بجھتی رہی۔ وہ ایک مشعل بنا رہا جس سے دوسرے کسب ضیا کر کے روشنی کا مینارہ بن گئے لیکن وہ شخص اپنی ذاتی زندگی میں "چراغ تلے اندھیرا" کے مصداق رہا اس نے اپنے علم و فضل سے کوئی بھی معاشی یا معاشرتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہاں خود پریشان حال رہ کر دوسروں پر خوشحالیاں بکھیریں۔ اوروں نے شہرت اور مرتبے پائے اور اسے گمنامی اور بے کسی ملی۔ اس شخص کو کم و بیش چودہ سال مولاناؒ کی معیت میں رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ایک بڑے شخص سے رشتہ جوڑ لینا ایک عام سی روش بن گئی ہے۔ یہ شخص بذاتِ خود نصف درجن بیرونی اور چوتھائی درجن ملکی زبانوں کا ماہر ہے۔ علم، ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب جیسے متنوع موضوعات کے سلسلہ میں بڑی اچھی بصیرت رکھتا ہے۔ کسی زمانہ میں مشہور صحافی رہ چکا ہے۔ اس کی خطابت نے کافی شہرت پائی ہے، مولانا محمد علی، مولانا آزاد، مولانا آزاد سبحانی، خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ مل کر ملی اور ملکی کام کرنے کا اسے فخر حاصل رہا ہے۔ ملک دشمن عناصر کو وطن کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے میں اس نے کافی حصّہ لیا ہے۔ سراغرسانی، تحریک، مجادلہ اور پھر قید و بند کی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ الغرض وہ سب کچھ کیا ہے جو اس وقت کی سچی ملکی خدمت کے لیے ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ارباب بست و کشاد جن کے ساتھ یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے، اہل علم جنھوں نے ان کے آگے زانوے ادب تہ کیا اور وہ سارے لوگ جو ان کے زیر بار احسان ہیں ان کے آڑے وقت میں کبھی کام نہ آسکے۔ کسی کی نظر اس دیے پر نہیں پڑتی جس نے کبھی اپنی ضیا سے ذہنوں کے چراغ روشن کیے تھے اور آج تنہا نحیف و نزار کاندھوں پر سارے کنبے کا بوجھ سنبھالے حالات کے تند جھونکوں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس شخص کا نام مسٹر ابو عمر

محمد ابراہیم زکریا ہے۔ انھیں عرف عام میں "مسٹر صاحب" کہتے ہیں۔ ان کی حیثیت مولانا کے عزیز دوست،
شاگرد اور کئی طرح کی ہے جیسا کہ ان خطوط سے ظاہر ہوگا جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔ ان کا اور مولانا کا ساتھ
۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک رہا۔۔۔ کلکتہ، رانچی اور پھر کلکتہ میں ایک ساتھ رہے۔

مسٹر صاحب اپنی خود نوشت سوانح عمری[1] (غیر مطبوعہ) میں فرماتے ہیں۔۔۔ "میں آٹھ برس کا تھا کہ ۱۸۹۷ء
میں پہلا زلزلہ ہوا۔ میرے والد جناب شیخ دیانت اللہ احمد صاحب رئیس انگریزی آباد مالدہ (بنگال) کے ملک التجار
اور جامع مسجد کے امام تھے۔ آپ مع بال بچوں کے ہجرت کرکے بھاگل پور (بہار) آئے۔ محلہ تاتار پور میں زمین خرید کر
مکان بنوایا... میری شادی بتیس برس کی عمر میں بمقام راج محل ضلع سنتھال پرگنہ (بہار) میں رئیس شہر حاجی رستم کی
دختر خوردسے ہوئی۔ خاکسار کو تین لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں (اس وقت دو لڑکیاں۔ ایک بیوہ دوسری شادی شدہ
اور ایک لڑکا ہے جو میٹرک پاس کرکے برسوں سے بیکار ہے)۔ میری تعلیم ابتداءً مقامی مدرسہ نور الہدیٰ میں ہوئی۔
فارسی ہرسہ دفتر ابوالفضل وغیرہ اور عربی میں منطق، فلسفہ، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں انتہا تک رہی ہے۔ سند بھی
موجود ہے۔ فن مناظرہ کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں رہی۔ اس وقت اس تعلیم گاہ کے پرنسپل مولانا آزاد سبحانی تھے۔
تفسیر قرآن کی تعلیم دارالارشاد کلکتہ جس کے پرنسپل حضرت علامہ ابوالکلام آزاد تھے۔ اس خاکسار کو عیسائی، آریا، قادیانی
کے رد میں خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) میں ایک عرصہ تک کام کرنا پڑا۔ تصوف میں حضرت علامہ محمد علیؒ سے شرف تلمذ رہا
اور آپ ہی سے بیعت کی نعمت حاصل ہوئی... آپ کے بعد عنایت وکرم فرمائی کی نظر حضرت علامہ ابوالکلام آزاد کی
رہی۔۔۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک حضرت علامہ کے ساتھ کلکتہ، رانچی پھر کلکتہ میں رہنا پڑا۔ مولانا کے قائم کردہ مدرسۃ العلوم
رانچی کا ایک عرصہ تک صدر المدرسین رہا.... ۱۹۱۱ء سے بذریعہ خطابت وصحافت تا ایں دم جہاد کر رہا ہوں۔
خلافت، کانگریس اور دیگر انجمن اور پبلک اجتماع میں لاکھوں سامعین کے درمیان تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ اخبار
زمانہ" کلکتہ "جمہور" کلکتہ "مسلم گزٹ" کلکتہ اور دیگر اخبارات کے ایڈیٹوریل میں کام کرتا رہا۔ "الہلال" اور "البلاغ"
کے اسٹاف میں بھی علمی خدمت انجام دے کر شرف وعزت حاصل کرتا رہا۔ "البشیر" پٹنہ کے ایڈیٹوریل میں میرے مضامین
شائع ہوا کیے ہیں۔ "مومن گزٹ" کانپور کا ڈھائی سال تک چیف ایڈیٹر رہا۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن سے اور بنیلز اسٹڈیز
پر کئی تمغے حاصل کیے۔ بھاگل پور لوکل کالج کے پروفیسروں کو قدیم اسلامی تاریخ کی تعلیم دیتا رہا۔ مکھن لال رائے[2] چودھری
شاستری ایم اے، بی ایل، پی آر ایس کو میں نے شروع سے اردو، فارسی، عربی، تاریخ، قرآن اور اسلامک کلچر وغیرہ کی تعلیم دی

[1] مسٹر صاحب کا اگست ۶۴ء میں انتقال ہوگیا حالانکہ کتاب تکمیلی مراحل تک وہ زندہ تھے۔ م۔ ر۔ [2] اس کا مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ [3] ابھی کئی سال ہوئے کہ مکھن لال رائے
چودھری کا انتقال ہوگیا۔ م۔ ر

اور میری ہی سعی موعود سے "دینِ الٰہی[1]" انگریزی میں لکھی گئی اور پی آر ایس کی ڈگری اور سونے کا تمغہ بابو صاحب کو ملا۔
میری پوری سعی سے "اسلامی فی الاسلام[2]" کی کتاب انگریزی میں لکھی۔ پھر "اسٹیٹ ریلیجنس آف دی مغل[3]" لکھا۔ پھر اسلامک کلچر کی
تعلیم کو مکمل کرنے مصر بھیجے گئے۔ ان دنوں کلکتہ یونیورسٹی کے اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ کے بوس
نے دکن کی تمام فارسی تاریخیں مجھ سے پڑھ کر "تاریخ بیجاپور[4]" لکھی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے علاوہ اور
لوگوں نے بھی بہت کچھ پڑھا اور سیکھا ——!

کانگریس کی شرکت سے پہلے سودیشی تحریک میں بابو شیام سندر چکرورتی ایڈیٹر "سرونٹ" بابو سریندر ناتھ بنرجی
ایڈیٹر "بنگالی" اور بابو بپن چندر پال بانی بم کے ساتھ کام کرتا رہا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک
میں اہم سے اہم خفیہ کام انجام دینا پڑا۔ بج بج کے گولی کانڈ میں ماخوذ ہوا۔ رانچی کے ڈورنڈہ برٹش فوجی کیمپ میں
انگریزوں کے خلاف کام کرتا رہا۔ کلکتہ، رانچی، کانپور وغیرہ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ سیاسی کام انجام دیتا رہا۔ پھر
راشٹرپتی راجندر پرشاد کی ہدایت سے مسلم ماس کنٹاکٹ کیلیے پٹنہ اور بھاگلپور میں کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں یہ پور دبھاگلپور)
جو برطانوی نوجوں کے حلقۂ قید میں تھا وہاں صدر کانگریس کمیٹی کی ڈاک آغا صاحب بن کر لے جایا کرتا تھا۔ اسی سال
پولیس کی تلاشی سے میری تمام کتب مثلاً "پورانی انسائیکلوپیڈیا" "بک آف نالج" دس جلدیں "ہسٹری آف نیشنز" دس جلدیں
وغیرہ کئی ہزار کی بنگلہ انگریزی کتب ضبط کر لی گئیں۔ اس کے قبل ۱۹۱۱ء میں جلیان والا باغ کے ہنگامے میں بھی پکڑا گیا
تھا نارنگی اور ہفتہ بھر جیل میں رہا۔ ۱۹۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی برسرکار رہا"

یہ تھی داستان اس منحنی سے شخص کی جس کی ہستی معدوم سی نظر آتی ہے۔ جو پتھر کا جگر چیر کے جوئے شیر لانے چلا
تھا مگر جوئے شیر اوروں کو مل گیا اور اسے تیشہ بھی نہ مل سکا کہ رسم عاشقی نباہتا۔ اب تو نہ جینا ہے نہ مرنا ہے زندگی
ایک بے برگ شجر ہے جس سے درد کی کونپلیں موسمِ گل میں بھی پھوٹتی ہیں! یہ حضرت مسٹر زکریا بھاگلپوری مقامی اسکول
(لڑکیوں کے اسکول) میں ہیڈ مولوی ہیں —— اور مولوی آپ جانیں محض مولوی ہوتا ہے چاہے اس نے کتنے ہی علوم
کے خزینے انڈیل دیے ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے ان سے جب میری پہلی پہلی ملاقات بھاگلپور کے ایک کتاب فروش
کی دکان پر ہوئی تھی تو وہ کسی سے محوِ گفتگو تھے۔ ان کے ایک جملے نے مجھے چونکا دیا —— "جب تک ہم یہ نہ جانیں
گھر سے اسکول تک جو چیزیں ملتی ہیں ان کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے تو علم کیا ہوا۔!" پھر میں اکثر ان کے یہاں
آنے جانے لگا اور جب ان کے لڑکے کو پڑھانے کا ذمہ لیا تو مجھے اور قریب سے ان کے ماحول کو دیکھنے کا موقع ملا

---

[1] دینِ الٰہی۔ ایم ایل رائے چودھری [2] ریفارم ان اسلام ایم ایل رائے چودھری [3] اسٹیٹ ریلیجن آف مغل۔ ایم ایل رائے چودھری [4] ہسٹری آف بیجاپور کے۔ کے۔ بوس۔

جس میں گھٹن زیادہ تھی اور شگفتگی کم ——— !

ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، زبان، سائنس پر اکثر نادر کتب ان کی مختصر سی ذاتی لائبریری میں جمع ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں وہ شخص غریب کیسے ہو سکتا ہے جس کے پاس اتنا بڑا خزانہ ہو لیکن پچھلے دس برسوں سے سنگین معاشی حقیقت کسی نہ کسی شکل میں انھیں اپنا شکار بنائے ہوئے ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ اکثر باتیں ان کے ذہن سے اترتی جا رہی ہیں۔ ہاں ان کی پرانی علمی زندگی کا ذکر آتا ہے تو آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ جاتی ہے۔ جانے یہ چمک بھی نئی نسل کو وہ دے سکیں گے یا نہیں! ایک لڑکا ہے محمد تحی جو برسوں سے میٹرک پاس کر کے بیٹھا ہے عمدہ افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے عمدہ افسانے لکھتا ہے اور پھاڑ دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن اپنی تعلیمی سارٹیفکیٹ کو بھی پھاڑ بیٹھا ——— ! اس منظر سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ اُس خاندان کا حال ہے جس کا ماضی قوم کی بھٹی میں جل گیا اور اسے منتشر راکھ کے ڈھیروں کے علاوہ کچھ نہ مل سکا[1] ——— !

لیجیے میں کہاں سے کہاں نکل گیا ——— آپ سوچیں گے اس سے مولانا کی زندگی کا کیا تعلق ہے ——— تعلق ہے میرے بھائی! اور نہ مولاناؒ کی شفقت کا دریا یوں جوش نہیں مارتا ——— ! پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مولاناؒ نے ان کے لیے کیا کیا؟ اس کا جواب خود مسٹر صاحب کی زبانی سنیئے۔ ایک دن میں نے مسٹر صاحب سے کہا ——— آخر اب مولانا آپ کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ———

"بھائی مولانا کی مثال اکبرؔ کے دربار کے ابوالفضلؔ اور فیضیؔ جیسی ہے جن سے ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا! اور میں بے بس سا ہو گیا ——— یہ اس مولاناؒ کا ذکر ہے جو ہندستان کے صف اوّل کا سیاستداں رہا۔ اور میرے موضوع کے دائرہ میں وہ مولانا ہیں جو ایک عام آدمی ہیں، ایک بزرگ ہیں، ایک دوست ہیں ——— !! — — —

---

[1] چند سال قبل حضرت عزیر منعمی مرحوم وزیر ریاست بہار کی سعی مشکور سے انھیں ایک ہزار کی رقم سرکار سے مکان بنانے کو ملی۔ مگر یہ مختصر رقم بیکاری اور بیماری کی نذر ہو گئی۔ (م۔ ن)

DANESH

QUARTERLY JOURNAL

Chief Editor:
Cultural Counsellor Islamic Republic of Iran

Editor:
Dr. Syed Sibte Hasan Rizvi

Honorary Advisor:
Dr. S. Ali Raza Naqvi

Published by:
Office of The Cultural Counsellor
EMBASSY OF THE ISLAMIC
REPUBLIC OF IRAN
House No. 25, Street No. 27, F/6-2
Islamabad, Pakistan.
✆ 818204/818149

کچھ اپنے کچھ مولانا آزاد کے بارے میں

مولانا آزاد کے مکتوب الیہ

زکریا بھاگلپوری

کے قلم سے

مولانا محمد علیؒ سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) بڑے بزرگ اور صوفی گذرے ہیں۔ میں نے ان سے بیعت حاصل کی تھی اور وہیں رہا کرتا تھا۔ ان کے حکم اور دعا سے آریہ اور قادیانی عقائد کی رد میں تقریریں کیا کرتا تھا اور بڑا مقبول تھا۔ بعدہٗ انھوں نے مجھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام تعارفی خط لکھا اور الہلال جو انھیں دنوں شروع ہوا تھا اس میں رکھ لینے کو کہا۔ حضرت مولانا آزاد خط لے کر کھڑے ہو گئے اور احتراماً کھڑے کھڑے سارا خط پڑھا۔ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے، بٹھایا اور شفقت سے رکھا۔ بہت مانتے تھے۔

"الہلال کے ابتدائی دور کلکتہ سے رانچی میں نظر بند ہونے اور رہا ہونے تک گہرا تعلق رہا۔ رہائی کے بعد مولاناؒ دہلی گئے، تو میں الگ ہو گیا۔"

ان کے والد ہجرت کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں شادی کی۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے غلام یٰسین آہ جامعہ ازہر (مصر) کے پڑھے ہوئے تھے۔ عالم اور شاعر تھے۔ مولانا ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی آبرو خانم ملکہ بھوپال کی سکریٹری تھیں۔ بڑی تعلیم یافتہ عمدہ مقرر اور مضمون نگار تھیں۔ بڑی بہن کی شادی کلکتہ کے کسی تاجر کے یہاں ہوئی تھی۔ مولانا کے والد مکہ سے بمبئی واپس آئے اور پھر کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے والد صوفی تھے۔ مولاناؒ میں بچپن سے بڑوں کی طرح بولنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ جہاں تہاں تقریر کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان کے والد سے اس بات کی شکایت کی۔ انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ یہ تو ایک دن کی بات ہے ابھی کھیلنے کے دن ہیں۔ چنانچہ ایک دن پکڑ کر مولاناؒ کو بٹھایا اور توجہ کی۔ سارے بچکانہ خیالات یکسر ختم ہو گئے اور سنجیدہ ہو گئے۔ پھر مطالعہ کیا۔ ذہن قدرتی طور سے کھل گیا تھا۔ آج کی بہت سی تصانیف میں اکثر غلط باتیں مولانا سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ کسی نے مولانا کی تعلیم جامعہ ازہر (مصر) بتائی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ نے باضابطہ تعلیم کہیں بھی حاصل نہیں کی۔

مولانا بڑے باذوق آدمی تھے۔ عمدہ پوشاک تو ہوتی ہی تھی لیکن کھانے کا خاصا امتیازی ذوق رکھتے تھے۔ ارزانی کے دنوں میں بھی ان کا دسترخوان ایک وقت میں تیس روپے کا ہوتا تھا۔ کھانا اکیلے کبھی نہیں کھاتے تھے۔ میں مستقل تھا اور اکثر لوگوں کا روزانہ تانتا بندھا ہوتا تھا۔ خانساماں بہترین قسم کا رکھا گیا تھا جو بقول خود کبھی نواب واجد علی شاہ کے یہاں نوکر تھا۔ نواب کی گرفتاری کے بعد مارا مارا پھرتا تھا کہ مولاناؒ نے رکھ لیا۔ مولانا کی لوا

ے بعد وہ کہیں نہ رہ سکا۔ مولانا عمدہ کھانا، عمدہ ناشتہ اور عمدہ کافی پیتے تھے۔ سگریٹ قسطنطنیہ کا ہوتا تھا۔ ایک
رمیں نے کافی پینے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ کافی پینے سے نیند نہیں آتی اور تصنیف کا کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔
مولانا کہتے تھے کہ اُردو مشکل زبان ہے اور اسے سیکھنے کے لیے اہل زبان کو پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں تک
مولانا نے دہلی کے لال کنواں کے چوراہے پر ایک چائے کا ہوٹل کھول رکھا تھا جس میں دو نوکر چائے بنانے کو رکھ
چھوڑا تھا۔ خود کاغذ قلم لے کر ایک جگہ بیٹھ رہتے۔ جہاں کوئی بوڑھا شخص ادھر سے گذرا اور آواز دی ——
ے مزاج! اجی حضرت ذرا چائے تو پیتے جانا۔" چائے پلاتے گپیں کرتے ڈھلے ڈھلائے محاورے بے تکلفی سے سنتے
ور فوراً نوٹ فرما لیتے، چائے کے پیسے بھی نہیں لیتے اور رخصت کر دیتے۔

میرے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی آئے تھے اور وہ بھی ساتھ ہوئے۔ یہاں پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک
ن مجھ میں اور ملیح آبادی میں ایک لفظی بحث چھڑ گئی۔ میں کہتا لفظ 'بَل' صحیح ہے اور ملیح آبادی کہتے 'بَھل' صحیح ہے۔
خر میں مولانا کو ثالث بنایا گیا۔ مولانا پہلو بچا گئے کہنے لگے 'دونوں صحیح ہے۔ بھئی ابھی تو اردو بن رہی ہے!' میں نے یہ
سوال اودھ پنچ کو بھیجا۔ جواب آیا، ملیح آباد آم کے لیے مشہور ہے زبان کے لیے نہیں'۔

کلکتہ الہلال کے دفتر رپن لین کے اوپری منزل میں مولانا اور نیچے دفتر تھا جو میری رہائش گاہ بھی تھا۔ رپن لین
نا بھی انگریز رہا کرتے تھے سامنے کے مکان کی ایک میم مولانا پر فدا تھی۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگی۔ آپ کا مولانا
ہت بڑا پادری ہے۔ اس لیے مجھے ہر وقت تانک جھانک کرنا پڑتا ہے۔!

مولانا بڑے پاکباز تھے۔ ان کے عقیدتمندوں کی تعداد بیرون ہند بھی بہت زیادہ تھی۔ افغانستان کے ایک
عالم سر پر قرآن پاک رکھ کر ننگے پاؤں رانچی پیدل آئے تھے۔ یہ "الہلال" پڑھ کر مولانا کے معتقد ہوئے تھے۔ بہرحال
ہ نو وارد شخص پہلے عبدالکریم ٹھیکیدار سے ملا جو مولانا کے معتقد اور مرید تھے۔ عبدالکریم نے مجھ سے کہا میں نے خفیہ طور سے
ولانا سے ملوایا۔ ایک انسپکٹر سی آئی ڈی سامنے کی بلڈنگ میں ٹھہرا تھا جو ہر شخص کا حلیہ، آنے کا مقصد وغیرہ لکھا کرتا تھا یہ رانچی کی
ظر بندی کا دور تھا۔ کلکتہ میں بھی ان کا ایک دستور العمل تھا بلد نماز مغرب (عشا تک) قرآن پاک کا درس دیتے تھے (ایک نعیدؔ کی تفسیر
ئی مہینوں میں مکمل کیا) پھر عشا کی نماز پڑھنے جاتے۔ چلتے وقت دونوں ہاتھ پیچھے بندھا ہوتا اور سر نیچے ہوتا۔ مجھ سے راہ
ر باتیں کرتے جاتے۔ مسجد میں پہنچ کر نماز خود پڑھاتے۔ کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ تفسیر پاک کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ
رمایا وہ میری 'دارالارشاد' میں لیے گئے نوٹس میں ہے۔

دارالارشاد (کلکتہ) میں

مولانا آزاد کا درسِ قرآن

مرتبہ

زکریا بھاگلپوری

قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا کا نام ایک مستند بلکہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان چند سطور کی جھلکیاں "شرح و بیان" کے تحت پیش کر رہا ہوں شان نزول کا ہلکا اشارہ میں (ابتدا میں) دے چکا ہوں۔ یہ دراصل کلاس نوٹس اور اسے سینا پسس یا خلاصہ ہی کہہ لیجیے! قرآن کریم کی شرح پاک اور مولانا آزاد کا انداز بیان معرفان کے پیمانوں سے لبریز دو آتشہ کے صحیح معنی کچھ ہو سکتے ہیں تو شاید یہی ہیں۔ ان پر میری رائے سے زیادہ آپ کے فہم کی ضرورت ہے۔ دارالارشاد کے بانی اور پرنسپل مولانا تھے جو نمبر ۴۵ رپن لین کلکتہ میں کھولا گیا۔ ۵ فروری ۱۹۱۶ء سے اس کی ابتدا ہوئی اور ۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو اس کا خاتمہ اپنوں ہی کی ایک سازش کے نتیجہ میں ہو گیا۔ یہ مسٹر صاحب کے کلاس نوٹس ہیں جو انھوں نے ایک متعلم کی حیثیت سے مولانا کے لکچر سن کر لکھے۔ ان جواہر پاروں کو میں بغیر کسی حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل بعینہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اہل علم کو اپنی رائے قائم کرنے میں سہولت ہو ——— محمود واجد

۵ر فروری ۱۹۱۶ء

(السورۃ الفاتحۃ)

استعانت: تحفظ خود عمل فطری ہے۔ انسان اپنی محنت کا قائم مقام پیدا کرتا ہے۔

صنعت: ترکیب و انتخاب کو کہتے ہیں۔ ہر تلاش جو انسان نے کی ہے محض فطرت کی تحریک پر ہے۔ فطرت حدود اللہ ہے اور اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ کونٹ ٹالسٹائی: روسی فلاسفر، ماہر علم الاخلاق

طغیان: پانی کا اوپر اٹھنا۔ گوش: جرمن فلاسفر، ماہر علم الاخلاق۔

فطرت کی بربادکن قائم مقام صنعت ہے۔ تمدّن کی بربادی کا سبب پیدا کرنے والا تمدّن ہے۔ صنعت کی زیادتی بربادکنِ فطرت تمدّن ہے۔ قوت فطریہ پر اعتماد کرنا اور صنعت سے اعتراض کرنا ترقی کا سبب ہے۔ فطرت کی مخالفت جرم ہے۔ صنعت غیر فطری بھوک پیدا کرنے والی چیز ہے۔ کونٹ ٹالسٹائی حامی اسلام تھا۔ اسلام کو دنیا میں پیش کیا تاکہ قوت فطری کو دنیا میں قائم کرے۔ ہر فطری ولولہ پر نماز مقرر ہے۔

مرعوبیت صنعت: بربادکن عالم اسلام ہے اور یہی ایک علت ہے جو عالم اسلام میں چھائی ہوئی ہے۔ جذباتِ ایمان ہی سبب ترقی ہے اور غلبہ و فتح۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین ہی سے عربوں نے ساری دنیا پر فتح و نصر پایا۔ جو اللہ پر اعتماد کرے گا اس میں انتہائی

وت وزور موجود ہوگا ایاک نعبد کی طرح ایاک نستعین بھی ایک مستقل چیز ہے۔ بقول ابن قیم۔

۷ فروری ۱۹۱۶ء

مسلمانوں میں تنزلی کا سبب یہ ہے کہ وہ مسئلہ استعانت کو چھوڑ بیٹھے استعانت بلا محنت و کوشش محض لغو ہے۔
ہمت اور کوشش ہی جذبات ہیں اور صبر برداشت بھی شامل ہے۔ ہر قوم جذبات ہی سے قوم بنی ہے۔
اعتقادات تو ذہنی ہیں جذبات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ترقی جذبات ہی سے ہوتی ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے تعلق ہے۔

ترقی و کامیابی میں استعداد و کوشش کرد۔

فتح و نصرت محض جذبات میں ہے۔

فوج کی کامیابی سپاہی کے بدن و جسم پر نہیں ہے بلکہ جذبات اور استطاعت میں ہے۔ تم جتنا کر سکتے ہو کرلو باقی میں کرلوں گا۔ استطاعت تک استعداد کر کے خدا پر بھروسہ کرو یعنی استعانت۔ تدبیر در فع ایک بدترین اور توں عجز کا نام ہے بچاؤ علامت ہے بزدلی کی دفع کا ظہور تنزلی میں ہوتا ہے۔

وسائل پر بھروسہ کرنا جو بربادی کا نتیجہ ہے استعانت اس کو مٹا کر اقدام کی راہ دکھاتی ہے۔
اعتقادات کو ذہنیات و دماغ سے تعلق ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے لگاؤ ہے مقصد نزول قرآن دفع وسائل ہے۔

۸ فروری ۱۹۱۶ء

انسان یا قوم کی ترقی و عزت صرف احساس میں ہے۔ احساسات کا مٹنا ہی بربادی ہے۔
سورہ فاتحہ ایک ایسی قوم بنا رہا تھا جو ساری دنیا اور اقوام کا فرمانروا ہو اور سب کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ سورہ فاتحہ کا ارادہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت و احساس پیدا کر دے جو کسی مشکل و سختی میں کبھی نہ دبے اور اپنی خواہش میں بھی کامیاب ہو اور تمام جہاں میں تنہا سیدالرسل ہے۔ جب انسان کل مشکل طے کر چکا تو اس کو اب کیا کرنا چاہیے اس لیے ایک نصب العین ہونا ضروری ہے۔
بسم اللہ انقطاع کل خدا کا توسل پیدا کر کے سب سے الگ کر دے۔ تخلقوا باخلاق (اوسط اخلاق پیدا کرو)
بسم اللہ اور الحمد میں یہ ربط ہے کہ وہ عالم میں ایک حس رفیع پیدا کر دے جو سوائے اللہ کے اور کوئی چیز اسکی نظر میں نہ ہو۔
مشکلات حیات مالک یوم الدین کے اقرار سے دفع ہو گئے۔

(السورۃ الفاتحہ)

<u>۹ فروری ۱۹۱۶ء</u>

راستہ، مسافر، منزل مقصود ـــــ یہی نصب العین ہے۔ جب انسان صراط المستقیم کا متمنی ہوتا ہے معاً
منزل طواغیت وضلالت کی طرف بھی نظر پڑتی ہے اور ایک تحقیر آمیز نگاہ اس پر ڈالتا ہے۔ بغض وحسد کوئی مستقل
چیز نہیں ہے بلکہ محبت کے ذیل میں یہ آجاتے ہیں۔ بامنعام یافتہ کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ مغضوب علیہم سے
دشمنی نہ پیدا کریں۔ قرآن کریم نے ہمکو جو مخصوص چیز بتلائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک کی دوستی کے واسطے دوسرے کی دشمنی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

آمین

<u>۱۰ فروری ۱۹۱۶ء</u>

یہ لفظ عبرانی ہے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اللہ ایسا ہی ہے یہ وہ لفظ ہے کہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا۔
سورہ فاتحہ میں آمین ضرور کہنا چاہیے کیونکہ آنحضرت صلعم برابر پڑھتے تھے۔
سورہ فاتحہ کو کیوں نماز میں شرط کیا گیا۔ چونکہ یہ دستور العمل ہے۔ خدا نے مسلمانوں کو عطا کیا ہے۔ دن میں ۲۲ مرتبہ
اس کو یاد کرایا جاتا ہے۔ نماز سریہ میں تو سورہ فاتحہ کو امام کے پیچھے ضرور پڑھنا چاہیے۔ لوجہ نہیں سننے کے ورنہ سننا
چاہیے کیونکہ یہ دستور العمل ہے۔ اور جہریہ میں امام چونکہ زور سے پڑھتا ہے۔ مقتدی کے لیے یہی کافی ہے اگر سن رہا ہو ورنہ پڑھے۔
لفظ سورہ ' چہار دیواری ـــــ اطلاق فی القرآن الشریف۔ چونکہ قرآن سورتوں سے گھیرا ہوا ہے۔
سورتوں کی ترتیب آنحضرت صلعم نے خود کی ہے۔

سورۃ بقرہ

<u>۱۱ فروری ۱۹۱۶ء</u>

مکی سے مراد آغاز عہد کا نزول اور مدنی سے مراد آخری نزول ہے۔
تورات بخت نصر کے زمانہ میں زائل ہوگئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے حافظہ کی بدولت مرتب کیا
پھر ٹیٹس کے حملہ میں برباد ہوگئی۔ دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ کمزوروں کو زائل کردیتی ہے اور جسمیں سلامتی وصحت
ہے وہ تو باقی رہتی ہے باصول علم ارتقاء۔
دنیا ہر بہتر اصلح چیز کو باقی رکھتی ہے اور معیوب کو برباد کردیتی ہے۔ بقاء اصلح ہی قرآن کو سلامت رکھتی
ہے۔ اسی قاعدہ کی رو سے زبانیں بھی جو اصلح نہ ہوں فنا ہوجاتی ہیں اور ہوگئیں۔ باطل کیسے رہ سکتا ہے؟ کیونکہ وہ تو
مٹنے والی شے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قرآن کی ایک ایک چیز بدستور موجود ہے قرآن پاک خود موجود ہے۔ کیونکہ وہ
اصلح ہے اور موجود رہے گا اور یہی صداقت ہے۔ بخت نصر نے حملہ کیا اور تورات کو برباد کردیا۔ ہلاکو خان
آیا کل کتابیں جلا کر دجلہ میں ڈال دیا جس سے پانی سیاہ ہوگیا ہے۔ پر قرآن پاک کو کچھ نہ کرسکا۔ دنیا کو جس چیز کی

ررت ہے اس چیز کو فطرت چھوڑ دیتی ہے۔ باتفاق کل سورہ بقرہ مدنی ہے بعض اختلاف کرتے ہیں کہ وہ مکی ہے۔
عموماً مجمل ہے برخلاف مدنی کے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں سب اجمال و تفصیل ہیں کیونکہ یہ ارتقاء کا اصول ہے۔
انچہ قرآن میں بھی اجمال و تفصیل ہے۔ اس قیاس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منجانب صاحب فطرت ہے۔ نزول
آن ہی شاہد ترتیب ہے جس قدر سورتیں ہیں وہ ضرورت پر نازل ہوئی ہیں اسلیے بادی النظر میں اختلاف باب معلوم ہوتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ البقرۃ)

تمام تعلیم میں خدائی اصول یہ رہا ہے کہ ایک جماعت تیار ہو جو تبلیغ دین الٰہی کی کیا کرے۔ نبوت انبیاء
کام کر کے چل دی۔ اب وہ جماعت جو اس کے قائم مقام میں ہے نبوت کی جگہ کام کرتی ہے۔

نزول قرآن کا دو کام ہے۔ ایک تو وہ جماعت تیار کرنا جو نبوت کی جگہ کام کرے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ وہ نسل
جو آنے والی ہے اس کی صلاحیت کی جائے۔

فطرت جب کوئی چیز بناتی ہے تو وہ ابتدا میں اجمال کے ساتھ ہوتی ہے بعدہ تفصیل وار ہوتی ہے۔
خدا کا کوئی کام بلا نظم کے نہیں۔ اللہ کا کوئی کام بلا ربط نہیں ابتدا میں جس طرح حالت گذرتی ہے اور انتہا میں جس طرح
مکمل ہوتی ہے۔ بعینہ قرآن پاک کی ۲۳ سالہ زندگی میں گذاری تعلیم باقاعدہ تدریجاً استعداد کے موافق ترقی کرتی ہے۔

ترتیب قرآن استعداد مخاطبین کے موافق ہے اور نزول تو ذریعہ بنا جماعت۔

تعلیم کی اولین بنیاد وجدان وجذبات ہے۔ انجماد قوئی دماغی ابتدائی مرحلہ ہے اور وجدان سے یہ مرحلہ
طے ہو جاتا ہے اس کے بعد مرتبہ ذہن و عقل کا آتا ہے۔

جتنی ابتدائی چیزیں ہوتی ہیں وجدانیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ مکی سورتیں ابتدائی سورتیں ہیں اس لیے وہ
وجدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ فطرت مقتضئ وجدان ہے۔

۱۴ فروری ۱۹۱۶ء

۲۷ سورتیں مدنی ہیں اور باقی مکی ہیں بروایت ابن عباس سورہ بقرہ سے لغایت سورہ ۵ تک کل مدنی ہیں
باتفاق۔ انفجار۔ یک بیک جلدی سے قوت کا ابھرنا ــــ پھٹ جانا سورہ مکی میں کثرت سے تہذیب وصلاح کا ذکر آیا
ہے۔ بقول مل سب سے پہلے ترقی کے واسطے پولیٹیکل ترقی بعدہٗ اور ترقیاں ہو جائیں گی جب انسان آزاد ہوا اور قید سے باہر
ہوا تو وہ اب ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے۔

قرآن نے سب سے پہلے دعوت فکر عمومی دی ہے یعنی پہلی منزل قید سے نکلنا ہے جب وہ قید سے نکل چکا تو

اب بارِ کی دعوت دی جاتی ہے یعنی فلاح و بہبودی۔ سورہ مکی میں بھی تدریجی فرق موجود ہے۔ اجمال و تفصیل میں بھی فرق ہے۔ مکی میں بھی پہلی سورہ چھوٹی ہے۔ یونس، ہود، رعد، ابراہیم، نحل وغیرہ بڑی ہیں اور مکی ہیں۔ مکی میں عموم کم اور خصوصیت زیادہ ہے۔

مکی سورتوں میں سب سے زیادہ سہولیت ہے اور مدنی میں برعکس مثلاً نزول میں سب سے چھوٹی سورتیں جیسے پارہ عم مقدم و متوسط و متاخر۔ اس میں کوئی حکم حلال و حرام نہیں ہے۔ اس میں اصولی اور عمومی بحث ہے۔ نبأ عظیم میں فتح مکی کی خبر ہے۔ اللہ جس چیز کی سب سے پہلے دعوت عمومی دیتا ہے وہ اس کی صنعت کاری وغیرہ ہے۔ پھر تکذیب کا بیان ہے۔ جزا و سزا کا ذکر جداگانہ ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۱۶ء

(سورۂ بقر)

مَنْ حَرَّمَ ۔۔۔ کے بیان سے مذمت دنیا، رہبانیت وغیرہ کو رد کیا ہے۔ غرض جو کچھ بیان کیا گیا ہے مختصر کیا ہے۔

سورہ نحل میں زیادہ دلچسپ بیان ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں دین الٰہی کے بڑے بڑے نتائج مندرج ہیں۔

سورہ رعد میں مظاہر فطرت کا خلاصہ ہے اور یہ تمام مکی ہیں۔

سورہ بقرہ مدنی ہے اور یہ سب سے پہلے کیوں رکھی گئی اگرچہ اور بھی مدنی سورتیں تھیں؟ شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ جب سورہ بقر اتری تو اس وقت کون کون مذہب جزیرۂ عرب میں تھے۔ (تفصیل کے واسطے دیکھیے فوز الکبیر)۔

اللہ نے عرب ہی کو مرکز برائے اصلاح عالم کیوں مقرر کیا؟

قرآن کریم نے منکر کو منکر صرف اسلیے نہیں کہا ہے کہ وہ خدا کا ماننے والا نہیں تھا بلکہ اس کو جو اپنے عمل اعتراف خدا کو ظاہر نہیں کیا۔ جس وقت قرآن نے نزول کیا اس وقت بھی منکرین خدا موجود تھے۔ یہ مقابلہ نیا نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ خدا کو جانتے تھے تو ضرور لیکن ہستیٔ خدا سے منکر تھے۔

قرآن شریف میں اہل کتاب سے کون مراد ہے؟ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے وقت میں بھی اختلاف ہوا تھا کہ اصحاب ژند و اوستا بھی اہل کتاب ہیں۔ بعض کی رائے میں قریش عرب بھی اہل کتاب ہو سکتے ہیں کیونکہ جب صحف ابراہیم کا لفظ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے اور قریش بھی اپنے کو متبع ابراہیم کہتے ہیں۔ بہرکیف یہود و نصاریٰ کو تو قرآن پاک نے اہل کتاب کہا ہے اور مشرکین عرب کا صرف دعویٰ ہی تھا کوئی کتاب موجود نہ تھی ——— لہٰذا مشرکین عرب کو اہل کتاب نہیں کہہ سکتے۔ یونان میں مدون کتاب "ہیروڈوٹس کی تاریخ" ہے۔ اس وقت یہودی سب سے زیادہ "اعلم" سب سے زیادہ معلومات کا خزانہ رکھنے والے تھے۔ سب سے زیادہ مذہبی معلومات رکھنے والے بھی یہود ہیں۔ مخاطب اگر سب سے زیادہ اعلم ہے تو اس کی تفہیم کے واسطے کلام بھی زیادہ افصح اور پُر از اشارات ہونگے یہی اصول مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

۱۶ر فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ البقرۃ)

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ہم نے دوسال میں سورہ بقر پڑھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے سورہ بقر ختم کی تو اس خوشی میں لوگوں کو دعوت دیا اور ایک بقرہ قربانی دی۔ سورہ بقرہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا عامل دنیا اور دین دونوں کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ دنیا سے صرف ظلمت و ضلالت ہی نہیں دور کرتے بلکہ ظلم و تعدی بطالت و استبداد کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتے ہیں۔ اس کی تلاوت دل میں صادق جذبات و تحقیقی وجدان پیدا کرتی ہے۔ سورتوں کا نام آنحضرتؐ ہی نے مقرر کیا تھا کیونکہ مسلم شریف میں آیا ہے کہ بعض مرتبہ دو دو سورتیں بھی اترتی ہیں اور آپ نے کاتب سے فرمایا ہے کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ اور فلاں سورت کو فلاں جگہ لکھ لو۔ لنظر بریں روایت یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ سورۂ قرآن اور اسمائے سور آنحضرت صلعم کے عہد ہی میں مرتب ہو چکے اور ربط مقرر ہو چکا تھا، ہاں رکوع و اوقاف قرآن حجاج نے مقرر کیا تھا۔

حروف مقطعات: عربی کے جمیع حروف ابجد بامعنی ہیں۔ لہٰذا کل حروف کے اسما بھی ہیں مثلاً الف جس کے معنی ایک اور ایک کے ہے لیکن قرآن پاک میں جس قدر حروف مقطعات ہیں ان کے معنی آج تک فہم میں نہیں آئے۔ جمیع فہم معنی سے عاجز ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ ان کے معنی خدا ہی جانتا ہے۔ لہٰذا جس کے معنی مجھ کو یقین کے ساتھ معلوم نہیں اس کی تاویل کرنا نہیں چاہیے۔ اگر سورتوں کا نام کہا جائے تو چنداں غیر مفید نہیں۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ ۵ قرآن کے اندر جو کچھ ہے بیان کرنے کے قبل ہی سچائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ قرآن پاک حقیقتاً مدون شدہ کتاب ہے۔ خدا اپنے علم میں اس کی تدوین کر چکا تھا۔ اب بحالت نزول بھی کتاب یہی وجہ ہے کہ نزول سورت ہی میں وہ الکتاب کہلایا۔

۱۹ر فروری ۱۹۱۶ء

قرآن شریف نے سب سے پہلی چیز جو دنیا میں پیش کیا وہ لاریب فیہ ہے۔ قرآن کی یہی سب سے پہلی صفت ہے۔ تمام تعلیم الٰہی تمام صفت لامتناہی جو خدا کی کتاب میں ہونا چاہیے وہ لاریب فیہ۔ اب دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے مشاہدہ چیزوں کو دکھلا کر وجود کی موجودگی کا یقین دلا دیتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت نہیں تبلا سکتا ہے۔ جتنی چیزیں مجرب کی ہیں ان میں یقین کو اس لیے دخل نہیں کیونکہ حقیقت حاصل نہیں ہے۔ جب حقیقت تو یقین نہیں ہے بس سب میں شک ہے۔ یورپ کے مشہور فلاسفر ہیوم نے کہا ہے کہ جس قدر چیزیں نظر آرہی ہیں کوئی کا درجہ نہیں رکھتی ہیں، سب میں شک ہے۔

بیکن نے فلسفہ اور علم طبعی کو علاحدہ کیا ہے۔ ۲۷ مذہب فلسفہ جدید میں پیدا ہو چکے ہیں۔ بعد تمام دلائل
کے یہ امر پایۂ ثبوت کو یوں پہنچی۔ غیب وہ ہے کہ جس کو حواس خمسہ سے دریافت نہ کرسکیں۔

۲۱ فروری ۱۹۱۶ء ذالک الکتاب لاریب فیہ

ہر نوع انسان جس چیز کا متلاشی ہے وہ یقین ہے۔ اور یہی کامیابی ہے۔ یونانی اسکول سوفسطائی کی تعلیم
اب بھی یورپ کے بہتر سے بہتر اسکول میں موجود ہے اور وہ تعلیم شک دیتی ہے۔
ڈاکٹر سی۔ بان بھی وجود کا قائل نہیں وہ شک بتلاتا ہے۔ یقین کا خاصہ عدم تزلزل، عدم تغیر، عدم تذبذب
ہے۔ یقین انمول ہے۔ سوائے شک کے دنیاوی ترقی کچھ نہیں دیتی۔ انکار کی پیدائش فطرت کے خلاف اور نیچر
مخالف ہے۔ وہ انکار خواہ کسی میں ہو، انکار تو عدم علم کا ثبوت ہے۔ انکار محض جہل ہے۔ ارباب علم نے کبھی
انکار خدا نہیں کیا۔ اگر کیا تو چند اراذل و سفہا نے۔ جب کسی کو کسی چیز میں یقین نہیں ہوتا تو عزم و محنت بھی مفقود
ہوتا ہے۔ جب سپاہی کے اندر یقین نہیں ہے تو وہ ضرور شکست و ناکام رہے گا۔ کامیابی یقین و عمل صالح پر منحصر
اختلاف نتیجہ شک ہے اور یہ جہل ہے۔ یقین تو علم ہے جب علم ہوگا تو اختلاف کبھی نہ ہوگا۔ شریعت علم و یقین
اس لیے اس میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کو ہم محسوس نہیں کرسکتے وہ غیب ہے۔ دنیا میں وحی الہی ؟
ہے چونکہ خوف میں شک رہتا ہے جب شک یعنی خوف زائل ہوجاتا ہے تو امن بھی قائم رہتا ہے۔
ہے اور یقین ہی ایمان ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم ایمان ہے، جہل کفر ہے۔ اگر یقین کا کوئی منتہا درجہ ہے تو
ہے۔ تقلید نتیجہ ہے جہل کا۔ علم کبھی بھی تقلید نہیں۔ تقلید تو محض ظن ہے جو شک ہے۔ شریعت کا نام علم رکھا
کے بعد تو جہل ہے۔ اہل علم و اہل جہل بصیر و اعمی۔ شب زندہ دار کو چونکہ خداوند کریم پر پورا یقین ہے جب ہی تو
رات کو کھڑا رہتا ہے۔ لہذا اول بنیاد کامیابی کی یقین ہے اور شک زوال کامیابی ——— !

۲۲ فروری ۱۹۱۶ء ھدی... مفلحون

راغب اصفہانی: متقین کا مادہ وقا ہے۔ کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اذیت سے اب اس کا اطلاق خوف
یعنی خوف اس بات کا کرنا اذیت و مضر سے بچا رہے۔ قرآن نے جو جماعت تیار کی ہے اس کا اولین نام متقی
ہیں انسان نے خدا کو خوف میں ڈھونڈھا۔ موسیٰؑ کے وقت میں اللہ و بندہ کا تعلق مانند تعلق زوجہ و زوج
بعدہٗ قہریت کا وزن کم کرنے کے لیے مسیحؑ نے باپ بیٹے کا تعلق بتایا۔ اور اب محبت کی ارتقائی نسبت
اس لیے اب کل تعلق دوری کو چھوڑ کر ملا دیا اور ربوبیت کا تعلق پیدا کردیا تاکہ کوئی غیر تعلق نہ رہے۔ اب خدا

تعلق براہ راست پیدا ہوگیا کیونکہ اب بندہ صاحب استعداد ہو چکا ۔۔۔۔!

سورہ فاتحہ میں اللہ نے جو پہلا حسن دکھایا وہ یہ ہے کہ پہلے نام بتایا بعدہ رب کہا جو غایت درجہ کی مہربانی ہے۔ اللہ کا خاص تعلق محبت سے ہے۔ انسان کی اصلی فطرت نیکی ہے۔ انبیاء کا کام صرف زنگ کو جو فطرت میں چھا گیا ہے دور کرنا ہے۔ بدنیکی کا عدم ہونا ہے۔ عدل پر چلنا ہی خیر ہے۔ گمراہی و مضرت سے بچانا فطرت و قلب کو یہی ارتقاء ہے۔

۲۳ فروری ۱۹۱۶ء

نزول، لغوی، اوپر سے نیچے آنا۔

آخر، لغوی یعنی وہ جو سب کے بعد آوے۔

قرآن نے جزا و سزا کا نتیجہ دنیا و قیامت دونوں میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ قانون مکافات دونوں جگہ ہے۔

الغیب: نظر سے پوشیدہ ہونا، غیر محسوس ہونا۔

دعویٰ کے صدق و کذب کی جانچ یہ ہے کہ دعویٰ کو کر کے دکھاوے۔ مثلاً حکیم کا دعویٰ حذاقت میں فرد ہونا یہ ہے کہ وہ مریض کو لاوے اور اچھا کرے۔ دیگر دعویٰ کی لیاقت ہے یا نہیں۔

قرآن نے جو دعویٰ کیا ثابت کر دکھایا بیماری دفع کی اور جماعت متقی تیار کردی۔ جو تندرستی حاصل کرتا ہے وہ ایمان الغیب پر یقین رکھتا ہے۔

الغیب: ذات الٰہی چونکہ حواس سے غیر محسوس ہے، وہ قرآنی جماعت جس کے اندر اللہ تعالیٰ کے وجود پر اس قدر یقین ہو جائے جس قدر محسوسات میں بھی نہیں ہو سکتا ہو۔ اس طرح یقین کرنا کہ بالکل زوال شک ہو جائے۔ کمال درجہ پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔ مثلاً عبادت الٰہی اس طرح کرنا گویا اللہ کو نظر سے دیکھ رہا ہو۔

الصلوٰۃ: ایام جہالت میں اس کے معنی تھے گھوڑے کے پیچھے گھوڑا کا دوڑنا، تالی بجانا یعنی عرب جاہلیت میں عبادت کے وقت عبادت میں کچھ موسیقی کا استعمال کرتے تھے۔ اصل معنی جو شعراء عرب نے استعمال کیا ہے وہ بلند دعا کے ہے۔ متقی تو خود ہدایت یافتہ ہوتا ہے پھر متقی کی ہدایت کیسی؟ یہ انتفاع جو اس کو ملا ہے وہ قرآن شریف کا ہے۔ اس کو جو تندرستی ملی ہے وہ اسی علاج سے۔ وہ گروہ جو اپنی بیماری کو اچھی طرح سمجھا اور علاج کرایا وہی لوگ متقی ہیں۔ قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ پہلے وہ وجدان بیان کرتا ہے بعدہٗ ذہنیات۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر یہود ہی کے بیان ہیں۔

۲۶ فروری ۱۹۱۶ء

ایمان بالغیب یہ صفت متقی کی ہے جو قرآن کے ذریعہ بنی، مومن خیر البریہ ہے۔ یہ دنیا میں آئے۔ یہ علمی بحث

ہے۔ اور باعتبار عمل کے غیب پر یقین رکھنے والا ہے۔ قرآن نے جس جماعت کو تیار کیا ہے گو دنیا ایمان بالشہود پر چل رہی ہے مگر یہ جماعت وہ ہے کہ اللہ نے جو چیز پر پیدا کر دیا اس کے تسلیم میں کچھ شک نہیں کرتے جو رسول م نے کہہ دیا اس کو بن دیکھے مان لیا متقی مومن کی یہی پہچان ہے ۔ مومن و غیر مومن میں یہی فرق ہے کہ مومن اللہ اور رسولؐ کی بات میں شک نہیں کرتے ۔ اگر ان سے کہا جائے کہ تم آگ میں کود جاؤ اس میں تمہاری فلاح ہے وہ بلا شک جھپ جھپ آگ میں کود جائیں گے ۔ غیر مومن تو حواسِ خمسہ پر زندہ ہے ۔ اگر اس کو روٹی ملی تو زندہ ہے اگر یہ گم ہو گئی تو وہ مر گیا ۔ اور اللہ کے بندۂ مومن کا یقین تو اللہ ہی کے فرمان اور رسولؐ کے حکم ہیں ۔ وہ حواس پر یقین رکھتے ہیں حواس پر بھروسہ نہیں کرتے ۔ مومن تو ایمان بالغیب فطرۃً ساتھ لیتا آتا ہے کیونکہ ایمان بالغیب تو ذوقِ سلیم ہے اور جب ہی تو کافر کو مریض کہا ہے ۔ کیونکہ مرض ہی کی وجہ سے ایمان کی حلاوت معلوم نہیں ہوتی محض تلخ معلوم ہوتا ہے ۔ یہ بات کس قدر بوالعجب ہے کہ وہ امر جو ہماری نظر سے گم ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے اس پر پورا یقین ہے اس کی فرماں روائی پر زندگی منحصر ہے ۔ اگر ایمان بالغیب نہیں ہے تو وہ ہرگز مومن نہیں ہے ۔ جب ایمان بالغیب پر یقین رکھتا ہے تو وہ سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ تمکو تمام دنیا کی خلافت دی جائیگی اور وہ ایمان بالغیب کا متوالا فوراً یقین کر لیتا ہے آخر وہی ہوا جو وعدہ ہوا تھا ۔ جس نے ایمان بالغیب پر یقین کر لیا اب وہ کبھی بھی شک نہیں کرتا چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کو ایران کے تخت کسریٰ کا تاج ملے گا گرچہ ان سے وطن چھوٹتا ہے عزیز سے عزیز چیزیں چھوٹتی ہیں مگر وہ ہے کہ اس یقین پر پورا بھروسہ کیے ہے آخر وعدہ کے موافق فائز المرام ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن نے یہی جماعت تیار کی اور وہ جو کچھ کہا اس پر وہ اس طرح یقین کر لیا کہ اس کے خلاف ذرہ بھر بھی شک نہ ہو اگرچہ اس پر کیسا ہی ستم ہو ۔

۲۸ ر فروری ۱۹۱۶ء

بغیر دیکھے ہوئے ۔ معنی ہے بغیر دلائل کے ۔ مومن ایک وجود ہے جس کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ جو کہا وہ یقین ہو گیا ۔ سبب تنزل صرف ایمان بالغیب کا گم ہونا ہے ۔

اور ترقی جو قرونِ اولیٰ میں حاصل ہوئی تھی وہ ایمان بالغیب کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی ۔ چونکہ اس میں ایمان بالغیب تھا اس لیے ثمرہ پایا ۔ ساری دنیا پر حکومت کی وہ صرف ایمان بالغیب تھا ورنہ اور کیا تھا ؟ اس لیے تعداد کا مسئلہ ان میں سے جاتا رہا تھا ــــــ یقین کا ثبوت اعضاء جوارح سے ہونا چاہیے ۔ اللہ جو کچھ فرمادے اس کو مان لینا اور اس پر یقین کرنا ۔ اُمت آخرہ کو اُمت اولیٰ پر اسی لیے فضیلت ہے چونکہ یہ آنحضرت صلعم پر بن دیکھے

یمان لایا ہے۔ اور وہ آنکھ دیکھا ایمان رکھتے تھے۔ ایمان بالغیب ہی کی فضیلت میں اُمّتِ آخرہ کی تعریف کی گئی ہے۔
ایمان بالغیب میں دل و دماغ شامل ہیں اور اعضاء جوارح میں صوم وصلوٰۃ شامل ہیں جس قدر مطلوبات ہیں وہ شامل
جوارح سے ہیں۔ تیسری چیز ثمرہ اعمال ہے یعنی تلاش رزق۔ تلاشِ رزق صرف تنازع للبقا ہے۔ مال نتیجہ جد وجہد اور تیسری
چیز ہے۔ جیسے دل و دماغ: ایمان بالغیب، اعضاء جوارح: صلوٰۃ، مال و دولت: رزق مما تحبون۔
خدا کا مسافر جب سفر طے کرے گا تو پہلی منزل دل و دماغ ہے۔ دوسری منزل اعضاء جوارح اور تیسری منزل
مال و دولت۔ انھیں تین منزلوں کا مرکب صراط مستقیم ہے۔

۲۹ر فروری ۱۹۱۶ء — والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک

اب کسی ایک پر خصوصیت نہیں ہے بلکہ وہ ایسا گروہ تیار ہوا ہے جو کسی ایک صداقت پر دعویٰ نہیں کر سکتا
کیونکہ یہ تو ایسی جماعت ہے کہ اب اور ماقبل کی کل صداقتیں اسمیں موجود ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہم نے
ایک ایسی جماعت تیار کر دی ہے جس میں صداقتِ موسوی و مسیحائی سب موجود ہے۔ متقی میں آخری درجہ وما انزل
من قبلک ہے۔ وبالآخرۃ ہم یوقنون (مفصل بیان سورہ فاتحہ میں دیکھو) الی مفلحون۔
فلاح یافتہ وہ ہے جس کے یقین و عزم و عمل اس قدر مضبوط ہوں کہ وہ کبھی کبھی کسی نقصان سے دب نہیں
سکتا۔ ان الذین کفروا — کفر بمعنی چھپانا۔

یکم مارچ ۱۹۱۶ء

جب کبھی راستی پیش کی جائے تو بلحاظ قبول کون جماعت اور کون نوع ہوگی۔ ایک جماعت وہ نظر آئے گی
جو حق پسند یعنی متقی۔ وہ پہلی جماعت ہے نیز اس میں استعداد بھی قبول حق کی موجود ہے یہ وہ جماعت جس میں رشتۂ قبولیت
موجود ہے۔ واولٰئک ھم المفلحون ٥
قرآن نے گمراہوں کو دو جماعت میں تقسیم کیا ہے۔ چونکہ یہ بحث مذہبی ہے اور قرآن مذہبی کتاب ہے۔
دنیا میں دو گروہ ہیں اصولاً ایک وہ جس نے حق کو نہیں پہچانا۔ اور جو روشنی حق کی اور ہدایت کی آتی ہے وہ اس سے
فیض حاصل نہیں کرتا بلکہ آنکھوں کو اس سے بچاتا ہے چونکہ اس میں استعدادِ اخذ فیض نہیں ہے۔ چونکہ بطالت اس کے قلب
میں پوری طرح تسلط کر چکی ہے، قوت احساس فنا ہو چکی ہے۔ وہ جس حال میں ہے قانع ہے۔ قوتِ تمیز مفقود ہے۔ کفر تو
تکذیب رسول ہے یعنی انکار حقیقت اور دوسری نسل اسی کے ضمن میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود معرفت حق
کے حق سے اعراض — وہ تو جانتا ہے کہ اس میں حق کی روشنی ہے مگر اس کے تسلیم میں فقدانِ عرفن کی وجہ پیدا ہوتی

ہے۔ بعوض قبولیت کے وہ اصرارِ حق میں پوری طرح کوشاں رہے گا۔ وہ حق کو اس لیے دفع کرتا ہے کہ اس کی قبولیت میں
اسکی غرض فوت ہوتی ہے۔ تجارت میں کمی واقع ہوتی ہے تو صرف قبول ہی نہیں کرے گا حق کو مٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔
اب تیسری جماعت وہ ہے جس میں کچھ دعوی تو حق کا معلوم ہوتا ہے مگر محض جاہل ہے۔ مذہبی جماعت ہونے کا
حریفانہ دعویٰ تو کرتا ہے مگر حقیقت سے ہے بے علم۔ وہ دوسرے کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتا ہے۔
یہ دنیا میں بوسیع ساری ہے۔ خادع مخادع کا عامل ہے۔ چونکہ علم مذہب ہے اس لیے مفسد ٹھہرتے ہیں۔

ان الذین کفروا... سواءٌ علیھم انذرتھم ام لم تنذرھم ——

وہ اس لیے نہیں دیکھیں گے۔ ختم اللہ علی قلوبھم ——

اس کی ضرب پہلی یہود پر پڑتی ہے۔

ومن الناس من یقول ——

۲ مارچ ۱۹۱۶ء

عمل صالح سے بقاہے اور غیر صالح سے فنا ہے یہی قانون الٰہی ہے۔ کوئی تعمیر بلا تخریب کے ہو ہی نہیں سکتی۔
تعمیر کثیر تخریب قلیل پر فوقیت رکھتی ہے۔ مذہب اگر تعمیر ہے تو شمشیر ہے اس کی مضبوطی منحصر ہے۔ قانون بقاء
اصلح کے مطابق مذہب کا تلوار چلانا نہایت بہتر کام ہے اور یہی سنت اللہ اور اس میں تبدیلی محال ہے۔

ختم: ڈھانک لینا، قلب: عقل

یخادعون اللہ۔ یعنی وہ جس عمل کو کرتے ہیں حقیقت میں وہ عمل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا دعوی کرتے ہیں کہ ان میں ہے
حالانکہ ان میں نہیں ہے۔ وہ دراصل اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں وہ تخلف الٰہی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے نقصان میں پڑے ہوئے ہیں۔

فی قلوبھم مرض۔ سے مراد تعطل عقول تعطل تفہیم ہے کمال ضعف۔
فزادھم اللہ مرضاً۔ اب امر الٰہی ظاہر ہوگا اور ان کے تعطل تفہیم و بصارۃ کا نتیجہ نکلے گا جسکی زیادتی پر دکھ کی زیادتی ہوتی ہے۔

۴ مارچ ۱۹۱۶ء ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم فزادھم اللہ مرضاً

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ ہی مرض بڑھانے والا ہے تو پھر جزا و سزا کیا؟ یہ خیال محض غلط ہے۔
صحابہ کرام جو بہترین قرآن سمجھنے والے تھے کبھی بھی اس کے متعلق ایسا خیال نہیں کیا اور نہ شبہ کیا ——
یہ تو اس جماعت کی حالت ہے جو نسلاً بعد نسل اپنی سہل انگاری سے ایسی بری کرلی ہے۔ اب خواہ ڈراؤ یا نہ
ڈراؤ وہ تو اس کی طرف خیال نہیں کرنے والے۔ وہ تو اللہ کی دی ہوئی چیز سے کام نہیں لیتے تو قانون الٰہی یہ ہے کہ

ایسا مریض ضرور مر جائے گا۔ جس قوت سے کام نہ لیا جائے تو لامحالہ وہ قوت زائل ہو جائے گی کیوں کہ یہ قوانین قدرت ہیں اور اسی قانون کو اپنی قدرت کی طرف نسبت دیتا ہے اسی لیے ختم اللہ... فرمایا۔ کیونکہ یہ طریقہ تعبیر ہے اسی مسئلہ کو بعض مسئلہ قضا و قدر کہتے ہیں محض غلط اور صریح غلط۔ فزادہم اللہ مرضاً سے مراد شریعت حقہ کا نزول ہے کیونکہ وہ تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ حق کے آنے سے ضرور دکھ بڑھے گا۔ واذا قیل لہم لاتفسدوا... جب اس سے کہا جائے کہ فساد مت کرو جواباً کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں فساد سے کیا علاقہ بعض کہتے ہیں کہ اصلاح سے مراد صلح؟ درمیان قریش و مسلمان کے کیونکہ کافر کہتے تھے کہ ہم تو ان دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں اور اللہ کہتا ہے کہ نہیں، یہی فسادی ہے۔

فساد سے مراد کفر ہے۔ اصلاح سے مراد ہے شریعت اسلامیہ کا قائم ہونا۔ مصلح سے مراد جو شریعت الٰہی پر چلے اور مفسد سے مراد جو شریعت الٰہی کا مخالف ہو۔

ملا فرعون نے بھی جماعت موسیٰؑ کو مفسدین فی الارض کہا مگر اللہ جانتا ہے مفسد اور مصلح کون ہے؟ سب جانتے ہیں کہ مفسد ہلاک ہوا اور مصلح وہ تھا جو فتح و نصرت کا مالک ہوا۔ مفسدین کا ایک یہ بھی فساد ہے کہ جب کبھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو محض فساد ہے۔ واذا قیل لہم آمنوا... جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم سفہا کی طرح ایمان لائیں گے۔ اس میں ان کی حقارت عملی المومنین معلوم ہوتی ہے۔ اخلاص سے ایمان لانا گویا ان کے نزدیک یہ فعل سفیہوں کا ہے۔ فی الحقیقت جو جماعت ایمان لے آئی وہی تو عقلمند ہے جو دائمی آرام و عزت و عظمت حاصل کر رہا ہے۔ عقلمند تو ضرور ہے جو ایک مٹھی خاک دے کر سونا خریدتا ہے ــــــ!

۶ر۷ر مارچ ۱۹۱۶ء

دوسری جماعت وہ ہے جو خادع ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ ہر چیز جو ضعیف ہے فنا ہو جائے گی اور قوی باقی رہتی ہے۔ صحیح موجود رہتا ہے بیمار فنا کو پہنچتا ہے اس طرح جس کی روح قوی ہے وہ موجود رہتی اور کمزور فنا کو پہنچتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حق قائم رہے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ لہٰذا سنت اللہ بدلیل (۱) استعداد (۲) التہاب (۳) انفجار یہ تینوں اصلاح و افساد میں بھی موجود ہیں ــــــ!

قانون اہمال (یہ قرآنی اصطلاح ہے بعوض استعداد کے) یہ خدا کے قوانین ہیں۔

قانون مکافات ہے۔ جیسا جرم ہو گا عذاب بھی ویسا ہی ہو گا۔ دیکھو سر سید نے جیسی یورپ کی پوجا کی

یسی ہی تعلیم یورپ نے انھیں برباد کیا۔ دنیاوی سزا کل غیر موافق ہے مگر خدا معصیت کے موافق سزا دیتا ہے۔ سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ ہے تو باطل مگر دعویٰ حق کا کرتا ہے۔ دنیا حق پرستوں کے لیے ہے بطالت کے واسطے نہیں کیونکہ دنیا خیر الآخرۃ ہے، جب کبھی حق منجانب خدا آتا ہے تو کوئی کبھی بھی قبول نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ قربانی نہیں دے۔

سچائی کا معجزہ یہ ہے کہ جب کبھی حق ظاہر ہوا ہے تو ضعفاء سے ہوا ہے، غربت سے ہوا ہے، جھونپڑی سے ہوا ہے، سچائی ہر موقع پر قربانی چاہتی ہے جس طرح ایک دہقان اپنی جھولی آئندہ امید پر خالی کرتا ہے۔ بعینہ ایک حق پرست بھی اپنی جھولی کل کی امید پر خالی کرتا ہے۔ مصلحت پرستی ایک شیطان لعین ہے۔ مومن پر استہزا کرنے والے ہی منافق اور دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ واذا لقوا الذین آمنوا.. یہ آیت منافق کے واسطے ہے۔ یعنی درمیانی راہ نکالنے والے ہیں۔ خارجی چیز کا احساس اندر کی لیاقت سے ہوتا ہے قرآن کا قول ہے کہ ہم کو لے لو جو کچھ ہے وہ ہم میں ہے۔ قرآن ایک قاعدہ کلیہ ہے ترقی کے واسطے قرآن کو قبول کرلو۔ دنیا میں حکومت قرآن ہی سے پھیلی ہوئی ہے۔ نفاق تزلزل ہے۔ انسان کے لیے دو درجے ہیں ایک تو اعلیٰ دوسرا ادنیٰ، تیسرا درجہ کوئی نہیں اگر ہو تو وہ نفاق ہے۔ شیاطین بمعنی سردار۔

تبلیغ —— ہجرت

وہ تو استہزا کرتے ہیں مگر وہ خود اپنے اوپر استہزا کرتا ہے۔

<u>۸ مارچ ۱۹۱۶ء</u>

جب تک ایمان و عمل صالح نہ ہوگا کبھی بھی نجات نہیں پاسکتے۔ وہ چیز جو بین بین ہوتی ہے وہ راہ محفوظ خلوع کی ہے اس کی تعریف نفاق ہے۔

واذا خلوا الی شیاطینھم .. ان کے رؤسا سردار شیطان کی اصل شیطنت ہے جس کے معنی ہیں دوری یعنی جس میں حق سے دوری ہو وہ شیطان ہے۔ جب کبھی سچائی ظاہر ہوئی ہے تو ایک جماعت شیطان کی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ شیطان انسان و جنات دونوں میں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے شیطان فرعون کی مخالفت ہوئی۔ ابراہیمؑ سے شیطان نمرود کا مقابلہ ہوا۔

اللہ یستھزئ بھم ویمدھم فی طغیانھم —— حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یمدھم بمعنی فرصت پہنچا (کذا) جانا مدومت، پھیلاؤ، طوالت۔

قانون اہمال، کسی مواد کے دور و تکمیل میں جو وقت ہوتا ہے وہی یہ ہے جو قانون تینوں کا مجموعہ ہے

یعنی استعداد، التہاب، انفجار، معصیت کی پیدائش استعداد ہے۔ ان کے انضمام و اجتماع کا نام التہاب ہے اور ان کا پھٹ جانا انفجار ہے۔ انفجار ہی عذاب الٰہی ہے۔

قرآن پاک میں عذاب بھی چند اقسام میں منقسم ہے ــــ سورہ عنکبوت میں ہے اللہ تعالیٰ کی شہادت انفجار ہے جو مخالف کو بتا دیتی ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ دکھا دے گا کہ یہ عذاب کیا اور کب آ جائے گا۔ سورہ نحل میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو چاہتا تو فوراً عذاب میں ڈالتا اور پھر کون تھا جو ان کو بچاتا۔

چونکہ اللہ نے وقت مقرر کر دیا اب وقت پر عذاب ظاہر ہوگا ــــ معصیت کا انفجار کثرت معصیت ہے۔

اللہ کا وعدہ بالیقین سچ۔ مشاہدہ شاہد ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نماز پڑھ کر کبھی بھی مرض خبیثہ میں نہیں مبتلا ہوا اور زانی برابر مبتلا ہوتا ہے۔ کفر اور ارباب کفر کو مہلت ان کی بھلائی نہیں ہے بلکہ اور بھی بلا ہے۔

اشترا کے معنی بعض نے استدلال کہا ہے ــــ اولٰئک ــــ الضلالۃ بالھدیٰ

اہل کتاب کے پاس تو خود ہدایت تھی مگر انھوں نے ہدایت کو تاراج کر دیا اور گمراہی کو بالعوض خرید۔

تمثیل عرب میں یہ دستور تھا کہ جس چیز سے تمثیل دی جاتی تھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر جز میں ملتا ہو۔ دوسری یہ ہے کہ ایک جز کا دوسرے جز سے ممثل ہونا۔

۹ مارچ ۱۹۱۱ء

ہر دو مثال ہر دو جماعت کے واسطے ہیں۔ تمثیل مرکب کے کل جز دوسرے کے کل جز سے نہیں مل سکتے۔ تمثیل مفصل کے کل جز دوسرے سے ملتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کو جب مدینہ والے اپنے وطن میں لائے اور باعث حصول ہدایت ہوئے مگر بعض نے نفاق کیا اور ایمان سے محروم رہ گئے۔ یہ مثال اول کی ہے۔ یہی ختم اللہ علیٰ... کے مصداق ہیں۔ وترکھم فی ظلمات... یک بیک روشنی سے محروم کر دینا۔ تو بھلا خیال کرو تو اس کی کیا حالت ہوگی۔

دوسری تمثیل کصیب من السماء... یہ تفسیر تمثیل مفصل ہے ــــ فیہ ظلمات و رعد و برق... بارش میں بجلی کی چمک اور کڑاک دونوں موجود ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی چیز سے ڈرتا ہے تو اسکو تو مٹا نہیں سکتا بلکہ اپنی ہستی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلی ڈال لیتا ہے اور آنکھیں چھپا لیتا ہے اور یہی تو بارش کے اجزا ہوتے ہیں۔ حصول بارش میں ان کی برداشت بھی ضروری ہے لیکن وہ کہاں بچ سکتے ہیں کیونکہ اللہ تو محیط ہے اور وہ ایسا ہی کرے گا جس قدر بارش محبوب و مطلوب ہے اسی قدر اس کے اندر رعد و برق کا خوف و ڈر بھی ہے۔ اگر تم بارش چاہتے ہو تو تم کو لازم ہے کہ بجلی کی کڑاک و چمک کو برداشت کرو۔ گرچہ بجلی

اکونے سے کچھ جانیں بھی ہلاک ہوتی ہیں یا للمحسا تزدل اس خوف و ڈر سے بارش کی رحمت باری سے محروم رہتے ہیں

۱۱، ۱۲ مارچ ۱۹۱۶ء

تشبیہ و تمثیل ـــــ اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کے بارے میں دو تمثیل دی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس میں دیکھتا ہے کہ بجلی گرتی ہے ہلاکت بھی ہوتی ہے اور امید کی روشنی بھی چمکتی ہے۔ بارش جو حقیقت میں محمود و محبوب ہے۔ تاہم اس میں بعض اجزا نہایت ہولناک و دہشت ناک ہیں۔ اگر بارش کی طلب ہے تو بجلی و رعد کے برداشت کی قوت بھی دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ تمہارے واسطے بارش اپنی جبلت نہیں چھوڑ سکتی۔ علیٰ ہذالقیاس۔ ہدایت و رشد کی بھی یہی حالت ہے بعینہ۔ طالب بارش ورود بارش کو دیکھ کر ہمہ تن تیار ہو جاتا ہے تخم ریزی پوری مستعدی کے ساتھ کرے گا۔ جو لوگ بجلی سے ڈرنے والے ہیں جو لوگ رعد سے خوف کھاتے ہیں ان کو پیغام مل جانا چاہیے کہ ان کا بارش میں کچھ حصہ نہیں ہے۔

بارش ہدایت میں جو رعد و برق ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ وہ انفاق ہے ہجرت ہے۔ اللہ نے دو قسم کے امثال بیان کیے ہیں ایک نوری دوسری ناری۔ قرآن پاک نہایت مربوط و منتظم ہے۔ ہر سورت کا ایک موضوع ہے۔ یہی دو اصول فہم قرآن کی جان ہیں۔ قرآن پاک کی ترتیب بمطابق خطبۂ عرب العربا کی ہے۔ سامع کو سمجھانے کے واسطے تمہید ضروری ہے تاکہ مضمون الیہ کے فہم میں آسانی ہو۔ مخلص و گریز شاعری میں مضمون کے فہم کے واسطے اصلی مطلب کی طرف رجوع کراتا ہے۔ گویا گریز تمہید کو اصلی مطالب کی طرف ملا دیتا ہے اگر سامعین پہلے ہی سے مضمون الیہ کے سننے کے واسطے موجود ہوں تو تمہید کی ضرورت نہیں۔ اگر مطالب اصلی سے ناواقف ہیں تو تمہید کی ضرورت ہوتی ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ تک کی تو تمہید ہے اس کے بعد اصل مطالب آئیں گے بلفظ تخاطب یا ایہا الناس۔

۱۴ مارچ ۱۹۱۶ء

یا ایہا الناس ـــــ اس میں سب سے پہلی چیز تخاطب ہے۔ اس تخاطب سے مقصود اہل مکہ ہیں اور یا ایہا الذین آمنوا… سے مقصود اہل مدینہ ہیں۔

از ابن عباسؓ۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ مدنی میں بھی یا ایہا الناس کا لفظ موجود ہے جس سے قول بالادب جاتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ حیاتِ مکی محض ایام ابتدائی ہے جس سے تخاطب کفر ہے اسلیے لفظ یا ایہا الناس استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں سات قسم کے خطاب موجود ہیں۔ پہلا خطاب مدح مثلاً یا ایھا النبی وغیرہ۔ دوسرا ذم یعنی خطاب تذلیل مثلاً یا ایھا الکافر وغیرہ۔ تیسرا خطاب اضافی ہے مثلاً یا عبادی وغیرہ۔ یعنی بپہلو رحمت و شفقت۔ چوتھا خطاب اسمی ہے مثلاً یا عیسیٰ وغیرہ۔ پانچواں جنسی مثلاً یا ایھا الناس وغیرہ۔ چھٹا ندائے نسبت مثلاً یا بنی اسرائیل وغیرہ۔ ساتواں ندائے شفقت مثلاً یا ایھا المزمل وغیرہ۔

پیغمبروں میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ کمال بلوغ نبوت کا سبب ہے۔

اس وقت ایک غیر یعنی عشق (زندگی) ہوتا ہے۔ مثلاً کوہ حرا کی سیر اور کوہ طور کی سیر ——

انسان بعض وقت اپنے بڑوں کو جو گذر چکے ہیں ان کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا ہے جس سے بت پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ تماثیل پرستی بھی جاری ہو جاتی ہے۔ اس خیال کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ ہی اس قسم کی فضیلت و تقدیس کے لائق ہیں۔ جب یہ تعظیم مذہب میں آتی ہے تو وہ عظیم الشان نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی تو پرستش شروع ہو جاتی ہے اور خلف کی ترقی معدوم۔ تقلید کا غلام ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے خدا سے مہجور کر دیا۔ لہذا قرآن پاک نے جہاں کہیں کہا ہے تو وہ یہ کہ کتاب اللہ کو قائم کرو۔ صرف زمانہ قدیم میں ہونا ہی شرف نہیں ہے بلکہ عمل و غور و خوض، تعلیم اعلیٰ بہترین معلم —— نہ کہ تقدم زمانی۔ اپنے بڑوں کی تقدیس حد شرعی سے زیادہ نہ ہو۔ یہاں تمہارا خیال ایک لمحہ کے واسطے بھی پیدا ہو جائے کہ وہ سب سے زیادہ بہتر ہے ہم کو اسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تو کتاب اللہ چھوٹ جاتی ہے اور یہی شرک ہے۔ آیت یہ ہے کہ والذین من قبلکم ... اللہ جس نے تم کو پیدا کیا بس اسی طرح تمہارے اگلے کو بھی پیدا کیا۔ یہ کیا بو العجبی ہے کہ تم ان کو پوجتے ہو یا محض ارباب من دون اللہ بنا رکھی ہے محض اس بنا پر کہ تم سے پہلے تھے۔ اسی وجہ سے کہا ہے کی سیروا فی الارض فانظروا —— یعنی یہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں وہ کیسے ہیں اور کیا حالت ان پر گذری۔ یہی وجہ ہے کہ تم کو پوری طرح متنبہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی مساوات تخلیقی بیان کی ہے۔

۱۵ر مارچ ۱۹۱۶ء

ربوبیت میں دو تعلق ہے۔ روح وغیرہ چند چیزیں علوم متعارفہ کی طرح ہمکو مان لینا چاہیے۔ کیونکہ کسی علم پر بحث کرنے کے واسطے چند چیزوں کو مان لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ مبحث فیہ کی بنیاد ہے۔ ایک عالم ارضی ہے جہاں تمہاری حسی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ فہکذا عالم سماوی ہے جہاں ضروریات روحانی پوری کی جاتی ہے۔ اور یہ تقسیم

بلحاظ عالم کے ہے۔ قرآن پاک چونکہ کتاب فلسفہ نہیں ہے لہٰذا وہ چیز کے ماہیت سے بحث نہیں کی ہے صرف چیز کا ذکر کر دیا کیونکہ اس چیز کی ضرورت ہے فقط اتنی کہ انسان اس سے تعلق رکھتا ہے ـــــ طبقۂ محدثین اس سے محترز رہا گو کچھ تفسیر میں ذکر آ گیا ہے تو اس کو متاخرین نے فلسفۂ یونان سے لیا۔

بناءً: کسی چیز کو اس طرح رکھنا کہ صورت پیدا ہو جائے مثلاً سیارگان و ثوابت کی خوبصورت نظام کا قیام۔

انداد: مماثلت و تشابہت پیدا کرنا۔

شہداءکم: سے مراد تمہارا خدا یعنی تمہارے الٰہ انداد حق کو کہیں بھی ناکامی نہیں ہے کبھی اس کو شکست نہیں۔ اس پر پورا یقین ہو اور اس کا ثبوت عملی ہونا چاہیے۔ صرف قرآن پاک کا دعویٰ پیشکش امر حق ہے اور حق کو یقیناً فتح ہے ـــــ طاقت بمعنی حق کمزوری بمعنی بطالت۔

۱۲ مارچ ۱۹۱۶ء

تاریخ اعجاز قرآن ـــــ پہلا دور صحابہ کرام کا ہے جسمیں عجز ثابت ہوا اور کوئی بھی نہیں پیش کر سکا۔ دوسرا دور جس میں علوم فنون نے ترقی کیا۔ ہاں دور اول میں فصاحت و بلاغت کی ترقی معراج ترقی پر پہنچی ہوئی تھی وہ اس کوئی سے عاجز ہو گئے اور کلام خدا تسلیم کر لیا۔ غیر عرب پر معنوی دعویٰ ہے۔ باقلانی کی کتاب جس میں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کے دلائل بیان کیا ہے اگرچہ وہ بھی چنداں مفید نہیں۔ قدماء کی تصنیفات غائب ہو گئیں۔ سورۂ قصص میں دعویٰ اعجاز قرآن موجود ہے۔ سورۂ ہود میں موجود ہے کہ تم قرآن کی طرح ایک آدھ سورہ لے آؤ۔ کلام الٰہی کو قطعاً بلیغ ہونا چاہیے جو فوراً دل میں اتر جائے۔ جب کلام الٰہی میں دعویٰ ثبوت مقابلہ کے واسطے طلب ہوتا ہے تو اس میں ہدایت کا ہونا بھی یقینی ہے۔ قرآن پاک کا دعویٰ نہیں تو صرف قرآن کی مثل لاؤ ہے اور کہیں تو ایک سورہ بھی اس کی مثل لاؤ ـــــ اگر ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف رجوع کریں تو دعویٰ نبوت کا ہوگا مگر اس سے قرآن کا اعجاز اضافی رہ جاتا ہے مگر اس کی چنداں وقعت نہیں۔ مگر تورات کی شمولیت نے واضح کر دیا ہے کہ مثال سے مراد اعجاز قرآن ہے اور شمولیت میں قرآن پاک ہے تورات بھی ہے۔ دعویٰ جو دراصل ہے وہ کلام الٰہی کے ہونے میں ہے جو اس کو جھٹلاتا ہے وہ ایک ایسا ہی کلام بنا لائے اور ایسا نہیں ہوا۔ پس قرآنی دعویٰ اپنے تمام اعجاز قرآن میں ہے یعنی جمیع اجزاء میں یہ دعویٰ شریک ہے۔ قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ میں کلام الٰہی ہوں اور فصاحت و بلاغت اور ہدایت و حکمت بھی ہے۔ سورۂ قصص میں جو دعویٰ ہے وہ یہ ہے کہ ایک مثل بھی قرآن و تورات جیسی لاؤ۔ اس میں معلوم ہوتا ہے کہ صرف بلاغت ہی معیار صداقت نہیں ہے کیونکہ تورات میں یہ صفت نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ دعویٰ صرف کلام الٰہی

ہے اور ہے بھی یہی۔ کوئی بھی اس کا مقابل نہیں لاسکتا کیوں کہ اللہ تو مدعی کے ساتھ ہے مفتری کے ساتھ خدا کہاں !
بوئی جزء کتاب میں نہیں ہے بلکہ کل میں ہے اور جمیع اوصاف جب ہیں آگئے بلاغت تو بدرجہ اولیٰ ہے۔

مارچ ۱۹۱۶ء

اعجاز قرآن ——— معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کا دعویٰ فصاحت و بلاغت میں نہیں ہے بلکہ دعویٰ رشد و ہدایت
ہے اور اشاعرہ کی دلیل ہے کہ قرآن کا دعویٰ صرف حکمت میں نہیں ہے بلکہ فصاحت و بلاغت میں ہے کیونکہ اہل عرب
دعویٰ فصاحت دانی میں تھا اسلیے تحدی فصاحت میں کی گئی ختم اصل دعویٰ تو تعلق الہٰی میں ہے۔ آخری فیصلہ درمیان حق و باطل میں ہے
حق کے مقابل ایک ایسی ہی قوت لاؤ اور اعانت بھی اپنے مددگار سے طلب کرو اسکے مقابل ایک نمونہ پیش کردیا جیسا آج فیصلہ کن
جیسا کہ قرآن پیش کر رہا ہے۔ دیگر خصائص یہ ہیں کہ اس آیت میں خصوصیت کیا ہے؟ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ لے لو مثلاً والعصر۔
عصر سے مراد ہے عموماً زمانہ۔ اور زمانہ شہادت دیتا ہے کہ انسان خسران میں مبتلا ہے اس کی حالت تاریخ میں
ور و مندرج ہے۔ عموماً ہر حالت میں انسان خسران میں ڈوبا ہوا ہے، یاس غالب ہے بمقابلہ فوز و کامیابی کے۔
اعام تباہی میں عام سعادت کا حاصل کرنا ہی کامیابی ہے۔ ہر وہ شے بمقابلہ خرابی کے بمقابلہ گھاٹے ٹوٹے کے آتی
ہے وہ کامیابی ہے۔ یہی عام سعادت والعصر نے پیش کیا ہے۔ یعنی چار چیزیں عصر کی پیش کردہ ہیں۔ ایک یقین جس کو
قرآن نے ایمان کہا ہے۔ شے دیگر عمل صالح ہے یعنی ہر وہ عمل جو عدل ہو، اور حق ہو، حقیقت و واقعیت کو ساتھ
ہو۔ ایمان اور صالح عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں کہیں ایمان ہوگا عمل صالح کا ہونا ضروری ہے اگر یہ نہیں
ہے تو ایمان ہرگز نہیں ہے۔ ثالث حق ہے۔ جتنے اعمال غیر صالح ہیں ان کو فنا ہے اور یہی قدرت کی سنت۔ زمانہ
گواہ ہے غیر صالح کا انفجار عذاب الٰہی ہے۔

چوتھا صبر۔ توصیہ حق باہم دیگر۔ اسی توصیہ کو قرآن نے امر بالمعروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا اسوہ حسنہ
انبیاء کرام نے پیش کیا۔ توصیہ حق میں بڑی بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اقدام میں سد راہی ہوتی ہے۔ مصیبت اور بلا
کے انبار سر آتے ہیں تو اس کے دفع کے واسطے صبر ہے۔ یعنی قربانی اور قربانی کو طے کرنا بلا صبر کے محال ہے۔ جب
کبھی حق آئے گا تو صبر بھی شامل آئے گا۔ اگر صبر تمہارے ساتھ نہیں ہے تو گویا حق نہیں ہے۔ ہاں ہر کامیابی
کے واسطے یہ چار صفتیں ہوتی ہیں ——— یہی اعجاز ہے جو بیان ہوا۔

۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء استاذ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی اخراج کا حکم جاں سوز کا واقع ہونا اور دارالارشاد
کا خاتمہ طلبہ کی رخصتی، اختتام امید ———

••

دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار
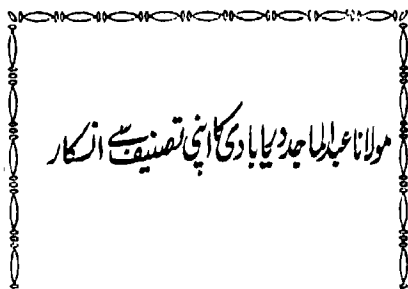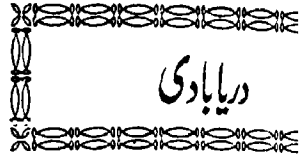
مراسلات

عبدالماجد دریا بادی کا اپنی تصنیف سے انکار

راقم نے استفسار کیا تھا کہ فلسفۂ اجتماع کہاں ملے گی۔ مصنف کتاب مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب نے جوابا جو مکتوب لکھا اس میں مولانا نے اپنی تصنیف "فلسفۂ اجتماع" کو اپنی تصانیف سے خارج کرنے کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

کرم گسترا وعلیکم السلام

فلسفۂ اجتماع میری بالکل نو عمری کی تصنیف ہے، ۱۹۱۴ء کی۔ جب میں نشۂ الحاد میں سرشار تھا۔ دو ہی چار سال بعد جب توفیق توبہ ہو گئی تو پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کتاب کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا اور اس کی اشاعت قطعاً روک دی۔ چنانچہ اب وہ کتاب کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ پچاس برس سے زائد ہوئے کہ کتاب اپنے مرگھٹ پر پہنچ چکی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بسم اللہ

صدق

دریاباد ضلع بارہ بنکی

مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۶۰ء

[illegible]
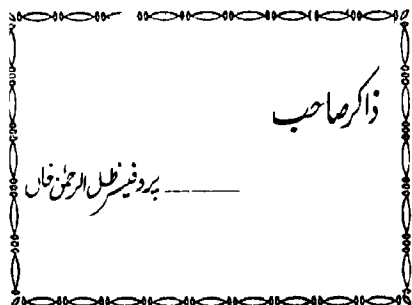
ذاکر صاحب

—— پروفیسر ظل الرحمٰن خاں

ذاکر صاحب : خدابخش خاں کے بعد اس لائبریری کے سب سے بڑے محسن تھے بہت کچھ انہوں نے اسکے لیے کیا۔ دسنہ جیسے بڑے کلکشن کے علاوہ اور متعدد ذخیروں کا اضافہ کرایا اور صوبائی حیثیت سے بلند کر کے اس ادارہ کو مرکز سے وابستہ کر کے قومی اہمیت کا ادارہ بنوایا۔

ذاکر صاحب کی یادیں ان کے قریبوں اور عزیزوں سے انکی ذاتی یادیں بطور ذاکر خطبات پیش کرانے کا اہتمام خدابخش لائبریری پچھلے کئی برسوں سے کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں خورشید عالم خاں صاحب، محمد شبیر خاں صاحب، رحمت اللہ خاں صاحب شیروانی، محترمہ صالحہ عابد حسین، عبداللطیف خانصاحب اعظمی وغیرہ کی یادیں اس جرنل میں پیش کی جا چکی ہیں ظل الرحمٰن خانصاحب کا یہ خطبہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ادارہ

ذاکر صاحب

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں (پ ۱۹۳۵ء رتقہ) شاہجہاں پوری پٹھان ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شعبہ طبیعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی پھر اس شعبہ کے چیرمین ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے جانیکے بعد یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی رہے فی الحال شعبہ طبیعیات میں پروفیسر ہیں۔ علیگڑھ کے طویل قیام کے باوجود شاہجہانپوری پختون ہونا ایک لمحے کیلیے بھی کبھی نہیں بھولے۔ ذاکر صاحب کے خویش ہونے کے ناتے ذاکر صاحب پر ان کا فرمایا ہوا سب سے زیادہ مستند ہوگا۔

ان کا وطن قائم گنج، ضلع فرخ آباد تھا۔ ان کے والد فدا حسین خاں صاحب وکالت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے، لیکن آبائی وطن ہمیشہ آتے جاتے رہے۔ وہاں کوٹھی بھی بنوائی۔ اس طرح ان کا تعلق یوپی اور حیدرآباد دونوں سے ہے۔

ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں حاصل کی جہاں وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب اور مولوی بشیرالدین سے بہت متاثر ہوئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ان کو تحریک خلافت سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ تحریک کی حمایت میں تقریریں کرتے اور چندہ جمع کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے ہونے والے خسر نے ان کی تقریر سنکر اپنی بیٹی کی ان سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہائی اسکول پاس کرکے انھوں نے علی گڈھ میں ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کے خاص دوستوں میں رشید احمد صدیقی، حبیب الرحمن صاحب اور اقبال احمد خاں سہیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سنا ہے ذاکر صاحب کورس کی چیزیں تو کم پڑھتے تھے لیکن علمی اور ادبی محفلیں گھنٹوں چلا کرتی تھیں۔ کھیل کے میدانوں کے پاس تماشائیوں میں بھی دیکھے جاتے تھے۔

زمانہ طالبعلمی میں ہی انھوں نے افلاطون کی کتاب "ریاست" کا اردو میں ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ علی گڈھ کی طالبعلمی کے دور میں وہ صوبہ سرحد کے اورنگزیب خاں سے الیکشن جیت کر یونین کے نائب صدر بنے۔ اس زمانے میں طالبعلم صدر نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اقبال احمد خاں سہیل نے ایک "تہنیت نامہ" فارسی میں لکھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

چو بینم رفعتِ اورنگ زیب از جا برآرم — چو افتد دیدہ بر ذاکر نگہ را پرفشاں دارم

مرا زیبد اگر صد نغمہ بر لب چوں ہزار آمد — کہ در گلزار دانش باز فصل نوبہار آمد

بیاید ذاکرِ فرخندہ طالع با ہوا داراں — کہ با خیلِ عزیزاں کارواں سالار می آید

نگارِ یونین را ساعت صد زیب و زیں آید — کہ اکنوں سروِ گلزارِ ہنر ذاکر حسین آمد

آخری شعر ملاحظہ ہو :۔

الٰہی دورِ جام مہر تا بر آسماں باشد — دریں میخانۂ دانش ہمیں پیرِ مغاں باشد

جب اورنگ زیب خاں شاید اگلے سال الیکشن جیتے تو اس موقع پر بھی سہیل صاحب نے ایک تہنیت نامہ فارسی میں لکھا۔

ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ اورنگ زیب خاں کے خلاف ان کا الیکشن اس بات کا اعلان تھا کہ علی گڈھ میں اب چھوٹے آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے بڑے بڑے جاگیرداروں کی اولادیں چھائی ہوئی تھیں۔ چھوٹے آدمی کی زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی اور اپنا ووٹ کا جنھوں نے کھولا ہوگا انھوں نے نقصان اٹھایا ہوگا۔ لیکن چھوٹے آدمی کی یہ جیت عارضی تھی کیونکہ شاید اگلے سال ہی بڑا آدمی کرسی صدارت پر براجمان ہو گیا۔ اب جاگیردار تو باقی نہیں رہے مگر دس سال سے جو فیل ہو رہا ہے اس کی اہمیت تھوڑی بہت اب بھی ہے، گو کہ فرق ہوا ہے۔

جب گاندھی جی کی تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڑھ میں اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگی لیکن بالآخر ایسا نہ ہوا۔ مایوسی کے دور میں جب آخری بار علی برادران نے ایم۔ اے۔ او کالج میں تقریر کی تو ذاکر صاحب اور ایک دوسرے کسی صاحب نے تحریک میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جس پر سب کو بہت تعجب ہوا کیونکہ ذاکر صاحب کا بظاہر کوئی رجحان اُس طرف پہلے نہیں معلوم ہوا تھا اور دوسرے اس وقت تحریک علی گڑھ میں دم توڑ چکی تھی۔ رشید صاحب کا بیان ہے کہ ذیل کے شعر کا جو محمد علی جوہر نے پڑھا تھا، ذاکر صاحب کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

چنانچہ وہ جامعہ پہنچ گئے جو پہلے علی گڑھ میں قائم ہوئی اور پھر وہاں سے دہلی منتقل ہو گئی۔ پہلے قرول باغ میں رہی اور پھر وہاں سے اپنی موجودہ جگہ پر پہنچی۔

چونکہ جامعہ کے زمانے کے حالات سے لوگ عام طور پر واقف ہیں اس لئے اس زمانے کے زیادہ تر حالات کا ذکر صرف اشارۃً کیا جائیگا۔ شدید مالی مشکلات سے تو لوگ واقف ہی ہیں۔ اسی زمانے میں ایک روایت کے مطابق دہلی کارپوریشن کی ایک نشست کے لیے ان کا الکشن نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ہوا اور دوسری روایت کے مطابق لیاقت علی خاں صاحب کے کسی قریبی رشتے دار سے ہوا، جس میں لیاقت علی خاں صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ دونوں روایتوں کے مطابق ذاکر صاحب الکشن جیتے۔

گو وہ علی گڑھ چھوڑ کر چلے آئے تھے، ان کا علی گڑھ سے اس زمانے میں برابر تعلق رہا۔ وہ اس زمانے میں وہاں کی کورٹ، اکیڈمک کونسل یا اگزیکیٹو کونسل کے برابر ممبر منتخب ہوتے رہے۔ ان 3ODIES میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔

جامعہ کے زمانے میں ان کو برابر چندے جمع کرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد کے لیے چندہ لینے میرے وطن شاہجہانپور بھی آئے۔ ہمارے شہر کے مشہور تاجر اور رئیس حاجی سعید خاں صاحب مرحوم نے جامعہ میں مسجد بنانے کے لئے شاید بیس ہزار روپئے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے لئے ذاکر صاحب خود آئے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ چاندی کے سکے دیں گے۔ علی گڑھ کے زمانے میں والد مرحوم کی ذاکر صاحب کے بڑے بھائیوں سے اچھی دوستی رہی تھی اور وہ ذاکر صاحب کے یونین کے الکشن میں ان کے خاص طرفداروں میں تھے۔ شاید ان کے نام کی طرف ہی اقبال سہیل صاحب کے تہنیت نامے میں اشارہ ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب والد مرحوم سے ملنے ہمارے گھر آئے اور ان سے یہ چاہا کہ جب حاجی صاحب رقم ادا کریں تو وہ سکے لیکر انھیں بیس ہزار روپئے کے نوٹ دیدیں کیوں کہ سکوں کے بوجھ ڈھونے میں پریشانی

اور خطرہ دونوں چیزیں تھیں۔ لیکن اس سب کی نوبت نہیں آئی کیونکہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا حائل ہوگیا کہ حاجی صاحب نے چندہ نہیں دیا۔ ذاکر صاحب نے معاملے کی تفصیل مجھے بتائی تھی مگر بدقسمتی سے مجھے اب یاد نہیں ہے ورنہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا۔ چندہ جمع کرنے کے کام میں انکو اکثر تلخ تجربے ہوئے۔

گاندھی جی کی دعوت پر ایک کمیٹی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کی وردھا اسکیم انھوں نے مرتب کی۔ اس کی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہونا چاہئے، اور دوسری یہ کہ تعلیم کو بالکل سیکولر رکھا گیا۔ البتہ پرائیویٹ اداروں کو یہ آزادی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے خرچ پر جن بچوں کے والدین اجازت دیں ان کو مذہبی تعلیم دیں۔ یہ اور دیگر اصول قومی سطح پر اصولاً مانے گئے، اور قومی پالیسی کا حصہ بن گئے۔ یہ دیگر بات ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں سے زیادہ تر کی ابتدائی تعلیم اردو میں نہیں ہو رہی ہے۔ گو کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم عملاً ناکامیاب ہوگئی مگر ان دو اصولوں کو اصولاً مان لیا گیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس سے کانگریس میں خصوصاً اور ملک میں عموماً جو لوگ سیکولر پالیسیوں کو عمل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور آئندہ کے آزاد امیدوار کی سیکولر پالیسی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس لئے ذاکر صاحب کو سیکولرازم کا معمار کہا گیا ہے۔ مگر یہ بات قابل بیان ہے کہ مجموعی طور پر ملک کی فضا اس لحاظ سے سیکولر تھی کہ لیگ اور جناح تک نے کبھی بھی آزادی سے پہلے اسلامی حکومت کی بات نہیں کی۔ بلکہ عام طور پر لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ جناح اس طرح کی سیاست کو وجود میں لانے کے خلاف ہیں۔ اس کا بالکل صاف اندازہ جناح کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو ڈھاکہ میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے کی۔ کانگریس میں سیکولر خیالات کے لوگ بھاری اکثریت میں تھے گو کہ مخالف خیال کے لوگوں کی تعداد بھی نہ کے برابر نہیں تھی۔ پھر بھی کانگریس میں کوئی گروہ اعلانیہ طور پر ہندوستان کو ہندو ریاست بنانے کی بات نہیں کرتا تھا۔ شاید صرف ہندو مہا سبھا ایسی گفتگو کرتی رہی ہو گی، مگر اس کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ گاندھی جی رام راج کی بات کرتے تھے جس سے غلط فہمیاں پھیلانے کا لوگوں کو موقع ملا، مگر وہ بلاشبہ سیکولر ہندوستان کے حامی تھے۔ ان کا کوئی ذرا سا بھی تعلق ہندو راشٹر کے فلسفے سے نہیں تھا۔

لہٰذا ابتدائی اور بنیادی تعلیم کو سیکولر رکھنا کوئی جدت نہیں تھی۔ یہ ہماری تحریک آزادی کی روایات، ملک کے مزاج، اور ضروریات کے عین مطابق تھا۔

کم از کم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اتنی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اتنے مختلف رسم و رواج ہیں، اتنے مختلف دھارے ہیں کہ ایئر IYER اور آئینگر IYENGAR تضاد کی حد تک مختلف ہیں گو کہ دونوں جنوبی

ہند کے برہمن ہیں، پھر مختلف خطوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تجربات اتنے مختلف ہیں کہ سیکولرازم کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کم از کم ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ریاست اور حکومت نہیں چلائی جا سکتی۔ اقلیت کی طرف سے تو شاید مذہبی حکومت کی مخالفت اتنی شدید نہ ہو، جتنی اکثریت کے مختلف طبقوں، مزدوروں، اچھوتوں، عورتوں اور نوجوانوں کی طرف سے ہوگی۔ برہمن کی برتری کو آج کون مانے گا جب کہ باپ کی برتری کو جوان مان نہیں رہے ہیں۔

ہم تو آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی بات کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کا مزاج کم از کم لاشعوری طور پر سیکولر تھا۔ پھر بھی اخلاقی بنا پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کو مذہبی تعلیم ملنا چاہیے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کو سیکولر کہنے کی تجویز عام طور سے جو سوچنے کا ڈھنگ تھا اس سے الگ تھی۔ کمیٹی میں اس بات پر کافی اختلاف رہا۔ ملک کے پیمانے پر مسلمانوں میں اس پہلو کی خاص طور پر بہت مخالفت ہوئی۔

جمہوریت، سیکولرازم، اور سوشلزم پچھلے دو سو سال کی دین ہے، اور یہ یورپ سے ہمارے پاس آئے۔ میری رائے میں ان کو پرانی تاریخ میں ڈھونڈنا گمراہ کن ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کو تو ہم نے جوں کا توں لے لیا، مگر سیکولرازم اور سوشلزم میں ہم نے ترمیمیں کی ہیں۔ مثلاً یورپ میں سیکولرازم کے ارتقاء میں ایک ہلکا سا عنصر مذہب کی مخالفت کا بھی ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔

اب دو طریقے ممکن تھے۔ ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ ریاست اور حکومت مذہب کی تقریباً بالکل بات ہی نہ کرتی یا سب مذاہب کی برابر سے بات کرتی۔ بظاہر آخرالذکر طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا جھکاؤ اکثریت کی طرف بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح سے سیکولرازم مسخ ہو گئی ہے۔

صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو ان خطروں کا احساس بہت پہلے سے تھا۔ یا تو اس صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں یا تیسری دہائی کے شروع میں انھوں نے کچھ اس طرح سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اس وقت بہت اچھی نیت سے مذہب کو سیاست میں استعمال کر رہے ہیں۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ کہیں بہت نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں نے اسے خود کہیں پڑھا ہے مگر مجھے یاد نہیں کہ کہاں۔ اس کو ڈھونڈ کر نکالنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ریاست اپنے آپ کو مذہب سے بالکل الگ رکھے۔ مگر یہ بات صاف رہنا چاہیے کہ ان کی سیکولرازم میں مذہب کی مخالفت کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے ——————— چونکہ سیکولرازم پر میں نے اتنی گفتگو کی ہے تو میں اتنا اور کہہ دوں کہ میری رائے میں اس وقت ہندوستانی ریاست تو سیکولر ہے۔ مگر حکومت پوری طرح نہیں ہے۔

جامعہ کے آخری دور کی قابل ذکر بات سلور جوبلی ہے جو ۱۹۴۶ء میں منائی گئی۔ اس کی خاص بات یہ

تھی کہ مختلف قومی پارٹیوں کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس سے جامعہ کے کام کا ملک بھر میں چرچا ہوا۔ لیڈروں نے ایک پلیٹ فارم پر آکر اس بات کی توقع اصولاً پیدا کی کہ مختلف الخیال لیڈر مل جل کر ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور ایک CONSENSUS پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں کیونکہ ملک کی فضا بہت مکدّر ہو چکی تھی اور اب کسی تصفیہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی سلور جوبلی کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۴۶ء میں انتخابات کے بعد پنڈت نہرو کی قیادت میں جب عبوری حکومت INTERIM GOVERNMENT قائم ہوئی تو ذاکر صاحب کو وزیر تعلیم بننے کی دعوت دی گئی جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ چونکہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے، اس لئے میں کوئی اور تفصیل بیان نہیں کروں گا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے فوراً بعد جب ذاکر صاحب ریل سے کشمیر جا رہے تھے تو جالندھر اسٹیشن پر ان کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور بڑی مشکل سے ایک سکھ افسر کی وجہ سے ان کی جان بچی۔ یہ واقعہ تفصیل سے اور لوگوں نے بیان کیا ہے، اس لئے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہوں گا کہ اس طرح کے تجربے کے باوجود ان کے خیالات اور رویے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔

جب کشمیر کا تصفیہ طے کرنے کے لیے یو۔ این (U.N) کی طرف سے ایڈمرل نمٹز ADMIRAL NIMITZ آئے تو ایک شاید چودہ نکاتی پروگرام ذاکر صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس سب کے علاوہ انھوں نے اس دور میں ہندوستان اور بیرون ملک کے سفر کئے اور مختلف اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ فساد سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے کی مہم میں شد و مد سے لگے رہے۔

ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں کی مالی مشکلات کا اندازہ ذیل کی باتوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب جن کا تعلق عرصے تک جامعہ سے رہا۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے، دو تین سال قبل ان سے جامعہ میں میری ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ میں سب بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈروں سے واقف ہوں، اور میں نے ذاکر صاحب کو بھی جامعہ کے دور میں دیکھا ہے، میں یہ پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ رہن سہن کے اعتبار سے ہندوستان کے سب سے بڑے کمیونسٹ گاندھی جی اور ذاکر صاحب تھے۔ جامعہ میں ان کے گھر کی حیثیت ایک COMMUNE کی تھی۔

دوسری بات بہت دلچسپ ہے۔ قرول باغ کے ایک بنیے نے جب ذاکر صاحب صدر تھے، ان کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ذاکر صاحب راضی ہو گئے۔ اوپر سے ان کو روکا گیا کہ وہ اس بنیے کے ساتھ فوٹو

کھنچوایں کیونکہ اس کی خراب شہرت ہے۔ انھوں نے یہ بات نہ مانی اور فوٹو کھنچوایا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ ان کے قرول باغ کے زمانے میں وہ بنیا ان کو اُدھار دیتا تھا ورنہ فاقے ہوتے۔

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے بہت اصرار پر انھوں نے علی گڈھ کا وائس چانسلر ہونا قبول کرلیا اور سنہ ۱۹۴۸ء میں علی گڈھ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں اور باتیں تو لوگ جانتے ہیں مگر شاید ایک اہم بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ ہو، اس لئے میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔ یہ معلومات مجھے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم سے حاصل ہوئی تھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو اکثریت میں مسلمانوں کے خلاف بہت سخت ناراضگی پیدا ہوئی جو دشمنی کی حد تک پہنچ گئی۔ اس وقت پنڈت گوبند بلبھ پنت یوپی کے وزیراعلیٰ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان یوپی میں رہیں اور بڑے پیمانے پر ہجرت نہ ہو مگر فضا کو دیکھتے ہوئے ان کو اس میں بڑی دشواری نظر آتی تھی چنانچہ انھوں نے یہ سوچا کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور مسلم یونیورسٹی پر ڈال دی جائے۔ آپ کو یہ یاد رہے کہ علی گڈھ کے طلبا اور اساتذہ نے مسلم لیگ کی حمایت میں زبردست حصّہ لیا تھا۔ اس سب کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمان اور ہندوؤں پر برابر کی ہے۔ میں یہ مزید کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری آزادی کی جنگ میں بہت سی کمزوریاں تھیں، مثلاً یہ طے نہ ہو سکا کہ گئوکشی کے مسئلہ پر کیا کرنا چاہیئے۔ بابری مسجد رام جنم بھومی اور کرشن جنم بھومی وغیرہ قسم کے مسائل پر قومی تحریک کا کیا رویہ ہونا چاہیئے تو پھر تقسیم تو ہونا ہی تھی۔ مسلمانوں پر ذمہ داری کیوں رکھ دی جائے۔ خیر، ان باتوں پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم پنت جی کی بات پر واپس آجائیں۔ انھوں نے یہ سوچا کہ غصّہ کو مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور علی گڈھ یونیورسٹی پر منتقل کر دیا جائے اور اس طور سے ان دونوں کا مکمل طور سے خاتمہ کر دیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو یوپی اور ہندوستان میں باقی رکھا جا سکے گا۔ اس پالیسی کو سمپورنانند جی کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں ذاکر صاحب کا علی گڈھ کا وائس چانسلر بننا خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکز نے ذاکر صاحب کو علی گڈھ بھیجنے کا فیصلہ پنت جی کی رائے کے خلاف کیا۔ شاید پنت جی کو ذاکر صاحب سے اس وجہ سے کچھ ناراضگی پیدا ہو گئی، جس کا ویسے تو کوئی ظاہری اظہار نہیں ہوا لیکن ہم آئندہ صفحات میں بتائیں گے کہ شاید یہ ناراضگی آگے چل کر بہت اثر انداز ہوئی۔

علی گڈھ جو بالکل ختم ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اسے ذاکر صاحب کے آنے سے ایک نئی زندگی ملی۔ شروع میں کچھ لوگوں کو جنھوں نے پاکستان کی مہم میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ ان کو ذاکر صاحب سے خطرہ تھا کہ ان سے بدلے لیے

جائیں گے، لیکن ذاکر صاحب نے ایسا نہیں کیا اور ہر اس آدمی کو جو یونیورسٹی کے لئے کسی بھی طریقے سے مفید ہو سکتا تھا، انھوں نے اس کو اپنا تعاون دینے کا وعدہ کیا اور یہ رویہ اختیار کیا کہ جو کچھ ہوا اس کو بھلا دیا جائے بشرطیکہ آئندہ کام خوش اسلوبی سے ملک کے آئین اور قانون کے مطابق ہو۔

انھوں نے تحقیق کے کام پر زور دیا جو علی گڑھ میں اس سے پہلے صرف خال خال ہو رہا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے باہر کے لوگوں کا بڑی تعداد میں تقرر کیا، اور جہاں کوئی اچھا آدمی ملا، اس کو بلا امتیاز مذہب و ملت وخیالات، تقرر کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ علی گڑھ میں اس کی روایت نہیں تھی۔ سر سید نے خود یہی پالیسی رکھی تھی، ان کے بعد ان کے پوتے سر راس مسعود نے بھی بالکل یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ مگر پچھلے پندرہ سولہ سال میں لوگ اس پالیسی کو بھول گئے تھے۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کو غیر مسلموں اور ترقی پسند خیالات کے لوگوں کا خاصی بڑی تعداد میں لیا جانا برا لگا۔ لیکن ذاکر صاحب اپنی پالیسی پر قائم رہے۔ پھر انھوں نے وہاں کے اساتذہ کو بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں پڑھنے اور تحقیق کا کام کرنے بھیجا۔ یونیورسٹی کا بجٹ کئی گنا بڑھا۔ تحقیق کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ پڑھائی لکھائی کا معیار بڑھا۔ یونیورسٹیوں نے نام پیدا کرنا شروع کر دیا۔ کھیلوں کا معیار بھی جو تقسیم ملک کے بعد بہت گر گیا تھا، آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو گیا اور اپنی پرانی سطح پر آ گیا۔ اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے آگے چل کر ہوگا۔ ڈرامے آئے دن ہونے لگے۔ سنگیت اور نغمے سنائی دینے لگے۔ غرضیکہ کلچرل سرگرمیاں زور وشور سے ہونے لگیں۔ علی گڈھ کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ایک نابینا اسکول پہلے سے تھا۔ وہ خیرات زکوٰۃ پر چلتا تھا جس سے وہاں کے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کو گرانٹ پر لے لیا جس سے اسکول کی کارکردگی اور وہاں کے بچوں کی زندگی پر بہت اچھا اثر پڑا۔

علی گڈھ میں جو لوگ میرے طالب علمی کے زمانے میں رہے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ مارچ سے لے کر جون تک ایسی دھول اڑتی تھی کہ سڑک پر چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نے بڑے پیمانے پر وہاں درخت لگائے اور لان تیار کرائے۔ اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوا اور دھول اڑنا بند ہو گئی۔

ذاکر صاحب نے علیگڈھ کے اقامتی کردار میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی مگر اس میں ان کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں بہت سی اہم شخصیتیں مثلاً پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھاکرشنن راج گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند بلبھ پنت اور مولانا آزاد وغیرہ علیگڈھ آئے۔ ان کے علاوہ بیرون ملک کی کئی اہم شخصیتیں بھی علیگڈھ آئیں، جن میں شاہ سعود اور شہنشاہ ایران خاص طور قابل ذکر ہیں۔ مولانا آزاد، ذاکر صاحب کے شروع زمانے میں آئے۔ اس موقع پر خاصی بدمزگی ہوئی اور مولانا ناخوش واپس گئے۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی کارگردگی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی طرف ذاتی توجہ دی۔ طالب علموں کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ اپنی جیب سے بھی خاصی رقم دی۔ ہالوں میں خود جاکر طالب علموں کی ہمت افزائی کرتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فضا بالکل بدل گئی اور یاس کے بجائے نوجوان ہر طرف پر امید نظر آنے لگے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی قدریں نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے میں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ علم کی پیاس پیدا ہو گئی اور نوجوانوں میں جدوجہد کرکے آگے بڑھنے کی امنگیں پیدا ہوئیں۔ بعد میں سب کو یہ اعتراف ہوا کہ ذاکر صاحب کے آنے سے یونیورسٹی بڑے خطروں سے بچ گئی اور اس نے بڑی ترقی کی۔

ذاکر صاحب کے دور میں جب نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو پاکستان میں قتل کر دیا گیا تو علی گڑھ میں اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو بگڑنے سے روکا۔ ایگزیکٹو کونسل یہ رزولیوشن پاس کر چکی تھی کہ کسی کی موت پر بھی یونیورسٹی سائرن نہیں بجایا جائے گا۔ لڑکوں کا اصرار تھا کہ سائرن بجایا جائیگا ذاکر صاحب نے لڑکوں کے موڈ کو جانپ لیا تو انھوں نے یونین میں جاکر یہ کہا کہ اگر یونین بغیر کسی اختلاف کے یہ رزولیشن پاس کردے کہ سائرن بجایا جائے تو میں اسے مان لوں گا۔ اس پر دو لڑکوں نے ہاتھ اٹھانا چاہے کہ ان کو اس بات سے اختلاف ہے۔ ایک تو رضی الدین احمد جو بعد میں تروپتی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ اور ایک صاحب کلکتہ کے جن کا پورا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ بہرطور بہت سے لڑکوں نے ان کا ہاتھ نیچے دبا دیا۔ لیکن ذاکر صاحب کو شبہ ہو گیا کہ کچھ لوگوں کو خلاف رائے دینے سے روکا جا رہا ہے، تو انھوں نے کہا کہ چونکہ اس پر اختلاف ہے۔ اس لئے سائرن نہیں بجایا جا سکتا۔ لڑکوں نے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہے۔ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ بات صاف تھی کہ اس پر اختلاف تھا۔ جب لڑکوں نے ذاکر صاحب کی بات نہیں مانی اور جس کمرے میں سائرن تھا اس کا دروازہ توڑنے لگے اور بالکل داخل ہونے والے تھے تو انھوں نے کہا۔ ”میں حکم دیتا ہوں کہ سائرن بجایا جائے۔“

علی گڑھ کے دور کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائنس کے ایک غیر مسلم پروفیسر صاحب کی بہت مخالفت پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب ان سے دل میں شاکی تھے۔ مگر برابر ان کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ضرور صحیح تھا کہ ان پروفیسر صاحب کا رویہ ڈکٹیٹروں جیسا تھا، مگر ان میں بہت خوبیاں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مضمون میں کافی شہرت کے مالک تھے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اپنے مضمون کے سب پروفیسروں سے زیادہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھ سے ذاکر صاحب نے کہا کہ دوسرے آدمی میں یہ سب خرابیاں جو وصف میں ہیں وہ تو ہوں گی اور مضمون اتنا بھی نہیں آتا ہوگا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات مجموعی طور پر صحیح ہے۔ ان

کہنا تھا کہ ہمارے نوجوانوں کو لوگوں کے ساتھ نباہ کرنا سیکھنا چاہیئے کوئی ABSOLUTE JUDGEMENT دیے جا سکتے۔ جیسے آدمی ہیں ان ہی سے کام نکالنا ہوگا۔ وہ آدمی جیسا لوگ چاہتے ہیں کہاں سے آئے گا۔

ایک اور دلچسپ بات مجھے حسین علی کاظمی مرحوم نے سنائی۔ یہ علی گڑھ میں بعد میں director PHYSICAL CULTURE ہوئے۔ اپنے علیگڈھ کے شروع کے دور میں ذاکر صاحب نے حسین علی صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کا اہم کام تو علم اور تحقیق کے کام کو بڑھانا ہے لیکن عام مسلمان علیگڈھ کو اس کی ہاکی ٹیم کی کارکردگی سے جانتا ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ ہاکی کوچ کی حیثیت سے کام کرنا قبول کریں اور ایک ایسی ٹیم بنا کر دیں جو علی گڈھ کی ہاکی کی پرانی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دے، مجھ سے جو مدد ہو سکے گی وہ میں کروں گا۔

ڈاکٹر نورالحسن صاحب کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ ان کو ہاکی کلب کا پریسیڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہکر معذرت کی کہ وہ کبھی ہاکی نہیں کھیلے ہیں اور نہ ان کو اس سے کچھ واقفیت ہے۔ وہ اس میں کیا کر سکیں گے۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ کام آپ کو قبول ہی کرنا ہے کیونکہ جو صلاحیتیں آپ میں ہیں ان سے آپ اس کام کو اور سب سے بہتر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے اس کام کو قبول کیا اور ایک ایسی ٹیم بنائی کہ شاید اس جیسی ٹیم علیگڈھ نے پہلے بھی بہت مشکل سے بنائی ہوگی۔ یہ سب کی متفقہ رائے ہے کہ نورالحسن صاحب جیسا کامیاب ہاکی کا پریسیڈنٹ کوئی نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ نورالحسن صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعبۂ تاریخ کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم اور شیخ عبدالرشید مرحوم نے وہاں بہت پہلے سے صحت مند روایات قائم کی تھیں، اور شعبے کی آئندہ ترقی کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ شعبۂ تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں دیر لگی، تو مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ سیاست لڑانے کے سوا کوئی علمی اور تحقیق کا کام وہاں نہیں ہو رہا ہے اور سب ایک FRAUD ہے۔ مجھ سے تو ذاکر صاحب نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کہی مگر میں نے اڑتی پھرتی یہ بات سنی ہے کہ وہ بھی شاکی ہو گئے تھے کہ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئی ہیں۔ مجھ کو اس میں ذرا شک ہے، کیونکہ ان کی زندگی ہی میں کچھ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ذاکر صاحب اب زندہ ہوتے تو شعبۂ تاریخ کے کام سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے بعد بھی بہت خوش ہوتے۔ ان میں وہ بات تھی کہ وہ متضاد دھاروں میں ایک ساتھ خوبیاں دیکھ سکتے تھے۔ (اس کی اور مثالیں بھی میں پیش کروں گا) چنانچہ اگر آج ذاکر صاحب زندہ ہوتے تو وہ بیک وقت

پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر اطہر علی، پروفیسر اقتدار عالم خاں صاحب اور کئی لوگوں کی طرح ستائش کرتے اور پروفیسر محمد حبیب اور شیخ رشید کے علاوہ نورالحسن صاحب کی خدمت کا اعتراف کرتے۔

پنڈت نہرو کی علیگڈھ آمد کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقعہ پر ذاکر صاحب نے جو تقریر کی اس کی ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد رہ گئی جو اکثر میں اپنے طالب علموں کو بتاتا رہتا ہوں۔ وہ میں یہاں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ذاکر صاحب کا اسی طرح قصے سنا کر چیزوں کو بتانے اور سمجھانے کا طریقہ تھا۔ کہنے لگے کہ اکثر ایجاد ایک بہت چھوٹی سی بات سے ہوتی ہے۔ مثلاً ریل کی پٹری پہلے سے تھی۔ اس پر گھوڑا گاڑیوں سے کوئلہ کی کانوں میں کوئلہ ڈھویا جاتا تھا۔ اسٹیم انجن کانوں میں جو پانی بھر جاتا تھا اسکو نکالنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جارج اسٹیفنس نے صرف یہ کیا کہ اسٹیم انجن کو پٹریوں پر رکھ دیا۔ اس طرح ریلوے کی ایجاد ہوئی۔

علیگڈھ کے زمانے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ رادھا کرشنن کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اس کمیشن کی رپورٹ کی بہت اہمیت ہے۔

علی گڈھ کے قیام کے دوران انھوں نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اردو کی حمایت میں دستخطوں کی مہم چلائی۔

ویسے تو علی گڈھ میں ان کو طلبا اور اساتذہ کی بڑی اکثریت کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا مگر آخر میں کچھ ساتھیوں سے شاکی ہو گئے اور دل برداشتہ رہنے لگے۔ چنانچہ بغیر TERM پورا کئے ہوئے ۱۹۵۶ء میں علی گڈھ چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد بہار کے گورنر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد پہلے وائس پریسیڈنٹ اور پھر پریسیڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ دو سال ہی پریسیڈنٹ رہے تھے کہ قلب کا دورہ پڑنے سے ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہو گیا۔

خیالات، مسائل اور شخصیتوں کی طرف رویہ: ذاکر صاحب نے تحریک خلافت سے زندگی شروع کی لیکن جب وہ ایم، اے، او، کالج آئے تو وہاں کے تجربات سے ان میں جاگیردارانہ نظام کی قدروں کے خلاف فکر شعوری طور پر پیدا ہوئی اور میرے خیال میں اس نے ان کی مستقبل کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا۔ شاید یہی ان کو گاندھی جی کے ساتھ لے گئی، اسی سے آگے چل کر انھوں نے سیکولرازم، نیشنل ازم، اور جمہوریت کے راستے ڈھونڈے، اور پھر زندگی بھر ان کو نہ چھوڑا۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان میں تکمیلیت پسندی بدرجۂ اتم تھی۔ اسی نے ان میں جمالیاتی حس پیدا کی۔
مندرجہ بالا کی روشنی میں ہم ان کی فکر پر مختصراً ایک نظر ڈالنے جا رہے ہیں:

جاگیردارانہ نظام مخالف رویہ: جیسا کہ ذکر آچکا ہے، اس کی شروعات علیگڈھ سے ہوتی ہے۔ جب وہ علیگڈھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے کوشش کی کہ وہاں کے اقامتی کردار میں ایسی تبدیلیاں پیدا کریں جس سے جاگیردارانہ قدریں کمزور ہوں، لیکن اس میں ان کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی جو ہوئی وہ مجھے یاد ہے۔ پہلے ہالوں میں نائی بال کاٹنے اور شیو بنانے کے لیے مقرر تھے۔ انھوں نے اس طریقے کو ختم کر دیا۔

ذاکر صاحب کے آنے کے بعد مولانا آزاد کی رائے اور مشورے سے ۱۹۲۰ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی جگہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ لایا گیا۔ اس سے پہلے کے ایکٹ نے یونیورسٹی کو روٗسا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ نئے ایکٹ میں یہ اثرات بہت کم کر دیے گئے اور یونیورسٹی کو ایک صحت مند راستے پر ڈالا گیا۔

علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں جو دو ایک باتیں سیکولرازم کے منافی تھیں، وہ ختم کر دی گئیں، مثلاً غیر مسلم اب کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے۔ ایک تبدیلی اس ایکٹ کی رو سے یہ کی گئی کہ اگر کوئی مسلمان طالبعلم چاہتا تو دینیات کے بجائے HISTORY OF CIVILIZATION لے سکتا تھا۔ اس کا استعمال تو دو چار سال میں کہیں ایک دو بار ہی ہوتا ہے، مگر اصولاً یہ امکان اس ایکٹ کی رو سے پیدا کر دیا گیا۔

سیکولرازم: بنیادی تعلیم کی سفارشات کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر MINUTES دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اگر ذاکر صاحب ذرا ڈھیلے پڑ جاتے تو سیکولرازم کا خاتمہ بہت پہلے ہو گیا ہوتا۔ ابھی تو سانس چل رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ مریض جانبر ہو جائے۔ غالباً اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اجاریہ کرپلانی نے ذاکر صاحب کے لیے کہا ہے کہ وہ ہماری سیکولرازم کے معمار تھے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ملک میں عام طور پر ایک سیکولر مزاج تھا۔ لیکن چیزیں واضح اور صاف نہیں تھیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ مذہبی تعلیم دینے کی سفارش کر دی جاتی۔ کمیٹی میں تو یہ رائے اکثریت میں معلوم ہوتی تھی۔

ایک بات جو مجھے اچھی طرح یاد پڑتی ہے، مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں دیکھا، اور جس کا ذکر آچکا ہے، یہ ہے کہ ریاست اس صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں ذاکر صاحب نے اس بات کے خطرے کا اظہار کیا کہ مذہب کو سیاست سے نہ ملایا جائے۔ اس کو ڈھونڈا جائے۔ اگر یہ مل جاتی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی سیاسی بصیرت ان کے

... تھی

ان کا سیکولر رویہ اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ جب وہ نائب صدر اور صدر تھے تو گو کہ وہ سب نمازیں پڑھتے تھے اور قرآن شریف کی تلاوت برابر کرتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے۔ کبھی ان سے اس پر بات نہیں ہوئی مگر یقیناً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ ایک سیکولر ریاست کے نائب صدر یا صدر کو RELIGIOUS میں DEMONSTRATIVE WAY نہیں ہونا چاہیے۔[1]

ایک دفعہ کچھ مسلمانوں نے یہ سوچا کہ کانگریس کے سب مسلمان ایم۔ پی ایک گروہ بنالیں اور کسی ایک طرف سودا BARGAIN کرکے ہو جائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی جس کی وجہ سے یہ پلان ناکامیاب ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ کا حال بہت ہی خراب ہوگیا۔ کوئی طالبعلم نہیں رہا۔ ہر طرف آگ لگ رہی تھی اور قتل و غارتگری ہو رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید کوئی مسلمان مع ذاکر حسین خاں کے ہندوستان میں نہ رہ سکےگا۔ تو وہاں کے استادوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ ہم لوگ ایسے میں کیا کریں تو انھوں نے کہا کہ ہم پھول بوئیں تاکہ ہم اپنے بعد کے آنے والوں کو خوبصورتی کا سبق سکھائیں۔ اس سے پہلے ان کے جالندھر کے حادثے کا ذکر آچکا ہے۔ ایسے تجربات کے بعد اپنا توازن قائم رکھنا ہر آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جو سیکولرازم کے عظیم ترین معماروں میں سے ہو۔

کبھی انھوں نے پرائیوٹ گفتگو میں بھی ذرا سی دیر کے لیے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو سیکولرازم سے ہٹ کر ہوتی۔ میں تو کہوں گا کہ پنڈت نہرو کے لیے سیکولر ہونا آسان رہا ہوگا کیونکہ انھوں نے مذہب قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ان کو مذہب عزیز تھا اور ملک کی فلاح و بہبود کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود بہت عزیز تھی۔ کبھی لغزش ہو سکتی تھی۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ کبھی بہت غصے میں یہ ایک دفعہ کہا ہے کہ اگر اس طرح کا دشمنانہ رویہ رکھا گیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ شاید مسلمانوں نے پاکستان ٹھیک بنایا۔ باقی وہ برابر سیکولرازم کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ میں ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں:

"یہ بات ۱۹۶۷ء کی ہے جب وہ صدر تھے۔ میں کشمیر سے قریب ایک ماہ بعد واپس آیا۔ اس دوران عرب اسرائیل جنگ ہو چکی تھی جس میں عربوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ میں سفر سے آتے

---

[1] جماعت اسلامی کے مشہور سید صاحب کو ذاکر صاحب نے سمجھایا کہ مسجد میں نماز ادا کرنے کی وجہ گھٹنے کی تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر نماز ادا کرتے تھے۔ عیدین جمعہ میں عیدگاہ میں نماز ادا کرنے تو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ (دیکھئے جرنل ۱۰-۲۲۔ صفحہ ۸۴) ادارہ

ہی سوگیا تھا۔ جیسے ہی اٹھا تو دیکھا کہ ذاکر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا واقعہ پہلی اور آخری بار ہوا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ملازمین سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ میں اٹھا یا نہیں۔ آتے ہی بولے کہ "جنگ ہوئی تھی . . ." اتنا کہا تھا کہ آنسو نکل آئے اور وہ ویسے ہی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر واپس چلے گئے۔

یہ PAN-ISLAMISM نہیں تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری تحریک آزادی نے، خاص طور پر گاندھی جی نے ہمیشہ واضح طور پر عربوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کو امپیریلزم کے خلاف جدوجہد کرنے والی سب قوموں سے ہمدردی تھی، عربوں سے یقیناً کچھ زیادہ رہی ہوگی۔

تکمیلیت: وہ چاہتے تھے کہ جو کام کریں وہ بہترین کریں ورنہ نہ کریں۔ دوسرے درجے کا کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کو تقریر لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی اور وہ اس سے بہت کڑھتے تھے، ان کا موڈ خراب رہتا تھا کیونکہ وہ بہترین چیز لکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر بالکل آخر وقت تیار ہو پاتی تھی۔

تکمیلیت پسندی کے فلسفے کی وجہ سے ہی انھوں نے نسبتاً بہت کم تحریری مواد چھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میر نے اپنے ذیل کے شعر میں ان کے فلسفے کی خاصی ترجمانی کی ہے:

شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں   عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

مذہبی افکار: ان کے فلسفۂ حیات میں خاص دخل قرآن، صوفی، لبرل فلسفی، شاعر، آرٹسٹ اور گاندھی جی کو ہے۔ ان کے یہاں خوبصورتی مذہبی عقیدے کا ایک خاص عنصر ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا عظیم ترین خوبصورتی ہے۔

وہ خوبصورتی کے سچے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی روحانی غذا تھی۔ وہ خوبصورتی آرٹ، سنگیت، رقص، رنگین پتھروں، پھولوں اور عمدہ لانوں وغیرہ میں دیکھتے تھے۔ لان پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ رانچی میں میں ان کے ساتھ لان میں ٹہل رہا تھا۔ میں لان کی خوبی کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا یہ لان کیسا ہے۔ میں نے اپنے خیال میں مصلحتاً کہا کہ اچھا خاصا ہے، تو اس پر انھوں نے جھنجھلاہٹ سے کہا کہ اگر یہ اچھا خاصا ہے تو پھر اچھا کیا ہے۔

ان کے اسلام کے تصور میں ڈرامہ، سنگیت، اور رقص وغیرہ حرام نہیں تھا۔ شاید ان چیزوں کی خوبصورتی ان کا خدا سے سلسلہ ملاتی ہے۔ ان کے مذہبی افکار یقیناً عام لوگوں سے مختلف تھے گو کہ وہ مجموعی طور پر پابند شرع

تھے۔ ان کو FULLY PRACTICAL MUSLIM کہنے میں مجھے ذرا سا بھی تامّل نہیں ہے۔ مجیب صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کو نہ تو کٹر کہا جا سکتا ہے نہ غیر کٹر۔ ان کی شخصیت اور افکار ایسے بنے ہیں جنکو دو چار الفاظ میں مروّج اصطلاحوں کی مدد سے بیان کیا جا سکے۔ اکبر کے ذیل کے شعر ان کے افکار کو سمجھنے میں کسی قدر مددگار ہوں گے:

ہیں ہر ایک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی یاد رکھ تو بات یہ اک محرمِ اسرار کی

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے راز دیں سمجھا فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

یہ بات ظاہر ہے کہ اس طرح کی مذہبی فکر رکھنے والا آدمی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

قوم و ملت اور ہندوستانی نیشنل ازم کا ان کا تصور: علما میں سب سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی نے مدلل اور واضح طور پر یہ کہا کہ قوم اور ملت دو الگ چیزیں ہیں اور قوم کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس بات کی بنیاد تو پہلے سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی تھی مگر مدنی صاحب نے اس کو پر زور طریقے پر پیش کیا اس نقطۂ نظر سے سر محمد اقبال کو سخت اختلاف ہوا اور انھوں نے ایک بہت سخت نظم بہ عنوان "حسین احمد" لکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا اس سے سخت جواب مولانا اقبال سہیل خاں نے لکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذاکر صاحب کے قوم و ملت کے بارے میں خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

گفت وخوش گفت برسرِ منبر ملت از دین، و قوم از وطن است

ہم روایت دلیل ایں معنی ہم ز آیت ثبوت ایں سخن است

آگے چل کر حب الوطنی پر کہتے ہیں:

گر نیاید بہ ملت آسیبے عین ایمان محبت وطن است

قوم ما ہست ہر کہ ہست بہ ہند خواہ شیخ است و خواہ برہمن است

. . . .

مسلم و ہندو و مجوس و یہود گل و نسرین و لالہ و سمن است

ہر کہ گفتہ خلاف ایں معنٰے راہبر نیست بلکہ راہزن است

ہر کہ خاک افگند بہ دیدۂ حق خاک بر سر و خاک در دہن است

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اقبال سہیل خاں علیگڈھ میں ذاکر صاحب کے ساتھی رہے تھے اور ذاکر

ان کی لیاقت، ذہانت اور قابلیت کے بہت قائل تھے۔ ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ "علی گڑھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیل تھے۔" رشید احمد صدیقی نے ان کے لئے کہا ہے "۔۔۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی ادبی فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے، لیکن سہیل نے دفعتاً فوقتاً ذوق پر ایسی کڑی اور کبھی استہزائی اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا ایسا سکہ بٹھلایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا۔"

کہا جاتا ہے کہ سہیل صاحب کا جواب پڑھ کر سر محمد اقبال نے مولانا حسین احمد سے لکھ کر معافی مانگی اور ان اشعار کو مجموعہ سے خارج کرنے کی ہدایت کی، مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے، اگر ایسا ہوا تو صرف تین چار اشعار نہیں بہت کچھ اور بھی خارج کرنا پڑے گا۔

انڈین نیشنلزم پر ذاکر صاحب بالکل صاف طور پر UNITY IN DIVERSITY کے قائل تھے۔ اس کو حال میں میں نے ای۔ کے۔ گجرال کی ایک تقریر سے واضح طور پر سمجھا۔ مختصراً عرض ہے:

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک بڑا حصہ مغلوں کے پاس تھا، لیکن دور دراز کے علاقے خود مختار تھے صرف مختصر عرصے کے لیے اشوک اور اورنگزیب کے زمانے میں تقریباً پورا ہندوستان ایک حکومت میں تھا۔ اس طرح ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مختلف مذاہب تھے، مختلف زبانیں تھیں بلکہ مختلف علاقوں کے تاریخی تجربات اور معاشی حالات بھی مختلف تھے۔

انگریزوں کے آنے کا جو ردِ عمل ہوا اس سے دو مکتبِ خیال پیدا ہوئے۔ ایک تو وہ تھے جنھوں نے DIVERSITY کا اعتراف کیا اور UNITY IN DIVERSITY کی بات کی۔ دوسرا مکتب وہ تھا جس نے ان فرقوں کو نظر انداز کیا اور پورے ملک کے سب خطوں کو یکساں ایک بنانے کی کوشش کی۔ ان دو مکاتب میں شروع سے رسہ کشی چلی آرہی ہے۔ کانگریس میں بھی دونوں مکاتب رہے ہیں، لیکن اوّل الذکر مکتب حاوی رہا ہے۔ اسی مکتب کے علمبردار گاندھی جی، پنڈت نہرو، ذاکر صاحب اور بہت سے اور لوگ ہیں۔

دوسرے مکتب کے لوگ اقلیتوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ کیا تم اپنی ملت کو مقدم سمجھتے ہو یا ملک کو۔ اس سے بدمزگی اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال بالکل ایسا ہے جیسا کہ بعض لوگ ناسمجھی میں بچوں سے پوچھتے ہیں کہ آیا ان کو ماں سے زیادہ محبت ہے یا باپ سے۔ اس سے بچے کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ دونوں سے محبت کرتا ہے یہی قدرتی بات ہے۔

- ارمغانِ بہار (عکس) مع مقدمہ

——— علی حیدر نیر

- یادداشتہائے ودود

قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے اور اب سب دانشوروں کی مشترکہ اثاثہ ہیں۔ اپنے پیچھے انھوں نے جو کچھ غیر منضبط ترکہ چھوڑا ہے اس میں ان کی بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو چھپیں تو لیکن آج تک چھپی پڑی ہیں۔ "ارمغانِ بہار" کے نام سے ایک گلدستہ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر علی حیدر نیر نے اسے از سر نو پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے ہم ان کے ممنون ہیں۔

آخر زمانے میں قاضی صاحب کا یہ عالم تھا کہ لکھتے تھے اور پھر ادھر ڈال دیتے تھے کبھی کبھی اسی چیز کو سامنے میسر نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں سے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آ چکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔

ادارہ

ارمغان بہار (عکس) مع مقدمہ

سید علی حیدر نیّر
استاد ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی
پٹنہ، بہار

ارمغانِ بہار

مرتبہ، قاضی عبدالودود مع تعارف

"ارمغان بہار" صوبہ بہار کے گذشتہ تیئیس شعرا کے اشعار کا انتخاب ہے۔ اس کو قاضی عبدالودود نے حسب فرمایش جناب انوار الحسن عظیم آبادی مرتب کیا، اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین (گورنر بہار) جو سبکدوش ہو کر دہلی جا رہے تھے، ان کی وداعی دعوت کے موقع پر ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کی جانب سے بطور یادگار بتاریخ ۲، مئی ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

مذکورہ انتخاب میں یہ اصول پیش نظر رہا کہ وہ بیرونی اصحاب جو کم عمری میں بہار آئے اور یہیں اقامت گزیں ہو گئے، انھیں بہاریوں میں محسوب کیا گیا جیسا کہ مرتب نے ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ایک مجلسِ مشورت تشکیل دی تھی:

۱۔ جناب کلیم الدین احمد، ۲۔ جناب عطا کاکوی، ۳۔ جناب جمیل مظہری، ۴۔ جناب سید حسن، ۵۔ جناب ذوار کا داس شعلہ، ۶۔ راقم الحروف (سید علی حیدر نیّر)۔

اس انتخاب کے سلسلے میں عملی طور پر یہ اصول کارفرما تھا کہ مذکورہ اشخاص سے جو اشعار یا شعرا کے متعلق واقفیت حاصل ہوتی۔ قاضی صاحب کی پسند اور تصدیق کے بعد ہی اسے اس انتخاب میں داخل کیا جاتا۔ بالخصوص شعرا کی سنہ پیدایش، وفات اور تلمذ کے سلسلے میں قاضی صاحب کا فیصلہ حرف آخر ہوتا۔

انتخاب کا آغاز راسخ عظیم آبادی کے منتخب اشعار سے ہوا جو قدما میں سب سے عظیم شاعر تھے۔ بعد ازاں کسی خاص قاعدے کی پابندی کیے بغیر اسے مرتب کیا گیا۔ عنوانات میں بطور اشاریہ "ش" سے شاگرد اور "م" سے متوفی مراد ہے۔

"ارمغان بہار" میں جن تیئیس شعرا کا انتخاب درج ہے۔ ان میں راسخ، ضیا، باقر، حسرت، امین، ثابت، رضا، سلطان، سلیم، کمال اور مبارک کے سال وفات کی تعین ہے۔ نیز اسحق بہاری، ضیا، رضا، رضا عظیم آبادی، حیران، تمنا، مبارک (شاہ مبارک حسین) اور مبارک (ڈاکٹر مبارک تلمیذ داغ) کے تلمذ کی

نشاندہی کی گئی ہے۔

"ارمغانِ بہار" گرچہ ایک مختصر انتخاب ہے، لیکن اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے قاضی عبدالودود کے ذوقِ شعری اور طریقۂ انتخاب پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابچہ گرچہ مطبوعہ ہے لیکن کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ قاضی صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ قاضی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس کا سلسلہ جاری رہے اور جہاں تک ممکن ہو مختصر انتخابات منظرِ شہود پر لائے جائیں، لیکن یہ منصوبہ تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ اور اس سلسلے کا یہ پہلا اور آخری انتخاب شائع ہوا۔

چند اشعار نمونے کے طور پہ پیش ہیں جن سے ذوقِ انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے:

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے — کہ ہنس بھی یاں کیا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو (راسخ)

صبح سے بیتابیِ دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے — دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے (سعید)

سیر کر کے چمن چمن فصلِ بہار دیکھ کر — دام بچھے ہیں جابجا بلبلِ زار دیکھ کر (اثر)

ہمیں تو عمرِ دوروزہ عذاب ہے اے خضر — بلائیں تم نے ہی عمرِ جاوداں کے لیے (اختر بہار)

پوچھا جو کسی نے اے اختر کیوں مشقِ سخن کو چھوڑ دیا — بولے کہ گیا جب موسمِ گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا (سید حفیظ الدین بلخی)

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں — یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں (مضطر مظفرپوری)

جو ٹپکے راز کھل جائے نہ ٹپکے آگ لگ جائے — تری یہ کشمکش اے دیدۂ پُرنم سمجھتے ہیں (ضیا)

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے — ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے (باقر)

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں (حسرت)

سنا ہے آج میخانے میں جامِ مے پرستوں نے — لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں (ابن خواجہ ابن العلی)

دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی (دل)

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا — اب تک دلِ مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا (جوشش)

ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا — مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا (ثابت)

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہو اب کیا کام کریں — شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں (مصحفی)

رفقا کا اب خدا حافظ ہے یارو — یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی (رفعت اشرف میر ضیا)

نکہت گل کو یے گوشش پہ پھرتی ہے صبا ___ رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو (فیق)

یاد آگیا کسی کا کہنا وہ بے رخی سے ___ بولے کوئی نہ ہم سے بولیں نہ ہم کسی سے (سلطان)

چلے جب روٹھ ہم زنداں کے در کی توڑ کر کڑیاں ___ تو زنجیریں منانے کو وہیں پاؤں کی آپڑیاں (سلیم)

پاس جب آپ کو نہیں پاتے ___ آپ میں آپ کو نہیں پاتے (رضوان)

جی دھڑکتا ہے مرا ہجر کی پھر رات آئی ___ ہائے جس بات کو ڈرتے تھے وہی بات آئی (حیران)

دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں ___ لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں (تمنا)

وہ جو نامور تھے زمانے میں ذکر سن لو فسانے میں ___ مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں (مبارک ش وحید)

اڑتا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں ___ منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہبر کہیں (کمال)

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا ___ پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا (مبارک ش وحید)

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا ___ یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا " " "

یہ غم کدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں ___ غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے " " "

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا ___ مرے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے (مبارک ش وحید)

ارمغان بہار
ARMAGHAN-I-BIHAR

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار

۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

IDARA-I-TAHQIQAT-I-URDU

ادارۂ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ

ارمغانِ بہار

صوبۂ بہار کے شعرای گذشتہ کے اشعار کا انتخاب

از

قاضی عبدالودود

جناب انوارالحسن عظیم آبادی کی فرمایش سے

لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ نے چھاپا۔

عرضِ حال

ارمغانِ بہار صوبۂ بہار کے شعرائے گذشتہ کے اشعار کا انتخاب ہے۔ وہ بیرونی اصحاب جو کمعمری میں یہاں آئے اور توطن پذیر ہو گئے، بہاریوں میں محسوب ہوئے ہیں۔

انتخاب کے ذمہ دار جناب قاضی عبدالودود ہیں۔ ادارہ اصحابِ ذیل کا جن سے اشعار کے جمع کرنے یا چننے میں مدد ملی ہے، نہایت ممنون ہے: جناب کلیم الدین احمد، جناب عطا کاکوی، جناب جمیل مظہری، جناب سید حسن، جناب دوارکا داس شعلہ، جناب سید علی حیدر نیر۔

ابتدا راسخ سے کی گئی ہے، جو غالباً شعرائے قدیم میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بعد ترتیب میں کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ شعرا کی فہرست آخر میں ملیگی، عنوانات میں ش سے شاگرد اور م سے متوفی مراد ہیں۔

ارمغانِ بہار کی اشاعت کے اخراجات جناب انوار حسن حیرت زادا کیے ہیں۔ ادارہ ان کا بغایت شکر گذار ہے۔

راسخ، غلام علی، م ۱۲۳۸ھ

اپنی جانب تھا کشاں ہر عضو تیری درد کو
ہای ری لذت کہ جھگڑا جس کا ہمدیگر رہا

تمہاری بات ای راسخ سمجھ میں کس طرح آئی
گلہ بھی یار کا کرتی ہو اور روتی بھی جاتی ہو

صبح سی بیتابی ہی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہی
دیکھیی کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہی

ہونٹ ہیں سوکھی تر ہیں آنکھیں زرد ہی چہرہ راسخ آہ
بندی سی صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھی رشک ہی تو انھوں پہ ہی
جنھیں تیری جلوی کی سامنی مری طرح بیخبری رہی

ضبط گریہ تو ہی پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہی   قطرۂ آنسو کی ٹپک پڑتی ہیں دو چار ہنوز

چشم کیا کیا تھی یہ دیکھا ہی نہ ان نی ہاتھ اٹھا
اک نگاہ سرمگیں کی میں تو حسرت میں رہا

اگر کچھ درد رکھتا ہی تو راہ عشق یوں طی کر
کہ نی کانٹا کوئی ٹوٹی نہ پھوٹی آبلہ پا کا

مجھی تو رنجش سی تھی میں اس کو کیا جانوں   تمھیں کہو کہ لیا تم نے کس ادا سے دل

ہنر مستغنی اس سے ہے کہ قدر افزا میسر ہو
شناسا گو نہ ہو تیرا کوئی پر تو تو گوہر ہو

الٰہی دے وہ آتش دل کے اندر — کہ جس سے شعلۂ دوزخ رہے تر
جگر وہ جس میں ہووے داغ پر داغ — ہزار آتشکدے ہوں زیر ہر داغ
رہے سوزش سے سینہ رشک گلخن — نفس آتش پہ دل کی مارے دامن
لبوں سے آشنا ہو نالۂ گرم — رہے جوں موم آتش دیدہ دل نرم
دھواں آہوں کا پہنچے آسماں تک — محبت آتش افگن ہووے یاں تک
مرے سے درد کے جو آشنا ہو — الٰہی اب مجھے وہ دل عطا ہو
شکست تازہ سے ہر دم رکھے ساز — رہے باب شکست اس پر سدا باز
شب لگ کے گلے مرے بلا فصل — روئی تا صبح حسرت وصل
دشمن ہوئی میرے جی کی ہیہات — افزونی خواہش ملاقات
گھٹنے لگی ہائے طاقت صبر — پہنچی نزدیک رخصت صبر
اشکوں نے کہ دل تھا ان کا مسکن — پھیلائے پاؤں تا بدامن
دریا بہا آنکھ سے لہو کا — ٹپکا خوں ہو دل آرزو کا
بیتابی سے بس کہ سر اٹھایا — سینے سے جگر لبوں تک آیا
تھا یہ دل داغ داغ کا حال — ہو باد میں جوں چراغ کا حال

سید محمد عباس عرف ابو صاحب

سیر نہ کر چمن چمن فصل بہار دیکھ کر
دام بچھے ہیں جابجا بلبل زار دیکھ کر

اثر، امداد امام

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

نہ کر شکوہ ہمارے بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں تری سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

خزاں زندگی ہے تفرقہ اہل محبت کا — مزا دنیا میں جینے کا بہار دوستاں تک ہے

ہیں تو عمر دو روزہ عذاب ہے اے خضر — بلائیں تم نے سہیں عمر جاوداں کے لئے

اثر مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی — قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہوکر

سمجھایا بہت دل کو سمجھانے کو کیا کہیے — دیوانہ ہے دیوانہ دیوانے کو کیا کہیے

آتے ہی چلے جانا کیا آنا ہے کیا جانا — اس آنے کو کیا کہیے اس جانے کو کیا کہیے

خدا کی خدائی ہمیشہ رہیگی — جو ہوتا رہا ہے سو ہوتا رہیگا

احقر بہاری، ش ازل لکھنوی

پوچھا جو کسی نے اے احقر کیوں مشق سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

سید حفیظ الدین بلخی

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں
یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

کچھ نہ تھا سب کچھ ہوا پھر کچھ نہیں — رنگ ہے آغاز کا انجام میں

جن کو ہے آداب مجلس کا لحاظ — خاک اڑتی ہے انھیں کے جام میں

مضطر مظفرپوری

جو ٹپکے راز کھل جائے نہ ٹپکے آگ لگ جائے
تری یہ کشمکش اے دیدۂ پرنم سمجھتے ہیں

ضیاء ش شوق نیموی م ۱۳۱۹ھ

کچھ کہا جاتا نہیں حال پریشانی دل — کہنے بیٹھینگے تو دل اور پریشاں ہوگا
تصویر ہوں میں غم کی کچھ سننا نہ کچھ کہنا — تانے ہوئے اک چادر خاموش پڑے رہنا
بڑھتی چلی ہے جی کی الجھن دل کو سنبھالے جاتے ہیں
دیکھیے آگے عشق میں کیا ہو لوگ بہت سمجھاتے ہیں
اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے
کبھی دکھے ہوئے دل سے جو آہ کی ہوتی — پکار چار طرف سے پناہ کی ہوتی
ضیا تری لاش پہ کرتی ہے ماتم — تری جامہ زیبی تری نوجوانی
کوچے سے نکلواتے ہو عبث ہم ایسے وطن آواروں کو
رہنے دو پڑے ہیں ایک طرف دکھ دیتے ہو کیوں بیچاروں کو

حزیں دہلوی میر محمد باقر م قبل ۱۱۶۶ھ

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

حسرت، ہیبت قلی خاں، م ۱۲۱۰ھ

عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا — کبھی اس کی کوچے میں آنا نہ جانا

ترا غرور مری عجز کی مقابل ہی — ادھر پہاڑ ادھر ایک شیشۂ دل ہی

سنا ہی آج میخانے میں جام مے پہ مستوں نے

لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

امین، خواجہ امین الدین، م ۱۱۹۹ھ

کیا فائدہ ہی رونے سے اے اہل درد پھر — آتا ہی بعد مرنے کے یاں کوئی مرد پھر

ہم کو کیا گر بہار آتی ہی — دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی

عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

دل، محمد عابد، معاصر امین

بدنام ہوئے عشق میں حاصل نہ ہوا کچھ — فریاد کی نسبت تو خموشی میں اثر تھا

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا

اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

دل مضطر کو ماری درد و غم ناحق جدائی میں

یہی انصاف ہی کیا اے خدا تیری خدائی میں

جوشش، برادر محمد عابد دل

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریے میں اثر تھا — یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

ہر ایک خار بیاباں رکھی ہی نوک زباں — یہ ماجرا ہی ہماری برہنہ پائی کا

ہزار پیار کریگا ہزار چاہیگا — مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہیگا

چمن میں یار بن رہنی کو تو کیا ہی رہا کیجی
ولیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجی

اختیاری کیا ہی یہ آوارگی — وہ مثل ہی بندگی بیچارگی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ — رہتا ہی مدام آب دیدہ

ماتمکدۂ جہاں میں جوں ابر — رونی کی لیی ہوں آفریدہ

گر آلندہ ہی دل میں اتنا ہی آرزو ہی — تاراج بی نیازی اقلیم آرزو ہو

گلزار محبت میں نہ پھولی نہ پھلی ہم — مانند چنار آگ میں اپنی ہی جلی ہم

ثابت، اصالت خاں، م ۱۲۰۸ھ

بگولی کا کبھو صدمہ کبھو صرصر کی زحمت ہی
ہماری خاک یوں اڑتی پھری ای ابر رحمت ہی

زلف و رخ سی دور پڑی ہیں کہ دل اب کیا کام کریں
شام سی رو رو صبح کریں یا صبح سی رو رو شام کریں

رضا، ش میر ضیا، م ۱۲۱۶ھ

دل کی بیتابیوں سی عشق چھپایا نہ گیا — نام کس نی لیا تیرا کہ میں پایا نہ گیا

جفای عشق کا جب بزم میں بیان ہوا — رضا کی سن کی خرابی ہمیں بھی کان ہوا

شکوہ کریں کسی سی ہم ہای کیا کسی کا — اپنا ہی دل ہوا ہی دشمن ہماری جی کا

یارب یہ کس کی غم میں آنکھیں بھر آئیاں ہیں
دامان و آستیں میں کل سی لٹائیاں ہیں

مجھ آگر گرفتاری ہوئی تھی   نہ اتنی زندگی بھاری ہوئی تھی
رضا کا اب خدا حافظ ہی یارو   یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

گر خوش نہ کیا مجھ کو نہیں اس کا تو غم ہای
ہوتی مری غیروں پہ ستم ہای ستم ہای

آنکھوں میں کس کی زلف سیہ فام چھا گئی
چاروں طرف جو دیکھوں ہوں اب شام چھا گئی

کیا کہیے اب ای یاراں اس عشق کی رسوائی
جس کے لیے سودا ہو سو ہی کہو سودائی

فیض، ش مصحفی

نہیں معلوم زندانی موئے یا قید سے چھوٹے
کھلا در تھا پڑا سنسان اس دم قید خانہ تھا

پھر رہا نظروں میں میری جو سماں رات کا ہی
دن پہ بھی جوش تصور سے گماں رات کا ہی

روز و شب ایک سا عالم ہی جدائی میں تری
دن کا آرام کہاں اور کہاں رات کا ہی

لطف گلشن نہیں جب تازہ گرفتاروں کو
توڑ کے پھینک دو گل پھونک دو گلزاروں کو

نکہت گل کو لیے گوشہ پہ پھرتی ہی صبا
رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو

دیکھا زنداں میں جو آ کہنہ اسیروں کا حال
زندگی موت ہوئی تازہ گرفتاروں کو

سلطان، خواجہ سلطان جان، م ۱۲۷۲ھ

پڑا جلتا ہوں حسرت سی لبوں پر ہر گھڑی اُف ہی
تصور بھی نہیں اس دلربا سی بی تکلف ہی

کیوں کر وہ خوشدلی کا زمانی میں نام لی
جو سانس لیتی آہ کلیجی کو تھام لی

مری نالوں کی ہی کچھ اور ہی راہ
نہ اس کی پیروی تو ای جرس کر

کسی سی دل کی حقیقت میں آہ کیا کہتا
جو کچھ کہ رنج و الم ہی سو میری جی پر ہی

میں کیا بتاؤں کہ اس گل سی ربط کیسا تھا
نہ فرق عاشق و معشوق میں تھا، ایسا تھا

دام بلای عشق میں ہم بے سبب پڑی
کم بخت دل پہ ہای خدا کا غضب پڑی

وہ میری پاس نہیں مفت میں جان جاتی ہی
الٰہی مجھ کو شب ہجر کاٹی کھاتی ہی

آگ دل میں لگ گئی شمعِ رُخِ جانانہ سی
جب بنا پتلا مرا خاکستر پروانہ سی

کہیں خوشی ہی کہیں رنج ہی زمانی میں
یہی ہی کسوت عالم کی تانی بانی میں

لاکھ تدبیریں کیں پر تجھ سی نہ ای جان بنی
ہای کیا بات کروں جان پر اب آن بنی

نہ پھر ہو جای کچھ کھٹکا مرا دل اس سی ڈرتا ہی
تصور اس کا اس قسم مجھ سی ہنس کر بات کرتا ہی

دل کو کس طور سی بہلاؤں میں
میری اللہ کدھر جاؤں میں

سارا زمانہ چھوڑا اب جن کی دوستی میں
قدرت خدا کی ہم سی وہ بیر رکھیں جی میں

میری جرأت کو نہ اپنی عشق میں بدنام کر
میں نی کس دن آہ کی سینی کو ظالم تھام کر

جو آج سمت فلک میری آہ جاتی ہی
ہی ایک شعلہ جہاں تک نگاہ جاتی ہی

صدموں سی غم عشق کی جی چھوٹ گیا ہی
کھائی ہی وہ چوٹ آہ کہ دل ٹوٹ گیا ہی

کیا ہوئی یاران ہمدم ہای وہ محفل کہاں
وہ طبیعت کدھر گئی وہ چہچہی وہ دل کہاں

دلِ مرحوم کا یاں ذکر سی سینہ بھر آتا ہی
نہ اس کا نام لی تو ای زباں ہر بار جانی دی

یاد آگیا کسی کا کہنا وہ بی رُخی سی
بولی کوئی نہ ہم سی بولیں نہ ہم کسی سی

ہمیں کیا کام ہی اس سی جو خوش سارا زمانہ ہی
ہماری تو مقدر میں فقط افسوس کھانا ہی

تجھے معلوم کچھ اس کی خبر ہی ای دفا دشمن ـ جب آدھی رات ہوتی ہی تو کوئی اللہ کی رتا ہی
اسی کا ذکر اب ساری جہاں کی زندگانی ہی ـ وہ کیا نام خدا ہی جس کی یہ افسانہ خوانی ہی
ہوئی عید اس کی آنی سی مرادیں سب ملیں دل کی ـ مکاں کا حسن ہی اپنی عجب زینت ہی محفل کی
غضب اس وقت تم نی اپنی جانی کی سُنائی ہی ـ کلیجہ پھک رہا ہی آگ کیا دل میں لگائی ہی
مرا پہلو کبھی خالی نہیں رہتا ہی ای ہمدم ـ نہیں آتا ہے وہ جتنک تو دل میں درد رہتا ہی
وہ دن ہیں یاد جو اُٹھتے کا میں نی نام لیا ـ تو تم نی جھپٹ کے ہیں دامن کو میری تھام لیا
پڑا ہوں غم کی بس میں کوئی میری بیبسی دیکھو ـ یہ دن بھر سوچ میں کٹنا یہ شب کی بیکلی دیکھو

سلیم، میر محمد سلیم، م عشرۂ آخر مأۃ دوازدہم

چین بستی میں ہی اس دل کو نہ ویرانی میں ـ ہی عجب طرح کی وحشت تری دیوانی میں

چلی جب روٹھ ہم زنداں کی در کی توڑ کر کڑیاں
تو زنجیریں منانی کو دہیں پاؤں کی آ پڑیاں

رضواں عظیم آبادی، ش سلیم و مجرم

یاس جب آپ کو نہیں پاتی ـ آپ میں آپ کو نہیں پاتی
کشور دل میں آج لوٹ پڑی ـ فوج غم کس کی ہای ٹوٹ پڑی

حیران، ش بوشش

جس وقت یار آکی ہم آغوش ہو گیا ـ شکوہ جو دل میں تھا سو فراموش ہو گیا
جی دھڑکتا ہی مرا ہجر کی پھر رات آئی ـ ہای جس بات کو ڈرتی تھی وہی بات آئی

نہیں رہتی ہو تم ہرچند میں کہتا ہوں رہنی کو
چلی جاؤ بھلا رہ جائیگی یہ بات کہنی کو

روئیے کس کے لیے اور کس کا ماتم کیجیے
عمر جاتی ہے چلی کچھ اپنا ہی غم کیجیے

تمنا، علی رضا، ش جوشش

دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں — لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں

تمنا جنس دل بازار میں جس سمت تو رکھے
خریداروں کا پھر ادھر گذر ہووے تو میں جانوں

گئی ہے تو جب سے اسی دم سے خوش ہیں — نہ آئی خوشی پاس ہم غم سے خوش ہیں

مبارک، شاہ مبارک حسین، ش وحید الہ آبادی

وہ جو اس جشن خسروی میں نہیں — لاکھ ساماں ہیں دل کسی میں نہیں
ہنس کے بھی دیکھا رو کے بھی دیکھا — جو مزا غم میں ہے خوشی میں نہیں

وہ جو نامور تھے زمانے میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں
مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

کمال، شاہ کمال علی دیوروی، م ۱۲۶۵ھ

تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد — کہیں کسی کا محبت میں ننگ و نام رہا
الٹتا پھروں ہوں دشت میں جوں گردکارواں — منزل کہیں ہے راہ کہیں راہبر کہیں
کبھی خطا نہ کرے تیر گر گماں یہ ہے — زمیں پہ کیوں نہ ستم ہو جو آسماں یہ ہے
اس دل کے تئیں درد سوں کب تاب بیاں ہے — احوال خرابی کا مری تم پہ عیاں ہے

مبارک، ش داغ، م ۱۳۷۷ھ

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا

ہم کو معلوم ہے انجام محبت کیا ہے — ایک دن موت کی اُمید پہ جینا ہوگا

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا — یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
مرے شیشے میں مَے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے

۴۱۰

ارمغان بہار

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو

وداعی دعوت کے موقع پر بطور یادگار

بتاریخ ۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

مطبوعہ لیبل لیتھو پریس - رملہ روڈ - پٹنہ۔

یادداشتہائے ورود

سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے اور بہادر شاہ (ظفر) کے حقیقی چچا تھے۔
یہ ۱۲۰۵ھ میں باپ کی اجازت کے بغیر عازم اودھ ہوئے تھے اور وہاں مدت
مقیم رہے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر اور شعرا کے مربی تھے اور جیسا کہ عام
طور پر معلوم ہے مصحفی و انشا و جرات برسوں انکے دامن دولت سے وابستہ رہے تھے
غازی الدین حیدر کے تخت شاہی پر جلوس کرنے کے بعد انکی ایک بیٹی کی شادی
نصیر الدین حیدر ہی سے ہوگئی تھی لیکن جب باپ کی موت کے بعد نصیر الدین حیدر
تخت نشین ہوا، تو اسکی بدسلوکی کی وجہ سے سلیمان شکوہ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ آخر عمر
اور بعض دوسرے مقامات میں قیام کے بعد یہ آگرہ میں مستقل طور پر سکونت
پذیر ہوگئے، جہاں ۱۲۵۳ھ میں انکی وفات ہوئی۔ "گلشن بیخار" میں جس
وقت انکا ترجمہ قلمبند ہوا ہے اس کے چند سال پیشتر یہ دہلی بھی گئے تھے
اس کا امکان ہے کہ غالب لکھنؤ یا دہلی میں انکی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں،
بہرحال، انکا ایک رقعہ غالب کے نام آیا تھا جسکے جواب میں "نوید
فرمانات" انھوں نے لکھی تھی کلیات نثر ص۱۰۵ میں موجود ہے۔ یہ
رقعہ غالباً میر قاسم علیخاں کی معرفت ملا تھا، جو سلیمان شکوہ
کے کسی کام کے لئے حاکم (جنکی کہ کوئی انگریز ہو) سے جسکے [illegible]
غالب سے تعلقات تھے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں کہ
حاکم مذکور دہلی سے باہر گیا ہوا ہے اس لئے میں تو دربار کاب ہوں لیتا ہم

تو ہی بت نا ہے ذکیوں مسجد یہ بتخانہ کیا تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ مطلع میر حسن نے میر امانی علی بن میر ولایت اللہ خاں دہلوی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ انھیں کا ہے لیکن یہ ذرا مختلف شکل میں سید محمد خاں رند سخن آتش کدہ

ماہنامہ "نگار" کے "ریاض" (جنوری فروری ۱۹۴۳ء) میں ریاض کی کچھ قدیم تحریریں جناب سید طفیل احمد جعفری نے بعنوان "ریاض کے بعض استادی مباحث" جمع کر دی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے "جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ تو بی لتعصب کے ہندو ... میں چکبست نے کی ہے جس کا کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اور ثبوت چکبست اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

مشاعرہ شروع ہوا۔ شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے، دوسرا نہیں سوجھتا، انھوں نے جواب دیا "فرمائیے" - ناسخ نے ~~مصرع پڑھا ... شیخ نے ... [illegible]~~ ... مار بھی نہ کیا" ... ان کے منہ سے مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا: "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"، سب پھڑک اٹھے۔ شیخ ناسخ نے مذہبی چوٹ کی تھی مگر نسیم نے ٹھنڈا کر دیا"

اس کذب دافزا کے بیان میں چند باتیں قابل غور ہیں: (۱) ناسخ کی غیور طبیعت اور شاعری کے دعوے ایسے نہ تھے جو وہ نسیم کو قابل خطاب سمجھتے اور ان کو اس تعظیم و تکریم کے ساتھ مخاطب کرتے تو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے تھے (۲) ناسخ ایسے غیر مہذب شخص نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر اپنے محبوب ہندو کو) مخاطب کر کے ایسا دل شکن مصرع پڑھتے (۳) نسیم چاہے لاکھ حاضر جواب سہی مگر ناسخ کا دبدبہ اور طنطنہ ایسا تھا کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے دیتا (۴) در اصل نسیم نے کوئی مصرع لگایا نہ ناسخ نے کوئی مصرع پڑھا، نہ اس حکایت کا ذکر کسی اور شاعر میں دیکھا گیا - یہ صرف غلط قومی جوش کا نتیجہ ہے جس نے ... دیا

نگار میں اسی طرح ... نسیم کا محبوب ناسخ ہونا کہیں اور نظر سے نہیں گزرا اور اسی جمع سمجھنے کی ... معمولی وجہ نہیں ہے [illegible]

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے عرفی کا کلیات مرتب کیا ہے جس میں اس کی کل نظم و نثر جو انھیں ملی ہے شامل ہے۔ یہ کلیات ان کے مقدمے کے ساتھ ڈی۔ لٹ کی ڈگری کے لیے پیش ہوا ہے۔ اور میں نے ایک ممتحن کی حیثیت سے اسے از ابتدا تا انتہا دیکھا ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے عرفی کے کلیات اور دیوان کے جن نسخوں کی مدد سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے، ان سے متعلق ضروری معلومات ان کے مقدمے میں موجود ہیں۔ ان کی تلاش داد طلب ہے۔ لیکن جب تک کتب خانوں کی فہرستوں کا جائزہ نہ لیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل قابل اعتنا نسخے کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جن نسخوں کو دیکھا ہے ان سے کس طرح کام لیا ہے اس کے متعلق بھی کوئی رائے ان نسخوں کا مطالعہ کیے بغیر قائم نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے مقدمے میں لکھا ہے کہ عرفی کے دیوان قصائد کے صرف ۲ نسخوں سے انھوں نے کام لیا ہے باقی کی طرف رجوع نا مناسب سمجھا گیا ہے۔ اس کی جو وجہ انھوں نے بتائی ہے وہ قطعاً ناقابل قبول ہے۔ انھیں دیوان قصائد کے کل قابل اعتنا نسخوں کو دیکھنا تھا، اور قصائد کی شرحوں کا بھی مطالعہ کرنا تھا۔ شرحوں کو دیکھنے سے ایک تو صحیح متن مرتب کرنے میں مدد ملتی دوسرے یہ کہ قصائد کے مشکل اشعار کے مطالب درج حواشی کرتے تو ۔ لیکن اس مقالے کی سرحد کے مطالب سے مطلقا بحث نہیں۔

ک (یعنی امتحانی مقالہ) میں جن تذکروں سے مدد لی گئی ہے کم ہیں۔ رضی کا تذکرہ پیش نظر ہے تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کلمات الشعرا، مرآۃ الخیال، سفینۂ خوشگو، خزانۂ عامرہ، مجمع النفائس، ریاض ... الشعرا، نتائج الافکار، شمع انجمن وغیرہ کیوں ناقابل اعتنا سمجھے گئے (یعنی مقالہ نگار) :

جاف عربی ہے اور فرہنگ محمد معین اس پر شاہد ہے کہ یہ ایران میں اسی طرح مستعمل ہے اس میں تصرف نہیں ہوا۔ اس کا مفرد سنجاف باعلانِ نون ہے کثرت سے (کلیات جلد ۲)

زیرِ دہ رگ جاں میں مری وہاں جو نہاں ہیں ۲۴۲ وہ منزل کی سنجاف میں پوشاک کے دور ہے

فرہنگِ آصفیہ میں یہ ہندی، اور بحث سنجاف میں فارسی۔ سنجاف تکتا کی سند میں رشک کا ایک شعر

جس میں سنجاف باعلانِ نون آیا ہے۔ مصحفی کے دیوان اوّل کے مرتب نے جہاں بھی عربی سنجاف آیا ہے اسے

سنجاف کر دیا ہے اور شعر ذیل کے حاشیے میں لکھا ہے "سنجاف داماں" = دامن پر لگی ہوئی گوٹ ؛

زرلبت و حریر کو تو اعتراض کرتی ہے ۲۴۲ تا قطع کر سیسے اس کی سنجاف زیاں،

ص ۱۱ میں ہے " یہ تو سنجاف سرخ سو کچھ کم نہ تھا میاں ؛" مخطوطاتِ دیوان اول کے جو نسخے میری

نظر سے گزرے ہیں، ان میں سنجاف ہی تحریر ہے۔ سنجاف بنون غنہ کی کوئی سند میرے علم میں نہیں اور میں نے کسی کو

اس طرح بولتے ہوئے بھی نہیں سنا۔

– صوفیانہ، (فرہنگیا) صوفیانہ (مہذب) – ہیئت یا جمع ہے صوفی میں ایک ہی ی ہے۔ قاعدے کے مطابق

اس پر انہ کا اضافہ ہو سکتا ہے 'یانہ' کا نہیں۔ فرہنگ محمد معین میں صرف اسی طرح۔ اردو میں سند صرف

اسی کی ملتی ہے۔ جرأت اسی ہے :

خضب سادہ رولوں کی یہ سادگی بھی ۸۵ کہ پہنچے مجھے صوفیانے بندھے ہیں

صوفیانے قافیہ ہے دوسرے قوافی لسانی ، ڈانی وغیرہ۔ صوفیہ بدرجہ صوفی کا اسم مجرد ہے جو اسرار

التوحید میں ملتا ہے اور فرہنگ محمد معین میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر اضافۂ 'انہ' کا سوال ہی نہیں۔

– افعی، افعیٰ بمعنی – عربی لفظ افعیٰ ہے۔ ایران میں اس کی مستعمل شکل افعی ہے۔ افعی کی طرف ایک

سند میرے علم میں ہے۔ اور وہ مظفر علی اسیر کے دیوان قصائد کا ایک شعر ہے جس میں یہ بطور قافیہ آیا ہے۔ افعی

کا اردو کی متعدد استعارہ میں آیا ہے از آں جملہ شعر غالب :

سیہ زہر تر بھی حریف دم افعی نہ ہوا

ناسخ دبستان لکھنؤ کے بانی کی ایک مثنوی سراج نظم ہے جو ۱۲۵۴ھ میں تمام ہوئی، نام تاریخی
ہے۔ اسی سال ناسخ کی وفات ہوئی۔ اس میں ایک ورق انتخاب کے مطالب نظم ہوئے ہیں۔ اس
میں بکثرت عربی الفاظ ہیں جنہیں اردو نے قبول نہیں کیا۔ بطور مثال کچھ ہیں اور ملیں تو کہیں سے نا—
ہے کہ ایک لغتیہ شعر میں آیا ہے۔ "ہیں ازل اور ابد کے مالک ملکے ہی باقی ہیں اور سب
ہالک" یہ بات کہ سب ہالک ہیں بجز خدا قرآن میں ہے، ناسخ کا قول صریحاً قرآن کے خلاف ہے
— لائح "سب برابر ہیں مجمیں (کذا) ہیں واضح ص۵ آشکارا و واضح و لائح" — تلال
"یہ جواہر جو سارے بیچ ہیں پہاڑ ص۸ ہیں تلال و جبال میں بکھا" — لبن "فائدہ مند تھا جو
شیر لبن ص۹" — طالح "مشکل ہے وہ مصالح کا فلاں شخص طالح کا شخص صالح" —
ادوات "ہوتی ادوات صرف سے تنبیہ ص۱۲" — بلع "ہیں بعد وقت بلع آب و طعام
ص۱۸" — اوجاع "ناخن موجود ہوتے ہیں اکثر کہ رنج و اوجاع ہوتے ہیں باہم"
— استیلا "ہوا داخل میں بعد استیلا" ص۸ — تانی "وجہ تدریج کی تانی کی"
(تانی میر کے یہاں آیا ہے) نامانوس عربی الفاظ سراج نظم میں اور بھی ہیں

- بالو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال و بہار میں زیادہ رائج ہے۔ ا
اسلاف کے ۲ شعروں میں بھی ملا ہے" اور دو لفظوں کلمات جرأت ۲ (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)
میں ہیں۔ ایک مثنوی راحت وجری میں ہے اور ایک سلیمان شکوہ کی ایک غزل میں آیا ہے اور
جس کی تخمیس جرأت نے کی ہے:

کہا درویش نے آ بیٹھ بابو ۶۳ بتا مجھ کو کہاں سے آیا تو
کریں ہے خلق سے رم شکل آہو کے ۲۵ ہوئے ہے عرش جب گرد ہیں اپر
سری دنیا بڑا ہے ان کا قابو نہ سمجھو کہکشاں تم اس کو بابو
فقیروں کا مہیا ہے مرگ چھالا
بچھالی

۱ البرا ایرانی فارسی میں مشابہت پہ نہ سمجھا کہ ایران میں ہندوستان سے گیا ہے۔ وہاں باپ = پدر
پر اضافہ "و" سے قبل ختم و مخفف بابا ہے۔ اسرار التوحید میں جو
صدی ہجری میں تصنیف ہوئی ہے، ابوسعید کے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بابو ابوالخیر تھے۔
بابو فرہنگ معین میں بھی ہے۔

— بیبی۔ مدت ہوئی میں نے ایک انگریزی مجلے میں مشرقی ترکی کے کچھ الفاظ دیکھے تھے، ان میں سے ایک
بیبی بھی تھا، مگر بمعنی زوجہ نہیں، دوسرے معانی کے ساتھ فرہنگ معین اس کی مصدق ہے اور اس
میں بھی بمعنی زوجہ نہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ فارسی ہے بمعنی مذکور مع معانی دیگر بغیر سند۔ قدیم
کتاب بھی اس معنی میں آیا ہے۔ فضلی کی کربل کتھا ہے: امام حسن اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

راجندر سنگھ بیدی کا اولین افسانہ 'فرشتہ'

راجندر سنگھ بیدی کی اولیں تحریر ملاحظہ ہو، جب وہ محسن تخلص کے ساتھ لکھتے تھے۔
تحریر غالباً انگریزی کے کسی ادب پارے کا ترجمہ ہے اس کے لیے ہم ڈاکٹر قمر رئیس کے ممنون ہیں

ادارہ

ہدی محسن

(۱)

پورے جوبن پر تھا۔ اور برف زمین پر
نمونہ پیش کر رہی تھی۔
رشتہ جس کے چہرے پر معصومیت نمایاں
ے وقت ایک تیرہ و تار گلی میں ترانہ
بار ہا تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کے دودھیا
پڑے ہوئے تھے۔ اور سینہ میں اُسکا
دھڑک رہا تھا۔
کی نگاہیں لوگوں کے دروازوں کی
ہیں۔
سیاہ ہوا تھا۔ اور تارے بھی اپنا منہ بادلوں
میں چھپا بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فرشتہ
بارگاہ تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ آسمان
کے لئے جو روشنی کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ
ٹھالیں تھیں۔

(۲)

زہ کھولو اور مجھے اپنی آگ کے پاس جگہ
دو...... اُف! کس قدر سردی ہے...... دروازہ
کھولو" فرشتہ نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہوئے
کہا۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔ لوگوں نے اس فرشتہ
کی چیخ و پکار کو بھی اپنی نیند کے خوابوں کا ایک حصّہ سمجھا
اور اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔

"میں تمہاری خواہش پوری کرونگا ـــ سُنا!
لالچی لوگو...... دروازہ کھول دو، آہ! تم کس قدر سنگدل
ہو گئے ہو۔ تمہارے دل کے تاریک گھر میں رحم کی
روشنی نہیں ـــ اُف سردی...... دروازہ کھولو۔
جلدی"۔

اب برف باری پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔
سرد ہوا کے جھونکے ہر کسی کو سامنے ٹانگوں پر کھڑا ہوتے دیکھ
کر اُسے سرنگوں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تند ہوا کے
جھونکے دیار کے بڑے بڑے درختوں کو جھکا سر ثریا تک
پہنچا تھا۔ اک خوفناک آواز سے توڑ کر نیچے گرا دیتے
تھے۔ اور وہ درخت جو کہ تھوڑی دیر پہلے آسمان کو

چھوتا تھا اب زمین پر پڑا تھا۔

"دروازہ کھولو! میں تمہیں ایک بہت ہی اچھی چیز دونگا — برائے خدا...... مرا — بوڑھی اماں ...... مرا" فرشتے نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

بڑھیا جس کا چہرہ گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور جس کا نحیف وزار بدن اس کے دائم المریض ہونے کی علامت تھا باہر نکلی۔

اس نے آوارہ فرشتہ کی پُرسوز اور الم انگیز آواز سُنی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی بیش قیم
گی — مطلق نہیں — وہ دکھی تھی۔ اور ستم
لوگوں کے مصائب سے بخوبی واقف تھی۔
فرشتہ کو اندر بلا لیا۔ آگ جلا کر اس کے نم
جو کہ برودت کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے۔
اور پھر اُسے سونے کے لئے نرم اور آ

جب مشرق کی طرف افق پر سرخی ک
ہوئی تو فرشتہ اُٹھا۔ اور جب آفتاب نے اپنا ر
اُتار کر اپنی نیلی شعاع سے دنیا کو سلام کیا تو
اُٹھ کر بڑھیا کی پیشانی کو بوسہ دیا اور آسمان ک
صبح کو لوگوں نے دیکھا۔ بڑھیا تمام دکھو
سے نجات حاصل کر چکی ہے۔

("چندن")

سفرنامہ قسطنطنیہ، عراق و ایران

——— سید حسن عسکری

حرفے چند

مشرق وسطیٰ، شرق اوسط، مڈل ایسٹ، مغربی ایشیا و شمالی افریقہ ——— مختلف ناموں سے
یہ علاقہ ہمارے لیے بڑی مانوس دنیا ہے جس میں عرب ہیں، ترک ہیں، ایرانی ہیں۔

ہندستانی سیاح اس علاقہ میں جاتے رہے ہیں اور اپنے تاثرات قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اردو میں ایسے
سفرناموں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ انیسویں صدی میں اور پھر ۱۹۴۷ تک بیسویں صدی میں جو کچھ میسّر رہے
اُسے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا۔

'مشرق وسطیٰ' قواعد کی رو سے صحیح نہیں لیکن، اردو نے اسے اپنا لیا ہے اس لیے عمومی عنوان یہی رکھا
جا رہا ہے: مشرق وسطیٰ کے سفرنامے۔

یہ سفرنامہ ۱۹۲۲ء کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے ابتدائی عہد کا حوالہ اسمیں ملتا ہے

——— ط ب

سفرنامہ قسطنطنیہ عراق وایران

فہرست

مرتبہ

سید حسن عسکری

ڈپٹی کلکٹر

آقای رضا خان جدید فرمانروای ایران

سفرنامہ

قسطنطنیہ عراق و ایران

مرتبہ

سید حسن عسکری، ڈپٹی کلکٹر

سابق ترجمان قنصل خانہ بغداد و ممبر ملٹیری مشن ٹو پرشیا مشہد

باہتمام سید احمد حسین۔ بی۔ اے پروپرائٹر

تعلیمی پریس لکھنؤ میں چھپا

عرب کا قول ہے "دُر مع الدهر کیف ما دار" یعنی جس طرف زمانہ پھرے اُسکے ساتھ پھر جا، ایک شاعر نے بھی کہا ہے :-

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

یہ ظاہر ہے کہ زمانہ مین ہمیشہ انقلاب رہا ہے اور قیامت تک رہے گا، تاریخ کے پڑھنے اور ہر روز کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات مذہب رسوم و عادات مین بھی مقتضائے وقت کے موافق انقلاب ہوا کیا ہی البتہ ہر ملک اور ہر قوم مین ہمیشہ ایسے لوگ ہوئے ہین جنھون نے زمانہ کے ساتھ چلنا اختیار نہین کیا لیکن متاسفانہ ہندوستان کے مسلمانون مین اس قسم کے اشخاص ابتک بکثرت پائے جاتے ہین اور اُنکی خام خیالی اوہام پرستی تقلید آبائی اور استبداد کا یہ نتیجہ ہے کہ مصر شام روم و ایران بلکہ دُنیا کے

تمام مسلمانون مین ہندستان کے مسلمان زیادہ ذلیل وحقیر خیال کئے جاتے
ہین حتی کہ اہل عراق تک اُنکو ہندی بطّال کے لقب سے یاد کرتے ہین اور ایران
مین لفظ ہندی اُسی مفہوم مین استعمال کیا جاتا ہے جس معنی مین لفظ Native
(نیٹیو) اکثر ہندستان کے انگریز استعمال کرتے ہین۔ اسلامبول مین ہندوستانی
مسلمان بہت ہی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہین اور بہت سے تُرک
اُن سے ملنا یا معاشرت کرنا پسند نہین کرتے اگرچہ بہت سے سیاسی اسباب
کی وجہ سے ہندستان کے مسلمان اور مسلمانون کی نگاہ مین وقعت رکھتے ہون
لیکن اصلی سبب اُنکی جہالت اور قدامت پرستی ہے۔ قدیم عادات و رسوم کو
اگرچہ کیسی ہی مضر و بیہودہ ہون یہ اُن کو ترک نہین کرتے لوازم زندگانی،
آداب معاشرت لباس و خوراک وغیرہ وہی قائم رکھنا چاہتے ہین جو ہندستان
مین صدیون سے ہین ہر امر اور ہر فعل کو اسلام بیچارے کی طرف منسوب
کرتے ہین خواہ اُسے اسلام سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ ہندوستان کے تمام مسلمان
یہان تک کہ علما بھی یورپ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرتے ہین کیونکہ وہ سستا
اور عمدہ ہوتا ہے لیکن انگریزی قطع کا بنا ہوا لباس مثلاً کوٹ پتلون۔ بُرا
سمجھا جاتا ہے حالانکہ مین نے خود بہت سے مصری ترکی و ایرانی علما کو

پتلون پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ مشہد مقدس مین مسجد گوہرشاد کے متولی اور
امام جماعت کو مین نے ہمیشہ عمامہ و قبا کے ساتھ پتلون پہنے ہوے دیکھا
میز پر چھری کانٹے کے ساتھ کھانا مذموم بلکہ شاید حرام خیال کیا جاتا ہے
اور ہاتھ سے کھانا سنت قرار دیا جاتا ہے لیکن جَو کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی
نمک یا سرکہ یا چھوارہ کے ساتھ کھانا سنت نہین سمجھا جاتا۔ تعجب ہے کہ قورمہ پلاؤ
شامی کباب متنجن۔ مزعفر مرغ مسلم تو جائز بلکہ واجب موکد لیکن میز پر چھری
کانٹے سے اُبلا ہوا گوشت اُبلی ہوئی ترکاری بدنما ڈبل روٹی کھانا ناجائز
بلکہ حرام مؤبد ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے سلمانون مین
ظاہر پرستی بہت ہی زیادہ اور حقیقت شناسی بہت ہی کم ہے اور یہ فقط
جہالت، اخلاق کی کمزوری اور اوہام پرستی کی علامت ہے۔ میرا مقصود یہ ہرگز
نہین ہے کہ ہر شخص کو کوٹ پتلون ہی پہننا یا میز ہی پر چھری کانٹے سے
کھانا چاہیے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو اُسکے فعل کو خلاف مذہب
نہ قرار دینا چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانون مین یہ تنگ خیالی و ظاہر پرستی
زیادہ تر ہندوؤن کی معاشرت و عورتون کی جہالت سے پیدا ہو گئی ہے
عورتون مین یہ ناقابل علاج جہالت اسوجہ سے ہے کہ اُن کی نانیان،

دادیان، اصلاً ہندو تھین جنکو اُن کے اجداد نے جب ہندوستان مین آئے تھے مسلمان کرکے اُن کے ساتھ عقد کرلیا تھا، وہ مسلمان تو ہوگئی تھین لیکن اُن کے خیالات، عادات، رسوم وآداب وہی رہے جو ہندوُن کے تھے۔ چنانچہ وہی قدیم خیالات ومراسم اب بھی باقی ہین اور بچے لڑکین سے اُنھین کو سیکھ لیتے ہین۔ اسلئے مسلمانون کو اپنی عادتون کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب اور آداب معاشرت کی ترقی کیلئے دو باتین لازم ہین اولاً نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانون کو چاہیئے کہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرین اور دوسرا امر جو اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے یہ ہے کہ عورتون کی تعلیم وتربیت مین پوری کوشش کرین۔

جو نوجوان حضرات ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار کرین اگر وہ ناکتخدا ہون تو اُن کو چاہیئے کہ کسی اسلامی ملک کی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کرکے اپنے ہمراہ ہندوستان لائین تاکہ اُن کے امور خانہ داری مین اصلاح وترقی ہو اور بچون کی تعلیم وتربیت عمدہ طرح سے ہوسکے۔ اس سفر مین مجھکو یہ بھی معلوم ہوا کہ اب اُن ملکون کی عورتین ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانون کے ساتھ نکاح کرنے سے اسقدر پرہیز نہین کرتین جیسا پہلے کیا کرتی تھین۔ البتہ

یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو اُن کے لئے گرمیون مین راحت کا سامان مہیا کرسکے
اور گردش وتفریح کے لئے گاڑی یا موٹر رکھ سکے۔ وہان کی عورتین یہان کی
عورتون کی طرح مکان کی چار دیواری مین قیدیون کی طرح زندگی نہین بسر
کرسکین گی اور نہ اُن کی صحت کیلئے ایسا طریقہ زندگانی مفید ہوگا۔ اگر کوئی
شخص اُن کو گرمیون مین پہاڑ پر بھیجنا چاہے تو بآسانی کرسکے گا۔ کیونکہ وہ
زنانے بورڈنگ ہوس یا ہوٹل مین بغیر کسی زحمت کے تنہا قیام کرلین گی۔

اس مقام پر یہ بھی ذکر کردینا غیر مناسب نہین ہے کہ حتی الامکان ہر ملازم گورنمنٹ
بعد پنشن لینے کے کسی اسلامی ملک مین جاکر قیام اختیار کرے۔ ہر مسلمان خصوصاً شریف
طبقون کے مسلمانون کو ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان انکا آبائی وطن نہین ہے اور انکے
اجداد عموماً دوسرے ملکون سے ہندوستان آکر آباد ہوگئے تھے اسلئے جب وہ تحصیل معاش سے دست کشی
اختیار کرین تو انکو چاہیے کہ اپنے اصلی وطن کو واپس جائین جسطرح انگریز بعد پنشن لینے کے انگلستان
چلے جاتے ہین جن لوگون نے ایسا کیا ہے مثلاً سید امیر علی صاحب نے انگلستان مین اور بعض
نوابون نے عراق مین اور ایک خاندان نے طہران مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ لوگ وہان کے
اصلی باشندون کی طرح نہایت ہی اچھی صحت و آرام وراحت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہین
نادر شاہ نے اپنے سپاہیون کو وصیت کی تھی کہ ہندوستان مین کبھی قیام نہ کرنا ورنہ تم لوگ بھی

نسل ہندوستانیوں کے سُست آرام طلب کمزور و بزدل ہوجاؤ گے افسوس ہے
کہ مسلمانون نے اُسپر عمل نہین کیا لیکن انگریز نادر شاہ کی وصیت کے مطابق
چل رہے ہین - جن پارسیون نے ہندوستان مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ
بہ نسبت ایران کے باشندون کے بہت ہی کمزور و نحیف الجثہ معلوم ہوتے ہین
لیکن اگر وہ عموماً یورپین طریقہ زندگانی کا اختیار نہ کرتے تو اور بھی بدتر ہوجاتے
چونکہ اُن مسلمانون سے جو خود سن رسیدہ اور جنکے اخلاق بوسیدہ اور
عادات پوسیدہ (پرانے) اور قواے جسمانی از کار افتادہ ہوگئے ہین کسی اصلاح
و ترقی کی اُمید نہین کی جاسکتی اسلئے میری عرض صرف نوجوان مسلمانون کی
خدمت مین ہے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوکر خود کوشش کرین اور
دوسرون کو جگائین - میرے نزدیک بہت ہی مؤثر اور آسان طریقہ اُن کے
بیداری کا یہ ہے کہ جو اُن مین سے صاحب استطاعت ہو اُسکو چاہیے کہ تعلیم کے
تکمیل کرنے یا کسی ملازمت یا پیشہ اختیار کرنے کے بعد کم سے کم کسی ایک
اسلامی ملک کا سفر اختیار کرے تاکہ وہان کے مسلمانون کے اخلاق و عادات
و مذہبی اصلاحات کو دیکھکر فائدہ اُٹھائے اور ہندوستان واپس آکر اُن کے
جاری کرنے کی کوشش کرے چنانچہ آیہ شریفہ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ طَائِفَةٌ

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ مین اسی اُمر کی طرف حکیم مطلق نے اشارہ فرمایا ہے۔

مین نے محض اسی غرض سے یہ مختصر سفرنامہ جوانون کے لئے بطور

Guide book. یعنی ہدایت نامہ کے لکھا ہے لیکن جو حضرات یہ چاہتے

ہین کہ ہندوستان سے باہر قدم نہ اُٹھائین اور محض سفرنامون کو پڑھکر ممالک اسلامیہ

کے متعلق اطلاعات حاصل کرین اُن کو اِس سفرنامہ کے پڑھنے سے چندان

فائدہ نہوگا کیونکہ اِس مین عمارات و مناظر طبیعی وغیرہ کا مفصل بیان جو اکثر

سفرنامون مین ہوا کرتا ہے نہین ہے اور مین نے قصداً اُن کے ذکر کرنے سے

احتراز کیا ہے۔

میرے نزدیک یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے

سفر کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کر لینا نہایت ہی مفید ہوگا کیونکہ ہندوستان

کے عام مسلمانون کا لباس و طرز معاشرت وغیرہ دوسرے اسلامی ملکون سے

اسقدر مختلف ہوگیا ہے کہ اگر ایک ہندوستانی پہلی مرتبہ اُن ملکون مین

جائے گا تو اسکو بہت سی مشکلین پیش آئین گی نہ بہ آسانی وہان کے لوگون سے

معاشرت کر سکے گا، نہ وہان کی تعلیم یافتہ سوسائٹی مین عزت و احترام

کے ساتھ داخل کیا جائے گا لیکن اگر اُسنے انگلستان کا سفر کرکے یورپ کے

عام طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کرلی ہے تو اُسکو ایشیا کے کسی ملک
میں زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔ کیونکہ ایشیائی ممالک اور مصر استانبول
میں بجز بعض خصوصیات کے عام طور پر طرز معاشرت مغربی جدید طریقے کا ہوگیا ہے
وہاں کے عام مسلمانوں اعلےٰ سے ادنیٰ اور عالم سے جاہل تک کم وبیش زمانہ کی
رفتار سے واقف ہوگئے ہیں جیسا کہ سرسید احمد خاں مرحوم ہندوستان کے
زمانۂ جاہلیت میں زمانہ کے رنگ کو پہچان گئے تھے اور اسلئے اسکی رفتار
کے ساتھ چلنے پر کاربند ہوئے۔

بعد اس مختصر بیان کے اب چند ضروری امور کا ذکر کرتا ہوں جنکا
سفر کرتے وقت لحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے پاسپورٹ یعنی پروانہ راہداری
حاصل کرلینا چاہیئے اور جن ملکوں کے لئے ویزہ (Visa) یعنی اجازت
کی ضرورت ہو اُس ملک کے قونسل کے جو ہندوستان میں ہو دستخط پاسپورٹ
پر کرالینا چاہیئے یا پاسپورٹ کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیئے کیونکہ اگر کسی
ملک میں ڈاک خانہ یا ٹامس کوک کے دفتر یا بنک میں خط یا روپیہ لینے جائیگا
تو سب سے پہلے آپسے پاسپورٹ مانگا جائیگا۔

(۲) جس ملک کا سفر کرنا مقصود ہو وہاں کے متعلق تمام ضروری باتوں کی اطلاع کسی گائڈ بک یعنی ہدایت نامہ یا سفرنامہ کو پڑھ کر یا کسی شخص سے جسنے وہاں کا سفر کیا ہو حاصل کر لینی چاہیئے

(۳) ٹامس کُک اور ایسٹرن ٹرنسپورٹ کمپنی Eastern Transport Company سے جنکے دفتر بمبئی میں ہیں سفر کے متعلق کافی اطلاعات حاصل ہو سکتے ہیں اور اُنکے ذریعہ سے روپیہ اور خط کے بھیجنے اور ملنے کا عمدہ انتظام ہو سکتا ہے اگر کوئی شخص بوشہر کے راستہ سے شیراز و اصفہان جانا چاہے تو روپیہ کا انتظام بنک شاہنشاہی ایران کے ذریعہ سے جسکی ایک شاخ بمبئی میں ہے بآسانی ہو سکتا ہے اور اگر کوئٹہ کے راستے مشہد مقدس کا سفر مقصود ہو تو دزداب میں اس بنک کی ایک شاخ ہے جہاں چیک اور ڈرافٹ وغیرہ ملسکتے ہیں بغداد میں بھی بنک شاہنشاہی ایران کی ایک شاخ ہے اسلئے بمبئی میں بغداد کیلئے بھی ڈرافٹ ملسکتے

(۴) لباس یوروپین وضع کا ہونا چاہیئے کیونکہ اسلامی ملکوں میں بھی اسی قسم کا لباس عموماً استعمال ہونے لگا ہے لیکن یورپ میں انگریزی ٹوپی اور اسلامی ملکوں میں وہاں کی مخصوص ٹوپیوں کا پہننا زیادہ مناسب ہوگا۔ "گمرک" یعنی Customs. کی زحمتوں سے بچنے کے لئے حتی الامکان تھوڑا لباس ساتھ لیجانا چاہیئے۔ سفید کوٹ پتلون کا دوسرے ملکوں میں بہت ہی کم استعمال

ہوتا ہے لیکن اگر کسی ریشمی کپڑے کا ہو تو یورپ ایشیا دونوں جگہ گرمیوں میں پہنا جاسکتا ہے۔ ایک بڑا کوٹ فراک یا مارننگ یا ٹرکش مع ایک دھاری دار پتلون کے ضرور ہمراہ ہونا چاہیئے کیونکہ ایران و اسلامبول میں معزز لوگوں کے پاس جاتے وقت ایسے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔

مختلف رنگوں کی ٹائی کا استعمال بہت کم ہے۔ حتی الامکان ہمیشہ سیاہ ٹائی لگانا چاہیئے۔

جوتے سیاہ اور عمدہ قسم کے ہوں کیوں کہ ایران اور دوسرے ملکوں میں لوگ عموماً اچھے قسم کے جوتے پہنتے ہیں۔ بارش کے زمانہ میں جوتے کو کیچڑ سے بچانے کے لئے گالش کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن ملکوں میں وہ بکثرت ملتا ہے اس لئے ہندوستان سے ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں۔ اُن ملکوں میں کرتے و پائجامے صرف سوتے وقت پہنے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے خالی کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے ملے تو نہایت ہی بدتہذیب سمجھا جائے گا۔ میں نے معمولی ایرانیوں کو دیکھا ہے کہ گھر میں تعطیل کے دن بھی کرتے پائجامے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ صبح کو ہاتھ منہ دھوکر پورا لباس پہن لیتے ہیں اور شب کو سوتے وقت تک اسی لباس کو پہنے رہتے ہیں اسلئے یہاں سے بہت سے کرتے اور پائجامے ہمراہ نہ لیجانا چاہیئے۔ ضروری کپڑوں

کے علاوہ بستر۔ گلاس۔ لوٹا۔ اور دو چھوٹے پورٹ مینٹو یا چمڑے کے دو سوٹ کیس بھی ہمراہ ہونا چاہیئے۔

(۵) ہر ملک کے گمرک یعنی (Customs) کے قواعد میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ اسلئے ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ لکھنا بیکار ہے۔ البتہ چند ضروری باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سیگار اور سیگرٹ بہت کم ہمراہ لیجانا چاہیئے روزمرہ کے استعمال کے لئے جہاں چاہیئے وہیں خرید لیجئے۔ نشہ کرنے والی چیزیں افیون وغیرہ۔ اسلحہ اور خوشبودار چیزیں مثل عطر وغیرہ کے ہمراہ لیجانا ممنوع ہے البتہ سر میں لگانے کے لئے معمولی تیل مستثنٰی ہے۔ کپڑے جوتے وغیرہ حتی الامکان استعمال شدہ ہوں۔ اگر نئے ہوں تو اُن کو چند روز استعمال کر لینا چاہیئے۔ اگرچہ شخصی استعمال کی چیزوں پر گمرک نہیں ہے لیکن بعض وقت گمرک کے ملازمین ناواقف سیاحوں کو دھوکا دے کر کچھ لے لیتے ہیں۔ یا کم سے کم اُن کو زحمت دینے کے لئے دیر تک اُنکی ہر چیز کا معائنہ کرتے ہیں مجھ کو تمام سفر میں گمرک کے متعلق جسقدر تکلیف کراچی مین ہوئی وہ نہ بغداد نہ اسلامبول نہ شام نہ ایران نہ فرانس نہ اٹلی نہ کسی دوسرے یورپین مقام پر یہ امر نہایت ہی قابل افسوس ہے کہ ہندوستانی ملازمین گورنمنٹ دوسرے ملکوں کے

زموں سے زیادہ تر تکلیف دہ ہوتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
ہی ہندستان کے لوگوں میں بالکل سلف گورنمنٹ یعنی استقلال داخلی کی
اہلیت نہیں ہے۔

(۶) چونکہ ہر ملک میں مختلف سکّوں کا رواج ہے اِس لئے انگریزی
ند کے نوٹ یا ڈرافٹ کا ہمراہ لیجانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہر ملک میں پونڈ
سانی چلجاتا ہے۔ بعض مختلف سکوں کے نام اور اُنکی قیمت یہاں ذکر کیے دیتا ہوں
رانس میں فرانک چلتا ہے جسکی قیمت قبل از جنگ ۲۵ فرانک فی پونڈ تھی
ر اب ایک پونڈ کی قیمت سو فرانک سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

اِٹلی میں لیر چلتا ہے اور ایک پونڈ کی قیمت قریب ۱۲۰ لیر کے ہوگئی ہے
بلجیم و سوئٹزرلینڈ میں بھی فرانک چلتا ہے۔ بلجیم میں اُسکی قیمت گھٹتی
ڑھتی رہتی ہے لیکن سوئٹزرلینڈ میں اسکی قیمت قریب قریب ایک ہی
الت پر باقی ہے جہاں اُسکی قیمت ۲۵ فرانک سے کچھ زائد ہے۔

مصر میں انگریزی و مصری پونڈ دونوں چلتے ہیں اور مصری پونڈ کی
مت انگریزی پونڈ سے کچھ زیادہ ہے۔

اسلامبول میں لیرہ عثمانی و پیاسٹر چلتا ہے اور سو پیاسٹر کا ایک لیرہ ہوتا ہے

ان دنوں انگریزی پونڈ کی قیمت ۸ لیرہ عثمانی ہوگئی ہے۔ فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے۔

بیروت میں شام کے لیرہ و پیاسٹر کا رواج ہے اور یہاں کا ایک لیرہ دو لیرہ عثمانی کے برابر ہے انگریزی پونڈ و فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے دمشق میں بیروت کا لیرہ کچھ کم قیمت پر لیا جاتا ہے۔ وہاں نقد سکہ اور نوٹ کی قیمت میں بھی فرق ہے مثلاً ایک لیرہ دمشقی سو پیاسٹر کا ہوتا ہے لیکن اگر ایک لیرہ کا نوٹ بھنایا جائے تو سو پیاسٹر سے کچھ کم پر چلے گا۔ اسی شہر دمشق کو جو شام کا پایۂ تخت تھا شام بھی کہتے ہیں۔

بیت المقدس میں انگریزی پونڈ و فرانک اور دوسرے ملکوں کے بھی سکے چلتے ہیں۔

بغداد میں اب ہندستانی روپیہ کا رواج ہے لیکن انگریزی پونڈ اور ایرانی قران بھی بآسانی بھن جاتا ہے۔

ایران میں قران چلتا ہے اور ایک پونڈ انگریزی کی قیمت ان دنوں قریب چالیس قران کے ہے اور ایک روپیہ کی قیمت تین قران ہے۔ لیکن روپیہ ایران میں نہیں بھن سکتا ہے۔ انگریزی پونڈ کے بھننے میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن

بنک شاہنشاہی میں وہ لے لیا جاتا ہے۔ ایک تومان دس قران کا ہوتا ہے۔ لیکن
کوئی سکہ ایک تومان کا نہیں ہے۔ قران کے دو سکے ہیں ایک ایک قران کا ہے
اور دوسرا دو قران کا۔ پہلے کو ایک ہزاری اور دوسرے کو دو ہزاری بھی
کہتے ہیں۔ نصف قران اور ربع قران کے بھی سکے ہیں۔ ایک قران بیس
شاہی کا ہوتا ہے۔ شاہی کو صنار بھی کہتے ہیں جو مخفف ہے صد دینار کا۔
نیم شاہی کا بھی سکہ ہے جو ہندوستان کے ڈبل کی طرح ہوتا ہے۔

(۷) زبان کا مسئلہ بہت ہی مشکل اور ضروری ہے۔ ہندوستانیوں سے
یہ امید رکھنی کہ وہ فرنچ یا عربی جدید یا ترکی یا فارسی جدید ہندوستان میں
رہ کر سیکھ سکیں غیر ممکن ہے البتہ اگر انگریزی داں شخص فرنچ سیکھنا چاہے
تو چھ مہینے میں بقدر ضرورت کے جان سکتا ہے۔ لیکن تلفظ کرنے میں ضرور
اُسکو دشواریاں پیش آئینگی۔ اگر کوئی شخص کچھ عربی و فارسی جانتا ہو تو اُن ملکوں
میں جاکر آسانی سے وہاں کے روزمرہ بولنے کی زبان سیکھ سکتا ہے لیکن چونکہ
اب انگریزی قریب قریب ہر ملک میں وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ کم و بیش
سمجھ لیتے ہیں اسلئے زبان کی ناواقفیت سے اسقدر دقت نہیں اُٹھانی پڑیگی
جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اسلامبول میں تعلیم یافتہ لوگ فارسی بقدر ضرورت کے

سمجھتے اور بول لیتے ہیں۔ اسلئے اگر کوئی ہندوستانی صرف فارسی جانتا ہو تو تعلیم یافتہ لوگوں سے ملنے میں کچھ آسانی ہو جائے گی لیکن عام دکانوں اور قہوہ خانوں میں فارسی سے کچھ مدد نہیں ملے گی۔

(۸) ہر ملک کے ضروری آداب سے بھی فی الجملہ واقفیت ہونی چاہیئے مثلاً ایران میں سلام کرنے کا طریقہ صرف گردن کو تعظیماً جھکا کر آہستہ سے سلام علیک کہنا ہے۔ اسلامبول و شام و عراق میں سلام کرتے وقت ہاتھ کو طرف سینہ و پیشانی کے لیجانا چاہیئے۔ لیکن کسی ملک میں رخصت ہوتے وقت سلام علیک نہیں کہا جاتا اس بدعت حسنہ کا رواج صرف ہندوستان میں ہے۔ علیگڈھ کالج میں بھی یہ طریقہ جاری ہے۔ خدا جانے اسکا رواج ہندوستان میں کیونکر ہوا۔ انگلستان و ایران میں بات کرتے وقت ہاتھوں کو زیادہ حرکت دینا خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ ڈکارنا۔ جمہائی لینا۔ زمین پر تھوکنا یا ناک صاف کرنا۔ ہر ملک میں سوائے ہندوستان کے بہت ہی برا خیال کیا جاتا ہے۔ ہر شخص تھوکتے اور ناک صاف کرتے وقت رومال استعمال کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ ان امور کا ہندوستان میں خیال رکھیں اور جب دوسرے ملکوں میں جائیں تو زیادہ تر انکا لحاظ کریں تاکہ حقارت و ذلت کے ساتھ نہ دیکھے جائیں

مختصر یہ ہے کہ جس ملک میں انسان جائے وہاں کے آداب کو غور سے دیکھکر
اُن پر عمل کرے جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اسلامی ملکوں
کی سیاحت کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کر لیا جائے۔ وہاں کا سفر نہایت ہی
آسان ہے بمبئی سے "پی اینڈ او کمپنی (P. & O. Co.) کے کسی جہاز میں سکنڈ
کلاس کا ٹکٹ ۵۶ یا ۶۰ پونڈ کو لیکر سیدھے لندن چلے جائیے یا مارسلیس سے
اُترکر ریل کے ذریعہ سے پیرس ہوتے ہوے لندن جائیے لیکن میرے نزدیک
مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا پہلا سفر ہو اور فرنچ زبان سے بھی ناآشنا ہو
اُسکو چاہیئے کہ سیدھا انگلستان ہی چلا جائے اور واپسی کے وقت پیرس کو
دیکھلے۔ پیرس سے اگر چاہے تو بذریعہ اکسپرس اورینٹ ریل کے تین دن
میں اسلامبول چلا جائے۔ یہ ریل ہر روز پیرس سے ایک مرتبہ شب میں روانہ
ہوتی ہے اور اُسمیں صرف اول درجہ ہوتا ہے اور شب کو سونے کا سامان
یعنی (واگون دولی (.Wagon de lit) مہیا کیا جاتا ہے۔ کرایہ
قریب چودہ سو فرانک یعنی ۵۶ پونڈ کے ہے۔ خوراک کا صرفہ اسکے علاوہ ہوگا۔
جن ملکوں میں ریل ہوکر جائے گی اُن ملکوں کا ویزہ (.Visa) یا سپورٹ پر
ہونا چاہیئے۔ ان زحمتوں سے بچنے اور تین دن تک ریل میں قید رہنے سے

بہتر ہوگا کہ مارسلیس سے جہاز میں سوار ہوکر پانچ چھ روز میں اسلامبول چلا جائے
اول درجہ جہاز کا کرایہ مع خوراک کے قریب بارہ تیرہ پونڈ اور سکنڈ کلاس کا
قریب آٹھ پونڈ کے ہے پھر اسلامبول سے بذریعہ ریل کے حلب اور حلب سے بذریعہ
موٹر کے بیروت چلا جائے لیکن دریا کا سفر زیادہ مناسب ہے۔ اسلامبول سے
کسی جہاز میں سوار ہوکر چار پانچ روز میں بیروت چلے جائیے وہاں کا بھی
اول درجہ جہاز کا کرایہ قریب بارہ تیرہ پونڈ کے ہے اور سکنڈ، تھرڈ کا
اور بھی کم۔ بہت سے لوگ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور کافی آرام
ملتا ہے۔ بیروت سے اگر دل چاہے تو یافہ (Yafa) اور یافہ سے
بیت المقدس چلے جائیے اور وہاں سے بیروت واپس آکر تین گھنٹے میں
موٹر کی سواری سے دمشق جائیے۔ دمشق سے اگر دل چاہے تو موٹر میں
سوار ہوکر ۲۶ گھنٹہ میں صحرا کو طے کرکے بغداد چلے جائیے یا ریل کے ذریعہ سے
تین چار روز میں مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوجائیے۔ بیت المقدس
سے سیدھے بغداد جانے کا راستہ بھی کھل گیا ہے اور Nairn Coy
کی موٹر بتیس ۳۲ گھنٹے میں پہونچ جاتی ہے لیکن اگر شب کو راستہ میں قیام کرے تو
البتہ اس سے زیادہ وقت صرف ہوگا۔ دمشق سے فرینچ کمپنی کی موٹر Palmyra

پالمیر اٹھرتی ہوئی بغداد جاتی ہے لیکن Nairn Coy کی موٹر
سیدھے بغداد چلی جاتی ہے۔ دونوں کمپنی ۲۵ پونڈ کرایہ فی شخص لیتی ہیں۔
بغداد سے طہران تک پانچ دن میں موٹر جاتی ہے اور کرایہ بھی ۲۵ پونڈ ہے
طہران سے مشہد، اصفہان و شیراز جانے کے لئے انگریزی یا فرنچ کمپنی
کی موٹر نہیں چلتی۔ لیکن ایرانیوں۔ قفقازی ترکوں اور بغدادی عربوں
کی موٹریں بکثرت اُن مقامات کو جاتی ہیں۔ مصر جانے کا راستہ ہر شخص کو معلوم
ہے اس لئے اُس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں یہاں سے اپنا سفرنامہ پیرس سے طہران تک کا چند فصلوں میں
لکھتا ہوں :۔

فصل اوّل از پیرس تا اسلامبول

میں ۱۴؍ ستمبر روز یکشنبہ کو پیرس سے سات بج کر پچاس منٹ شب
کی گاڑی سے مارسیلس کو روانہ ہوا۔ ۲۶۵ فرانک کو اوّل درجہ کا ٹکٹ لیا۔
یہ گاڑی اکسپریس تھی۔ اس میں صرف اوّل درجہ تھا۔ سکنڈ کلاس کا کرایہ

پیرس سے مارسلیس تک ۱۷۳ فرانک ہے۔ اسباب کے بک کرانے میں جو تین چمڑے کے سوٹ کیس اور ایک بستر تھا، ۳۰ فرانک دینے پڑے۔ صبحکو ۸ بجے مارسلیس پہونچا۔ اسیوقت ایک موٹر میں بندرگاہ پر گیا اور موٹر والے نے ۲۵ فرانک لیا۔ یہ کرایہ معمول سے زیادہ تھا کیونکہ فرنچ مثل انگریزی ٹیکسی والوں کے ایماندار نہیں ہوتے اور ایسے موقع پر اجنبی سے زیادہ لے لیتے ہیں۔ مارسلیس سے قسطنطنیہ تک اول درجہ جہاز کا کرایہ ۱۲۸۷ فرانک ہے۔ فرنچ (Pacquet) پاکے کمپنی کا جہاز تھا جس میں سوار ہوا۔ میرے کیبن (Cabin) میں جواہرات کا ایک ارمنی تاجر تھا جو پیرس سے اسلامبول کو جا رہا تھا۔ جہاز بجائے ۱۱ بجے چلنے کے ڈھائی بجے دن کو چلا۔ جہاز میں مختلف قوم کے لوگ سوار تھے۔ منجملہ دیگر مسافروں کے اسلامبول کی سفارت انگریزی کا سکریٹری دو تین امریکن اور دو نارویجین تھے۔ چند ترک بھی جہاز پر تھے جو مدت تک نیویارک میں رہ کر اب اسلامبول واپس جا رہے تھے۔ ایک نے انمیں سے ایک نارویجین عورت کے ساتھ نکاح کر لیا تھا اور اُس سے دو بچے تھے۔ جو اُسکے ہمراہ جا رہے تھے۔ چونکہ وہ صورت اور لباس سے بالکل یورپین معلوم ہوتا تھا اسلئے مجھے پہلے نہیں معلوم ہوا کہ وہ ترک ہے۔ دو تین روز کے بعد

اثنائے گفتگو میں اُسنے اپنا نام فتح اللہ بتلایا اور یہ بھی کہا کہ اسکی لیڈی بیوی
مسلمان ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کے ہمراہ ایک اور عورت تھی جو یوروپین لباس پہنے
ہوئے تھی بجز اسکے کہ بجائے انگریزی ٹوپی کے اسکے سر پر ایک عصابہ تھا اور پردہ نہیں کرتی تھی۔
یہ مراکش سے آرہی تھی عربی اور ترکی خوب جانتی تھی۔ اور کچھ فرنچ بھی سمجھ لیتی تھی لیکن انگریزی نہیں
جانتی تھی۔ ایک جوان یہودی بھی اسلامبول جا رہا تھا جو تقریبًا ہر زبان بول سکتا تھا اُسنے کہا کہ اسکا
ایک دوست آگرہ بادمیں ہے جسکے پاس جواہرات کی دکان ہے۔ اور ایک اور بھی ترک اسی جہاز پر تھا جو
بالکل یوروپین معلوم ہوتا تھا اور ہمیشہ فرنچ مسافروں کے ساتھ گانے
بجانے میں مشغول رہتا تھا۔ اثنائے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ ترک تھا اور
اُسنے مجھسے ترکی اور فرنچ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بہت کچھ
گفتگو کی۔ وہ سینما کا فلم اڈیٹر تھا اور اسلامبول فلم لینے جا رہا تھا۔ ایک ڈینشن
سے بھی جہاز پر ملاقات ہوئی جو ڈنمارک کے تھیوسافیکل سوسائٹی کا سکریٹری
تھا اور ڈنیش گورنمنٹ کا سفیر ہو کر قسطنطنیہ جا رہا تھا۔ اُسنے گاندھی اور ٹیگور
کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اُسکا ارادہ ہندوستان کی مسافرت کا ہے کیونکہ
اُسکے سوسائٹی کی ایک شاخ مدراس کے کسی شہر ٹنوالی میں ہے۔ اسکو علم تصوف
اور علم الارواح کا بہت شوق معلوم ہوتا تھا اور اکثر مجھ سے ان مسائل پر گفتگو

کیا کرتا تھا۔ اُس سے جب زیادہ بے تکلفی ہو گئی تو اُس نے مجھسے اسٹائنر (Steinner.) کے طریقہ تصوف کے متعلق بہت کچھ گفتگو کی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ میں ایک سوسائٹی اسٹائنر کے تصوف کی ہے اور وہ خود بھی اُسکا ممبر تھا۔ اُسنے مجھ سے قسطنطنیہ کے ایک عالم شیخ عبدالوہاب آفندی کی بہت تعریف کی اُنکا مجھکو پتہ بتایا اور کہا کہ اُنسے ضرور ملنا۔ چنانچہ میں قسطنطنیہ میں اُنسے ملا، اُنکی ملاقات کا ذکر آیندہ کروں گا۔ اسی جہاز پر ایک یہودن سے ملاقات ہوئی جو قسطنطنیہ کے کسی وکیل کی بیوی تھی اور کئی زبانیں جانتی تھی. یہ عورت نہایت ہی ہوشیار و کاروباری معلوم ہوتی تھی اور ہر شخص سے اپنے شوہر کی تعریف کرتی تھی اور سفارش کرتی تھی کہ اُس سے ضرور ملو اور کہتی تھی کہ اُسکے شوہر نے قسطنطنیہ کے بڑے بڑے معزز حکام و ممبران پارلیمنٹ سے ملاقات ہے۔ اگر کسی قسم کی دشواری پیش آئے گی تو وہ ضرور مدد دے گا۔ وہ غالباً ترکوں کی طرف سے محکمہ راز میں ملازم تھی۔ اسی جہاز میں دو جوان لڑکیوں کو روز دیکھتا تھا جنسے کئی دن کے بعد کسی موقع پر گفتگو ہوئی۔ وہ انگریزی۔ فرنچ۔ جرمنی اور ترکی بول لیتی تھین۔ مدت سے یورپ میں تعلیم پاتی تھیں دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دو ترکن بہنیں تھیں اور اپنے والدین سے ملنے قسطنطنیہ جارہی تھیں

بڑی بہن سے ریاضی کے کسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اثنائے کلام میں میں نے علم مثلث [Trignametry] کے ایک مسئلہ پر نہایت بے اعتنائی سے اظہار خیال کیا۔ اُس نے مجھے فوراً ٹوک دیا اور ہنسکر مجھکو میری غلطی کیطرف توجہ دلائی۔ مجھکو نہایت تعجب ہوا اور میں نے دل میں نادم ہوکر اپنے مطلب کی تصحیح کی اُس سے حقوق زن و شو اور تعلیم و حقوق نسواں کے مسائل پر اکثر گفتگو ہوا کی اُسنے کہا کہ مرد چاہتے ہیں کہ عورتیں اُنکی محکوم رہیں اور اپنی معاش کو آزادانہ طریقہ پر حاصل کرنے سے محروم رہیں۔ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی حالت کو سنکر اُسنے بیحد اظہار تاسف کیا۔ میں نے کہا کہ اگر تعلیم یافتہ ترک عورتیں ہندوستان جائیں اور وہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ساتھ نکاح کریں تو وہ ہندوستان کی عورتوں کے تعلیم و تربیت میں بہت کچھ مدد دے سکیں گی اُسنے کہا کہ جب پہلے ترک عورتیں زیادہ آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نہیں تھیں اُسوقت ہندوستان جانے میں شاید تعرض کرتی رہی ہوں لیکن اب وہ غالبا وہاں کا جانا ناپسند نہ کرینگی۔ یہ ایک نمونہ وہانکی تعلیم یافتہ عورتوں کے عمدہ خیالات کا ہے جو یہانکی عورتوں کیلئے سبق آموز ہے۔

جہاز بحر میڈیٹرینین۔ بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین سے گذرتا ہوا چھٹے روز

۱۲ر ستمبر کو شام کے وقت چناق پہونچا۔ لیکن ترک حکاموں نے جہاز کو آگے جانے سے
روک دیا۔ اگرچہ جہاز کے کپتان نے بہت شور وغل کیا لیکن حکاموں نے یہ
کہا چونکہ جہاز کی روانگی کا تار نہیں آیا تھا اِسلئے ہم آگے جانے کی اجازت
نہیں دیسکتے۔ بہت سے مسافر اپنی جگہ پر سخت اعتراض کررہے تھے کہ ترک
نہایت ہی سخت اور غیر منصف ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ جہاز کے کپتان ہی
کی غلطی تھی کہ قلعہ چناق پر پہونچنے کی اطلاع جیسا کہ اُسکو قاعدہ کی رو سے
دینی چاہیے تھی نہیں دی تھی۔ آخرکار شب کو تمام مسافر جہاز ہی پر رہے۔
دوسرے روز جہاز علی الصباح چناق سے روانہ ہوا اور گیلی پولی جزیرہ سے
گزر کر شام کو ۸ بجے قسطنطنیہ پہونچا۔ چونکہ رات ہوگئی تھی اِسلئے تمام مسافر شب کو
جہاز ہی پر رہے۔ رات کے وقت قسطنطنیہ جہاز پر سے ایسا خوشنما معلوم ہوتا تھا کہ
کاش تمام عمر راتیں وہیں گزرتیں۔ صبح کے وقت ڈاکٹر اور افسر پولیس جہاز پر
آئے۔ سب سے پہلے اول درجہ کے (Saloon) میں مجھکو بلایا۔ قبل اسکے
کہ میں اُنکے پاس جاؤں میں نے قفقازی ٹوپی جو ایران میں جندارمہ پولیس کے
افسر دیتے ہیں وہ لے لی تھی اور ڈنمشن سفیر نے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے
اُس قسم کی سیاہ استرخانی ٹوپی جیسی مصطفٰے کمال پاشا استعمال کرتے ہیں پہن لی تھی

افسر پولیس نے میرا پاسپورٹ دیکھکر بہت سے سوالات مجھ سے ترکی میں کئے اور مین نے ٹوٹی پھوٹی ترکی مین جواب دیا۔ مین نے دیکھا کہ یہ افسر ہر شخص سے خواہ انگریز ہو یا فرنچ ترکی ہی مین سوالات کرتا تھا۔ اگرچہ وہ خود فرنچ خوب جانتا تھا اور غالبًا انگریزی و جرمنی سے بھی واقف تھا۔ جہاز ہی پر حمال آ گیا اور میرا اسباب اُتار کر گمرک خانہ لے گیا۔ جیسا فرانس جاتے وقت کیلئے (Calais) مین حمالوں کا شور و غل سُنا تھا وہی منظر یہاں بھی سامنے تھا۔ گمرک کے افسر نے میرے تمام اسباب کا معائنہ کیا لیکن مجھے کچھ دینا نہیں پڑا۔ اگر کسی کے پاس دو۔ تین درجن سگریٹ یا تھوڑا سا عطر ہو تو ہلا مبول ایران شام و عراق مین انپر کچھ محصول نہین لیا جاتا کیونکہ ذاتی استعمال کی چیزین گمرک کے محصول سے مستثنیٰ ہین۔ جب میرا اسباب گمرک خانہ مین معائنہ کیلئے پہونچا تو حمال نے کہا کہ تھوڑا سا انعام افسر کو دیدو تاکہ اسباب زیادہ دیر تک نہ دیکھا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا افسر گمرک نے میرے اسباب کو دیکھا لیکن نہ کسی قسم کا تعرض کیا اور نہ مجھسے انعام کی خواہش ظاہر کی۔ گمرک خانہ سے باہر آکر ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر مسترت ہوٹل گیا۔ چونکہ وہان کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اس لئے پیرہ کے امپیریل ہوٹل (Imperial Hotel) مین گیا۔ اس کا مالک ایک مصری یا شامی مسلمان تھا

وہان ایک کمرہ ڈیڑھ لیرہ ترکی یومیہ پر بغیر خوراک کے لے لیا ممکن تھا کہ ایک لیرہ فی یوم پر ملجاتا اگر میں زیادہ قیام کرتا یا ہوٹل کے منیجر سے کرایہ کے کم کرنے کیلئے بہت زیادہ اصرار کرتا۔ حمال بھی میرے ساتھ ہوٹل تک آیا اور میرا اسباب گاڑی سے اُتار کر ہوٹل مین رکھا۔ جب اُس سے کرایہ گاڑی اور اسکی اُجرت کے بابت دریافت کیا تو اُسنے پچیس لیرہ ترکی یعنی تین پونڈ سے زیادہ بتایا۔ مین نے کہا کہ یہ بہت زیادہ ہے مین اسقدر نہین دونگا۔ ہوٹل کے کلرک کو بلایا اور اُس سے دریافت کیا کہ کسقدر دینا مناسب ہے۔ اُسمین اور حمال مین بہت مباحثہ ہوا۔ بالآخر حمال اور گاڑی والے کو مین نے دس لیرے دیئے جسمین سے ۴ لیرہ غالباً گاڑی والے نے اور چھہ لیرہ حمال نے لئے ہونگے۔ حمال نے ضرور مجھ سے زیادہ لیا۔ لیکن مین نے یہ غلطی کی تھی کہ اسباب حمال کو دینے سے پہلے اُس سے اُجرت طے نہ کرلی۔ اسمین شک نہین کہ حمال نے بہت زیادہ خدمت کی تھی کیونکہ اسباب کو جہاز سے اُتارنے گمرک خانہ تک لیجانے اور ہوٹل تک ساتھ آکر اسباب کے اُتارنے مین بہت کام کیا تھا لیکن جب بھی اُجرت زیادہ لی۔ واضح رہے کہ اندنون ایک انگریزی پونڈ کی قیمت آٹھ لیرہ ترکی تھی۔ اسلئے دس لیرے جو مین نے حمال کو دیے وہ ۲۵ شلنگ کے برابر ہوے جو تقریباً اُنیس روپیہ کے

برابر ہوتے ہین۔ ہوٹل کا کرایہ بحساب ڈیڑھ لیرہ یومیہ قریب چار شلنگ یعنی
تین روپیہ کے ہوا جو یورپ اور ہندوستان کے ہوٹلون سے عموماً سستا تھا۔
لوقانده یعنی ریسٹارنٹ یہان کثرت سے ہین اِسلئے جہان دل چاہتا تھا وہان
جاکر کھانا کھالیتا تھا۔ اِسلامبول مین لوقاندے بہت کثرت سے ہین اور نہایت ہی
صاف ستھرے یورپین طور پر رکھے جاتے ہین۔ کھانے مختلف قسم کے ہر وقت
اُنمین تیار رہتے ہین اور چار پانچ قسم کے عمدہ کھانون مین میرا تقریباً ایک لیرہ
یعنی ۲½ شلنگ صرف ہوتا تھا۔ اندنون عبد اللہ آفندی کا لقانده نہایت
مشہور ہے۔ مین کئی مرتبہ وہان گیا اور بہت سے یورپین کو بھی وہان جاتے ہوئے
دیکھا۔ اِس شہر مین مٹھائی کی دکانین بکثرت ہین اور دودھ اور بالائی کے ساتھ
مختلف اقسام کی مٹھائیان بنتی ہین پیرس کے بعد شاید ہی کوئی دوسرا شہر علاوہ
اسلامبول کے ہوگا جہان اِس کثرت سے میٹھی چیزین بنائی جاتی ہوں۔ یہان
دہی کا استعمال مثل ایران کے بکثرت ہے اور ہر لوقانده مین کھانے کے بعد
دہی اور کھانے کے ساتھ مٹھا پینے کے لئے ملتا ہے۔ مٹھا پینے کا رواج اسلامبول
اور ایران مین بکثرت ہے۔ مین جبتک اسلامبول اور ایران مین رہا ہمیشہ
کھانون کے بعد مٹھا پیا کرتا تھا۔ اندنون میوے اور انگور بکثرت ملتے ہین اور

بہت ہی سستے ہین۔ یہان کی مچھلی بہت ہی بڑی اور نہایت ہی لذیذ ہوتی ہے اور ہر لوقانده مین کھانے کے لیے ملسکتی ہے۔ البتہ یہان کے لوقانده مین پلاؤ یا چلاؤ ایسا اچھا نہین ہوتا جیسا ایران مین ہوتا ہے۔ ہمین شک نہین کہ پلاؤ یا چلاؤ کا پکانا فقط ایرانیون ہی کا حصہ ہے۔ دوسرے روز کارو انسرائے والده خانی اس غرض سے گیا کہ سید آغا طبا طبائی تاجر سے جو میرے قدیم دوست تھے اور جن سے مجھے ایران کے ایک شہر شاہرود (Shahroad) مین جنگ کے زمانہ مین ملاقات ہوئی تھی جا کر ملون۔ وہان وہ نہین ملے اسلئے خان ترکیہ گیا وہان معلوم ہوا کہ اُنکا دفتر سلامت خانی مین ہے چنانچہ وہان جا کر اُنسے ملا۔ اُن کو جب مین نے پہلے ایران مین دیکھا تھا تو وہ عبا پہنتے تھے اور ڈاڑھی رکھے ہوئے تھے لیکن یہان ڈاڑھی منڈی ہوئی اور یورپین لباس مین تھے۔ وہ عرصہ سے اسلامبول مین مقیم ہین اسلئے اُنکے ذریعہ سے سیر و سیاحت اور دریافت حالات مین بہت مدد ملی وہ اسلامبول سے کچھ دور باہر رہتے تھے اور مجھے اپنے مکان پر لیگئے۔ صبح کو اسٹیمر پر سوار ہو کر دوسرے جانب شہر کے جو ایشیائی ساحل ہے مقام حیدر پاشا گیا اور وہان سے ریل مین سوار ہو کر گیوزپتہ جو ایک چھوٹا سا گاؤن ہے وہان جا کر اُترا۔ جب اُن کے مکان پر گیا تو اُنھون نے اپنی بیوی اور لڑکی سے ملاقات کرائی

جب وہ آٹھ نو برس کی تھی اسوقت اُسنے مجھے شاہرود مین دیکھا تھا۔ اسکا نام
ماہ سلطان ہے اب اسکی عمر ۱۵ یا ۱۶ برس کی ہوگی۔ جب مین نے اُس سے فارسی میں
دریافت کیا کہ تمنے مجھے پہچانا یا نہین تو اُس نے تھوڑی دیر غور کرکے فارسی مین
کہا کہ آقا آپ وہی تو نہین ہین جو میرے مکان پر شاہرود مین آیا کرتے تھے۔ اسکی
اس ذہانت اور حافظہ پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اسوقت ایک سن رسیدہ ترک سے
فرنچ کا سبق پڑھ رہی تھی تھوڑی سی فرنچ مین بھی مین نے اُس سے گفتگو کی۔
پھر طباطبائی کے ساتھ انکے ہم زلف سے جو ایک ترک تبریزی تھے ملنے گیا۔
اُنھون نے اپنے دو لڑکون سے ملاقات کرائی۔ اُنکی عمر ۹ یا ۱۰ سال کی ہوگی۔
اُن لڑکون نے مجھ سے انگریزی مین گفتگو کی۔ جب مین نے پوچھا کہ اُنکی انگریزی
تعلیم کہاں اور کیونکر ہوئی تو اُن کے والد نے کہا کہ اُن کے جوار مین
پہلے ایک مدرسہ فرانسیسی پادریون کا تھا جسمین ترکی زبان کے ساتھ فرنچ
زبان کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اُس مدرسہ مین نشان صلیب بھی لگا ہوا تھا۔ ترکی کی
جدید حکومت نے صلیب کے رکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ چونکہ ہر مدرسہ مین ہر
مذہب کے بچے تعلیم پاتے ہین اسلئے جیسا کہ گورنمنٹ کے مدرسون میں کوئی خاص
علامت مذہبی نہین رکھی گئی ہے اس مدرسہ مین بھی نہین ہونی چاہیئے۔

فرانسیسی پادریوں نے جب صلیب کا اٹھالینا منظور نہین کیا تو انکو مجبوراً مدرسہ بند
کردینا پڑا۔ امریکن پادریوں نے یہ اچھا موقع پاکر اپنا مدرسہ کھولدیا اور کہا کہ ہم کوئی
نشان صلیب کا اسمین نہین لگائینگے۔ چنانچہ وہ مدرسہ اب خوب چل رہا ہے اور بہت سے
ترک کے لڑکے وہان انگریزی پڑھتے ہین۔ یہ دونون لڑکے بھی اسی اسکول مین تعلیم
پاتے ہین اور دن رات وہین رہتے ہین۔ ایرانیون اور ترکون مین یہ خاص بات
مین نے دیکھی کہ وہ اپنے بچون کے دن رات بورڈنگ ہاؤس مین رہنے کو مکان کے
رہنے پر ترجیح دیتے ہین۔ وہان سے پھر مین ایک نہایت ذی علم شخص مرزا حسین خان
دانش سے ملنے گیا وہ اصلاً ایرانی ہین لیکن انکی تعلیم و تربیت اسلامبول مین ہوئی ہے
وہ انگریزی فرنچ عربی۔ فارسی۔ ترکی نہایت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور بہت ہی زبردست
اہل قلم ہین۔ ڈاکٹر توفیق رضا بیگ مشہور ترک مصنف کی شرکت مین بہت کچھ
تصانیف بھی کرچکے ہین۔ نہایت ہی روشن ضمیر اور آزاد خیال ہین اور اُنسے اد
ترکون کے معاشرت و سیاست کے متعلق بہت ہی صحیح اطلاعات حاصل ہوے
ترکون مین وہ نہایت ہی مشہور ادیب فاضل لکھنے والے خیال کئے جاتے ہین
انھون نے رباعیات عمر خیام کی شرح ترکی زبان میں لکھی ہے اور پہلے اسلامبول
کے دار الفنون مین پروفیسر بھی رہ چکے ہین اور بالفعل محکمہ دیون عمومیہ، یعنی

(Public Debt Office) مین ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہین اثناے گفتگو مین اُنسے معلوم ہوا کہ میرے مشفق قدیم سید سجاد حیدر صاحب بھی اندنون مسرت ہوٹل مین ٹھہرے ہوے ہین۔ چنانچہ مین اُنکے ساتھ ہوٹل گیا اور سجاد حیدر صاحب سے ملا لیکن اس امر کا نہایت ہی افسوس ہوا کہ دوہی روز کے بعد سجاد حیدر صاحب سیر کو دیکھتے ہوے ہندوستان واپس چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے پیرہ مین ڈنمارک کے ایک سفیر سے ملاقات ہوئی۔ اُسنے مجھ سے پوچھا کہ تم شیخ عبدالوہاب آفندی سے ملے مین نے کہا نہین۔ وہ مجھکو اپنے سفارت خانہ مین لیگیا اور اپنے سکرٹری کو میرے ہمراہ کر کے عبدالوہاب کی خدمت مین بھیجا۔ وہ عربی لباس پہنے ہوے تھے اور کہا کہ مین مدینہ کے سادات مین سے ہون اور تیرہ چودہ برس ہوے کہ مدینہ سے چلا آیا ہون۔ اُنھون نے مجھ سے اُردو مین گفتگو کرنی شروع کی۔ اُنکا سن قریب چالیس برس کے ہوگا لیکن انگریزی فرنچ۔ جرمنی روسی اطالیانی یونانی عربی فارسی۔ ترکی اور اردو بولتے اور لکھتے ہین۔ اُنکی ذہانت اور زبان دانی پر نہایت ہی حیرت ہوئی۔ اُنھون نے کہا کہ اسلامبول ہی مین رہکر بعضے ہندوستانیون سے اُردو سیکھلی ہے۔ وہ بمقابل علم تصوف (Theosophy) کے (Biosophy) کو ترجیح دیتے ہین اور انسان کی تہذیب اخلاق اور

تزکیہ روح کیلئے اُسکو زیادہ مفید مُوثر سمجھتے ہین میرے خیال مین Steinner کے طریقہ تصوف کی جانب بھی انکا میلان ہے۔ وہ کھانا نہایت ہی سادہ کھاتے ہین۔ گوشت اور انڈا مطلق نہین کھاتے اور نہ کسی مشروبات یا دخانیات کا استعمال کرتے ہین۔ اُنکے پاس عمُوماً روسی۔ جرمنی اور یونانی وغیرہ بہت آتے ہین اور تمام یورپین جنکو علم الارواح مین کچھ دلچسپی ہے اُنسے ضرور ملتے ہین۔ وہ دوبار پیرس اور ایک مرتبہ ماسکو Moscow بھی جا چکے ہین اور پیرس مین علم الارواح پر ایک بہت ہی مفصل اور دلچسپ لکچر دیا تھا۔ اُنکا ارادہ ہندوستان مین آنے کا ہے اور علوم روحانی اور طریقہ ریاضت جو ہندو تقیرن اور صوفیون مین رائج ہے اُسکو سیکھنا چاہتے ہین اُنھون نے دو تین مرتبہ دعوت کی اور اُردو زبان مین برابر گفتگو کی۔ جو حضرات ہندوستان سے اسلامبول جائین اُنکو چاہیئے کہ مرزا حسین خان دانش اور شیخ عبدالوھاب آفندی سے جو پروفیسر شیخ عبدالوھاب کے نام سے مشہور ہین ضرور ملاقات کرین۔ چند دیگر تجار ایرانی۔ سفیر ایران اور بعض تعلیم یافتہ ترکون سے ملاقات ہوئی۔ ایک ترک مجھکو ایک کلب لے گیا جو پیرہ مین واقع تھا۔ دہان ایک جوان ترک سے ملاقات ہوئی جو فرنچ خوب جانتا تھا اور ترکی راگون کو یوروپین علم موسیقی کے رسم خط مین لکھکر پیانو پر بجاتا تھا۔ اُسنے مجھسے کہا کہ اگر علیگڈھ کالج

میں کسی پروفیسر علم موسیقی کی ضرورت ہو تو میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بیچارہ علیگڈھ کالج کے متعلق کیسے دھوکے میں پڑا ہوا ہے، کیا علیگڈھ کالج کو اُسنے اسلامبول یا طہران کا دارالفنون سمجھا ہے جہاں اور علوم کے ساتھ علم موسیقی کی بھی تعلیم مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔ اُسنے مجھسے یہ بھی کہا کہ عنقریب اس کلب میں ایک کنسرٹ (Concert.) ہونے والا ہے جسمیں تمام معزز ترک مرد اور عورت شریک ہونگے اور اُسکے بعد بال (Ball.) بھی دیا جائیگا۔ اُسنے کہا کہ ٹکٹ کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی وہ شہداے جنگ کے یتیم خانہ کو دیدی جائیگی۔ میں نے کہا کہ کنسرٹ کے زمانہ تک میں اسلامبول میں نہیں ہونگا لیکن ایک ٹکٹ میں نے ۵ لیرہ ترکی پر خرید لیا۔ ایک مرتبہ سجاد حیدر صاحب کے ساتھ اور دوبارہ ایک ترک پروفیسر کی معیت میں دارالفنون دیکھنے گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ترک تعلیم جدید کے ترقی کیجانب بیحد مائل ہیں اور تمام علوم ترکی زبان میں تعلیم ہونے لگے ہین اور ترکی اب گویا ایک مکمل علمی زبان ہوگئی ہے۔ مکاتب و نصاب تعلیم وغیرہ کے متعلق میں بالتفصیل نہیں لکھنا چاہتا۔ جو صاحب آیندہ سفر کریں وہ خود ان امور کی تحقیق کرلیں۔ بعض اخباروں کے نامہ نگاروں اور مدیروں سے بھی ملاقات ہوئی لیکن اُنسے گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ سر دست اپنی آزادانہ راے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ سیاسی امور کے متعلق جو جو اخبار نویسوں

اور بعض جوان ترکوں سے گفتگو ہوئی ۔ انکے اظہار کرنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا ۔ البتہ اسقدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے ترک ہندوستان کے مسلمانوں سے نہایت ہی مخالف معلوم ہوتے تھے کہ انھوں نے مسئلہ خلافت میں اسقدر کیوں کوشش کی کہ خلافت سلاطین عثمانی میں قائم رہے ۔ بہرحال میں اس مسئلہ میں اظہار رائے نہیں کر سکتا کہ اس اعتراض میں کہانتک ترک حق بجانب ہیں ۔

میرے زمانہ قیام میں اتفاقاً وہ دن بھی آگیا جس دن اس سے ایک سال قبل قسطنطنیہ کو دول اتحادین کی فوجوں نے تخلیہ کر کے مصطفےٰ کمال پاشا کی فوج کے حوالہ کر دیا تھا ۔ اُسدن تمام شہر میں جوش پھیلا ہوا تھا اور کل دُکانیں اور مکانات اور سرکاری عمارتیں اور سفارتخانے اور تمام جہاز خواہ عثمانی خواہ غیر عثمانی ترکی جھنڈوں اور پھریروں سے آراستہ تھے ۔ میں نے تمام عمر میں کبھی کسی مقام پر خواہ یورپ ہو خواہ ایشیا میں اس کثرت سے برق اور جھنڈے کسی خوشی کے موقع پر نہیں دیکھے تھے منجملہ اور مقاموں کے پیرہ میں ایک جگہ طاق نصرت بنایا گیا تھا جہاں سے صبح کے وقت تمام مختلف فوجیں بری و بحری مع توپ خانے اور باجے وغیرہ کے گزریں ۔ یہ جلوس گھنٹوں رہا اور میں صبح کا گیا ہوا دوپہر کو ہوٹل واپس آیا ۔ لوگوں میں اسقدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ بعض اسدن کا اندیشہ ہوتا تھا لیکن پولیس کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ کسی قسم

کی بدنظمی یا فساد نہیں ہونے پایا۔

اسلامبول میں مساجد۔ مدرسے۔ تکیے دوسری عمارات عالیہ بکثرت ہیں لیکن جدید عمارتوں میں بڑے ڈاک خانہ و دیوان عمومیہ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت و عالیشان ہے۔ ایرانی سفارتخانہ کی بھی عمارت بہت ہی خوبصورت اور باب عالی کے قریب واقع ہے واضح رہے کہ روم میں تکیہ خانقاہ کو کہتے ہیں اور اسلامبول میں ہر قوم کا تکیہ علیحدہ بنا ہوا ہے جہاں اُس قوم کے فقرا اور غریب مسافر آکر قیام کرتے ہیں لیکن ایران میں تکیہ امام باڑہ کو کہتے ہیں البتہ جدید فارسی میں امام باڑہ کو حسینیہ کہتے ہیں اور تکیہ کی لفظ کا استعمال بڑے شہروں میں متروک ہو گیا ہے۔

اسلامبول میں قہوہ خانے کثرت سے ہیں اور بعضے ایسے خوبصورت و عالیشان ہیں کہ پیرس کے قہوہ خانوں کا مقابلہ کرتے ہیں بعض قہوہ خانوں میں آدھی رات تک عربی و ترکی ساز بجا کرتے ہیں اور شامی مرد و عورت جو عموماً یہودی یا نصرانی ہوتے ہیں عربی و ترکی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ترکوں کو قومی امور کی جانب نہایت ہی انہماک ہے چنانچہ جمعہ کے دن کوئی شخص کسی مذہب یا کسی سلطنت کی رعیت ہو اپنی دکان یا دفتر نہیں کھول سکتا یہاں جمعہ کا دن ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا لندن میں اتوار کا دن۔ یہ دیکھکر مجھکو ہندوستان کی جمعہ

خوشی ہوئی۔ اپنے زمانہ وزارت میں سید ضیاء الدین صاحب نے ایسا ہی حکم طہران میں جاری کیا تھا لیکن اب رضا خاں کے زمانہ میں اُسپر عمل نہیں کیا جاتا۔

اسلامبول کی عمارات و مساجد و آداب معاشرت کے متعلق میں زیادہ تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ بعض حضرات اُن مطالب کو اپنے سفرناموں میں مفصل لکھ چکے ہیں البتہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ اسلامبول میں ترکوں سے معاشرت کریں اور اُنکی تمدنی حالت سے واقفیت حاصل کریں اُنکو چاہیئے کہ ترکی یا کم سے کم فرنچ زبان بقدر ضرورت سیکھ کر اسلامبول جائیں۔ اگرچہ اب انگریزی بھی اسقدر جاری ہوگئی ہے کہ بہت سے ترک اُسکو جانتے ہیں لیکن فرنچ سے عام طور پر تعلیم یافتہ ترک واقف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص فارسی بقدر ضرورت کے جانتا ہو تو تعلیم یافتہ ترک سے گفتگو کرنے سے ضرور مدد مل سکتی ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح ترک بھی فارسی ابتدا میں پڑھتے ہیں۔

ہر شخص غالباً اسکو جانتا ہے کہ اسلامبول کے ترک پہلے ہی سے دوسرے ملک کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن اس جنگ عمومی کے بعد سے بہت ہی سرعت کے ساتھ مراحل تمدن و تہذیب کو طے کر رہے ہیں۔ اس امر کا ثبوت وہاں کے عورتوں کی تعلیمی و تمدنی حالت کو دیکھکر ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام متمدن قوم کا

عقیدہ بلکہ میرے نزدیک بدیہی امر ہے کہ ہر قوم کی ترقی زیادہ تر عورتوں ہی کی
تعلیم و تہذیب پر موقوف ہے ہندوستان کے تمام مسلمان تمام دنیا کے مسلمانوں
سے اسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ان کی عورتیں تمام دنیا کی مسلمان عورتوں
سے تعلیم، تمدن اور آداب معاشرت وغیرہ میں بہت ہی پیچھے ہیں۔ اسلامبول
اور دوسرے اسلامی ملکوں میں عورتوں کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور مکان کی
چار دیواری میں محبوسانہ زندگی نہیں بسر کرتیں کہ اُن کی اور اُنکے بچوں کی صحت
خراب ہو جائے۔ ہر طبقے کی عورتیں عام طور پر باہر جاتی ہیں اور خرید و فروخت خود
کرتی ہیں بلکہ بعض بڑی دوکانوں میں مثل یورپین عورتوں کے ملازمت کرتی
ہیں۔ ترکوں نے عورتوں کے حقوق کا اسقدر خیال رکھا ہے کہ کوئی شخص بغیر
کسی عذر شرعی کے ایک سے زیادہ عورت حبالۂ نکاح میں نہیں لاسکتا اور یہ بھی
قانون وضع کردیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان جو کسی دوسری سلطنت کی رعیت ہو
کسی ترکن سے عقد کرے اور عثمانی ملک میں قیام کرنا چاہے تو اُسپر لازم ہوگا کہ
وہ عثمانی سلطنت کی رعیت ہو جائے ورنہ وہ ترکی سلطنت سے مع اپنی ترکن
بیوی کے نکالدیا جائیگا۔ چنانچہ دو تین ایرانی جنھوں نے ترکنوں سے عقد
کیا تھا اِس قاعدہ کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے یعنی عثمانی سلطنت کی تبعیت

قبول نہ کرنے کی وجہ سے اسلامبول سے مع اپنی بیویوں کے نکالدئے گئے۔

واضح رہے کہ یہ امر اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ ایرانی شیعہ تھے کیونکہ ترکوں کے نزدیک

شیعہ وسنی میں باہمی نکاح کو ناجائز سمجھا جاتا ہے جیساکہ ایران میں بھی انکا رواج

ہے۔ میں نے کئی سنی المذہب ہندوستانی وعرب کو دیکھا کہ ایران میں شیعہ عورتوں

کے ساتھ نکاح کیا۔ میں ہندوستان میں دو تین سنی مسلمانوں کو جانتا ہوں کہ جو ایران

میں شیعہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرکے اپنے ہمراہ اُن کو ہندوستان لائے ہیں غالباً

خان بہادر مولا بخش صاحب نے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن افیس میں ملازم

تھے مشہد مقدس میں ایک اچھے خاندان کی شیعہ عورت سے نکاح کیا تھا۔ اسیطرح

بہت سے ایرانی مردوں نے ترکی اور مصری عورتوں سے نکاح کرلیا ہے۔

بہتر ہوگا کہ جو شخص اسلامبول جانا چاہے اُسکو چاہیے کہ امریکن اکسپرس کمپنی سے

جسکی ایک شاخ بمبئی میں اور ایک اسلامبول میں ہے ضروری امور کے متعلق خط وکتابت

کرے اسلامبول جانے کے لئے بہت ہی کم اسباب اپنے ہمراہ لیجاوے کیونکہ تمام

ضروری چیزیں وہاں ملجاتی ہیں۔ میرے خیال میں اسلامبول کا روزانہ خرچ قریب

۱۲ شلنگ کے ہوگا اسطرح پر کہ کسی اسلامی یا یوروپین ہوٹل میں ایک کمرہ لے لے اور

کھانا جس ریسٹارنٹ میں چاہے کھالیا کرے۔ البتہ اگر زیادہ قیام کرنا چاہے تو

قدہ کوئی۔ گیوزتپہ۔ ارن پتہ یا مویک ورہ وغیرہ میں جاکر کسی بورڈنگ ہاؤس یا کسی ترک کے مکان میں ایک کمرہ لیکر قیام کرے ایسی صورت میں مصارف بھی کم ہونگے اور ترکوں سے معاشرت کرنے کا بھی زیادہ موقع ملے گا۔

فصل دوم روانگی از اسلامبول بہ بیروت

اسلامبول سے روانہ ہونے سے دو تین روز پہلے ترکی پولیس سے اجازت نامہ روانگی کا حاصل کیا کیونکہ کوئی شخص اسلامبول سے بغیر پولیس سے اجازت نامہ تحریری لئے ہوئے کسی دوسرے شہر کو نہیں جاسکتا۔ لائڈ ٹریسٹینو کمپنی سے ۱۱۲ لیرہ یعنی تقریباً ۱۴ پونڈ کا اول درجہ کا ٹکٹ بیروت تک کے لئے خرید کیا اور جمعہ کے روز اسلامبول سے روانہ ہوا۔ جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے پولیس کا افسر جہاز پر آیا اور پاسپورٹ اور اجازت نامہ روانگی کا ملاحظہ کیا۔ جہاز نے ساڑھے گیارہ بجے دن کو لنگر اٹھایا۔ جہاز پر ایک ترک کامل آفندی سے ملاقات ہوئی جو مع اپنے بیٹے امین آفندی اور ایک چرکس ملازم کے بغداد جا رہے تھے۔ ان لوگوں سے مراسم بڑھ گئے اور ہمیشہ ہندوستان اور یورپ کے سیاسی و تمدنی مسائل پر گفتگو ہوا کی۔ امین آفندی نہایت ہی خوبصورت تعلیم یافتہ اور خلیق شخص تھے اور انکا سن تقریباً پچیس برس کا ہوگا۔ ابھی تک

شادی نہیں ہوئی تھی۔ فرینچ خوب جانتے تھے مسکرات و دخانیات سے قطعی
پرہیز کرتے تھے علم تاریخ کو خوب جانتے تھے اور جنگ میں بھی خدمت کر چکے تھے
خلافت عثمانی کے سخت مخالف تھے اور انکا اعتقاد تھا کہ سلاطین دنیادی خلافت
کے مستحق نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ احکام شریعت کے پابند نہوں۔ انکا یہ بھی
خیال تھا کہ نقطہ نظر سیاست سے خلیفہ کا اسلامبول میں رہنا غیر مناسب ہے۔

دوسرے دن شنبہ کو جہاز (Smyrna) ازمیر پہونچا۔ میں ترک
رفیقوں کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہو کر شہر دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا۔ اس
شہر کو یونانیوں نے زمانہ جنگ میں قبل تخلیہ کرنے کے جلا دیا تھا اسلئے وہ بہت ہی
ابتر حالت میں تھا۔ یہ تجارت کا بہت ہی بڑا بندرگاہ ہے انجیر کی پیداوار اسکے
اطراف میں کثرت ہوتی رہی ہے اور دوسرے ملکوں کو لاکھوں من انجیر یہاں سے جاتی ہے
زمانہ جنگ میں بہت سے یوروپین تجار یہاں سے چلے گئے تھے لیکن اب دوبارہ
کچھ واپس آرہے ہیں۔ اس جہاز پر ایک انگریز اور اسکی بیوی سے ملاقات ہوئی لیکن
اُن لوگوں کے لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ انگریز نہیں تھے اور غالباً اپنی اصلی
قومیت کو چھپانے کے لئے انگریزی میں گفتگو کرتے تھے بسبب یوم ولادت
حضرت پیغمبر صلعم ہونے کے تمام جہازوں اور عمارات پر پھریرے اور جھنڈے نصب

کئے گئے تھے۔ تمام شب جہاز یہاں ٹھہرا رہا۔ دوسرے روز صبح کو جہاز یہاں سے روانہ ہوا
اور تمام دن رات چلکر دوشنبہ کے دن سات بجے صبحکو مقام روڈس (Rhodes)
پہونچا۔ یہ بندرگاہ اطالی والوں کے قبضہ میں ہے۔ جنگ بلقان کے بعد اِن لوگوں نے
بدون کسی جنگ کے اِس شہر پر قبضہ کر لیا تھا اور چونکہ اُسوقت کوئی ترکی فوج وہاں
موجود نہ تھی اِسلئے اُن لوگوں نے موقع پا کر شہر پر تصرف کر لیا۔ یہاں پر یونانی اور
اطالیانی بکثرت آباد ہیں مسلمان رعایا اطالیائی حکام سے خوش نہیں معلوم ہوتے
یہاں کے لیمو اور نارنگی بہت مشہور ہیں اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں شہر نہایت ہی
صاف اور روبہ ترقی ہے۔ یہاں سے دو بجے شب کو جہاز روانہ ہوا۔ اور دوسرے روز
صبح کو انطالیہ پہونچا۔ یہ مقام ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ چونکہ یہاں جہاز تھوڑی ہی
دیر ٹھہرا تھا اِسلئے کنارہ پر نہ جا سکا۔ جہاز دوپہر کو روانہ ہو گیا اور تمام شب چلکر
دوسرے روز صبح کے وقت جزائر سائپرس (Cypress.) کے بندرگاہ
لیموسل پر پہونچا۔ اُسکو دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا لیکن یہاں وہ رونق نہیں
پائی جو دوسرے بندرگاہوں میں تھی۔ بہت سے یونانیوں کو انگریزی ٹوپی پہنے ہوے
اور پا برہنہ مزدوری کرتے ہوے دیکھا۔ یہ لوگ نہایت ہی ذلیل حالت میں تھے
اور بہت ہی کثیف اور پھٹے کپڑے پہنے ہوے تھے۔ یہ شہر انگریزوں کے قبضہ میں ہے

اس شہر میں تقریباً ساٹھ ہزار ترک اور تین لاکھ یونانی آباد ہیں۔ تعلیم کی بہت ہی
کمی ہے۔ بعض ہندوں نے اس امر کی سخت شکایت کی۔ ایک ترک یہیں کا رہنے والا
[illegible] ہم سفر تھا اور انگریزی بول لیتا تھا۔ اُسنے کہا کہ انگریزی حکومت
ہمارے ملک کے لوگوں کو اعلی قسم کی تعلیم دینا پسند نہیں کرتی۔ میں نے کہا کہ اگر فی الواقع
ایسا ہے تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ ہندوستان میں اعلی تعلیم کا نتیجہ نہ گورنمنٹ
اور نہ ہندوستانیوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔ تمام ہندوستانی تعلیم یافتہ عموماً اپنے پرانے
مراسم بیہودہ میں باوجود تعلیم جدید کے مبتلا ہیں اور انکی تمدنی حالت میں بہت ہی کم ترقی
ہوئی ہے۔ انکی تعلیم ایسی ہے کہ بجز سرکاری ملازمت کرنے کے اور کسی قابل وہ نہیں ہوتے
اسلئے اُنکے وجود سے ملک کی ثروت میں ایک کوڑی کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ انکی دماغی
تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ تعصب مذہبی روز بروز روبہ ترقی ہے اور بہت سے اعلی درجہ کے
تعلیم یافتہ مذہبی نزاع کے پیدا کرنے میں لیڈر بنجاتے ہیں۔ اعلی تعلیم کا نتیجہ
گورنمنٹ کے لئے اسوجہ سے مفید نہیں ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے اعلی تعلیم انگریزی
کی حاصل کی ہے اُن کو عموماً ایسے عہدے نہیں ملتے جنکی وہ توقع کرتے ہیں اور جسکا
نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اگر اُنکو علوم تجارت و فنون صنعت
وحرفت کی تعلیم دی جاتی تو یہ نتیجہ نہ ہوتا۔ میری گفتگو سے اُس ترک کو پہلے کچھ تعجب ہوا لیکن

چونکہ زمانہ جنگ میں کچھ ہندوستانی فوج کو اُسنے سائپرس میں اور کسی دوسرے مقام پر دیکھا تھا اسلئے اسنے
بھی میرے خیال کی تصدیق کی کہ فی الواقع ہندوستانکے لوگ تمدنی حالت میں ابھی بہت ہی
پیچھے ہیں۔ یہ عجیب بات دیکھی کہ جہاں جہاں کے لوگ زمانہ جنگ میں ہندوستان سے باہر گئے بجز
اسکے کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زیادہ حقیر و ذلیل ہوگئے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ اسلامبول
بیروت شام عراق و ایران میں ہندوستانی اسابق سے زیادہ مبتذل ہوگئے ہیں عراق و
حجاز میں ہندوستان کے حضرات "ہندی بطال" و ہندی بابا چورتی" کے القاب سے پکارے
جاتے ہیں اور بعض ایرانیوں نے ازراہ تمسخر و استہزا ہندیوں کی شان میں یہ شعر نظم کیا
ہے شعر " ما مردم ہندیم دبود آں وطن ما ٭٭ ما کشتۂ دالیم و چپاتی کفن ما "

طہران میں ایک موقع پر مجھکو بہت ہی شرم معلوم ہوئی جب ایک ایرانی نے جو محکمہ مال
میں ایک اچھے عہدہ پر ممتاز تھا بہت سے تعلیم یافتہ ایرانیوں کے مجمع میں مجھ سے پوچھا کہ کیا
ہندی لوگ ابھی سگرٹ کا استعمال کرنا نہیں جانتے کہ بجاے اسکے کہ ہونٹوں سے
لگاکر پئیں اُسکو مٹھی کے اندر رکھکر مثل حقے کے پیتے ہیں دوسرے صاحب نے کہا کہ
میں نے اکثر ہندی سپاہیوں کو دیکھا ہے کہ وہ پائجامہ کا استعمال نہیں کرتے اور اکثر
تمام جسم میں تیل لگاکر زمین پر آفتاب میں اکڑوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات
کا میں نے کچھ جواب ضرور دیا لیکن فی الحقیقت وہ ایسا جواب نہیں تھا کہ وہ لوگ

قبول کر لیتے۔ اگر اچھے تعلیم یافتہ لوگ یہاں سے اِن ملکوں میں جاتے تو ممکن تھا
کہ ہندیوں کی جانب سے وہاں کے لوگوں کا خیال اچھا ہو جاتا کیونکہ میرا ذاتی تجربہ
ہے کہ وہ لوگ تعلیم یافتہ و روشن خیال ہندوستانیوں سے ملکر نہایت ہی خوش ہوتے
ہیں۔ وہاں کے لوگ ابتک نہیں جانتے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے یہاں
ملتے ہیں کیونکہ اُن لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی عموماً ابتک اس قابل نہیں ہوئے
ہیں کہ انکو انگریز اعلیٰ مرتبہ کی نوکریاں دیکیں جب میں نے ہندوستان کی ریفارم
اسکیم کا ذکر کیا تو اسلامبول و طہران میں بہت سے لوگ سنکر کہنے لگے کہ ابھی کم سے
تیس چالیس برس کی تعلیم کے بعد یہ حقوق اگر ہندوستانیوں کو دئے جاتے تو زیادہ مناسب
ہوتا۔ بہرحال اس سائپرس کے ترک سے بہت دیر تک مجھ سے تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو
رہی اور اُنکے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلامبول تعلیم دینے کیلئے
بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ جب آپ کے ملک میں انگریزی حکومت ہونیکی وجہ
انگریزی زبان کا جاننا زیادہ مفید ہے تو آپ اپنے بچوں کو علیگڈھ کالج یا لندن کیوں
نہیں بھیجتے اُسنے کہا کہ نہ تو ہندستان کی آب و ہوا اچھی ہے اور نہ وہاں کا طرز معاشرت
مہذبانہ طریقے کا ہے اسلئے علیگڈھ میں نہیں بھیج سکتا۔ لندن بھیجنا بھی میرے
نزدیک زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ میرا ارادہ ہے کہ پہلے اُنکی ابتدائی تعلیم اسلامبول میں

اُسکے بعد انجینیری یا ڈاکٹری پڑھنے کے لیے جرمنی بھیجدونگا۔ اگر میرا مقصود گورنمنٹ
کی ملازمت دلانا ہوتا تو البتہ لندن انگریزی تعلیم کے لئے بھیجتا۔ میں شہر کی تھوڑی سی
گشت کرکے ڈاک خانہ گیا وہاں ایک ترک کلرک سے ملاقات ہوئی جو انگریزی بول سکتا
تھا اُسنے بھی کمی تعلیم کی شکایت کی اُس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں تین چار بیرسٹر
ہیں جنہیں سے دو یا تین مسلمان ہیں کھر پہر میں کچہریوں کی طرف گیا اور وہاں معلوم ہوا کہ
عدالت دیوانی میں چیف جج انگریز اور ایک جج مسلمان اور دوسرا جج یونانی
ہوا کرتا ہے کچہریوں میں موکلوں کا اسقدر مجمع نہیں دکھائی دیا جیسا ہندوستان میں ہوا کرتا ہے
میں نے خاص طور پر اسلامبول اور طہران میں کچہریوں کو جاکر دیکھا تو وہاں ہندوستانی
کچہریوں کی سی بھیڑ کہیں نہیں دیکھی میرے خیال میں ہندوستان سے زیادہ کسی
ملک میں مقدمہ بازی کا رواج نہیں ہے اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی
کسی زمانہ میں سلف گورنمنٹ یعنی استقلال کامل کے مستحق نہیں ہونگے جس طرح میرا
اعتقاد خدا کے وجود کا ہے اسیطرح   کی ناقابلیت کا بھی ہے۔ شہر کو
دیکھکر میں جہاز واپس پر آیا پنجشنبہ کے روز سہ پہر کو جہاز کا لنگر اُٹھا اور اسی روز شب کو
جہاز لارنکا (Lanarca.) میں جو جزائر سائپرس کا دوسرا بندرگاہ ہے
ہونچگیا اور چونکہ یہ چھوٹا سا بندرگاہ ہے اسلئے اُسی شب کو تھوڑی دیر ٹھہر کر

وہاں سے روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جہاز مرسین (Mersin)
پہونچگیا۔ یہ بندرگاہ ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ یہاں تمام دن جہاز ٹھہرا رہا۔ اور
بہت سی روئی اور اُون یہاں جہاز میں لادی گئی مقام ادنہ جو یہاں سے ریل سے
ڈھائی گھنٹہ کی راہ ہے روئی کی کان ہے اور تمام ضلع میں کثرت روئی پیدا ہوتی
ہے۔ یہاں کے لوگ عربی زبان بولتے ہیں۔ یہاں سے جہاز شب کو دس بجے روانہ ہوا
اور دوسرے دن صبحکو الگزاندرٹ (Alexandretta) پہونچا۔ یہ شام کا
بندرگاہ ہے اور فرنچ کے زیر نگرانی ہے۔ جہاز تمام دن ٹھہرا رہا اور ہزاروں بھیڑ
و بکری یہاں سے سوار کی گئیں۔ یہاں کے لوگ بھی عربی بولتے ہیں۔ یہاں سے
جہاز ۵ بجے شام کو روانہ ہوا اور تمام رات چلکر صبح کو آٹھ بجے طرابلس شام میں
پہونچا۔ طرابلس شام اسکو اسوجہ سے کہتے ہیں کہ دوسرے طرابلس کو طرابلس غرب
کہتے ہیں۔ یہ بندرگاہ بھی فرنچ کے زیر نگرانی ہے یہاں سے نارنگیاں کثرت
لادی گئیں اور ۱۱ بجے دن کو جہاز روانہ ہوکر اُسی روز چار بجے شام کو بیروت پہونچگیا
ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسلامبول سے بیروت تک آنے میں جو مختلف بندرگاہ
ملتے ہیں اُنمیں سے کوئی تو ترک کوئی ایطالی کوئی انگریزی اور کوئی فرنچ کے
قبضہ میں ہے۔ جہاز سے اُترکر ایک کشتی میں سوار ہوا اور کنارے گیا گمرک خانہ میں

اسباب کو دکھلا کر ایک ہوٹل میں جا کر قیام کیا اُسکا نام ادنہ ہوٹل تھا اور اسکا منیجر ایک یونانی تھا۔ ایک لیرہ یومیہ پر ایک کمرہ بدون خوراک لیا۔ یہاں کا ایک لیرہ دو ترکی لیروں کے برابر ہوتا ہے۔ اس حساب سے یہاں کے ایک لیرہ کی قیمت ۵ شلنگ یعنی قریب تین روپیہ بارہ آنہ کے ہوئی۔ شب کو ایک قہوہ خانہ میں جا کر ترک رفیقوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ قہوہ خانہ بہت ہی بڑا تھا جسمیں ہر قوم کے لوگ عیسائی یہودی اور مسلمان کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا کھا کر دوسرے قہوہ خانہ میں جو بہت ہی وسیع تھا اور جسمیں چشمہ کا فوارہ جاری تھا چاے اور نرگیلہ یعنی حقہ پیا۔ جب وہاں سے ہوٹل واپس آ رہا تھا تو رستہ میں ایک اور قہوہ خانہ دیکھا جسکے بالاخانہ میں بہت ہی زیادہ برقی روشنی ہو رہی تھی اور کثرت سے مجمع تھا۔ اُسکے باہر یہ اعلان لگا ہوا تھا "

"سیدنا الشیخ عبد القادر یغنی ھذا المساء"

"یعنی آج کی شب کو سیدنا شیخ عبد القادر صاحب گائینگے"۔ چونکہ میرے رفقا ترک اور عربی سے ناواقف تھے اسلئے ہم لوگ وہاں نہیں گئے بلکہ سیدھے ہوٹل چلے گئے۔ بیروت میں دو ہی روز رہا اسلئے نہ کسی سے مل سکا اور نہ اچھی طرح بیروت اس مرتبہ دیکھ سکا۔ بیروت میں بہت سی پرانی عمارتیں گر گئی ہیں لیکن اُسکے بجاے بہت سی جدید دوکانیں ہوٹل قہوہ خانے اور بنک وغیرہ زیر تعمیر ہیں۔ یہاں کی علمی ترقی کی حالت سے ہر شخص واقف ہے

اسلئے اُسکے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ میں نے فرانس میں شام آنے کے لئے فرنچ گورنمنٹ کا ویزہ (Visa.) اپنے پاسپورٹ پر نہیں کرایا تھا اسلئے مجھکو فرنچ کونسل کے پاس جاکر ۲/۱ لیرہ (۲۷ پیاسٹر) فیس دیکر ویزہ کرانا پڑا۔

فصل سوم از بیروت تا بغداد

دوشنبہ کے روز بیروت سے ایک موٹر بغداد جانے کے لئے کرایہ کرکے ۸ بجے دن کو دمشق یعنی شام روانہ ہوگئے اور ۵ بجے دمشق پہونچگئے۔ ایک ہوٹل میں جسکا نام دَارُالفَرَح تھا جاکر قیام کیا۔ اس شہر میں قہوہ خانہ اور لوقانذہ یعنی رسٹارنٹ جسکو یہاں فرنچ زبان کے تلفظ کے لحاظ سے "راستوران" لکھتے ہیں کثرت ہیں اور کھانے اچھے اور سستے ہیں۔ انگور ان دنوں بکثرت اور نہایت ہی لذیذ تھا۔ ایسا عمدہ انگور میں نے اس سے قبل کہیں نہیں کھایا تھا۔ شام کی حالت ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی بعض بازار نہایت ہی خراب و کثیف ہیں۔ البتہ فرنچ نے چند جدید عمارتیں تعمیر کرائی ہیں اور سواد شہر میں کثرت سے باغ اور چشمے ہیں۔ بعض فرنچ افسروں سے اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ فرنچ شام سے چلے جانے کے لئے بالکل تیار ہیں کیونکہ اس ملک کی آمدنی کم اور مصارف زیادہ ہیں اسلئے فرنچ گورنمنٹ کو یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب جمعیت اتحاد الاقوام کا حکم شام کو چھوڑ دینے کا

ہوگا فرنچ فوراً اسکا تخلیہ کر دینگے۔ اس افسر نے یہ بھی کہا کہ اگر برٹش گورنمنٹ عراق
کو چھوڑ دے تو فرنچ بھی فوراً شام سے چلے جائینگے۔ بادی النظر میں بالکل نہیں معلوم
ہوتا کہ یہاں فرنچ کی حکومت ہے تمام انتظام عرب حکام کرتے ہیں اور فرنچ گورنمنٹ
برائے نام نگرانی کرتی ہے۔ دوسرے روز سہ شنبہ کو اسی موٹر پر جس میں بیروت سے آئے تھے
بغداد جانے کیلئے روانہ ہوئے۔ پوری موٹر ہم چار آدمیوں نے بیروت سے بغداد
تک کیلئے چالیس پونڈ کرایہ پر لی تھی۔ یہ موٹر ایک ارمنی کی تھی اور خود مالک موٹر
ہم لوگوں کے ساتھ شام تک آیا تھا۔ یہاں سے ایک مسلمان شوفر ہم لوگوں کو لے چلا
یہ موٹر اس صحرا کے راستہ سے چلی جس راستہ سے نیرن کمپنی (Nairn Coy)
کی موٹریں جاتی ہیں۔ اس راستہ میں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ کہیں پانی ملتا ہے۔ بجز
زمین و آسمان کے دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ شام سے بغداد تک کی مسافت قریب
۵۰۰ میل کے ہے۔ واضح رہے کہ علاوہ معمولی کرایہ کی موٹروں کے دو یوروپین کمپنی کی
موٹریں بیروت سے بغداد اور بغداد سے طہران تک جاتی ہیں۔ ایک کا نام:-
Nairn Coy اور دوسری کا نام Eastern Trans-Port
Company ہے۔ پہلی انگریزی اور دوسری فرنچ ہے دونوں کمپنیاں بیروت
سے بغداد تک کے لئے فی کس ۲۵ پونڈ کرایہ لیتی ہیں۔ اور اسیقدر بغداد سے طہران تک کا بھی

کرایہ ہے۔ انگریزی کمپنی کی موٹر شام سے بغداد تک کم سے کم ۲۶ گھنٹے میں جاتی ہے اور صحرا میں کہیں نہیں ٹھہرتی لیکن فرنچ کمپنی کی موٹر ایک شب پالمیرا Palmyra اور ایک شب ایک دوسرے مقام پر ٹھہرتی ہوئی جاتی ہے۔ ان دونوں مقاموں پر کمپنی کی طرف سے مسافروں کے لئے قیامگاہیں (Rest House.) بنی ہوئی ہیں اور خوراک اور خوابگاہ کمپنی کی جانب سے مہیا کی جاتی ہے۔ یہ راستہ انگریزی کمپنی کی راہ سے زیادہ محفوظ ہے اور اگر کسی شخص کو عجلت نہ ہو تو اسی راہ سے جائے۔ میری موٹر جسمیں اور تین ترک سوار تھے شام سے سہ پہر کو روانہ ہوئے اور کچھ دور چلکر شب کو دس بجے صحرا میں ٹھہر گئی اور دوسری موٹر بھی جسکا شوفر ایک محمد علی ہندوستانی تھا ہم لوگوں کی موٹر کے ساتھ ٹھہر گئی۔ صبح ہوتے ہی موٹر روانہ ہوئی لیکن ایک یا دو گھنٹہ چلی تھی کہ خراب ہو کر رک گئی۔ شوفر نے بہت کچھ کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہم لوگوں کے مایوسی کی حالت بڑھتی جاتی تھی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اتفاقاً دو موٹریں Nairn Coy کی قریب ۵ بجے شام کے ہمارے قریب سے بغداد کو جاتی ہوئی گذریں۔ ہم لوگوں نے ہاتھ اُٹھائے ایک تو ٹھہری ہی نہیں۔ لیکن دوسری ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ ہمارے شوفر نے اِس موٹر کے شوفر سے اپنی موٹر کے خراب ہو جانے کا حال بیان کیا۔

اِس موٹر کے مسافر یورپین تھے اور شوفر بھی فرنچ یا اطالیائی معلوم ہوتا تھا
اُسنے ہنسکر عربی میں کہا کہ تم اب یہیں مرجاؤ اور یہ کہکر چلدیا۔ چونکہ اس صحرائے خطرناک
میں ہر شخص کو نفسی نفسی پڑی رہتی ہے اسلئے ایک شخص دوسرے کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ اب
جوں جوں شام قریب ہوتی تھی ہم لوگوں کی شام غریباں خطرناک تر ہوتی جاتی تھی۔
ترک نفقار میں جو امین آفندی تھے وہ محنت کرنے سے باز نہ آتے تھے اور چونکہ
انھوں نے اسکول میں کچھ انجنیری پڑھی تھی اسلئے وہ کچھ نہ کچھ انجن کے بنانے کی
فکر میں مشغول تھے حسن اتفاق سے قریب غروب کے انجن کچھ ٹھیک ہوا اور ہم لوگ
پھر شام کو واپس ہوے۔ ایک یا دو گھنٹہ چلنے کے بعد صحرا روشنی سے بھرا ہوا دکھلائی دیا
اور بدو عرب اپنے خیمے جنکی تعداد سیکڑوں کی معلوم ہوتی تھی نصب کر رہے تھے۔ یہ
دیکھکر ہم لوگ بہت ہی خوفزدہ ہوے کہ کہیں بدو عرب گولی مار کر ہم لوگوں کو
لوٹ نہ لیں مگر خدا نے خیریت کی اور موٹر بہت ہی سرعت کے ساتھ چلدی قریب
نصف شب کے ہم لوگ صحرا میں ٹھہر گئے اور پھر علی الصباح روانہ ہوکر دوپہر کے وقت
دمشق میں پہونچگئے۔ دمشق پہونچتے ہی ہم لوگوں نے پلیس میں جاکر شوفر کی شکایت کی
اور کہا کہ یا تو موٹر والا ہمارا کرایہ واپس کرے یا دوسری اچھی موٹر بغداد تک کیلئے
دے۔ بعد از ہزار زحمت موٹر کا مالک بیروت سے بلوایا گیا اور اُسنے دوسری

موٹر دینے کا وعدہ کیا۔ شب کو پھر دار الفرح ہوٹل میں قیام کیا اور علی الصباح جامع ہوئی یعنی دمشق کی مشہور جامع مسجد کو جا کر دیکھا۔ اس مسجد میں وہ مقام بنا ہوا ہے جہاں حضرت امام زین العابدینؑ نے اسیری کی حالت میں خطبہ پڑھا تھا۔ مسجد اندر تو آراستہ ہے لیکن صحن خراب حالت میں ہے۔ اسی مسجد کے اندر حضرت یحییٰ پیغمبر کا مزار بھی بنا ہوا ہے۔ اہلبیت کے مظالم کی یادگاریں بھی کچھ موجود ہیں۔ حضرت زینبؑ کا مزار شہر سے باہر قریب چار میل کے فاصلہ پر بنا ہوا ہے۔

بارے جمعہ کے روز سہ پہر کو دوسری موٹر میں سوار ہو کر شام سے روانہ ہوا اور چھ سات گھنٹے چلکر شب کو صحرا میں ٹھہر گیا۔ دوسرے روز علی الصبح موٹر روانہ ہوئی اور تمام دن چلکر شب کو پھر صحرا میں ٹھہر گئی۔ دوسرے روز اتوار کے دن بہت سویرے موٹر چلی اور دس بجے دن کو مقام رمادی میں پہونچ گئی۔ چونکہ یہ مقام عراق کی سرحد ہے اسلئے کمرک خانے میں اسباب کا معائنہ ہوا۔ مفتش (انسپکٹر) جو عرب تھا نہایت ہی غور سے اُسنے اسباب کا معائنہ کیا اور آخر میں ایک فارم بھرنے کے لئے دیا اور کہا کہ اسکو بغداد کے کمرک خانے میں لیجا کر دینا۔ وہاں سے روانہ ہو کر فلوجہ پہونچا اور وہاں بھی مختصر سا معائنہ کیا گیا اور ۲½ بجے دن کو بغداد پہونچ گیا میں موٹر میں سیدھا کمرک خانہ گیا۔ ملازمین کمرک نے کہا کہ آج اتوار ہے اسباب

گمرک میں چھوڑ جاؤ اور کل آکر لیجانا جب گمرک کا انسپکٹر آیا میں نے اس سے
کہا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اور میرے پاس کوئی اسباب قابل محصول نہیں ہے
اُسنے میرے اسباب کا معائنہ نہیں کیا اور کہا کہ تم اپنا اسباب لیجاؤ حالانکہ اُسنے میرے
رفقاے ترک کے اسباب کا بہت ہی سختی سے معائنہ کیا۔ چونکہ میں نے اس سے انگریزی
میں بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اُسنے میرے ساتھ
یہ رعایت کی تھی وہ بالکل ایک نوجوان عرب تھا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان
تھا یا یہودی یا نصرانی، اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں سال آیندہ رخصت لیکر
لندن جاؤنگا۔ میں اپنا اسباب حمال سے اٹھواکر "Wellingdon
Hotel." دلنگڈن ہوٹل گیا جو یہاں کے بہت ہی اچھے ہوٹل مو ڈ
(Maude Hotel) کے مقابل میں واقع ہے۔ وہاں ایک کمرہ مع خوراک
کے دس رُپیہ فی یوم پر لیا۔ چونکہ آج اتوار کا دن تھا اسلئے کثرت سے مرد و عورت
نصرانی، یہودی اور مسلمان بازاروں میں اچھے اچھے لباس پہنے ہوئے پھر رہے تھے
لیکن اس مجمع میں مسلمان عورتیں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔ مجھکو اپنے قدیم احباب
سے ملنے کا اسقدر شوق تھا کہ اسی روز شام کے وقت پل کے دوسرے جانب
جو بغداد قدیم کے نام سے مشہور ہے گیا اور وہاں جاکر نواب احمد حسن خانصاحب سے ملا

اُنھوں نے زمانہ جنگ میں بسبب انگریزی رعیت ہونے کے بہت مصائب اُٹھائے تھے لیکن اب بھی اُنکو ویسا ہی خلیق اور زندہ دل پایا جیسا کہ وہ بائیس برس پہلے تھے۔ شب کو آٹھ بجے اُنکے پاس سے ہوٹل واپس آیا اور سفر کی تکان کی وجہ سے کھانا کھا کر فوراً سو رہا۔ اس ہوٹل کا مالک ایک عرب تھا جو علاوہ عربی کے انگریزی اور فرنچ بول لیتا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عراق کا رہنے والا تھا یا شام کا۔ ہوٹل کے کل ملازم عرب تھے اور نہایت صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان تھے یا نصرانی۔ میرے علاوہ چند انگریز، دو تین امریکائی مرد و عورت دو ایک فرنچ اور دو چار شامی و مصری عرب بھی اُس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بجز میرے کوئی دوسرا ہندوستانی نہیں تھا۔ میں دوسرے روز وہاں سے کاظمین چلا گیا اور سید ناصر خادم کے مکان پر قیام کیا لیکن ہر روز کاظمین سے بغداد تھوڑی دیر کے لئے گھوڑے کی ٹریموے پر سوار ہو کر آجایا کرتا تھا۔ بغداد میں میونسپلٹی کی طرف سے تعلیم۔ صفائی۔ اور بجلی کی روشنی وغیرہ کا کافی انتظام ہے۔ حتیٰ کہ میں نے کاظمین میں بھی دیکھا کہ تنگ کوچوں میں میونسپلٹی کا جاروب کش جا کر جھاڑو دیتا تھا اور کوڑے کو اُٹھا کر لیجاتا تھا۔ چونکہ بغداد کے باشندے صفائی وغیرہ کے خواہاں ہیں۔ اسلئے حکومت عراق بھی انگریزی گورنمنٹ کی مدد سے اُنکے لئے ہر امر کا

انتظام کررہی ہے۔ ہندوستان کے لوگ چونکہ صفائی کے خوگر نہیں ہیں اسلئے اگر
یہاں گورنمنٹ کی جانب سے کچھ انتظام بھی کیا جاتا ہے تو عموماً لوگ اُسکو پسند نہیں کرتے
جب سے مینوسپلٹی ہندوستانیوں کو دیدی گئی ہے حالت بدتر ہوتی جاتی ہے اور
غالباً کچھ دنوں کے بعد سڑک روشنی اور صفائی وغیرہ کی حالت ویسی ہوجائیگی جیسی
ہزاروں برس سے تھی۔ یہاں کی تمدنی حالت میں پہلے ہی سے ترقی موجود تھی
اور اب تو اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ تعلیم کی جانب عام توجہ ہورہی ہے اور بہت سے
ابتدائی مدرسے جاری ہوگئے ہیں۔ اِن مدرسوں میں چھہ درجے ہوتے ہیں اور تمام
مضامین عربی میں پڑھائے جاتے ہیں البتہ چوتھے درجہ سے چھٹے تک انگریزی
بطور زبان ثانوی ("Second language.") کے پڑھائی
جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور مدارس اعدادیہ یعنی (Intermediate
Schools.) بغداد۔ بصرہ اور موصل میں قائم کردئے گئے ہیں۔ مینے ایک
ابتدائی اسکول کو جو کاظمین میں تھا جاکر دیکھا۔ وہاں کی عمارت۔ صفائی۔ فرنیچر اور
انتظام تعلیم وغیرہ کو دیکھکر نہایت ہی تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کا
ایک چھوٹا سا ہائی اسکول ہے۔ لڑکیوں کے لئے بھی چند ابتدائی مدرسے کھل گئے
ہیں اور اُنکی تعلیم روز افزوں ترقی کررہی ہے۔ بغداد میں عورتوں کا ایک کلب بھی

قائم ہوگیا ہے اور تعلیم یافتہ عورتوں نے سیاسی اور تمدنی معاملات میں حصہ لینا
شروع کردیا ہے۔ بڑے ڈاک خانہ میں سالار خاں بلوچی سے جو اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر
ہیں ایک اپنے قدیم ملاقاتی فہمی آفندی کا پتہ پوچھکر انسے ملنے گیا۔ اب وہ بغداد
میں فہمی المدرس کے نام سے مشہور ہیں جس زمانہ میں میں مع سجاد حیدر صاحب کے
کے قونسل خانہ میں ترجمان تھا اُسوقت ہم لوگوں سے اور انسے بہت ہی گہرے
مراسم تھے اُسوقت وہ معمم اور ریشدار تھے اور ترکی گورنمنٹ گزٹ کے اڈیٹر تھے اب
میں نے انکو دیکھا تو وہ یوروپین وضع میں تھے اور چہرہ بھی صاف تھا۔ اثنائے گفتگو
معلوم ہوا کہ وہ جدید دارالفنون کے جسکا نام جامعہ آل البیت ہے ڈائرکٹر ہیں
اور مبلغ نوسو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ پندرہ سو روپیہ تک ہو جائیگی
اِس دارالفنون کا نام جامعہ آل البیت اسوجہ سے رکھا گیا ہے کہ امیر فیصل بادشاہ
عراق جو اسکے مربی ہیں حسنی نسب کے سید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بادشاہ کی
موٹر پر جو اُن کو لینے آئی تھی مجھے اِس دارالفنون کے دکھانے کو لیگئے اور برہان الدین
آفندی جو خاندان نقیب کے ایک تعلیم یافتہ جوان تھے اور یوروپین لباس پہنے ہوئے
تھے وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ گئے۔ یہ دارالفنون صیغۂ اوقاف کی طرف سے تعمیر ہو رہا ہے
اور کابینہ یعنی ہیئت وزراء کے زیر نگرانی ہے وزارت معارف یعنی صیغۂ تعلیم

اسکو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی صرف شعبۂ دینیات و ہندسہ کے لئے ایک عمارت دو منزلہ نہایت ہی خوبصورت مضبوط تیار ہوئی ہے۔ نیچے کے حصہ میں دینیات کے درجے اور اوپر کے حصہ میں ہندسے کے کلاس ہیں۔ ادب، فنون، حقوق و طب کے لئے ابھی عمارتیں نہیں تیار ہوسکی ہیں۔ صرف موجودہ عمارت کی تعمیر میں قریبا ت لاکھ روپیہ کے صرف ہوچکا ہے تعلیم دینیات کیلئے فرنیچر، ریڈنگ روم، مدرسوں کے لئے میٹنگ روم وغیرہ اسی طرح پر مہیا کئے گئے ہیں جیسا کہ یورپ کے عام کالجوں میں ہوا کرتے ہیں۔ ان دینیات کے درجوں میں علم تفسیر و احادیث وغیرہ کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ بطریق جدید مصر کے طریقہ پر ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس امر کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی قدیم طریقۂ تعلیم میں اصلاح کیجائے اور جس طرح کہ علماے قدیم نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اصول مذہب اسلام کے اثبات حقانیت کیلئے اور اسلام پر جو اعتراضات بروئے فلسفہ یونانی وارد ہوتے تھے انکے دفع کرنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا تھا اسی طرح اب ضرورت ہے کہ ازروئے فلسفہ اور سائنس جدید جو اسلام پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں انکے رفع کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے علم کلام کی ترتیب دیجائے اور اسی نقطۂ نظر سے نصاب موجودہ کی ترمیم کی جائے۔ عربوں کی اس روشن خیالی اور عالی حوصلگی کو دیکھکر جو ہمیشہ سے انمیں موجود رہی ہے

نہایت ہی خوشی ہوئی اور فوراً علیگڈھ اور شیعہ کالج یاد آ گیا۔ خیر علیگڈھ نے تو بہت کچھ کیا ہے لیکن دیکھیے شیعہ کالج کیا کرتا ہے فوٹ بال و کرکیٹ کا کھیلنا شرعاً جائز قرار دیتا ہے یا نہیں۔ "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"، جب کچھ دنوں کے بعد اس دار الفنون کی عمارت مکمل ہو جائے گی اسوقت یہ قابل دید کالج ہو گا۔ فہمی آفندی نے یہ بھی فرمایا کہ اس دار الفنون میں فارسی اور اردو زبان کی بھی تعلیم ہو گی۔ واضح رہے کہ یہ حضرت فہمی نہ کسی یورپ کے کالج کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ فرنچ۔ البتہ اسلامبول در مصر میں کچھ دنوں رہے ہیں۔

علاوہ تعلیم کے عراق میں تجارت و زراعت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ریل اور نہریں بہت سی نکلی ہیں اور روئی کی کاشت کے لئے بہت زیادہ کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسا پہلے میں نے ذکر کیا ہے عراق میں روپیہ کا سکہ جاری ہے اور بغداد میں انگریزی اردو کثرت سے لوگ جانتے ہیں اسلئے ہندوستانیوں کو یہاں اسقدر زحمت نہیں پیش آئے گی جیسی دوسرے ملکوں میں ہو گی۔ بغداد میں متعدد ہوٹل ہو جانے کی وجہ سے نہایت ہی آرام سے مسافر قیام کر سکتا ہے۔ منجملہ بہت سے ہوٹلوں کے ولنگڈن۔ موڈ۔ کانٹینٹل۔ ضیار وگراند بہت اچھے ہوٹل ہیں۔ بمبئی و کراچی سے ہفتہ وار جہاز بصرہ کو جاتے ہیں بمبئی سے بصرہ تک اول درجہ کا کرایہ ڈاک کے جہاز میں مع خوراک کے مبلغ تین سو روپیہ ہے لیکن

دوم درجہ کا کرایہ غالباً دو سو یا کچھ کم ہے۔ اگر دو تین شخص باہم سفر کرتے ہوں اور موسم جاڑے کا ہو تو ڈک (Deck) پر بھی جا سکتے ہیں۔ ڈک کا کرایہ بمبئی سے بصرہ تک صرف سینتیس ۳۵ روپیہ ہے۔ کھانے کا انتظام خود کرنا پڑیگا۔ دو تین طالب علم ملکر ڈک پر بہت ہی آسانی سے سفر کر سکتے ہیں۔ جہاز بصرہ ساتویں دن پہونچ جاتا ہے اور پھر وہاں سے ریل بغداد تک اٹھارہ گھنٹے میں جاتی ہے سکنڈ کلاس ریل کا کرایہ چوالیس روپیہ ہے۔ لیکن تیسرے درجے میں بھی آرام سے سفر ہو سکتا ہے اور کرایہ بھی بہت کم ہے۔ علیگڑھ اور دوسرے کالجوں کے جوان طالبعلموں کو چاہیے کہ تعطیل کے زمانہ میں پانچ چھ ملکر کم سے کم عراق کا سفر کر لیا کریں۔ بغداد میں معمولی ہوٹل کا خرچ مع خوراک وغیرہ کے زیادہ سے زیادہ پانچ روپیہ فی یوم ہوگا لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ کاظمین میں کسی خادم کے یہاں قیام کریں اور جب دل چاہے بغداد آدھ گھنٹے میں ٹریموے پر سوار ہو کر چلے جایا کریں۔ جہاں دل چاہے کھانا کھا لیا کریں زیادہ سے زیادہ دو روپیہ فی یوم صرف ہوگا جب چلنے لگیں تو خادم پانچ چھ آدمی ملکر بیس پچیس روپیہ دیدیں۔ کاظمین سے ریل میں سوار ہو کر سامرہ کی زیارت کر آویں۔ آمد و رفت کا کرایہ مبلغ پانچ روپیہ ہے۔ سامرہ کی آب و ہوا نہایت ہی اچھی ہے اور وہاں کا خربزہ مشہور ہے حضرت امام علی نقیؑ اور حضرت امام حسن عسکریؑ اور حضرت نرجس خاتونؑ والدہ حضرت امام مہدی وہاں مدفون ہیں اور یہ روضہ

نہایت ہی اچھا بنا ہوا ہے۔ اس روضہ کا گنبد طلائی تمام مشاہد کے گنبدوں سے بڑا ہے
اسی مقام پر مرزا محمد حسن شیرازی مجتہد رہتے تھے جو سرکار مرزا کے لقب سے مشہور تھے انیسویں
صدی میں دنیا کے کسی مذہب میں کوئی رئیس روحانی اُنسے زیادہ اپنے مذہب میں مشہور اور باثر نہیں
گذرا ہے۔ جب ناصر الدین شاہ سامرہ گئے تھے اور اُنسے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو نہ تو
خود شاہ کے قیامگاہ پر گئے نہ اُنکو اپنے مکان پر آنے دیا بلکہ اُنسے حرم عسکری ہی میں ملاقات
کی تاکہ دید و بازدید کا سوال نہ پیش ہو۔ اُنکی وفات سامرہ میں ہوئی تھی اور اُنکا جنازہ
تختہ وال میں ہزاروں آدمی اپنے کاندھوں پر قریب ۸۰ میل کے نجف اشرف تک لیگئے
تھے۔ سامرہ میں چونکہ سنی المذہب عرب کی آبادی کثرت سے ہے اسلئے وہ لوگ اُنکا جنازہ
سامرہ کی سرحد یعنی دریاے دجلہ کے اُس پار تک جو شہر سے قریب تین میل کے ہے خود
اپنے ہی کاندھوں پر لیگئے اور شیعوں کو جنازہ میں شریک نہیں ہونے دیا اور اُسکے بعد
پھر شیعہ جنازہ کو لیگئے۔ بغداد و کاظمین میں تمام ترکی حکام نے مع والی پاشا کمانڈر انچیف
اور ترکی فوج کے اُنکے جنازہ کی مشایعت کی۔ کاش کہ ہندوستان میں بھی شیعہ علما کے
جنازہ کے ساتھ سنی اور سنی علما کے جنازہ میں شیعہ اسی طرح پر شرکت کرتے۔ اُن
مرحوم کے چند واقعات ہیں جو نہایت ہی حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں لیکن بسبب طوالت کے
اُن کا ذکر نہیں کر سکتا منجملہ اور باتوں کے یہ بات خاص قابل ذکر ہے کہ جب پہلے پہل میں

ہندوستان سے سامرہ پہونچا اور انکی خدمت میں حاضر ہوا تو جب انکو یہ معلوم ہوا کہ میں انگریزی عربی کا طالب علم ہوں تو نہایت درجہ میری قدر فرمائی اور یہ فرمایا کہ ایسے طالب علم جو انگریزی کے ساتھ عربی بھی جانتے ہیں وہ زیادہ قابل قدر ہیں اسلئے کہ اس زمانہ میں ایسے لوگوں سے اسلام کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے چنانچہ میرے زمانہ قیام میں بعض طلبا نے مثل پسر جناب مرزا حسین نوری مرحوم کے مجھسے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی۔

سامرہ میں کچھ آثار خلفائے قدیم کے ابتک موجود ہیں کیونکہ بسبب خوبی آب و ہوا کے بہت سے خلفائے بنی عباسیہ نے اپنا پایۂ تخت اسی مقام کو قرار دیا تھا مسافر کو چاہیے کہ سامرہ سے کاظمین واپس آئے اور کاظمین سے پھر ریل کے ذریعہ سے کربلائے معلی اور وہاں سے موٹر میں سوار ہو کر نجف اشرف کی بھی زیارت سے مشرف ہو جائے نجف سے کوفہ بہت ہی قریب ہے۔ عبرت کیلئے اُس مقام کو بھی دیکھ لے۔

فصل چہارم از بغداد تا طہران

شنبہ کے روز کاظمین سے قریب دس بجے دن کے موٹر میں روانہ ہوا میرے ساتھ تین اور ایرانی مسافر تھے جو طہران جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے مبلغ چھ سو روپیہ پر ایک بالکل نئی فورڈ موٹر کرایہ کی تھی۔ میں نے اپنے حصے کا مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ پیشتر ہی دیدیا۔ اگر انگریزی یا فرنچ کمپنی کے موٹر میں جاتا تو مبلغ ۲۵ پونڈ یعنی قریب ۳۷۵ کے خرچ ہو

روپیہ کے دینے پڑتے۔ اگر میرا ساتھ ان طہرانی مسافروں کا نہ ہوتا تو میرا ارادہ انھیں
کمپنیوں میں سے کسی ایک کی موٹر میں جانے کا تھا جیسا کہ میں نے واپسی کے وقت طہران
سے کیا تھا۔ موٹر قریب ۴ بجے کے خانقین پہونچی اور بعد معائنہ کسٹم کے وہیں ایک سرا
میں ایک کمرہ لیکر ہم لوگ ٹھہر گئے بغداد سے خانقین تک ریل بھی آٹھ گھنٹے میں جاتی
ہے لیکن پھر وہاں سے طہران کے لئے موٹر ملنے میں دقت پیش آتی ہے اسلئے ہملوگوں
کاظمین ہی سے طہران تک کے لئے موٹر کرلی تھی

دوسرے روز اتوار کے دن صبح کو موٹر چلی اور راستہ میں دو مقام
ایک سرحد عراق اور دوسرا سرحد ایران پر کسٹم کا معائنہ ہوا اور تیسرے پہر
کے وقت ہم لوگ قصر شیریں پہونچ گئے۔ وہاں بھی کسٹم کا معائنہ
اور وہاں سے چلکر ایک گھنٹہ رات گئے کرماں شاہ پہونچ گئے یہاں میں نے ایک ہوٹل
میں جسکا مالک ایک یونانی تھا قیام کیا اور ایک تومان یعنی تین روپیہ اور کچھ آنے
فی شب کرایہ دیا اور شہر میں جاکر ایک رستوران میں کھانا کھایا۔ یہ شہر بہت ہی قدیم
کوچے بہت تنگ اور بازاریں چھت دار ہیں۔ شہر تو البتہ اچھا ہے وہاں بڑی عمارتیں
اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر طاق بستان ہے جہاں
میں چند قدیم تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ رستم کا مجسمہ (Statue) ایک پتھر

گھوڑے پر نہایت ہی عمدہ بنا ہوا ہے۔ دوسری محراب میں میخی خط میں کچھ لکھا ہوا ہے لیکن
میں اسکو پڑھ نہ سکا۔ اس شہر میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں جو معاون الملک کے لقب
سے مشہور ہیں وہ ایک نہایت ہی شاندار خوبصورت تصاویر و نقش و نگار سے مزین حسینیہ
یعنی امام باڑہ تعمیر کر رہے ہیں اس سے عمدہ امام باڑہ غالباً تمام ایران میں کہیں نہیں ہے
ایک روز یہاں قیام کیا اور شب کو ایک ایرانی تاجر کے یہاں اپنے طہرانی رفقا کے ساتھ
مہمان ہوا۔ مہمانی نہایت ہی پر تکلف تھی اور بہت سے ایرانی تاجروں سے وہاں ملاقات ہوئی
دوسرے روز سہ شنبہ کی صبحکو کرمانشاہ سے روانہ ہو کر غروب کے وقت ہم لوگ ہمدان
پہونچگئے اور میں ہوٹل اقتصاد میں ایک کمرہ لیکر ٹھہر گیا۔ کرایہ ۵ قران یعنی قریب
۱۲؍ کے شب کے حساب سے دیا۔ صبحکو ایک سلمانی یعنی (*Hair dresser.*)
کی دوکان پر بال کٹانے گیا نائی نے بال کاٹتے وقت مسائل سیاسی پر اسطرح مجھسے
گفتگو کی جیسا ہندوستان میں ایک اخبار پڑھنے والا معمولی گریجویٹ کرتا ہے میں نے
اخبار پڑھنے کی وجہ سے قید لگائی کہ ہندوستان میں بہت سے گریجویٹ اور تعلیم یافتہ
اشخاص ہیں جو اخبار کو مہینوں یا مطلق نہیں پڑھتے۔ اثنائے گفتگو میں اسنے مجھ سے
یہ بھی کہا کہ آپ یورپ کو چھوڑ کر ایران کیوں آئے کیونکہ ایران میں مسافروں کو بہت سخت
تکلیف ہوتی ہے۔ بال کاٹنے کے بعد اسنے مجھکو چائے پلائی۔ چلتے وقت میں نے

اُسکو دو قران یعنے قریب دو روپیہ آنے کے دیئے اور اُسنے میرا شکریہ ادا کیا۔ سہ پہر کو بابا طاہر
کے قبر کی زیارت کرنے گیا مقبرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا اور باوجود موقوفات کے
کوئی سامان نہ تھا۔ وہاں کے مجاور ایک جوان سید تھے جنھوں نے اثنائے گفتگو میں کہا
اُنکے جد بزرگوار کشمیر سے آئے تھے فوراً ہی میرے دل میں خیال گذرا کہ اگر یہ حضرت کشمیری الاصل
ہیں تو وقف کو خوب کھاتے ہونگے۔ یہ شہر تجارت کا بہت ہی بڑا مرکز ہے اور یہاں کے قد
باشندے اکثر یہودی ہیں یہاں ہر قسم کا میوہ بکثرت پیدا ہوتا ہے اور بہ نسبت کرمانشاہ
قزوین اور طہران کے یہ زیادہ سرد مقام ہے یہاں کی آب ہوا نہایت ہی اچھی خیال
کی جاتی ہے۔ ایک روز یہاں قیام کیا اور سہ پہر کو شہر کے باہر گردش کرنے گیا۔ شہر
کے باہر کثرت سے باغ ہیں اور یہاں کا جدید سربازخانہ (Barrack.)
نہایت ہی عظیم الشان بنا ہوا ہے۔ شہر کے باہر انگریزوں کا ایک قبرستان دیکھا
اُسپر "British military Cemetery" لکھا ہوا تھا جس
معلوم ہوا کہ زمانہ جنگ میں جب (Dunster force.) کی فوج
یہاں مقیم تھی اُسوقت کچھ انگریز افسر اور سپاہی اِس قبرستان میں دفن کئے گئے
یہاں ایک امریکائی مریضخانہ یعنی اسپتال بھی بنا ہوا ہے۔ پنجشنبہ کو ہملوگ ہمدان سے
روانہ ہوے اور غروب سے دو گھنٹے پہلے قزوین میں پہونچ گئے۔ یہاں میں نے ایک

ہوٹل میں جسکا نام (Grand Hotel.) ہے ایک کمرہ ۵ قران یعنی ۱۲/عہ فی شب کرایہ پر لیکر قیام کیا۔ کھانا رستوران میں کھانے گیا بلکہ ہوٹل ہی میں کھا لیا۔ اور اسکی قیمت علیحدہ دی اس شہر کے لوگ ترکی۔ فارسی اور روسی عموماً جانتے ہیں اور بہت سے لوگ انگریزی حتیٰ کہ اردو بھی بول لیتے ہیں۔ چونکہ یہاں بھی جنگ کے زمانہ میں انگریزی اور ہندوستانی فوج ٹھہری ہوئی تھی اسلئے بازار کے کاسبوں نے انگریزی اور اردو دیکھ لی تھی۔ سہ پہر کو میں شہر گھومنے گیا اور جامع مسجد اور مقبرہ حسین بن امام علی رضا کو جاکر دیکھا مسجد نہایت ہی قدیم اور عظیم الشان ہے لیکن بہت ہی بری حالت میں ہے مقبرہ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت ہے۔ مرزا علی اصغر خاں صدر اعظم نے اسکو تعمیر کرایا تھا۔ ایران اور خصوصاً قم میں صدر اعظم مرحوم نے بہت سے مقبرے تعمیر کرائے ہیں اور تمام مقبروں کی عمارت ایک ہی سی ہے جمعہ کے روز صبح کے وقت قزوین سے روانہ ہوے اور بعد از ظہر طہران پہونچ گئے۔ جب ہم لوگ شہر کے قریب پہونچے تب میرے رفقا کے اعزا واحباب ان لوگوں کے استقبال کو آئے اور میں بھی آقا غلام حسن تبریزی کے ساتھ انکے مکان پر چلا گیا اور شب کو انھیں کا مہمان رہا۔ مہمانی نہایت پر تکلف تھی اور قریب ۵۰ آدمی کے دسترخوان پر موجود تھے۔ چائے اور شیرینی کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا دوسرے روز میں اپنے ایک پرانے ملاقاتی مرزا علی اصغر کاشف سے تیجہ صدر اعظم میں

جاکر ملا۔ ایران میں تیمچہ اُس عمارت کو کہتے ہیں جہاں پر تاجروں کا آفس
اُنھوں نے چائے پلائی اور پھر میرے ساتھ وہ مکان کی تلاش میں چلے
کوئی اچھی جگہ قیام کے لئے نہ ملسکی اِسلئے ہوٹل اقتصاد میں جاکر ٹھہر گیا
یعنی ایک روپیہ فی شب کرایہ طے ہوا اور کھانا جس رستوان میں دل چاہتا
کھالیا کرتا تھا۔ پہلے میں نے چاہا تھا کہ گرانڈ ہوٹل میں جاکر قیام کرو
دوستوں نے وہاں جانے سے منع کیا کیونکہ وہاں کا کرایہ کچھ زیادہ تھا
سے معلوم ہوا کہ بغیر خوراک کے تین اور پانچ روپیہ فی یوم کی شرح تھی۔
طہران میں ہیں لیکن اسقدر نہیں ہیں جتنے بغداد میں اور نہ بہت آرام
ہفتہ اس ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد ملاک قاسم مرزا صابری سے
ہوئی یہ وزارت مالیہ میں کلرک ہیں اور اُن کو میں شاہرود سے
میں نے اُنسے اپنے لئے ایک مکان کی خواہش ظاہر کی تو اُنھوں نے کہا کہ
میں آکر رہو۔ میں تم کو ایک کمرہ دیدوں گا اور کھانا بھی اپنی بیوی سے پکو
چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اُنکے یہاں جاکر مثل بورڈ کے رہنے لگا۔
روپیہ مہینہ کے میں کمرہ اور کھانے کے لئے دیتا تھا۔ صبح اور عصر چا
دوپہر اور شب کو جو کھانا اُن کے یہاں پکتا تھا اُنکے ساتھ کھاتا تھا۔

ن سے سجا ہوا تھا اور تمام ضروری چیزیں اسمیں موجود تھیں۔ اگرچہ اس قسم کا رواج
رن میں نہیں ہے لیکن انھوں نے میرے ساتھ خاص مہربانی کی تھی۔ طہران
بلکہ بہت قدیم شہر نہیں ہے اسلئے نہ تو بہت گنجان آبادی ہے اور نہ اسمیں تنگ
چے اور گلیاں ہیں۔ سڑکیں بہت ہی چوڑی اور سیدھی بنی ہوئی ہیں اور عموماً
ڑکوں کے دونوں جانب درخت لگے ہوے ہیں جیسا پیرس میں۔ ایسے مقامات کو
یہاں خیابان اور فرانس میں بولوار (Baulevard) کہتے ہیں
ام ایشیائی ملکوں میں کوئی ایسا شہر نہیں ہے جہاں اسقدر خیابان ہوں جسقدر
ہران میں ہیں منجملہ بیسیوں خیابان لالہ زار۔ خیابان ناصری۔ خیابان چراغ برق
خیابان حسن آباد۔ خیابان دوشن تپہ۔ خیابان نادری۔ خیابان حاجی ملا ہادی وغیرہ
بہت اچھے خیابان ہیں جس طرح لکھنؤ میں امین آباد حضرت گنج و چوک ہے اسطرح
یہاں خیابان لالہ زار و خیابان ناصری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی آبادی صرف
قریب ڈھائی لاکھ کے ہے لیکن چونکہ عموماً مکان بہت کشادہ ہیں اور قریب قریب
ہر اچھے مکان کے اندر ایک باغ ہوتا ہے اسلئے شہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے اور
ناواقف مسافر یہ خیال کریگا کہ یہاں ۸-۱۰ لاکھ آدمی رہتے ہونگے۔ چونکہ شہر
نہایت ہی کھلا ہوا ہے۔ اسلئے یہاں کی آب و ہوا بہت ہی اچھی ہے۔

بلدیہ یعنی میونسپلٹی بہت سرگرمی سے کام کرتی ہے اور شہر کی صفائی اور برقی
روشنی وغیرہ کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہے۔ البتہ جاڑوں میں جب برف باری
ہوتی ہے اُسوقت سڑکوں پر اسقدر کیچڑ ہوتی ہے کہ چلنا دشوار ہوجاتا ہے ابتک
گھوڑے کی ٹریموے چلتی ہے لیکن عنقریب برقی ہوجائے گی۔ گھوڑے گاڑیاں
اور موٹریں کثرت سے کرایہ پر چلتی ہیں۔

طہران میں کوئی خاص عمارت نہیں ہے جسکا خاص طور پر ذکر کیا جاوے الب
مسجد سپہ سالار اعظم نہایت ہی عظیم الشان ہے لیکن اسکا ایک حصہ ناتمام رہگیا۔
اُمرا کے ذاتی مکان البتہ نہایت ہی عمدہ ہیں اور ہر مکان کے اندر اکثر پارک
کم سے کم بڑا سا باغ ہوتا ہے تمام مکانوں میں آتابک مرحوم کا مکان اور پارک نہا
عظیم الشان ہے اسمیں اب روس کا سفارت خانہ ہے۔ مجلس شوریٰ و بلدیہ و
حربیہ کی بھی عمارتیں عمدہ ہیں۔ شاہی عمارتیں باہر سے تو بہت ہی معمولی معلو
ہوتی ہیں لیکن اندر سے نہایت اچھی ہیں اور نقش و نگار سے پُر ہیں۔

تعلیم کی جانب لوگوں کا بہت ہی زیادہ خیال ہے اور لڑکے اور لڑکیوں
مدارس کافی تعداد میں ہیں جس خاندان میں تعلیم کا رواج ہے اسمیں لڑکے اور ل
کو برابر تعلیم دی جاتی ہے۔ البتہ جس خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اسمیں لڑ

دونوں محروم رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح نہیں ہے کہ بیٹا تو گریجویٹ ہے
لڑکی قرآن پڑھ لینے سے زیادہ کچھ نہیں جانتی اور بعض شرفا کے خاندان میں
ایسی لڑکیاں ہیں کہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتیں۔ علاوہ ایرانی مدرسوں کے تین
مدرسے فرانسیسیوں کے ہیں اور دو بہت بڑے اسکول امریکائیوں کے ہیں ایک
لڑکوں کے لئے اور دوسرا لڑکیوں کے لئے۔ اب امریکائی شہر کے باہر ایک بہت بڑا
کالج تعمیر کر رہے ہیں اور بعد تعمیر ہو جانے کے اسکا شمار ایران کی بہت بڑی عمارتوں
میں ہوگا۔ میرے خیال میں کئی لاکھ روپے اسکی تعمیر میں صرف ہو چکے ہیں اور اب بھی
تکمیل میں دو تین لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

علاوہ ابتدائی و متوسط مدرسوں کے ایک دارالفنون بھی ہے جہاں فی الجملہ
تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ طب۔ مدرسہ حقوق یعنی (Law College)
کا پرنسپل ایک نہایت ہی قابل فرنچ ہے اور مدرسہ ارکان حرب یعنی Staff College
یہاں کے عمدہ درسگاہوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دارالفنون میں ایک شعبہ
علم موسیقی کا بھی ہے لیکن تعجب ہے کہ یہاں کے علما اور خصوصاً سید حسن مدرس و
مجتہد خوئی جنکا شہر میں زیادہ اثر ہے اسکی مخالفت نہیں کرتے۔

علاوہ ان مدارس کے یہودی اور ارمنیوں کے بھی مدرسے ہیں۔ ایک کانونٹ سکول

(Convent school) بھی ہے جسمیں فرینچ کی راہبات یعنی
(Sisters) تعلیم دیتی ہیں۔ روسیوں کے بھی مدرسے ہیں جہاں اُنکے
لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ عموماً فرینچ جانتے ہیں۔
اور اب انگریزی کا بھی رواج کثرت سے ہو گیا ہے اور بالخصوص جب سے امریکائی
مستشار (.Advisers) ایران کے ادارہ مالیہ میں مستخدم ہوئے ہیں۔
اخبار یہاں کثرت سے نکلتے ہیں اور متعدد قرأت خانے یعنی (Reading
Rooms) ہیں جہاں لوگ جا کر مفت اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ قرأت خانے
عموماً کسی ایک شخص کے یا کسی خاص حزب کے قائم کردہ ہیں اور اُن کو محکمہ تعلیم یا
بلدیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اکثر قرأت خانہ "طوفان" میں عصر کے وقت
جا کر اخبار پڑھا کرتا تھا یا کتب بینی کیا کرتا تھا۔ میں نے اس قرأت خانہ کے ایک
کمرہ میں دنیا کے قومی لیڈروں کی تصویریں دیکھیں جنمیں مہاتما گاندھی کو بھی وہاں
موجود پایا۔ ذیل میں چند اخباروں کا نام لکھتا ہوں جس سے طہران میں روزنامہ نگاری
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "ایران" ستارہ ایران۔ کوشش۔ میہن۔ قانون۔
وطن۔ شفق سرخ۔ حیات ایران۔ نسیم صبا۔ حلاج۔ توفیق۔ فکر آزاد۔ ناہید۔
محشر۔ شہاب۔ تجدد۔ جنت۔ آسائش۔ طلوع شمس۔ پیک۔ آواز تاجیک۔

ارمغان۔ نسیم شمال وغیرہ بعض اخبار شاید انمیں سے ایسے ہی ہوں جو کسی دوسرے شہر میں طبع ہوتے ہیں اور طہران کے قرأت خانوں میں پڑھنے کے لئے بھیجدیے جاتے ہوں لیکن بیشتر اُنمیں ایسے ہیں جو طہران میں شایع ہوتے ہیں۔ اگر ایران کے تمام اخباروں کا شمار کیا جاوے تو غالباً اُنکی تعداد قریب سو کے ہوگی۔ واضح رہے کہ تمام ایران کی آبادی دو کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کم ہو۔ یہاں چند کلب بھی ہیں اور سب سے اچھا فوجی کلب ہے امریکن اسکول کے طلاب کا بھی ایک کلب ہے جو مجمع جوانان ایران کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اکثر شب میں مختلف مضامین پر لکچر بھی دیے جاتے ہیں ایرانیوں میں بسبب تعلیم اور روشن خیالی کے تعصب ہی کا نام نہیں۔ تبرا یا ایسی چیزوں کا جن سے سنیوں کے دل کو صدمہ پہونچے مطلق رواج نہیں ہے اگر کسی ایرانی سے تبرا کا لفظ کہا جاوے تو وہ ہرگز نہیں سمجھیگا کہ اُس سے کیا مراد ہے۔ بجز اعیاد اسلام اور ایام ولادت ائمہ کے اور کسی دن کو وہ عید کا دن نہیں قرار دیتے۔ سنی۔ یہودی۔ پارسی اور ارمنی بالکل آزاد ہیں اور کسی دوسرے کے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے پارلیمنٹ میں پارسی۔ یہودی اور ارمنی کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اور ان دنوں مجلس شورے کا منتظم ایک پارسی ہے جسکا نام ارباب کیخسرو ہے اور جو طہران میں بہت ہی محترم ہے۔

ہر روز عصر کے وقت ایک فوجی بینڈ میدان سپہ میں عمارت بلدیہ کے مقابل
دوسرا میدان مجلس میں بجا کرتا ہے۔ موزیک سننے کے لئے ہزاروں مرد و زن جمع ہوا کر
مغرب کی اذان ہوتے ہی بینڈ بند ہوجاتا ہے لیکن کبھی کبھی بعد ختم اذان بجنا شروع ہوتا
مجلس شوری اندنوں قاعدہ سے کام کر رہی ہے اور اکثر وکلائے مجلس پابند
کے ساتھ مجلس میں شرکت کرتے ہیں۔ ممبران مجلس میں سید حسن مدرس نہایت
بااثر و قابل شخص ہیں۔ اگرچہ وہ نجف اشرف کے تعلیم یافتہ ہیں اور جدید علوم
بالکل ناواقف ہیں لیکن اُنکی ایک تقریر جو میں نے وضع مالیات ارض یعنی
قانون مالگذاری کے متعلق سنی تھی اُس سے معلوم ہوا کہ اُن کو اکثر مسائل اقتص
و سیاسی میں کافی مہارت حاصل ہے۔ مرزا حسین علائی جو اس سے پیشتر امر
سفیر تھے اور نصرۃ الدولہ فیروز مرزا جو سابق میں وزیر امور خارجہ کے عہدے
فائز تھے اور تقی زادہ جو اس سے قبل برلن میں مجلہ کاوہ کے مدیر تھے مجلس کے
ممبروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اندنوں مجلس کے رئیس یعنی (Speaker
آقا موتمن الملک ہیں جو نہایت ہی قابل قانون دان اور مدبر شخص ہیں۔ اُنکے بھ
آقا مشیر الدولہ بھی مجلس کے ممبر ہیں جو نہایت ہی باعلم و تجربہ کار ہیں۔ یہ
خاموشی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ بعضے واقعات مجلس شوریٰ کے میں لکھتا

اگر خیال طوالت مانع نہ ہوتا۔

ایران کی انتظامی حالت ان اوقات میں بہت ہی غنیمت ہے اور اسمیں شک نہیں آقا رضا خاں سردار سپہ نے بہت کچھ اصلاح کردی ہے۔ محکمہ جنگ میں بہت کچھ ترقی ہوگئی ہے اور اسوقت ایران میں قریب ساٹھ ہزار فوج کے موجود ہے۔ بہت سے افسروں نے فرانس و جرمنی میں تعلیم پائی ہے اور جو یہاں کے مدرسہ حربیہ کے تعلیم یافتہ ہیں وہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے اپنے خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ راستوں میں بہ نسبت پہلے کے بہت ہی اطمینان بخش امن و امان قائم ہوگئی ہے اور بجز اسکے کہ حال میں دو ایک حملے ترکمانوں نے مشہد و شاہرود کے درمیان قافلوں پر کردئے تھے اور کوئی ڈاکے نہیں پڑے۔ ایران و عرب میں عام طور پر اس قدر ڈاکے نہیں پڑتے جتنے ہندوستان میں ڈالے جاتے ہیں۔

نظمیہ یعنی پولیس کا انتظام بہت ہی قابل تعریف ہے اور زمانہ جنگ میں مجکو مشہد کی پولیس کے ساتھ بہت کچھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے عموماً پولیس کو بہت ہی بادیانت پایا۔ پولیس پبلک کو بہت کم موقع شکایت کا دیتی ہے اور رشوت ستانی یا جھوٹے مقدمات بنانے کی شکایات بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسمرتبہ طہران میں میں نے پولیس کو اپنے وظائف منصبی کے انجام دینے اور پبلک کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے سلوک کرنے میں نہایت ہی سرگرم پایا۔

یہ پولیس کا حسن انتظام ہے کہ اکثر شہروں میں عام طور پر چوری و نقب زنی نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں جسقدر سرقہ کا جرم ہندوستان میں ہوتا ہے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوتا۔ Finance Deptt ادارہ مالیہ میں بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے اور قریب بیس بارہ امریکن مستشار کے اس میں ستخدم ہیں مستشار کل Administrator General ڈاکٹر ملیپو Milispaugh امریکن ہے جسکو بہت وسیع اختیارات دئے گئے ہیں۔ خزانہ گمرک۔ ڈاکخانہ وغیرہ کے حسابات کی جانچ امریکاؤں کے متعلق ہے۔ اگرچہ کچھ دنوں اسیطرح امریکن خدمت انجام دیتے رہیں اور موانع خارجی و داخلی نہ حائل ہوں تو یہ ادارہ نہایت منتظم و مرتب ہو جائیگا۔ ہر اسلامی و مذہبی عید کے موقع پر شاہ یا ولیعہد ان دونوں شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں دربار میں رسم سلام کے لئے تشریف لاتے ہیں اور سلام کے شروع ہوتے ہی توپ چلنے لگتی ہے اور ایک سو دس آواز ہوتی ہیں کیونکہ لفظ علی کا عدد بحساب ابجد ۱۱۰ ہوتا ہے۔

جو لوگ سلام کے لئے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اُن کا لباس عام سیاہ فراک کوٹ یا سیاہ سرداری جو ایک شیروانی سے مشابہ ہوتی ہے اور دھاری یا سیاہ پتلون اور سیاہ جوتا ہوتا ہے۔ جو لوگ سرداری پہنے رہتے ہیں اُنکو کلاہ

ائی لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن فراک کوٹ والوں کو سخت کالر اور سیاہ
ائی پہننی پڑتی ہے۔ اسکے علاوہ ہر شخص بالتو یعنی اورکوٹ [Over coat]
یا عبا اوپر سے پہنکر جاتا ہے لیکن اطاق پذیرائی (Reception room)
میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بالا پوش کو Cloak . room یعنی
بیرونی کمرہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا تمام لوگ اُطاق پذیرائی میں جمع ہو جاتے ہیں
اُسوقت ہر شخص فرداً فرداً دوسرے کمرہ میں شاہ یا ولیعہد کی خدمت میں پیش
کیا جاتا ہے اور جاکر تعظیم کرتا ہے۔ شاہ یا ولیعہد اُس سے علی قدر مراتب کھڑے
کھڑے مزاج پرسی کرتے ہیں۔ اس طرح شاہ ہوں یا ولیعہد اُن کو گھنٹوں کھڑے رہنا
پڑتا ہے۔ میں جب عیدِ ولادت حضرت علیؑ میں ولیعہد کی خدمت میں حاضر ہوا تو
وہ مجھ سے نہایت ہی خلق سے پیش آئے اور میرے بامحاورہ فارسی بولنے پر
بہت تعجب کیا اور اپنے مصاحبین خاص کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ "ایں
آقا خیلے خوب بامحاورہ حرف می زند۔ اُسکے بعد اُنھوں نے آگرہ کے تاج محل کی
بہت ہی تعریف کی میں نے بھی لکھنؤ کے دونوں امام باڑوں کا ذکر کیا۔ اُسپر
اُنھوں نے کہا کہ میں لکھنؤ اسٹیشن سے گذرا تھا اگر مجھ کو معلوم ہوتا تو میں ضرور جاکر
اُن کو دیکھتا۔

طہران اور دوسرے بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ ایرانیوں کا لباس عام
یوروپین ہے بجز اسکے کہ سیاہ ٹوپی اور اوپر سے عبا پہنتے ہیں۔ اس امر کا ضر
رکھنا چاہیے کہ جو شخص ایران کو جائے وہاں اسکو ایک عبا خرید لینی چاہیے تاکہ
اشخاص محترم سے ملنے یا مقدس اماکن یا مذہبی جلسوں میں جائے تو اسکو ضرور پہنے
ایران میں بدون عبا یا التو (Over Coat) کے ایسے موقعوں پر
نہایت ہی بدتہذیبی خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کا بھی لباس یوروپین (اور
ہوگیا ہے البتہ اوپر سے وہ سیاہ ریشمی چادر یعنی برقع پہنتی ہیں۔ عورتیں عموماً
جوتے اونچی اڑیوں کے مثل فرینچ اور انگریزی لیڈیوں کے پہنتی ہیں۔ مجھکو
تیز چلتے ہوئے دیکھکر نہایت ہی حیرت ہوتی تھی کہ اس خراب اور اونچی نیچی پڑی
اور برف باری کے بعد یخ بستہ کوچوں میں وہ کیونکر ایسے اونچے جوتے پہنے ہو
اس تیزی سے چلتی ہیں کہ دنیا میں کسی قوم کی عورتیں سوائے انگریزی اور امر
ایرانی عورتوں سے زیادہ تیز نہیں چل سکتیں۔ عورتیں عام طور سے ہر شریف
وضع کی اپنے گھروں سے باہر جاتی ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتی
جمعہ اور دوسری مذہبی اعیاد میں ہزاروں عورتیں شاہ عبدالعظیم کو جو طہران
تین چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے زیارت و گردش کے لئے جاتی ہیں۔ اس

ریوں میں ہر روز کثرت سے عورتیں شمیران کو جو طہران سے چند میل کے فاصلہ پر
اتع ہے سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں۔

ایران میں بھی مثل دیگر ایشیائی اور یورو پین ممالک کے چند مخصوص مراسم ہیں
ور دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتے مثلاً عید نوروز جو ایرانیوں کی قومی عید ہے نہایت ہی
جشن و اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ آفتاب کے برج حمل میں داخل ہوتے ہی خوشی کے
مراسم ادا کئے جاتے ہیں اور اسی وقت سے نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اس روز
نئے کپڑے پہنتا ہے اور تحویل آفتاب سے پہلے ہر گھر میں تمام خاندان ایک صاف و پاکیزہ
مقام پر جمع ہوتا ہے۔ اور ایک سینی میں سات چیزیں رکھی جاتی ہیں جنکے نام حرف "س"
سے شروع ہوتے ہیں اور جنکو ہفت "س" کہتے ہیں مثلاً سرکہ۔ سبزی۔ سیب۔ سیر
سیاہ دانہ۔ سنجد۔ سمنو۔ ایک ظرف میں پانی دعا پڑھ کر رکھا جاتا ہے جس میں سے بعد
تحویل کے خاندان کا ہر شخص کچھ پانی پیتا ہے۔ ایک ظرف میں سرخ زندہ مچھلی بھی رکھی
جاتی ہے اور انڈا۔ دودھ۔ پنیر۔ دہی۔ مچھلی پکی ہوئی اور بغیر پکی ہوئی اور مرغ پکا ہوا
اور بغیر پکا ہوا اور چاندی اور سونے کے سکے بھی رکھے جاتے ہیں۔ مختلف رنگ
کی شمع روشن کی جاتی ہیں خواہ تحویل آفتاب دن کو واقع ہو یا شب کو اور وہ خاموش
نہیں کی جاتی ہیں مگر یہ کہ خود ہی جلکر تمام ہو جائیں۔ ہر شخص جنتری سے تحویل کے وقت کو

ساعت اور دقیقہ اور ثانیہ کے ساتھ جانتا ہے اور صاحب خانہ تحویل سے پہلے
مکان کے باہر چند دقیقہ کے لئے چلا جاتا ہے اور جیوں ہی تحویل کا وقت آ
میں داخل ہوتا ہے اور اپنے گھر کے لوگوں کو سونے کے سکے بطور عیدی کے د
تحویل کے وقت عموماً لوگ ایک مخصوص مختصر سی دعا پڑھتے رہتے ہیں۔ عید
دنوں پہلے لوگ اپنے گھروں میں کسی ظرف گلی یا مٹی میں جو گیہوں یا پھول وغیرہ
ہیں اور عید کے روز دسترخوان پر اُس سبزی کو بھی رکھ دیتے ہیں اور تیرھویں
تمام لوگ نحوست سال کو دور کرنے کے لئے گھروں سے باہر جاتے ہیں اور جسکو
کہتے ہیں اُس سبزی کو لیجا کر میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ جوان ناکتخدا لڑ
سبزی پھینکتے وقت کہتی ہیں" سیزدہ بدر سال دگر۔ خانۂ شوہر بچہ بہ بغل" ا
میں جو سبزی ہوتی ہے اُسمیں گرہ لگاتی ہیں اور کہتی ہیں" زردی من از تو، د
از من" سیزدہ بدر کی ایسی رسم ہے کہ ہر شخص مرد و عورت اور بچہ ضرور اس روز
مکان سے باہر نکل جاتا ہے اور لوگ نہایت ہی جشن اور سرور میں مشغول ہوتے
بڑے شہروں میں اُس روز خاص طور پر پولیس انتظام کرتی ہے کہ کوئی شخص
عورتوں سے غیر مہذبانہ طریقہ پر نہ پیش آئے۔ بہت سے مذہبی خیال کے لوگ
منانے کے لئے عراق یا مشہد یا قم زیارت کرنے چلے جاتے ہیں۔ طہران سے ہزار

قم چلے جاتے ہیں کیونکہ بذریعہ موٹر کے طہران سے قم چند گھنٹوں میں انسان پہونچ سکتا ہے۔ اسیطرح بہت سے لوگ شاہ عبدالعظیم چلے جاتے ہیں۔ عید کے دوسرے روز شب کے ہر شخص مرغ مسلم کھاتا ہے یہ دیسی مرغ ہوتا ہے جو بے پکا ہوا دسترخوان پر تحویل کے وقت رکھا جاتا ہے مچھلی کا صرف اُسدن اسقدر ہوتا ہے کہ ملک روس اور انزلی وغیرہ سے مچھلیاں خشک کی ہوئی بکثرت ایران میں دو کا ندار بیچنے کے لئے منگاتے ہیں۔ مٹھائی کا بھی صرف اتنا ہوتا ہے جتنا ہندوستان میں دیوالی کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ مراسم تحویل ادا کرانے کے بعد ہر شخص اپنے دوستوں امرا اور علماء سے ملنے جاتا ہے اور بعضے رؤسا و متمولین اُس روز لوگوں کو علیٰ قدر مراتب عیدی دیتے ہیں عیدی میں سونے کے سکے یا اشرفی پانچ ہزاری یا دو ہزاری دی جاتی۔ نوروز کے پہلے کثرت سے پنجہزاری دوہزاری کے سکے صرافوں کی دکانوں پر بکتے ہیں۔ سونے کی پنجہزاری بقدر چونی اور دوہزاری بقدر دوانی کے ہوتی ہے۔ اصل میں پنجہزاری دوہزاری سکے چاندی کے ہیں جو پانچ قران اور دو قران کے ہوتے ہیں اور سونے کے صرف عیدی دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زمانہ جنگ میں ایک سال عید کے موقع پر میں شاہرود میں تھا۔ وہاں شاہزادہ امیر اعظم حاکم شاہرود نے مجھکو دو اشرفی ناصر الدین شاہی عیدی دی تھی اور دوسرے موقع پر مشہد مقدس میں آقا قوام السلطنہ

والی خراسان نے ۵ سونے کی تجھزاریاں دی تھیں۔ طہران، اصفہان وغیرہ میں
بعض اُمرا عید کے دن ہزاروں روپیہ عیدی دینے میں صرف کرتے ہیں لیکن
اب اسمیں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

عید نوروز ایران میں تیرہ روز تک منائی جاتی ہے اور اکثر تجار و کسبہ اس
مدت تک کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں
اور ہر جگہ کثرت سے مٹھائی اور چاے صرف ہوتی ہے۔ تیرھویں تاریخ کو سیزدہ
کی رسم ادا کرنے کے بعد لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ جیسا یورپ کی
قوموں میں انگریز بڑے دن کو نہایت اہتمام سے مناتے ہیں اسیطرح ایشیا کی تمام قوموں
میں ایرانی اپنی قومی عید کے مراسم کو بہت ہی سرگرمی سے ادا کرتے ہیں۔ واضح
رہے جیسا ایران میں نوروز کے دن عیدی دینے کا دستور ہے اسیطرح انگریزوں میں
بھی کرسمس کے زمانہ میں ہدیہ وتحفہ دینے کا رواج ہے۔ انگلستان کے دیہاتوں میں
رات کے وقت لوگ کرسمس کی مخصوص گیت گاتے ہوے لوگوں کے دروازوں پر جاتے
ہیں اور صاحب خانہ انکو مٹھائی اور کچھ مشروبات دیتا ہے اور صبح کے وقت
لوگوں کے مکانوں پر جاتے ہیں اور اُن کو کچھ پیسے دیدیئے جاتے ہیں۔

●●●

- تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام ——— فواد سیزگین
- فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام ——— ״
- عربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر ——— ״
- آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔ ״

ارسطو کی گاڑی کے تقلیدوں نے

کیا خود بھی کچھ کام کیا ہے؟

فلسفہ یں، منطق یں،

اور خاص کر سائنس یں!

سید گین نے اس موضوع پر جو مفید خطبات دیے ہیں، پاکستان کے صف اول کے دانشور فکر و نظر نے انھیں اپنے چند شماروں میں ترجمہ کر دیا۔ موضوع ایسا ہے جس پر بہت کم لکھا ہے لوگوں کو پیاس رہتی ہے اسلیے ہم نے مناسب جانا کہ "جرنل" میں پیش کر دیں۔

ادارہ

ٹر فؤاد سیزگین
مہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام

مشہور معاصر ترک فاضل ڈاکٹر فؤاد سیزگین کی ذات کسی
ارف کی محتاج نہیں ۔ تاریخ علوم و کتابیات عربی پر انکی مبسوط
رمن تالیف Geschichte des Arabischen Shrifttums
اریخ التراث العربی) عالم گیر شہرت رکھتی ہے۔ تاریخ حدیث پر
، کے نتائج تحقیق خصوصیت سے اہم سمجھے جاتے ہیں ۔
,,جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ ،، کی دعوت پر ریاض جا
ر انھوں نے عربی میں سات خطبات دیئے جنہیں جامعہ نے ۱۳۹۹ ھ/
۱۹۷۹ ء میں ـــ (اسی سال ڈاکٹر فؤاد سیزگین کو شاہ فیصل ایوارڈ
یا گیا) ـــ ,,محاضرات فی تاریخ العلوم،، کے عنوان سے شائع کیا ۔
ن میں سے پہلے خطبے ,,مکانۃ المسلمین فی تاریخ العلوم،، کا اردو
جمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کھڑے بریکٹ میں مختصر اضافے
اقم کی طرف سے ہیں ۔ ان اضافوں کے لئے مندرجہ ذیل مصادر سے
ستفادہ کیا گیا ۔

(1) Dictionary of Scientific Biography,

American Coucil of Learned Societies New York — 1981.

(2) George Sarton, Introduction to the History of Science, Carnegie
Institution of Washington 1927 onwards

Encyclopaedia Britanica, 15th ed. 1985

Wüstenenfeld Mahler Sche, Verglei Chungs — Tabellen,

...sbaden, 1961.

(۵) القفطي، علي بن يوسف، إخبار العلماء باخبار الحكماء، مط...
السعادة مصر ۱۳۲٦ هـ

(٦) الزركلي، خيرالدين، الأعلام، قاموس تراجم. دوسرا ايڈيـ...
مطبعة كوستاتسوماس وشركاء، ۱۳۷۳هـ/۱۹۵۳ء وبعد

(مترجم

هر چند که مورخین علوم کے ہاں، مختلف علوم کی تاریخ بدلتے ہوئے منظر نامے کی اہمیت ایک حقیقت مسلّمہ ہے تاھم علمی تاریخ کی کتابوں میں، کئی صدیوں سے ایک تصور شدت غالب چلا آتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم کا ارتقاء ــ خص... ان علاقوں میں جو بحیرہ روم کے طاس میں واقع ہیں ــ دو سیاسی مرحلوں سے گزرا ہے۔ ایک یونان قدیم کا مرحلہ دوسرے مغ... دنیا کا مرحلہ جس کا آغاز ,,تحریک احیائے علوم،، کے مظہر سے ... ہے۔

تاریخ فکر انسانی کے خط و خال اجاگر کرنے کے ضمن ... گزشتہ چند صدیوں کی تحقیقات سے ایسے نتائج سامنے آ چکے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نتائج یقیناً اس قابل تھ... مورخین علوم کی توجہ انکی طرف مبذول ھوتی اور انکی روشنی نسلوں سے چلا آنے والا مذکورہ بالا تصور تبدیل ھو جاتا۔
موجودہ صدی کی پہلی دو تہائیوں کے آغاز سے عملاً ڈنمارک عالم اوتو نوبگباور (OTTO NEUGEBAUER) کی اہم مساعی سامنے

کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ یونانیوں کو تاریخ علوم کے ضمن
اولیت حاصل نہیں بلکہ انہیں زمانہ ماقبل اسلام کی بعض اقوام
کارگزاری ورثے میں ملی تھی ۔ اس عالم کو بالآخر شاکیانہ انداز
یہ کہنا پڑا کہ :

,,ہر وہ کوشش جو یونانیوں کے کارناموں کو ان سے پہلے کی
دیگر اقوام سے مربوط کرنے کے لئے کی جاتی ہے شدید مخالفت
سے دو چار ہوتی ہے ۔ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ یونانیوں
کی حیثیت سے متعلق جس تصور کا وہ عادی ہو چکا ہے اس
میں کوئی تبدیلی لائی جائے ۔ یہ کیفیت ان تمام تحقیقات کے
علی الرغم ہے جن سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یونانی دور سے
قبل ڈھائی ہزار برس کا زمانہ موجود ہے جس میں مختلف ایسے
کارنامے انجام دیئے گئے جن کے ہوتے ہوئے یونانیوں کا مقام
تاریخ علوم کے وسط میں متعین ہوتا ہے نہ کہ اسکے آغاز میں،،۱۱

گذشتہ دو صدیوں کے دوران علوم عربیہ پر مستشرقین کی
قات نے تاریخ علوم کے اس غلط تصور کو متزلزل کرنے میں کچھ
کھایا ۔ مگر وہ تقریباً اس متواضعانہ اعتراف سے آگے نہیں بڑھتا
ربوں نے قدیم یونانیوں اور ، احیائے علوم کے دور میں، لاطینیوں کے
، واسطہ بننے کی خدمت انجام دی ۔

اس ضمن میں میری خواہش ہے کہ اس موضوع پر کلمۂ حق
کروں اور مجملاً امر واقع کا اظہار کروں ۔ ساتھ ہی ساتھ
ے اس امر کا اعتراف ہے کہ جدید تحقیقات کے نتائج ۔ اگرچہ ہنوز
ود ہیں ۔ بہرحال حقیقت کا سراغ پانے اور اسکا اظہار کرنے کی
ش میں ہیں ۔ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد بھی مورخین علوم ،
یوں اور احیائے علوم کے مابین ایک ایسے مرحلے کو نظر انداز کرتے
ائی دیتے ہیں جس میں بڑی تازہ کاری کا ظہور ہوا ۔

میری ان معروضات میں کلمۂ حق کا تقاضا ہے کہ میں تاریخ علوم میں عربوں کے ظہور کی مناسبت سے چند نکات کی نشان دہی کرتا چلوں :

اول یہ کہ ,,عربوں کے ہاں ابتدائے علوم کی تاریخ،، - نیز یہ کہ یہ ,,کس مرحلے کے علوم،، تھے - کے مسئلے پر ہنوز اختلاف رائے پایا جاتا ہے -

اس ضمن میں میرا نقطۂ آغاز اکثر محققین سے جداگانہ ہے - میری رائے یہ ہے کہ اسلام میں فکری و عملی نتیجہ خیزی پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گئی تھی -

میں اس بحث کے اجمال پر ہی اکتفا کروں گا اور ان تاریخی شواھد سے صرف نظر کروں گا جن کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہ ہو گا -

اسلامی معاشرہ جس کی تشکیل پہلی صدی ہجری کے وسط سے مختلف منظر ناموں، متعدد ثقافتوں اور متفرق زبانوں سے مل کر ہونی شروع ہوئی ، فی الواقع مختلف مکاتب فکر اور انکے افکار کا نقطہ اتصال بن گیا - جبکہ اس سے قبل یہ سب عناصر ایک دوسرے سے جدا تھے - اور ایک دوسرے پر ان کا اثر تقریباً مفقود تھا -

یہی وہ معاشرہ تھا جس نے رابطہ پیدا کیا اور اسی میں فکر انسانی کے ایک نئے دور نے جنم لیا - ھمیں اس امر میں قطعاً شک نہیں کہ ابندائی مسلمان حکام کا رویہ ، اجنبی ثقافتوں کے حاملین کی جانب سے پیش آمدہ صورت حال کے روبرو ، بے خبری کا رویہ نہ تھا -

لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جس کے لئے یہ رائے قابل قبول نہیں کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اس حد تک سادہ تھے کہ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُن نئے حالات پر کوئی ردّ عمل پیدا کر سکیں، جن سے وہ دوچار ہوئے ... ایسا تصو

رکھنے والوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس بحث میں اساسی نقطہ یہ ہے کہ عرب ۔ کم از کم جغرافیائی اعتبار سے ۔ بابلی آرامی اقوام کے وارث تھے ۔ اور اگر ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو وہ آس پاس کی متمدن اقوام سے مکمل طور پر کٹے ہوئے بھی نہیں تھے ۔

اس حقیقت کو سمجھے بغیر دور جاہلیت کی عربی شاعری کے بلند فنی ارتقاء اور دل کش صنعت گری، دوسری صدی ہجری کے نصف اول اور نصف ثانی میں علم نحو کی تیزی سے رونمائی اور اسکی وسیع پیش رفت نیز یونانی کتب کے ترجمے اور متعلقہ موضوعات پر ان سے اثر پذیری سے قبل نباتات ، حیوانیات اور موسیقی جیسے بعض علوم کی عجیب و غریب نشو و نما کا راز پانا از بس دشوار ہوگا ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں، دیگر اقوام کے علوم و معارف کو بےتکلف اخذ کرنے کی کوشش میں ایک اہم محرک کا بہت بڑا دخل تھا ۔ اس محرک کی وضاحت فرانز روز نتھال کے اس مختصر تبصرے سے ہو جاتی ہے جو ان کی کتاب ,,اسلام میں قدیم یونانیوں کے علوم کا تسلسل (۲) ,, میں وارد ہوا ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں :

,,غیر زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ کرانے کا وسیع کام ایک ایسا مظہر ہے کہ عملی یا نظری فائدۂ محض کا محرک اسکی توجیہ کے لئے کافی نہیں ۔ بلکہ ضروری ہے کہ علم کے بارے میں خود دین اسلام کے موقف کو بھی سمجھا جائے اور یہی موقف بہت بڑا محرک تھا نہ صرف زندگی کے دینی پہلو کیلئے بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کیلئے ۔ اسلام کا یہی موقف علوم کی جستجو اور انسانی دانش تک رسائی کے دروازوں کو کھولنے کیلئے سب سے بڑا محرک تھا ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ترجمے کا کام

صرف عملی زندگی کی بعض ضروری اشیاء تک محدود رهتا۔

میں یہاں اجمالاً اس بات کا اعادہ کرنا چاهوں گا کہ اجنبی علوم کا مرحلہ، تاثر کے اعتبار سے، ظہور اسلام کے بعد تھوڑی سی مدت میں شروع ہو چکا تھا ۔ اس کا ذریعہ پہلی صدی هجری میں بعض کتب کے ترجمے کی وساطت سے اصحاب علوم سے رابطہ تھا ۔ اس کی حقیقت وہ نہیں جو بعض مورخین خیال کرتے ہیں یعنی یہ کہ یہ مرحلہ دوسری صدی هجری کے وسط کے بعد، خلافت عباسیہ کے آغاز کے ساتھ، اور دوسری صدی کے انجام اور تیسری کے آغاز کے موڑ پر خلیفہ مامون کے قائم کردہ ,,بیت الحکمة،، کی تأسیس کے بعد پیش آیا ۔ اسلام کی فکری تاریخ میں اس ,,بیت الحکمة ،، کی اھمیت میں مبالغے سے کام لیا جاتا رہا ہے اور اسکی حیثیت کو بالکل غلط انداز میں سمجھا گیا ہے ۔

استفادے کا معاملہ ۔ جسکا آغاز بہت ابتدائی زمانے سے ہوا اور جو حیرت خیز تیزی سے ترقی کرتے ہوئے استفادے سے تقلید تک جا پہنچا ـــ تیسری صدی هجری کے اواسط سے اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہو گیا ۔

پھر اس مرحلے میں بھی کہ جسے غالب رنگ کے اعتبار سے استفادہ و تقلید کا مرحلہ کہا جاتا ہے عالم اسلام کے علماء نے عربی شعر کی پیمائش اوزان کا علم یعنی علم عروض ایجاد کیا اور علم لغت و نحو کو ترقی دی ۔ علم کلام و فلسفہ کی اصطلاحات کا وسیع ذخیرہ، اصول فقہ اور خود فقہ کا علم جو مختلف قواعد پر استوار ہے ، اس پر مستزاد ہیں ۔ اس ضمن میں عربوں کا یہ تصور بھی قابل ذکر ہے کہ الجبرا ایک مستقل چیز ہے نہ کہ اعمال حسابیہ کی ایک فرع ۔ اسی طرح هم

ـانش کیلئے ایسا طریقہ وضع کرنے کا اهتمام کیا جو
اطوستانس [ERATOSTHENES. تقریباً ۲۷٦ ـ ۱۹۵ ق ـ م]
، اس طریقے سے مختلف تھا جسے غالباً اهل بابل سے اخذ کیا
ا اور جسکی درستی کا انحصار اتفاقات کے عنصر پر تھا ـ

اسی مرحلے پر عرب علماء تیقّن کے ساتھ اس نتیجے پر
ـنچ گئے کہ بطلیموس [Ptolemy ـ تقریباً ۱۰۰ ـ ۱۷۰ء] کے
اسات اور فلکی زانچے غلطیوں پر مشتمل ھیں ـ چنانچہ انکی
ـحت کی جانچ پرکھ ، اور تصحیح و تکمیل ضروری ہے ـ
ـی طرح انھوں نے چاند دکھائی دینے کے فرق کا قیاس ایسے
ـسابی طریقوں پر قائم کر لیا جو یونانیوں کے ھاں غیر معروف
ے ـ

انھوں نے جغرافیہ پر بھی قلم اٹھایا چنانچہ ایک طرف ان
ـرافیائی نتائج کو جانچا جو یونانیوں کی وساطت سے ان تک
ـنچے تھے اور دوسری طرف اس جانچ پرکھ کے نتیجے میں
ـھوں نے کرۂ ارض کی حدود معلومہ میں وسعت پیدا کی ـ

اس مرحلے میں عربوں نے علم کیمیا کو نظری و عملی
ادوں پر استوار کیا اور اس ضمن میں ان نتائج پر انحصار کیا
ـن تک مختلف اقوام نے اسلام سے فوراً پہلے کے دور تک
ـائی حاصل کی تھی لیکن ان کے ھاں رابطہ باھمی کی وہ
ورت نہ ابھر سکی تھی، جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے
ـر قبول کرتے اور بالآخر ایک جامع اور مہتم بالشان امتزاج
ـک پہنچ جاتے ـ (حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں مجھے
ـققین کی اکثریت سے اختلاف ہے جن کا خیال یہ ہے کہ
ـلمانوں کے ھاں ,,علم الصنعة،، کے نام سے علم کیمیا کی بنیاد
ـتھی صدی ھجری سے قبل نہیں رکھی جا سکی تھی ـ)

ہم تاریخی حقائق سے انحراف کے مرتکب نہ ہوں گے اگر ہم یہ تصور کریں کہ استفادہ و تقلید کا مرحلہ تیسری صدی ہجری کے اواسط میں آکر اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا ـ اسی طرح ہم اس مرحلے ـ یعنی اختراعی مرحلے ـ کی ابتداء کا سنگ میل اس نقطے کو قرار دے سکتے ہیں جب مسلمان علماء کو اپنے بارے میں یہ شعور حاصل ہوا کہ وہ اختراع و تازہ کاری پر قادر ہیں اور نتیجۃً اس بات پر بھی قادر ہیں کہ ان حقائق تک رسائی حاصل کریں جن تک ان سے پہلے اہل یونان کی رسائی نہ ہو سکی تھی ـ

اگر اس شعور کی ایک مثال مقصود ہو تو ہم ,,بنی موسیٰ،، کے نام سے معروف تین مشہور بھائیوں [ابو جعفر محمد بن موسیٰ ، (م ۲۵۹ ھ / ۸۷۳ء) ،ابو القاسم احمد بن موسیٰ ، الحسن بن موسیٰ] کے موقف کا ذکر کر سکتے ہیں جو ارشمیدس[ARCHIMEDES ـ تقریباً ۲۸۷ ـ ۲۱۲ ق ـ م] اور ابلونیوس [APPOLONIUS ـ م ـ دوسری صدی ق-م کا آغاز] پر ایک مشترکہ تحقیقی مطالعے میں مصروف رہے ـ یہ تینوں بھائی ,,آآ،، کے یونانی عدد کی حد بندی قدماء کے مقابلے میں زیادہ باریکی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے ـ نیز انھیں زاویے کو تین متساوی اقسام میں تقسیم کے مسئلے کا نیا حل مطلوب تھا ـ اور بسا اوقات وہ ان اغلاط کی درستی بھی کرتے تھے جو انکی رائے میں ابلونیوس کی کتاب ,,المخروطات،،[CONICS] میں سرزد ہو گئی تھیں ـ

اسی طرح ریاضیات کے میدان میں ہم یہ ذکر کر سکتے ہیں کہ الماھانی [ابو عبداللہ محمد بن عیسیٰ،م.تقریباً ۲٦۷ ھ ـ ۸۸۰ ع] نے تیسری صدی ہجری کے اواسط میں یہ کوشش

رازی [ابو بکر محمد بن زکریا۔تقریباً ۲۴۰/ ۸۵۴ ء۔
۳ ھ/۹۳۵ ء]نے طب اور بصریات کے میدان میں اقلیدس
Eucli ، زمانہ، تقریباً ۲۹۵ ق م] اور جالینوس[GALEN۔
یباً ۱۲۹ ۔ ۲۰۰ ء] کے اس قول کو رد کیا کہ اشیاء کے
ہائی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی
ف جانے سے عبارت ہے۔ رازی وضاحت کرتے ہیں کہ دکھائی
ے کا عمل مادے سے آنکھ تک روشنی کی رسائی پر مبنی ہے۔
ی طرح انکی یہ رائے ہے کہ آنکھ کی پتلی، آنکھ میں
فل ہونے والی روشنی کی مقدار کی مناسبت سے سکڑتی یا
پلتی رہتی ہے۔

ایک اور مثال الکندی [ابو یوسف یعقوب بن اسحاق
صبّاح۔ تقریباً ۱۸۵ ھ/ ۸۰۱ ء۔ ۲۵۲ھ/۸۶۶ء] کی ہے جو
ر علویہ (METEOROLOGY) کے میدان میں ارسطو اور دیگر
مائے یونان کے نتائج سے اختلاف کرتا ہے اور بعض نہایت اہم
اء پیش کرتا ہے جن میں سے بعض دور جدید کے نتائج سے دور
یں۔

میری رائے میں ,,عطاء و اختراع،، کے مرحلے کے دو پہلو
یاں ہیں : ایک یہ کہ پانچویں صدی ہجری کے اواسط تک
ماء خود کو بڑی حد تک قدیم یونانیوں کے شاگردوں کی صف
ں میں شمار کرتے رہے حالانکہ وہ خود علوم کے جملہ پہلوؤں
ں شاندار جدید نتائج تک پہنچ چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ
کورہ بالا زمانے کے بعد سے یہ علماء خود کو۔ دیگر اقوام سے
طع نظر۔ صرف اپنے مسلمان اساتذہ کے کارناموں کا تسلسل
یال کرنے لگے۔

,,عطاء و اختراع کے اس مرحلے کی آخری حدود کیا تھیں؟
ں سلسلے میں محققین کے ہاں یہ تصور غالب ہے کہ اسلام

علوم میں جمود کا آغاز ساتویں صدی ھجری سے ھوا۔ میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ھوں کہ مجھے ان محققین کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیونکہ یہ ان حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا جن کا انکشاف بہت سی ایسی تحقیقات سے ھو چکا ہے جو ,,جمود سے متصف،، اس صدی کے بعد آنے والے علماء کی کاوشوں سے متعلق ھیں۔

یہ ثابت کرنے کے لئے دلائل کی چنداں ضرورت نہیں کہ علوم عربیہ ، ساتویں اور آٹھویں صدی ھجری میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے تھے۔ مثال کے طور پر دوران خون کے سلسلے میں ابن النفیس [علاء الدین ابو الحسن علی بن ابی الحزم م۔ ٦٨٧ ھـ/ ١٢٨٨ ء] کی دریافت ، چھوت کے مسئلے پر لسان الدین ابن الخطیب [محمد بن عبداللہ بن سعید السلمانی ٧١٣ ھـ/١٣١٣ ء۔ ٦٧٧ ھـ/ ١٣٧٣ ء] کی وضاحت اور نصیر الدین طوسی [محمد بن محمد بن الحسن ٥٩٧ ھـ/ ١٢٠١ ء۔ ٦٧٢ ھـ/ ١٢٧٣ ء] کی طرف سے علم المثلثات [TRIGONOMETERY] کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے وضع کرنے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اھل غرب بالعموم علم المثلثات کو مستقل حیثیت دینے کا سہرا ریجیو مونتانوس (REGIOMONTANUS) [جرمن حساب دان و ماھر فلکیات ، JOHANN MULLER کا لقب ۔ ١٤٣٦ ھـ ۔ ١٤٧٦ ء] کے سر باندھتے ھیں جو پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ھوا ہے۔

مزید براں ساتویں اور آٹھویں صدیٔ ھجری کے دوران شُرف الدین طوسی [المظفر بن محمد بن المظفر۔ م تقریباً ٦١١ ھـ/ ١٢١٤ ء] کی طرف سے چوتھے درجے کی مساوات کی تنظیم اور اس پر بحث ، علم ریاضیات میں غیاث الدین الکاشی [یا

تعدد اهم دریافتیں ، علم الفلک میں قطب الدین شیرازی
محمود بن مسعود بن مصلح ٦٣٣ ھ/ ١٢٣٦ ع - ۷۱۱ ھ/
۱۳۱۱ ع] اور ابن الشاطر [علاء الدین ابو الحسن علی بن
براهیم - تقریباً ۷۰۳ ھ/ ۱۳۰۵ ع - ۷۷۷ ھ/ ۱۳۷۵ ع] کی
ناندار مساعی اور فلسفه تاریخ اور علم الاجتماع کی تاسیس
کو بھی ذهن میں رکھنا چاهئیے ۔

یہاں میرا مقصد یہ نہیں که عربی میں لکھنے والے علماء
کے کارناموں کو شمار کرنے کی کوشش کروں ۔ ایسی کوشش کے
لئے تو کئی خطبے درکار هوں گے ۔ علاوه ازیں اس میدان میں
تحقیق خود ابھی اپنے سفر کے آغاز میں ہے ۔ میرا مقصود صرف
تنا ہے که تاریخ علوم میں عرب مرحلے کے بعض اهم امتیازی
وصاف کا ذکر کر دوں ۔

میری رائے میں تاریخ علوم میں مسلمان علماء کے ظہور نے
یک اهم مظهر کی تشکیل کی ۔ وہ یہ که علم و دانش کے مراکز ۔
ـن میں اسلام سے فوراً قبل کے دور تک یونانی اور بابلی
علوم کا ورثه ارتقا کے ایک خاص مرحلے تک پہنچ چکا تھا ـــ
ب ان کیلئے باهمی تاثیر و تاثر کے امکانات بڑی حد تک مفقود
ھے ۔ لیکن جلد هی اسلامی معاشرے کی صورت میں ارتکاز کا
ہ عنصر میسر آ گیا جو علم و دانش کے مراکز کو باهمی تاثیر و
اثر کے امکانات فراهم کر سکتا تھا ۔

ایک اور بات بھی بہت اهم ہے ۔ وہ یه که ـــ اسلام سے
وراً قبل کے دور میں ـ بعض علماء اپنی تالیفات کو بعض
شہور قدیم علماء کے نام سے منسوب کر دینے کا رجحان رکھتے
ھے اور اس طرح خود کو ان علماء کے پیچھے چھپا لیتے تھے ۔
اید یہ خود اعتمادی کے فقدان کا نتیجه تھا یا ممکن ہے بعض

سے منسوب کرنے پر آمادہ رہتے تھے ۔

یونان کے مشہور علماء سے منسوب یہ جعلی کتابیں علـ
دانش کے مراکز میں متداول تھیں ۔ بعد ازاں انھیں کو اوا
مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی پھر یہ ترجمے کی وساطت ،
مسلمانوں تک پہنچیں۔حالانکہ اس جعل سازی یا غیر حقیـ
مؤلفین کی طرف نسبت میں ان کا اپنا کچھ دخل نہ تھ
انھی جعلی کتابوں کی وساطت سے یونانی علوم کی اھمیت
دھوم ھوئی اور لوگوں کو ان کے عظما ، یا مؤلفین کے نام مـ
ھونے ۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے سو ان کے ھاں بدیـ
عـلم و دانش سے استفادے کی صورت حال نے آغاز ھی
— بلا تردد اور بغیر کسی داخلی اضطراب یا نفسیاتی الجـ
کے — اپنے پیشرووں کے بارے میں ایک واضح موقف پیدا کر
تھا ۔ اور اس عظیم الشان موقف کی اھمیت اس وقت وا
ھوتی ہے جب ھم اسکا موازنہ لاطینیوں کے اس موقف سے
ھیں جو انھوں نے اپنے اساتذہ، یعنی عربوں، کے بارے میں ا
کیا ۔

تاریخ علوم میں داخل ھونے والے جس عنصر کو ,,وضـ
سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے ھم ایک اھم بـ
گفتگو کر سکتے ھیں اور وہ ہے عرب علمـاء کے ھاں
پیشرووں کی جانچ پرکھ کا عمومی انداز ۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان علماء نے اپنے پیش رووں سے
و استفادہ کیا ۔ اور پہلی تین ھجری صدیوں میں وہ ا
استفادہ پر مجبور تھے ۔ انھوں نے یونانیوں سے، ھندوؤں

ضرورت بھی تھی کہ ان پیش رووں کی کتابوں کو سمجھنے کیلئے ان کے جانشینوں سے مدد لیں کیونکہ وہ اصحاب دانش کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو واسطے کا کام دے سکتے تھے ایک ھی معاشرے میں رہ رہے تھے - یہیں سے ھم اس سبب کو سمجھنے کے لائق ہوتے ھیں جس نے ان کے دلوں سے غیر قوم کے اساتذہ کے سامنے متکبرانہ روش اختیار کرنے کی نفسیاتی گرہ دور کر دی، انھیں ان کے روبرو تواضع کا رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور اپنی تنقید میں تردد یا احتیاط کا ایک خاص موقف اختیار کرنے پر مائل کیا -

اس بات کا یہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے پیش رووں پر مطلقاً تنقید نہیں کی یا انکے ھاں قدماء پر تنقید کا حوصلہ نہیں پایا جاتا تھا - حقیقت اسکے برعکس ہے کیونکہ انھی علوم میں مسلمانوں کی دل چسپی کی تاریخ دیکھی جائے تو انھوں نے بہت آغاز ھی میں قدماء پر تنقید کی - ھاں یہ ضرور ہے کہ انکی تنقید ایک خاص وضع پر تھی جو علمائے عرب کی اپنی ہے - مختصر ترین الفاظ میں اسکی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ تنقید کا ایک اخلاقی اسلوب ہے اور ان ناقدین کو بڑی وضاحت کے ساتھ قانون ارتقائے علوم کا ادراک حاصل تھا -

مسلمانوں کے وہ اصول ، جنکی بنیاد پیشرو اقوام کے محرک علمی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے پر تھی ، کئی بنیادوں پر قائم ھیں - ایک یہ کہ بعد میں آنے والے اپنے پیش رووں کے منّت پذیر ھیں - اور بعض غلطیوں یا لغزشوں کے واقع ہونے سے اُن پیش رووں کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آتی نیز یہ کہ پیش

کسر شان اور حرف گیری میں مبالغے سے کام نہ لیا جائے ۔ مسلمان علماء کی رائے میں کوئی بھی عالم خواہ کتنا ھی عظیم المرتبت کیوں نہ ھو غلطی سے محفوظ اور لغزش سے مبّرا نہیں

ان اصولوں نے ان کے ھاں تنقید کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد رکھی اور ان کی تنقید کو مفید اور باثمر بنایا ۔ تاھم محققین کی ایک بڑی تعداد اس حقیقت سے غافل رھی اور امر واقع کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ھو کر عالم اسلام کے علماء ر تنقیدی صلاحیت کے ضعف اور قدماء کی تقلید محض کا الزام عائد کرتی رھی ۔

اس موقف کی ایک مثال پیش کرنے کے لئے میں ۱۹۵٦ ء کی بوردو [BORDEUX] کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک محقق کا ذکر کروں گا ۔ اسلامی علوم میں جمود کے سبب پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے یہ رائے ظاھر کی کہ علمائے اسلام کی مساعی بس اسی قدر تھیں کہ انھوں نے جو کچھ اپنے اساتذہ سے سیکھا وہ تقلیدی انداز میں ٹھیک ٹھیک آئندہ نسلوں تک پہنچا دیا انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان علماء میں خود اعتمادی کی کمی تھی ۔ اور انھوں نے اپنے اساتذہ کے بعد کوئی نئی شے اختراع کرنے کی کوشش نہیں کی (۳) ۔

اس قسم کی رائے کی تنقیص کو سب سے پہلے تو اتنا ھی کافی ہے کہ اس عظیم فرق پر نگاہ ڈالی جائے جو بعد کی صدیوں میں شاگردوں کے کام اور اُن سے پہلے اُن کے اساتذہ کے کام میں پایا جاتا ہے ۔ یہاں بیرونی کا وہ قول نقل کر دینا کافی ھو گا جس میں تنقید کی اخلاقی بنیادوں کے خط و خال نہایت اختصار کے ساتھ نمایاں ھیں ۔ بیرونی نے کہا ہے :

,,میں نے وھی کیا ہے جو ھر انسان پر واجب ہے کہ اپنے فن میں

کرے اجتہادات کو قبــول کرے ۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو
بےجھجھک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے
سوجھے اسے اپنے بعد آنے والے متأخرین کے لئے بطـور ایک
یادداشت ، محفوظ کر جائے" (القانون ۱/۳ ـ ۵)

اسکے بعد میں اسلامی علوم کے ایک اور عنصر کو زیر بحث لانا
پسند کروں گا ۔ میرا اشارہ نظریے اور تجربے کے مابین عدل و توازن
کے اصول کی طرف ہے ۔

بہت سے لوگ جو اس میدان میں عرب علمـاء کے موقف سے
بےخبر هیں اس گمان میں مبتلا هیں که بجا طور پر راجر بیکن
(ROGER BACON) [م تقریباً ۱۲۹۲ ع] ایک طویل مدت سے اس منہج
علمی کا بانی شمار کیا جاتا ہے جسکی رو سے علوم طبیعی میں تجربے
کو تحقیق کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے ۔ اس عالم کی سبقت کا تصور
ہمارے آج کے دور تک باقی ہے ۔ لیکن علم منطق کے فاضل مورخ
پرانتل (C. PRANTL) [م ۱۸۹۳ ء] نے ــ اگرچه وه اسلامی علوم میں
اختصاص نہیں رکھتے ــ اس روش عام کے خلاف آواز اٹھائی ۔ (۴)
انہوں نے کہا ,,راجر بیکن نے وہ تمام نتائج عربوں سے اخذ کئے تھے ،
جو علوم طبیعیة میں اس سے منسوب چلے آتے هیں " ۔

ویڈیمان (۵) (E. WIEDEMANN) اور شرام (۶) (M. SCHRAMM) جیسے
بعض ماهرین خصوصی نے بڑی وضاحت سے تجربه و نظریه کے قانون
کی بنیاد رکھنے میں مسلمان علماء کے مقام اور راجر بیکن اور لیو
نارڈو ڈاونشی (LEONARDO DA VINCI) [۱۳۵۲ ھ ـ ۱۵۱۹ ء] جیسے
لوگوں پر ان کے نمایاں اثرات کی نشاندهی کر دی ہے ۔ اب اس روشن
حقیقت میں بحث و اختلاف کی گنجائش نہیں رهی که مسلمان علماء
کی توجه کا انحصار محض تجربے پر نہیں تھا بلکه انہوں نے دراصل
اس مسئلے پر توجه دی که تجربے سے قبل نظریے کا هونا لازمی ہے ۔

اور ان معنوں میں گویا انہوں نے تجربے کو ایک واسطے کی شکل دی جسے تحقیق کے دوران تسلسل کے ساتھ استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ویڈیمان پوری صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس موضوع پر عربوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے بلکہ جن نتائج تک راجر بیکن پہنچ سکا وہ ان معلومات کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو قدیم عربوں کے ہاں موجود تھیں ۔

علاوہ ازیں ویڈیمان نے مسلمان علماء کے ہاں تحقیق کے انداز اور اس کی پیشکش کے ایک اور اہم امتیازی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے اور کہا ہے (۷):

,,یونانیوں کے ہاں نتائج تحقیق ہمارے سامنے اپنی آخری کلاسیکی شکل میں آتے ہیں چنانچہ ــ بعض استثنائی صورتوں کے علاوہ ــ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم ان کی اٹھان کا سراغ لگا سکیں ۔ لیکن عربوں کے ہاں صورت حال یکسر مختلف ہے۔عرب جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے قدم بہ قدم ارتقاء کی وضاحت کرتے ہیں ۔ کچھ اسی طرح جیسے آج ہمارے بعض محققین کرتے ہیں ۔ انکی اس وضاحت کے پیش نظر ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انکی طبعیتوں میں اپنے کام کی قدم بہ قدم پیش رفت پر اطمینان و سرور کی ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی تحقیقات میں اپنے ذوق فنی اور ان آلات کے کمال کے سبب ، جن سے وہ کام لیتے تھے ، کامیابی سے ہم کنار ہوئے ،،۔

یہ بات محققین سے پوشیدہ نہ ہو گی کہ مسلمان علماء، مشاہدہ فطرت، مسلسل فلک بینی ، دقت نگاہ اور اپنے ان آلات کے باعث جو انہوں نے ایجاد کئے، دنیا کے سامنے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں ایک

اس امر سے قطع نظر کہ انہوں نے بعض نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ اور بعض علوم کو نئی بنیادوں پر استوار کیا مثلاً نحو انشائی جس کا نام انہوں نے ,,علم المعانی" رکھا کیمیا ، بصریات، مثلثات ۔ بطور ایک مستقل علم ۔فلسفہ تاریخ اور علم الاجتماع، انہوں نے بارھا دوسری صدی سے لے کر نویں صدی ھجری تک یہ کوشش بھی کی کہ علوم کی شناخت اور تصنیف نئے زاویہ ھائے نگاہ کے مطابق کریں۔ ان تمام حقائق کے پہلو بہ پہلو ایک اور حقیقت کی تصریح بھی ضروری ہے وہ یہ کہ فلسفہ اور علوم طبیعیہ کی تاریخ اصطلاحات میں ان کا بہت بڑا مقام ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے صرف اتنا ھی نہیں کیا کہ جو سرمایہ دوسروں سے ان تک منتقل ھوا اسے جلا بخشی ھو بلکہ ان اصطلاحات کا بہت بڑا حصہ انہوں نے خود وضع کیا ۔ تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام اور لاطینی دنیا میں انکے زبردست اثر پر بات کرتے ھوئے لازم ہے کہ ھم اس امر کو بھی زیر بحث لائیں کہ ان کا یہ اثر محض عربی کتب کے ترجمے یا صلیبی جنگوں اور مغرب و مشرق کے اتصال ھی کے باعث پیدا نہیں ھوا بلکہ بہت بڑا اثر استفادہ و تقلید کے اس عمل پر مبنی تھا جسکا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ھوا اور تسلسل سے کئی صدیوں تک جاری رھا اس کی تکمیل تین راستوں سے ھوئی ۔

ھسپانیہ، سسلی/ اٹلی ، بیزنطہ

میں یہاں اس صورت حال کی تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ یہ میرا اصل مقصود نہیں ہے۔ یہاں میرے پیش نظر چند نکات کو سامنے لانا ہے۔ ایک یہ کہ استفادہ و تقلید کا عمل لاطینیوں کے ھاں اس سے مختلف صورت میں تکمیل کو پہنچا جس میں کہ وہ عربوں کے ھاں مکمل ھوا ۔ وہ اسطرح کہ مسلمانوں کی اس تک رسائی ان لوگوں کی وساطت سے ھوئی جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ نیز اپنے ان

کے ھاں صورت حال مختلف تھی ۔ وہ ۔ یعنی لاطینی ۔ مجبور تھے کہ علوم ، مختلف اداروں کے نظام، اور جامعات کے طریقہ ھائے کار و لائحہ ھائے عمل اپنے سیاسی اور دینی حریفوں سے اخذ کریں چنانچہ جن لوگوں سے وہ اخذ کر رہے تھے ان کے لئے دشمنی اور بغض کے جذبات رکھتے تھے اور اس کیفیت کا اثر نفسیاتی الجھنوں کی صورت میں انکے ھاں عمل استفادہ پر منعکس ھوا ۔ ایسی صورت میں عین فطری تھا کہ ان کے ھاں وضاحت و صراحت کے عنصر کا فقدان ھوتا جبکہ مسلمانوں کے ھاں دوسروں سے استفادے کے عمل میں یہی دو اصلی عنصر ھیں ۔

ایک اور بات اس سے بھی بڑھ کر ہے مسلمانوں کے علوم سے لاطینیوں کے عمل استفادہ نے سرقہ و انتحال کی صورت پیدا کر لی ۔ اس کی وضاحت کئی متخصصین بہت سے تحقیقی مضامین میں کر چکے ھیں جن میں انھوں نے کھول کر دکھایا ہے کہ کسطرح لاطینی علماء نے بعض بحثیں مسلمان علماء کی کتابوں سے اخذ کر کے خود اپنی طرف منسوب کر لیں ۔ یا مکمل کتابیں اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی طبع زاد تصانیف یا انکی اپنی تالیفات ھیں ۔ اسی طرح بعض کتابیں عربی سے ترجمہ کر کے یہ کہا کہ یہ یونانی مشاهیر مثلاً ارسطو ، جالینوس ، روفوس [RUFUS OF EPHESUS پہلی صدی ق ۔ م کے اواخر سے پہلی صدی عیسوی کے اواسط تک وغیرہ کی کتابیں ھیں ۔ اس روش اور اسکے دیگر مظاھر کی بکثرت مثالوں کا ذکر یہاں ضروری معلوم نہیں ھوتا ۔

یہاں یہ صراحت لازم ہے کہ میرا مقصد لاطینی کارگزاری کی تخفیف و توھین ھر گز نہیں ۔ میں تو بس اتنا کہنا چاھتا ھوں کہ لاطینیوں کے ھاں عربوں سے اخذ کرنے کا انداز جن محرکات پر استوار تھا وہ ان محرکات سے مختلف تھے جن کے تحت ان کے پیشرو اساتذہ یعنی عربوں نے یہ عمل اختیار کیا تھا ۔ اور ان امتیازی پہلوؤں کے ذکر

پر صرف ایک حقیقت مجھے آمادہ کرتی ہے ۔ وہ ہے اس امر کی نشاندھی کہ مغربی دنیا میں علمی مرحلے کا ارتقاء مسلمان علماء سے متاثر ہے ۔ اور یہی امر بہت سے لوگوں سے مخفی ہے ۔

ایک اور بات جس کا اس سلسلہ کلام میں ذکر ضروری ہے،یہ ہے کہ علوم عربیہ سے استفادہ و تقلید کا یہ مرحلہ جو مسلمان علماء کے خلاف بغض و نفرت پر استوار تھا، ایک ایسے وقت میں پیش آیا جب علوم عربیہ سے استفادے کا معاملہ ابھی نامکمل تھا اور پختگی کو نہیں پہنچ پایا تھا ۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ بھلا کیونکر ممکن ہوا کہ [علم کے]مغربی مرحلے کے احیاء پر عربوں کے اثرات سے مورخین کئی صدیوں تک چشم پوشی کرتے رہے ۔ لیکن مغرب میں مسلمانوں اور ان کے علوم کے خلاف عداوت (۸) کی جو روح جاری و ساری رھی اس کی جہات کو سمجھ لینے کے بعد جواب صاف ظاھر ہے اور اس صورت حال کا پھیلاؤ غالباً راجر بیکن (۱۲۱۰ ـ ۱۲۹۰ ع) کے عہد تک پہنچتا ہے جس نے وہ تمام نتائج جو اس کے نام سے منسوب کئے جاتے ھیں حقیقت میں ان عربی کتب سے اخذ کئے جن کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا تھا ۔ پھر رایموندوس لولوس (RAYMUNDUS LULLUS) کے ظہور کو لے لیجئے جس نے اپنی پوری زندگی اور تمام تر قوت ھر عرب شے کے خلاف جدوجہد میں گزار کر ۱۳۱۵ ء میں وفات پائی۔اس شخص نے علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تالیف کیں جن کے بارے میں حال ھی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر عربی الاصل ھیں ۔ اسی طرح ان بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو علوم کو عربوں کی غلامی کے جوئے سے آزاد کرانے کے داعی تھے ۔ (۹)

اس میں شک نہیں کہ بعض علماء نے عربوں کا دفاع بھی کیا ان

موس اندریاس الباغوس (ANDREAS ALPAGUS) کا نام سب سے نمایاں ہے ۔ علوم اسلامیہ کا مرتبہ اس کے دل میں اس حد تک تھا کہ اس نے مشرق کا سفر اختیار کیا ۔ ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کر کے تیس برس دمشق میں قیام کیا پھر ۱۵۱۵ ء میں پاڈوا (PADUA) واپس چلا گیا اور بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ انھی کتابوں میں ابن النفیس کی وہ مشہور کتاب بھی ہے جس کو مائیکل سروٹ (SERVET) [۱۵۱۱ ۔ ۱۵۵۳ ء] نے اپنی طرف منسوب کر لیا.

تاہم غالب رو بغض و عداوت ھی کی رھی جو سولھویں صدی عیسوی تک جرمنی . فرانس اور اٹلی میں جاری رھی ۔ اس رو میں ایک نمایاں نام لیونھارٹ فوکس (LEONHART FUCHS) [۱۵۰۱ ۔ ۱۵٦٦ ء] کا ہے جس کا تعلق ٹیوبنگن یونیورسٹی سے تھا ۔ جن لوگوں نے عربوں کے خلاف کشاکش بھی جاری رکھی اور ان کی کتابوں کو اپنے نام منسوب بھی کیا ان میں ایک مشہور نام پارا سیلسوس (PARACELSUS) [۔ ۱۴۹۳ ۔ ۱۵۴۱ ء] ۔ کا ہے ۔

ھر چند کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے دوران جب مغرب میں عربوں کے مقام کو فراموش کر دیا گیا تھا ۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی کتب سے استفادہ جاری تھا، اور ہے ۔ تاہم علوم کے مورخین نے اپنی تواریخ ترتیب دینے کا آغاز [فراموشگاری کی] اسی فضا میں کیا ۔ اٹھارویں صدی عیسوی البتہ علوم عربیہ کے حق میں ایک نیا عنصر لے کر آئی ۔ یعنی مستشرقین کا ظہور جن میں سے بہت سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ علوم اسلامیہ کو ان کا جائز حق دلائیں اور انھیں تاریخ علوم میں صحیح مقام پر رکھیں۔اس سلسلے میں اھم ترین اور قدیم ترین شخصیت جیکب ریسکے (JAKOB REISKE) [۱۷۱٦ ۔ ۱۷۷۴ ء] کی ہے اور کرٹ سپرنگل ، (KURT SPRENGEL) گوئٹے (J.W. GOETHE) [۱۷۴۹ ۔ ۱۸۳۲ ء] اور الیگزینڈر فان ھمبولٹ (ALEXANDER VON HUMBOLDT) ۱۷٦۹ ۔

۱۸۶ء] جیسے بعض مورخین اس کے هم نوا هوئے ۔ لیکن ان لوگوں
ی مساعی روش عام پر اثر انداز هونے کے لئے کافی نه تهیں خصوصاً
ں صدی میں که جب تاریخ علوم کا جدید زاویه نگاہ پخته هو رها
ا اور وہ یه تها که گیارهویں صدی عیسوی سے آگے تمام علمی نتائج
مطالعۂ علوم یونانی کی نوبیداری تصور کیا جائے ۔ اسی تصور کے
جے میں ,,احیائے علوم،، کی اصطلاح وجود میں آئی ۔

باوجودیکه بعض علـماء کی مخالفانه روش علـوم کی تاریـخ
ومی کے بنیادی خطوط میں اسی صورت حال پر مصر رهی ہے اور
بھی بڑی حد تک اسکے اثر کو باقی رکھے هوئے ہے؛ تاهم بعض
ستشرقین کی کوشش سے بعض میدانوں میں غلط فهمیوں کا ازاله
کن هو سکا ہے ۔ خصوصاً ان علوم کی شاخوں میں جن پر محققین
اپنے کام کا آغاز موجودہ صدی سے قبل کیا تها ۔ یه [ازاله] ان
گوں کو اسی نسبت سے حاصل رها ہے جس نسبت سے وہ روش عام
اثر سے محفوظ تھے اور انیسویں صدی عیسوی کی سوچ پر لگی
ئی چھاپ ـــــ جو وضعی مکتـب فکر (POSITIVISM) کے نام سے
روف ہے ۔ کے شکار نه تھے ۔

توقع رکھنی چاهئیے که علوم عربیه کے مقام کا مسئله مستقبـل
ب کی علمی تاریخ میں همارے زمانے سے بڑھ کر عدل و انصاف پر
ی هوگا ۔ اور اس توقع کو عملی جامعه پهنانے کے لئے اس اسلامی
ے کے وارثوں پر یه لازم ہے که وہ اظهار حقائق میں بھر پور حصه
ں ۔

حواشی

۱ ۔ دیکھیئے راقم کا مقالہ ,,کتاب مہرجان افرام حبیب" بغداد ، ۱۹۷۳ء ، ص ۳۲۷

۲ ۔ دیکھیئے : Fr Rosenthal, Das Fortleben der Antike im Islam. Stuttgart, 1965 S 18

۳ ۔ H Ritter, Hat die religiöse Orthodoxie einen Einfluss auf die Dekadenz des Islams ausgeübt?

در کتاب : Klassizismus und Kulturverfall. Frank furt 1960, S 136

۴ ۔ اپنی کتاب تاریخ منطق میں (Geschichte der Logik, III, Leipzig,1927,121)

۵ ۔ اپنے متعدد مقالات میں حصوصاً دیکھیئے

Die Naturwissenschaften bei den Orientalischen Völkern

Eringer Aufsatze aus eruster Zeit ,1917, S 42 — 58

٦ ۔ اپنے بعض مقالات میں خصوصاً دیکھیئے انکی کتاب

Ibn al Haythams Weg Zur Physik, Wiesbaden, 1963

۷ ۔ اپنے متعدد مقالات میں ، حصوصاً دیکھیئے

Die Naturwissenschaften bei den Orieutalischen Völkern

Eringer Aufsatze aus ernster Zeit, 1971, S 42 — 58

۸ ۔ پروفیسر H. Schipperges نے اس موضوع پر ایک مفصلاً مضمون لکھا ہے حس کا عنوان ہے Ideologie und Historiographie des Arabismus دیکھیئے رسالہ Sudhoffs Archiv ، سال ۱۹٦۱

۹ ۔ ایضاً ص ۱۱ ۔ ۱۲ ، ۱۵

فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

ہر چند کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرب/اسلامی علم الفلک ـــ جو دسویں صدی عیسوی میں یورپ منتقل ہوا اور یورپین ممالک میں اسے جذب کرنے کا سلسلہ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک جاری رہا ـ ـ ھی یورپ میں ریاضیات اور فلک بینی کی اساس پر قائم ہونے والے علم الفلک میں دل چسپی کا بنیادی محرک تھا اور اسی کے وسیلے سے یہ علم کوپرنیکس [COPERNICUS] کی

شخصیت میں پہنچ کر ایک نئے مرحلے سے روشناس ہوا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ ہر چند کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے مگر فلکیات کی عمومی تاریخ میں اسلامی علم الفلک کے جائز مقام کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔

اس مقام کو کامل طور پر فراموش ہونے کئی صدیاں بیت چلی تھیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مستشرقین نے علم الفلک کے میدان میں اسلامی ورثے پر تحقیق اور اس سلسلے کے مخطوطات کی اشاعت کی لائق تعریف مہم شروع کی۔

اس عرصے میں تحقیقات کے جو نتائج سامنے آ چکے ہیں وہ کوئی معمولی نتائج نہیں۔ تاہم وہ ہنوز اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں مسلمان فلک شناسوں کے کام کی حدود کا مکمّل اور ٹھیک ٹھیک تصور فراہم کر سکیں اب تک اس میدان میں محققین کی کاوشوں سے جو کچھ روشن ہو سکا ہے اس نے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ علم الفلک کی عمومی تاریخ میں مسلمان فلک شناسوں کا حصہ بہت بڑا اور ابداعی[ORIGINAL] نوعیت کا ہے۔

اسی کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔

ہماری تازہ ترین معلومات یہ بتاتی ہیں کہ ستارہ شناسی سے متعلق قبل از اسلام عربوں کا علم بس محدود سا تھا۔ وہ چاند کی اٹھائیس منزلوں اور بارہ برجوں سے واقف تھے اور گمان غالب ہے کہ سیاروں کے نام بھی جانتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا اور آسمان کو اس پر ایک گُنبد کی صورت میں تصور کرتے تھے۔

اسلام سے فوراً پہلے کے زمانے تک یونان ، ہندوستان اور ایران میں عام تصور یہ تھا کہ زمین مرکزِ عالم میں واقع ہے اور تمام افلاک اپنے ثابت و سیّار اجرام کے ساتھ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس کلّی حرکت کے نتیجے میں، جو چوبیس گھنٹے میں پوری ہوتی ہے۔

رات اور دن وجود میں آتے ھیں - پہلی صدی ھجری کے نصف ثانی میں بھی تصور عالم اسلام میں منتقل ھو گیا -

اس تصور کو اسلامی حلقوں میں منتقل کرنے والے لوگ بلاسبہ وہ تھے جو اسلامی جھنڈے تلے آ جانے والے علاقوں میں ھنوز قائم علمی مراکز کے آخری منسوبین تھے - یہ لوگ جو اجنبی ثقافت کے حامل تھے انھی کے ھاتھوں ایرانی ، یونانی ، سریانی اور ھندوستانی کتابوں کا عربی ترجمہ عمل میں آیا جن میں علم الفلک کی کتابیں بھی شامل تھیں -

میں سمجھتا ھوں کہ دوسری صدی ھجری کے اواسط تک فلکی معلومات اور اس سلسلے کی ضروری اصطلاحات کافی حد تک مسلمانوں کی رسائی میں آ چکی تھیں چنانچہ انھوں نے عباسی خلیفہ منصور کی خواھش کے مطابق فلکیات پر ھندوستان کی سب سے بڑی کتاب ,,کتاب السندھند،، کا عربی میں ترجمہ کر ڈالا اور جن دو عالموں نے یہ ترجمہ کیا تھا، یعنی الفزاری اور یعقوب بن طارق، انھوں نے خود بھی علم الفلک پر کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دیں - یہ دونوں فلکی حسابات میں دوسرے درجے کی مساوات کے استعمال پر قادر تھے - ,,کتاب السندھند،، کے ترجمے کے تقریباً بیس برس بعد مسلمانوں کو ھندسی اور تطبیقی علم الفلک پر اس حد تک معلومات حاصل ھو چکی تھیں کہ انھوں نے ۱۶۵ - ۱۸۰ھ کے درمیان بطلمیوس [PTOLMEY]کی کتاب المجسطی [ALMAGEST]نیز اس کی ,,زیج،، یعنی جنتری کا ترجمہ کر لیا -

اس اولین مرحلے میں مسلمان فلک شناسوں کی سرگرمیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین ھو گیا کہ وہ دوسری صدی ھجری کے اختتام سے لے کر تیسری صدی ھجری تک کے عرصے میں اس

قابل تھے کہ مجسطی کے تمام نظریات و حسابات کو سمجھ سکیں اور اسی زمانے میں وہ فلکیات کے میدان میں اخذ و جذب کا مرحلہ مکمل کر لینے کے بعد آنے والے دور میں تازہ کاری کے لائق ہو چکے تھے۔

خلیفہ مامون کے حکم سے شمّاسیّہ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیون پر ایک ایک رصدگاہ کا قیام اس ضمن میں بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ فلکیات میں ابھی تک یہ پتہ نہیں چلایا جا سکا کہ کیا اس قسم کی رصد گاهیں اس سے پہلے بھی کبھی قائم ہوئی تھیں۔ ان دونوں رصد گاهوں کے قیام کے بعد ماہرین فلکیات اس قابل ہو سکے کہ بطلمیوس کے ہاں بہت سی باتوں کی اصلاح کریں اور پڑتال اور درستی کے بعد فلکی حسابات کی ایک جنتری تیار کریں۔ یہ دو جلدوں میں تھی۔

اس میدان میں ایک اہم بنیادی اقدام یہ تھا کہ مسلمانوں نے تدمر اور رقّہ کے مابین ایک درجے کے طول کی دقیق سائنسی طریقے پر پیمائش کی اور اسے ۵۶$\frac{۲}{۳}$ میل پایا اور اسی کے نتیجے میں انہوں نے خط استواء کا طول ۴۰۲۵۳ کلو میٹر برآمد کیا۔ پھر انہوں نے اپنے اس تمام حساب کو دھرایا تاکہ جغرافیۂ فلکی کے سلسلے میں ان کا نقطہ آغاز غلطی سے پاک ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز سے انجام تک مسلمان فلک شناسوں کی توجّہ نئے فلکی نظریات وضع کرنے سے زیادہ سیّاروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے اور ان کا حساب لگانے پر مرکوز رہی۔ اس میدان میں جو نتائج انہوں نے برآمد کئے وہ نہایت اہم تھے۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان فلک شناسوں نے محض مشاہدے

صدی کے بعد ایجاد ہونے والے بعض جدید آلات کے بغیر ممکن ہو سکتی تھیں -

اس میدان میں ان کی تحقیقات کے جو نتائج اب تک پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں اُن سب کا شمار یہاں ممکن نہیں حالانکہ یہ مطالعہ ہنوز ابتدائی مراحل میں ہے -

اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں ان کی عظیم کامیابی کو ہم مندرجہ ذیل وجوہات پر محمول کر سکتے ہیں -

۱ - وہ فلکیاتی مسائل کے حساب کے لئے ریاضی کو استعمال کر سکتے تھے اور ریاضی میں ان کے وسائل یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے -

۲ - وہ رصدی آلات کا استعمال بھی یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ شکل میں کر سکے -

۳ - وہ ایسے رصدی طریقے استعمال میں لا سکے جن میں بعض یونانیوں سے بڑھ کر ترقی یافتہ تھے اور بعض ایسے تھے جن کا یونانیوں کو مطلق علم نہ تھا -

۴ - مسلمان فلک شناسوں کے ہاں عملی تجربات کا تناسب قدماء سے بڑھ کر تھا -

اگر ہم جاننا چاہیں کہ فلکیاتی عمل میں ان کے ریاضیاتی وسائل کیونکر قدماء کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے تو سب سے پہلے ہمیں یہ یاد کرنا ہوگا کہ انہوں نے دقیق حساب المثلثات [TRIGONOMETRY] سے کام لیا جبکہ اہل یونان کو اس کا علم ہی نہ تھا چنانچہ وہ مجبور تھے کہ اپنے فلکی اور جغرافیائی تجربات میں ایک پیچیدہ طریقۂ حساب استعمال کریں جو دائرے کی قوسوں اور اس کے نصف قطر کے باہمی نسبت تناسب کے مشاہدے پر مبنی تھا -

حساب المثلّثات نے اہل ہند کے ہاں بھی خاصی ترقی کی۔ چنانچہ وہ اپنے حسابات میں قائم الزاویہ مثلث کے دو ضلعوں کے تناسب کو بنیاد بنایا کرتے تھے اور ,,جیب،،[SINE]اور ,,تمام الجیب،، [COSINE]کے علم تک رسائی پا چکے تھے۔ انہوں نے ,,جیب،، کے لئے جدول کا استعمال بھی کیا۔ اہل ہند کے یہ علوم دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو گئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے اواسط سے مسلمانوں کے ہاں پہلی بار ,,جیب الضلعین،، کی جگہ ,,جیب الزاویہ،، کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔ یہ علم المثلّثات کے ارتقاء میں ایک نئے اصول کا آغاز تھا۔ اور یہ مسلسل ارتقاء ساتویں صدی ہجری میں جب نصیر الدین طوسی نے علم المثلّثات کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے دی ،۔ اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا۔

گذشتہ چند سالوں میں سامنے آنے والی تحقیقات کے نتیجے میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں حساب المثلّثات قریب قریب ان تمام باریکیوں کو محیط تھا جو موجودہ صدی تک اس شعبۂ علم میں معلوم ہو سکی ہیں (دیکھئے ج۵ ، ص ۵۳ ـ ۵۸ از ,,تاریخ التراث العربی،،) اور اس میدان میں اُن کا کام اِن لوگوں[یعنی علمائے دورِ جدید] کی کار گزاری سے زیادہ دور نہ تھا۔

عرب ماہرین فلکیات تیسری صدی ہجری کے اواسط سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ ایسے طریقے دریافت کریں جن سے کرۂ ارض پر مختلف مقامات کے مابین فاصلے کا حساب آسانی سے لگایا جا سکے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان فاصلوں کے حساب کا یونانی طریقہ بہت مشکل ہے اور اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میدان میں پیش رفت کا اولین قدم ثابت بن قرّہ نے اٹھایا اور

مسلسل ارتقاء بالآخر چوتھی صدی ھجری کے اواخر میں „اضلاع المثلث الکُروی" کے حساب پر منتج ہوا ۔ جس کے نتیجے میں مثلثات کُرویہ [SPHERICAL TRAINGLES]کا علم وجود میں آیا ۔ یہاں رفع التباس کی غرض سے یہ وضاحت مناسب ہو گی کہ یونانیوں کے ہاں ہندسہ کرویہ [SPHERICAL GEOMETRY]کا علم ضرور موجود تھا لیکن مثلثات کرویہ سے وہ ناواقف تھے ۔

قدماء کے مقابلے میں مسلمانوں کے ہاں زیادہ ترقی یافتہ طریقہ ہائے حساب کے ضمن میں آخری بات یہ بھی عرض کرنے چلیں کہ انھوں نے وقت گزرنے کے ساتھ فلکی قیاسات میں حسابِ تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] اور جداول المنحنیات سے بھی کام لینا سروع کر دیا تھا ۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ انھوں نے قدماء کے مقابلے میں بہتر رصدی آلات استعمال کئے سو اس کے لئے بہت وقت درکار ہے ۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اگلوں سے جو کچھ اخذ کیا اسے ترقی دی، مختلف آلات خود ایجاد کئے، انھیں حسب ضرورت بڑا یا چھوٹا کیا اور انھیں بہتر بنانے اور ان کی تفصیلات کے بیان پر بے مثال توجہ دی ۔ مثال کے طور پر مراغہ اور سمرقند کی رصد گاہوں میں بعض „ذات الربعین" آلات کی بلندی ستر میٹر سے زائد تھی ۔ „آلۃ السدس الفخری" * جسے حامد بن الخضر الخجندی نے „میل اعظم" [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC]کی پیمائش کے

---

* „السدس" سے مراد دائرے کا چھٹا حصہ ہے اور „الفخری" فخرالدولہ کی طرف نسبت ہے جس کی سرپرستی میں الخجندی نے یہ آلہ تیار کیا ۔ آلے کی شکل اور کارکردگی کی تفصیل کے لئے دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies. New York. 1981. 7:353.

لئے بطور خاص استعمال کیا تقریباً چالیس میٹر ** اونچا تھا۔

ان جدید طریقوں کے ضمن میں یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ مسلمان پہلی قوم تھے جو مسلسل رصد کا اہتمام کر سکے اور یہ ان کی تعمیر کردہ رصد گاھوں کے سبب سے ممکن ھوا۔ علمی مآخذ میں اکثر ایسی روایات دیکھنے میں آتی ھیں کہ فلاں فلاں رصد گاہ تیس برس یا زیادہ عرصے تک مسلسل کام کرتی رھی۔

یہاں ھم ان کی علمی رسائی کی چند مثالیں دینا چاھیں گے جو ان وسائل کے سبب ان کے لئے ممکن ھو سکی۔

ایک مثال یہ ہے کہ تیسری صدی ھجری کے نصف اول میں انھوں نے اپنی رصدگاھوں کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ رات اور دن کے مساوی ھونے کے وقت کے آگے بڑھ جانے کی مقدار جسے وہ ,,الحرکۃ البطیئۃ،، *** سست حرکت کا نام دیتے تھے۔ سو برس میں ایک درجہ نہیں ہے جیسا کہ اھل یونان نے حساب لگایا تھا بلکہ ھر ٦٦ برس میں ایک درجہ ہے۔ پھر وہ اس مدت کی تصحیح میں مسلسل مصروف رھے حتی کہ اسے ھر ۷۰ برس میں ایک درجہ طے کیا اور یہ تحدید دور جدید کے سائنس دانوں کی تحدید۔ یعنی ھر ۷۲ برس میں ایک درجہ۔ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔

اسی طرح ھم یہ ذکر کرنا چاھیں گے کہ تیسری صدی ھجری میں مسلمان فلک شناسوں نے پہلی بار اس نکتے پر توجہ دی کہ سورج کا ,,اوج،، — یعنی اس کے زمین سے زیادہ سے زیادہ فاصلے کا نقطہ۔ یکساں نہیں رھتا۔ بعد ازاں وہ اس جنبش کی حد متعین کرنے میں مصروف رھے۔ مثلاً ھم دیکھتے ھیں کہ پانچویں صدی ھجری میں

** قدیم اصطلاح میں چالیس ,,دراع،،۔ دیکھئے حوالہ بالا۔ مترجم)

*** اس سے مراد غالباً PRECESSION OF THE EQVINOXES ہے۔

البیرونی چاروں موسموں میں چار بار کی رصد کے نتیجے میں یہ کوشش کرتا ہے کہ اس جنبش کی مقدار حساب تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] کے ذریعے معلوم کرے ۔ اس جنبش کی آخری تعیین جو مسلمان فلک شناسوں نے طے کی وہ ۱۲۶۰۹ سیکنڈ سالانہ تھی اور یہ تحدید بھی دور حاضر کی تحدید یعنی ۳۶، ۱۱ سیکنڈ سالانہ سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتی ۔

اسی طرح ایک مثال اُسی کوشش کی بھی دی جا سکتی ہے جو انھوں نے ,,میلِ اعظم،، [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC] کا حساب لگانے کے لئے کی ۔ بطلمیوس اسے ۲۳ درجہ اور ۵۱ منٹ تصور کرتا تھا ۔ ہندوستانی علماء کے نزدیک یہ ۲۳ درجے سے عبارت تھا ۔ مسلمان فلک شناسوں کی توجہ تیسری صدی ھجری کے اوائل ہی میں اس امر کی طرف مبذول ہو چکی تھی کہ میلِ اعظم کی تعین کے بارے میں بطلمیوس کا بیان اصلاح طلب ہے ۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے دقیق آلاتِ رصد کے ذریعے اس کی پیمائش شروع کی اور چوتھی صدی ھجری کے وسط میں یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا کہ آیا یہ جُھکاؤ یکساں ہے یا متغیّر ۔ ابراھیم بن سنان بن ثابت اور ابو جعفر الخازن نے یہ مشاھدہ کیا کہ مختلف رصدی مطالعوں کے نتائج میں تفاوت، آسمان کے قطبین کی یکبارگی اور بےترتیب حرکتوں سے عبارت ہے ۔ اس سے تقریباً پچاس برس بعد حامد بن الخضر الخجندی نے یہ دریافت کیا کہ میلِ اعظم وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہا ہے ۔ دور جدید میں اُس کی اِس دریافت کی تائید ہوئی مگر دور احیائے علوم اور بعد کے فلک سناسوں کو اس امر کا احساس نہیں ہوا ۔ خجندی نے میل اعظم کی جو

تعیین کی تھی وہ ۲۳ درجہ ۳۲ منٹ اور ۲۲ سیکنڈ تھی ۔ جدید علم فلک سے اس کا فرق بہت معمولی ہے یعنی صرف دو منٹ ۔

تیسری اور چوتھی صدی ھجری میں رصدِ آسمانی اور سیارات کی حرکت کے حساب پر توجہ مرکوز رکھنے کے بعد چوتھی صدی کے اواخر میں مسلمان فلک شناسوں نے روز بروز نئے فلکیاتی نظریات وضع کرنے میں دل چسپی لینی شروع کی ۔ مثال کے طور پر ابو العباس ایرانشھری نے یہ دریافت کیا کہ ,,بطلمیوس کی رائے کے برخلاف مکمل سورج گرھن صرف اُس بُعد میں ممکن ہے جو اَبعَد کی نسبت وسط سے قریب تر ہو،، ۔ *

مسلمان فلک شناسوں نے سورج اور سیّاروں کے مدار کی سکل پر بحث کا آغاز کیا ۔ اور بعض نے یہ رائے ظاھر کی کہ ان کا مدار ۔ دونوں کے قطر میں معمولی فرق کے ساتھ ۔ بیضوی ساخت رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں اس مسئلے پر بحث نے بہت طول کھینچا کہ زمین ساکن ہے یا متحرک ؟ کوئی سکون کا قائل تھا اور کوئی تحرّک کا ۔ جن لوگوں نے حرکت زمین کا نظریہ قبول کیا ان میں ابو سعید السجزی اور جعفر بن محمد بن جریر شامل ھیں جنھوں نے اسی بنیاد پر ایک اسطرلاب بھی تیار کی ۔ بیرونی اس مسئلہ پر ساری عمر دماغ لڑاتا رھا ۔ اس کے لئے کسی بھی رائے کو ترجیح دینا مشکل رھا۔ آخر میں وہ سکون زمین کے نظریے کی طرف اس لئے مائل ہو گیا کہ حرکت کا نظریہ قبول کر کے بعض طبیعیاتی سوالات کا جواب اس کے لئے بعض دشواریاں پیدا کرتا تھا اس مسئلے پر تقریباً یہی حال ابن

---

* غالباً مراد یہ ہے کہ مکمل سورج گرھن استوائی یا خط استواء سے قریبی عرض بلد میں ھی ممکن ہے جس قدر قُطبین کی جانب بڑھتے جائیں گے یہ صورت ممکن نہ رھے گی ۔ (مترجم)

الہیثم کا تھا ۔

پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں فلکیات کی تاریخ ابن الہیثم کی شخصیت میں ایک اہم مرحلے کو پہنچتی ہے ۔ ابن الہیثم ہی وہ شخص ہے جس کے ہاں پہلی بار سیّاروں کی حرکات کی سائنسی وضاحت ملتی ہے جسے وہ ,,نظام طبیعی" کا نام دیتا ہے جو اس کے الفاظ میں یوں ہے :

,,وہ مقدّمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب مبنی ہے چار ہیں ۔ ایک یہ کہ جسمِ طبیعی خود ایک سے زیادہ طبیعی حرکت نہیں کرتا ۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسمِ طبیعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ جسمِ آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے ۔"

مذکورہ بالا امور کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الہیثم پہلی بار اس امر کی نشاندھی کرتا ہے کہ بطلمیوس نے پانچ سیّاروں کی حرکات کی جو ہیئت مقرر کی تھی وہ غلط ہے اور بطلمیوس نے بھی اسے غلط ہی جانتے ہوئے مقرر کیا تھا کیونکہ اس کے لئے اسکے علاوہ اور کچھ ممکن نہ تھا ۔ (۱)

ابن الہیثم نے زیر تبصرہ مقامات کی نشاندھی یوں کی ہے: ,,سو یہ مقامات جن کا ہم نے ذکر کیا باہم تناقض رکھنے والے مقامات ہیں جنہیں ہم نے کتاب المجسطی میں پایا ۔ کچھ ایسے ہیں جن میں وہ معذور ہے اور کچھ ایسے ہیں جن میں وہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا ۔ وہ یوں کہ کچھ مقامات تو بھول چوک کی ذیل میں آ جاتے ہیں جن سے انسان کا بچنا ممکن نہیں سو ان میں تو وہ معذور ہے

(۱) الشکوک علی بطلمیوس للحسن بن الہیثم نشر عبدالحمید صبرہ و نبیل الشہابی القاہرہ ۱۹۷۱ ص ۳۳ ـ ۳۸

اور کچھ مقامات وہ ہیں جن میں اس نے جانتے بوجھتے غلطی کا ارتکاب کیا ۔ یعنی وہ ہیئتیں جو اس نے پانچوں سیّاروں کے لئے متعین کیں ۔ سو ان میں اس کا کوئی عذر نہیں چل سکتا ۔

رہی اس بات کی دلیل کہ اس نے ان مقامات میں غلطی کا ارتکاب قصداً کیا سو وہ نویں مقالے کی دوسری فصل میں اس کا یہ قول ہے : ․․․ ,,اسی طرح اس مفہوم نے ہمیں ایک جگہ مجبور کر دیا کہ ہم بعض خارج از قیاس اشیاء کو استعمال میں لائیں ۔ مثال کے طور پر یہ سیّارے اپنے اپنے مدار میں حرکت کرتے ہوئے جو مجرّد دائرے بناتے ہیں ان پر دلائل قائم کریں ۔ نیز اس مضمون پر اسی نوع کی مزید گفتگو ... ''

اس قول سے اس کا یہ اعتراف سامنے آتا ہے کہ اس نے سیاروں کی حرکات کی ہیئت کے سلسلے میں کچھ خارج از قیاس اشیاء سے کام لیا ۔ اور یہی وہ اشیاء ہیں جن سے اس کے ہاں تناقض پیدا ہوا ۔ کیونکہ حرکاتِ سیّارگاں کی ہیئتوں سے متعلق اس کے ہاں تناقض کی بنیاد یہی ہے کہ اُس نے ان حرکات کو حقیقی اجسام کے بجائے چند خیالی دائروں اور خطوط میں فرض کر لیا تھا ۔ پھر جب اُنہیں حقیقی اجسام میں تصور کیا گیا تو تناقض لازم آیا ۔ سو اُس کے اعتراف سے واضح ہو گیا کہ اُس نے ان مضامین میں غلطی کا ارتکاب جانتے بوجھتے کیا ۔ رہا یہ کہ اس ضمن میں وہ کوئی عذر نہیں لا سکتا سو وہ اس لئے کہ آخر کلام میں اس نے یہ کہہ کر عذر پیش کیا کہ : ,,.... یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نوع کی کسی شے کا استعمال — جب تک کہ اُس سے بنیادی طور پر کوئی قابلِ ذکر فرق نہ پڑتا ہو۔ مقصد کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا '' ۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو ہیئت اس نے فرض کی ہے اس سے سیّاروں کی حرکات میں کچھ

فرق واقع نہیں ہوتا ۔ مگر یہ بات غیر حقیقی ہیئتوں کے مفروضوں کا عذر نہیں بن سکتی کیونکہ اگر وہ ایک غیر حقیقی ہیئت کو فرض کرے گا اور وہ ہیئت اس کے تخیّل کے مطابق سیّاروں کی حرکات کو ان کے معمول پر قائم رکھے گی تو ★ (۲)۔

اپنے ان اعتراضات میں ابن الھیثم کا ھدف وہ جدید عنصر ہے جس کا اضافہ بطلمیوس نے سیاروں کی ان ہیئتوں میں کیا جو قدماء کے ہاں معروف تھیں ۔ اس عنصر کا نام بطلمیوس نے ,,الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT]رکھا ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کے ھاں سیّاروں کی ہیئت کے دو بنیادی عناصر کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ انھی پر بطلمیوس نے اپنی خاص ہیئت کی بنیاد اٹھائی ۔

بات یہ ہے کہ قدماء نے جب سیاروں کا مشاہدہ شروع کیا تو دیکھا کہ زمین سے مشاہدہ کرنے والے کی نسبت سے ان میں سے ہر ایک کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ۔ اُن کا نقطہ آغاز چونکہ یہ تصور تھا کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے لہذا اُنھیں اِس مظہر کی توجیہ مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ سیاروں کے مداروں کے اپنے مرکز ھیں جو مرکز کائنات یعنی زمین سے الگ ھیں اور اُن مداروں کے مختلف مراکز زمین سے ھٹے ہوئے فرض کر لئے ۔ بعد ازاں جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ترکیب ۔ یعنی ایسے مداروں کا تصور جن کے مرکز خارج میں واقع ھیں ۔ بھی زمین سے

★ تو اس سے اس امر کا امکان ختم نہیں ہوتا کہ اس نے جو ہیئت فرض کی ہے اس میں غلطی کی ہو (تکمیل اقتباس از مترجم بحوالۂ مذکورۂ ذیل)

(۲) مرجع سابق ، ص ۳۷ ۔ ۳۸

سیاروں کے مختلف بُعد کی مکمّل توجیه کے لئے کافی نہیں، تو انھیں ایک اور ترکیب کرنا پڑی ۔ یعنی یه مفروضه قائم کرنا پڑا که سیّاروں کی کچھ اور چھوٹی گردشیں ایسے مداروں پر بھی جاری ھیں جن کے مرکز اُن افلاک کے مداروں میں گردش کر رھے ھیں جن کے اپنے مرکز خارج میں واقع ھیں ۔ اِن چھوٹے مداروں کو اُنھوں نے ,,افلاک التّداویر،، [EPICYCLES] کا نام دیا ۔

بطلمیوس نے یه کیا که سیّاروں کے لئے ایک تیسرے دائرے کا تصور قائم کیا جسے اس نے ,,الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT] کا نام دیا ۔ بطلمیوس کے تصور کے مطابق اس مدار کا مرکز نه تو مرکز کائنات پر منطبق ھوتا ہے اور نه مرکز فلکِ خارجی پر ۔ اس نے یه مفروضه قائم کیا که اپنے اپنے ,,تداویر،،[EPICYCLES] میں گردش کرتے ھوئے سیّاروں کی حرکات اس فلکِ معدّل کے اعتبار سے منظم ہے نه که مرکزِ فلکِ خارجی یا مرکزِ کائنات کے اعتبار سے ۔

یہی بطلمیوس پر ابن الھیثم کے اعتراض کی اساس ہے که اس نے یه ھیئت قائم کر کے سیّاروں کی منظم حرکات کے اصول میں خلل ڈال دیا اور ایک نئی ھیئت پیش کر دی ۔ افسوس که اِس نئی ھیئت کی تفصیل ھم تک پہنچ نہیں سکی ۔

بعد ازاں اور کئی فلک شناس آئے جنھوں نے بطلمیوسی ھیئت کو رد کیا ۔ مثلاً ابو عبید الجوز جانی اور عمر خیّام ۔ پھر ان کے بعد نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، اور ابن الشاطر جیسے لوگ آئے جو یکے بعد دیگرے نئے نظریات پیش کرتے رھے اور ھر ایک اپنے پیش رو کے نتائج پر تعمیر کو آگے بڑھاتا رھا ۔

بیس برس قبل بعض محققین کی توجه اس طرف مبذول ھوئی که عین ممکن ہے اِن علماء کے نظریات ھی کے نتیجے میں کوپرنیکس

COPERNICUS نے سیاروں کی ہیئت میں بطلمیوس کے داخل کئے ہوئے نئے عنصر ,,الفلک المعدّل للمسیر،، کو رد کیا ہو اور بطلمیوسی نظام کو ترک کرتے ہوئے سورج کو مرکزِ عالم میں جگہ دی ہو ـ

اس میدان میں متعدد تحقیقات کے بعد اِس امر میں کوئی شک باقی نہ رہا کہ مسلمان فلک شناسوں کے نظریات پوری تفصیلات کے ساتھ کوپرنیکس کے علم میں تھے اور اُس نے حرف بہ حرف اِنھیں اخذ کیا (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ,,تاریخ التراث العربی،، جلد ٦ پر میرا مقدّمہ)

آج جو مسئلہ اصحابِ تحقیق کو درپیش ہے وہ اِس امر کی وضاحت ہے کہ یہ نظریات کس طریق پر مغرب میں منتقل ہوئے؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا ان متأخرین فلک شناسوں کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں ـ اس موقع پر میں مکمل تفصیلات اور دلائل تو پیش نہیں کر سکتا تاہم جو کچھ بالتفصیل اسی کتاب کی چھٹی جلد میں لکھ چکا ہوں اس کی تلخیص پر اکتفا کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مسلمان علماء کے یہ جدید نظریات مغربی دنیا میں عربی اور فارسی کتب کے یونانی زبان میں ترجمے کی وساطت سے منتقل ہوئے ـ یہ کام مدرسۂ ترجمہ سے مسلک لوگوں نے انجام دیا جو تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے طربزون اور قسطنطینوبل کے شہروں میں قائم تھا ـ غالباً یہ سلسلہ قسطنطینوبل کی فتح تک جاری رہا ـ ساتھ ھی ساتھ ان دونوں شہروں کے بہت سے رہنے والوں نے زبانی روایت کے ذریعے بھی ان دونوں دنیاؤں کے مابین واسطے کا کام دیا ـ

بطلمیوس نے عالم کی جو ہیئت معیّن کی تھی اُس پر اندلسی فلسفیوں کی طرف سے بھی شک کا اظہار کیا گیا ـ چنانچہ محمد بن

یحیی بن الصائغ المعروف به ابن باجه (المتوفی ۵۳۳ھ) نے کہا :
,,مرکز عالم کے گرد اپنے اپنے مداروں میں سیاروں کے فاصلوں کی پیمائشوں میں اختلاف کا سبب متعین کرنے کے لئے ,,افلاک تداویر،، [EPICYCLES] کے تصور کی ضرورت نہیں ۔ خارجی مرکز رکھنے والے دائروں [ECCENTRICS] کو قبول کر لینا ھی کافی ہے ،،بعد ازاں ابن طفیل (المتوفی ۵۸۱ھ) نے،، افلاک تداویر ,,نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا ۔ اس کے بعد فلسفی ابن رشد (المتوفی ۵۹۵ھ) آیا اور افلاکِ تداویر نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کے انکار کی ضرورت کا نظریہ پیش کیا ۔ اور صراحت سے کہا کہ سیّاروں کے مداروں کے مرکز مشترک ہونے چاھئیں نیز یہ کہ سیاروں کی حرکات لولبی [SPIRAL] حرکات ھیں اور اسی حرکت کی بنیاد پر وہ مرکز عالم سے سیاروں کے مختلف مداری فاصلوں کی وضاحت کیا کرتا تھا ۔ اس کا عزم تھا کہ وہ عالم کی ایک نئی ھیئت متعین کرے گا لیکن موت نے اسے فرصت نہ دی ۔

اس آرزو کی تکمیل ابو جعفر البطروجی (المتوفی ٦٠٠ ھ تقریباً) کے ھاتھوں ہوئی جس نے اپنا تعارف بطلمیوسی ھیئت کی جگہ لینے والے ایک نئے علم ھیئت کے بانی کی حیثیت سے کرایا ۔ اس نے اپنی کتاب المرتعس میں اسے اس موقف کا اظہار یوں کیا ہے (۳)۔

,,.... میں یہ کہتا ہوں کہ بطلمیوس نے یہ وضعیں اس دعوے پر قائم نہیں کی تھیں کہ یہ حقیقت نفس الامری سے عبارت ھیں ۔ نہ اُس کا موقف یہ تھا کہ جو اصول اُس نے بنائے ھیں لازماً اس کے رصدی وحسّی مشاھدے سے مطابقت رکھتے ھیں ۔ اُس نے تو انہیں اُن [مخصوص] حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے وضع کیا تھا تاکہ ان کے ذریعے وہ حرکات اس طرح چل سکیں کہ ایک مخصوص نظام

(۳) کتاب المرتعس، نسخہ استانبول، کتب خانہ احمد الثالث ، نمبر ۳۳۰۲ ، ورقہ ۱۰/ب ۔ ۱۱/أ

ور ایک ایسی ترتیب کے تابع ہوں جس میں اختلاف و تفاوت کی
جانس نہ ہو۔ یہ بات اُس سے پوشیدہ نہ تھی کہ اُس کی قائم کردہ
ضع [در اصل] نظام میں مخل تھی اور [ہنوز] پختگی سے دور تھی
ونکہ اس کے وضع کردہ دونوں اصولوں سے ، الگ الگ اور یکجا
ہی لازم آتا ہے کہ یا تو ایک خلا ہے جس میں خارجی مراکز والے یہ
لاک حرکت کرتے ہیں ۔ یا پھر ان افلاک پر مستمل افلاک کسی اور
معلوم مادے سے پُر ہوں جس کے اجزاء ان میں حرکت کرنے والے
سام کے منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہوں جسا کہ
، کے نئے جگہ خالی کر کے کسی اور جگہ کو خود پُر کرتے ہوں۔ یہ
ب باتیں ناقابل قبول ، سچائی سے دور اور حقیقتِ آسمان سے
طابقت نہ رکھنے والی ہیں ۔ ,,بطروجی کے خیال میں بطلمیوس نے
ں سلسلے میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کی اساس ,, توہّم پر ہے نہ
، حقیقت پر (۳) ,,

یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ بطروجی کے اپنے الفاظ میں
ں محرّک حقیقی کا ذکر کر دیں جس نے بطروجی کو ان تحقیقات پر
ادہ کیا ۔

. . کہ تمھیں بتاؤں کہ مجھے کیا سوجھا اور عمر بھر کی
معولیت اور سوچ بچار کے نتیجے میں جو متاع گراں بہا مجھے
اصل ہوئی اس کا رازِ دروں تم پر کھولوں۔ میں تم سے، اور ہر اس
خص سے جو میری تحریر پڑھے ، درخواست کرتا ہوں کہ یہ گمان نہ
ے کہ جن خیالات کا یہاں اظہار کیا جا رہا ہے ان کا مقصد قدماء
، رائے سے ٹکراؤ پیدا کر کے شہرت حاصل کرنا ہے کہ اللہ جانتا ہے
ر گواہ ہے کہ میں نے آغاز ہی سے محض اس خاطر یہ مقصد اپنایا
لزشتہ کے دور ہی میں جب میں نے آسمانوں کی حرکت پر

---

(۳) مرجع سابق ۸ ۔

ریاضیات کا مطالعہ کیا اور اس علم کے امام بطلمیوس اور بعد میں آنے والے اسی کے متّبعین کے اقوال کا جائزہ لیا (جبکہ کرہ ثوابت کی حرکت کے مسئلے پر اس سے ابو اسحاق ابراهیم بن یحیی المعروف بالرزقالی کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا) ... (۵)

بطروجی کی یہ کتاب جس میں عالم کی ایک نئی ہیئت پیش کر کے اسے بطلمیوسی ہیئت کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا ترجمہ تالیف کے چند ھی سال بعد، لاطینی اور عبرانی میں ہو گیا تھا، نہ صرف یورپ کے، فلکیاتی افکار پر اثر انداز ہوئی بلکہ سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک فلسفےاور طبیعیات کے افکار پر بھی اثر ڈالتی رہتی اور ان تمام میدانوں میں اس کا اثر بہت گہرا تھا اسی طرح اس کتاب نے بعد کے فلک شناسوں کی مساعی کے دوش بدوش ـ جن میں ابن الهیثم، الزرقالی، جابر بن افلح، ثابت بن قرّة، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن الشاطر کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ھیں ـ علم الفلک کو اُس جدید مرحلے تک پہنچانے میں حصہ لیا جس کا ظہور کوپر نیکس کی شخصیت میں ہوتا ہے ـ چنانچہ کوپرنیکس کو اس نظر سے دیکھا جانا چاهئے کہ وہ علم الفلک کے تاریخی ارتقاء کی بہت سی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے اور اس ارتقاء میں مسلمان سائنس دانوں کا حصہ ان کے پیش روؤں یا بعد میں آنے والوں سے کسی طور کم نہیں ـ

---

(۵) مرجع سابق، ۱/ب

ربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر

معاصر جرمن عالم نے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب تالیف کی
اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ
صدی عیسوی میں یورپ میں اچانک یونیورسٹیاں کیونکر
، آ گئیں جبکہ اس سے قبل، ایسی یونیورسٹیوں کا کوئی نمونہ
ونانیوں کے ہاں ملتا ہے نہ رومیوں یا بیزنطیوں کے ہاں۔ مؤلف
و یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ یہ ادارہ ایسی چیز ہے جس کی
ں کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ کہ یہ یورپ میں کسی خارجی
یر از خود وجود میں آ گیا۔
ب مذکور کی اشاعت کے پانچ برس بعد، میرے رفیق کار
ں (H. SCHIPPERGES) نے ــ جو ایک مدت سے اس مسئلے پر
کرکے قابل قدر نتائج تک پہنچ چکے ہیں کہ عربوں کا علم
ب میں کیونکر منتقل ہوا ــ اس پر اصلاحی نظر ڈالی اور یہ
تایا کہ مؤلف کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ ان اداروں یا ان

کے ابتدائی مرحلوں کے بارے میں یہ سراغ لگانے کہ عالم اسلام میں ان کے وجود کا کہاں تک امکان ہے۔ موضوع پر طویل بحث اور بہت سے دلائل مہیا کرنے کے بعد شپرجس نے یہ ثابت کر دیا کہ بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کی یہ سب یونیورسٹیاں، طلیطلہ کے راستے مکمل طور پر اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید میں بنی تھیں۔

مغربی تحریک احیائے علوم کے تمام پہلوؤں پر اسلامی علوم اور ثقافتوں کے عمومی اثر کا یہ مظہر تین راستوں، یعنی ھسبانیہ، اٹلی اور بیزنطہ کے راستے، عمل میں آیا۔

اس خطبے میں میری کوشش ہو گی کہ یورپ میں عربوں کے علم الفلک کے اثرات سے متعلق ایک عمومی تصور آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث میں اپنی کتاب [GESCHICHTE DES ARABISCHEN SHRIFFTUMS] کی چھٹی جلد میں کر چکا ہوں۔ سامعین کرام سے درخواست ہے کہ دلائل و مراجع کے لئے اس جلد کی طرف رجوع فرمائیں۔

اجتماعی رابطے کے [عمومی] اثرات سے قطع نظر، عربی سے لاطینی میں کیا جانے والا قدیم ترین ترجمہ جو اب تک معلوم ہو سکا ہے دسویں صدی عیسوی کا ہے۔ کتاب کے مؤلف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ترجمہ "ASTROLOGIA" کے عنوان سے، لوپیٹس برسلونی [LUPITUS]، نامی کسی شخص نے کیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اسطرلاب سے متعلق اولین کتاب بھی دسویں صدی عیسوی ہی کے اواخر میں سامنے آئی جس کا مؤلف گربرٹ (GERBERT) بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو سیلوسٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم رہا اور اسی نے لاطینی دنیا میں عربی ہندسے متعارف کرائے۔ وہ ایک مدت تک طلیطلہ اور برشلونہ میں رہ چکا

کے ایک مورخ نے اس رائے کو رد کیا ہے کہ گربرٹ نے
اپنی کتاب کا مواد مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کیا یا
ہ ان سے استفادہ کیا ۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر
یہ رویہ قبول عام پا رہا تھا کہ اس کتاب کے دریافت ہو
جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ۔ حقیقت واضح ہو گئی اور
ہ کے مابین ربط ثابت ہو گیا ۔ علاوہ ازیں لوبینس کے نام
یک خط بھی دریافت ہو گیا جس میں وہ کہتا ہے :

,,میں نے سنا ہے کہ آپ نے اسطرلاب پر ایک عربی کتاب
کا ترجمہ کیا ہے ۔ استدعا ہے کہ یہ ترجمہ مجھے بھجوا
دیں ۔ اس کے معاوضے کی جو شکل بھی ہو میں اس کے
لئے تیار ہوں،، ۔

بھی دیکھتے ہیں کہ فلکیات کی بعض اصطلاحیں گربرٹ
میں اپنی عربی صورت ہی میں باقی رہیں کیونکہ لاطینی
ان کے مترادفات نہ ہونے کے سبب ، ان کا ترجمہ ممکن نہ
وع سے ہٹ کر یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ لوگ
ت کے ترجمے میں غلطی کا شکار ہوا کرتے تھے ۔ اس کی
، (SINUS) کا لفظ ہے جو مسلمان فلک شناسوں کے ہاں
لفظ ,,الجیب،، کے ترجمے کے طور پر برتا گیا ۔ مسلمانوں کے
صطلاح ہنود کی زبان سنسکرت سے آئی تھی ۔ انہوں نے
عربی میں ترجمہ کیا ہی نہیں ۔ تاہم لاطینی مترجم اس
حال کو نہ سمجھ سکا اور لغتوں کی ورق گردانی کے اس
مجھا کہ مراد عربی کا لفظ ,,الجیب،، ، یعنی لباس کی جیب

ر یہ جملہ معترضہ تھا ۔ میں گربرٹ کی کتاب کے موضوع کی
اس آتا ہوں ۔ اس امر میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو

کتاب اس کی طرف منسوب ہے یا تو اس نے اسے عربوں سے اخذ ک
یا پھر وہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو گربرٹ سے منسوب ھ

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ اسی زمانے سے لاطینی دنیا میں
تطبیقی و ریاضی علم الفلک سے دل چسپی کا آغاز ہوا ۔ اس
قبل ان کے ہاں علم الفلک سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور پایا جا
مگر وہ دراصل قدیم ,,کوزمولوجی" ھی کے تسلسل سے عبارت
بطلمیوس کی ہندسی فلکیات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ م
میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ بطلمیوس اور اس کے نظام
سے واقف ھی نہیں تھے ۔ اور اگر ہوتے بھی تو اس کو سمجھ
سکتے تھے کیونکہ اس کی کتاب کو سمجھنے کے لئے علم ہندسہ
عنصر ضروری تھا وہ ان کے ہاں سرے سے موجود نہ تھا ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اسطرلا
متعلق دو کتابیں اور تالیف کی گئیں ۔ دونوں میں اسی کتاب کو
کی گئی جو گربرٹ سے منسوب ہے ۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ
دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں استفادے کا مرکز طلیط
گیارھویں صدی کے اواخر میں طلیطلہ کے ساتھ فرانس کے د
طولوز (TOULOUSE) اور شارتر (CHARTRES) بھی شامل ہو
ان کے بعد پیرس ۔

استفادے کے سلسلے کا ایک اہم کام وہ ہے جو قسطنط
افریقی [CONSTANTINE THE AFRICAN] نامی ایک عربی ا
شخص نے انجام دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ الجزائر کا ایک عر
تھا جسے جنوبی اٹلی کے شہر سالرنو (SALERNO) جانے کا اتف
ان کے ہاں طب کے پست معیار کو دیکھتے ہوئے اسے خیال پیدا
اٹلی میں عربوں کے علم طب کو متعارف کرائے ۔ چنانچہ وہ اپ

اس گیا اور چند سال میں طب کی تحصیل کی۔ پھر دوبارہ اٹلی آیا
ور اپنے ساتھ طب عربی کی بہت سی کتابیں لایا۔ کہا جاتا ہے کہ
، یا تو پہلے سے عیسائی تھا یا عیسائی مذہب اختیار کر گیا اور
طینی زبان سیکھی اور اسے ایک خانقاہ میں بتھا دیا گیا تاکہ وہ
ماں علم طب پر عرب اطباء کی تالیف کردہ ستر کے قریب کتابوں کا
جمہ کرے۔ ان میں سے بعض کو اس نے یونانی اطباء سے. بعض کو
ے آپ سے اور بعض کو حقیقی مؤلفین سے منسوب کیا۔ یہ صورت
ال اس وقت واضح ہوئی جب ان میں سے کچھ کتابوں کا ازسر نو
طینی میں ترجمہ کیا گیا کہ انہی میں سے بعض جالینوس یا روفوس
{RUFU یا ارسطو کے نام سے متداول چلی آ رہی تھیں۔

آئیے علم الفلک پر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کریں ...
دیکھتے ہیں کہ بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ، بتّانی کی
خم کتاب نیز فرغانی کی اور خوارزمی کی کتاب (بترتیب
ربطی*) کا ترجمہ کیا گیا۔ ان سب کتابوں کو سمجھنے کے لئے
ھی خاصی فلکی اور ھندسی معلومات درکار ھیں۔

۱۱۳۹ اور ۱۱۳۸ء کے درمیان ہم مارسیلیہ کے شہر میں ایک
خص کو دیکھتے ھیں۔ جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ وہ اپنے
مذھبوں کے لئے، ایک جنتری تیار کرتا ہے جسے وہ ,,لاطینی
تری،، کا نام دیتا ہے۔ لیکن دراصل اس کا کام الزرقالی کی جنتری

---

* ابو جعفر محمد بن موسی الخوارزمی کی ,,زیج السند ھند،، کو ابوالقاسم مسلمہ بن احمد
مجریطی نے ۹۷۹/۳۶۹ھ کے لگ بھگ، ھجری تاریخوں اور قرطبہ کے طول بلد کے مطابق از سر نو
۔ کیا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies New York — 1981, 7, 360—1, 9 :39.

(مترجم)

کے ایک عوامی سے ترجمے سے عبارت ہے جس میں عربی اصل کی تاریخوں کو عیسوی سالوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ اس نامعلوم شخص نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ الزرقالی کا پیرو ہے ۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کلدانی اور ہنود اور عرب، اہل مغرب کو علمی قیادت فراہم کرتے ہیں ۔ اسے بطلمیوس کا نام ضرور معلوم ہے لیکن وہ علم الفلک کی تاریخ میں اس کے کام سے ہرگز واقف نہیں

صرف علم الفلک کے میدان ہی میں نہیں بلکہ علی العموم اسلامی علوم سے اکتساب کے سلسلے میں ایک اہم مظہر، بارھویں صدی عیسوی میں ایک بڑے مترجم کا ظہور ہے جس کا نام جیرارڈ کرمونی (GERARDO DE CREMONA) تھا ۔ اس نے طلیطلہ کے شہر میں عربی زبان اور اسلامی علوم سیکھے اور نوّے سے زائد عربی کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ان میں سے پانچ فلکیات کے میدان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یعنی بطلمیوس کی کتاب المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح، الزرقالی کی جنتری، طلوع فجر پر ایک کتاب جو ابن الہیثم سے منسوب ہے ، نیز الفرغانی کی کتاب کا ترجمہ جو اس سے قبل بھی ایک بار ترجمہ کی جا چکی تھی، اسی طرح بطلمیوس کی کتاب المجسطی کا عربی سے لاطینی ترجمہ جس سے پہلے المجسطی لاطینی میں غیر معروف تھی ۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جیرارڈ کرمونی نے جو ترجمے کئے ان کے ذریعے میدان فلکیات کے بعض اہم عناصر لاطینی دنیا میں منتقل ہوئے اور جس زمانے میں لاطینیوں کا تعارف بطلمیوس کی کتاب المجسطی سے ہوا اسی زمانے میں الزرقالی کی جنتری بھی ان کے علم میں آگئی جس میں مجسطی سے متعلق بعض اہم نتائج موجود ہیں ۔ اسی طرح المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح کے ذریعے لاطینیوں کو مجسطی

پر شدید تنقید اور اس میں بعض اہم تصحیحات سے بھی واقفیت حاصل ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جابر بن افلح کی اسی کتاب کی وساطت سے ان کی رسائی علم المثلثات [TRIGONOMETRY] کے تفصیلی تعارف تک ہوئی جس کا وسیع اثر کوپرنیکس کے عہد تک بہت سے مؤلفین کے ہاں نظر آتا ہے۔ خود کوپرنیکس نے اس کتاب سے دور رس استفادہ کیا۔ بایں ہمہ جابر بن افلح پر یہ تہمت چلی آتی ہے کہ اس نے بطلمیوس پر غلط الزامات عائد کئے ہیں۔

الزرقالی کی جنتری اور اس کی دیگر کتب کے لاطینی و عبرانی ترجمے نے لاطینی دنیا میں علم الفلک کے آئندہ ارتقاء پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اوروں پر ان اثرات کی بات ایک طرف، اب تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ خود کوپرنیکس نے۔ ماخذ کا ذکر کئے بغیر الزرقالی کی جنتری سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ ہاں کوپرنیکس اوج الشمس [SOLAR APOGEE] کی سالانہ حرکت، جو الزرقالی کے حساب سے ۴ء ۱۲ ہے کی مناسبت سے رواروی میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے اگرچہ خود اسے یہ تسلیم کرنے میں تامّل ہے کہ اوج الشمس میں حرکت پائی جاتی ہے۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ مشہور سائنسدان کپلر (KEPLER بھی الزرقالی کی کتاب سے متأثر ہوا مثلاً اس نے سیّارۂ مریخ کے مدا کی بیضوی شکل کے بارے میں اس کے نظریے سے اثر قبول کیا۔

ریجیومونتانوس (REGIOMONTANU S) کی کتاب میں ایک عجیب چیز ہے۔ اس نے الزرقالی کا جو ترجمہ کیا، چھاپے کی غلطی سے اس میں جہاں یہ ذکر تھا کہ چار رصدی مطالعوں کے بعد وہ ثابت کر سکا کہ اوج الشمس کا نقطہ (40 r — quattuor) ہے وہاں طباعت میں یہ عدد ,,402 ،، بن گیا اور اسی کی بنیاد پر کپلر نے ایک

اس کے پاس الزرقالی کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ اس کے رصدی مطالعوں کی تعداد ۴۰۲ تک پہنچ گئی تھی۔

طلوع صبح کے موضوع پر جو کتاب ابن الھیثم سے منسوب ہے۔ اور درحقیقت ایک اور فلک شناس، محمد بن یوسف بن معاذ کی ہے جس کا تعلق اندلس سے تھا اور جو پانچویں صدی ھجری میں ھوا ہے۔ ــــ فضا میں شعاعوں کے ٹوٹنے کے مسئلے پر اس کے اثر کا سراغ سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک ملتا ہے۔

اس امر کا ذکر بھی اھمیت سے خالی نہ ھوگا کہ مترجم جیرارڈ کرمونی کو یہ خیال ھوا کہ ان کتابوں کا ترجمہ کر لینے کے بعد اب وہ اس قابل ھو گیا ہے کہ نظری فلکیات THEORETICAL [A STRONOMY پر لاطینیوں کے لئے خود ایک کتاب تالیف کر سکے لیکن درحقیقت جو کچھ اس نے کیا وہ صرف اس قدر تھا کہ اس نے الفرغانی اور البتّانی کی دو کتابوں کی باھم آمیزش کر دی۔ ھر چند کہ بعد کے زمانے میں اس کتاب کو تصحیفات نیز موضوع کے اعتبار سے ناپختگی کے سبب تنقید کا نشانہ بنایا گیا ... پھر بھی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ نہ کچھ تقلید کرنے والے پیدا ھوئے۔ مثلاً تیرھویں صدی عیسوی میں ھم دیکھتے ھیں کہ ایک مشہور لاطینی فلک شناس آلونیس دو انسولیس (ALONIS DE INSULIS) متوفی ۱۲۰۳ء ایک کتاب ترتیب دیتا ہے جس میں جابر بن افلح اور الفرغانی کی کتاب کے علاوہ جیرارڈ کی کتاب ــــ (جو خود بھی بعض عربی مآخذ کی نقل ہے جیسا کہ ذکر ھو چکا) ــــ کا بھی چربہ اڑاتا ہے۔

لاطینی علم الفلک کی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ ولیم (GUILLAUME) * نامی ایک انگریز فلک شناس نے الزرقالی کی ,,ربیج طلیطلہ،، (طلیطلہ کی جنتری)، جسے کسی گمنام شخص نے مرسیلیہ کے حالات کے مطابق ڈھال دیا تھا ، لی اور اس میں ضروری تبدیلیاں کرکے اسے لندن کے حالات کے مطابق بنا دیا ۔ یہ جنتری جو ,,لندن کی جنتری،، کہلائی، ایک طویل عرصے تک اپنے مقام کو برقرار رکھ سکی اور کئی صدیوں تک وہاں فلکی حسابات کے لئے بنیاد کا کام دیتی رہی ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل تک لاطینی حلقوں میں ــ بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کے علاوہ ــ نظام عالم پر ابن رشد اور البطروجی کا نظریہ بھی راہ پا چکا تھا، جو بطلمیوس کے نظام عالم کی جگہ لینا چاہتا تھا ۔ یہ نظریہ لاطینی دنیا میں اس شرح کے جو ابن رشد نے ارسطو کی کتاب السماء والعالم پر لکھی تھی نیز ہیئت عالم پر البطروجی کی کتاب کے ترجموں کی وساطت سے پہنچا ۔ اسی آخر الذکر کتاب نے یورپ میں ، سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک، نہ صرف فلک شناسی کے میدان میں ذہنی رویے پر گہرے اثرات چھوڑے بلکہ فیزیائی فلسفے کے زاویۂ نگاہ کو بھی متاثر کیا ۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کا ترجمہ انگریز عالم مائیکل سکاٹ (MICHAEL SCOTUS) نے کیا ۔ علاوہ ازیں اسنے اس غیر بطلمیوسی

---

* لفظ WILLIAM ہی کی ایک صورت ۔ دیکھئے :

Websters' New Biographical Dictionary,

Merriam — Webster Inc., Springfield M. A., U.S. A., 1983, P. 430

نیز دیکھئے : Dictionary of Scientific Biography, 14 : 389:,

"William the Englishman. .."

نظام کی ترویج کے سلسلے میں دو کتابیں خود بھی تالیف کیں ۔ یہاں
میں بطور خاص اس بات کا ذکــر کرنا چاھوں گا کہ یہ شخص
البطروجی کے نظام کی توضیح پر اپنی کتاب کو نیـکولاوس دمشقـی
[NICOLAUS OF DAMASCUS] سے منسوب کرتا ہے جسکا زمانہ پہلی
صدی قبل مسیح کا ہے ۔ اس سے یہ مشکل پیدا ھوتی ہے کہ آئندہ
نسلوں میں اس کتاب کو مشہور فلک شناسوں اور فلسفیوں کے ھاں
ایک مقام حاصل ھوتا ہے مگر اس مفروضے پر کہ یہ نیکولاوس دمشقی
کی کتاب ہے ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں البطروجی کی کتاب کے
ترجمے کے بعد سے لاطینیوں کو دو متضاد نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے یعنی
بطلمیوسی نظام اور غیر بطلمیوسی نظام ۔ نتیجۃً ان میں ایک طبقہ
ایک نظام کی پیروی کرتا ہے اور دوسرا دوسرے کی ۔ جبکہ ایک
تیسرا طبقہ ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرنے کے سوال
پر تردّد کا شکار ھو جاتا ہے اور تذبذب میں پڑ کر عرب اساتذہ کی
جانب سے وصول ھونے والی نو بہ نو معلومات کے مطابق اپنے موقف
میں تبدیلی کرتا رھتا ہے میں اس آخر الذکــر طبقے میں سے تین
اشخاص کا ذکر کروں گا جو تیرھویں صدی عیسوی میں پیرس کے
مکتب فکــر کے ستون سمجھے جاتے ھیں یعنی راجر بیکن
(ROGER BACON) البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اور
رابرٹس گروسٹسٹے (ROBERTUS GROSSETESTE) ۔

رابرٹس بڑے مؤلفین میں سے تھا اور اس کا شمار ارسطو کے
پیروؤں میں ھوتا ہے چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں اس کے مسلک کا دفاع
کرتا ہے۔ حال ھی میں یہ انکشاف ھوا ہے کہ ارسطو کی کتابیں مطل

رابرٹس سے منسوب ہے البتانی اور ثابت بن قرہ کی کتابوں سے منقول ہے۔ بطلمیوس کا اس نے بس سرسری سا ذکر کیا ہے۔ حقیقت میں اس کا میلان البطروجی کی طرف ہے مگر وہ متردد ہے۔ ساتھ ہی اس کی کتابوں کے قاری کو یہ بات اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ بعض اور عرب فلک شناسوں کے افکار کو اخذ کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ افکار البطروجی کے اصولوں سے ٹکراتے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی میں بھی کسی رابرٹس سے منسوب ایک اور لاطینی کتاب ملتی ہے اور اس کے بارے میں بھی یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ عرب فلک شناسوں ہی کے افکار سے منقول ایک مجموعہ ہے۔

رابرٹس کی ایک کتاب ,,مدوجزر،، پر ہے جو آج تک اس موضوع پر پہلی اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ میں نے اس کا موازنہ الکندی کی کتاب سے کیا تو دیکھا کہ یہ اسی کا خلاصہ ہے۔ اس پر، ان شاء اللہ، میں ,,آثار علویہ،، [METEOROLOGY] پر اپنے خطبے کے دوران بات کروں گا ۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ بطلمیوسی مکتب فکر کے لوگ پیرس اور آکسفورڈ میں، مشاہدۂ افلاک اور سیاروں کے مداروں کے حساب پر توجہ رہے ہیں تاہم وہ کوئی نئی بات پیش کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ ہنوز اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کردہ معلومات کو ہضم ہی نہیں کر سکے۔

البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں البطروجی کے نظریات کا پیرو رہا لیکن جب ثابت بن قرہ کی کتاب اس تک پہنچی جو مدار سیّارگاں کی وضاحت میں اس کے خاص نظریات پر مشتمل تھی تو میگنس کا غالب میلان بطلمیوس کی طرف ہو گیا۔

جہاں تک راجر بیکن کا تعلق ہے سو اسے ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک کے قبول کرنے میں سب سے زیادہ تردّد رہا اور اسی تردّد کے سبب اسے یہ شہرت حاصل ہوئی کہ وہ ناقدانہ ذہن کا مالک ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الہیثم کی کتاب ہیئۃ العالم کے زیر اثر فلکی حرکات کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کا میلان عرب بطلمیوسیوں کے مسلک کی طرف ہے۔ لیکن نظام عالم کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے وہ البطروجی کے نظریے کو زیادہ مناسب پاتا ہے۔

پیرس کے فلک شناس حلقے کے لوگوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کے عرصے میں عرب بطلمیوسیوں کی آراء قبول کرکے خود کو تذبذب سے نجات دلا لی۔ اور یہ ھیئت عالم پر ابن الہیثم کی کتاب کے ترجمے کے بعد ھی ممکن ھو سکا۔

ابن الہیثم کی کتاب کے ترجمے کے ساتھ لاطینی فلک شناس حلقوں میں ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے جو لاطینی فیزیائی فلکی رویّے کو بہت گہری تحریک بہم پہنچاتا ہے۔ اس نئے عنصر کا نام (IMAGINATIO MODERNORUM) یعنی ,,عالم کی نئی ھیئت" تھا اور پہلا فلک شناس جس نے تذبذب کے موقف کو خیرباد کہنے کی جرأت کی برنا رڈوس دو ویریدینو (BERNARDUS DE VIRIDINO) تھا

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے پیرس اور آکسفورڈ میں بطلمیوس مکتب فکر کی بالادستی قائم ھو جاتی ہے اور یہ لوگ فلکیاتی مشاہدات و حسابات میں دل چسپی کا آغاز کرتے ھیں۔ لیکن ھنوز وہ کوئی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر تھے کیونکہ انھوں نے جو کچھ اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا تھا اس ... [illegible]

سکے تھے ۔ ان فلک شناسوں میں مشہور ترین لیوی بن گرسون (LEVI BEN GERSON) ہے ۔ تاہم مورّخین علم الفلک کے وہ دعوے اب ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتے جن کی رو سے متعدد دریافتوں کا سہرا اس شخص کے سر ہے ۔ کیونکہ آج ہمارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان دریافتوں کو ان کے حقیقی دریافت کنندگان کی طرف لوٹا سکیں ۔ مثلاً اس فلک شناس کے ہاں ہمیں بطلمیوس پر تنقید ملتی ہے جو کئی صدیوں سے اس کے نام درج چلی آتی ہے ۔ لیکن محقّق سے یہ بات مخفی نہیں رہی کہ اس نے بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کو دھرانے سے زیادہ کچھ نہیں کیا ۔

سائنس کی تاریخ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بصریات کے میدان میں حجرہ تاریک [CAMERA OBSCURA] کو دریافت کرنے اور چاند کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کو استعمال کرنے والا لیوی ہے ۔ تاہم نوے برس ہونے یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ یہ کارنامہ دراصل ابن الهیثم نے انجام دیا تھا اور اس شہرت کا زیادہ حقدار وهی ہے ۔

اس طرح مثلّثات کرویہ [SPHERICAL TRIANGLES] کی دریافت لیوی سے منسوب کر دی گئی ہے مگر تیس برس پیشتر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سہرا ۔ چوتھی صدی هجری کے ــ الخجندی ، ابو الوفاء البوزجانی، اور ابونصر بن عراق کے سر ہے اور همارے لئے یہ سراغ لگانا مشکل نہیں رہا کہ لیوی نے یہ سب کچھ کہاں سے اخذ کیا ۔

اسی طرح لیوی سے یہ بات منسوب ہو گئی کہ اس نے رصد کا وہ آلہ ایجاد کیا جو لاطینی دنیا میں ,,عصائے یعقوب [JACOB'S STAFF] کے نام سے مشہــور ہوا ۔ اسی آلے کی ایجاد پر پندرھویں صدی عیسوی کا جرمن عالم ریجیو مونتا نوس بھی فخر کرتا نظر آتا ہے ۔ معاصر علماء نے اس امکان پر بھی بحث کی ہے کہ ریجیو مونتانوس نے

لیوی بن کرسون کی اس ایجاد کو ناجائز طور پر خود سے منسوب کر لیا ہو۔ تاہم مشہور عالم ویڈیمان [WIEDEMANN] نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دراصل ابن سینا اس آلے کا موجد ہے۔ مزید برآں ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آلہ ابن سینا کے ہاتھوں جس درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا سترھویں صدی عیسوی کے ان علماء کے ہاں اس درجے کو نہیں پہنچ سکا۔

آخری بات یہ کہ کسر اعشاریہ کی دریافت بھی لیوی بن گرسون سے منسوب کر دی گئی ہے حالانکہ اب ہمارے علم میں ہے کہ یہ سہـــرا الاقلیدسی کے سر ہے جو چوتھی صدی ھجری کے مسلمان حساب دانوں میں سے ہے۔

پیرس اور آکسفورڈ کے مکاتب فکر پر مزید گفتگو طوالت کا باعث ہوگی لہذا اسے چھوڑتے ہوئے میں لاطینی فلکیاتی حلقوں کے ایک اور مظہر کی طرف اشارہ کرنا چاھوں گا جو میری نظر میں اپنی جگہ اہم ہے اور توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ یہ ان نئی کتابوں کا وجود ہے جو عربی کتب کے تراجم کے پہلو بہ پہلو ایک اہم حیثیت رکھتی ھیں ۔ میری مراد ان بڑی بڑی تالیفات سے ہے جو عربی مآخذ کی نقول پر مشتمل ھیں مگر جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل مآخذ اور اصل اساتذہ کے ناموں کو فراموش کر دینے کا سبب بنیں۔

مثال کے طور پر شاہ الفونس دھم (ALPHONS) قسطلیۃ میں علماء کی ایک بڑی جماعت کو اپنے گرد جمع کرتا ہے تاکہ وہ علم الفلک پر ان سب عربی کتابوں کے مواد پر مشتمل ایک جامع تالیف تیار کر سکیں جو اس وقت ان کے ھاں معروف تھیں۔ چنانچہ انہوں نے عملاً

ثم کی کتاب هیئة العالم بھی تھی ۔ یہ مجموعہ اپنے پرتگیزی
ان سے مشہور ہوا اور یورپ میں (LIBROS DELSABER) کے نام
عام ہوا اور اسے اپنے لاطینی ترجمے کی وساطت سے یورپ میں
ت فروغ حاصل ہوا ۔

اسی طرح کی ایک اور کتاب ,,سیّاروں کا جدید نظریہ،،
(THEORICAE NOVAE PLANETARU) ہے جس کا مولّف فلک
ناس پوائرباک (PEURBACH) تھا ۔ وہ پندرھویں صدی عیسوی کا
می ہے۔ اس کتاب میں اس نے عربی سے کئے ہوئے کئی تراجم یکجا
دیئے ہیں ۔ لیکن اساسی طور پر اس کا انحصار ابن الھیثم ، ثابت
قرّہ اور الزرقالی کی کتابوں پر رہا ہے ۔

ایک اور کتاب ریجیومونتانوس کی تالیف ہے جس کا عنوان
بطلمیوس کی عظیم کتاب کا خلاصہ ،، ہے مگر درحقیقت یہ البتّانی
ور الزرقالی کی کتابوں کی تلخیص سے عبارت ہے ۔ مزید یہ کہ یہ
فلک شناس ۱۳۶۴ء میں اٹلی کے شہــر پاڈووا [PADOVA] میں
الفرغانی کی کتاب پر لیکچر دیا کرتا تھا ۔

بہ آخر الذکر دونوں مشہور کتابیں، کوپرنیکس، گلیلیو اور کپلر
کے اہم مآخذ میں شامل تھیں ۔

یہاں میں خود کو مجبور پاتا ہوں کہ متأخر مسلمان فلک شناسوں
مثلاً نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن شاطر سے
کوپرنیکس کے متأثر ہونے کے مسئلے پر چند الفاظ کہوں ۔ یہ مسئلہ
گذشتہ بیس برس سے ماھرین علم فلک کے درمیان اہم ترین اختلافی
مسائل میں شامل ہو گیا ہے ۔ کوپرنیکس نے سیاروں کی حرکات سے
متعلق ان علماء کے بعض نظریات اخذ کئے ۔ اس خطبے کی حدود میں

ہوگی ۔ اپنی کتاب ,,تاریخ التراث العربی" کی چھٹی جلد کے مقدمہ میں میں نے اس مسئلے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً یہ کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوران بحیرۂ اسود کے مشرقی ساحل پر واقع شہر طرابزون [TRABZON] میں نیز قسطنطینیہ میں ترجمے کے لئے ایک ایک مدرسہ قائم ہوا ۔ ان دونوں مدرسوں کے علماء یورپ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے مذہبی جوش کے تحت عالم اسلام میں تالیف کی جانے والی تازہ ترین کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے ۔

تاریخ علوم پر اپنی تحقیقات کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عالم اسلام سے لاطینیوں کے اکتساب کا مسئلہ اتنا پھیلاؤ رکھتا ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت مل کر بھی کئی دھائیوں میں اس کی وضاحت کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی ۔

جوں جوں انسان یورپ کے اصل مآخذ کی گہری تحقیق کرتا ہے اس کے ہاں یہ تصور قوت پکڑتا چلا جاتا ہے کہ وہاں کی نام نہاد تحریک احیاء اس بچے سے ازحد مشابہت رکھتی ہے جسے اس کے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔

آثار علویہ * کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

اس موضوع کا انتخاب ــــ جس سے آپ لوگوں کی اکثریت کو واسطہ نہ رہا ہوگا ـ میں نے اسلئے کیا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقی مثال سمجھی جاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ علوم کے بارے میں ، خصوصاً مسلمانوں کے حصے سے متعلق، دور حاضر کی آراء مبنی برحقیقت نہیں ہیں ـ نیز یہ کہ اس علمی ورثے کی تحقیق پر توجہ دینا ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ان آراء کو اسلامی علوم کے حق میں ہموار کیا جا سکتا ہے ـ

یہ موضوع معمولی سے معمولی مطالعے اور توجہ سے بھی محروم رہا ہے اور اس میدان میں جو کتابیں تالیف ہوئی تھیں انہیں فلکیات کی کتابوں کے ذیل میں رکھ دیا گیا ہے ـ اس علم کے مؤرخین نے اس کے الگ الگ موضوعات پر نیز اسکی عمومی تاریخ پر متعدد تحقیقات کی ہیں ـ عموماً وہ آغاز چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر ظہور اسلام تک کے علمائے یونان کے کام سے کرتے ہیں اور پھر اگلے مرحلے

کے بارے میں ، تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام یعنی اس دور کے
اوائل تک کے لئے سکوت اختیار کرتے ھیں جسے وہ احیائے علوم کا دور
قرار دیتے ھیں ۔

دور حاضر میں، کچھ ھی عرصہ قبل ، بعض علماء کو جب
رسائل اخوان الصفا کا جرمن ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو انھوں نے یہ
رائے قائم کی کہ ان رسائل میں ایک فصل فضائے آسمانی میں واقع ہونے
والے بعض امور سے متعلق ہے ۔ اسی طرح معروف عالم ویڈیمان
(E · Wiedemann) جس کی ساری علمی زندگی تاریخ علوم میں
مسلمانوں کا مقام واضح کرنے کی کوشش میں بسر ھوئی ۔ نے بھی
ایک مختصر مقالہ لکھا ہے جو آثار علویہ پر ان بحثوں سے متعلق ہے جو
البیرونی کی کتاب ,,الآثار الباقیة عن القرون الخالیة ،، میں اس کی
نظر سے گزریں ۔ تاھم یہ سب چیزیں آثار علویہ کی تاریخ میں
مسلمان علماء کی مساعی کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر تصور مہیا
کرنے کے لئے کافی نہ تھیں ۔

جہاں تک ,,آثار علویہ ،، کی اصطلاح کا تعلق ہے سو یہ
Meteorology کی عربی صورت ہے جس کا مفہوم ہے وہ اشیاء یا تغیّرات
جن کی نمود زمین سے اوپر اوپر ھوتی ہے ۔ اس اصطلاح کا آغاز
چوتھی صدی قبل مسیح میں ھوا ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ فلاسفۂ
یونان فضائے آسمانی میں وقوع پذیر ہونے والے مظاھر کی توضیح میں
دل چسپی لیا کرتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ان کی مختلف توجیہات
پیش کی ھیں ۔ یہ معلوم نہیں ھو سکا کہ یونانیوں نے دیگر اقوام
خصوصاً اھل بابل سے کس حد تک استفادہ کیا ۔ مگر اتنا ثابت ہے کہ
قدیم ھی سے ان کی رسائی اھل بابل و مصر سے منقول بعض

بھی شامل تھیں -

یونانیوں کے ہاں اس موضوع پر پہلی مفصّل کتاب ، ارسطو کی کتاب ,,الآثار العلویه (۱) " ہے۔ اس میں اس نے متقدمین کے افکار کی جمع و ترتیب کی ہے۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ باعتبار اھمیت متقدمین کے افکار کی درجہ بندی کرتے ہوئے ارسطو کی رائے اکثر صائب نہیں ہے۔ مؤرخین علوم کے ہاں یہ رائے غالب رہی ہے کہ آثار علویہ کا علم، ارسطو کے شاگرد تھیوفراسٹس (Theophrastos) کے ہاں ایک اہم مرحلے میں داخل ہوا۔ اس قیاس کی اساس عربی زبان میں ہم تک پہنچنے والے بعض نثر پاروں کی تاویل پر تھی کیونکہ یونانی اصل تو ضائع ہو چکی تھی۔ عربی اور سریانی میں دریافت ہونے والے کچھ ٹکڑوں پر تحقیق کی گئی اور بعض علماء نے ان سے بعض نتائج اخذ کئے۔

چار برس ہوئے رامپور (ہندوستان) میں[اس کتاب کے]عربی ترجمے کا واحد مکمل نسخہ میرے ہاتھ لگا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ کیا کہ آثار علویہ کی تاریخ میں تھیوفراسٹس کی حیثیت سے متعلق جو قیاس آرائیاں کی گئیں ، کہاں تک درست ہیں۔ کھلا یہ کہ اس میدان میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ مبصّر کتاب بعض عجیب و غریب توجیہات و آراء کا جواز ــــ بشمول ان آراء کے جو خود تھیوفراسٹس نے پیش کی ہیں ــــ محض اس مفروضے پر فراہم کرنے کی کوشش میں حق بجانب نہیں کہ دراصل یہ عرب مترجم کی کوتاہئ فہم کا نتیجہ ہیں جس نے ، بقول موصوف ، کتاب کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہی ، اس کی تلخیص کر ڈالی ہے۔

رہی مسلمان علماء کی حیثیت سو اس کو ، کماحقّہٗ معلوم کرنا

ہی ممکن نہیں رہا کیونکہ اس میدان میں ان کی زیادہ تر اہم کتب ضائع ہو چکی ہیں مثلاً الکندی ، ابن الہیثم اور البیرونی کی وہ کتابیں جن میں اس علم کے پیچیدہ مسائل پر بھرپور بحث کی گئی تھی ۔ چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ اپنے اس خطبے میں ان مخصوص رسائل پر، جن کا موضوع آثار علویہ کے لخت لخت مسائل ہیں نیز مسلمان سائنسدان فلسفیوں کی ان آراء پر انحصار کریں جو ان کی کتابوں میں بالواسطہ آ گئی ہیں ۔

مسلمانوں کے ہاں آثار علویہ کی تحقیق کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز الکندی کے رسائل ہیں ۔ آثار علویہ پر الکندی کی اہم ترین عطا ,,قانون انبساط احجام ,, (حجم میں پھیلاؤ کا قانون) ہے جس کی بنیاد پر اسے پہلا عالم قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اس علم کو اس قانون کی اساس فراہم کی۔جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو اور اس سے قبل اور اس کے بعد کے لوگوں کے ہاں علم آثار علویہ کی اساس زمین سے اوپر سورج کے اثر سے دو قسم کے بخارات یعنی تر بخارات اور خشک بخارات کے جدا ہونے کے تصوّر پر قائم تھی [۲]۔ تر بخارات بارش ، برف اور اولوں وغیرہ کا مادہ تھے جبکہ خشک بخارات ہواؤں کا مادّہ تھے ۔

الکندی نے فضائی احوال کی تشکیل کے ضمن میں ,,قانون انبساط احجام،، کو بنیادی اصول کی حیثیت دی ۔ بنا بریں وہ ہمیں اس میدان میں جدید نظریات کا پیشرو نظر آتا ہے ۔ اپنے مخصوص اسلوب میں وہ اس قانون کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ [۳]

,,ہر جسم جو ٹھنڈا ہوتا ہے وہ سکڑ جاتا ہے اور ٹھنڈا ہونے سے قبل جتنی جگہ گھیرتا تھا اس سے کم اسے درکار ہوتی ہے ۔ اور ہر جسم جو گرم ہوتا ہے وہ پھیلتا ہے اور گرم ہونے سے قبل جتنی جگہ

نها اس سے زیادہ اسے درکار ہوتی ہے » ۔
م دیکھتے ہیں کہ الکندی نے نہ صرف ,,قانون انبساط» کو علم
لوبہ کی اساس بنایا بلکہ اس قانون کی اولین جامع و مختصر
بھی وہی ہے جو اس نے فراہم کی۔اگرچہ اس قانون کا علم
یونان کو بھی تھا جیسا کہ ہم بلیناس کی کتاب ,,علل الاشیاء
الخلیقة » (۴) میں دیکھتے ہیں ، جس کی تألیف اسلام سے فوراً
کی چند صدیوں کے دوران میں ہوئی ۔ بلیناس کی کتاب میں
انبساط کی تعریف الکندی کی جامع و مختصر تعریف سے
انداز میں یوں آئی ہے : ,,برودت کے خواص میں سکڑنا اور
ہے اور حرارت کے خواص میں پگھلنا اور پھیلنا » ۔
سی قانون کی بنیاد پر الکندی بارش کے عمل کی توجیہ میں
و سے مختلف بات کہتا ہے۔ ارسطو کا موقف یہ ہے کہ بارش ہونے
ب مرطوب بخارات کا برودت سے اتصال ہے (۵)۔ بارش ہونے کی
حت اصولاً درست ہے لیکن ارسطو یہ نہیں بتاتا کہ جب
ب بخارات ٹھنڈے ہوتے ہیں تو ٹھنڈ کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔
الکندی بارش کے عمل کی آخری علّت تک پہنچتا ہے یعنی
ت کے حجم کا سکڑنا جو درجہ حرارت میں تبدیلی سے واقع
ہے۔ اس طرح اس کی توجیہ مکمل طور پر دور جدید کی توجیہ
ا ملتی ہے ۔

الکندی اور ارسطو کے مابین جو بڑا فرق ہے وہ ہواؤں کے چلنے
سلسلے میں دونوں کے نظریات سے واضح ہو جاتا ہے۔ ارسطو کے
ک ہواؤں کا مادّہ خشک بخارات ہیں جبکہ الکندی کی نظر میں
ے ہواؤں کا مادّہ ہوائے محض ہی ہے۔ (٦) ضروری معلوم ہوتا ہے

که هواؤں کے چلنے کی جو توضیح ارسطو نے پیش کی ہے وہ آپ کے سامنے بیان کر دوں تاکہ الکندی کے نظریات کی اہمیت کھل کر سامنے آ سکے۔ ارسطو نے ہواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: عمودی ہوائیں اور افقی ہوائیں۔ اول الذکر اس کے خیال میں خشک بخارات کے اٹھنے اور بلندی پر جا کر سردی سے ٹکرانے کے سبب پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ بخارات زمین کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یہ حرکت عمودی ہواؤں کو جنم دیتی ہے۔ افقی ہوائیں اس کی رائے کے مطابق، کرہ ارض کے گرد موجود طبقہ ہوائی کی حرکت سے عبارت ہیں جو فلک افقی کے ساتھ کلّی حرکت کی تابع ہیں۔ یہ عجیب و غریب تصوّر بہت بڑے تضادات پر مشتمل ہے۔ ایک محقق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ,,ارسطو خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس نے یہاں کیا کہا ہے،،۔

آئیے اب دیکھیں کہ الکندی ہواؤں کے چلنے کی کیا توجیہ کرتا ہے:

,,جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں۔ بجز ان صورتوں کے جو زیریں[یعنی زمینی]اسباب سے پیش آتی ہیں۔ مثلاً ندی نالوں کا بہاؤ، عارضی طغیانیاں تھمے ہوئے پانی، اور چوٹیوں کی بلندی کہ یہ اور ایسے ہی دیگر اسباب ایسی وجوہ پیدا کرتے ہیں جن سے بخارات کا بہاؤ مختلف سمت اختیار کر لیتا ہے اور نتیجۃً مقامات کی بلندی کے اعتبار سے، مختلف قسم کی ہوائیں رونما ہوتی

ی کا یہ نظریہ مکمل طور پر اس جدید نظریے سے ہم آہنگ
رھویں صدی عیسوی میں جارج ہیڈلی (George Hadley)
ل کانٹ (Immanuel kant) سے منسوب کیا جاتا ہے۔
انبساط احجام ھی کی بنیاد پر الکندی اور بھی کئی
کیلات کی وضاحت کے سلسلے میں ارسطو سے اختلاف
ثلاً برف اور اولوں کا وجود میں آنا۔ میں یہاں اس کی
جانے کی گنجائش نہیں پاتا۔ مگر مناسب خیال کرتا ہوں
، بخارات کے بلند ہونے کی حدود کے سلسلے میں ارسطو کی
ندی کی تنقید کا ذکر کرتا چلوں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ
ی بلندی سولہ (ستاڈیون) یعنی تقریباً تین ہزار دو سو میٹر
ہیں ہوتی۔ اس پر الکندی یوں تبصرہ کرتا ہے:
ی"[ارسطو] کو کیونکر علم ہوا کہ روئے زمین سے بخارات
سولہ سٹا ڈیا سے زائد نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ روئے زمین اور
ترین مقام کے درمیان۔ جہاں بخارات منجمد ہو کر بادل
، اختیار کر لیتے ہیں۔ کس قدر فاصلہ ہے"۔
. کی آراء پر ناقدانہ بحث کے بعد وہ کہتا ہے:
کچھ ہم نے عرض کیا اس سے واضح ہو گیا کہ اس حد کا
ہ نہیں ، جہاں پہنچنے پر بخارات کثیف ہو کر پانی بن
... بسااوقات اس کے زمین سے قرب یا بلندی کے اعتبار سے
ں عوامل رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ مقامات جہاں
ہاڑ ہوتے ہیں بلند بخارات کو گردش کی حرکت کا اثر
سے باز رکھتے ہیں ... الخ"۔
لویہ پر الکندی کے ہاں جو اہم نکات ملتے ہیں ان میں سے

ایک وہ رائے ہے جو اس نے فضا میں نظر آنے والے لاجوردی رنگ کا سبب متعیّن کرنے کے سلسلے میں پیش کی ۔ اس موضوع کی تاریخ بر ہمارے علم کے مطابق الکندی ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ رائے قائم کی کہ آسمان کا رنگ دراصل لاجوردی نہیں ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

,,فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہونے ہے اثر پذیر ہو کر ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا ہیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ہیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے ۔ (چنانچہ) ہمارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کے بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وہی یہ لاجوردی رنگ ہے ،،۔

تاہم سائنس کی تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ اٹلی کے لیونارڈو ڈاونچی اور جرمن شاعر گوئٹے وہ دو شخص تھے جنھیں پہلے پہل یہ توجیہ سوجھی ۔ لیکن جب ہم الکندی کی وضاحت اور اس کی توجیہ کا موازنہ ان دونوں کی آراء سے کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ الکندی کی رائے ، جو سائنسی علم رکھتا ہے ، ان دونوں سے زیادہ دقیق ہے جن میں سے ایک نے تو مصوّر کی نگاہ سے اس مظہر کو بیان کیا اور دوسرے نے شاعر کی نگاہ سے ۔ اور ان تینوں میں جنھوں نے اس مظہر کی توجیہ پیش کی ، صرف الکندی ہی ایسا ہے جس نے اس کے مقداری پہلو پر نظر ڈالی اور یہ رائے قائم کی کہ درمیانی فضا کی مقدارِ کثافت لاجوردی رنگ کے مدارج پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اس مقداری مشاہدے سے پہلی بار بروکے (Brücke) نامی عالم نے

الکندی کا ایک مستقل رسالہ ,,مدوجزر،، کے موضوع پر بھی ہے
انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کے دور میں مدوجزر کے مظہر
سب سے بھرپور اور سب سے مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

اس مظہر کی وضاحت کی تاریخ میں ہم یہ سنتے ہیں کہ
تھوستنیز (Arathóstenes) یونانی اور سلیکوس (Seleukos) بابلی نے
سری اور تیسری صدی عیسوی میں یہ رائے قائم کی کہ مدوجزر کا
ی نہ کسی شکل میں چاند کی حرکات سے تعلق ہے۔ تاہم یہ دونوں
مظہر کی توجیہ نہ کر سکے اور یہ گمان قائم کر لیا کہ جب کبھی
ند سمندر کے پاس سے گزرتا ہے، سمندر حیوان کی طرح سانس لیتا
۔

جہاں تک الکندی کا تعلق ہے سو وہ مدوجزر کی اقسام سے
ف ہے اور ان کو اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح وہ آج ہماری
موده صدی میں معروف ہیں۔ تاہم اسے یہ علم نہیں کہ اصل سبب
ند کی کشش ہے۔ شاید، قانون انبساط احجام کے زیر اثر ہونے کے
ث اس نے یہ توجیہ قائم کی کہ چاند فضائے زمینی سے گزرتے وقت
ارت پیدا کرتا ہے جو حرارت شمسی کے علاوہ ہوتی ہے۔ اس
ارت سے ہوا کا حجم پھیلتا ہے اور نتیجۃً سمندر کا حجم جس کے
ں سے چاند گزرتا ہے، بھی پھیل جاتا ہے۔

یہ بات مجھ پر واضح ہو چکی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے
یبنی عالم رابرٹ گروستسٹے (Robertus Grosseteste) نے الکندی کی
ب دیکھی تھی اور اس سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا تھا۔ اور
رستسٹے کے رسالے ہی کو مدوجزر کے مظہر کا اولین مفصّل علمی
شمار کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ الکندی کی توجیہ گروستسٹے
واضح نہیں ہو سکی چنانچہ اس نے اسے ایک عجیب و غریب

انداز میں سمجھا (دیکھئے میری کتاب تاریخ التراث العربی کی
ساتویں جلد) ۔

مسلمان علماء نے چاند کی کشش کے سبب سے مدوجزر کی توجیہ
تک فوراً بعد کی صدیوں میں رسائی پالی ۔ چنانچہ ایک گمنام مؤلف
کا ایک رسالہ ہم تک پہنچا ہے جو مختلف آراء کے ساتھ ساتھ ا
لوگوں کی رائے بھی پیش کرتا ہے جو چاند کی کشش کی بنیاد پر اس
کی توجیہ کرتے ہیں ۔ امکان یہ ہے کہ یہ رسالہ پانچویں صدی ہجری
میں تالیف ہوا ہو ۔ اس میں مؤلف نے کرۂ ارض پر مدوجزر کے اہ
مقامات کے نقشے بھی بنائے ہیں ۔

یہاں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آثار علویہ کے میدان میں
مسلمانوں نے جن جن نتائج تک رسائی حاصل کی سب کو بیان
دوں تاہم الکندی کے بعد کے بعض اہم نتائج کی طرف اشارے پر اکتف
کرتا ہوں ۔

قابل ذکر امور میں سے ایک یہ ہے کہ النیریزی جو چوتھی صد
ہجری کے اوائل میں ہو گزرا ہے ، پہلی بار بادلوں اور بخارات ک
بلندی کی پیمائش کے لئے آلات وضع کرتا ہے اور یہ آثار علویہ ک
تاریخ میں ایک نیا مرحلہ ہے ۔ چوتھی صدی ھی کے اواخر میں
ابوسھل الکوھی یہ حساب لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ شہابیے ک
کن فاصلوں پر ہیں اور اس نوع کی تحقیق فضائی امور سے متعلق ا
تصوّر ہونی تھی ۔

تاہم آثار عِلویہ کی تاریخ میں عربی کی اہم ترین کتاب
ابراھیم بن سنان بن ثابت بن قرۃ کی کتاب ,,الابانۃ عن الطر
المتعرّفۃ،،[۷] ہے ۔ اس کی وفات چوتھی صدی ھجری کے اواسط
ہوئی جبکہ اس کی عمر ابھی چالیس برس کی بھی نہ تھی ۔ ریاض

ر علم الفلک کے میدان میں اس نے حیرت انگیز دریافتیں کیں ۔
نیف و تالیف کا آغاز اس نے اٹھارہ برس کی عمر ھی میں کر دیا
ا۔ سورج کی حرکات پر اس کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اچانک
جھے اس کتاب [الابانة] کی اھمیت کا احساس ھوا کیونکہ اس میں
ثار علویہ پر ارسطو کی کتاب زیر تنقید لائی گئی ہے۔ ارسطو پر اس
ی تنقید کے بعض اقتباسات دیکھ لینے کے بعد میں اس کی اس
تاب کو عربی اسلامی ورثے کی اھم ترین گم گشتہ کڑیوں میں شمار
رتا ھوں۔ سب سے پہلے اس شدید تنقید کا ذکر مناسب ھو گا جو
س نے پیروان ارسطو پر ان الفاظ میں کی ہے : (۸)

,,ان لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ یہ ارسطو کی تمام تر آراء کے
دفاع میں افراط سے کام لیتے ھیں اور یہ سمجھتے ھیں کہ ان میں
لغزش کا وجود ممکن نہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ ارسطو مجتھد
ضرور تھا معصوم و مؤیّد نہ تھا ۔اور اجتھاد میں خواہ کتنی ھی عرق
ریزی کیوں نہ کی جائے بہرحال لغزش کا اندیشہ باقی رھتا ہے۔ یہ وہ
مقام ہے جہاں ان کی ھٹ دھرمی (۹) سے شکایت پیدا ھوتی ہے اور ان
کے طور طریقے پر افسوس ھوتا ہے۔ یعنی وہ اسے اپنے لئے درست
سمجھتے ھیں کہ ارسطو کی کتاب الآثار العلویہ کی بتمام و کمال
پیروی کرتے رھیں ،، ۔

ارسطو کی کتاب پر اس کی تنقیدات میں سے صرف تین ھم تک
پہنچی ھیں :

۱ ۔ پہلی بات جسے وہ سخت غلطی قرار دیتا ہے ارسطو کی یہ
رائے ہے کہ خط سرطان سے نیچے آبادی ختم ھو جاتی ہے اور اس سے
آگے جنوب کی سمت اس کا وجود ممکن نہیں (۱۰) کیونکہ اس کے
خیال کے مطابق شمال اور مغرب کی طرف سایہ نہیں پایا جاتا ۔

۲ ـ دوسری بات پہاڑوں کی فضا میں بخارات کے وجود کی حدود سے متعلق ارسطو کی رائے ہے ـ (۱۱) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے : (۱۲) ,,ارسطو کا خیال ہے کہ بخارات کوہ قاقوس[Caucasus]تک بلند نہیں ہوتے اور ہوائیں وہاں تک نہیں پہنچتیں ـ اس پر اس کا استدلال یہ ہے کہ وہ لکیریں اور ہندسے جو قربانیوں اور ذبیحوں کی راکھ پر بنائے جاتے ہیں جوں کے توں باقی رہتے ہیں ـ نہ ہوائیں ان کو مٹاتی ہیں نہ بارش ختم کرتی ہے ـ[تاہم اس نے ہوا کی تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا](۱۳)حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اس پہاڑ پر چلنے کا راستہ ہی نہ سوجھتا اور نہ وہ سب کام ممکن رہتے جو وہ اپنی قدیم جاہلیت کے دور میں وہاں جا کر انجام دیتے تھے ـ پھر وہ اس تاریکی (۱۴) کا بیان بھی ضرور کیا کرتے کیونکہ یہ باقی باتوں سے بڑھ کر اچنبھے کی چیز تھی بلکہ اس سے متعلق ایسی اساطیر گھڑ لیتے جو قربانی کے جانور لے کر اس پہاڑ پر جانے والوں اور پھر واپسی پر ان سے[وہاں کے احوال]سننے والوں کے عقائد کو تقویت پہنچاتیں " ـ

۳ ـ تیسری بات جو میرے خیال میں اس کا سب سے اہم اعتراض ہے اس اصول کے رد میں ہے جس پر یونانی اور بہت سے مسلمان علماء بھی نہ صرف آثار علویہ کے میدان میں بلکہ طبیعیات کے سلسلے میں بھی یقین رکھتے تھے ـ یہ اصول اہل یونان کے ہاں(Antiperistasis) کہلاتا تھا (۱۵) ـ الکندی کے الفاظ میں یہ اصول ,,متضاد عوامل مثلاً ظاہر و باطن کی کیفیات کی تقسیم " سے عبارت ہے ـ مراد یہ کہ حرارت اپنے آپ کو آس پاس کی برودت کے مقابلے میں سمیٹ کر رکھتی ہے ـ اور اس کے اثر سے خود کو گھٹنے نہیں دیتی اور اسی طرح بالعکس ـ ارسطو بہت سے فضائی مظاہر کی توجیہ اسی اصول کی بنیاد پر کرتا ہے ـ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ارسطو کی رائے میں

موسم گرما کی بارش گرم بخارات کے اس برودت سے ٹکرانے کا نتیجہ ہوتی ہے جو گرم ہوا میں محبوس ہوتی ہے۔ الکندی اور بعض دوسرے مسلمان علماء مثلاً ابن العمید اسی فضائی مظہر کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ گرم بخارات فضا میں سرد ہوا سے ٹکراتے ہیں جس کے نتیجے میں گرم بخارات کا حجم سکڑ جاتا ہے اور یہی توجیہ وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے کہ موسم گرما میں مصر اور جزیرہ عرب میں بارش کم کیوں ہوتی ہے اور ہندوستان میں زیادہ کیوں ہوتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں موسم گرما کی بارش کی جو توجیہ ابن العمید نے بیان کی ہے وہ موجودہ دور کی توجیہ سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا سبب بحرهند سے آنے والے بخارات کی کثرت کا اس شمالی ہوا سے ٹکراؤ ہے جو سورج کے شمالی جھکاؤ کے باعث پھیل کر ادھر آ رہی ہوتی ہے۔

یہ اصول ,,جوّالأسراب،، [تہ خانوں کی فضا] کے عنوان سے چوتھی صدی ہجری میں علماء کے ہاں موضوع اختلاف بنا رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم بن سنان ارسطو کے اصول کو تجربے کی بنیاد پر یوں رد کرتا ہے : (١٦)

(١٧) ,, اور میں نے دو مساوی اور باہم مشابہ برتنوں میں اس حد تک ٹھنڈے اور گرم سادہ پانی کی ، یکساں مقدار ڈالی جسے چھونے سے تکلیف محسوس نہ ہو۔پھر دونوں کو بیک وقت خشک(١٨) ہوا کے سامنے رکھا ، سو ٹھنڈے پانی کی سطح جم گئی جبکہ گرم پانی میں ہنوز گرمی کی کچھ رمق باقی تھی ۔ میں نے اس تجربے کو دہرایا ور گرم پانی کو خوب کھولا لیا (١٩)۔ نتیجۃً ٹھنڈا پانی جم گیا۔ جبکہ گرم پانی ہنوز پہلے تجربے والے درجہ حرارت تک بھی نہیں آیا تھا۔

علاوہ ازیں تہ خانوں کی فضا کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ

وہ موسم گرما کی نسبت موسم سرما میں زیادہ گرم ہوتی ہے نیز بالعکس ، حالانکہ دونوں موسموں میں موم یا پگھلی ہوئی چربی کے وہاں کی فضا میں جم جانے کی مدت کا تجربہ اور پھر اس بات کا ریکارڈ کہ جسم سے متصل لباس (۲۰) کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہے جس سے دونوں(۲۱) موسموں میں وہاں پر جسم موسم کی شدت سے بس محفوظ رہ سکے ، ان کی رائے کو غلط ثابت کرتا ہے اور اسی رائے کی تصدیق کرتا ہے کہ گرمی اور سردی ہوا کو لاحق ہونے والی دو کیفیتیں ہیں ۔ نیز یہ کہ ہوا کا جو حصہ زمین کی بیرونی سطح سے متصل ہوتا ہے وہ ان دونوں کیفیتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے بنسبت اس حصے کے جو سطح زمین سے دور ہوتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارسطو کے معتقدین میں سے ایک فاضل شخص نے مجھ سے کہا : ,, اگر اسے درست مان لیا جائے تو کیا (۲۲) ہمارے تمام علوم طبیعیات ناقص نہ قرار پائیں گے ؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر ناقص ٹھہریں گے تو وہ اصول ٹھہریں گے جن پر تم نے عمارت اٹھائی ہے اور جو چیز حقیقت پر مبنی نہیں اس کے علم کو ,,علم،، کہنا ھی درست نہیں،،۔

مندرجہ بالا بحث کے تسلسل میں میں یہاں ایک شعاعی مسئلے کا بھی ذکر کرنا چاھوں گا جو (Meteorology) کے دائرے میں زیر بحث آتا رہا ہے۔ یعنی روشنی کی رفتار کا مسئلہ۔ علمائے یونان آسمانی بجلی اور گرج کی رفتار پر بحث کیا کرتے تھے اور اس ضمن میں بار بار یہ کہتے تھے کہ روشنی کے محسوس ہونے میں وقت صرف نہیں ہوتا جبکہ آواز کے محسوس ہونے میں وقت لگتا ہے۔ مسلمان علماء بھی اسی رائے کے قائل تھے جن میں ابن سینا بھی شامل ہے۔ لیکن ابن الهیثم نے پہلی بار یہ لکھا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اور

[illegible]

اخر میں اس اهم توضیح کا ذکر کرنا چاهوں گا جو مسلمان علماء
ے هاله اور قوس قزح کے پیدا هونے کی توجیه میں پیش کی - اس
ضمن میں انهوں نے حیران کن نتائج تک رسائی حاصل کی - یہاں ان
کی تفصیل میں جانا ممکن نه هو گا صرف اجمالاً ان کا ذکر کروں گا۔
ان کی دریافتوں کی اهمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری هو گا که هم
یه بھی جانتے هوں که یونانیوں بالخصوص ارسطو اور اس کے شاگرد
تھیوفراسٹس کے تصوّرات کیا تھے - ان کے هاں نقطۂ آغاز یه تھا که
آنکھ سے نکلنے والی بصری شعاع بادل تک اور پھر منعکس هو کر
چاند اور سورج تک پہنچتی ہے گویا اس مسئلے کی وضاحت میں
ارسطو ، صاف طور پر یه کہتا تھا که بادل کا زمین سے فاصله اتنا
ھی ہے جتنا چاند اور سورج سے ہے (۲۳) - هاله بننے کے سلسلے میں
تھیوفراسٹس کا تصوّر یه تھا که چاند اپنی روشنی کی موجوں نیز اپنے
گرد موجود بادل اور کھرکے ساتھ دور هٹ جاتا ہے -

چوتھی صدی هجری کے اواخر میں مسلمان علماء نے یه سمجھ
لیا که چیزوں کا نظر آنا ان چیزوں سے آنے والی شعاع کے آنکھ میں
داخل هونے کے سبب سے هوتا ہے اور اسی اساس پر وہ هاله اور قوس
قزح کے پیدا هونے کو زیر بحث لاتے تھے - هم دیکھتے هیں که ان کی
توضیحات کا ارتقاء بالآخر ساتویں صدی هجری کے کمال الدین
الفارسی کی شخصیت میں اس صحیح حل تک پہنچ گیا جو
فرانسیسی عالم ڈیکارٹ (Descartes) کے هاں سترھویں صدی
عیسوی میں نظر آتا ہے - یعنی یه که قوس قزح فضائے آسمانی میں
موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دوبار ٹوٹنے کا نتیجه ہے اور رنگ
اس شکستِ شعاع کے زاویوں کے اختلاف سے پیدا هوتے هیں -

حواشی از مترجم

۱۔ ارسطو کی یہ کتاب چار مختصر حصوں میں منقسم ہے۔ تعارف کے لئے دیکھئے :

arton George, Introduction to the History of Science, Washington, 1950-53, 1/333.

"Meteorology" کے عنوان سے اس کے مکمل انگریزی ترجمے کے لئے دیکھئے :

reat Books of the Western World, (Britannica Great Books), Chief Ed. Hutchins R.M., Encyc. Brit. Inc. 1952, 8/445-494 (tr. by E.W. Webster)

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس انگریزی ترجمے کے حوالے کے لئے صرف ,,ارسطو، eteorology استعمال ہوگا۔

۲۔ دیکھئے ارسطو، Meteorology ، ص ۳۶۳

۳۔ خطبے میں اقتباسات کے حوالے مہیا نہیں کئے گئے اور الکندی کے سلسلے میں تو کتاب کا نا بھی مذکور نہیں لہذا اصل تک رسائی ہمارے لئے ممکن نہ ہو سکی ۔

۴۔ Appolonius of Tyana سے منسوب کتاب

Book of Causes (or Secret of the Creation)

مراد ہے۔ دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of of Learned Societies, Chief Ed. C.C. Gillispie, New York, 1981, 7/41, 13/407.

۵۔ دیکھئے ارسطو، Meteorology ص ۳۵۳۔

۶۔ چلتی ہوا (ریح ، Wind) ، ہوائے محض (ہواء Air) اس بحث کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ارسطو، Meteorology ص ۳۵۵ ، ۳۶۵۔

۷۔ مطبوعہ حیدرآباد میں ,,المحترقة ،، ہے اور فاضل محقق نے اس کی اصلاح کی ہے۔ دیکھئے ابراهیم بن سنان ، کتاب فی حسرکات الشمس ، دائرة المعارف العثمانية ، حیدر آباد دکن ۱۳۶۷ ھ/ ۱۹۴۸ ع ص ۵۶۔

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس کتاب کے حوالے کے لئے صرف ,,حرکات الشمس ،، استعمال ہوگا۔

۸۔ بحوالۂ بالا۔ خطبے میں اقتباس کی عبارت کئی جگہ لفظی فرق رکھتی ہے۔

۹۔ بحوالۂ بالا۔ مطبوعہ میں ,,وھذا موضع شکایة آباه هم ،، ہے۔ خطبے میں بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔ تاہم ہماری سمجھ میں اس کا کچھ مفہوم نہیں آیا ...

ہو گا جس میں ,,اِباء ،، سے مراد ,,ابائے حقیقت ،، ہے۔ اسی قیاس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔
بحوالۂ بالا ، نیز موازنہ کیجئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۶۸ ۔
یہاں غالباً فاضل محقق کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اصل کتاب میں اس مقام پر یہ تو پہاڑوں کی فضا میں بخارات کا مسئلہ زیر بحث ہے نہ اس سلسلے میں ارسطو کی رائے زیر تنقید ہے۔ تنقید اس رویے پر ہو رہی ہے کہ ارسطو کے متبعین اس کی اپنی آراء پر بھی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے ان آراء پر مزید قیاسات قائم کر کے انہیں مشاہدے کا قائم مقام تصوّر کرنے لگتے ہیں ۔ اس ضمن میں احمد بن الطیّب السرخسی کی وہ رائے زیر بحث لائی گئی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ,,ارکان الفلسفہ ،، میں بیان کی ہے اور جس کے بموجب بہت زیادہ بلند مقامات پر ہوا کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ ابن سنان اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ارسطو کی کتاب ,,الحس والمحسوس ،، (Sense and the Sensible) میں ہوا کی سیاہی کا جو اشارہ ملتا ہے ، سرخسی نے اس پر مبالغے کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ حالانکہ کوہ پیماؤں کا تجربہ و مشاہدہ اس امر کی قطعاً تصدیق نہیں کرتا ۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ خود ارسطو کے نزدیک کوہ قافوس بلند ترین پہاڑ ہے جس تک ، بقول ارسطو بخارات اور ہواؤں کی بھی رسائی نہیں ، لیکن اس نے وہاں بھی ہوا کی سیاہی یا تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ الغرض ارسطو کا ذکر ضمناً آیا ہے اصل تنقید سرخسی کی مبالغہ آرائی پر ہے۔ دیکھئے ، حرکات الشمس ، ص ۵۳ ـ ۵۵ ، ۵۶ ۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارسطو کے ہاں جہاں کوہ قافوس کے بلند ترین پہاڑ ہونے کا ذکر ہے وہاں دیحوں وغیرہ کی راکھ ور اس پر سالے جانے والے نقوش کا ذکر ہمیں نظر نہیں آیا (دیکھئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۵۰) ۔ اگرچہ ہواؤں کے ضمن میں ایک اور مقام پر یہ جملہ موجود ہے :

"They do not seem to blow above the level of th highest mountains"

(ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۴۸) ۔

شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ابن سنان (م ۳۳۵ ھ/۳۷ ـ ۹۳۶ ء) کے سامنے ارسطو کی کتاب کا کوئی قدیم تر اور زیادہ مکمل نسخہ تھا ۔ معاصر مغربی دنیا میں جن مخطوطات سے اس کتاب کا متن معیّن کیا گیا ہے ان میں قدیم ترین غالباً وہ ایک نسخہ ہے جس کا تعلق دسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے سے ہے۔ (دیکھئے : ISIS, III, 1920, p. 278)

۱۲ ۔ حرکات الشمس ، ص ، ۵۵ ، یہاں بھی اقتباس کی عبارت اصل سے کامل مطابقت نہیں رکھتی ۔

۱۳ ۔ فاضل محقق نے ,,لم یذکر فیہ شیئاً من سواد الھواء ،، کے الفاظ یہاں سے حذف کر دیئے ہیں حالانکہ ان کے بغیر وہ استدلال سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جس کی تلخیص اوپر بیان ہوئی (دیکھئے حوالہ بالا)

۱۴ ۔ حرکات الشمس (حوالہ بالا) میں ,,الظلام ،، ہے اور یہی بر محل معلوم ہوتا ہے ۔ فاضل محقق نے اسے ,,الکلام ،، بنا دیا ہے۔

۱۵ ۔ دیکھئے : Dictionary of Scientific Biography, 9/133, 13/330

۱۶ - ہماری فہم ناقص کے مطابق یہاں بھی فاضل محقق کو ایک گونہ التباس ہوا ہے کیونکہ آگے بیان ہونے والی دو مثالوں میں سے پہلی کا ,,جوّ الأسراب ,, سے کوئی تعلق نہیں ۔ صرف دوسری اس سے متعلق ہے ۔ پہلی مثال اسی رویے کے ضمن میں لائی گئی ہے جس پر تنقید سرخسی کے حوالے سے ہوئی ۔ اسی تسلسل میں متبعین ارسطو کا یہ قیاس زیر بحث آیا ہے کہ گرم پانی چونکہ لطیف تر ہوتا ہے اور اس کے سالموں میں باہمی فاصلہ زیادہ ہو جاتا ہے ، اس لئے وہ ٹھنڈے پانی کی نسبت جلد جم جائیگا کیونکہ ٹھنڈا پانی کثیف ہوتا ہے اور اسکے سالمے باہم پیوستگی کی حالت میں ہوتے ہیں ۔ اس کے رد میں ابن سنان نے ٹھنڈے اور گرم پانی پر اپنے تجربے کی تفصیل بیان کی ہے جس کا تہہ خانوں کی فضا سے کوئی تعلق نہیں ۔ البتہ دوسرا تجربہ جو موم اور چربی وغیرہ پر کیا گیا ، زیر زمین درجۂ حرارت سے متعلق ہے اور ایک الگ چیز ہے ۔

۱۷ - اس اقتباس کے متن — (حرکات الشمس ، ص ۵۶ - ۵۷) — میں کئی مقامات محل نظر معلوم ہوتے ہیں اور یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید ان میں ایڈیٹنگ کی کچھ خامی ہے ۔ تاہم اصل مخطوطے تک رسائی نہ ہونے کے سبب ہمارے لئے اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں کہ عبارت جس حد تک بھی ہمارے فہم ناقص میں آ سکے اس کی ترجمانی کر دیں ۔

۱۸ . حرکات الشمس (ص ۵۷) میں ,,النشّاف ,, ہے جس کا کچھ مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ۔ ممکن ہے کہ یہ ,,النشّاف,, ہو جس سے مراد چوس لینے والی یعنی حرارت جذب کر لینے والی ہوا ہو ۔ خطبے میں اسے ,,الحاف,, بنا دیا گیا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بھی ,,النشّاف,, کے قریب قریب ہی ہے ۔ چنانچہ اسی کے مطابق ترجمہ کر دیا گیا ہے ۔

۱۹ - حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,أعليت,, ہے ۔ ہمارے قیاس میں یہ ,,أغلیت ,, ہے ۔

۲۰ - حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,الشباب ,, ہے جو سیاق کلام میں ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے ۔ ہم نے اسے ,,الثیاب ,, تصور کیا ہے ۔

۲۱ - حرکات الشمس میں ,,منہا,, ہے ۔ خطبے میں بجا طور پر اسے ,,منہما,, بنا دیا گیا ہے ۔

۲۲ - حرکات الشمس اور خطبے میں ,,لوصحّ ھذا لا ینقص ما معنا من العلوم .. ,, ہے لیکن سبق و سیاق نیز وزان عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ ,,لا,, کی جگہ ألا ,, ، بصیغۂ استفہام ، سمجھا جائے

۲۳ - موازنہ کیجیئے ارسطو Meteorology ، ص ۳۷۷ .

قرآنیات

قرآنیات پر عموماً اور قرآن کے مفسروں کی ۱۴ سو سالہ خدمات میں خصوصاً [illegible]

سمینار ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا۔ اسمیں ایک مقالہ ڈاکٹر انصار اللہ نے بھی پیش کیا تھا۔ وہ نظر

پیش خدمت ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن کا مختصر سا مقالہ بھی اپنے موضوع پر خاصا [illegible] ہے۔

امید ہے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ادارہ

ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان

اور

قرآن پاک کے تراجم

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

۴/۵۰۵ سرسید روڈ
سرسید نگر، علیگڑھ

دکن کے علاقوں میں اس سلسلے میں، جس سے بالآخر شنکر آچارج کا تعلق ہے، ایک شخص یامن آچارج ([illegible]) ہوا ہے۔ شنکر آچارج کے زمانے پر اگر قیاس کریں تو یامن آچارج کو پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی کا آدمی ماننا ہوگا۔ تمل زبان میں اس کا نام آڑوندار۔ (आड़वन्दार) ہے یعنی وہ جو حفاظت کے لیے تشریف لائے۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن کا کہنا ہے کہ یامن آچارج مسلمان تھا۔[1] اس شخص کے ظہور[2] کے بارے میں جو روایت مشہور ہے اس سے بھی مہرشی جی کے قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یامن آچارج ہی وہ شخص ہے جس سے بھکتی کے تصور کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں آنے کے بعد ہی مسلمان بزرگوں نے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ عبادت اور ریاضت کے معاملوں میں بھی ایسی صورت اختیار کی جائے جو یہاں کے ماحول اور مزاج سے مطابق ہو اور غیریت کا احساس پیدا نہ ہو تاکہ یہاں کے عوام ان کے زیادہ سے زیادہ قریب آسکیں اور ان کی باتوں کو جلد از قبول کرلیں اس طرح اسلامی عقائد اور تعلیمات بالواسطہ طریقے پر بتدریج رواج پاتے رہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی اسی رواداری نے انھیں بھکتی یعنی نیازمندیِ عشق کے طریقہ کو جو خالقِ کائنات تک رسائی بلکہ اس کی ذات میں فنا ہو جانے کا عمل تھا، اختیار کر لینے کی تحریک کی تھی۔ یامن آچارج کے بعد یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ شمالی ہند میں بھی پہنچا البتہ یہاں جن لوگوں نے اس طریق کو پہنچایا تھا وہ برہمن تھے اور انھوں نے اس طریق کو اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے مطابق ڈھال لیا تھا شمالی ہند کے ابتدائی زمانے کے مسلمان صوفی بزرگوں نے بھی عشق کے راستے کو اختیار کیا تھا اور ان کا مشرب یامن آچارج کے طریقے سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہاں کی زبان میں وہ صوفی بھگت کہلائے۔ یہاں کے مخصوص حالات میں انھوں نے بہترین انداز سے تبلیغ و اشاعتِ مذہب کے سلسلے کو جاری رکھا۔ بتایا گیا ہے کہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے زبان ہندی میں گیتوں کے گائے جانے کی اجازت دی۔ اجمیر میں آج تک عرس کے موقع پر استُتی (स्तुति) یعنی خدا کی حمد کے گانے کا رواج چلا آتا ہے۔ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے شیخ اکھر وتی نے تو زبانِ ہندوی (اردو) کی ابتدا کا سلسلہ بھی حضرت خواجہ بزرگ اجمیری سے ہی جوڑا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں[3]:

"و توہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ، زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملکِ عرب مخصوص نہ بودہ۔ پس ہر ملکے کہ بودہ زبانِ آں ملک را بکار بُردہ اند۔ و گمان نکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندوی تکلم نکردہ، زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ"

۱؎ یہ بات راقم کو ڈاکٹر ڈی۔ اس ورون نے بتائی ہے لیکن وہ یامن آچارج کو مسلمان نہیں مانتے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ سری رامانج کے بعد ان کے ایک شاگرد قریش سوامی ہوئے ہیں۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام کمار ورما ص ۱۱۶) ۲؎ کبیر جوگ مہرشی شیوبرت لال ورمن مطبوعہ نظام آباد جلد اول ص ۱۸ معارف
۳؎ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی انجمن ترقی اردو کراچی، مرتب سید عارف نوشاہی ۱۹۸۴ء ص ۱۳۶۔

مدازاں حضرت قطب الاسلام قدس اللہ سرہٗ وبعدازاں حضرت گنج شکر قدس اللہ سرہٗ ۔۔۔"

ت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی:
سجد، دوم زبان اہلِ ہند۔

لک میں جن مقاموں پر انھوں نے قیام کیا ہوگا، وہیں کسی جگہ کو مسجد کے لیے مقرر کر لیا ہوگا اور وہی جگہ بالآ
مانوں کے دینی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی ہوگی۔ مسجدوں میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جاتی ہوگی اور
ہر نو مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے عام رہی ہوگی بلکہ تعلیم دینے والوں میں نو مسلموں کا کردار زیادہ سے زیادہ اہم
ا ہوگا کیوں کہ وہ نہ صرف یہاں کی زبان بلکہ یہاں کے لوگوں کے مزاج اور انداز فکر کے بھی نبض شناس تھے۔ تعلیم
نے والوں میں اکثریت ان عوام کی رہی ہوگی جن کا تعلق غریب اور پست تر طبقہ سے ہوگا چنانچہ تدریس اور رابطہ
ا زبان غیر سنسکرت ہوگی اور چونکہ وہ بول چال میں رائج تھی، لب و لہجہ اور مقامی اصطلاحوں کے اختلاف
با وجود ملک کے بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہوگی۔ عوام ان پڑھ تھے۔ ان کی بول چال کی زبان کو مسلمانوں نے اپنے
رسم خط میں لکھا ہوگا۔ ایسی قدیم تحریروں کی جستجو کا ابھی سلسلہ بھی غالباً شروع نہیں ہوا ہے۔ راقم کو قرآن پاک کے
یسے دو ترجموں کا علم حاصل ہو سکا ہے جن میں سے ایک تمل اور دوسرا ملیالم زبان میں ہے اور دونوں عربی خط میں
لکھے گئے ہیں۔[1] یہ ترجمے بہت جدید ہیں۔ قدیم تحریروں کی تلاش جاری ہے۔

زبان ہندوی (قدیم اردو) میں اسلامی تعلیمات کی تلقین و اشاعت کا ذکر سب سے پہلے تیسری صدی
ہجری نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتا ہے جب بقول بزرگ بن شہریار ایک عراقی نے جو زبان ہندوی سے
واقف تھا "الرا" (اروڑ) کے راجا کو منصورہ (سندھ) کے بادشاہ عبد اللہ کے حکم سے ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں وہاں
جا کر "اسلام کی شریعت کا حال ہندوی زبان" میں بتایا تھا۔ کہتے ہیں اس نے قرآن شریف کا اس زبان میں
ترجمہ کر کے بھی سنایا تھا۔ تلقین و تبلیغ کا یہ کام زبانی تھا اور تادیر اسی طور پر جاری رہا۔

سلطان محمود غزنوی پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندستان کی مذہبی اور علمی زبان سنسکرت میں کلمۂ طیبہ
کا ترجمہ اپنے "دلی والے" سکوں پر لکھوایا اور ساتھ ہی اس پر ہجری سال بھی منقش کرایا تھا۔ ان اندراجات کے
ہندوستان پر دور رس اور دیرپا اثرات مرتب ہو سکتے تھے ان کا قیاس کیا جانا چاہیے۔ اس وقت سے گویا سنسکرت کا دروازہ

1۔ محمد صاحب علیم صبا نویدی نے تمل زبان میں اسلامی موضوعات سے متعلق حال کے مطبوعہ ایسے دس رسالے راقم کے پاس بھیجے ہیں۔ جو عربی خط میں ہیں۔ اس سے
بات یقینی طور پر ہمارے علم میں آ جاتی ہے کہ تمل زبان کے لیے اب بھی عربی خط کا استعمال ہوتا ہے۔ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۷

مسلمانوں کیلئے کھل گیا تھا اور پھر تو اپنے مسلک، عقیدے اور مزاج کے مطابق وہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بھی کرنے لگے۔ اس صورتِ حال نے اس زبان کو نئی زندگی اور ایک مختلف مزاج عطا کیا۔ مسلمانوں کے شعروں کو غالبًا قدیم طرز کے "اشلوکوں" سے میز کرنے کے لیے "شرلوک"[1] کہتے تھے۔

زبان ہندوی کو تو مسلمانوں نے شروع سے اپنا لیا تھا اور اپنے معتقدات و نظریات کو اس میں زبانی پیش کرتے آرہے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں مولانا داؤد نے لورک اور چاندا کے معاشقہ کی داستان کو "چندائن" کے نام سے ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء میں نظم کیا اور اس داستان کے واسطے سے انھوں نے نہایت موثر اور دلگداز انداز سے اسلامی تعلیمات کو پیش کیا تھا۔ یہی زبان ہندوی کی پہلی دستیاب تصنیف ہے اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ:

"مطابق تفسیر بعضے از آیاتِ قرآنی"[2] ہے اس کتاب میں متعدد اشعار واضح طور پر قرآن پاک کی آیتوں کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

اُس ابتدائی زمانے میں لازم تھا کہ قرآن پاک کی افہام و تفہیم ہندوستانیوں کے مخصوص علمی اور فکری مزاج کی مناسبت سے ہو، چنانچہ قدما خود اس کتابِ الٰہی کو بجائے قرآن کے "پُران" کہتے رہے ہیں۔ شیخ قطبن نے اپنے ممدوح مسلمان بادشاہ کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے ؎

پنڈت اَو بُدھونت سیانا   پڑھے پوران، ارتھ سب جانا

یعنی وہ صاحب علم اور زیرک ہے۔ وہ قرآن پڑھتا ہے اور اُس کے تمام مطالب سے آگاہ ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں تادیر مستعمل رہا ہے۔ ملک محمد جائسی نے بھی "پدماوت" میں کہا ہے ؎

پُن سو عثمان پنڈت بڈ گُنی   لکھا پُران جو آیت سُنی

یہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ پنڈت کا لفظ صاحب علم کے معنی میں عام تھا۔ آج کے مروجہ اصطلاحی مفہوم میں اس کا استعمال بعد کے زمانے کی بات ہے۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے ختم تک قرآن پاک کے مطالب کی پیشکش کا انداز وہی تھا جو مذکور ہوا۔ شیخ بہاء الدین باجن نے اپنے کلام میں قرآنِ پاک کی مختلف آیتوں کے مطالب کو نظم کیا۔ مثلاً سورۂ اخلاص کے مفہوم کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نا اُسکھ جینا، ناوہ جایا   نا اُنکھ مای باپ کہایا

---

[1] شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے رشد نامے میں ان کے شرلوک منقول ہیں اور مولانا داؤد نے بھی چندائن میں کہا ہے۔ ملا کہتا کا ایک شرلوک نمونے کے لیے پیش کیا۔

[2] منتخب التواریخ ۔ عبدالقادر بدایونی

نا اُنھ کوں گود ہِ چڑھایا | با آجن سب اُنھ آپ نپایا

اسی طرح کہتے ہیں ؎

آں کاسۂ زنجبیل مزاجھا کافورا | واں مشک لون ز بوے شراب طہورا

پہلا مصرع اس آیت کا ترجمہ ہے: اِنَّ الابرار یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا

اور دوسرا مصرع اس آیت کا: ویسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا

یہ دونوں آیتیں سورۂ دہر کی ہیں۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے اسلامی تاریخ کے واقعات اور اسلامی تعلیمات کے واضح لفظوں میں بیان کیے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اشرف بیابانی کی نظم "نوسرہار" میں جو ۹۰۹ھ/۴-۱۵۰۳ء کی تصنیف ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے ایک غیر معمولی واقعہ یعنی سانحۂ کربلا کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد اسلامی عقائد اور مسلمان بزرگوں سے متعلق تصنیف و تالیف کا سلسلہ عام ہو گیا۔ جہانگیر بادشاہ نے تزک میں اپنے تیرھویں سال جلوس کا ایک واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"بمشارٌ الیہ فرمودیم کہ مصحف بہ عبارتِ سلیس خالی از تکلف و تصنع ترجمہ نماید و اصلاً بہ شرح و بسط، شانِ نزول آں مقید نشدہ، بہ لغاتِ ریختہ قراں را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بر معنی تحت اللفظ نیفزاید و بعد از اتمام آں مصحف ــــ روانہ درگاہ سازد"[1]

یہ نہیں معلوم کہ جہانگیر کی یہ فرمائش پوری ہوئی یا نہیں۔

یہ بات صحیح طور سے معلوم نہیں ہے کہ ہندستانی زبانوں میں قرآنِ کریم کا ترجمہ سب سے پہلے کس نے اور کب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے[2] کہ قاضی محمد معظم سنبھلی نامی کسی شخص نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پہلے سالِ جلوس یعنی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں یہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد کسی مجہول الحال شخص نے دوسرا ترجمہ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں بادشاہ مذکور ہی کے عہد میں کیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں ترجموں کا کیا جانا خلافِ قیاس نہیں ہے لیکن ان دونوں ترجموں کے بارے میں کوئی بات بھی ہمارے علم میں نہیں ہے۔

قرآنِ پاک کے اردو تراجم کے نقطۂ نظر سے نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کا زمانہ خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس کے زمانے میں ایک سے زیادہ لوگوں نے اس کام کو کیا، بلکہ خود اسی نے اپنی مشہور تصنیف[3] عجائب القصص

---

[1] اس کے لیے راقم پروفیسر شیخ فرید برہانپوری صاحب کا ممنون ہے [2] مقالاتِ (محمود) شیرانی جلد ۲۔ [3] قرآنِ کریم کے اردو تراجم مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں، سید عبد القدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) ص ۱۲ [4] عجائب القصص ص ۵۶۸، ۵۷۴ وغیرہ

(آغاز ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء) میں احادیث اور آیات قرآنی کا ترجمہ کرنے کے علاوہ ان کی تشریح اور تفسیر بھی لکھوا دی ہے۔ ایسے مقاموں پر شیخ محمد واعظ الہ آبادی کی جامع المعجزات کے علاوہ کتب حدیث اور تفسیر مثلاً تفسیر معالم التنزیل، تفسیر بیضاوی وغیرہ کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

یہ بات عام طور سے تسلیم کی گئی ہے کہ قرآن پاک کا اولین ترجمہ وہ ہے جو شاہ رفیع الدین نے ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء میں کیا تھا۔ اس کے بعد یہ کام شاہ عبدالقادر نے ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں کیا، لیکن مطبوعہ صورت میں اولین[1] دستیاب ترجمہ مولانا لطیف اللہ لکھنوی کا ہے۔ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی تھی اور وہ اصل متن اور ترجمے کے ساتھ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج کے مطابق صدیقی پریس، بنارس میں ۱۲۱۳ھ/۹۸-۱۷۹۷ء میں چھپ گئی تھی۔ اس کے کوئی چھ برس بعد حکیم محمد اشرف کاندھلوی کی سورۂ یوسف[2] کی تفسیر انقلاب اسٹیم پریس، لاہور میں ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں دو سو سولہ صفحوں پر چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کسی نامعلوم پریس سے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں نکلا تھا۔ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں منظوم ترجمہ و تفسیر بھی شامل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی محفوظ ہے۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے نے غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔ وہ قرآن پاک کا مکمل ترجمہ[3] ہے اور اس کی زبان بھی نسبتاً صاف ہے۔ وہ ترجمہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی اور کلکتہ دونوں مقاموں سے شائع ہوا تھا۔ کلکتے والے ایڈیشن میں مقدمہ بھی شامل ہے۔

متعدد باصلاحیت حضرات نے اپنے اپنے طور پر قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جو حضرات اس کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئے، ان میں محمد[4] نبی بخش اور محمد شمس[5] الدین شائق ایزدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کی تفسیر نبوی منظوم کریمی اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۰ء میں اور ثانی الذکر کا منظوم اردو ترجمۂ قرآن مجید دین اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ اشاعت پذیر ہوا۔

اردو نثر و نظم میں قرآن پاک کے جزوی اور مکمل جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر احمد خاں اور سید عبدالقدوس ہاشمی صاحبان نے اپنی کتاب میں ایک ہزار گیارہ مطبوعہ تراجم کا تعارف کرایا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے ایسے مطبوعہ تراجم ہوں گے جو ان حضرات کے علم میں نہیں، پھر ایسے تراجم جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے، بے شمار ہوں گے۔

قرآن پاک کے پڑھنے والے اس سرزمین کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے اس کو سمجھنے کیلئے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا ہوگا۔ عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم ڈاکٹر محمد حمید[6] اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں کم و بیش سو بیس زبانوں کے تراجم موجود ہیں، لیکن وہ بھی کل نہیں ہیں۔ اس قابل فخر ذخیرے میں خود اس برصغیر میں بولی جانے والی

---

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء) ص ۷، ۸؛ [2] ص ۲۴۰
[3] ایضاً ص ۳۳۱؛ [4] ایضاً ص ۴۲؛ [5] ایضاً ص ۲۴۵؛ [6] یہ فہرست ہمیں جناب عبداللہ (مدراس) نے عنایت کی ہے۔

زبانوں میں سے سرائیکی اور پشتو کے تراجم نہیں ملے۔ دنیا میں بولی جانے والی کتنی ہی اور زبانیں بھی ہوں گی جن کے تراجم اس ذخیرے کی زینت نہیں بن سکے ہیں۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ، ترجمہ اور تفسیر کا کام صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کیا ہے۔ اس نیک کام میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ جن عیسائی پادریوں اور عالموں نے ترجمہ مکمل کیا ان میں ریورنڈ احمد شاہ پادری، علی بخش پادری وغیرہ کے نام قابلِ توجہ ہیں۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ پہلا قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر غالباً وہ ہے جو مطبع "پیغام" دہلی سے ۱۸۴۴ء میں چھپا تھا۔ جو پادری اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا جنھوں نے محض کسی جز کا ترجمہ کیا ان میں جے علی بخش پادری اور سلطان محمد خاں پادری کا نام آیا ہے۔[1]

ہندو عالموں[2] میں کنھیا لال الکھداری نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ (بلا متن) دھرم سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں چھپوایا تھا۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت[3] زبان میں بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ میرے ایک کرم فرما نے اطلاع دی کہ بنگلہ زبان میں بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے میں گریش گھوش نامی ایک ہندو عالم نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ اس زبان میں اولین ترجمہ یہی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ اس سے پہلے[4] الطافی پریس کلکتہ سے ۱۹۰۹ء میں قرآن حکیم کا بنگلہ میں مکمل ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا تھا اور اس کے مترجم کا نام مولانا عباس علی بتایا گیا ہے۔

تیلگو زبان میں البتہ اس نیک کام کے لیے ایک[5] ہندو عالم چلکوری نارائن راؤ کو اولیت حاصل ہے۔ اس ترجمہ کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے محمد قاسم خاں نامی ایک مسلمان عالم نے اس کام کو از سرِ نو کیا اور ان کا ترجمہ[6] حیدر آباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اوپر جو عرض کیا گیا اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اس کرۂ ارض پر جس پر ہم بستے ہیں، علمی نقطۂ نظر سے اس کے ماننے والوں اور منکروں نے جس کتاب کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے وہ وہ قرآن پاک ہے جس میں خود خالقِ عالم نے یہ فرمایا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

---

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبد القدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء) ص ۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۸۶ [3] ایسے ایک ترجمہ کے ایک صفحہ کا عکس جناب عبد اللہ نے عنایت کیا ہے اور یہ اطلاع دی ہے کہ اصل نسخہ شرف الملک اکیڈمی، مدراس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ [4] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خان و سید عبد القدوس ہاشمی ص ۸۳ [5] یہ اطلاع راقم کو ڈاکٹر شیخ مستان (علیگڑھ) نے دی ہے [6] بحوالہ مکتوب جناب عبد اللہ مدراس

ڈاکٹر مہدی حسن

پی ایچ ڈی (جرمنی) ایف۔ آر۔ سی۔ ایس

چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

کرسی۔ جن محققوں نے قرآن میں غیر ملکی الفاظ کی فرہنگیں ترتیب دی ہیں ان میں اے جیفریز
[illegible] خاص طور سے قابل ذکر ہے، انھوں نے ایک لفظ بھی ایسا تلاش نہیں کیا
جو چینی زبان سے مشتق ہو، بہرحال میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ طوفان Tufan
(J. B. B. R. A. S. 1946. 22-56) یہ لفظ چینی زبان کا ہے اور Kursi
(کرسی) یہ دوسرا لفظ ہے جو چینی زبان سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ پلیٹز کا اردو انگریزی لغت "کرسی"
کو عربی لفظ بتاتا ہے جس کے معنی تخت یا "کرسی" ہوتے ہیں۔ یہ لفظ بہت پہلے عربی زبان میں داخل
ہو گیا ہوگا اور عربی زبان میں مستعمل ہونے کے بعد ہی ہم اسے قرآن میں (۲۔ سورہ ۲۵۵۔ سطر) دیکھتے
ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے قرآنی ترجمے میں، وہ سطر جس میں لفظ 'کرسی' استعمال ہوا ہے اس طرح
لکھی گئی ہے۔ His Throne doth extend over the heavens
(اس کا تخت بہشت تک پھیلا ہوا ہے) ظاہر ہے کہ کرسی یہاں تخت کے معنوں میں استعمال کیا
گیا ہے۔ کسی لغت میں لفظ 'کرسی' پر اشتقاقی طریقے سے بحث نہیں کی گئی چنانچہ اس لفظ کی
ساخت تک پہنچنے اور اس کے معنی کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی بنیاد معلوم کریں۔
لاہشید Lahschied کے انگریزی چینی لغت (حصہ اول، ص ۵۰۳)
میں ایک لفظ K'au-Tsz-i ملتا ہے۔ جس کے معنی آرام کرسی ہوتے ہیں۔ Wade وہڈ
کے طریقے کے مطابق لفظ 'K'au' اصل میں 'K'ao' ہے
Giles گائلس کے چینی لغت میں (نمبر ۵۹۶۴) اس کے معنی 'کرسی کی پشت پر جھکنے کے
ہوتے ہیں' K'au-tsz-i کے آخری لفظ 'I' کے معنی گائیلس کی لغت میں (نمبر ۵۳۰۷)
کرسی یا نشست کے ہوتے ہیں، درمیانی لفظ Tsz گائیلس کے لغت میں 'Tsu' کی صورت میں نظر آتا ہے
اور اس کے معنی 'بیٹا' یا 'آقا' ہوتے ہیں۔ یہ لفظ چینی زبان میں مستعمل ہے لیکن انگریزی ترجموں میں
کہیں نظر نہیں آتا اس لفظ کی صرفی تشریح اس طرح ہو سکتی ہے، آقا (Tsz)، کرسی (I) —
پشت پر جھکنا (K'au)، چینی زبان کا 'Tsz' — 'Tzu' ہندوستانی کے 'جی' سے مشابہ ہے اور
اسی طرح 'K'au-Tsz' کی طرح ہندوستانی میں بھی 'جی' کا لاحقہ لگانے سے لفظ بنایا جاتا ہے۔

جیسے ماتا جی۔ پتا جی۔ گرو جی۔ یونانی زبان میں بھی 'Eu' کے معنی 'اچھا' ہوتے ہیں۔ اسی طرح Euphrates کے حرفی معنی Good Phrates یا 'اچھا فرات' ہوں گے۔ چینی لفظ Kau-TSZ-I کی بہتر تشریح اس طرح ہوسکتی ہے۔ TSZ بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی نشست۔ 'Kau' بمعنی پشت جس پر جھکا جائے۔ پوری ترکیب کے یہ معنی ہوئے، وہ پرعظمت نشست جس پر آرام سے بیٹھا جائے"۔

مہاتما بدھ چینی اور ہندوستانی مجسموں میں تخت پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے پیچھے ایک ستون نظر آتا ہے جس پر آرام کے لئے جھکا جاسکتا ہے۔ اس مجسمہ سے (Kau-TSZ) کی تشریح ہوتی ہے۔ ہندوستانی میں 'گدّی' کے حرفی معنی 'تکیہ' ہوتے ہیں۔ 'گدّی پر بٹھانا' ہندستانی میں 'تخت پر بٹھانے' کے مترادف ہے۔ چنانچہ 'گدّی' یہ لفظ چینی زبان کے 'Kau-I' سے بہت زیادہ قریب اور مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح 'گدّی' کے معنی تکیہ اور تخت ہوتے ہیں اسی طرح چینی لفظ Kau-TSZ کے معنی بھی 'کرسی' اور 'تخت' ہوتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں chair کا مفہوم کرسی کے علاوہ عزت وعظمت سے وابستہ ہے جیسے He occupied the chair of honour عربی تمدن کے ان اثرات کو دیکھتے ہوئے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی علمی زندگی کو متاثر کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ غالباً 'کرسی' یہ لفظ انگریزی میں کچھ معمولی ترمیم کے ساتھ chair پڑگیا ہوگا۔

۱ لفظ 'Kau-I' گلیورے (Gilliway) کے چینی لغت (ص ۳۰۴۵) میں ملتا ہے جس کے معنی ہیں "اونچی پشت والی کرسی"۔ 'اونچی پشت' سے جو اہمیت کرسی کو حاصل ہوتی ہے اس سے عظمت کا تصوّر پیدا ہوجاتا ہے (F[illegible]) فلین کے چینی لغت میں (ص ۔ ۱۹۱) اس لفظ کے معنی صرف کرسی یا 'نشست' کے ہوتے ہیں۔ لیکن صرف نشست سے 'I-Tsu' بمعنی اچھا یا باعزت کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔

اس تجزیہ کے بعد یہ دونوں مرکب الفاظ Kau-Tsz اور I-TSZ تیسری صورت اختیار کرتے ہیں "Kau-TSZ-I" جس کا مطلب ہوا 'TSZ' بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی کرسی Kau بمعنی اونچی پشت۔ پوری ترکیب کا مطلب یہ ہوگا "اونچی پشت والی پرعظمت کرسی"۔ چین میں یقیناً باعزت و پرعظمت شخصیتوں کے لئے شاندار کرسیاں ہوتی ہوں گی جنھیں اسلام سے پہلے کے عربوں نے تخت سمجھا ہوگا۔

'دفتر' پر مضمون لکھتے وقت میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چینی لفظ 'Tu-Seu'

ہندوستانی بنانے کے لئے 'ر' اس حرف کا لاحقہ لگایا گیا۔ چنانچہ لفظ Tu - Szu - R یا Tussea بن گیا۔

اسی طرح چینی لفظ 'Ssu' بمعنی ریشم، یونانیوں کے پاس پہنچ کر 'ر' (R) کا لاحقہ بڑھاتے ہوئے Sua یا Sezr بن جاتا ہے ___ لفظ Porcelain بھی چینی لفظ Po - Tsu - Lan سے بنا ہے۔ اس لفظ میں بھی "ر" (R) کا اضافہ ہے۔ چنانچہ "ر" کے اضافہ سے چینی لفظ Po - R - Tsu - Lan بن جاتا ہے اور لسانیاتی ترمیموں کے بعد Porcellain بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ____ بالکل اسی طریقے سے K'au - Tsz - I عربی میں "ر" (R) کے اضافہ سے 'K'au - R - Tsz - I' بن گیا ہوگا۔ کیونکہ جب ہم (R) 'ر' کے اضافہ سے اس لفظ کا تلفظ ادا کریں تو ہمارا تلفظ 'کرسی' سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے ___ چینی زبان سے لفظوں کو بطور قرض لیتے ہوئے عجب نہیں کہ ہندوستانی، یونانی اور عربی زبان نے 'ر' (R) کا اضافہ کیا ہو۔

چینی کلاسیکی لفظ K'ao - Tsu - I جنوبی چین کی حکا بولی میں 'گائیل' (Gile) کے خیال کے مطابق اس لفظ میں 'K'au - Tsz - I' تبدیل ہو جاتا ہے۔ لاہشیڈ Lahscheid لفظ کی اس صوتی تبدیلی سے متفق تھے۔ چنانچہ عربی لفظ 'کرسی' اس اعتبار سے 'حکا' بولی سے بہت زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے Ko - R - Z - I سے 'K'au - Tsz - I' یا اور 'K'au - Tsz - I' سے Ku - R - S - I بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ کیونکہ حکا بولی میں 'س' (S) کا استعمال اور کلاسیکی چینی زبان میں 'ز' (Z) کا استعمال لفظ کی ساخت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

خلاصہ

عربی لفظ 'کرسی' جو ہندوستان میں صرف کرسی کے لئے استعمال ہوتا ہے قرآن میں تخت کا مفہوم ادا کرتا ہے یہ لفظ چینی زبان سے لیا گیا ہے K'au - Tsz - I جس کے عرفی معنی پُر عظمت کرسی کے ہوتے ہیں جس کی پشت اونچی ہو، یہ معنی ہندوستانی کے لفظ 'گدی' سے ہم آہنگ ہیں، جس کا مطلب اکثر تخت سے لیا جاتا ہے۔ 'K'au - Tsz - i' کا تلفظ ایک عرب کی زبان سے 'K'au - R - Tsz - i' کی طرح ہوتا ہے جو کہ بعد میں 'Ku - R - S - i' یا کرسی بن گیا۔

خزانہ پلیٹز (Platts) اپنے اُردو۔ انگریزی لغت میں (ص ۴۸۹) لفظ 'خزانہ' کے معنی ذخیرہ۔ گھر، حفاظت گھر۔ یا خزانہ لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں 'خزانہ' اس لفظ کو فارسی بتایا گیا ہے۔ پلیٹز کے مطابق اس لفظ کا بازاری تلفظ 'خزانہ' ہوتا ہے لیکن صحیح تلفظ خِزانہ ہے، کیونکہ عربی میں لفظ 'خزن' ہے جس کے معنی محافظ کے ہیں۔ عربی لفظ 'خزن' سے اگر فارسی میں خزانہ بن جاتا تو یہ لفظ جدید ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال موجود ہے، بہرحال ہندوستان میں بلا استثناء لفظ 'خزانہ' اس طرح مستعمل ہے جیسے اس کا دوسرا تلفظ ہی نہیں ہے۔ — قرآن میں یہ لفظ صاف طور سے 'خزانہ' ہے ——

(سورۂ ۶ — ۵۰، ۱۱ — ۳۱، ۱۵ — ۲۱)۔ عبداللہ یوسف علی اپنے ترجمہ میں (حصہ ۲۔ ص ۶۴۰) فٹ نوٹ (نمبر ۱۹۵۸) میں لکھتے ہیں Khazain خزائن کے معنی حفاظت گھر اور ایسی جگہیں ہیں جہاں قیمتی چیزیں جمع کی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ مفہوم درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ بنیادی طور سے لفظ کے معنی ہیں غلہ گھر۔

لفظوں کی بنیاد معلوم کرنے کے لئے اور خصوصاً اس وقت جب تاریخ بھی خاموش ہو ترکیبی طریقہ ہی کارگر ہو سکتا ہے Synthatic - method. جس کا مقصد یہ ہے کہ لفظ (خزن) کے خاص اشارتی معنی (Connotation meanings) دریافت کرے 'خزن' کے بنیادی معنی 'حفاظت کرنا' یا (To guard) سے بھی کچھ مفہوم نکالے جا سکتے ہیں جیسے (Prison) قید خانہ وغیرہ، لاہتشید Lahschid اپنی انگریزی۔ چینی لغت میں (ص ۱۶۸۴) 'Ts'ang' کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' Store - house اور گنس '' ذخیرہ گھر' کے لئے 'Ho - Ts'ang' استعمال کرتا ہے۔ ذخیرہ گھر Store house کے لئے چینی زبان میں اور بہت سے الفاظ ہیں جس میں ایک لفظ 'Nagu' بھی ہے (Nagu) - (Ho-Ts'ang) کے معنی لاہتشید کے لغت میں 'اشیا کا ذخیرہ گھر' ہوتے ہیں۔ وڈ (Wade) کے طریقے کے مطابق ''Ho'، 'Au o' بتایا گیا ہے۔ گائیلز (Giles) کے چینی انگریزی لغت میں (نمبر ۳۲۹۵) اس کے معنی 'اشیا یا زیور' ہوتے ہیں، دوسرا لفظ 'Ts'ang' گائیل کے لغت میں (نمبر ۱۱۵۹۱) 'Ts'ang' ہی کی شکل میں نظر آتا ہے اور جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔ لاہتشید کا استعمال کردہ لفظ 'Ho-Ts'ang' گائیل کے لغت میں بھی ملتا ہے اور اس کے معنی 'زیور گھر' ہوتے ہیں۔ سوشان Soch'uan بولی میں اس لفظ کا تلفظ Hua-Tsing

ہے اور (Amanese) امینز بولی میں اس کا تلفظ Hwa-Tang ہوتا ہے۔
گائیل کے لغت (کیرکٹر نمبر ۸۶) 'AO' کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں، اور سوشانی
Sochuan اور امینز Amanese میں 'AO' کا تلفظ 'Kaga' ہوتا ہے۔ گائیل کے
ت میں بھی یہ لفظ Ts'ang-Ao ملتا ہے (کیرکٹر نمبر ۱۱۵۹۱ اور ۸۶) جس کے معنی
ہ کی دکان' ہوتے ہیں، لاہشیہ کی لغت میں اس لفظ کے معنی کسی قدر واضح شکل میں نظر
تے ہیں، لاہشیہ اس لفظ کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' بتاتا ہے۔ چینی، ایک لفظ کے لئے
دو طرح کے لفظ استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں 'Huo-Ts'ang' اور Ts'ang-Ho
ن دونوں لفظوں میں سے صرف ایک ہی لفظ مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان دونوں
لفظوں میں 'Ts'ang' مشترک ہے اور ان دونوں لفظوں کے اشتراک سے بنے ہوئے تیسرے
لفظ 'Huo-Ts'ang-Ao' کے معنی ہوں گے 'غلہ گھر یا گودام'۔ امینز Amanese
بولی میں اس لفظ کا تلفظ 'Hwa-T'ang-Nagau' ہوگا۔ اور Huo-Tsang
کا تلفظ Hwa-T'ang ہوگا۔

(Yell) یل اور (Burnell) برنل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ Godown
انگریزی لفظ ہے اور (Malay) ملائی Ga-Dong سے مشتق ہے۔ بہت ممکن
ہے کہ امینز لفظ 'Hwa-T'ang' ملائی میں Ga-Dong بن گیا ہوگا۔ اس طرح انگریزی
لفظ Godown کی بنیاد 'Hua-Tsang' معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاہشیہ نے
ذخیرہ گھر بتائے ہیں

امینز (Amanese) لفظ 'Hwa-Tang-Nagau' اگر (Ga-Dong-Ngau)
میں تبدیل ہو جائے جس کے آخر میں ng ہو اور Ngau کے ابتدا میں ng ہو تو
اس کی آسان شکل Ga-Dong-Au ہو سکتی ہے، جو ملایا یا جاوا کی زبان سے تامل
میں داخل ہو کر Ki-Dang-u بن گئی ہو، یل Yell اور برنل Burnell اس لفظ کے
معنی اُس گھر کے بتاتے ہیں جہاں چیزیں جمع کی جائیں۔ اس طرح سے Kidongu کے معنی
لازم ہونے چاہئیں لیکن تامل زبان میں گودام کے معنی Kidongu نہیں ہوتے، حیدرآباد کے
ضلع پربھنی کی مقامی بولی میں لفظ Gidangi کے معنی اس گھر کے ہوتے ہیں جہاں پانی جمع کیا
جائے۔ لیکن مجھے Gidangi کے ساتھ پانی کا تعلق کچھ عجیب سا لگتا ہے۔
سوشان بولی (Souchuan) میں Hwo-Ts'eng Ngau کا مفہوم

متحرک غلہ گھر (Mobile grain establishment) ہو سکتا ہے جہاں سے شاید
ریشم فروخت کرنے والے چینی قافلے اپنا غلہ حاصل کرتے ہوں گے۔ یوسف علی کے خیال کے مطابق
یا تو غلہ ہر روز تقسیم کیا جاتا ہوگا یا پھر ضرورت کے وقت تقسیم ہوتا ہوگا۔ ریشم فروخت کرنے والے
چینی قافلے آخر سفر میں (Syria) ملک شام میں ٹھہرتے تھے اور وہیں پر شاید لفظ
Hwo-Tsing-Ngau عربی زبان میں Kha-zana بن کر داخل ہو گیا ہوگا۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ پرانے زمانے کی اقتصادیات میں 'رسم مبادلہ' (Barter system)
رائج تھی اور خراج بھی اناج کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ تمدن کے ایسے دور میں حکومت کا خزانہ
سوائے 'غلہ گھر' کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ گائلس Giles کے الفاظ میں اسلام سے قبل عربوں کا
خزانہ کا تصور 'غلہ گھر' کا ہی ہو سکتا ہے۔

خلاصہ

چینی لفظ Huo-Ts'ang کے معنی 'گودام' ہوتے ہیں۔ ایمنر Amanu
بولی میں اس کا تلفظ 'Hwa-Tsang' ہوتا ہے۔ ملائی زبان میں اس لفظ نے Ga-Dang
کی شکل اختیار کی اور انگریزی کے 'Godown' سے قریب تر ہو گیا۔

چینی زبان میں 'Huo-Ts'ang Ao' کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں — ایمنر بولی میں
اس کی شکل 'Hwa-Tsang Ngou' ہو جاتی ہے جو تامل زبان میں داخل ہو کر
Ki-Dang-u بن جاتی ہے، جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔

سوشان Suchan بولی کا لفظ 'Hwo-Ts'ang-Ngau' غالباً
چینی قافلے اپنے ساتھ شام لے گئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے عربوں نے اسے Kha-zana
بنا لیا ہو جس کے ابتدائی معنی 'غلہ گھر' تھے چونکہ 'غلہ' ہی اس زمانہ کا خزانہ سمجھا جاتا تھا۔ قیمتی
اشیا پر لفظ 'خزانہ' کا اطلاق بعد کا تصور معلوم ہوتا ہے۔

- مناقب ابوبکر بزبان علی
- مناقب علی بزبان ابوبکر

تصنیف: علامہ زمخشری

ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی

پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس وہی صورت شیعہ سُنی مسئلہ کی ہے
عام شیعہ عام سُنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن
دیتے ہیں علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیرووں کے درمیان
اور وہ اسلیے ہے کہ مفادات بنا لیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو مفادات پر تو ضرب لگے گی نا۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے "انصاف کا تقاضا
بھی یہی ہے۔

چنانچہ زمخشری احتشام کاندھلوی (دونوں ـــ بڑے بھائی!) نے پہل کی۔ ہمیں
ہمیں خوشی ہے۔

ـــــــ ادارہ

تصنیف : علامہ زمخشری

ترجمہ : احتشام الحسن کاندھلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علیؓ کے مناقب حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اکثر حضرت علیؓ کے چہرے کو دیکھا کرتے تھے میں نے عرض کیا "ابا" آپ اکثر علی کے چہرے کو کیوں دیکھتے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "بیٹی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا علی کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔"

حضرت حبشی بن جنادہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے فرمایا جس شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وعدہ فرمایا ہو اسے کھڑے ہو کر بیان کرے۔ ایک شخص کھڑا ہوا! اور عرض کیا۔ اے خلیفۂ رسول اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین مٹھی کھجور دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور فرمایا! ابوالحسن یہ شخص کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین مٹھی کھجور کا وعدہ فرمایا تھا تم اس کو تین مٹھی کھجور دے دو۔

حبشی کہتے ہیں جب حضرت علیؓ اس کو کھجوریں دے چکے تو آپ نے فرمایا ان کو شمار کرو تو ہر مٹھی میں بلا کم و بیش ساٹھ کھجور آئیں۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا صدق اللہ ورسولہ (اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا)

ہجرت کی شب جب ہم غار سے نکل رہے تھے اور مدینہ کا ارادہ تھا" ابوبکر میرا اور علی کا ہاتھ شمار میں برابر ہے۔"

حضرت زید بن یثیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا حضور اقدس نے خیمہ نصب کرایا اور عربی کمان سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ اس وقت خیمہ میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ اور حسن و حسین تھے اور آپ نے ارشاد فرمایا اے گروہ مسلمین جو شخص ان اہل خیمہ سے صلح رکھے میں اس کے حق میں صلح مجسم ہوں اور جو ان سے

لڑائی کرے میں اس سے لڑنے والا ہوں اور جوان کو دوست رکھے میں اس کا دوست ہوں۔ ان سے وہ شخص محبت رکھتا ہے جو نیک بخت اور نیک ذات ہے اور بدبخت بدذات ان سے بغض رکھتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا، کیا زید تم نے خود حضرت ابوبکر سے سنا؟ حضرت زید نے فرمایا ہاں ربِ کعبہ کی قسم۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ روز بعد حضرت ابوبکر اور حضرت علی قبر مبارک کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ حجرہ شریف پر پہنچ کر حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے کہا "خلیفہ رسول اللہ آپ پہلے اندر داخل ہوں"۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں اس شخص سے پیش قدمی نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا علی کو میرے ساتھ وہ تقرب حاصل ہے جو مجھے بارگاہ رب العزت میں حاصل ہے۔

حضرت علی روئے اور فرمایا میں اس شخص سے سبقت نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا ابوبکر کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جس نے میری تکذیب نہ کی ہو۔ اور ابوبکر کے علاوہ ہر ایک کے دروازہ پر صبح کے وقت ایک قسم کی ظلمت ہوتی ہے۔

حضرت ابوبکر نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت علی نے جواب دیا میں نے اپنے چچازاد بھائی سے سنا ہے پھر حضرت ابوبکر نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ایک ساتھ حجرہ شریف میں داخل ہو گئے۔

حضرت قیس بن ابی حازم سے مروی ہے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابوبکر حضرت علی کو دیکھ کر مسکرائے۔

حضرت علی نے دریافت کیا آپ مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائے؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تمھارے اجازت نامہ کے بغیر کوئی شخص پل صراط سے نہ گذر سکے گا۔

حضرت قیس کہتے ہیں یہ سن کر حضرت علی مسکرائے اور فرمایا ابوبکر میں تمھیں خوشخبری سناتا ہوں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ صرف اس شخص کو اجازت نامہ دوں جو تمھیں محبوب رکھتا ہو۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام آپ کے گرداگرد جمع تھے کہ حضرت علی سامنے سے آئے سلام کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہو کر صحابہ کے چہروں کو دیکھنے لگے کہ کون ان کو جگہ دیتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب بیٹھے تھے آپ نے تھوڑا سا سرک کر فرمایا ابو الحسن اس جگہ بیٹھو جاؤ اور حضرت علی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر ارشاد فرمایا ابو بکر صاحب کمال کی فضیلت کو کمال والا ہی پہچانتا ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کے مناقب حضرت علیؓ کی زبانی

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں مجھ سے اور ابو بکر صدیقؓ سے ارشاد فرمایا تم میں سے ایک کی دائیں جانب حضرت جبرائیلؑ اور دوسرے کی دائیں جانب حضرت میکائیلؑ ہیں۔ اور حضرت اسرافیلؑ ایک جلیل القدر فرشتے ہیں جو جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور صفِ قتال میں شامل رہتے ہیں۔

حضرت علی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا میرے ساتھ کون ہجرت کرے گا؟

حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا "ابو بکر صدیق" اسی روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا لقب "صدیق" رکھ دیا۔

ابو یحییٰ حکم بن سعد کہتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ حضرت علی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے نبی کے ذریعہ حضرت ابو بکر کا لقب صدیق رکھا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آیت وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ (اور جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی سچائی کو مانا) میں سچ لانے والے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور آپ کی سچائی ماننے والے سے مراد حضرت ابو بکر صدیق ہیں۔

حضرت نزال بن سبرہ ہلالی کہتے ہیں کہ ہم نے ایک روز حضرت علی کو ہشاش بشاش پاکر عرض کیا کہ امیرالمومنین اپنے اصحاب کے واقعات بیان کیجئے۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (ساتھی) میرے بھی اصحاب ہیں۔

ہم نے عرض کیا اپنے مخصوص دوستوں کے واقعات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابی میرا خصوصی دوست تھا۔

ہم نے مکرر عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حالات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا کہ تم میرے سے نام لے کر دریافت کرو۔

ہم نے عرض کیا حضرت ابوبکر صدیق کے حالات بیان فرمائیے۔

آپ نے فرمایا یہ وہ ہستی ہیں جن کا حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی صدیق لقب رکھا۔ اور نماز کی امامت کے لئے رسول اللہ کا نائب بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہماری دینی امامت کے لئے پسند فرمایا اسی لئے ہم نے ان کو اپنی دنیوی امامت کے لئے منتخب کر لیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ جعرانہ ادا کر کے مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر صدیق کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ میں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہوا جب ہم موضع عرج پہنچے اور آپ کو صبح کی نماز کی اطلاع دی گئی۔ آپ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اچانک حضرہ کے پیچھے سے اونٹنی کی آواز سنائی دی آپ نماز پڑھانے سے رک گئے اور فرمایا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعا کی آواز ہے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج کا ارادہ ہو گیا ہو اور آپ تشریف لا رہے ہوں تو پھر ہم آپ ہی کے ہمراہ نماز ادا کریں گے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت علی پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر نے ان سے دریافت کیا تم امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا محض قاصد ہو۔

حضرت علی نے فرمایا امیر نہیں بلکہ قاصد ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات برات دے کر مجھے بھیجا ہے تاکہ مواقف حج میں لوگوں کو پڑھ کر سنا دوں۔ ہم مکہ مکرمہ پہنچے جب چھٹی ذی الحجہ ہوئی تو حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں احکام حج بیان فرمائے جب آپ خطبہ سے فارغ ہو گئے تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ برات

آخر تک سنائی۔ پھر جب ہم دسویں ذی الحجہ کو عرفات سے منی واپس آئے تو حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں طواف افاضہ اور قربانی وغیرہ کے احکام بیان کئے پھر حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ براءۃ آخر تک سنائی۔ گیارھویں تاریخ کو حضرت ابوبکر نے پھر خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت علی نے کھڑے ہو کر سورۂ براءۃ سنائی۔

مروی ہے کہ جب دونوں حضرات مدینہ منورہ واپس پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیق بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے لئے کیا حکم ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سراسر خیر ہے تم غار میں میرے ساتھی تھے اور حوض پر بھی میرے ساتھی ہو گے۔ لیکن براءت[ف] میں خود پہنچا سکتا ہوں یا پھر میری طرف سے میرا کوئی قریبی رشتہ دار (اسی لئے حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی)

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو روانہ کرنے کے بعد پھر ایک دم حضرت علی کو بھیجا اس پر حضرت ابوبکر صدیق کو خیال ہوا کہ شاید بارگاہ رسالت میں میری کوئی بات ناپسند آئی جس کی بنا پر حضرت علی کو بھیجا گیا چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ بے التفاتی بھی کسی صحابی کو گوارا نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے معاملہ کی صفائی چاہی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی تسلی اور تشفی کے لئے آپ کے چند مناقب بیان فرمائے اور حضرت علی کو بھیجنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قریش مکہ کے دستور کے موافق اپنے کئے ہوئے معاہدہ کو میں خود فسخ کر سکتا ہوں یا میری طرف سے میرا قریب ترین رشتہ دار فسخ کر سکتا ہے۔ اس مجبوری کی بنا پر حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تصدیق اور تصویب

حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا خدائے پاک کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ اچانک وفات ہوئی اور نہ آپ مقتول ہوتے بلکہ آپ چند شب و روز بیمار رہے موذن روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور نماز کی اطلاع کرتا تھا اور آپ اس کو حکم فرماتے کہ ابوبکر کے پاس

ف یعنی فسخ معاہدہ ۱۲

جاؤ اوران سے کہو کہ نماز پڑھائیں آپ نے مجھ سے نماز نہیں پڑھوائی حالانکہ میں وہاں موجود ہوتا تھا اور آپ کو میری موجودگی کا علم بھی ہوتا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے متعلق کوئی عہد ہوتا تو کسی تیم زادے اور خطاب زادے کی یہ مجال نہ تھی کہ منبر نبوی پر کھڑا ہو کر خطبہ پڑھ سکے میں بزورِ شمشیر اس سے جہاد کرتا (اور اپنا حق حاصل کرتا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہم نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو ہماری یہ سمجھ میں آیا کہ نماز اسلام کا ستون اور دین کی اصلی بنیاد ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو ہمارے دین کی امامت کا حکم فرمایا تھا اسی کو ہم نے اپنی دنیوی قیادت کے لئے منتخب کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو اپنا امیر بنا لیا جب انھوں نے جہاد کا اعلان کیا ہم نے ان کے حکم پر جہاد کیا اور جو انھوں نے عطا کیا اس کو بخوشی قبول کر لیا اور ان کے حکم سے حدود اللہ قائم کیں کبھی کوئی اختلاف نہ رہا اور باہم ہمیشہ متحد اور متفق رہے مختصر یہ کہ اب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی برائی اور گمراہی کو نہ پھیلائے۔

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں جس روز حضرت ابوبکر صدیق سے بیعت کی گئی حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا لوگو جس شخص کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھایا ہو اب کون اس کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت علی نے خلافت صدیق کی تائید میں ایسی مستحکم دلیل بیان کی جو کسی کے بھی ذہن میں نہ تھی۔

(ف) حضرت علی مرتضیٰ کے استدلال کا منشا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوبکر صدیق کو نماز کی امامت کے لئے مامور فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ دیگر تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں اور افضل کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو امیر بنانا درست نہیں لہٰذا حضرت ابوبکر کی موجودگی میں کسی کی امارت جائز نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابوبکر کا فسخ بیعت کا اعلان اور حضرت علی کا انکار

حضرت ابو الجحاف سے مروی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق سے خلافت کی بیعت کی گئی اور حضرت علی مرتضیٰ نے اپنے رفقا سمیت بیعت کر لی تو حضرت ابوبکر صدیق تین مرتبہ کھڑے ہوتے اور فرمایا اگر کسی کو ... تو میں تمہاری بیعت فسخ کرتا ہوں [illegible]

حضرت علی مرتضیٰ سب سے پہلے کھڑے ہوتے اور فرماتے خدائے پاک کی قسم نہ ہم آپ سے فسخ بیعت کرتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش کریں گے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا ہے اب کون آپ کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ کے فضائل حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت شعبی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت علی کے چہرہ پر نظر ڈالی اور فرمایا اگر ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت در مرتبہ میں سب سے زیادہ قریب ہو اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے سب سے زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہو تو وہ انھیں دیکھ لے" اور حضرت کی جانب اشارہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا اگرچہ حضرت ابوبکر نے ایسا فرمایا لیکن وہ مخلوق خدا پر سب سے زیادہ شفیق و مہربان ہیں اور عشقِ الٰہی میں سرد آہ کرنے والے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار ہیں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہر قسم کی مشقت برداشت کی اور حضور پر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیا آپ اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اپنے مال میں سے خرچ کرتے تھے اور سب سے زیادہ بارگاہِ رسالت میں مقرب تھے۔

علی بن قادم فرماتے ہیں جو شخص صحابہ سے اس کے خلاف بیان کرے وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کنبہ میں سے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل حضرت علی کی زبانی

ابن اذنیہ کہتے ہیں کہ میں جب کوفہ گیا تو حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا امیر المومنین مہاجرین اور انصار کو کیا ہوا جو وہ آپ کو حضرت ابوبکر سے گھٹاتے ہیں حالانکہ آپ سب سے بڑھے ہوتے ہیں اور آپ کے بڑے بڑے کارنامے ہیں اور آپ کے مناقب بھی سب سے زیادہ ہیں۔

حضرت علی تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا اگر تو قریشی ہے تو شاید بنو عائذہ کے کنبے میں سے ہے اور میرا خیال ہے کہ تو وائلہ کا رشتہ دار ہے۔

میں نے جواب دیا "ہاں"

حضرت علی نے فرمایا اگر تو میں حق تعالیٰ کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں تجھے ابھی قتل کر دیتا کم بخت ابو بکر مجھ سے چار باتوں میں بڑھے ہوئے تھے جن کو میں نہیں پا سکا۔ ورنہ ان کے عوض کوئی اور شے پا سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہ ہجرت اور نماز کی رفاقت اور نماز کی امامت اور اسلام کی اشاعت۔ ان سب امور میں حضرت ابو بکر مجھ سے سبقت لے گئے حضرت ابو بکر ہمیشہ میرے اور مشرکین کے درمیان حائل رہتے اور سپر کا کام دیتے وہ کھلم کھلا دین کو ظاہر کرتے تھے اور میں اس وقت اپنے دین کو چھپاتا تھا قریش مجھے حقیر سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

اگر حضرت ابو بکر لشکر کشی اور مرتدین کی سرکوبی سے درگزر کرتے تو ہمیشہ پیچیدگیاں پڑی رہتیں اور لوگ اصحاب طالوت کی طرح بے غیرت و بے حمیت ہو جاتے۔ حق تعالیٰ ابو بکر پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کو میرا سلام پہنچائے۔

پھر فرمایا کوئی شخص مجھے حضرت ابو بکر پر فوقیت نہ دے ورنہ میں اس کو سزا دوں گا اور اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا۔

حضرت محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے امیر المومنین حضرت علی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟

حضرت علی نے فرمایا بیٹا حضرت ابو بکر صدیق ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت ان کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی رات کو حضرت ابو بکر کے گھر تشریف لے گئے اور میں آپ کی چادر مبارک اوڑھ کر لیٹ گیا اس لئے کہ حضرت جبریل علیہ السلام رات کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کفار آپ کے ساتھ دغا اور فریب کر رہے ہیں تاکہ آپ کو قید کر لیں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لاتے جو لوگ برے ارادے سے باہر کھڑے تھے انھوں نے آپ کو دیکھ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ　　　　اور ہم نے ان کے سامنے آڑ

سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا — پیچھے ایک ایک پردہ ڈال دیا۔
فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا — پس ڈھانک لیا ہم نے ان کوتاکہ
یُبْصِرُوْنَ ○ — وہ دیکھ نہ سکیں۔

ایک مٹھی خاک پردم کی اور ان کی طرف پھینک دی جس سے حق تعالیٰ نے ان کو اندھا اور بہرا کر دیا۔ پھر آپ حضرت ابوبکر کے پاس تشریف لے گئے اندر فرمایا ابوبکر مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے۔ اور حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی۔ حضرت ابوبکر آپ سے آگے آگے چلتے اور زمین سے کانٹوں کو ہٹا کر راستہ صاف کرتے جاتے اسی طرح ایک غار پر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکر نے چلنے سے پہلے حضرت عائشہ کی بہن حضرت اسماء کو کچھ دراہم دے کر فرمایا ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کر لینا اور چونکہ آپ کو گوشت مرغوب ہے اس لئے گوشت روٹی پکانا اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں آئے تو کہہ دینا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔

غار پر پہنچ کر حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ذرا ٹھہر جائیے اور خود غار میں جا کر اس کو صاف کیا اور اس خیال سے کہ کوئی موذی چیز حضور کو ایذا نہ پہنچائے جو سوراخ نظر پڑا اس میں انگلی ڈال کر دیکھی ایک بڑا بھٹ تھا آپ نے اپنا پیر اس میں داخل کر دیا جو ران تک اندر چلا گیا پھر باہر نکالا اور عرض کیا یا رسول اللہ تشریف لائیے میں نے آپ کے لئے جگہ صاف کر دی اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ آپ کے محافظ اور نگہبان ہیں۔

کفار قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاک میں تھے کہ شیطان آیا اور ان سے کہا تم کس کام میں ہو میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔ انھوں نے کہا ہم محمد کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ کہہ کر وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرامگاہ کو دیکھنے لگے تو وہاں آپ کی بجائے علی بن ابی طالب کو آپ کی چادر اوڑھے ہوئے پایا۔

اس وقت جب رسول اللہ تشریف لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بدحواس بنا دیا تھا۔ پس علیؓ اور ابوبکرؓ دونوں رسول اللہ کے جاں نثار فدائی ہیں۔

جب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں آپ کی جگہ حضرت علیؓ کو پایا تو کہا آج اس جھوٹے شخص نے ہمیں خوب دھوکا دیا اور اس کا جادو ظاہر ہو گیا۔ شیطان نے ان سے کہا محمد

ابھی ابھی باہر چلے گئے اور وہ سب آپ کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے جہاں حضرت اسماءؓ گوشت پکا رہی تھیں اور انھوں نے چراغ کو نکال کر باہر رکھ دیا تاکہ سالن کی بو محسوس ہو۔
وہ سب حضرت اسماء کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا کیا تمھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خبر ہے؟
حضرت اسماء نے جواب دیا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔ اس پر وہ لوگ وہاں سے چل دئے اور جستجو کرتے کرتے غار تک پہنچ گئے جہاں حق تعالیٰ نے ان دونوں کے نشانات قدم کو چھپا دیا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے قدموں کے نشانات کا پتہ نہ چلا حتیٰ کہ ایک شخص غار پر بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ اس وقت حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو یہ شخص اس طرح ہمارے سامنے بیٹھ کر پیشاب نہ کرتا۔ پھر وہ لوگ وہاں سے منتشر ہو گئے۔ اور دونوں حضرات نے غار میں رات گذاری۔ حضرت ابوبکر کے ایک سانپ نے کاٹ لیا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ رات سخت بے چینی سے بسر کی صبح کو تمام بدن پر ورم تھا اور حالت نازک تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ابوبکر یہ کیا ہوا؟
حضرت ابوبکر نے عرض کیا "یا رسول اللہ سانپ نے کاٹ لیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے اسی وقت مجھے کیوں نہ خبر کی۔
حضرت ابوبکر نے عرض کیا آپ کی نیند کو خراب کرنا گوارا نہ ہوا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت ابوبکر کے بدن پر پھیرا جس سے ان کی ساری تکلیف جاتی رہی اور بالکل خوش و خرم اور تن درست و توانا ہو گئے۔
حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ حاضر خدمت ہوئے تو حضرت ابوبکر نے اشارہ سے ان کو بلایا اور کہا بیٹا اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتا ہوا آئے تو کہہ دینا مجھے کیا خبر اور چرواہے سے کہنا کہ بکریوں کو ایسی طرح غار پر لائے کہ ہمارا کوئی نشان و پتہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت اسماء روٹیاں لے جاتیں انھوں نے اپنی چادر کو پیٹی کی طرح باندھ رکھا تھا جس میں ایک روٹی دائیں جانب اور ایک بائیں جانب چھپا کر لے جاتی تھیں تاکہ کسی کو ان پر شک و شبہ نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز غار میں قیام فرمایا حضرت ابوبکر صدیق نے سفر کے لئے دو اونٹوں کا انتظام کر رکھا تھا وہاں اطلاع دی گئی اور حضرت عبداللہ ایک راستہ بتانے والا اور دونوں اونٹ لے کر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کو اپنی ذرا پرواہ نہ تھی۔ البتہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں نے قابو پالیا تو دین اسلام ختم ہو جائے گا۔

اگرچہ حضرت ابوبکر کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کامل یقین حاصل نہ تھا اس اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے ارشاد فرمایا فکر نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ إِذْ هُمَا فِی الْغَارِ إِذْ یَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

دوسرا دو میں سے جس وقت وہ غار میں تھے جس وقت آپ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے غم مت کر اللہ ہمارے ساتھ ہے

انہی کے متعلق ارشاد ربانی ہے

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ

پس خدا نے ان پر اطمینان نازل فرما دیا۔

پس حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و مرسلین کے بعد سب سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق اسلام لائے اور سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ میں علی بن ابی طالب نے نماز پڑھی۔

حضرت مسلم بن زفر کہتے ہیں کہ جب کبھی حضرت علی کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق کا تذکرہ ہوتا تو آپ فرماتے تم اس شخص کا تذکرہ کر رہے ہو جو ہر کار خیر میں دوسروں سے سبقت اور بازی لے گیا۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ہم نے جس کار خیر میں بھی پیش قدمی کا ارادہ کیا ابوبکر اس کام کو ہم سے پہلے کر گذرتے تھے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ میرے باپ ابوطالب کی وفات کے تین روز بعد کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے جمع ہوئے اس وقت حضرت ابوبکر کے

---

۱۲ راستہ بتانے کے لئے عامر بن فہیرہ کو ساتھ لائے جو حضرت ابوبکر کے خادم اور آزاد کردہ غلام تھے ۱۲

سوا کوئی آپ کے کام نہ آیا۔ حضرت ابوبکر تن تنہا مقابلہ کے لئے آئے اور کوشش کر کے مجمع کو ہٹاتے جاتے اور فرماتے کم بختو کیا ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے اور اس پر اللہ رب العزت کی جانب سے دلائل اور براہین پیش کرتا ہے۔ خدا کی قسم یہ شخص اللہ کا رسول اور پیامبر ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے سر پر دو مینڈھیاں تھیں اس ہنگامہ میں ان میں سے ایک ٹوٹ گئی۔

حضرت علی نے اپنے رفقاء سے فرمایا تمھیں خدا کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کہ آل فرعون کے مومن شخص اور ابوبکر میں سے کون افضل ہے؟

اس پر سب خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا خدا کی قسم حضرت ابوبکر کا ایک ایک دن مومن آل فرعون سے افضل ہے وہ ایک شخص تھا جس نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا اس پر حق تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی اور یہ ابوبکر صدیق ہیں انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنا خون خرچ کیا ہے۔

حضرت محمد بن عقیل بن ابی طالب سے مروی ہے کہ ایک دفعہ امیرالمومنین حضرت علی نے خطبہ پڑھا پھر فرمایا بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟

ہم نے عرض کیا "امیرالمومنین آپ ہی ہیں"

حضرت علی نے فرمایا میں نہیں بلکہ ابوبکر صدیق تھے اس لئے کہ جنگ بدر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خیمہ نصب کیا اور باہم مشورہ ہوا کہ یہاں کسی کو حفاظت کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے تاکہ دشمن خیمہ تک نہ پہنچ سکے حضرت ابوبکر کے سوا کسی کی وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ اپنی تلوار سوت کر کھڑے ہو گئے جب کوئی مشرک آپ کے قریب آتا آپ اس پر فوراً تلوار سے حملہ کرتے۔ ایک مرتبہ کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے پاس گھیر لیا اور آپ کو ستانا اور پریشان کرنا شروع کر دیا اور بار بار کہتے کیا تو نے ہی سب معبودوں کو ایک معبود کر دیا۔

خدا کی قسم اس وقت ابوبکر صدیق کے علاوہ کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لئے نہ گیا (پھر تمام قصہ بیان کیا) حضرت عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علی نے

فرمایا قرآن کریم کی خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کے مستحق حضرت ابو بکر صدیق ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کو جمع کیا ہے۔

حضرت موسیٰ بن شداد سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جماعتِ صحابہ میں حضرت ابو بکر صدیق سب سے افضل ہیں۔

حضرت ابو سفیان کا حضرت ابو بکر کی خلافت کو ناپسند کرنا اور حضرت علی کی تردید

حضرت ابو سفیان حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں گئے اور ان سے کہا اے علی اور عباس خلافت قریش کے چھوٹے اور ادنیٰ قبیلہ میں چلی گئی اب اس کا کیا حشر ہوگا؟ خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو ابھی ان کے خلاف اطراف و جوانب سے پیادہ اور سوار لشکر جمع کر دوں۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم میں اس بات کو پسند نہیں کرتا اگر ہم حضرت ابو بکر صدیق کو خلافت کا اہل نہ سمجھتے تو ہرگز ان کو خلیفہ نہ بناتے۔ ابو سفیان! مسلمان وہ قوم ہے جو ایک دوسرے کی خیر خواہ اور معین و مددگار ہو۔ اگرچہ ان کے اجسام اور اوطان دور دور ہوں۔ اور منافق وہ قوم ہے جس کا شیوہ دھوکا اور فریب ہے وہ ایک ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور مکر و فریب پھیلاتے ہیں یعنی یہ بات کہ ہم ظاہر میں تو حضرت ابو بکر سے بیعت کرلیں اور دل سے اس کو ناپسند کریں۔ اسلامی تعلیمات اور مسلمان قوم کی خصوصیات کے بالکل منافی ہے یہ تو کھلا نفاق ہے اور منافقوں کی خاص علامت ہے کہ بظاہر رواداری برتی جائے اور اندرونی طور پر دھوکا اور فریب دیا جائے

مرتدین وغیرہ کے بارہ میں حضرت ابو بکر کا حضرت علی سے مشورہ

جب حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ منتخب ہو گئے تو عرب کے بعض قبیلوں نے مالِ زکوٰۃ بیت المال میں دینے سے انکار کیا اور کہا کہ ہم مال زکوٰۃ کو اپنے رشتہ داروں میں اور اپنی خواہش کے موافق خرچ کریں گے اس پر حضرت ابو بکر صدیق نے صحابۂ کرام کو جمع فرمایا اور اس معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ بعض کی رائے تھی کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے تاکہ اسلام سے وابستہ

ہوجائیں اور اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہوجائے۔ بعض نے کہا ان کو اپنی حسبِ منشا خرچ کرنے دیجئے بعد میں آپ اس مال کو واپس لے لیں۔ حضرت ابوبکر حضرت علی کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا ابوالحسن تمھاری کیا رائے ہے؟

حضرت علی نے فرمایا جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اگر آپ نے اس میں سے کچھ بھی چھوڑ دیا تو یہ طریقہ نبوی کے خلاف شمار ہوگا۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا جب یہ بات ہے تو اگر انھوں نے مالِ زکوٰۃ کی ایک رسّی دینے سے بھی انکار کیا تو میں ان سے ضرور قتال کروں گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں والد ماجد اپنی سواری پر سوار ہو کر تلوار سونتے ہوئے ذوالقصہ عہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ حضرت علی کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے پہنچ کر سواری کی باگ پکڑ لی اور کہا کہ خلیفہ رسول اللہ کہاں کا قصد ہے؟ میں آپ سے اس وقت وہی بات عرض کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد میں آپ سے فرمائی تھی کہ اپنی تلوار کو نیام میں رکھو اور ہمیں اپنا دکھ نہ پہنچاؤ۔ خدا کی قسم اگر ہم پر آپ کی مفارقت کا صدمہ پڑا تو پھر آپ کے بعد اسلام کا نظام ہرگز قائم نہ رہ سکے گا اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس پر حضرت ابوبکر صدیق لوٹ آئے اور لشکر کو روانہ کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید نے امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق کو اطلاع دی کہ اطرافِ عرب میں ایک شخص عورتوں کی حرام کراتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق نے مشورہ کے لئے صحابہ کرام کو جمع فرمایا جن میں حضرت علی بھی تھے۔ حضرت علی نے فرمایا قوم لوط کے سوا یہ گناہ کسی سے سرزد نہیں ہوا پھر جو معاملہ حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا وہ سب کو معلوم ہے میرے خیال میں اس شخص کو آگ لگا دینا چاہئے۔ اسی پر تمام صحابہ کا اتفاق ہوگیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق نے حکم تحریر فرما دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کے بعد حضرت علی کے تاثرات

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوگیا اور آپ کو چادر اڑھا دی گئی تو

عہ ایک مقام کا نام ہے ۱۲

سارا مدینہ منورہ آہ وزاری سے گونج اٹھا اور وہ حالت ہوگئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ہوئی تھی۔ حضرت علی آبدیدہ رنجیدہ انا للہ پڑھتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا آج خلافت نبوت ختم ہوگئی۔ پھر اس حجرہ پر پہنچے جہاں حضرت ابوبکر کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور دروازہ پر کھڑے ہوکر فرمانے لگے ابوبکر خدا تم پر رحمت نازل فرمائے تم رسول اللہ کے دوست اور ساتھی تھے اور آپ کے مونس وغم خوار اور معتمد علیہ تھے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی رازدار اور مشیر خاص تھے۔ تم سب سے پہلے اسلام لائے اور خلوص ایمان اور شدت یقین اور خشیت خداوندی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے تم نے دین کی حمایت کی خاطر بہت تکالیف برداشت کیں۔ تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی اور اسلام کے شیدائی تھے اور اپنے دوستوں کے لئے سراسر خیر وبرکت اور بہترین ساتھی تھے تم بڑے عالی مناقب صاحب خیر بلند مرتبہ عالی حوصلہ تھے اور رشد وہدایت اور رحمت و فضیلت میں سب سے زائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ دربار رسالت میں تمہاری قدر ومنزلت سب سے زیادہ تھی اور تم سب سے زیادہ قابل اکرام اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ حق تعالیٰ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے تھے۔ اور آپ نے ایسے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی جب لوگ حضور کو جھٹلا رہے تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آپ کا لقب "صدیق" رکھ دیا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت میں مال خرچ کیا اور غم خواری کی جب لوگ پہلوتہی کر رہے تھے اور آپ مصائب میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھی رہے جب لوگ حضور انور کو چھوڑ بیٹھے تھے آپ نے مشکلات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوب ساتھ دیا آپ ثانی اثنین اور رفیق غار تھے آپ ہی پر سکون وطمانیت نازل کی گئی اور آپ ہی ہجرت کے ہمراہی بنائے گئے۔ آپ دین الٰہی اور امت محمدی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور نائب منتخب ہوئے جب لوگ مرتد ہونے لگے آپ نے بہترین طریقہ پر فرائض خلافت انجام دیئے اور وہ کارنامے کئے جن کو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کیا جب لوگ سست ہوگئے تو آپ مستعد رہے اور جب لوگ پست ہمت ہونے لگے تو آپ خود قتال کے لئے تیار ہوگئے [illegible]

اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر کاربند ہے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق تھے اور منافقوں کی کاوش اور کافروں کی ناگواری، حاسدوں کی ناراضگی ناسقوں کی ریشہ دوانی اور باغیوں کی مساعی کے باوجود نہ آپ کی خلافت میں کوئی جھگڑا ہوا اور نہ آپ خلافت سے باز رکھے گئے۔

جس وقت لوگ سست پڑ گئے تو آپ چست رہے اور اہم امور انجام دئے اور جب وہ بول نہ سکتے تھے آپ گویا رہے، وہ بھٹک کر ٹھہر گئے تو آپ روشنی میں چلے انھوں نے آپ کی پیروی کی اور راہ یاب ہوئے۔

آپ پست آواز تھے مگر تلاوتِ قرآن اور گفتگو خوب صاف کرتے تھے۔ آپ کم گو اور راست گو تھے اور بیشتر خاموش رہتے تھے۔ آپ قدرت کلام، اصابت رائے۔ شجاعت بحربہ میں سب سے ممتاز تھے۔ خدا کی قسم آپ اس وقت بھی اسلام کے رئیس اور امیر تھے۔ جب لوگ اسلام سے پہلو تہی کر رہے تھے اور اس وقت بھی رئیس تھے جب لوگ جوق درجوق اسلام کی جانب مائل تھے آپ مومنوں کے رحیم باپ تھے جب وہ آپ کے عیال بن گئے تو آپ نے ان کا وہ بوجھ سنبھال لیا جس سے وہ عاجز ہو گئے تھے اور جو انھوں نے چھوڑ دیا تھا اس کی حفاظت فرمائی اور جو ضائع کر دیا تھا اس کی تلافی فرمائی ان کی ذلت اور گھبراہٹ کے وقت آپ نے اہتمام کیا اور عالی ہمتی سے کام لیا اور ان کے جزع و فزع کے وقت صبر و تحمل کیا اور ان کی جنایات کا بدلہ لیا۔ وہ اپنی ہدایت یابی کے لئے آپ کی طرف بڑھے اور کامیاب ہوئے اور آپ کے باعث وہ حاصل کر لیا جس کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ آپ معاندینِ اسلام کے لئے سراپا قہر و غضب تھے اور مومنوں کے حق میں سراسر رحمت و نعمت تھے۔ واللہ تمام امور میں آپ کی پرواز بہت بلند رہی اور آپ نے اہم امور میں ہمیشہ کامیابی حاصل کی اور اعلیٰ فضائل اور مناقب کو حاصل کیا۔ نہ آپ کی دلیل کبھی منقطع ہوئی اور نہ آپ کی بصیرت کمزور ہوئی اور نہ کبھی آپ پر بزدلی ظاہر ہوئی نہ کسی قسم کا خوف و ہراس ہوا بلکہ آپ ہمیشہ استقلال سے پہاڑ کی طرح جمے رہے جس کو نہ آندھیاں حرکت دے سکیں اور نہ اپنی جگہ سے ہٹا سکیں۔ آپ ویسا ہی تھے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا مال و

[illegible]

معاملہ میں ضعیف اور حق تعالیٰ کے معاملہ میں قوی اور اپنی نگاہوں میں حقیر اور بارگاہِ خداوندی میں مقرب اور لوگوں کی نگاہوں میں صاحبِ حشمت و شوکت۔ آپ امتِ محمدیہ کی بزرگ ترین ہستی تھے نہ کسی کو آپ کی شان میں طعنہ کی گنجائش اور نہ بدزبانی کا موقع اور نہ آپ کی نسبت لالچ کا گمان اور نہ کسی کی طرفداری کا وہم۔ ایک ضعیف اور ذلیل شخص آپ کے نزدیک قوی تھا جب تک آپ اس کا حق اس کو نہ دلا دیتے اور ایک قوی باعزت شخص آپ کے نزدیک ضعیف اور ذلیل تھا جب تک کہ آپ اس سے دوسرے کا حق نہ دلا دیتے۔ دور و نزدیک اس میں آپ کے نزدیک سب برابر تھے۔ آپ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ تقرب اور عزت اس شخص کو حاصل تھی جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار اور متقی و پرہیزگار تھا۔ آپ کی شان حق گوئی اور راست بازی اور نرم خوئی تھی آپ کا فرمان حکم محکم اور حتمی فیصلہ ہوتا تھا اور آپ کا فرمان بردباری اور استواری پر اور آپ کی رائے دانائی اور پختگی پر مبنی ہوتی تھی۔ آپ جس طرح بھی چلے راستے کھل گئے اور دشوار آسان ہو گیا۔ آپ کی بدولت باطل کی آگ بجھ گئی اور دین اعتدال پر آ گیا ایمان پھر سے قوی اور مضبوط ہو گیا اور اسلام اور مسلمان از سرِ نو تم گئے اور حکمِ الٰہی غالب ہو کر رہا اور معاندین سرنگوں ہوئے۔ آپ مسلمانوں کو چھوڑ کر چل دیتے جس سے وہ حیران رہ گئے آپ نے بہت جلدی کی اور اپنے پسماندگان کو سخت مشکل میں پھنسا دیا۔ آپ تو پورے طور پر فائز اور کامیاب ہو گئے۔ آپ کو کسی کی آہ و زاری کی کیا حاجت۔ آپ کا تو آسمانوں میں پرتپاک خیر مقدم ہے لیکن آپ کی مصیبت نے مسلمانوں کو نڈھال اور شکست کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہم حق تعالیٰ سے اس کے حکم پر راضی ہیں اور اس کا معاملہ اسی کے حوالہ کرتے ہیں خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں پر آپ جیسی کوئی مصیبت نازل نہ ہوگی اس لئے کہ آپ دین کے نگہبان اور دین کی عزت اور دین کے ملجا اور ماویٰ تھے۔ آپ مومنوں کے حق میں سایۂ عاطفت اور قلعۂ مستحکم اور بارانِ رحمت تھے اور منافقوں کے حق میں سخت اور غیظ و غضب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو اپنے نبی سے ملا دیا اب ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ رکھے اور آپ کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرے۔

حضرت علی کی بات ختم ہونے تک سب لوگ خاموش رہے پھر اس قدر روئے کہ چیخیں نکلنے لگیں اور کہا رسول اللہ کے داماد تم نے جو کچھ فرمایا بالکل سچ اور حق فرمایا۔

وہ احادیث جن کو حضرت علی نے حضرت ابو بکر سے روایت کیا

اسماء بن حاکم فزاری سے مروی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچاتے اور جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے حدیث رسول بیان کرتا تو میں اول اس سے قسم لیتا جب وہ قسم کھا لیتا تب میں اس کو سچ سمجھتا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے مجھ سے حدیث بیان کی اور حضرت ابو بکر سچے تھے (لہٰذا ان سے قسم لینے کی ضرورت نہ تھی)

حضرت ابو بکر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور توبہ و استغفار کرے تو حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کے دفن کرنے میں صحابہ کرام کی مختلف رائے تھی بعض نے بقیع کی رائے دی بعض نے موضع جنائز پسند کیا اور بعض نے صحابہ کے قبرستان کا مشورہ دیا۔ اسی دوران میں حضرت ابو بکر صدیق تشریف لائے اور فرمایا ہٹ جاؤ نبی کے روبرو موت و حیات دونوں حالت میں بلند آواز سے گفتگو نہ کرنی چاہیے۔

حضرت علی نے فرمایا حضرت ابو بکر اپنے معمولات میں قابل اعتماد ہیں۔
حضرت ابو بکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ جس جگہ نبی کا وصال ہوتا ہے اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔

(ف) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کا خلیفہ ہونا تقدیر الٰہی میں لکھا جا چکا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے مناسب احکام خاص طور پر ان کو بتلا دیتے تھے۔ نبی کا کسی مقام پر وصال ہونا یہ گویا حق تعالیٰ کی جانب سے اس مقام کا نبی کی آرام گاہ کے لئے انتخاب ہے پس جس جگہ نبی کا وصال ہو وہیں اس کا مدفن اور آرام گاہ بنے گی۔ اس قاعدہ کلیہ سے حضرت یوسف علیہ السلام مستثنیٰ ہیں

ان کا وصال مصر میں ہوا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے تابوت کو فلسطین لے جا کر دفن فرمایا۔ اور اس استثنار کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بارگاہِ الٰہی میں یہ تمنا اور التجا تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ ان کے وطن میں ہو جہاں دیگر انبیاء بنی اسرائیل آرام فرما ہیں۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا ابو بکر جب لوگوں کو دنیا کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھو تو تم آخرت کو مقدم رکھنا۔ اور آبادی اور ویرانہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں نہ بھولیں گے۔ اور کسی مسلمان کو ہرگز حقیر مت سمجھنا کیونکہ ادنیٰ مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعظمت و حرمت ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا گناہوں کے حق میں ایسا ہے جیسا آگ کے حق میں پانی (یعنی جیسا پانی ڈالنے کے بعد آگ کے تمام اثرات ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح درود شریف پڑھنے کے بعد گناہوں کے سارے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔) اور بارگاہِ نبوی میں سلام بھیجنا غلاموں کے آزاد کرنے سے افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تمام نفوس سے افضل ہے۔

حضرت فاطمہؓ اور حضرت ابو بکرؓ کا تذکرہ

حضرت فاطمہ زہراؓ حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں آئیں اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ فدک مجھے ہبہ فرما دیا تھا لہٰذا وہ مجھے دے دیجئے۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا صاحبزادی تم سچ کہتی ہو مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اس باغ کی آمدنی سے تمہارا روزینہ دے کر باقی کو فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ فرماتے تھے تم اسے لے کر کیا کرو گی؟

حضرت فاطمہ نے فرمایا جس طرح میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، اسی طرح میں بھی کروں گی۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا میں تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں

کہ اس کی آمدنی اسی طرح خرچ کروں گا جس طرح تمہارے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کرتے تھے۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا قسم کھاؤ کہ ایسا ہی کروگے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا خدا کی قسم ایسا ہی کروں گا۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ"۔

پھر ہمیشہ حضرت ابوبکر صدیق اس باغ کی آمدنی سے اہل بیت کرام کے اخراجات دے کر باقی فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کر دیتے تھے ان کے بعد حضرت عمر فاروق بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ پھر حضرت علی نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ایسا ہی کیا۔ حضرت علی سے کسی نے اس بارہ میں گفتگو کی تو آپ نے فرمایا جس کام کو ابوبکر اور عمر کرتے تھے اس کا خلاف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔

حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں تشریف لے گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ کا مطالبہ کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر اور تمہارے والد پر قربان ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ مال و سامان ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

(ف) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت نہ ہونے میں چند منافع ہیں۔

اول یہ کہ نبی کی ذاتِ گرامی پر کسی کو دنیا طلبی اور جمع مال کا شک و شبہ نہ ہو جو اس کی گمراہی اور تباہی کا باعث بنے۔ دوسرے یہ کہ نبی کے رشتہ داروں کے دل میں کبھی یہ وسوسہ نہ آئے کہ نبی کے بعد یہ مال و متاع ہمارا ہوگا۔ یہ خیال گویا نبی کی وفات کی خواہش ہے جو موجب ہلاکت و بربادی ہے۔ تیسرے یہ کہ نبی اپنی ساری امت کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے اور امت نبی کی اولاد ہوتی ہے اور یہ روحانی تعلق تمام مادی تعلقات پر غالب ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کے ورثہ کی حق دار ساری امت ہوتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؓ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں تشریف لائیں اور فرمایا خلیفہ رسول اللہ! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں یا رسول اللہ کے اہل بیت؟

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا میں وارث نہیں، بلکہ ان کی امت وارث ہیں۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا پھر خُمس کا کیا معاملہ ہے؟

حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب حق تعالیٰ کسی نبی کو کچھ مال دیتے ہیں تو نبی کے وصال کے بعد وہ مال بعد والوں کا ہوتا ہے اب جب میں خلیفہ ہوا تو خیال ہوا کہ اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔ حضرت فاطمہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تم زیادہ واقف حال ہو۔ اور واپس تشریف لے گئیں۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت فاطمہ کا حضرت علی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا تو فرمایا میری لاڈلی بیٹی میری آنکھوں کی ٹھنڈک فاطمہ کا اچھی طرح بناؤ سنگار کرو اور خوشبو خوب لگاؤ اور مہندی لگانا نہ بھول جانا۔

حضرت فاطمہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا میرے بعد ایک جماعت ظاہر ہوگی جن کو روافض کہیں گے جس جگہ تم ان کو پاؤ قتل کر دینا۔ یہ لوگ مشرک ہیں اور ان کی علامت یہ ہے کہ وہ ابوبکر و عمر کو گالیاں دیں گے۔

حضرت فاطمہ زہرا جب بیمار ہوئیں اور مرض بڑھ گیا تو حضرت ابوبکر صدیق ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

حضرت علی نے حضرت فاطمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق دروازہ پر کھڑے ہیں اگر تم چاہو تو ان کو اندر آنے کی اجازت دے دو حضرت فاطمہ نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا یہ بات تمھیں پسند ہے؟ حضرت علی نے فرمایا "ہاں"

پس حضرت ابوبکر صدیق گھر میں تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ سے گفتگو کی اور معذرت چاہی پھر حضرت فاطمہ ان سے راضی ہو گئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی نماز جنازہ

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مغرب و عشا کے درمیان انتقال فرمایا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر ابن عوام وغیرہم حضرات جنازہ پر حاضر ہوئے جب جنازہ نماز کے لئے رکھا گیا تو حضرت علی نے فرمایا، ابوبکر آگے بڑھئے اور نماز پڑھائیے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا تمھاری موجودگی میں میں آگے بڑھوں؟

حضرت علی نے فرمایا ہاں خدا کی قسم آپ کے ہوتے ہوئے کوئی اور نماز نہ پڑھائے گا
پس حضرت ابوبکر صدیق آگے بڑھے اور نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت فاطمہ زہرا
رضی اللہ عنہا کو رات ہی میں دفن کر دیا گیا۔

حضرت ابوبکر نے حضرت فاطمہ کے جنازہ کی نماز میں چار تکبیریں کہیں۔

حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے مناقب حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنین
کے متعلق ارشاد فرمایا یہ دونوں جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔

(ف) بعض روایات میں ہے کہ اہل جنت سب کے سب نوجوان اور ہم عمر ہوں گے
پس ارشاد نبوی کے یہ معنی ہوئے کہ انبیاء و مرسلین اور خلفاء راشدین کے علاوہ جن
کی فضیلت یقینی اور واضح ہے۔ یہ دونوں حضرات باقی تمام اہل جنت کے سردار اور
سرتاج ہوں گے۔

حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے
تھے اور سجدہ میں تھے کہ حضرت حسن یا حسین آئے اور کود کر آپ کی پشت پر بیٹھ گئے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکڑا اور آہستہ سے اتار کر سامنے بٹھا دیا میں نے ان کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھا ہے اور میں نے حضرت ابوبکر صدیق کو دیکھا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے اور ان کو اپنے کندھے
پر بٹھایا کرتے تھے۔

حضرت عقبہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق کے
ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ مسجد سے واپس ہو رہے تھے اور آپ میرے اور
حضرت علی کے درمیان تھے کہ راستے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے جن میں حسن بن علی بھی تھے۔
حضرت ابوبکر نے ان کو پکڑا اور گود میں اٹھا لیا اور فرمانے لگے میرے باپ تم پر قربان ہوں
تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو علی کے مشابہ نہیں ہو۔
حضرت علی یہ سن کر ہنسنے لگے۔

کہا میرے والد کی جگہ سے اترو۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا بے شک خدا کی قسم یہ تمہارے والد ماجد کی جگہ ہے میرے باپ کی جگہ نہیں۔ یہ کہہ کر ان کو گود میں اٹھالیا اور رونے لگے۔

حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم یہ میرے اشارہ سے نہیں ہوا حضرت ابوبکر نے فرمایا واللہ میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔

حضرت ابوبکرؓ کا وصال اور حضرت عمرؓ کی خلافت

معیقیب بن ابی فاطمہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے نفقات پر ملازم تھا۔ آپ جب مرضِ موت میں مبتلا ہوئے تو میں حاضر خدمت ہوا وہاں ایک صحابی کو آپ کے پاس تنہائی میں بیٹھے ہوئے پایا جو حضرت عمر کی خلافت کے متعلق اختلاف کر رہا تھا میں نے اس وقت لوٹنا چاہا لیکن جب آپ نے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا تو میں بیٹھ گیا اتنے میں ان کی باہمی گفتگو زور سے ہونے لگی اور حضرت ابوبکر نے غصہ سے فرمایا خدا کی قسم یہ کام بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا گیا بلکہ عمر تمہارے لئے تم سے بہتر ہیں اور تم اپنے لئے سراسر شر و فساد ہو۔ واللہ اگر میں تجھے حاکم بنادوں تو تو اپنی ناک کو گدی کے پیچھے لگالے (یعنی حق سے اعراض کرکے باطل کی طرف متوجہ ہوجاتے اور اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے کو اونچا سمجھنے لگے) تو میرے پاس آنکھیں ملتا ہوا اس لئے آیا ہے کہ مجھے میری رائے سے باز رکھے اور میرے دین میں رخنہ ڈالے خدا تجھے کھڑا ہونے کی بھی توفیق نہ دے واللہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تو نے عمر کی تحقیر یا بدگوئی کی تو تجھے شہر بدر کرکے تلخ چراگاہوں میں بھیج دوں گا جہاں چرو گے اور سبز ہو گے۔ پانی پیو گے اور سیراب نہ ہو گے۔ اسی پر وہ شخص اٹھ کر چلا گیا پھر میں نے آپ کے قریب ہوکر سلام کیا اور کیفیت مزاج دریافت کی آپ نے سلام کا جواب دیا اور مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اتنے میں اطلاع دی گئی کہ دروازہ پر حضرت عثمان اور حضرت علی حاضر ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ ان کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں گے مگر آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اندر آئے سلام کیا اور مزاج پرسی فرمائی آپ نے سلام کا جواب دیا اور کیفیت مزاج بیان فرمائی پھر فرمایا شاید تم کو بھی عمر کے متعلق وہی کہو گے جو فلاں شخص ابھی کہہ گیا ہے۔

انھوں نے عرض کیا خلیفہ رسول اللہ وہ شخص کیا کہہ گیا؟

حضرت ابوبکر نے فرمایا اس کے خیال میں عمر ادنی گھرانے کا آدمی ہے اور بعد میں اسلام لایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت کم فائدہ پہنچا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا خدا کی قسم اس نے بہت نازیبا کہا۔ اے خلیفہ رسول اللہ عمر ویسے ہی ہیں جیسا آپ چاہتے ہیں اور آپ کی منشاء کے مطابق ہیں علاوہ ازیں وہ نہایت جری اور قوی ہیں اور مؤمنین سابقین سے ہیں۔

حضرت علی نے فرمایا اس شخص نے جھوٹ بولا اور بہت سخت کہا۔ اگر آپ نے عمر کو خلیفہ بنا دیا تو وہ آپ کے خیال اور منشا کے مطابق نکلیں گے پھر وہ آپ کے ساتھ کام بھی کر چکے، آپ ان کی رائے پر چلتے تھے اور اس کو قبول کرتے تھے آپ کا جوار اللہ کی طرف ہے۔ اگر عمر آپ کے گمان کے مطابق نکلے اور ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا تو آپ کا مقصد پورا ہو گیا اور اگر خدانخواستہ آپ کے گمان کے برعکس نکلے تو مقصد خیر ہی تھا۔ پھر وہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور آپ نے مجھ سے فرمایا معیقیب قریب ہو جاؤ اور بتلاؤ لوگ عمر کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ کچھ لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ زائد کون ہیں؟

میں نے عرض کیا ناپسند کرنے والے۔

یہ سن کر فرطِ غم سے خاموش ہو گئے میں اپنی اس زیادتی پر بہت پشیمان ہوا اور سوچ میں رہا کہ اس کی تلافی کس طرح کروں اس لئے کہ حضرت عمرؓ میرے خصوصی دوستوں میں سے تھے کہ اتنے میں حضرت عمرؓ کے دروازہ پر حاضر ہونے کی اطلاع دی گئی آپ نے ان کو اندر بلا لیا۔ حضرت عمرؓ نے آکر سلام کیا آپ نے سلام کا جواب دیا پھر حضرت عمر نے مزاج پرسی کی آپ نے مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اور فرمایا عمر بعض لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں اور بعض ناپسند اور اکثر شریف لوگوں کو پسندیدہ ہوتی ہے اور خیر ناگوار گزرتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ اس منصبِ خلافت کو مجھ سے علیحدہ کیجئے مجھے اس کی حاجت نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا لیکن خلافت کو تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تمہارے سے کسی کی حق تلفی ہو جائے تو اس وقت تک اپنے ہاتھ کو اپنے منہ سے جدا رکھنا (یعنی کھانا نہ کھانا) جب تک کہ حق دار کا پیٹ نہ بھر جائے اور اس کا حق اس تک نہ پہنچ جائے۔ اگر ذاتی ضروریات تمہیں لوگوں کے مال میں شریک ہونے پر مجبور کر دیں تو اپنا روزینہ مقرر کر لینا لیکن اپنے کو ترجیح نہ دینا۔ اور کبھی مال جمع نہ کرنا۔ مال آنکھوں کو بھلا لگتا ہے اور دل اس طرف مائل ہوتا ہے امیر کا مال جمع کرنا اس کے خون کو بہا دیتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور اس کے دین کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ کے لئے گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے لئے بہترین دن وہ ہوگا جب اللہ ربّ العزت سے ملاقات ہوگی۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا میری بھی یہی تمنا ہے اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اسی دن میں پوری ہوگی، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خواب دیکھا تھا کہ مجھ پر تین دفعہ غشی طاری ہوتی اور تیسری دفعہ تے ہو کر سب کھانا نکل گیا۔ اس کے بعد میں دو مرتبہ بیمار ہو چکا اور یہ تیسری مرتبہ ہے بس اب میں جلد ہی جانے والا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا معیقیبؓ ہمارا اور تمہارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا میرے آپ کے ذمہ پچیس ۲۵ درہم نکلتے ہیں اور آپ ان سے سبکدوش ہیں

آپ نے فرمایا ٹھیرو جلدی نہ کرو کیوں دنیا کو ہماری ساتھ کرتے ہو۔ پھر فرمایا میرے خیال میں یہ ہمارا اور تمہارا آخری معاملہ ہے۔ سن کر میں رونے لگا۔

آپ نے فرمایا رومت مجھے امید ہے کہ میں خیر کی طرف جاؤں گا اور ہمیشہ خیر ہی میں رہوں گا۔

پھر حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ عائشہ کے پاس سے پچیس ۲۵ درہم لے آؤ۔ وہ دراہم لے آئی اور میں نے ان کو لے لیا۔ اس کو تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ بے شک آپ خیر کی طرف چلے گئے اور ہمیشہ خیر میں رہیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب بیمار ہوتے تو آپ گھر کی ایک کھڑکی میں سے لوگوں کی جانب

متوجہ ہوئے اور فرمایا میں تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تم اس پر راضی ہو؟
لوگوں نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ" ہم راضی ہیں۔ پھر حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ہم عمرؓ بن الخطاب کے علاوہ کسی دوسرے سے راضی نہیں۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ مرض الموت میں مبتلا ہوتے (حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور امت محمدیہ کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے)

اس وقت آپ نے صحابہ کے پاس قاصد بھیجا اور بہترین منتخب چیدہ صحابہ کو بلایا۔ جس مہاجرین اولین میں سے جن میں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر وغیرہ وغیرہ عمائدین قریش تھے اور انصار میں سے حضرت سعد بن مالکؓ اور حضرت خزیمہ بن ثابت اور حضرت ابوطلحہؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت سعد بن عبادۃ وغیرہ وغیرہ سرداران انصار تھے۔ یہ سب حضرات صحابہ کرام جمع ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت آپ کو ایک چادر اڑھا رکھی تھی اور ایک چادر آپ کے نیچے بچھا رکھی تھی اور آپ کے سرہانے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں گیہوں تھے یا کھجور اور جو کے ٹکڑے۔

جب سب حضرات بیٹھ گئے تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا مجھے سہارا لگا کر بٹھا دو۔ لوگوں نے سہارا لگا کر آپ کو بٹھایا جسم پر گوشت کا نام نہ تھا ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ نہ تھا سر اور جسم کے بال جھڑ گئے تھے صرف ایک نحیف اور ناتواں جثہ تھا۔ آپ کا یہ حال دیکھ کر سب رونے لگے۔

آپ نے فرمایا خدا تم سب پر رحمت نازل فرمائے کیوں روتے ہو؟

صحابہ نے عرض کیا آپ کی اس ظاہری حالت پر، سارا جسم دبلا ہو گیا اور بال جھڑ گئے اور ساری رعنائی اور خوب صورتی جاتی رہی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "جس شخص کو جہنم کی آگ میں جھونکے جانے کا خطرہ ہو جس کا عذاب دائمی ہے جس کی رسوائی بڑی رسوائی ہے جس میں رہنے والوں کا کام ہر وقت دکھ درد سے چلانا اور واویلا کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ حالت کچھ بھی نہیں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت اور مغفرت اور عفو و درگذر سے امید واثق ہو کہ جنت تک پہنچ جائے گا۔ اور جو اس میں پہنچ گیا وہ تمام نعمتوں سے سرفراز ہو گیا اور تمام آفتوں سے محفوظ ہو گیا اور

ہر قسم کی تکالیف سے مامون ہو گیا اور جس کو حق تعالیٰ خوش کر دیں اور وہاں کی راحت و رحمت سے نواز دیں تو جو حالت تم دیکھ رہے ہو ذرا بھی قابلِ التفات نہیں۔ پھر آپ کو غش آ گیا اور قریب تھا کہ آپ گر جائیں حضرت علی مرتضیٰؓ نے فوراً آگے بڑھ کر آپ کو تھاما اور اپنے سینے سے لگا کر بٹھا دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "ابوالحسن جو کچھ تم نے کیا حق تعالیٰ تمھیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اگر تم مجھے سہارے سے بٹھانا چاہتے ہو تو گھر کی دیوار سے سہارا لگا دو۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپ کو دیوار کے سہارے سے بٹھا دیا اور آپ کے پیچھے چادر رکھ دی آپ نے بیٹھ کر حاضرین کی طرف دیکھا اور نگاہ جما کر دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے پھر آپ پر گریہ طاری ہو گیا آپ کو روتا دیکھ کر سب پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں عورتیں بھی پس پردہ بے اختیار رو رہی تھیں اور آواز باہر آ رہی تھی۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ضبط کر کے اپنے کو سنبھالا اور اشارہ سے عورتوں کو منع فرمایا وہ خاموش ہو گئیں اور مرد بھی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر آپ نے فرمایا گروہ مہاجرین و انصار پردہ ہٹ گیا اور دھوکہ کھل گیا اور وہ وقت آ گیا جس کا کوئی دفعیہ نہیں۔ جاءت سکرۃ الموت بالحق انا للہ و انا الیہ راجعون کوئی شخص موت سے نہیں بچ سکتا موت کے سوا کوئی ٹھکانا اور چارہ کار نہیں۔ جس یقینی امر سے ڈرایا گیا تھا وہ قریب آ گیا۔

قیامت میں زیادہ قابلِ حسرت بدنصیب و بدحال جس کی نیکیوں کا پلڑا بالکل ہلکا ہو گا وہ شخص ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کے دنیاوی منفعت کے عوض فروخت کر ڈالے اور موت کے وقت جب کہ اپنے پروردگار کے سامنے جا رہا ہو پروردگار عالم کو دھوکہ دینا چاہے میں اس وقت حق تعالیٰ سے اپنے لئے بہترین ٹھکانہ کا طلب گار اور امیدوار ہوں اور اخروی زندگی کے زیادہ قریب ہوں تمھیں خدا کے حوالہ کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمھیں بہترین خلیفہ عطا فرمائے۔

پھر فرمایا میں نے اس رات دس ہزار مرتبہ استخارہ کیا اور جناب باری سے التجا کی کہ مجھے ایسے شخص کی جانب رہنمائی فرما جس سے تو راضی ہو تاکہ میں اپنے بعد یہ کام اس کے حوالہ کر دوں۔ پھر آخر شب میں کچھ دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ اب میں تمھیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں اور اپنی بات میں بالکل سچا ہوں اگر ذرا بھی جھوٹ ہو تو یہی جھوٹ میری تباہی کے لئے کافی ہو گا

جھوٹ بولنے یا اپنی طرف سے کوئی بات بڑھانے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

حاضرین نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ بے شک آپ بالکل سچے ہیں"۔

آپ نے فرمایا میں نے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ دو سفید کپڑے پہنے ہوتے تھے جن کی آستین جڑی ہوئی تھی ایک نور چمک رہا تھا جو آنکھوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ آپ کے ہمراہ دو شخص اور تھے ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب اور آپ وسط میں تھے یہ دونوں بھی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے جس سے نور پھیل رہا تھا۔ میں نے ان جیسا آدمی کبھی نہیں دیکھا کوئی بلند مرتبہ معلوم ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سلام کیا اور مجھ سے مصافحہ کیا پھر میرے سینہ پر اپنا دست مبارک رکھا جس سے وہ کرب و بے چینی جو میں محسوس کر رہا تھا جاتی رہی میں اب تک آپ کے دست مبارک کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ابوبکر تمھاری ملاقات کا شوق بڑھ گیا کیا تم بھی ہمارے مشتاق ہو؟

میں خواب میں خوب رویا جس کی بعد میں گھر والوں نے بھی خبر دی اور عرض کیا واشوقاہ الیک یا رسول اللہ (آہ یا رسول اللہ آپ کی ملاقات کا شوق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑی دیر بعد ہماری ملاقات ہوگی۔ ابوبکر حق تعالیٰ نے تمھارے معاملہ میں تمھیں خیر کی جانب رہنمائی فرما دی اب جو کچھ تمھارے دل میں آئے کر گزرو یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں مرنے کے قریب ہوں اب آپ کی امت کے لئے کس کو خلیفہ مقرر کروں؟ اور کس کو عوام کا حکمراں بناؤں؟ اور یہ بار کس کے گلے میں ڈالوں؟ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے آج استخارہ کیا ہے اور مجھے ان شاء اللہ بہتری کی امید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عادل صادق صاحب قوت و شوکت جن سے زمین و آسمان والے سب خوش ہیں۔ راہ راست پر چلنے والے متقی و پرہیزگار جن کا تقویٰ مقبول و مبرور ہے۔ عمر بن الخطاب تمام صحابہ سے افضل اور خلافت کے مستحق ہیں۔

پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہمراہیوں نے کہا اس کے بعد خدا کا فیصلہ

اور حکم نافذ ہو کر رہے گا۔ یہ دونوں (یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما) دنیا میں آپ کے وزیر ہے اور آپ ہی کے پاس مدفون ہوں گے اور جنت میں آپ کے قریب تر ہوں گے

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور ان دونوں نے بھی سلام کیا اور مجھ سے کہا تم مکروہات سے محفوظ ہو گئے اور بالکل پاک و صاف ہو گئے اب زمین و آسمان اور انسانوں اور فرشتوں میں تم "صدیق" ہو۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یہ کون ہیں؟ ان جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں" آپ کا اشارہ حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرف تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے جب میں بیدار ہوا تو آنسو میرے چہرے اور ڈاڑھی پر بہہ رہے تھے اور گھر والے میرے گرد اور سرہانے کھڑے ہوئے مجھ پر ترس کھا رہے تھے انھیں کیا معلوم کہ میں نے کیا دیکھا اور کیوں رو رہا ہوں؟ میں پھر بن دیکھی اور بے بھی خبر دینے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور آج تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تمھیں یہ پسند ہے

سب خاموش رہے اور حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ کسی کو پسند نہ کرتے اب آپ کی پسندیدگی نے ہماری پسند کو اور تقویت پہنچا دی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت علی مرتضیٰ کے متعلق چند کلمات خیر فرمائے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا میں تمھارے پر عمر بن الخطاب کو حاکم بناتا ہوں تم ان کی بات کو سنو اور ان کی اطاعت کرو اور یاد رکھو ان کی رہنمائی میں ہرگز ضائع اور رسوا نہ ہو گے۔ حضرت ابوطلحہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے سب کا خیال تھا کہ حضرت ابوبکر ان کو خلیفہ بنائیں گے جب آپ نے خلاف توقع حضرت عمر کو خلیفہ بنایا تو انھوں نے عرض کیا خلیفہ رسول اللہ قیامت کے دن اس کا بھی آپ سے سوال ہو گا لہذا امت کے لیے اچھی طرح غور کر لیجئے۔

حضرت علی نے فرمایا "طلحہ ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ نہ کسی کی بات سن سکیں گے اور نہ کسی کی اطاعت کر سکیں گے پھر فرمایا۔ واللہ عمر کے سوا کوئی اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا بلکہ عمر جیسا بھی اس کا متحمل نہیں کر سکتا۔ اور ابوبکر کے بعد عمر کے سوا کوئی بھی خلافت کے لیے موزوں نہیں۔ حق گوئی۔ راست بازی۔ پاک دامنی پرہیزگاری۔ امانت داری۔ منافقوں پر درشتی۔ مسلمانوں پر نرمی وغیرہ وغیرہ اوصاف میں عمرؓ سب سے ممتاز ہیں۔

واللہ عمرؓ وہ شخص ہیں جو اسلام لاکر کبھی مذبذب نہ ہوئے۔ قتال کیا اور کبھی سُست نہ ہوئے۔ مشقتوں کو برداشت کیا اور کبھی پشت نہ پھیری۔ اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور کبھی بخل نہ کیا۔

پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

خلیفہ رسول اللہ جس سے آپ خوش اس سے ہم بھی خوش ہیں اور جو آپ کی خواہش ہے وہی ہماری بھی خواہش ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے امت محمدیؐ سے کسی خیر و بھلائی اور نصیحت و خیر خواہی کی بات کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ کی طرف سے بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کو آپ کی آرزو اور آپ کی تمنّا اور آپ کے وہم و گمان سے بہت زیادہ الطاف و انعامات سے سرفراز فرماتے۔

پھر سب لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جب سب لوگ چلے گئے تو میں اور میری سوتیلی مائیں آپ کے پاس حاضر ہو گئے ایک چادر آپ کے لئے بچھا رکھی تھی اس پر آپ کو لٹا دیا اور دوسری چادر اُڑھا دی۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مرض میں کمی محسوس کرتا ہوں جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں پھر آپ سو گئے۔ ہم سمجھے کہ شاید پھر غشی طاری ہو گئی اور آپ کو اسی حال میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ باہر سے ایک بلند آواز سنائی دی جس سے آپ گھبرا کر بیدار ہو گئے اور صاحبزادہ سے فرمایا " بیٹا دیکھو دروازہ پر کون ہے؟ وہ باہر گئے اور واپس آکر کہا بعض مسلمان ملاقات کے لئے آئے ہیں۔

آپ نے فرمایا " ان کو اندر بلا لو "۔

صاحبزادہ نے ان کو اندر بلایا۔ وہ ہنستے کھل کھلاتے اندر داخل ہوتے سلام کیا اور مزاج پُرسی کی۔ آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا پھر دیر تک حق سبحانہ وتعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا پھر فرمایا تم لوگ جمع ہو کر ہنستے کھل کھلاتے کیوں آتے ہو اور کیا سرگوشیاں کر رہے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف زور سے کہو چھپاؤ نہیں وہ واضح اور کھلی بات ہے جو تم دل میں لئے ہوئے ہو۔

انہوں نے عرض کیا " خلیفۂ رسول اللہ آپ نے عمرؓ جیسے سخت مزاج کو خلیفہ بنا دیا۔

؎ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امور حق میں سختی اور اپنے عزم میں پختگی کے باعث بعض صحابہ کرام ان سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی نرم خو سہولت پسند خلیفہ مقرر ہو۔ حضرت ابو بکر اور

اللہ تعالیٰ کے روبرو جب آپ پیش ہوں گے اور آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا تو آپ کیا جواب دیں گے اور کیا دلیل پیش کریں گے؟

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر یہ سن کر بہت غصہ ہوئے میں نے اُن کو اس قدر غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ مجھے ان کا یہ غصہ اچنبھا معلوم ہوا پھر فرمایا: پھر کیا تم مجھے میرے پروردگار کی دھمکی دیتے ہو؟ اگر اس ذوالجلال والاکبر نے مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا تو عرض کروں گا میں نے ایسے شخص کو حاکم بنایا جو سب سے بہتر اور اعلیٰ تھا اور تیرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھا اور اہلِ زمین میں سب سے زیادہ تیری مرضیات کا شناسا تھا۔

خدا کی قسم جو کچھ ہونا تھا وہ آج مجھ سے صادر ہو چکا اور توحید اور ادائے فرائض کے بعد مجھے اپنے کسی عمل پر اتنا وثوق اور اطمینان نہیں۔ جتنا عمر کو خلیفہ بنانے پر ہے پھر تم عمر کو کسی عیب کی وجہ سے ناپسند نہیں کرتے بلکہ اس لئے ناپسند کرتے ہو کہ وہ انصاف پسند اور صلح جو ہے دھوکہ باز اور زمانہ ساز نہیں ان کا باطن نفاق سے پاک و صاف ہے اور ان کا ظاہر قوت کے ساتھ حق سے وابستہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے یہ ارشادات سن کر ان سب نے بھی حضرت عمر کی تعریف کی گویا وقتی تاثر کے باعث مشتعل چنگاریاں تھیں جن پر پانی ڈال دیا گیا پھر وہ لوگ آپ کے پاس سے چلے گئے اور سارے میں مشہور ہو گیا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کر دیا۔
جب یہ لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے تو آپ نے آدمی بھیج کر حضرت عمر کو بلوایا اور تنہائی میں ان سے فرمایا، عمر تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں اور ایسی بات بتاتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو محفوظ رکھا تو مجھے امید ہے کہ تم اس بارِ (خلافت) کی ذمہ داریوں سے محفوظ ہو گے اور اس بوجھ سے سبکدوش رہو گے۔

حضرت عمر نے فرمایا، خلیفہ رسول اللہ ضرور فرمایئے میں اس کو غور سے سنوں گا جو کچھ آپ مجھ سے مطالبہ کریں گے اس کو پورا کروں گا اور جو آپ حکم دیں گے انشاء اللہ اس کی پابندی کروں گا۔

حضرت علی چونکہ سمجھتے تھے کہ بغیر اس کے کارِ خلافت سرانجام نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اپنی رائے پر

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور اپنی منشا کے موافق بنایا وہ ذات وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو حکم رات کے متعلق ہوتا ہے وہ دن کو مقبول نہیں ہوتا اور جو حکم دن کے متعلق ہوتا ہے وہ رات کو مقبول نہیں ہوتا۔ اور جب تک فرائض خداوندی ادا نہ ہوں نفلی کام قبول نہیں ہوتے۔ قیامت میں ان لوگوں کی ترازو بھاری اور وزنی ہوگی جن کا شیوہ حق کی پیروی اور پابندی ہو اور حق ان کے لئے سہل اور آسان ہو جس ترازو میں حق کے سوا کچھ نہ ہو اس کا وزنی ہونا برحق اور بدیہی ہے اور ان لوگوں کی ترازو ہلکی ہوگی جو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور باطل ان کے لئے آسان ہے جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ نہ ہو اس کا ہلکا پھلکا ہونا کھلی بات ہے۔ اس کو ہلکا ہی ہونا چاہئے حق تعالیٰ نے اہل جنت کا اچھے اعمال کے ساتھ ایسی طرح تذکرہ فرمایا کہ ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ ان کے علاوہ اور کوئی بھی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مرغوب اور پسندیدہ نہیں اور اس رتبہ کو بغیر رحمت خداوندی اور عنایت، تقوی و پرہیزگاری اور اوامر خداوندی کی پابندی اور منہیات سے رستگاری کے بغیر کوئی شخص بھی حاصل نہیں کر سکتا پھر حق تعالیٰ نے دوزخیوں کے برے اعمال کا تذکرہ فرمایا اور ان کے اچھے اعمال کو اس لئے رد فرما دیا کہ وہ خلوص سے خالی تھے اور ان کو کرنے والے منہیات سے نہ بچتے تھے تاکہ ہر ایک ان سے بہتر بننے کی خواہش کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے نبی صادق مصدوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت رحمت اور آیت عذاب دونوں نازل فرمائیں چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ	بلاشک تمہارا پروردگار لوگوں کی بخشش کرنے والا ہے ان کے ظلم کی بنا پر

دوسری جگہ ارشاد ہے

اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ	بلاشک تمہارا پروردگار سخت گرفت کرنے والا ہے

تاکہ مومن ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار بھی رہے اور عذاب الٰہی سے خوف زدہ بھی رہے اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑے اور اللہ تعالیٰ سے ناحق بات کی امید اور تمنا رکھے۔

عمر اگر تم نے میری وصیت کو محفوظ رکھا تو محبوب چیزوں میں موت سے زیادہ کوئی شے

تمہیں محبوب نہ ہوگی اور موت کے بغیر چارہ بھی نہیں ۔ اور اگر تم نے میری وصیت کو ضائع کردیا
تو کوئی غیب دار چیز موت سے زیادہ تمہیں مبغوض نہ ہوگی اور تم موت سے کسی طرح بچ نہیں سکتے
حضرت عمرؓ نے فرمایا خلیفہ رسول اللہ میں نے آپ کی وصیت کو قبول کیا اور میں
انشاء اللہ آپ کے فرمان کو مضبوط پکڑے رہوں گا ۔
پھر حضرت عمر روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے اور کہتے جاتے کہ بخت عمر جس
کام کو تو نے قبول کرلیا اس سے تیری خلاصی کس طرح ہوگی اور اس بار گراں کا تحمل کیوں کر ہوگا
پھر خود ہی فرمایا خلاصی پرہیزگاری میں ہے اور نجات دنیا سے بے رغبتی میں ہے ۔ اے نفس خشوع
وخضوع کی کوشش کر اور بھوک پیاس پر صبر اختیار کر ۔
حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں ابو بکرؓ کی جان آفریں کی قسم ابو بکرؓ کا آخر وقت بھی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت کے مشابہ گذرا آپ درمیانی رات میں اٹھے اور فرمایا عائشہ
وہ کپڑا کہاں ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک ڈھکا گیا تھا ۔ آپ نے اس کو
لیا اور اپنے چہرہ پر رکھا اس کی خوشبو سونگھی اور فرمایا اگر تم جھٹلاؤ نہیں تو مجھے اپنے حبیب صلی اللہ
علیہ وسلم کی خوشبو آرہی ہے ۔ پھر اپنا چہرہ قبلہ رُخ کیا اور کہا اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى سَكَرَاتِ
الْمَوْتِ وَشِدَّةِ الموت وَعفر الموت
پھر آپ کو خوب پسینہ آیا اور اس محراب پر نگاہ جم گئی جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے
اور چند بار فرمایا ۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ — اور موت کی سختی (قریب آپہونچی) یہ (موت)
ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ — وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا ۔

پھر کچھ افاقہ ہوا اور پتلی اپنی جگہ پر آگئی اور دیر تک کلمہ شہادت اور درود پڑھتے رہے
پھر صلی اللہ علیک صلوٰۃ طیبۃ مبارکۃ پڑھا ۔ اس کے بعد نگاہ قبلہ کی طرف
پھر گئی اور بلند آواز سے کہا اللہ کے فرشتو اور میرے پروردگار کے قاصدو ! السلام علیکم پھر
آہستہ سے چند بار کہا لبیك لبيك من داع وسعديك (اے بلانے والے میں حاضر
ہوں) ۔ پھر منہ کھولا اور بند کرلیا اور واصل بحق ہوگئے ۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ ۔

آپ کے دفن کے متعلق صحابہ کرام میں اختلاف رائے ہوا بعض نے بقیع غرقد کی رائے

دی اور بعض نے مدفن شہدا کو پسند کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا نہیں میں اپنے گھر اپنے حجرہ میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کردں گی اور دونوں حضرات کی قبور کی زیارت سے ان کی یاد تازہ رکھوں گی۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک دم سب پر نیند کا غلبہ ہوا اور اونگھ طاری ہو گئی۔ اسی حال میں ایک غیبی آواز سنی ضموا الحبیب الی الحبیب دوست کو دوست سے ملادو۔ ہم نے سر اٹھایا تو کوئی نظر نہ آیا البتہ آواز سب نے سنی حتیٰ کہ جو لوگ مسجد میں تھے انھوں نے بھی سنی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کرنا طے ہو گیا تو جو شخص بقعہ انور پر نظر ڈالتا نگاہیں خیرہ ہو جاتیں اور قبر کا کھودنا مشکل ہو گیا۔

حضرت علی نے فرمایا رات تک ٹھیر جاؤ جب رات ہو گئی تو حضرت علیؓ نے گورکن کے چہرے پر کپڑا ڈال کر اس کو حجرہ منورہ میں داخل کیا اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے قبر اطہر و انور کی جانب پشت کر کے قبر کھودنی شروع کی۔

حضرت علی نے گورکن کو حکم فرمایا کہ جلدی کرو زیادہ دیر نہ لگے۔

باقی لوگ باہر کھڑے رہے جب لحد تیار ہو گئی تو آپ کے صاحبزادوں اور گھر والوں نے آپ کو قبر میں اتارا اور مٹی ڈال دی۔

اسلام اور ہندومت

اسلام اور ہندومت کی بعض مشترک تعلیمات

—— مناظر احسن گیلانی

ہندو مذہب بلکہ ہندی مذاہب پر ہم اچھی طرح بھرپور طور سے اردو والوں کے سامنے اور پھر عزیزانِ وطن کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دینا چاہتے ہیں جس سے عزیزانِ وطن کی آنکھیں کھلیں کہ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہ تو پورے ہندوستان کی زبان ہے نہ پوری پوری سیکولر! لیکن فی الحال اس مسئلہ کو چھیڑنے سے قبل بطور دیباچہ دانا گیا دن کی ایک معرکۃ الآرا تحریر پیشِ خدمت ہے۔

ادارہ

اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات

از

ازمولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

"تناسخ اور اس کے ذریعہ نجات کے عقیدے کی تعلیم آپ نے (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے) نہین دی، بہشت و دوزخ وغیرہ باتین عیسائیون اور یہودیون کے مذہب جیسے رہنے دین"

(ابھینو نڈل اتہاس ص ۸۸)

یہ ہے وہ علم جو اس وقت اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارے بچون کو سکھایا جا رہا ہے، مذکورہ بالا کتاب (ابھینو نڈل اتہاس) ہمارے اسکولون کے نصاب مین شریک ہے، مصنف کا نام بھولا داس بی اے ایل ایل بی ممبر بہار ریسرچ سوسائٹی ہے، کتاب ابھینو گرنتھاگار کی شائع کی ہوئی ہے،

جو فقرے اس کتاب کے آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہین، اُن کو پڑھکر پہونچنے والے یقیناً ان ہی نتیجون تک پہنچ سکتے ہین، کہ

۱۔ مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان مین جو لوگ آباد تھے، اور ویدک دھرم کے قائل تھے، اُن کے اس دھرم مین صرف تناسخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور بہشت و دوزخ وغیرہ عقائد سے اس دھرم کو کوئی تعلق نہین ہے،

۲۔ عیسائیون اور یہودیون کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکی اور بدی کے نتیجے اُن کے سامنے بہشت و دوزخ کی شکل مین سامنے آئین گے،

دوسری بات یعنی عیسائیون اور یہودیون کے ذہن مین مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور اسلام مین بھی یہی مانا جاتا ہے، کیا یہی واقعہ ہے؟ یہودیون کا حال تو یہ ہے کہ اُن کے دین کی بنیادی کتاب توراۃ، مرنے کے بعد جی اٹھنے کے عقیدہ سے خاموش ہے نیکی اور بدی کے صلہ مین فلسطین کی سرزمین کا وعدہ اس کتاب مین پایا جاتا ہے جس مین بار بار دہرایا گیا ہے کہ اسی ارض موعود مین شہد اور دودھ کی نہرین بہتی ہین، خدا کے حکمون کو مانو گے، تو اس سرزمین پر تمھارا قبضہ قائم رہے گا، باقی عیسائی مذہب سو اس مین مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر ضرور کیا گیا ہے لیکن عیسائیون کا عقیدہ ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد فرشتہ بن جاتا ہے، اور بدکار شیطان اور بھوت بن جاتے ہین یہی وجہ ہے جو قرآن کی حیثیت پر عیسائی اس لئے بیچین بیچین ہوئے ہین کہ فرشتہ کی زندگی کو جنات وانہار وحور و قصور سے کیا تعلق،

باقی پہلی بات یعنی ہندوستان کے باشندے اسلام کے پیش کئے ہوئے عقیدے جنت و دوزخ سے قطعاً ناآشنا اور ناواقف تھے، اُن کے دین مین نجات کا ذریعہ صرف تناسخ کو مانا جاتا تھا، اور اُس کے سوا بھی اسلامی تعلیمات کے دوسرے اجزار کے متعلق دیکھئے کہ ویدک دھرم کی تصریحات اس باب مین کیا ہین،

افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤن کے ویدک دھرم کا مقابلہ صحیح علمی روشنی مین نہین کیا گیا ایک ہندو دوان (عالم) کے تاثرات تو آپ دیکھ چکے، خود مسلمانون کا بھی حال اس معاملہ مین یہ ہے کہ براہ راست ہندوؤن کی کتابون کے پڑھنے کا موقع جن لوگون کا نہین ملا ہے، سُنی سنائی باتون کو اتنا قرار دے کر اس قسم کی چیزین اُن کی کتابون مین بھی درج ہو گئی ہین، اور تو اور محمد بن عبدالکریم شہرستانی جنھون نے مذاہب و ادیان ہی پر اپنی مشہور کتاب ملل ونحل لکھی ہے، اس مین بعض مسلمانون کے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ برہمن کا لفظ برہما نامی جس شخص کی طرف منسوب ہے، یہ دراصل حضرت ابراہیم کے نام کا ایک ہندی تلفظ ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے شہرستانی نے لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے اس لئے کہ برہمنون

کا طبقہ جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے، وہ تو

المخصوصون بنفی النبوات اصلاً ورأسًا (نبوات کے سلسلے کا سرے سے منکر ہوا) (ترجمہ)

خدا ہی جانتا ہے کہ شہرستانی نے "براہمہ" یعنی برہمن، ہندوستان کے کن لوگوں کو سمجھ لیا۔ وہ اُن کی طرف یہ عجیب و غریب عقیدہ منسوب کر دیا کہ وہ نبوات و رسالات ہی کے سلسلہ کے سرے سے منکر تھے،

حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ برہمنوں کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور کیوں جانئے نہ بھارت جو عام طور پر ہر ہندو کے گھر میں اب بھی پڑھی جاتی ہے، اسی میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل سکتی ہیں، مثلاً:۔

"پرمیشر (خدا) کی سانس سے وید اتپن (پیدا) ہوئے"

(انوشاسن پرب ادھیائے)

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ یہ ہیں کہ

"تپشری (عبادت گزار) لوگ بیدبچن (وید کے الفاظ) کو بھگوان کا ونک (کلام) جان کر اس پر دڑھ بدھی (استقامت اختیار کرتے) رہے ہیں"

(شانتی پرب حصہ سوم ۲۰، ادھیائے)

بہرحال وید کا برہما کے منہ سے نکلنا، ہندوؤں کے سناتن دھرم کا عام عقیدہ ہے اور خواہ شہرستانی کو اس کا علم نہ ہو، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء اور صوفیہ بھی تو کتابوں میں اس قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور فقرہ مکتوبات مظہری میں پایا جاتا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے رحم و فضل سے

"کتابے مسمی بہ بید کہ چہار دفتر دارد و مشتمل بر احکام نہی و امر و اخبار ماضی و مستقبل است"

" تو ستا ملکے برہما نام کرد او را بجائے عالم ست فرستاد " (ص ۱۹۰)

مرزا صاحب نے برہما کو بجائے ابراہیم علیہ السلام کے ملک یعنی فرشتہ قرار دیا ہے، لیکن بہرحال اس کی تو تصریح فرمائی ہے کہ وید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہی ہندوؤں کا عقیدہ ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناواقفیت کی وجہ سے شہرستانی نے ہندوؤں کو سرے سے نبوات و رسالات کا منکر ہی ٹھہرا دیا، اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام اور ویدک دھرم کے تعلیمات میں کیا تعلق ہے ؟ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر نہ ہندوؤں میں صحیح طور پر کام کرنے والوں نے اب تک کوئی قابل ذکر کام کیا ہے، اور جیسا کہ چاہئے مسلمانوں میں بھی اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ قرار واقعی طور پر مستحق ہے، بطور ابتدائی و تمہیدی مضمون کے ایک مختصر سا مقالہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، غرض یہ ہے کہ کام کی راہ کم از کم ان لوگوں کے سامنے آ جائے، جو ہندو مذہب کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں،

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے نہیں کیا گیا ہے، ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا نام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے، اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہو گئی ہے بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر گھر میں پاٹ ہوتا ہے اور ہر کہہ و مہ چھوٹے بڑے کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود

لہ میرا اشارہ وید اور اپنشد وغیرہ ہندوستان کے قدیم دینی سرمایوں کی طرف ہے، وید کے متعلق پنڈت سندر لال جی نے اپنی کتاب "قرآن اور گیتا" میں جو حال میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ وید کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ صحیح مطلب کا سمجھنا بڑا دشوار ہے

ہے، قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ، اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں، توحید ہے، یعنی بجائے مخلوقات کے عالم کے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی عبادت پر اصرار یہی قرآن کا محوری پیام ہے، اسی محور پر اس کے سارے مطالبات گردش کرتے ہیں، لیکن یہ تو قرآن میں ہے، اب مہابھارت کے بن پرب کا اکھڑ وان، دھیائے کا ترجمہ پڑھیے بھیم سین جو مہابھارت کی جنگ کے گویا رستم تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے کہ ایک دفعہ ہنومان جی نے بھیم سین کو اپنے درشن دیئے تو اس وقت قدیم ہند کے سناتن دھرم کی خصوصیت کو بتاتے ہوئے ہنومان جی نے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے یہ کہا کہ

"کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں، اس میں سناتن دھرم جاری تھا"

سناتن دھرم جب اس ملک میں جاری تھا، تو اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہنومان جی کے بیان کے مطابق کیا تھی، سنیئے ہنومان جی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ

"اس جگ میں دھرم کا ناش نہیں ہوتا تھا، دیوتا دانو، گندھرب، کھتر، جکش، رنش[1] ایک پرشوتم بھگوان کی پوجا کرتے تھے"، (بن پرب ادھیائے)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ اس ملک کے آباد کاروں کے آبا رآ ولین (اگلے آبا اجداد) کے دین کا جوہری عنصر توحید ہی تھا، اور خالق عالم جل مجدہٗ ہی کی ذات پاک اس ملک کا واحد معبود ہنومان جی کے زمانہ میں تھی، یہ وہ زمانہ تھا، جب ملک پر رام چندر جی حکومت کرتے تھے، لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ بھیشم پتامہ جن کا ذکر علم وعرفان حسن وکردار وعمل کے مثالی وجود کی حیثیت سے اس رزمیہ داستان مہابھارت میں کیا گیا ہے، جب زخمی ہو کر یہی بھیشم پتامہ تیروں کے سیج پر لٹا دیئے گئے تھے، اور اُن کی مزاج پرسی کے لئے آخر میں خود شری کرشن جی بھی اُن کے بالین

---

[1] ملائکہ جن اور ارواح طیبہ، وخبیثہ کے متعلق ہندو ادبیات میں یہی الفاظ مستعمل ہیں، جکش ورنش الجن والانس کے ہم معنی الفاظ ہیں ۱۲۔

پہونچے، تو لکھا ہے کہ

"بھیشم جی کر اَن بھگت جان کر ترلوکی درشن"

سے سری کرشن جی نے سرفراز کیا یعنی تینون عالم (لوک) کا مشاہدہ ان کو کرا دیا، مذکورۂ بالا فقرے مین "اَن بھگت" کا جو لفظ ہے، اس کا مطلب اسی کتاب مین یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"جو کیون (صرف) نارائن (خالقِ عالم) کی اوسپانا (عبادت) کرتا ہو"

(مہابھارت شانتی پرب ۴۲۱ ادھیائے)

جس سے معلوم ہوا کہ مہابھارت کی جنگ اس ملک مین جب لڑی گئی تھی اس وقت بھی دینی زندگی کی روح یہی "اَن بھگت" ہونا سمجھی جاتی تھی، اور یہ تو خیر پھر بھی ایک اجمالی بات ہوئی، مہابھارت کی جنگ مین فاتحِ اعظم ہونے کی حیثیت راجہ جدھشٹر کو حاصل ہوئی تھی، ان ہی کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے یعنی :۔

"ہے مہابھاگ (بڑے خوش قسمت) راجہ جدھشٹر"

منجملہ اور باتون کے یہ اپدیش بھی ان کو دیا گیا تھا جس مین خالقِ عالم کو ان الفاظ مین روشناس کراتے ہوئے کہ

"وہی نارائن سرشٹی (عالم) کو اتپن (پیدا) کرتا ہے، اور پھر اپنے مین لے کر لیتا ہے"

(یعنی ہر چیز اسی کی طرف واپس ہو جاتی ہے انا الیہ راجعون) وہی سب دیوتاؤن، رشیون، دانوون، گندھروون، منشون، کا پالن پوشن کرنے والا ہے"

آخر مین راجہ جدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ

"اسی نرگن دیوتا کا پوجن کرو"

گویا :۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ یہی اللہ ہے تمہارا پروردگار، بس اسی

فاعبد ر کا ، کو پوجتے رہنا،

کی قرآنی آیت کا جو حاصل ہے، اسی کی تعلیم راجہ جدھشٹر کو دی گئی تھی، اور مہابھارت کا یہ نرگن دیوتا

جس کی پوجا کا مطالبہ راجہ جدھشٹر سے کیا گیا ہے جانتے ہیں، ہندوستان کے آباد کاروں کے آباؤ لیسٹ

کی معرفت اس کے متعلق کن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔

اسی کتاب کا وہ حصہ جسے اد یوگ کہتے ہیں، اس کے گیارہویں ادھیائے ہیں، ایک رشی جن کا

نام سجات جی بتایا گیا ہے، ان ہی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہو کہ

"سجات جی بولے کہ برہم کا روپ کیا برنن (بیان) کروں نہ پرتھی (زمین) میں وسا

ہے، نہ آکاش (آسمان) میں نہ اس کا کوئی جسم ہے، نہ وہ سمندر میں ہے، نہ ستاروں میں

نہ بجلی میں نہ بادل میں، نہ چندرماں آدمکنڈروں میں دکھائی دیتا ہے، نہ سورج میں نہ اور

کسی میں، کنتو اس کا روپ اپارینہ ہے"

اپارینہ کا ترجمہ مترجم صاحب نے "بے مثل و بے حد" کیا ہے، نیز اسی اد یوگ کے بارہویں ادھیائے

میں صراحتہً ان الفاظ کو ہم پاتے ہیں،

"اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہیں بتائی جا سکتی، اور نہ کوئی اُس کے

مشابہ ہے"

الغرض لیس کمثلہ شیئ کے تعبیری لباس میں قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو

ل مترجم صاحب سے میری مراد منشی شری رام صاحب ا تھرد ہلوی ہیں، جنھوں نے چار ضخیم جلدوں میں کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مہابھارت کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا ہے، مطبع نولکشور میں متعدد بار یہ ترجمہ چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۳ء کا مطبوعہ نسخہ ہے، سارے حوالے مہابھارت کے اسی ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔

ملا کیا ہے کہ مہابھارت کے اس فقرے میں اس کے سوا اور بھی کچھ ہے

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے، صرف چند سرسری مثالوں کو پیش کر رہا ہوں، ورنہ

قوم کی باتیں مثلاً:

"جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کریں، اس کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا، اور جس پر پرمیشر

کوپ کریں، اس کو کوئی بچا نہیں سکتا،   (سبھا پرب ادھیائے ۸۱)

مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ   اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو

فَلَا مُمْسِکَ لَہَا وَمَا یُمْسِکْ   کھولے، اسے کوئی روک نہیں سکتا

فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ ۔   اور جسے روک دے، اسے کوئی کھول

(صافات)   نہیں سکتا،

اور اسی مضمون کی بے شمار آیتوں کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل ہے، آپ بکثرت اسی مہابھارت

میں پا سکتے ہیں، اور قدم قدم پر اسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی

اگلی نسلوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، جیسے دوسروں تک ان کے آبائی سرمایہ کو قرآن نے واپس کیا

اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو ان کے وارثوں تک وہ پہنچانا چاہتا ہے، لوگوں کو معلوم

نہیں ہے اور نہ توجیہ ہی نہیں، مذہب کی عملی زندگی اثر دائم یعنی پاپ پن یا نیکی اور بدی کے قانون

کی تاریخ ہے، اس عام اسلامی نظریہ اور جو کچھ اس کے تفصیلات ہیں، ایک ایک جزء اس کا بھی آپ کو

مہابھارت ہی میں مل سکتا ہے، اسی قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی

"پاپ پن، دونوں پھل، والے (نتیجہ خیز بار آور) ہیں، ایک سے سورگ (جنت) ملتا

دوسرے سے نرک (نار،) ملتا ہے (اڈیوگ ادھیائے ۱۱)

اور یہ کہ آدمی تپ اس لوک (دار دنیا) میں کرتا ہے، اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرت)

بن جاتا ہے"

نیز:-

"ن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے"

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کرکے پشچاتاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کئے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر اب پاپ کرم نہیں کروں گا، وہ اس کئے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا ہے"

(منو پرب ادھیائے ۹)

"بردائتم" یا نیکی اور بدی کے ان ہی کلیات پر تصدیق کی مہر ثبت کرکے موجودہ زندگی کے انجام کو قرآن نے جب بے نقاب کیا ہو، تو پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے وطن کے باشندوں کی طرف بھی اس کے خطاب کا رُخ نہ تھا جن کی کتابوں میں نیکی اور بدی کے قانون کے ان تمام پہلوؤں کو ہم پاتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے آخر آپ ہی بتائیے قرآنی آیات مثلاً

لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت (البقرہ ۷) — یعنی ہر شخص کو اپنے بھلے کاموں کا نفع بھی ملتا ہے، اور بُرے کا وبال بھی اسی پر عائد ہوتا ہے،

یا:-

انّ الحسنات یذھبن السیّئات — بھلائیاں (پن) برائیاں (پاپ) کو زائل کردیتی ہیں،

اور یہ کہ:-

وَالَّذِینَ اِذَا فَعَلُوا فَاحِشَۃً اَوْ	جن لوگوں نے بے حیائی کا کام کیا، یا
ظَلَمُوٓا اَنفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ	اپنے اوپر ظلم توڑا، یاد آیا ان کو اللہ
فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِھِمْ وَ لَمْ	پھر معافی چاہی اپنے گناہوں کی،
یُصِرُّوا عَلٰی مَا فَعَلُوا وَھُمْ یَعْلَمُونَ	اور جو کچھ کر گزرے اس پر اڑا
اُولٰٓئِکَ جَزَآءُ ھُمْ مَغْفِرَۃٌ مِّنْ	نہ کیا، کیا لیکر وہ جان رہے تھا
رَّبِّھِمْ	ان کا صلہ ہے اپنے مالک کی طرف
(آل عمران)	سے آمرزش،

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مروج غیر مستند؛ دل کتابوں ہی میں نہیں، بلکہ اسی ہندو عقائد میں جب یہ موجود ہے کہ نیکی آدمی اس لوک (دنیا) میں کرتا ہے اور جنت اس کا دوسرے لوک (یعنی آخرت) میں پاتا ہے اور اس کے بعد سرگ، نرگ کا ذکر کرکے بار بار ہر طرح سے تھوڑے وقت کی قسم کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً سرگ (الجنۃ) کا تذکرہ کرتے ہوئے

" سرگ، اس لوک (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (سازوسامان) موجود ہیں،

وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس سردی گرمی کچھ نہیں لگتی"[1]

بہشتی نعمتوں کی ایک طویل فہرست جس میں ملبوسات، مطعومات، مشروبات، مسموعات الغرض سارے حسی لذائذ کی تفصیل کے بعد آخر میں ہے

" اس دیہ (جسم) سے جو دیہ نورانی جسم کہلاتی ہے جس میں نہ بڑھاپا، نہ جوانی ہے، ہمیشہ ایک حسین روپ رہتی ہے، سرگ باس ملتا ہے، وہاں سوائے ہر کہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہر ہر انسانی حاسہ کے ساتھ جن جن لذتوں کا تعلق ہے، سب ہی کا ذکر وید کے دھرم کے سرگ میں کیا گیا ہے حتی کہ پیراؤں (حوروں) کے ساتھ بھوگ بلاس کے پراپت ہونے یعنی حاصل ہونے کا ذکر کم از کم ان کتابوں میں ضرور

(سرود) کے شوک پیڑا (دکھ کی تکلیف) نہین ہے"۔ (جن پ ب ادھیاے ۱۱)

اور اسی کے مقابلہ مین نرک کے متعلق

گھور نرک جہان اندھیرا ہے، اچھس (یا ملائکہ غلاظ شداد) پیڑا (تکلیف) دیتے ہین،

(جن پ ب)

شاید ہی کوئی حصہ مہابھارت کا ہوگا، جو انسانیت کے اس آخری انجام یعنی الجنۃ والنار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ تھوڑا یا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہین، بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کے ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہین، اس دین کو تو محض یورپ والون کی اس قسم کی مصنوعی تقسیمون یعنی سامی و آریائی، و تورانی وغیرہ حصون مین مذہبی قومون کو بانٹ بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت دین

تو دین کی سامی قلم مین شریک ہین، اور ہندوستان وغیرہ مین جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا، وہ وید کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ ہی کہین، لیکن اسلامی دین جسے قرآن نے اس دعوی کے ساتھ پیش کیا ہے، کہ اصولاً دین کی یہ کوئی نئی شکل و صورت نہین ہے، بلکہ ساری انسانی نسلون کا جو حقیقی موروثی، اور آبائی دین اور دھرم تھا، اسی کو ہر قسم کی خارجی آمیزشون سے صاف و پاک کر کے قومون کے حوالہ کر دینا ہی اس کا واحد نصب العین ہے، مرحوم ڈاکٹر اقبال کے الفاظ مین

از قبائے لالہ ہائے این چمن

پاک شست آلودگیہائے کہن

قرآن کے پیش کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت جب یہی ہے تو ایسی صورت مین کوئی وجہ نہین ہو سکتی کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے باشندون کو قرآنی دائرے کے مذکورۂ بالا

احاطہ سے خواہ مخواہ باہر سمجھا جائے، بلکہ تحقیق و تلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کا آبائی اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کئے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی موجودہ شکلوں کو بھی بہ مشکل میسر آسکتی ہو، جن کو یورپ والوں کی مذکورۂ بالا ذہنی تقسیم کے رو سے سامی ادیان کی فہرست میں ہم شریک پاتے ہیں، حالانکہ محض چند سرسری باتیں اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہا بھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں توحید فی الخلق توحید فی الدعا توحید فی الافعال یا قانون بردائم (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج الجنۃ والنار، توبہ و استغفار، الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآنی تعلیم کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض بعض فقرے مہا بھارت کے مذکورۂ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ کے ہم اُن کو آسانی درج کر سکتے ہیں،

اور یہ قصہ صرف مبدء و معاد نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فضائل و رذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے، بجنسہٖ یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے، بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں، مثلاً جوا، شراب خوری، اُن کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، قمار (جوا) کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ مہا بھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے اگر سمجھا جائے تو قمار یعنی جوئے کے نتائج اور انجام کو بیان کرنا ہے، یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہا بھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑہا کروڑ انسان جو اس جنگ میں مارے گئے، سب کا خون پانڈو اور کورو خاندان کے خاندان

---

[۱] استری پرب دسواں ادھیا میں جد ھشٹر کی زبانی مقتولوں کی تعداد ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ بیس ہزار بتائی گئی ہے

کے شاہزادوں کے جذبۂ قمار بازی کے سر عائد ہوتا ہے، گویا جوا بازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مرتب کی گئی، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندوستان میں عموماً مروج ہیں، بلکہ ناجائز تدبیر دین اور دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیئے ہوئے ہیں، اُن کے متعلق بھی اسی مہابھارت میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، جو اسلام کا ہے، مثلاً ادیوگ کے دسویں ادھیائے میں مہرشی کا ایک طویل اپدیش کو نقل کرتے ہوئے ان فقروں کو بھی ان ہی کی طرف ہم منسوب پاتے ہیں کہ

"تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر کٹھور بچن کا زخم کبھی نہیں بھرتا، جب تک انسان کی نیک نامی دنیا میں رہتی ہے تب تک وہ زندہ سمجھا جاتا ہے، قسم کھانے والے کی بات کا اعتبار نہیں رہتا"

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ

"سامدریک یعنی ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والا شگون بتانے والا جوتشی"

ان سب کو

"بے شرم بھڑوا، گربھ گرانے والا، اپنی استری (عورت) کا خرچ کھانے والا، برہمن ہو کر شراب پینے والا"

کی فہرست میں شریک کیا گیا ہے، حالانکہ آج ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والے اور شگون بتانے کا پیشہ کرنے والے ہی اس ملک میں دین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، یہی نہیں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بھکشا لینا، اور بھیک مانگنا بھی برہمن کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اسی مہابھارت میں ہم بھکاری اور گداگر برہمن کے متعلق یہ الفاظ پاتے ہیں:

"جو برہمن سوال کرنے والا ہوتا ہے، اُس کی عزت نہیں ہوتی، ہاں اس کا ڈر ہو جاتا ہے سوال کرنے والے برہمن کا خوف چور کا سا ہوتا ہے"

اور آخر میں ہے:۔

"بھیک مانگنے والا مرتا ہے دان کرنا کبھی نہیں مرتا"۔ (انوساسن پرب چودھواں ادھیائے)

اسی طرح آج "بیاج" یعنی ربا یا سود خواری اس ملک میں جس قوم کا خصوصی پیشہ سمجھا جاتا ہے، اسی کی دینی کتاب میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ

"بیاج (سود) کھانے والا کا ان (کھانا) بشٹا (گوہ) سمان (مانند) کہا ہے"

(شانتی پرب ۱۲۰ ادھیائے)

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے۔ انشاء اللہ کسی مستقل مقالہ میں اپنے معلومات کو جمع کر کے پیش کروں گا، سردست صرف سرسری باتوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

خیال تو کیجئے، پانی سے تطہیر یا پاکی تو خیر عام بات ہی، لیکن ہماری فقہ کا ایک جزئیہ ہے کہ آفتاب سے بھی چیزیں پاک ہوتی ہیں، ٹھیک اسی جزئیہ کو ان الفاظ میں آپ مہابھارت میں بھی پائیں گے۔

"سورج کی کرن سے سب بستو (چیزیں) پوتر (پاک) ہوتی ہیں"۔

(ادیپرب ۴ ادھیائے)

حد یہ ہے کہ غسل کے ساتھ قریب قریب وضو کے مسئلہ کو بھی آپ چاہیں تو پا سکتے ہیں، عبادت کرنے

---

[1] اسی ادھیائے میں ایک فقرہ جس میں اچھے برہمن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے ایک خاص علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو برہمن

"ڈاڑھی مونچھ رکھنے والے ہیں ان کو نیوتہ دے کر اچھے پدارتھ بھوجن کراؤ" (انوساسن پرب ۹۰ ادھیائے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھ ڈاڑھی ہمارے وطن میں پرہیزگار انسانوں کی علامت ہمیشہ مانی جاتی تھی۔ ۱۲

سے پہلے کیا کرنا چاہئے اس کا جواب دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے۔

"ممکن ہو تو انسان (غسل) کرے نہیں تو ہاتھ پاؤں دھو کر آچمن (کلی) کر کے شدھ (پاک) آسن (جگہ) بیٹھ کر ایشور (خالق عالم) کا سمرن (ذکر) دھیان جپ وغیرہ کرے۔"

(شانتی پرب ۱۹۴ ادھیائے)

اسی طرح صدقہ خیرات تو خیر مذاہب و ادیان کی عام بات ہے لیکن مہابھارت میں اطلاع دی گئی ہے کہ سب سے پہلے منو جی نامی راجہ کو راج ملا، اور اُن سے پرجا نے وعدہ کیا کہ آپ

"ہمارا پالن کریں، ہم پشوؤں کا، اور سونے کا پچاسواں بھاگ (حصہ) اور اناج کا دسواں (حصہ) خزانہ کی ترقی کے لئے ..... تمہارے خزانے میں داخل کریں گے"

(شانتی پرب ۶۷-۱۰ ادھیائے)

زکوٰۃ کے قانون کی تفصیل کہتے ہوئے پشوؤں (السوائم یعنی بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ) اور سونے نقرے سے اسلام نے جس قدر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا ہے، اور عُشر یعنی دسواں حصہ زمین سے پیدا ہونے والے اناج کا صدقہ جو طلب کیا گیا ہے، اس کو اپنے سامنے رکھیے، اور مہابھارت کی زکوٰۃ اطلاع کو پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے اُن قرآنی آیات پر جن میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اگلے باپ دادوں کے پاس جو کچھ آیا تھا، کیا اس کے سوا قرآن تمہیں کچھ اور دے رہا ہے، یا ارشاد ہوا ہے،

لیھدیکم سنن الذین من قبلکم،	تاکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں، اُن کے طور طریقوں کی طرف تمہاری راہ نمائی کی جائے،
(النساء)	

قرآن کے ان دعووں کی تصدیق کے لئے میں نہیں سمجھتا کہ اور کیا چاہا جاتا ہے، ذرا ملاحظہ کیجئے، جرائم کے سلسلہ میں چوری کے جرم کی سزا قرآن میں جیسا کہ مشہور ہی ہے، یہ مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ

کاٹ دیا جائے. ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو چوری کا انسداد ہے، جرم کے انسداد ہی کے لئے یہ سزا مقرر کی گئی ہے. خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، اور ان ہی کی طرف منسوب ہوکر یہود بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی زبانی قرآن میں چوری کی سزا ان کے پاس مروج تھی، یہ بتایا گیا ہے کہ چوری کا مال جس کے پاس نکلے، خود اسی چور پر مال کا مالک قبضہ کرلے، سورۂ یوسف میں یہ مشہور اعتراف حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا منقول ہے،

قالوا جزائہ لمن وجد فی	(یعقوب علیہ السلام کے وہ کون نے) کہا کہ
رحلہ فہو جزائہ کذلک	بدلہ اس کا یہ ہے کہ جس کے سامان میں
نجزی المجرمین	چوری کا مال ملے وہی اس کا بدلہ ہے
	ہم جرم کرنے والوں کو یونہی سزا دیتے ہیں

جس سے معلوم ہوا کہ چوری کے انسداد کے لئے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کافی نہ تھا، کٹے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بے شرمی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چور چوری سے باز نہیں آتے تھے، اس لئے اس سے زیادہ سخت سزا ان کے یہاں غالباً مروج ہو گئی تھی لیکن آئیے اور دیکھئے، ویدک دھرم جسے شمار کرنے والے سامی مذاہب کے مقابلہ میں آریائی دین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اس میں اسی چوری کے جرم کی سزا کے متعلق جو اگاہی نما بھارت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، ایک شخص چوری کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے، اور وقت کے راجہ سودمن کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، خود چور درخواست کرتا ہے کہ

"جو ڈنڈ (سزا) چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو"
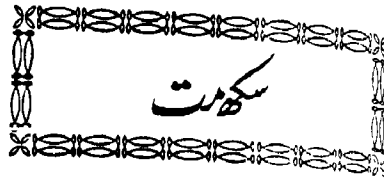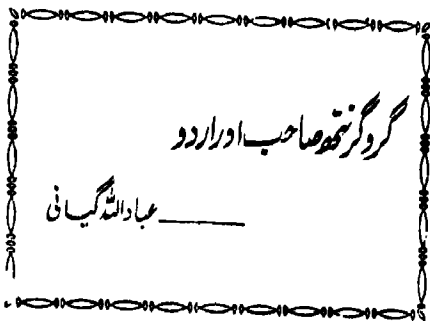
گرو گرنتھ صاحب اور اردو

—— عباداللہ گیانی

○

حکومت کی ایک بنیاد تو یقیناً توسیعِ خاندان ہے۔ دوسری بنیاد اردو بھی ہے۔
یہ بات پیشِ نظر تحریر سے قبل کسی دوسری شکل میں محمود شیرانی کہہ چکے ہیں۔

● ادارہ ●

عباد اللہ گیانی

گرو گرنتھ صاحب اور اردو

گورو گرنتھ صاحب سکھ صاحبان کی مقدس مذہبی کتاب ہے اور سب کی سب منظوم کلام پر مشتمل ہے جو اکتیس راگوں میں منقسم ہے۔ اکثر سکھ اسے گوروگوبند سنگھ جی کے بعد اپنا علمی گورو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر انسان گوروؤں کے سلسلے کو ختم یقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے بعد گوربانی کو گرنتھ اور پنتھ کے دو حصوں میں تقسیم کر کے انسان گوروؤں کا سلسلہ بند کر دیا تھا(۱)۔ علمی گوربانی گوروگرنتھ صاحب کو اور عملی گوربانی پنتھ کو سونپ دی تھی۔ گوروگرنتھ صاحب، گورو ارجن جی نے ۱۶۶۱ بکرمی مطابق ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا۔

---

(۱) سکھوں میں نام دھاری اور نرنکاری وغیرہ ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک ہر زمانہ میں انسان نمونہ کا محتاج ہے اور انسان کے لیے کوئی کتاب نمونہ نہیں بن سکتی۔ بلکہ یہ مقام کسی مقدس انسان ہی کو حاصل ہے۔ وہ گورو گوبند سنگھ جی کے بعد بھی انسان گوروؤں کے اجرا کے قائل ہیں۔ وہ گرنتھ اور پنتھ کو ان معنوں میں گورو تسلیم نہیں کرتے کہ اب کوئی انسان گورو نہیں ہوگا۔ ان کے اپنے الگ الگ گورو ہیں۔ چنانچہ نام دھاری فرقہ کے لوگ گوروگوبند سنگھ جی کے بعد جن بزرگوں کو اپنے گورو مانتے ہیں وہ یہ ہیں: (۱۱) بابا بالک سنگھ جی، (۱۲) بابا رام سنگھ جی، (۱۳) بابا ہری سنگھ جی، (۱۴) بابا پرتاب سنگھ اور (۱۵) بابا جگجیت سنگھ جی۔ اب ان کے گورو مؤخرالذکر بزرگ ہیں۔ نرنکاری صاحبان کے گوروؤں کا سلسلہ اس سے الگ ہے۔

عام طور پر مطبوعہ گوروگرنتھ صاحب خواہ وہ کسی سائز میں ہو ۱۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ گوروگرنتھ صاحب کے قلمی نسخوں میں اپنی بانیوں کے لحاظ سے تو کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ خاکسار نے عام مروجہ مطبوعہ گورو گرنتھ صاحب کو مد نظر رکھا ہے اور اسی سے شبد اور شلوک نقل کیے ہیں ۔

سکھ تاریخ سے اس کتاب سے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب سکھوں کے پانچویں گورو ارجن جی کی تالیف ہے اور اس کی تکمیل گورو گوبند سنگھ جی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں مندرجہ ذیل سات سکھ گورو صاحبان کا بیان کردہ کلام مختلف راگوں کے شبدوں اور شلوکوں میں ملتا ہے ۔

پہلے گورو : گورو نانک جی
دوسرے گورو : گورو انگد جی
تیسرے گورو : گورو امرداس جی
چوتھے گورو : گورو رام داس جی
پانچویں گورو : گورو ارجن جی(۱)

---

(۱) گورو ارجن جی کے بعد ہونے والے چھٹے ، ساتویں اور آٹھویں گورو صاحبان سے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کوئی بانی بیان نہیں کی مگر گورو گرنتھ صاحب کے بعض قدیمی اور قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جن میں ان تینوں گورو صاحبان کے نام پر بھی کچھ بانیاں درج ہیں ۔ مروجہ گوروگرنتھ صاحب میں ان کے نام کا کوئی شبد یا شلوک نہیں ہے اور جو شبد یا شلوک ان کے بیان کردہ بعض پرانے قلمی نسخوں میں ملتے ہیں ان کا رنگ ڈھنگ سکھ گورو صاحبان کے بیان کردہ کلام سا ہے اور ان میں بھی دوسرے سکھ گورو صاحبان کی طرح " نانک " لفظ بطور تخلص کے استعمال کیا گیا ہے ۔

نویں گورو : گورو تیغ بہادر جی
دسویں گورو : گوبند سنگھ جی (صرف ایک شلوک)

ان سکھ گورو صاحبان کے علاوہ بعض ھندو اور مسلمان بزرگوں بیان کردہ کلام بھی گورو گرنتھ صاحب میں درج ھے ۔ جسے عرف ام میں " بھگتاں کی بانی " یا " بھگت بانی " کے نام سے موسوم یا جاتا ھے اور وہ بھگت یہ ھیں :

(۱) شیخ فرید جی ۔ (۲) بھگت کبیر جی ۔
(۳) ترلوچن جی ۔ (۴) نام دیو جی ۔
(۵) سدھنا جی ۔ (۶) جے دیو جی ۔
(۷) بینی جی ۔ (۸) راما نند جی ۔
(۹) پیپا جی ۔ (۱۰) سین جی ۔
(۱۱) دھنا جی ۔ (۱۲) بھیکھن جی ۔
(۱۳) پرما نند جی ۔ (۱۴) سورداس جی ۔
(۱۵) پرسانند جی ۔

ان بھگتوں میں اکثریت ان کی ھے جو ھندو سماج میں ادنیٰ ور اچھوت تصور کیے جاتے تھے اور یہ سارے بھگت سکھ گورو احبان سے بہت پہلے گزرے ھیں ۔ ان میں سے بعض بھگتوں کا زمانہ و صدیوں قبل ھے یعنی سکھ گورو صاحبان ان سے صدیوں بعد پیدا ھونے تھے ۔

بعض سکھ مؤرخین اور مصنفین کے نزدیک بھگتوں کا جملہ کلام گوروگرنتھ صاحب کے مؤلف گورو ارجن جی نے خود اپنی مرضی سے گوروگرنتھ صاحب میں شامل کیا تھا(۱) ۔ لیکن سکھوں میں ایسے ودوان

---

(۱) مشہور سکھ ودوان پنڈت تارا سنگھ جی نروتم کا خیال ھے کہ گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی گورو ارجن جی نے خود ھی ان بھگتوں کے نام پر اچارن کی تھی گویا یہ کہ اس کے مصنف گورو ارجن جی خود ھی ھیں ۔

بھی موجود ھیں جن کے نزدیک سکھ گورو صاحبان کے کلام کے ساتھ ساتھ بھگتوں کا کلام شامل کرنے کی داغ بیل گورو نانک جی نے ڈالی تھی جنھوں نے اپنی زندگی عی میں بھگت بانی کو جمع کر کے اپنے کلام کے ساتھ درج کر دیا تھا ۔ گورو ارجن جی نے گورو نانک جی کی جمع کردہ بھگت بانی عی کو گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دیا تھا(۲) ۔

سکھوں میں بھگت بانی سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ گورو ارجن جی کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی پرتھی چند جی نے (جو بعض مؤرخین کے نزدیک گورو ارجن جی کے سوتیلے بھائی اور اشد مخالف بلکہ خون کے پیاسے تھے) ھندوؤں اور مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گورو صاحب کی منشاء کے خلاف بھگت بانی گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دی تھی اور گورو صاحب موصوف کے مؤلفہ گورو گرنتھ صاحب کو تلف کروا دیا تھا ۔ مروجہ گورو

---

(۲) جو لوگ اس امر کے قائل ھیں کہ بھگت بانی کے مصنف وہ بھگت ھی ھیں جن کے نام پر اسے گروگرنتھ صاحب میں درج کیا گیا ہے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود ھیں جن کے نزدیک گورو ارجن جی نے اس میں مناسب ترمیم کرنے کے بعد اسے گرنتھ صاحب میں درج کیا تھا ۔

(۱) بعض سکھوں کے نزدیک یہ بھاٹ اصل میں چاروں ویدوں کے اوتار ہے ۔ یعنی ویدوں نے انسانی شکل اختیار کر کے سکھ گورو صاحبان کی تعریف میں کلام بیان کیا تھا جسے گورو ارجن جی نے گرنتھ میں شامل کر دیا ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بھاٹ ویدوں کے عالم تھے ۔ سکھوں میں ایسے لوگ بھی موجود ھیں جن کے نزدیک یہ بھاٹ سکھ گورو صاحبان کی گدی نشینی کے وقت مختلف اوقات میں جو کلام بیان کرتے رہے اسے گورو ارجن جی کے گوروگرنتھ صاحب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر درج کروا دیا ۔

گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی کا گورو ارجن جی سے کوئی تعلق نہیں ۔ گوروگرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخے ایسے بھی ھیں جن میں یہ بھگت بانی شامل نہیں ہے ۔

ان مختلف بھگتوں کے کلام کے علاوہ بعض اور لوگوں اور بھاٹوں(۱) کے نام سے بھی کافی کلام گورو گرنتھ صاحب میں درج ہے ، جن کے نام یہ ھیں :

(۱) بھائی مردانہ جی۔ (۲) بابا سندرداس جی ۔
(۳) رائے بلونڈ اور ستاؤوم ۔ (۴) کلسہار ۔
(۵) جالب ۔ (۶) کرت ۔
(۷) بھکہا ۔ (۸) سل ۔
(۹) نل ۔ (۱۰) گیند ۔
(۱۱) متھرا ۔ (۱۲) بل ۔
(۱۳) ھربنس وغیرہ ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں جن بھگتوں کا کلام درج ہے وہ سب کے سب سکھ گورو صاحبان سے بہت عرصہ پہلے گزر چکے ھیں ۔ بعض تو ایسے بھی ھیں جن میں صدیوں کا بُعد ہے ۔ اور سکھ گورو صاحبان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اردو زبان کے نشو و نما پانے سے قبل وفات پا چکے تھے۔ اس لیے اردو کی اس ترقی پائی ھوئی صورت کا تو ذکر ھی کیا ، جو ھمارے زمانے میں ہے ، گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں شلوکوں میں تو اردو کی وہ صورت بھی نہیں مل سکتی جو اسے شاہ جہان کے عہد میں حاصل ھوئی تھی ۔ البتہ ایسے شبد اور شلوک یا ان شبدوں اور شلوکوں کی بعض سطور ایسی ضرور مل جاتی ھیں جن میں اردو کی جھلک نظر آ جاتی ہے اور اس سے یہ امر واضح ھو جاتا ہے کہ سکھ

گورو صاحبان اور ان سے قبل گزر چکے بعض بھگتوں نے ھندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے ان الفاظ کو بھی اپنا لیا تھا جو آگے چل کر اردو زبان کو وجود میں لانے کا باعث بنے اور ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کر گئے ۔

کلام کا ایک نسخہ گورو نانک جی کی بھینٹ کیا تھا ۔''

سکھ ودوانوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے نزدیک گورو گرنتھ صاحب میں درج شدہ فرید جی کی بانی شیخ فرید شکر گنج اور شیخ ابراھیم (فرید ثانی) دونوں کی ملی جلی ھے ۔

موجودہ مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں شیخ فرید جی کے نام پر جو بانی درج ھے وہ چار شبدوں اور ایک سو تیس شلوکوں پر مشتمل ھے ۔ سکھ ودوان شیخ جی کے کلام کو ابتدائی پنجابی کلام کا درجہ دیتے ھیں ۔ تاھم اس میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ھے جو اردو کے ارتقائی منازل کی نشان دھی کرتی ھے ذیل میں ھم شیخ جی کے کلام سے نمونہ پیش کیے دیتے ھیں ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ آسا کے آخر میں آپ کے یہ شبد درج ھیں :-

دلھوں مھبت (محبت) جن سیئی سچیا
جن من ھور مکھ ھور سے کانڈھے کچیا
رتے اسک کھدائے (عشق خدائے) رنگ دیدار کے
وسریا جن نام تے بھوئے بھار تھیئے
آپ لیے لڑ لائے در درویس (در درویش) سے
تن دھن جنیدی ماؤ آئے سپھل سے
پرودگار (پروردگار) اپار اگم بے انت تو

جنھاں پچھاتا سچ چوما پیر موں
تیری پناہ کھدائے (خدائے) تو بکھسندگی (بخشندگی)
سیکھ پھرید (شیخ فرید) کھیر (خیر) دیجے بندگی

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸]

دوسرا شبد یہ ہے :—

بولے سیکھ پھرید (شیخ فرید) پیارے اللہ لگے
ایہ تن ھوسی کھاک (خاک) نمانی گور گھرے
آج ملاوا سیکھ پھرید (شیخ فرید)
ٹا کم کوجڑیا (ں) منہہ چنلڑیا (ں)
جے جانا مر جائیئے گھوم نہ آئیئے
جھوٹھی دنیا لگ نہ آپ ونجائیئے
بولیئے سچ دھرم جھوٹھ نہ بولیئے
جو گور دسے واٹ مریداں جولیئے
چھیل لنگھندے پار گوری من دھیریئے
کنچن ونے پاسے کلوت چیریا
سیکھ (شیخ) ھیاتی (حیاتی) جگ نہ کوئی تھر رھیا
جس آسن ہم بیٹھے کیتے بیس گیا
کتک کونجاں چیت ڈوساوں بجلیاں
سیالے سوھندیاں پر گل باھڑیاں
چلے چلنہار وچارا لیئے منو
گندھیندیاں چھ ماہ تڑندیاں اک کھنو
جمی (زمیں) پوچھے اسمان پھریدا (فریدا) کھیوٹ کن گیئے
جالن گوراں نال الاہے جیئی سہے

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸]

شیخ فرید جی کے مندرجہ بالا دونوں شبدوں میں عربی اور فارسی

الفاظ کی آمیزش ہے ۔ چنانچہ محبت ، عشق ، رنگ ، در ، درویش ، پروردگار ، پناہ ، بخشندگی ، خیر ، اللہ ، گور ، خاک وغیرہ الفاظ کا تعلق عربی اور فارسی سے ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ سوھی میں شیخ فرید جی کے نام پر دو شبد درج ھیں ۔ ان میں بھی عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ھیں ، جیسا کہ :

تپ تپ لوہے لوہے ھاتھ مروڑو
باؤل ھوئی سو سہ (شہ) لو رو
تے سہ (شہ) من میں کیا روس
مجھ اوگن سہ (شہ) ناھی دوس
تیں صاحب کی میں سار نہ جانی
جوبن کھوئے پاچھے پچھوتانی
کالی کوئل تو کت گن کالی
اپنے پریتم کے ھوں برہے جالی
پرہے بہون کیتے سکھ پائے
جا ھوئے کرپال تاں پربھو ملائے
ودھن کھوھی مندھ اکیلی
نہ کو ساتھی نہ کو بیلی
کر کرپا پربھ سادھ سنگ میلی
جاں پھر دیکھاں تاں میرا اللہ بیلی
واٹ ھماری کھری اڈینی
کھنیوں تکھی بہت پینی
اس اوپر ہے مارگ میرا
سیکھ بھریدا (شیخ فریدا) پنتھ سمار سویرا

اور دوسرا شبد یہ ہے :۔

بڑا بندھ نہ سکیو بندھن کی ویلا
بھر سروور جب اوچھلے تب ترن دوھیلا
ھتھ نہ لائے کسمبھڑے جل جاسی ڈھولا
اک آپنے پتلی سہ (شہ) کیرے بولا
ودھا تھنٹی آونی بھر ھونے نہ میلا
کہے بھرید (فرید) سہیلیو (سہیلیو) سہ (شہ) الائے سی
ھنس چلسی ڈوسنا ایہ تن ڈھیری تھیسی

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ گوروگرنتھ صاحب میں شیخ
جی کے نام پر کچھ شلوک بھی درج ھیں ۔ ان شلوکوں میں
صاحب نے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے ھیں ۔ ذیل میں ھم
شلوکوں سے بعض مثالیں پیش کیے دیتے ھیں :—

والوں نکی پرسلات (پل صراط) کنیں نہ سنٹی آئے
بھریدا (فریدا) کیڑی ہوندی‌نی کنبڑا نہ آپ مہائے
بھربدا (فریدا) دردرویسی (درویشی) کاکھڑی چلاں دنیا بھت
بنہ اٹہائی پوٹلی کتھے ونجاں گھت ۔ ۲

....

بھریدا (فریدا) جے تو اکل لتیپھ (عقل لطیف) کالے لکھ نہ لیکھ
آپڑے گریوان (گریبان) مہ سر نیواں کر ویکھ ۔ ۶

....

بھریدا (فریدا) جاں تو کھٹن ویلا تاں توں رتا دنی سیوں
مرگ سوائی نیہ جاں بھریا تاں لدیا ۔ ۸

....

بھریدا (فریدا) کوکیندیاں چانگیندیاں متی دیندیاں نت
جو سیتان (شیطان) ونجایا سے کت بھیرے چت ۔ ۱۵

....

پھریدا (فریدا) خاک نہ لندئیے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے موئیاں اوپر ہوئے - ۱۷
پھریدا (فریدا) جاں لب تاں نیہ کیا لب تاں کوڑا نیہ
کچر جھت لنکائیے چھپر توٹے میہ - ۱۸
پھریدا (فریدا) جنگل جنگل کیا بھوہے ون کنڈا موڑیہ
وسی رب ہیا لئے جنگل کیا ڈھوڈھیہ - ۱۹

....

پھریدا (فریدا) چنت کھٹولا وان دکھ برہ وچھاون لیپھ (لحاف
ایہہ ھمارا جیونا صاحب سچے ویکھ - ۳۵
برھا برھا آکھیئے برھا توں سلتان (سلطان)
پھریدا (فریدا) جت تن برھا نہ اوپجے سو تن جان مسان - ۳۶

....

پھریدا (فریدا) چار گوایا ہنڈھ کے چار گوایا سم
لیکھا رب منگیسیا تو آں ہو کیرے کم - ۳۸
پھریدا (فریدا) در درواجے (دروازے) جائے کے کیوں ڈٹھو گھڑیا
ایہہ نردوساں مارئیے ہم دوساں دا کیا ہال (حال) - ۳۹

....

ہاس دماہے چھت سر بھیری سدو رڈ
جائے متے جیراں مہ تھیئے اتیماں (یتیماں) گڈ - ۴۵

....

پھریدا (فریدا) کھنتھڑ میکھا (میخاں) اگلیاں
جند نہ کائی میکھ (میخ)
واری آپو آپنی چلے مسائک (مشائخ) سیکھ (شیخ) - ۴۷
پھریدا (فریدا) دوھی دیوے بلندیاں ملک بہٹھا آئے

گڑھ لینا کھٹ لولیا دیوڑے گینا ہوجھانے - ٣٨

....

پھریدا (فریدا) کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائے چت
مٹی پئی اتولوبی کوئے نہ ھوسی مت - ٥٧
پھریدا (فریدا) منڈپ مال نہ لائے مرگ ستانی چت دھر
سائی جائے سمال جھتے ھی تؤ ونجناں - ٥٨
پھریدا (فریدا) جنی کیں ناھیں گن تے کڑے وسار
مت سرمندا (شرمندا) تھیوھی سائیں دے دربار - ٥٩
پھریدا (فریدا) صاحب دی کر چاکری دل دی لاہ بھراند
درویساں (درویشاں) نو لوڑیئے رکھاں دی جیراند - ٦٠
پھریدا (فریدا) کالے میڈے کپڑے کالا میڈا ویس
گنہی بھریا میں پھراں لوک کہے درویس (درویش) - ٦١

....

جاں کواری تاں چاؤ ویواھی تا ماملے (عاملے)
پھریدا (فریدا) ایہو پچھوتاؤ وت کواری نہ تھیئے - ٦٣

....

پھریدا (فریدا) بھنی گھڑی سونوی ٹوٹی ناگر لج
اجرائیل (عزرائیل) پھریستہ (فرشتہ) کے گھر نائھی اج - ٦٨

....

پھریدا (فریدا) بے نواجا (بے نمازا) کتیا ایہ نہ بھلی ریت
کبھی چل نہ آیا پنجے وکھت (وقت) مسیت - ٧٠
اٹھ پھریدا (فریدا) اجو (وضو) ساج
سبہ (صبح) نواج (نماز) گجار (گزار)
جو سر سائیں نہ نویں سو سر کپ اتار - ٧١

جو سر سائیں نہ نویں سو سر کیجے کائے
کنے ہیٹھ جلائیئے بالن سنڈڑے تھائے۔ ۲۷

....

پھریدا (فریدا) من میدان کر ٹوئے ٹبے لاہ
اگے مول نہ آوسی دوجک (دوزخ) سندی بھاہ ۔ ۳۷

پھریدا (فریدا) کھالک (خالق) کھلک (خلق) میں
کھلک (خلق) وسے رب ماہ
مندا کس نو آکھیئے جاں تس بن کوئی ناہ ۔ ۵۷

پھریدا (فریدا) جے دہ لالا کپیا جے گل کپے چوکہ
پون نہ اتی ماملے (معاملے) سہاں نہ اتی دوکھ ۔ ۶۷

....

پھریدا (فریدا) برے دا بھلا کر گسہ (غصہ) من نہ ھڈھائے
دیہی روگ نہ لا گئی پلے سب کچھ پائے۔ ۸۷

پھریدا (فریدا) پنکھ پراھنٹی دنی سوھاوا باگ (باغ)
نوبت وجی سبہ (صبح) سیوں چلنٹ کا کر ساج (ساز) ۔ ۹۷

....

پھریدا (فریدا) مہل (محل) نسکھن رہ گئے واسا آئیا تل
گوراں سے نمانٹیاں بہسن روھاں (روحاں) سل
آکھیں سیکھاں (شیخاں) بندگی چلنٹ اج کہ کل ۔ ۹۷

پھریدا (فریدا) سوتے دا بناں ابوے دسے جیوں دریاوے ڈھاھا
اگے دوجک (دوزخ) تپیا سنٹیئے ہول پوے کاھاھا
اکناں نوں سب سوجھی آئی اک پھردے بے پرواھا
امل (عمل) جے کیتا دنی وچ سے درگہ اوگاھا ۔ ۹۸

پھریدا (فریدا) دریاوے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے

کیل کریندے ھنجھ لو اچنتے باج (باز) پئے
باج (باز) پئے تس رب دے کیلاں وسریاں
جو من چت نہ چیتے سن سو گالی رب کیاں - ۹۹

ساڈے ترے من دیہری چلے پانی ان
آئیو بندہ دنی وچ وت آسونی بھن
ملک الموت جاں آوسی سب درواجے (دروازے) بھن
تناں پیاریاں بھائیاں اگے دتا بنہہ
دیکھو بندہ چلیا چوہ جنیا دے کن
پھریدا (فریدا) اسل (عمل) جے کیتے دنی وچ درگاہ آئے کم - ۱۰۰

پھریدا (فریدا) ہوں بلہاری تن پنکھیاں جنگل جناں واس
ککر چگن تنیل وسن رب نہ چھوڈن پاس - ۱۰۱

....

پھریدا (فریدا) پچھلی رات نہ جاگیوہے جیوندڑو موئیوہ
جے تیں رب وساریا تاں رب نہ وسریؤہ - ۱۰۷

پھریدا (فریدا) کنت رنگولا وڈا وے سہتاج (بے محتاج)
اللہ سیتی رتیا ایہہ سچاواں ساج (ساز) ۱۰۸

پھریدا (فریدا) دکھ سکھ اک کر دل تے لاہ وکار
اللہ بھاوے سو بھلا تاں لبھی دربار - ۱۰۹

پھریدا (فریدا) دنی وجائی وجدی توں بھی وجھیے نال
سوئی جیؤ نہ وجدا جس اللہ کردا سار - ۱۱۰

پھریدا (فریدا) دل رتا اس دنی سیوں دنی نہ کتے کم
مسل (مثل) پھکیراں (فقیراں) گاکھڑی سو پائیے پور کرم - ۱۱۱

....

سبر (صبر) منجھ کانڈ اے سبر (صبر) کا لیہنٹو

سبر (صبر) سندا بانْ کھالک (خالق) کھتا (خطا) نہ کری ۔

۱۱۵

سبر (صبر) اندر سابری (صابری) تن ایوے جالین

ہون نجیک (نزدیک) کھدائے (خدائے) دے

بھیت نہ کسے دین - ۱۱۶

سبر (صبر) ایہہ سواؤ جے تو بندہ دڑ کرے

ودھ تھیوے درباؤ ٹوٹ نہ تھیوے واھڑا - ۱۱۷

پھریدا (فریدا) درویسی (درویشی) گا کھڑی چوپڑی پریت

اکنے کنے چالیئے درویساوی (درویشاوی) ریت - ۱۱۸

[گورو گرنتھ صاحب شلوک فرید ص ۱۳۷۷ تا ص ۱۳۸۴]

شیخ فرید جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا کلام سے واضح ہے کہ ان کے زمانہ میں بولی جانے والی زبان میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال رواج پڑ چکا تھا اور اس طرح اردو زبان کی بنیاد رکھی جا چکی تھی -

بھگت نام دیو جی کے نام سے جو کلام گورو گرنتھ صاحب میں درج ہے اس میں بعض ایسے شبد ھیں جنہیں ابتدائی اردو کا نمونہ کہ سکتے ھیں ۔ آپ فرماتے ھیں کہ :

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھوندکارہ (خوندکارہ)

میں گریب (غریب) میں مسکین تیرا نام ھے آدھارا

کریما رھیما (رحیما) اللہ تو گنی (غنی)

ھادرا (حاضرہ) ھدور (حضور) در پس (در پیش) تو منی (مینی)

درباؤ تو دھند تو بسیار تو دھنی

تو دانا تو بینا میں بیچار کیا کری

نامے چہ سوامی بکھسند (بخشند) تو ھری

[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۷۲۷]

نام دیو جی کے اس شبد میں ھندی ، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ھیں اور اس کے معنے یہ ھیں :

میں اندھا ھوں اور خداوند تو ھی میرا سہارا ہے ۔ میں غریب اور مسکین ھوں تیرا نام ھی میرے لیے سب کچھ ہے ۔ اے رحیم اے کریم اللہ تعالیٰ تو ھی غنی ہے ، تو ھی حاضر ناظر ہے اور المتکبر ہے ۔ تو دریا ہے اور تو داتا ہے تیرے خزانے ھمیشہ بھرے رھتے ھیں ۔ تیرے سوا اور کوئی دوسرا دینے اور لینے والا نہیں ہے ۔ تو ھی (حقیقی) داتا اور بینا ہے ۔ میں تیری جملہ صفات بیان کرنے سے قاصر ھوں ۔ اے نام دیو کے مولا تو ھی بخشنہار ہے ۔

نام دیو جی کا ایک اور شبد یہ ہے :

ھلے یاراں ھلے یاراں کھسکھبری (خوشخبری)
بل بل جاؤں ھوں بل بل جاؤں
لبکی تیری بیکاری آلا (اعلیٰ) تیرا ناؤں
کجا آمد کجا رپہتی (رفتی) کجا میروی
دوارکا نگری راس بگوئی
کھوب (خوب) تیری پگڑی میٹھے تیرے بول
دوارکا نگری کاھے کے مکول (مغل)
چندیں ھجار (ھزار) آلم (عالم) ایکل کھانہ (خانہ)
ہم چنیں پاتساہ (پاتشاہ) سانولے برنا
اسپت گج پت نرا نرند
سے کے سوامی میر مکند
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۷۲۷]

نام دیو جی کے نام سے درج شدہ اس شبد میں بھی فارسی ،

عربی اور هندی کے الفاظ استعمال کیے گئے هیں ۔ اس سے معلوم هو
هے کہ ان کے زمانے میں عربی اور فارسی زبان کا اثر تمام هندوستا
میں پھیل چکا تھا اور لوگ اپنی تحریر و تقریر میں عربی اور فارسی ۔
الفاظ بھی بکثرت استعمال کیا کرتے تھے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر نام دیو جی کے ن
سے ایک اور لمبا شبد درج هے ۔ اس میں بھی هندی کے ساتھ عر
اور فارسی کے الفاظ کا استعمال مثل سابق موجود هے ۔ فرماتے هیں

سلتان (سلطان) بوجھے سن بے نامہ
دیکھوں رام تمھارے کاماں
نامہ سلتانے (سلطانے) باندهلا
دیکھوں تیرا میں هر بیٹھلا
بسمل گؤ دیؤ جیوائے
ناترگردن ماروں ٹھائے
بادساہ (بادشاہ) ایسی کیوں هوئے
بسمل کیا جیوے نہ کوئے
میرا کیا کچھو نہ هوئے
کرے رام هوئے هے سوئے
بادساہ (بادشاہ) چڑھیو اهنکار
گج هستی دینوں چکار
....
کاجی (قاضی) ملاں کریں سلام
ان هندو میرا ملیا مان
بادساہ (بادشاہ) بینتی سنیهو
نامے سر بھر سونا لیهو
مال لیؤں تو دوجک (دوزخ) پرؤں

دین چھوڑ دنیا کو بھروں
پاؤں بیڑی ہاتھوں تال
نامہ گاوے گن گوپال
گنگ جمن جیوں الٹی بہے
تو نامہ ہر کرتا رہے
سات گھڑی جب بیتی سنی
اجہوں نہ آئیو تربھون دھنی

....

کبھے تو دھرنی اکوڈی کروں
کبھے تو لے کر اوپر دھروں
کبھے تو موئی گؤ دیوں جیائے
سب کوئی دیکھے پتیائے
نامہ پرنوے سیل مسیل
گؤ دوھائی بچھرا میل
دودھ دوہے جب مٹکی بھری
لے بادساہ (بادشاہ) کے آگے دھری
بادساہ (بادشاہ) مہل (محل) میں جائے
اوگھٹ کی گھٹ لاگی آئے
کاجی (قاضی) ملاں بینتی فرمائے
بکھسی (بخشی) ہندو میں تیری گائے
نامہ کہے سنو بادساہ (بادشاہ)
ایہ کچھ پتیا مجھے دکھائے
ایہ پتیا کا ایہ پروان
ساچ سیل چالہو سلتان (سلطان)
[گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۶۶ - ۱۱۶۵]

نام دیو جی کے ایک اور شبد سے بھی ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے

ھیں کہ اس زمانے میں ھندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال جاری ھو چکا تھا ۔ اسے ھم اردو کی ابتدائی حالت کا درجہ دے سکتے ھیں ۔ دیکھیے :

ماٰئے نہ ھوتی باپ نہ ھوتا کرم نہ ھوتی کائیا
ھم نہیں ھوتے تم نہیں ھوتے کون کہاں تے آیا

....

چند نہ ھوتا سور نہ ھوتا پانی پون ملایا
شاست نہ ھوتا بید نہ ھوتا کرم کہاں تے آیا

[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی نام دیو ص ۹۷۳]

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ نہ ماں تھی ، نہ باپ تھا اور نہ کسی کا کوئی عمل تھا اور نہ کسی کا جسم ھی تھا ۔ ھم بھی نہیں تھے، تم بھی نہیں تھے اور کوئی بھی نہیں تھا... اس وقت یہ چاند اور سورج بھی نہیں تھے اور پانی اور ھوا کا بھی کوئی نام و نشان نہ تھا ۔ اس وقت شاستر اور ویدوں کا بھی کوئی وجود نہ تھا ۔ اس وقت کرم (اعمال) کہاں سے آ گئے تھے ۔

ھندو قوم کا یہ نظریہ ھے کہ ھر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ اعمال کا نتیجہ ھے اور جس قدر بھی جاندار چیزیں چرندے ، پرندے ، درندے ، کیڑے مکوڑے اور سبزیاں ، ترکاریاں ھیں یہ سب پچھلے جنم میں انسان تھے اور اپنے برے اعمال کے نتیجہ میں اب کوئی ھاتھی بن گیا ھے اور کوئی شیر ۔ کسی کو چوھے کا جنم مل گیا ھے ور کوئی بلی کی شکل میں پیدا ھو گیا ہے ۔ کوئی ٹماٹر بن گیا ھے ور کسی نے بیگن کی شکل اختیار کر لی ھے ۔ ایسے لوگوں سے نام دیو ی نے اپنے اس شبد میں سوال کیا ھے جب کہ کسی چیز کی تخلیق نہیں ھوئی تھی اس وقت یہ چاند ، سورج اور ستارے بھی موجود نہیں ہے اگر کسی ذی روح کی پیدائش اس کے پچھلے جنم کے اعمال کا یجہ ھے تو اس وقت اس کے اعمال کہاں سے آ گئے اور کس نے وہ

اعمال کیے تھے کیونکہ اس وقت تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ موجودہ زمانے کا سائنسدان بھی اس نظریہ کا حامل ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ زندگی ظہور میں نہیں آئی تھی اور یہ چاند ، سورج ، ستارے وغیرہ بھی نہیں تھے ۔

نام دیو جی کا یہ شبد بھی گوروگرنتھ صاحب میں درج ہے :

آؤ کلندر (قلندر) کیسوا
کر ابدالی بھیسوا
جن اکاس (اکاش) کلاہ سر کینی کوسے (کفش) سپت پیالہ
چمر پوس (پوش) کا مندر تیرا ایہ بدھ بنے گوپالا
چھپن کوٹ کا پیہن تیرا سولہ سہس اجارہ (آزارہ)
بھار اٹھارہ مدگر تیرا سہنک (صحنک) سب منسارا
دیہی مہجد (مسجد) من مولانا سہج نواج (نماز) گجارے (گزارے)
بی بی کولاں سو کائن (قائن) تیرا نام نرنکار آکارے
بھگت کرت میرے تال چھنانے کہ پہ کروں پکارا
نامے کا سوامی انتر جامی پھرے سگل بے دیسوا
[گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۱۱۶۷]

نام دیو جی کے اس شبد میں بھی ہندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں البتہ ان کی شکلیں کچھ بدل دی گئی ہیں ۔ مثلاً کفش کو کوسے ، چرم پوش کو چمر پوش ، پیراھن کو پیہن ، مسجد کو مہجد اور نماز کو نواج کی شکل دے دی گئی ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے علاوہ کبیر جی کا اور کلام بھی ملتا ہے اور بعض کتابیں ''کبیر بیجک'' وغیرہ بھی ان کی طرف منسوب ہیں ۔ گورو گرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخوں میں تو کبیر جی کی بانیاں مروجہ گورو گرنتھ صاحب سے بھی زیادہ درج ہیں ۔

بعض ودوانوں نے کبیر جی کو گورو نانک جی کا اور بعض نے گورو نانک جی کو کبیر جی کا گورو ظاہر کیا ہے - بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گورو نانک جی اور کبیر جی میں کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی ، کیونکہ گورو نانک جی جب بنارس گئے ہیں کبیر جی وفات پا چکے تھے - کبیر جی کی زندگی میں گورو جی کا بنارس جانا ثابت نہیں -

بھگت کبیر جی کے کلام میں بعض ایسے شبد بھی موجود ہیں جن میں ہندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں جو اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ ذیل کے شبد سے ظاہر ہے :

راجہ رام توں ایسا
نربھو ترن تارن رام رائیا
جب ہم ہوتے تب تم ناہیں ، اب تم ہو ہم ناہیں
اب ہم تم ایک بھئے ہیں ایکے دیکھت من پتی آہی
جب بدھ ہوتی تب بل کیسا اب بدھی بل نہ کھٹائی
کہ کبیر بدھ ہر لئی میری بدھ بدلی سدھ پائی
کھٹ نیم کر کوٹھڑی باندھی بست انوپ بیچ پائی
کنجی کلپھ (قفل) پران کر راکھیے کرتے بار نہ لائی
اب من جاگت رہ رے بھائی
کابھل (غافل) ہوئے کے جنم گوائیو چور مسے گھر جائی
پنچ پہروآ در میں رہتے تن کا نہیں پتی آرا

کلام میں یہ الفاظ بکثرت استعمال کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گو اس زمانے میں اردو زبان ابھی وجود میں نہیں آئی تھی تاہم اس کی داغ بیل پڑنی ضرور شروع تھی اور لوگ ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال کرنے لگے تھے -

اس سلسلہ میں کبیر جی کا ایک یہ شبد بھی پیش کیا جا سکتا
ہے :

ایک کوٹ پنچ سکدارا پنچے مانگیں ہالہ (حالہ)
جمی (زمیں) نہیں کسی کی بوئی ایسا دین دکھالا
ہر کے لوگا مو کو لیت ڈسے پٹواری
اوپر بھجا کر مین گور پہ پکاریا تن ہوں لیا اباری
نو ڈاڈی دس منسف (منصف) دھاوہں رئیت (رعیت) بسن نہ دیہی
ڈوری پوری ماپے ناہیں بہ بسٹالا لیہی
بہتر گھر اک پورکھ سمایا ان دیا نام لکھائی
دھرم رائے کا دھپتر (دفتر) سودھیا باکی رجم (باقی رزم) نہ کائی
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی کبیر ۷۹۳]

کبیر جی کے اس شبد میں بھی زمین ، منصف ، رعیت ، دفتر ،
باقی اور رزم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ھیں -

ایک اور مقام پر بھی کبیر جی نے بیان کیا ھے کہ :

امل (عمل) سرالو لیکھا دینا
آئے کٹھن دوت جم لینا
کیا تیں کھٹیا کہاں گوایا
چلہو ستاب (شتاب) دیبان بلایا
ہر بھرمان (فرمان) درگاہ کا آیا
کروں ارداس گاو کچھ باکی (باقی)
لیؤ لبیر آج کی راتی
کچھ بھی کھرچ (خرچ) تمھارا ساروں
سبہ (صبح) لواج (نماز) سرائے گجاروں (گزاروں)
سادہ سنگ جاں کو ہر رنگ لاگا
دھن دھن سو جن پرکھ سبھاگا
ایت اوت جن سدا سہیلے

جنم ہدارتھ جیت اولے
جگت سویا جھنم گوایا
مال دھن جوریا بھیا پرایا
کہ کبیر تئی نو بھولے
کھسم (خصم) بسار ماٹی سنگ رولے

[گورو گرنتھ صاحب سوھی کبیر ۹۲ے]

ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ شبد درج ہے :

من کر مکہ کبلہ (قبلہ) کر دیہی
بولن ہار پرم گور ایھی
کہہ رے ملاں بانگ نواج (نماز)
ایک مسیت دسے درواج (درواز)
مسمل تاس بھرم کدوری (قدوری)
بھاکھ لے نیجے ہوئے سبوری (صبوری)
ہندو ترک کا ساھب (صاحب) ایک
کہ کرے ملاں کہ کرے سیکھ (شیخ)

[گورو گرنتھ صاحب]

کبیر جی کے اور بھی متعدد شبد ایسے ہیں جن میں ریختہ زبان کی جھلک ہے ۔ ذیل میں ہم ان کے چند شبد اور درج کیے دیتے ہیں :

۔ ہمرا جھگرا رہا نہ کوؤ
پنڈت ملاں چھاڈے دؤو
... ...
پنڈت ملاں جو کچھو لکھ دیا
چھاڈ چلے ہم کچھو نہ لیا
ردے اکھلاس (اخلاص) نرکھ لے میرا
آپ کھوج کھوج ملے کبیرا

[گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ۱۱۵۹]

سو ملاں جو من سیوں لرے
گور اپدیش کال سیوں جرے
کال پورکھ کا مردے مان
تس ملاں کو سدا سلام
ہے ہجور (حضور) کت دور بتاؤ
دندر بادھو سندر پاؤ۔
کاجی (قاضی) سو جو کائیاں بیچارے
کائیاں کی اگن برہم پرجارے
... ...
جوگی گورکھ گورکھ کرے
هندو رام نام اچرے
مسلمان کا ایک خدائے
کبیر کا سوامی رهیا سمائے

سترسے سالار هیں جاں کے
سوا لاکھ پیکابر (پیغمبر) تاں کے
سیکھ (شیخ) جو کہئیے کوٹ اٹھاسی
چھپن کوٹ جاں کے کھیل کھلاسی (خیل خلاصی)
سو گریب (غریب) کی کو گجراوے (گزراوے)
مجلس دور مہل (محل) کو پاوے
تیتیس کروڑی ہے کھیل کھالہ (خیل خالہ)
چوراسی لکھ پھرے دیوالہ
بابا آدم کو کچھ ندر (نظر) دکھائی
ان بھی بھست (بہشت) گھنیری پائی
دل کھلهل (خلل) جاں کے جرد روبانی (زرد روبانی)
چھوڈ کیتب کرے سیتانی (شیطانی)

دنیا دوس (دوش) روس ہے لوئی
اپنا کیا پاوے سوئی
تم داتے ہم سدا بھکھاری
دیؤ جواب ہوئے بجگاری (بزہ‌گاری)
داس کبیر تیری پناہ سمانا
بھست (بہشت) نجیک (نزدیک) را کھ رھمانا (رحمانا)

[گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ص ۱۱۶۱

۴ ۔ اول اللہ نور اپایا کدرت (قدرت) کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کو مندے
لوگا بھرم نہ بھولو بھائی
کھالک کھلک (خالق خلق) کھلک (خلق) میں کھالک (خالق
پور رھیو سرب ٹھائی
ماٹی ایک انیک بھانت کر ساجی ساجن ھارے
نہ کچھ پوچ ماٹی کے بھانڈے نہ کچھ پوچ کمہارے
سب میں سچا ایکو سوئی تس کا کیا سب کچھ ہوئی
ھکم (حکم) پچھانے سو ایکو جانے بندہ کہیئے سوئی
اللہ الکھ نہ جائی لکھیا گور گڑ دینا میٹھا
کہھ کبیر میری سنکا ناسی سرب نرنجن ڈیٹھا
[گورو گرنتھ صاحب پربھاتی کبیر ص ۱۳۵۰

۵ ۔ اللہ ایک مسیت بست ہے اور ملک کس کیرا
ھندو مورت نام نواسی دوہ میں تت نہ ھیرا
اللہ رام جیؤں تیرے نائیں
تو کر مہراست (محراست) سائیں
دکھن دیس ھری کا باسا پچھم اللہ مقاما
دل میں کھوج دلے دل کھوجو ایہی ٹھور مقاما
براھمن گیاس (غیاث) کرھے چوبیسا

کاجی ماہ رمجانا (قاضی ماہ رمضانا)
گیارہ ماس پاس کے راکھے ایکے ماھیں ندھانا
کہاں اڈیسے مجن کیا کیا مسیت سر نائیں
دل میں کپٹ نواج (نماز) گزارھیں کیا
ھج (حج) کابے (کعبہ) جائیں
اپنے اورت (عورت) مرداں ساجے ایہ سب روپ تمھارے
کبیر پونگرا رام اللہ کا سب گور پیر ھمارے
[گورو گرنتھ صاحب پربھاتی کبیر ص ۱۳۴۹]

۔ جب ہم ایک ایکو کر جانیا
تب لوگا کاھے دکھ مانیا
ہم اپتہ اپنی پت کھوئی
ھمری کھوج پرو مت کوئی
ہم مندے مندے من ماھی
سانجھ پات کاھو سیوں ناھی
پت اپتہ تاں کی نہیں لاج
تب جانوگے جب اگھرے گو پاج
کہ کبیر پت ھر پروان
سرب تیاگ بھج کیول نام
[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۷]

۔ نگن پھرت جو پائیئے جوگ
بن کا مرگ مکت سب ھوگ
کیا نانگے کیا باندھے چام
جب نہیں چینیس آتم رام
[گوروگرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۴]

۸ ۔ گربھ واس میں کل نہیں جاتی
برہم بندتے سب اتپاتی

کہ رے پنڈت بامن کب کے ہوئے
براہمن کہ کہ جنم مت کھوئے
جو تو براہمن براہمنی جایا
تو آن باٹ کاھے نہیں آیا
تم کت براہمن ہم کت سود
ہم کت لیہو تم کت دودھ
کہ کبیر جو برہم بیچارے
سو براہمن کہیئت ہے ھمارے

[گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی ص ۳۲۴

۹ - ایسے اچرج دیکھیو کبیر
ددھ کے بھولے برولے نیر
ھری انگوری گدھا چرے
نت اٹھ ھاسے ھینگے مرے

[گورو گرنتھ صاحب راگ گوری کبیر ص ۳۲۶

۱۰ - چوآ چندن مردن انگا
سو تن جلے کاٹھ کے سنگا
اس تن دھن کی کون بڈائی
دھرن پرے اروار نہ جائی
رات جے سوویں دن کریں کام
اک کھن لیں نہ ھر کو نام
ھاتھ تاں ڈور مکھ کھائیو تمبور
مرتی بار کس باندھیو چور
کہت کبیر چیت رے اندھا
ست رام جھوٹا سب دھندا

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۶]

۱۱ - تن من دھن گرہ سونپ سریر
سوئی سوھاگن کہے کبیر

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۸]

۱۲. سکھ مانگت دکھ آگے آوے
سو سکھ ہموں نہ مانگیا بھاوے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۵]

۱۴. کون کو پوت پتا کو کا کو
کون مرے کو دے سنتاپو
ہر ٹھگ جگ کو ٹھگوری لائی
ہر کے بیوگ کیسے جیوں میری مائی

....

کہ کبیر ٹھگ سوں من مانیا
گئی ٹھگوری ٹھگ پہچانیا

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۱]

۱۰. ہر جس سنیں نہ ہر جس گاویں
باتن ہی آسمان گراویں
آپ گئے اورن ہوں کھوویں
آگ لگائے مندر میں سوویں
اورن ہست آپ ہیں کانے
تن کر دیکھ کبیر لجانے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۲]

۱۱. پھرمان (فرمان) تیرا سرے اوپر پھر نہ کرت بیچار
تو ہی دریا تو ہی کریا تجھے تے نستار
بندے بندگی اکھتیار (اختیار)
ساھب (صاحب) روس دھروں کہ پیار
نام تیرا آدھار میرا جیوں پھول جئی ہے نار
کہ کبیر گلام (غلام) گھر کا جیائے بھاویں مار

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۲۸

۱۶ ۔ جب ہم ہوتے تم ناہیں اب تم ہو ہم ناہیں
اب ہم تم ایک بھئے ہیں ایکے دیکھت من ہتی آہیں

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۲۹

۱۷ ۔ ترک تریکت (طریقت) جانیئے ہندو وید پوران
من سمجھاون کارنے کچھوا ک پڑھیئے گیان

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۳۰

۱۸ ۔ لنکا سا کوٹ سمند سی کھائی
نہ راون گھر کھبر (خبر) نہ پائی
کیا مانگوں کچھ تھر نہ رھائی
دیکھت نین چلیو جگ جائی
اک لکھ پوت سوا لکھ ناتی (ناطی)
چیت سچیت چت ہوئے رہ تو لے پرکس اجی آرا
نو گھر دیکھ جو کامنی بھولی بست انوپ نہ پائی
کہت کبیر نوے گھر مو سے دسویں تت سمائی

[گورو گرنتھ صاحب ورگ گوڑی کبیر ۲۲۹

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ شبد درج ہے :

وید کتب اپھترا (افتراء) بھائی دل کا فکر (پھکر) نہ جائے
ٹک دم کراری (قراری) جو کرو
ہاجر ہجور کھدائے (حاضر حضور خدائے)
بندے کھوج دل ہر روج (روز) نہ پھر پریسانی (پریشانی) ماہیں
ایہ جو دنیا سہر (سحر) میلا دستگیری ناہیں
دروگ (دروغ) پڑھ پڑھ کھسی (خوشی) ہوئے
بے کھبر (بے خبر) باد بکاہیں

مک (حق) سچ کتھالک (خالق) کھلک (خلق) میانے
سیام مورت ناھیں
اساں لہنگ دریا گسل (غسل) کردن بوّد
کر پھکر (فقر) دائم لائے چسمے (چشمے) جہاں تہاں موجود
اللہ پاکنگ پاک ہے سک (شک) کروں جے دوسر ہوئے
کبیر کرم کریم کا اوہ کرے جانے سوئے
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ کبیر ص ۷۲۷]

کبیر جی کے اس شبد میں افترا، دل، فکر، حاضر حضور، خدا، بندے، ہر روز، پریشانی، دنیا، سحر، دستگیری، دروغ، خوشی، بے خبر، باد، حق، سچ، خالق، خلق، دریا، غسل، کردن، بود، فقر، دائم، چشم، موجود، اللہ پاک، شک، کرم، کریم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ہیں۔ کبیر جی کا اپنے

گورو گرنتھ صاحب میں جن بھگتوں کے نام سے کلام درج ہے ان میں بھگت روداس جی بھی شامل ہیں۔
بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں ہندی کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ آپ کے ان شبدوں کو اس زمانے کی ریختہ کا نمونہ کہا جا سکتا ہے جو ہندی اور اردو کی درمیانی کڑی ہے اور بعد کو اردو کی مستقل شکل اختیار کر گئی۔ آپ فرماتے ہیں:

بے گم (بے غم) ہورہ سہر (شہر) کو ناؤں
دوکھ الدوہ نہیں نہ ٹھاؤں
نہ تسویس کھراج (تشویش خراج) نہ مال
کھوپھ نہ کھتا (خوف نہ خطا) ترس نہ جوال (زوال)
اب موہے کھوب (خوب) وتن (وطن) گہ پائی
اوہاں کھیر (خیر) سدا میرے بھائی
کائم دائم (قائم دائم) سدا پاتساہی (پاتشاہی)

دوم نہ سیم (سوم) ایک سو آھی
ابادان سدا مسہور (مشہور)
اوھاں گنی (غنی) بسیں مامور (معمور)
تیوں تیوں سیل کرہں جیوں بھاوے
مہرم مہل (محرم محل) نہ کو اٹکاوے
کہ روداس کھلاس (خلاص) چمارا
جو ہم سہری (شہری) سو میت ھمارا
[گورو گرنتھ صاحب گوڑی روداس ص ۳۴۵]

بھگت روداس جی کے اس شبد میں بے غم پورہ، شہر، تشویش، حراج، مال، خوف، خطا، ترس، زوال، خوب، وطن، خیر، قائم دائم، پاتشاھی، دوم، سیم (سوم)، ابادان، مشہور، غنی، معمور، محرم اور محل وغیرہ الفاظ فارسی اور عربی کے ھیں۔ هندی شاعری میں ان الفاظ کا استعمال هند میں اردو زبان کی بنیاد رکھے جانے اور هندی اور اردو کی درمیانی کڑی کا پتا دیتا ھے۔

بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں اور بھی کہیں کہیں فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کیے ھیں۔ ذیل میں ھم ان کے بعض نمونے پیش کرتے ھیں:

۱۔ تم چندن ھم ارنڈ باپ رے سنگ تمھارے باسا
نیچ روکھ تے آوچ بھئے ھیں گندھ سو گندھ نواسا

....

تم مکھتول (مخمل) سپید سپیئل ھم بپررے جس کیرا
ست سنگت مل رھیئے مادھو مدھوپ مکھیرا
جاتی اوچھی پاتی اوچھی اوچھا جنم ھمارا
راجہ رام کی سیو نہ کینی کہ روداس چمارا
[گورو گرنتھ صاحب ص ۴۸۶]

۔ جب ہم ہوتے تب تو ناہیں اب توھی میں ناہیں
انل اگم جیسے ہرئیو ددھ جل کیول جل مانہیں

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٧]

۔ جو ہم بالدھے موہ پھاس میں ہم پریم بندھن تم بالدھے
اپنے چھوٹن کو جتن کرو ہم چھوٹے تم ارادھے

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٨]

۔ جو تم گرور تو ہم مورا
جو تم چند تو ہم بھئے ہے چکورا
مادھو تم نہ تورو ہم نہیں توریں
تم سیوں تور کون سیوں جوریں
جوتم دیورا تو ہم باتی
جو تم تیرتھ تو ہم جاتی
ساچی پریت ہم تم سیوں جوری
تم سیوں جور اور سنگ توری
جہ جہ جاؤں تہاں تیری سیوا
تم سوں ٹھاکر اور نہ دیوا

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٨]

۔ ماٹی کو پترا کیسے نچت ہے
دیکھیے دیکھے سنے بولے دوریو پھرت ہے
جب کچھ پاوے تب گرب کرت ہے
مائیا گئی تب رون لگت ہے

[گورو گرنتھ صاحب آسا روداس ص ٤٨٧]

۔ سہ (شہ) کی سار سوھاگن جانے
تج ابھمان سکھ رلیاں مانے
......　　　　......

سوکت جانے پیر پرائی
جاں کے اندر درد نہ پائی
دکھی دوھاگن دوئے پکھ ھینی
جن ناہ نرنتر بھگت نہ کینی
پرسلات (پل صراط) کا پنتھ دوھیلا
سنگ نہ ساتھی گون اکیلا
دکھیا درد ولد در آیا
بہت پیاس جواب نہ پایا
کہ روداس سرن پربھ تیری
جیوں جانو تیوں کرگت میری

[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۳

۷ - ناتھ کچھوآ نہ جانو
من مایا کے ھاتھ بکانو
تم کہیئت ھو جگت گور سوامی
ھم کہیئت کل جگ کے کامی
ان پنچن میرو من جو بگاریو
پل پل ھر جی کے انتر پاریو
جت دکھیو تت دکھ کی راسی
اجوں نہ پتائے نگم بھئے ساکھی

....

کہ روداس کیا کیسے کیجے
بن رگھوناتھ سرن کا کی لیجے

[راگ جیتسری روداس ص ۱۰...

۸ - اونچے مندر سال رسوئی
ایک گھری پھن رھن نہ ھوئی

ایہ تن ایسا جیسے گھاس کی ٹاٹی
جل گیو گھاس رل گیؤ ماٹی
بھائی بندھ کٹنب سہیرا
کنبر کی نار ارھے تن لاگی
اوہ تو بھوت بھوت کر بھاگی
کہ روداس سبھئے جگ لوٹیا
ہم تو ایک رام کہ چھوٹیا
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۰]

۔ ھرا کہا کرے سنسار
سٹی ذات ھوئے دربار
[گورو گرنتھ صاحب راگ گونڈ روداس ص ۸۷۵]

۔ ایسی لال تجھ بن کون کرے
گریب نواج (غریب نواز) گو سائیں میرا ماتھے چھتر دھرے
... ...
نیچوں اوچ کرے میرا گوبند کاھو تے نہ ڈرے
[گورو گرنتھ صاحب مارو روداس ص ۱۱۰۶]

۔ پھل کارن پھولی بن رائے
پھل لاگا تب پھول بلائے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں روداس ص ۱۱۶۷]

۔ کہ روداس بھیؤ جب لیکھو
جوئی جوئی کینو سوئی سوئی دیکھو
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۱۲۹۳]

۔ پنڈت سور چھتر پت راجہ
بھگت برابر اور نہ کوئے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۸۵۸]

ذیل میں ہم گورو نانک جی کے کلام سے بعض ایسے شبد
پیش کیے دیتے ہیں جن میں ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال
کیے گئے ہیں - اسے اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ قرار دیا جا سکتا
ہے - راگ تلنگ میں آپ کا یہ شبد درج ہے :

یک ارج (عرض) گوپتم (گفتم) پیس تو (پیش تو)
در گوس (گوش) کن کرتار
ہکا (حقا) کبیر کریم تو بے ایب (بے عیب) پرودگار (پروردگار)
دنیا مکام بیفانی (مقام فانی) تہکیک (تحقیق) دل دانی
مم سر موئے اجرائیل (عزرائیل) گرپہتہ (گرفتہ) دل ہیچم نہ دانی
جن (زن) پسر پدر برادراں کس نیس دستگیر (دستگیر)
آخر بیفتم (بیفتم) کس نہ دارد چوں سود (شود) تکبیر
سب روج (شب روز) گستم (گشتم) در ہوا
کردیم بدی کیہال (خیال)
گہے نہ نیکی کار کردم مم ایں چنی اہوال (احوال)
بد بکہت (بد بخت) ہم چوں بکہیل گبہل (بخیل غافل)
بے نجر (بے نظر) بے باک
نانک بگوید جن ترا تیرے چاکراں پا کہاک (خاک)
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ - ۱]

گورو نانک جی نے اس شبد میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت
استعمال کیے ہیں - مشہور سکھ سکالر پروفیسر تیجا سنگھ جی نے بیان
کیا ہے کہ گورو نانک جی کے اس شبد کی زبان ہندی اور اردو کی
درمیانی کڑی (ریختہ) ہے -

گورو نانک جی کے کلام میں اور بھی متعدد ایسے شبد ہیں
جن میں آپ نے ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

---

۱ - عبرت نامہ ص ۱۶۱ -

ذیل میں ہم چند اور نمونے پیش کیے دیتے ہیں :

۱ ۔ جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
تو سدا سلامت نرنکار

[گورو گرنتھ صاحب ص ۴

۲ ۔ بابا اللہ اگم اپار
پاکی نائیں پاک تھائیں سچا پرودگار (پروردگار)
....

پیر پیکامبر (پیغمبر) سالک سادک (صادق)
سہدے (شہدے) اور سہید (شہید)
سیکھ مسائک (شیخ مشائخ) کاجی (قاضی) ملاں
در درویس رسید (درویش رشید)
برکت تن کو اگلی پڑھدے رہن درود

[گورو گرنتھ صاحب ص ۵۳

۳ ۔ مکام (مقام) کر گھر بیسنا نت چلنے کی دھوکھ
مکام (مقام) تاں پر جانیئے جاں رہے نہچل لوک
دنیا کیس مکامے (مقامے)
کر سدک (صدق) کرنی کھرچ (خرچ) باندھو لاگ رہو نامے
جوگی تاں آسن کر بہے ملاں بہے مکام (مقام)
پنڈت وکھانے پوتھیاں سدھ بہن دیو ستھان
سر سدھ گن گندھرب منی جن سیکھ (شیخ) پیر سالار
در کوچ کوچا کر گئے اور بھی چلن ہار
سلتان کھان (سلطان خان) ملوک امرے (امرا) گئے کر کر کوچ
گھڑی مہت کہ چلنا دل سمجھ توں بھی پہوچ
....
اللہ الکھ اگم کادر (قادر) کرن ہار کریم
سب دنی آون جاونی مکام (مقام) ایک رہیم (رحیم)

مکام (مقام) تس نوں آ کہیئے جس سس نہ هووی لیکھ
آسمان دھرتی چلسی مکام (مقام) اوھی ایک
دن رو چلے نس سس چلے تارکا لکھ پلوئے
مکام (مقام) اوھی ایک ہے نانکا سچ بگوئے
[گورو گرنتھ صاحب سری راگ محلہ ۱ ص ۶۴

۴ - مہر مسیت صدک مسلا (صدق مصلے)
هک هلال (حق حلال) کران (قران)
سرم (شرم) سنت سیل روجہ (روزہ) هوهو مسلمان
کرنی کابا (کعبہ) سچ پیر کلما (کلمہ) کرم نواج (نماز)
تسبیہ (تسبیح) ساتس بهاوسی نانک رکھے لاج
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۰

۵ - مسلمان کہاون مسکل (مشکل) جاں ہوئے تاں مسلمان کہاوے
اول اول دین کر مٹھا مسکل (مشکل) مانا مال مساوے
ہوئے مسلم دین مہانے مرن جیون کا بھرم چکاوے
رب کی رجائے (رضائے) منے سر اوپر کرتا منے آپ گواوے
تو نانک سرب جیاں میں مہرست هوئے تاں مسلمان کہاوے
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۱

۶ - راجے رئیت (رعیت) سکدار (شکدار) کوئے نہ رهسی او
هٹ پٹن باجار (بازار) هکمی (حکمی) ڈھسی او
پکے بنک دوار مورکھ جانے آپنے
درب بھرے بهنڈار ریتے اک کھنے
تاجی (تازی) رکھ تکھار (تخار) هاتھی پا کھرے (پاخرے)
باگ (باغ) ملکھ (ملک) گھر بار کتھے سے اپنے
تمبو پلنگ نوار سرائچے لالتی
نانک سچ داتار سناکھت (شناخت) کدرتی (قدرتی)

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۰]

ہک (حق) پرایا نانکا اس سؤر اس گائے
گور پیر ہامہ (حامہ) تاں بھرے جاں مردار نہ کھائے
گلیں بہست (بہشت) نہ جائیے چھوٹے سچ کمائے
مارن پاہ ہرام (حرام) میں ہوئے ہلال (حلال) نہ جائے
نانک گلیں کوڑی‌نی کوڑ پلے پائے
پنج نماجاں وکھت (نمازاں وقت) پنج پنجے پنجاں ناؤں
پہلا سچ ہلال (حلال) دوئے تیجی کھیر کھدائے (خیر خدائے)
چوتھی نیت راس من پنجویں سپھت سنائے (صفت ثنائے)
کرنی کلما (کلمہ) آکھ کے تاں مسلمان سدائے

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۱]

۔ بدپھیلی گیبانا کھسم (بدفعلی غائبانہ خصم) نہ جانی
سو کہیے دیوانہ آپ نہ پچھانی
کلہے بری سنسار وادے کھپیئے
بن ناویں ویکار بھرمے پچیئے
راہ دوویں اک جانے سوئی سجھسی
کپھر (کفر) گوکپھرانے (کفرانے) پیا دجھسی
سب دنیا سبہان (سبحان) سچ سمائیے
سجھے در دیوان آپ گوائیے

[گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ ص ۱۴۲]

۔ ہکمے کی سرکار جگ جگ جانیئے
ہکم (حکم) منے سردار در دربانیئے
پھرمانی (فرمانی) ہے کار کھسم (خصم) پٹھایا
تبل باج (طبل باز) بیچار سبد (شبد) سنایا
اک ہوئے اسوار اکناں ساکھتی (ساختی)

اکناں بدھے بھار اکناں تا کھتی (تاختی)

[گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۴

۱۰ ۔ ہم جیر جمیں (زیر زمیں) دنیا پیرا مسائکا (مشائخا) رائیا
سے رود بادساہ (بادشاہ) اپھجوں کھدائے (افزوں خدائے)
ایک توھی ایک توھی
نہ دیو دانوا نرا
نہ سدھ سادھکا دھرا
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
دادے دھند آدمی
نہ سپت جیر جمیں (زیر زمیں)
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی

....

نہ رجک (رزق) دست آں کسے
ہما را (ہمہ را) ایک آس وسے
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
پرندۂ نہ گرہ جر (زر)
درکھت (درخت) آب آس کر
دھند سوئی
ایک توئی ایک توئی

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۴

۱۱ ۔ سچا تیرا ھکم (حکم) گور موکھی جالیا
گورمتی آپ گوائے سچ پچھالیا

سچ تیرا دربار سبد (شبد) نیسانیا (نشانیاں)
سچا سبد (شبد) ویچار سچ سمانیا
من مکھ سدا کوڑیار بھرم بھولانیا
وسنا اندر واس ساد نه جانیا
ون ناویں دکھ پائے آون جانیا

نانک پارکھ آپ جن کھوٹا کھرا پچھانیا
سیہاں (شیہاں) باجاں (بازاں) چرگن کوھیاں ایناں کھوالے گھاہ
گھاہو کھان تناں ماس کھوالے ابه چلائے راہ
ندیاں وچ ٹبے دیکھالے تھلیں کرے اسگاہ
کیڑا تھاپ دیے پاتساھی (پاتشاھی) لسکر (لشکر) کرے سواہ
جیتے جی جیوہے لے ساھا جیوالے تا که اساہ
[گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی دار ص ۱۴۴]

چوہدری راجے نہیں کسے مکام (مقام)
ساہ (شاہ) مرہں سنجے مایا دام
میں دھن دیجیے ھر امرت نام
ریت (رعیت) مہر مکدم (مقدم) سکدارے (شکدارے)
نہچل کوئے نه دسے سنسارے
اپھربو کال کوڑ سر مارے
نہچل ایک سچا سچ سوئی
جنی کر ساجی تنہے سب گوئی
اوہ گورموکھ جاپے تاں پت ھوئی
کاجی (قاضی) سیکھ (شیخ) بھیکھ پکھیرا (فقیرا)
وڈے کہاوے ھومیں تن پیرا
کال نه چھوڑے بن ست گور کی دھیرا
[گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی محله ۱ ص ۲۲۷]

- مانس مورت نانک نام
کرنی کتا در پھرمان (فرمان)
گور پرسادی جانے سہان
تاں کچھ پاوے درگاہ مان

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا ص ۳۵۰

۱۴ - جے کو درگہ بہتا بولے ناؤں پولے پاجاری (بازاری)
سترنج باجی (شطرنج بازی) پکے ناہیں کچی آوے ساری
[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا محلہ ۱ ص ۳۵۹]

۱۵ - ھکم رجائی سا کہتی (حکم رضائی ساختی) درگہ سچ کبول (قبول)
ساھب (صاحب) لیکھیا منگسی دنیا دیکھ نہ بھول
دل دروانی جو کرے درویسی (درویشی) دل راس
اسک مہبت (عشق محبت) نانکا لیکھا کرتے پاس
[گورو گرنتھ صاحب مارو کی وار محلہ ۱ ص ۱۰۹۰

۱۶ - کہاں سو کھیل تبیلا (طویلہ) گھوڑے کہاں بھیری سہنائی (شہنائی)
کہاں سو تیگ بند (تیغ بند) گاڈیرڑ کہاں سو لال کوائی (قبائی)
کہاں سو آرسیاں منہ بنکے ایتھے دسہے ناہی
ایہ جگ تیرا تو گوسائیں
ایک گھڑی میں تھاپ اتھاپے جر (زر) ونڈ دیوے بھائی
کہاں سو گھر در منڈپ مہلا (محلہ) کہاں بنک سرائی
کہاں سو سیج سکھالی کامنی جس ویکھ نیند نہ پائی
کہاں سو پان تنبولی ھرماں (حرماں) ھویاں چھائی مائی
اس جر (زر) کارن گھنی وگوتی ان جر (زر) گھنی کھوائی (خوار)
پاپاں باجھوں ھووے ناھی مویاں ساتھ نہ جائی
جس نوں آپ کھوائے کرتا کھس لیے چنگیائی
کوٹی ھوں پیر ورج رھائے جاں میر سنیا دھایا
تھان مکام (مقام) جلے بج مندر مچھ مچھ کوئر رلایا

کوئی مغل نہ ہؤا اندھا کنے نہ پرچا لائیا
مغل پٹھاناں بھئی لڑائی رن میں تیگ (تیغ) وگائی
اونی تپک، تان چلائی اونی ھست چڑھائی
جن کی چیری درگہ پائی تناں مرنا بھائی
اک ھندوانی اور ترکانی بھٹیانی ٹھکرانی
اکناں پیرن (پیراھن) سر کھرپاٹے اکناں واس مسانی
جن کے بنکے گھریں نہ آیا تن کیوں رین وھانی
آپے کرے کرائے کرتا کس نو آکھ سنائیے
دکھ سکھ تیرے بھانے ھووے کستھے جائے رو آئیے
ھکمی (حکمی) ھکم (حکم) چلائے وگسے نانک لکھیا چائیے

[گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۱ ص ۴۱۷ - ۴۱۸]

۔ نانک دنیا کیسی ہوئی
سالک مت نہ رھیو کوئی
بھائی بندھی ھیت چکایا
دنیا کارن دین گوایا

[گورو گرنتھ صاحب واراں تے دوھیک ص ۱۴۱۰]

۔ نانک آکھیے رے سا منیئے سکھ سبھی
یکھیا رب منگیسیا بیٹھا کڈھ وھی
تلباں (طلباں) پوسن آکیاں باکی (عاقیاں باقی) جنہاں رھی
اجرائیل پھریستہ (عزرائیل فرشتہ) ھوسی آئے تئی
آون جان نہ سوجھئی بھیڑی گلی پھہی
کوڑ نکہوٹے نانکا اوڑک سچ رھی

[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی وار محلہ ۱ ص ۹۵۳]

سوئی جند چڑھے سے تارے سوئی دنیار تہت رہے
سا دھرتی سو پون جھلارے جگ جی کھیلے تھاو کیسے
جیون تلب (طلب) نوار

ھووے پروانا کرے دھنگانا کل لکھن وچار
کتے دیس نہ آئیا سنیئے تیرتھ پاس نہ بیٹھا
داتا دان کرے تا ناہیں مہل (محل) اسار نہ بیٹھا
جے کوست کرے سو چھیجے تپ گھر تپ نہ ھوئی
جے کو ناؤں لئے بدناوی (بدنامی) کل کے لکھن ایئی
جس مکداری تسیے کہواری (خواری) چاکر کھیے ڈرنا
جاں مکدارے پوے جنجیری (زنجیری) تاں چاکر ھتہوں
آکتے گنا کل آئیے
نہ جگ کیرا رھیا تپاوس (تفحص) جے گن دے تاں پائیے
کل کل والی سرا (شرع) نبیڑی کاجی (قاضی) کرسنا (کرشنا
بانی برھما بید اتھربن کرنی کیرت لہیا
بت ون پوجا ستون سنجم جت ون کاٹے جنیؤ
ناوہو دھوھو تلک چڑھاوھو سچ ون سوچ نہ ھوئی
کا پروان کتیب کران (قران)
پوتھی پنڈت رھے پوران
نانک ناؤں بھیا رھمان (رحمان)
کر کرتا تو ایکو جان
نانک نام ملے وڈیائی ایدوں اوپر کرم نہی
جے گھر ھوندے منگن جائیے پھیر اولاسہ ملے تہی
[گوروگرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۱ ص ---

۱۸ ۔ کاجی سودبیں توٹا آوے
گور مکتہ وچ کرے پرنتہ بہاوے
پونجی سابت (ثابت) راس سلاست چوکا جم کا بہاڑھے
... ...
اوڑ نہ کتھنے سپھت (صفت) سمائی
جیوں تدھ بہاوے رھیں رجائی (رضائی)

ورتہ پیدے جان سوعیلےھکم (حکم) سجیے پاتساھا ہے (پاتشاھا ہے)
[گورو گرنتھ صاحب مارو محلہ ۱ ص ۱۰۲۳–۳۳]

۱۔ جلمل بسیار دنیا پیانی (فانی)
کالو بے اکل (قالو بے عقل) من گور نہ مانی
من کین کترین تو دریاؤ کھدایا (خدایا)
ایک چیج (چیز) مجھیے دے اور جہر (زہر) چیج (چیز) نہ بہایا
پراب (پورآب) درکہام (خام) کوجے (کوزے)
ھکمت کہدایا (حکمت خدایا)
من توانا توں کدرتیں (قدرتیں) آیا
سگ نانک دیبان مستانہ لت چڑھے سوایا
آتس (آتش) دنیا کینک (خنک) نام کیدایا (خدایا)
[گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۱ ص ۱۲۹۱]

۷۔ نانک چنتا ست کرو چنتا تس ھی ہونے
جل میں جنت اپائین تناں بھی روجی (روزی) دے
اوتھیے ہٹ نہ چلئی نہ کو کرس کرے
سودا مول نہ ہوئی نہ کو لے نہ دے
[گورو گرنتھ صاحب رام کلی کی وار شلوک محلہ۲ ص ۹۵۵]

۸۔ تس سیوں کیسا بولنا جے آپے جانے جان
چیری جاں کی نہ پھرے ساھب (صاحب) سو پروان
چیری جسکی چلنا میر ملک سلار
جو تس بہاوے نانکا سائی بھلی کار
... ...
سبھت (صفت) جنہاں کو بکھسیئے (بخشیئے) سیئی ہوتے دار
کنجی جن کو دتیا تنہاں ملے بھنڈار
[گورو گرنتھ صاحب وار سارنگ شلوک محلہ۲ ص ۱۲۳۹]

۹۔ جیسا کرے کہاوے ایسا ایسی بنی جروت (ضرورت)

ہووے لنگ جھنگ نہ ہووئے ایسی کہیے سورت (صورت)
جے اوس اچھے سو پھل پائے تاں نانک کہیے مورت
[گورو گرنتھ صاحب وارسا رنگ شلوک محلہ۲ ص ۱۲۳۵

گورو انگد جی نے اپنے پیش رو گورو نانک جی کی تتبع میں اپنے کلام میں ھندی کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیا ھے جس سے یہ امر واضح ھے کہ اردو کے وجود میں آنے سے قبل ھندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے کا عام رواج ھو چکا تھا اور یہ رواج ھی بڑھتے بڑھتے اردو زبان وجود میں لانے کا باعث بنا۔

گورو انگد جی کے چند شلوک ذیل میں درج کیے جاتے ھیں

۱ - جو سر سائیں نہ نویں سو سر دیجے ڈار
نانک جس پنجر میں برھا نہیں سو پنجر لے جار
[گورو گرنتھ صاحب وار سری راگ محلہ۱ ص ۸۹

۲ - سیئی پورے ساہ (شاہ) جنی پورا پایا
اٹھیں وے پرواہ (بے پرواہ) رھن اکتے رنگ
درسن (درشن) روپ اتنھاہ ورلے پائیے
کرمی پورے پورا گورو پورا جاں کا بول
نانک پورا جو کرے گھٹے ناھیں تول
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ شلوک محلہ۲ ص ۱۴۶

۳ - چوتھے پہرے صبح (صبح) کے سرتیا اپجے چاؤ
تناں دریاواں سیوں دوستی من مکھی سچا ناؤ
اوتھے امرت ونڈیئے کرمی ہوئے پساؤ
کنچن کائیاں کسیئے ونی چڑھے چڑھاؤ
جے ہووے ندر سرابو (نظر صراف) کی بہڑ نہ پائی تاؤ
ستیں پہریں ست بھلا بہیئے پڑھیاں پاس

اونہی پاپ بن ویچاریئے کوڑے گنیئے راس
اونہی کھوٹے متّیئے کھرے کیجے ساباس (شاباش)
نون بہادل (فاضل) نانکا دکھے سکھ کھسمے (خصمے) پاس
[گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی وار شلوک محلہ ۲ ص ۱۴۰]

۴۔ ایہ کنہی آسکی (عاشقی) دوجے لگے جائے
نانک آسک (عاشق) کانڈھیے سدھی رہے سمائے
چنگے چنگا کر منے مندے مندا ہوئے
آسک (عاشق) ایہ نہ آکھیئے جے لیکھیے ورتے سوئے
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۵۔ سلام جواب دووہیں کرے منڈھو گھتیا جائے
نانک دووہیں کوڑیاں تھائے نہ کائی پائے
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۶۔ چاکر لگے چاکری نالے گارب واد
گلاں کرے گھنیریاں کھسم (خصم) نہ پائے ساد
آپ گوائیے سیوا کرے تاں کچھ پاوے مان
نانک جس نوں لگا تس ملے لگا سو پروان
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۷۔ ناؤں پھکیرے پاتساہ (فقیرے پاتشاہ) مورکھ پنڈت ناؤں
اندھے کا ناؤں پارکھو ایوے کرے گواؤ
الت (علت) کا ناؤں چوھدری کوڑی پورے تھاؤں
نانک گورکھ جالیے کل کا ایہ لیاؤں
[(گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۲ ص ۱۲۸۸]

گورو انگد جی پنجابی تھے اور ان کی تمام زندگی پنجاب میں ہی بسر ہوئی۔ اس لیے ان کے کلام میں پنجابیت غالب ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے ان شلوکوں میں عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال

کیے ھیں جیسا کہ پنجر ، شاہ ، بے پرواہ ، صبح ، دریا ، نظ
صراف ، شاباش ، خصم ، عاشق ، سلام ، جواب ، چاکر ، چاکری
روزی ، سودہ ، صاحب ، ملک ، سالار ، کار ، صفت ، پورے دار
ضرورت ، صورت ، فقیر اور پاتشاہ وغیرہ ۔

گورو ارجن جی کے نام سے جو بانیاں گورو گرنتھ صاحب میں در
ھیں ان میں بھی بعض ایسے شبد ھیں جن میں ھندی ، عربی اور فارس
الفاظ پائے جاتے ھیں ، مگر چونکہ گورو ارجن جی پنجابی تھ
اور ان کی تمام عمر پنجاب ھی میں گزری تھی اس لیے ان کے شبدو
سے بھی پنجابیت ظاھر ھو رھی ہے ۔ ذیل میں ھم گورو جی کے د
شبد پیش کرتے ھیں :

نکٹ جیاں کے سدھی سنگا
کدرت (قدرت) ورتے روپ ار رنگا
کرھے نہ جھرے نہ من روون ھارا
اوناسی اوگت اگوچر سدا سلامت کھسم (خصم) ھمارا
تیرے داسرے کو کس کی کان
جس کی میرا راکھیے ان
جو لوڑا (لونڈا) پربھ کیا اجات
تس لوڑے (لونڈے) کو کس کی تات
وے محتاجا (بے محتاجا) وے پرواہ (بے پرواہ)
نانک داس کہو گور واہ

[گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۵ ص ۳۷۶]

کھاک (خاک) نور کردنگ (کردم) آلم (عالم) دنیائے
آسمان جمین (زمین) درکھت (درخت) آب پیدائس کھدائے (پیدائش خدائے
دنیا مردار کھردنی گافل (خوردنی غافل) ھوائے
گیبان ھیوان ھرام کستنی (غائبان حیوان حرام کشتنی)
مردار بکھورائے (بخورائے)

دل کیج کبجه کادرو دوجک سجانے
(دل قبض قبضه قاردو دوزخ سزائے)
ولی نیامت (ولی نعمت) برادرا دربار ملک پهنائے (فنائے)
جب اجرائیل (عزرائیل) بستی تب چه کارے بدائے
هوال ملوم (حوال معلوم) کردنگ (کردم) پاک الله
بگو نانک ارداس بیس درویس (پیش درویش) بنده
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ۵ ص ۷۲۳]

گورو ارجن جی کا اس قسم کا ایک اور شبد ہے جو اس طرح
ہے کہ:

مہروان (مہربان) ساهب (صاحب) مہروان (مہربان)
ساهب (صاحب) میرا مہروان (مہربان)
جیاں سگل کو دئے دان
تو کاهے ڈولے پرانیا تدھ راکھیے گا سرجن هار
جن پیدائس (پیدائش) تو کیا سوئی دے آدهار
جن اپائی میدنی سوئی کردا سار
گھٹ گھٹ مالک دلاں کا سچا پرودگار (پروردگار)
کدرت کیم (قدرت قیم) نه جانیے وڈا وے پرواه (بے پرواه)
کر بندے تو بندگی جچر گھٹ میں ساه
تو سمرتھ اکتھ اگوچر جیؤ پنڈ تیری راس
رہم (رحم) تری سکھ پایا سدا نانک کی ارداس
[گورو گرنتھ صاحب تلنگ محلہ۵ ص ۷۲۴]

راگ تلنگ میں گورو ارجن جی کے بعض اور شبدوں میں بھی
ہندی، عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں، جیسا کہ:

• کرتے کدرتی مستاک (قدرتی مشتاق)
دین دنیا ایک تو هی سب کھلک (خلق) هی تے پاک

کتھن میں تیاپ اتھاہدا اچرج تیرے روپ
کون جانے چلت تیرے اندھیارے میں دیپ
کھود کھسم کھالک (خود خصم خالق) جہم
اللہ مہربان کہداۓ (خدائے)
دنس رین جنے تدھے آرادھے سے کیوں دوجک (دوزخ) جانے
اجرائیل (عزرائیل) یار بندے جس تیرا آدھار
گناہ اس کے سگل آبھو (عفو) تیرے جن دیکھے دیدار
دنیا چیج ہیل ہال (چیز فی الحال) سگیے سچ سکھ تیرا ناؤں
گور مل نانک بوجھیا سدا ایکس گاؤں

[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴

۲ - میراں داناں دل سوچ
مہبتے (محبتے) من تن بسے سچ ساہ (شاہ) بندی موچ
دیدنے دیدار ساھب (صاحب) کچھ ناھیں اس کا مول
پاک پرودگار (پروردگار) تو کھود کھسم (خود خصم) وڈا اتول
دستگیری دیہ دلاور توھی توھی ایک
کرتار کدرت (قدرت) کرن کھالک (خالق) نانک تیری ٹیک
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴

گورو ارجن جی چونکہ پنجاب میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنی زندگی میں پنجاب سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہؤا اس لیے ان کے شبدوں میں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ ملتے ھیں وھاں ان سے پنجابیت بھی ٹپک رھی ہے ۔

گورو صاحب کے اور بھی شبد ھیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت موجود ھیں چنانچہ راگ مارو میں ان کا ایک شبد یوں ہے :

الله اگم کہدائی (خدائی) بندے
چھوڑ کہیال (خیال) دلیا کے دھندے
ہوئے پاکیاک (پاخاک) بھکیر مساپھر (فقیر مسافر)
ایہ درویس کبول (درویش قبول) درا
سچ نواج یکین مسلا (نماز یقین مصلئے)
منسا مار نوارھو آسا
دیہ مسیت من مولانا کلم (کلمہ) کہدائی (خدائی) پاک کنورا
سرا سرئیت (شرع شریعت) لے کاوھو
تریکت (طریقت) ترک کھوج ٹولاوھو
ماربہت (معرفت) من مارھو ابدالا
ملہو ھکیکت (حقیقت) جت پھر نہ مرا
کران (قران) کتیب دل ماھیں کاھی
دس اورات (عورات) رکھہو بدراھی
پنچ مرد سدک (صدق) لے باندھو
کھیر سبوری کبول (خیر صبوری قبول) پرا
مکا (مکہ) مہر روجہ بے کھاکہ (روزہ بے خاکہ)
بھست (بہشت) پیر لپھج (لفظ) کائے انداجا (اندازہ)
ہور (حور) نور مسک (مشک) کہدایا (خدایا)
بندگی الله آلا (اعلیٰ) ھجرا (حجرہ)
سچ کاوے سوئی کاجی (قاضی)
جو دل سودھے سوئی ھاجی (حاجی)
سو ملاں ملڑن (ملعون) نوارے سو درویس (درویش)
جس سبہت (صفت) دھرا
سبۓ (سب) وکہت (وقت) سبہے کر ویلا
کہالک (خالق) یاد دلے میں سولا
تسبی (تسبیح) یاد کرھو دس مردن منت سیل بندہان برا
دل میں جانہو سب پھلہالہ (فی الحالہ)

کہیل کہانہ (خیل خانہ) برادر ھموں جنجالہ
میرِ سلک امرے پھانایا (فنایا) ایک مکام کنھدائے (مقام خدائے)
اول سبہت (صفت) دوجی سابوری (صابوری)
تیجے ھلیمی (حلیمی) چوتیہے کھیری (خیری)
پنجویں پنجے اکت مکامے (مقامے)
ایہ پنج وکیت (وقت) تیرے اپروا
سگلی جان کرو مودیپہ (موضیفہ)
بد اسل (عمل) چھوڑ کرو ھتھ کوجا (کوزہ)
کنھدائے (خدائے) ایک بوجھ دیوھو بانگاں
برکو برکھردار (برخودار) کپرا
ھک ھلال بکھورو (حق حلال بخورو) کھانا
دل دریاء دھوھو میلانا
پیر پچھانے بھستی (بہشتی) سوئی
اجرائیل (عزرائیل) نہ دوج (دوزخ) ٹھرا
کائیاں کردار اورت یکیناں (عورت یقیناں)
رنگ تماسے (تماشے) مان ھکینا (حقیناں)
ناپاک پاک ھدور ھدیسا (حضور حدیثا)
سابت سورت (ثابت صورت) دستار مرا
مسلمان موم دل ھووے
انتر کی مل دل تے دھووے
دنیا رنگ نہ آوے نیڑے جیوں کسم پاٹ گھیو پاک ھرا
جاں کو مہر مہر مہروانا (مہربان)
سوئی مرد مرد مردانا
سوئی سیکھ مسائک ھاجی (شیخ مشائخ حاجی)
سو بندہ جس نجر (نظر) نرا
کدرت کادر (قدرت قادر) کرن کریماں
سیفت سبہت (صفت محبت) اتھاہ رھیماں (رحیماں)

ہک ہکم (حق حکم) سچ کہدایا (خدایا)
بوجھ نانک بند کبہلاس (خلاص) ترا
[گورو گرنتھ صاحب راگ مارو ص ۸۴-۱۰۸۳]

ایک مقام پر گورو ارجن جی کا یہ شبد درج ہے :

کارن کرن کریم
سرب پرتپال رهیم (رحیم)
الله الکھ اپار
کہود کہدائے (خود خدائے) وڈ بے سمار (بے شمار)
اپو بھگونت گوسائیں
کیالک (خالق) رو رهیا سرب ٹھائیں

....

مہروان (مهربان) مولا توهی ایک
پیر پیکامبر سیکھ (شیخ)
دلاں کا مالک کرے ھاک (حاق)
کران (قران) کتیب تے پاک
....

مہر دیا کر کرنے هار
بھگت بندگی دیه سرجن‌هار
که نانک گور کہوئے بھرم
ایکو الله پار برہم
[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی محلہ ۵ ص ۸۹۷]

دھرتی اکاس (اکاش) پاتال ہے چند سور بناسی
بادساہ ساہ (بادشاہ شاہ) امراء کہن (خان) ڈھائے ڈیرے جاسی
رنگ تنگ گریب (غریب) مست سب لوک سدھاسی
کاجی (قاضی) سیکھ مسائکاں (شیخ مشائخاں) سبھے اٹھ جاسی

پیر پیکامبر (پیغمبر) اولیاء کو تہرنہ رہاسی
روجہ (روزہ) بانگ نواج (نماز) کیتب بن بوجھیے سب جاسی
لکھ چوراسی میدنی سب آوے جاسی
نہچل سچ کیندانے (خدائے) ایک کیندانے (خدانے) بندہ اباسی
[گورو گرنتھ صاحب راگ مارو کی وار محلہ ۵ ص ۱۱۰۰]

۱ ۔ ورت نہ رہوں نہ ماہ رمدانا (رمضانا)
تس سیوی جو رکھیے ندانا
ایک گوسائیں اللہ میرا
هندو ترک دوهاں نے بیرا
هج کابے (حج کعبے) جاؤں نہ تیرتھ پوجا
ایکو سیوی اور نہ دوجا
پوجا کروں نہ نواج گجاروں (نماز گزاروں)
ایک نرنکار لے ردے نمسکاروں
نہ هم هندو نہ مسلمان
اللہ رام کے پنڈ پران
کہ کبیر ایہ کیا وکھانا
گور پیر مل کھود کھسم (خود خصم) پچھانا(۱)
[گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں محلہ ۵ ص ۱۱۳۶]

۲ ۔ انگیکار کیا پربھ اپنے بیری سگلے مادھے
جن بیری هے ایہ جگ لوٹیا تے بیری لے بادھے

---

۱ ۔ گورو گرنتھ صاحب میں یہ شبد گورو ارجن جی اور کبیر جی کے نام پر درج ہے ۔ اس کے اوپر محلہ ۵ کا عنوان دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ گورو ارجن جی کا بیان کردہ ہے اور آخر میں بطور تخلص نانک کی بجائے کبیر کا لفظ ہے ، جس سے یہ واضح ہے کہ یہ شبد کبیر جی کا بیان کردہ ہے ۔

ست گور پرمیسر میرا
اِنک راج بھوگ رس مانی ناؤں جپی بھروسا تیرا
حت نہ آوس دوجی ہاتا سر اوپر رکھوارا
بے پرواہ رہت سوامی اک نام کے آدھارا
پورن ھوئے سلیؤ سکھداتی اون نہ کائی باتا
تت سار پرم پد پایا چھوڈ نہ کتہوں جاتا
برن نہ سا کوں جیسا تو ہے سچے الکھ اپارا
اتل اتھاہ اڈول سوامی نانک خصم ھمارا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۴]

۔ تو دانا تو اچل توھی جات میری پاتی
تو اڈول کدے ڈولے ناھی تام کیسی تاتی
ابکے ابکے ایک توھی
ابکے ابکے تو رائیا
تو کرپا تے سکھ پایا
تو ساگر ہم ھنس تمہارے ھم میں مانک لالا
تم دیوھو تل سنک نہ مانوں ہم بھنچہ سدا نہالا
ہم بارک تم پتا ھمارے تم مکھ دیوھو کھیرا
ہم کیھلیں سب لاڈ لڈاوھو تم سد گنی گہیرا
تم پورن پور رہے سمپورن ہم سنگ اگھائے
ملت ملت ملت مل رھیا نانک کہن نہ جائے

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵]

۹ ۔ کوئی بولے رام رام کوئی کہیدائے (خدائے)
کوئی سیوے گوسائیاں کوئی اللہ
کارن کرن کریم
کرپا دھار رھیم (رحیم)

کوئی نہاوے تیرتھ کوئی ھج (حج) جائے
کوئی کرے پوجا کوئی سر نوائے
کوئی پڑھے بید کوئی کتیب
کوئی اوڈھے لیل کوئی سپید
کوئی کہے ترک کوئی کہے ھندو
کوئی باچھے بھست (بہشت) کوئی سر گندو
کہ نانک جن ھکم (حکم) پچھاتا
پرابھ ساھب (صاحب) کا تن بھید جاتا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۱۸۵

۷ - پونے میں پون سمائیا
جوتی میں جوت رل جائیا
ماٹی ماٹی ھوئی ایک
روون ھارے کی کون ٹیک
کون موا رے کون موآ
برھم گیانی مل کرو بیچارا ایہ تو چلت بھیا
اگلی کچھ کھبر (خبر) نہ پائی
روون ھار بھی اوٹھ سدھائی
بھرم موہ کے باندھے بندھ
سوپن بھیا بھکھلائے اندھ
ایہ تو رچن رچیا کرتار
آوت جاوت ھکم (حکم) اپار
نہ کو موآ نہ مرنے جوگ
نہ بنسے ابنامی ھوگ
جوا ایہ جانو سو ایہ ناہ
جانن ھارے کو بل جاؤں
کہ نانک گور بھرم چکائیا

نہ کوئی مرے نہ آوے جائیا
[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵]

کرن کراون سوئی
آن نہ دیسے کوئی
ٹھاکر میرا سگھڑ سجانا
گورمکھ ملیا رنگ مانا
ایسو رہے ہر رس میٹھا
گورمکھ کنے ور لے ڈیٹھا
نرمل جوت امرت ہر نام
پیوت امر بھئے نہکام
تن من سیتل اگن نواری
آنند روپ پرگٹے منساری
کیا دیوں جا سب کچھ تیرا
سد بلہاری جاؤں لکھ بیرا
تن من جیو پنڈ دے ساجیا
گور کرپا تے نیچ نواجیا (نوازا)
کہول کوارا مہل (محل) بلایا
جیسا سا تیسا دکھلایا
کہ نانک سب پڑدہ توٹا
ہوں تیرا تو میں بن ووٹھا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۶]

• سِفت (صفت) سلاہن بھگت ورلے دتی ان
سوپے جس بھنڈار پھر پوچھ نہ لیتی ان
جسنوں لگا رنگ سے رنگ رتیا
اونہاں اکو نام ادھار اکا ان بھتیا
اونہاں پچھے جگ بھنچے بھوگئی

اوہاں پیارا رب اونہاں جوگنی
جس ملیا گور آئے تن بربھ جالیا
ھوں بلہاری تن جے کہسمے (خصمے) بھانیا

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۸

۱۰ - جورتے دیدار سبئی سچ ھاک (حاق)
جنی جاتا کہسم (خصم) کیوں لبنیے تناں کہاک (خاک)
من سیلا و یکار ھووے سنگ پاک
وسے سچا مہل (محل) کہلے بھرم تاک (طاق)
جسہے دکہالے سہل (محل) تس نہ ملے دھاک
من تن ہوئے نہال بندک ندر جھاک
نو ندہ نام ندھان گور کے سبد (شبد) لاگ
تسہے ملے سنت کہاک (خاک) مستک جسے بھاگ

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۹

۱۱ - وڈا تیرا دربار سچا تدہ تکھت (تخت)
سر ساھاں (شاھاں) پاتساہ (پاتشاہ) نہچل چور چھت
جو بھاوے پار برھم سوئی سچ نیاؤں
جے بھاوے پار برھم لتھاوے ملے تہاؤں
جو کینی کرتار سائی بھلی گل
جنی پچھاتا کہسم (خصم) سے درگاہ مل
سہی (صحیح) تیرا پھرمان (فرمان) کنے نہ پھیرئے
کارن کرن کریم کدرت (قدرت) تیرے

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۶۰

۱۲ - جاں پر اندر تاں دھن باھر
جاں پر باھر تاں دھن ماھر
بن ناویں بہ بھیر پھراھر

ست گور سنگ دکھایا جاہر (ظاھر)
جن نانک سمجھے سح سماھر

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹٦۵]

آھر سب کردا پھرے آھر اک نہ ھوئے
نانک جت آھر جگ ادھرے ورلا بوجھے کوئے

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹٦۵]

وڈی ھوں وڈا اپار تیرا مرتبا (مرتبہ)
رنگ پرنگ انیک نہ جاپن کرتبا (کرتبہ)
جیاں اندر جیؤ سب کچھ جان لا
سب کچھ تیرے وس تیرا گھر بھلا
تیرے گھر آنند ودھائی تدھ گھر
مان مہتا تیج آپنا آپ جر
سرب کلا بھرپور وسے جت کتا
نانک داسن داس تدھ اگے بنوتا

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹٦۵]

گورو ارجن جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا شبدوں میں ... کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال ھوئے ھیں تاھم ان پر ... پنجابیت کا بہت اثر ھے -

گورو گرنتھ صاحب کے راگ رام کلی میں ایک " وار " رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کے نام سے درج ھے -

رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کی بیان کردہ وار کا نمونہ درج ذیل ھے :

ناؤں کرتا کادر (قادر) کرے کیوں بول ھووے جوکھیوے

....

لہنے دھریون چہتر سر کر سپھتی (صفتی) امرت بہوندے

....

گور چیلے رہراس کیتی نانک سلامت تھیوندے
سہ (شہ) ٹکہ دتوس جیولدے

....

جہولے سو چہت لرنجنی مل تکہت (تخت) بیٹھا گور ہٹیے
کرے جے گور پھرمایا (فرمایا) سل جوگ الونی چٹیے
لنگر چلے گور سبد (شبد) ہر توٹ نہ آوی کھٹیے
کھرچے (خرچے) دتی کھسم (خصم)
دی آپ کھھدی کھیر (خیر) دبٹیے
ہووے سپھت (صفت) کھسم (خصم) دی
لور ارسون (عرشوں) کرسون جھٹیے

....

سچ جے گور پھرمایا (فرمایا) کیوں ایدوں بولوں ہٹیے
ہتربی کول (قول) نہ پالیؤ کر ہیروں کن مرٹیے
دل کھوٹے آکی (عاقی) پھرن بنہ بھار اچائن چھٹیے

....

جن کیتی سو مننا کوسال جیواے سالی
دھرم رائے ہے دیوتا سے گلاں کرے دلالی
ستگور آکھے سچا کرے سا بات ہووے درھالی (درحالی)
گور انگد دی دوھی پھری سچ کرتے بندھ بہالی
نانک کائیاں پلٹ کر مل تکہت (تخت) بیٹھا سے ڈالی
درسوے است کھڑی مسکلے (مصقلے) ہوئے جنگالی (زنگالی)
در دروبس کھسم (درویش خصم) دے لائے سچے بانی لالی
بلونڈ کیبوی نیک جن جس بہتی چھاؤ پترالی

لنگر دولت ونڈیئے رس امرت کھیر گھیالی

....

ہئے کبول کھسم (قبول خصم) نال جاں کھال مردی گھالی

....

پھیر وسایا پھیروآن ستگور کھاڈور
جپ تپ سنجم نال تدھ ہور موچ گرور (غرور)
لب و ناھے مالسا جیوں پانی ہور
ورھیے درگاہ گورو کی کدرتی (قدرتی) نور
جت سو ھاتھ نہ لھبئی توں اوہ ٹھرور
نو ندھ نام ندھان ہے تدھ وچے بھرپور
نندہ تیری جو کرے سو وغجے چور
نیڑے ویے مات لوک تدھ سوجھے دور
پھیر وسایا پھیروآن ستگور کھاڈور
سوئنکا سو پنہا سوی دیبان
پیو دادے جیوھا ہوتا پروان
جن باسک نیترے گھتیا کر بنہی تان
جن سمند وروليا کر میر مدھان
چودہ رتن نکالیئن کیتوں چانان
گھوڑا کیتو سہج دا جت کیؤ پلان
دھنکھ چڑھائیو ست دا جس ھندا بان
کل وچ دھو اندھار سا چڑھیا رے بھان
ستہو کھیت جمائیو ستہو چھاوان
نت رسوئی تیرے گھیو میدا کھان
چارے کونڈاں سوجھیوس من میں سبد (شبد) پروان
آواگون نواریو کر ندر نیسان (نشان)

....

نانک هندا چیتر سر است هیران (حیران)

....

دهن سو تیرا تہان ہے سچ تیرا پیس کاریا (پیش کاریا)
نانک تو لہنا تو ہے گور امر تو ویچاریا
گور ڈٹھا تاں من سادھاریا

....

آپے پٹی کام (قلم) آپ آپ لکھن ھارا هوآ
سب است آون آون جاونی آپے ھی نواں نروآ
تکہیت (تخت) بیٹھا ارجن گورو ست گور کا کھوے چندوآ

....

دونی چونی کرامات سچے کا سچا ڈھوآ
[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی ستہ بلونڈ ص ۹۶۸-۹۶۷-۹۶۶]
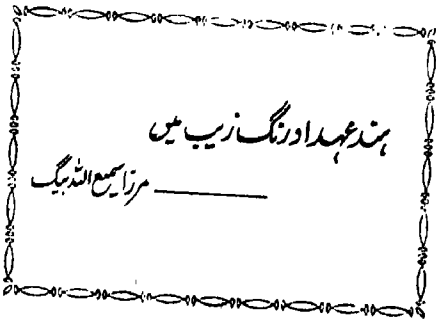
ہند عہد اورنگ زیب میں

———— مرزا سمیع اللہ بیگ

جسٹس حمید اللہ بیگ اور جسٹس نصر اللہ بیگ کے والد مرحوم
جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۴ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے۔ اسکے
واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزان وطن ہوں گے جن کے لیے اسے
الگ سے ہندی میں پیش کیا جارہا ہے۔ لیکن اردو والے بھی اپنی
میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے اردو اصل بھی!

ادارہ

ہند عہد اورنگ زیب میں

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

از

مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ
چیف جسٹس حیدرآباد دکن سابق ایڈوکیٹ لکھنؤ

جمادی الاول سنہ ۱۳۴۳ھ — دسمبر ۱۹۲۴ء

فہرست مضامین

باب اول

تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن تا بماند نامِ نیکت برقرار

"زمانہ" کے مارچ و اپریل ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں مسٹر جے۔ آر۔ راؤ صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا "ہندوستان عہدِ مغلیہ میں" مضمون مذکور میں چند واقعات بیان کر کے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں رشوت کا بازار بے حد گرم تھا۔ رعایا مفلوک الحال تھی اور بہت افلاس و تنگدستی میں بسر کرتی تھی عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی وزرائے سلطنت نیک نفس، مردم شناس و منتظم نہ تھے۔ تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اوس کی ترقی دشوار تھی۔ صداقت نابود تھی، فرامینِ شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ سمندر میں بحری قزاقوں کے بیڑے پھرا کرتے تھے۔ اندرون ملک راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجمع تھا۔ بڑا حصہ زمین کا ویران اور غیر آباد تھا۔ کالج اور تعلیمگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔

مسٹر راؤ صاحب نے اپنے مضمون کی تائید میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو کہ مختلف اوقات اور سنین میں انہوں نے ولایت کو اپنے آقا ڈائرکٹرس کو اطلاع

دینے کی غرض سے لکھے تھے اور ایک فرانسیسی سیاح کی تحریر سے بھی استدلال کیا ہے
مسٹر جے۔آر۔رائے صاحب کے اس مضمون نے پہلے مجھ کو صرف یہ خیال دلایا تھا کہ
"ہند بعہد اورنگ زیب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جائے۔ لیکن ہندو
مسلمانوں کے آجکل کے نزاعوں سے اس اندیشہ نے کہ کہیں ایسے مضامین سے
جن میں صحیح واقعات کا اظہار نہ ہو غلط فہمی بڑھ کر ملک کے حالات بد سے بدتر نہ
ہوجائیں۔ میرے خیال کو مصمم ارادہ کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مضمون تاریخ کی
وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام
واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسمیں زیادہ تر عہد اورنگ زیب
کے وہ چند واقعات پیش کئے گئے ہیں جنکو عہد مغلیہ اورنگ زیب کے متعلق اصحاب
رائے عموماً نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان واقعات کا انتخاب کپتان الگزنڈر ملٹن کے
سفرنامے سے کیا گیا ہے۔ الگزنڈر ملٹن ایک انگریز سیاح وسوداگر تھا۔ یہ شخص علمی
حیثیت سے بھی معمولی شخص نہ تھا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پاچکا تھا تقریباً ۱۶۸۸ء میں
جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا یہ شخص بہت سا سوداگری مال واسباب لیکر معہ چند
توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولائت سے روانہ ہوا ہے اور تمام ساحل
افریقہ وعرب وایران پر تجارت کرتا ہوا بالآخر ہندوستان کے ساحل پر پہنچا ہے
تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد ونواح میں اپنی زندگی بسر کی ہے
اس شخص نے اپنا ایک سفرنامہ لکھا ہے جسکی دوسری طبع ۱۷۳۹ء کی ہے۔ یہ سفرنامہ
دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسوقت "کتب خانہ آصفیہ" حیدرآباد دکن میں موجود ہے
یہ کتاب پرانی انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ یہ سوداگر

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ لہٰذا اکثر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس اور اُن کے ملازمین کی پولیٹیکل حرکات و چالوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے غالباً اُسوقت کپتان صاحب کو اسکا خیال بھی نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وہ چالبازیاں جن کو انہوں نے اپنے سفرنامے میں نظرِ حقارت سے دیکھا ہے بالآخر اُن کی قوم کی حکومت اس ملک میں قائم کردیں گی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے جس کو ہمارے بعض مورخ ہونے کے مدعی سب سے زیادہ متعصب مسلمان مغل بادشاہ ظاہر کرتے ہیں۔ ساحل ہندوستان پر کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا کہ جہاں یہ مصنف گیا ہو علاوہ بریں سورت، احمد آباد، دہلی، آگرہ، کلکتہ وغیرہ کی بھی اس نے سیر کی ہے ایک موقع پر اورنگ زیب کے روبرو بھی پیش کئے جانے کی عزت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم ذاتی ہے اور اس کے بیانات بادی النظر میں بے غرض اور بے لوث معلوم ہوتے ہیں میں نے اپنے مضمون میں کپتان موصوف کی اسی عینی شہادت پر استدلال کیا ہے اور جو شہادت میں پیش کرتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو اُن واقعات کی بہت کچھ تکذیب ہوتی ہے جن پر مسٹر جے۔ آر۔ ہے انصاحب نے اپنی رائے قائم کرنے میں استدلال کیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتے یا ڈائرکٹرس غلط واقعات کیوں لکھتے اس کے متعلق ناظرین اولاً اس مضمون کے باب (۹) کو ملاحظہ کریں اس کے بعد وجوہ خود ذہن میں آجائینگے فرانسیسی سیاح کی بابتہ جس کی کتاب کا حوالہ مسٹر جے۔ آر۔ ہے صاحب نے دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ امر قابلِ غور ہوگا کہ اُس سیاح کے ذرائع علم کیا تھے۔ اُس نے کس زمانہ میں اور کتنے روز تک اس ملک کو دیکھا۔ بالآخر ناظرین سے

یہ میں التجا کروں گا۔ کہ اگر اس مضمون کی کوئی عبارت خلافِ مزاج ہو تو معاف فرمائیں
کسی کا دل دکہانا میرا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ
گذشتہ صحیح تاریخی واقعات سے لاعلمی یا غلط فہمی نے ہندو مسلمانوں کے دلوں پر ایک
دوسرے کے مقابل کوئی غبار پیدا کر دیا ہے تو اسکے دہونے کی کوشش کروں اور
اگر اس مضمون سے انکی باہمی محبت و ارتباط کی زنجیر کو کچھ بھی تقویت حاصل ہو سکے
تو میرا اصلی مطلب حاصل ہو جائے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین !!

باب دوم

تعلیمی حالت

مسٹر جے۔ آر۔ راجا صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ عہد مغلیہ میں کالج اور درسگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا تقریباً سنہ ۱۶۹۰ء میں کپتان ہملٹن خلیج فارس سے ہوتے ہوئے ساحل ہندوستان پر آئے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اس حصہ ہندوستان کو دیکھا ہے جو سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام "ٹھٹہ" تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو ان کو پہلے پہل نظر آیا وہ لکھتے ہیں۔

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کیلئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں۔" (جلد اول صفحہ ۱۲۰)

اگر ایک سندھ کے ساحل کی یہ حالت تھی تو اس زمانہ میں پایہ تخت کے قریب قریب شہروں کی تعلیمی نظر سے کیا حالت ہوگی۔ اس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کا نقطہ نظر ہی زمانہ موجودہ سے علیحدہ تھا۔ اور اس کے طریقے جدا تھے۔ پڑھانا ایک ایسا نیک کام خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا معاوضہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ استاد کا درجہ والدین سے کم نہ تھا۔ پڑھانا ایک معزز پیشہ تھا۔ بہت سے لوگ اس کو باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور اس کام کو خوشی سے انجام دیتے تھے اور آج تک اسی کا یہ اثر ہے کہ جب ہم لفظ "مولوی" کسی کے نام کے ساتھ سنتے ہیں تو دل میں وقار و عزت کے خیالات آجاتے ہیں علاوہ بریں ہر رئیس محلہ کے لئے اپنے دروازے پر ایک

مکتب کا قایم کرنا ویسا ہی اُسکی ریاست کے لوازمات میں سے تہا جیسا کہ گھوڑے
ہاتھی کا پالنا یا دیگر مذہبی رسم و رواج کی پابندی کرنا ۔ اِن مکتب میں نہ صرف اِس
رئیس ہی کے بچے پڑہتے تھے بلکہ تمام غریب اہل محلہ کے بچے مولوی صاحب کے پاس
پڑہنے کے لئے بٹھائے جاتے تھے ۔ نقد کی صورت میں مولوی صاحب کو بہت کم
ملتا تھا ۔ مگر اسطرح بہت سے لڑکے پڑھ جایا کرتے تھے ۔ مولوی صاحب نہ صرف
پڑہاتے تھے بلکہ آداب بھی سکہاتے تھے ۔ اگر لڑکے نے ذراسی بدتہذیبی کی تو ماں
باپ بھی مولوی صاحب کے حوالہ سے بچہ کو ڈراتے تھے ۔ لڑکے کے کیرکٹر درست
کرنے میں انکو بہت دخل تھا ۔ ہم اِس زمانہ کے اسکول اور کالجوں کے خلاف
نہیں ہیں لیکن ہماری رائے میں اِس ملک کے واسطے ابتدائی تعلیم گاہوں کا
مکتب کی صورت میں ہونا بہترین طریقہ تھا ۔ افسوس کہ رفتارِ زمانہ نے اِس قسم کے
مولویوں اور مدرسین کا طبقہ ہی نیست و نابود کردیا ۔ مکتبوں کے تعداد کی جو
حالت بچشم خود میں نے بچپن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ امیٹھی میں دیکھی ہے اِس سے
میں قیاس کرسکتا ہوں کہ ملک میں انکی مجموعی تعداد موجودہ پرائمری اسکولوں سے
کم نہ ہوگی ۔ اِس قصبہ امیٹھی میں ایک ویرانہ سنسان مقام ہے جہاں کچھ عرصہ ہوا
چند بلا سقف صرف دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور اب تو شاید صرف بنیاد کے نشان
باقی رہگئے ہیں ۔ پرانے لوگ اِسی کو وہ مقام بتلاتے ہیں جہاں طلباء دور دور
دراز فاصلہ سے آکر قیام کرتے تھے اور مُلا جیون مرحوم جن کو ایک زمانہ تک
اورنگ زیب کے اُستاد ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا درس دیا کرتے تھے
یہ اِس قصبہ کے ان کہنڈروں میں سے ہے جسکو ہم لوگ اہل قصبہ حسرت کی نگاہوں

سے دیکھا کرتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے قصبہ کا پرانا کالج سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے مکتبوں
اور کالجوں میں ہندو مسلمان لڑکے یکجا پڑھا کرتے تھے۔ یہیں پر ان دونوں
مذاہب کے بچوں میں دوستی کے وہ استوار رشتے قائم ہوتے تھے جن کا آئندہ
توڑنا دشوار ہوتا تھا۔ ان مکتبوں کے علاوہ جہاں عام تعلیم دیجاتی تھی مذہبی
درسگاہیں بھی تھیں۔ مثلاً ہندو پاٹ شالہ یا کسی پیر طریقت یا حافظ جی
کا قیام گاہ۔ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں صرف ایک مقام "ٹھٹھہ"
میں جو چار سو کالجوں کا ذکر کیا ہے غالباً وہ ایسے ہی مکتب، مدرسے اور
کالج ہونگے۔ جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اور جب کہ مدرسوں اور کالجوں کی
کثرت کی یہ حالت ہو تو مسٹر جے۔ آر۔ راجپا کا یہ دعویٰ کہ اس عہد مغلیہ
میں درسگاہوں اور کالجوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔ یا تعلیم کے ذرائع اس
زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موجود نہ تھے۔ میری رائے میں محض بلا ثبوت
معلوم ہوتا ہے۔

باب سوم

مذہبی رواداری

مذہبی رواداری کے معاملہ میں کپتان ہملٹن کی رائے کا پورا اندازہ
کرنے کے لئے ہم کو پہلے یورپ کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی حالت
پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ کپتان ہملٹن اس ملک کے باشندے تھے
جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ

لاکھوں بنی نوع کا خون بہادیا تھا۔ جہاں اُس زمانہ کی رعایا اگر گورنمنٹ وحکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو رعایا کے واسطے بہت مہلک نتائج پیدا ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء میں بادشاہ فرانس نے یہ حکم دیدیا تھا کہ پیرس میں تمام پروٹسٹنٹ مذہب کی رعایا کا قتل عام کردیا جائے اس عام فرمانِ قضا میں بچے، بوڑھے، مرد و عورت کا کچھ استثناء اور امتیاز نہ تھا۔ بادشاہ نے کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے نکلنے کا نظارہ اپنے مکان سے بیٹھ کر تماشے کے طور پر دیکھا۔ اسی طرح سے جب ولایت میں شاہزادی "میری" Mary جو کہ رومن کیتھولک تھیں تخت نشین ہوئیں تو ایک نوجوان شاہزادی کی ننھی سی خوبصورت گردن پتھر پر رکھوا کر اس بنیاد پر کٹوادی کہ وہ پروٹسٹنٹ ہونے کا علانیہ دعویٰ کرتی تھی۔ اسقف Rowlands کے دس بچوں اور بیوی پر ترحم نہ کیا گیا۔ بلکہ اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے اُن کو زندہ جلا دیا گیا۔ یورپ میں اُس وقت مذہبی رواداری کی یہ حالت تھی۔ لہذا کپتان ہملٹن کو عہد اورنگ زیب کی مذہبی رواداری دیکھکر عجیب وغریب سماں معلوم ہوا۔ بہت بڑی بات جو کہ اُن کو متحیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر ایک دوسرے سے اس طرح مل جل کر بسر کر رہے ہیں اور وہ مذہبی تعصبات سے اس قدر بری ہیں کہ اُن میں سوائے پوشاک کے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی تھی جس سے اس کا امتیاز ہوسکے کہ اُن کا مذہب کیا ہے۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ میں ایک مقام پر شہر ٹھٹھہ کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر یہ ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے
ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں
اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود
ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن انکی بیویوں کو اجازت نہیں ہے
کہ شوہر و نکے مُردے کے ساتھ ستی ہوں" (جلد اول صفحہ ۱۲۷ - ۱۲۸)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"صرف بنیوں میں ۸۸ فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے
ہیں لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اسکی ترغیب دیا کرتے ہیں
کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجائیں"۔

"پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو
پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ
وہ اسمیں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق
اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں۔ (جلد اول ۱۵۹ و ۱۶۲)

یہ سیاح و تاجر جب سورت میں پہنچا ہے تو وہاں کی مذہبی حالت حسب ذیل الفاظ میں
بیان کرتا ہے:۔

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن انہیں کبھی کوئی سخت جھگڑے
ان کے اعتقادات و طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح
چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو
تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے"۔ جلد اول صفحہ ۱۶۲

ہم اُن مورخین سے جن کی کتابیں ہم کو اسکول میں پڑہائی گئی تھیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اخلاقی جرم نہ تھا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات اپنی تاریخ میں نہیں درج کئے۔ کیا وہ لاعلم تھے۔ یا اُن کی سیاسی اغراض اسکی متقاضی تہیں کہ وہ تمام ہندو و مسلمان بچوں کے دل میں یہ خیال قایم کریں کہ اورنگ زیب ایک متعصب مسلمان تھا جس نے ہمیشہ ہندوؤں کا گلا کاٹا۔ یہ وہی خیالات ہیں جو بعض اوقات ہمارے بعض تعلیم یافتہ ہندو برادران وطن کے دلوں میں آتش عداوت کو مشتعل کردیتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تہی اور وہ جن لوگوں کو لامذہبی کے راستہ پر جاتا دیکھتا تھا ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا تھا مثلاً جب کبھی وہ کسی مسلمان کو خلاف شرع کوئی فعل کرتا دیکھتا تو وہ اُس کو خود اُسی کی شرع کے مطابق سزا دینا فرض سمجھتا تھا۔ ملک دکہن میں اورنگ آباد کے قریب ایک مقام دولت آباد ہے۔ وہاں کی روایت ہے کہ اس عظیم الشان جلیل القدر فقیر منش بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے کلام مجید لکھکر اور ہدیہ سے جو رقم وصول ہوتی تھی اُس کے سرمایہ سے چند گز زمین اُسی مزار کے قدموں کے قریب خریدی تھی جس سے اُس کو روحانی بیعت تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اُسی زمین کو اسکی نعش پر رکھا جائے اُسپر نہ عمارت ہو نہ مقبرہ ہو۔ سبز گھاس کافی ہے۔ اور قبر ایسی بنائی جائے کہ اسکے پیر طریقت کے مزار ہونے سے جو پانی بہے وہ اس بادشاہ کی قبر سے گذرے اُس کے پاس ایک مدرسہ ہو جسمیں بچوں کو کلام مجید کی تعلیم دیجائے۔ میں نے اس مقام کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آجتک اُس وصیت کی پابندی ہو رہی ہے۔ حال میں اعلیحضرت حضور نظام دکہن نے ایک سنگ مرمر کا کٹہرہ

اس قبر کے گرد بنوا دیا ہے۔ اس سے اورنگ زیب کی مذہبی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس مذہب کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھا ہوا تھا وہی مذہب اسکو مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا تھا وہی مذہب یہ پکار پکار اس سے کہتا تھا۔

لا اکراہ فی الدین

(کلام مجید پارہ سوم)

(مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں)

دولت آباد کے جس دامن کوہ پر اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کیے اسی کے نیچے چند قدموں کے فاصلہ پر وہ غارہائے ایلورہ واقع ہیں جہاں بدھ اور ہندو زمانہ کے مذہبی مندروں اور بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لئے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ اسی ضلع میں اجنتہ کے وہ مذہبی غار ہیں جنکی نقاشی دیکھکر اس زمانہ میں بھی ایک فرانسیسی ماہر فن گویا سکتہ میں آگیا۔ اگر اورنگ زیب کا تعصب اس قسم کا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا تو اسوقت اس کے لئے ان آثار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن سوائے ذہنی خیال کے اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود اورنگ زیب ہی یا اس کے حکمت کسی نے ان میں ہاتھ لگایا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ دوسرے مذہب کی رواداری نہ تھی ہر ہندو اپنے مذہب کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ ہر شخص آزاد تھا۔ ہر شخص جو مذہب چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا۔ جب میں ملک دکھن کے قلعہ گولکنڈہ و قلعہ کریم نگر کو دیکھنے گیا تو ایک منظر ایسا دکھائی دیا جس کا اثر میرے دل پر بہت خوشگوار تھا۔ قلعہ گولکنڈہ و کریم نگر

ہندو زمانہ کے ہیں ابھی جو ہیوں پر اب تک ہندو پرستش گاہیں موجود ہیں مسلمانوں
نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوؤں کی ان عبادت گاہوں کو نیست و
نابود نہیں کیا ۔ ہندو وہاں تیرتھ کیلئے آج بھی جاتے ہیں یہ دیکھکر مجھ کو
مسلمانوں کی مذہبی رواداری پر فخر ہوا ایک ہی اللہ کے بندے ایک ہی خدا
کی پرستش اس عالم میں کس کس طریقہ سے کر رہے ہیں اگر مسلمان اہل ہنود کو اسکی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں
کہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی پتھر کو واسطہ قرار دینے کی ضرورت نہیں تو اس زمانہ میں یہ مقصد ان کا پتھر کی تو ڑ
پھوڑ ہرگز نہ حاصل ہوگا اگر مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہتے ہیں اگر مسلمان ہندو کو اپنی مادر مشفقہ سمجھتے ہیں
تو اس زمین میں جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں ان سے برادرانہ تعلق اور مذہبی رواداری کا ہونا انکے قیام زندگی کیلئے لازمی ہے ۔
یہ تاریخی واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں تبلیغ اسلام کبھی نہ گورنمنٹ و حکومت
کی شاخ قرار دیگئی نہ مغلیہ بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کبھی اپنا فریضہ سمجھا البتہ
یہ اور بات ہے کہ مولویوں کے اثرات اور بعض خدا پرست مسلمانوں کے طرز
زندگی سے عوام الناس کے دل متاثر ہوئے اور مذہب اسلام کی سادگی
اور اس کی یہ تعلیم کہ خالق کی نظر میں سب انسان برابر ہیں ہندوستان کے باشندوں
کے اس حصہ کو جو ذات پات کی زنجیروں میں گرفتار تھے ایک خوشگوار منظر معلوم
ہوا اور خود بادشاہ کا مذہب بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہے ان وجوہ سے
مسلمانوں کی تعداد میں کسیقدر اضافہ ہوا مگر ہندوستان میں تبلیغ اسلام کبھی اس
باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے نہیں کیگئی جیسے کہ اسوقت مذہب عیسوی کی
تبلیغ مشنری کرتے ہیں ۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کا بیڑا نہیں اٹھایا ۔
خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا ۔ عہد اورنگ زیب میں مذہبی رواداری کی بابتہ

رائے قائم کرنے کی غرض سے اپنے موجودہ تمدن کو ذرا گہری نظر سے دیکھیے اور ہندوستان کے اُن حصص میں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز ہے کسی پُرانے شہر کے پُرانے محلے میں قدم رکھیئے خواہ دہلی ہو آگرہ ہو یا لکھنؤ یا کسی قصبے میں جائیے۔ خواہ امیٹھی ہو کاکوری ہو یا جگوا۔ تو کیا نظر آئیگا کہ ایک ہی دیوار کے سایہ میں ان دونوں مذاہب کے لوگ امن وامان سے پشتہا پشت زندگی بسر کر چکے ہیں اور اسی کا اب بھی یہ اثر ہے کہ ایک ہی بنیا۔ بزاز۔ حجام۔ مالی۔ لوہار۔ سنار۔ دونوں کی روزانہ ضروریات پوری کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے علیحدہ ہٹ کر کوئی سول لائنس نہیں قائم کیں ابھی ہیں خاص میرے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اسی طرح سے چچا یا دادا کہکر خطاب کرتے تھے۔ جیسے کہ میرا فرض تھا کہ اپنے والد سے ملنے والے ہندو احباب کو خطاب کروں۔ اگر قدیم سے مذہبی رواداری نہ ہوتی تو اس تمدن کے بڑے بڑے یہ آثار اس طرح سے آج کیونکر باقی رہتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمدن اب سرعت سے مٹتا چلا جا رہا ہے۔ جس کے اسباب پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں مگر اب بھی جا بجا اُن لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اس مذہبی رواداری کی آب وہوا میں پوری نشوونما پائی ہے مجھ کو امید ہے کہ میرے معظم و مکرم راجہ راجایاں سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ جی سی۔ آئی۔ ای مجھ کو معاف فرمائیں گے۔ اگر ان کی ایک خانگی تحریر کا ذکر کر دوں ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں عید الضحیٰ کے موقع پر اپنے اہل اسلام احباب کو مہاراجہ صاحب ممدوح نے ایک مبارکباد لکھی تھی چنانچہ مجھ کو بھی کمال عنایت سے

یاد فرمایا تھا اُس تحریر کی نقل کرتا ہوں۔

هُوالکُل مُعِین یا مُعِین

خدا کہنے پہ کہتے ہیں نہیں پڑتا ہے کیا کہئے
اگر پڑتا تو کہتا ہو کہتے ہیں خدا کہئے

مری وحدت پرستی پر کبھی اتنا دیا ضغطے میں
نہیں کچھ کہتے بنتا ہے اگر کہئے تو کیا کہئے

یہ جھگڑے تو چلے ہی جائے تنا آپ آؤ سنگے
مجبوب ہے نوید آمد عید الضحیٰ کہئے

میں اپنے جوابی شکریہ کے خط کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ ان کے سنگم ہیں۔ اگر ہندو
مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ اُن کا نرکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں
دو نوں کی روشنی مل جاتی ہے۔ افسوس! ہندوستان میں ایسے نفوس کم ہو جاتے ہیں۔"

المختصر مہاراجہ صاحب اس ملک کے قدیم تمدن کے عظیم الشان نمونہ ہیں کیا اختلاف
مذہب ہندو مسلمانوں میں گہری دوستی قائم ہونے کا کبھی مانع ہوا؟

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی مانع نہیں ہوا۔

بابو شیو سہائے مرحوم لکھنؤ کے ایک محلہ "عیش باغ" میں رہتے تھے۔ طالب علمی کی
حالت میں انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا جس میں بحیثیت طالب علم میں بھی
شریک ہوا۔ ہماری دوستی کے پینگ اتنے بڑھے کہ ایک ساتھ خورد و نوش میں
عار نہ رہا۔ جب جون ۱۸۹۴ء میں معلوم ہوا کہ میں امتحان بی اے میں کامیاب

ہوگیا۔ اُس وقت تک بابو شیو سہائے ایل۔ ایل۔ بی پاس کر چکے تھے مثل ایک بڑے بھائی کے انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ اسی سال نومبر کے مہینہ میں مجھ کو ایل۔ ایل بی کے امتحان میں شریک ہونا پڑیگا۔ میرا دلی رجحان طبابت و ڈاکٹری کی طرف تھا لیکن انہوں نے قانون کیلئے مجبور کیا۔ اُس زمانہ کے قواعد کے بموجب لالکچرس ایف۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے پورے کر لئے تھے۔ پھر بھی زمانہ بہت کم تھا علاوہ بریں ایم۔ اے میں بھی شریک تھا۔ طبیعت بچکچاتی تھی۔ میں تو کاندھا ڈالے دیتا تھا۔ بابو شیو سہائے نے کہا نہیں۔ تم کو اسی سال شریک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے اِس ہندو دوست کی شفقت کو کبھی نہیں بھولونگا۔ دن دن بھر میرے لئے قانون کی کتابوں کے خلاصے بناتے تھے مجھے رات کو آکر پڑھاتے تھے۔ ہالینڈ جورسپروڈنس کا مشہور بابو شیو سہائے کا خلاصہ جو بعد کو انہوں نے طبع کرایا اور جس سے سینکڑوں ایل۔ ایل بی کے طلباء فیضیاب ہوئے اُن کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ ۱۷ جولائی ۱۸۹۴ء کو میں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۹۴ء کو امتحان ایل۔ ایل بی شروع ہوا جب جنوری ۱۸۹۵ء میں میرے پرنسپل مسٹر وھائیٹ نے الہ آباد یونیورسٹی کے قانونی امتحان کے اشاعت نتیجہ کی کمیٹی سے واپس آکر مجھ کو قبل سے قبل یہ خبر پہنچائی کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوا۔

جب یہ خبر بابو شیو سہائے کے کانوں تک گئی تو اُن کی مسرت کا اندازہ سوائے میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بابو شیو سہائے مرحوم ہندو تھے۔ مسلمان نہ تھے لیکن کیا یہ اختلاف سچی دوستی کا مانع ہوا؟ اِن باتوں کے لکھنے سے میرا یہ مقصود

نہیں ہے کہ ہندوستان میں آج کے قبل ہندو مسلمانوں میں مذہبی جھگڑے کبھی نہیں ہوئے بلکہ میرا مقصد صرف مقدر ہے کہ اس ملک کی عام حالت ہندو مسلمانوں میں مذہبی رواداری کی رہی ہے۔ عام طور سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہتے بستے رہے ہیں۔ یہ ہمارا اصلی تمدن اورنگ زیب کے زمانہ میں تھا اور اب بھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نظر سے موجودہ زمانہ کے حالات مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ اصل مضمون سے کسیقدر ہٹ کر عام مذہبی رواداری کے متعلق اظہار رائے کروں۔ اور پہلے میں اُن اہل اسلام سے پوچھتا ہوں جو کہ اپنی زندگی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مندروں کے پاس سے ہوکر گزرے ہیں کہ کیا ان مندروں کو دیکھ کر کبھی بھی کوئی جوش اُن کے دل میں اس قسم کا پیدا ہوا کہ وہ مندر مسمار کر دئے جائیں یا اُن کی صورت اُن کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوئی اور اگر ایسا ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں اور اسی طرح اُن اہل ہنود سے بھی پوچھتا ہوں جو ہزاروں مسجدوں کے پاس سے ہوکر روزانہ گذرے ہیں کہ کیا صرف اُن مسجدوں کو دیکھ کر کوئی مذہبی ولولہ اُن کے دل میں پیدا ہوا اور اگر ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری پنج وقتہ اذان اہل ہنود کے لئے ایک معمولی صدا ہوگئی ہے اسی طرح عام اہل اسلام کو ناقوس صرف ایک ایسی شئے معلوم ہوتی ہے جس میں سے سانس اور ہوا کے زور سے ایک بلند آواز نکلتی ہے اس میں اور عیسائیوں کے کلیسے کے گھنٹوں میں کیا فرق ہے؟

مسلمانوں کو نہ مندر کی عمارت سے کوئی خاص دشمنی ہے اور نہ ناقوس کی آواز سے کوئی خاص نفرت ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ خدا کے تصور میں ہے پتھر اور مٹی

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر مسجد و مندر والوں کے جھگڑے بعض اوقات ہیبت ناک صورت میں جا بجا کیوں پیش آجاتے ہیں اور اُن سے وہ ناگوار اور تکلیف دہ نتائج کہ جن کا خیال کرنا ہی امن پسند صلح جو دل کو روح فرسا ہوتا ہے۔ نمودار ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس قسم کے تنازعات کی ابتدا میں اصلی مذہبی جوش کو اسقدر دخل نہیں ہوتا جسقدر اغراض ذاتی اور نفسانیت کو ہوتا ہے جن کی جڑ جہالت و انسانی کمزوریاں ہیں مثلاً بعض اوقات کسی مقام کے چند سربراوردہ اشخاص میں کوئی خصومت قبل سے چلی آتی ہے محض اسکی بنا پر وہ کسی مذہبی رسم کی انجام دہی کے موقع پر مذہب کی آڑ میں اس طرح کچھ امور پیش کر دیتے ہیں کہ لوگوں کو برانگیختگی ہوتی ہے اور اسکے بعد عام مسلمان اور ہندوؤں کی شرکت اور پارٹی بندی خودداری کے اصول پر شروع ہوتی ہے اور اُسوقت کسی ذاتی خصومت، غرور و خودداری سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو ہم صرف مذہبی جوش پر محمول کرتے ہیں بعض اوقات ہمارے اوہام بھی ایسے تنازعات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر اہل ہنود نے عشرۂ محرم میں مسجد کے قریب باجا بجا دیا یا ناقوس پھونک دیا تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس سے غرض ہماری توہین تھی خواہ دراصل یہ غرض ہو یا نہ ہو شریر النفس لوگ جا گزیں ہی کراتے ہیں کہ توہین کرنا مقصود تھا۔ پھر خودداری کا مادہ مثل باد تند کے اس شعلہ کو بھڑکا دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب ایک مقام پر ایک ہی وقت دونوں فرقے اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تب چند لوگ ایسے بھی نمودار ہو جاتے ہیں کہ جو

مذہبی جنون تو کچھ نہیں ہوتا لیکن لاٹھی، تلوار، اور پتھروں کی زور آزمائی میں لطف آتا ہے۔ یہ تو عام صورتیں ہیں کہیں کہیں شاذ و نادر مذہبی جوش کو بھی دخل ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ عالم صورتیں ایسی نہیں ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ہندوستانی قوم کا دائمی تسلط لازمی ہو۔ یہ عام صورتیں انسانی خلقت اور کمزوریوں کے وہ شعلے اور چنگاریاں ہیں جو ہر ملک میں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نکلا کرتی ہیں اور جب تک انسان باقی ہے نکلا کریں گی ان کا انسداد بہت کچھ حکومت کی انتظامی قابلیت پر منحصر ہے اور ان کو مذہب سے اسقدر تعلق نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ آج ایسا کون ملک ہے جہاں انسانوں کے جذبات سے بعض اوقات خونریزی کے نتائج نہیں پیدا ہو جاتے اگر ہندوستان میں کبھی کبھی مذہبی جھگڑے ان کے باعث ہوا کرتے ہیں تو یورپ کے ممالک میں آئے دن کی ہڑتال اور سیاسی امور میں اختلاف رائے اسی قسم کے فسادات کے موجب ہو جاتے ہیں ایسے ممالک جیسے جرمنی، یونان، اٹلی فرانس، آئرلینڈ، و انگلستان میں بھی وقتاً فوقتاً ان جذبات کے اظہار میں ایک دوسرے کا سر توڑنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں جس ملک کی آبادی تخمیناً ۳۲ کروڑ ہو اس میں کبھی کبھی کہیں کہیں جھگڑوں کا پیش آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی فرمایا ہے۔ اس کا خوف نہ کرنا چاہیے کہ برٹش انڈیا میں بحالت خود مختاری ہندو مسلمانوں کو ہضم کر جائیں گے یا مسلمان ہندوؤں کے مذاہب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ جب کئی سو برس کی اسلامی حکو

نہ کرسکی تو پھر اس صدی میں مسلمان کیا کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے تنازعات کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور ان کا انسداد کافی انتظام سے ہو سکتا ہے۔

اے بھائیو! گزشتہ صدیوں میں اپنی انتظامی قابلیت سے تم اس قسم کے تنازعات کا سدباب کرتے رہے ہو اور آئندہ بھی کر سکو گے۔

اگر مجموعی حیثیت پر غور کیا جاوے تو ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی ریاستوں میں مذہبی رواداری برٹش انڈیا سے کم نہیں ہے اور اس قسم کے تنازعات کو رفع کرنے میں اُن کی انتظامی قابلیت کسی طرح برٹش انڈیا کے حکمرانوں سے کم نہیں ہے۔

اے برادرانِ وطن! مایوس نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے تم میں مذہبی رواداری کا کافی مادہ اب بھی موجود ہے

باب چہارم

تجارت و تموّل و فارغ البالی

اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت تھی اُس کا حال پڑھکر ہم کو اپنے موجودہ افلاس پر افسوس معلوم ہوتا ہے جبکہ کروڑوں بنی نوع انسان کو سوائے ایک وقت کے دوسرے وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے اورنگ زیب کے زمانہ میں تجارت سے دوطرفہ تمول بڑھتا تھا۔ باہمی تجارت کرنے والے دونوں ملک' دولت سے مالامال ہوتے تھے۔ ہندوستان کا بیشمار مال ولایت' پرتگال' ہالینڈ اور فرانس کو جایا کرتا تھا اور اسی طرح سے اُن ممالک کے لوگ ہندوستان کو مال بھیجتے تھے۔ اس باہمی مساوات سے اس ملک کے تجار کی یہ حالت تھی کہ کپتان ہملٹن ایک مقام پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا سرمایہ تجارتی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں مال کے تقریباً (۲۰) جہاز بھر کر وہ بھیجتا ہے ہر ایک جہاز ۳۰۰ سے لیکر ۸۰۰ ٹن کا تھا۔ اور ہر ایک میں صرف اس کا مال دس ہزار پونڈ اور بعضوں میں ۲۵۰۰۰ پونڈ کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تھا تب بھی اُس سے زیادہ مال اس کے پاس آئندہ کے لئے باقی رہتا تھا"

جلد اول صفحہ ۱۴۷ - ۱۴۸

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس بڑے بڑے عمدہ جہاز تھے

ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر بحیثیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۲۲۴)

ملابار کے کنارے پر ایک قوم آباد تھی جو غالباً اب "ماپلا" کے نام سے مشہور ہے انکی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ یورپ کے براعظم کو مچھلیاں بھیجتے ہیں عام طور سے لوگ ہندوستان سے لوا قیمتی جواہرات وچوبینہ بھیجا کرتے تھے ایک قسم کا رنگ بھی بھیجا جاتا تھا جس سے چھینٹ ایسی خوبصورت چھپتی تھی کہ بقول ہلٹن دنیا میں کہیں کا رنگ اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے خود بھی میسور کے عجائب خانہ میں ہندوستان کی پرانی چھینٹ دیکھی ہے جو ہمن اس ملک سے جایا کرتا تھا اسکی نسبت بھی کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یورپ میں اس سے بہتر ذائقہ کا ہمن دستیاب ہونا دشوار تھا۔

ہندوستان کا کپڑا ایسا عمدہ ہوتا تھا کہ اسکی مانگ نہ صرف ولایت میں تھی بلکہ ایسے مقامات پر بھی تھی جیسے پیگو وسماٹرا وغیرہ

(جلد اول صفحہ ۲۹۶ - ۳۵۰)

جنوبی ہند کے بڑے بڑے ہندو راجہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ساحل ہندوستان کے جنوبی حصہ سے جب کپتان صاحب کا جہاز گذرا تو اُن کو ایک مقام پر خفیف سا ٹیکس راجہ صاحب کو ادا کرنا پڑا جب کپتان صاحب راجہ صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور غالباً ٹیکس کی شکایت کی تو راجہ نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے فرض کرو کہ غیر اقوام کے لوگ ولایت بغرض تجارت جائیں تو اُن سے بھی وہاں ٹیکس لیا جائے گا۔ علاوہ بریں ہم لوگ تمہاری جان ومال کی حفاظت کے

ذمہ دار ہیں لہذا ایسا خفیف سا ٹیکس لینا ایک واجبی بات ہے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۹)

شاہی ٹیکس جو تجار کو دینا پڑتا تھا وہ بھی بہت کم تھا تجارتی مال پر مسلمانوں سے (۲) فیصدی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عیسائیوں سے (۳) یا (۲½) فیصدی لیکن مسلمانوں کو ایک اور دوسرا ٹیکس بھی اپنے مال پر دینا پڑتا تھا جو (۲) فیصدی تھا۔ کپتان ہملٹن صاحب نے اسکو "پال ٹیکس" لکھا ہے۔ پال ٹیکس عیسائیوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ٹیکس کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کیجاتی تھی۔ مزید برآں انگلستان کے تجار پر ابتدا، اسقدر اعتبار کیا جاتا تھا کہ جب وہ مال ساحل ہندوستان پر اتارتے تھے تو فوراً کوئی محصول اُن سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ آخر سال میں جسقدر مال واقعی فروخت ہوتا تھا۔ اُس پر انہیں کے خیالی عمل پر اعتبار کرکے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس معاملہ میں زیادہ دیانت سے کام نہیں لیا جسکی وجہ سے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جو اسوقت رائج ہے یعنے جونہی مال سرزمین ہندوستان پر آتا جاتا تھا اس پر محصول کا جبا لگا لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے موقع پر اُس خط و کتابت کی نقل کریں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور گورنمنٹ مغلیہ کے سورت کے گورنر کے مابین ٹیکس کے معاملہ میں ہوئی ہے اسی سلسلہ میں ہم یہ بھی کہلائیں گے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں گورنمنٹ نے تجار کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسقدر اپنے ذمہ لے لی تھی کہ اگر اُن کا مال چوری جاتا تو گورنمنٹ خزانہ شاہی سے نقصان کی تلافی کردیتی تھی

اسمیں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ
یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد
و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ
ہوتی تھی اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی
ملاحظہ ہو (جلد اول صفحہ ۱۴۸)

بنگال میں صرف دریائے ہوگلی سے (۵۰ یا ۶۰) جہاز مال سے بھرے ہوئے
سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایک ایک ہزار میل کے
فاصلہ سے یہ مال کشتیوں پر لایا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر افیون، مرچ، سونٹھ
تمباکو اور کپڑا ہوتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۲۱)

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ تمام ساحل ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے
بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۴۵)

آج وہ ہمارے تجارتی جہاز کہاں چلے گئے۔ آج جب کونسل میں یہ تجویز پیش
کیجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو جہازی بیڑہ تیار کرنے کی اجازت ہو اور یہ کہ ان کو
جہازرانی سکھلانا چاہیے تو دبی زبان میں انکو نا قابل کہا جاتا ہے لیکن افسوس ہے
ہماری گزشتہ تواریخ پر نظر نہیں ڈالی جاتی ہم صرف بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے
ہیں اگر ہم سبق بھولنے کے وجوہ بیان کرنے بیٹھیں گے تو یہ کام بہت رنج دہ و
ملال انگیز ہوگا۔

یہاں تک تو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت اور تمول کا بیان

کیا گیا ہے اب اہل ہند کی فارغ البالی کا حال سنئے اگر اشیاء مایحتاج کی ارزانی لوگوں کی خوش حالی و فارغ البالی کیسی حکومت کی کامیابی کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستانی رعایا بہت فارغ البال و خوشحال تھی۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بیف (گائے کا گوشت) تین فارڈنگ یعنے کچھ کوڑیوں کو نصف سیر ملتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ایک ٹن یعنے کئی من نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا۔ جو کہ غالباً دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا

(جلد اول صفحہ ۲۵۵)

ساحل کارومنڈل کے کنارے ساڑھے تین آنہ میں ۲۰ پونڈ مچھلی جو کہ ذائقہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی ملتی تھی۔

(جلد اول صفحہ ۴۷۹)

شہر کٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ یعنے نصف سیر ملا کرتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

دو آنہ میں ایک سو مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں جو کہ اتنی اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتی تھیں

"شہر ڈھاکہ میں اشیاء مایحتاج اس کثرت سے اور اس قدر ارزاں دستیاب ہوتی تھیں کہ اس وقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ملک بہت آباد تھا"

(جلد دوم صفحہ ۲۳)

میں نے ایک ایسے قابل اعتبار شخص سے سنا ہے جس نے کہ موسم سرما میں وہاں زندگی بسر کی ہے کہ پانچ سو اسی (۵۸۰) پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے"

(جلد دوم صفحہ ۲۵)

ہرن، بارہ سنگھے، مور، اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے گھروں میں بلاخوف وخطر آجاتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۲۴)

احمد آباد۔ دولت۔ ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو (۱۶۲۵۰۰) پاؤنڈ تھی اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔ کپتان ہملٹن عہد اورنگ زیب کی بابت اپنی عینی شہادت دیتے ہیں کہ ہند میں یہ ترقی وثروت تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۶)

*

کیا آج تمام یورپ کے بڑے بڑے مدبر اس میں متفق الرائے نہیں ہیں کہ ہر گورنمنٹ کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جو خدا کے بندے اسکے زیر حکومت ہوں وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں اسکی زیر حکومت ہر متنفس کو اگر پیٹ بھر کھانا پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان مل جائے تو گورنمنٹ کی اصلی غرض حاصل ہوجاتی ہے۔ آج اگر تہذیب وتمدن کی صرف سطح ظاہر پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ ایسا عظیم الشان اور درخشاں نظر آئیگا کہ دیکھنے والے کی نظر خیرہ کریگی اور ایسا دلفریب وخوبصورت دکھائی دیگا کہ دل لوٹ پوٹ ہوجائے گا۔ مگر جب بنظر تحقیق اس کی تہ کو دیکھا جائے تو یہ پتہ ملیگا کہ ہر یوروپین سلطنت اپنی رعایا کی صرف خورد ونوش کے انتظام میں منہمک ہے۔ ولایت میں لیبر گورنمنٹ اس سلسلہ

* شکار اس کثرت سے پایا جاتا تھا کہ جرمنی اور ولایت کے بڑے بڑے رؤساء صرف شکار کھیلنے کی غرض سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ (جلد اول صفحہ ۲۶۰)

کو حل کر رہی ہے۔ مجھ کو تو ۱۹۲۴ء کے یورپ کے سفر میں یہ محسوس ہوا کہ اس وقت یورپ کے باشندے روپیہ پیدا کرنیکی دُھن میں ہیں، نہ حق و ناحق کی پرواہے نہ واجب و ناواجب کا کچھ لحاظ، خصوصاً وہ جب کہ کسی اجنبی سے معاملہ کرتے ہیں۔ خیر سفر میں میری یہ نظر تو سرسری تھی مگر کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کے باشندے اپنی زیست کے اسباب فراہم کرنے میں اسقدر حیران و پریشان نہ تھے جیسا کہ آج نظر آرہے ہیں بلکہ دنیا کے اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ان کی تجارت، دولت، ثروت اور فارغ البالی یورپ کے ممالک سے اُس زمانہ میں اگر بڑھی چڑھی نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ موجودہ افلاس کو عہد اورنگ زیب کی خوشحالی سے مقابلہ کیجئے اور پھر لوگوں کی فارغ البالی کا فیصلہ کرئیے۔

باب پنجم

انصاف امن و امان

ہر حکومت کا دارومدار انصاف پر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہادی برحق رسول خدا کا آب زر سے لکھنے کے قابل یہ ارشاد ہے کہ انصاف و کفر کے ساتھ سلطنت کی بقا ممکن ہے مگر ظلم و اسلام کے ساتھ وہ ہرگز باقی نہ رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی سلطنت اپنی رعایا کے ساتھ عام اس سے کہ وہ مسلمان یا غیر مسلمان کوئی ہو یکساں انصاف کرنا بقائے سلطنت کا موجب سمجھتی آئی ہے اور شرع اسلام میں قضا کو حکم

کہ ابن مسلم و غیر مسلم ہی وہی فیصلہ کریں جو مقتضائے نصفت و عدالت ہو۔ انصاف وہ مقدس عمل بلکہ عبادت ہے کہ جس کی بجا آوری میں ذات پات اور مذہب کو کچھ دخل نہ ہونا چاہیئے۔ انصاف صرف سلاطین اور قضاۃ ہی کا فرض نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ ایک دوسرے سے انصاف کرے اور انصاف چاہے اور جب تک انصاف نہ ہو انسانوں کا ایک ساتھ مل جلکر رہنا غیر ممکن ہے انصاف ہر سوسائٹی کی جان ہے۔ اگر کسی تمدن میں انسانوں کے دل سے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری و حفاظت کا خیال نکال ڈالا جاوے تو وہ تمدن ایک دم سے درہم برہم ہو جائے گا یوں تو انصاف رواداری اور حسن سلوک کی ہر ملک اور قوم کو ضرورت ہے لیکن ہر تمدن میں انسانوں کے باہمی حقوق کا تخیل و تصور مقامی عادات و رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے اور جب ہر قوم کے خیال کے مطابق انصاف ہوتا ہے تو وہ اسکو انصاف سمجھتے ہیں ورنہ ظلم۔ چاہے عامل نے اپنی سمجھ میں کیسا ہی جائز اور درست عمل کیا ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ دو ہزار برس قبل ہندوزمانہ کا ایک خاص نوع کا تمدن تھا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اہل ہند کی خاص ضرورتیں اسوقت کے خیالات کے تعلق سے تھیں انھوں نے پیشوں کی تقسیم کردی تھی اور شادی و غمی و معاشرت حتیٰ کہ خور و نوش کے معاملہ میں ذات برادری کی آہنی دیوار وسے انسانوں کی تقسیم مختلف طبقات میں اسطرح کردی تھی کہ اگر ہندو زمانہ کے کسی منصف سے یہ کہا جاتا کہ معاملات کے فیصل کرنے میں اس خاص تمدن کے تصور کو ذہن سے مثلاً ایسے امر میں نکال ڈالے کہ اگر کوئی نائر یا چھوت والے شودر نے

کسی برہمن کو چھو لیا ہے تو وہ کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تو غالباً وہ منصف انصاف کے اس تصور پر تمسخر کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ہندوؤں کی کیفیت اُن کے ابتدائی تمدن میں تھی اس کے بعد جب مسلمانوں کا تمدن آیا اس نے ہند کے تمدن میں کچھ نئے عنصر داخل کئے جنکی وجہ سے انسانو نکے خیالات اور ضرورتیں بدل گئیں اور ہند کے باشندوں میں وہ خلط ملط شروع ہو گیا جو کہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نئے تمدن نے انصاف کے تصور و تخیل کو بھی بدل دیا لہذا جب ہم کسی ملک کے انصاف رسانی کے طریقوں پر واجبیت یا نا واجبیت کا فتوے دینے بیٹھیں تو انصاف یہی ہے کہ ہم اُس زمانہ کے تمدن و ضرورتوں کو پیش نظر رکھیں اس لئے جو انصاف عہد اورنگ زیب میں تھا اس کے متعلق فتویٰ دیتے وقت ہم کو بھی اصول پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنے وہ تمدن کونسا تھا اور اُس زمانہ کی ضرورتیں کیا تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں گو کہ ڈاک کا انتظام اس حد تک کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دُور دُور مقام سے دہلی تک خطوط پہنچنے میں صرف آٹھ یوم صرف ہوتے تھے۔ اور ہر پانچ میل کے فاصلہ پر ہرکارے بدل دیئے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۹)

پھر بھی ریل نہ تھی، تار نہ تھا، سڑکیں اس حالت میں نہ تھیں جیسی کہ آج ہیں انسان اس حد تک خلط ملط نہیں ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان ہملٹن نے اکثر مقامات پر جو تصویر اُن سزاؤں کی کھینچی ہے جو کہ قاتلوں یا

ڈاکوؤں کو دی جاتی تھیں وہ آج ہم کو ہیبت ناک معلوم ہو رہی ہیں مگر اس زمانہ کے حالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے وہ کچھ بھی نا واجبی نہیں تھیں۔ کپتان ہملٹن نے اس زمانہ کی عدالتوں کا پورا دستور العمل یا تنظیم ہم کو نہیں بتائی۔ البتہ سورت کے قاضی کی بابت یہ لکھا ہے کہ وہ راشی تھا اور اکثر ڈگریوں (فیصلوں) میں اپنا حصہ لیتا تھا اور امیروں کو بہ نسبت غربا کے مقابلہ میں اکثر بازی لے جاتے تھے ممکن ہے کہ سورت کے قاضی کی یہی حالت ہو جس سے آج بھی دنیا خالی نہیں ہے مگر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے انصاف کی کیا حالت تھی انصاف رسانی کا پورا انتظام تھا یا نہ تھا۔ اس کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ ملک کی اندرونی حالت پر نظر ڈالی جائے۔ کیا وہ نشانات و اثرات بخوبی نمودار تھے جو انصاف سے عموماً پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیا اہل ہند دنیا کے کاروبار کو باطمینان تمام چلاتے تھے اگر مذہبی رواداری اس قسم کی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ملک میں تجارت و تمول و فارغ البالی و صنعت و حرفت ویسی ہی پائی جاتی تھی جیسا بیان ہوا تو پھر یہ کہنا دشوار ہے کہ عہد اورنگ زیب میں انصاف نہ تھا۔ یہ ثمرات اور نتائج بلا امن و امان و عدل و انصاف کبھی کسی ملک کو میسر نہیں ہوتے بس عہد اورنگ زیب کی یہ جو کچھ حالات لکھی گئی ہے یقیناً اس عہد کے امن و امان اور عدل و انصاف کے ہی بدولت تھی۔ کیا ایک درخت میں سیب کا پھل لگا ہوا دیکھ کر پھر بھی یہ کہنا کہ یہ درخت سیب کا نہیں ہے انصاف ہوگا؟

کپتان ہملٹن نے اپنے سفر نامے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں انصاف کا چشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور گو کہ اس چشمہ کے صاف و شفاف

دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس و خاشاک مکدر اور گدلا کر دیتے ہیں
مگر اس عہد کی مجموعی حالت انصاف کا فیصلہ اس نقاد سیاح نے پر معنی فقرے
سے کیا ہے۔

"لیکن سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ
گورے چہرے والوں میں ہے" (جلد اول صفحہ ۱۰ دیباچہ)

اس موقع پر گورے چہرے والوں کی رشوت ستانی و مظالم کے کچھ حالات بیان
کئے بغیر شاید عہد اورنگ زیب کے زمانہ کی قدر اور اس عہد کے انصاف کا
پورا اندازہ ناظرین کو نہ ہوسکے۔ لہذا کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے چند اقتباس
کرتا ہوں:۔

ایک شخص مسٹر ولڈن Weldon نامی ایسٹ انڈیا کمپنی کے
معاملات طے کرنے کے لئے انگلستان سے ہندوستان بھیجا گیا تھا اس کے چال
چلن کے متعلق کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس کا زمانہ گورنری بہت مختصر سا تھا۔ لیکن اس میں بھی اس نے لوگوں کو تنگ
کر کے اپنا خزانہ بھرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اس کے مظالم کی ایک خاص مثال
یہ ہے کہ"

"ایک غریب ملاح کی ایک خوبصورت بیوی تھی جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں
کبھی کبھی کچھ بدعنوانیاں بھی کر گذرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس عورت نے دو آرمینیوں
کو اپنے یہاں بلایا۔ ان میں اس عورت کے متعلق رقابت ہوگئی۔ شدہ شدہ
اس کی خبر گورنر کے کان تک پہنچی۔ اس نے پہلے تو ان دونوں کو طلب کر کے کچھ"

سرزنش کی لیکن جب اُمین نے ایک نے گورنر کے ہاتھ میں پانچ سو روپیہ رکھ دیے تو اُس کو بلا شرکت غیرے اس عورت کا مالک بنادیا اور وہ اس کو لیکر ہو گلی چل دیا۔ یہ شخص علانیہ کہتا پھرتا تھا کہ اس سودے میں اسکو کیا خرچ کرنا پڑا اور وہ اُس گورنر کا بڑا مداح تھا۔ جب اس عورت کا بے چارہ شوہر واپس آیا تو اس کو بیوی کی تفرقت پر مجبوراً صبر کرنا پڑا بایں ہمہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا اس گورنر کو رشوت لینے میں کچھ شرم دامنگیر تھی یا اندیشہ مانع ہوتا تھا اسلئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو لوگ اس قسم کے معاملہ کے واسطے اسکے پاس آیا کرتے تھے اُن سے کہہ دیا کرتا تھا کہ میم صاحب اور بابا لوگ سے بات کرو اور اسکی بیوی اور اسکی لڑکی نہایت عمدگی کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ٹھہرالیتی تھیں اور روپیہ انھیں کے ہاتھ سے پہنچتا۔ میں یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اس قسم کی جبریہ رشوت ستانی کی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں مگر پرانے زخموں کی پوست کنی نہیں چاہتا۔"

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے انصاف کا عالم تھا۔ یہ مشتے از خروارے ہے اس قسم کے بہت سے واقعات کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔ اب اورنگ زیب کا جو انتظام امن و امان و انصاف کے متعلق تھا اس کی بابت کپتان ہملٹن صاحب کی رائے کو ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اس ملک کی رعایا فرامین کی اسقدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ و قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جاوے۔ کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے" (جلد اول صفحہ ۲۰۹)

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ فرامین شاہی کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا اس امن و امان کا مقابلہ اس بدامنی و ظلم و ستم سے کیجئے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں نے ہندوستان کے اس خطۂ زمین پر پھیلا رکھی تھی جس کو بغرض تجارت شاہان مغلیہ نے اس کو سپرد کر رکھا تھا۔ جس کا مفصل بیان باب نہم (۹) میں کیا جائے گا۔

مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب لکھتے ہیں کہ سمندر پر قزاقوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی ذمہ داری عہد مغلیہ کے انتظام پر عائد کیجائے ذرا یہ تو دیکھ لیا جاتا کہ یہ قزاق کون تھے۔ اور کیونکر ان کو قزاقی کا موقع ملتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قزاق مخصوص ہندوستان کے ساحل کے نہ تھے بلکہ اس زمانہ میں ولایت سے لیکر ہندوستان تک و نیز دیگر مقامات کے سمندر پر چند لوگوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا انہیں کو "پائی ریٹس" (Pirates) کہتے تھے۔ کپتان ہملٹن نے ان کا ذکر بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بھی بعض اوقات راہ میں قزاق بن جایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی تجارتی مال راستہ میں مل جاتا لوٹ لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۶)

ایک انگریز مسمی کپتان گرین "Captain Green" یہ ڈینگ مارا کرتا تھا کہ جسقدر مختصر سامان لیکر وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا اس بے سروسامانی سے یہاں آنے کی شاید کسی شخص کی بھی ہمت نہ پڑی ہوگی وہ بحری قزاقوں سے تجارت کیا کرتا تھا اور راستہ میں جو جہاز اسکو مل جاتا تھا اس کو لوٹ کر وہیں ڈبا بھی دیتا تھا۔ اور اسی طرح سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۱۸)

میں نے تجارت کے باب چہارم کے سلسلہ میں دکھلایا ہے کہ اُس وقت اہلِ ہند یورپ تک تجارت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ قزاق بعض وقت راستے میں دیگر جہاز لوٹ لیتے ہوں جیسا کہ ہملٹن کے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۲۱۵ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اورنگ زیب اس غارتگری کے انسداد کا انتظام نہیں کرتا تھا۔ اول تو اسکا انسداد اُس زمانے کے حالات کے لحاظ سے صرف ہند کے سمندر پر انتظام سے ناممکن تھا۔ پھر بھی بادشاہ کے فوجی جہازوں کا بیڑہ "ڈنڈا راجا پور" میں رہتا تھا۔ اس کا کمانڈر سیدی خاں تھا جس کے قبضہ میں (۳۰) یا (۴۰) ہزار آدمیوں کی فوج کا دستہ رہتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۰)

اسلئے یہ کہنا کہ سلطنت ہند کی طرف سے انسداد قزاقی میں بے پروائی کیجاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ رہی کامیابی و ناکامیابی وہ کہاں تک تھی اس کا فیصلہ اس زمانہ کے حالات کی نظر سے کرنا چاہیئے خصوصاً جب کہ انسداد قزاقی کی غرض سے اُس کمانڈر کے پاس توپیں بھی تھیں ایک مرتبہ جب ضرورت پڑ گئی تو اسی کمانڈر نے آناً فاناً میں چار بڑی توپیں کروڑگیری کی اس عمارت پر چڑھا دیں تھیں جو کہ بمبی کے قلعہ سے صرف ۲۰۰ قدم کے فاصلہ پر تھی الغرض رعایا کی پوری طرح سے حفاظت کیجاتی تھی۔ کپتان جبانے مس چیش بربس کی سیاحت میں صرف ایک موقع کا ذکر اپنے سفرنامہ میں یہ لکھا ہے کہ انھیں سرزمین ہند پر ڈاکوؤں سے اُن کا مقابلہ ہوگیا تھا ایک قافلہ کے ساتھ شہر سورت کیطرف کپتان صاحب موصوف اور اُن کے ہمراہی و ملازمین جا رہے تھے کہ چند قزاقوں کے گروہ نے جو کہ سرحد ہندوستان

کے باہر بلوچستان سے عموماً آیا کرتے تھے قافلہ کو روکنا چاہا۔ کپتان صاحب اور
اُن کے ملازمین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کرکے اُن کو بھگا دیا۔ قافلہ پر اس عزت کا
کا بڑا اثر ہوا۔ یہ خبر اڑتی اڑتی شہر سورت میں پہنچی کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب
اُن کا قافلہ سورت کے قریب پہنچا تو اہالیان شہر نے مٹھائیوں اور تحفوں کے
ساتھ اُن کا استقبال کیا اور جب کپتان جبانے گورنر سورت سے ملاقات کرنے کی
خواہش کی تو اس نے چند گھوڑے زیور سے آراستہ و پیراستہ اور ایک باڈی گارڈ
استقبال کے لئے روانہ کیا اور جب وہ قریب آئے تو آتے ہی یہ آؤبھگت کی کہ خلاف
معمول و دستور کپتان صاحب کی سواری کو اپنے خیمے تک آنے کی اجازت دی انکے
تمام مال و اسباب کا محصول معاف کردیا اور بہ نفس نفیس خود فوج کا ایک دستہ لیکر
اُن قزاقوں کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۹)

اسقدر خاطر مدارات کی غالباً یہ وجہ تھی کہ بقول کپتان صاحب بادشاہ وقت
اورنگ زیب کو حفظ امن کا بید خیال تھا اور جب کبھی کسی مقام پر اس قسم کے واقعات
ہوتے تھے تو اُن کی تمام ذمہ داری صوبہ کے گورنر نے سر ہوتی تھی ایک مرتبہ جب
اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا تو بادشاہ کا حکم بدیں مضمون
شرف صدور لایا کہ فوراً شہر کے گرد چار دیواری بنادی جائے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۵)

ایسے واقعات کا یہاں کبھی کبھی پیش آنا تعجب خیز نہ تھا اور کس زمانہ میں در
کس ملک میں ایسے واقعات نہیں پیش آتے رہتے ہیں اور یہ زمانہ کب اُن سے خالی کر

دیکھنا یہ چاہئے کہ اس زمانہ میں ملک میں امن وامان کی حالت یہ تھی کہ یہی سیاح
تاجر مال و اسباب لیکر سترہ (۱۷) کہاروں کی پالکی میں سوار ساحل و وسط ہند
میں برسوں پھرتا رہا مگر سوائے ان دو واقعات کے ہندوستان میں کوئی اور
ایسا واقعہ اس کو پیش نہیں آیا جس کو وہ اپنے سفرنامہ میں درج کرتا ملک کی اس اندرونی
حالت سے عہد اورنگ زیب میں انصاف وامن وامان کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی ہے
میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ عہد اورنگ زیب میں تمام عہدہ داروں کا دامن رشوت ستانی
کے دھبوں سے پاک وصاف تھا یا کبھی ڈاکہ نہیں پڑتا تھا انصاف کے معاملہ میں
جب کبھی دولت وغربت کا مقابلہ ہوجاتا ہے تو یہ حضرت زر مختلف صورتوں میں آج
بھی بڑے بڑے کرشمے دکھلاتے ہیں۔ جو لوگ کہ موجودہ مقدمہ بازیوں کی اندرونی
حالت سے واقف ہیں وہی اسکا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی روپیہ
جھوٹی شہادت کے مہیا کرنے میں اور قانون کی امداد حاصل کرنے میں ایک دولتمند
فریق کو کہاں تک مدد دیکر قوی بنادیتا ہے اور مفلس فریق مخالف کو کیسی کچھ لاچاری
اور مجبوری کا سامنا ہوتا ہے اور اسطرح سے یہ حضرت زر آئے دن کیا کچھ انصاف
کا خون نہیں کرتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی و ڈاکہ اور چوری اب بھی بند نہیں ہے
ہمارے بچوں کو جو تاریخیں مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں انہیں ٹھگی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے
اور کہا جاتا ہے کہ ٹھگی کا انسداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد حکومت میں انیسویں
صدی میں کیا گیا تھا اور اس کا فخر کمپنی مذکور کو دیا جاتا ہے مگر ان تاریخوں میں
ملک کے اس امن وامان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا جو کہ قبل کمپنی کی حکومت کے تھا
اور جس کا تذکرہ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اصلیت یہ ہے کہ اس

ملک میں ٹھگی اُسوقت آئی جب کہ حکومتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا جب اس ملک کے باشندوں نے اپنے انگریز حکمرانوں سے یہ کہا کہ عنانِ حکومت پھر اُن کے ہاتھ میں دیدیجائے تو بڑی کشمکش کے بعد اُن کو "ڈائی آرکی" (Diarchy) دیگئی جس کے بموجب ملکی انتظام کا ایک جزو انتخاب شدہ منسٹر یا وزیر کے سپرد ہوا اور دوسرا جزو گورنمنٹ کے سپرد رہا۔ اس طرح سے حکومت کی تقسیم ہوئی اس تقسیم کے دو ہی برس میں چل پکار مچ گئی دونوں حصوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ دو ہی برس میں بد امنی و بے اطمینانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "ڈائی آرکی" ناکام ثابت ہوئی اور ہر دور اندیش شخص کہنے لگا کہ "ڈائی آرکی" حکومت کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اب اُس "ڈائی آرکی" پر غور کیجئے جب ہندوستان کی حکومت شاہ مغلیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں میں تقسیم ہوئی تھی ملک کی اسوقت کیا حالت ہوگی جبکہ حکومت کا شعبۂ دیوانی کمپنی کے عہدداروں کے قبضہ میں آگیا اور دوسرا شعبہ مالگزاری شاہ مغلیہ کے سپرد رہا ایسے دو متضاد عنصر کا جمع رہنا محال تھا۔ پھر بھی رہا ملک تا اندازاً نصف صدی اُس عجیب و غریب "ڈائی آرکی" Diarchy کے تہلکہ میں گرفتار رہا۔ ان حالات میں ڈکیتی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ لیکن جب عنانِ حکومت کلیتاً اُس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی تب ایسی بد امنی یا ٹھگی نہ تھی اس وقت انصاف تھا اور امن و امان تھا۔

بہ حیثیت قانون پیشہ اودھ کے بہت سے دیہات و تعلقہ جات کی واجب العرض پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا جن میں گاؤں یا تعلقہ کی گذشتہ تاریخ بھی بندوبست اول میں درج کیجاتی تھی مجھ کو اکثر یہ دیکھکر استعجاب ہوا کہ ایک گاؤں یا تعلقہ

پشتہا پشت تک ایک ہی خاندان کی ملکیت وقبضہ میں برقرار رہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جس شخص نے تین سو یا چار سو برس قبل جنگل کا ٹکرا آباد کیا تھا اسی کی اولاد کے قبضہ میں وہ گاؤں ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی پایا گیا۔ اگر گزشتہ زمانہ میں انصاف و امن وامان نہ تھا تو کسی گاؤں کی مسلسل تاریخ اسطرح سے کبھی نہ ہوتی ان وجوہ سے جیسے موجودہ زمانہ کی بابتہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجموعی حیثیت سے انصاف نہیں ہے یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کیجاتی ہے اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کی بابت یہ کہنا کہ انصاف نہ تھا یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ یہ عہد اورنگ زیب کے انصاف اور امن وامان کے نتائج تھے جو کہ ملک کی تجارت وتمول وفارغ البالی کے سلسلہ بیان میں ظاہر کیے جا چکے ہیں

باب ششم

صنعت وحرفت

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب کسی ملک میں انصاف ہوتا ہے تو امن وامان ہوتا ہے اور جب لوگ فارغ البال وخوشحال ہوتے ہیں اور جب تلاش معاش سے کسیقدر بے فکری ہوتی ہے تب ہی انسانی دماغ صنعت وحرفت کی جانب رجوع ہوتا ہے مفلس قوم دین ودنیا دونوں میں روسیاہ رہتی ہے۔

"الفقر سواد الوجہ فی الدارین" میں کوئی شک نہیں جسطرح ہے

"پراگندہ روزی پراگندہ دل" کی مثل ایک متنفس پر صادق آتی ہے اسی طرح سے قوم پر بھی صادق آتی ہے اب آپ دیکھئے کہ عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کی کیا حالت تھی اس سے اس ملک کی خوشحالی کا بھی اندازہ ہوسکے گا۔

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا اور بکثرت ایسا ملتا تھا جسکی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے اور اسقدر پائدار کہ ویسا انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۷)

غالباً یہ ڈھاکہ کی مشہور ململ ہوگی۔ اس کے علاوہ کمخواب چھینٹ اور سادے کپڑے بنانے والے اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ صرف ایک شہر بیجاپور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے (۵۰۰۰) پچاس ہزار کپڑا بننے والے جلاہے ملازم رکھ چھوڑے تھے لوگ پوچھیں گے کہ پھر یہ صنعت کہاں غائب ہوگئی۔

جن لوگوں کو اسکی جستجو ہو وہ رمیش چندر دت آئی۔ سی۔ ایس۔ سی آئی۔ ای مرحوم کی کتاب "ہند کی اکانومک ہسٹری" ملاحظہ فرمائیں۔ یہ قابل فخر ہندوستانی ایک زمانہ میں اڑیسہ میں بہ عہدہ کمشنر ممتاز تھے اور پھر لندن کی یونیورسٹی کالج میں تاریخ ہند پر لیکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان سرکاری کاغذات کی مدد سے جو انکی نظر سے گزرے تھے یہ دکھلایا ہے کہ انگلستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے اور اس خوف سے کہ شاید ہندوستان کا کپڑا انگلستان کی منڈیوں تک

قبضہ نہ کرلیوے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار ہندوستان کے نداف اور اُس کی
صنعت کو نیست نابود کرنے کی غرض سے مختلف اقسام کی تدابیر استعمال کرتے تھے
پہلے کچھ رقم پیشگی دیکر اُن کو ملازم رکھ لیتے تھے اور جو لچا ہتے تھے وہ کام اُن سے
لیتے تھے اگر کسی نے کچھ بھی خلاف معاہدہ کیا تو ٹکٹکی میں باندھ کر بید وں کی سزا
دیتے اور اُنکی انگلیوں کو مختلف اقسام کی ایذا پہنچاتے تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۷۹۹ء
کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو عام ہدایتیں اپنے عہدہ داروں کے لئے جاری کی تھیں
ان کا پڑھنا بھی تکلیف دہ ہے۔ ہاؤس آف کامنس کمیٹی کے روبرو ۱۸۱۳ء میں جو
شہادت مسٹر منرو نے دی تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمپنی کے عہدہ داران
ندافوں کو بھیڑیوں کی طرح سے ایک مقام پر جمع کرکے کھڑا کرتے تھے اور اُن پر
پہرہ مقرر کردیا جاتا تھا کہ جب تک وہ نداف حسب لخواہ کمپنی معاہدہ پر دستخط نہ کردیں
اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پاویں۔ مسٹر کاکس نے شہادت دی تھی کہ اس طریقہ سے معاہدہ
کے پابند جولاہوں کی تعداد صرف انکے ایک کارخانہ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) ہے
کمپنی نے جو قانون ۱۷۹۳ء میں نافذ کیا تھا اور جو ریگولیشن ایکٹس ۱۷۹۳ء کے نام سے
موسوم ہے اسکو ملاحظہ کیجئے۔ اس قانون کے بموجب جس پارچہ باف نے کمپنی سے پیشگی
رقم لے لی پھر اس کو یہ حق نہ تھا کہ کسی دوسرے کا کام بنادے اور اگر کوئی پارچہ باف
ایک سے زیادہ کارگاہ اپنے گھر میں رکھے گا تو بڑا تاوان دینا پڑے گا۔ فوجداری میں
مقدمہ چلایا جاویگا۔ عہدہ داران کمپنی کو اُن کے مکانوں میں خلاف مرضی داخل
ہوجانے کا بھی اختیار دیدیا گیا تھا۔ ان کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب ۱۷۹۴ء میں
صرف (۱۵۶) پونڈ کا قیمتی کپڑا سالانہ ولایت سے ہندوستان کو آیا تو ۱۸۱۳ء میں

یعنے صرف دس برس کے بعد (۲۷۸۵۶) ستائیس ہزار آٹھ سو چھپن پونڈ کا مالیتی کپڑا سالانہ ہندوستان کی تن پوشی کے لئے ولایت سے لایا گیا اور ۱۸۳۷ء میں یعنے تیس برس کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چوبیس (۱۰۸۸۲۴) پونڈ کا کپڑا سالانہ لایا گیا۔ پھر وہ پارچہ باف یا ان کی صنعت جو عہد اورنگ زیب میں تھی اب کیسے دکھلائی دے۔ یہ تمام مواد رمیش چندر دت مرحوم کا جمع کیا ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور عملاً کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی صنعت پارچہ بافی کو اسقدر عروج تھا کہ ہم نہ صرف اپنی پوری ضروریات کو ملک ہی کے کپڑے سے پورا کرتے تھے بلکہ غیر ممالک کے ہاتھ فروخت کرکے اپنی دولت میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ یہ تو صرف پارچہ بافی کا ذکر تھا۔ اورنگ زیب میں کپتان صاحب ملتان کو بھی گئے تھے تو وہاں ان کو بہترین تیر و کمان بنانے والے ملے۔ لوہا بکثرت پایا جاتا تھا کہ جہازوں کے واسطے لوہے کے لنگر بھی ڈھالے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۲)

کپتان صاحب نے گولکنڈے کے ہیروں کا بھی ذکر کیا ہے قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی ملک کے تمدن کو عروج ہوتا ہے تو اس کا عکس اس ملک کی عمارات و مکانات پر بھی اسی طرح پڑتا ہے جیسا کہ ملبوسات پر عیش و عشرت کے یہی سامان ہیں جن میں انسان کی طباعی و ذہانت اکثر نمودار ہوا کرتی ہے۔ فن انجینری کے متعلق تو صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل ہند آگرہ، و دہلی و لاہور کی وہ خوشنما

عمارتیں مکمل کر چکے تھے جن میں ایک عمارت "تاج بی بی" کا روضہ ہے جو اس وقت
بھی عجائبات دنیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عمارات بنانے والے عہد اورنگ زیب
میں موجود تھے اور ان کے دماغوں کی جھلک دکھن تک پہنچی تھی۔ دکھن میں جہاں
اورنگ زیب کا قیام کچھ عرصہ تک رہا ہے اس کے قرب و جوار کی عمارتیں ملاحظہ ہوں
اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ قلعہ دولت آباد کے نیچے کی وہ مسجد
وہ کھنڈر اور وہ منارے ملاحظہ ہوں جہاں اب بوربچے کے شکار کے لئے لوگ جاتے ہیں
اور جن کو دیکھ کر یہ شعر یاد آتا ہے :-

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

خود میرے قصبہ امیٹھی میں ایک مقبرہ ہے جس کے گنبد پر بچپن میں دور سے
چند ٹائلیں اس نمونے کے چمکتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جیسے کہ اب یورپ سے منقش ٹائلیں
آتے ہیں اور جو وہاں کی صناعی کے نمونے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے ہم نے
بہت زمانہ ہوا ایجاد کر کے رائج کر دیا تھا۔

اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے فن انجنیری کے دوسرے شعبہ کا اندازہ کرنا مقصود ہے
تو دکھن میں اورنگ آباد کے قدیم واٹر ورکس کو دیکھئے۔ آج تک لوگ حیران ہیں کہ وہ
کونسا چشمہ ہے اور وہ کونسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے تہ زمین میں بڑے
بڑے نالے بنا کر میٹھے پانی کی گویا ندی بہا دی ہے جس نے اورنگ آباد کی آبادی
کو صرف سیراب ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ باغوں، نہروں، حوضوں اور فواروں سے
بہشت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مجھ سے خود اسٹون برج صاحب نے جو سلطنت حیدرآباد

کے واٹر ورکس کے انجینیر تھے۔ یہ بیان کیا کہ اگر آج ہم اس سے بہتر پانی کا لیول نکالنا چاہیں تو مشکل ہے وہ معترف تھے کہ اورنگ آباد کے لئے اس سے بہتر واٹر ورکس کا انتظام کرنا اس زمانہ میں بھی دشوار ہے۔ اُن کو افسوس تھا کہ فن انجینیری جس نے ایسے واٹر ورکس بنائے تھے ہندوستان سے اب معدوم ہے..........

......کیفیت اس خزانہ آب کی یہ ہے کہ ایک مقام پر صرف ایک بہت عمیق کنواں ہے جس میں جھانکنے سے ایک چشمہ کا جھرا یا سوتا سا نظر آتا ہے۔ یہیں سے ایک گہرا پختہ نالہ بہنا شروع ہوا ہے۔ جوں جوں شہر کیطرف یہ نالہ بڑھتا گیا ہے اُسمیں الغاروں پانی نمودار ہوتا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جاکر اس میں سے پختہ نالیاں نکالی گئی ہیں۔ ڈھائی سو برس کے بعد آج بھی انہیں نالیوں سے شہر کو پانی ملتا ہے لیکن اسکی مرمت و صفائی کرنے میں اس زمانہ کے انجینیر بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے محیر العقول واٹر ورکس نہ صرف اورنگ آباد میں تھے بلکہ ہمنے اس کے آثار بیڑ و بیدر جیسے دور دراز مقامات پر بھی دیکھے ہیں گو کہ وہاں اب وہ اسطرح سے کار آمد نہیں ہیں جیسے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ کا شہر "ٹھٹھ" دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریا سے بذریعہ کینالس اور نہریوں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۱)

کیا یہ تمام واقعات اس کا ثبوت بین نہیں ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں صنعت و حرفت اور دوسرے فنون پورے عروج پر تھے۔ کہ اسوقت غالباً یورپ کو

ہندوستان سے وہی رشک تھا جو کہ صنعت و حرفت کے مقابلہ میں آج ہندوستان کو یورپ سے ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دولت برطانیہ کی صنعت و حرفت کی بڑی نمایش جو لندن میں ہوئی اسی ایک عمارت میں ہندوستانی صنعت و حرفت کے نمونے بھی دکھلائے گئے مجھ سے جب کسی انگریز نے ان نمونوں کی تعریف کی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اس نمایش کے ہندوستانی سکشن میں وہ کونسی چیز ہے جس کو ہمارا ہندسو برس قبل نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم کو یہ دکھلاؤ کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستانی دماغوں نے گذشتہ صدی میں پہلے سے زیادہ کیا ترقی کی ہے ......

......لکھنؤ کی چکن، فرخ آباد کے پردے، دہلی و آگرہ کا سنگ مرمر کا کام، مرادآباد کے برتن، کشمیر کی شالیں، یہ سب چیزیں جو اسوقت ہم نمایش میں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ ان سے بہتر نہیں ہیں جو ہم سابقہ صدیوں میں بنا سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کشمیر میں ان سے بہتر پرانی شالوں کے نمونے دیکھے ہیں جن کے فوٹو آج ولایت کے اخبارات میں نمایش کی شہرت دینے کی غرض سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

دیگر ممالک مثل کینڈا اور اسٹریلیا وغیرہ کا جو سکشن دولت برطانیہ کی اس نمایش میں ہے اسمیں اور ہندوستان کے سکشن میں بڑا فرق یہ ہے کہ ان نوآبادیوں کی اکثر نمایش میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جس کو وہ ایسی خوبی اور مقدار میں اب سے پچاس برس قبل بنا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے سکشن میں کوئی ایسی اکثر بیشتر نہیں معلوم ہوتی جس کو ہندوستانی دماغ نے حال میں سیکھا ہو اور وہ

سو برس قبل نہ بنا سکتا ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو بہت سی صنعتیں بھول گئے یا ہم
اُن کے بھول جانے پر مجبور کیے گئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو ململ ڈھاکہ میں بنتی
تھی آج وہ کہاں ہے؟

وہ فولاد کہاں ہے جو ہندوستان کے نام سے لندن کے بازار میں بکا کرتا تھا
وہ چھینٹ کہاں ہے جس کا ذکر کپتان ہملٹن نے کیا ہے۔ وہ زربفت کہاں ہے
جس کا خلعت کمپنی کو گورنر سورت نے اورنگ زیب کا فرمانِ شاہی پڑھتے وقت
حسبِ رواج ملک عطا کیا تھا اور جس کا ذکر دوسرے موقع پر کرونگا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا کسی
قوم سے جو فوائد پہنچتے ہیں اُن کو نظر انداز کرنا بڑا اخلاقی جرم ہے لہذا ہم آخری
باب میں اُن فوائد کا اعتراف کریں گے جو موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو ہوئے ہیں
لیکن اس موقع پر ہم کو عہد اورنگ زیب کی صنعت وحرفت کا بتلانا منظور رہے
اور اس سلسلہ میں مقابلہ کرنا ضروری تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں آج ریلیں چل رہی ہیں موٹریں
دوڑ رہی ہیں۔ جابجا ہوائی جہاز بھی اُڑتے نظر آرہے ہیں۔ یہ سب عہد
اورنگ زیب میں کہاں تھا۔ کاش یہ چیزیں ہمارے دماغ کی ترقی کا ثبوت ہوتیں
ہم تو ایسی ذری ذری سی چیزوں کے آج محتاج ہیں جیسے دیا سلائی، بوٹ کا پالش
ہماری اصلی حالت اب یہ ہے کہ مختلف اقسام کے فنون وصنعت وحرفت سیکھنے کے
لئے دوسری قوموں کا منہ تک رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ فرانس جاؤ۔ کوئی
کہتا ہے کہ جرمنی جاؤ۔ وہاں کے لوگ سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے کہ

شاید جاپان کو ایشیائی ہمدردی ہو' کوئی کہتا ہے کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔ صنعت وحرفت تم کو کوئی نہیں سکھائیگا تم خود اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرو اور چرخہ کی الف۔ بے سے پھر شروع کرو۔ انگلستان کے ہم شکور ہیں کہ چند زبانوں کے سکھانے کے واسطے اسنے اپنی بڑی بڑی یونیورسٹیز کے دروازے ہی ہمارے بچوں کی ایک محدود تعداد کے لئے کھولدئے ہیں مگر ساتھہ ہی ساتھہ ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمارے ملک کے طالب علموں کو اسکی عام شکایت ہے کہ انگلستان انکو اس صنعت وحرفت کے سکھانے میں پس وپیش کررہا ہے جس سے ملک کی وہ دولت وتمول عود کرے جو عہد اورنگ زیب میں پائی جاتی تھی جب کہ صرف ایک ہندوستانی تاجر کا سرمایۂ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا جیسا کہ کپتان ہملٹن صاحب کے سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے اور جس کا ذکر باب چہارم میں کیا جاچکا ہے۔

بابِ ہفتم

مہمان نوازی

کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں مہمان نوازی کا ایشیائی شعار بہت کچھ موجود تھا۔ جہاں جہاں انہوں نے سفر کیا ہندستانیوں کی مہمان نوازی نے انکے دل پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ مثلاً صوبہ بنگال میں کسی رئیس کی سرحد سے جب انکی پالکی گذری اُسوقت وہ رئیس تو شکار کو گئے ہوئے تھے مگر مقام شکار ہی سے دعوت کا رقعہ بھیجدیا۔ چنانچہ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"جب میں وہاں پہنچا وہ رئیس صاحب شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مجھکو سلام کہلا بھیجا"
"اور یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھسے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں نے یہ بہانہ کردیا کہ مجھے"
"نقرس کی شکایت ہے۔ میرے اس عذر کو انہوں نے بلا تامل قبول کرلیا۔ اور"
"میرے کھانے کے واسطے چڑیوں کا مرغن سالن بھیجا۔ اور دوسرے روز شہر کے"
"اکثر معززین مجھ سے ملنے آئے اور یہ خواہش کی کہ جب تک وہاں کے رئیس شکار سے"
"واپس آئیں میں وہاں قیام کروں۔ لیکن مجھے ضروری کام تھا اسلئے مناسب الفاظ"
"میں انکا شکریہ ادا کرکے میں وہاں سے رخصت ہوا"

(جلد اول صفحہ ۳۰۷)

مغربی تمدن کے لحاظ سے بغیر اس کے کہ کوئی شناسا تعریف یعنے انٹروڈکشن کرے

بات کرنا تک معیوب ہے۔ تواضع ومدارات تو در کنار۔ ایک دوسرے مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کنانور کی سرحد میں داخل ہوئے تو صرف بہ خیال مہمان نوازی وہاں کے رئیس کی بیوی نے جو شاہزادی تھی اپنے ہاتھ سے پان اور شربت دیا۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ایک دوسرے رئیس کو جب کپتان صاحب نے کچھ کپڑا، قالین، اور دو تفنگچے بطور سوغات بھیجے تو وہ اسقدر خوش ہوا کہ اسنے فوراً اپنی کلائی سے ایک زیور جو جواہرات سے مرصع تھا اُتار کر کپتان صاحب کو پہنا دیا اور یہ اجازت دی کہ اسکی ریاست کے حدود میں کپتان صاحب ہر جگہ بے تکلف سفر کر سکتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۳)

انصاف و امن وامان کے باب میں ہم یہ لکھہ چکے ہیں کہ جب کپتان صاحب ایک قافلہ کے ساتھہ سورت کے قریب پہنچے تو کسطرح لوگوں نے انکی خاطر تواضع کی اور جب وہ گورنر سورت سے ملنے گئے تو کس کشادہ پیشانی سے اُسنے اِنکا استقبال کیا اور انکی دعوت کے لئے ایک گائے، پانچ بھیڑیں، پانچ بکریاں، بیس مرغیاں، پچاس کبوتر اور بہت سی مٹھائی اور پھل بھیجے۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۲۰ و ۱۹۰)

کپتان صاحب پھر لکھتے ہیں کہ اہل ہند انگریزوں کی فیکٹری کے افسروں کی بہت عزت کرتے ہیں اور بسا اوقات جب کبھی یہ انگریز شکار کھیلنے جاتے ہیں تو وہاں کے معزز ہندوستانی اپنے ملازمین واسلحہ اور باجے گاجے کے ساتھہ انکے ہمراہ جاتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۳)

یہ مہمان نوازی ایشیائی خلقت میں داخل ہے اور غالباً قدیم زمانہ میں خطۂ عرب دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بھی سبقت لیگیا تھا۔

اَکْرِمُوا ضَیْفَکُمْ وَلَوْ کَانَ کَافِرًا اَوْ اَجْنَبِیًّا

(اپنے مہمان کا اکرام کرو چاہے وہ کافر ہو یا اجنبی کوئی ہو)

عربوں کا دستور العمل رہا ہے۔ مجھے ایک واقعہ ساحل عرب کا بہت دلچسپ معلوم ہوا جسکا ذکر کپتان صاحب نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ساحل عرب کے کسی مقام پر جہاز میں پانی آنے لگا۔ مجبوراً کپتان صاحب کو لنگر ڈالنا پڑا دیکھا کہ ریگستان میں کچھ جنگلی عرب خیمے ڈالے پڑے ہوئے ہیں گویا وہ اس جہاز کے منتظر تھے۔ یہ عرب مدد کیواسطے فوراً ہی پہنچ گئے انہوں نے پہلے یہ طے کرنا چاہا کہ انکو کیا اجرت ملیگی۔ کام یہ تھا کہ جہاز سے کل مال نکالکر ساحل پر جمع کردیں تاکہ جہاز ہلکا ہوجائے اور جہاز کی مرمت کے بعد اسباب پھر لاد دیں۔ اور اس اثنا میں مال کی پوری حفاظت بھی کریں۔ کپتان صاحب اول تو ڈرے کہ یہ لوگ جہاز کا مال کہیں لوٹ نہ لیں مگر صاحب بہادر لنگر ڈالنے پر مجبور تھے ورنہ جہاز ہی ڈوبا جا رہا تھا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کل مال دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ اجرت میں دیا جائے جب یہ طے ہوگیا تو عربوں نے کہا کہ مزدوری کی حد تک تو معاملہ ختم ہوگیا مگر اب آئندہ سے تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کپتان صاحب کو ان جنگلی عربوں کی مہمان نوازی پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایشیائی مہمان نوازی کی روایات ہیں۔ کپتان صاحب کو اس پر بھی حیرت ہوئی کہ وہ اس ریگستان میں پہلے سے خیمے ڈالے کیوں پڑے تھے۔ ان سے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ

ان عربوں کے پہرنے پیشتر سے اسکی اطلاع دیدی تھی کہ فلاں مقام پر ایک جہاز کے مسافر مصیبت میں گرفتار ہونگے تم اُنکی مدد کرنا اور بدمعاملگی نہ کرنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے انگریزوں کا اعتقاد جادو پر تھا۔ کپتان صاحب نے اپنے سفرنامہ میں ان عربوں کی پیش بندی جادو پر محمول کی ہے خاص سندھ و ملتان کے متعلق جو حالات کپتان ہملٹن صاحب نے عہد اورنگ زیب کے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت اہل سندھ بھی مہمان نوازی و مسافر نوازی میں اپنے کسی پڑوسی ایشیائی ملک سے پیچھے نہ تھے یورپ کا موجودہ تمدن جہاں کچھ اچھی باتیں ہم کو سکھا رہا ہے وہاں اسکے ساتھ ساتھ ہمارے قدیم تمدن کی بعض اچھی باتیں ہم کو بھلا بھی رہا ہے منجملہ ان چیزوں کے جو اہل سندھ بھولتے جا رہے ہیں مہمان نوازی کی عادات ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ میں مہمان نوازی نہیں ہے لیکن ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ یورپ میں کنبے اور خاندان کی نسبت تصور۔ افراد خاندان کے باہمی فرائض اور ذمہ داریوں کا تخیل ذاتی آسائش و عیش و عشرت کو حتی الامکان ترجیح دینا۔ روزانہ کی ضروریات۔ طرز معاشرت۔ مکان میں کمروں کی تقسیم۔ ہوٹلوں میں رہنے کی عادت۔ زمین کی قلت۔ آبادی کی کثرت۔ مادی ترقی میں بے حد انہماک۔ روحانیت کی جانب بے توجہی۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنکے اعتبار سے ایشیا و یورپ کے طرز معاشرت و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے گویا ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے بالکل ہی علحدہ دو عالم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں جو فرق تھا اور ہے وہ اسی قسم کی مغائرت و فرق کیوجہ سے تھا جنکی طرف

مینے اشارہ کیا اگر جوں جوں ان باتوں میں فرق کم ہوتا جائیگا اُسی مناسبت سے دونوں ملکوں کی عادتوں میں مشابہت ہوتی جائیگی اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اہل یورپ میں انسانی ہمدردی کم ہے یا اُن میں نیکی کرنے کا مادہ کم ہے خلق اللہ کو آرام پہنچانے اور انکی تکالیف کو کم کرنے کے لئے یورپ میں جو انسٹی ٹیوشنس شفاخانوں اور دیگر امدادی جماعتوں کی صورت میں آج بکثرت موجود ہیں وہ اسکی دلیل ہیں کہ دنیا میں اسوقت اہل یورپ بنی نوع انسان کو مدد دینے میں بڑا حصہ لے رہے ہیں اہل یورپ کی تحقیر کرنا ہم ایک اخلاقی جرم سمجھتے ہیں بہر حال مہمان نوازی کے متعلق ہمارے اور اہل یورپ کے تمدن میں ہمیشہ فرق رہا ہے مثلاً لندن کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی کے مکان میں ایک کمرہ بھی خالی ہو گیا تو اسکو دوبھر ہو جاتا ہے فوراً "پے انگ گسٹ" یعنے خرچہ ادا کرنیوالے مہمان کی گنجائش کے عنوان سے روزانہ اخبار میں اشتہار دیدیا جاتا ہے۔ وہاں ہزاروں آدمی اس قسم کے مہمانوں کی امداد پر زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی صورت میں اگر باپ کے ہاں اُسکا کماؤ لڑکا بھی اچانک آجائے تو گھر میں جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے اور اسکو کسی دوسرے شخص کا "پے انگ گیسٹ" (خرچہ ادا کرنے والا مہمان) بنایا جاتا ہے اس سے یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ وہاں باپ بیٹے میں محبت نہیں ہوتی محبت بہت ہوتی ہے مگر اُنکا تمدن، انکی روزانہ ضرورتیں اور انکی زندگی کی کشمکش اس طرز معاشرت کے لئے انکو مجبور کرتی ہے۔ ایشیا کا تمدن ہمیشہ اسکے خلاف رہا ہے یہاں مہمان نوازی کو ایک قسم کے مذہبی فرض کی وقعت دیدی گئی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں دو ایک قصے مشہور ہیں جنکو لوگ کبھی کبھی بڑے تسخر سے بیان کرتے ہیں ایک ہندوستانی

جج ہائیکورٹ تھے جنکی پوری تعلیم ولایت میں ہوئی تھی اُنکے باپ نے اطلاع دی کہ وہ آرہے ہیں۔ جج صاحب نے فوراً تار دیا کہ مکان میں گنجائش نہیں ہے ذرا ٹال کیجئے۔ جب انتظام ہو جائے تشریف لائیے گا۔ یا ایک ہندوستانی بیرسٹر صاحب ولایت سے تازہ وارد ہوئے۔ باپ اسٹیشن پر لینے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیرسٹر صاحب ہوٹل کے قیام میں زیادہ سہولت سمجھکر اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل تشریف لے گئے اور اسباب وغیرہ وہاں رکھکر پھر ماں سے ملنے گھر گئے۔ ممکن ہے کہ ان واقعات میں کچھ مبالغہ ہو اور لوگوں نے حاشیہ چڑھایا ہو مگر ان دونوں مثالوں سے میرا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ تمدن بدلنے سے کسی ملک کے باشندوں کی جبلی عادات واخلاق میں عظیم الشان فرق ہو جانا ممکن ہے کیا خوب ہوتا اگر ہم اپنے قدیم تمدن کی اچھی باتیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے قوموں کی عادتیں سنوارنے میں بہت دیر لگتی ہے بگڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔

بابِ ہشتم

یورپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا
اس سوال کا جواب مسٹر جے آر ائے صاحب نے اثبات میں دیا ہے۔ اپنی رائے
کی تائید میں جہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے قول و فعل پر انہوں نے استدلال
کیا ہے اسکی نسبت ہم چند واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں انسانوں کے صدق و
کذب پر فتویٰ دینے کے لئے ان کی نیت کا معلوم کرنا ایک اہم امر ہوا کرتا ہے
اسی نیت کی بنیاد پر بعض وقت ایک ظاہرہ قاتل بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور ظاہرہ
بیگناہ شخص قتل کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو مراسلت
ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آقا ڈائرکٹرس میں ہوا کرتی تھی اس سے گماشتوں
کی کیا نیت تھی کیا غرض اور کیا پالیسی مضمر تھی تو سارا عقدہ کھل جائیگا اور
راز فاش ہو جائے گا سر دست تو جب کوئی ہندوستانی رومیش چندر دت کی وہ
کتاب پڑھتا ہے جسمیں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی مراسلت
سے استدلال کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی صنعت کو کس کس طریقے سے
کاریگروں کو ایذا دے دیکر تباہ کیا گیا تھا تو اسکو حیرت ہوتی ہے لیکن اگر آج وہ
تمام رازکی خط و کتابت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور اُن کے

آقا ڈائرکٹروں کے درمیان ہوا کرتی تھی پیش کردی جاتو قرائن سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ ہمارے اہلِ وطن دنگ ہو جائیں گے ہم کو اس راز کی کچھ جھلک
کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے بھی ملتی ہے یہ منجملہ انہیں واقعات کے ایک واقعہ
ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے
اور اس سے انکی نیت معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اقوال و
افعال کیا تھے اور نیت کیا تھی جس کے بعد وہ تمام شہادت مشتبہ ہو جاتی ہے
جو عہدِ مغلیہ کے نظم و نسق کے خلاف وہ گڑھا کرتے تھے۔ کپتان صاحب ایک
مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس خط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود
پڑھا ہے جو ولایت سے ڈائرکٹروں نے بطور ہدایت نامہ یا دستور العمل اپنے ملازمین
و عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجا تھا۔ اس خط میں حکومتِ مغلیہ سے
چھیڑ چھاڑ قائم کرنے کی ایک تدبیر بتلائی تھی وہ یہ تھی کہ تم ہندی تجار و متمول
اشخاص سے روپیہ قرض لو اور جب رقم کثیر ہو جائے تو کوئی ایسی لڑائی جھگڑے
کی بات پیش کرو جسکی وجہ سے قرضہ کا مسئلہ تو پیچھے پڑ جائے اور وہ نزاع سامنے
آجائے۔ اس طریقہ سے قرضہ بھی ہضم ہو جائے گا اور حکومت کے خلاف لڑائی کا
بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک جانب تو ایسٹ انڈیا کمپنی
کے لوگوں نے شاہی فوج کے غلہ و رسد سے بھرے ہوئے جہاز بمبئی کے قریب
سمندر میں پکڑ لئے اور دوسری جانب اسی کمپنی کے گورنر و ایجنٹ مسٹر چائلڈ نے
ایک لمبی چوڑی شکایتی درخواست حکومت مغلیہ کے گورنر مقیم سورت کے پاس
بھیجی جسمیں (۳۵) شکایتیں درج تھیں اس پوری درخواست کی نقل کپتان ہملٹن نے

اپنے سفرنامے میں کر دی ہے۔ اگر میں بھی اسکی پوری نقل کرنے بیٹھوں تو کئی صفحے اس کی نذر ہو جائینگے اور ناظرین کا وقت ضائع ہوگا تاہم اسکا اندازہ کرنے کے لئے کہ باوجود تصنع اور بناوٹ کی سخت کوشش کے کس نوعیت کی بیجا شکایتیں کی گئیں اس درخواست کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں یہی وہ سنگین ترین شکایتیں تھیں جو ۱۶۸۸ء اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کر سکی معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی اس سے زیادہ مواد و شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔ ان شکایتوں کی صداقت کا تصفیہ کرتے وقت ناظرین اسکو کبھی نہ بھولیں کہ یہ محض سازشی درخواست تھی اور اس سے اصل مقصود لڑائی کا بہانہ ڈھونڈھنا تھا جس کو روح جر الفاظ میں کشتی میں خاک اڑانا کہنا چاہیئے۔ اس درخواست کے فقرات ۱ و ۲ میں ایک ہندوستانی سوداگر مولا عبدالغفار کی یہ شکایت ہے کہ اس نے کمپنی کے نسبت غلط افواہیں اڑائیں جس سے کمپنی کا نام بدنام ہو گیا اور اعتبار بھی بمقابلہ سابق کے جاتا رہا۔ یہ وہی عبدالغفار تاجر ہے جس کا ذکر میں باب (تجارت) میں کر چکا ہوں اور جس کے متعلق کپتان ہملٹن کی یہ رائے تھی کہ صرف اس ایک متنفس ہندوستانی کا سرمایہ تجارتی کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کے برابر تھا غالباً یہ عبدالغفار تجارت میں کمپنی کا مقابلہ کر رہا تھا!

پھر بھی دفعہ میں دو انگریز ایک مسٹر پٹیٹ (Pitit) اور دوسرے مسٹر باوچر (Boucher) کی شکایت عجیب و غریب الفاظ میں لکھی ہے اس امر کے لکھنے کے بعد کہ وہ کمپنی کے روپیہ کا حساب کتاب نہیں سمجھاتے اور اب شاہی حکومت کی پناہ میں بمقام سورت محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جو مطالبہ کمپنی کی جانب سے

اِن انگریزوں کی بابتہ کیا گیا تھا اُسکا ترجمہ یہ ہے :-

"مسٹر مپٹیٹ تو مرگیا اور جہنم واصل ہوا لیکن مسٹر باؤچر سورت میں بیٹھے ہوئے ہیں

"میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اور اسکی بیوی بچے اور اُس کے تمام متعلقین انگریز معہ

"اُنکے مال و اسباب کے میرے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ سورت سے فرار نہ ہوسکے"

(یہاں تو میں اسی اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں لیکن میں دوسرے باب میں دکھلاؤنگا کہ عہدہ دارانِ کمپنی لوگوں کی بیوی بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا کرتے تھے)

دفعات ۵ و ۶ و ۷ میں یہ شکایت تھی کہ حال میں بعض اشیاء پر خفیف محصول بڑھا دیا گیا ہے وہ واپس دلایا جائے (اول تو ٹیکس ہی کیا ہوتا تھا جب کپتان صاحبان ٹریہ پہنچے ہیں تو کل ٹیکس جو اُن سے وصول کیا گیا (۴) شلنگ تھا جسمیں ملازمین اور کہاروں کی مزدوری بھی شامل تھی (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۳۴۸) میں پوچھتا ہوں کہ آج وہ کون دعویدار تمدن ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی خود مختار سلطنت کو محصول میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے)

دفعہ (۸) قابلِ غور ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہ پابندی فرامین شاہی اس ملک کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جب کبھی کمپنی کا کچھ مال سرقہ جاتا تھا تو اسکی تلافی خزانہ شاہی سے کردی جاتی تھی مگر سورت کے گورنر نے اب یہ طریقہ بند کردیا ہے۔

(اِس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ مجھے بتلایا جائے کہ دُنیا بھر میں آج وہ کونسی حکومت ہے جو مال و اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری اس حد تک قبول کرتی ہے)

دفعہ (۹) میں کچھ ہندوستانی قرضداروں کی نادہندی کی شکایت ہے

دفعہ (۱۰) میں یہ شکایت ہے کہ شاہی دارالضرب میں روپیہ جلد جلد مسکوک نہیں ہوتا۔

دفعات (۱۱ و ۱۲) ذرا زیادہ قابل غور ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کمپنی کی حسابی کتابوں پر ہمیشہ اعتبار کیا جاتا تھا اور آخر سال پر انھیں ہی کہاتے دیکھکر محصول لیا جاتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ جاری ہوا ہے کہ جونہی مال سرزمین ہندوستان پر اُتارا جاتا ہے محصول وصول کر لیا جاتا ہے (میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تھا تو وہ کیا بیجا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور تمام یورپ یہی کر رہا ہے۔)

دفعہ (۱۳) میں یہ شکایت ہے کہ گورنر نے سرکاری قلعہ کی دیوار سیدھی کرنے کے لئے کمپنی کی کچھ اراضی حاصل کر لی ہے جسکا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔

دفعات ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں محکمہ کروڑگیری یعنے محکمۂ وصول محصول کی جزوی شکایتیں ہیں۔

دفعہ ۱۷ میں یہ شکایت ہے کہ قرضداروں سے روپیہ وصول نہیں ہوتا اور انکی نسبت دادرسی نہیں ہوتی اور استدعا تھی کہ گورنر اسکی تلافی خزانۂ شاہی سے کر دے۔

(میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج کوئی تاجر کسی حکومت سے ایسا مطالبہ کرے تو اسکو کیا جواب ملیگا)

دفعۂ (۱۸) میں یہ شکایت ہے کہ اُن کے کارندوں کو گورنر کے روبرو حاضری کا موقع اسوقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نوکروں کو بخشش نہیں دیجاتی۔

دفعہ (۱۹) بدیں مضمون ہے کہ تجارتی گھوڑے جو ایران اور بصرہ سے آتے ہیں انکی گردنوں پر مہر کردیجاتی ہے اور بغیر محصول ادا کئے ہوئے نہ وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں نہ ان پر سواری کی اجازت ہوتی ہے دفعہ ۲۰ میں عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے۔

دفعات ۲۱ و ۲۲ میں محکمہ کروڑگیری کی تعویق و دیگر جزوی شکایتیں ہیں دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ جب کمپنی اپنے اگر زر لازمیں کو ہندوستان کے دور دراز شہروں میں بھیجتی ہے تو وہ شاہی نوکر کی حفاظت میں اسلحہ آجاتے ہیں کہ پھر ان سے مطالبہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے اور اس موقعہ پر بھی وہی مسٹر پیٹیٹ Mr Petet اور مسٹر باؤچر Mr Boucheer کی مثال پیش کیگئی ہے جن کا ذکر دفعہ ۱۴ میں آچکا ہے۔

دفعہ ۲۴ میں ایک قطعہ اراضی کی بابت شکایت اور نیز جدید اراضی کے وصول کی درخواست ہے۔

دفعہ ۲۵ کا مضمون یہ ہے کہ حسب دستور سابق محصول وصول کرتے وقت ان کا مال کھولکر نہ دیکھا جائے اور یہ کہ ان کے اعتبار پر عمل ہو (گو یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ آج بھی یورپ کے ممالک میں اسباب کھولکر دیکھا جاتا ہے)

دفعہ ۲۶ میں بھی عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے
دفعہ ۲۷ میں مکرر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ ۲۸ میں کہ بارہ اسی مسٹر باؤچر Mr Boucheer کا تصفیہ میں کیا گیا ہے جس کا ذکر دفعات ۲۲ و ۲۳ میں کیا جاچکا ہے دفعہ (۲۹) میں کہ بارہ

پھر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۰) میں کسی ناظم کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۱) میں لکھا ہے کہ اُن کا لوہے کا ایک لنگر دریا میں گم ہوگیا تھا وہ مرزا معظم کے لڑکے کو ملا ہے وہ واپس دلایا جائے اور اس کے ڈھونڈھنے میں جو خرچ ہوا ہے وہ لے لیا جائے (ذرا اس جزوی شکایت کی نوعیت پر غور کیا جائے)

دفعہ (۳۲) کی شکایت کا مفہوم یہ ہے کہ جب اُن کا جہاز ساحل ہندوستان پر پہنچا ہے تو کروڑگیری پر اُن کے آدمیوں کی روک ٹوک بہت کیجاتی ہے۔ اس میں تعویق ہوتی ہے دفعہ ۳۳ بھی قابل غور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کمپنی کے لوگوں نے کچھ شاہی جہاز پکڑ کر اُن میں آگ لگادی تھی اسکی بابتہ مسٹر چائلڈ بطور پیش از مرگ واویلا تحریر فرماتے ہیں کہ انکا کچھ بھی لگاؤ اس فعل سے نہیں ہے پھر اس کے متعلق مسٹر چائلڈ درخواست دہندہ سے باز پرس نہ کی جائے۔ (اس شکایت کو جو کوئی پڑھے گا ہم نہیں جانتے کہ بجز خور کی ڈاڑھی میں تنکا اور کیا کہیگا۔ اب کپتان ہملٹن کی تحریر سے معلوم ہوا کہ خود اُن حضرت کو بھی اس قسم کے افعال کرنے کی ہدایت ولایت سے ہوئی تھی اور اس شکایتی درخواست کا دینا اور سرکاری غلہ کے جہازوں کو پکڑنا سب اسی ہدایت کے بموجب تھا۔

دفعہ (۳۴) میں ہندوستانی قانونوں کی تحویل کا مطالبہ ہے۔ اور آخری دفعہ (۳۵) بدیں مضمون ہے کہ شام کو شہر کا دروازہ قبل از وقت بند کر دیا جاتا ہے اور جب وہ شہر کے باہر سے سیر کرکے واپس آتے ہیں تو بغیر بخشش و انعام دئیے اندر داخل ہونا دشوار ہوتا ہے۔

بس اب درخواست کا مضمون ختم ہو گیا قبل اس کے کہ ان شکایتوں کے متعلق کچھ لکھوں ذرا مسٹر چایلڈ صاحب گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیرکٹر پر نظر ڈالئے جنہوں نے یہ شکایتی درخواست مرتب کرکے شاہ مغلیہ کے گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ جب مسٹر چائیلڈ ایک مرتبہ کپتان تھاربرن سے ناراض ہو گئے تو ان کی جائداد ضبط کرنے اور ان کو جیل خانہ بھیجنے کی غرض سے مسٹر چایلڈ نے جعلی دستاویزات بنائیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۵)

مسٹر چایلڈ جب ایک مرتبہ مسٹر بوچر (Mr Boucher) سے ناراض ہو گئے تو مسٹر بوچر کو زہر خورانی کے جو انتظامات مسٹر چایلڈ نے کئے تھے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۷)

مسٹر چایلڈ ایک مرتبہ مسٹر پیٹیٹ سے ناراض ہو گئے اور جب مسٹر پیٹیٹ کو سمندر کے قزاقوں کے ہاتھ پکڑ لئے گئے تو مسٹر چایلڈ نے قزاقوں سے کہلا بھیجا کہ مسٹر پیٹیٹ بڑا مالدار ہے اس سے خوب وصول کرنا۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۸) یہ تو مسٹر چایلڈ کا کیرکٹر تھا۔ یہ واقعات زیادہ تفصیل سے باب نہم میں بیان کئے جائینگے۔

جہاں تک شکایتی درخواست کا تعلق ہے۔ اب ناظرین خود سمجھ لیں گے کہ ان شکایتوں کی کیا نوعیت و اصلیت تھی۔ اگر کسی غیر ملک کا تاجر آج بمبئی کے گورنر کے روبرو ایسی درخواست پیش کرکے ویسا ہی مطالبہ کرے جو اس درخواست میں کیا گیا ہے۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا علی الخصوص جبکہ یہ معلوم

ہوجائے کہ وہ درخواست خواہمخواہ لڑائی کی چھیڑ چھاڑ کی غرض سے پیش ہوئی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اسکا نتیجہ کیا ہوا جب یہ درخواست گورنر سورت کے پاس پہنچی تو شیدی یعقوب کمانڈر افواج شاہی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کو اولاً مہذبانہ طریقہ سے ایک خط لکھا جس میں کمپنی کے طرز عمل پر اعتراض کیا لیکن جب کمپنی کی جانب سے متمردانہ جواب آئے تو مجبوراً اُسنے بالآخر یہ تحریر کر دیا کہ اگر گرفتار شدہ شاہی جہاز ۱۱ فروری تک نہ چھوڑ دئے جائینگے تو ۱۴ فروری کو فلاں وقت شاہی فوج بمبئی میں داخل ہو کر ہر چیز پر قبضہ کر لیگی۔ مجھ کو اس ہندوستانی فوجی افسر کی یہ سپاہیانہ ادا بہت پسند آئی کہ اُسنے دشمن کو پہلے سے اپنی آمد کے وقت تک کی بھی اطلاع دیدی کہ اگر متنبہ ہو کر سنبھل جائے تو بہتر ورنہ مقابلہ کے لئے تیار رہے یہ نہ کہا جائے کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا اگر مسٹر چائلڈ پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی حمایت کا نشہ سوار تہا۔ اُس زمانہ میں یہ لوگ بغیر فوجی مدد کے سمندر میں سفر نہیں کر سکتے تھے ولایت کے راستے بحری قزاقوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھے علاوہ ازیں وہ یہ عہد نہ تہا کہ کسی قوم کے ہتھیار لیکر اسکو نامرد بنایا جائے ہر شخص مسلح رہا کرتا تھا۔ لہذا کمپنی کے پاس بھی فوج تھی توپیں تھیں خزانہ تہا اور غالباً اسی غرہ پر انکو جنگ چھیڑنے کی جرات ہوئی تہی۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جو کچھ شیدی یعقوب شاہی فوج کے کمانڈر نے پیشتر لکھا تہا بالکل اسی کے مطابق اُسنے عمل کیا اور جو وقت اُسنے مقرر کیا تہا ٹھیک اُسی وقت معہ فوج کے پہنچا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۷) آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور جب

معرکہ میں شیدی کی فوج تلواریں ہاتھ میں لیکر یلغار کرتی ہوئی انگریزی فوج پر جا پڑی۔

"تو کمپنی کا کپتان میدان سے بھاگ نکلا اور بھاگنے والوں میں یہی سب سے آگے تھا۔ پرتگیزوں کے گرجے میں پہونچکر جب ذرا اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے پیچھے مڑکر اپنے آدمیوں کو دیکھا کہ اُنکا کیا حشر ہوا۔"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۲۰)

کپتان صاحب پر یہ سب سرگزشت بیتی تھی وہ خود اسی بھنور میں گرفتار تھے اور سب معاملہ کو بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ ازبسکہ انکی حیثیت کمپنی کے ملازم کی نہ تھی وہ ایک آزاد خود مختار تاجر تھے مگر مثل دوسرے انگریزوں کے وہ بھی کمپنی کی حفاظت میں رہتے تھے وہ کمپنی کی اس رذیل حرکت پر بہت مشتعل ہوئے اور اپنے سفرنامہ میں انہوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگر راوی کا بیان راوی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مگر وہ انگریزی میں ہے اس لئے ابتداء سے جو واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں اُن کا ترجمہ کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"کمپنی کے پاس یوں تو بہت سے بڑے بڑے جہاز تھے جن کو ملک سے باہر بھیجنے کے لئے وہ مجبور تھی لیکن اُن کو کام میں لانے کے لئے چونکہ کمپنی کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنے جنرل کو اور نیز اپنے ان کارخانوں کے عہدہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے حکم دیدیا تھا کہ وہ اپنے جہازات و بلن نے بھیجنے کے لئے ہندوستانی تاجروں سے جسقدر رقم قرض حاصل کرسکتے ہوں کمپنی

"کی ذمہ داری پر دیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو جہاز وہ اپنے
وطن کو نہ لے جاسکے انکو کرایہ پر ہندوستان میں چلایا میں نے کمپنی کے گورنر کا
ایک خط انگلستان میں دیکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ جب وہ مغل شہنشاہ کی رعایا سے
جسقدر روپیہ حاصل کر سکتے ہوں لے لیں تو فرضخواہوں سے جھگڑا کر کے یک لخت انکے
ساتھ لین دین موقوف کر دیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کیونکہ ۱۶۸۱ء و ۱۶۸۲ء
میں سورت کے ہندوستانی تاجروں نے سمندر کے راستے سے مغرب میں بہت بڑی
تجارت مکا۔ ایران اور بصرہ سے قائم کر لی تھی اور مشرق میں بنگال و چین اور
سیام سے بیوپار کرتے تھے وہ جنرل سب لوگوں کو انکی استدعا پر پروانہ راہداری
دیدیا کرتا تھا پھر اس کے بعد ۱۶۸۶ء کے آخر میں ایک شکایت صوبہ دار سورت
کے روبرو پیش کی اور انصاف و اطمینان کا طالب ہوا۔ اس شکایت کی ایک
مطبوعہ کاپی میں نے خود دیکھی ہے۔ وہ حسب ذیل (۴۵) فقرات پر مشتمل تھی"

(جلد اول صفحہ ۱۹۹)

سفرنامے میں اس جگہ پوری درخواست نقل کر دیگئی ہے جسکا خلاصہ بیان
کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کیرکٹر کا ایک رخ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسکی تعریف و مدح
کرنا ہر منصف مزاج کا فرض ہے۔ جب کبھی وہ ڈپلومیسی و سیاسی اغراض سے
بلند پروازی کر جاتا ہے تب انکی آزادانہ رائے میں ایک ایسی دلکش و دلفریب
خوبی پیدا ہو جاتی ہے جس سے دوسری قوم والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتے۔ چنانچہ اس موقع پر کپتان ہملٹن نے بھی اسی انگریزی کیرکٹر کا ثبوت
دیا ہے۔ آخر تمام بنی نوع انسان ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں اور نیکی و

بدی کی حرکات سے ہر انسان کا دل یکساں متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان شکایتوں کی نسبت کپتان ہیلٹن نے جو رائے قائم کی تھی وہ انسان کی اصلی خلقی صداقت پسندی کا نمونہ ہے۔ درخواست کی نقل کرنے کے بعد کپتان صاحب لکھتے ہیں

"یہی وہ شکایتیں ہیں جن کی بنیاد پر جنرل چانلڈ نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ایک جنگ کی عمارت قائم کی اور اپنی شکایات بادشاہ تک پہنچانے اور منشائے شاہی معلوم کرنے کے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ جہاں کہیں بادشاہی رعایا کے جہاز ملے انکو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ جہاز خود اہنیں کے عطا کردہ پروانہ جات اپنے پاس رکھتے تھے شکایت مذکورہ کا فقرہ (۴) ایسا ہے کہ گو وہ ایک عیسائی قلم سے نکلا ہے لیکن ہر مسلمان اور بت پرست بھی اُسکو نفرت کی نظر سے دیکھیگا فقرات نمبر ۱۷ و ۲۳ و ۲۸ خلاف انصاف ہیں اور فقرات نمبر (۳۰ و ۳۱) اُس شکایت اور جنگ کے لئے بہت ہی کمزور وجوہ ہیں جنکی وجہ سے مسٹر چانلڈ کے آقا او مالکوں کے زائد از چار لاکھ پونڈ اختتام جنگ سے قبل ہی خرچ ہوگئے علاوہ ازیں بادشاہ اور اسکی رعایا کے نزدیک ان لوگوں کا اعتبار اسقدر جاتا رہا جو آجتک پوری طرح جیسا کہ چاہئے قائم نہیں ہوا ہے۔ وہ کون قاعدہ اور پالیسی تھی جسکے بموجب یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ باوجود اسکے کہ بادشاہ مغلیہ کے ایک حصہ حکومت میں تو مسٹر چانلڈ یا سر جوزیا (Sir Josiah Child) بادشاہی رعایا کو قتل و غارت کریں اور بادشاہ موصوف اپنے دوسرے حصہ حکومت میں کمپنی کو امن و امان کیساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیں۔ نہیں معلوم یہ لوگ کسطرح اسکی امید کر سکتے تھے کہ ایسے موقعہ پر بادشاہ غیر جانبداری کی صورت اختیار کریگا

اِس سوال کا جواب تو وہ مدبرین دیں گے جن کو پالیٹکس میں دخل ہے۔ میں تو
صرف اصلی واقعات بیان کرتا چلا جا رہا ہوں"

(جلد اول صفحہ ۲۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ سرجوزیا (Johnson) وہی حضرت ہیں جو
بنگال میں ایسے افعال کے مرتکب ہوچکے تھے کہ جسکی وجہ سے مسٹر جاپلیڈ گو بھی
اپنی درخواست کی دفعہ ۲۲ میں پیش بندی کرنی پڑی۔ بہرحال جب خود
ایک بے غرض اور بے لوث انگریز نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کردی تو اسپر اور
کچھہ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس سے چند نتائج ضرور اخذ کئے جاسکتے
ہیں اول یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھہ سلطنت مغلیہ کی طرف سے پہلے بہت
رعایت کیجاتی تھی مگر کمپنی مذکور بجائے اسکے کہ وہ سلطنت موصوفہ کی شکر گذار ہوتی
اور خوش کرداری سے اپنے متعلق مزید مراعات شاہی کا مستحق بناتی اُس نے
کچھہ ایسے اعمال کئے کہ اسکے اعتبار میں فرق آگیا۔ دوسرے یہ کہ عہد اورنگ زیب
میں محصول کے متعلق زیادہ جانچ پڑتال شروع ہوئی جو کمپنی کو بُرا معلوم
ہوا عجب نہیں کہ اسکی ضرورت بھی خود کمپنی ہی کے اعمال کی وجہ سے سلطنت
کو ہوئی ہو۔ تیسرے یہ کہ اُس زمانہ کی گورنمنٹ کو غیر ممالک کے تجار کی
جان و مال کی حفاظت کا اسقدر خیال تھا کہ اگر انکا کوئی مال سرقہ جاتا
تو خزانۂ شاہی سے اسکی تلافی کیجاتی تھی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے غالباً
جانچ پڑتال میں جدوجہد کی کامل ضرورت ہوتی تھی اور یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض
وصول محصول کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کرنے میں جو جانچ پڑتال

کی سختی کی جاتی تھی اس کی نسبت ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں
وہ یہ کہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ہوا نکی نگاہ سے وہ سماں گزرا ہوگا
جب کہ ایک فرانسیسی کسی انگریز یا جرمن مسافر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈالکر
بعض وقت صرف اس خیال سے کہ محصولی مال چھپا رکھا ہوا ہے طرح ٹٹولتا ہے
کہ گویا وہ مسافر چور ہے۔ غالباً احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے کیونکہ مجھ سے
خود ایک یوروپین نے کہا کہ ایک مرتبہ انکی لیڈی صاحبہ بہت سے سگریٹ
اپنے انڈر رویر یعنے اندر پہننے کے کپڑوں میں چھپا کر فرانس لے گئی تھیں
گزشتہ سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ پیرس میں ایک جنٹلمین صاحب
اپنا اسباب گورنس کے سپرد کرکے چلدئے اور جب محصول لینے والا آیا اور
دریافت کیا تو گورنس صاحبہ محصولی مال کے ہونے سے صاف انکار کرگئیں
مگر جب ایک بکس بطور نمونے کے کھولا گیا تو اس میں سے محصولی مال برآمد ہوا
پھر تو ہر بکس کھولا گیا جس سے سارا اسٹیشن ایک اچھا خاصہ مینا بازار بن گیا
خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا جو موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات سے متعلق
تھا۔ یہاں دراصل عہد اورنگ زیب کا ذکر ہے لیکن موجودہ واقعات کے تعلق سے
ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عہد موصوفہ میں محصولی اسباب کی جانچ پڑتال میں
کد و کاوش یا شرح محصول کی رد و بدل میں حکومت نے کیا جرم کیا تھا وہ
لوگ جن کو بادشاہ نے اپنے ملک میں تجارت کی اجازت دی تھی۔ زمینیں
عطا کی تھیں۔ جو بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں باطمینان صرف بسر ہی نہیں
کرتے تھے بلکہ تجارت کی بدولت وہ ہندوستان کی دولت سے بھی مستفید ہورہے تھے

انہیں لوگوں نے ایسی ناشکری اور کمینہ پن کی حرکت کی جس سے خود اُن ہی کی قوم کا ایک فرد متنفر تھا اسوقت اورنگ زیب کی قوت مسلمہ تھی اُس کو انگریزی تجار کا خوف نہ تھا اسکے قلم کی ایک گردش ان کی تجارت کا خاتمہ کر سکتی تھی عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت ایک شیرخوار بچہ کی تھی چنانچہ وہی لوگ جنہوں نے یہ شکایتی درخواست اس زور و شور سے بھیجی تھی اور جنگ کی تھی اُن کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے خمیازہ میں اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونے اور معافی حاصل کرنے کی تدبیر کرنی پڑی۔ ایک وفد تیار کیا گیا جس میں کپتان ہملٹن بھی شریک تھے اور حسن ذلت آمیز طریقہ سے یہ وفد شاہجہان آباد میں اورنگ زیب کے حضور میں پیش کیا گیا اس سے کپتان صاحب کو کسقدر تکلیف ہوئی کیونکہ وہ اُنکی قومی خود داری کے بہت ہی خلاف تھا۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں :-

> "دربار میں انکی رسائی تو ہوگئی لیکن اورنگ زیب کے حضور میں وہ اس ذلت کے ساتھ پیش کیے گئے جو کسی ملک کے سفیروں کے لیے زیبا نہ تھی۔ سامنے کے لگے دونوں ہاتھ ایک پٹکے سے باندھ دئے گئے تھے اور اس حالت سے "بادشاہ کے روبرو خمیدہ پشت زمیں بوس ہیئت میں پیش کیے گئے"
>
> (جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی کیفیت تھی اور اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر اورنگ زیب نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ اورنگ زیب کا اصلی کیرکٹر جانچنے کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ یہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں جن پر

ایک بادشاہ کا اصلی کیرکٹر معلوم ہوتا ہے جب مرور زمانہ سے انسانی جذبات کا بادل چھٹ جاتا ہے اور مورخ کے سامنے صرف سچائی اور اصلیت کا صاف مطلع باقی رہ جاتا ہے تب ایسے ہی وقت کے افعال پیش نظر ہوتے ہیں۔ آج سوا دو سو برس کے بعد ہم اس امر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟

میری رائے میں اورنگ زیب نے جو طرز عمل ایسے موقع پر اختیار کیا اُسی سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا اس بادشاہ کا یہ مقصود تھا کہ اہل یورپ ہندوستان میں تجارت نہ کرنے پائیں؟

درخت کی ایک پتی کی حرکت سے نہیں بلکہ بعض وقت ایک تنکے کی حرکت سے سینکڑوں میل کی ہوا کا رخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض وقت انسان کے ایک فعل سے ہی اُسکے تمام کیرکٹر کا پتہ چل جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر مغلوب غالب کے پاس جاتا ہے۔ عاجز قادر کے روبرو حاضر ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ غالب و قادر کیا کرتا ہے۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جب یہ وفد اورنگ زیب کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ پہلے تو بہت غیظ و غضب میں معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غصہ اُتر گیا تب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تمہاری کیا درخواست ہے وفد نے پہلے قصور کی معافی مانگی اور بعدہٗ دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت چاہی اوسوقت اورنگ زیب نے اپنے اصلی کیرکٹر کا اظہار کیا اور الطاف شاہی سے یہ دونوں درخواستیں منظور کرلیں۔ وفد کو حکم ہوا کہ وہ بمبئی واپس جائے بعدہٗ فرمان مبارک

بھیجا جائیگا چنانچہ کچھ روز بعد فرمان شاہی اُن تمام لوازمات کے ساتھ شرف صدور پایا جو ایسے موقعوں پر بطور اعزاز و اکرام مبذول فرمائے جاتے ہیں۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سورت میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں وہ فرمان شاہی پڑھا گیا جس کا ترجمہ کپتان نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور جس کا اب اردو ترجمہ میں پیش کرتا ہوں۔ لوازمات فرمان شاہی یہ تھے کہ فرمان کے ساتھ ساتھ ایک عدد گھوڑا و بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت بھی جس پر کارچوبی سنہری، روپہلی گل بوٹے کاڑھے گئے تھے عطا ہوا۔ یہی فرمان وہ چارٹر (Charter) و منشور خسروی تھا۔ جو اورنگ زیب کے پیشگاہ سے کمپنی کو عطا ہوا تھا اور جس کی سند پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر ہندوستان میں تجارت شروع کی تھی۔

ترجمہ فرمان شاہی

اورنگ زیب بنام ایسٹ انڈیا کمپنی

"تمہاری عرض داشت بدین مضمون بادولت و اقبال کے ملاحظہ میں آئی کہ جس قدر فتنہ و فساد پیدا ہوا اسکے قصور وار تم ہو۔ تم نے صوبہ داران شاہی کے خلاف متعدد شکایتیں کی تھیں جن کا ذکر بادولت نے اپنے امرائے دربار سے سُنا۔ تم کو شکایت تھی کہ صوبہ داروں یا ماتحت عہدہ داروں نے تمہارے ساتھ

بدسلوکی کی تم کو لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے قبل ان سب باتوں کی اطلاع تم
مجھ کو دیتے۔ لیکن اب چونکہ تم اپنی خطا کے معترف اور خواستگار معافی ہو لہذا
واقعات گزشتہ کو معاف کرکے صرف تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی
بلکہ تمہارے حسب استدعا تم کو ایک فرمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اسد خان
کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بعد از تمام تفصیلات جنکی اطلاع وہ تم کو دیدیگا فرمان کو
صوبہ دار سورت کے پاس روانہ کردے جس وقت یہ فرمان نافذ ہو تم اس کی
تعظیم و احترام کیساتھ وصول کرو اور اسکی عزت و شرف کا اقبال و اعتراف کرو
جو فرمان مذکور صادر کرکے تم کو بخشا گیا ہے جیسے تم پیشتر تجارت کیا کرتے تھے
اب بھی اسی طرح حسب معمول تجارت کرنیکی تم کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن تاجروں
کی تم شکایت کر رہے ہو تم پر واجب ہے کہ ان کے جہازات مع سامان ان کے
حوالہ کردو اور آئندہ سے اس قسم کی غلطی کبھی نہ کرنا جس کے تم اس مرتبہ مرتکب ہوئے
ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی و رضاجوئی کے امیدوار رہو۔ اور اسکو کبھی نظر انداز
نہ کرو۔ اگر تم کو میرے صوبہ داروں عہدہ داروں یا میری رعایا کی کسی قسم کی
اذیت پہنچے تو اسکی اطلاع دینے میں کبھی فروگزاشت نہ کرو۔ مابدولت نے
اسدخاں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اسی کے مطابق تحریر کرے۔ مسمی باؤجی کی
پناہ دہی کے متعلق تم نے شکایت کی ہے کہ سابقہ صوبہ داروں نے اسکو اپنی
پناہ میں لے لیا ہے اور نامبردہ پر تمہاری کئی رقوم واجب الادا ہیں اور اس لئے
تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سپرد کر دیا جائے۔ اس بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنا دعویٰ
(عدالت میں) بروئے قانون ثابت کرو اسوقت جو مقتضائے انصاف ہوگا عمل میں آئیگا

"سنہ ۱۲ جلوس اورنگ زیب"

(جلد اول صفحہ ۲۲۰)

یہ فرمان اورنگ زیب کے کیرکٹر کی کنجی ہے۔ اس فرمان سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ کا مقابلہ اورنگ زیب کے الطاف و کرم سے کیجئے۔ وہ مورخ جسکو اصلی واقعات نہیں معلوم جو چاہے کہے یا لکھے مگر ۱۶۸۸ء میں اس انگریز کے دل پر جو اس وفد میں شریک تھا۔ اورنگ زیب کے رحم و کرم شاہانہ کا جو اثر ہوا وہ یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انکی بدسلوکی سے جو اسکی رعایا کے ساتھ کی گئی تھی"

"لاعلم نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ جرائم اور خطاؤں کے پاداش میں کچھ سخت سزا بھی نہیں"

"دینا چاہتا تھا اس لئے اسنے ایک رحمدل بادشاہ کی طرح ان لوگوں کو ان کے قصور"

"سے آگاہ کر دیا اور ان کو دانشمندانہ نصیحت کی کہ آئندہ ایسی غلطی کے پھر مرتکب"

"نہوں۔ شاہانہ طریق سے انکو سمجھا دیا کہ وہ عنایات و عطوفات شاہی کو نظر"

"شکر و سپاس دیکھیں اور پابندی قانون کو اپنا مسلک قرار دیں۔ غرض کہ اس بادشاہ"

"نے تمام اقوال و افعال میں پوری طرح سے تحمل سے کام لیا"

(جلد اول صفحہ ۲۲۹)

آج کلکتہ میں جس مقام پر فورٹ ولیم قلعہ بنا ہے وہ زمین کس نے اور کس کو دی تھی؟

"کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اورنگ زیب

کی رعایا پر قتل و غارتگری کیا کرتے تھے۔ اور ڈاکے مارا کرتے تھے لیکن ایک موقعہ پر اورنگ زیب نے ان خونریزیوں کو معاف کر کے کمپنی کے ایجنٹ وفائنڈ مسٹر جوزف بیجاک کو یہ حکم دیا کہ وہ بنگال میں کوئی زمین اپنے قیام گاہ و مال و اسباب کی منڈی قائم کرنے کے لئے خود منتخب کر لیں تب اس ایجنٹ نے ۱۶۹۰ء میں وہ زمین دریائے ہگلی کے کنارے انتخاب کی جس پر آج قلعہ فورٹ ولیم نظر آرہا ہے۔

(جلد دوم صفحہ)

اِن واقعات کے بعد یہ کہنا کہ اورنگ زیب تجارت کا حامی و مددگار نہ تھا سخت بے انصافی ہوگی۔ یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کا ذکر تھا مگر ہندوستان صرف انگریزوں کا بازی گاہ نہ تھا بلکہ دوسری یوروپین قومیں بھی یہاں شکار کھیل رہی تھیں اور اُن میں قابل ذکر ڈچ ہیں جنکا ذکر باب نہم میں کیا جائیگا۔ یہ جو چند واقعات یہاں لکھے گئے ہیں یکے از ہزار و مشتے از خروارے ہیں تاہم انہیں واقعات سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ جو واقعات اس مضمون میں درج ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں اور ڈچوں نے اورنگ زیب کی حکومت میں کسطرح کی دشواریاں پیدا کرنی چاہیں مگر اورنگ زیب نے اپنے الطاف شاہانہ سے انکی خطاؤں سے چشم پوشی کی اور تجارت میں ہمیشہ ان کو مدد دی جسکی وجہ سے اُن کو اور اُن کے ملک کو وہ تمول نصیب ہوا جس کا ذکر تجارت

تجارت کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ آج ان سب باتوں کو بھول جانا سخت ناشکری ہے۔

باب ہشتم

یوروپین تجار کی پالیسی و اخلاق

اس باب میں ایک کامیاب ڈپلومیسی اور بدترین اخلاق انسانی کے عجیب و غریب اجتماع کا ذکر کیا جائیگا اور یہ دکھلایا جائیگا کہ باوجودیکہ اس ڈپلومیسی کے حاملوں کی اخلاقی حالت کیسی کچھ متبذل اور دیانت سے دور تھی مگر اس نے کیونکر ایک ہندوستانی سلطنت کو مٹا کر اپنا منشاء پورا کر دکھایا یہ قدرت کا کرشمہ ہے جس سے ایسے عظیم الشان تغیرات ظہور پذیر ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے ایک سلطنت کا صفحۂ ہستی سے مٹنا اور دوسری کا قائم ہو جانا چونکہ اس ڈپلومیسی کی ابتداء عہد اورنگ زیب میں ہوئی لہذا اس کتاب میں اسکا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شاید یہ ہی غلطی اورنگ زیب کی دور اندیشی کے خلاف تھی کہ بادشاہ موصوف نے اپنی تمام قوت کل ہندوستان کو ایک متحد بڑی ایمپائر Empire یعنے عظیم الشان سلطنت کی صورت میں مبدل کر دینے میں صرف کر دی اور ان کیڑوں کو نہ دیکھا جو کہ نظر سے دور رہ کر تہ میں اس بڑی سلطنت کی عمارت کی بنیاد کو کھود کھود کر کمزور کر رہے تھے

جس کو یہ بادشاہ اس شان و شوکت کے ساتھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب نے اس دار فانی سے رحلت کی بظاہر عظیم الشان عمارت تو بن کر تیار ہو گئی لیکن چونکہ بنیاد تو کمزور ہو گئی تھی ایک تند ہوا کے جھونکے نے اسکو گرا دیا جس تدبیر سے یہ بنیاد کمزور کی گئی وہ ایسی مؤثر ڈپلومیسی ہے جس کا نشانہ اس ملک میں کبھی خالی نہیں گیا ہندوستان کے اس حصہ تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ کسی قوم و ملت کو نہ بھولنا چاہیئے بلکہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جو انسان اپنے گزشتہ تجربہ سے آئندہ کے لئے سبق نہیں حاصل کرتا وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار و ناکامیاب رہتا ہے اسی طرح سے جو قوم اپنی قومی سوانح عمری اور تاریخ سے سبق نہیں لیتی وہ ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جس ڈپلومیسی کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے وہ یہ تھی کہ دو قوتوں کو لڑا کر ایک قوت کا ہمدرد بننا اور اس سے سلطنت و حکومت میں کچھ حقوق حاصل کرنا پھر جب حاصل شدہ حقوق مستحکم ہو گئے تو اسی ڈپلومیسی سے آگے قدم بڑھانا اور نئے حقوق حاصل کرنا اسی طرح سے رفتہ رفتہ دونوں قوتوں کو مٹا کر خود بلا شرکت غیرے ملک کا بادشاہ بن جانا۔

انسانوں کے کسی طبقہ کے عیوب بیان کرنا کوئی خوش کن کام نہیں ہے لیکن فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بعض وقت ایسے واقعات کا بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادی النظر میں سب سے پہلے اس ڈپلومیسی کی ابتدا، ہندوستان میں جو نیچے

کی تھی۔ ہندوستان میں ڈچوں کی پالیسی کی بابت کپتان صاحب نے
سنہ ۱۷۰۰ء میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:۔

"اس ایماندار کمپنی نے ہمیشہ سے یہ قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اول تو وہ ہندوستانی
"رئیسوں اور حکمرانوں میں لڑائی کرا دیتی اور پھر بڑے اظہار دیانت داری کیساتھ
"ان کے جھگڑے قضئے چکانے کے لئے خود ثالث اور پنچ بن جاتی اور ہمیشہ میزان عدالت
"کا پلہ اس کے حق میں بھاری کر دیتی جس کے ملک کی پیداوار یا جس کے مال
"کمپنی کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہوتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی رئیس کو اسلحہ جنگ
"سے مدد دیتی تھی جسکو مدد دینا کمپنی کے مفید ہوتا اور جنگ ختم ہونے پر وہ
"غریب مفتوح کی گردن پر ان تمام مصارف کا بوجھ ڈالتے تھے جو فاتح کی مدد
"دینے میں عائد ہوتے تھے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کا
"وقت آتا تو کمپنی جو کہ دوستی کا دعوے کرتی تھی اپنے دوست کا بہترین بندرگاہ
"معاوضہ میں لے لیتی۔ اس پر قلعہ بندی کرتی اور پھر سوائے ڈچوں کے دوسروں
"کو اس بندرگاہ پر تجارت کی اجازت نہ دیتی اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوتا تو
"کمپنی کی فوج بہ شرکت کسی دوسرے دشمن کے اس کے مقابلہ پر تیار کی جاتی"

(جلد اول صفحہ ۲۲۵)

کپتان ہملٹن کی رائے میں یہ طرز عمل ڈچوں کا اس ملک میں تھا لیکن
میری رائے میں صرف ڈچوں کو اس غیر مستحسن پالیسی کا الزام نہیں دیا جا سکتا
ممکن ہے کہ اسکی بنیاد ڈچوں ہی نے ڈالی ہو مگر رفتہ رفتہ تمام یوروپین قومیں
اسی پالیسی پر عمل کرنے لگیں۔ من حیث الانسان

ان پر کوئی بڑا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسروں پر سیادت و فوقیت حاصل کرنے کا خیال جیسا کہ دو سو برس پہلے تھا ویسا ہی اب بھی موجود ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اُن کے حصول کے طریقہ بدل گئے ہوں مگر خیالات، جذبات حرص و ہوا اور انسانی فطرت کا تقاضا آج بھی وہی ہے اسکو مذہب و قومیت سے بھی تعلق نہیں ہے مسلمان و عیسائی۔ انگریز و فرانسیسی سب اس انسانی کمزوری کے شکار بن چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسٹیٹسمین یعنے مدبرین و اہل سیاست کا اخلاقی دستور العمل ہر زمانہ میں ممبر پر بیٹھکر وعظ کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہوا کرتا ہے۔

سنہ ۱۶۸۰ء کے قریب جو خط ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں کے پاس بدیں مضمون آیا تھا کہ ہندوستانیوں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیکر جہاز ولایت کو بھیج دو اور پھر حکومت اورنگ زیب سے کسی نہ کسی طرح سے جنگ کے وجوہ پیدا کرکے روپیہ ہضم کر لو اُس کا تذکرہ "باب ہشتم" میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ طرز عمل بھی اسی پالیسی پر مبنی تھا جس کا اتہام کپتان صاحب نے ڈچوں پر اس وقت لگایا تھا۔

ایک مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۷۱۲ء میں:—

"زومرن کے راجہ نے ڈچ کمپنی سے جنگ کی جب ایک انگریزی فیکٹری کے افسر اعلیٰ نے جو راجہ زومرن کا مشیر خاص تھا۔ آتش جنگ بھڑکانے میں بہت کچھ حصہ لیا اُس وقت تو ڈچوں کا قلعہ "فتح کر لیا گیا۔ لیکن پھر انگریز مشیر نے اپنا ہی جھنڈا"

اُس قلعہ پر نصب کرا دیا اور بالآخر نتیجہ میں اس بازی میں فرانسیسیوں کی ہار ہوئی"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح سے سیام میں جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی پر قرضہ بہت ہو گیا ہے تو انہوں نے دفعتہً کارخانہ کو محض اس لئے آگ لگا دی کہ شاہ سیام کی رعایا پر اس حرکت کا الزام لگا کر شاہ سے تاوان وصول کریں اور انکار کرنے پر جنگ چھیڑ دیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۰۰)

اس قسم کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں اور ڈچوں کی پالیسی میں کچھ فرق نہ تھا اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کے بعد ڈوپلے فرانسیسی گورنر اور کلائیو انگریزی گورنر کی سرگرمیاں اور ریشہ دوانیاں کی فتح اور شکست ہندوستان میں بس اسی غرض وغایت سے تھی کہ اس دوڑ میں کون سبقت لیجاتا ہے اور بالآخر اس پالیسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی گوئے سبقت لے گئی اور نتیجتاً انگریز اس ملک کے حکمراں ہو گئے۔ اس موقع پر مجھے خیال آتا ہے کہ تمدن ہند کے فرنچ مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ملک گیری انگلستان سے سیکھنا چاہیے اس نے ہندوستان کی مثال پیش کر کے لکھا ہے کہ انگریزوں نے یہ ملک ہندوستانیوں ہی کے خون اور روپیہ کی مدد سے فتح کر لیا اس ملک کے فتح کرنے میں جتنی بڑی بڑی لڑائیاں انگریز لڑے اُن میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہیوں کا خون بہا تھا اور

اخراجات جنگ اسی ملک کے روپیہ سے ادا کیے گئے تھے نہ انگریزوں کا ایسا خون بہا جو بیان کے قابل ہو اور نہ انکے ملک کا روپیہ صرف ہوا اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک گیر کو ملک گیری کا مقصد اس طرح سے حاصل ہو سکتا تھا تو سیاسی حیثیت سے کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا اس کی بڑی حماقت ہوتی ۔ہندوستانیوں نے اگر اس کا مقابلہ عقل سے نہ کیا تو یہ ان ہی کا قصور تھا اور اب بھی اگر ہندوستانی اس سبق سے کر عقل سے کام لیں تو انکو کوئی منع نہیں کرتا۔

یہاں تک تو کامیاب پلوسیی کی نوعیت بیان کی گئی اب ان حضرات کی اخلاقی حالت کو ملاحظہ فرمائے جو اس پلوسیی کی مدد سے ہندوستانی سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس ملک ہندوستانی سلطنت اس وجہ سے نہیں گئی کہ اس کے دشمنوں میں کوئی خاص انصاف کا مادہ یا انسانی اخلاقی خوبیاں تھیں جنکے اثرات نے اس سلطنت کو معرض زوال میں ڈالدیا تھا ۔کپتان ہملٹن کا تمام سفرنامہ میرے اس خیال کا شاہد ہے ۔اس زمانہ میں جو پرتگیز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے تھے ان کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص ان پر بھروسہ کرتا تھا اس کو دہوکہ دینے میں وہ کبھی نہیں چوکتے تھے

(جلد دوم صفحہ ۷۷)

شاہ بنگو نے ایک پرتگیز کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کیا تھا وہ اسقدر بیہودہ اور گستاخ ہو گیا تھا کہ ایک دن جب وہ ہاتھی پر سوار کسی دولہن کے مکان میں

اُس کے والدین کو مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ دولہن کو دیکھکر ایسا مفتون اور از خود رفتہ ہو گیا کہ وہ اُس ایک دن کی بیاہی عروس کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ (جلد دوم صفحہ ۳۰)

سمندر کے راستوں پر لوٹ مار کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (جلد اول صفحہ ۱۶۴)

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو اصل سنٹر یعنے مرکز تھے صوبہ بنگال میں کلکتہ اور صوبہ سورت میں سورت میں بمبئی۔ بنگال میں مسٹر جوزف چناک ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ تھا اس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنی تجارت کی منڈی کے لئے کوئی جگہ خود منتخب کرلے چنانچہ سنہ ۱۶۹۰ء میں اس نے اُس مقام کو منتخب کیا جہاں کہ اب فورٹ ولیم کا قلعہ واقع ہے کپتان ہملٹن نے اس مسٹر چناک کے بڑے کرتوت اپنے سفرنامہ میں تحریر کئے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ :۔

"مسٹر چناک نے اپنی بستی بسانے کے لئے یہ موجودہ زمین لے لی تھی اور یہاں وہ ایک والئی ملک سے بھی بڑھکر خود مختاری سے بادشاہت کرتا تھا البتہ فرق اتنا تھا کہ سلاطین میں ہمدردی و انسانیت ہوتی ہے اور وہ اُسمیں مفقود تھی۔ جب کبھی کوئی غریب ناواقف ہندوستانی اسکے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو لزوما اسکو سخت سزائے بید دیجاتی اور اسکے اس حکم کی تعمیل عموماً اُس وقت کی جاتی تھی جب وہ کھانے پر ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے پاس اس مجرم کی گریہ وزاری میں اسکو خوشگوار سرود کا مزا آتا تھا۔ اس جگہ کے آس پاس تب بہت

"آباد ہیں اور اُن میں مُردہ شوہر کے ساتھ بیوہ کا ستی ہو جانا مروج ہے مغلوں"
"کی جنگ سے پہلے ایک مرتبہ مسٹر چناک نے اپنے معمولی باڈی گارڈ کے ساتھ ایک جوان"
"بیوہ کو ستی ہونے کی دردناک رسم ادا کرتے ہوئے دیکھا جس کے حُسن و جمال پر وہ"
"ایسا فریفتہ ہو گیا کہ اُسنے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان جلادوں سے اس عورت"
"کو زبردستی چھین لاؤ جن کی قمیں میں وہ حسینہ و جمیلہ زبردستی ایک بنگلہ میں پہنچائی"
"گئی جہاں وہ دونوں بہت برسوں تک محبت کیا تہ رہے اور اس عورت سے"
"کئی بچے بھی ہوئے۔ آخر کار مسٹر چناک کے کلکتہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد وہ"
"مر گئی۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت عیسائی"
"ہو جاتی اُس عورت نے خود مسٹر چناک کو شدھی کر لیا جس کے بعد مسٹر چناک میں"
"صرف اس قدر بات تو مسیحی عقیدہ کے موافق دیکھنے میں آئی کہ اُس نے اپنی"
"بیوی کو اچھی طرح دفن کر کے اسکی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرا دیا اور جب تک زندہ رہا"
"بُت پرستوں کے دستور کے مطابق سال بسال ایک مرغ اس عورت کی قبر پر ذبح"
"کر کے اسکی برسی کرتا تھا۔ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے اور مجھے معتبر ذرائع سے"
"اطلاع ملی ہے۔ ہندو اور عیسائی جو بمقام کلکتہ چناک کے قلعہ میں آباد تھے"
"اُن سب کا بیان تھا کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔"

(جلد دوم صفحہ ۸ و ۹)

بنگال میں ہوگلی کے قریب جو کالونی یا نو آبادی انگریزوں کی تھی اُن لوگوں کی بابتہ کپتان صاحب بیان کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ کہ اس نو آبادی کے جلسۂ انتظامی کے ممبر بہت سے معاملات میں آپس میں اختلاف"

کیا کرتے تھے مگر اُن غیر شخصوں کے ستانے میں جو ان کے قابو میں آ جاتے ہیں بے تعلق
اور بکیدل ہو جاتے ہیں اُن کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہیں
حسب مرضی منافع کے ساتھ مال کی خرید و فروخت کریں بلکہ وہ مجبور ہیں کہ گورنر یا جنا
کونسل اپنی مرضی اور صوابدید سے جو قیمت مقرر کر دیں اسی پر بیع و شری کریں اگر بیوپار کے طور پر یہ ہو تا بھی
اگرچہ پیشتر سے خرید و فروخت کی اجازت گورنر سے حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ ایک نا قابل معافی جرم قرار
دیا گیا ہے کہ وہ موگلی جا کر مال کا نرخ بھی دریافت کریں" (جلد دوم صفحہ ۱۲ و ۱۳)

اگر کبھی کوئی مال فروخت کرتا یا روپیہ قرض دیتا اور پھر جاپہنچتا کہ تقاضہ کرے تو بغیر دھکا پھٹکار کے اسکی جان بری نہیں ہوتی۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اور یہ تو ایک بالکل معمولی بات تھی کہ فرنگی سیاح ہندوستانیوں کے رقص و سرود کے جلسہ میں جب مدعو کیے جاتے تھے تو وہ وہاں جا کر تہذیب اور شرم و حیا کو خیرباد کہکر طوائف سے ہوسناکی کی خواہشات کی تکمیل آزادی سے کرتے

(جلد اول صفحہ ۲۶۴)

یہاں تک بنگال کے انگریزی تجار کی اخلاقی حالت بیان ہو گئی اب بمبئی کا حال سنیے۔ بمبئی کے مجلس انتظامی کا صدر نشین مسٹر چائلڈ Mr. child نامی ایک شخص تھا جس سے اور ایک شخص مسمی کپتان تھار برن Captan Tharburon سے بگاڑ تھی۔ صدر نشین مذکور نے اس کے خلاف جھوٹے دستاویزات اور جعلی کاغذات بنا کر اسکی سب جائداد ضبط کر لی اور اس کو جیل خانہ بھیجدیا۔ اس کپتان کی بیوی پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی بعض

دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اِسی قسم کی جلسازیاں کی گئیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۵)

یہ مسٹر چائلڈ جو کمپنی کا جنرل سمجھا جاتا تھا ایک شخص مسمی بوچر Boucher سے ناراض ہو گیا اور اس نے ایک بنئے کو اس پر متعین کیا کہ کسی طرح سے مسٹر بوچر کو زہر دیا جائے۔ یہ بنیا مسٹر بوچر کے ہندوستانی باورچی سے ملا اور مسٹر چائلڈ کا مطلب حاصل کرنے کے لئے اس کو روپیہ کا لالچ دیا۔ ہندوستانی باورچی نے بنئے سے تو وعدہ کر لیا مگر سفید سنکھیا اور روپیوں کی تھیلی جو اس بنئے نے اسکو دی تھی وہ اس نے اپنے مالک مسٹر بوچر کے سامنے لیجا کر رکھدی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

ایک شخص مسمی ٹپیٹ (Mr. Petit) کو بحری قزاقوں نے گرفتار کر لیا تھا اور اس کا فدیہ یعنے زر مخلصی پانچ ہزار پونڈ قرار دیا تھا۔ مسٹر ٹپیٹ نے سورت میں اپنے دوستوں کو روپیہ ادا کرنے کے لئے لکھا لیکن مسٹر چائلڈ نے کسی بنئے کے زبانی قزاقوں کو کہلا بھیجا کہ مسٹر ٹپیٹ بہت مالدار آسامی ہے اس سے پچیس ہزار پونڈ لئے بغیر مت چھوڑنا اس پر قزاقوں نے زر مخلصی کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ یہ رقم مسٹر ٹپیٹ ادا نہ کر سکا اور چھ مہینے میں یہ بیچارہ قزاقوں کی قید میں مر گیا۔ یہ قزاق مسٹر چائلڈ کو گالیاں دیتے تھے کہ اس نے ان کو ایسی بری صلاح دی کہ اچھے پانچ ہزار پونڈ بھی گئے۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۸)

یہ حضرت وہی مسٹر چائلڈ ہیں جنکا تذکرہ باب ہشتم میں کیا جا چکا ہے

اور جن کو ڈائرکٹر نے یہ ہدایت بھیجی تھی کہ ہندوستانی تاجروں سے خوب رو
اینٹھ کر جہاز ولایت کو روانہ کرو اور جنگ کی چھیڑ چھاڑ کرو۔ انہیں حضرات
(۳۵) دفعات کی شکایتی درخواست گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی جس کا
نتیجہ بھی باب ہشتم میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اب دوسرے گورنر صاحب کے حالات

جس زمانہ میں سرجان گیر (Sir John Gayer) بمبئی میں ایسٹ
انڈیا کمپنی کی طرف سے گورنر تھے اُن دنوں ایک شخص اپنی چہاردہ سالہ
بیوی کو بمبئی میں چھوڑ کر کسی کام کے لئے چین گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اُس عورت
کی شادی اپنے لڑکے سے کر دی اور سابقہ شادی محض اس بناء پر کالعدم قرار
دیدی کہ بمبئی میں وہاں کے قانونِ نافذہ کی رُو سے شادی کی توثیق کے لئے
گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے جو اس شادی میں حسب قاعدہ نہیں
حاصل کی گئی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۵)

کپتان ہملٹن کو اس گورنر کی نسبت یہ شبہ تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے
کو اور اپنی بیوی کو عمداً کسی نہ کسی طرح سے گورنر سورت کا قیدی بنایا اور
اس میں اُس کی یہ مصلحت تھی کہ سورت میں قیام کرنے کا اس کو موقع ملے
پھر وہاں وہ اپنا ذاتی سرمایہ کسی تجارت میں اچھی طرح لگا سکے۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

سرجان کے بعد سر نکولس ویٹ صاحب (Sir Nicholas Waite)
گورنر مقرر ہوئے۔ یہ ایسا بدرویہ شخص تھا کہ خود کمپنی کے ملازموں نے اس کو پکڑ کر

بحیثیت ایک قیدی کے انگلستان روانہ کر دیا۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

یہ حالت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سرزمین ہند پر تھی سمندر کی بابت کپتان جب تحریر فرماتے ہیں کہ یہی یورومین تاجر بعض اوقات دریائی ڈاکو بھی بنجایا کرتے تھے اور بڑے بڑے ستم ڈھایا کرتے تھے سورت کے حالات تحریر کرتے ہوئے کپتان موصوف لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۶۹۵ء میں کپتان اویسی ایک بحری قزاق نے اس شہر کی تجارت وامن میں خلل ڈالا اور چار چھوٹے جہازوں سے حملہ کرکے دولت مغلیہ کا ایک جہاز لوٹ لیا جس سے بہت سارا سونا چاندی اور ایک مسلمان خاتون لوٹ میں اس کے ہاتھ آئی جیسا کہ میں بسلسلہ بیان تجارت بحر احمر و سیدا کا ذکر تحریر کر چکا ہوں اس وقت سے اس شہر کی تجارت کو بہت صدمے پہونچے ہیں"

(جلد اول صفحہ ۱۴۶)

عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام حالات کی بابت کپتان جب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کمپنی کے عمال کے ہاتھوں اسقدر ظلم و ستم ہوتا تھا کہ نہ کسی آسمانی کتاب میں اور نہ کسی انسانی قانون میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان زیادتیوں سے باز رکھتا۔

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

جب کبھی رعایا مغلیہ انگریزوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھتی تو کمپنی کے عہدہ دار یہ کہکر کہ تمہاری تنخواہیں بہت زیادہ ہیں جبراً اُن کی ماہوار میں

آدھا ساجھا کر لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۴)

یہاں تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجار کی عام اخلاقی حالت بیان کی گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقی حیثیت سے پورا آوا کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ جو لوگ کہ ان تاجروں کی اخلاقی حالت درست کر سکتے تھے یا جن کا کچھ اثر تھا وہ پادری صاحبان کا طبقہ ہو سکتا تھا لیکن کپتان ہملٹن صاحب کی رائے اس طبقہ کی بابت یہ تھی کہ جہاں کہیں انکے قدم پہونچتے تھے وہاں شراب خانے اور عیاشی کے اطوار بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے اور وہ لوگ جو ابھی تک ان باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے انکو بھی ان بدعات سے بچنا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔

(جلد دوم صفحہ ۸۵ و ۸۶)

بصرہ کی تو یہ حالت تھی کہ علانیہ گرجوں میں شراب فروخت کرتے تھے اور جو رعایت گورنمنٹ انکے ساتھ مرعی رکھتی تھی اس سے یہ بدترین اور ذلیل ترین فائدے اٹھاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۸۴)

گولکنڈے مشنریز کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص ایک نے راسی چیز مثلاً مچھلی وغیرہ بازار سے خریدے اور پادری صاحب کو دینے سے انکار کردے۔ تو وہ اس کی مدد قرار دیکر ذات سے باہر کر دیتے تھے۔ اور پھر بغیر ساٹ پونڈ لئے شریک نہ کرتے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

لوگوں کو طرح طرح کی بازیگری و افسوں گری کے کرتب دکھا کر اپنا معتقد بنا لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

اگر کوئی شخص گناہوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ اسکو بہت آسانی سے خرید سکتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۲۴)

منگلوریں بعضے ایسے بے حیا تھے کہ اگر کچھ روپیہ ملتا ہو تو مسافروں کے واسطے عورتیں مہیا کرنے میں بھی ان کو کچھ عار نہ تھا۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر کچھ فائدہ ہوتا ہو تو چوری۔ قتل۔ یا زنا کوئی گناہ نہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۸۲)

انہیں کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا کے ریاکاروں کے طبقہ سے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۶)

ہم کو ان واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف معلوم ہوتی ہے، لیکن ہم اس تفصیل کیساتھ مثالیں پیش کرنے کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ اگر صرف دو ایک واقعات بیان کئے جاتے تو ناظرین کو شاید یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ بداخلاقی کی مثالیں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں لیکن جب حالت وہ تھی کہ جس کا بیان کیا گیا تو پھر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو ڈپلومیسی اس ملک کے فتح کرنے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئی اس زمین اصل

انصاف یا عمدہ اخلاقِ انسانی کو ابتدا میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ ڈلوسی بغیر ان اوصاف کی امداد کے کامیاب ہوئی۔ میں نے لفظ "ابتدا" عمداً استعمال کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان واقعات کو انگلستان کے ان پاک نفوس سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و تعدی کا مسئلہ پارلیمنٹ اور اپنی قوم کے روبرو خود ہی پیش کر دیا یا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے بعد جب ہندوستانی سلطنت مٹ چکی تھی اور انگریزی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ ہندوستان کو بغرض حکومت بھیجے گئے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ظلم و تعدی کے رفع کرنے میں اور انصاف کے قائم کرنے میں کوشش کی۔ میں ظلم و تعدی کے ان واقعات کی نقل نہ کرتا لیکن کسی ملک کی تاریخ میں ایسے بڑے بڑے واقعات جن کا ذکر کیا گیا لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ قوموں اور ان کی سلطنت کی زندگی و موت کے متعلق جو اصول قانونِ قدرت نے بنائے ہیں وہ صحیح طور سے اخذ کئے جا سکیں یا یوں کہئے کہ صحیح فلسفۂ تاریخ تیار کیا جا سکے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ کس طرح سے بدترین اخلاقِ انسانی بھی بعض صورتوں میں کامیاب ہوئے ہیں گو کہ ان کا انجام کچھ ہی ہو۔

۱۸۵۶ء کی ایک معاصر شہادت

حدیقۂ شہداء

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

بابری مسجد رام جنم بھومی کا مسئلہ۔

جس رخ سے چھیڑا گیا اور جسطرح دونوں طرف سے سفلی جذبات کو بھڑکا کے مطلوبہ مقصد حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کی جاتی رہی ہیں زندہ قومیں اس طور سے اپنے مسائل حل نہیں کیا کرتیں۔

یہ ایک گھرانے کا، ایک خاندان کا، ایک قوم کا اندرونی جھگڑا ہے جسمیں ایک بڑا بھائی ہے ایک چھوٹا بھائی۔ بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیئے اور چھوٹے بھائی کو بڑا بننے کی ہوس نہیں کرنی چاہیئے۔

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اسکی ایک مثال غدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں ہمیں ملتی ہے جب اجودھیا کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اسوقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اسوقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا بیراگیوں، جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سالہ قبضہ کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ قبلاً یہ مسجد تھی اسلیئے پھر ان کے حوالے کی جائے، نامناسب ہے۔ بڑا سنگ کی گفت و شنید ہفتوں پھر مہینوں چلتی رہی۔ اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضہ کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے اور مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا لیکن واقعتاً مندر توڑنے کے احکام لے جانے والے در اصل توپ خانے سے لیس، امیر المجاہدین اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق [illegible] جا رہے تھے ادھر توپخانہ نصب کر دیا گیا ادھر مجاہدین آراستہ ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں، جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہا آج بھی مندر ہے ___ بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و امتیاز کا نشان ہے!

لیکن ___ کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!! بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو! ایسا کہ بھی کبھی تو دل بیٹھنے لگتا ہے!

لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!

بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیئے

لیکن

پھر

چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینا چاہیئے۔

اصل کتاب موجود ہے لیکن سہولت کے لیے ہم نے رئیس احمد جعفری کی تلخیص لے لی ہے۔

___ ادارہ

مرزا جان

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء

حدیقۂ شہداء

کتاب کے مصنف ایک صاحب مرزا جان ہیں سید امیر المجاہدین کے رفقاء میں تھے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی معلومات و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لہذا اس کے صحیح اور مستند ہونے میں کلام نہیں۔ ہم عصر مؤرخین کے بیانات یوں بھی قابل توجہ اور لائق اعتناء ہوتے ہیں پھر یہ کہ ایسا مؤرخ جو خود شریک کارزار رہا ہو لہذا اس کی صحت اور درستی میں کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل کتاب ۹۰ صفحات کی ہے پریس کا نام نہیں۔

- ساری کتاب میں کوئی پیراگراف نہیں ہے، میں نے حسب ضرورت پیرے قائم کر دیے ہیں۔
- ضمنی اور ذیلی سرخیاں میری قائم کی ہوئی ہیں۔
- میں تو یہ چاہتا تھا کہ ضمیمہ کے طور پر پوری کتاب شامل تاریخ کر دوں اب یہ چیزیں کہاں ملیں گی؟ لیکن ایجاز و اختصار نے دامن پکڑا۔ لہذا میں نے تلخیص سے کلام چلایا ہے لیکن تلخیص ایسی کہ بڑھایا کچھ نہیں غیر ضروری عبارت حذف کر دی ہے کتاب کا مفہوم پورا آ گیا ہے، اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔
- یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ میں پیش آیا، اسی سال یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی اتنی قریب العمر تاریخ بجائے خود ایک نادر تحفہ ہے۔ (ر-ا-ج)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سراپا عصیان مرزا جان کی یہ عرض ہے کہ شکر پروردگار کا ہر فرد بشر پر فرض ہے جس نے کعبہ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کو نقشہ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا ہرچند دیر و حرم دونوں میں کار سنگ و خشت ہے کہیں اس کی پرستش میں دوزخ کہیں اس کی زیارت کے صلہ میں بہشت ہے۔

نعت | نعت اور نعت رسول امام الثقلین محمد بن عبداللہ نور من نور اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہر انسان کو مناسب ہے نام کے ساتھ درود پڑھنا واجب ہے کہ باعث ایجاد کونین ہیں صاحب شہد اور حنین ہیں و ما ارسلنک الا رحمۃ العالمین کی مصداق ہیں برگزیدہ آفاق راکب براق طی کنندہ قصر نیلی رواق ہیں۔

سبب تحریر | جب مولوی امیر الدین علی قدس سرہ العلی نے جہاد کا قصد کیا یہاں کے علما سے مشورہ لیا۔ سب صاحبوں نے بیعت کی۔ اس جلسے میں سراپا گناہ، الراجی الی رحمۃ اللہ بھی شریک تھا۔ ہنگام نہضت ہرچند ہمراہی کا اصرار کیا لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تمہارا یہیں رہنا مناسب بلکہ واجب ہے کہ اکثر خطوط تمہارے یہاں کے عمائد کو آئیں گے تمہارے سبب سے جواب باصواب مل جائیں گے علاوہ اس کے وہ کام انصرام ہوں گے جو باعث تقویت مجاہدین نیک فرجام ہوں گے پس عاصی نے ناچار اس خادم رسول کی اطاعت قبول کی پھر کچھ نہ کہا یہیں رہا اس دن سے جو مولوی صاحب نے بذریعہ نامہ ارشاد فرمایا بسر و چشم بجا لایا اور کیفیت کو قلمدان میں بھرتا گیا جب امیر المجاہدین رئیس المسلمین نے شربت شہادت پیا میں نے بھی افسردہ ہو کے قلم کو روک لیا اور اس کا نام "حدیقۂ شہداء" رکھ دیا۔

مسجد ہنومان گڑھی کی تاریخ | اب طرفہ ماجرا سنیے جس سے دل دو نیم ہوتا ہے قطع نظر اور مسجدوں کے اودھ میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا حیلہ تھا راجہ رام چندر نے اس مقام پر ہنومان اپنے رفیق کو ٹھہرایا تھا بعد فتح لنکا اس کی بزرگی کا وسیلہ تھا۔ اس لیے ہنومان پرست اس کو ہنومان بیٹھک کہتے تھے۔ بالفعل اسی کا نام ہنومان گڑھی ہے حسب دستور وہاں بھی اورنگ زیب

عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد قناتی بنوا دی تھی۔ ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ بعد چندے مسلمانوں کو غافل پا کے چاہا کہ پھر تختا کر دروازہ بنا کے پوجا کا رنگ جمائیں اور جس پہ مورت ہنومان کی ہے یہاں دہی سنگ جمائے لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی اور انہی کی اجازت سے پاتی شاہ فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا اذان کہتا تھا جب شجاع الدولہ بہادر کیسر کو گئے متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حامل میں فقیر کا بھی حصہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمدنی زیادہ ہوئی بہاری قوم پوجا پر آمادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا۔ اس کے وارثوں نے مل تال لیا اور علیحدہ مسجد سے عقب اس ٹیکری کے کھیر دیا تالاب پر تکیہ جما لیا لیکن انیت مراعات کیے جاتے تھے جعوتی فقیر دئے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگیوں نے امتیوں کو نکالا اپنا عمل کر کے مسجد کی منبر کو توڑ ڈالا۔ اس بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلوا کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض مسجد لکھوا کے اور کسی فقیر مسلمان کو اذان کے واسطے مقرر کر دیا۔

بیراگیوں کی شرارت

جب پھر اودھ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا۔ اس پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھچوایا۔ لڑائی کے قابل قلعہ بنوایا۔ پھر تو کیا مثل مشہور ہے کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس کے سبب روز بروز بیراگی زور پکڑتے گئے۔ مسجد کے آثار بگڑتے گئے۔ ہندوؤں کی نظامتیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی۔ حکام کو خیر و شر کی لیاقت نہ رہی گرد اس مسجد کی حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا۔ اس مسلمان فقیر کو پہلے تو کچھ دیتے رہے۔ بجبر و اکراہ اس کی خبر لیتے رہے۔ جب وہ درویش مسلمان مسجد کا جنت کو سدھارا بیراگیوں نے میدان مارا اس خانۂ خدا کو اپنا گھر سمجھ کے ہنومان گڑھی میں تو داخل کر ہی چکے تھے اب کچھ نشان باقی نہ رکھا طاق و محراب و منبر کو برابر کر کے مسجد کا گمان باقی نہ رکھا۔ جب انتہا کو درشن کی حکومت پہنچی تو پھر تو ادھر میں یہ نوبت پہنچی کہ کئی برس تک اذان اور گاؤکشی موقوف رہی۔ اطلاع اس کی اہل دربار کو ہوئی لیکن مفصل خبر نہ سرکار کو ہوئی۔

نظم حسب حال زمانہ حال

حکام کافروں کی خوشامد سے کہتے ہیں — کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے
کس طرح سے اودھ میں ہو بانگِ اذاں بلند — حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے
اختر نگر میں گاؤ کشی کیوں نہ بند ہو — گوسالہ پوجتا ہے جو پیشِ نماز ہے
سب کو تلاش زر ہے جو ہیں اہل کاریاں — چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے
ہندو کھلے خزانہ تعلی کے لیتے ہیں — حاصل بہ زور زر یہ انھیں امتیاز ہے
~~واں کربلا میں خیمہ جلاکر کیا غرور — یاں اب کلام حق کے جلانے پہ ناز ہے~~
اسلام کی تمیز ہو کیا کافروں کو ہائے — بلما کو مسئلے میں نہیں امتیاز ہے
خاطر سے اون کی شرع کے گھوڑے کی پھر گئی — ہر فعل کا درست یہ حکم جواز ہے
فتویٰ سے ان کے غازیوں کا خوں ہوا حلال — اس پہ بھی ان کو اپنی فضیلت پہ ناز ہے
اے خامہ ابتدا کر اب اس داستان سے — جس میں تمام سوز سراپا گداز ہے

شاہ غلام حسین کا عزم جہاد

الغرض جب یہاں تک ہنگاموں کی نوبت آئی فلک بے پیر نے نئی مہلت دکھائی کہ کافروں نے صحن مسجد میں بت خانہ بنا لیا اور مرگ دداری کی مسجد خس و خاشاک ناپاک سے پٹ گئی۔ اسلام کی قدر و منزلت گھٹ گئی تب ۱۲۷۱ھ میں کہ عہد دولت عہد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد باخدا حقیقت آشنا تھے۔ خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین جانتے تھے اور صاحب ان کے مولوی محمد صالح اسم بامسمی صلاح و تقوی میں درست راہِ خدا میں بہت چالاک و حیثیت عالم باعمل حق پرستوں میں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کرکے راہِ خدا میں سرِ خیمہ کو قدم گاڑا۔ ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر نیت درست باندھی اور مسجد آباد اور بت خانے برباد کرنے پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بغرض جہاد حیدرآباد میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا۔ سامان عفو جرائم کیا اگر سچ پوچھئے تو یہ۔ سید احمد صاحب مرحوم سے بڑے

ہیں کس واسطے کہ ان کو سب سامان میسر تھا یہ مفلسی میں اس عزم پر کھڑے ہوئے۔ احسان علی خاں رسالدار، حسن علی خاں بانکے کے بیٹے ان کے معین و مددگار ہوئے بلکہ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی شریک ہو کے مستعد کارزار ہوئے اس زمانے کے مسلمانوں کا حال ظاہر ہے کہ بات بات پر ایمان بدلتے ہیں کیچڑ سے زیادہ ایک رکابی پر پھسلتے ہیں — تعمیر مسجد یا امام باڑہ یا سبیل کی تو کوئی سبیل نہیں کرتے کوئیں مہمان سرا بنوائیں گے۔

مسلمان جہاد سے کتراتے تھے

وہ لوگ جن پر جہاد فرض تھا یعنی مال و زر رکھتے تھے۔ اشرفیاں پرکھتے تھے۔ گھر رکھتے تھے نہ کسی کا فرض تھا صاف نکل گئے رنڈیوں کی طرح مچل گئے۔ محمدی جھنڈے کو طمع دنیا سے محمول کیا۔ جہاد میں حجتیں نکالنے لگے۔ جا بانہ قبول کیا مولویوں کی خدمت میں آ آ مسئلہ پوچھتے تھے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ جان بہت عزیز ہے اگر کسی نے کہا جہاد فرض کفایہ ہے۔ مصدق اس کا ہدایہ ہے خوش ہو گئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ آپ بڑے عالم ہیں خوب آنت سے بچایا جیسا آپ کو سنتے تھے ویسا ہی پایا اور معاذ اللہ اگر کسی نے کہا جہاد فرض عین ہے۔ اس میں سعادت دارین ہے۔ سنتے ہی جان نکل گئی رنگ بدل گئی جیتے جی مر گئے۔ ہزار حیلے نکالے کہ ہمارے گھر میں سوا ہمارے کوئی اور نہیں جانے کا طور نہیں کوئی کہتا تھا جورو کو کس پر چھوڑیں کیونکر رشتۂ الفت توڑیں کوئی کہتا تھا کہ علیل ہیں کوئی کہتا تھا ہندوؤں کی کثرت ہے ہم قلیل ہیں یہ بزدل ترہوں ہی کھچڑی پکایا کیے۔

اسلام کے مجاہد مساکین

اگر بعض مساکین کہ بالفعل کچھ اسلام اگر ہے تو ان میں باقی ہے شریک احوال اس درویش دلریش ملک خصائل کے ہوئے اور حسب ارشاد روانہ اودھ فیض آباد ہوئے شاہ صاحب کچھ شاد ہوئے رونا ہی تک پہنچے تھے کہ لکھنؤ کا رستہ لیا اور جو فیض آباد میں پہنچ گئے تھے ان کو نثار حسین نائب کو توال اور کپتان الگزنڈر آہد خصال نے نکال دیا بھانے سے ٹال دیا سبحان اللہ وبحمدہ آر تو انگریز تھا اس کو مسلمانوں سے عار بجا ہے لیکن نائب کو توال کے ایمان کو دیکھئے کہ بیرا گیوں کے چیلے بنے کافروں کے جانب دار ہوئے۔

مسجد بابری میں قیام

بعد چندے فیض آباد سے پرچہ اخبار کا ہندو مسلمانوں کی تکرار کا بارگاہ حکام بالا میں گذرا ملاحظہ کے بعد ناظم اور کوتوال کے نام پر دستخط ہوا کہ مسجد کی تحقیقات کر کے اس بات کو اثبات کرو اس سہارے پر شاہ صاحب نے پھر چند مسلمان بسر کردگی قاضی نور علی ساکن مضافات اعظم گڑھ اودھ کو بھیجا وہ مردانِ خدا مسجد بابری میں مقیم بے خوف و بیم ہوئے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے یہاں انسان کیا فرشتے کی عقل جاتی ہے کہ پڑھے لکھے مال دار جہاد سے کنارا کریں اور جاہل مفلس مرنے کو گوارا کریں۔ تھوڑے دنوں کے بعد شاہ صاحب بھی بہ نفس نفیس توکلت علی اللہ تعالیٰ کہہ کے وارد مسجد مذکور ہوئے اور مولوی محمد صالح ان کے پاس سے دم بھر نہ دور ہوئے۔ شب و روز اسی تصور اور خیال میں رہتے تھے۔ یہ تصور تھا کہ کوئی ایسا سامان یزداں کر دے کہ مسجد بیراگیوں کے تصرف سے باہر آئے۔ اودھ کا کفرستان مٹ جائے۔ ترقی اسلام ہو۔ مومنوں کا بیڑا پار ہو۔

جہاد کی دعوت قبول کرنے سے مسلمانوں کا گریز

اسی خیال میں دو تین مہینے گزر گئے۔ شاہ صاحب شرکت کی جستجو میں ادھر ادھر گئے مگر کسی نے ساتھ نہ دیا ادھر رخ نہ کیا بلکہ بعضے مسلمان اس امر سے منع کر کے مانع الخیر مسجد و دیر میں مشہور ہوئے بانی فتنہ ہوئے تفصیل اس کی لکھنا مناسب نہیں۔ بیں قافی نہیں مناسب نہیں مگر شاہ عبدالحق ردولی کے عرس میں جو بزرگوار گئے تھے علی آباد میں ان سے اور مولوی محمد صالح سے سلسلہ جہاد میں تقریر ہوئی وہ گوش زد برنا و پیر ہوئی مضمون کی نظر میں حق و باطل کی تمیز کھل گئی۔ خلاصہ یہ کہ مولوی محمد صالح درپئے ثبوتِ جہاد تھے اور دوسرے صاحب ایسی باتیں کرتے تھے کہ ان کے وعظ و پند سے کسی بندۂ خدا نے ارادہ جہاد کا نہ کیا رخ اودھ فیض آباد کا نہ کیا۔ سچ ہے خدا کی راہ میں جان و مال دینا بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔

کشن بردوش مجاہد اور بیراگیوں کے حامی اور مددگار رام سنگھ اور کشن دت پانڈے چکلہ دار اور زمیندار اس قرب و جوار کے ہوئے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار گنوار اور بیراگی نابکار اس گڑھی میں جمع ہوئے۔ مستعد کارزار کے ہوئے۔ گھاگرہ کے گھاٹ روک لیے کہ شاید کوئی مسلمان جاہل قصد بھی کرے اترنے نہ پائے۔ اسی پار سرینک کر مر جائے اور مولوی صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ سو آدمی ہوں گے۔ ان کی یہ کیفیت تھی

کہ اگر کچھ ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ لیکن فاقہ کو اور عریانی تن کو عین خدا کی مہربانی سمجھ کے وہاں اڑے رہے خدا کے گھر میں ڈھیلے پڑے رہے کہ شاید کچھ مسلمان بجرأت و حمیت ایمان بہ نیت جہاد شریک معرکہ فیض آباد ہو کے کافروں کو تہ تیغ کریں اس امر خیر میں جان و مال سے نہ دریغ کریں کسی نے خبر نہ لی آخرش ۱۷ تاریخ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ جمعہ کے دن دو تین سو مسلمان بہ ارادہ نماز اسی مسجد میں یکجا ہوئے شاہ صاحب سب کے پیشوا ہوئے۔ یہ خبر بیراگیوں کو پہنچی فرصت کو غنیمت جانا دل میں کچھ اور ہی ٹھانا۔ سرکاری لوگوں کی طرف سے تو ہر گونہ اطمینان تھا ان میں سے کاہے کو کوئی مسلمان تھا اور بعض جو مومن پاک تھے کافروں سے زیادہ سفاک تھے بے خوف و خطر خانۂ خدا کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جو دیکھا کہ خواہ مخواہ گھیرے میں مرتے ہیں بیکار جان سے گذرتے ہیں ہم بھی کچھ کام کریں۔ اس میدان میں نام کریں مستعد اور آمادہ سب مجاہدین پاپیادہ ہوئے۔ واللہ اعلم کیا سمجھ کے کوتوال کے پیادوں اور الگزندر آر کے سواروں نے متوسط ہو کے رفع شر کیا۔

مجاہد کی شان

دوسرے روز شنبہ ۱۸ تاریخ اسی مہینہ کی کہ اسی کو ماتم میں عشرۂ محرم سے کم نہ جانئے جان ہرسی انگریز بھی لکھنؤ سے داخل فیض آباد ہوا بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا پہلے تنہا الگزندر آر۔ تھا ممد اس کا تھانہ مددگار تھا اب دوسرا ہرسی نابکار آیا۔ دونوں صاحب تثلیث نے مشورہ کیا خانہ خدا کا رستہ لیا شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں بکمال خیر خواہی یہ فقرہ عرض کیا کہ مسجد کے دروازے میں کواڑ نہیں کسی طرح کی آڑ نہیں مناسب ہے بلکہ واجب ہے کہ ایک جوڑی کواڑ کی قائم ہو جائے مخالف دفعتاً آنے نہ پائے۔ شاہ صاحب غافل مکر و فریب سے جھٹ پٹ دو مجاہدوں کو کواڑ لانے کے واسطے بیگم پورہ کے ایک محلہ اودھ میں سے بھیجا کسی مرد مسلمان نے ایک جوڑی کواڑ کی بہت اچھی گاڑی پر لدوا کے دونوں مجاہدوں کے ساتھ روانہ کی۔ گاڑی کچھ آگے بڑھی تھی کہ بیراگیوں نے خبر پائی خدا جانے اس میں فرمان فوج کا اشارہ تھا یا کوئی ہرکارہ تھا کہ دفعتاً کافروں کی بھیڑ آئی ان کو گھیر لیا مار ڈالنے کا قصد کیا قریب تھا کہ ان دونوں کو باب جنت تک پہنچائیں۔ یکایک مسجد والوں کو خبر ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی اور میاں فقیر بخش نائی اور بہادر خاں اور ایک مجاہد پھر تو اللہ رے اور بندہ لے کہاں یہ سینکڑوں کہاں یہ فقط

سات جرار لیکن خدا کی شان ساتوں نے تلوار کھینچ کے اسی دم وہ جرأت اور سینہ سپر ہو کے وہ بہادری کی کو ساتوں طبقے زمین کے تھرانے لگے۔

کربلا کا نمونہ جس پر ایک بار تلوار پڑتی تھی دو ہوتا گویا برق تھی بار بار پڑتی تھی کافروں سے جہنم بھر گیا۔ میدان خالی ہوا جو شہید ہوا اس کا مرتبہ عالی ہوا جو کوئی دیکھتا تھا معرکہ کربلا یاد آتا تھا۔ ہر ایک جوان شجاعت سر میدان دکھاتا تھا جب اللہ اللہ کہہ کے تلوار لگاتے تھے۔ کافروں کے غول پیچھے ہٹ جاتے تھے بید کی طرح تھراتے تھے وہ جو ہنومان گڑھی کا پشتہ تھا وہاں کشتہ پر کشتہ تھا کسی نے نیزہ مارا کسی نے تلوار لگائی کسی نے چقماق خالی کی کسی نے تپنچہ کو آگ بتائی کوئی بھاگنے والے کو للکارتا تھا جھپٹ کے تلوار مارتا تھا یہ ساتوں سبعہ سیارہ کی طرح بڑھے چلے جاتے تھے کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے دروں پڑھتے چلے جاتے تھے جو کافر جہنم واصل ہوا سرد تھا اسی طرح لڑتے ہوئے گڑھی کے دروازے تک پہنچے مجاہدوں کے نعرے تا بہ فلک پہنچے وہاں بھی بڑا گھمسان کا رن پڑا بڑی بڑی نمود کا بیراگی نابود ہوا۔ ان تھوڑوں نے بہت کام کیا سینکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا سیدھا رستہ جنت کا لیا لطف حیات جاودانی کا پایا۔ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی حقیقت میں رستم تھے اور میاں فقیر بخش گو نائی تھے مگر جرأت اور دانائی میں کسی سے کم نہ تھے۔ ساتوں کا شش جہت میں نام رہے گا۔ پنج تن اور چار یار حامی سر میں گے۔ گڑھی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مسجد کے مجاہدوں کو خبر ہوئی ہتھیار باندھ کے ادھر بڑھے۔ مان سنگھ کے لوگ سد راہ ہو کے ان کے منہ چڑھے یہاں بھی ایسی تلوار چلی اور اس طرح سے لڑائی پڑی دبن دار آمادہ ہوئے کہ فیصلہ کے بعد مقتولوں کا جو حساب ہوا تو مسلمانوں سے ہندو بہت زیادہ مقتول ہوئے۔ کافروں کو بچ گئے کی راہ نہ ملی مجاہد وہاں ایسے کچھ اڑ گئے زمین میں پاؤں گڑ گئے۔ ان سنگھ کے لوگ لوہا مان گئے مسلمانوں کی تلوار سے دوزخ کو بے ایمان گئے۔ شہیدوں پر باران رحمت برسا زخمی کا فر ایک بوند کو ترسا۔

غداری پھر مل خوب گھر آئی شاہ صاحب کی جماعت پھر مسجد میں پھر آئی اسی وقت ایک طرہ فروش ملے محبت سے مدہوش معتقد خاص مرید با اختصاص تھوڑا سا کھانا مجاہدوں کے واسطے لایا یہ دو دن سے خدا کے مہمان تھے۔ منتظر ہر آن تھے۔ دستر خوان بچھایا کھانے کا لگا لگایا۔ دونوں انگریزوں نے بھی

غازیوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اب کمریں کھول کے بخاطر جمع اپنی مسجد میں رہو تم سے کوئی نہ بولے گا جب
تک فیصلہ نہ ہولے گا۔ وہ ان کے قول پر اعتماد کر کے مشغول طعام ہوئے ہنوز نوبت سیر ہونے کی نہ آئی
تھی کہ دونوں انگریز اصلی علی اور نثار حسن نائب کوتوال باہم کچھ قیل و قال کر کے اپنے ہمراہیوں کو نامرد
سپاہیوں کو لے کے مع چند ضرب توپ مسجد سے دور جا کے ٹھہرے۔ خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیا اشارہ
تھا کہ فوج سرکاری کے الگ ہوتے ہی ہزار دو ہزار بیراگی لاٹھیں گنوار ہاتھوں میں تلوار مور و ملخ کی طرح خانۂ
خدا کو گھیر لیا۔ یہ جو فوج شاہی اور کوتوال بدافعال کے ہمراہی تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا پھر
تو کافروں نے رجب علی شاہ کے کوٹھے پر چڑھ کے جو لوگ خدا کی راہ میں مسجد کے سپر میں تھے جسم زاران
کا گولیوں سے غربال کیا مسجد کی حرمت کا کچھ خیال نہ کیا صحن مسجد لالہ گوں ہوا۔ غازیوں نے بھی گولی برسنے
کو باران رحمت الٰہی جان کے اور بجائے سپر چھاتیاں تان کے ہتھیار نکلے ہاتھ پاؤں نکالے۔ حتی الوسع
جرأت کی داد دی۔ جب یہاں صفائی ہو گئی موقوف لڑائی ہو گئی۔

مجاہد اس طرح ذبح کیے گئے جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے

تب دو تین سو گنوار بیراگیوں کے مددگار

بم مہادیو اور ہر ہر کرتے مسجد کے اندر بے خوف و خطر آئے اور جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے ۶۹
غازیوں کو جو اس وقت تک زندہ تھے شہید کیا جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاریز بدکیا۔ پانی کی طرح مسجد
کے موری سے خون بہتا تھا اور ہر غازی دم بازپسیں اللہ اکبر کہتا تھا، مولوی محمد صالح بھی اسی وقت
شہید ہوئے خلد سے نزدیک دنیا سے بعید ہوئے لیکن عین شورش ہنگامہ جدال و قتال میں اسی ضرب و
حرب کے حال میں غازیوں نے شاہ صاحب سے گذارش کی کہ ہم ایسے طوفان میں گھرے ہیں کہ نکلنا معلوم
اور ایسے دریائے ناپیدا کنار میں گرے ہیں کہ اچھلنا معلوم۔ خدانخواستہ آپ کی زندگی میں اگر خلل آئے
گا تو اس بیڑے کا تھل بیڑا نہ ہو گا۔ نام و نشان ڈوب جائے گا کوئی ہمارا نام نہ لے گا بے گناہوں کا
انتقام نہ لے گا۔ آپ کے جینے میں فاتحہ کا سہارا ہے جہاد کی امید دوبارہ ہے اس دم چلے جانا مناسب
ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب بہ مجبوری حسب صوابدید ان کے کسی سمت کو چلے گئے اور مجاہد ستم دیدہ آسیائے

غلہ سے دبے گئے جب کافروں نے مجاہدوں کا کام تمام کیا پھر یہ سرانجام کیا گیا کہ قرآنوں کو یعنی سیپاروں کو ہزار پارہ کیا دو ایک کو جلا دیا یہ بلا دیکھیے کس پر پڑتی ہے آج تک کہ ایک مہینہ ساون کا اور نو روز بھادوں کے گذرے پانی نہیں برسا ہے یہ قہر نازل ہوا ہے چاروں طرف شور عطش کا ہے گرمی کی شدت سے ہر شخص کو غش ہے اور وباء کی وہ شدت ہے کہ ہزاروں آدمی ہیضہ سے مرگئے

مسجد توڑی لاشیں کچل دیں اور صحن مسجد میں کھڑا تو تغیر تحقیقا کی رسوئی اور خدا کی مسجد کے واسطے حد تھا اس کو توڑا ہندؤں کی گوبیوں سے مسجد کے ستونوں کو ثابت نہ چھوڑا پھر مسجد سے نکل کے لاشیں کچل کے گنواروں نے گھر کی راہ لی۔ مہنتوں نے گڑھی میں پناہ لی۔ لاشیں شہیدوں کی بے گور و کفن چادر نہ پیرہن عریاں پڑی رہیں پلٹنیں دیکھا کیں کھڑی رہیں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ ان کی خبر لیتا دو گز کفن دے کے دفن کر دیتا۔ دوسرے روز نثار حسین نائب کوتوال بدافعال نے اسی مسجد کے دروازے پر گڑھا کھدوا کے توپ دیا۔ کسی نے تاریخ ان مظلوموں کی کہی تھی مصرع تاریخ۔ بلغ العلی بکمالہ۔ ۱۲۷۱ھ

مقابر شہدا کی بے حرمتی یہاں تو حاکم ہندو ہیں سردار ہیں مسلمان مجرم گنہگار بر سردار ہیں ایسی زیادتی ہندؤں کی مسلمان دیکھیں جلے ہوئے اوراق قرآن دیکھیں اور پھر حمایت کفار ہو ایسی رعایت پر خدا کی مار ہو جائے عبرت ہے مقام حیرت ہے نہ کسی کو شرم ہے نہ غیرت ہے ظاہر میں تو مسلمانی کے ٹھاٹ ہیں باطن میں یزید علیہ اللعن کے بھاٹ ہیں بعد اس معرکہ کے بیراگیوں نے صحن مسجد میں آکے ہوم کیا سنکھ بجایا وہیں موہن بھوگ کھایا کہتے تھے ہنومان جی نے کرپا کی ملیچھوں سے پاک کیا غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی۔ اسلام کی توقیر ذرا نہ رکھی اس کی تفصیل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں لکھنے کے قابل نہیں۔ متصل اسی مسجد کے ایک ٹیلہ تھا۔ مسلمانوں کی دعا کا وسیلہ تھا خواجہ مٹی اس کا نام تھا مقابر شہداء کا مقام تھا قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر لیا اور ایک بت وہاں بھی دھر دیا بعض لکھتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی یہ جو افعال صادر ہوئے سب مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے مگر ہم دم بخود

ں زبان ہلا نہیں سکتے۔ ان کا نام لب پر لا نہیں سکتے۔ کس واسطے کہ وہ سرکار کے زعم میں خیر اندیش ہیں،
ب سے زیادہ وفا کیش ہیں۔

گم پورہ میں مسلمانوں کی درگت

اب حال بگم پورہ والوں کا سنیے اعلیٰ علی شقی کے حکم سے منادی
نے ندا کی جو مسلمان اس کا شریک ہوگا جان سے مارا جائے گا۔ گھر
لٹے گا سر اتارا جائے گا یہ سن کے وہ بیچارے ڈر کے مارے شاہ صاحب کے شریک نہ ہوئے اس پر ناکردہ
گناہ آفت میں پھنسے بعد فراغت کے قتل مسلمانوں سے بیراگیوں نے چار حملے ان کے مکانوں پر کیے۔ بہت
زور دکھایا مگر خدا کے فضل سے دخل نہ پایا چنانچہ افضل بیگ نامی ایک شخص وہاں کا رہنے والا ان کے
ہاتھ سے زخمی ہو کے اب تک صاحب فراش ہے۔ صد رحمت شاباش ہے جب ان بچاروں نے دیکھا کہ
وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے ہیں ناچار گھر چھوڑے فیض آباد میں آرہے۔

واجد علی شاہ کا حکم

دو چار دن پیشتر اس معرکہ کے حکام سرکار سے جب
کچھ بن نہ آئی تب یہ بات ٹھہرائی کہ مولوی نہال الدین صاحب اودھ میں جا کر بصلاح و صوابدید مولوی
حفیظ اللہ صاحب داروغہ عدالت العالیہ دیوانی اس باب خاص میں ساکنان اودھ اور فیض آباد سے استفسار
کریں بلکہ قلم بند اظہار کریں بعد تحقیقات مبنی بے رو و رعایت کیفیت واقعی بارگاہ ظل اللہ میں حاضر کریں۔
اور اگر نشان مسجد کو دیکھیں مشاہدہ اپنا ظاہر کریں چنانچہ ۱۶ ذیقعد الحرام ۱۲۷۱ھ قدسی کو یہاں سے روانہ
ہوئے دو منزل پہنچے کہ سنا فیصلہ ہو گیا مگر امتثالاً للامر وہاں پہنچے ہنگام تحقیقات اور تحریر اظہارات روبرو
مولوی صاحبین محمد وحیین اور میر سید علی صاحب مجتہد فیض آباد اکثر رئیسوں نے دیکھنا مسجد کا اور بعضوں نے
اس میں نماز پڑھنا ظاہر کیا اور قاضی یار علی نبیرہ قاضی حبیب اللہ نے کئی محضر سابق کے دکھائے کہ ان سے
صاف مسجد ثابت تھی اور طرفہ یہ کہ کئی ہندوؤں نے بھی مسجد پر گواہی دی منکروں کو روسیاہی دی۔ چنانچہ
ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست براست بے کم و کاست کہ بعینہ مضمون اس کا موافق تحریر عاصی کے
ہے بارگاہ شاہی بندہ پناہی میں ارسال کی جب ضرورت تفصیل مہر گواہی مندرجہ کیفیت ہذا لکھی جاتی
ہے۔

تحقیقاتی رپورٹ کا خلاصہ

نقول مہر و گواہی مندرجہ کیفیت مرسلہ مولوی حفیظ اللہ و مولوی نہال الدین صاحب مرقوم ذیقعد ۱۲۷۱ھ

ابراہیم بیگ	سید بخش علی جعفری	حسین علی	مرزا جان
ساکن محلہ قنات فیض آباد سطور المتن واقعی است	زمیندار محلہ بیراں پور مضافات اودھ بیان واقع است	زمیندار محلہ قضیانہ یکے از اولاد مسے لطف اللہ مسجد بچشم خود دیدہ ام	علاقہ دار خاص محل مسجد ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام

سید باقی علی	عبد الحسین مرزا	آغا علی	علی مرزا
مسجد بچشم خود دیدہ ام	لا ریب فیہ	لا ریب فیہ	بیان واقعی است در بودن مسجد بر گڑھی شک نیست

گواہ شد چیدی این قوم بتولی اظہار محمد نولیسانیدہ است کہ بارہا مسجد را بچشم خود دیدہ ام

گواہ شد

محمد روشن خاں ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات آں بخوبی ذہن نشین دارم فقط

گواہ شد۔ محمد علی خاں ساکن اودھ خاص بعمر یکصد و چہار سال مسجد واقع گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

احمد علی	ساکن فیض آباد سوز خوان مسجد بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات و مقام و سمت آں بخوبی یاد دارم و بر محراب آں اسم یا اللہ نقش بودہ است ۔
سید محمد علی	مرثیہ خوان ساکن فیض آباد مسجد قناتی کہ بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بودہ بچشم خود دیدہ ام فقط
مرزا علی	ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات آں بخوبی یاد دارم فقط

اظہار دینی سنگھ چپڑاسی عدالت فیض آباد برائے ترقی حسب الحکم سرکار در عہد نیابت منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر بر ہنومان گڑھی رفتہ بودم مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

خدا فراموش، ناحق کوش

جب یہ کیفیت بارگاہ ہندوستان پناہ میں آئی اور چھوٹے درباریوں نے لاحظہ فرمائی۔ نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم یہ کیفیت جو دو لون مولویوں کی دو حرفی ہے اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا اور اپنی رعایا کو ستانا ضعف عملداری ہے بلکہ رعیت آزاری ہے آپ نائب سلطان ہیں آپ کے نزدیک برابر ہندو اور مسلمان ہیں۔ انصاف

یہ چاہتا ہے کہ راجہ مان سنگھ اور آغا علی خاں ناظم کو ارشاد ہو دے جا کے دیکھیں اس امر کو خوب چھانیں گو راجہ صاحب مدعی علیہ ہیں لیکن یہ ایمان کا مقدمہ ہے۔ نواب صاحب کو خود یہ منظور تھا نیت میں فتور تھا کیفیت کی جانب خیال نہ کیا ٹال دیا مگر مان سنگھ بے ایمان اور آغائی ننگ خاندان کو روانہ کیا۔ وہ دونوں خدا فراموش ناحق کوش جس وقت ادھر میں پہنچے مسلمانوں کو دھمکایا ہندوؤں کو سر چڑھایا کہ مسلمان بیچارے بقول شخصے قہر درویش بجان درویش صلح پر راضی ہوئے آخر آغائی اور مان سنگھ نے ایک اقرار نامہ اور صلح نامہ مفتوں سے لکھوا کے سرکار میں بھیج دیا کہ اب کسی طرح کا یہاں فساد ہندو اور مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔

لکھنؤ کے مسلمانوں میں اضطراب

جب اقرار نامہ اور صلح نامہ نواب نے ملاحظہ کیا مارے خوشی کے ہنس دیا اور کہا الحمد للہ جو ہونا تھا سو ہوا مگر اب فساد مٹ گیا غرض ایسی کچھ صورت ہوئی کہ نواب کے نزدیک جو خون مسلمانوں کا ہوا تھا اس کے انتقام کی نہ ضرورت ہوئی تب بعض علماء لکھنؤ کے کان کھڑے ہوئے ان کے ساتھ کچھ مسلمان کھڑے ہوئے ہمہ دیگر یہ کلام کیا کہ یہاں کے حکام نے اسلام کو سلام کیا آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے اگر ایسے ہی مسلمان بودے ہیں تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے ہر خانۂ خدا میں ایک ایک بت دھریں گے۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی و مولانا سید امیر علی

آخرش ارباب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب کو طفلی سے ہم ان کو ورع اور پرہیز میں کامل جانتے ہیں عبادت میں طاق ریاضت میں مشتاق شب بیدار تہجد گذار اور مولوی امیر الدین علی صاحب ساکن قصبہ امیٹھی کہ امور مذکور میں بمراتب بڑھے ہوئے ہیں نہ دن کو آسودہ ہو کے کھاتے ہیں نہ رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں دونوں صاحب بعزم جہاد مستعد ہوئے اور مولوی تراب علی اور مولوی محمد ظہور الحق اور مولوی حیدر علی مدظلہ سے مشورہ ہوا۔ سب نے فرضیت جہاد کا اقرار کیا اور کہا کہ جب تک ہنود سے مقابلہ نہ ہوا تھا اور مسجد بابری میں مقاتلہ نہ ہوا تھا تب تک فرض کفایہ تھا اب بے شبہ فرض عین ہے، ہمارے نزدیک اب ہنگام نفیر عام ہے

سید امیر علی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت

الغرض جب یہ پانچوں رکن رکین دین متین تابع شرع مبین خادم پنج تن وارث مسند رسول ذوالمنین ایک دل اور ایک زبان ہوئے۔ تب یہ خیال آیا کہ انھیں پانچوں میں ایک کو امام ٹھہرائیے اس کے حکم کو بجا لائیے آخرش باوجود انکار سب صاحبوں نے مولوی امیرالدین علی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اپنا امام کیا اور کہا کہ بالفعل آپ اور مولوی عبدالرزاق صاحب روانہ ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ سامان سفر کرکے ہم بھی دو ہی چار دن میں حاضر خدمت شریک رنج و راحت ہوتے ہیں پس سلطان المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے حسب تجویز ان سب صاحبوں کے یہ بات ٹھہرائی پنجشنبہ کو یہاں سے کوچ کرکے ایک دو مقام امیٹھی میں کیجئے اور بعد اجماع اور سامان جہاد فیض آباد میں چل کے انتقام لیجئے۔

فرنگی محل میں ہلچل

ادھر یہ مشورہ ہوا ادھر چہارشنبہ ہی کو شیطان کے کان بہرے کہیں سن بھاگا اور ان صاحب کو خبر پہنچائی جن کے نزدیک شہید کرنا مسلمانوں کا اور جلانا قرآن کا کچھ اصل نہ رکھتا تھا انھوں نے طرز حرکت کی شام ہے یہ شہرت کی کہ عزم مولوی عبدالرزاق کا چھپا نہیں ظاہر ہے ہر کس و ناکس اس سے ماہر ہے کوتوال نے سنا ہی ہوگا کسی نہ کسی نے کہا ہی ہوگا ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ دو گھڑی میں دوڑ آئی اور سارا فرنگی محل بے جرم و گناہ اسیر دام بلا ہو جائے ایسی لغو حرکت کرنا اپنے ساتھ سب کو فضیحت کرنا ہے ایسی ایسی باتیں کیں کہ سارے فرنگی محل میں ہلچل کیا کہیں بل پڑ گئے آرام کی صورت بگڑ گئی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوگا انجام اس کا برا ہوگا یا بھلا ہوگا ۔۔ ضعیفین لونڈی باندیاں کہتی تھیں دیکھیے کیا پیش آئے گا حاکم زیر و زبر کرے گا برے دن دکھائے گا۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کا عزم مردانہ

غرض ایسا کچھ منتر پڑھا کہ انھیں کا طوطی بولنے لگا۔ چھوٹا بڑا مولوی عبدالرزاق صاحب پر زبان طعن کھولنے لگا یہاں تک شور و غوغائے محشر برپا ہوا کہ یہ خدا دوست فرمانے لگے کہ یہ سب سامان فقط میرے روکنے کے واسطے ہوا ہے وہ ممکن نہیں میں خواہ مخواہ جاؤں گا۔ کافروں کو جہنم میں پہنچاؤں گا میرے نزدیک اور وقت دارالحرب ہے فرض عین حرب و ضرب ہے۔ ہاں صبح تک اگر میں نے قیام کیا پھر جانا دشوار ہوگی محمد مجبر روکنے کو تیار

ہوگا یہ سوچ کر کہ بینی و دگوش فقط ایک تیر بردوش لنگی کندھے پر عصائے پیری ہاتھ میں رمضان خدمتگار
ساتھ میں محلہ نرہی کو روانہ ہوئے امیر المجاہدین وہاں اترے تھے آدھی رات گذری ان کے پاس پہنچے
وہ توان سے زیادہ چلنے کے لیے آمادہ تھے گو سواری نہ تھی پیادہ تھے جس دم ارکیہ آراے سپہر جوش ان
بزرگوں کا دیکھنے مشرق سے نکل آیا یہاں کمربندی ہونے لگی خدا کی راہ میں قدم بڑھایا۔ ان علماء کی
سواری کا بیان قلم کی طاقت زبان کی قدرت سے باہر ہے۔

قافلۂ مجاہدین کی روانگی بیچ میں دونوں خورشید ماہ خدا کے پیارے ایک پنس پر سوار دوسرے
کی ران تلے راہوار نمازیوں کی قطار خدا کی قدرت نظر آتی تھی کو فرما
کی ہیبت سے جان جاتی تھی سب کہتے تھے اس فوج محمدی کی ایسی شان ہے کہ عقل حیران ہے
ایک ایک ان میں ہزار پر بھاری ہے۔ چہروں پر نور برستا ہے جو ان سے لڑے گا وہ ناری ہے۔
اسی شان و شوکت خاص جہاد کی نیت سے بحر مواج کی طرح لہراتے ہوئے رو بہ منزل ایلچی مبارک
میں داخل ہوئے سبحان اللہ وبحمدہ خدا اگر ایمان دے تو ان لوگوں کے قدموں پر انسان جان دے
حکم کی یہ منادی کہ کوئی بنیض آباد اور ادوھ کو حریم نہ کرے بے فائدہ رزم نہ کرے مگر ان اللہ والوں کو نہ کسی
تماری سے غرض نہ دوڑ دھوپ سے کام فقط خدا اور رسول کی خوشنودی سے طبیعت کو چین دل کو آرام تھا۔

محمدی جھنڈا ایک طرف محمدی جھنڈا ایک جانب لشکر قلیل بارعب وجلال پڑا نقارہ پر جس دم
چوب پڑتی تھی ہیبت سے برہمن کی لڑکی کلمہ پڑھتی تھی۔ غازیوں کا جماؤ سپہ گری کا بناؤ
کوئی ہیزم تا نہ تھا کوئی رستم کو پیر زال جانتا تھا۔

یہ تھے مجاہدِ اسلام خلاصہ یہ کہ اس جلسہ میں کیسا کیسا نوجوان اور کیا کیا شیخ زادہ باشوکت و شان تھا
مولوی عبدالرزاق صاحب کہ افسر غازیان نامدار تھے سب کے سردار تھے ہمہ
صفت موصوف دیار و جوار میں معروف میں ہمراہ ان کے محمد خورشید حسین مجاہدان بدر و حنین کے ہم پہلو بہادر
دوسرے حسام الحق مولوی نور الحق صاحب مرحوم و مغفور کے پوتے ہیں نام سے جلادری عیاں ہے۔
تیسرے لمعان الحق مولوی برہان الحق کے فرزند دلبند جن کی پیشانی سے شجاعت کا نور چمکتا ہے ہر دم بیرا

شہر امام کا منہ تکتا ہے کہ اجازت پاؤں اور ہوا کی طرح اودھ کو جاؤں چوتھے محمد شیخ سرفراز احمد کی چراغ عالی دماغ کاکوری کے رہنے والے جنائیں پہننے والے پانچویں عبدالغفار مولوی عبدالجامع کے نورالابصار سلیقہ شعار خوش کردار جوان صالح، جرار اور ماسوا ان کے اسی طرح کے کتنے ہی جوان نادر روزگار باوقار تھے۔

علی نقی خاں کی برہمی

اب یہاں کا حال سنیے۔ ادھر جناب امیرالمجاہدین اور مولوی عبدالرزاق کا جانا ادھر سامنے لکھنؤ میں قیامت کا آنا ہر مسلمان نے جہاد پر کمر باندھی کافر کشی پر تیغ دم باندھی جس کو دیکھئے راہی ہے عازم نوراہی ہے جب یہ خبر نواب علی نقی خاں کو پہنچی کہ علما فرنگی محل بھی جہاد پر آمادہ ہوئے یہ سنتے ہی پریشان حد سے زیادہ ہوئے اور مولوی مفتی محمد یوسف کو بلا کے استفسار کیا کہ فرنگی محل میں کن کن صاحب نے یہ فساد اٹھایا ہے؟ ہم تو اس خاندان کو بہت مانتے ہیں۔ برائے خدا اور رسول جلد جائیے فتنۂ خوابیدہ نہ جگائیے ہنگامہ کو مٹائیے نشیب و فراز دکھا کے امیٹھی سے پھیر لائیے وہ جو فرنگی محل میں آئے اور غیظ و غضب نواب کی خبر لائے پھر تو گویا مولوی عبدالرزاق کے گھر پر قیامت کبریٰ آئی نصیحت اور ملامت کیا کیا نہ کی مفتی صاحب نے بھی زبانی کوئی بات اٹھا نہ رکھی اپر ان کی حمیت اور جیا دساز نہ رکھی۔ وہ تو امیٹھی پر کرکے اپنے گھر سیدھے ہی کو تشریف لے گئے۔

نفسا نفسی کا عالم

اب دوسرے صاحب کا عمل ہوا گویا دشمنوں کے دماغ میں خلل ہوا آدھی رات تک دوڑ کی خبر گرم رہی۔ دروازے کی طرف سب کی نظر رہی اور مولوی عبدالحق کے اہل و عیال کو گنہگاروں کی طرح چھپا کے اپنے گھر لے گئے مکان میں قفل دے گئے۔ ہر شخص ہمت ہارا تھا جیسی مولوی عبدالرزاق نے ڈاکہ مارا تھا اور اساب کا عجب حال تھا اٹھانا محال تھا آدھا گھر پہنچا تو نصف راہ میں رہا اور کہیں چھپانے کا قصد کرتے تھے تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے رکھتے تھے ہمارے گھر میں نہ لانا ہمیں اس آفت سے بچانا کیا ہمارا گھر بھی لٹوا دو گے کوئی طعنہ سے کہتا تھا کیا تم بھی جہاد کو جاؤ گے؟ قصہ کوتاہ اسی حیص بیص خوف و رجا میں اوقات گذر گئی چار پہر رات گذر گئی نہ سوار آئے نہ پیاسے نظر آئے۔

شاہی پیامبر

نور کے تڑکے حسب الحکم نواب نقیر اللہ رفیق شرف الدولہ غلام غضنفر ی الاصل بلا فصل اور میر صفدر علی چکلہ دار حیدر گڑھ امیٹھی کو روانہ ہوئے مطعون زمانہ ہوئے دیکھنے والے کہتے

ر کہ مجاہدین کو پھیرنے جاتے ہیں دیکھئے کس طرح لاتے ہیں لیکن اتنی خیر گذری کہ دونوں صاحبوں نے کچھ
رائے کو دخل نہ دیا بکمال نرمی فقط ابلاغ حکم سرکار کیا کہا حضور عالم کا ارشاد یوں ہے کہ تم کو اضطراب
ں ہے ؛ پہلے تدارک اس کا ہم پر واجب ہے اگر خدانخواستہ ہم اس امر دینی میں کچھ سہو تہی کریں اس
ت تم کو مناسب ہے امیر المجاہدین نے بھی بکمال لطف ان سے خطاب کیا مناسب وقت کے جواب دیا آخر
ئی امر طے نہ ہوا گو انھوں نے بہت التیام کیا ناچار فوج محمدی سے علیحدہ کسی باغ میں قیام کیا۔

کارملائی سبیل اللہ فساد اب پھر چند فقرے یہاں کے سننا چاہیئے داد سخن دیا چاہیئے کہ بعض مولویوں نے میدان خالی پا کے نواب کے پاس جا کے سارے عالم کو برا
راپ کو بھلا بنا کے صاف کہہ دیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے کتب فقہ میں یوں ہی آیا ہے جو فرض عین کہتا ہے خطا
ہے شاید قتل بندگان خدا ناحق مدِ نظر ہے بلکہ یہ معرکہ جو ادھر میں گذرا ہے مطلق جہاد نہیں وہاں تو لڑنا
بھی نا روا ہے وہاں تو جہاد کی شرط نہیں پائی جاتی وہ دارالحراب کب ہے۔ بیراگی ہنومان گڑھی کے مطیع الاسلام
ہیں جس کا جی چاہے ہم سے گفتگو کرلے مناظرہ آپ کے روبرو کرے آپ اتنا تردد ناحق فرماتے ہیں کیوں غصہ
کھاتے ہیں اگر سرکار ہم کو خلعت اور زادِ راہ دے کے فیض آباد کو روانہ کرے ابھی علی آباد میں جا کے رہتے ہیں ایسا
وعظ کہتے ہیں کہ لوباٹ جاتا ہے ایک شخص وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ غرض ایسا کچھ تڑاق پڑاق باتوں سے سبز باغ
دکھایا کہ نواب نے دوشالہ اور رومال کوٹی میں پچیس روپیہ کا منگا کے اسی وقت اڑھایا اور سو روپیہ نقد چلنے کی
زبانی دلوادی۔ یہ تو خلعت پہن کر ایسے خوش ہوئے گویا سلطنت ملی بڑی دولت ملی۔

اصحاب فیل اپنا قلم تھراتا ہے کاغذ کا سینہ پھٹا جاتا ہے کیفیت لکھنا دشوار ہے ان کا دربار سے نکلنا اور گھر کی طرف چلنا دم بھر میں سارے شہر میں خبر منتشر ہوئی دنیا زیر و زبر ہوئی۔
انگشت نمائی ہونے لگی۔ اشعار ہجو برملا ہونے لگے جو جس کے دل میں آتا تھا بے تکلف زبان پر لاتا تھا الغرض
سامان سفر جو اسنتھ لے جاتا عزیزوں کا مدنظر ہوا ہاتھی تعینات ہوا اصحاب فیل بنے عقل پہ پتھر پڑے طوعاً و کرہاً
ابابیل بنے۔ مبارکیوں سے صحت ہوئی بلا قید کے اہانت ہوئی۔ ہر روز یہ ہاتھی پر چڑھ کے جانے لگے

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کی واپسی

وہاں امیٹھی میں بعد قیل وقال ایک دو روز میر صفدر علی اور پڑھے نہ لکھے نام مولوی محمد فاضل نے یہ نوشتہ لکھ دیا اور زبانی بھی بحلف اقرار کیا کہ اگر مسجد ثابت ہوگئی نواب صاحب بہادر اسی وقت بنوا دیں گے اور بیراگیوں سے بے ادبیوں کا انتقام بھی لیں گے اور اگر ثابت نہ ہوئی مجبوری ہے بیراگیوں کی بے قصوری ہے شکایت نہ کیجئے گا جہاد کا نام پھر نہ لیجئے گا اس عہد پر وثوق کرکے مولوی عبدالرزاق مع اعوان وانصار اپنے گھر کو آئے مگر امیر المجاہدین تشریف نہ لائے۔ مولوی عبدالرزاق نے حسب الطلب نواب صاحب سے ملاقات کی اور ہنگام استفسار حرف وحکایات کی لیکن وہی تبور رہی جہاد فرض عین زبان پر رہا ایسی تقریر دل پذیر کی کہ خروج واجب ہر مسلمان پر رہا۔

مولانا عبدالرزاق کا شاہی خلعت قبول کرنے سے انکار

خلاصہ یہ ہے کہ خلعت دیتے ہیں نواب نے بہت اصرار کیا مولوی صاحب نے انکار کیا رخصت ہو کے مکان پر آئے کلمات حسرت وافسوس زبان پر گئے دو ایک بار اور دربار گئے مجبوری ناچار گئے جب نواب تعمیر مسجد میں حیلے حیلے کرنے لگے تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے جی چاہا کہ پھر عزم کریں سامان رزم کریں لیکن مردمت شہر سے نکلنا دشوار تھا کہ لوہے کے پل اور ناکجات پر بندوبست سرکار تھا۔

امیر المجاہدین سے واجد علی شاہ کی ملاقات

جب مولوی عبدالرزاق کے پھر آنے پر بھی اہلکاران سرکاری کا اطمینان نہ ہوا تو منشی امیر سید بشیر الدولہ بہادر خواجہ سرا کو روانہ کیا کہ ایسا کچھ نشیب وفراز دکھاؤ کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لاؤ چنانچہ حسب الحکم امیر حیدر نے امیٹھی میں جاکے جناب ممدوح سے عہد وپیمان کیا۔ مولوی صاحب نے بھی اصرار نہ زیادہ کیا لکھنؤ کا ارادہ کیا خلاصہ یہ کہ دو تین دن کے بعد امیر المجاہدین منشی امیر حیدر کے ساتھ ناکے تک پہنچے اور وہاں سے بشیر الدولہ بہادر کے ساتھ کہ وہ استقبال کو گئے تھے تشریف لائے اسی آن بان سے مع سپر وشمشیر اپنے مجاہدین کو ساتھ لیے ہوئے نواب صاحب کے پاس آئے۔ نواب صاحب کی مروت اور اخلاق چھپا نہیں ہے وہ خاطر داری کی کہ جتنے حضار مجلس تھے دنگ ہوگئے سب کے زرد رنگ ہوگئے۔

امیر المجاہدین کا بھی وہ رعب چھایا کہ سارا دربار تھرایا۔

امیر المجاہدین اور واجد علی شاہ کی گفتگو

پہلے کشتی خلعت کی منگائی اور اس کے ساتھ پانسو روپے کی تھیلی آئی در گفتگو باز ہوا قصہ دنیا سازی بلکہ دم بازی کا آغاز ہوا۔ نواب نے فرمایا سرکار تمھارے عزم بالجزم سے کہ ہمہ تن خدا کی راہ میں جان دینے کو موجود ہو۔ بہت رضامند ہے نہایت خرسند ہے کار مردانہ کرنے ہو خدا کی راہ میں قدم دھرتے ہو خلعت پہنیے، روپیہ لیجئے چندے بسر کیجئے انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بشرط ثبوت تعمیر خانہ خدا ہو جائے گی جھنوں کو سزا مل جائے گی امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام ہے۔ اس خلعت کا بدانجام ہے کہیں کے عامل نہیں تحصیلدار نہیں مصاحب نہیں سپہ سالار انھیں خلعت لے کے کیا کریں آپ کو اوروں کی طرح کیوں رسوا کریں یہ خلعت اور انعام نہیں ایمان فروشی ہے دنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصت جہاد ہو۔ اجازت سفر فیض آباد ہو کہ بیراگیوں سے انتقام خون ہر فرد مسلمان اور بے ادبی ہائے قرآن لیں۔ نواب نے جیسا بعض علماء سے سنا تھا فرمایا کہ یہ جہاد نہیں۔

دربار واجد علی شاہ میں امیر المجاہدین سے مناظرہ

تھوڑی رد و قدح ہوئی تھی کہ ناگہاں وہی صاحب کہ اسی بات کا خلعت پہنے ہوئے بیٹھے تھے، باشارۂ حضور دور سے نزدیک آئے اور تائید کلام حضور زبان پر لائے کہ واقعی فرض عین ہونا جہاد کا کتب فقہ میں دیکھا نہیں خصوصاً ہندوؤں کی زیادتی کا کچھ لکھا نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ سبحان اللہ آپ کو عبارت شرح وقایہ کی بھی ذہن نشین نہیں ان هجموا تخرج المرأة والعبد بلا اذنهما پھر یہ کس طرح کہتے ہیں کہ جہاد نہیں۔ اس میں کلام چند در چند ہوئے آخر کو بند ہوئے اور کہنے لگے کہ بالفرض اگر فرض بھی ہو تو شرط امامت ہے کہ اولی الامر منکم قرآن کی آیت ہے۔ امیر المجاہدین نے پھر خطاب کیا اور یوں انھیں لاجواب کیا کہ ہمارا امیر کوئی نہیں کس واسطے کہ یہاں شرطیں امارت کی مفقود ہیں چھوٹی سی یہ بات ہے کہ بڑے صاحب موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں صاحب کے باختہ ہوش ہوئے۔ امیر المجاہدین خاموش نہ

ہوئے بعض کہتے ہیں کہ مولوی خادم احمد صاحب نے یہ کہا کہ فرضیت جہاد سے ہم کو انکار نہیں بلکہ ہم نے ہی تو آپ سے بیعت کی تھی۔ بندہ بھی عازم ہے مگر بجا آوری حکم حاکم کی لازم ہے تھوڑے دن دیکھیے اگر باسانی تعمیر خانہ خدا ہو گی مشرکین کو سزا ہو گی تو پاؤں پھیلا کے گھر میں سو ئیے۔

نواب نے بھی ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی ——— کیوں کرتے ہیں ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں قابو نہیں "صاحب کلاں" سے مجال گفتگو نہیں۔ جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے دل کباب ہو گیا ہے کلیجہ پھٹتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا کلام یاد نہیں دیر آید درست آید۔ آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں روانگی میں تساہل کریں ہم حکمت عملی سے مسجد بھی بنوا دیں گے اور انتقام بھی بے ادبیوں کا لے لیں گے۔ اس بات پر امیر المجاہدین باوجود اصرار خلعت وغیرہ سے انکار کر کے نواب کو سلام کر کے معہ مجاہدین مسجد مقبرہ امجد علی شاہ میں بانتظار حکم نواب ٹھہرے۔

امیر المجاہدین کا جوشِ جہاد

لیکن امیر المجاہدین کو عجب طرح کا جوش تھا اور ہر مجاہد بھی مئے اشتیاق جہاد سے مدہوش تھا ہر دم یہی چاہتے تھے کہ جس طرح ہو آپ کو فیض آباد اودھ میں پہنچائیں اور خدا کی راہ میں جوہر شجاعت و جوانمردی دکھائیں۔

شیعہ بھی امیر المجاہدین کے ساتھ تھے

حاجی بشیر الدولہ بہادر باایں ہمہ کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگواتے تھے۔ آٹھ پہر انہی کی خاطرداری میں رہتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو اور دین کی دھوم چار سو رکھے۔ اس خدادوست کی عزت پر حرف نہ آوے۔ جو اس خمسہ بجا نہیں حامی خدا کے سوا دوسرا نہیں گو اکیلا ہو لیکن اس بزرگ کے واسطے جان پر کھیلا ہوں اکثر خود تشریف لاتے تھے اور مولوی صاحب کی تسکین فرماتے تھے۔ بہ چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے اس امر دینی میں ساتھ دیجیے مگر چار و ناچار مسجد سے اٹھ جاتے تھے۔ ایسا ملال تھا کہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے دنیا کے کام سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس ملال سے آنکھوں میں اندھیرا تھا دو دو پہر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ سلطان عالم سے بھی موقع پر ذکر آ جاتا تھا لیکن نواب کے خوف سے

زبان دبا جاتا تھا جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار بھی اور ہوتے تو کاہے کو مسلمان مسجد کو روتے۔

عبرت انگیز واقعہ

دہم ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ قدسی کو سر شام مولوی خادم احمد صاحب کی آفت ارضی عالم تہ و بالا ہوا بدنام رومال اور دوشالہ ہوا۔ دم بدم مرض بڑھتا تھا دم چڑھتا تھا۔ رگ رگ میں نیش غم تھا۔ آشنا خویش و اقربا نے دوڑ دھوپ میں کیا کیا نہیں لیکن مرض الموت کی دوا نہیں نہ نواب کام آئے نہ روپیہ پیسہ کام آیا جو کچھ کیا تھا سامنے وہ کام آیا ۱۲ تاریخ ظہر کے وقت پیک اجل کو لبیک کہہ کے سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے سیدھے جنت الماوا کی راہ لی مورد رحمت الٰہی ہوئے گنہگار ہیں بے گناہی ہوئے سب بکھیڑا ایڑا اگیا جبرت کے عالم میں کوئی بیٹھ کوئی کھڑا رہ گیا۔ اس مرگ ناگہانی سے سب کو حیرانی ہوئی۔ عبرت کی نشانی ہوئی آخر جنازہ لے کے چلے سینکڑوں آدمی ماتم کرتا ہوا ساتھ تھا کوئی نالہ و آہ کرتا تھا کسی کی زبان پر ہیہات ہیہات تھا ہندو مسلمان روتا تھا لیکن وہ بھی ذکر ہوتا تھا۔ ناچار نماز پڑھ کے پیوند زمیں کیا۔

امیر المجاہدین کی دوبارہ روانگی

جب امیر المجاہدین کو مسجد میں بہت دن بسر ہوئے تعمیر مسجد کیسی نواب کو کبھی جھوٹ بھی دھیان نہ آیا کہ کسی کو ٹھہرایا ہے کیا وعدہ فرمایا ہے اور مجاہدین کا تقاضا شدید ہوا جماعت قدیم کے سوا اور بھی بہت اہل اسلام بہ نیت جہاد آئے کہنے لگے ہم ایسے جھوٹے وعدوں سے بہت گھبرائے اب مناسب ہے کہ چلیے اس منحوس شہر سے نکلیے۔ ناچار مولوی صاحب نے رخصت کے باب میں اصرار کیا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ دینداری کارگزاروں سے مفقود ہے مسجد کے نہ ہونے کا اب تک گمان ہے کیفیت اور محضر مرسلہ مولوی نہال الدین و مولوی حفیظ اللہ خاں ہے۔ بشیر الدولہ نے بھی کہا تعمیر مسجد ان لوگوں کے ہاتھ سے دشوار ہے حیلہ انگریزی ان کا شعار ہے چلیے انشاء اللہ تعالیٰ ہم بھی آتے ہیں بلکہ دیانت الدولہ بہادر کو ساتھ لاتے ہیں۔ گھڑی بھر میں گڑھی کو تاخت و تاراج کریں گے۔

مولوی مسیح الزماں کا ایثار

نعمہ مختصر نوز دہم ذیحجہ سن مذکور کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے اسی شان و شوکت جاہ و حشمت سے نصر من اللہ فتح القریب پڑھ کر کوچ

کیا اور مولوی مسیح الزماں صاحب ایمان صاحب اپنا کارخانہ بنا بنایا بگاڑ کے دنیا سے دل سے منہ موڑ کے بہ نیتِ خاص جہاد کان پور سے آئے تھے وہ بھی مولوی صاحب سے بیعت کر کے ہمراہ ہوئے۔ ان کی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے گروہ مسلماں کا موج در موج آنے لگا لشکرِ اسلام دریا کی طرح لہرانے لگا۔ بابِ ترک و اختتام قریب شام امیٹھی شریف میں داخل ہوئے وہاں سے بھی بہت مسلمان لشکر میں شامل ہوئے شب کے شب آرام کر کے بفضل خداوندکریم بحفظ مستقیم فیض آباد کو راہی ہوئے۔

حکم امتناعی

۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ تھی کہ اہلکاران سرکاری کو اجازت ملی کہ جاؤ اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو لاؤ آگے بڑھنے نہ پائیں ہنومان گڑھی پر چڑھنے نہ پائیں کسی طریق سے راہ میں روکو چنانچہ میر مسند علی اور رمضان علی ان کی نائب اور رودرسن کا بیٹا نصرت جنگ نواب کا مصاحب اور محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور میر محمد حسین کا کلکٹر سحر گفتار اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد اس عہدے پر معمور ہوئے۔

ناحق چوٹ جولاہا کھائے

سرکاری لوگوں پر لشکرِ اسلام کا ایسا رعب چھایا مارے ڈر کے کوئی فوج محمدی کے گرد نہ آیا سب ٹھٹک کر رہ گئے۔ محمد حسین کلکٹر اور تہور خان اور شیخ حسین علی وغیرہ بڑے بڑے تھے نہ جا سکے۔ لشکرِ اسلام سے دو رمقام کیا کسی اور کی معرفت پیغام سلام کیا۔ اگر اجازت ہو تو ہمیں بھی آپ کی زیارت سے سعادت ہو یہ لوگ تو اسی فکر میں ہے رہ جو مثل ہے ناحق کی چوٹ جولاہا کھائے کر گہ چھوڑ تماشے جائے صادق ہوئی۔ رمضان علی اور عامل نواب گنج کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ یہ دونوں آگے بڑھے غازیوں کے منہ چڑھے چاہا کہ امیر المجاہدین سے ملاقات کریں۔ لوگوں نے آنے نہ دیا آگے قدم بڑھانے نہ دیا۔ جب امام المجاہدین سے اجازت ملی ہتھیار سب کے لے لیے یہ سب نہتے روبرو پہنچے جس دم مولوی صاحب سے گفتگو روبرو ہونے لگی دم تقریر کڑے کلمے زبان پر لائے کہ سبحان اللہ آپ دو تین سو جولاہے لے کے گڑھے کھودنے چلے ہیں۔ خوب حوصلے ہیں وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اگلوں کی طرح جان دے دو گے اور کیا ہوگا اسلام کا ضعف عیاں ہوگا بُرا ہوگا اتنا کہنا تھا کہ آفت آئی یہ بنس کہتے ہیں کہ سوائے ہشت و مشت کے زد و کوب کی نوبت

آئی۔ آخر کو ذلیل و خوار ہوئے دونوں آدمی گرفتار ہوئے۔

نئی چال نیا جال

الغرض باغی تو جب مجبور ہوئے تو عذر کرنے لگے دل میں بغاوت ظاہر میں زنانت کا دم بھرنے لگے کہ ہم لوگ ملازم سرکار ہیں لیکن ایمان سے آپ کے تابعدار ہیں۔ سرکار فیض آثار کو منظور ہے کہ آپ ایک مہینہ اندمال فرمائیے۔ اگر اس مدت میں مسجد تعمیر ہو گئی نہو المراد ورنہ بے تکلف فیض آباد کو جائیے اور ایام موعودہ تک آپ جماعت کے ساتھ سہالی یا فتح پور میں بسر کریں۔ جو کچھ کھانے پینے میں آپ کے صرف ہو گا وہ سرکار سے ملے گا اور ہم بھی عہد کرتے ہیں، بلکہ قرآن مجید پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ اگر اس میعاد کے اندر مسجد نہ بنوائی تو انشاء اللہ ہم بھی آپ کے شریک حال شامل جدال و قتال ہوں گے۔ جب ان سب نے کئی دن تک بہت باتیں کیں وہ بھی غلط قسمیں کھائیں تب سلطان المجاہدین بھی سمجھے کہ حاکم سے لڑائی ضرور نہیں اور مہینہ کچھ دور نہیں بعد بیتنے کے سمجھ لیں گے پھر ایمان سرکار کہیں گے یہ سوچ کے حسین علی کے ساتھ سہالی میں کہ ملا قطب الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مدفن ہے رونق افروز ہوئے مشغول عبادت خدا شب و روز ہوئے اور مولوی مسیح الزماں صاحب نہور خاں کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے اور انھیں کے ساتھ دو چار بار نواب کی خدمت میں گئے آئے۔ نواب نے تعمیر مسجد کے باب میں ایسے کچھ میٹھے کہ جیسے تقریر سابق تو فقط چرب زبانی جھوٹی کہانی تھی آخر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کر کے چلنے پر سب کو آمادہ کیا آپ سہالی کا ارادہ کیا۔

راجہ مان سنگھ کے جاسوس

سہالی میں ایک روز تین فقیر بھیک مانگتے ہوئے دستہ فوج اسلام کی طرف سے گذرے۔ غازیوں نے قرائن سے دریافت کیا کہ یہ زنار دار ہرگز ہیں دشمن ہیں ایسے ہی غمازی کا جامہ پہنے ہیں۔ اس گمان سے ان بت پرستوں کو تنگ پکڑا اور تازیانہ کی ادر مار زنرہ ورخ کیا مار سے بھوت بھاگتا ہے اور لکڑی کے بل بندر ناچتا ہے جب خون کے فوارے بدن سے نکلنے لگے تب ہاتھ باندھ کے کہنے لگے ہم راجہ مان سنگھ کے نوکر ہیں خفیہ اخبار پر مقرر ہیں جیسا کیا تھا ویسا بھر پایا اب اگر آپ سے مخلصی پائیں گے ترقی جماعت کی دعا مانگتے چلے جائیں گے۔ اس کی خبر امیر المجاہدین کے گوش زد ہوئی فرمایا کہ کان مروڑ دو اور چھوڑ دو ہمارا خدا مددگار ہے راجہ مہاراجہ کیا نابکار ہے۔

مسیح الزماں کی بے وفائی اب کی بار مولوی مسیح الزماں بعد ملاقات اہالیان سرکار جب سہالی بن گئے خدمت فیض درجت میں کچھ عجب حالت اور کیفیت میں پہنچے۔ ظاہر میں ت باطن میں خلاف بہنے لگے۔ مجاہدین کو بہکانے لگے۔ نفاق کی باتیں کرنے لگے۔ اپنا گروہ الگ جمایا لیکن وہ لوگ سیدھے مسلمان جلد ہوشیار ہو گئے۔ آخر جب ان کو بالکل بہکا ہوا پایا تب یہ مشورہ ٹھہرایا کہ لشکر اسلام سے خارج کرو پھر ان کا نام نہ لو اپنا سامنہ لیے چلے آئے۔ سبحان اللہ و بحمدہ مسیح الزماں کا وہ آغاز تھا کہ ملا الہام لشکر اسلام مشہور ہوئے۔ انجام یہ ہوا کہ لوگ نفرین کرنے لگے۔ یہ کبھی نمک حرام مشہور ہوئے۔

مولوی تراب علی و مولوی عبدالرزاق جب مسیح الزماں کی کجروی کی خبر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب کو پہنچی کہ وہ اسی نیت سے سندیلہ کو تشریف لے گئے تھے۔ گو ابھی تک سامان درست نہ ہوا تھا لیکن سیدھے سہالی کو روانہ ہوئے پھر تو مجاہدین کو بڑی تقویت ہوئی بہت قوت ہوئی اور اکثر مسلمان ان صاحبوں کے باعث شریک لشکر اسلام ہوئے۔ جو کوئی سنتا تھا کہ ہمارے پیشواؤں نے حکم نفیر عام دیا ہے اور بقصد اودھ سہالی میں مقام کیا ہے چلنے کا سامان کرتا تھا اور جو کوئی جانے سے معذور تھا مگر زردار صاحب مقدور تھا وہ سلاح وغیرہ اسباب حرب حاضر کرتا تھا یوں تسکین خاطر کرتا تھا جس وقت ایام موعودہ میں دو ہی ایک دن کا باقی زمانہ رہ گیا۔ امیر المجاہدین نے مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق وغیرہ سے کہا کہو اہالیان سرکار کو اب کیا عذر باقی رہا وہ ٹالتے ہیں خواہ مخواہ حیلے نکالتے ہیں۔ آمد سرما ہے ٹھنڈی ہوا ہے۔ صاحبو ہم تو بسم اللہ کرتے ہیں ان لوگوں کو عذر تھا تابعدار تھے سب کے سب کہنے کے ساتھ ہی تیار تھے۔ تاریخ روانگی مقرر ہوئی تیاری لشکر ظفر پیکر ہوئی۔

طفل تسلیاں جب خبر کوچ مشہور ہوئی پھر یہاں کے حکام کو اضطرار ہوا امیر المجاہدین کے توقف میں اصرار ہوا پہلے ادھر ان منگرہ کو فیض آباد اودھ کی طرف روانہ کیا کہ جلد جاکے مسجد بنواؤ اور اگر کچھ مسجد کی اثبات میں شبہ ہو تو مفتنوں کو درِ دولت پر رستگاری کے واسطے لاؤ۔ غرضیکہ زبانی جھوٹ موٹ تہدید کی اور دھمکایا اور ایک دوشالہ رومال بہت بہتری منگا کے اوڑھایا اس نے بھی جی میں کہا چلو مفت میں لگا گر اشتیان کر حضور عالم کی مہربانی ہے۔ لطف زندگانی ہے اب کی اگر آؤں گا تو ایک دو بہنت کو بھی ساتھ لیتا

آؤں گا کیا نقصان ہے میرا حامی ہنومان ہے۔ ایسی احمق سرکار کہاں رہے گی عین عشرہ میں تو دوشالہ رومال عنایت ہوا ہے ہنگام سرفرازی شاید حکومت ہندوستان مٹے گی اور ادھر افسران فوج کو حکم ہوا کہ پھر مولوی امیرالدین علی صاحب کی خدمت میں جاؤ اور بکمال تملق و چاپلوسی سمجھاؤ جس طرح بن پڑے متوقف کرو یہاں تک کہ سر بھی ان کے قدموں پر دھر دو کہنا کہ اب عزاداری محرم سے فراغت ہوئی ہے ماتم امام علیہ السلام سے فرصت ہوئی ہے تعمیر مسجد میں خوب اہتمام ہوگا ایک دم نہ آرام ہوگا بعض افسروں نے بطائف الحیل جانے سے انکار کیا۔

امیرالمجاہدین کی مصالحت پسندی

مگر بعض افسر سہالی کو پہنچے معاذ اللہ گویا غازیوں کی گوشمالی کو پہنچے لیکن اجازت حضور امیرالمجاہدین امام الانام حاصل نہ ہوئی بکمال عرض و معروض محمد نور خاں بہادر رسالدار اور مرزا قدرت اللہ بیگ جمعدار اور میر محمد حسین کلکٹر اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں کو روبرو بلوایا اور کہا اب کیا ہے جواب دیا کہ اگرچہ مقتضائے حمیت نہ تھا کہ آپ کی خدمت میں آتے اور پھر منہ دکھلاتے لیکن کیا کریں تابعدار ہیں حاکم کے فرمانبردار ہیں کیا مشکل ہے اگر آتے ہیں تو آپ سے شرماتے ہیں ورنہ روزگار سے جاتے ہیں اب پھر نواب صاحب بہادر نے آپ کو پیغام دیا ہے اور یہ عذر پیش کیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ماتم فرزند رسول مقبول تھا ہمیں عزاداری محرم میں مشغول تھے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب تھوڑے توقف میں بہت کام بن جائے گا بے تامل خانہ خدائے ذوالجلال والاکرام بن جائے گا چنانچہ مان سنگھ کو سوئے اودھ بھیجا ہے اگر وہ مسجد بنواتا ہے تو بہتر نہیں تو ہمیں مہنتوں کو لانا ہے کما ینبغی روبکاری ہوگی بہرحال مسجد کی تیاری ہوگی اب ہرگز تامل نہ ہوگا اس امر میں کسی طرح سے تغافل نہ ہوگا۔ آپ کو بھی مناسب ہے کہ مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو بطور رسالت و سفارت روانہ فرمائیے اب کہیں نہ جائیے ان کے سامنے بخوبی روبکاری ہوگی عیاں کیفیت ساری ہوگی۔ غرض ایسی کچھ باتیں بنائیں نشیب و فراز کی صورتیں دکھائیں کہ امیرالمجاہدین نے ان کی گفتگو بظاہر مصلحت آمیز و بباطن فتنہ انگیز سن کے توقف کیا اور تینوں مولویوں کو فقط پانچ دن کے وعدے پر مع عرض کے روانگی کا حکم دیا۔

چار ثالثوں کا واجد علی شاہ کی طرف سے تقرر

۲۷ تاریخ محرم الحرام ۱۲۷۱ھ تینوں مولوی کوٹلے لشکر اسلام سے مقام لکھنؤ میں داخل ہوئے دربار لو

میں شامل ہوئے وہ ایک منت بھی حسب الطلب آئے اور نواب نے احمد علی خاں اور مولوی غلام جیلانی اور مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی ثالث مقرر فرمائے۔

ہنمنتوں کے ساتھ شاہی سلوک لیکن عجب یہ ہے کہ ایک دن بھی دکھائے اسلام اور ہنمنتوں کو روبکاری پر مواجع نہ ہوا۔ نواب صاحب نے کچھ بھی خیال نہ کیا کہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کس کو پیغام لائے ہیں بلکہ ہنمنتوں کی تو قدر بھی ہوئی صوبہ منگھ کپتان کی پلٹن یا جگہ رہنے کے لیے لی۔ انھیں کے تلنگے حفاظت کے واسطے مقرر ہوئے۔

پھر حربہ کاری ظاہرا یہ پنچایت وغیرہ ٹھہرنا فقط ایام گذاری تھی مسجد ہونا کسی طرح منظور نہ تھا چاہتے تھے کہ یہاں تک مولوی صاحب کو روکیے کہ جماعت ٹوٹ جائے۔ مسیح الزماں کو دوں چیٹر الباعلماء کو دکالت کے بہانے سے بلالیا اب کیونکر جماعت کم نہ ہوگی۔ الغرض وردغ گو راحافظہ نباشد نہ پنچایت ہوئی نہ مسلمانوں کی حمایت ہوئی والائے لشکر اسلام بھی نواب کی عدم توجہی دیکھ کے تھک کر بیٹھ رہے۔ پانچ دن کا وعدہ کرکے آئے تھے کئی مہینے گذر گئے مگر یہ نہ سوئے لشکر ظفر پیکر گئے۔ حاکم کے خوف سے دل کچ ہوئے بعض اشخاص بر عام کہتے تھے کہ یہ لوگ اس بہانے آئے ہیں ان کا جانا دشوار ہے۔ یہاں سے کہ غدکے گھوڑے دوڑائے گئے نامہ و پیام سے امیر المجاہدین کو تسکین فرمانے لگے۔ تنصیہ کو لشکر اسلام نے سہالی سے کوچ کیا۔ زمین نفرانی تھی ہاتھی پر لشکر کا نشان ہم پہلوئے آسمان نشان وشکوہ کوئی پیادہ کوئی سوار کر بے شمار کوئی اپنا گھوڑا کودا تا تھا کوئی پیادہ پائی ہے مائے جرأت کے اکڑا جاتا تھا غلب گاہ میں سلطان المجاہدین کی پالکی نشانی اقبال کی آگے آگے کے والا ہتوں کے غول بطور نقیب قصائد مدح رسول الثقلین امام الثقلین پڑھتے چلے جاتے تھے کس ملاحظہ اور ادب سے قدم بڑھاتے تھے۔

مجاہدین کی دہشت اجب شان وشوکت لشکر اسلام کی خبر یہاں عام ہوئی گھر گھر پہنچی بستی لکھنؤ کی اطلاع فی ہوئی۔ ہندوؤں کے ہوش باختہ ہوئے بدحواس سب الوکی دم فاختہ ہوئے بعضیں جب کہنے لگے۔ حاکم سے رعایا تک ہر بشر درد مند ہوا یہ اندھیر ہوا کہ پہروں سے مرافعہ بند ہو کوتوال پر تہدید ہوئی تاکید تشدید ہوئی کہ شہر سے خبردار رہنا اپنے کام سے ہشیار رہنا لٹ جانے کا ڈر ہے

بادشاہ کا اضطراب

اگر صبح کو خبر آئی کہ ہزار مجاہد جرار ہیں تو شام کو پرچہ لگا کہ دو ہزار ہیں تب تو نواب کو کمال اضطراب ہوا کہنے لگے کہ یہ گھر خراب ہوا اب یہ انبوہ کب رکے گا صفائی ہو جائے گی۔

بادشاہ کی مجتہدوں سے گفتگو

آخر اسی اضطراب میں طرفہ تدبیر عقل میں آئی یا کسی استاد نے سجھائی کہ مسئلہ جہاد میں اختلاف ہے۔ آپ کیوں بکھیڑا سر پر لیتے ہیں عاملوں کو کیوں نہیں حکم دیتے ہیں وہ ابھی چلے جائیں سب کو پھیر لائیں۔ یہ سنتے ہی نواب بحال ہو گئے اور سب ملال ہو گئے۔ پہلے نواب نے سلطان العلماء سید محمد اور سید العلماء میرن صاحب دونوں مجتہدوں کو بلوایا اور فرمایا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ باعث فروغ مذہب اثنا عشری خاندان ابو المنصور خاں مرحوم ہے نیز اجتہاد اسی خاندان سے چکا ہے یہی خاندان سبب تمہاری جاہ و حشم کا ہے خصوصاً سعادت علی خاں کی اولاد نے تمھیں سر چڑھایا ہے۔ امجد علی شاہ نے تمہارا رتبہ بڑھایا ہے اگر یہ گھر نہ ہوگا تو آپ کو یہ رتبہ میسر نہ ہوگا آپ اس گھر کو مٹاتے ہیں مولوی امیر الدین علی صاحب کو رغبت جہاد دلاتے ہیں۔ لوگ آپ کی تحریص اور ترغیب سے چلے جاتے ہیں اب آپ کو مناسب ہے کہ جائیے اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لائیے مجتہد نے تخلیہ کر کے جواب دیا کہ لاحول ولا آپ کا کیا خیال کدھر ہے شاید کلام عوام پر نظر ہے ہمارے نزدیک ہنود اگرچہ بت پرست ہیں لیکن ذمی مطیع اہل اسلام ہیں۔ خروج ان پر روا نہیں مذہب امامیہ میں بدون امام جہاد جائز نہیں۔ لیکن اگر ہم منع کرنے جائیں کلمات افہام و تفہیم زبان پر لائیں گمان کیا ظن غالب ہے کہ مبادا مضمون دستخط سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں کو ہدف تیر جہاد بنائیں۔ اس صورت میں آپ بدنام ہوں گے مطعون خاص و عام ہوں گے مناسب ہے کہ علمائے سنت و جماعت کو افہام کے واسطے روانہ کیجئے۔

علماء آلۂ کار بنائے گئے

غرض نواب کو ایسا معقول کیا کہ انھوں نے بے عذر قبول کیا اور اسی وقت سب عاملوں کو حکم پہنچا کہ جلد جاؤ اور جس صورت سے ممکن ہو اس فتنہ کو مٹاؤ تمھارے واسطے بہت فروغ ہوگا۔

یہ حکم سنتے ہی ان لوگوں کے دل کی کلی پھول گئی، علماء کو خدا کی کتاب پیغمبر اسلام کی حدیث بھول گئی کتابیں کھلیں روایات ضعیفہ کے لیے، ورق الٹنے لگے، جناب مولوی سعد اللہ صاحب اور جناب مفتی محمد یوسف صاحب مدظلہما نمک خوار سرکار تھے جیلۂ شرعی بھی بھولے حکم کے ساتھ تیار رہتے مگر ان لوگوں کو دیکھیے جن کو کسی طرح کا تعلق سرکار سے نہ تھا زیادہ ان سے اصرار نہ تھا، سلطان المجاہدین سے ملاقات کا پیغام کیا حسب الطلب دونوں مفتی صاحبین اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب لشکر اسلام میں رونق افروز ہوئے اور ملازمت امیر المجاہدین کو نذر دی اور زبان ثنا و صفت میں کھولی کہ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اس زمانہ آخر میں اسلام رکھ لیا دین محمدی کا نام رکھ لیا۔ ایسا صاحب ہمت اولو العزم کہاں ہے۔ ایسی دو چار باتیں سنا کے خلق خدا کو رام کیا اپنا کام کیا کہ ہم کو آنے کی غایت نہ تھی مطلق حاکم کی رعایت نہ تھی لیکن بقول شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

حاکم سد راہ ہے نرغہ کیے سرکار کی سپاہ ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ فوج حاکم آپ سے زیادہ ہے دھرم پور کے پاس سامانِ ضرب توپ تیار گولہ انداز مستعد ہوشیار آپ کی طرف ٹوٹی پھوٹی دو چار بندوقیں ہیں تو کبھی نہیں۔ اس وقت میں واجب بلکہ فرض ہے کہ اودھ کو نہ جائیے یہیں عزیمت فرمائیے اور اگر خواہ مخواہ قصد کوچ کا کریں گے اور غازی فوج سرکاری سے لڑ کے مریں گے۔ اس صورت میں ثواب کہاں ہے۔ اگر آپ کو اس کا خیال ہو کہ ہم اور مولوی محمد یوسف ملازم سرکاری ہیں پابند دنیاداری ہیں تو مولوی ابوالحسن صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب کسی طرح کا سرکار سے سروکار نہیں رکھتے ہیں۔ دولت دنیا پر مدار نہیں رکھتے ہیں۔ دنیا سے نارض ہیں دونوں صاحب مرد غنی ہیں ان سے استفاق حق کیجیے پھر نہ انکار مطلق کیجیے وہ دونوں صاحب بھی مصدق کلام ہوئے۔ امیر المجاہدین نے بھی مناسب وقت کے جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد صحبت برخاست ہوئی۔

عوام میں ہیجان اس وقت لشکر اسلام میں کچھ صورت اور ہو گئی ہیجان فی الفور ہوئی بلکہ کچھ غازی لشکر اسلام سے اٹھ کے ظالموں کے پاس آئے علماء کی خلاف آسمان تک غل گیا۔ مفتیوں کی دینداری بایدہ

ن کھل گیا اس پر بھی مفسدوں کو قرار نہ آیا زیادہ فتور بڑھایا مسلمانوں کو تعمیل فتوے دستخط علماء پر راضی کیا۔

فتوے پر علماء کے دستخط

زور ہے علماء پر ایسا کیا کہ سب دستخط پر آمادہ ہو گئے مفسدوں کی بن آئی جب یہ مضمون حسب دل خواہ بندھ گیا تب ان منافقوں نے جو سرکار محض فتنہ انگیزی اور تفرقہ پردازی کو جمع ہو کے مامور ہوئے تھے بظاہر جبہ و خرقہ عبا اور قبا پہنے اسلام کے لیے ایک مسودہ فریب آمیز گانٹھ کے استفتا کیا۔ مفتیوں نے بے تکلف صاف صاف زراہ خدمت دستخط کر دیے۔

استفتا اور فتویٰ

بادشاہ باعث فساد حاکم بالادست مجبور شدہ براہ مصلحت چندایام منع روانگی مے فرماید دریں حال اگر مولوی امیرالدین علی صاحب کوچ سازند و مقاتلہ و مجادلہ از باہران و افواج سلطان اسلام بوقوع آید پس مرگ مسلمانان طرفین چگونہ خواہد بود؟ **جواب**

دریں حال جماعت مولوی امیرالدین علی را ہرگز قتل روا نیست بل در نہی تولہ تعالیٰ داخل شدنست کذا فی العالمگیری کتبہ محمد سعد اللہ عفی عنہ فی الواقع فسخ عزیمت بباید و در نہادت و غدغا است۔ کتبہ محمد یوسف صح الجواب حررہ حسین احمد صح الجواب کتبہ بخطہ عبید اللہ۔ اگر از حاکم بالا دست انتزاع سلطنت و اجرائے کلمۃ النصاری بظن قوی متصور مستیقن باشد بحکم آنکہ من ابتلی ببلیتین فالالزم علیہ ان یختار اہونہما و ما کان تحت الامر ماجور ومثاب واللہ اعلم بالصواب وعلیہ التکلان حررہ افقر العباد ابوالحسن عفا عنہ۔ سب علماء کی عبارت اسی قسم کی ہے کہ خوف حاکم سے معمہ کر دیا ہے۔

نہایت دلچسپ مادۂ تاریخ

انھیں عالموں کی شان میں تاریخ ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلا اس ترکیب سے کہ تشتروا کہ تحت لا میں واقع ہے بحکم لا مادہ [illegible] سے خارج ہوا اور لا شریک اعداد تاریخ ہوا۔

ایک اور دلچسپ مادۂ تاریخ

کسی نے مفتی اور مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبدالوالی صاحب کی بھی شان میں کہ ہر چند نواب نے مثل اور علماء کے بلوایا اور کہہ بھیجے کہ مولوی امیرالدین علی صاحب کے پاس جا کے افہام و تفہیم کرو مگر اپنی حق پرستی

سے ہو گئے تاریخ لکھی ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمنا قلیلا اسی ترکیب کے پیشتر دن کہ تحت لاہور واقع ہے وہ تاریخ سے ناسخ ہوا اور اس ترکیب اعداد ہو اور لطیفہ اس میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ انشاء صیغہ نصائح کا فرماتا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں کہ نہیں لیتے ہیں میری آیتوں کی قیمت صیغہ مضارع کا جو بہ معنی یہ دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کمال خوشی سے ان کی مدحت کی حکایت کرتا ہے بخلاف صیغہ نہی کے ۔

فوج شاہی در غلانے میں آگئی

شور و غوغا پڑ گیا چاروں طرف ایک تہلکہ پڑ گیا کہ شہادت میں شک نہ تھا ہے یا اس لڑائی میں دغا ہے ناحق جان دینا گوارا نہیں کیا قول علماء سے چارا نہیں۔ شہادت کے لیے جان و مال نوکری چاکری سے ہاتھ اٹھایا تھا خوب موقع ہاتھ آیا تھا اگر اس معرکہ میں شہادت نہیں تو ہمیں لڑائی کی حاجت نہیں ہم عالموں سے اپنی تسکین کر چکے ہیں۔ ان کے کہنے پر یقین کر چکے ہیں قصہ کوتاہ فوج شاہی صاف امیر المجاہدین سے پھر گئی جہاد کی عظمت دراشک کی طرح نظروں سے گر گئی۔ علماء نے بھی وہاں سے آ کے اپنے اپنے گھر کو آباد کیا حضور عالم بہادر کے دل کو شاد کیا۔

عوام پر علماء کی غلط کاری کا ردِ عمل

یہاں عجب طرح کا معاملہ علماء کے پیش آیا۔ کسی نے زبان طعن اور تشنیع کھولی کسی نے قصیدہ ہجو میں کہہ کے اکبری دروازہ میں لٹکایا۔ اب یہ حال ہے کہ جدھر نکلیے ہجو علماء کی نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالموں کی پھبتی کی چپاتی سنتے ہیں اور خاموش ہیں۔ دوسرا ہوتا زہر کھا کے مر جاتا۔

جوشِ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا

مگر شکر خدائے عزوجل کہ تفرقہ جماعت کی بڑی بڑی تدبیریں ہوئیں کیا کیا تحریریں اور تقریریں ہوئیں اگر ایک بہکانے سے لشکر اسلام سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے جماعتِ مجاہدین بدستور ہے اور ہر دم زبان پر یہ مذکور ہے کہ اودھ کا چلنا ضروری ہے۔ وہی کثرت جماعت ہے وہی شان و شوکت ہے نامردِ جان کے خوف سے چلے جاتے ہیں۔ کھٹکا اتنا ہے کہ فوج شاہی گھیرے ہے۔ لشکر اسلام کی طرف توپیں پھیرے ہے لیکن ان جوانمردوں کو کچھ خیال نہیں جینے کی خواہش

رنے کا ملال نہیں ہر روز تیاری ہے اور لب پر یہ کلمہ جاری ہے کہ جب اس لشکر نے سیلاب دار
کوچ کیا فوج شاہی کائی کی طرح ہٹ جائے گی۔ ایک کنارے ہٹ جائے گی۔ لشکر اسلام موجیں
مارتا اہراتا چلا جائے گا ڈنکے کی چوٹ پر برملا جائے گا اور اگر فوج شاہی لڑے گی تو آفت میں
پڑے گی۔ غرض جو مشیت ایزدی میں ہوگا وقوع میں آئے گا بے کم و کاست لکھا جائے گا۔
ان اللہ قریب من المحسنین۔

کوچ کا فیصلہ ۲۰ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ معلوم ہوا کہ شب کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے فرمایا کہ علی الصباح بعد نماز فجر جانب ردولی کوچ ہے۔
لشکر اسلام میں تیاری ہونے لگی۔ تدبیر بار برداری ہونے لگی۔ یہ خبر جو افسران شاہی کو پہنچی گھبرا
گئے۔ امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو کے عذر کیا کہ ابھی کوچ واجب نہیں خلاف رائے حاکم
ہے۔ چندے اور تامل کیجئے تھوڑا اور تساہل کیجئے۔ مخدوم الانام نے فرمایا یہی حکم سنتے سنتے
کئی مہینے گذر گئے۔ اب ہم رکنے کے نہیں۔ تم بھی اگر ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو
کا نیک ہے ہمارا ساتھ دو ہمارے تمھارے درمیان بھی عہد و پیمان تھا بلکہ قرآن درمیان تھا
اگر تم ہی اپنے عہد پر مستقیم نہیں تو جو حکم تمھارے حاکم کا ہو بجا لاؤ توپیں سرکرو بندوقیں سرکرو لشکر اسلام
کی خوں ریزی پر شوق سے آمادہ ہو۔

امیر المجاہدین کا نعرہ جب صبح نمودار ہوئی اور فوج محمدی چلنے کو تیار ہوئی امیر المجاہدین نے بعد فراغت نماز فجر کمال تاسف سے ایک نعرہ اللہ اکبر کا کیا
کہ تاب اہل لشکر کو کیا ہے۔ تو یہ حال تھا کہ تمام لشکر کہتا تھا کہ یا اللہ تجھ سے فریاد کرتے ہیں ہم
بر سر حق ہیں ہم پر یہ ناحق بیداد کرتے ہیں۔

امیر المجاہدین کی شرائط صلح آخر لشکر اسلام روانہ ہوا۔ افسران سلطانی نے بہزار منت اور عذر خواہی دو تین دن کی رخصت چاہی خصوصاً
تہور خان بہادر نے خدمت سراپا افادت میں عرض کیا کہ حکام کو بہرحال قتل لشکر اسلام منظور

ہے اور آپ کو ادھر جانا ضرور ہے کوئی صورت ایسی فرمائیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ کسی طرح جان عذاب سے چھوٹے۔ مخدوم الانام نے کہا کہ آپ ہی تصور کیجئے کہ میرا بے جا سوال نہیں ہیں طالب ملک، و مال نہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی نواب کا اور ایک اس خادم رسالت مآب کا ہنومان گڑھی میں چلا جائے۔ مسجد قدیم پر فقط ایک مسجد کا خط کھینچ کر اذان کہہ کے نماز پڑھ آئے پھر تنبیہ کو دعویٰ نہ رہے گا۔ بہ تحج اصلاح ہے گا اور اگر نواب کو یہ بھی نامنظور ہو تو وہ جب تک کہیں گے ہم یہاں رہیں گے مگر امداد مصارف وغیرہ ہو اس امر میں نہ کوتاہی ہو اور اگر یہ بھی خلاف ہو تو کہنا کہ ہم اپنے لشکر کے ساتھ عیش باغ میں مقام کریں گے دو مہینہ اور خاطر داری لشکر اسلام کریں گے۔ اس مدت میں ایسی تدبیر ہو کہ مسجد تعمیر ہو جب مسجد بن جائے گی ہم جدھر چاہیں گے چلے جائیں گے۔ ان کے ملک میں بھی نہ آئیں گے۔

بادشاہ کی بے پروائی

تہور خاں مولوی صاحب کے کلام نیک انجام سن کے بہت خوش ہوئے۔ ابھی جاتا ہوں اور نواب کو سمجھاتا ہوں۔ غرض دو تین دن کا وعدہ کرکے چلے آئے۔ ہر چند چاہا کہ نواب صاحب متوجہ ہو کے حال سنیں اور کوئی صورت نکالیں انھیں خون ناحق سے مطلب تھا ایسی باتوں کا خیال کب تھا۔ وہ بیچارے دو دو پہر اسی قبل و قال میں رہے نواب صاحب مست اپنے حال میں رہے۔ نوبت ملاقات کی بھی نہ آئی اور اگر اتفاقاً ملاقات ہوئی نواب صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ آخر وہ بھی خون جگر پی کے خاموش ہوئے۔ ندامت سے روپوش ہوئے۔ اسی ہنگام میں اور افسروں نے وزیر اعظم کو عرضداشت کی کہ امیدوار ہیں کہ حکم قطعی لکھا جائے کہ ہر فدوی بجا لائے۔

حکومت کی چال

پہلے یہ حکمت کی کہ فوج شاہی میں جو اہل اسلام تھے مثل پلٹن علی خاں اور پلٹن عسکری وغیرہ انھیں برخواست کر لیا فقط کفار کو قتل کے واسطے چھوڑ دیا کہ مبادا مسلمانوں کو حرارت آجائے۔ مگر وہ مسلمان جو ہندوؤں سے بدتر تھے خواہ پیادے تھے خواہ افسر تھے انھیں بدستور رکھا۔ چنانچہ شیخ حسین علی جو بالفعل اس فوج ستم کے کمانڈر تھے اور

ظالموں کے رہبر تھے اور رجب خان شمر کا نشان گلابی پلٹن کے زرد رو سالار عمر سعد کی نجس یادگار اور فرزند علی امام علی دارو غہ توپ خانہ کے خونخوار زمانے کے وہیں رہے اور بار لو انگریز کو یہاں سے مامور کیا۔ خوف خدا دل سے دور کیا۔

وزیر اعظم کا حکم نامہ

جب یہ سب انتظام ہو گیا قتل کا سرانجام ہو گیا تب بجواب عرضی افسران یہاں سے وہ حکمنامہ جاری کیا جس کے مضمون قتل شبخون نے عالم کو مشغول گریہ وزاری کیا کہ مولوی صاحب نے باوجود فہمایش ہمارا کہنا نہ مانا فساد کو مصلحت جانا خون ریزی پر تیغ وسپر باندھی۔ اب جس وقت کوچ کا قصد کریں ایک بھی قدم آگے دھریں، تو بے تکلف توپ سے اڑا دینا۔ اس خیر خواہی کے عوض انعام اور خلعت ملے گا۔

بے وفائی مرد ماں ہمراہی امیر المجاہدین

جب اس طرح کا حکم قطعی آیا بے غیرتوں نے شرم کا پردہ اٹھایا افسران فوج شاہی کمال دلیر ہوئے خصوصاً بارلو انگریز اور شیخ حسین علی گرگ باران دیدہ اس خون بے گناہ پر نہایت شیر ہوئے لیکن ہیبت لشکر اسلام دیکھ کے فوج کو قلیل پایا۔ تب ان مکاروں کے دل میں خیال آیا کہ تفریق جماعت کی تدبیر کیجیے۔ اپنے ساتھ مولوی محبوب علی اور مولوی محمد شاہ کو لیا ان ظالموں نے سب سے بڑھ کر ظلم کیا ایسا دام مکر بچھایا۔ دانا دانا مجاہدین کو بہکا دیا کہ لوگ اس بھیڑ سے چھٹنے لگے معرکہ سے قدم ہٹنے لگے جس کو مفلس پایا روپیہ کا لالچ دے کے سرکایا جس کی حیثیت ظاہری درست پائی طمع پر طبیعت سست پائی اس پر زن وفرزند کی گرفتاری، قہر وعتاب سرکاری کا زور ڈالا اور جس پر یہ دونوں زور نہ چلے اس پر یہ توڑ جوڑ ہے کہ جھوٹا نسبت بنا کے قدم رسول کی قسمیں کھا کے کسی سے کہہ دیا کہ فلاں شخص تمھاری غیبت کرتا تھا بلکہ لعنت ملامت کرتا تھا۔ سننے والوں کو غصہ آیا بگڑنے لگے یہاں تک نفسانیت بڑھی کہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر اسی غصہ وغضب میں لشکر اسلام سے چل نکلے کسی کو یوں اپنا کیا کہ نوکر رکھ لیا۔ سب مصارف اس کا اپنے سر پر رکھ لیا۔ چنانچہ حاجی مرتضیٰ مجاہد قدیم ہمراہی سید احمد صاحب مرحوم بجبلۂ تیاری سرائی اختر نگر میں داخل ہوئے۔ ہمراہی

ان کے اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میر عباس صاحب نخانہ دار کوتوال لشکر دیندار انہیں فسادوں کے جہت ڈیڑھ سو مجاہدوں کو لے کے علیحدہ سرا میں مقیم ہوئے گو نیت میں فساد نہ تھا عزم عدم اشتراک جہاد نہ تھا لیکن بالفعل باعث قلت لشکر عظیم ہوئے۔ اسی طرح بہت لوگ اپنے قول و اقرار سے نکل گئے۔ جب وقت جان دینے کا آیا بدل گئے۔

میدان کربلا کا سماں ان افسروں نے دوسری یہ تدبیر کی اطراف کے ہندو زمینداروں کو یہ بات تحریر کی کہ عنقریب ہم لشکر اسلام کو لیا چاہتے ہیں بے گناہوں کو قتل کیا چاہتے ہیں تم بھی ہوشیار رہنا توپ کی آواز سے خبردار رہنا آواز کے ساتھ ہی تیر کی طرح آنا گولیاں لگانا جب سب طرف سے نشانہ ہو جائیں گے پھر دم بدم لشکر اسلام ایک دم میں عدم کو روانہ ہو جائیں گے۔

غرض جب دیکھا کہ جماعت میں یہی خلل ہے اور ایک دل میں بھی بل ہے۔ ۲۵ صفر المظفر سہ شنبہ کی صبح سے بالکل رسد بند کر دی چاروں طرف آواز بلند کر دی کہ کہیں سے رسد پہنچنے نہ پائے۔ پانی تک لشکر اسلام میں نہ آئے جو کوئی اس امر میں کوشش کرے گی گنہگار ہوگا۔ سزا کا سزاوار ہوگا کافروں نے اس مقام کو میدان کربلا بنا دیا۔ سب وہی سامان دکھا دیا۔ اہل اسلام کو تمام رات اور دن بے دانہ آب رکھا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ افسروں کے اشارے سے گنوار ملعون کئی بار بعزم شبخون آئے۔ غازیوں نے للکارا لیا نعرہ بڑھنے نہ پائے۔ لشکر اسلام تک گذر نہ ہوا بدخواہوں نے جو چاہا تھا اس کا اثر نہ ہوا۔ شبدیز قلم جولانی پر ہے۔ جمعیت بحر مواج کی صورت طغیانی پر ہے۔ ہر چند بند در رد کتا ہوں نہیں رکتا ہے۔ بے ساختہ قلم کی زبان سے نکلتا ہے کہ یزید بد انجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں باقی سب سامان وہی ہے۔ مظلوم کشی وہی میدان وہی ہے وہی انسداد آب و دانہ ہے جور دجفا کا کارخانہ۔ وہی لوگوں کی بے وفائی ہے وہی دین کی لڑائی ہے وہی فوج کی چڑھائی ہے۔ وہی سرد ہی ظلم ہے وہی جور ہے وہی ستم ہے جو حسین علیہ السلام پر گذرا تھا وہی ستم عیاں ہے قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے یہ غلام امام ہیں وہ پیشوائے دین تھے۔ یہ اسلام میں یہ سرنام ہیں۔

شدائد و مصائب و شہادت امیر المجاہدین

۲۶ صفر المظفر ۱۲۴۶ھ روز چہار شنبہ کو رایات ظفر آیات لشکر اسلام نے کوچ کیا منزل مقصود کا رستہ لیا لیکن امیر المجاہدین نے ہنگام روانگی یوں لشکر آراستہ کیا کہ مجاہدوں کے چار غول کیے ایک غول کو آگے بڑھنے کی اجازت دی ایک فرسخ کے فرق سے دوسرے کو رخصت دی تیسرے غول کو لے کے آپ تشریف فرما ہوئے۔ طریق خدا میں گام فرسا ہوئے۔ چوتھے غول کو ارشاد کیا کہ جب ہم ایک فرسخ کے انداز پر نکل جائیں تم چلنا اس سے پہلے نہ نکلنا۔ وقت نہفت زباں فیض ترجمان سے بے ساختہ یہ مصرعہ جس کو الہام غیبی یا القائے لاریبی کہیئے کہ نکلا کہ مصرع

سر میدان کفن بر دوش دارم

اب یہاں قدرت خدا دیکھیے اسکی مشیت کا ماجرا سنیے کہ فوج شاہی کو باوجود ہوشیاری نوم غفلت سے ایسی شکست ہوئی کہ مطلق نہ خبر ہوئی جب امیر المجاہدین کا غول کچھ دور پہنچا بار اد خواب غفلت سے چونکا۔ کوچ کی خبر سنتے ہی ہوش جاتے رہے۔ حواس باختہ ہوا روانہ بے ساختہ ہوا اور شیخ حسین علی سے کہا یہی وقت عیاری اور کارگزاری کا ہے۔ غافل کیوں ہو ہنگام ہوشیاری کا ہے۔ اگر یہ لشکر محمد پور پہنچا تو سمجھ لو کہ بہت دور پہنچا پھر اگر ممالک محروسہ کی فوج جمع کرو گے تو بھی ان لوگوں کا قلع قمع نہ کر سکو گے۔ برائے خدا سے اتر د گھوڑے پر چڑھو لیکن جلد آگے بڑھو حکمت عملی سے فقط مولوی صاحب کے غول کو مقام زد پر ٹھہراؤ۔ ان کو باتوں میں لگاؤ پھر ہم سمجھ لیں گے۔ ایک دم کی فرصت آگے بڑھنے کی مہلت نہ دیں گے جب سردار کو مار لیا کسی کا قدم میدان میں نہ جمے گا۔ سب کے سب بھاگ نکلیں گے کوئی نہ ٹھہرے گا تمھارے اوپر مولوی صاحب کو اعتماد ہے یہ کام تمھیں سے بن پڑے گا۔ شیخ بھی اس وقت بڑی جرأت کر کے باد صرصر سے زیادہ سرعت کر کے چشم زدن میں گھوڑا دوڑا کر آ پہنچا اور شجاع گنج کے اس پار امیر المجاہدین کے غول کو ٹھہرایا۔ ساتھ ہی بارلو بھی معہ آتش خانہ آیا۔ حسین علی امیر المجاہدین سے باتیں بنانے لگا اور ادھر بارلو کا ہر گولہ انداز موقع سے توپیں جمانے لگا

علی حسین کی مکاری و عیاری

ادھر شیخ نے مخدوم الانام کے آگے ہاتھ باندھ قدموں پر ٹوپی رکھ منہ بنا کے عرض کیا کہ اگر آپ ایک بار اور

ہمارا کہنا مانیں اور ردولی میں تشریف فرما کے دو تین دن مقام کریں تو بے جنگ وجدال مسجد بن جائے گی اور بندگانِ خدا پر آنچ نہ آئے گی۔ یہ بکھیڑا بے کار ہے۔ بندہ ذمہ دار ہے۔ خدا کو مانیے مجھ کو جھوٹا نہ جانیے کیسی نرم نرم ملائم ملائم باتیں کیں کہ مولوی صاحب کے دل میں اثر کر گئیں۔

ادھر انگریز نے اسی راہ پر ایک اونچا ٹیکرا دیکھ کر توپیں لگا دیں تلنگوں کی صفیں جما دیں۔

ادھر سلطان المجاہدین تاج العارفین اس دغاباز کی چرب زبانی سے رضامند ہو کے ردولی کو روانہ ہوئے اور ادھر شیخ صاحب اپنا کام تمام کر چکے تھے موضع کھپلر کو چل دیے فقط اس واسطے ناپدید ہوئے کہ جائے انکار باقی رہے کہ بندہ جا چکا تھا تب لوگ شہید ہوئے راہ لگانا اس واسطے تھا کہ نمک حرامی نہ ہو اور چلا جانا اس واسطے تھا کہ بدنامی نہ ہو لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے یہ کلام سنا ہوگا کہ چلتے وقت انگریز سے کہہ گئے کہ میں اپنا کام تمام کر چکا تم کو اختیار ہے۔

قضائے کار لشکرِ اسلام ہمراہ امام حسب رہنمائی حسین علی اس ٹیکرے کے برابر پہنچا وہیں قابض روح کو حکم خالق اکبر پہنچا کہ مسلمانوں کو گلستانِ ارم دکھاؤ۔ رضوان اور مالک دونوں ہشیار ہوئے۔ اپنے عہدے سے خبردار ہوئے۔ موت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ جان کا لین دین ٹھہرا سر کی سردست خریداری ہونے لگی وہ دن روزِ رستاخیز سے کیا کم تھا۔ زمین و آسمان درہم برہم تھا ساکن آسمان الامان کہتے تھے بیگناہوں کو خون بہا ہوتے دیکھ کر فرشتے "کل یوم ہو فی شان" کہتے تھے وحش وطیر اس میدان کی قیامت کا گمان کرتے تھے۔ "اقترب للناس حسابہم وہم فی غفلۃ معرضون" کا وصیان کرتے تھے۔ اشجار کو بارِ غم سے زندگی بار تھی۔ جس دم حسرت سے فرماتے تھے زبان پر یہ مصرع لاتے تھے۔ سر میدان کفن بردوش دارم

عرش سے آواز آتی تھی۔

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

یعنی ذلتِ شہادت ۱۲

••

آخری دہائی کی دستاویزات —

خطبہ استقبالیہ ———— شیخ محمد جان

تقسیم ہند ———

ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک ناسور۔

یہ تقسیم جسے نہ ہم پسند کرتے تھے اور نہ آپ۔ صرف چند مفاد پرست لیڈران کے مفاد کی خاطر یہ سیکولر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

تقسیم آپ کو پسند نہ تھی؛ اس کا ثبوت پیش خدمت ہے۔ ایسی دستاویزات آگے بھی پیش کی جاتی رہیں گی۔ پیش نظر خطبۂ استقبالیہ کے لیے ہم مہر الٰہی صاحب (ایم۔ ندیم) علیگڑھ کے ممنون ہیں۔

——— ادارہ

تقسیم کی طرف

آخری دہائی کی دستاویزات

(۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

مرے طائرِ قفس کو نہیں باغباں سے رنجش

ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

خطبہ استقبالیہ

از

جناب خان بہادر شیخ محمد جان صاحب ایم ایل سی (بنگال)

صدر مجلس استقبالیہ تمام ہند آزاد مسلم مؤتمر

منعقدہ

۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

بمقام دھلی

جس کو مجلس استقبالیہ نے

انصاری پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادران اسلام!

اپنی اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے میں اُن تمام دوستوں کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے دور و دراز کا سفر کر کے یہاں جمع ہوئے ہیں اور جن کا مقصد اجتماع یہ ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے سکون و اطمینان اور حزم و احتیاط کے ساتھ اُس بین الاقوامی صورت حالات پر غور کریں جس سے نہایت دور رس نتائج و اثرات برآمد ہونے والے ہیں، بالخصوص مسلمانان ہند کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ اقوام عالم کی مجلس میں ہندوستان کے لئے ایک باوقار جگہ حاصل کرنے اور ہادر وطن کی ترقی میں مسلمانان ہند کو واجب حصہ دلانے کے لئے ہمیں اس وقت کیا عمل کرنا ہے۔

میں آل انڈیا مسلم لیگ کا بحیثیت ایک جماعت کے زبردست حامی رہ چکا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ بہت سے صوبوں اور مرکز میں مسلمانوں کی اقلیت کے باعث اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا ایک مضبوط سیاسی نظام ہو جو عظیم الشان اسلامی کلچر اور دیرینہ اسلامی روایات کے بقا و قیام کا نگراں رہے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا وجود بحیثیت ایک ممتاز ملت کے باقی نہ رہے اور وہ اکثریت والی قوم کے ساتھ مدغم ہو کر اپنی جداگانہ حیثیت کو ضائع کر دیں جو ایک عظیم مذہب کے پیرو ہونے کی صورت میں انہیں حاصل ہے

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح نے بنگال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی ہے میں نے بلا پس و پیش، اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ اور تمام ممکن ذرائع سے بنگال میں مسلم لیگ کی امداد کی اور اس کے موافق زبردست رائے عامہ پیدا کرنے کیلئے جو کام کیا گیا۔ اس میں میں نے اپنا پورا حصہ ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دوسرے تمام مخلص خیر خواہوں کی طرح ایمانداری کے ساتھ میرا عقیدہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی راسخ ہے۔ اور میں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انتہائی دشواریوں کے باوجود حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سعی کی ہے میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ جہاں کہیں وہ اقلیت میں ہیں، مجالس مقننہ کی چند نشستوں کے متعلق مراعات کردیں بشرطیکہ اس سے ہماری اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے تو اس طریقہ سے ہم اکثریت والی قوم کا اعتماد اور دوستی حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ اہم معاملات جن سے ہمارا خاص مفاد وابستہ ہے اسی صورت میں بطریق احسن محفوظ رہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں ممکن ہو ہم ایک دوسرے کے ساتھ مراعات کی اسپرٹ پیدا کریں اور اسے ترقی دیں۔ اگر ہم ایسی فضا میں کام کریں جو ایک دوسرے کیساتھ دوستانہ مراعات کی اسپرٹ سے پیدا ہوتی ہے تو ہم ایسے بہت سے مسائل حل کرسکتے ہیں جن کا نتیجہ آج تک سوائے غیر ضروری تیزی و تندی اور تباہ کن نفرت و مخالفت کے اور کچھ نہیں نکلا اور جن سے ملک کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ وہ ترقی جس میں ہمارا حصہ بھی ہماری ضروریات کے مطابق یقیناً شامل ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے کیونکہ یہی وہ معیوب طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کرادیئے ہیں۔ اس طریقہ سے مسلمانوں نے ماضی میں خواہ کتنا ہی

بڑا فائدہ کیوں نہ حاصل کیا ہو، یہ حقیقت ہے کہ آج اس طریق انتخاب کا مفید پہلو بالکل ختم ہو چکا ہے اور وہ کسی طرح مناسب حال نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمارے بہت سے مخلص رہنماؤں کے اخلاق پست کر دئے ہیں اور ان میں کم ہمتی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جداگانہ انتخاب ہی کا کرشمہ ہے کہ انتخابات کے وقت اور دوسرے ایسے ہی مواقع پر ہندو اور مسلمان ایکدوسرے کو خوب دل بھر کر گالیاں دیتے ہیں اور جس قدر ایک امیدوار گالیاں زیادہ دیتا ہے اسی قدر اسکو میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، صوبجاتی مجالس مقننہ اور مرکزی مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہونے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وقت دونوں قومیں صرف اُن ہی امیدواروں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو جائیں جن کی انتخابی بنیاد باہمی نفرت اور سب وشتم پر قایم ہو تو اُسوقت ہمارے لئے ہر لمحہ خانہ جنگی کا خطرہ یقینی ہو جائے گا اور یہ ایسی صورت حالات ہے جس کا تصور مخلص ہندو اور مخلص مسلمان کسی طرح بھی سکون قلب کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں جبکہ مسٹر جناح کلکتہ ہی میں تشریف رکھتے تھے میں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن سے یہ کہا کہ وہ ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمانوں کی ایک نمایندہ کانفرنس طلب کریں اور جہاں تک ممکن ہو معقول اور متفقہ مطالبات مسلمانان ہند کی طرف سے مرتب کرکے اُن کی بنیاد پر کانگریس سے سمجھوتہ کی گفت و شنید کریں اور ان مطالبات کو ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی میں داخل کرائیں مگر اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ابھی اس قسم کی کانفرنس کا وقت نہیں آیا ہے اور جب وقت آئے گا تو میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔ بدقسمتی سے گذشتہ دو سال کے دوران میں مسٹر جناح نے بہت سے مخلص اور ذمہ دار مسلمانوں کی انتہائی سعی کے باوجود اس کو مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ کسی دوسرے مختلف الخیال مسلمان سے خواہ

وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کسی قسم کا مشورہ کریں یا اسے اپنے اعتماد کا اہل سمجھیں۔ ہے حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اُن تمام مخلص مسلم کارکنوں کو جو اُن کے ساتھ متفق الرائے نہیں ہیں قطعاً نظرانداز کر دیا ہے۔ اور نہ انہوں نے کبھی اسکی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے تصفیہ حقوق کی کون سی تعمیری اسکیم سب سے بہتر ہے اور وہ کون سی ٹھوس شرائط ایسی ہیں جو اُن کو مطمئن کر دیں گی اور جن سے مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اسلئے ایک طویل و شدید انتظار کے بعد دوسرے خیرخواہان اسلام اور آل انڈیا مسلم جماعتوں نے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کانفرنس طلب کی ہے اور اب آپ حضرات ہی کا یہ کام ہے کہ آپ فیصلے کریں اور بتائیں کہ ملکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور مشترکہ مادر وطن کے باعزت فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی غرض سے مسلمانان ہند کو کیا کرنا چاہیے۔

مجھے مجبوراً یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں تعلیمی دائرہ کے اندر بالخصوص ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں مسلمانوں نے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اقتصادی حیثیت میں ہم نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اور ہماری قوم کی مالی حالت اُس سطح سے بہت زیادہ پست ہو گئی ہے جس پر ہم ایک نسل پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سی جائدادیں اور وسیع زمینداریاں جو کسی زمانہ میں ہماری مملوکہ تھیں آج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے افلاس کے اسباب معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان اسباب میں سب سے نمایاں سبب میری حقیر رائے میں یہ ہے کہ ہماری معاشرت کا معیار بہت بلند ہے اور ہم بہت زیادہ اسراف میں مبتلا ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری زندگی کا معیار ہندوستان کی اُن دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بلند ہے۔ جو ہم سے زیادہ متمول ہیں

اور جنہیں ملک کی تجارت کا بڑا حصہ ملا ہوا ہے۔ ہم میں بہت سے ایسے غریب ہیں جو کھدر سے صرف اسلئے نفرت کرتے ہیں کہ کانگریس نے اُسے اختیار کر لیا ہے حالانکہ اُن کی اقتصادی حالت اُنہیں ہرگز اسکی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ایک دن کے لئے بھی کھدر کے سوا کوئی کپڑا استعمال کریں۔ بعض مسلم رہنماؤں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوؤں کے خلاف نفرت وحقارت کے شعلے اس طرح بھڑکائے ہیں کہ محض معمولی واقعات کو جو روزانہ کی زندگی میں بہترین ماحول کے اندر بھی پیش آتے رہتے ہیں مبالغہ کے ساتھ خوفناک بنا کر سات صوبوں میں کانگریس کے مظالم کی فرضی داستانیں وضع کر لی ہیں اور انہیں شہرت دے رہے ہیں جس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ قوم کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں ہمارا حصہ صفر کے برابر ہے اور ہم سب سے زیادہ نقصان برداشت کر رہے ہیں۔ ذاکر حسین کمیٹی کی تعلیمی اسکیم کو اُن ہی لوگوں نے رد کر دیا ہے جو سب سے زیادہ اس کے ضرورتمند ہیں اور وجہ یہ قرار دی کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے حالانکہ اس اسکیم کے اندر عمداً یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی مذہبی تعلیم کے لئے خود آزاد رہے اور اس میں حکومت دخل نہ دے۔ ہم "ہندوستانی" کے متعلق نہایت زور شور کی بحثیں سنتے رہے ہیں کیونکہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں جہاں اُردو بولی نہیں جاتی، ہندی کے الفاظ کا غلبہ ہے بعض رجحانات مسلّمہ طور پر تکلیف دہ اور پریشان کن ہیں مگر ان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آپس میں فساد انگیز جھگڑے شروع کر دئے جائیں۔ ہم نے دیہاتی اصلاح کے کام میں محض اس لئے حصہ نہیں لیا ہے کہ اس سے کانگریس کا پروپیگنڈہ بڑھے گا۔ جس کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض اوّلین ہے۔ مکمل نشہ بندی کی تجویز محدود رقبوں میں بھی ہمیں گوارا نہیں ہے کیونکہ مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق یہ تجویز ابھی قبل از وقت ہے اور ملک کے اقتصادی حالات اسکی اجازت نہیں دیتے

صحیح ہے کہ بہت سے مسلمان فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل میں کانگریس کی "ٹیت و لعل" والی پالیسی سے پریشان ہوگئے ہیں اور اس اہم اور مشکل ترین مسئلہ کو پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لینے سے کانگریس کے سربرآوردہ رہنماؤں کی پہلو تہی نے بے اطمینانی پیدا کردی ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ گذشتہ دو سال کے عرصہ میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے اور دونوں قوموں کو ایک مشترک سطح پر لانے کیلئے سنجیدگی اور اخلاصمندی کے ساتھ مسلسل کوششیں کی گئی ہیں جن کی نظیر پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اس مقصد کے لئے ان اصحاب نے مسٹر جناح سے براہ راست خط و کتابت بھی کی ہے اور خود اُن ہی کی شرائط پر اُن سے خود جا کر ملے بھی ہیں۔ اگر مسٹر جناح نے ان پُرخلوص اقدامات کا جواب صحیح اسپرٹ میں دیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش منزل آزادی کی طرف گامزن ہو چکے ہوتے، اور مکمل درجۂ نوآبادیات آج ہم سے بہت قریب تر ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک آرزو کی نہ ہوتی جس کی تکمیل کے لئے مستقبل کا کوئی زمانہ متعین ہی نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم ہندوؤں کے ساتھ اپنے اختلافات کو باعزت طریقہ پر ختم کرنے کیلئے اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں جبکہ خوش قسمتی سے کانگریس کو ہندوؤں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے اور گاندھی جی جو عملاً کانگریس کے ڈکیٹیٹر ہیں اس مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے حل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں یا ہم نظر فریب الفاظ اور خالی خولی جملوں کے طلسم میں مبتلا ہو کر نہ صرف اپنے ملک کی ترقی کو روکنا بلکہ خود اپنے آپ کو انتہائی نقصان پہونچانا چاہتے ہیں۔ ہم آیندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتے کہ " اگر ہمارے آباؤ اجداد نے غیر دانشمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اور

ہندوستانی مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں باوقار جگہ حاصل ہو۔

مجھے یقین کامل ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا کے اندر بہت انقلابات برپا ہونے والے ہیں جن سے ہندوستان بھی ضرور متاثر ہوگا۔ آجکل کا ہندوستان ایک جامد ملک بن کر نہیں رہے گا۔ وہ اپنی محکومیت پر قانع نہیں رہ سکتا۔ کیا مسلمانوں کو آنیوالے انقلاب میں اپنا واجب حصہ نہیں لینا چاہیئے۔؟ کیا اُن کے لئے یہ طرز عمل باعزت ہوگا کہ وہ اسوقت تو کچھ نکریں اور جب دوسرے جنگ لڑکر فتحیاب ہو جائیں تو وہ مال غنیمت میں برابر کا حصہ بٹانیکے لئے مستعد ہوں؟ مجھے اُمید ہے کہ یہ کانفرنس نہ صرف مسلمانان ہند کے جائز حقوق و مطالبات کا تحفظ کرنیکے لئے ایک مشترک فارمولا تلاش کریگی بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل بھی تیار کریگی جس کے ماتحت وہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کیلئے اپنی عظیم الشان قومی خصوصیات کے لائق قربانیاں پیش کرسکیں۔

میں صرف ایک بات اور کہوں گا اور اس کے بعد ختم کردوں گا۔ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کرنے یا جداگانہ ہندو اور مسلم ریاستیں قایم کرنے کی تمام گفتگو نہ صرف نامعقول بلکہ ناقابل عمل بھی ہے کیونکہ ان اسکیموں میں سے کوئی اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور کروڑوں مسلمان اور ہندو دور و دراز کے صوبوں سے ہجرت کرکے ہندو یا مسلم آزاد علاقوں میں نہیں جاسکتے۔ ان تجاویز کو صرف وہی دماغ پیدا کرسکتا ہے جو غصہ کی وجہ سے ماؤف ہوچکا ہو۔

جہاں تک کہ اس اُمید موہوم کا تعلق ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے جداگانہ فیڈرل مسلم حکومت کے ماتحت آجانے سے ہندوستان میں امن و امان قایم ہوجائے گا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ اسکے برعکس، دو فیڈرل حکومتوں کے درمیان جن کی سرحدوں کو صرف نفرت و حقارت

مذہبی تعصب کے جذبات ایکدوسرے سے جدا کریں گے۔ سخت جنگ و جدال کا آغاز ہوجائے گا۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نکرنا چاہیئے کہ جب وہ اکثریت والے صوبوں میں مسلم لیگ "اسلام" کے نام پر اور "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگاکر انتھک پروپگنڈہ کرنے کے بعد بھی لیگی حکومتیں قایم نکرسکی تو ان "اسلامی" اور "آزاد" حکومتوں کی حقیقت جنہیں لیگ پیدا کرنا چاہتی ہے سوائے پانی کے خالی بلبلوں کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ میری حقیر رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ ہندوستان میں ساتھ رہنا ہے اور انہیں ایک ایسی نئی تہذیب کے بنانے میں اپنا اپنا بہترین حصہ ادا کرنا ہے جو ترقی کریگی اور پھلے پھولے گی۔ اور شاید ایک دن تمام دنیا کی رہنمائی کرے گی۔

اس سے قبل کہ میں ختم کروں آپ حضرات سے اُن کوتاہیوں کیلئے معافی چاہتا ہوں جو مجلس استقبالیہ کے انتظامات میں آپ کو محسوس ہوئی ہوں اور اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی عُذر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انتظامات جس مدت میں کئے گئے ہیں وہ چند یوم سے زائد کی مدت نہیں تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اس شہر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں جو قدیم عمارات کے اُن شاندار کھنڈروں سے بھرا ہوا ہے جن کا سلسلہ ہمیں زمانہ ہائے ماقبل تاریخ تک لے جاتا ہے۔ اور دوبارہ امید کرتا ہوں کہ آپ نہایت فیاضی کے ساتھ ہماری کوتاہیوں کو معاف کردیں گے۔

(خان بہادر شیخ) محمد جان
(ایم۔ ایل سی بنگال)

مشرقی کتاب خانے

مشرقی کتب خانوں کے تعارف کا یہ سلسلہ ہم مخطوطات میں مشرق کے سب سے زیادہ ثروتمند
ملک سے شروع کر رہے ہیں۔ ترکی عالم اسلامیہ کا حاکمانہ مرکز ہونے کے سبب اور کئی صدی تک علم
قلب ہونے کے باعث کتابوں اور خطی نسخوں کے لیے بھی مرکز کا کام کرتا رہا۔ سارے عالم اسلام
کا قیمتی ذخیرہ کھنچ کھنچ کے سلطنت عثمانیہ کے قدموں میں ڈھیر ہوتا رہتا تھا۔ بچا کھچا ادھر
ادھر نکل جاتا تھا۔

ترکی ذخیروں کا یہ تعارف امید ہے اس سلسلہ کو آغاز کرتے ہوئے مناسب خیال کیا
جائے گا ——————— ادارہ

پروفیسر احمد آتش

مترجمہ ڈاکٹر اکمل ایوبی

ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ

قسطمونی اناطولیہ کے ان شہروں میں سے ہے جو زمانۂ قدیم سے اہم تمدنی مرکز رہے ہیں . یہاں مدرسوں اور خانقاہوں سے متعلق بہت سے کتب خانے تھے . ان مقامات کے بند ہوجانے کے بعد ان کی کتابیں ایک عرصہ تک مختلف جگہوں پر پڑی رہیں اور آخر میں قسطمونی کے کتب خانۂ عمومیہ کی عمارت میں محفوظ کردی گئیں . کتابوں کا موجودہ ذخیرہ تین خانقاہوں خالدیہ، مولوی خانہ اور شعبان ولی، بارہ مدرسوں اور ایک ارمنی گرجا کے کتب خانوں سے حاصل شدہ کتابوں پر مشتمل ہے یہاں مخطوطات کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہے یہ کتابیں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تر ان علوم سے متعلق ہیں جنکی تعلیم عام طور پر مدارس میں دی جاتی تھی . ان میں ادبیات سے متعلق بہت کم کتابیں ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر غیر اہم . ذیل کی سطور میں بعض منتخب کتابوں کا ذکر کیا جائے گا جو قدیم، نادر اور بے مثال ہیں . کتابوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان کو موضوع کے لحاظ سے الگ الگ تقسیم کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے ان کی فہرست مصنفین کی تاریخ وفات کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے .

(۱) مجموعہ .

اوراق ۲۷۰ ، سطور فی صفحہ ۱۷ ، خط نسخ، مکتوبہ یونس بن عبداللہ تاریخ کتابت : ۲۵ شعبان ٦١٥ ھجری . [قسطمونی : ۲۷۱۳]

i) کتاب الخلوه والتنقل فی العباده و درجات العابدین

(ورق ۱ ـ ۵۷) مصنفهٔ ابو عبداللہ الحارث بن أسد المحاسبی[1] (م ۲۴۳ / ۸۳۷)
اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ملتا ہے

آغاز: بسمله ۔ الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفی ۔ باب الإجتهاد و الخلوة و قصر الأمل و غیر ذلک ۔

قال الإمام أبوعبدالله الحارث بن أسد المحاسبی رضی الله عنه ۔ إعلم رحمک الله أن أهل طاعة الله قدموا بین یدی الأعمال . . .

اختتام : . . . قال احفظ لسانک ولا تقولن إلا حقاً و اسکت فانک إذا فعلت ذلک أدخلک فی أصناف الخیر و الحمد لله وحده وصلی . . .

گوشه میں : بلغ مقابلة بحمد الله .

ii) کتاب الصفات (ورق ۵۷ـ۶۲) مؤلفه ابو سعید أحمد بن عیسی الخراز[2] (م ۲۸۶ / ۸۹۹) . اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ہے ۔

آغاز : قال أبو سعید الخراز رحمة الله

الحمد لله الذی خلق الخلق حین أراد کما أراد فأحسن خلقهم و تمت مشیئة فیهم ثم دعاهم إلی الفهم ... فآثر أقوام الدنیا ... فحجب الله قلوبهم عن الأخرة ...

اختتام : ... ان هذا العلم موف (؟) لأن کثیراً من العارفین یحبون الله لأنفسهم ویذکرونه بأنفسهم و یریدونه لأنفسهم .

iii) کتاب الضیاء (ورق ۶۲ ـ ۶۴) یه تصنیف بھی الخراز سے منسوب ہے ۔ اس کتاب کا کوئی دوسرا نسخه اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے ۔

آغاز : الحمد لله المحتجب من الأوهام بعلوه المنفرد عن الأفهام بعزته ... یعلم ما تکنه الصدور ...

---

۱ ـ دیکھیے Carl Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Litteratur* I, 213; Suppl. I, 351

۲ ـ دیکھیے *GAL* I, 214; Suppl. I, 354.

(iv) **کتاب الکشف والبیان** (ورق ۶۴ - ۷۰) یہ رسالہ بھی خراز سے منسوب ہے جس کے کسی دوسرے نسخے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔ علما میں جو طویل بحثیں ہوتی تھیں کہ انبیاء کا مقام بلند ہے یا اولیاء کا اسی مسئلہ پر یہ رسالہ تصنیف کیا گیا ہے۔

آغاز: بسملہ. رب یسر قال أبوسعید ... الخالق البرّ الصادق ... وآثار المناهج ... بالأنبیاء الذین اصطفا ... أما بعد فان قوماً من أهل التصوف غلطوا فی التمیز بین مقام الأنبیاء والأولیاء فجعلوا مقام الأولیاء أرفع من مقام الأنبیاء وانما ذلک سبب حجابهم عن الحقیقة ...

(v) **کتاب الفراغ** (ورق ۷۱ - ۷۸) یہ نادر نسخہ ہے۔

آغاز: قال الشیخ أبوسعید ... إعلم أن الخلق لواشتغلوا بانفسهم فی ذکرالمولیٰ لتفرغوا عمن دونهم ولوجدوا فی ذکر ربهم غنیة عن ذکر مادونه ...

اختتام: ... فان لم یقدر ان یخرج من عیوبها فلا یعجز عن معرفة عیوبها متأسفا وبالله التوفیق والعون.

(vi) **کتاب الحقائق** (ورق ۷۸ - ۸۷) الخرّاز نے اس رسالے میں جو ایک نادر تصنیف ہے بعض مستعمل تعبیروں کی وضاحت صوفیوں کے نقطۂ نظر سے کی ہے عقل، خشیت، تواضع، عدل، طاعت وغیرہ جیسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور صوفیوں کے نقطۂ نظر سے ان کے معانی سمجھائے ہیں نسخے کے اختتام پر وضاحت شدہ الفاظ کی ایک فہرست بھی مندرج ہے۔

آغاز: قال أبوسعید ... الحمدلله حمد منقلب بقلبه فی ریاض منته ومتنزه بروحه تحت أشجار کرمه ... أمابعد قد جمعت فی کتابی هذا مسائل عن طریق الحکمة علی بیان الشریعة بلسان أهل المعرفة علی الایجاز والاختصار ... وافتتحت ذلک بباب العقل ... قال نور فی القلب یهدی النفس الی اصول العمل ...

(vii) کتاب معیار التصوف وماهیته (ورق ۸۸-۱۳۳) مصنف ابوسعید الخرّاز و ابو یعقوب (؟) وسہل بن عبداللہ التستری[3] (م ۲۷۳ / ۸۸۶ یا ۲۸۳ / ۸۹۶؟)

آغاز: بسملہ۔ ذکر ماهیة التصوف، قوله عزوجل انا اخلصناهم بخالصة ذکری الدار ... وقیل هم أهل الصفوة وارباب الصفا قال جعفر الصادق الصافی هو محمد بن عبداللہ والصوفی ابوبکر الصدیق لقوله من کان یعبد محمدا فان محمدا قدمات

(viii) کتاب معرفة الأسرار (ورق ۱۳۳-۱۴۹ اور ۲۰۴-۲۲۰) مؤلفہ ابوعبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی[4] (م ۲۵۵/۸۶۸) اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کے وجود کی اطلاع نہیں۔

آغاز الحمد للہ الذی تفرد فی ازلیته وتوحد فی دیمومته ثم انا شرحنا الاحوال والاسماء التی قد خفی علی بعض الناس ... ان سبب الذاکر فیه علی طریق الصفا ویدل علی اخلاق المکارم والوفا ... فصل فی صفة أسراراللہ ... فی طبقات اهل الارادة ... فی صفة ... المرید المحقق ... فصل فأما تمزیق الثیاب فی السماع ..

اختتام: ... کذلک کونه یکون فانیاً و علم اللہ باقیاً وباللہ التوفیق تم کتاب معرفة الأسرار ... من کلام الشیخ ... أبی عبداللہ الترمذی.

(ix) کتاب شکایة أهل السنه بحکایة مانالهم من المحنه (ورق ۱۶۵-۱۷۹) مؤلفہ ابوالقاسم عبدالکریم بن هوازن القشیری[5] (۳۷۶-۴۶۵ / ۹۸۶-۱۰۷۲) دولت سلجوقیہ کی تشکیل کے ابتدائی دور میں وزیر عمیدالملک الکندری کی خلل اندازی اور القشیری، امام الحرمین

---

۳. دیکھیے GAL I, 204; Suppl. I, 333.

۴. دیکھیے GAL I, 216; Suppl. I, 355. H. Ritter, Philologika xiii, Oriens I, p. 34; اور ترجمۂ ضحات: ۱۶۹ (استنبول، ۱۲۸۹)

۵. دیکھیے GAL I, 556; Suppl. I, 770; H. Ritter, Oriens III, p. 36.

اور انکی طرح کے دوسرے لوگوں کی ادبی پچشیں معلوم ھیں۔ جو اصولی طور پر اشعری تھے اور جو علماے اھل سنت کی وجہ سے مکہ ہجرت کر گئے تھے[6]۔ القشیری کے اس شکایت نامے کو جو قیام مکہ کے دوران میں لکھا گیا تھا، سبکی نے اپنی کتاب «طبقات الشافعیة الکبری» میں شامل کر لیا ھے[7]۔

آغاز: بسمله. قال الأستاذ القشیری الحمدلله المجمل فی بلائه . .

(x) تفسیر فاتحة الکتاب العزیز (ورق ۱۸۰-۲۰۸) کتاب کے اوپر کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ھے کہ اس کے مصنف ابو محمد عبدالجلیل بن موسیٰ الأنصاری[8] ھیں جن کے حالات کا صحیح طور پر علم نہیں ھے صرف ایک کتاب میں ان کے متعلق سنہ ۶۰۵/۱۲۰۵ سے قبل زندہ رہنا بتایا گیا ھے: یہ کتاب سورۃ فاتحہ کی مختصر سی تفسیر ھے۔

آغاز: بسمله. اعلم ان الله تبارک و تعالیٰ ینزل باسمه الرحمن الرحیم الی عباده لیجذبهم إلیه برسله و کتبه . . .

اختتام: و تبری من العون بالمخلوقات فانهم قهمنا الله وایا کم بمنه . . .

(ix) صفة القلوب (ورق ۲۲۰-۲۲۶) یہ حکیم ترمذی کی ایک مختصر کتاب ھے جسکا کوئی دوسرا نسخہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ھے۔ اس میں الفرق بین الصدر والقلب والفؤاد واللب[9] کی وضاحت کی گئی ھے

آغاز: بسمله. کتاب صفة القلوب قال الشیخ ابو عبدالله الترمذی رحمه الله الفؤاد اول مدینة من مدائن النور والنور سبع مدائن اولها الفؤاد ثم الضمیر ثم الغلاف ثم القلب ثم الشغاف ثم الحبة ثم اللباب . . .

۶ دیکھیے M. Sheref-eddin, *Selchuklular devrinde mezahib*, Turkiyat Mejmuasi I, (Istanbul 1925) p. 10ff.

۷- السبکی: طبقات الشافعیة (۲: ۲۷۶-۲۸۸)

۸- دیکھیے *GAL* Suppl I, 607

۹- دیکھیے *GAL* I, 213, no. 20

(xii) **کتاب السماع** (ورق ۲۲۶ - ۲۳۲) مصنفہ القشیری۔ نسخہ منحصر بہ فرد۔ اس رسالے میں سماع اور اسکے احکام وغیرہ کا ذکر ہے۔
آغاز: الحمدلله خالق الأرواح لکشف ... هذه فصول یخبر عن حقیقة السماع و أحکامه و امارات صحته و اعلامه ذکرنا علی حد الاختصار...

(xiii) **کتاب أدب المرید** (ورق ۲۳۲ - ۲۷۰) مصنفہ ابوالقاسم الحسین بن جعفر بن محمد الواعظ الوزّان جو پانچویں/نویں صدی کے صوفیوں میں سے ایک تھے[10]۔ اس تصنیف کا ایک نسخہ استنبول میں ایا صوفیہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔
آغاز: قال الحمدلله الذی خلقنا فاکمل خلقنا و أدبنا فاحسن تأدینا...

(۲) **کتاب الهیئة** مصنفہ ابوعلی الحسن بن الحسن بن الهیثم[11] (م ۴۳۰/۱۰۳۸) اس کتاب کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے[12] لیکن وہ ظاہرا ناقص ہے۔ ترکی کا یہ نسخہ بھی نہیں کہ قدیم ہے بلکہ مکمل بھی ہے۔

ترقیمہ: تم القول و الحمد لله ... وکتب هذا الکتاب من النسخة التی نسخ (!) من نسخة الشیخ أبی القاسم السمیساطی بخطه ذکر انه نقلها من نسخة بخط مصنف الکتاب الشیخ أبی علی الحسن بن الحسن بن الهیثم و قابل علیها من أولها الی آخرها فی رجب من سنة ست و سبعین وأربعمایة۔

سرورق پر: والنسخة المکتوب منه هذه النسخة عورض بهذه النسخة الأصل المذکور وهو بخط الشیخ أبی علی بن الهیثم و صحح والحمدلله وکتب فی رجب من السنة المذکورة۔

آغاز: بسمله ... قول الشیخ الفاضل أبی علی ... إبن الهیثم فی هیئة العالم لم یزل کثیر من أصحاب التعالیم من أنعم النظر فی علم الهیئة ... یجردون

۱۰۔ دیکھیے GAL I, 357

۱۱۔ دیکھیے GAL I, 617; Suppl. I, 851

۱۲۔ دیکھیے O. Loth, *A Catalogue of Arabic Manuscripts in the India Office*, (London, 1877), p. 213.

ولا مرسلاً ... فنحن قائلون فی هیئة العالم قولاً یشتمل فیما نظن علی کلیات المعانی التی الیها انتهی ادراک الباحثین علی حقایق العلوم التعلیمیة .

اوراق ٤٤ ، سطور ١٧ ، خط نسخ جلی [قسطمونی : ٢٢٩٨]

(٣) کتاب الفرائد و القلائد عام طور سے یہ ادبی کتاب[13] ابوالحسین محمد بن الحسین (یا حسن) الأهوازی سے منسوب کی جاتی ہے جو چوتھی / دسویں صدی میں زندہ تھے . بعض حضرات اس کو الثعالبی سے اور بعض رشید الدین وطواط سے بھی منسوب کرتے ہیں . موجودہ نسخہ مصنف کے بیٹے ابوالحسین أحمد بن محمد بن الحسن الأهوازی کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے .

آغاز : الحمد لله العلی الکبیر القوی القدیر العلیم الخبیر السمیع البصیر ...

مکتوبه علی بن جعفر بن أسد بن علی الجوهری الکاتب . دمشق رجب سنه ٥٦٤ ھ

اوراق ٧٨ ، سطور ١٠ ، خط نسخ مشکول [قسطمونی : ٧٧٤]

(٤) کتاب أسماء الله و صفاته مصنفه ابوبکر أحمد بن الحسین البیهقی[14] (م ٤٥٨ ١٠٦٦). یہ کتاب قرآن ، حدیث اور اجماع امت کو مد نظر رکھتے ہوئے ، الله کے اسماء حسنه اور صفات کے بارے میں لکھی گئی ہے . اس کتاب کے نسخے کمیاب ہیں . یہ کتاب سنہ ١٣١٣ھ میں الہ آباد سے اور سنہ ١٣٥٨ھ میں قاہرہ سے محمد زاهد الکوثری کے مقدمه اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع ہوچکی ہے .

موجودہ نسخه سنه ٥٥٦ ھ میں لکھا گیا ہے کتاب کے سرورق پر جو سماع کی تحریر ثبت ہے اس کے بموجب یہ نسخہ الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن هبة الله الشافعی یعنی مشہور مؤرخ و محدث کی روایت کے مطابق خود ان کا پڑھا ہوا ہونا چاہیے کیونکہ ان کی وفات ٥٧١/١١٧٦

١٣- دیکھیے GAL I, 91; Suppl. I, 153

١٤- دیکھیے GAL I, 446; Suppl. I, 566.

میں ہوئی تھی[۱۵]. اس کتاب کا ایک تنقیدی ایڈیشن شائع ہونا چاہیے اور اس نسخے سے خاص طور پر مدد لینی چاہیے.

آغاز: حدثنا الشیخ الامام الثقة الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن هبة الله الشافعی قال قرأت علی الشیخ ابی الحسن عبیدالله بن ابی عبدالله محمد بن ابی بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی ببغداد فاقرّ به قلت اخبرکم جدک الامام ابو بکر أحمد بن الحسین البیهقی قراءة علیه فاقرّ به ثم اخبرنا الشیخ . . . ابو عبد الله محمد بن الفضل بن أحمد بن محمد الفراوی الواعظ الفقیه قراءة علیه بنیسابور قال اخبرنا الشیخ الامام الحافظ ابو بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی رحمة الله علیه قراءة علیه فی شعبان سنة تسع وأربعین وأربع مایة.

قال کتاب أسماء الله . . . باب إثبات أسماء الله تعالی ذکره بدلالة الکتاب والسنة وإجماع الأمة . . .

اوراق ۳۹۱، سطور ۱۷، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۲۱۰]

(۵) مجموعه

اوراق ۱۴۳، سطور ۱۹، خط نسخ غیر مشکول [قسطمونی: ۱۲۷]

(i) کتاب الجواهر (ورق ۱—۷) مصنفه ابو حامد محمد بن محمد الغزالی[۱۶] (م ۵۰۵ / ۱۱۱۱).

(ii) کتاب الأربعین في أصول الدین (ورق ۸—۷۰) مصنفه غزالی. مکتوبه ۴ محرم سنه ۵۴۴ھ مدرسه نظامیه نیشاپور.

(iii) کتاب قواشم الباطنیة (ورق ۷۱—۷۸) یه بھی غزالی کی تصنیف ہے. ان کی اہل سنت کے علاوہ تمام دیگر مذاہب سے دشمنی اور اسی طرح باطنیوں کے خلاف ان کا کھلا ہوا سخت فکری جہاد

۱۵- دیکھیے GAL I, 403; Suppl. I, 686

۱۶- دیکھیے GAL I, 538.

۱۷. ابھی تک اس سلسلے کی تصانیف میں صرف «کتاب المستظہری» معلوم ہے تھا جسے گولڈسیہر نے شائع کیا ہے اور جس کے متن کا دارومدار ایک ناقص نسخے پر رکھا تھا۔

«قواصم الباطنیہ» ایک مختصر رسالہ ہے جو سات اوراق پر مشتمل ہے «المستظہری» کا خلاصہ ہے۔ ابتدا میں مؤلف کہتا ہے:

وابتدأت بتوفیق اللہ لاسعافک إلی ما تمسته من کلمات و جیزة جلیة تقصم ظہور الباطنیة ویستأصل دابر أباطیلہم ... یستغنی ایجازها عما ... مؤذاه به النفس فی الکتاب الملقب بالمستظہری.

اس مختصر مقدمہ کے بعد وہ اصولوں کو بیان کرتا ہے اور باطنیوں کے خیالات کو چار عنوانات میں جمع کرکے یکے بعد دیگرے سب پر بحث کرتا ہے اور ان کو منطقی دلیلوں سے غلط ثابت کرتا ہے۔

آغاز: استوفق اللہ الذی لم یلذ بذبہ مخلص إلاّ عصمہ ولم یتمرد عن موردیہ جبار إلاّ قصمہ ... وابتدأت.

اختتام: ... فان جاز لک أن تعرف بنظر العقل صدقہ وإن کان ذلک محال جاز لی أیضاً أن أعرف ہذہ المسائل نور معلم وإن کان لی فیہا خلاف

(iv) المنقذ عن الضلال (ورق ۷۹—۹۶) مصنفہ الغزالی[18]۔

مکتوبہ سلخ ذی القعدہ سنہ ۵۴۳ ھ درمدرسۂ مذکور

(v) القسطاس المستقیم (ورق ۹۷—۱۲۵) مصنفہ الغزالی[19]

مکتوبہ یوم الأحد ۲۶ محرم سنہ ۵۴٤ ھ درمدرسۂ مذکور

(vi) کتاب الجام العوام عن علم الکلام (ورق ۱۲۶—۱۴۳) یہ بھی الغزالی کی تصنیف ہے[20]

۱۷۔ دیکھیے Islam Ansiklopedisi, Batiniye maddesi; I. Goldziher; *Streitschrift des Gazali gegen die Batinijja*-Sekte, Veroffentlichungen der De Goeje-Stifting, Leiden, 1916, Introduction.

۱۸۔ دیکھیے *GAL* I, 544

۱۹۔ دیکھیے *GAL* I, 540

۲۰۔ دیکھیے *GAL* I, 538

٦) کتاب التمهید فی معرفت التجوید اس تصنیف کے مؤلف بوالعلا الحسن بن أحمد بن الحسن بن أحمد بن محمد العطار الھمذانی[٢١] (م ١١٧٣/٥٦٩) ھیں جو عراق میں اپنے وقت کے تجوید کے عالموں میں سب سے بڑے خیال کیے جاتے تھے ۔ ابن الجزری کے بقول[٢٢] العطار الھمذانی کا مرتبہ اھل مشرق کے لیے وھی ھے جو کہ مغرب والوں کے لیے علم تجوید کے میدان میں الدانی کا ھے ۔ اس نادر نسخے پر مصنف کے ھاتھ کی تحریر کردہ ایک سند موجود ھے۔ اس کتاب کا ذکر ابن الجزری نے «التجوید» کے نام سے کیا ھے[٢٣] . اس سے ابتدائی عہد کے کچھ قراء کے متعلق اھم معلومات حاصل ھوتے ھیں ۔

ترقیمہ : آخر کتاب التمهید ... و فرغ من انتساخه من أصل مصنفه المكتوب بخطه محمد بن إبراهيم بن الحسين بن محمد داد الجرباذقانی یوم الاثنين ١٧ رمضان من شهور سنة ٥٣٧ حامداً لله ...

اس کے نیچے ایک سماع کی عبارت ثبت ھے جس پر کسی نے سیاہ روشنائی پھیردی ھے : بلغ من أول هذا الكتاب سماعاً بقرانه على صاحبه الشيخ ... كتبه الحسن بن أحمد بن أحمد [بن أحمد بن] بن الحسن... العطار فی شهرالله الأصم رجب من سنة اثنين و خمسين [وخمس مائة].

آغاز : ألحمد لله ... أما بعد فانک سألتني أسعدک الله بطاعته أن أذكر لک جملاً فی تحقيق القرآءة وترتيلها و تجويد التلاوة وترسيلها على ماورد عن النبی ... و صحابته .. والتابعين ... فسألتک على ما أنا عليه من تقسم الفكر لترادف الهموم ... جارياً على المألوف من توخی رضاک ... وسلكت فی النهوض بعبئه ...

اوراق ٨٨ ، سطور ٢٠ ، خط نسخ [قسطمونی ؛ ١٥٢٥]

٢١- دیکھیں GAL Suppl. I, 724 ،

٢٢- غایة النهایه فی طبقات القراء ؛ ٢٠٤ (قاھرہ ، ١٩٣٢)

٢٣- ایضاً : ٢٠٤

(۷) عوارف المعارف مصنفه شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی (م ۶۳۲ / ۱۲۳٤). اس کتب خانے میں «عوارف» کے تین نسخے موجود ہیں:

(i) مکتوبه: ابوالفتح سعید بن سعید الاصفہانی، ضحوة یوم الخمیس ۱۵ رمضان ۶۲۷ ھ، مکه.

سرورق پر دوسری روشنائی اور غالباً دوسرے قلم سے: استکتبه الفقیر... کحلی (؟) بن بکمش القطبی أحد أصحاب الأمیر... شمس الدین...
«عوارف» کے قدیم نسخوں[24] میں اس نسخے کا بھی شمار ہو سکتا ہے.

اوراق ۱۶۳، سطور ۲۱، خط معمولی نسخ [قسطمونی: ۱۵۶۳]

(ii) مکتوبه: ۶۱۵ ھ (یا ۷۱۵ ھ؟)

اوراق ۳۰۳، سطور ۱۹، خط نسخ جلی [قسطمونی: ۹۰٤]

(iii) مکتوبه: محمد بن امام، ۱۵ صفر ۷٤۸ھ، خانقاه السمیساطیه، دمشق

اوراق ۳۰۲، سطور ۱۹، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ۱۶٤۱]

(۸) مجموعه

اوراق ۱۷۵، سطور ۱۹، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۶۰٤]

(i) مقدمة عوارف المعارف (ورق ۱—۳)

(ii) تفسیر خطبة عوارف المعارف (ورق ٤—۱۶) کتاب پر مصنف کا نام یعقوبی دیا ہوا ہے.

آغاز: قوله الحمد لله ای الثناء لله والشکر له. قوله العظیم شأنه العظیم الزیادة.

(iii) اعلام الهدیٰ و عقیدة أرباب التقی[25] (ورق ۱۷—۳۵)

مکتوبه: علی بن محمد بن ابی بکر الساوی المعروف بالتبریزی. یوم الثلاثاء ۲۳ محرم ۷۰۷ ھ. دمشق.

۲٤. دیکھیے GAL I, 569; Suppl. I, 788; H. Ritter, Philologika IX: *Der Islam*, XXV, 1938, p. 36

۲۵. دیکھیے H. Ritter, no. 51 and *GAL*, no. 3

آغاز: الحمدلله الذی رفع غشاوة الغمّة عن بصایر أهل الوداد...

(vi) اللوامع الغیبیه (ورق ۳۵—۳۶) مصنفه سہروردی. روح کے متعلق ایک مختصر رسالہ[۲۶]

(vii) (ورق ۳۷—۴۱) سہروردی کے مختلف اقوال پر مشتمل ایک رسالہ. ہر قول لفظ «فتوح» سے شروع ہوتا ہے.

(vii) (ورق ۴۱—۴۴) خراسان کے بعض صوفیوں سے استفسارات کے جواب میں[۲۷] سہروردی کا رسالہ.

آغاز: وقل سألت رحمك الله وایانا هذه الأسئلة و أنا ... احیب عن بعضها...

(viii) ورق (۴۴—۴۵) روح حیوانی کے متعلق سہروردی کے کچھ اقوال[۲۸]

آغاز: قال الروح الحیوانی المجنّس المسمّی نفسا حیث تجس بورود الروح العلوی...

(viii) رسالة السیر و الطیر (ورق ۴۵—۴۷) یہ بھی سہروردی کی تصنیف[۲۹] ہے.

آغاز: قال رسول الله... سیر وا سبق المفردون قیل من المفردون...

(ix) وصیت و مختصر اقوال (ورق ۴۷—۷۱)

مکتوبہ: ۲۶ صفر ۷۰۷ ہجری

(x) ذکر أفاظ تدور بین الطائف الصوفیة (ورق ۷۲—۷۶)

تصرف کی بعض اصطلاحات کا مختصر ذکر.

(۹) اس مجموعہ کا خاص حصہ مشہور فخرالدین رازی (م۶۰۶/۱۲۰۹) کی «نهایة الایجاز فی درایة الإعجاز» نامی تصنیف پر مشتمل ہے[۳۰]

مکتوبہ: محمد بن ابی بکر ۱۴ محرم ۷۰۷ ہجری

۲۶. دیکھیے G.IL no. 29

۲۷. دیکھیے GAL I, 570, no. 11

۲۸. دیکھیے GAL S I, 790, no 20.

۲۹. دیکھیے H. Ritter, no. 52; GAL, no. 29.

۳۰. دیکھیے GAL Suppl. I, 924, no. 32.

(۱۰) الدرة الفريدة فى شرح القصيدة مصنفه منتجب الدين بن ابی العز بن رشید الہمذانی[31] (م ۶۴۳/۱۲۴۵). علم قراءت سے متعلق الدانی کی "التیسیر" کو شاطبی (م ۵۹۰/۱۱۹۴) نے نظم کا جامہ پہنایا تھا جس کا نام "الشاطبیہ" تھا[32]. پیش نظر کتاب جس کے کسی دوسرے نسخے کا اب تک علم نہیں ہو ہے، اسی منظوم کتاب کی شرح ہے اور یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر ابن الجزری نے کیا ہے[33].

اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے محمد بن أحمد بن ابی الفضل نے جو اناطولیہ میں سلجوقیوں کے دور کے مشہور خاندان ابو الفضل التفلیسی سے تعلق رکھتے تھے، شام میں سنہ ۶۵۲ھ میں خریدا تھا. اس نسخے پر ان کی حسب ذیل تحریر ہے:

إنتقل بحكم الشرى إلى أضعف خلق الله ... محمد بن أحمد بن ابي الفضل الحافظ التفليسي بمحروسة دمشق فى سنة اثنى و خمسين و ستماية ...

اس پر ابو عمرو عثمان بن موسیٰ الضریر المصری القرشی کی دی ہوئی ایک سند سماع بھی موجود ہے کہ سنہ ۶۵۳ھ میں شہر سیواس میں شمس الدین محمد بن حمید (؟) بن ابی الفضل التفلیسی اور ابو یزید بن ابراهیم نے مندرجہ بالا کتاب کی جلد دوم کے کچھ حصے پڑھے.

اوراق ۲۴۷، سطور ۱۷، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ۷]

(۱۱) کتاب معرفة أنواع علم الحديث مصنفه ابو عمر عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان ابن الصلاح. یہ ساتویں صدی کے مشہور محدث تھے. ان کی پیدائش ۵۷۷/۱۱۸۲ میں بمقام شہرزور ہوئی تھی. تعلیم موصل میں شروع ہوئی اور اس زمانے کے مختلف علم کے مرکزوں کی سیر کرتے ہوئے خراسان پہنچے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی. کچھ عرصہ بعد شام گئے جہاں انہوں نے سکونت اختیار کرلی اور جہاں وہ

---

۳۱. دیکھیے G.AL I, 528; Suppl. I, [illegible] اور ابن الجزری: غاية النهاية (۲: ۳۱۰)

۳۲. دیکھیے G.AL I, 5[illegible]0

۳۳. دیکھیے G.AL II, 310

مدرسۂ اشرفیہ میں حدیث کے شیخ ہوگئے. ان کی وفات سنہ ۶۴۲/۱۲۴۳ میں شام میں ہوئی[۲۴].

اس کتاب کا ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ استنبول میں موجود ہے[۲۵]. پیش نظر نسخہ مصنف کی زندگی میں ان کے پڑھے ہوئے ایک نسخے سے محمد بن سلیمان المقدسی نے نقل کیا ہے.

ترقیمہ: فرغ من نسخه من أصل مصحح متقن مضبوط مسموع علی شیخنا الإمام ... صدر الحفاظ مفتی الشام تقی الدین أبی عمرو عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان المعروف بابن الصلاح ... فی عشرین من شهر المحرم سنة احدی و أربعین و ستماية و کتب العبد... محمد بن سلیمان المقدسی

اوراق ۱۰۴، خط ترکی نسخ [قسطمونی: ۲۰]

(۱۲) شرح الوافیه مؤلفه ابوالفداء[۳۶] (م ۷۳۲/ ۱۳۳۱) کتاب الکافیہ مصنفۂ ابن حاجب[۳۷] (م ۶۴۶/ ۱۲۴۹) فن نحو کی مشہور کتاب ہے، طلبا کی آسانی کے لیے اسے نظم کا جامہ پہنایا گیا تاکہ نحوی مسائل حفظ کرنے میں انہیں آسانی ہو. اس کا نام «وافیہ» رکھا گیا. اس کا ایک نسخہ اسکوریال کے کتب خانے میں محفوظ ہے[۳۸]. پیش نظر نسخہ اس کتاب کی شرح ہے.

آغاز: الحمد لله الذی علم بالقلم ... و بعد فاننی لما وجدت منظومة الشیخ... جمال الدین أبی عمرو بن الحاجب فی النحو المسماة بالوافیة من أحسن أراجیز نظماً ولم أجد لها شرحاً توافق غرضی آثرت أن أعلق علیها شرحاً لطیفا

ترقیمه: کان فراغ مؤلفه العبد الفقیر ... اسمعیل بن علی بن محمود

۲۴- دیکھیے GAL I, 440; Suppl., 610

۲۵- دیکھیے M. Weisweiler, *Istanbuler Handschriften zur arabischen Traditionsliteratur*, Bibliotheca Islamica, X, (Istanbul, 1937), no. 6.

۳۶- دیکھیے GAL II, 55; Islam Ansiklopedisi, Ebu'l-Fida maddesi

۳۷- دیکھیے GAL 1, 367; Suppl. 1, 531

۳۸- دیکھیے Escurial, no. 146; GAL 1, 370

بن محمد بن عمر ابن شہنشاہ بن ایوب من تعلیقه فی یوم الأحد سابع عشر شعبان المکرم سنة ۷۲۳ ..... حامداً لله .....

مکتوبه بخط مصنف

اوراق ۱۴۳، سطور ۲۱، خط نسخ [قسطمونی : ۲۸۹۲]

(۱۳) کتاب الفصول مصنفه بقراط. یه کتاب حنین بن اسحاق کی کتاب کا ترجمه هے[۳۹].

مکتوبه ۷۰۳ هجری [قسطمونی : ۱۰۴۵]

(۱۴) المنتقی فی الأحکام عن خیر الأنام مصنفه عبدالسلام بن عبدالله بن تیمیة الحرانی[۴۰] (م ۶۵۲ / ۱۲۵۴).

مکتوبه ۶۵۱ هجری [قسطمونی : ۸۸۰]

(۱۵) معانی الاخبار مصنفه محمد بن إسحاق الکلاباذی[۴۱] (م ۳۸۰/ ۹۹۰)

مکتوبه ۷۸۵ هجری [قسطمونی : ۱۳۹۸]

(۱۶) شرح الصدور بشرح حال الموتی فی القبور مصنفه جلال‌الدین السیوطی[۴۲].

مکتوبه بخط مصنف ۱۵ جمادی الآخر ۸۸۳ ه [قسطمونی : ۱۱۴۴]

(۱۷) کتاب التوحید مصنفه ابو بکر محمد بن إسحاق بن خزیمة النیسابوری[۴۳] (م ۳۱۱/ ۹۲۳). [قسطمونی : ۳۰۲۵]

(۱۸) تاریخ مصر مصنفه علی بن أحمد السخاوی. یه مصر کی مختصر تاریخ هے جو سنه ۸۰۹ه سے سنه ۸۸۷ ه تک کے واقعات پر مشتمل هے.

---

۳۹. دیکھیے GAL I, 226

۴۰. دیکھیے GAL I, 504

۴۱. دیکھیے GAL I 217; Suppl. I, 360

۴۲. دیکھیے GAL II, 180, no. 30

۴۳. دیکھیے GAL I, 206

آغاز : ذکر سلطنة الملك الناصر فرج ابن برقوق الثانية لما جلس الملك الناصر فرج على تخت الملک ثانی مرة استقار أمره. واحتوى بأمور المملكة... الحوادث فی سنة ۸۰۹

اختتام : ... وقع الفراغ من جمعه على يد كاتبه على بن أحمد السخاوى نسبا الحنفى مذهبا فی ليلة يسفر صباحها عن يوم الجمعة الثامن عشر من المحرم سنة سبع ثمانين ثمانماية يتلوه إن شاء الله أول سلطنة الأشرف قايتباى.

مکتوبہ بخط مصنف

اوراق ٦٧ ، سطور ١٩، مصری نسخ† [قسطمونی : ١٢٩]

[*]

---

† International Society for Oriental Research کے شماہی رسالے Oriens جلد ٥ صفحات ٢٨—٤٦ کے ایک ترکی مضمون سے ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد غوث۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

استنبول کے کتب خانے

گزشتہ ستمبر میں استنبول میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا بائیسواں اجلاس منعقد ہوا،
اس میں شرکت کے سلسلہ میں شرق وسطیٰ میں چار مہینوں کے سفر کا موقع حاصل ہوا،
کانگرس ختم ہونے کے بعد ترکی کے شہروں اور قصبوں میں کتب خانوں عجائب خانوں اور کتابوں
کی نمائشوں کو دیکھنے کے لیے تین مہینوں کا دورہ کیا گیا، اور بروسہ، بالکی سر، منیسا، افیون قرہ حصار، کرمان،
اسکی شہر، قونیہ اور انقرہ میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری ذخیرے دیکھے
ترکی سے واپس ہوتے ہوئے حلب، بیروت، دمشق، بیت المقدس اور بغداد میں مکتبوں،

یونی ورسٹیوں اور علمی اداروں کے کتب خانوں اور عجائب خانوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، ہر جگہ کتب فروشوں کی چھوٹی بڑی دکانیں بھی دیکھیں

ترکی اور دوسرے مقاموں کے ذمہ داروں نے کتابوں کی تنظیم، فہرستوں کی ترتیب اور دوسرے نظم و نسق کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا بڑی کشادہ دلی اور اخلاق کے ساتھ انتظام کیا،

اس سفر میں جو معلومات حاصل ہوئے، ان میں دوسرے ذوق آشناؤں کو بھی شریک کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور اُن کو مضمون کی شکل میں ناظرینِ معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون میں صرف استنبول کے کتبخانوں کا ذکر کیا جائے گا، اور انشاء اللہ دوسرے مقامات کے کتبخانوں اور دوسرے علمی و تعلیمی حالات کو دوسرے مضمون میں قلم بند کیا جائے گا، واللہ الموفق،

استنبول کے کتب خانے زمانۂ قدیم سے مشہور ہیں، اور دور دور تک اُن کی شہرت ہے، یہ کتبخانے ترکوں کے اعلیٰ علمی ذوق اور خدمتِ علم کی ایسی شہادت ہیں جس کی تردید ممکن نہیں،

ترکی کے شہروں اور قصبوں میں جہاں جائیے ہر جگہ ترکوں کی تعمیری قابلیت اور تنظیمی قوت کا نظارہ ہوتا ہے، ترکوں کی قوم عملی قوم ہے، کچھ کرکے دکھانے کا شوق اس کی قومی خصوصیت ہے، یہ خصوصیت کتبخانوں کے دیکھنے سے بھی ظاہر ہوتی ہے،

صدیوں قبل سے استنبول کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں تک کے لوگ کتابیں جمع کرنے اور اُن کی حفاظت کے انتظامات کے شائق رہے ہیں، اور اب جب کہ ان کتابوں کو قومی امانت قرار دیا جارہا ہے، اُن کی اہمیت اور قیمت سے واقف ہوتے جاتے ہیں، اور خوشی خوشی اپنے بزرگوں کی علمی اور نادر کتابیں سرکاری کتب خانوں میں محفوظ کراتے چلے جارہے ہیں، اور کتابوں کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ بہترین انتظامات کے ساتھ عام استفادہ کے لئے مہیا ہوتا جارہا ہے جس کے اثرات علمی دنیا میں بہت گہرے ہوں گے،

استنبول مین اولاً مسجدون اور دوسری مذہبی عمارتون مین کتابون کی فراہمی شروع ہوئی تھی
پھر اُن کے احاطون مین مخصوص حجرے تعمیر کرکے ان مین کتابون کو جمع کرنا شروع کیا گیا تھا، پھر بعد
مین کتب خانون کے لئے مستقل عمارتین تعمیر ہوئین،

پہلی دو قسمون کے کتب خانون کے لئے کتابون کی فراہمی سلطان محمد فاتح نے شروع کی تھی. اور
مسجد ایوب مین اس کی ابتدا ہوئی. گویا ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء مین استنبول کے فتح ہوتے ہی مسجد ایوب مین
کتابین بھی فراہم ہونے لگین،

مسجدون سے الگ سب سے پہلا مستقل کتب خانہ استنبول مین قائم ہوا جو کوپرولو کا کتب خانہ کہلاتا
ہے، ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء مین یہ کتب خانہ قائم ہوا، اس کتب خانہ کی بلند و بالا نفیس اور شاندار عمارت کے ساتھ اس کی
کتابین بھی مشہور عالم ہین،

یون تو ہر عالم کے ہان کار آمد اور ضروری کتابون کا ذخیرہ ہوتا ہی تھا لیکن آگے چل کر کتابون
کو عام استفادہ کے لئے وقف کرنے کا رواج شوق کی حد تک پہنچ گیا، چنانچہ کتب خانون کے علم
دوست بانیون نے جو خود بھی بڑے عالم و فاضل ہوتے تھے، نہ صرف کتابین وقف کین، بلکہ اُن کے
رکھ رکھاؤ، اور اعلیٰ درجہ کے انتظام و اہتمام کے لئے بڑی بڑی جائدادین بھی وقف کین،

وقف نامون مین کتب خانہ کے ملازمین کے تقرر وغیرہ کے علاوہ کتب خانہ کے روزانہ کھلنے
اور بند ہونے کے اوقات تک کی صراحت ہوتی تھی،

ترکی کے طول و عرض مین جو بے شمار کتب خانے قائم ہوئے، اُن کی عمارتون اور کتابون کے
ذخیرون کو آگ اور زلزلون سے بھی بہت نقصان پہنچا، ایسے اوقاف جو سلطنت عثمانیہ کے ماتحت
ملکون اور علاقون مین قائم کئے گئے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد اُن سے ہاتھ دھونا پڑا،
اس لئے اس جنگ کے بعد یہ کوشش شروع کی گئی کہ کتابین مزید حفاظتی انتظامات کیساتھ

موزون عمارتون مین جمع کی جائین، اور کتب خانون کی خاص خاص خصوصیتین بھی برقرار رکھی جائین، اور ناظرین وشائقین کو بھی زیادہ سے زیادہ سہولت وآسانی حاصل ہو

چنانچہ اس وقت سارے استنبول کے (۱۰۵) کتب خانون کو (۱۱) کتب خانون مین ضم کر دیا گیا ہے۔

استنبول اور مملکت ترکیہ مین جو کتب خانے موجود ہین، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایسے کتب خانے جن کے اخراجات سررشتہ تعلیمات کی وساطت سے مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ترکی حکومت مین ۹۴ ہین جن مین ۲۰ شہر استنبول مین ہین،

ان کتب خانون مین وہ کتب خانے شامل نہین ہین جن کے اخراجات گو حکومت ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ برداشت کرتی ہے، لیکن جو یونیورسٹیون یا دوسرے سرکاری ادارون سے متعلق ہین، عجائب خانون سے ملحق کتب خانے بھی جدا ہین،

(۲) وہ کتب خانے جن کے اخراجات اضلاع کی حکومت برداشت کرتی ہے، اور وہ سررشتہ تعلیمات کی عام نگرانی مین ہین،

(۳) وہ کتب خانے اور دارالمطالعہ جو پبلک کے خرچ سے اور اُن کے انتظام کے تحت چلائے جاتے ہین، (۴۰۰) ہین،

(۴) ایسے کتب خانے جو خانگی انجمنون یا علم دوست افراد نے قائم کئے ہین، ملک بھر مین پھیلے ہوئے ہین، چنانچہ ازمیر (سمرنا) کا قومی کتب خانہ اسی نوعیت کا ہے،

(۵) علمی ادارون کے کتب خانے جن کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، مثلاً لسانی ادارہ اور انجمن تاریخ کے کتب خانے،

اس وقت استنبول مین جو کتب خانے موجود ہین، ان کے نام یہ ہین،

۱۔ عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ، ۲۔ کتب خانۂ لطف آفندی،

۳۔ کتب خانۂ ایاصوفیا، ۴۔ کتب خانۂ جدیدیہ،

۵۔ کتب خانۂ عمومی بایزید، ۶۔ کتب خانۂ مسجد فاتح،

۷۔ کتب خانۂ خسرو پاشا، ۸۔ کتب خانۂ کوپرولو،

۹۔ نت کتب خانہ، ۱۰۔ کتب خانۂ مراد ملا،

۱۱۔ نور عثمانیہ کتب خانہ، ۱۲۔ کتب خانۂ راغب پاشا،

۱۳۔ کتب خانۂ سلیم آغا، ۱۴۔ کتب خانۂ عام سلیمانیہ،

۱۵۔ کتب خانۂ توپ قپو سرائے، ۱۶۔ کتب خانۂ انجمن ترکیات،

۱۷۔ کتب خانۂ استنبول یونیورسٹی، ۱۸۔ کتب خانۂ ولی الدین آفندی،

ان مین سے بعض کتب خانے روزانہ صبح کے ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک کھلے رہتے ہین بعض کتبخانون مین ہفتہ مین ایک مرتبہ سہ شنبہ کو باری باری سے صفائی کے لئے تعطیل ہوتی ہے،

عموماً سب کتب خانون مین داخلہ کی عام اجازت ہے لیکن عجائب خانۂ آثار قدیمہ کے کتبخانہ، کتب خانۂ جدیدیہ، توپ قپو سرائے کے کتب خانہ اور یونیورسٹی لائبریری مین داخلہ خاص اجازت سے ہوتا ہے، ان کتب خانون کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات سرکاری دفترون کے اوقات کے مطابق ہین،

اوپر جن کتب خانون کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان مین سے بعض کی کتابین کل کی کل مطبوعہ ہین، مثلاً عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ، اس مین بیس ہزار کتابین ہین جو سب مطبوعہ ہین، اسی طرح ادارۂ ترکیات کے کتب خانہ مین (۱۲۰۰۰) کتابین موجود ہین لیکن یہ بھی تمام کی تمام مطبوعہ ہین،

ان مین سے بعض کتب خانون کو مطبوعہ کتابون کے ذخیرہ ہی کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے لیکن ان میں

قلمی کتابین بھی کچھ نہ کچھ موجود ہین، جیسے بلدیہ کا کتب خانہ، اس کتب خانہ مین (۸۲۲۶۲) کتابین جمع ہین لیکن قلمی کتابین صرف (۱۰۳۲) ہین،

بعض کتب خانون مین اصلی ذخیرہ قلمی کتابون کا ہے لیکن مطبوعہ کتابین بھی موجود ہین، مثلاً کتب خانہ ایاصوفیا مین (۵۰۹۴) مخطوطات کا ذخیرہ ہے لیکن مطبوعہ کتابون کی کل تعداد صرف (۴۴) ہے،

بعض کتب خانون مین مطبوعہ اور مخطوطہ دونون قسم کی کتابون کا بڑا وافر ذخیرہ ہے مثلاً بایزید عمومی کتب خانہ مین (۴۹۶۷) مخطوطات اور (۹۱۲۱۷) مطبوعہ کتابین ہین، اسی طرح یونیورسٹی کے کتبخانہ مین (۱۳۵۹۰) مطبوعہ کتابین، اور (۸۴۷۱) مخطوطات ہین،

غرض استنبول کے موجودہ کتب خانون مین (۳، ۱۲۳۴) مخطوطات استفادۂ عام کے لئے ہر طالب علم کی دست رس مین ہین، اور ابھی نجی کتب خانون اور کتابون کو حکومت، یا کتب خانون کے سپرد کر دینے کا سلسلہ جاری ہے،

نئی لائبریری مین جو کتب خانے شامل کئے گئے ہین، اُن مین سب کو علحدہ علحدہ کمرون مین رکھا گیا ہے،

ان تمام کتب خانون مین حسب ضرورت فرنیچر دوسرے ضروری سامان اور خوش اخلاق و مستعد عملہ موجود ہے، سامان ایسا ہے جس سے شان و شوکت کا بھی اظہار ہوتا ہے، صفائی اور پاکیزگی تو ایک عام بات ہے، جس کا مشاہدہ ہر جگہ ہوتا ہے،

ہر کتب خانہ مین کارڈ کیٹلاگ کو رواج دیا جارہا ہے، قلمی کتابون کی فہرستین رجسٹرون مین بھی ہین،

صرف ایک شہر مین ایک لاکھ سے زیادہ قلمی کتابون کا بہترین انتظامات کے ساتھ استفادۂ عام

کے لئے تنہا ہونا علمی دنیا کے لئے ایک غیر معمولی بات ہے۔

یہ ساری قلمی کتابیں عربی، ترکی اور فارسی کی ہیں، مگر زیادہ تعداد عربی کتابوں کی ہے۔

یورپ اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں صرف چند ہزار عربی اور فارسی اور ترکی قلمی کتابیں ہیں،[1] لیکن چونکہ اُن کی تفصیلی فہرستیں بڑی محنت و قابلیت اور بڑی جانکاہی سے مرتب کی گئی ہیں، بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہیں، اور آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں، اس لئے اُن کی عام شہرت ہو گئی، لیکن استنبول کے اس عظیم الشان ذخیرہ پر جب کچھ اصحابِ علم اپنی عمریں صرف کر دیں گے، اس وقت اس کی اہمیت اور قدر کا عام اندازہ ہو سکے گا، خوشی کی بات ہے کہ اس کا اہتمام ہو رہا ہے، چنانچہ وزارتِ تعلیمات کے تحت کتب خانوں کے ڈائرکٹر کی نگرانی میں ایک خاص کمیشن استنبول کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنے کے لئے مامور ہوا ہے۔

اس مضمون میں ہر کتب خانہ کے الگ الگ حالات اور خصوصیات بیان کرنے کی گنجائش دشوار ہے، اس لئے صرف استنبول یونیورسٹی لائبریری کے متعلق کچھ وضاحت یہاں کی جاتی ہے۔

اس کتب خانہ کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا، اس کی تین منزلہ عمارت یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے علحدہ لیکن اُسی کے قریب واقع ہے، استنبول کی موجودہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے جو دار الفنون قائم تھا، اس کے

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند کتب خانوں کی کتابوں کے اعداد کا بیان ذکر کر دیا جائے، اس کی تفصیل کے لئے خود ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

پورے استناد کے ساتھ اعداد بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے کہ اس وقت تک اس کا مستند مواد بہت کم فراہم ہو سکا ہے، جو اعداد معلوم ہیں، وہ ۱۰، ۲۰ سال بلکہ ۴۰، ۵۰ سال قبل کے ہیں، تاہم عمومی اندازہ کے لئے کافی حد تک یہ اعداد کافی ہیں۔

برٹش میوزیم میں مخطوطات فارسی کی تعداد ۲۹۹۱۰ ہے۔

شعبہ ہائے ادبیات، سائنس، دینیات اور قانون کی کتابیں اس کتب خانہ کے لئے دے دی گئیں بعض اور دوسرے خانگی کتب خانے بھی اس میں شامل کر دیئے گئے، حکومت نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کا کتب خانہ بھی اس کو دے دیا، اس طرح کتب خانہ کے قیام کے بعد سے کتابوں کے اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

۱۹۳۳ء میں جب یونیورسٹی کی جدید تنظیم ہوئی، اور مختلف شعبوں (فکلٹیز) نے اپنے لئے علیحدہ کتب خانوں کا قیام ضروری سمجھا، اس وقت سے یونیورسٹی لائبریری میں جو کتابیں فراہم کی جاتی ہیں ان کی نوعیت یہ ہے،

۱۔ ایسی کتابیں جو انسائیکلوپیڈیا یا ببلوگرافی کی نوعیت کی ہوں،

(بقیہ حاشیہ ص۱۱۱) ڈاکٹر ریو نے فارسی کیٹلاگ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ برٹش میوزیم میں عربی مخطوطات کی تعداد ... تک نہیں پہنچتی ہے، اور دوسری مشرقی زبانوں کی قلمی کتابیں اور بھی کم ہیں، انڈیا آفس میں فارسی مخطوطات کی تعداد ۳۰۷۶ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں فارسی مخطوطات کی تعداد کرزن کلکشن کو ملا کر کل ۲۵۳۰ ہے، بمبئی یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اردو مخطوطات = ۱۶۷ - مدراس کے مشرقی مخطوطات کے کتب خانہ میں عربی فارسی اور اردو مخطوطات ۹۲۵ نیشنل لائبریری کلکتہ کو بوہار کتب خانہ میں عربی فارسی قلمی کتابیں کل ۹۳۳۹ ہیں، بانکی پور کی خدا بخش لائبریری میں ۲۲۳۲ فارسی کے اور (۲۶۴۴) عربی کے مخطوطات ہیں، حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ میں غیر سرکاری اطلاع کے بموجب جو مجلہ نوائے ادب بمبئی میں شائع ہوئی عربی فارسی اور اردو مخطوطات کی تعداد (۱۴۰۰۰) ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں قلمی کتابوں کی تعداد ۲۱۵۱ یا اس سے کچھ زیادہ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں قلمی کتابیں (۴۰۰۰) ہیں، یہ اعداد محض اندازہ کے لئے بیان کئے گئے، ورنہ صحیح اعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے،

۲۔ وہ کتابین جن کا تعلق عام ادب سے ہے،

۳۔ وہ کتابین جو قدیم ترکی رسم الخط (عربی رسم الخط) مین لکھی گئی ہون،

۴۔ ۱۹۲۳ء مین یہ قانون منظور ہوا کہ مملکت ترکیہ مین جو بھی کتاب، رسالہ یا اخبار طبع و شائع ہو اس کا ایک نسخہ اس یونیورسٹی لائبریری مین محفوظ کیا جائے،

۵۔ تبادلہ مین بعض یورپین یونیورسٹیون سے سائنٹفک مطبوعات حاصل کیجاتی ہین،

اس کتب خانہ کا ذخیرہ کتب مطبوعات اور مخطوطات دونون پر مشتمل ہے، مطبوعہ کتابون کے بڑے حصہ کا موضوع یا مشرق ہے یا ترکی مملکت، ترکی مطبوعات کے لئے یہ کتب خانہ ساری دنیا مین خصوصی ترجیح کا حامل ہے،

اس یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات جو کم و بیش بیس ہزار ہین، ترکی، عربی اور فارسی زبانون کے ہین اور ان مین بے شمار ایسے نسخے بھی شامل ہین، جو خطاطی، مصوری، نقاشی، اور جلد سازی کے بے مثل نمونہ ہین، وہ ایک ایک نسخہ صناعی اور مہارت فن کا گویا ایک شاہکار ہے، جس کے دیکھنے سے آنکھون کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے،

قرآن شریف کے نسخون مین رق پر لکھے ہوئے نمونے بھی جو ابتدائی صدیون کی یادگار ہین، موجود ہین، اور عرب اور ایران، ترکستان، ہندوستان، افغانستان، اور عثمانی ترکون کی سلطنت کے مختلف علاقون کے مشہور خطاطون، عالمون اور عالمانون کے لکھے ہوئے، مصاحف، ابتدائی کوفی خط سے لیکر اعلیٰ درجہ کے نسخ و نستعلیق تک مین یہان موجود اور باصرہ نواز ہین، ان مصحفون مین سادہ اوراق سے لے کر فن کاری کے اعلیٰ ترین دیدہ زیب اور دل نواز نمونے ع:-

"داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار"

کے مصداق ہین،[1]

اس کتب خانہ کے مقدور نسخون کی فہرست جو ناظم کتب خانہ فہمی ادہم نے مرتب کی ہے، بڑے اہتمام سے پیرس میں ۱۹۳۰ء میں چھپا ہوئی ہے،

ترکی زبان کے رسالے اور مجلے جو اس کتب خانہ میں آتے ہیں، اُن کی تعداد (۳۴۰) اور اخبارات کی (۴۰۰) ہے[1]

چونکہ کتب خانہ کی عمارت تنگ ہے، اس لئے اس سے استفادہ بھی محدود رکھا گیا ہے، اور صرف اساتذہ اور اعلیٰ جماعتون کے طلبہ کو استفادہ کی اجازت ہے، البتہ کتب خانہ میں ایک ایسا کرہ بھی ہے جہان طلبہ خود اپنی ذاتی کتابون کا مطالعہ کرسکتے ہین، یہ دار المطالعہ روزانہ صبح کے سات بجے سے رات کے دس بجے تک کھلا رہتا ہے،

مطالعہ اور تحقیقی کام کرنے والون کو خاص اجازت سے استفادہ کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اس کتب خانہ کے لئے ایک نئی موزون عمارت کی تعمیر زیر تجویز ہے، اس کی تعمیر کے بعد کتب خانہ سے استفادہ کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے گا،

اس لائبریری مین دو قسم کی عام فہرستین ہین، ایک ڈکشنری سسٹم پر، دوسرے اعتباری فرلیڈ کی تقسیم علوم والی فہرست، عربی اور فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرستین اُن کے رسم الخط مین علٰحدہ علٰحدہ مرتب اور مبیامین قلمی کتابوں کی فہرست علٰحدہ ہے،

اس کتب خانہ کی مختلف نشریات کی تعداد ۱۹۳۵ء تک (۴۹) تک پہنچ چکی ہے، ان مین سے دو مطبوعہ فہرستین تحفہ کے طور پر راقم کو بھی حاصل ہوئین، ان مین ایک کتب خانہ کی فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرست ہے جو ۱۹۳۵ء مین طبع ہوئی ہے، اس کے مرتب فہمی ادہم ہین، یہ فہرست علوم اور مولفون کے نام کے لحاظ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰۵) علٰحدہ رکھی ہوئی ہین جن کو دیکھتے دیکھتے آدمی تھک جائے، اور کتابین ختم نہ ہون.

[1] ان اعداد سے ترکی کی عام تعلیمی اور علمی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے،

یہ حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے، اور استنبول مین نہایت خوبصورت طبع ہوئی ہے، ایران
اور ایرانیات پر دوسری زبانون کی جو کتابین کتب خانہ مین محفوظ ہین، وہ بھی اس فہرست مین شامل
کر دی گئی ہین،

دوسری فہرست عربی کی قلمی کتابون کی ہے، اس کے مرتب بھی تہمی اوغلو ہین، یہ نشریہ عربی مخطوطات
کی فہرست کی پہلی جلد کا پہلا حصہ ہے، اس حصہ مین قرآن مجید اور اس سے متعلقہ علوم کے (۲۳۲) مخطوطات
کا تذکرہ ہے، ان مین سے (۲۵۰) قرآن مجید ہین اور باقی تجزیہ وغیرہ فنون کے قلمی نسخے، دس تصویرین
بھی اس نشریہ مین ہین، آٹھ تصویرین قرآن شریف کے مختلف نسخون کے ایک ایک صفحہ کی اور دو تصویرین
جلد بندی کے نمونون کی ہین،

یہ فہرست گو تفصیلی فہرست نگاری کے جاریہ طریقہ پر مرتب کی گئی ہے، لیکن اختصار پیش نظر رکھا گیا ہے،
تاہم کوئی ضروری بات چھوٹنے نہین پائی ہے، اس فہرست مین مختلف اشاریے اور کارآمد جدولین بھی ہین،
ہر کتاب کا نام اور ابتدائی عبارت عربی رسم الخط مین تحریر ہے،

یہ تو ان کتب خانون کے ظاہری حالات ہین، ان کی کتابون اور مخطوطات پر مختصر تبصرہ کے لئے بھی
استنبول مین کافی قیام کی ضرورت بلکہ ساری عمر درکار ہے، اس پاسورہ روز مین کوئی کیا دیکھ سکتا ہے اور حسرت
وافسوس کے ساتھ واپس ہونا پڑتا ہے،

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا، اگر استنبول کی ان نمایشون کا تذکرہ کیا جائے جو کانگرس کے سلسلہ
مین قلمی کتابون کی نمایش کے لئے منعقد کی گئی تھین[1]،

---

[1] مخطوطات اور مطبوعہ کتابون کی نمایشون کے علاوہ اور دوسری جو نمایشین ہوئی تھین، وہ یہ ہین،

۱- ترکی کی یادگار عمارتون کے نقشون کی نمایش، استنبول کی ٹکنکل یونیورسٹی مین۔

۲- ٹرکش انسٹی ٹیوٹ فار گرس نے نور بانی کی نمایش کی تھی،

مندرجہ ذیل ۵ مقامون مین قلمی کتابون کی نمایشون کا انتظام کیا گیا تھا،

۱۔ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانہ مین،

۲۔ فتح لائبریری مین،

۳۔ کتب خانہ راغب پاشا مین،

۴۔ توپ قپو سراے کی میوزیم کے کتب خانہ مین،

۵۔ خود استنبول یونیورسٹی کی مرکزی عمارت مین،

مخطوطات کی ان نمایشون کے علاوہ، یونی ورسٹی کی عمارت ہی مین مطبوعہ کتابون کی بھی نمایش ہوئی تھی،

مطبوعہ کتابون مین زیادہ تر جدید ترکی مطبوعات تھین اور کچھ قدیم رسم الخط کی کتابین بھی تھین، بیرونی ادارون کی کتابین بھی نمایان کی گئی تھین، ان مین حیدرآباد کے دائرۃ المعارف[1] کی مطبوعات بھی تھین، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ناشرون نے اس نمایش کے ذریعہ اپنی نشریات کو مشہور کرنے کی اہمیت کم محسوس کی، حالیہ ترکی مطبوعات کا موضوع ایک علٰحدہ مضمون کا متقاضی ہے،

یہ تمام نمایشین بڑی خوش انتظامی اور حسن اہتمام سے منعقد ہوئی تھین،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷) ۳۔ قدیم سرکاری دفاتر کے اہم کاغذات کی نمایش، حکومت کے کاغذات قدیم کے دفتر مین،

۴۔ مصوری اور بُت تراشی کی گیلری،

۵۔ عصری ترکی پینٹنگ کی نمایش، یہ بھی یونیورسٹی کی عمارت مین تھی،

۶۔ ترکی عورتون کے لباس کی نمایش،

۷۔ قالینون اور تعفون یا خطی، اور دوسری اشیاے فنون لطیفہ کی نمایش، اس نمایش کا مختصر تذکرہ مضمون مین کیا گیا ہے۔

[1] حیدرآباد دکن کے اس ادارہ نے خاموشی کے ساتھ علم کی جو خدمت کی ہو اسکا بیرونی علمی دنیا مین بڑا چرچا ہو

استنبول یونیورسٹی کی عمارت مین مخطوطات کی جو نمایش ہوئی تھی، اس کے لئے خاص طور سے بڑا اہتمام کیا گیا تھا، ایک وسیع مربع ہال مین جس کی وسعت ہندوستانی یونیورسٹیون کی عمارتون مین کم دیکھنے مین آتی ہے، شیشہ کے صندوقون مین یا میزون پر کھلی کتابین سارے ہال مین قرینے سے ترتیب دی گئی تھین، ہر کتاب پر اس کا مختصر حال علحدہ علحدہ کارڈ پر لکھا ہوا تھا، یہ نمایش گیارہ دن صبح کے ۹ بجے سے شام کے چھ بجے تک مسلسل رہی،

اس نمایش مین استنبول کے تمام کتب خانون سے کتابین فراہم کی گئی تھین، جن کتابون کی نمایش کی گئی، اُن کی ایک فہرست بھی چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس فہرست کے مطابق (۸۹۹) عربی فارسی اور ترکی زبانون کی قلمی کتابین اس نمایش مین موجود تھین، سب سے زیادہ کوپرلو کے کتب خانہ کی کتابین (۱۶۰) کی تعداد مین تھین،

نمائش مین رکھی جانے والی کتابون کی جو فہرست چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس مین ہر کتاب کے متعلق مندرجۂ ذیل باتین تحریر تھین،

(۱) نام کتاب (۲) سنہ کتابت یا سنہ تالیف (۳) مؤلف کا نام (۴) مؤلف کا سنہ وفات (۵) فن (۶) زبان (عربی، فارسی یا ترکی) (۷) کتب خانہ کا نمبر،

فراہمی معلومات کے دو دفتر نمایش مین قائم کئے گئے تھے، ایک ان کتابون کے متعلق جو نمایش مین رکھی گئی تھین، دوسرے استنبول کے کتب خانون کے متعلق اور یہ انتظام کیا گیا تھا کہ ترکی جرمن، عربی اور فارسی چار زبانون مین یہ معلومات بہم پہنچائی جائین دوسرے فنی معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام تھا، اس نوعیت کے معلومات بھی چار زبانون، ترکی، انگریزی، عربی اور فارسی مین

(بقیہ حاشیہ ۱) جس صاحب علم سے ملاقات ہوتی تھی، وہ ضرور اس ادارہ کا حال دریافت کرتا تھا، وطن مین اس ادارہ اور اس کے ٹھوس کام کی اہمیت کا اندازہ نہین ہوسکتا،

فراہم کئے جا سکتے تھے،

چونکہ نمایش کے بڑے ہال میں کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ممانعت تھی، اس لئے نمایش میں ہی ایک دارالمطالعہ بھی قائم کر دیا گیا تھا، تاکہ اگر کوئی چاہے تو جن کتابوں کی نمایش کی گئی تھی، ان میں سے کوئی کتاب تھوڑی دیر کے لئے لیکر ضروری معلومات حاصل کر سکے، جو لوگ اپنے اخراجات سے تصویر یا فلم لینا چاہتے تھے، ان کے لئے بھی معقول انتظامات کئے گئے تھے،

دل چاہتا ہے کہ نمایش میں جو کتابیں دیکھی تھیں، ان کا مفصل تذکرہ کیا جائے، لیکن بحالات موجودہ یہ ممکن نہیں، اس لئے صرف چند کتابوں کا تذکرہ مختصر طور سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ اختلافات الائمہ، شمس الدین الاوزجندی (المتوفی سنہ ۶۶۲ھ) کی تالیف، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے آئی تھی، زبان عربی، نمبر[1] ۳۰۳، جہاں تک علم ہے یہ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی ہے

۲۔ التذکرۃ الہرویہ فی الحیل الحربیۃ، فنون حرب میں علی بن ابو بکر الہروی (المتوفی سنہ ۶۱۱ھ) کی تالیف، کتب خانہ کا یہ نسخہ مؤلف کی زندگی میں سنہ ۶۱۱ھ میں لکھا گیا تھا، تا حال غیر مطبوع ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے یہ نسخہ آیا تھا، نمبر (۲۰۱۸) زبان عربی، غالباً شمس الدین الاوزجندی، اور علی بن ابو بکر الہروی کی کوئی دوسری کتاب بھی ابھی طبع و شائع نہیں ہوئی ہے،

۳۔ المنصف، فن صرف میں ابو الفتح ابن جنی (المتوفی سنہ ۳۹۲ھ) کی تالیف سنہ ۵۱۱ھ میں لکھا ہوا نسخہ، زبان عربی، عاطف آفندی کے کتب خانہ کی نمبر ۲۹۳۹، ابن جنی کی دوسری کتابیں طبع ہوئی ہیں، لیکن اس کتاب کی طباعت کا حال معلوم نہیں،

۴۔ مقدمہ ابن خلدون (المتوفی سنہ ۸۰۸ھ) یہ مقدمہ سنہ ۷۷۹ھ میں تالیف ہوا۔

---

[1] یہاں اس بات کی صراحت کر دی جاتی ہے، کہ نمبر سے کتب خانہ متعلقہ کا نمبر مراد ہے۔

نسخہ اسی سال کا مکتوبہ ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۱۹۲۹،

۵- ادلۃ الرسمیۃ فی ..... الحربیۃ :- فنون حرب پر عربی زبان میں محمود بن شخلی کی تالیف، ۸۶۰ھ میں یہ کتاب تالیف ہوئی، غالباً یہ نسخہ اسی سنہ کا مولف کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، ایاصوفیہ کے کتب خانہ سے یہ کتاب نمائش میں آئی تھی، نمبر ۲۸۳۹- کتاب کی طباعت کا کوئی حال معلوم نہیں ہے،

۶- اربعین فی ارشاد السّالکین : ابو الفتح محمد الطائی کی تالیف، ۵۶۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ، عربی زبان میں حدیث اور سلوک کے موضوع پر مختصر رسالہ ہے، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نمبر ۵۱۲، اس کتاب کے چھپنے کے حال سے کوئی آگاہی نہیں ہے،

۷- اغراض السّیاسۃ فی علم الریاسۃ : الخلیب السمرقندی کی فارسی زبان میں تالیف، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ، کتاب کا نمبر ۲۸۰۴، کتاب غالباً تاحال غیر مطبوعہ ہے،

۸- کتاب الاقالیم الارضیہ علی الممالک الاسلامیہ } ابو اسحٰق الاصطخری المتوفی (۳۴۳ھ) کی تالیف، عربی زبان میں جغرافیہ کے موضوع پر، اصطخری کی دوسری دو کتابیں صور الاقالیم اور مسالک الممالک چھپ چکی ہیں، لیکن یہ تالیف غالباً ابھی چھپی نہیں، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۲۹۷۱،

۹- اعیان العصر وآوان النشر - عربی زبان میں اپنے ہم عصر مشاہیر پر خلیل الصفدی المتوفی ۷۶۴ھ) کی تالیف، غالباً مؤلف کا خود اپنا لکھا ہوا نسخہ ہے، (ایاصوفیہ نمبر ۲۹۶۲) حال طباعت نامعلوم،

۱۰- اظہار صنعۃ الحیّ القیوم فی ترتیب بلاد الفیوم } فخر الدین ابن النابلسی کی تالیف عربی زبان میں، حال طباعت نامعلوم (ایاصوفیا نمبر ۲۹۶۰)

۱۱۔ الاشراف علیٰ معرفۃ الاطراف: ابن عساکر (المتوفی ۵۷۱ھ) کی عربی زبان میں حدیث کے موضوع پر تالیف، غالباً کوئی انڈکس ہے، حال طباعت غیر معلوم نسخہ اباصوفیا نمبر (۵۱۰)
یہ نسخہ کتاب کی دوسری جلد پر مشتمل ہے،

۱۲۔ سیر ابن اسحاق کا فارسی ترجمہ، ۸۲۶ھ میں لکھا ہوا نسخہ (اباصوفیا نمبر ۳۲۲۵) یہ امر تحقیق نہ ہوسکا کہ یہ کتاب ابن ہشام کی ترتیب دی ہوئی سیرت ابن اسحٰق کا ترجمہ ہے، یا اصل کتاب کا، اگر اصل کتاب کا ترجمہ ہے تو علمی دنیا کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے،

۱۳۔ جغرافیہ کی کتاب العجائب کا ترکی ترجمہ: مترجم مصطفیٰ سروری (المتوفی ۹۶۹ھ) نسخہ اباصوفیا نمبر (۳۱۵۶)

۱۴۔ المسالک والممالک: کا فارسی میں ترجمہ مترجم کا نام ابوزید احمد بلخی ہے، نسخہ اباصوفیا نمبر (۳۱۵۶)

المسالک والممالک کے نام سے عربی زبان میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً ابن خرداذ (المتوفی فی حدود ۳۰۰ھ) کی تالیف، الاصطخری (نبذ ۳۴۰ھ) کی تالیف اور ابن حوقل (المتوفی ۳۶۷ھ) کی تالیف، یہ تینوں کتابیں دی خویہ وغیرہ مستشرقین نے لیڈن سے طبع و شائع کی ہیں، اس بات کی تحقیق نہ ہوسکی کہ اباصوفیا کے کتب خانہ میں محفوظ المسالک والممالک کا ترجمہ فارسی کس متن کا ترجمہ ہے؟

۱۵۔ التکملہ لوفیات النقلۃ: دوسری تا دسویں جلد، الترغیب والترہیب کے مؤلف ذکی الدین المنذری (المتوفی ۶۵۶ھ) کی تالیف، عربی زبان میں تاریخ و تذکرہ کے موضوع پر ۸۷۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے، اور غالباً تاحال غیر مطبوع، نسخہ اباصوفیا نمبر (۳۱۹۳)

۱۶۔ تلخیص المخروطات: یہ کتاب عربی زبان میں فن ہندسہ کے موضوع پر ہے، مؤلف کا نام محمود بن قاسم الاصفہانی ہے، ۵۳۳ھ کا لکھا ہوا نسخہ، طباعت کا حال معلوم

(نسخہ آیا صوفیا نمبر ۳۲۲۶)

۱۷۔ تاریخ اسلام وطبقات المشاہیر والاعلام: شمس الدین الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ ہجری) نسخہ آیا صوفیا نمبر ۳۰۰۵)

۱۸۔ تاریخ المجروحین من المحدثین: ابوحاتم البستی المتوفی (۳۵۴ھ) کی تالیف عربی زبان میں، ابوحاتم البستی کی ایک دوسری تالیف روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء طبع ہو گئی ہے لیکن اس کتاب کے طبع ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ (نسخہ آیا صوفیہ ۲۹۴)

۱۹۔ روضات اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب: فخرالدین بناکتی (المتوفی ۷۳۰ھ) کی تالیف فارسی زبان میں ۸۳۰ھ میں اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے (نسخہ آیا صوفیا نمبر ۳۰۲۶)

۲۰۔ شرح اشکال التاسیس: مولانا قاضی زادہ رومی (المتوفی ۸۱۵ھ) فن ہندسہ کے موضوع پر عربی زبان میں ۸۱۴ھ میں غالباً یہ کتاب تالیف ہوئی ہے۔ (نسخہ آیا صوفیا نمبر ۲۷۳۴)

۲۱۔ ظفرنامہ: امیر خسرو دہلوی (المتوفی ۷۲۵ھ) کی تالیف ترکی زبان میں، یہ نسخہ ۹۳۵ھ میں نقل ہوا ہے۔ (نسخہ آیا صوفیا نمبر ۳۳۰۱)

۲۲۔ کتاب المسافات والولایات: عربی زبان میں ابوعبداللہ القدسی (زبیح ۳۸۰ھ) کی تالیف۔ یہ نسخہ ۸۵۵ھ میں نقل کیا گیا ہے۔ القدسی کی ایک دوسری تالیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم کے بعض اجزاء طبع وشائع ہو چکے ہیں، کتاب المسافات غالباً ابھی طبع نہیں ہوئی ہے (نسخہ آیا صوفیا ۲۹۷۱)

۲۳۔ معادن النوادر فی معرفت الجواہر: کوئی بیہقی اس کے مولف ہیں۔ کتاب عربی زبان میں ہے جواہرات اس کا موضوع ہے، ۹۱۵ھ کی تالیف ہے۔ اس موضوع پر مسلمان علماء نے بہت توجہ کی ہے، ترکی کے دوسرے کتب خانوں میں اس موضوع پر جو تالیفیں دیکھنے میں آئیں ان کا آئندہ تذکرہ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (نسخہ آیا صوفیا نمبر ۳۶۳۰)

۲۴۔ معرفۃ انواع علم الحدیث : یہ رسالہ مقدمۂ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، مؤلف کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی، اور یہ نسخہ ۶۴۰ھ کا لکھا ہوا ہے، (نسخہ ایا صوفیا نمبر ۴۴۴)

۲۵۔ معرفۃ اصول الحدیث : محدث حاکم نیشاپوری (المتوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف، ۵۰۸ھ میں لکھا ہوا نسخہ (ایا صوفیا نمبر ۴۴۹)

یہ چند کتابیں جو مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق ہیں، ورنہ ایک ایک کتاب کے لئے کئی کئی صفحے درکار ہیں، اور کوئی دس بیس کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں نایاب اور نادر نسخے ہیں، جن کا نام شمار کرانا بھی دشوار ہے،

کانگرس کے ضمن میں جو دوسری مختلف نمائشیں ہوئی تھیں، ان سب کا تذکرہ باعث طوالت ہوگا، صرف خطاطی کی نمائش کے متعلق سرسری اشارہ کیا جاتا ہے،

خطاطی کی نمائش فنون لطیفہ کے شعبہ کا جزو تھی، پوری نمائش میں موجودہ عہد کے نمونے رکھے گئے تھے، اس ہال میں جو چیز سب پر چھائی ہوئی تھی، وہ نجم الدین خطاط کے لکھے ہوئے قطعے تھے، ان قطعوں کو دیکھ کر خطاطی میں نجم الدین کے کمال پر نمائش میں ہر شخص کی زبان سے بے اختیار ستائش اور تحسین کا اظہار ہوتا تھا، نجم الدین اپنے پیشرو باکمال ترک استادان خطاطی کے قابل فخر جانشین ہیں،

خطاطی کا یہ کمال نئے رومن رسم الخط میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا، یہ تو عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے قطعے تھے، پھر انقلاب کے بیس پچیس سال قبل کے لکھے ہوئے نہیں، بلکہ ۱۹۳۶ء کے لکھے ہوئے یعنی نمائش سے صرف کچھ عرصہ قبل تحریر کئے ہوئے تازہ بتازہ نو بہ نو کے مصداق، پھر ان قطعوں کے مضامین رندانہ یا اس سے کم درجہ کے شاعرانہ نہیں، بلکہ خالص اسلامیاتی یعنی آیات قرآنی، حدیثیں یا تاریخ العقیدہ و عمارکے اول وغیرہ قدیم مشرقی امور اور اسلامی روایات و شعار سے ترکوں کی یہ شیفتگی، اور والہانہ عقیدت شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ اور مکان بہ مکان نظر آتی ہے، یہ تجربے اور مشاہدے ایک علیحدہ مضمون ہی میں تفصیل کے

ساتھ سما سکتے ہین،

اس مضمون کے آخر مین قدیم کتابون کی ایک ترکی خدمت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا گیارہوین صدی ہجری کے ایک ترک اہل علم و اہل قلم حاجی خلیفہ (المتوفی ۱۰۶۷ھ) نے اپنی مشہور عالم تالیف کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون سے علوم اسلامیہ کی جو خدمت انجام دی ہے، اس کے احسان سے عالم و متعلم کبھی عہدہ برآ نہین ہو سکتے، یہ کتاب لنڈن، قاہرہ اور آستانہ مین طبع ہوئی تھی لیکن ہر جگہ نادر و نایاب تھی، اور اگر اس کا کوئی نسخہ مل جاتا تھا، تو منہ مانگی قیمت دے کر لینا پڑتا تھا۔ اب استنبول مین اس کا نسخہ سرکاری اہتمام سے چھپ رہا ہے، اس کی پہلی جلد جو حرف ر تک ہے ۱۹۴۱ء مین سررشتۂ تعلیمات کے مطبع مین چھپی ہے، دو عالمون نے اس کو اڈٹ کیا ہے، ایک شرف الدین یالتقایا اور دوسرے رفعت بیگہ الکلیسی، پہلے صاحب استنبول یونیورسٹی مین پروفیسر ہین، اس نسخہ کی ابتدا مین عربی زبان مین تمہید و مقدمہ لکھا گیا ہے، حاجی خلیفہ کے حالات بھی بیان کئے گئے ہین، جدید ترکی رسم الخط مین بھی ایک پیش لفظ لکھا گیا ہے، اس نسخہ مین حاجی خلیفہ کی قبر کے فوٹو کے علاوہ کتاب کے اصل مسودہ اور مبیضہ کے ایک ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے، پیش لفظ وزیر تعلیم حسن علی نے لکھا ہے۔ اور کتاب عصمت اونو کے نام پر منسوب کی گئی ہے،

اصل کتاب کی ایک جلد چھپنے کے بعد غالباً مناسب یہ معلوم ہوا کہ اس کا ایک ذیل پہلے چھاپ دیا جائے، چنانچہ اسماعیل پاشا بغدادی کی تالیف موسوم بہ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کی دو جلدین چھپ چکی ہین، یہ بھی سررشتۂ تعلیم کے مطبع مین طبع ہوئی ہین، پہلی جلد ۱۹۴۵ء مین طبع و شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۴۷ء مین، طباعت کے اخراجات سررشتۂ تعلیم نے برداشت کئے تھے[1]،

---

[1] اس مضمون کی ترتیب مین جن مطبوعات کا حوالہ نفس مضمون مین ہے، ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل نشریون سے ج

اقبال مرحوم نے عربی اور فارسی زبانوں کی نادر و نایاب کتابوں کو مشرقی مدارس کے طاق و ایوانوں سے نکل کر مغربی کتب خانوں اور جامعات کے رواقوں کی زینت بنی ہوئی دیکھ کر کس حسرت افسوس سے نوحہ خوانی کی تھی کہ

گر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

انھوں نے اپنے دل کی قاش فروشی غنی کشمیری کے اس شعر کو نقل کر کے بھی نمایاں کی تھی کہ

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لیکن بحمد اللہ بحول و قوتہ اب اس یاس و اندوہ کی ضرورت نہیں، ہر طرف امید کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور اب تو اس زمزمہ کا وقت آگیا کہ

صبح امید کہ بد معتکف پردۂ غیب
گو برون آئے کہ کار شب تار آخر شد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱۵) انگریزی میں ہیں، مدد لی گئی ہے (۱) رہبر کتب خانہ ہائے استنبول، تیسرا ڈیشن مرتبہ مظفر گوک نمان (۲) کٹیلاگ (کیلنڈر) استنبول یونیورسٹی (۳) ایجوکیشن ان ٹرکی،

ڈاکٹر سید نعیم الدین

بروصہ کے کتبخانوں کے چند فارسی مخطوطات

پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے اپنے ایک مقالے میں استنبول کو "شہر کتب خانہ ہا" کہا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ترکیا کے بعض دیگر شہر بھی "کتب خانوں کے شہر" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ قونیہ، مانیسہ، قیصریہ اور بروصہ بھی اپنے کتب خانوں کیلئے مشہور ہیں۔ بروصہ میں، جو مردم شماری کے لحاظ سے پانچواں بڑا شہر ہے، تقریباً چھ کتب خانے موجود ہیں۔ یہ کچھ صدیوں تک ترکی کا پایہ تخت بھی رہا ہے اور آج بھی فطری مناظر، حمام، مساجد اور درگاہوں کے لیے مشہور ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر علم و ادب اور خاص کر صوفی طریقتوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہاں سہروردی اور رفاعی طریقتوں کے لوگوں نے کئی خانقاہیں اور زاویے بنوائے تھے۔ غرض قدیم زمانے سے یہاں مذہب و علم کا چرچا رہا ہے اور اسی لیے یہاں کے کتب خانوں میں عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا بڑا عمدہ ذخیرہ ملتا ہے۔ مجھے اپنی سیاحت کے دوران میں وہاں جو اہم فارسی مخطوطات نظر آئے وہ میں نے اس وقت نوٹ کر لیے تھے اور اب قارئین مجلہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

دیوان انوری خراج چی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۲۵ • ابعاد ۱۵×۲۴ (۸×۱۷) سنٹی میٹر، اوراق ۳۲۰، سطور ۱۹، • خط تعلیق، عنوان "مذہّب حاشیہ زریں۔

آغاز: مقدری انہ بآلت بقدرت مطلق کند ز جرم بخاری چو گنبد ازرق

اختتام: باقی بوجود تست از پانصد سال ہم گوہر مصطفی و ہم تخم علی

ترقیمہ: تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب فی غرۃ محرم الحرام سنۃ ثمان و ثلاثین و سبعمایۃ علی ید الفقیر روح اللہ علی جلال

قصاید: ورق ۱ – ۱۶۲ ب، مقطعات: ۱۶۳ ب – ۲۲۳ الف، غزلیات: ۲۲۳ ب – ۲۸۰ ب، فی الہجا: ۲۸۰ ب – ۲۹۸ ب، رباعیات: ۲۹۹ ب – ۳۲۰۔

"دیوان انوری" کے مرتب پروفیسر سعید نفیسی کو قرن ہفتم کے صرف دو ہی نسخے ملے ہیں، زیادہ تر قرن نہم

دہم و یازدہم کے نسخے ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ تقابلی ایڈیشن کے لیے قرن ہشتم کے لکھے ہوئے اس نسخے کی خاص اہمیت ہے۔

منطق الطیر عطار:- پبلک لائبریری نمبر ۱۱۰۲ ، ابعاد ۱۹×۲۷ ، ۲۲ ، (۱۲٫۵×۱۹) اوراق ۱۴۱ ، سطر ۱۵ ، خط نسخ۔

ابتدائی صفحے پر "وقف تکیہ اشرف زادہ" کی مہر ہے۔ "دال" "ذال" کی شکل میں لکھی ہے۔ کاغذ کی علامت بھی گواہی دیتی ہے کہ یہ نسخہ غالباً تیرہویں یا چودھویں صدی عیسوی میں نقل ہوا ہے۔ آخر میں کچھ اوراق کم ہیں۔

آغاز : آفرین جان آفرین پاک را

اختتام : یاری او کردم و یارش شدم

"منطق الطیر" کے قدیم ترین نسخے سنہ ۶۸۰ھ اور ۶۹۲ھ کے لکھے ہوئے قونیہ میوزیم میں موجود ہیں۔[1]

"منطق الطیر" کے تنقیدی اڈیشن کے لیے قونیہ کے علاوہ بروصہ کا متذکرہ بالا نسخہ بھی بیحد مفید ہوگا۔

منطق الطیر عطار:- ارخان جامعی لائبریری ، نمبر ۵۸ ، ابعاد ۱۲٫۵×۱۲ ، ۲۰٫۳ (۱۴٫۵×۷٫۵) اوراق ۱۶۵ ، سطور ۱۵ ، خط تعلیق ، مکتوبہ ۲۴ شعبان المعظم سنہ ۹۴۰ھ۔

عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔ ابتدائی دس ابیات بعد میں لکھی گئی ہیں۔ نسخے کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:

کوہ را ہم تیغ داد و ہم کمر   تا بسرہنگی او افراخت سر

اختتام: شوخی و بی شرمی ما درگذار   شوخی ما پیش چشم ما میار

بوستان سعدی:- پبلک لائبریری ، نمبر ۲۲۲۴ ، ابعاد ۱۰٫۵×۱۷٫۲ ، (۱۱٫۲×۵٫۷) اوراق ۱۹۲ ، سطور ۱۱۔

عنوان سرخ روشنائی میں لکھے گئے ہیں۔ ابتدائی دو اوراق کے حاشیے طلائی ہیں۔

آغاز: بنام خدائی کہ جان آفرید   سخن گفتن اندر زبان آفرید

اختتام: بضاعت نیاوردم الا امید   خدایا ز عفوم مکن نا امید

ترقیمہ : تمام شد . . . فی تاریخ خمس و خمسین و ستمایۃ نقل من خط الکرم روح اللہ روحہ وغفر اللہ لہ ولکاتبہ ولقاریہ سنۃ ۶۶۰ھ۔

---

[1] ر - دفضر احمد آتش : در قونیہ کے کتب خانوں میں محفوظ بعض اہم مخطوطے ، بلیتن جلد ۱۶ ، شمارہ ۶۱ (انقرہ ۱۹۵۲)

خود مولف کے نسخے سے پانچ سال بعد کا نقل کیا ہوا نسخہ ہے اس لحاظ سے اہم اور نادر ہے۔

دیوان جلال الدین رومی: پبلک لائبریری، نمبر ۹۳۹۰، ابعاد ۲۵x۱۸ (۲۱x۱۳)، اوراق ۴۰۱، سطور ۲۲، عمدہ خوش خط تعلیق۔

یہ نسخہ محمد افندی ابن المرحوم ابی بکر افندی الشہیر تخفیف زادہ کا وقف کیا ہوا ہے۔ پہلے دو ورق مذہب ہیں۔

ابتدا: ای دلچہ اندیشیدۂ دو عذر این تقصیر را

اختتام: فتنہ رخ بنمود از آن زاہد را   زیر افسر شدہ غلغال پا می

غزلیات: ۱ ــ ۳۶۸ الف

ترجیعات: (رباعیات در حاشیہ): ۳۶۸ الف ــ ۲۹۷ الف

رباعیات: ا ــ ی تک حاشیے میں ترتیب وار: ۳۶۸ الف ــ ۳۹۱ ب

مزید رباعیات: ۳۹۱ ب ــ ۳۹۷ الف، معمیات: ۳۹۷ ب ــ ۴۰۱ الف

ترقیمہ: (ترجیعات کے آخر میں) تم الکتاب... بید العبد حسن بن سلغر بن حسن... فی یوم الاحد من شہر جمادی الثانی سنۃ اربع وثلاثین وثمان مایۃ الہجریۃ۔

PROF. HELLMUT RITTER نے "دیوان رومی" کے قدیم نسخوں کی فہرست DER ISLAM میں شائع کر دی ہے۔ پروفیسر بدیع الزماں فروزان فر آجکل اس کا تنقیدی ایڈیشن ترتیب دے رہے ہیں۔

دیوان خسرو: خواجہ چی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۷۸، ابعاد ۲۲x۱۵ (۱۵x۸)، اوراق ۱۶۱، سطور ۱۹، خط تعلیق۔

پہلا ورق مذہب ہے، ورق ۲ (الف) پر "زاویہ نقشبندیہ" کی مہر ہے۔ حاشیوں میں حسن دہلوی کا دیوان لکھا ہے۔ "دیوان خسرو" کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:

وقت گلشت نوش کن بادۂ چون گلاب را   بلبل نغمہ ساز کن بلبلۂ شراب را

اختتام: گفتم کہ مگوی کفر گفتا چہ کنم   زنار شد است رشتہ بہر اندام

سنہ ۸۲۲ھ کا لکھا ہوا بہت ہی قابل قدر نسخہ ہے۔

مجموعۂ رسائل: پبلک لائبریری، نمبر ۴۱۷۷، ابعاد ۱۸x۱۲ (۱۱x۷)، اوراق ۲۸۱، سطور ۱۹، خط نسخ۔ یہ مجموعہ ہر تین رسائل نقد النصوص، اشعۃ اللمعات، شرح قصیدۂ میمیہ خمریہ فارضیہ پر مشتمل ہے۔

نقد النصوص ورق ۴ ب ـــــ ۱۴۵ الف (تاریخ تالیف ۸۶۳ھ)

اشعۃ اللمعات ۱۵۰ ب ـــــ ۲۴۲ الف (تاریخ تالیف ۸۸۶ھ)

شرح قصیدۂ میمیہ ۲۴۲ ـــــ ۲۸۱ ب (تاریخ تالیف ۸۷۵ھ)

ترقیمہ : تمت فی خامس شہر ربیع الآخر سنہ تسعۃ وثمانین وثمانمائۃ علی ید الفقیر احمد بن محمد الحرآبادی (؟)۔

نسخے میں کہیں کہیں "منہ مدظلہ العالی" اور "صح" لکھا ہوا ہے۔ جامی کی وفات (۸۹۸ھ) سے نو سال پہلے ۸۸۹ھ میں لکھے ہوئے اس نسخے کی بڑی اہمیت ہے

دیوان جامی: پبلک لائبریری، نمبر ۲۵، ابعاد ۱۳×۲۰ (۸×۲)، اوراق ۲۲۸، سطور ۱۷، خط تعلیق، تاریخ کتابت ۹۴۱ھ۔

مثنویات، غزلیات، سب اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں جامی کے اپنے دواوین پر لکھے ہوئے مقدمات بھی موجود ہیں۔

ہٹرمان نے اپنے مرتب کیے ہوئے "دیوان جامی" کے مقدمے میں واضح کیا ہے کہ ان کے پیش نظر دیوان کا تہران والا ایڈیشن رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان کو "از نسخۂ مزبور از حیث غزلی کامل تر" بتایا ہے، لیکن کن نسخوں سے استفادہ کیا ہے اس کی تفصیل نہیں دی ہے اور نہ اختلاف قراءت پیش کیا ہے۔ اس لیے "دیوان جامی" کے تنقیدی و تقابلی ایڈیشن کی آج بھی ضرورت باقی ہے۔ خوش قسمتی سے لینن گراڈ، استنبول اور قونیہ میں جامی کے خود نوشت یا زمانۂ حیات کے لکھے ہوئے نسخے مل جاتے ہیں۔

"دیوان جامی" کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۶۵ھ قونیہ میں ہے۔ شاعر کے زمانۂ حیات کا لکھا ہوا یہ پہلا نسخہ ہے جو اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر احمد آتش نے "بیلیتن" کے اس مضمون میں کر دی ہے جس کا ذکر ابھی گذرا۔

●●

خدابخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

ڈاکٹر افتخار احمد مدنی

○

خدابخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی تین یک سطری بیان کی مختصر فہرستیں مرآۃ العلوم کے نام سے یکے بعد دیگرے ۱۹۲۵ء، ۱۹۴۲ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔ یہ ہینڈ لسٹ (H L) کہلاتی ہیں۔ ڈاکٹر مدنی باقیماندہ فارسی مخطوطات پر مشتمل چوتھی فہرست بھی تیار کر چکے ہیں لیکن ساتھ ساتھ پچھلی تینوں فہرستوں کے مسامحات پر بھی نظر ڈالی جاتی رہتی ہے اور ان میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان کے سامنے مختصراً اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بار کی قسط میں ہینڈ لسٹ کے ساتھ ساتھ توضیحی فہرست کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ جرنل کے پچھلے شماروں میں عطاء الرحمٰن صاحب، محبوب حسین صاحب اور خود مدنی صاحب کی تحریریں اس سلسلے میں چھپ چکی ہیں امید ہے یہ تازہ قسط بھی بہت سی غلطیاں دور کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

ادارہ

تصحیح و اضافہ

خدا بخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

تاریخ و تذکرہ

یہ خدا بخش کے فارسی مخطوطات کی ہینڈ لسٹ "مرآۃ العلوم" کے تصحیح و اضافہ کی دوسری قسط ہے جو تاریخ و تذکرہ کے مخطوطات کا احاطہ کرتی ہے۔ تصوف کے مخطوطات کی تصحیح جو جرنل ۵۱۔۲۵ میں شائع ہو چکی ہے، میں صرف ہینڈ لسٹ کو ہی سامنے رکھا گیا تھا۔ اب لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست کو بھی، جو ۳۴ جلدوں تک انگریزی میں شائع ہو چکی ہے، سامنے رکھا گیا ہے اور ہینڈ لسٹ کی جن کمیوں کو توضیحی کیٹلاگ میں دور کر دیا گیا ہے اُن کی، اور جو نہ کی جا سکی ہیں اُن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ امید ہے یہ اضافے فائدے سے خالی نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر افتخار احمد مدنی

جلد اوّل :

تاریخ

HL.2 No.452 تاریخ بناکتی : نسخہ کے دیباچہ میں اس کا پورا نام "روضۃ لاولی الالباب فی معرفت التواریخ والانساب" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں اس کا نام "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ اکابر والانساب" دیا گیا ہے۔ اور یہی نام خدابخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں بھی ہے اوراق ۲۹۳ نہ کہ ۲۹۵۔

HL.4 No.449 تاریخ طبری : اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا کیوں کہ یہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی عربی تصنیف "تاریخ الرسل والملوک" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اوراق ۲۴۳ نہ کہ ۲۴۵۔

HL.5 No.450 تاریخ طبری : نام کے سلسلے میں مذکورہ بالا نمبر کے تحت تفصیل موجود ہے اوراق ۲۷۰ نہ کہ ۱۷۵۔

HL.6 No.453 تاریخ گزیدہ : ناقص الآخر۔

HL.8 No.470 تحفۃ الکرام : اوراق ۴۹۹ نہ کہ ۴۹۷ توضیحی کیٹلاگ میں ۴۹۸ مذکور ہے۔

HL.9 No.478 جنات الفردوس : ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد اسمٰعیل ابن حاجی محمد باقر شیرازی مذکور ہے نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL.10 No.464 حبیب السیر : کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے توضیحی کیٹلاگ میں یہ نام مذکور ہے لیکن ہینڈ لسٹ میں نہیں۔

HL.11 No.466 حبیب السیر : اوراق ۳۸۲ + ۸ نہ کہ ۳۸۷ نسخہ میں مذکور فہرست ۱۱۴۱ھ میں عبداللہ نے لکھی۔

HL.12 No.467 حبیب السیر : اوراق ۲۱۰ نہ کہ ۲۰۸۔

HL.14 No.480 حدیقۃ الصفا : اوراق ۲۵۱ نہ کہ ۲۵۲۔

HL.15 No.463 خلاصۃ الاخبار : کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاخبار فی بیان الاحوال الاخیار" نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے۔

HL.16 No.456 روضۃ الصفا : کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیا والملوک والخلفا" نسخہ کے دیباچہ میں مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی پورا نام آگیا ہے۔ اس کے کاتب احمد بن مسعود ہیں تعداد سطور ۲۳-۲۴ نہ کہ ۲۳ نسخہ کے پہلے ورق پر قالبخان خانہ زاد بادشاہ عالمگیر اور لطف اللہ خاں بہادر کی مہر کے علاوہ

عبدالحق اور دیگر لوگوں کی تحریریں بھی نہیں۔

HL.19 / No.457 روضۃ الصفا: ۳۴۶ + ۳ اوراق نہ کہ ۳۴۷۔

HL.20 / No.458 روضۃ الصفا: نسخہ میں مختلف مقامات پر کتب خانہ سید ولایت علی خاں اور خورشید نواب کی مہر ثبت ہے اوراق ۳۳۸ نہ کہ ۳۶۰۔

HL.23 / No.472 صبح صادق: اوراق ۵۳۹ نہ کہ ۵۳۸۔ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد اوراق صحیح مذکور ہے

HL.24 / No.473 صبح صادق: اوراق ۵۳۸ نہ کہ ۵۴۳۔ توضیحی کیٹلاگ کے مطابق ۵۴۴ جلد دوم نہ کہ سوم ناقص الآخر۔

HL.26 / No. صبح صادق: یہ صبح صادق کے دو جلدوں کی فہرست ہے جبکہ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت میں یہ تو مذکور ہے کہ یہ فہرست ہے لیکن یہ نہیں کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے کہ یہ صبح صادق کے چاروں حصوں کا انڈکس ہے حالانکہ اس کے بعد اس نے ترقیمہ کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں واضح ہے کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے۔

HL.27 / No.451 طبقات ناصری: ہینڈ لسٹ میں نسخہ میں مذکور مصنف کا پورا نام لکھا جانا چاہیے یعنی ابو عمر بن عثمان بن محمد المنہاج الجوزجانی نہ کہ منہاج بن سراج نسخے ورق ۳، ۴، ۱۴ تا ۶۰ کے حاشیہ پر حسین واعظ کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہدا" ہے جس کا ذکر ہینڈ لسٹ میں نہیں توضیحی کیٹلاگ میں مصنف کا پورا نام دیا گیا ہے البتہ حاشیہ کی کتاب کے سلسلے میں یہ مذکور ہے۔

"ON THE MARGINS OF FOLL 3b 4b AND 14a - 60a SOME CONFUSED ACCOUNTS OF THE BATTLE OF KARBALA ARE GIVEN.'

HL.30 / No.481 مرآۃ آفتاب نما: کتاب کے خاتمہ پر محمد علی مذکور ہے قیاس یہ ہے کہ یہی کاتب ہیں۔

HL.31 / No.477 مرآۃ العالم: نسخہ کے دیباچہ میں اس کے مصنف کا نام بختاور خاں مذکور ہے جبکہ ہینڈ لسٹ میں اسے محمد بقا سہارنپوری کی تصنیف بتایا گیا ہے ایسا کیوں ہے اس کی وضاحت توضیحی کیٹلاگ سے تو ہو جاتی ہے کہ اسے بقا نے بختاور خاں کے لیے لکھا ہینڈ لسٹ میں بھی اس قسم کی وضاحت ہونی چاہیے۔

HL.33 / No.470 نگارستان: اوراق ۳۷۵ نہ کہ ۳۶۵۔

HL.34 / No.482 تاج القصص: مصنف کا نام نسخہ میں ابو نصر کنیت احمد بن احمد بخاری مذکور ہے۔ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی نام دیا گیا ہے یعنی (احمد بن احمد) خدا بخش لائبریری میں مصنف کی ایک اور

کتاب "انیس المریدین وروضۃ المحبین" کے نام سے موجود ہے جو تاج القصص کا ہی ایک حصہ ہے۔ قیاس ہے کہ مصنف نے "انیس المریدین وروضۃ المحبین" کو پہلے لکھا اور بعد میں اسے تاج القصص میں شامل کردیا
اس نسخہ میں مصنف کا نام احمد بن محمد بن نصر بخاری مذکور ہے اور یہی نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

HL.36 / No.484 **ترجمۂ مولود النبی**: اس کا نام "ترجمۂ مولود مصطفیٰ" ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی اصل عربی تصنیف کے سلسلے میں وضاحت کے باوجود اس کا نام "ترجمۂ مولود النبی" ہی دیا گیا ہے۔

HL.37 / No.485 **درج الدرر**: کتاب کا پورا نام نسخہ میں "درج الدرر و درج الغرر فی بیان میلاد سید البشر" ہے اوراق ۲۷۲ + ۸ نہ کہ ۲۷۳، تعداد سطور ۲۳ نہ کہ ۱۰۔ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے اور کتاب کا پورا نام بھی دیا گیا ہے۔

HL.39 / No.490 **معارج النبوت**: کتاب کا نام "مدارج نبوت" ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا نام صحیح مذکور ہے اوراق ۶۳۰ + ۱۰ نہ کہ ۶۲۰۔

HL.40 / No.491 **مدینۃ العلم**: کاتب کا نام نسخہ میں اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور نہیں جبکہ ہینڈ لسٹ میں اس کا نام سلطان محمد ولد آغا عبدالکریم درج ہے۔

HL.41 / No.492 **مدینۃ العلم**: اس کے کاتب غلام سعید ہیں۔

HL.42 / No.486 **معارج نبوت**: کتاب کا پورا نام "معارج نبوت فی مدارج النفرۃ" ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس نام کا ذکر کردیا گیا ہے۔

HL.43 / No.487 **معارج نبوت**: اوراق ۲۰۴ + ۷ نہ کہ ۲۲۴۔

HL.45 / No.496 **روضۃ الاحباب**: کتاب کا پورا نام "روضۃ الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" ہے مصنف کے نام میں بھی الملقب بجمال حسینی کا اضافہ کردیا جائے تو بہتر ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں کتاب اور اس کے مصنف کے سلسلے میں تفصیل دیدی گئی ہے۔

HL.46 / No.497 **روضۃ الاحباب**: اوراق ۲۵۷ + ۷ نہ کہ ۳۵۲۔

HL.47 / No.[illegible] **فتوح ابن اعثم**: اس کا عنوان "ترجمہ فتوح ابن اعثم" ہوگا کیونکہ یہ کتاب ابن اعثم کی عربی تصنیف "فتوح" کا ترجمہ ہے۔

HL.49 / No.495 **مناقب مرتضوی**: اس کے کاتب سید محمد ضیا ولد سید محمد اشرف حسینی ہیں اوراق ۳۵۴ نہ کہ ۳۵۵۔

HL.52 / No.509 **ترجمہ کشف الغمہ**: یہ کتاب "ترجمۃ المناقب" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور اس کے مصنف کا پورا نام ابوالحسن علی بن حسن زواری اصفہانی ہے لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں مذکورہ باتوں کی تفصیل موجود ہے۔

HL.54 / No.501 **حیات القلوب**: یہ جلد اوّل ہی ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت میں "غالباً جلد اوّل" لکھا گیا ہے اس کے کاتب عبدالکافی بن محمد باقر خابدی ہیں ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صرف ابن باقر خابدی مذکور ہے۔

HL.55 / No.498 روضۃ الشہدا: اس کے کاتب خواجگی المنشی ہیں اور یہ نہ صرف اہل بیت کے حالات پر ہے بلکہ اس میں بعض انبیا اور خود حضور صلعم کے حالات بھی درج ہیں اس کے مصنف کا پورا نام کمال الدین حسین کاشفی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے مندرجات اور مصنف کے نام کے سلسلے میں تفصیل موجود ہے۔

HL.56 / No.499 روضۃ الشہدا: اوراق ۳۰۸ تا ۳۴۸ روضۃ الشہدا کے خاتمہ کے بعد ایک دوسری کتاب "روایات مصائب سید شہدا" بھی ہے یہ ۳۲ اوراق پر ناقص الآخر ہے اس کے علاوہ ۲ ورق پر حضرت علی کے بارے میں بتایا گیا ہے اور آخری ۲ ورق پر قصیدہ انوری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۳۴۷ اوراق مذکور ہے کتاب کے مندرجات کی تفصیل بھی موجود ہے۔ لیکن اس میں قصیدہ انوری کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

HL.57 / No.503 ریاض الشہادۃ: کتاب کا پورا نام ریاض الشہادۃ فی ذکر مصائب السادۃ ہے اور یہ کتاب کا جلد دوم ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

HL.58 / No.508 غایۃ الہم فی ذکر الصحابۃ والائمہ: اوراق ۲۴۵ تا ۲۵۶ نیز اس میں ایک دوسرا رسالہ "البصارۃ فی احادیث الاشارہ" مصنف محمد علیم یحیائی الہ آبادی بھی ہے جو ۹ اوراق پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کے پاس رہی ہے اس رسالے کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر مصنف نے اپنے قلم سے اوراد لکھے ہیں اور اوراد کے خاتمہ پر اپنا نام بھی ان کی تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہیں۔

HL.62 / No.510 تاریخ وصاف: کتاب کا اصل نام بھی جو "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے کیفیت کے خانے کے بجائے نام کے خانے میں دیا جانا چاہیے۔

HL.64 / No.512 ظفر نامہ: تعداد سطور ۱۹ تا ۲۱ نسخہ کے آخری ۲۰ اوراق پر ۲۱ سطریں ہیں۔

HL.65 / No.513 مطلع السعدین: کتاب کا پورا نام "مطلع السعدین و مجمع بحرین" ہے۔

HL.67 / No.515 ملفوظات تیمور: یہ کتاب "توزک تیموری" ہے۔

HL.68 / No.516 ملفوظات تیمور: یہ توزک تیموری ہے اور اس میں صرف سات سطریں کم ہیں نسخہ کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے کہ جس نسخہ سے یہ نقل کیا گیا ہے اس کے خراب ہونے کی وجہ سے اس حصہ کو نقل نہ کیا جا سکا ہینڈ لسٹ میں ناقص الآخر لکھنے کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔

HL.69 / No.517 کتاب المعجم فی آثار ملوک العجم: یہ ناقص الاول ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

HL.71 / No.523 تاریخ طاہر وحید: کتاب کے نام کا اس کے دیباچہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے البتہ کتاب کے پہلے ورق پر

"ریاض التواریخ طاہر وحید" مذکور ہے جو کاتب کا ہی لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

HL.71 / No.520 **تاریخ عالم آرای عباسی:** نسخہ میں درمیان کے دو اوراق سادہ اور غیر ضروری ہیں اس لیے اسے گنتی میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس طرح کتاب کے ۲۶۴ اوراق ہی ہوں گے نہ کہ ۲۶۶۔

HL.75 / No.522 **تاریخ عالم آرای عباسی:** ۳۶۳ اوراق نہ کہ ۳۵۳

HL.76 / No.524 **تاریخ جہانگشای:** سنہ کتابت ۱۲۲۱ نہ کہ ۱۲۳۳ خط شکستہ نہ کہ نستعلیق خط شکستہ ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی موجود ہے۔

HL.77 / No.52[illegible] **تاریخ ترندیہ:** کتاب کا یہ نام نسخہ میں نہیں دیا گیا ہے اس کے ابتدائی ۸ اوراق کا خط نستعلیق ہے اور اس کے بعد کے اوراق شکستہ خط میں ہیں۔

HL.79 / No.526 **تاریخ محمدی:** مصنف کے نام کی ترتیب اسی طرح ہونی چاہیے محمد فتح اللہ ابن محمد تقی الساروی ہینڈلسٹ میں ابن محمد تقی الساروی محمد فتح اللہ ہے اور توضیحی کیٹلاگ میں ابن محمد تقی الساروی محمد مذکور ہے۔

HL.80 / No.5[illegible] **مآثر سلطانیہ:** مصنف کے نام کی ترتیب عبدالرزاق ابن نجف قلی ہوگی نہ کہ ابن نجف قلی عبدالرزاق۔

HL.81 / No.531 **امیر نامہ:** مصنف کا نام بساون لعل متخلص شادان بن نین سکھ رائے ہوگا نہ کہ نسکھ رائے کیٹلاگ میں نسکھ رای مذکور ہے اسکے کاتب عطاء اللہ نومسلم (عطا اللہ) ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ۔

HL.82 / No.529 **تاریخ خانجہان و مخزن افغانی:** اوراق ۵۵۲ نہ کہ ۵۵۴ اسکے کاتب دوبیچند (دوبے چند) ہیں نہ کہ دو بچند۔

HL.84 / No.532 **ہشت بہشت:** کتاب کا ایک دوسرا عربی نام بھی ہے یعنی "الصفات الثمانیہ فی اخبار القیاصرة العثمانیہ"۔

HL.85 / No.533 **ہشت بہشت:** اوراق ۱۸۲ نہ کہ ۱۸۱۔

HL.86 / No.534 **ہشت بہشت:** اوراق ۳۱۸ نہ کہ ۳۱۷۔

HL.87 / No.544 **بحر المواج:** اوراق ۶+۳۳۲ نہ کہ ۳۳۶۔

HL.88 / No.545 **بحر المواج:** اوراق ۳+۱۲۸ نہ کہ ۱۲۸۔

HL.90 / No.538 **تاریخ فرشتہ:** کتاب کا اصل نام "گلشن ابراہیمی" ہے۔

HL.91 / No.539 **تاریخ فرشتہ:** اوراق ۴۱۲ نہ کہ ۴۱۰۔

HL.92 / No.542 **چہار گلشن:** اس کے مرتب چندر بھان برہمن ہیں۔ ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مرتب کے نام کا ذکر بھی ضروری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں مرتب کا ذکر کیا گیا ہے۔

HL.93 / No.543 حقیقتہای ہندستان: اوراق ۲۸۹ نہ کہ ۲۸۷ تعداد سطور ۱۳–۱۴ نہ کہ ۱۲۔

HL.94 / No.540 خلاصۃ التواریخ: تعداد سطور ۱۷–۱۸ نہ کہ ۱۷۔

HL.95 / No.535 طبقات اکبری: اس کتاب کا نام دیباچہ میں طبقات اکبرشاہی مذکور ہے البتہ یہ "طبقات اکبری" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں یہ بات کہی گئی ہے البتہ عنوان "طبقات اکبری" کا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ "طبقات اکبرشاہی" اور "تاریخ نظامی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس کے کاتب محمد بخش ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۸۰ھ۔ اوراق ۵۲۹+۵ نہ کہ ۵۲۹۔

HL.100 / No.548 تاریخ داؤدی: اوراق ۲۲۴ نہ کہ ۲۲۳

HL.102 / No.550 تذکرۃ الواقعات: اس کے کاتب سید فرزند احمد صفی (صفیر) بلگرامی ہیں توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام موجود ہے۔

HL.105 / No.554 آئین اکبری: اوراق ۵۹۰+۵ نہ کہ ۵۹۰ تعداد سطور ۱۹–۲۱ نہ کہ ۱۹–۲۰۔

HL.109 / No.559 اقبال نامہ جہانگیری: ناقص الاول توضیحی کیٹلاگ میں بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے صرف SLIGHTLY DEFECTIVE مذکور ہے۔

HL.111 / No.561 اقبال نامۂ جہانگیری: اوراق ۳۳۱ نہ کہ ۲۹۰۔

HL.113 / No.557 جہانگیرنامہ: بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ کتابت ۱۰۲۱ھ ہے نہ کہ ۱۰۲۰ھ۔

HL.121 / No.570 عمل صالح: اوراق ۳۷۷ نہ کہ ۳۷۶ توضیحی کیٹلاگ میں صحیح تعداد ۳۷۷ مذکور ہے ناقص الآخر۔

HL.123 / No.568 ملخص: نسخہ میں مصنف کا نام اس طرح مذکور ہے محمد طاہر متخلص بہ آشنا المخاطب بہ عنایت خاں بن مظفر خاں بن خواجہ ابوالحسن ہینڈلسٹ میں نام عنایت خاں سے شروع کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام مذکور ہے۔

HL.124 / No.572 تاریخ شجاعی: نسخہ میں مصنف کا نام محمد معصوم بن حسن بن صالح مذکور ہے۔ ہینڈلسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں محمد معصوم بن حسن صالح۔

HL.127 / No.573 فتحیہ عبریہ: مصنف کا نام نسخہ میں اس طرح ہے ابن محمد ولی احمد الملقب شہاب الدین طالش اس کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے۔ احمد الملقب بہ شہاب الدین طالش بن محمد ولی یا شہاب الدین احمد تالش بن محمد ولی۔

HL.128 / No.574 فتحیہ عبریہ: اوراق ۹۵ نہ کہ ۹۴۔

HL.129 / No.575 فتحیہ عبریہ: اوراق ۱۱۴ نہ کہ ۱۱۳ توضیحی کیٹلاگ میں ۲۲۶ مذکور ہے نسخہ میں مختلف مقامات پر خورشید نواب اور کتب خانہ سید ولایت علی خاں کی مہریں بھی ہیں۔

HL.131 / No.579 تاریخ ارادت خانی: مصنف کے نام میں المخاطب بہ ارادت خاں کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

توضیحی کیٹلاگ میں تفصیل موجود ہے۔ کتاب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں تاریخ ارادت خاں مذکور ہے اور یہی صحیح ہے نہ کہ تاریخ ارادت خانی۔

HL.133 / No.581 تاریخ عالی: کتاب کا پورا نام "تاریخ عالی فی سلک الالی" ہے۔ اوراق ۲۳۷+۲ نہ کہ ۲۴۴۔ کتاب کا پورا نام توضیحی کیٹلاگ میں درج کر دیا گیا ہے۔

HL.134 / No.580 تاریخ محمد شاہ: کاتب نے ترقیمہ میں کتاب کا نام "تاریخ چغتائی" لکھا ہے۔ جبکہ کسی نے پہلے ورق پر "وقائع سلطنت محمد شاہ" لکھ دیا ہے۔

HL.135 / No.582 سیرۃ المتاخرین: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "مشہور است کہ این نسخہ از قلم مصنف علیہ الرحمۃ است اما این بپایہ ثبوت نرسیدہ" لیکن یہ نسخہ مصنف کے قلم کا نہیں ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو ۹۵-۱۱۹۴ھ کے درمیان لکھا اور مصنف کی وفات ۱۲۰۸ھ میں ہوئی جبکہ اس نسخہ پر سنہ کتابت ۱۲۳۰ھ مذکور ہے۔

HL.139 / No.588 عبرت نامہ: تعداد سطور ۱۳-۱۲ نہ کہ ۱۳۔ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے۔ سنہ کتابت ۱۸۸۷ء نہ کہ ۱۸۷۸ء۔

HL.140 / No.589 عبرت نامہ: اوراق ۲۸۵ نہ کہ ۲۸۱۔

HL.141 / No.585 ملخص التواریخ: اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱۔

HL.143 / No.593 تاریخ مظفری: اوراق ۵۱۶+۷ سات اوراق پر تتمہ تاریخ مظفری اور تصحیح نامہ ہے نہ کہ ۴۹۲ ورق۔ ۴۹۲ اور اسکے بعد کے کاتب فیض الحق امرتسری ہیں جنھوں نے یہ حصہ مسٹر قاسم حسن صاحب بہادر سکریٹری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے حکم سے ۱۳۶۲ھ میں لکھا۔ اس لیے اب یہ کتاب ناقص الآخر جیسا کہ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں لکھا گیا ہے، نہیں رہی۔

HL.144 / No.591 تذکرہ سلاطین چغتا: تعداد سطور ۲۱-۲۳ نہ کہ ۲۱۔

HL.146 / No.595 جام جم: اس کے کاتب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۷۶ھ توضیحی کیٹلاگ میں ۱۲۶۶ھ مذکور ہے۔

HL.147 / No.594 خلاصۃ التواریخ: اوراق ۲۲۶ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.148 / No.592 منتخب اللباب: مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد ہاشم مخاطب ہاشم علی خاں کہ آخر مخاطب خافیخاں نظام الملکی" ہینڈ لسٹ میں محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں پورے نام کی وضاحت موجود ہے البتہ خافی خاں کو خوافی خان لکھا گیا ہے۔

HL.149/No.598 **بیگ لار نامہ:** نسخہ میں اس کے مصنف کا نام موجود نہیں اور نہ ہی ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ فہرست مشترک میں اس کے مصنف کا نام ادراکی بیگلاری دیا گیا ہے اوراق ۱۳۲ نہ کہ ۱۳۲ ۔ اس کے کاتب شیخ راجی محمد ہیں نہ کہ محمد خلیل اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۳۳ھ۔

HL.150/No.599 **تاریخ سند:** یہ کتاب تاریخ معصومی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مصنف کا تخلص نامی ہے اس نے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد معصوم المتخلص نامی" اس لیے ہینڈ لسٹ میں بھی نام کے ساتھ اس کے تخلص کا اضافہ مناسب ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں یہ موجود ہے۔

HL.151/No.597 **چچ نامہ:** اس کے مصنف علی بن حامد بن ابی بکر کوفی ہیں نہ کہ علی بن ابی بکر فی توضیحی کیٹلاگ میں صحیح نام مذکور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تلخیص چچ نامہ ہے جس کے ملخص محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد ہیں جنھوں نے مراد علی خاں کے حکم سے یہ تلخیص ۱۲۲۳ھ میں کی نہ کہ چچ نامہ۔ اوراق ۱۰۷ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.152/No.600 **تاریخ طاہر وحید:** اس کے کاتب راجے محمد ولد شیخ میراں ہیں نہ کہ محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۳ھ محمد خلیل اس نسخہ کے کاتب ہیں جس سے راجے محمد نے نقل کیا ہے۔ کتاب کا نام ہینڈ لسٹ میں "تاریخ طاہر وحید" مذکور ہے جبکہ نسخہ کے ترقیمہ میں "تاریخ طاہری" اس کا نام "تاریخ طاہری" ہی ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی مذکور ہے۔

HL.153/No.601 **واقعات کشمیر:** یہ کتاب "تاریخ اعظمی" کے نام سے بھی مشہور ہے اس لیے کتاب کے نام کے بعد المعروف بہ "تاریخ اعظمی" کا اضافہ مناسب ہوگا۔

HL.154/No.602 **تاریخ بھرت پور:** اوراق ۸۴ نہ کہ ۶۰۲ تعداد سطور ۱۲-۱۵ نہ کہ ۱۳-۱۸ صرف آخری ورق پر پہلی طرف ۱۶ اور دوسری طرف ۱۸ سطریں ہیں۔ یہ وقائع ہے مصنف نے بھی اس کے لیے وقائع کا لفظ ہی استعمال کیا ہے اس لیے اسے "تاریخ بھرت پور" کے بجائے "وقائع بھرت پور" کا نام دیا جانا چاہیے۔ تعداد اوراق توضیحی کیٹلاگ میں صحیح مذکور ہے۔

HL.155/No.603 **گل رحمت:** یہ کتاب محمد مستجاب خاں کی تصنیف "گلستان رحمت" سے انتخاب ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ ضروری ہے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے۔

HL.156/No.605 **تاریخ محتشم:** یہ کتاب دو طبقوں میں ہے اور یہ طبقہ اوّل ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانہ میں یہ درج ہونا چاہیے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے۔ سنہ کتابت ۱۲۱۷ نہ کہ ۱۲۱۷۔

HL.159 / No.608 **تاریخ بنارس**: اوراق ۲۱۸ تا ۲۲۰۔ ناقص الآخر نسخہ کے ابتدائی دو اوراق پر مصنف کے نواسے سبحان علی ابن حسن علی خاں کا لکھا ہوا تعارف ہے کتاب کا نام "تاریخ بنارس" نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ نام فہرست نگار کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی کتاب کا نام نہیں دیا گیا ہے اس کتاب میں بنارس کے راجاؤں / زمینداروں کے حالات میں اس لیے اسے "تاریخ راجگان و زمینداران بنارس" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

HL.160 / No.607 **تحفۂ تازہ**: یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور یہ کتاب کی پہلی جلد ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اوراق ۱۵۸ تا ۱۵۷۔

HL.161 / No.609 **مظفر نامہ**: تعداد سطور ۱۴ - ۱۵ تا ۱۴۔

HL.164 / No.612 **بساطین السلاطین**: اس کے کاتب میر حیدر علی ہیں مصنف کے نام محمد ابراہیم البریزی ہیں المعروف بہ صاحب حضرت کا اضافہ مناسب ہوگا ترقیمہ میں بھی مصنف کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام کے ساتھ صاحب حضرت بھی مذکور ہے۔

HL.165 / No.613 **تاریخ محمد قطب شاہ**: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تاریخ سلطان محمد قطب شاہی" مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہ نام دیا گیا ہے۔

HL.171 / No.619 **تاریخ حمید خاں**: کتاب کا یہ نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں البتہ یہ حمید خاں کا لکھا ہوا وقائع ہے۔

HL.174 / No.620 **روزنامچۂ شاہ عالم**: ناقص الآخر۔

جلد دوم

HL.1742 / No.1744 **تاریخ طبری**: اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا۔

HL.1745 / No.1752 **جام جہاں نما**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ یہ کتاب مصنف کی اپنی تحریر میں ہے۔ لیکن ترقیمہ کی عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی تحریر کردہ ہے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے "کتاب مسمیٰ بجام جہاں نما من تصنیف افضل المتاخرین محمد مظفر حسین"۔ نسخہ کے پہلے ورق پر ظفر علی خاں کی مہر ہے ظفر علی خاں مصنف کا پوتا ہے

HL.1755 / No.1756 **ہدیۃ الشائقین**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ یہ کتاب خلفای راشدین کے حالات پر مشتمل ہے جبکہ ایسا نہیں ہے اس میں مناقب یا فضائل خلفای راشدین ہیں اس لیے اسے تاریخ

کی کتابوں میں رکھنا مناسب نہیں بلکہ تذکرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

HL.1758 / No.1759 **مجالس الائمہ** : اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۶۸ھ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اس کا نام کہیں "مجالس الائمہ علیہم الصلوٰۃ والسلام" لکھا ہے اور کہیں "مجلس الائمہ" اوراق ۱۹۴ نہ کہ ۱۹۳۔

HL.1761 / No.1762 **خلاصۃ التواریخ** : نسخہ میں کہیں بھی مصنف کا نام مذکور نہیں مرتب ہینڈلسٹ نے مصنف کا نام سبحان رائے لکھا ہے جبکہ کیٹلاگ جلد ۱ میں مختلف حوالوں سے تین نام دیے گئے ہیں اور آخر میں سُجان کو صحیح مانا گیا ہے فہرست مشترک میں مصنف کا پورا نام سُجان رای سنگھ بتالوی مذکور ہے

HL.1765 / No.1766 **اقبالنامۂ جہاں گیری** : مذکورہ نمبر کے تحت جلد سوم ہے نہ کہ دوم توضیحی کیٹلاگ جلد ۱ (S) میں بھی جلد سوم مذکور ہے اوراق ۲۹۲ ہیں نہ کہ ۲۹۱۔

HL.1767 / No.1769 **(مقدمہ) سیر المتاخرین** : یہ صرف مقدمہ نہیں بلکہ سیر المتاخرین کا جلد اول بھی ہے۔

HL.1774 / No.1775 **نشان حیدری** : اس نسخہ کے کاتب غلام نبی نہیں بلکہ میر سرفراز علی خلف میر غلام علی خاں ہیں غلام نبی اس نسخہ کے کاتب ہیں جس نسخہ سے سرفراز علی نے نقل کیا ہینڈلسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں مذکور سنہ کتابت بھی غلام نبی والے نسخہ کی ہے سرفراز علی نے سنہ کتابت نہیں دی ہے اوراق ۲۰۲ نہ کہ ۱۹۷۔

HL.1754 / No.203 **شواہد نبوت** : کتاب کا پورا نام دیباچہ میں یہ مذکور ہے "شواہد نبوت لتقویت یقین اہل فتوت" توضیحی کیٹلاگ میں اس نمبر کے تحت کتاب کا پورا نام مذکور نہیں البتہ وہاں توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ پر اس نام کا کوئی رسالہ نہیں البتہ نمبر ۱۸۱ کے تحت چوتھے نمبر پر یہ رسالہ ہے اور یہاں رسالے کا پورا نام مذکور ہے۔

HL.1757 / No.1758 **جلاء العیون** : اوراق ۳۴۵ نہ کہ ۵۱۴ تعداد سطور ۲۱ نہ کہ ۲۵۔

HL.1759 / No.1760 **قصۂ ابومسلم** : اوراق ۱۹۱ نہ کہ ۱۹۰۔

HL.1764 / No.1765 **اقبال نامۂ جہاں گیری** : اوراق ۲۰۲ نہ کہ ۲۰۴۔

HL.1766 / No.1767 **مآثر عالمگیری** : اوراق ۱۳۲ نہ کہ ۱۵۵۔

HL.1768 / No.1770 **سیر المتاخرین** : اوراق ۴۸۸ نہ کہ ۴۸۷ اس نسخہ میں صرف جلد اوّل و دوم ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں اس کا ذکر ہونا چاہیے ناقص الآخر توضیحی کیٹلاگ میں جلد اوّل و دوم ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.1770 / No.1772 **تاریخ تیموریان** : نسخہ میں کہیں بھی کتاب کا نام مذکور نہیں ہینڈلسٹ و توضیحی کیٹلاگ میں جو نام دیا گیا ہے

اس کے آخر میں اگر ہند کا اضافہ کردیا جائے تو مناسب ہوگا یعنی "تاریخ تیموریان ہند"۔

HL. 1775 / No. 1776 وقائع مہابت جنگ: ہینڈ لسٹ میں توضیحی کیٹلاگ کی طرح کیفیت کے خانے میں اگر درج ذیل عبارت کا اضافہ کردیا جائے تو مناسب ہوگا "کہ از عدد ہر فقرہ او سال حال بر می آید"۔

HL. 1756 / No. 1757 روضۃ الشہدا: مصنف کا نام ہینڈ لسٹ میں حسین بن علی کاشفی مذکور ہے مناسب ہوگا اگر حسین کا پورا نام یعنی کمال الدین حسین لکھا جائے۔

جلد سوم:

HL. 263 بہجۃ التواریخ: ناقص الآخر مصنف کا نام شہاب الدین احمد ہوسکتا ہے۔

HL. 2772 تاریخ ایران: نسخہ میں سنہ کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے جو بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے خود مصنف نے کتاب میں ۱۱۵۴ھ تک کے حالات بیان کیے ہیں ہینڈ لسٹ میں بھی سن کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے۔

HL. 2817 تاریخِ خانجہانی مخزن افغانی: کتاب کے نام میں خانجہانی کے بعد اور مخزن افغانی سے قبل "و" کا اضافہ کیا جائے اس کے مصنف نعمت اللہ سامانی بن حبیب اللہ ہروی ہیں اوراق ۲۲۳ تا ۳۱۹۔

HL. 3790 تاریخ رشید: اس کے مصنف مرزا محمد حیدر دوغلت گورگانی بن محمد حسین ہیں۔ ۹۵۲ھ سنہ تصنیف ہے اگر یہی سنہ کتابت بھی مان لیا جائے تو یقیناً یہ بہت اہم اور مصنف کی خود نوشت تحریر ہوسکتی ہے۔

HL. 2816 تاریخ طبری: "یہ ترجمہ تاریخ طبری" ہے ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۳۵۱ تا ۳۵۰۔

HL. 3854 تاریخِ عالم آرای عباسی: کتاب کے نام میں لفظ تاریخ کا اضافہ غیر ضروری ہے یہ کتاب تین جلدوں میں ہے مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے اوراق ۲۸۶ تا ۲۳۸۔

HL. 3092 تاریخ عرب قدیم مع سیرت عنترہ بن شداد: ناقص الاول اوراق ۱۶۶ تا ۱۶۸۔

HL. 4028 تاریخِ مجمل مفصل: اوراق ۱۴۵ تا ۱۴۶ اس کے کاتب درج ذیل شعر کے مطابق عنایت ہوسکتے ہیں

نوشتہ بماند بخط غریب — نصر من اللہ فتح قریب
ای عنایت تو دست کن کوتاہ — مژدہ یابی ز رحمت اللہ

HL. 3322 تاریخ وصاف: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" درج ہے اوراق ۲۸۰ تا ۸۷ یہ تاریخ پانچ جلدوں میں ہے جبکہ مذکورہ نسخہ جلد اوّل و دوم ہے۔

HL. 2525 تزک تیمور: یہ توزک تیموری ہے اوراق ۲۳۸ تا ۲۲۷ قدرے کرم خوردہ۔

HL.2565 **حبیب السیر**: کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے یہ نسخہ جلد دوم کے جزو دوم تک رہی ہے، مکمل نہیں اوراق ۱۹ ۴ تا ۲۸ ۴ کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کاتب کے خانہ میں سید اسمٰعیل درج ہے جو غلط ہے کاتب کا نام نسخہ میں جو لکھا تھا قیاس یہ ہے کہ اسے مٹا کر اس کی جگہ سید اسمٰعیل نے اپنی حق ملکیت کا ذکر کیا ہے نسخہ کے آخری ورق پر سید اسمٰعیل علی خاں کی مہر بھی ثبت ہے۔

HL.3289 **حملۂ سکندری**: مصنف کے نام کے آخر میں عظیم آبادی کا اضافہ مناسب ہوگا "حملۂ سکندری" دراصل نظامی گنجوی کے "سکندر نامہ" کا ترجمہ ہے جو ۱۲۸۰ھ میں کیا گیا۔

HL.2796 **روضۃ الصفا**: کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفا" ہے مصنف کا پورا نام سید محمد بن برہان الدین خاوند شاہ بن کمال الدین محمود معروف بہ میر خواند ہے۔ اوراق ۲۲۷ تا ۱۹، ۱۶، ابتدائی اور آخری ورق بعد کے لکھے ہوئے ہیں یہ کتاب سات جلدوں میں ہے جبکہ زیر نظر نسخہ صرف جلد اوّل ہے۔

HL.3639 **روضۃ الصفا**: کتاب اور مصنف کے نام کے لیے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۷۹۶ دیکھیں اس کے کاتب شاہ محمد بخاری ہیں کرم خوردہ اوراق ۲۲۴ تا ۲۳۱۔

HL 3769 **سارستان چہار چمن**: اوراق ۶۵۸ تا ۵۵۸ اس میں ورق کے ایک طرف ہی تحریر ہے۔ دوسرا حصہ سادہ ہے تعداد سطور ۱۵ - ۲۵ تا ۱۵-۱۶۔

HL.4087 **کتاب (مجہول الاسم)** مصنف کا نام نسخہ کے ورق ۵ ب پر محمد جلیل مذکور ہے اور کتاب کا نام ورق ۲۳ الف پر آئین امیر الامراے... مذکور ہے یہ کتاب امیر الامرا بہادر فیروز جنگ کے حالات پر ہے تعداد سطور ۱۴-۱۷ تا ۱۲

HL.3778 **مرآۃ العالم**: ناقص الاول تا ناقص الطرفین یہ مرآۃ العالم کے نمائش ہفتم اور اس کے بعد کے حصے ہیں۔ اس سے پہلے کا حصہ نہیں نیز یہ کتاب آرائش نہم تک ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب سات آرائش میں ہے آٹھویں اور نویں آرائش درج ذیل ہے۔

آرائش ھشتم: "درذکر طایفہ از وزرای ازمنہ سابقہ و عہد سعادت مہد پادشاہ دین پرور و علمائے عم کرامت بہر خدیو عدالت گستر محتوی بر دو پیرائش"۔

آرائش نہم: "درذکر مخترع صنعت کتابت و احوال طایفہ خوش نویسان و برخی از بدائع و غرائب جہاں مشتمل بر دو پیرائش" نیز ساتویں آرائش کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ یہ تین پیرائش ہیں

ہے جبکہ مذکورہ نسخہ میں یہ پانچ پیرائش میں ہے۔

HL.34 **مہدی نامہ:** اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۸۵۔

HL.25 **نگارستان:** اوراق ۱۹۰ نہ کہ ۱۷۸۔

HL.3/3 **ہیئت الافلاک:** ایک ورق نہ کہ ۲ ناقص الآخر۔

L.4 **ترجمۃ الاسرار:** اس کے مصنف کا نام کمال اللہ ابن محمد یہ صدیقی ہے نہ کہ کمال الدین اوراق ۲۶۴ نہ کہ ۲۶۱۔ قدرے کرم خوردہ۔

حیات القلوب: کاتب کا نام مرزا محمد رضا ولد مرزا فضل علی ہے نہ کہ افضل علی! اوراق ۲۷۴ نہ کہ ۲۷۵۔

HL **درج الدرر الغرر فی بیان میلاد سید البشر:** کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹۲ کے تحت جلد اول اور ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹۱ کے تحت جلد دوم مذکور ہے درحقیقت کتاب کی ضخامت کی وجہ سے لائبریری نے اسے دو جلدوں میں مجلد کردیا ہے۔ ہینڈ لسٹ میں تعداد اوراق دونوں نمبروں کے لیے تقریباً دو سو (۲۰۰) مذکور ہے جبکہ جلد اول میں ۱۶۶ اور جلد دوم میں ۱۶۹ اوراق ہیں اس طرح کتاب کے کل اوراق ۳۳۵ ہوتے ہیں۔

رسالہ علی شیر شیرازی یعنی مناقب محمدی: رسالہ کا نام "شمس مناقب محمدی" ہے اور یہ سیدنا محمد ابن سید درویش ابو محمد شمس الدین قادری جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے تعداد سطور ۱۱-۱۸ نہ کہ ۱۴۔

HL.2 **روضۃ الاحباب:** مصنف کے نام کے آگے الملقب بہ جمال الحسینی کا اضافہ سمجھا جائے کرم خوردہ اوراق ۱۹۷ نہ کہ ۱۹۶۔

HL.2 **مطلع الانوار فی سیرۃ النبی المختار:** کتاب کا نام "مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار" ہوگا۔ سنہ کتابت ۱۲۳۸ فصلی ہے نہ کہ ۱۲۲۸ اوراق ۱۵۹ نہ کہ ۱۶۰۔

HL.2 **مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار:** اس کے مصنف عفیف نور کا شانی ہیں۔

HL.2 **معارج النبوۃ:** یہ کتاب "قصص موسیٰ" ہے جو "اعجاز موسوی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور یہ کتاب تفسیر کے موضوع پر ہے نہ کہ تاریخ۔ اس کے کاتب عبدالرحمٰن شکارپوری ہیں۔

HL.2 **معارج النبوۃ:** کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوۃ" ہے اور یہ کتاب کا رکن اول و دوم ہے نہ کہ جلد اول اس کے مصنف معین المسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی یہ کتاب دو خط

ہیں ہے ابتدائی ۱۶۲ اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں بقیہ اوراق کے کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL.2901 **معارج النبوۃ**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوۃ" ہے اور یہ کتاب کا رکن سوم و چہارم ہے مکمل جلد دوم ——————— اوراق ۳۱۲ تا ۳۱۱ دراصل ہینڈ لسٹ نمبر ۲۹۰۰ اور ۲۹۰۱ ایک ہی کتاب ہے جس کو دو جلدوں میں مجلد کر دیا گیا ہے کل اوراق ۵۴۸ ہیں جس میں ۲۱۵ اوراق کے کاتب کا نام معلوم نہیں اس کے بعد کے اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں۔ کرم خوردہ نسخہ کے آخری ورق پر تین مہریں ہیں ایک عبداللہ خانہ زاد بادشاہ عالمگیر کی اور دو مہریں کن ہیں اسے کرم خوردگی کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

HL.2915 **معارج النبوۃ**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوۃ" ہے اور اس کے مصنف معین مسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی اوراق ۲۶۲ نہ کہ ۶۲۳۔ اس میں صرف رکن اول و دوم ہے۔

HL.4016 **نسخہ تولد حضرت محمد صلعم**: یہ تولد نامہ حضرت رسالت پناہ صلعم" ہے

HL.2790 **تحریر الشہادتین**: اس کے مصنف شاہ عبدالعزیز دہلوی نہیں بلکہ یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی عربی تالیف سر الشہادتین کا فارسی ترجمہ ہے جسے سلامت اللہ نے تحریر الشہادتین" کے نام سے کیا اوراق ۹۲ نہ کہ ۸۔

HL.4017 **جنگ نامہ امیر المومنین**: اس کے مصنف ابوبکر بن احمد بن محمد علی الملقب بہ پدر ہیں اور یہ رسالہ روز عاشورہ کی فضیلت اور آخر کا حصہ حضرت حسن و حسین کی شہادت کے ذکر پر مشتمل ہے کتاب کے ترقیمہ میں کاتب نے کتاب کا نام "جنگ نامہ امیر المومنین حسن و حسین" لکھا ہے جبکہ مصنف نے خود اس کا کوئی نام نہیں دیا ہے لیکن دیباچہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسن و حسین کے شہادت کے ذکر پر ہے اس لیے کتاب کا نام جنگ نامہ امیر المومنین مناسب نہیں بلکہ "رسالہ در فضیلت روز عاشورہ" زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں سنہ کتابت مذکور نہیں اس کی جگہ "در عہد اورنگ زیب غازی" مذکور ہے۔

HL.2781 **روضۃ الشہدا**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۱۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۷ھ۔

HL.3032 **روضۃ الشہدا**: کاتب کا نام نسخہ میں عنایت مذکور ہے نہ کہ عنایت اللہ اذا ابتدا کرم خوردہ۔

HL.2459 **اکبرنامہ**: دیباچہ میں نہ تو کتاب کا نام ہے اور نہ ہی اسکے مصنف کا البتہ ترقیمہ میں" انتخاب اکبر نامہ" مذکور ہے۔ اوراق ۱۳۷ نہ کہ ۱۳۸۔

HL.268 اکبر نامہ: اوراق ۳۴۶ نہ کہ ۳۴۴ تعداد سطور ۱۲ نہ کہ ۱۳۔

HL.303 اکبر نامہ: اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱ ورق ۱۰ تک تعداد سطور ۱۵ ہے اور اس کے بعد ۲۱-۲۲ نہ کہ ۱۵ اور یہ اکبر نامہ کا صرف جلد اوّل ہے۔

HL.274 اکبر نامہ: اوراق ۲۶۹ نہ کہ ۲۶۶ سنہ کتابت ۱۲۲۹ھ یہ بھی کتاب کا جلد اول ہی ہے۔

HL.331 اکبر نامہ: اوراق ۲۹۴ نہ کہ ۲۹۸ ناقص الآخر تعداد سطور ۱۶-۱۷ نہ کہ ۱۷ یہ جلد دوم ہے۔

HL.172 آئین اکبری: اسے HL ۱۷۲۰ نہیں بلکہ ۲۷۲۰ سمجھا جائے۔ کرم خوردہ۔

آئین اکبری: اوراق ۱۵۷ نہ کہ ۱۵۶۔

HL.27 آئین اکبری: اسے HL ۲۷۱۲ نہیں بلکہ ۲۷۲۳ سمجھا جائے۔

آئین اکبری: از ابتدا کرم خوردہ تعداد سطور ۱۸-۱۹ نہ کہ ۱۹۔

بادشاہ نامہ: اوراق ۳۲۰ نہ کہ ۳۲۱ کرم خوردہ۔

تاریخ انگریز: یہ دراصل بل صاحب کی انگریزی کتاب کے باب نہم و دہم کا ترجمہ ہے اور اس کے مترجم محمد انور ہیں اوراق ۹۴ نہ کہ ۹۲۔

تواریخ جہانگیر موسوم بہ "اقبال نامہ جہانگیری": اس کا عنوان صرف "اقبال نامۂ جہانگیری" ہوگا اور یہ کتاب کا صرف جلد سوم ہے۔

HL.32 تاریخ شاہجہان: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "عمل صالح" مذکور ہے۔ اوراق ۳۲۲ نہ کہ ۳۲۹ ناقص الآخر و قدرے کرم خوردہ۔

HL.2 تاریخ عالمگیر ثانی: اوراق ۱۱۰+۶ نہ کہ ۱۱۸۔

HL.26 تاریخ عالمگیر ثانی المعروف بہ تذکرہ عماد الملک: اوراق ۱۹۸+۲ نہ کہ ۱۹۸، ناقص الطرفین۔

HL.27 تاریخ فرشتہ: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نورس نامہ" مذکور ہے (۲ب) دراصل اس کتاب کا نام گلشن ابراہیمی ہے نورس نامہ کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ "نگارندہ پس از پایان کار خود بخش تاریخ عمومی آں را گزیدہ نورس نامہ نامیدہ است"۔ اوراق ۶۳۹+۱۲ نہ کہ ۶۴۹۔

HL.27 تاریخ منتخب نامۂ ہندیہ: کتاب کے نام میں لفظ "تاریخ" کا اضافہ غلط ہے صرف "منتخب نامۂ ہندیہ" اس کا نام ہے اس میں ہندستان کے مختلف صوبوں کے بارے میں اور ابتدا سے عالمگیر ثانی تک

کے بادشاہوں کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL. 3779 **تلخیص تاریخ مظفری:** اوراق ۲۷۷ نہ کہ ۱۷۵۔

HL. 3080 **جنگ نامۂ بہادر شاہ:** یہ کتاب جنگ نامہ کے نام سے ہی جانی جاتی ہے کتاب کے ترقیمہ میں "جنگ نامہ بہادر شاہ اعظم شاہ" مذکور ہے اس کے کاتب مقصود علی ہیں اور یہ خط نیم شکستہ میں ہے نہ کہ نستعلیق۔ کرم خوردہ۔

HL. 2374 **جنگ نامۂ بہادر شاہ:** اسے بھی جنگ نامہ ہی پڑھا جائے اس میں بھی اختتام پر نقل جنگ نامہ محمد اعظم شاہ و بہادر شاہ" مذکور ہے۔

HL. 2999 **خلاصۃ الاحوال بادشاہان و راجگان سلف ہند:** اس کا نام صرف "خلاصۃ الاحوال" ہے اور اس کے مصنف آسارام ذوق ہیں پاکستان میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے اس کے مصنف کے لیے ناشناختہ لکھا ہے۔ یہ ہندستان کی تاریخ ہے جس میں ابتدا سے لے کر ۱۱۳۸ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL. 2908 **خلاصۃ التواریخ:** اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۳ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۲ھ اوراق ۲۲۴ نہ کہ ۲۱۷۔

HL. 3290 **خلاصۃ التواریخ:** یہ کتاب کا صرف حصہ اول ہے ناقص الآخر اوراق ۹۸ نہ کہ ۹۶۔

HL. 4080 **خلاصۃ التواریخ:** ناقص الاول اوراق ۳۰۹ نہ کہ ۳۰۸۔

HL. 2475 **سوانح اکبری جلد اول:** یہاں جلد اول لکھنے کی ضرورت نہیں چونکہ جلد بندی میں سہولت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے کاتب محمد مستحسن زمان بہاری ہیں نہ کہ محسن زمان بہاری۔ اوراق ۱۳۵ نہ کہ ۱۳۲۔

HL. 2476 **سوانح اکبری جلد دوم:** یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۷۵ کا بقیہ حصہ ہے اس لیے یہاں بھی جلد دوم نہیں ہوگا۔ اس نسخہ کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد جلد اول سوانح اکبری" اس کے کاتب بھی مستحسن زماں بہاری ہیں۔

HL. 2995 **سوانح دکن:** اس کے مصنف منعم خاں الہمدانی الاورنگ آبادی ہیں اوراق ۲۰۷ نہ کہ ۲۰۴۔ ناقص و کرم خوردہ۔

HL. 3669 **سوانح دکن:** اوراق ۱۵۲+۶ نہ کہ ۱۵۵۔

HL. 3771 **سیر المتاخرین:** کاتب کے نام میں معروف بہ محمد بساون کا اضافہ سمجھا جائے اوراق ۴۳۶ نہ کہ ۴۳۲۔

HL. 4085 **سیر المتاخرین:** یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے تعداد سطور ۱۶-۱۸ نہ کہ ۱۹

آخری ۴۳ اوراق پر "انتخاب لفظیات سیر المتاخرین" ہے۔

HL.3009 شاہنامہ منور کلام: اس کے مصنف شیو داس لکھنوی ہیں نہ کہ منور کلام۔ اوراق ۷۶ نہ کہ ۱۵۱۔

HL.2611 عبرت العالم: ناقص الآخر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ہی مکمل نہ ہو سکی۔

HL.2615 عبرت مقال مع عبرت نامہ: اوراق ۱۳۱ + ۳ نہ کہ ۱۳۲۔ ابتدائی دو اوراق پر فہرست مضامین ہے اور تیسرے ورق پر کاتب کا نوٹ بہ تشریح تسطیر مجلد ہذا۔

HL.3095 فیاض القوانین: اس نمبر کے تحت فیاض الانشا ہے جس کے مصنف محمود بن شیخ محمد گیلانی ہیں یہ کتاب علم انشا اور اس کے قواعد و ضوابط پر ہے۔ ناقص الآخر۔

HL.2790 مرآت سکندری: اوراق ۱۸۶ نہ کہ ۱۸۵ ناقص الاول ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں دوسرے نسخہ کے لیے شمارہ نمبر ۳۶۲ دیا گیا ہے جو غلط ہے اس نمبر کے تحت شجرۃ الاتراک ہے جو چنگیز خاں اور اس کے آبا و اجداد کے حالات میں ہے دوسرے نسخہ کا شمارہ ۱۶۳ ہے۔

HL.3573 منتخب التواریخ: اوراق ۲۲۰ نہ کہ ۲۶۱ قدرے آب و کرم خوردہ۔

HL.3690 نسخۂ دلکشا: ۲۴۲ اوراق اگر ابتدائی ایک ورق جو سرورق ہے اسے بھی شامل کر لیا جائے تو ۲۴۳ ہونگے نہ کہ ۲۸۳۔

HL.3840 واقعات کشمیر: اوراق ۱۰۸ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.2880 واقعات جنگ شاہ عالم بادشاہ ثانی: اس کے مصنف چھکن لال ہیں (ورق ۳۲ - ۳۶) اس میں ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۰۰ھ تک کے مختلف واقعات مذکور ہیں جس میں واقعات جنگ عالم شاہ بھی ہے اوراق ۵۸ نہ کہ ۵۹ ناقص الطرفین۔ خط نستعلیق نہ کہ شکستہ۔

(۲) "نقولات فرامین شاہی" یہ در اصل "منشآت مادھو رام" ہے اور اس کے مصنف مادھو رام منشی ہیں یہ کتاب دو فصل میں ہے۔ موجودہ نسخہ فصل دوم ہے یہ فن انشا کے تحت ہوگا نہ کہ فن تاریخ۔ ناقص الآخر اوراق ۵۰ نہ کہ ۲۸ تعداد سطور ۱۲ نہ کہ ۹-۸ خط نیم شکستہ۔

HL.2869/2 واقعات عالمگیری: اس کے مصنف عاقل خاں متخلص بہ رازی ہیں اور خط نستعلیق و قدرے شکستہ لیے ہے نہ کہ شکستہ۔

تذکرہ

جلد اوّل:

HL.176 / No.650 **مرآۃ القدس**: اس کے مصنف کا نام پادری ژیرو ویمنوشو ہے نہ کہ ژیرو ذیمو شیو یر۔ سن کتابت ۱۰۱۲ھ ہے۔ کتاب مکمل ہے نہ کہ ناقص الآخر۔ اوراق ۲۹ نہ کہ ۲۸۔ خدابخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ جلد ۸ میں سن کتابت مذکور ہے۔

HL.178 / No.652 **بستان المحدثین**: یہ صرف کتاب کا جز اول ہے۔

HL.180 / No.654 **آثار الوزرا**: اوراق ۲۲۸ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.181 **تذکرۂ صوبہ داران اودھ**: اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۳۴۔

HL.182 / No.655 **مآثر الامرا**: اوراق ۳۰۲ نہ کہ ۳۰۱۔

HL.183-84 **مآثر الامرا**: مصنف کا نام عبدالرزاق الحسینی ہے جو شاہنواز خان کا اصل نام ہے نہ کہ عبدالحئی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے ترتیب دیا ہے اور مصنف کے حالات لکھے ہیں۔

HL.185 / No.666 **اخبار الاخیار**: کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے اوراق ۲۱۱ نہ کہ ۲۱۲ توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام دیا گیا ہے۔

HL.186 / No.667 **اخبار الاخیار**: کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر کاتب کے نام کی جگہ تمام شد بقلم قادری المشرب مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کتاب کا پورا نام دے دیا گیا ہے۔

HL.190 / No.67. **تاریخ قادریہ**: اوراق ۸۳+۲=۸۵ نہ کہ ۸۳، دو اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب محمد منیر قادری انصاری کرانوی ہیں۔ کاتب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں مذکور ہے۔

HL.19 / No.66 **تذکرۃ الاولیا**: اوراق ۳۷ نہ کہ ۳۶۔ کاتب بختی شاہ بن ملتان شاہ ہیں نہ کہ بختی شاہ بن ملتانی شاہ توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صحیح مذکور ہے۔

HL.19 / No.67 (ترجمہ) **خلاصۃ المفاخر**: اوراق ۱۴۷ نہ کہ ۱۵۴۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۷ اوراق پر مکتوبات شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہے۔ جس کی تفصیل توضیحی کیٹلاگ میں آچکی ہے۔ ہینڈ لسٹ میں نہیں۔

HL.1? / No.6? **توضیح الرشحات**: کتاب کا یہی نام مصنف نے دیباچہ میں دیا ہے۔ اس لیے اسے قوسین کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ توضیحی کیٹلاگ میں بغیر قوسین کے نام مذکور ہے۔

HL.199 / No.674 **سفینۃ الاولیا** : اوراق ۱۹ نہ کہ ۹۰۔ سنہ کتابت نسخہ میں ۳۹ عالمگیری مذکور ہے فہرست نگار نے ہینڈ لسٹ میں اسے ۱۱۰۸ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں عالمگیر کا سن جلوس ۱۰۶۸ھ ہے ایسی صورت میں ۳۹ سن جلوس ۱۱۰۶ھ/۱۱۰۷ھ ہوگا نہ کہ ۱۱۰۸ھ۔

HL.201 / No.562 **صفوۃ الصفا**: کتاب کا نام دیباچہ میں "مواہب السنیۃ فی مناقب الصفویہ" ہے۔ اوراق ۴۴۴ نہ کہ ۲۴۴۔ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے نام کی تفصیل موجود ہے۔

HL.202 / No.671 **کلمات الصادقین**: ناقص الاول۔ اوراق ۱۱۶ نہ کہ ۱۱۷۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.20[illegible] / No.67[illegible] **مرآۃ الاسرار** : اوراق ۹۴۹+۲، نہ کہ ۶۴۷ - ۷ اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب شیخ رحمت اللہ ہیں۔

HL.207 / No.703 **انیس الاحبا** : اوراق ۴، ۱۸۳ نہ کہ ۱۸۲، ۳ اوراق پر فہرست ہے۔

HL.209-10 / No.682-83 **تحفۂ سامی** : مصنف نے کتاب میں اپنا نام یہ لکھا ہے "فقیر حقیر سام ابن اسمٰعیل الحسنی سامی" کیٹلاگ میں صرف سام مرزا مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

HL.212 **تذکرۃ الشعرا** : اس کے کاتب رحمت اللہ ابن عبداللہ ہیں۔

HL.214 / No.711 **تذکرۂ فارسی** : کتاب کا نام دیباچہ میں "ریاض الفصحا" مذکور ہے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے مصنف نے اسے ۱۲۳۶ھ میں مکمل کیا اور یہ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۳۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ اوراق ۱۳۱+۱ نہ کہ ۱۳۱۔

HL.215 / No.687 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی** : اوراق ۳۳۰ نہ کہ ۳۳۹۔ اس کے کاتب محمد مقیم ابن حاجی کمال اصفہانی ہیں۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۳۲۹ اوراق ہیں اور کاتب کے نام کی صراحت موجود ہے۔

HL.217 / No.700 **خزانۂ عامرہ** : اوراق ۳۴۸+۵ نہ کہ ۳۴۹۔ کتاب کے خاتمے کے بعد ½ ورق پر نقل رقعہ میر حسن متخلص بہ تسہیل ہے۔

HL.218 / No.684 **خلاصۃ الاشعار** : کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار" ہے اور اس کے مصنف کا نام بھی مکمل شکل میں تقی الدین محمد ابن شرف الدین علی لکھا جائے تو بہتر ہے۔ اوراق ۳۹۱ نہ کہ ۳۹۵۔ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام آگیا ہے۔

HL.219 / No.712 **خلاصۃ الافکار** : اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "ابو طالب ابن مغفور (مرحوم) حاجی محمد بیگ خاں تبریزی الاصفہانی" جبکہ ہینڈ لسٹ میں ابن کے بعد صرف محمد اصفہانی ہے۔ اوراق ۲۴۹ نہ کہ ۲۵۷۔ کتاب میں مختلف مقامات پر کمی و اضافہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی خود نوشت تحریر ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی اس میں شامل ہیں۔

• رسالہ در علم اخلاق ۲ ورق، • رسالہ در مصطلحات موسیقی ۲ ورق، • اشعار فارسی آمیز عربی ا ورق
اس کے بعد ۴ اوراق پر بیاض ہے جس میں رسالہ بھید نایکا اور عبدالرحیم خانخاناں و مومن لکھنوی کے
بھاکا کے اشعار ہیں مومن کی کتاب بر ہاولیلا کا انتخاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عنوان "در
ذکر شعرای ہندی الاحباب کے بزبان بھاکا سخن گویند" وغیرہ ہے مذکورہ بالا رسالہ یعنی اشعار فارسی آمیز
عربی کے بعد کے بقیہ رسالوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں نہیں ہے بلکہ صرف some Hindi verses مذکور ہے

HL.222 / No.706 (منتخب) خلاصۃ الکلام : اوراق ۸۰ نہ کہ ۷۹۔

HL.223 / No.693 ریاض الشعراء : اوراق ۲۸۷+۲۲ نہ کہ ۲۸۸ آخری ایک ورق پر تھوڑے سے حصے میں چند سطریں
تذکرۂ خزانہ عامرہ سے نقل کی اخیر میں "سلطان دختر حسن علی خاں" ہے۔

HL.225 / No.690 سفینۂ خوشگو : اوراق ۲۱۵+۴ نہ کہ ۲۱۶۔ آزاد بلگرامی نے اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔
ابتدائی ورق پر "فقیر آزاد" کی مہر کے علاوہ یہ تحریر بھی موجود ہے "فقیر آزاد بلگرامی استکساب
نمود ۱۱۸۲ھ" اوراق کے علاوہ بقیہ باتوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں کر دیا گیا ہے۔

HL.228 / No.708 صحف ابراہیم : اوراق ۶۵۲+۱۱ نہ کہ ۶۵۶، ۱۱ اوراق پر جو فہرست ہے وہ کتاب کے کاتب
کی تحریر نہیں بلکہ بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

HL.229 / No.685 عرفات العاشقین : کتاب کا پورا نام اس کے دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "عرفات عرفا۔
عاشقین و عرصات و عارضات عارفین" اور اس کے مصنف کا نام تقی بن معین الدین محمد بن
سعد الدین محمد ہے۔ ہینڈ لسٹ میں "معین الدین محمد" کا "محمد" لکھنے سے رہ گیا ہے اوراق ۴۲۰+۱ نہ کہ ۴۲۰۔

HL.23 / No.709 عقد ثریا : اس کے کاتب کا نام لودھر پنڈت عرف ننکو ہے۔

HL.232 / No.688 کلمات شعراء : کتاب کا نام "کلمات الشعرا" ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام صحیح مذکور ہے۔

HL.233 / No.692 گلدستہ : اس کے مصنف عبدالوہاب عالمگیری ولد سید منصور خاں ہیں نہ کہ تقی بن معین الدین الحسینی
الاوحدی اور یہ میر تقی الدین حسینی کی کتاب "عرفات العارفین" کے انتخاب "کعبۂ عرفان"
سے انتخاب ہے اوراق ۲۱۷ نہ کہ ۲۴۷ کتاب کے خاتمے کے بعد ۹ اوراق پر رباعیات عمر خیام
ہے اس کے بعد ۷۶ اوراق پر مختلف عنوانات کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار کا
انتخاب ہے جس کے اوراق بے ترتیب ہیں اور یہ ناقص الاول بھی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب

اور اس کے مصنف کے نام کی تفصیل موجود ہے البتہ رباعیات عمر خیام اور اس کے بعد کے حصے کا سرسری ذکر ہے۔

HL.234 / No.701 **گلِ رعنا**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۰۴ فصلی ہے نہ کہ ہجری۔ کتاب کے اختتام پر سبحان علی کا ایک نوٹ ہے جس میں اس کے کاتب کا نام درج کیا گیا ہے نوٹ درج ذیل ہے جو کتاب کی تحریر سے مختلف ہے۔
"بندہ سبحان علی این نسخہ گل رعنا بحسب فرمائش راؤ صاحب والاقدر راؤ خوشحال سنگھ صاحب دام شفا در مقام آرہ بخط صاحبان عزیزان کہ اسم ہر یک صاحب تحریر می آید آں تحریر اختتام یافت میر افتخار علی میر طفیل علی میر بہادر علی میر کرم علی میر غلام حیدر و بیر ملی و لالہ بھوگے لال کاتھہ سکینہ واقع تاریخ پنجم جمادی الآخر ۱۲۰۴ فصلی" اوراق ۲۸۳ نہ کہ ۲۸۶۔ اوراق کے علاوہ بقیہ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں۔

HL.235 / No.707 **گلزار ابراہیم**: اوراق ۲۳۶ نہ کہ ۲۳۶، اس کے علاوہ ابتدائی دس اوراق پر مجہول الاسم و مولف ایک واقعاتی مثنوی ہے جو اردو زبان میں ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس مثنوی کا ذکر آگیا ہے۔

HL.237 / No.695 **مجمع النفائس**: اوراق ۲۸۰+۱۰ نہ کہ ۲۸۰ کاتب یا ملخص نے دیباچہ میں فہرست کے سلسلے میں لکھا ہے:
"فہرست اسامی شعرای کہ احوال و اشعار آنہا داخل این تذکرہ است در تذکرہ دستخطی جناب سراج الدین علی خان آرزو کہ این نسخہ ازان نقل کردہ شد مرقوم بود لیکن این نسخہ بسبب اختصار کتابت نوشتہ نشد" لیکن بعد میں کسی شخص نے اسے لکھ کر شامل کر دیا ہے۔

HL.238 / No.696 **مجمع النفائس**: اوراق ۲۷۲+۱۰ نہ کہ ۲۷۲۔

HL.239 / No.713 **مخزن الغرائب**: اوراق ۲۲۳+۱۰ نہ کہ ۲۲۲۔

HL.242 / No.717 **نشترِ عشق**: اوراق ۵۰۷ نہ کہ ۵۰۶۔

HL.243 / No.689 **ہمیشہ بہار**: اس کے کاتب سلطان علی بیگ ہیں۔

HL.244 / No.691 **ید بیضا**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "پارہ این نسخہ متبرکہ (ص ۱۶۰ تا ۲۲۲) بخط مصنف علیہ الرحمۃ است" ص ۱۶۰ سے ۲۲۳ تک (نہ کہ ۲۲۲) دوسرا خط ضرور ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ مصنف کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے نیز یہ کہ ص ۱۶۰۔ ۲۲۳ جیسا خط ص ۲۵۴ کا بھی ہے۔

HL.245-46 / No.724-25 **روایح المصطفیٰ**: کتاب کا پورا نام "روایح المصطفیٰ فی من ازہار المرتضیٰ" ہے۔ مصنف

کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"چوں ایں کتاب فقط در ذکر احوال اولاد مرتضوی کہ دران بیشتر فرع مصطفوی اند . . . .

لاجرم ایں کتاب را روایح المصطفٰی من ازہار المرتضٰی نامیدہ شد" (۸ الف)

ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "در ذکر ائمہ و علما و مشائخ"۔ کتاب کی عبارت میں کمی و اضافہ جیسے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بخط مصنف ہے البتہ دیباچہ میں کتاب کی ابتدا اور اس کے اختتام کے سلسلے میں مصنف یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۳۰۳ھ میں اسے مکمل کر لیا جبکہ کتاب کے اختتام پر مصنف خود ہی یہ لکھتا ہے کہ روز جمعہ ۲۸ صفر ۱۳۰۴ھ کو یہ کتاب اختتام کو پہنچی کتاب کی ابتدا ۳ شعبان ۱۳۰۲ھ (سنہ یکہزار دوصد و دو کتابت کی غلطی ہے یکہزار سہ صد و دو ہونا چاہیے) کو ہوئی اور ایک سال چھ ماہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی ـــــــــــــــ اوراق ۳۰۷ ہیں نہ کہ ۳۱۴ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۶۱ اوراق پر شاہی اسناد کی نقول "سند شاہی بابت دربست ایمہ لوہار" ہے اور اس کے بعد کے سات اوراق پر فہرست کتاب "روایح المصطفٰی من ازہار المرتضٰی" اس کا پورا نام اور کچھ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں ۔

HL.247/No.723 **مآثر الکرام**: نسخہ کے دیباچہ میں کتاب کا نام "مآثر الکلام تاریخ بلگرام" مذکور ہے۔ (مآثر الکلام کتابت کی غلطی ہے) صحیح مآثر الکرام ہوگا اور ترقیمہ میں "مآثر الکرام فی احوال بلگرام" اوراق ۱۳۴+۲ نہ کہ ۱۳۴ سنہ کتابت کی جگہ تھوڑا کرم خوردہ ہے البتہ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۸ھ ہو سکتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام مذکور ہے۔

HL.248/No.722 **مآثر رحیمی**: اوراق ۲۵۹ نہ کہ ۲۵۸، ناقص الاول پہلے ورق کا ابتدائی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ناقص الاول ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی کیا گیا ہے۔

HL.249/No.720 **مجالس المومنین**: یہ شیعہ مشاہیر علما، صوفیہ، سلاطین، وزرا اور شعرا کے حالات میں ہے۔

HL.250/No.721 **مجالس المومنین**: اوراق ۲۰۶+۹ نہ کہ ۲۱۶ توضیحی کیٹلاگ میں بھی ۲۱۶ مذکور ہے۔ ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ "نسخہ ہذا از نسخہ بالانقل شدہ و تاریخ کتابت سنہ ۱۰۴۵ھ کہ در آخر نسخہ درج است نیز از نسخہ بالانقل است"

میرے خیال میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نسخہ کو کس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے دونوں نسخوں میں مذکور ہے کہ اس کے آٹھ نسخے تیار کیے گئے اور اصل نسخہ سے مقابلہ کیا گیا ممکن ہے یہ نسخہ بھی ان ہی آٹھ نسخوں میں سے ہو اور اس کی تاریخ کتابت بھی ۱۰۴۵ھ ہی ہو۔

HL.251 / No.719 **منظر الانسان**: اوراق ۴۶۵ تا ۴۶۸۔

جلد دوم:

HL.1777 / No.1778 **اقوال حکما**: اوراق ۴۸ تا ۹۵۔

HL.1779 / No.1779 **خلاصۃ الحیوٰۃ**: اس کا نام "خاصۃ الحیوۃ" ہے۔

HL.1780 / No.1781 **رشحات**: اوراق ۲۴۳ + ۱۸ تا ۲۴۳، ۱۸ اوراق پر فہرست ہے جو بعد میں کسی نے شامل کر دیا ہے ناقص الاول نہ کہ ناقص توضیحی کیٹلاگ جلد اول میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا۔

HL.1782 / No.1780 **نفحات الانس**: کتاب کا پورا نام "نفحات الانس من حضرات القدس" ہے اوراق ۴ تا ۲۷۷۔

HL.1784 / No.1789 **تذکرہ شعرائے ہندی**: کتاب کا نام نسخہ میں موجود نہیں البتہ اگر اس کے ساتھ مع تکملہ کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا "تذکرہ شعرای ہندی (ریختہ گویان) مع تکملہ" یہ تذکرہ ۲۴۵ اوراق پر مکمل ہو جاتا ہے اس کے بعد کے ۱۳ اوراق پر اس کا "تکملہ" ہے۔

HL.1785 / No.1787 **تذکرۂ علی حسین گردیزی**: نسخہ کے دیباچہ میں تذکرہ کا نام مذکور نہیں البتہ خاتمہ پر "نسخہ تذکرہ فتح علی خاں گردیزی تمام شد" مذکور ہے "فہرست نسخ خطی فارسی انجمن ترقی اردو" میں اس کا نام "تذکرہ ریختہ گویان" مذکور ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵۔

HL.1787 / No.1788 **خزانۂ عامرہ**: اوراق ۲۲۷ + ۴ تا ۲۲۶، کرم خوردہ۔

HL.1788 / No.1786 **سفینۂ خوشگو**: تعداد سطور ۱۲ - ۱۷ تا ۷۔

HL.1789 / No.1785 **مراۃ الخیال**: اوراق ۳۰۲ + ۱ تا ۳۰۱ نیز خستہ و کرم خوردہ۔

جلد سوم

HL.2593 **احوال حضرت ابو مسلم**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۴ھ ہے قدرے کرم خوردہ۔

HL.3903 **اشجار الجمال**: اوراق ۱۰۰ تا ۷، ۹ تعداد سطور ۲۵ چند اوراق پر ۱۶ - ۱۹ تا ۱۹

HL.2648 **اصول المقصود**: اوراق ۱۱۱ تا ۱۱۶۔

HL. 3246 **بستان المحدثین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "بر اول صفحہ و درمیان کتاب مہر غلام صادق ۱۱۸۸ھ موجود است" لیکن نسخہ پر ایک بھی مہر موجود نہیں نیز ہینڈ لسٹ کے ہی کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "از زبان عربی ترجمہ شدہ" لیکن میری معلومات کے مطابق یہ کتاب فارسی زبان میں ہی لکھی گئی ہے "الاعلام" میں بھی اس کتاب کا ذکر آگیا ہے ممکن ہے اسی کے ذریعہ فہرست نگار کو یہ معلوم ہوا ہو۔ کیفیت کے خانے میں لائبریری میں موجود اس کے دوسرے نسخہ کا جو حوالہ نمبر دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۰۵۹ کے تحت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی اصول حدیث/فقہ پر "عجالۂ نافعہ" ہے البتہ مرآۃ العلوم جلد اول کے ہینڈ لسٹ نمبر ۸۷ کے تحت اس کتاب کا دوسرا نسخہ موجود ہے۔ کرم خوردہ۔

HL. 3602 **بحر الانساب:** طابع اور ترتیب کی غلطی سے کتاب نمبر کی جگہ ۳۶۰ ہی مذکور ہے یہ دراصل ۲۶۰ ہے اور سلسلہ وار نمبر ۲۲۳ کے بجائے ۲۲۴ ہو گیا ہے۔ نسخہ میں مصنف کے نام کی جگہ محمد جعفر حسینی مکی مذکور ہے نہ کہ محمد جعفر حسینی مکی۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ محمد جعفر حسینی مکی نے اپنے والد کی عربی تصنیف بحر الانساب کا فارسی ترجمہ کیا ہے مع متن عربی۔ ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت کی جگہ سن یکم جلوس عالمگیر مذکور ہے اس کی جگہ سن یکم جلوس عزالدین عالمگیر ثانی ہوگا جو ۱۱۶۳ھ ہوتا ہے۔

HL. 3533 **بحر الانساب:** کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۶۱۲ دیکھیے اس کا سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ ہے نہ کہ ۱۱۷۵ھ نسخہ میں جہاں سنہ ہجری مذکور ہے وہ قدرے کرم خوردہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سن جلوس محمد شاہ بھی مذکور ہے جو ۱۴ ہے ایسی صورت میں اس کی سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ یقینی تسلیم کی جائے۔

HL. 3664 **تاریخ احوال اسلام خاں:** نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نسب نامہ مختصر لشجرۂ اثنا عشر" مذکور ہے اور اس کے مصنف سید حیدر حسین خاں بن میر محمد حسین خاں شاہجہاں آبادی ہیں اوراق ۵۴ نہ کہ ۵۹ ابتدائی ۵ اوراق پر ورق کے دونوں طرف لکھا گیا ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے ہینڈ لسٹ میں عدد سطور کے خانے میں ۱۷ مذکور ہے اسے ۷ پڑھا جائے۔

HL. 3011 **تاریخ حبیبی و تذکرہ مرشد:** اس کے کاتب کا نام محمد تقی الدین نعمانی ہے نہ کہ محمد تقی نعمانی نسخہ میں سنہ کتابت سنہ عیسوی کے ساتھ ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۷۱ھ ہے تعداد سطور ۲۲ نہ کہ ۱۲۔

HL.2602 **تالیف محمدی:** ناقص الاول نسخہ میں سنہ کتابت عیسوی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۶۵ھ ہے۔

HL.3568 **تبصرۃ الناظرین:** اوراق ۱۱۷ نہ کہ ۱۱۶ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ فائدے سے خالی نہ ہوگا: "سوانح مردم بلگرام و وقائع سادات و شرفای آں مقام از تاریخ ولادت علوی وفات"

HL.3370 **تحفہ سامی:** اوراق ۱۹۳ نہ کہ ۲۵۶ ناقص الآخر نسخہ کے ابتدائی ۱۱۱ اوراق پر ورق کے دونوں طرف تحریر ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ "بر اول و آخر صفحہ مہر نواب سید ولایت علی خاں و خورشید نواب" لیکن نسخہ میں کسی بھی جگہ مہر موجود نہیں۔

HL.2400-A **تحفۃ الکرام:** اوراق ۲۴۷ نہ کہ ۲۴۶۔

HL.2400-B **تحفۃ الکرام:** اوراق ۲۴۲ نہ کہ ۲۴۸۔

HL.3214 **تذکرۃ الاحوال:** اس کے کاتب کا نام مظہر حسن ہے نہ کہ مظہر حسین۔ نسخہ کے ابتدائی ۸ اوراق کی کتابت کی تحریر کسی دوسرے شخص کی معلوم ہوتی ہے۔

HL.2949 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ۱۶۷ نہ کہ ۱۶۶ سنہ کتابت ہینڈ لسٹ میں ۱۲۲۱ مذکور ہے جبکہ نسخہ میں سنہ کتابت والا حصہ کرم خوردہ ہے البتہ ۱۲۲۱ میں اس کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "حاشیہ از محمد علی رفعت بن عتیق اللہ خاں الحسینی الواسطی" جبکہ نسخہ کے حاشیہ پر "رسالہ محمد علی رفعت" ہے جو ۲۸ اوراق پر ہے حاشیہ کے کاتب مرزا غلام علی بیگ ہیں سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں۔

- رسالہ۔ اس میں مختصر حکایات ہیں ۱۲ اوراق • صد پند لقمان ایک ورق • رسالۂ شیخ شرف الدین علی قلندر پانی پتی ۱۶ اوراق سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ • رسالہ ۲ اوراق • رسالہ بیان رگہا کہ در وجود آدمی اند۔ خواجہ معین الدین چشتی ۴ اوراق • رسالہ ارشاد الطالبین۔ جلال محمود تھانیسری ۱۶ اوراق • رسالہ (در تصوف) ۲ اوراق • مصیبت نامہ۔ شیخ فرید الدین عطار ۸ اوراق

یہ تمام رسائل قدرے کرم خوردہ ہیں اور کہیں کہیں جلد سازی کے وقت حاشیہ کی طرف سے کاٹے گئے کاغذ کے ساتھ کٹ گئے ہیں۔

HL.2979 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ۳۳۲ نہ کہ ۳۳۱۔

HL.2993 **تذکرۃ الاولیا و انبیا:** اس تذکرہ کا نام "ریاض الحیات" ہے اور اس کے مصنف درویش خاں

عرف محمد حیات قادری ہیں اوراق ۲۶۱ تا کہ ۲۶۰ ۔

HL.2761 **تذکرۃ الائمہ** : سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۲ ۔ اوراق ۱۷۵ نہ کہ ۱۷۴

HL.3535 **تذکرۃ الائمہ** : اوراق ۲۴۰ نہ کہ ۲۳۷ ۔ اس کے کاتب کا نام بہادر علی ہے ہینڈ لسٹ میں بہادر کے بعد علی واضح نہیں ۔

HL.3817 **تذکرۃ الائمہ** : اس نسخہ میں خطبہ مصنف کا نہیں بلکہ نسخہ کے کاتب غلام کوثر عرف درگاہی کا ہے محمد معظم کے خطبہ کو اس نے چھوڑ دیا ہے خود کہتا ہے ۔

" ناقل این نسخہ متبرکہ بسبب کم فرصتی خطبہ اصل را گذاشتہ نقل نمودہ ... خطبہ از طرف خود گفتہ نوشتہ

اوراق ۲۴۰ نہ کہ ۲۴۳ ۔ آخری ۴ اوراق پر عرضی ابن انس یعنی انیس بن خبیس ابن الیس ½ ورق اور "التماس مرزا عبداللہ اصفہانی بخدمت اہل سنت و جماعت" ہے جو شیعہ عقیدہ کے بارے میں ہے ۔

HL.2603 **تذکرہ شاکر خاں** : اس میں سنہ کتابت سن عیسوی کے ساتھ سن ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۶۳ھ ہے ۔

HL.3858 **تذکرۂ شیخ علی حزیں** : اوراق ۹۳ نہ کہ ۹۲ تعداد سطور ۱۴ ۔ ۱۷ نہ کہ ۱۵ ۔

HL.3320 **تذکرۂ صوفیا** : ناقص الاول وکرم خوردہ ۔ اوراق ۱۰۲ نہ کہ ۱۰۴ ۔ تذکرہ کے خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر تصوف میں ایک رسالہ ہے جس کا نام "منشا چہاردہ خانوادہ" دیا جا سکتا ہے اس کے کاتب کے نام کے آخر میں جونپوری کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا ۔ کتاب کا نام "تذکرہ صوفیا" نسخہ میں مذکور نہیں ۔ اس لیے اسے انڈر بریکٹ لکھا جائے ۔

HL.3831 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی** : کتاب کا نام "تذکرۂ طاہر نصر آبادی" ہوگا اور مصنف کے نام میں بھی نصر آبادی ہی لکھا جائے گا اوراق ۳۲۷ + ۱۵ نہ کہ ۳۲۷ ۔ خدا بخش لائبریری میں اس کا مطبوعہ نسخہ بھی موجود ہے جو وحید دستگردی نے مرتب کیا ہے ۔ مطبوعہ نسخہ میں تین چار سطریں کم ہیں قلمی نسخہ میں خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر یزد کے بعض شاعروں کا ذکر "بعضی از شعرای دار العبادہ یزد" کے عنوان سے ہے اس کے علاوہ چند منظوم تاریخیں بھی ہیں لیکن مطبوعہ نسخہ میں یہ سب چیزیں نہیں ۔

HL.2965 **تذکرۃ الکرام** : ناقص الطرفین وقدرے کرم خوردہ ۔ اوراق ۴۲۵ نہ کہ ۴۲۶ ۔ اس کے مصنف مولوی محمد ابو الحیوات ہیں ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں بوسیدہ مذکور ہے اس کی ضرورت نہیں ۔

HL.3213 **تذکرۂ معاصرین** : ناقص الآخر اس کا آخری یعنی ۳۳ واں ورق سادہ ہے یہ "مجموعہ رسائل شیخ علی حزیں" ہے اس میں موجود دیگر رسائل کی کتابت ایک ہی شخص مظہر حسن کی ہے اس لیے اس کے کاتب بھی مظہر حسن ہی ہوں گے ۔

HL. 4089 **تذکرہ:** اوراق ۵۲ سنہ ۲۰ ابسنہ کتابت ۱۱۸۵ھ ہے نہ کہ ۱۱۵۸ھ یہ رسالہ اولیاو عرفا کے نکات کے بیان میں ہے اس لیے اسے تذکرہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ نسخہ میں اس کے علاوہ درج ذیل عنوانات کے تحت بھی رسالے موجود ہیں۔

• در بیان خط و اقسام آن ۲ اوراق • در بیان حروف اعراب نا الفاظ ½ ورق • آغاز احوال اشعار متقدمین ۴۴ ½ اوراق ان تینوں رسالوں کی سنہ کتابت بھی ۱۱۸۵ھ ہی ہوگی۔

HL. 2596 **چراغ پنجاب:** ناقص الاول و کرم خوردہ کتاب کا نام "چراغ پنجاب" نہیں بلکہ "رسالہ صاحب نما" ہے اور اس کے مصنف کا نام لالہ گنیش داس قانون گوئی گجرات ہے نہ کہ لالہ گنیش داس قنوجی اس کے کاتب محی الدین و چراغ الدین نہیں بلکہ چراغ الدین مرید محی الدین ہیں نیز یہ کتاب تذکرہ نہیں بلکہ تاریخ ہے۔

HL. 2831 **حال مرزا اسعد اللہ کرمانشاہی:** کتاب کا یہ نام غلط ہے فہرست نگار کو کتاب کے آخر کی اس عبارت "این کتاب از مال حقیر اسد اللہ ولد ... حاجی مہدی" سے غلط فہمی ہو گئی ہوگی اور اس نے مال کو حال پڑھ لیا کتاب کا نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ مختلف قسم کے خطوط اور دستاویزات وغیرہ پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام "منشات" دیا جا سکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ تذکرہ میں نہیں بلکہ انشا میں ہوگا۔

HL. 3353 **حالات حضرت امام حسین و ابوالقاسم:** اس میں درج ذیل رسالے ہیں مذکورہ نام کا کوئی رسالہ نہیں۔

• ذکر بلا کے متعلق چند سوالات اور اس کے جوابات) ۳ اوراق • امام حسین کی شہادت کے بعد یزید کا مدینہ پر حملہ اس کی بے حرمتی اور مختار کی جانشینی کے بعد ان لوگوں کو سزا جو کربلا میں شریک یزید تھے پھر مختار کا انجام ۴ ½ اوراق • مختلف قسم کی دعائیں ½ ورق • تاریخ پیدائش، وفات، مدت عمر، مدفن، نام مادران، تعداد اولاد حضور صلعم، خلفای راشدین حضرت فاطمہ حسن حسین و امامان دیگر ۲ ½ اوراق

• نماز برای طلب حاجات ½ ورق یہ اردو زبان میں ہے • نسب نامہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی و خواجہ معین الدین چشتی ½ ورق کل ۵ سطور ۱۲-۱۵ نہ کہ ۱۵۔

HL. 2912 **حدیقۃ الشیعہ:** اوراق ۲۸۲ نہ کہ ۲۷۸۔

HL. 3439 **دوازدہ مجلس:** ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد عسکری حسینی بلگرامی مذکور ہے جبکہ نسخہ میں کاتب کا نام موجود نہیں کتاب کا نام بھی نسخہ میں مذکور نہیں اس کتاب میں صرف گیارہ مجلس ہے ہر مجلس کی ابتدا میں ترکیب بند ملا محتشم کاشی ہے اور اس کے بعد مجلس لیکن بارھویں ترکیب بند کے بعد مجلس کا عنوان

نہ دے کر روایات کا سلسلہ ہے ترقیمہ کی عبارت ہے "تمام شد روایات متعددہ از کتب مختلفہ"
اوراق ۱۵ تا ۱۱۰ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۱۸ ویں ورق پر حضرت علی کی شہادت اور اس
سلسلے کی مختلف روایات کا ذکر ہے۔ کرم خوردہ۔

HL. 3541 دہ مجلس: اس میں درج ذیل رسالے ہیں۔

• فاتحہ (نظم) حیدری ۳ ورق یہ اردو زبان میں ہے • رباعیات فارسی برای پیشخوانی مجلس امام علیہ السلام ۱/۲ ورق • رباعیات ہندی برای پیشخوانی مجلس امام علیہ السلام ۱/۲ اوراق •
کتاب کا نام موجود نہیں ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے خطبہ ہے پھر ملا محتشم کاشی کا ترکیب بند
اور اس کے بعد مجلس لیکن بندیا نزدھم و دوازدھم میں نہ تو خطبہ ہے اور نہ ہی مجلس (قیاس یہ ہے کہ
اس مجلس کے مصنف بھی حیدری ہیں) اوراق ۲۵ تا ۴۲ • من کلام میر محمد باقر داماد اوراق
۲ یہ عربی زبان میں ہے اور اس میں حضرت امام حسین سے ابتہالات (دعائیہ کلمات) کیے گئے ہیں۔

HL. 3746 ذکر حکما: کل ۵۳۴ اوراق میں سے ۱۸۶ اوراق پر فارسی متن ہے اور وہ بھی ورق کے صرف ایک طرف۔

HL. 3702 راحت الارواح: اوراق ۸۰ تا ۹۰ ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت ۸۴۲ھ مذکور ہے یہ سنہ کتابت
نہیں بلکہ سنہ تصنیف ہے۔

HL. 3075 رسالہ در احوال پیران و خرقۂ خلافت و ارشاد: اس رسالے کا نام "احوال خرقۂ خلافت چہار
پیر و چہاردہ خانوادہ" ہے اور یہ "مرآۃ الاسرار" تصنیف شیخ عبدالرحمن کے مختلف مقامات سے
انتخاب ہے۔ اوراق ۸ تا ۹ کرم خوردہ۔

HL. 3304 رسالہ در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی: کتاب کا نام "مدائح قادریہ مصطفویہ" ہے نہ کہ رسالہ
در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی (ملاحظہ ہو نسخہ کا ورق ۱۱) اس کے مصنف کا نام حافظ غلام
مصطفٰی ابن محمد اکبر التھانیسری الدہلوی القادری ہے مصنف نے ابتدا میں یہ کتاب عربی
زبان میں لکھی لیکن بعد میں لوگوں کی فرمائش پر خود اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ عام لوگ
بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں زیر نظر نسخہ میں عربی متن اور پھر ترجمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔
اوراق ۱۳۳ نہ کہ ۱۲۱ تعداد سطور ۱۷ نہ کہ ۲۷۔

HL. 3879 رسالہ ہمیشہ بہار: کتاب کے نام میں بجائے رسالے کے تذکرہ ہو تو مناسب ہوگا یعنی تذکرہ ہمیشہ بہار

یا پھر "ہمیشہ بہار" ویسے یہ کتاب "تذکرہ ہمیشہ بہار" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

HL.2 **ریاض الشعرا:** تعداد سطور ۲۵ نہ کرہ ۲۴۴۔

HL.2 **ریاض الشعرا:** اوراق ۴۲۰ نہ کرہ ۴۵۹ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3 **سفینۂ خوشگو:** ناقص الآخر اوراق ۱۲۵ نہ کرہ ۱۲۴۔

HL.4 **سوانح جہانگیر:** تعداد سطور ۹۔ ۱۱ نہ کرہ ۱۱۔

HL.29 **سوانح مرزا وزیر علی نواب لکھنؤ:** اس کا عنوان "سوانح مرزا وزیر علی خاں بہادر" ہوگا۔

HL.30 **سیرۃ مشائخین وصحابہ کرام:** کرم خوردہ ناقص الاول / ناقص الطرفین بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ کتاب مکمل نہیں اگر کاتب نے مکمل نہ کی ہو۔ اوراق ۲۲۵ نہ کرہ ۲۲۱۔

HL.40 **شبستان اقامت:** کتاب کا نام "شبستان امامت" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے شبستان اول تا شبستان چہاردہم مشتمل بر حالات آنحضرت صلعم تا شہادت امام حسن عسکری" اس میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ "و شبستان پانزدھم در حال جناب مہدی دیں علیہ السلام و در آخر حال دجال" یعنی پانزدہ شبستان و یک خارستان۔

HL.35 **شجرۂ طیبہ بلگرام:** کتاب کا نام صرف "شجرۂ طیبہ" ہے ہینڈ لسٹ میں بلگرام کا اضافہ غیر ضروری ہے اس کتاب میں سید رضا نے کتاب کے مصنف سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بعد مختلف لوگوں کے نام کا اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ ۱۲۵۲ھ تک کا ہے۔ ۱۱۰ ورق پر کتاب مکمل ہو جاتی ہے ۱۱۱ ویں ورق سے ۱۲۵۲ھ تا ۱۲۵۷ھ کے مختلف لوگوں کی تاریخ پیدائش، وفات، شادی وغیرہ کا ذکر ہے جو ۴ اوراق پر ہے ترقیمہ کی عبارت ورق ۱۱۰ پر یہ ہے۔

"بفضل او تعالیٰ شانہ باتمام رسید از قلم شکستہ رقم بندۂ خدا سید رضا بتاریخ ۲۰ جمادی الاول سنہ یکہزار دوصد و پنجاہ و دو ہجری نبوی صلے اللہ علیہ آلہ وسلم"۔

نسخہ کے پہلے ورق پر مہر سید رضا ۱۲۳۰ھ کے علاوہ یہ عبارت بھی درج ہے "ہذا نسخہ شجرۂ طیبہ مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی است کتبہ بندہ فرزند احمد بلگرامی" کتبہ اس عبارت کے ہوسکتے ہیں اور پوری کتاب کے بھی لیکن اندازہ یہ ہے کہ فرزند علی صرف اس عبارت کے ہی کاتب ہیں اصل کتاب کے کاتب سید رضا ہی ہوسکتے ہیں۔ قدرے کرم خوردہ۔

HL. 3567 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: کتاب کا نام شجرۂ طیبہ ہے اوراق ۱۱۶ تا ۱۲۰۔ اس کے کاتب سید خورشید احمد بلگرامی ہیں

HL. 3576 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: اس کا نام بھی شجرہ طیبہ ہی ہے اور یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۲۴ سے نقل کیا گیا ہے
سنہ کتابت ۱۲۸۲ھ ہے اور کاتب سید محمد مرتضی ولد سید مصطفی علی بلگرامی اوراق ۵ تا ۹۶
آخر کے ۴ اوراق پر دو اضافے بھی ہیں جنکا ذکر ہینڈ لسٹ نمبر ۳۲۵ کے تحت کیا گیا۔

HL. 2687 **صحائف شرائف**: اوراق ۲۱۵ تا ۲۱۳۔

HL. 3935 **طرب القلوب**: تعداد سطور ۱۶ تا ۱۷۔

HL. 3360 **عماد السعادات**: اس کا نام "عماد السعادت" ہے اور اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں غلام علی رضوی
ابن سید محمد اکمل خاں مذکور ہے نہ کہ غلام علی رضا رضوی سنہ کتابت ۱۲۵۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۴ھ۔

HL. 3425 **فواتح القدس**: ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۵۳ تا ۵۵ نہ کہ ۵۵۴۔

HL. 3364 **کلمات الشعرا**: کرم خوردہ۔

HL. 3380 **گلزار حال**: کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے اپنا نام بنوالی اور تخلص ولی لکھا ہے نہ کہ بنواری لعل
اوراق ۷۶ نہ کہ ۷۲ قدرے کرم خوردہ یہ ہندی کتاب "پربودہ چندا ودی ناٹک" کا فارسی ترجمہ ہے
نیز یہ کہ یہ تذکرہ نہیں بلکہ داستان ہے جو صوفیانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

HL. 3894 **گلشن ابرار**: کتاب کا نام "گلشن ابرار" نہیں بلکہ "ریاض العاشقین" ہے۔

HL. 3677 **مجالس الاحزان**: اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں حکیم علی اصغر خاں مذکور ہے نہ کہ حکیم علی
اکبر خاں۔ اوراق ۲۴۵ نہ کہ ۲۴۴۔

HL. 3867 **مجمع النفائس**: اوراق ۳۵۰+۲+۳۲ نہ کہ ۲۷۲، ۳۲ اوراق پر فہرست ہے جس میں درمیان کے ۷ اوراق سادہ ہیں

HL. 3424 **مجموعہ در احوال ولادت و شہادت**: مصنف نے باضابطہ طور پر کتاب کا کوئی نام نہیں
دیا ہے البتہ دیباچہ میں یہ لکھتے ہیں:
"این رسالہ ایست در چگونگی احوالات حضرت ائمہ المعصومین..." اس لیے اس کا نام
"رسالہ در احوال ائمہ المعصومین" دیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ در احوال ولادت و شہادت کسی طرح بھی مناسب نہیں

HL. 3975 **مرآت الابرار**: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "مرآت ابرار" مذکور ہے۔ ناقص الآخر و کرم خوردہ
اس کے پہلے ورق پر میر غلام احمد خاں بہادر کی مہر ثبت ہے۔

HL.2 **مرأت النحیال:** اوراق ۲۸۱ + ۳ نہ کہ ۲۷۰۔

HL.3 **مرأت النحیال:** کرم خوردہ۔

HL.3 **مرآت النحیال:** اوراق ۳۲۸ نہ کہ ۳۲۴۔

HL.3 **مرأۃ مداری:** قدرے کرم خوردہ نسخہ کے ترقیمے میں سنہ جلوس احمد شاہی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۱۶۵ھ ہے۔

HL.3 **مرأت مسعودی:** اوراق ۷۴ نہ کہ ۹۲۔

HL. **مفید المخلصین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں صرف "احوال سید شاہ رحمۃ اللہ مذکور ہے" جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سید شاہ کون ہیں اس کی جگہ احوال سید شاہ عزیز اللہ (معروف غریب نواز) ہونا چاہیے۔

HL. **مقتل نامہ:** کتاب کا پورا نام مقتل نامہ امیر المومنین حسین رضؓ ہوگا کیوں کہ کتاب کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد ہذا الکتاب مقتل نامہ امیر المومنین حسین رضی اللہ عنہ فی یوم ... ماہ صفر ۱۰۶۱ ... این کتاب را فقیر حقیر عوض بیگ نوشتہ ... در لشکر ظفر اثر اورنگ زیب بادشاہ غازی کہ ... در ملک کرن نزدیک بیجاپور" لیکن کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۶۱ کا نہیں ہوسکتا اوراق ۹۰ نہ کہ ۱۰۸۔ مقتل نامہ کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر عالمگیر (اورنگ زیب) اور صائب کے اشعار ہیں۔ ۴ ۱/۲ اوراق پر روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسینؓ کے واقعہ کا ذکر ہے۔ ۲ ۱/۲ اوراق پر قصیدہ حضرت غوث الثقلین شاہ محی الدین عبدالقادر جیلانی اور اس کی خاصیت کا بیان ہے قصیدہ کے خاتمہ پر مذکور ہے "این قصیدہ را میر روح اللہ نوشتہ است بتاریخ چہارم شہر ربیع الاول سن ۴۰ جلوس عالمگیر" ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "مہر اول و ۵۰ اصغر میر غلام صادق ۱۱۹۸ھ موجود است" اسے اس طرح پڑھا جائے "بر ورق اول و صد و شش مہر غلام صادق ۱۱۹۸ھ ثبت است"

HL.24 **مناقب العارفین:** اوراق ۳۲۸ نہ کہ ۳۲۴۔

HL.30 **منقول مرآت الاسرار:** کرم خوردہ اوراق ۴۰ نہ کہ ۳۹۔

HL.41 **وفات نامہ:** اوراق ۲۹ نہ کہ ۴۴ (اس میں حضرت علیؓ، امام حسنؓ، حضرت مسلمؓ، فرزندان حضرت مسلمؓ، حرؓ، امام قاسمؓ حضرت عباسؓ و علی اصغر کی شہادت کا ذکر ہے) اس کے کاتب سید محمد حسن ہیں اس کے بعد ۴ ۱/۲ اوراق پر بند محتشم (بند دہم تک) ہے پھر فاتحہ اور کربلا کے واقعات پر اشعار ۷، اوراق۔

HL. 261 **وقائع آنند رام مخلص**: اوراق ۱۹۵ نہ کرم۸ا کاتب الیس نورالحق افضلی اور سنہ کتابت ۱۹۵۱ء
اس نسخہ میں دو یا تین اشخاص کی کتابت معلوم ہوتی ہے قیاس ہے کہ آخری ۱۱ اوراق کے کاتب مذکورۂ بالا
شخص ہیں نسخہ کی ابتدا میں تذکرہ وقائع آنند رام مخلص حصہ دوم مذکور ہے اس لیے ہینڈ لسٹ میں
کیفیت کے خانے میں "حصہ دوم" کا اضافہ مناسب ہوگا نیز یہ کہ اسے تذکرہ کے بجائے تاریخ میں رکھا جانا چاہیے۔

HL. 3729 **ہفت اقلیم**: اوراق ۴۰۲ نہ کرہ ۴۰۹ ناقص الاول نہ کہ ناقص آخر چوتھے اقلیم تک اس کا ابتدائی حصہ
نہیں ہے اس کے بعد کا ہے۔

ضمیمہ:

HL. 3648/22 **اسامی شہدای کربلا**: اس نام یا اس عنوان سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL. 3441/2 **حالات معین الدین چشتی**: اس کے کاتب بھی عبدالستار ہی ہوں گے کیوں کہ مجموعہ میں اس سے قبل
مذکورہ کتاب کے کاتب وہی ہیں دونوں کی تحریر اور سیاہی بھی یکساں ہے۔

HL. 3922/6 **شجرہ چشتیہ**: ہینڈ لسٹ میں اس کے کاتب کا نام بشارت حسین مذکور ہے یہ کاتب نہیں ہیں بلکہ بشارت
حسین والے شجرہ سے نقل ہے اس طرح اس کی سنہ کتابت بھی ۱۲۰۷ نہیں ہوگی۔

HL. 3979/2 **رسالہ مناقب امام اعظمؒ مع اسمای حسنیٰ**: اس نمبر کے تحت جو نسخہ ہے وہ گنج لا یخفی۔ ملفوظات
مولانا حسین نوشہ توحید ہے دوسرا کوئی رسالہ اس میں نہیں۔

HL. 3712/2 **گلزار صابری**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے" وہ زبان اردو احوال حضرت
غوث الاعظم " لیکن اس میں غوث الاعظم کے حالات نہیں بلکہ غوث الاعظم کی پیدائش سے چالیس
روز قبل کا ایک واقعہ ہے جو ان کی والدہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ واقعہ گلزار صابری کے
صفحہ ۴۰ سے منقول ہے۔ اس لیے اسے "منقول از گلزار صابری" کہا جا سکتا ہے۔

HL. 3648/5 **نسب نامہ حضرت علی**: اس نام یا اس سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL. 3081/1 **وفات نامہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری**: اس کے مصنف زین بدر عربی ہیں۔ کرم خوردہ
اوراق ۱۱ نہ کہ ۱۲۔

For this purpose he persecuted the Nurbukhshiya, whom he regarded as heretics, and banned all Sufi orders, because the sufis led immoral lives, ate and drank forbidden things and spent their time interpreting dreams and prostrating themselves before one another. But Mirza Haider's rule did not last long. The Kashmiris rebelled against him on account of his narrow-mindedness and fanaticism and killed him.

Three more names deserve to be mentioned in order to complete the list of those who carried on the struggle on behalf of orthodoxy. These are Shaikh Hamza Makhdum, his disciple, Baba Daud Khaki and Shaikh Yaqub Sarfi. But their definition of un-Islamic beliefs and usages was very wide. They not only regarded Hindu beliefs and practices as un-Islamic, but also the *Shi'ite* beliefs and usages. Thus it came to pass that in opposing *Shi'ism*, which had been lately gaining ground in the Valley, they came into conflict with the chak rulers who were Shi'ites. Therefore, they approached Akbar and requested him to send Mughal troops for the conquest or Kashmir. That appeared to them the only way to restore orthodoxy.

Now, what was the result of struggle which the *Ulema* waged for over two centuries. The result was no doubt a substantial gain for orthodoxy At the same time it should not be forgotten that customs, beliefs and practices were too deeply embedded in the life of the people to be completely uprooted and replaced. The Kashmiris, no doubt, accepted the new values, but they did not forget the old. The result was a synthesis between the two. The legal system was replaced by the *Shari'a*, but the customary law continued to exist side by side. Caste and untouchability disappeared but it reappeared in a new garb. Idol worship was abolished, but the Hindu image gave place to the tomb of a Muslim saint, and the old places of worship still retained their sanctity for the Muslims. Thus the Islam which emerged in the Valley was not the same which had been introduced by the followers of the great Sufi orders. It had comprised itself and had thus become considerably transformed.

principles. Sayyid Ali was shocked to see these things and advised the Sultan to change his and his peoples' way of life. Qutubuddin accepted some of the saint's suggestions, but ignored others which were likely to antagonise his subjects. Sayyid Ali's son, Mohammad Hamadani, who also visited Kashmir, continued the work of his father, and it was under his influence that Sikandar tried to enforce the *Shari'a*, imposed *Jizya*, introduced prohibition, banned *sati* and the playing of musical instruments. Under Zainul-Abidin a number of Sufi and learned *Ulema* entered the Valley, but although the Sultan respected them he did not give up what they regarded as un-Islamic practices, Zainul-Abidin was inclined to be in favour of a more liberal interpretation of Islam.

During the later Shah Mir period there were two persons who deserve to be mentioned as revivalists. These were Mir Shamsuddin, the founder of the Nurbakhshiya sect, and Mirza Haidar Dughlat. Under Zainul-Abidin and his successors many of the un-Islamic practices, which had been discontinued by the Muslims under Sikandar, came to be revived. Mir Shihabuddin, who had arrived from Iraq in the spring of 1502, was anxious to wean the people away from such practices. He soon won over some influential nobles, among whom was Musa Raina the prime minister of Sultan Mohammad Shah, and under his patronage he began his crusade. Once while the Hindus were celebrating the spring festival on the Koh-i-Maran, Shamsuddin proceeded there and put a stop to these festivities on the ground that Muslims were participating in them and every one, including women, were drinking wine and behaving indecently. Shamsuddin even belaboured some of the persons who opposed him. When the next morning the Hindus complained to Mohammad Shah about Shamsuddin's high handed behaviour he was so angry that he wanted to put him to death, but was dissuaded by his counsellors.

Mirza Haider Dughlat, who ruled Kashmir from 1540 to 1551, was an able ruler. But he was a great fanatic and a champion of Islamic orthodoxy, which he was anxious to revive at all costs.

Sadhus. They, in fact, represented a compromise between Hinduism and Islam. The Rishis were Muslims but, like the Hindu ascetics, and unlike the Sufi saints, they preferred a life of retirement, living in caves and jungles, away from human habitations, to pray and meditate. Like the Hindu ascetics they renounced the world, leaving their wife and children, inflicting bodily sufferings upon themselves, and regarding the world as an illusion.

The impact of Hinduism and Islam on each other led eventually to a synthesis. This, of course, does not mean that there had been no difficulties in the way, and that the process had been an easy one. Actually the first resistance that was offered was by the Hindu society itself, which felt itself on the defensive. But its resistance proved to be futile. The statements of Jonaraja and Srivara, already quoted, reveal their agony and suffering at the complete failure of Hindu Society to set up a dam against the advancing tide of Islamic beliefs and practices. But as these defences weakened and Islam began to achieve success, it found that it was itself on the defensive. For the new converts refused to break their links with the past, and carried with them their old beliefs and practices. The result was that from the 14th to 16th centuries there was a constant conflict between those who wanted to keep to their old customs and usages and those who were insistent upon introducing the Perso-Islamic way of life. The champions of the latter were the Turks and Persians, who had settled in the country in large numbers, and the *Ulema* and Sufis, both Kashmiri and foreign.

In the course of his visits to Kashmir at the end of the 14th century, the great Sufi saint Sayyid Ali Hamadani found that there was nothing to distinguish Muslims from non-Muslims in dress, manners and customs. At Alauddinpura, in Srinagar, there was a temple which was visited every morning both by the Sultan and Muslims of the town To avert famine Shihabuddin performed the *Yagna* and distributed gifts to the Brahmans. Moreover, he had two wives, who were sisters, a clear violation of Islamic

Although their religion was opposed to caste system, they continued to observe caste distinctions. Caste names were kept, marriages were arranged on caste basis and caste functions were not given up. The Sultans also, like their Muslim subjects, adopted Hindu practices. They participated in Hindu festivals, visited Hindu temples to beseech the aid of the gods, and in order to avert calamities they performed sacrifices and bestowed grants on the Brahmans. They also performed the *Homa* ceremony at the time of the coronation. The only difference was that instead of a Brahman priest and the chief minister, the *Shaikhul-Islam* applied the *tikka* to the ruler's forehead and made offerings of gold and flowers.

The mutual influences which the Hindus and Muslims exercised on each other was not confined to manners and customs, but also extended to the realm of ideas and religious beliefs. The ideas of Lalla Did, for example, were greatly influenced by Sayyid Ali Hamadani and Nuruddin Rishi. Lalla Did, who lived in the 14th century, was greatly dissatisfied with the Saivite beliefs and practices. Under the influence of Islamic ideas, which she came to know through her contact with these saints, she denounced the caste system and criticised idol worship as silly and useless. She looked upon the world as an illusion, yet she also stated that it was not necessary for a man to become a hermit in order to achieve the absorption of the individual soul into the Supreme, but that even a house-holder could obtain Ultimate Release. In this there is evidence of the influence of Sayyid Ali Hamadani, who believed that in order to be a good Sufi it was not necessary to renounce the world In fact, he denounced celibacy and asceticism. Lalla also learnt from the Sufis to use words in an esoteric sense. From them also she imbibed the idea of the Divine Love, and like them she employed the word "Beloved" to denote the Godhead.

Just as Lalla Did came under Islamic influence, so did Nuruddin Rishi and his followers accept the ideas of Hinduism. The Rishis of Kashmir stood midway between the Sufis and Hindu

influence. A rigid caste system acts as a strong cohesive force, and thus serves as a powerful defence mechanism against the infiltration of foreign ideas. But in Kashmir, under the Buddhist influence, there had been a relaxation of caste rules and, as a result, the Hindu Society's power of resistance had been undermined. Islam, therefore, did not have to face the same degree of opposition in Kashmir as it did in other parts of this sub-continent where the caste rules continued to be rigid and the society was able to set up barriers against external influences. These facts go to explain why Islam's success in Kashmir was much more rapid and complete than in any other part of this sub continent.

THE IMPACT OF ISLAM

That the impact of Islam on Kashmir was profound and far-reaching is evident from the statement of Jonaraja who complains that "as the wind destroys the trees and locusts the shali crop, so did the *Yavanas* destroy the usages of Kashmira" and that "the kingdom of Kashmira was polluted by the evil practices of the *mlecchas*." Similarly Srivara, writing in the second half of the 15th century, says that Hindus had adopted blameable practices and given up preference for prescribed ceremonies Now what were the blameable practices which the Kashmiris began to adopt and the usages which the foreigners began to destroy. These practices were that caste rules became relaxed; foreign dress, manners and costoms began to be adopted; strange dishes began to be relished and what was most shocking was that even beef began to be liked by some Hindus.

It is necessary to poin t out here that while Kashmir was subject to foreign influences and was assimilating strange practices and usages, she herself was not slow in converting others to her own way of life Thus many Muslims, while they celebrated their religious festivals, also participated in the Hindu festivals of Gana-chakra Sripanchami and others. They regarded the Hindu pleces of worship as sacred, and sometimes they even worshiped idols.

successors. The conversion of Kashmiris to Islam, therefore, cannot be limited to any specific period; it was a long-drawn process extending to about 300 years. The only definite thing that can be said about it is that not until the early part of the 16th century were the great bulk of the people converted to Islam.

I have given so far a brief history of the spread of Islam in the Valley but this does not fully explain the problem of how this was accomplished. Actually rulers of Kashmir were, for the most part, indifferent to the missionary activities of Sufis and the *Ulema*. In fact, there is evidence to suggest that they discouraged these activities. The only ruler who actively took interest in them was Sikandar, but much of his work was undone by his son and successor, Zainul-Abidin. Thus it is not the Sultans but the Sufis who were mainly responsible for introducing and spreading Islam. But for this they did not use compulsion, because they were neither capable of employing it, nor did they have the sanction of the State behind them. Their methods were persuation, discussion and discourse. And they won over the hearts of the people on account of their simplicity, sincerity, piety and devotion. But we must remember that despite all these qualities, the Sufis would not have been able to make much headway, had they not been helped by certain objective conditions. Since about the 12th century society in Kashmir was in the process of social, political, and religious disintegration, caste rules had been relaxed, Brahmans had become arrogant, sectarianism was prevalent, the priests were uneducated, true spiritual values were lacking and religion consisted in nothing more than belief in superstitions and the performance of certain prescribed ceremonies. Buddhism also had become decadant and could not offer spritual satisfaction to the people. It was these conditions which had driven Rinchana into the fold of Islam, and had provoked Lalla Did to protest against the Saivite beliefs and practices.

I should mention one more cause which helped the spread of Islam. This was the laxity of caste rules resulting from Buddhist

Hindus and Buddhists, and appointed them to positions of responsibility.

The next person who carried on intensive missionary activity was Mir Shamsuddin. As a result of the liberal policies pursued by Zainul-Abidin and his successors, the Hindus had recovered some of their former position and strength. In a communal riot, which took place during the reign of Haider Shah, they caused damage to the *Khanqah-i-Mua'lla*. This provoked a reaction and Shamsuddin, protected and encouraged by some nobles, began his missionry work and achieved considerable success not only in the Kashmir valley but also in Baltistan. Those who played an important part in continuing his work after his death were Shaikh Makhdum Hamza, Baba Daud Khaki and Jamaluddin Bukhari.

Now the question arises as to when did a majority of the inhabitants of Kashmir become Muslim. There is evidence to show that in the time of the chak rulers the dominant religion of the Valley was Islam. But just as it is difficult to say with certainty as to when Islam was first introduced in the Valley, so it is not possible to specify any definite period when the process of conversion was completed. Stein's view that the adoption of Islam by the great mass of the population had become an accomplished fact during the second half of the 14th century is not borne out by facts When Sayyid Ali Hamadani visited the Valley at the end of the 14th century, he found the Muslims in a minority. Sikandar ascended the throne in 1389 and ruled till 1413. It is impossible to believe that in the course of 24 years he could have converted the whole Valley to Islam, particularly, when we remember that in the early years of his reign he was a minor, and power was exercised by his mother, who acted as Regent. Moreover, most of the work of proselytisation accomplished by him was undone by his son and successor, Zainul-Abidin, who completely reversed his religious policy. And from the accounts of Jonaraja and Srivara it is clear that there were still a large number of Hindus in the Valley and they had regained their position under Zainul-Abidin and his

meant to ameliorate the condition of all his subjects. On the other hand, Sikander introduced certain other measures whose object was certainly to secure converts. For example, he imposed the *Jizya* upon non-Muslims, and due to the economic pressure many must have become Muslims. Those who did not want to pay left the Valley. But we must remember that Sikander never compelled any one to become Muslim, if he paid the *Jizya*.

As regards the destruction of temples, Jonaraja accuses Sikander that there was no village or town left where temples were not razed to the ground. There is no doubt that Sikander destroyed temples, but not to the extent mentined by Jonarja or the Persian chroniclers This is clear from the fact that Mirza Haidar, writing after 150 years of Sikandar's death, testified that "first and foremost among the wonders of Kashmir stand her idol temples. In the rest of the world there is not to be seen, or heard of, one building like this. How wonderful that there should be 180 of them." Abul Fazl and Jahangir also mention of the lofty temples in a state of perfect preservation In reality many of the temples whose destruction has been attributed to Sikandar were destroyed by earthquakes. Some suffered due neglect, and some had already been destroyed during the pre-Sultanate period by the Rajas of Kashmir, namely, Jayapida, Saṅkaravarman, Adhimanyu II and Harsha.

When Zainul-Abidin ascended the throne he completely reversed his father's religious policy. He allowed every one full freedom of belief and worship. He recalled those Brahmans who had left the country under his father, and permitted others who had embraced Islam to return to their former faith. He banned cow-slaughter, and gave Hindus the right to perform their customs. He allowed them to repair and rebuilt temples and, in some cases, he himself had them rebuilt. He practically abolished the *Jizya* and other taxes which specially fell upon the non-Muslims. He participated in Hindu festivals, enjoyed the society of learned

was the best religion, Rinchana decided to accept the faith of the first person he saw in the morning. And since the first person he saw from his palace was Bulbul Shah, a Muslim, he embraced Islam. But this is too naive an explanation to be believed, for people do not change their religion in such a way. What actually must have happened is that Rinchana, who was spiritually restless and inquisitive and hankered after truth, failed to get any satisfaction either from Buddhism, the faith in which he was born, or from Hinduism, the faith of his subjects. It was at this time that he came into contact with Bulbul Shah who explained to him the teachings of Islam Rinchana was impressed by these teachings, which were simple and free from caste rules, priesthood, superstition and narrow formalism, and, therefore, accepted the Islamic faith. The conversion of Rinchana was a landmark in the history of Islam in Kashmir, because the example set by him was followed by a number of nobles, and according to a tradition by 10000 people. After Rinchana's death a number of sufis visited Kashmir among them Sayyid Ali Hamadani, who belonged to the Kubraviya order of Sufis, was the most prominent. He is said to have made 37,000 converts. These figures should not be taken too literally because both the Sufi accounts and the chronicles have a tendency to exaggerate. What these figures do indicate is simply this, that both Bulbul Shah and Sayyid Ali Hamadani made a number of converts. Sayyid Muhammad Hamadani, the son of Sayyid Ali Hamadani, who also visited Kashmir and stayed there for 12 years, continued the work of his father. But the next large scale conversions that took place were the result of the efforts of Sultan Sikander (1389-1413) and his minister Suhabhatta, who had become a Muslim under the influence of Muhammad Hamadani.

While studying Sultan Sikandar's religious policy, there are two things to be kept in view. First, he tried to introduce a number of social reforms like the abolition of *Sati*, the banning of gambling and the prohibition of wine and other intoxicants. These measures were not intended to persecute any community, but were

It was during the Sultanate period that Islam became the religion of the majority of the people of Kashmir, and since this had profound and far-reaching results, we must try to understand how it was introduced and it spead.

The earliest reference to Muslims in Kashmir is in Kalhana's *Rajatarangini*, where it is mentioned that Lalitaditya's son and successor, Vajraditya, who ruled in the early part of the 8th century, "sold many men to the *mlecchas*, and introduced into the country practices which befitted the *mlecchas*." These *mlecchas* were, probably, Muslims and the men whom they purchased must have been later converted to Islam. These appear to have been the first converts to Islam in the Valley. Later, Harsha employed Turkish soldiers and was influenced by Muslim fashions in dress and ornament. In the early part of the 12th century again we find a Kashmiri ruler employing Muslims in his army. From the travels of Marco Polo, it appears that by the end of the 13th century there was a colony of Muslims in the Valley, for he says that its inhabitants, the Kashmiris, do not kill animals but that if they want to eat meat they buy it from the Saracens. These Saracens were, most probably, Kashmiris who had become converts to Islam.

The first specific reference in the chronicles to conversion is that of Rinchana, a Buddhist ruler of Kashmir, which was brought about by the efforts of Sayyid Sharafuddin, commonly known as Bulbul Shah, who was a sufi saint of the Suhrawardiya order The chronicles and the Sufi *Tazkiras* represent this event as the outcome of a miracle. They say that unable to make up his mind as to which

2

Introduction and spread of Islam in Kashmir

19. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 360.
20. Ibid., p. 374.
21. Ibid , p. 276.
22. Ibid., p. 331.
23. Original Records, No. 16, *Tipu to Nizam* (Natiooal Archives of India).
24. Mackenzie, *A Sketch of the war with Tipu Sultan*, vol ii, pp. 72-3.
25. Mohibbul Hasan, op. cit., Appendices C & D.

●

REFERENCES

1. Valentia, *Travels*, xol. i, p 417.
2. Sinha, *Haidar Ali* (2nd ed.), pp. 255-56.
3. Ibid., p. 254.
4. *Mysore Archaeological Report*, 1914 and 1917.
5. Epigraphica Carnatica, vol. ix, p. 27; Khare, Itihas *Sangraha*, vol. viii, No. 3286.
6. Henderson, *The Coins of Haidar Ali & Tipu Sultan*, Mysore and Coorg, vol. i, Appendix.
7. Logan, Malabar, p. 50.
8. Sinha, op. cit. pp. 158-59; p. 254, 256.
9. Ibid., p. 251.
10. Ibid, p. 254.
11. See for details Mohibbul Hasan, *History of Tipu Sultan* (2nd ed.), Calcutta, 1971, pp. 355-55.
12. Ibid., p. 357-58.
13. Khare, op. cit, vol. viii, No. 3286.
14. *Mysore Archaeological Report*, 1916, pp. 10-1, 73-6.
15. Ibid. 1912, pp. 23-40; 1917, p. 58-59; 1940, p. 26. See also *Epigraphica Carnatica*, vol. iii, Sr. 77.
16. Baramhal Records, section xii. p. 9; *Local Records*, vol. iv, p. 280, cited in Report of the *Indian Historical Records Commission*, 1934, p. 417.
17. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 373.
18. India office Mss Eur. C. 10, p 206; Beatson, *A view of the origid and Conduct of the war with the Tipu Sultan*, p. 317; also Kirmani, *Nishan-i-Haidari*, p. 391.

officers by admonishing them and sometimes by inflicting upon them deterrent punishments[24]

There is no evidence to suggest that Tipu tried to establish an Islamic State, for like his father, he too knew that such a thing was impossible. However, from some of his actions it appears that he wanted to play the role of a Muslim ruler. Thus, he called his state *Saltanat-i-khudadad* (God-given State) He instituted a new calender called it *Mauludi*, dating it from the spiritual birth of the Prophet instead of from his flight (*Hijrat*). And he named some of the months after the Prophet and 'Ali. The same Islamic bias is evident in the names he gave to the new coins he introduced. The gold and silver coins were called after the Prophet, the first two Caliphs and the twelve *Shi'a Imams*. The copper coins, with the exception of the double paise, which is called after the third Caliph, bear the Arabic and Persian names of stars.[25] It seems that Tipu made these innovations as a concession to Muslim orthodoxy and also to satisfy his own conscience. However this did not imply any basic change in and departure from his policy of toleration.

he tried to excite his religious sentiments by dwelling on the atrocities which the English were committing on the Muslims in India. While these religious appeals were ineffective, as in the case of the French, he made appeals to their self-interest, stressing the danger to which they were all exposed by the British designs of aggrandisement. The same appeal he made to the Marathas; but in addition, he tried to arouse their patriotic feelings [20]

There are, however, some instances in which Tipu, persecuted unlike his father, the *Mahdavites*, a Muslim sect founded by Sayyid Muhammad of Jaunpur at the end of the 15th century. Tipu imposed a ban on their religious practices; and when despite this, they ignored his orders, he exiled them from his kingdom.[21] It was a strange contradiction in his character that while he himself held superstitious beliefs and indulged in un-Islamic practices, he refused to countenance the same in some of his Muslim subjects.

It was his religious beliefs and ideals that determined the attitude towards certain social practices and customs and religious ceremonies. For example, he banned many practices during the time of *Muharram* because he regarded them as un-Islamic. He forbade prostitution, and tried to put a stop to polyandry in Malabar and Coorg. In some parts of Malabar women did not cover their bodies above the waist; so Tipu decreed that no woman should go out of her house without being properly dressed. He abolished the custom of human sacrifice which was practised in the temple of Kali Devi near Mysore city. He also banned the use of liquor and other intoxicants in his kingdom [22]

Tipu was anxious to give a moral basis to his government, for he had a high sense of duty to his office, and believed that his subjects constituted a unique trust held for God, the real master.[23] He, therefore, spared no pains, to promote the welfare of his people, and was busy from morning till evening with state affairs. He personally supervised every department of the Government, and endeavoured to check the laxity, peculation and oppression of his

Brahmins he gave a black bullock, a milch she-buffalo, a male-buffalo, a black she-goat, a jacket of coarse black cloth, a cap of the same material, ninety rupees, and an iron pot filled with oil, and previous to the delivery of these articles, he held his head over the pot in order to see the reflection of his face and thereby avert misfortune[18]

To a man who possessed such eclectic beliefs and was so catholic in his outlook, it would be a mistake to attribute either religious fanaticism or even religious motives. If he crushed the Hindu Coorgs and Nayars, he did not spare the Muslim Moplahs His forcible conversion of Coorgs and Nayars to Islam was not due to religious but political motives. He had warned them several times that they should remain peaceful. But they ignored his warnings and repeatedly rebelled. He, therefore, converted them as a punishment However the conversions were on a much smaller scale and not as large as mentioned in some of the accounts. Besides, some of the conversions were voluntary.[19]

In his relations with Indian or foreign powers also, Tipu, like his father, was not influenced by religious considerations. He sent embassies to Persia, Afghanistan and Oman to obtain military help or promote commercial relations. He sent a mission to Constantinople for military and commercial reasons as well as to legalize his position as ruler of Mysore, because he had failed to secure confirmation of the title from the Mughal Emperor due to English intrigues. He made war on the Muslim rulers of Savanur, Kurnool, Adoni, Hyderabad and the Carnatic just as he fought against the Marathas and the Raja of Travancore. However, although religious considerations did not influence his State policy. Tipu, unlike his father, did not hesitate to exploit religion if it served his purpose. In his efforts to win over the Nizam against the English he appealed to his religion, pointing out that for the good of Muslims they should forget their past differences and unite against the common enemy. Similarly, to obtain the support of the Ottoman Sultan,

Despite all this, Tipu was very strict in the performance of his obligatory prayers and keeping the *Ramazan* fasts; and throughout the day he carried a rosary in his hand. He had great reverence for 'Ali, the cousin and son-in-law of the Prophet, and inscribed on his weapons the words *'Asadullah al-Ghalib* one of 'Ali's title. He also revered the other Shi'a *Imams* and named many of the coins after them. The manuscripts of his library had the names of Fatima, Hasan and Husain stamped on them. The ambassadors he sent to constantinople were instructed to lay offerings on his behalf at the tombs of 'Ali and Husain at Najaf and Karbala, and they were to ask the Caliph's permission for constructing a canal from the Euphrates to Najaf, where there was a great shortage of water.[17] Tipu was greatly interested in Sufism, and under his patronge a number of books were written on it. Like his father, he revered Muslim saints and conferred grants for the up-keep of their tombs; he also held Hindu *sadhus*, saints and gods in high respect. Further, like his father, he was extremely superstitious, and believed that the performance of certain ceremonies could avert misfortune. Everyday he consulted the astrologers attached to his conrt about his stars. He fed Brahmins and bore the expenses of Hindu religious ceremonies performed to invoke success for his arms. On every Saturday, withont fail, according to the advice of the astrologers, he made an offering to the Seven Stars of seven different kinds of grain, of an iron pot full of sesame oil, of a blue cap and coat and one black sheep and some money All these articles were distributed among the Brahmins and the poor. On the morning of 4th May, 1799, before Seringapatam was captured by the English, Tipu had been warned by both Hindu and Muslim astrologers that, since it was an inauspicious day for him, he should remain with the army till the evening, and in order to avert disaster he should give alms. After his bath, therefore, he distributed money and cloth among the poor who had gathered there. To the chief priest of Chennapatna, he presented an elephant, a bag of oil seeds and two hundred rupees To the other

the title of an independent ruler might have created diplomatic problems. It would have had also no meaning unless confirmed by the Mughal Emperor, but this confirmation was not an easy thing to secure.

Tipu Sultan, for the most part, followed in the footsteps of his father. He appointed Hindus to high offices of State [11] He not only continued the *Inam* grants of the previous reigns to Brahmins and temples but gave fresh grants [12] In the course of the Third Anglo-Mysore War, when he visited Conjeevaram, he gave 10,000 *Huns* towards the construction of the Gopur temple whose foundations had been laid by his father,[13] and like his father, wrote letters to the Jagatguru of Sringeri Math couched in respectful and polite language. In 1791 some Maratha horsemen plundered the monastery of its valuable property, and displaced the sacred image of the goddess Sarada When Tipu came to know of this he sent the Math money, grain and other articles for the consecration of the goddess.[14] In Nanjundesvara temple at Nanjangud a jadite *linga* was installed by Tipu's orders. Tipu also gave elephants, jewels, silver and gold vessels to various other temples in the kingdom.[15]

Tipu, like his father, allowed the Hindus complete freedom of worship. The magnificent temple of Sri Ranganatha is situated within the fort of Seringapatam, about one hundred yards west of the palace, from where the Sultan heard daily the ringing of temple bells and the hymns chanted by Brahmin priests. Yet he never interfered with these The Narasimha and the Gangadharesvara are the other two big temples inside the fort and near the palace. But neither in these nor in the thousands of other temples scattered throughout his kingdom, did Tipu ever prevent Hindus from offering worship. On the contrary, he often made grants to the Brahmins to perform their religious ceremonies in the temples. He also distributed money for the performance of religious ceremonies among the Muslims.[16]

cising them and recruiting the Nayar boys into his *chela* battalion, which he had formed on the lines of the Janissarries of the Ottoman Empire. He also converted some of his European prisoners from motives which had nothing to do with religion. Since he needed Europeans as artificers, engineers and officers for his army, he hoped to persuade them to enter his service [9]

Haidar Ali was very much influenced by his Hindu environment This is evident from his belief in the efficacy of certain ceremonies. Thus, he ordered the performance of *Japam* in Hindu temples before setting out on a campaign. Similarly, buffaloes were sacrificed on the occasion in accordance with the Hindu tradition, and he usually marched against the enemy only after the Brahmins had declared that the hour and day were auspicious.[10]

It has been maintained that Haidar did not set aside the Raja of Mysore and himself assume the title of a king in deference to Hindu sentiments, and that is why every year at the annual *Dasahra* festival, he allowed the Raja to come out of his palace and show himself to his people. But the fact is that, if after he had consolidated his position, Haidar had deposed the Raja there would have been no resistance, for, on account of his benevolent rule he was extremely popular both with his Hindu officers and Hindu subjects. Later, when Tipu, his son and successor, did eventually put an end to the rule of the Wodeyars and declared himself Sultan, there was no opposition. It seems, therefore, more probable that the reason why Haidar did not think it necessary to assume the title of an independent king was first, that he possessed in practice full sovereign powers. He struck coins in his own name, received envoys of Indian and foreign powers and sent his own to them and made war and concluded peace. Secondly, he might have been influenced by the examples of the Peshwa, the Nizam, the Nawabs of Oudh, the Carnatic and Bengal, none of whom were *de jure* rulers, although in practice enjoying sovereign powers. That is why Haidar Ali also remained content with the position he occupied and did not desire for any change. Besides, the assumption of

Haidar appointed Hindus to high position in his government. At the time of his death, out of five officers in charge of different departments, three were Hindus, namely, Krishna Rao, Purniya and Shamia. In addition, his revenue officers and diplomatic agents were mostly Hindus.[2] Haidar continued the *Inam* grants of the time of the Rajas to Brahmins and temples.[3] He presented various articles to the temples in Mysore, for example a *Sankh* to the temple in Devanhulli, and some vessels to Sri Ranganatha temple in Seringapatam.[4] Although this was against the *Shari'a*, he did not care In fact, he went much further in violation of it, When the temple of Sri Ranganatha was damaged as the result of fire, he had it rebuilt in one month. He also laid the foundations of Gopur temple in Conjeevaram during his invasion of the Carnatic in 1780, but it could not be completed owing to his war with the English [5]

In the matter of coinage also he followed a policy which though un-Islamic, took into account Hindu sentiments. He allowed the retention of gold coins which had the figure of the Hindu god Siva and his consort on the obverse. Similarly, the half *pagoda* had on the reverse a figure of Vishnu with a discus in the right and a conch in the left hand; and the Ganapati *pagoda* had on its obverse the figure of an elephant with an uplifted tail [6]

Haidar's attitude towards the Christians of Malabar was also very liberal. He granted the Catholic church in Calicut 2,420 *fanams* yearly, and allowed the Catholics complete freedom of worship.[7] Later, however, this grant to the church was cancelled along with the trade privileges which the Portuguese had until then enjoyed in the Mysore kingdom, because, in 1768, when the English attacked Mangalore, the Portuguese gave them help in its conquest [8]

Similarly, Haidar Ali's harsh treatment of Hindus in Malabar was not due to religious but to political considerations. The Nayars had again and again rebelled; so Haidar punished them by circum-

According to Valentia, once a *pirzada* complained to Haider Ali that some Hindus of Seringapatam had beaten up his followers, who had attacked a Hindu procession, and demanded redress from him as head of a Muslim government. Haider Ali replied angrily : "Who told you that this was a Muslim government ?"[1] These words very vividly sum up Haider Ali's concept of government and his attitude to the relationship between religion and politics They show that he regarded religion as a purely personal matter having no connection with public affairs, and believed that in a territory mainly, inhabited by non-Muslims, it would be foolish to think of establishing an Muslim State

Haider's concept of government was the product of several factors. First, there was his family background. His forefathers had been *Sufis* attached to the shrine of Jamal-ud-Din Husaini commonly known as Gisu Daraz. Although himself not a *Sufi*, Haidar revered the *Sufis* and paid visits to their tombs Secondly, he was influenced by the tradition of religious toleration that existed both in the Muslim and Hindu States of the Deccan and South India. Thirdly, as a *pragmatic* and a statesman possessed of great *foresight* he realised that, ruling as he did an overwhelmingly large non-Muslim population, it would be suicidal to think of establishing a Muslim State. Throughout his career, therefore, he did two things. First, he did his best to win over the goodwill of Hindus; and secondly, he kept religion and politics apart, never permitting his personal beliefs to influence the latter.

KHUDA BAKHSH EXTENSION LECTURES, 1988

PROF. MOHIBBUL HASAN was educated at Lucknow and London. Worked as lecturer in Islamic History and Culture in Calcutta University (1943-1956), Reader in History in Aligarh Muslim University, (1956-1963), Professor and Head, Department of History Jamia Millia Islamia, New Delhi (963-1970), Senior Professor and Head Department of History in University of Kashmir Srinagar, member of the Executive Committee of the Regional Records Survey Committee, West Bengal (1947-1955), the Archival Legislation Committee (Government of India 1959-60), Vice President of the Iran Society, Calcutta (1952-54). Presided over the Medieval Section of the Indian History Congress in 1957 and 1967.

His well known works include : History of Tipu Sultan, Kashmir under the Sultans, Historians of Medieval India, Babur : Founder of the Mughal empire in India, Readings in Democracy, Messages by Freedom, Introduction and annotation to the Babur Nama (Part III) translated by Bacque-Grammont (Paris 1981) and Waqai i-Manazil-i-Rumi (Diary of an Indian Embassy to constantinople).

Besides, he contributed a number of articles to various Indian and foreign Journals including the Encyclopaedia of Islam. Presently he is settled at Aligarh.

1

Religion and Politics under Haider Ali and Tipu Sultan

By

Prof. Mohibbul Hasan
Aligarh

Printer : Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi 2

Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 50109, Telex: 22-430 KBL IN)

Editor : Dr. A.R. Bedar.

Annual Subscription : Rs. 300/- (Inland) U$ 60 (Asian Countries) U$ 120 (Other Countries). Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-.

JOURNAL NO. 57-62

CONTENTS

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

57——62

JANUARY-JUNE 91

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

خدابخش لائبریری پٹنہ
جرنل
۶۳ تا ۶۸
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر:	۳۳۴۲۴/۷۷	سالانہ:	۳۰۰ روپے (ہند)
شمارہ:	ستمبر تا اکتوبر		۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک
قیمت:	ڈیڑھ سو روپے		

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

متین

اردو دانشوری

تازہ دانشوری

بازیافت

اہم رسائل کا اشاریہ

اردو اکادمیاں

مشرقی کتابخانے

مراسلات

خدابخش نوادر

حصہ انگریزی

ہندستانی مذاہب

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

خدابخش نوادر

●●

حرفِ چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے کے لیے کوئی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر بھی گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔ ۱۹۹۱ سے جرنل کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے، تاکہ اس سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشمولات سے بہت کچھ فائدہ ہوا، اس کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت نہ رکھے۔

لیکن —— صرف ایڈیٹر کیوں؟ اس کارِ خیر میں آپ بھی برابر کے شریک کیوں نہ ہوں۔ آپ کی نظر سے بھی اچھی چیزیں گذرتی رہتی ہوں گی، اصلاً سہی ان کے حوالے ہی ہمیں بھجوا دیں۔

—— ع ب

تشکر

خدابخش لائبریری جرنل نمبر ۵۔۴ میں شامل کچھ مضامین کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا جاسکا تھا۔ معذرت کے ساتھ ان رسالوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے:

۱) کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟ ___ ہماری زبان، ۲۲ اگست ۱۹۸۹ء

۲) عصر حاضر میں ادب کا کردار ___ صحیفہ، جولائی ستمبر ۱۹۹۰ء

۳) چینی زبان کے الفاظ قرآن میں ___ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء

۴) اسلام اور ہندو مت کی بعض مشترک تعلیمات ___ معارف، اپریل ۱۹۴۲ء

۵) ترکی کا ایک غیر معروف کتب خانہ ___ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۰ء

۶) استنبول کے کتب خانے ___ معارف، ستمبر ۱۹۵۲ء

۷) بروصہ کے کتب خانے ___ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۱ء

ہندستانی مسلمان
ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ
ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین

ادارہ تحقیقات اردو اور خدابخش لائبریری
کے تعاون سے یہ مقالہ منظر عام پر آرہا ہے۔ مرحوم
قاضی عبدالودود دونوں کو ملانے والی سنہری کڑی تھے۔
ان کی یاد میں یہ اشتراک ہنوز جاری ہے۔

——ادارہ

انتساب

اپنے نانا مرحوم مولوی مجید حسن
مالک اخبار "مدینہ" بجنور اور نانی
مرحومہ کنیز فاطمہ کے نام جن کی آغوشِ
شفقت میں میں نے حبُّ الوطنی
کا پہلا سبق سیکھا۔

ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں سبھی فرقوں اور تمام ہی طبقوں نے گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اس جامع تحریک کے تمام پہلو ہر ایک کی نظر میں نہیں رہتے۔ محترمہ عابدہ بیگم نے بڑی محنت سے جو مواد جمع کیا ہے اس سے متعدد اہم واقعات منظر عام پر آسکیں گے اور بہت سی مسلم خواتین کی خدمات کا مناسب اعتراف ہو سکے گا۔

ہندستانی جنگ آزادی کے تمام طالب علموں کے لئے یہ کتاب نہایت اہم اور مفید ثابت ہوگی۔

(سید نور الحسن)

۱۰ر اپریل ۱۹۹۰ء

پیش لفظ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کا مسودہ پڑھنے کا موقع ملا۔ بڑی خوشی ہوئی پڑھ کر۔ اس کتاب میں ان ۲۰ خواتین کے سوانحی خاکے شامل ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر، تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت اور پھر قومی جدوجہد کے آخری مرحلے میں حصہ لیا۔ یہ ایک مفید کام ہو گیا جو حوالے کی کتاب کا کام دے گا کہ، اس میں بہت سی ایسی شخصیتوں اور ایسے حقائق پر روشنی پڑتی ہے جن سے ہم بہت کم واقف تھے۔

قومی تحریک پر اردو میں یوں بھی بہت کم مواد ہے، اور اردو دانشوروں نے اس جدوجہد میں قوم کو جو کچھ دیا ہے (اور ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کے مطالعہ میں آنیوالی یہ خواتین بھی اسی طرح اردو سماج سے متعلق ہیں)، خود اردو داں قارئین کو ان کے بارے میں یاد دہانی کی ضرورت بھی ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں قومی جدوجہد کے اس عظیم اصول کو بھی پختگی ملے گی۔ —— یعنی مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا اصول —— جس پر کم فہم لوگوں کی طرف سے آج بھی اعتراض ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خواتین کی قدم سے قدم ملا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے شاندار جدوجہد خود بخود ان اعتراضات کا ایک مثبت جواب بن جاتی ہے۔

عرفان حبیب
پروفیسر شعبۂ تاریخ
علیگڑھ

ترتیب

ہندستان کی جنگ آزادی میں
مُسلم خواتین کا حِصّہ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین
ریڈر ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

هم آج بیٹھے هیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کے اُڑا نے گئے هوا ایک ایک

مہاتما گاندھی نے کہا تھا "قومی جہدِ آزادی کی تاریخ ہندوستانی خواتین کے تذکرے کے بنا مکمل نہیں ہوسکتی"۔ زیرِ نظر اوراق میں مسلم خواتین کی جہدِ آزادی میں شرکت کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اس کا بنیادی مقصد آزاد ہندوستان کی نئی نسل میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ جس طرح ہماری جنگِ آزادی چند مستحکم اصولوں پر مبنی اور مشترک تھی اسی طرح ہماری آزادی بھی ایک قیمتی مشترک ورثہ ہے جس کی حفاظت ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں اور قوموں کے گمنام مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کی بازیافت اور انھیں ان کا مناسب مقام دینا ہمارا ملّی فریضہ ہے۔ امید ہے کہ یہ بازیافت قومی یک جہتی کی جانب بھی نمایاں پیش رفت ہوگی۔

"ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ" کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بابِ اول میں ان چند محب وطن اور بہادر خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے ملک کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملی طور پر حصّہ لیا۔

ہندوستان میں انگریز بحیثیت سوداگر آئے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ان کی کوٹھیاں بنیں لیکن اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا

آفتاب پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ جیسے جیسے مغلیہ سلطنت کی چھاؤں ڈھلنے لگی سات سمندر پار کے ان مسکین صورت انسانوں کے سائے بھی لمبے ہوتے چلے گئے انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی و اودھ کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا تو ملک کے طول و عرض میں ایک آگ سی لگ گئی ۱۸۵۷ء میں سارا ہندوستان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس انقلابی جدوجہد میں ہندوستان کا چپہ چپہ ان کے لئے دوزخ بن گیا۔ اپنے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین نے بھی اس انقلابی دور میں غیرت و حمیت، بہادری و سرفروشی اور ایثار و قربانی کے دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد کے بعد جو ہندوستانی عوام کے غیر منظم ہونے کے سبب ناکام ہوئی، انگریزوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ غیر مسلموں کو ان کی طرف سے بدظن کیا گیا اور نئی سامراجی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی حالت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ نتیجے میں عرصۂ دراز تک مسلمانوں پر ایک جمود و بے حسی کی کیفیت طاری رہی۔ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کی کم و بیش یہی حالت تھی۔

سلطنتِ عثمانیہ جیسی عظیم و پُر شکوہ حکومت بھی روبہ زوال تھی یہاں کا سارا معاشی نظام اور تجارتی کاروبار یوروپی اقوام کے ہاتھ میں تھا۔ جگہ جگہ بغاوت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں خود ترکوں میں سلطان کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

لیکن پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹) کے بعد جب سامراجی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے آپس میں بانٹ لئے تو اسلام کے اس زوال پذیر دور میں شیرازہ بندی کے لئے عہدِ رفتہ کی یاد ہی ایک واحد اور مضبوط رشتہ ثابت ہوئی۔ رہنمایانِ قوم نے ان جذبات کو قومی و ملی اجتماعی خدمات کے لئے تعمیری پہلوؤں سے جوڑا، مسلمانوں کو درس دیا گیا کہ وہ اپنا ملی اتحاد اور تشخص قائم رکھنے کی خاطر اپنا شاندار ماضی نگاہ میں رکھیں۔ ہندوستان میں خلافت تحریک نے برطانوی سامراج سے

زبردست مورچہ لینے کا عزم کیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے کہا "مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے، تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں"۔ اُدھر گاندھی جی جنگ کے خاتمے پر رولٹ ایکٹ اور جلیان والا باغ کے خونی حادثوں سے انتہائی ناامید تھے۔ مسلمانوں کا اضطراب وہ سمجھ رہے تھے ان کی دانست میں ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا۔

تحریکِ خلافت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد غیر حقیقی مفروضے تھے نیز اس کا اصل مقصد اسلامی ممالک کی ایک عظیم فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اسلامی اقدار پر خصوصی زور دینے کے سبب یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئی وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا سوال ہے گاندھی جی اور دوسرے ممتاز ملکی رہنما یہ بات اچھّی طرح سمجھتے تھے کہ تحریکِ خلافت کا اصل نشانہ سامراجی طاقتیں تھیں، خلافت کا مسئلہ محض علامتی تھا۔ پان اسلامزم ایک مذہبی تصور تھا، سیاسی نہیں۔ اس کا بنیادی مقصد مسلم ممالک میں مذہبی معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کرنا تھا اور جہاں جہاں مسلم و غیر مسلم آبادی مشترک تھی وہاں ان میں اشتراکِ عمل پیدا کرنا اور انقلابی تحریکات کو منظم کرنا تھا تاکہ مغربی سامراج سے زبردست ٹکر لی جاسکے۔ یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہو سکتی کہ تحریکِ خلافت کا مقصد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ اپنے پان اسلامک مزاج کے ساتھ وہ قومی تحریکِ آزادی میں پوری طرح ضم ہو گئی تھی۔ اکثر مقامات پر مقامی کانگریس شاخیں، رضاکار جتھے، کسان سبھاؤں اور ہوم رول لیگ اور ان کی سرگرمیوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ پنجاب میں جس طرح پریم سبھاؤں اور انجمن اسلام نے کام کیا اس سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا ؎

آئی ہیں آسماں سے چل کر وہ قوتیں
جو مسلم و ہنود کو شیر و شکر کریں

یہاں یہ یاد دلانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ کچھ پان اسلامی رہنماؤں نے کابل میں جو جلاوطن حکومت قائم کی تھی اس کے صدر راجہ مہیندر پرتاپ تھے اور ایک کابینہ درجے کے وزیر ڈاکٹر متھرا سنگھ تھے۔

یہ خیال بھی تاریخی اعتبار سے درست نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ بعد میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات تحریک خلافت کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے آرہ (بہار) میں بھیانک فساد ہوا تھا۔ گو شدھی تحریک کے اصل محرکات متعین کرنا بہت مشکل ہے تاہم ہندوستان پہونچتے ہی لارڈ ریڈنگ نے جو کردار ادا کیا اس کا جائزہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس الکشن کا کردار بھی اہم ہے جو سوراجسٹ موتی لال نہرو اور سبرلسٹ مالویہ اور چنتامنی کے درمیان ہوا۔ اس الکشن نے جس طرح ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دیا اس سے متعلق کاغذات ہوم ڈیپارٹمنٹ (پولیٹیکل) میں ۱۹۲۳ء کے بعد سے موجود ہیں اور جن سے لارڈ ریڈنگ کی حکمت عملی پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ پنجاب میں جس حکمتِ عملی کے تحت زمینی اصلاحات کی گئیں وہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت کا بیج بونے کے لئے کافی تھیں۔

مندرجہ بالا مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مقصود ہے کہ تحریک خلافت قومی جنگِ آزادی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ولایتی سامان کا مقاطعہ، ترک موالات اور سامراجی استبداد کے خلاف اتحاد و یک جہتی کا جو دور شروع ہوا وہ تاریخ وطن کا ایک زرّین باب ہے۔ اس دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے وہ بڑے روح پرور تھے اس لئے تحریکِ خلافت سے وابستہ مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کو ایک مذہبی تحریک سے وابستہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا قافلۂ آزادی جن جن مراحل سے گزرا ہر منزل کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اس منزل کا ہر ایک راہی ہماری ستائش و تعظیم کا مستحق ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قومی جہد آزادی کے اس موڑ پر بھی مسلم خواتین نے اپنے بھائیوں

کے دوش بدوش حصّہ لیا۔ تحریک عدم تعاون ہو یا انگورہ فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام خواتین ہر موقع پر پیش پیش رہیں، سودیشی کو عام کیا اور ولایتی کپڑوں میں آگ لگادی، خلافت فنڈ میں روپیوں اور زیور کے ڈھیر لگ گئے ملاحظہ ہو بطور نمونہ ضمیمہ (۱) جس سے پیرانہ سالی کے باوجود بی اماں (والدہ محمد علی) کے طوفانی دوروں، حکومت مخالف تقاریر اور چندے کی فراہمی کی کچھ تفصیلات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ خلافت کے ان چندوں سے گاندھی جی نے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے میں خلافت کے چندوں کا اہم کردار رہا ہے۔

تحریک خلافت کا بہرحال ایک منفی پہلو بھی تھا۔ ۱۹۲۴ء میں جب کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی میں خلافت کا خاتمہ کردیا گیا تو ہندوستانی مسلمان کچھ عرصے کے لئے ششدر رہ گئے اور پھر کچھ عرصے بعد تحریک بھی سرد پڑ گئی۔ لیکن اس نے عوامی اتحاد وسیاسی بیداری کی جو فضا قائم کی اس نے کاروان آزادی کو ایک نئی جہت عطا کی گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں لکھا "اگر میں کوئی اوتار ہوتا اور میں یہ جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصّہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔"

کتاب کا دوسرا باب اُن خواتین کے تذکرے پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریکِ خلافت میں عملاً حصّہ لیا۔ بحیثیت مجموعی یہ سبھی خواتین پردہ نشین تھیں اپنے زمانے کے معاشرتی تناظر میں ان خواتین کا بیدار سیاسی شعور اور قومی سیاسی زندگی میں اُن کی شرکت قابلِ تحسین اور ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھی جس کا تصور بھی آج کے معاشرے میں مشکل سے ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) میں اکبری بیگم جیسی خاتونِ خانہ کے پختہ و بیدار سیاسی شعور کی ایک جھلک۔ قومی سیاست میں خواتین کے اثر و رسوخ کے بارے میں ایک برطانوی افسر سر ہرکورٹ بٹلر نے ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ

کو لکھا تھا کہ علماء اور خواتین ہندوستان میں انتہائی اہم اثرات کے حامل ہیں۔ جب تک اِن دونوں کے بارے میں میری حکمتِ عملی کامیاب ہے مجھے سیاست دانوں کا کوئی خوف نہیں۔"

Butler to Lord Harding Jan. 16th, Butler Papers Mss. Eur. F 116/53/11, India Office Library, London Quoted in separate word by Hanna Papanek & Gail Minault P. 248.

کتاب کے تیسرے باب میں اُن مسلم خواتین کا تذکرہ ہے جو ۱۹۳۰ء کے نزدیک اور اس کے بعد کے زمانے میں براہِ راست گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیرِ اثر قومی محاذ آرائی میں شامل ہوئیں۔ ان خواتین کی اکثریت کالج یا اسکول کی فارغ التحصیل تھی اور یہ انڈین نیشنل کانگریس کے ہمہ جہت مقاصد، ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، دیہی ترقی، تعلیم بالغان، ہری جنوں کی فلاح و بہبود کے تعمیری منصوبے"۔ عوامی رابطہ منصوبہ Mass Contact جیسے کاموں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہیں۔ وہ کھل کر عوامی جلسوں میں شریک ہوئیں، ولایتی کپڑوں اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دیا ان کی اکثریت قید و بند کی صعوبتوں کی تلخ چاشنی سے بھی ناآشنا نہیں ہیں۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا واحد مقصد آزاد و متحدہ ہندوستان کا خواب تھا جو بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ ان خواتین میں سے اکثر نے بعد میں آزاد غیر مذہبی جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

" ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ " کے اس جائزے کو کسی بھی اعتبار سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسی دوسری مسلم خواتین رہی ہوں گی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔ خود جائزے میں جن شخصیتوں کو لیا گیا ہے وہ خاکے بی اماں اور بیگم حسرت موہانی کے علاوہ سبھی نامکمل ہیں۔ کہیں ابتدائی زندگی کے

حالات کا تذکرہ نہیں تو کہیں جنگ آزادی میں شرکت کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہیں اس کی بڑی وجہ مواد کی کمیابی رہی ہے۔ جو حضرات اس سے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے تھے ان میں بہت سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں پُرانے اردو قوم پرست اخبارات ان تفصیلات کی فراہمی میں بہت کچھ معاونت کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو ضمیمے (۳)، (۴)، (۵) میں دی گئی چند اخباری خبریں لیکن افسوس کہ معتبر قوم پرست اردو اخبارات کے فائل ہندوستان میں بہت کم اور نامکمل ہیں، پاکستان میں موجود قوم پرست اخبارات ورسائل کے فائل ایثار و قربانی کی ان داستانوں میں اور بہت سے ناموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو بہرحال ایک مشکل اور طویل کام ہے اور کافی وسائل چاہتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اس نامکمل جائزے کی اشاعت کے بعد علم دوست اور قومی یکجہتی میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور تحریر فرمائیں گے کہ اس میں فلاں اہم شخصیتوں کے ناموں کا اضافہ ضروری تھا۔ یا فلاں خاتون کے متعلق دی گئی معلومات میں اس سے زیادہ اہم واقعات وحالات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور یوں ان بکھری ہوئی کڑیوں میں سے بہت سی کڑیوں کو مربوط کیا جا سکے گا۔ یہ تمام اضافے شکریے کے ساتھ کتاب کے انگریزی مسودے میں شامل کر لئے جائیں گے۔

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی تیاری میں نہ صرف مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا بلکہ بہت سے افراد سے بذریعہ ملاقات نیز بذریعہ خط وکتابت معلومات حاصل کی گئیں۔ کچھ اہم معلومات "جمہور" کلکتہ اور "مدینہ" اخبار بجنور کے چند پرانے فائلوں سے دستیاب ہوئیں علاوہ ازیں Collected works of Mahatma Gandhi کی سبھی جلدوں سے بیش قیمت مواد حاصل ہوا۔

میں جناب پروفیسر نور الحسن صاحب گورنر مغربی بنگال کی انتہائی ممنون

ہوں جنھوں نے اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت فرمائی۔ میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی بھی شکرگزار ہوں جس نے کتاب کی تیاری کے لئے جزوی امدادی رقم مہیا کی اس سلسلے میں جن دیگر حضرات نے مواد کی فراہمی میں معاونت کی ان میں سے چند کے اسمائے گرامی کا خصوصی طور پر تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ شکریے کے دو بول نہ تو اُن کے پُر خلوص تعاون کا بدل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی میرے جذبۂ تشکر کے آئینہ دار ہیں اس کام میں معاونت کے لئے جناب اصغر علی انجینئر ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز بمبئی ڈاکٹر بی این چوپڑا چیف ایڈیٹر فریڈم پروجکٹ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ جناب پروفیسر عرفان حبیب ڈائریکٹر انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، جناب عابد رضا بیدار ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ، جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ، جناب انعام الکبیر، نائب آرکائوسٹ، نیشنل آرکائوز دہلی۔ جناب جے این گھیرا نائب کیپر (MASS) تین مورتی میوزیم لائبریری نئی دہلی، جناب کشن ترویدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگھرالیہ ہریجن آشرم احمد آباد جناب شہاب الدین لائبریرین جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ڈاکٹر کے کے سکسینہ، اسٹیٹ پبلک لائبریری الہ آباد، پروفیسر نورالحسن خاں لائبریرین۔ جناب عشرت علی قریشی نائب لائبریرین، جناب ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری انچارج اردو سیکشن، ایس مقبول حسن اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ہرالٰہی اسسٹنٹ لائبریرین کوچنگ سینٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی سابق ممبر راجیہ سبھا، جناب پروفیسر نذیر احمد پدم شری سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب پروفیسر عتیق صدیقی ڈائریکٹر سرسید اکاڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر شہریار، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مرحوم علی گڑھ، بیگم سکینہ عمار حسن سابق ریڈر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب کوکب قدر ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی۔ سرخ پوش مجاہد آزادی مرحوم خان غازی کابلی اور جناب عبداللطیف اعظمی ذاکر نگر دہلی کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں۔ میں پروفیسر احمد سعید صاحب ایم۔اے۔ او کالج لاہور کی علم دوستی کی خصوصی طور پر معترف ہوں۔ موصوف نے ضمیمہ الف کے لئے اخبار زمیندار کے وہ تراشے مہیا کئے جو میری دسترس سے باہر تھے۔ اس اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں جناب آغا جعفری ریڈر شعبۂ کامرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جو پُرخلوص تعاون مجھے حاصل رہا اس کے لئے میں تہہ دل سے ان کی ممنون ہوں۔ کتابت کے لئے جناب حافظ عتیق احمد صاحب کی جانفشانی، لگن کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے۔ میں اپنے شوہر پروفیسر سمیع الدین شعبۂ کامرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بھی انتہائی شکر گزار ہوں جن کی معاونت کے بغیر اس کام کی تکمیل ناممکن تھی۔

مجھے امید ہے کہ میری اس ناچیز کاوش کو تحریک آزادی میں دلچسپی اور قومی یکجہتی میں اعتقاد رکھنے والے حلقوں میں سراہا جائے گا۔

عابدہ سمیع الدین

ریڈر شعبۂ سیاسیات

ومینس کالج، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۷ر جون ۱۹۹۰ء

بابِ اوّل

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
ایک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

حضرت محل

۱۹۳۷ء میں مجاز مرحوم نے ہندوستان کی نوجوان عورت سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی ؎

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

لیکن ہندوستان کی ایک مایہ ناز دختر حضرت محل اس سے بہت پہلے یہ پرچم اٹھا کر قومی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ چکی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ مادرِ ہند نے طوقِ غلامی اتار پھینکنے کے بعد بھی اپنی اس جیالی بیٹی سے نہ جانے کیوں ایسا تجاہل برتا کہ نہ کبھی برسہا برس کی پڑی تعصب کی گرد جھاڑ کر ان نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کا نام جنگِ آزادی کے پروانوں اور قومی یک جہتی کے متوالوں کی فہرست میں شامل ہو کر نئی نسل کی درسی کتابوں کی زینت بن سکا۔

انیسویں صدی عیسوی کا عہدِ وسطیٰ ہندوستانی تاریخ کا وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب سلطنتِ مغلیہ تیزی سے رو بہ زوال تھی، تاجر کی حیثیت سے آئے ہوئے انگریز کے قدم سرزمینِ ہند پر بحیثیت حکمراں پوری طرح جم چکے تھے۔ ہندوستانی راجے اور مہاراجے اپنی اندرونی ریشہ دوانیوں کے سبب لڑ بھڑ کر اتنا کمزور ہو چکے تھے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے تھے لیکن "اکثر برسے ہوئے بادلوں میں بھی کچھ بجلیاں رہ جاتی ہیں" (نظارہ لکھنؤ بیگم حضرت محل نمبر ۲۶ اگست ۶۲ء)،

بیگم حضرت محل بھی انگریزوں کے لئے ایک ایسی ہی بجلی ثابت ہوئیں جو اس دورِ انحطاط میں قطعی غیر متوقع تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عوام کے سبھی طبقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے طریقِ کار سے سخت نالاں

تھے۔ کمپنی کا حلقۂ تجارت جب بڑھا تو جو نظریات مذہب، عزّت اور دولت کے سلسلے میں عام کیے گئے وہ عوام کے لیے نہ صرف نئے بلکہ قطعی ناقابلِ قبول تھے۔ جنرل بارلی کے وقت میں فوجیوں کے لیے جو نئے قانون بنے وہ ہندو مسلمان دونوں طرح کے فوجیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے والے تھے۔ انھیں کے نتیجے میں ۱۸۰۶ء میں بلور کی لڑائی ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس طرح ریاستوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس سے راجاؤں اور نوابوں میں شدید بے چینی پھیل رہی تھی۔

اعظم گڑھ کے مجاہدین کے ایک خط میں کہا گیا کہ "انگریزوں نے مال گذاری بڑھا کر انھیں برباد کر دیا ہے۔ نیچے درجے کے لوگوں کا دعویٰ کرنے پر بھی انھیں عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا ہے جو باعثِ ذلت ہے۔ تیل، افیون، کپڑے کی تجارت پر مکمل قبضے کے سبب تاجر برباد ہو رہے تھے۔ ملازم پیشہ، دستکار، مولوی، پنڈت سبھی اپنی اپنی پریشانیوں کے سبب سرکار سے خفا تھے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ان ہی بچی کھچی حریت پسند جماعتوں کی انگریزی سامراج سے آخری بھرپور ٹکر تھی جسے سامراجی طاقت نے غدر کا نام دیا۔ قومی آزادی کی اس لڑائی میں ہر طبقے ہر مذہب و ملّت کے افراد شامل تھے انھوں نے وطنِ عزیز کی خاطر بڑی بہادری اور خلوص سے اپنی اپنی جانیں نذر کیں۔

دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے بغاوت کے شعلے بھڑکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

۴ر فروری ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا، اور کمپنی کی فوج ۱۸۰۱ء اور ۱۸۳۷ء کے صلحناموں کو نظر انداز کرتی لکھنؤ میں زبردستی داخل ہو گئی اور معزول واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا تو کچھ عرصے کے لئے تو اودھ کے عوام بھونچکے رہ گئے اور پھر برافروختہ مورخین نے اودھ کے الحاق کو غدر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب مانا ہے۔ سر جان کے الفاظ میں "انگریزوں کے ہاتھوں اس آخری ہندوستانی ریاست کی ضبطی کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اب کون محفوظ رہ سکتا ہے! اگر انگریز سرکار نے اودھ کے نواب جیسے اپنے وفادار دوست اور مددگار کی حکومت

چھین لی جس نے انگریزوں کی ضرورت کے وقت مدد کی تھی تو انگریزوں کے ساتھ وفاداری سے کیا فائدہ؟" (بحوالہ پنڈت سندرلال بسن ستاون اردو ص ۵۵) پہلی بار اودھ کے عوام کو احساس ہوا کہ ان کے علاقے، ان کی عزت و وقار، ان کی زندگی سبھی کچھ غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں بک چکی ہے اودھ میں علماء اور مجاہدینِ اسلام کی منظم جماعت موجود تھی۔ایک سردار آغا مرزا نے جو کمبل پوش کے نام سے بھی مشہور تھے دو سو مجاہدین کے ساتھ محمدی جھنڈا بلند کیا لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے گرفتار ہوئے اور آغا مرزا کے ساتھ چودہ مجاہدین کو پھانسی دیدی گئی۔ اس کے بعد کمپنی کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا۔پورے صوبۂ اودھ میں اشتہار تقسیم کیے گئے، اور ساتھ ہی عوام اور شاہی خاندان سے ہتھیار لینے کی پالیسی بھی عمل میں لائی گئی جس سے عوام اور بالخصوص علماء کے طبقے میں سخت ناراضگی اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

اودھ کے چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تمام افواج کو مچھلی بھون اور ریذیڈنسی میں جس کی تعمیر آصف الدولہ نے گومتی کے کنارے ایک اونچی جگہ پر کی تھی، جمع کر دیا۔باغیوں کی جماعت تیزی سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی مقابلے کے لیے لارنس نے اپنی فوجوں کو شہر سے باہر فیض آباد روڈ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔۳۰ر جون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ سے چھ میل دور چھوٹے سے گاؤں چنہٹ میں باغیوں اور انگریزی افواج کا مقابلہ ہوا۔انگریزوں نے شکست کھائی اور لارنس نے اپنی فوجوں کو ریذیڈنسی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا۔ اور پورا شہر باغیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔انقلابیوں نے مچھلی بھون کے میگزین کو آگ لگا دی اور اس پر مکمل قبضہ کر لیا۔ مچھلی بھون پر قبضے کے بعد لکھنؤ اور گردونواح کی ساری انگریزی طاقت ریذیڈنسی کے حصار میں قلعہ بند ہو کر رہ گئی۔۳۱ر مئی اور ۳۰ر جون کے درمیان صرف اس حصہ کو چھوڑ کر پورا اودھ انگریزی حکومت کے چنگل سے نکل چکا تھا۔

اودھ کی سرحد نیپال سے ملی ہوئی ہے۔سر ہنری لارنس نے خاص سفیر بھیج کر نیپال دربار کے وزیرِ اعظم سپہ سالار جنگ بہادر سے درخواست کی کہ آپ اس مصیبت

میں انگریزوں کی فوج کی مدد کیجیئے۔

جنگ آزادی کے سپاہیوں کو ایک سربراہ کی تلاش تھی جو ان کے حوصلے بلند کرسکے۔ فوجی افسروں نے یکے بعد دیگرے شاہی خاندان کے چند سربرآوردہ افراد سے قیادت کی درخواست کی لیکن وہ ایک حضرت محل کی ذات تھی جس نے اس پُرآشوب زمانے میں قیادت کا بار گراں اپنے کندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا اور ان ہستیوں کی فہرست میں شامل ہوگئیں جن کے ہاتھوں آزادی کے شاندار قلعے کی خشتِ اول رکھی گئی۔

" ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب محمد خاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تختِ واجدی پر متمکن ہوئے۔ شہاب الدین اور سید برکات احمد رسالدار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گزرانی۔ ۲۱ ضرب توپ سلامی کی سر ہوئیں۔ شہر میں غلغلہ مسند نشینی ہوا" (کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ ص ۲۲۶) شہزادے کو محلاتِ شاہی، اکابر فوج اور مدبرین سیاست کے مشورہ کے مطابق تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن چونکہ برجیس قدر کی عمر اس وقت صرف چودہ سال کی تھی (مثنوی حُزنِ اختر تصنیف واجد علی شاہ) اس لیے حضرت محل ان کی مختارِ کل بنیں اور اس طرح ہنگامی حالات کے تحت وہ انتخاب عمل میں آیا جس میں امراء سے زیادہ عوام کو دخل تھا۔ حضرت محل کے دوش بدوش لکھنؤ میں تحریک آزادی کے چلانے والے مولوی احمد اللہ شاہ، آزمودہ جنگ راجہ بینی مادھو سنگھ، راجہ مان سنگھ مدبّر راجہ جیالال جیسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں۔ بھنی سرکار بہ جیسی کی تہہ شناس یہ وہ تمام طاقتیں تھیں جن کا اس وقت اودھ میں دور دورہ تھا اور سوائے انگریزوں کے کوئی ایسا نہ تھا جو اس خود مختاری کا معترف نہ ہو۔ مُغلیہ تاجدار بہادر شاہ نے سفارت قبول کرکے مہر خطاب سے نوازا۔ (قیصر التواریخ ص ۲۴۲) پیشواؤں کے رہبر نانا راؤ نے پہلے وکیل بھیجا پھر خود تشریف لائے۔ گیارہ ضرب توپ سلامی ہوئی، ۱۷ پارچہ خلعت قبول کیا۔ (ایضاً ص ۲۵۰) فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان، جنرل بخت خاں روہیلہ، شفیع اللہ خاں رئیس نجیب آباد، ولی داد خاں رئیس بالا گڑھ، مظہر علی خاں رئیس مرانہ، عنایت اللہ خاں رئیس پیلی بھیت، غلام قادر خاں رئیس شاہجہان پور، بالا راؤ پیشوا اپنے اپنے

علاقے کے رئیس وحاکم یہ وہ افراد تھے جو توسل کے خواستگار بنے اور حسب مراتب سرکار برجیسی نے سب کا خیال کیا۔ (ایضاً) اور یوں ۱۸۵۷ء کے وسط سے جنگِ آزادی کا وہ درخشاں باب شروع ہوا جس نے سرفروشی حُبّ الوطنی ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی ایسی بے مثال یادگاریں چھوڑیں جو نئی نسلوں کے لیے باعثِ افتخار بھی ہیں اور نمونۂ عمل بھی۔

شہر میں منادی ہوئی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ دلی کا حکم برجیس قدر کا۔

دوسرے روز تمام اہلِ وثائق پنشن یافتہ قدیم وجدید درِ دولت پر حاضر ہوئے اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے۔ برجیس قدر کے نام کا سکّہ بھی جاری ہوا۔ حسب ذیل شعر اس پر کندہ تھا ؎

نصاریٰ پہ قہرِ خدائی ہوا
جواں سالِ سلطانِ لکھنؤ ہوا

(انیس فاطمہ بریلوی ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۲۹)

شہزادے کے نام سے مندرجہ ذیل فرمان جاری ہوا۔

فرمانِ برجیس قدر والی اودھ ۱۸۵۷ء

"سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین و دھرم دوسرے عزت و آبرو تیسرے جان اپنی و اپنوں کی چوتھے مال و اسباب۔ یہ چار چیزیں عملداریِ ہندوستان میں بچی رہتی ہیں۔ اس عملداری میں کوئی دین و دھرم کو نہیں ٹوکتا ہے۔ ہر ایک مانس اپنے دین و دھرم پر رہتا ہے۔ عزت و آبرو ہر ایک مانس کی موافق اس کی درد کی رہی ہے۔ اشراف کسی قوم کا ہو سید اور شیخ اور مغل اور پٹھان مسلمانوں میں اور برہمن اور چھتری اور ویش اور کایستھ ہندو موافق اپنے اپنے رتبہ، عزت و آبرو رکھتے ہیں۔ کوئی پاجی جیسے چوہڑے

چمار اور دھانک اور پاسی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ اور کسی اشراف اور پاجی کی اِس عمل داری میں جان نہیں ماری جاتی اور کسی کا مال و اسباب بھی بغیر کسی جرم اور بڑے باپ کے چھینا نہیں جاتا اور انگریز یہ لوگ ان چار چیزوں کے بیری ہیں دین اور دھرم ہندو مسلمان سب کا کھونا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ سب لوگ کرسچن ہوں، نصرانی بن جائیں۔ ان کے عمل سے ہزاروں آدمی کرسچن ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ عزّت و آبرو تمام اشراف کی اور چوہڑے چماروں کی ان کے نزدیک برابر ہے بلکہ نواب اور راجہ کو کھنچوا بلاتے ہیں اور بے عزّت کرتے ہیں جہاں جاتے ہیں وہاں عزت دار لوگوں کو پھانسی دیتے ہیں اور اُن کے زن و بچے کو مار ڈالتے ہیں اور عورتوں سے ان کی فوج کے لوگ بُرا کام کر کے سب کو بے حرمت کرتے ہیں اور سب مال و اسباب سب لوگوں کا گھروں کو کھود کر سب لے لیتے ہیں۔ کچھ نہیں چھوڑتے۔ بنیئے مہاجنوں کو جان سے نہیں مارتے ان کا مال لے کر اور ان کی عورتوں کو بے عزّت کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہاں کے سب لوگوں سے ہتھیار لے لیتے ہیں جب وہ نہتے ہو جاتے ہیں تو جس کو چاہتے ہیں پھانسی سے یا گولی یا توپ سے باندھ کر مار ڈالتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بیدم کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بے عزّت کرتے ہیں۔ بعض جگہ یہ فریب کرتے ہیں کہ زمینداروں سے وعدہ پیسہ معاف کرنے کا کرتے ہیں۔ یا جمع میں تخفیف دیتے ہیں اس مطلب سے کہ جب عملداری خوب بیٹھ جائے گی اور قابو میں سب آجائیں گے پھر جو چاہیں گے ان کا حال کریں گے، یا کرسچین کر لیں گے یا پھانسی دیں گے یا بے عزّت کریں گے۔ بعض زمیندار احمق ان کے فریب میں آجاتے ہیں اور جو چترا ور ہوشیار ہیں وہ فریب نہیں کھاتے ہیں۔ اس واسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین دھرم اور عزّت و آبرو ناموس و جان اپنی و اپنے لوگوں کی اور اپنے مال و اسباب کا جس کو منظور ہو وہ انگریزوں سے لڑنے پر بالاتفاق فوج سرکار کے مستعد رہے اور ہرگز ان کے فریب میں نہ آئے۔ سرکار سے ان کی پرورش اور تخفیف ہو گی۔"

(بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی، جنگِ آزادی، اٹھارہ سو ستاون ص ۵۵۶-۵۵۷
ہندی وار دو میں فرمان بجنسہٖ یہی ہے)

حضرت محل نے بار قیادت سنبھالتے ہی بھرتی کا اعلان کیا۔ تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری کیے کہ "ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرنگ لازم ہے باہم شریک ہو کر باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کردو۔ جوانکو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ (قیصر التواریخ۔ ص ۲۲۹)

تمام امور سلطنت کو حضرت محل ایک مشاورتی کمیٹی کی رائے سے طے کرتیں جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ غدر کے زمانہ میں ان کا قیام چولکھی میں تھا اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا (عبدالحلیم شرر۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۱۴۳) مجمع عام میں اور محاذ جنگ پر تلوار ہاتھ میں لیے اپنے پرجوش الفاظ سے وہ عوام اور فوج کے دلوں میں قربانی، حب الوطنی اور آزادی کا جوش بھر دیتی تھیں اور دوران جنگ فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔ فوجی سرداروں کی ایک میٹنگ میں انھوں نے کہا تھا" دلی کی عظیم طاقتور سلطنت نے بڑے امید افزا وعدے کیے تھے اور دہلی سے جو مراسلات لکھنؤ پہنچے تھے وہ میرے دل میں خوشی کی لہریں دوڑا دیتے تھے لیکن کتنی جلد بادشاہ کو معزول کر دیا گیا۔ سکھوں اور جاٹوں کو انگریزوں نے خرید لیا ہے اور مواصلات کا سلسلہ کاٹ دیا ہے ۔ نانا فرنویس کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور لکھنؤ کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیئے؟ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ لکھنؤ میں پوری فوج موجود ہے لیکن عزم و ولولے سے خالی ہے۔ اگر فوج میں جانبازی کا عزم اور حب الوطنی کا ولولہ موجود ہے تو وہ عالم باغ پر حملہ کیوں نہیں کرتی ؟ کیا فوج اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ برطانوی فوج کو مزید کمک پہنچ جائے اور وہ لکھنؤ کا محاصرہ کرلے۔ مجھے جواب دو تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

(CORNEGY'S INTELLIGENCE FOR DEPT, Secret Branch, 26th February 1858 No.223 News of 22nd December 1857, National Archives New Delhi)

حضرت محل سپاہیوں کو حوصلے سے زیادہ انعام دیتیں۔ معرکہ عالم باغ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلے میں علاوہ خلعت، رومال اور دوشالے کے "فرزند خاص" کا خطاب اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور کہا کہ

بعد فتح کے بہت سارو پیہ اور جاگیر دے کر خوش کرونگی (قیصر التواریخ ص ۲۶۷)

انگریزوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کے تحت انھوں نے لکھنؤ شہر کے چاروں طرف دیوار بنانے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ منظور کیا۔ جب انھیں علم ہوا کہ نیپال کے رانا جنگ بہادر کو بعوض گورکھپور اور اودھ کے کچھ حصّوں کے خرید لیا گیا ہے تو انھوں نے فوراً رانا کو اپنی حمایت کے بدلے میں گورکھپور، اعظم گڑھ، آرہ، چھپرا اور صوبہ بنارس کی پیش کش کی۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی سے ان کے جنگی تدبّر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے انھوں نے انڈین رجمنٹ کے ان افسروں سے بھی رابطہ قائم کیا جو کانپور کی فوج میں انگریزوں کی طرف سے شریک تھے اور اُن سے یہ طے کیا کہ پہلے وہ ہوائی فائر کریں گے اور پھر اچانک اُن کا رُخ انگریزوں کی طرف موڑ دیں گے"

—S.N.Chanda
(Untold Stories, P. 11)

امرت لال ناگر لکھتے ہیں کہ "بیگم حضرت محل نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کا ایک فوجی گروہ (سنگھٹن) تیار کیا تھا۔ محلوں کی باندیاں ان کی نگرانی میں قواعد کرتی تھیں انھیں عورتوں نے جاسوس عورتوں کا بھی ایک گروہ تیار کیا تھا۔ اس طرح اس آپسی نفاق کے مایوس کن حالات میں بھی ایک ایک فرد کے دل میں بغاوت کا جذبہ تقریباً پونے دو برس تک اودھ میں برقرار رکھنا بیگم ہی کا کام تھا"

(امرت لال ناگر۔ غدر کے پھول ص۔ ۲۶۰)

" حضرت محل کے تدبّر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز ممّو خاں اور احمد اللہ شاہ کے حسنِ تدبیر نے انقلابی تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی کے سبب طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا وہ یکدم رخصت ہو گیا، جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بیکار ہو گئے تھے وہ صیقل کئے گئے۔ ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج کر تخ بستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی (۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۳۱)

یہ وہ وقت تھا کہ پورا اودھ کوہ آتش فشاں شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا اور عوام باوجود بے سروسامانی اور تہی دستی کے ایک تہار و باجبروت طاقت کے مقابلے میں سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔ وہ اضلاعِ اودھ سے لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے

وہ اِس تخت پر اپنی جان نثار کرنے آئے تھے جس سے ان کو بدگمان بنایا جاتا تھا۔ حاکم وقت سے ایسی عقیدت اِس زمانے میں دلی کے بعد لکھنؤ میں ہی ملتی ہے جو بقول مولوی عبدالحلیم شرر ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ گاؤں اور قصبوں تک کی یہ حالت تھی کہ "قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں جس کا رقبہ صرف پون بیل تھا لڑنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور گاؤں کے تمام گھروں میں ریتیاں بنی ہوئی تھیں۔

(مولوی ذکاراللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۶۲)

انھیں مجاہدین کی اَن تھک کوششوں کے نتیجہ میں صرف گیارہ دن کے اندر انگریزی عمل داری کے سارے تانے بانے توڑ کر اودھ ایک آزاد ملک بن گیا۔ شمس العلما مولوی ذکاراللہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ صرف گیارہ روز کے اندر اودھ کے تمام اضلاع میں حکومت برطانیہ کا کوئی حاکم موجود نہ تھا اور انگریزی عمل داری محض خواب معلوم ہوتی تھی (ایضاً ص ۸۱۸) منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہوگا۔ مسلمانوں نے قرآن شریف اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کرکے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔

(قیصرالتواریخ؛ ص ۲۳۲)

سرہنری لارنس نے لفٹنٹ گورنر کو لکھا کہ "سارے اضلاع ہمارے ہاتھ سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جارہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہورہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کرلیا ہے" (عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۱۶)

بیلی گارد پر پہلا حملہ مولوی احمداللہ کی سپہ سالاری میں ہوا۔ مولوی صاحب نے فوج میں اعلان کیا "بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو، تنخواہ بھی وہی دیں گی" قیصرالتواریخ ص ۲۶۰) حملے کے روز بیگم کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے" (عبدالحلیم شرر؛ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ ص ۱۳۸)

دلی کی شکست نے تازیانے کا کام کیا اور حملوں کا زور اور بڑھ گیا۔ ایک اشتہار شایع ہوا۔ "سب خاص و عام بگوش ہوش سنیں کہ ان کافروں نے جب دلی کو ختم کیا۔ وہاں کسی کو

جیتا نہ چھوڑا۔ اسی طرح تمہارے بال بچے مار ڈالے جائینگے۔ مقام غیرت ہے کہ آنکھوں کے سامنے عورت اور بچے مارے جائیں یا ذلیل ہوں۔ اے بہادر و یہ گورے ۵۰۰ سے زیادہ نہیں۔ اگر انھیں مار لو تو تمام عمر چین سے رہیں گے۔ (قیصر التواریخ ص ۲۶۴) ۵ ستمبر جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارد پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ مولوی ذکاء اللہ کے بقول اس کی سب سے بڑی خندق اڑ گئی، باغی زینے لے کے آگے بڑھے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے۔ انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے رات کو گھنٹوں شور و غل مچاتے۔ (عروج سلطنت انگلشیہ ص ۱۸۵)

ایک روز علی محمد خاں نے علم اٹھایا اور قرآن شریف کو مثل جنگ صفین اس میں باندھا اور کلمات یاس کہتے رہے (قیصر التواریخ ص۔ ۲۸۰) ایک فقیر منش بزرگ جنھیں عوام عقیدت میں شاہ جی کہتے تھے۔ ان کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ یکہ و تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر بیلی گارد پر اشعار ذیل پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے ؎

در میانِ ایں و آں گردد بسے جنگ عظیم

قوم عیسیٰ را شکستِ بے گماں پیدا شود (ایضاً ص ۲۰۵)

انھیں حملوں میں سر ہنری لارنس انقلابیوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔ لارڈ کیننگ تک کی رائے میں دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو لیکن اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت ہی سے دوچار تھی۔" (Canning Secret Committee of Court of Directors 17th June, 1858 Freedom Struggle in U.P. P. 353)

انگریز اپنی حفاظت کے لیے ریذیڈنسی میں مقیم تھے لیکن ہندوستانی سپاہی باوجود جان توڑ کوشش کے اس پر قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ ریذیڈنسی محاصرہ میں تھی ایک بیان کے مطابق انقلابیوں نے سینتیس[۳۷] بار اسے اڑانے کی کوشش کی مگر انگریزوں کے سکھ ساتھیوں نے تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔ پھر نا مناسب نہ فوج کا تھا نہ مالی بندوبست کا۔

"فیروز شاہ ناظم بخت کے لڑکے اور فرخ سیر بادشاہ دہلی کے نواسے، نانا راؤ اور جنرل بخت خاں بھی اس وقت آ گئے تھے اور حضرت محل کے یہاں بطور مہمانِ خاص مقیم تھے ان ہر سہ فدائین کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔"

کانپور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی بھی لکھنؤ آئے۔ حضرت محل نے شیش محل میں اتارا۔ گیارہ ضرب توپ کی سلامی ہوئی، ۲۵ ہزار دعوت کے دو شالے، رومال اور خلعت اس کے علاوہ عطا ہوئے" (انیس فاطمہ ۱۸۵۷ء کے ہیروص: ۲۵-۳۶)

اگست میں لڑائی کا زور پھر بندھ گیا کیونکہ کانپور سے شکست کھا کر فوج کی کافی تعداد خداحسین رسالدار کی معیت میں لکھنؤ آگئی تھی۔

اِدھر دوسری طرف ہیولاک زبردست فوج لے کر کانپور سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اودھ کی زمین پر قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ لکھنؤ تک پہنچنا آسان نہیں۔ انقلابی کیمپ میں باغی فوجیں اور تعلقدار دور دور سے آکر جمع ہو رہے تھے۔ ۲۹ر جولائی کو اُناؤ اور بشیرت گنج کے زبردست معرکوں میں پسپائی کے بعد اس نے کلکتہ اوٹرم کے پاس مدد کے لیے پیغام بھیجا (سرجیمس اوٹرم ایران سے واپسی پر کلکتہ پہنچا تھا اور اودھ کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا) ہیولاک کے پیغام پر اوٹرم اپنی فوج کے ساتھ ۱۶ر ستمبر کو کانپور پہنچا اور ۲۰ ستمبر کو لکھنؤ کی طرف کوچ کیا۔ ۲۳ر ستمبر کو کمپنی کی مشترک فوجیں جس میں ایک رجمنٹ سکھوں کی بھی تھی لکھنؤ سے چھ میل دور کانپور روڈ پر واقع عالم باغ جو اس وقت شہر سے باہر کا علاقہ تھا پہونچیں۔ حضرت محل سے ان برطانوی افواج کا مقابلہ پہلے عالم باغ ہی میں ہوا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی بہت سے انگریز فوجی افسر مارے گئے۔ حضرت محل ایک گرانڈیل ہاتھی پر سوار فوج کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ سرفراز بیگم لکھنوی نے کلکتے کی اختر محل کو اپنے خط میں لکھا تھا "میں نہیں سمجھتی کہ حضرت محل ایسی آفت کا پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں سے مقابلہ کرتی ہے ..... اور اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"
(بیگماتِ اودھ کے خطوط) سب سے خوفناک جنگ چارباغ کے پُل پر ہوئی لیکن بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی ہندوستانیوں کو شکست ہوئی جہاں تک شجاعت و ہمت کا سوال ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

زبردست جانی نقصان کے بعد انگریز ریذیڈنسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے
اور نو دن کی لگاتار جنگ کے بعد ریذیڈنسی کی فوجوں سے مل گئے شہر ابھی انقلابیوں
کے قبضہ میں تھا۔ ریذیڈنسی کا محاصرہ جاری تھا اب ہیولاک بھی ریذیڈنسی میں قید ہو گیا تھا۔
کمپنی کی فوجوں کا نیا کمانڈر انچیف سر کالن کیمپ بل مقرر ہوا۔ کلکتہ میں مکمل تیاری کے
بعد ریذیڈنسی کا محاصرہ توڑنے کی خاطر ۲ نومبر کو کانپور پہنچا اور ۹ نومبر کو عالم باغ میں
جہاں انگریزی فوجوں کا پڑاؤ تھا اُن سے آملا۔ ریذیڈنسی کا ایک انگریز ہندوستانی بھیس میں
ایک پرانے وفادار قنوجی لال کے ہمراہ نکل کر انگریزی کیمپ میں آگیا۔ اس انگریز کو بیش قرار نقد کے علاوہ
وکٹوریہ کراس دیا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ دیا گیا۔ قنوجی لال کو غداری کا انعام صرف تحصیلداری اور
5000 ہزار چاندی کے ٹکڑے دیئے۔ (سین: اٹھارہ سو ستاون شائع کردہ حکومت ہند ص ۲۲۸)

ان لوگوں کی رہنمائی میں سر کولن کیمبل ۱۲ نومبر کو روانہ ہوا۔ سکندر باغ، دل خوش باغ شاہ نجف اور
موتی محل کی بھیانک خونریزی کے بعد انگریزی فوجیں ریذیڈنسی میں داخل ہو سکیں۔ ان معرکوں میں مرد عمل کے
دوش بدوش کئی عورتیں بھی مصروف جنگ تھیں فوربس مچل نے ایک عورت کا ذکر کیا ہے جس نے ایک پیپل کے
درخت سے بے شمار انگریز سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا (ایضاً ص ۲۴۲)

لارڈ کیننگ کا اصرار تھا کہ لکھنؤ جس قدر جلد ممکن ہو سکے فتح کر لیا جانا ضروری ہے
لارڈ کیننگ نے ۲۰ دسمبر کو لن کیمبل کو لکھا کہ "بالفعل فوراً اودھ کو لے لینا چاہیئے اور سب
جگہوں سے زیادہ باغی وہاں جمع ہیں۔ اس کام میں اودھ کے خاندان کی طرف
سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں کہ آیا ہم میں یہ قدرت ہے یا نہیں کہ اس پر اپنا تسلط قائم
رکھ سکتے ہیں۔ اس کی مثال دہلی کی سی ہے کہ لکھنؤ کا دوبارہ فتح نہ کرنا ہمارے حق میں
ایسا ہی ہے جیسا کہ دہلی سے واپس چلے آنا ہوتا۔" (تاریخ عروج عہد انگلشیہ تاریخ
بغاوت ہند حصہ سوم ص ۴۴) ادھر برطانوی افواج کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ایک
زبردست گورکھا فوج بھی سپہ سالار جنگ بہادر کے ماتحت لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی
تھی۔ ۲۵ فروری ۱۸۵۸ء حضرت محل خود برجیس قدر کو لے کر میدان جنگ میں آئیں۔
اس سے جوش و خروش میں اضافہ تو ہوا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء گورکھا

فوج بھی انگریزی لشکر سے آکر مل گئی اور انگریزی تلواریں لکھنؤ پر مکمل اقتدار کے لیے بے نیام ہو گئیں۔ ادھر کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں کے سائے میں اس اودھ کو ختم کرنے کے درپے ہو رہے تھے جہاں بقول گورنر جنرل سب سے زیادہ باغی جمع تھے۔ ادھر لکھنؤ کا بچہ بچہ سر سے کفن باندھ کر ملک و قوم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں "ستر اسی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت، مذہبی دیوانگی نے جوان مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔" (ایضاً ص ۵۹) بیگم حضرت محل ناکامیوں سے دل شکستہ ہونا نہیں جانتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس فوج نے ان پر یورش کی تھی تعداد و اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج کبھی صف آرا نہیں کی تھی۔ وہ ایک مقام سے ہٹ کر دوسرے مقام پر مورچہ بندی کرتی رہیں۔ ان کی کوٹھی چوکھی پر سخت لڑائی ہوئی۔ قریب تھا کہ چوکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اسی وقت خان علی خاں ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آ گئے۔ خوب رن پڑا۔ چمن گھون کی نہر جاری تھی پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑھ ماری۔ سینکڑوں گر پڑے خان علی خاں بھی زخمی ہوئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ حملہ کا رخ چوکھی کی جانب ہے حضرت محل کسی طرح بھی چوکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ (قیصر التواریخ ص ۳۲۳) بقول ذکاء اللہ بیگم کی کوٹھی پر جیسی سخت لڑائی ہوئی ایسی کوئی اور لڑائی اس محاصرہ میں نہیں ہوئی۔ آٹھ نو گھنٹے تک گولہ زنی رہی تو ایک دراڑ پڑی (تاریخ بغاوت ہند حصہ سوم ص ٦) بالآخر نے پیر نے یورش کر کے اسے لے لیا حملہ آوروں کے بیان کے مطابق ایک ایک انچ زمین پر سخت لڑائی ہوئی اور اہم مقامات بیگم کوٹھی سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ وغیرہ پر سپاہیوں کی لاشوں سے گذر کر قبضہ ہو سکا (مرزا علی اظہر برلاس: تاریخی شہ پارے ص ۱۴۴) سکندر باغ کے ایک مقام پر زخمیوں اور مقتولین کا بھیانک ڈھیر تقریباً ایک گز یا اس سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ (تاریخی شہ پارے ص ۲۹۴) انگریزی سپہ سالار کولن کیمبل کے الفاظ میں "اس سے زیادہ بہادری کہیں نہیں دیکھی گئی" (علی گڑھ میگزین ۲۷-۱۹۲۶ء ص ۲۸۳)

لکھنؤ کے انقلابی عوام دس دن تک لڑتے رہے شہر کے چپے چپے پر شہیدانِ وطن کے پاک خون کی گلکاریاں ہوگئیں۔ دشمن کی متحدہ تازہ دم اور نئے ہتھیاروں سے لیس فوجیں بڑھتی جارہی تھیں (خورشید مصطفےٰ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۹۱) اسی دوران ایک صبح کو اشارۃً واجد علی نے حضرت محل کو بہت سمجھایا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا لیکن بنگال اور دہلی کی طرح ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اودھ میں بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پسپائی کے آثار دیکھ کر ہزارہا ملازم نمک حرام ہوگئے تھے۔ مہاراجہ بال کرشن انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ایماء پر بہت سے تعلقداروں کا تحصیلِ زر کے بہانے مع افواج کے چلے جانے سے تحریک میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ انگریزی افواج جدید اسلحہ اور توپ خانوں سے لیس تھیں اور ان وجوہات کے سبب جنگ نے اب جارحانہ انداز کے بدلے مدافعانہ صورت اختیار کرلی تھی۔ اس دوران جنگ بہادر وزیراعظم نیپال نے کالن کیمپبل اور جنرل اوٹرم کا ساتھ دے کر جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ آخر ۱۹ر مارچ ۱۸۵۸ء میں موتی باغ کی شکست کے بعد لکھنؤ کی لڑائی بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ آخری جنگ عیش باغ پر ہوئی۔

دورانِ جنگ حضرت محل کی شخصیت میں کچھ عجیب وغریب کشش پیدا ہوگئی تھی ان کی غیر معمولی شجاعت و مستعدی کا تذکرہ کرتے ہوئے مارشمین نے اعتراف کیا "لکھنؤ میں باغیوں نے جو مقاومت کی وہ ایسی سخت تھی کہ کبھی انگریزی فوج کو سابقہ نہیں پڑا تھا حتی کہ دہلی میں بھی ایسی سخت مقاومت نہیں کی گئی۔ باغیوں کا جوش بیگم اودھ کی وجہ سے بڑھا ہوا تھا جو غیر معمولی مستعد اور سرگرم عورت تھی اور تمام بغاوت کی روحِ رواں رہی۔ پورے دس دن تک لڑائی ہوتی رہی جب کہیں جاکر اس مستحکم شہر کی تسخیر مکمل ہوئی (مارشمین ہسٹری آف انڈیا ص ۵۱۷)

حضرت محل نے قریب دس ماہ بے جگری سے انگریزی افواج کا مقابلہ کیا۔ (طفیل منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۹۱) اور جنگِ آزادی کی تاریخ میں ایک روایت بن گئیں۔

دورانِ جنگ جنرل اوٹرم نے صلح کی کئی شرطیں پیش کیں جنھیں غیور ملکہ

بے نیازی سے ٹھکراتی رہی۔ جنرل اوٹرم کی پہلی پیشکش یہ تھی کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافق عہد دولت نواب شجاع الدولہ ملے گا بشرطیکہ لڑائی موقوف کردی جائے اور ان باغیوں کو نکالنے کی تدبیر کریں گے اور مسافران کلکتہ اور لندن کو بھی بلوادیں گے۔ حضرت محل کو اپنی فوج کی کامیابی پر اعتماد تھا۔ جنرل اوٹرم کی پیش کش کو اس قابل نہ سمجھا کہ جواب دیتیں۔ یا بہ الفاظ صاحب قیصر التواریخ۔ یہاں خود آہنی غلط بات کب سنتے تھے۔ بعض نے جانا اب یہ مغلوب ہوچکے ہیں جب یہ آہنی بات کرتے ہیں خدا نے چاہا تو ہم انھیں نکالے دیتے ہیں (قیصر التواریخ۔ ج ۲ ص ۴۴۴) اوٹرم کا دوسرا صلح نامہ حضرت محل کو اس وقت ملا جب وہ قیصر باغ سے شکست کھا کر غلام رضا کے مکان پر اپنی لپا ندہ طاقت جمع کررہی تھیں۔ اوٹرم کی شرط یہ تھی، ہم زمانۂ واجد علی شاہ کا بدستور تمہارا ملک دیں گے جنگ سے دست بردار ہوجائیے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس شرط کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلحنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ (ایضاً)

اوٹرم کو اپنی کامیابی کا جتنا یقین بڑھتا گیا صلح کی شرطیں بھی اتنی عامیانہ ہوتی گئیں اس کی تیسری اور آخری پیش کش جو حضرت محل کو نواب شرف الدولہ کے مکان پر ملی یہ تھی کہ صرف ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ ملے گا۔ (ایضاً) جس غیور دختر وطن نے عہد شجاع الدولہ و زمانۂ واجد علی شاہ کا ملک انگریزوں کا عطیہ سمجھ کر لینے سے انکار کردیا ہو وہ ان چند ہزار روپیوں کی کیا حقیقت سمجھتی۔

جس وقت انگریزوں کی کامراں فوجیں لکھنؤ میں داخل ہوئیں "شہر لکھنؤ شہر خموشاں کا منظر پیش کرتا تھا۔ ہر چہار طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ گلیوں سے کتے شہر کے معلوم نہیں کہاں چھپ رہے تھے، کوئی پرندہ آسمان پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہر کوچے سے وحشت برستی تھی اور خون ناحق کی بو آتی تھی اور عورات پردہ نشین کو پردے کا کب ہوش رہا تھا، وارث مسلح آگے عورات چادر اوڑھے پیچھے چلی جاتی تھیں۔"

(قیصر التواریخ ج ۲۔ ص ۴۴۶)

لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے جس طرح کھلے عام لوٹ، قتل عام اور قتل سے پہلے جس طرح کی اذیت لوگوں کو پہنچائی اس کی کئی مثالیں رسل نے دی ہیں مثلاً "کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور ان پر رحم کر کے انھیں مار ڈالا گیا لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر رتیلے میدان میں لایا گیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا۔ ایک سہولت کی جگہ پر لایا گیا۔ وہاں اس کو لٹایا گیا کچھ انگریز سپاہیوں نے اُس کے منہ اور جسم میں سنگین بھونک کر اسے لٹائے رکھا۔ دوسرے لاش کو جلانے کے لیے لکڑی لے آئے جب سب تیار ہو گیا تو اسے زندہ بھون دیا گیا۔ اس کام کو کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے لیکن کسی نے مداخلت نہ کی۔ اس دوزخی ظلم و ستم کی خوفناکی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب اس بدقسمت ستم زدہ نے ادھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی۔ یکایک کوشش کر کے وہ چتا سے کود پڑا۔ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ دور دوڑا پھر پکڑ لیا گیا، واپس لایا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہو گیا سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا۔

(رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز کی ڈائری ص ۲، ۳ بحوالہ سندر لال 'سن ستاون' ص ۱۹۳)

اس کے برخلاف انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لکھنؤ میں انقلابیوں کا پلّہ بھاری تھا کچھ انگریز مرد عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے۔ لیکن چھ ماہ تک انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا جس وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر بے قصور لوگوں کا قتل عام شروع کیا کچھ جوشیلے انقلابیوں نے محل میں جا کر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ بیگم نے سات یا آٹھ انگریزوں کو ان کے حوالے کر دیا جنھیں فوراً گولی سے اڑا دیا گیا۔ لیکن عورتوں کے بارے میں بیگم نے ان لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ اقدام عورتوں کی شان اور آن کو بڑھانے والا تھا۔

(چارلس بال۔ انڈین میوٹنی بحوالہ سندر لال، سن ستاون۔ ص، ۱۹۴)

لکھنؤ کی فتح کے بعد انگریزوں نے حضرت محل کو دشمن نمبر ایک ٹھہرایا۔ آخرکار

۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو انھیں لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا، قریب شام انتہائی دل شکستہ نا کر
عالم باغ سے پینس میں سواری نکلی، نواب محمد خاں اور احمد حسین کے علاوہ ایک لاکھ کا
مجمع بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے ان کے بعد بھی لڑائی جاری رکھ کر برجیس قدر
اور حضرت محل کیلئے آزادی کے ساتھ چلے جانے کا موقع پیدا کر دیا تھا۔" (مشرقی تمدن کا
آخری نمونہ، ص ۱۲۹) صبح کو بھراؤں پہونچیں۔ اب اس وقت بھی اگرچہ سوار انگریزی
پہونچتے بے تکلف گرفتار کر لیتے اس کا سبب نہیں معلوم، حکام نے کیوں اس
کا خیال نہیں کیا اور ایسی خبر عظیم سے کس وجہ سے غفلت کی۔ راجہ مردان سنگھ زمیندار
نے ایک چوپال رہنے کو دیا اور خود حاضر نہ ہوا۔ خلاصہ یاری ہو کر خیرآباد پہونچیں، بہر شاد
ناظم قسمت اول خیرآباد، مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد ناظم بسواں باڑی جو سندیلہ
میں لڑتا رہا اور بڑی نمود سے مارا گیا۔ بہ محبت سنتے خبر آمد جناب عالیہ تین کوس سے
استقبال کیا۔ بڑی دھوم نقارہ و شانِ جلوس سواری سے مرزا بندہ علی بیگ کے امام
باڑے میں آتارا۔ راہ میں فقراء کو دو ہزار خیرات کئے۔ جب داخل شہر ہوئیں تو بیس
سلامی کی چلیں۔ وہاں صلاح یہ ٹھہری کہ بریلی کو چلیں، اکثروں کا رجحان یہ ہوا کہ ابھی اپنے
ممالکِ محروسہ میں توقف مناسب ہے جب اور گذرگاہ نہ رہے گی اور کہیں پناہ نہ
ملے گی ملکِ غیر میں مجبوری چلے جائیں گے۔ بعد اس کے محمود آباد راجہ نواب علی خاں
کے گھر میں مہمان ہوئیں پھر بھٹولی راجہ منوا کی گڑھی میں رہیں۔ وہاں وکیل راجہ
ہردت سنگھ بیواتی حاضر ہوا۔ عرض کی کہ ہم آپ کے بہرحال شریک و فرمانبرداری میں ہیں
احتمال راجہ منوا کا انگریزوں سے سازکا ہے۔ پھر وہاں سے وکیل کے ساتھ داخل
بونڈی ہوئیں جو ضلع بہرائچ میں تھا چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے اندرونی اور
بیرونی مع سپاہ جنگی سب جمع ہو گئے اور زمین قدیم و جدید مع بیگمات و محلات اور
امراء و رعایا وغیرہ آ پہنچے اور جتنے اہل حرفہ تھے اور اہلِ بازار مع اجناس از خود جمع
ہوئے مثل لکھنؤ چوک آباد ہو گیا۔ بونڈی کی چہل پہل اور بازاروں کی رونق لکھنؤ کی
یاد تازہ کرتی تھی۔" (قیصر التواریخ ص ۳۳۶ تا ۳۳۸) اس کے سوا زمینداروں تعلقداروں

نے بے طلب زرِ تحصیل بھیجنا شروع کیا۔ اندازے کے مطابق اس وقت بھی ان کے ساتھ پندرہ سولہ ہزار فرمانبردار تھے۔ یہ وہ زمیندار تھے جنھوں نے انگریزوں پر کئی حملوں کو منظم کیا تھا غدر کی پوری تاریخ میں یہ معرکے انگریزوں کے لیے سخت ترین تھے۔ حضرت محل کئی معرکے گرم کرنے کے بعد جب بونڈی میں اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کر رہی تھیں اس اثنا میں برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم کرکے ہندوستان کا نظم ونسق براہِ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا۔ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو بمقام الہ آباد ایک پُرشکوہ دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا فرمان پڑھا گیا حضرت محل اعلان کی خامیوں پر ہندوستانی لیڈروں کی خاموشی برداشت نہ کرسکیں۔ اپنی فرودگاہ بونڈی سے انھوں نے اس فرمان کو چیلنج کیا اور بتایا کہ اس میں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بیان کے تیکھے پن سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی یہ دخترِ عظیم جنگ ضرور ہار گئی تھی لیکن ہمت نہیں۔ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانے والی ملکہ کی فراست کے نکتے بھی ملاحظہ ہوں۔

"چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے یہ خبر مشہور کر رکھی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کی خطائیں اور جرم بخش دیئے ہیں۔ ہماری نظر میں ایسا ہونا نہایت تعجب خیز ہے۔ کیونکہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریزوں نے کسی کا قصور چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا کبھی معاف کیا ہو، اور اس میں ایسی سختی برتی گئی ہے کہ اگر کبھی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی لاعلمی یا بے احتیاطی سے ہو جائے تو وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔

پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا جو اعلان ہمارے سامنے آیا ہے بالکل صاف ہے اور چونکہ کچھ نہ کچھ آدمی اس اعلان کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم ہمیشہ سے حکومت کرتے آئے اور اودھ کے لوگوں کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر موجودہ فرمان جاری کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر پہلے اعلان کی خاص خاص باتوں کا اصلی بھید کھل جائے اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا ملک جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا

اب ملکہ نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا
ہماری حق شناس رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے
انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں سب جیوں کی تیوں بنی رہیں گی۔
تو پھر یہ نئی بات کونسی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہوا اور وہ اس پر بھروسہ کر سکیں۔
اس اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیمان کیے تھے ملکہ انھیں
منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس چال کو غور سے دیکھیں، کمپنی نے سارے ہندوستان
پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی، کمپنی نے بھرت پور
کے راجہ کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا، لاہور کے راجہ کو لندن لے گئے اور پھر
کبھی اسے ہندوستان لوٹنے نہیں دیا۔ نواب شمس الدین خاں کو پہلے تو انھوں نے پھانسی
پر لٹکایا اور پھر دوسری طرف اظہار افسوس کیا۔ پیشوا کو انھوں نے پونا اور ستارہ سے نکال
دیا اور زندگی بھر کے لئے بٹھور میں قید کیا۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ ان کی عیاری کوئی ڈھکی
چھپی بات نہیں۔ بنارس کے راجہ کو انھوں نے آگرے میں قید کر دیا، گوالیار کی ریاست کا
انتظام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہاں انگریزی رسوم کو رواج دیا، بہار
بنگال اور اُڑیسہ کے راجاؤں کا انھوں نے نام و نشان تک نہیں چھوڑا۔ فرخ آباد کے رئیس
کو برائے نام وظیفہ دیا اور اس کی ریاست ہضم کر گئے، شاہجہاں پور، بریلی، اعظم گڑھ،
جون پور، گورکھپور، اٹاوہ، الہ آباد، فتح پور وغیرہ جو ہماری قدیم مملکت میں شامل تھے انھوں
نے اس وعدے پر لیے کہ فوج کو وہ خود تنخواہ دیں گے اور ہمارے ساتھ جو صلح کی (معاہدہ
۱۸۰۱ء) اس کی ساتویں دفعہ میں قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور کچھ طلب نہ کریں گے۔ اب
اگر جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں وہ سب منظور کئے جائیں تو اس سے پہلے کے حالات میں
اور موجودہ حالات میں کیا فرق پڑتا ہے؟ خیر یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ لیکن حال میں
قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر اور باوجود اس بات کے کہ انگریزوں نے ہم لوگوں سے
کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے انھوں نے بغیر کسی سبب صرف یہ بہانہ تراش
کر کہ آپ کا انتظام اچھا نہیں ہے اور آپ کی رعایا خوش نہیں ہمارا ملک اور کروڑوں

روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہمارے پُرانے نواب واجد علی شاہ سے خوش نہ تھی تو ہم سے کیسے خوش ہو گئی۔ کبھی بھی کسی رعایا نے حکمراں کے لئے اپنا جان و مال قربان کر کے اپنی وفاداری کا ایسا ثبوت نہیں دیا جیسا ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے۔

اعلان میں یہ بھی درج ہے کہ ان کو اپنی مملکت کی حدود بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن اس کے باوجود الحاق سلطنت کا جاری ہے۔ اگر ملکہ نے حکومت اپنی اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے تو ہمارا ملک ہم کو کیوں واپس نہیں کرتے۔ جب کہ ہماری رعایا کی بھی یہ دلی خواہش ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا ملکہ نے بغاوت کی سزا ساری فوج اور رعایا کو کبھی نہیں دی، سبھی کو معاف کیا جاتا رہا اور ذی فہم لوگ ہندوستان کے تمام باشندوں اور فوجوں کو سزا دینا کبھی پسند نہیں کرتے کیونکہ جب تک سزا دی جاتی رہے گی یہ فساد کبھی نہیں رُک سکتا۔ مشہور مقولہ ہے کہ "مرتا کیا نہ کرتا"، یہ ممکن ہی نہیں کہ ہزار آدمی لاکھوں کا مقابلہ کریں اور سب بچ جائیں۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن کسی دوسرے مذہب کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اور سب کے ساتھ یکساں انصاف ہوگا۔ عدالت گستری میں کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے سے کیا بحث ہے؟ مذہب وہی برحق ہے جو ایک خدا کو تسلیم کرتا ہے اور اس ایک کے علاوہ کسی کو نہ ملنے، اور جب کسی مذہب میں تین خدا ہوں تو صرف ہندو اور مسلمان بلکہ یہودی اور وہ بھی جو سورج اور آگ کی پوجا کرتے ہیں اس کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ سوئر کھانا، شراب پینا سوئر کی چربی لگے کارتوسوں کو کاٹنا، آٹے اور مٹھائی میں سوئر کی چربی ملانا، راستہ بنانے کے بہانے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنا، گرجے بنانا، عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے گلی کوچوں میں عیسائی راہبوں کو بھیجنا، انگریزی اسکول قائم کرنا، لوگوں کو روپے کی طرح دے کر اپنی مذہبی باتیں سکھانا جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معبد کا آج تک کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیونکر لوگ اعتبار کریں کہ ان کا دین محفوظ رہے گا۔ بغاوت کی ابتدا ہی مذہب سے

ہوئی۔ اور اسی مذہب کے لیے لاکھوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ہماری رعایا ہرگز دھوکے میں نہ آئے۔ شمال مغرب ہزاروں کی عاقبت برباد ہوئی اور ہزاروں نے مذہب نہ چھوڑنے کے باعث پھانسی پائی۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ جن لوگوں نے باغیوں کو پناہ دی ہے یا جو باغیوں کے سردار تھے یا جنھوں نے بغاوت پر لوگوں کو اکسایا ہے اُن سے اس کا قصاص لیا جائیگا لیکن یہ کہ جب یہ ہوگا سمجھ کے کیا جائے گا اور جن لوگوں نے قتل و غارت کیا ہے یا قاتل اور خونی کی مدد کی ہے اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی باقی سب کو معاف کر دیا جائیگا ایک معمولی آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار اور بے قصور کوئی بھی نہیں بچ سکتا سب ہی کچھ لکھا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں لکھا۔ ایک بات اس میں کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار کو چھوڑا نہ جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں اور علاقے میں ہماری سپاہ نے پڑاؤ کیا۔ اس کے باشندے نہیں بچ سکتے۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں صاف دشمنی بھری ہے ہمیں اپنی پیاری رعایا کی حالت پر افسوس ہے۔ اب ہم یہ صاف حکم جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں جن لوگوں نے بیوقوفی کرکے گاؤں کے چودھری کی حیثیت سے خود کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں حاضر ہوں۔ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور ان کی لیاقت کے مطابق اعزاز عطا ہوگا ہمارے اعلان کی صداقت اسی سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی فرمانروا، خطا پوش اور عطا شعار ہوتے ہیں۔ ہزاروں نے اس کو دیکھا ہے لاکھوں نے اُسے سُنا ہے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا کہ کسی انگریز نے قصور معاف کیا ہو۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ امن و امان ہو جانے کے بعد لوگوں کی خوشحالی کے لئے عوامی فلاح کے کام مثلاً راستے اور نہریں بنانے کا کام شروع کئے جائیں گے۔ سوچنے کی جگہ ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستانیوں کے لئے راستہ بنانے اور نہریں کھودنے سے بہتر کوئی کام ہی نہیں اگر لوگوں کو اب بھی اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔ ہماری رعایا میں کوئی انگریزوں کے دھوکے میں نہ آئے۔"

Foreign Political Consultations, 17th Dec. 1858 Nos. 250/54
National Archives, New Delhi

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد انگریزوں کی معافی اور پنشن کے ہر اعلان کو غیور ملکہ نے ٹھکرا دیا۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں مجبور ہو کر لونڈی بھی چھوڑنا پڑا۔ اب علاوہ اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ جس زمین پر حاکم بن کر رہیں اس پر غلامی کی ذلت کے بجائے کسی آزاد زمین پر مستقبل کی تلاش کریں۔ چند وفادار سپاہیوں اور جاں نثاروں کی معیت میں ہمالیہ کی ترائی کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ نیپال پہنچیں لیکن شکست کے بعد بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے کے عہد پر قائم رہیں (S.N. Chanda Untold Stories, P. 12)

نیپال میں حضرت محل کو ہر قسم کی تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ بٹولی کی پہاڑی پر واقع آصف الدولہ کی بارہ دری میں انھیں مہاراجہ نیپال نے خبردار کیا۔

"آپ یا انگریزوں سے صلح کریں یا کسی اور طرف کو چلی جائیں۔ ہم سے توقع کسی قسم کی امداد و اعانت کی نہ رکھیے گا۔ ہم انگریزوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۲۳۰)

حضرت محل کی طرف سے ممو خاں نے جواب دیا۔ ہم کسی طرف نہیں جائیں گے۔ یہیں رہ کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ کچھ تمہارے بھروسے پر اُن سے نہیں بگاڑا ہے۔" (قیصر التواریخ ص ۳۴۱) اس کا جواب آیا "اُدھر سے انگریز اور ادھر سے ہم ماریں گے یہاں سے نکل جاؤ۔"

غرض یہ کہ خط و کتابت کے نتیجے میں حضرت محل، برجیس قدر اور ان کے ساتھ عورتوں و بچوں کو نیپال میں رہنے کی اجازت مل گئی اور مجاہدین کی کثیر تعداد نیپال کے پہاڑوں میں درندوں کی خوراک بن گئی۔

حضرت محل اور برجیس قدر کے قیام کی اجازت میں دو باتوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اول عورت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک جس غیر معمولی جرأت اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا تھا اس سے جنگ بہادر کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے پاس جو کثیر تعداد میں قیمتی ہیرے اور جواہرات تھے انھوں نے ان سب کو حکومت نیپال کی نذر کر دیا۔"
(مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۵۵)

حضرت محل کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سبھی رہنما یا تو اودھ چھوڑ کر چلے گئے یا مارے گئے تھے۔ ان کی لکھنؤ سے روانگی کے بعد صرف مولوی احمد اللہ شاہ تین ماہ تک مصروف کار رہے لیکن قضا و قدر کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی جہد آزادی کا ایک اہم ستون گر گیا۔

اودھ کی جنگ آزادی ختم ہوئی لیکن ہندو مسلم اتحاد کی بے مثال یادگاریں چھوڑ گئی۔ انھیں میں سے ایک ناقابل فراموش کہانی کنور سنگھ کی ہے "جو اودھ کے جنگی محاذ آرائی کے ایک اہم رکن اور ہردوئی کے تعلقدار تھے اور فوج کے ایک حصہ کی کمانداری ان کے حصہ کی تھی۔ ہردوئی کے معرکے میں اس کی فوج گھر گئی اور فتح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا اور اس کے حکم کے تحت سفید جھنڈے بلند کر دیئے گئے لیکن سفید جھنڈوں کے بلند ہونے کے بعد جب انگریز کمانڈر نے خود راجہ کنور سنگھ سے ہتھیار طلب کیے تو اس جواں مرد نے نہ صرف ہتھیار حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایک ایسا جواب دیا جو بہادری، وفاداری اور حب الوطنی کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہیگا ہتھیار حوالے کرنے کے اصرار پر اس نے جرأت سے کہا "یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے ان کی حفاظت اور خیر خواہی کا فیصلہ کرنا میرے اختیار میں تھا۔ انھیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ان کے حاکم کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑیں لیکن میرا معاملہ تو دوسرا ہے میں ہتھیار کیسے ڈال سکتا ہوں، میں تو برجیس قدر کی ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں۔ یہ کہہ کر اس جواں مرد نے تلوار کھینچی اور تنہا انگریزی فوج پر حملہ کیا اور سینکڑوں گولیوں کی باڑھ میں آناً فاناً مارا گیا۔" (جمیل مہدی نیا دور، یوم آزادی نمبر اگست ۱۹۶۲ء ص ۱۸)

اسی طرح کا ایک اور عدیم المثال واقعہ بینی مادھو سنگھ کا ہے۔ نیپال کی ترائی میں جن دنوں حضرت محل اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں انھیں دنوں شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ نے جب اپنا قلعہ بغیر مزاحمت کے جنرل ہوپ گرانٹ کے حوالے کیا تو وہ سمجھے کہ مصالحت پر آمادہ ہے رانا نے جواب دیا "میں اپنے قلعہ

کی مدافعت سے معذور تھا آپ کے حوالے کر دیا لیکن میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے۔ نیپال کی ترائی میں سرگباشی رانا نے اپنے ناموس کو حضرت محل کی سرپرستی میں دیا اور اپنا مال و متاع اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھ کر اجازت دی کہ جس کا جو جی چاہے لے اور چلا جائے اور جو مردانہ وار مرنے کی آرزو رکھتا ہو ساتھ آئے۔ ڈھائی سو جوانوں میں سے صرف ۲ نے راہِ فرار اختیار کی باقی سب رانا کے ساتھ اس گھاٹی میں جان پر کھیل گئے۔ (نیا دور لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۷ء ص ۱۶-۱۷، بحوالہ حالاتِ غدر منشی رام سہائے)

اس عرصے میں جنگ بہادر ادھر انگریزوں کا قبضہ کرا کر واپس آ گیا تھا۔ نواب علی محمد خاں اور نیپالیوں سے روزانہ جنگی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ آخر میں بہادر جنگ کی چالبازی مو خاں کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہوئی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی اور وہیں فوت ہوئے ان کے ساتھ ہی ان کی جماعت بھی منتشر ہو گئی۔

خدا کی قدرت ہے "کجا وہ محلاتِ شاہی جن پر بلا شبہ جنتِ ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ کجا نیپال کی سنسان ویران پہاڑیاں۔ دیار غیر میں تنگین کے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اس پر مستزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا لیکن پائے ثبات کو لغزش ہونا ممکن۔" (۵۷ء کے ہیرو ص ۷۴)

عرصے تک انگریزوں کی یہ خواہش بلکہ کوشش رہی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آ جائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا یہ پیغام بھیجا کہ "حکم سرکار ہے فیض آباد، لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آ جائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ کیا جائے گا۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۳۶۸) لیکن ہند کی مایہ ناز بیٹی نے نہ خود غلامی کی فضا میں جانا قبول کیا نہ اپنے بیٹے کو زندگی میں اس کی اجازت دی۔

"بیگم حضرت محل نے بعد شکست لکھنؤ اپنے لڑکے اور چند ساتھیوں کے ساتھ گورکھوں کے ملک میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ علاوہ اس مشاہرے کے جو ان کے شوہر اودھ کے سابق بادشاہ کو دینا طے پایا تھا۔ ان کے شایانِ شان وظیفہ دیا جائے گا اور

انھیں یقین دلایا گیا کہ ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا لیکن بیگم کو ہندوستان بلانے میں کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ جنگ میں شکست کھا کر برٹش حکومت کی پنشن پانا اور اس طرح اپنے بیٹے برجیس قدر کے حق سے دست بردار ہو جانا اس غیور خاتون نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے آقا اور شوہر سے بہتر انسان تھیں"۔

(سین: اے ٹین نفٹی سیون ص ۳۰۰۔ شائع کردہ حکومت ہند)

انسان کی حقیقی تعریف وہ ہے جو اس کے دوست اور دشمن دونوں کریں۔ نیپال میں حضرت محل کو سیاسی پناہ دینے میں ایک بڑی وجہ جنگ بہادر کا ان کی جرائت اور اولوالعزمی سے مرعوب ہونا تھا۔ ان کی غیرت و حمیت، حب الوطنی اور قابلیت کے معترف ان کے سب سے بڑے دشمن انگریز بھی تھے۔ سر ڈبلیو۔ ایچ رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز نے "مائی انڈین میوٹنی ڈائری میں تحریر کیا ہے"۔ بیگم میں بڑی قابلیت اور طاقت دکھائی دیتی ہے۔ بیگم نے ہم سے لا متناہی جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے ان رانیوں اور بیگموں کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں"۔

(رسل کی ڈائری۔ ص ۲۷۵۔ بحوالہ پنڈت سندر لال، سن ستاون ص ۱۷۴)

بادشاہ کی عیش پسند بیگمات میں سے ایک 'رشیدا بیگم' نے اپنے خط میں انھیں لکھا۔

"آپ کے جانے کے بعد وہ بلوائے عام ہوئے۔ وہ وہ مصیبتیں آئیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں سلطان عالم کا نام کر دیا"۔ انتظام اللہ شہابی بیگمات اودھ کے خطوط ص ۵۲)

غرض یہ کہ جنگ آزادی کے مورخ نے اپنے خزانے میں محفوظ کر لیا کہ "بیگمات اودھ نے ہندوستان کی تاریخ پہ ہمیشہ باقی رہنے والا نشان چھوڑا ہے۔ اس خاندان کے آخری زمانے میں غازی الدین حیدر کی جوشیلی بیوی بادشاہ بیگم اور باغی سپاہیوں کی جوڑ توڑ (ہیروئن) حضرت محل کا ورود ہوا جو نرم مزاج رکھنے والے واجد علی شاہ کی اور بھی اولوالعزم بیگم تھی"۔ (سرجادوناتھ سرکار کے پیش لفظ تاریخ بادشاہ بیگم مورخہ ۱۵ جون ۱۹۳۶ء کا ترجمہ)

نیپال میں حضرت محل نے ایک محل برف باغ کے نام سے تعمیر کرایا اور آزادی ہند کے لیے درپردہ سرگرم عمل رہیں ۱۸۷۴ء میں اس برف باغ میں جس پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا یہ شمع حریت ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی۔ نیپال پہونچ کر انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا یہ اختتام نہیں آغاز ہے۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی روشن کی ہوئی شمع ۱۹۴۷ء تک وطن پرستوں کے سینوں میں شعلہ بن کر بھڑکتی رہی۔

کٹھمانڈو میں حضرت محل کی بے نشان قبر گویا فریاد کر رہی ہے کہ آزاد ہندوستان نے اپنی اس عظیم مجاہدہ کو جس کی بہادری اور فراست پر خود شجاعت کو ناز تھا، جس کی سیاست نے انگریزوں کی شاطرانہ سیاست سے زبردست ٹکر لی، جس کی انتظامی صلاحیت کا لوہا بڑے بڑے مدبّروں نے تسلیم کیا، جس کے مقصد کی لگن نے جنرل بخت خاں روہیلہ نانا راؤ پیشوا، تانتیا ٹوپی جیسے سرداروں اور رسل، ہسین، جادو ناتھ سرکار جیسے تاریخ نویسوں کے دل جیت لئے، جو اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی علم بردار تھی۔ اور جس کی حریّت پسندی نے پسپائی کے بعد بھی انگریزی سامراج کی تابعداری قبول نہ کی بشاید فراموش کردیا ہے۔ کیا ہندوستان اپنے اس قرض کو کبھی اتار سکے گا؟

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

عوامی انقلاب

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ایک ایسی عوامی بغاوت تھی جس میں بادشاہ بیگمات، رجواڑے اور خواص ہی نہیں، عوام بھی برطانوی آمریت سے آخری بھرپور ٹکر لینے کفن بردوش میدان میں اتر آئے تھے ان بے شمار وغیر معروف قوم پرستوں نے قربانی، جرأت وشجاعت کی جو شاندار مثالیں قائم کیں اس کی مثال ہندوستان کی ہزاروں سالہ تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انھوں نے ایک زندہ قوم میں حرارت باقی رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھیں بھولی بسری کہانیوں میں دو کہانیاں دہلی کی "سبز پوش" خاتون اور کانپور کی "عزیزن" کی ہیں۔

سبز پوش عورت: اسی زمانے میں جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کی عبرت انگیز مثال ایک سبز پوش بوڑھی عورت قائم کر رہی تھی یہ دلیر بڑھیا مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی، شہر کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتی: "آؤ چلو خدا نے تمہیں بہشت میں بلایا ہے"۔ شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سُن کر جوق در جوق اس کے ہمراہ ہو جاتے وہ ان کو لے کر بہادری سے انگریزوں پر حملہ کرتی، اس کا وار بے پناہ ہوتا۔ وہ تلوار اور بندوق سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دیتی۔ اگر اس کے ساتھی میدان چھوڑ جاتے تو یہ جنگ جو، اور دلیر بڑھیا تنہا جنگ کرتی اور پھر زندہ واپس آجاتی

بعض لوگ چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ "اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔اس کو موت کا کچھ خوف نہ تھا۔وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا، کبھی گھوڑے پر سوار، وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی جرأت و ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا" (بیگمات کے آنسو ص ۱۲۶) واپس آکر وہ کہاں جاتی تھی؟ وہ کون تھی؟ کسی کو پتہ نہ چل سکا، آخر ایک دن ماہ جولائی میں (غالباً ۲۷، ۲۸) وہ جنگ کرتی ہوئی انگریزی مورچے کے قریب جا پہنچی مگر زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑی اور گرفتار کر کے انبالہ بھیج دی گئی، لفٹننٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو ایک خط ۲۹ر جولائی میں لکھا:

" میں تمہارے پاس ایک مسلمان بڑھیا کو روانہ کر رہا ہوں۔یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی تھی۔جن سپاہیوں کو اس سے سابقہ پڑا وہ کہتے ہیں کہ اُس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے جس روز گرفتار ہوئی۔اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی . . . . یہ بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے"!

بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۱۸۷، ۱۸۸)

انبالہ کی گرفتاری کے بعد سبز پوش خاتون پر کیا گذری کسی کو اس کا علم نہیں البتہ ہڈسن جیسا مغل شاہزادوں کا خون پینے والا شخص بھی اس اعتراف پر مجبور ہوا تھا کہ دہلی کی یہ "خاتون" ہندوستان کی "جون آف آرک" کے نام سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

عزیزن

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین کی خاصی بڑی تعداد اپنے انقلابی بھائیوں کے دوش بدوش جہدِ آزادی میں شریک رہی اور جامِ شہادت نوش کیا۔ جنگِ آزادی کی تاریخ نے جن چند ایسے ناموں کو محفوظ کرلیا ہے ان میں عزیزن کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر بٹھور کی اس مجاہدہ کی قربانی بے لوث تھی۔ اس میں نہ تخت وتاج کی خواہش تھی اور نہ محلوں کی آرام وآسائش کا خیال۔ وہ صرف آزادیٔ وطن کی خاطر ایک غاصب وجابر حکمراں سے برسرِ پیکار رہی تھی۔

حسن ونزاکت کی مورت یہ رقاصہ ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئی۔ والد حسین خاں اور والدہ حمیدہ بیگم تھیں جو اس کی ولادت کے کچھ عرصے ہی بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں، عزیزن مشہور امراؤ جان ادا کے یہاں سارنگی محل میں رہی۔ ایک روایت ہے کہ اسے شمس الدین سے دلی محبت تھی جو پہلے برطانوی فوج میں صوبیدار تھا اور بعد میں اسے چھوڑ کر نانا صاحب پیشوا سے مل گیا تھا قرینِ قیاس ہے کہ وہ شمس الدین کی معیت میں ہی کانپور سکونت پذیر ہوئی ہوگی

عزیزن کو اپنے حکمراں نانا صاحب کی وفاداری پر ناز تھا جس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی دشمن تھی۔ اس لیئے زندگی کے آخری سانس تک اس کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کانپور انقلابیوں کا پڑاؤ تھا۔ سر جیورج ٹریولین کے مطابق ۷ جون ۱۸۵۷ء کو نانا صاحب پیشوا کی طرف سے ہندی و اردو میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی تھی، کہ وہ اپنے ملک و مذہب کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لئے متحد ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں۔ فوجی بھرتی کا اعلان سنتے ہی یہ مجاہدہ گھر بار چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ میں کود پڑی۔ شمس الدین کے تعاون سے اُس نے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کی، وہ گھر گھر جاتی، عورتوں کو گھڑسواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی تھی۔ وہ خود اپنے فوجی دستے کی مخصوص وردی میں ملبوس، کاندھوں پر تمغے سجے ہوئے سوار بے خوف و خطر ادھر سے ادھر گھومتی تھی۔ عزیزن کی تنظیمی صلاحیت بھی بے پناہ تھی۔ حکومت اترپردیش کی طرف سے شائع کی گئی آنند سروپ مصرا کی مرتبہ کتاب "نانا صاحب پیشوا اور جنگِ آزادی میں خصوصی طور پر ذکر ہے کہ خواتین کے فوجی دستہ کا قیام اس عظیم مجاہدہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

خواتین کی یہ چھوٹی سی فوج زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتی، سپاہیوں کے لئے گولا بارود فراہم کرتی، ان کے لئے کھانے اور کپڑے فراہم کرتی، نیز ان بہادر سپاہیوں کے لیے جو جون کی تپتی ہوئی گرمی میں برطانوی سپاہ کے سامنے سینہ سپر تھے، گھر گھر سے تازہ پھل، مٹھائی اور میوے بھی اکٹھا کرتی تھی، علاوہ ازیں اس کے اہم فرائض میں جاسوسی کرنا، جنگی اطلاعات حاصل کرنا اور ان کو مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچانا اور ان بزدلوں کو شرم بھی دلانا تھا جو خوف کے سبب اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ عزیزن ایسے مردوں کو خود چوڑیاں پہناتی، اس شرمندگی سے بچنے کے لئے عوام کی بھاری تعداد نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔ خواتین کا یہ فوجی دستہ اپنی مخصوص وردی میں ملبوس گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں تلواریں لیے جب خاص خاص شاہراہوں سے

گزرتا تو سڑک کے دونوں طرف کھڑی بھیڑ "عزیزن زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے استقبال کرتی تھی۔

عزیزن "انقلابی کمان" کی بھی فعال ممبر تھی۔ نانا صاحب ان کے دست راست عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپی کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے متعدد محاذوں کی مانند کانپور میں بھی انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ کرنل ولیم نے جب باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سرِ فہرست رکھا۔ شہر کے ایک تاجر جانکی پرشاد نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا "دوسری سپاہی خواتین کے ساتھ وہ شب و روز فوجی وردی میں جس پر تمغے سجے ہوئے تھے ملبوس رہتی تھی۔ جب آزادی کا علم بلند ہوا تو اس نے اعلانیہ جنگ میں حصہ لیا۔ پیشوا کی افواج سے اس کا براہِ راست تعلق تھا۔

ہندوستانیوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کارروائی شروع ہوئی جب عزیزن بحیثیت قیدی، جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کی گئی تو اس حسین عورت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے لیے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ گلاب کی مانند تروتازہ اور پھول کی پتی جیسی نازک اندام یہ لڑکی فوجی وردی میں ملبوس ہتھیار سجائے میدانِ جنگ میں اتر سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین جنگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہیولاک جیسے ظالم و سفاک کا دل بھی اسے دیکھ کر پسیج گیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے عزیزن سے کہا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے اور رحم کی درخواست کرے تو وہ اس کے خلاف الزامات واپس لے سکتا ہے۔ وہ جنگِ آزادی کی پہلی مجاہدہ تھی جس نے اس رعایت کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ قدم اس کے بقیہ انقلابی ساتھیوں کے حوصلے پست کردے گا۔ ہیولاک نے پھر پوچھا آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ ہندوستان کی اس جیالی بیٹی کا جواب تھا "ہر ممکن طریقے سے برطانوی حکومت کا خاتمہ"! ہیولاک نے مجبوراً سپاہیوں

کو فائر کرنے کا حکم دیا۔ پہلے ہی فائر پر اس نے نعرہ بلند کیا "نانا صاحب زندہ باد"، تو چند لمحوں کے لئے برطانوی سپاہ کا خون منجمد ہو کر رہ گیا اور گولیاں نازک بدن کو چھلنی کر گئیں۔

اب عزیزن ایک ناقابلِ فراموش روایت بن گئی تھی۔ بتھور کے گاؤں میں اس کی شجاعت تنظیمی صلاحیت اور مادرِ وطن کی خاطر بے لوث قربانی کی کہانیاں عرصۂ دراز تک کہی اور سُنی جاتی رہیں۔

(ماخوذ

(1) (AlKabir AlKausar: Prominent Muslim Women of India. Bibliographical Dictionary PP. 3942

(2) (Muslim Women Patriots of 1857, Thomas Smith, The Statesman March, 1986)

جھانسی کی گمنام شہید:

سینٹرل انڈیا کے لئے گورنر جنرل کے ایجنٹ روبرٹ ہملٹن نے اپنی رپورٹ مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں ایڈمسن اسٹون سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو رانی لکشمی بائی کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "رانی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ اس موقع پر ایک دوسری مسلمان خاتون بھی جو عرصے سے اس خاندان سے وابستہ تھی اور ہمیشہ رانی کی مصاحبت میں رہتی تھی، سوار تھی، دونوں کو گولی لگی اور دونوں ہی ساتھ زمین پر گر گئیں۔

(Foreign Political A 31st December 1858, NATIONAL ARCHIVES OF INDIA, NEW DELHI)

اصغری بیگم:

اصغری بیگم کی پیدائش ۵ر جولائی ۱۸۱۱ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اتر پردیش

میں ہوئی۔ تھانہ بھون کے باغی رہنما قاضی عبدالرحیم کی والدہ محترمہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں برطانوی افواج کی مزاحمت کے جرم میں پکڑی گئیں اور زندہ جلادی گئیں۔

(Dr. P.N. Chopra: Who is Who India Martyrs Govt. of India Publication P 11)

جلیبہ :

ضلع مظفر نگر، یوپی کے ایک گاؤں میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک مسلم گوجر خاندان سے تھا۔ برطانوی افواج کی مزاحمت کی پاداش میں گرفتار ہوئیں اور ۱۸۵۷ء میں پھانسی کی سزا پائی۔ (Ibid : P. 49)

رحیمی :

اس نوجوان خاتون کا تعلق ایک مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ پیدائش ڈسٹرکٹ مظفر نگر اتر پردیش کے ایک دیہات میں ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانوی فوجوں سے مزاحمت کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اندازاً دو سو پچپن (۲۵۵) خواتین برطانوی افواج سے لڑتی ہوئی شہید ہوئیں اور گیارہ نوجوان عورتوں کو پھانسی کی سزا دی گئی (Ibid : P 118)

نوری یک جہتی کا تقاضہ ہے کہ دیس کے ان سبھی عوامی مجاہدین پر تحقیق کی جائے جن کی قربانیاں ایک نام چاہتی ہیں۔ اس 'تاریخ جنوں' کی صحیح تحقیق ہی نئی نسل کو پیغام عمل دے سکتی ہے۔

بَاب دوم

مٹی کی مُحبّت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

بی اماں

(والدۂ محمد علی)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی اپنی نصف منزل میں تھی کہ ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک عکس ابھرنا شروع ہوا جو ایمان راسخ، حب الوطنی قومی یک جہتی حق پسندی و راست گوئی، آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ فکر، بلند حوصلگی، عزم مسلسل غیر متزلزل سامراجی استبداد سے بے خوف و خطر ٹکرا جانے کی غیر معمولی جرأت و ہمت، پیرانہ سالی میں جوانوں جیسی سرگرمیٔ عمل و کارکردگی، نہ جانے کتنے ہی خوبصورت رنگوں کا امتزاج تھا کسی ایسے ہی لطیف نقش کے تصور میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

حادثاتِ وقت کے ساتھ ساتھ جیوں جیوں نقوش واضح ہوتے گئے۔ ان رنگوں کی دل آویز آمیزش پرستارانِ وطن و ملت پر سحر کرتی چلی گئی۔ کاروان حریت کے مسافروں نے اپنے اس میر کارواں کو "ام الاحرار" کے خطاب سے نوازا لیکن پیار میں اپنے پوتوں و پوتیوں کی "بی اماں" ان سبھوں کی "بی اماں" بن گئیں۔

نوٹ:۔ ان کے بیٹے انہیں بوا کہتے تھے مولانا محمد علی کے نومبر ۱۹۲۴ء کے کامریڈ میں شائع شدہ مضامین بہ عنوان "ماں کی یاد" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بی اماں کا اصلی نام آبادی بانو تھا اور امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی تھیں ۔ ان کی پیدائش اور عمر کے متعلق محمد علی نے کامریڈ میں لکھا ہے کہ بی اماں کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ البتہ مرحومہ کہا کرتی تھیں ۔ اچھی طرح مجھے یاد ہے کہ غدر کے زمانے میں میری عمر پانچ چھ سال کی تھی ۔ اس کی بنیاد پر مولانا نے ان کا سال پیدائش ۱۸۵۲ء اور ان کی عمر ۷۲ سال لکھی ہے (کامریڈ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۴ء) شوہر عبدالعلی کا تعلق رام پور سے تھا ۔ ۲۷ سال کی جوان عمر میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں جیسا کہ سر سبرامنی آئر صدر مدراس ہوم رول لیگ کے نام اپنے ۴ر اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں انھوں نے خود تحریر کیا ہے " میرے خاوند کی اچانک اور قبل از وقت موت نے مجھے ۲۷ سال کی عمر میں بیوہ بنا دیا ۔"

آبادی بانو بیگم بڑی آن بان کی شریف زادی تھیں ۔ رشتہ داروں نے جب نکاح ثانی پر زور دیا تو انھوں نے جواب دیا " تم میرے رتبے اور درجے کو نہیں پہچانتے ۔ میں رام پور کی نہیں ہوں ۔ امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی ہوں جو اعلیٰ درجے کے سیدوں سے بھرا ہوا ایک قصبہ ہے اور میرے باپ تو نہیں لیکن میرے دادا اور پردادا شاہان دہلی کے دربار میں وزارت کے مناصب پر فائز تھے اور میرے دادا کو ایک دفعہ بادشاہ دہلی نے امروہہ کا علاقہ جاگیر میں دینا چاہا تو میرے دادا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بالکل سیدوں کی بستی تھی اور وہ سیدوں پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ خبردار جو کبھی کسی نے ایسی بات منہ سے نکالی ۔ یہ میرے چھ لخت جگر مجھے کیا کم ہیں ۔ میری عمر بھر کی خدمت اور جاں نثاری کے لئے یہ کافی ہیں ۔ (علی برادران اور ان کا زمانہ سید محمد ہادی، ص ۱۰) سبرامنی آئر کے نام ۴ر اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں ہی بیوگی کے بعد وہ اپنی ذمہ داریوں اور بچوں کی تربیت کے متعلق لکھتی ہیں " اس وقت میرے چھ بچے تھے جن میں محمد علی سب سے چھوٹا اور دو برس کا تھا ان کی تعلیم میرے ذمہ ہوئی ۔ ماسوائے اس کے ان کی ملکیت کی نگہبانی میرے سر پڑی ۔ خدا کی مدد پر پورا بھروسہ کر

کے جو نیک کام کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے اعتقاد و مذہب پر یقین رکھ کر میں کام کرنے لگی اور باوجود تکلیف و مشکلات کے مجھے اس کا صلہ مل گیا یعنی ہماری کل اولاد جوان ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئی"۔

انیسویں صدی کے مسلم معاشرے کے پیشِ نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے جس طور پر پردے میں رہنے کے باوجود اپنی جائیداد کا انتظام، اپنے بچوں کی تربیت اور انھیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا وہ بڑی جرأت اور قدامت کا بھی کام تھا اور پرانی روایتوں سے بغاوت بھی۔ شوہر کے بعد دیور کے اصرار کے باوجود وہ جائداد کا ایک حصّہ بھی فروخت کرنے پر رضا مند نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا میں چاہتی ہوں میرے بچوں کو ان کا مکمل حق ملے تاکہ وہ اپنی ماں کو الزام نہ دے سکیں کہ وہ عورت ہونے کے سبب جائیداد کا صحیح انتظام نہ کر سکیں۔ تنگدستی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں بیٹوں کی تعلیم کی خاطر چھپ کر ملازم کی معرفت پڑوس کے ہندو بنیکر کے یہاں زیور رہن رکھنا پڑا۔ بقول مولانا محمد علی "وہ خود معمولی کپڑا پہنتیں اور ہمارے لئے جامدانی کے کپڑے بنائیں .... وہ خود چولائی کی سبزی پر گذارا کرتیں۔"

بی اماں کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق مولانا محمد علی فرماتے ہیں۔ "اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ اگرچہ عملی طور پر وہ بالکل اَن پڑھ تھیں لیکن جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا مجھے زندگی میں جن لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہے ان میں سے کسی ایسے شخص سے مجھے سابقہ نہیں پڑا ہے جسے میں والدہ سے زیادہ عقلمند اور یقیناً ان سے بڑھ کر خدا پرست اور روحانی کہہ سکوں ....

ہندوستان میں مسلم معاشرے نے اپنے زوال کے دنوں میں اپنی عورتوں کو سوائے عام جہالت کے ہر روشنی سے محروم رکھنے سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں کیا۔" (محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۴۶)

مولانا محمد علی نے اپنی سوانح حیات میں بی اماں کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے شادی کے بعد اردو کیسے پڑھی اور ان کا کس بلا کا حافظہ تھا۔ مولانا

محمد علی مرحوم کے والد ایک پرانی وضع کے انسان تھے جس کی وجہ سے ان کے گھر کا ماحول بھی بیحد رجعت پسندانہ تھا۔ مولانا محمد علی کے والد باوجود سنت رجعت پسند ہونے کے ہر قسم کی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانے میں اس خیال سے لائے کہ سونے سے قبل وہ اسے پڑھ کر ختم کر دیں گے مگر وہ رات میں اسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اُٹھے اپنے ہمراہ لیجانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچازاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک اردو ناول تھا۔ انھوں نے بی اماں کو اس کے بعض اقتباسات سُنائے جو بیحد دلچسپ تھے اور جو بی اماں کو بھی بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سوگئیں تو سوتے میں ان کے منہ سے اس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہوئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے انھوں نے جب سوتے میں بیوی کے منہ سے اردو ناول کے وہ اقتباسات سُنے تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ بعد میں بی اماں نے مولانا کے چچازاد بھائی سے شوہر سے چھپ کر اتنی اردو پڑھ لی تھی کہ شوہر کی زندگی میں ہی ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنے و پڑھنے لگی تھیں پھر بعد میں تو انھوں نے باقاعدہ اردو پڑھی اور تحریک خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرروں میں کیا جاتا تھا۔

(از فرقت کاکوروی، علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ ص ۷۵۔۷۶)

بی اماں کا شمار تاریخ انسانی کی ان چند معزز ہستیوں میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جن کی آغوشِ تربیت میں طفلِ ناداں، عبور علم بردار حریت اور حقیقی معنوں میں رضا کاران ملک و ملّت بن کر اُبھرتے ہیں۔ مولانا محمد علی کی تاریخ ساز شخصیت بھی بی اماں کی تربیت کی ہی مرہونِ منت ہے جس کا اعتراف اُنھیں خود بھی ہے۔ "مجھے اپنے والدِ مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ

کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ۔ ۔ ۔ میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوندِ کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہونچایا ہے (نقوش آپ بیتی حصہ اول جون ۱۹۶۴ء)

عملی اعتبار سے بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم سے ہوتا ہے "قانون تحفظ ہند" کا نفاذ دورانِ جنگ ہوا۔ یہ ایسی شمشیر برہنہ تھی جس نے صدہا حریت پسندوں کی آزادی کا خون کیا اور جس کے حربے کے سامنے تمام قانونی تحفظات اور آئینی جوابات بیکار ثابت ہوئے۔

لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں لکھے گئے مولانا محمد علی کے مضمون کو حکومت نے قابلِ اعتراض قرار دیا اور اس کی پاداش میں جب کہ ابھی قانونِ تحفظ ہند کو رائج ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کو چھندواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ (نظر بندی کا آخری زمانہ بیتول جیل میں گزرا) مجاہد بیٹوں کی قابلِ فخر ماں نے اپنی مرضی سے بیٹوں کی قربت کی خاطر چھندواڑہ میں ہی قیام پذیر ہونا پسند کیا۔ اُن کی نظر بندی پر اظہار فخر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا "یہ صرف ایک عزت ان ہی لوگوں کے لئے ہے۔ جن کو خدا اپنے ملک اور اپنے مذہب کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے"۔ (خط بنام سر امنی آئر ۲۸ اگست ۱۹۱۷ء) یہ مرتبہ بلند ملا جن کو مل گیا۔ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں جگہ جگہ ہوم رول لیگ کا چرچا تھا۔ لوک مانیہ تلک اور مسز انی بیسنٹ کی سرپرستی میں مہاراشٹر ہوم رول لیگ کی شاخیں سارے ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔

مسز بیسنٹ نظر بند ہوئیں اور ہندوستانی سیاست میں ایک نئی سرگرمی کی لہر دوڑ گئی۔ بی اماں نے سر سبرامنی آئر کے نام اپنے خط میں جسے انھوں نے اس عظیم الشان جلسہ میں بحیثیت صدر پڑھ کر سنایا جو مسز بیسنٹ کی نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے مدراس میں منعقد ہوا تھا۔ تحریر فرمایا "مجھے خوف ہے کہ یہ خط شاید آپ کو متعجب کردے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ ایک اجنبی شخص کا

خط ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ راقم ایک مسلمان عورت ہے جس کی پرورش پُرانی وضع کے مطابق ہوئی ہے۔ جس کی رو سے عورتیں اجنبی سے بہت کم خط وکتابت کرتی ہیں اور مردوں سے تو کبھی کرتی ہی نہیں لیکن زمانہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہے اور اس کی رفتار عجیب ہے کہ اگر مجھ جیسی پُرانی خیال کی عورت اس اصولِ قدیم کو بھلا کر ایک ایسے معزز اور محترم شخص کو خط لکھے، جن کا تمام عالم مدّاح ہے اور پھر خط کا مضمون بھی وہ ہو جو آج سب کے دلوں میں جاگزیں ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں پرانے لوگ اور خصوصاً بوڑھی عورتیں عموماً دنیا میں ردوبدل کی خواہاں نہیں۔ گو میں ضعیفہ ہوں لیکن ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہوں جو آج ہمارے گردوپیش وقوع میں آرہی ہیں رول لیگ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے لکھا:" جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ گو میں صوبہ متوسط میں رہتی ہوں لیکن ہمارا اشٹر ہوم رول لیگ ہے جس کو اس بہادر اور صائب الرائے شخص یعنی لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک نے قائم کیا ہے شامل ہو سکتی ہوں تو میں نے مع اپنی بہو (یعنی محمد علی کی بیوی) اور اپنے گھر کے تمام دوسرے لوگوں کے اس لیگ کی ممبری کا حلف لے لیا ہے۔ اس زمانے میں محض عقائد کافی نہیں اب تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کا اعلانیہ اظہار کریں اور اگر ضرورت ہو تو باآوازِ بلند اعلان کریں۔

مسز بیسنٹ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس کرتے ہوئے ان کے متعلق اظہارِ خلوص یوں کیا۔ ان کی نظربندی میں سوائے مبارک بادیوں کے اور کوئی تحفہ نہیں بھیج سکتی، متحدہ ہندوستان میں نوجوان، بوڑھے، ہندو اور مسلمان سب کی دعائیں ان کے حق میں ہیں۔ یہ دعائیں ان سختیوں کی تلافی ہوں گی جو ادنیٰ لوگوں کی ایک جماعت سے انھیں مل رہی ہیں اور ہمیں بھی ۲۷ مہینوں سے نصیب ہو رہی ہیں۔ دعائیں اور مبارکبادیوں کے سوا ان کی نذر کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نظربندی کے متعلق جو فنڈ کھولا گیا ہے اس میں تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکتا ہے چندہ دوں۔ ہم لوگ کبھی متمول نہیں رہے بلکہ میرے بیٹے جب سے نظربند ہوئے ہم اور بھی غریب ہو گئے ہیں۔ ان میں کوئی

بھی اِس قابل نہیں کہ کسی قسم کا کاروبار جاری رکھ سکے اور بجائے کچھ کمانے کے صرف قرض کے لئے ہزاروں روپیہ کا سود دینا پڑتا ہے۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کی غرض سے اور ایک بڑے خاندان کے روزانہ اخراجات کے واسطے جس کی کفالت کو ہمارے بیٹوں کی تنخواہیں کافی نہیں ہوسکتیں۔ میں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا حصّہ فروخت کرڈالا۔ یہ جاگیر میرے خسر کی کمائی تھی جو انھوں نے غدر کے زمانے میں جب وہ نواب رام پور کی ملازمت کرتے تھے۔ روہیل کھنڈ اور کمایوں میں بہت سے انگریز باشندوں اور افسروں کی جانیں بچانے کے صلہ میں حاصل کی تھی۔ جب تک میرے بچے کمسن تھے اور مجھے ان کی پرورش کرنی تھی۔ اس وقت تک میں نے اس امر کو ایک بڑا فرض سمجھا کہ اس جائیداد کے کسی حصّے کو علیحدہ نہ کروں اور باوجود تنگ دستی کے اس کا ایک ایکڑ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ گیا تھا لیکن کیونکہ پوتوں کی نظر بندی کی وجہ سے ۱۹۱۷ء میں اس جاگیر کے فروخت کرنے کی ضرورت ہوئی جو دادا نے ۱۸۵۷ء میں حاصل کی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو اس فرض سے سبکدوش سمجھا اور مجھے اس کا مطلق غم نہیں کہ میں نے اس جاگیر کا اتنا بڑا حصّہ علیحدہ کردیا۔ رہا مستقبل تو اس کے لئے مجھے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے متعلق کوئی فکر نہیں، میں اپنی مشرقی مثل پر پورا اعتماد رکھتی ہوں یعنی

ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست

اب بھی میری یہ خواہش ہے کہ ہماری عالی مرتبہ بہن ہماری آمدنی میں شریک ہوں اور میں نہایت مشکور ہونگی اگر آپ ہم سے دس روپیہ ماہوار قبول فرمائیں گے۔ پہلے مہینے کے لئے میں منی آرڈر روانہ کرچکی ہوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتادوں کہ یہاں ہمارے گھر کے ہر ایک شخص نے اس رقم میں کچھ نہ کچھ دیا ہے حتیٰ کہ بچوں اور نوکروں نے بھی نہایت شوق و اصرار کے ساتھ اپنے حصّے کی قلیل رقم اس روپے میں شامل کی ہے۔"

قانون تحفظ ہند کے آہنی پنجوں میں گرفتار بدنصیب بندوں، ان کی معاشی بدحالی اور پریشان حال پسماندگان کے متعلق اس خط میں ظاہر کئے گئے جذبات ان کی

انسانی ہمدردی، وطن پرستی اور ملکی آزادی کے لئے ان کی بے قراری کی بہترین عکاسی کرتے ہیں: "میرے بیٹے جوان و تندرست ہیں۔ سارے ملک میں ان کے اتنے دوست و احباب ہیں کہ جو مدد چاہیں ان کو خوشی کے ساتھ مل سکتی ہے۔ لیکن مجھ ماں کا دل ان سینکڑوں بدنصیب بہادر لڑکوں کے غم میں خون روتا ہے جو بغیر کسی داد فریاد کے مجرم قرار دیئے گئے ہیں اور اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی کمانے کی آزادی سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یقیناً ان کے لئے بہن بیسنٹ کا دل بھی روتا ہوگا۔ میں اپنے سوا دو برس کے تجربے سے محسوس کر سکتی ہوں کہ وہ سینکڑوں مائیں جن کے گھر تباہ و برباد ہو گئے آج کیا خیال کرتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ نوجوان کیا محسوس کرتے ہونگے جن کی جلاوطنی میں انکے آرام و آرائش کا خیال رکھنے اور تسلّی و دلاسا دینے والی مائیں بھی نہیں ہیں۔ غم و فاقہ کشی کی دلخراش داستانیں کبھی کبھی ہمارے کانوں تک پہونچتی ہیں اور اُن سے ہم کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنے ایسے پُر درد افسانے ہوں گے جو ہمارے کانوں تک پہونچتے بھی نہیں۔ کیا ان کو قانونی مشورہ اور مالی امداد دینے کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی؟ اور اگر ان بدنصیب لوگوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنے کا کوئی علاج نہیں ہے تو وہ اور ان کے متعلقین جو کبھی کسی جرم کے مرتکب اور ایسی سزا کے مستوجب نہیں ہیں بھوکوں کیوں مریں؟ کیا ہماری ہوم رول کی شاخیں ان نظربندوں کے علاوہ جنھیں پبلک جانتی ہے ہر نظربند کے حالات کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتیں اور انکو اور ان کے متعلقین کو ضروری مدد نہیں دے سکتیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اپیل کی جائے تو ہر گوشہ ہندوستان میں ہر گھر ان مقدس اغراض کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور دے گا۔ خواہ وہ مٹھی بھر اناج ہی کیوں نہ ہو"

ملک کے تمام حریت پسندوں کے پس ماندگان کے سلسلے میں عملی اقدامات کے تذکرے کے ساتھ اور ان کی امداد کے لئے مسز اینی بیسنٹ کے نام پر ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز کے ساتھ انھوں نے ایک بار پھر اپنے اس ایمان راسخ اور پختہ یقین کا اعادہ کیا کہ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہے اور فتح عنقریب ہی ہے

(خط بنام مسز اینی آئرس ۳ اگست ۱۹۱۸ء چند اہم خطوط، انجمن اعانت نظربندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۸ء ص ۹۔ ۱۰۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵)

مختلف اشخاص کو لکھے گئے ان خطوط سے ان کی اندرون و بیرون ملک معاملات پر وسعت نظر، مسائل سے گہری واقفیت اور ان کے حل کی تلاش میں ان کے اضطراب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوشِ وفاداری میں اکثر حکام ہوم رول لیگ کے جھنڈے گرا دیتے تھے اس سے متعلق سر سبرامنی آئر کے نام ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء کے خط میں بی اماں نے اپنے جذبات و احساسات کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا "اگر ایک ہوم رول لیگ کا جھنڈا زبردستی اتار دیا گیا تو کیا اس کی جگہ ہزاروں نئے جھنڈے بلند نہ ہوں گے۔ اپنے جذبات سے اندازہ کرتے ہوئے مجھے پورا یقین ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی اس خوبصورت سرخ و سبز جھنڈے کو نہ صرف اپنے گھروں پر لگائیں گے بلکہ دلوں میں جگہ دیں گے۔ اپنے سارے زمانۂ بیوگی میں میں نے کبھی کوئی رنگین چیز نہیں پہنی۔ لیکن اب میں سرخ و سبز جھنڈے کو خدام کعبہ کے مقدس نشان کے نیچے اپنے سفید برقعے یا بالفاظ دیگر نقاب وار پوشش پر جو کہ میں باہر نکلتے وقت پہن لیتی ہوں لگاؤں گی۔ میں شیخی یا نمائش کے لئے ایسا نہ کروں گی بلکہ میرے اس عمل کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے شرمانا یا اس کے نتائج سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں مجھے تو بجائے غصّے کے اس بات پر افسوس آتا ہے کہ حکام اپنی بیوقوفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اس قسم کے خفیف اظہار سے مستحکم سے سلطنت کی جڑ پختہ ہوتی ہے، کاش کہ وہ ان چیزوں کو ہماری آنکھ سے دیکھ سکتے اور معلوم کرتے کہ پردہ نشین عورتیں تک اس بات کو خوب سمجھتی ہیں کہ اس قسم کی تلون مزاجی کا اثر صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی بنیاد کو صدمہ پہونچے۔

چند سال گذرے کہ "بندے ماترم" کا نعرہ جو ایک بے ضرر بلکہ قابل تعریف نعرہ ہے، بنگال میں باغیانہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے محبانِ وطن کو تکلیف اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس پر بھی مجھکو معلوم ہوا ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کی کاروائیاں "بندے ماترم" کے راگ سے شروع ہوتی تھیں اور وہی بہادر نوجوان بنگالی جوان الفاظ کے زبان پر لانے سے سزائیں جھیلتے تھے۔ اب اس کو اپنی جگہ مقبول جنگی نعرہ کی طرح میدانِ جنگ میں اپنی جان دینے کے وقت

استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی قوم اور اپنی مردانگی کے دامن کو بدنما دھبے سے پاک کردیتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو جو زبردستی ہوم رول کا جھنڈا گرادیتے ہیں سبق لینا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک روز یہ سبق سیکھ لیں گے خدا کرے کہ وہ جلد اس سبق کو سیکھیں ایک پرانے شاعر کا قول ہے ؎

ہرچہ داناکند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

مہربانی کرکے میری بہن سے کہدیجئے کہ گو میں پیغمبر یا غیب داں نہیں تاہم مجھے اس کا یقینِ کامل ہے کہ انشاءاللہ وہ اور میں اپنی موت سے قبل ہوم رول کو ہندوستان میں قائم دیکھ لیں گے لیکن اگر مشیتِ ایزدی یہ ہوئی کہ ہم اپنی دل کی حسرت پوری ہونے سے قبل اس جہانِ فانی سے کوچ کرجائیں تو ہم مسرت اور شکریہ کے ساتھ سرِ تسلیم خم کردیں گے اور اپنے بنانے والے کے سامنے بخوشی اس خیال کے ساتھ جانے کو تیار ہو جائیں گے کہ شاید ہماری وہ کوششیں جو کہ ہم اپنے مذہب، قوم اور غم زدہ بنی نوعِ انسان کے لئے کررہے ہیں۔ ہماری دوسری خامیوں کا کفارہ ہوسکیں ۔۔۔ بعض اوقات مرنا فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے لیکن اس سے زیادہ بڑی چیز اور بہادری کی بات اور بعض اوقات مشکل تر شے یہ ہے کہ آدمی اچھے مقصد کے لئے زندہ رہے اور بے انتہا مشکلات اور روز مرّہ کی ذلتوں اور تکالیف کے باوجود اس کے پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اس لئے میں جناب باری کی درگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ میری بہن مسز بسینٹ کو اور جناب کو جو اس جواں مردی اور بہادری سے کام کررہے ہیں۔ بہت تندرستی، خوشی اور اس سے زیادہ کارآمد زندگی کے بہت سے سال عطا کرے۔

آج میں مبلغ ۵۰؎ روپیہ آپ کو بذریعہ منی آرڈر بھیجتی ہوں یہ بسینٹ فنڈ میں ہماری طرف سے دوسری قسط ہے۔ مجھے محمد علی کی زبانی یہ سُن کر تعجب ہوا کہ گورنمنٹ نے آپ کے نام جو میرا خط گیا تھا اس کی بابت کچھ عجیب سوال کئے اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ سوال تھا کہ میں یہ دس روپے ماہوار کی رقم بسینٹ فنڈ میں کس طرح دے سکتی

ہوں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میرا خط جو آپ کے نام لکھا گیا ہے وہ غور سے نہیں پڑھا گیا۔ ایک عورت جو اپنی چالیس ہزار کی جائیداد فروخت کرکے اپنے بچوں کا قرضہ پندرہ ہزار روپیہ سال کے اندازے سے گذشتہ دو سال کے زمانہ نظر بندی میں ادا کرتی رہی ہو کیا یہ قدرت بھی نہیں رکھتی کہ وہ یہ قلیل رقم فروخت کی حاصل میں سے نکال سکے۔ اور کیا دس روپیہ ماہوار اپنی ضروریات زندگی کو کم کرکے ماہوار مصارف میں سے بچا لینا کوئی غیر معمولی بات ہے بالخصوص جب کہ یہ رقم ایک ایسے مقصد کے لئے ہو جو کہ ہمارے دلوں کو اس قدر عزیز ہے" (چند اہم خطوط، سلسلہ حالات نظر بندان اسلام نمبر ۲۔ انجمن اعانت نظر بندان اسلام دہلی۔ ص ۱۷۔ ۱۸۔ ۲۱)

محترمہ بی اماں کا وہ بیان جس میں انھوں نے تفصیل سے فرمایا ہے کہ محمد علی شوکت علی کیوں آزاد نہ ہوئے بمتعدد رسائل میں شائع ہوا۔ آپ نے اس بیان میں تحریر فرمایا، ۷ ستمبر کی صبح کو ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اس صبح کو مسٹر عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمہ خفیہ پولیس جو شملہ سے آئے تھے میرے دونوں لڑکوں کے پاس آئے۔ ان کو سر چارلس کلیولینڈ محکمہ خفیہ پولیس کے ڈائرکٹر نے بھیجا تھا۔ مسٹر عبدالمجید نے میرے لڑکوں کو ایک عہدنامہ دکھلایا اور کہا کہ سر چارلس کلیولینڈ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس عہدنامہ پر دستخط کریں۔ اس عہدنامہ کا مضمون یہ تھا۔ "میں بقیہ ایام جنگ میں کوئی ایسا کام کرنے، ایسی تحریر لکھنے یا کسی ایسی بات کے کہنے سے جس کا منشا یہ ہو کہ دشمنان تاج کی ہمت افزائی ہو یا ان کو اس سے مدد پہنچے، بچوں گا۔ میں کسی ایسے کام کرنے یا کسی ایسی بات کہنے سے بھی پرہیز کروں گا جس سے بادشاہ کے دوستوں یا حامیوں پر حملہ ہو یا حملہ معلوم ہو۔ میں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوئی ایسا غیر آئینی اور سخت ایجی ٹیشن نہیں کروں گا جس سے امن عامہ کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ تشریح: اور یہ وعدہ جو میں نے ابھی اوپر کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاست میں اپنی حدود کے اندر رہ کر حصہ لینے سے باز رہوں گا۔"

(دستخط سر چارلس)

پھر تحریر فرماتی ہیں کہ میرے بیٹوں نے کچھ دیر تک مطلوبہ طمانیت کی نوعیت، دائرۂ اثر کی بابت مسٹر عبدالمجید سے گفتگو کی اور بعدازاں محمد علی مسودہ لکھنے کے لئے قلم لینے اپنے کمرے میں آیا اور اسی وقت پہلی مرتبہ مجھے یہ حالات معلوم ہوئے میں نے ان کی ڈھائی سال کے بعد آزادی کی شروط سے واقف ہونا چاہا اور بہ ضرورت برقعہ اوڑھ کر اسی کمرہ میں آکر بیٹھ گئی جہاں مسٹر عبدالمجید سے گفتگو ہو رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے حسب ذیل الفاظ سے ان کو مخاطب کیا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ گورنمنٹ میرے بیٹوں کے آزادی بحال کر کے آخر کار ان کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے۔ قدرتی طور پر میں اس سے خوش ہوں کیونکہ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ پچھلے ۲۸ ماہ کے اندر انھوں نے کیا کیا تکالیف اٹھائی ہیں اور ان تکلیفوں کو کس طرح برداشت کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں گورنمنٹ ان سے کوئی عہد لینا چاہتی ہے ان کی عمر اتنی کافی ہے کہ وہ فائدہ اور نقصان کو خود سمجھ سکتے ہیں۔ آج یقینی ان کو میرے کسی صلاح و مشورے کی ضرورت نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ میری طرف سے گورنمنٹ سے یہ کہدیں کہ میرا ایک فرض ان کے ذمہ ہے جو تمام ان فرائض سے مقدم ہے جو دوسروں کے ان کے ذمہ ہوں۔ کیونکہ میں نے نو مہینے ان کو پیٹ میں رکھا۔ ان کی ابتدائی عمر میں ان کو دودھ پلایا اور ہمارے رسول اکرمؐ نے ان کو بتایا کہ ان کی جنت میرے قدموں کے نیچے ہے (ان الجنۃ تحت اقدام امھاتکم) اپنی طویل جلا وطنی اور نظربندی کے زمانے میں انھوں نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے ان سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ان کے لئے کسی ایسی شرط کو مسترد کر دینا کیسا سخت ہوگا جن کے قبول کرنے میں زمانہ دراز کی ان تمام صعوبات کا خاتمہ ہوسکتا ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لئے وہ کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی

گو یہ مجھے عزیز ہیں اور طاقتور اور لحیم و شحیم دکھائی دیتے ہیں۔ باقی ماندہ تمام باتوں کے متعلق میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمیشہ حضور شاہ قیصر کی پابندِ قانون رعایا رہے ہیں اور آپ (مسٹر عبدالمجید) کے سامنے میں ان کو یہ حکم دیتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسے ہی رہیں۔ اور یہی مجھے کہنا تھا اور میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس کو گورنمنٹ سے کہہ دیں۔"

اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آنے کو تھی لیکن میرے بیٹوں نے مجھے روکا اور اس طمانیت نامے کا جو ان سے مانگا گیا تھا۔۔۔ اور اس کا جواب جو مسٹر عبدالمجید کو لکھ کر دینے والے تھے تاکہ وہ اس کو بذریعہ تار سر چارلس کلیولینڈ کو روانہ کریں، ترجمہ کرکے سُنایا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"ہم دونوں ہمیشہ خداترس مسلمان رہے ہیں جو تمام باتوں سے فائق ان احکام الٰہی کو سمجھتے ہیں جو قرآن پاک اور ہمارے رسولِ اکرمؐ کے واقعاتِ زندگی اور اقوال کی صورت میں ہم کو پہنچائے گئے ہیں۔ اس اعتقاد کو ضرر پہونچائے بغیر ہم دونوں ہمیشہ اپنے ملک کے پابندِ قانون اور تمام غیر آئینی و شدت انگیز طریقوں کے مخالف رہے ہیں اور خواہ جنگ ہو یا نہ ہو ہم دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہنے کے خواہش مند ہیں اور اُمید ہے کہ ایسے ہی رہیں گے۔ لہٰذا اگر اب بھی اس مضمون کی کسی طمانیت کی ضرورت ہے تو ہمیں اس کے کر دینے میں کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اطاعت اسلام کو ضرر پہنچے بغیر، ہم ایسا کوئی کام کرنے یا تحریر لکھنے، یا کوئی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دشمنوں کو مدد پہنچانی مقصود ہو یا معقول طریقے سے مدد پہنچنے کا احتمال ہو۔ اور کوئی ایسا کام کرنے یا ایسی تحریر لکھنے، ایسی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دوستوں اور حلیفوں پر کوئی حملہ مقصود ہو یا معقول طور سے اس کا کوئی احتمال ہو کہ اس کے حملے کے معنی لگائے جائیں گے اور ہم کسی شدت آمیز یا غیر آئینی ایجی ٹیشن سے بھی محترز رہیں گے جس سے حفظ عامہ پر اثر پڑنے کا احتمال ہو ہم سمجھتے ہیں اور مندرجہ بالا طمانیت کو اس صاف سمجھوتے پر مبنی کرتے ہیں کہ اوپر جن

احترازوں کا اقرار کیا گیا ہے ان سے ہمارے تمام مذہبی فرائض کو ملحوظ رکھنے کی آزادی کو خفیف ترین درجہ میں بھی محدود کرنا یا ہمیں آئینی حدود کے اندر سیاسیات میں حصّہ لینے سے باز رکھنا مقصود نہیں ہے۔"

میرے بیٹوں نے اپنی پوزیشن کا جو بیان دیا ہے اس نے کامل طور سے مجھے اطمینان دلا دیا ہے اور میں خیال کرتی ہوں کہ ہر شخص کو یہ مطمئن کرے گا" (مدینہ اخبار بجنور ۵ راکتوبر ۱۹۱۷ء)

آزادی ایک نعمت ہے جس کے حصول کی خاطر انسان سبھی کچھ کر گزرتا ہے۔ اس نازک مرحلے پر بڑے بڑے قوی ہیکل مردوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن سرکاری مخبر کی موجودگی میں مجاہد بیٹوں کی اس عظیم ماں نے جس ثابت قدمی اور رفقید المثال جرأت مندی کا ثبوت دیا وہ ان کے ایمانِ راسخ اور غیر متزلزل عزم کی روشن مثال ہے ام الاحرار کا بیان ایک ضعیف مجاہدہ آزادی کی عظمت اور کردار کی بلندی کی ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔

مسز اینی بیسنٹ نے اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد وائسرائے سے ملاقات کی، دورانِ ملاقات علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش ہوا جس میں انھیں ناکامی ہوئی اور جس کے نتیجے سے انھوں نے پبلک کو بذریعہ ایک گشتی مراسلے کے آگاہ کیا۔ بی اماں نے جواب میں ایک طویل خط مسز بیسنٹ کے نام لکھا جس نے بہت سی حقیقتوں پر سے پردہ ہٹایا۔ ایک اقتدار پسند جماعت کے حکام کے جبر و تشدد کی کہانی کو انھوں نے عوام کے سامنے بہ کمالِ جرأت و ہمت پیش کیا ہے۔ خط کا مکمل متن حسب ذیل ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

چندواڑہ (ممالک متوسط)

۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء

عزیز بہن! اگرچہ کچھ عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا ہے، لیکن عرصہ ایک

ماہ کا ہوا کہ آپ نے ہز ایکسیلینسی حضور وائسرائے سے میرے بیٹوں کی آزادی سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد اپنی کوششوں کے متعلق پبلک کی آگاہی کی غرض سے ایک مراسلت شائع کرائی تھی جس کا جواب لکھنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتی لیکن میری طبیعت ناساز تھی، اور محمد علی شوکت علی اور میری ایک پوتی بھی بیمار ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مسٹر گھاٹے مجھے خط و کتابت میں مدد دیتے ہیں۔ ایک مقامی سیاسی کام میں مصروفیت کے باعث موجود نہ تھے۔

اس معذرت کے اظہار کو میں نے اس بنا پر ضروری سمجھا کہ کہیں میری خاموشی سے غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ہز ایکسیلینسی وائسرائے کی ملاقات کے بعد آپ کے اور اس نصیحت کی نوعیت کے متعلق جو آپ نے پبلک کو کی تھی بعض طبقوں میں افسوس ناک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔

میں ان صعوبتوں کا جو آپ جیسی عمر و تندرستی والے شخص کو ان دو طویل سفروں میں جو آپ نے میرے بچوں کی رہائی کی خاطر برداشت کئے اٹھانا پڑی ہونگی محض رسماً نہیں بلکہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کا کوئی اثر آپ کے اس بار احسان پر نہیں پڑتا جو ہم پر ہے، نہ اس سے کوئی تبدیلی اس عقیدے میں پیدا ہوتی ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی۔

جہاں تک میرا اور میرے بیٹوں کا تعلق ہے میں کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہے، اور اس کی حفاظت میں دے دیا ہے۔ ہمیں ایسی بڑی امید کا سہارا ہے جسے کوئی مایوسی توڑ نہیں سکتی، نہ دور کر سکتی ہے، مایوسی بے دینی اور بداعتقادی سے پیدا ہوتی ہے جن کا کہ ہم وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے ہیں، چونکہ ہم کو توفیق الٰہی پر بھروسہ ہے، اسی لئے ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ہمیں ہمارے احباب اور ساتھیوں سے کیا مدد پہنچی ہے نہ اس امر کا کہ ہمارے مہربانوں کی کوششیں جلد یا دیر میں بارآور ہوتی ہیں، صورت واقعات پر کچھ زیادہ اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہم ان کی کوششوں کو محسوس نہیں کرتے، یا ہم کو ان کی تدابیر کے موثر یا غیر موثر ثابت ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں، جو وہ نظر بندوں کی آزادی کے لئے اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ مجھے اس اصلی دشواری سے جو میرے بچوں کی رہائی کے راستے میں حائل ہیں سرکاری نقطۂ نظر سے سمجھنے کا وہ موقع نہیں ملا جو آپ کو ملا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گی۔ اگر میں آپ کی رائے سے پورے طور پر اتفاق نہ کروں، خصوصاً جب کہ آپ اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ بحیثیت اس شخص کے جوان کا عزیز رفیق ہے مجھے ان تمام معاملات کے اپنے بچوں کے نقطۂ نظر جاننے کا بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ موقع ملا ہے، میں فی الحقیقت بڑی خوشی سے آپکی طرح اس امر کے باور کرنے کے لئے تیار ہوتی کہ اگر جنگ موجودہ نازک صورت اختیار نہ کر لیتی، تو حضور والسرائے اور ان کی ممبران کونسل بطیب خاطر میرے لڑکوں کو رہا کر دیتے، لیکن ان وجوہ کی بنا پر جو مسٹر گھاٹے کہتے ہیں کہ وہ اپنے جداگانہ خط میں آپ پر ظاہر کرنے والے ہیں۔ میں آپکی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آسکتا کہ جب گورنمنٹ کے یہ نیک ارادے ہیں تو پھر محمد علی اور شوکت علی کو اصلاحاتِ ملکی سے متعلق وزیر ہند اور والسرائے سے ملاقات کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، اور اس بات پر کیوں اصرار کیا گیا کہ محمد علی اُس وفد کے رکن بھی نہ ہوں جو منجانب انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ جناب وزیر ہند اور والسرائے کی خدمات میں حاضر ہونے والا تھا، آپ فرماتی ہیں "کہ مسٹر محمد علی ٹرکی کے ساتھ جو بے انتہا گو مجہول ہمدردی ظاہر کر چکے ہیں میرے خیال میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کے بموجب اس خطرے سے خالی نہ تھی کہ کہیں یہ مجہولیت سے عملی صورت اختیار نہ کرلے۔

حضور والسرائے سے آپ کی ملاقات کرنے سے قبل یہ امر صاف طور سے نہیں معلوم ہوا تھا کہ ملک معظم کے کس دشمن کے ساتھ میرے لڑکوں نے آزادانہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اب یہ بات صاف ہے کہ میرے لڑکے آسٹرین، بلغارین اور جرمنوں سے نہیں بلکہ صرف ترکوں سے ہمدردی کرنے کے الزام پر نظر بند کئے گئے ہیں

اس لئے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آیا حقیقت میں گورنمنٹ کو ہم مسلمانوں کی حالت کا بخوبی احساس بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ہمارے صحیح حالات کے سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں کو ٹرکی سے اس سے زیادہ خاص ہمدردی نہیں ہے جتنی کہ انھیں چین سے ہے، لیکن مثل اور دوسرے لوگوں کے جن کا قرآنِ مجید پر ایمان ہے انھیں صاف الفاظ میں متعدد جگہ پہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں، اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کریں۔ کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک کہ وہ ٹرکی کے ساتھ ویسے ہی ہمدردی کا آزادانہ اظہار نہ کرے اور اس ہمدردی کی تبلیغ کے لئے کوشاں نہ ہو جیسا کہ وہ مسلمانانِ ایران، ہندوستان و عربستان کے ساتھ کرتا ہے گذشتہ چھ سات سال کا عرصہ دنیائے اسلام کے لئے سخت مصیبت اور رنج کا زمانہ گزرا ہے اور میں فخر کرتی ہوں کہ اس زمانے میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا دیکھا یا سنا، میرے بیٹوں نے اس درد کو محسوس کیا اور ان کے ساتھ رنج میں شریک ہوئے۔ چنانچہ ایران، مراقش اور طرابلس کے مسلمان ٹرکی کے مسلمانوں سے ان کی ہمدردی کے کم مستحق نہ تھے۔ سب کے ساتھ ان کی ہمدردی یکساں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ سب مسلمان تھے اور کلام مجید کی تعلیم کے مطابق وہ سب یکساں ہمدردی کے مستحق تھے۔ یہ بات بھی ناقابل فراموش ہے کہ طرابلس اور بلقان کے ہنگامہ آرائیوں میں مظلومین کے ساتھ جو ہمدردی آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی اس کو وائسرائے و دیگر اعلیٰ حکام گورنمنٹ نے نہ صرف پسند کیا اور اس میں مدد دی بلکہ اعلانیہ اس کو پھیلایا اور مسلمانوں کی اس کے اظہار میں ہمت افزائی کی اور میرے بچوں نے بھی بوجہ سیاسی عقائد بلکہ بطور جزو مذہب کے اس ہمدردی کو آزادانہ طور پر ظاہر کیا اور پھیلایا، اور اس وقت کی بات ہے اب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی جس سے اس مذہبی فرض کی بجا آوری کو کوئی جرم یا گناہ قرار دیا جائے۔

اسی کے ساتھ ہی اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ خواہ وہ کسی خطّے کے رہنے والے ہوں، ان کے برادرانِ ملّت کی ہمدردی لازمی اور ضروری ہے لیکن اعلیٰ حضرت سلطان ٹرکی کی ایک مخصوص حالت ہے۔ بحیثیت ایک دنیاوی تاجدار ہونے کے وہ دنیا کے ایک خطّے پر جو ٹرکی کے نام سے موسوم ہے ایسے ہی حکمراں سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ شاہ کجکلاہ سرزمین فارس میں۔ اور اعلیٰ حضرت امیر افغانستان افغانستان میں سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دنیاوی حکمراں سے جدا گانہ سلطانِ ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے مسلم تاجداروں کو حاصل نہیں ہے۔ یہ امتیاز ان اختیارات، مرتبہ اور عظمت کی وجہ سے ہے جو خلافت کے ساتھ وابستہ ہے سلطان المعظم خلیفۃ الرسول یعنی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور امیر المومنین ہیں، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کم سے کم ہماری گورنمنٹ اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ یہ مذہبی مسئلہ (خلافت) غیر مسلمین کے اختیار سے باہر ہے لیکن عملاً اس اعتراف سے کیا فائدہ جبکہ گورنمنٹ ہندوستان کے بہترین مسلمانوں کو صرف اس جرم میں آزادی سے محروم کر رہی ہے کہ وہ اعلانیہ عالمِ اسلامی کے روحانی پیشوا اور اس کی مسلم رعایا سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں، حالانکہ یہ بھی اقرار ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی مجہول تھی یا اس کے جو کچھ بھی معنی ہوں)

میں دوبارہ اس امر پر زور دیتی ہوں کہ مسلمانانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حکمراں کو مذہبی پیشوا ماننا کوئی سیاسی عقیدہ نہیں ہے جس کو اپنی نجات عقبیٰ کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کا دل چاہے تو تسلیم کرے اور نہ چاہے تو نہ تسلیم کرے نہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس کے تسلیم کرنے والے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے جو ہمارے مذہب کی روح سمجھا جاتا ہے ان کے حدود بھی مذہب میں سختی کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں جس طرح کہ دوسرے مذہبی مسائل ہیں۔ میں کوئی مذہبی عالمہ نہیں ہوں نہ میرے لڑکے عالمِ دین ہیں۔ ہم لوگ اس مسئلے میں بھی مثل دوسرے دینی مسائل کے پیشوایانِ دین کی رہنمائی پر کاربند ہوتے ہیں

تاہم اس قدر تو ہماری طرح تمام مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ اپنے برادرانِ مذہب کے ساتھ جس ہمدردی کے برتنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی حدود کل حالتوں میں یکساں اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ کیا میرے لڑکوں نے اس عجیب مسئلہ کو برطانیہ کے ٹرکی کے خلاف، اعلانِ جنگ کے بعد گورنمنٹ کو پریشان کرنے کے لئے تراشا ہے یا یہ مسئلہ اس مذہب کا جزو ہے۔ جو تیرہ سو برس ہوئے مکمل اور نہ بدلنے والی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا گیا تھا۔ جاہل اور غیر معتبر شخصوں کی رپورٹوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے گورنمنٹ کو اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا اگر غور کیا تو اس فیصلہ کے نتائج پر کاربند ہونے کو تیار نہیں جس کے علاوہ سچائی سے وہ کسی دوسرے فیصلہ پر پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ کم از کم اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ میرے بیٹوں نے دشمنانِ بادشاہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار آزادانہ طور پر کیا۔ اور اسی طرح اس ہمدردی کو پھیلایا اور چونکہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ ہمدردی کب اور کس صورت میں ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی۔ اس لئے یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے ان دعاؤں کے غلط معنی سمجھے ہیں جو تمام مسلمان ہمیشہ سے خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کی افواج کے مظفر و منصور ہونے کے لئے مانگتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ صوبہ متوسط کے چیف کمشنر نے شوکت علی کو ایسی دعا مانگنے سے روکا تھا۔ چنانچہ ان دعاؤں کی نسبت جب مذہبی احکام ان کے سامنے پیش کئے گئے تب وہ حکم امتناعی منسوخ کر دیا گیا۔ اگر میرے بیٹوں نے (اس کے علاوہ) کوئی دوسرا طریقہ ہمدردی کا اختیار کیا تو صاف طور سے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔

ہم کو مسلمانانِ ٹرکی سے جو ہمدردی اور سلطانِ ٹرکی سے جو روحانی عقیدت ہے وہ ہمارے ناقابلِ تغیر مذہب کا ایک لازمی و ضروری جزو ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں، انھیں وجہ سے علی اور مجہول ہمدردی میں جو امتیاز پیدا کیا گیا ہے ہم مسلمانوں کے لئے ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ رہی جذبات کی زیادتی تو اس کی نسبت یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ بمقابلہ فتح و کامیابی کے ہمارے مسلمان بھائیوں کی تکالیف

و مصائب ہمارے دلوں میں ان کے لئے زیادہ ہمدردی پیدا کرتی ہیں اور میں نہیں سمجھ
سکتی کہ روسی ہزیمت جس نے بقول آپ کے اگر جرمنوں اور ترکوں کے حوصلے بڑھا بھی
دیئے ہوں کس طرح میکہ لڑکوں کی ہمدردی اور کامل ترین قانونی آزادی پر اثر ڈال
سکتی ہے۔

گورنمنٹ اس امر کی مختار ہے کہ وہ میکہ لڑکوں کی رہائی کے لئے شرائط پیش
کرے اور جب وہ اُن مجوزہ شرائط کو اپنے تحفظ مذہب کے ساتھ قبول کرلیں تو ان کو
واپس لے لیں۔ اگر اُن کا (میکہ لڑکوں کا) طرزِ عمل کسی سیاسی خیال پر مبنی ہوتا تو
(گورنمنٹ کا یہ رویہ) اس میں تبدیلی پیدا کر سکتا تھا لیکن ان تکالیف نے جو اس ڈھائی
سال کے عرصہ میں انھیں پہونچی ہیں اور جو ان کی سیاسی حماقت بخوبی دور کر سکتی تھیں
ان کو اپنے اس ارادے میں اور پختہ کر دیا کہ وہ کوئی ایسا فعل نہ کریں جو ان کی نجات آخری
کے مانع ہو۔ اور اس معاملہ میں وہ اپنی رائے کو بلا ان تمام چیزوں کے چھوڑے ہوئے جن
کو وہ نہایت عزیز اور مقدس سمجھتے ہیں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کر سکتے اور یقین مانئے کہ یہ
الفاظ ایک ماں کے منہ سے نکلے ہیں۔

میری عزیز بہن میں نے اس مسئلہ پر آپکی بہت سمع خراشی کی لیکن میں
افسوس کے ساتھ یہ بتلانا چاہتی ہوں کہ چونکہ اس مسئلہ پر اس وقت تک پبلک اخبارات
میں بھی کوئی ایسا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا اور میں آپکو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ
باوجود اپنی عبادت اور گھر کے فرائض کی انجام دہی کے جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی
ہے۔ میں تمام اردو اخبارات پابندی کے ساتھ پڑھواتی ہوں اور اکثر انگریزی اخبارات
کا بھی خلاصہ کروا کر سنتی ہوں جو مجھے اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ ہماری غیر مسلم حکومت
نے ہم مسلمانوں کی مذہبی پوزیشن کو اصلی اور حقیقی صورت میں سمجھا ہے اور اس امر کا
اظہار بس غصہ سے نہیں بلکہ کمال حزن و ملال کے ساتھ کرتی ہوں۔ ہماری وفاداری
دنیاوی بادشاہ کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو ہماری کامل مذہبی آزادی
کے ساتھ مشروط ہے اور خدا سے ڈرنے والے مسلمانوں کی حیثیت سے ہم دنیا

کے کسی حکمراں کے ایسے احکام کی تعمیل نہیں کر سکتے جو احکم الحاکمین کے احکام کے خلاف نافذ کیئے جایئں اس لیے کہ خدا کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے خواہ وہ اطاعت بادشاہ کی ہو یا ملک کی۔ باپ کی ہو یا ماں کی۔ بھائی کی ہو یا احباب کی۔ میری رائے میں اگر کوئی بادشاہ یا حکومت کسی مسلمان کے اس قرار پر اعتماد کرکے کہ حکومت کی اطاعت کو خدا کی اطاعت پر مقدم رکھتا ہے تو وہ بادشاہ یا حکومت ٹوٹی ہوئی لکڑی کے بل پر کھڑی ہے، میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ دنیاوی حکومتوں کی ضروریات لباً اوقات اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ خدا کی اطاعت ان کی وفاداری کے مساوی بھی جاوے اور ہر مذہب کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کی رواداری بعض اوقات دشوار ہو جاوے۔ دنیاوی حکمرانوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ رعایا کے حقیقی مذہبی جذبات سے آگاہ ہوں اور اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق طے کریں تاکہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ رعایا کی مذہبی اطاعت اس کی دُنیاوی اطاعت کے متضاد ہو ہر گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ رعایا کی اس نازک حالت کو پورے طور سے محسوس کرے جبکہ اس کو خدا کی فرمانبرداری اور انسان، یا انسانوں کی ایک جماعت کی اطاعت شعاری میں انتخاب کرنا ہوتا ہے خواہ وہ انسان یا جماعت کیسی ہی اعلیٰ مرتبت کیوں نہ ہو۔ ایسے انتخاب کے وقت دوسرے چاہے کچھ کریں لیکن مُسلمان صرف ایک راستہ اختیار کر سکتا ہے ملک اور بادشاہ کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیئے کوئی شخص دوسرے سے اس کی روح کے حوالے کر دینے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے لڑکوں نے کبھی اپنے مذہبی عقائد کو پوشیدہ رکھا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عقائد دیگر مسلمانانِ ہند کے عقائد سے مختلف ہیں اس لئے کہ تمام مسلمانانِ ہند بالاعلان کہہ رہے ہیں کہ جو محمد علی اور شوکت علی کا عقیدہ ہے وہ ہی ہمارا بھی عقیدہ ہے اس لئے کہ سب بھی اگر ان سے زیادہ نہیں تو ان سے کم نظر بندی کے سزاوار نہیں اپنی نظر بندی سے برسوں پہلے انھوں نے بار بار گورنمنٹ کو اپنے عقائد سے مطلع کیا ہے اس لئے ان پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا

کہ انھوں نے دفعتاً گورنمنٹ کے سامنے کوئی انوکھے خیالات پیش کئے ہیں۔ میری عزیز بہن! یہ بہت کمزور قسم کا تدبّر ہے کہ پہلے تو رعایا کے مقدّس عقائد کو نظرانداز کیا جائے اور پھر بعد میں ان کو ان عقائد رکھنے کے بنا پر سزا دی جائے اگر گورنمنٹ کا منشاء سات کروڑ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرض کے ادا کرنے سے روکنے کا ہے تو چند مسلمانوں کی نظر بندی خواہ وہ کیسے ہی عزیز مذہبی اور سیاسی رہنما کیوں نہ ہوں بہت معمولی سزا ہے۔ کیا مسلمان کا ہر فرد اپنے مقدّس پیغمبر کے اس عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا ہے کہ تحقیق میری عبادت اور ریاضت حیات و موت اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے جس کا کوئی شریک نہیں میں اس کی طرف سے مامور ہوا ہوں اور اس کی اطاعت گذاری میں سب بندوں سے آگے ہوں؟ کیا باوجود اس اعتقاد کے کوئی سچّا مسلمان نظربندی زندان یا موت سے ڈر سکتا ہے؟

میں بہت کچھ لکھ چکی ہوں مگر آپ کی اس تجویز کے متعلق کہ میرے لڑکوں کا مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش کیا جائے اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر میں یہ خط ختم نہیں کر سکتی افسوس کہ میں قانون سے واقف نہیں نہ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہے جو میری رہنمائی کر سکتا۔ مگر میرے لڑکوں کو اس کا کچھ تجربہ ہے اور اُن کے بعض دوست اور ہمارے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے قانون سے بخوبی واقف ہیں اور اس کے عملدرآمد کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میرے لڑکوں کے مقدمہ کے لیے موافق پہلو پر عدالت میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور ہائی کورٹ کا فیصلہ قانون تحفظِ ہند کے جواز یا عدم جواز تک محدود رہے گا جس کو وائسرائے کی کونسل نے پاس کیا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس بات کو منظور کر لیتی کہ میرے بچوں کے اوپر ایک باقاعدہ عدالت میں غیر جانبدار اور منصف ججوں کے سامنے مقدمہ چلایا جائے گو کہ میں جانتی ہوں کہ محمد علی کی شکستہ تندرستی پر ایسے مقدمے کے جوش کا نہایت خوفناک اثر پڑے گا لیکن جو چاہے سو کہے قانون سے فائدہ صرف روپیہ والے اٹھا سکتے ہیں۔ اور اگر اس کے حریف کے تمام اخراجات مقدمہ

خزانہ عامرہ سے دیے جائیں تو ہمارے مالدار سے مالدار آدمی کا بھی دوالہ نکل جائے۔ آپ نے خاص ہمدردی و عنایت سے قانونی اخراجات کے لئے ایک فنڈ کھولا ہے اور ہیں اپنی جیب خاص سے بھی چندہ عنایت کیا ہے لیکن میں آپ سے صاف طور پر پوچھتی ہوں کہ کیا اس میں کوئی فائدہ بھی ہے۔ اگر ہم نے اپنے حاکموں کے خلاف کوئی فیصلہ کرا بھی لیا تو کیا آپ اُمید کرتی ہیں کہ وہ اس معاملے کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ اور نچلے بیٹھ جاویں۔ اگر ہم آپ کی طرح یہ یقین بھی کر لیں کہ اگر جنگ کی حالت اس قدر نازک نہ ہوتی جتنی کہ آجکل ہے تو وائسرائے اور ان کی کونسل میرے بیٹوں کو بخوشی رہا کر دیتی تو کیا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جنگ اور میرے بچوں کی رہائی کے تاریخ کے متعلق اپنے موجودہ خیالات رکھتے ہوئے وہ میرے بیٹوں کی رہائی کو صرف اس وجہ سے خوشی سے دیکھ سکیں گے کہ الہٰ آبادکی ہائی کورٹ ہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسے میرے بیٹوں کو آزادی سے محروم کرنے کا کوئی اختیار نہیں ؟ اور کیا وہ ایسی زبردست طاقت (قانون تحفظ ہند) کو اپنے ہاتھوں سے ایسی آزادی کے ساتھ نکل جانے دیں گے اور ہزاروں ہندوستانیوں کو جو اب قید میں پڑے سڑ رہے ہیں آزاد ہوتے دیکھ سکیں گے ؟ کیا اس وقت برطانوی پارلیمنٹ سے قانونِ تحفظ ہند کو جائز قرار دینے یا اسی قسم کا کوئی دوسرا قانون بنا دینے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا ؟

لیکن ان سب باتوں پر غور کر کے فیصلہ کرنے کا انحصار آپ لوگوں پر ہے جو عام حالات سے بخوبی واقف ہیں مگر میری رائے میں ان باتوں سے بدرجہا زیادہ ضروری ایک اور مقصد کیلئے چندہ کرنا ہے اور وہ مقصد اُن نظربندوں اور ان کے متعلقین کی امداد ہے جو اس نفرت انگیز قانون کی وجہ سے سخت مصائب اور آلام اٹھا رہے ہیں۔ آئے دن ان مصیبت زدوں کے دردناک قصے سُنے جاتے ہیں جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو گورنمنٹ نے آزادی سے محروم کر دیا ہے اور پھر ان کو اس بات کا بھی اختیار نہیں کہ کمائی کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکیں اور اس کے ساتھ ہی حکومت نے ان کی گذر اوقات یا ضروریات زندگی

کے لئے اپنی طرف سے کسی قسم کی امداد دینے کے خیال کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی حالتوں میں خودکشی کی خبریں بھی سنی گئی ہیں۔ میں پھر وہی کہتی ہوں جو میں نے اپنے عزیز بھائی سر سبراملی آئر کو لکھا تھا کہ کوئی صورت ان بدنصیبوں اور ان سے زیادہ بدنصیب ان کے متعلقین کے لئے جن کی معصومیت میں قطعی کلام نہیں روپیہ مہیا ہونے کی ہو سکتی ہے؟ گزشتہ ڈھائی برس میں حکومت کے قطعی ناکافی امدادی رقم میں گذر اوقات کرنے کا جو تجربہ مجھے ہوا ہے اس سے اندازہ کر سکتی ہوں کہ ان لوگوں کو ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے کی کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا جو ہم سے بھی زیادہ بدقسمت ہیں۔ ہمارے پاس کچھ جائیداد تو ہے جو سخت ضروریات کی حالت میں فروخت کی جا سکتی ہے (کچھ عبارت مٹ گئی ہے) جو ہماری تکلیف کی خبر سنتے ہی اس کو رفع کرنے کے لئے مستعد ہوتے ہیں۔ علاوہ مالی امداد کے یہ خیال کر کے بھی بہت ہمت بندھتی ہے کہ اگر ہم جلاوطن یا شہر بدر ہیں تو ہمارے ان ہم وطنوں کو ہماری حالت کا احساس ہے جو آزاد ہیں اور آرام بلکہ عیش کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ صرف ان بیسیوں مسلمانوں کا جس میں زیادہ تر مذہبی رہنما یا مقدس کتابوں کے پڑھنے والے ہیں۔ جن کے متعلقین کی مصیبتوں کا حال اُردو اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے بلکہ سینکڑوں بنگالی نوجوانوں کا خیال کر کے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے جو مختلف جگہ نظر بند ہیں اور جن میں سے بعض تنہا کوٹھریوں میں قید ہیں اور جنھوں نے دوامی فاقہ کشی کا مستقل ارادہ کر لیا ہے کہ یہ ہماری حب الوطنی پر ایک بدنما دھبہ نہیں کہ تقریباً تین سال تک ایک نفرت انگیز قانون پر سختی کے ساتھ عملدرآمد ہونے کے باوجود ہم نے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا جس سے ایک تفصیلی یادداشت تمام نظر بندوں کی ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون کون شخص اور کس کس جگہ نظر بند ہیں یا کس وجہ سے نظر بند کئے گئے ہیں۔ اور کس قسم کی قیود ان پر عائد کی گئی ہیں اور بعد میں اکثر بغیر کسی سبب کے ظاہر کئے ہوئے ان پر کس قسم کی تازہ سختیاں

عائد کی گئی ہیں۔ ان کے لئے اور ان کے متعلقین کے لئے جن کی پرورش ان پر لازمی ہے کس قدر وظیفہ مقرر ہے اور نظر بندی سے پہلے جس طریقے سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس کو خیال کر کے ان کی بسر اوقات کے لئے اُن کو مقررہ امداد کے علاوہ کس قدر دیگر امداد کی ضرورت ہے اور نظر بندوں کے وظائف مقرر کرتے وقت ان امور کو بالعادات فراموش کر دیتی ہے۔ نظر بندوں کے متعلق کفالت کا انتظام ان بچوں کی مناسب تعلیم گورنمنٹ کے پاس ان کی (تحریر مٹ گئی ہے) سلسلہ میں قائم رکھنا اور نظر بندوں کو مقامی حکام کے جائز استعمال اختیارات سے بچانے کے لئے جو بعض اوقات اس حکومت سے بھی زیادہ ان لوگوں سے ناراض ہوتے ہیں جن کے حکم سے یہ لوگ نظر بند ہوئے ہیں اور جو عملی تشریحات اور شہر والوں پر خفیہ سرکاری دباؤ ڈال کر نظر بندوں کی پابندیوں کے اضافہ کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان تمام اُمور کے متعلق یادداشت کا مرتب کرنا میرے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کے انتظام کی راہ میں کوئی ایسی دشواری حائل نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی تدابیر پر بھی عمل کیا جائے جو نظر بندوں کی رہائی کے لئے مناسب سمجھی جائیں خواہ وہ قانونی چارہ جوئی ہو یا سرکاری عمال سے اپیل ہو اور یا برطانوی قوم اور پارلیمنٹ سے درخواست ہو یا خود اپنی ہی قوم کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نظر بندوں کے شریکِ حال ہوں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ خوش قسمتی سے میرے بچوں کو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پوری مدد مل جاتی ہے مگر دوسرے لوگ ایسے خوش قسمت نہیں ہیں اور ان کی طرف خاص طور سے دست امداد بڑھانا چاہیئے۔ ان بچاروں نے پبلک لائف میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی اور جب کہ ہم چند مشہور لوگوں کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں جو اپنی قومی کوششوں کے باعث مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ جو زیادہ مشہور

نہیں ہیں بھلا دیئے جاویں اور اگرچہ ان کی تکلیف دوسروں سے زیادہ ہیں اور ان پر کسی سے کم زیادتی نہیں ہوئی ہے۔

ایک اور امر ہے جس کے متعلق زیادہ نہیں تو سرسری اشارہ کرنا چاہتی ہوں اور وہ شاہ آباد اور گیا و پٹنہ کے اضلاع میں عیدالضحیٰ کے موقع پر فسادات کے جگر خراش واقعات ہیں ان واقعات کا مسلمانانِ ہندوستان پر قدرتاً بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اثر اُس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ان مسلمان مردوں اور عورتوں کی خوفناک مصیبتوں اور مذہبی توہین کا آپ کو بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہے جتنا کہ مجھے۔ میرے دل پر ان واقعات کا جیسا کہ چاہیئے بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ واقعات ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوئے جبکہ ان کو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ان حادثات نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہمیں اس مذہبی تعصب کی کتنی بیخ کنی کرنی باقی ہے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور جن کو ہمارے حریف ہم کو ہمارے گھر کی ملکیت سے محروم رکھنے کا بہانہ بنائے ہوئے ہیں جو کچھ ہم کر چکے ہیں ہمیں اس پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دل سے کوشش کرتے رہنا چاہیئے کہ اس قسم کے ناگفتہ بہ واقعات دوبارہ ظہور پذیر نہ ہوں اور خاص کر اس وقت میں جبکہ برعکس موجودہ زمانے کے ہم خود اس قسم کے بدنظمی کے انسداد کے تمام و کمال ذمہ دار ہوں۔ یہ معلوم کرکے مجھے تسکین ہوتی ہے کہ باہمی شکوہ و شکایات کے باوجود ہماری قوم اس وقت کی شدید ترین ضرورت کو نظر انداز کر رہی ہے اور وہ ضرورت ان سے زیادہ مصیبت زدوں کی امداد کرنا ہے جن کے پاس نہ پیسہ ہے نہ روٹی نہ کافی کپڑے ہیں نہ رہنے کا جھونپڑا ہی ہے جسے وہ اپنا گھر کہہ سکیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ان کی مدد کرنے کے لئے اور زیادہ کوشش کی جائے۔

ایک بات جس پر میں فخر کرتی ہوں اور جسے دیکھ کر مجھے مسرت ہوتی ہے یہ ہے کہ ان جگر خراش واقعات نے میرے ہم مذہبوں کے عقیدے میں کوئی فرق

نہیں ڈالا ہے کہ بالآخر ہندوستانی مفاد ایک ہی ہے نہ ان واقعات نے ان کے اس عزم میں کسی قسم کی کمزوری پیدا کی ہے کہ اقوام عالم میں جس درجہ اور مرتبہ کا ہندوستان ایک مدت سے مستحق ہے اس کو بلا توقف حاصل کرنا چاہیئے۔ خودغرض اشخاص کرو ڑہا بے زبان ہندوستانیوں کی ترجمانی کرنے کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن وہ کتنا ہی حقیقت کو چھپانا چاہیں اور وزیر ہند صاحب سے جن کا ہم نے خوشی سے خیر مقدم کیا ہے ملنے والوں کے بجائے وزیر ہند کے خود انتخاب کر کے کتنے ہی واقعات کی پردہ پوشی کرنا چاہیں کبھی وزیر ہند صاحب اس امر کو بغیر محسوس کئے ہوئے نہیں رہ سکتے کہ باوجود اس اشتعال کے (واقعات اضلاع شاہ آباد، گیا، پٹنہ) سمجھدار مسلمانوں کی حب الوطنی مثل سابق کے ہے۔ اور وہ اس راہ سے جو انھوں نے اپنی قوم کے لئے بڑے غور و فکر کے بعد طے کی تھی منحرف نہیں ہوئے۔ ان بے انتہا پریشان کن حادثات کے صدمہ کے موقع پر وہ ثابت قدم رہے ہیں۔ اس سے بہترین طور پر ثابت ہے کہ مسلمان اپنے قومی احساسات کو محو کئے بغیر تمام ملک کے ساتھ کس قدر خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ مجھے ایک طرح خوشی ہے کہ یہ سانحات خاص ایسے ہی وقت میں ظہور میں آئے۔ یہ ہوم رول کا ابتدائی پھل یا مزہ نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کا رعایا کو جواب دہ ہونے کا لوازمہ ہے۔ میں دعا کرتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ مسلمانوں نے ان واقعات سے پریشان ہوئے بغیر اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا جو تہیہ کر لیا ہے اس کے اجر میں امن و عافیت اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے ان کو کامل آزادی اور پوری ذمہ داری ملے گی۔ اور یہی چیزیں امن و انتظام اور کامل رواداری کی بہترین ضمانت ہیں۔

عزیز بہن! میں اب آپ سے جدا ہوتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ کلکتہ میں قوم کے بحث و مباحثہ میں کامل غور و خوض کے بعد آپ کامیابی کے ساتھ اس کی راہ نمائی کریں۔

میں صرف یہ اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ یہ خط میں نے مسٹر گھاٹے کی مدد سے

لکھا ہے جو دو سال سے ہم لوگوں کے پاس آتے جاتے ہیں اور ہمارے تمام حالات سے
پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ مجھے مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے کیونکہ گذشتہ ستمبر میں جو خط
میں نے اخباروں کو بھیجا تھا اس کے بابت سرکار نے غلطی سے یہ یقین کر لیا کہ اس کو
میرے بیٹوں نے لکھا تھا۔ اور اس بنا پر ان کو دھمکی بھی دی گئی کہ اگر ان سے وہ خطا جس
کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے دوبارہ سرزد ہوئی تو ان پر اور زیادہ قیود لگائی جاوینگی۔
اگر وہ آزاد ہوتے تو میں قدرتاً ان سے امداد لیتی لیکن جیسا کہ آپ جانتی ہیں ان کے آزاد
نہ ہونے کی وجہ سے مجھے مسٹر گھاٹے سے متعدد بار مدد لینا پڑی۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ
ہم غریب پردہ نشینوں کو کس قدر ناقابل خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرے زمانے کی
بیبیاں اسکول اور کالجوں میں نہیں جاتی تھیں لیکن تعلیم ہمیشہ سے اس قسم ہی کی درسگاہوں
میں نہیں دی گئی ہے اور آج بھی تعلیم صرف ان ہی کے ذریعہ سے نہیں دی جاتی ہے۔ میں
خود ایسی عورتوں سے واقف ہوں جن کو میری طرح کم سنی میں بیوگی میں تمام بار برداشت
کرنا پڑے جن کا تعلق مردوں سے تھا۔ اور انھوں نے ان غیر معمولی خدمتوں کو اس
عمدگی سے انجام دیا کہ جو نہ صرف ان کے لئے قابلِ تعریف ہے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی
مفید ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ستمبر کے سادہ بیان میں کونسی ایسی
بات تھی جو مسٹر گھاٹے جیسے یونیورسٹی کے قابل گریجویٹ اور تجربہ کار شخص کی قابلیت
سے باہر تھی۔ میں نے مسٹر گھاٹے کو بڑی محنت کے ساتھ وہ تمام باتیں سمجھا دی تھیں جو میں
لکھوانا چاہتی تھی۔ اور پھر آخر میں اس بات کا اطمینان بھی کر لیا تھا کہ جو میں چاہتی
تھی وہ ہو گیا۔ غالباً اس بات کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ جب بدقسمتی سے ان معصوم
بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تو یہ غریب پردہ نشین ماں تھی جو ان کی تعلیم
کی منتظمہ و نگہبان تھی۔ اور آج بھی ان تمام گھر کی مالک ہے اور تمام اہم معاملات
میں کم از کم ان سے مشورے کئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

ان کی ماں جو ان کے ساتھ زبردستی کے جلاوطنی میں رہ کر خود بخود اپنے آپ
کو چھنڈواڑہ سے باہر بقیہ دنیا سے کلیتہً علیحدہ نہ کر سکی تو اس میں نہ میرا کوئی بس

ہے نہ ان کا۔ یہ خیال کر کے ان کو کچھ تسکین ضرور ہو گی کہ اگرچہ پہلی مرتبہ بغیر کسی وجہ یا سبب کے ظاہر کیے ان پر مزید قیود عائد کی گئی تھیں۔ اور ان کی تمام فکر و احتیاط حکام کے ناجائز استعمال اختیارات سے ان کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ اس مرتبہ ان کو بوڑھی ماں کی بدولت یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ ان کو یہ معلوم ہو گا کہ کس گناہ کی پاداش میں ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ چاہے وہ اپنے مذہبی عقیدہ کے باعث مصیبت جھیل رہے ہوں جیسا کہ سرکاری باتوں سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، یا اپنے ملک کی بدولت جس کی خدمت گذاری میں انھوں نے ان لوگوں کی ناراضگی اور کینہ کے باعث مصیبت اٹھائی جنھوں نے حکومت کا اجارہ لے لیا ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس بات کا فیصلہ ہے کہ ان کو آزاد کیا جائے یا نہیں۔ میں دعا کرتی ہوں اور آپ سے بھی دعا کرنے کی درخواست کرتی ہوں کہ خدایا آخر تک ان کو برداشت کی قوت دے۔ خواہ اس قید ستم کی انتہا قریب ہو یا دور میرا کامل یقین ہے کہ فتح حق و انصاف اور صداقت ہی کی ہوتی ہے۔ ہم بھروسے کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے ہیں اور جب تک وہ حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک جیسا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ صبر و دعا سے کام لیتے ہیں۔"

انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۷ء — آپ کی عزیز بہن
(چند اہم خطوط: تذکرہ ص ۲۳۔ تا ۲۸) — (آبادی بانو عبدالعلی بیگم)

جب محترمہ بی اماں کو ہندوستانی خواتین کے اس وفد کا ایک رکن مقرر کیا گیا جو ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والا تھا تو انھوں نے اپنی عدم شرکت کی وجوہ کی توضیح کرتے ہوئے مسز اوما نہرو الہ آباد کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"اس کے علاوہ چند اور امور ہیں جن کو میں نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ آپ کو جتا دینا چاہتی ہوں اور مجھے یقین کامل ہے کہ میری تحریر کا مطلب

غلط نہ سمجھا جائے گا۔ خواہ باہر کے لوگ جو ہمارے ملک کو مشکل ہی سے دنیا کا کوئی ملک
خیال کرتے ہوں گے۔ ہندوستان کی مصیبت زدہ پردہ دار عورتوں کے متعلق
کچھ بھی خیال کیوں نہ کریں مگر آپ جانتی ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ اپنی
چھوٹی سی حکومت میں کیا حیثیت رکھتے ہیں عورتیں اپنے گھروں کی ملکہ ہوتی ہیں اور ہمیں
اپنے گھروں میں کس قدر وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور
ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کے لئے نئے طریقے اختیار
کریں اور یہ بھی قابل اجازت ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی اپیلوں کو لے کر غیروں کے سامنے بھی
جائیں خواہ ہم اپنے مقصد کی کامیابی کے متعلق کتنے ہی مشتبہ کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر
کیا میں آپ سے دریافت کرسکتی ہوں کہ آیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اپنی متحدہ چار دیواری
کے اثرات ڈال کر اپنے بیٹوں، بھائیوں یا بابلوں سے مطالبہ کرتے بجائے اس کے
کہ ہم بھکاری کے طور پر کسی دوسرے کے پاس جائیں خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ حیثیت
کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس معاملے میں میری رائے بہت سخت ہے اور آپ کو مدنظر
رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک ایسی عورت کی رائے ہے جو پرانے زمانے کی ہندوستانی
عورت ہے مگر وہ اپنے آپ کو نئے خیالات سے بھی بہرہ ور رکھنے کی کوشش
کرتی ہے:

اس کے بعد اسی خط میں آپ لکھتی ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی وفد پرانے
ایام میں کسی ہندو یا مسلمان بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو اسے " رعایا کے
باپ " سے ۹۹ فیصدی وہ ثمر مراد حاصل ہو جاتا جس کا وہ طالب ہوتا، خواہ اس
کے عطیے سے مردوں کو متعدد بار بھی انکار کیا جا چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ
خیال کرتا کہ اس طرح اس کی غیر معمولی عزت کی گئی ہے۔ اس کے قصر کے طائر
اس واقعے کے راگ گاتے اور لوگ اس بادقار کو رازِ دائم بنا دیتے۔ آپ کے وفد
کے نتیجے کی نسبت میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر ہماری یہی بہادر بہن
مسز بیسنٹ کے ساتھ ان کی اس کوشش اور جدوجہد کی وجہ سے جو

انھوں نے سلطنت برطانیہ کو دوام بخشنے کے لئے کی ہے جو کچھ برتاؤ ہوا اس کو مد نظر رکھ کر میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتی ہوں کہ بہادر اینگلو انڈین پریس کی طرف سے آپ لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ کاش ہندوستانی عورتوں کی عزت کی خاطر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مردوں کی عزت کی خاطر کوئی ایسا وفد وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے نہ جاتا۔ بلکہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس جاتا اور نہایت صفائی سے اعلان کر دیتا کہ ہندوستان کی خواتین اپنے مردوں سے کیا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ عورتیں جو کچھ طلب کرتیں مرد جلد یا بدیر ان کے مطالبات پورے کر دیتے۔ یہ تمام دنیا کی تاریخ کا ایک سبق ہے۔ یہ آخری وجہ جو آپ اپنے مدراس کے وفد میں شریک نہ ہونے کے متعلق پیش کرتی ہیں وہ ذاتی ہے۔ امید ہے کہ اینگلو انڈین حضرات اور مسٹر مانٹیگو اس کی پورے طور پر قدر کریں گے۔

تمام باتوں کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ میں کس وجہ سے مدراس میں آپ لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہو سکوں گی اور یہ وجہ میری ذاتی وجہ ہے۔ صاحب وزیر ہند ایک آزاد ملک سے آئے ہیں اور آزاد آدمی کی حیثیت سے وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں سے ملیں اور گفت و شنید کریں جن کی حیثیت یہ ہو کہ وہ انھیں بتائیں کہ ہمارے ملک کی ضروریات کیا ہیں اور ہم اپنے ملک کی بہبودی، خوشحالی، اس کو بلند کرنے کے لئے کیا چاہتے ہیں مگر طاقت اور انگریزی سرکاری ملازمین نے جو تحقیقات خواہ ان کے کسی اہل ملک کے ہاتھوں کی جائے یا کسی ہندوستانی کے ہاتھوں سوائے کچھ کھونے کے کچھ حاصل نہیں کرتے۔ یہ مناسب خیال کیا کہ جس وقت تک صاحب وزیر ہند اس ملک میں رہیں ہم لوگوں کی طرح پردہ نشین رہیں اور ان لوگوں سے نہ ملیں جو نہایت آزادی کے ساتھ صورت حال کو ان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔ ان لوگوں میں میرے نظر بند بچے بھی شامل ہیں اور جن کو ملنے دیئے جانے کی اجازت سے گورنمنٹ ہند نے انکار کر دیا۔ یہ نہایت تعجب انگیز امر ہوگا کہ صاحب وزیر ہند جن کی رگ و پے میں ایک آزاد ملک

میں پرورش و نشو و نما پانے کی وجہ سے آزادی کی روح ہے ۔ ان کو تو مشرقی
ملک کی آب و ہوا میں رہنے کے قابل بنانے کے لئے پردہ میں رکھا جائے اور
میں جو پردہ نشین عورتوں کی طرح پلی ہوں پردہ سے نکل کھڑی ہوں ۔ اگر میں
رسم و رواج کو چھوڑ کر (وفد میں شریک ہونے کو) تیار بھی ہو جاؤں تو یہ ممکن ہے
کہ اسی دوران میں صاحب وزیر ہند پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں کہ میں
ان سے اہم معاملات مثلاً مذہبی عزت و احترام، ہندوستانی عورتوں اور مردوں
کی زندگیوں اور آزادی کے متعلق کچھ نہ کہہ سکوں میں ان سب باتوں کو ایک ایسی
لازوال قوت کے سامنے پیش کرنے کے لئے اٹھائے رکھتی ہوں جس کی ذات
کسی التجا کرنے والے کو نا امید کرنے سے بہت اعلیٰ ہے اور جو خود لوگوں کو التجائیں
پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ انھیں پورا کیا جائے" (اخبار جمہور کلکتہ ۔ ۷/ جنوری ۱۹۱۸ء)
وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والے زنانہ وفد کی فہرست میں بی اماں کا اسم
گرامی اخبارات میں دیکھ کر مدراس کے آنریبل یعقوب حسن نے آپ کو دعوتی
خط تحریر کیا کہ آپ مدراس تشریف لائیں تو میرے یہاں قیام فرمائیں جواباً جو خط
تحریر کیا گیا (۷/ دسمبر ۱۹۱۷ء) اس کا بقول ایڈیٹر اخبار "مدینہ" "ایک ایک
حرف غیوری کا نقش اور خدا پرستی کا نشان ہے"۔ وہ فرماتی ہیں .... "علاوہ ازیں میں
نہیں جانتی کہ اس وفد کی کون سی ضرورت ہے جو مطالبات ہندوستان کی عورتیں پیش
کرنا چاہتی ہیں ان میں سے چند تو ایسے ہیں جن کو ہمارے مردوں کو ہی پیش کرنا
چاہئیں ۔ ہاں اگر وہ مطالبات کو مردانہ وار پیش کرنے کی ہمت
نہیں رکھتے تو ہم عورتوں کا فرض ہوتا کہ خود جا کر ان کو وزیر ہند کے سامنے پیش
کرتے اور اپنے مردوں کو غیرت دلاتے ۔ مگر خدا کے فضل سے مردوں نے اب
تک ایسی کمزوری نہیں دکھائی ہے کہ ہمیں انھیں غیرت دلانے کی ضرورت پیش
آئے ۔ باقی مطالبات جو عورتوں کے مخصوص حقوق سے متعلق ہیں ان کے بارے میں کیا
یہ کہنا مناسب ہے کہ انھیں اپنے مردوں کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کریں
اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جس سے مردوں اور عورتوں دونوں

کی سبکی ہے۔ خاص میرے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کہ وزیر ہند وائسرائے گورنمنٹ کے مشورے پر مرد ہو کر میرے لڑکوں سے پردہ کرتے ہیں تو مجھے تو عورت اور پردہ نشین ہو کر اُن سے اور بھی زیادہ پردہ کرنا چاہیئے۔ مجھے نہ اپنے لئے اور نہ اپنے بچوں کے لئے ان سے کچھ مانگنا ہے۔ میرے لئے خدا کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور دن ورات میں کم از کم پانچ سات بار اس چوکھٹ پر سر جھکاتی اور ہاتھ پھیلاتی ہوں جو مجھے درکار ہے صرف وہیں سے مل سکتا ہے اور جب اس کا ملنا مناسب ہوگا آپ مل رہے گا۔ مجھے میرا خدا کافی ہے"۔ (اخبار مدینہ بجنور ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء بحوالہ قومی رپورٹ)

اسی دوران علی برادران کی اسیری سے متعلق اہل وطن کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی لیکن ان کی رہائی کیلئے ملک کے مختلف گوشوں اور تنظیموں کی طرف سے اٹھائی گئی ہر آواز برطانوی سامراجیت سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے کلکتہ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے محترمہ بی اماں ۲۵ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ تشریف لائیں عوام کے بے پناہ جوش وعقیدت کے درمیان وہ "اجلال سکندری اور شانِ جمشیدی کے ساتھ کلکتہ میں داخل ہوئیں شاید اس ملکۂ حریت کے استقبال کو شکوہ اسکندری یا جلالت جمشیدی کے ساتھ تشبیہ دینا غلط ہے کیونکہ جلوس شاہانہ ہمیشہ استبداد کا علم بردار رہا ہے اور ظاہرداری کا منظر عام ہوتا ہے۔ عقیدت واخلاص سے شاید ایک متنفس بھی اس میں شریک نہ ہوتا۔ مگر اس بے تاج کی ملکہ حریت کے جلوس استقبال سے اس خلوص وعقیدت کی آوازیں ہمارے کانوں میں آرہی ہیں جو گدایانِ الٰہی کے سوا ملوک اقالیم کو نصیب نہیں ہوتیں"۔

(مدینہ بجنور یکم جنوری ۱۹۱۸ء)

کلکتہ میں کانگریس کا دوسرا اجلاس ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بی اماں کی موجودگی میں ہوا اس میں علی برادران کی رہائی کا ریزولیوشن متفقہ رائے سے منظور

کیا گیا۔ اجلاس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جناب قاضی عبدالغفار نے اپنے اخبار "جمہور"
میں لکھا "۲۸ دسمبر کو ۱۲ بجے مسز بیسنٹ کے تشریف لانے کے غلغلے سے کانگریس کا پنڈال
گونج اٹھا اور اس وقت جو نظارہ مادرِ ہند کے فرزندوں نے دیکھا وہ کانگریس کی ۳۲
سالہ تاریخ میں پہلا نظارہ تھا۔ کانگریس کے سربرآوردہ فدائیوں کے حلقے میں سن رسیدہ
محترم خاتون (مسز بیسنٹ) برقعہ پوش قابلِ احترام خاتون (والدہ محمد علی)، مسلمانوں کے
ہر دلعزیز اور سچے فدائیوں کی ماں کا بازو پکڑے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئیں۔
مسٹر محمد علی و شوکت علی کی والدہ کے داخل ہونے کا صحیح خاکہ پیش کرنا سخت مشکل ہے
مگر ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ آگے آگے والنٹروں کی ایک جماعت تھی اور اس کے
بعد محمد علی کی والدہ سپید برقعہ اوڑھے لکڑی کے سہارے چل رہی تھیں۔ مسز بیسنٹ
ان کا بازو پکڑے ہوئے تھیں اور ان دونوں خواتین کے جلو میں ہندوستانی سیاست
کے تاج کے درخشاں ہیرے تھے جن میں مسٹر تلک کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ
سادہ مگر دلوں پر اثر کرنے والا جلوس بندے ماترم، محمد علی، شوکت علی کی جے کی پرجوش
آوازوں میں سے ہو کر ڈائس تک پہنچا۔ محمد علی و شوکت علی کے متعلق ریزولیوشن پر
تقریر کرنے کے لئے مسٹر تلک کو مدعو کرتے ہوئے مسز بیسنٹ نے فرمایا" محمد علی
و شوکت علی کی والدہ ماجدہ آپ لوگوں کے درمیان موجود ہیں... آپ نے اپنے بچوں
کی تربیت و تعلیم اس طرح کی کہ آج وہ سچے مسلمان اور مخلص محب وطن ہیں۔ آپ
میں نسوانی محبت کا جذبہ ہے مگر آپ کے پہلو میں شیر کا دل ہے۔ آپ رنج و افسوس
نہیں کرتیں بلکہ آپ خوش ہیں کہ آپ کے فرزند ملک کی خدمات کے قابل ہیں۔
ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے بال گنگادھر تلک نے کہا ہم مطالبہ کرتے ہیں
کہ محمد علی و شوکت علی کو چھوڑ دیا جائے یا حکومت مقدمہ چلائے گورنمنٹ کو آئینیت
کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہ وقت عجیب و غریب ہے کہ اس ریزولیوشن کو ہم ان کی والدہ
کی موجودگی میں پاس کر رہے ہیں۔ بہادر بچوں کی والدہ ہونے کا جو اعزاز انھیں
حاصل ہے وہ بہت باوقعت ہے اس وقت ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے

کہ آپ اس سختی کو بھول جائیں جو گورنمنٹ نے آپ کے بچوں کے ساتھ کی ہے ہم سب کو آپ سے ہمدردی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ ملک ایسی بہت سی بہادر مائیں پیدا کرے ... مسٹر ایس ایس سیتا مورتی نے ریزولیوشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا "اب میں ایک بات اور کہہ کر اپنی تقریر ختم کردوں گا۔ ہندو شاستروں میں لکھا ہے کہ قومیں دولت اور روپے سے سربلند اور سرتاج نہیں ہوتیں بلکہ اپنی قربانیوں سے، وہ قربانی جو حق وصداقت کے لئے ہو۔ نظر بند علی برادران نے قربانی کی اور ملک نہ صرف ان کے سامنے خراج وفاداری اور اطاعت پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان کی والدہ کے سامنے بھی سر نیاز خم کرتا ہے۔"

(اخبار جمہور کلکتہ، ۸ جنوری ۱۹۱۸ء)

۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو کلکتہ میں ہی منعقد ہوا بی اماں کی طرف سے ایک پیام بنام مسلمانانِ ہند پڑھا گیا جس کے ولولہ انگیز الفاظ نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی پڑھنے کے فرائض محترم قاضی عبدالغفار نے انجام دیئے۔ دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق بی اماں کے پیغام عمل کا ایک ایک لفظ نیشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔

(سیرت محمد علی، رئیس احمد جعفری۔ ص ۲۶۰)

ملک کے سبھی اخبارات نے اس کا مکمل متن شائع کیا جو درج ذیل ہے۔

"ملکۂ حرّیت کا پیام"

مسلمانانِ ہند کے نام

یعنی ام الاحرار مسٹر شوکت علی و مسٹر محمد علی کی والدہ مکرمہ کا پیام جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرزندانِ اسلام۔ میرے عزیزو اور بچو۔

آج کا دن جب کہ تمہاری مجلس میں پہلی دفعہ اور شاید آخری دفعہ (اس لئے کہ اب عمر کی آخری منزل آ لگی ہے) آئی ہوں۔ میری زندگی میں اس قدر عجیب نہیں جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں عجیب اور معنی خیز ہے۔ جس محبت اور جوش کے ساتھ تم نے میرا خیر مقدم کیا اس کا اجر سوائے خدائے کریم کے اور کوئی نہیں دے سکتا لیکن تم نے اپنی محبت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا جو انشاء اللہ تا دمِ مرگ میرے صفحۂ دل سے محو نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ جوش ہمیشہ قائم رہے اور اسلام کی خدمت میں صرف ہو۔

بیوگی اور مصیبت کے ۴۵ سال میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کاٹ دیئے اور اس آخری وقت میں جب کہ گور کی اندھیری کوٹھری میں جانے کا وقت ہے نہ کہ گھر سے باہر نکل کھڑی ہونے کا۔ میں یہاں تمہارے روبرو آموجود ہوئی۔ ع

میرے دریائے بیتابی میں ہے ایک موجِ خوں یہ بھی

مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے روبرو آئی ہے نہ اس لئے کہ آوارہ وطن ہو کر اور چھنڈواڑہ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں اگر میں محض اپنے بچوں کی عافیت و خیریت کی طلبگار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی یا ان مصائب کی داستان سناتی جو ہر ایک سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنے پڑتے ہیں، تو یقین جانو تمہارے دل غم سے بھر آتے مگر میں ان اغراض کے لئے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں بلکہ صرف ایک پیغام عمل لے کر آئی ہوں اور یہ پیغامِ عمل نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا اور جنھوں نے میری گود میں پرورش پائی۔ یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل شوکت علی و محمد علی

جیسے بچوں کی محبت سے لبریز ہونا چاہیئے میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی جذبات محبت مادری سے نا آشنا نہیں لیکن میرے عزیزو، یاد رکھو کہ تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو تمہارا قدرتی رشتہ ہے اس رشتہ سے زیادہ مستحکم ایک اور تعلق بھی ہے جس کو تم بھول تو سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔

وہ رشتہ، وہ تعلق، وہ قرابت ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشۂ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا اس جادو کا نام " اسلام " ہے اور وہ منتر

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ہے۔ میرے بچو اگرچہ تم بھی ماں کی محبت بھری گود میں، اور باپ کے سایۂ حفاظت میں پلے ہو مگر یاد رکھو کہ تم سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو۔ دنیا کے تمام رشتے ایک سانس کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں مگر رشتہ مذہب تمہارے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔

فرزندان اسلام تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ کا افسر اُن کے پاس کچھ شرائط لے کر آیا تھا اور وہ وقت شوکت علی اور محمد علی کے لئے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ انسپکٹر خفیہ ان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہوگا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور شوکت علی و محمد علی سے کیا کہا۔

میں نے خفیہ کے انسپکٹر سے صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دے اور ان کو اچھی طرح بتا دے کہ اگرچہ اس ضعیف اور سن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ شوکت اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے میں نے کہدیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف ہو یا مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے پلٹ سکیں میں انشاءاللہ

اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ میرے عزیزو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے وطن کی آسائش کو محبت مادری کی وجہ سے چھوڑا اور نظر بندوں کے ساتھ در در خاک چھانتی پھرتی ہوں تو بیجا نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنا کچھ سکھا دیا ہے کہ میرا دل اب دنیوی تعلقات سے آزاد ہو گیا ہے۔ میرا اصلی مدعا جس وجہ سے میں مہرولی سے لینسیڈون اور لینسیڈون سے چھندواڑہ جاتے وقت ان کے ساتھ رہی صرف یہی نہیں تھا میں جانتی ہوں کہ جس راہ حق پر وہ چل رہے ہیں وہ مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ گو میرے بچے ہمت والے ہیں پر مجھ سے زیادہ تجربے کار یا مجھ سے زیادہ گرم و سرد دیکھے ہوئے نہیں، مجھے ان کے ایمان پر بھروسہ ہے پھر بھی میں ان کے ساتھ ہوں کہ اگر ذرا بھی ان کے ارادے میں خامی، ان کے ایمان میں تزلزل، ان کے عزم میں کمزوری دیکھوں تو ٹوک دوں اور کہہ دوں کہ بس! آگے گمراہی اور ضلالت ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں نے ڈیڑھ سال سے زیادہ خاموشی کے ساتھ اس طرح گذار دیئے کہ گویا میں خود بھی شوکت و محمد علی کے ساتھ نظر بند ہوں، لیکن اب تم پوچھو کہ اس دو سال کی خاموشی کے بعد مجھے کس چیز نے کھینچ کر یہاں بلایا، تم سوال کرو کہ میں دنیا کی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر یہاں کیوں آ گئی، کیا طاقت تھی جو مجھ کو چھندواڑے سے کلکتہ لے آئی، میں تمہیں ابھی بتاؤں گی! جس وقت تک کہ میرے لڑکوں کی آزادی کا مسئلہ معرض بحث میں نہ آیا۔ میں خدا پہ بھروسہ کئے صبرو شکر کے ساتھ بیٹھی رہی اور شاید اسی طرح بیٹھی رہتی اس لئے کہ مصائب و مظالم میرے لئے خوفناک چیزیں نہیں ہیں۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ میں خود اپنا پیام لے کر نکلوں حکومت کے خودغرضی

اور انتقام پسند عمال نے جب دیکھا کہ شوکت علی اور محمد علی کی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے تو ان پر ایک ایسا الزام لگایا گیا جس کا جواب دینا ان پر فرض ہو گیا اور ان سے زیادہ مجھ پر اس لئے کہ میں ان سے زیادہ آزاد تھی، وہ الزام یہ تھا کہ میرے بچے ترکوں سے جن کا اس وقت حکومت کے دشمنوں میں شمار کیا جاتا ہے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ اے فرزندانِ اسلام آج میں تمہارے سامنے کہتی ہوں کہ یہ الزام اسلام کی ایک ایسی توہین ہے ایک ایسی اہانت ہے جس کو کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب دینا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کیا رشتۂ اخوتِ اسلامی کو کسی حکومت کے بے معنی شبہات اور جابرانہ احکام کاٹ سکتے ہیں؟ کیا حمیت و غیرتِ مذہبی کی اس عمارت کو جس نے تیرہ سو برس تک زمانے کے بہت سے طوفان دیکھے ہوں حاکموں کی ناراضگی اور خفگی صدمہ پہنچا سکتی ہے۔ اے مسلمانو! آج میں تم سے اپنے اس سوال کا جواب مانگتی ہوں! کیا کُل مسلم اخوۃ کے کوئی معنی نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، ٹرکی میں ہوں یا مراقش میں افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہوں یا شام کے سبزہ زاروں میں ہمدردی نہیں اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی اور محمد علی ہی باغی نہیں، ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان باغی ہیں، اور اگر حکومت نے یہ سوال پیدا کیا ہوتا اور اس عذر کو اپنے طرزِ عمل کے لئے پردہ نہ بنایا ہوتا تو شاید میں اب بھی باہر نہ نکلتی مگر جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں اب سوال میرا تمہارا نہیں۔ سوال اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو۔

میری تقریر طویل ہو گئی لیکن دل میں جب درد ہوتا ہے تو الفاظ کی طوالت نگاہ میں نہیں رہتی زخم جب ہرے ہوتے ہیں تو ضرور رستے ہیں۔ ادھر تو ہندوستان کا کتنا ہی بیش قیمت خون میدانِ جنگ میں برطانیہ کے لئے بہہ گیا اور ادھر ہم کو غیر وفاداری اور بغاوت کے طعنے دیئے جا رہے ہیں پہلے تو گورنمنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ اسلام کے مقدس مقامات میں دخل اندازی نہ کرے گی اور پھر معاہدے کی خلاف ورزی کی پھر

پھر یہودیوں سے بیت المقدس میں خاص مراعات کی گفت وشنید ضروری کر دی اور دوسری طرف عرب کے باغی کو ایک آزاد حکمراں سمجھا گیا۔ میرے عزیزو! یہ واقعات ایسے نہیں کہ کانوں سے دل تک نہ جا سکیں اور دل سے زبان تک نہ آئیں۔ متخاصمین کے توپوں کے گولے مقاماتِ مقدسہ اسلامی کے دیواروں کے سایہ میں گر رہے ہیں اور مسلمانانِ ہند اپنے مذہبی مقامات کے تحفظ کے متعلق حکومت کے وہ وعدے یاد کر رہے ہیں جو ابتدائے جنگ میں کئے گئے تھے۔ کیا حکومت کے عمال اب اس قدر بے خبر ہو گئے ہیں کہ وہ معاملات کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں سکتے! کیا مقاماتِ مقدسہ کی قسمت کا فیصلہ کروڑوں مسلمانوں کی خواہشوں اور دعاؤں اور التجاؤں کے خلاف ہوگا؟

آج اس جگہ اپنے ہندو بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھ کر میرے دل میں باوجود غم والم کے خوشی کی ایک لہر اٹھتی ہے مگر وہ لہر شکوہ شکایت کی آمیزش سے پاک نہیں ہے۔ آرہ وشاہ آباد کے واقعات نے میری امیدوں کا خون کر دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ ہندو، ہندو قوم کے وہ رہنما جو ہندوستان میں صبح سے شام تک اتحاد واتفاق کے وعظ کہتے ہیں، کہاں تھے جب کہ آرہ وشاہ آباد میں ہزاروں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ سے تباہ وبرباد ہو رہے تھے! میں اپنے ہندو بھائیوں کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر کسی دن ہندوستان کے لئے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا جائے تو انشاء اللہ وہ اس ضعیفہ کو طالبانِ ہوم رول کی صفِ اول میں پائیں گے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ کوئی شخص جو اپنے مذہب اور مذہبی حقوق کے ساتھ وفاداری نہ کرے وہ نہ اہلِ وطن کے ساتھ وفادار ہو سکتا ہے نہ حکومت کے ساتھ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے تو وہ دعویٰ قابلِ اعتماد نہیں۔ میرے نزدیک ہر شخص کا اپنے مذہب پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ قائم رہنا ہوم رول کا جزو لازمی ہے۔

آخر میں پھر اپنے عزیزوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ دنیا میں سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے ایمان پر بھروسہ کر کے یقین رکھیں کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو فتح ان کی ہے۔ واللہ مع الصابرین۔

میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ ۱۳ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیئے۔ یعنی یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔ ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات و بشّر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ط اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المفلحون ط۔

(بحوالہ "مدینہ" بجنور ۵ رجنوری ۱۹۱۸ء)

"مسٹر گاندھی نے لیگ کے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ جس دن محمد علی صاحب کی والدہ جلسے میں آئی تھیں تو میرے لڑکے نے بہت سے آدمیوں کو روتے دیکھا جب اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا رونے کا وقت نہیں ہے کام کرنے کا وقت ہے۔ (جمہور کلکتہ ۱۲ رجنوری ۱۹۱۸ء)

بی اماں کے اس پیغام عمل، کے متعلق نیو انڈیا نے لکھا یہ پیام ان دونوں بھائیوں کی والدہ کے شایانِ شان ہے جو ان ناانصافانہ قیود کی وجہ سے تکلیف اُٹھا رہے ہیں جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہیں۔ ایک خاتون کا پرانے رسم ورواج کو ترک اور پردے سے باہر آکر مردانی مجلسوں میں شرکت کرنا صورتِ حال کی افسوسناک حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس موجودہ صورتِ حال میں ترقی کے غیر متوقع طور پر تیز ہونے کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ قابلِ قدر خاتون نے فرمایا کہ میں اس لئے آئی ہوں کہ مسلمانوں سے کہوں کہ وہ میرے بچوں کے لئے نہیں اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لئے اپنے فرائض کو انجام دیں ہمیں یقینِ کامل ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے دلوں پر بھی یہ پیام گہرا اثر کرے گا اور ان کو میدانِ عمل کی طرف آنے کی ہدایت کرے گا"

سروجنی دیوی نے کہا کہ "ہندوستان کی نسوانی آواز کو اس کی اجازت دینا کہ وہ اٹھیں اور جو مطالبات مردوں کی طرف سے ہو رہے ہیں ان کی تصدیق کریں۔ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہم کامل اور ذمہ دارانہ سیلف گورنمنٹ کی قابلیت رکھتے ہیں۔ خواتین سابقہ روایات کے مطابق مردوں کو ان کی جدوجہد میں مدد کریں گی خدا کرے کہ ہندوستانی مرد اس طرح کام کریں کہ وہ ہندوستانی خواتین کی امداد حاصل کر سکیں"۔ (اخبار جمہور کلکتہ ۱ار جنوری ۱۹۱۸ئ بحوالہ نیو انڈیا)

ہفتہ نظر بند ان اسلام منانے کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کے آئینہ میں آج بھی ہمارے ملی طرز فکر کے خدوخال کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

پیامِ عمل :

حقیقت یہ ہے کہ ہم اور قوموں کی تقلید میں انجمنیں تو قائم کرتے ہیں اور ان کی تشہیر بھی خوب کی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ اب تک ہم میں تقلید کی بھی پوری صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے ہم ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انجمنوں اور جماعتوں کے قیام کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ ایک اچھا نام رکھ دیا، چند سر برآوردہ اشخاص اس کے عہدے دار ہو گئے اور اخباروں اور قومی مجالس میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم اب تک یہ نہیں سمجھے کہ یہ تمام کارروائی صرف اسی قدر اصلیت رکھتی ہے کہ ایک جسم بے روح بنا کر کھڑا کر دیا گیا لیکن کسی انجمن کے قیام سے کوئی کام لینا مقصود ہو تو ہم کو سب سے اول اس کی فکر کرنا چاہیئے کہ کام کرنے والے افراد مہیا کئے جائیں۔ تم شاید یہ سمجھو کہ میں گھر میں بیٹھنے والی عورت ہوں مشکلات کو کیا جان سکتی ہوں جو تم مردوں کو قومی کام کرنے والوں کے فراہم کرنے میں پیش آتی ہیں۔ اسی لئے میں غالباً اس کام کو آسان سمجھتی ہوں مگر عزیزی میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں سے پردہ میں رہ کر بھی بالکل ناآشنا نہیں رہی ہوں اور شوکت و محمدؐ کی

نظر بندی کے بعد سے تو قدرتی طور پر مجھے ان قومی تحریکوں اور قومی کام کرنے والوں
سے اور بھی زیادہ واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ گذشتہ تین سال میں مجھے کافی تجربہ
ہو چکا ہے اور قومی کاموں کی مشکلات اور کام کرنے والوں کی دشواریوں اور ذمہ داریوں
کا مجھے پورا احساس ہے میں خوب جانتی ہوں کہ شہرت کے طالب ہم بہت زیادہ
ہیں اور محنت و مستعدی سے کام کرنے والے بہت کم۔ لیکن اس قحط الرجال کے
باعث تو کام کرنے والوں کی تلاش اور ان کا فراہم کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔
.... عزیزی سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی مستند اور کارگزار مرکزی جماعت
اگر ہوتی تو ان تمام قیود کا کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ مسلمان ممبر کاؤنسلوں
میں سوال کرتے ریزولیوشن پر ریزولیوشن زیر بحث آتے اور یکے بعد دیگرے
قانونِ تحفظ ہند کی تنسیخ یا کم از کم ترمیم کے لئے نئے نئے قوانین کے مسودے پیش ہوتے
مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا عشر عشیر بھی ہے خیر ان تمام
کارروائیوں کا انحصار تو چند سر برآوردہ افراد قوم پر ہے اگر وہ اپنے فرض کو نہ پہچانیں
یا باوجود اپنے فرض کو پہچاننے کے اس کی ادائیگی میں پہلو تہی کریں تب بھی عامۃ المسلمین
ان پر اعتراض و نکتہ چینی کر کے اپنے فرائض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ خطاب
خداوندی ہم سب کے لئے یکساں ہے عوام نے بھی اگر خواص کا طرزِ عمل اختیار کیا تو
سب کے سب مواخذۂ آخرت میں گرفتار ہوں گے ..... البتہ میں اس قدر ضرور
کہوں گی کہ عوام ہمیشہ رہنمائی اور رہبری کے حاجتمند ہوتے ہیں۔ مجھے یقین کامل
ہے کہ وہ اب بھی چلنے کو تیار ہیں مگر راستہ بتانے والے درکار ہیں۔ اور اگر زیادہ
سر برآوردہ قوم اس کام کو انجام نہیں دینا چاہتے تو ان سے کسی قدر کم معروف
مگر تعداد میں کہیں زیادہ قوم کے جواں ہمت و جواں سال تعلیم یافتہ کہاں ہیں
جو رہنمائی نہ سہی ہم سفر ہی بن کر عامۃ المسلمین کے ساتھ چل سکیں .....
دوسروں کے پست خیالات پر معترض ہونا ضروری ہے مگر اس کا بھی خیال

رہے کہ تمہاری بلند خیالی اوروں کی پست خیالی سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اگر تمہاری قوتِ عمل ضائع ہو چکی ہے اور تمام تر کام میں یہی رہ گیا ہے کہ اوروں کے کام پر ناک و بھوں چڑھاؤ اور کسی میں ایک عیب نکالو تو کسی میں دوسرا۔" (اُم الاحرار والدہ محمد علی و شوکت علی صاحبان کا خط بنام مسٹر تاج الدین اخبار "جمہور کلکتہ" ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء)

پانچ برس نظر بند رہ کر جنگ ختم ہونے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی بھی اور لوگوں کے ساتھ آزاد کئے گئے اور لوگوں کے دل خوشی اور جوش مسرت سے بھر گئے۔ سبھوں نے دہلی، لاہور، بمبئی وغیرہ میں نہایت شان و شوکت سے ان کا استقبال کیا اور جلوس نکالے۔ بی اماں فطرتی خواہش کے مطابق چاہتی تھیں کہ اب دونوں بچے کچھ دنوں میرے پاس رہیں لیکن لوگ محمد علی کو صدر وفد خلافت بنا کر انگلستان بھیجنے کی تجویز کر رہے تھے اور کئی مہینوں کے لئے گھر ہی سے نہیں بلکہ وطن سے ان کا علیحدہ رہنا ضرور تھا۔ بی اماں سے کہا گیا کہ آپ انھیں ملک و قوم کی خدمت کرنے دیں تو اپنی دلی اور دیرینہ آرزو پر انھوں نے اس بات کو ترجیح دی۔ چنانچہ اس بارے میں جو پیغام انھوں نے اخباروں میں بھیجا اس کے ایک حصے میں وہ لکھتی ہیں "میں قدرتاً یہ چاہتی تھی کہ اب جو میرے لڑکے میرے پاس آگئے ہیں تو کچھ عرصہ پاس رہتے لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس کام کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اس میں ان کا مصروف رہنا میرے پاس یا اپنے خاندان میں رہنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے اور چند مہینوں کے لئے ان میں سے ایک کو یا دونوں کو باہر رہنا پڑے گا۔ اس لئے ہم بہت خوشی کے ساتھ ملک و قوم کے مطالبے کو منظور کرتے ہیں۔ ہندوستان اور اسلام کے کام کے لئے ہمیں ان کی جدائی گوارا ہے۔"

غرض انھوں نے نہ صرف انھیں اجازت دی بلکہ بہو یعنی مسز محمد علی اور چھوٹی پوتی بنتِ محمد علی کو ہمراہ لے کر خود بمبئی پہنچانے گئیں۔ (تہذیب نسواں راقمہ خاتون اکرم یکم اپریل ۱۹۲۲ء ص ۲۰۰)

۱۹۱۹ء کا زمانہ ہندوستانی جنگِ آزادی میں سیاسی سرگرمیوں اور برطانوی

استبداد کے اظہار قوت کے اعتبار سے بڑا اہم ہے ہندوستان میں برطانوی دفتری اقتدار کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ جب کبھی کسی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا گیا تو ساتھ ہی تشدد کی تلوار بھی علم کی گئی تاکہ بُزدل رعایا ڈر کر جلد از جلد ناقص و ناکام اصلاحات کو قبول کرلیں۔ چیمسفورڈ مانٹیگو اصلاحات اسکیم شائع ہوئی تو اس کے ایک عشرہ بعد ہی رولٹس کمیشن کی تہدید آمیز رپورٹ بھی شائع کردی گئی جس کے تحت رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) کا نفاذ ہوا۔ مادرِ ہند کے فرزند وفاداری کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے خون و دولت کی قیمت نہ مانگ سکیں ان کے منہ میں لگام دینے اور قلم توڑ دینے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کا خونچکا حادثہ پیش آیا عوام کا جوش و غضب اپنی آخری حدوں کو پہنچ رہا تھا اور صبر و ضبط کا ہر بندھن سرفروشی کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔

ادھر جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب سلطنتِ عثمانیہ کی قطع و برید کی گئی تو خاص طور پر مسلمانانِ ہند میں غم و غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی نے انتہائی کوشش کی کہ ہر جگہ مسلمانوں کے ظالمانہ استحصال کے مقابلے کی خاطر انھیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا جائے۔ انھوں نے خلافت تحریک چلائی جس کا مقصد تھا کہ مسلمان نہ صرف ایک بار پھر عظیم طاقت بن کر اُبھر سکیں بلکہ تیزی سے ابھرتی و بڑھتی ہوئی مغربی سامراجیت سے بھی بھرپور ٹکر لی جاسکے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو اس سے بہت تقویت ملی۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں مشاہدے میں آیا وہ قومی زندگی کا روشن ترین باب ہے۔ ترکِ موالات کی تجویز پہلے خلافت کانفرنس اور پھر کانگریس کے اجلاس میں منظور ہوئی۔ بی اماں باوجود پیرانہ سالی کے دل و جان سے شریک تحریک رہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے پنڈت سندر لال کے ایک انگریزی مضمون کے حوالے سے لکھا ہے "۱۹۱۹ء تھا کہ مرادآباد میں صوبے کی پولیٹیکل کانفرنس ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں منعقد

ہوئی وہاں مہاتما جی موجود تھے۔ میں نے ترک موالات والا ریزولیوشن پیش کیا سارے پرانے لیڈروں نے مخالفت کی۔ تین دن گذر گئے اور ریزولیوشن پاس نہ ہوسکا۔ آخر میں مولانا شوکت علی آئے اور انھوں نے مہاتما جی کی تجویز آزادی کی تائید کی۔ اس کے بعد مولانا کی والدہ بی اماں آئیں اور انھوں نے ریزولیوشن کی تائید کردی۔ اس حیرت انگیز تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور خود ڈاکٹر بھگوان داس نے مخالفت چھوڑ کر تائید کردی اور ووٹنگ کے وقت کہا جب خود بھارت ماتا بی اماں کے روپ میں آگئی ہیں تو میں بھی تائید کرتا ہوں"۔ (صدق جدید لکھنؤ ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء ص ۱ و ۲)

تحریک خلافت کے سلسلے میں علی برادران ستمبر ۱۹۲۱ء میں کراچی پہنچے۔ وہاں خلافت کانفرنس میں ایک جوشیلی تقریر میں مولانا محمد علی نے کہا کہ "برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے"۔ پاداش میں دو سال قید کا حکم دیا گیا اور ہندوستان ان کی دوبارہ طویل المیعاد جدائی پر ماتم کدہ بن گیا لیکن بی اماں نے ان کی عارضی جدائی پر جیسا صبر و شکر کیا وہ ذیل کے خط سے واضح ہوگا جو انھوں نے آغا محمد صفدر صاحب کی گرفتاری پر ان کی بیوی کو لکھا ہے، وہ لکھتی ہیں:

"آج عزیزم صفدر کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی خدمات خداوندِ عالم کی بارگاہ میں مقبول ہوئیں۔ میں اس زمانے کو بہار تعبیر کرتی ہوں جب میں نے شوکت و محمد کی سزا کی خبر سن کر دو رکعت نمازِ شکر ادا کی تھی۔ تم بھی ہمت سے کام لینا اور ہمت نہ ہارنا مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہے"۔ (تہذیب نسواں تذکرہ)

علی برادران گرفتار ہوئے بی اماں خاصی نحیف ہوچکی تھیں اور کسی سہارے کے بغیر مشکل سے ہی کھڑی ہوسکتی تھیں لیکن بیٹوں کی گرفتاری نے ان میں ایک تازہ روح پھونک دی انھوں نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ بی اماں اب مکمل طور پر عوام کے سامنے آگئی تھیں وہ دور دراز کے سفر کرتیں۔ بڑے بڑے اجتماعات کو مخاطب کرتیں دورانِ سفر اسٹیشنوں پر مشتاقِ زیارت ہجوم سے ملتیں اور انھیں مخاطب کرتیں

ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے تحریک خلافت کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ جگہ جگہ انکی آواز پر ہزاروں کے عطیات خلافت فنڈ میں جمع ہوئے۔ ایوانِ حکومت میں کھلبلی تھی مسٹر ملکم ہیلی نے علی برادران پر لگائے گئے الزامات میں یہ الزام بھی شامل کیا تھا کہ "ان کے گھر کی عورتیں بھی عطیات جمع کر رہی ہیں"۔

جیسے جیسے اربابِ حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا بی اماں کا لب و لہجہ بھی شدت اختیار کرتا گیا۔

وہ عوامی جلسوں میں زور و شور سے تقاریر کر رہی تھیں اور خلافت اور قومی آزادی کے حصول کی خاطر ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ان تھک کوشش میں معروف تھیں مشہور نظم "صدائے خاتون"

(تحریک خلافت کے ایام میں سہارنپور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم صدائے خاتون تحریر کی جس کو محمد قادر حسین نے بی اماں کا پیام فرزند کے نام سے مدراس میں طبع کیا) (لطیف حسین ادیب، آواز دہلی یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء ص۱)

بولیں اماں محمد علی کی ۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم تو جاتے ہو دو دو برس کو ۔ بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا ۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی دور کی یادگار ہے اس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے طول و عرض میں حریت پسندوں کے لئے پیغام عمل بن کر پہنچی۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شرکاء اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی انوسیا بائی، شریمتی چودھرائن، شریمتی سرلا دیوی، محترمہ امجدی بیگم محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم، محترمہ بیگم ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محترمہ نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ اور محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے نام قابلِ ذکر ہیں ان کے علاوہ ہزاروں دوسری خواتین نے بھی کانفرنس میں حصہ لیا جس سے ثابت

ہوتا ہے کہ غیر مسلم بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین بھی تحریکِ آزادی میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیتی رہی ہیں۔ چند مقرر خواتین کے بعد بی اماں نے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

" پیاری بہنو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار، وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مابین اتحاد و اتفاق پیدا کریں تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پرامن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن جس وقت برطانوی تجّار ہندوستان میں اپنی تجارتی مہم پر آئے اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ان کی کامیابی کا انحصار ہماری پھوٹ اور تفریق پر ہے چنانچہ جس وقت سے بیرونی حکومت یہاں قائم ہوئی۔ ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بُری عادتیں سیکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہو گئے۔ خدائے قادر و توانا جسے زندہ رکھنا چاہے اسے خواہ کتنا ہی زہر دیا جائے لیکن وہ نہیں مر سکتا جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کے رولٹ ایکٹ پنجاب کی خوں ریزی اور خلافت کی تقسیم کا تجزیہ کر کے دیا تھا۔ وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالی کا وقت تھا ہندوستان کو یہ معلوم ہو گیا اس کا علاج غیر ہمدرد برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کے پاس ہے اور اب ہم خود ہی جد و جہد کر کے اس کی کوشش

کر رہے ہیں تاکہ جن مختلف امراض کا ہم شکار ہو رہے ہیں ان سے آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بہنو! خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہوگئی ہیں اور انھوں نے اپنے آپکو کل حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔ زمانہ موجودکی تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک وشبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا نور جہاں چاند بی بی رانی لکشمی بائی آف جھانسی زیب النسا رابعہ بائی پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں لیکن خداوند عالم کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نسل میں مسز کستوربا گاندھی مسز سروجنی نائیڈو انسو بابائی سرلا دیوی چودھرانی بیگم محمد علی بیگم انصاری بیگم خواجہ بیگم حسرت موہانی بیگم کچلو وغیرہ ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی بہت جذبات حب الوطنی اور عزم واستقلال میں شہرۂ آفاق ہیں اور جنھوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈروں کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ پیاری بہنو تمہارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کردیئے گئے ہیں یا قیدخانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور کنتکا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اپنے کو والنٹیروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے اسے اپنے کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہیئے ہم ہندوستانیوں میں ہر مرد اور عورت والنٹیر ہے خواہ مصلحت اور یقین کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے

تم معاہدہ پر دستخط نہ کر سکو۔

میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہے۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اس کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کی ذمہ داری کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب نہ پیدا کرو لیکن اسی کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو اس سے بھاگو بھی نہیں وہ تمہاری جرأت اور بے خوفی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع پذیر آئے گی تمہیں قرآن پاک اور شاستر کے احکامات کا پابند رہنا چاہیئے یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اسی وقت آزادی کے پھریرے کو اڑتے ہوئے دیکھ لوگے"

اوراق گم گشتہ۔ ترتیب و تہذیب سید رئیس احمد جعفری۔ ندوی
محمد علی اکیڈیمی۔ لاہور۔ ص ۱۸۳-۸۴-۸۵

۱۹۲۱ء میں ہی بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے بی اماں نے کہا:

"اس وقت ہندو مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحد رہیں کھدر پہنیں اور تمام دن کپڑا بنیں۔ ملکی مفاد کی خاطر دونوں کا اتحاد ضروری ہے.... آخر تم کھدر کیوں نہیں پہنتے؟ کیا میں پہلے ہمین کپڑے نہیں پہنتی تھی؟ کیا میں اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں پاتی؟ کیا تم زمانۂ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے؟ کیا پیغمبرؐ نے کھدر نہیں پہنا؟ اس لئے میرے بھائیو! میری خواہش ہے کہ تم سیدھے راستہ پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ دلیر بن جاؤ، خدا تمہیں عزت بخشے"

گاندھی جی نے ان کی تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ینگ انڈیا میں لکھا "اگرچہ سن رسیدہ تھیں لیکن ان میں نوجوانوں جیسی طاقت تھی

انھوں نے خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لئے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور ہندوستان کی آزادی ان کے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی اس لئے انھوں نے اتحاد کے لئے زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزوِ ایمان تھیں"۔

علی برادران کی رہائی کے بعد بھی بی اماں کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں گرچہ صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ کانگریس کے اندرونی اختلافات، ہندو مسلم نفاق جزیرہ نما عرب میں ہونے والے واقعات بدستور ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ مولانا شوکت علی کی رہائی کے بعد ان سے ملنے کاٹھیاواڑ گئیں، پھر بمبئی، پنجاب اور کوکناڈہ کے سفر کئے، مولانا شوکت علی کے ساتھ کانگریس کے اجلاس کے بعد وہ سیلون بھی گئیں اور موثر تقاریر کیں۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں لکھا ہے" بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم آگئے ہیں اور پوری ہمت و مصروفیت کے ساتھ کام کریں گے آپ کے اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام کیجئے اور مطمئن رہیے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گذاری کا اٹھا نہ رکھیں گے مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر پر پڑی رہوں اور اپنے ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کر سکوں"۔ (ہمدرد۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۴ء)

عمر عزیز کے آخری لمحات میں وہ بغرض علاج دہلی آئیں اور اس کے بعد مسوری اور پھر رام پور چلی گئیں۔ وہاں جاکر طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں" ہم لوگ فوراً ہی رام پور گئے مگر کئی دنوں تک بوجہ امتناعی احکامات رام پور میں داخل نہ ہو سکے اور اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ بی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے نہیں اور میں بچوں سے نہیں مل سکتی تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار کیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً اُن کو دلی لانا پڑا یہاں ڈاکٹر انصاری کا علاج ہوتا رہا۔

جن دنوں بی اماں دہلی میں بغرض علاج مقیم تھیں اسی زمانے میں گاندھی جی نے مولانا محمد علی کے مہمان کی حیثیت سے ان کے یہاں قیام فرمایا اور دوشنبہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یکایک ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خاص طور پر مولانا محمد علی جو گاندھی جی کے میزبان تھے سخت پریشان ہوئے ان لوگوں نے انتہائی کوشش کی کہ گاندھی جی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب ان بزرگ رہنماؤں کو کامیابی نہ ہوئی تو بی اماں نے کوشش شروع کی مگر اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی کی دعوت پر مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے اور مولانا کے یہاں مقیم تھے وہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں بی اماں نے گاندھی جی کو پیغام بھجوایا کہ "تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو اور اپنے اس ارادے سے باز آؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمہارے پاس کوٹھے پر آتی۔" گاندھی جی نے کہلوایا اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس بات میں کر سکتا تو آپ کی بات ضرور مان لیتا۔"

(بحوالہ ہماری زبان۔ بی اماں عبداللطیف اعظمی یکم اپریل ۱۹۸۵ء)

بی اماں کا انتقال ۱۲، ۱۳ نومبر کی درمیانی شب ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اور یوں ۷۲ سال کی عمر سے جہاد زندگانی میں مشغول یہ مجاہدہ عظیم اپنے معبود حقیقی کی آغوش رحمت میں دائمی سکون کی نیند سو گئی۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تصور کرنا بڑا کٹھن ہے کہ بی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کون بی اماں کی باوقار شخصیت اور عوامی اجتماعات میں ان کی آواز کی گونج سے ناواقف ہے...... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں موت کی رات ان کے قریب ہی تھا۔ میں اور سروجنی فوراً پہنچ گئے، تھے مولانا محمد علی رو رہے تھے مگر شوکت علی خاموش تھے وہ بہت ضبط کر رہے تھے اور اللہ کا نام لے رہے تھے کامریڈ کا پریس بی اماں کے کمرے کے قریب تھا لیکن وہاں کام ایک لمحہ کے لئے نہیں رکا نہ ہی مولانا نے اپنے مدیرانہ فرائض سے غفلت برتی۔"

ہمدرد کے ۸ مئی ۱۹۲۵ء کے اداریے بعنوان ملّت کا خدمت گزار میں مولانا نے اس حادثے کی تفصیل یوں لکھا ہے ۔

" جب بی اماں مرحومہ کا انتقال ہونے والا تھا اور چہارشنبہ کی شام کو بعد مغرب جب وہ رات کے دو بجے تک ان کی پٹی کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ جب سوا دو بجے ان کا انتقال ہو چکا اور ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیئں تو اٹھ کر آیا اور پریس میں بیٹھ کر پروف پڑھنے لگا۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر فرش پر لیٹ گیا گھنٹے دو گھنٹے بعد ایک لیڈنگ آرٹیکل تھا وہ لکھتا رہا۔ ظہر کے بعد لوگوں نے اطلاع دی کہ غسل دیا جا چکا، کفن پہنا دیا گیا، تم بھی چلو، اسی وقت مضمون بھی ختم ہوا۔ قلم رکھ کر شریک جنازہ ہو گیا" (مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، ص ۲۱۷) تدفین سہ پہر ۱۳ر نومبر درگاہ شاہ ابو الخیر میں ہوئی۔ ہندوستان بھر میں ان کی شاندار قومی و ملی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مسز اینی بیسنٹ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

" میں خراجِ عقیدت پیش کرنے میں خود کو دوسروں کے ساتھ شریک کرتی ہوں اس شیر دل اور انتہائی مذہبی خاتون کے تئیں جو کسی خطرے سے خوفزدہ نہیں ہوئی اور جس نے اس دھرتی پر کسی چیز کو اپنے عقیدے پر فوقیت نہیں دی ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی روحیں دوسروں کو بھی باوقار بناتی ہیں اور مثال پیش کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آزادی کی راہوں کو منور کرتی ہیں اور رہنما بناتی ہیں، اپنے خون بہتے ہوئے پاؤں سے جس پر قومیں چلتی ہیں انھیں ابدی روشنی میسّر ہو "۔

۱۴ر نومبر کو پٹودی ہاؤس دہلی میں منعقد ہوئے تعزیتی جلسے میں سوامی شردھانند سرسوتی جی نے ہندو مسلم اتحاد کی اس علامت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ " لوگوں کو شاید خیال ہو کہ علی برادران کام کرتے تھے اس لئے ان کی والدہ صاحبہ ان کے شریک ہو گیئں لیکن میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک لگن ہندو مسلم اتحاد کے لئے کسی کے دل میں تھی تو وہ بی اماں کے

دل میں بھی اور ان کا ہی یہ بھاؤ تھا جو مولانا محمد علی اور شوکت علی کے اندر کام کر رہا تھا۔ یہ وقت زیادہ کہنے کا نہیں ورنہ میں بتلاتا کہ اُن سے زیادہ سیاسی لیڈر بھی اس ہمت اور جوش سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے جیسی وہ کرتی تھیں .... (ہمدرد دہلی ۱۶ ار ۱۷ ار نومبر ۱۹۲۴ء ص ۲)

گاندھی جی نے پہلے علی برادران سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح علی بھائی اور میں، ہندو مسلمان ہو کر بھی ساتھ رہ سکتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے "ایک ماں کے تین لڑکے"، پھر بی اماں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "جیسے اپنی سگی ماں کے لئے کہنے میں مجھے مشکل ہوتی ویسے ہی بی اماں کے لئے کہنے میں ہے۔ میں نے ۱۹۱۷ء میں ان کے درشن کئے تھے اس وقت سے بی اماں کو جانتا ہوں۔ عدم تعاون کے وقت بی اماں نے ملک کا دورہ کیا تھا۔ بی اماں بحیثیت مسلمان ہوتے ہوئے بھی دورہ کر رہی تھیں کہ اسلام پر مصیبت ہے، تو جس جگہ وہ اسلام کے لئے کچھ کہتی تھیں وہاں ہندو مسلمانوں کی ایکتا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی ضرور کہتی تھیں۔ میں ہندو مسلم جھگڑے کو مٹانے کے لئے دہلی میں ایک عرصے سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ بی اماں بھی یہیں موجود تھیں میں بی اماں سے ملتا رہتا تھا وہ ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھیں کہ میں (۱) ہندوستان میں سوراج (۲) ہندو مسلم اتحاد کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہندو مسلمان ایک ہو کر بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے، آزادی ناممکن ہے۔ ہم کو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایکتا کرنی چاہیئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم غلام رہیں گے (ایضاً)

مولانا عارف ہسوی نے ہمدرد کے اسی شمارے میں اپنے تعزیتی نوٹ میں لکھا:

"اس بڑھاپے اور ضعیفی کے زمانے میں ان کے اندر قومی کاموں کے لئے جو ہمت، جوش اور ولولہ تھا وہ جوانوں میں بھی نہیں پایا جاتا اور اس لحاظ

سے ان کا مقدس وجود ملک و قوم کے لئے ایک برکت تھا۔ انھوں نے گذشتہ دس سال کے اندر اپنے مجاہدانہ اعمال سے یہ ثابت کردیا کہ اگر مذہب اور ملک کی سچی تڑپ انسان کے دل میں ہو تو ضعف ونقاہت اور عمر کا تفاوت اس میں حارج نہیں ہوسکتا اور یہ کہ اس میدان میں بوڑھے اور جوان سب کے لئے گنجائش ہے اور اگر خدائے بزرگ و برتر توفیق دے تو بہتر سالہ ضعیفہ بھی بیس سالہ نوجوان سے زیادہ ہمت کے ساتھ ملک و ملّت کی خدمت کا مقدس فرض انجام دے سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۴)

علی گڑھ کے ایک تعزیتی جلسہ میں سوامی ستیہ دیو جی نے بی اماں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا "بھائی ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں جب ہم جوان ہمت ہار جاتے تھے تو وہ آگے بڑھتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دکن میں دورہ کر رہے تھے ایک اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے آئے۔ ہم نے پوچھا تمہارا گاؤں کتنی دور ہے اور وہاں کیسے جاتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ گاؤں اسٹیشن سے تیس میل پر ہے۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ وہ ناراض ہو کر جانے لگے ماتا جی کو پتا چلا تو لوگوں کو بلا کر کہا کہ بیٹا تمہارے ساتھ میں چلوں گی موٹروں پر تو سبھی جاتے ہیں بیل گاڑی میں جاؤں گی۔ بوڑھی ماتا اتر پڑیں۔ ہم جوان بھی اُتر پڑے اس طرح ماتا جی ہم کو بتا گئیں کہ کام کیسے ہوتا ہے۔"

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی سوانح و خدمات ص ۲۴۔ ۲۵)

لیکن بی اماں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والے ان گنت پیغامات میں عوام کی ان سے محبت و عقیدت کی عکاسی شاید ہی کوئی اس تعزیتی خط سے بہتر کر سکے جو پنجاب کی ایک ہندو خاتون نے مولانا محمد علی کو اس تاکید سے لکھا تھا کہ اسے ہمدرد میں شائع ہونے والے تعزیتی پیغامات میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن جو مولانا نے معذرت کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے اس کا ہر ہر لفظ خلوص کے آنسو میں ڈوبا ہوا ہے، ایک گہرے درد کی کسک لئے ہوئے ہے۔

مولانا کا نوٹ:

"پنجاب کا یہ مراسلہ اس شاندار مستقبل کے لئے جس کے ہم آرزومند ہیں نہایت روح پرور شگون ہے۔ بی اماں کی سب سے بہتر یادگار یہ ہوگی کہ ہندوستان کے تمام بہادر فرزند اپنے حقیر اختلافات کو بھلا دیں اور اپنے مصیبت زدہ وطن کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔"

محمد علی
شوکت علی

دہلی ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۴ء

پنجابی بہن کے تعزیت نامے کی نقل

نمبر ۲ پنج محل روڈ، تاریخ ۹ر دسمبر

"میرے محترم و ممتاز بھائی مولانا صاحب نمسکار

نہیں جانتی کہ کس تمہید کے ساتھ اپنا خط لکھنے کا مقصد بیان کروں۔ کانفرنس میں آپ کی اسپیچ کے اس حصّے میں جہاں آپ نے ہماری بی اماں کا ذکر کیا تھا نہایت ہی دردانگیز تھا۔ شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جس نے اس قابلِ قدر خاتون کے لئے اس وقت آنسو نہ بہایا ہو۔ اور میں تو اول دن سے ہی یعنی میں نے جب پہلی مرتبہ ان کے درشن کئے تھے۔ ان کی بہت ہی معتقد تھی۔ میں جانتی ہوں کہ ایسی روحیں دنیا میں کبھی کبھی آتی ہیں اور ابھی تک ان کی سی خاتون میری نظر سے نہیں گذری۔ مجھ کو ان کے مرنے کا اس قدر رنج ہوا کہ میں لفظوں میں اس کو بیان نہیں کر سکتی۔ وقت کے حساب سے وہ سن رسیدہ تھیں مگر غریب ہندوستان کے لئے ان کی بہت ضرورت تھی۔ اس لئے ان کا رنج ہمارے لئے بہتیری نوجوان عورتوں سے زیادہ تھا۔ میں نہیں جانتی کہ کون اس خالی جگہ کو پُر کرے گا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ عورتیں خاص طور پر جمع ہو کر ان کے رنج و غم کا اظہار کریں لیکن آجکل حالت ہی درست نہیں۔ ان کی نیک اور بہادر عورتوں کے کارنامے تو سنہری حرفوں میں چھپنے چاہئیں اور گھر گھر پہنچنے چاہئیں اور ہر عورت

دلڑکی کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔

میں چاہتی ہوں کہ اپنی شردھا اور بھگتی کے پھول ان کی قبر پر چڑھاؤں ۔ لیکن میرے لئے اس وقت ممکن نہیں اگر کبھی الہ آباد آتے جاتے دہلی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو انشاءاللہ پورا کروں گی۔ میں خود ان کی قبر پر جاؤں گی اور وہاں کی خاک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاؤں گی لیکن اب تو دس روپے کی ناچیز رقم آپ کے پاس بھیجتی ہوں آپ پانچ روپے کے پھول میری طرف سے ان کی قبر پر چڑھا دیجئے گا اور پانچ روپے کا پھل یا مٹھائی غریب بچوں کو ان کے نام پر کھلا دیجئے گا۔

پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل ان کے خیال سے کتنا بھرا ہے اور میں کتنی دفعہ اپنے دل میں ان کو یاد کر چکی ہوں ہمارے لئے تو ایسی بیش بہا ہستیاں ویسے ہی بڑی ناپید ہیں لیکن اس پر جو تھوڑی سی ہیں وہ بھی ہم سے چھین لی جاتی ہیں ۔ یہ ہندوستان کی کم نصیبی ہے۔ بہرحال پرماتما کے سامنے سرِتسلیم خم ہے، کیا چارہ ہے"!

(ہمدرد ۱۵ دسمبر ۱۹۲۶ء ص ۴)

بے شک بی اماں ان چند خوش نصیب رہنماؤں میں تھیں جنھیں اپنی حیات میں ہی یہ دیکھنا نصیب ہوا کہ " شہرتِ عام و بقائے دوام "، کے دربار میں ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ قومی جہدِ آزادی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر ان کی بے لوث خدمات اور ملّت کے لئے ناقابلِ فراموش ایثار کے عوض جہاں رضا کاران ملک نے انتہائی فراخدلی سے ملک کے طول و عرض میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا وہیں پرستارانِ ملت نے ٹوٹ کر ان کے قدموں میں گلہائے عقیدت نذر کیئے۔ تاہم ایک تابندہ عکسِ لطیف کو زمانے کی گرد دھندلا نہ دے اس لیے ضروری ہے کہ ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

بیگم حسرت موہانی (نشاط النساء بیگم)

آج کے ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے ہم لوگوں کے لئے اس وقت جب کہ صدائے حق بلند کرنے والوں کی زبانوں پر پریس ایکٹ نے قفل ڈال رکھے ہوں، قانون تحفظِ ہند کا آہنی پنجہ انھیں اپنی گرفت میں دبوچ لینے کے لئے ہر آن مستعد ہو اور قید خانوں کی بھیانک تاریکی انھیں نگلنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو، ان شمعِ حرّیت کے پروانوں کی اولوالعزمی و جانبازی کا اندازہ لگانا آسان نہیں جو اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی خاطر سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔

حسرت و بیگم حسرت کی کہانی بھی دار و رسن کی آزمائش کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک ہے اور ساتھ ہی ان بہت سی بھولی بسری داستانوں میں شمار کی جا سکتی ہے جن کے ساتھ آزاد ہندوستان کی تاریخ نے مناسب انصاف نہیں کیا۔

بیگم حسرت کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ مولانا حسرت سے ہی روایت منسوب ہے کہ اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال و البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال سے زیادہ

ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے یہ عورتیں وفا پرست اور ایثار مجسّم تھیں انھوں نے جان دے دی مگر ہم سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستار و انم تجیل جا رہے ہو۔ ہمارا کیا ہوگا؟

(علیم اختر مظفر نگری۔ مقالہ مولانا حسرت موہانی شبستان اردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۶۸ء ص ۱۲۷)

بیگم حسرت کو ان خواتین میں پوری امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے حسرت کو جن کی تمام تر زندگی آزادی کی مکمل تفسیر رہی نہ صرف لیلائے حریت کے سپرد کر دیا بلکہ اپنی زندگی کو بھی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ چکبست نے ان کی قومی خدمات کو سراہتے ہوئے "صبحِ امید" میں قوم کے جوانوں کو مشورہ دیا تھا۔

"بیگم حسرت کی زبان عام جلسوں میں پولٹیکل مردانگی کا راگ گانے کے لئے خلق نہیں ہوئی ہے مگر اس شہیدِ وفا کی زندگی کا نغمۂ خاموش، وطن پرستوں کی روح کو وجد میں لانے کے لئے کافی ہے.... ہم قوم کے نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس دیوی کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر استقلال اور ایثارِ نفس کا سبق حاصل کریں۔" (چکبست، صبحِ اُمید۔ ۲/۱۹۱۸ء)

پروفیسر عبدالشکور نے اپنی تالیف "حسرت موہانی"، میں رسالہ "رہبرِ نسواں" نومبر ۱۹۳۴ء کے حوالے سے نشاط النساء (بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے:

"محترمہ نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) کے ایک معزز خاندان سادات میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیب حسن موہانی مرحوم رائچور (ریاست حیدرآباد) میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔

زمانۂ دوشیزیت میں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو "محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے"۔ (حسرت موہانی، عبدالشکور اشاعت سوم۔ لکھنو۔ ص ۱۱۷) اور جس سے ان کے پختہ سماجی شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۱۹۰۱ء میں جب وہ حسرت کی زندگی میں داخل ہوئیں تو محض کندۂ ناتراشیدہ نہ تھیں۔ گمان غالب ہے کہ قومی و ملکی مسائل سے بھی وہ کچھ نہ کچھ آشنا ضرور رہی ہونگی کیونکہ لکھنؤ سے قربت کے سبب قصبہ موہان میں بھی اردو اخبارات پہنچنے لگے تھے۔ ہر چند کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ عہد طفولیت تھا تاہم لوگوں کی ملکی سیاست میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ "یہ دیہاتی ماحول کی پلی ہوئی لڑکی نہایت جری باحوصلہ اور ہر طرح حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں تھی .... حسرت نے مالی اعتبار سے کبھی کسی قسم کی فراغت و اطمینان کو محسوس نہیں کیا لیکن کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ہر کٹھن موقع پر وہ حسرت کی رفاقت کے لئے آمادہ رہا کرتی تھیں حسرت کو ہمیشہ ان کی رفاقت پر فخر رہا ہے"۔

(رابعہ بیگم، حسرت کی خانگی زندگی، اردو ادب حسرت نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۵۱ء علی گڑھ ۹۸-۹۹)

اور حسرت کا یہ فخر بے جا نہ تھا۔ "اگر نشاط النساء بیگم کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہم خیالی شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم ثبات کا شاید ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے"۔ (عارف ہسوی۔ حالات حسرت دہلی ۱۹۱۸-۱۹۱۹)

جس طرح حسرت کی سوانح عمری کے مصنف کے مطابق "مولانا کی لائف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیگم حسرت کے واقعات و حالات شامل نہ کئے جائیں کیونکہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی کی ہر طرح کی شریک رہیں اور مولانا کے کاروبار قومی میں ہمیشہ معاون رہیں ——" (ایضاً)

اسی طرح جدوجہد آزادی میں بیگم حسرت کے ایثار اور ان کے سیاسی شعور کے ارتقاء کا جائزہ حسرت کی سیاسی نظریات و عقاید کے تجزیے کے بغیر

ممکن نہیں۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب کہ حسرت ابھی علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے وہ علی گڑھ آئیں اور اس کے مختصر سے وقفے کے بعد ہی حسرت کی دار و گیر کا وہ طویل سفر شروع ہوا جس کی داستان انھیں کی زبان میں سنئے

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ اس اک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے فراغت پاتے ہی حسرت نے اپنے نظریات و عقاید کی اشاعت و ترویج کی خاطر ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے شراب حریت کے جام پر جام لنڈھانا شروع کر دیئے۔ حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے علانیہ علی گڑھ تحریک سے انحراف کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانگریس میں وہ گرم دَل کی سیاست کے علمبردار تھے اس لئے ۱۹۰۷ء کے سورت اجلاس میں نرم و گرم دَلوں کے ٹکراؤ کے بعد بال گنگا دھر تلک کے ساتھ وہ بھی باقاعدہ گرم دَل میں شامل ہو گئے اردوئے معلیٰ کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں کالج کے ایک طالب علم کا مضمون، مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کی زد میں آگئے لیکن انھوں نے طالب علم کا نام بتانے سے انکار کرتے ہوئے تمام ذمہ داری اپنے سر لی۔ مسلم معاشرہ پر سیاسی جمود کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج کی وحشت بھی اس قدر غالب تھی کہ انھیں ایک بھی وکیل یا بیرسٹر مقدمے کی پیروی کے لئے میسّر نہ ہو سکا اور ایک دو پیشیوں میں ہی دو سال قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔ حسرت مسلمانوں میں پہلے سیاسی قیدی ہیں یہ پہلی گرفتاری ہی نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی اور حبس دوراں انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ شوہر کی محض چند سالوں کی رفاقت میں ہی اس دیہاتی ماحول میں پلی ہوئی لڑکی

کا شعور کتنا بیدار، کتنا پختہ ہو گیا تھا اور اب ایک واضح منزل کی طرف گامزن تھا۔ مصیبت کے اس نازک وقت میں وہ نہ صرف ہر اعتبار سے رفیق سفر ثابت ہوئیں بلکہ یہ اُن کی مستقل مزاجی، ہم خیالی ہی تھی کہ مجاہد آزادی ہر اس افتاد کو جھیل گیا جو بڑے سے بڑے رہنماؤں کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی تھی۔ بقول حسرت "گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن انکی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و نا مدربانی حیرت انگیز حوصلہ اور استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کارپردازان زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہ امرحق کی پیری کے باعث یونہی توی تھا لیکن ان کی بہ تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں لیکن آخر تک ان کی جرأت، ہمت میں فرق نہ آیا"

(مشاہداتِ زنداں، بحوالہ حسرت کی سیاسی زندگی عبدالقوی دسنوی ص ۱۷-۱۶)

دورانِ نظر بندی جب علی گڑھ مجسٹریٹ نے حسرت کو پڑھنے لکھنے کی اجازت دے دی تو بیگم حسرت برابران کے پسندیدہ اخبار ان تک پہونچاتی رہیں۔ حسرت کی درویشی پانچسو روپے جرمانہ کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی عزیز و نایاب کتابیں حکومت کی طرف سے صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دی گئیں۔

دورانِ قید حسرت نے جن مصائب اور سختیوں کا سامنا کیا اس کی ہولناک داستان "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے اردوئے معلی میں قسط وار شائع ہوئی جو سامراجی آمریت و بربریت کی ایک مستند تاریخ ہے۔

رہائی کے بعد حسرت کا جوشِ عمل قید فرنگ کی بنا پر مزید ترقی کر گیا۔ دوستوں نے ہزار نرم روی کا مشورہ دیا مگر یہ نشہ اُترنے والا نہ تھا۔ یہاں تو عالم یہ تھا

ع بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

"دو چار پتھر کا بندوبست کر کے اپنے مختصر سے مکان میں ہی انھوں نے کاٹھ کا ایک پریس لگایا جس کا نام اردو پریس رکھا۔ اس مطبع میں بقول عتیق صدیقی اگر اسے مطبع کا شاندار نام دیا جا سکے تو حسرت کتابت کرنے کے علاوہ پریس مین کی خدمت انجام دیتے اور نشاط النساء پیپر مین کی"

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، عتیق صدیقی دہلی۔ ص ۲۸)

اب صوبہ متحدہ کی جیمس مٹن کی گورنمنٹ کو اردوئے معلیٰ کھٹک رہا تھا چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو اردو پریس سے جس کی کل کائنات ایک لکڑی کی دستی مشین اور دو پتھر تھے قانون مطابع کے تحت تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی حسرت کے پاس اردوئے معلیٰ اور پریس بند کر دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت کی مطلق العنانی پر احتجاج کرتے ہوئے الہلال کی دو مسلسل اشاعتوں میں "اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت" کے عنوان سے لکھا جو خصوصیت سے اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں انھوں نے بیگم حسرت کو حسرت کی "کوہِ عزم ثبات" بیوی سے تعبیر کیا ہے۔ (الہلال ۲۱-۲۸ مئی ۱۹۱۲ء)

اسی دوران پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی ہندوستان میں سیاسی ہل چل اپنے عروج پر تھی اور ساتھ ہی برطانوی آمریت بھی۔ ٹرکی سے ہمدردی کے سبب جو اس لڑائی میں جرمنی کا حلیف تھا ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی طبعًا جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مقاماتِ مقدسہ کے سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ مکمل دستورِ زبان بندی کے تحت سبھی احراری لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے حسرت ابھی تک آزاد تھے اور مسلم

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں انھیں بھی نظر بندی کا حکم ملا جسے ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا جس کی پاداش میں بالآخر انھیں قید کر دیا گیا۔

حسرت کی دوسری گرفتاری اور بیگم حسرت:

۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء میں حسرت دوسری بار گرفتار کیے گئے نشاط النساء بیگم کی زندگی میں یہ تاریخ "ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سیاسی زندگی عملی زندگی کا آغاز ہے جب انھوں نے گھر کی چہار دیواری سے نکل کر حسرت کے مقدمے کی پیروی اپنے ذمہ لی اور یہ کام انتہائی نامساعد حالات میں بڑی دلیری اور ہمت سے انجام دیا۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور بعد میں ان کے اسیری کے زمانے میں بھی انھوں نے بڑی ہمت اور قابلیت کے ساتھ حسرت کے پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمت بھی انجام دی مقدمے کی پیروی کے ساتھ ساتھ اخبارات کی وساطت سے حسرت کے حالات سے بھی عوام کو باخبر رکھا۔

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط تذکرہ ص ۲۹)

اس بار حسرت کو کئی جگہ قید رکھا گیا۔ پہلے علی گڑھ جیل میں رہے پھر للت پور لائے گئے۔ وہاں سے جھانسی، الہ آباد، پرتاپ گڑھ۔ فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں میں رہے۔ باہری دنیا کو ان تمام حالات کا علم بیگم حسرت ہی کے ذریعہ ہوا مثلاً یہ خبر:

" ہندوستانی لکھنؤ رقم طراز ہے کہ مسز حسرت موہانی کی ایک تحریر سے جو انھوں نے ہم کو ارسال کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کو للت پور میں نظر بند رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

(بحوالہ مدینہ اخبار بجنور۔ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء)

حسرت کو ۱۹۱۶ء میں قانون تحفظ ہند کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس

کے مذہبی اور اخلاقی جواز کو وہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا نے للت پور میں نظربندی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا علم بھی اخبارات کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ہوا آپ فرماتی ہیں کہ آج حسرت کا خط آیا ہے۔ ان کا مستقل ارادہ ہے کہ ایسے حکم کی تعمیل سے جو بغیر اظہار جرم و موقع تردید سزا دینا ہے۔ انکار کر دیں گے۔" (ایضاً)

مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد حسرت کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ ابتداً نشاط النساء بیگم بھی اس سے مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھیں جیسا کہ مولانا عبدالباری کے نام ایک ذاتی خط مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا تھا:

"کل محمد علی صاحب کا خط بھی (چھنڈواڑے سے) آیا ان لوگوں کی بھی یہی رائے ہے حسرت خدا کرے راضی ہو جائیں ورنہ مصیبت تو ہی ہے"

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، تذکرہ ص ۵۸)

لیکن جب احکام نظر بندی کی خلاف ورزی میں حسرت پر مقدمہ چلایا گیا تو وہ پوری طرح غیر ملکی سامراجیت سے ٹکر لینے کے لئے سینہ سپر تھیں۔ مولانا کو للت پور جیل میں انھوں نے جو حوصلہ افزا خط لکھا وہ ملاحظہ ہو:

۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء

آج کارڈ ۲۷ کا لکھا ہوا اور لفافہ بھی ساتھ ملا۔۔۔۔ تمہارے استقلال کی حد ہو گئی، میں تعریف کرتی ہوں مگر افسوس کہ تم سے علیحدہ رہنے کا خیال سخت تکلیف دہ ہے۔ ناقابلِ برداشت ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے خیالِ غالب یہی ہے کیونکہ تم اپنی دُھن کے پکے ہو۔ اور واقعی حق سے اجتناب کرنا ایک سچے مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔ ظلم خدا ہرگز پسند نہیں کرتا وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ مگر ہم کو کیا۔ ہماری چند روزہ زندگی تو گورنمنٹ کی مہربانیوں کی نذر ہو گئی تھی دنیا میں تو انصاف نہیں رہا نہ سہی۔ خدا منصف ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کی

مہربانی اور مدد پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ جو ظلم کرتا ہے وہ اپنی تلوار سے اپنا نقصان کرتا ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے مگر ہم ظلم نہیں کرتے۔"

(بحوالہ اسلم ہندی، رازدانِ حیات سوانح حسرت موہانی، ص ۲۷، ۱۲۸)

مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا:

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا تھا کہ حسرت اپنی دھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے اسی پر بھروسہ ہے۔ خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے آمین۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر خدانہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہیئے اور خدا سے دعا کرنا چاہیئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرتِ کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہو جائے۔"

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۶۱)

برطانوی استبداد کے سامنے سر جھکانا حسرت کی سرشت میں تھا نہ بیگم حسرت کی بلکہ معاملہ بالکل ہی برعکس تھا ؎

جی مانتا نہیں کہ رہوں بے خطا کئے   تعزیر دے کے آپ نے عادت بگاڑ دی

چنانچہ جب احکام نظر بندی کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہو کر حسرت ڈیڑھ سال کے لئے جیل چلے گئے تو اپنے اخباری بیان میں ان کی کوہِ عزم و ثبات" بیوی نے کہا:

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خودرائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس رائے کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے ایسی نظر بندی سے قید بہرحال بہتر ہے حسرت نے خوب کیا مجھے اُن سے یہی امید تھی۔ (بیگم حسرت اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۲۰) واضح رہے کہ "یہ رائے کسی خوشحال گھرانے کی عورت کی نہیں۔ بیگم حسرت کی تھی۔ جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اور اُجرت پر سلائی کر کے چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں۔"

(کرشن بلدیو شرما آجکل اگست، ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۲)

دورانِ مقدمہ نشاط النساء بیگم نے حسرتؔ کے مقدمے کی پیروی کا کام انتہائی ناساعد حالات میں کیا۔ ان کی زندگی کا یہی وہ دور ہے جب انھوں نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا۔ "وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتیں اور کسی کی پرواہ نہ کرتیں۔"
(سید سلیمان ندوی "نگار" لکھنؤ حسرت نمبر جنوری، فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۱۸)

بقول پنڈت کشن پرشاد کول "یہ جرأت مندانہ اقدام انھوں نے اس وقت کیا جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔" (ایضاً ص ۵۹)

حسرتؔ کے بیرسٹر دوستوں نے ان کے مقدمہ کی پیروی سے گریز کیا۔ اس سلسلے میں وہ جن صبر آزما مرحلوں سے گزریں اس کے کرب و بے بسی کا اندازہ مولانا عبدالباری کے نام خط کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے "افسوس ہے کہ کوئی وکیل بیرسٹر پھانسی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیسی مجبوری و افسوس کا مقام ہے۔" (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط۔ متذکرہ ص ۵۷) تاہم باوجود اس عالم کس مپرسی کے جس ہمت و جرأت مردانہ کا انھوں نے ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان دنوں خود ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت رانچی میں نظربند تھے انھیں کے نام اپنے ایک طویل خط میں کیا ہے:

"اخبارات میں صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ کا کمیونک نظر سے گذرا اور آپ کا خط بھی جو سنٹرل (مسلم) بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی خالی نہیں ہوئی ہیں . . . .

جب میں آپ کے عزم و استقلال اور اس کے ساتھ تنہائی و کس مپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا قلب کا کیا حال ہوتا ہے، یہ اللہ ہی کی مدد ہے جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجہ عزم بخشا ہے جو کسی مرد کو

بھی آج نصیب نہیں۔" مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۱۷۰، ۹"

انھیں دنوں حسرت کے نام اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی نے بھی جو اس وقت چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے بعض ہم عصر لیڈروں کی روش سے اظہار مایوسی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

" البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے زیادہ بہن (نشاط النساء) کا جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس جرأت و ہمت سے سنبھالے ہیں اور ساکت و صامت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو بآواز بلند سب کو سنا رہی ہیں تو بے اعتباری دور ہو جاتی ہے (محمد علی بنام حسرت موہانی نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۲۳۶)

بیگم حسرت کے نام بھی علیحدہ ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں احساسات کا اظہار کیا:

" بھائی حسرت سے کہہ دیجئے کہ برادرم! باوجود عزم و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں تم سے بھی بڑا ایک دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر بھی نہ دے سکے اور شاید قید ہو کر بھی نہ دیا۔" (احمد لاری، حسرت موہانی حیات و کارنامے، لکھنؤ ص ۱۴۶)

حسرت نے اس بار بھی قید فرنگ میں جن صعوبتوں کا سامنا خندہ پیشانی سے کیا اس کی اطلاع بھی بیرونی دنیا کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ملی۔ مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۶ء میں لکھتی ہیں:

" ، ، محرم کو دفعتاً الہ آباد جیل میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں یعنی ان کا سامان ضروری لوٹا، جوتا وغیرہ زبردستی لے لیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رو سے جھانسی جیل میں اور اب تک الہ آباد جیل میں ان چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کر دے کہ مسلمان

ہونے کی حیثیت سے میں نے قیدی کے ساتھ کوئی رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ حالانکہ اس نے کوئی رعایت بجز سختی کے نہ کی تھی۔ کھانا بھی وہی جوار باجرہ کی مٹی ملی ہوئی روٹی ملتی ہے جو درد گردہ کی وجہ سے حسرتؔ کے لئے سخت مضر ہے۔ چنانچہ حسرتؔ نے بھی یہ عہد کر لیا کہ، رمحرم سے جھگڑا شروع ہے اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی بحمداللہ پیروئ حسین کے لئے اچھی طرح تیار ہوں۔"

(بیگم حسرت اور اُن کے خطوط متذکرہ۔ ص ۱۱۳)

لیکن ان ایامِ بلا" میں بھی بیگم حسرتؔ کی غیور طبیعت نے حسرت کے سیاسی دوستوں کی مالی اعانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا۔ تفصیل کشن پرشاد کول کی ہے "غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گذر رہی ہے میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں وہ میرے نام اور حسرتؔ سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جاکر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرتؔ اپنی بیمار بوڑھی ماں اور بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں حسرتؔ کے متعلق بات چیت ہوئی وہ جیل میں حسرتؔ کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں آپ اس کی زحمت گوارا نہ کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعراء کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ

بند ہو گیا۔ یہ کاروبار ہی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں بیکار پڑا جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائیگی میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے، سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپے انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لئے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپیہ کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصے تک 'ہندوستانی' اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔" (کشن پرشاد کول نگار یادگار حسرت نمبر ۵۹)

پنڈت کشن پرشاد کول کے اس بیان کی تصدیق بیگم حسرت کے مندرجہ ذیل خط سے بھی ہوتی ہے جو کم و بیش اسی طرح کی مالی اعانت کے سلسلے میں انھوں نے ایڈیٹر "ہمدم" کو لکھا تھا۔ اسی قیدِ فرنگ کے دوران ان کے یہاں حوصلہ شکن چوری ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے بی اماں نے مسٹر تاج الدین کے نام اپنے خط میں لکھا تھا: "حسرت کے واقعات سے تم مجھ سے بھی زیادہ واقف ہو۔ سرکاری پولیس اس ناکردہ گناہ کو گرفتار کرنے میں تو بے حد مستعد کار تھی مگر کسی سے اس کی دوکان کی حفاظت نہ ہو سکی جو اس غیرت مند مسلمان اور اس کی بیوی و بچی کے گذر اوقات کا ذریعہ تھی۔ کئی ہزار کا مال چوری ہو گیا مگر چور کا سراغ نہ ملا۔"

(اخبار جمہور۔ کلکتہ: ایڈیٹر قاضی عبدالغفار۔ ۱ر جولائی ۱۹۱۶ء)

بعض ہمدرد نامہ نگاروں نے توجہ دلائی کہ بیگم حسرت موہانی کی چندے سے امداد کی جائے عارف ہسوی صاحب کو ان کی طبیعت کے پیشِ نظر شک تھا کہ وہ یہ امداد قبول نہ کریں گی جواب میں بیگم حسرت نے جو خط ایڈیٹر ہمدم کو تحریر کیا اس کی نقل

مندرجہ ذیل ہے۔

" ۵ ر دسمبر ۱۹۱۷ء، علی گڑھ

برادر محترم تسلیم۔ "ہمدم" میں چوری کے متعلق نوٹ عارف صاحب اور آپ کا نظر سے گزرا آپ کے اظہار ہمدردی کا دلی شکریہ۔ ہمدردی کے جواب میں عرض یہ ہے کہ آپ اس کو شائع فرما دیجئے مشکور ہوں گی۔ اپنے نقصان کا بار دوسروں پر ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم اگر لوگ ہمارے دفتر کی موجودہ کتابوں کی خریداری کے ذریعہ سے مدد کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ اس کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی۔ اے ایڈیٹر ہندوستانی، کا شکریہ خاص طور پر ادا کرنا لازم ہے کہ ان کے ذریعے سے اس قسم کی اعانت پہلے بھی ملتی تھی۔ اور اب پھر۔ ۵ روپے نقد خریداری کتب کے لئے وصول ہوئے ہیں کہ اس رقم کی جو جو کتابیں بہ آسانی بھیجی جا سکتی ہیں بھیج دیجئے چنانچہ شرح دیوان غالب اور دیوان حسرت وغیرہ کتابیں ان کو جلد یہاں سے روانہ کر دی جائیں گی۔ یہی طرز عمل اور لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خاکسار بیگم حسرت موہانی" (بحوالہ مدینہ اخبار بجنور ۱۲ ر دسمبر ۱۹۱۷ء) یقیناً ایسی ہی قابل احترام ہستیوں کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا ؂

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بیگم حسرت کا یہی کردار تھا جس سے متاثر ہو کر سید سلیمان ندوی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

" شوہر کے قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری و استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔" (نگار لکھنؤ حسرت نمبر تذکرہ ص ۱۱۸)

حسرت ابھی قید فرنگ میں ہی تھے کہ بیگم حسرت نے وزیر ہند سے ملاقات

کرنے والے ہندوستانی خواتین کے ایک نمائندہ وفد میں شرکت کی۔ اس شرکت کی اہمیت دو وجوہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ نشاط النساء بیگم نے دوران ملاقات جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ تنہا ان کے کردار کی عکاسی کے لئے کافی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کُل ہند وفد میں ان کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اس وقت تک وہ قومی سیاسی زندگی میں بہت اہم مقام حاصل کر چکی تھیں۔

۱۹۱۷ء وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ قومی آزادی کے سلسلے میں عوام کی توقعات میں اضافہ ہوا تھا جنھیں وہ اپنی جنگی خدمات کا جائزہ صلہ سمجھتے تھے۔ ادھر جنگِ عظیم اپنے فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستانی امداد کی مزید توقع اور دستوری اصلاحات کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو نے ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد کو بھی ان سے ملاقات کرنے کے لئے مدعو کیا گیا، اس وفد میں بی اماں (والدہ محمد علی) اور بیگم حسرت کے نام بھی شامل تھے گو بی اماں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر وفد میں شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن نشاط النساء بیگم اس میں شریک ہوئیں۔ اس کا ایک گروپ فوٹو آل انڈیا ویمنس کانفرنس نئی دہلی کے دفتر میں موجود ہے جس میں مسز این دلوی۔ بیگم حسرت موہانی، ڈاکٹر مس این جوشی، مسز جبارا داس، مسز چندر سیکرآئر۔ مسز ایس کروسرائی چیتی، مسز لزندراس، مسز سروجنی نائیڈو اور مسز بیسنٹ وغیرہ شامل ہیں (حسرت موہانی ایم حبیب خاں دہلی ۱۹۵۲ء ص ۲۳)

اس ملاقات کا پس منظر اور اس کی اخباری رپورٹ درج ذیل ہے:

"مسٹر محمد علی کو صاحب وزیرِ ہند سے ملنے کی اجازت نہ ملی۔ پھر اسی لئے صاحب وزیرِ ہند کی تشریف آوری سے قبل یہ اعلان کیا گیا کہ وہ ریفارم اسکیم کے سوا کوئی ایڈریس نہ لیں گے۔ پھر اسلامی جلسہ شوریٰ لکھنؤ منعقدہ ۴ ارنومبر سے دو دن قبل لیگ کو یہی فیصلۂ آسمانی یاد دلایا گیا۔ اسی مستحکم دلیل اور قومی محبت سے

صوبہ متحدہ کی لیگ کے وفد کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی نظر بندی کے مضمون پر سرخ نشان پھیر کر آئے ورنہ باریاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تمام مسلمانانِ ہند کے قائم مقام وفد سے کہا گیا کہ وہ بھی نظر بندوں کے مضمون کو اپنے ایڈریس سے خارج کر دے۔ باوجودیکہ وفد کے صدر عالی جناب نواب اسحاق خاں صاحب نے بار بار عرض کیا کہ ہم ارکانِ وفد اس بارے میں مجبور رہیں لیکن دفتری اقتدار کی جانب سے جواب ملا کہ مزاجِ شاہانہ تاب خلاف ندارد۔ آخر کار اسلامی وفد، کروڑ مسلمانان ہند کی امیدوں کا خون کر کے بے نیل و مُرام واپس آ گیا۔ غرض صاحب وزیر ہند پہرے بٹھائے گئے اور سخت سے سخت امور کا ارتکاب کیا گیا تاکہ صاحب وزیر ہند کے سمع مبارک تک نظر بندوں کی فریاد نہ پہنچے مگر بیگم صاحبہ حسرت موہانی کی اس دلیری پر دفتری اقتدار انگشت بدنداں ہوگا اور یا پھر غصہ سے ہاتھ کاٹ رہا ہوگا کہ بیگم حسرت نے صاحب وزیر ہند کے روبرو نظر بندوں کی آزادی کا پیغام پہنچا دیا۔ چنانچہ جب وہ خاتون ہند کے وفد میں ان کے سامنے پیش ہوئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا تو فوراً ہی بلا تکلف انگریزی زبان میں کہا "جب کہ باغیانہ آئرلینڈ کو رہا کر دیا گیا ہے تو نظر بندانِ ہند کو بھی آزاد فرما دیجئے" اور پھر یہ کہہ کر کہ نیو ایرا (NEW ERA) کا وہ پرچہ پیش کر دیا جس میں مسٹر مانٹیگو اور مسلمان کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہو چکا ہے اور جو حال ہی میں حکومت صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا ہے۔

راستہ روک کے کہہ دوں گا جو کہنا ہوگا
کیا ملو گے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

ہم اپنی بہن کی خدمت میں تمام ملک کی طرف سے اس جرأت و شہامت پر صرف یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں۔ "آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو"

(بحوالہ اخبار مدینہ بجنور ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۷ء)

مندرجہ بالا اخباری رپورٹ سے ایک نیا انکشاف بیگم حسرت سے متعلق یہ بھی ہوتا ہے کہ انھیں اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ یہ

استعداد انھوں نے کب اور کیوں کر بہم پہنچائی، اس بیان کے قریبی اعزا رہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

کل ہند زنانہ وفد کی اس نمائندگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرؔت کے کردار اور قومی محاذ پر ان کی سرگرمیوں کے سبب جدوجہد آزادی کی عظیم مجاہدہ بی اماں (والدہ محمد علی) کی نظر میں ان کے لئے کتنی وقعت و عزت تھی اسی سلسلے میں سنرا دما نہرو کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء میں انھوں نے تحریر کیا تھا:

"اخباروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اس بہادر اور پیاری بیٹی نشاط بیگم (بیگم حسرؔت موہانی) کے ساتھ مجھے بھی ممالک متحدہ کی خواتین کی قیادت اس وفد میں کرنا ہے جو تمام خواتین ہند کی جانب سے جناب وزیر ہند کی خدمت میں ۱۸ ماہ حال کو ملاقات میں حاضر ہونے والا ہے۔" شوکت علی و محمد علی صاحبان کی نظر بندی کے چند اہم خطوط

(انجمن اعانت نظر بندان اسلام (نمبر ۲) دہلی ۱۹۱۸ء ص ۶۹)

حسرؔت کی قید کی یہ مدت تو ۲۲ر مئی ۱۹۱۸ء کو ختم ہو گئی، تاہم نظر بندی کے احکام اپنی جگہ بدستور رہے۔ نشاط النساء بیگم کی قوتِ ارادی کا اب پھر وہی امتحان اور عزم و استقلال کی پھر وہی آزمائش تھی۔ بوقت رہائی وہ نواب اسحاق خاں صاحب اور قاضی بشیرالدین وکیل کے ہمراہ جیل کے دروازے پر استقبال کے لئے موجود تھیں۔ رہائی کے بعد کی تفصیل ایڈیٹر جمہور کی زبانی سُنیے۔

"قاضی بشیرالدین صاحب کا تار اور بیگم صاحبہ حسرت موہانی کا ایک مفصل خط ملا جس سے حسب ذیل امور معلوم ہوئے:

(۱) مولانا حسرؔت نے گورنمنٹ کے احکام کو لینے سے انکار کر دیا

(۲) وہ آئندہ پھر پہلے کی طرح احکام نظر بندی کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ ہیں۔

(۳) گورنمنٹ ۶۰ روپیہ ماہوار وظیفہ دینا چاہتی تھی مگر مولانا نے اس کے

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

(اس کی تصدیق مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے بھی اپنے متذکرہ خط میں کی ہے۔" حسرت کی مثال اور بھی حیرت انگیز ہے حکومت نے جو دینا چاہا اسے لینے سے انکار کر دیا اس کو یاد آ گیا کہ اسی کے نانا نے تو فاطمہ کے لاڈلے کے منہ میں سے بیت المال کی کھجور کخ کخ، کہہ کر نکلوائی تھی کہ صدقہ اس کی اولاد پر حرام ہے جس کا نانا ایسا ہو اس کا نواسہ بھی حسرت کی طرح غنی کیوں نہ ہو۔ سچ ہے اسی کو یہ کہہ کر حکومت کا ملتا ہوا روپیہ ٹھکرا دینا سزاوار ہے ؎

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی اُمید ہے میری بڑا دل

(جمہور کلکتہ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء)

(۴) نواب اسحاق خاں صاحب و دیگر حضرات میموریل تیار کر رہے ہیں جو پندرہ دن کے اندر نینی تال میں پیش ہو گا۔ اگر منظور نہ ہوا تو بقول بیگم صاحبہ " وہی حالت سابقہ بدستور اور خود بخود قائم ہو جائے گی یعنی علانیہ قیام کٹھور کیا جائے گا اور تمام واقعات گذشتہ از سر نو واقع ہوں گے۔"

گو ممدوحہ کا یہ خط پرائیویٹ ہے اور ہمیں حق حاصل نہ تھا کہ ہم اس کے کسی حصے کو شائع کرتے مگر حسرت کے ہم قوموں کے لئے اس کے اندر جو پیام عبرت موجود ہے اسے ان تک پہنچانے کے لئے ہم نے یہ بے ضابطگی بھی گوارہ کی۔ موصوفہ فرماتی ہیں " افسوس اپنا ساتھ دینے والا اس وقت کوئی نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم آپ ہی کوشش کر دیجئے۔۔۔۔ میں عورت ہو کر کیا کر سکتی ہوں۔ خدا مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور ہمدردی پیدا کرے تو شاید بھلائی کی کوئی صورت نظر آئے ورنہ اس مرتبہ بھی خدا نخواستہ وہی ہوا تو صبر کر کے بیٹھ رہوں گی۔"

(جمہور، کلکتہ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۱۶ء)

بیگم حسرت کے اس خط سے گو ایک طرح کی بے بسی اور کس مپرسی کا اظہار

ہوتا ہے جو ان کی قوتِ ارادی کی فولاد جیسی صلابت اور عزم محکم کی چٹان جیسی مضبوطی سے میل نہیں کھاتا۔ لیکن یہ کیفیت یقیناً عارضی تھی جس کا واحد سبب اپنوں کی بے حسی اور بے رُخی تھی۔ اسی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے مرحوم قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا:

" بقول ہمارے نامہ نگار کے مسٹر حسن امام اور آنریبل مسٹر سمیع اللہ بیگ کی رائے یہ ہے کہ حسرت قانون تحفظ ہند کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مسٹر حسن امام کا تو ذکر ہی فضول ہے لیکن مرزا سمیع اللہ بیگ کو ہم ایک سمجھدار محب قوم سمجھتے ہیں اس لئے ہم صاحب ممدوح سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے خیال میں مسٹر گاندھی کا طرزِ عمل بھی قابلِ اعتراض ہے؟ کیا حق کے لئے جھگڑنے کا یہ طریقہ کسی حیثیت سے نامناسب ہے؟ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ گاندھی ایک ایسی قوم کے فرزند ہیں جو زندہ ہے اور حسرت ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے ہیں جو عزت اور عظمت کے ساتھ ہی اپنی عصبیت اور غیرت بھی کھو بیٹھی"۔ (ایضاً)

چند ماہ میرٹھ اور موہان میں نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں بالآخر حسرت کو پھر سے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن پابندیاں ختم ہوتے ہی وہ پھر سے اپنے معمولات میں سرگرم نظر آنے لگے۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ایک بار پھر انھیں گاندھی جی کے قریب لے آیا۔

۱۹۱۹ء کے امرتسر اجلاس میں حسرت کے ساتھ حسبِ معمول بیگم حسرت نے بھی شرکت کی جس کا تذکرہ عبدالمجید سالک نے اپنے مقالے حسرت موہانی میں کیا ہے۔

" مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہوا جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے اور محترمہ نشاط بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔"

(آجکل اگست ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۸)

۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ چھوڑ کر کانپور منتقل ہوئے تو بیگم حسرت بھی کانپور

آگئیں۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جس سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بیگم حسرت کی طبعی خوش مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس تلاشی کی غرض سے علی گڑھ میں ان کی قیام گاہ پر آئی بیگم حسرت نے چپہ چپہ دکھایا مگر ایک مقفل صندوق کے بارے میں کہا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیے گا اگر اندر کا بم پھٹ گیا اور آپ لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی پولیس انسپکٹر نے سپاہی سے کہا کہ صندوق کھول کر دیکھو اس بم کیا ہے۔ "سپاہی خوف زدہ تھا اور اس لئے اس نے اپنے افسر سے کہا کہ ذرا اور انتظار کر لیجئے اس صندوق کو مولانا سے ہی کھلوائیں گے جب سارا واقعہ سنایا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں جب اسے کھولا گیا تو وہ اندر سے بالکل خالی نکلا۔ مولانا کو جب سارا واقعہ بتایا گیا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا" بیگم نے مذاق کیا ہوگا"

(ضیاءالدین احمد برنی" عظمتِ رفتہ کراچی ص۱۹۲)

دسمبر ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستانی غم و غصّہ سے بیتاب تھے۔ ناگپور کے دسمبر اجلاس میں کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کی۔ اس میں حسرت کی شرکت ناگزیر تھی۔ بقول گاندھی جی یہ راہ حسرت کی دکھائی ہوئی تھی۔

(My experiments with truth - M.K. Gandhi P 478-82)

حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سودیشی تحریک کی قیادت کی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے علی گڑھ خلافت اسٹور بھی قائم کیا تھا۔ بیگم حسرت نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور مسلم خواتین میں اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے سودیشی کپڑے کی تجارت کی۔ ای پر شبلی نے کہا تھا "تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنئے ہوئے"۔ اس کا اعتراف گاندھی جی نے 'روز بروز سودیشی' کے عنوان سے اپنے مضمون "ینگ انڈیا" مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۲۰ء میں کیا ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ تحریک کو مقبول بنانے کے لئے وہ برابر ملک میں مختلف دورے بھی کرتی رہی تھیں۔ "سودیشی کی مقبولیت کا سب سے زیادہ خوشگوار اور حیرت انگیز تجربہ شریمتی سرلا دیوی چودھری اور محاذ آزادی کے مخلص انتھک مجاہد مولانا حسرت موہانی کی بیگم کا ہوا۔ اپنے بریلی کے تجربات کے سلسلے میں سرلا دیوی نے لکھا ہے کہ بیگم حسرت کی بلائی گئی میٹنگ میں پندرہ مسلم خواتین نے سودیشی کا عہد لیا

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol. XVII, P 429)

۱۹۲۱ء کا سال کانگریس کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احمد آباد کے تاریخی شہر میں اسی سال خلافت کانگریس و مسلم لیگ کے اجتماعات ہوئے۔ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی اور پھر کھلے اجلاس میں حسرت نے گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود مکمل سوراج کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پر امن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کے لئے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہے جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو (

(Report of thirty six Indian National Congress 1921 P 50)

اس وقت کسی فرد واحد نے بھی اس کی تائید نہیں کی مکمل آزادی کی یہ تجویز انھوں نے اسی سال خلافت کانفرنس کے اجلاس میں بھی پیش کی تھی۔ لیکن وہاں بھی کسی نے اس کی حمایت نہیں کی تاہم یہی تجویز آٹھ سال بعد کانگریس کے مقاصد میں شامل ہوئی۔ لیکن تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا پہلا اعلان حسرت کی زبانی ہوا۔ بیگم حسرت یہاں بھی حسرت کی ہم نوا و ہم سفر تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی راوی ہیں "یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں حسرت مع بیگم کے بیٹھے ہیں اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں۔ مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں اسی میں کھانا پینا ہے۔ ہجوم کی کوئی پرواہ نہیں۔ دوسری طرف دیکھا

کہ پنڈت موتی لال نہرو کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبے میں لگ رہا ہے اور وہ اس میں آرام سے سوار ہو رہے ہیں۔ اسی وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے۔ حسرت جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے با سروسامان کے لئے۔"

(سید سلیمان ندوی مقالہ و احسرتا! یادگار حسرت نمبر اردو اکاڈمی لکھنؤ نومبر ۱۹۵۱ء ص ۱۸۱،۱۷)

بیگم حسرت کی اس بے سروسامانی کی کیفیت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا انکی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس کے علاوہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہی کل ہند زنانہ کانفرنس کا اجلاس بھی بی اماں (والدہ محمد علی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، شریمتی چودھرائن سرلا دیوی اور دیگر ہزاروں مسلم و غیر مسلم خواتین کے ساتھ نشاط النساء بیگم بھی شریک تھیں (مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری۔ اثر بن یحییٰ انصاری ص ۱۸۱)

حسرت کی تیسری گرفتاری اور بیگم حسرت:

خلافت اور کانگریس کے اجلاس میں تقاریر کی بناء پر حکومت بمبئی نے حسرت پر تاج برطانیہ کے خلاف اقدام جنگ اور بغاوت کے الزام میں دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ چلایا گرفتاری اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ اس بار وہ یرودا (پونا) جیل میں رکھے گئے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی بھی اسی جیل میں مقیم تھے۔ انھیں پہلا درجہ دیا گیا لیکن حسرت جیسے "خطرناک" قیدی کے حصے میں ہمیشہ کی طرح جیل کا تیسرا درجہ ہی آیا اور یزیدی انداز بھی حسب سابق تھا جس کی تصدیق بیگم حسرت کے مولانا باری کے نام پونا سے لکھے گئے ۲۸ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط سے ہوتی ہے "اب تک مولانا کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کا برتاؤ نہایت سخت ہے بلکہ روزانہ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا ہے حال میں

مزید لغویت یہ کی ہے کہ برش، آئینہ، سرمہ، قرآن شریف رکھنے کا تختہ حتی کہ پانی کا گھڑا تک اٹھوالیا ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ روٹی ایک گیہوں کی صبح کو ملتی ہے وہ بھی بند جوار، باجرہ مٹی ملی ہوئی ترکاری خراب ملتی ہے۔ یہ سب سزائیں روزانہ اس لئے دی جاتی ہیں کہ کام کیوں نہیں کرتے مگر مولانا بھی اپنی دھن کے پکے ہیں۔ برابر سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ (بیگم حسرت موہانی اور انکے خطوط۔ تذکرہ ص ۹۷)

حسرت و بیگم حسرت کے تذکرے میں اس پس منظر کو دھیان میں رکھنا یوں ضروری ہے کہ قید و بند کی بڑی سے بڑی سختی بھی ان کو جادۂ مستقیم سے ہٹلنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ سچا جہاد ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان ہے۔ یہ ان کا ایمان تھا اور وہ زندگی بھر اس جہاد میں مصروف رہے۔ بحیثیت عورت طبعی نرم دلی کے باوجود بیگم حسرت ہر ہر قدم پر حسرت کی ہمنوا و دمساز رہیں۔ چنانچہ اس بار بھی وہ مع بیٹی و داماد کے پونا میں ہی مقیم رہیں اور اپنی کفیل آپ رہیں۔ اس بارے میں انھوں نے کسی کا احسان لینا قبول نہیں کیا۔

(ضیاء الدین برنی۔ بیگم حسرت عظمت رفتہ کراچی ص ۱۹۵) دوران قید حسرت کو باہر سے کتابیں منگانے اور لکھنے و پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ بیگم حسرت انھیں کتابوں کے حاشیوں پر خط کا مضمون لکھ دیا کرتی تھیں۔ ضیاء الدین کے جو اس زمانے میں حکومت بمبئی کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں تھے، استفسار پر انھوں نے بتایا تھا کہ "نہ تو میرا کوئی خط ہی مولانا تک پہنچتا ہے اور نہ مجھے ملاقات کی ہی اجازت ملتی ہے۔ اس لئے خطوں کی باتیں کتابوں کے حاشیے پر لکھ کر بھیجتی ہوں۔ (ایضاً)

دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے گیا اجلاس کے موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے ان کی عدم موجودگی میں تحریک موالات کی مخالفت اور کانسلوں میں شرکت کے سوال پر زوردار بحثیں ہوئیں حسرت بھی ان دنوں قید تھے۔ نشاط النساء بیگم نے نہ صرف اجلاس میں شرکت کی بلکہ ترک موالات کی وکالت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "مکمل آزادی کے جو لوگ علمبردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک

کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں وہ کانسلوں میں جا کر آئینی اصلاحات کی قسط وصول کر سکتے ہیں انھوں نے کہا کہ احمد آباد میں (کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ) مکمل آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی تھی، آج داخلۂ کونسل کے حامیوں کا زور اسی کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔

(انڈین انیول رجسٹر ۲۳-۱۹۲۲ء جلد اول ص ۹۱- ۸۷۲)

سزا کی مدت میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا کہ حسرت رہا کر دیئے گئے اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد کانگریس سے بددلی کے سبب ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو وہ اس سے مستعفی ہو گئے۔

مولانا حسرت کے مصائب سے بھرپور اس تمام عرصے میں جس طرح بیگم حسرت نے حق رفاقت ادا کیا اس کے پیشِ نظر خواجہ حسن نظامی نے ان کا شمار مشاہیر ہند میں کرتے ہوئے درویش جنتری میں لکھا تھا ”حسرت کی بیوی مسلمانان ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایام بلا میں ایسی وفاشعاری اس عورت سے ظاہر ہوتی ہے جیسی سیتا جی نے رام چندر سے کی تھی۔“

(درویش جنتری ۱۹۲۳ء بحوالہ کتابی دنیا۔ کراچی جنوری و فروری ۱۹۶۷ء ص ۱۴) تاہم ”ایامِ بلا“ کے دوران اس وفاشعاری سے جو نتیجہ عتیق صدیقی نے اخذ کیا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط میں انھوں نے تحریر کیا ہے ”حسرت کے ایامِ بلا“ ان کے قید و بند کی زندگی کا دور ختم ہوا تو نشاط النساء بھی اپنی گھریلو زندگی کے خول میں واپس چلی گئیں اور اپنی بقیہ زندگی کے دس سال اسی خول میں بسر کیے۔“ (ص ۷۴)

یہ تاثر کہ نشاط النساء بیگم تمام تر سیاسی سرگرمیوں کے پس پشت محض ایک جذبۂ رفاقت تھا۔ جدوجہد آزادی میں ان کی عظیم الشان خدمات کا مناسب اعتراف نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے سیاسی شعور کا آغاز اور ارتقاء حسرت کی صحبت

میں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ارتقاء کے مراحل جس تیزی سے انھوں نے طے کیے اس میں بڑا دخل ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھی تھا۔ عملی زندگی میں جوں جوں سامراجی آمریت واستبداد سے ٹکراؤ بڑھتا گیا اس کے استحصال کے حکمت عملی کے گھناؤنے نقوش بھی واضح ہوتے چلے گئے۔ اور سیاسی شعور میں پختگی کے ساتھ ساتھ آزادی کامل کا یقین بھی ایمان کی شکل اختیار کر گیا جس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیاں محض حسرت کے مقدمات کی پیروی تک ہی محدود نہ تھیں حسرت کے ساتھ ہر اہم سیاسی اجلاس میں ان کی شرکت اور اس کے لیے بے سروسامانی کی حالت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کی انتھک جدوجہد، کل ہند زنانہ کانفرنس میں شرکت، ہم خیال سیاسی رہنماؤں سے خط وکتابت، قومی اخبارات سے مسلسل ربط اور کل ہند زنانہ وفد میں مسز بیسنٹ وسروجنی نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت جو قومی سطح پر ان کی منفرد حیثیت کی واضح نشاندہی ہے۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدوجہد آزادی میں بھی ان کی حیثیت منفرد تھی۔ کشن پرشاد کول کا یہ بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وطن پرستی ان میں بھی ایسی ہی تھی کہ جیسے حسرت میں۔ ان کے خلقی رجحانات کے علاوہ غالباً حسرت کی صحبت نے ان میں چار چاند لگا دیئے تھے لیکن میرے خیال میں وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور پڑتا رہا،، (نگار، حسرت نمبر تذکرہ ص ۶۰) اس بیان کا مقصد موازنہ یا حسرت کی عظمت کو کم کرنا ہرگز نہیں۔ یقیناً حسرت کی عظمت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ خود انتہائی فراخدلی سے ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء میں بیگم حسرت کی دائمی جدائی کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں " راقم کو بیگم حسرت کی جدائی اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر

باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں اس لئے انھیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق
حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا" (حسرت اردوئے معلی فروری تا اپریل ۱۹۱۳ء ص ۲)

بیگم حسرت کی جرأت و ہمت کی صفات، ان کی کارکردگی کی اہلیت و صلاحیت
اور ملک کی آزادی کی خاطر جد وجہد کا تجزیہ اگر ہم اس زمانے کے مسلم معاشرے
کے پس منظر میں کریں تو ان کے کارناموں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

رہی عمر کے آخری حصے میں "گھریلو خول میں واپس چلے جانے کی بات تو میرے
خیال میں عمر عزیز کے آخری دور میں صحت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ خود مولانا
حسرت کے سیاسی مسلک کی تبدیلی بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ انڈین نیشنل
کانگریس سے مستعفی ہونے کے بعد جو باوجود اندرونی اختلافات کے ملک کی سب سے
زیادہ فعال جماعت تھی، خود حسرت کی زندگی بہت کچھ بدل گئی تھی۔ گو بعد میں وہ آل
انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی رہے اور مزدور تحریکات میں
بھی برابر حصہ لیتے رہے لیکن ان تمام کاموں میں اب وہ سرگرمی نہ رہی تھی جو اس
سے پہلے کے دور میں ملتی ہے جب حسرت اور بیگم حسرت دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے
اس لئے سیاسی سرگرمیوں کے نشیب و فراز میں بھی یکسانیت لازمی بات تھی۔ تاہم زندگی
کے اس دور میں بھی شواہد موجود ہیں کہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں کانگریس اجلاس کے
موقع پر مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت وہ دونوں مشترکہ طور پر کر رہے تھے۔
بہرحال نشاط النساء بیگم کی عوامی زندگی کا یہ آخری واقعہ ہے جس کا تحریری ثبوت
ملتا ہے۔

اس تمام تر تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ قومی جنگ آزادی میں بیگم حسرت کی قربانیوں
کے پس پشت جذبۂ رفاقت و جذبہ حب الوطنی دونوں ہی مساوی طور پر کارفرما
تھے اور قربانی جہاں ہو جس شکل میں ہو اس کا اعتراف خود اپنی بقا کے لئے ضروری
ہوتا ہے۔ اس اعتراف کے بغیر نہ ہم میں جوش عمل پیدا ہو سکتا ہے نہ حسن کردار
آ سکتا ہے۔ نئی نسل کا یہ شعور ہی کہ قومی آزادی ہم سب کی مشترکہ میراث ہے،
یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ اس قیمتی ورثے کی حفاظت بھی ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔

امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی)

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹ء) کے دوران جب دنیائے اسلام کے مفکرین ایک نازک دوراہے پر کھڑے شش و پنچ میں مبتلا تھے کہ آیا وہ بھی وطنیت کی آگ میں کود پڑیں یا وطنیت کے دیو کو ختم کرکے بذریعہ مذہب امن وامان کا علم بلند کرنے کی کوشش کریں تو مولانا محمد علی جوہر نے ایک نسخہ پیش کیا! "جب وطن کا معاملہ ہے تو میں اول ہندوستانی بعد میں مسلمان ہوں۔ اور اسلام کا معاملہ ہے تو میں پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی ہوں"! بالفاظ دیگر انھوں نے یہ ثابت کرنے میں زندگی صرف کردی کہ پان اسلام ازم اور حب الوطنی میں کہیں پر کوئی تصادم نہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے اس علمبردار نے کہا تھا:" آپ جو کہتے ہیں کہ جب تک انگریز رہیں گے پھوٹ رہے گی یہ میں نے مانا کہ درست ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ جب تک ہم میں پھوٹ رہے گی اس وقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے"! (ہمدرد، ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۵ء) اپنے اس مشن کی تکمیل میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھوں نے قیدیوں کے کپڑے و ٹوپی پہن کر ملک و ملت کی خاطر جیل میں پتھر بھی توڑے اور زمین بھی کھودی اور جرأت و بے باکی، حب الوطنی اور مذہبی حمیت کی جو مثالیں قائم کیں وہ

جنگِ آزادی کی تاریخ کی سنہری سرخیاں ہیں۔

امجدی بیگم اسی مجاہد ملک و ملّت کی رفیقۂ حیات تھیں۔ ان کا تعلق رامپور کے ایک باحیثیت اور باوقار خاندان سے تھا۔ گھر میں دینی و مذہبی کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے سبب مذہب کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ مولانا محمد علی جوھر سے شادی کے بعد سراسر انھیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ طبیعت انتہائی قانع پائی تھی مولانا کی فقیرانہ و قلندرانہ زندگی بھی اپنائی اور سیاسی مسلک بھی۔

برطانوی سامراج سے برد آزمائی کے سبب خاندان کی مالی مشکلات کا بی اماں (والدہ محمد علی) کے اس خط سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے مولانا کی نظر بندی کے دوران "ہفتہ نظر بندی اسلام" کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کو لکھا تھا، "ہمارے نظر بندوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی مالی حالت اس نظر بندی میں خراب نہ ہو گئی ہو اور جس کو باوجود بار بار کی یاد دہانی کے حکومت کی طرف سے خور و نوش کے لئے بھی کافی رقم ملتی ہو۔ علاوہ روزمرّہ کے اخراجات ضروری کے مالی نقصانات کا معاوضہ تو حکومت نے ایک کو بھی نہیں دیا۔ شوکت و محمد کی ہزاروں کی آمدنی یک قلم مسدود ہو گئی اور گھر سے پندرہ ہزار سالانہ سود وغیرہ تین برس سے دینا پڑ رہا ہے۔ ایک قرض خواہ نے شوکت پر بارہ تیرہ ہزار کی نالش کر دی ہے اور دوسرا ایک سکھ نالش کا نوٹس دے چکا ہے۔ روئی کا کارخانہ تین سال سے بند پڑا ہے اور اس کو چلانے کے لئے رام پور عارضی طور پر بھی جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ محمد کا پریس بھی بند ہے ہزاروں کا خانگی اور دفتر کا سامان پچیس تیس ہزار روپے کا باقی ہے۔ وہ زنگ گرد اور کیڑوں کی نذر ہو رہا ہے۔۔۔۔ نظر بندوں میں شاید سب سے بڑی رقم حکومت شوکت و محمد کو دیتی ہے۔ مگر حکومت نے خود اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو رقم ایک عرصہ تک انھیں دیتی رہی وہ ان کی ضروریاتِ زندگی کو بقدر نصف کے بھی پورا نہ کر سکتی تھی۔"

(اخبار جمہور، کلکتہ اڈیٹر قاضی عبدالغفار ۱۵ر جولائی ۱۹۱۸ء)

مولانا محمد علی اور امجدی بیگم کے خوشگوار آپسی تعلقات ہی کے سبب مولانا کی طویل مجاہدانہ زندگی قید و بند کی صعوبتیں ہنسی و خوشی جھیلتے گزر گئی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی رقم طراز ہیں۔

" میاں و بیوی میں میل محبت شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیئے عشق کی کیفیت تھی، عشق ایسا نہیں جس میں سوزش و شورش ہو اور جو تمام تر جوانی کے قوی کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے اور عربی میں اس کے لئے لفظ "اُنس" ہوتا ہے "۔

(عبدالماجد دریا بادی۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ص ۲۶۹)

مولانا نے ان کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے "امجدی بیگم ہر جلسہ، ہر سفر، خلافت کانفرنس میں مولانا کے ساتھ شریک رہتیں اور برابر جلسوں اور دوسری کارروائیوں میں حصہ لیتیں۔ انھوں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں جس کے اجلاس ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸، دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہوئے یوپی کی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی "۔

(A.M., S.G. Zaidi - Encyclopaedia of I N C. Vol. VIII 1921-24 p 66)

گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کانگریس کی ستیہ گرہ تحریک اور خلافت فنڈ کے لئے بی اماں (والدہ محمد علی) اور امجدی بیگم نے اپنے دوروں سے کروڑوں کا چندہ جمع کیا۔ انھوں نے ستیہ گرہ تحریک جسے خلافت کمیٹی اور کانگریس نے مشترکہ طور پر منظور کیا تھا۔ اس کے مقاصد انگریزی سامان کا مقاطعہ، شراب کی دوکانوں پر پکیٹنگ، فوجی بھرتی حرام، انگریزی نوکریوں سے استعفیٰ کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کے دور دراز کے سفر کے اخراجات کا بار اٹھانے میں تحریک خلافت کے رضاکاروں اور مولانا محمد علی کے خاندان کی خواتین کے فراہم کئے ہوئے چندوں کے اہم کردار کو نظرانداز

نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے میلکم ہیلی مرحوم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں مولانا محمد علی کی فرد جرم گناتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کے گھر کی عورتیں تک چندہ جمع کرتی اور شورش برپا کرتی پھرتی ہیں"۔

امجدی بیگم کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ انکے متعدد بار جیل کے سفر بھی اس بات کا محرک بنے کہ آزادی کے جو چند لمحات ان کی معیت میں گذریں انھیں بیش قیمت جان کر ایک لمحہ ضائع نہ کیا جائے۔" میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کافی لمبا سفر کیا ہے اور پبلک مصارف پر کیا ہے کیونکہ ہوا یہ کہ جب اس نے میرے ساتھ سفر کرنا شروع کیا تو اسے میرا بیکار کا ضیمہ بننا ناگوار گزرا۔ اور چونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا حساب و کتاب رکھنے والی تھیں اور کم سے کم اپنے عورتوں کے حلقے میں یقیناً وہ اتنی ہی اچھی منتظم بھی تھیں۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی عورتوں میں بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ اور خلافت فنڈ میں اتنی رقمیں جمع کیں کہ منتظمین نے انھیں اپنی طرف سے سفر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرتے اکٹھے گذارے۔ ہم مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سیکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فساد زدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے، مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے لیکن یہ بات میرے لئے تسکین بخش ہے جس میں کہ کچھ میری حیرانی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر"۔

(مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ و تاریخ ساز، مرتبہ محمد سرور ص ۱۸۵)

اس گرفتاری کی داستان کا گاندھی جی نے مختلف موقعوں پر تذکرہ کیا ہے اور امجدی بیگم کی قوت ارادی کو بھی جگہ جگہ خراج تحسین ادا کیا ہے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے اس گرفتاری

کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا "مولانا محمد علی کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب ہم مدراس کے لئے سفر میں تھے۔ میں ٹرین سے ہی یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ والٹیر اسٹیشن پر ٹرین ۲۵ منٹ سے بھی زیادہ دیر تک رُکی۔ مولانا محمد علی اور میں ٹرین سے اُتر کر ایک میٹنگ کو خطاب کرنے چند قدم چلے ہی تھے کہ میں نے مولانا کو زور زور سے وہ نوٹس پڑھتے ہوئے سُنا جو انھیں اسی وقت دیا گیا تھا۔ میں ان سے چند قدم آگے تھا۔ اس گرفتاری کے لئے ۲ دو سفید فام اور آدھی درجن ہندوستانی سپاہیوں کی پارٹی تعینات کی گئی تھی۔ افسر انچارج مولانا کو وہ نوٹس ختم کرنے سے قبل ہی بازو پکڑ کر لے گیا۔ انھوں نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ میں مطلب سمجھ گیا۔ اب اس علم کو مجھے تنہا ہی بلند رکھنا ہے خدا مجھے اس ساتھی کے مشن کو پورا کرنے کی صلاحیت بخشے جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے باعثِ فخر تھا۔۔۔۔۔۔

میں نے مجمع سے خطاب کیا اور عوام کو پُرامن رہنے نیز کانگریس کا پروگرام کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ بعد میں مڑ کر میں اس مقام پر گیا جہاں مولانا کو حراست میں رکھا گیا تھا اور ان سے ملاقات کی اجازت چاہی، جواب ملا کہ صرف ان کی بیگم اور سکریٹری ہی کو اجازت ہے۔"

(Collected works of Mahatma Gandhi, Ministry of Information Govt. of India Vol. XXI, P. 176)

اسی سلسلے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کے "نوجیون" میں بھی امجدی بیگم کے زبردست صبر و تحمل اور جذبۂ ایثار کی تعریف میں انھوں نے لکھا "مجھے بیگم صاحبہ محمد علی کی جرأت پر غیر معمولی حیرت ہے جب وہ مولانا سے مل کر والٹیر اسٹیشن پر واپس ہوئیں تو میں نے اُن سے پوچھا آیا آپ کے دل میں کسی طرح کا کوئی خوف تو نہیں؟ انھوں نے فوری جواب دیا "قطعاً نہیں، میرے شوہر نے اپنا فرض پورا کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔" اس گرفتاری کے بعد بھی وہ اسی

جرأت وہمت سے میرے ساتھ سفر کرتی رہیں ۔۔۔۔ برقع میں ملبوس وہ زنانے و مردانے سبھی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اور مختصر سی تقاریر بھی کرتی ہیں۔ جس کا براہِ راست اثر عوام کے دلوں پر ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر شخص سے کھادی پہننے چرخہ کاتنے اور مسلم عوام سے سمرنا فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل بھی کی ہے کچھ ہی عرصہ قبل ان کی زندگی ایک آرام و آسائش کی زندگی اور نفیس و ملائم لباس ان کا پسندیدہ لباس تھا لیکن اب وہ موٹی کھادی کا ہرا برقعہ پہنتی ہیں جبکہ ایک مسلم خاتون کو اپنی ہندو بہن کے مقابلے میں کپڑے بھی زیادہ پہننے ہوتے ہیں اور بیگم صاحبہ کا جسم بھی کچھ ہلکا پھلکا نہیں ہے لیکن وہ ان تمام تکالیف کو ملک و مذہب کی خاطر ہنسی خوشی برداشت کر رہی ہیں۔ مدراس میں میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ مسلم خواتین کے سفید موٹے لباس میں ایک طرح کا تقدس نمایاں ہے، ہندو خواتین کے رنگا رنگ ملبوسات مجھے موجودہ حالات میں پسند نہیں آئے۔" (Ibid : P 205)

قومی لحاظ سے ہندوستانی خواتین کی خدمات کے تذکرے میں ۲۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے امجدی بیگم کے لئے "ایک بہادر خاتون" کے عنوان سے خصوصی طور پر لکھا۔ "بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے مجھے جو تجربات ہوئے ہیں اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ سال انھوں نے پبلک کاموں میں اپنے شوہر کی مدد کرنا شروع کیا۔ ابتدا سمرنا فنڈ کے لئے چندہ کرنے سے ہوئی۔ تب سے وہ ہمارے طویل اور دشوار ترین۔ ہمارے آسام بنگال کے سفر میں بھی شریک رہیں۔ انھوں نے خواتین کے جلسوں سے بھی خطاب شروع کر دیا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے باوجود انتہائی پُر اثر ہوتی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا وہ اپنے شوہر کو بھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا یہ آرٹ سکھا سکتی ہیں یا نہیں؟ ۔۔۔۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش اور اس میں فتح کا وقت آیا جب اُن کے شوہر کو اسٹیشن پر ان سے

چھین لیا گیا۔ میں نے انھیں اس وقت دیکھا ہے جب وہ اس کمرے سے نکلیں جہاں ان کے شوہر کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ وہ اسٹیشن کی طرف جمے ہوئے قدموں سے چل رہی تھیں اور جب میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے شوہر کی گرفتاری کے سبب خوش ہیں؟ ان کا فوری جواب تھا یقیناً۔ وہ اپنے ملک و ملت کی خاطر جیل گئے ہیں۔" ہم نے اپنا مدراس کا سفر جاری رکھا، سمندر ساحل پر زبردست عوامی جلسہ ہوا، سامعین اس وقت تک اُن سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے اونچی آواز میں بغیر کسی لڑکھڑاہٹ کے خوبصورت ہندوستانی میں عوام سے خطاب کیا اور میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ صحیح معنوں میں بہادر شوہر کی بہادر بیوی ہیں۔" (Ibid P 218 - 219)

جیل کی اذیت ناک زندگی اور محبوب شریکِ حیات سے جُدائی کے لمحات میں مولانا کے لئے قومی زندگی میں امجدی بیگم کی شرکت اور دار و رسن کی آزمائش میں ان کی ثابت قدمی کا تصور نہ صرف انتہائی خوشی کُن تھا بلکہ نئے عزم و ولولے کا محرک بھی تھا۔

ہم میں اور تم میں ہوئے محبس و زنداں حائل
آؤ رویا میں کریں اپنی تمنا حاصل

کراچی جیل سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کے نام ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں تشکر کے طور پر لکھا:

"پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں لیکن بوجہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپکے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں ان کارروائیوں کے متعلق جو وہ والیٹر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی ہیں پڑھیں! اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا..... غالباً میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم میاں بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی اور یہ ہندوستان

میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے اس جدائی نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز شریک زندگی بنا دیا۔ اور گذشتہ عرصے میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے اختیار کی تھی اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پرخطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ میری نظروں میں جس قدر عزیز و محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی۔ وہ ریلوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور نہایت فراخدلی سے مجھ سے کہا "ہراساں نہ ہونا، میری اور میری بچیوں کی فکر نہ کرنا۔"[1] مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئی اور نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی۔۔۔۔ آپ نے جو کچھ ہماری وکالت اور تعریف کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لیے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جانباز اہلیہ کی تعریف کی ہے۔ حقیقتاً میں اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں کرتا۔ مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان بھی جلد ختم ہو جائیگا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی سے جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک انگیز داد لیتی رہے گی۔" (رئیس احمد جعفری۔ علی برادران، ص۔ ۵۵)

۲۷ نومبر ۱۹۲۱ء کے "ینگ انڈیا" میں اس خط کو شائع کرتے ہوئے گاندھی جی نے نوٹ لکھا تھا کہ اس خط کی اشاعت کی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسی دستاویز ہے جس میں مولانا کے اندر کا انسان مکمل طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔"

(Collected works of Mahatma Gandhi OP. Cit. P 350)

---

[1] "نوٹ: یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں بھی مولانا نے اس مختصر ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ دشمنان ملک و ملت کے سامنے انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رازق تھا اب بھی وہی رازق ہے تم صرف ایک واسطہ تھے، خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے رہا تمہارا کام سو اگر اجازت دو تو میں اسے کرتی رہوں۔

والیٹر اسٹیشن پر گرفتاری کے وقت امجدی بیگم کی ثابت قدمی اور سپاہیانہ
رویے کا تاثر کتنا گہرا اور مولانا کو اس پر کتنا فخر تھا۔ اس کا کھل کر اظہار انھوں نے
کراچی جیل سے ہی لکھے گئے بی اماں کے نام ایک خط میں کیا ہے: "میں بھی چالیس
اکتالیس سال کی عمر سے یہاں داخل، گھر پر آیا کرتا ہوں۔ پہلے بیتول کی قید، پھر رہائی ہوتے
ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ، بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا کر چھ سات
مہینے کو چھوڑ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی
میں ہی بسر ہوا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر کے اسٹیشن پر قید کی ابتدا کا خیال کیا
جائے تو یہی غنیمت ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں بھی ملاقات کا
دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے۔ ورنہ منی غریب کس کس کے بچوں کو پالتیں ......
آپ میرا یہ خط امجدی کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی الفاظ اسے یاد دلادیں کہ
خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی والیٹر کے اسٹیشن کا سپاہیانہ رویہ جواب تک قائم
رکھا ہے قائم رکھو جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد شامل ہے تو یہ عورت
اپنے مسلمان اور ہندوستانی بھائیوں کے سامنے کسی بھٹر دلی کے اظہار سے نہ
خود شرمندہ ہوگی، نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور اپنے شیر دل ہزاروں مرنے
والوں کو شرمندہ کرے گی۔" (علی برادران تذکرہ۔ ص ۹۴۵)

" مقدمہ کراچی کے دوران امجدی بیگم کراچی چلی گئیں تھیں۔ مولانا کو سزا ہو
جانے کے بعد وہ واپس علی گڑھ آ گئیں۔ طلباء جامعہ نے ان کی ہمدردی میں ایک
جلسہ محمد علی ہال میں کیا۔ نہایت دکھے دل سے اچھی زبان میں آپ نے ایک دلدوز
تقریر کی۔ طلباء جامعہ زار و قطار رو رہے تھے، وہ تو ان کو کیا ڈھارس دیتے الٹی
بیگم صاحبہ ہی ان کو ڈھارس دے رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا "بچو! بے شک مولانا
کی سزایابی سے میں سخت مغموم ہوں، لیکن خداوند قدوس پر بے حد بھروسہ رکھتی
ہوں۔ آدمی کی موت و زیست کا کوئی بھروسہ نہیں ہے ٹھوکر لگی اور آدمی مر جاتا
ہے۔ پھانسی لگتی ہے اور آدمی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے یہ تو دو برس کی بات ہے

میں تو یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ چاہے گا تو یہ زن بھی نکل جائیں گے"۔

(سید محمد ہادی: علی برادران ص ۱۱۵)

مولانا محمد علی جب تک جیل میں رہے ان کا کام جیل سے باہر ان کی والدہ اور بیوی انجام دیتی رہیں جیسا کہ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں مولانا نے لکھا ہے۔

"ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا دروازہ بند ہو گیا تو میری ماں نے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں عصائے پیری کو لیا، نقاب اُلٹ کر وہی کام کرنا شروع کیا جو ہم کیا کرتے تھے مگر جسے حکومت نے خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال کر ہم سے چھڑا دیا تھا۔ میری اہلیہ نے اس سے پہلے ہی عورتوں میں جن کا ذوق وشوق مردوں سے کہیں بڑھ کر تھا اس کام کو شروع کیا تھا اور وہ میری رفیق کار اور رفیقِ سفر بن گئی تھیں"۔ اور یہ رفاقت زندگی کے آخری سانس تک باقی رہی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی، دوسری آنکھ کی بینائی بھی جواب دے رہی تھی، گٹھیا کے اثرات بھی تھے اور ذیابیطس کے حملے بڑی شدت سے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر مکمل آرام و علاج کا مشورہ دے رہے تھے لیکن یہ مجاہد تھا کہ میدانِ جنگ کے لئے مچلا ہوا تھا۔ اسی شدید علالت کی حالت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وہ لندن روانہ ہوئے۔ حسب دستور امجدی بیگم اس آخری سفر میں بھی رفیقِ سفر تھیں۔ اس سفر کے بارے میں مولانا نے کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطانِ جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مرجاؤں اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر جس طرح بھی ہو سکے تین چار ہزار درہم فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے چلوں گا اس لئے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل میں میری رفیقِ سفر رہی ہیں"۔

(محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق متذکرہ دوئم ص ۱۵۶)

مولانا کی شدید علالت اور وفات کے درمیانی وقفے میں امجدی بیگم نے جو خطوط ہندوستان اپنی بیٹی کے نام لکھے وہ اہم تاریخی دستاویز ہیں معالجوں کے پیہم اصرار کے باوجود ملک و ملّت کی خاطر بستر مرگ پر بھی مولانا محمد علی کے آخری سانس تک مسلسل کام کئے جانے کی لگن ان خطوط کے آئینے میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے آخری شبانہ روز کی مشغولیات کی تفصیلات کا واحد ماخذ بھی یہی خطوط ہیں مثلاً!

۹۲ مرٹن روڈ

S.W.1 — ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ ...... تمہارے ابّا کی طبیعت پھر تین روز سے خراب ہے کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا جلنا رہتا ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے تھک جاتے ہیں ۷ اسے کانفرنس شروع ہے وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں۔ تمہارے ابّا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا ہے چونکہ کوئی آدمی نہیں کام کرنے کے لئے اس لئے تھک جاتی ہوں، خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ...... تمہاری والدہ امجدی

(رئیس احمد جعفری، علی برادران متذکرہ ص ۶۱۴)

ہائیڈ پارک ہوٹل نائٹس برج لندن — ۲۷ر نومبر ۱۹۳۰ء

S.W.1

...... "تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے لیکن پیروں اور رانوں پر ورم بہت زیادہ ہے اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں آرام کر رہے ہیں (ایضاً ص ۶۱۵)

ان خطوط میں اکثر لوگوں سے ملاقات کا تذکرہ ہے جس میں بیگم بھوپال مہاراجہ الور، مہاراجہ جام، مہاراجہ اور مہارانی بڑودہ کے نام خاص ہیں۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن ۱۴؍ دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

...... اس ہفتے تمہارے ابّا پلنگ پر لکھ رہے ہیں لیکن جب سے یہاں آئے ہیں لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ آرام نہیں کرتے جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ اب چار پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا.....

...... کل تمہارے ابّا کا فاقہ تھا، سوجن ہے اس کی وجہ سے ڈاکٹر پلنگ سے نہیں اٹھنے دیتے۔ ویسے طبیعت اچھی ہے تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو جس کام کے لئے آئے ہیں بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ وسلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں۔" (ایضاً ص ۶۱۶-۶۱۸)

اور وہ مشن کیا تھا جس کی خاطر موت وزیست کی کش مکش میں بھی وہ برطانوی سامراج سے نبرد آزما تھے؟ ملک و ملت کی خاطر۔ سوراج اور قومی یک جہتی کے لئے ہندو مسلم اتحاد۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن ۲۶؍ دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

پیاری زہرہ دعا۔ تم زندہ وسلامت و تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے ماں باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہو گی اس کا مجھے بھی اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے اخبار والے نہیں مانتے لکھ دیتے ہیں۔ میری رائے نہیں تھی۔ اس خط میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد کی تفصیل اور خاندان کی مالی مشکلات کا بھی ذکر ہے۔ تمہارے وہ خطوط جس میں تم نے روپے کا لکھا تھا تمہارے ابا کے نام تھا وہ ان کو نہیں دکھا سکے۔ صرف کہہ دیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، وہ خیریت سے ہے۔ تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔ صاحب نے جنوری میں بھوپال سے چچا کو خط لکھ دیا تھا۔ اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا اور

برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو ہزار نہیں۔ چار ہزار نہیں صرف تین چار سو روپے کا ہمارا کسی کو اعتبار نہیں۔

...... میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم پردیس میں ہیں ہم کیا کریں گے"۔ (ایضاً ص ۶۲۰)

امجدی بیگم کا خط ۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کا مولانا کی وفات کے بعد کا ہے جس میں باوجود انتہائی صبر و ضبط کے ایک ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

"پیاری زہرہ۔ میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر۔ میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جس کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا، وہ سامنے آکر رہا۔ میری ایک بھی دُعا قبول نہیں ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے میں ابھی نہیں جاؤں گا، جب پورا کام ہو جائے اس کے بعد پیرس جاؤں گا علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا"...... دو ڈاکٹروں کے ساتھ یہاں کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی آئے تھے، مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی سب پیتے رہے۔ مسٹر نہرا نے کہا آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں انھوں نے کہا بھائی ابھی ہندو مسلمانوں کا معاملہ ٹھیک ہو جانے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکناڈا میں جھنڈا اٹھایا تھا اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا ابھی اس کا موقع نہیں ہے.... ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے اگر اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں تک رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر مار دو تو ٹوٹ جائے گا اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہیں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جائیے"۔ (ایضاً ص ۶۲۲۔ ۶۲۵)

اور بالآخر شیشہ ٹوٹ گیا۔ مجاہد حریت لندن اس عزم کے ساتھ گیا تھا

کہ غلام ہندوستان واپس نہیں ہوگا۔ خدا نے اپنے محبوب بندے کی لاج رکھ لی۔ آخری سانس آزاد لندن میں ہی لیا اور فلسطین میں تدفین جس انداز سے ہوئی اسی کے لئے شاعر نے کہا تھا ؎

ہے رشک اک جہان کو جوہرؔ کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

امجدی بیگم کے یہ غم جان لیوا تھا گو لندن سے واپسی پر کافی عرصے تک وہ خلافت کمیٹی سے وابستہ رہیں لیکن اندر ہی اندر گھلتی رہیں اور تقریباً پندرہ سال بعد سفر آخرت پر روانہ ہوگئیں۔

آزاد ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر جیسے پیکرِ حریت اور شہیدِ قوم کو کبھی خراجِ تحسین پیش نہیں کیا گیا۔ نتیجے میں امجدی بیگم کی شاندار اور بے لوث اور بے مثال قربانیاں بھی تاریخ کا ایک ورقِ پارینہ بن گئیں۔ اس کی بڑی وجہ کوہاٹ کے ہندو مسلمان فساد پر گاندھی جی اور محمد علی میں اختلاف تھا مولانا محمد علی نہرو رپورٹ سے بھی خفا تھے جو ان کی قید کے دوران تیار کی گئی تھی اور جس کے بعد انھوں نے کانگریس سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اختلاف بہرکیف انڈین نیشنل کانگریس اور انقلابی رہناؤں کے درمیان ہی نہیں، خود اندرونِ کانگریس نرم و گرم رہناؤں کے درمیان ہمیشہ ہی رہا گو راہی سبھی ایک منزل کے تھے اور عوام کے کان ابھی تقسیمِ وطن کے تصور سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

اچھا ہوا جو آپ نے دل سے بھلا دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

خود گاندھی جی نے ان کی موت پر کہا تھا کہ ملک ایک انتہائی نڈر عظیم "قوم پرست" سے محروم ہو گیا۔ شاید کوئی آنے والا غیر جانبدار مورخ ان سبھی مختلف راستوں کے مجاہدینِ حریت کی قربانیوں پر جمی گرد کو جھاڑ کر ان کے صحیح خدوخال کو نمایاں کر سکے۔ اگر ایسا ہو سکا تو یہ قومی یکجہتی کی جانب نمایاں پیش رفت اور ملک کی ایک عظیم خدمت ہوگی۔

نوٹ: امجدی بیگم زندگی کے آخری برسوں میں مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئی تھیں۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پرواہ

سعادت بانو کچلو

سعادت بانو کی پیدائش ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء میں امرتسر کے ایک متمول ومعزز اور علم دوست خاندان میں ہوئی علمیت اور قابلیت کے مختلف مدارج انھوں نے گھر پر ہی طے کئے۔ ان کے والد میاں حفیظ اللہ صاحب اور بڑے بھائی سعید اللہ صاحب نے ان کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ سعادت بانو نے بہت جلد اردو فارسی میں کافی مہارت حاصل کرلی اور اپنے دائرہ اثر میں مختلف سماجی عیوب کے خلاف نیز دوسرے ملکی مسائل پر دکن ریویو، تہذیب نسواں، خاتون وغیرہ رسائل میں پُر زور مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم نسواں اور ان کی مضمون نگاری کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ سعادت بانو کا مضمون "حریت نسواں" تہذیب نسواں میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں تحریر کئے گئے اس مضمون سے ان کی دور اندیشی، دور بینی اور وسعت مطالعہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "حقوق نسواں بچپن۔ بے تکلفی میں تکلیف نیا فیشن، تہذیب کی جلی، علم سے خطاب اور نئی جنتری کا ایک ورق" جیسے عنوانات سے ان کے متعدد مضامین ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان شائع ہوئے خصوصاً تین مضامین بعنوان "شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم گردشِ زمانہ، اور سرسیّد مرحوم" اپنی نوعیت وطرز نگارش کے اعتبار سے ہی اعلیٰ

مقام نہیں رکھتے بلکہ ان سے مضمون نگار کے وسعت مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔
اسی زمانے میں انھوں نے گھر پر انگریزی تعلیم بھی شروع کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شعر و سخن اور ادب لطیف سے بھی ان کی دلچسپی شیفتگی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اردو فارسی کے کلاسیکی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور نیچرل شاعری کے سبزہ زاروں میں آزاد مرحوم کے اتباع میں ایک نئی راہ نکالی تھی۔

سعادت بانو کی تمام تر نظمیں قومیت اور حب الوطنی کے جذبات کا مظہر ہیں۔ "اسیر قفس" جو علامہ اقبال کی نظم "ایک بلبل کی فریاد پنجرے میں" کی تضمین ہے ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی جب ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے دل کسے سناؤں میں غم بھرا فسانہ
گلشن سے اب قفس میں میرا ہوا ٹھکانہ
رنج والم سے دل پر لگتا ہے تازیانہ
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

پنجرے میں دیکھتا ہوں آزادیاں جہاں کی
آتی ہے یاد مجھ کو اب اپنے آشیاں کی
میں قید میں پڑا ہوں طاقت نہیں فغاں کی
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

یارب کدھر گئے وہ اب دن مری خوشی کے
گلشن میں جن دنوں میں کرتا تھا اڑ کے پھیرے

گلشن کی سب بہاریں پیشِ نظر تھیں میرے
پتوں میں ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

سلگی ہے جان میری افسوس جل گیا جی
سینے میں سوزِ غم نے وہ آگ تیز پھونکی
چھوٹے سے اک قفس میں میں ہو رہا ہوں قیدی
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

کس سے کہوں میں اپنی اس بے بسی کا عالم
قسمت دکھا رہی ہے اب مجھ کو نت نئے غم
کرتا ہوں اپنے ٹوٹے پھوٹے پروں سے ماتم
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آ کر پھولوں کا منہ دھلانا

آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ آشیاں کی صورت
ڈھونڈھوں کہاں سے اب میں آرام و عیش و عشرت
آتی ہے یاد دل کو ہوتی ہے سخت وحشت
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

"تاروں سے گفتگو" بھی ۱۹۱۰ء میں ہی شائع ہوئی۔

پُر لطف کیا سماں ہے تمہارے بہار کا
نکلا مگر نہ حیف میرے دل کا مدعا
تم سے غرض ہے مجھ کو نہ کچھ آسمان سے
مطلب ہے اپنے ملک سے ہندوستان سے
کیا وہ بھی دن خدا کبھی مجھ کو دکھائے گا
ہندوستان تمہاری طرح جگمگائیگا
اہلِ زمانہ دیکھیں گے ہندوستان کو
اس کی چمک لبھائے گی سارے جہان کو
پیارے وطن کے نام پہ جاؤں نثار میں
اجڑے چمن میں دیکھوں الٰہی بہاریں

سعادت بانو کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی ان کا دل جذبۂ حبّ الوطنی سے سرشار تھا۔ ایک مسلم لڑکی، زمانۂ دوشیزگی، پردے کی قیود اور توم پرستی کے ایسے جذبات و احساسات کی حزنیہ داری آج کے زمانے میں کوئی اہم بات نہ ہو لیکن اس زمانے کے تناظر میں یقیناً وہ حیران کن اور قابلِ ستائش ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے ۱۹۱۱ء سے مسلمانانِ ہند کی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جنگِ طرابلس و بلقان اور قضیۂ مسجد کانپور نے ان کے طرزِ فکر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ہر شخص بے چین و مضطرب تھا۔ ان واقعات نے سعادت بانو کو بھی نئے میدان تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ زمیندار' اور' ہمدرد' نے انھیں دنیائے سیاست کی نئی راہوں سے روشناس کرایا اور وہ نئے انہماک کے ساتھ قومی و ملی خدمات کے لئے کمربستہ ہو گئیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں پہلے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کیا اور پھر ہلال احمر اور مجروحین کانپور کے لئے باوجود طویل سلسلۂ علالت کے وہ ہمدرد، وکیل اور زمیندار میں بھی گاہ بہ گاہ سیاسی مضامین لکھنے لگیں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں سعادت بانو فدائے ملک و ملت، فخر قوم جناب سیف الدین کچلو بیرسٹرایٹ لا کی رفیقۂ حیات بنیں۔ ڈاکٹر کچلو کا خاندان کشمیر سے ترک سکونت کرکے امرتسر میں آباد ہوا تھا۔ امرتسر، آگرہ، علی گڑھ میں تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ لندن سے بارایٹ لا۔ جواہر لال جی کے ساتھ کیا اور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری جرمنی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایک عظیم محبِ وطن اور شعلہ بیان مقرر تھے اور وکالت چھوڑ کر کانگریس اور خلافت تحریک کے لئے اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں انھیں ایک تقریر کی پاداش میں بنگال سے نکالا گیا تھا۔ ایسے جیون ساتھی کی رفاقت میں سعادت بانو کی قومیت کے جذبات امڈ پڑے اور دبی ہوئی چنگاری شعلہ زن ہو گئی۔ دونوں شمعِ آزادی کے پروانے ایک نئے عزم و استقلال سے ملک و ملت کی خدمت میں دل و جان سے لگ گئے۔

جب آنجہانی لالہ لاجپت رائے اپنی جلاوطنی کے خاتمے پر امرتسر آئے تو سعادت بانو نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کئے ؎

اتحادِ ہندو مسلم خوشی کی بات ہے
قابلِ افسوس ہے گو سخت حالت قوم کی
سیکڑوں افراد گر غافل ہیں کچھ پروا نہیں
لاجپت جیون نے رکھ لی لاج اور پت قوم کی

لالہ دُنی چند جی صدر صوبائی کانگریس امرتسر جب ان کے یہاں ملاقات کی خاطر گئے تو مندرجہ ذیل رباعی ان کی نذر کی ؎

نہ ہارو ہمتیں اپنی نہ تم ملول رہو
شگفتہ گلشنِ ہستی میں بن کے پھول رہو
یہ التجا ہے سعادت کی بھول مت جانا
ہو جس طرح سے بھی تم ہوم رول لے کے رہو

رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کے درمیان انھوں نے زبان و قلم سے ہر ممکن خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی پنجاب میں ۱۹۱۹ء کا زمانہ قیامت خیز تھا۔ کونسی سختی کونسا ظلم اور کونسی بے عزتی تھی جو مارشل لا کے پردے میں جابر حکام نے مظلوم عوام پر روا نہ رکھی تھی۔ آگ تیزی سے سُلگ رہی تھی۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کرکے پابجولاں نامعلوم مقام پر لے جایا گیا۔ جلیان والا باغ آگ وخون کے دریا میں ڈوب گیا۔ سعادت بانو جیسی باوفا حوصلہ مند خاتون جانتی تھیں کہ اب ان کے فرائض کی اہمیت کتنی بڑھ گئی ہے۔ شادی کے پانچ سال بعد ہی محبوب شوہر کی طویل غمناک مدت اسیری جس پر گمان ہوتا تھا کہ اس تاریک رات کی کبھی سحر ہی نہ ہوگی۔ انھوں نے انتہائی پامردی و استقلال سے گزاری دوران مقدمہ دو بار اور دورانِ اسیری ایک بار جیل میں ان سے ملیں اور ہر بار انھیں یقین دلایا کہ "آپ کوئی فکر نہ کیجئے بچوں کی پرورش اور گذرانِ حیات میں آپ مجھے ایک ثابت قدم اور سچی قوم پرست پائیں گے۔ اس وادئ پُرخار میں میں جان تک دینے سے گُریز نہ کروں گی"۔ فدائے ملک وشوہر کی ہمتیں اس عزم صمیم سے نہ صرف تازہ ہو جاتی تھیں بلکہ ان پرجوش الفاظ سے قدرتی طور پر جو تشویش پیدا ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ مقدمے کے بعد ڈاکٹر کچلو کو لاہور سے نکال دیا گیا اور نظربندی کا حکم ہوا۔ حکم سزا سن کر محبِّ وطن بیوی نے سجدۂ شکر ادا کیا اور بنا کسی اضطراب و اظہارِ غم کے اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہیں۔ جب گاندھی جی بسلسلۂ تحقیقات مظالم پنجاب امرتسر آئے اور سعادت بانو سے بھی ملاقات کی تو انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کیے ؎

بنا ہے سب کے دلوں میں ترا مکاں گاندھی
ہے تیری مدح وثنا در دہر زباں گاندھی
ہر اک طرف ہیں عقیدت کے تیرے پھول کھلے
نہ آئے گی کبھی اس پھول میں خزاں گاندھی

پھنسے ہیں سخت مصیبت میں اہلِ امرتسر
عیاں ہے آپ پران کا غم نہاں گاندھی

یقین ہے گوہرِ مقصود ان کو مل جائے
اگر ہوں آپ حقیقت کے ترجماں گاندھی

کچھ ایسی بات کریں اپنی دست گیری سے
جو قید میں ہیں پڑے وہ چھٹیں اسیری سے

ڈاکٹر کچلو کے زمانۂ اسیری میں محترم سی آر۔ داس، پنڈت نہرو اور سوامی شردھانند جی وغیرہ متعدد قومی رہنما تسکین دہی کی خاطر سعادت بانو سے ملے انھوں نے سب سے یہی کہا "مجھے فخر ہے کہ ملکی خدمات میں ان کو قید و بند نصیب ہوئی۔ اس راہ میں جان تک دینا ہزار زندگی حاصل کرنا ہے۔" دراصل جلیانوالہ باغ کے مشہور جلسے میں وہ خود بھی حالاتِ حاضرہ پر ایک پر جوش تقریر کرنے جارہی تھیں شہر میں دھوم تھی، زبردست جوش پھیلا ہوا تھا لیکن وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر عزیز و اقارب نے جبراً روک لیا۔ اور ان کے قدم اس جلوہ گاہ شہادت تک پہنچنے سے رہ گئے۔ شاید ہی کوئی بڑا سیاسی جلسہ ہو جس میں سعادت بانو نے شرکت نہ کی ہو، خصوصاً زنانہ جلسوں میں وہ پر جوش تقاریر کیا کرتی تھیں اس بلند حوصلہ خاتون نے سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شوہر کے دوش بدوش حصہ لیا۔ ۲۲-۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون میں ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے دوران انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ سوراج آشرم کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

ڈاکٹر کچلو گرچہ تحریک آزادی کے سرگرم و فعال سپاہی کی حیثیت سے مختلف اہم منصبوں پر فائز رہے، ۱۹۲۹ء میں جواہر لال جی کے مکمل آزادی کے ریزولیوشن کی تائید بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ لیکن آزادیٔ وطن کے بعد ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف بڑھتا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے

اسٹاک ہالم میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہ قومی امن کاؤنسل کے صدر اور بین الاقوامی امن کاؤنسل کے پریذیڈیم کے ممبر بھی رہے انھیں عالمی لینن امن انعام سے بھی نوازا گیا۔ سعادت بانو ان کی شروع کی گئی امن تحریک کی بھی فعال ممبر رہیں۔ وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی بھی سرگرم رکن تھیں اور ۱۹۵۰ء کے وسط میں اس کی دہلی شاخ کی خازن کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ وہ تاحیات انجمن ترقی اردو کی بھی سرپرست تھیں۔

جنگِ آزادی میں شریک نوجوان سعادت بانو کی توجہ کا خصوصی مرکز تھے، ان کی ہر ممکن امداد اور اپنی ماں جیسی ممتا کے سبب وہ بلا تفریق مذہب و ملّت ان سبھی نوجوانوں کی "آپا جی" بن گئی تھیں۔ وہ ایک سچی مسلمان خاتون تھیں۔ اپنے غیر مسلم دوستوں کی دل آزاری سے بچنے کے سبب انھوں نے کبھی اپنے گھر گائے کا گوشت پکنے کی اجازت نہیں دی۔ عمرِ عزیز کے آخری لمحات تک وہ نہ صرف خود کھادی پہنتی رہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی ہمیشہ کھادی ہی پہنایا۔

تقسیمِ وطن کے بھیانک طوفان میں کچلو خاندان کا بھی امرتسر میں سب کچھ لٹ گیا لیکن انھوں نے سرحد پار جانا گوارا نہیں کیا اور مسلم "پناہ گزین" بن کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دونوں جیون ساتھی تقسیمِ وطن کے سخت مخالف تھے قوم نے بحیثیت مجموعی ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی اور جد و جہد آزادی میں کی گئیں ان کی تمام قربانیاں تاریخ کا ایک گمشدہ ورق بن کر رہ گئیں۔ ۹ راکتوبر ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر کچلو کے انتقال کے بعد بھی خاندان منتشر ہو گیا۔ گو کچلو خاندان نے مادرِ وطن کی خاطر ان گنت ذہنی، جسمانی اور مالی قربانیاں دیں لیکن اپنی خودداری و غیورِ فطرت کے سبب کبھی حکومتِ وقت کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ مرحوم ڈاکٹر کچلو کو پنڈت جواہر لال نہرو نے زبردستی اسپتال میں داخل کیا تھا لیکن پرجوش مجاہدہ آزادی، روشن خیال ادیبہ و شاعرہ اور وسیع القلب وسیع النظر سعادت بانو کچلو آزاد ہندوستان میں بے کسی و

مفلسی کی حالت میں بغیر دوا علاج کے ۱۸ اگست ۱۹۷۰ء میں اپنے مالکِ حقیقی سے یوں جا ملیں جیسے غالبؔ نے اپنے لئے تمنّا کی تھی ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(ماخوذ: بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق، لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۹ تا ۶۷ اور جناب طلعت کچلو (ڈاکٹر کچلو کے صاحبزادے) سے ۷ جون ۱۹۸۷ء کو تین مورتی میوزیم میں لیا گیا انٹرویو)

بیگم خورشید خواجہ

بیگم خورشید خواجہ کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد سر بلند جنگ حیدرآباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، ان کے دادا سمیع اللہ خاں سرسید مرحوم کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق خورشید بیگم کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں وہ مسز سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ ان کی شادی علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر خواجہ عبدالمجید صاحب سے ہوئی۔ جو جنگِ آزادی کے نامور مجاہد بھی تھے۔ شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور قومی محاذ پر قوم پرست شوہر کے شانہ بشانہ چلنے کا فیصلہ کیا نیز اس دشوار ترین راہ میں ہر قسم کی ذہنی و معاشی پریشانیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔

خورشید بیگم ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر بنیں اور تاحیات اسے برقرار رکھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں یو پی کی نمائندہ تھیں۔ ان کے ساتھ یو پی سے دوسری خواتین بیگم حسرت موہانی، بیگم محمد علی، شریمتی کملا نہرو اور شریمتی سروپ رانی نہرو بھی تھیں۔ سبجیکٹ کمیٹی کی نشستیں ۲۴، ۲۵، اور ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد میں ہوئیں۔

(Encyclopaedia of Indian National Congress, A.M. Zaidi & S.G. Zaidi Vol. Eight, 1921 - 24 P 66)

انھوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے ہی 'ہند' نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا جس کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے خود ہی انجام دیئے۔ اپنے ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا کہ وہ انھیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں اس قوم پرست جوڑے کی خدمات کے تذکرے میں گاندھی جی نے بعنوان "گرفتار نہ ہونے پر افسوس" تحریر کیا تھا کہ "موجودہ حالات میں ہر اس ہندوستانی کے لئے جو عزتِ نفس رکھتا ہے، جیل ہی ایک مناسب جگہ ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ میں ہر شخص مولانا شیروانی اور ان کے ساتھیوں کو رشک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ بیگم خواجہ نے مجھے لکھا ہے کہ انھیں اپنے شوہر کے اب تک آزاد رہنے کا افسوس ہے جب کہ میدانِ عمل کے ان کے ساتھی جیل پہنچ چکے ہیں۔ جذبۂ صادق اسی کا نام ہے۔ سوراج تب ہی ممکن ہے۔ جب ہمارے سبھی خواتین و حضرات آزادی وطن کی خاطر جیل جانا اپنی خوش قسمتی سمجھیں"

(Collected works of Mahatma Gandhi Vol. XX April, August 1921 P 490)

" میرے نوٹس میں "ایک باعزت قابلِ احترام بیوی" کے عنوان سے مہاتما گاندھی نے مرحوم خواجہ عبدالمجید کے تذکرے میں لکھا تھا "میں انھیں ایک انتہائی راست باز انسان سمجھتا ہوں۔ انھیں جتنا فخر اپنے مذہب پر ہے اتنا ہی ناز اپنے وطن پر بھی ہے ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے۔ بیرسٹر کی حیثیت سے وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے لیکن اب ملک و ملت کی خاطر انھوں نے درویشانہ زندگی کو اپنا لیا ہے مجھے ابھی ابھی ان کی بیگم خورشید کا تار موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ وہ لکھتی ہیں "آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میرے شوہر کو حکومت نے گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے انتظام سے متعلق میں ان کے سبھی کاموں کو خود انجام دینے کی کوشش کروں گی"۔ مجھے اس تار کی انتہائی خوشی ہے۔ خواجہ صاحب

اور دوسرے حضرات کی قربانیوں کے سبب اب کون حصولِ آزادی کو روک سکتا ہے؟ بیگم خورشید کو ان کا کام دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کیونکہ جامعہ کے بہادر اور حق پسند طلباء ان کے ساتھ ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ان کی خاطر یہ طلباً ان کاموں سے بھی گریز نہ کریں جنھیں انھوں نے خواجہ صاحب کی موجودگی میں نہیں کیا اس کے علاوہ بیگم خورشید چرخہ کاتنے کی تربیت انھیں خواجہ صاحب سے بہتر طور پر دے سکیں گی ..... جب ایک پاکباز عورت میں بہادری اور مادرانہ شفقت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جس کی برابری کوئی مرد بھی نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر محمود عالم نوجوانوں کی ذہنی نشو ونما کو دیکھیں گے۔ لیکن بیگم خورشید ان کے دلوں کو تسخیر کریں گی اور انھیں کندن بنا دیں گی۔"

(Collected work : Vol.XXII December, 1921, March 1922 P 46)

خواجہ عبدالمجید صاحب اس گرفتاری کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ بیگم خورشید تاحیات کانگریس کے نصب العین سے وابستہ رہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے الہ آباد میں حمیدیہ گرلس سکنڈری اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنا۔ آج یہ ایک ڈگری کالج ہے۔

بیگم خورشید خواجہ کا انتقال جولائی سنہ ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ دستند حوالوں کے علاوہ بقیہ معلومات بیگم خورشید کے صاحبزادے پروفیسر جمال خواجہ سمیع منزل نمائش روڈ، علی گڑھ کے توسط سے حاصل ہوئیں۔

دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

زلیخا بیگم (بیگم مولانا ابوالکلام آزاد)

تحریک آزادی میں خواتین کی شرکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس زمانے میں ان کے مجاہد شوہر جیلوں میں چکی کی مشقتیں برداشت کیا کرتے تو ان کی ہمدم و ہمساز رفقائے حیات گھروں کا انتظام ہی نہیں سنبھالتی تھیں بلکہ ہر طرح کی معاشی سختیوں، ذہنی اُلجھنوں اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اپنے شوہروں کے حوصلے بڑھاتیں اور دوسرے اسیرانِ آزادی کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ سخت سے سخت آزمائش میں بھی کبھی کوئی شکوہ ان کے لبوں پر نہیں آیا۔ ایسی ہی بلند حوصلہ خواتین میں زلیخا بیگم آزاد کا نام بھی سرِفہرست آتا ہے۔

زلیخا بیگم کی خوبصورت قلمی تصویر کھینچتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے: نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلاویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جِلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں، یوسف ہندی، حضرت ابوالکلام آزاد

کی رفیقِ حیات زلیخا بیگم تھیں !!

(حمیدہ سلطان۔ رسالہ صبح، سہ ماہی ابو الکلام آزاد نمبر ۱۹۷۰ء کا پہلا شمارہ ص ۱۳۲)

جنتِ ارضی کی یہ حور جو مجسم پیکرِ صبر و قناعت تھی، صرف چھ سال کی عمر میں "یوسف ہندی" کی جو تقریباً اس وقت بارہ سال کے تھے، رفیقۂ حیات بنادی گئی اور یوں بچپن سے شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے "یوسف" کے رنگ میں رنگ گئی بڑی شخصیتوں کی سوانح حیات میں اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کردیا جاتا ہے حالانکہ ایسی شخصیتوں کے پیچ و خم کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ زلیخا بیگم مولانا پر فدا تھیں۔ ان کے جذبۂ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے کہ ایک دن جب وہ مع اپنی والدہ کے مولانا کے یہاں پہونچیں تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے اُن سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔ وہ ہنس کر بولیں آپ کو عادت ہی ہے بنانے کی۔ آجکل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو ۲ بجے کے بعد اُٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں"۔ (ایضاً ص ۱۳۵)

یہ ایثار و وفا محض شوہر کی خدمت تک ہی محدود نہ تھا۔ مولانا کا بار بار جیل جانا، ہجر کی سختیاں جھیلنا اور معاشی مشکلات برداشت کرنا اس کو انھوں نے خاموشی سے گلے لگا لیا تھا بوجہ سیاست مولانا کی مالی حالت کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ زلیخا بیگم نے نہ اچھا کھانے و پہننے کی شکایت کی اور نہ کبھی اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیا بلکہ ہر طرح محبوب شوہر کو آرام پہنچانے میں لگی رہیں تاکہ گھریلو فضا کے خوشگوار ماحول میں تازہ دم ہو کر وہ نئے ولولے اور جوش سے جنگِ آزادی کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ یہی نہیں انھوں نے مولانا کے سیاسی عقائد و افکار کو بھی مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ مولانا ہی کی زبان میں "زلیخا بیگم نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات

کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت سے ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار"

(ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر، تیسرا اڈیشن لاہور ص ۲۸۴)

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب مولانا کو سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا تو زلیخا بیگم نہ صرف ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ تھیں بلکہ ایک سال قیدِ بامشقت کی اس سزا کو وہ کم سمجھتی تھیں جو ایک طرح سے لیلائے حریت کے شیدائی کی توہین بھی تھی۔ گاندھی جی کے نام ایک برقیئے میں انھوں نے مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔ "میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ آج سنوایا گیا۔ انھیں صرف ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا و قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے ان کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

یہ میرے لئے ایک بہت بڑا بوجھ ہے، لیکن خدا سے مدد کی پوری اُمید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں ہی خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں اس کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ابتدائی آزمائش پوری کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اُتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں

حصّہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ میں آج سے بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی"۔ (مولانا آزاد قولِ فیصل۔ چمن بک ڈپو دہلی ص ۱۴۶) اسی پرچے میں بطورِ ضمیمہ انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی لکھا تھا کہ میرے شوہر نے نہایت محبت و تکریم کے ساتھ اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہوئے مندرجہ ذیل پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے کہا ہے۔

"حکومت اور ملک اس وقت کسی قسم کی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا فرض اس وقت اپنے کو پوری طرح تیار رکھنا ہے۔ بنگال آئندہ بھی اس پیش قدمی کو باقی رکھے گا جو اس وقت اس نے قائم کی ہے۔ باردولی تعلقہ کے ساتھ اب بنگال کے نام کا بھی اضافہ کر دیجئے تو عنایت ہوگی اور اگر کوئی موقعہ مصالحت کا آتا بھی ہے تو برائے مہربانی ہماری رہائی کو کوئی اہمیت نہ دیجئے جو بدقسمتی سے اس کے ساتھ آجکل وابستہ ہو گئی ہے صرف ایک مقصد کے مدنظر، قومی مفاد و خواہشات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی صلح کی شرائط واضح رکھئے، جس کا ہماری رہائی سے قطعی کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے"

(Collected Works of Mahatma Gandhi : Publication Division, Govt. of India Vol. XXII P. 459)

دن و رات کی گردش تیز تھی، سیاسی سرگرمیوں میں ہلچل کے سبب مولانا کی غیر معمولی مصروفیت بھی بڑھ رہی تھی۔ ان کے بار بار جیل جانے اور روز افزوں پریشانیوں کے باعث زلیخا بیگم کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نینی تال جیل میں قید تھے ان کے خطوط انھیں ملتے رہے تھے جس میں علاوہ اپنی بیماری کے سبھی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ رہائی کے بعد ہی مولانا کو علم ہو سکا کہ یہ پورا زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں ہی گزرا تھا۔ رہائی کے بعد علاج اور تبدیلیٔ آب و ہوا سے کچھ افاقہ ہوا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا پھر قید کر لئے گئے اور کافی عرصے تک قید کا محل بھی پوشیدہ رکھا گیا۔

اپنے صدیق محترم نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے نام

احمد نگر جیل سے لکھے گئے ایک طویل مکتوب ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء (جو رہائی کے بعد شائع ہوا) میں مولانا نے اپنی گرفتاری، زلیخا بیگم کی علالت اور وفات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ مکتوب گرچہ طویل ہے تاہم زلیخا بیگم سے متعلق یہی واحد ماخذ ہے ملک و قوم کی خاطر اس بے مثال ایثار کی داستان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس تمام زمانے میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے گذر رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی، ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی ..... جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا یہ وہ وقت تھا کہ طوفان ابھی آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا اور یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کے مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے

آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا مقصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول سا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں ہماری آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا۔"

(ابوالکلام آزاد۔ غبارِ خاطر۔ متذکرہ ص ۲۸۱-۸۲-۸۳-۸۴)

عرصے بعد جب احمد نگر جیل کے اسیروں کو اپنے عزیزوں سے خط و کتابت کی اجازت ملی تو مولانا کو زلیخا بیگم کا ایک خط ملا جس میں بھی اِدھر اُدھر کی باتیں تھیں لیکن اپنی علالت کا انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر اخبارات سے ان کی شدید علالت کی خبریں ملنا شروع ہوئیں۔ آخر میں خطرناک صورتِ حال کا تار ملا

حکومتِ بمبئی کے ایماء پر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے پیرول پر رہائی کی بات کی۔ دوستوں خصوصًا پنڈت نہرو نے لاکھ اصرار کیا کہ وہ اس پیرول کی بات مان لیں لیکن مولانا کی خودداری کب اس تنک سری کی متحمل ہو سکتی تھی۔ البتہ جذبات و احساسات کی جو کیفیت تھی اس کا حال خود انھیں کی زبانی سُنیے۔

"جوں ہی صورتِ حال کی پہلی خبر ملی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی یہ جدوجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔" (غبارِ خاطر تذکرہ ص ۲۸۸)

بالآخر ۹ار اپریل ۱۹۴۳ء کو زلیخا بیگم ان کے دیدار کی حسرت ہی لئے اس دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئیں ؎

کام تو عشق میں بہت تھے میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اور یوں بقول مولانا "ہماری چھبیس [۲۶] برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے...... مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں یہاں احاطے کے اندر ایک پُرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے، لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔" (غبارِ خاطر تذکرہ ص ۲۹۰)

اس مرثیے کے مطلب کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں

تو اس نے مجھے ملامت کی اس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ ایک اس قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے میرے لئے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں۔" (محمد اجمل خاں دیباچہ غبار خاطر متذکرہ)

پورے ملک میں زلیخا بیگم کی اس المناک موت پر ماتم کیا گیا اور سامراجی حکومت کے ظلم و استبداد پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا جس نے مولانا کو اپنی شریک حیات کی خطرناک علالت کے باوجود بھی غیر مشروط رہائی دینا منظور نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ نے بھی مولانا کے سیاسی عقائد و نظریات سے سخت بیزاری کے باوجود کلکتہ میں تعزیتی جلسہ کیا۔ جلسے میں ابراہیم ہوش کی تعزیتی نظم کو سن کر سبھی سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں:

اے زمیں حق ہے اگر تو اپنے سر پر خاک اڑائے
اے فلک حق ہے اگر تو خون کے آنسو بہائے
حق ہے گیتی پر جو چھائیں یاس کی تاریکیاں
حق ہے دنیا میں اگر شمع مسرت جھلملائے
آج تک دیکھا نہ ہوگا عالم ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگم آزاد نے

آؤ اے مرغانِ گلشن اشک افشانی کریں
آؤ اے صحرا کے ذرو مرثیہ خوانی کریں
آؤ اے اہل وطن سب مل کے ہوں ماتم گسار
آؤ ہم رو رو کے اپنے خون کو پانی کریں
باغ پر آئے خزاں اور باغباں ہو قید میں
کارواں لٹ جائے میر کارواں ہو قید میں

اس کی بیگم جان دے اور وہ سرِبالیں نہ ہو
یا خدا ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو

مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی بھی مملکت میں جبر کا آئین نہ ہو

آہ وہ آنکھیں جو ترسے گئیں دیدار کی
یہ بھی اک طرزِ عنایت تھی مرے سرکار کی

ایسی موتیں ہوتی ہیں سرمایۂ نقشِ دوام
تا ابد باقی رہے گا ہوشِ مرحومہ کا نام

جب مرتب ہو گی مستقبل میں تاریخِ وطن
حرفِ خونیں سے رقم ہو گا یہ قصۂ لاکلام

انقلاب ایسا بھی ہونے کو ہے زیرِ آسماں
ظلم خود دہرائے گا صبر و رضا کی داستاں

(رسالہ ماحول، کراچی آزاد نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۰۵-۱۰۶)

رہائی سے کچھ عرصے قبل مولانا کو احمد نگر قلعہ سے باکورہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد جب ہاوڑا اسٹیشن سے وہ کار میں روانہ ہوئے تو بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبا بنا پربھادتا اور دیگر مقامی لیڈر بھی ان کے ہمراہ تھے جس وقت کار پل سے گزری مولانا پر کیا گزری اسے جانے بغیر اس داستانِ غم کا خاتمہ ممکن نہیں۔ "مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا۔

"مگر اب وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے! میری دنیا کیسی بدل گئی ہے۔"
میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا۔"

(ابوالکلام آزاد۔ ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورئنٹ لونگ مینس ص ۲۰۷)

مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں "مولانا کے گھر پہونچتے ہی میں بھی حاضر ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

(عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، ص ۲۵۴)

اپنی سب سے قیمتی متاع بھی قوم پر نچھاور کر کے مولانا کے قدم آزادی کی منزل تک بڑھتے ہی رہے۔

آزادی کی اس منزل کو پا لینے میں زلیخا بیگم جیسے کتنے ہی پیکر مہر و وفا و خلوص و ایثار، مادرِ وطن پر خاموشی سے پروانہ وار نثار ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کیا کبھی ان کا شمار کر سکے گی؟ شاید کبھی نہیں۔

ایک خوش فکر شاعرہ، علمبردار حقوقِ نسواں اور باشعور محبِ وطن۔ ز۔خ۔ش

زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت علی گڑھ کے قریب قلعۂ بھیکم پور میں ۸ر دسمبر میں ہوئی۔ وہ نواب محمد مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور و سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صاحبزادی تھیں۔ کم سنی ہی میں والدہ کے انتقال کے سبب والد نے بڑی شفقت سے پرورش کی اور گھریلو تعلیم بھی ایک خاص اہتمام کے ساتھ دلوائی۔ انکی معلمہ آغا کمال الدین سنجر کی رشتے کی بہن فرخندہ بیگم طہرانیہ تھیں۔ صرف و نحو، حساب و فقہ کے لئے ایک دوسرے معلم حضرت مولوی محمد یعقوب اسرائیلی مقرر تھے۔ اعلیٰ عربی تعلیم مولوی سید احمد صاحب ولایتی نے دی جو فرصت کے اوقات میں انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ دس سال کی عمر میں زاہدہ خاتون نے شعر کہا تھا ؎

ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم مری دیکھتا رہے

اور انھوں نے اس کمال کی منزل کو پا بھی لیا تھا۔ اپنی عمر کی پندرہ سولہ منازل طے کرنے کے بعد زاہدہ خاتون شروانیہ گاؤں کے ایک شریف اور امیر گھرانے کی بھول بھلیوں میں پلی بے خبر، بے احساس، ناز پروردہ اور الھڑ لڑکی نہ تھی بلکہ اس وقت اس کو ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، بالغ نظر، خوش فکر شاعرہ اور ادیبہ کہا جا سکتا

تھا جس کی ذہانت اور ذکاوت لمحہ بہ لمحہ ترقی پر ہو۔" (حیاتِ ز-خ-ش" مؤلفہ،
انیس ہارون بیگم شروانیہ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد، دکن ۱۹۴۲ء ص ۷، ۸)

زاہدہ تحصیل علم پر ٹوٹ کر گریں لیکن "والد کا منشا یہ نہ تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ
کر چل نکلیں اگرچہ زاہدہ نے ذوقِ شعری انھیں سے ورثے میں پایا تھا، لیکن وہ کوئی
سیدھا سادہ شعر بھی کبھی باپ کے سامنے لانے کی جرأت نہ کر سکی۔"

(نکتہ راز" شان الحق حقی عصری کتب کراچی ۱۹۷۲ء ص ۳۰۱)

ز-خ-ش کے مخفی نام سے اُن کی نظمیں مشہور ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں
اور مشاہیر سے دادِ تحسین لیتی رہیں۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے جن سے وہ خاص عقیدت
رکھتی تھیں خواجہ حسن نظامی کے مکان پر ان کے کلام کے متعلق کہا تھا "اگر یہ اشعار
کسی خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیئے۔"

(حیات ز-خ-ش- متذکرہ- ص ۷۷)

دراصل اس زمانے میں خواتین میں تعلیم کا ایسا فقدان تھا کہ لوگوں کا یہ باور
کرنا بھی مشکل تھا کہ کوئی گھریلو لڑکی ایسی شاعری بھی کر سکتی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ان
کے انتقال کے بعد ۱۹۲۱ء میں دارالاشاعت پنجاب سے "فردوس تخیل" کے نام سے شائع ہوا۔

زاہدہ خاتون اصلاحِ معاشرت "خصوصاً آزادیٔ نسواں کی خصوصی طلبگار تھیں۔
انھوں نے عورتوں جو مردوں کو بڑی دلسوزی سے انقلاب پر ابھارا ہے، خاص طور عورتوں
کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پُرجوش تلقین کی
ہے۔" (نکتہ راز- متذکرہ ص ۲۹۲) ؎

کس طرح افراد پر واجب نہ ہو اصلاحِ قوم
فرض عین باغباں کیا باغ پیرائی نہیں (رسالہ خاتون علی گڑھ جولائی ۱۹۱۲ء)

ہندوستانی اسلامی معاشرہ میں عورت کی بے بسی کا ایک واضح خاکہ ان کا مندرجہ
ذیل شعر ہے ؎

سراپا جرم ہوں کس کس خطا کا نام لوں زینت
مسلماں ہوں صداقت کیش ہوں ہندی ہوں عورت ہوں

(فردوس تخیل، ص ۱۶۲)

"ان کا طویل مسدس "آئینۂ حرم" اقبال کے شکوے کا ہمرنگ و ہم آہنگ ہے یہ ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا تھا جب شاعرہ کی عمر ۱۲ سال تھی ؎

دل کو ارماں کہ زنِ ہند کا کچھ حال لکھوں
طبع حیراں کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں

میں پریشاں کہ پشیماں نہ کرے بختِ زبوں
ہاں کہی بات پرائی ہے کہوں یا نہ کہوں

آ گیا لب پہ مگر ذوقِ تکلم سے سخن
منہ پہ آئی بھی کہیں رکتی ہے اے مشفقِ مَن

(فردوس تخیل ص ۱۱۹)

مندرجہ ذیل اشعار میں عورتوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بڑا پرتاثیر ہے۔ جستہ جستہ اشعار دیکھئے:

ڈاکٹر کہتے ہیں در کھولو ہوا آنے دو
سنگدل کہتے ہیں ہرگز نہیں مر جانے دو

خود بھلے بنتے ہیں اوروں کو برا کہتے ہیں
"ناقص العقل" ہمیں یہ عقلاء کہتے ہیں

پُر دغا کہتے ہیں بے مہر و وفا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں

جسم اسلام کو افگار کیا ظلم کیا
نصفِ محمود کو بیکار کیا ظلم کیا

ان کو رہ رہ کے ستاتا ہے یہ بے عقل خیال
گھر میں پڑھ لکھ کے خواتین کا رکنا ہے محال

کہیں اُٹھے نہ مساوات کا غم خیز خیال
کہیں ہو جائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال

ہائے ان خود غرضوں کو نہیں اتنی بھی خبر
زوجۂ جاہلہ ہے آفتِ جانِ شوہر

(ایضاً ص ۱۲۲-۱۲۳)

عروجِ اسلام کے زمانے میں مسلم خواتین کے کارناموں کا ذکر یوں ہے۔

ہم تھے اس عہدِ ہمایوں میں نہ یوں مشقِ ستم
بے دل و روح اندھا دھند نہ کہلاتے تھے ہم

قفسِ خشت میں گھٹ گھٹ کے نکلتا تھا نہ دم
ہم نے کھائی تھی نہ یوں گھر سے نکلنے کی قسم
عضوِ مفلوج کی مانند نہ بے کار تھے ہم
قصرِ اسلام کی تعمیر میں معمار تھے ہم

(ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷)

بیسویں صدی کا دوسرا دہا فرسودہ جاگیردارانہ نظام کسی خاتون کو آہ کھینچنے کی اجازت بھلا کب دے سکتا تھا۔ زاہدہ خاتون بھی "زمانے کی ہوا" لگ جانے کے

طنز کا شکار ہوئیں ذہین مجاہدہ بھی ہتھیار ڈالنے والی شخصیت نہیں تھیں۔ انھوں نے اس طنز کا جرأت مندانہ جواب دیا ؎

نہ ہوتا گر اثر ہم پر زمانے کا تو حیرت تھی
اثر ہونے پہ کیوں ہے شیخ حیراں وقفِ حیرت ہوں

ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی طرح عورتوں کی سیاست سے بے خبری بھی قوم کو قعرِ مذلت میں ڈھکیل دے گی اور باعثِ ادبار ہوگی۔" رسالہ استانی، بابت ماہ ربیع الاول ۳۶ھ سیاسی استانی کے عنوان سے انھوں نے لکھا " تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص قسم کے دل و دماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر مصلح کی جدت طراز اور ولی کی فنا فی اللہ۔ جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنایا بگاڑا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی، مادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاسی عظمت کی ٹھیکیدار قوموں پر نظر ڈالیں گے تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیسا صحیح مذاق رکھتی ہیں اور حبِّ وطن کے پاک جذبے سے کس قدر سرشار ہیں۔ ان کا وجود ماں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ فلاحِ عامہ کے ہر ایک شعبہ میں کارکن کی حیثیت سے ملک و قوم کے لئے رحمتِ الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی مستورات کو جاہل رکھنا اور پھر تعلیم دے کر سیاست سے بے تعلق رکھنا تھی۔ قومی ماؤں کی سیاست سے ناواقفیت کے سبب افرادِ قوم میں بھی صحیح سیاسی مذاق اور سچا جوش مفقود ہے۔" اگر آپ ذلت و ادبار کی تلخ غذا سے سیر ہو چکے ہیں تو مہربانی سے گذشتہ پر صلوٰۃ بھیج کر آئندہ کے لئے احتیاط کیجئے۔ تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی تعلیمِ نسواں کی نشر و اشاعت میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھایئے اور تعلیم کے ساتھ انھیں اصول سیاست سے آگاہ کیجئے۔"

(حیات ز۔خ۔ش متذکرہ ص ۷۸۔۷۹۔۸۱)

زاہدہ خاتون نزہت کے یہ افکار و عقائد آج اتنا عرصہ گذر جانے پر بھی

بھی فکر و عمل کے محتاج ہیں۔

برطانوی سامراجیت اور جاگیردارانہ نظام کے جس گٹھ جوڑ میں زاہدہ خاتون نے آنکھ کھولی اسی کی بنیادوں پر غیر ملکی حکومت و آمریت کے قلعے کی تعمیر ہوئی تھی لیکن حب قومی اور جذبۂ حریت سے سرشار وہ ایک نڈر و بے باک مجاہدہ تھیں اپنے جذبۂ بغاوت کے دفاع میں انھوں نے کیا خوب کہا تھا ؎

علم بردارِ حریت ہوں حکم شاہ عالم سے
نہ سمجھو مجھ کو باغی تابع قانونِ قدرت ہوں

اسی کی سمت چل دینے کی ٹھانی ہمت دل نے
کہا جس رہ گذر نے معرضِ خوف ہلاکت ہوں

(فردوس تخیل، ص ۱۶۴۔ ۱۶۵)

یہاں اس موقع پر ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے نئی کروٹ بدلی تھی۔ ان میں قوم پرستی کی ایک نئی روح پیدا ہو چکی تھی۔ اندرون و بیرون ملک اسلامی معاملات جیسے ہندو مسلم یونیورسٹیوں کا قیام استرداد تقسیم بنگال، ہندو مسلم اتحاد، شہادت مسجد کانپور، جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پھر جنگِ عظیم جیسے مسائل نے اہلِ ملک اور عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ز۔ خ۔ ش کے اشاراتِ مخفی سے زاہدہ خاتون بے تکان لکھ رہی تھیں اور ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ان کے دلچسپ مضامین اور پرمغز نظمیں خصوصی مقبولیت حاصل کر رہی تھیں جن کا بیشتر حصہ اخبار 'زمیندار' لاہور میں شائع ہوتا تھا۔ زمیندار لاہور کو ضمانت و قید و بند کی صعوبتوں کا اکثر سامنا رہتا تھا۔ زاہدہ خاتون ان ضمانتی چندوں میں دل کھول کر حصہ لیتی تھیں ان کے سیاسی خیالات پر اس زمانے کے قومی اخبارات زمیندار، ہمدرد اور الہلال

کا گہرا اثر تھا۔ ان اخبارات کے افکار اور تخیلات کو ان کے سیاسی معتقدات کی اساس کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا، یہ وہ وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار ''الہلال'' ملک بھر میں بے مثال مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ زاہدہ خاتون مولانا کو اخی فی الدین مانتی تھیں۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا اس پر اپنے ایک خط میں وہ لکھتی ہیں ''کیا تم نے اخبار 'ہمدرد' دہلی میں آزاد بھائی پر پولیس کانپور کا ظلم دیکھا؟ کیا رئیس الاحرار سلمہ الرب سے پولیس کی مخصوص اہانتیں مثلاً تمام پولیس اور افسرانِ پولیس کا ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لینا اور برادر ممدوح کا فوٹو ان کے پاس سے نکلنا، ان کو کسی سے عام بات کی اجازت نہ دینا۔ ٹائیلر کی سخت بدکلامی، مسجد، جیل خانہ، ہوسپٹل کے دیکھنے سے روکنا اور بالآخر کانپور سے نکلوا دینا، ان کا لیفٹیننٹ گورنر کو تار دینا، وہاں سے جواباً عدم مداخلت کا اعلان کیا جانا ان تمام باتوں پر مطلع ہو کر بھی تم عنانِ ضبط مضبوط تھامے رہو گی''۔ (سوانح حیات مذکرہ ص ۱۵)

واقعہ کانپور پر ان کی متعدد نظمیں ''زمیندار'' لاہور میں شائع ہوئیں جنگِ طرابلس کے غمگین تاثرات کو لے کر جب علامہ شبلی نے ملک و ملت کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی ؎

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

تو زاہدہ خاتون خلوص دل سے لبیک کہہ کر آلِ عثمان کی مدد کے لئے تیار ہو گئیں اور دامے درمے، قدمے سخنے اپنی تمام تر مساعی جمیلہ کو ان کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے طرح طرح سے صرف چندہ ہی جمع نہیں کیا بلکہ اپنے قلم کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ اس زمانے کی ان کی مشہور مثنوی موسومہ ''عالم خواب'' جس کے اشعار تعداد میں ستتر ہیں ۱۹۱۳ء کے رسالہ خاتون علی گڑھ میں شائع ہوئی۔ الحاق طرابلس اور شرائط صلح پڑھ کر تمام عالم اسلام کی مانند زاہدہ خاتون کو بھی از حد ملال ہوا اور اس واقعہ کی تاریخ مندرجہ ذیل رباعی میں نکالی ؎

کیا پوچھتے ہو آہ سُراغ طرابلس
گلچیں ہوا ہے قابض باغ طرابلس
نزہت جو پوچھے حادثۂ جاں گسل کا سال
کہہ دو بکا کے ساتھ ہے داغ طرابلس

۲۳ ۱۳۳۰ھ ۷ - ۱۳

(فردوس تخیل، ص ۳۵۷)

لیکن یہ مذہبی البتہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ دول یوروپ کی ریشہ دوانیوں کے سبب جلد ہی جنگ بلقان شروع ہوئی۔ اس بار سلطنتِ عثمانیہ کا مقابلہ سربیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور جبل اسود تھا جن کی پشت پناہی یوروپین طاقتیں کر رہی تھیں حکومت ہندوستانی مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رہی تھی اس کے باوجود مسلمانوں نے جہاد بالمال میں دل کھول کر حصہ لیا۔ زاہدہ خاتون کے افکار و خیالات کی ملک بھر میں دھوم تھی؛ "اپیل منظوم برائے امداد ہلالِ احمر" عید کی خوشی میں شہداء کی یاد" مرثیہ کنگ جارج والی یونان" زندہ بادا نور پاشا اور "آشوب اسلام" اس زمانے کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں "آشوب اسلام" سے دو اشعار ؎

نہ ہو گی نقشہ بلقاں میں اپنے بھر ترمیم
نہ تھا ارادہ ایفا تو کیوں قرار کیا

فلک زدوں کو ستانا یہی ہے کیا انصاف
فغاں فغاں کہ زمانے سے اٹھ گیا انصاف

("خاتون" علی گڑھ اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۴۸)

پہلی جنگ عظیم کے دوران اپنی مشہور نظم "موصل کا تیل" میں بھی انھوں نے کھل کر اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور نظم "جلوۂ شب" کے عنوان سے ۱۸ر جولائی ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں شائع ہوئی۔ جس پر اظہار خیال کرتے

ہوئے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار نے لکھا تھا "گو نور جہاں بیگم اور زیب النساء بیگم خود تو دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی ایک معنوی یادگار اب بھی ہندوستان کے عالم نسواں کا سرمہ بینش ہے۔" (بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۵)

قومی رہناؤں کی شخصیتیں بھی زاہدہ خاتون کی توجہ کا خاص مرکز تھیں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی اور آنجہانی گوکھلے ان سب کی وفات کے قومی حادثے پر ان کے قلم نے کھل کر اشک فشانی کی۔ مرثیہ ہائے شبلی کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

دامن صبر کاٹ لے سوزن سے رشتہ تو
یوں چاک ہو کہ پھر نہ کبھی ہو سکے رفو
اشک گہر فشاں تو مرا ہی سپیے لہو
بہہ بہہ کے گرد بوئے نہ دریا کی آبرو
ہاں برقِ آہ اور ذرا زور سے چمک
اُٹھ اے فغانِ دل سوئے عرش بریں لپک
ہاں گر کے خاک پر تڑپ لے رفعتِ خیال
اے قوتِ بیان تو رو رو کے ہو نڈھال
خاک اے عروسِ نظم تو تزئین مو پہ ڈال
غم اپنی بے سری کا کر اور کھول سر کے بال
قومی شرف کا آج پھٹا جامۂ حیات
پائی جناب شبلی علامہ نے وفات

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۹)

شمس العلماء مولانا حالی کی رحلت پر ان کے قلم نے "وائے حالی" کے نام سے اشک فشانی کی ؎

نام چمکے گا "مدرس" سے سدا جوں خورشید
مرنے دیگی کبھی اس کو نہ "حیاتِ جاوید"

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۵)

آنجہانی گوکھلے کی وفات پر بھی زاہدہ خاتون کا دل تڑپ اٹھا تھا ؎

کیوں یاس ہو نہ مجھ کو بہبودِ ہندیاں سے
سنتی ہوں گوکھلے بھی رخصت ہوئے جہاں سے
بڑھتی ہوئی امیدیں اٹھتی ہوئی اُمنگیں
مٹی میں مل گئیں سب اس مرگِ ناگہاں سے
اماں کی پہلے سے وا صحت کی فکر پہلے
ایسا سپوت بھارت تو لائے گی کہاں سے
حبِ وطن ہمیں بھی اور گوکھلے کو بھی تھی
پر تھا وہاں تعلق دل سے یہاں زباں سے
سرگوشیاں کریگی اک روز آسماں سے
ہاں ہاں یہی ادھوری تعلیم گوکھلے کی
تعلیم ابتدائی ہو کر رہے گی لازم
روشن کرے گی آنکھیں تنویر گوکھلے کی
حبِ وطن کو جزوِ ایماں کہا گیا ہے
واعظ سمجھ کے کیجو تکفیر گوکھلے کی
اے معترض حصار باطل ہو لاکھ محکم
کرلے گی پر صداقت تسخیر گوکھلے کی

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۶)

"ماتم شیخ الہند" میں وہ ان کی رحلت پر یوں آنسو بہاتی ہیں ؎

جس کا منہ دیکھو وہی ہے اشک خوں برسا رہا
جس جگہ جاؤ وہیں ہے نالۂ نا منتہا
جبرت دانش نے پوچھا کس کا غم ہے قوم کو
ہائے محمود الحسن کا غم ہے ہاتف نے کہا

---

۱۳ ھ ۳۹

زاہدہ خاتون علی برادران سے بھی خاص عقیدت رکھتی تھیں ان کی نظر بندی پر بھی "جرم عشق" کے نام سے ایک نظم "فردوس تخیل" میں شامل ہے۔

ز ۔ خ ۔ ش ۔ نے بھونرے میں پرورش پانے کے باوجود اپنے کلام میں جس بیدار مغزی اور صحت فکر کا ثبوت مہیا کیا ہے وہ بجائے خود کمال کی بات ہے وہ کہاں اور ترقی پسند تحریک کہاں لیکن اس نے اپنے ہی زمانے میں مزدور اور کہار کی دردمندی میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ کسی تحریک کی پاسداری نہ تھی محض اس کے باشعور دل کی آواز تھی۔" سہ
(نکتہ راز تذکرہ ص ۲۹۰)

علم و تہذیب و ترقی و شکون و تفریح
ہیں ظہور عمل سحر نمائے مزدور
ثبت جس پرزے پہ ہے ملکیت سرمایہ
کس کا مرہون کرم ہے وہ سوائے مزدور
کل جہاں اس کیلئے جیل ہے پھانسی گھر ہے
خاص کر ہند تو دوزخ ہے برائے مزدور
(فردوس تخیل، ص ۲۲۰۔ ۲۲۱)

ملکی سیاست کے بارے میں ان کے پختہ شعور کا اندازہ ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ "ہمارا قومی جوش جس قدر اپنی خوفناک

شدت کے لئے دنیا میں مشہور ہے اسی قدر سرعت فنا میں زبان زد خلائق ہے۔ ہمارا مجموعہ سیاست کیا ہے؟ ایک طومار خرافات، ہمارا میدان عمل کیا ہے؟ ایک بازیچۂ اطفال ہماری متفقہ آواز کیا ہے؟ ایک قہقہہ انگیز تمسخر ہمارے رہنما سیاست کو تسخیر عوام کا چلتا ہوا جادو، عزت حاصل کرنے کا نسخہ، سونے و چاندی کا مینہ برسانے والا چشمہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا رعب و اثر اقوام عالم کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا ہے"۔ (حیات فرخ بخش متذکرہ ص ۸۱) کیا یہ افکار و عقائد آج بھی مسلمانوں کی خصوصی توجہ کے مستحق نہیں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب قومی سیاست کے بارے میں زاہدہ خاتون ایک مستحکم عقیدے پر پہنچ گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر ان پر بھی چل چکا تھا، قومی آزادی کا مطلب، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ سبھی سیاسی تحریکات جو اس وقت ہندوستان میں اپنے شباب پر تھیں وہ ان سب کی خلوص دل سے مرید تھیں ملکی اتحاد پر ایک نظم "ترانۂ اتحاد" میں وہ کہتی ہیں ؎

جنت کی دید سے ہے دل شادماں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کہنے کو ہم ہیں ہندی حب وطن ہے ایماں
کیا پوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا

دورِ نفاق دم الاخوین چاہتا تھا[1]
شاکر ہے قاتلوں کا آرام جاں ہمارا

روتے ہیں ہم جو مل کر گنگ و جمن کی صورت
شاداب ہو کے ہنسنا ہے گلستاں ہمارا

---

[1] جلیان والا باغ کی طرف اشارہ ہے جہاں ہندو مسلمانوں کا مشترکہ خون بہا تھا۔

ہو جائے کاش ثابت روحوں کی کوچہ گردی
بن جائے کاش گاندھی ہر نوجواں ہمارا

جاں سے بدن سے خوں سے ہندوستاں کے ہیں ہم
حیرت ہے کیوں نہیں ہے ہندوستاں ہمارا

(فردوس تخیل، ص۲۴۰)

زاہدہ خاتون سودیشی تحریک اور ترک موالات میں عملی طور پر شریک ہونا چاہتی تھیں۔ سعادت مند بیٹی اور شفیق باپ کے خیالات میں تصادم ناگزیر تھا تاہم انھوں نے دیسی کپڑے پہننے کے عزم کا اپنی ایک تحریر میں عہد کیا: "اگرچہ ترکِ موالات کے طریق عمل سے بعض صورتوں میں مجھے اختلاف ہے اور نظام تحریک میں بھی تعلیمی مقاطع کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہوں[1] مگر اس اہم اور اعلیٰ اقدام حریت سے اصولاً مجھے اتفاق ہے اور سودیشی تحریک پر تو میں عاشق ہوں آج سے نہیں ہمیشہ سے اب چونکہ تازہ واقعات نے بدیشی مال سے ناقابلِ برداشت نفرت پیدا کر دی ہے۔ اس لئے ان تمام مشکلات پر کامل غور کرنے کے بعد کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی۔"

(حیات ز۔ خ۔ ش۔ متذکرہ ص ۱۰۴-۱۰۰)

"قدرت اس کشمکش قلم پر مسکرا رہی تھی۔ اور یہ عہد پورا کرنے کی بشارت دے رہی تھی کہ "اب کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی" اس تحریک کے ٹھیک گیارہویں روز یہ محبِّ وطن خاتون مرض الموت میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی داؤد احمد خاں نے وہی دیشی کپڑا ان پر اُڑھا دیا جو کہ اس عہد کے وقت انھوں نے اپنے لئے خریدا تھا۔"

(ایضاً ص ۱۰۶)

اس قبل از وقت حادثے پر سجاد حیدر یلدرم نے ۱۸ فروری ۱۹۲۲ء

---

[1] آنجہانی ٹیگور نے بھی تعلیمی مقاطع پر اس طرح کا اظہارِ خیال کیا تھا۔

کے تہذیب نسواں میں لکھا: "وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے۔ یکایک خاموش ہو گئی...... وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی۔ قفس میں ہی تھی اور قفس میں ہی دم توڑ دیا۔"

اپنی جواں مرگ کا ذکر وہ بڑے رجائی انداز میں اس وقت سے بہت پہلے ہی کر چکی تھیں ۔

مرے رُخ کو چھپا کر خاک سے جب اقربا نکلے
پکاری معنوی صورت کہ زندہ ہوں سلامت ہوں

(فردوس تخیل، ص، ۱۶۵)

خدیجہ بیگم

خدیجہ بیگم کا تعلق ایک معزز سرحدی خاندان سے تھا، ان کے والد ضلع بنوں میں انسپکٹر مدارس تھے۔ پردے کی قیود کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی صوبہ سرحد میں مسلمان بڑی اکثریت میں تھے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی رہنمائی میں وہاں کی سیاسی فضا پر کانگریس پوری طرح حاوی تھی۔

۳۰ راپریل و یکم مئی ۱۹۳۰ء کو پنجاب صوبائی کانگریس کا اجلاس راولپنڈی میں ہوا۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صدر جلسہ تھے۔ جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ۔ لالہ لاجپت رائے، خان عبدالقیوم پشاوری، مولانا سید حبیب ایڈیٹر سیاست کے علاوہ خدیجہ بیگم نے بھی اس میں تقریر کی۔ کھادی کے برقعے میں ملبوس انھوں نے تقریر کے ساتھ اس عظیم الشان جلسے میں ایک نظم بھی پیش کی جس سے ان کی حب الوطنی اور آزادیٔ مادرِ وطن کی خلش کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم کے چند اشعار:

مسرور گو بظاہر رہتی ہوں میں زمن میں
کٹتا ہے وقت میرا اسیرِ گلِ چمن میں

اغیار نے بٹھایا سکہ میرے وطن میں
اس سے نہ چین دل میں نہ شانتی ہے من میں

جاکر چمن میں سنتی بلبل کے ہوں ترانے
کوئل کی میٹھی کو کو آتی ہے دل لگانے

آتی ہوں گو چمن سے بستی میں دل لگانے
لیکن ہو شانتی کیا جی کو کسی بہانے

ملتی ہے درد و غم سے کچھ بھی ذرا فراغت
ہوتا ہے گر ذرا سا بھی کم ملالِ فرقت

حسرت بھری نکلتی منہ سے ہے یہ عبارت
پھر اوج پر الٰہی کب ہوگا پیارا بھارت

خدیجہ بیگم نے نہ صرف خود ہمیشہ کھدر کا استعمال کیا بلکہ بنوں میں گلی گلی اور خانہ بخانہ پھر کر خواتین کو چرخہ کاتنے، کھدر پہننے اور سودیشی تحریک کو ترقی دینے کی ترغیب دیتی رہیں۔ (ماخوذ بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۴۲) ان کی بقیہ زندگی کی تفصیلات نیز قومی زندگی میں سرگرمیوں کا تذکرہ آزاد ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

خدیجہ بیگم کے علاوہ صوبہ سرحد کی کچھ اور خواتین کے نام بھی اکثر قومی رہنماؤں کے کاغذات میں پائے جاتے ہیں مثلاً گاندھی جی کے خطوط میں خان عبدالغفار خاں کی بیٹی مہر تاج اور ڈاکٹر خان صاحب کی بیٹی مریم کا متعدد بار ذکر ہے۔ مہر تاج گاندھی جی کے آشرم میں بھی رہی ہیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے اپنی پشتو سوانح عمری میں خواتین رضا کار کی حیثیت سے ان کا تذکرہ کیا ہے (دیکھئے تذکرہ صوفیہ سوم جی) بادشاہ خان نے اپنے بڑے بھائی عبدالغنی خاں کے تذکرے میں خورشید بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت و بہادر خاتون تھیں۔ کابل سے جو بادشاہ خان کے خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں ایک خط "خورشید بہن کے نام

بھی ہے۔ احمد آباد جیل سے ۲۲ر فروری ۱۹۳۰ء کو سری رام سنگھ بنوں والے ۲؎ کے خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ " خورشید بہن میری ملاقات کو آئی تھی۔ اس بہادر لڑکی کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اس نے جس جرأت و قربانی اور تکلیفوں کو صوبہ سرحد کے افغانوں کے لئے برداشت کیا ہے اس کی مثال نہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اس بہادر لڑکی خورشید بہن کی طرح تکلیفیں برداشت کی ہوں گی " (مکتوب سرحدی گاندھی ص۱۲ بحوالہ خط سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۸۴ء) تفصیلات نہ ملنے کے سبب قومی شرکت سے متعلق ان بکھری ہوئی کڑیوں کو مربوط کرنا ممکن نہیں۔ البتہ وہاں کی سیاسی فضا کے پیش نظر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اور بھی سرحدی خواتین تحریک آزادی میں پیش پیش رہی ہونگی۔

اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

زبیدہ بیگم داؤدی

محترمہ زبیدہ بیگم کی پیدائش پارو گاؤں، ضلع مظفر پور (بہار) میں اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ ان کے والد مرحوم سید عبدالفتح سب رجسٹرار تھے اور پارو گاؤں نیز قرب وجوار میں بڑی زمینوں کے مالک تھے۔ زبیدہ بیگم کی شادی بہار کے مشہور ایڈوکیٹ اور ممتاز قومی رہنما شفیع داؤدی سے ہوئی جو مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت موتی لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ مولانا شفیع داؤدی کے سیاسی نظریات کا زبیدہ بیگم نے پورا اثر قبول کیا۔ بی اماں (والدہ محمد علی) کا ان کے یہاں قیام اور ان کی شعلہ بار تقاریر سے بھی زبیدہ بیگم خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر تھیں اور اپنے معزز شوہر کی سیاسی سرگرمیوں میں برابر کی شریک تھیں۔

خلافت وتحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی نے فعال کردار ادا کیا۔ انھوں نے قانون کی پریکٹس چھوڑ دی۔ اس وقت وہ تین ہزار روپے ماہوار کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اتنی بڑی آمدنی ایک دم ختم ہوگئی لیکن زبیدہ بیگم نے خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مالی سختیوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی سابقہ بہت بڑی رہائش گاہ کی تعمیر اور ولایتی کپڑوں پر پہلے ہی صرف ہو چکی تھی۔

انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس جب تحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی کو گرفتار کرنے کی خاطر شفیع منزل پہونچا تو تین چار سیڑھی چڑھ کر ہی مولانا کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں لڑکھڑا گیا۔ یہ مولانا کی شخصیت اور حب قومی کا رعب تھا جس نے اسے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وارنٹ گرفتاری بھی بمشکل تمام دکھا سکا۔ مولانا نے اسے بڑی فراخدلی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ دم چلنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اُٹھ کر زنان خانے گئے اور ہدایت دی کہ زبیدہ بیگم شفیع منزل چھوڑ کر فوراً تلک میدان کانگریس کے دفتر پہونچیں اور اس وقت تک وہاں قیام کریں جب تک مولانا کے خاص رفیق کار رام دیالو مظفر پور ہیڈ کوارٹر نہ پہنچ جائیں " جس سے عوام میں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ مولانا شفیع داؤدی کی گرفتاری سے قیادت میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ بیگم زبیدہ داؤدی فوراً ہی تلک میدان پہونچیں اور کانگریس کے دفتر میں اس وقت تک قیام کیا جب تک رام دیالو بابو نے آکر قیادت کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال لیا۔ مولانا کو ایک سال قید کی سزا ہوئی۔

زبیدہ بیگم نے سب سے پہلے اپنے شوہر کے تمام قیمتی ولایتی کپڑے (مولانا کا شمار اپنے زمانے کے مشہور جامہ زیب حضرات میں ہوتا تھا ان کے کپڑے کلکتے سے سِل کر آتے تھے) پھر اپنے نیز اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ولایتی کپڑے بھی کانگریس کے دفتر تلک میدان بھیج دیئے۔ جہاں انھیں ہنسی خوشی آگ لگائی گئی۔ اس طرح ولایتی کپڑوں کی ہولی جلانے میں انھوں نے بقیہ لوگوں کی قیادت کی وہ اپنے ساتھ ایک یا دو بیٹیوں کو لے کر بگھی میں سوار دوپہر کو گھر گھر جایا کرتیں اور ولایتی کپڑے اکٹھا کرتیں۔ شفیع منزل کی شاندار سُرخ عمارت کے پورٹیکو میں ایسے کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا، ہفتے کے اختتام پر ان میں باقاعدہ رسم کے طور پر آگ لگا دی جاتی تھی۔

زبیدہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون تھیں، شوہر کے ہمراہ وہ ہر عوامی جلسے میں شریک ہوتی تھیں اور خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں۔ وہاں

سبھی خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔ جن کے شوہر نیز دوسرے عزیز قومی آزادی کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ کھادی کے کپڑوں میں ملبوس خواتین شفیع منزل کی شاندار احاطے میں جمع ہوتی تھیں۔ بیگم زبیدہ چرخے کی کلاس بھی وہیں پر لیتی تھیں۔ اسی عمارت کے وسیع و عریض لان میں گاندھی جی نے بھی خواتین سے خطاب کیا تھا۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلبار نے گورنمنٹ اداروں سے اپنے نام کٹوالئے تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے شفیع داؤدی احاطے میں قومی اسکول و کالج قائم کئے گئے تھے۔ روپیہ فراہم کرنے کی خاطر محب وطن خواتین کھانا پکانے سے قبل ایک ایک مٹھی اناج بچالیا کرتی تھیں۔ زبیدہ بیگم طلبار کی غذا و صحت کا خاص خیال رکھتی تھیں خصوصًا ان کا کھانا وہ اپنی نگرانی میں تیار کراتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے جنھوں نے خود گورنمنٹ ادارے سے اپنی تعلیم منقطع کر لی تھی میز بانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن مالی مشکلات اور حکومت کی طرف سے مستقل پریشان کئے جانے کے سبب یہ ادارے زیادہ عرصے تک نہ چل سکے۔

نہرو رپورٹ سے مخالفت کے سبب مولانا داؤدی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تھے اور ۱۹۳۷ء میں احرار پارٹی کی شکست کے بعد سیاست سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ ان کی تین سال کی طویل علالت کے دوران زبیدہ بیگم ان کی تیمار داری میں مشغول رہیں اور ۱۹۴۹ء میں ان کے انتقال کے بعد بقیہ زندگی خاموشی سے گذار دی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب زبیدہ بیگم کو اپنا رہائشی مکان کرائے پر دے کر ایک مختصر سے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ گذر بسر کی خاطر زبیدہ بیگم نے اپنی زمینیں بھی فروخت کیں لیکن آزاد ہندوستان میں دستِ طلب دراز کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

(بشکریہ جناب عطار الرحمٰن داؤدی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفر پور۔ خط مورخہ ۹ مارچ ۱۹۸۰ء)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

کنیز سیدہ بیگم

کنیز سیدہ بیگم کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں چھپرہ (سارن) بہار میں ہوئی۔ آپ سید مبارک حسین کی پوتی اور بہار کے ممتاز کانگریسی رہنما سید صلاح الدین کی چھوٹی بہن تھیں۔ اردو عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، ان کی شادی جناب ریاست حسین صاحب سے ہوئی جو بیرسٹر ایٹ لا تھے۔

کنیز سیدہ بیگم مہاتما گاندھی، علی برادران اور مولانا آزاد جیسے قوم پرست رہنماؤں کے سیاسی نظریات و عقائد میں یقین رکھتی تھیں اور انتہائی قوم پرور جذبات کی خاتون تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں انھوں نے سودیشی اور چرخہ تحریک کے لئے خواتین کو منظم کیا۔ تحریک خلافت کے دوران خواتین کے جلسوں کو خطاب کرتی تھیں۔ ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں میں ان کے بڑے بھائی سید صلاح الدین حسین کی ہدایات شامل ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں کنیز سیدہ بیگم کے شوہر ریاست حسین صاحب کا صرف پینتالیس ۴۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس سانحے سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے سبھی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر لیا اور ۱۹۵۵ء میں اپنی وفات کے وقت تک ایک مذہبی خاتون کی حیثیت سے خاموشی کے ساتھ زندگی گزار دی۔

(بشکریہ جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن۔ نمائش روڈ پٹنہ۔ بہار۔ ذاتی انٹرویو۔ ۳ مارچ ۱۹۸۸ء)

منیرہ بیگم

منیرہ بیگم بہار کے ممتاز قومی رہنما مولوی مظہرالحق کی اہلیہ تھیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بدرالدین طیّب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی شادی ۱۸۹۱ء میں مولوی مظہرالحق سے ہوئی جن کا پٹنہ کے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق تھا انھوں نے لندن سے بار ایٹ لا کیا اور وہیں وہ گاندھی جی، مسٹر علی امام اور مسٹر سچدانند سنہا کے قریب آئے۔ سیاسی عقائد کے لحاظ سے وہ جداگانہ انتخاب کے حق میں نہیں تھے۔ اور ہندو مسلم اتحاد ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انھوں نے پٹنہ سے باہر دگھا کے مقام پر صداقت آشرم کی تعمیر کی اور مغربی طرز کی بود و باش نیز سبھی دنیادی عیش و آرام کو تج کر فقیرانہ زندگی اختیار کی۔ اکبر حیدری کے نام گاندھی جی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیرہ بیگم نے قوم و وطن کی خاطر اس عظیم قربانی میں شوہر کا پورا ساتھ دیا۔ خط کا متن حسب ذیل ہے۔

" آرہ جاتے ہوئے

۴ر دسمبر ۱۹۲۰ء

عزیز دوست! ہم ابھی ابھی بانکی پور پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔ مظہرالحق

نوٹ:۔ بیگم حیدری اور بیگم مظہرالحق دونوں بہنیں تھیں اور طیب جی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہمارے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ گذشتہ شب میری بلائی ہوئی خواتین کی نشست میں بیگم مظہرالحق نے اپنے چار عدد ہیرے سے مرصع بیش قیمت کنگن ہمیں بطور عطیہ دیے ہیں۔ کیا آپ بیگم حیدری کو ایک ایسی خاتون کی بہن ہونے پر مبارک باد پیش کریں گے جو ملک و قوم کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے سکے؟ جب انھوں نے کنگن پیش کیے تو میرا دل جذبات سے بھر آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے طیب جی خاندان سے قریب ہونے کا موقع دیا۔"

(م۔ک۔گ)

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol.XIX 1920 - 1921, P. 70)

کفنی سے اپنا دین و دنیا کا سلسلہ نیتی حیات

عصمت آرا بیگم

جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے حکیم عبدالقوی صاحب کو ملکی سیاست سے بہت تعلق تھا۔ خلافت کمیٹی کے ایک جلسہ میں علی برادران نے چندہ کی اپیل کی لوگوں نے بہت کچھ نچھاور کیا۔ عورتوں نے زیورتک پیش کیے۔ حکیم صاحب نے گھر آکر اپنی بھتیجی عصمت آرا بیگم سے اپنے گھر خواتین کا جلسہ منعقد کرانے کی خواہش کی اور فرمایا کہ بدیسی کپڑوں میں آگ میرے گھر سے ہی لگائی جائے۔ عصمت آرا نے جلسے کے انعقاد کا نہایت خوشدلی سے اہتمام کیا اور بی اماں (والدہ مولانا محمد علی و شوکت علی) کی موجودگی میں بڑی شان سے جھوائی ٹولہ میں جلسہ ہوا۔ عصمت آرا کے علاوہ بی اماں نے بھی تقریر کی، اس جلسے میں حکیم صاحب نے گھر کے سارے بدیسی کپڑے جلوا دیے۔ عصمت آرا بیگم نے جہیز کے کپڑوں کو خود اپنے ہاتھ سے آگ لگائی اور اپنی شادی کا زیور اسی جلسہ میں بطور چندہ پیش کیا (حکیم سید ظل الرحمٰن: تذکرہ خاندان عزیزی ۱۹۰۸ ص ۲۲۳)

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

صغریٰ خاتون

صغریٰ خاتون عرف بگّن کی پیدائش عثمان آباد ریاست نظام حیدرآباد میں ہوئی۔ والد کا نام سید ہادی اور والدہ کا سعیدالنساء تھا۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے سبب وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننہال موضع بھٹولی، ضلع بارہ بنکی آ گئیں۔ وہیں تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی محمد ضمیر صاحب سے ہوئی جو صرف چھ سال بعد ایک دو سال کی بچّی زاہدہ کو چھوڑ کر طاعون میں انتقال کر گئے۔ سسرال میں جائداد کی رنجشوں کے سبب صغریٰ بیگم اپنے ماموں کے پاس لکھنؤ چلی آئیں۔ لکھنؤ میں ان دنوں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی اور پردہ نشین خواتین بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ صغریٰ خاتون بھی تحریک آزادی میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ وہ سروجنی نائیڈو، شریمتی موتی لال نہرو اور دوسری خواتین کے ساتھ سبھی زنانہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور باوجود برقعہ پوشی کے ستیہ گرہوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ جب ولایتی کپڑوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو دوسری خواتین کے ہمراہ وہ بھی دکانوں کے سامنے راستے روکنے میں شریک تھیں۔ اس وقت پولیس نے خواتین پر کوڑے برسائے۔ سروجنی نائیڈو زیادہ زخمی ہوئیں۔ پھر سب خواتین کو گرفتار کر کے

گل سے جایا گیا اور درختوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا لیکن صغریٰ بیگم بر تعے
، سبب چھوڑ دی گئیں۔ انھوں نے خود اپنے سبھی ولایتی کپڑوں کو آگ لگا دی
ی اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ و کرتا پہنا شروع کر دیا تھا جس پر ان کے ماموں
زیبوہ ہونے کے بعد ان کے سرپرست تھے ان سے ناراض رہنے لگے تھے، سرکاری
لازم ہونے کے سبب وہ کھدر پہننے کے سخت مخالف تھے۔

جب خلافت کے جلسے میں شرکت کی خاطر بی اماں پہلی بار لکھنؤ آئیں تو صغریٰ
خاتون بھی بی بی آفتاب النساء بنت شیخ عبدالرحمٰن قدوائی ساکن بڑا گاؤں کے
ساتھ بی اماں کے استقبال کی خاطر فرنگی محل گئیں اور تحریک خلافت کے زنانہ جلسوں
کی روح رواں بن گئیں۔ جب بی اماں نے لکھنؤ میں چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا تو وہ
ایک تخت پر بیٹھ گئیں اور ان کے سامنے ایک چوکور کپڑا بچھا دیا گیا۔ سب سے پہلے صغریٰ
بیگم نے اس پر اپنا پورا زیور لا کر رکھ دیا جو تقریباً پچاس تولے سونا اور کچھ جواہرات
پر مشتمل تھا (ان کے شوہر محمد ضمیر بڑے زمیندار تھے) اس کے بعد انھوں نے
ایک پُرجوش مختصر سی تقریر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں پر موجود سبھی خواتین نے
اپنا سب کچھ لا کر چندے میں دے دیا۔ اس وقت صغریٰ خاتون کے بیان کے مطابق
جواہرات سے لے کر ایک چوّنی تک چندے میں آئی۔ اس واقعہ کا ذکر انھوں نے
متعدد لوگوں سے کیا۔ ہر بار اس کو بیان کرتے وقت ان کا چہرہ شدت جذبات سے
تمتما اٹھتا تھا۔ اور آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔

تحریک کے دیگر کاموں کے سلسلے میں وہ بی بی آفتاب النساء کے ساتھ بی اماں
سے ملنے رام پور بھی جاتی تھیں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں بی اماں کی آمد کے موقع
پر "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ہنگامی اجلاس میں موصوفہ رضاکاروں
میں شامل تھیں اور جلسے کا نظم و نسق سنبھال رہی تھیں۔ چندہ فراہم کرنے کے
سلسلے میں انھوں نے بارہ بنکی، کانپور، الہ آباد، اور دہلی وغیرہ کے سفر بھی کئے۔

صغریٰ بیگم کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور قومی و بین الاقوامی حالات سے

سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کئی اخبارات ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔ خود ان کے مضامین 'ہمدم'، 'زمیندار'، 'ہمدرد' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے پاس اخبارات نیز اپنے مضامین کا بڑا ذخیرہ تھا جو ایک بار گھر میں آگ لگ جانے کے سبب سب ضایع ہو گیا۔

نہرو خاندان سے صغریٰ بیگم کے خصوصی مراسم تھے وہ تفصیل سے اس خاندان کی طرز معاشرت کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں بھی انھوں نے حصہ لیا لیکن اسی دوران انھیں کئی بار حیدرآباد جانا پڑا جس کے تحت اس میں میں کوئی نمایاں کام نہیں کر سکیں۔

آزادی سے قبل وہ اپنی بیٹی اور نواسی و نواسوں کے ساتھ حیدرآباد دکن چلی گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شہادت پر وہ تڑپ کر روئی تھیں اور کہا تھا کہ قوم نے اپنے ہاتھوں ملک کے سب سے مضبوط ستون کو گرا دیا ہے۔" نظام کی حکومت کے خاتمے کے بعد وہ حیدرآباد سے ایک بار پھر لکھنؤ واپس آگئیں اور وہیں ۱۹۶۲ء میں ۱۰ مئی بروز جمعہ انتقال کیا۔ وہ ایک انتہائی باوقار و خوش شکل خاتون تھیں۔

(اطلاعات محترمہ سیدہ ضیا احتشام فرحت کدہ، سرسید نگر علی گڑھ اور محترمہ نفیسہ عزیز، تاریخ کی استاد کرامت حسین کالج لکھنؤ نے مہیا کیں)

قافلے شوق کے رُکتے نہیں دیواروں سے
سینکڑوں محبس و زنداں کے دیار آئے ہیں

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

بی بی امت السلام

بی بی امت السلام پٹیالہ کے ایک رئیس، محب وطن راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کرنل عبدالحمید خاں ریاست پٹیالہ میں وزیر مالیات تھے۔ ان کی پیدائش غالباً ۱۹۰۷ء میں موتی باغ محل پٹیالہ میں ہوئی۔ بی بی امت السلام نے بچپن سے ہی آزاد طبیعت پائی تھی۔ ایک بیدار ولاغر جسم، بنی نوعِ انسان کی خدمت کا بے پناہ جذبہ، ملکی حریت کی تڑپ شک وشبہ سے بھرا دماغ اور روایات سے بغاوت کا آہنی عزم ان کی شخصیت کے متضاد پہلو تھے محبت وعقیدت سے بھرپور دل لئے وہ تمام سماجی بندشوں کو توڑ کر گاندھی جی کے سابرمتی آشرم پہنچی تھیں۔ طبعاً انتہائی سادہ لوح تھیں جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے: "یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ گاندھی جی پہلے شخص تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لقب "قائدِ اعظم" کو رواج دیا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ لوح مگر نیک خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ انھوں نے کچھ اخبارات میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ قائدِ اعظم لکھا ہوا دیکھا تھا جب گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات کے لئے خط لکھ رہے تھے تو انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہتے ہیں۔ اس لئے آپ بھی اسی نام سے

خطاب کیجئے۔ ایک منٹ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر خطاب کیا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہتے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ حقیقت میں یہی رتبہ رکھتے ہوں گے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۱ء ص ۱۹۵)

بحوالہ ۱۹۳۰ء، مارچ ۱۹۳۰ء کی ستیہ گرہ کے دوران ۲۵ سال کی عمر میں وہ سابرمتی آشرم پہنچ گئی تھیں بطور مہمان اور بن گئیں غلام " یہ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر تھا مگر کیسا؟ ؎

اور ہی کچھ ہے گرفتاریٔ دل کی ترکیب
سختیِ طوق و گرانباریٔ زنجیر نہیں

ایک جاگیردار گھرانے کی مسلم لڑکی، پردے کی سخت قیود کو توڑ کر جنگِ آزادی میں خود کو ہر قربانی کے لئے تیار کرنے کی خاطر کس طرح آشرم پہنچی، یہ ایک ناقابلِ یقین کہانی ہے، سُنیئے ان کی اپنی زبانی، "باپو کے پاس"

" میری پیدائش پٹیالہ کے اس مشہور خاندان میں ہوئی جس کے ہندو سکھ سبھی خاندانوں سے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے اور اس دوستی و خلوص کو یاد کرکے ہم سبھی محبت کے آنسو بہاتے ہیں۔ اس خاندان میں مذہبی تفریق کا کبھی سوال ہی نہیں اٹھا۔ میرے والدِ مرحوم محمد عبدالحمید خاں مجھے تیرہ سال کی عمر میں چھوڑ کر چل بسے۔ میں اپنی والدہ امتہ الرحمٰن کی اکلوتی لڑکی اور چھ بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ والد کا اس دنیائے فانی سے گذر جانا میری زندگی کا پہلا حادثہ تھا جس کی چوٹ سے آج تک نہ سنبھل سکی۔

میں تیرہ سال کی عمر میں قرآن مجید مع ترجمہ اور چند مذہبی کتابیں ہی ختم کر سکی تھی۔ ہمارے خاندان میں پردے کی اتنی سختی تھی کہ صرف حقیقی بھائیوں کے سامنے ہی آنے کی اجازت تھی، اس لیے اسکول جانے کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ والدِ مرحوم مجھے علی گڑھ لڑکیوں کے اسکول بھیجنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان میں سماجی بندشوں کو توڑنے اور قومی ترقی کی خاطر کوئی بھی قدم اٹھانے کی جرأت بھی تھی لیکن افسوس کہ اس کا فائدہ مجھے نہ مل سکا اور میری تعلیم اردو لکھنے پڑھنے تک ہی رہ گئی۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ کو جلد ہی میری شادی کی فکر ہوئی میرے بڑے بھائی محمد عبدالرشید خاں جنھوں نے قومی خدمت کے لیے راستہ ہموار کرنے میں میری رہنمائی کی ۱۹۲۱ء میں بیرسٹری چھوڑ کر قومی جنگِ آزادی میں کود پڑے تھے۔ انھوں نے والدہ کو سمجھایا کہ اتنی کم عمری میں شادی میں گناہ سمجھتا ہوں۔ آپ نے اب کیا تو میں بہن کی شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔ اب اس کے بعد چھوٹے بھائیوں کی جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بچپن سے ہی مجھے دنیاوی عیش و آرام، زیورات اور کپڑوں سے دلی نفرت تھی۔ یوں میرے سامنے نہ کوئی نصب العین تھا نہ ہی مجھ میں اپنے جذبات کا ماں یا بھائیوں کے سامنے اظہار کرنے کی جرأت تھی۔ ماں اکلوتی بیٹی کے لئے ہمیشہ ریشم و زردوز کپڑے اور زیورات تیار کراتیں جو مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ میری صحت ابتدا سے ہی خراب تھی، جسم میں کمزوری تھی اور سابرمتی آشرم جانے سے پہلے ہی میں ٹی۔ بی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس درمیان والدہ نے پھر بڑے بھائی پر میری شادی کے لئے زور دیا۔ بھائی نے بمبئی میں ڈاکٹر بلیموریا سے مشورہ کیا۔ میں پردے کے پیچھے سے سن رہی تھی، انھوں نے کہا کہ "بخار رہتے ہوئے شادی میں جان کا خطرہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تین سال تک بخار نہ رہے"! اب میں ہر ممکن طریقے سے صحت خراب کرنے پر تل گئی تھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں"

بیس سال کی عمر میں کچھ صحت سنبھلی تو بھائیوں نے پھر میری پسند کی بات شروع کی۔ میری پسند کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مجبوراً کہا "آپ جہاں مناسب سمجھیں میری شادی ضرور کر دیں لیکن میری طرف سے شوہر کو دوسری شادی کر لینے کی پوری اجازت

ہو گئی؛ بھائیوں کو ایک طرف میری پسند کی خواہش تھی۔ دوسری طرف دنیا کا خوف تھا کہ والد کے بعد چھ بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک بہن کی شادی نہ کر سکے۔

۱۹۲۲ء میں بڑے بھائی عبدالرشید خاں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے چھ ماہ کے لئے جیل گئے۔ قوم پرستی کا جوش بڑھ رہا تھا، میں نے برقعہ پہن کر انبالہ میں گلی گلی کھادی کی تبلیغ اور کھادی فروخت کرنا شروع کیا۔ میں مختلف جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگی تھی (بیگم محمد علی جوہر اور ان کی والدہ "بی اماں" کے اکثر پنجاب کے دورے ہوا کرتے تھے ان دوروں کا بھی میرے اوپر گہرا اثر تھا۔ بھائی رشید چھ ماہ جیل رہے اس دوران گھر میں سب بچوں کے جسم پر کھادی ہی کھادی تھی، والدہ نازک مزاج تھیں، موٹی کھادی پہننے سے ان کے جسم پر زخم ہو گئے تھے۔ تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے انھیں بھلانا ممکن نہیں۔ باپو کے اکیس دن کے برت کا بھی میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

میرے سامنے اب مستقبل کا سوال تھا۔ شادی نہیں کرنا تھی لیکن زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیئے۔ اخبارات میں باپو کی مختلف تحریکات کے بارے میں تو پڑھتی ہی رہتی تھی۔ ڈانڈی کوچ میں حصہ لینے کو بے اختیار دل مچلا لیکن آزادی کی کسی تحریک میں عملاً حصہ لینے کی اس کے لئے گنجائش ہی کہاں تھی جو خود آزاد نہ تھی۔ پٹیالے میں تو پردہ تھا ہی لیکن ۱۹۲۵ء تک بمبئی میں کافی حد تک اس سے آزادی تھی۔ بھائی عبدالرشید غلامی میں بیرسٹری نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ ان کے دوست انھیں مہاراجہ اندور کا سکریٹری بنا کر اندور لے گئے۔ بھائی کی لائبریری میں باپو کی خود نوشت سوانح عمری تھی۔ میں نے ایک بار شروع کی تو ختم کر کے ہی دم لیا۔ مجھے مستقبل کے لئے نئی روشنی بنا نصب العین مل گیا تھا۔ جب بھائیوں سے کہا میں سابرمتی آشرم جانا چاہتی ہوں تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ میری مشکل تھی کہ کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ باپو سے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا بہن کا نام اخبار میں پڑھا تھا، انھیں کو خط لکھا۔ جواب کافی انتظار کے بعد آشرم کے منتظم نارن داس گاندھی نے دیا: "تمہارا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" کچھ گھر کی حالت پوچھی تھی گھر

میں کوئی دکھ تو نہیں، تندرستی کا سرٹیفکٹ بھی مانگا تھا۔ اسے لینے میں نارنول سے
بمبئی ڈاکٹر بلیموریا کے پاس گئی۔ ڈاکٹر جنھوں نے میری ٹی۔ بی کا تین سال تک علاج
کیا تھا سُن کر ہلکی سی ڈانٹ سنائی "کیا بات کرتی ہے، تیری ایسی طبیعت کہاں کہ آشرم
کی سخت زندگی گزار سکے"۔ سچائی کی پرستار میں بچپن سے ہی تھی۔ نہیں تو نارنول سے
دلی بہت دور نہیں تھی وہاں سے بہ آسانی کسی ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ لے کر بھیج سکتی تھی
میں نے ڈاکٹر بلیموریا سے کہا میں سچا سرٹیفکٹ بھیجنا چاہتی ہوں۔ آپ میری جسمانی کمزوری
سے واقف ہیں۔ چار سال سے آپ کے زیرِ علاج ہوں۔ آپ کو جو بھی لکھنا ہو لکھ دیں
میں جاؤں گی نہیں بھیج دوں گی میری قسمت ہے۔ مرحوم ڈاکٹر بلیموریا نے لکھ دیا کہ "میں چار
سال سے اس کا علاج کر رہا ہوں ٹی بی تھی لیکن اب ٹھیک ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ آشرم
کی سخت زندگی نہیں گزار سکے گی"۔ میں نے وہی آشرم کو بھیج دیا اور لکھا کہ آنے کیلئے اجازت
کی منتظر ہوں۔ اس کا جواب آنے میں بھی کافی دیر لگی جب کہ میرے لئے ایک ایک منٹ
بھاری تھا۔ بھائی نے خط کھولا اور ہنستے ہنستے کہنے لگے، "تو تمہیں وہاں داخل کرنے
کے لئے کوئی تیار نہیں"۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی بھائی برداشت نہ کر سکے
اور خط مجھے دے دیا اس میں لکھا تھا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو داخل نہیں کر سکتے
ہاں آشرم کی زندگی دیکھنے آپ بطور مہمان یہاں آسکتی ہیں"۔ میں خوشی سے اچھل پڑی
دل میں یہ بھی خیال تھا کہ جانے کے لئے بھائیوں پر کیوں بوجھ بنوں۔ ماں کے مجبور کرنے
پر ہاتھ، کان اور گلے میں زیور تو رہتے ہی تھے، انھیں کو فروخت کرنے بمبئی کے
جھویری بازار گئی، کچھ دلال پیچھے لگ گئے جو کچھ ہاتھ آیا وہ بس اتنا تھا کہ آشرم پہونچ
کر دودھ، گھی کے کوپن لینے کے بعد صرف پانچ روپے باقی بچے انھیں میں نے وہاں جمع
کر دیا۔ دو چار دن میں ہی باپو احمد آباد آئے وہ شام کو سابرمتی کے کنارے ٹہلنے آتے تھے
آشرم والے ان سے یہیں ملتے تھے میں نے بھی اپنی رام کہانی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں
لی تھی کیونکہ میں نہ ہندی جانتی تھی نہ گجراتی، باپو نے محبت سے استقبال کیا یوں
جیسے ہمارے برسوں پرانے تعلقات ہوں۔ میری جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں

ممکن نہیں۔ خیر باپو نے دوسرے دن دوپہر کو شری امبالال سارہ بھائی کے گھر ملنے کا وقت دیا۔ خط میں میں نے لکھا تھا کہ "آشرم میں رہ کر آپ کے سائے میں ملک کی خدمت کے لئے تیار ہونا چاہتی ہوں لیکن جسمانی طاقت نہ ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔" باپو نے کہا "اگر حقیقت میں تمہاری یہ دلی خواہش ہے تو جسم آشرم کی سخت زندگی کو برداشت کر لے گا۔" جب چاہو مجھ سے مل سکتی ہو، داخلے کی فکر مت کرو، جسم جتنی اجازت دے اتنا ہی کام کرو بس پھر کیا تھا "گئی تھی مہمان بن کر اور بن گئی غلام۔"

میں نے بھائیوں کو لکھ دیا کہ اب آپ میری فکر نہ کریں۔ میں کتائی بنائی "دھنائی" کے کورس سیکھنے میں لگ گئی دو گھنٹے باورچی خانے میں کام کرتی، کوٹھار میں رہتی پھر گئن باڑے میں جاتی، وہاں کے بھائی بہنوں سے مجھے غیر معمولی محبت تھی۔ گنگا بہن دید کی محبت مادرانہ شفقت جیسی تھی پیارے لال بھائی کی والدہ تو پنجابی زبان بھی جانتی تھیں۔ اپنی بچی کے مانند پیار کرتیں جس کا احسان بھلا نہیں سکتی۔ آشرم کے سبھی اصولوں کو میں مجبوراً نہیں شوق سے پورا کرتی تھی۔ علی الصبح ندی پر جا کر نہا لیتی تھی کیونکہ میں کپڑے پہن کر نہانے کی عادی نہیں تھی۔ میری ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو لالٹین جلاتے نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں سے پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی تھی اس لئے ہوسٹل میں جب کوئی بہن لالٹین جلاتی تو چپ چاپ جا کر دیکھتی تھی کہ چمنی نکال کر کس طرح صاف کی جاتی ہے غرض زندگی محنت سے بھرپور تھی جسمانی کمزوری کو بھلا کر میں صبح سات سے دس تک دھنائی کرتی تھی۔ جوانی میں بھی تھکان تو ہوتی ہی ہے۔ مگر پسینے سے شرابور ہو کر بہت اچھا لگتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں پرانی پلوریسی پھر غالب آگئی، بخار بھی رہنے لگا تھا اس لئے پھر کام کم اور مفت خوری زیادہ تھی لیکن پھر بھی سلائی والے حصے میں جا کر میں ۱۲ آنے ایک روپیہ کی سلائی ضرور کر لیتی تھی۔ غرضیکہ آنے والی زندگی میں جو بھی مشکلات پیش ہوئیں ان پر میں باپو کی روحانی طاقت کے بھروسے

پرہی قابو پاسکی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے میں باپو کی غیر موجودگی میں اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے میں نے بہت کچھ سوچا اور ان کے ذریعے شروع کئے گئے بہت سے کاموں میں سے ایک کام "ہندو مسلم اتحاد" کو اپنے لئے چن لیا۔ باپو نے کانفرنس سے واپسی پر اس کی بھرپور تائید کی۔ وہی ان کی اپنی زندگی کا مشن بھی تھا" (باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام (ہندی) مرتبہ کالا صاحب کالیلکر نوجیون پرکاشن مندر احمد آباد ص ۱۹ تا ۲۶)

باپو نے انھیں سمجھایا "میں چاہتا ہوں آشرم میں تمہاری ذہنی وجسمانی ترقی ہو اور روحانی طاقت بڑھے" امت السلام شرمندہ تھیں آئی تھیں دوسروں کی خدمت کے لئے لیکن نازک مزاج ہونے کے سبب دوسروں کی خدمت کا سہارا لینا پڑا، باپو نے ہمت بندھائی صبر سے کام لو، خدا تمہیں خدمت کی طاقت بھی دے گا۔ جسمانی خدمت ہی تو سب کچھ نہیں، وقت پر ایک میٹھا بول، دل میں کسی اچھے خیال کا آجانا بھی بڑی خدمت ہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا:

"تمہارے دوسروں کی سیوا کے لئے جلد باجی (بازی) نہیں کرنا چاہیئے پہلے تو تمہاری صحت اچھی کرلو پیچھے سب کچھ اچھا ہوجاوے گا۔ باپو کی دعا" ۲۸/۲/۳۳ (باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام نہرو میوزیم لائبریری فائل نمبر ۵/۱۴ جلد اول)

آشرم میں رہتے ہوئے انھوں نے ہندی و گجراتی سیکھی۔ باپو انھیں اردو میں خط لکھتے تھے کبھی کبھی انھیں پڑھنے میں ایک گھنٹہ بھی لگ جاتا مگر وہ ختم کر کے ہی چھوڑتے۔ بی بی امت السلام کے ہندی اور گجراتی سیکھ لینے کے بعد وہ کبھی کبھی ہندی و گجراتی میں لکھتے اگر بہت جلدی میں کسی اور سے گجراتی میں لکھاتے تو آخر میں "باپو کا آشیرواد"، اپنے ہاتھ ہی سے لکھتے۔ ان کو ہمیشہ بی بی امت السلام کی صحت کی فکر رہتی تھی وہ ان کا علاج کبھی ڈاکٹر سے کراتے کبھی خود مٹی، پانی کا قدرتی علاج کرتے دھن کی پکی امت السلام اکثر سر پر مٹی کی پٹی لئے اپنے کام میں ہمہ تن مشغول رہتی تھیں

خرابیٔ صحت کی بناء پر انھیں ہمیشہ فکر رہتی کہ شاید وہ جیل نہ جا سکیں۔ باپو انھیں پرسکون رہنے کی تلقین کرتے۔ مندرجہ ذیل خط ان سے متعلق بہت سے خطوط میں سے ایک ہے۔

"پیاری بیٹی امت السلام"

تمہارا خط کل ملا سارا پڑھ لیا۔ مجھے رنج ہوا...... جیل جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم نے قبول کیا ہے جب تک بالکل اچھی نہیں ہوتی ہے تب تک جیل جانے کی بات نہیں کرے گی۔ یہ بھی سمجھو کہ راجہ جی کا سنگ جتنا ملے اتنا ہی اچھا ہے وہاں رہ کر جو سیوا بن سکے کیا کرو۔ اب پاگل مت بنو۔ خُش (خوش) رہو۔ مجھے لکھا کرو۔" (باپو کی دُعا۔ ۲ مارچ ۱۹۳۳ء (ایضاً جلد نمبر ۳)

بی بی امت السلام نے اپنی زندگی کا ہر عیش و آرام تج کر اپنے کو آشرم اور اس کے آدرشوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ بڑودہ سے گاندھی جی نے ایک خط مورخہ ۵ جون ۱۹۳۱ء میں نارن داس گاندھی جی کو لکھا تھا۔

"ہمیں امت السلام کو اگر وہ عمر بھر رہنا چاہے تو آشرم میں رہنے کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ اسے باہر سے روپیہ منگانے کی آزادی بھی ہونا چاہیئے بالفرض اگر باہر سے کوئی روپیہ نہ بھیجے تو ہمیں اس کے اخراجات اس کے اکاؤنٹ سے برداشت کرنا چاہیئں۔"

۱۹۳۳ء میں جب باپو نے سابرمتی آشرم کو ختم کر کے چند دوسرے آشرم والوں کے ساتھ راس گاؤں کی طرف کوچ کیا تو بی بی امت السلام بھی ساتھ تھیں، آشرم کی دوسری خواتین کے ساتھ انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں ستیہ گرہ بند ہونے پر وہ بھی رہا ہوئیں تو جیسے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ باپو کی شفقت نے انھیں مستقبل کی ایک نئی جہت عطا کی تھی۔ سیوا گرام آشرم میں باپو کی ذاتی خدمت کی خوش قسمتی انھیں کے حصے میں آئی باپو کے ملک گیر دوروں میں بھی وہ اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہیں ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء کے خط میں

انھوں نے راجکماری امرت کور کو بی بی امت السلام کی خدمت کے بارے میں لکھا تھا امت السلام میرے نزدیک ہی سوتی ہے مجھے پنکھا کرتی ہے اور جب ضرورت ہو اوڑھاتی بھی ہے۔ وہی مجھے کھانا کھلاتی ہے۔

(Collected Worksof Mahatma Gandhi, Ministry of Information Vol. LXVII. P. 165)

باپو سے ان کا پیار بیٹی سے بڑھ کر تھا اور خود باپو بھی انھیں کتنا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ یکم مئی ۱۹۳۷ء کے اس خط سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے "بی بی جان پیاری بیٹی امت السلام" کہہ کر انھیں مخاطب کیا ہے

(Collected Works Vol. LXV, p. 162)

بی بی امت السلام ہریجنوں کی خدمت جس انداز سے کرتی تھیں باپو کے دل میں اس کے لئے بڑی وقعت تھی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔

"میرا چاہنا کیا چیز ہے۔ آج میں کتنا پیار کر رہا ہوں اس کا تجھے پتہ نہیں۔ جتنا میں تیرے لئے کر رہا ہوں اتنا میں نے کسی لڑکی کیلئے نہیں کیا۔ یہ کوئی مہربانی کی بات نہیں ہے۔ میں دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ تیرا غصّہ ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ مگر تیری خدمت کی لگن کے آگے ہر کسی کا سر جھک جاتا ہے اور تیرے غصّے کو برداشت کر لیتے ہیں۔

(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص ۱۵)

سردار پٹیل کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "امت السلام پھر بستر پر لیٹ گئی ہے اس کا دل سونا ہے مگر جسم پیتل"

ایک بار ہریجنوں کی خدمت کرتے ہوئے امت السلام دہلی میں بیمار پڑ گئیں باپو کو بڑی فکر ہوئی لکھا۔ میری بات مانو تو مہربانی۔ میرے پاس آجاؤ تمہارا سب دکھ بھاگ جائے گا۔ اتنا میرا مانو گی تو میں تمہاری بڑی مہربانی مانوں گا مہربانی کر کے یہاں آجاؤ یہ نہ کر سکو تو پھر مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے"۔ (ایضاً ص ۹)

ایک بار بی بی امت السلام نے کاکا صاحب کالیلکر سے اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھیں بتایا تھا کہ "جب بھائیوں نے دیکھا کہ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکی ہوں تو انھوں نے جائداد میں سے نصف جائداد مجھے دینے کیلئے طے کیا۔ ہمارے

پوچھا گیا آپ کس قانون کے تحت ایسا کر رہے ہیں تو ان کا جواب تھا کہ ہم اسے عطیہ دے رہے ہیں۔ ایک بار ماں کی بیماری کے سبب میں پٹیالہ کی طرف آئی ہوئی تھی، گاؤں پہونچی تو دیکھا کہ بسوے داری کے ٹیکس غریبوں کیلئے آفت جاں ہیں۔ میں نے مختار سے کہا سب ٹیکس معاف کردو وہ پریشان ہوا کیونکہ دوسرے بھائیوں کے ٹیکس پر اس کا بُرا اثر ہونا لازمی تھا۔ بھائیوں کے پاس پہنچا، انھوں نے کہا امتل جو چاہتی ہے وہی سب کے لئے کرو۔ بھائیوں کی دلی خواہش تھی کہ کسی بھی بہانے بہن گھر واپس لوٹ آئے اس کے لئے وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار تھے۔۔۔۔۔۔ "ہزاروں ایکڑ کی زمین بٹائی کرانے میں گھوڑے پر جاتی تھی۔ گھوڑ سواری کا شوق بھی تھا اور اتنا چلنا بھی مشکل تھا ایک شام کو گھومتے گھومتے باہر گئی تو دیکھتی ہوں کہ ہریجن بہنیں لائن سے کنوئیں پر کھڑی ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں پانی چاہیئے۔ پوچھا بھرتی کیوں نہیں جواب دیا ہمیں کون بھرنے دے گا، میں سُن کر آگ بگولہ ہوگئی۔ کنواں میرے ہی نام سے تھا بسوے داری کا نشہ بھی تھا کہا ہریجن میرے ہی کنوئیں سے پانی بھریں گے خواہ دوسری ذاتیں بھلے ہی اجڑ جائیں۔ سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا۔ برہمن ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ہم فوراً کنواں کھود دیتے ہیں تب تک ہم خود پانی بھر کر انھیں دیں گے۔ رات بھر کام ہوا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پانی نکل آیا۔ اب چنائی کا سوال تھا۔ والد کا ہی ایک اینٹوں کا بھٹہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں بھائیوں کا حصّہ تھا گھوڑے پر ایک آدمی ان کے پاس گیا، جواب ملا۔ جتنی اینٹیں چاہے لے لو۔ غریبوں کی خدمت سے میرا دل انتہائی خوش ہوتا تھا۔" (ایضاً کا کا صاحب کالیلکر ص۱۲) بنگال میں بورکامتہ کے مرکز میں بی بی امت السلام نے جو کام کیا اسے باپو نے ان کے انتہائی عمدہ کام (Excellent Work) سے یاد کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے گول میز کانفرنس سے باپو کی واپسی کے بعد بی بی امت السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا یہی وہ مشن تھا جس کی خاطر خود انھوں نے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دی سن۱۹۴۷ء میں سندھ کے خوفناک فرقہ وارانہ فساد کے دوران

باپو نے انھیں سندھ بھیجا۔ سندھ بھیجتے وقت آنند ٹی ہنگورانی کے نام اپنے خط مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۴۲ء میں انھوں نے لکھا "امت السلام سندھ میں ہو رہے قتل عام کو روکنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جا رہی ہے وہ وہاں چند مسلم دوستوں سے ملے گی، نیز حاجی پیر عبداللہ سے اپنے کام میں معاونت کی درخواست کرے گی۔ تمہیں اس کی ہر ممکن مدد کرنا ہے اس کو کسی بہن سے ملا دو اور جو کچھ اس کے لئے کر سکتے ہو دریغ نہ کرو۔ تمہارا باپو۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 154)

سیوا گرام سے باپو نے اپنے خط مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۴۲ء میں پیر عبداللہ ہارون رشید کو بی بی امت السلام سے متعارف کراتے ہوئے لکھا "اس میں بچپن سے ہندو مسلم اتحاد کی لگن ہے۔ سندھ میں جو قتل و خون ہو رہا ہے اس سے میں بھی پریشان ہوں اور امت السلام بھی۔ آپ سے زمانۂ خلافت کے پرانے تعلقات کی بنا پر اسے میں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میں اس وقت موجودہ حالت کے سیاسی مضمرات کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ بی بی امتُ السلام نہ سیاست سمجھتی ہے اور نہ ہی اس میں دلچسپی رکھتی ہے وہ ایک سچی مسلمان ہے۔ باقاعدگی سے قرآن پڑھتی ہے اور جب بیمار نہ ہو تو رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھتی ہے ..... وہ بہادر ہے اور اس قتل و غارت گری کو روکنے کیلئے اپنی جان بھی دینے کو تیار ہے۔ میں نے حصول مقصد کی خاطر اس کی ہمت افزائی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ اسے اور مجھے سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔ میرے پاس اس سے زیادہ شریف اور دُھن کا پکا کوئی مرد یا عورت نہیں ہے جب وہ ہندوؤں کی جان بچانے نیز اسلام کا وقار بڑھانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہے تو میں اسے اپنی نیک خواہشات دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 145)

خود بی بی امت السلام کو انھوں نے لکھا تھا۔ "جیوں جیوں تیرا خیال کرتا ہوں تیری قدر بڑھتی ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔ تجھے تیرا کام اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہیئے۔ سچ تو یہ

ہے تو یہی مشن لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور تیرا یہی مشن لے کر سندھ گئی تھی اور جائے گی۔ سندھ کے مسلمانوں کو تجھے بتانا ہے کہ سیاسی اور دوسرے معاملات میں خون خرابے، زبردستی یا جھوٹ سے انصاف نہیں ملتا۔ تیرا سندھ جانا اور جان تک کی پرواہ نہ کرنا صرف قتل وغارت گری روکنے کے لئے ہے یہ میرا مقصد تجھے بھیجنے میں تھا اور اب بھی ہے۔ خدا تیرا راستہ صاف کرے۔ وہی ایک رہنما ہے۔ اور تو، میں سب اس کے بندے ہیں باقی سب جھوٹ ہے۔ باپو کی کروڑوں دعائیں۔"

(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص۱)

" گھنے جنگلوں سے گزرتی، گھوڑوں پر سوار بی بی امت السلام بے خوف ہو کر فساد زدہ علاقوں میں پہنچیں اور فساد ختم کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا"

(ذاتی انٹرویو) محترمہ سروجنی نائیڈو صدر ہندوستان پرچار سبھا سندھی، راجگھاٹ، نئی دھلی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بی بی امت السلام بہت سے دوروں میں گاندھی جی کے ساتھ رہی تھیں۔ جب نواکھالی میں قتل وخون کا ہولناک طوفان آیا تب وہاں کے دورے میں بھی وہ اپنے باپو کے ساتھ تھیں۔ وہاں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کیلئے برت رکھا اور حصول مقصد کے بعد باپو ہی کے ہاتھوں سے رس پی کر توڑا۔ نواکھالی میں ان کے تعمیری کاموں سے سبھی مسلم خواتین متاثر تھیں وہاں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر شیطانیت اور بربریت کے بھیانک طوفان میں انھوں نے اپنے کو جھونک دیا وہ باپو کی کروڑوں دعاؤں، کے بل پر ہی ممکن ہوسکتا تھا اور جب سرحد میں بھی انسان وحشی بن گیا تو وہ وہاں جانے کے لئے بھی بے چین ہو گئی تھیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے انھیں خط لکھا:

شملہ ۱۰-۵-۴۶ء

پیاری امت السلام سلامت رہو۔

تمہارے دو خط مجھے دو دن پہلے ملے تھے اور ایک خط آج ملا ہے.... باقی

رہا سرحد کا معاملہ میں بھی حیران ہوں۔ یہ ایک عجیب سا معاملہ ہے۔ آپ اس کا فکر نہ کریں۔ اس کو ہم خدا پر چھوڑ دیتے ہیں اور میرا یہ ایمان ہے کہ جب اور جس وقت بھی اسے منظور ہوگا اسے کرے گا۔ ہم تو یہ سب کچھ اسی لئے کرتے ہیں۔ کوئی اپنی غرض نہیں۔ تم ایک عجیب لڑکی ہو۔ تم نے اپنے خط میں میری ناراضگی کا لکھا تھا، میں کیوں آپ سے ناراض ہو جاؤں آپ نے تو کافی کوشش کی اور انسان اگر ناراض بھی ہوتا ہے تو اپنے کام سے اور یہ کام تو کوئی میرا نہیں اور نہ میں اس کو اپنے لئے کرنا چاہتا ہوں تم ایسے فکر دل سے نکال دو بلکہ امید رکھو اگر تمہارا خیال اور ارادہ مضبوط ہے تو ضرور ایک دن تم کو مہاتما جی اس کام کی اجازت دیں گے بلکہ آپ کو سرحد کے لئے خود روانہ کریں گے۔ باقی خیریت ہے۔ فقط

"آپ کا عبدالغفار"

(کاغذات مہاتما گاندھی، گاندھی میوزیم لائبریری راجگھاٹ ص ۵۲۵)

سرحد ہی سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ سرحد کے سفر میں ایک شام پرارتھنا کے وقت انھوں نے تھوڑے زیادہ انگوروں کا رس نکال کر باپو کو دیا۔ باپو نے خدائی خدمت گاروں کی بھری سبھا میں رس کا گلاس ہی اٹھا کر پھینک دیا تھا پھر وہ آٹھ دن تک معافی مانگتی رہیں اور باپو انھیں سمجھاتے رہے وہ بڑے پیار و لگن سے ان کی شخصیت کو سنوار نکھار رہے تھے۔

غصے میں امت السلام بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ اس واقعہ سے پہلے ایک مرتبہ جب وہ باپو کو کھانا کھلا رہی تھیں تو نہ جانے کس غلط فہمی کی بناء پر اُن کے لئے بنائی روٹی ہی پھینک دی تھی۔ باپو کا وہ خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے انھوں نے لکھا۔

"پاگل بیٹی! آج تو نے پورا رنگ بتایا۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ اچھی طرح ثابت کیا۔ میں نے کہا تھا آج روٹی کھاؤں گا، بھاجی کھاؤں گا اگرچہ میرے لئے الگ پکے ہوئے ہیں تو بھی۔ پھر روٹی پھینک دینا۔ میں نے جو کہا اس میں تمہارے ہاتھ کی روٹی بھاجی نہ کھانے کی میرے خوابوں میں بھی

بات نہ تھی۔ اتنا غصّہ کیسا گناہ، اتنا غصہ میرے جیسے غریب پر کرنے سے بھی تیرا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اچھا ہے میرا مون برت ہے۔ کہو اب میں کیا کروں، فاقہ کروں"؟
(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام، مرتبہ کاکا صاحب کالیکر۔ متذکرہ ص ۱۱)

باپو نے بڑی محبّت ولگن سے ان کی شخصیت کو بنایا سنوارا تھا، کبھی ڈانٹ، کبھی نصیحت اور کبھی پیار سے۔ ایک خط میں انھوں نے سمجھایا تھا "میرے باپ جو حکم کرتے تھے وہ مجھے واجب ہی لگتے تھے۔ زندگی بھر میں نے دلیل نہیں کی۔ ماتا نے کہا بیٹا یہ کر، میں نے کیا ہی ہے۔ میں باپ ہوں، ماں ہوں۔ میری ایک بات بھی بغیر دلیل کے تو نے مانی ہے؟ جاننے کے بعد بھی تیرا دماغ کہاں نہیں پھرا ہے۔ یہ سب وچار کرنے کے لائق ہیں۔ جب تک یہ نہیں سمجھے گی تب تک نہ میں سکھی ہونے والا ہوں نہ تو سکھی ہونے والی ہے۔ تو مجھے چھوڑ نہیں سکتی نہ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں"۔
(ایضاً ص ۱۲)

باپ بیٹی میں جب محبت کا ایسا اٹوٹ رشتہ ہو تو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ باپو کی شہادت چہیتی بیٹی کے لئے کیسا صدمۂ جانکاہ رہا ہوگا۔ وہ رات بھر ان کی سمادھی پر روتے ہوئے گزار دیتیں لیکن کب تک۔ امت السلام صحیح معنوں میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے سیکڑوں عقیدتمندوں میں ایک ممتاز فرد تھیں۔ اپنے دل ودماغ پر قابو پاتے ہی وہ باپو کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں تن من دھن سے جٹ گئیں۔ مسز سبھدرا جوشی اور مس مردولا سارہ بھائی کے ساتھ انھوں نے مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے ناقابلِ فراموش کام کیا، اس سلسلے میں وہ کئی بار پاکستان بھی گئیں۔

کستوربا گاندھی سے بی بی امت السلام کو ماں جیسا پیار ملا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے راجپورہ (پنجاب) میں ایک آشرم "کستوربا مندر" کے نام سے قائم کیا اور اپنی تمام جائیداد اس کے لئے وقف کر دی۔ پنجاب کے مختلف قصبوں اور شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں جس سے ہزاروں ضرورتمند لوگوں کو کام ملا۔ آشرم میں

وہ ان خواتین کو مختلف کاموں کی تربیت بھی دیتی تھیں۔ گاندھی جی کے سیوا گرام آشرم میں جو جاپانی سادھو آتے تھے انھوں نے واپس جا کر جاپان میں سروودے کا کام شروع کیا۔ بی بی امت السلام اپنے منہ بولے بیٹے سنیل کمار کو لے کر اسے دیکھنے جاپان گئیں اور وہاں سے واپسی پر اپنے راجپورہ مرکز میں ایک جاپانی بدھ مندر بھی بنوایا کستوربا مندر میں بچوں کیلئے اسکول بھی قائم کئے گئے اور خواتین اساتذ کے بچوں کے لئے نرسری بھی۔ وہاں کھیتی بھی ہوتی تھی۔ کھادی بنی جاتی تھی اور سلک کی ساڑیوں کا بھی ایک کارخانہ تھا۔ ہریجنوں کی خدمت اس آشرم کا خصوصی مقصد تھا۔ راجپورہ میں ہوائی پٹی بھی ہے۔ یہاں سے وہ ہیلی کوپٹر میں ۱۹۶۱ء ہندوستان پر چین کے حملے کے دوران نیفا فوجیوں کیلئے کھانا، کمبل، اور دوائیں لے کر جاتی تھیں ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ کے دوران بھی وہ بلڈ پریشر کی مریض ہونے کے باوجود اسی مقصد کی خاطر لداخ جاتی تھیں۔ سرحدی گاندھی مرحوم خان عبدالغفار خان صاحب جب ۱۹۶۹ء میں ہندوستان آئے تو ان کا کھانا وہ خود بناتی تھیں اور ملک گیر دورے میں بھی ان کے ساتھ رہی تھیں۔

'بی بی امت السلام کی اپنی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ بغیر بلیچ کی کھادی کی ساڑی پہنتی تھیں۔ چٹائی پر سوتیں اور رات کو صرف ایک گول لکڑی سرہانے رکھ لیا کرتی تھیں۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی، پنجابی اور انگریزی سے بھی بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ آشرم میں رہ کر انھوں نے گجراتی و ہندی بھی سیکھ لی تھی پھر کیوں کہ آشرم کے مقاصد کی خاطر وہ جنوبی ہندوستان اور بنگال میں بھی رہی تھیں۔ اس لئے اڑیہ، تیلگو، تامل اور بنگالی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئی تھیں اور جاپانی زبان بھی وہ اچھی طرح سیکھ گئی تھیں انھوں نے راجپورہ سے 'ہندوستان' نام کا ایک اردو اخبار بھی نکالا تھا۔

(ذاتی انٹرویو بیگم کنور عمار احمد خاں صاحب علی گڑھ، بی بی امت السلام کی بھتیجی ہیں)

بی بی امت السلام ایک محاذ پر اپنی بیماریوں اور صحت سے لڑتی دوسرے محاذ پر اَن گنت تعمیری کاموں کا بوجھ سنبھالتی اب تھک چکی تھیں۔ آخر طویل عرصے کی اس مسلسل جدوجہد کے بعد ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۵ء کو ان کی شمعِ حیات ہمیشہ کے لئے گُل ہو گئی۔ شام کو جنازہ سنّ ندھی (قریب راجگھاٹ) کے دعائیہ ہال میں رکھا گیا اور شب بھر کی دعاؤں کے بعد اگلے دن جامعہ ملیہ کے قریب انھیں اُن کی ابدی آرام گاہ پہونچا دیا گیا۔ اور یوں عمر بھر کی ایک بیقرار زندگی آخر قرار پاگئی ؎

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

آمنہ قریشی

آمنہ قریشی ہندوستانی نسل کے جنوبی افریقہ میں مقیم امام عبدالقادر باوزیر کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ امام صاحب گاندھی جی کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف جدوجہد میں برابر کے شریک تھے ٹرانسوال میں مذہبی درس وتدریس کے سبب وہ امام صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ آمنہ قریشی کے جذبہ قوم پرستی اور حب الوطنی کے تجزیے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اُن کی پرورش اور تربیت کس ماحول میں ہوئی اس لئے اس سلسلے میں ملک وملّت کی خاطر امام خاندان کی عظیم قربانی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

امام صاحب کا جنوبی افریقہ میں عربی گھوڑوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شرکت کی خاطر کیوں کر آئے اس کا تذکرہ گاندھی جی کی زبانی سنئے:۔

" امام صاحب کا گھر انگلش وضع پر آراستہ کیا گیا تھا۔ حاجی صاحبہ بچپن سے اسی انداز کی عادی تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں فاطمہ اور آمنہ کی پرورش بھی انگریز بچوں کی طرح ہی کی گئی تھی۔ ایسے اشخاص کے لئے ایک عیش وعشرت کی زندگی کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن امام صاحب کے لئے ایک بار عزم کر لینے کے بعد اسے نبھانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسی لئے جب جوہانسبرگ چھوڑ کر میں نے

نونکس میں رہائش اختیار کی تو امام صاحب نے بھی میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔
ان کی اولوالعزمی سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد بھی میں حیران تھا کہ انھیں کیا
جواب دوں جس شخص نے کبھی زندگی میں تکلیف نہ اٹھائی ہو وہ کس طرح سب عیش و
آرام کو تج کر نونکس میں ایک مزدور کی زندگی گزار سکتا ہے! میں نے انھیں نونکس کی
سخت زندگی کے بارے میں بتایا اور پوچھا اگر وہ بذاتِ خود بھی یہ تہیہ کرلیں تو حاجی صاحبہ
اور فاطمہ و آمنہ کا کیا بنے گا؟ انھوں نے جواب دیا: "مجھے خدا پر پورا اعتماد ہے اور تم
حاجی صاحبہ کو نہیں جانتے۔ وہ جہاں میں رہوں، جس حال میں رہوں رہنے کے لئے
تیار ہوں گی۔ کسی کو علم نہیں ہماری جدوجہد کب ختم ہوگی۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنے
گھوڑوں کی تجارت جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ اور نہ ہی اب کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا
ہوں۔ ایک ستیہ گرہی کے لئے تمام عیش و آرام اور دولت کی محبت ترک کر دینا لازمی
ہے۔" مجھے اس جواب سے دلی خوشی ہوئی میں نے نونکس کے اپنے دوسرے ساتھیوں کو
بھی لکھا، ان سب نے اس اقدام کا خیرمقدم کیا اور یوں امام صاحب اور ان کا خاندان
ہمارے ساتھ آگیا۔

نونکس میں مقیم حضرات کے ساتھ امام صاحب نے ہر کام میں برابر کا حصّہ لیا۔ نونکس
میں عمارتیں پہاڑی پر تھیں۔ ہر شخص کو اپنے استعمال کا پانی نیچے چشمے سے لانا ہوتا تھا۔
امام صاحب کی صحت اس وقت بھی نازک تھی لیکن ہر صبح وہ کاندھے پر پانی سے بھری
بالٹیاں لٹکائے پچاس فیٹ اوپر چڑھتے تھے۔ جو جگہ اب نونکس میں چرخہ کاتنے کے
کام آتی ہے وہاں پہلے چھاپہ خانہ تھا۔ آشرم میں مقیم سبھی لوگوں کو خواہ وہ لڑکے
ہوں یا لڑکی، نوجوان ہوں یا بوڑھے کچھ نہ کچھ کام کرنا لازمی تھا۔ امام صاحب حاجی
صاحبہ، فاطمہ اور آمنہ چاروں ہی چھاپہ خانہ میں کام کرتے تھے۔ امام صاحب نے کمپوز
کرنا سیکھ لیا تھا جو ان کے جیسے مزاج، عادتوں اور عمر رسیدہ شخص کے لئے بڑا حیرت
انگیز تھا۔ ان کا خاندان گوشت خور تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں نونکس میں انھوں نے ایسا
کوئی کھانا پکایا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امام صاحب کا جذبۂ ایمانی

کچا تھا۔ ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی نہ ہی ان کے خاندان نے کبھی روزہ قضا کیا۔
آشرم میں مقیم دوسرے حضرات جیسی طرزِ زندگی اختیار کرکے انھوں نے اسلامی طرزِ فکر کی وسعت کا ہی مظاہرہ کیا لیکن ابھی امام صاحب کے جذبۂ قربانی کو کچھ اور منزلوں سے گزرنا تھا وہ کئی بار قید ہوئے اور مثالی قیدی ثابت ہوئے اصل امتحان کا وقت ۱۹۱۴ء میں آیا جب آشرم کے زیادہ تر حضرات نے ہندوستان لوٹنے کا قصد کیا جنوبی افریقہ امام صاحب کا وطن بن چکا تھا۔ حاجی صاحبہ فاطمہ اور آمنہ کے لئے تو ہندوستان ایک بالکل اجنبی ملک تھا۔ وہ لوگ ہندوستان کی کسی بھی زبان سے آشنا نہیں تھے اور صرف انگلش و ڈچ زبانیں ہی جانتے تھے۔ لیکن امام صاحب کو یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا کہ وہ مع خاندان میرے ساتھ ہی ہندوستان آئیں گے۔ ستیہ گرہ اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یہ ان کی عظیم قربانی تھی۔

سابرمتی آشرم کے سبھی اشخاص کو ان کی روزانہ زندگی کے بارے میں علم ہے۔ وہ دن بدن عام انسانی سطح سے اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ ان کا دل زیادہ پاک و صاف اور اللہ تعالیٰ سے ان کی قربت بڑھ رہی تھی۔ آشرم کے اصولوں میں بھی ان کا اعتماد دن بدن پختہ ہو رہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ امام صاحب سے متعلق سبھی اشخاص اپنی اپنی یادداشتوں کو قلم بند کر دیں۔ اور پھر وہ یکجا کر لی جائیں۔

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XLIX, January - May, 1932, PP. 217 - 219)

غلام ہندوستان میں بھی امام صاحب نے ہنسی و خوشی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آمنہ قریشی انھیں مجاہد آزادی کی دوسری بیٹی تھیں۔ ملک و قوم کی خاطر ایثار و قربانی کے راستے پر چلنا انھوں نے بچپن میں ہی اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ امام صاحب اپنا کاروبار چھوڑ کر ڈربن میں فونکس آشرم میں مقیم ہوئے تو آمنہ بہت کم عمر تھیں ۱۹۱۶ء میں جب امام صاحب کو پھر سے آشرم آئے تو آمنہ مشکل سے سات برس کی رہی ہوں گی ۱۹۱۷ء میں امام خاندان سابرمتی آشرم میں منتقل ہوا۔ آشرم کی زندگی انتہائی سخت تھی

اس کے اصولوں کی پابندی بلا تفریق مذہب وملت ہر شخص کے لئے لازم تھی۔ ننھی آمنہ جوں جوں بڑی ہوتی گئیں ان کی خوش مزاجی، ذہانت اور جذبہ خدمت نے آشرم میں ہر شخص کا دل جیت لیا۔ گاندھی جی کو تو وہ حقیقی بیٹی جیسی عزیز تھیں۔ وہ بچپن سے آشرم کی سبھی مصروفیات میں پیش پیش رہیں۔ امام خاندان سابرمتی آشرم میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا تحریک آزادی میں شریک جتنی اہم شخصیتیں آشرم میں آتیں امام صاحب کی رہائش گاہ امام منزل کی مہمان ہوتیں، حب الوطنی اور جذبہ آزادی سے سرشار مجاہدین سے ملاقاتوں نے آمنہ کی نہ صرف ذہنی تربیت میں معاونت کی بلکہ انھیں زندگی کا ایک نصب العین بھی عطا کیا۔ ۱۳ رمئی ۱۹۲۴ء میں ان کی شادی ایک گجراتی نوجوان غلام رسول قریشی سے ہوئی۔ جو خود بھی حریت وطن کی خاطر برطانوی سماج سے برزآزما تھے۔ شادی کا دعوت نامہ امام صاحب کے حقیقی بھائی کی حیثیت سے گاندھی جی کی طرف سے بھیجا گیا۔ ہندو رسم و رواج کے مطابق کنیادان بھی گاندھی جی نے ہی کیا۔

(ماخوذ: نوٹس کشن بھائی ترویدی ڈائرکٹر گاندھی اسمارک سنگرہالیہ، ہریجن آشرم احمد آباد، ۱۰ ر نومبر ۱۹۸۵ء)

اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود باپو ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھتے تھے۔ شری نارن داس کے نام اپنے خط مورخہ ۱۸ ر دسمبر ۱۹۳۰ء میں انھوں نے لکھا: "آمنہ کی اُردو کی تعلیم کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ گری راج اسے پڑھاتے تھے انھیں اب پھر سے شروع کر دینا چاہیئے یا پھر کوئی دوسرا انتظام فوری ہونا ضروری ہے۔"

(Collected Works Vol. XLV, 1930-31, P. 25)

آمنہ قریشی کو اپنی اسکول کی تعلیم نہ ہو سکنے کا افسوس تھا جس کی شکایت انھوں نے باپو سے کی۔ باپو نے جواب دیا۔

۲۰ ر نومبر ۱۹۳۲ء

فرزند۔ آمنہ۔ تمہارا خط ملا، اچھا لگا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے صفائی سے لکھ دیا ہے۔ تمہاری صحت بہتر ہونے کا صرف وہی ایک طریقہ ہے جو میں نے تمہیں تجویز کیا

ہے۔ اگر تم تعلیم حاصل نہیں کر سکیں تو کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔ تھوڑا سوچو۔ زیادہ غلطی میری ہے کہ میں نے آشرم کے بچوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی۔ بہرحال اگر تم سنجیدگی سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہو تو میں تمہیں اسکول میں داخل کرانے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم بھاؤ نگر جانا چاہو تو میں تمہیں لڑکیوں کے اسکول میں داخل کر سکتا ہوں۔ امریلی میں بھی لڑکیوں کا ایک اچھا اسکول ہے دونوں ہی جگہوں میں تمہیں خصوصی توجہ ملے گی۔ میں تمہاری پریشانی دور کرنے میں مدد کر سکتا ہوں۔ لکھو تم کیا چاہتی ہو۔ نارن داس سے بھی کھل کر بات کرو۔ خدا تمہیں ذہنی سکون دے۔ باپو۔"

(Collected Works, Vol.LII, November 1932, January, 1933, P. 25)

واضح رہے یہ خط امام صاحب کی وفات کے بعد کا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے گاندھی جی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آمنہ قریشی کی اسکول کی تعلیم نہ سہی لیکن آشرم میں جس زندگی کی تربیت ہوئی تھی، اُس نے آزادیٔ وطن کی راہ میں جینے مرنے کا ایک نیا سلیقہ عطا کیا تھا۔ امتحان کا اصل وقت ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی مارچ کے موقع پر آیا، باپو سبھی آشرم والوں سے اپنا سب کچھ آزادیٔ وطن کی راہ میں قربان کر دینے کی اُمید رکھتے تھے۔ آمنہ کے والد امام صاحب اور شوہر غلام رسول قریشی نے بقول باپو "پورا حق ادا کر دیا"۔ امام صاحب نے باوجود خرابیٔ صحت کے دھرسنا کی ستیہ گرہ کی رہنمائی کی اور پولیس کی وحشیانہ مظالم کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ غلام رسول قریشی ان دو ہراول دستوں میں سے ایک دستے کے رہنما تھے جو ڈانڈی مارچ سے ایک روز قبل روانہ کئے گئے تھے۔ امام صاحب غلام رسول قریشی دونوں گرفتار ہوئے اور سزا ہوئی۔ جوشیلی آمنہ کا جذبۂ بغاوت بھی کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن ابھی باپو نے خواتین کو باہر آکر کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آمنہ قریشی بار بار ان سے یہ اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

*

جمعرات، ساڑھے دس بجے شب
یکم مئی سنہ ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ تم اچھی طرح اس کا سبب بھی جانتی ہو کہ میں نے تم کو گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی۔ پریشان نہ ہو تم گھر پر رہ کر جو چاہو کر سکتی ہو۔ مجھے آزادی سے لکھا کرو۔ امام صاحب جلد ہی جیل میں ہونگے۔ وہ شاید مجھ سے پہلے ہی وہاں پہونچیں کاش ایسا ہی ہو۔ باپو کی دُعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 359)

باپو نے جب یہ خط لکھا آمنہ کے یہاں ولادت کے دن قریب تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل خط سے علم ہوتا ہے:-

" ۲۶ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

پیاری آمنہ۔ آخر کار امام صاحب جیل پہونچ ہی گئے شاید قریشی بھی اب تک جا چکے ہوں لکھو تمہاری صحت اب کیسی ہے؟ زچگی کا اب کیا انتظام کیا، بچے کیسے ہیں؟ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 430

باپو ان کی صحت کی طرف سے پریشان تھے اپنے خط مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا " یروڈا مندر۔ چرنجیو آمنہ۔ میں ہر دن تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ تمہاری زچگی اب ختم ہو گئی ہو گی۔

بچے کی پیدائش کی خبر سُن کر باپو نے مُبارک باد دی۔

یروڈا مندر۔
۱۷ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ میں تمہارا خط پا کر بہت خوش ہوں مجھے خوشی ہے کہ تم ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی ہو۔ خدا اسے طویل عمر دے اور وہ بھی بہادر و باہمت

نکلے۔ جتنا تم اور قریشی۔ کیا بچیاں مجھے یاد کرتی ہیں؟ اُمید کہ تمہاری صحت اچھی ہو گی۔ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIV, July, December, 1930, P. 5)

نومولود بچہ ابھی صرف چند ہفتوں کا ہے۔ لیکن جذبۂ شوق ہے کہ راہ کی کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جیل کے لئے بے قراری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ باپو نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

یرودا مندر۔

۱۹؍ جولائی ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ والد اور قریشی دونوں ہی جیل میں ہیں اور تم بھی وہیں جانا چاہتی ہو۔ تم آشرم میں رہتی ہو۔ یقین جانو آزادی کی اس لڑائی میں تم برابر کی شریک ہو۔ خدا ہمیں جہاں اور جس حال میں رکھے اس پر قناعت کرنی چاہیئے۔ اپنی اردو کی تعلیم جاری رکھو۔ گری راج تمہاری مدد کریں گے۔ والد اور قریشی جس سے بھی ملاقات ہو کہنا میرے لئے ان میں سے کسی کو بھی بھولنا ممکن نہیں۔ باپو کی دُعائیں۔ (IBID, P. 29)

باپو نے غلام رسول قریشی کے نام بھی خط لکھا کہ آمنہ جیل جانے پر مُصر ہیں۔ میرے لئے اجازت دینا مشکل ہے۔"

"۸؍ دسمبر ۱۹۳۰ء ...... آمنہ کے عزم و ہمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کا نام بحیثیت رضاکار دینے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوتا لیکن گرفتاری کی صورت میں وہ کس طرح بچوں کو جیل میں ساتھ رکھ سکے گی؟ بہتر یہی ہو گا کہ وہ آزاد رہ کر جو کچھ کر سکتی ہے کرتی رہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جیل کے لئے بھی تیار رہے۔ یہی بہت کافی ہے۔ باپو کی دعائیں۔" (IBID, P. 151)

غلام رسول قریشی ابھی جیل ہی میں تھے اور آمنہ قریشی ان سے بار بار گرفتاری کی اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے پھر انھیں لکھا:

چرنجیو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ امام صاحب سے علم ہوا کہ تم گرفتاری کے لئے
بے قرار ہو۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ خدا کو جب منظور ہوگا بغیر کوشش کے ہی
تمہیں یہ موقع بھی ملے گا۔ تم اس کے لئے تیار ہو یہی بہت ہے جب تک یہ موقع
آئے تم بچوں کی پرورش کرتی رہو۔ اپنی صحت اچھی رکھو اور گھر پر رہتے
ہوئے جو خدمت بن سکے کرتی رہو۔ تم نے خوف و ہراس پر فتح پائی ہے۔
یہی کافی ہے۔ باپو کی دُعائیں۔ (IBID, P. 346)

آمنہ کے والد امام صاحب کی صحت جیل میں خاصی خراب ہوگئی تھی۔ رہائی کے کچھ
عرصے بعد ہی ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ باپو نے ان کے انتقال پر
"نوجیون" (گجراتی) مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان کے تفصیلی حالاتِ زندگی کے تذکرے
میں لکھا "... ہندوستان آنے پر پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوا پھر بڑی بیٹی
فاطمہ کا اور اب وہ خود چلے گئے۔ ان کی یادگار اب اُن کی بیٹی آمنہ اور داماد
غلام رسول قریشی ہیں۔ دونوں ہی ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مجھے
خود اُن کی وفات سے گہرا صدمہ ہوا ہے۔ ان کا انتقال میرے پہنچنے سے پہلے ہی
ہوگیا اس کا مزید غم ہے۔"

باپو انھیں تسلّی دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے لیکن مشفق باپ کی جدائی
سے آمنہ کے جذبۂ حرّیت کی تڑپ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آخر ان سب خواتین
کی بے قراری بھی رنگ لائی جنھیں ڈانڈی مارچ میں شرکت کی اجازت نہیں
ملی تھی " باپو نے گجرات کی خواتین کو شراب اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ
کرنے کا حکم دیا۔ گجرات کے کونے کونے سے خواتین نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ریحانہ
طیب جی، حامدہ بہن اور آمنہ قریشی بھی ان میں شامل تھیں۔ نوساری، میں
آمنہ قریشی کو گرفتار کیا گیا اور انھیں چھ ماہ کی قید ہوئی۔
(نولش کشن بھائی ترویدی، متذکرہ)

غلام رسول قریشی کی متعدد گرفتاریاں ننھے منّے بچے، پھر گرفتاری

آمنہ قریشی نے مثالی ستیہ گرہی کا ثبوت دیا۔ باپو نے ایک خط میں انھیں لکھا:

چرنجیو آمنہ۔ مجھے متعدد اشخاص نے لکھا اور بتایا ہے کہ تم بے مثال جرأت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اگر امام صاحب کی بیٹی جس کی پرورش اور تربیت فونکس اور آشرم میں ہوئی ہو ایسا نہیں کرتی تو پھر بھلا ہم کس سے ایسی توقع کر سکتے ہیں؟

(Collected Works, Vol. LIV, P. 252)

تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے حکومت وقت نے لوگوں کی جائدادیں ضبط کرنا شروع کیا۔ باپو نے آشرم کو بھی ضبطی کے لئے پیش کیا لیکن حکومت نے اسے ضبط نہیں کیا۔ گاندھی جی نے آشرم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، آشرم میں مقیم حضرات نے بخوشی یہ فیصلہ منظور کیا اور قریب کے گاؤں میں ستیہ گرہ مارچ کرنے کا ارادہ کیا لیکن یکم اگست ۱۹۳۳ء کو علی الصبح مارچ سے پہلے ہی سب گرفتار کر لئے گئے۔ آمنہ بھی گرفتار ہونے والی تھیں۔ باپو کے کہنے پر وہ غلام رسول قریشی سے جو ان دنوں خود جیل میں تھے اس کی اجازت لے چکی تھیں۔ گرفتاری سے ایک روز قبل ان کے تینوں چھوٹے بچے انوسویا بین کے ہریجن آشرم میں پہونچا دیئے گئے۔ (انوسویا بین احمد آباد کی مشہور مزدور لیڈر تھیں) ولبھ بھائی پٹیل کے نام اپنے خط میں باپو نے اس کا ذکر کیا ہے۔ "آنندی اور دوسری لڑکیاں نیز قریشی کے بچے انوسویا بین کی ہریجن بورڈنگ میں ہیں۔ میں نے سوچا ہمارے بچوں کے لئے وہی ایک بہتر جگہ ہو سکتی تھی۔ بچے وہاں بہت خوش ہیں۔"

(Collected Works, Vol. LVI, September 13, 1933 - January 15, 1934 P. 405)

جب جمنالال بجاج نے گاندھی جی سے واردھا آشرم میں منتقل ہونے کا اصرار کیا تو سابرمتی آشرم کو ہریجن فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا گیا اور آشرم کے کچھ پرانے اشخاص کو اس کام کی ذمہ داری سونپی

گئی۔ غلام رسول قریشی کو باہر کے متعلقہ کام اور آمنہ قریشی کو آشرم کے اندرونی معاملات کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ آمنہ نے اپنے بچوں کے ساتھ آشرم کے سبھی بچوں کی مادرِ مہربان کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (نوٹس کشن بھائی ترویدی متذکرہ)

آمنہ قریشی کی بیٹی سلطانہ تنہا آج بھی ہریجن آشرم میں مقیم ہیں۔ اور تیاگ و قربانی کے عہدِ رفتہ کی ایک خوشگوار یاد ہیں۔

فاطمہ عریضی

فاطمہ بیگم عریضی امام صاحب عبد القادر باوزیر کی بیٹی اور آمنہ قریشی کی بڑی بہن تھیں۔ خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ انھوں نے بھی اپنی زندگی کا خاصا عرصہ سابرمتی آشرم میں گزارا تھا۔ نیز آشرم کے مختلف کاموں میں فعال کردار ادا کیا تھا۔

لاہور سے مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے ایستھر فارنگ کے نام اپنے خط میں گاندھی جی نے آشرم کی زندگی کی تشریح کرتے ہوئے ان سے معلوم کیا تھا۔ "کیا فاطمہ کتائی کا کام کر رہی ہیں؟ اگر نہیں تو فاطمہ اور آمنہ دونوں سے کہو کہ اس سے غفلت نہ برتیں انھیں یہ کام ایک مقررہ وقت پر روزانہ کرنا ہے۔ آشرم کی دوسری خواتین کے لئے بھی یہی ہدایت ہے۔"

(Collected Works : Vol.XVI, P. 343)

انھیں کے نام ایک دوسرے خط میں بتاریخ ۲۵ر جنوری ۱۹۲۰ء باپو نے لکھا تھا "تمہاری سے یہ سن کر میں بہت خوش ہوں کہ تمہارا قیام امام صاحب کے ساتھ ہے۔ یہاں تمہیں زیادہ اپنائیت کا احساس ہوگا کیونکہ مستقل انگریزی بولنے کی سہولت رہے گی۔ تمہیں فاطمہ پر اپنی محبت نچھاور کرنے کا بھی

موقع ملے گا جس کے نتائج فوری ہوں گے۔"
Ibid : P. 506

فاطمہ بی بی کی شادی ستیہ گرہ آشرم سے ہی ہوئی۔ دعوت نامہ گاندھی جی کی طرف سے تھا۔ کارڈ کی پیشانی پر بسم اللہ لکھی تھی، پھر ستیہ گرہ آشرم، سابرمتی ۲۱ اپریل ۱۹۲۰ء درج تھا۔ دعوت نامے کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"عزیز دوست۔ فاطمہ بی بی میرے دوست و بھائی امام عبدالقادر صاحب کی بڑی بیٹی ہیں۔ امام صاحب اور میرا جنوبی افریقہ، ہندوستان میں آشرم اور جیل کا برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ فاطمہ بی بی کی شادی حسین میاں عریضی کے ہمراہ بروز شنبہ ۲۶ اپریل ۱۹۲۰ء بوقت شام ۷ بجے ہونا قرار پائی ہے۔ ساڑھے چھ بجے میلاد شریف ہوگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ تقریب سعید میں شریک ہوکر دولھا دولہن کو اپنی نیک خواہشات سے نوازیں۔ موہن داس کرم چند گاندھی۔"
(Collected Works : Vol. XVII, P. 399

اس شادی کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے "نوجیون" بتاریخ ۹ مئی ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا، "میں آشرم کی اس شادی اور باہری شادیوں میں فرق کئے بنا نہیں رہ سکتا۔ امام صاحب کا تعلق ایک دیندار اور معزز مسلم خاندان سے ہے۔ دو مختلف مذاہب کو ماننے کے باوجود ہم دونوں ابتدا سے ہی حقیقی بھائیوں کی مانند رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے مذہب کا خلوصِ دل سے احترام کیا ہے۔ ان کے نماز ادا کرنے پر آشرم میں کسی کو اعتراض نہیں ہوا اور وہ ہندوؤں کے طریق عبادت پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ ان کی بڑی بیٹی فاطمہ کی شادی ہوئی ہے۔ فاطمہ بیس سال کی ایک ذہین لڑکی ہے۔ اس کے مشورے کے بعد ہی آشرم کے اصولوں کے مطابق یہ رسم انتہائی سادگی سے ہونا قرار پائی۔ امام صاحب، دولھا بھائی سید حسین عریضی کے عزیز نیز آشرم سے متعلق سبھی افراد مدعو کئے گئے تھے۔ ان کی تواضع گھر میں بنے شربت اور پھلوں سے

کی گئی۔ روشنی کے لئے دیوار پر صرف ایک لیمپ ٹنگا ہوا تھا۔ رسم شادی دو گھنٹہ چلی۔ آدھا گھنٹہ میلاد شریف ہوا۔ پھر قاضی صاحب نے دولھا و دلہن کی موجودگی میں نکاح نامہ لکھا وہ پڑھا گیا۔ پھر اس پر دستخط ہوئے جس میں بیس منٹ صرف ہوئے۔

بعد خطبہ و دعا مہمانوں کی تواضع شربت و پھلوں سے کی گئی۔ دولھا کا لباس بہت سادہ تھا۔ شادی کی رسم جو ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی ساڑھے آٹھ پر ختم ہو گئی فاطمہ بی بی آشرم کے سبھی ساتھیوں سے ملنے گئیں۔ رخصت کا وقت قریب آرہا تھا۔ یہ نظارہ بڑا متاثر کرنے والا تھا۔ فاطمہ رونے لگیں۔ انھیں سمجھایا گیا کہ اب ان کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی آشرم کی تربیت، سچائی، حلیمی سودیشی اور قومی خدمت کے پیغام کو اپنے نئے گھر میں عام کریں۔" Ibid.

افسوس کہ فاطمہ بی بی کی زندگی نے ان سے وفا نہیں کی اور امام صاحب کی زندگی میں ہی ان کی وفات ہو گئی۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

امینہ طیّب جی

امینہ طیب جی گجرات کے ممتاز سیاسی رہنما عباس طیب جی کی اہلیہ اور بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۶ء اور انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔

(Neeish Kumar Jain : Muslims in India, A Bibliographical Dictionary, P. 194)

امینہ طیب جی ابتدا سے ہی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے شوہر کی متعدد گرفتاریوں میں ان کی ہمت بندھائی بلکہ قومی محاذ پر خود بھی آگے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ملاحظہ ہو مہاتما گاندھی کا ایک خط جس میں انھوں نے عباس طیّب جی کی سیاسی سرگرمیوں میں ان کی اہلیہ اور بیٹیوں کے کردار کا ذکر کیا ہے۔ خط بنام عباس طیّب جی۔

" آشرم
۱۳ مئی ۱۹۲۰ء

میرے پیارے دوست۔ آپ کا خط ملا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ قومی محاذ پر مزید کام کے لئے سوچ رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ نے مجھے غلط مبارک باد دی۔ میں صرف آپ کو لاہور تک کھینچ لانے اور زبردست

ذہنی تناؤ کے باوجود آپ کو وہاں رکھنے کے لئے ضرور مبارکباد کا مستحق ہوں۔
آپ نہیں جانتے دوسری صورت میں ہم نے کیا کچھ کھو دیا ہوتا۔ میرا حصہ اس
مبارک باد میں آپکی بیگم اور دونوں عظیم بیٹیوں کے ساتھ برابر کا ہے۔ جنھوں نے
آپ کو لاہور کے لئے آمادہ کیا۔ پھر ہنسی وخوشی روانہ کیا اور ہمت بڑھائی۔
ان لوگوں کی تکالیف اور برداشت کے مقابلے میں میں صرف ایک چوتھائی
مبارکبادی کا حقدار ہوں۔"

گاندھی جی اور عباس طیب جی کانگریس پنجاب انکوائری کمیٹی کے
سلسلے میں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں لاہور میں تھے۔ مندرجہ بالا حوالہ اسی کا ہے

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XVII, February to June, 1920, P. 414-415)

قومی محاذ پر امینہ طیب جی کو نیا میدانِ عمل ۱۹۳۰ء میں ملا جب گاندھی جی
نے انھیں بیٹی کے ساتھ گجراتی خواتین کی کانفرنس میں مدعو کیا۔

"ڈانڈی!

۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

میری پیاری ریحانہ، میں چاہتا ہوں کہ تم اور والدہ (امینہ طیب جی)
مع دیگر افراد کے بروزاتوار یہاں آجاؤ۔ میں گجراتی خواتین کی ایک کانفرنس
طلب کر رہا ہوں جس میں شراب اور ولایتی کپڑوں کے مسئلے کا حل تلاش
کرنے کی مناسبت اور امکانات پر غور کیا جائے گا۔"

(Collected Works : Vol. XLIII, March - June, 1930, P. 238)

گجراتی خواتین کی اس کانفرنس میں امینہ طیب جی نے انتہائی اہم کردار ادا
کیا۔ ان کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر کانفرنس نے لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے
جو پانچ نفری کمیٹی بنائی انھیں اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ملاحظہ ہو

کانفرنس کی روئیداد:

"گجراتی خواتین کی یہ کانفرنس جو ڈانڈی میں ۱۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو منعقد کی گئی گاندھی جی کو سننے کے بعد یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خواتین شراب اور ولایتی کپڑے کی دوکانوں پر دھرنا دیں گی اور دوکانداروں نیز خریداروں سے درخواست کریں گی کہ وہ ان کی خرید و فروخت سے باز رہیں۔

کانفرنس کا یہ بھی خیال ہے کہ ولایتی کپڑوں کا بائیکاٹ صرف کھادی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس لئے خواتین کا یہ اجتماع یہ عہد کرتا ہے کہ وہ صرف کھادی کا ہی استعمال کریں گی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے باقاعدگی سے سوت کاتیں گی، اپنے پڑوس میں کھادی کی تبلیغ کریں گی۔ پڑوسیوں کو کاتنا سکھائیں گی، اور پابندی سے سوت کاتنے کی ہمت افزائی کریں گی۔

یہ کانفرنس مندرجہ ذیل ممبروں کی ایک مجلس عاملہ بھی مقرر کرتی ہے جو کام کا لائحہ عمل تیار کرے گی اور ضرورت کے لحاظ سے اُسے بدلنے کی بھی مجاز ہوگی۔

مسنر امینہ طیب جی	صدر	ممبرس
شریمتی مینھو بہن	سکریٹری	شریمتی منی بہن پیٹیل
		شریمتی روہنی دیسائی
		شریمتی چندو بہن

(Collected Works : Vol. XLIII, P. 271)

یہ طے ہوجانے پر کہ شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکان پر پکٹنگ میں خواتین بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں، مہاتما گاندھی نے امینہ طیب جی کو لکھا۔

"۲۷ر اپریل ۱۹۳۰ء

پیاری بہن۔ وائسرائے کے نام جانے والا خط بھیج رہا ہوں برائے

مہربانی دستخط کر کے ڈاک کے سپرد کرنے کے لئے واپس بھیج دیجئے۔
مخلص م۔ک۔ گاندھی

(IBID : P. 347)

وائسرائے کو بھیجے گئے خط کا متن حسب ذیل ہے:

"یور ایکسی لینسی: ہم گجراتی خواتین اب یہ سمجھتے ہیں کہ ملک جس ہنگامی دور سے گزر رہا ہے۔ اس میں ہم موجودہ واقعات سے اپنے کو علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ ہم نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں چل رہی سول نافرمانی کی تحریک سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ ہماری دیہاتی بہنوں نے تو پہلے سے ہی نمک پر عائد پابندی کو توڑنا شروع کر دیا ہے۔

لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم خواتین کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک مخصوص میدانِ عمل تلاش کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں گاندھی جی کے اس خیال میں وزن ہے کہ خواتین غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک میں فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ شراب و نشیلی اشیاء نے بہت سے گھروں کو تباہ کیا ہے اور ولایتی کپڑوں کے سبب ہندوستان کی بہت سی خواتین سے ان کا فالتو اوقات کا روزگار چھن گیا ہے جس کا اوسط سال میں چار ماہ سے کم نہیں پڑتا۔ یہ دو ایسے مسئلے ہیں جن سے مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ متاثر ہیں۔ ان اشخاص سے درخواست کرنے میں جو ان چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں اور ان سے جنھیں شراب اور ولایتی کپڑے کی چاہ کھینچ کر لاتی ہے ہم اپنی کوششوں میں مردوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم خواتین کے کام کرنے کا مطلب ہی پُرامن طریقے پر کام کرنا ہے۔

اپنی تحریک کے آغاز پر ہم ادب سے یہ بھی گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ شراب اور دیگر نشیلی اشیاء کی خرید و فروخت اور ولایتی کپڑوں کی درآمد پر پابندی عائد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اول الذکر نہ صرف افراد کے جسم و ذہن

تباہ کرتی ہے بلکہ ان کے گھروں کی بربادی کا بھی باعث ہے۔ آخر الذکر اس بدقسمت ملک کے دیہاتوں میں معاشی بدحالی کی ذمہ دار ہے۔

ولایتی کپڑوں کی درآمد سے متعلق دلیل کا اطلاق کچھ حد تک ہندوستانی ملوں میں تیار شدہ کپڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ گو ان ملوں کا پیدا شدہ مال ابھی ضرورت سے اتنا کم ہے کہ کھادی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ اگر وقت اجازت دیتا تو ہم اپنی دوسرے صوبوں کی بہنوں کی خواہشات کی بھی ترجمانی کرتے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے کا ہمیں بخوبی احساس ہے کیونکہ ہم کسی نئے مسئلے پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ قومی تنظیم کانگریس کی وساطت سے پوری قوم کو ان مسائل کا علم ہے۔ ہمارا مقصد بہ نسبت اور دوسرے متعلقہ مسائل کے جو قومی آزادی کے سلسلے میں درپیش ہیں صرف ان دو مسائل پر ہی اپنی خصوصی توجہ مرکوز کرنا ہے اور اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر دینا ہے۔"

ہم ہیں آپ کے تابعدار

دستخط

(Collected Works : Vol. XLIII, PP. 336 - 337)

مندرجہ بالا خط میں چوبیس خواتین کے دستخط ہیں۔ اس میں مسلم خواتین آمنہ قریشی، آمینہ طیّب جی اور ریحانہ طیب جی ہیں۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کے "نوجیون" اور ۷ اپریل ۱۹۳۰ء کے "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کر کے گجراتی خواتین نے اہم ذمہ داری سنبھالی ہے اور بیگم آمینہ طیب جی اور ان کی کمیٹی نے خواتین کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی ہے۔ خدا ان کو طاقت دے۔"

عباس طیب جی کی وفات کے بعد گلیڈ مین اودین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا: "بڑودہ میں

عباس طیب جی سے ملنے کی تم بہت خواہش مند تھیں لیکن افسوس کہ اب وہ نہیں رہے ۔ ان کا تعلق ان غیر معمولی شریف انسانوں سے تھا، جن سے ملاقات میرے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی ۔ لیکن ان کے خاندان سے ملنے کی خواہش تمہیں اب بھی ہونا چاہیئے ۔ وہ سب لوگ انھیں پرانی روایات کے علمبردار ہیں۔"

(Collected Works : Vol. LXIII, June 1 - November 2, 1936 P. 128)

تجھ سے روشن اھل اخلاص وفا کی انجمن

بیگم سکینہ لقمانی

بیگم سکینہ لقمانی جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں جو انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھے۔ ان کے شوہر مسٹر لقمانی بمبئی کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ سکینہ لقمانی بذاتِ خود مقامی کانگریس شاخ کی صدر تھیں اور قومی سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ مہاتما گاندھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ریحانہ طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۳۰ء میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے گاندھی جی نے لکھا۔
" لقمانی کیسی ہیں؟ طیب جی خاندان نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے"۔

(Collected Works : Vol. XLIV, July - December, 1930, P. 54)

ولے پارلے بمبئی میں ۸ مارچ ۱۹۳۱ء کا ایک جلسے میں مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا تھا " آپ لوگوں نے جو سپاس نامہ اور رقم میری نذر کی ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس خوشی میں مزید اضافہ کا سبب چند اور بھی وجوہات ہیں۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے صدر جلسہ نٹ راجن میرے دوست ہیں سپاس نامہ مسز لقمانی نے پڑھا ہے جو طیب جی خاندان سے ہیں جس سے میں محبت کی اٹوٹ بندشوں سے جکڑا ہوا ہوں"۔

(Collected Works : Vol. XLV, 1930 - 31, P. 309)

شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکانوں پر پکیٹنگ کے سلسلے میں بیگم سکینہ لقمانی نے فعال کردار ادا کیا۔ واضح رہے گجراتی خواتین کی طرف سے جو خط وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اس پر بیگم سکینہ لقمانی کے بھی دستخط تھے بیگم لقمانی شراب کی دوکانوں پر دھرنا دینے کے لئے پانچ سو گز کی دوری پر بیٹھی تھیں۔ ان کی صرف موجودگی کا ہی اتنا اثر تھا کہ خریدار دوکان تک پہونچنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ عاجز ہو کر دوکانداروں نے ان پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگایا۔ سکینہ لقمانی گرفتار کرلی گئیں۔ کرلا (ضلع تھانہ) میں اُن پر مقدمہ چلا اور چار ماہ قید با مشقت نیز سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں قید مزید ایک ماہ بڑھ جانے کا حکم تھا۔ بیگم سکینہ لقمانی کی عمر اس وقت پینسٹھ[65] سال کی تھی جرم کی نوعیت سزا کی سختی اور ان کی ضعیفی، ہندوستان کے طول وعرض میں اس سزا کے خلاف احتجاج ہوا۔ ملاحظہ ہو بمبئی کرانیکل میں شائع ایک خط بنام اڈیٹر جناب۔

ہم دیش سیوکائیں اس معزز ومحترم دیش سیوکا کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتی ہیں جنھیں اس عمر میں ۴ ماہ قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ مسز لقمانی کا جرم کیا ہے؟ یہ سزا ایک ایسے کام کے لئے ہے جس کام پر ہر ملک ومذہب میں اس شخص کو عزت کا تاج پہنایا جاتا ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی ہو۔ یہ خاتون انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک معزز شخص کی بیٹی ہیں جو بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس بھی رہ چکے ہیں وہ اپنے ایک بدنصیب بھائی کو شراب سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دیش سیوکائیں مادر وطن کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار ہیں۔ اب جبکہ ماں کو کام کرنے سے زبردستی روک دیا گیا ہے۔ ان کی بیٹیاں ان کا کام آگے بڑھائیں گی۔ کل خواتین کے جلوس میں مسز لقمانی نے جو جھنڈا اٹھایا وہ امن وانصاف کے لئے ہماری مسلسل جدوجہد کا مظہر ہے۔ آپ کی سیوکا۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۰/ جولائی ۱۹۳۰ء)

اسی اخبار میں مسٹر جی کے - این نے احتجاج کیا ۔

وحشیانہ دنا عاقبت اندیشی : ہندوستانی عوام کا ردِ عمل مسز سکینہ لقمانی کے معاملہ میں وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا - انھیں چار ماہ کی قید با مشقت دی گئی ہے ۔ شاید رپورٹ کرنے میں کہیں پر غلطی ہوئی ہے ۔ سیاسی قیدیوں کے ساتھ سخت سزا کا حکم سُنائے جانے کے بعد بھی عموماً سختی نہ برتنے کی ہدایت کی جاتی ہے ۔ اپنے اصولوں پہ کاربند ایک مہذب خاتون کو جو جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی بھی ہیں ایسی سخت سزا ہندوستانی رائے عامہ کو بھڑکانے کے لئے کافی ہے ... میں شراب کی دوکانوں پر پکیٹنگ اور مذہب کی آڑ میں جو کچھ کہا گیا اس کے خلاف ہوں ۔ لیکن سزا کے وحشیانہ انداز کے مقابلہ میں خاتون کا جرم کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ چار ماہ کی قید با مشقت اور سو روپے جرمانے کی سزا میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی عوام کو یہ سند مانگنے کا حق ہے کہ آیا کرلا کے یہ مجسٹریٹ اس جگہ پر کام کرنے کے لئے بھی موزوں ہیں یا نہیں ۔" (IBID))

سزا کی خبر سُن کر بمبئی کی خواتین نے جلوس نکالا ۔ پھر مادیو باغ میں خواتین کی ایک نشست ہوئی ۔ مسز ہنسہ مہتا نے اپنی تقریر میں کہا " ایسا نظام حکومت جس میں مسز لقمانی جیسی ضعیف خاتون کو پانچ مہینے کی قید با مشقت کا حکم سُنایا جائے ۔ جلد از جلد ختم ہونے کا مستحق ہے ۔" اس نشست میں یہ بھی طے کیا گیا کہ خواتین کو جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لینا چاہیئے ۔ مسز لیلاوتی منکر نے مسز لقمانی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ " مسز منشی ، مسز لقمانی ، مسز پیرن کیپٹن کو جیل بھیج کر جو ہندو ، مسلمان اور پارسی فرقوں کی نمائندگی کرتی ہیں ، حکومت نے یہ مان لیا ہے کہ آزادی کی لڑائی درحقیقت ایک قومی لڑائی ہے جس میں ہندوستان کے سبھی فرقے ایک ساتھ حصہ لے رہے ہیں ۔"

ایک دوسری خاتون اسپیکر نے کہا " جب ہماری مسلم بہنیں جو پردے کے پیچھے زندگی گزارنے کی عادی ہیں اب میدانِ عمل میں آگئی ہیں اور آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار

ادا کر رہی ہیں تو ہم ہندو خواتین جو بیرونی دنیا کی عادی ہیں، پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو شرمندگی کا باعث ہوگا۔"

(بمبئی کرانیکل جولائی ۱۹۳۰ء تاریخ مٹی ہوئی ہے)

عوامی غم و غصّے کے اظہار کے سبب چوبیس گھنٹے کے اندر گورنر (HUDGSON) کے حکم سے سزا کو آسان قید میں تبدیل کر دیا گیا نیز رہنے کے لئے بھی اے (A) کلاس دیا گیا۔ بیگم سکینہ لقمانی دو ماہ جیل میں رہیں اس زمانے میں کانگریس کا کوئی شخص اپنا دفاع خود نہیں کرتا تھا۔ پھر وکلاء کی ایک جماعت نے ان کا مقدمہ لڑا اور ہائی کورٹ نے اُن کی رہائی کا حکم جاری کیا۔

گاندھی جی کی گرفتاری پر بیگم سکینہ لقمانی نے مسلم خواتین کی ایک میٹنگ بلائی یہ میٹنگ بلاواٹسکائی لوج میں بوقت شام منعقد ہوئی صدارت بیگم سکینہ لقمانی نے کی۔ متعدد مسلم خواتین کی تقاریر کے بعد مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

"مسلم خواتین کا یہ جلسہ مہاتما گاندھی کے برت پر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی فوری و غیر مشروط رہائی کی مانگ کرتا ہے۔"

(بمبئی کرانیکل۔ بمبئی منگل ۲۳ فروری ۱۹۴۳ء)

مہاتما گاندھی کی شہادت پر بمبئی کی خواتین نے سوا میل لمبا جلوس نکالا جس کی قیادت باوجود انتہائی ضعیفی کے ہاتھ میں جھنڈا لئے بیگم سکینہ لقمانی کر رہی تھیں بیگم سکینہ لقمانی کا انتقال ۷ر فروری ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

(بمبئی کرانیکل کے تراشے اور بقیہ اطلاعات بیگم سکینہ لقمانی کی پوتی محترمہ یاسمین لقمانی نے مہیا کیں۔)

(154, Jolly Maker Apartments in CAFE PARADE, BOMBAY, 400005
Dated : 28.5.86)

ریحانہ طیّب جی

ریحانہ طیّب جی کی پیدائش ۲۶ر جنوری ۱۹۰۰ء میں ریاست بڑودہ گجرات میں ہوئی۔ وہ مشہور قومی رہنما اور بڑودہ کے جج عباس طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ امینہ طیب جی کی قومی خدمات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر قربانی کا جذبہ انھیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ جنگِ آزادی کی تحریک میں وہ ابتدا سے ہی پیش پیش رہیں۔ تعلیمی حیثیت سے وہ گریجویٹ تھیں۔ انگلش گجراتی اور اردو ہندی سے بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی کام کیا تھا۔ اپنے خط میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا۔" اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تم کو جو کام مل گیا ہے سو تو بہت اچھا ہے۔ اب تو ریحانہ اسکالر کہلائے گی۔ آسمان میں اڑے گی اور ہم سب دیکھتے رہیں گے۔" (باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام۔ گاندھی میموریل لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔ ص۔ ۲۹۳)

گاندھی جی کو ریحانہ طیب جی کتنی عزیز تھیں اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں گاندھی جی نے انھیں "بیٹی ریحانہ، استانی صاحبہ، پاگل ریحانہ، شریر لڑکی ریحانہ، چر بجیو ریحانہ، پریہ ریحانہ، اور بھلی بیٹی" جیسے پیار بھرے

ناموں سے مخاطب کیا ہے (ایضاً) ایک خط کے خاتمے پر لکھتے ہیں " باباجان واماں جان کو آداب اور دوں کو بندے ماترم۔ تم کو تھپیڑ "۔

(ایضاً مورخہ ۲۳ جون ۱۹۳۲ء، ص ۲۳۶)

ریحانہ طیب جی نے بچپن سے صوفیانہ مزاج پایا تھا، شادی نہیں کی۔ اسلامی تصوف اور ہندو فلاسفی پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ ہر ایک مذہب کی سچائی پر انھیں کامل یقین تھا۔ ان کی عملی زندگی اور عقائد میں مکمل یکسانیت تھی۔ انتہائی روشن خیال تھیں شاردا بل کی حمایت میں پیش پیش رہیں۔ ان کے عقائد سے متعلق گاندھی جی نے لکھا تھا: " بی بی ریحانہ طیب جی کچھ دنوں کے لئے سیوا گرام میں ہمارے پاس رہنے کے لئے آئی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک سچی مسلمان ہیں لیکن ان کے عظیم والد کے انتقال سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن شریف کی اتنی اچھی قرأت بھی کر سکتی ہیں۔ جب " گجراتی ہیرے " عباس طیب جی کا انتقال ہوا تو کمرے کی گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی سسکیوں میں ریحانہ کی قرأت گونج رہی تھی۔ عباس طیب جی جیسے افراد کبھی مر نہیں سکتے۔ ملک کی خاطر ان کی قربانیاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ بی بی ریحانہ گاتی بھی بہت اچھا تھیں اور ہر طرح کے بھجن انھیں یاد تھے۔ وہ روزانہ بھجن بھی گاتی تھیں اور قرآن کی آیتوں کی تلاوت بھی کیا کرتی تھیں۔ میں نے اُن سے آشرم میں کسی کو کچھ قرآنی آیتیں سکھانے کے لئے کہا اور انھوں نے بخوشی ایسا کیا۔

آشرم کے دوسرے افراد کی مانند وہ سب میں ایسا گھل مل گئی تھیں جیسے وہ ہمیشہ سے اپنی ہوں۔ رہائش کی مدت ختم ہونے پر ریحانہ واپس چلی گئیں لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی مہک چھوڑ گئیں جو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتی رہے گی"۔

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXV, October 11, 1941 March 31, 1942, P. 281)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی سے متاثر ہی نہیں تھیں وہ ان کے لئے خاندان

کے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے جن سے وہ نہ صرف دل کی بات بلکہ اپنی ہر
ذہنی الجھن پر بلاتکلف تبادلۂ خیال بھی کر سکتی تھیں وہ صحت کی ہمیشہ سے کمزور تھیں
گاندھی جی نہ صرف علاج کے بارے میں صلاح دیتے بلکہ ذہنی سکون کے لئے روحانی
غذا کا انتظام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے لکھا "جیون کے ساتھ مرن
بھی خدا نے رکھا ہے، اس لئے ہم ایک سے خوش نہ ہوں، دوسرے سے ناخوش
نہ ہوں۔ (لفظ مٹا ہوا ہے) کی دو بازو کی مانند دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جینے
کے موہ میں ہم موت کو الگ و برا مانتے ہیں۔"

(گاندھی جی کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام بتذکرہ ۲۱ جون ۱۹۳۲ء ص ۴۹)

ان کی علالت کے دوران اگر کچھ دن خیریت نہ ملے تو باپو بے چین ہو جاتے تھے
یرودا جیل پونا سے خط لکھا: "پیاری بیٹی ریحانہ۔ میرا کارڈ ملا ہوگا۔ میں نے جو ڈر
مانا تھا وہی ہوا۔ تم نے رواج کر رکھا ہے اس لئے جب تمہارا خط نہیں ملتا تو
میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اسی حالت میں ابا جان یا اماں جان سے بھی ایک کارڈ
لکھوا سکتی ہو۔ کیسے بھی میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ بیمار ہوتے ہوئے بھی تمہارے
لکھنا۔ کیوں بیمار ہو گئی بہت کام کیا تھا؟ تمہارے تو بیمار ہونا بھی نہیں چاہیئے اب
اچھی ہو گی اس کارڈ کا جواب تمہارے دینے کی کوئی زورورت (ضرورت) نہیں
ابا جان ایک کارڈ بھیج دیں تو کافی ہوگا" خدا حافظ باپو کی دعائیں۔

(ایضاً۔ ۱ دسمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۲۹)

ایک اور جگہ نصیحت کرتے ہیں "کیوں تھوڑا آرام لے کر بالکل اچھی نہیں ہوتی
اچھی رہے گی تو کام بہت ہے جو سیوا ہی کرنا چاہتے ہیں ان کو سیوا کی کمی نہیں
ہوتی۔ باپو کی دعائیں"

(ایضاً۔ ۲۳ جنوری ۱۹۳۳ء ص ۳۲۱)

ریحانہ طیب جی بہت خوش الحان تھیں کانگریس کے اجلاس اور
گاندھی جی کی دعائیہ نشستوں میں قومی گانے اور بھجن گایا کرتی تھیں

احمد آباد میں جب عدم تعاون ریز ولیوشن پاس ہوا تو وہ سب سے پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے بندے ماترم گایا۔ میٹنگ کی صدارت حکیم اجمل خاں مرحوم نے کی تھی (حقیقی بہن بیگم سہیلہ حبیب، بدر باغ علی گڑھ، گاندھی جی تو ان کے گائے ہوئے بھجنوں کے شیدائی تھے۔ اپنے جیل سے بھیجے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ریحانہ کو خدا تندرست رکھے اور مندرست (من درست) کرے اور رکھے۔ تمہارا بھجن سنے بنا اچھا نہیں لگتا۔ آکر سنا دو۔ تب بن سکتا ہے اس لئے تمہارے لڑکا بن کر جیل میں آنا ہوگا۔ دیکھتا ہوں ہادو (رہا دیو) گا سکتا ہے کیا؟" (گاندھی جی کے خطوط۔ متذکرہ۔ ۴ اپریل ۱۹۳۲ء ص ۲۸۲)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اکثر بھجن اور غزل لکھ کر بھیجتی رہتی تھیں جس کا اکثر خطوط میں تذکرہ ہے۔ ملاحظہ ہو ایک خط: "پیاری بیٹی ریحانہ تمہارا خط اور بھجن ملا ہے۔ بھجن اچھا ہے آج زیادہ لکھنے کا وقت نہیں ہے۔ فاقہ کرنے کا ارادہ تم سب کو پسند آیا ہوگا۔ ابا جان کو تو یہ چیز سمجھنے میں مشکل ہی نہیں ہونی چاہیئے۔ خدا کے نام سے خدا کے کام کے لئے شروع کیا ہے۔ وہی انجام پہونچا دے گا۔ مجھے ابا جان کی اماں جان کی دعائیں چاہیئے تو کیا بھیجے گی؟ تجھے تو ناچنا چاہیئے کہ خدا نے باپو کو ایسی قربانی کرنے کا موقہ (موقعہ) دیا ہے۔ باپو کے آشیرواد۔" (ایضاً ۱۹ ستمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۴)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت چالاک لڑکی ہے۔ اپنا بھجن کے لئے مجھے فاقہ کروانا چاہتی ہے۔ میں نہیں کروں گا اور بھجن تو گا کر سنائے گی تب دل کو بھائےگا۔ (بھائے گا) اگر اٹھ جاگ مسافر، میں نہ سنتا تو مجھے ایسا دلچسپ نہ لگتا اگر جیل کی دیوار کے بہار (باہر) سے بھی گائےگی (گائیگی) تو بھی تیری آواز مجھے پہونچ جائے گی۔ باپو کی بہت دعائیں۔" (ایضاً ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۳۳۶)

اکثر و بیشتر بھجن ان کے اپنے ہی لکھے ہوتے تھے۔ اس کا تذکرہ بھی

گاندھی جی کے خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً "پیاری بیٹی ریحانہ۔ فاقہ کے بعد یہ پہلا اردو خط ہے۔ تمہارے بھجن بہت اچھے ہیں۔ فاقہ شروع کرنے کے وقت جو بھجن گایا وہ تمہارا نہیں ہے تو کیا ہوا آخر ہے تو تم نے دی ہوئی عدہ چیز۔ ہاں تمہارا ہی ہوتا تو مجھے بہت زیادہ اچھا لگتا۔ ٹھیک ہے۔ دوبارا (دوبارہ) جب فاقہ کا موقہ (موقعہ) خدا بھیج دے گا تب تمہارا ہی بنایا ہوا بھجن مجھے چاہیے۔ آج سے مجھے تیار کرو۔ باپو"

(ایضاً ص ۳۶۔ اس خط پر تاریخ نہیں ہے)

ریحانہ طیب جی کے گائے ہوئے بھجنوں کو یاد کرکے باپو کے دل میں پیار کا ساگر امڈ آتا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت دن سے تم کو لکھنا کوشش کر رہا ہوں لیکن وقط (وقت) نہیں ملتا تو تو مجھے بھول ہی گئی ہے لیکن میں کیسے بھولوں۔ پرسو (پرسوں) ہی ناتا دتی نے اُٹھ جاگ مسافر گایا۔ اور تمہاری مورت میرے سامنے کھڑی ہوں"

(ایضاً، ۷ جولائی ۱۹۲۷ء ص ۳۵۹)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اردو سکھانے میں بھی مدد کرتی تھیں۔ گاندھی جی کے متعدد خطوط میں اس کا تذکرہ ہے جیسے۔۔۔۔ میں غلطیا (غلطیاں) تو بہت کرتا ہوں وہی رخ رکھنا۔ جب تھکان آوے تب درست کرنے کا چھوڑ دو میں تو ہر ہفطے (ہفتے) میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ شروع کیا ہے اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میری استادنی کی عمر خدا دراز کرے۔

(ایضاً۔ ۹ فروری ۱۹۳۲ء ص ۲۷۶)

اسی سلسلے کا ایک دوسرا خط۔۔۔۔۔ اور ریحانہ وہاں بیٹھی بیٹھی کیا کر رہی ہے کیسی استانی۔ اب حرف اچھے بنانے کے لئے کاپی بوک (بک) مگوالی (منگوالی) ہے۔ آج کل میں شروع ہو جائیگی (جائے گی)، اردو کتاب تو پڑ (پڑھ) رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بوجھ بہت اور وقت کم۔ دیکھیں خدا کے نام سے اور اسی کے کام کے لئے سب کر رہا ہوں وہ چاہے گا وہاں

ے جائے گا۔ تم نے تو گا یا ہے۔

ملک نیند سے انکھیاں کھول ذرا۔ اے غافل رب سے دھیان لگا۔ جو کال کرے وہ آج تو کر، جو آج کرے وہ اب کر لے۔ اب کر لینے کی کوشش تو ہو رہی ہے۔ انجام پہونچانا اسی کے ہاتھ ہے (ایضاً ۹ رمئی ۱۹۳۲ء ص ۲۸۸)

یرودا جیل سے ریحانہ طیب جی کے نام ایک خط کے جواب میں گاندھی جی نے لکھا تھا: "اگر میں حروف اچھے نکلے اور غلطی ایک بھی نہ رہے تو کبھی اردو نہیں لکھ سکوں گا۔ مجھے سکھاتی ہے اس کے ساتھ وقت بھی ڈاک سے بھیج دو تو غلطیاں نہیں رہنے دوں گا۔ (ایضاً ۲۳ رجنوری ۱۹۳۳ء ص ۳۲۰)

گجرات میں جب پہلی بار گاندھی جی نے شراب اور ولایتی کپڑوں پر پکٹنگ کے لئے خواتین کا اجلاس کیا تو خصوصی طور پر ریحانہ طیب جی اور ان کی والدہ جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے امینہ طیب جی کو مدعو کیا گیا تھا۔ والسرائے کو جو ریزولیوشن اس سلسلے میں بھیجا گیا اس پر ریحانہ طیب جی کے بھی دستخط تھے۔ وہ یوتھ لیگ (کانگریس کے نوجوانوں کی تنظیم) کی صدر بھی تھیں۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے پٹنہ میں ولایتی کپڑا فروخت کرنے والوں کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی تھی۔

۱۹۳۲ء میں ریحانہ طیب جی کو 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کے دوران ایک جلوس میں شرکت کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور دیگر ساٹھ خواتین کے ساتھ ایک سال قید کی سزا ہوئی ان میں سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ ان سب کو سینٹرل جیل ناگپور میں رکھا گیا تھا۔

ریحانہ طیب جی سیاست داں نہیں جنگ آزادی کی مجاہدہ تھیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ مزاج ابتدا سے ہی صوفیانہ تھا۔ گلیڈس اوڈین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۳۶ء، گاندھی جی نے لکھا تھا "ریحانہ روحانیت میں گہرا اعتقاد رکھتی ہیں"۔ اس لئے آزادی کے بعد بقیہ زندگی کا کا صاحب

کالیلکر، جنھیں وہ اپنے والد کے جیسا اور سروجنی نانا وتی، جنھیں وہ اپنی حقیقی بہن سمجھتی تھیں، کے ساتھ خاموشی سے گزار دی۔ آخر زندگی تک وہ نہ صرف قومی یکجہتی بلکہ عالمی بھائی چارے کے لئے کام کرتی رہیں۔ ہر روز سینکڑوں اشخاص ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ریحانہ طیب جی جنگِ آزادی کے ان ہزاروں مجاہدوں میں سے ایک تھیں جن کی قومی خدمات بے لوث اور صرف زنجیر غلامی کو توڑنے کے لیے تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے ایک کتاب (THE HEART OF GOPI) کی مصنفہ تھیں اس کتاب کا ہندوستانی نیز کئی غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اور اس کی بہت شہرت ہوئی۔

ریحانہ طیب جی کا انتقال ۱۶ر مئی ۱۹۷۵ء میں ہوا۔

(انٹرویو سروجنی نانا وتی صدر ہندوستانی پرچار سبھا، سن ندھی راج گھاٹ، ۷ر جولائی ۱۹۸۷ء)

حمیدہ طیب جی

حمیدہ طیب جی گجرات کے مشہور مجاہد آزادی عباس شمس الدین طیب جی کی پوتی اور مجاہدہ آزادی ریحانہ طیب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی پیدائش بڑودہ میں غالباً ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ سینئر کیمبرج کے بعد تحریک آزادی میں شریک ہونے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔

سیاسی خیالات و نظریات میں وہ گاندھی جی اور اپنے دادا شمس الدین طیب جی کی معتقد تھیں۔ "انڈین نشنل کانگریس اور یووک سنگھ" کی ممبر بھی تھیں۔

انھوں نے اپنے زمانے کی جنگ آزادی کی تقریباً سبھی تحریکات میں نمایاں حصہ لیا۔ مثلاً سودیشی تحریک، شراب کے خلاف ستیہ گرہ وغیرہ وغیرہ۔ حمیدہ طیب جی ایک لاٹھی چارج میں زخمی بھی ہوئیں۔ وہ خواتین کی اس ستیہ گرہ تحریک میں بھی شریک تھیں جسے منتشر کرنے کے لئے گھوڑ سواروں کی ایک ٹکڑی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور جس میں گھوڑ سواروں نے خواتین پر گھوڑے دوڑا دیئے تھے

تحریک آزادی کے سلسلے میں انھیں دو بار جیل کی سزا بھی ہوئی۔ ایک بار سول نافرمانی کی تحریک اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں شمولیت کے سبب انھیں گرفتار کیا گیا اور جیل بھیجا گیا۔

سورت: مسٹر عباس طیب جی کی پوتی مس حمیدہ طیب جی اور سورت ضلع کے

پہلے ڈکیٹر کنہیا لال دیسائی کی اہلیہ مالویکا دیسائی اور بیٹی مس روہنی دیسائی کو آج خلاف قانون کارروائیوں میں شریک ہونے کی بنا پر سزا دی گئی۔ مسز ڈیسائی کو تین ماہ قید، سو روپے جرمانہ یا ڈیڑھ ماہ مزید قید کی سزا ہوئی۔ مس روہنی دیسائی اور حمیدہ طیب جی چار چار ماہ قید اور ساٹھ ساٹھ روپے جرمانہ یا چھ چھ ہفتے مزید قید کی سزا ہوئی۔ (مدینہ اخبار بجنور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء)

گاندھی جی کے اکثر خطوط میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً مہادیو دیسائی کو اپنے خط مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا "اولپاڈ مسلمان بستی ہے اس لئے حمیدہ وہاں کام کرے گی۔ کانجی بھائی کی بیٹی بھی وہیں ہے۔"

(Collected Works : Vol. LXIII, P. 250)

۲۷ اپریل ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے امینہ طیب جی کو لکھا کہ "حمیدہ اولپاڈ میں بہت اچھا کام کر رہی ہے۔"

۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں انھوں نے ریحانہ طیب جی کو لکھا "اب اور دو (اردو) شرد (شروع) ہوتا ہے۔ حمیدہ بہادر لڑکی ہے خدا اس سے بڑا کام لے گا اور اس کو بڑپن (بڑکپن) دے گا۔ بس خدا حمیدہ کو امر دراج (عمر درازی) کرے۔ اس بارے میں تم کو بھی دھن دا ہونا چاہیئے کیونکہ حمیدہ آخر میں تمہاری چیلی ہے نہ؟ (ریحانہ طیب جی کے نام باپو کے خطوط (گاندھی میوزیم لائبریری، راج گھاٹ ص ۲۷۵)

ریحانہ طیب جی کے نام ایک اور خط میں باپو نے معلوم کیا "سینچر کو سنا کہ حمیدہ چھوٹ گئی۔ یہ ٹھیک بات ہے کیا اگر ٹھیک ہے تو مجھے سب حال لکھے (ایضاً ۱۲ اپریل ۱۹۳۲ء: ص ۲۹)

گاندھی جی کے کچھ خطوط براہِ راست بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں لیکن ان کی نوعیت ذاتی ہے۔

حمیدہ طیب جی نے انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کے مسٹر پربودھ بہتار (بمبئی) سے شادی کی تھی۔ آزادی کے بعد انھوں نے بقیہ زندگی ایک اچھی شہری، خاتون خانہ اور ایک اچھی ماں کی حیثیت سے گزاری (خطوط کے علاوہ معلومات محترمہ سروجنی ناناوتی، صدر ہندوستانی پرچار سبھا، راج گھاٹ نئی دہلی نے مہیا کیں جو اسکول میں محترمہ حمیدہ طیب جی کی ساتھی بھی رہی ہیں اور خود ایک سرگرم مجاہدہ آزادی تھیں)

کس غضب کی لو نکلتی ہے ترے پیغام سے

فاطمہ طیب علی

فاطمہ۔ ایف طیب علی کی پیدائش ۲ر نومبر ۱۹۰۲ء میں کیمبے (گجرات) میں ہوئی۔ والد کا نام عبد العلی تھا جو طیب علی کے پوتے تھے جنھوں نے طیب جی خاندان کی بنیاد ڈالی اور بدر الدین طیب جی صدر کانگریس کے والد تھے۔ شادی بدر الدین طیب جی کے پوتے سے ہوئی ان دنوں کیمبے میں لڑکیوں کیلئے اسکول نہیں تھے اس لئے ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔

فاطمہ طیب علی سیاسی نظریات وعقائد کے اعتبار سے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل سے خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ ابتداء سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ نمک ستیہ گرہ میں بیٹوبا، ضلع احمد نگر میں نمایاں حصہ لیا۔ گاؤں کی عورتوں کو کتائی کی تعلیم دی۔ اور کھادی کی تبلیغ کی۔ فاطمہ طیب علی ایک بار گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں جیل گئیں۔

فاطمہ طیب علی آزادی کے بعد سوشل ورک میں لگ گئیں۔ وڈے لا گاؤں میں صفائی ستھرائی کے لئے بہت کام کیا ان کے گاؤں کو مثالی گاؤں کے لئے احمد نگر ضلع میں پانچ سو روپیہ کا انعام بھی ملا ہے۔
اب بہت ضعیف ہیں (معلومات بذات خود محترمہ فاطمہ طیب علی سب پوسٹ وڈے لا ضلع احمد نگر، مہاراشٹر نے بذریعہ بیگم سہیلہ حبیب، علی گڑھ بذریعہ خط مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء مہیا کیں۔

صوفیہ سوم جی / سعد اللہ خاں

بمبئی کی صوفیہ سوم جی ہندوستانی سیوادل میں خواتین کے شعبے کی نگراں و منتظم تھیں۔ مرحوم بادشاہ خان عبدالغفار خاں کے خطوط و تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ صوفیہ سوم جی آل انڈیا کانگریس کی عورتوں کے شعبہ کی صدر اور رضاکاروں کی کمانڈر بھی تھیں۔ بادشاہ خان نے اپنی خودنوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۵۰۵ پر لکھا ہے۔

"کانگریس نگر بڑے پیمانے پر تیار تھا۔ سرحد سے کوئی نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ مہرتاج (میری لڑکی)، اور مریم (بڑے بھائی صاحب کی لڑکی) تھیں اور یہ سب (صوفیہ) کے ساتھ لڑکیوں کے کیمپ میں تھیں۔ صوفیہ بمبئی صوبے کی رضاکار لڑکیوں کی کمانڈر تھی اور یہ رضاکار لڑکیاں ذرا پہلے مہمانوں کی خدمت کے لئے آئی تھیں۔ میری لڑکی مہرتاج اور مریم بھی ان رضاکاروں میں شامل تھیں اور سارا دن خدمت کرتی تھیں۔"

(بحوالہ ذاتی خط، سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ء)

صوفیہ سوم جی نے قومی جدوجہد آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اس کی خاطر قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی۔ جنگ آزادی میں ان کی خدمات کا تفصیلی علم تو نہیں ہو سکا ہے تاہم دو خبروں سے ان کی دو بار گرفتاری کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ پہلی خبر ہے: "بمبئی ۱۲ مارچ۔ بمبئی کی مشہور خاتون مس صوفیہ سوم جی رہا ہو گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ

وہ بمبئی چھوڑ دیں۔" مدینہ "اخبار بجنور ۷ ارمارچ ۱۹۳۲ء دوسری خبر:" بمبئی کی مس صوفیہ سوم جی جو ہندوستانی سیوادل میں خواتین کے شعبے کی نگراں اور منتظم تھیں ہنگامی آرڈی ننس کی خلاف ورزی کے الزام میں کل دوپہر کو بمبئی میں گرفتار کرلی گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ شہر میں داخل نہ ہوں" ایضاً ۹ رمئی ۱۹۳۲ء)

صوفیہ سوم جی کی شادی ڈاکٹر خان صاحب (سرحدی گاندھی بادشاہ خان کے بھائی) کے عزیز بیٹے سعداللہ خاں سے غالباً شری جمنالال بجاج کے ایما پر ہوئی تھی۔

ملاحظہ ہو گاندھی جی کا ایک خط بنام جمنالال بجاج مورخہ ۲۶ ر جنوری ۱۹۳۵ء)

" معلوم ہوتا ہے تمہیں شادیاں طے کرانے میں خاص مہارت ہے۔ یہ شادی اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی شادی ہوگی۔ غریب صوفیہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ وہ ایک پٹھان سے شادی کرے گی۔ نہ ہی سعداللہ خاں کے وہم وگمان میں ہوگا کہ اس کی شریک حیات ایک خوجہ لڑکی ہو سکتی ہے۔ مجھے تمہارا انتخاب بہت پسند آیا دونوں خوش رہیں گے اور صوفیہ اپنی خواہش کے مطابق قوم کی زیادہ خدمت کر سکے گی"۔

شادی کے موقع پر گاندھی کی طرف سے مہادیو دیسائی نے دولھا دولہن کو مبارکباد کے خط میں لکھا:" اگر باپو کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ذاتی طور پر آپ کو لکھتے۔ اب اس مبارک موقع پر ان کی طرف سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے یہ رشتہ آپ کی قومی لگن و قربانیوں کو مزید تقویت دے اور یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن آپ کی ازدواجی زندگی کو زیادہ فعال اور بامقصد بنائے۔ آپ کا مخلص مہادیو دیسائی"۔

(ایضاً (IBID Vol. LXII, P. 182)

مرحوم بادشاہ خان نے اپنی مختلف تحریروں میں ان کا تذکرہ خانم سعداللہ کے نام سے کیا ہے۔ اور متعدد مقامات پر ان کی قومی خدمات کو سراہا ہے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۳۵۶ پر انھوں نے لکھا ہے:" سعداللہ خاں بمبئی کارپوریشن میں انجینئر تھے۔ ایک خوبصورت مکان بھی تھا۔ صوفیہ جو ان کی اہلیہ ہے بہت خوبصورت واچھی لڑکی ہے اور بے حد قوم پرست اور محبِّ وطن ہے میری بے حد عزت ہی نہیں

خدمت بھی کرتی تھی یہ (بحوالہ ذاتی خط مرحوم خان غازی کابلی، متذکرہ)

بریلی جیل سے "میٹھی صوفیہ" کے نام سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مرحوم بادشاہ خان نے انھیں لکھا تھا:

"جیل میں ملاقات پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ ۲۰ یا ۲۵ منٹوں کی ملاقات کے لئے تکلیف اٹھاؤ۔ بمبئی سے یہاں تک آنے میں پیسے بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔ میں اچھا ہوں اور کسی قسم کی تکلیف مجھے نہیں ہے۔" (ایضاً)

شفاعت النساء بی بی

آپ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب نقشبندی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ مولانا نے اپنی تمام زندگی جس بہادری، قوم پر مر مٹنے کے عزم اور حصول مقصد کی خاطر مستقل مزاجی سے سرگرم عمل رہنے میں گزاری وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہرلال نہرو مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے اور احترام کرتے تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کے الفاظ میں "وہ ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے ہماری جنگِ آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں"۔ بی بی شفاعت انھیں کی مانند محب قوم اور پُرجوش مجاہدۂ آزادی تھیں وہ جمعیتہ العلماء اور انڈین نیشنل کانگریس کی مخصوص و فعال رکن تھیں۔ شفاعت بی بی اور ان کے خاندان نے جنگِ آزادی میں زبردست قربانیاں دیں مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے صاحبزادگان کی زندگی دار و رسن کی آزمائش کی ایک داستان مسلسل ہے۔ مولانا نے اکثر مجلسوں میں کہا کہ "اگر مجھے اس عالی ہمت خاتون کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو شاید میں اتنا سیاسی کام نہ کرسکتا۔ اکثر رہنماؤں کو خانگی زندگی کی مجبوریوں سے سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ کچھ رہنماؤں کو خوش قسمتی

ہے ایسی رفیقۂ حیات کا سہارا ملتا ہے جو ان کے سیاسی کردار کو اور بلند کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس رہنما کو اس رفیقہ کا ساتھ نہ ملتا تو ان کی زندگی اور انکا کام ادھورا رہ جاتا۔" غرض مولانا محترم کے لئے شفاعت بی بی کی رفاقت انھیں اثرات کی حامل تھی۔ مولانا اور ان کے صاحبزادگان جیل گئے۔ شفاعت بی بی نے تمام مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کئے انھوں نے ان کا سیاسی کام بھی جاری رکھا" خدا نے اس خاندان کو قوم و وطن کی محبت کی آگ بخشی ہے۔ قید و بند گرفتاریاں، خانہ تلاشیاں، حکومت کی دشمنی تیس سال تک یہی کھیل رہا۔ لیکن شفاعت بی بی کی جبین پر کوئی بل تک نہ آیا۔ مولانا سات بار جیل گئے۔ ملاحظہ ہو ان ایام مصائب و آلام کی ایک جھلک اور اس دوران اس مجاہدہ بی بی کی صبر و استقامت کی ایک داستان۔

" مولانا حبیب الرحمن کو ۱۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ قید با مشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ۷ اگست ۱۹۲۲ء کو آپ کی قید کے چھ ماہ پورے ہو جاتے تھے اچانک تاریخ رہائی سے چار یوم پہلے پولیس لدھیانہ جیل میں لے آئی۔ آپ پر دوسرا کیس تیار کر کے مقدمہ چلا دیا گیا۔ اور ایک سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ قید کے ساتھ مولانا پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا آپ نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ ایک شام مغرب کے بعد پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت گھر میں مولانا مرحوم کی اہلیہ اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو کارروائی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتیٰ کہ روزانہ استعمال کے برتن توا اور دست پناہ تک اٹھا لیا۔ زنانہ پولیس کے ذریعہ آپکی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء کو آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے

لدھیانہ پہونچے، گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آرہی تھی۔ بارش سے گھر کی چار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گزار دیئے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا۔ پھر جہاں پولیس تو اور آتش گیر تک اٹھا کرے گئی ہو اس گھر میں چور کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی غربت سامان کی ضبطی آپ کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔ آپ نے اپنی اہلیہ کے چہرے پر کوئی شکن نہ پائی بلکہ وہ زندگی کے آخری سانس تک آپ کی معاون رہیں"۔

(مولانا عزیز الرحمٰن جامعی ثم دہلوی: رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی در حدیث دیگراں۔ ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

قیام پاکستان کی مخالفت میں انھوں نے کافی کام کیا اور ہمیشہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی مختلف تحریکات سے وابستہ رہیں۔

لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اس جلیل القدر خاندان اور اس علو ہمت خاتون پر بھی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے طوفان میں ان کا بھی کچھ نہ بچ سکا اور تمام خاندان کو انتہائی مجبوری کے عالم میں گھر چھوڑنا پڑا۔ آبائی گھر بھی چھن گیا اور مجاہدینِ آزادی خود پناہ گزینوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ شفاعت بی بی پر اس صدمے کا غیر معمولی اثر ہوا اکثر کہتی تھیں "جلا وطنی ہماری خدمت کا صلہ ہے"۔ انھیں لدھیانے سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ جب فسادات انتہائی شدت پر تھے تو بڑے اصرار سے مولانا سے کہا کرتی تھیں "ہم کو لدھیانہ نہیں چھوڑنا چاہیئے ہم کو یہیں مرجانا چاہیئے"۔ جب وہ لدھیانے سے بہاولپور پہنچیں تو مولانا سے اکثر کہتی تھیں کہ میں کسی سکھ بہن کا بھیس بھر کر لدھیانہ جاؤں اور اپنا گھر دیکھ آؤں۔ ایک مرتبہ بہاولپور سے لاہور چلنے کی فرمائش کی۔ مولانا کے استفسار پر کہا لاہور لدھیانہ سے بہت قریب ہے۔ لیکن زندگی کے اس موڑ پر بھی انھوں نے نقل وطن کا خیال تک نہیں کیا۔ آخری دنوں میں دہلی آگئیں۔ یہاں جس مکان میں مقیم تھیں اس کی مالکہ واپس

اپنے مکان میں آگئی تھیں۔ اس خبر کو سن کر انھوں نے بڑی بے قراری سے کہا "وہ دن کب آئے گا جب ہم بھی اپنے گھر لوٹ سکیں گے"۔ لیکن افسوس ان کی زندگی میں یہ دن کبھی نہ آیا۔

۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو شفاعت بی بی ہیضہ میں مبتلا ہوئیں۔ اس کے بعد نمونیہ اور بخار کا دورہ ہوا۔ ان کے معالج ڈاکٹر شنکر داس نے ہزار جتن کئے لیکن مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ قدرت کا فیصلہ اٹل تھا۔ یکم جون کی رات کو وہ ہمیشہ کے لئے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ سیکڑوں ہندو سکھ بھائی بھی شریک تھے۔ نماز جنازہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے پڑھائی اور مسجد شاہجہانی کے سائے میں انھیں ان کی آخری آرام گاہ میں پہونچا دیا گیا۔

شفاعت بی بی ایک برگزیدہ ہستی تھیں۔ ان کی دریادلی بنی نوع انسان سے ان کی محبت جس میں ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تخصیص نہیں تھی، غریب و مجبور انسانوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا، پروقار زندگی اور ملک و قوم کے لئے مر مٹنے کا مستقل جذبہ، ان کے کردار کی ایسی خصوصیات تھیں جن کی یادوں کے چراغ ان لوگوں کے دلوں میں آج بھی فروزاں ہیں جنھیں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سدا رہے نام اللہ کا (ماخوذ اخبار الجمعیۃ ۵ جولائی ۱۹۴۸ء)

(A BIBLIOGRAPHICAL DICTIONARY OF PROMINENT MUSLIM WOMEN, AL- KABIR AL-KAUSAR AE PP. 334-335)

اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، در حدیث دیگراں

مرتبہ: مولانا عزیز الرحمٰن جامعی ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

بیگم ماجدہ بانو

بیگم ماجدہ بانو مصطفیٰ احمد صاحب کی صاحبزادی تھیں جن کا تعلق لکھنؤ کے شیخان اودھ خاندان سے تھا۔ ماجدہ بانو کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی جہاں انکے والد تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ کچھ عرصہ کرامت حسین گرلز انٹر کالج میں ہوسٹل میں رہیں، پھر کشمیری محلہ میونسپل گرلز انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دسویں کلاس کی طالبہ تھیں کہ جناب محمد صدیق ایڈووکیٹ سول لائنز بارہ بنکی سے شادی ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ماجدہ بانو کا خاندان ابتدا سے خلافت تحریک میں شریک تھا۔ مرحوم رفیع احمد قدوائی سے تعلقات کی بناء پر کانگریس میں شرکت اختیار کی اور انھیں کی ایما پر ماجدہ بانو ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی مخالفت میں لکھنؤ کی مسلم کانسٹی ٹیونسی سے کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء کا الیکشن ہندوستانی جنگِ آزادی کی تحریک میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا ملک گیر الیکشن کے نتائج سے یہ اخذ کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کی حامی ہے یا ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح نمائندہ مسلم لیگ ہے یوں تو اس الکشن میں متعدد نشستیں ایسی تھیں جن کو حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور نہ صرف ان کے حاصل کرنے کے لئے روپیہ

ہی پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا بلکہ ہر دو فریق کے لیڈروں نے بقول شخصے پوٹے ٹیک دیئے تھے۔ انھیں اہم نشستوں میں ایک زنانی نشست لکھنؤ کی تھی جہاں انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" کی سالی بیگم ماجدہ اور بیگم انعام حبیب اللہ کا مقابلہ تھا بیگم ماجدہ بانو کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئی تھیں اور بیگم حبیب اللہ مسلم لیگ کی اُمیدوار تھیں۔ عالم یہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما کلام پاک ہاتھوں پر لئے جلسہ گاہ میں اور لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً آجاتے اور کہتے کہ اس وقت الکشن کا سوال نہیں کلام ربّانی کی عزت کا سوال ہے مولانا شوکت علی مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ مولانا محمد علی کی روح کا واسطہ بھی مسلمانوں کو دیتے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل مولانا شوکت علی بھی پہونچ گئے، ان کے گلے میں کلام پاک پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے میرے بھائی تم مجھے جانتے ہو کہ محمد علی کا بڑا بھائی ہوں آج میرے چھوٹے بھائی کی روح عالم بالا سے تمہارے ووٹ کی طالب ہے۔ (از غلام احمد فرقت کاکوروی علی برادران رئیس احمد جعفری۔ ص ۴۳۔۴۷)

ماجدہ بانو نے الکشن کے دنوں میں زبردست کام کیا۔ اس الکشن کے متعلق الہ آباد کے روزانہ اخبار لیڈر نے لکھا " ماجدہ بانو کو جو کم عمر خاتون ہیں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ جگہ جگہ برقعے میں جاتی ہیں اور تقاریر کرتی ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی متوسط کلاس اور غریب طبقوں میں برابر بڑھ رہی ہے" لیکن مقابلہ بہت سخت تھا۔ ماجدہ بیگم اکیسو چوہتر ووٹوں سے یہ الکشن ہار گئیں۔

۱۹۴۶ء میں ماجدہ بانو نے آزاد مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف مظاہرے میں بھی حصہ لیا یہ تنظیم چند قوم پرست نوجوانوں نے بنائی تھی۔

۲۱ فروری ۱۹۷۴ء میں بیگم ماجدہ بانو کا انتقال بارہ بنکی میں ہوا۔ (شکریہ جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز مکتوب مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

انھیں چراغوں کے گل سے جلیں گے کتنے چراغ

بیگم کلثوم سایانی

مسلمانوں کی خوجہ جماعت کا ایک فرقہ سنی خوجہ ہے جن کی تعداد بہت کم ہے ڈاکٹر رجب علی پٹیل کا تعلق اسی فرقہ سے تھا، ان کا خاندان قومی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ ڈاکٹر پٹیل گاندھی جی کے خصوصی رفیق کار اور معالج بھی تھے۔ گاندھی جی اکثر ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ان کی بیٹی کلثوم کی پیدائش ہوئی۔ کلثوم شروع سے ہی اپنے ماحول کے اثر سے قومی وسماجی کاموں میں حصہ لینے لگی تھیں۔ گاندھی جی سے وہ خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ انگریزی و گجراتی بہت اچھی جانتی اور بولتی تھیں۔

انیس سال کی عمر میں کلثوم کی شادی ڈاکٹر جان محمد سایانی سے ہوئی جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رحمت اللہ سایانی کے بھتیجے تھے۔ ڈاکٹر سایانی بڑے نیک دل اور مقبول ڈاکٹر تھے۔ وہ امن کمیٹی کے جسٹس، آنریری مجسٹریٹ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے معالج خصوصی ہونے کے علاوہ دوسرے کئی عوامی اداروں سے بھی منسلک تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ہر طرح سے بیوی کی حوصلہ افزائی کی جس کے سبب کلثوم سایانی کو سیاسی وسماجی میدان میں عملی سرگرمیوں کے اظہار کا مناسب موقعہ ملا۔ اور وہ بڑی لگن وخلوص کے ساتھ کام میں لگی رہیں۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ڈونگری میں چرخہ

کلاس کی ممبر بنیں۔ عوامی شعور کی بیداری کی خاطر پیری بین کیپٹن نے "یونٹی کلب" کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۰ء میں بیگم سایانی اس کی سکریٹری مقرر ہوئیں اور ۱۹۳۶ء میں جب پہلی قومی پلاننگ کمیٹی بنی تو بیگم کلثوم سایانی اس کے خواتین کے شعبے کی ممبر بنائی گئیں۔ بیگم سایانی کی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب صوبائی خودمختاری کی بنیاد پر بمبئی میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں کانگریس وزارت قائم ہوئی۔ وزیر اعلیٰ بالا صاحب کھیر نے اپنے پروگرام میں تعلیم بالغان کو خصوصی اہمیت دی۔ بمبئی شہر کے لئے ایک کمیٹی بنی جس کے صدر خود کھیر صاحب اور بعد میں گلزاری لال نندہ صاحب رہے۔ بیگم کلثوم سایانی ۱۹۳۹ء سے اس کی رکن اور بعد میں نائب صدر رہیں یہ کمیٹی آئندہ چل کر سوشل ایجوکیشن کمیٹی میں تبدیل ہوگئی۔

بیگم سایانی تعلیم بالغان کے پروگرام میں خاص طور سے بمبئی شہر کی مسلمان خواتین کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس میں انھیں متعدد دشوار مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف مسلم خواتین اپنی ناخواندگی سے مطمئن تھیں دوسری طرف کانگریس میں مسلم لیگ کی آپسی رقابت کے سبب کانگریس کی طرف سے کئے گئے ہر کام کو مسلم لیگ شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اسی لئے تعلیم بالغان کی تحریک کو بھی عرصے تک مسلم ماس کانٹیکٹ کی ترکیب سمجھا گیا۔ سیاسی مخالفت کے سبب بعض لوگوں نے متوازی تحریک چلانے کا فیصلہ بھی کیا تاکہ "کھدر پوش" مسز سایانی کے اثرات ختم ہوجائیں لیکن بیگم سایانی نے ہر قسم کی مخالفت کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

بمبئی شہر کے کئی علاقے ایسے ہیں جن میں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے بھنڈی بازار ڈونگری، ناگپاڑہ، مدن پورا، کرلا، ماہم وغیرہ، ان میں شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ بسے ہیں۔ میمن، کوکنی، دکنی مقامی بولیوں کے علاوہ اردو ہی کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں۔ ان ہی کی عورتوں میں تعلیم بالغان کا کام کرنا تھا۔ مسز سایانی کے نزدیک سب سے پہلا مرحلہ عورتوں کو اکٹھا کر کے انھیں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلانا تھی۔ ان کو کسی ہال یا عام جگہ پر جمع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے مسز سایانی نے ایسے وقت جب کہ

عورتیں نسبتاً فرصت میں ہوتی ہیں۔ بلڈنگوں کی کئی کئی منزلیں طے کرکے فرداً فرداً
ان عورتوں سے باتیں کرنا شروع کیا۔ بڑی عمر میں پڑھنے لکھنے کی جھجک دور کی۔ کتابیں
پنسل کاغذ، سلیٹ کی سہولیتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا اور اس طرح مسلسل کوشش
کے بعد انھیں آمادہ کیا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ اس کام کے لئے دیا کریں۔ اس ابتدائی کام کے بعد
عورتوں کو بلڈنگوں سے باہر کہیں کلاس روم یا کسی اور جگہ لے جانے کی بجائے بلڈنگ ہی
میں جہاں کہیں کچھ بھی کھلی جگہ ملی وہیں کلاس شروع کر دی گئی۔ کہیں زینے کا چبوترہ
اور کبھی کمروں کے سامنے کا راستہ کلاس روم بن جاتا۔ یہاں تختہ سیاہ، تعلیم کے
سامان، ٹیچر وغیرہ کا انتظام کمیٹی کی طرف سے کیا جاتا۔ بمبئی کی بلڈنگیں عموماً تین چار
منزل کی ہوا کرتی تھیں۔ موسم کیسا ہی ہو موسلا دھار بارش شدت کی گرمی، مسز سایانی،
ایک مجاہد کی طرح اونچے اونچے زینے طے کرتی ہوئی ان کلاسوں کی نگرانی کرتیں۔ ان
عورتوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ نوشت و خواندگی کی اہمیت سمجھاتیں، عام معلومات سے ان کے
علم میں اضافہ کرتیں۔" (سید شہاب الدین دسنوی، ایک مجاہد خاتون، کلثوم سایانی
ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۸ راکتوبر ۱۹۸۷ء)

بیگم کلثوم سایانی کی مسلسل کوششوں کے سبب بمبئی میں تیس سال کے عرصے میں
پانچ لاکھ خواتین کو خواندگی کی تعلیم دی گئی جس میں برقعہ پوش خواتین کی تعداد تیس ہزار
تھی۔ انھوں نے نو آموز بالغوں کے لئے اردو میں ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنے کا بھی فیصلہ
کیا جس کا نام "رہبر" تجویز ہوا، غالباً یہ پہلا اخبار تھا جو نو آموز بالغوں کے لئے نکالا
گیا۔" اس کی زبان گاندھی جی کے تصور کی ہندوستانی تھی، مضامین معلوماتی اور ہلکے
پھلکے ہوتے تھے۔" (ایضاً) بیگم سایانی نے اردو رہبر کے ساتھ دیوناگری اور گجراتی
رسم الخط میں بھی 'رہبر' نکالنا شروع کیا جو ایک انقلابی قدم تھا۔ رہبر ۱۹۶۰ء تک
پابندی سے نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری بیگم سایانی کی اپنی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب
مسز ہنسا مہتا جیل گئیں تو بیگم سایانی آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی ایکٹنگ جنرل سکریٹری
مقرر ہوئیں اور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک اس کی باقاعدہ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام

کیا۔ اس دوران انھوں نے ۶۵۰۰ ممبران سے ۲۲۰۵۰۰ تک کی تعداد بڑھانے میں زبردست کارکردگی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ بمبئی کی شہری ایجوکیشن کمیٹی جس سے وہ ۱۹۳۹ء کے آغاز سے ہی منسلک رہی تھیں، نائب صدر مقرر ہوئیں۔

تعلیم بالغان کے علاوہ بیگم سایانی سماجی فلاح و بہبود کی متعدد تنظیموں کی بھی فعال ممبر رہیں مثلاً ممبر مہاراشٹر سوشل ایجوکیشن کمیٹی، صدر بورڈ آف ٹرسٹیز سجن بھائی مہرانی گرلس اسکول، ممبر انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نئی دہلی (۱۹۴۰ء میں اس کے آغاز ہی سے) ممبر ہندوستانی پرچار سبھا (۱۹۳۶ء میں اس کے آغاز سے ہی) ممبر انڈین کانفرنس آف سوشل ورک (۱۹۴۷ء میں اس کے آغاز سے ہی) اور ممبر گاندھی اسمارک ندھی بمبئی بورڈ وغیرہ۔

آزادی کے بعد بھی نئے ہندوستان کی تعمیر میں بیگم سایانی نے ایک فعال کردار ادا کیا۔ ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر حکومت نے انھیں متعدد اہم جگہوں کے لئے نامزد کیا مثلاً جسٹس آف پیس، نوعمر ملزموں کی عدالت کی آنریری مجسٹریٹ، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، نیشنل کمیٹی ویمینس ایجوکیشن، قومی یک جہتی کانفرنس نئی دہلی۔ ریڈیو ایڈوائزری بورڈ بمبئی اور بمبئی بورڈ آف فلم سنسر۔

بیگم کلثوم سایانی نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۹۵۳ء ورکرس ورک شاپ ایجوکیشن سمینار اور ایکسپرٹ ورک شاپ فرانس (Loe Breviere)

۱۹۵۶ء ہندوستانی وفد کی رہنمائی جس نے دو ماہ تک چین کا دورہ کیا۔

۱۹۵۷ء یونسکو کی تعلیم بالغان کی مشاورتی کمیٹی میں ہندوستان کی نمائندگی پیرس

۱۹۵۹ء تعلیم بالغان پر سمینار، ڈنمارک۔

ڈنمارک سے واپسی پر بیگم سایانی لندن، پیرس، میونخ، وی آنا، قاہرہ جدہ، مکہ مدینہ، یروشلم اور کراچی رکتی ہوئی تعلیمی ادارے دیکھتی اور تعلیم بالغان پر لکچر دیتی ہوئی

ہندوستان لوٹیں۔

۱۹۵۷ء میں گاندھی جی کے صلح امن و آشتی کے پیغام کے فروغ کے لیے بیگم سایانی نے گیارہ ممالک کا دورہ کیا اور مختلف تعلیمی اداروں کو دیکھا نیز خواتین کی تنظیموں سے ملاقات کی۔ ان کے لکھے ہوئے چار مضامین "تعلیم بالغان اور میرے تجربات" "ہند و پاکستان دوستی اور میری کوششیں" "ہندوستانی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار" "ہندوستان میں تعلیم بالغان" انڈیا ہاؤس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔

بیگم کلثوم سایانی کی خدمات کو کئی اداروں، انجمنوں اور حکومت کی طرف سے سراہا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں انھیں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۶۹ء میں انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی جانب سے صدر جمہوریہ نے، نہرو لیٹرلیسی ایوارڈ" دے کر عزت افزائی کی۔

۲۸ رمئی ۱۹۸۷ء کو چھیاسی سال کی عمر میں کینسر کے موذی مرض میں یہ فعال مجاہدہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئیں۔

مندرجہ ذیل رسائل و میگزین میں بیگم سایانی کی مختلف سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ FEMINA ۱۰ رجون ۱۹۶۰ء۔

سنڈے ٹائمز آف انڈیا، ۲۸ رستمبر ۱۹۶۷ء

ایوز ویکلی، ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء

سنڈے اسٹینڈرڈ، ۱۴ رستمبر ۱۹۶۹ء

ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۰ رمارچ ۱۹۷۰ء

ہندوستان ٹائمز۔ نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

انڈین ایکسپریس، نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

پیٹریاٹ نئی دہلی۔ ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

اسٹیٹسمین نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

نو بھارت ٹائمز ۱۶ر مارچ ۱۹۷۰ء
بھارت جیوتی ۲۹ر مارچ ۱۹۷۰ء
الاہرام قاہرہ، ۱۰ر جولائی ۱۹۷۰ء
انڈین نیوز، لندن یکم اگست ۱۹۷۰ء
فری پریس بلیٹن - ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء

(Directory of Indian Women Today India International, 1976)

علاوہ ازیں، دیگر معلومات سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی۔ این بنرجی روڈ پٹنہ نے مہیا کیں۔

کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

فاطمہ اسماعیل

فاطمہ اسماعیل بمبئی کے ایک مشہور کچھی میمن خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ والد کا نام حاجی یوسف سوبانی تھا۔ ان کے بھائی عمر سوبانی اور عثمان سوبانی ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں پیش پیش رہے۔ چھوٹے بھائی نے گزشتہ جنگ کے دوران میں نیوی کی بغاوت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس خاندان کا شمار بمبئی کے متمول خاندانوں میں ہوتا تھا۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک میں مالی امداد کے علاوہ ان لوگوں نے عملی حصہ بھی لیا۔ تحریک خلافت کے دوران ان کی والدہ مسز حاجی یوسف سوبانی نے اپنے گھر پانچ سو خواتین کے اجتماع میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستانی دلوں کے بادشاہ کو خیر مقدم کہہ کر ہم بہت خوش ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک مہاتما رشی ہیں، عیسائی انھیں سینٹ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک حریت و مساوات اور جمہوریت کا وعظ کرتے ہیں۔ سنت رسول پر چلنے والے ہیں" (بھارت کی دیویاں تذکرہ ص ۳۳)

فاطمہ نے ۴، فروری ۱۹۰۲ء کو اسی قوم پرور ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کے گھر کی تہذیب حیدرآبادی طرز کی تھی۔ وہ نہایت شستہ اردو اور اچھی انگریزی بولتی تھیں۔ وہ ایک باوقار تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے سینئر کیمبرج اور ۱۹۲۰ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس

لئے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک دی آنا میں میڈیسن کا کورس کیا جو نامکمل رہا۔ ان کے شوہر ہاشم اسماعیل صاحب کئی سال تک مشرقی افریقہ میں ٹریڈ کمشنر رہے انھیں اردو فارسی کا اچھا ذوق تھا، شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

فاطمہ اسماعیل کی طبیعت میں فرسودہ خیالات اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت تھی جس کا اظہار وہ برملا کرتی تھیں۔ جن دنوں سودیشی کی تحریک چل رہی تھی۔ فاطمہ اسماعیل دیسی صنعتوں کے سامان ریل کے ایک خاص ڈبے میں لے کر شہر شہر پھریں اور ان کی نمایش و فروخت سے سودیشی کا پیغام عام کیا۔

۱۹۳۴ء میں وہ انجمن اصلاح نسواں کی سکریٹری اور ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی سکریٹری مقرر ہوئیں، انھوں نے بمبئی کے مسلم محلوں میں تعلیم بالغان کے لیے بھی بہت کام کیا۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی پبلسٹی اور ہوسٹل سکریٹری رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ صوبہ بمبئی کی ویمنس کاؤنسل کی لیبر ذیلی کمیٹی کی صدر بنائی گئیں انھوں نے ملوں کے گردونواح کی چالوں میں سماجی بہبود کے مراکز قائم کیے۔ وہ کل ہند دیہی صنعتوں کی تنظیم کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھیں۔ شملہ کی پہاڑیوں میں انھوں نے دستی ملوں کا آٹا و چاول عام کرنے میں بھی نمایاں کام کیا۔

فاطمہ اسماعیل آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۳۴ء کے بمبئی اجلاس اور ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ اجلاس میں شریک ہوئیں۔ اور کھادی، سودیشی نیز ہندو مسلم اتحاد کے لئے بمبئی شملہ اور مشرقی افریقہ میں مسلسل کام کرتی رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ پلاننگ کمیشن کی ویمنس کمیٹی کی ممبر مقرر ہوئیں۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں نمایاں حصہ لینے کے سبب وہ انڈر گراؤنڈ رہیں۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ان کی سات آٹھ سال کی بچی کو پولیو ہو گیا جس کے سبب اس کا پیر مفلوج ہو گیا۔ اس کے علاج کے لئے فاطمہ اسماعیل پورے ہندوستان میں پھریں، امریکہ گئیں مگر اس کا علاج نہ جب تھا نہ اب ہے۔ البتہ اس مرحلے میں اتنا معلوم ہوا کہ اس مرض سے پیدا شدہ خرابی خاصا

قسم کی ورزش سے بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ورزش کے وہ خاص طریقے سیکھے اور خود ہی بچوں کو ورزش کرانے لگیں۔ یہ کوشش انتہائی صبر آزما ثابت ہوئی مگر فاطمہ اسماعیل دھن کی پکی تھیں وہ ہار ماننا نہیں جانتی تھیں۔ جب انھیں بچی کے معاملے میں کچھ مہینوں کے بعد کامیابی کے آثار نظر آئے تو انھوں نے سیاسی نیز دوسرے کام چھوڑ کر بمبئی کے مشہور سرجن بالیگا کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کے لئے ایک کلینک کھولا۔ گذشتہ عالمی جنگ کے دنوں میں بمبئی کے جنوبی حصّے کے ایک میدان میں فوجی ضرورت کے لئے ایک شیڈ بنا تھا۔ اس کے ایک حصے میں حکومت نے ان دونوں کو کلینک کے لئے جگہ دے دی۔ اس میں ورزش کے لئے سامان مہیا کئے گئے، معذور بچوں کو لانے کے لئے ایک بس خریدی گئی۔ فاطمہ اسماعیل نے اپنا سارا وقت اس مرکز کے لئے مختص کر دیا۔ عطیات، چندے سرکاری و نیم سرکاری امداد غرض ہر طرح سے انھوں نے اس کے اخراجات کے لئے روپے جمع کئے۔ بیرونی ممالک کے فلاحی اداروں نے بھی مدد پہنچائی لوگوں میں بھی اسکی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ ان معذور بچوں کو ہمیشہ کیلئے اپاہج ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں فاطمہ نے دوسرے سماجی کارکنوں کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کو برسر کار لانے کیلئے ایک سوسائٹی قائم کی وہ نہرو خاندان سے بہت قریب تھیں ان کی سفارش پر حکومت بمبئی نے حاجی علی کے سامنے ایک قطعہ زمین اس سوسائٹی کو دینا منظور کر لیا۔ اس پر ایک اچھی خاصی عمارت بنائی گئی جس کا افتتاح خود وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کیا۔ یہ مرکز آج بھی پولیو زدہ بچوں کو برسر کار لانے میں بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بچّے آتے ہیں۔

فاطمہ اسماعیل نے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ معذور بچوں کی بحالی، خواتین کے حقوق نیز سماج کے پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح و بہبود کیلئے انکی کوششیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہندوستانی

مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ جسمانی طور پر معذور بچوں کی بحالی کی خدمات کے عوض ۱۹۵۸ء میں انھیں 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۷۲ء میں 'دلت مترا' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں بیرونِ ملک کے بھی اعزاز ملے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۰ء تک فاطمہ اسماعیل راجیہ سبھا کی ممبر نامزد رہیں۔ ملک کے مختلف رسائل میں ان پر مضامین لکھے گئے۔ پیرس سے ان کی سوانح حیات بھی شائع ہوئی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو طویل بیماری کے بعد چھیاسی سال کی عمر میں انکا انتقال ہو گیا ایک ممتاز سماجی خدمت گار اور مجاہدہ آزادی کی حیثیت سے ان کے کارنامے نئی نسل کیلئے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور ان حیات بخش نقوش سے نئی نسلیں زندگی و آزادی کی قندیلیں روشن کر سکیں گی

(Directory of Indian Women Today India International, p. 461 1976, P. 383)

نوٹس : جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ)

بیگم سلطانہ حیات انصاری

بیگم سلطانہ حیات نے قوم پرستی وراثت میں پائی ہے۔ ان کے خاندان نے ہمیشہ ہی انگریزی سامراجیت سے ٹکر لی۔ ان کے پر دادا کے والد قاضی ضیاء الدین صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کے شہر قاضی اور کسی سرکاری عہدے پر بھی فائز تھے جس سے انھوں نے بعد میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب بخت خاں بہادر شاہ ظفر کے انکار کے بعد مایوس ہو کر ہمایوں کے مقبرے سے نکلے تو چڑھتی ہوئی جمنا کے کنارے کنارے شمال کی جانب رُخ کیا اور قاضی صاحب کو اطلاع دی۔ انھوں نے بخت خاں اور ان کی فوجوں کو اپنا بجرا بھیج کر بلایا۔ بجرے کو آگ لگوا دی تاکہ انگریزی فوجیں اسے استعمال نہ کر سکیں۔ اور پھر بخت خاں کو مع ان کی فوج کے فرار ہونے میں مدد دی جس کے سبب ہڈسن نے ان کے گھروں کو مسمار کر دیا تھا۔ کچھ افراد کو توپ سے اڑا دیا گیا تھا۔ ان کے دادا مرحوم قاضی نجم الدین صاحب نے اپنے گھر "قاضی نجم الدین ہاؤس میرٹھ" کا ایک حصّہ کانگریس و خلافت وغیرہ کے دفتر بنانے کے لئے مفت دے رکھا تھا۔ نجم الدین ہاؤس میں یہ دفتر ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ ۱۹۲۷ء تک کھادی بورڈ کا دفتر بھی اسی گھر میں تھا۔ قاضی نجم الدین صاحب عرصے تک کبھی شہر کانگریس اور کبھی ضلع میرٹھ کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔

بیگم سلطانہ حیات کے والد قاضی بشیر الدین احمد صاحب ۱۹۱۲ء میں ہلال احمر

میں طبی وفد کے ہمراہ اپنے ذاتی خرچ پر ٹرکی گئے تھے۔ غالباً وہ واحد شخص تھے جو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی بھی بہ آسانی بول سکتے تھے۔ انھوں نے وفد کے مترجم کی خدمت بھی انجام دی۔ آصف علی مرحوم جب دہلی میں گرفتار ہوئے وہ اس وقت صوبہ دہلی کے کانگریس کے سکریٹری تھے انھوں نے قاضی صاحب کو دلی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا۔ ایک عرصہ تک کانگریس میں سرگرم عمل رہنے کے بعد انھوں نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

بیگم سلطانہ حیات نے جس ہماآزادی کی سرگرمیوں کے درمیان آنکھ کھولی اس کے نقوش ان کے دل و دماغ پر بچپن سے ہی بہت گہرے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات و عقائد پر اپنے دادا مرحوم کی چھاپ تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانے کے کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کی بھی ان کے یہاں آمد و رفت تھی۔ مثلاً موتی لال نہرو، سیٹھ چھوٹانی، مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی، مسز کملا دیوی چٹو پادھیائے مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حفظ الرحمان صاحب وغیرہ، ان شخصیتوں نے انھیں ابتدا ہی سے متاثر کیا ان کے گھر کی آئے دن خانہ تلاشی ہوا کرتی تھی۔

بیگم سلطانہ حیات شروع ہی سے کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ جب جب کانگریس کی کوئی تحریک چلی وہ جلسے جلوس میں شرکت کرتی رہیں اور دوسری بہنوں کے ساتھ جھنڈا اونچا رہے ہمارا نظمیں بھی گاتی رہیں۔ خاصی کم عمری میں انھوں نے میرٹھ کی جامع مسجد میں بھی تقریر کی تھی۔

"ہندوستان چھوڑو" تحریک کے وقت انھوں نے لڑکیوں کی ایک تنظیم بھی بنائی تھی جس کا مقصد ہر ممکن طریقے پر انگریزی سرکار کو پریشان کرنا تھا۔ اس چھوٹی سی تنظیم نے جس میں ہندو مسلمان سبھی لڑکیاں شامل تھیں فرسٹ ایڈ کی ایک جماعت بھی بنائی تھی جس نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں جہاں بھی مرد و عورتوں پر لاٹھیاں پڑیں گی وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے

پہونچ جائیں گی ۔ یہ لڑکیاں محکمۂ ڈاک کو پریشان کرنے کے لئے ڈاک میں بغیر ٹکٹ کے خطوط ڈالتی تھیں تاکہ وہ بیرنگ ہو جائیں ۔ اسی وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ سبھی لڑکیاں و خواتین اپنی عزت و ناموس کی خاطر چھوٹے چھوٹے خنجر رکھیں گی ۔ سلطانہ بیگم نے اپنے دادا کی مدد سے یہ خنجر بنوا کر سیاسی سرگرمیوں میں ملوث خواتین میں تقسیم کئے تھے (حالانکہ اب وہ خودکشی حرام سمجھتی ہیں) سیاسی تحریک کا یہ وہ موڑ تھا جب تنظیم کی لڑکیاں جوش سے بھری ہوئی تھیں ۔ لیکن کام کے لئے عملی اعتبار سے میدان بہت کم تھا غیر شادی شدہ لڑکیوں کو سیاست میں براہِ راست حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی ۔ ان کی ایک قریبی ساتھی ویر بالاجی کا تو اسی سبب دماغ بھی خراب ہو گیا تھا ۔ سلطانہ خود بھی بیمار رہیں ۔ ان کا وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہوا تھا ۔ لیکن کسی سبب گرفتاری عمل میں نہیں آئی ۔ ان کے اس زمانے کے احساسات اور کچھ واقعات انھیں کی زبانی سنیئے :

"جب ہمارے گھر سے بدیسی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹنگ کرنے کے لئے خواتین کی ٹولیاں جاتی تھیں تو میں بہت چھوٹی تھی اور جب بڑی ہو گئی تو پتہ چلا کہ مسلمان لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا ۔ ہندو لڑکیاں بھی کسی طرح کی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں بس گھروں میں رہ کر جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ کیا گیا ......

یہ کوئی ۱۹۴۳ء ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہو گا کہ میرٹھ میں بیگم نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم نے بزم خواتین کے نام سے خواتین کی ایک جماعت بنائی اور اس سے ملحق لڑکیوں کے لئے خدمات ملت کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ۔ مسوری کے ایک اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے مجھے پی ۔ ٹی ۔ آتی تھی ۔ چنانچہ میں بیگم صاحبہ کی خواہش کے مطابق "خادمات ملت" کو پی ۔ ٹی کراتی تھی جس میں چھوٹی بڑی سب لڑکیاں شامل تھیں ۔ اسی زمانے میں عربک کالج دہلی میں مسلم خواتین کی ایک کانفرنس بہت دھوم دھام سے بلائی گئی ۔ جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر سے خواتین آئی تھیں ۔ شلاً فاطمہ بیگم صاحبہ مرحومہ محبوب عالم صاحب

پیسہ اخبار“ کی صاحبزادی لاہور سے ، مسز حکیم صاحبہ کلکتہ اور بیگم اعزاز رسول صاحب لکھنؤ سے آئی تھیں، میرٹھ سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے اور میری بہن زہرا بیگم صاحبہ کو بھیجا گیا تھا خیال تھا کہ یہ دو روزہ کانفرنس مسلمان خواتین کی فلاح وبہبود کے لئے منعقد کی جارہی ہے مگر دہلی آکر مجھے پتہ چلا کہ اس کانفرنس میں مسلم گرلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جارہی ہے اور یہ کانفرنس مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کے اشارے پر بلائی گئی ہے۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو یقین ہے کہ بیگم اسماعیل خاں صاحبہ مرحومہ کم ازکم مجھے نمائندہ بنا کر نہ بھیجتیں۔ کیونکہ میرے خیالات سے سب واقف تھے اور میں اس وقت کانگریس کے جلسوں میں برابر شرکت کرتی تھی۔ کانگریس کی والینٹر لڑکیوں میں شامل تھی اور لاٹھی وغیرہ چلانا سیکھ رہی تھی۔

جب مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا ریزولیوشن پیش ہوا تو میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ جب گرلس فیڈریشن موجود ہے تو مسلم لڑکیوں کے لئے الگ فیڈریشن کی کیا ضرورت ہے۔ چند اور لڑکیوں نے بھی ساتھ دیا۔ یہ بحث پورے دن چلی۔ چاروں طرف سے اتنا زور پڑا کہ ہمارا ساتھ دینے والی لڑکیاں اور خواتین نے ہمارا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ بیگم اعزاز رسول صاحبہ نے سخت ترین طریقے پر ہماری مخالفت کی اور اگلے دن ہم دونوں بہنیں اکیلی رہ گئیں۔ ہماری ساری دلیلوں کا جواب یہ تھا ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“۔ چنانچہ مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن بن گئی اور سارے ہندوستان کے اخباروں میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔“

”میں کانگریس کی تحریکوں میں کھل کر تو سماجی قیود کی وجہ سے نہ آسکی مگر ہر تحریک کی جس قدر بھی مدد کی جاسکتی تھی کی۔ مثلاً ۱۹۴۱ء جب انفرادی ستیہ گرہ ہو رہی تھی میں اس وقت سیوا گرام آشرم میں تھی۔ ایک روز یہ پتہ چلا کہ باپو نے پیارے لال بھائی کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت

دے دی ہے۔ اور وہ اگلے روز صبح سیواگرام آشرم ستیہ گرہ کرنے لئے چلے جائیں گے۔ میں مسز کستوربا گاندھی کی کٹیا میں تھی جو مجھ سے ہمیشہ بہت محبت سے باتیں کرتی تھیں۔ یہ دوستی اتنی جلدی بڑھ گئی تھی کہ اپنا دکھ درد بھی بتاتی تھیں۔ اس وقت خبر آئی کہ باپو نے یاد کیا۔ میں بھاگتی ہوئی باپو کے پاس پہنچ گئی۔ باپو کے پاس چند حضرات کے علاوہ سردار وٹھل بھائی پٹیل، پیارے لال بھائی بھی بیٹھے تھے اور پیارے لال بھائی کے آگے کچھ مسودات رکھے تھے۔ پتہ چلا کہ پیارے لال بھائی نے صوبہ سرحد میں باپو کے دورے کے متعلق جو مسودہ ہندی میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ بھی کر لیا ہے مگر وہ اشاعت سے پہلے کسی اردو داں کو دکھانا چاہتے ہیں اور یہ کام صبح ان کے جانے سے پہلے پورا ہو جانا چاہیئے اور یہ خواہش باپو کی بھی تھی۔ سردار صاحب بولے اردو آتی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا "تھوڑی سی"۔

سردار صاحب بولے "رات بھر جاگ لو گی؟" مسودہ موٹا سا تھا۔

"پیارے لال بھائی ستیہ گرہ کرنے جا رہے ہیں ان کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے" میں نے کچھ اس طرح کا جواب بڑی عقیدت سے دیا تھا۔

باپو سونے کے لئے اٹھ گئے اور جاتے جاتے فرما گئے کہ یہ کتاب کل چھپنے چلی جاتی تو اچھا ہوتا۔ جاتے جاتے مڑے اور پھر مجھ سے کہا "بہت نیند آئے تو سو جانا"۔ پیارے لال بھائی اور میں باپو کی کٹی میں ہی بیٹھ گئے کیوں کہ یہاں جو لالٹین جل رہی تھی اس میں غالباً تیل زیادہ تھا اور روشنی بھی تھی۔ پیارے لال بھائی نے مجھے اردو مسودہ دے دیا اور خود ہندی کا لے لیا۔ کبھی وہ زور سے پڑھتے تھے اور کبھی میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے تاکہ صبح تک یہ کام پورا ہو جائے۔ بیچ بیچ میں تصحیح بھی کی جا رہی تھی۔ نیند کا جب شدید حملہ ہوتا تھا تو باہر برآمدے میں جا کر منہ دھو لیتی تھی اور پانی پیتی تھی ایک

عجیب ولولہ تھا کہ کتاب ختم کر دوں۔ ایک ستیہ گرہی کی خواہش اور باپو کا حکم۔ چنانچہ جب صبح کاذب کا وقت ہوا اور چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تو مسودے کے ایک یا دو صفحے باقی تھے۔ میں تصحیح کر رہی تھی تو پیارے لال بھائی اٹھ کر باہر چلے گئے باپو اپنی کٹی کے باہر ہی میدان میں سوتے تھے پیارے لال بھائی اس طرف سے گزرے تو مجھے باپو کی آواز آئی۔

"کتنا کام ہوا؟"

پیارے لال بھائی نے جواب دیا کہ کتاب پوری ہو گئی۔ پھر باپو نے یہ بھی سوال کیا کہ میں سوئی تو نہیں تھی "نہیں بہت مستعدی سے کام کیا۔" پیارے لال بھائی نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہ میری تصحیح سے بہت مطمئن ہیں۔ بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی۔"

"میں نے دوسرا کام انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں یہ کیا کہ مجھے ناگپور میں اپنے دادا ابا قاضی نجم الدین مرحوم کا خط ملا کہ انھوں نے باپو کو خط لکھا ہے کہ ان کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت دی جائے مگر ابھی تک اجازت نہیں ملی۔ میں اس خط کو لے کر باپو کے پاس گئی۔ باپو خوش ہوئے، بولے یہ بتاؤ کہ قاضی صاحب کی عمر کیا ہے۔ باپو نے ابا جی مرحوم کو بڑی محبت کا خط لکھا مگر ستیہ گرہ کی اجازت نہیں دی۔ میں میرٹھ واپس چلی آئی۔ اسی زمانے میں کراچی میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اخبارات میں کانگریس کے ایک ریزولیوشن کا ذکر تھا۔ میں نے باپو کو خط لکھا کہ کانگریس کراچی میں جو ریزولیوشن پاس کر رہی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس نے ستیہ گرہ کو بطور اصول نہیں بلکہ بطور پالیسی اختیار کیا ہے تو یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے وغیرہ۔

باپو نے جواب میں کارڈ لکھا جو میرے پاس اب تک ہے اور پھر کراچی کے اجلاس کے بعد انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔" کارڈ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۲ء میں انھوں نے لکھا "اس بارے میں تمہاری رائے بالکل صحیح ہے۔"

بیگم سلطانہ کے نام مہاتما گاندھی کا ایک اور خط مندرجہ ذیل ہے۔

"بی بی سلطانہ کو میں نے میرا سوت دیا ہے، اس کو وہ بیچے گی اور اس سے جو پیسے ملیں گے وہ دین بندھو معموریل (میموریل) میں دیئے جائیں گے"۔ موک گاندھی

اس زمانے میں گاندھی جی اردو میں دستخط اس طرح کرتے تھے۔

سلطانہ حیات صاحبہ نے ایک مرتبہ گاندھی جی سے شکایت کی تھی کہ آپ نے کہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہے تو اسے رکھیں، چاہے تو مٹا دیں وہ جس دن اُن سے ملیں وہ گاندھی جی کی خاموشی کا دن تھا۔ شکایت کا جواب انھوں نے لکھ کر دیا۔ "تم نے بحث دیکھی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کر بھیج سکتا ہوں" اس پر سلطانہ نے کہا کہ اردو کے ہر اخبار اور رسالے میں آپ کے اس جملے کو دہرایا جا رہا ہے۔ "تو پھر گاندھی جی نے لکھ کر دیا۔ "کیا کیا جائے؟ اخباروں میں بہت سی باتیں غلط لکھی جاتی ہیں۔ اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ"۔ کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا"

مہاتما گاندھی کے علاوہ بیگم سلطانہ حیات کی اردو کے سلسلے میں پنڈت سندر لال جی، راجکماری امرت کور اور پیارے لال بھائی وغیرہ سے بھی خط و کتابت رہی تھی۔

۱۹۴۲ء میں ان کی شادی حیات اللہ انصاری صاحب سے ہوئی جو بذات خود قومی رہنماؤں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بیگم سلطانہ حیات کی تعلیم بی اے تک ہے۔ نیز جرنلزم کی ٹریننگ بھی لے چکی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد سے انھوں نے سیاست سے الگ ہو کر اردو کا کام کرنا شروع کیا۔ اتر پردیش کی دستخطی مہم جس نے اردو کی حمایت میں ۲۰ ½ لاکھ دستخط جمع کئے تھے، بیگم سلطانہ حیات اس کی آفس سکریٹری بھی رہی ہیں۔ اس وقت وہ ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی صدر ہیں۔ انھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا

ہے۔ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں انھوں نے عورتوں کی مشہور جماعت "بزمِ خواتین" کی بنیاد ڈالی۔ جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی شاخیں بھی دوسرے شہروں میں قائم ہو رہی ہیں۔ آزادی سے قبل انھوں نے مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اور آج بھی ہندو احیا پرستی اور مسلم فرقہ واریت سے مقابلہ میں مصروف ہیں۔

(ذاتی انٹرویو بیگم سلطانہ حیات انصاری۔ ۲۴ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ نئی دہلی۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۸۰ء)

ہاجرہ زیڈ احمد

بیگم ہاجرہ زیڈ احمد جو عام طور پر ہاجرہ آپا کے نام سے جانی جاتی ہیں، ۲۲ دسمبر ۱۹۱۰ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ریاست رام پور میں نائب تحصیلدار تھے، والدہ کا نسب روہلکھنڈ ہی کے نواب نجیب الدولہ سے ملتا ہے والد والدہ دونوں روہیلہ پٹھان تھے۔ والدہ کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا، والد کے ساتھ انھوں نے متعدد شہروں میں رہائش اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم قرآن شریف اور اردو فارسی میں ہوئی۔ نوابی خاندان سے تعلق کی بنا پر لاہور کے کوئینز میری کالج میں داخلہ ہوا۔ ہاجرہ بیگم ایک اچھی طالب علم تھیں انگریزی، حساب، اردو اور کھیل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے پنجاب سے میٹریکولیشن امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں ان کی شادی خاندان ہی میں ایک پولیس افسر کے ساتھ ہوئی جن کے ہمراہ وہ گونڈہ، رائے بریلی اور لکھنؤ رہیں۔ ۱۹۳۱ء میں وہ ایک بیٹے کی ماں بنیں اور ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں انھوں نے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔
۷ اگست ۱۹۳۳ء میں اپنے دو سالہ بیٹے کے ساتھ بذریعہ سمندری جہاز لندن گئیں اور ۱۹۳۵ء میں مانٹی سوری کالج سے ٹیچرس کا ڈپلوما حاصل کیا۔

ہاجرہ بیگم لندن میں سجاد ظہیر اور ریبہ مودداس گپتا کی رہنمائی میں قائم کردہ

طالب علموں کی تنظیم کی رکن بن گیئں۔ سی۔ جی۔ بی کے واسطے سے رالف فوکس
سے رابطہ قائم کیا۔ نیز دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ انھیں
مختلف مباحثوں، لکچرس اور عوامی جلسوں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا۔
پارٹی کا لیٹریچر فروخت کرنے نیز چندہ جمع کرنے میں انھوں نے فعال کردار ادا کیا۔
اٹلی میں وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئیں۔ ہندوستانی وفد کے
ممبر کی حیثیت سے انھوں نے فاشزم اور جنگ کے خلاف برسلز میں منعقد ایک
بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۵ء میں طالب علموں کے ایک گروپ
کی ممبر کی حیثیت سے وہ پندرہ دن کے لئے لندن سے روس بھی گیئں غالباً وہ روس
جانے والی پہلی مسلمان لڑکی تھیں۔

ہندوستان واپس آنے پر ستمبر ۱۹۳۵ء میں کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ میں ہاجرہ
بیگم کا تقرر بحیثیت ٹیچر انچارج جونیر اسکول ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر کے ساتھ
انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے لئے بہت کام کیا۔ کمیونسٹ
پارٹی ان دنوں غیر قانونی پارٹی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے پی۔ سی جوشی کے ساتھ جو ان دنوں
لکھنؤ میں انڈر گراؤنڈ تھے، پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

۲۰ رمئی ۱۹۳۵ء میں پارٹی کی اجازت سے ان کی دوسری شادی مسٹر زیڈ احمد
کے ساتھ سجاد ظہیر کے مکان پر ہوئی۔ زیڈ احمد ان دنوں سندھ میں ایک کالج
کے پرنسپل تھے۔ پارٹی کی ہدایت پر ہاجرہ بیگم لکھنؤ اور زیڈ۔ اے۔ احمد حیدرآباد سے
تدریسی کام سے مستعفی ہوگئے اور الہ آباد میں پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ پارٹی کے
فیصلے کے مطابق انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی
کی رکنیت اختیار کی، لیکن خفیہ طور پر آر۔ ڈی۔ بھاردواج کی رہنمائی میں مسٹر
زیڈ احمد۔ مسٹر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ انھیں خصوصی
طور پر خفیہ پتوں کا ریکارڈ رکھنے، لٹریچر تقسیم کرنے اور پارٹی کے اخراجات کا حساب
دیکھنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں عرش دیو مالویہ۔ او پی سنگال،

رمیش سنہا اور پی۔ ڈی۔ ٹنڈن وغیرہ کے ساتھ پارٹی کے الہ آباد سیل
سے وابستہ کر دی گئیں۔ ایودھیا پرشاد، ارجن ارورہ، سنتوش چند کپور،
سنت سنگھ اور دوسروں کے ساتھ یوپی کی پہلی خفیہ کمیونسٹ پارٹی میں شرکت
کی۔ ہاجرہ بیگم پارٹی کی صوبائی کمیٹی میں بھی رہیں اور الہ آباد میں ضلع کمیٹی منظم
ہو جانے پر اس کی باقاعدہ رکن بن گئیں۔ بعد میں اس کی سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالا
اس وقت صرف چند خواتین ہی ضلع کمیٹی کی سکریٹری تھیں۔

۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر بنے تو انھوں نے
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کئی شعبوں میں تقسیم کیا۔ مسٹر زیڈ۔ اے احمد کو معاشیات
کے شعبہ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ہاجرہ بیگم نے "ماس کانٹیکٹ (Mass Contact)
پروگرام کے تحت خصوصی طور پر خواتین میں کام کیا۔ کانگریس کے سبھی قمی الکشنوں
میں نمایاں حصہ لیا۔ اور محلہ محلہ جا کر اس کے لئے کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مسٹر ہری کے
لئے الہ آباد میں اور ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کے لئے فیروز آباد کے الکشن میں فعال کردار
ادا کیا۔ پنڈت سندر لال کی رہنمائی میں "امن دستوں" میں شامل ہو کر
فرقہ وارانہ فسادات ختم کرانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ہاجرہ بیگم کانگریس کے
فیض پور، ہری پورا اور رام نگر کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئیں۔ انھوں
نے کچھ عرصہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے سٹی آفس کی سکریٹری کی حیثیت سے بھی
کام کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں ہاجرہ بیگم اور مسٹر زیڈ۔ اے احمد کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔
کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ ممبر کی حیثیت سے ہاجرہ بیگم نے متعدد عہدوں پر کام
کیا۔ ٹریڈ یونین تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواتین کی تنظیموں میں نمایاں
کام کیا اور آج بھی ادبی سماجی تحریکات میں پیش پیش رہتی ہیں۔ لینن صدی
تقریبات کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء میں سپریم سوویت کے جوبلی میڈل کے اعزاز
سے بھی انھیں نوازا گیا ہے۔ (تفصیلات ہاجرہ بیگم نے بذات خود مہیا کیں)

اٹھی ہیں سب کی نگاہیں جہاں سے گذرے ہیں

زہرہ انصاری

انڈین نیشنل کانگریس کی جہدِ آزادی میں قربانیوں کی داستان ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اہم کردار کے تذکرے کے بنا مکمل نہ ہو سکے گی جن کے قومی جوش اور مجاہدانہ جذبے کو سیاسی نشیب و فراز قیدِ فرنگ نیز اپنے اور بیگانوں کی خفگی بھی متزلزل نہ کر سکی۔ انصاری صاحب کی غیر معمولی فعال زندگی کے پس پشت شمس النساء بیگم انصاری کا کردار بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ میدانِ عمل میں ان کی برابر کی شریک تھیں۔ گو دائرۂ کار مختلف تھے۔ محترمہ زہرہ انصاری کے بارے میں کچھ تحریر کرنے سے قبل اس ماحول کا جاننا ضروری ہوگا جس میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔

ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے مطابق بیگم انصاری ایک معزز و متمول مسلم پردہ نشین خاتون کا مثالی نمونہ تھیں۔ وہ فارسی، عربی نیز اردو کی عالمہ تھیں اس لئے فرصت کے اوقات مطالعے میں گذارتیں۔ وہ انتہائی نیک اور مخیر خاتون تھیں۔ پردے کی سخت پابندی کے باوجود مہاتما گاندھی کے سامنے آتی تھیں۔"

Halide Edib; Inside India (London, 1937) quoted in "Muslims and the Congress: p. 312

ڈاکٹر انصاری اکثر و بیشتر گاندھی جی کو پندرہ بیس منٹ کے لئے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے جاتے تھے جہاں وہ بیگم صاحبہ سے ملاقات و گفتگو کرتے تھے۔

Zohra Ansari : Oral History Transcript Part II

Teen Murti Library, New Delhi.

گاندھی جی جب لارڈ ارون سے گفتگو کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھے تو انھوں نے بعنوان "انصاری دھرم شالہ" بتاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کے "نوجیون" (گجراتی) میں بیگم انصاری کے متعلق لکھا تھا۔ "مجھے ڈاکٹر انصاری کی فیاضی کا بخوبی تجربہ تھا لیکن میرے دہلی کے دوران قیام تو اس کی انتہا ہی ہو گئی ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا کہ ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبران ان کے یہاں قیام کریں گے ان کا وسیع و عریض بنگلہ بھی جب اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا تو کمپاؤنڈ میں ہی شامیانوں کا انتظام کیا گیا۔ تقریباً سو اشخاص روزانہ ان کے یہاں کھانا کھاتے تھے۔ ان کی بہت بڑی پریکٹس بھی تھی۔ مختلف مقامات سے لوگوں کے آنے کا تانتا بھی بندھا رہتا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے بحث و مباحثہ بھی جاری تھا۔ اس پر اتنے افراد کی میزبانی لیکن اس مصروفیت کے باوجود میں نے کبھی ڈاکٹر صاحب کو پریشان یا خفا ہوتے نہیں پایا۔ نہ ہی میں نے کبھی ان پر تھکن کے آثار پائے۔ اس غیر معمولی بندوبست کے پس پشت صرف بیگم انصاری کا ہاتھ تھا۔ ایک دن بیگم صاحبہ کی موجودگی میں ہی میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "آپ کس طرح اپنے غیر معمولی فرائض کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کے فرائض بھی ایسی خوش دلی سے انجام دے لیتے ہیں" انھوں نے جواب دیا اس کا سہرا صرف بیگم صاحبہ کے سر ہے میں جو کچھ کماتا ہوں انھیں سونپ دیتا ہوں وہ اردو حساب میں ماہر ہیں۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہیں۔

اور جس طرح چاہتی ہیں خرچ کرتی ہیں۔ اس لئے گھریلو محاذ پر مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ سن کر میں نے فرطِ عقیدت سے اپنا سر بیگم انصاری کے سامنے جھکا دیا۔"

Collected Works: XLV (1930-1931), p.361.

نمبر ایک دریا گنج میں تین علیحدہ باورچی خانے تھے ایک مسلم باورچی خانہ دوسرا سبزی کھانے والے حضرات کے لئے اور تیسرا یوروپین کھانوں کے لئے مخصوص تھا بیگم انصاری سبزی والے باورچی خانے کیلئے اتنی محتاط تھیں کہ انھوں نے کبھی مسلم باورچی خانے کے برتن وہاں لے جانے کی اجازت نہیں دی ایک پنڈت جسے روزانہ کا راشن اور دیگر ضروریات کی اشیا دی جاتی تھیں وہی علیحدہ ملازموں کے ساتھ سبزی والے حضرات کو کھانا کھلاتا تھا۔ بیگم ایک اعلیٰ درجہ کی منتظم اور میزبان تھیں۔

بیگم انصاری سیاسی عقائد کے اعتبار سے بھی انصاری صاحب کی ہم عقیدہ تھیں مثلاً "دہلی ویمنس خلافت کمیٹی کی سربراہ بیگم اجمل خاں اور بیگم انصاری نے بی اماں کے دوران ملاقات خواتین کی آٹھ نشستوں کا اہتمام کیا اور دو ہزار سے اوپر چندہ جمع کیا۔"

Gail Minault: The Khilafat Movement, p.150.

ڈاکٹر انصاری قومی سیاست میں جتنا سرگرم تھے اتنا ہی مشغول اپنی پریکٹس میں بھی تھے۔ اس زمانے میں ان کی ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی بیگم انصاری نے کبھی ان کی غیر معمولی مصروفیت کا شکوہ نہیں کیا بلکہ اندرونِ خانہ انھیں ہر ممکن سکون، تعاون اور فرصت مہیا کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ملک و قوم کو جو کچھ دیا اسکے پس پشت بیگم انصاری کا کتنا اہم کردار تھا اس احساس کے پیش نظر ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے ان کے انتقال پر ان کی بیٹی کو دیئے گئے اپنے تعزیتی تار میں لکھا تھا: "آپ کے والد نے اپنی حیات میں جو کچھ حاصل کیا وہ صرف آپ کی والدہ کے سبب ہی ممکن ہو سکا۔" یہ خراج عقیدت ایک ایسے انسان کی طرف سے تھا جو سیاست اور پیشہ دونوں ہی اعتبار سے انصاری خاندان سے انتہائی قربت رکھتا تھا۔

Zohra Ansari : Oral History transcript
Teen Murti Library, New Delhi.

بیگم انصاری کا انتقال ۱۹۳۸ء میں انصاری صاحب کے دو سال بعد ہوا۔

زہرہ انصاری ڈاکٹر انصاری کی بھانجی اور گود لی ہوئی بیٹی تھیں۔ ان کی محبت انصاری صاحب کی بڑی کمزوری تھی جس کا اعتراف انھوں نے شوکت اللہ انصاری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۲ر مئی ۱۹۳۲ء میں بھی کیا ہے۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا " میری غیر موجودگی میں بیگم انصاری، زہرہ اور قدسیہ کا قیام زیادہ تر دہلی میں ہی رہے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ماہ اگست میں جب اسکول بند ہوں یہ لوگ کسی پہاڑی مقام یا کم از کم حیدرآباد دکن ہی چلی جائیں لیکن زہرہ کو اپنے اساتذہ سے اتنی لمبی رخصت ملنا مشکل ہے خصوصاً کیمسٹری اور انگریزی کے استادوں کی خواہش ہے کہ انھیں تعطیلات میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہیئے۔ خود زہرہ کی بھی یہی خواہش ہے مجھے ان کی صحت کی طرف سے فکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دو ماہ کی تعطیلات کے بعد وہ اپنی پڑھائی بہتر طور پر کر سکینگی لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو زہرہ میری کمزوری ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیئے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی اماں جان اور قدسیہ کے ساتھ اس وقت تک کے لیئے چلی جائیں جب تک تعلیم کا نقصان نہ ہو۔"

Mushirul Hasan: Muslims and the Congress, p.155.

(بعد میں انھیں شوکت اللہ انصاری کے ساتھ جو ڈاکٹر انصاری کی بہن قمر النساء کے بیٹے تھے ان کی شادی ہوئی)

" زہرہ انصاری" دار السلام " (ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دہلی رہائش گاہ کا نام جس کے معنی ہیں امن و سلامتی کا گھر) اسلام کا گھر کی پروردہ تھیں اور اس کی تمام روایتیں انھوں نے وراثت میں پائی تھیں۔ ترکی کی ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے ان کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا: " ان کی زندگی میری ۳۵ سال قبل کی زندگی کا ایک عکس ہے وہ اتنی منفرد شخصیت کی مالک ہیں کہ اسے بیرون پردہ یا اندرونِ پردہ، کسی ایک خانے میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ گو " دار السلام " کا طرزِ معاشرت قطعاً مشرقی ہے تاہم بیگم انصاری اپنے شوہر یا دیگر افراد کے مغربی انداز میں کبھی مخل نہیں ہوئیں۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں۔ اسی لیئے نوجوان

زہرہ کو آزاد زندگی کے منازل طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کھانے میں شریک ہوتی ہیں لیکن جب مہمانِ خصوصی مدعو ہوں۔ ساڑی پہننے میں انھیں قطعاً کسی دشواری کا احساس نہیں۔ موٹر اسی اعتماد سے چلاتی ہیں جیسے کوئی امریکن لڑکی انھیں اپنے ملک کے تمدن اور سیاسی مسائل سے انتہائی دلچسپی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو آئندہ زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنے میں ان کا ماحول انتہائی صحت مند ہے...... زہرہ کو میری ہی طرح تاریخ وادب سے دلچسپی ہے جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لئے باعثِ شگون بھی ہے۔ زہرہ کو یقین ہے کہ لوگ جس عبوری دور سے گذر رہے ہیں وہ ان کے لئے سبق آموز بھی ہے۔ زہرہ کو اپنے مُلک کی تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ لیکن ایک نوجوان رومانی تخیل کے باوجود ان کے فیصلے جذبات سے متاثر نہیں ہوتے۔ شاید مسلمان ہونے کے سبب انھیں نہ احساس برتری ہے۔ نہ احساس کمتری۔ وہ مسلمانوں کو کوئی غیر قوم نہیں سمجھتیں جس کی ایک اجنبی زمین میں پیوندکاری کی گئی ہو اور اب وہ اس کا مقدر بن چکی ہو۔ وہ ہر اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کی زندگی میں اشوک کی اتنی ہی تاریخی اہمیت ہے جتنی ہمایوں اور بابر کی۔ میرا قیاس ہے کہ جامعہ کے اساتذہ کی قربت نے ان کے زاویۂ نظر کو متاثر کیا ہے۔"

"میں ان کی صبح کی آمد کی منتظر رہتی تھی۔ وہ اکثر دہلی کی سیاحت میں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ دہلی کی یادگار تاریخی عمارتوں کو انھوں نے میرے لئے ایسا جیتا جاگتا روپ عطا کردیا تھا جس کے بغیر وہ شاید میرے لئے پتھروں کا ایسا ڈھیر ثابت ہوتے جنھیں محض خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہو۔ وہ ان تمام افراد سے وابستہ روایتوں سے بھی باخبر تھیں جن کی زندگی ان کھنڈرات سے منسلک تھی۔"

Halide Edib, Inside India (London, 1937) quoted in "Muslims and the Congress: p.313-314.

ملکی سیاست سے زہرہ انصاری کو گہری دلچسپی تھی۔ گاندھی جی سے ان کی قربت اور ان کے مسلک کی ہم آہنگی کا اندازہ کئی خطوط سے لگایا جاسکتا ہے ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل ایک خط :

"۳ ؍اکتوبر ۱۹۳۲ء

پیاری بیٹی زہرہ۔ تمہارے دونوں خطوط ملے، خدا کے فضل سے میری صحت بہتر ہو رہی ہے۔ میرا برت خدا ہی کی طرف سے تھا، اسی نے مجھے بحفاظت بچا لیا۔ آؤ ہم سب ہندو مسلم اتحاد کے لئے دعا کریں۔ جب تک یہ مقصد پورا نہ ہو جائے مجھے سکون میسر نہیں ہو سکتا۔ مجھے ابا جان کے خطوط بھی ملتے رہے ہیں۔ تمہیں اب میری استاد بننا بھی قبول کر لینا چاہیئے۔ تمہارے خطوط سے میں اپنے سبق کا کام بھی لیتا ہوں۔ چند ہی افراد مجھے اردو میں خطوط بھیجتے ہیں لیکن تمہاری جیسی خوبصورت تحریر کسی کی نہیں۔ اسی لئے تمہارے خطوط بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ با اس وقت پورے دن کے لئے میرے ساتھ ہیں، سردار اور مہادیو بھی ہیں۔ ابا جان سے سلام کہنا۔ میری طرف سے ڈھیروں دعائیں۔ گاندھی۔"

Collected Works: Vol.LI, p.185.

ایک اور خط ڈاکٹر انصاری کے نام :

" یرودا سنٹرل جیل

۲۲ ؍دسمبر ۱۹۳۲ء

پیارے ڈاکٹر انصاری! زہرہ اور میری خط و کتابت پابندی سے جاری ہے تمہیں اس کی تدریسی استعداد پر اعتبار ہو یا نہ ہو لیکن میری اردو ٹھیک کرنے کے لئے تو وہ بہت محنت کر رہی ہے۔ مجھے جتنے لوگ اردو میں خطوط بھیجتے ہیں کسی کا خط اس سے بہتر نہیں۔ مجھے ہر ہفتے اس کے خط کا انتظار رہتا ہے مجھے اس کی لفظی بندش پسند ہے ہم سب کی طرف سے پیار مخلص۔ م۔ک گاندھی۔

Ansari's Letter Vol.13. Zakir Husain Library, Jamia Millia Islamia, New Delhi.

گاندھی جی کی شخصیت نے زہرہ انصاری کو لڑکپن سے ہی متاثر کیا تھا۔ مدراس کے اجلاس ۱۹۲۷ء سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: گو میں ان دنوں خاصی کم عمر تھی تاہم اس زمانے کی اتنی یاد ضرور ہے کہ میں ہمیشہ ان والنیٹرس کے ساتھ رہتی تھی جو ہمارے خیمے سے کانگریس پنڈال میں جایا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ وہاں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی اور ان کے ساتھ ہی خیمے میں واپس آتی تھی۔ جہاں ہمارا قیام تھا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part II

گاندھی جی جب ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے ساتھ دارالسلام میں مقیم تھے ان دنوں کے تذکرے کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا "میں ان دنوں اسکولی طالبہ تھی لیکن میں جب بھی اسکول سے واپس ہوئی میں نے اپنا گھر مہمانوں سے بھرا دیکھا۔ میں نے باپو کی دعائیہ نشست کبھی نہیں چھوڑی رام دھن میں مجھے خاص لطف کا احساس ہوتا تھا۔" (Ibid)

کنچن ایم۔ شاہ کے نام واردھا سے گاندھی جی کے خط مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء سے زہرہ انصاری کے آشرم میں قیام کی بھی اطلاع ملتی ہے۔

"چر بچیو کنچن! تمہارا خط ملا۔ تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ جلد آجاؤ۔ منالال ابھی واپس نہیں لوٹے۔ باورچی خانہ امت السلام دیکھ رہی ہیں۔ زہرہ ان کی مدد کرتی ہیں۔ یادھلی ہیں۔ کانو راجکوٹ چلے گئے ہیں"۔ باپو کی دعائیں۔

Collected Works: Vol.LXXI, p.35.

زہرہ انصاری جنگِ آزادی میں جیل جانے کی بھی خواہش مند تھیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل خط سے لگایا جاسکتا ہے۔

۲۹ر جون ۱۹۴۱ء

" بیٹی زہرہ! تمہارا خط ملا۔ فرید بھائی نے لکھا ہے کہ تم ان کی والدہ کی بہت اچھی تیمارداری کر رہی ہو۔ خدا تمہارے لئے بہتر ہی کرے گا۔ تھوڑا صبر سے

کام لو۔ ایک دن میں ضرور تمہیں جیل جانے کی اجازت دوں گا۔ امید کہ شوکت بخیریت ہوں گے۔ بچوں کو پیار باپو کی طرف سے دعائیں۔"

Collected Works: Vol.LXXIV, p.131.

(وہ جیل گئیں یا نہیں اس کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں)

" دارالسلام کے سلسلے میں بھی ان کی قربانی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں اس گھر کی اہم تاریخی حیثیت ہے۔ اس میں نہ صرف کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کا قیام رہا ہے بلکہ اس زمانے کے سبھی علمائے کرام کی میزبانی کا بھی اسے شرف حاصل رہا ہے۔ کانگریس اور سوراج پارٹی کی اہم نشستیں بھی یہاں پر ہوئی ہیں۔ زہرہ انصاری صاحبہ کے بیان کے مطابق اس گھر کو اسی انداز پہ قائم رکھنا ہمارے لئے بڑا مشکل تھا۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائیں اور "دارالسلام" کو کرائے پہ اٹھا دیں۔ ہمارے دوستوں کا مشورہ تھا کہ اسے ہم انجمن ترقی اردو کو دے دیں۔ لیکن اچانک ۱۹۴۶ء میں الکشن کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میرے شوہر نے محسوس کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت ہے مسلم لیگ سے مورچہ سخت ہے اور پیسوں کا انتظام انتہائی دشوار۔ میں نے اس وقت اپنے شوہر کی مدد کی اور ورثے میں ملے اپنے اس گھر کو جس کا رقبہ بارہ ہزار اسکوائر یارڈ تھا فروخت کرکے اس رقم سے یوپی میں الکشن کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part I

ان کا انتقال ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء میں انگلینڈ میں ہوا۔ اور وہیں پہ تدفین ہوئی۔

مائی بخت آور

مائی بخت آور ایک سندھی کسان خاتون تھیں۔ شوہر کا نام ولی محمد لاشاری تھا۔ لاشاری گاؤں ضلع تھرپارکر سندھ میں واقع ہے۔ زمینداری ظلم واستبداد برطانوی آمریت کے نظام کا ایک جزو لاینفک رہا ہے ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، زمیندار کے آدمیوں نے لاشاری کے کسانوں کے اناج پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تو اور گاؤں والوں کے ساتھ مائی بخت آور نے بھی بڑی بہادری سے مزاحمت میں حصہ لیا۔ پولیس نے نہتے کسانوں پر فائرنگ کی اور ۲۴ر جون ۱۹۴۶ء میں مائی بخت آور اس فائرنگ میں شہید ہوگئیں۔ ان کے آخری الفاظ تھے "دیکھو وہ ہمارا اناج نہ لے جاسکیں"۔ اس فائرنگ میں ان کے شوہر بھی زخمی ہوئے۔ لاشاری گاؤں میں مائی بخت آور کی شہادت کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ہری کمیٹی ہر سال ان کی یادگار مناتی ہے۔ اس زمانے کے مشہور سندھی شاعر شیخ ایاز نے ان پر ایک نظم لکھی تھی جو آج بھی عوام میں مقبول ہے۔ اس میں کہا گیا تھا "ہمیں موت کے سائے میں آگے بڑھنا ہے، ہماری محبوب ماں بخت آور نے اپنا خون بہایا ہے وہ فردوس بریں سے انھیں سلام بھیجتی ہے جو اس کے نصب العین پر چل رہے ہیں۔ مائی بخت آور کا خون بھی منصور کی مانند "انا الحق" پکارتا ہے۔

مشہور سندھی ادیب منیر مانک نے "شہید بخت آور" کے نام سے

۱۹۶۷ء میں ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی دورِ حکومت میں ۱۹۲۲ء کی "حر" تحریک میں بھی کئی سندھی خواتین شہید ہوئیں۔ ان سے متعلق تفصیلی معلومات ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

(بشکریہ سندھی ادیب جناب اے۔ جے۔ اتم۔ بی۔ ۹ سیتلادیوی روڈ، سندھی نواس، ماہم بمبئی، ذاتی انٹرویو ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء)

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

ماجدہ حسینہ بیگم

غیر معمولی جرأت اور نصب العین میں اپنے کو جذب کر دینے والی ماجدہ حسینہ بیگم کلکتہ کے نچلے طبقے کے عوام کے حقوق کی علمبردار تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جیل گئیں رہائی کے بعد پھر پولیس کے مظالم، سماجی عدم مساوات اور مسلم لیگ کے فرقہ دارانہ تعصب کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئیں۔

(SHANTIMOY RAY : FREEDOM MOVEMENT AND INDIAN, MUSLIMS, People's Publishing House, P. 84)

ظہیرہ بیگم - سلطانہ بیگم

'ابھودایہ' نے اپنی اشاعت بتاریخ ۲۰ راگست ۱۹۳۰ء، بنگال میں پہلی بار دو مسلم خواتین کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ ظہیرہ بیگم و سلطانہ بیگم دونوں پروفیسر عبدالرحیم ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صاحبزادیاں ہیں۔ انھیں شراب و ولایتی کپڑوں کی دوکانوں کے سامنے دھرنا دینے پر گرفتار کیا گیا ہے۔

Women in India's Freedom Struggle : National Archives, New Delhi P. 13

فاطمہ بیگم

فاطمہ بیگم پنجاب کانگریس کی بڑی فعال رکن تھیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کانگریس کے ماس کونٹیکٹ (Mass Contact) پروگرام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہر ضلع کانفرنس میں شریک ہوتی تھیں اور جلسوں کو مخاطب کرتی تھیں

(ڈاکٹر ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا)

تھوڑی روایتوں سے بغاوت بھی چاہئے

بیگم صفیہ عبدالواجد

۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو صفیہ بیگم کی پیدائش بمقام (اٹیہ) یوپی ہوئی۔ ان کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ والد ڈپٹی کلکٹر اور نانا ڈسٹرکٹ جج تھے۔ ان کا خاندان ایک روشن خیال خاندان تھا۔ سیاسی نظریات میں وہ اپنے اموں مولوی سید عبدالودود سے متاثر تھیں۔ صفیہ بیگم نے بی۔ اے ازابیلا تھوبرن کالج سے کیا اور ایم اے ایل۔ ٹی کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کے شوہر مولوی عبدالواجد بریلی کے مشہور وکیل اور ممتاز قوم پرست رہنما تھے۔ وہ یوپی بورڈ برائے مرکزی صوبائی اسمبلی الیکشن" کے سکریٹری بھی تھے۔ صفیہ بیگم ان کی قومی کارکردگی میں برابر کی شریک تھیں۔ ابتدا سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں خفیہ سرگرمیوں کی سزا میں انھیں گورنمنٹ گرلز انٹر کالج کی لکچرر شپ سے برطرف کر دیا گیا۔

گاندھی جی کی خواہش تھی کہ وہ پردہ ترک کر دیں اور پبلک محاذ پر کھل کر سامنے آئیں۔ مولوی عبدالواجد چاہتے تھے کہ وہ صرف بریلی میں برقعہ استعمال کریں لیکن صفیہ بیگم کا اصرار تھا کہ اگر پردہ ترک کیا تو پھر کبھی برقعہ کو ہاتھ نہیں لگائیں گی اور انھوں نے یہی کیا بھی۔ تحریک آزادی میں ان کی خدمات کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں انھیں یوپی اسمبلی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ دیا گیا۔ وہ الیکشن

میں کامیاب ہوئیں اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک ممبر قانون ساز اسمبلی کی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صفیہ بیگم بڑی پر لطف و پرکشش شخصیت کی مالک ہیں۔ آج کا ہندوستان ان کے خوابوں کے ہندوستان سے قطعی مختلف ہے اس کا انھیں شدت سے احساس ہے۔

ضعیفی کے باوجود وہ آج بھی فعال ہیں اور سماجی خدمات میں مشغول رہتی ہیں۔ وطن عزیز کے لئے اپنی نیز اپنے خاندان کی نمایاں خدمات کے باوجود ان کی خود دار طبیعت نے مجاہدینِ آزادی کو دی گئی پنشن کو قبول نہیں کیا۔

(بشکریہ مکتوب بیگم صفیہ عبدالواحد مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء، ۶۹ آواس وکاس، سول لائنز بریلی)

ضمیمہ نمبر (۱)

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ محمد علی پنجاب میں

دورہ کا نظام نامہ

تاریخ	مقام	روانگی از مقام	آمد بوقت	
۲۹-۸-۱۹۲۲	امرتسر	لاہور ۸-۲۴ دن	امرتسر ۹.۴۹ دن	ریل
۳۰-۸-۱۹۲۲	〃	قیام امرتسر		
۳۱-۸-۱۹۲۲	گجرات	امرتسر ۳۹۔۷ دن	گجرات ۴۶۔۱۱ دن	ریل
۱-۹-۱۹۲۲	جہلم	گجرات ۰۰۔۷ دن	جہلم ۰۰۔۹ دن	موٹر
۲-۹-۲۲	راولپنڈی	جہلم ۴۲-۱ رات	راولپنڈی ۱۸-۶ دن	ریل
۳-۹-۲۲	〃	راول پنڈی قیام		
۴-۹-۲۲	پشاور	〃 ۳۷-۱ دن	پشاور ۰۵-۶ شام	ریل
۵-۹-۲۲	پشاور	شام ۲۰-۵	〃 〃	〃
۶-۹-۲۲	میانوالی	〃 〃	میانوالی ۴۰-۶	〃

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۲

شہر انبالہ میں ام الاحرار و بیگم محمد علی کا وُرودِ مسعود

۲۴ر اگست کو دن کے ۱۲ بجے بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی شہر انبالہ پہنچیں۔ مولوی زاہد علی صاحب صاحبزادے مولانا شوکت علی ہمرکاب تھے۔ اسٹیشن پر ہزارہا مرد و زن ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ عہدہ دارانِ خلافت و کانگریس و جوشِ رضا کاران استقبال کے لئے حاضر تھے۔ ان کی تشریف آوری پر اس قدر جوش پھیلا کہ "اللہ اکبر" اور قومی نعروں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہجوم کی وجہ سے تل رکھنے کو جگہ نہ تھی چونکہ سخت گرمی کا وقت تھا اس لئے جلوس ملتوی رکھا گیا اور ہر دو خواتین اور انکے ہمراہیوں کو خان عبدالرشید خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی کوٹھی پر پہنچایا گیا جہاں تاروانگی یہ معزز مہمان قیام فرما رہے۔ سہ پہر کو ہر دو خواتین جلوس کے ساتھ امام باڑہ میر عبدالرحیم صاحب مرحوم میں تشریف لے گئیں اور وہاں زنانہ جلسہ ہوا۔ حاضرات کی کثرت سے کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں تھی۔ اور سینکڑوں مستورات مایوس واپس ہو گئیں۔ رات کے وقت میدان غلہ منڈی میں زیرِ صدارت جلسہ لالہ بینی پرشاد صاحب وکیل عام جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کی خدمت میں اہلِ شہر کی طرف سے ایک عقیدت نامہ پیش کیا گیا جس کو خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکرٹری ضلع انبالہ کانگریس کمیٹی نے پڑھا اور بی اماں نے اور ان کے بعد بیگم محمد علی صاحبہ نے تقاریر کیں لیکن ہنوز بیگم صاحبہ نے نصف تقریر بھی نہ کی تھی کہ بارش زور سے ہونے لگی اور مجبوراً جلسہ برخاست کرنا پڑا۔

۲۵ر اگست کو مسلم ہال میں ایک اور زنانہ جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرات کی کثرت سے

اس وسیع عمارت کو ناکافی ثابت کر دکھایا۔ سہ پہر کو انبالہ چھاؤنی تشریف لے گئیں وہاں اوّل جلسہ زنانہ اور شب کو بصدارت غلام بھیک نیرنگ وکیل صدر ضلع خلافت کمیٹی انبالہ جلسہ عام نہایت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ۲۶ اگست کو اول آپ میر غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل کے مکان پر تشریف لے گئیں وہاں بھی مستورات کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس کے بعد سہ پہر کو ہندو ہال میں زنانہ جلسہ اور شب کو میدان منڈی میں خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکریٹری ضلع کانگریس کمیٹی انبالہ کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔

چونکہ جلسہ سابق کے بارش کی وجہ سے منتشر ہو جانے کے باعث لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی اور اسی سبب سے سخت اشتیاق تھا۔ اس لئے اول بیگم صاحب نے اپنی تقریر دلپذیر کو مکمل کیا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے ایک لاجواب تقریر فرمائی۔ بارش پھر آئی لیکن لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بھیگتے رہے اور دونوں کی تقریر سنتے رہے۔

اسی شب کو ایک بجے کی ٹرین سے بی اماں اور بیگم صاحبہ معہ رفقاء لاہور تشریف لے گئیں۔

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

نوٹ: "نیشنل آرکائوز میں بی اماں کی اس تقریر کے نوٹس ہیں جو انھوں نے لاہور میں ۲۰ اگست ۱۹۲۲ء میں کی تھی انھوں نے کھل کر کونسلوں میں داخلے کی مخالفت کھادی کے استعمال اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ بھائیو جیل سے خوف نہ کھاؤ۔ گولیوں سے مت ڈرو، موت برحق ہے اگر گولیوں سے ہوئی تو شہید کہلاؤ گے۔"

نوٹس کے مطابق وائسرائے نے ہوم منسٹر سے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ (مصنف)

اُمّ الاحرار امرتسر میں
عظیم الشان جلسہ

[از مولوی غلام ربانی صاحب]

۲۹ر اگست کی شب کو جلیان والا باغ میں کانگریس و خلافت کمیٹی کی طرف سے عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد تخمیناً ۱۵ ہزار تک تھی جلسہ کے باقاعدہ افتتاح سے قبل چند نظمیں اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد باقاعدہ جلسہ زیر صدارت ملک لعل خاں معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور شروع ہوا۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ جس چیز نے بی اماں کو اپنے اس ضعف و نقاہت کے باوجود ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں صوبات سفر برداشت کرنے پر مجبور کیا وہ ان کی شفقتِ مادری اور بے مثل جذبۂ ہمدردی ہے۔ اسی طرح بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کو بھی مسٹر لائڈ جارج کا وہ تار برسرِ عام لایا ہے جو مسٹر موصوف نے جنرل ایلن بی کو فتح بیت المقدس کے وقت بھیجا تھا۔

سپاسنامہ

مولوی ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہلِ حدیث، امرتسر نے بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس کا جواب اُمّ الاحرار نے حسب ذیل فرمایا۔

"جو تعریف اس سپاسنامے میں میری اور میرے بیٹوں کے متعلق ظاہر کی ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ یہ تعریف ہماری خدمات سے بہت بڑی ہوئی ہیں۔ جو کچھ میں نے اور میرے بیٹوں نے کیا وہ ہمارا

فرض تھا۔ مجھے امید ہے کہ میرے تمام ہندوستانی بچے اپنے فرض کو پہچانیں گے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکیں گے"!

بی اماں کی تقریر

سپاسنامہ کے جواب اور تقریر سے بی اماں بالکل معذور تھیں گلا بیٹھا ہوا تھا اس لئے مولوی عزیزالرحمٰن صاحب کارکن مجلس خلافت بمبئی آپکے ملفوظات مبارکہ کو دہراتے جاتے تھے۔ بی اماں نے فرمایا کہ سکھ بھائیوں پر مجھے فخر ہے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ منحوس خبر میرے کانوں میں پہنچی کہ سکھ بھائیوں پر ظلم ہو رہے ہیں اس سے میرے دل میں سخت صدمہ ہوا لیکن ان کی مردانگی اور بہادری کو دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوئی۔ ان کی پابندی عدم تشدد، قابلِ فخر ہے۔ اپنے مسلمان بیٹوں سے مجھے بہت شکایت ہے کہ انھوں نے میری بوڑھی ہڈیوں کی پرواہ نہ کی۔ سکھوں کا مذہب مہاتماجی کے مذہب سے مختلف ہے لیکن انھوں نے مہاتماجی کے ایک لفظ کو پکڑا اور آج تک اس پر ثابت قدم ہیں۔ انھوں نے ہر قومی کام میں صداقت سے قدم رکھا ہے اور مکمل ارادے اور عقیدے سے کیا ہے لیکن مسلمانوں نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر کھدر تک بھی نہ پہنا۔ مسلمانو! اپنی بوڑھی ماں کی لاج رکھو۔ اپنے خدا اور رسول کا پاس کرو۔ اگر میرے کہنے سے تم نے کھدر ابھی نہ پہنا تو کل مجھ پر (خدا نخواستہ) بجلی گرے تو پانی کا چھینٹا نہ دے سکو گے۔ اب میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلامی سے چھڑائے۔ ہندوستان کے کتے بلیاں بھی غلامی کی زنجیروں میں نہ بند رہیں۔

زمیندار ۔ ۲ر ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

محترمہ بی اماں کا حضرو میں ورود

راولپنڈی سے حضرو یہ خبر پہنچی کہ محترمہ بی اماں صاحبہ کچھ دیر کے لئے حضرو تشریف لے جائیں گی۔ یہ خبر آناً فاناً تمام علاقہ چھچھ میں پھیل گئی اور سرِ شام ہی ۱۵۔۲۰ ہزار عقیدت مند شوقِ دیدار سے جمع ہو گئے۔ یہاں سے حضرو تک چار میل کی وسعت میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ ہندو مسلمان فرطِ ارادت سے آنکھیں فرشِ راہ کرنے کو مضطرب تھے۔ ۴۰۔۵۰ تانگے، سو ڈیڑھ سو سوار اور رضا کارانِ خلافت ایک بڑی جمعیت میں جلوس کے لئے موجود تھے۔ راولپنڈی سے محترمہ بی اماں صاحبہ اور پارٹی بذریعہ موٹر روانہ ہوئیں لیکن ایک تو روانگی میں دیر ہو گئی تھی اس پر طرہ یہ کہ موٹر راستہ میں بگڑ گئی اور محترمہ بی اماں صاحبہ ۱۰ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکیں۔ اگرچہ بہت سا وقت ہو جانے کے باعث بہت سے لوگ مایوس ہو کر چلے گئے تھے لیکن پھر بھی پانچ چھ ہزار کی تعداد موجود تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہندوستان کی واجب الاحترام ماں کے احکام و نصائح سننے کے لئے جمع تھے۔ مولانا محمد اسحٰق مانسہری صدرِ جلسہ تھے۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب، رانا فیروز الدین صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر مختصر تقاریر کیں۔ پھر بی اماں نے تقریر شروع کی جسے حاضرین نے نہایت سکون و سکوت سے سنا۔

---

۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں کی کیمبل پور میں آمد

۵ ستمبر کو ۳ بجے کے قریب بذریعہ ریل پارٹی کیمبل پور پہنچی۔ چونکہ محترمہ بی اماں صاحبہ کے داخلہ کی صوبہ سرحد میں حکومت کی جانب سے مخالفت ہو چکی تھی اور امتناعی احکام مجلس خلافت پشاور اور محترمہ بی اماں کو پہنچ چکے تھے اسلئے سرفروشانِ پشاور ہزاروں کی تعداد میں کیمبل پور پہنچ گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ پشاور اور دوسرے اسٹیشنوں سے کیمبل پور کا ٹکٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ رضاکارانِ پشاور کا ایک دستہ ریلوے اسٹیشن پر کھدر کی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے استقبال کے لیے ہلالی جھنڈا لئے موجود تھا۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اللہ اکبر کے غلغلہ انداز نعروں سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ جلوس مرتب کیا گیا۔ رات کو میدان پریڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی صوبہ سرحد سے باوجود گوناگوں بندشوں اور رکاوٹوں کے ہزارہا حضرات شاملِ جلسہ ہوئے۔ فخرِ قوم میاں گل حمید کاکاخیل بھی تشریف لائے تھے اور مجلس نصرت الاسلام زیارت کاکا صاحب کی جانب سے سپاسنامہ بی اماں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

شیخ محمد غوث صاحب نے کیمبل پور میں مجلس خلافت کے انعقاد کی جانب توجہ دلائی اور بی اماں نے ایک موثر تقریر کی۔ جس کا ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔

میانوالی میں ورود اور اظہار جوش

۱۶ ستمبر کو محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی بمعیت رانا فیروز الدین صاحب معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور کیمبل پور سے روانہ ہو کر بوقت صبح ۸ بجے میانوالی پہنچیں۔ اسٹیشن پر کانگریس اور خلافت کے کارکنان معززین شہر اور جماعت رضاکاران استقبال کے لئے موجود تھے۔ گاڑی کے ٹھہرتے ہی قومی نعرے بلند ہوئے اسٹیشن کے باہر ہزارہا مشتاقانِ دیدار بینڈ لئے کھڑے تھے۔ شاندار جلوس مرتب کیا گیا اور شہر کے بڑے بازاروں میں سے جو جھنڈیوں سے آراستہ تھے گذر کر ملک مولا بخش صاحب وکیل کے مکان پر ختم ہوا جو مہمانان محترم کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ۵ بجے شام خواتین کا جلسہ ہوا۔ محترمہ اماں اور بیگم صاحبہ نے مستورات کو فرائض مذہبی اور ملک کی طرف متوجہ کیا۔ مبلغ ۵۶ روپے نقد اور دو طلائی چوڑیاں چندہ ہوا۔ ۶ بجے شام پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ جو جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا۔ حاضرین کی تعداد ۵-۶ ہزار کے قریب تھی۔ مجالس کانگریس و خلافت و اہلیانِ شہر کی جانب سے ملک مولا بخش صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ محترمہ بی اماں نے مناسب الفاظ میں جواب دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر زور دیا۔ اور حاضرین سے پُرزور الفاظ میں اپیل کی کہ سکھ بھائیوں کی قابل تقلید مثال سے سبق حاصل کریں۔

زمیندار - ۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

اُمّ الاحرار ضلع جھنگ میں

اُمّ الاحرار ۱۲ ستمبر کو صبح چنیوٹ روانہ ہوئیں جس میں نواب عبدالرحمن صاحب غازی اور ملک نصراللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے۔ چنیوٹ میں ایک پرجوش اور شاندار جلوس میں وفد شہر میں گھومتا ہوا جائے قیام پر پہنچا۔ بی اماں کی زیارت کے لئے مستورات کا تمام دن تانتا بندھا رہا۔ پچھلے پہر ۶ بجے مستورات کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بی اماں اور بیگم صاحبہ نے تقریریں کیں۔ ۳ سو روپے نقد اور بہت سے چاندی سونے کے زیورات جمع ہوئے۔ رات کے ۹ بجے جھنگ تھان میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ بی اماں نے کھدر، سوراج اور اتفاق پر تقریر کی۔ ۱۳ ستمبر کی شام کو مستورات کا ایک اور جلسہ ہوا۔ بی اماں نے اپنے پند و نصائح سے محظوظ فرمایا اور چندہ جمع کیا۔ چنیوٹ کھدر کے معاملے میں پنجاب کی تمام بستیوں سے پس ماندہ ہے۔ الحمدللہ کہ بی اماں کے ورود مسعود کی برکت سے عورتوں اور مردوں میں کھدر کا شوق اور پیدا ہو گیا ہے۔

چک جھمرہ میں جلسہ

بعد شام ۱۳ ستمبر کو بی اماں چک جھمرہ تشریف لائیں۔ ۱۰ بجے رات کے زیر صدارت ملک نصراللہ خاں عزیز جلسہ منعقد ہوا جس میں بی اماں نے ملتان کے واقعات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ آپس میں جھگڑنا چھوڑ دو۔ اس سے گورنمنٹ کے گھر میں گھی کے چراغ جلتے ہیں اور ہمارے گھروں میں ماتم ہوتا ہے۔

کھدر پہنو اور پنچایتیں قائم کرو۔

مراسلہ معتمد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی، لائل پور

(زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵۔)

بی اماں فیروز پور میں

بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی رات کے بارہ بجے چک جھمرہ سے روانہ ہو کر آج مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۲ء دن کے ۱۱ بجے فیروز پور پہنچے بارش کے باوجود اسٹیشن پر رضاکارانِ کانگریس وخلافت اور باشندگان شہر کا ہجوم تھا۔ قیام مولوی کمال الدین صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل بی کے مکان پر ہوا۔ ۳ بجے عورتوں کا جلسہ ہوا جس میں محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ نے حالات وضروریات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے مسلمان عورتوں سے استعمال کھدر کی درخواست کی۔ رات کو زیر صدارت چوہدری عبدالحق بیرسٹر جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد قریباً ۸ ہزار تھی جس میں تقریباً ایک ہزار مستورات ہوں گی۔ چند نظموں کے بعد صدر صاحب کی مختصر تقریر کے بعد محترمہ بی اماں نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے کھدر کے استعمال وہندو مسلم پنچایت پر زور دیا۔

زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ضلع لائل پور میں بی اماں کا ورود مسعود

بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی ۱۰ ستمبر کو صبح ۶ بجے وارد لائل پور ہوئیں۔ ایک نہایت شاندار جلوس کے ہمراہ آپ کو دفتر خلافت میں بغرض قیام پہنچایا گیا۔ مغرب کے بعد ۸ بجے گول باغ میں زیر صدارت خواجہ عبدالرحمن غازی بی اے صدر مجلس خلافت لائل پور ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ ملک نصراللہ خاں عزیز نے تلاوت کے بعد بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور سردار کبیر سنگھ جتھہ دار اکالی دل نے اس کو بی اماں کے حضور پیش کیا۔ بی اماں نے اپنے بیٹے بھائیوں کو خطاب کر کے اتحاد، اتفاق کھدر اور پنچایتوں پر زور دیا اور کہا کہ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ نیز فرمایا کہ آپس میں رواداری اور درگذر کے ساتھ رہو۔ میں خالصہ کو گورو کے باغ میں قربانیوں پر مبارکباد دیتی ہوں حکومت روپے کے بل پر ناچ رہی ہے اس سے روپیہ چھین لو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی بی اماں کا ایک ایک لفظ سادگی کے ساتھ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔

مورخہ ۱۱ ستمبر کو صبح ۸ بجے بی اماں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سانگلہ کو مشرف فرمایا۔ خواجہ عبدالرحمن غازی اور ملک نصراللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے بی اماں نے سادہ مگر پراثر انداز میں غصہ کو ضبط کرنے، دشمنوں کے فریبوں سے ہوشیار رہنے اور قومی خدمت کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ بس کھدر پہنو، کھدر پہنو۔ (مراسلہ معتمد کانگریس لائل پور)

روزنامہ زمیندار ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ کی سرگرمیاں شملہ میں جلسۂ عام

لدھیانہ - ۲۲ ستمبر -

محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے شملہ میں چار جلسوں میں تقریریں کیں مجالس خلافت کانگریس و سکھ لیگ کی طرف سے محترمہ ام الاحرار کی خدمت میں مشترکہ سپاسنامہ پیش کیا گیا - ام الاحرار نے موزوں الفاظ میں جواب دیا اور حاضرین سے استدعا کی کہ محض زبانی اتحاد کی نہیں بلکہ حقیقی اتحاد اور دلوں کے اتحاد کی ضرورت ہے کیونکہ یہی کلید کامیابی ہے -

---

زمیندار - ۲۵ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ہوشیار پور میں بی اماں صاحبہ کی تقریر

محترمہ بی اماں و بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کل صبح دس بجے کی گاڑی سے ہوشیار پور پہنچیں - ہزارہا مرد و عورتوں نے آپ کا پرجوش استقبال کیا - شہر کے بازار نہایت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے اور جگہ جگہ پتوں اور پھولوں کی محرابیں لگائی گئیں تھیں -

چار بجے دوپہر اسلامیہ قومی پرائمری اسکول کی کھلی عمارت میں بی اماں صاحبہ و بیگم صاحبہ نے ہزارہا مستورات کے جلسے میں تقریر فرمائی - رات کے آٹھ بجے چوک کمیٹی گنج میں عام جلسہ منعقد ہوا - شیخ خان محمد صاحب صدر جلسہ منتخب ہوئے - شیخ محمد معراج الدین صاحب صدر سٹی کانگریس کمیٹی نے ایک مناسب موقعہ

خودساختہ نظم پڑھی جس کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔ نظم کے بعد پنڈت ہرجن داس صاحب نائب صدر ضلع کانگریس کمیٹی نے مجالس خلافت و کانگریس کی جانب سے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر قومی سنگھ صاحب نے کھدر پر چھپا ہوا ایڈریس ایک ہوشیار پور کی بنی ہوئی کشتی میں رکھ کر پیش کیا جس پر ہاتھی دانت کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے لوگوں کو کامل استقلال، ہمت اور حوصلہ سے کام کو جاری رکھنے کے لئے زبردست اپیل کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر بہت زور دیا اور اسلامیہ اسکول ہوشیار پور کا دوبارہ سرکاری یونیورسٹی کے ساتھ الحاق ہونے کے خلاف زوردار الفاظ میں فرمایا کہ ایسی کوششیں دین اسلام اور اس کے محافظوں کی صریحاً مخالفت ہے اور کفر سے کچھ کم نہیں۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ نے تقریر فرمائی۔

آج صبح پانچ بجے کی گاڑی سے بی اماں معہ رفقاء جالندھر روانہ ہوگئیں۔

(درگاداس سکریٹری)

زمیندار۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۷

فہرست آمدنی دورہ پنجاب بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی

۲۶ شعبان ۱۹۲۲ ۱۴۵ روپے ۱۳۲ بالیاں نقرئی انگوٹھیاں چھلے نقرئی ۱۳ عدد

۲۸ اگست لاہور ۱۶۰ روپیہ - ۳۱ اگست - امرتسر ۹۲ روپے لونگ طلائی کمید چوڑی نقرئی - ایک عدد - بالیاں نقرئی ۲ عدد

۳۱ اگست گجرات ۴۳ روپے ۸ آنہ بالیاں نقرئی ۵ چوڑی نقرئی ایک عدد

یکم ستمبر جہلم ۱۵ روپے ۶ آنے چوڑی ۲ بالیاں ۲ انگوٹھیاں ۲ چھلے نقرئی ۶

۲،۳ ستمبر راولپنڈی ۱۱۵ روپے ۸ آنے بالیاں نقرئی ۲ -

۴ ستمبر حضرو ۸۳ روپے ۸ آنے چوڑیاں نقرئی ۶

۶ ستمبر میانوالی ۵۶ روپے چوڑیاں طلائی ۲

۸ ستمبر سرگودھا ۲۳ روپے انگوٹھی طلائی ۲ - بالیاں طلائی ۲

۹ - ۱۰ ستمبر جھنگ ۱۰۵ روپے ۶ آنے بالی طلائی ۱ بالیاں نقرئی ۲ چوڑی نقرئی ۱ انگوٹھی نقرئی ۳

۱۱ ستمبر لائل پور ۴۴ روپے ۵ آنے ۳ پائی چوڑیاں نقرئی ۱۰ - بالیاں نقرئی ۲

۱۳ ستمبر چنیوٹ - ۶۱۵ روپے تین آنے چھلے ۲ - بالیاں ۴ پھول ناک ۱ انگوٹھی طلائی ۱ بالیاں ۴۸ - چھلے انگوٹھیاں ۴۲ - چوڑیاں نقرئی ۳

۱۴ ستمبر فیروزپور ۴۳ روپے ۱۱ آنے ۶ پائی

۱۵ ستمبر رہتک ۲۴۰ روپے ۹ آنے ۳ پائی - بالیاں ۱۶ - چوڑیاں ۲ چھلے انگوٹھیاں ۶۲ - پتے ۲۱ بالے نقرئی ۲

۱۶ ستمبر مجلس خلافت پانی پت ۵۰۰ روپے متفرق ۶۸ روپے ۱۰ آنے۔ بالیاں۔
طلائی ۲۔ چوڑیاں پاؤں کی ۱۴۔ چوڑیاں دستی ۱۴۔ نونگے ہاتھ کے ۲
آرسی ۱، بالے ۲۔ بالیاں ۲۴۔ چھلے وانگوٹھی ۳۴۔ بٹن دو جوڑہ نقرئی

۱۷ ستمبر کالکا ۵۳ روپے ۴ آنے

۲۰ ستمبر شملہ ۲۴۴ روپے ۱۴ آنے ۳ پائی۔ پاؤں کے توڑے۔۲۔ نونگے ۴
چوڑیاں ۲ بالی ۱۔ انگوٹھی نقرئی ۱

۲۲ ستمبر لدھیانہ ۱۵۰ روپے بالیاں طلائی ۲۔ بالیاں نقرئی ۱۸۔ چھلے وانگوٹھیاں نقرئی ۳

۲۳ ستمبر ہوشیارپور ۱۵۰ روپے چار آنے ۹ پائی۔ بالیاں نقرئی ۸۴

۲۴ ستمبر جالندھر شہر ۸۲ روپے ۱۰ آنے ۶ پائی۔ بالیاں طلائی ۲۔ بلاق خورد طلائی
۱ کڑہ نقرہ

۲۵ ستمبر بستی شیخ درویشی۔ ۱۱۶ روپے ۱۰ آنے

۲۶ ستمبر گوجرانوالہ ۸۴ روپے ایک آنہ۔ بالیاں طلائی ۲ انگوٹھیاں طلائی
۲۔ انگوٹھی نقرئی ۱۔

وزیرآباد ۱۴ روپے ۳ آنے ۶ پائی۔ بالیاں طلائی ۲۔ انگوٹھی نقرئی

۲۶ ستمبر سیالکوٹ ۷۴ روپے ۱۰ آنے بالیاں نقرئی ۲ چوڑی نقرئی ۱

۳۰ ستمبر قصور ۶۰ روپے بالیاں نقرئی ۳۔ چوڑی نقرئی ۱

یکم اکتوبر مجلس خلافت بٹالہ ۱۰۰ روپے بٹالہ زنانہ جلسہ ۷۵ روپے بالیاں نقرئی
۵ چوڑی نقرئی ۱

کل نقد ۳۹۴۴ روپے ایک آنہ چھ پائی

زمیندار ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں صاحبہ کا دورہ

سرمایہ طیارہ کی فراہمی کی سرگرم کوششیں

سہارن پور ۲۴ دسمبر۔ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ام الاحرار و بیگم محمد علی صاحبہ سہارنپور دوسرے دورے پر تشریف لائیں بشام کو شاہ مدار کے میدان میں خلافت کمیٹی کا جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ام الاحرار نے زبردست تقریر فرمائی۔ تقریر کا زیادہ تر حصہ داخلہ کونسل کی مخالفت میں تھا۔ ام الاحرار نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے کونسل میں داخل ہو کر بے عزت ہوں۔ جلسہ عصر کے وقت برخاست ہو گیا ۱۴ دسمبر کو دونوں بہمراہی مولانا خلیل الرحمن صاحب صدر ضلع خلافت کمیٹی بابو محمد یوسف صاحب ناظم ضلع قصبہ رام پور ضلع سہارن پور تشریف لے گئیں جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ تین جلسے زنانہ و مردانہ منعقد ہوئے۔ آخری جلسہ میں خلافت کمیٹی رام پور کی طرف سے معرفت حکیم حافظ محمد احمد صاحب صدر خلافت کمیٹی رام پور (جو ایک واجب التعظیم بزرگ ہیں اور جنھوں نے تمام بار بھائی اپنے ذمہ لیا تھا) مبلغ ۱۹۴۰ روپے سوا چھ آنے طیارہ فنڈ کے ام الاحرار کی خدمت میں پیش کئے اور اشیاء موصولہ طیارہ فنڈ کو جلد فروخت کر کے ایک معقول رقم روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کو رڑکی تشریف لے گئیں جہاں شاندار استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۶۷۶ روپے طیارہ فنڈ کے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۷ دسمبر کو قصبہ منگلور تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں۔ دو جلسے مردانہ و زنانہ ہوئے جس میں خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۲۳۱ روپے طیارہ فنڈ آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۸ دسمبر کو قصبہ سکروڈہ تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں جہاں پُر جوش استقبال کیا گیا جس

کی نظیر قصبات میں کم ملے گی۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک زنانہ دو مردانہ جلسے ہوئے جلسے میں ۲۵۰۰ روپے دینے کا اعلان ہوا جن میں مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے گئے اور مبلغ ۱۳۰۰ روپے کے قریب سامان ہے جس کو فروخت کر کے قیمت داخل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۱۹ دسمبر کو ۱۲ بجے شب کے کلکتہ میل سے رام پور ریکا بیر تشریف لے گئیں جہاں سے آپ گیا کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جائیں گی۔

اس دورہ میں کل نقد مبلغ پانچہزار اہتر روپے پونے تین آنے اور بالی نقرہ ۳۲ عدد، آرسی نقرئی ایک عدد چھلے نقرئی ۵ عدد ہار نقرئی ایک عدد۔ کٹورہ مسی ۲ عدد کرتہ کھدر ایک عدد طیارہ فنڈ کے لئے پیش کئے گئے۔ بارہ ہزار روپے اس سے پہلے دورہ میں بی اماں کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے۔ گذشتہ رقوم کو شامل کر کے جو ضلع سہارن پور کی طرف سے وقتاً فوقتاً مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی و صوبہ خلافت کمیٹی آگرہ کو روانہ کی جا چکی ہیں چندہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے ہو چکی ہے۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶+۷

بی اماں اور بیگم صاحبہ محمد علی بیجاپور میں مولانا محمد علی سے ملاقات

۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء

اُم الاحرار بی اماں صاحبہ اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی، مولانا محمد علی سے ملنے کے لئے بیجاپور تشریف لائیں۔ مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ارکین نے اسٹیشن پر خیر مقدم کیا۔ انھوں نے شام کو ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی جس میں مرد و عورت سب شریک تھے۔ بی اماں نے حالاتِ حاضرہ پر نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے تقریر کی۔ اور برطانیہ کی نازک حالت، غازی مصطفےٰ کمال کی فتوحات اور مسئلہ خلافت پر اس کے اثرات پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ انگلستان نے

اپنی یونان نواز حکمت عملی کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ فرانس، اٹلی اور دیگر اقوام کی ہمدردی واعانت کھو دی۔ آپ نے مجمع کو نصیحت کی کہ وہ حصول سوراج اور مسئلہ خلافت کے حل کرنے کے لئے پوری قوت وطاقت سے کام کریں۔ آپ نے آگاہ کیا کہ اگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا گیا تو یہ ایک عظیم ترین غلطی ہوگی اور ہمیشہ پچھتانا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے بھی ایک موثر تقریر کرتے ہوئے فصیح الفاظ میں خواتین سے استدعا کی کہ وہ اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی امداد کریں قومی معرکہ آرائی میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔

زمیندار۔ ۶ر نومبر ۱۹۲۲ء ص ۳

بی اماں صاحبہ سکروڈہ ضلع سہارنپور میں

جنابہ بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی ۱۹ر دسمبر کو یہاں تشریف فرما ہوئیں اور انھوں نے تقریر فرمائی۔ حاضرین نے بہت جوش کے ساتھ طیارہ فنڈ میں حصہ لیا اور خلافت سکروڈہ نے حسب تفصیل مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے۔

بتوسط پروفیسر احمد سعید صاحب ایم اے او۔ کالج لاہور

زمیندار۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ضمیمہ (۲)

اکبری بیگم

"مئی ۱۹۲۰ء میں دہلی میں منعقد ایک نشست میں ایک ممتاز شیعہ خاتون نے جلسے میں موجود خواتین سے اپنے مذہب کے تحفظ کی تحریک عدم تعاون کی حمایت کرنے کی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا "کیا ہم اپنے گھروں کی حاکم و مختار نہیں ہیں؟ اگر ہاں! تو ہمیں اپنے مردوں کو تحریک عدم تعاون بطور مذہب ماننے کے لئے پابند کرنا چاہیئے ہمیں اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے جو اس سے منحرف ہوں "ان کا سماجی مقاطعہ کرنا چاہیئے ہمیں اپنے مردوں کو پابند عمل بنانا چاہیئے۔ اگر آپ کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی قربت اور بہشت میں بی بی فاطمہ کی خدمت میں حاضری کی خواہش ہے تو اپنے مذہبی عہد پر سختی سے قائم رہیے۔"

GAIL MINAULT: SEPARATE WORLD P. 235

اکبری بیگم مشہور قومی رہنما بیرسٹر آصف علی کی والدہ تھیں۔

ضمیمہ (۳)

دہلی کی پہلی مسلم خاتون کو سزا

دہلی ۲۱ر اپریل بیگم محبوب فاطمہ (مسز طاہر محمد) جن کو بہن ستیہ وتی کے ہمراہ جلیانوالہ باغ ڈے کے سلسلے میں چاندنی چوک سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو آج مسٹر اے ایس ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپ کے خلاف دفعہ ۱۷۔ الف ترمیم قانون ضابطہ فوجداری کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ آپ نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے آپ کو چھ ماہ قید محض و پچاس روپے جرمانے کی سزا دی۔ عدم ادائے جرمانہ آپ کو ڈیڑھ ماہ مزید قید بھگتنی ہوگی"۔ (مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۳۲ء)

مدراس سٹی کانگریس کی آٹھویں ڈکٹیٹر مسز سوابیگم کو پکٹنگ کے سلسلے میں ایک سال قید محض اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی"۔

(مدینہ اخبار، بجنور۔ ۲۱ر فروری ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۴)

بیگم ڈاکٹر محمد عالم

ڈاکٹر عالم لاہور کے مشہور رہنما اور بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ ۱۹۳۲ء میں گرفتاری کے وقت ان کے شانے میں پھوڑا اور گردے میں تکلیف تھی۔ جیل میں جب ان کی حالت تشویشناک ہوئی تو ملک بھر میں پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تمام قومی اخبارات میں ان کی شدید علالت پر اظہار تشویش کیا گیا لیکن بیگم عالم نے بڑی بہادری سے صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور برطانوی آمریت کے سامنے سر جھکانے سے یکسر انکار کر دیا۔ ملاحظہ ہو ایک خبر:

ڈاکٹر عالم کی تشویشناک علالت، ڈاکٹر عالم کی صحت بد سے بدتر ہوتی گئی ہے۔ بخار ۱۰۴ درجے تک پہونچ گیا ہے۔ پیشاب کے ساتھ خون بھی آنے لگا ہے اور وزن نہایت تیزی کے ساتھ کم ہو رہا ہے مگر حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین کو زیادہ سے زیادہ تکالیف پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو رہا کرنا نہیں چاہتی۔ آپ سن کر تعجب کریں گے کہ اتنی شدید تکلیف کے دوران نہ تو جیل کے کسی ملازم کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا اور نہ ڈاکٹر صاحب ہی کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے کسی ملازم کو خدمت کے لئے بلالیں۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو ملاقات تک کی اجازت دینا حکومت نے گوارا نہ کیا۔ اب جب کہ ڈاکٹر صاحب موصوف تقریباً موت

کے منہ میں پہونچ گئے ہیں حکومت نے آپ کو جیل سے میو ہسپتال میں علاج کے لئے تبدیل کر دیا ہے۔ میو ہسپتال کے ڈاکٹر مشوش ہیں کہ عمل جرّاحی کیا جائے یا نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ عمل جراحی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ ادھر تو یہ حالت ہے ادھر حکومت ابھی اسی چیز پر غور کر رہی ہے کہ بمبئی سے دو خاص ڈاکٹر طلب کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت ڈاکٹر صاحب کو مشروط طور پر رہا کر دیتی یا کم از کم ڈاکٹر صاحب کو پرائیویٹ طور پر علاج کرانے کی اجازت دے دیتی مگر حکومت کو ان چیزوں کی نہ کبھی پرواہ ہوئی ہے اور نہ ہے"!

(مدینہ اخبار بجنور ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۳۲ء)

بیگم عالم نے مصیبت کی اس گھڑی میں جس عزم و استقلال کا ثبوت دیا وہ قابل ستائش ہے۔ لوگوں کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیگم محمد عالم نے حسب ذیل بیان اخبارات میں اشاعت کے لئے دیا:

"میرے شوہر کی زندگی سب سے پہلے قوم کی ملکیت ہے اور بعد کو میری یا کسی اور کی ہے۔ اس لئے قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا استعمال کرے۔ بیگم عالم نے محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر عالم کی رہائی کا مطالبہ نامناسب ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پہلے جب ان کی حالت اس حد تک نہیں پہنچی تھی تو حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ کسی غیر سرکاری ڈاکٹر سے ان کا معائنہ کرانے کی اجازت دی جائے اور بعد کو مقامی سرکردہ ڈاکٹروں کی ایک فہرست بھی پیش کی گئی تھی کہ ان میں سے انتخاب کر لیا جائے لیکن اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ درخواست میں یہ گزارش بھی نہیں کی گئی تھی کہ ڈاکٹر عالم کو غیر سرکاری ڈاکٹر کے زیر علاج رکھا جائے"۔ مجھے آجکل اپنے شوہر کی خدمت کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور میرے علم میں جو ان کی حالت ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کو میں تیار نہیں ہوں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں نے اس اعتماد کی خلاف ورزی کی جو مجھ پر

بیگم عالم نے قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ مجھے نیم مردہ شوہر کو واپس لینے پر مجبور نہ کرے، بہتر ہے کہ ساری ذمہ داری حکومت پر چھوڑ دی جائے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے دیا جائے، ہمیں اجازت دینی چاہیئے کہ وہ بہادری کی موت مر جائیں، قومی زندگی میں انفرادی ہستیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں قوم کے مفاد کے لئے متعدد عالم اور دیگر اشخاص قربان کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے شوہر اس بیماری سے صحت یاب ہو جائیں گے لیکن میری نظر میں ایک باعزت آدمی کی لاش ایک ذلیل زندہ شخص سے بدرجہا بہتر ہے۔"

(مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۵)

بیگم صاحبہ مولوی ظفر علی خاں:

مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار کی گرفتاری پر ان کی اہلیہ محترمہ نے عامۃ المسلمین کے نام حسب ذیل پیغام ۱۹۲۰ء کے روزنامہ ۲۴ ستمبر "زمیندار" میں شائع کرایا:

"میرے مسلمان بھائیو اور بہنو! آپ کو معلوم ہے کہ میرے شوہر مولوی ظفر علی خاں کو حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ہے اور اب ان پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ میرے شوہر کے عقائد و خیالات کی معلومات مجھ سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ مدۃ العمر اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی ایسے امر کے مرتکب نہیں ہوئے جس پر حکومت قانوناً گرفت کر سکے۔ چونکہ وہ میرے نزدیک بے گناہ ہیں اس لئے میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ عدالت میں اپنی صفائی ہرگز ہرگز پیش نہ کریں۔ نظر بندی ہو، قید ہو، حبس دوام ہو، پھانسی ہو کچھ ہو خدا اور رسول کے راستے میں ہر قسم کی کڑی مشکلات اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ امتحان کی منزل بہت سخت ہے۔ خدائے بزرگ استقلال و استقامت دے کہ تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ ہندوستان بھر میں جتنے بھائی اور جتنی بہنیں خدمت خلافت میں مصروف اور خدا اور رسول کے راستے پر سرگرم کار ہیں ان سب سے میری یہ التجا ہے کہ وہ حقیقی اسلامی تڑپ سے کام کریں

اور حکومت کے جبر و تشدد کو بے حقیقت سمجھیں۔ خلافت کی بحالی بڑی قربانی چاہتی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لئے ہر وقت تیار رہے اور مصیبتوں کو ہنسی و خوشی برداشت کرے۔ ہماری فریاد سننے والا وہی ہے جو مالک الملک ہے جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلت کے غار میں اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔ آؤ تمام بہنیں اور بھائی مل کر اسی بارگاہ میں دعا مانگیں کہ وہ اپنی خلافت کے خادموں کو مصیبت کے عالم میں ثابت قدم اور راضی برضا رکھے اور کامیابی کی منزلیں ان پر آسان کردے۔ آمین۔"

آپ کے اس پیغام سے ملک میں آپ کی اولوالعزمی، حب قومی اور ایثار و قربانی کا ایک غلغلہ پیدا ہو گیا۔ سہسوان ضلع بدایوں کی خلافت کمیٹی نے ایک طویل تحریر کے ذریعہ اُم الاحرار کا خطاب پیش کیا۔ اس پر آپ نے پھر ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

"اگر ناعاقبت اندیش حاکموں نے ظلم و ناانصافی کا شیوہ اختیار کر لیا تو خلافت کے علمبردار صبر و رضا اور جفاکشی کا شیوہ اختیار کریں اور حق و صداقت کے لئے جیل خانوں کو بھر دیں۔ ممکن ہے حاکم اسی طرح بیدار ہوں۔ حکومت کو ہوش آئے اور وہ اس راستے پر چلنے سے پرہیز کرے جس پر گام فرسا ہونے کا نتیجہ یقیناً بربادی ہے۔ آج ملک و مذہب کی طرف سے ہر ہندو ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حکومت سے عدم تعاون کرے۔ ہر بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت کو چاہیئے کہ جس طرح بھی ممکن ہو عدم تعاون کا ثبوت دے۔ ایک سودیشی کی تحریک ہی کو دیکھو۔ اگر اس پر پورا پورا عمل کیا جائے تو آج ہندوستان اور خلافت کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ میں خود آج سے عہد کرتی ہوں کہ کبھی غیر ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال نہ کروں گی اور جہاں تک ممکن ہو گا صرف ہندوستان کے بنے ہوئے پارچہ جات پر اکتفا کروں گی۔ خدا مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

نوٹ:۔ عبارت کی دونوں مرتبہ محمد الدین فوق، اگست ۱۹۲۱ء لاہور سے ماخوذ ص ۲۵، ۲۶، ۲۷

اعتراف

"ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی ترتیب کے سلسلے میں شکر و سپاس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ میں نے مندرجہ ذیل کتابوں، رسائل، اخبارات اور اشخاص سے استفادہ کیا ہے۔

کتابیات

۱۔ ابوالکلام آزاد:۔ غبار خاطر، مکتبہ احرار لاہور (تیسرا اڈیشن) ۱۹۴۶ء۔

۲۔ ابوالکلام آزاد:۔ ہماری آزادی، مرتبہ محمد مجیب، اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۰ء۔

۳۔ ابوالکلام آزاد:۔ قولِ فیصل، چمن بک ڈپو دہلی۔

۴۔ اثر بن یحییٰ انصاری، مولانا آزاد، ایک سیاسی ڈائری۔ عالیہ پبلی کیشنز دھولیہ (مہاراشٹر) ۱۹۰۲ء۔

۵۔ احمر لاری: حسرت موہانی۔ حیات و کارنامے، ادبستان، گورکھپور ۱۹۷۳ء۔

۶۔ اسلم ہندی: رازدانِ حیات۔ سوانح حسرت موہانی، دانش محل لکھنؤ ۱۹۷۵ء۔

۷۔ اشتیاق اظہر و نصرت موہانی، مولانا حسرت موہانی حصہ اول ذاتی زندگی، حسرت میموریل سوسائٹی۔

۸۔ اظہر علی برلاس: تاریخی شہ پارے، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی۔

۹۔ امداد صابری: سیاسی رہنماؤں کی مائیں و بیویاں، جمال پریس، دہلی ۔۶ ۱۹۸۶ء۔

۱۰۔ امرت لال ناگر، غدر کے پھول، ایک ڈائری (ہندی) پرکاشن شاکھا سوچنا وبھاگ، اتر پردیش ۱۹۵۷ء۔

۱۱۔ ایم حبیب خاں: حسرت موہانی، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۱۲۔ انتظام اللہ شہابی: بیگمات اودھ کے خطوط، مکتبہ ادب اردو بازار۔ دہلی ۱۹۵۷ء۔

۱۳۔ انیس فاطمہ بریلوی: ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۹ء۔

۱۴۔ انیسہ ہارون شروانیہ: حیات ز۔ خ۔ ش، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء۔

۱۵۔ پنڈت سندر لال: سن ستاون (اردو) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔

۱۶۔ خورشید مصطفےٰ رضوی: جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی ۱۹۵۹ء۔

۱۷۔ ذکاءاللہ: تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، شمس العلماء محمد ذکاءاللہ۔ شمس المطابع، دہلی ۱۹۰۴ء۔

۱۸۔ رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۳۲ء۔

۱۹۔ رئیس احمد جعفری: علی برادران، محمد علی اکاڈمی لاہور ۱۹۶۹ء۔

۲۰۔ رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ، محمد علی اکاڈمی لاہور ۱۹۶۹ء۔

۲۱۔ ز۔ خ۔ ش: فردوس تخیل (دیوان) دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۲۲ء۔

۲۲۔ سید ظل الرحمٰن: تذکرہ خاندان عزیزی، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۷۸ء۔

۲۳۔ سید محمد ہادی: علی برادران اور ان کا زمانہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۸ء۔

۲۴۔ شان الحق حقی: نکتہ راز، عصری کتب، کراچی ۱۹۶۲ء۔

۲۵۔ صبح امید لکھنؤ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت تیسری جلد ۱۹۱۸ء۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۰ء۔

۲۶۔ ضیاءالدین احمد برنی: عظمت رفتہ، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء۔

۲۷۔ طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل (پانچواں ایڈیشن) کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء۔

۲۸۔ عارف ہسوی: حالات حسرت، انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۹-۲۰ء۔

۲۹۔ عبدالحلیم شرر: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، سلطان حسن اینڈ سنز بندر روڈ کراچی ۱۹۵۶ء۔

۳۰۔ عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۸ء۔

۳۱۔ عبدالشکور: حسرت موہانی، (تیسرا ایڈیشن) انوار بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۳ء۔

۳۲۔ عبدالقوی دسنوی: حسرت کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں، حلقۂ احباب، پٹنہ ۱۹۵۳ء۔

۳۳۔ عبدالماجد دریابادی: محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، معارف پریس اعظم گڑھ

۳۴۔ عتیق صدیقی: بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی ۱۹۸۱ء۔

۳۵۔ عتیق صدیقی: حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں، انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۸۱ء۔

۳۶۔ عزیز الرحمٰن جامعی: رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، کوچہ رحمان چاندنی چوک، دہلی، ۱۹۷۵ء۔

۳۷۔ کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ، ج ۱۔ ۲، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔

۳۸۔ محمد الدین فوق: چند محب وطن خواتین (بھارت کی دیویاں)، ظفر برادرس، تاجرانِ کتب لاہور ۱۹۲۱ء۔

۳۹۔ محمد سرور: محمد علی بحیثیت تاریخ داں و تاریخ ساز، سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۶۲ء۔

۴۰۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین: سن ستاون میری نظر میں، آئینہ ادب، چوک انارکلی لاہور ۱۹۵۶ء۔

۴۱۔ نعیمہ بیگم: حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی، سعید آرٹ پریس حیدرآباد سندھ ۱۹۶۳ء۔

۴۲۔ "باپو کے پتر بی بی امت السلام کے نام" مرتبہ کاکا صاحب کالیلکر، نوجیون پرکاشن مندر احمدآباد۔

۴۳۔ باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام، جلد اول فائل نمبر ۱۹۲۵ء نہرو، میوزیم لائبریری نئی دہلی۔

۴۴۔ باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام، نیشنل گاندھی میوزیم و لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔

۴۵۔ چند اہم خطوط، صدر دفتر انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔

رسائل

۱۔ آج کل، دہلی، مارچ ۱۹۵۹ء، اگست و ستمبر ۱۹۸۱ء، نومبر ۱۹۸۸ء (مولانا آزاد نمبر)۔
۲۔ اردو ادب، دہلی (حسرت نمبر) ۱۹۸۱ء شمارہ ۱ تا ۴۔
۳۔ اردو ادب، علی گڑھ (حسرت نمبر) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء۔
۴۔ اردو اکادمی، لکھنؤ (حسرت نمبر) نومبر ۱۹۸۱ء۔
۵۔ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، کانپور، اپریل ۱۹۰۸ء، فروری تا اپریل ۱۹۲۷ء۔
۶۔ آواز (آل انڈیا ریڈیو)، دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء۔
۷۔ خاتون، علی گڑھ، جولائی ۱۹۱۲ء، اپریل ۱۹۱۳ء۔
۸۔ شبستان اردو ڈائجسٹ، دہلی، مارچ ۱۹۶۸ء۔
۹۔ صبح امید، یکم فروری ۱۹۱۸ء چکبست، لکھنؤ۔
۱۰۔ صبح (سہ ماہی) انجمن ترقی اردو ہند، دہلی (ابوالکلام آزاد نمبر) ۱۹۷۰ء۔
۱۱۔ صدق جدید، لکھنؤ، ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء۔
۱۲۔ علی گڑھ میگزین، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۷۴-۱۹۷۳ء۔
۱۳۔ کتابی دنیا، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۷ء۔
۱۴۔ ماحول (ہفت روزہ)، کراچی (ابوالکلام آزاد نمبر) ستمبر ۱۹۶۰ء شمارہ ۱۷/۱۸۔
۱۵۔ نظارہ، لکھنؤ (بیگم حضرت محل نمبر)، ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء۔
۱۶۔ نظارہ، لکھنؤ (ملکہ حضرت محل نمبر)، ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء۔
۱۷۔ نقوش (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء۔
۱۸۔ نقوش (آپ بیتی نمبر)، فروغ اردو لاہور، جون ۱۹۶۴ء
۱۹۔ نگار، لکھنؤ (حسرت نمبر) جنوری، فروری ۱۹۵۲ء
۲۰۔ نگار، کراچی (سالنامہ) ۱۹۷۶ء۔
۲۱۔ نیا دور، لکھنؤ (یوم آزادی نمبر) اگست ۱۹۸۲ء۔
۲۲۔ ہماری زبان، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، یکم اپریل ۱۹۸۵ء، ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء۔
۲۳۔ تہذیب نسواں، لاہور، یکم اپریل ۱۹۲۲ء۔

اردو اخبارات

۱۔ **الجمعیۃ**، دہلی ۵ جولائی ۱۹۲۸ء۔

۲۔ **الہلال**، کلکتہ: ۲۱-۲۸ مئی ۱۹۱۳ء۔

۳۔ **جمہور**، کلکتہ: ۸ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۰ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۶ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۹ مئی ۱۹۱۸ء، ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء، ۱۵ جولائی ۱۹۱۸ء۔

۴۔ **زمیندار**، لاہور: ۲۴ ستمبر ۱۹۲۰ء، یکم ستمبر، ۲ ستمبر، ۱۷ ستمبر، ۱۸ ستمبر، ۲۳ ستمبر، ۲۵ ستمبر، یکم اکتوبر، ۲۶ اکتوبر، ۲۹ دسمبر، ۳۰ دسمبر ۱۹۲۲ء۔

۵۔ **مدینہ اخبار**، بجنور: ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء، ۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء، ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء، یکم جنوری ۱۹۱۸ء، ۵ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ۱۷ مارچ ۱۹۳۲ء، ۲۵ اپریل ۱۹۳۲ء، ۹ مئی ۱۹۳۲ء، ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

۶۔ **ہمدرد**، دہلی: ۱۱ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۶-۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء، ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء، یکم دسمبر ۱۹۲۶ء۔

ذاتی انٹرویو

۱۔ مجاہد آزادی جناب **غلام رسول قریشی**، امام منزل، سابرمتی ہریجن آشرم ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء۔

۲۔ **بیگم ہاجرہ زیدا احمد**، جی۔ ۵، پارک کالونی پارک روڈ، لکھنؤ، ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ء۔

۳۔ **جناب طلعت کچلو**، تین مورتی میوزیم لائبریری دہلی۔ ۷ جون ۱۹۸۷ء۔

۴۔ **محترمہ سروجنی ناناوتی**، صدر ہندستانی پرچار سبھا سن ندھی، راج گھاٹ، نئی دہلی ۷ جولائی ۱۹۸۷ء۔

۵۔ **محترمہ بیگم کنور عمار احمد خاں** صاحب میرس روڈ، علی گڑھ، ۱۰ اگست ۱۹۸۷ء۔

۶۔ **محترمہ بیگم سہیلہ حبیب** صاحبہ، بدر باغ، علی گڑھ، ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۷۔ **جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی** صاحب، ممبر راجیہ سبھا، ذاکر باغ، علی گڑھ، ۹ نومبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ **جناب ڈاکٹر اقبال حسین** صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن ۱۸ جنوری ۸۸

بذریعہ خطوط فراہم کی گئی معلومات

۱۔ جناب کشن ترویدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگرالیہ، ہری جن آشرم احمد آباد مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء۔

۲۔ محترمہ یاسمین نعمانی ۱۵۲ جولی میکرا پارٹمنٹ III کیفے پریڈ، بمبئی مورخہ ۸ر مئی ۱۹۸۶ء۔

۳۔ جناب اے۔ جے۔ اتم، بی ستیلا روڈ، ستدھی نواس ماہم بمبئی۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء۔

۴۔ محترمہ فاطمہ طیب علی، سب پوسٹ وڈے لا، ضلع احمد نگر مہاراشٹر مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

۵۔ جناب عطاء الرحمن داؤدی، ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفرپور مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۸۶ء۔

۶۔ سرخ پوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم ۱۹۹۴ کوچہ رحمان چاندنی چوک دہلی مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۷ء۔

۷۔ محترمہ بیگم سلطانہ حیات انصاری، ۲۴ ویسٹرن کورٹ جن پتھ نئی دہلی مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ جناب سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی این بنرجی روڈ پٹنہ بہار مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۸۸ء۔

۹۔ جناب پروفیسر جمال خواجہ سمیع منزل، علی گڑھ۔ مورخہ ۲۶ر مئی ۱۹۸۸ء۔

۱۰۔ جناب عشرت علی صدیقی، چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

۱۱۔ محترمہ صفیہ واجد بریلوی ۲۹ آواس وکاس، سول لائنز، بریلی مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۸۹ء۔

۱۲۔ سیدہ ضیا احتشام، فرحت کدہ سرسید نگر، علی گڑھ، یکم فروری ۱۹۸۹ء۔

OTHER ENGLISH BOOKS

1. Chanda, S.N. : Some untold stories, Sterling Publishers, Private Ltd., 1976
2. Chopra, P.N. : Who is Who of Indian Martyrs, Ministry of education & youth services Delhi, 1969.
3. Gail Minault : Khilafat Movement, Religious symbolism & political mobilisation in India-Oxford University Press, 1982.
4. Gail Minault : The extended family-women & political participation in India and Pakistan. Chanakya Publications, Delhi, 1981.
5. Gandhi, M K. : My experiments with truth: Navjivan Press, Ahmedabad, 1963
6. Hanna Papanek & Gail Minault : Separate Worlds-Studies of Purdha in South Asia. Chanakya Publications, Delhi, 1982.
7. Hasan Mushir : Muslims & the Congress, Manohar, 1979.
8. Jain Naresh Kumar : Muslims in India, Vols.I-II, Manohar Publications, Delhi, 1979-1983.
9. Kabir Kausar & Inam Kabir : Bibliographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies, Lite and Light Publishers, New Delhi, 1982.
10. Marshman, J.C. : Memoirs of Sir Henry Havelock, London, 1908.
11. Ray Shantimoy : Freedom movement and Indian Muslims, People's Publishing House Private Ltd. New Delhi, 1983.
12. Rizvi, S.A. & Bhargawa, M.L. (ed.) : Freedom Struggle in Uttar Pradesh, Lucknow, 1957.
13. Rudrangshu Mukherji : Awadh in Revolt-1857-1858. Oxford University Press, 1984
14. Savarkar, V.D. : The Indian War of Independence 1957, Bombay, 1947.
15. Sen Surendra Nath : Eighteen Fifty Seven, Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1957.
16. Tarachand : History of Freedom Movement in India. Vol.I-II Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1961-1967.
17. Zaidi, A.M. & S.G. : The Encyclopedia of the Indian National Congress, Vol.VIII, S. Chand & Company Ltd., New Delhi, 1980.

COLLECTED WORKS OF MAHATMA GANDHI, PUBLICATION DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION AND BROADCASTING GOVERNMENT OF INDIA

Vol. XVI : August, 1919 - January, 1920.
Vol. XVII : February - June, 1920.
Vol. XIX : November 1920 - April, 1921.
Vol. XX : April - August, 1921.
Vol. XXI : August - December, 1921.
Vol. XXII : December, 1921 - March, 1922.
Vol. XLII : October, 1929 - February, 1930.
Vol. XLIII : March - June, 1930.
Vol. XLIV : July - December, 1930.
Vol. XLV : December, 1930 - April, 1931.
Vol. XLVI : April 16, - June 17, 1931.
Vol. XLVIII : September, 1931 - January, 1932.
Vol. XLIX : January - May, 1932.
Vol. LI : September 1, - November 15, 1932.
Vol. LII : November, 1932 - January, 1933.
Vol. LIV : March 6 - April 22, 1933.
Vol. LVI : September 16, 1933 - Jaunary 15, 1934.
Vol. LVIII : May 18, - September 15, 1934.
Vol. LX : December 16, 1934 - April 24, 1935.
Vol. LXII : October 1, 1935 - May 31, 1936.
Vol. LXIII : June 1, - November 2, 1936.
Vol. LXV : March 15, - July 31, 1937.
Vol. LXVI : August 1, 1937 - March 31, 1938.
Vol. LXVII : April 1, - October 14, 1938.
Vol. LXIX : March 1, 1939 - July 15, 1939.
Vol. LXXI : December 1, 1939 - April 15, 1940.
Vol. LXXIII : September 12, 1940 - April 15, 1941
Vol. LXXIV : April 16 - October 10, 1941.
Vol. LXXV : October 11, 1941 - March 31, 1942.

REPORTS, PAPER AND LETTERS

Cornegy's Intelligence, for Dept., Secret. Branch. 26th Feb., 1858 No. 228 (News of 22 Dec., 1857). National Archives, New Delhi.
Foreign Consultation 17th Dec., Nos. 250/54 National Archives, New Delhi.
Foreign Political (A) 31 Dec., 1858. National Archives, New Delhi.
Subermati Series: File No. 21, Part III, S.Letter No. 17991-19172. Gandhi Museum Library, Rajghat, New Delhi.
The Bombay Chronicle, July 10, 1930 & February 23, 1943
Comrade, Delhi November 21, 1924.
The Statesman, Delhi, March 19, 1986.
Directory of Indian Women Today, India International Publication, 1976.
Oral History Transcript Zohra Ansari Recorded on 3.11.1974 Teen Murti Library, New Delhi.

******

اقبال

○ اقبال کے کلام کی ابتدائی اشاعت
اقبال کے نام پر رسائل

اقبال کی نظمیں / غزلیں ان کی زندگی میں پہلی

بار جن رسالوں میں چھپیں، اور ———

اقبال کے نام پر آزادی سے قبل جو رسالے نکلے،

ان کے عکس پیش خدمت ہیں۔

——— ادارہ

الکاشف

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء

الکاشف ۲/۱

اپنی طرز کا ایک جدید میگزین
جس میں علمی۔ اخلاقی۔ مذہبی
تاریخی اور سائنٹفک حالات
کے علاوہ صنعت و حرفت کے
مفید ملک مضامین چھپینگے۔
مذہبی مباحثہ اور فاتیات کے جھگڑوں
سے اسے کوئی کام نہیں قیمت
سالانہ مع محصول مرقوم ہے

مائیم و خلق جملہ جہان دوستدار ما

(جلد اول) مضامین کی تفصیل (نمبر اول)

ایڈیٹر و پراپرائیٹر قاضی حمید الدین احمد حمید۔ا۔ڈسٹرکٹ پروفیسر

منشی فیض علی پرنٹر پنجاب پریس سیالکوٹ سے چھپوا کر قاضی حمید الدین مالک ایڈیٹر نے شائع کیا

اشاعت گلکشن

غزل اقبال

زمانہ کی مسلسل تفرقہ اندازیوں سے ایک مدت کے بعد ہمیں اپنے معزز ہمعصر و ہموطن اور مکرم دوست جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے سیالکوٹ ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ صاحب موصوف کا نام تاہی زیادہ تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ ہمیں انکی ایک غزل اتفاق سے ملی ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:—

ایڈیٹر

جو مضمون زندگی میں حرفِ موزوں بن کے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں

سبب اے ہمنشیں کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارمان نے
کہ سارے دیکھنے والے تیری چلمن کے نکلے ہیں

کبھی اس رہ سے بھی شاید سواری تیری گزری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا تیرے توسن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی میرے دردمندوں نے
خدا جانے تیری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

کوئی کیا جانے وسعت فزا یہاں کی ہوا کیسی
تیری درگاہ سے ذرّے بیاباں بن کے نکلے ہیں

میرے ہیجان داستاں میری کلیجہ تھام کر سننا
کہ میری حال پر آنسو میرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر بن چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے
متاعِ دل کو لیکر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنونِ بادِ محبت کی
عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رخ نہیں کرتے
جو مثلِ بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

رفو کے بخیہ گر چاک محبت ہو تو کیونکر ہو
میرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی تیرے دانے میرے خرمن کے نکلے ہیں

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

برہمن روز محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو — صنم جو تھے وہ پتھر وادیٔ ایمن کے نکلے ہیں
تماشائی جو وسعت سینے اپنے دامن دل کی — ہزاروں دشت اک گوشے میں طول سخن کے نکلے ہیں
وہ مذبوح ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے — پرانے آشنا میری رگ گردن کے نکلے ہیں

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اسکے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں — اقبال

(سید) شیخ صاحب موصوف نے جس خوش اسلوبی سے مقطع میں اس لفظ کو رکھا ہے اُس کا مزا کچھ واقفان راز ہی لے سکتے ہیں جناب قبلہ مولینا سید میر حسن صاحب سیالکوٹ میں ایک نہایت ہی نیک نفس اور روشن خیال خوش اخلاق عالم و فاضل بزرگ ہیں جنکے شاگردان رشید کی ایک معتد بہ جماعت گورنمنٹ کی ملکی اور مالی خدمات کے معزز عہدوں پر ممتاز ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنی ابتدائی تعلیم سے لیکر ایف۔ اے تک انہیں کے سایہ عاطفت میں نشو و نما پائی ہے۔ اور مذاقِ شاعری بھی حضرت ممدوح کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے جسکا اشارہ انہوں نے مقطع میں کیا ہے۔

• •

ہمارے خاص قلمی معاونین

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا لاہور + منشی احمد حسین خانصاحب بی۔ اے سابیم سٹارئیلی شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ صاحب دہلی + میرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جالندھر + منشی نذیر محمد صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر حلقہ مدارس امرتسر +

مندرجہ بالا فہرست میں جن بزرگان قوم کے اسماے گرامی درج ہیں انھوں نے نہایت فراخدلی سے الاخوت کی دائمی امداد کا مستقل وعدہ فرمایا ہے۔ اس فہرست کے کھولنے سے ہمارا یہ منشا ہے کہ الاخوت کی قلمی معاونت کے لئے چیدہ چیدہ اصحاب کی ایک خاص جماعت پیدا کر جائے۔ تاکہ اسکی دائمی زندگی کا کافی یقین ہو جائے۔ مذکورہ اصحاب کا اس قومی خدمت کو سرانجام دینے کا ٹھیکہ لے لینا ہی کافی ہے۔ مگر پھر بھی احتیاطاً ہمیں یقین ہے کہ ہم اگلے پرچے کے جاری کرنے تک اس فہرست میں معتد بہ اضافہ کرنے کے قابل ہو جائینگے۔ جو صاحب خود بخود ہی اپنے آپ کو اس قومی خدمت کے لئے والنٹیر بنانا چاہیں انکے اسماے گرامی کمال شکریہ کے ساتھ درج کئے جائینگے ۱۲

جن معزز اصحاب کی خدمت میں رسالہ کا پہلا نمبر بطور نمونہ کے بھیجا جاتا ہے براے مہربانی اپنی منظوری یا نامنظوری سے منیجر کو مطلع فرمائیں اگر کوئی اطلاع نہ پہنچی تو یہ سمجھ لیا جائیگا کہ انھوں نے خریداری منظور فرمالی ہے۔ اور دوسرا نمبر ان کے نام بذریعہ وی پی ارسال کیا جائیگا ۱۲

منیجر

کلام اقبال

الاخوت کی اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جناب ڈاکٹر اقبال دام فیضہ جیسے صاحب علم و کمال نے اسکا سرپرست ہونا منظور فرما لیا ہے۔ اس سے ہم ضرور یہی نتیجہ مستنبط کرینگے کہ اس بروا کے چکنے چکنے پات بزبان حال سے ہونہاری کی پیشگوئی کر رہے ہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر اقبال شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ خان مرزا سلطان احمد صاحب اور احمد حسین خان صاحب جیسے بزرگان عالی پایہ اپنی گراں بہا عنایات کیلئے اسکی جانب توجہ ملتفت فرماتے؟

ڈاکٹر صاحب ابھی مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ ان دنوں آپکے جملہ علمی مشاغل بے توجہی کا شکار بن رہے ہیں۔ یہی حال شغل شعر و سخن کا ہے تاہم بعض اوقات اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی بن آتی ہے۔ لیکن جو لطف فراغت اور سکون میں نظم لکھنے آتا ہے ایسی حالت میں کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

اُمید ہے کہ ہمارے دوسرے پرچے کے چھپنے تک آپ مستقل طور پر یہاں مقیم ہو جائیں گے۔ اور ہمارے دامن اُمید کو دُر مقصود سے پر کرتے رہا کرینگے۔ ذیل کی فارسی غزل جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اس پرچہ کیلئے مرحمت فرمائی ہے۔ کمال شکریہ کیساتھ چھاپی جاتی ہے غزل سراپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔ ایڈیٹر۔

اے گل ز خار آرزو آزاد چون رسیدۂ — تو ہم ز خاک این چمن مانند ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ — دامن ز سبزہ چیدۂ تا بہ فلک رسیدۂ

افتی اگر بدست ما حلقہ بگرد تو کشیم — ہنگامہ گرم کردۂ خود ز میان رمیدۂ

شورش کعبہ یکطرف ہنگامہ دیر یکطرف — از آفرینش جہان درد سری خریدۂ

ہستم گدائے تو یا تو گدائے ماستی — با ہمہ نیاز سجدۂ دل بہ ما دویدۂ

با من بگو که مثل گل همواره شاخ بسته باش   مانند موج بوم را آواره آفریده‌ای

اقبال غربت توام نشتر بدل همی زده

تو در هجوم عالمی یک آشنا نه دیده‌ای

اقبال

الله اکبر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۶۱۷

(شائستہ کلیکشن)

تنظیم

جلد ۱ — نمبر ۱

فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

قیمت سالانہ تین روپے (سے) — ایک نمبر کے لئے پانچ آنہ کے ٹکٹ بھیجیں

سوراج

(در حدودِ دوائر سلطنت)

(از ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب)

شبے بہ میکدہ پیرِ کلیسیا می گفت ⁂ کہ رندِ میکدۂ تو بستۂ تنک جام است

گرفتم ایں کہ ثمر پختہ شد دلے گویم ⁂ اگر برید ز شاخِ نہالِ ما خام است

ترا ز پنجۂ شاہیں اماں دہد صیاد ⁂ فغاں چہ سود آزادگی تہِ دام است

من ستم زدہ ایں نکتہ را نہ فہمیدم ⁂ کہ فکرِ کہنۂ ہندی اسیرِ اوہام است

سروش مطلعِ میرضی بیادم داد ⁂ چہ مطلعے کہ سراپا نوائے الہام است

"نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخلِ خانۂ صیاد آشیاں بستند"

ہفت روزہ اقبال رام پور
ایڈیٹر حکیم مسیحا نظامی
یوم جمعہ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۳۸ء — پہلا سال

مدراس اسمبلی کا آئندہ اجلاس

خوشامد!

اے خوشامد کانپتے ہیں تجھ سے خود داروں کے دل — تو رخِ جرأت پہ حائل، تو ترقی پر محل
اعتمادِ نفس کے چھکے چھڑا دیتی ہے تو — پائے استقلال کے تئیں اڑا دیتی ہے تو
جس میں لیلائے غلو بیٹھی ہو وہ محمل ہے تو — چاپلوسی کا جہاں سایہ ہو وہ منزل ہے تو
تو وہ شیشہ ہے نہاں ہو جس میں غیبت کی پری — ہے تری روباہ بازی تک تری خوش منظری
تیرے ہر عشوے پہ کٹتی ہے ترے شیدا کی مت — [illegible]
تو لگا سکتی ہے ہر موقع پہ وہ باتوں کا باغ — مست ہو جاتا ہے جس میں خود پسندی کا دماغ
کاذبوں کو پیکرِ صدق و صفا کہتی ہے تو — اپنے متوالوں کو [illegible] کہتی ہے تو
تیرا عادی خلق میں ملعون بھی مطعون بھی — چوستی ہے تو رگِ انسانیت سے خون بھی
دیکھتی ہے جب مخاطب میں کوئی شانِ حباب — تو پلا دیتی ہے کانوں کو تملق کی شراب
رہزنِ تحقیق ہیں تیری قصیدہ بافیاں — منصفوں کو تو سکھا دیتی ہے ناانصافیاں

آہ وہ نادان جو آتے ہیں تیری چال میں
تیری تعریفیں نہیں لپٹے ہیں جوتے شال میں

شاد عارفی

رامپور میں خودکشی کا سنسنی خیز واقعہ

اسٹیشن روڈ کے درخت کیوں کاٹے گئے

(مسرت حسین آزاد کلیکشن)

جلد نمبر ۱

مدیر
ظفر احمد صدیقی
ایم۔ اے (علیگ)

مقاصد

"اقبال" "حلقۂ اقبال علی گڑھ" کی آواز ہے۔

اقبال کا مقصد ہے۔

علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت۔

مسلمانوں کی زندگی کی تمام مشکلات کا حل اسلام کی تعلیمات میں تلاش کرنا۔

ادبی کج راہی اور بد ذوقی کی اصلاح کرنا۔ "ط"

قواعد

۱۔ رسالہ اقبال ہر انگریزی مہینے کے شروع میں شایع ہوا کرے گا۔

۲۔ رسالہ میں نظم و نثر کے وہی مضامین شایع ہو سکتے ہیں جو رسالہ کے مقاصد اور پالسی کے مطابق ہوں۔

۳۔ رسالہ میں بیرونی اشتہارات حسب ذیل نرخ پر شائع کئے جا سکتے ہیں۔ ایک صفحہ ۱۰ روپیے۔ نصف صفحہ ۵ روپیے۔ ربع صفحہ ۳ روپیے۔

(نوٹ۔ صرف وہی اشتہارات شائع کئے جا سکتے ہیں جو رسالہ کی پالسی کے منافی نہ ہوں)

"منیجر"

۱۸۶

ماہنامہ

اقبال

جلد ۱ اپریل ۱۹۴۰ء نمبر ۱

مدیر

ظفر احمد صدیقی

ایم۔ اے (علیگ)

شبلی روڈ۔ علی گڑھ

قیمت سالانہ چار روپے فی پرچہ ۶ آنے

فہرست مضامین

یہ خط علامہ اقبال نے میری اُس نظم کے جواب میں ارسال فرمایا تھا جو ""نذر اقبال"" کے نام سے گذشتہ صفحہ پر درج کی گئی ہے۔ (ظفر)

لاہور ۱۲ / دسمبر ۳۶ء

[illegible]

[illegible]

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

- مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں — پروفیسر رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الٰہی — ۲۰ روپے
- رقعات رشید صدیقی — مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں — ۳۰ روپے
- اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر) (ہندی) — ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد — ۱۵ روپے
- قومی یکجہتی کی روایات — مسٹر بی۔ این۔ پانڈے — ۱۵ روپے
- مقدمہ طلسم ہوشربا — مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار — ۲۰ روپے
- طلسم ہوشربا (نو جلدیں) — منشی محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر — ۸۰۰ روپے
- فرہنگ زفان گویا — بدر ابراہیم، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد — ۵۰ روپے
- ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت — منشی رام پرشاد ماتھر — ۳۰ روپے
- جنید احمد کی آٹوگراف بک — مرتبہ جنید احمد — ۲۰ روپے
- ایک نادر روزنامچہ — مظہر علی سندیلوی — ۲۵ روپے
- دیوان مصحفی — منتخبہ امیر مینائی و اسیر — ۵۰ روپے
- من موہن کی باتیں (قرآن مجید کا ترجمہ) (ہندی) — مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی — ۱۵ روپے
- داستاں میری (بیسویں صدی کے بہار کی تہذیبی تاریخ) — ڈاکٹر اقبال حسین — ۳۰ روپے
- شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا — جنید احمد — ۴۵ روپے
- یادگار روزگار (تذکرہ کاملانِ پٹنہ) — بدر الحسن (م ۱۹۳۴ء) — ۱۲۵ روپے
- گیتا اور قرآن — پنڈت سندر لال — ۲۵ روپے
- تحفۃ السعداء — خواجہ کمال (م بعد ۱۰۱۹ھ) پیشکش حکیم حسین خاں شفا — ۲۰ روپے
- قطعات دلدار — دلدار بیگ، مرتبہ قاضی عبدالودود — ۲۰ روپے
- اقبال ہندستان اور پاکستان (ہندی) — پروفیسر سید حسن احمد، ترجمہ نریندر کمار پوڑی — ۱۵ روپے
- ایک نادر روزنامچہ — پروفیسر نور الحسن ہاشمی — ۳۰ روپے
- تواریخ نادر العصر — منشی نولکشور، تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن — ۲۵ روپے
- دیوان حافظ (شاہان مغلیہ کے ذاتی نسخہ کی عکسی اشاعت) — ۱۰۰ روپے
- نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد (۱۲-۱۹۱۰ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰ روپے
- پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۳ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ — ۴۵ روپے
- برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰ روپے
- قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰ روپے
- مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ — ۷۵ روپے
- خوشتر منگر دلی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ — ۵۰ روپے

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ابوالکلام آزاد
یاد آزاد
مرتبہ: محمد حبیب (مرحوم)

عبدالسلام صاحب ابن محمد حبیب صاحب کی پیشکش

۱۹۸۷ء میں رانچی جانا ہوا تو محمد حبیب صاحب زندہ تھے جنھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بھی کہ انھوں نے اس وقت کی یادداشتیں بھی کہیں لکھ رکھی ہیں۔

۱۹۹۰ء میں پھر جانا ہوا تو حبیب صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ان کے فرزند گرامی جناب عبدالسلام صاحب نے ان کے مسودات بکمال مہربانی ہمارے سپرد کیے، جو اب آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ اس کے لیے اردو دنیا اور ابوالکلام شناسی کے طالب علم ان کے شکر گزار ہیں۔

—— ادارہ

ابوالکلام آزاد رانچی میں

رانچی نظر بندی زمانے کے

ملفوظات

معمولات

متعلقات

مرتبہ

محمد حبیب

(رانچی)

کچھ محمد حبیب صاحب (رانچی) کے بارے میں

یہ خاکہ ہمیں محمد حبیب صاحب کے صاحبزادے عبدالسلام صاحب سے ملا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

● **نام والد صاحب**:۔ محمد حبیب ولد عظمت علی ● **مکان**:۔ ڈاکٹر فتح اللہ لین، رانچی ● **تاریخ پیدائش** مطابق اسکول سرٹیفکیٹ ۱۸۹۷۔۵۔۱۴ ● **تاریخ وفات**:۔ ۱۹۹۰۔۱۔۹ ● ابتدائی اردو، فارسی اور دینی تعلیم گھر میں۔ بعد میں اپنی کاوش سے average standard کی عربی تعلیم حاصل کی۔

انگریزی اور اسکول کی تعلیم کے لیے مقامی St. Paul's school کے طالب علم رہے۔ ۱۹۱۹ء میں First Division سے Matriculation کا امتحان پاس کیا۔ مقامی طور پر اس زمانہ میں کوئی کالج نہیں تھا لہٰذا تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

۱۹۲۰ء میں Inspector of school Ranchi کے آفس میں ملازم ہو گئے اور پھر وہاں سے Resign کر کے ۱۹۲۹ء میں Indian Mental Hospital, Kanke (Ranchi) کے دفتر میں بحیثیت خزانچی کے بحال ہوئے اور وہاں سے ۱۹۵۵ء کی مئی میں Retire کر گئے۔

Retirement کے بعد سکریٹری انجمن اسلامیہ رانچی کے عہدہ پر معمور ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک رہا۔

● **مولانا آزاد سے رابطہ**:۔ نظر بندی کے عالم میں مولانا اکثر ہم لوگوں کے محلے سے ٹہلتے ہوئے گذرتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی۔ محمد حبیب صاحب اکثر مولانا کے ساتھ نشست میں شامل رہتے تھے۔

۷ دسمبر ۱۹۱۹ء (جمعہ) جامع مسجد رانچی

(خطبہ) برادران من

تم اس شخص کو کیا کہو گے جو معمار بن کر کسی مکان کو بنانے کے لیے گیا ہو اور بجائے اس کے کہ اس کے ہاتھ اینٹوں کے جمع کرنے اور دیواروں کو درست کرنے میں مشغول ہوتے ایک تیشہ ہے کہ دیواروں کو توڑ رہا ہے اور مکان کو ڈھا رہا ہے تو تم تعجب کی نگاہوں سے دیکھو گے۔ مگر افسوس، ظلمت کے پردے پڑے ہوئے ہیں تاریکیوں اور اندھیرے بادلوں سے گھرے ہوئے ہیں اور اس پر بھی غفلت در غفلت۔

حقیقت یہ ہے، عزیزان من، شریعت دنیا کو جس تاریکی سے بچانے کے لیے آئی تھی آج بعینہ وہی تاریکیاں مجھ پر بھی پڑی ہوئی ہیں۔ شریعت کے آنے سے قبل زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے الگ مہینوں کے الگ الگ شگون خیالی اوہام کے بنا پر قرار دیدیا تھا۔ نہ تو ان کو کسی الہامی کتاب نے تعلیم دی تھی اور نہ کسی شریعت نے بتلائی تھی ایک مہینہ کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مہینہ بہت اچھا ہے اور دوسرے مہینہ کو منحوس سمجھا کرتے تھے تو تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ان مہینوں کے ایک مہینہ صفر کا بھی تھا جس کو لوگ نہایت بدشگون سمجھتے تھے۔ مگر افسوس آج یہی سب چیزیں ہم میں رائج ہیں۔ اس مہینہ کے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس مہینہ میں کوئی خوشی کا کام نہیں کرنا چاہیے اور اگر کریگا تو نقصان اٹھائیگا اور کوئی اس مہینہ کے آخری چہار شنبہ میں خوشی مناتا ہے کہ جس سے سال بھر تک اس کو خوشی حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں کہ جس کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو دفتر کے دفتر چاہئیے میں کس کس بات کو دکھلاؤں۔ لوگ تعویذ گھول کر پیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب تمام دنوں کے گناہ معاف ہو گئے حالانکہ اس میں

کوئی بات مطابق شرع کے نہیں ہے سب باطل اور لغو ہیں اس کو نہ تو قرآن نے بتلایا ہے اور نہ اس کے رسول نے۔
سب برابر ہیں ہر روز سورج نکلتا ہے اور غروب ہوتا ہے اس کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں۔ تواریخ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے قبل اس مہینہ میں بیمار ہوئے اور وہ دن چہار شنبہ کا تھا تاریخ ۲۰ صفر اس کے بعد آپ کی وفات ربیع الاول کی بارہویں تاریخ بعض روایتوں کے مطابق ہوئی۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اس کے علاوہ کچھ کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔

آخری چہار شنبہ کوئی چیز نہیں اور نہ اس کی کوئی خصوصیت ہے۔

(خطبہ کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب تشریف لائے جو ایک عالموں میں سے ہیں دانا پور کے رہنے والے ہیں اور ان کا مطب کلکتہ میں ہے۔

۹ دسمبر ۷۸ء (یکشنبہ)

ایک آدمی دیکھنے میں بہت سیدھے مسجد میں آئے ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

قبل مغرب ایک شخص نے مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا حضور۔ دو بھائی تھے۔ کول ایک بھائی مسلمان ہو گیا اور دوسرا اپنے قدیم مذہب پر قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد جو بھائی مسلمان نہیں ہوا تھا مر گیا۔ لوگوں نے اس کے بھائی سے کہا دیکھو تمہارا بھائی مر گیا ہے اب اس کا کوئی نہیں ہے لکڑی تمہارے گھر موجود ہے جلانے کے لیے دیدو اگر قیمت مانگو گے تو قیمت بھی مل جائیگی یوں تو تمہارا بھائی ہی ہے اس نے لوگوں کے اصرار پر لکڑی اس کے جلانے کے لیے بھیج دیا اب دور دیہہ کے ایک مولوی نے فتوی دیدیا کہ وہ شخص مسلمانوں سے خارج ہونے کے قابل ہو گیا ایک تو وہ نو مسلم دوسرے مذہب سے ناواقف۔ یہ سنتے ہی گھبر اٹھا۔

مولانا نے فرمایا۔ بات یہ ہے میرے بھائی فتوی دینے والے کو چاہیے کہ قبل اس کے کہ وہ فتوی دے مجرم کی حالت پر بھی غور کر لے اور پھر عام اثر جو لوگوں پر ہوگا اس کو بھی سوچ لے۔ اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کو تنبیہ کریں ایسا نہ ہو لوگ دیکھ کر ویسا ہی کرنے لگیں تو یہ عین شریعت ہے اور چاہیے بھی یہی کیونکہ حب اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی ہر مسلمان پر فرض ہے اور جو ایسا نہیں کرتا ہے وہ اپنے ایمان میں مکمل نہیں ہوا ہے ایمان کمزور ہے۔

اسلام تو ایسی تعلیم اخلاق و آداب کی غیر مذاہب کے لیے دیتا ہے جو دوسرے قوموں کو حاصل نہیں ہے۔
جنگ بدر میں جب کفار مارے گئے تو آپ کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا آپ نے ان لاشوں کو زمین کھود کر ڈلوا دیا بغیر نماز جنازہ

پڑھے ہوتے اور درحقیقت اس میں بگڑتا ہی کیا تھا ہم سے جہاں تک ہو سکے غیر مذہب والوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آویں اب فرض کر لیجئے ایک شخص جو ہندو تھا مسلمانوں کے محلہ میں مر گیا اور اب اس کا کوئی نہ رہا اس حالت میں اگر ہم اس لاش کو چھوڑ دیتے ہیں تو وہ سڑتا ہے اور اس سے بیماری پھیلتی ہے تو اس وجہ سے چاہئے کہ اس لاش کو زمین کھود واکر ڈال دیں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ (دوشنبہ)

وہ شخص جو کل مسجد میں آیا تھا مشہور کیا کہ میرے پاس کچھ زیارت کی چیزیں ہیں۔ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے موذن ضیاالحق سے کہلا دیا کہ اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ بڑائی چھوڑ کر چلا جائے۔

بعد مغرب مولانا نے فرمایا:

لوگ چندہ کے حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب سے عام مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں میں نے خود حیدرآباد میں دیکھا ہے عید کی نماز کے بعد ایک شخص لوگوں سے ایک کاغذ پر سجدہ کرا رہا تھا اور پیسے وصول کر رہا تھا۔ نہ معلوم ایسے لوگ اپنے جی کو کیونکر تسکین دیتے ہونگے کہ تو بہ کریں گے۔ ایسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے اور کسی جگہ سنٹر مقرر کر کے ان کا استاد بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ادھر اُدھر بھیجتا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں اور دو چار لڑکے گانے بجانے والے لگا رہتے ہیں۔ موقعہ دیکھ کر گانے بجانے لگے اور جب لوگ جمع ہو گئے تو اپنا کام شروع کر دیا۔

عام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی چیز نسبت کی جاتی ہے تو انکے دل میں ایک طرح کی محبت ہوتی ہے اور اس حالت میں روپیہ دو روپیہ دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

یہ لوگ آثار قدم اور پیراہن جسکا کوئی ثبوت نہیں لیے پھرتے ہیں اور غلاف کے اندر اس کو رکھتے ہیں نکالتے وقت لوبان جلاتے ہیں اور لوگوں سے سجدہ کراتے ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ واقعی یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں تو اس آدمی کو جس کے پاس یہ چیز ہے اس سے محبت ہوتی اور اس کو اپنے جگر سے لگاتا دیر کہ ٹکے دو ٹکے میں ذلیل کیے پھرتا اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو شرعی قانون کے مطابق دُرّے لگائے جاتے۔ ایک آثار قدم آگرہ میں ہے تو دوسرا حیدرآباد میں اور لطف یہ بنانے والے نے یہ سمجھا کہ چونکہ آپ ایک بڑے آدمی تھے اس بنا پر آپ کا پیر بھی بڑا ہوگا۔ ایک دو فٹ کے پیر کا نقش پتھر پر کھود دیا حالانکہ یہ بھی غلط ہے بخاری میں آپ کے وجود گرامی کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کا ہر عضو

درمیانی حالت پہ تھا نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا

۱۱ دسمبر ۱۷ء (سہ شنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب مسجد میں آئے رانچی میں ان کے چند مرید بھی ہیں۔ نماز مغرب انہوں نے پڑھائی مولانا نماز پڑھ کر چلے گئے۔

۱۲ دسمبر ۱۷ء (چہارشنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب نے مغرب کی نماز پڑھائی اور مولانا ابوالکلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ افسوس مولانا کی قدر رانچی کے مسلمان نہیں جانتے۔ اگر کچھ علم ہوتا تو آنکھیں کھل جاتیں جناب مولانا کو علماء کا طبقہ عزت کرتا ہے اور یہ محدث محقق اور ہمدرد قوم ہیں۔

۱۳ دسمبر ۱۷ء (جمعرات)

جمعدار صاحب نے مولانا سے کہا:

حضور، رانچی میں آدمی کے مرنے کے بعد لوگ قرآن شریف یا گیہوں کے قسم کا غلہ فدیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میت نے جو کچھ فرائض یا واجبات اپنی زندگی میں جان بوجھ کر یا سہواً ترک کیا ہے تو بالعوض اس کے یہ قرآن اور اس قدر گیہوں فدیہ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب قبول کرتے ہیں اور دیگر اشخاص جو تعداد میں سات ہوتے ہیں ایک دوسرے کی طرف ان چیزوں کو بڑھاتے ہیں ایسا کرنا شریعت سے جائز ہے یا نہیں مولانا نے فرمایا:

یہ صورت جو آپ نے فدیہ کی بیان کی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ حقیقت یہ ہے کہ فرائض یا واجبات سے کیا معنی کوئی گناہ بھی کرے اور اس کا بدلہ زمین کو سونا سے بھر کر دینا چاہے کہ معاف ہو جائے تو یہ محال ہے۔ آیت کریمہ مجکو بتلا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ذرہ برابر گناہ کے لیے اگر تم دنیا کو سونا سے بھر دو اور چاہو کہ معاف ہو جائے تو یہ محال قطعی ہے۔ یہاں پر یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ جب خدا نے انسانوں کو مخاطب کر کے سنا دیا تو لوگ عزیزان من کب ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہ صرف ایک وقت کی نماز بلکہ سوال یہ ہے کہ عمر بھر کی نمازیں اور روزے قصداً ترک کیے ہوں اور بعد مرنے کے فدیہ دیدیا جائے اور معاف ہو جائے اس کے معنی ہیں کہ آدمی عمر بھر ضلالت اور گمراہی میں مبتلا رہے اور صرف اتنا کرے کہ دس بیس روپئے چھوڑ کر مرے تو اس کے تمام ذنب و گناہ معاف ہو جائینگے۔ درحقیقت جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ شریعت اور احکام الہٰی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ سخت معصیت کر رہے ہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے اور تمام فقہاء نے اس پر بالاتفاق اجماع کیا ہے کہ کوئی شخص بوجہ مسافرت یا اور کسی مجبوری سے روزہ نہ رکھ سکا ہو

اور درمیان میں قبل روزہ رکھنے کے قضا کر گیا ہو تو اس کے وارث پر واجب ہوگا اگر وہ مسلمان ہے۔ اس کے ترکہ میں سے دو شام کے کھانے کے حساب سے ہر روزہ کے بدلے فدیہ کر دے۔ بس اور یہ مسئلہ صرف روزہ ہی کے متعلق ہے نہ دیگر فرائض کے۔

گناہ معاف ہونے کی یہ صورت غلط ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد فدیہ ادا کر دیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ اگر کوئی آدمی صدق دل سے توبہ کرتا ہے تو دو چار روزے کے گناہوں کے کیا معنی اگر اس کے تمام گناہوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور زمین سے آسمان تک پہنچ جائے تو ایک لمحہ ادا ایک آن میں معاف ہو سکتا ہے توبہ کرنے والے کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ ان سے رضامند ہوا اور وہ اللہ سے رضامند ہوئے۔ یہ تعبیر فرشتوں کو بھی میسر نہیں۔ پس ہر مرد انسان اور عورت پر واجب ہوا کہ وہ درگاہ الٰہی میں ہمیشہ توبہ و اجابت کا سر جھکائے رہے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہے۔

(ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد)

اگر مسلمانوں کے مقدمے، طلاق اور نکاح کے قاضی فیصلہ کرتے تو آج یہ ذلتیں جو ہم اٹھا رہے ہیں اور غیر لوگوں کے سامنے جو دشریعت سے واقف اور نہ اسلام کی خوبیوں کی خبر رکھتے ہیں جو جی میں آتا ہے فیصلہ لکھ دیتے ہیں ان کے سامنے ہمارا مقدمہ جاتا ہے۔ دراصل پہلے سے مسلمانوں نے اس کی کوشش نہیں کی حالانکہ گورنمنٹ کو کوئی عذر نہ تھا انگریزوں نے ہندستان ہندوؤں سے تو لیا نہ تھا یہ حکومت مسلمانوں کی تھی۔ گورنر جنرل نے عالم گیر سے تخت لیتے وقت یہ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے مقدمے ان کے قرآن اور حدیث کے مطابق فیصل کیے جائیں گے۔

گورنمنٹ کو بہت آسانی ہوتی بلکہ ایک بہت بڑا جھگڑا طے ہو جاتا۔ ایک شیخ الاسلام ہوتا جس کے صلاح کار ممبر ہوتے اور قاضی مقرر کیے جاتے مسلمانوں کا جو مقدمہ ہوتا قاضی فیصلہ کرتا۔ یہی سب حق تلفی کی سزا ہے جو آج ہم پا رہے ہیں۔

گزشتہ مردم شماری میں ایک خانہ اور بڑھا دیا گیا تھا جس میں مختلف پیشوں کے حالات خاص کر بازاری عورتوں کی تعداد کتنے دنوں سے وہ اس کام کو کر رہی ہیں اور کیا وجہ ہے، معلوم کر سکیں۔

(۱) پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کی غفلت اور سستی کی وجہ سے بھی مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھی جا رہی ہے اور ہندو دن بدن گھٹتے جا رہے ہیں۔

(۲) بہت سے مسلمانوں کی وہ عورتیں جو بازاری ہو گئی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جن کے شوہران سے برطرف ہو گئے اور آخر ان عورتوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔

(۳) ہندوؤں میں وہ عورتیں جو لڑکپن میں بیوہ ہو گئیں اور شادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کام کو اختیار کر لیا۔

یہ باتیں کس قدر قابل افسوس ہیں اور یہ سب نتائج عورتوں کے حق کو چھوڑ دینے کے ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے حق کو ادا کریں تو ایسا ہی ہم لوگوں پر فرض ہے کہ ہم ان کے حقوق ادا کرتے رہیں۔

آج اگر گورنمنٹ کو کوئی اس طرف متوجہ کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ قانون ایک بار پاس کر دیا گیا اب بدل نہیں سکتا لاکھ آپ بکا کیجئے مگر کارگر نہیں ہوتا یہ سب باتیں جب ہی قرار پا سکتی ہیں جب رعایا کو حکومت میں دخل ہو۔

۱۶؍دسمبر ۱۹۰۷ء (یکشنبہ)

طاہر صاحب نے دریافت کیا۔

جس عورت کے گود میں بچہ ہو اور وہ حیثیت لڑکے کی وجہ سے پاک صاف نہیں رہ سکتی ہو تو اس حالت میں اس کے نماز پڑھنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔

مولانا نے فرمایا۔ وہ عورت اگر اس بات سے مطمئن ہے کہ غسل کرنے سے کوئی ضرر خود یا لڑکے کو نہیں پہنچ سکتی تو اس حالت میں بہتر اور اولیٰ ہے کہ وہ غسل کر کے نماز ادا کرے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر میرے بھائی عذر کی حالت میں غسل کیے بغیر نماز ہو جاتی ہے۔ صرف اس جسم کو صاف کرے جہاں ناپاکی کا احتمال ہو اور اگر یہ خیال نہ ہو کہ کون سا عضو صاف کرے تو چاہئے کہ صرف وضو کر کے نماز پڑھے۔ شریعت میں کسی قسم کا جبر اور تشدد نہیں ہے۔ دین اسلام ایک آسان مذہب ہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے عورتیں جو مجبور ہیں اور نہیں ہو سکتا کہ پانچوں وقت غسل کر سکیں اگر اس بات کی پابندی لگائی جائیگی کہ بغیر غسل کے نماز ہی نہیں ہو سکتی تو نتیجہ یہ نکلیگا کہ نماز ہی نہیں پڑھی جائیگی۔

نماز ہر حالت میں پڑھنا چاہئے۔ غسل کرنے سے ضرر کا خوف ہو تو صرف وضو ہی کر لے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے اگر نماز ضرور پڑھے۔

اب اس کو دیکھئے کہ لوگ کس قدر بیجا تشدد کرتے ہیں جس کی ایک قلم ضرورت نہیں اور لطف تو یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی پر دباؤ چل سکتا ہے تو اس پر بالکل سختیوں کا حد کر دیتے ہیں نرمی کی جگہ پر سختی اور سختی کی جگہ پر نرمی مگر وہ لوگ جو ذرا قوی پنجہ رکھتے ہیں اور پیسے والے ہیں تو مفتیوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ اگر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ حرام کو حلال ثابت کر دیں تو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں صرف سوال ہے پیسوں کا اور وہ غریب بیچارے جو مسکین ہیں تو ان پر جس قدر بے جا سختیاں کی جائیں درست ہے۔

اب اس کو کیا کہئے گا۔ لوگ جھگڑا کرتے ہیں حرف ضاد پر کوئی کہتا ہے سورۂ فاتحہ میں ولا الضالین کو ولاالدالین اور کوئی کچھ غرض یہ ہے کہ نہیں پڑھنے سے گنہگار تھے اب پڑھنے سے کافر کیا خوب ایک لطیفہ گویا

کہا ہے صاحب میں نماز نہیں پڑھتا تھا اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ سخت معصیت کر رہا ہوں مگر جب اس بات کا پتہ چل گیا کہ صرف ضاد کو جب تک کوئی صحت کے ساتھ عربوں کی طرح نہ ادا کر سکے گا وہ نماز نہ پڑھے ورنہ کافر حالانکہ یہ سمجھنا لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ حرف ضاد کو صرف عرب والے ادا کر سکتے ہیں دوسری زبان میں یہ حرف کا ادا کرنا عربوں ہی کی خصوصیت ہے۔ جب آپ کتب ادب عربی پڑھیں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ منجملہ عربوں کی خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اہل ضاد کہلاتے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ، جو دوسرے خلیفہ گزرے ہیں، ان میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حرف ضاد داہنے جانب منہ سے ویسے ہی صحت کے ساتھ ادا کر سکتے تھے جیسے بائیں جانب سے اور دائیں جانب سے ادا کرنا مشکل ہے کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جب تک کوئی آدمی حرف ضاد کو عربوں کی طرح نہ پڑھ سکے گا تب تک وہ مسلمان ہی نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان عجمی بھی تھے۔ حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور دیگر اشخاص جنکی زبان عربی نہیں تھی آپ نے یہ نہیں کہا، ان لوگوں کو حرف ش، س، یا ض پڑھاؤ بلکہ آپ نے یہی کہا قرآن پڑھاؤ

حضرت بلال کا واقعہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے حرف ش ادا نہیں ہوتا تھا بجائے ش کے س کہتے تھے مگر جس دن اذان نہیں پکارتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان میں مزہ نہیں آتا تھا وہاں حضرت بلال کا س، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر محبوب تھا اور آج یہ حال ہے کہ ہم صرف ضاد پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں گے حالانکہ عشرہ مبشرہ، جنکو جنت کی بشارت وحی سے مل تھی، اور واقعہ یہ تھا کہ جب وحی آئی کہ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف منہ پھیرلو تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پھیرنے پہ اول دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا تو وہ لوگ تھے، عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے مگر عمر رضی اللہ عنہ جب دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں صہیبؓ میرے جنازہ کی نماز پڑھائیں گے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ مسجد نبوی میں ہر ملک کے لوگ جو ایمان لائے تھے قرآن تلاوت کر رہے تھے۔ سبھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا تو فرمایا۔ زبانیں تو مختلف ہیں مگر قرآن ایک ہے۔ ان بحثوں کا نچوڑ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن اس لیے نہیں آیا ہے کہ ہم صرف ض اور ظ اور ذ پر ایک دوسرے کو کفر کا فتویٰ دیں بلکہ اس لیے کہ ہم اس کے مطالب پر غور کریں اپنے اندر نور ایمان پیدا کریں اور تب دنیا و دین کی سعادت و برکت حاصل ہو سکتی ہے آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہندستان میں کہیں عربی کی اصل تعلیم نہیں مسلمانوں نے اگر کوشش کر کے کچھ روپے جمع بھی کیے کہ ایک مدرسہ کھولیں گے کس لیے کہ قاری پیدا کیے جائیں۔ ان سب باتوں سے

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ قرآن کے معنی سے غفلت کیے جارہے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں جو اتنا ضروری نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ قرآن کے الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرے مگر بعد مطالب کے یہ نہیں کہ زبان سے لفظوں کو کہتے جارہے ہیں اور معنی سے بے خبر ہیں۔ میری مادری زبان عربی ہے میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا گیارہ برس عربی کی تعلیم پائی مگر حرف ضاد کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوتا کہ میں صحت کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔

۱۷ ردسمبر ۱۹۱۷ء (دوشنبہ)

محمد اسمٰعیل شہید کو دیکھئے دلی کی مسجد میں انکا یہ حال تھا کہ ایک گھنٹہ مصافحہ میں لگ جاتا تھا اور فرصت نہیں ملتی تھی کہ سیڑھی سے نیچے قدم رکھیں۔ انہوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کر کے شاہانہ زندگی بسر کی اور آخر میں شہید ہو گئے

اسکا واقعہ یہ ہے کہ جب سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم کرنا شروع کیا تو اسمٰعیل نے، خدا انکو جنت نصیب کرے، جہاد کا فتویٰ دینا شروع کر دیا پہلے لوگوں کو تعجب معلوم ہوا کہ جہاد کا حکم بادشاہوں اور امیروں سے ہوتا ہے۔ کہاں اسمٰعیل اور جہاد۔ پھر لوگ بیان کرتے ہیں۔

محمد اسمٰعیل کی زبان میں اتنی تاثیر خدا نے دی تھی کہ ان کے آدھ گھنٹہ کے وعظ میں لوگ لاکھوں روپئے کا مال چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو جاتے تھے اور یہ واقعہ لارڈ ڈالگن کے زمانہ میں ہوا تقریباً ۱۸۶۲ء میں۔ بس وہ یہی کہتے تھے اب نماز روزہ کا وقت گیا اب وقت آ گیا جہاد کا دشمنوں کی راہ میں کمر باندھو اور خدا کی راہ میں اپنے کو قربان کر دو۔ چنانچہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے مگر منافقین ادھر آگ لگانے لگے اور لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ بہتوں نے اسمٰعیل کا ساتھ چھوڑ دیا ایک مقام پر دشمنوں کی فوج نے حملہ کر دیا اسمٰعیل کے ساتھ کل گیارہ سو آدمی تھے اور دشمن پچاسوں ہزار۔ اسی میں ان کی شہادت ہوئی

ایک شخص مجھے اجمیر میں ملا وہ بہت بوڑھا تھا اسکا نام غنی تھا۔ اسکی کتابوں کی دکان تھی۔ اس نے مجھ سے کہا اسمٰعیل کی یہ حالت تھی کہ جس وقت وہ وعظ کرتے تھے اس وقت لوگ اپنے تمام اشیاء و اہل و عیال کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لیتے تھے اور میرا بھی جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ ہو جاؤں۔

محمد اسمٰعیل سے لوگوں نے پوچھا آپ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور آپ نے سید احمد سے بیعت کر لی۔ اسکے جواب میں انہوں نے کہا۔ نماز روزہ کے مسئلوں سے میں خوب واقف ہوں اور ایک مسئلہ پر گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے نماز پڑھنا نہیں آتا تھا مولانا سید احمد نے مجھے نماز پڑھادی۔ دراصل یہ وہ جماعت تھی، میرے بھائی، جو صحابہ کرام کے گروہ میں سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اور سب سے پہلے تو دی کو نمونہ بننا چاہتے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ ویسا ہی کریں اور جب اپنے ہی میں وہ صفت نہیں ہے تو دوسرے اس کی باتوں پر کیا عمل کرینگے۔ ایسے کوئی کتاب ایک کہہ کہا جاتا ہے

ایک شخص۔ حضور یہ جو لوگ کہتے ہیں۔ فلاں شخص بڑا ولی اللہ ہے تو اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور میں بھی۔

مولانا۔ بھائی یہ جو تم نے کہا بہت صحیح کہا ان کے پاس کوئی نئی شریعت نہیں آئی۔ وہ اسی پر عمل کرتے ہیں جس پر میرا عمل ہے۔ مگر حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ سے ارشاد فرمایا میں ابوبکر کو دوست رکھتا ہوں نا سلئے کہ وہ بہت نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ زیادہ نماز پڑھنے سے کوئی شخص خدا و رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا بلکہ اصل چیز ایمان ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جس کو تم بار ہا سن چکے ہوگے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شریعت کی خدمت کرنے میں سبقت لے جائیں اب خیال کیجئے صحابہ کرام کو رشک کس کا ہوتا تھا، خدمت شریعت میں اور مال خرچ کرنے میں اور یہاں یہ حال ہے کہ ہم رشک کرتے ہیں مال جمع کرنے بڑے کام کرنے اور پہننے اور اوڑھنے میں۔ بہر کیف آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی آپ نے ارشاد فرمایا جس سے جو ہو سکے اس کار خیر میں حاضر کرو چنانچہ لکھا ہے، اس دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا بس اس بار میں ابوبکر سے سبقت لے جاؤنگا حضرت عمر رضی اللہ نے اپنے مال کا دو حصہ مسجد نبوی میں حاضر کیا اور ایک حصہ اپنے بی بی کے بچوں کے لیے رکھ چھوڑا کیونکہ وہ بھی ضروری تھا۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عمر نے اپنے مال میں سے ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے لیے رکھا ہے اور باقی کو حاضر کیا اسی طرح دیگر صحابہ نے کہا۔ جب باری ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آئی تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں کہا۔ یا رسول اللہ میں نے اپنے بی بی بچوں کے لیے خدا اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا ابوبکر سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

اس بحث سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ درحقیقت زیادہ نماز اور روزہ کی گنتی سے کوئی شخص بزرگ نہیں ہو سکتا، اصل دیکھنا ہے کہ وہ کس قدر شریعت کے احکام پر عامل ہے اور اس کے انجام دینے میں کس قدر کوشاں ہے۔

وہ شخص۔ مگر حضور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پھر ان کو کیوں فضیلت حاصل ہوئی۔

مولانا۔ میں نے آپ سے کہا نہ۔ پہلے آدمی کو چاہئے کہ جو لفظ بولے اس کے معنی پر غور کرے۔

ولی کے معنی چاہنے کے ہیں اور یہ لفظ مشتق ہے لفظ ولایت سے تو ولی اللہ کے معنی ہوئے اللہ کا چاہنے والا۔ انکی نمازوں کا کیا پوچھنا ہے۔ وہ اپنی نماز اس طریقہ سے پڑھتے ہیں کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔ بس۔ اگر یہ کسی سے نہ ہو سکے تو وہ یہ تصور کرے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

وہ شخص۔ بس حضور سمجھا ان میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔

مولانا۔ ہاں میرے بھائی اتباع رسول اور اتباع خدا یہ اصل چیز ہے۔

۱۰ر دسمبر ۱۹۶۷ء (سہ شنبہ)

اکرام علی۔ حضور مجھکو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دراصل صوفی کا مطلب کیا ہے۔

مولانا۔ صوفی کے معنی کھلے لفظوں میں یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ شخص شریعت پر عامل ہو اور ایک سنت بھی ایسی نہیں ہو جسکو وہ ترک کرتا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھنا چاہیے کہ ایک آدمی ہے جو برسوں چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو اس مریض کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اس کی تلاش کرے کہ کہیں اس کو حکیم حاذق مل جائے لوبغیر حکیم کے اسکا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد حکیم سے نسخہ لے مگر اب بھی وہ مریض نسخہ حاصل کرنے پر اچھا نہیں ہوگیا۔ اس لیے اس کو تیسری منزل طے کرنا پڑیگی اور وہ یہ ہے کہ اس نسخہ کے مطابق عمل کرے جو جو دوائیں اس میں لکھی ہیں اپنے حلق سے اتارے۔

جس طرح جسمانی تندرستی کے لیے تین مراتب طے کرنا پڑتے ہیں اسی طریقہ سے روحانی تندرستی کے لیے بھی تین منزلیں ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف حکیم مل گیا تو محض حکیم کے ملنے سے بیماری دور نہیں ہو جاتی یا یہ کہ ایک نسخہ خواہ جالینوس کا کیوں نہ ہو، حاصل ہو جائے اس سے ہرگز ہرگز بیماری دفع نہیں ہوتی جبتک اس کی دواؤں کو نہ پیئے۔ اسی طریقہ سے روحانی بیماری کے لیے سب سے پہلا کام ایک مریض کو چاہیئے کہ سمجھ لے کہ حکیم کی تلاش کے بغیر اس کو تندرستی نہیں ہو سکتی تو شریعت کی اصطلاح میں اس حکیم کا نام رسول ہے اور اس دنیا میں اب سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحیح علاج نہیں کر سکتا اس کے سوائے جتنے علاج ہیں سب ناقص ہیں۔

اس بنا پر جب آدمی کو حکیم مل گیا تو اس کے بعد نسخہ لکھا لینا چاہیئے۔ نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہے اس کو میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں مگر دقت یہ پیش آتی ہے کہ بیمار کو باوجود نسخہ مل جانے کے دوا نہیں پیتا اور بظاہر نسخہ لے لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نسخہ کے حرفوں اور نقطوں سے بیماری نہیں جا سکتی۔ اس سے پہلے وہ بیمار جو مدتوں چارپائی پر لوٹ رہا ہے اور باوجود دوا آنے کے گھنٹوں پڑا منہ بنا رہا ہے مگر دوا نہیں پیتا ہے اب صرف دوا بھی کچھ کام نہیں کرتی جبتک اس کو ایسا شخص نہ ملے کہ جب جب ضرورت ہو زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دے گھر پر ڈاکٹر پرہیز کرنے کے لیے بول گیا مگر جہاں آواز آئی گرم گرم چنے ہیلو، فوراً منگوا کر کھا لیا گیا اس مریض کو یہ معلوم نہیں کہ چنا بیماری میں مضر ہے پھر وہ کیوں کھاتا چاہتا ہے درحقیقت اس کے اندر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کی دوا اور اسکا وجود بھی مریض کے لیے سودمند نہیں جبتک وہ اس کی تلاش نہ کرے کہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دیتا

اگرچہ وہ کتنا ہی منہ بنایا کرتا اور اس کی دوا کڑوی معلوم ہوتی جب مریض کو اس بات کا احساس ہوجاتا ہے تو پھر وہ یہ کرتا ہے کہ وہ گھر سے اٹھ کر شفاخانہ میں جاتا ہے اب وہاں کی حالت دوسری ہے گھر میں تو یہ حال تھا کہ جہاں برف کی آواز سنی فوراً برف کھا لیا مگر جب یہاں پہنچا تو ایک ٹکڑا برف کا نصیب نہیں ڈاکٹر آیا ملاحظہ کی کڑی نظر ڈالی کہ مریض تھرتھر لرزنے لگا دودھ پینا پڑی ڈاکٹر کہہ گیا اسکو بارلی دی جائے تو وہ اسی کو پی رہا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ مریض کی طبیعت گھبراتی ہوگی کہ کیوں اس بلا میں آگیا مگر جوں جوں بیماری ہٹتی جائیگی اور وہ تندرست ہوتا جائیگا خیال کریگا جس چیز سے میں بھاگ رہا تھا وہ عین تندرستی کا نسخہ ہے اس کو صوفیا کرام کی بولی میں شیخ اور پیر کہتے ہیں۔

جب سے دنیا اور انسان قائم ہیں ہمیشہ نسخہ ایک ہی رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دی اور جب نوح علیہ السلام کا ظہور ہوا تو اس نے اللہ واحد کو بتلایا۔ غرض سب سے کہ خدا کی شریعت ایک ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کیا دنیا میں کوئی ایک متنفس ملیگا جو یہ کہے کہ جھوٹ بولنا ثواب ہے اور چوری کرنا اچھا ہرگز نہیں پھر کیوں وہ شخص باوجود علم ہونے کے اور نسخہ جاننے کے عمل نہیں کرتا ہے تو معلوم ہوا خواہ انسان کتنا ہی نسخہ لیکر جاتا رہے جب سوئے اپنے سرہانے رکھے۔ جاگے تو اسکو اوڑھ لے چلے تو جیب میں رکھے غرض سب کچھ کرے سود مند نہیں ہوسکتا جب تک کوئی شخص نسخہ کی چیزوں کو اس کے حلق سے نہ اتار دے، تو دراصل جو پیر جو صوفی جو شیخ یہ کرسکتا ہے وہ ہمارا پیر ہے اور جس سے یہ کام نہیں ہوسکتا وہ ہمارا پیر نہیں ہے۔

پیر کی اطاعت اور اسکی پیروی ہر حالت میں مفید اور بہتر ہے بغیر اس کے صحت نہیں ہوسکتی ایک مریض جب حکیم کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے۔ حکیم صاحب جو کچھ مجھکو پینے کے لیے دینگے میں فوراً آپ کی اطاعت کرونگا اور آپ کے حکم کو مانونگا مگر مجھکو تندرستی ملنی چاہئے تو کیا اس کا یہ کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر حکیم اس کو زہر دیدے تو وہ پی لیگا ہرگز نہیں، زہر تو اس کو اور مار ڈالیگا اس حالت میں وہ حکیم کی بات نہیں سنے گا اس لیے کہ وہ تندرست ہونے کے لیے آیا ہے مرنے کے لیے نہیں اسی طریقے سے جن لوگوں نے پیر کی اطاعت اور اس کے قدم بقدم چلنے کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اگر خلاف حدیث اور قرآن کے پیر تعلیم دے تو اس کو بھی کر لینا چاہئے نہیں۔ بلکہ وہ تو آیا تھا اسلئے کہ قرآن اور حدیث کے مطالب کو سمجھے اور چونکہ وہ عمل نہیں کرسکتا ہے پیر اسکو اس کو عامل کرادے نہ اسلئے کہ اس کو زہر دیدے۔

پہلا مقام حقیقت کا پیرو سنت حکیم کی تلاش۔ دوسرا معرفت کا نسخہ تلاش کرنا اس کے بعد حقیقت۔ جب دوا پی لی تندرست ہوگئے۔ تینوں ایک ہی حقیقت کی متعدد کڑیاں ہیں ایک کے بغیر دوسرا نہیں ہوسکتا وہ

صوفی جو شریعت پر عمل نہیں کرتا صوفی ہرگز نہیں کیونکہ بغیر شریعت کے کیونکر کوئی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

۱۴، دسمبر ۱۹۱۰ء (چہارشنبہ)

مولانا ابوالعلاء۔ مرزا مظفر حسین و دیگر صاحبان قبل مغرب جامع مسجد میں جمع ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ (مرزا صاحب کی طرف مخاطب ہو کر) آپ غیر مقلدوں میں سے ہیں

مرزا صاحب۔ جی ہاں

مولانا ابوالعلاء۔ آپ آمین کیوں کہتے ہیں

مرزا صاحب۔ اسلئے کہ نبی صاحب نے آمین کہنے کا حکم دیا اور رسول اللہ خود اس پر عمل رہا اور جتنے صحابہ کرام گذرے ہیں سبھوں نے اسکو کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ میں نے سوال کیوں کیا

مرزا صاحب۔ آپ نے کیوں کہا میں نہیں سمجھتا۔ شاید آپ کے نزدیک میں نے کچھ گناہ کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ آمین پر تو میرا بھی عمل ہے۔

مرزا صاحب۔ آپ ہی بتلایئے کہ آپ آمین آہستہ کیوں کہتے ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل آمین کہنے میں آہستہ رہا اور آپ نے رفع یدین نہیں کیا۔

مولانا ابوالکلام۔ اجی یہ سب غیر ضروری بحث ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ سب باتیں بھی بہت ضروری ہیں اور جس پر ہم عمل کر رہے ہیں اس کی میرے پاس دلیل موجود ہے مگر سارا دارومدار اس پر ٹھہر جاتا ہے کہ ایک کا کرنا فضیلت ہے اور دوسرے کا عدم فضیلت کچھ گناہ تو ہے نہیں اور جناب ان سب باتوں نے مسلمانوں کے اندر ایسا ضعف پیدا کر دیا ہے کہ وہی لوگ جانتے ہیں جنکو مسلمانوں کی آہ ان کے دل میں ہے۔ جو لوگ اس بات کو سمجھے ہوتے ہیں ان کو نیند نصیب نہیں ہوتی میں تو اس بات کی فکر میں رہتا ہوں کہ ان لوگوں کو ایسی باتوں کی مہلت کب ملتی ہے جب ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔ پچاس برس پیشتر کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے نزاع اور جھگڑے نے مسلمانوں کو کس قدر تباہ کر دیا ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مسجد سے نکال دیا پھر اس کا مقدمہ کفاروں کے پاس فیصلے کے لیے گیا قرآن اور حدیث کی توہین

کی جارہی ہے۔ لاکھوں روپئے برباد کردیا صرف اتنی بات پر کہ ایک شخص آمین زور سے کہتا ہے دوسرا آہستہ سے مولوی صاحب رانچی کے مسلمانوں میں تو آج کل اس قدر اتحاد اور میل جول پیدا ہوگیا ہے کہ شاید کوئی گمان میں بھی نہیں لاسکتا۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے الگ تھا اور اب سب کوئی ملکر اتحاد سے لیے کام کر رہے ہیں اب غیر مقلد بھی آتا ہے تو وہ بے باکی سے آمین زور سے کہتا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ خدا رانچی کے مسلمانوں کی نیک نیتی کا اجر دے۔

۲۰ دسمبر ۷۱ء (پنجشنبہ)

اسد اللہ شاہ نے کہا حضور۔ ایک آدمی ہے وہ ایک عورت کو تقریباً ایک برس سے رکھے ہوئے ہے ایجاب قبول سے جب نکاح ہو جاتا ہے تو اس حالت میں جبکہ طرفین راضی ہیں مسئلہ کیا ہوگا۔

مولانا نے فرمایا۔ سب سے پہلے اس چیز کو سمجھ لینا چاہئے کہ شریعت جس چیز کو زنا کہتی ہے وہ کیا چیز ہے۔ دراصل شریعت کے کاموں میں سارا دارومدار نیت پر رکھا گیا ہے اور یہی ایک چیز ایسی ہے جسکو قرآن نے جابجا اشارہ کیا ہے۔ نیت اگر اچھی ہے تو انسان کا ہر وہ قدم جو اس کام کے لیے اٹھیگا اچھا ہوگا اور اگر نیت خراب ہے تو یقینی اس کو اس کام میں ناکامیابی ہوگی۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھئے کہ آپ ایک مکان بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس میں ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ ایک مصمم ارادہ اپنے جی میں کر لیجئے کہ کس طرح کا مکان بنائینگے جب آپ نے یہ ارادہ کر لیا تو پھر ایک کام آپ کا ہوگیا اور اگر کسی کے ارادہ میں ابھی شک ہے کبھی سوچتا ہے مکان بناؤں تو کہاں سے روپئے لاؤں اور اسی طرح کی باتیں غرض دن رات اسی وہم میں پیچاں رہتا ہے تو سمجھ لو ہرگز وہ مکان تیار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ میں نے ایک مثال دی۔ اب اسی طریقہ سے اور مثالوں کو لاؤ اور سمجھو کہ آیا اس کی نیت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہی ایک چیز بھی جسکو دنیا نے قبل ظہور شریعت گم کردی تھی اور سوائے ناکامیابی اور بربادی کے کچھ اچھا نتیجہ نہیں نکلتا تھا مگر جب شریعت کا ظہور ہوا تو اس نے پھر اس بھولے ہوئے رہنا کو یاد دلایا اور بتلایا کہ تمہارے یہ سب اسباب کام نہیں آئیں گے جبتک تم اپنے جی میں ارادہ کامل پیدا نہ کر لو۔ تم جانتے ہو کہ قرآن کریم نے ہمکو سورہ فاتحہ میں جو بتلایا کہ کہو ایاک نعبد وایاک نستعین۔ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ یعنی ایک مسلم کی کامیابی کا ذریعہ لوہے کے ہتھیاروں پر نہیں ہے، روپئے پیسوں سے کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی کامیابی کا ذریعہ اس کا ارادہ اور خدائے واحد پر بھروسہ کرنا ہے۔

[اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہوگیا]

۲۱ دسمبر ۸۲ (جمعہ)

(خطبہ) اگلے جمعہ میں صفر کے مہینہ کے متعلق آگاہ کیا تھا کہ لوگ جو اس مہینہ کی نحوست اور بد شگونی اپنے ذہن میں خیال کیے ہوتے ہیں وہ محض غلط ہے اور اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جی میں آتا ہے کہ آج بھی اس پورے حدیث کے مطالب بیان کر دوں اور یہ نہایت ضروری اور اہم مسئلہ ہے صفر کے مہینہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا صفر........ صفر کی کوئی اصلیت نہیں پھر اس کے بعد فرمایا:

شگون کوئی چیز نہیں۔ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے کام شگون کی بنا پر کیے جائیں تو اچھا ہے مگر یہ شگون کوئی چیز نہیں صرف لوگوں کو جال اور مکر میں شگون کے ذریعہ پھنسانا چاہتے ہیں۔

نجوم کوئی چیز نہیں

مختلف جانوروں کی بولی میں کچھ دھرا ہوا نہیں ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں اگر کوا اتنے مرتبہ آواز دیگا تو کام برا آئیگا اور اگر اس رخ بیٹھے گا تو سفر میں خلل پہنچے گا خدائے تعالی نے جانوروں کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ تمہارے کام بتا دیں بلکہ اس میں جو بھید ہے اس کی تمہیں کیا خبر۔

سایہ اور بھوت کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔ بلاشبہ جنوں کا وجود ہے اور ممکن ہے کسی جن کا اثر کسی آدمی پر ہو مگر بیماری کے لیے سایہ اور بھوت وجہ نہیں۔ [اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہو گیا]

[اس کے پہلے کا کاغذ ضائع ہو گیا]

مولانا کا بیان۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ گھر لوٹا جا رہا ہے اور ہمکو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایک خاندان ہو جس میں لوگ اپنے اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہوں ایک بھائی کہتا ہے میرا حق چھ آنا ہوتا ہے تم نے ساڑھے پانچ آنے کیوں دئے مگر سوال یہ ہے کہ اگر ان سب کو ایک جماعت ڈاکوؤں کی نظر آجائے اور دیکھیں کہ سب کے سب ان کے گھروں کو لوٹنے کیلئے آرہے ہیں تو پھر گھر والے کیا کرینگے۔ کیا آپس میں لڑتے رہیں گے یا دشمنوں سے بچنے کے لیے تلوار لیکر مقابلہ کرینگے اگر ان کا گھر لٹ گیا تو پھر ساڑھے پانچ آنے اور چھ آنے کا حق آئیگا کہاں سے۔ افسوس مسلمانوں پر آج انکا گھر لٹ رہا ہے، لڑکے اور بچوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا پہننے کے لیے کپڑا نہیں، مگر پھر یہ غفلت، ایک مسلمان دوسرے سے اب بھی لڑنے کے لیے تیار ہے، تو عزیزان من جب مسلمانوں کی یہ حالت ہے اور وہ تلوار جو دشمنوں سے مقابلہ کے لیے دی گئی تھی اب چاہیئے تھا کہ ان تلواروں سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے آج یہ حال ہے کہ وہی تلوار اپنے بھائی کی گردن پر چل رہی ہے۔

دشمن سے زیادہ بچنے کی کوشش کرتے آج وہی ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو صرف کر رہے ہیں تو اے ماتم شعار! یہ کب ہو سکتا ہے کہ تم دشمنوں کی گرفت سے بچ سکو گے۔ ایسا سمجھنا صد درجہ کی غفلت ہے۔ دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ایک دم میں مارنا چاہتے ہیں۔ اب بھی ہوشیار ہو جاؤ ورنہ یہ سب تمہارے آمین جہر اور بے جہر باقی نہیں رہیں گے جب اسلام ہی نہیں رہے گا تو تم کہاں ہو گے۔ دشمن تو تیغ لے گا اور کہے گا ہر موحد کو قتل کر دو یہ نہ پوچھے گا تم میں کون آمین پکار کر کہتا ہے اور کون آہستہ۔ بے شک یہ سب چیزیں بھی ہونی چاہئیں مگر بعد کو۔ ابھی ضرورت حفاظت اسلام ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا چاہئے۔ جب یہی نہیں رہے گا تو ہم کہاں رہ سکتے ہیں۔ ان کو چھوڑ دو۔ جو آدمی زور سے آمین کہتا ہے کہنے دو اور جو آہستہ کہتا ہے وہ بھی آہستہ کہے۔

ایک شخص۔ اگر کوئی غیر مقلد نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟

مولانا۔ جب میرے یہاں فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے تو ان کے پیچھے کیوں نہیں۔ جب ایسا موقعہ ہو تو میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لونگا

●●

آندھرا پردیش اورینٹل ریسرچ جرنل

سابقہ آصفیہ لائبریری اور حال اورینٹل مینسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد

کا

شاندار جرنل —— دوسو صفحات

۱۹۹۰ء کا دوسرا شمارہ مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے :-

◉ اپنی بات (میر کرامت علی خاں) ◉ اس شمارے کے قلمی معاونین (میر کرامت علی خاں) ◉ سلطان محمد قلی اور حیدرآباد (پدم شری عابد علی خاں) ◉ قطب شاہی دور کا حیدرآباد (ڈاکٹر داؤد اشرف) ◉ قطب شاہی عہد کی بیگمات (رفعت رضوانہ) ◉ قطب شاہی مساجد (ڈاکٹر کرشنا شاستری) ◉ قطب شاہی گنبدیں (محمد عبدالقیوم) ◉ ماں صاحب تالاب (محمد نورالدین خاں) ◉ قطب شاہی دور کے مخطوطات (میر کرامت علی خاں) ◉ ملا وجہی بحیثیت انشائیہ نگار (ڈاکٹر جاوید وشسشٹ) ◉ قطب شاہی دور میں فارسی شعر و ادب کی ترویج (ڈاکٹر محمد صدیقہ) ◉ مثنوی بہرام و گل اندام (ڈاکٹر نورالسعید اختر) ◉ محمد قلی قطب شاہ (کتابیات) (ڈاکٹر محمد علی اثر) ◉ دفتر ریاستی اسناد میں محفوظ قطب شاہی عہد کے مخطوطات (راجندر پرساد) ◉ قطب شاہی دور کے کتبات (ڈاکٹر مزیب حیدر) ◉ قطب شاہی دور کے سکے (ڈاکٹر مفضل الدین علی خاں)

:(ملنے کا پتا):

آندھرا پردیش اورینٹل ریسرچ جرنل

۵-۸-۵۹۹، آر-ایم-بلڈنگ، عابد روڈ، حیدرآباد

اورنگ زیب
ہند عہد اورنگ زیب میں ح-۲
مرزا سمیع اللہ بیگ

جسٹس حمید اللہ بیگ اور جسٹس نصر اللہ بیگ کے والد مرحوم
جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۳ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے
اس کے واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزانِ وطن ہوں گے
جن کے لیے اسے الگ سے ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے لیکن
اردو والے بھی اپنی میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے
اردو اصل بھی!

حسن نظامی مرحوم نے جسٹس بیگ کا یہ کارنامہ "حکومت
اورنگ زیب کی اصلی تاریخ" کے نام سے دوسری بار ۱۹۲۵ء
میں شائع کیا تھا اور اب تیسری بار یہ بیش قیمت تحریر آپ کی
خدمت میں پہنچ رہی ہے۔ جسٹس سمیع اللہ بیگ حیدر آباد
میں میر عدل (چیف جسٹس) تھے اور انھیں نواب سرزا یار
جنگ بہادر کا خطاب ملا تھا

—— ادارہ

ہند عہد اورنگ زیب میں-۲

مرزا سمیع اللہ بیگ

مسئلہ اتحاد پر ایک نظر

باب ہذا میں تین امور پر غور کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ ہندو برادران وطن کو عہد مغلیہ کو کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ دوم یہ کہ مسلمانوں کو عہد کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے؟ اور تیسرا یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی بہترین تدبیر میری رائے میں کیا ہے؟

حصۂ اوّل۔ اہل ہنود کا نقطۂ نظر

خلاصہ کی استدعا

قبل اسکے کہ میں اہل ہنود کے صحیح نقطۂ نظر کے متعلق زبان کھولوں مجھ کو ناظرین معاف فرمائیں گے۔ اگر اس خاتمہ کے باب میں مختصراً ان واقعات کا اعادہ کروں جنکے ثابت کرنے کی کوشش پچھلے ابواب میں کیگئی ہے کیونکہ دراصل انہیں واقعات کی مدد سے اہل ہنود کے صحیح نقطہ نظر کی

رائے قائم کی جائیگی پہلے ابواب میں عہد اورنگ زیب کے ہندوستان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ عہد مغلیہ کے دور کا درحقیقت یہ آخری بادشاہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ کا یہ متعصب ترین مسلمان بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔

تعلیم

باب دوم میں دکھایا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں صرف ایک ہی شہر ٹھٹھہ میں مسٹر ہملٹن انگریزی سیاح نے چار سو درسگاہیں تعلیمی اور وہ اس حیثیت کی تھیں اور وہ انکو ایسی شان کی نظر آئیں جن کو وہ کالج کہتے ہیں کیا دنیا کا کوئی دوسرا حصہ اشاعت تعلیم میں اس سے زیادہ اس وقت مصروف تھا۔؟

مذہبی رواداری

باب سوم میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں ملک کی مذہبی رواداری و بے تعصبی کی یہ حالت تھی کہ ایک انگریز سیاح کو مذہب کے اعتبار سے ہندو مسلمانوں میں امتیاز دشوار ہو گیا تھا۔ آج بھی ہندوستان میں لاکھوں روپئے کی ایسی جاگیریں موجود ہیں جو شاہان مغلیہ نے مندروں کی امداد کے لئے عطا کی تھیں خود اورنگ زیب کے متعلق جسکو بڑا متعصب کہا گیا ہے ابھی چند دن ہوئے ایک واقف حال مسلمان نے ہندو مسلمانوں کے بھرے مجمع میں یہ بیان کیا کہ صرف بنارس میرے ساتھ چلے چلو تو میں وہاں کے پجاریوں سے انکی اسناد نکلوا کے دکھادونگا کہ ان میں سے قریب قریب سب اسی بادشاہ کی عطیہ ہیں عیسائیوں کو بھی گرجے بنانے کی اجازت دیگئی تھی۔ اب ذرا اس زمانہ کی یورپ کی تاریخ پڑھئے

اور وہاں کی مذہبی خونریزیوں سے ہند کی حالت کا مقابلہ کیجئے اُس وقت معلوم ہوگا کہ مذہبی رواداری کے معاملہ میں عہد مغلیہ نے اس ملک کو کہاں تک تیار کیا تھا۔

تجارت، تمول و فارغ البالی | باب چہارم میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص عبد الغفار کا سرمایۂ تجارت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا اور صرف احمد آباد و سورت کے تجارتی محصول کی آمدنی اسقدر تھی کہ اُس زمانہ کے انگریز سوداگر و سیاح کو بے اختیار رشک ہوا۔ اس زمانہ میں اشیائے احتیاج کا نرخ بھی بتایا جا چکا ہے۔ تجارت، دولت اور فارغ البالی کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دنیا کے کسی ملک کا مقابلہ ہند سے کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ عہد مغلیہ میں تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل تھا۔

انصاف و امن و امان | باب پنجم میں انصاف و امن و امان کے ضمن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک انگریز کی جسنے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سفر کیا تھا اور وہاں کے حالات کو بغور کامل دیکھا بھالا تھا یہ رائے ہے کہ مسافر بغیر جان و مال کے کچھ خطرے کے تمام ہندوستان میں اسوقت بآسانی سفر کر سکتے تھے ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہند کے دور و دراز مقامات سے دہلی تک خط پہونچنے میں صرف آٹھ روز صرف ہوتے تھے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسا انتظام قائم رکھنے کے لئے نقل و حمل، سڑکوں اور راستوں کی حفاظت کے کیا کیا نہ انتظامات ہونگے۔

صنعت وحرفت اب صنعت وحرفت کے شعبہ کو دیکھئے۔ عہد مغلیہ نے ہند میں یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ صرف ایک شہر کے کارخانے میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ یہ قصے کہانی نہیں ہیں تاریخی واقعات ہیں۔ المختصر یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی عینی شہادت کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۲۴ء میں جو بڑی نمائش دولت برطانیہ کے تمام ممالک کی ہوئی ہے اسمیں ہندوستان کے سکشن یعنے حصہ میں مجھ کو ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی ایک بھی ایسی چیز نہ دکھائی دی جو عہد مغلیہ میں نہ بنتی ہو یا جسکا بنانا عہد مغلیہ کے بعد اس ملک نے گزشتہ صدی میں سیکھا ہو۔ ان تمام واقعات اور امور کے متعلق باب ششم ملاحظہ فرمائیے۔

یوروپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ اگر ناظرین کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ملک کی تجارت وتمول کے بڑھانے میں اور ایشیا و یورپ کو یکجا ملا دینے میں عہد مغلیہ میں کیا کیا کوششیں کیگئی ہیں تو ذرا عہد اورنگ زیب کے وہ حالات جن کی دستاویزی شہادت آج موجود ہے باب ششم میں ملاحظہ فرمائیں اسی باب میں انگریزی کمپنی کی اصلی خط وکتابت و اورنگ زیب کے اصلی فرمان کی نقل کی گئی ہے۔

یوروپین تجار کی کم ظرفی اگر ناظرین کو اُن مشکلات کا اندازہ کرنا ہے جنمیں عہد مغلیہ کا آخری دور پھنسا ہوا تھا اور اگر اپنے ملک کے عہدہ داروں کے عادات واطوار کا مقابلہ ان لوگوں کے کیرکٹر سے کرنا منظور ہے جنکی ڈپلومیسی (حکمت عملی) اور تدبیر نے سلطنت مغلیہ کی بیخ کنی کی تو باب نہم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ خلاصہ ہے اُن واقعات کا جن کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا

جا چکا ہے۔

کل ہند کو ایک امپائر سلطنت بنا دیا

اب اِن تمام کوششوں کا مجموعی اثر ہندوستان پر کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ اگر خدائے تعالےٰ کو یہ منظور تھا کہ بالآخر کُل ہندوستان ایک ملک ہو جائے۔ اُس کا ایک تمدن ہو جائے اُس کے بڑے بڑے پہاڑ اور دریا اسکے باشندوں کو جُدا نہ کرسکیں تو اس کی بنیاد قادر مطلق نے شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں سے ڈلوائی تھی اور اسکے فخر کا سہرا اورنگزیب ہی کے سر پر زیب دیتا ہے کہ اسی بادشاہ اورنگ زیب کے آخری عہد میں ہند نے ایک متحدہ سلطنت وامپائر کی صورت اختیار کرلی تھی مغربی ہند، مشرقی ہند سے اور شمالی ہند جنوبی ہند سے مِلگیا تھا اسکے باشندے بہت کچھ خلط ملط ہو چکے تھے۔ تمام ہند مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر ایک تخت دہلی سے اسطرح وابستہ ہو گیا تھا کہ گویا سارا ہندوستان ایک ہی ملک ہے۔ صوبوں کی قریب قریب اسی تقسیم ہند پر آجتک عمل ہو رہا ہے۔

قوانین بنائے

آج برٹش انڈیا میں جو قانون مال و وصول مالگزاری رائج ہے اُنکی نسبت کیا کسی کو انکار ہے کہ اسکا ڈھانچہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو سلطنت کے ڈیزائن (Design) و نمونہ کے بنانے کی زحمت ہی نہیں برداشت کرنی پڑی بلکہ اُن کو بنی بنائی تیار عمارت مِلگئی۔ البتہ حسب ضرورت وہ اسمیں ترمیم و تغیر و تبدل کرتے رہے ہیں اور مرورِ زمانہ اور رعایا کے تبدیلی خیالات کیساتھ ترمیم کرنی رہنی پڑیگی جیسا کہ ہر سلطنت کو کرنا پڑتا ہے سلطنت میں نصفت و عدالت

وقانون شہادت و دیگر علوم سائنس کے وہ اصول جن سے اسپین کے فاتح عربوں نے یورپ کو مستفیض کیا تھا ہندوستان میں اُن کے رائج کرنے والے عہد مغلیہ کے حکمران تھے۔

ہند کا قدیم تمدن

ہم کو اس ملک کے تمدن سے ایک خاص اُنس ہے، اُسنے نہ صرف روحانی تعلیم اور ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے تھے بلکہ فن حکمرانی میں بھی قدیم دنیا میں ایک خاص امتیازی رتبہ حاصل کیا تھا۔ ہماری رائے میں اس ملک کے لئے عرصہ تک وہی تمدن موزوں تھا مگر ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تمدن ہند کی معراج ترقی کا آخری زینہ تھا۔ انسانوں کو بلحاظ انکے پیشہ کے مختلف طبقات میں تقسیم کر دینا اور پھر اُن میں طرز معاشرت کی ایسی آہنی دیواریں بنانا کہ آپس میں شادی بیاہ کھانا پینا تو درکنار محض چھو جانا بھی بعض اوقات معصیت میں شمار ہو یا حصول علم کے حق کو انسانوں کے مخصوص طبقہ یعنے برہمنوں میں محدود کر دینا یا غیر مذاہب کے افراد سے امتیاز ومغایرت برتنا یا تجارت وتحصیل علم کے لئے ممالک غیر میں سفر کرنے سے احتراز کرنا۔ یا صرف یہی نہیں کہ چودہ پندرہ برس کی بیوہ کی شادی نہ کرنا بلکہ اُس کو ستی کر دینا اور اسی قسم کے تمام روایات ورواج جو ہند کے قدیم تمدن میں داخل ہوگئے تھے سوسائٹی (Society) کی اُس حالت کے اعتبار سے جب اہل ہنود بطور آریہ قوم کے ابتداءً اس ملک میں آئے تھے شاید ضروری ولازمی ہونگے لیکن آج یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ تمدن اپنی نوعیت میں ایسا تھا کہ ہندوستان کی روز افزوں ترقی کیساتھ دائماً قایم رہ سکتا تھا۔

قدیم تمدن میں مذہبی لوچ پیدا کردیا

جس قدیم تمدن کا ذکر کیا جارہا ہے ممکن ہے کہ وہ ویدانت کی
تعلیم نہ ہو مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ تمدن ہند میں قائم ہوگیا
تھا۔ میری رائے میں اس تمدن میں جو ضروری تبدیلیاں آج سرعت کیساتھ
ہورہی ہیں انکی ابتدا کرنے کا سہرا بھی عہد مغلیہ کے سر پر بندھا نظر آتا ہے جب مسلمان
اس ملک میں آئے وہ بھی یہاں اسیطرح بس گئے جیسے آریہ زمانہ کے اہل ہنود آباد
ہوگئے تھے لیکن یہ اپنے ساتھ ایک دوسرا تمدن لائے جسکا خمیر انہوں نے
اہل ہنود کے قدیم تمدن میں شریک کردیا جس تمدن کی رو سے کسی زمانہ میں
ایک مسلمان کو ہندو کا چھونا تو درکنار ایک ہی ہندو مذہب کے بعض فرقے ایک
دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے۔ اس میں مسلمانوں نے یہاں آکر تغیر پیدا کرنا شروع
کیا۔ اور عہد مغلیہ میں بالآخر یہ عظیم الشان تغیر پیدا ہوگیا کہ وہ ایک دوسرے
کے پڑوسی بنکر ایک ہی دیوار کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہند کے کل بچوں کو
ایک سطح پر لانے کی عملی ابتدا اسی عہد مغلیہ سے ہوئی تھی۔ اسی عہد مغلیہ میں تحصیل
علم کے حق کا دائرہ وسیع کیا گیا اور کایستھوں کا شمار اہل قلم میں ہوگیا چھوت
کے رواج کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر رہبران قوم کی تعلیم آج یہ ہے کہ وہ
رواج اس ملک کی ترقی کیلئے زہر قاتل ہے۔ لیکن اس سبق کی الف۔ ب
اہل ہند کو عہد مغلیہ ہی سے پڑھانا شروع کردی گئی تھی ہر نئے رواج و رسم کی ابتدا
کسی سوسائٹی کی چوٹی سے ہوا کرتی ہے لہٰذا اکبر بادشاہ نے ستی کے قدیم رواج
کو زبردستی موقوف کر کے ہندو مسلمانوں میں شادی کا رواج بھی قائم کرنا چاہا تھا
اور اسکی ابتدا خود ہی کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ہند کے قدیم سخت تمدن میں جو لوچ

آج نظر آرہا ہے اور جس کی وجہ سے ہند جدید تمدن کی روز افزوں ترقی کا بار برداشت کرسکتا ہے وہ لوچ عہد مغلیہ ہی سے برابر پیدا کیا جارہا ہے تب کہیں یہ موجودہ حالت رونما ہوئی ہے اس لوچ کے پیدا کرنے میں اب اُن موانع اور زحمتوں کا سامنا نہیں رہا جو ابتدا میں مسلمانوں کو اُس وقت پیش آئیں اور برداشت کرنی پڑیں جبکہ انہوں نے ہندوؤں کی دیوار سے اپنی دیوار ملا کر رہنا شروع کیا تھا۔

بڑے بڑے شہر بسائے

اس عہد مغلیہ میں سرزمین ہند پر اتنے بڑے بڑے شہر آباد کیے گئے کہ جب لارڈ کلایو (Lord Clive) یا لارڈ وارن ہیسٹنگز (Lord Warren Hastings) (دونوں میں سے کوئی ایک جس کا پورا خیال مجھ کو اس وقت نہیں آتا) شہر ڈھاکہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی آبادی و تجارت کو دیکھا تو یہ کہا کہ لندن و ڈھاکہ میں صرف اسقدر فرق ہے کہ ڈھاکہ کی تجارت لندن کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے اُن بڑے شہروں میں سے بعض بعض آج بہت ہی پست حالت میں ہیں مثلاً شہر ٹھٹہ جو سندھ کا ایک زبردست شہر تھا جہاں چار سو درسگاہیں تھیں وہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ اب رہ گیا ہے یا شہر شادی آباد منڈو جسکے خوشنما کھنڈر علاقہ ریاست دھار میں آج اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا اظہار زبانِ حال سے کر رہے ہیں ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔

عمدہ عمارتیں بنائیں

سرسینک آرٹ Saracenic Art کی کیسی کیسی خوبصورت خوبصورت محرابدار سنگ مرمری کی عمارتیں، وسیع سڑکیں۔

کاروانسرائیں، کیسے کیسے باغات، آبرسانی کے عجیب وغریب ذرائع اور تالاب بنا بنا کر سرزمین ہند کو خوشنما و آراستہ کرنے کی کوشش اسی عہد مغلیہ میں کی گئی۔

دریا سے تجارت بڑھائی

ہند کے بڑے بڑے دریاؤں سے تجارت و آبپاشی کا کام لیا گیا۔ جو تجارتی جہاز ان دریاؤں میں دوڑا کرتے تھے انکا کچھ تذکرہ باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

پہاڑوں کو فردوس بنا دیا کشمیر کے حالات

زمین اور دریا کا ذکر ہو چکا اب اگر ناظرین کو اسکا اندازہ کرنا ہے کہ عہد مغلیہ نے بنی نوع انسان کی راحت و آرام میں اضافہ کرنے کے لئے پہاڑوں کو کس طرح زیر و زبر کیا اور ان جنگلوں کو جہاں شیر، چیتے، ریچھ، وغیرہ درندے رہا کرتے تھے۔ کاٹ کاٹ کر کیسی کیسی نئی بستیاں آباد کیں تو عالم تصور میں میرے ساتھ کشمیر کی جانب رخ کریں اور جموں سے لیکر سرینگر تک ڈیڑھ سو میل کی قدیم شاہی سڑک پر سفر کریں۔ راستے میں ویری ناگ۔ اچھل۔ اسلام آباد اور دوسرے آس پاس کے مقامات پر عہد مغلیہ کے تمدن کے آثار زیر زمین تو حماموں کی دبی ہوئی ٹونٹیوں میں اور بالائے زمین پرانے باغات ٹوٹے پھوٹے فواروں اور کہیں کہیں بڑے بڑے واٹر ورکس کی صورت میں دیکھتے چلیں۔ سرینگر پہونچنے سے قبل راستے میں اس زعفران زار کی بھی سیر کرلیں جسکی جڑیں سرزمین ہند کو معطر کرنے کے لئے ایران سے لائی گئی تھیں اور اور جن کو دیکھنے کے لئے آج بھی دور دور سے سیاح جایا کرتے ہیں۔ سرینگر

پہونچکر پہلے اِس نسیم باغ کو دیکھیں جہاں صدیوں کے پرانے چنار کے عظیم الشان
وتنا ور درخت کھڑے ہوئے اپنے ایرانی النسل ہونے کا اظہار کر رہے ہیں
یہ چنار کا درخت جس پر وادیٔ کشمیر کو آج اس قدر فخر اور ناز ہے بلکہ وہ عزیز
ہے کہ وہاں کے قانون کے بموجب اُس کی شاخ کاٹنا بھی جرم ہے عہدِ مغلیہ
ہی میں ایران سے لاکر یہاں لگایا گیا تہا۔

کشمیر کا قدیم کالج و دار الاقامہ

اس نسیم باغ میں مشرق رو کھڑے ہونے سے آپکی نظر
بار بار دوکر ایک پہاڑ کی چوٹی پر پڑیگی جس پر ایک
عالیشان پختہ ویران عمارت دکھائی دے رہی ہے راستوں کے نشانات
بھی نظر آئینگے۔ مگر وہاں کسی آدم زاد کی صورت نہ دکہائی دیگی۔ منظر دلفریب
عمارت بہت بڑی لیکن ویران اور ہو کا عالم ہے۔ اسکے آس پاس بھی
کوئی مکان نظر نہ آئیگا۔ ناظرین کا جی چاہیگا کہ اس کو قریب سے ایک نظر
دیکھیں لیکن کشتی کا کشمیری مانجی (ملاح) یہ مشورہ دیگا کہ وہاں نہ
جائیے۔ وہاں جنات ہیں، بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہے ہر
طاق و گوشہ میں پڑے سو رہے ہیں اور شیروں کا مسکن ہے ناظرین متحیر
ہو کر دریافت کرینگے کہ آخر یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تہی۔ زیادہ دریافت
سے معلوم ہوگا کہ یہ وہ کالج ہے جسمیں پڑہنے کے لئے عہدِ مغلیہ میں دور و دراز
کے سفر طے کرکے طلبا آیا کرتے تھے۔ اور جو محرابیں نیچے نظر آرہی ہیں وہ
طلبا کا دار الاقامہ و بورڈنگ ہوس تہا۔ گہنا جنگل کاٹ کر وہ پہاڑ طلبا سے
آباد کیا گیا تہا۔ ابھی تو اس سنسان عمارت کی خاموش دیواریں عہدِ مغلیہ

کی کوششوں اور تمدن کے نشانات کا کام دے رہی ہیں اور زبان حال سے اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا قصیدہ اور اپنی تباہی و بربادی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں مگر کچھ برسوں کے بعد وہ دیواریں بھی جب مسمار ہو جائینگی اسوقت میری اس کتاب کے پڑھنے والے شاید یہ کہیں گے کہ یہ شخص نہ معلوم کس عمارت کا ذکر کر گیا۔

چشمہ شاہی

جس پہاڑ پر یہ عمارت ہے اُسی کے نیچے سرینگر کا وہ مشہور و معروف چشمہ شاہی ہے جسکو شاہان مغلیہ نے ایک خوبصورت عمارت کی آغوش میں محفوظ کر کے ایک فوارے کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ عہد مغلیہ میں کشمیر کے چشموں کی حفاظت اور قدر و منزلت کا یہ ایک نمونہ مشتے از خروارے ہے۔

نشاط باغ و شعلہ ماہ باغات

اس مقام سے دو تین میل کے فاصلہ پر عہد مغلیہ کے وہ باغات ہیں جن کو عوام الناس نشاط باغ و شالا مار (دراصل شعلہ ماہ تھا) کہتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا مجھسے سرینگر کے ڈائرکٹر (Director) صاحب زراعت نے جنکے چارج میں وہ باغات تھے یہ بیان کیا تھا کہ جب لارڈ منٹو وائسرائے ہند کشمیر تشریف لیگئے تھے تو انہوں نے عہد مغلیہ کے یہ باغات دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ اسوقت یہ باغات بہت ابتر حالت میں تھے اسلیئے کچھ روپیہ صرف کر کے انکی درستی کرائی پھر بھی جا بجا کیچڑ سے انکو گزرنا پڑا تھا اب تو میں نے انکو دیکھا کہ اچھی حالت میں ہیں مگر انکے پرانے در و دیوار فوارے اور درختوں سے انکے اصلی حسن کی صرف جھلک دکھائی دے رہی ہے کیونکہ اب

نیا جامہ پہنانے کی کوشش کیگئی ہے جن ڈاکٹر صاحب زراعت کا میں نے
ذکر کیا وہ ولایت کے تعلیم یافتہ اور فن زراعت کے ماہر تھے وہ فرماتے تھے
کہ اب ایسے باغات کا بنانا تو درکنار انکا قائم رکھنا بھی دشوار ہے۔ ناظرین
کے قیمتی وقت ضایع ہونے کا خوف میرے دل پر طاری ہے مگر میں عہد
مغلیہ کے کشمیری باغات میں داخل ہو رہا ہوں اگر انکے بیان کرنے میں ذرا
طوالت ہوجائے تو معاف فرمائیں۔ ناظرین کے ذہن میں اگر ایسے ایک
باغ کی بھی صورت آجائے تو وہ حضرات جنہوں نے کشمیر نہیں دیکھا ہے
اُن تمام باغات کا تصور کرسکتے ہیں جن سے عہد مغلیہ میں وادی کشمیر اسطرح
آراستہ پیراستہ کیگئی تھی جیسے کسی دلہن کو کوئی کامل مشاطہ بنا و سنگھار
سے سنوارتی ہے۔ نشاط باغ و شالامار باغ میں داخل ہوتے وقت سب سے
پہلے انکا پرانا پھاٹک، نقارخانہ زینہ اور دیواریں خاموشی سے اپنے
تعمیر کرنیوالوں کی شان و شکوہ اور فراخ حوصلگی کی نسبت سرگوشی کرینگی
مگر سامنے باغ کا نظارہ اتنا موقع نہ دیگا کہ اسطرف توجہ کیجائے اس منظر کا
سماں یہ ہے کہ ایک پہاڑ کو چوٹی سے لیکر نیچے سڑک تک اسطرح تراشتے چلے
آئے ہیں کہ اسمیں زینوں کی کیفیت و صورت پیدا ہوگئی ہے۔ ہر زینہ
نہایت وسیع اور بہت لمبا چوڑا ہے جس پر ایک خاص ڈھنگ سے
چمن بندی کیگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ پر اسکی چوٹی سے
دامن تک باغوں کے زینے بنا دئے ہیں۔ ان زینہ نما باغات کے وسط
میں اوپر سے نیچے تک چار پانچ گز چوڑی پانی کی چادر ماہی پشت تراشے ہوئے

پتھروں سے گزرتی ہوئی ہر زینے پر اسطرح گر رہی ہے گویا سبز مخمل کے فرش پر صاف و شفاف جالی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ہر زینے پر جہاں یہ چادر گرتی ہے ایک حوض ہے جو اس پانی کو پہلے اپنے آغوش میں لیتا ہے اور پھر گویا فرط نشاط سے اسکو گھماتا، نچاتا، اور اڑاتا ہوا بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا آسمان کی طرف اچھال لیتا ہے۔ یہی اس باغ کے فوارے ہیں۔ پھر یہ بہتا ہوا پانی دوسری چادر بناکر اس سے نیچے والے زینے کے حوض میں گرتا ہے اور اُسی قسم کی اٹھکھیلیوں میں مشغول ہو جاتا ہے جیسے کہ اوپر تھا۔ چونکہ پانی برابر رواں ہے اسلئے اوپر سے نیچے تک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تمام چادریں اور فوارے ایک ہی ساتھ اوپر سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آرہے ہیں اور بالآخر سب سے نیچے والے حوض سے گزر کر خدا حافظ کہتے ہوئے اُس خوبصورت وسیع ڈل جھیل میں گر کر غائب ہو جاتے ہیں جو دامن کوہ میں انکو اپنی آغوش میں لینے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے کی سُریلی آواز اور حوض کے فواروں کی گنگناہٹ کشمیر کے اُن خوبصورت رنگ برنگ خوش الحان طیور کو راگ سُر کا کام دیتی ہے جو آس پاس کے خوشنما خوشبودار درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے چہچہاتے ہیں اور بعض تو من و عن واقعی گاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نشاط باغ و شالامار باغ کا یہ پہلا سماں دیکھکر یقینی ہے کہ ناظرین کی زبان پر کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

بے اختیار آجائے اور وہ اسکی واقعیت کی صدق دل سے تصدیق کریں
اب ناظرین باغات میں تیرتے ہوئے زینہ بہ زینہ پہاڑ کی چوٹی تک قدم بڑھائیں
اگرچہ راہ میں ہر چمن اور اسکی ہر کیاری آنکھوں کو ایسی مرغوب ہوگی کہ ہر قدم
پر قدم بڑھانے کو جی نہ چاہیگا اور ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کی کیفیت ہوگی۔ مگر اس موقع پر ہم کو تو صرف عہد مغلیہ کا تمدن دکھانا مدنظر ہے
اسلئے ہم نے پھولوں پر نظر بھی نہیں ڈالتے بلکہ جلدی سے چوٹی کے باغ
پر پہنچتے ہیں۔ یہاں پہلے اس کنجی کے انتظام کو دیکھیے جو تین سو برس قبل
اسطرح بنائی گئی تھی ایک جنبش سے باغ کے تمام فوارے اور چادریں آنا فانا میں
بند ہوسکتی ہیں اور دوسری جنبش سے پھر رواں ہوسکتی ہیں یہ ایسی حکمت تھی جس سے
پہاڑ کی چوٹی پر پانی کے قدرتی چشمہ کو قابو میں کرلیا گیا تھا۔ اسکے بعد کچھ
اور سیرگاہوں کے نشانات و آثار پر نظر ڈالتے ہوئے پرانے سایہ دار چنار تما
چنار کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہوئے ان تیلی تیلی
سڑکوں پر (جو ایک بڑے حوض کو اقلیدس کی مستطیل و مربع شکلوں میں تقسیم کر
اسکے اندر بنائی گئی ہیں اور جنھیں شفاف پانی کے فوارے ہر جانب طرح طرح
کے رقص کا سماں دکھا رہے ہیں) چہل قدمی کیجیے۔ بالآخر اس چھوٹی سی

عمارت میں جو وسط حوض میں بنی ہوئی ہے اور جو اپنے محرابوں چھتوں اور
مینا کاری کے کام سے سریسنک آرٹ (Saracenic Art) کا نمونہ بنی
آرام فرما ہے۔ اب اس سنگ مرمر کے تخت پر جس پر نور جہاں جلوہ افروز
ہوکر مناظر قدرت کا تماشا دیکھا کرتی تھیں مغرب کی طرف منہ کرکے کھڑے
ہو جائیے۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ پہاڑ کی چوٹی ہے سامنے ان باغات
کے زینے ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے انکے بعد صرف ایک سڑک درمیان میں
ہے پھر میلوں تک اس ڈل جھیل کا پانی سطح پر انگڑائیاں لیتا ہوا
نظر آئیگا جسکی شفافی کی یہ حالت ہے کہ تہ میں مچھلیاں چلتی پھرتی نظر
آتی ہیں اور پانی کے اندر جو درخت اور بیل پھول ہیں بعض مقامات پر
انکی پتی پتی دکھائی دیتی ہے (شکارہ میں چلتے وقت اس شفاف پانی
میں آس پاس کے پہاڑوں اور باغوں کا جو عکس پانی میں لہراتا نظر آتا ہے
اکثر میں اپنی نظر اس سے منٹوں تک نہ ہٹا سکا) خیر اس تخت شاہی سے
نظر اور آگے بڑھائیے اور سامنے دور گلمرگ وغیرہ کے برفانی پہاڑوں کو
دیکھئے جنکی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں
اگر یہ وقت طلوع آفتاب کا ہے تو تصور میں ہر جگہ پر روپہلی افشاں
چھڑکی ہوئی نظر آئیگی اور اگر غروب آفتاب کا وقت ہے تو آپ دیکھتے
ہیں۔ یہاں سے لیکر برفستان تک یہ معلوم ہوگا کہ سنہری کرنوں اور نقشیں کا
مینہ برستا ہے یہ مختصر بیان اس منظر کا ہے جو میں نے اکثر نشاط باغ وشالامار باغ
جاکر دیکھا ہے۔

نورجہاں کے تمنا کا عکس

نشاط باغ و شالا مار جنکا بیان ابھی ہوا دراصل نورجہاں نے تیار کرائے تھے۔ جہاں جہاں شیریں چشمہ معلوم ہوا یا جہاں پرلطف منظر دکھائی دیا وہاں اس مغلیہ خاتون نورجہاں نے اپنے خیالات و مذاق کا عکس باغات کی صورت میں اسطرح چھوڑ دیا کہ آج تین سو برس بعد بھی ہم اُس سے لطف اُٹھا رہے ہیں جب اس بڑھاپے میں ان باغات کے مناظر کا یہ عالم ہے تو جوانی میں دلفریبی کی کیا حالت ہوگی میں نے اس نمونہ کے باغات کے آثار ویری ناگ اور اچھبل وغیرہ مقامات پر بھی دیکھے ہیں۔ ان پہاڑوں سے کیا دلی تعلقات ہونگے جنہوں نے انکی یہ قدر و منزلت کرائی جنکا صرف خیال کرنے سے وجد آتا ہے غالبًا ایسے ہی وجد کی حالت میں عرفی نے کشمیر دیکھکر وہ قصیدہ لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

جامع مسجد

ناظرین کو عہد مغلیہ کی قدیم عمارت میں لیجائے بغیر میں سرینگر کے حالات ختم نہیں کرسکتا۔ سرینگر میں آج بھی مسلمان اُس جامع مسجد میں خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو عہد شاہ جہاں میں بنی تھی اسکا پھاٹک اسکا صحن اور اسکی چھت کے ستون آج تک اُسکے بنانے والوں کے پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ تمدن کا ثبوت ہیں۔ ہر ستون دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلند دیوار درخت کا زبردست تنہ سالم کا سالم زمین میں نصب کردیا گیا ہے

وہ کونسا جرثقیل تھا جو اُن ستونوں کو جنگل سے وہاں لایا۔ ہم گزشتہ تیس
چالیس برس سے ایسی عمارتوں میں لکڑی کے شہتیروں کے بجائے لوہے
کے گرڈر بلحاظ صفائی وسہولت استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن عمارت میں
ہم کو لوہے کی عمر ابھی پوری طرح معلوم نہیں ہوئی۔ تین سو برس کی پرانی
مسجد کے ان ستونوں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمارت میں
لکڑی کی عمر زیادہ ثابت ہو۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے سرینگر کا دورہ کیا ہے تو وہاں کی رعایا
نے کچھ شکایتیں اُنکے حضور میں پیش کیں۔ اُسپر ایک فرمان نافذ ہوا اور
یہ فرمان زبان فارسی میں اس پتھر پر بجنسہ کندہ کر دیا گیا جو مسجد کے پھاٹک
پر آج بھی نصب ہے اس کتبے میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا
خلاصہ بدیں مضمون ہے کہ "ما بدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ
زعفران کی پتی چننے والوں کو اور شال پر سوئی کا کام بنانے والوں
کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں
کہ اس قسم کے کام کرنے والونکی آنکھوں پر کسقدر زور پڑتا ہے۔ امید ہے کہ
آیندہ ایسی شکایات ما بدولت کے کانوں تک نہ پہنچنگی" ناظرین خیال کر سکتے
ہیں کہ رعایا کی رسائی اس بادشاہ تک کیونکر ہوتی تھی اور اس بادشاہ
کے دل میں اپنی رعایا کے ساتھ کس درجہ ہمدردی تھی اور اس کی تحقیقات
اور معلومات کی کیا حد تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ان مزدوروں اور کاریگروں
کو کیسی کچھ مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور اسکا انکی صحت پر کیا اثر

اثر ہوتا ہے لہذا اس نے محض کاغذ پر حکم لکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رعایا کی
تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظر عام پر کندہ کرا دیا جو اسوقت
تک اس کی بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمک رہا ہے۔

مینے ناظرین کا بہت وقت ضائع کیا جسکی معافی چاہتا ہوں لیکن
میرا اصلی مقصد بغیر اس تفصیلی بیان کے شاید نہ حاصل ہوتا۔

کشمیر کا تمدن

اب ان تمام واقعات پر فلسفیانہ گہری نظر ڈالئے۔ سائنس یہ
بتلا رہی ہے کہ ہزاروں میل کے لمبے چوڑے سمندر میں ایک
کنکری چھوڑدی جاتی ہے تو گو ہماری آنکھیں نہ دیکھہ سکیں مگر اس کنکری سے
جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ اوسوقت تک ختم نہیں ہوتی جبتک اسکو سمندر کا
کنارہ نہ ملے۔ اسیطرح اگر ہوا میں حرکت کے ذریعہ سے کسی مقام پر کوئی لہر
پیدا کیجائے تو اسکا اثر اس تمام کرہ ہوا پر پڑتا ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے
ہے۔ وائرلس (wireless) یعنے بغیر تار کے خبر پہونچانے کا طریقہ
سائنس کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے دماغ میں بہت کم ایسے خیالات
آتے ہیں جو اپنا کچھہ نہ کچھہ اثر اسکی روح پر نہیں چھوڑ جاتے اسیطرح کوئی تمدن
بھی کسی ملک میں وہاں کے باشندوں پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کیا ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے بادشاہ کشمیر کو بہشت بنانے
کی کوشش کریں اور اس سے وہاں کے لوگوں کا مذاق یا تمدن متاثر نہ ہو؟
میں جب کبھی نشاط باغ و شالامار کو جایا کرتا تھا تو مجھہ کو ایک بات ہمیشہ محسوس
ہوا کرتی تھی کہ جمعہ کے دن سینکڑوں کشمیری معہ بال بچوں کے کشتیوں اور شکاروں

پر سوار ہو کر ان باغوں کو آتے ہوئے اور پھر وہاں دن بھر گزار کر شام کو
ڈل جھیل کے راستے میں واپس جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا
خیال ہے کہ یہ مذاق اُسی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ ثبوت کی
ضرورت ہو تو اسی کشمیر کے پہاڑوں کی دوسری جانب تبت کی طرف
جا کر جہاں عہد مغلیہ کے تمدن کا زیادہ اثر نہ تھا وہاں صنعت پر لہاسا پیٹرن
(Lhasa Pattern) کے بجھے کھو پر نہایت ناک جانوروں
کی صورت لکڑی یا نمدوں پر بنی ہوئی دیکھئے اور پھر اُسکا مقابلہ کشمیر پیٹرن
Kashmere Pattern سے کریئے۔ لکڑی پر۔ مسرتی پر۔ شالوں پر
قالینوں پر جہاں جہاں اہل کشمیر نے صنعت پر اپنا پیٹرن و نمونہ دکھایا ہے
وہاں خوبصورت خوبصورت چنار کی پتیاں اور نازک نازک پھول بنے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ انکی دستکاریوں میں وہ جھاڑ فانوس دکھائی دیتے ہیں
جو ایران کی صنعتوں میں ہوا کرتے ہیں انکی زبانوں کو ایرانی کھانوں کا
مزا عہد مغلیہ میں پڑا۔ اب کچھ ہی حالت ہو مگر کشمیر کے عمدہ باورچی کا
یہ دعوے رہا ہے کہ کسی دوسرے ملک کا باورچی اس سے بہتر و لذیذ کھانا
نہیں پکا سکتا۔ ذرا غور کریئے کہ یہ ڈشز او کھانے دراصل کس ملک کے ہیں
میری رائے میں کشمیری کھانے دراصل ایرانی کھانے ہیں کشمیر کی دعوت پلاؤ
سے شروع ہوتی ہے۔ اب تو انگریزوں اور انکے مقلد انگریزی دانوں کے
نئے مذاق نے کشمیری باورچیوں کو فن طباخی اسطرح بھلا دیا ہے جیسے یورپ
کے مشین کے بنے ہوئے سستے جامہ واروں نے کشمیر کی سوئی کی مہین بیریا

اور خوشنما صنعت کو مٹی میں ملا دیا سرینگر ایک وہ سرینگر تھا جہاں سے ۱۸۵۵ء
تک کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی شالیں یورپ کے بازاروں میں جا کر فروخت ہوا
کرتی تھیں اور آج وہی سرینگر ہے جسکے سوداگر سوائے نمونوں کے عمدہ
شالیں بنا کر بھی اسلئے نہیں رکھتے ہیں کہ انکی مانگ نہیں ہے۔ نمونہ دیکھکر جب کوئی
شخص خاص طور پر فرمایش کرتا ہے تب کہیں مہینوں میں ایک آدہ شال بنا کر
دیدیتے ہیں۔ اب تو کشمیر میں وہ پرانا کام نظر نہیں آتا۔ میرا اصلی پوئنٹ
یہ تہا کہ عہد مغلیہ کے تمدن نے ہمالیہ کے پہاڑوں کو بہی بہت کچھ فائدہ پہنچایا
ہے اور کشمیریوں کی صنعت وحرفت، تجارت، دولت، پوشاک، غذا
اور انکے کل مذاق وتمدن میں بہت کچھ تبدیلیاں اسی دور مغلیہ میں ہوئی
ہیں۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھکر عہد مغلیہ کا مقابلہ اس زمانہ کی
تمام دنیا کی سلطنتوں سے کر لیا جائے تو ہندوستان دنیا کے کسی حصہ سے
ترقی او تہذیب میں کم نہ پایا جائیگا۔

ہند کو مسلمانوں کے وجود سے فائدہ

ابہی تک اُن ترقیات کا ذکر کیا گیا جو ہند کی زمین اور دریاؤں اور پہاڑوں اور تمدن میں عہد مغلیہ نے کر دکہایا
اب ہم اس ملک میں مسلمانوں کے وجود پر ایک سیاسی نظر ڈالنا چاہتے ہیں
کیا اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بالآخر مفید ثابت ہوگا؟ میری رائے
یہ ہے کہ اگر ہند کی رگوں میں ترکستان۔ افغانستان وایران وعرب کا
خون شامل ہو گیا ہے تو اس امتزاج سے ہند کی اصلی اندرونی قوت میں اضافہ
ہو گیا اور ہوتا رہیگا۔ بڑی بات جو ہند کو مسلمانوں کی آبادی سے عہد مغلیہ

حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ چنگیز خاں. تیمور، نادرشاہ کی طرح سیلاب کی صورت میں آکر پھر یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ مستقل طور سے یہیں بس گئے ہیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ انکی کوئی علٰحدہ سول لائنس (Civil Lines) اس طرح کی نہیں ہیں جیسے ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ہیں۔ وہ ہند کے گوشت پوست اور خون میں شامل ہو گئے۔ مجھ کو تو معلوم ہو رہا ہے کہ جو جو قوت انگلستان کی اصلی سیکسن (Saxon) کو اُن کی سرزمین پر یورپ کی مختلف اقوام کے بس جانے سے بالآخر حاصل ہوئی ہے وہی قوت اہل ہنود کو سرزمین ہند پر ایشیا کے مختلف مسلمان اقوام کے امتزاج سے بالآخر حاصل ہوگی۔ علی الخصوص جبکہ ان نئی آنے والی قوموں میں سے بعض ایسی ہیں جنکے آباؤ اجداد وہی آریا تھے جنکی اولاد واخلاف اور نسل میں ہونیکا فخر اہل ہنود کو ہے انگلستان کے باشندے اندرونی معاملات میں چاہے کتنی ہی جنگ کریں لیکن جب جرمنی کا مقابلہ پڑ گیا تھا تو انگلستان کی کل آبادی ایک سر بنگئی تھی کیونکہ غیروں کے مقابلہ میں اغراض متحد تھے انسانی خلقت کا تقاضا یہی تھا۔ میری رائے میں ہند کی آخری حالت یہی ہونے والی ہے۔ آج ہر ملک کی قوت کا معیار اُس ملک کی آبادی اور وہاں کے باشندوں کی جسمانی ودماغی قوت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے جس اصول پر آج اسٹریلیا، کناڈا، نیوزیلینڈ وغیرہ نوآبادیات والے اپنی قوت بڑھانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کر رہے ہیں اور یورپ کے باشندوں کو

اپنے ممالک میں لیجا کر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں وہی مقصد ہند کو سینکڑوں برس ہوئے مسلمانوں کے آنے اور بس جانے سے حاصل ہو چکا ہے۔

پین اسلام ازم

لوگ بعض وقت میں پان اسلام ازم (Pan Islamism) کے خیال سے چونکنا ہو جاتے ہیں۔ ہم اس باب کے حصہ دوم میں دکھلا دینگے کہ پین اسلام ازم ایک خیالی چیز ہے جس سے خوف کھانا فضول ہے۔

مسلمان کیوں آئے؟ بے سود بحث

ایک اور بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ آیا مسلمانوں کو اس ملک میں آنا چاہیئے تھا یا نہیں اسطرح فضول ہوگی جیسے اس ملک کے اُن اصلی باشندوں کا جو آریا قوم کے آنے سے قبل یہاں آباد تھے یہ اعتراض کرنا کہ اہل ہنود یہاں آکر کیوں بسے اور قابض ہوئے یا یوں کہیئے کہ جیسے چھوٹے بھائی کے تولد ہو جانے کے بعد بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اعتراض کرنا فضول ہوگا۔ مسلمانوں کو قدرت لائی یا شمشیر لائی یا ضروریات زمانہ لائیں کسی نہ کسی طرح وہ آگئے اور ہند کے گوشت و پوست میں شامل ہو گئے دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ آگئے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے تمدن کو اُنکی ذات سے فائدہ پہنچا یا نقصان اور یہی دکھانے کی کوشش کیگئی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کا اثر ہند پر

میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مسلمان اس ملک سے نیست و نابود ہو گئے یا وہ اس قدر گر گئے کہ اُنمیں کوئی قوت باقی نہ رہی (گو کہ ایسا ہونا محال ہے) تو ہند میں بھی ایسا انحطاط پیدا ہو جائیگا

جیسے کسی شہ رگ کے ذریعے جسم کا خون نکل جانے سے ہوتا ہے دیکھ لیجئے جب اسپین مسلمانوں سے خالی ہوگیا اور اسکی رگوں سے عرب کا خون ایک مرتبہ ملکر پھر نکل گیا تو جو انحطاط اسپین میں پیدا ہوگیا۔ اسکا علاج یورپ بھی آجتک نہ کرسکا۔ لیکن اگر مسلمان ہندوستان میں مثل اہل ہنود کے یہاں پھلتے پھولتے رہے تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین کے لئے یہ اپنا خون بہا دینگے۔ اس پر غور کیجئے کہ جب ہند میں عہد مغلیہ کا دورہ تھا تو وہ ہندوستان کو ہر بیرونی قوت کی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رکھنے میں کوشاں رہے خواہ وہ بیرونی قوت افغانستان کی ہو یا ایران کی نادرشاہ کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی ہو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انکا اصل وطن ابھی میں ہے کہ ہند پر کسی غیر ہندی کا عمل دخل نہ ہو۔ مسلمانوں کے انحطاط سے اس ملک کی بہر کمزور ہو جائیگی۔

نقطۂ نظر وسیع ہونا چاہئے

ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ عہد مغلیہ نے سرزمین ہند اور اسکے دریاؤں اور پہاڑوں میں کیسے کیسے بہترین تغیر پیدا کردئے۔ اسکی تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثر پڑا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ہم یہ بھی بیان کرچکے کہ اس ملک کو مسلمانوں کے وجود سے کیا کیا فوائد نصیب ہوئے اور کیا کیا آئندہ ظہور پذیر ہوسکتے ہیں۔

اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ہندو برادران وطن کے لئے عہد مغلیہ کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔ کوہ ہمالیہ کے ایک غار میں بیٹھکر اگر ہم ایک چیونٹی کیطرح رینگنا شروع کریں تو ہر چیز

ہم کو تاریک و بدنما معلوم ہوگی لیکن اگر ہم کسی ہوائی جہاز میں بیٹھکر اُس عظیم الشان پہاڑ کی چوٹیاں، برفستان اور اسکا کل منظر مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو پھر اسکی چھوٹی چھوٹی بدنمائیوں پر نظر نہیں پڑتی اور وہ خوبصورت پہاڑ نہ صرف قدرت کا عجیب وغریب منظر معلوم ہوتا ہے بلکہ ہندوستان کی پشت وسپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسیطرح اگر ہم عہد مغلیہ کے ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں تو ممکن ہے کہ بہت سے ٹکڑے بدنما معلوم ہونگے لیکن اگر اس کل عہد کے کارنامے جمع کئے جائیں یا اس عہد کی ایک پوری تصویر کھینچی جائے تو عہد مغلیہ بھی تاریخ ہند میں قدرت کا عجیب وغریب دلکش نظارہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں عہد مغلیہ اسیطرح قابل فخر ہے جیسے عہد اشوک یا چندر گپت انکے زمانہ کی حالت کے اعتبار سے تھا۔ ویدوں کے زمانہ بلکہ اسکے بعد کی بھی مکمل صحیح تاریخ ہند مرتب کرنا تو دشوار ہے لیکن آج ہم عہد مغلیہ کے ہر کارنامہ کو پیش کرکے ہند کی تہذیب دولت، تجارت، مذہبی رواداری، انتظامات، عمارات، باغات، اور کل تمدن کا مقابلہ دنیا کے تمام ملکوں سے کرنے کو موجود ہیں۔ ہم اپنے موجودہ یورپ کے حکمرانوں کے سامنے اس عہد مغلیہ کے کارنامے اس امر کے ثبوت میں پیش کرسکتے ہیں کہ اگر ہم کو پورا موقع دیا جائے تو ہم دکھا دینگے کہ گو آج ہم بے بس ہیں اور موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اصلی قابلیت ظاہر نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم صدیوں اس ملک کی حکومت کا انتظام اُس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرچکے ہیں۔ میری

رائے میں اگر ہند کی کل تاریخ ایک مرصع زیور خیال کی جائے تو عہد مغلیہ اس کا وہ درخشاں اور شاندار کوہ نور ہیرا ہوگا۔ جسکے نکال ڈالنے سے زیور کی خوبصورتی اور جگمگاہٹ رہی جاتی رہیگی۔ یا کم سے کم یہ ہے کہ بالکل وہم پڑجائیگی۔

اہل ہند کا صحیح نقطۂ نظر

میرے پاس اسوقت مسٹر جسٹس مہادیو گوو ند رینڈے کا وہ مضمون نہیں ہے جسمیں انہوں نے عہد مغلیہ کی نسبت اپنا نقطہ نظر بتایا تھا لیکن جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہند کو اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں اس معراج ترقی میں عہد مغلیہ بھی ایک ضروری منزل اور زینہ تھا جسکے طے کئے بغیر ہند اپنی موجودہ حالت پر نہیں پہونچ سکتا تھا میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں۔ عہد مغلیہ نے ہند کو اس کے نصب العین ترقی کے قریب پہنچانے میں مدد دی ہے اور کبھی اُس میں ہرج نہیں ہوا عہد مغلیہ ہند کا وہ شاندار زمانہ ہے۔ جس پر اہل ہند کو فخر کرنا چاہئے اہل ہند کو چاہئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عہد مغلیہ کو اپنا عہد تصور کریں۔ یہ عہد غیر ہندی عہد نہ تھا اس عہد کا یہ مقصود نہ تھا کہ ہند کا مفاد کسی دوسرے ملک کے مفاد کا تابع ہو۔ عہد مغلیہ کی نسبت ہندو برادران وطن کا صحیح نقطہ نظر یہی ہوگا۔

باب دہم۔ حصہ دوم

مسلمانوں کا نقطۂ نظر

تمہید

اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔

میری رائے میں فی الحقیقت اس کا فیصلہ تو اسی روز ہوگیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی سچی حب الوطنی کی نسبت شبہات کیے جاتے ہیں۔ شبہات پیدا کرنے والا طرزِ عمل عموماً ان جذبات میں مضمر ہوتا ہے جن کا اظہار وہ مسئلہ خلافت اور "پین اسلام ازم" "Pan Islamism" کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ ایا کسی عارضی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں کہ ہم مسلم پہلے ہیں ہندی بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمائشی جذبات ہیں جو بعض اوقات سیاسی مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطۂ نظر پر جو ایک دوسرا مسئلہ ہے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم اول اسی قسم کے جذبات کی واقعیت اور قوت پر ایک نظر ڈالیں گے تاکہ اس امر پر رائے ظاہر کرنے میں کہ ہندوستان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر

کیا ہے بالآخر ہم کو مدد ملے اور اس کے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "سیاسی خلافت" سے ہماری کیا مراد ہے۔

سیاسی خلافت سے مراد

"سیاسی خلافت" سے مراد ہماری ایسی خلافت ہے جو تمام دنیا کی مسلم آبادی کی (خواہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی ہو یا غیر اسلامی مملکت کی) مرکزی قوت بنکر اسکی متحدہ قوت کو کل مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مفاد کے لئے استعمال کر سکے اور اپنے قبض و اختیار میں رکھے جس شخص میں یہ مرکزی قوت موجود ہو وہی سیاسی خلیفہ ہوگا۔ مسلمان خلافت کیساتھ "سیاسی" کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن ہم نے صرف اسی سیاسی مرکزی قوت کے خیال و تصور کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ بار بار مطول عبارت نہ لکھنی پڑے۔ لہٰذا جہاں کہیں ہم "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کریں گے ہماری مراد اسی قسم کی قوت سے ہوگی۔

"سیاسی خلافت" محال ہے

منجملہ اُن جذبات کے جو ہندوستان کے تعلق سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ سیاسی خلافت کا جذبہ بھی ہے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر غیر مسلموں کے دل میں اس کا خوف ہو کہ مسلم اندرونی طور پر کسی سیاسی خلافت کی حمایت میں اگر اپنے اصلی وطن کے سیاسی مفاد کو پس پشت ڈال دینگے یا اگر کوئی مسلمان کسی ایسی خلافت کا خیال بھی دل میں لاتا ہو تو ہماری رائے میں یہ خوف اور یہ خیال و وہم ایک خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ عملی طور سے نہ کبھی ایسا ہوا

اور نہ ایسا ممکن ہے لوگ یہ کہیں گے کہ ابھی تک جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا رہا وہ دراصل ایک سلطنت کا حکمران رکر رات دن عیش کے سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ "سیاسی خلیفہ" یا "سیاسی خلافت" کا خیال نقش بر آب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسا بادشاہ خلیفہ تو ضرور کہلایا گیا لیکن اس میں سیاسی خلافت کی قوت یا خلافت کے اوصاف کبھی نہیں پائے گئے۔

تاریخ اس کی شاہد ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلفاء راشدین یکے بعد دیگرے ہوئے انکی نسبت تو کچھ شبہ نہیں کہ جو جذبات ان کے دل میں موجزن تھے وہ صرف اشاعت اسلام کے تھے۔ دنیوی بادشاہت یا یوں کہیے کہ محض بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا خیال ان پر غالب نہ تھا۔ مگر ان چار خلفاء کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ جونہی اسلامی سلطنتیں بیرون حدود عرب قائم ہونا شروع ہو گئیں انہیں وہی حالت پیدا ہو گئی جو فطرت کا تقاضا تھا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ یہی پیشگوئی آنحضرت کی بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سلطنت کے اغراض و مفاد علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور پھر یہ محال ہو گیا کہ کسی ایک اسلامی سلطنت کا حکمران سیاسی امور میں کسی دوسری اسلامی سلطنت کی رائے و مشورہ کا محکوم اور پابند ہو۔ ایک بادشاہ خلیفہ تو کہلاتا رہا مگر اس میں سیاسی خلافت کی مرکزی قوت کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ خلافت کبھی کسی اسلامی سلطنت کو دوسری اسلامی یا غیر اسلامی قوتوں کی دست درازی سے محفوظ نہ کر سکی

نہ کبھی یہ خیال تک ہوا کہ اسکا زوال صرف خلافت کا (جزو ہی سہی) نقصان ہے۔ جب تاتاریوں نے بغداد کا پایہ تخت الٹ دیا۔ مصر و اسپین تو کجا پڑوسی عرب تک امداد کو نہ پہونچے۔

جب شہزادہ فرڈینڈ اور ملکہ آئیزبیلا کے عہد میں لاکھوں مسلمانوں کے خون سے اسپین کے در و دیوار رنگین ہوئے اور اسلام کے لاکھوں نام لیوا جلاوطن کئے گئے۔ لاکھوں کلمہ گویوں کو بالجبر عیسائی بھی بنایا گیا اور بے شمار مسلمان آگ میں زندہ جلا دئے گئے۔ اُس وقت کونسی وہ مرکزی قوت تھی جو سپر بنی؟

جب ہندوستان کے تخت تیموریہ پر یورپ کے سوداگروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے دست درازی شروع کی تب کوئی ایسی مرکزی قوت نہ پائی گئی جو اُن کو روک سکتی۔ جب یہ اسلامی قوت بھی نیست و نابود ہوگئی تب سرزمین یورپ پر خلیفۃ المسلمین کا وجود اور اُنکی حکومت یورپ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی میدان صاف پاکر پہلے زار (ــــ) روس نے ابتدا کی۔ پچاس برس ہوئے جب قسطنطنیہ کے دروازہ پر آکھڑا ہوا اور خلیفہ سلطان کو خواب غفلت سے بیدار کیا اُسوقت اُن کے پاس کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جس سے اُن کو کچھ بھی مدد ملتی اور اُن کو ایک حد تک یورپ سے قدم ہٹانا پڑے۔ پھر تو یورپ کی یہ مسلمہ پالیسی ہوگئی کہ "ترکی" کے قدم جسطرح جلد ہوسکے بقیہ سرزمین یورپ سے اُکھاڑ دئے جائیں جب اس پالیسی کو اس قدر

نشوونما ہوا کہ اولاً اٹلی نے اور پھر بلقان کی پانچ متحدہ قوتوں نے یورپ کی اندرونی کمک و مدد سے خلیفۂ اسلام کے نشانِ ہلالی کو نیچا دکھانا شروع کیا تو انگلستان جیسے مدعی بے تعصبی کا وزیر اعظم بھی اپنے جوش مذہبی کو روک نہ سکا اور عام جلسہ میں اسنے اسپر اظہارِ مسرت کیا کہ آج اسلام مسیحی ممالک سے رخصت ہو رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کے مسلمان سوائے تماشہ دیکھنے کے نہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا اور سلطان میں کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی بالآخر خود یورپ کی قوتوں میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور خلیفہ نے جو یورپ کی پالیسی سے عاجز آگئے تھے اپنی آئندہ کی حفاظت اسی میں سمجھی کہ کسی قوت کا ساتھ دیکر خود اس جنگ میں کود پڑیں اس وقت دنیا کے مسلمانوں کی حمیت دینی دیکھکر جو کچھ سیاسی خلافت یا مرکزی قوت کی رہی سہی نمایشی دہاک یورپ میں تھی اسکی بھی قلعی کھل گئی سب سے پہلا ملک جس نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا وہ عرب تھا۔ غالباً وجہہ یہ تھی کہ سیاسی خلافت تو محال تھی ہی اور ترکوں نے اپنے سیاسی مفاد سے عربوں کو ہمیشہ دبا یا بھی تھا۔ البتہ ہندوستان کے چند مسلمانوں نے غل پکار مچا کر معتدبہ رقم جمع کی مگر اس میں سے ایک جزو قلیل جنگ کے بعد ترکوں کو بھیجا اور باقی خود صرف کر لی جس نے لیپا پوتی کرنے کی کوشش کو دیکھکر اور بھی نفرت بڑھتی ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ وہ شخص جسپر سیاسی خلیفہ کے الفاظ کسی حد تک صادق آسکتے تھے اسکو خود ترکوں نے دارالخلافت سے خارج کر دیا

اور اسکی وہ سلطنت جو یورپ و ایشیا کے بر اعظم کا معتد بہ حصہ گھیرے ہوئے تھی سمٹ سمٹا کر انگورہ گورنمنٹ کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئی الحاصل اب اس دنیا میں آج کوئی ایسا شخص بھی نہیں دکھائی دیتا جو اس معنی میں سیاسی خلیفہ کہا بھی جا سکے جسکی تعریف ہم کر چکے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو برس کی خلافت کی یہ مختصر حقیقت ہے اس کے ملاحظہ کے بعد کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ابتداء کے چار خلفاء راشدین کے کے زمانہ کے بعد ان تیرہ سو برس میں جس جس بادشاہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا دعوے کیا انھیں واقعی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی مرکزی قوت موجود تھی جس کو وہ سب کے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا تھا یا اس نے کبھی واقعی اس قوت کو استعمال کیا اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام عالم اسلام کی قوت و تمدن سے مسخر ہو گیا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ قصور محض خلیفہ کا نہ تھا بلکہ یہ امر بھی محال تھا۔ کیونکہ ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور اغراض علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات باہم متضاد ہوتی ہیں اور اس حال میں ہر دنیوی بادشاہ کا ہمیشہ یہی فرض ہوگا کہ وہ اپنی رعایا اور ملک کے مفاد کو بمقابلہ دیگر ممالک کے مفاد کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہوں ترجیح دے۔ یہ تو خیر بادشاہ کا فرض ہے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر اگر کسی ملک کے مسلمان باشندے بھی اپنے سیاسی مفاد اور اغراض کسی ایسے خلیفہ بادشاہ سے وابستہ کرنا چاہیں جو ان کے ملک کا بادشاہ نہیں ہے تو وہ مسلمان اگر

خود مختار سلطنت ہی رکھتے ہونگے تو بھی کچھ عرصہ کے بعد اسی قسم کی حالت محکومی میں گرفتار ہو جائیں گے جیساکہ اہل عرب عرصہ تک ترکوں کے ہاتھوں میں بادل ناخواستہ رہے اور اگر وہ مسلمان کوئی اسلامی خود مختار سلطنت نہیں رکھتے بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ اُس ملک میں آباد ہیں جیساکہ ہندوستان میں تو ایسی صورت میں اُس ملک میں اُن کا بقاو قیام ویسا ہی دشوار و محال ہو جائیگا جیساکہ اجتماع ضدین کیونکہ ایسی صورت میں مسلم و غیر مسلم آبادی کے اغراض و نصب العین میں بین مغائرت ہوگی ہماری رائے میں سیاسی خلافت نہ کبھی تھی اور نہ اُسکا قائم کرنا ممکن ہے اگر ہماری رائے صحیح ہے تو مسلمانوں کو سیاسی خلافت کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے اور ہندوستان کے متعلق نقطہ نظر قایم کرنے میں اس خیال کو کچھ بھی دخل نہ دینا چاہئے۔

خلافت بلا سیاست کا تصور

ہم یہاں کوئی ایسی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے جسکا تعلق اس کتاب کے اصل مضمون اور مقصد سے نہ ہو۔ اس لئے ہم یہ مسئلہ اُٹھانا نہیں چاہتے کہ بغیر کسی خلافت سے وابستہ ہونے کے کوئی مسلم آیا مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں نے کسی مذہبی خلیفہ کو کھڑا بھی کیا تو اُس کی وقعت اور حیثیت رفتہ رفتہ وہی ہو جائیگی جو مسیحی دنیا میں اب پوپ (Pope) کی ہے یا اگر وہ خلیفہ واقعی مقدس ہوا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اہل تشیع میں مجتہد العصر یا اہل تسنن میں کوئی پیر طریقت کہ جس سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیا جائے یا

اُن کے حلقے میں صفائی قلب کی توقع سے کچھ لے بیٹھا جائے۔ گر میری رائے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ پہونچے گا۔ علاوہ بریں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ہمارے ذہن میں بڑی بڑی دشواریاں آرہی ہیں جن کے بیان کرنے میں ہم کو اندیشہ ہے کہ ایک ایسی طولانی بحث میں پڑ جائیں گے جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہوگا اور یہ بحث حقیقی شاہراہ سے بھٹکا کر پیچیدگیوں کے دلدل میں پھنسا دیگی بہر کیف اول تو کوئی ایسا خلیفہ ہوگا ہی نہیں اور ہوگا بھی تو بلا کسی سیاسی قوت کے ہوگا جس کے خیال کا بھی ہماری رائے میں اہل ہند کی نسبت نقطۂ نظر قایم کرنے میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

خلافت کا عام تصور

اس وقت خلافت کا عام تصور ہمارے برادران اسلام میں یہ ہے کہ خلیفہ ایسا مسلم بادشاہ ہو جو جزیرہ نمائے عرب پر حکمران ہو اور اسکی حدود سلطنت میں حجاز و شام۔ بیت المقدس و فلسطین و عراق وغیرہ شامل ہوں اور وہ بادشاہ حج کے موقع پر یا کسی اور طریقہ سے تمام دنیا کی مسلم آبادی سے تعلقات قائم کرے اور اپنی مرکزی قوت کو اسلام اور تمام مسلمانوں کے مفاد کے واسطے استعمال کر سکے۔ اس عام تصور میں اور ہماری اُس سیاسی خلافت کے تصور میں جسکا ذکر ہو چکا ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یعنے صرف اسی قدر فرق ہے کہ اسمیں چند ممالک اسلامیہ کی بادشاہت جزو لاینفک ہے۔ ہماری تو یہ عین خواہش ہے کہ اُن تمام ممالک پر جو گہوارہ اسلام ہیں۔ جہاں کے

ذرّے ذرّے سے انوار اسلام منور اور جن کے در و دیوار سے اسلامی تمدن کے آثار ہویدا ہیں اور جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات و عتبات عالیات واقع ہیں وہاں پرچم اسلام لہرائے اور مسلمانوں کی حکومت قائم رہے کیونکہ فی الحقیقت ان ممالک کی اصلی بہبودی کے خواہاں جس طرح قدرتاً مسلمان ہوسکتے ہیں ویسے کسی غیر مذہب کے لوگ نہیں ہوسکتے ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ اسوقت انگلستان و فرانس نے ان ممالک میں اپنے اثرات کی جو باہمی تقسیم کرلی ہے اسکا اصل مقصد اپنے ممالک کو فائدہ پہنچانا ہے نہ کہ اُن ممالک کی رعایا کو باوجود اس تمنا و خواہش کے ہماری رائے یہ ہے کہ ان ممالک میں جو مسلم بادشاہ یا قوت ہوگی اسمیں وہ مرکزی قوت پیدا ہونے کی امید نہ رکھنی چاہیے جس کا محال ہونا سیاسی خلافت کے ضمن میں ہم دکھا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے برادران اسلام خلافت کے اس عام تصور کو کچھ نتیجہ بخش سمجھتے ہیں تو جہاں تک ہندی مسلم متعلق ہیں وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں اسی وقت مدد دے سکتے ہیں جب خود اُن میں کوئی قوت ہو اور اُن میں اُس وقت تک کوئی قوت نہ ہوگی جب تک وہ اپنے ملک ہندوستان کی سیاسی حالت اُس بلند و رفیع پایہ پر نہ پہونچادیں کہ بحیثیت ہندی ہونے کے ان کی کوئی قدر و منزلت ہونے لگے۔ لہٰذا مسئلہ خلافت کو خواہ ہم کسی پہلو سے دیکھیں مگر اس ملک کی سیاسی ترقی میں ہمارا نقطہ نظر وہی رہنا چاہیے جو یہاں کی غیر مسلم آبادی کا ہے۔

"پین اسلام ازم"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں پین اسلام ازم کی ایک خطرناک قوت اسوقت پھیل رہی ہے اس کی واقعیت کے معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ "پین اسلام ازم" Pan Islamism کس قوت کا نام ہے۔

اگر "پین اسلام ازم" سے یہ سمجھا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں کوئی ایسی باہمی قرارداد ہے کہ ایک مقام کے مسلمان دوسرے مقام کے مسلمانوں کو عملی مدد دیکر اس دنیا میں کوئی غلبہ حاصل کریں تو بحیثیت ایک مسلم کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ہماری رائے میں جن غیر مسلموں نے پین اسلام ازم کی مہیب صورت دنیا کے سامنے پیش کی ہے یا تو وہ غلطی میں ہیں یا اس میں کوئی سیاسی غرض اس مقصد سے مضمر ہے کہ خواہ مخواہ دنیا کو اسلام سے برگشتہ اور چوکنا رکھکر دنیا کو اسلام کی فضا اور اسکی نفع کے لئے تیار رکھا جائے۔ لیکن اگر "پین اسلام ازم" درحقیقت اس کشش کا نام ہے جو کسی ہم خیال یا ہم تمدن اشخاص کے درمیان عادتاً ہوا کرتی ہے تو پین اسلام ازم کا وجود ہے کیونکہ تمام مسلمان بعض اصولی باتوں میں ہم خیال بن جاتے ہیں اور ایک حد تک انمیں کشش محبت پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی موجودہ سوسائٹی مختلف قسم کی قدرتی کششوں کا نتیجہ ہے ایسی جماعتیں خواہ کلب کمیٹی یا کسی اور صورت میں ہوں وہ صرف مختلف

اقسام کی کششوں کی مثالیں ہیں۔ ہم مذہبی میں بھی ایک کشش ضرور ہے
اور اس کشش کی قوت کا معیار اُن افراد کے مذہبی خیالات کی قوت
پر منحصر ہوا کرتا ہے جو اُن سے متاثر ہوں۔ یہ عام اصول انسانی خلقت
کے ہیں کچھ مسلمانوں ہی سے مختص نہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ یہودیوں میں
مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہم مذہبی کی کشش موجود ہے۔ اسی طرح ہم ملک
ہونے کی بھی ایک کشش ہے جسمیں مذہب کو دخل نہیں ہوتا اس کشش کا
پورا حس اُسوقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر جاکر اپنے کسی ملکی
فرد سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے یورپ کا سفر کرتے وقت جہاز میں قدم
رکھتے ہی ہم نے دیکھا ہے کہ اس پندرہ روزہ سفر میں جو چھوٹی سی
دنیا بحر ذخار میں چلتی نظر آتی ہے اس میں جو سوسائٹیاں فوراً بنجاتی
ہیں وہ اسی ملکی کشمکش کے نمونے ہوتی ہیں۔ اس کشش کی ایک دلچسپ
مثال مجھ کو یاد آگئی۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت لندن کی انڈر
گراؤنڈ (زیرزمین) ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک کنڈکٹر یعنے ریل
چلانے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھنا شروع کیا جن لوگوں نے
لندن کی انڈر گراونڈ ریلوں میں سفر کیا ہے وہی اسکا اندازہ کر سکتے
ہیں کہ کنڈکٹر کسقدر عدیم الفرصت ہوا کرتا ہے اور ایک ایک دو دو
منٹ کے بعد وہ کس طرح ہزاروں آدمیوں کی بہتی ہوئی زندہ دھار
کے رُخ بدلتا اور موڑتا رہتا ہے لیکن ملکی کشش اُسپر اسقدر غالب تھی کہ
اس عدیم الفرصتی میں بھی وہ میرے پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ

ہندوستانی ہیں۔ جب اوس کو اس خیال کی تصدیق ہوگئی تو مسکرا کر کہنے لگا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ یہ کہکر پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے ظاہر ہورہا تھا کہ مجھے دیکھکر اسکو ایک خاص مسرت ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبہ کا علیحدہ کلب اسی کشش کے اصول پر مبنی ہے خیر یہ سب مختلف قسم کی قدرتی کششوں کی مثالیں ہیں اور یہ جذب مقناطیسی اوسوقت تک باقی رہیگی جب تک انسان کی خلقت قائم ہے۔ دیکھنا صرف اسقدر ہے کہ جو کشش ہم مذہبی ہونے کی مسلمانوں میں ہے کیا وہ سیاسی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کے واسطے کچھ پرخطر ہے۔ یا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حبل المتین (مضبوط رسی) ہے جس کے بھروسہ پر وہ ہند کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پین اسلام ازم کی مذہبی کشش غیر مسلموں کے واسطے کچھ بھی پرخطر نہیں ہے۔ اور جو وجوہ ہم سیاسی خلافت کے محال ہونے کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں انہیں وجوہ پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کشش ایسی نہیں ہے جس کے بھروسہ پر ہم اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر کو بدل دیں۔

مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ وہ بلالحاظ مذہب و ملت اپنے کو تمام برادرانِ وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا ہوا تصور کریں۔ اور وہ کشتی ہندوستان ہے۔

جو طوفان اہل ہنود کو ڈبانے کی قوت رکھتا ہے وہی انکو غرقاب کریگا۔ اور جو امن و سکون اہل ہنود کو ساحل مراد پر پہونچائیگا وہی مسلمانوں کو دنیاوی گرداب ہلاکت سے بچائیگا اگر کوتاہ نظری سے کام نہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کی ترقی و وقار کا عکس کسی نہ کسی حیثیت سے پلٹ کر دوسرے باشندوں پر بالحاظ مذہب و ملت پڑتا ہے ہم کو اس امر کا پورا احساس کہ ہندوستانی عزت و ذلت کا اثر ہماری ذاتی عزت و ذلت پر کہا تک پڑتا ہے اُس وقت ہوا جب ہم نے ہندوستان کے باہر سفر کیا۔ ہم نے سنہ ۱۹۱۱ء میں ولایت سے واپسی کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ دکھایا تھا کہ حدود ہندوستان کے باہر ہماری تمام عزت و وقار کا معیار لفظ "ہندی" ہونے میں ہے ہر مقام اور ہر سوسائٹی میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ غیر ممالک میں پہلے لوگ اس کی جستجو کرتے ہیں کہ کون شخص کہاں کا باشندہ ہے اس کے بعد اُن کی نگاہوں میں اس کا وہی وقار ہوتا ہے جو اُس کے ملک کی سیاسی و تمدنی حالت کا ہے جہاں کا وہ مسافر اصلی باشندہ ہے اُسکی وقعت یا تو ایک دم اُنکی نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے یا وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ کوٹ، پتلون، ہیئت، صورت، وضع، قطع بلکہ ذاتی قابلیت بھی بالائے طاق ہو جاتی ہے سنہ ۱۹۲۲ء کے سفر میں بھی یورپ کے ہر مقام پر جہاں جہاں گئے ہم نے دیکھا کہ بہ لحاظ عزت ہم محض اپنے ہندی ہونے کی وجہ سے کہیں نقصان میں رہے اور

کہیں گھاٹے ہیں۔

یہ عزت و خفت ہندوستان کی نسبت ہر شخص کے خیال پر منحصر تھی۔ اس میں مذہب کا دخل نہیں تھا۔ مجھ کو خیال ہے کہ ولایت میں ایک انگریزی خاتون نے مجھ سے یہ کہا کہ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے ہندوستان سے لچھمی کی ایک مورت اس کو بھیجی اور یہ لکھا تھا کہ ہندیوں کے اعتقاد کے بموجب جس شخص کے پاس یہ مورت رہیگی اسکو دولت ملیگی۔ اس پر خاتون موصوفہ نے مذاقاً کہا کہ اُن کو ابھی تک کوئی دولت نہیں ملی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے مگر کسی طرح اُنکی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب میں بھی ہندی ہوں تو اس عقیدہ کا قائل کیوں نہیں ہوتا۔ سر رابندو ناتھ ٹاگور نے دوسر ممالک میں سفر کر کے جو نکہ اپنی علمی لیاقت و انسانی وقار کا قائم کیا ہے اس کا فائدہ بلا لحاظ مذہب ہر ہندی کو پہنچے گا۔ اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں ایک سوداگر نے اپنا قیمتی زیور بغیر فوری قیمت لئے ہوئے ہم کو اس اعتبار پر دیدیا کہ ہم ہندی تھے اور اسی شہر کی دوسری دوکانوں پر ایک سوداگر نے یہ کہا کہ ایک ہندی مسافر نے جن زیور کے خریدنے کا وعدہ کیا اُسے چھ مہینے بعد لوٹتے وقت حسب وعدہ اس نے خریدا اور ہندیوں کی اسی ساکھ کی بنا پر اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ بھی خرید کا وعدہ کرلیں تو زیور کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائیگا۔ یہ کچھ یورپ ہی کی کیفیت نہیں ہے

بلکہ عراق اور حجاز و عرب میں بھی جو ہندوستانی مسلمان زیارات اور حج
کی غرض سے جاتے ہیں انکو تمام عراقی اور حجازی عموماً ہنودی کہتے
ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست نجف اشرف میں
جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ راستہ میں جا رہے تھے کچھ عرب بچے اشارہ
کرکے کہا "ھذا الشیخ الھنود"
مہاتما گاندھی کی روحانیت کی شہرت سے غیر ممالک میں
ہر ہندی بلا لحاظ مذہب فخر کرنے لگتا ہے۔ انگلستان میں آپ کتنا ہی
اکڑتے لیکن انگریزوں کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ہندی ہیں تو بلا لحاظ
مذہب آپ کا وہی وقار رہ جاتا ہے جو ایک رعایا اور محکوم کا ہونا چاہیے
جنوبی افریقہ اور دوسری نو آبادیات میں آپ کتنا ہی سر پٹکیں لیکن وہاں
آپ کا شمار بحیثیت انسان وہ اپنے مساوی درجے کے لوگوں میں اس
وقت تک ہرگز نہ کریں گے جب تک کل ہندوستان کا سیاسی پایہ بلند نہ ہو
امریکہ کے ہائیکورٹ میں اسرار کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندی اون کے
ملک کا کبھی سٹیزن Citizen نہیں بن سکتا یا مستقل باشندے کے
حقوق نہیں حاصل کر سکتا اس ہندی کے مذہب کا خیال بھی ان کے
دل میں آیا ہوگا جس کا مقدمہ ان کے روبرو پیش تھا۔ ہم کو اس وقت
کسی مذہب کی صداقت و کذب سے بحث نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں اس
ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں کہ بیرون حدود ہندوستان وہاں کے باشندوں
سے ہمارا باہمی مذہب کا فرق اٹھ جاتا ہے اور غیر ہندی لوگوں کی نگاہ

"ہندی" محض "ہندی" ہی کی حیثیت سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے خواہ وہ
کسی جامے میں ہو۔ ناظرین اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ ایک ہندی
مسلمان اسلامی ممالک میں جا کر دائرہ ہندی سے نکل جایا کرتا ہے نہیں
وہاں بھی "ہندی" ہی رہتا ہے۔ میری والدہ ہمشیرہ جب حج و زیارات
سے واپس آئی ہیں تو فرمایا کرتی تھیں کہ انکے قافلہ میں جب کوئی ہندی
کسی بدوی عرب کی کافی خاطر مدارات نہیں کرتا تھا یا کافی انعام نہیں
دیتا تھا تو وہ "ہندی بطال" کے الفاظ بطور تکیہ کلام کے ہر ہندی کیلئے
عام طور پر استعمال کرتا تھا اور اس ہندی کا مذہب اسلام اُس کو اذیت
و تکلیف ہی سے بلکہ بعض اوقات قتل سے بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسی
سال کا واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ کے راستے میں ہزاروں حاجیوں کا
قافلہ بدوی عربوں نے روک لیا اور جب انکو کافی رقم نہ پہونچی تو
سارے قافلہ کو بغیر مدینہ منورہ کی زیارت کئے ہوئے واپس آنا
پڑا۔ اور راہ میں ان مصائب کا سامنا ہوا کہ ہزاروں جانیں ضائع
ہوئیں۔ بدویوں پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔
سال گزشتہ سلطنت حجاز عرب کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مصری ڈاکٹروں
کا وفد حاجیوں کے علاج و معالجہ کے لئے حج کے زمانہ میں زمین عرب
پر قدم بھی رکھے یا خیمہ نصب کرے کیونکہ سیاسی حیثیت سے اُن کی
موجودگی اُنہوں نے اپنے لئے مضر خیال کی تھوڑا عرصہ ہوا جب
ہند کے وفد خلافت نے اسلامی جوش میں آکر مشورہ دینے کی غرض سے

سلطنت انگورہ میں داخلہ کی اجازت چاہی تو ترکوں نے صاف انکار کر دیا جس سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہونگی تین برس کا عرصہ ہوا جب صوبہ پنجاب و صوبہ سرحدی کے ہزاروں مسلمانوں نے ترک وطن کا خیال اس بھروسہ پر کیا تھا کہ افغانستان بحیثیت ایک اسلامی سلطنت کے اُن کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کریگا اور اپنے ملک میں آباد کریگا۔ لیکن اُس ارادہ کو پورا کرنے میں جو جو نتائج پیدا ہوئے وہ ہر باخبر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ہمارے دوست خواجہ غلام الثقلین مرحوم کو ایک مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ ایران جا کر وہاں کے مسلمانوں کے خیالات درست کئے جائیں۔ اسلامی ہمدردی سے ایران پہنچے مرحوم میں ایثار نفس کا بہت مادہ تھا وہ فرماتے تھے کہ ایرانیوں کو ان پر یہ شبہ تھا کہ یہ شخص ہندوستان کی خفیہ پولیس کا کوئی رکن ہے اور ان کو پھانسنے کے لئے آیا ہے۔ انکی ہندیت نے ایران میں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غرض سخت مایوس ہوکر واپس آئے اگر ایران میں کوئی ہندی مسلمان اس طرح قتل کیا جاتا جیسے کہ ابھی چند دن ہوئے کہ ایک امریکن سفیر کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے کہ اسکی تلافی یا مکافات اور اُس کے خون بہا کے لئے ایران صرف مذہب کی بنیاد پر اس حد تک تیار نہ ہوتا جیسا کہ امریکہ نے ایران کو مجبور کر کے آمادۂ تلافی کیا۔ یہ سب صرف امریکہ کی سیاسی قوت کا زور اور اثر تھا۔ ان تمام مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی مسلمان ممالک اسلامیہ میں

بھی ہندی ہی رہتا ہے جس سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ معاملات
دنیوی میں کسی ملک کی مجموعی سیاسی و تمدنی حالت کا جو اثر اُس ملک
کے ہر باشندے پر پڑتا ہے اس کو مذہب نہیں روک سکتا ہند کے مسلمان
ہرگز خیال نہ کریں کہ کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی سیاسی و تمدنی بہتر حالت ہندوستانی مسلمانوں کی
سیاسی و تمدنی حالت کو کسی اسلامی مقناطیسی اثر سے درست کر سکتی ہے۔ ایسا کبھی
ہوا اور نہ ہوگا۔ قصہ کوتاہ سیاسی و تمدنی معاملات میں اہل ہنود و
مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ہند کی سیاسی ترقی مجموعی
حیثیت سے مسلمانان ہند کے وقار و عزت اور قوت کو اسی طرح
گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے غیر مسلم ہندیوں کی عظمت اور وقعت کو۔
پس ہمیں ہندوستان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور ہمارا
یہی نقطۂ نظر صحیح ہوگا۔

باہمی مطالبات کی نوعیت

ہم کو اس رسالہ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ
ہر شخص کی نیت و غرض کا اثر اس کے افعال و معاملات
پر کہاں تک پڑتا ہے۔ اس ملک میں ہندو مسلمان
ایک دوسرے کے مقابلہ میں بعض مطالبات پیش کرتے ہیں۔ ہم یہ
نہیں کہتے کہ مطالبات نہ کیے جائیں۔ باہمی صفائی اور سمجھوتا اسی
وقت کر لینا ضروری ہے۔ ہم نے اسے خوب سمجھ لیا ہے۔ باہمی مطالبات
کے متعلق آج جس بات کو ہم لڑائی سمجھ رہے ہیں وہی آئندہ ہماری
صفائی اور صلح کا باعث ہوگی لیکن ہماری رائے میں اگر ہندو مسلمان

ایک دوسرے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں جس کے قائم کرنے کی
کوشش اس باب کے حصۂ اول و دوم میں کی گئی ہے تو پھر باہمی مطالبات
کا فیصلہ کرنے میں بہت کچھ سہولت پیدا ہو جائیگی اگر تمام اہل ہنود
مسلمانوں کو اس نگاہ سے دیکھنے لگیں کہ انکے عہد حکومت میں ہندوستان
کے تمدن کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے یہ اس ملک کے اب جزو لاینفک ہیں
یہ ایک ایسا ذخیرہ دماغی و جسمانی قوت کا ہیں جو اس ملک کی بہتری
کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ حصۂ اول میں مفصل طور پر
بتایا گیا ہے) اور اسی طرح اگر تمام ہندی مسلمان یہ خیال کرنے لگیں کہ
اُن کا وقار و ذلت اس ملک کے وقار و ذلت کے ساتھ وابستہ ہے
اہل ہنود اس ملک کی صنعت و حرفت و دولت میں کوئی ایسی ترقی
نہیں کر سکتے جس کا فائدہ صریحی یا معنوی طریقہ سے بواسطہ یا
بلا واسطہ مسلمانوں کو بھی نہ پہنچیگا۔ خلافت و حمین اسلام از مرا ابھی
آئندہ قسمت کا فیصلہ نہ کر سکیں گی اور اس کے جوش میں وہ کسی طرح
اس ملک کی سیاسی ترقی میں سد راہ نہ ہونگے تو پھر ہماری نیتوں اور
اغراض میں بہت کچھ یکسانیت پیدا ہو جائیگی ایک دوسرے کے
مقابل سے شبہ کا بادل چھٹنا شروع ہوگا۔ باہمی تعلقات کا مطلع
صاف ہو جائے گا اور ہم کو اپنے باہمی مطالبات کی نوعیت ایسی
معلوم ہو گی گویا دو بھائی ہیں جو گھر کو بگاڑنا نہیں چاہتے بلکہ
کچھ لیا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں کہ عرصہ تک اپنی متحدہ قوت اُس گھر کے

بقا و قیام کے لئے صرف کریں اسکو بجائیں اور اس کی ہم آہنگی سے دونوں بھائی منتفع ہوں۔ ہمارا یہ گھر ہندوستان ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کے کل باشندے اپنے اپنے مطالبات کی نوعیت کو سمجھتے رہیں تاکہ اُن کا تصفیہ کرنے میں آسانی ہو۔ مطالبات اس نیک نیتی سے کئے جائیں کہ ایک کو دوسرے پر کوئی بیجا غلبہ نہ حاصل ہو دونوں کی بقا فیصلہ کی شرط رہے نہ ایک جانب ہندو راج کا خیال غالب ہو نہ دوسری جانب سیاسی خلافت کی دُھن ہو اگر طبیعتیں اس رُخ پر آجائیں تو بیڑا پار ہے۔ جو ہوا عالم میں آج چل رہی ہے اُسے دیکھ کر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں ملکی قوت و جذبات تمام دوسری قوتوں اور جذبات پر غالب ہو جائینگے اور اس سے کسی شخص کے اصلی اصول مذہب پر آنچ نہ آئے گی۔ فروعات کا کچھ ہی حشر ہو مثلاً یہ باجا بجانے کا مسئلہ یا کسی جانور کے ذبح کرنے کا حق۔ ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک وقت آجائے کہ ایسے مطالبات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ بہرکیف آج تو صرف اسکی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی نوعیت کو نہ بھولیں۔

باب دہم ۔ حصہ سوم

نفاق کے نتائج و باہمی اتحاد کی تدبیر

تمہید

اگر شروع کے نو ابواب باب دہم کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں تو باب دہم کے حصہ اول و دوم کو اس آخری حصہ سوم کی تمہید سمجھنا چاہئے۔ شروع کے نو ابواب میں صرف باب دہم لکھنے کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور باب دہم کے حصہ اول و دوم میں (جس میں ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے) اس آخری حصے کی بنیاد ڈالنا منظور تھا۔ اس میں اہل ملک کے سامنے باہمی اتحاد کی تدابیر پیش کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر اگر ناظرین میرے خیالات پوری طرح معلوم کرنا چاہیں تو حصہ اول و دوم کو پیش نظر رکھیں۔

عداوت و کینہ و نفرت کے جذبات کے نتائج

عداوت و کینہ اور نفرت انسانی خلقت کے بہت زبردست جذبات ہیں اور جب یہ کسی انسان میں سرایت کر جاتے ہیں تو ان کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ خلقت انسانی کے جزو یا طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی قومیں اور جماعتیں آخر افراد ہی سے بنتی ہیں۔ اسلئے جب کسی جماعت یا قوم میں کینہ و نفرت کا مادہ کسی دوسری جماعت اور قوم کے خلاف سرایت کر جاتا ہے

تو اُس کا دور کرنا بھی ویسا ہی سخت دشوار ہوتا ہے جیسا کہ کسی ایک فرد کے دل سے ان جذبات رذیلہ و مقتضیات ذمیمہ کا نکالنا اور جب کسی دو قوموں میں یہ صفات رذیلہ انتہا کو پہونچ جاتی ہیں تو اُس وقت اُن دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کا فنا ہو جانا ہی اُس کا علاج ہوتا ہے ایمیں ذرا شک نہیں کہ کینہ اور نفرت کی قوت کشش ہم ملکی و ہم وطنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان و عیسائی گو صدیوں تک ایک ہی ملک اسپین میں رہے سہے لیکن اُن دونوں میں) دوسرے کی طرف سے آتش نفرت بھڑکتی رہی۔ اسپین کے مسلمانوں کا فنا ہو جانا اُس کا علاج ثابت ہوا۔ اگرچہ ہر مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ اُنکے فنا ہو جانے سے جو کمزوری اسپین میں پیدا ہو گئی وہ آج تک دور نہ ہو سکی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے واقعہ کو گو دو ہزار برس گزر گئے مگر جو اشخاص اس اندوہناک و ناشدنی فعل کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی خاک کیا نام و نشان کا بھی پتہ نہ رہا ؎

بنداشت ستمگر کہ ستم بر ما کرد
بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

لیکن آج بھی روس، جرمنی، آزاد انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کے دلوں میں گھس کر ذرا یہودیوں کی طرف سے اُن کے جذبات نفرت کا کوئی تماشہ دیکھئے اِسی سال لندن کی ذیلی کمیٹیا

میں ایک انگریزی عینک ساز نے ہمارے اعتبار سے بیجا فائدہ اٹھاکر ہم سے کچھ رقم وصول کرلی۔ جب ہم لندن کی ایک دوسری بڑی دوکان سے عینک خریدنے گئے تو اس دوکان کا مالک طیش میں آکر کہنے لگا کہ افسوس ایک یہودی نے آپ کو ٹھگ لیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر یہودی ایسا ہوتا ہے لیکن یہ صرف اسکی ایک مثال ہے کہ ایک غیر یہودی انگریز کا جذبہ ایک یہودی انگریز کے مقابل میں آج تک کیا ہے اور یہ کچھ عیسائیوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حضرت عیسے سے یہود کے سلوک نامحمود کا ہی یہ بھی نتیجہ ہے اور اثر ہے کہ آج عراق میں مسلمان بھی یہودیوں کو ایسا ہی برا سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ یورپ میں عیسائی۔ ہم مذہب اشخاص میں بھی باہمی بغض و کینہ و نفرت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ خواہ یہ ہم مذہب عیسائی ہوں یا مسلمان۔ آخر جرمن و فرانس پڑوسی ہو کر بھی کیوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب و تمدن پر فخر ہے لیکن وہ تمام تمدن و تہذیب اس کینہ و بغض و نفرت کے جذبات سے دبکر فنا ہو جاتی ہے۔ آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن چار سو برس سے کینہ و بغض و نفرت کی جو آگ اسکے شمالی و جنوبی حصوں میں بھڑکی ہوئی ہے۔ اسکے بجھانے کی تدبیریں بڑے بڑے مدبرین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کی حالت بھی سب کو معلوم ہے قصہ کوتاہ ایک ہی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتوں میں ایک

دوسرے کے خلاف نفرت وکینہ کے جذبات کا پیدا ہوجانا اُس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستان کی گزشتہ حالت اور آئندہ کے خدشات

عہد مغلیہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی جو حالت تھی اُسکی تصویر ہمنے باب سوم میں مذہبی رواداری کے سلسلۂ بیان میں صفحات (۷) لغایت (۱۹) کھینچی ہے اور ہم کو خود اپنی زندگی کے اُن واقعات کا ہوش ہے کہ ہم اپنے ہم محلہ دُوسرن مذہب بزرگ کا نام لیکر نہیں پکار سکتے تھے بلکہ اپنے بزرگوں کی تربیت کے اثر سے بلحاظ تفاوت عمر کسی ایسے رشتے سے منسوب کرکے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ مثلاً چچا۔ دادا۔ بھائی وغیرہ۔ خیر یہ تو ہندوستان میں باہمی اتحاد کی گزشتہ حالت تھی۔ لیکن اب بھی کچھہ نہیں بگڑا ہے حال میں اسوقت تک جو لڑائی جھگڑے ہندو مسلمانوں میں ہوئے ہیں اُنکی بنا اور نوعیت کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے باب سوم کے آخری حصے میں ظاہر کرچکے ہیں۔ ہماری رائے میں ابھی تک فتنہ وفساد چند [illegible] یا شریر النفس اشخاص [illegible] کی ذات تک محدود ہے۔ ہم کو گلبرگہ دہلی یا [illegible] میں ایسے جھگڑوں سے زیادہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ تو ہوا کے جھوکوں کیطرح آکر چلے جائینگے جس سرزمین پر کروروں بنی نوع انسان مختلف الاقوام والمذاہب ایک دوسرے کی دیوار کے زیر سایہ آباد ہیں وہاں کبھی کبھی ایسا ہوجانا چنداں بعید نہیں ہے لیکن اطمینان بخش اور امید افزا بات یہ ہے کہ یہ جھگڑے دیرپا اور

مستقل نہیں ہوتے بلکہ جہاں کہیں آندھی کے جھونکے کیطرح چلکر کچھ اضطرابی
جذبات کو اُبھار کر مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں وہاں بہت جلد امن
وسکون قایم ہوجاتا ہے اور روزانہ کاروبار دنیوی بدستور چلنے
لگتا ہے۔ ایسلئے جھونکوں کی روک تھام تھوڑی سی انتظامی قابلیت سے
ممکن ہے اور یہ سب فروع ہیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے تو اسکا ہے کہ
کہیں یہ شعلہ بھڑک کر سوسائٹی کی تعلیم یافتہ اور بلند طبیعتوں کو مشتعل
نہ کردے۔ خوف ہے تو ایسے بیج کا ہے کہ وہ دلوں میں جم کر نشوونما
کرے اور اُسکی جڑیں اور شاخیں تو نہ معلوم کہاں تک پہنچیں۔ اگر تاریخی
غلط واقعات تعلیم یافتہ طبقے کے دلمیں جاگزیں ہوگئے اور اُن کے
دلوں میں اختلاف کی بارود بھر دیگئی تو پھر آگ کے بتانے کی بھی ضرورت
نہ ہوگی۔ خود خیالات کی کشمکش اور جوش طبیعت شعلہ ور ہوگی آتش فساد
کو مشتعل کردیگی اور ہندوستان تباہ اور ہندوستانی جل بھنکر فنا ہوجائینگے
اور یہ شعر صادق آئیگا۔ ؎

شعلے بھڑک کے اُٹھے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جو ڈھانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے پچاس برس کی محنت سے تیار کیا ہے وہ
اک دم گر جائیگا۔ ہندوستان میں اہل ہنود اور مسلمانوں کے اصلی تصادم
کی لہریں سمندر کے بڑے طوفان سے کم نہ ہونگی پھر یہ کہنا دشوار ہوگا کہ پھر بھی
کشتی اُس طوفان کے تھپیڑوں سے کیونکر بچ سکیگی اور منزل مقصود یا ساحل مراد تک کیونکر

نصیب ہوگی ایک زمانہ میں تو یہ ممکن ہوا تہا کہ مسلمانوں نے اسپین کو آٹھ سو برس کے بعد بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس زمانہ میں مسلمان اپنے وطن ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ لہذا ہندو مسلمان دونوں بھائیوں میں مسلسل تصادم کی حالت قائم ہوجانے سے ملک کی جو حالت ہوگی اُسکے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر دوراندیش ہندوستانی سمجھ رہا ہے کہ مہاتما گاندھی صلح قائم کرنیکی کوشش میں کیوں اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اس تصادم کے نتائج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ ہماری رائے میں اس وقت بھی کافی اتحاد موجود ہے اور جو کچھ بگڑے ہوئے تیور نظر آتے ہیں اُنکی اصلاح بھی ممکن ہے۔ مرض لاعلاج نہیں ہے پس ہم کو ابھی سے مؤثر تدابیر کو نہ صرف سوچنا بلکہ عمل میں لانا چاہئے اور ہم کو علاج واقعہ قبل از وقوع باید کرد۔ پر کاربند ہونا چاہئے۔

مستقل اتحاد کی اصلی تدبیر

ہماری رائے میں مضبوط بنیاد پر مستقل اتحاد قائم کرنے کی صرف ایک ہی یہ تدبیر ہے کہ ہندوستان کی صحیح تواریخ ہمارے ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں جن میں تعصب کو دخل ہو نہ غلط فہمی کا امکان اور وہی ہمارے نونہالان مدرسہ یعنے ہندو مسلمان بچوں کو پڑھائی جائیں اگر یہ اچھا ہوگا تو ثمر بھی اچھا ہوگا کیونکہ خیالات کے جذب کرنے میں بچوں کے قلوب موم کی خاصیت رکھتے ہیں جس سانچے میں ڈھالو ڈہل جائینگے۔ اور وہی شکل وصورت اختیار

کرلیں گے۔ پس اس موم کے دلوں کو فولاد بنانا چاہئے جو مضبوط ہو اور اُس پر جو نقش ہو نقش کالحجر ہو۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر بنیاد غلط پڑ گئی تو سارا مکان ٹیڑھا ہو جائیگا۔ ؎

خشت اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اگر ہندوستان کی بہبودی پیش نظر ہے تو آئندہ نسلوں کے خیالات کی درستی کا انتظام آج ہی سے کرنا چاہئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی تاریخ میں غلط واقعات درج کئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ سچ سچ جو واقعہ ہو وہی لکھا جائے تاکہ تاریخ کی اصلی عزت اور گزشتہ امور سے جو بڑے بڑے نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن سے اطلاع ہو۔ مؤرخ کا نقطۂ نظر ذرا بدل جانے سے پڑھنے والے کے دل پر اسکی تحریر کا اثر بھی بدل جاتا ہے خاص کر بچوں کے دل پر۔ ہندوستان کی جو تاریخیں عموماً ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ہماری رائے میں غلط اُصول پر مبنی ہیں۔ کہیں تعصب ہے اور کہیں خودستائی اور دوسروں کی بھلائی کی بدنمائی اور اخفائے حقیقت۔ اُن میں عموماً وہ واقعات نہیں لکھے جاتے جن کا لکھنا ہمارے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ اورنگ زیب کی انسانی کمزوریاں نہ بتائی جائیں لیکن اعتراض یہ ہے کہ اُس کے عہد کی خوبیاں بھی کیوں نہیں بیان کیجائیں۔ اسکے علمی مذاق اور اُس کے زمانہ

کی اشاعت تعلیم کا مفصل ذکر کیوں نہیں کیا جاتا جس کے کچھ حالات
باب دوم میں لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک کتاب فتاوائے عالمگیری ہی
کو دیکھیے کہ کس طرح، کس محنت اور کن مصارف سے تیار کرائی گئی تھی
اگر اورنگ زیب کے تعصب کا ذکر کیا جاتا ہے تو مذہبی رواداری
کے معاملہ میں ملک کی اس حالت کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا جس کی
کیفیت باب سوم میں مفصل بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی کیوں نہیں کہا جاتا
کہ اسکا ایک وزیر راجہ جے سنگھ اور فوج کا کمانڈر ان چیف راجہ رام سنگھ
تھا اور اس کا ایک فرزند شہزادہ اکبر ہندو رانی کے بطن سے تھا۔ اورنگ زیب
نے اس سرزمین کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت پیدا کر دی
تھی اور جس کی شہادت باب چہارم میں پیش کی گئی ہے اس پر کیوں مٹی
ڈالی جائے اور وہ ہمارے طلبا کو کیوں نہ پڑھائی جائے۔ انصاف
و امن و اماں کے متعلق جو حالات ہم نے باب پنجم میں لکھے ہیں اور
صنعت و حرفت کی نسبت جو مواد ہم نے باب ششم میں جمع کیا ہے اگر
یہ سب واقعات صحیح ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ ان تاریخوں میں بھی لیا جا
جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں تاکہ انکو معلوم ہو کہ عہد مغلیہ کی
حکومت کیسی قابل قدر ہندوستانی حکومت تھی اس حکومت کا
مقصد ہندوستان کا فائدہ تھا اور اس سے واقعی ہندوستان کو
فائدہ پہنچا۔ یہ کیسا انصاف کا خون ہوگا اگر اس شریفانہ و شاہانہ برتاؤ
کے ذکر کرنے کی بجائے جو اورنگ زیب نے ہمیشہ یورپ کے تجار کیساتھ

کیا اور جس کی تحریری شہادت کا حوالہ باب ہشتم میں دیا گیا ہے یہ کہا جائے
کہ اورنگ زیب نے غیر ممالک کے سوداگروں کو تجارت کرنا دشوار
کر دیا تھا۔ جیسا کہ رسالہ "زمانہ" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے اور
جس کا حوالہ باب اول میں دیا گیا ہے اور یورپین تجار کے ساتھ
اورنگ زیب کا برتاؤ دکھانے میں خود ان تجار کی اس اخلاقی حالت
و پالیسی پر پردہ ڈالا جائے جس نے ہندوستانی بادشاہ کو ہندوستان
میں بادشاہت کرنا دشوار کر دیا تھا جس کی مفصل کیفیت باب نہم میں
دکھلائی گئی ہے۔ جو تاریخیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اُن میں اورنگ زیب
و شاہجہاں و داراشکوہ کے باہمی داؤ پیچوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے
حتیٰ کہ محلات کی اندرونی زندگی بھی دکھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن
اس کا عادہ فقیرانہ زندگی اور خدا پرستی کا ذکر بالکل ہی نہیں یا اس قدر
کم اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ عدم و وجود یکساں ہو۔ کیا جاتا ہے جس نے
شاہان مغلیہ کے درشن کا طریقہ موقوف کرایا۔ دربار میں رقص و سرود
و عیش کے مشاغل بند کرائے محکمۂ احتساب قائم کرا دیا اور خود
اپنے جیب خاص کے مصارف کی رقم کو بھی کم کرا دیا۔ اورنگ زیب اور
مرہٹوں سے جو لڑائیاں ہوئیں اُن کا تو مفصل حال بیان کیا جاتا ہے
لیکن اس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی رعایا کے آرام
و فلاح و بہبودی و دلجوئی کے لئے کون کون ٹیکس موقوف کئے تھے اور
پہرہ داروں کی نذر اور ضبطی مال کے قواعد میں کیا کیا ترمیم کی تھی

ٹھگی ڈکیتی کا ذکر اسطرح کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان ہمیشہ ٹھگی کی زد کا جولانگاہ تھا لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ ٹھگی کن صورتوں میں اور کیونکر ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسکی اصل ذمہ داری کس پر ہے اور کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے پہلے بھی ان ٹھگوں کا وجود تھا۔ ہر سلطنت میں خوبیاں اور برائیاں دونوں جیسی اور جو کچھ ہوں اگر کوئی مورخ بیان کردے تو شکایت نہیں لیکن اگر کوئی مورخ کسی سلطنت کے نقائص تو بڑے زور دار اور موثر الفاظ میں پیش کرے اور فوائد کا حوالہ دبی زبان سے دھیمے لفظوں میں دیکر یا اُن کو ترک کر کے آگے بڑھ جائے تو اس سلطنت کے نقائص ظاہر اور فوائد جیسا کچھ تاریخ سے چاہئے ظاہر نہوں گے۔ نتیجہ برعکس ہوگا۔ ہماری رائے میں جو تاریخیں نصاب تعلیم میں مقرر کیجاتی ہیں اُن سے بہت کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے اور ہر شخص ادنی غور و فکر سے اس کو دریافت کر سکتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تاریخوں میں سب واقعات غلط لکھے ہیں لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ واقعات پورے پورے نہیں لکھے جاتے اور صحیح اسلوب میں بھی نہیں لکھے جاتے۔

جسطرح عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ ہندو بچوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمان بچوں کو بھی ہندو پیریڈ (عہد ہنود) کی صحیح تاریخ اور صحیح واقعات سے آگاہ کرنا لازم ہے اگرچہ اس زمانہ کے حالات کا

پورا مواد و ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جس قدر ہے وہ ایسا ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ہندی ہونے کے اُس پر فخر کر سکتا ہے۔ عہد ہنود کی دولت ثروت، تمدن، اخلاقی تعلیم و علمی ترقی وغیرہ کی نسبت صحیح تاریخی حالات ایسے پیرایہ میں لکھے جا سکتے ہیں کہ اُنکا اثر مسلمان بچوں کے دل پر خاص طریقے سے پڑے۔ مہابھارت۔ رامائن۔ بدھ اور اشوک کے زمانہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تاریخ ہند کے دس پانچ صفحے میں لکھکر ختم کر دیئے جائیں۔ ہمارے لڑکوں کا کیرکٹر بھی ہندوستان کے ایسے مشہور و معروف ارواح کے حالات سے بہت کچھ درست ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہمنے ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے متعلق حصہ اول و دوم میں لکھا ہے اگر ہماری وہ رائے صحیح ہے تو پھر جو تاریخیں ہمارے بچوں کے نصاب میں مقرر کیجائیں وہ اُسی نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہئیں۔ بڑی بڑی فلسفیانہ و علمی تاریخیں سن رسیدہ اشخاص اور منتہی طلبا کے لیئے خواہ کوئی مورخ کسی طرح لکھے سن تمیز و تنقید کو پہونچکر ہر شخص صحیح و غلط۔ واقعیت اور تصنع میں امتیاز کر لیگا مگر بچوں میں یہ قابلیت کہاں ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ہی گہوارۂ محبت میں پرورش پائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہوگا جب اس ملک کی صحیح تاریخ بچوں کو پڑھائی جائے۔ اب صیغۂ تعلیم ہندوستانیوں کے سپرد ہو چکا ہے پس ہر ہندوستانی منسٹر یا وزیر کا فرض ہے کہ جو تاریخ اس کے نصاب میں مقرر ہے اُس کو خود ملاحظہ فرمائے اور با خبر اصحاب

اور انعام میں وہ نکتہ رس اشخاص سے اُنکی جانچ کرائے اور اگر ذرا بھی
اُس میں تعصب کی بو موجود ہو تو اُن کو نامنظور کردے بلکہ ہر صوبہ میں
ایک انعام دس ہزار روپے کا مقرر کیا جائے کہ سررشتہ تعلیم کا
متعلق یا غیر متعلق جو شخص ہندوستانی لڑکوں کے پڑھنے کے لئے سب سے
اچھی تاریخ اس نقطۂ نظر سے لکھیگا جس کو ہم اپنے ملک کی بہبودی کیلئے
اور آئندہ نسلوں کے واسطے مفید پائیں گے وہ اس انعام کا مستحق ہوگا
اور پھر چند سال تک وہی تاریخ ہمارے بچوں کو اسکول میں پڑھائی جایا کرے
بہرکیف ہماری رائے میں مستقل اتحاد قایم کرنے کی بڑی تدبیر یہی ہے
کہ ہمارے ہندو مسلمان بچوں کے واسطے صحیح تاریخ ہند نصاب تعلیم
میں داخل ہو۔

اتحاد کی دیگر تدابیر

ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قایم رکھنے کی اصل تدبیر
تو ہم بتا چکے۔ اب بہت سی چھوٹی چھوٹی فروعی
تدبیریں ہیں جن کے اختیار کرنے سے بھی اصلاح میں بہت کچھ مدد
مل سکتی ہے۔

اضلاع کی کانگریس کمیٹیوں پر بار ڈالنا

(۱) ہماری رائے میں اتحاد قایم رکھنے کی تدبیروں
کا کام ہندوستان کے ہر ضلع کی نیشنل کانگریس کی
کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے
کہ اغراض اتحاد کے لئے وہ حسب ضرورت مقامی و غیر مقامی اشخاص کو
اپنی کمیٹی کا ممبر بنائیں اتحاد کی عملی تدابیر کرنا نیشنل کانگریس کا ویسا ہی

اہم فرض و پروپیگنڈا ہونا چاہئے جیسا کہ دوسرے سیاسی معاملات کے دستور العمل پر کاربند ہونا بغیر اتحاد کے سوراج کا حاصل کرنا محال ہے اور اگر وہ ملا بھی تو بیکار ہوگا۔ ہر ضلع کی یہ کانگریس کمیٹی اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اتحاد بڑھانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر ممکن ہو تو مقامی عہدہ داروں کو شر و فساد رفع کرنے میں بھی مدد دیگی۔

اتحادی لٹریچر کی بہم رسانی سے نقطہ نظر کا بدلنا

(۲) افسوس ہے ابھی تک نیشنل کانگریس کا کوئی خاص اخبار نہیں ہے ورنہ اُس کا ایک کالم اس کے لئے وقف کیا جاتا تاہم ملک میں اور بہت سے اردو انگریزی اخبار ہیں اِن اخبارات اور رسالہ جات کے ایڈیٹر ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے بارہ میں ہماری رائے سے اگر متفق ہوں جس کا اظہار اس باب کے حصہ اول و دوم میں کیا گیا ہے تو وہ اِسی عنوان پر مسلسل مضامین اُسوقت تک شائع فرماتے رہیں جب تک کہ لوگوں کا نقطۂ نظر نہ بدل جائے اور اہل ملک کے خیالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ محض اتحاد اتحاد پکارنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ مقصد اُسوقت حاصل ہوگا جب ملک میں اس قسم کے مضامین کی بھرمار کر دیجائے۔

دہلی کی اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنا

(۳) ۱۹۲۴ء کی دہلی کی اتحادی کانفرنس نے بہت کچھ کام کیا ہے۔ جو عام اصول اس کانفرنس نے قائم کئے ہیں ہم اُن سے بالکل متفق ہیں کیسی کی مذہبی آزادی میں ذرا سا فرق نہ آنا چاہئے

ہر شخص کو اختیار ہے کہ خدا کی پرستش کے جذبات وہ جن حرکات جسمانی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے کرے۔ خدا اس کانفرنس کی کوششوں کو کامیاب کرے مگر اسکے بعد کہیں پھر خواب غفلت نہ طاری ہو جائے عملی کام برابر جاری رہے۔

رکنیت کانگریس کی شرط بنانا

(۴) مہاتما گاندہی نے کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بہی شرط قرار دی تھی کہ ہر ممبر روزانہ تھوڑا سا سوت چرخے میں کاتا کرے۔ مہاتما ممدوح غالباً اس ملک کے پالٹیکس میں روحانیت کے جزو کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کو ایثار کا سبق سکہا کر تن پوشی کے معاملہ میں دوسرے ممالک کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان خود اپنی سعی و کوشش سے اپنی ضرورتوں کو فراہم کرنے کا عادی ہو۔ اور تن آسانی کی بجائے محنتی بنے لیکن ہندوستان میں اتحاد قائم رکھنے کی اہمیت اگر اس سے کم نہ خیال کیجائے تو ہم اس حد تک بہی کہنے کو تیار ہیں کہ کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بہی شرط ہونی چاہیے کہ ہر ممبر اتحاد پر ایک مضمون لکھکر کسی اخبار میں شائع کرائے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس تحریک کو مذاق سمجھیں یا مخالفین کو تسلیم وجود نفاق کی بحث کا ایک شگوفہ ہاتھ آجائے لیکن مسئلہ کی اہمیت تو اسی کی متقاضی ہے کہ قبل اسکے کہ ایسی کانگریس میں جو انڈین نیشنل کہلاتی ہے شرکت کی کوئی تمنا

درخواست پیش کریں وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور فرما کر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور کم از کم یہ ہو کہ ممبری کے فارم میں اتحاد کی کوشش کرنے کا اُن سے اقرار ہی لے لیا جائے۔

یکجا تعلیم دلانا

(۵) ہم کو ہندو مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول بھی ناپسند ہے۔ پہلے زمانہ میں دوستی محبت و الفت کی گرہ مکتب ہی میں دی جاتی تھی۔ ہم کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ اپنے ہم مکتب ہندو بچوں سے کٹ کرتے پھر کیسے خلدمل جایا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح یہ ہمارے بچے پھر ساتھ ساتھ پڑھیں۔ کیونکہ جو تعلقات اور روابط اس عمر میں قائم ہو جاتے ہیں ان کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے مذہبی تعلقات سے یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ قائم کرلی ہیں۔ یہ تو مجبوری تھی۔ مذہب کے نام سے ایسے بڑے بڑے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے روپیہ لینا تھا مگر جہاں تک ممکن ہو ہماری پالیسی یہی رہے کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں نہ الہ آباد کا یتھ پاٹ شالہ کالج کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہو اور نہ لکھنؤ کے مسلم ہائی اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ممنوع ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس وقت کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ یہ عام اصول ہمارے ذہن نشین رہیں۔

سوشل لائف و طرز معاشرت میں یکجائی

(۶) ہمارے قدیم تمدن میں جو ملنے جلنے کے مواقع تھے وہ تو اب عالم ہوتے جارہے ہیں۔ محلے محلے میں شام کے وقت

اکھاڑوں کو جاتے ہوئے لڑکوں کے وہ جھرمٹ اب نظر نہیں آتے ہمارے وہ کم خرچ بالانشین سستے کھیل اور ورزشیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ تبدیلی ترقی کی شرط ہے۔ لیکن اب کلب لائف میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملنے جلنے کے مواقع میں جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اجنبیت سے مغائرت بڑھتی جاتی ہے اس کو متواتر ملنے سے محبت میں اضافہ ہونے کی غرض سے مٹانا چاہئے اگر خورد و نوش میں بھی شریک ہو جاتے تو کیا کہنا تھا۔ خیر وہ وقت جلد آرہا ہے۔

جداگانہ انتخاب

(۷) اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق میں ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ یہ بھڑ رول کا چھتہ ہے ۱۹۱۶ء کی کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں جو قرارداد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان قرار پائی تھی اس سے بہتر ہماری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی اس کے طے کرنے میں جو جو دشواریاں محسوس ہوئی تھیں وہ اس وقت بھی ہمارے دماغ میں تازہ ہیں۔ ہم کو اس سال کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک سکرٹری ہونے کا فخر تھا اور کسی حد تک اندرونی کارروائیوں سے بھی ہم واقفیت رکھتے ہیں ہم کو پنجاب و بنگال کے مسلمان بھائیوں سے جنہوں نے اس قرارداد کے خلاف کہیں کہیں آواز بلند کی ہے یہ بات کہنا ہے کہ جو اصول اس وقت طے کئے گئے تھے وہ تمام ہندوستان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے تھے کوئی

خاص صوبہ ہمارے پیش نظر نہ تھا۔ اس فیصلہ کی عمر (۸) برس کی ہو چکی
اور مرور زمانہ سے اس میں اور پختگی پیدا ہوتی جائیگی اگر وہ کسی فیصلہ کو
قطعی نہیں سمجھتے اور قدامت کی کوئی وقعت انکی نگاہ میں نہیں ہے تو ہماری
رائے میں ہمارے مسلمان بھائی اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مار رہے ہیں
ہر چیز جو آج وہ تیار کریں گے اگر وہ کل پلٹ دی جائیگی۔ تو قدیم روایات کا
قایم رہنا دشوار ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو بعض ہندو برادران وطن سے
بھی جو آجتک مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے
تیار نہیں ہیں کچھ کہنا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کی کامیاب حکومتوں پر نظر ڈالی جائے کہ کیونکر
وہ کامیاب ہیں۔ بطور مثال ہم انگلستان ہی کو لیتے ہیں اگر کوئی ہم سے
پوچھے کہ برٹش پارلیمنٹ کی تعریف کرو تو ہم یہ کہیں گے کہ انسانی متضاد
قوتوں اور کششوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو معتدل و درمیانی
انسانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی برٹش پارلیمنٹ ہے اس کو ہی
حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کچھ لبرل (Liberal)
اور کنسرویٹو (Conservative) اور کچھ لیبر (Labour)
ممبر ہیں جب لیبر گورنمنٹ ہو جاتی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ
ہر امر کا فیصلہ اپنی اصلی رائے کے مطابق کر سکے گی بلکہ لبرل اور کنسرویٹو
ممبروں کی متضاد کششیں اوس کو درجہ اعتدال پر قایم رکھتی ہیں ہماری
رائے میں متضاد کششوں کا قایم رہنا برٹش پارلیمنٹ کی روح رواں ہے

اگر ان قوتوں کو نکال ڈالئے تو برٹش پارلیمنٹ کا تصور ہی مفقود ہوجائیگا اور جو کامیابی آج اس انگریزی حکومت کو حاصل ہے وہ ہرگز نہ رہے گی۔ اب انگلستان کو چھوڑکر ہندوستان پر نظر ڈالئے یہاں بھی متضاد کششیں اور قوتیں موجود ہیں البتہ انکی نوعیت بدلی ہوئی ہے ہماری رائے میں ہندوستان کی حکومت اسی وقت کامیاب ہوگی جب اہل ہند ان متضاد کششوں کے وجود کو تسلیم کرکے اپنا پارلیمنٹ بنائیں گے۔ اگر اس ملک نے اپنی اسمبلی (Assembly) یا پارلیمنٹ کی تنظیم ایسی کردی کہ مسلمانوں کے مخصوص جذبات اس کو جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے کام نہ آسکے تو وہ حکومت ہماری رائے میں نقش برآب کی مصداق ہوگی۔ یہ تضاد ایسا نہیں ہے کہ اس سے مجموعی حیثیت سے ملک کا نقصان ہو۔ ہمارے ہندو بھائی یہ کبھی خیال نہ کریں کہ ہندی مسلمان اس ملک کے مفاد کو کسی دوسرے اسلامی ملک کے مفاد کے تابع کردیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا اور یہ محال ہے۔ اس ملک کے مسلمان اپنے اصلی فائدہ کو سمجھتے جارہے ہیں اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اسی باب کے حصۂ دوم میں ظاہر کرچکے ہیں البتہ ایک ہی ملک میں رہکر ہندی مسلمان اپنی ترقی کے سامان کررہے ہیں اور دوڑ میں برابر رہنا چاہتے ہیں۔ انکی ترقی ملک کی ترقی ہے۔ ان کا تنزل ملک کا تنزل ہے۔ میں تو اگر ہندو

ہوتا تو مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی نسبت یہی رائے دیتا کہ اس معتدل کرنے والی قوت کو قائم رکھئے۔ ہماری حکومت میں یہ عنصر فروگذاشت کے قابل نہیں ہے۔ اتحاد قائم رکھنے کی اور یہی چند دوسری تدابیر ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔

ہندو مسلمانوں میں سیاسی اتحاد ہو کر رہیگا

ہماری رائے میں ہندو مسلمان بڑے بڑے سیاسی امور میں ایک ہی نقطہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ گذشتہ (۴۰) برس سے جو حالات ہم خود دیکھ رہے ہیں ان سے ہماری یہ رائے قائم ہوئی ہے۔ ہم کو ۱۸۹۸ء کا ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ اس سال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں تھا۔ ہم کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں ہماری شرکت سے مسلمانوں کو بڑا استعجاب ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک روز جب ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو چند بڑے معزز مسلمان احباب نے ہم کو دیکھکر ہماری شرکت پر مذاق اڑانا شروع کیا اور ہم سے طنزاً اس طرح مخاطب ہوئے۔

"آئیے جناب! ممبر کمیٹی استقبالیہ نیشنل کانگریس"

پندرہ برس کے بعد ہم نے دیکھا کہ انہی میں ایک حضرت کا شمار کانگریس کے بہت بڑے حامیوں اور لیڈروں میں ہو گیا اور اب یہ ایک عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ایک زمانہ سر سید احمد خاں مرحوم کا تھا جب کہ نہ صرف کانگریس بلکہ تمام سیاسی مجالس میں مسلمانوں کی شرکت

تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر
مرحوم کی کوشش سے "مسلم لیگ" قائم ہوئی جسکی بابتہ لوگوں کو
ابتدا میں یہ بدگمانی ہوئی کہ وہ کانگریس کی مخالف ہوگی لیکن رفتہ
رفتہ وہ ان تحریکات کی آواز بازگشت کا کام کرنے لگی جو کانگریس
کے پلیٹ فارم سے منظور ہوتی تھیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ مسلمان
کانگریس میں ضم ہو رہے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ ہماری رائے
میں وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت انگریزی کے مقابلہ میں ہندوؤں
اور مسلمانوں کے اغراض مشترک ہیں۔ ہندوستان کو جس قدر حقوق
عطا ہونگے اُن سے بالآخر سب ہندوستانیوں کا فائدہ ہوگا
علاوہ بریں سچ کی آخری کامیابی قانون قدرت میں داخل ہے
اگر یہ بات سچ ہے کہ بغیر سیاسی اتحاد کے ہندوستانیوں کو سیوراج نہیں
مل سکتا اور بغیر سیوراج یا ہندوستانی حکومت کے اس ملک کے
تمدن میں اصلی ترقی نہ ہوگی اور کوئی ہندی بحیثیت ہندوستانی
کے بیرون ہندوستان کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ جیسا کہ دوسرے
موقع پر دکھلایا جاچکا ہے تو یہ سچ بات کبھی نہ کبھی روز ضرور
سمجھ میں آئیگی۔ اگر انسان سچ بات کو خود نہیں سمجھتا تو دنیا کی
مصیبتیں اسکو سکھا دیتی ہیں۔ دنیا کے تلخ تجربے سچائی کا سبق
دیدیتے ہیں ایکنہ ایک دن سچ ضرور غالب ہوتا ہے۔ یہ قانون
قدرت ہے اور یہی وجہ ہمارے اس اعتقاد کی ہے کہ ہندو مسلمان میں

سیاسی اتحاد ہو کر رہے گا۔ مسلم لیگ بھی رہے گی۔ کانگریس بھی ہوگی مگر ان دونوں جماعتوں کا سیاسی مرکز ایک ہی ہو جائیگا۔ اور جن باتوں میں فرق رہیگا ان کا تعلق صرف اندرونی باہمی معاملات سے ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان کی اب کیا حیثیت و پوزیشن ہے

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مستقل اتحاد قایم کرنے کے لئے مدارس کے ابتدائی درجوں میں عہد ہنود و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جو ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو لڑکوں کو پڑھائی جانی چاہیئے لیکن کوئی تاریخ ہند اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک گزشتہ دوسو برس کا حال بھی اُسمیں نہ ہو یعنے جب سے عہد مغلیہ کا دَوْر ختم ہوا اور دور جدید کی بنیاد پڑی ہم نے بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کی ثناء خوانی کی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں کو دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں اُن اثرات اور قوتوں پر اظہار رنج و تعجب کیا ہے جو ہماری صَنْعَت۔ حِرْفَتْ۔ دَوْلت۔ تِجَارت ثَرْوَت۔ فَارِغُ الْبَالِی۔ آزادی۔ خُودْدَارِیْ کو اڑا لے گئیں۔ اور اس غرض سے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم رہے یہ بھی بتایا ہے کہ عہد مغلیہ کی نسبت اہل ہنود کا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہیے اور مسلمان کس نظر سے اہل ہنود کو دیکھیں لیکن قبل اس

اُٹھانے کے ملک ہندوستان کے مورخ کو اس کا تصفیہ بھی کرنا ہوگا کہ کہ اس کو موجودہ حکمرانوں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ صحیح واقعات کا لکھ دینا ایک اور بات ہے اور ان واقعات کو ناظرین کے روبرو پیش کرنے کا طریقہ امر دیگر ہے۔ کسی واقعہ کے پیش کرنے کا طریقہ ہی وہ شئے ہے جس میں مؤرخ کے جذبات ناظرین کے دلوں پر اپنے گل کھلایا کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خوف ضرور ہے کہ ہماری قومی آزادی و خودداری کے چھن جانے سے اور صنعت و حرفت کے مٹنے سے جو جذبات و جوش پیدا ہوں وہ کہیں صداقت کا خون نہ کردیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ صداقت ہر چیز کی مضبوط بنیاد ہے۔ جو عمارت صداقت پر مبنی ہے وہ کبھی منہدم نہ ہوگی یوں تو جوش اور جذبات کی لہریں سنگ صداقت سے بہت کچھ ٹکرائیں گی مگر یہ پتھر ایسا گراں وزن ہوگا کہ اسکو بڑے سے بڑا طوفان بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ یہ بڑا اخلاقی جرم ہوگا کہ ہم ان نقصانات کا تو ذکر کریں جو موجودہ حکومت سے ہم کو پہنچے ہیں اور ان فوائد کا اعتراف نہ کریں جن سے ہم مستفید ہو رہے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی اس جرم کے مرتکب ہونگے جسکی فرد قرارداد جرم ہم ان مورخین پر لگا رہے ہیں جو عہد مغلیہ کے صحیح صحیح واقعات درج نہیں کرتے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس کا پیش نظر رکھنا ہندوستان کے مورخ کا فرض ہوگا۔

یوں تو ہر مورخ کے خیالات علیحدہ علیحدہ ہونگے لیکن موجودہ انگریزی حکومت کی نسبت ہمارے جو خیالات ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں ہم اپنے خیال کو اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر جسٹس رینڈے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور اب پھر مختصر الفاظ میں اُس کے اعادہ کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان ایک منزل مقصود کی طرف بڑھ جارہا ہے جس کے بہت سے درمیانی منازل ہیں جس طرح عہد ہنود کے بعد عہد مغلیہ اُس کی ایک ضروری طے شدنی منزل تھی اسی طرح موجودہ انگریزی حکومت کی منزل کا طے کرنا بھی قادر مطلق نے ضروری کیا تھا۔

ہم موجودہ حکومت کو اصلی ڈرامے کا ایک سین یا منظر سمجھتے ہیں عہد مغلیہ کے بادشاہ کی ذات و مذہب کا جو جذب متفاطیسی اثر دل پر ہو تھوڑی دیر کے لئے اُس سے قطع نظر کر کے ہم دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں انسانوں کے باہمی تعلقات میں کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں مجموعی حیثیت انسان کا پایہ کیسا بلند ہوتا جارہا ہے۔ جو شخص دوسرے کو چھو نہیں سکتا تھا آج وہ دوسروں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر حکومت میں اب جو انتظامی شاخیں قائم ہوگئیں یا قائم ہوتی جارہی ہیں اُس کے ایک شعبہ کی نگرانی بھی ایک دماغ قابل اطمینان طریقے سے نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل حکومت کا انتظام پھر نقل و حمل کے ذرائع میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اُس سے اس دنیا کی

تمام حکومتوں میں جو باہمی تعلقات منسلک ہوتے جارہے ہیں وہ
ایک مہین باریک جال کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ہر تار پر نگاہ
رکھنا ایک دماغ سے ممکن نہیں ہے۔ ان واقعات کا جو اثر ہر ملک کی
طرز حکومت پر پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں حکومت
کی قوت انسانوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ باید و شاید۔ کیا ایشیاء
اس سے بچ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر ایشیاء میں یہ تبدیلی کیونکر نہ ہوتی؟
معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے قادر مطلق نے
ہر ملک کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ دنیا امریکہ فرانس
روس۔ جرمنی۔ یونان چین۔ ٹرکی۔ اور ایران کے گزشتہ
ڈیڑھ سو برس کے حالات پر نظر ڈالئے۔ کہیں کشت و خون کی مدد
سے کہیں اخلاقی قوتوں کے زور سے کہیں حکمت عملی سے حکومتوں
کے تغیرات کا ایک ہی سین و منظر اس دنیا کے تھیٹر میں ہم کو دکھایا
جارہا ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک سچے
مورخ کو ہندوستان میں انگلستان کی حکومت کس نقطہ نظر سے دیکھنی
چاہیے۔ اور اسی وجہ سے یہ واقعات لکھے جارہے ہیں۔ مورخ
کا فرض ہے کہ وہ جزئیات سے قطع نظر کرکے بلند پروازی کرے اور
پھر قدرت کا سماں دیکھے۔

خدا کی زبان اس عالم کے واقعات ہیں اور ان واقعات میں
کچھ ایسا تسلسل ہے کہ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے مڑکر

[illegible] میں تو نتائج کا ایک نیا سماں نظر آتا ہے [illegible] تک جو واقعات
گزرے اُن سے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ ظالم ایسٹ انڈیا کمپنی
ہندوستان میں کیوں آئی ایک صدی کے بعد [illegible] میں عالم اسباب
کے عجیب و غریب ڈرامہ کا سلسلہ کچھ سمجھ میں آنے لگا اب گزشتہ چوبیس
برس میں جو تغیرات دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے دنیا میں ہو گئے
ان پر ہم غور کرتے ہیں۔ زار (Czar) روس کی نسل کا نام
و نشان نہ رہا۔ قیصر جرمنی لکڑی کی تجارت کر رہا ہے۔ سلطان ترکی
اپنی بسر اوقات میں دوسروں کا دست نگر ہے۔ شاہ ایران پیرس
میں کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ یونان کا فرمان روا جلا وطن
کیا گیا۔ چین کا بادشاہ تاش کے بادشاہ سے زیادہ قوت نہیں رکھتا
یہ وہ عبرتناک واقعات ہیں جو چھبیس برس قبل ہمارے خواب و خیال
میں بھی نہیں آ سکتے تھے اب ان چھبیس برس کے واقعات کو اس کے قبل کے
ڈیڑھ سو برس کے واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ بالخصوص امریکہ و
فرانس کے واقعات مورخ کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے مسلمہ یا مثبتہ
واقعات سے نتیجے اخذ کرے۔ قوموں کی حیات و ممات کے متعلق
صحیح نتائج وہی ہونگے جن کی تطبیق ان واقعات عالم سے ہو جو قدرت
خدا سے دراصل ظہور پذیر ہوئے۔ خدا اپنا ارادہ اسی عالم اسباب
اور انہیں واقعات عالم کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔ جب ہم نتیجہ نکالنے
اور اپنی رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں طریقۂ حکومت کا بدلنا قادر مطلق کی اسکیم اور پروگرام میں داخل تھا۔ پھر بھلا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کس طرح مستثنےٰ کیجا سکتی تھی۔ ہماری رائے میں ہندوستان میں طریقہ حکومت بدلنے کا مقصد حاصل کرنے کے لئے قادر مطلق نے انگلستان کو یہاں مسلط فرمایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان نے اس دور حکومت میں سیکھی وہ یہ ہے کہ حکومت کی قوت مختلف افراد میں تقسیم کر کے وہ حکومت زیادہ مستحکم کیونکر بنائی جا سکتی ہے انفرادی و اجتماعی حیثیت سے کام کرنے کے اصول بھی اس حکومت نے ہم کو سکھائے یورپ و امریکہ نے جسقدر سوسائیٹیاں اور جماعتیں معاملات دنیوی کو زیادہ مکمل طور سے انجام دینے کے لئے قائم کر رکھی ہیں انکی مثال دنیا کے قدیم تمدن میں نہیں ملتی۔ ہم یہ چیز بھی انگلستان کے ذریعہ سے سیکھ رہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اُس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انگلستان دراصل اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہم پر مسلط کیا گیا ہے ابتدا میں کچھ ہی حالت رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تاریخ ہند میں انگلستان کی پوزیشن (Position) اور حیثیت ایک امین یا معلم کی سی ہو گئی ہے۔

ہندوستان میں انگلستان کے کام کی مختصر کیفیت

ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین ہمارے اصلی پوائنٹ (Point) اور مقصد کو پیش نظر رکھیں اسوقت ہم کو نہ مہاتما گاندھی کے نان کوآپریشن Non Cooperation

یعنے ترک موالات سے تعلق ہے اور نہ پنڈت سرنواس شاستری کے
کوآپریشن (Cooperation) یعنے موالات سے بحث ہے۔ اس
حصے میں شروع سے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں
میں مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ ہندو زمانہ
و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جس میں کچھ چھپایا نہ گیا ہو لڑکوں کو پڑھانی چاہیے
جسکی مفصل کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم اپنا خیال اس امر
کے متعلق بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دور موجودہ یعنے انگلستان کے
کارنامے بھی ہمارے بچوں کے سامنے کیونکر پیش کئے جائیں ہم یہاں
بھی بحیثیت مورخ منافقت سے متنفر ہیں۔ ہم صرف اصولی طور سے یہ
بیان کر سکتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں پہلے سے کوئی زہر ڈالنا اور اس
سے ان کو متاثر کرنا مناسب نہیں۔ مورخ کے فرائض بہت مقدس ہیں
اسکی ذمہ داریاں اہم ہیں۔ اسکو صرف صداقت کے راستے پر چلنا چاہیے
اس راستے میں کہیں کہیں دشواری ضرور پیش آئیگی لیکن وہ ناگزیر ہے۔
مثلاً یہ سچ ہے کہ انگلستان ہم کو نیا طرز حکومت سکھا رہا ہے۔ ہندوستان
کے نقل و حمل کے ذرائع و تجارت میں روز افزوں ترقی ہے۔ بڑے بڑے
جہاز ساحل ہندوستان پر مال و اسباب سے لدے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔
ریلیں اور موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑتے نظر آ رہے ہیں
ہندوستان ہزاروں میل کے فاصلہ سے تار اور بے تار دونوں کے ذرایع
سے اپنے معاملات دیگر ممالک سے چند منٹ کی گفت و شنید میں طے

کر رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس موجودہ دور
کے قبل ہم اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور اپنے ہی پاؤں سے چلتے
پھرتے تھے۔ اب نئی رفتار و طرز حکومت کے سکھائے جانے کے پیرایہ
میں ہم ابھی تک انگلی پکڑا کر چلائے جا رہے ہیں۔ جہازوں میں مال
تو ہے مگر جب مال کا بنڈل اور صندوق کھول کر دیکھتے ہیں تو
اُس میں ہماری دولت وصنعت وحرفت مقابلۃً بہت کم معلوم ہوتی
ہے۔ مال کسی اور کا ہے۔ ریلیں اور موٹریں تو ہیں مگر ہم انکے انجنیر
نہیں ہیں بلکہ ابھی شوفر کا کام انجام دے رہے ہیں اور ہوائی جہاز
کا انجنیر ہونا تو درکنار اسکے شوفر بھی ہم نہیں ہیں۔ صرف دُور سے
تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ تار او بے تار کی خبروں کے معاملہ میں ہم
ہمہ تن تحیر کھڑے ہیں۔ بنانا تو درکنار ابھی سمجھنے کی بھی قابلیت ہم کو
نہیں۔ ان سچی باتوں کے نہ ظاہر کرنے میں اُسی قسم کی افراط وتفریط
ہوگی جو بعض عہد مغلیہ کے مورخ اُن کے عیوب دکھا کر اسکی خوبیوں پر
پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخ
جادۂ اعتدال وصداقت پر رہیں اور ہم ابھی انگلستان سے ناامید
بھی نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب ابھی مشرق کو اچھی طرح سمجھا بھی
نہیں۔ بعض اوقات دیکھا ہے کہ جن قومی اوصاف کو ہم اپنی
خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اُن پر مغرب انگشت نمائی کرتا ہے اور
جن باتوں کو ہم عیوب میں داخل کرتے ہیں اُن کو اہل مغرب فیشن و

تہذیب کی علامات سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے موجودہ حکمرانوں پر ابھی یہ اصل حقیقت واضح
ہوئی ہے کہ کسی آدمی و کسے بڑی سے بڑی قوموں کی تاریخ اور زندگی میں ڈیڑھ سو برس
ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جیسا کہ آدمی کی زندگی میں ایک دو سال۔ انگلستان نے ہندوستان
سے ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر ایک ملکہ معظمہ کی زبان کے ذریعہ سے
کچھ وعدہ کیا تھا اور پھر ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی مصیبت کے وقت
اُس وعدہ کی توثیق ایک دوسرے جلیل القدر شہنشاہ کی زبان سے کرائی
اس دور کے یہ سب سے بڑے کارنامے ہیں اگر انگلستان نے یہ وعدے خود
پورے کئے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچے اور ہماری نسلیں احسان و
شکر گزاری کے بارگران سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکینگے دنیا کی تاریخ
میں اسکی مثال ملنا دشوار ہوگی۔ ہماری دولت صنعت۔ حرفت خود داری
وقعت اور کیرکٹر میں حالت محکومی سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی
وخانہ پری ایفاء وعدہ سے جلد ہو جائیگی لیکن اگر بالآخر واقعات
وحادثات عالم کے زور نے وعدہ پورا کرایا تو اس میں شک نہیں کہ
تاریخ کا آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ انگلستان پر خود غرضی کی انسانی کمزوریاں
غالب آگئی تھیں وہ اپنے بار امانت کو برداشت نہ کر سکا۔ یوں تو
اس دنیا کی قدرتی قوتیں عمل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے متنفر کروڑ
بنی نوع انسان بھی ایک نہ ایک دن ضرور ٹھکانے لگینگے۔ ہماری تاریخ
میں موجودہ دور اس طرح گزر جائیگا جیسے کسی لذیذ پلاؤ کے تیار کرنے
میں بیچ کا ابال ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مقابلہ

انگلستان کی اہلیت و قابلیت کا آخری فیصلہ تاریخ اسی بنا پر کرے گی
کہ اس نے اپنے دور میں ہمارا پایہ بحیثیت انسان بلند کیا یا پست۔ حق
ہماری جانب ہے اور ہم کو امید ہے کہ انگلستان کا کیرکٹر بالآخر حق کا
ساتھ دیگا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں کے سامنے انگلستان
کے کارناموں کا کھاتہ بند کرنا نہیں چاہتے۔ دور مغلیہ کا کھاتہ تو بند
ہو چکا ہے لیکن موجودہ دور کا کھاتہ رواں ہے۔ ہماری رائے میں ابھی
ہندوستان کے مورخ کو آخری فیصلہ بھی نہ نکالنی چاہیئے۔ موجودہ دور
کو ہم نہ شب تار سمجھتے ہیں اور نہ روز روشن۔ ہماری امیدیں ابھی
انگلستان سے وابستہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے مورخ کے لئے
یہی سچا اور صحیح راستہ ہوگا۔

خاتمہ

ممکن ہے کہ اس کتاب میں کوئی عبارت ایسی موجود
ناظرین میں سے کسی کے خلاف مزاج ہو اگر ایسا ہو تو اس
کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری غرض اس کتاب سے اتحاد
پیدا کرنا نہ کہ نفاق۔

گو اب ۱۹۱۸ء سے میں رعایا حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ
کی خدمت کرنے میں مصروف ہوں لیکن اسکے قبل کچھ عرصہ تک ہندوستان
کے پالٹیکس (Politics) کے میدان میں کچھ بادیہ پیمائی
اور خاک بیزی کر چکا ہوں۔ میں اس کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں کہ
ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی کا سیاسی اثر ہم پر کیا ہوگا۔ یہی اندیشہ

اس کتاب کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں عشر عشیر بھی کامیابی ہوئی تو میں یہ خیال کرونگا کہ میری کل محنت وصول ہو گئی۔ بالآخر ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم انسان تیرے بندے کمزور ہیں۔ بغیر تیری مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اے خدا مدد کر۔ اور اس ملک کے تمام باشندوں میں اتفاق پیدا کر تاکہ اسکی قوت سے ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں فقط

سمیع اللہ بیگ

۵ نومبر ۱۹۲۶ء ۰ ۳ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ

ختم شد

قطعۂ تاریخ طبع کتاب ہذا

از مولوی اسد اللہ حسینی صاحب سررشتہ دار مجلس عالیہ عدالت سرکار عالی

مندر میں ہنود مطمئن مسجد میں مسلم مطمئن ۔ تھے بے الم ہندو مسلماں عہد عالمگیر میں

۱۲۴ ۔ ۱۲۴ ف

تاریخ لکھتے مرا سال نواب زار یار جنگ ۔ ہندو مسلماں ایک تھے بان عہد عالمگیر میں

۱۳۴۳ ۔ ۱۲ھ

ہندو۔ ہند اسلامی عہد میں

○ ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

○ سید سلیمان ندوی

○

سید سلیمان ندوی مرحوم نے 'معارف' میں ٹے سکھ کی چیزیں شائع کیں۔ 'معارف' بابت مئی تا دسمبر ۱۹۱۸ء سے ان کا یہ ایک اہم مقالہ پیش خدمت ہے۔

ادارہ

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

سید سلیمان ندوی

۱

مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ قوم تھی جو ہر غیر قوم سے اسقدر شدید نفرت رکھتی تھی کہ اسکے سایہ تک سے گریز کرتی تھی، اور اس کو ملیچھ، ناپاک، اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اس وقت مین کوئی یہ خیال کرسکتا تھا کہ کسی زمانہ مین ہندو قوم بھی اس قدر روادار اور وسیع الخیال ہوجائیگی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جلکر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی، اُسکے علوم و فنون پڑھے گی، اُسکے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اسکے ساتھ شاگردی و استادی کا رشتہ قائم کرے گی۔ لیکن سو دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات مین بڑا تغیر آگیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریان کرنے لگے، اور درباروں مین مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندوون کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے۔

اگر مسلمانون کا درمیانی دور جسنے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤن کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور دوسری قومون کے علوم و فنون سیکھنے کی اُن مین ترغیب پیدا کی، ہندوستان مین قائم نہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزون کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کردیتے اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان مین

ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کے لیے، مدارس، مکاتب، پاٹ شالے اور کالج کہلاتے، گوہر مقصود کی تلاش مین ہندو رون مین بے محابا سفر کرتے، انکو سو دو سو برس تو صرف اپنی نفرت قومی اور تعصب مذہبی کے مٹانے مین صرف ہوتے، اور اس اثنا مین مسلمان کہین سے کہین جا نکلتے۔

ہندوؤن پر مسلمانون کا دوسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانون سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق، تعلیم ہندوؤن کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، حکم تھا کہ وید کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر کے کان مین پڑجائے تو اُس مین سیسہ پلا دیا جائے، برہمنون کے علاوہ ہندوؤن کے دیگر طبقون مین یا علم مطلق نہ تھا، یا بہت ہی کم تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مذہبا انکو تعلیم کے حاصل کرنے کی مطلقا اجازت نہ تھی، لیکن مسلمانون نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندوؤن کے ہر طبقہ تک عام کردیا۔ برہمنون سے لیکر کھتری، کایستھ، بنیے، اوران سے بھی نیچے درجون تک علم اتر آیا، آج ہندوستان مین برہمنون سے زیادہ نہین تو برہمنون کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہین، اور مسلمانون کے عہد حکومت مین بھی یہی حال تھا کہ برہمنون سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے۔

ہندوؤن پر مسلمانون کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان مین تعلیمی علوم وفنون مین وسعت پیدا کی، قدیم ہندوستان کے شیشۂ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین جن علوم کی تعلیم رائج تھی، انکی فہرست نہایت مختصر تھی۔ نصاب تاریخ سے یہان کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہان برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان مین پہلے سے موجود تھے، لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگون کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم

کے متعلق دنیا کی دوسری قومون کی جو تحقیقات تھی، اس سے یہان سرتا پا ناواقفیت تھی، مسلمان علما نے اسکے نصاب تعلیم کو ان فروگذاشتون سے پاک کیا،

مسلمانون مین ہندوستان کا سب سے پہلا علمی فاتح، بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے زمانہ مین ہندوستان آیا، یہ مسلمانون کی ہندوستان کی عملداری کا آغاز باب تھا اور ضرورت تھی کہ ہندؤن نے خلافت بغداد کو دوسری صدی ہجری مین جو علمی قرض دیا تھا، وہ مع سود کے واپس کردیا جائے، بیرونی کتاب الہند کے پہلے باب مین لکھتا ہے:

"اجنبی ہونے کے سبب مجکو ہندو علماے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی، لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زباندانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی، چونکہ ہیئت اور ریاضیات مین مجکو کامل مہارت حاصل تھی مین خود انکو تعلیم دینے لگا، پنڈتون کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی، تعجب سے پوچھتے تھے کہ تمنے یہ باتین کس پنڈت سے سیکھی ہین، انکو یقین نہین آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم وفنون مین انکا ہمسر ہوسکتا ہے، وہ مجکو جادوگر سمجھتے تھے اور "بحر العلوم" کہتے تھے"

ہندو پنڈتون کی واقفیت کے لیے، اسنے عربی زبان سے حسب ذیل کتابین سنسکرت مین ترجمہ کین۔ رسالۂ اصطرلاب۔ مجسطی۔ اقلیدس کے مقالے، علاوہ ازین ہندو پنڈتون کے سوالات کے جواب مین بھی اُسنے کئی رسالے لکھے، ہندو ہیئت دانون نے ہیئت کے متعلق سوالات کیے تھے۔ ۱۲۰ صفون مین اسنے انکے جوابات لکھے، ایک رسالہ اُس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے مدارج جو عربی زبان مین ہین وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہین[1]۔

---

[1] فہرست تصنیفات بیرونی در آثار باقیہ۔

مسلمانون کے فتوحات نے ہندوستان مین جب وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتون کو ان کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بھوجر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت مین پہنچا اور وہان سے مسلمانون کے علوم کی تکمیل کی قاضی صاحب نے بھوجر سے سنسکرت سیکھی اور اسکی مدد سے انبرت کنڈ (حوض آبحیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی مین ترجمہ کیا[1]

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ مین تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا اور جسکے آثار سلطنت پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادین کھڑی کی تھین اُسنے ہندوون کے لیے بہت سی عربی اور فارسی کتابون کے ترجمے ہندی مین کرائے، فرشتہ کی عبارت یہ ہے:

وفرمود تا اکثرے از کتب عربی وفارسی بزبان ہندی ترجمہ کردند،

سری بھٹ نام ایک بید کو طبابت کی تعلیم دلا کر اپنے دربار مین یہان تک ممتاز کیا کہ وہ سیاسی معاملات مین بھی دخیل ہوگیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

وسلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیب حاذق بود تربیت کرد (صفحہ ۳۴۲)

ہندوون کو مسلمانون سے جو نفرت قلبی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی ہندو مسلمان بادشاہون کے دربار مین نوکری تک قبول نہین کرتا تھا، رسوم و عادات کی یہ بندشین سب سے پہلے دکن مین ٹوٹین، مسلمان سلاطین نے ہندو فاضلون کی قدر افزائی شروع کی اور اس بہانہ سے وہ رفتہ رفتہ مسلمانون سے مانوس ہونے لگے۔

شہزادہ محمد تغلق کے دربار مین گنگو نام ایک برہمن صنعت منجمی پر ممتاز تھا حسن بہمنی جو

[1] جامع التقصص العربیہ فی الاخبار الہندیہ صفحہ ۱۵ مطبوعہ فرانس (دکن) ۱۸۴۷ء صفحہ ۳۴۴، نولکشور

دکن میں بہمنی حکومت کا بانی ہوا، وہ اس منجم کا نہایت ممنون احسان تھا اس تقریب سے
دکن کے برہمنوں کو بہمنی حکومت کے ساتھ موانست پیدا ہوئی اور بالآخر تمام دفاتر سرکاری کے
وہ مالک بن بیٹھے، فرشتہ میں ہے:

مشہور است کہ پیش ازین برہمنان پیرامون خدمت و عمل (نوکری) شہریاران اسلام نمی گردیدند و در
قرایا و زوایا و مواضع انزوا بکسب انواع علوم خصوص علم نجوم اشتغال داشتہ متوکلانہ زندگی
(گوان) میکردند و ملازمت اہل دنیا خصوص مسلمانان را مخل حسنات دانستہ و شقاوت ابدی
تصور کردہ پیرامون خدمت و عمل نمی گردیدند اگر احیاناً بعضے از ایشان بوسیلۂ طبابت و نجوم
و دعا و قصہ خوانی در صحبت ارباب جاہ می بودند بانعام و احسان ایشان مخصوص گشتہ
قلادۂ نوکری در گردن نمی انداختند اول کسیکہ از فرقہ براہمہ در دور سلاطین اسلام نوکری
کرد گانگو پنڈت بود و تا حال کہ سنہ ۱۰۱۵ھ است بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً قرباً نشانان
دکن و نویسندگی ولایت ایشان بہ بہامنہ (برہمن) مرجوع است (جلد ا صفحہ ۲۷۰)

شاہی دفتر کی زبان عموماً فارسی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل کار فارسی زبان اب سیکھنے
لگے تھے، ابراہیم عادل شاہ جو ۹۴۱ھ میں دکن کی عادل شاہی خاندان کا فرمانبردار رہا تھا اُسنے
فارسی زبان بھی دفتر سے برطرف کر دی۔

و دفتر فارسی برطرف کردہ ہندوی کرد و بہامنہ (برہمن) را صاحب دخل گردانید۔ (فرشتہ صفحہ ۲ جلد ۲)

شمالی ہندوستان کی نسبت مشہور ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں،
یہاں ہندوؤں نے فارسی پڑھنی شروع کی، تاریخوں کے پڑھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو
رعایا کی تعلیم کے لیے اس سے پہلے کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ جو طریقۂ تعلیم، اور
نصاب تعلیم ان میں مدتوں سے توارث چلا آتا تھا اس میں کوئی دخل نہیں دیا گیا۔ اپنے طور پر

درس تدریس کے جو انتظامات اُن مین جاری تھے انکو علی حالہا باقی رکھا گیا۔ مسٹر لا اپنی
تاریخ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا کے دیباچہ مین لکھتے ہین:

ابھی وہ دن دور تھا جب کہ ہم مسلمان سلاطین کو ہندو اور مسلمان دونون رعایا کی
تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوے اور ایک ہی جوش کے ساتھ مسلمانون سے کے
علاوہ دوسری قومون کے علوم کو ترقی دیتے ہوے پائین سب سے پہلے مسلمان فاتح کے
ہندوستان مین قدم جمنے کے ایک صدی یا دو صدی بعد تک ہندوؤن کی تعلیم اور
اُنکے علوم اپنے (قدیم) راستہ پر اپنے حامیون کی اعانت سے چلتے رہے۔

مگر بعض قراین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ان مین اس سے پہلے پیدا ہو چکا
تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۷۵۲ھ مین تخت نشین ہوا تھا، کانگڑہ کی فتح کے موقع پر
جوالا مکھی کی سیر مین اسکو ایک چھوٹا سا کتبخانہ ملا تھا، پنڈتون کو بلا کر چند کتابون کا فارسی
مین ترجمہ کرایا۔ سیر المتاخرین کی عبارت یہ ہے۔

سلطان علماے آن طائفہ را بحضور خویش طلب داشتہ مضامین آن را شنیدہ محظوظ
گردید و فرمود بعضے از آن کتب را بفارسی ترجمہ کنند۔

بہر حال مورخین کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندوؤن مین فارسی تعلیم کا
رواج سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا۔ سلطان لودی نے ہندوؤن کے نمایان
جگہون مین مساجد، مدرسے اور بازار قائم کئے، سپاہیون کو تعلیم پر مجبور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ہندوؤن مین بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہو گئی۔ فرشتہ شہادت دیتا ہے:

بعد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء و ارکان و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال
نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آن زمان درمیان ایشان

معمول بود پرداختہ،

اسکے بعد شیرشاہ کا زمانہ آتا ہے، اُسنے ہندؤن کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، بہت سے ہندوؤن نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان مین بھی دفاتر سرکاری مین نوکریان حاصل کین، راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کے نورتن مین شامل ہے وہ شیرشاہ ہی کا تربیت کردہ تھا اور اسکی محکمہ مالگذاری کا دیوان تھا۔

تیموریون کے زمانہ مین ہندوؤن کی تعلیمی ترقی درجۂ کمال تک پہنچ گئی، گو اسکی تفصیلات نہ ملین لیکن استقصاے جزئیات سے یہ نتیجہ واضح طور سے نمایان ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم ان کے زمانہ مین گھر گھر پھیل گئی۔

فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لیے ملک کے مشہور شہرون مین بڑی بڑی درسگاہین تھین، جہان دور دور سے طلبہ آکر شریک درس ہوتے تھے۔ یہ درسگاہین، ٹھٹھہ، ملتان، اور خصوصاً بنارس مین زیادہ تھین[1]۔ سلاطین تیموری بھی ان علوم کی دستگیری مین کمی نہین کرتے تھے۔ دربارون مین انکو مسلمان فضلاے عہد کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری کے ہندو فضلا کے حسب ذیل نام لکھے ہین: مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، اشیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، مدھوسودن بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر، مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، واسودیو بھٹ، بابن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، برم اندر، گوپی ناتھ، بجی سین، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی مین ترجمہ کیا،

---

[1] آثر عالمگیری صفحہ ۱۸۔

اکبری دربار میں فن مصوری و نقاشی کے جو ماہرین تھے اُن میں مسلمان اُستادوں کو چھوڑ کر حسب ذیل ہندو اساتذہ تھے : دسونت کہار، بساون، کیشو، لال، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، ساونلا، ہری بنس، رام۔

جس طرح اس عہد میں سنسکرت سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کی گئیں بعض کتابوں کا عربی و فارسی سے سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ مرزا الغ بیگ کی زیج، علم ہیئت کی آخری اور مستند کتاب ہے، مسلمان اور ہندو فضلا کی ایک مشترک مجلس نے اس کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ ہندو علما میں سے کشن، جوتشی، گنگا دھر، مہیش اور مہانند اس مجلس کے ممبر تھے۔

جہانگیر نے بھی ہندو فضلا کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے عہد میں جدروپ گوسائیں نہایت مشہور ویدانت تھا، وہ پاپیادہ اسکے جھونپڑے تک جاتا اور گھنٹوں اُسکے پاس بیٹھا رہتا، راستہ چلتے کسی سنیاسی کا نام سنتا تو اُسکے ملاقات کو اتر پڑتا، ایک دفعہ وہ سفر کررہا تھا کہ ناگاہ ایک مقام پر اسکو بہت سے جوگی نظر آئے، تزک میں لکھتا ہے:

در ہمین منزل شب شیورات واقع شد جوگی بسیار جمع آمدہ بودند ..... با دانایان این طائفہ صحبتہا داشتہ شد[1]

رائے منوہر لال ولد رائے لون کرن لڑکپن سے جہانگیر کے زیر سایہ عاطفت تعلیم پاکر جوان ہوا تھا۔ فارسی زبان کی شاعری اور خوشخطی میں سلیقہ خاص پیدا کیا[2]۔ راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا۔ جہانگیر اسکے چند ہندی اشعار سنکر نہایت محظوظ ہوا۔ اور ایک ہاتھی اسکو عطا کیا[3]، اسکے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا جسکو جہانگیر نے ایران بھیجا تھا[4]

دارا شکوہ کا دربار ہندو فضلا اور شعرا سے بھرا رہتا تھا، وہ خود بھی ہندوؤں کے

---

[1] تذکرہ خوشنویسان [2] تزک جہانگیری [3] [4] تزک جہانگیری صفحہ ۲۰

علوم وفنون مین مہارت رکھتا تھا، اسلیے ہندو علما کو عزیز رکھتا تھا، اسکے دربار کا گویا ملک الشعرا ایک برہمن چندر بھان نامی تھا۔ اس کا تخلص برہمن تھا، فارسی مین دلپسند شعر کہتا تھا، اس کا دیوان فارسی اب تک موجود ہے، دارا شکوہ کے قتل کے بعد بنارس مین آکر سکونت اختیار کرلی تھی جہان اسنے ۱۰۷۳ھ مین وفات پائی،

اس مضمون مین بدنصیب عالمگیر کا نام، کسی دوستانہ حیثیت سے تو بار نہین پاسکتا لیکن دشمنانہ انداز مین بھی کیا کسی رسم محبت کا سراغ لگ سکتا ہے، مآثر عالمگیری مین ہے

بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ وملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان در مدارس مقررہ بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند ورا غبان طالبان از ہنود و مسلمانان مسافتہاے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت گمراہی آیند، احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس ومعابد بے دینان دستخوش انہدام سازند وبتاکید اکید طور درس وتدریس ورسم شیوع مذہب کفرانیان برانداز ند (صفحہ ۸۱)

اس عبارت سے جہان عالمگیر کی تنگدلی ظاہر ہوتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبون مین اُنکے مدارس قائم تھے، غالباً ان مدارس کے توڑنے کے احکام اُسی اصول پر مبنی ہونگے، جسکی مثال ہمکو اس روشن عہد حکومت کی تعلیمی پالیسی مین نظر آتی ہے۔

محمد شاہ کے زمانہ مین راجہ جی سنگھ والی جے پور نے، دلی، بنارس اور اوجین مین رصدخانے قائم کرائے، ملا خیر اللہ مہندس رصدخانۂ دلی کے منتظم خاص تھے، بنارس کا رصدخانہ اب تک موجود ہے، اور ہندوؤن کے تہوارون مین اور شادی بیاہ کی

تاریخون مین اس سے اب تک مدد لی جاتی ہے۔

جی سنگھ نے مسلمان علما کو جمع کرکے عربی زبان کی چند مشہور ہیئت کی کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا۔[1]

اس تمام عہد مین ہندوؤن کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوشنویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اس عہد مین یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا، یہ تو ہم نہین کہتے کہ مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان مین کتابون کے جمع کرنے اور کتبخانون کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا۔ کانگڑہ کی فتح مین مسلمانون کو جو کتبخانہ ملا تھا اُسکا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ لیکن اس عہد مین مسلمانون کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا مین کتبخانون کے قائم کرنیکا شوق پیدا ہوگیا۔ تاریخی حوالون کو چھوڑکر آج ہندوؤن کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہین وہان عربی اور فارسی کتابون کے چند فرسودہ جلدین کسمپرسی مین پڑی ہوئی ملین گی۔ بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانون مین دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتبخانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا، لاہور، دلی، لکھنؤ، پٹنہ، اور ڈھاکہ مین ایسے بکثرت گھرانے ملین گے، پٹنہ مین اسوقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہین جنکے ان عربی کتابون کے نادر نسخے ابتک موجود ہین اور انکو اسقدر عزیز ہین کہ وہ انکو جدا نہین کرسکتے، راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان مین اس قسم کا ایک نادر کتبخانہ موروثی چلا آتا ہے۔

---

[1] سیرۃ المرجان آزاد۔

۲

گزشتہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا وہ جنوبی اور شمالی ہندوستان اور کشمیر کے متعلق تھا، ان اوراق میں اس خطۂ ہند کے متعلق ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو آج ہندوستان کا سرتاج اور مایۂ فخر و ناز ہے، یعنی **بنگال** !

بنگالی زبان آج اپنی ثروت اور تمول کے لحاظ سے تمام ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ دولتمند ہے، لیکن یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اسکی ترقی کا آغاز بنگال میں مسلمانوں کی ابتداے حکومت سے ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ زبان کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی، بنگالی زبان کی سرسبزی اور شادابی کی آج دہوم ہے، لیکن مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی بویا نہ گیا تھا،

اس دعوی کے ثبوت میں ہم اپنی تحقیقات کے بجاے، ایک فاضل بنگالی مورخ کی تاریخ "ترقی علوم در ہندوستان" کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں،

"سلاطین بنگال کی کوششیں صرف مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی تک محدود نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی دیرینہ بیدار مغزی کو ایک نئے راستہ پر علوم کو ترقی دینے میں جسکے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگوں کو خاص طور سے دلچسپی ہونا چاہیئے، متوجہ کیا، ان لوگوں کو یہ بات

بے ہو تسلیم ہوگی کہ انکی زبان اپنے علمی سطح تک پہنچنے میں خود انکی نہیں بلکہ ان سلاطین کی ممنون ہے جنکی ابتدائی توجہ اسکی طرف صرف اسکی ندرت کی بنا پر اور اس بنا پر تھی کہ اسکو اس سنسکرت زبان سے تعلق ہے جو اس وسیع ہندو آبادی کا محبوب خزانہ ہے جسکے ساتھ انکو بہت زیادہ تعلق ہے۔"

"سب سے پہلے مہابھارت اور رامائن کی رزمیہ نظموں نے بنگال کے سلاطین کو اپنی طرف متوجہ کیا، جنکے اشارہ سے انکا بنگالی یعنی ملکی زبان میں ترجمہ ہوا۔ مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ، والی بنگال (۱۲۸۲ء تا ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا۔ جو صوبہ کی دیسی زبان کا بہت بڑا مربی تھا اور جسکو شاعر اعظم ودیاپتی نے اپنی نندیکر نندہ جاتیدنا [illegible] اپنی ایک نظم میں سلطان غیاث الدین کا بھی ذکر کیا ہے جس سے غالباً غیاث الدین ثانی والی بنگال (۱۳۶۷ء تا ۱۳۷۳ء) مراد ہے۔"

"... یہ مشکوک ہے کہ بنگال کے کسی مسلمان بادشاہ، یا ہندو راجہ کانس[1] نے کرتی باس کو بنگالی میں رامائن ترجمہ کرنیکا حکم دیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں ہی کے نظیروں نے اس کارنامہ کے انجام پر اسکو آمادہ کیا۔"

"سلطان حسین شاہ، بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، مالا دھر باسو کو اسی نے بھاگوت پوران کے بنگالی ترجمہ پر مقرر کیا۔ حسین شاہ کا ایک سپہ سالار پرگل خان تھا، پرگل خان اور اسکے بیٹے نے اپنے نام کو اس بنا پر بقائے دوام بخشدیا ہے کہ انھوں نے مہابھارت کا ٹکڑا بنگالی میں ترجمہ کرایا۔"

پرگل خان روزانہ شام کو اپنے محل پر جو چٹاگانگ میں واقع تھی میں اپنے اہل دربار کو جمع

[1] معارف: مسلمانوں کے عہد میں چند سال کیلئے یہ بنگال کا راجہ بن بیٹھا تھا۔ اسکا بیٹا تخت نشین ہوکر مسلمان ہو گیا تھا

کہا ہتا تاکہ مہابہارت کے بنگالی ترجمہ کو ترجمہ نیپی کوبندا پرمیشور کی زبان سے سنین،
پرگل خان کے زیر اہتمام اس مذہبیہ نظم کا ترجمہ "استری پرو" تک پورا ہوا، اسکے بعد چہوٹے خان
جو اسکا چاٹگام کی گورنری پر جانشین ہوا، اس نے سری کرن نا ندی شاعر کو مقرر کرکے
اس کام کو جاری رکہا اور "اشومیدہ پرو" کا ترجمہ کرایا۔"

مسلمان امرا کے اشارہ سے بنگالی مین سنسکرت اور فارسی کتابون کے ترجمہ کرنیکی
مثالین شاذ نہین ہین، انہون نے سنسکرت کے عشاق برہمن اور ہندو راجاؤن کے
اس مغرورجذبہ کو جس سے وہ بنگالی زبان کو دیکہتے تہے بدل دیا، مسلمان امرا کی تقلید مین
بنگالی مصنفین کی ہمت افزائی اور دربارون مین بنگالی شعرا کے رکہنے کا ہندو راجاؤن مین
عام رواج ہوگیا، اس زمانہ سے کتنے ممتاز بنگالی شعرا اور مصنفین نے ہندو راجاؤن کے
دربارون کو آراستہ کردیا، جسکے سبب سے بنگالی مقبولیت عام مین بلند سطح تک ترقی کرگئی اور ان
زبانون کی جو اپنے پاؤن اس صوبہ مین گاڑ رہی تہین حریف بنگئی۔[1]"

الغرض رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم بنگالی شرفا کا طغراے امتیاز بن گئی
خصوصًا ان خاندانون کے لئے جنکو حکمرانون کی نیابت اور سرکاری عہدون پر سرافرازی کا
موروثی حق ہوگیا ہتا، مہاراجہ سورج کنتا اچارجی ناگی، مہاراجہ جتندر و موہن ٹاگور اور مہاراجہ
ناودا کرشنا کے خاندان بنگال مین عربی اور فارسی علوم و ادبیات کے مربی تہے، اور انکے
فرزند ان علوم مین عالمانہ مہارت رکہتے تہے، راجہ رام موہن راے بانی فرقہ برہمو سماج، اور
راجہ کشب چندر سین جنہون نے آخر زمانہ مین بنگالی قوم مین مصلحین اعظم کا درجہ پایا ہے، علوم
اسلامیہ کے واقفین مین انکا شمار ہے، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی ندوہ کے اجلاس

[1] صفحہ ۱۰۷-۱۱۱، پروموشن آف لرننگ ان انڈیا،

مدراس (۱۹۱۲ء) کی تقریر میں فرماتے ہیں:-

"بنگال کے جدید دور ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن راے کے قابل ہاتھون سے رکھا گیا، یہ واقعہ ہے کہ اُنھون نے پٹنہ مین عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی گذشتہ موسم سرما مین کلکتہ کے ایک نامور بنگالی بابو نے مجھسے کہا کہ اُنکے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بکثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے، چنانچہ انکے چچا نے پندرہ برس مین علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی،

گریش چندر گوش نے قرآن مجید، تذکرۃ الانبیاء اور مشکوۃ کا بنگالی مین ترجمہ کیا،

انہین اسباب کا اثر ہے کہ بنگالی زبان مین عربی اور فارسی کے الفاظ خصوصاً آداب سلطنت اور کاروائی ہاے مقدمہ کے الفاظ بکثرت ہین، اور اب رفتہ رفتہ انکی جگہ انگریزی لے رہی ہے، تاہم بنگال کی ڈیڑھ دو سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی ان الفاظ کا ابتک بنگالی مین رواج پذیر رہنا، اسکے یہ معنی ہین کہ اس زبان مین ان مفاہیم کے لئے سرے سے الفاظ ہی نہ تھے،

بنگال کے بعض ممتاز خاندانون کا سرنام ابتک فارسی ہے، مثلاً ملک، مجمدار، سرکار، موزمدار، اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انکو اپنے حاکم وقت کی زبان کس درجہ محبت تھی،

مہاراشٹر کی مرہٹی زبان جو کہنا چاہیئے کہ یہ ہندوستان کی اس قوم کی زبان ہے جسکا اگر بس چلتا تو مسلمانون کی ہستی کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ ڈالتی، تم اس سے قیاس کرسکتے ہو کہ مسلمانون کے علوم و فنون اور زبان سے اسکو کس درجہ نفرت ہوگی، لیکن یہ معلوم کرکے تعجب کی انتہا نرہیگی کہ مرہٹی زبان کے بنانے مین مسلمانون کے زبان و قلم نے سب سے زیادہ کام کیا ہے، دہقانی اور صحرائی مرہٹون کو طرز و آداب شاہی سیکھنے کے لئے اپنے انہین

دستمنون کا دست نگر ہونا پڑا، ابتدائً مرہٹی زبان ایک وسیع ملک کی جہانداری کی قوت نہین رکھتی تھی، اسلئے ناچار اُنہین مسلمانون اور برہمنون کا اسکو ممنون ہونا پڑا، جنھون نے فارسی زبان پڑھی اور سیکھی تھی، مرہٹہ راجاؤن کے فرامین آج بھی تم پڑھ لو تو آدھے سے زیادہ اسمین اصلی یا بگڑے ہوسے فارسی وعربی الفاظ کی آمیزش پاؤگے، تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ مرہٹہ آج قدیم مرہٹی زبان کے لٹریچر کے سمجھنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے،

آداب وقواعد سلطنت، کاغذات سرکاری صنعت وحرفت، خانگی زندگی ہر ایک چیز مین اسکی زبان کا اصلی راس المال عربی وفارسی زبان کے الفاظ ہین ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب ایم، اے پروفیسر الفنسٹن کالج بمبی جو مرہٹی کی زباندانانہ لیاقت رکھتے ہین وہ مرہٹی زبان کی ایک ڈکشنری لکھنے والے تھے، جس سے بیک دفعہ یہ نظر آجاتا کہ عدالت، کتبخانہ، مدرسہ، بازار، کارخانہ، ہر جگہ مرہٹی کے آلاتِ تخاطب عربی وفارسی الفاظ ہین، حلوائی کی دوکان سے بڑھئی اور لوہار کے مکان تک چلے جاؤ، آلات کے نام اور تہذیب وتمدن کے الفاظ کا ماخذ مسلمانون ہی کے زبان کو پاؤگے، تاریخ کے لئے لفظ مرہٹی مین نہ تھا، اب اسکو باکھر کہتے ہین، اس زبان کے محققین کا بیان ہے کہ یہ خبر کی تحریف ہے خبر، سمجھے؟ خبر!

بیسیون ہندو خاندان وہان آباد ہین، جنکا سرمایۂ امتیاز یہ ہے کہ عہد قدیم مین اُنکا خاندان فارسی کا خدمتگذار رہتا، اور اب تک اُن کا خاندانی سرنام وہی فارسی زبان کا لفظ ہے مثلاً "پھرنیس" یعنی فردنویس، "چٹ نیس" یعنی چٹھی نویس، "کلہ دار" یعنی قلعہ دار، "پوت دار" یعنی پوتھی دار، ایک قسم کے مرہٹہ سپاہی کا نام "سلہ دار" تھا، اسکی اصل سمجھے "سلحدار" تنگائی تم جانتے ہو؟ تم جسکو تعادی بولتے ہو، آجکل دکن مین مرہٹون اور برہمنون کی زبان حسب ذیل

عہدون کے نام عام طور سے جاری ہین،

مقدم	چودہری،	فوجدار	سب انسپکٹر
معاملہ دار،	تحصیلدار	ناجر	ناظر
کارکن،	محرر	سررشتہ دار	سرشتہ دار
دیوان،	سکریٹری	. . .	. . .

ملک دکن اور مہاراشٹر کی تقریب سے ہم نے حیدرآباد کا ذکر نہین کیا، سبب یہ ہے کہ اس مجسمۂ عدل وانصاف ریاست نے اپنی ہندو رعایا کی تعلیمی وعلمی ترقی مین جو کارنامے انجام دیئے ہین وہ ایک مضمون کی ضمن مین نہین بلکہ ایک کتاب کے سیکڑون صفحات مین انکا تذکرہ ہونا چاہیئے، صرف ایک حیدرآباد کی اسلامی ریاست نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جو کچھ کیا اور کر رہی ہے، تمام ہندوستان کی ہندو ریاستون نے ملکر بھی اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ اتنا نہین کیا، اس وقت موضوع سخن صرف علمی اور تعلیمی حالات ہین، اسلیئے صرف اسی زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جاے تو معلوم ہوگا کہ علاوہ عام تعلیم کے جسکی بدولت ریاست کے تمام دفاتر پر ہندو اہل کار قابض رہے ہین، اعلےٰ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہر عصر مین یہان ہندو اہل قلم مصنفین اور شعرا موجود رہے ہین، اس بیان کی تصدیق کتبخانہ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کی دو جلدون مین ملیگی، منشی لچھمی نرائن شفیق مصنف بساط الغنائم و تاریخ دکن، لالہ گرو ہاری لال مصنف تاریخ دکن، راے منا لال مصنف تاریخ دکن، لالہ لچھمی نرائن مصنف چمنستان شعرا، راجہ گروہاری پرشاد، باقی صاحب دیوان و مثنوی، مہاراجہ چندو لال شادان صاحب کلیات، سندرام مصنف سیاق نامہ، جگناتھ نجومی مصنف تقویم التواریخ حکیم راے بچو لال تمکین، صاحب دیوان و مصنف مجربات، رتن لال مصنف تخلیط المداد

وغیرہ کے سیکڑون نام گنا ے جا سکتے ہین، اور عجب ہنین کہ کوئی حیدرآبادی قلم ان سے بھی بہتر اشخاص کے نام پیش کرسکے،

بہار، اودہ، صوبہ آگرہ اور دلی کے متعلق بمختصر کہنا چاہیے کہ یہان ہندوون کی تعلیم مسلمانون کے برابر برابر تھی، ان ممالک کے بیشمار ہندو فضلا کے نام تذکرون مین محفوظ ہین. فقط ایک لکھنؤ مین ہندو شعرا کی تعداد سیکڑون سے تجاوز ہوئی ہوگی، لکھنؤ کے کشمیری ہندوون مین فارسی تعلیم کا رواج انتہائی عروج پر تھا لکھنؤ مین راجہ الفت رائے الفت کالی پرشاد اخلاص، لالچند انس، راجہ گنگا پرشاد بدر، منشی خیالی رام خیالی، بحنا ور سنگہ قمر، سیکولال الفت، رام سہاے رونق، میڈو لال زار، راجہ جیالال گلشن، راجہ کالکا پرشاد موجد، منشی لالک راجہ جوالا پرشاد وقار، دیگر اضلاع اودہ والہ آباد مین نمن لال فرین، الہ آبادی، راے امر سنگہ خوشدل مانکپوری، گوکل چند ہندو فرخ آبادی، راجہ مدن سنگہ موزون اٹاوی، راے گلاب راے گلشن سندیلوی لکھن لال موجد بدایونی لالہ بجناتھ شائق بریلوی، لالہ رام بخش مطیع قنوجی، لالہ بالمکند شہود مانکپوری، منشی الیشری داس ابہم فرخ آبادی، اندرمن اورنگ آبادی (علی گڈہ) آگرہ مین چندر بہان برہمن، شیورام حیا راے منوہر ولد راے لون کرن عظیم آباد (پٹنہ) مین، لالہ اوجاگر الفت، راجہ پیارے لال الفتی، راجہ بہادر راجہ، راجہ رام نرائن موزون، بینی پرشاد دل وغیرہ فارسی زبان کے مشہور شاعر سخن فہم، انشا پرداز اور فاضل گذرے ہین،

الہ آباد کے مشہور ہندو لیڈر مالوی جی اگر اسکو یاد رکہین تو اچھا ہے کہ ممالک متحدہ کے ہندوون کا سب سے پہلا لیڈر ہوا اسی شہر الہ آباد مین آپکے ہم پیشہ تھے اور جنکی کوشش سے آپ "پالیٹکس" کے لفظ سے گوش آشنا ہوسے ہین وہ عربی اور فارسی علوم کے ایک بہت بڑے

ہمہ دان فاضل تھے، یعنی پنڈت اجودھیا ناتھ! وہ ایک طرف کانگرس کے پلیٹ فارم پر لکچر دیتے تھے تو دوسری طرف اپنے گھر مین بیٹھکر متنبی اور عرفی کا درس دیتے تھے،

پنجاب بھی مسلمانون کے تعلیمی اثر سے خالی نہین، مل سیالکوٹی متخلص بہ وارستہ جو فارسی کے مشہور بنت مصطلحات الشعرا کا مصنف ہے، واقی کھتری شاگرد ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، منشی لچھمی نرائن دبیر گنجاوی لاہوری پنجاب کے نامور ہندو فضلا ہین، لچھمی نرائن کو معقولات مین بھی بہت بڑی مہارت حاصل تھی، مصطلحات فارسی کی تحقیق مین وارستہ نے ۳۰ برس ایران مین گذارے تھے،

دلی مین منشی مادھو رام منشی، رائے منوہر لال منوہر، مرزا راجہ کدار ناتھ مقیم، مرزا کودرا دینہ سنگھ! راجہ گوپال ناتھ غلام، پوران لال رنگین، بہادر سنگھ دلخوش، لالہ جی داس ذرہ، شیو سنگھ بیجان، لالہ نرائن داس بیخود، سکھراج سبقت، منشی گوہر لال تفتہ وغیرہ سیکڑون فضلا گذرے ہین،[۵]

دیہاتون مین تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو مدت دراز سے ہندوستان مین جاری ہے، گرو جی دیہات کے زمیندار کے ہان نوکر ہوتے تھے، یا تمام گاؤن کی طرف سے انکو تنخواہ ملتی تھی، اُنکے کسی کچے مکان کے برآمدہ مین یا سایہ دار درخت کے نیچے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ جاتے تھے، ہاتھ مین لکڑی کا سیاہ رنگا ہوا تختہ ہوتا تھا، اسپر کھریا کی سفید روشنائی سے لکھتے تھے، یا کھریا مٹی کے ڈھیلے سے زمین پر لکھتے تھے، ہندی لکھنا پڑھنا اور پہاڑا اور حساب انکو سکھایا جاتا تھا، یہ گویا پرائمری تعلیم تھی،

عام تعلیم تو یہین ختم ہوجاتی تھی، جو لڑکے آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ یا سنسکرت یا سلسلہ

---

[۵] یہ تمام نام مختلف فارسی تذکرون سے التقاط کئے گئے ہین،

سیکتے تھے، اور پنڈت بنتے تھے، اور یا سرکاری زبان فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے،
قصبوں مین فارسی کے مکتب ہوتے تھے، ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میان جی" پڑہاتے تھے،
فارسی کی ابتدائی تعلیم مین بول چال، خط و کتابت اور اخلاقی حکایات کی کتابین داخل
ہوتی تہین، ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول اور یکجہتی کے ساتھ پڑہتے تھے،
گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، انشاے خلیفہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی،
سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ کتابین داخل درس تہین، خوشخطی اور فارسی نویسی سکہائی جاتی تھی
فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خط شکستہ کے پڑھنے کی عادت دلانیکے لئے پورانے
لنبے خطوط کا ایک طومار "میان جی" اپنے پاس رکہتے تھے جسمین سو دو سو خط لنبے جڑے
ہوتے تھے، مکتب کے طالب العلم انکو پڑہتے تھے اسکو اسکول کی تعلیم سمجہنا چاہیئے،

اسکے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے تھے اور یا تکمیل کے لئے مشہور اساتذہ کی خدمت
مین بڑے بڑے شہرون مین چلے جاتے تھے، انسے فارسی کی اعلےٰ تعلیم، شاعری، علوم،
اور کچھ عربی کی کتابین پڑہتے تھے، بعض بعض طلبہ تمام علوم مروجہ کی تکمیل کرتے تھے،

ابوالفضل نے آئین اکبری مین اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم بتایا ہے، اخلاق، ریاضیات،
حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب،
طبعیات، الٰہیات، اور تاریخ، ہندوون کو ان علوم کے علاوہ دیاکرن (سنسکرت صرف و نحو)
ویدانت (ہندو تصوف و اخلاق)، پاتن جلی (ہندو فلسفہ) بہی پڑہنی پڑتی تھی، ابوالفضل کا
بیان ہے کہ اس تعلیم کی بدولت تمام سلطنت آراستہ و مرصع ہوگئی تھی، اسکو اس عہد کے کالج
کی تعلیم سمجہنی چاہیئے،

سطور بالا مین تحصیل کمال اور طلب علم کے لئے جا بجا اساتذہ کی خدمت مین سفر کا جو

نقشہ مین نے کھینچا ہی، فارسی تذکرون کے پڑھنے سے یہ خود بخود سمجھ مین آجاتا ہی، ذیل مین منشی لچھمی نرائن دبیر کے حالات تعلیم کی چند سطرین ایک فارسی تذکرہ سے نقل کرتے ہین،

" جد و پدرش در دہلی بوکالت امراے عالمگیری و محمد شاہی عز امتیاز داشت سبیدولعلی از مولوی شیخ محمد گرفت، و درسن دوازدہ سالگی بشوق علم و نثر در مجلس استفادۂ سراج الدین علیخان آرزو جا گرفت، و براے تحصیل صرف و نحو نزد لالہ ٹیک چند بہاری رفت، بعد رشد خدمت علماے اعلام را التزام نمود، مشغول اکتساب علم طب و دیگر علوم عقلیہ بود، ازشتمو[؟]

ہندو اور مسلمان طلبہ ان اساتذہ کی خدمت مین جس محبت و یکجہتی کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے تھے، اور استاد بھائی بنکر جو رشتۂ اتحاد باہم قائم کر لیتے تھے، وہ آجکل کے شاندار ایوانون کے تاریخی زمانہ مین مفقود ہے، محمد حفیظ خان المتوفی ۱۱۹۳ھ ایک نامور استاد تھے، انکے شاگردان با اخلاص کے نام سنئے، میر ابوالحسن، منشی لچھمن سنگھ، میر کلن، قادر بخش، پنڈت لچھمی رام، محمد اسماعیل، لالہ سکھ رام، منشی کشن سنگھ، محمد تقی، منشی محبوب راے، دیکھنا! منشی محبوب راے" کتنا پیارا نام ہے، کیا یہ ہندو مسلمانون کے اتحاد باہمی کی عملی دلیل نہین؟

لالہ چنی داس ذرہ دلی کے ایک مشہور معلم تھے، جنکے مکتب مین ہندو مسلمان لڑکے پڑھتے تھے ہندوستان کے خاتمہ العلما، مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی، منشی سوہن لال تھے، اور مولانا ے مرحوم کے تلامذہ مین جے بہاری لال کایستھ تھے مولانا کے ایک تلمیذ رشید گواہی دیتے ہین کہ مین نے خود دیکھا ہے کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ انکے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے[۱]"

---

[۱] خطبۂ صدارت ندوہ، رس ۱۹۱۱ء از مولانا ے شروانی،

تمدن ہند کا مصنف موسیو لیبان اپنی کتاب کے تیسرے باب مین ہندوؤن کے علوم و فنون پر حسب ذیل تبصرہ کرتا ہے :-

"ہم نے تمدن عرب مین جتنے باب علوم و فنون پر لکھے ہین، انکی ترتیب اس کتاب مین نہین ہو سکتی، چونکہ عربون نے یونان و روم کے قدیم علمی ذخیرہ کو خود بہت ترقی دی اور اسکے بعد اسکو یورپ کے دار العلومون تک پہنچایا، اسلئے ہمین انکے زمانہ حکومت کی علمی ترقیون مین ایک خاص دلچسپی تھی اور اس وجہ سے ان ترقیون کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے علوم کی یہ حالت نہین ہے، برخلاف اسکے انکے علوم کے متعلق جو قدیم رسالے تھے انمین بہت کچھ ترمیم ہوگئی ہے اور ہمین معلوم ہوگیا ہے کہ انکے علمی خیالات ان اقوام سے لئے گئے ہین جنکے ساتھ انکو تعلق پیدا ہوا اور خود ہندوؤن نے انمین کچھ اضافہ نہین کیا، پس کسی خاص زمانہ کے ہندی علوم کی تحقیقات کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ ہم ان اقوام کے علوم کی تحقیق کرین جنکا تعلق اسوقت ہند سے تھا اور یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہماری کتاب کے مقاصد سے خارج ہے، جو کچھ ہم ہندوؤن کے دماغی حالت کے متعلق لکھ چکے ہین، اس سے بآسانی سمجھ مین آجائیگا کہ انھون نے کیون ان علوم مین جو انھین باہر سے حاصل ہوئے کوئی ترقی نہین کی، ہندو دماغ جو فلسفہ مین نکتہ رس اور فنون مین

تیز فہم ہے اس خاصیت سے جسکا نام مادہ تحقیق ہے اور جسکے اوپر علوم کا دارو مدار ہے بالکل خالی
حیثیت سے ہندوؤن مین اصلی علوم کی کمی رہی ہے، ان مین دوسرون کی تحقیقات کو حاصل کر لینے کا
تو پورا مادہ ہے لیکن اس درجہ سے یہ کبھی آگے نہ بڑھ سکے، وہ دو قومین جن سے ہندوؤن نے
اپنے علوم اخذ کئے، یونانی اور عرب معلوم ہوتے ہین، یہ نہین معلوم ہے کہ یونانی علوم ہند مین کیونکر
پہنچے، لیکن شمال مغربی ہند کی عمارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تعلقات
بیکٹریا کے ساتھ مدت دراز تک قائم رہے، بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اسی ذریعہ سے یونانی
علوم ہند مین آئے، وراہ مہر جو نہایت قدیم ہندو مہندس ہے اور جو اجین مین چھٹی صدی عیسوی
مین تھا، اپنی ہیئت کی کتاب مین یونانی اصطلاحین استعمال کرتا ہے، اور یونانیون کی طرف
اشارہ کرتا ہے، عربون کا علم کس طرح ہند مین آیا اسکا سمجھنا زیادہ آسان ہے، سنہ مسیحی سے
بہت پہلے عربون کے تجارتی تعلقات ہندوستان سے قائم تھے، اور عرب ہی مشرق اور مغرب کے
باہم ملنے کے ذریعہ تھے، اسکے بعد جب مسلمانون نے تمام قدیم دنیا کو فتح کر لیا تو یہ تعلقات مثل
سابق کے قائم رہے، اور ہمین عربی مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بغداد کے دربار مین
متعدد ہندو علما موجود تھے، اس سے بھی مابعد زمانہ مین جب مسلمانون نے ہندوستان پر حکومت
حاصل کی تو علمائے اسلام علوم کو برابر ملک مین پھیلاتے رہے، مثلاً گیارھوین صدی عیسوی مین
البیرونی نے جسکا زمانہ محمود غزنوی اول فاتح ہندوستان کا ہے، تمام ملک مین سفر کیا، اور علوم
عربی کو جو اسوقت بہت وسیع ہو گئے تھے، کیونکہ ان مین نہ صرف قدیم دنیا کے علوم موجود تھے بلکہ
خود عربون کی تحقیقات شامل ہو گئی تھی، ہندوستان مین پھیلایا، گیارھوین صدی عیسوی کے
بعد سے کہنا چاہیئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، پس ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی
ابتدا پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بھٹ کی ریاضیات سے ہوئی اور پھر ساتوین صدی مین

برہم گپت نے اسپر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک انہین مسائل سے بحث کرتے ہین جو ہندوون نے ان دو ذریعون سے آئے اسوقت ہمارے پاس ہندو علوم کی جو تصانیف موجود ہین اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوون نے خود ان علوم مین زیادہ ترقی نہین کی کسی زمانہ مین خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوون کا علم ہیئت بہت کچھ کامل ہو گیا تھا معلوم ہے لیکن اب یہ خیالات قائم نہین رہے، اور ان پر بحث کرنا بے فائدہ ہوگا۔ اگر ان تصانیف مین کوئی نیا مسئلہ بیان کیا گیا ہے تو محض استدلالاً اور بلا دلیل، مثلاً آریہ بھٹ چند سطرون مین زمین کی محوری حرکت روزانہ کا ذکر کیا ہے، لیکن کسی قسم کا ثبوت نہین دیتا، اسی طرح بارہوین صدی عیسوی مین بھاسکر چاریہ نے اس طریقہ حساب کی طرف جسکو کیلکولس کہتے ہین اشارہ کیا ہے لیکن اس سے آگے نہ بڑھا،

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوون نے علوم مین کسی قسم کی جدت نہین پیدا کی، جب انکی ذاتی تحقیقات کچھ نہین ہو تو پھر انکے علوم سے بحث کرنا اور محض ایسے مسائل پر ذکر کرنا جو عربون اور یونانیون کی تحقیقات سے لیے گئے ہین محض لاحاصل ہے اگرچہ ہندو علوم مین کم ہین لیکن عملی طور پر انھون نے بہت بڑی ترقی کی،،

عبارت بالا مین عربون سے مانسیو موصوف کی مراد "مسلمان" ہین، یہ غلط اصطلاح دوسرے یورپین مصنفون کی زبان و قلم پر بھی چڑھی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ قدیم عرب تعلقات کا جو ذکر مصنف نے کیا ہے اس سے اسکا اشارہ اُس زمانۂ قبل اسلام کی طرف ہے جب مشرق و مغرب یا ہندوستان و چین اور روم و یونان کے درمیان عرب تاجر سفیر اور متوسط کی خدمت انجام دیتے تھے، یورپ کا مال وہی ہندوستان و چین لیجاتے تھے، اور وہی ہندوستان کی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھون مین دیتے تھے، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ قدیم ہندوستان، قدیم عرب کے تمدن کی کسی کیفیت تاثر ہوتا اس تاثر کے آثار و علامات ہندوستان کے سنگی کتبات اور تحریری اوراق دونون مین ملتے ہین

ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اسوقت وہ خطوط اور کتبے (انسکرپشن) ہین جو مگدھ (بہار) کے
سوریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۰ ق م) کے مذہبی فرامین کی صورت مین ہندوستان کے پورے
طول وعرض مین پشاور سے گجرات و دکن تک پہاڑون پر اور لاٹون پر کندہ ملتے ہین، محققین فن خط
(ایکیرکٹر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے لیکن
خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی،

تمام آرین تحریرین بائین سے دائین طرف لکھی اور پڑہی جاتی ہین، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ
کتبے سامی تحریرون کی طرح داہنے سے بائین طرف لکھے ہوے ہین، اور اسی طرح سے پڑہے جاتے ہین
یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایہ تحریری اپنے وجود وبقا مین عربون کا ممنون کرم ہے[1]

ہمارے دعوی کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر وہ دستاویز ہے جو مہابھارت[2]
کی عدالت عالیہ سے ہمکو مل سکی ہے، ستیارتھ پرکاش کے گیارہوین سملاس مین سوامی دیانند لکھتے ہین کہ
مہابھارت مین جب کورون نے لاکہ کا گھر بناکر پانڈون کو اسکے اندر پھونک دینا چاہا تو بدہر جی نے یدہشٹر کو
عربی زبان مین بتایا، اور یدہشٹر نے اسی عربی زبان مین انکو جواب دیا، سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے تو
ہمکو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملیچھون کی زبان کسی زمانہ مین اسقدر مقدس بھی تھی کہ دیوتاون کے بڑے بڑے
اوتار اسکو بولتے تھے، اور اسمین ایک دوسرے سے راز کی باتین کہتے تھے،

بہرحال یہ قصے تو تاریخ کی یاد سے پہلے کے ہین، خدا جانے انکی بدگمان دنیا ان کہانیون کو سچ بھی
مانیگی یا نہین، اسلئے ہمکو وہ داستان چھیڑنی چاہیئے جو تاریخ کے ہوش کی باتین ہین، مسلمانون کے آفتاب
دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہوکر ملک مین جو روشنی پھیلائی ہم چاہتے ہین کہ تاریخ کے [illegible] شیشے کے
ذریعہ سے اسکی تحلیل کردین تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ واقعہ کیا ہے، مسلمانون نے ہندوستان آکر

[1] تاریخ الادب جلد ۱ صفحہ ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (ایجپشین یونیورسٹی) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ صفحہ ۱۰ طبع ۱۱،
[2] پہلا باب [illegible] ۴۳،

جن علوم کو پھیلایا اور جس تعلیم کو رائج کیا اترتیب وار ہم اسکی تشریح کرنی چاہتے ہین، اسکی بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس عہد کے ہندو مصنفین کا جائزہ لیا جاے اور دکھایا جاے کہ مسلمانون کے عہد حکومت مین انکی کیا تعداد تھی، کیا حیثیت تھی، کیا نوعیت تھی، اور کسی پچھلے زمانہ کی تعلیمی حالت کی تشریح کیلیے اسکے سوا کوئی اور تدبیر نہین،

ہمکو اس سے انکار نہین کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین مصنفین موجود تھے اور انکی خاصی تعداد ہے، انکی ابتدا بودھ مت کے زمانہ عروج سے ہوتی ہے، قدیم ہندوستان مین کہین کہین جو مدارس قائم تھے جنکا ذکر چینی سیاحون نے کیا ہے وہ اسی مذہب کے درسگاہ تھے، شنکر اچارج نے بدھ اور جین مت کو مٹاکر جب ویدک دہرم کا دوبارہ پرچار کیا، اور سنسکرت زبان نے بدھ والون کی پالی کو ہٹاکر خود اسکی جگہ لینی شروع کی تو اس جوش و ہیجان نے طبیعتون کو تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا، اور سنسکرت زبان جو پہلے صرف دعاؤن بھجنون اور منترون پر مشتمل تھی وہ علوم و فنون پر بھی حکمران ہوئی، تاہم مذہبی کتابون سے قطع نظر کرکے اسکا خالص سرمایہ تحریری اتنا بھی نہیں جو چند الماریون کی زینت ہوسکے، ہر علم پر تھیالوجی اور افسانون مین ملی جلی دو دو تین تین کتابین تھی، اس دعوی کی دلیل سنسکرت دان علماے اسلام[1] اور مستشرقین یورپ[2] کے بیانات ہین، اور سنسکرت کی سرزمین کی موجودہ پیمائش علمی ہے[3]،

مسلمانون نے انکو بتایا کہ افسانہ اور کہانی سے الگ کرکے علوم و فنون پر خالص علمی کتابین بھی لکھی جاسکتی ہین، اکثر قدیم تصنیفات صرف برہمنون کی ملکیت تھی، وسعت تعلیم نے برہمنون سے نکلکر ہندوستان کے دوسرے طبقون کو بھی یہ علمی آزادی بخشی گئی، اولاً جیسا کہ ہر نئی چیز کا قاعدہ ہے مسلمانون کی زبان سیکھنا برہمنون نے ناجائز قرار دیا تھا، اشلوک بناے گئے کہ مسلمانون کی زبان سیکھنا، اور جینیون کے مندر مین جا

[1] بیرونی کی کتاب الہند، ابوالفضل کی آئین اکبری کا دفتر سوم، [2] مثلاً تمدن ہند، انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، [3] دکن کالج پونہ مین سنسکرت کی مطبوعہ و قلمی کتابون کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، یہی کتابون اور دیگر نسخون کو ملاکر ۔۔۔ کتابون کی تعداد ہے،

ست ہاتھی کے آگے پڑنے سے زیادہ خطرناک ہے[1]، تاہم جیسا کہ پہلے نمبر میں ہم نے بتفصیل بیان کیا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ تعصب ہندوؤں سے کیونکر دور ہوا، اور سیکڑوں برس کے بعد سکندر لودی کے زمانے سے فارسی تعلیم نے ان میں عام اشاعت پائی،

اسلامی علوم میں سب سے پہلے تاریخ کا ذکر کرتے ہیں:

تاریخ

تاریخ وہ فن ہے جس کی طرف قدیم ہندو دماغ نے کبھی توجہ ہی نہیں کی، لیبان تو کہتا ہے کہ اسکے نزدیک ہندوؤں کا دماغ ناموزون معلوم ہوتا ہے[2]، آریہ ورت انسانیت کا ——— نہایت قدیم گہوارہ ہے اگر یہاں انسانوں کے پچھلے تاریخی کارناموں کو محفوظ رکھنے کی لیاقت ہوتی تو بہت سے قدیم عقدے آج ہمارے لیے پیچیدہ نہ ہوتے، ہندوستان کی پرانی داستان سننے کے لئے ہمکو یونان اور چین کے سیاحوں کے پاس جانا پڑتا ہے، خود ہمارے گھر میں اپنی دنیا کی پچھلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ نہیں ہے ویدوں کے کہنہ اوراق، منوشاستر کے قانونی دفعات، مہابھارت کے رنگین صفحات، رامائن کی پردرد کہانیاں، اور اپنشد کی پیاری پیاری باتیں، ان میں سے کوئی چیز قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ہمکو پتہ نہیں دیتی،

آغاز عالم سے زمانۂ اسلام تک ہندوستان میں جو سیاسی انقلابات ہوئے، ملک کے صوبہ صوبہ پر جو حکمران فرمانروائی کرتے رہتے تھے، بڑے بڑے عالم، فاضل اور پنڈت پیدا ہوئے انکے تاریخی حالات کا آج پتہ لگانا چاہو، صحیح تاریخ ولادت، وفات اور سوانح حیات جاننا چاہو تو قیاس کے سوا کوئی روشنی تمہاری رہنمائی نہ کریگی، پرانوں سے صرف رشیوں اور منیوں کے کچھ کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ تاریخ نہیں،

لیکن اسی غیر تاریخی ملک میں جب مسلمانوں کا قدم آتا ہے تو یہاں کا آسمان و زمین بدلجاتی ہے،

[1] ستیارتھ پرکاش، سمولاس ۱۱ [2] تمدن ہند صفحہ ۲۳۹،

آریہ ورت کا ذرہ ذرہ چمک اٹھتا ہے، مسلمان سلاطین، امرا، علما، شعرا اور دوسرے اکابر رجال کو چھوڑ کر مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے خود ہندو راجاؤں، پنڈتوں، شاعروں اور امیروں کے حالات اس قدر لکھے ہیں کہ یہ بآسانی دعوی کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہزار ہا سال جو ہندو قوم پر گذرے [اس زمانہ کے] (میتھالوجیکل) تمام ہندو علما اور امرا کی فہرست جتنی طویل بنائی جا سکتی ہے مسلمانوں کی آمد کے بعد صرف آخری سو برس کے عرصہ میں اس سے دوچند بلکہ سہ چند بڑی فہرست مع احوال تاریخی پیش کی جا سکتی ہے، صرف تیموریوں کے زمانہ میں جو ہندو امرا اور علما گذرے ہیں انکے حالات و بیانات دو تین جلدوں میں سما سکتے ہیں، ہندو فارسی شعرا کے نام و سوانح باایں ہمہ قومی بیگانگی ہمارے فارسی تذکرے جو خاص مسلمانوں کے قلم سے نکلے ہیں اس قدر سنا سکتے ہیں کہ آپ سنتے سنتے گھبرا اٹھیں گے،

آج یورپ کے دعوی آزادی و مساوات کے شور و ہنگامہ نے دنیا کو چھا لیا ہے، ممالک مفتوحہ میں اشاعت تعلیم کی یہ کثرت انکا بیان ہے کہ صرف ہمارے دور حکومت کی خصوصیت ہے، ہم کہتے ہیں بجا ہے، اور درست ہے، جاؤ اور انگریزی قلم کے تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، انکی انسائیکلوپیڈیا میں الٹ پلٹ ڈالو، انکی تاریخ اور تذکروں کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش، اور اس محنت کے بعد ہمکو بتاؤ کہ مغرور انگریزی قلم نے آبحیات سے نکلنے کے بعد کتنے علما، فضلا، اور شعرا کے نام زندہ کئے ہیں، اور کتنے اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ حکمران قوم اپنی شاہی زبان میں اور اس پریس کے عہد میں انکے تذکرے لکھے، پھر کیا ظالم، بت شکن، اور ہیچ مسلمانوں کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائیگی کہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوم کے فضلا کو ایک نظر سے دیکھا اور اس حکمران قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی درباروں میں دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی،

علاوہ ازیں مسلمانوں کے تاریخی ذوق نے ہندوؤں میں اس فن کی تعلیم و ترقی کا وہ جوش پیدا کیا کہ آج بھی اگر یورپ اور ہندوستان کے کتبخانوں کا جائزہ لیا جاے تو ایک بیش بہا گراں قیمت سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے،

۱؎ گذشتہ تاریخ سے بحث نہیں، بلکہ زمانہ رواں کا سوال ہے۔

ہمارے سامنے تو اسوقت یورپ اور ہندوستان کے مادی کتبخانے نہیں صرف حیدرآباد، بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اور لندن کے کتبخانوں کی فہرستوں کے معلومات ہیں، تاہم انھوں نے ہندو زبان کے فارسی مصنفین کے (جو عہد اسلامی کے علمی و تعلیمی کوششوں کے نتائج کلی ہیں) حالات بہم پہنچائے ہیں، ہم کہ صرف انہیں ہیں، سب سے پہلے ہم اس عہد کے ہندو مورخین کا تذکرہ کرتے ہیں،

راج ترنگنی | پیش نظر مواد جہاں تک ہماری اعانت کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخ جو کسی ہندی قلم نے لکھی وہ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی ہے، یہ کتاب ہندی میں سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی[1]، (سلطان ۸۲۳ھ میں تخت نشین ہوا تھا) مصنف کا نام کلہانا ہے، اکبر جب کشمیر گیا ہے تو یہ کتاب اسکے دربار میں پیش کی گئی، اور اسکے حکم سے اسکا فارسی میں ترجمہ ہوا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اسمیں کشمیر کے متعلق پانچ ہزار برس کا حال لکھا ہے، والیان کشمیر کے درباروں میں تاریخ نویسی کا خاص عہدہ تھا اور یہ کتاب اسی کوشش کا ثمرۂ نورس تھی[2]،

اصل متن کتاب فرانس اور ہندوستان میں چھپ گئی ہے[3] اور فارسی نسخہ بھی مطبوع ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو شاہجہان کے زمانہ میں ایک عارف جوگی تھے شہزادہ داراشکوہ انہیں کا مرید تھا، لال جی داس، بابا لال گرو کا چیلا تھا، بابا کا سنہ پیدائش ۱۰۱۴ھ ہے ۱۰۶۵ھ تک وہ زندہ تھے، لال جی داس نے ۱۰۶۵ میں گرو کے حالات و ملفوظات کو فارسی میں جمع کیا، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری میں اسکا ایک نسخہ ۱۱ سنہ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا موجود ہے،

بنوالی داس ولی | شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی تھا، بعضوں نے اسکا نام بھوانی داس لکھا ہے، کتبخانہ آصفیہ کے فہرست نویس نے ولی رام گوسائین (داراشکوہی) نام بتایا ہے، بنوالی اور بھوانی تو کتابت کی تصحیف ہے، ولی اسکا تخلص نام میں داخل ہو گیا ہے، اس نے شاہان دہلی کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا نام راجاولی ہے،

۱؎ تاریخ فرشتہ، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۳۳۸، ۲؎ آئین اکبری، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۱۰۳، ۳؎ دکن کالج لائبریری کیٹلاگ صفحہ ۱۹۹،

کتاب مستند ہے اور بہت سی معتبر کتابون مین اسکے حوالے ہین، اسکے قلمی نسخے اکثر کتبخانون مین موجود ہین،

رای بندرابن | رای بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے ۲۰ سنہ جلوس شاہجہانی مین حسن خدمات کے صلہ مین رای کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا تھا، اسکے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت کیا اور رای کا خطاب بخشا، بندرابن نے لب التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسرداس | قوم ناگر پٹن کا باشندہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ بچپن سے ۳۰ سال کی عمر تک وہ قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب المتوفی ۱۰۹۸ھ کی خدمت مین حاضر ہوکر تحصیل علم کرتا رہا ہے، امراء اور اعیان دولت جو قاضی صاحب کی خدمت مین آیا کرتے تھے انکے مباحثات اور گفتگوؤن کو بغور سنتا تھا اور ان سے فوائد حاصل کرتا تھا، تکمیل علم کے بعد ایسرداس، شجاعت خان حاکم گجرات کی وساطت سے جودھپور کا امین مقرر ہوا، وہ ہاتھ جو ۳۰ برس تک صرف قلم سے مانوس رہا تھا، تلوار کے قبضہ پر بھی مضبوط تھا، اس نے میدان جنگ مین کامیابی حاصل کی، بادشاہ کی طرف سے صوبہ مین اسکو جاگیر عنایت ہوئی، اور دو دست نیم صدی افسر مقرر ہوا، عہد عالمگیری کے ان حالات مین جو ایک فوجی افسر ہونے ۳۰ سال کا تجربہ ہی طالب علم نظر آتا ہے اور فتوحات عالمگیری نام ایک بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے

بھیم سین کایستھ | رگھونندن داس اسکے باپ کا نام تھا، ۲۳ سنہ جلوس شاہجہانی (۱۰۶۳ھ) برہانپور دکن مین پیدا ہوا تھا، اسکا ایک عزیز جگنداس عالمگیر کے دربار مین دیوان تھا، اور دیانت رای کے خطاب سے ممتاز تھا، بھیم سین نے بندیلہ کے حاکم راؤ دلپت کی سرکار مین نوکری کی، راو دلپت دکن کی لڑائیون مین نہایت کارآمد سردار ثابت ہوا تھا، عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنا دیا،

بھیم سین گو کایستھ تھا لیکن قلعہ نالدرک کی قلعہ داری اس نے نہایت خوبی سے کی، ۱۱۲۰ھ مین نوکری سے مستعفی ہوکر اپنے وطن مین گوشہ نشین ہوگیا، اور اب موقع آیا کہ تلوار کی بجاے قلم کا حق ادا کرے، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ لکھی جو اب تک موجود ہے،

نرائن کول عاجز | باشندۂ کشمیر اپنی تصنیف کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ ایک مدت سے شرفاے کشمیر کا تقاضا تھا کہ

انکے وطن کی ایک تاریخ لکہدون، بالآخر بیگان وطن کے اصرار سے مجبور ہوکر مین سنے یہ بار امانت اوٹھالیا اوسی زمانہ مین عارف خان کشمیر کے دیوان اور نائب صوبہ دار کے حکم سے ملک حیدر نے سنسکرت سے کچہہ حصہ ترجمہ کیا تہا وہ میرے حوالہ کیا گیا، مین نے اسکو دیکہا تو قابل اصلاح نظر آیا، بالآخر اصل سنسکرت سے مقابلہ کرکے اسکو بہی اپنی کتاب مین شامل کرلیا ۱۱۳۳ھ مین تاریخ کشمیر تکمیل کو پہنچی،

منشی بیرمن گوبردہن | معتمد خان کے منشی تہے، معتمد خان نے بہائیون کی لڑائی مین عالمگیر کا ساتہہ دیا تہا، اوس کے بعد ۱۰۷۱ھ مین وہ گوالیار کا حاکم مقرر ہوا، منشی بیرمن نے اس تقریب سے اسی زمانہ مین گوالیار نامہ کتاب لکہی، جسمین راجہ بکرماجیت کے ۳۳۶ برس بعد سے لیکر معتمد خان کی حکومت کی زمانہ تک گوالیار کی تاریخ مرتب کی،

جسونت رائے | ولد بہگونت رائے، ولد سندر داس منشی لاہوری فارسی زبان کا فاضل اور شاعر تہا، پہلے بیدل خان کے یہان نوکر تہا، ۱۱۳۱ھ مین کرنال گیا اور نواب سعادت اللہ خان کے دربار مین رسائی پیدا کی اور ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا، نواب نے قدردانی کی اور جسونت رائے نے وہین سکونت اختیار کرلی، اور سعید نامہ کے نام سے نواب سعادت اللہ خان اور انکے خاندان کی تاریخ لکہی،

منشی ٹہاکر لال | ولد بہوج داس کایستھہ، ماتر ضلع برہان پور کا رہنے والا تہا، ۱۱۳۹ھ مین اس نے ایک کتاب لکہی جسکا نام "دستور العمل شاہنشاہی" رکہا، اسمین اس نے ہندوستان اور دکن کے واقعات بطور فہرست ترتیب دیئے ہین،

منشی سجان رائے کہتری | یہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ مین تہا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت ضخیم اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکہی، اور اس کوشش اور محنت سے لکہی کہ وہ مستند کتابون کی فہرست مین داخل ہی، منشی موصوف اپنے کو پٹیالہ کا رہنے والا بتاتا ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ حیدرآباد اور لندن کے کتبخانہ مشرقی مین موجود ہے، ۱۱۲۰ھ مین وفات پائی،

بندرابن داس | بندرابن داس بہادر شاہی، بہادر شاہ اول کے دربار کے متوسلین مین تھا، اسنے ۴۰ جلوس عالمگیری مطابق سنہ ۱۱۰۷ھ مین اس نے خلاصۃ التواریخ نام کتاب لکھی، اسمین ہندوستان کی تاریخ ابتدائی قدیم زمانہ سے لیکر عہد عالمگیری تک ترتیب دی ہے، عربی آمیز فارسی عبارت اس خوبی سے لکھی ہے کہ ایرانی قلم کا اسپر دھوکا ہوتا ہے، مقدمہ مین اپنے ماخذ گنائے ہین، واقعات کا نہایت استقصا کیا ہے، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ سنہ ۱۲۲۰ھ کا لکھا ہوا دیسنہ (بہار) کی الاصلاح لائبریری مین موجود ہے،

جگجیون داس | ولد منوہر داس، باشندہ گجرات، محمد اعظم شاہ کی سرکار مین ڈاک کا مہتمم تھا، چونکہ خفیہ سرکاری کاغذات اسکی نظر سے گذرتے تھے، اسلیے اسکو واقعات کے جمع کرنیکا شوق پیدا ہوا، سنہ ۱۱۱۹ھ مین بہادر شاہ اول نے لاہور کے دربار مین باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر اسکو مامور کیا، سنہ ۱۱۲۰ھ مین اس نے اپنی محنتون کا ثمرہ منتخب التواریخ کے نام سے لکھکر پیش کیا، اسکے صلہ مین دربار شاہی سے خطاب و خلعت و انعام حاصل ہوا،

کامراج | ولد نین سنگھ، بھپھوند ضلع اٹاوہ اسکا وطن تھا، شہزادہ محمد اعظم کی سرکار مین مالوہ مین اسکو حاضری کا موقع ملا، اعظم الحرب کے نام سے اس نے شہزادہ کی لڑائیون کے حالات لکھے، کامراج دیباچہ مین لکھتا ہے کہ بہت سے واقعات خود شاہی وقائع نگارون نے اسکے لیے بہم پہنچائے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدتمندی کے ساتھ اپنے کو تیموری دربار کا تین پشت سے نمکخوار بتاتا ہے،

کشن چند اخلاص کھتری | شاہجہان آبادی، شاگرد مرزا عبدالغنی قبول کشمیری، اسکا باپ اچل داس فارسی کا شاعر تھا، کشن چند نے ہمیشہ بہار کے نام سے سنہ ۱۱۳۶ھ مین تذکرۂ شعرا لکھا، اسمین اکبر سے لیکر محمد شاہ کے عہد تک کے فارسی شعراء کے حالات و سوانح ہین یہ تذکرہ اسقدر مستند ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ کی تالیف مین اسکو اپنا ماخذ قرار دیتے ہین اور علانیہ اس سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہین، اس کتاب کے نسخے بانکی پور اور حیدرآباد کے کتبخانون مین ہین،

لال رام | باپ کا نام دولہ رام اور دادا کا نام رائے گجن، رائے گجن عالمگیر کے عہد حکومت مین کسی عہدہ پر ممتاز اور رائے کے خطاب سے مشرف تھا، دولہ رام بھی رائے کے خطاب سے مخاطب اور عہدہ داران شاہی مین داخل تھا، خود لال رام محمد شاہ کی سرکار مین نوکر تھا، ۱۱۴۹ھ مین تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر دربار شاہی مین تحفۃً پیش کی،

خوشحال چند | کسی زمانہ مین شاہ عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا ۱۱۶۳ھ اسکی تاریخ وفات ہو، اسکی وفات کے بعد اسکی جگہ اسکے بیٹے کو ملی، تاریخ نادرالزمانی خوشحال چند کی بہترین تصنیف ہے،

ہیرالال خوشدل | یہ غالبًا دکن کا باشندہ ہوگا، قطب شاہیہ دکن کی اس نے منظوم تاریخ لکھی ہے، زمانۂ وجود معلوم نہین، دسوین صدی ہجری کے آخر مین یا گیارہوین صدی کے اول مین اسکو ہونا چاہیئے قطب شاہیہ کا زمانۂ حکومت یہی ہے، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ہے،

مہاراجہ کلیان سنگھ | کلیان سنگھ کا دادا رائے بہت سنگھ دہلی کا ایک کایستھ، امیرالامرا صمصام الدولہ کی سرکار مین دیوان تھا، اسکے بیٹے شتاب رائے نے بڑا عروج حاصل کیا، دربار شاہی سے ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے نام سے مخاطب تھا، اور سلطنت کی طرف سے صوبہ بہار کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، خود بھی فاضل تھا اور فضلاے وقت کا قدردان بھی تھا، ۱۱۸۷ھ مین اس نے وفات پائی تو اسکا بیٹا انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ کے نام سے صوبہ کی نظامت (گورنری) پر مامور ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا، خلاصۃ التواریخ اسکی تصنیف ہے، جسمین امیر تیمور سے لیکر اپنے زمانہ تک کے حالات اس نے لکھے ہین، اسکی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے جو صوبۂ بہار کی تاریخ ہے،

شیوداس لکھنوی | شیوداس نے شاہنامہ منور کلام کے نام سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ) سے محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے زمانہ تک کے حالات لکھے ہین، دربار شاہی مین بہت دنون تک یہ منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر ممتاز رہا،

روپ نرائن | ولد ہری رام کھتری، ساکن سیالکوٹ، اس نے ۱۱۶۹ھ مین ہندوؤن کے مقدس مقامات کے

حالات وکیفیات لکھے، کتاب کا اصلی نام «جامع عالم» اور تاریخی نام مخزن العرفان ہے،

رائے چترمن | قوم کا یستھ سکسینہ، اس نے وزیر الملک غازی الدین خان کی فرمائش سے ہندوستان کی تاریخ لکھی، اور اسکا نام چار گلشن رکھا، یہ کتاب چار گلشنون پر منقسم ہے، گلشن اول بادشاہان ہند کے حال مین، گلشن دوم صوبون کے حال مین، گلشن سوم دہلی سے چارون طرف بڑے بڑے شہرون تک جو سڑکین گئی ہین، انکی پیمائش اور ایک ایک منزل کا حال، (یہ باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے) گلشن چہارم مین ہندو فقیرون اور جوگیون کے حالات اور سلسلے ہین، ۱۱۷۳ھ مین یہ کتاب اتمام کو پہنچی،

درگا داس | باپ کا نام شیو گوپال داس، سفینۂ عشرت ایک فارسی تذکرہ کا مصنف ہے، ۱۱۸۳ھ مین تذکرہ تالیف پایا، عجب نہین کہ یہ حزین کا شاگرد ہو،

انند روپ | ضلع نارنول (مدراس) کا ایک برہمن تھا، مکھاوجی بھونسلا کے دربار مین کچھ دنون نوکر رہا تھا، نصیر الملک نصیر جنگ کے معاملہ مین ناگپور سے الہ آباد آیا، یہان اس نے ۱۲۰۳ھ مین میزان دانش لکھی جو "جنگ" کے اعتبار سے چار حصون مین منقسم ہے،

منا لال | ولد بہادر سنگھ، اس نے شاہ عالم کے دور حکومت کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا آغاز ۱۱۸۴ھ سے ہوتا ہے، جب شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رخ کیا ہے،

رائے کیول رام | ولد رگھناتھ داس اگروال، اطراف دلی مین قصبہ کسنا اسکا وطن تھا، ۱۱۹۴ھ مین اس نے تذکرۃ الامرا نام ایک کتاب لکھی، دیباچہ مین بیان کیا ہے کہ یہ کتاب شاہی دفترون اور تاریخ ناموں سے مرتب کی گئی ہے،

دلپت رائے | مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ، اسکا مولد احمد آباد گجرات ہے، اسکا باپ گلاب رائے یہان متصدی تھا، دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا زبانون مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، ۱۰ برس کی عمر مین جے نگر (جی پور) آیا اور مہاراجہ مادھو سنگھ کے حکم سے ملاحت مقال لکھنی شروع کی اور ۱۱۸۱ھ مین مہاراجہ کے مرنے کے بعد اسکو تمام کیا،

گذشتہ اوراق میں ان ۲۰ ہندو فضلاء کے نام گنائے گئے ہیں جو تاریخ کے فن میں ممتاز ہوئے ہیں بادجودیکہ تمام معلومات سامنے نہ تھے، یہ داستان اتنی بسیط کہ عہد سابق میں پوری نہ ہو سکی، جہاں سے یہ کہانی چھوٹی تھی وہیں سے اب پھر شروع ہوتی ہے،

بندرابن خوشگو | قوم ویش، باشندۂ متھرا، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذۂ فن کا شرف تلمذ حاصل تھا سراج الدین علیخان آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد افضل سرخوش اور شیخ سعد اللہ گلشن کی صحبتیں اٹھائی تھیں نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل تھا، سفینۂ خوشگو، تذکرۃ المعاصرین، دو تذکرے لکھکر نواب عمدۃ الملک امیر خان کی سرکار میں پیش کئے، نواب نے قدر دانی کی اور دو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا، نواب کی وفات کے بعد ترک دنیا کر کے عظیم آباد پٹنہ میں اقامت اختیار کی، ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی، کتبخانہ بانکی پور میں اس تذکرہ کا جو نسخہ ہے وہ علامہ آزاد بلگرامی کا مملوکہ ہے، اور انہیں کی فرمائش سے ۱۱۸۳ھ میں نقل کیا گیا ہے گل رعنا کے مولف نے اس تذکرہ سے فائدہ اٹھایا ہے؛

پنڈت کرشنانند | پنڈت انند گھن کا بیٹا تھا، اس نے تاریخ شاہان ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی اسکا متعین زمانہ نہیں معلوم، لیکن ۱۱۶۰ھ یعنی تقریباً ۱۷۴۳ء میں موجود تھا،

بدھ سنگھ | قوم کھتری، اس نے سکھ فرقہ کی تاریخ ۱۱۷۰ھ سے اپنے زمانہ تک لکھی ہی، اسکو اس کتاب کی تالیف میں لالہ عجائب سنگھ سے بہت مدد ملی کتاب کا نام رسالہ نانک شاہ ہے سنہ تالیف معلوم نہیں،

رگھوناتھ | غالباً مرہٹہ ہے اس نے ۱۱۹۸ھ مین حالات مرہٹہ کے نام سے انکی تاریخ لکھی،

شیو پرشاد | نواب فیض اللہ خان روہیلہ کی سرکار مین نوکر تھا، ۱۱۹۱ھ مین اس نے تاریخ فیض بخش کے نام سے روہیلہ پٹھانون کی تاریخ لکھی،

کمند رائے | اس نے راجہ ہولکر کے سیاسی خطوط کا فارسی مین ترجمہ کیا، ایک نسخہ کتبخانہ آصفیہ مین ہے، خط ہولکر نام ہے، ۱۲۱۱ھ سنہ تالیف ہے،

موہن لعل انیس | ولد رائے تولا رام قانونگو، قوم کایستھ، باشندہ لکھنؤ، فارسی شاعری مین مرزا فاخر مکین کا شاگرد تھا، انیس الاحبا کے نام سے ۱۱۹۷ھ مین اس نے مرزا مکین اور انکے تلامذہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا، اس تذکرہ مین مرزا مکین کے چھ ہندو شاگردون کے بھی حالات ہین۔

ہرنام سنگھ | ولد گوردا سنگھ، ملا نواح لکھنؤ کا باشندہ سرسوتی برہمن تھا، بچپن سے عین الدین خان حاکم بریلی کے زیر سایہ رہا، تاریخ سعادت جاوید اسکی بہترین یادگار ہے، معین الدین خان کا زمانہ حکومت بریلی ۱۱۹۵ھ سے ۱۲۰۰ھ تک ہے،

رنچھوڑجی | ولد امرجی دیوان، رنچھوڑجی نے ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء مین تاریخ سورٹھ لکھی، اسمین جوناگڑھ اور ناگر قوم کے حالات درج کئے ہین،

لچھمی نراین شفیق | لاہور وطن تھا، اسکا دادا عالمگیر کے ساتھ ہم دکن مین گیا، اور اورنگ آباد دکن مین سکونت اختیار کرلی، اسکا باپ رائے منسا رام نواب آصفجاہ کا دیوان تھا، لچھمی نراین شفیق ان ہندو فضلا مین سے ہے جنکی قابلیت اور علم پر زمانہ فخر کرسکتا ہے، علامہ آزاد بلگرامی کا شاگرد اور عالیجاہ بہادر کے سلک ملازمین مین داخل تھا، تاریخ کا ذوق استاد آزاد سے وراثت مین پایا تھا، چنانچہ اس فن مین اسکی متعدد تالیفات ہین، گل رعنا اور شام غریبان دو شعرا کے تذکرے ہین، ۱۲۰۵ھ مین حقیقتہاے ہندوستان لکھی، خلاصۃ الہند بھی اسی کی تصنیف ہے، تاریخ آصفی اسکی پانچوین تالیف ہے، لیکن سب سے بہتر اور عمدہ تر تصنیف بساط الغنائم

جسمین اس نے مرشدون کی تاریخ قلمبند کی ہے،

ہرسکھ راے | جیون داس کا بیٹا، اور بسنت راے کا پوتا، قوم کھتری، وطن لاہور، اس نے اپنے ماموں سری نارائن کے مشورہ سے سنہ ۱۲۱۴ھ مین مجمع الاخبار لکھی شروع کی، اور سنہ ۱۲۲۰ھ مین اسکو اختتام کو پہنچایا، اس سے چند سال پیشتر سنہ ۱۲۱۱ھ مین زبدۃ القوانین نام ایک نہایت کارآمد اور پر معلومات کتاب لکھ چکا تھا اسکا ذکر آگے آئیگا

منشی متا لال | ولد منشی بہادر سنگھ، دفتر خالصہ شاہی کے منشی تھے، شاہ عالم کے روزنامچہ لکھنے پر مامور تھے، یہ روزنامچہ شاہی کتبخانہ بانکی پور مین موجود ہے، اس سے منشی موصوف کی لیاقت تحریر اور قوت مشاہدہ ثابت ہوتی ہے روزنامچہ کا آخری ورق شاہ عالم کے صحیفۂ حیات کے اختتام پر (سنہ ۱۲۲۱ھ) تمام ہوا ہے،

راے امر سنگھ خوشدل | ولد جیون رام کایستھ، اصلی وطن کنڑہ مانکپور تھا، نواب شجاع الدولہ کے عہد مین سرکار غازیپور کا ناظم (حاکم اعلی) تھا، امر سنگھ نہایت لائق اور فاضل تھا، تعلیم سے فارغ ہوکر مہاراجہ اجیت سنگھ راجۂ بنارس کی سرکار مین نوکر ہوا، اور آخر سرکار کمپنی کی طرف سے علی گڈھ کا ناظم مقرر ہوا، اس نے تاریخ فرمانروایان ہنود لکھی ہے جو آغاز سے لیکر سلطان علاؤالدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوئی ہے، اسکی دوسری تاریخی تصنیف بزم خیال ہے جسمین خاص مشاہدات اور احوال موجودہ کی بنا پر اپنے ملک کے حالات لکھے ہین، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سنہ ۱۲۱۱ھ تک ساتھ ساتھ انگریزون کے حالات بھی لکھتا گیا ہے سنہ ۱۲۲۵ھ مین وفات پائی،

دولت راے | منشی دولت راے کایستھ، بہاول خان المتوفی سنہ ۱۲۲۴ھ بانی ریاست بہاولپور کے مصاحب خاص تھے بہاولپور کا خاندان عباسی ہے، اس مناسبت سے مرآۃ دولت عباسیہ کے نام سے بہاولپور کی تاریخ لکھی سنہ ۱۸۴۸ء مین یہ کتاب چھاپی گئی تھی،

راے بھگوان داس | کایستھ، متخلص بہ ہندی، ولد دلپت داس ساکن کالپی، تعلیم و تربیت لکھنؤ مین ہوئی ملا سید یوسف سہارنپوری سے تحصیل علم کی، نواب آصف الدولہ کی سرکار مین معزز عہدہ پر ممتاز ہوے پھر معتمد الدولہ مہاراجہ ٹکیت راے نائب دیوان شاہ اودھ کی مصاحبون مین داخل ہوگئے، دو تذکرے انکی علمی زندگی کی یادگار ہین

حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی، حدیقہ میں گذشتہ شعرا اور سفینہ میں معاصرین کے حالات ہیں، اسکی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۹ھ ہے،

سوہن سنگھ | موہن رائے ہلکر کی سرکار میں ملازم تھا، عربی وفارسی علوم میں بہرہ وافر رکھتا تھا، آقا کی فرمائش سے وقائع ہلکر کے نام سے ملہر راو ہلکر وریاست اندور کے حالات لکھے، ۱۲۳۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی،

منشی بہترمل | ولد بسنت رائے پران چند، اسکی سب سے نادر تصنیف تو دیوان پند ہے جسمیں مالیات ہند پر اس نے بحث کی ہے، اسکی تاریخی تصنیف عمارات الاکبر ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر آباد کی عمارتون کا حال ہوگا، اسکی یہی تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس سے زمانہ معلوم ہو سکتا ہے،

بسا ون لال شادان | بلگرام کا باشندہ، امیر الدولہ محمد امیر خان کے دربار میں نائب میر منشی تھا، اور اسی کے حکم سے ۱۲۲۰ھ میں امیر نامہ لکھی، یہ درحقیقت امیر خان کی سوانح عمری ہے.

سندر لال کول | ولد نوبت رائے، متھرا کا باشندہ دفتر خالصہ میں میر منشی تھا، ۱۲۳۱ھ میں اس نے گل بیخزان لکھی جو بیا ابواب پر منقسم ہے، تین پہلے ابواب میں دہلی، متھرا اور بندرابن کے حالات ہیں، اور چوتھے میں افسانہ ہے،

منشی سدا سکھ لال | تخلص بہ نیاز، نجف خان کے زمانہ میں بہ آگرہ کے سررشتہ دار تھے، ۱۲۳۴ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں دلی چھوڑکر الہ آباد آگئے تھے، مرزا قتیل، میر تقی و خواجہ میر درد وغیرہ کے معاصرین میں تھے، الہ آباد میں منتخب التواریخ نام ایک کتاب لکھی، سرہنری ایلیٹ اپنی تاریخ میں اسکا حوالہ دیتا ہے،

بہادر سنگھ | ہزاری مل کا بیٹا اور لچھمی چند کا پوتا تھا، اصل وطن گو شاہجہان آباد تھا، لیکن الہ آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی، یہان عربی فارسی اور ہندی کی تاریخی کتابون سے مواد فراہم کرکے یادگار بہادری کے نام سے تمام دنیا کی تاریخ لکھی، اسکا سال اختتام ۱۲۲۹ھ ہے،

رتن سنگھ | منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنؤ، قوم کا بیتھ، اسکا خاندان تین پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدون پر ممتاز رہتا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا، اسکے اصلی

کمالات مصنف کے زیر عنوان ظاہر ہونگے، اسکا دادا راجہ بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی مین اتالیق تھا
اور عہد حکومت مین دیوان تھا، رتن سنگھ نے منجملہ تصنیفات کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہان اودھ
کی تاریخ مین لکھی ۱۲۵۸ھ مین ساٹھ برس کی عمر مین یہ کتاب اس نے ختم کی،

رام سہا سنگھ | متخلص بہ مکرت، اس نے منشی سیتل سنگھ بیخود کے حالات مین حقیقتہاے بیخود کے نام سے ایک
کتاب لکھی جو ۱۲۸۴ھ مین چھپکر شائع ہوئی،

پنڈت کشن نراین | مولف نظارۃ السند فن تاریخ مین ہے، زمانہ نہین معلوم لیکن ایشیاٹک سوسائٹی مین
اسکا جو نسخہ ہے وہ ۱۷۵۹ء کا لکھا ہوا ہے،

لالہ سیتل چند | آگرہ مین رہتے تھے، غدر سے بہت پہلے مدرسہ آگرہ مین مدرس تھے، انھون نے تعریف العمارت کے
نام سے نہایت محنت کاوش اور تحقیق سے اکبرآباد آگرہ کی ایک ایک عمارت کا حال لکھا، اور اسکے نقشے شامل کیے،
یہ کتاب نہایت مفید اور پُراز معلومات ہے، لالہ صاحب غدر سے بہت پہلے مدرسہ آگرہ مین مدرس تھے،

منشی مہتاب سنگھ | قوم کایستھ مستوطن کانپور، مولف "تاریخ ہزارہ" اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مین ہے

گردہاری لال | مولف تاریخ ظفر دکن، اسکا قلمی نسخہ کتبخانہ آصفیہ مین ہے، حال سنہ نہین معلوم فلسفی کے لقب سے مشہور تھے

راجہ کندن لال | اپنے زمانہ کے مشہور فاضل تھے، فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، دہلی وطن تھا ۱۲۳۶ھ مین قرطاس
لکھی، انکی ایک تاریخی تصنیف تنقیح الاخبار ہے جسمین زیادہ تر خود اپنے حالات لکھے ہین،

تین اور چار دو نمبرون مین ہم ہندو مورخون کا تذکرہ ہوا، انکے زمانون پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ
یہ صرف ڈہائی سو برس کی مدت کے اندر پیدا ہوئے ہین، یہ تعداد بھی بہت کچھ بڑھ سکتی ہے، کیونکہ ہندوستان کے
سیکڑون ہزارون ذاتی کتبخانون کے معلومات حاصل کرنیکے ذرائع ہمارے پاس نہین ہین، اور بہت سی ایسی کتابین ہین
جو جاہل خاندانون کی غفلت کی نذر ہوگئی ہین، تاہم اتنی مختصر تعداد سے بھی ہمکو تسلی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ اس
اسکولون اور کالجون کے عہد مین سوا سو برس کے اندر انگریزی کے ہندو مورخین اتنے بھی پیدا نہو سکے،

پھر اس نکتہ کو بھی فراموش نکرنا چاہیئے، آج انگریزی تاریخ کی کچھ کتابین جو بنگالی یا دکنی برہمن مصنفون کے قلم سے نکلی ہین، وہ صرف یونیورسٹیون کے سامنے پر لکھی گئی ہین، کہ وہ کورس مین داخل ہو سکین، اور انسے کچھ تاجرانہ منافع حاصل ہو، لیکن گذشتہ شاہی زمانہ کے مصنفون کی یہ حالت نہ تھی، انکا محرک یا محض شوق علمی تھا یا سلاطین اور امرائے ملک کی قدرشناسی،

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ باوجود ہمہ آجکل تاریخ کی جو کتابین ہندوستانیون نے لکھی ہین یا لکھی جا رہی ہین وہ زیادہ تر کتابون کی ورق گردانی اور اگلے مصنفون کی دانائی کے ساتھ نقل صورت ہے، وہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کے بعد نہین، بلکہ محض کتبخانون کی الماریون کی تلاش کے بعد لکھے گئے ہین، وہ دنیا کی وسیع فضا مین چل پھر کر نہین بلکہ بلند ایوان لائبریرین کے تہخانون مین بیٹھکر ترتیب پائی ہین، اپنی آنکھون سے مشاہدۂ حقائق اور استنباط نتائج کی بنا پر نہین لکھی گئی ہین بلکہ صرف اپنی دماغی محنت وکاوش اور کتابی تلاش و تفحص کی مدد سے لیکن جن اگلے ہند مورخون کا ہمنے تذکرہ کیا ہے انکی تصنیفات زیادہ تر مشاہدۂ فطرت، معائنہ حقیقت اور مطالعۂ واقعات کے نتیجے ہین،

ان مصنفین کے حالات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان مین زیادہ تر ایسے تھے جو شاہی دفاتر کے ذمہ دار افسر تھے، ان مین بہت سے دفتر شاہی کے منشی، وقائع نویس اور دیوان تھے، انکی نگاہ سے سلطنت کا کوئی راز چھپا نہ تھا سیاسی، انتظامی، اور مالی ایک ایک جزئی واقعہ پر انکو عبور رہتا، اسلئے وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے، اور یہی سبب ہے کہ انکو اپنے تاریخی اوراق کے مرتب کرنیکا سب سے بہتر موقع ملتا تھا،

۵

ہندو فارسی شعراء

محکوم قوموں کو حاکم قوم کی زبان سے کسی طرح استغنا نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، اور اب انگریزی ہے، اس زمانہ کے طرز حکومت کے لحاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے محکوم قوم کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، اور آج جس معاش کی مجبوری سے ہمکو انگریزی پڑھنی پڑتی ہے کل بھی یہی حالت تھی، بہرحال کسی سبب سے بھی ہو سکندر لودی کے زمانہ سے ہندوؤں کو فارسی کی جانب توجہ ہوئی اور اسمیں اسدرجہ انہوں نے ترقی کی کہ ایک انگریز مورخ کے بقول "ہندوؤں اور مسلمانوں میں فارسی زباندانی میں کوئی فرق نہیں رہا"[1]

آج بھی انگریزی تعلیم اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے جہانتک گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باایں ہمہ نظم و اہتمام، جد و جہد، سعی و کوشش اور زرپاشی و اسراف جدید تعلیم کا وہ نتیجہ نہیں پیدا ہوا، جو پہلے پیدا ہوا، یہ ممکن ہے کہ کتب اور تعداد کے لحاظ سے آجکل کی سرکاری زبان کے جاننے والے زیادہ ہوں لیکن کیفیت اور اثر کے لحاظ سے گذشتہ تعلیم زیادہ مفید کارآمد اور موثر تھی، اسکے اسباب میرے خیال میں حسب ذیل ہیں،

(۱) تعلیم مفت تھی، صرف طلب نہ تھی،

---

[1] "ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں" مسٹر لا نے یہ قول نقل کیا ہے،

(۲) اساتذہ شفیق باپ اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے، آجکل کی طرح "اجرت گیر اور پیشہ ور معلین" نہ تھے،

(۳) زبان تعلیم سے نہیں بلکہ اہل زبان کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتی ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت، صحبت اور سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا مسلمان ہندو ایک دوسرے کی صحبتیں رہتی تھیں، جنمیں تینوں ایک ساتھی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انکو فارسی زبان باتوں باتوں میں آجاتی تھی، اسی کا یہ اثر ہے کہ اجتک اسکولوں اور کالجوں میں ہندو طلبہ فارسی کو سہل تر آسان سمجھکر اختیار کرتے ہیں، اور سنسکرت کے مقابلہ میں اسکو ترجیح دیتے ہیں مگر رفتہ رفتہ قومی تعصب کا رنگ اب تعلیمی تفرق و امتیاز بھی پیدا کرتا جاتا ہے،

بہرحال یہ واقعہ ہے، جسکی کوئی تکذیب کی جرأت نہیں کرسکتا کہ ادبی حیثیت سے فارسی تعلیم نے ہندوؤں پر جو اثر ڈالا وہ انگریزی تعلیم باایں ہمہ ہمہ گیری نہ ڈال سکی، سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کتنے ایسے انگریزی کے باکمال شاعر گذرے ہیں جنکا نام تاریخ کے صفحات میں زندگی حاصل کرسکا ہے یا کریگا، جو نام کے سامنے ہیں انکی تعداد ۵ یا ۶ سے زیادہ نہیں، اور یہ بھی زیادہ ہے، لیکن دیکھو کہ صرف تیموریوں کے آخر زمانہ میں صرف دو ڈھائی سو برس کے اندر فارسی زبان کے کتنے ایسے ہندو شعراء گذرے جنکے نام اجتک جامع تاریخی تذکروں کے فخر و مباہات کے باعث ہیں اور جنکے اشعار کو سن سن کر اہل زبان سر دھنتے تھے اور مزے لیتے تھے، آج انگریزی کے دو تین ہندوستانی شاعر جنکی اہل زبان نے کچھ تعریفیں کردی ہیں یا انکو کوئی انعام مل گیا ہے، فرنگی مدح و ستائش کے گیت گاتے گاتے ہماری زبانیں خشک ہوگئی ہیں، لیکن ذرا اپنے اسلاف کو دیکھو کہ انکے کیا کارنامے تھے؟ میں نے چند فارسی تذکروں کو سامنے رکھکر حسب ذیل اشخاص کا انتخاب کیا ہے، انکی ترتیب زمانہ اور دور پر نہیں بلکہ حروف تہجی پر ہے، ان میں سے ہر ایک نے سلاطین زمانہ اور ابنائے عصر سے اپنی زبان آوری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی،

اس احتیاط کی بنا پر کہ تذکرہ نویسوں کے اصلی الفاظ محفوظ رہیں، اور زیادت و نقص اور کمی و بیشی کا شبہ نہو اصل عبارت فارسی ہی اس مقام پر نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

آرام | منشی المشہری داس قوم کایستھ و منصرم نشان سرکار امیر الامرا نواب غضنفر جنگ رئیس فرخ آباد منسلک دا[illegible]

نظم و نثر فارسی بفصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نثرش بعض وقائع و سوانح جنگ گذشته حق آنست که بکمال لطف و خوبی می نگاشت، در مدح نواب عماد الملک نیز نظام الملک آصفجاه باستیصال سوسیج ل جات گفته،

بظفر که به بخشی ممالک هند | سزد که باج ز خاقان و رفغفور گیرند
شهان مملکت آن جم وقار آصفجاه | رکاب توسن شاهنشه زمن گیرند
جوان صاحب بخت جوان نظام الملک | که باو بهت ازو مردم دکن گیرند
بدیگرون بتو سے فتنہ ساز نحت | چنانکہ صبح سر شمع در لگن گیرند

آزرده تمن لال قوم کایسته ساکن الٰه آباد، در رنگینی مضمون آزرنی سرکاری می نمود،

بیا رکہسار و مرغان چمن را | نو سنجان رنگین انجمن را
که عیدِ بہار آمد طرب جوش | زی گل کرده دامانِ کمن را

اخلاص کالی پرشاد قوم کایسته متوطن حوالی لکهنو مشق نظم و نثر فارسی از مولوی احسان الله ممتاز نامی می نمود، بعد مرگش کلام منظوم و منثورش پریشان گردید، قصیده در مدح محمد علی شاه اوده برشته نظم کشیده که بصنعت توشیح از اشعار اسم محمد علی شاه بادشاه زمان خلد الله ملکه برآورده و از خزانه شاهی هزار روپیه بجائزه برده،

الفت راجه الفت رائے بخشی ممالک اوده، دستگاهش بر اصناف نظم و قصیده و غزل و رباعی و مثنوی قوی بسکه موزون طبع بود،

نیست اهل کمال را بدرست بے اوزان بار | می کند گردون طواف رحلت لیل و نهار
هرچه ناممکن بود آید نه تو برد دست کار | از نمایر دنگه عرش احترامست آشکار

الفت لالہ سجاگر قوم کایسته عظیم آبادی است، برائے اصلاح سخن بخدمت میر عظیم سمرقندی می رسید،

وه آمد شام غم در سینه حسرت نام مهمانی | نه داغ دل کشیدم بے تکلف پیش آمد خوانی

انسی   مادهو پیارے لال قوم کایسته از صوبهٔ عظیم آباد است، مثنوی نیرنگ تقدیر و دیوان اشعارش بطبع رسید،
میر منشی بادشاه اکبر ثانی بود، و با اسباب کمال طریقهٔ الفت و خلق مرعی می‌نمود،

چون غنچه جز سکوت نباشد بیان ما   پیچیده شعلهٔ سخن در دهان ما

اندیشهٔ مآل نیاید ز ما درست   در دست دیگریست چو سود و زیان ما

در دشت پر بلاست جنون نیست انسی   جز موج ریگ خشک روان کاروان ما

رانت   لاله امانت رام شاگرد مرزا بیدل و از منشیان سخن سنجی بیچاره آشنا و خود مائل

می‌گردد بعد فنا خاک هم باد مزار ما   که بخشید صبا با بیدل خوبان غبار ما

شکر که نقش پاے صنم جبینے یافتم   آن دمے سجده می کردم زمینے یافتم

اندرمن   پسر کنول رام مولدش قصبهٔ اورنگ آباد از اعمال علی گڈه، استفادهٔ علم فارسی از شیخ نظام الدین سکندرآبادی
کرده در موزونی طبع و سخن سنجی نام برآورده، هرچند در عین جوانی نابینا شد مگر قوت حافظه‌اش چندان افزود که سائر نظم
و نثر خودش نوک زبان بود،

صد جلوه دگر شمهٔ آن ماه پاره است   این ماه نو ز ابروے او یک اشاره است

انس   لال چند کایسته، لکهنوی، از دیوانے مختصر یادگار، ۱۲۴۹ھ،

شوخ جوشیده در خنک می زنشئ ما   که لب یار بود مایهٔ بیهوشی ما

جلوهٔ عالم است خدا امتحان کرده رنج   است وابستهٔ تیغ تو سبکدوشی ما

انیس   موهن لال شاگرد مرزا فاخر مکین، نام پدرش رائے آرام کایسته، صاحب دیوان فارسی،
بدر   رائے گنگا پرشاد بهادر از زمرهٔ کایتهان نفیسه و سنجیدهٔ شهر لکهنو است، بحضور واجد علیشاه عهدهٔ سررشته‌داری
در علم سیاق و سباق سری آورده،

می کنم سهو بتے که کند   هر نفس دعوے خدائیها

زخم طرّه داشت سودا زده   من و اندیشهٔ رهایی ها

برهمن | چندر بهان آگره در سرکار دارا شکوه منشی داشت، بعد قتل وی ترک نوکری نموده بشهر بنارس رفت، سنه [illegible] مرد،

کلم زساده دلی بند بیه مژگان داشت   نگشت خس نتوان بست راه طوفان ما

بهار | ٹیک چند کلامش دل پسند، تتبع زبان فارسی بدرجهٔ تحقیق رسانیده، کتاب بهار عجم (لغت) و جواهر الحروف در نحو است، از ارشد تلامذهٔ سراج الدین علیخان آرزو،

جانب تو دل بحال مضطرابم می پرد   زنده ام بیطاقتی تا آشنایم می برد

بهجت | کمن لال صاحب دیوان بهجت،

تفته | منشی گوهر لال تفته، برهمن، خلیفه بزرگ است، کلام منظومش بسیار، پنج دیوان شعر دارد ابیات هر یکی از آنان قریب سیزده هزار، کل ۶۵ هزار،

چنگلی کز نشان نیست نغز بین کشمان   گمراین بلاکه بینی زشهیدان تو نیست

تمنا | کمن لال کایسته از شکوه آباد است، دیوان و مثنویش یکی ۱۵ هزار بیت است،

ثاقب | مهاراجه شیو پرشاد جی گوپال سنگه بهادر، از کایستان سری باسپت است، پدرش منشی بنی پرشاد سررشته دار دیوان عام سلطانی اوده بود، شیو پرشاد نگاره باسه دیوانی شهزادهٔ صاحب جنرل فریدون قدر مرزا اسد علی اوده [illegible] تاریخ اوده که نام تاریخی او دفتر ثاقب، و نسخهٔ تاریخ دهلی که نام تاریخش حقیقت تیموریه تالیف آن سخندان و مجموعهٔ کلیات الثاقب و مثنوی مجمع محبت از منظومات آن است،

حیا | شیو رام اکبرآبادی کایسته، پدرش بهگوتی مل از متصدیان سرکار نواب اسفان وزیر عالمگیر بادشاه، مشق شعر سخن از مرزا بیدل می نمود، نسخهٔ گلگشت بهار ارم بطرز چهار عنصر مرزا بیدل بستعدی تمام نگاشته، سنه ۱۱۴۲ وفات یافت،

بیاد چشم تو داریم می پرستیها　　　رسانده ایم بگردون دماغ مستیها

فرحت رای امر سنگه ولد جیون رام کایسته از کتهری مانکپور، جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابوالمنصور خان
صفدر جنگ، در زمان نواب شجاع الدوله به نظامت سرکار غازی پور مامور گردید، رای امر سنگه بعد تحصیل علوم دفتر
ولا در سرکار مهاراجه جیت سنگه راجه بنارس تا آخر در سرکار مانکپور بدیوان جنگی کامران گشت، در ۱۲۲۲ھ هم
درگذشت. بهار دانش نظم، و نسخه تاریخ فرمانروایان هنود تا سلطان علاء الدین غوری از وی یادگار است
است. دیوانش قریبا پنج هزار است،

گرم است بسکه نالهٔ آتش فشان ما　　　سوزد برنگ شمع زبان در دهان ما

خیال منشی خیالی رام لکهنوی، در نظم و نثر فارسی قدرتش علی وجه الکمال، و تالیفاتش گرانمایه از قصیده انجلا
شیخ الهی زمسروری ادر ۱۲۶۹ھ گذشت، قصیده در مدح واجد علیشاه بصنعت نو منزل نوشته که از حروف اوائل
مصاریع اولی سنه هجری، و از حروف اوائل الفاظ آخر سنه فصلی، و از مصاریع ثانیه سنه عیسوی و سمت هندی

خاموش رام صاحب المتوفی ۱۲۳۰ھ کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

راقم انباد سنگه لکهنوی، بشیرین گفتاری از ممتازان گروه هنود، پسرش جواهر سنگه جوهر از پدر خود خوشگو.

رحمتی کنور سکهراج سنگه بهادر، خلف کنور هیرالال ضمیر، پسر راجه پیارے لال الفتی:

گه بجرش دل سوازده غمناک شود　　　جامهٔ صبر ز بیتابی من چاک شود

رفعت سکهولال لکهنوی، طبعش بشعر و سخن مائل و مشق این فن از مولوی نذیر احمد می نمود،

رفیق داتا رام، طبعش باموزون توام و لب و لهجه اش با خوش بیانی همدم،

نگار من بتیغ خویش چون نقاب گرفت　　　فتاد شور که امروز آفتاب گرفت

رونق منشی رام سهاے لکهنوی، نظم شعر فارسی بلطافت می نوشت، ۱۲۹۰ھ وفات، دیوان شعر و مثنویات
از وے یادگار، غزلے نوشته در چهار بحر.

زرہ | منشی بیندولال دہشہر لکھنو. در نظم و نثر فارسی شاگرد انش بسیار، دیوان فارسی و رسائل نثر بنام بحر الموّ

دہفت صحیفہ بطرز پنج رقعہ، و نادر بازار بر تتبع مینا بازار وجاوید بہار،

ثبت | سکھراج پدرش بملازمت عمدۃ الملک بہادر وزیر بادشاہ عالمگیر مرزا است، از مستعدان روزگار بود واز

علوم عربیہ دیگر حساب وطب وتصوف از اقران گوے سبقت برد، بر انواع نظم ونثر و تاریخ قدرت داشت

شاگرد بیدل، در سرکار سید حسین علیخان کار دیوانی و میر سامانی سرانجام داده بمنصب پانصدی رسیده وجنگ نامہ

حسین علیخان ترتیب ہفت صد اشعار ازوے یادگار،

سرمدی | راے بنسی دہر فواسنہ بخشی الملک راجہ لال جی بہادر نظم ونثر فارسی را پیش مولوی احسان اللہ ممتاز عمل

نامم کی دستم امروز سرمدی ست   متاع آل سرو وشیداے سرو دم

شادان | مہاراجہ چندولال دیوان دولت آصفیہ حیدرآباد، بزمش مجمع اہل کمال مطلع ارباب سخن در ہر شب

مجلس شعر وسخن برپا می ساخت، در فن شعر پایۂ بلند داشت، فارسی دیوان چھپ گیا ہے. یہ مہاراجہ کشن پرشاد کے

پردادا تھے، ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی.

شفیق | منشی لچھمی نراین کھتری اورنگ آبادی شاگرد مرزا آزاد، دو تذکرۂ شعراء دارد گل رعنا و شام غریبان

و صالگوذ... بند تش است، اصلش از لاہور است. پدرش بھوانی داس ہمراہ عالمگیر وارد دکن گردید بادرنگ آباد

سکونت گزید، شفیق در سلک ملازمان عالیجاہ، خلف نواب نظام علیخان منتظم گردید، در ۱۲۱۳ھ مرد،

شوق | منشی دولت راے بنیو راجہ بھولا ناتھ از زمرۂ منشیان بیت الانشاء شاہی اودھ ممتاز قصیدۂ بلند

گفتہ، در صنعت عکس وسجع دردی گفت، بہ ہمراہی شاہ واجد علی مع اہل وعیال کلکتہ بیامد ۱۲۷۰ھ مرد،

از حسن فروغ از در حسن تو جہان را   داغ تو چراغ است دل پیرو جوان را

شہیر | لالہ بالکشن سانکیوری در ۱۲۵۰ھ بگذشت، طبع نکتہ سنجی در نظم گوے داشتہ،

کمن اشک مرا بیقدر ای مژگان تر ہمہ   ببین طفل غذا پرورده خون جگر ہستے

صاحب رسم سخن سنج فارسی ہے تاریخ گوئی ملکہ داشت، در عہد سلطنت شاہ غازی الدین حیدر علم شہرت می افراشت، در تاریخ وفات غازی الدین حیدر بادشاہ کہ در مقام نجف شہر لکھنؤ مدفون است می گوید

چون رفت شہ زمن ز دنیا　　الم دل خاص و عام بگرفت

از روے بکا و آہ گفتم　　حیدر بہ نجف مقام بگرفت
۱۲۴۳ھ

ضیائی | راجہ گوبند بخش ضیائی، المتوفی ۱۲۲۹ھ، انکا نہایت عمدہ فارسی دیوان کتبخانۂ آصفیہ میں ہے،

عشرت | جی کشن اہل کشمیر در سخن طرازی سلیقہ اش نیکو، مدتے بملازمت نواب نجم الدولہ امیر خان، دیوان خالصۂ شریفہ بقانون گوئی تمام خطۂ کشمیر سرافراز،

دشت از لالہ بسکہ رنگین است　　پاے دیوانہ دست گلچین است

گلشن | راجہ جیالال بہادر، خوش فکر صاحب دیوان، بدیوان انشا ابوالفتح محمد علی شاہ اودھ سر دفتر منشیان،

گلشن | راے گلاب راے سندیلوی، شاگرد قتیل، در ریاست اودھ متعہد عہدہ ہاے جلیلہ، و استعداد کلی بعمل در فنون سپہگری فائق الامثال، تذکرۂ شعرا ضخیم و دیوانے ہم یادگار او،

آنکس کہ از زبان تو حرف جفا شنید　　گویا پیام خضر ز آب بقا شنید

شائق | لالہ بیجناتھ بریلوی،

سلیم | لالہ رام بخش قنوجی

ممتاز | لالہ سیتل داس در نازک خیالی ممتاز، بلب و لہجہ اہل زبان پیدا بود،

ظفر | منشی ادھو رام شاہجہان آبادی، در سرکار نواب لطف اللہ خان بن سعد اللہ خان شاہجہانی بعہدہ انشا اعتبار داشت، در عہد امیر الانشا معز الدین جہاندار بن بہادر شاہ مشرف،

نمی رسد بمیان صنم ز باریکی　　ہزار بار بدقت شگافتم مو را

منشی | لالہ فتح چند برہانپوری کایستھ، علم نظم دارد و خوشگو است،

نیست آسائش بمنزل جان از خود رستہ را | ہر قدم دام است نقش پا شکار جستہ را
بسکہ از شرم تو در پروانۂ رنگ گلشن است | رشتۂ نظارہ بندد در ہوا گلدستہ را

سوہر | امراے سوہر لال از امراے سلطنت اکبر بادشاہ است، طبع متین و ماے رزین داشت، رباعی

روزیکہ سموم حشر افزون گردد | و ز آتش غم چو چہرہ گلگون گردد
مادر دو زخ چنان بدستے سوزم | کز رشک دل بہشتیان خون گردد

سوجہ | سکھن لال بدیونی،

چشبنم چہ کنم چون نرگس سربرنگ | مدتے شد کہ زجانان خبرے پیدا نیست

سوجہ | لالہ کالکا پرشاد لکسنوی بموزونی طبع و رسائی ذہن امتیاز داشت و خط نستعلیق خوش و شیرین می نگاشت
با صطلاحات و محاورات زبان فارسی بخوبی ماہر،

رسائی نیست تا سر منزل تو کفر و ایمان را | کہ دیر کعبہ سنگ رہ بود گبر و مسلمان را

سوجی | لالہ سوجی رام،

صفدون | راجہ رام نرائن عظیم آبادی، پدرش بدیوانی سرکار نواب صابت جنگ عزت داشت، بعدہ باین عہدہ
موروثی رسید، در جنگ پامردی نہاد، دیوان اشعارش، شاگرد شیخ محمد علی حزین، سنہ ۱۱۷۵ھ،

صفدون | راجہ مدن سنگھ اتاوی، پدرش راجہ جگت سنگھ دست توسل بدامن دولت نواب غازی الدین خان آویخت
و بمنصب سہ ہزاری و بخطاب راجگی، و بعدہ دیوانی نواب ممدوح، مدن سنگھ در سرکار نواب آصفجاہ دکن متوسل
و در عہد ناصر جنگ بمنصب دو ہزاری و علم و نقارہ و خطاب راجگی یافت و بمور بحراست قلعہ مصطفی نگر گردید تا آنکہ
افواج انگریزی محاصرہ او بود، بش بر آن قلعہ نمود راجہ تا توانست پاے برجا ماند بصدمۂ تفنگ بعمرہ سال
سنہ ۱۱۶۹ھ جان داد، در نظم و نثر فارسی استعدادے نیکو داشت،

کو گلشن جلوۂ رنگین یار آئینہ را | می رسد عرض تو بوس از بہا آئینہ را

نقاد | پنڈت جی گوپال کشمیری از آشنایان قاضی محمد صادق اختر بوده، شاگرد قتیل.

واثق | کھتری بود به برکت صحبت مولوی عبد الله بن مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی مشرف باسلام شده بمحمد عظیم خان مخاطب گردید، در ولایت اورنگ زیب رسید و بوکالت بعضے از امرا می شتافت. نظم و نثر فارسی چنان خوب تر می نوشت که اورنگ زیب زبان باحسنت و آفرین می کشود، در جوانی میل بشعر و شاعری داشت بعد ازان بافادهٔ علوم و فنون طبیعت گماشت، سنه ۱۱۳۳ه مرد.

محتسب مے کشی از دست تو مشکل شده است　　　شیشهٔ مے به بغل آبلهٔ دل شده است

وفا | پنڈت دیا ناتھ ولد مت رام کشمیری شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی می نمود.

وفا | میر الدوله منشی الملک راجه دیا الا پرشاد بهادر محکم جنگ، امیر الانشا امجد علی و واجد علی شاهان اوده باوجود چندین اقتدار درویشانه نسبت که گفته، در نظم و نثر فارسی صاحب استعداد است، دیوانش مطبوع.

هندو | شیو سنگھ لکھنوی.

هندو | گوکل چند قوم کھتری فرخ آبادی.

---

(۶)

ہندو ادباے فارسی

ہندو ادباے فارسی اس کثرت سے گذرے ہین کہ انکا شمار بھی حیطۂ امکان سے باہر ہے، ان مین بہت سے اچھے لکھنے والے انشا پرداز تھے، اور ایسے بھی تھے جو بعض دفتری ضرورت کے مطابق اس زبان مین نوشت و خواند کر سکتے تھے، ہندوؤن کے دوسرے فرقون کی بہ نسبت کایستھ ذات نے فارسی زبان کی تحصیل مین کثرت تعداد کے لحاظ سے زیادہ ناموری حاصل کی، لیکن اصل زباندانی اور جوہر فن کے لحاظ سے برہمنون نے زیادہ کمال پیدا کیا، خصوصاً آخر زمانہ مین کشمیری برہمنون نے جس طرح آجکل بنگالیون کی انگریزی زبان کو "بابو انگریزی" کہتے ہین، اسی طرح مسلمانون کے عہد حکومت مین کایستھون کی فارسی" اور "لالاؤن کی فارسی" مشہور تھی،

دفاتر مین زیادہ تر ہندو ہوتے تھے، محکمۂ انشا (سکریٹریٹ) اور مال کے صیغے تمامتر ہندوؤن کے ہاتھ مین تھے، آخر زمانہ مین انشا کے اعلےٰ افسر بھی ہندو ہونے لگے تھے جنکو عموماً میر منشی اور اس سے بڑھکر منشی الممالک کہتے تھے، ان عہدون پر جو ہندو سرفراز ہوتے تھے وہ فارسی زبان کے لائق ادیب ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے احکام و فرامین انہین کی زبان و قلم سے ادا ہوتے تھے وقایع نویسی کی خدمت پر بھی زیادہ تر مامور ہوتے تھے،

ہندو ادبا کے یہ فارسی منشآت اور رقعات جب زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور انکی مقبولیت دیکھی جاتی تھی تو وہ بطور کتاب کے یکجا جمع کر دئے جاتے تھے، ان میں سے بعض مجموعے اسقدر مقبول ہو گئے تھے کہ وہ طالبعلموں کے نصاب تعلیم میں داخل کر لئے جاتے تھے، چنانچہ منشآت برہمن، انشاے مادھو رام، منشآت جواہر الحروف، خیالات نادر، دستور الصبیان وغیرہ اسی قسم کی کتابیں ہیں،

اس واقعہ کا تکرار کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ ہندوؤں نے فارسی تعلیم لودیوں کے زمانہ سے شروع کی۔

چنانچہ فارسی کا سب سے پہلا ہندو ادیب بھی اسی زمانہ میں ہمکو ملتا ہے،

پنڈت ڈونگرمل | ایک بزرگ کہتے ہیں کہ پنڈت ڈونگرمل سکندر لودی کے زمانہ میں تھے انکی فارسی زباندانی پر مسلمان بھی تعجب کرتے تھے، کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے چنانچہ انکا یہ ایک شعر ارباب تذکرہ نقل کرتے ہیں،

دل خون نشدے چشم تو خنجر نشدے گر ۔۔۔ رہ گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر

ٹوڈرمل | کھتری تھا، شیرشاہ کے عہد میں فارسی تعلیم حاصل کی، اور دربار تک رسائی پائی، شیرشاہی کارخانے کے انقلاب کے بعد اکبری نورتن میں شامل ہوا جہان مال کا صیغہ اسکے ہاتھ آیا، ٹوڈرمل فارسی کا خوشخط کاتب بھی تھا، تذکرۂ خوش نویسان میں ہے،

"نویسندۂ چابکدست دخطوط اکبر شغلی دنگی ی نوشت"

اس عہد کے دیگر ادبا کا تذکرہ اسلئے قلم انداز کرتے ہیں کہ انکا ذکر دوسرے سلسلوں میں آچکا ہے،

رائے منوہر لال | رائے لونکرن کا خلف الرشید تھا، شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے آغوش تربیت میں پلکر جوان ہوا اور فارسی زبان میں یہ سلیقہ پیدا کیا کہ اہل تذکرہ اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں،

چندربھان برہمن | انکا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، یہ پنجابی برہمن تھا لاہور میں پیدا ہوا تھا، عبدالکریم کی شاگردی میں آسکے فضل و کمال نے نشو و نما حاصل کیا تھا، فارسی زبان کا

شاعر تھا، اور برہمن تخلص کرتا تھا، اسکا فارسی دیوان اتبک کتبخانوں مین موجود ہے اسکو فارسی ادب مین بڑی
دستگاہ حاصل کی تھی، افضل خان امیرالامراے شاہجہانی نے اسکی لیاقت وقابلیت کو دیکھکر اسکو اپنا
منشی خاص (پرائیوٹ سکریٹری) بنایا [illegible] مین افضل خان نے وفات پائی تو وہ بادشاہی کے سلک ملازمین
مین داخل ہوا اور دربار شاہجہان کا وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ روزنامچہ کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا اس عہدہ
جلیلہ کے باعث وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہوکر بہ دولت کے مرتبہ واقعات وحالات سنا تا تھا [illegible] مین
چندربھان نے چہار چمن برہمن لکھکر ورونکے موقع پر سرسند مین دربار شاہجہانی مین نذر گذرانی، اسکی
لیاقت وادب دانی کو دیکھکر شہزادہ داراشکوہ نے جو خاص طور پر ہندوؤن کے جوہر کمال کا قدردان تھا اسکو اپنے
اعیان دربار مین داخل کرلیا، اور اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کیا، داراشکوہ کی تباہی کے بعد حوادث
زمانہ سے تنگ آکر بنارس مین گوشہ گزین ہوگیا، اور بعین [illegible] مین راہی عدم ہوا، تذکرۂ عمل صالح کا
مصنف اسکو اپنے زمانہ کے فضلاے ادب مین شمار کرتا ہے اس نے اپنے رقعات ومنشآت کا مجموعہ بھی
مرتب کیا، اسکا نام منشآت برہمن ہے، وہ شعر مین آقا عبدالرشید کا شاگرد تھا،

| ہرکرن داس | ولد متھرا داس، قوم کنبوہ، باشندۂ ملتان، ۱۰۳۱ھ مین زندہ تھا، فارسی علم ادب مین دستگاہ

اس نے حاصل کی تھی اسکی شہادت یہ ہے کہ وہ امراے جہانگیری مین سے اعتبار خان صوبہ دار اکبرآباد کا
میر منشی تھا، انشاے ہرکرن کے نام سے اس نے فارسی ادب کی ایک کتاب لکھی تھی جو اتبک
بعض کتبخانون مین موجود ہے،

| داس کھتری | امراے عالمگیری مین سے ایک کا وکیل (ایجنٹ) تھا، اسکے نظم ونثر ادب فارسی کی یہ
دہوم تھی کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت وآفرین کہتا تھا،

| شیورام کایستھ | اکبرآباد کا باشندہ تھا، اسکا باپ نواب اسدخان وزیر عالمگیر کا متصدی تھا مرزا بیدل کا
شاگرد تھا، مرزا کی چہار عنصر کا جواب گلگشت بہار ارم کے نام سے اس نے لکھا تھا ۱۱۴۴ھ مین وفات پائی

کنور پریم کشور | راجہ جگل کشور کا پوتا، شاعر، لطیفہ گو، سخن فہم، خوش نویس تھا، چند فنون کا مصنف ہے

منشی لچمن سنگھ | قوم کے بقال تھے، نہایت ہوشمند، عاقل، اور عربی و فارسی کے ادیب تھے، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور مشہور ایرانی انشا پردازوں کے طرز پر لکھتے تھے، صاحب تذکرۂ خوشنویسان لکھتا ہے

مرد دانا قابل، در علم و ہنر فارسی و عربی و عبارت پردازی خیلے مہارت داشت، در صحبت منایان ایران بسیار ماندہ دل و دماغ دیگر پیدا کردہ و طور انشا بر روش طاہر وحید و ظاہر کہنی رجالا اختیار کردہ،

خوشنویسی میں محمد حفیظ خان کے، شفیعہ میں مرزا آغا کے، شاعری میں میر شمس الدین فقیر (المتوفی سنہ ۱۱۸۰ھ) کے شاگرد تھے، شعلۂ آہ وغیرہ انکی تصنیفات ہیں، ظہوری کے اشعار انکی نوک زبان رہتے تھے،

پنڈت لالہ لچھمی رام | ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان (المتوفی سنہ ۱۱۹۶ھ) جو شاہ عالم کا وزیر تھا، اسکی سرکار میں یہ ملازم تھا، تذکرۂ مذکور کا مصنف انکی نسبت لکھتا ہے،

منشی بے نظیر بود، در علم عربی و فارسی و انشا پردازی و مصوری نصیب وافر داشت، ...

این چنین انسان باسلیقہ و صاحب کمال کم پیدا می شود،

خوشوقت راے شاداب | کھتری، یہ ایک مشہور اور معزز خاندان کا فرزند تھا، بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، آخر اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے کبار علما میں سمجھا جانے لگا، تذکرۂ مذکور میں ہے،

از ابتداے عمر طبع را بہ تحصیل علم و ہنر راغب و مائل داشت و در اندک زمان در جمیع علم و ہنر آراستہ شد، در خصائل نیکو از ہمچشمان خود سبقت بردہ، در خوشنویسی کمال داشت، این چنین شخص در این قوم صاحب استعداد و فیاض و قدر شناس کم شدہ باشد،

راے پریم ناتھ | اسکا خاندان ایک مدت سے شاہی دفتر کا عہدہ دار چلا آتا تھا، یہ خود شاہ عالم سرکاری دفتر کا مالک الکل تھا، خوشنویسی و ادب دانی میں اپنے زمانہ کا استاد یگانہ تھا، شاگردوں کا بڑا مجمع اس نے

یادگار چھوڑا،

سکھ رام داس | ولد نیل کنٹھ، زمانہ متعین نہین، آمد نامۂ بدیع اسکی ایک تصنیف ہے جسے معلوم ہوتا ہے کہ اطراف لکھنؤ کا باشندہ تھا" اور محمد شاہی مین قانون گوئی کے عہدہ پر مامور تھا،

بینی نرائن | ولد چین راے، قوم کھتری معروف سودہی، پنجاب کا رہنے والا تھا، فتح سنبر کے عہد مین حکم سنگھ اسکو منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر سرفراز کرکے اپنے ساتھ تاتار دار لیگیا، اثناے سفر مین اسکو محمد طاہر کشمیری کی کتاب ہوش افزا ملی، اس نے اسکو خود پڑہا اور اسکی بنا پر اسکو قدیم ہندو عہد کے عجائبات اور مذہبی معجزانہ قصص کو فارسی زبان مین لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ راماین، مہابھارت، بھاگوت، ہری بنس وغیرہ سے انتخاب کرکے ۱۱۲۵ھ سے گلشن اسرار ربانی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جو ۱۱۳۳ھ مین اختتام کو پہنچی،

منشی موہن لال سنم | اکبر ثانی کے عہد مین تھے، انکی تین مثنویان، مثنویات سنم کے نام سے فارسی مین موجود ہین، بہ ترتیب انکا نام بہار عشق، شاہ رخ، اور دلبر جہان ہے، اور غالباً یہ تینون افسانے ہین، شاہ رخ اور دلبر جہان کو اس نے اکبر ثانی کے نذر کیا تھا،

کشن سنگھ | ولد راے پران ناتھ کھتری قوم سنکل ساکن سیالکوٹ، یہ فارسی زبان کا ایک چابکدست انشا پرداز تھا، چکر روشی اور غریب الانشا، وغیرہ کتابون کا مصنف ہے غریب الانشا ۱۲۳۰ھ مین اس نے لکھی،

بنوالی داس ولی | تم اس سے ہندو مورخین کی بزم مین مل چکے ہو انکا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ بھاشا زبان سے ایک "ناٹک" پربودہ چندرودیا کا فارسی زبان مین ترجمہ کرکے شراب شیراز کے متوالون کو ہندوستان کی رام رنگی کا مستانہ بنایا، ۱۰۷۳ھ مین یہ موجود تھا،

دونی چند | ۱۲۳۰ھ مین گیگوہر نامہ کے نام سے فارسی زبان مین ایک افسانہ لکھا ہو یان غلام محمد

جو بہادر شاہ اول کے عہد مین ایک امیر تھا اسکا مربی اور محسن تھا،

شنبھو دل | یہ مہاراجہ چیت سنگھ والی بنارس کا منشی و سکریٹری تھا، سنہ ۱۱۹۶ھ مین اس نے منشآتِ خرد افزا نام کتاب لکھی جو بہت سے خطوط کا مجموعہ ہے جنمین سے بعض نہایت اہم ہین،

منشی منوہر لال تمکین | بارہوین صدی ہجری کے اوائل مین فارسی کا یہ ایک مشہور ادیب تھا اسکے پوتے پران چند سرشار ولد بخت مل نے اپنے دادا کے فارسی خطوط و رقعات کو گلدستۂ فیض کے نام سے ایک رسالہ کی صورت مین مرتب کیا، یہ خطوط سنہ ۱۲۳۹ھ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہین،

منشی بھن راے پوری | شجاع الدولہ کے عہد مین سنہ ۱۱۷۶ھ مین راجہ راے پور کے دربار مین نوکر تھے، منشی تخلص تھا اور قلم کے بھی منشی تھے، فن انشا پر انھون نے ایک کتاب لکھی ہے، انشاے نیاز نامہ نام رکھا، کتاب کے تین ٹکڑے کئے ہین، (۱) عرائض، (۲) رقائم (۳) نثر ہاے متفرق،

منشی جسونت راے | عالمگیر ثانی کے عہد مین تھے، گلشن بہار کے نام سے انھون نے ایک چمن ادب کھلایا ہے، مختلف لوگون کے خطوط اسمین جمع کئے ہین جنمین بکثرت سیاسی اور جنگی معلومات ہین، شاعر بھی تھے منشی تخلص کرتے تھے، اور اسی نام سے ایک دیوان فارسی بھی چھوڑا ہے، سنہ ۱۱۷۳ھ مین تھے،

نسارام | منشی تخلص تھا، سرزمین پنجاب کے مجنون و لیلےٰ، ہیرا اور رانجھا کا افسانۂ حسن و عشق نظم کرکے اہل فارس کو سنایا، سنہ ۱۱۸۱ھ مین یہ نغمہ سراے محبت سراے فانی سے کوچ کر گیا،

موہن راے | مسرت تخلص، قصیدۂ مسرت لکھکر شاہ عالم کے دربار مین پیش کیا، اسمین کمال یہ کیا ہے کہ ہر شعر مین بادشاہ کو نئے طور سے خطاب کیا ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکا قلمی نسخہ ہے،

نہال چند لاہوری | یہ ایک افسانہ کا جسکا نام مذہب عشق ہے مصنف ہے، مذہب عشق مین نام و نشان تنگ ہے، اسلئے اس ادیب کے حالات نامعلوم ہین،

والہ بھوپت ملہ | فن بلاغت کی ایک کتاب دستور شگرف کا مصنف تصنیف تو حیدرآباد اور بنگال

ایشیاٹک سوسائٹی مین قلمی موجود ہے، لیکن صاحب تصنیف کا تذکرہ مفقود ہے حیدرآباد کا نسخہ ۱۱۹۲ھ

لکھا ہوا ہے،

| اودھ بہاری لال | فیض آباد کا باشندہ تھا، اس نے سعدی کی گلستان مین پھول کھلائے یعنی اسکی شرح

لکھی جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین موجود ہے،

| منشی امیشری داس | کایستھ، امیرالامرا نواب غضنفر جنگ والی فرخ آباد کے منشی تھے، ایک فارسی تذکرہ کا

مصنف، انکی نسبت لکھا ہے،

نظم و نثر فارسی بہ فصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت

از نظرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشتہ، حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت،

| منشی ٹیک چند بہار | انکا تذکرہ آگے آئیگا، یہان صرف اس حیثیت سے انکو جگہ ملی ہے کہ یہ بوستان سعدی کے

شارح اور بہار بوستان کے مصنف ہین،

| اننت رام | زمانۂ متاخر کا ایک فارسی ادیب ہے، ۱۸۵۱ء کے قریب مین اس دنیا سے چل بسا، لیکن

اسکے چمنستان کی بہار ابتک باقی ہے، یہ ایک فارسی افسانہ ہے، ۱۲۷۹ھ مین یہ کتاب چھپ چکی ہے،

| ماتا پرشاد | صحیفۃ الشوق نام ایک فارسی افسانہ کا مصنف ہے اسکا قلمی نسخہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا

کتبخانۂ آصفیہ مین ہے،

| دین دیال | عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت ایک افسانہ فارسی زبان مین اس نے لکھا ہے

۱۲۹۷ھ مین یہ کتاب طبع ہوئی ہے،

| امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے فارسی مین پاربتی، مہادیو، رام چندرجی اور راجہ دسرت کے

تصورن کو نظم کر گیا،

| سیالکوٹی مل | انکا ذکر آگے آتا ہے، یہ زمانۂ متاخر کا بہت بڑا ادیب تھا، صفات کائنات کے

نام سے فارسی علم بلاغت مین اسکی ایک کتاب ہے جو [illegible] مین چہپ گئی ہے، اسکی دوسری کتاب ہجم اشیاطین ہے جو سراج آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے، یہ دونون کتابین دلی مطالعات پرشتمل ہین،

لچھمی نرائن | باپ کا نام دانی رام، سراج الدین آرزو کا شاگرد تہا، لاہور اپنا وطن چہوڑکر دلی مین آکر ڈیرے ڈالے، درانی کے حملون نے دلی سے نکال کر بریلی اور اورنگ آباد کی سیر کراتے ہوے لکھنؤ پہنچایا، یہ فارسی کا نامور انشا پرداز تہا، اسکے فارسی رقعے بہت مشہور ہین، [illegible] مین اس نے ان رقعون کو ترتیب دیکر رقعات لچھمی نرائن نام رکہا،

لچھمی نرائن | یہ حاجی پور (بہار) کا رہنے والا تہا، عالمگیر کے عہد مین شہزادہ بیدار بخت کی سرکار مین پیشکاری کے عہدہ پر تہا اور سہ صدی منصب رکہتا تہا، [illegible] مین اس نے شاہنامہ کا انتخاب کیا اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے،

شکر و سپاس و نعمت و منت خدای را   پروردگار خلق و خداوند کبریا

راجہ رام نرائن | لچھمی نرائن کا بیٹا، عظیم آباد پٹنہ مین اس نے بڑا سیاسی عروج حاصل کیا تہا اور مدت تک اسکا خاندان معزز رہا، شیخ حزین کا شرف تلمذ اسکو حاصل تہا، خود صاحب ادب اور ادباے زمانہ کا مربی تہا نواب قاسم کی معرکہ آرائی کا نشانہ بنا، نہایت وسیع النظر اور کتب بینی کا شائق تہا،

کیول رام | شاہ عالم کے عہد مین تہا اور اودہ کے بیت الانشا مین منشی تہا، ۱۱۹۱ھ مین منشی کیول رام نے پچاس جز مین فن انشا پر ایک کتاب لکھی اور طلسمات خیال اسکا نام رکہا،

پنڈت کرپا دان | پنڈت جی کا جنم پتر معلوم نہین، مثنوی دلپسند کے مصنف ہین، بنگال ایشیاٹک سائٹی مین [illegible] کا لکہا ہوا اسکا قلمی نسخہ موجود ہے،

منشی خیالی رام | لکھنؤ وطن، خیالی تخلص، نظم و نثر فارسی کے استاد، واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق تہا انکی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے، امیر خسرو کی سب سے مشکل کتاب اعجاز خسروی کی شرح لکھی،

منشی ابوجام | دلی کے رہنے والے تھے، وہ فارسی زبان کے استاد تھے، انشائے ابوجام انکا مجموعہ ہے جسمین بادشاہون، شہزادون اور امرا کے نام خطوط ہین، یہ پہلے نصاب فارسی مین داخل تھا،

ذیل کی سطرون مین چند منشیات کے نام نقل کرتے ہین جنکے مزید حالات سے واقفیت نہوئی،

کاشی پرشاد | انشائے بے نقط کا مصنف،

منشی کالی رائے | انشائے تیز کا مصنف، اس انشا مین ایک خاص صنعت بدیع (ترک حرف مسلسل) ملحوظ رکھی،

دولت رام | کتاب کا نام انشائے دولت رام،

منشی جے سنگھ رائے | انشائے راحت جان کا مصنف ہے، اس کتاب مین سخاوت و عدالت وغیرہ مختلف عنوانات پر مضامین ہین،

ہر سہائے | انشائے ہر سہائے اسکی کتاب کا نام ہے، اسمین منشی گری کے قوانین نظم ونثر فارسی مین بیان ہوئے ہین،

منشی ہرنرائن | دہلی کے باشندہ تھے، خیالات نادر انکے فارسی رقعات کا مجموعہ ہے،

لالہ رنگ رائے | دستور الصبیان کے نام سے فارسی مکتوبات کے جامع ہین،

لچھمی داس | بن نرائن داس، رقعات نظامیہ اسکا سرمایۂ کمال ہے، چھپ گئی ہے،

خوشحال رائے | دستور الامتیازہ کے نام قوانین انشا کا مدون ہے، نسخہ موجودہ کتبخانۂ آصفیہ سنہ ۱۲۰۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے،

نند رام | باپ کا نام بیہارنند، قانون انشا اسکی تالیف ہے، موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

رام سنگھ | گلشن عجائب انشا مین انکی کتاب ہے نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۲۲۳ھ کا چھپا ہوا ہے،

کشن جی پنڈت | شاید یہ دکنی ہون، انکی نادر الانشا قلمی آصفیہ مین ہے،

رگھناتھ داس | جونپور کا رہنے والا تھا، دقائق الانشا کا مولف ہے،

۳ ہندو لغت نویس

کسی زبان کے جاننے کے صرف یہ معنی نہین ہین کہ وہ اس زبان کی عبارت کو بخوبی سمجھ سکتا ہی اور انہین لکھ پڑھ سکتا ہے، یہ تو نہایت ادنی درجہ ہے، اصلی زباندانی یہ ہے کہ وہ اہل زبان کی طرح اس زبان پر قابو رکھتا ہو، اور اسکے ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ و اشتقاق کا علم اور غلط و صحیح کی تمیز اور خواص کے طرز ادا، ترکیب الفاظ، ادائے مطلب، اور محاورات پر اسکو دسترس ہو، ہندوستان مین جو ہندو ادبائے فارسی گذرے ہین غور کرنا چاہیے کہ کیا انکی واقفیت زبان، ہماری آجکل کی بیرونی زبان کی واقفیت کے معیار سے کچھ بلند ترقی یا نہین،

اکبر کے زمانہ تک فارسی زبان کے چھوٹے بڑے ۴۴ سے زیادہ لغت موجود تھے، لیکن یہ تمام تر قدما، اور اہل زبان کے لکھے ہوئے تھے، جو اہل ہند کے ضروریات کے مطابق نہ تھے، بہت سی چیزین ایسی ہین جنکو ایک صاحب زبان لغت نویس مشکل اور قابل حل نہین سمجھتا، حالانکہ غیر زباندان کے نزدیک وہ سخت مشکل و قابل حل ہین، لغات سے زیادہ محاورات کا معاملہ سخت ہے، اہل زبان انکے ایک ایک نکتہ کو سہل سمجھتا اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا انکو اسی طرح سمجھ لیگی، حالانکہ دوسری قومون کو جنکی وہ زبان نہین یہی مرحلہ دشوار نظر آتا ہے، الغرض یہی اسباب تھے کہ جنکی بنا پر ہندو ادبائے فارسی کو فارسی زبان کے لغات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

ٹیک چند بہار قوم کا کھتری، سراج الدین علیخان آرزو اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ مین تھا، فارسی زبان کی گرہ و بند پر اسے کامل عبور تھا، اہل زبان کی مدت تک صحبتین اٹھائی تھین، اس نے فارسی زبان کے کئی لغت لکھے ہیں، بہار عجم، نوادر المصادر، جواہر الحروف، زیادہ مشہور بہار عجم ہے، اسکے مقدمہ مین وہ لکھتا ہے کہ بدو طفولیت سے ۴۰ سال کی عمر تک فارسی زبان کی تحقیق و کاوش مین بسر ہوا، ۲۰ برس تک متصل اُس نے اس لغت کی تالیف و ترتیب مین بسر کئے، اور سات دفعہ خود اپنے ہاتھ سے مسودہ کاٹ چھانٹ کی

صاف کیا، یہ عمر کی آخری کمائی تھی، اور اسی پر جان دی، بہار کے شاگرد منشی آنند رام نے آٹھویں دفعہ
مرتب کیا، اور خطبہ اور خاتمہ لکھکر شاہ عالم کے زمانہ میں ١١٨٢ھ میں ختم کیا، بہار عجم مستند و مقبول ہوئی کہ تمام
ارباب علم میں متداول ہو گئی، اور لوگ اسکی سندیں پیش کرتے ہیں، ہر فارسی دان اسکے نام سے واقف ہے،
محاورہ کے لئے اس نے اہل زبان کے شعر سند میں پیش کئے ہیں،

سیالکوٹی مل وارستہ نام سے زیادہ یہ اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہے، شیخ حزین پر سراج آرزو نے
جو اعتراضات کئے تھے اسکے جواب میں رجم الشیاطین اس نے لکھی تھی، سمجھو کہ اہل زبان اور اساتذہ
فن کے مناظرات اور معرکہ میں جو صاحب نظر حکم آزمانہ اور خصوصاً مدافعانہ حصہ لے وہ کسقدر اس
زبان پر عبور کامل اور وقوف تام رکھتا ہوگا۔ وارستہ نے اسی فارسی زبان کے عشق میں ایران تک کی
خاک چھانی، اور کامل ۳۰ برس اس ملک میں بسر کئے، اس سفر کے نتائج علمی مصطلحات الشعرا اور
صفات کائنات ہیں، مصطلحات الشعرا گو صرف ۴۰۰ صفحہ کی ضخامت کا لغت ہے، لیکن پندرہ برس کی
محنتوں کا صلہ ہے، وارستہ دیباچہ میں لکھتا ہے،

> اکثر محاورات فرہنگ فارسی زبانان در خیار فصاحت بار دیدم بہ تحقیق آن کمر سعی محکم بربستم
> ہر چند گرد کتب لغات گردیدم نفعی حل معانی بعضے از آن نشنیدم ناچار رجوع بزبانانان ایران دیار
> آوردم و پانزدہ سال درین تلاش بسر بردم، آنچہ از زبان آن جماعت شنیدم برائے انتفاع
> جمہور سخن پردازان فاخرہ در حیز کتابت آوردم،

پنڈت [illegible] حال نہیں معلوم، اس نے فرہنگ شیر و شکر کے نام سے عربی و فارسی الفاظ کا لغت لکھا ہے،
کاشی ناتھ کھتری لغت پنجابی کے نام سے فارسی زبان میں لغت لکھا ہے، اسکا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے،
گردھاری لال دکن کا باشندہ، ١٢١٢ھ میں گنج اللغات فارسی لکھی، قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،
فرہنگ آنند راج اس فرہنگ کا ذکر اس سلسلہ میں مناسب نہ تھا کہ وہ تو ایک مسلمان کی تصنیف ہے اور

تانیاً اسلئے کہ مسلمانون کے عہد حکومت کے بعد لکھی گئی ہے، لیکن صرف اسلئے اسکا تذکرہ مقصود ہے کہ اس سے اردو سے احسان کا موقع پیدا ہوا، فرہنگ آنند راج چالیس پچاس برس ہوئے کہ مدراس کے ایک ہندو راجہ آنند رام کی فرمائش سے ترتیب پائی، یہ فارسی زبان کا سب سے ضخیم اور مطول لغت ہے جو کئی جلدون مین لمبی چندہزار بڑی تقطیع کے صفحات مین تمام ہوئی ہے، اسمین صرف خالص فارسی الفاظ نہین ہین جیسا کہ دیگر لغت نویسون نے کیا ہے بلکہ ان عربی الفاظ کو بھی لیلیا ہے جو فارسی مین مستعمل ہین، مصنف کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ نے اسپر ہزارون روپے صرف کیے ہین، اسکے لئے دور دور سے کتابین منگوائین کتبخانہ ترتیب دیا، مصنف کا وظیفہ مقرر کیا اور خود چھپوا کر شایع کیا،

اس موقع پر ایک نکتہ کی بات ہم کہنا چاہتے ہین، اگرچہ ہندوستانیون نے انگریزی پڑھکر مرہٹی بنگالی اور اردو مین انگریزی ڈکشنریان آج بھی لکھی ہین لیکن درحقیقت انھون نے اسمین صرف مترجمی کی خدمت انجام دی ہے یعنی کسی مستند انگریزی ڈکشنری کو سامنے رکھکر اسکے مقابل کے معنی اپنی زبان مین لکھکر خانہ پری کردی ہے، لیکن جو خدمت ٹیک چند بہار اور وارستہ نے اپنے زمانہ کی سرکاری زبان کی ادا کی اور مثل ایک اہل زبان کے بذات خاص تحقیق و کاوش سے شعرا کے کلام پڑھکر، ایرانیون کی صحبتین اٹھا کر خود اہل زبان سے مطارحات اور چھیڑ چھاڑ کرکے انجام دی اسکی نظیر اب تک تو پرانے "منشی" کے نوجوان "مسٹر" نہ دکھا سکے،

منشی کاشی پرشاد | نادان تخلص، وطن دکن ہوگا، انھون نے فارسی قواعد کی کتاب "ہفت گل" لکھی، آصفیہ مین اسکا نسخہ ہے،

میندولال | زار تخلص، بہار علوم کے نام سے فارسی قواعد کی کتاب تصنیف کی، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

مترجمین

دو مختلف قومون کے متضاد عناصر کو متحد کرنیکے لے بہترین کیمیاوی مسالہ دونون قومون کے

لٹریچر کو منعکس کرتا ہے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے صبح امید کے پہلے نمبر میں اس مقصد پر پرزور دیا ہے،
ہم کہتے ہیں کہ ہاں اس جدید زمانہ میں سرنو کوشش کی ضرورت ہے، لیکن پہلے عہد کے بزرگوں نے
اپنے دور عمل میں اس خیال کو پیش نظر رکھا اور کامیابی ہوئی، اسوقت میرا سلسلہ مضمون یہ نہیں ہے کہ
مسلمانوں نے کیا کیا، بلکہ یہ ہے کہ اس عہد کے ہندوؤن نے کیا کیا،

اس خیال کی اصلی کامیابی ملک کے مترجم طبقہ کے ہاتھ میں ہے، جو ایک قوم کے خیالات کو دوسری
قوم کے سامنے پیش کرتا رہے، اور بتاتا رہے کہ ان دونوں میں کچھ بیر نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف
مظاہر ہیں، اگرچہ ترجمہ کا سلسلہ مسلمانوں کے آغاز عہد سے قائم تھا لیکن وہ صرف علمی ذوق کا نتیجہ تھا قومون کی
باہمی بیگانگی اور اجنبیت کا دور کرنا اسکا مقصد نہ تھا،

اکبری عہد میں حکومت کی خواہش کے مطابق مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں نے ملکر رامائن مہابھارت
سنگھاسن بتیسی، لیلاوتی، نلدمن، تاجک، ہری بنس، اتھربن وید وغیرہ کتابوں کا ترجمہ کیا، وہ پنڈت جو
ان میں سے بعض کتابوں کے ترجمہ میں شریک غالب رہے، یہ تھے، گنگا دھر، مہیش، مہانند، کشن جوشی
بھاون، افسوس ہے کہ ان نامورون کے حالات نہیں معلوم،

اب وہ زمانہ بھی آیا جبکہ بادشاہوں کی خوشی کے لئے نہیں بلکہ اپنی خوشی کے لئے فارسی دان ہندو
پنڈتوں نے اس کام کو از خود انجام دینا شروع کیا،

گردھرداس قوم کایستھ، متوطن دہلی، شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تھا، سنہ [illegible] میں اس نے رامائن کا ترجمہ
فارسی نظم میں کیا، یہ کتاب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے،

بنوالی داس ولی تخلص، شہزادہ داراشکوہ کا میرمنشی، (چیف سکریٹری) تھا، سنہ [illegible]ھ میں اس نے بھاکا سے
پربودھ چندرودیا نام ایک افسانہ کا فارسی میں ترجمہ کیا،

چترت بھوج زائن انھون نے شنکراچاری کی پوتھی اپدیس کہابوتی کا ترجمہ حدائق المعرفت کے نام سے فارسی میں کیا

منشی لچھمن داس | جہان ظفر کے نام سے راماین کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا،

امر سنگھ | راماین امر پرکاش کے نام سے پاربتی، مہادیو، رامچند، راجہ دسرت کے حالات نہایت فارسی کو شامل ہے،

پنڈت امر نلقہ | شیدا تخلص، چار ویدون کے مطابق دنیا کے جو احوال ہے وہ فارسی مین خیالات شیدا کے نام سے بیان کر گئے، یہ کتاب مین کتبخانہ آصفیہ مین ہین،

رام پرشاد | اودھ کا باشندہ تھا، نواب ناظم محمد ارباب خان کا خزانچی تھا، اس نے سنہ ۱۲۲۶ھ مین نواب مذکور کی فرمائش سے امت چرتر کا فارسی نظم مین ترجمہ کیا، اور مخزن العرفان اسکا نام رکھا،

گوپال | خلف سری گوبند، اس نے سری بھاگوت وادھیا تما راماین کا ترجمہ فارسی مین کیا سنہ ۱۱۹۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین ہے،

اننداگھن گوشائین | متخلص بہ خوش اس نے پوتھی کاشی کھنڈ اس کو فارسی زبان مین منتقل کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین جو نسخہ ہے وہ سنہ ۱۲۰۹ھ کا لکھا ہوا ہے،

انند گھن دار | حالات نہین معلوم، پوتھی مہ جپہ دہرم گیان ساگر کا قلمی نسخہ جو اس نے فارسی مین ترجمہ کیا تھا، سوسائٹی مذکور کے کتبخانہ مین ہے،

زور آور سنگھ | اس نے پوتھی بہادار نیہہ کو فارسی زبان مین منتقل کیا،

برلی دھر | پوتھی سری بہاگوت کا فارسی مین مترجم قلمی نسخہ سوسائٹی مین ہے،

ماؤدلپت سنگھ | اہل تاریخ کے سلسلہ مین اسکا حال گذر چکا ہے، مہاراجہ جگت سنگھ والی اودے پور کی سرکار مین نوکری کے زمانہ مین اس نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا، بادۂ شیراز کو سغال ہندی مین بھر کر ملک کے سامنے پیش کیا، یعنی دیوان حافظ کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا،

---

(۷)

ہندو علماے علوم عقلیہ

علوم عقلیہ سے میری مراد طبعیات، الٰہیات، ریاضی، ہیئت، طب وغیرہ جملہ علوم حکمت
ہین اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہندوستان بھی ان ممالک مین سے ایک ہے جسکو علوم عقلیہ کا
جنم بھوم کہنا چاہیئے، یہ بحث دوسری ہے کہ یہ علوم براہمنا یہین پیدا ہوے جیسا کہ اہل ہند کا دعویٰ ہے
یا سکندر کے بعد یونانیون کے ذریعہ سے یہ علوم یہان منتقل ہوئے جیسا کہ اہل یورپ کا بیان ہے تاہم
یہ ماننا پڑیگا کہ اہل ہند نے ان علوم مین کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی، اور ریاضیات و ہیئت مین
ایک حد تک وہ استادی کے رتبہ کو پہنچ گئے تھے،

ہندوون کے دماغ کو ریاضیات سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی ہے مسلمانون کے
عہد حکومت مین علوم عقلی کے جو ہندو نامور یہان پیدا ہوے ان مین مہندسین اور علماے ریاضیات
کی تعداد زیادہ ہے،

بیرونی کے ذریعہ سے جن برہمنون نے عربون کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا افسوس کہ
انکے حالات ہمکو نہین معلوم، اور نیز بعد کی صدیون مین جن ہندو برہمنون نے ادہر توجہ کی انکے
نام سے بھی ہم واقف نہین، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سنسکرت مین عربون کی تحقیقات عقلی کی کافی
آمیزش موجود ہے، چنانچہ تمدن ہند کا فرنچ مصنف شہادت دیتا ہے کہ گیارہوین صدی عیسوی کے

بعدے کہنا چاہیے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، البتہ ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی
ابتدا پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بھٹ کے ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتوین صدی مین
برہم گپت نے ان پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک اہنین مسائل سے بحث کرتے ہین
جو ہند مین (یونانی اور مسلمان) ان دو ذریعون سے آئے"

عہد اکبری کے ہندو علماے معقولات ابو الفضل تنہا مورخ ہے جس نے اپنے بادشاہ کے عہد کے
جزئی سے جزئی واقعہ کو قلم انداز نہین کیا، آئین ہین دانش آموزان دولت کے عنوان سے
ہر فن کے ۱۴۲ علما کے نام لکھے ہین، اس کا نغذی دربار مین بلاتفریق ہندو اور مسلمان دونون
قومون کے اکابر علم اور اساطین فلسفہ دوش بدوش بٹھائے گئے ہین، شناساے عقلی کلام کے
عنوان ہین ابو الفضل نے اپنے زمانہ کے حسب ذیل اشخاص کے نام لکھے ہین، نارائن، مادھو بھٹ
سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر، باہن بھٹ، بدیا نواس، گوری ناتھ
گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹاچارج، بھاگیرت، کاشی ناتھ بھٹاچارج،

جن ہندو پنڈتون نے مرزا الغ بیگ کی زیچ جدید جو مسلمان علماے ہیئت کی تحقیقات کا
مجموعہ ہے، مسلمان علما کی زیر نگرانی فارسی سے ہندی مین ترجمہ کیا تھا، انکے نام یہ ہین، کشن جوتشی
گنگا دھر، مہیس، مہانند،[۵]

جے سنگھ کے رصدخانے مسلمان سلاطین نے دنیا کے ہر گوشہ مین جہان انکے تمدن نے فروغ
پایا، تحقیقات فلکیہ کی تکمیل کے لئے رصدخانے قائم کئے، سنہ ۱۹۰۹ء کے الندوہ مین مین نے
متعدد نمبرون مین ان رصدخانون کے حالات و تحقیقات کی تفصیل لکھی ہے، اسوقت سلسلۂ سخن کے
طور پر یہ کہنا ہے کہ ہندوستان مین متعدد مسلمان سلاطین نے رصدخانے قائم کرنا چاہے؛

---

[۵] آئین اکبری، آئین تصویر خانہ،

فیروز شاہ بہمنی، اور شاہجہان نے کام کو شروع کرایا لیکن مختلف وجوہ سے ناتمام چھوڑنا پڑا، یہ ہم در حقیقت محمد شاہ کے عہد حکومت کے لئے اُٹھ رہی تھی،

راجہ جی سنگہ سوائی کچھواہا، امبیر کا راجہ تھا، اورنگ زیب عالمگیر اور اسکے جانشینوں کے ایام سلطنت مین ایک فوجی افسر کی حیثیت سے نمایان عزت حاصل کی، محمد شاہ کے عہد مین وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے اپنی ریاست کا نیا مرکز جے پور کے نام سے آباد کیا اور اب اسی نام سے یہ ریاست معروف ہے، جی سنگہ ایک نہایت علم دوست اور عالم راجہ تھا، عربی علوم و فنون مین وہ اچھی دستگاہ رکھتا تھا اور علم ہیئت سے اسکو ایک خاص ذوق تھا۔

راجہ جی سنگہ نے الغ بیگ کی زیج جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات، اور ملا فرید شاہجہانی کی زیج شاہجہانی کے اصول پر زیج محمد شاہی ترتیب دی، اور بادشاہ کے حضور مین پیش کی یہ وہ زمانہ تھا جب اہل یورپ کے فضل و کمال کی طرف اہل ہند کی نگاہین اٹھ رہی تھین بادشاہ کے حکم سے مسلمان، برہمن، اور فرنگی علماے ہیئت جمع کئے گئے، اور دلی مین ایک جدید رصدخانہ کی تعمیر کا کام ۱۱۳۷ھ مین شروع ہوا، مرزا امیر اللہ مہندس اس کے مہتمم تھے، اس رصدخانہ مین بعض آلات ایسے تھے جو سمرقند کے الغ بیگی رصدخانہ مین استعمال پا چکے تھے، اور بعض بالکل نئے تھے اور خود راجہ کے ایجاد کردہ تھے،

راجہ نے اس غرض سے تاکہ رصدخانہ کی تمام تحقیقات پوری اُترین اور انکی تصدیق ہوتی جائے رصدخانہ دہلی کے نمونہ پر جی پور، متھرا، بنارس، اور اُجین مین بھی رصدخانے بنواے، دلی اور بنارس کے رصدخانون کی ٹوٹی پھوٹی یادگارین تو اب تک باقی ہین، اور مین نے دیکھی ہین، باقی شہرون کا حال نہین معلوم،

بہرحال ان رصدخانون مین ہندو، مسلمان، اور فرنگی علماے ہیئت نے سات برس تک

کام کیا اور اسکے بعد کچھ لوگ پادری ینویل کی ماتحتی مین یورپ بھیجے گئے، وہان سے یہ علمی جماعت
جو معلومات لیکر آئی انکا اپنے اصول کے مطابق بیان مقابلہ کیا گیا، یہ مشرق کا پہلا مصنفانہ ہے
جس نے مغربی تحقیقات کی موافقت کی، اس مصنفانہ کی تحقیقات نقل ست زیچ محمد شاہی تیار کیگئی
جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت
رفتار سیارات و ثوابت[1]،

راجہ نے اس راہ مین ایک اور اہم خدمت انجام دی مغربی زبان کی مستند علم ہیئت کی
کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا، اور اسپر ہزارون روپئے صرف کئے[2]،

| مہاراجہ شتاب رائے | اعتصام الدولہ بہادر الملک راجہ خان بہادر نصرت جنگ، ہمارے اس عہد کے
ہندو دوست سمجھتے ہونگے کہ یہ کسی مسلمان امیر کا نام ہوگا، لیکن انکو سننا چاہیے کہ یہ مہاراجہ شتاب رائے
راجہ ٹکاری (صوبہ بہار) کے فرزند ارجمند کا نام ہے، یہ راجہ خود ۳۰ برس پہلے تھا، راجہ مذکور
تمام علوم و فنون عربی و فارسی مین ماہر تھا، اسکا دربار مسلمان اور ہندو فضلاے عہد سے بھرا ہوا تھا
اس زمانہ مین مولانا غلام حسین جونپوری ایک نامور ریاضی دان تھے، وہ بھی اس راجہ کے
دامن دولت سے وابستہ تھے، مولانا راجہ کے فضل و کمال کا ذکر ان الفاظ مین فرماتے ہین،

”چنانچہ فنے از فنون متداولہ و علمے از علوم متداولہ مسلوخ نشدہ کہ در ذات شریف آن
یگانہ جمع نیامدہ باشد،

راجہ نے ایک دن اپنی بزم علم مین تذکرہ کیا کہ روز بروز علم کا فقدان ہو رہا ہے، اور
اسکے متعدد وجوہ ہین جنمین سے ایک یہ ہے کہ علوم و فنون کی زیادہ تر کتابین عربی زبان مین
ہین جن سے فارسی خوان فائدہ نہین اٹھا سکتے، اسلئے مناسب ہے کہ فارسی مین ایک ایسی

[1] مقدمہ زیچ محمد شاہی [2] سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی،

جامع کتاب لکھی جاسے جو ہر قسم کے اصول و فروع پر شتمل ہو، تین سو برس ہوے کہ علامۂ عبدالعلی برجندی کے زمانہ سے اسوقت تک کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی، اس تقریر کے بعد راجہ نے مولانا غلام حسین کو حکم دیا کہ اس مجوزہ تصنیف کا کام شروع کرین،

مولانا ے موصوف نے جامع بہادرخانی کے نام سے ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ریاضیات پر فارسی مین لکھی جس سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب شاید عربی مین بھی نہوگی اسکو علوم ریاضیہ کی انسائکلوپیڈیا کہنا زیادہ موزون ہوگا، علم ہندسہ، علم الابصار، علم المناظر، علم حساب، جبر و مقابلہ، جومیٹری، علم ہیئت، علم آلات رصد و قواعد رصد وغیرہ اصولی ابواب کے تحت مین بیسیون فروعی مباحث اور فصول ہین، پوری کتاب بنی اور چوڑی تقطیع کے ۱۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور ہر صفحہ مین ۲۵ لمبی اور باریک سطرین ہین ۱۲۴۹ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۵۹ھ مین تمام ہوئی، اکبر ثانی کا یہ زمانہ تھا، کتاب مین جا بجا کہین ستارون کے طلوع و غروب کا وقت دیا گیا ہے، قلعہ نکاری کے مطالع و مغارب کے حساب سے دیا ہے، مصنف جا بجا قدیم تحقیقات کو یورپ کے جدید معلومات سے موازنہ بھی کرتا گیا ہے،

راجہ رتن سنگھ زخمی | قوم کا بیتھ سکسینہ، ۱۱۹۷ھ مین لکھنؤ مین پیدا ہوا، اسکا خاندان تین پشتون سے دربار اودھ کے معزز عہدون پر ممتاز چلا آتا تھا، لکھنؤ کی درسگاہون کے آغوش مین اُس کے فضل و کمال نے نشو و نما پایا، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور کسی قدر انگریزی زبان سے واقفیت تھی، علم ہیئت مین اسکو استادی کا رتبہ حاصل تھا، فارسی شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتا تھا، کچھ دنون ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی، اسکے بعد اودھ مین اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا محمد علی شاہ کے زمانہ مین دیوان شاہی مقرر ہوا، اور فخر الدولہ دبیر الملک ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا،

[illegible] مین محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت مین حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب فارسی زبان مین لکھی جو ۴۰ جز مین جا کر ختم ہوئی ہے جدید مغربی تحقیقات کو پرانے عربی اس نے پیوند دیا ہے، یہ کتاب اپنے باب مین نہایت مستند اور معرکۃ الآرا سمجھی جاتی ہے اور اب علماے اسلام مین ہیئت کی اعلیٰ کتابون مین اسکا شمار ہوتا ہے،

مدیا نرائن | [illegible] مین وفات پائی، علم ہندسہ مین شش جہات نام ایک کتاب لکھی جو ارباب فن مین نہایت وقیع خیال کیجاتی ہے، قلمی نسخہ موجود ہے،

اندرمن | منشی نیکچند بہار کا شاگرد تھا، اصل وطن حصار تھا، لیکن توطن شاہجہان آباد مین اختیار کر لیا تھا، بہار عجم کو اسی نے آخر مین مرتب کیا تھا، ریاضیات مین اسکو ید طولیٰ حاصل تھا عربی وفارسی کا عالم تھا، [illegible] مین دستور الحساب نام کتاب، علم الحساب (میتھیمیٹکس) مین تالیف کی، کتبخانہ بانکی پور مین اسکا قلمی نسخہ ہے، کتاب ۷ اجز مین تمام ہوئی ہے،

بیدنی مل | قوم کایستھ، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت مین تھا، علوم عقلیہ کا واقف کار تھا [illegible] مین بدائع الفنون کے نام سے ریاضیات مین ایک عمدہ کتاب لکھی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور کتبخانۂ آصفیہ مین اسکے قلمی نسخے موجود ہین،

رام پرشاد | عظیم آباد پٹنہ وطن تھا، علم ہندسہ مین مفتاح الناظرین اسکی تالیف ہے، [illegible] مین اسکی یہ کتاب کلکتہ مین چھپی تھی،

دیوان کانجی | یہ بھی عظیم آباد پٹنہ کے باشندے تھے، ریاضیات وہندسہ مین خزانۃ العلم انکی کتاب ہے [illegible] مین یہ کتاب کلکتہ کے چھاپہ خانہ مین طبع ہوئی تھی،

ماسٹر سندر لال فلسفی | علوم حکمت اور فلسفہ مین ممتاز ومعروف تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی تھے، اور فلسفی بننے کے مدعی تھے، اسلئے فلسفی تخلص کرتے تھے، انکے بیٹے کندن لال نے اپنی

تصنیف مین اپنے خاندان کا حال لکہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا علم وکمال کا سلسلہ تہا
شاہجہان کے زمانہ سے اس خاندان مین علم و دولت ساتہ ساتہ تہا سندیلہ کے برہمن سنے،
رائے سون لال کی نسبت لکہا ہے،

"پدر فقیر رائے سون لال طپش تخلص کرد، علوم حکمیہ یادگار رکہائے سلف بود، و صاحب تصانیف کثیرہ"

رائے سون لال پہلے نواب فیض اللہ خان کی سرکار مین تہے، اسکے بعد نواب آصف الدولہ کے
دربار مین گئے، اور یہان سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی مین آئے، اور غالبًا یہین کسیقدر انگریزی
حاصل کی، ۱۲۰۰ھ مین وفات پائی، اور گیارہ کتابین مختلف علوم وفنون مین اپنی یادگار چہوڑین
گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار، تنقیح الاخبار، جغرافیہ، یہ کتابین
ادب وتاریخ مین ہین، خالص فلسفہ کی تصنیفات حسب ذیل ہین، سدید الاستخراج، کتاب احکام
عجائب در علم حساب، ہیئت، حکمت انگریزی، مفردات طب،

کندن لال اشکی | یہ اسی نامور باپ کا فرزند تہا، باپ اور چچا کے زیر عاطفت عربی اور فارسی علوم
کی تحصیل کی، ۲۲ سال کی عمر تک بریلی، رامپور، دہلی اور بنارس کی درسگاہون مین عمر گذاری
سنسکرت مین سری کب اندرجہا کے شاگرد تہے، کچھ سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت مین بسر کئے
اور آخر نواب منتظم الدولہ ناظم الملک مہدی علیخان کی وساطت سے محمد علی شاہ اودہ کے دربار
مین پہنچے، چارصدی منصب پایا، دفتر انشا مین کسی عہدہ پر ممتاز ہوے، منتظم الدولہ کی وفات کے
بعد خدمت سلطانی سے مستعفی ہوکر بنارس مین گوشہ نشینی اختیار کی،

کندن لال عربی اور نیز اسلامی علوم مین استادی کا درجہ رکہتے تہے. حدیث وفقہ پر بہی
اُنکی نظر تہی، فلسفہ اور ریاضیات سے اُنکو خاص ذوق تہا ہیئت مین اُنہون نے زیچ اشکی
ترتیب دی، فلسفہ مین حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت، اور قسطاس تین کتابین فارسی زبان مین

لکین، اخیر کتاب درحقیقت تمام علوم وفنون کی انسائیکلوپیڈیا ہے، کندن لال سنے اسکو
چار حصون پر منقسم کیا ہے پہلے حصہ مین ہندؤن کا فلسفہ ہے، دوسرے مین یونانیون کا،
تیسرے مین عربون کے علوم، اور چوتھے مین یورپ کا جدید سائنس، کہین سے یہ نہین علوم ہوکہ
وہ کسی علم وفن سے بیگانہ ہے، کتاب ۱۲۲۵ھ مین مطبع محمدیہ لکھنؤ مین چھپی،

انتظامات مالی

اس فن پر ہندو مصنفین کی تین کتابین ملی ہین جنکا ذکر بہ ترتیب آتا ہے، اس فن پر انکی
توجہ اسلئے مبذول ہوئی کہ زیادہ تر یہ عہدے انہین کے زیر اقتدار رہتے تھے،

چھتر مل | ولد رائے پران چند، اس نے اس فن مین ایک نادر کتاب یادگار چھوڑی ہے
جسکا نام دیوان پسند ہے، دیوان زراعت، محاصل زراعت کے اعلیٰ عہدہ دار کو کہتے تھے،
دیوان پسند یعنی وہ کتاب جو ہر دیوان کے لئے اسکے ادائے فرائض مین معین ہے، مصنف نے
باب کے لئے ایمن دستور کا لفظ پسند کیا ہے، دیوان پسند چار دستورون پر منقسم ہے (۱) در بیان
درستی زمین ہائے کاشتکاری وتعین جمع سرکار وطبعے حساب در پیداواری اجناس (۲) سیاق و
شمار در طبعے انتظام مہات (۳) مزروعہ در بعضی دست (۴) مالی وملکی آدینات معاملہ،
دیباچہ مین مصنف اپنی معاملہ فہمی اور انتظامی مہارت پر بے انتہا فخر کرتا ہے، زمانہ وجود
نہین معلوم، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے،

جگت راے | حالات وزمانۂ وجود نہین معلوم سیاق یعنی کاغذات وحسابات مالی کے قواعد
ترتیب مین سیاق فارسی اسکی تصنیف ہے،

مہتاب مل | مجموعۂ سیاق (فارسی) کا مصنف، یہ دونون رسالے قلمی کتبخانہ آصفیہ مین ہین،

نند رام | سیاق نامہ (فارسی) کا مصنف، کتبخانہ آصفیہ مین ۱۲۸۱ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے،

نجوم

بیربل	یہ نہین معلوم کہ یہ کون بیربل ہے، رسالۂ نجوم فارسی مین اسکی تصنیف ہے،
وشنوت مات	ولد بھوپت رائے، خاص النجوم کا مصنف،
سدا سکہ کول	باپ کا نام کیول رام کول، کاشف الدقائق، نجوم مین اسکی تصنیف ہے،
جواہر سنگھ	جواہر افلاک، جواہر اوراک کا مصنف،

یہ تمام قلمی رسالے کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

طب

ہندوؤن کے ہان مسلمانون کی آمد سے پہلے طب مین دو کتابین مشہور ہیتین، چرکا اور شسشرت کی کتابین، مسلمانون کا علم طب عرب، یونان، ایران اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ تہا اور خود انھون نے بہت کچھ اُسپر اضافہ کیا تہا، اسلئے یہ نیا علم طب ہندوستان کے قدیم طب پر امتیاز خاص رکہتا تہا، ہندوستان کے علم طب مین مسلمانون کی آمد کے بعد جو ترقیان رُونما ہوئین وہ حسب ذیل ہین،

(۱) حاکم قوم اپنے علوم وفنون کو محکوم قوم کے علوم وفنون سے بہت بالادست سمجھتی ہے، اوراس سے استغنا برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکہئے کہ گذشتہ کونسل مین جب بعض ممبرون نے دیسی طب کی سرکاری حمایت اور اُسکو مستند تسلیم کرنیکا رزولیوشن پیش کیا تو نا اتفاقی کے ساتہ رد کردیا گیا، لیکن مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین ایسا نہین کیا، ہندی علم طب کی بیسیون کتابین اُنہون نے اپنی زبان مین منتقل کین اور اپنا علم طب ہندوستان مین پہیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کرکے خود اُنہین کے علم طب کو فارسی مین منتقل کیا اور شاہی حیثیت سے اسکو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک

درباری امیر نے عرض کی کہ جہاں پناہ! یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہیں،
حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی میں منتقل کیا جائے، چنانچہ میاں بھوہ بن خواص نے
اس کام کو انجام دیا اور کتاب کا نام معدن الشفا سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے
اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان میں
اسوقت فارسی میں جو علم طب ہے اور خصوصاً خاندانی اطبار کے سفینوں میں اور مجربات نامون
میں سیکڑون نسخے اور دوائیں ہندوستان زاد ہیں، اسی طریقہ سے بیدون نے مسلمانون کے
سیکڑون نسخے، دوائیں اور اصول علاج اپنے ہان لے لئے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا
طرز علاج رائج ہوا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا،

(۲) پہلے بیدون میں وہ دوائیں متداول تھین جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھین طب اسلامی نے
تمام دنیا کے ملکون میں جو دوائیں اور جڑی بوٹیان زیر تجربہ آچکی تھین انکو ہندوستان میں
رواج دیا، انکے فواید و منافع لوگون نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بیحد بڑھا دیا،

(۳) دواون کی ترکیب میں عرق، معجون، اقبرو ملی، سفوف وغیرہ مختلف طریقون کو پھیلایا،

(۴) چیچک وغیرہ متعدد بیماریان جنکو یہان وہم پرستی سے دیوتاؤن، دیبیون اور بھوت
پریت کا اثر سمجھا جاتا تھا اور اسلئے انکا طبی علاج نہین کیا جاتا تھا، انکو طبی علاج بتایا، چیچک
کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربون ہی نے لکھی،

طب اور دیگر علوم متفرقہ

یہ سلسلہ اسقدر پھیلا کہ ارباب بزم گو زبان سے تو نہین کہتے لیکن تیور سے پہچانتا ہون کہ وہ گھبرا اٹھے ہونگے لیکن بات یہ ہے کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب اسکے بعد تکلیف نہ دیجائیگی،

پچھلی داستان مین ہم طب تک پہنچے تھے، اب ہماری کہانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور عہد اسلامی کے بعض ہندو طبیبون کا حال سناتے ہین۔

دربار شاہی مین مسلمان اطبا کے ساتھ ہندو طبیبون کا رہنا بھی ضروری تھا، چنانچہ ہندو علما کے مختلف طبقون مین سے سب سے پہلا طبقہ جو شاہان اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا وہ بھی ہندو طبیب تھے، ہندو اطبا مین سے زمانۂ اسلام مین سب سے پہلے ہم جسکو جانتے ہین وہ سری بھٹ ہے،

سری بھٹ یہ حکیم سلطان زین العابدین (۸۳۰ھ) والی کشمیر کے دربار مین تھا، بادشاہ نے اسکی خود تربیت کی تھی، فرشتہ[1] مین ہے،

---

[1] فرشتہ ذکر بمن شاہیہ،

"سلطان بصحت طبابت سری بہٹ راکہ طبیب حاذق بود تربیت کرد"

اطباے عہد اکبری | اکبر کے عہد حکومت کے نامور ہندو اطبا کے چند نام ابو الفضل نے آئین میں لکھے ہین، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی، افسوس کہ انکے حالات کچھ نہین معلوم،

سکھراج | اسکا باپ اسد خان وزیر عالمگیر کی سرکار مین تہا، سکھراج علاوہ دیگر علوم عقلیہ کے فن طب مین کامل دستگاہ رکہتا تہا، سید علی حسین خان کی سرکار مین پانصدی منصب پر تہا،

منشی لچھمی نرائن گنجاوی | انکا ذکر زمرۂ شعرا مین بھی گذر چکا ہے، یہ بھی مسلمان طبیبون کی درسگاہ سے فن طب کے ماہر بنکر نکلے تھے، انکا خاندان عالمگیری و محمد شاہی دربار دارون کے متوسلین مین تہا،

منشی رام پرشاد عظیم آبادی | خلف گنگا پرشاد، گو یہ طبیب تھے، لیکن طبابت کا پیشہ نہین کرتے تھے، کمپنی کے زمانہ مین پٹنہ کی صدرامینی قبول کر لی تھی، پنڈت داتارام کی فرمائش سے ۱۲۳۵ھ مین معیار الامراض نام ایک کتاب فن طب مین تالیف کی جسمین سر کے بال سے پاؤن کے ناخنون تک کی کل بیمارزیون کے قوانین کلیہ لکھے ہین، یہ کتاب اسی زمانہ مین چھپ بھی گئی تھی،

راے منولال فلسفی | المتوفی ۱۲۵۲ھ، دیگر علوم عقلیہ کے ساتھ طب کا بھی ماہر تہا، مفردات طب مین اسکی ایک تصنیف ہے،

لالہ سوہن لال | سندیلوی، راے منولال کا بہائی تہا، فارسی کا ادیب اور طب مین یگانہ عہد تہا اسکا بھتیجا کندن لال، قسطاس کے خاتمہ مین لکھتا ہے:

"عموم لالہ سوہن لال کہ طبیب حاذق وادیب کامل بودند،"

پیارے لال حکیم | حیدر آبادی، اس نے اپنے طبی تجربات دو جلدون مین لکھے ہین، یہ دونون

له صفحہ ۱۰۰، نولکشور،

جلدین قلمی کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

پنڈت اودھ چندا | اسکی ایک تصنیف کحل الابصار کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مخصوص آنکھ کی بیماریون کے علاج مین ہے،

دیانات | اس نے ویدک سے پاکا ہوی کالی کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے

منشی مستاب رائے | ضروری الطب کا مصنف ہے، اسکا موضوع ادویہ کے خواص ہین،

یہان طبیب مصنفون کی مختصر فہرست ہے، جنھون نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیون مصنفین اسکے علاوہ ہین جنھون نے اسلامی طب کو ہندی، مرہٹی، بنگالی اور تلنگی مین منتقل کیا، تلنگی کی بعض طبی کتابون کے نام کتبخانۂ آصفیہ کی فہرست مین موجود ہین، یہ اسی وسعت کا اثر تھا کہ شہرون کو چھوڑکر دیہات اور قصبون تک کے ہندو بنیے، طبی دوائین بیچنے لگے، بڑے بڑے عطار بنگئے، اور عرب وایران وترکستان کی دوائین انکی دوکانون پر بکنے لگین، اور زمانہ کی شدید مخالفتون کے باوجود انکے آثار اتبک باقی ہین،

اخلاق وتصوف

اس مضمون پر مفصل بحث تو ایک مستقل عنوان "اسلام کا اثر ہند و مذاہب" مین ہوگی، یہان علمی حیثیت سے صرف چند ہندو مصنفین کا تذکرہ مقصود ہے، جنھون نے ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے،

بابا نانک | جو سکھ فرقہ کے بانی ہین، وہ فارسی مین بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، انکے گرنتھ مین فارسی کے سیکڑون اشعار و الفاظ ہین، اور مولوی رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے تو وہ دلدادہ تھے، فارسی مین انکی دو کتابین تصوف مین ہین، الٓہی نامہ اور دل طلب ایک اور مناجات بحر طویل مین انکی ہے، یہ تینون رسالے آصفیہ مین ہین،

رس بتی داس | عالمگیر ثانی کے عہد مین تھے، محیط معرفت تصوف مین انکی کتاب ہے، ۱۹۰۵ء مین چھپ بھی گئی ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو، (دارا شکوہ کا مرشد) کا چیلا تھا، بابا لال کے ملفوظات ۱۰۶۳ھ مین اس نے فارسی مین جمع کئے ہین، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری مین ۱۲۱۱ھ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے،

بھیرو لال | رسالہ علم جوگ فارسی کا مصنف،

بشن سنگھ | شیو پران، فارسی مین اسکی تصوف پر تصنیف ہی، یہ دونون نسخہ قلمی آصفیہ مین ہین،

رائے لکھن لال | اخلاق نامہ فارسی منظوم کا مصنف، اسکا قلمی نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے

سوامی بیاس | مشارق المعرفت کے نام سے جوگ بشسٹ کا فارسی ترجمہ کیا، حال و زمانہ نہین معلوم

ان کے علاوہ اکبری دور کے ان خدا پرستون کے نام بھی ملاؤ جنکو ابو الفضل نے خدیو نشنا ئین، خداوند باطن اور خوانائے نقلی مقال کی فہرست مین جگہ دی ہے، یعنی مادھو سرتی، مدھو سودن، بابا بلاس، نارائن آسرم، بابا کپور، بھان چند، ہرجی سور، دامودر پرت، رام تیرتھ، نرسنگ، پرم اندر، آدت، رام بھدر، بجی سین سور، اور جہانگیری دور مین جدروپ گوسائین، اور دوسرے ہندو صوفیا تھے جنکا ذکر تزک مین اس نے متعدد مقامات پر کیا ہے،

موسیقی

فن موسیقی کے جاننے والے اس کثرت سے اس عہد مین پیدا ہوئے ہین کہ استقصا بھی مشکل ہے، شاہان ہند کی فیاضیون نے اس فن کو کہان سے کہان پہنچا دیا، ہندوستان مین یہ فن نہایت قدیم زمانہ سے ہے، اور اسمین اسکی استادی مسلم ہے، لیکن مسلمانون کی آمد کے بعد ایران و توران کی موسیقی نے ملکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، پٹھانون کی عہد حکومت مین بھی

اس فن کے جاننے والے ہندو موجود تھے [1] اور سلاطین دہلی کا دست کرم انکو دارالحکومت کی طرف ہمیشہ کھینچتا رہتا تھا، جہاں خسرو کے سے ہمہ دان سے انکو مقابلہ کرنا پڑتا تھا، جن میں سب سے مشہور نایک گوپال تھا، اسکے ۱۲۰۰ فن موسیقی میں شاگرد تھے جو اسکے جلو میں ساتھ ساتھ چلتے تھے، گوپال اسی شان سے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تھا،

کشمیر ایک مدت سے فن موسیقی کا گہوارہ ہے، لیکن ہمیں علم ہو کہ یہاں کس دایۂ کرم نے اسکی پرورش کی، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر (۸۷۸ھ) نے، وہ خود اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اور موسیقی دانوں کا مربی تھا، ایران اور ہندوستان کے موسیقی دان اسکے دربار میں کھچے چلے آتے تھے، فرشتہ کہتا ہے:

آوازۂ جود او چون انتشار یافت، سازندہا و گویندہا کہ در علم موسیقی یگانۂ زمان بودند از اطراف و نواحی روے بکشمیر نہادند، چنانکہ کشمیر از کثرت ہندیان این فن رشک ملک زنگ شد' (۴۴۲ جلد دوم)

بودی بت (شاید صحیح دیوی پت ہو) وہ ایک طرف فارسی کا ادیب تھا، تمام شاہنامہ اسکو برزبان یاد تھا، دوسری طرف موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بادشاہ کے نام کی مناسبت سے زین نام اس نے اس فن میں ایک کتاب لکھکر دربار میں پیش کی، بادشاہ نے اسکو نہایت پسند کیا، اور اسکے حال پر نوازش فرمائی،

ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی نسبت میں نے کہا ہے کہ وہ تنہا ہندوستان زا نہیں ہے بلکہ مسلمان بادشاہوں کی خوش مذاقی نے ایران و توران و ہندوستان کو ملا کر ایک کر دیا تھا، علاوہ قیاس کے ابوالفضل کی اس عبارت سے بھی یہ اشارہ سمجھنا چاہیئے،

---

[1] شعر العجم میں راگ درپن کے حوالے سے امیر خسرو و گوپال کا حال پڑھو، جلد دوم صفحہ ۱۳۵،

نامہ کاران ہندی و ایرانی و تورانی و کشمیری ، از مردہ زنان عشرت افزاے بزم ایمان (آئین ۱۳۰)

دربار اکبری مین مسلمان استادان فن کے ساتھ حسب ذیل ہندو مشاہیر کے نام بھی ہم دوش بدوش پاتے ہین ، باباؔ رام ، سورداس ، اور رنگ سین ، میان تان سین اور میان چند جو چاہے سمجھئے ، میان تان سین کی نسبت ابو الفضل نے لکھا ہے کہ ایک ہزار برس مین کوئی اسکے برابر کا پیدا نہین ہوا ،

مسلمانون نے تو ہندوؤن کی موسیقی پر راگ درپن ، اور چندرکا اور مدھنا یک سنگار وغیرہ کئی کتابین لکھی ہین ، مگر بھوپت راے کے علاوہ جس نے ۱۹؎ جلوس محمد شاہی مین رسالہ علم موسیقی لکھا اس فن کے دوسرے ہندو مصنف کا نام ہمکو نہین معلوم ،

ذیل مین چند نام اخیر زمانہ کے استادون کے آثار شعراے ہنود سے اضافہ کرتے ہین ،

پنڈت اجودھیا پرشاد کشمیری لکھنوی ، حیرت تخلص ، استاد جرأت کے شاگرد تھے ، کئی دیوان اور مثنویان اُنسے یادگار ہین ، فن موسیقی مین اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے ، ۷۰ برس کی عمر مین ۱۲۳۳ھ مین وفات پائی ،

مکھن لال دہلوی ، ولد بخشی سلطان سنگھ کایستھ ، فارسی و سنسکرت و طبابت و شاعری کے علاوہ موسیقی کے ماہر تھے ، ایک خاص ساز کے موجد ہین ،

روشن لال شوق تخلص ، موسیقی کے استاد تھے ،

لچھمی داس دہلوی ، صمیم تخلص ، سنسکرت کے عالم تھے اور فارسی سے واقف تھے فقیرانہ بسر اوقات کرتے تھے ، طبابت کے علاوہ فن موسیقی کے استاد یگانہ تھے ، دلی کے شہزادہ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرہ گلستان سخن مین لکھتے ہین ،

" زبان فارسی سے بقدر ضرورت آگاہ ، اور کتب ہنود علی الخصوص فن موسیقی کی پوتھیون سے

۱؎ عدد سیاہ ، تو مسلم ہونیکی علامت کو ظاہر کرتا ہے ،

صاحب ابتاہ، ستار بجانے مین جوش مسرت اور بیان تن سے نکال دیتا تھا مین نے
اسکے نغمۂ دلنواز کو اپنے کانون سے سنا ہے اور اس کیفیت سے حظ اٹھایا ہے
گاہ گاہ ریختہ کی طرف التفات کرتا تھا،

موسیقی ہندوستان کی چیز تھی لیکن مسلمانون نے اپنا سرمایہ ملا کر اسکو اپنا کر لیا ہند
موسیقی دان بھی انکا تلمذ خوشی سے قبول کرتے تھے، اس اخیر عہد مین استاذنا المرحوم مولانا
محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی
جو اپنے وقت کے ہمہ دان فاضل تھے بلکہ بعض حیثیات سے کہا جا سکتا ہی کہ ہندوستان کی
خاک نے انکی نظیر نہین پیدا کی، وہ علاوہ دیگر علوم کے فن موسیقی کے بھی ماہر یگانہ تھے اور
علمی حیثیت کے علاوہ عملاً بھی اسکو جانتے تھے، اُنکے کئی ہندو شاگرد اس فن مین ابتک موجود
ہین، اور انکے نام کی عظمت کو ابتک برقرار رکھے ہوئے ہین،

مصوری

ہندوستان مین سنگ تراشی تو یقیناً قدیم زمانہ سے موجود تھی اور اسکی بہترین زندہ
مثالین، بودھون اور جینیون کی عمارتون اور معبدون مین مل سکتی ہین، ایلورا اور اجنتا وغیرہ
کے غار ابتک دنیا کے لئے تماشائے حیرت ہین، لیکن شبیہ کشی طراحی اور رنگ آمیزی مصوری
کی نسبت نہین کہا جا سکتا کہ ہندوستان قدیم نے اس فن کو کہانتک سیکھا تھا اور نہ کسی
ہندی مصور کا نام معلوم ہے، جس نے اس فن مین کمال حاصل کیا ہو،

مسلمانون کی آمد کے بعد دیگر فنون لطیفہ کی طرح اس فن مین بھی ہندوؤن نے کمال
پیدا کرنا شروع کیا، اور چند روز مین یہ حال ہو گیا کہ بقول ابو الفضل ہندوستان کے صنعو نیان
مین بھی جس نقش کمال کا تصور ہوا ہو گا وہ واقعاً پہونچ گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ شہنشاہ اکبر

جیسے ہندپرست کے عجائب خانہ مین قدیم ہندوستان کی صنعت مصوری کی کوئی یادگار ہی
ابوالفضل کی عبارت یہ ہے،

ہندما چہ گویم کہ تصویر این معنی (مصوری مین کمال) بر صفحہ خیال ثمرہ بود چنانکہ
از اقالیم جہان کمتر نشان دہند۔ (صفحہ ۰۰)

یعنی جس ہندوستان کو اس فن کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا، اب دنیا مین بہت کم اس
فن مین کوئی اسکا حریف نکلیگا، دربار اکبری کے مشہور ہندو مصورین کے نام یہ ہین کیسو،
لعل، مکند، مادہو، جگن، مہیش، کھیکرن، تارا، سانول، ہرجنس اور رام، بساون ایک
ہندو مصور کی نسبت ابوالفضل لکھتا ہے،

بساون در طراحی وچہرہ کشائی ورنگ آمیزی ومانند نگاری ودیگر کارہاے این فن یگانہ
زمانہ شد۔ (صفحہ ۰۰)

دسونتھ ایک کہار بچہ تھا اسکو اس فن سے فطری مناسبت تھی، وہ محل شاہی کی
دیوارون پر ادہر ادہر بچپن سے لکیرین کھینچا کرتا تھا، ایک دن اکبر کی نظر اسپر پڑگئی جوہر قابل
پاکر خواجہ عبدالصمد شیرین قلم کے سپرد کیا، تھوڑے ہی زمانہ کی تعلیم مین وہ اس فن کا بینظیر استاد بنگیا،
جہانگیر تمام شاہان تیموریہ مین اس فن کا سب سے بڑا ماہر اور قدردان تھا، بشن داس
اسکے دربار کا مشہور مصور تھا، خود بادشاہ تزک مین اسکی تعریف مین لکھتا ہے۔

بشن داس مصورے کہ در شبیہ کشی از یکتایان روزگار است،

سنہ جلوس مین جہانگیر نے خان عالم کو عراق بھیجا تھا، بشن داس کو بھی اسکے ساتھ بھیجا کہ
شاہ عباس صفوی اور اسکے دربار کی تصویرین کھینچکر لائے، یہ تصویرین اسقدر عمدہ کھینچی گئی تہین کہ
جن لوگون نے ان اشخاص کو دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ اصل سے سرمو فرق نہین خود بادشاہ بھی

جن داس کے اس کارنامہ کو تزک مین فخریہ لکھتا ہے اور مصور کے قلم کو داد دیتا ہے،

عبدالرحیم خانخانان کا کتبخانہ ایک عجائب خانہ تھا، اس عجائب خانہ کی سب سے حیرت انگیز چیز ایک ہندو مصور ماد ہو تھا (شاید یہ وہی ہو جسکا نام ایک دفعہ اوپر بھی آیا ہے) جسکی نسبت ماثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے کہ تصویر طراحی، مصوری اور شبیہ سازی مین نادرۂ روزگار تھا اور اس کتبخانہ کی اکثر باتصویر کتابین اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں،

محمد شاہ کے زمانہ مین گوردھن دلی مین ایک مصور تھا، اندرام مصنف مرأة الاصطلاح[۱] اسکی نسبت لکھتا ہے کہ نرگس کی ایک پتی پر پورے شہر کی تصویر وہ کھینچتا تھا،

افسوس کہ ان استادون کو تاریخ کی زندگی نصیب نہین ہوسکتی تھی، اسلیے بجز ان لوگون کے جو سلاطین اور امرا کے دامن سے لپٹے رہتے تھے، اورون کے نام تک بھی تاریکی کے پردہ مین گم ہین، ورنہ سینکڑون استاذ وقت ہونگے جنکو قسمت نارسا ملی ہوگی لیکن دست و دماغ کی نارسائی کے وہ شاکی نہونگے،

اخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب

پورن سنگھ | قوم کالیتھ، دہلی وطن، سعادت یار خان رنگین کے شاگرد تھے اور پورن تخلص کرتے تھے، علم سنسکرت اور طبابت ہندی مین مہارت کامل رکھتے تھے مگر بدمزاجی اور وارستگی کے سبب بیمارون کی طرف کم التفات کرتے تھے، فارسی مین بھی دخل تھا،

لالہ کھیم نرائن کھتری | مہاراجہ تکیت رائے لکھنوی کے رفقا مین تھے، اخیر عمر مین نوابی کے بعد کلکتہ جاکر رہ گئے تھے، فارسی کے شاعر تھے طب مین بہت اچھا دخل رکھتے تھے مولوی حفیظ الدین تہید کے شاگردون مین تھے،

---

[۱] قلمی نسخہ پٹنہ کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، نہایت نادر کتاب ہے،

سُمن لال | قوم کایستھ سکسینہ، ولد بخشی سلطان سنگھ دہلوی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، ایک نسخے کے مصنف ہیں، طبابت مین شہرت رکھتے تھے،

تلسی داس | سادھو تھے، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، دلّی وطن تھا، قلعہ کے شہزادون سے ارتباط رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، حکیم تخلص تھا، طب ہندی مین امام تھے، اور مجربات بیدک سے اکثر امراض مزمنہ کا علاج کرتے تھے، کشتون کے استعمال مین اور جذام اور درج مفاصل وغیرہ کے علاج مین مہارت تامہ رکھتے تھے، موسیقی مین کمال پیدا کیا تھا، فارسی زبان سے واقف تھے،

سکھانند | قوم کایستھ، دلّی وطن، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد، شاعری کے علاوہ فن طبابت میں "وحید العصر" تھے،

تخلیقی ادب کا نمائندہ اور فکرِ نو کا ترجمان

نسیم درّانی کی ادارت میں کراچی سے نکلنے والا

سہ ماہی اشاعتِ خاص، شمارہ - ۵۶ کے مشتملات

○ حمد (ضمیر اظہر، غفار بابر)○ نعت (کرار نوری، امید فاضلی، اکرام کلیم)○ مضامین (تھیٹر کی کہانی، فانی اور ہیڈ نگر کا تصورِ مرگ، رومانوی طرزِ احساس)○ افسانے (ام عمارہ، رشید امجد، محمد منشا یاد، کرامت اللہ غوری، امراؤ طارق وغیرہ)○ غزلیں (رضی اختر شوق، اختر لمان، صابر ظفر، امید فاضلی، جمیل ملک، شاہد عشقی وغیرہ)○ نظمیں (الیاس عشقی، قمر جمیل، محسن بھوپالی، جمیل عظیم آبادی وغیرہ)○ رباعیات (صبا اکبرآبادی، سرفراز علی حسین)○ تبصرے (تنقیدی تحریریں، مٹھی بھر ہوا، لندن لندن، تلافی، پہلی بوند سمندر، پرسپشنز، سایہ سایہ دھوپ، معادن تاریخ، دھند میں آفتاب، سنگلاب، اردو ادب میں احتجاج، خوشبو کا سفر، مرتضیٰ برلاس - فن اور شخصیت، جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی، آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے، پرانی بات ہے، پلک پلک سمٹی رات، لمحوں کی داستان، پل صراط، قامت، پسِ آئینہ، ثبات، سوا نیزے پر سورج)۔

صفحات: تقریباً ۳۰۰ ——— قیمت: ۳۰ روپے

چار شمارے کی قیمت : ۱۲۰ روپے مع رجسٹری

: ملنے کا پتا :

سیپ پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ ——— کراچی ۷۵۶۳۰

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

○ مسجد شہید گنج

○ ——— ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو ○ تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اس کی ایک مثال غدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں ملتی ہے جب ہندو مسلمانوں کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اس وقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اس وقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بیراگیوں / جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سال قبضہ کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ قبلاً یہ مسجد تھی اس لیے پھر ان کے حوالے کی جائے نامناسب ہے۔ بونا سنگھ کی گفت و شنید ہفتوں نہیں مہینوں تک چلتی رہی ــــ اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضہ کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے، ادھر مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا۔ لیکن واقعہ؟ مندر توڑنے کے احکام دے جانے والے دراصل توپ خانے سے لیس امیر المجاہدین، اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق سے حملہ آور ہونے جا رہے تھے۔ ادھر توپ خانہ نصب کر دیا گیا، ادھر مجاہدین کا راستہ چھٹنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہی، آج بھی مندر ہے ــــ بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

اس کی دوسری مثال مسجد شہید گنج ہے جو ۱۹۳۸ء کے فیصلے کے بموجب مسجد نہیں ٹھہرائی گئی، تو پاکستان بننے کے بعد آج بھی ۱۹۹۱ء میں بھی وہ مسجد نہیں ہے۔ اگرچہ آج کی اسلامی دنیا اسے مسجد شہید گنج کے نام سے ہی جانتی ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و امتیاز کا نشان ہے!

لیکن ــــ کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!! بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو! ایسا کر کبھی کبھی تو دل پھٹنے لگتا ہے!

لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!

بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیے۔

لیکن

پھر

چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینی چاہیے۔

یہ حصہ ہم نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی آپ بیتی "رو میں ہے رخش عمر" سے لیا ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۸۶ء میں چھپی ہے، ــــ مصنف ۳۶-۱۹۴۶ء کی تحریک کا بطور طالب علم لیڈر پورے زور و شور سے شریک تھے، اس لیے یہ چند صفحات دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ ــــــــ

ایک مہینہ بعد تحریک مسجد شہید گنج اٹھی۔ اور اس شدت سے اٹھی کہ مجلس احرارِ اسلام
کی ساری ہر دلعزیزی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ اس سے پہلے کہ احرار کی رسوائی اور تباہی
کی داستان قلمبند کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسئلے کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ لاہور
ریلوے سٹیشن کے قریب نولکھا بازار میں دو سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی، جو مسجد عبداللہ خان
کے نام سے مشہور ہوئی، کیونکہ اسے لاہور کے کوتوال عبداللہ خان نے بنایا تھا۔ جس زمانے میں
سکھوں کی شورش عروج پر تھی۔ پنجاب کے مغل گورنر معین الدولہ نے ان کی سرکوبی شروع کی۔
اور مسجد کے قریب کوتوالی میں سکھ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی عہد میں سکھوں کا ایک رہنما بھائی
تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔ جب سکھوں کے راج کا آغاز ہوا۔ تو انہوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے
قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنائی۔ جون ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد عبداللہ
خان (جو اب مسجد شہید گنج کے نام سے یاد کی جاتی تھی) کو مسمار کر کے گوردوارہ تعمیر کیا جائے۔ اس
پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ لیکن شنوائی نہ
ہوئی۔ اور برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد گرا دی۔ اس پر مسلمانوں کا ایک بہت
بڑا جلوس اندرونِ شہر سے دہلی دروازے کے باہر پہنچا۔ تاکہ مسجد شہید گنج کی حفاظت کے لیے
آگے بڑھے۔ پولیس نے صف بندی کی۔ لیکن جلوس صف بندی توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اور اس طرح
پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا ایک خونریز تصادم شروع ہوا۔ جو اڑتالیس گھنٹے تک جاری رہا
مسلمانوں کی سرفروشی اور جانسپاری ملاحظہ ہو کہ جب گولی چلی۔ انہوں نے سینے پر کھائی۔ دو دنوں
میں دس دفعہ گولی چلی۔ تیرہ نوجوان شہید ہوئے۔ اور سینکڑوں زخمی۔ اس سے پہلے مولانا ظفر علی خان
کی قیادت میں مجلسِ اتحادِ ملت کے نام سے ایک جماعت بن چکی تھی۔ جس میں ملک لال دین قیصر
ملک لال خان، میاں فیروز الدین احمد، سید حبیب اور دوسرے بزرگ شامل تھے۔ اس جماعت کا
واحد مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج واگذار کرائی جائے۔ جب مسجد منہدم ہوئی، تو یہ سب رہنما نظر بند
کر دیے گئے۔ اس دوران میں مجلس احرارِ اسلام خاموش رہی۔ اور اس نے اسے "پُر وقار سکوت"
سے تعبیر کیا۔ لیکن اس سے اُس کا وقار مٹی میں مل گیا۔ اس خاموشی کی وجہ یہ تھی۔ کہ احرار آنے والے
عام انتخابات میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور انہوں نے سوچا۔ کہ اگر ہم گرفتار ہو
گئے۔ تو یہ سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ حکومت نے مسلمانوں کی اشک شوئی کے
لیے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگذار کر دیا۔ جو پون صدی سے انگریزوں کے قبضے میں چلی آ

تھی لیکن یہ آتش شوق شہید گنج کا داغ دھو سکی۔ مجلس اتحاد ملت کے نیلی پوش رضاکاروں
نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اور ہزار ہا رضاکار جیلوں میں چلے گئے۔ جب لیڈر قید ہو گئے۔ کوئی ذمہ دار
رہنما باقی نہ رہا۔ تو پہلے ایک نوجوان ابو سعید انور نے بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر کچھ دن سول نافرمانی چلائی
پھر دو اور نوجوان اُبھرے۔ ایک ملا بخش، دوسرا یعسوب الحسن۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ حکام کا ناطقہ
بند کیے رکھا۔ احرار کو بڑی دیر کے بعد ہوش آئی۔ انہوں نے مسجد وزیر خان کو اڈا بنایا۔ اور سول
نافرمانی کی تحریک چلا دی۔ اس کے پہلے جلسہ عام میں میں بھی شریک تھا۔ وہاں بہت جوش و خروش
کا اظہار ہوا۔ لیکن احرار کے موقف کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ وہ بار بار اعلان کرتے کہ مسجد
سول نافرمانی کے ذریعے سے نہیں مل سکتی۔ لیکن عوام کہتے ہیں کہ مل سکتی ہے۔ اس لیے ہم سول
نافرمانی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی احرار کے سرخ پوشوں اور اتحاد ملت کے نیلی پوشوں کے
درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہوا۔ دہلی دروازے کے باہر سرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔
جو شخص گزرتا۔ احرار اس کی قمیص اتار کر رنگ دیتے۔ موچی دروازے کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں
تیار رہتی تھیں۔ لوگ ادھر ادھر آتے۔ اپنے کُرتے نیلے رنگ میں رنگتے اور سُکھا کر پہن لیتے۔
اُس زمانے میں بازاروں میں سُرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آتے تھے۔ اور شعرا
پالیٹکس میں بھی یہی موضوع عام تھا۔ ۱۹۳۶ء میں قائداعظم لاہور آئے۔ حکومت کے ساتھ گفت و
شنید کی اس پر رہنما رہا کر دیئے گئے۔ اور سول نافرمانی بند کر دی گئی۔

اس دوران میں لاہور کے وکلا نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے ایک
مقدمہ بھی دائر کر رکھا تھا۔ لیکن یہ دعویٰ خارج ہو گیا۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔
۲۶ جنوری ۳۸ کو یہ اپیل بھی خارج ہو گئی۔ لیکن اتفاق رائے سے نہیں، اکثریت رائے سے۔ کیونکہ
چیف جسٹس ینگ اور مسٹر جسٹس بھڑے نے یہ فیصلہ دیا۔ کہ جہاں تک قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے۔ وہ
مستقل قانونی صورت لے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ مسجد شہید گنج میں نماز
ادا کریں۔ تیسرے جج مسٹر جسٹس دین محمد نے اس فیصلے کے خلاف اختلافی نوٹ قلمبند کیا۔ اور اس رائے
کا اظہار کیا کہ مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور وہ عام غیر منقول املاک سے مختلف نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔

مسجد شہید گنج کی تحریک میں عام نوجوانوں نے تو بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جہاں
تک طلبہ کا تعلق تھا۔ انہوں نے جماعتی حیثیت میں کوئی حصہ نہ لیا۔ بہرحال جس دن ہائی کورٹ
نے فیصلہ صادر کیا۔ اُس سے اگلے دن اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ اور ہم نے پہلے
اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں احتجاجی جلسہ کیا۔ اور اس کے بعد جلوس نکالا۔ بندۂ عاجز نے جلوس کی رہنمائی

کا فرض ادا کیا۔ پھر تحریک میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اُس دن نمازِ ظہر
کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسۂ عام ہونے والا تھا۔ اور شہر کے مختلف حصوں سے جلوس
نکل رہے تھے۔ اور سب کی منزل بادشاہی مسجد ہی تھی۔ ہمارا جلوس براندرتھ روڈ سے دہلی دروازے
کی طرف بڑھ رہا تھا کہ نیلے گنبد میں مولانا ظفر علی خان بیس پچیس نیلی پوش رضاکاروں کے
ہمراہ مل گئے۔ ہم نے اُنہی کو جلوس کا قائد بنا لیا۔ اس جلوس میں جہاں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، مسجد شہید گنج
زندہ باد اور مولانا ظفر علی خان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ وہاں ایک نعرہ انگریزی زبان
میں بھی لگتا تھا کہ

WHAT DO YOU WANT?

SHAHEED GUNJ MUSUUE. یہ جلوس دہلی دروازے میں داخل ہوا۔ کشمیری بازار، ڈبی بازار،
بزاز ہٹہ اور دوسرے بازاروں سے گزرتے گزرتے جب بادشاہی مسجد پہنچا۔ تو عجیب ہنگامہ برپا
تھا۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ اور ابھی دوسرے جلوس آ رہے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر علی خان کو جلسے کی
صدارت کرنی تھی۔ اور ہمارے جلوس کے وہی قائد تھے۔ اس لیے ہم لوگ اُن کے ساتھ ساتھ مسجد
کے منبر تک پہنچ گئے۔ اور اُن کے اردگرد بیٹھ گئے۔ تلاوتِ قرآن حکیم کے بعد مولانا ظفر علی خان منبر پہ
کھڑے ہوئے۔ اور کہنے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہارے لیے ایک بشارت لایا ہوں"۔ ابھی اتنا کہا
تھا کہ چاروں طرف اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے
سے لوگوں کو خاموش کیا۔ اور فرمانے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہیں بشارت دیتا ہوں" کہ مسجد شہید
گنج زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ شاید واقعی حکومت نے
مسجد واگزار کر دی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا۔ جانتے ہو میں ایسا کیوں کہتا ہوں! آج
میری آنکھوں نے ایک روح پرور نظارہ دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہزاروں طلبہ ننگے سر دیوانہ وار
آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے۔ WHAT DO YOU WANT? اور سب
جواب دیتے ہیں SHAHEED GUNJ MOSQUE تو اے لوگو! جب کسی قوم کے نوجوان کوئی فیصلہ
کر لیں۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُن کی کامیابی میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میرا ایمان ہے کہ مسجد
شہید گنج مل کر رہے گی"۔ جائے عبرت ملاحظہ ہو کہ پاکستان بن گیا۔ لیکن مسجد شہید گنج واگزار نہ ہو
سکی۔ وہی مسجد جسے دو سو سال پہلے انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ جہاں مدتوں بندگانِ
خدا سجدہ ریز ہوتے رہے۔ جہاں اذان دینے کے لیے پینتالیس سال پہلے بہت سے مسلمان
انگریز کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ اور جس کی واگزاری کے لیے ہمارے رہنماؤں نے قید و بند کی

پروفیسر ظلّ الرحمٰن خاں (علی گڑھ) کا گرامی نامہ (۹۰/۷/۳۱)

محترمی بیدار صاحب السلام علیکم

مسجد شہید گنج کا قصہ مجھے قصے ہی کی طرح معلوم ہے۔ اگر کسی کو سنجیدگی سے دلچسپی ہو تو اسے پھر قانونی کتابوں میں دیکھنا چاہیے۔ والد مرحوم نے قصے کی طرح سنایا تھا۔ آپ کو بھی اسی طرح سنائے دیتا ہوں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب کی بات ہے لیکن غالباً Twenties or Thirties کی بات ہوگی۔

المختصر یہ پہلے مسجد تھی جسے سکھوں نے زبردستی قبضہ کرکے گرودوارہ بنالیا۔ کسی Stage پر مسلمانوں کے اسلامی جذبے نے زور مارا اور انھوں نے سب ثبوت فراہم کر لیے جس سے یہ ظاہر تھا کہ یہ مسجد تھی مگر یہ بہت برسوں سے گرودوارہ ہو چکی تھی۔ عام چیزوں کے لیے تو قانون یہ ہے کہ اگر کسی کا قبضہ مخالفانہ (Adverse possession) ۱۲ سال سے زیادہ رہا ہے تو اسے ملکیت کے پورے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ سکھوں کا معاملہ یہ تھا کہ اگر اسے پہلے مسجد بھی مانا جائے تو قبضہ مخالفانہ ہونے کی بنا پر اسے گرودوارہ باقی رہنا چاہیے۔

مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ مسجد چونکہ خدا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خدا کے خلاف قبضۂ مخالفانہ کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لیے وہ مسجد ہی رہی اور ان کو واپس ہونا چاہیے۔

مقدمہ تین ججوں کے ایک بنچ نے سنا جس میں ایک جج ہندو تھے جن کا نام Bhide تھا۔ یہ مہاراشٹرین تھے اور غالباً بلگام کے رہنے والے تھے۔ ایک مسلمان جج تھے جن کا نام غالباً کچھ بخش پر تھا، شاید اللہ بخش، خدا بخش یا کچھ ایسا۔ اور ایک انگریز جج تھا۔ مسلمان جج نے مسلمانوں کی رائے سے اتفاق کیا، ہندو جج نے شاید کچھ اس طرح لکھا کہ بحث کچھ بھی ہو، اگر اسے مانا گیا تو سارے ہندستان میں آگ لگ جائے گی اور یہ گڑے مردے کہاں تک اکھاڑے جائیں گے۔ انگریز جج نے جسٹس بھِڈے سے اتفاق کیا اور اس طرح معاملہ سکھوں کے حق میں فیصل ہوا۔

والد مرحوم فرماتے تھے کہ اس وقت مسلمان اپنی بے وقوفی پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن دراصل یہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ یہ تھی کہانی جو میں نے سنی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کا ذکر اس زمانے میں نہیں آیا۔ آپ خدا کے واسطے لوگوں کو بتائیں

••

اے گرفتار ابوبکر و علی

○ مناقب عمر بزبان علی — مناقب علی بزبان عمر

○ مصنف: علامہ زمخشری

مترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی

پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس یہی صورت شیعہ سنی مسئلہ کی ہے۔ عالم شیعہ عالم سنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیروؤں کے درمیان ہے اور وہ اس لیے ہے کہ مفادات بنا لیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو مفادات پر تو ضرب لگے گی ہی۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے، انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔

چنانچہ زمخشری احتشام کاندھلوی (دونوں — بڑے بھائی!) نے پہل کی، اس کی ہمیں خوشی ہے۔

——— ادارہ

○

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجہیز و تدفین سے فارغ ہو کر صحابہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت عمرؓ پہلے جمعہ کو صوف کا موٹا کرتا پہنے ہوئے جس میں ران پر اور مونڈھوں کے درمیان چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے اور ایک چادر مونڈھوں پر ڈالے ہوئے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور منبر نبوی پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اوّل حق تعالیٰ کی خوب حمد و ثنا کی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے لئے رحمت کی دعا مانگی اور بے اختیار رونے لگے حاضرین پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ حضرت عمرؓ روتے روتے غش کھا کر منبر پر گر پڑے اور چہرے پر خراش آئی لوگ غشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر لے گئے چند روز آپ باہر نہ نکل سکے جب کچھ افاقہ ہوا تو گھر سے باہر جلوہ افروز ہوئے۔

حضرت عمر فاروقؓ دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے لوگوں کی خبر گیری کے لئے بازاروں اور گلیوں اور راستوں میں پھرا کرتے تھے۔ خدا کی قسم اُن کا دُرّہ تمہارے ان کوڑوں سے زیادہ ہیبت ناک اور خوفناک تھا۔

حضرت عمرؓ یتیموں اور بیواؤں اور مسکینوں کی خبر رکھتے تھے، اُن کے پاس بیٹھتے اور ان کے ساتھ چلتے اور بوڑھوں اور بچوں پر کھڑے ہو کر پرسش احوال کرتے تھے۔ اور غلام کا حق آزاد سے، کم زور کا حق زور دار سے، مسکین کا حق زبردست سے، چھوٹے گروہ کا حق بڑے گروہ سے دلواتے اور جو کچھ کرتے اجر و ثواب کی خاطر، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتے تھے۔ اور دینی معاملہ میں کسی کی ملامت کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔

زہد و تقویٰ کے باعث اپنے لئے جَو کی تین روٹیاں روزانہ مقرر کر رکھی تھیں جن کو کبھی

چربی سے تناول فرماتے تھے اور کبھی کبھی صرف نمک کی ڈلی سے کھاتے تھے جب اس تنگی کا مزا اور خشکی کا اثر زیادہ بڑھ گیا تو زیتون اور کھجور کا استعمال بھی شروع کر دیا چند مرتبہ تھوڑا سا گھی بھی کھایا اور دودھ بھی نوش فرمایا کلیجی آپ کو زیادہ پسند تھا اور اونٹ کی گردن کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں جب حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات دیں اور مال غنیمت کی فراوانی ہوئی تو حضرت عمرؓ ہر جمعہ کو کچھ اونٹ ذبح کرلیتے اور اچھا اچھا تمام گوشت مساکین، مہاجرین اور ضعفاء انصار میں تقسیم فرما دیتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے گردن کا گوشت رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے سے کہا کرتے تھے کہ بھوکا رہنا اس جہنم کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے جہاں ہمیشہ رہنا پڑے گا۔ وہاں موت ہے اور نہ وہاں سے چھٹکارا۔ اس میں راحت وخوشی کا نام نہیں اور وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں اور دوزخیوں کے لئے فرحت و خوشی کا کوئی موقع نہیں۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حقانیت چمک اٹھی اور صداقت سربلند ہو گئی نفاق کی آگ بجھ گئی اور کفر کی مشتعل چنگاریاں دھیمی پڑگئیں۔ باطل مغلوب ہو گیا اور حق غالب آگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کا طریقہ عام طور پر پسندیدگی اور شوق و رغبت کے ساتھ رواج پکڑ گیا اور شیطان ناکام و نامراد ہو گیا۔

چنانچہ حضرت حسان فرماتے ہیں ؎

"یا کارها عمر الفاروق مت کمداً"
"قد قام خیر عباد الله فی العرب"

حضرت عمر فاروقؓ کے ابتداء خلافت میں قحط پڑا اور ہر شے گراں ہو گئی جس کے باعث لوگ پریشان حال ہو گئے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے مویشی مرنے لگے۔ اس وقت حضرت عمر کو جو بھی غلہ میسر آتا تھا سب میں حصہ رسد برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ نہ اپنے حصہ میں کبھی زیادتی کرتے اور نہ کبھی اپنے کو ترجیح دیتے جو ناداری اور تنگ حالی عام مسلمانوں کو لاحق تھی اسی میں آپ اپنے کو بھی مبتلا رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایک روز اپنا دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے مدینہ منورہ کے راستوں اور گلیوں

میں گھوم رہے تھے کسی کا کوئی کام ہوتا تو اس کو خود انجام دیتے تھے۔ کسی دوسرے کے حوالے نہ کرتے تھے۔ اسی دوران میں ایک انصاری بچے پر گذر ہوا جو رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا "الٰہی عمر کے مقابلہ میں میری مدد فرما تو ہی اس پر ظلم کر"۔

حضرت عمرؓ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے اور دوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت عمرؓ نے انا للہ پڑھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کی تکلیف کے باعث رونے لگے اور فرمایا کم بخت عمر

قَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ تو نے ایک پاکیزہ جان کو بلا قصاص کے
لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ہلاک کیا۔ بلا شک تجھ سے بہت برا کام سرزد ہو گیا۔

کل کو بارگاہِ خداوندی میں کیا عذر پیش کرے گا؟

پھر بچے کے سر کو زمین سے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ لیا اور روتے رہے آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر بچے کے چہرے پر گر رہے تھے۔ اتنے میں اہل لوگ جمع ہو گئے اور حضرت عمرؓ کو اس حال میں حواس باختہ پریشان دیکھ کر رونے لگے پھر دریافت کیا امیر المومنین کیا بات ہے؟ کیا ماجرا ہے؟ اور یہ کیا حادثہ پیش آیا؟۔

حضرت عمر نے بچہ کا سارا واقعہ بیان کیا اور اس کو مسجد میں لے جانے کا حکم فرمایا۔

پھر جب وہ بچہ ٹھیک ہو گیا تو آپ نے اس سے فرمایا میرے پیارے بچے کیا بات ہے جو تو عمرؓ کے مقابلہ میں خدا سے مدد مانگ رہا ہے؟ کیا عمرؓ نے تجھ پر کوئی ظلم کیا ہے؟ یا تیرا مال غصب کیا ہے؟ یا تجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچائی ہے؟ یا تجھے کسی خیر سے محروم رکھا ہے؟

بچے نے جواب دیا خدا کی قسم ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی بات یہ ہے کہ میں ایک انصاری بچہ ہوں میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شہید ہوئے اور میرے چچا یوم حدیبیہ میں شہید ہوئے اور میرے ماموں بازو ہو کر جنگ میں شہید ہوئے بھاگتے ہوئے نہیں مارے گئے۔ اب آپ کی خلافت میں ہیں اور میری والدہ اور دو بہنوں نے آج تین شب و روز سے کچھ نہیں کھایا بھوک اور بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔

امیر المومنین جو کچھ میری زبان سے نکلا اس کا باعث یہ تنگی اور سختی ہے جس کو میں نے بیان کیا۔

یہ حال سن کر حضرت عمر رونے لگے حاضرین بھی رونے لگے حتیٰ کہ عورتیں بھی گھروں میں رونے لگیں پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگو یہ دنیا دنیا والوں کا دا اصلی گھر ہے نہ حقیقی قیام گاہ ہے اور آخرت اصلی ٹھکانہ ہے اور محل جزا اور سزا ہے جن صحابہ کا حافظہ قوی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے پاس نہ کوئی تہ شدہ کپڑا تھا اور نہ کوئی غیر مستعمل برتن تھا اور نہ کوئی دروازہ پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میدے اور گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور آخر تک کبھی آپ کے دسترخوان پر دو سالن نہیں کھائے گئے باوجودیکہ آپ کو حق تعالیٰ نے تمام مخفی خزانوں کی کنجیاں عطا فرما دی تھیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ نہ کبھی نیا کپڑا پہنا اور نہ کبھی عمدہ نفیس کپڑا استعمال فرمایا اور نہ مال و دولت ہی جمع کیا جس سے اہل و عیال گزر بسر کرتے اور نہ کبھی کوئی خادم و غلام رکھا اور دنیا سے اپنا دامن بچا کر صحیح و سالم تشریف لے گئے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور خود آپ سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے، جب فقر و تنگی کو آتے دیکھو تو سمجھو صالحین کی مرغوب پسندیدہ خصلت آرہی ہے اور جب تونگری اور فراخی کو آتے دیکھو تو سمجھ لو کہ کوئی خطا سرزد ہوئی جس کی پاداش میں جلدی کی گئی ہے

غور سے سن لو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اس شخص میں اخوت اسلامی نہیں جو خود پیٹ بھر کر رات بسر کرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی ملک میں چالیس درہم سال بھر تک رکھے رہیں نہ کبھی ان کو راہِ مولیٰ میں خرچ کرے اور نہ کسی کارِ خیر میں صرف کرے اور کسی ضرورت مند محتاج سے بھی واقف ہو تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جباریں کی صف میں کھڑا کریں گے اور ان درہم سے اس کو داغا جائے گا

لوگو خبردار ہو جاؤ تمہارا یہ مال و متاع قیامت کے دن تمہارے لئے باعث ننگ و عار ہوگا اور تمہیں دوزخ میں لے جائے گا۔

خوب سمجھ لو جو شخص اپنی ذات کے لئے مال جمع کرتا ہے اس کے اس مال ہی سے اس کی پیشانی اور پشت داغی جائے گی۔ مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔ البتہ جو شخص اپنے مال سے حقوق خداوندی ادا کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کو سچ اور حق سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور خدا

کے خوف سے ڈرتا ہے اور اسی پر بھروسہ رکھے تو مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم سے بچ نکلے گا اور نار اس کے حق میں مستعمل نہ ہوگی اور میں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب بھی اس کی نجات محض فضلِ رحمانی اور کرم ربانی سے ہوگی۔ تمہیں چاہئے کہ خیر کی طرف سبقت کرو امور خیر میں سبقت ہی باعثِ رشک ہے۔ سمجھو ہمیں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے قریب ہی قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے ان کی اولاد تمہاری غلام ہوگی اور ان کی زمینوں اور گھروں اور شہروں اور مال و دولت کے تم وارث ہوگے اس وقت تم اپنے اعمال اور کردار پر قایم رہنا۔ مجھے امید ہے کہ یہ زمانہ قریب ہی آنے والا ہے انشاء اللہ پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا

اَللّٰھُمَّ مِنْکَ الرَّجَاءُ — الٰہی تجھی سے امیدیں وابستہ ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دریافت کیا امیر المومنین آپ نے جو کچھ بیان کیا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''ہاں''

حضرت عثمانؓ یہ سن کر روتے ہوئے مسجد سے باہر آئے اور کہتے جاتے، ابنِ عفانؓ قیامت کے روز تجھے تیرے مال سے داغا جائے گا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اونٹ، بکری، سونا چاندی، غلہ کھجور لے کر پہنچے اور فرمایا، اللہ کی راہ میں یہ میرا ایک تہائی مال حاضر ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی اسی طرح اپنا تہائی مال لائے۔ پھر اور صحابہ نے مال لانا شروع کیا حتی کہ تمام مسجد اندر اس کے ارد گرد کی جگہ بھر گئی۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اس مال کو لوگوں میں تقسیم کرا دیا اور اس بچہ کو بہت سا مال عطا فرمایا اور فرمایا عمر کے گھر والوں کو بھی حصہ رسد دوسروں کے برابر دینا۔ چنانچہ اس میں سے اونٹ کی گردن کا گوشت چند مٹھی کھجور اور تھوڑا سا آٹا امیر المومنین کے حصہ میں آیا اور آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ اس کو جلد تیار کر کے خبر دیں۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ گھر والوں کے بلانے کے منتظر تھے کہ اتنے میں ایک بدوی آیا امیر المومنین کو سلام کیا اور سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

امیرالمومنین نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ ارشاد فرمایا کہ بدویوں میں غلظت اور قساوت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ نہ کتاب اللہ کو سیکھتے ہیں اور نہ ان کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے۔

بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سچ اور برحق ہے آپ صادق و مصدوق ہیں لیکن میں بدوی کیوں کر ہو گیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کی اور آپ کے سامنے جہاد کیا اور اکثر قرآن کا حافظ ہوں اور دینی امور میں کسی کا محتاج نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہماری اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے مجھے اس کا علم نہ تھا۔

پھر آپ اس بدوی اور دیگر حاضرین کو ساتھ لے کر گھر تشریف لے گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ستونوں پر چھت پڑی ہوئی تھی اور دسترخوان کی جگہ کھجور کے پتے بچھے ہوئے تھے سب بیٹھ گئے اور کھانا لایا گیا سب نے داہنے ہاتھ سے کھایا اور بدوی نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا یہ دیکھ کر امیرالمومنین کو طیش آگیا اور فرمایا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا ہے تمھیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے شیطان اس کے کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔

بدوی نے کہا، آپ نے سچ فرمایا بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی لیکن اگر کسی شخص کے داہنا ہاتھ نہ ہو تو پھر وہ کس سے کھائے؟ اور اپنا داہنا ہاتھ نکال کر دکھایا جو کٹا ہوا تھا۔

امیرالمومنین نے شرمندہ ہو کر دریافت فرمایا یہ ہاتھ کو کیا ہوا؟ بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں کٹ گیا۔

پھر بدوی نے اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ میں اپنے اونٹوں میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے پاس اترنے کی درخواست کی آپ نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور میرے یہاں اتر گئے میں نے کھانا حاضر خدمت کیا آپ نے کھانا تناول فرمانے سے انکار فرمایا میں نے انکار کی وجہ دریافت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چونکہ تم مشرک ہو اس لئے میں تمھارے یہاں کا کھانا نہیں کھا سکتا میں نے عرض کیا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و انک رسول اللہ

اس کے بعد میں چند بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوا
میں نے اس بارے میں چند اشعار بھی کہے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی
سنایا ہے۔

ألا من كفى في رضا الله نالها
ضراب العدى في الله من دون احمد

وحميت من دين النبي الذي له
على دليل ظاهر في كل مشهد

فما قطعت حتى رأيت مكانها
وفلقت هامات العدى بالمهند

فان قطعت كفي فيا رب مشهد
شهدت بها والسيف يقطر في يدي

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے پھر دریافت فرمایا تمہاری معاش کا کیا
ذریعہ ہے؟
بدوی نے کہا میرے پاس ایک لادو اونٹ ہے اس پر لکڑیاں لاد کر مدینہ لاتا ہوں اور
ان کو فروخت کر کے اپنے کنبہ اہل و عیال پر خرچ کرتا ہوں۔
امیر المومنین نے دریافت فرمایا تمہارا داہنا ہاتھ تو ہے نہیں پھر لکڑیاں کس طرح اٹھاتے ہو؟
بدوی نے کہا کسی مسلمان سے مدد لے لیتا ہوں داہنا ہاتھ وہ لگا دیتا ہے اور بایاں ہاتھ
میرا اپنا ہوتا ہے۔ امیر المومنین خدا کی قسم پہلے میں بہت قوی تھا لیکن اب بہت کم زور ہو گیا میری
ہڈیاں نرم پڑ گئیں اور جسم کا گوشت سوکھ گیا۔

؎ مطلب یہ کہ میرے ہاتھ کو جو کچھ دشمن کی طرف سے پہنچا اللہ کی رضا کے لئے اللہ کی راہ
میں احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں پہنچایں لے نبی برحق کے دین کی حمایت کی جس
کی حقانیت ہر ہر جگہ مجھ پر واضح ہو گئی۔ میرا ہاتھ اس وقت کٹا جب میں نے اس کا مقام عالی
دیکھ لیا اور دشمنوں کی کھوپریوں کو ہندی تلوار سے اڑا دیا۔ اگر میرا ہاتھ جاتا رہا تو کوئی حرج نہیں
میں بہت معرکوں میں شریک ہو چکا جن میں میری تلوار میرے ہاتھ میں تھی اور اس سے خون کے
قطرے گر رہے تھے۔

امیرالمومنین نے اس کی امداد فرمائی اور اس کو ایک لادہ اونٹ پر سوار کرایا اور کھانے اور کھجور کا توشہ ساتھ کیا۔

پھر ایک روز امیرالمومنین نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر بارش کی دعا کی اور جس تنگی میں مسلمان مبتلا تھے اس سے خلاصی کی التجا کی۔ دعا قبول ہوئی اور صبح ہونے سے پیشتر حق تعالیٰ نے بادل بھیجے کئی دن بارش کا سلسلہ جاری رہا اور تمام سرزمین سرسبز و شاداب ہو گئی

حضرت مثنیٰ ابن حارثہ نے جنگ فارس کی اجازت طلب کی۔ امیرالمومنین نے اس کے ساتھ ایک لشکر روانہ فرمایا اور حق تعالیٰ نے قادسیہ کو فتح کرا دیا۔ پھر متواتر فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مال و دولت کی انتہائی فراوانی ہو گئی اور مسلمان خوشحال فارغ البال ہو گئے۔ رجسٹر مرتب کئے گئے اور سب کے وظائف مقرر کئے گئے۔ پھر جب حق تعالیٰ شانہ نے امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں صحابہ کرام کے ہاتھوں ملک شام ملک عراق ملک مصر فتح کرا دیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے منتخب اور چیدہ صحابہ عظام کو امراء متعین فرما کر اطراف ممالک میں انتظام کے لئے روانہ فرمایا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے وصال کا وقت قریب آگیا تو آپ نے مجھے بلایا اور اپنے سر کے قریب بٹھا کر فرمایا جب میں مر جاؤں تو تم مجھے اپنے ان ہاتھوں سے غسل دینا جن سے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا تھا۔ پھر کفن پہنا کر حجرۂ اطہر دانور پر لے جانا اگر دروازہ خود بخود کھل جائے تو مجھے جوار نبی میں دفن کر دینا ورنہ وہاں سے لوٹا کر عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ پھر جو کچھ بھی حق تعالیٰ فیصلہ فرما دیں۔

وہ احادیث جن میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کا تذکرہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سامنے سے آتے نظر آئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

علیؓ یہ دونوں انبیاء و مرسلین کے بعد تمام اگلے پچھلے ادھیڑ عمر اہل جنت کے سردار ہیں۔

لیکن علیؓ تم ان کو اس کی اطلاع نہ کرنا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آیت "وجبریل وصالح المومنین الخ" میں صالح مومنین علی بن ابی طالب اور ابو بکرؓ اور عمرؓ مراد ہیں۔ حضرت ابو صالح سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ دونوں نے بیان کیا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا میرے بعد میری امت میں سب سے افضل ابو بکرؓ ہیں ان کے بعد پھر عمرؓ سب سے افضل ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی پر سہارا دیتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے راستے میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علی ان سے محبت رکھنے والا جنت میں جائے گا۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر کسی کو بھیجنا چاہتے تھے اس وقت آپ کے دائیں اور بائیں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ ان میں سے ایک کو بھیج دیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میں ان کو کس طرح بھیج سکتا ہوں۔ یہ دونوں تو دین کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں"۔

یعنی ان دونوں حضرات کا وجود دین کے لئے خاص اہمیت اور شان رکھتا ہے جس کے نقصان سے دین میں نمایاں کمی اور خرابی محسوس ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے کچھ خصوصی معاون و مددگار رفیق کار ہوتے ہیں اور مجھے حق تعالیٰ نے چودہ معاون و مددگار رفقائے کار عطا فرمائے جن میں سات قریشی ہیں۔ علیؓ۔ حسنؓ۔ حسینؓ۔ حمزہؓ۔ جعفرؓ۔ ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔

اور سات انصاری ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سلمانؓ۔ ابو ذرؓ۔ مقدادؓ۔ حذیفہؓ عمارؓ۔ بلالؓ۔ رضی اللہ عنہم۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا اگر تم ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو ان کو دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا مشتاق پاؤ گے۔ اور اگر عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو ان کو زور دار امانت دار پاؤ گے۔ اور اگر علیؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو وہ تمہیں سیدھی راہ پر قائم رکھے گا اور حق پر چلائے گا۔

(ف) ارشادِ نبوی سے خلفاء راشدین کی ترتیب خلافت اور ذاتی خصوصیات اور ان کی اہم دینی خدمات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے ان کے دورِ خلافت میں صحابی صحابہ کا بھرپور جلوہ ہوگا اور یہ نجومِ شریعت ہر طرف رونق افروز ہوں گے، اس وقت ان کی رہنمائی اور رہبری کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کی ضرورت ہوگی جو زہد و تقویٰ کا مجسم ہوں گے اور آخرت کے سراپا مشتاق و منتظر اور بے قرار تاکہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرام کا اصلی رنگ قائم رہے۔

پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوں گے اسلام اور مسلمین کو عروج و فروغ ہوگا۔ فتوحاتِ اسلامی میں افزونی اور مال و دولت کی فراوانی ہوگی اس وقت ان کو قابو اور اعتدال میں رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ کی ضرورت ہوگی جو اپنی سخت گیری اور امانت داری سے خود بھی متاعِ دنیوی سے محفوظ اور مامون رہیں گے اور دوسروں کو بھی محفوظ اور مامون رکھیں گے اور دنیا کی بہتات کے باوجود دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق قائم رہے گا۔

پھر فتنوں کا آغاز ہوگا اکثریت غیر صحابی کی ہوگی اور انھیں کو غلبہ و قوت ہوگی جس پر قابو پانا اور حق پر قائم رہنا دشوار ہوگا۔ یہ خدمت حضرت علیؓ انجام دیں گے اور استقلال کے ساتھ خود بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے اور دوسروں کو بھی قائم رکھیں گے۔ ارشادِ نبوی میں دورِ عثمانی کا تذکرہ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ کلمات طیبات ارشاد فرمائے کہ تم علیؓ کو عمرؓ کے بعد خلیفہ نہ بناؤ گے پھر جب خلیفہ بناؤ گے تو ان کی یہ خصوصیات سامنے آئیں گی۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارہ میں حضرت علیؓ کے اقوال

ایک قریشی حضرت علیؓ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ "امیر المومنین آپ ابھی منبر پر فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْنِی بِمَا اَصْلَحْتَ بِہٖ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ۔

وہ خلفاء راشدین کون ہیں؟

حضرت علیؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے اور فرمایا تیرے حبیب اور چچا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں امام ہدیٰ اور شیخ الاسلام اور قریشی تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقتدیٰ بنے۔ جس نے ان کی اقتدا کی محفوظ ہوگیا۔ اور جس نے ان کا اتباع کیا صراطِ مستقیم تک پہنچ گیا اور جس نے ان کا پلہ پکڑ لیا وہ حق تعالیٰ کی جماعت میں داخل

ہو گیا حزب اللہ ھم المفلحون حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا واللہ تم ایک واقف کے پاس آتے ہو۔ دونوں امام ہدیٰ تھے۔ اور راہ راست اور صراط مستقیم پر چلانے والے مصلح قوم اور فایز المرام تھے۔ یہ دونوں حضرات فارغ البال صحیح وسالم دُنیا سے تشریف لے گئے۔

عبد خیر سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قیامت تک جس قدر حکام و سلاطین آئیں گے حق تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اُن کے لئے راہبر اور حجت بنا کر بھیجا ہے۔ یہ حضرات بہت پہلے تشریف لے گئے اور اپنے پسماندگان کو خوب تھکا دیا۔ ان کا تذکرہ امت کے لئے موجب رنج و غم ہے اور سلاطین کے لئے باعث طعنہ۔

حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں حضرات ان ستر آدمیوں میں سے ہیں جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوئے تھے۔

عبدالرحمن بن ابزی کے صاحبزادہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازہ کے ساتھ تھے حضرت علیؓ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جنازہ کے آگے تھے۔ حضرت علیؓ فرمانے لگے یہ دونوں حضرات جانتے ہیں کہ جنازہ کے پیچھے چلنے والے کی فضیلت آگے چلنے والے پر ایسی ہے جیسے جماعت سے نماز پڑھنے والے کی تنہا نماز پڑھنے والے پر لیکن ان کے مزاج میں سہولت ہے لوگوں کے لئے سہولت پسند کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ بہت آہ کرنے والے اور رقیق القلب تھا اور حضرت عمرؓ خالص اعتقاد رکھتے تھے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ خلوص کا معاملہ کیا۔

حضرت علیؓ نے منبر پر فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبقت کی حضورؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ تھے وہ بھی تشریف لے گئے تیسرے درجہ پر حضرت عمرؓ تھے وہ بھی رخصت ہوئے ان کے بعد اب فتنوں سے سابقہ پڑ گیا۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص بتاؤں۔ حاضرین نے عرض کیا ہاں بتائیے آپ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔

عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا سب انبیا علیہم السلام میں بہتر طریق پر رسول اللہ صلعم کا وصال ہوا حضور کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا اور آپ کی سنت پر چلے اور باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر ان کی وفات ہوئی۔ اور آپ حضور کے بعد اس امت میں سب سے افضل تھے ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کیا اور ان کی سنت پر چلے باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر وفات پائی اور حضرت عمرؓ اس امت میں حضور اور حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ سب سے افضل ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا امت محمدیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے افضل ہیں۔ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ تیسرے درجہ میں حضرت عثمانؓ ہیں۔

حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؓ نے پھر کہا اے باپ تیسرے درجہ میں آپ ہیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اے بیٹے تمہارا باپ تو عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہے جو لجر اُن کے لئے ہے وہی اس کے لئے ہے اور جو مواخذہ ان سے ہوگا وہی مواخذہ اس سے ہوگا۔

حضرت علیؓ کا اُن لوگوں کی تردید کرنا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بُرا کہتے ہیں یا حضرت علیؓ کو ان پر فوقیت دیتے ہیں

حضرت علقمہؓ نے کوفہ کے منبر پر ہاتھ مار کر کہا کہ حضرت علیؓ اس منبر پر وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے تقریر میں فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اشخاص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر مجھے فوقیت دیتے ہیں اگر میں پہلے ممانعت کر دیتا تو ضرور اس کی سزا دیتا لیکن میں اعلان سے قبل سزا دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شخص نے آئندہ یہ خیالات ظاہر کئے اور میرے روبرو پیش کیا گیا تو چونکہ یہ شخص مفتری ہے لہذا اس کو مفتری کی سزا دی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، پھر عمرؓ، پھر واللہ اعلم کون ہے۔ اس لئے کہ ان کے بعد ہم نے نئی نئی باتیں گھڑی کر دیں جن میں حق تعالیٰ جو چاہے فیصلہ فرمائے۔

محبت اور عداوت میں حد سے نہ بڑھنا چاہیئے ممکن ہے کہ دوست دشمن ہو جائے اور

دشمن دوست ہو جاتے۔ اور تمہیں اس کے باعث ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے)

حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن سبا ان کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر فوقیت دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا میں نے اس کے قتل کا ارادہ کر لیا ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ ایسا شخص جو آپ سے محبت رکھتا ہے اور آپ کو افضل سمجھتا ہے آپ اس کو قتل کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا واللہ جس شہر میں میں ہوں یہ وہاں نہیں رہ سکتا اور اس کو شہر بدر کر دیا۔

حضرت علیؓ ایک دن کوفہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ ایک شخص نے عرض کیا اے خیر الناس میرے معاملہ میں غور کیجئے واللہ میں نے آپ سے بہتر آدمی نہیں دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس شخص کو سامنے پیش کرو۔ وہ سامنے حاضر ہوا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے اس نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو دیکھا ہے اس شخص نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیکھا ہے تو صرف تنبیہ و تہدید کرتا لیکن جب ایسا نہیں تو جو جاہے کہتا پھر۔

سوید بن غفلہ سے مروی ہے کہ میں ایک مجمع پر سے گذرا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تنقیص کر رہے تھے۔ میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ بعض شیعہ کے پاس سے گزر ہوا جو شیخین کا ذکر کر رہے تھے۔ اور اُن کی تنقیص کر رہے تھے۔ اگر وہ یہ نہ سمجھتے کہ آپ اُن کے ہم خیال ہیں اور اس خیال کو پوشیدہ رکھتے ہیں تو ہرگز ایسی جرأت نہ کرتے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا خدا کی پناہ میں اور ان کی نسبت خوبی اور بھلائی کے سوا کچھ بھی دل میں رکھوں۔ اُس شخص پر خدا کی لعنت جو ان کے متعلق خوبی اور بھلائی کے علاوہ کوئی خیال پوشیدہ رکھے یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور وزیر تھے۔ پھر آپ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر سے نکلے اور منبر پر چڑھے۔ آپ کے آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور داڑھی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور اس کو دیکھ رہے تھے (اور داڑھی سفید ہو گئی تھی) جب لوگ جمع ہو گئے آپ کھڑے ہوئے اور ایک بلیغ مختصر خطبہ پڑھا اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو سرداران قریش کو جو مسلمانوں کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں جن سے میں بری

ہوں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور ان کے اس قول کی سزا دینے والا ہوں۔ اس ذات پاک کی قسم جس
نے دانہ کو شق کیا اور ہر ذی روح کو پیدا کیا۔ مومن پرہیزگار ہی ان سے محبت کرتا ہے اور فاجر بدبخت ہی
ان سے کینہ رکھتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے صدق و وفا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا ساتھ دیا۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور سزائیں دیتے تھے۔ اور جو کچھ
کرتے تھے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے ہرگز تجاوز نہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کی رائے کی برابر کسی کی رائے نہ سمجھتے تھے۔ اور ان جیسی محبت
بھی کسی سے نہ فرماتے تھے۔ حضورؐ ان سے خوش تشریف لے گئے۔ اور مسلمان بھی ان سے
خوش رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نائب
بنایا۔ جب حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو بلا لیا تو مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور
زکوٰۃ ان کے حوالہ کی اس لئے کہ زکوٰۃ اور نماز کا اسلام میں ایک درجہ ہے۔ (جب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے اپنا قائم مقام بنایا تو زکوٰۃ لینے میں بھی آپ کے قائم
مقام ہوں گے) بنو عبدالمطلب میں میں پہلا شخص تھا جس نے ان کے لئے سہولتیں بہم
پہنچائیں۔ بعض لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بعض کا زکوٰۃ دینا بھی کافی ہے
خدا کی قسم آپ ماسبق لوگوں میں سب سے افضل اور نرم دل اور رحیم اور متقی اور متقدم
الاسلام تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نرمی اور رحم دلی میں حضرت میکائیل
علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور عفو و وقار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت
ابوبکرؓ آخر وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلتے رہے۔ اور اپنے بعد
حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا۔ اس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ کیا کچھ لوگ حضرت عمرؓ کی خلافت
سے ناخوش تھے اور میں ان لوگوں میں تھا جو خوش تھے۔ واللہ حضرت عمرؓ اس وقت تک دنیا
سے تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ ناپسند کرنے والے بھی ان کو پسند نہ کرنے لگے۔ حضرت
عمرؓ نے ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کیا اور ان کے آثار
پر اس طرح چلے جیسے بچہ اپنی ماں کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ واللہ حضرت عمرؓ ماسبق لوگوں
میں سب سے بہتر اور نرم دل اور رحیم اور ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کرنے والے تھے حق
تعالیٰ نے ان کی زبان پر حق بات جاری کر رکھی تھی۔ جب بولتے تو ہم سمجھتے ایک فرشتہ ہے جو
عمرؓ کی زبان سے بول رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے اسلام کی وجہ سے اسلام کو عزت

دی اور ان کی ہجرت کو دین کی مضبوطی کا باعث بنایا۔ اور مومنوں کے قلوب میں ان کی
محبت اور کافروں اور منافقوں کے دلوں میں ان کی ہیبت پیدا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے دشمن پر سختی اور بدخلقی میں ان کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور
غیظ و غضب میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ۔ کیا تمھارے پاس ان جیسا کوئی
ہے؟ کوئی شخص بغیر ان سے محبت کئے اور بغیر اُن کا اتباع کئے اُن کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔
جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے
وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے اور میں اس سے بری ہوں۔ اگر میں پہلے اس کی ممانعت کر دیتا تو اس
وقت سخت سزا دیتا۔ البتہ آئندہ جو شخص اس خیال کا میرے پاس لایا جائے گا اس کو وہ سزا
ملے گی جو مفتری کو ملنی چاہیئے۔

کوفہ میں ایک شخص حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو شیخین کو بُرا کہتا تھا حضرت علیؓ
نے اپنے غلام سے فرمایا اے قنبر اس کی گردن اڑا دو۔ اس شخص نے عرض کیا آپ میری گردن کیوں
اڑواتے ہیں۔ میں تو آپ کی ہی وجہ سے ان پر غصہ ہو رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ کیوں کر؟
اس شخص نے عرض کیا میں ایک غریب آدمی ہوں جس کو رسول اللہ صلعم کی صحبت میسر نہیں
ہوئی اور نہ یہ معلوم کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رتبہ حضور کے یہاں کیا تھا۔ اور تمھارے
یہاں اُن کی کتنی عظمت ہے۔ البتہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا جو اکثر آپ کے پاس آتے جاتے
ہیں وہ آپ کو ان دونوں سے افضل بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے ظلماً آپ کی حق تلفی
کی اور پہلے خود خلیفہ بن گئے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کیا تو ان لوگوں کو جانتا ہے، اس شخص
نے جواب دیا نام نہیں جانتا مگر ہاں صورت دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا
واللہ خدا اور رسول کے حکم سے یہ دونوں مجھ سے پہلے خلیفہ بنے اور مجھ پر ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں
کیا۔ اور اگر تو اپنی غربت اور شیخین کی نسبت اپنی کم علمی کا اعتراف نہ کرتا تو میں اس وقت
تیری گردن اڑا دیتا۔ پھر غلام سے فرمایا اے قنبر نماز کے لئے منادی کرو۔ اور ظہر کا وقت
تھا لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے اوّل نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور حق تعالیٰ شانہٗ
کی کما حقہ حمد و ثنا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسا چاہیئے تھا درود و سلام بھیجا۔ اور
مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔ حق عز و جل نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے وقت
بھیجا جب کہ اسلام پرانا ہو گیا اور دین کی رونق جاتی رہی تھی اور کفر کی وجہ سے ظلمت

پھیل گئی تھی اور لوگ زمانہ جاہلیت کی گمراہیوں میں پڑے ہوئے بتوں کی عبادت اور
مورتیوں کی تعظیم کرتے تھے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا انکار کرتے تھے۔ ایسے وقت
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک اللہ ذات پاک کے سوا کوئی معبود نہیں۔
لوگوں نے حضور کو جھٹلایا اور کہا اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ
لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی تصدیق کی اور میں اُس وقت بچہ ہی تھا اپنے آپ کو بھی
نہیں بچا سکتا تھا اور رسول اللہ صلعم کی پرورش اور آپ کے گھر میں رہتا تھا۔ اس
حالت میں حضرت ابوبکر ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ رہے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہے اور
ان کو ڈراتے دھمکاتے لیکن خود ان کے ڈرانے سے نہ ڈرتے تھے۔ اور امورِ دین کو کھلم کھلا
کرتے۔ اور اپنے ایمان کو نہ چھپاتے۔ حتیٰ کہ قریش کہنے لگے کہ ابن ابی قحافہ تو مجنوں ہو گیا۔ اسلام
کے لئے ابوبکرؓ ہی احق اور اولیٰ تھے۔ رسول اللہ صلعم کو ان سے زائد کسی سے محبت نہ تھی۔ اور
حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حضورؐ کے بعد ان سے زائد صاحب اکرام کوئی نہیں اور نہ کوئی شخص دُنیا
و آخرت میں ابوبکرؓ سے بہتر اور افضل ہے۔ بعض لوگ مجھے شیخینؓ سے افضل کہتے ہیں ان کے
قلوب میں بقیہ نفاق ہے اور اس سے ان کا مقصود مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا اور امتِ محمدیہ میں
اختلاف پیدا کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حال پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا
اور ان کے قتل کا حکم فرما دیا تھا۔ اور قریب ہی آخر زمانہ میں ان کی حکومت ہوگی جس میں
خسران و نامرادی کی آفت بڑھ جائے گی۔ اور شریر روافض کی تبلیغ کو عروج ہوگا۔ اور ان
کے مخالف ذلیل ہوں گے۔ حق مٹ جائے گا۔ اور رفض و بدعت اور گناہ و بدکاری کھلم کھلا
ہوگی۔ اور دولت سب ان کے پاس منتقل ہو جائے گی۔ عزت ان کو حاصل ہوگی اور ان کی
سوء حالی نرم پوشاک اور عمدہ لباس سے بدل جائے گی۔ اس وقت جو لوگ علانیہ بھائی
بھائی ہوں گے وہ باطن میں دشمن ہوں گے۔ کذب ان کے نزدیک خوبی ہوگا اور بدکاریاں
ان سے ظاہر ہوں گی۔ اور باوجود مغلظ قسموں کے عہد و پیماں کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور نقضِ
عہد کریں گے۔ قرآن کو بغیر سوچے و سمجھے پڑھیں گے۔ اور معارف و علوم کو لغویات سے
بدلیں گے۔ مصاحف کو معطل اور بے کار کر دیں گے۔ اور پے در پے معاصی کریں گے۔ صحابہ
رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب و شتم ان کی بُرائی ان لوگوں کا مذاق ہوگا اور صحابہ کے ان
واقعات کا اتباع کریں گے جن کو حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے۔ اس سے مقصود صحابہ

کی تضحیک اور توہین ہوگا، یہ باتیں چھوٹا بڑے سے سیکھے گا اور انہی عبادات میں فرسودگی ہوگی پس سنت مٹ جائے گی اور بدعت کا احیاء ہوگا اس زمانہ میں جو شخص متبع سنت ہوگا وہ افضل الشہداء اور افضل العباد اور افضل المجاہدین ہے۔ ان کے لئے بشارت ہے۔ ان کی مصیبت کس قدر بڑی ہوگی۔ اس زمانہ میں ہم سے زائد بڑا بلا میں مبتلا ہوگا۔ حق تعالیٰ مسلمان کے ایمان کو کم کر دیا اور ان کے اعمال بے کر دیئے جس سے خدا کی زمین ان پر غضب ناک ہوگی اور آسمان ہاویہ ناخواستہ ان کو سایہ کرے گا اور تختہ زمین پر کوئی شخص عنداللہ ان سے زائد مبغوض نہ ہوگا۔ ان کی علامات بہت ہیں۔ جن سے یہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ جماعت کا چھوڑنا اور سلف صالحین میں گفتگو کرنا۔ اور نمازوں میں تاخیر کرنا اور سنت کی تردید کرنا۔ اور آثارِ صحابہ کو نہ ماننا۔ اور کفار سے یگانگت۔ اس وقت ان کے سلاطین کا لباس حریر و دیباج ہوگا۔ اور مغنیات کو رکھیں گے مکتوں کی خرید و فروخت کرنا اور دین کا ضائع کرنا اور زنا کو حلال سمجھنا اور سود کھانا اور آزاد کی خرید و فروخت اور دین اور مطیع سنت کا مذاق اڑانا۔ اور مرگ مفاجات۔ اور بازاروں میں عورتوں کی خرید و فروخت اور راستوں کا بند ہونا۔ اور ذمیوں کا حاکم ہونا۔ اور اہل مذہب کی ذلت اور کمینوں کا سوار ہونا اور غریب کا قتل اور غلاموں کا دولت مند ہونا۔ اور مخنثوں کی کثرت اور عورتوں کا سوار ہونا۔ اور بلند و پختہ عمارتیں بنانا اور اہل ہوی اور اہل بدعت کی طرف طبیعتوں کا مائل ہونا اور صاحب ثروت کی تعظیم کرنا۔ اس زمانہ کے علماء آسمان کے نیچے رہنے والوں میں سب سے زائد شریر ہوں گے۔ انہی سے فتنہ و فساد نکلے گا اور ان کی طرف لوٹ جائے گا عالم ملکوت میں ان کا نام ارجاس ( ) و الماس ( ) ہوگا۔ جب اصحاب رسول اللہ صلعم کو محفلوں اور مجلسوں اور مسجدوں میں لعنت کی جائے گی اور لوگ اس کو اپنا شعار بنائیں گے تو حکمت سینوں سے نکل جائے گی اور ایک سبز و سرخ ہوا نازل ہوگی جس سے حق تعالیٰ ان کو بندر اور سور کی شکلوں میں مسخ کر دیں گے۔

لوگوں نے عرض کیا اے امیر المومنین اگر ہم اس زمانہ کو پائیں تو کیا کریں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا ایسے رہنا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفقاء رہے اور صبر کرنا۔ اور جس راستہ پر ہم ہیں اس پر استقامت سے قائم رہنا اور حق تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

اور صحابہ کی محبت کا حکم فرمایا ہے۔ تم اس پر جمے رہنا۔ اور روافض کے پاس اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا، ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا کہ جنگلوں میں چلے گئے اور مشقتوں کو برداشت کیا۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ حق اور سنت پر مرنا بدعت اور عصیان کی حیات سے بدرجہا بہتر ہے۔ خوب سمجھ لو کہ نبی صلعم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ پھر عثمانؓ ذوالنورین اور پھر میں ہوں۔ میں نے تمہارے روبرو اور تمہاری پیٹھ پیچھے یہ صاف صاف کہہ دیا اب تمہیں مجھ پر حجت کی گنجائش نہیں۔ اور میں اللہ بالا و برتر سے اپنے اور تمہارے اور تمام مسلمان بھائیوں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

وہ احادیث جو حضرت علیؓ کے فضائل میں حضرت عمرؓ سے مروی ہیں

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جنگ خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کل ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ اور رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ شخص حملہ آور ہے۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ حق تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح دیں گے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کے دائیں جانب اور حضرت میکائیل علیہ السلام اس کے بائیں جانب ہوں گے۔ یہ شب ہر مسلمان نے اس خواہش میں گذاری کہ وہ شخص میں ہوں۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا علی بن ابی طالب کہاں ہیں نظر نہیں آتے۔ لوگوں نے عرض کیا وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت علیؓ خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا مجھ سے قریب ہو۔ وہ قریب ہو گئے۔ پھر حضورؐ نے ان کی آنکھوں میں تھوکا اور آنکھوں کو اپنے دست مبارک سے ملا اور حضرت علیؓ حضورؐ کے سامنے سے ایسے اٹھے کہ گویا آنکھ دکھنے ہی نہ آئی تھی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تین فضیلتیں ہیں اگر ان میں سے ایک بھی میرے لئے ہو تو مجھے سرخ اونٹوں (بہترین نعمت) سے زائد محبوب ہے۔ حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے

نکاح۔ اور حضرت علیؓ کا رسول اللہ کے ہمراہ مسجد میں رہنا۔ کہ مسجد سے حالت جنابت میں گزرنا جیسا حضورؐ کے لئے جائز تھا، حضرت علیؓ کے لئے بھی جائز تھا۔ اور جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کو جھنڈا دینا۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حضرت علیؓ کو گالی دیتے ہوئے سنا تو فرمایا۔ میرے خیال میں تو منافق ہے۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم میرے ایسے قائم مقام ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے لیکن چوں کہ میرے بعد نبوت ختم ہو گئی لہذا تم نبی نہ ہو گے۔

جب حضورؐ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ کو عورتوں اور صغار کی خبر گیری کے لئے مدینہ چھوڑ دیا۔ منافقین نے طعنہ دیا کہ حضور نے بزدلی کے باعث ان کو چھوڑا۔ جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو تلوار نیزہ وغیرہ لے کر ملاتے اور مقام حرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے اور عرض کیا کہ منافقین کا یہ خیال ہے۔ حضورؐ نے اس کی تردید کی اور فرمایا تم بمنزلہ ہارون علیہ السلام کے ہو۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام میقات کو جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا گئے تھے ایسا ہی میں تمہیں اپنا نائب بنا کر لڑائی کے لئے جا رہا ہوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں نبی تھے۔ اب چوں کہ نبوت ختم ہو چکی لہذا تم میری عدم موجودگی میں نبی نہ ہو گے بلکہ صرف میرے قائم مقام ہو گے۔ اور حضرت علیؓ کو واپس کر دیا۔ اس حدیث سے حضرت علیؓ کا مستحق خلافت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال سے چالیس سال قبل ان کا وصال ہو گیا تھا۔ البتہ حضرت علیؓ کے خلیفہ نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسا حضرت ہارون علیہ السلام میقات کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ ہوئے ایسا ہی تم بھی زمانہ سفر میں میرے خلیفہ ہو۔ اور جیسا ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے ایسا ہی تم بھی میرے بعد میرے خلیفہ نہ ہو گے۔

جب وفدِ ثقیف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان سے فرمایا تم اسلام لے آؤ۔ ورنہ حق تعالٰی میری طرف سے ایسا شخص بھیجے گا جو تمہاری گردنیں اڑا دے گا اور تمہارے بچوں کو قید کرے گا اور تمہارے مال و دولت کو چھین لے گا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے اس روز کے علاوہ کبھی امارت کی تمنا نہیں کی اور میں اپنا سینہ باہر نکال کر بار بار سامنے آتا تھا کہ شاید حضورؐ یہ ارشاد فرمادیں کہ وہ شخص یہ ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "وہ شخص یہ ہے وہ شخص یہ ہے"

دو شخص حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور پوچھا باندی کی طلاق کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کچھ لوگ حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے اُن میں ایک شخص تھا جس کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہ تھے۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس گئے اور پوچھا مملوکہ کی طلاق میں تمہارا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا سو دو طلاق ہوں گی۔ ان میں سے ایک شخص بولا آپ امیر المومنین ہیں اس لئے ہم آپ کے پاس آئے اور طلاقِ مملوکہ کا مسئلہ پوچھا اور آپ نے ایک دوسرے شخص سے پوچھ کر جواب دیا اور اس شخص نے آپ سے بات بھی نہ کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کم بخت جانتا بھی ہے یہ کون ہیں۔ یہ علیؓ بن ابی طالب ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر آسمان و زمین ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور علیؓ کے ایمان کے ہم وزن بوجھ دوسرے میں تو علی کا ایمان جھکا رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے حضورؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق ارشاد فرمایا جس کا میں آقا ہوں اُس کا علیؓ بھی آقا ہے۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ جب غدیر خم (نام جگہ) پر پہنچے تو حضور نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر حاضرین سے فرمایا "کیا میں مومنوں کو اُن کی اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں؟" لوگوں نے عرض کیا "ہاں" پھر فرمایا یہ میرا مولیٰ ہے اور یہ اس شخص کا سردار ہے جس کا میں سردار ہوں۔ "اَللّٰھُمَّ وَالِ مَن وَالَاہُ وَعَادِ مَن عَادَاہُ (اے اللہ جو علیؓ سے دوستی رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو شخص علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس کو دوست نہ رکھ)

حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے ملے اور کہا مبارک ہو آج تم ہر مومن مرد و عورت کے دوست بن گئے۔ (حضرت اسامہ نے کسی بات پر حضرت علیؓ سے کہہ دیا تھا وہ تم میرے آقا نہیں بلکہ میرے آقا رسول اللہ صلعم ہیں؛ اس پر حضورؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا اور مقصود حضرت اسامہ کو تنبیہہ کرنا تھا)

وہ احادیث جو حضرت عمرؓ کے فضائل میں حضرت علیؓ سے مروی ہیں

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب (اے خدا اسلام کو عمر بن الخطاب کی وجہ سے قوت اور نصرت دے)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شہر مداین کو حق تعالیٰ نے فتح کرایا تو حضرت عمرؓ نے دسترخوان کے لئے حکم فرمایا اور دسترخوان مسجد میں بچھائے گئے۔ سب سے اول حضرت حسن لپک کر آئے اور کہا اے امیرالمومنین مال غنیمت سے میرا حق دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فراخی اور کرامت کی دعا دی اور ان کے لئے ایک ہزار کا حکم دیا۔ حضرت حسنؓ لوٹ گئے اور حضرت حسینؓ آئے اور کہا اے امیرالمومنین مال غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے بھی ایک ہزار کا حکم فرمایا۔ یہ بھی لوٹ گئے۔ اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ آئے اور کہا اے امیرالمومنین مال غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے پانچ سو کا حکم فرمایا۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا اے امیرالمومنین میں ایک طاقت ور آدمی ہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تلوار چلائی جب کہ حسنؓ و حسینؓ بچے ہی تھے اور مدینہ کی گلیوں میں گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو ایک ایک ہزار دیئے اور مجھ کو پانچ سو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں دیئے، تو بھی جا کر ان جیسے ماں دباپ ان جیسے نانا و نانی ان جیسے چچا و پھوپی، ان جیسے ماموں و خالہ لا تو تجھے بھی ایک ہزار مل جائیں گے) اور تو ہرگز نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ ان کے باپ ہیں اور حضرت

فاطمہؓ ان کی ماں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نانا ہیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ ان کی نانی ہیں حضرت جعفر ان کے چچا تھے اور حضرت اُم ہانی ان کی پھوپی اور حضورؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم ان کے ماموں تھے۔ اور حضورؐ کی صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ان کی خالہ۔ حضرت علیؓ نے جب یہ سُنا تو کہنے لگے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے عمر بن الخطاب اہل جنت کے لئے چراغ ہیں۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ہوئی تو کچھ صحابہ کو لے کر حضرت علیؓ کے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت علی گھر سے نکلے حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ عمر بن الخطاب اہل جنت کا چراغ ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "ہاں" حضرت عمرؓ نے کہا " مجھے ایک رقعہ لکھ دو " حضرت علیؓ نے یہ لکھ کر آپ کو دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما ضمن علی بن ابی طالب لعمر بن الخطاب عن رسول اللہ صلعم عن جبرئیل عن اللہ عزوجل ان عمر بن الخطاب سراج اھل الجنۃ فی الجنۃ (یہ وہ معاہدہ ہے جو علی بن ابی طالب نے عمر بن الخطاب سے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بواسطہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے رب العزت والجلال کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ عمر بن الخطاب اہل جنت کا چراغ ہے۔)

حضرت عمرؓ نے اس پرچہ کو لیا اور اپنے کسی صاحبزادہ کو دے کر فرمایا میرے مرنے کے بعد جب غسل وکفن وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ تو اس کو میرے ساتھ کفن میں لپیٹ دینا۔ تاکہ میں اپنے پروردگار کے سامنے اس کو لے کر حاضر ہوں۔ جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا اور تجہیز وتکفین سے فارغ ہوتے تو وہ پرچہ آپ کے کفن میں لپیٹ دیا اور آپ کو دفن کر دیا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمر بن الخطاب کے غضب سے بچا کرو جب عمرؓ غصہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے حق تعالیٰ غضب نازل فرماتا ہے

حضرت عمرؓ کے اقوال حضرت علیؓ کے مناقب میں اور بعض مسائل میں حضرت علیؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اثنا خطبہ میں فرمایا کہ علی بن ابی

طالب ہم سے زیادہ خوبی کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں اور ابی بن کعب قرآن سب سے اچھا پڑھتے ہیں۔

ایک مجنونہ عورت نے زنا کیا اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر کی گئی حضرت عمرؓ نے اس کو رجم کرانا چاہا تو حضرت علیؓ نے کہا اے امیر المومنین کیا آپ نے نہیں سُنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے تین شخص مرفوع القلم ہیں۔ مجنون ہوش میں آنے تک۔ اور بچہ بالغ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس مجنونہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک حاملہ عورت پیش کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر اس نے بدکاری کا اقرار کیا جس پر حضرت عمرؓ نے اس کے رجم کا حکم فرمایا۔ راستہ میں حضرت علیؓ نے اس عورت کو دیکھ کر پوچھا اس کا کیا معاملہ ہے لوگوں نے عرض کیا کہ امیر المومنین نے اس کے لئے سنگ ساری کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو واپس کر دیا۔ اور جا کر حضرت عمرؓ سے پوچھا کیا آپ نے اس کو رجم کا حکم کیا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں۔ اُس نے میرے سامنے بدکاری کا اقرار کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا آپ کی یہ دلیل اس عورت پر چل سکتی ہے اور اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے آپ اس کو کس دلیل سے قتل کرتے ہیں اور شاید آپ نے اس کو ڈرایا دھمکایا ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں یہ تو ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص مصیبت اور بلا کے بعد اقرار کرے اس پر حد نہیں اور مقید اور محبوس اور مکرہ کا اقرار معتبر نہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور فرمایا عورتیں علی بن ابی طالب جیسا جننے سے عاجز ہیں۔ اگر آج علی نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش کی گئی جو پیاس سے بے تاب ہو کر ایک چرواہے کے پاس گئی اور اس سے پانی مانگا۔ چرواہے نے جب تک کہ اپنے پر اس کو قدرت نہ دی پانی پلانے سے انکار کیا اس عورت نے ایسا ہی کیا حضرت عمرؓ نے اس عورت کے رجم کے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا میرے خیال میں یہ مضطر ہے لہذا اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت حاضر کی گئی جس نے عدت میں نکاح کر لیا تھا حضرت عمرؓ نے ان میں تفریق کرا دی اور مہر بیت المال میں داخل کر دیا۔ اور فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نکاح کو رد کر دوں اور اس کا مہر جائز رکھوں۔ اور فرمایا کہ آئندہ کبھی یہ دونوں

نکاح نہ کریں۔ جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا اگرچہ لوگ سنت سے ناواقف ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس نے عورت کو حلال سمجھا ہے اس لئے مہر دینا ہوگا اور ان دونوں میں تفریق کردی جائے گی۔ بعد انقضاء عدت دوسروں کی طرح یہ بھی پیغام دے سکتا ہے حضرت عمرؓ نے وعظ کہا اور فرمایا امور جاہلیت کو سنت کے مطابق کرنا چاہیئے۔ اور حضرت علیؓ کے قول کی طرف رجوع کیا۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ مملوک کس قدر نکاح کرسکتا ہے؟ اور حضرت علیؓ سے کہا اے یمنی چادر والے تمہارے ہی سے سوال کرنا مقصود ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "دو نکاح کرسکتا ہے"۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک لڑکے کے جنازہ پر تھے۔ حضرت علیؓ نے اس لڑکے کے باپ سے کہا اس کی ماں سے ابھی جماع نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیوں اس کی کیا وجہ۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "تاکہ حمل نہ ٹھیر جائے پھر وہ بچہ اپنے بھائی کی میراث کا دعویٰ کرے حالانکہ وہ اس کا وارث نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے خدا جس پیچیدہ مسئلہ میں حضرت علیؓ کی رہنمائی نہ ہو میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

ایک شخص نے حضرت علیؓ کے ظلم کی چارہ جوئی کی اس وقت حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا اے ابوالحسن یہاں سے اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت علیؓ اٹھ کر اپنے حریف کے پاس بیٹھ گئے۔ جب بحث ختم ہوئی اور وہ شخص چلا گیا تو حضرت علیؓ پھر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار دیکھ کر پوچھا اے ابوالحسن کیا بات ہے تمہارا چہرہ متغیر دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ بات تمہیں بری معلوم ہوئی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا ہاں امیرالمومنین۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا اس لئے کہ آپ نے میرے حریف کے سامنے مجھے کنیت سے پکارا آپ کو میرا نام لے کر کہنا چاہیئے تھا کہ اے علیؓ اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کا سر پکڑا اور پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ لے کر فرمایا میرے باپ تم پر قربان تمہارے سبب سے حق تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی اور تمہارے ہی سبب ظلمات سے نکال کر روشنی میں پہنچایا۔

حضرت عمرؓ نے اثناء وعظ میں فرمایا اگر ہم تم سے نیک کاموں کو چھڑا کر منکرات

کرائیں تو بتاؤ تم کیا کرو گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ تین مرتبہ کہا۔ پھر حضرت علیؓ کھڑے ہوتے اور کہا اے امیرالمومنین اس وقت ہم آپ سے توبہ کرائیں گے، اگر آپ نے توبہ کر لی تو ہم اس کو قبول کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اگر توبہ نہ کی تو کیا کرو گے، حضرت علیؓ نے جواب دیا "اُس وقت ہم آپ کو قتل کر دیں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا الحمد للہ ابھی اس اُمت میں ایسے شخص موجود ہیں کہ اگر ہم کجروی اختیار کریں تو وہ راہ راست پر لے آئیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا اے ابوالحسن مجھے کوئی نصیحت کرو۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنے یقین کو شک مت بناؤ اور اپنے علم کو جہل نہ بناؤ۔ اور اپنے گمان کو حق نہ سمجھو کو دُنیا میں سے تمہارا حصہ وہی ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں دے کر چلتا کر دیا اور تقسیم کر کے برابر کر دیا اور پہن کر پرانا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے ابوالحسن تم نے بالکل سچ کہا" حضرت عمرؓ نے اثنائے وعظ میں فرمایا، زیادہ ڈر مجھے اس امر کا ہے کہ ایک بےگناہ مسلمان کو پکڑ کر اس کا گوشت اس طرح جلایا جائے گا جیسے اونٹوں کا گوشت بھونا جاتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ شخص مجرم ہے۔ لیکن وہ بالکل بے قصور ہوگا۔ حضرت علیؓ منبر کے پاس بیٹھے تھے اٹھے اور کہا اے امیرالمومنین یہ کب ہوگا۔ پھر خود ہی بولے۔ یہ اس وقت ہوگا جب آنکھیں کھٹری ہو جائیں گی اور نخوت پیدا ہو جائے گی اور فتن اس طرح پیدا کریں گے جیسے چکی دانہ کو پیستی ہے اور جیسے آگ لکڑیوں کو خاک کر دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے علیؓ یہ کب ہوگا" حضرت علیؓ نے کہا یہ اُس وقت ہوگا جب لوگ دنیا کی خاطر تجربے کریں گے اور علم سیکھیں گے لیکن عمل کی نیت نہ ہوگی۔ اور دنیا کو آخرت کے ذریعہ سے کما دیں گے۔

سب نے سفید کپڑوں میں احرام باندھا اور حضرت عقیل بن ابی طالب نے گلابی چادروں میں احرام باندھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تمہیں بھی خلاف کرنے کی ہوس ہے۔ لوگ سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو آپ نے سُرخ پہنے۔ حضرت علیؓ نے کہا، کوئی ہمیں سنت کا اتباع بتانے والا نہیں رہا" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "سچ کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو"

حضرت عمرؓ حج کر رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آیا جس کی آنکھ کسی نے پھوڑ دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تیری آنکھ کس نے پھوڑی اس شخص نے جواب دیا

"حضرت علیؓ نے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خیر تیری آنکھ اللہ کے واسطے جاتی رہی" اس کے سوا اُس سے واقعہ پوچھا اور نہ وجہ دریافت کی۔ یہ شخص ابھی وہیں تھا کہ حضرت علیؓ آگئے اور کہنے لگے یہ شخص اثنارِ طواف میں بیت اللہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس لئے میں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے علیؓ تم نے ناحق خدا کے نور کو ضائع کیا۔

قریش کے کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس جمع ہوئے ان میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ اور شرف و بزرگی کا ذکر تھا اور حضرت علیؓ خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے ابوالحسن تم کو کیا ہوا خاموش کیوں ہو؟ حضرت علیؓ اس وقت بولنا نہ چاہتے تھے۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں ضرور بولنا پڑے گا۔ تو حضرت علیؓ نے کہا

فی کل معترك تزیل سیوفنا — فیہا الجماجم عن فراخ الھام
اللہ اکرمنا بنصر نبیہ — وفیا اعز شرایع الاسلام
ویزورنا جبرئیل فی ابیاتنا — بفرایض الاسلام والاحکام
فنکون اول مستحل حلة — ومحرم للہ کل مرام

جب حضرت علیؓ کا کلام ختم ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے کہا اے میرے بھتیجو کیا تم اس کی گواہی دوگے وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ اور اپنے باپ (حضرت علیؓ) کی طرف دیکھنے لگے حضرت علیؓ نے فرمایا "گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔

اہلِ نجران اپنی کتاب سُرخ چمڑے میں رکھے ہوتے حضرت علیؓ کے پاس لائے اور عرض کیا کہ ہم آپ کو اس مکتوب کی قسم دیتے ہیں جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس سفارش کی قسم دیتے ہیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ کہ ہم کو ہماری اراضی واپس کردی جائیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "حضرت عمرؓ زیادہ واقف اور تجربہ کار ہیں"

عاصم بن جعد کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اگر حضرت عمرؓ کو کبھی کسی بات پر طعنہ دیتے تو آج دیتے۔

(ف) اہلِ نجران حضرت علیؓ کی سفارش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جزیرہ عرب میں رہتے تھے اور ان سے ایک معاہدہ لکھا گیا تھا جس کو حضرت علیؓ نے لکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو جزیرہ عرب سے خارج کردیا۔ اس وقت

اہلِ نجران حضرت علیؓ کے پاس وہ پرانا معاہدہ لے کر آئے اور چاہتے تھے کہ پھر وہیں واپس ہو جائیں مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔

شعبی سے مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں آئے تو فرمایا، جس گرہ کو حضرت عمرؓ نے باندھا ہو میں اُس کو نہیں کھول سکتا۔

حضرت علیؓ اونی چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلے اور کہنے لگے یہ کپڑا میرے بھائی اور میرے دوست اور میرے ہمراز اور میرے مخلص امیر المومنین نے مجھے پہنایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو دیکھا جو قریب البلوغ تھا اور اس کے زلفیں بھی تھیں اور سر پر بال بھی۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس وقت شک میں تھا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ پھر اُس سے کبھی زائد خوب صورت لڑکے پر گذر ہوا جو حضرت علیؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے ان سے کہا خدا تمہیں اس لڑکے سے محفوظ رکھے جو تمہارے پاس بیٹھا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ میرا لڑکا عثمانؓ ہے۔ میں نے اس کا نام حضرت عثمانؓ کے نام پر رکھا ہے اور میں نے اپنے بعض بچوں کے نام حضرت عمرؓ اور حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے نام پر بھی رکھے ہیں۔ بلکہ آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر بھی نام رکھا ہے۔ اور حسنؓ و حسینؓ اور محسن کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے۔ اور حضور ہی نے ان کا عقیقہ کرایا اور ان کے سر کے بال اُترواکر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کرائی۔ اور حضورؐ کے فرمان کے بموجب اُن کی ناف کاٹی گئی۔ اور ختنہ کرائی گئیں۔

حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی نے ایک شخص کو قتل کیا پھر اقرار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق فیصلہ کیا اور اس کے اقرار کی وجہ سے عاقلہ (کنبہ) سے دیت دلانے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا اے امیر المومنین جب یہ تسلیم کر رہا ہے تو اس کو سچا سمجھنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کا اس وقت اقرار اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا امیر المومنین (وفقک اللہ) آپ ہم سے ہر خیر میں سبقت لے جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کہ مالک کے انتقال کے بعد ام ولد (وہ

باندی جس سے مالک کی اولاد ہو، آزاد ہو جاتی ہے۔ میری اور حضرت عمرؓ کی ایک رائے تھی لیکن اب میرے نزدیک وہ مملوکہ ہی رہے گی۔ عبیدہ سلمانی نے کہا۔ اختلاف کی صورت میں ایک کی رائے سے آپ کی متفقہ رائے اولیٰ ہے۔

عبداللہ بن میرز کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت عمرؓ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی جب نماز ختم ہو گئی تو داہنی طرف کے لوگ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ نے کوڑہ سے اشارہ کر کے ان کو بٹھایا۔ جب حضرت علیؓ کے پاس پہنچے (وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے) تو اُن سے کہا اے علیؓ واللہ مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز سے منع فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ کا اپنی صاحبزادی اُم کلثوم کا حضرت عمرؓ سے نکاح کرنا

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے حضرت ام کلثوم سے نکاح کے متعلق کہا تو حضرت علیؓ نے جواب دیا میرا اسے بنی جعفر کو دینے کا خیال ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا مجھ سے نکاح کر دو۔ واللہ اس کی ددھیال میں کوئی میری برابر اس کا خیال نہ رکھے گا۔ پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا۔ حضرت عمرؓ مسجد میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا مجھے نکاح کے لئے آراستہ کرو انھوں نے عرض کیا "کس سے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادی اور حضورؐ کی نواسی ام کلثوم سے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ بجز میرے تعلق اور نسب کے ہر تعلق اور نسب ختم ہو جائے گا۔ پس میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی تعلق ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا تاکہ تم اس کی صغر سنی کو دیکھ لو۔ اور حضرت ام کلثوم کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت ام کلثوم نے کہا میرے باپ (حضرت علیؓ تم سے کہتے ہیں۔ کیا تمھیں یہ لباس پسند ہے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں پسند ہے" پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے چالیس ہزار درہم مہر میں دیئے۔

(ف) حدیث میں لفظ ملحفہ (چادر) ہے اور چادر لباس میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے عورتوں کو ہی لباس کہا ہے۔ لہٰذا اس مناسبت سے یہاں چادر سے مراد عورت ہوئی۔

مروی ہے کہ جب حضرت ام کلثوم حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور حضرت عمرؓ نے ان کا نقاب اٹھانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے چھوڑ۔ اگر تو امیر نہ ہوتا تو ضرور چپت مارتی

مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے عذر کیا کہ ام کلثوم چھوٹی بچی ہے حضرت عمرؓ نے کہا اگر زندہ رہی تو بڑی ہو جائے گی۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے علاوہ اس کے دو بڑے اور بھی ہیں مجھے ان سے بھی مشورہ لینا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ منتظر رہے اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور تنہائی میں لیجا کر حمد و ثنا کے بعد ان سے کہا حضرت عمر تمھاری بہن کے لئے پیغام دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے سوا اس کے دو بڑے اور ہیں اور میں نے بغیر تم سے مشورہ کئے نکاح کرنا مناسب نہ سمجھا حضرت حسینؓ خاموش رہے اور حضرت حسنؓ بولے اور حمد و ثنا کے بعد کہا ابا جان حضرت عمرؓ جیسا کون ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش تشریف لے گئے۔ پھر خلیفہ ہوتے تو عدل و انصاف کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا تم سچ کہتے ہو لیکن میں نے تمھارے بغیر بات پکی کرنا مناسب نہ سمجھا پھر فرمایا۔ ام کلثوم کو بلاؤ ام کلثوم بلائی گئی۔ تو ایک کچی ایک کرتہ پہنے ہوئے آئی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا بیٹی میں عمر بن الخطاب کے پاس تھا انھوں نے مجھ سے ایک چیز مانگی اب تم ان کے پاس جاؤ۔ سلام کہنا۔ اور کہنا مجھ کو میرے باپ نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کی حاجت پوری کردی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ان کا کرتہ اتاریں لیکن انھوں نے کرتہ چھڑا لیا اور واپس ہوگئیں اور والد ماجد سے جاکر کہا تمھارا پیغام حضرت عمرؓ کو پہنچا دیا۔ تم نے مجھے اس لئے بھیجا تھا کہ حضرت عمرؓ مجھے خرید لیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ تمھارے لئے زیادہ مناسب ہیں۔ حضرت ام کلثوم نے کہا، آپ نے مجھ سے اجازت کیوں نہیں لی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اگر تم بڑی ہوتیں تو تم سے اجازت لیتا۔ لیکن آج تمھارا معاملہ میرے اختیار میں ہے۔

مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے حضرت ام کلثوم سے ایک بچہ ہوا جس کا نام زید رکھا عبدالملک سے کسی نے کہا یہ شخص حضرت عمرؓ کا بھی صاحبزادہ ہے اور حضرت علیؓ کی

بھی اولاد ہے۔ عبدالملک کو اپنی سلطنت کا خوف ہوا اور اُس نے ان کو زہر دے دیا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد جب ان پر چادر ڈال دی گئی تو حضرت علیؓ نے کہا حق تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں کہ میری خواہش ہو کہ اس جیسے اعمال لے کر خدائے تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو آپ کے دوستوں (حضور اور حضرت ابوبکر) سے ضرور ملائے گا۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے "میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ تھے" "میں ابوبکرؓ اور عمرؓ (فلاں جگہ گئے)"۔

اے عمرؓ بن الخطاب (رحمک اللہ) تم آیات اللہ کے عالم تھے۔ تمہارے سینہ میں حق کی عظمت تھی تم صرف خدا سے ڈرتے تھے اور دین میں 'لومۃ لائم' کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ تم حق کے لئے سخی تھے اور باطل کے لئے بخیل اور دنیا سے بھوکے اور آخرت سے سیر۔

مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ کی وفات کا حال معلوم ہوا تو غسل کر کے گھر سے نکلے سلام کیا اور سر جھکا لیا۔ پھر سر اُٹھایا اور فرمایا، حضرت عمر پر نوحہ کرنے والی نے کیا خوب کہا ہے" آہ عمرؓ تم نے کجی کو سیدھا کیا اور بیمار کو شفا دی۔ (یعنی سیاست خوب کی) آہ عمر پاک دصاف کم گناہوں کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے۔ آہ عمرؓ سنت کو ساتھ لے گئے۔ اور فتنہ و فساد چھوڑ گئے۔ اس کو کیا معلوم محض الفاظ میں جو اس کی زبان سے نکل گئے۔ واللہ حضرت عمرؓ خیر کی طرف تشریف لے گئے اور شر و فساد سے دور ہو گئے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے فضائل میں

احادیث اور حضرت عمرؓ کا ارشاد

حضرت علیؓ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھ کر پہچان لی اور اس سے کہا یہ زرہ میری ہے فلاں دن گر گئی تھی۔ یہودی نے جواب دیا نہ معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ زرہ میری

ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔ چلو ہمارا تمہارا فیصلہ قاضی مسلمین کریں گے اور دونوں شریح قاضی کے پاس گئے۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کو دیکھا تو اپنی جگہ ان کے لئے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ اور شریح کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اگر میرا حریف مسلمان ہوتا تو میں اس کے ساتھ تمھارے سامنے بیٹھتا لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہود کو اپنی برابر مت بٹھاؤ۔ اور نہ ان کے مریضوں کی عیادت کرو اور نہ ان کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ اگر تمھیں کہیں یہ مل جائیں تو ان پر راستہ تنگ کر دو۔ اگر یہ گالی دیں تو ان کو مارو۔ اور اگر یہ ماریں تو ان کو قتل کر دو۔ پھر فرمایا میں نے اپنی زرہ اس یہودی کے پاس دیکھی اور پہچان لی حضرت شریح نے یہودی سے کہا "تو کیا کہتا ہے" یہودی نے جواب دیا "میری زرہ ہے اور میرے قبضہ میں ہے" حضرت شریح نے کہا "امیرالمومنین آپ سچے ہیں واللہ جیسا آپ فرماتے ہیں یہ زرہ آپ ہی کی ہے لیکن پھر بھی دو گواہ کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے غلام قنبر کو بلایا۔ اس نے شہادت دی۔ پھر اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ کو بلایا انھوں نے شہادت دی حضرت شریح نے عرض کیا میرے نزدیک بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہ کرنی چاہئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے حضرت عمرؓ سے یہ حدیث سنی ہے کہ حسن و حسین جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔ شریح نے جواب دیا "ہاں سنی ہے" حضرت علیؓ نے فرمایا کیا تم اہل جنت کے سردار کی شہادت قبول نہیں کرتے اس کی سزا میں چالیس دن تک تمھارا بانقیا کا تبادلہ کرتا ہوں۔ اور زرہ یہودی کے حوالہ کردی، یہودی نے دل میں سوچا امیرالمومنین میرے ساتھ قاضی کے یہاں آئے اور قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ کیا اور وہ اس پر رضامند ہو گئے۔ اور کہا بے شک یہ زرہ آپ کی ہے فلاں دن آپ کے خاکی رنگ کے اونٹ سے گر گئی تھی اور میں نے اٹھالی تھی۔ اور کہا "اشهد ان لا الٰه الا الله واشهد ان محمدا رسول الله" حضرت علیؓ نے فرمایا یہ زرہ بھی تمھاری ہے اور یہ گھوڑا بھی تمھارا اور اس کے لئے سات سو درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر یہ شخص ہمیشہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہا۔ اور جنگ صفین میں مقتول ہو گیا۔

حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور کہا میرے باپ کے منبر سے اُتر جاؤ۔ اُنھوں نے فرمایا خدا کی قسم یہ منبر تمھارے باپ کا

؎ کوفہ کے قریب کوئی جگہ ہے۔

ہے میرے باپ کا نہیں۔ پھر پوچھا تمہیں یہ کس نے سکھایا میں نے جواب دیا "کسی نے نہیں" اس کے بعد فرمایا۔ تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرو۔ میں ایک دن اُن کے پاس گیا تو وہ معاویہ سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابن عمرؓ دروازہ پر تھے یہ دیکھ کر واپس چلا آیا۔ پھر ایک دن حضرت عمرؓ ملے تو فرمایا ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے سے ملتے رہا کرو۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے پاس حاضر ہوا لیکن آپ معاویہ سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابنِ عمرؓ دربان تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم ابن عمر جیسے ہو۔ کیا حق تعالیٰ کے سوا کسی اور نے ہمارے سر والے بال اگائے۔ جب تم آؤ تمہیں اوروں کی طرح اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

ایک مرتبہ لوگ چادریں اوڑھے ہوئے پھر رہے تھے اور حضرت عمرؓ مسجد میں حجرہ شریف اور منبر کے درمیان بیٹھے تھے۔ لوگ آکر ان کو سلام کر رہے تھے۔ اور دعائیں دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے گھر سے نکلے۔ (حضرت فاطمہؓ کا گھر وسط مسجد میں تھا) دونوں حضرت عمرؓ کے سامنے تھے اور ان کے پاس ان چادروں میں کی چادر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ خدا کرے یہ کپڑے تقسیم کرنا مجھے مبارک ہو۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اے امیرالمومنین کیوں۔ آپ نے تو اپنی رعیت کو بہت عمدہ پوشاک پہنائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس لئے کہ یہ دو لڑکے جو ابھی پھلانگتے ہوئے آئے۔ اُن کے پاس ان میں سے چادر نہیں یہ بچے ہیں اور چادریں ان سے بڑی ہیں پھر داہنی طرف جو شخص بیٹھا تھا اس سے جھک کر فرمایا۔ (حضرت) حسنؓ و حسینؓ کے لئے دو چادر بھیج دو۔ اس نے دو چادر بھیج دیں اور آپ نے حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کو پہنا دیں۔

جب حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کئے تو لوگوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا اور پوچھا کہ ابتدا کس سے کروں لوگوں نے عرض کیا۔ امیرالمومنین اپنے سے شروع کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے خوب یاد دلایا۔ بنو ہاشم سے ابتداء کی اور حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کے لئے پانچ پانچ سو دینار وظیفہ مقرر کئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت زبیر سے کہا کہ (حضرت) حسن بیمار ہیں کیا ان کی عیادت کرو گے حضرت زبیر بہانہ کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا معلوم بھی ہے بنو ہاشم کی عیادت فرض ہے۔ اور ان کی ملاقات سنت ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا تمہارے باپؐ کے بعد مجھے تم سے زاید کوئی عزیز نہیں۔

حضرت عمرؓ کی شہادت اور مجلس شوریٰ کا انعقاد

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابو لولوہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا (یہ روم کا باشندہ اور نصرانی تھا) اور کہا امیر المومنین مغیرہ سے کہہ دیجئے کہ جو درہم مجھ سے لیتا ہے اُس میں کچھ کم کر دے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم سے کیا لیتا ہے" اُس نے جواب دیا "چار درہم" حضرت عمرؓ نے پوچھا "تمہارا کیا پیشہ ہے" اُس نے جواب دیا "چکی چلانا" حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا سے ڈرو اور اپنے آقا سے خلوص کے ساتھ پیش آ۔ ابو لولوہ حضرت عمرؓ کے پاس سے غصہ میں بھرا ہوا نکلا اور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا "احمق ہے" حضرت عمرؓ نے (حضرت) مغیرہ کو بلایا اور فرمایا خدا سے ڈرو اور جس کو خدا نے تمہارا دست نگر کیا ہے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

اس غلام نے ایک چھری تیار کی جس کی دو نوک تھیں اور موٹھ درمیان میں تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ اس وقت صبح کی نماز کے لئے صفوں کو سیدھا کرا رہے تھے۔ اور فرما رہے تھے تمہارے مونڈھے آگے پیچھے نہ ہوں کبھی تمہارے قلوب میں بھی تفرقہ پڑ جائے۔ اور آپ پر تو وار کئے اور آپ کے ساتھ تیرہ ۱۳ آدمیوں کو زخمی کیا۔ جن میں چھ وہیں مسجد میں شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کتے کو پکڑو۔ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ سورج نکلنے کے قریب تھا اور ابھی لوگوں نے صبح کی نماز نہ پڑھی تھی۔ اس لئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پیچھے اقتدا کی انھوں نے سورج نکلنے کے خوف سے قل ہو اللہ اور اذا جاء نصر اللہ پڑھی۔

حضرت عمرؓ کے پاس سب سے پہلے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ پہنچے حضرت ابن عباسؓ نے کہا "امیر المومنین جنت کی بشارت ہو" حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم اس کی گواہی دو گے (گویا آپ خرید و فروخت کر رہے تھے) حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے مونڈھا مار کر کہا تو بھی گواہ بن اور میں بھی گواہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا "یہ کیوں کر" حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس لئے کہ آپ کا اسلام باعث عزت

تھا اور آپ کی امارت انصاف تھی اور آپ کی موت شہادت سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ واللہ اس کی وجہ سے تم مجھ کو عزیز نہ سمجھو اگر حق تعالیٰ نے اپنا رحم نہ فرمایا تو عمرؓ ہلاک ہو جائے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا سر میری گود میں رکھا تھا آپ نے فرمایا میرے سر کو زمین پر رکھ دو۔ میں نے عرض کیا آپ کا سر نیچے رکھنا مجھ پر شاق ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے تیری ماں روئے رکھ دے۔ پھر فرمایا لوگوں کے پاس جاؤ اور ان سے سلام کے بعد پوچھو کہ کیا یہ کام تمھارے مشورہ سے ہوا ہے؟ (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں) میں باہر گیا۔ اور لوگوں کو یہ پیغام سنایا۔ اُنھوں نے جواب دیا ہماری خواہش ہے کہ آپ کے بدلے میں ہمارے ماں باپ چلے جائیں۔ رسول اللہ صلعم کے وصال کے بعد آج جیسا سخت دن ہم پر نہیں گزرا۔ میں حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور اُن تک یہ فقرے پہنچا دیے۔ آپ نے فرمایا دیکھو کیا میرے قاتل کا پتہ لگایا ہے۔ میں نے عرض کیا ہاں مغیرہ بن شعبہ کا غلام ہے۔ آپ نے فرمایا الحمد للہ کوئی مسلمان میرے ظلم کا شاکی نہیں ایک مشرک ہے جس کے آقا کو میں اس پر احسان کرنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ لوگ اندر چلے گئے اور حضرت عمرؓ نے نبیذ مانگی آپ کو نبیذ پلائی جو خون میں مل کر زخم سے نکل گئی۔ حرث بن کلدہ ثقفی ایک طبیب تھا وہ آیا اور کہا دودھ پلاؤ آپ کو دودھ پلایا وہ بھی خون آلود نکلا۔ حرث نے کہا جو کچھ کہنا ہو یا عہد وغیرہ لینا ہو وہ کہہ لیجئے۔ پھر لوگوں نے عرض کیا کہ خلیفہ مقرر کر دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں زندگی اور موت دونوں حالت میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے عرض کیا مسلمان عبداللہ بن عمرؓ سے راضی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر آلِ عمرؓ میں سے کوئی خلافت کے قریب گیا تو تباہ ہو جائیں گے اور میں ان کے لئے کیسے بد فالی لے سکتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا آپ ہمیں مشورہ کیوں نہیں دیتے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مشورہ دینے میں کچھ حرج نہیں۔ قریش کے سردار جن کے جنتی ہونے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے سات ہیں (حضرت) عثمانؓ بن عفان۔ (حضرت) علیؓ بن ابی طالب۔ (حضرت) طلحہؓ۔ (حضرت) زبیرؓ۔ (حضرت) سعدؓ بن ابی وقاص (حضرت) عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (حضرت) سعد بن زید (رضی اللہ عنہم اجمعین)

لوگوں نے عرض کیا "امیرالمومنین ان میں سے اپنی رائے متعین کیجئے" حضرت عمرؓ نے فرمایا (حضرت) عثمانؓ سے تو اس لئے رکتا ہوں کہ وہ اپنے کنبہ کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور (حضرت) علیؓ کی طبیعت میں مذاق ہے۔ اور (حضرت) زبیرؓ مومن الرضا اور کافر الغضب ہیں۔ اور طلحہؓ میں نخوۃ ہے۔ اور (حضرت) سعدؓ میں بدخلقی اور سختی ہے۔ اور عبدالرحمٰن بن عوف مالدار بہت ہیں گویا اس امت کے قارون ہیں۔ یہ سب ایک گھر میں تین روز تک مشورہ کریں۔ ان ایام میں صہیب نماز پڑھائے۔ اور عبداللہ بن عمرؓ وزیر و مشیر رہے۔ اُس کے ذمہ اور کوئی کام نہ اور کثرت الرائے پر عمل کر لیا جائے۔ اگر پانچ کی رائے متحد ہو جائے اور ایک خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دینا۔ اور اگر چار کی رائے متحد ہو اور دو مخالف تب بھی اُن دونوں کو چھوڑ دینا۔ اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو عبداللہ بن عمرؓ کو حکم بنا لینا اور جس فریق کے موافق طے ہو جائے دوسرے فریق کی رائے کو چھوڑ دینا۔ پھر حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ سلام کہنا اور کہنا کہ جو جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان آپ نے اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے عمرؓ اس کی آپ سے درخواست کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں۔ میں حضرت عائشہؓ کے گھر گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا عبداللہ بن عمرؓ ہے۔ پھر پوچھا کیوں آئے ہو؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت عمرؓ کو خون آلود چھوڑ کر آیا ہوں وہ آپ سے اُس جگہ کی درخواست کرتے ہیں جو آپ نے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے۔ حضرت عائشہ نے پوچھا حضرت عمرؓ کو کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا۔ مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے اُن کو زخمی کر دیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا واللہ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان میرے سوا کوئی اور مدفون ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے مجھ سے خواہش کی ہے تو بہت اچھا۔ میں واپس چلا آیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا کہ اُنھوں نے اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا حق تعالیٰ جزائے خیر دے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد پھر پوچھ لینا اگر اس وقت بھی اجازت دے دیں تو فبہا ورنہ عام مسلمانوں کے قبرستان بقیع میں دفن کر دینا۔

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد ہم جنازہ کو لے گئے اور حضرت عائشہؓ کے دروازہ

پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے پوچھا کون ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ جانتے ہیں ؟ انھوں نے فرمایا تھا کہ وفات کے بعد پھر آپ سے پوچھ لیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا واللہ جو جگہ میں ان کو دے چکی اب اس کو واپس نہ لوں گی۔ پھر اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ اور کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اے (حضرت) ابو بکرؓ تمہارا دوست عمرؓ تمہارے پاس زیارت کے لئے آیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت ایسا زلزلہ آیا کہ ہمیں آبادی کے منہدم ہونے کا خطرہ ہو گیا جب تیسرے دن عصر کا وقت ہوا تو صہیب ہمارے پاس آئے اور پوچھا تم نے کیا کیا ہم نے جواب دیا ابھی کچھ نہیں کیا۔ صہیب نے کہا اس ذات پاک کی قسم جس نے عمرؓ کی روح کو قبض کیا آج مغرب سے زیادہ اس معاملہ میں دیر نہ ہوگی۔ اس کے بعد اپنے گھر میں بیٹھ جانا۔ جب لوگ تلواریں سنبھال لیں گے تو تم کیا کر سکو گے جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔ حضرت عبدالرحمن نے اصحاب شوریٰ سے کہا تم مجھے اجازت دو کہ میں خلافت سے دست بردار ہو جاؤں اور تم میں سے ایک کو اللہ اور رسول کے لئے تجاویز لوں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ اگر اور ساتھی راضی ہو جائیں۔ تو میں سب سے پہلے منظور کرتا ہوں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے متعلق فرمایا ہے کہ تم زمین و آسمان میں امین ہو۔ دیگر حضرات بھی اس پر راضی ہو گئے۔

حضرت عبدالرحمن نے کہا۔ سعدؓ تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں اور تم اس کے اہل نہیں۔ اور طلحہؓ اور زبیرؓ تم بھی اس کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی آپ حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑتے اور کبھی حضرت علیؓ کا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ سے بیعت کر لی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اصحاب شوریٰ سے فرمایا کہ اگر تم نے گنجے کو حاکم بنایا تو اگرچہ وہ تلوار گردن میں ڈالے رکھے پھر تمہیں راہ راست پر نہیں چلا سکتا۔ میں نے عرض کیا۔ وہ خود بھی جانتا ہے۔ لہذا اس کو حاکم نہ بنایئے۔ پھر فرمایا۔ اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر (حضرت ابو بکرؓ) نے خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور اگر میں ایسے ہی چھوڑ دوں تو مجھ سے بہتر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا ہے یعنی میرے لئے دونوں امر کی گنجائش ہے۔

ے اس سے مراد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہو کے تو انھوں نے چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ منعقد کی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو ان میں کلام ہے تو فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں مقامات قیامت میں جس جگہ ہوں گا میرا ہاتھ علیؓ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور مجھ سے فرمایا۔ اے عمرؓ جب عثمانؓ بن عفان رات کو سوتے ہیں تو آسمان کے تمام فرشتے ان کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ صرف عثمانؓ کے لئے ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس لئے کہ وہ گناہ اور خطا کرنے میں رب العالمین سے حیا کرتا ہے۔ اور طلحہؓ بن عبداللہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے اور رات ٹھنڈی تھی کہ حضورؐ کا کجاوہ گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے اللہ جو شخص اپنی سواری سے اُتر کر میری سواری کو درست کرے تو اُس سے ایسا راضی ہو جس کے بعد کبھی غصہ نہ ہو۔ میں نے دیکھا کہ طلحہؓ اُسی وقت اُترے اور حضورؐ کے کجاوہ کو درست کر کے واپس کر دیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے طلحہؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طلحہؓ سے کہہ دیجئے اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی قیامت تک ہر مصیبت میں میں تمھارے ساتھ رہوں گا اور زبیرؓ بن العوام ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے اور چہرۂ مبارک پر مکھیاں گر رہی تھیں۔ جب تک حضورؐ بیدار ہوئے حضرت زبیرؓ برابر مکھیوں کو ہٹاتے رہے۔ حضورؐ نے بیدار ہو کر فرمایا اے زبیرؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی میں قیامت کے دن تمھارے چہرے سے دوزخ کی لپٹ کو دور رکھوں گا۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر تھے۔ کہ حضرت فاطمہؓ مع حضرت حسنؓ و حسینؓ کے حاضر ہوئیں۔ اور یہ تینوں رو رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے بچے کیوں رو رہے ہیں۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا" بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں" حضورؐ نے دریافت کیا" اور تم کیوں رو رہی ہو" حضرت فاطمہؓ نے کہا" ان بچوں پر ترس کھا کر" حضورؐ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ مجھے اور میرے بچوں اور میری لڑکی فاطمہؓ کو جنت کا کھانا کھلا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ حضورؐ نے دروازہ کھولا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے اور اُن کے ہاتھ میں حلوے کا پیالہ اور دو روٹیاں تھیں جن کے درمیان زیتون تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے ان کو پیش کیا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ یہ ہدیہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نے اس کو پیٹ بھر کر کھایا۔ اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے عبدالرحمٰنؓ جنت تو تمہاری طرف سبقت کر رہی ہے لیکن حق تعالیٰ تمہاری دنیا میں بھی برکت عطا فرمائے اور سعدؓ بن وقاص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی لڑائی میں تیرہ دفعہ ان کو تیر ٹھیک کر کے دیا۔ پھر فرمایا۔ تیر پھینک تجھ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں۔ جو شخص ان کو بھی برا کہے وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا تو ان کی تجہیز و تکفین کے بعد حضرت ضحاک بن قیسؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ کے یہاں اہل شوریٰ کا اجتماع ہوا (حضرت فاطمہؓ بہت نیک عورت تھیں۔ لوگ اکثر ان کے یہاں جمع ہوتے تھے)۔ حضرت عبدالرحمٰن سب میں بڑے تھے۔ اول انھوں نے گفتگو شروع کی اور مناسب حمد و ثنا کے بعد فرمایا اے جماعت حاضرین میری ایک رائے ہے تم بھی اس پر غور کر لو۔ اول خاموشی سے سن لو تاکہ معلوم ہو جائے اور سمجھ میں آ جائے۔ ضعیف جو سیدھی راہ چلے اُس قوی سے بہتر ہے جو کجرو ہو۔ اور ایک گھونٹ پانی جو ضرورت کے وقت پیاس بجھائے اس شیریں کثیر پانی سے بہتر ہے جس سے ہیضہ ہو جائے۔ تم علما رہو۔ قوم کے مقتدار اور ملجا ہو۔ اختلاف میں پڑ کر اپنی چھری کو ٹھنڈا مت کرو۔ اور اپنی تلواروں کو دشمن سے نہ روکو جس سے وہ تم پر سرکش ہو جائیں اور تمہارے اعمال میں نقصان آئے۔ ہر گھر کے لئے ایک امیر ہوتا ہے جس کے کہے پر سب چلیں۔ اور اُس کی مخالفت سے ڈریں۔ اپنے میں سے کسی کو اپنا کام حوالہ کر دو اور جس پر بھروسہ ہو اپنا بوجھ لاد دو۔ نرمی سے چلو تاکہ مطلوب تک پہنچ جاؤ تمہاری نیات تمہارے علم سے تجاوز نہ کریں اور تمہارے اعمال تمہاری نیات سے متجاوز نہ ہوں۔ مختصر بات زیادہ بکواس سے بہتر ہے۔ دشمن اور بدبخت کی اگرچہ وہ قریب ہو اطاعت نہ کرو۔ اور یہ بار (خلافت) ایسے شخص کو پہناؤ جو مصائب کے وقت قوی رہے۔ اور بعید میں امانت دار ہو۔ وہ تم سے راضی ہو اور تم اس سے راضی ہو اور تم میں سے مختار اور پسندیدہ ہو اور تم مقصد ناصح کی اطاعت نہ کرو۔ اور مرشد معاون کی مخالفت نہ کرو۔ میں

اس پر بات ختم کرتا ہوں اور اپنے اور تمھارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔

پھر حضرت عثمان بولے فرمایا۔ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا اور اُن کے لئے اپنے وعدہ کو پورا کیا اور ہر قریب و بعید پر اُن کی مدد کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کو نور بنا کر بھیجا اور ہمیں خواہشات کے تموج اور دشمنوں کے اختلاف کے وقت حضورؐ کے اتباع کی توفیق دی اور ہمیں اپنے فضل سے ائمہ بنایا اور اپنی اطاعت کے لئے امیر بنایا۔ یہ معاملہ ہم سے تجاوز نہ ہوا اور بجز ہمارے کوئی شریک نہ ہو۔ مگر جو شخص حق سے انجان ہوا اور راستہ سے بھٹک گیا ہو۔ اگر تمھاری مخالفت کی گئی۔ اور تمھاری بات رد ہو گئی تو میں سب سے پہلے تمھاری بات پر ہاں کروں گا۔ اور اس کو قبول کروں گا۔ میں اپنے اس قول پر کفیل اور ضامن ہوں اور اپنے اور تمھارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اور تمھاری مخالفت سے پناہ مانگتا ہوں۔

پھر حضرت زبیر بولے اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ حق تعالیٰ کے لئے پکارنے والا جاہل نہیں ہوتا اور اس پر ہاں کرنے والا نامراد نہیں ہوتا۔ خواہشات کے بڑھنے کے وقت جانوں کا محافظ رسان ہے۔ اگر حدود فرمیہ متیقن نہ ہوتیں اور فرائض خداوندی متعین نہ ہوتے۔ راحت و حیات ہوتی اور موت نہ ہوتی تو امارت اور حکومت سے بھاگنا اور بچنا باعث نجات اور عصمت ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے ہم پر اجابۃ حق اور افشاء سنت کو واجب کر دیا ہے تاکہ ہم گمراہی میں نہ پڑیں۔ اور زمانہ جاہلیت کی طرح پھر گمراہ نہ ہوں۔ جو کچھ تم کہو گے میں اُس کو قبول کروں گا اور تمھارے حکم کا اتباع کروں گا۔ والحمد للہ رب العلمین۔

پھر حضرت سعد بن ابی وقاص بولے کہ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں اس ذات پاک کی اس لئے حمد کرتا ہوں کہ اُس نے مجھ کو گمراہی سے نجات دی اور گمراہی پر متنبہ کیا۔ جو شخص محفوظ رہا اُس نے ہدایت خداوندی کے باعث فلاح پائی۔ اور جس کی نجات ہو گئی وہ خدا کے رحم و فضل سے کامیاب ہو گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے راستے منور اور درست ہو گئے۔ اور حق واضح ہو گیا اور باطل تمام مٹ گیا۔ اے حاضرین تم اہل کذب کی باتوں اور منکرین کی تمناؤں سے بچو۔ ان تمناؤں نے تم سے پہلے ایک قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ جس امر کے تم وارث ہوتے اور جو چیز تم کو ملی وہ بھی اُس کے وارث ہوئے تھے اور اُن کو بھی یہی ملی تھی۔ پھر

حق تعالیٰ نے ان کو اپنا دشمن بنا لیا اور اُن پر لعنت فرمائی۔

"لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذلك بما عصوا وکانوا یعتدون۔ کانوا لا یتناهون عن منکر فعلوه لبئس ما کانوا یفعلون"

اور میں اپنے تیر دان کو خالی کرتا ہوں اور اپنا حصہ چھوڑتا ہوں اور حضرت طلحہؓ کی نسبت میں ان کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کیا۔ اور جو کچھ اُن کی طرف سے ہو اس پر میں کفیل اور ضامن ہوں۔ اے ابن عوف یہ معاملہ تمہارے سپرد ہے بشرطیکہ سچائی اور کوشش بلیغ سے کام لو۔ "وعلی اللہ قصد السبیل والیہ الرجوع۔"

حضرت علیؓ سب سے چھوٹے تھے اس لئے سب کے بعد ان کا نمبر آیا۔ فرمایا تمام محامد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے ہم میں سے محمد صلعم کو نبی اور اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا۔ ہم نبوت کا گھرانا اور حکمت کی کان اور اہل زمین کے لئے امان اور طالب کے لئے نجات ہیں۔ ہمارا ایک حق ہے اگر وہ دیا گیا تو ہم لے لیں گے اور اگر اُس سے روکا گیا تو ہم اونٹوں کی پشت پر سوار ہوں گے اگرچہ طویل سفر کرنا پڑے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی عہد فرما لیتے تو ہم تاحیات اُس پر جہاد کرتے اور اگر حضور ہم سے کچھ فرما جاتے تو ہم اسے ضرور پورا کرتے۔ اگرچہ ہمارا گمان ہی ہو لیکن مجھ سے پہلے کوئی شخص دعوتِ حق اور صلہ رحمی کی طرف نہیں بڑھا۔ میری بات سنو اور یہ منتظر نہ دکھائیں کہ اس مجمع کے منتشر ہونے کے بعد اس معاملہ میں تلواریں چلیں اور بدعہدیاں ہوں۔ حتیٰ کہ ایک فرقہ تم لوگ ہو اور یا تم میں سے بعض گمراہ لوگوں کے مقتدا ہوں یا جہال کے تابع ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

حضرت منسور کہتے ہیں کہ پھر یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمن میرے ماموں تھے۔ صبح کو وہ اپنی رائے ظاہر کرنے والے تھے۔ یہ رات میں نے انہی کے یہاں گزاری۔ جب کچھ حصہ رات گزری تو مجھ سے فرمایا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے پاس جا کر ان کو بلا لاؤ۔ میں نے پوچھا "پہلے کس کو بلاؤں" حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "جس کو دل چاہے" میں نے پوچھا "دونوں کو ساتھ بلاؤں یا علیحدہ علیحدہ۔ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "ساتھ لانا"، چونکہ مجھے حضرت علیؓ سے زیادہ محبت تھی اس لئے پہلے اُن

ے پاس گیا وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا " چلیے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے"
حضرت علیؓ نے پوچھا " میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے" میں نے کہا " ہاں " حضرت
علیؓ نے پوچھا " کس کو " میں نے جواب دیا " حضرت عثمانؓ کو " حضرت علیؓ نے کہا۔
" پہلے کس کو بلایا ہے " میں نے کہا کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا کہ پہلے کس
کو بلاؤں انھوں نے جواب دیا جس کو دل چاہے۔ پھر میں نے اُن سے پوچھا کہ دونوں
کو ساتھ لاؤں یا یکے بعد دیگرے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ دونوں کو ساتھ لانا۔ ہم وہاں
سے چلے اور حضرت عثمانؓ کے گھر پر پہنچے۔ حضرت علیؓ باہر ٹھیر گئے اور میں حضرت عثمانؓ کے
پاس گیا اور اُن سے کہا چلیے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا
میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے۔ میں نے جواب دیا " ہاں " حضرت عثمانؓ نے پوچھا
" کس کو۔ میں نے جواب دیا حضرت علیؓ کو " حضرت عثمانؓ نے فرمایا " پہلے کس کو
بلایا ہے " میں نے کہا کہ اس کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا۔ انھوں نے
فرمایا۔ جس سے دل چاہے شروع کرنا اور دونوں کو ساتھ لانا اور حضرت علیؓ دروازہ
پر موجود ہیں۔ ہم وہاں سے چلے اور پھر دونوں حضرت عبدالرحمٰن کے پاس جاکر اُن کے
سامنے بیٹھ گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن نے بہت دیر تک کچھ باتیں کیں پھر فرمایا تمھارے معاملہ کو میں
نے اُلٹ پھیر کیا اور اب میں تم سے پوچھتا ہوں تم مجھے مشورہ دو اور میری اعانت کرو۔
اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت
علیؓ نے کہا " اپنی طاقت کے بقدر۔ اور حضرت عثمان نے کہا " اے ابو محمد (کنیت حضرت
عبدالرحمٰن) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیماں کے ساتھ تم سے بیعت کرتا ہوں
حضرت عبدالرحمٰن نے کچھ اور باتیں کیں۔ پھر کہا میں نے تمھارے معاملہ کو واضح کیا اور تم
سے بحث کی تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد و پیماں کے
ساتھ مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنی طاقت کے بقدر اور حضرت عثمانؓ
نے جواب دیا کہ اے ابو محمد میں اللہ و رسول کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر تم سے
بیعت کرتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے پھر کچھ اور باتیں کیں اور کہا میں نے تمھارے معاملہ
میں غور کیا اور تم سے پوچھا تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد

دپیاں کے ساتھ کتاب و سنت پر مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اپنی طاقت کے بقدر، اور حضرت عثمانؓ نے کہا۔ میں حضورؐ کے عہد و پیاں کے ساتھ کتاب و سنت پر تم سے بیعت کرتا ہوں حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر فرمایا سوجو تم چاہو! اور یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ چلے جاؤ۔ یہ دونوں حضرات کھڑے ہو گئے اور تشریف لے گئے۔

جب صبح کی نماز کا وقت ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن نے اپنا عمامہ منگا کر باندھا اور تلوار گردن میں ڈالی پھر منبر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب حضرت صہیبؓ نے نماز ختم کی تو حضرت عبدالرحمٰن منبر کے قریب کھڑے ہوئے۔ اور حمد و ثنا کے بعد کہا۔ لوگو! تمھیں وہ کام معلوم ہے جو تم نے میرے حوالے کیا ہے اور جس میں تم نے میری اطاعت کا عہد کیا ہے۔ چاہے میں اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر خود اپنے ہی سے بیعت کر لوں۔ پھر فرمایا "اے عثمانؓ کھڑے ہو" حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے۔ اور حضرت عبدالرحمٰن نے پھر دیگر لوگوں نے بیعت کی۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ پھر گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا، "اے علیؓ تم دھوکے میں آ گئے" حضرت علیؓ نے کہا "کیسا دھوکا" (فاطمہ بنت قیس نے یہ سن لیا) حضرت ابن عباسؓ نے کہا "حضرت عبدالرحمٰن اپنے لئے اعتماد اور پختگی چاہتے تھے" چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اعتماد ظاہر کر دیا پس حضرت عبدالرحمٰن نے جس کو محکم اور مضبوط پایا قبول کر لیا۔ اور ایک ہی بات کو تین مرتبہ تین طریق سے بیان کی۔

حضرت ابو وائل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ تم نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ سے کیوں بیعت کی۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ میرا کیا قصور میں نے حضرت علیؓ سے ابتدا کی اور ان سے کہا کہ میں تم سے کتاب و سنت اور سیرت شیخین پر بیعت کرتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا جس قدر مجھ میں طاقت ہے۔ پھر میں نے حضرت عثمانؓ کے سامنے اس کو پیش کیا انھوں نے منظور کر لیا۔

حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے جب بیعت عثمانؓ کا پہلا دن ہوا اور مہاجرین و انصار مسجد میں جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن کو دیکھا ایک چادر کا عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اور لوگوں میں اختلاف ہو رہا تھا کہ حضرت ابوالحسن (میرے ماں باپ ان پر قربان) تشریف لائے جب مجمع نے ان کو دیکھا تو سب خوش ہو گئے اور حضرت علیؓ فرمانے لگے، وہ کلام جس سے لوگ ابتدا کرتے ہیں۔ وہ بات جس کو لوگ بولتے ہیں۔ وہ گفتگو جو لوگ کرتے ہیں۔ سب سے بہتر

حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور حضورؐ اور آپ کی آل و اولاد پر درود بھیجتا ہے۔

جمیع محامد اس ذات پاک کے لئے جو یکتا ہے۔ صرف اسی کے لئے دوام و بقا ہے۔ ملک کا وہ تنہا مالک ہے۔ فخر و بزرگی اور ثنا صرف اُسی کے لئے ہے۔ اُس کے جلال کے باعث سب (تمام زمانہ) موجود اُس کے زیر ہیں۔ اور اس کے خوف سے قلوب لرزاں ہیں۔ نہ کوئی اس کا مثل ہے اور نہ کوئی اس کا شریک۔ کوئی مخلوق میں اس کا مشابہ نہیں ہم اُس بات کی گواہی دیتے ہیں جس کی خود اُس نے اور اُس کی مسلم مخلوق نے گواہی دی۔ لا الٰہ الا اللہ۔ نہ اُس کی کسی صفت کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تعریف ہو سکتی ہے جس سے اُس کو سمجھایا جا سکے اُس نے بادلوں کی رَو کو دریاؤں میں بہایا اور بادلوں کو تھوڑی بارش اور زیادہ بارش کے ساتھ بھیجا۔ جس سے میدانوں اور ٹیلوں پر گھاس کا فرش بچھایا اور پھولوں اور مختلف قسم کی گھاسوں کو اُگایا۔ اور سخت پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے جاری کئے جو صاف جگہ سے بہتے ہیں جن سے پرندوں اور درندوں اور حشرات الارض اور تمام چوپایوں اور انسان کی حیات ہے۔ ہم ان لوگوں میں ہیں جو اُس کے دین پر چلتے ہیں کسی دوسرے دین پر نہیں چلتے۔ پاک ہے وہ ذات جس کی صفت کی نہ نعت ہے اور نہ حد۔ اور گواہی دیتے ہیں ہم کہ محمد صلعم اُن کے پسندیدہ بندے اور برگزیدہ نبی اور رسول تھے۔ ان کو ہمارے پاس ایسے وقت بھیجا جب لوگ بت پرست اور گمراہی کا مرکز تھے اور خون بہاتے تھے اور اولاد کو قتل کرتے تھے اور راہ گیروں کو ڈراتے تھے۔ ان کا عیش ظلم تھا اور ان کا امن خوف تھا اور ان کی عزت ذلت تھی۔ حماقت اور ضلالت اور نخوۃ مزید براں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ہمیں گمراہی سے بچایا۔ اور جہالت سے ہدایت دی۔ اور ہلاکت سے بچایا۔

ہم اہل عرب سب سے زیادہ تنگ معاش کریہ المنظر اور بدحال تھے۔ ہمارا اچھے سے اچھا کھانا پیاز اور ہمارا عمدہ لباس بالوں کے بنے ہوئے کپڑے اور کھال تھی اور بتوں اور آگ کی پرستش مزید براں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے طفیل ہمیں بہتر دین کی ہدایت دی اور مورتوں کی پرستش سے بچایا۔ حق تعالیٰ نے ان کو شعلہ نور سے بنایا اور ان کے سبب سے مشرق و مغرب کو منور کیا۔ پھر حضورؐ کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یکس قدر بڑی آفت اور مصیبت تھی۔ سب مسلمان اس مصیبت میں شریک ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔

اے مہاجرین واللہ جب لوگ مرتد ہونے لگے میں نے اس وقت حضرت ابوبکرؓ سے اچھا تلوار پکڑنے والا نہیں دیکھا۔ حضرت ابوبکرؓ ایک ایسی بات پر جم گئے جس کے باعث حق تعالیٰ نے سنت رسول کو جو مٹے رہی تھی پھر زندہ کر دیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ واللہ اگر ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تب بھی میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کو سُنا اور ان کی اطاعت کی اور میں سمجھتا تھا کہ میرے لئے یہی بہتر ہے۔ وہ دنیا سے اس لئے فارغ تشریف لے گئے اور میں ان کے متعلق یہ خیالات کیسے ظاہر کروں وہ ثانی اثنین تھے۔ اور ان کی صاحبزادی ذات النطاقین نے اپنی چادر کا پٹکا بنلیا تھا اور دوروٹیاں حضورؐ کی خدمت میں لے جایا کرتی تھیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے سات شخصوں کو آزاد کیا جن میں تین عورتیں اور چار مرد تھے سب کو اللہ اور رسول کی وجہ سے تکلیف دی جارہی تھی۔ انہیں میں سے حضرت بلالؓ ہیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلعم کو سامانِ سفر دیا اُن کے پاس اُس روز چالیس ہزار درہم تھے جن کو اُنھوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا اور ان کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔

پھر حضرت عمرؓ فاروق اُن کے قائم مقام ہوئے وہ مستعد رہے اور اللہ کے کام میں لوملۃ لائم کا خیال نہ کرتے تھے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ گویا سکینہ اور وقار ان کی زبان پر بول رہا ہے میں کیسے ان کے متعلق یہ نہ کہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ پر سہارا لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے کہ ہم اسی طرح ساتھ زندہ رہیں گے اور اسی طرح مرنے کے بعد ساتھ رہیں گے۔ اور اسی طرح قبور سے اُٹھیں گے۔ اور اسی طرح جنت میں جائیں گے۔ اور شیطان اُن کی آہٹ سے بھاگتا تھا۔ اور دنیا سے شہید ہو کر تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب اے مہاجرین وانصار میں تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر فرمایا۔ اے مہاجرین تم میں جو ایک شخص ابو عبداللہ حضرت عثمانؓ بن عفان ہیں کیا رسول اللہ صلعم نے ان سے اپنی صاحبزادی کا نکاح نہیں کیا۔ پھر حضورؐ کے پاس جبرئیلؑ آئے اس وقت حضورؐ مقبرہ میں تھے اور کہا اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالیٰ

فرماتے ہیں کہاں کی بہن کا حضرت عثمانؓ سے نکاح کر دو۔ اور حضرت عثمانؓ نے جیشِ عسرۃ کو سلطانی سفر دیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ایک روز حضورؐ کے لئے دلیا تیار کیا اور ایک پیالہ میں لے کر حاضر ہوئے۔ وہ پیالہ بھرا ہوا تھا اور حضورؐ کے سامنے رکھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کناروں سے کھاؤ اور چوٹی کو نہ توڑو اس لئے کہ برکت اوپر سے اترتی ہے اور حضورؐ نے گرم کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گھی اور شہد اور گیہوں کے آٹے کے ساتھ تناول فرما چکے تو مخلوق کے پیدا کرنے والے کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا۔ اے عثمانؓ حق تعالیٰ نے تمہارے اگلے پچھلے ظاہر و باطن سب گناہ بخش دیئے۔ اے اللہ عثمانؓ کا یہ دن نہ بھولنا۔
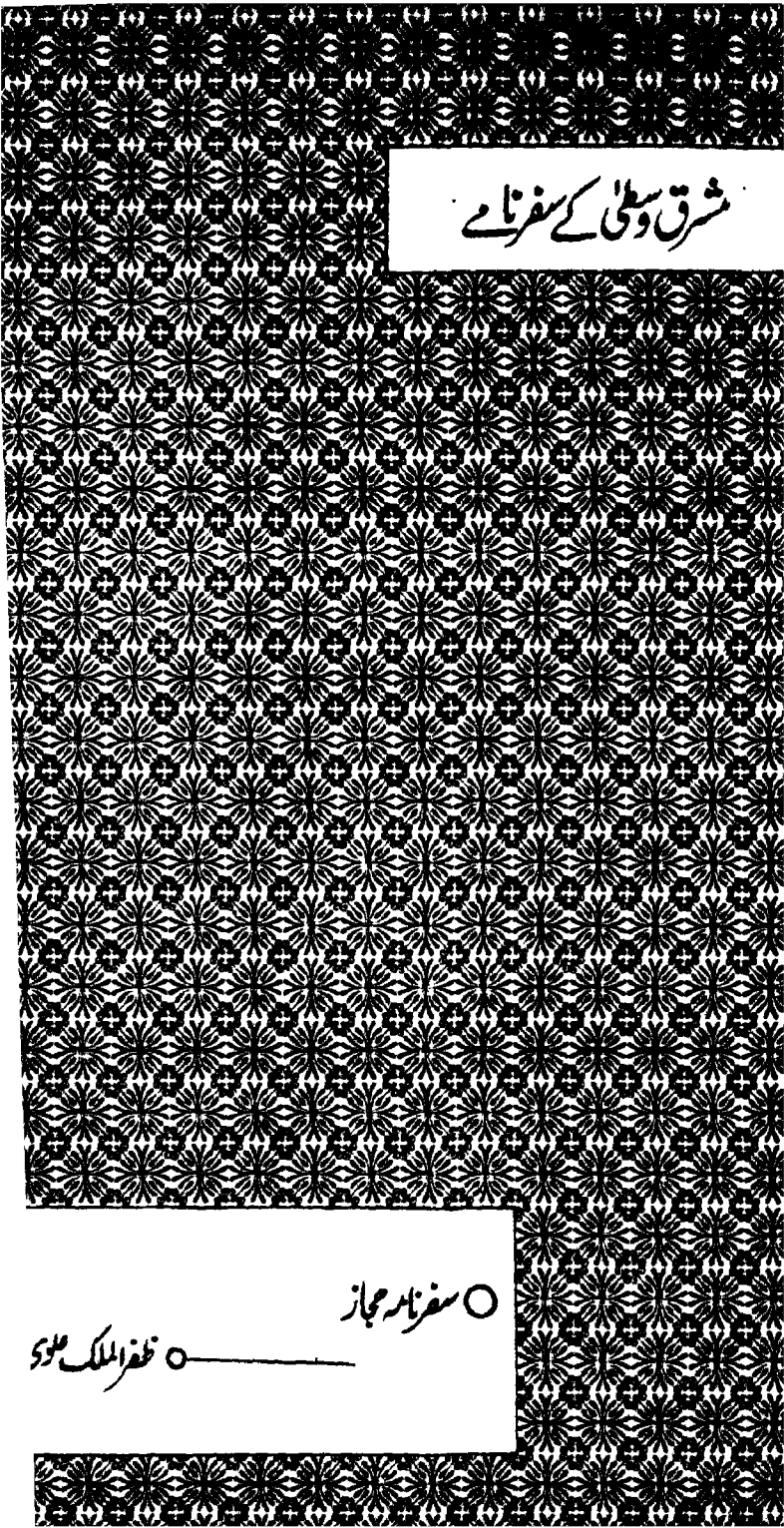
پھر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ لا سیف الا ذوالفقار لا فتیٰ الا علی (تلوار صرف ذوالفقار ہے (نام تلوار) اور جوان صرف علیؓ ہے) لوگوں نے جواب دیا "ہاں" حضرت علیؓ نے فرمایا میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم علیؓ سے محبت رکھو اور اس شخص سے محبت رکھو جو علیؓ سے محبت کرتا ہو اس لئے کہ حق تعالیٰ بھی علی اور اُن کے محب سے محبت کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا "ہاں"

حضرت علیؓ نے کہا میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب مجھے ساتویں آسمان پر لے گئے تو میں نور کے پردوں اور حجاب میں گیا۔

جب حضورؐ وہاں سے لوٹے تو ہاتف نے پردہ کے پیچھے سے کہا آپ کے باپ (حضرت) ابراہیمؑ اور آپ کے بھائی علی کس قدر اچھے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسا ہوا۔ حضرت ابو محمد (کنیت حضرت عبدالرحمن بن عوف) نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اور اگر نہ سنا ہو تو میرے دونوں کان گونگے ہو جائیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے سوا حالت جنابت میں کوئی مسجد سے گزرتا ہو۔ لوگوں نے جواب دیا "نہیں" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا نہیں معلوم کہ

سوائے میرے دروازہ کے اور سب دروازے مسجد کے بند کر دیئے گئے تھے۔ لوگوں نے جواب دیا "ہاں" فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب میں حضورؐ کی داہنی جانب قتال کرتا تھا تو ابوبکرؓ اُن کی بائیں جانب قتال کرتے تھے۔ پھر فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا تمہارا رتبہ میرے یہاں ایسا ہے جیسا حضرت ہارونؑ کا درجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہاں تھا لیکن میرے بعد نبوۃ ختم ہو گئی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین کو پکڑا اور فرمانے لگے "کھیر حسن کھیر" حضرت فاطمہؓ نے کہا یا رسول اللہ حسین اس سے چھوٹا ہے اور ضعیف بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ میں "حسن کھیر" کہوں تو حضرت جبرئیلؑ "حسین کھیر دو" کہیں۔ کیا تم میں سے کسی کا ایسا رتبہ ہے ہم صابر ہیں تاکہ حق تعالیٰ اس بیعت میں شقاق امر کا حکم فرما دیں۔ وصلی اللہ علی محمد وسلم

حضرت عمرؓ نے منبر پر فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین دفعہ چونچ ماری۔ میرا خیال ہے کہ کوئی عجمی شخص میرا قاتل ہے۔ اور میں نے خلافت کا معاملہ اُن چھ آدمیوں کے حوالہ کر دیا جن سے حضورؐ خوش تشریف لے گئے۔ جس کو وہ خلیفہ بنا دیں وہی خلیفہ ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ کے سفرنامے

○ سفرنامہ حجاز

○ ظفر الملک علوی

ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر) کا یہ سفر نامہ "الناظر" کے ستمبر ۱۹۲۳ء تا ستمبر ۱۹۲۶ء کے مختلف شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ ہم اسے اب یکجا پیش کر رہے ہیں۔

○ ادارہ

سفرنامہ حجاز

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کے نامور سپوتوں میں ایک نام ظفر الملک کا بھی ہے۔ آپ کا نام اسحاق علی علوی تھا مگر دنیائے ادب و صحافت میں ظفر الملک کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام منشی حمایت علی علوی تھا جو کاکوری کے مخدوم زادگان کے اسلاف میں سے ایک ہیں۔ ظفر الملک ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۱ھ قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اردو عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اسکے بعد لکھنؤ کے جوبلی اسکول میں انگریزی تعلیم کے لیے داخل کر دیے گئے۔ آپ نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کی طرف توجہ کی۔ محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کی حتی کہ بیرون ملک ہانگ کانگ تک کا سفر کیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی مشغلہ انھیں پسند نہ آیا اور وہ وطن واپس آگئے۔

مگر پھر کچھ دنوں قیام کے بعد حیدر آباد چلے گئے، جہاں عبد الحلیم شرر، علامہ عمادی، ظفر علی خاں اور نیز محفوظ علی خاں بدایونی کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ یہیں آپ کی ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ حیدر آباد سے ٹونک آئے۔ یہاں ایک اخبار کی ادارت سنبھالی۔ پھر لکھنؤ آکر ۱۹۰۹ء میں رسالہ "الناظر" جاری کیا۔ الناظر پریس لکھنؤ سے "الناظر" کے علاوہ مختلف انواع کی کتب وغیرہ شائع ہوتی تھیں۔ صحافتی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ظفر الملک جلد ہی ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا تو انھوں نے لیگ کاؤنسل کے رکن کی حیثیت سے اس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی نے علی برادران کے تعاون سے عدم تعاون تحریک چلائی تو ظفر الملک لکھنؤ سے پہلے شخص تھے جنھیں اس سلسلہ میں گرفتار کیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں جب "ہندوستان چھوڑو" تحریک بڑے پیمانے پر شروع ہوئی تو ظفر الملک نے جے پرکاش نرائن اور ارونا آصف علی کے ساتھ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۴۹ء میں ظفر الملک جمعیۃ العلماء ہند کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سلطان پور گئے تھے جہاں ان کا پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور اپنے آبائی قبرستان کاکوری میں دفن ہوئے۔

"ظفر الملک کی صحافتی و ادبی خدمات" از ڈاکٹر اخلاق حسین عارف
اکادمی لکھنؤ۔ مارچ تا جون ۱۹۹۰ء ـــ تلخیص

ظفر الملک علوی

○

پہلی منزل

دوشنبہ ۱۶ را پریل ۱۹۲۳ء کو رات کے دس بجے جب چارباغ اسٹیشن (لکھنؤ) پر اعزا
واقربا سے رخصت ہوا تو تیسرے درجہ کے ایک ڈبہ میں بیٹھنے بھر کی جگہ ملی۔ دن بھر لوگوں سے ملنے
اور رخت سفر باندھنے میں مصروف رہا تھا اور مسلسل حرکت کے باعث خستگی و ماندگی سے بدن چور چور
ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر قدرتاً جی چاہتا تھا کہ پاؤں پھیلا کر لیٹوں اور سو جاؤں مگر درجہ میں مسافروں
کی کثرت نے اس کا موقع نہ دیا اور ناچار گھٹنوں پر سر ٹیک کر جسقدر سونے کی کوشش ممکن تھی کی گئی۔
کانپور کے اسٹیشن پر کچھ مجمع چھٹا تو میں نے فراغت کے ساتھ لیٹنے کی امید باندھی لیکن تھوڑے
ہی وقفہ کے بعد نئے رنگروٹوں کی بھرتی ہونے لگی جسکے بعد پھیلے ہوئے پاؤں پھر سکڑ گئے اور اسی
عالم میں رات تمام ہونے کے بعد علی الصباح نماز فجر کے وقت جھانسی پہونچا۔ سامان گاڑی سے
اتر کر اس چبوترہ پر پہونچا جہاں بمبئی کی گاڑی آکر ٹھہرتی تھی اور میں نے قریب کے نل سے پانی لیکر
وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ طلوع آفتاب کے بعد چائے کی تلاش میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجلس خلافت
جھانسی کے ایک کارکن ملے جو ریلوے میں ملازم ہیں اور جن سے فتح گڈھ جیل میں ایک بار نیاز حاصل
ہوا تھا جبکہ وہ میرے رفیق مجلس مکرمی سید محمد ہادی صاحب سکرٹری مجلس خلافت جھانسی سے ملاقات
کرنے آئے تھے اور اُنھوں نے مجھے پہچان کر از راہ کرم چائے کی ضیافت فرمائی اور دیر تک اسٹیشن
پر میرے ساتھ ٹہلتے اور مقامی حالات سناتے رہے۔ جب وہ اپنے کام پر چلے گئے تو مجھکو تلاوت
کلام مجید کا موقع ملا۔ اِس سے فارغ ہوتے ہی بمبئی جانے والا ایکسپرس آگیا اور ایک نہایت ہی محفوظ
اور کم مسافروں والے ڈبہ میں قلی نے میرا سامان پہونچا دیا۔ قلیوں اور یکہ گاڑی والوں کی جماعت سے
ہمیشہ مسافروں کو شکایت رہتی ہے اور جھانسی اسٹیشن پر اس سے قبل متعدد دفعہ مجھے کافی پریشانی
اُٹھانا پڑی تھی مگر اب کی بار میں گھر سے تہیہ کر کے چلا تھا کہ ہر مقام پر منہ مانگی اُجرت ادا کر دونگا تاکہ بیس
منٹ کسی سے جھک جھک نہ ہو۔ چنانچہ جھانسی میں اسی طرز عمل کی بدولت بہت فراغت سے رہا اور

اچھی جگہ بھی مل گئی، جس ڈبہ مین مین مجانسی سے سوار ہوا یہ تیسرے درجہ کی عام گاڑیون کے اندر تھا
بلکہ اس کی ساخت قریب قریب اُس قسم کی تھی جیسے ڈاک گاڑیون مین اول و دوم درجہ کے متصل ڈبے
ہوتے ہین جنھین شاید ریلوے اصطلاح مین "بوگی کیریج" کہتے ہین۔ ایک طویل گاڑی مین پانچ کمرے
بنے ہوئے تھے جن کے ایک جانب آمد ورفت کے لیے برآمدہ چھوٹا ہوا تھا اور بیرونی جانب چورون
سے محفوظ رکھنے کے لیے پائدان نہین لگائے گئے تھے۔ ایک طرف کے کنارے کا کمرہ ذرا چھوٹا رکھا
گیا تھا اور جو گنجائش اس طور سے نکلی تھی اس مین پائخانہ تھا جسکا دروازہ سب کمرون کے دروازون
کی طرح برآمدہ مین تھا۔ ڈبہ مین داخلہ کے لیے کنارہ کی طرف دونون جانب دروازے لگے تھے۔ رات بھر
آرام سے سونے نہ پایا تھا اس لیے ریل چلی تو تھوڑی ہی دیر مین غافل ہو کر سو گیا، کئی گھنٹہ کے بعد
آنکھ کھلی تو پاس والے کمرے مین ایک صاحب نہایت فصیح انگریزی مین اور کسی قدر بلند آواز سے
سیاست حاضرہ پر گفتگو کر رہے اور اپنے کم عمر مخاطب کے سامنے اہل ہند کی بدبختی، تحریک ترک موالات
کی عدم کامیابی اور حکومت دفتری کی چیرہ دستی پر نوحہ خوان ہو رہے تھے۔ مین دیر تک استفادتاً
اُن کی گفتگو کو توجہ سے سنتا رہا تا آنکہ مجھے خطرہ ہوا کہ میرا یہ فعل کہین اُن کی ناگواری کا باعث نہو اور وہ
یہ شبہ نہ کرنے لگین کہ مین کوئی جاسوس ہون۔ لہٰذا مین نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے سلسلہ مکالمت
شروع کر دیا۔ یہ صاحب اگرچہ سرکاری ملازم تھے مگر خیالات آزادانہ اور فکر بلند رکھتے تھے اس لیے
حکومت کی کمزوریون اور بدعنوانیون کے اعتراف مین دریغ نہ تھا۔ مہاتما گاندھی کی دل سے عظمت
کرتے۔ تحریک ترک موالات کے اصولون کو نہایت پسندیدہ نگاہون سے دیکھتے اور اُسکی ناکامیابیون کے
اسباب و علل کا نہایت صحیح اندازہ رکھتے تھے۔ ان سے مل کر بہت جی خوش ہوا اور راہ مین متعدد بار مختلف
مباحث پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ۹ بجے دن کو بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو ایک عزیز بھائی سے
ملاقات ہوئی جن کو روانگی سے قبل تار دیدیا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ سے ریاست مین ایک ممتاز عہدہ پر مامور
تھے مگر اب بد دل ہو کر مستعفی ہو گئے ہین اور عنقریب اپنے وطن واپس جانے والے تھے۔ تقریباً بیس منٹ
تک اُن سے بات چیت ہوتی رہی۔ اسکے بعد ریل کے انجن نے سیٹی دی اور مین اُن سے رخصت ہو کر
اپنے ڈبہ مین آبیٹھا میرے کمرے مین دو صاحب الہ آباد کے رہنے والے مجانسی سے سوار ہوئے تھے
اور بمبئی تک برابر ساتھ رہے۔ اُن کے ہمراہ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھی تھا جسکو دیکھکر مجھے بار بار اپنے

بچون اور خصوصاً داؤد سلمہ کی یاد آجاتی تھی۔ بچون کے ساتھ مجھے طبعاً ایک خاص دلبستگی ہو اس وجہ سے جو بچہ بھی مجھکو ملجاتا ہو میرے لیے سامان تفریح اور موجب راحت قلب بنجاتا ہو۔ رات کو خوب اطمینان سے سونے کا موقع ملا اور صبح کو نماز و تلاوت سے فارغ ہوتے ہی منزل پر پہونچنے کا انتظار شروع ہوگیا۔ وہ الہ آبادی لڑکا اب چونکہ مجھسے کسی قدر مانوس ہوگیا تھا اس لیے اُسکی بچپن طبیعت کو زیادہ آزادی ملی اور جب تک ریل وکٹوریہ ٹرمنیس پر نہیں ٹھہری وہ برابر اپنی شوخیون اور اضطراری حرکتون سے میرے اور اپنے ہمراہیون کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بنا رہا۔ ۹ بجے کے قریب گاڑی بمبئی پہونچی اور ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوے۔ قلی نے سامان اتار کر چبوترہ پر رکھا تو مین اُس صندوق کو حاصل کرنے کی غرض سے آگے بڑھا جو بریک وان مین رکھا ہوا تھا۔ چند قدم چلا ہون گا کہ ایک پولیس کانسٹبل سے مڈبھیڑ ہوئی جس نے فوراً ہی سوالات کی بوچھار کردی۔ آپ حاجی ہین؟ کہان سے آئے ہین؟ کہان ٹھہریے گا؟ ان سوالات کے مختصر جوابات دیتا ہوا مین بریک وان تک پہونچا۔ جہان معلوم ہوا کہ میرا صندوق پچھلے بریک وان مین ہو۔ واپس ہونا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کانسٹبل صاحب سر پر آدھمکے اور وہی سوالات اُنھون نے بھی شروع کردیے۔ مین اس ملک کی پولیس کے کارنامون سے بخوبی واقف ہون۔ اس لیے یہ خیال کرکے کہ مجھے اجنبی جانکر ستانا مقصود ہو مین نے کہا کہ آپ میری فکر نہ کرین اپنی راہ لین۔ اور جب دیکھا کہ یہ بلا اس طور پر نہین ٹلی تو انگریزی مین کسی قدر ترش ہوکر اُس سے کہا کہ مین بمبئی سے خوب واقف ہون۔ اور کسی کی رہنمائی کا محتاج نہین۔ انگریزی دانی کے اظہار کی یہان صرف یہ ضرورت تھی کہ کانسٹبل صاحب کے یہ ذہن نشین ہوجائے کہ کسی سادہ لوح ملا سے سابقہ نہین ہو جسے وہ لوٹ سکے گا۔ جیسا کہ میرے لباس اور چہرے بشرے سے غالباً اس نے سمجھا ہوگا۔ چنانچہ یہ نسخہ فوراً کارگر ہوا۔ اور وہ کانسٹبل کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور جب ایک تیسرے کانسٹبل صاحب نے میرے حال پر توجہ فرمانی چاہی تو اُس نے اُس کو بھی روک دیا۔ خدا خدا کرکے پچھلے بریک وان پر پہونچکر بابو کو بلٹی حوالہ کی اور اپنا صندوق لے کے قلی پر لدوایا اور گاڑی پر سامان رکھ کے سوار ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ گاڑی روانہ ہونے والی تھی ایک اور صاحب نازل ہوے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا سامان ہو۔ کہا گیا کہ بستر، کپڑے، ناشتہ اور دیگر اشیاے خوردنی۔ حکم ملا کہ کھولکر دکھاؤ۔ مین نے پوچھا کہ کیوں آپ کون ہین جو میرا سامان دیکھین گے، مین متعدد بار بمبئی گیا تھا اور کبھی کسی نے میرا سامان نہ دیکھا۔

ایک دفعہ یہ بناؤ انداز دیکھکر خیال پیدا ہوا کہ
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

دریافت کرنے پر اُس شخص نے اپنے کوٹ کا دامن اُٹھا کر اپنی پیٹی دکھائی جس سے ظاہر ہوا کہ محکمۂ چنگی کا
سپاہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ بمبئی میں اُترنے والے مسافروں پر یہ پابندی کبھی عائد نہ تھی اور میرے لیے
آسان بھی نہ تھا کہ اپنے وزنی صندوق کو جو رسی کے جال سے کسا ہوا تھا تنہا اُلٹ پلٹ کر کھولتا۔ اسلیے
میں نے کہا کہ بستر اور کپڑوں کا بورہ کھلا ہوا ہے آپ شوق سے اس کا معائنہ کیجیے۔ اور ازار بند سے کنجی
کھول کر پیش کی کہ بکس بھی کھولکر دیکھ لیجیے مگر اُس کو اصرار تھا کہ میں گاڑی پر سے نیچے اتروں اور سب چیزوں
کو اپنے ہاتھ سے کھولکر دکھاؤں۔ میں نے کہا کہ جس وقت سامان اسٹیشن کے چبوترہ پر تھا اور قلی موجود تھا
تم کو سامان دیکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو یہ میرے امکان کی بات نہیں کہ اتنا بھاری صندوق گاڑی سے
نیچے اتاروں اور اُسے کھولوں۔ اگر تم کو دیکھنا منظور ہے تو ہر چند کہ یہ امر خلاف دستور ہے مگر چونکہ مجھے اس بات
کا اطمینان ہے کہ میرے سامان میں کوئی چیز لائق گرفت نہیں اس لیے بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تم
سامان دیکھ لو۔ مگر وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوا۔ اور جب گاڑی والا گھوڑا بڑھانا چاہتا تھا تو وہ اُسے ڈانٹ کر
روک دیتا تھا۔ تب میں نے کہا کہ تم اپنے افسر کے پاس گاڑی لے چلو میں اُس سے بات چیت کروں گا
مگر اُسے اصرار تھا کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے سامان یہیں دکھانا ہوگا۔ مجبور ہو کر میں نے کہا کہ تم جو کہتے ہو
اُس کی تعمیل سے میں قاصر ہوں۔ اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ یہ گاڑی
کی بات ٹھیک نہیں ہے تم سامان دکھاؤ ورنہ بہت پریشان ہوگے۔ میں نے پھر کہا کہ خیر جو کچھ ہو۔ سامان
دکھانے میں مجھے عذر نہیں مگر یہ بکس میرے کھولے نہیں کھل سکتا اس لیے میں مجبور ہوں۔ تمہارا جی
چاہے کنجی لیکر کھولو اور دیکھ لو ورنہ جو تمہارے اختیار میں ہو کرو۔ وہ دیر تک کھڑا رہا مگر جب اُس نے دیکھا
کہ کوئی دھمکی کارگر نہیں ہوتی تو ذرا سیدھا ہوا اور پوچھنے لگا کہ کوئی نشے کی چیز تو نہیں ہے میں نے کہا نہیں
تب اُس نے پیچھا چھوڑا اور میں سیدھا سابو صدیق کے مسافر خانے پہونچا جو اسٹیشن سے تقریباً دو فرلانگ
کے فاصلہ پر ہے۔ مسافر خانہ میں عبدالقادر سکندر معلم حجاج مقیم لکھنؤ کے بیٹے حسن سکندر پہلے سے جس کمرہ میں
ٹھہرے ہوئے تھے اُسی کمرہ میں مجھکو بھی ٹھہرنے کی جگہ دی گئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاز اکبر و رضوانی دو دن
پیشتر روانہ ہو چکے ہیں۔ اب ۲۱ کو ہمایوں جانے والا ہے جسکے ٹکٹ برابر فروخت ہو رہے ہیں۔ اسلیے میں

تھوڑی دیر ٹھہر کر بازار ہوتا ہوا جناب مولوی عبد الاحد صاحب محافظ حجاج کی خدمت میں حاضر ہوا
وہ میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ اس وجہ سے بڑے تپاک سے ملے اور فوراً ہی پاسپورٹ بنوا دیا اور کمپنی
کے ایک ملازم (بایدال) کو جو دفتر میں موجود تھا بلاکر میرے ساتھ بھیجا کہ ٹکٹ خریدنے میں میری رہنمائی کرے
چنانچہ کمپنی کے دفتر میں جاکر ایک سو روپیہ کا ٹکٹ خرید لیا گیا۔

میں ۱۰۔ اپریل کی صبح کو بمبئی پہونچا تھا اور چونکہ پہونچنے کے دو ہی گھنٹے کے اندر حصول پاسپورٹ
اور خریداری ٹکٹ کے مراحل سے فراغت مل گئی تھی اس لیے دو ڈھائی دن ضروری سامان کی خریداری
اور دوستوں سے ملاقات کے لیے مل گئے اور جب اتفاق سے ۱۲ کے بجائے ۱۴ اپریل کو جہاز کی
روانگی ہوئی تو دو دن فرصت کے اور ہاتھ لگے۔ چار پانچ دن کی اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر
میں نے ضروری سامان بھی خریدا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور اخبار خلافت کے دفتروں میں بھی حاضری
دی اور اس مجلس ملی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق معلومات بھی فراہم کیں۔ اور ضمناً بمبئی کی تھوڑی سی
سیر بھی ہو گئی۔ گو سابق کی طرح حقیقتاً اس کا کم موقع ملا۔ بمبئی اتنا بڑا شہر ہے کہ اسکی سیر کرنے کے لیے
ہفتوں بلکہ شاید مہینوں کی اقامت درکار ہے۔ پھر آئے دن کے تغیرات کی وجہ سے ایک ایسے شخص کو
جو برسوں کے بعد بمبئی آتا ہو ہمیشہ اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی رفیق و رہنما سیر کے وقت ساتھ ہو
میرے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ کوئی ایسا راہبر۔ اس لیے بمبئی کی شہری زندگی کے متعلق کچھ کہنے کا
موقع نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بمبئی کی سابقہ چہل پہل میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اور جدید
عمارتوں کو دیکھکر تو یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ شہر جو ہندوستان کا عروس البلاد کہا جاتا ہے برابر ترقی کر رہا

خلافت کمیٹی کے دفتر میں جب حاضری کا اتفاق ہوا تو دوپہر کا وقت تھا اور کوئی صاحب دفتر
میں موجود نہ تھے۔ البتہ دفتر کے متعلقہ مہمانخانہ میں محترمہ بی اماں صاحبہ کے تشریف رکھنے کی خبر ملی چنانچہ
میں نے اپنی حاضری کی اطلاع کر کے محترمہ موصوفہ کی قدمبوسی اور رخصتی دعائیں حاصل کیں۔ اور بہ
معیت چودھری عبد الغنی صاحب ایڈیٹر روزنامہ خلافت اُن کے دفتر چلا گیا۔ وہاں کئی گھنٹہ ٹھہرا
کیونکہ اتفاق سے کرمی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی تشریف لے آئے اور چونکہ وہ ایک سال سے زا
عرصہ تک عراق میں سفر کرنے کے بعد واپس آئے تھے اس لیے دیر تک عراق کے تمدنی و سیاسی حالا
اُن سے سنتا رہا اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا کہ عراق کے عربوں علی الخصوص علما و مجتہدین نے کمال تم

واستقامت سے برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا ہے اور نام نہاد شاہ عراق امیر فیصل کو ناکون چنے چبوا دیے ہین ساتھ ہی یہ دریافت کرکے بہت صدمہ ہوا کہ جیسا اندیشہ تھا انگریزی قبضہ کی بدولت عراق کی مقدس زمین پر وہ تمام شیطنین مسلط ہو گئی ہین جو گویا تہذیب جدید کے لوازم مین داخل ہین اور جنھین قرآن کریم نے مسلمانون پر مطلقاً حرام کیا ہے۔ برطانوی مدبرین و وزرا از راہ تبختر کہا کرتے ہین کہ خدا نے دنیا مین تہذیب پھیلانے کی خدمت ان کے سپرد کی ہے لیکن معلمین تہذیب کے چند سالہ تصرف عراق نے اس ملک مین بداخلاقیون کی جو فراوانی کر دی ہے اُس کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج شخص یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ

اے خدا مجھے میرے دوستون سے بچا

یہ بالکل جُداگانہ امر ہے کہ آجکل خود حق و انصاف کے معنی و مفہوم مین ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا ہے اور جن باتون کو ہم مسلمان بداخلاقی سمجھتے ہین دانایان فرنگ کے لیے وہ روزمرہ کی معمولی باتین ہین جن پر حرف گیری کرنے والون کو وہ بڑی خوشی سے بیوقوفون اور جاہلون کی فہرست مین داخل کر دینے کے لیے تیار رہتے ہین۔

۱۸ راپریل کو جب مین بمبئی پہونچکر مسافر خانہ مین ٹھہرا تو میرے کمرہ مین حسن سکندر اور مکہ معظمہ کے ایک دوسرے مطوف کے بھتیجے سید احمد جفری پہلے سے ٹھہرے ہوے تھے۔ سامان رکھکر مین ٹکٹ لینے گیا وہان سے دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ تو اپنے بستر کے قریب ہی ایک اور صاحب کا سامان رکھا ہوا دیکھا اُس شخص کی صورت اور وضع اور اُسکے لباس اور مختصر ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ ۱۹۱۹ء مین مہاتما گاندھی کی تحریک ستیاگرہ کی شرکت کے بعد سے برابر خفیہ پولیس جو کہ میرے حرکات و سکنات کی نگران رہی تھی اس لیے خیال ہوا کہ اس سفر مین بھی میری معیت کے لیے ایک فرشتہ معین کیا گیا ہے اور اگرچہ اس بات کا بجاے خود مجھکو اطمینان کامل تھا کہ مین کوئی مجرمانہ ارادہ نہین رکھتا تاہم کوئی وجہ نہ تھی کہ مین ایسے شخص کے مقابلہ مین کسی قدر احتیاط نہ برتتا چنانچہ بمبئی کے قیام مین جب کبھی رحمت شاہ نے مجھ سے گفتگو کرنا چاہی یا ضروری سامان کی خریداری مین شرکت کا خیال ظاہر کیا تو مین نے ہمیشہ ٹالدیا اور حتی الامکان اس کی موجودگی مین اپنے دوسرے ساتھیون سے بھی زیادہ بات چیت نہ کی۔

۲۰ راپریل کو خبر ملی کہ دوسرے روز دوپہر کے بعد جہاز پر سب مسافرون کو سامان پہونچانا ہوگا

اس سے پیشتر جتنی دفعہ بحری سفر کا موقع ملا کبھی ایسا نہیں ہوا تھا اس لیے پہلے کسی قدر تذبذ
مگر جب معتبر ذرایع سے اُس کی تصدیق ہو گئی اور اسکی ضرورت بھی سمجھ مین آگئی تو دوسرے رو
سامان باندھنے لگا۔ چونکہ حسن سکندر رحمت شاہ کے بھی معلم قرار پا گئے تھے اس لیے اُنھون
اور ان کے سامان کے لیے ایک ہی بیل گاڑی والے سے طے کیا۔ جب سامان بالائی منزل
آیا اور مین اپنے صندوق کو رسیون سے باندھنے لگا تو رحمت شاہ ازراہ ہمدردی اس محنت
مین میرے معین بن گئے اسکے بعد حسن سکندر ہی کے مشورہ کی بنا پر رحمت شاہ تو بندی ویل
پر سامان کے ہمراہ آئے اور مین اُن کے ساتھ ٹریم کار مین بیٹھکر گودی (ڈاک یارڈ) پہونچا۔ گو
جہاز کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو اسٹیشن کا مال گودام ریل سے تعلق رکھتا ہے۔ گودی کی وسیع
کے سامنے سمندر کی طرف جو چبوترہ تھا ہمارا جہاز اُس سے چند گز کے فاصلہ پر لنگر انداز تھا اور
بیچ دونون حصون مین زینے لگے ہوئے تھے جن سے مسافر جہاز پر جا سکتے تھے، چاہیے یہ تھا کہ
حجاج آتے جاتے اپنا سامان جہاز پر پہونچاتے جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ پہلے تو جملہ حجا
کھلے چبوترہ پر جمع ہو کر اپریل کی تیز دھوپ مین تقریباً دو گھنٹہ کامل تک سکھلائے گئے اسکے بعد
مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج تشریف لائے تو ایک ڈاکٹر صاحب بغرض معائنہ طلب
پھر جب مولوی صاحب موصوف نے کمپنی کے کارکن سے دریافت کیا کہ حجاج کو ٹھہرانے کے لیے گود
مین کھلوا دی جاتی تو اُن کو دھوپ کی تپش سے نجات ملتی۔ تو معلوم ہوا کہ اتوار کا دن ہونیکی وجہ سے
نہیں کھولی گئی اور خود کمپنی والون نے محض اس اعتماد پر کہ جب حجاج سامان پہنچانے جاتے ہیں
کھلی رہتی ہے۔ کوئی خاص تحریک نہ کی۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا لیکن آئندہ کے لیے مجھے امید ہے
کے کارکن ایسی غفلت نہ کرین گے۔ کچھ توقف کے بعد ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور ا
نے کسی کا معائنہ نہیں کیا لیکن اُن کا آنا حاجیون کے لیے موجب نجات ہو گیا اس لیے کہ فو
جہاز پر جانے کی اجازت مل گئی۔ اجازت پاتے ہی دفعتاً تمام حاجی دوڑ پڑے اور ہر شخص کو شش
کہ سب سے پہلے وہی جہاز پر پہونچکر اپنے لیے بہترین جگہ انتخاب کرے اور اس غرض سے کہ انتخاب
اُس جگہ پر فوراً قبضہ بھی ہو جائے لوگ اپنے ہاتھون مین چٹائیان، کمبل، دریان اور طرح طرح کے
لیے ہوئے تھے۔ بعض لوگ جو اپنا سامان کسی معتبر شخص کے پاس نہیں چھوڑ سکتے تھے پورا سامان

چڑھ رہے تھے غرضکہ اس وقت کا یہ ہنگامہ اچھا خاصہ تماشہ بن گیا تھا۔

میں اس وقت تک نیچے ہی کھڑا رہا جبتک زینہ پر چڑھنے والوں کا ریلا رہا جب بھیڑ چھٹ گئی تو میں بھی چٹائیاں لیکر اوپر پہونچا۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب نے اپنے ایک ماتحت کو اس ہدایت کے ساتھ میرے ہمراہ بھیجدیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کردیں مگر جو جگہ اُنھوں نے تجویز کی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں نے خود اپنی رائے سے ڈیک کے بالائی حصہ پر ایک جگہ منتخب کی۔ اور وہیں اپنی چٹائی بچھادی۔ تھوڑی دیر بعد جب سامان اوپر آیا تو رحمت شاہ نے بھی میرے پاس ہی اپنی چٹائی بچھالی۔ یہ امر اگرچہ میری مصلحت کے خلاف تھا لیکن پے در پے اتفاقات نے رحمت شاہ کو میرا ساتھی بنادیا اس لیے مجھے چار و ناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جہاز پر سامان کی حفاظت کا انتظام بمبئی کی پولیس کے سپرد تھا جو ان معاملات میں محافظ حجاج صاحب کے تحت میں کام کرتی ہے اور جب سب حجاج کا سامان پہونچگیا تو حجاج اپنے اپنے جائے قیام پر واپس آگئے۔

دوسرے دن معائنہ طبی کا مرحلہ تھا جسکے لیے سویرے ہی سے حجاج روانہ ہونا شروع ہوے۔ میں رات کو ایک دوست کے یہاں مدعو تھا اور کھانے کے بعد دیر تک اُن سے بات چیت کرتا رہا۔ جسکی وجہ سے صبح کو سویرے نہ اُٹھ سکا۔ کچھ تو دیر میں اُٹھنے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ مجھکو پھلوں کی خریداری کرنا باقی تھی میں سب سے آخر میں روانہ ہوا۔ پھر بھی جب میں بھپارے کی جگہ پہونچا تو معائنہ طبی ختم نہ ہوا تھا۔ پہلے جب ہندوستان میں طاعون کسی قدر اجنبی تھا تو عموماً معائنہ طبی کے موقع پر حجاج کے کپڑوں کو بھپارہ بھی دیا جاتا تھا مگر اب کہ یہ مرض مثل بخار اور دوسرے ہندوستان کے عام امراض کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے۔ بھپارہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بھپارہ کا مکان ایک گودام کے مانند بنایا گیا ہے۔ مگر اس کی ساخت میں چونکہ اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اندر بند کیے جانے والے ذی روح مال کو باہر کی کافی ہوا پہونچتی رہے۔ اس لیے باہر سے کھڑے ہوکر اندر کی کارروائیوں کا تماشا دیکھنا آسانی سے ممکن ہے چنانچہ پیش آنے والے معائنہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے میں نے بھی کچھ دیر تک اس تماشہ کی سیر کی اور جب حجاج کی آخری جمعیت اندر جانے لگی تو میں بھی اُسی گودام میں داخل ہوگیا۔ اس مقام پر حجاج کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا جاتا ہے جو گنتی کے وقت عموماً جیلخانوں کی بارکوں میں ہوتا ہے۔ پہلے تو جملہ حجاج کو ایک قطار میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر

کہا گیا کہ سب لوگ اپنے اپنے پیٹ کھولکر کھڑے ہوں۔ اسکے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اُنھون نے ہر شخص کی جانگہ ٹٹول کر دیکھی کہ کسی کے گلٹی تو نہیں ہے۔ پھر حکم ملا کہ سب لوگ اپنے ٹکٹ اپنے سینون پر کھولکر رکھیں۔ اور ایک شخص نے آکر ان ٹکٹون اور حجاج کے ہاتھوں پر مہرین لگائیں جسکے بعد گنتی شروع ہوئی۔ اور متعدد آدمیون نے کئی کئی دفعہ شمار کیا۔ شمار ختم ہونے کے بعد ہدایت ہوئی کہ سیدھے جہاز پر چلے جاؤ۔ اُسی گودام کے ایک گوشہ مین عورتون کے لیے ایک بند کمرہ ہے جسمین ایک لیڈی ڈاکٹر صاحب معائنہ کرتی ہین اور مجھے اپنی ایک عزیزہ سے معلوم ہوا کہ اُنھون نے اُن کو دھمکی دیکر کچھ رقم بطور زرِ زنانہ وصول کر لی۔

مین نے بعض لوگون کو لکھدیا تھا کہ بمبئی کے قیام مین اگر وہ کوئی خط وغیرہ میرے نام بھیجنا چاہین تو جنرل پوسٹ آفس بمبئی کے پتہ پر بھیجین۔ مگر سامان کی فراہمی اور لوگون سے ملاقات مین ایسا منہمک رہا کہ چار پانچ دن مین ایک دفعہ بھی ڈاک خانہ تک نہ جا سکا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاز کی روانگی مین کسی قدر دیر ہے معائنہ طبی سے فارغ ہوتے ہی مین ٹرام کار پر بیٹھکر ڈاک خانہ گیا اور وہان سے تقریباً نصف گھنٹہ کے اندر اندر واپس آکر جہاز پر سوار ہوا۔

دوسری منزل

جہاز پر دس بجے تک کل حجاج جن کی تعداد تقریباً پانچسو تھی سوار ہو چکے تھے لیکن بندرگاہ
کنارے پر پانی اتنا نہ تھا کہ جہاز روانہ ہو سکتا۔ دو ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب جوار بھاٹا آیا اور پانی
تو ایک بجے جہاز روانہ ہوا۔ اور جب تک بندرگاہ کا ارکانی جو جہاز کی رہنمائی کر رہا تھا جہاز کو بندرگاہ
کے باہر پہونچا کر اتر نہیں گیا جہاز کی رفتار سست رہی اور اکثر حجاج صحن جہاز پر سے بمبئی کی عمارتوں
اور بندرگاہ کے جہازوں کو دیکھتے رہے۔ ہم نے اپنے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ صحن کے پچھلے حصہ
میں اُس مقام پر تھی جہاں سامان اُٹھانے کے کرین [illegible] یا آلات جر ثقیل لگے ہوتے ہیں
چونکہ یہ حصہ بالکل کھلا ہوا تھا اور روانگی کے بعد فوراً ہی پردے بھی نہیں ڈالے گئے، اس لیے سوا
ہونے کے وقت سے عصر کے بعد تک آفتاب کی تپش رہی اور اُس مقام پر دوسرے بیٹھنے والوں
کے لیے حد درجہ صبر آزما تھی۔ یہ مختصر جگہ قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی یعنی وسط میں دونوں
جانب کے کرین تقریباً سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر آویزاں تھے۔ ایک جانب میرا اور رحمت شاہ کا
بستر تھا اور دوسری جانب لاہور کے ایک ٹھیکہ دار صاحب معہ اپنی اہلیہ صاحبزادی اور ایک کمسن
بھتیجے کے مقیم تھے یہ کل رقبہ چاروں طرف سے محاط تھا۔ ایک سمت میں کرین کو حرکت دینے اور
کرین کے رسوں کو لپیٹنے والی کلیں اس طریقہ سے لگی ہوئی تھیں کہ اُن کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گز
مربع آہنی حوض چھوٹا ہوا تھا اور ان کلوں کے نیچے کے تختے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک
مسلسل چلے گئے تھے جہاں جہاں کھلے ہوئے تھے ہمارے لیے سامان رکھنے کی جگہ فراہم کرتے تھے
دوسری سمت میں وہ آہنی پشتہ تھا جس پر کرین رکھے ہوئے تھے ان پشتوں کے نیچے کی جگہ
خالی تھی اس لیے ہمیں اپنا پانی اور سامان خوردنی رکھنے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی اس
پشتہ کے عقب میں لکڑی کی ایک بڑی جعفری بنی ہوئی تھی جس میں بھیڑیں بند تھیں تیسری سمت
میں ایک طویل نل لگا ہوا تھا جس کے اندر وہ زنجیر تھی جو جہاز چلانے والے عقبی پنکھوں کو مسلسل حرکت

ین دکھتی ہے اور چوتھی سمت کی حد بندی بھی اسی قسم کی زنجیر سے تھی۔ بس فرق اس قدر تھا کہ
جس جانب کو میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اُدھر اُس نل سے کے اوپر ایک فٹ چوڑا آہنی پٹرا
لگا ہوا تھا جسکے وسط میں ہم لوگوں نے اپنے صندوق اور بورے ایسے طور پر رکھدیے تھے کہ دونوں
نل سے آمد و رفت سکے لیے دروازوں کے مانند کھلے رہتے۔ اور دوسری جانب جدھر ہمارے لاہوری
ساتھی تھے زنجیر کے اوپر کوئی پٹرا نہ تھا جب تک صحن میں دھوپ رہی (طوطق (طبقۂ اندرونی) کے
حجاج اپنی اپنی جگہ پر رہے یا جس رُخ دھوپ نہ تھی وہاں اپنے لپٹے چولھے جلا کر کھانا پکاتے رہے مگر
جیسے جیسے دھوپ کم ہوتی گئی لوگ نیچے سے اوپر آتے گئے تا آنکہ شام تک صحن کے کسی کونے میں آمد و رفت
کا راستہ چھوڑ کر حصہ بھر جگہ نہ باقی رہی جہاں کسی نے بستر نہ لگا لیا ہو۔ ہم لوگ چونکہ ایک محاط جگہ
میں تھے جہاں ہماری چٹائیوں کے بچھ جانے کے بعد صرف ذرا سی جگہ آمد و رفت کے لیے بچی تھی
اس لیے ہمارے یہاں کسی نے داخلت پسند نہ کی اور ہم جتنی مدت جہاز پر رہے اس حیثیت سے نہایت
امن میں رہے۔ دن بھر تمازت آفتاب سے جو تکلیف اُٹھائی تھی شام ہوتے ہی نہایت ٹھنڈی ہوا
نے اس کی تلافی کر دی اور رات بڑے آرام سے بسر ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو پہلے صحن دُھویا گیا۔
اسکے بعد پردے باندھ دیے گئے تو پھر دھوپ کی کوئی شکایت باقی نہ رہی صحن جہاز ہر روز دھویا
جاتا ہی اور اُس وقت عموماً مسافروں کو تھوڑی سی دقت ہوتی ہی۔ بعض لوگوں کا سامان ذرا سی غفلت
میں بھیگ جاتا ہی۔ میرے قریب دو جانب چونکہ سطح صحن سے تقریباً ۹ انچ بلند پٹرے تھے
اس لیے کل سامان بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا اور سوائے بچھونے اور متفرق چھوٹی چھوٹی اشیا
کے کسی چیز کو اُٹھانے کی حاجت نہوتی تھی، دو منٹ کے اندر بچھونے لپیٹ کر پن چلانے والی
کل کے اوپر رکھدیے جاتے تھے اور متفرق چیزیں اسی کی خالی جگہ میں۔ اور دُھلائی کے وقت
میں خود کبھی تو اونچے پٹرے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی جہاز کے دوسرے کسی حصہ کی گشت لگانے
چلا جاتا۔ سید احمد جعفری نے جو مسافرخانہ میں میرے ساتھ تھے اور اسی جہاز پر کہ معظمہ جا رہے
تھے اپنے مقام پر گنجایش کم دیکھکر اپنی کریچ کی آرام کرسیاں میرے یہاں لاکر رکھدی تھیں جنمیں سے
ایک تو وہ دوسرے دن لے گئے اور دوسری پر اُن سے اجازت لیکر ہم لوگ بیٹھتے رہے۔ ان ذریعہ
سے مجھکو اور بھی راحت ملی۔

حجاج کے ٹکٹ بالعموم بغیر خوراک کے ہوتے ہین اور اُنھین کھانا پکانے کے لیے جہاز پر جگہ بھی دی جاتی ہی۔ اور لکڑی بھی ملتی ہی۔ ہمایون چھوٹا سا جہاز ہوا، اس سبب سے اس کے باورچی خانے بھی چھوٹے ہین لیکن اسی نقص کو رفع کرنے کے لیے صحن کے مختلف حصّون مین کنارے کے رُخ پر تین چار انچہ کے بلند چبوترے بنادیے گئے ہین جہان لوہے کی انگیٹھیان رکھکر کھانا پکا لیا جاتا ہی پہلے روز تو لوگ عموماً بمبئی سے روٹیان اور دیگر سامان خوردنی ساتھ لاے تھے گر دوسرے روز سے ہر طرف چولھے جلنا شروع ہوے اور صبح سے لیکر شام تک باری باری سے لوگ کھانا پکایا کرتے تھے۔ میری جگہ باورچی خانہ کے عین مقابل تھی اور اگر برابر اسی مین کھانا پکتا رہتا تو دھوئین سے کافی تکلیف ہوتی۔ گر اول تو وہان گنجائش کم تھی دوسرے دُھوئین سے خود پکانے والون کا دم گھٹتا تھا اس بنا پر باورچی خانہ کے اندر پکانے کے بجاے لوگ زیادہ تر باہر کی چبوترون پر پکانا پسند کرتے تھے اور ایک دو دن کے بعد تو باورچی خانہ بالکل ہی خالی رہنے لگا۔

مین گھر سے تنہا چلا تھا اور بمبئی سے اگرچہ رحمت شاہ کا ساتھ ہوگیا تھا گر مین نے اُن کے ساتھ کھانے پکانے کا انتظام گوارا نہ کیا۔ اِسکے علاوہ چلتے وقت اعزا نے اس قدر ناشتہ ساتھ کردیا تھا کہ اسکے اوپر معقول رقم محصول ریل کی مد مین مجھے صرف کرنا پڑی جسکے بعد سواے اسکے کوئی صورت نہ رہی کہ مین اس رقم کی وصولی اور اس ناشتہ کے انبار کو ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز پر تازہ کھانے کے انتظام سے قطع نظر کرون چنانچہ جتنے دنون مین جہاز پر رہا یہ ناشتہ ہی کھاتا رہا۔ اور اُسکی مقدار اتنی تھی کہ اسکے بعد بھی ایک معقول حصہ بچ گیا جو واپسی تک کام آتا رہا بلکہ بعض چیزین ساتھ واپس آئین۔

جہاز پر مسافرون کو کھانے کی فکر کے سوا کوئی شغل نہین ہی۔ عام جہازون پر لوگ عموماً اپنا وقت گذارنے کے لیے تاش وغیرہ کھیلا کرتے ہین۔ گر حجاج کی جماعت مین اس کا رواج عام طور پر نہ تھا۔ جو لوگ خواندہ تھے وہ عموماً فرصت کے اوقات کتب بینی مین صرف کرتے تھے۔ ورنہ باہم بات چیت کرکے یا لیٹے لیٹے وقت گذرتا تھا۔ کچھ عابد و زاہد لوگ بھی تھے جو زیادہ تر تسبیح و مصلیٰ سے کام رکھتے تھے پانچون وقت اذانین ہوتی تھین۔ اور متعدد چھوٹی بڑی جماعتون مین لوگ نمازین پڑھتے تھے۔

پینے اور کھانا پکانے کے لیے میٹھا پانی دن مین ایک بار ملا کرتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا اپنا

برتن لیکر پانی بھروانے جانا پڑتا تھا۔ اور لکڑی بھی کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے دن ملتی تھی جسکے لیے بھی لوگوں کو جد و جہد کرنا پڑتی تھی۔ پانی اور لکڑی حاصل کرنے کے وقت اچھا خاصا ہنگامہ ہوجاتا تھا کیونکہ ہر شخص چاہتا کہ پہلے وہی حاصل کرلے۔ دینے والا ایک اور لینے والے بہت سے اور وہ بھی بے صبر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض اوقات جہاز کا منشی جو پانی اور لکڑی تقسیم کرتا تھا گھبرا کر بھاگ جاتا۔ اور تقسیم رُک جانے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی۔

مجھے کھانا پکانے کی تو کوئی فکر نہ تھی۔ اور پاتی بھی بمبئی سے اتنا لے لیا تھا کہ کئی دن تک چلتا رہا۔ لیکن میرے ساتھی رحمت شاہ کو کھانا پکانے کی وجہ سے دونوں چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی لہٰذا پانی اور لکڑی کے جو ٹکٹ ہر مسافر کو دیے گئے تھے وہ میں نے رحمت شاہ کے حوالے کردیے اور جب انھیں ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اور میرے ٹکٹ دکھا کر لکڑی اور پانی لاتے رہتے۔ میں چائے کا عرصہ سے عادی ہوں اور جہاز پر تو ہر شخص کے لیے چائے کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے لیے میں نے شروع ہی جہاز کے بھنڈاری سے انتظام کرلیا تھا اور وہ جس وقت ضرورت ہوتی کیتلی بھر پانی گرم کردیتا تھا بھنڈار خانہ چونکہ جہاز کی پچھلی چھت کے بالائی حصہ پر تھا اس لیے مجھ کو چائے کا پانی گرم کرانے کے لیے دن میں کئی بار وہاں جانا پڑتا تھا مگر دو ہی تین دن کے بعد سے رحمت شاہ نے مجھے اس سے بے نیاز کردیا۔ اب میرے پاس سوائے اس کے کوئی کام نہ تھا کہ دن بھر نوشت و خواند میں مصروف رہوں یا جہاز کے ملاقاتیوں سے بات چیت کرتا رہوں۔

جہاز پر جتنے حجاج بمبئی سے سوار ہوئے تھے اُن میں بڑی تعداد تو بنگالیوں کی تھی اور باقی مختلف صوبجات کے لوگ تھے۔ مگر اُن میں یہ دیکھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نہایت قلت تھی۔ انگریزی داں طبقہ کا نمائندہ تو میرے سوا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں لیکن عربی فارسی جاننے والے بھی انگلیوں پر شمار ہوسکتے تھے۔ البتہ جاہل اور ناخواندہ لوگوں کی کثرت تھی۔ انگریزی خواں جماعت کے لیے جہاں مسجد کی حاضری اور پنجوقتہ نماز معاف ہے۔ وہیں معلوم ہوتا ہے کہ حج کا فریضہ بھی اُن کے ذمہ عائد نہیں کیا گیا۔ گویا قرآن شریف صرف جاہل مسلمانوں ہی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تعلیمیافتہ اور خصوصاً انگریزی خواں مسلمانوں کو اس کی حاجت ہی نہیں، اس بے نیازی کا کیا ٹھکانا۔ مذاق کے مطابق جہاں ملنے والے نہ میسّر آئیں وہاں خلاف مذاق لوگوں ہی میں انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اگرچہ میری نوشت و خواند کی مصروفیتیں کچھ کم نہ تھیں تاہم چند گھنٹے روزانہ نئے احباب کے نذر کرنا

پڑتے تھے۔ زحمت شاہ اب چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اس لیے مجھکو اُن کے بشرے اور حرکات وسکنات پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا اور جب میں نے خود اُن کے بیان کردہ حالات سنے اور ایک حد تک اُنکی تصدیق اُن کاغذات سے بھی ہو گئی جو اُن کے پاس موجود تھے اور جو میں نے ایک مناسب موقع پر اُن سے مانگ کر دیکھے تو میری بدگمانی جاتی رہی۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی غربت مزاج اور نیک نفسی کے باعث مجھکو اُن سے ایک طرح کا اُنس ہو گیا۔ اور اُس غریب نے حتی المقدور میری خدمت بھی کی۔

ہمارے پڑوسی نظام دین صاحب جو لاہور میں ٹھیکہ داری کا کام کرتے ہیں نیک دل اور خوش خلق آدمی تھے اور اُن کا کمسن بھتیجا غلام حسین اپنی بھولی باتوں اور بچپن کی شوخیوں سے ہم سب کا دل بہلایا کرتا تھا۔ اِن لوگوں کا تو خیر ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا۔ مگر اِن کے علاوہ اور بھی متعدد حجاج ہماری صحبت میں شریک ہوجایا کرتے تھے جنمیں ضلع پرتابگڈھ کے ایک صاحب سوار خاں سے خاص لطف ہو گیا تھا۔

۱۹ اپریل کو رات میں جہاز کراچی پہونچکر بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ صبح سویرے جہازی صفائی سے فارغ ہو کر خلاصیوں نے پردے کھول دیے اور کرمیں اوپر کو اٹھا دیے اور دن بھر گیہوں اور آٹے کے بورے جو کشتیوں پر لاد کر لائے گئے تھے۔ جہاز کے اندر دتی تہ خانے میں بھرے گئے اس سے اندر کے مسافروں کو بھی کسی قدر تکلیف ہوئی اور جو لوگ صحن میں فروکش تھے وہ تو دھوپ کی گرمی سے بلبلا اٹھے لیکن چونکہ کھانے پینے کی مختلف چیزیں بیچنے والے جہاز سے متصل بہت سی کشتیوں پر سوار تھے اور اُن میں سے بعض بعض آدمی جہاز کے اوپر بھی پہونچ گئے تھے اس لیے مسافروں کو ایک اچھا شغل ہاتھ آگیا تھا اور ہر شخص خریداری میں یا اُس کا تماشا دیکھنے میں مصروف نظر آتا تھا۔ شام تک سب سامان بھی لاد دیا گیا اور کشتیاں بھی مال بیچکر چلی گئیں۔ دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد جہاز گودی کے کنارے پہونچا دیا گیا اور کراچی کے مسافر سوار ہونے لگے۔ میں نے جلدی جلدی چند خطوط لکھے اور ایک صاحب کی معرفت پولیس سارجنٹ کے حوالے کیے جس نے یقین ہو کر ڈاک خانہ میں ڈالدیے ہوں گے۔ صحن کی چھت پر چونکہ اب تک پردے نہیں پڑے تھے اس لیے آج بھی کافی تکلیف رہی اگرچہ نئے حجاج کی دیکھ بھال سامان کی خریداری خطوط نویسی وغیرہ مشاغل کی وجہ سے کم محسوس ہوئی ظہر کے بعد جہاز روانہ ہوا اور عصر کے وقت تک کراچی کا کوئی پتہ نشان باقی نہ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح کو پردے پڑ گئے اور جب تک جہاز پر قیام رہا پھر اس زحمت کا سامنا نہیں ہوا۔

جہاز کراچی سے روانہ ہوا تو دوسرے دن میں نے الناظر کے لیے مضمون لکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے
جہاز کے ڈاکٹر صاحب اس وقت میرے پاس سے ہو کر گذرے اور مجھے مصروف تحریر دیکھ کر میری طرف
متوجہ ہو گئے۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں ایک ناچیز قومی خادم ہوں تو دیر تک مختلف معاملات قومی و
ملکی پر گفتگو کرتے رہے۔ اُس وقت سے وہ میرے حال پر خاص کرم فرمانے لگے اور روزانہ ملاقاتیں ہونے
لگیں۔ اُنھوں نے کراچی اور عدن میں انگریزی اخبارات خریدے اور مجھے بھی پڑھنے کو دیے۔ کراچی سے سندھ
پنجاب اور بلوچستان کے تقریباً ساڑھے چار سو حجاج سوار ہوئے اور اگرچہ ان میں بعض بڑے بڑے معزز
لوگ بھی تھے۔ مگر تعلیم یافتہ لوگوں کی ویسی ہی قلت تھی۔ صرف ایک صاحب انگریزی دان تھے جو
پنجاب کے رہنے والے تھے اور بلوچستان کی ریاست لسبیلہ میں ملازم تھے۔ ان صاحب سے ڈاکٹر
داکدے کے یہاں ملاقات ہوئی اور پھر ان کے ذریعہ سے اکثر بلوچی سرداروں سے نیاز حاصل ہوا۔
کراچی سے عدن تک چھ دن کا راستہ تھا۔ جہاز ہمایون چھوٹا تھا اس کی رفتار بھی کم تھی تیز جہاز
چوتھے یا پانچویں ہی دن پہونچ جاتے ہوں گے۔ مجھے اس اثنا میں اپنا مضمون بھی ختم کرنا تھا اور بہت سے
خطوط بھی لکھنا تھے اس وجہ سے میں روزانہ کئی گھنٹے لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ فرصت کے اوقات
میں کبھی دوسرے مسافر میرے یہاں آکر جمع ہو جاتے اور کبھی میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں یا مسٹر فضل الدین
کے یہاں چلا جاتا اور بلوچی سرداروں سے اُن کے حالات سنتا رہتا تھا۔

سندھ کی ریاست میرپور خاص کے سابق رئیس کے چھوٹے بیٹے بھی کراچی سے سوار ہوئے تھے
ان کو عدن پہونچنے سے قبل ایک تار بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ سید احمد جعفری نے چونکہ اُن سے وعدہ
لے لیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ پہونچکر ان کے چچا سید امین عاصم کو اپنا معلم بنائیں گے اس لیے سید احمد نے
ان کی خدمت گذاری یہیں سے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اور وہی میرے پاس آکر تار کا مسودہ لکھوا لیتے۔
جہاز پر مارکونی کمپنی کا وائرلس اپریٹس (بے تار کے تار بھیجنے والا آلہ) لگا رہتا ہے اور اسی کے ذریعہ یہ تار
بھیجنا مقصود تھا۔ چونکہ تار بابو انگریز تھا جو ہندوستانی زبان سے بہت تھوڑی واقفیت رکھتا تھا
اس لیے سید احمد صاحب کو ایک ترجمان کی حاجت ہوئی۔ اور وہ مجھے اس خدمت کے لیے پکڑ لے گئے
اسکے بعد جو کچھ اس انگریز سے گفتگو ہوئی تھی اُنھوں نے خواہش کی کہ میں خود چل کر پیر صاحب کو سمجھا دوں
میر بنی بخش صاحب ہندوستانی بھی سمجھتے تھے مگر فارسی میں گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ

تار کے متعلق ضروری بات چیت ختم ہو جانے کے بعد اُن سے دیگر امور پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ا
جب ان کو شاہ سے گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں تو پھر وہ واجد علی شاہ اور اُن کی
اولاد کے حالات اور لکھنؤ کی بعض عمارتوں خصوصاً قیصر باغ کے بارہ میں مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ لکھنؤ
کے ساتھ اُن کو اس قدر دلچسپی تھی کہ پھر جب کبھی اُن سے ملاقات ہوتی تو وہ لکھنؤ ہی کا تذکرہ چھیڑ دیتے
جیسے جیسے جہاز کراچی سے دور اور عدن سے قریب ہوتا جاتا تھا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ ۱۴ مئی
کو رات کے دس بجے جہاز بندرگاہ عدن میں لنگر انداز ہوا۔ تو دیر تک مسافر دور سے شہر کی روشنیوں کا
نظارہ کرتے رہے۔ صبح سویرے ہی کشتیوں پر سامان بیچنے والے آ گئے اور ہر شخص شغل خرید میں منہمک
ہو گیا۔ میں نے بھی کچھ پھل اور آلو خرید لیے۔ چونکہ رحمت شاہ سے اب ربط ہو گیا تھا اکثر کھانے میں بھی
شرکت ہونے لگی تھی اس لیے ترکاری پکوا لینا آسان تھا عدن میں مچھلی بہت خریدی گئی میاں
نظام دین اور رحمت شاہ دونوں نے مچھلی خریدی اور اپنے اپنے طور پر پکا کر مجھے بھی کھلائی۔ دس بجے
دن کو جہاز روانہ ہو کر دوسرے دن اُسی وقت جزیرۂ کامران کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہاں قرنطینہ ہر
اس لیے ایک رات کے لیے جہاز چھوڑنا پڑا۔ جملہ مسافر ضروری بچھونے اور کھانے کا سامان لئے ہوئے
کشتیوں پر سوار ہو کر جزیرہ کے ساحل پر اُتر گئے۔ ساحل سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر قرنطینہ کا
کیمپ ہے۔ نمازی کمپنی کا ایک جہاز اُسی وقت جاوا کے حجاج کو لیے ہوئے پہونچا تھا۔ پہلے ہماری
کے مسافر اُتارے گئے پھر دوسرے جہاز کی باری آئی۔ اور دونوں جہازوں کے مسافر جداگانہ کیمپوں
میں ٹھہرائے گئے۔ کیمپ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایک مکان میں بلائے گئے جہاں ہر شخص سے
کہا گیا کہ اپنے کپڑے اُتار کر وہ لنگی باندھے جو قرنطینہ ہی کی ملک تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لوگ
مکان کے اندر جاتے۔ کپڑے اُتارتے۔ لنگیاں باندھتے اور پھر ایک مقام پر لیجا کر اُن کا شمار ہوتا اسکے
بعد وہ ایک ایسے کمرہ میں بھیج دیے جاتے جہاں چھت میں فوارہ دار نل لگے ہوئے تھے اور تھوڑی دیر کے
لیے نل کھول دیے جاتے۔ بعض لوگ تو نلوں کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کر لیتے تھے بعض پر تھوڑا ہی سا
پانی پڑ جاتا تھا اور بعض جو اِدھر اُدھر کناروں سے لگ کر کھڑے ہوتے بالکل نہیں بھیگتے تھے۔ اُتارے
ہوئے کپڑے اور بستر ہر شخص سے لے لیے جاتے تھے اور ایک بڑے آہنی ظرف میں رکھکر انھیں بھپارہ
دیا جاتا تھا غسل خانہ سے نکل کر ہم لوگ اسی بھپارہ والے کمرے میں پہونچے جہاں ہمارے کپڑے اور بستر

ہمارے حوالے کیے گئے۔ عجلت میں بعض لوگوں کے کپڑے اور بچھونے گڈمڈ ہو گئے۔ چنانچہ میاں نظام مین کی ایک صدری اسی مین تلف ہو گئی۔ اشیاے خوردنی اور دیگر سامان جو ہم اُس کمرہ میں چھوڑ آئے تھے جہاں کپڑے اُتارے گئے تھے وہاں سے ملازمین قرنطینہ نے اٹھا کر باہر رکھ دیا اور جب ہم لوگ اپنے کپڑے پہن کر باہر آئے تو ہر شخص نے اپنی اپنی چیز پہچان کر اٹھالی۔ مگر بعض لوگوں کو شکایت رہی کہ کچھ چیزیں اُنھیں نہیں ملیں۔ مجھے یہاں ایک خاص واقعہ پیش آیا۔ میرے دونوں بازوؤں میں تعویذ کے طور پر سو سو روپیہ کے نوٹ بندھے ہوے تھے جس وقت میں نے کپڑے اُتارے تو دونوں تعویذ کھول کر ہینڈ بیگ میں رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد سردار خان صاحب نے اپنا روپیہ میرے سپرد کیا تو میں نے بیگ کھول کر اُس کو بھی رکھدیا۔ جب غسل خانہ کی طرف جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ عینک اور خلال تر ہو جائے گی۔ لہذا پھر بیگ کھولا اور یہ دونوں چیزیں بھی رکھدیں۔ اسکے بعد جب میں نہاکر اپنے کپڑے پہن کر اپنا سامان اُٹھا رہا تھا تو دفعتاً سردار خان صاحب ایک طرف سے آئے اور ایک تعویذ دکھا کر مجھسے پوچھنے لگے کہ کیا یہ آپکا ہے۔ میں نے دیکھا تو کہا ہاں یہ میرا ہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کھدر دیکھ کر خیال کیا کہ آپ ہی کا ہوگا۔ اُسمین پانچ سو روپیہ کے نوٹ تھے۔ خدا معلوم یہ کس وقت میرے بیگ سے نکل کر سردار خان صاحب کے کپڑوں میں جا گرا۔ اللہ تعالی نے بڑا فضل کیا ورنہ غربت میں اتنی بڑی رقم ضایع ہو جائے گی اور یہ میرے لیے کافی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ غسل سے فارغ ہو کر سب لوگ کیمپ میں پہونچ گئے۔

کیمپ کے چاروں طرف بلند جالی دار کٹھرا لگا ہوا ہے۔ اور وسط میں فوجی بارکوں کی طرح چھپرا دار ٹینوں کی متعدد بارکین بنی ہوئی ہین۔ جن کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑا گیا ہے اور اُن کے دونوں جانب ڈھکے ہوے برآمدے بنائے گئے ہین۔ اِن بارکوں مین تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑی بڑی کھڑکیاں ہین جنمین دروازے نہیں لگائے گئے تاکہ ہوا کی کسی وقت روک نہ ہو سکے۔ بارکوں کے درمیان جو راستے بنائے گئے ہین ان کے وسط مین جہاں چوراہے ہین گیس کی تبیاں لگی ہوئی ہین۔ جن سے میدان اور قریب کی بارکوں کے برآمدوں مین روشنی رہتی ہے۔ اور بارکوں کے اندر لالٹینین روشن کی جاتی ہین۔ احاطہ کے دو جانب آہنی جالی سے متصل پختہ پاخانے غسل خانے اور وضو خانہ بنا ہوا ہے جسمین پانی کے نل لگے ہوے ہین۔ مغربی سمت مین ایک وسیع بارک نماز کے لیے بنی ہوئی ہے جسمین چٹائیاں بھی بچھی ہین بارک

مین کسی قسم کا فرش نہین ہو۔ جنوبی جالی کے قریب ایک پختہ بارک کسی قدر بلند کرسی کی بنی ہوئی ہو جسمین
اول درجہ کے مسافر ٹھہرائے جاتے ہین۔ اور اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک کمرہ مین مٹھائی کا ذخیرہ ہو۔
جالی کے جنوبی مشرقی کونہ پر لکڑی کا ذخیرہ رکھا گیا ہو۔ اِن دونون کے درمیان مختصر سا بازار ہو۔ جہان ضروری
اشیاے خوردنی فروخت ہوتی ہین۔ دوکانون کے باہر ایک تختی پر چیزون کا مقررہ نرخ لکھا ہوا ہے۔
روٹی۔ پراٹھے۔ چائے۔ شربت۔ لمنیڈ۔ برف۔ بکٹ۔ شکر۔ سگریٹ۔ تمباکو۔ دیاسلائی وغیرہ مناسب قیمتون پر فروخت
ہوتی ہین۔ بکری۔ مرغیان۔ مچھلی اور انڈے بھی ملتے ہین اور اِن چیزون کی قیمتین عموماً کم ہین۔

سہ پہر کو ظہر کے وقت ہم لوگ کیمپ مین داخل ہوے۔ اگرچہ آفتاب کی تپش ناقابل برداشت تھی
لیکن سمندر کی تازی ہوا کے باعث گرمی کی تکلیف بہت کم محسوس ہوئی۔ اور رات کے وقت اس سہانی فضا
مین سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے جو لطف دیا اُس سے تو ہر شخص نہایت ہی شادان و فرحان تھا
میرے کرمفرما سردار خان صاحب تو جہاز کی قید اور گرمی سے اِس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اگر اُن کو عمر بھر
تک اِس قرنطینہ مین رہنے کا موقع دیا جاتا تو وہ اُسے بہت خوشی سے منظور کر لیتے۔ اگرچہ فی الجملہ یہان بھی
یہ قید لگی ہوئی تھی کہ تارون کی چار دیواری کے باہر کوئی حاجی نہین جا سکتا تھا حتی کہ دوسرے جہاز کے
حجاج سے بھی ملاقات نہین ہو سکتی مگر یہ مقام ایسا صاف اور ستھرا اور ہوادار تھا کہ ہر شخص نے اُس کو
پسند کیا۔ یہ قرنطینہ ترکی عہد کی یادگار ہو اور جنگ کے زمانہ سے انگریزی قبضہ مین آ گیا ہو۔ قرنطینہ کی
بارکون سے کچھ فاصلہ پر انگریزون کی مختصر فوج کا پڑاؤ ہو۔ اور اُسکے آگے تقریباً ایک میل پر عربون کی بستی
ہو جسکا انتظام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ سے متعلق ہو۔ یہ صاحب شام کو ہمارے کیمپ مین بھی تشریف
لائے اور اتفاق سے مجھے مل گئے تو دیر تک قرنطینہ کے انتظامات اور دیگر امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ صبح سویرے
ہی سے لوگون نے جہاز پر واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دیر مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹری معائنہ
ہوگا چنانچہ مختلف بارکون کے لوگ بارکون سے باہر میدان مین جمع کر کے قطار در قطار بٹھائے گئے اور
جب تک کل حجاج کا معائنہ نہو لیا کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پایا۔ گنتی اور معائنہ ختم ہوتے ہی سب
لوگ اپنا اپنا سامان لیکر کنارہ کی طرف روانہ ہوے۔ اور وہان جو بڑی بڑی کشتیان کھڑی ہوئی تھین
اُن پر سوار ہو کر تقریباً دس بجے تک جہاز پر واپس پہونچ گئے۔ کامران جانے کے لیے جہاز سے جس وقت
حجاج کشتیون پر سوار ہوے تھے تو جہاز کے کرانی (کلرک) صاحب نے زینہ کے اوپر کھڑے ہو کر کل حاجیون
سے ٹکٹ لیے تھے اور اُس وقت پہلی دفعہ جہاز والون کو معلوم ہوا کہ ۹ آدمی بے ٹکٹ کے سفر کر رہے ہین۔ یہ

سب مدراس کے رہنے والے نوجوان تھے جنھوں نے خدا معلوم کیسے بمبئی میں روانگی سے قبل جہاز کے اندر اپنے تئیں چھپا دیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جہاز کے ملازمین میں سے کسی کی شرکت سے یہ کارروائی کی گئی۔ بہرحال جب حال کھلا تو جہاز کے عمال چکرائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی غفلت کو طشت از بام کرنا اُنھیں منظور نہ تھا اس لیے انھوں نے ان لوگوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ جہاز پر بہت سے ایسے مسافر تھے جو اپنی غربت و مسکینی کا اظہار کر کے دوسرے حجاج سے کھانا اور خیرات حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی اُنھیں میں شریک رہتے تھے اور کسی کو گمان بھی نہ ہوا کہ یہ بغیر ٹکٹ سوار ہوئے ہیں۔ حج کا فریضہ صرف انھیں لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو خدا نے اتنی استطاعت دی ہو کہ وہ ضروری مصارف برداشت کر سکیں۔ لیکن ہندوستان سے ہر سال کثیر تعداد میں ایسے لوگ بھی حج کے لیے ضرور جاتے ہیں جن کے پاس صرف جہاز کا کرایہ ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو تو بمبئی اور کراچی کے صاحبان خیر ٹکٹ لا دیتے ہیں اگر وہ اُن ذلتوں اور حقارتوں کا احساس کر سکتے جو ان مساکین کی بدولت دنیا بھر کے مسلمان حجاج کی نظروں میں عموماً اور ارض حجاز کے باشندوں کی نگاہوں میں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی ہوتی ہے اور ان دشواریوں کا اندازہ کر سکتے جو اُن کی واپسی کے انتظام میں درپیش آتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب اس تھوڑے سے ثواب کو حاصل کرنا ضروری نہ خیال فرماتے اور محض جانے کا ٹکٹ دلا کر اپنی ذمہ داری کو ختم نہ ہو جانے دیتے۔

میں ان مفلس و نادار لوگوں کو الزام نہیں دے سکتا جو فرض نہ ہونے کے باوجود اپنے مذہبی جوش اور مخلصانہ شوق سے مجبور ہو کر سفر حجاز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقتاً ان کی مذہبی دلدادگی نہایت درجہ قابل قدر ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس سفر کو ایک قسم کی تجارت بنا لیا ہے اور جن کی تعداد کچھ کم نہیں ہوتی وہ یقیناً حد درجہ قابل ملامت ہیں۔ تاجران بمبئی و کراچی اور دوسرے مقامات کے جو صاحب جبر لوگوں کو حج کرانے کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں اُنھیں چاہیے کہ آمد و رفت کے کرایے اور زاد راہ و دیگر مصارف ضروریہ کی کفالت اپنے ذمہ لیں تاکہ ان غریبوں کو بھی ارض مقدسہ میں جا کر ہر قسم کی مصیبتوں سے نجات ملے اور ہم مسلمانان ہند بھی تحقیر و رسوائی سے محفوظ رہیں۔ میں اس مسئلہ پر اخبار میں علیحدہ لکھوں گا مگر یہاں بھی یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بارہ میں سب سے زیادہ علمائے مذہب کو توجہ کرنا چاہیے۔

۲۰ مئی کو جب جہاز کامران سے روانہ ہوا تو اکثر حجاج نے احرام باندھنا شروع کر دیے۔ ہم لوگوں نے

اس وقت تک انتظار کرنا مناسب سمجھا جب تک یلملم کی پہاڑی نہ آجائے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز اور دیگر مستند علمائے ہندوستان کی ہدایات کا یہی منشا ہو جہاز کے کپتان سے جا کر دریافت کر لیا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ ۲ مئی کو شام کے ۴ بجے یلملم کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں گی اور اسی وقت جہاز سیٹی دیگا۔ اسکی اطلاع اپنے ساتھیوں اور دوسرے ملاقاتیوں کو کر دی تھی اور وہ سب لوگ ظہر کے بعد سے سیٹی کے لیے ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے مگر جب عصر کا وقت تنگ ہونے لگا اور سیٹی نہ بجی تو انتظار سے تنگ آکر پھر کپتان کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے مخالف باد تُند جو چل رہی ہے اسکے بدولت جہاز کی رفتار کم ہو گئی ہے اور اب نصف شب میں یلملم پہونچنے کی سیٹی دی جائیگی چنانچہ سب لوگوں نے اطمینان سے مغرب کے بعد غسل سے فراغت حاصل کی۔ اور کپڑے اُتار کر احرام کی لنگیاں باندھ لیں۔ صرف سُنّت الاحرام پڑھ کر نیت کر لینا باقی رہ گیا چنانچہ ٹھیک گیارہ بجکے پچاس منٹ پر جہاز نے ایک طولانی سیٹی بجائی اور ہم لوگوں نے سوتے سے اٹھکر جلدی جلدی وضو کیا اور دو رکعت سنّت ادا کرکے احرام کی نیت کر لی۔

ایک دن قبل سے جو ہوائے تُند چل رہی تھی وہ شام ہوتے ہوتے بہت تیز ہو گئی تھی اور جہاز کو بہت حرکت دے رہی تھی۔ رات کو تو اس کا اثر چنداں نہیں محسوس ہوا مگر ۳ مئی کی صبح کو جہاز کی جنبش زیادہ ہو گئی تو ہر طرف لوگ متاثر ہونے لگے۔ جس کو دیکھو دوران سر میں مبتلا اور بیٹھے اچھے خاصے بیمار کی صورت بنا لیتا ہے۔ بعض لوگوں کو متلی اور قے بھی ہو رہی تھی حتیٰ کہ اکثر جہاز کے ملازمین بھی جو عموماً بحری سفر کے عادی ہوتے ہیں پریشان نظر آتے تھے۔ چونکہ آج جہاز جدہ پہونچنے والا تھا اس لیے میں نے صبح ہی کو اٹھکر سامان درست کر لیا تھا صرف بستر نہیں باندھا تھا۔ یہ دن ایسا تھا کہ منزل پر پہونچنے کی خوشی میں سارے جہاز پر چہل پہل ہونا چاہیے تھی مگر جہاز کی جنبش کے باعث سب لوگ پڑ گئے تھے اس وجہ سے چہل پہل کی جگہ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میری طبیعت بفضلہ اچھی رہی گو سر کسی قدر بھاری معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال خدا خدا کرکے دوپہر کو ۱۲ بجے جہاز بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوا تو لوگوں کے دم میں دم آئے۔ نازری کمپنی بمبئی کا وہ جہاز جس پر حاجی حجاج سوار تھے اور جو کامران سے ہمارے جہاز کے بعد روانہ ہوا تھا ہم لوگوں سے پیشتر بندرگاہ میں پہونچ گیا تھا اسلئے پہلے اُسی کے مسافر اُتار کر قرنطینہ پہونچائے گئے۔ توقع تھی کہ شام تک ہم لوگ بھی جہاز سے اتر جائینگے

مگر معلوم ہوا کہ جدہ مین کشتیان زائد نہین ہین اس لیے صرف ایک جہاز کے مسافر اتارے جائینگے اور ہمین ایک شب اور جہاز پر رہنا ہوگا۔ جن لوگون کی طبیعتین جہاز کی جنبش سے زیادہ خراب ہوئی تھی اُنھین تو خواہش سکون مین یہ تعطل چندان گران نہین گذرا لیکن مجھے کافی افسوس ہوا۔ بہرحال رضینا بالقضا کہکر رات کو سو رہے۔ ابھی صبح نہوئی تھی کہ کسی نے بیدار کر دیا۔ آنکھ کھولکر دیکھا تو ایک شخص سر پر مسلط تھا۔ مین نے سفر بحری کے اثنا مین عربی کے ضروری اور کارآمد جملے یاد کر لیے تھے مگر ان کے استعمال کا ابتک کوئی موقع نہین ملا تھا اِس لیے مجھے قدرتاً اس شخص سے گفتگو کرنے مین قدرے دقت محسوس ہوئی۔ بہرحال وہ میری ٹوٹی پھوٹی عربی سے خواہ کچھ نہ سمجھا ہو مگر مین نے اُس کی گفتگو کا یہ مطلب سمجھ لیا کہ وہ کشتی والا ہے اور ہم لوگون کو اپنی کشتی پر سوار کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مین نے اُس سے کہا کہ بعد نماز فجر ہم لوگ سوار ہو سکینگے۔ اُس نے اپنا نام محمد بتا کر مجھ سے کہا کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جانا تو مجھے پکار لینا۔ اِس قدر بات چیت ہو جانے کے بعد مین نے اپنے دوسرے ساتھیون کو جگایا۔ ہم سب لوگون نے ساتھ وضو کرکے اول وقت نماز فجر ادا کی۔ اور محمد کو بلا کر سامان کشتی پر پہونچانا شروع کیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزین ہم نے خود رکھدین اور وزنی اشیا محمد نے اپنے ایک ساتھی کی معیت مین اُٹھائین اور مین مع اپنے پڑوسیون اور اُن کے ساتھیون کے کشتی پر سوار ہو گیا۔ ہم سب دس آدمی تھے یہ امر ہمکو جہاز ہی پر معلوم ہو چکا تھا کہ کشتی والے کو کرایہ ساحل پر پہونچکر اس شرح سے دیا جائیگا جو حکومت کی طرف سے معین ہو۔ اور نیز اس امر کی بھی اطلاع ملگئی تھی کہ کشتی قرنطینہ مین ہم لوگون کو اُتار کر ہمارے سامان سمیت وہین کھڑی رہے گی۔ لہذا قرنطینہ مین ایک رات بسر کرنے کے لیے تقریباً اُسی قدر ضروری اشیا ہم مین سے علیحدہ کر لی تھین جو کامران مین ساتھ گئی تھین۔ کشتی پر سوار ہو جانے کے بعد اب فکر ہوئی کہ کشتی جلد روانہ ہو تاکہ دھوپ کے تیز ہونے سے پہلے ہم لوگ قرنطینہ پہونچ جائین۔ مگر ہمارا کشتی بان دوسرے مسافرون کی فکر مین جہاز پر جا کر غائب ہو گیا تھا۔ انتظار سے تنگ آکر مین پھر اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک کشتی پر کم سے کم بیس آدمی ہون تب کشتی روانہ ہو سکتی ہے۔ بہرحال کچھ مزید وقت گذرنے کے بعد محمد تقریباً ڈیڑھ درجن حاجیون کو لیکر آیا اور اُن کو سوار کرکے کشتی روانہ ہوئی۔

جدہ کا قرنطینہ دو مختصر جزیرون مین ہے جو شہر سے تقریباً چار اور پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہین۔ دور والے جزیرہ مین پہلے دن کے جاوی حجاج اُتارے جا چکے تھے۔ اِس لیے ہم لوگ قریب کے جزیرہ مین

اُتارے گئے کشتی کا سفر ایک گھنٹہ کے اندر طے ہو گیا۔ جزیرہ میں داخل ہوے تو وہاں کوئی سرکاری میزبان نہ نظر آیا۔ ایک ضعیف العمر شخص نے ہم لوگون کو پانی کے ٹکٹ دئے جسکی ظاہری صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تکیہ کا مجاور ہے۔ آگے بڑھے تو متعدد پختہ بارکین دکھائی دین جن کے گرد تارون کی بلند دیوارین تھیں مگر استداد زمانہ سے یہ تار زنگ آلود ہو کر بالکل کمزور ہو گئے اور جالیان جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔ ہم سے پہلے جو کشتیان پہونچ گئی تھین اُن کے مسافر اتر چکے تھے اور اُنھین کی مدد و رہنمائی سے ایک بارک پر ہم لوگون نے بھی قبضہ کیا۔ تھوڑی دیر میں اور لوگ بھی پہونچ گئے اور ساری بارکین بھر گئین۔ ہم لوگ چونکہ پہلے آئے تھے اس لیے ایک کونہ مین جہان تین طرف سے ہوا آتی تھی کافی جگہ پر ہمارا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور اپنا سامان وغیرہ رکھکر پہلا کام جو مین نے کیا وہ یہ تھا کہ سارے قرنطینہ کا ایک چکر لگایا۔ جزیرہ اتنا چھوٹا ہے کہ شاید پندرہ منٹ کے اندر کل احاطہ اور تعمیرات کا سرسری ملاحظہ ہو گیا۔ کامران کی طرح یہان بھی ایک بھپارہ کی جگہ بنی ہوئی تھی مگر اس جگہ کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ برسون سے یہان انسان کا گذر نہین ہوا۔ کل چار بارکین مسافرون کے قیام کے لیے تھین اور ہم لوگون کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ لہذا بارکون مین خوب ٹھسا ٹھس بھر چکنے کے بعد جو لوگ بچے اُن کو اپنے لیے خود جگہ پیدا کرنا پڑی۔ بارکون کے شمول مین ایک کمرہ اسپتال کا تھا۔ جو بند پایا گیا اسکے سامنے کے برآمدہ اور پاس کے خالی کمرہ مین جولاشین جیرنے کی جگہ تھی کچھ لوگون نے قبضہ کیا۔ کچھ بھپارہ گھر کے سامنے والے سقف برآمدہ مین ٹھہرے اور کچھ اشخاص خود بھپارہ گھر کی عمارت مین داخل ہو گئے۔ غرض جسکو جہان جگہ ملی اپنا اپنا بستر جما دیا۔ ایک طرف ایک دوکان تھی۔ جو پہلے تو بند تھی مگر جب تھوڑی دیر بعد کھلی تو معلوم ہوا کہ روٹی، کھجور، شکر، تمباکو، تربوز، خربزہ وغیرہ یہان نسبتاً گران قیمت پر مل سکتے ہین۔ اور پکے ہوے چاول اور گوشت اور مچھلی بھی ملتی تھی مگر اِن کی صورت ہی دیکھ کر انسان کی بھوک بھاگ جاتی جو لوگ جنس ساتھ لائے تھے اُنھون نے تو خیر کھانا پکا لیا۔ باقی جو لوگ بے سروسامان تھے اُن کو اسی دوکان سے کام نکالنا پڑا۔ ہم لوگ اپنے ہمراہ ضروری اشیا خوردنی لائے تھے تاہم کچھ روٹیان اور کھجور یہان بھی خریدی جہاز سے روانہ ہوتے وقت میرا احرام نجس ہو گیا تھا اس لیے کہ جہان کشتی کھڑی تھی وہین جہاز کی نالی کا پانی گر رہا تھا اور اسکی چھینٹون سے سارے کپڑے تر بتر ہو گئے تھے۔ مین نے اوڑھنے کی لنگی کو تو اُسی وقت سمندر مین دھو کر کشتی کے اندر سکھا لیا تھا مگر پھر بھی طہارت کی طرف سے اطمینان نہوا اس لیے جزیرہ مین پہونچکر باری باری دونون لنگیان پاک کین۔ یہان ہوا اور دھوپ دونون کے درمیان سخت مقابلہ تھا ہوا اس قدر تند و تیز چلتی تھی کہ آدمی اُڑا جاتا تھا اور

کسی دوسری جگہ ایسی ہوا چلے تو لوگ سردی کے مارے کانپ جائیں مگر یہ جگہ شہنشاہ شمس کے دار السلطنت خط استوا سے قریب ہے اس لیے ہوا کی کچھ نہ چلی اور تمازت سے ریت کے ذرات گرم لوہے کے مانند تپنے لگے۔ اور جب کبھی ہوا کے جھونکے سے ریت اُڑ کر کسی شخص پر پڑ جاتی تھی تو وہ بیتاب ہو جاتا تھا جو لوگ بارکوں کے اندر تھے اُنھیں تو خیر ہوا اور دُھوپ کی اس جنگ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر جو لوگ برآمدوں میں پڑے ہوئے تھے اُنھیں کافی پریشانی ہوئی۔ خدا خدا کر کے دن گذرا اور شام ہوئی تو مشکل سے نجات ملی۔ رات کے لیے سارے کیپ کے وسط میں ایک گیس کی بتی تھی اور بارکوں کے اندر ایک ایک لالٹین جس سے اگرچہ ساری بارک میں روشنی نہیں ہوتی تھی تاہم بہت کچھ سہارا رہا۔ شدت ہوا کے باعث رات ٹھنڈی تھی اس لیے بارکوں کے اندر بھی کھڑکیاں بند کر کے سونا پڑا۔ صبح کو نماز فجر سے فراغت پاتے ہی کشتیوں کی طرف اپنا اپنا سامان لیکر حجاج دوڑے اور مسافروں کے بیٹھتے ہی کشتیاں روانہ ہو گئیں ہماری کشتی کسی قدر دیر میں چلی اس لیے کہ میاں نظام دین صاحب کے ہمراہ مستورات تھیں جن کو سوار کرانے میں تھوڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی لیکن ہمارا کشتیبان بہت ہوشیار تھا ساحل کے قریب پہونچے تو ہم ان متعدد کشتیوں سے آگے تھے جو ہم سے پہلے روانہ ہوئیں تھیں۔ جدہ پہونچنے سے پہلے محمد نے ہم لوگوں سے بخشش طلب کی تو ہر شخص نے خوشی خوشی اس کو انعام دیا۔

جدہ کا بندرگاہ عام بندرگاہوں کی طرح نہیں ہے جو عموماً ہر جگہ ساحل کے کنارے سمندر کی گہرائی بہت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن بندرگاہ بنانے والے جہازوں کو ساحل سے متصل لانے کی غرض سے کہ مسافروں اور مال کے اُتارنے چڑھانے میں بڑی آسانی ہو جائے۔ کناروں کی ریت کو ہٹا ہٹا کر اتنا عمیق کر لیتے ہیں کہ اگر ہر وقت نہیں تو کم سے کم جوار بھاٹا آنے کے وقت تو جہاز ساحل تک پہونچ سکے۔ جدہ کے ترکی حاکموں نے شاید اس سبب سے کہ حفاظت ساحل کے لیے اُن کے پاس کافی قوت موجود نہ تھی اس بندرگاہ کے کنارے کو عمیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف کشتیوں کی آمد و رفت بھر کا ایک راستہ بنا لیا ہے جسکی نشاندہی کے لیے جا بجا ستون نصب ہیں۔ چونکہ یہ راستہ بہت کشادہ نہیں ہے اس وجہ سے اکثر اوقات کشتیاں بھی ریت میں پھنس جاتی ہیں۔ چنانچہ چند کشتیوں کے سوا عموماً ہر کشتی ریت میں پھنستی تھی۔ اور بلیوں کی مدد سے نکالی جاتی تھی۔ محمد کی ہوشیاری کی بدولت خود ہماری کشتی اس زحمت سے محفوظ رہی۔ ورنہ ساحل تک پہونچنے میں بہت دیر ہو جاتی۔ بہر حال ابھی کوئی ۹ بجے کے قریب ہماری کشتی جدہ کے کنارہ پہونچ گئی الحمد للہ علی احسانہ

منزل پر پہونچنے کے بعد ہر شخص چاہتا ہے کہ جلد سے جلد مع سامان کے اُتر جائے. عورتوں کی معیت کے باعث ہماری مختصر جماعت کو یہاں بھی تعجیل مناسب نہیں معلوم ہوئی. لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سامان ابھی کشتی ہی پر رہے گا اور مسافروں کو اُتر جانا چاہیے تو پھر دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی اُتر گئے۔ اور وہاں حکومت نے ہر شخص سے عہ فی کس کے حساب سے کشتی کا کرایہ وصول کر کے ہمیں اپنا سامان لینے کے واسطے محصول خانے کی طرف جانے کی ہدایت کی۔

تیسری منزل

کشتی کا کرایہ دے کر ہم لوگ اپنا اپنا سامان اُتروانے کی غرض سے محصول خانہ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ کہ دروازہ کے باہر ہی معلمین کے نمائندون کی پلٹن نظر آئی۔ اور جب مین نے اور میرے ساتھیون نے اپنے اپنے معلمون کے نام بتائے تو ایک صاحب نے جو اتفاق سے ڈیزن معلمون کے وکیل تھے ہم لوگون کو علیحدہ کھڑا کر دیا اور جب تک اُن کو یقین نہین ہو گیا کہ ہم لوگن کے سوا اس جہاز پر اُن کے حاجی اور نہین ہین ہم لوگ وہین کھڑے رکھے گئے۔ جہاز اور قرنطینون کی اسیری کے بعد یہ گرفتاری زیادہ ناگوار نہین ہوئی مگر ہر شخص کو اپنے سامان کی فکر تھی اور شہر مین پہونچنے کی جلدی۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد جب ہم محصول خانہ کے کنارے پہونچے تو کشتیون پر سے سامان اُترنے لگا ہمارے وکیل صاحب کے ایک ملازم نے ہم لوگون کا سامان اتروا کر محصول خانہ مین رکھوا دیا اور یہان سرکاری عمال نے جانچ شروع کی۔ اس وقت محصول خانہ مین جو ہنگامہ بپا ہوا تھا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ہر مسافر چاہتا تھا کہ اپنا سامان دکھا کر جلدی سے باہر نکل جائے۔ جن لوگون کے پاس سامان کم تھا وہ اپنے کندھون پر رکھے ہوے تھے اور زیادہ عجلت وہی کرتے تھے۔ ہم لوگون نے چھوٹی چھوٹی اشیا عورتون کے پاس چھوڑ دی تھین اور ایسی چیزین جن کو محصول خانہ مین دکھانا ضروری تھا حمالون کے ذریعہ سے محصول خانہ پہونچا دی گئین۔ جب حبشی نژاد مفتش کو جس کے سیاہ لباس کی چمک رنگت کی آب و تاب دوبالا کر رہی تھی اور دن سے فراغت ہوئی تو وہ میرے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے سامان مین ایک بچھونا تھا۔ ایک کپڑون کا بورا اور ایک اشیا خوردنی کا صندوق۔ بستر اور بورے پر تو اُس نے کچھ توجہ نہین کی البتہ جب بکس کھولا گیا تو اوپر ہی دودھ کے چند ڈبے رکھے ہوے تھے۔ اُس نے ایک ڈبہ فوراً اُٹھا لیا اور جا کر قریب کے ایک گودام مین رکھ آیا اور واپس آ کر اُس بکس پر اور میرے دیگر سامان پر کھریا سے ایک نشان بنا دیا۔ یہ کل کارروائی شاید ایک منٹ کے

نذر ہوگئی اور اُس کے بعد وہ تو دوسرے اشخاص کا سامان دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور وکیل صاحب کے ملازم نے مجھسے کہا کہ چلئے سامان باندھیے اور باہر نکلیے۔ مین حیران تھا کہ معاملہ کیا ہی جب یہ کہا گیا ہی تو مجھے اپنی سادہ لوحی سے یہ خیال گذرا کہ کسی دوسرے افسر کو دکھایا جاے گا۔ لہذا جب سامان باندھ کر باہر نکلنے کے لیے مجھسے کہا گیا تو مین متامل ہوا اور مین نے کہا کہ میرا ڈبہ تو واپس ملجاے۔ جس پر وکیل صاحب کے ملازم نے کسی قدر نفرت و حقارت کے لہجہ مین مجھسے کہا کہ آپ خواہ مخواہ دیر کر رہے ہین آپ تو بہت سستے چھوٹ گئے اور جلدی جلدی میرے سامان کو خود باندھنے لگا۔ اُس وقت ہجوم اتنا تھا کہ کسی جگہ اطمینان سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لوگ سیل دریا کے مانند دوڑتے ہوے چلے آرہے تھے اور ذرا سی غفلت مین دھکہ کھا کر گرنے کا اندیشہ تھا۔ لہذا مین بھی خاموش ہو رہا اور سامان اُٹھوا کر باہر آیا۔ باہر نہایت تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس لیے کہ تقریباً دس بج گئے تھے۔ مین نے چاہا کہ چھتری کھولکر لگا لون تو معلوم ہوا کہ محصول خانہ مین چھتری کسی کے پانون سے دب کر ٹوٹ گئی ہی اب مجھے اپنے ساتھیون کا انتظار تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر محصول خانہ مین داخل ہونا چاہا تو ہجوم کی وجہ سے نہایت بڑی مشکل سے جب اندر گیا تو دیکھا کہ مستری نظام الدین صاحب ایک کونہ مین کھڑے ہین اور لٹھے کے ایک تھان کے لیے مفتش صاحب ان سے للعہ محصول مانگ رہے ہین۔ وکیل صاحب کے ملازم نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ مفتش صاحب کو کچھ نذرانہ دیکر اپنی جان چھڑا لیجیے مگر اسے اُنھون نے گوارا نہین کیا لہذا جنس کے بورے اور گھی کے پیپے تو مفتش صاحب نے رکھوا لیے اور کہا کہ شام کو آکر ان کا محصول دیکر لیجا سیے گا۔ اور تھان کا محصول اسی وقت لے لیا۔ مین نے مستری صاحب سے کہا کہ جو سامان آپ سے لیا جاتا ہی اُس کی رسید لے لیجیے تو اب کوئی رسید نہین دیتا۔ اور وکیل صاحب کے ملازم کا حکم تھا کہ گھبرانے کی بات نہین ہی مین خود آپ کے ساتھ آکر سامان لیجلون گا۔ بڑی دقت و دشواری کے بعد ایک صاحب نے رسید لکھ کر دی تو مین اُن کو اور بقیہ سامان اور عورتون کو ساتھ لیکر باہر آیا۔ یہان کل سامان ایک چھوٹے ٹھیلے پر جسمین خچر جُتا ہوا تھا بار کیا گیا اور ہم لوگ سامان کے ساتھ پیدل روانہ ہوے۔ وکیل صاحب کا مکان محصول خانہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہم لوگ اُن کے مکان مین فروکش ہوگئے۔ اِس گاڑی کا کوئی کرایہ نہین دینا پڑا۔ اور وکیل صاحب سے یہ دریافت کرکے خوشی ہوئی کہ حکومت ہاشمیہ کی ہدایت کے بموجب عمال جدہ نے یہ انتظام کر دیا ہی کہ حجاج کو جہاز پر سے

قرنطینہ لیجانے اور وہان سے ساحل تک پہونچانے کا جو کرایہ فی کس کے حساب سے کشتی والے کا مقرر ہی اسی مین جرک سے جائے قیام تک باربرداری کا صرف بھی شامل ہی۔ اس طریقہ سے حجاج کو بہت آسانی رہی ورنہ اجنبی مقام پر کشتی اور ٹھیلہ والے حاجیون کو دق بھی کرتے اور اُن سے من مانی اُجرتین بھی وصول کرتے۔

یہان بطور جُملہ معترضہ یہ بیان کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ جاپان کے مختصر قیام مین مجھے ناگاسکی Nagasaki جاتے ہوے ریلوے اسٹیشن پر بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا تھا اور معلوم ہوا کہ وہان ریلوے کی طرف سے سامان اُٹھانے والے قلی ملازم ہین جن کی اُجرتین مسافرون کے ٹکٹ کی قیمت سے دی جاتی ہین اور مسافرون سے سامان ریل پر رکھنے کے لیے کچھ نہین ملتا ہندوستان کے بڑے بڑے اسٹیشنون پر بھی اسی قسم کا انتظام کر دیا جاے تو اجنبی مسافرون کو بہت آسانی و راحت ہو۔

وکیل صاحب کے جس مکان مین ہم ٹھہرائے گئے اس کی تین منزلین تھین بالائی منزل پر تو وکیل صاحب معہ اہل و عیال کے خود مقیم تھے۔ نیچے کی منزل مین دو کمرے تھے جسمین سے ایک کو وکیل صاحب نے اپنا دفتر بنایا تھا اور دوسرا کمرہ حاجیون کے لیے تھا۔ ابتداءً اسی کمرہ مین اُنھون نے ہم لوگون کو ٹھہرایا مگر یہ دیکھکر کہ اس چھوٹے سے کمرہ مین ہم سب لوگ معہ سامان کے اگر رہے تو بہت دقت اور کشمکش رہے گی اُنھون نے مجھے اور میرے ساتھی حمت شاہ کو وسطی منزل کے ایک کمرہ مین ٹھہرایا جدہ کے مکانات عموماً ایک ہی نمونے کے بنے ہوے ہین۔ مربع یا مستطیل قطعات زمین پر تین یا چار منزلون کی عمارتین اس اہتمام کے ساتھ بنائی گئی ہین کہ ہر منزل مین تقریباً برابر وسعت کے کمرے نکل آئے ہین اور زینہ کے لیے جگہ چھوٹ گئی ہی۔ کل منزلون کے پاخانے تلے اوپر ہین مکان کے نیچے جو نڈا اس بنائی جاتی ہی سب فضلہ اُسمین جمع ہوتا رہتا ہی اور سال مین ایک بار باہر سے زمین کھودکر نکالا جاتا ہی۔ ہر منزل مین گنجائش کے لحاظ سے دو تین یا چار کمرہ ہوتے ہین جنمین سے کونے والے کمرون مین دو سمت سے ہوا آتی ہی اور اوپر کی منزل مین تین سمت سے۔ مغرب کی جانب چونکہ سمندر واقع ہی اس لیے ٹھنڈی ہوا اُس رُخ سے آتی ہی مین ۱۰ مئی کو جدہ پہونچا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا روزے بمبئی ہی سے شروع ہوگئے تھے۔ اور جہاز مین اکثر لوگون نے رکھے گر مجھے خلل معدہ کی حالت مین

چونکہ جہاز پر متلی ہونے لگتی ہے اس لیے مین نے قضا کیے تھے۔ صبح سویرے ہی کھانا کھانے کا عادی ہون اور جہاز پر بھی یہ انتظام قایم رکھا گیا تھا۔ چنانچہ کشتی سے اُترنے کے بعد جب سامان اتارا جارہا تھا تو مین نے وہین ایک خوانچہ والے سے کچھ خرید کر ناشتہ کرلیا اور مکان پر آتے ہی سب سے پہلی فکر پیٹ کی ہوئی۔ وکیل صاحب کے ایک ملازم چھوکرے کو ساتھ لیکر بازار گیا۔ روٹیان گرم و سرد دونون بافراط موجود تھین مگر کھانے کی سب دوکانین خالی نظر آئین۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رمضان مین یہان دن کو کھانا نہین فروخت ہوتا۔ اگرچہ مسافرون کو اس سے تکلیف ضرور ہو مگر رمضان کا یہ احترام نہایت قابل قدر ہو۔ خداوند کریم سب مسلمانون کو اس کی تقلید کی توفیق عطا فرمائین۔ جمے ہوے دہی کے پیالے خوانچون مین بک رہے تھے اسی پر قناعت کی گئی۔ خمیری روٹیان یہان کئی قسم کی بنتی ہین اور سب ذائقہ کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہین۔ بلکہ ہندوستان مین جہان جہان بازار کی روٹیان کھانے کا اتفاق ہوا کہین ایسی خوش ذائقہ نہین بنتین۔ رنگون مین جو روغنی روٹی بکتی ہو وہ بھی اچھی ہوتی ہو مگر یہان کی روغنی جسپر تھوڑی سونف بھی چپان ہوتی ہو اُس سے بھی زیادہ مزہ دار ہو اور آبی تو بہت ہی افضل ہو۔ اور قیمت کچھ زیادہ نہین۔ معمولی روٹی کی قیمت پانچ پیسے جو اتنی وزنی ہوتی ہو کہ میرے لیے ایک اور خوش خوراک لوگون کے لیے دو کافی ہین۔ کھانے کے ساتھ ہی پانی کی فکر ہوئی۔ پانی مول لیا تو مٹی کے تیل کا ایک ٹین چار آنے مین ملا۔ اور یہ پانی بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہان میٹھے پانی کے کنوئین نہین ہین اور نہ کوئی چشمہ ہو بلکہ حکومت ترکی کے زمانہ سے سمندر کا کھاری پانی کل کے ذریعہ سے پینے کے قابل بنایا جاتا ہو۔ مگر بسبب اس کے کہ حکومت ہاشمیہ نے یہان کا ایک انجن کہ معظمہ منتقل کردیا ہو اب کم مقدار مین پانی بنتا ہو اور عموماً شہر کے مستقل باشندون کو یا جو لوگ خاص اہتمام کرکے اُس کے خزانہ سے حاصل کرین نصیب ہوتا ہو۔ شہر کے عامۃ الناس اور مسافرون کے پینے پانی کے ذخیرے شہر سے باہر ہین۔ یہ بڑے بڑے تہ خانون کی صورت مین ہین جنمین برسات کا پانی جمع کرلیا جاتا ہو اور وہان سے سوڈانی مزدور اور غریب بدو اونٹون یا گدھون پر اور اور بہت ہی غریب لوگ اپنے سرون پر لادکر لاتے ہین۔ یہ پانی کل کے پانی سے گندلا ہوتا ہو۔ شہر مین جابجا کنوئین ہین جن کا پانی بالکل سمندر کے پانی کی طرح کھاری ہو۔ اور بعض اوقات پانی لانے والے لوگون کو مخلوط کردیتے ہین جس کے باعث نہایت بدمزہ پانی پینا پڑتا ہو

کھانے اور پانی کی خرید کے لیے ضرورت پڑی کہ مقامی سکے بدل کر لیے جائیں کیونکہ اگرچہ ہندوستان کی چاندی کی ریزگاری بھی چل جاتی ہو مگر جہاز ہی پر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں خسارہ رہتا ہو۔ جدہ میں اُس وقت روپیہ کے پندرہ گل کے ترش ملے۔ چنانچہ حسب ضرورت فرش اور ہلیلے لے لیے گئے۔ ایک فرش کے چار ہلیلے ہوتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے وکیل صاحب سے دیر تک گفتگو کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ جدہ سے براہ راست ینبوع جانے کی قطعاً اجازت نہیں تو میں نے کہ معظمہ حاضر ہونے کا تہیہ کیا۔ وکیل صاحب کے بیان کے مطابق قافلہ سنیچر کو روانہ ہونے والا تھا اس وجہ سے میں نے خیال کیا کہ اور ذرائع سے بھی ینبوع جانے کے لیے کوشش کروں۔ روانگی کے وقت ایک دیرینہ کرم فرما کی عنایت سے بمبئی کے ایک عرب تاجر نے جدہ کے ایک معزز تاجر کے نام تعارفی خط لکھدیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ وقت ضرورت ہر قسم کی امداد ملجائے گی۔ اُن کا پتہ دریافت کیا تو وکیل صاحب سے معلوم ہوا کہ رمضان میں عموماً مغرب بلکہ عشا و تراویح کے بعد یہاں کے معززین سے ملاقات کا وقت ہو۔ سہ پہر کو میں نے بازار کا ایک گشت لگایا۔ ضرورت بھی تھی چلتے وقت لکھنؤ یا بمبئی سے سامان تحریر تو ساتھ رکھ لیا تھا اور خطوط کے کاغذ بھی مگر مضامین لکھنے کے واسطے کاغذ موجود نہ تھا۔ جہاز پر ضرورت پڑی تو خیر خط کے کاغذ سے کام چلا لیا گیا۔ اس کے علاوہ شکستہ چھتری اور ٹوٹے ہوے جوتے کی بھی مرمت کرانا تھی۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہو۔ چاروں طرف شہر پناہ کی دیواریں ہیں جسمیں چار دروازہ چاروں جانب ہیں ساحل سے آنے والوں کو مغربی دروازہ سے آنا پڑتا ہو دروازہ ہی پر جانب راست ڈاک خانہ اور تارگھر ہو اور جانب چپ محصولخانہ کا دفتر اِسی سڑک سے چل کر شرقی دروازہ (باب المکہ) پر پہونچتے ہیں جہاں سے قوافل کہ معظمہ یا دیگر حصص ملک کی طرف جاتے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف بازار ہے جسمیں تین چار بڑی دوکانوں کے سوا سب چھوٹے چھوٹے متفرق چیزوں کے دوکاندار ہیں۔ قہوہ خانے تو پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ملتے ہیں اُس کے بعد کھانے کی چند دوکانیں ہیں اور پھر متفرق اشیا کی۔ دروازہ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر چوراہا ہو جہاں سے شمال و جنوب کے بازاروں کا نظارہ ہو جاتا ہو شمالی بازار زیادہ بارونق ہو کیونکہ تقریباً تمام تھوک فروش اور بڑے بڑے تاجروں کی دوکانیں اسی بازار میں ہیں۔ جنوبی بازار میں صرافہ اور کھانے کی دوکانیں ہیں ان بازاروں کے اطراف میں شہر

بنا ہوا ہر شمالی بازار کے خاتمہ پر جو بڑے بڑے مکانات ہین اُسے گویا یہان کی سول لائنس سمجھنا چاہیے۔ فصیل کی شمالی سمت مین ایک دروازہ ہر جس کا نام باب الجدید ظاہر کرتا ہر کر وہ حال ہی مین بنا ہر یہان سے ایک کشادہ سڑک نکلی ہر جو فصیل کے نیچے نیچے نصف مغربی سمت کو طے کرکے شمالی بازار کی سڑک سے جا کر ملجاتی ہر۔ اسی کے کنارے تمام قنصل خانہ ہین۔ دروازہ کے باہر سمندر کے کنارہ ایک وسیع میدان ہر جہان لوگ شام کو بغرض ہوا خوری جاتے ہین۔ اور اسی میدان مین ایک جانب شریف مکہ کے ہوائی جہازون اور مختصر فوج کی بارکین بنی ہوئی ہین۔ یہ ہوائی جہاز مشق اور ممکن ہر کہ مرعوب کرنے کے لیے بھی روزانہ صبح کو اُڑائے جاتے ہین اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک نووارد مسافرون اور شہر کے عجائب پسند لوگون کو تماشا دکھا کر اپنی جگہ واپس جاتے ہین۔ اس عمارت کے شرق جانب تھوڑے فاصلہ پر حضرت حوا علیہا السلام کا مزار ہر جس کی زیارت کے لیے ہر حاجی باب المکہ کی راہ سے جاتا ہے۔

بازار مین جا کر پہلے چھتری کی مرمت کرائی۔ پھر متعدد دکانون پر کاغذ کی تلاش کی۔ اول تو مرضی کے مطابق کاغذ کسی دکان پر نہ ملا۔ اور جب دو ایک کاغذ پسند کیے تو دام بہت مانگے گئے بازار مین عام طور پر اشیائے خوردنی کو چھوڑ کر کل مال یورپ کا ساختہ نظر آیا بشبہ ہوتا تھا کہ بمبئی کے کسی چھوٹے سے بازار مین کھڑے ہین۔ چند انگریز بھی دکھائی دیے جو یقیناً قنصلات سے تعلق رکھتے ہون گے۔ جوتے کی مرمت ایک بخاری سے کرائی۔ اُس کی دکان پر عمدہ قالین بچھا ہوا تھا۔ اور وہ خود گھڑی سازون کا سا ایک میز سامنے رکھے اور ایک تپائی پر بیٹھا ہوا جوتہ بنا رہا تھا اُس نے نہایت خوش اخلاقی سے بٹھایا اور فارسی مین دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ شام کو بازار مین ہم لوگون نے کھانا کھایا۔ اتفاق سے مالک دکان ایک ایسا عرب تھا جو کئی بار ہندوستان ہو آیا تھا اور اس لیے اُردو صاف بولتا تھا۔ اُس دوکان پر اور نیز دیگر دکانون پر کئی قسم کا گوشت، سبزی، اور دال موجود تھی۔ کھانا ہمارے مذاق کے مطابق تو نہ تھا اس لیے کہ نہ اس مین کافی روغن تھا۔ نہ مصالح اور نہ مرچ۔ تاہم پیٹ پالنے کے لیے غنیمت تھا۔ اور کچھ زیادہ گران بھی نہین اس لیے کہ دونون آدمیون نے کئی قسم کے کھانے سے ۱۲ ارمین پیٹ بھر لیا اور آخر مین سابودانہ کی کھیر سے منھ بھی میٹھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد قہوہ خانے مین بیٹھ کر چائے پی۔ چائے قہوہ اور تمباکو کا رواج یہان بہت ہر۔ قہوہ خانون مین کافی مجمع تھا۔ اور اکثر

لوگ حقے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ یہاں کے حقے دیکھنے مین بہت شاندار ہین کیونکہ یہ چوان کا عام طور پر رواج ہی مگر خشک تنبا کو پیا جاتا ہے اس لیے اہل ہند کو اس مین مزہ نہین مل سکتا۔

یہان کے بازار مین تقریباً وہ تمام اجناس اور ترکاریان ملتی ہین جو ہندوستان مین عام طور پر مستعمل ہین لہذا جو لوگ اپنا کھانا خود پکانا چاہتے ہین اُن کو کوئی دقت نہین ہوتی۔ نرخ نسبتاً گران ضرور ہی مگر اس ملک کے موقع پر نظر کرکے مجھ کو زیادہ گران نہین معلوم ہوا۔ روپیہ کا تقریباً تین سیر گیہون کا آٹا ملتا ہی خربوزے اور تربوز کے سوا بازار مین میوہ کوئی نہ تھا مگر کاغذی لیمون اور سبز پودینہ بافراط ملتا ہی۔ تربوز بعینہ اسی قسم کا ہوتا ہی جیسا فرخ آباد و کانپور مین ملتا ہی اور بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہی۔

میرے دوست مسٹری نظام الدین صاحب مجھ سے جُدا ہوکر اپنے اور ہمراہیون کے خورد و نوش کا انتظام کرنے کے بعد جمرک (محصول خانہ) گئے کہ جو سامان صبح کو رکھ لیا گیا تھا اُس کو محصول ادا کرکے لے آئین۔ واپسی مین بازار مین ملے تو اُنھون نے بیان کیا کہ چالیس روپیہ کے قریب اُن کو محصول دینا پڑا۔ اجناس اور گھی کے علاوہ اُن کے پاس تقریباً پانچ سیر تمباکوے کشیدنی بھی تھی جس کی قیمت ہندوستان مین غالباً ایک روپیہ ہوگی اُس پر آٹھ روپیہ محصول کے دینے پڑے۔ اسی طرح معمولی لٹھے کے ایک تھان پر جس کی اصلی قیمت دس گیارہ روپیہ سے زائد نہ ہوگی چار روپیہ محصول کے لیے گئے۔ اس حساب سے مین نے خیال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ڈبہ دودھ کا لیکر مجھے بہت سستا چھوڑ دیا ورنہ کم سے کم تیس چالیس روپیہ مجھکو بھی دینا پڑتے۔

رات کو عشا کے بعد اُن عرب صاحب کی خدمت مین حاضر ہوا جن کے نام خط لایا تھا۔ وہ خود تو نہین ملے مگر اُن کے بڑے صاحبزادہ اور ایک معتمد ملازم سے ملاقات ہوئی۔ وہ دونون بہت اخلاق سے پیش آئے اور ہر امکانی امداد و اعانت کا وعدہ کیا مگر ینبوع کے راستہ سے مدینہ منورہ جانے کے معاملہ مین صاف اپنی معذوری ظاہر کی۔ جس کے بعد مجھ کو بالآخر یہ طے کرنا پڑا کہ سیدھا مکہ معظمہ حاضر ہون چونکہ ایام قریب الاختتام تھا اس لیے مجھے فکر ہوئی کہ اب جلد سے جلد مکہ معظمہ پہونچ جاؤن تاکہ جسقدر دن باقی رہے ہین یہ وہین بسر ہون۔

دوسرے دن علی الصباح نماز فجر سے فارغ ہوکر حضرت حوا کے مزار کی زیارت کے لیے گئے۔ یہ مزار ایک وسیع ریتیلے میدان مین ہی۔ مزار کے چارون طرف چار دیواری ہی۔ حضرت حوا جس زمانہ مین تھین روایات مشہورہ کے مطابق اُس وقت انسان کے ارتقاء عقلی نے موجودہ جسمانی انحطاط کی صورت اختیار نہین کی تھی۔

اس لیے اُس عہد کے انسانون کی عمرین دراز اور جسامت طویل و عریض ہوتی تھی۔ اجودھیا فیض آباد مین
ایک بڑی بھاری قبر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت شیث علیہ السلام ابن حضرت آدم علیہ السلام کی ہے۔
مین اس کی زیارت کر چکا تھا اس وجہ سے حضرت حوا کی طولانی قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ حضرت حوا کا مزار
ہندوستان کی قبور کے مطابق نہین ہے بلکہ بیشی عرض کی وجہ سے صرف قبر کے دونون جانب بطور
نشان دیوارین بنا دی گئی ہین جن کے درمیان مین حوض سا بن گیا ہے۔ پائین مزار مین ایک قبہ بنا ہوا
ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حوا کا فرق مبارک یہان مدفون ہے۔ باب المکہ سے نکلتے ہی بھکاری بچون
عورتون اور مردون کا جم غفیر نظر پڑتا ہے جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے یا بیٹھے رہتے ہین۔ اور زائرین کو
دیکھتے ہی دعائین دے دے کر اور اشعار دعائیہ و آیات قرآنیہ پڑھ پڑھ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہین۔ اور
جو لوگ اپنی جیب کی وسعت محدود پر نظر کر کے یا کسی اور سبب سے اُن کو بھیک دینے مین پہلو تہی کرتے ہین
اُن کے ساتھ دور تک لگے رہتے ہین حتیٰ کہ بعض بیباک بچے تو دامن پکڑ لیتے ہین۔ اندھے اور معذور فقیر
الگ رستہ مین بیٹھے ہوے صدائین لگاتے رہتے ہین اور ان کی حالت یقیناً قابل رحم ہے۔ مزار کے اندر
داخل ہونے کے بعد ہی جو پہلی جگہ فاتحہ خوانی کے لیے معین ہے وہان مجاورین کی معقول تعداد موجود تھی جنھون نے
صدر مین ایک جانب چادر بچھا دی تھی کہ زائرین اُسی پر اپنے نذرانے رکھدین یہان پر وکیل صاحب کے
خورد سال پوتے نے جو ہم لوگون کو زیارت کرانے لائے تھے مقررہ الفاظ مین سلام پڑھوایا اور اس کے بعد
جب قبہ کے اندر جانے لگے تو باہر چند غریب بدوی عورتین جوتے رکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی ملین جن کے
پاس جوتے امانت رکھ کے قبہ مین داخل ہوے۔ یہان ہجوم زائد تھا خصوصاً عورتون کی تعداد کثیر دیکھ کر
افسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجمع چھٹا تو ہم لوگ اندر حاضر ہوے۔ یہان ایک تابوت رکھا ہوا ہے جس کے
ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی لگا دی گئی ہے اور اسی مین سے شائقین کو زیارت کرائی جاتی ہے۔ مین نے
باہر سے فاتحہ خوانی پر قناعت کی اور مجاورون کو کچھ دے دلا کر رخصت ہوا۔

زیارت سے واپس آنے کے بعد ہی مین نے وکیل صاحب کے بیٹے سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ
مین آج ہی جانا چاہتا ہون اور چونکہ ہندوستان ہی مین ایک عزیز کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جدہ
اور مکہ معظمہ کے درمیان فاصلہ کم ہے اور گدھے پر سوار ہو کر جلد پہونچنا ممکن ہے اور ایک دن قبل بازار مین ایک
صاحب سے شرح کرایہ وغیرہ بھی دریافت کر لی تھی اس لیے مین نے اُن سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک گدھا

اور سامان کے لیے ایک اونٹ مہیا کر دیں۔ اور میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ آپ انتظام نہ کر سکیں تو مجھ سے کہہ دیجیے میں خود انتظام کر لوں۔ یہ اس لیے کہ ایک صاحب نے بازار میں انتظام کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اُنھوں نے وعدہ کیا اور دوپہر کو آ کر تاکید کی کہ اپنا سامان تیار رکھوں۔ سامان باندھ لیا تھا کہ پھر تاکیدی پیام پہونچا کہ اونٹ آتا ہو سامان تیار رکھیے۔ جمعہ کا دن تھا مگر مجھے اُس روز روانگی کے انتظامات میں نماز بھی نہ مل سکی۔ اور میری حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی جب عصر کے قریب وکیل صاحب کے دوسرے بیٹے نے آکر یہ اطلاع دی کہ اونٹ نہیں ملا۔ میں اسی حالت میں خود باہر نکلا اور باب المکہ تک گیا جہاں سے قوافل روانہ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قافلہ جا چکا اور اب کوئی اونٹ نہیں ہے۔ پھر گدھے والے کے پاس گیا تو اُس نے دیر تک فضول بحث و گفتگو میں وقت ضائع کیا۔ پہلے تو سرے سے انکار ہی تھا کہ بغیر وکیل کی وساطت کے گدھا نہیں مل سکتا۔ مگر بعد کو وہ راضی ہو گیا تو اب کرایہ بہت مانگنے لگا۔ میں اکر کر گھر چلا آیا اور یہاں وکیل صاحب کے بیٹے کو بہت ملامت کی۔ میرے رنج و غصہ سے وہ متاثر ہو کر اپنے باپ کو بلا لائے جو بہت چالاک آدمی ہیں اُنھوں نے مجھے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور یہ طے پایا کہ میں اسی وقت گدھے پر روانہ ہو جاؤں اور سامان میرے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے دن بھیج دیا جائے۔ اب مجھے یکسوئی خاطر نصیب ہوئی۔ تو اپنی اس غلطی پر بہت انفعال ہوا کہ وکیل صاحب کے بیٹے کو غصہ میں بہت سخت سُست کہہ ڈالا تھا اور میں نے اُن سے اور اُن کے والد صاحب سے بہت تمام معذرت کی جس کے بعد قرارداد کے بموجب میں نماز عصر سے فارغ ہو کر اُن کے صاحبزادہ کے ساتھ گدھے والے کے یہاں گیا۔ انھوں نے چودہ روپیے کرایہ طے کیا تھا اور اگرچہ میرے اندازے سے یہ بھی زائد تھا۔ مگر میں نے مجبوراً منظور کر لیا اور مختصر سامان جو ساتھ لیجانے کی غرض سے لایا تھا دونوں جانب خرجیوں میں بھر کر ساتھیوں اور وکیل صاحب کے صاحبزادہ سے رخصت ہوا۔ اونٹ کا کرایہ چودہ روپیہ آٹھ آنے بتائے گئے تھے لہٰذا اپنے ساتھی مستری نظام الدین صاحب کو پندرہ روپیے دیدیے کہ جب آنے لگیں تو میرے سامان کے اونٹ کا کرایہ دیدیں۔ گدھے پر عمر بھر میں کبھی سوار ہونے کا اتفاق نہوا تھا اس بنا پر وکیل صاحب اور ساتھی دونوں منع کرتے تھے مگر میں نے کہ معظمہ جلد پہونچنے کے خیال سے ان کے مشوروں کو رد کر دیا۔ اور اب جو سوار ہوا تو محسوس ہوا کہ واقعی ٹیڑھی کھیر ہے۔ باب المکہ پر ایک عامل حکومت نے روک کر دریافت کیا کہ تمھارے پاس گنیاں تو نہیں ہیں۔ اور میرے انکار کے باوجود اُس نے میری کمر اور گردن وغیرہ ٹٹول کر دیکھی۔ اُس سے نجات ملی تو

لدھا لیکر تیزی سے بھاگا۔ سڑک یہان کی کسی قدر ڈھلوان تھی اور راستہ مین جگہ جگہ پتھر پڑے
ہوے تھے پہلے تو مین ڈرا کہ کہین گر نہ جاؤن پھر ہمت کرکے اور جسم کو سادھ کر بیٹھا تو تھوڑی دیر کے
بعد اندیشہ جاتا رہا۔ میرے ساتھ ایک شخص بطور رہنما کے تھا۔ تھوڑی دور آگے چلکر دو ایرانی زائرین
بھی مل گئے وہ بھی اسی قافلہ کے رُکن تھے مگر ذرا پہلے روانہ ہوگئے تھے۔ اب چارون گدھون نے
ساتھ چلنا شروع کیا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین مین نے محسوس کیا کہ مجھ کو اب کسی قسم کا خطرہ نہین ہے
البتہ راستہ مین پتھرون اور اونٹ کی ہڈیون سے جب وہ ٹھوکر لیتا تھا تو مجھے خیال ہوتا کہ کہین گر نہ جائے۔
مغرب کا وقت آیا تو ہم لوگون نے ایک مقام پر جہان قہوہ خانہ بنا ہوا تھا ٹھہر کر نماز ادا کی۔ ابتدا
مین تو ہم سب لوگ لبیک پڑھنے مین زیادہ مشغول رہے اور معمولی تعارف کے سوا کوئی بات چیت
نہ ہوئی۔ نماز مغرب کے بعد کچھ کچھ بات چیت ہونے لگی۔

دونون ایرانی قالین کے تاجر اور ایران کے اُس حصہ ملک کے باشندے تھے جو در اصل
عراق عرب کا کبھی ایک جزو تھا اور اس وجہ سے فارسی عربی دونون زبانین بولتے تھے۔ ان کے
ملک مین ریل اور پختہ سڑکین نہین ہین اس لیے گدھے اور اونٹ کا وہان بھی رواج ہے اور یہ لوگ
گدھے کی سواری کے عادی تھے۔ رات اندھیری تھی اس لیے مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد سے
راستہ دکھائی دینا موقوف ہوگیا اور اب مین تمامتر گدھے کے رحم و کرم پر تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے
تجربہ سے ظاہر ہوگیا کہ یہ گدھے اس راستے پر چلنے کے عادی ہین اور کوئی اندیشے کی بات نہین میرے
ساتھیون کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھون نے کرایہ کچھ زائد ہی دیا ہے مگر میرا گدھا نسبتہً تیز تھا اور عموماً
آگے ہی رہتا تھا۔ بائیسکل پر چڑھنے والے کو گدھے کی سواری آسان ہوگی کیونکہ اسمین بھی جسم کا توازن قایم رہنا چاہیے
جدہ اور مکہ کے درمیان اگرچہ پختہ سڑک نہین ہے مگر کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ریت پس کر ہموار
ہوگئی ہے اور سوا اسکے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر یا اونٹون کی ہڈیان پڑی ہوئی ہین۔ راستہ کی
صورت بالکل سڑک ہی کی سی ہوگئی ہے۔ راستہ کے دونون جانب تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے بدوؤن کے
جھونپڑے ملتے ہین۔ جہان قہوہ چائے اور پانی ملجاتا ہے اور راستہ اتنا پُرامن ہے کہ ایک دو آدمیون کو بھی
کسی قسم کا خوف نہین ہوسکتا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم پھر رُکے میرے ساتھیون نے تو عشا کی نماز بھی
پڑھ لی مگر مین صرف چاء اور تمباکو نوشی مین مصروف رہا۔ راستہ مین میرے ساتھی تو دو ایک بار گر بھی

گر مین بچار ہا۔ چونکہ وہ گدھے کی سواری کے عادی تھے اس لیے گرے تو چوٹ ذرا بھی نہ لگی۔ تقریباً دس بجے رات کو بحرے پہونچے رات کا وقت تھا اس لیے اس مقام کو مین دیکھ نہین سکا صرف بازار سا نظر آیا۔ ایک قہوہ خانے مین ہم لوگ اُترے خرجیون سے سامان اُتار کر ایک کوچ پر رکھدیا گیا اور مین وضو کر کے نماز مین مصروف ہوا۔ میرے ساتھیون نے فوراً حقہ بھروایا اور کھانا لانے کی ہدایت کی۔ نماز سے فارغ ہوکر ہم تینون آدمی کھانا کھانے بیٹھے تو تازہ تازہ خمیری روٹیان اور تلے ہوے انڈے کھانے مین آئے۔ اُس کے بعد خربوزہ اور تربوز۔ مین اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ہندوستان مین بھی تربوز بہت کم کھاتا ہون۔ اور کھانے کے بعد تو تمام عمر نہین کھایا تھا۔ گران صاحبون کے اصرار سے مجبور ہوگیا اور غالباً یہ یہان کی آب و ہوا کی برکت ہو کر کچھ تکلیف نہین ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہر لوگ اپنے اپنے کوچ پر سو رہے۔ سو رہے تھے کہ گدھے والے نے آکر جگایا اور جلدی جلدی سامان خرجیون مین رکھ کر اور قہوہ والے کا حساب چکا کر ہم لوگ رخصت ہوے قہوہ والے کا حساب تو میرے دوستون نے طے کیا۔ مجھے ۲۵ قرش (تقریباً ۱۰؍) دینا پڑے۔ اس وقت ٹھنڈک تھی اور چونکہ جسم پر احرام کے سوا کچھ نہ تھا اور سر بھی برہنہ تھا اس لیے مجھے اتنی سردی معلوم ہوئی کہ مین کانپ رہا تھا۔ مین نے روزہ کی نیت کر لی تھی اس لیے تمباکو کے ذریعہ بھی جسم کو گرمانا ممکن نہ تھا۔ گدھا اتنی دیر آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہوگیا تھا اور تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اندھیرے مین ٹھیک طور پر کچھ معلوم نہین ہوسکا۔ لیکن غالباً تھوڑی ہی دیر مین کسی قدر اُتار پڑا اور ایک سمت کو راستہ مُڑا۔ گدھا تیزی سے جو مُڑا تو مین جھٹکا کھا کر گر پڑا اور گرا تو ایسی جگہ جہان کچھ پتھر پڑے ہوے تھے۔ کہنی چھل گئی اور پانون مین خفیف سی چوٹ آئی۔ سب لوگ رُک گئے اور مین گدھے والے کی امداد سے پھر اپنا بستر وغیرہ گدھے پر رکھ کر سوار ہوا۔ چوٹ تو کافی آئی اگر اس واقعہ کی بدولت سردی کا اثر بھی زائل ہوگیا۔ جدہ سے چلے تو ہم صرف چار آدمی تھے مگر بحرے سے ایک شخص اور ساتھ ہولیا۔ یہان پہونچکر وہ گدھا چھوڑ کر چلا گیا اور کوئی گدھا آگے آگے چلنے لگا۔ چونکہ اُس پر بوجھ نہ تھا اس لیے وہ سب سے تیزی کے ساتھ چلتا تھا اور اُسی کے پیچھے پیچھے ہمارے گدھے چلتے تھے۔ گویا وہ ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گدھے والے نے کہا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہین جس کے بعد تلاش راہ مین بہت وقت ضایع ہوا۔ کیونکہ اس صورت سے رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ خود پیادہ پا چلنے لگا۔ تھوڑی دیر ایک طرف جاتا تھا پھر زمین پر چوپایون کی طرح لیٹ کر زمین سونگھتا اور اس طرح گویا راہ کا پتہ

چلاتا تھا۔ بہت دیر کے بعد راستہ ملا اس تلاش نے وقت بھی بہت لیا۔ اور گدھوں کو بھی بہت تھکا دیا۔
گدھے والے کے قبضہ میں اب دو گدھے تھے کبھی وہ ایک پر سوار ہوتا اور کبھی دوسرے پر اور جب ہمارے
گدھے ذرا اُڑ کتے تو اپنے لمبے بیت سے اُن کو مارتا چلتا۔ فجر کے وقت ایک قہوہ خانے میں قیام کیا
یہ ذرا بڑی جگہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ کئی جھونپڑے بنے ہوئے تھے اور ایک جانب چھوٹی سی مسجد بھی نظر آئی۔
قضائے حاجت کے بعد نماز ادا کی اور پھر سوار ہوئے۔ رفتہ رفتہ آفتاب بھی نکل آیا بلکہ دھوپ کی تمازت
اب تکلیف دینے لگی۔ اور خستگی و ماندگی کا جو عالم تھا وہ تو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال خدا خدا کر کے
مکہ معظمہ کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ مکہ معظمہ کے قریب راستہ پہاڑیوں میں سے بل کھاتا ہوا گذرا ہے جا بجا
اونچے ٹیلوں پر توپیں لگانے کے دُمدمے بنے ہوئے ہیں جو حکومت ترکی نے اس غرض سے بنا دیے تھے
کہ اگر کوئی حملہ آور ہو تو مدافعت میں آسانی ہو اور اس میں ذرا شک نہیں کہ چند صد یا زیادہ سے زیادہ ایک
ہزار سپاہی اس راستے سے گذرنے والی بڑی سی بڑی فوج کو بخوبی روک سکیں گے۔ اگر اُن کے پاس
ساز و سامان جنگ وافر ہو۔ یہ پہاڑیاں گویا "بلد الامین" کی قدرتی محافظ ہیں۔ جدہ سے مکہ معظمہ تک جو ٹیلیفون
لگا ہوا ہے اُس کے کھمبے بار بار سامنے آتے تھے اور اس سبب سے ہر موڑ پر خیال ہوتا تھا کہ شاید اب
منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ بالآخر کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں۔ گدھے والے نے بتایا کہ ترکی زمانہ میں
یہاں کچھ فوج رہتی تھی۔ اب تو عمارت بھی بہت کچھ منہدم ہو گئی ہے۔ اس مقام سے کچھ پہلے ہی سے بڑی لڑکے
بچ قبول کہہ کہہ کر بھیک مانگتے ملتے تھے جو اس بات کی علامت تھی کہ اب مکہ معظمہ زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔ صبح کو
راستہ میں ایک عورت ایک سمت سے دوڑتی ہوئی ہم لوگوں کی طرف آئی اور منت کرنے لگی کہ میرے گھر میں آگ
جلانے کا کوئی بندوبست نہیں دیاسلائی ہو تو دیدو۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی ڈبیا تھی جس میں کوئی دیاسلائی
نہ تھی اپنے ایرانی ساتھی کے بتانے پر میں نے اُس کو اپنی دیاسلائی کی ڈبیہ پھینک کر دی تھی اُس وقت
بھی یہ خیال گذرا تھا کہ منزل قریب آگئی ہے۔ اُس کے بعد مسلسل کئی گھنٹہ تک چلنا پڑا۔ اس بنا پر بدوی لڑکوں
کو دیکھ کر اور گدھے والے کے بوثوق کہنے پر پوری طرح یقین نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر اور چلنے کے بعد ایک بڑی
عمارت نظر پڑی معلوم ہوا کہ یہ بھی ترکی فوجوں کی قیام گاہ ہے اور اب عساکر حکومت اخمیہ اسی میں رہتے
ہیں۔ یہیں سے مکہ معظمہ کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ آٹھ بجے کے قریب وقت ہو گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ
کم سے کم بیرا تو بھیجا گھلا جاتا تھا۔ اس لیے یہ معلوم کر کے کہ اب چند ہی منٹ کے اندر ہم مکہ معظمہ پہونچ جائیں گے

بہت مسرت ہوئی۔ چنانچہ کچھ دور آگے بڑھے تو داہنے جانب ایک سلسلہ عمارتوں اور جھونپڑیوں کا نظر
آیا۔ جن مین متعدد قہوہ خانے بھی تھے۔ اور پندرہ منٹ کے اندر ہم شہر کے حدود مین داخل ہوگئے۔ اب
دورویہ عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بازار نظر آنے لگا۔ مین نے تمازت آفتاب سے بچنے کی غرض سے
شرقی جانب کی عمارات کے سایہ مین چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد اپنے ساتھیون سے جدا ہونیکا وقت
آیا کیونکہ ان کے معلم کا مکان دوسرے محلہ مین تھا۔ چنانچہ گدھے والا ہم لوگون کو روک کر ایک گلی مین چلا گیا
اور وہان سے ایک اور شخص کو بلا لایا جس کی رہبری مین جلد ملاقات ہونے کی امید ظاہر کرکے ایک شب کی
رفاقت پر اظہار مسرت کرتے ہوئے وہ لوگ ایک راستہ کی طرف چلے گئے اور گدھے والے کی معیت مین
مین آگے بڑھا تا آنکہ حرم شریف کے پاس پہنچ گیا اور دور ہی سے حرم محترم کے در و دیوار صحن و عمارات کو
کمال عظمت و اشتیاق سے دیکھتا اور دل ہی دل مین دعائین مانگتا ہوا محلہ بیاد پہنچ گیا جہان ہمارے
خاندان کے مطوف عبد القادر سکندر کا مکان ہے الحمد للہ علی احسانہ

چوتھی منزل

عبدالقادر سکندر ہمارے معلّم لکھنؤ ہی میں مقیم ہیں یہاں کے بڑے بیٹے حسن سکندر بمبئی میں رہ گئے تھے کہ شوال میں حجاج کے ساتھ جائیں گے۔ کہ مکرمہ میں اُن کی اہلیہ اور اعزائے خسرالی موجود تھے اور اُنھوں نے اپنے سالے یوسف کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیدیا تھا گدھے والا پہلے عبدالقادر سکندر کے مکان پر گیا۔ وہاں سے حسن کے مکان کا پتہ دیا گیا اور وہیں لاکر مجھے اُتارا۔ یوسف موجود نہ تھے اس لیے فوجی کا سامان اُن کے پڑوس میں رہنے والی ایک ہندوستانی بڑھیا کے یہاں رکھدیا اور اپنی بخشش لیکر وہ تو روانہ ہو گیا۔ مین کچھ دیر اُسی بڑھیا کے یہاں بیٹھا رہا۔ اُس کے بعد معلّم صاحب کا ایک ملازم آگیا جس نے مجھکو حسن کے مکان میں سامان سمیت پہونچا دیا۔ میرے جیل کے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب فوجی مجھسے پہلے روانہ ہوے تھے اور حسن کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ وہی اُن کے بھی معلم ہیں۔ چنانچہ ذرا دیر کے بعد جب اُن کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ خود مجھسے ملنے تشریف لائے وہ بیٹھے ہی تھے کہ یوسف آگئے۔ گدھے کی سواری سے اگرچہ خستگی بہت ہو گئی تھی اور پہلا روزہ بھی تھا مگر شوق زیارت نے ہمت نہ ہاری اور میں معمولی صاحب سلامت کے بعد معلّم صاحب کے ایک کارکن کے ہمراہ زیارت و طواف کعبۃ اللہ شریف کے لیے روانہ ہوا۔ اگرچہ ضروری دعائیں جہاز ہی پر یاد کرلی تھیں مگر اپنے حافظہ کی خرابی پر مطلع ہونے کی وجہ سے وثوق نہ تھا کہ ہر موقع کی دعا پوری صحت سے اور مقررہ وقت پر پڑھ سکون گا اس لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کی کتاب زبدۃ المناسک جس سے مین نے دعائیں یاد کی تھیں چلتے وقت ہاتھ میں لے لی۔ اور اسی کی ہدایت کے بموجب اپنے رہبر سے درخواست کی کہ باب السلام سے لے چلیں۔ محلہ جیاد سے تقریباً ۳ سو گز کے فاصلہ پر حرم محترم اور باب السلام کچھ زیادہ دور ہے چنانچہ ہم لوگ مختلف گلیوں اور بازار کو طے کرتے ہوے باب السلام پر پہونچے مین دروازہ پر داخلہ کی دعا پڑھتا ہوا حرم شریف میں حاضر ہوا۔ سامنے ہی بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس وقت جو حالت دل کی تھی اُس کا بیان دشوار ہے۔ بیت اللہ شریف

زیارت کی ایک مدت سے تمنا تھی مگر سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے سیہ کار و بدبخت کو جس کی عمر کا بیشتر حصہ لہو و لعب
اور عصیان و طغیان میں بسر ہوا ہو یہ دولت کیسے نصیب ہو گی اور اب جو واقعتاً بیت اللہ شریف کی زیارت
سے مشرف ہوا تو اللہ تعالے کے کمال فضل و احسان اور غایت لطف و کرم کے احساس نے دل کی عجیب
کیفیت کر دی۔ اس وقت میں دیر تک دعا مانگتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر دلی امتنان ظاہر کرنا
چاہتا تھا مگر میرے رہنما نے جلدی سے ہدایت کی کہ آگے بڑھو اور ساتھ ہی کچھ دعا پڑھوانا شروع کی۔
میں گویا مسحور ہو رہا تھا اور جو حالت ایک عامل کے معمول کی ہوتی ہے بعینہ یہی کیفیت میری اپنے رہنما
کے ساتھ رہی۔ وہ مجھ کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھا اور باب ابراہیم سے گذرتا ہوا حجر اسود سے کچھ فاصلہ
پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں نیت طواف کرائی گئی۔ پھر حجر اسود کی طرف چلکر گیا۔ استلام کیا اور اپنے رہنما
کے ساتھ یکے بعد دیگرے سات بار کعبۃ اللہ شریف کا طواف کیا اور اس اثنا میں جو کچھ وہ باواز بلند
پڑھتا رہا میں اُس کی تکرار کرتا رہا۔ طواف کی حالت میں جو ادعیہ ماثورہ ہیں وہ مجھے یاد تھیں اور
اندر سے دل یہ چاہتا تھا کہ بالکل تنہائی ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی دوسرا طواف کرنے والا بھی نہ ہوتا اور خوب
دل کھولکر اور پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کی جاتی مگر ایک بے بسی کے عالم میں میں اپنے
رہنما کے دوش بدوش انھیں الفاظ کو دھراتا رہا جن کا بیشتر حصہ عربی سے ناواقفیت کی بنا پر میری
سمجھ سے باہر تھا۔ لہذا خاتمہ طواف پر جب ملتزم شریف سے لپٹکر دعا کرنے کا موقع ملا تو میں نے
بہت کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اور جب تک رہنما صاحب نے کئی بار نہ پکارا میں وہاں سے
نہ ہٹا۔ باوجودیکہ تمازت آفتاب کی وجہ سے مطاف کی تابش ترقی پذیر تھی ملتزم شریف سے ہٹ کر
مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبۃ اللہ کے درمیان چھوڑکر دو رکعت سنت طواف ادا کیں۔ یہاں بھی رہنما
نے بہت کچھ عجلت کرنا چاہی مگر میں نے نماز کے بعد دیر تک دعا کی۔ پھر رہنما نے ایک اور دعا پڑھوائی
اور چاہ زمزم شریف پر لائے۔ در زمزم پر دعا پڑھکر دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آب زمزم پیا اور ہاتھوں
چہرہ اور جسم کے دیگر حصوں میں ملا۔ وہاں سے نکل کر حرم شریف کے باہر جانے کا قصد کیا۔ باب الصفا
پر ہو چلکر دعا کے لیے ٹھہرا۔ کچھ لڑکے چاہ زمزم سے نکلتے ہی ساتھ ہو لیے تھے۔ اب رہنما صاحب نے
ہدایت کی کہ خیرات طواف دو۔ ان لڑکوں کو کچھ دیا گیا۔ اُس کے بعد رہنما صاحب نے کچھ اور لوگوں کے
نام لیے کہ اُن کا حق دو۔ چنانچہ ہیلوں کی ایک گڈی اُن کے نذر کی اور جتنی دیر میں میں نے

دعا مانگی اُنھون نے اس کی تفہیم خیالی سے فراغت کر لی اور مجھے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرانے کے لیے لیچلے۔ کوہ صفا کے دامن مین جو ایک بے چھت کی محراب دار عمارت ہے اُسکے زینہ اولین پر کھڑے ہوئے اور کعبۃ اللہ شریف کی طرف منھ کرکے دعا پڑھی اور رہنما کے ساتھ سعی کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ طواف کی طرح سعی کے ساتون چکرون مین بھی رہنما صاحب آواز بلند دعائین پڑھواتے رہے اور جب ساتوان چکر مروہ پر تمام ہوا تو وہان جو متعدد حجام بیٹھے ہوے تھے اُن مین سے ایک سے اپنے کاکلون کی ایک جانب کی نشین کترواکر اور اُس کی اُجرت دیکر باب السلام کی طرف سے پھر حرم شریف مین حاضر ہوا اور حطیم مین جاکر دو رکعت نفل ادا کین۔ اب گھر جانے کا ارادہ ہوا تو رہنما صاحب نے باب الزیادہ پر لیجاکر ٹھہرایا اور کہا کہ آپ کے جاے قیام سے حرم شریف آنے جانے کے لیے یہی دروازہ قریب پڑے گا اور ساتھ ہی صحن حرم مین ایک موقع دکھا کر بتایا کہ بعد عصر یہین عبد القادر سکندر کے حجاج جمع ہو کر درہ کھولتے ہین اور تم بھی یہین آکر بیٹھنا اور طواف کرنا یا ہو گے تو مین ساتھ چل کر طواف کرا دون گا۔ دوپہر کے قریب مین گھر واپس پہونچا اور خستگی رفع کرنے کے خیال سے ذرا لیٹ کر سو گیا۔ کئی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ حرم شریف مین نماز ظہر ہو چکی ہو گی۔ لہذا وضو کرکے نماز ادا کی۔ اور میر عبد العزیز صاحب کی معیت مین عصر کے وقت حرم شریف مین حاضر ہو کر نماز پڑھی اور صحن حرم کے اُس کونہ مین جو باب الوداع سے قریب ہے جہان اکبر سرمزمی کی جا نمازون پر اپنے معلّم کے دوسرے حاجیون کے ساتھ جا بیٹھا جہان اکبر صاحب اور بعض دیگر حجاج سے بھی ملاقات ہوئی۔ افطار و نماز مغرب سے فارغ ہو کر میر صاحب کے ہمراہ گھر واپس آیا۔ اُنھون نے ازراہ محبت میرے لیے کھانے کا انتظام کر لیا تھا لہذا کھانا کھا کر اور حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرکے پھر حرم شریف گیا اور نماز عشا کے بعد واپس آیا۔ دوسرے دن عمرہ لینے کے لیے جانا تھا اس لیے میر صاحب نے اپنے ساتھی ظہور کو رہنمائی کی غرض سے میرے ساتھ جانے کی ہدایت کر دی تھی چنانچہ سحری کھا کر مین ظہور کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اندھیرا تھا اور مین برہنہ پا۔ راستہ مین بکثرت چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوے تھے۔ جا بجا ٹھوکرین کھاتا ہوا نماز فجر کے وقت مسجد تنعیم کے قریب پہونچا۔ یہان جگہ جگہ وضو کرانے والے اور قہوہ خانے نظر پڑے۔ ایک ہیلہ مین پانی کی ایک صراحی ملتی تھی چنانچہ استنجا کرکے وضو کیا اور مسجد مین جاکر پہلے نماز فجر ادا کی پھر دو رکعت نفل پڑھکر اور تلبیہ کہکے عمرہ کی نیت کی اور

اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس ہوا۔ حرم شریف مین حاضر ہوکر طواف کیا اور پھر وہان سے عمل کرسی کی اور فارغ ہوکر گھر واپس آیا۔ مسجد تنعیم تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہی، راستہ ریتلا اس لیے آمد و رفت ہی مین تقریباً تین چار گھنٹے صرف ہوے اور چونکہ اس قدر پیدل چلنے کی عادت نہین کافی خستگی بھی معلوم ہوئی۔ اور رات کو سونے کا وقت بھی کم ملا تھا اس لیے آتے ہی سو رہا۔ ظہر سے قبل اُٹھا۔ نماز حرم شریف مین ادا کی اور واپس آکر پیر عبدالعزیز صاحب سے ملا اور عصر کے وقت اُنھین کی معیت مین حرم شریف مین نماز پڑھی اور پھر اُن کے ساتھ بازار چلا گیا۔ اور مغرب و عشا بدستور حرم مین ادا کی۔

رمضان المبارک مین حرم محترم کا نظارہ عجیب و غریب ہوتا ہی۔ یون تو ایام حج مین حرم شریف کے اندر ہر وقت کافی مجمع رہتا ہی اور خصوصاً نمازون کے اوقات مین ہجوم بہت زیادہ ہو جاتا ہی۔ مگر ماہ صیام کے اجتماع کی جو خصوصیات ہین وہ جُدا گانہ امتیاز رکھتی ہین۔ عصر کے بعد ہی سے جدھر دیکھیے حرم شریف مین لوگ جمع ہین۔ کوئی قرآن شریف پڑھتا ہی کوئی دلائل الخیرات وغیرہ ورد کر رہا ہی۔ کوئی طواف مین مصروف ہی۔ کعبۃ اللہ شریف کا طواف یون تو تقریباً شب و روز مین ہر وقت ہوتا رہتا ہی۔ دن کو تو کبھی اوقات جماعت کے سوا کسی وقت مطاف خالی نہین نظر آتا۔ رات مین شاید کوئی وقت خالی گذرتا ہو۔ لیکن گرمیون مین ہجوم عموماً صبح اور شام ہی کو رہتا ہی۔ رمضان المبارک کے عمرون کی جو فضیلت ہی اُسکے باعث ماہ صیام مین عمرہ لانے والون کی تعداد کثیر کے لیے طواف لازم ہی اور جو لوگ دن مین تمازت آفتاب کی وجہ سے یا عمرہ لاکر خستہ ہو جانے کے باعث طواف نہین کرتے وہ عموماً سہ پہر ہی کو طواف کرتے ہین۔ عصر کے بعد جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہی مطاف مین اور مصلون پر ہجوم بڑھتا جاتا ہی۔

حجاج اور اہل شہر سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق افطار کا سامان کرتے ہین۔ صاحبان خیر، ارباب ثروت اور اکثر حجاج کی طرف سے سامان افطار کی تقسیم بھی ہوتی رہتی ہی۔ کہین خرمے بٹ رہے ہین۔ کہین مٹھائیان۔ کہین تربوز کی پھانکین۔ توپ دغتے ہی لوگ باہم ملکر یا الگ الگ افطار کرتے اور نماز مغرب ادا کرتے ہین۔ نماز کے بعد کچھ لوگ کھانا کھانے گھر چلے جاتے ہین اور وہ جو عشا کے بعد کھاتے ہین رہ جاتے ہین۔ مغرب و عشا کے درمیان گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا فصل ہوتا ہی مغرب کے وقت ہی حرم شریف مین برقی روشنی ہو جاتی ہی۔ لیکن عشا کے وقت تک برقی روشنی کے علاوہ سارے صحن مین جگہ جگہ گیس کے لیمپ اور رنگ برنگ کی لالٹینین ہو جاتی ہین۔ کیونکہ نماز عشا کے بعد

حرم شریف مین جا بجا تراویح پڑھی جاتی ہے۔ مغرب کے سوا کل نمازون کے اوقات مین باالتزام جماعتین ائمۂ اربعہ کے نام سے موسوم مصلون پر ہوتی ہین اور انھین مین لپنے اپنے مسلک یا موقع کے لحاظ سے سب لوگ شریک ہوجاتے ہین۔ مغرب کے وقت صرف دو جماعتین حنفی اور شافعی مصلون پر پڑھائی جاتی ہین۔ مگر تراویح کے وقت کثیر التعداد جماعتین کھڑی ہوتی ہین۔ صحن کے اکثر حصون مین آگے پیچھے کئی کئی جگہ تراویح ہوتی ہے۔ اور ہر جماعت کے لیے علٰحدہ روشنی کا اہتمام ہوتا ہے۔ مین چونکہ آخری تاریخون مین پہونچا تھا اس لیے اکثر جگہ قرآن شریف کا ختم تھا۔ ختم کے لیے خاص اہتمام ہر جماعت کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ مقام جماعت سے قریب قالین یا دری کا فرش بچھایا جاتا ہے اور اس کے گرد گیس کے فانوس اور خوشنما لالٹینین روشن کی جاتی ہین۔ وسط مین سنگ مرمر کی میزون پر خوشنما گلدان وغیرہ رکھے ہوتے ہین۔ نماز تراویح سے فارغ ہوکر لوگ اس مقام پر جمع ہوتے ہین اور شرکاء جماعت کے علاوہ منتظمین کے دوست واحباب اور عام حاضرین حرم شریف مین سے بھی کچھ لوگ شریک ہوتے ہین پھر قاری صاحبان اور قرات کے طلبا ختم پڑھتے اور تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ مجھے کئی ختم دیکھنے کا موقع ملا مگر مین آخر وقت تک نہ ٹھہر سکا۔ حرم محترم مین معمولاً بھی کچھ کم روشنی نہین ہوتی۔ گو رقبہ کی وسعت یا سابقہ انتظامات کے لحاظ سے کم ہے کیونکہ سوائے مطاف کے جسکے گرد برقی روشنی کا مالا جگمگاتا رہتا ہے صحن اور دالانون مین ذرا فاصلہ سے روشنی ہوتی ہے۔ لیکن ماہ صیام مین مغرب کے بعد سے ختم تراویح تک تو صحن حرم بقعۂ نور معلوم ہوتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے دالانون مین دن کے سوا بہت کم کوئی بیٹھتا ہے اس لیے وہان روشنی کا بھی کوئی خاص اہتمام نہین کیا جاتا۔

رات کو حرم شریف مین ختم قرآن مین شرکت کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی تھی نیز اسی صبح کو رحمت شاہ سامان کے ساتھ آنے والے تھے اس لیے مین عمرہ لینے نہ جا سکا۔ رحمت شاہ طلوع آفتاب سے پہلے ہی پہونچ گئے۔ سامان نہ آنے کی وجہ سے ابتک احرام نہین کھول سکا تھا۔ کیونکہ جدہ سے روانگی کے وقت کپڑے ساتھ رکھنے کا خیال ہی نہین آیا تھا۔ حسن کے مکان مین جہان مین ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم لوگون کی بسر نہین ہوسکتی تھی اور چونکہ میر عبد العزیز صاحب سے گفتگو کے بعد یہ امر طے پاگیا تھا کہ مین اور وہ ساتھ ہی رہین اس لیے جمعیت بھی کافی ہوگئی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ پانچ اور آدمی تھے جنمین دو عورتین بھی تھین سامان آنے کے بعد مکان بدلنے کی زیادہ فکر لاحق ہوئی۔ یوسف نے کئی مکان دکھلائے اور بالآخر

اُن کے مکان سے قریب ہی ایک مکان میں گنی پر ٹھہر گیا۔ مکان چھوٹا سا تھا مگر یک منزلہ ہونے کی
وجہ سے اُس کی کھُلی چھت پر رات کو آرام لیٹ سکتے تھے اِس لیے غنیمت جانا۔ دو حجرے تھے چھوٹے
درجے تھے جن میں سے بڑی کوٹھری میں ہم لوگ رہے اور چھوٹی کوٹھری عورتوں کو دیدی گئی میر صاحب
کا باورچی خانہ بھی اُسی جانب رہا میں عموماً کسی دوکان ہی میں کھانا کھاتا تھا مگر جب کبھی رحمت شاہ
کا جی چاہتا تو وہ ہماری کوٹھری کی صحن میں لوہے کے چولھے پر کھانا پکا لیتے۔ میر صاحب نے ازراہِ شفقت
بہت اصرار کیا کہ میں اس سفر میں برابر انھیں کا مہمان رہوں اور چونکہ وہ ہندوستان سے کثیر مقدار میں
جنس ساتھ لائے تھے اِس لیے اُن کا خیال تھا کہ میرے کھانے کے لیے اُن کو نئی جنس خریدنا نہ ہوگی۔
اور جو جنس وہ ساتھ لائے تھے ظاہر ہے کہ اُس کو واپس لیجانا اُن کو منظور نہ تھا لیکن میں نے اسے قبول
نہ کیا۔ دوسرے دن میں پھر عمرہ لینے گیا۔ اتفاق سے پاؤں میں موچ آگئی جس کی وجہ سے طواف و
سعی کے بعد سو کر اٹھا تو کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ اُس پر طرہ یہ کہ نئے مکان میں سامان بھی منتقل کرنا تھا۔
خدا بھلا کرے رحمت شاہ کا کہ اُن کی وجہ سے سامان کے منتقل کرنے میں مجھکو بہت کم محنت پڑی۔ بھاری اشیا
تو حمال نے پہونچا دیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں رحمت شاہ نے اور میں نے مل کر رکھوائیں۔ درد کی تکلیف
بڑھ رہی تھی اِس لیے میں شفا خانہ چلا گیا جو حرم شریف اور ہمارے جائے قیام کے درمیان راستہ
ہی میں پڑتا تھا۔ تین بار شفا خانے گیا مگر دوا نہ لگی۔ اس لیے کہ دو بار تو ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے
اور تیسری دفعہ ملے تو فرمایا کہ اپنے سطوت کے ساتھ آؤ۔ رمضان المبارک کا صرف ایک دن اور باقی تھا
لہٰذا عمرہ کے لیے جانا ضروری تھا۔ لیکن جب سحری کے وقت اُٹھا تو پاؤں کے درد کی وجہ سے پیدل
جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ نماز فجر کے وقت ایک گدھا قرش میں کرایہ پر لیا اور اُس پر سوار ہو کر عمرہ لینے گیا
واپس آ کر طواف و سعی کر کے اپنے جہاز کے ساتھی میاں نظام الدین کے مکان پر چلا گیا۔ اور انھیں کے
یہاں سوتا رہا۔ رمضان کی وجہ سے اِس کا موقع کم ملتا تھا کہ ان لوگوں سے ملتا۔ تاہم ایک بار پہلے بھی ان کے
یہاں گیا تھا۔ اہل شہر میں ابتک کسی سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف مشہور دہلی کے تاجر حاجی علی جان
کی کوٹھی تک جو حرم شریف سے بالکل متصل ہے جا سکا۔ وہ بھی اس ضرورت سے کہ میرے اور میرے ساتھیوں
کے پاس جو زر نقد تھا اُسے اُن کے یہاں بطور امانت جمع کرانا تھا۔ یہ لوگ بڑے صاحب خیر اور خلیق ہیں۔
حجاج کو ان کی ذات سے بہت آرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دیں۔ دوسرے دن عید ہونیوالی تھی

اس وجہ سے شام کو بعد عصر تین گولے عام اطلاع کی غرض سے چھوٹے۔ رات کو چونکہ تراویح اور سحری کی فکر نہ تھی اس لیے مغرب اور عشا دونوں نمازوں کے بعد بازار کی سیر کی۔ ایک خونچہ والے کے پاس بالائی بالکل ہندوستان جیسی جمی ہوئی دیکھ کر فوراً طبیعت راغب ہوئی۔ اور باوجودیکہ کھانا کھا چکا تھا اور صرف قہوہ خانے میں چائے پی رہا تھا لیکن ایک پیالی بالائی چٹ کر گیا۔ مگر کھانے کے بعد جب اس میں ترشی محسوس ہوئی تو بہت پچھتایا۔ معلوم ہوا کہ دہی پر سے بالائی اتار کر جمع کی گئی تھی۔

عید کی نماز کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ سویرے ہی ہو جاتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ مجمع زائد ہوگا اس لیے نماز فجر سے پہلے ہی کپڑے بدل لیے گئے اور حرم شریف میں پہونچا تو اس وقت بھی کافی ہجوم تھا بہر حال مجھے بغیر کسی دقت کے مقام ابراہیم کے سامنے ممبر سے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ آفتاب نکلنے کے بعد ہی خوشنما گنگا جمنی علم جن میں زرکار پھریرے لگے ہوئے تھے لاکر ممبر کے دونوں جانب لگا دیے گئے۔ ممبر تقریباً ۴، ۵ گز لمبا ہے اور نشست کے مقام پر ایک برجی بنی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے بنانے میں ایسی صنعت کی گئی ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو کبھی خطیب کے چہرہ پر دھوپ نہیں پڑتی۔ برجی سے نیچے زینا ہے جس پر پوشش پڑی ہوئی تھی۔ ممبر کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے صرف جمعہ کے دن یا عید کے موقع پر کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب ہی چند خوجے کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجمع میں کسی قدر حرکت پیدا ہوئی۔ اور بعض لوگ کھڑے ہو گئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ شریف کہ اپنے مصاحبین و مقربین خاص کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نماز ہوئی۔ اور نماز کے ختم ہوتے ہی چاروں مصلوں کے امام ممبر پر گئے اور حنفی خطیب نے خطبہ پڑھا۔ خطیب صاحب کی آواز اگرچہ بہت بلند نہیں تھی لیکن اُن کا انداز تقریر ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ سنائی دیتا تھا۔ کم سے کم اُن لوگوں کو جو بہت دور نہ ہوں۔ خطبۂ اولیٰ کے بعد جب خطبۂ ثانی پڑھا جا رہا تھا تو حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نام نامی لینے کے بعد خطیب صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شریف صاحب کا نام لیا اور اس موقع پر سب حاضرین کھڑے ہو گئے۔ غالباً شریف کے اشارہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ ورنہ تعظیم کے زیادہ مستحق اُن اصحاب کے اسمائے گرامی تھے جو شریف کے نام سے پہلے لیے گئے تھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا غنیمت ہے کسی نے مجھے ٹوکا نہیں خطیب صاحب کے خطبہ کا پورا اثر تو عربی داں اشخاص ہی پر پڑ سکتا ہے مگر عربی زبان کی دلکشی اور خطیب صاحب کا موثر

انداز ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ضرور ہوتا ہوگا۔ نماز کے بعد ہندوستان کی طرح عام طور پر بغلگیر ہونے کا دستور
نہیں ہے البتہ اکثر لوگ باہم معانقہ کرتے ہیں اور خطیبوں کی دست بوسی کے لیے بھی بہت لوگ منتظر رہتے ہیں۔
میرے قریب چونکہ شناساؤں میں سے کوئی نہ تھا اس لیے میں جلدی سے اُس دروازہ کی طرف گیا جدھر
شریف کی نشستگاہ ہے مگر میرے وہاں تک پہونچنے میں اتنی دیر لگی کہ شریف کی واپسی ہوچکی تھی۔ البتہ
سڑک پر شرطون (پولس) کی جمعیت صف آرا تھی، جو تھوڑی دیر کے بعد ضابطہ فوجی کے مطابق منتشر
ہوگئی۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بازار بند ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ تین روز تک عموماً بازار بند
رہیں گے صرف کہیں کہیں اشیائے خوردنی فروخت ہو رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر پولیس کی جمعیت کے قریب کھڑا
رہا اور اُن کی قواعد دیکھتا رہا۔ اور صفوں کے منتشر ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ ساتھیوں سے تبادلۂ تہنیت
کے بعد رحمت شاہ کے ساتھ اس جستجو میں روانہ ہوا کہ کہیں کچھ کھانا میسر آئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اور کلچوں۔
پکوڑیوں اور چٹنی پر قناعت کرنا پڑی۔ ایک شخص سے تھوڑی آئس کریم لیکر کھائی تو اگرچہ آئس کریم خود
کچھ زیادہ مزے دار نہ تھی لیکن تشنگی کے عالم اور گرمی کے موسم میں بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پہلے مجھے کسی قدر
حیرت ہوئی کہ یہاں جب برف نہیں ہے تو آئس کریم کیسے تیار ہوتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چند مشینیں یہاں
ہیں جن میں شورے وغیرہ کی امداد سے آئس کریم تیار ہوتی ہے۔ شام کو ایک مرشد زادہ سے جو کہ مکۂ معظمہ میں
مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں ملا۔ بڑے اخلاق و محبت سے ملے اور ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ میرے پاؤں
کا درد ابھی تک نہیں گیا تھا۔ اُنھوں نے حال سنکر دوسرے روز دوا دینے کا وعدہ کیا۔

ایک روز عصر کے بعد حرم شریف میں ایک جگہ کچھ حضرات جمع تھے۔ اتفاق سے میرے ایک ہم وطن
تاجر بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میں اُدھر سے گذرا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا مجھے اُن اصحاب سے
ملایا۔ جناب مولوی محب الدین صاحب خلیفہ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بھی وہاں تشریف فرما
تھے۔ بڑی عنایت و محبت سے پیش آئے اور اپنے مصلے پر بٹھا کر دیر تک مزاج پرسی فرماتے رہے اور رخصت ہوتے
وقت بہت کچھ دعائیں دیں۔ ایک صاحب جو وہیں کے مدرسہ میں مدرس ہیں اور اتفاق سے میرے ہمنام
ہیں بہت اخلاص سے ملے اور میرے ساتھ ہی اُٹھے اور فرمانے لگے کہ حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی کے
صاحبزادوں کے یہاں جا رہا ہوں میں بھی چونکہ اسی سلسلہ کا غلام ہوں اس وجہ سے اُن کے ہمراہ چلا گیا اور

صاحبزادگان سے قدم بوسی حاصل کرکے بہت محظوظ ہوا۔ اُن کے یہاں اُس وقت قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اُس میں شرکت کا موقع ملا اور صاحبزادہ صاحب سے پھر قدم بوسی حاصل کرنے کا دعا کرکے واپس آیا۔

عید کے دوسرے دن مرشد زادہ سے ملکر پاؤں میں لگانے کی دوا لی تو اُنھوں نے کہا کہ زیادہ چلنا پھرنا نہ چاہیے۔ اگرچہ اس کی پابندی مشکل تھی اس لیے کہ مدینہ منورہ کا قافلہ شوال کو جانے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے پہلے تمام ضروری انتظامات سفر کرنا تھے تاہم عید کی وجہ سے چونکہ بازار بند تھے اس لیے کسی قدر سکون کا موقع ملا۔ ظہر کے بعد اتفاق سے میرے ہمنام صاحب پھر حرم شریف میں مل گئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ کے یہاں حاضر ہوا۔ وہاں بھی قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ قرآت سے لذت اندوز ہونے کا چونکہ مجھے اپنے پیرو مرشد کے طفیل میں یہاں اکثر موقع ملتا ہے اس وجہ سے میں ایسے مواقع کا شائق رہتا ہوں اور عربوں کی قرآت تو ہر بھی حد درجہ وجد آور۔ حرم محترم میں متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بعض نابینا قاری قرآت سنایا کرتے ہیں اور اگرچہ یہ امر مجھے پسندیدہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ قرآت سنانے کو حصول خیرات کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں تاہم میں اکثر اُن کی قرآت سنا کرتا تھا۔

عید کے دنوں میں چونکہ تین دن تک برابر لوگ اپنے احباب و اعزہ سے ملتے رہتے ہیں اس وجہ سے اپنے ہمنام کے ساتھ جن مدرس صاحب کے یہاں گیا تھا اُن کے یہاں بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی اور یہیں پہلی بار یہ بات دیکھنے میں آئی کہ مہمانوں کے سامنے علاوہ چلے کے ایک خوشنما شیشے کے ظرف میں انگریزی مٹھائی پیش کی گئی جس میں سے ہر شخص نے ایک دو ڈلیاں لے لیں۔ یہ مٹھائی چونکہ ابتداءً شام کی طرف سے آتی تھی اور غالباً وہاں بنتی بھی ہوگی اس لیے شامی مٹھائی کہی جاتی تھی حالانکہ اب عام طور پر یورپ سے آتی ہے اور بارٹن کے مشہور انگریزی کارخانہ کی بنی ہوتی ہے۔

اُسی روز اُن کرم فرما سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی جن کے پتہ پر میں نے اپنی ڈاک منگائی تھی اور اپنے خطوط وغیرہ پاکر بہت خوش ہوا۔ یہیں ضیاء الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی جو علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ، ضلع مظفرنگر کے رئیس اور خلافت کمیٹی کے ممتاز عہدہ دار ہیں اور دونوں صاحبوں سے ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے روز صبح کو بازار کی طرف گیا تو اگرچہ بازار بند تھا مگر صفا اور مروہ کے درمیان جہاں سعی کرتے ہیں ایک جگہ جلسہ کا ساز و سامان دیکھ کر کچھ دیر اس خیال میں ٹہلتا رہا کہ جلسہ کی کارروائی کچھ سنوں

لیکن زیادہ دیر چلنے کی وجہ سے پاؤں میں درد محسوس ہوا اس لیے چلا آیا۔

عید کے ایام مسرت ختم ہو گئے اور بازار کھل گئے تو سامان سفر کی خریداری پر متوجہ ہوا چونکہ میں یہ سن چکا تھا کہ مدینہ منورہ میں قافلہ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے حتی کہ چالیس نمازیں بھی حرم نبوی میں نہیں پڑھنے کا موقع ملتا اور میں تو آستانۂ رسالت پناہی پر زیادہ دنوں تک جبہہ سائی کا آرزومند تھا اور متمنی تھا کہ حتی الامکان پورے چالیس روز کی حاضری کا موقع ملے اس لیے میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں جاؤں گا پہلے قافلے کے ساتھ اور واپس آؤں گا سب سے آخری قافلہ کے ہمراہ لہذا اس امر کی کوشش کی گئی کہ یک طرفہ اونٹ کا انتظام ہو جائے۔ مگر جتنے اصحاب سے دریافت کیا سب نے مایوس کن جواب دیا۔ اور ہمارے مطوف صاحب کے کارکن یوسف نے وعدہ بھی کیا تو بالآخر اس کا ایفا نہ کر سکے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ اونٹ والا اس شرط سے راضی تھا کہ نصف کرایہ سے ایک اشرفی زائد دی جائے مگر جب شیخ المطوفین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اُنھوں نے اجازت نہ دی' ہر حال میں مجبور ہو گیا۔

اب دشواری پیش آئی کہ میں تنہا تھا۔ ساتھیوں میں سے کسی کے اونٹ پر جگہ نہ تھی۔ اور رحمت شاہ خرچ کی قلت کے باعث مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ ہیں کہ معظمہ میں نوکری کر کے رہ پڑیں گے۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر ہی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے نوکری سے مایوس ہو گئے۔ اس لیے اُن کا خیال ہوا تھا کہ حج کر کے ہندوستان واپس جائیں گے۔ ہمارے جہاز کے ساتھی میاں نظام دین کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے ازراہ فیاضی اُن سے کہا کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے اُس سے مدینہ منورہ کی زیارت تو کر آؤ۔ واپسی کے مصارف کا انتظام ہم کر دیں گے۔ بس رحمت شاہ اس سفر میں بھی میرے ہمراہ رہے۔ اور ہم دونوں کے لیے ایک اونٹ کر لیا گیا۔

اگرچہ اس ملک کا عام سکہ چاندی کی مجیدی (ترکی روپیہ) اور رائج کے قرش ہیں لیکن حکومت کی طرف سے دونوں کا کرایہ ہر اونٹ ۲ مجیدی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ ۱۲/ کے حساب سے گنیاں اور ۱۲/ میں مجیدی لیکر میں نے کرایہ ادا کیا اور اس رقم کے علاوہ ہے فی کس شغدف کا کرایہ اللہ فی کس حق ترجمانی اور ہر منازل میں مشعل جلانے کی اجرت یعنی مجموعہ ما ۔ دینا پڑے۔ رحمت شاہ نے چونکہ گنیاں بعد میں لیں اس وجہ سے اُنھیں ۱۲/ کے حساب سے لیں۔ مگر اتفاق سے حق ترجمانی اور اُجرت مشعل کی رقم سے وہ بچ گئے۔ ترجمان کی اُجرت کی یہ بنا ہے کہ ہر علم کی طرف سے ایک شخص حاجیوں کے ساتھ جاتا ہے جو راستہ

یعنی حجاج اور بدوؤن کے درمیان ترجمانی بھی کرتا ہے اور عام طور پر حجاج کی راحت رسانی کا سعین رہتا ہے۔

ہم لوگون نے اپنا کل روپیہ علی جان کی کوٹھی مین جمع کرا دیا تھا۔ چلنے سے قبل اُن کے یہان سے ایک ایک حوالہ مدینہ منورہ مین اُن کے نمائندے کے نام سے لیا اور راستہ کے مصارف کے لیے کافی روپیہ مجیدیان اور قرش سب طرح کے سکے رکھ لیے۔ سامان سفر کچھ بہت زیادہ درکار نہ تھا اس لیے کہ ہم مین سے ہر شخص مسافر ہی تھا۔ مگر اپنا کل سامان ساتھ لے جانا منظور نہ تھا۔ دوسرے تسعدن کے لیے بعض اشیا کی ضرورت تھی اور مدینہ سورہ تک کے لیے جنس بھی ساتھ لینا تھی۔ شفقی پیر عبدالعزیز صاحب تو ہندوستان ہی سے جنس ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگون کو جنس خریدنا پڑی۔ جو چند روپیہ مین فراہم ہوگئی۔ خیال تھا کہ اشیاے خوردنی بہت گران ملین گی اور اگرچہ اکثر چیزون کا نرخ ہندوستان کے مقابلہ مین دگنا تھا تاہم جب اس امر پر نظر کی جاے کہ یہ اجناس بالعموم ہندوستان مصر عراق جیسے دور دراز مقامات سے آتی ہین تو ہرگز گران نہ معلوم ہونگی۔ اجناس کی خریداری مین ایک صاحب کی وجہ سے بہت آسانی ہوئی جو دفتر النائب کے ایک کارکن مولوی جعفر علی صاحب کے دور کے رشتہ دار ہین اور جن کے والدین عرصہ ہوا ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہین۔ تسعدن کے لیے ہین اشیاء ذیل درکار تھین پیراہیان، چٹائیان، زنبیل اور شکیزے۔ ان چیزون کے لیے مرشد زادہ صاحب سے عرض کیا کہ کسی واقف کار شخص سے منگوا دین اُنھون نے ازراہ محبت انتظام تو کر دیا مگر جو شخص چیزین خرید کر لایا اُس نے شرارت سے یا ممکن ہے کہ نادانی سے تقریباً دگنے دام صرف کرا دیئے۔

کلکتہ سے روانگی کے وقت بعض اصحاب نے کچھ رقوم خیرات میرے حوالے کر دی تھین۔ جو رقوم مخصوص لوگون کے لیے تھین ان کے متعلق تو مجھے صرف اسی قدر اہتمام کرنا پڑا کہ جلد سے جلد اُن لوگون سے مل کر دیدون البتہ جو رقوم یہ کہکر دی گئی تھین کہ مستحق لوگون مین تقسیم کر دی جائین۔ اُن کو مستحق لوگون تک پہونچانے مین بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ کہ معظمہ مین جس قدر رقم تقسیم کرنے کی تھی اُس کا بڑا حصہ مرشد زادہ کے ساتھ ایک ایک گھر پر جا کر دیا گیا اور بقیہ حصہ ایک دوسرے بزرگ کی معرفت اُسی طریقہ پر صرف کیا گیا۔ مرشد زادہ ہی کی معیت مین جناب شیخ حسام الدین بخاری کی خدمت مین حاضر ہوا آپ کا عرف شیخ سینی ہے۔ اور طریقہ نقشبندیہ کے بزرگ ہین۔ آپ کا دولت خانہ حرم محترم سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے اور جتنے لوگون سے ذکر آیا سب نے بالاتفاق آپ کی بزرگی و عظمت کا اقرار کیا۔ آپ کی عمر

بہت زیادہ ہو۔ اندازاً سو برس سے اوپر۔ مگر ضعیفی کے باوجود روزانہ نماز فجر اول وقت جماعت شافعی کے ساتھ حرم شریف مین ادا کرتے اور اُس وقت سے لیکر طلوع آفتاب تک وہین حلقہ فرماتے ہین۔

اہل عرب کی مہمان نوازی اس قدر مشہور ہو کہ یہان اس کا تذکرہ فضول ہوگا۔ مکہ معظمہ مین کسی کے یہان جائیے تو جانے کی ضیافت ضروری ہو حقہ سگریٹ بھی اکثر لوگ پلاتے ہین۔ اور سوکھے پانون کی گلوریان بھی کہین کہین ملتی ہین۔ شیخ کے یہان بھی جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوتا تو کثر ایسا ہوتا کہ جائے لوا کہات یا کھانے کے بغیر وہ رخصت ہونے دیتے۔ نا وقت اوقات مین بھی وہ اکثر اصرار فرماتے اور مجھے مجبور ہونا پڑتا۔

حرم شریف مین توجسقدر ممکن ہوتا ہو آب زمزم پیا جاتا ہو۔ چاہ زمزم پر ہر وقت سقے موجود رہتے ہین جو صبح سے لیکر عشا کے وقت تک پانی پلاتے رہتے ہین۔ اس کے علاوہ صحن حرم مین جا بجا لوگ صراحیان لیے ہوئے پھرتے اور پانی پلاتے رہتے ہین اور بہت سے حجرے دن مین مختلف سبیلون کے ہنمین کی طرف سے پانی جمع رہتا ہو اور حجاج کے زمزمیون کی طرف سے بھی حرم شریف مین شام کے وقت پانی پلایا جاتا ہو اور گھرون پر بھی آب زمزم کی صراحیان بھیجی جاتی ہین۔ آب زمزم اگرچہ ذائقہ کے لحاظ سے شیرین نہین اور عموماً ٹھنڈا پینے کو نہین ملتا لیکن اس مین عجیب عجیب برکتین ہین اس لیے جسقدر ملتا پیا جاتا۔ شہر مین نہر زبیدہ کا پانی عام طور سے ملتا ہو جو نہایت شیرین اور لطیف ہو۔ عام صرف کیلیے اکثر لوگ کنوئین کا کھاری پانی بھی لیتے ہین۔ مین پانی عادتاً زیادہ نہین پیتا مگر مکہ معظمہ مین کچھ تو موسمی حرارت و خشکی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ چلنا زیادہ پڑتا تھا، بکثرت پانی پیتا تھا اور بجائے اسکے کہ نقصان پہنچتا صحت کے لیے وہان کے پانی سے زیادہ کوئی چیز مفید معلوم نہین ہوئی۔ کیونکہ جسقدر غذا ناموافق ملتی تھی اُسی قدر قوت ہاضمہ اس سے کم متاثر تھی۔ بلکہ سچ یہ ہو کہ ایسی ناموافق غذا یہان رہ کر ہضم ہی نہین ہوسکتی۔

مرشد زادہ کی معیت مین جنت المعلیٰ کی حاضری بھی دے آیا۔ پیر عبدالعزیز صاحب تو دیگر زیارتگاہون پر بھی ایک صاحب کے ساتھ حاضری دے آئے تھے۔ مگر مین نے مدینہ منورہ سے واپسی پر زیارتگاہون پر حاضری ملتوی رکھی۔

۹ شوال ۱۳۰۰ھ (؟) ہماری روانگی کا دن متعین تھا۔ مگر جب عصر کے وقت تک اونٹ نہ آئے تو ہم لوگ مطمئن ہوگئے کہ آج روانگی نہ ہوسکے گی۔ شام کے قریب دفعتاً اونٹون کے آجانے کی اطلاع ملی اور جلدی جلدی شغدفون پر سامان رکھا گیا۔ سامان رکھکر ہم لوگ حرم شریف چلے گئے جہان نماز مغرب کے بعد

طواف وداع کیا اور باب الوداع کی طرف سے رخصت ہوے۔ ہمارے اونٹ حرم شریف کے باہر ہی کھڑے تھے اس لیے فوراً سوار ہو کر ایک گھنٹہ مین شہدا پہونچ گئے۔ یہ مقام کہ معظمہ کے نواح مین تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر مسجد تنعیم سے قریب ہے۔ شہر سے تمام قوافل یہان آ کر جمع ہوتے ہین اور ایک دن کے بعد جب قافلہ پورا اکٹھا ہو جاتا ہے تو روانہ ہوتا ہے۔ قوافل کا یہ اجتماع "تبریز" کی اصطلاح سے موسوم ہے۔ شغدف پر پہلی بار سوار ہونے کا اتفاق ہوا تھا اس لیے یہ مختصر سفر بجائے تکلیف دہ ہونے کے بہت فرحت کا موجب ہوا۔ میرے شریک شغدف رحمت شاہ ماشاء اللہ بہت تندرست و توانا تھے لہذا شغدف کا وزن برابر کرنے کے لیے جنس کا بڑا حصہ میرے شغدف پر رکھ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے مجھے جنبش تک کا موقع نہ تھا۔ شہدا پہونچ کر سب سے پہلے پانی کی فکر ہوئی۔ تلاش سے ایک کنوان ملا جہان پانی بھر کر وضو کیا گیا اور نماز کے بعد شغدف کے سامنے زمین پر بچھونا بچھا کر پڑ رہے۔ صبح کو مین اور دو ساتھی مکہ معظمہ واپس آئے۔ بعض ضروری چیزین رہ گئین تھین اُن کو گھر اور بازار سے لیکر ساتھیون کو تو مین نے دوپہر ہی کو رخصت کر دیا اور مین نماز کے بعد اپنے مہتمم ڈاک کی خدمت مین حاضر ہوا۔ اتفاق سے گھر کے خطوط اور اخبارات آ گئے تھے۔ عجلت مین خطوط کے جواب تو لکھ دیے مگر اخبارات لینا بھول گیا اور ایک گدھا کرکے سہ پہر تک قافلہ مین آ کر ملگیا۔ یہان میدان مین دھوپ کی تمازت سے لوگ بدحواس ہو رہے تھے اور پانی کی قلت مزید برستم ڈھا رہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا اور وضو کے لیے ساتھیون کے پاس ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔ قریب ہی اگرچہ بازار بسا ہوا تھا جہان ضروری اشیائے خوردنی ملتی تھین مگر پانی کہین بھی نہین ملتا تھا۔ البتہ کنوئین پر سقے بھر رہے تھے مگر وہ بات بھی نہین سنتے تھے۔ آخر بعد تلاش بسیار ایک کنوان ملا جہان کوئی سقہ نہ تھا اور مین نے اور رحمت شاہ نے مل کر پانی بھرا۔ وضو کیے اور ایک ایک ٹین بھر کر اپنے مقام تک لائے۔ اس قسم کی جسمانی محنت کا مین بالکل نا اہل ہون اس وجہ سے پانی کا ٹین لانا گویا ایک عظیم الشان مہم تھی۔ اور اگرچہ بالآخر مین اس مہم کو سر کر سکا مگر پانی کا ایک معقول حصہ ضایع ہو گیا اور میرے کپڑے شرابور ہو گئے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اگرچہ فی الجملہ اس کی کوئی تکلیف نہین ہوئی لیکن بہت پست ہو گیا۔ نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ عین اُسی وقت دیکھا کہ شریف کی سواری آ رہی ہے۔ سبزہ گھوڑے پر شریف سوار تھے اور ان کے پیچھے ایک دو سو آدمی اور گھوڑون پر سوار اور جلو مین مختصر سی جماعت خدام اور محافظین کی تھی۔ شریف ایک پہاڑی کے دامن پر

گھوڑے سے اُترے پہاڑی کے ایک حصہ پر جو زیادہ بلند نہ تھا ایک جگہ کسی قدر ہموار تھی یہاں چند
اونی دریاں بچھا دی گئیں اور شریف معہ دو ایک ساتھیوں کے وہیں جا کر بیٹھ گئے اور بقیہ ہمراہیوں میں سے
کچھ تو نیچے گھوڑوں کے پاس کھڑے رہے یا بیٹھ گئے اور کچھ شریف کے عقب میں پتھروں کی آڑ میں ہو گئے۔ ایک
کرسی شریف کے قریب شاید اُن کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی مگر وہ دری پر بیٹھے۔ ایک دوربین اُن کے پاس
تھی اُس کے ذریعہ سے کبھی وہ قافلہ کا نظارہ کرتے اور کبھی اُس کو کرسی پر رکھ کر ساتھیوں سے بات چیت کرتے۔
میں نے اس سے قبل شریف کو نہیں دیکھا تھا اس لیے میں غور سے دیکھتا رہا اور اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا اور
میری نگاہ بھی کمزور ہے تاہم میں ان کی حرکات و سکنات کو بخوبی دیکھ سکا۔ اب قافلہ روانہ ہونے لگا اور مختلف
جوانب میں شغدف اونٹوں پر کسے جانے لگے جس کی وجہ سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ادھر ہمارے
بدوؤں نے اکثر شغدفوں پر سامان رکھنے کا تقاضا کیا۔ ہمارے ترجمان صاحب ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے
بلکہ عصر کے قریب ہمارے ملک کے وکیل عبدالرحمن قشاش کے ساتھ آئے۔ یہ صاحب تنہا ہمارے قافلہ کے
ترجمان نہ تھے بلکہ ایک اور مختصر قافلہ دوسرے ملک کے حاجیوں کا بھی ان کے تحت میں تھا۔ وکیل صاحب نے
ہر اونٹ کے کرایہ میں سے دو دو گنیاں ہمارے پاس اس غرض سے جمع کیں کہ یہ رقم مدینہ منورہ پہونچ کر اپنے
بدوؤں کو دیں۔ یہ کل رقم سید عبدالعزیز صاحب کے پاس جمع کرا دی گئی کہ ہمارے مختصر قافلہ کے سردار وہی تھے۔
دوسرے شغدفوں کے مقابلہ میں میرے یہاں سامان زیادہ تھا۔ اس پر ہمارا بدو عبدالرحمن بہت جز بز ہوا۔
دیر تک حجت ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ راستہ میں ناقص جنس خریدنا مجھے منظور نہیں اس لیے میں نے
مدینہ منورہ تک کے لیے سامان یہیں سے ساتھ لے لیا ہے۔ البتہ اگر بدو اس پر رضامند ہو کہ اُس کو راہ میں کھانا
نہ دیا جائے تو مجھے کچھ عذر نہ ہوگا اگر نصف جنس یہیں چھوڑ دی جائے۔ بدو پہلے تو بہت ناراض ہوتا رہا اور
جیسا کہ عموماً بدوؤں کا قاعدہ ہے بہت قسمیں بھی کھاتا رہا لیکن بالآخر وکیل صاحب نے جب یہ تصفیہ
کر دیا کہ میں ایک روپیہ اُس کو دے دوں تو وہ راضی ہو گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر جب ہم اونٹوں پر سوار ہوئے
اور ہمارا قافلہ چلا تو عبدالرحمن کے بجائے ایک دوسرا بدو میرے اونٹ کے ساتھ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ
وہ عبدالرحمن کا بھائی ہے اور اُس کا نام عمار ہے۔ مکہ معظمہ کے حالات میں اس وجہ سے بہت اختصار کرنا پڑا ہے کہ
مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد زیادہ دنوں وہاں حاضر رہنے کا موقع ملا اور اُس کا مفصل ذکر انشاء اللہ آئندہ
کیا جائے گا۔

پانچوین منزل

شہداسے نکلکر مسجد تنعیم کے آگے اونٹ رُک گئے۔ یہان ایک جانب حکومت کے کارکن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور گیس کی تیز روشنی مین اونٹون کا شمار کر رہے تھے۔ ہمارے معلم کے کارکن یوسف نے اپنے سب اونٹ شمار کرا دیے اور ضروری مراسم تحریر ادا ہوگئے تو وہان سے رخصت ہوکر آہستہ آہستہ قافلہ روانہ ہوا۔ اور دن بھر کی ماندگی کے اثر سے فوراً نیند آگئی۔ مگر شغدف پر مسلسل سونا اور وہ بھی پہلی رات' قطعاً ناممکن تھا اس لئے کہ جمال (شتربان) بار بار 'میزان میزان' کے آوازے لگاکر مسافرون کو اپنے اپنے شغدفون کا توازن برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے تھے اور چونکہ اونٹون کی دو تین قطارین پاس پاس چلتی تھین اس وجہ سے کبھی آگے پیچھے کے شغدف ٹکرا جاتے تھے اور کبھی برابر برابر چلنے والے شغدف باہم الجھ جاتے تھے۔ نصف شب کے بعد دور سے روشنی دکھائی دی تو ہم نے سمجھا کہ منزل قریب آگئی ہے۔ چنانچہ تقریباً ۲ بجے رات کو پڑاؤ پر پہونچے۔ جمالون نے فوراً ہی 'انزل انزل' کہکر اترنے کا تقاضا

۲۰ مئی روز یکشنبہ

شروع کیا۔ جلدی جلدی آنکھ ملتے ہوے اترے شغدفون کو انھون نے ہم لوگون کی مدد سے بعجلت تمام اوتار پھینکا اور اونٹون کو لیکر چلتے بنے۔ ہمنے امداد باہمی سے اپنے اپنے شغدفون کا سامان اوتارا۔ زمین پر چٹائیان اور بچھونے بچھائے کہ اتنے مین آواز آئی "حطب" فوراً تھوڑی لکڑی خریدی گئی اور پھر جب "موبا موبا" کی صدا لگاتے ہوے مرد عورتین اور بچے مشکیزون اور مٹی کے کنستڑون مین پانی لائے تو ضرورت کے مطابق پانی لیا گیا۔ وقت اتنا نہ تھا کہ سوتے لہذا تھوڑی دیر باتون مین گذار کر نماز فجر ادا کی۔ مین نے اپنے ساتھیون سے طے کر لیا تھا کہ لکڑی اور پانی کی فراہمی اور بازار کے دوسرے کام میرے متعلق رہین گے کھانا پکانا یا پکوانا اور جاے قیام پر دوسرے امور کی نگرانی

وہ کرین گے۔ لکڑی اور پانی چونکہ بآسانی فراہم ہو گئے تھے اور دونون چیزون کے
بیچنے والے مسلسل آتے رہتے تھے اس لئے نماز ظہر کے بعد ہی مین نے پڑاو کا گشت لگایا
اور بازار کا پتہ چلایا۔ ہمارا حاجی قافلہ ایک بلندی کے دامن مین تھا اور دور تک شغدف ہی
شغدف نظر آتے تھے۔ ہر معلم کے حجاج کی الگ الگ ٹولی تھی اور عموماً ان کے شغدف
پاس پاس ایسے طریقہ پر رکھے گئے تھے کہ دائرہ یا نصف دائرہ کی صورت بن جائے
درمیانی میدان مین لوگ اپنے بچھونے بچھاتے اور چولھے چڑھاتے۔ جن لوگون کے ساتھ
راوٹیان یا تمبو تھے انھون نے شغدفون سے کچھ فاصلہ پر ڈیرے جمائے تھے۔ یہ سلسلہ
بلندی کے اوپر تک چلا گیا تھا مین گھومتا ہوا ادھر پہونچا تو دیکھا کہ بلندی کے اس
جانب نہر روان ہے۔ جس کے کنارے بکثرت اونٹ اور آدمی جمع ہین۔ یہ نہر وہی ہے
جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پانی مکہ معظمہ مین پیا جاتا ہے۔ اس کا
اکثر حصہ پٹا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہان دور تک کھلی ہوئی ہے۔ نہر کا عرض بہت
ہی کم ہر کسی جگہ تین چار فٹ ہی ورنہ عموماً دو فٹ سے زیادہ نہین تھے بڑے بڑے الومنیم
کے تسلے اونٹون کے سامنے رکھے ہوے تھے اور جا بجا چمڑے کے ڈولون سے پانی
بھر بھر کر پلا رہے تھے۔ پاس ہی سیکڑون آدمی غسل کر رہے تھے جس مین مرد و عورت
کی کچھ تمیز نہ تھی۔ یہ لوگ عموماً ملک جاوہ کے رہنے والے تھے۔ ان لوگون مین لحاظ ہر حیا و
غیرت کا نام نہین ہے۔ جس طرح ہندوستان مین دریاؤن کے گھاٹون پر ہندو
مرد و زن ملکر اشنان کرتے ہین، بعینہ یہی حالت جاویون کی تھی۔ بعض لوگ نہر کے
اندر نہا رہے تھے۔ اور چونکہ نہر کا عمق بھی بہت کم ہے اس وجہ سے مرد و زن سب برہنہ
یا نیم برہنہ نظر آتے تھے۔ نہر کے کنارہ دور تک کھیتی اور نخلستان دکھائی دیتے تھے
کنارہ سے ذرا ہٹکر ایک سمت کو بازار بسا ہوا تھا۔ یہان اونٹ گائے، بکری اور
دنبہ کا گوشت، انڈے، روٹیان، سبزی، خربزے، تربوز، جبن، تیل، چائے، شکر
اور تمباکو وغیرہ ضرورت کی سب چیزین بک رہی تھین۔ بازار جھونپڑیون کا بنا ہوا تھا
اور بیلون سے منڈھے ہونے کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتا تھا کھانے کی دوکانین

اور قہوہ خانے متعدد تھے ۔ میں چونکہ گھومتا ہوا پہونچا تھا اس وجہ سے ذرا دیر میں پہونچا ورنہ ہمارے مقام سے ایک فرلانگ سے زائد فاصلہ نہ ہوگا ۔ واپس آکر ساتھیوں کو چائے اس اور کھانا کھانے کی فکر ہوئی ۔ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا ۔ تمازت بڑھ رہی تھی اور ہوا کی حدت ترقی پر تھی ۔ دن اسی بے پناہ میدان میں بسر کرنا تھا لہذا لیٹنے ۔ بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ بنانا ضروری تھی ۔ مگر ناواقفیت اور پہلے سے اس کا خیال نہ آنے کی وجہ سے ہمارے شغدف بہت ناموزوں رکھے گئے تھے ۔ بہرحال موقع کے لحاظ سے پانی بھرنے کی تھیلیوں اور چادر و رضائی کی مدد سے ایک جگہ ایسی بنائی گئی جہاں سایہ رہ سکے اور کھانا کھا کر سو رہا ۔ ظہر کے قریب اٹھا تو ایک شخص خرمے بیچنے لایا ۔ یہ خرمے بہت ہی خوش ذائقہ تھے ۔

صبح ہی کو ہمارے شغدفوں سے قریب عراقیوں کی جو جماعت خیمہ زن تھی اس میں سامان غسل و کفن ہو رہا تھا ۔ شام کو ہمارے سامنے کے قافلہ میں ایک حاجی نے انتقال کیا انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ عصر کے وقت میں ضیاء الاسلام صاحب کے یہاں بیٹھا تھا کہ دفعۃً آندھی چلنے لگی ! دن بھر کی تپش اور لو کے بعد اگرچہ اس سے بہت کچھ فرحت ہوئی مگر اس خیال سے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے بعجلت اپنے مقام پر واپس آیا ۔ آندھی دیر تک رہی ۔ کچھ ترشح بھی ہوا باقی غنیمت ہے کہ بارش کی نوبت نہیں آئی ۔

ہمارے قافلہ نے یہاں ایک دن مقام کیا ۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بہت سے جمالوں کے گھر قریب ہی ہیں اس لئے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے گئے ہیں شام کو ہم بعد مغرب کھانا کھا رہے تھے کہ میرا جمال عبدالرحمن آگیا ۔ اور میری دعوت پر وہ بھی کھانے میں شریک ہو گیا اور کھانے سے فارغ ہو کر بخشش کا روپیہ جو سب کو حتماً نہیں دیا گیا تھا لیکر کہیں چلا گیا ۔

۲۸ مئی روز دوشنبہ

دوسرے دن چاشت کے وقت بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے کہا کہ ایک بورے میں تمام جنس اور بھاری سامان باندھ کر مجھے دو میرے پاس کوئی فاضل بورا نہ تھا لہذا اس کے ساتھ جا کر بازار سے خرید کیا اور واپس آکر بھاری اور غیر ضروری سامان بورے میں رکھ کر اس کے حوالہ کیا ۔ ہمارے ساتھیوں نے بھی اپنا زائد سامان اپنے جمالوں کو

دیدیا۔ ہمارے پانچ اونٹ تھے۔ جس میں سے تین پیر صاحب کے۔ ایک میرا اور ایک ہمارے اُن پنجابی ساتھی کا جو پیر صاحب کی اجازت سے مکہ معظمہ میں ہمارے مکان کے بیرونی حصہ میں رہتے تھے۔ یہ تین آدمی تھے، دو بہنیں اور ایک بھائی۔ ایک بہن جو پہلے ایک بار حج کر چکی تھی غربت کی وجہ سے شغدف کا کرایہ نہ دے سکتی تھی۔ لہذا وہ شہداءِ وادی فاطمہ تک جھکر پیادہ پا چلی آئی اور یہاں ہمارے قافلہ کے سردار سے گفتگو کر کے ۳ گنی میں آمد و رفت کا کرایہ طے کر لیا۔ باقی دونوں نے ایک اونٹ مع شغدف کر لیا تھا۔ ان پانچوں اونٹوں میں سے چار کے جمال ہم قبیلہ تھے۔ مگر عبدالرحمٰن کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبدالرحمٰن کے پاس چار اونٹ تھے جنہیں ایک میری سواری میں تھا اور دو جادیوں کی سواری میں تھے۔ چوتھا جو کوتل چلتا تھا جادیوں ہی کے قافلہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی پر زائد سامان جا کر باندھ دیا گیا۔

چاشت ہی کے وقت قافلہ میں ہر طرف حیّ حیّ کی صدا بلند تھی اور مختلف ٹولیاں شغدف رکھ رکھ کر روانہ ہونے لگی تھیں۔ دوپہر کے قریب ہمارے جمال اونٹ لائے اور آتے ہی یہاں بھی حیّ حیّ کہکر شغدف لادنے کی جلدی مچانا شروع کی۔ ہم لوگ بھی تیار بیٹھے تھے۔ لہذا ظہر سے قبل ہی روانہ ہوگئے۔ راہ میں جا بجا کہیں شربت کہیں تربوز کہیں چائے بکتی جاتی تھی۔ بدوی دوڑ دوڑ کر شغدف سواروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے اونٹ سے اُترا تو میدان میں ایسی تپش تھی کہ الامان والحفیظ۔ نماز پڑھنے سے قبل اپنے شغدف سے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ جتنی دیر میں نماز پڑھی اونٹ نے وہ راستہ طے کیا اور کچھ آگے بڑھ گیا اور مجھے اُس تک پہونچنے کے لئے ذرا تیز چلنا پڑا۔ زمین کی ریت جو چلنے میں جوتہ کے اندر بھر گئی تھی اسقدر گرم تھی کہ اُسکی وجہ سے پاؤں جھلسے جاتے تھے۔ ہوائے گرم و تند کے طمانچوں سے چہرہ بدحواس تھا اور آنکھوں سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ شغدف میں پہونچکر جان میں جان آئی اور کئی گھنٹہ تک دم لینے کے بعد جب عصر کے وقت قدرے ٹھنڈا ہوا تو پھر نماز کے لئے اوترنا چاہا۔ رحمت شاہ پہلے اوترنا چاہتے تھے۔ اوترنے میں اُن کا تہمد شغدف میں اولجھ گیا

اور اُن کے بوجھ سے اُن کا شغدف زمین سے جا لگا۔ اونٹ برابر چل رہے تھے۔
اس لئے جبتک جمال کو اطلاع ہو وہ دوڑکر آئے اور اونٹ کو کھولے ہمارا ایک شغدف
زمین بوسی کی حالت میں اور میں دونوں شغدفوں کے درمیان معلق رہا۔ یہ چند منٹ
اس قدر خطرہ کی حالت میں گذرے کہ عبدالرحمٰن نے دوڑکر شغدف کو اُبھار کے درست
کردیا۔ مگر پھر بھی طبیعت کی بدمزگی اور افسردگی زائل نہ ہوئی۔ جب مغرب کے وقت
قافلہ چند منٹ کے لئے رکا تو شغدفوں کو اوتروا کر از سرنو اونٹ پر کسوایا۔ پھر بھی آرام
سے نیند نہ آئی عبدالرحمٰن و عمار کو اس بات پر غصہ میں آکر بہت ڈانٹا کہ وہ ہمارے اونٹ کو
چھوڑکر جاویوں کے اونٹوں سے جا ملے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ
ہونا چاہیئے تھا۔ عبدالعزیز ہمارے ترجمان نے سمجھا بجھا کر اطمینان دلایا کہ آئندہ شغدف
بہت مضبوطی سے کسے جائیں گے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ منزل طولانی تھی اور سپر
یہ حادثہ۔ مشکیزے جو مکہ معظمہ سے ساتھ لائے تھے اُن میں وادی فاطمہ میں پانی بھرا گیا تو
معلوم ہوا کہ سب ٹپکتے ہیں۔ صرف دو صراحیاں دونوں شغدفوں پر تھیں۔ لہذا پانی چک گیا۔
رات میں سوتے سے آنکھ جو کھلی تو خشکی سے منھ میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے
مویا مویا کی صدا لگائی تو ایک قرش دے کر ایک گلاس پانی لیا اور جلدی میں غٹ
غٹ چڑھا گیا۔ بمشکل دو حصہ پانی ہوگا باقی ریت ہی ریت تھی۔ خدا خدا کرکے صبح کو
۴ بجے قافلہ منزل پر پہونچا۔

۲۹ مئی روز شنبہ ۔ بڑاو کی زمین کسی قدر ناہموار تھی۔ بہر حال جلدی جلدی شغدف
اوتارے گئے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اونٹ پر سے پھینکدیے گئے اور شغدفوں
کے سامنے بچھونے بچھا کر ذرا دیر لیٹے ہوں گے۔ نماز فجر کے بعد میں وظیفہ پڑھتا
ہوا بازار کی طرف گیا۔ طفان کا بازار اچھا خاصہ ہے۔ یہاں غلہ بہت فروخت ہوتا ہے۔
دوکانیں عموماً بنی ہوئی ہیں۔ تربوز، خربزے، بیگن، ککڑی، لیموں وغیرہ بکثرت ملتے
ہیں۔ کھانے اور چائے کی دوکانیں بھی ہیں۔ مگر پکی ہوئی روٹی نہیں نظر آئی۔ متعدد کنوئیں
قریب ہی تھے۔ جن میں سے دو جو باولیوں کی وضع کے پختہ بنے ہوئے تھے بہت بڑے

اور کسی قدر بلندی پر تھے کہ اُن پر سے چڑھ کر سنا رے پڑاؤ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر پانی وادی فاطمہ جیسا شیریں و سبک نہ تھا اور نسبتاً گران بھی ملا۔ جمالون نے شغدف اُتار پھینکنے کے وقت تو میری ہدایت پر چندان توجہ نہ کی تھی لیکن وادی فاطمہ میں شغدفون کے الٹا لٹک رکھے ہونیکی وجہ سے جو تکلیف ساتھیون کو ہوئی تھی اُس کی بنا پر سب لوگون نے بالاتفاق طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے شغدف بالمقابل رکھے جائین۔ چنانچہ ہم لوگون نے خود اپنے اپنے شغدف اٹھا کے مقابل مین کر لئے تھے اور بازار سے آگے جیسے ہی آفتاب بلند ہوا اور تمازت ناقابل تحمل ہو گئی، رضائیان نکال کر شغدفون کے درمیان باندھ دی گئین جسکے سایہ مین کھانا بھی پکا لیا گیا اور آرام سے لیٹ بیٹھ بھی سکے۔ وادی فاطمہ مین ٹھہرنا زیادہ پڑا تھا اور یہان قیام مختصر تھا اس وجہ سے کھچڑی کھائی گئی اور شام کے لئے روٹی پکالی گئی۔ ظہر کے قریب قافلہ روانہ ہوا۔ منزل چھوٹی تھی۔ راہ مین شربت چائے تربوز بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ ایک روز قبل کے تجربہ کی بنا پر مین نے طے کر لیا تھا کہ اب عصر سے قبل شغدف سے نہ اُترون گا۔ کیونکہ ہوائے گرم و تند اور آفتاب کی جھلس دینے والی تپش کے مقابلہ مین مین بہت نحیف و زار تھا۔ ہمارے اونٹون کا رُخ اگرچہ مغرب جانب ہونے کی وجہ سے آفتاب پشت کی جانب تھا لیکن ہوا گرم کے لپکے شغدف کے اندر بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اس لئے سامنے کے رُخ پر رضائی کا پردہ باندھا گیا اور پشت پر باوجودیکہ شغدف مین چٹائی کسی ہوئی تھی لیکن دونون شغدفون کے درمیان جو حصہ کھلا رہتا تھا اُس سے دھوپ اور ہوا کے گذر کو بند کرنے کے لئے بھی ایک مختصر پردہ باندھنا پڑا۔ پھر بھی ہوا کی تیزی اور اونٹ کی بے ڈھنگی چال کے باعث جب کسی جانب کا پردہ کھل جاتا تو ہوا کا وہ تھپیڑ لگتا کہ معلوم ہوتا کسی نے آگ سے داغ دیا ہے۔ شغدف مین پردون کے باندھ دینے کی وجہ سے جہان ہوا کے تھپیڑون سے نجات مل گئی تھی وہان حبس بھی ہو گیا تھا جسکی وجہ سے دم گھٹنے لگتا۔ پیاس کی شدت تھی۔ جو صراحیان سامنے کی طرف تھین اُن کا پانی پیتے رہے اِس لئے کہ پشت کی طرف جو صراحیان تھین اُن کا پانی تمازت آفتاب سے پک گیا تھا۔ عصر کے وقت

اتنے مین کچھ لوگ آئے جو گرد و پیش کے عرب قبائل کی طرف سے چوکیداری وصول کرتے تھے۔ ۵ قرش فی شغدف کے حساب سے چوکیداری کا لا کا گیا

جبکہ آفتاب بالکل شغدف کے اس جانب آگیا جدھر چٹائی کسی ہوئی تھی اور ہوا کی تیزی دگری میں بھی کمی ہوئی تو پشت کا پردہ کھولا گیا۔ شام کو روٹی اور کھجور اور طن کا پکوان کھایا۔ اور یہی یدد کو دیدیا۔ عشاء پڑھکر کچھ دیر سوئے نصف شب کو منزل پر پہونچے۔ چونکہ پورا قافلہ آگے پیچھے روانہ ہوتا۔ چلتا اور منزل پر پہونچتا ہے اس لئے جو لوگ پہلے پہونچ کر آباد ہوچکے ہیں اُن کے پڑاؤ کی مشعلوں کا نظارہ دور سے شغدف میں بیٹھکر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے پڑاؤ پر پہونچنے سے پہلے جتنی مسافت قافلہ کے گرد طے کی جاتی ہے اس میں میلہ کی سیر کا لطف آتا اور چونکہ پانی اور لکڑی فروخت کرنے والوں کی کثیر تعداد "مویا۔ مویا" اور "حطب حطب" کے آوازے لگایا کرتی اس لئے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ شغدف سے اُترتے ہی فوراً پانی خریدا گیا۔ اور چند منٹ کے اندر بستر بچھا کے سو رہے۔

۲۰ مئی روز چہارشنبہ

رات کو کسی قدر شبنم پڑی جس سے سارا بستر تر ہوگیا، اور صبح کو خفیف سی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ سویرے حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا۔ دُفن کا بازار مختصر ہے۔ گو سفری ضروریات کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ پچھلی منزلوں میں گرمی سے پیاس کی شدت رہی تھی اس لیے آج تربوز لیکر کھایا۔ میں معدہ و جگر کے ضعف کی وجہ سے وطن میں رہکر تربوز شاذونادر کھاتا ہوں مگر یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا میں تربوز کا کھانا مفید ہے۔ کوئیں یہاں زیادہ اور بڑے نہیں۔ پانی کسی قدر کھاری تھا اور گراں بلا۔ وادی فاطمہ میں دو سے لیکر چار قرش فی ٹین پانی کی قیمت دی گئی۔ اطفان میں چھ سے آٹھ قرش تک اور یہاں آٹھ سے بارہ قرش تک۔ اس قافلے میں کم و بیش چھ ہزار اونٹ تھے، جو دو ٹکڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی نصف قافلہ جب ایک پڑاؤ سے گذر جاتا تو بقیہ نصف قافلہ دوسرے روز وہاں پہونچتا۔ ہم لوگ دوسرے قافلے میں تھے۔ ہر ٹکڑی میں کچھ کوتل اونٹ بھی ہوتے تھے لیکن زائرین کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اور جمالوں، اُن کے سرداروں اور دیگر ہمراہیان کو ملا کر یہ سارا قافلہ تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے قافلے کے دو حصوں میں منقسم ہوجانے کے باوجود بھی جب ایک حصہ پڑاؤ پر مقیم ہوتا تو وہاں

ایک اچھے خاصے قصبے کے برابر آبادی ہو جاتی۔ اس سارے مجمع کو سیراب کرنے کے لیے ایک دو کنویں کیا کافی ہو سکتے تھے۔ کنووں سے متصل بڑے بڑے حوض یا نالے بنائے جاتے تھے تاکہ اونٹوں کو پانی پینے میں آسانی رہے۔ ہر وقت متعدد گراریوں پر بڑے بڑے چرمی ڈولوں میں پانی کھینچا جاتا تھا اور سقوں، پانی بیچنے والوں، اور غریب زائرین کا جو اپنے مقام پر پانی نہیں خرید سکتے تھے ان کنووں کے گرد ایک ہجوم رہتا تھا۔ سقے جو عموماً سوڈانی عرب ہوتے تھے صرف ڈول کھینچتے رہتے تھے۔ پانی بیچنے والے مرد، عورتیں اور بچے انھیں سے اپنی مشکیں، شکیزے، اور ٹین بھرواتے اور دوڑ دوڑ کر پڑاؤ والوں کے ہاتھ جا کر فروخت کرتے۔ جو لوگ اپنے مقام پر پانی کی گراں قیمت نہیں دے سکتے تھے وہ اپنے اپنے ٹین یا شکیزے لا کر انھیں سقوں سے براہ راست بھروا لیتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرانی اور اُسکے حصول کی دشواریاں سب بجائے خود اگرچہ ہمت شکن ہوتیں مگر جب اُس ملک کے قدرتی حالات پر نظر کیجاتی تو شکوہ و شکایت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا۔ اور جب اُس نعمت عظمیٰ کی لذت کا دھیان آتا جسکے حصول کی تمنا کشاں کشاں اس انبوہ کثیر کو لیے جا رہی تھی تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

جو کیداری کی فیس وہ قرض ادا کیے گئے اور ٹھیک دوپہر کو قافلہ روانہ ہوا۔ گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہ تھی مگر تربوز کی بدولت پیاس کم معلوم ہوئی۔ وقت میں تھوڑے لیموں خرید لیے تھے۔ شام کو شدت پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا شربت بنا کے پی لیا۔ جس سے مزید تسکین ہوئی اور راستہ کیزو خوبی کٹ گیا۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد پہونچ گئے۔ اور نماز عشا پڑھ کے سو گئے۔

۳۱۔ مئی، روز پنجشنبہ — قدیمہ یا قدیمیہ کا بازار جو ذرا بلندی پر واقع ہے، پختہ ہے اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ اسکے ایک جانب بہت سے کچے کنویں بنے ہوئے تھے۔ ان کا پانی میٹھا ہوتا تو قافلے والوں کو بہت آسانی ہوتی۔ مگر میٹھے پانی کے پختہ کنویں ذرا فاصلے پر تھے۔ ہمارا پڑاؤ دوسری جانب تھا۔ اور نہایت سطح زمین پر تھا۔ اور چونکہ دوسرے مقامات کی طرح دور تک کسی قسم کی بلندی، ٹیلہ یا پہاڑی نہ تھی اس لیے جگہ بہت کھلی ہوئی اور پُرفضا معلوم ہوتی تھی۔ حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا تو دیکھا کہ بازاروں میں کھانے کی دوکانیں بھی ہیں جہاں مچھلی کا گوشت بکثرت بک رہا تھا معلوم ہوا کہ سمندر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تازی مچھلیاں

بھی کھیتی نظر آئیں۔۔ آفتاب بلند ہو جانے کے بعد میں قافلے سے ذرا دور رفع حاجت کے لیے گیا تو یکلخت ایسا نظر آیا کہ سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اور دھندلے سے نشانات کشتیوں کے بھی دکھائی دیے۔ یہ خیال کر کے کہ ساحل قریب ہے اور ابھی قافلے کی روانگی میں بہت دیر ہے، میں نے چاہا کہ ساحل کی سیر کر آؤں۔ پڑاؤ پر آکر ڈنڈا اٹھایا اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ ساحل قریب ہے میں ذرا سیر کر کے ابھی آتا ہوں، نکل کھڑا ہوا۔ اور جس طرف سمندر کی موجیں نظر آئی تھیں اُسی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے جب سامنے نظر کرتا تو جھلکتا ہوا پانی دکھائی دیتا۔ اور میں سمجھا کہ ساحل کے قریب پہونچ رہا ہوں۔ اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جاتا اور روشنی تیز ہوتی جاتی کشتیاں قریب ہوتی نظر آتیں۔ دیر تک چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قافلے سے بہت دور نکل آیا ہوں اور ساحل جتنے فاصلے پر پہلے تھا اب بھی اُسی قدر دور ہے۔ میدان میں کوئی شخص ایسا نہ نظر آیا جس سے پوچھ سکتا۔ کہیں کہیں کوئی بدو عورت بکریاں یا اونٹ چراتی ہوئی نظر آجاتی اور اُس سے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دریافت کرتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ تا آنکہ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اور قافلے سے اتنی دور تنہا ہو گئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی بدو تنہا دیکھ کر حملہ آور نہ ہو۔ ناچار واپس ہوا۔ گو مڑ مڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا اور عجیب بات تھی کہ جس جگہ پہلے سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں وہاں اب پہاڑی دکھائی دیتی تھی۔ اپنے مقام پر پہونچ کر لوگوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ساحل یہاں سے اتنا قریب نہیں کہ دکھائی دے اور جو پانی کی سی چمک دکھائی دیتی تھی وہ دراصل ریت کے ذرے تھے جو آفتاب کی کرنوں سے جگمگا اُٹھے تھے۔ اور کشتیاں جو نظر آتی تھیں وہ دراصل کشتیاں نہ تھیں بلکہ بگولے تھے کہ ہوا پہ اُڑ رہے تھے

بگولہ اور سراب کی ماہیت سے تو واقفیت تھی مگر اُنکے نظارے کا کبھی موقع نہ آیا تھا۔ پہلی دفعہ قدرت کے یہ کرشمے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ منزل طولانی تھی لہذا چاشت ہی کے وقت روانگی ہو گئی۔ راستے میں ابر محیط رہا۔ سمندر کے کنارے کنارے قافلہ چل رہا تھا۔ اس لیے برابر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔

اس منزل میں چوروں کی کثرت ہے۔ اس کی اطلاع روانگی سے پہلے ہی کر دی گئی تھی اور شام کے قریب پھر عبدالعزیز ترجمان اور ہمارے بدوؤں نے آکر کہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا۔

شام ہوتے ہی جمالوں نے حرامی - حرامی (چور - چور) پکارنا شروع کیا - ہر ایک اپنے اونٹ کے ساتھ چلتا تھا اور ذرا ذرا دیر کے بعد پکارتا جاتا تھا - ہم لوگوں سے بھی تاکید کی گئی تھی کہ سوئیں نہیں اور اپنے سامان سے خبردار رہیں کہ مبادا پیچھے سے کوئی چور کچھ اُٹھا نہ لیجائے - چونکہ سب ساتھیوں کی رقوم میرے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی تھیں اس لئے مجھے احتیاط و ہوشیاری کی تاکید مزید کی گئی تھی - یہ بیگ ڈبل ٹین کا تھا اور اگرچہ بمبئی سے اُسکو ساتھ لے لینے کی وجہ سے مجھے بہت کچھ آرام ملا تھا مگر وزنی ہونے کی وجہ سے شغدف میں اس کا رکھنا سخت دشوار تھا شروع میں تو ایک دو دن تک بہت ہی زحمت رہی - کبھی اونٹ کی پیٹھ پر ڈوری سے کسا جاتا تھا، کبھی شغدف کے کسی کونے میں باندھا جاتا تھا - کئی بار اُس سے چوٹ بھی کھائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ چمڑے کا بیگ کیوں نہ لیا - اس منزل میں گرمی کی تکلیف نہیں ہوئی - اگرچہ رات کو عموماً یہ تکلیف جاتی رہتی تھی - لیکن یہاں ساحلی ہوا کی وجہ سے زیادہ ٹھنڈک ملی اور باوجود جمالوں کے شور اور چوری کے خطرے کے میں گہری نیند سویا - اگرچہ روانگی سویرے ہوئی تھی مگر منزل اتنی طولانی تھی کہ صبح کو جب آفتاب کافی بلند ہوگیا تب کہیں جا کر رابغ پہونچے -

یکم جون روز جمعہ — رابغ یا رابق قربِ ساحل کی وجہ سے تجارتی منڈی بنگیا ہے - جدہ سے کشتیوں پر سامانِ تجارت یہاں آتا ہے اور وسطِ حجاز کے بدو قبائل میں تقسیم ہوتا ہے - یہاں کا بازار وسیع اور پٹا ہوا ہے جس میں عام ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے - مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد اب تک جہاں جہاں قافلہ ٹھہرا تھا وہاں کسی مستقل آبادی کے نشان نہ تھے - مگر یہاں بازار کے علاوہ مختصر سی مستقل آبادی بھی ہے جسکے تمام مکانات دونوں جانب اور نیز کچھ فاصلہ سے ایک ٹیلہ پر بنے ہوئے ہیں - ایک جانب ایک سنگی مگر شکستہ قلعہ ترکی عہد حکومت کی یادگار ہے - بازار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک مسجد ملتی ہے جس میں اگرچہ بلحاظ تعمیر مسجد کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی لیکن اوقات نماز میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور نمازیوں کا اچھا خاصہ مجمع ہو جاتا ہے - قافلے کے لوگوں کو عام طور پر مسجد کا پتہ نہیں چلا لیکن جن لوگوں کو سراغ مل گیا وہ مسجد تک پہونچ گئے - بازار کے ایک سرے پر قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے اجناس کے علاوہ پکا ہوا کھانا اور روٹی وغیرہ بھی یہاں مل سکتی ہے - قربِ ساحل کی بدولت تازہ مچھلی بھی ملجاتی ہے اور شلجم، مولی، لیموں وغیرہ بھی نظر آئے - دوکانوں پر

زیادہ تر تو اجناس ہی فروخت ہوتی ہیں اس لیے کہ بدوی زندگی کی سادگی نے ضروریاتِ زندگی کی تعداد کو اس قدر محدود بنا دیا ہے کہ دوسری عام اشیا کی مانگ بہت کم ہے، تاہم کپڑے، بساطخانہ اور دواؤں کی دوکانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کو پیچش ہوگئی تھی لیکن راستے میں کسی مقام پر کوئی دوا نہ مل سکی۔ یہاں اسبغول خریدا گیا تو ایک روپے میں غالباً دو تین تولہ سے زیادہ نہیں ملا۔ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا کہ مل تو گیا۔

بدوؤں کا لباس بہت سادہ ہے۔ ایک لمبا کُرتہ ستر پوشی کے لیے۔ ایک رومال کمر میں اور ایک سر پر۔ اور بعضوں کے پاس ایک اُون کی عبا بھی ہوتی ہے جو کبھی کُرتے کے اوپر زیب بدن کی جاتی ہے اور کبھی اونٹ کی پیٹھ پر بستر کا کام دیتی ہے۔ پائجامہ پہننا یا تہ باندھنا بدوی معاشرت میں ایک شدید بدعت ہے۔ اگرچہ شہروں میں آمدورفت کی وجہ سے بعض ایسے بدو جن کو مسلسل اونٹ یا گھوڑے پر سوار رہنا پڑتا ہے کُرتے کے نیچے جانگھیا پہن لیتے ہیں۔ اسی سبب سے کپڑے کی دوکانیں زیادہ بارونق نہیں ہیں۔

بساطخانہ کا بھی یہی حال ہے کہ صابن، تباکو، دیا سلائی وغیرہ چند اشیا کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ہر بدو مسلح رہتا ہے۔ کم سے کم ایک تیز چھری ہر شخص کی کمر میں کھنسی رہتی ہے، ورنہ تلوار یا بندوق یا دونوں ہوتی ہیں۔ بازار میں ایک شخص دو بندوقیں اور ایک سات نل کا طپنچہ فروخت کر رہا تھا۔ قیمت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت کم قیمت پر بک رہی ہیں۔ ایک بندوق کی قیمت تقریباً بیس روپے دینا پڑتے۔

بازار کے عین وسط میں ایک بہت بڑا پختہ کنواں بنا ہوا ہے جس کا پانی اگرچہ دیکھنے میں بہت صاف و شفاف ہے مگر ذائقے میں بالکل تلخ۔ اس لیے قافلے والوں کے پینے کے لیے اُن چھوٹے چھوٹے کچے کنوؤں کا پانی آتا ہے جو بازار کے ایک سمت قبرستان سے قریب بنے ہوئے ہیں۔ ان کا پانی عموماً گدلا تھا اور کسی کسی کا میٹھا نکلتا ورنہ کچھ نہ کچھ کھاری پن موجود ہوتا۔ جس کی وجہ سے کھانا پکانے میں سخت دقت واقع ہوئی۔ چونکہ رابغ میں ایک شبانہ روز کا قیام تھا اس لئے خیال تھا کہ کھانا اہتمام سے تیار ہوگا۔ مگر پانی کی خرابی نے سارا انتظام برباد کر دیا۔ دن بھر نہایت تیز ہوا چلتی رہی۔ اگرچہ ہوا میں تپش کم تھی مگر گرد اس قدر اُڑتی تھی کہ الامان۔ شام کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں

سے ڈاک جا سکتی ہے، اس لیے رات کو دیر تک خطوط لکھتا رہا۔ بمبئی سے جو بنڈل کے بنڈل موم بتیاں
کے ساتھ لایا تھا اُنکی اب تک تو کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ رات کو خط لکھنے کے واسطے روشنی کی ضرورت
ہوئی تو موم بتیاں کام آئیں۔ اب چونکہ مٹی کا تیل ہر پڑاؤ پر ملتا ہے اس وجہ سے حجاج کو چاہیے کہ موم
بتیوں کے بجائے ایک لالٹین ساتھ رکھیں۔ اور اس خیال سے کہ شدت کی حرکت یا ٹکرے ٹوٹ نہ جائے
چمنی کے گرد تاروں کا جال بندھوالیں۔ جن جاویوں یا ہندوستانیوں کے پاس لالٹین تھی اُن کو بہت
آرام ملا۔

ڈاک کا اہتمام یہاں یہ ہے کہ ایک دوکان پر تمام خطوط جمع کر دیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو وہیں سے
کاغذ لفافہ مول لیلے۔ محصول ڈاک نقد جمع کرنا ہوتا ہے۔ اُس دوکان کا مالک گویا ڈاک کے مہتمم صاحب کا
ایجنٹ ہے جن کا مستقر مکہ میں بتایا گیا لیکن تلاش کے باوجود اُنکی صورت نہ دکھائی دی۔ ظاہر ہے
کہ ڈاک کا یہ انتظام کچھ قابل اطمینان نہیں مگر اس خیال سے دل کو کسی قدر تسلی ہو گئی کہ خط بھیجنے کی ذمہ داری
سے سبکدوشی تو حاصل ہوئی۔ مکتوب الیہ تک نہ پہونچے تو اسکے ذمہ دار کارکنان قضا و قدر ہیں۔

رات کو کافی ٹھنڈک رہی اس لیے خوب نیند آئی۔ مگر وسط شب میں دفعۃً چور چور کا غل ہوا۔ ہمارے
ساتھ کے قافلے کی ایک عورت کا زیور رابغ کی منزل میں راستے سے اُڑ گیا تھا جسکی وجہ سے مترجم، جمالوں
اور اُس قافلے کے حجاج کے درمیان مسلسل تکرار و بحث ہوتی رہی۔ اس رات میں ہمارے ایک ساتھی کی
بھی ایک گٹھری غائب ہو گئی۔ راستے میں نگہبانی کے ذمہ دار تو جمال ہیں لیکن پڑاؤ پر نگہبانی کا فریضہ
اُس جماعت پر عائد ہوتا ہے جو چوکیداری وصول کرتی ہے۔ اور ہمارے مترجم صاحب نے اطمینان
دلایا کہ یہ لوگ مال تلاش کر کے یا تو واپسی پر آپ کو مال دیں گے ورنہ اُسکی قیمت ادا کریں گے۔ سب
جانتے تھے کہ یہ باتیں محض دفع الوقتی کی ہیں۔ مگر کرتے کیا۔ دنیا بامید قائم۔ غریب ظہور حسین کا یہ سامان
تھا صبر کر کے بیٹھ رہا۔

میرا نیا جوتہ چند ہی روز میں جواب دے گیا۔ پرانا پہلی ہی منزل میں رخصت ہو گیا تھا۔ اس لیے
اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک موچی بھی ہے۔ مگر باوجود کوشش بلیغ اُس
سے ملاقات نہ ہوئی۔ بالآخر بدوؤں کے پہننے کا ایک چپل خرید لیا گیا۔ بدو اس چپل کو پہن کر کس آسانی سے
ریتلی اور پتھریلی زمین پر چلتا ہے۔ مجھے تو اسکو پہنکر چار قدم بھی چلنا مشکل ہوتا تھا۔ تاہم ضرورت نے اسی کو

قناعت کرنے کے لیے مجبور بنا دیا۔

۱۔ جون ۔ روز شنبہ | رابغ میں عادت کے خلاف دونوں وقت گوشت کھایا تھا اس لیے صبح اُٹھتے ہی سوء ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ غذا ہضم کرنے کے خیال سے دیر تک ٹہلتا رہا۔ چاشت کے وقت کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر روانہ ہوئے۔ رابغ سے نکلے تو دُور تک نخلستان میں اونٹ چلتے رہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے ساحل سے بہت دُور ہو گئے تو دھوپ اور لُو کے تھپیڑوں سے سامنا رہا۔ رات کو عشا کے وقت مستورہ پہونچے۔ شغدف سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ساتھیوں کے اونٹ نہیں ہیں۔ خیال ہوا کہ پیچھے آ رہے ہونگے۔ جمال تو شغدف پھینک کر الگ ہو گیا۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ساتھیوں کے اونٹ نہ آئے اس لیے بہت پریشان ہوا۔ ادھر اُدھر ڈھونڈھتا رہا مگر رات کا وقت اور چاروں طرف قطار در قطار شغدف رکھے ہوئے۔ پتہ چلانا مشکل ہوا۔ بدشواری تمام تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک پھرنے کے بعد میر صاحب وغیرہ ملے۔ مترجم اور مقوم پر بہت کچھ اظہار غیظ و غضب کر کے میں نے چاہا کہ اپنے شغدف کو یہیں اُٹھوا لاؤں لیکن اب اپنا شغدف تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ مترجم صاحب جو ہمراہ تھے آخر زچ آ کر واپس چلے گئے۔ میں نے تنہا گھوم پھر کر اپنا شغدف تلاش کیا اور اپنے ساتھی رحمت شاہ کو لیکر پھر اُسی جگہ آیا جہاں میر صاحب تھے۔ شغدف مع کل سامان کے جمال کے پاس چھوڑا صرف بٹیہ ساتھ لے لیا کہ اُس میں اپنا اور سب ساتھیوں کا زر نقد تھا۔

۲۔ جون روز یکشنبہ | صبح سویرے اپنا شغدف بھی اُٹھوا لیا۔ مگر جمال کی اس حرکت کی وجہ سے رات کو جس قدر زحمت ہوئی تھی اُس کا غصہ ہنوز باقی تھا۔ اور اس غرض سے کہ جمال آیندہ ایسی کارروائی نہ کرے میں نے اُسکی مقررہ بخشش کے دینے میں تامل کیا۔ بالآخر مترجم نے درمیان میں پڑ کر صفائی کرائی اور جمال سے پختہ وعدہ لیا گیا کہ اب کبھی میرا اونٹ ساتھیوں کے اونٹوں سے الگ نہ کریگا۔ مستورہ میں ایک بڑی پختہ باؤلی بنی ہوئی ہے مگر اس کا پانی گندلا اور کھاری ہے۔ کہیں نالے سے میٹھا پانی بھی آتا ہے مگر ہم لوگوں کو باوجود کوشش دستیاب نہ ہوا مجبوراً اسی پانی پر قناعت کی گئی لیکن دال کچی رہ گئی جسکی وجہ سے غریب رحمت شاہ کو پیچش شروع ہو گئی۔

مستورہ میں بازار بھی بہت مختصر تھا۔ اگرچہ مدینۂ منورہ کے کھجور تازہ اور عمدہ ملے۔ میں رات کو ساتھیوں کی تلاش میں بہت خستہ ہو گیا تھا اس لیے خلاف عادت بازار میں زیادہ نہ ٹھہرا اور تھوڑی

کھجوریں لیکر واپس آیا۔ تمازت آفتاب بھی مستورہ میں زیادہ محسوس ہوئی اور دوپہر ہونے پائی تھی کہ نہایت تیز لوہ چلنے لگی۔ جسکی وجہ سے میر صاحب کی طبیعت بدمزہ ہوگئی۔ خدا خدا کرکے ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے۔

۴۔ جون روز دوشنبہ | مستورہ سے چلے تو گرمی اور ہوا کی تیزی سے پریشان تھے۔ راستہ میں اگرچہ تپش کا وہی عالم رہا مگر ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اس لیے لوہ سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ پانی کی خرابی کا یہ علاج کیا کہ ہر دفعہ پیاس کے وقت شربت گھولا جاتا۔ نماز فجر کے وقت بیر شیخ پہونچے۔ یہاں کا بازار بھی مستورہ کی طرح مختصر ہے۔ اور کنواں بھی صرف ایک ہے مگر اس کا پانی شیریں اور صاف ہے اگرچہ ۸۔ فی ٹین کے حساب سے دام کسی قدر گراں دینا پڑے۔ بیر کنویں کو کہتے ہیں۔ دن کو یہاں بھی تپش اور لوہ سے سامنا رہا۔ مگر خوش ذائقہ پانی نے گرمی کی تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہونے دی عصر پڑھکر روانہ ہوے۔ راستے میں خبر ملی کہ جو قافلہ ہم سے آگے روانہ ہوا تھا اُسے اگلے پڑاؤ پر بدوؤں نے روک لیا ہے۔ نصف شب کو ہمارا قافلہ بھی بیر حسانی پہونچ گیا۔

۵۔ جون سہ شنبہ | صبح کو بعد نماز فجر حسب معمول بازار کی طرف گیا تو دیکھا کہ واقعی قافلے کا وہ حصہ جو ہم سے آگے تھا یہاں پڑاؤ کیے ہوے ہے۔ اب گویا پورا قافلہ ایک جگہ ہوگیا۔ یہاں کا بازار بہت فراخ و وسیع ہے کچھ حصہ پٹا ہوا ہے اور کچھ ابتدائی پڑاؤ نکے مانند جھونپڑوں کی شکل میں ہے۔ ترکاری کے سوا اور سب چیزیں ضرورت کی ملتی ہیں۔ کنوئیں متعدد ہیں اس لیے پانی بہت ارزاں ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ وادی فاطمہ کے بعد سے جو لوگ نہیں ملے تھے اُن میں سے بعضوں سے اب ملاقات ہوئی جن بدوؤں نے قافلے کو روکا تھا اُن سے گفتگو کرنے کیلیے جمالوں کے سردار گئے ہوے تھے۔ دوپہر کو مترجم نے اطلاع دی کہ دو مجیدی فی شندف دینا طے پایا ہے۔ کل قافلہ روانہ ہوگا۔ ہمارے قافلے کے ایک افغانی کا یہاں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ یوں تو ہر منزل پر کچھ نہ کچھ لوگ مرتے تھے مگر یہ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ افغانی ساتھی کے متعلق سارے انتظامات آنکھوں کے سامنے ہوے تو معلوم ہوا کہ قبر کھودنے کے لیے وہی تکروری جو مشکیں بھر بھر کر پانی بیچتے ہیں بلالیے جاتے ہیں اور چند روپیوں کے خرچ سے سب کام نکل جاتا ہے۔ کہ معظمہ میں سنا تھا کہ امیر کابل کے پیر صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں۔ مجھے اُنکی زیارت کا شوق تھا مگر وہاں کہیں

پتہ نہ چلا۔ اور انتظامات سفر سے فرصت ہی کب ملی۔ وادی فاطمہ پر اُن کا خیمہ دکھائی دیا تھا مگر قبل اسکے کہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوں وہ روانہ ہو گئے۔ یہاں اُن کا خیمہ نظر پڑا تو مغرب کے قریب میں بھی حاضر خدمت ہوا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت شمس المشائخ بتایا گیا۔ جوان آدمی ہیں اور صورت سے عابد و مرتاض معلوم ہوتے ہیں۔ نقشبندی ہیں۔ کچھ دیر اُن سے گفتگو رہی۔ معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے بدوؤں سے طے کر لیا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس روز قیام کریں گے۔ ....

.... اُنکے ہمراہ سترہ اٹھارہ اونٹ تھے اور ولایتیوں کی ایک جماعت ہر وقت اُنکو گھیرے رہتی تھی۔ ایک سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور خیمے میں دریوں اور قالین کا فرش تھا۔ جسکو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ عالتِ سفر میں ہیں۔ مغرب کے وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ امامت ایک دوسرے صاحب نے کی جو مقرب خاص معلوم ہوتے تھے۔ جب ہمارے افغانی ساتھی کے دفن کا وقت آیا تو اُنکو اطلاع دی گئی۔ اُنکی جماعت کے اکثر لوگ آکر نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور اپنے افغانی بھائی کو اخیر منزل تک پہونچا آئے۔

۶۔جون روز چہارشنبہ | ہمارے قافلہ کا کچھ حصہ بیر شیخ میں یہ سنکر ٹھہر گیا تھا کہ بیر حسانی میں قافلہ رکا گیا ہے۔ آج وہ بھی اُس قافلہ سے آملا۔ میر صاحب کا جو سامان اُنکے جمال کے کوتل اونٹ پر بندھا رہتا تھا اُس میں ایک ٹین گھی کا بھی تھا۔ یہ کسی صورت سے ٹوٹ گیا اور سارا گھی بہہ گیا۔ بیر حسانی میں جب اس سے آگاہی ہوئی تو میر صاحب بہت پریشان اور اپنے جمال سے ناخوش ہوئے۔ مگر کرتے کیا۔ بازار میں بہت تلاش کیا کہیں گھی نہ ملا۔ ۲ مجیدی فی شغدف کے حساب سے بدوؤں کی نذر کرکے بیر حسانی سے بعد ظہر روانہ ہوئے۔ قافلہ میں بعض لوگ اس زائد خرچ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے شغدف یہیں چھوڑ دیے اور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوئے۔ خالی اونٹوں سے جن پر شغدف یا شبری نہ ہو بدو کچھ نہیں لیتے۔ نصف شب کے بعد ایک تنگ وادی میں جسکے دونوں جانب بلند پہاڑیاں ہیں قافلہ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آج بھی میرا اونٹ ساتھیوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جمال پر غصہ تو بہت آیا مگر میدان کی تنگی اور راستے کی ناہمواری کی وجہ سے مستورہ کی طرح یہاں اس کا موقع نہ تھا کہ ساتھیوں کو تلاش کرتا اس لیے مجبور ہو کر رات وہیں بسر کی۔ اس مقام کا نام شفاعیہ یا شفیہ بتایا گیا۔

۷۔جون روز پنجشنبہ | صبح کو مترجم نے کہدیا کہ میر صاحب کے جمالوں کا مکان یہاں سے قریب ایک

دوسری سمت میں ہے اور وہیں وہ چلے گئے ہوں گے۔ اس لیے تلاش بے سود سمجھی گئی۔ یہاں کوئی بازار بھی نہ نظر آیا اس وجہ سے کھچڑی پر قناعت کی۔ مگر کھانا کھا کر جب میں نکلا تو قریب ہی میر صاحب کے شندف مل گئے۔ راستہ ایسا تنگ تھا کہ شندف وہاں نہ لایا جا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور جمال کو بخشش دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ عصر کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو ایک بلند پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جب پہاڑی طے کرکے سطح میدان میں تھوڑی دیر چلے ہونگے تو یہ اطلاع ملی کہ آگے بدو راستہ روکے پڑے ہیں۔ ناچار کچھ دیر رُکے رہنے کے بعد قافلہ پھر اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اب سب ساتھی پھر یکجا ہو گئے۔ اور رات وہیں بسر ہوئی۔ مترجم نے بہت کچھ گفت و شنید کے بعد کچھ روپے بدو سے قرض لیکر بدو کو دیئے۔

۸۔ جون روز جمعہ | آج معلوم ہوا کہ کوفیل کے قبیلہ نے ساڑھے پانچ مجیدی فی شندف طلب کیے ہیں۔ دن میں اور قافلہ والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصاً حیدرآباد کے قافلہ میں ہمارے لکھنؤ کے ایک کرم فرما تھے اُن سے ملا۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار ایک تونسی عرب تھے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ چائے پلائی۔ اور بہ اصرار کہا کہ جس قسم کی ضرورت ہو بے تکلف کہیے۔ رقم ملاوہ ادا کرکے بعد نماز ظہر روانہ ہوئے۔ پہاڑی طے کرکے جب سطح میدان میں آگئے تو میرے جمال نے پھر اونٹ کو ساتھیوں کے اونٹ سے جدا کرکے اُن جاویوں کے اونٹوں سے جا ملایا جو اُسکے دوسرے اونٹوں پر سوار تھے۔ مجھے یہ امر بہت ناگوار گذرا کہ مشورہ میں اور پھر شغفیہ میں پختہ عہد و پیمان ہو جانے کے باوجود جمال نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے مجھکو فوراً خبر ہو گئی۔ اب میں نے اپنے جمال کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے ساتھی رحمت شاہ کو چونکہ برابر پیچش ہو رہی تھی اس لیے انھیں تو میں نے اُترنے کا مشورہ نہیں دیا مگر میں خود اونٹ سے اُتر پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کے اونٹوں کے پاس پہونچ گیا۔ مترجم اور جمال دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ مجھ کو پیدل چلنا گوارا ہے مگر اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بالآخر جمال کو اپنی ضد چھوڑ کر اونٹ وہیں لانا پڑا اور میں پھر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر اونٹ کو جدا کر دیا۔ میں پہلی دفعہ پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد عصر کی نماز کے لیے اونٹ سے اُترا اور نماز پڑھکر جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا اونٹ ذرا رُکا جس سے آگے والے اونٹ کو بھی جس پر جاوی سوار تھے رُکنا پڑا۔ وہ اونٹ بدمزاج تھا۔ اس لیے بگڑ گیا۔ اور ایسا بگڑا

کہ باوجود جمال اور اُسکے بھائیوں کی کوشش کے قابو میں نہ آیا اور قافلے سے الگ ہو کر اُس نے شقدف
کو گرا دیا جس سے اُن جاویوں کے سخت چوٹ آئی جو اُس پر سوار تھے۔ اس پر جمال اور اُسکے بھائی
مجھ سے بہت بگڑے اور غصہ میں بہت کچھ سخت و سُست کہا۔ اور ایک نے تو تلوار نیام سے ذرا باہر
کر کے مجھے دھمکایا۔ جاویوں کے جو مترجم صاحب تھے وہ بھی طیش میں آکر میری طرف دوڑ کے آئے
اور لگے سخت کلامی کرنے۔ تو میں نے اُن کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈانٹا۔ اور کہا کہ آپ اپنی راہ
لیں مجھ سے کچھ آپ کا تعلق نہیں ہے۔ آخر اُنکے ہوش درست ہو گئے تو وہ جمالوں پر خفا ہوئے اور
انھیں مجبور کیا کہ میرے اونٹ کو کھول کر میرے ساتھیوں کے اونٹوں کے ساتھ ملا دیں۔

مغرب کے بعد قافلہ پھر رکا۔ میر صاحب کا اونٹ ذرا آگے تھا اُنھوں نے مجھے بلوایا اور
مقوم کا یہ پیام سنایا کہ دو مجیدی فی شقدف یہاں رات میں بدوؤں کا امیر قبیلہ طلب کر رہا ہے۔
میں اسکو مقومین کی شرارت سمجھتا تھا، کیونکہ مانگنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اسلیے میں نے رقم دینے
میں عذر کیا۔ جس پر مقوم صاحب آئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو رقم نہ دے گا اُس کا شقدف یہیں
چھوڑ دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ میرا شقدف یہیں چھوڑ دیجیے مگر میرے پاس مجیدیاں نہیں ہیں
اور یہ واقعہ تھا کہ شعفیہ میں مجیدیاں دینے کے بعد اب میرے پاس کوئی مجیدی باقی نہیں رہی تھی
بہرحال میر صاحب نے ہم سبھوں کی طرف سے مجیدیاں دیدیں۔ عشا کے اول وقت کچھ فاصلہ پر
روشنی دکھائی دی تو ہم سمجھے کہ منزل آگئی۔ مگر کہیں دو تین گھنٹے کے بعد ترا ع یا تراہ پہونچے۔ معلوم
ہوا کہ ہم بلندی پر تھے اور تراہ نشیب میں تھا اس لیے روشنی دور سے دکھائی دینے لگی تھی۔

۹۔ جون روز شنبہ | صبح کو حسب معمول بازار کی طرف رُخ کیا۔ یہاں کوئی باقاعدہ بازار اگرچہ نہیں ہے
تاہم ایک جانب بلندی پر بہت سی دوکانیں نظر پڑیں۔ کنواں یہاں ایک ہی ہے اس لیے پانی گراں
ملا۔ رحمت شاہ کو پیچش کی شکایت تو کئی روز سے تھی لیکن یہاں پہونچکر تکلیف بڑھ گئی۔
دن بھر خوب گرمی رہی اور لُو بھی چلی۔ کچھ قافلہ پھر عباس میں ٹھہرا ہے جو تراہ سے شاید کوس
بھر کے فاصلہ پر ہوگا۔ ہمارا جمال عبد الرحمن کل سے جو بگڑا ہے تو اُس نے نہ شام کو معمول کے مطابق
کھانا لیا اور نہ آج دوپہر کو آیا۔ کھانا نکال کر اُسکے لیے رکھدیا گیا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بھیجا مگر جب
اُس سے کہا گیا کہ عبد الرحمن کو بھیجدو یا اپنے برتن لاؤ تو وہ بھی جا کر بیٹھ رہا۔ مجھے تمباکو پینے اور کھانے
کی عادت دیرینہ ہے۔ حقہ یا چرٹ کا استعمال کیے بغیر قبض ہو جاتا ہے۔ اس واسطے برسوں کا معمول ہو

کہ صبح کو لازماً تباکو پیتا ہوں - البتہ جیل میں یہ تجربہ ہوا کہ دماغی محنت نہ کرنا ہو یا قلم پڑھے اور مشق یا ورزش کرنے کا موقع ملے تو پھر تباکو کی حاجت نہیں - چنانچہ فتح گڑھ جیل میں باوجود سرکاری اجازت اور سامان کی موجودگی کے میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک حقہ نہیں پیا - بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے کئی بکس چرٹ کے لیے تھے، جو جہاز پر اور مکہ معظمہ میں برابر استعمال کرتا رہا - جب مدینہ منورہ کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس سفر میں چرٹ یا سگریٹ کا استعمال نہ کروں گا - مگر بعد کو اس خیال سے کہ بدو سگریٹ کے عادی اور شائق ہیں میں نے اپنے بدو کے لیے ایک پاؤنڈ تباکو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ لیکر رکھ لیا - راستہ میں برابر عبدالرحمٰن اور اُسکے بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا دیتا رہا - یہاں عبدالرحمٰن تو نہیں مگر اُسکا بھائی عبدالبصیر تباکو مانگنے آیا تو میں نے کہا کہ کل تو تم لوگ مجھے گالیاں دے رہے تھے آج تباکو مانگنے آئے ہو! اس پر وہ مایوس ہو کر چلا گیا - شام کو کچھ قافلہ اور آکر اُترا اور یہ خبر معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کو بڑی حسانی سے اس وقت تک کل ۸ مجیدیاں فی شغدف دینا پڑیں - جن میں سے تین ابھی مقوموں کے پاس جمع ہیں جو یہاں دی جائیں گی - حالانکہ ہم ۹½ مجیدیاں فی شغدف دے چکے تھے - یہ بھی سننے میں آیا کہ دو حاجیوں کو راہ میں مجیدیاں نہ دینے کی بنا پر بندوق سے مار دیا -

۱۰ - جون روز یکشنبہ | آج صبح کو ضیاء الاسلام صاحب کو تلاش کیا - اُنھوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس دواؤں کا کافی ذخیرہ ہے اور کچھ طبابت میں بھی اُنکو دخل ہے - جب وہ نہ ملے تو جدید آئے ہوئے قافلہ میں جا کر حکیم غلام احمد مدنی کو جو اُس قافلہ کے طبیب تھے لایا اور رحمت شاہ کو دکھایا - ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں مختلف پڑاؤں پر جانا پڑا - کل جو نیا قافلہ آیا تھا اُس میں بعض میرے جہاز کے بنگالی ہمراہی بھی تھے جن سے اب ملاقات ہوئی - وہ بیحد پریشان و مضطرب نظر آئے بہت سمجھایا بجھایا تب اُنکی تسلی ہوئی - حکیم صاحب نے صبح کو ایک دوا دی تھی مگر کچھ نفع نہ ہوا - شام کو دوسری دوا دی - مگر رات بھر غریب کو دست آتے رہے اور سخت اُلجھن رہی -

۱۱ - جون روز دوشنبہ | آج حکیم صاحب نے رحمت شاہ کو پھر دیکھا - اب اُنکو بخار تھا - مگر حکیم صاحب نے غسل تجویز کیا - اور دوا بدل دی - غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی -

بدو کا مزاج خدا خدا کر کے اب درست ہوا - تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے کھانے کی قیمت دی جائے - مگر یہ خلافِ انصاف تھا اس لیے اُس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا - اور دونوں

وقت کا کھانا لیکر رخصتی ہو گیا۔ جسکے بعد پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قبیلہ ظواہر کے لوگ ایک مجیدی فی شغدف پر راضی ہو گئے ہیں مگر احمدی قبیلہ سے ابھی تک کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس لیے ابھی قیام رہے گا۔ وادی فاطمہ اور بیر عسفانی پر ایک ایک روز زیادہ ٹھہرنا کچھ کم ناگوار نہ گذرا تھا کہ نہ صرف منزل مقصود پر پہونچنے میں دیر ہو رہی تھی بلکہ میری تمنا یہ تھی کہ آستانہ رسالت پناہی پر ایک ماہ تک حاضر رہوں۔ اور جتنی دیر راہ میں ہوتی تھی اُسی قدر میری حاضری کے دنوں میں کمی ہونے کا احتمال تھا۔ اس وجہ سے مجھ پر یہ تاخیر بہت شاق تھی۔ مگر بے بس تھا آج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے بدوؤں میں عجب شور و غوغا رہا۔ کنوئیں پر جو تکروری حبشی پانی بھرتے تھے اُن سے اور ایک جمال سے کسی بات پر تکرار بڑھی۔ زبانی توتو میں میں کے بعد مارپیٹ کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ ایک بدوی تلوار نے اُس تکروری کو واصل بحق کر دیا بہت سے با اثر بدوؤں اور متوطنوں کے درمیان میں پڑنے سے اُسوقت تو تصفیہ یہیں ختم ہو گیا مگر رفتہ رفتہ یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ تکروریوں کی جماعت کثیر انتقام لینے کے منصوبے کر رہی ہے۔ اب جہاں دیکھیے کچھ لوگ بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جمالوں کی ٹولیاں الگ اسی بحث پر بحث گفتگو میں مصروف ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جذبات انتقام زیادہ اُبھرنے نہ پائے اور پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

اتفاق سے آج میری طبیعت بھی کسی قدر بد مزہ رہی۔ کچھڑی ذرا کچی رہ گئی تھی۔ شام کو حیدرآبادی قافلہ میں اپنے لکھنؤ کے کرم فرما فقیر محمد خاں صاحب کے پاس گیا تو اُنکے ایک دوست نے فروٹ سالٹ اور ست لیموں کا شربت پلا دیا۔ جس سے طبیعت ٹھیک ہو گئی۔

۱۲۔ جون روز سہ شنبہ آج اطلاع ملی کہ پندرہ مجیدی فی شغدف یہاں دینا ہوں گے جن میں سے ایک مجیدی قبیلہ ظواہر کی جس کی خبر کل ملی تھی، ۱۲ مجیدیاں احمدیوں کے لیے اور دو ایک امانتاً مقوم کے پاس رہے گی کہ راستے میں بیر درویش اور مدینہ منورہ کے درمیان کے بدوؤں کو دی جائے۔ ہم لوگوں کے پاس نواب مجیدیاں باقی تھیں نہ روپئے۔ حیدرآباد کے ناظر سالار عبد اللطیف تونسی نے شفعیہ میں چونکہ یہ کہا تھا کہ روپیہ کی حاجت ہو تو ہم قرض دیدیں گے۔ اس لیے اُن سے صورت حال بیان کی مگر اُنکے پاس صرف دو اشرفیاں نکلیں جن سے ہمارا کام نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً جمالوں کی جو اشرفیاں مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ہمارے معلم کے وکیل عبد الرحمن بشناس نے امانتاً میر صاحب کے پاس

رکھادی تھیں اور جو انھیں مدینہ منورہ پہونچکر دینا تھیں اُنکو بھنا کر اس مجیدی فی گنی کے حساب سے
لیں اور معتوم کے حوالہ کیں۔ ہمیں تبادلہ کے اس نرخ سے بہت نقصان پہونچا مگر کیا کرتے سوا اسکے
کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جتنے ملنے والے تھے وہ اس قافلہ میں نہ تھے۔ رحمت شاہ دوپہر تک اچھے
رہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُلجھن بڑھنے لگی اور شام تک بدحواسی بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ نصف شب کے
بعد اچھی خاصی سرسامی حالت ہوگئی اور بیہوشی کے عالم میں وہیں بستر پر دست آتے رہے۔ اُن کی
اس حالت کی وجہ سے رات بھر ہم لوگ سخت پریشان رہے اور میں تو بالکل نہ سو سکا۔

۱۲-جون روز چہارشنبہ | آج سوق کے ایک حکیم صاحب کو بُلا کر لایا۔ اور حضرت شمس المشائخ سے
جاکر اس پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھوں نے ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ حکیم صاحب نے ازراہ لطف دوا
بھی عنایت کی۔ صبح کو غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت ذرا ٹھہری ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے
دھوپ بڑھتی گئی طبیعت بگڑتی گئی۔ بعد ظہر جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو وہ شغدف سے باہر نکلے اور
بیدم ہوکر زمین پر لیٹ گئے۔ منہ میں پانی ٹپکانے سے کچھ طبیعت اُبھری تو کئی آدمیوں نے مل کر اُنکو
بمشکل شغدف پر سوار کیا۔ قافلہ روانہ ہوا اور عصر کے وقت بیر عباس پہونچ کر رک گیا۔ اب جو
شغدف سے رحمت شاہ کو اُتارنا چاہا تو اُنکی حالت متغیر نظر آئی۔ لہذا اونٹ کو بٹھا کر شغدف وہیں
کھلوا دیا گیا۔ اور میں ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں دوڑا گیا۔ وہ ملے تو بہت متاسف
ہوئے۔ مگر اب اُنکے پاس دواؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اس لیے کہ سولہ سترہ دن میں بکثرت لوگ
بیمار ہوئے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن تک پہونچا برابر دوا دیتے رہے تھے۔ بہر حال اُنھوں نے
تھوڑا سا جواہر مہرہ دیا کہ اسکو پلانے سے طبیعت اُبھر آئے تو پھر علاج کی فکر کی جائے۔ لیکن بمشکل چند
قطرے حلق سے اُترے ہونگے کہ روح نے قالب خاکی سے جدائی اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
میرے لیے یہ تمام دن کلفت و پریشانی کے تھے۔ لیکن جب تک امید حیات باقی تھی باوجود اپنے
ضعف و بے سروسامانی کے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ مگر خدا کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ ہمارے
مختصر قافلہ میں متعدد ایسی ضعیف، ناتوان اور مریض عورتیں تھیں جنکو حرکت کرنا مشکل تھی اور معمولی
حاجات ضروریہ کے رفع کرنے کے لئے دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مگر موسم کی سختی اور سفر کے صعوبات
سب کچھ جھیل گئیں۔ اور یہ نوجوان جو اپنی جسامت اور توانائی کے لحاظ سے ایسا نمایاں تھا کہ جہاز پر اور
نیز اس سفر میں ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑتی تھی آٹھ روز کے اندر ختم ہو گیا۔ العظمۃ للہ۔ میری ہمت نے اگرچہ

فی الواقع اب جواب دے چکا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے رفیق کی لاش کو ساتھیوں کے سپرد چھوڑ کر میں بیٹھا رہتا لہٰذا پھر ہمت اٹھا کر تجہیز و تکفین کے لیے اٹھا۔ ضیاء الاسلام صاحب جن کے قافلہ میں تھے اُسی میں ہمارے اور کے کچھ لوگ تھے جن میں دو ایک حجام بھی تھے۔ انکو بلا کر غسل دلوایا۔ ایک تکروری نے قریب ہی قبر کھودی۔ ساتھیوں میں سے مبین خان نے کفن عنایت کیا۔ اور بالآخر عشا کے بعد غریب رحمت شاہ کو سپرد خاک کر دیا۔

۱۴ - جون روز پنجشنبہ فی الصباح پڑاؤ کا گشت لگایا اور تقریباً قافلہ کی ہر چھوٹی بڑی ٹکڑی پر نظر دوڑائی مگر نظام الدین لاہوری کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی۔ وسط میں ایک شکستہ قلعہ نظر آیا جسکے اطراف میں پڑاؤ کا بازار تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن چونکہ بندرگاہ ینبوع کی طرف سے جو قافلے مدینۂ منورہ جاتے ہیں اُن کا رہگذر یہی ہے اور اسوقت تو مکۂ معظمہ کا تقریباً پورا قافلہ یہیں لگا تھا اس لیے بکثرت دوکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت اور دیگر ضروری اشیا کی فراوانی کے علاوہ جو تقریباً ہر پڑاؤ پر ملتی تھیں یہاں سبزی، پیاز اور مسالے بھی زیادہ مقدار میں نظر آئے۔

پڑاؤ چونکہ قلعہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت دیر میں گشت تمام ہوا۔ اپنے مقام پر واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ میر صاحب سے ایک گنی مستعار لیکر بازار سے مجیدیاں بھنائیں اور رحمت شاہ کے مصارف تجہیز و تکفین ادا کیے۔ پھر اُنکے آلودہ بستر اور کپڑوں کو ایک پشاوری مولوی صاحب کی معرفت جو ہمارے ہمراہ تھے مساکین حجاج میں تقسیم کیا۔ عصر کے بعد الگیار پھر نظام الدین کی تلاش کے لیے نکلا مگر اب کی دفعہ بھی ناکامیاب رہا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ خبر دریافت ہوئی کہ رابغ سے حیدرآبادی قافلہ اور حضرت شمس المشائخ معہ اپنے ہمراہیوں کے اور بعض اور ٹکڑیاں ادھر نہیں آئیں بلکہ انھوں نے احمدیوں کو مجیدیاں دینے سے انکار کر دیا اور اس بنا پر غائر کا راستہ اختیار کیا جس میں ایک بلند پہاڑی پر سے گذرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

۱۵ - جون روز جمعہ آج صبح سے چل چلاؤ کا سامان ہے۔ رحمت شاہ کے انتقال سے میرے شغدف میں جو جگہ خالی ہوگئی تھی میں چاہتا تھا کہ اُس پر پشاوری مولوی صاحب کو بٹھالوں جو برحسانی سے برابر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوکر منازل طے کر رہے تھے۔ مگر جمال باوجود دیکہ ۵ روپیہ کے بجائے اب اُس سے کہا گیا کہ صرف ۵ ریخشش کے ملیں گے کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور میزان برابر کرنے کے لیے

خالی شندف پر میرے زائد سامان کا بوجھ لاد دیا۔ قافلہ ظہر کے قریب روانہ ہوا۔ مگر تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ٹھہر گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بدووں کا کوئی اور شیخ نمودار ہو گیا ہے اور حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اس لیے قافلہ آج قیام کرے گا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتہ کے بعد روانگی ہوئی تھی اور اب جو دوبارہ اقامت کی اطلاع ملی تو بہت ناگوار ہوئی جس مقوم کو ہم سبھوں نے ملکر گھیر لیا اور خدا مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے اُس غریب کو بہت ڈانٹا۔

۱۶- جون روز شنبہ | صبح کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معمول کے مطابق تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ہم نے رضائیوں کا تمبو تان لیا تھا۔ چاشت کے اخیر وقت میں تپش سے بچنے کے لیے ہمارے جمالوں کے ساتھ کئی اور بدو اور جمال ہمارے تمبو کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدو احمدی فرقہ کے ہیں، تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُن سے شکایت کی کہ تمام اہل عرب اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں اور تم لوگ کیسے ہو کہ حجاج کو جو اس وقت نہ صرف اہل عرب کے بلکہ خدا اور اُسکے رسولؐ کے مہمان ہیں پریشان کرتے ہو۔ اُن میں سے ایک نے میری گفتگو سننے کے بعد فوراً ہی کہا "اور شریف کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے جو حجاج سے چودہ گنی فی اونٹ وصول کرتا ہے اور جمالوں کو صرف پانچ چھ گنیوں پر ٹرخا دیتا ہے اور باقی خود ہضم کر جاتا ہے۔ احمدی کی اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اور یقیناً امیر الحج کے اس عمال نوازانہ طرز عمل کے بعد غریب بدووں سے یہ توقع رکھنا عبث ہی ہوگا کہ وہ اپنی روایات مہمان نوازی کو برقرار رکھنے کے لیے اس موقع پر سال بھر کا آذوقہ جمع کرنے کی فکر سے باز رہیں گے۔

بالآخر ظہر کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ مغرب کے وقت بیر الروحہ پر نماز کے لیے قافلہ رکا تو چار پانچ گھنٹے وہیں رُکا رہا۔ معلوم ہوا کہ کچھ بدوی قبائل نے یہاں بھی روک لیا ہے۔ قافلہ چل رہا ہو تو شب کے وقت شندف میں پڑے رہنے کے سوا چارہ نہیں مگر قافلہ رکا ہوا تھا اسلیے شندف میں پڑا رہنا کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ میں کچھ دُور تک ٹہلتا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مقام پر قہوہ اور چائے کی چند دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جمال کو ہمراہ لیکر میں بھی وہاں پہونچا اور اُسکے ساتھ بیٹھکر چائے پی۔ عشاء پڑھکر پھر شندف میں سوار ہو گیا۔ اور جب قافلہ چلا تو نیند آ گئی۔

۱۷- جون روز یکشنبہ | صبح کو قافلہ پھر ایک مقام پر رُکا جس کا نام غالباً غار بتایا گیا۔ یہاں دو طرفہ

چاریاں تھیں جن پہ سے برابر بندوقوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتی تھیں۔ بعد کو پتہ چلا کہ سوا مجیدی کا مطالبہ ہے۔ مجبوراً یہ رقم بھی ادا کی گئی۔ تب قافلہ روانہ ہوا اور دوپہر کے قریب سویقہ میں مقیم ہوا۔ یہاں کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ دال چاول کا گلنا بھی مشکل نظر آیا۔ ہم لوگ بازار سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے قریب ٹھہرے تھے۔ بقیہ قافلہ بازار کے قرب میں اور ہم سے کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ ایک کنواں اُس مقام پر بھی تھا۔ یہاں ککڑیاں بہت بکنے آئیں جنکو بڑے شوق سے سب لوگوں نے خریدا۔ رات بہت ٹھنڈی ہوئی۔ سردی کی وجہ سے اس قدر چھینکیں نکل آئے کہ نصف شب کے بعد سونا دشوار ہوگیا۔ آخر پریشان ہوکر شغدفوں کے اندر پناہ لی۔

۱۸-جون سہ شنبہ – سویرے ہی سے روانگی کا اہتمام ہوا۔ عجلت میں صرف چاول پکائے اور شکر یا پیاز کے ساتھ کھائے گئے۔ ایک مجیدی آج اور طلب کی گئی تھی مگر متوسلین نے نہیں دلائی بلکہ قافلہ کو چارے لیجانا پسند کیا۔ ظہر پڑھ کر سوار ہوئے۔ عصر کے بعد ایک جگہ ایک پتھر نظر پڑا جس کا اُس خط میں کچھ عبارت منقوش دیکھی جو حضور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ جات سے مشابہ تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ قافلہ روک کر یہاں قیام کیا جائے اور اس تحریر کو کسی سے پڑھوا کر دیکھا جائے شاید یہ کوئی اہم آثار ثابت ہو۔ مگر قافلہ کا روکنا بس کی بات نہ تھی۔ مغرب کے قریب جب ٹھنڈا ہوگیا تو جی چاہا کہ قمری مہینہ کی ابتدا ہے آج کچھ دیر شب ماہ میں اونٹ کی کھلی پیٹھ پر سوار ہونا چاہیے۔ لہذا نماز مغرب سے فارغ ہوکر جمال کو اپنی جگہ شغدف میں بٹھایا اور اسکے کوتل اونٹ پر تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا۔ مگر اتنی ہی دیر میں ہچکولوں نے خستہ کر دیا۔ اس منزل میں اگرچہ تمامتر پتھریلی اور ناہموار زمین سے سابقہ رہا مگر مغرب کے بعد ہی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور عشاء کے وقت سے تو ایک نہایت ہی دشوار گذار گھاٹی میں چل رہے تھے۔ پہاڑی زیادہ بلند نہ تھی مگر راستہ نہایت ناہموار تھا جسکی وجہ سے اکثر اونٹ چلتے چلتے اگلے گھٹنوں کے بل گر پڑتے۔ الحمد للہ کہ مجھے اس قسم کی کوئی اُفتاد نہیں پڑی لیکن جب تک پہاڑی کے اوپر نہیں پہونچ گئے، ایک منٹ کے لیے بھی چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا۔ نصف شب کے بعد پہاڑی راستہ تمام ہوا اور مسطح میدان آگیا۔ جہاں پہونچکر دفعۃً خنکی بڑھ گئی۔

چھٹی منزل

علی الصباح جو آنکھ کھلی تو ہوٹل سر پر چل رہی تھی۔ گویا بارگاہ رحمۃ للعالمین کی طرف زائرین مدینہ منورہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے نسیم سحر مقرر ہوئی تھی۔ جیسے جیسے اُجالا ہوتا جاتا تھا، گنبد خضرا کے نظارہ کی امیدیں مبدل بہ اشتیاق ہوتی جاتی تھیں۔ آہ انتظار کی اُس گھڑی کا سماں دکھانا اور اس کا نقشہ کھینچنا امکان میں نہیں ہے جب ہر چند ساعت کے بعد زیارت روضۂ اطہر کی متمنی آنکھیں باربار حد نظر کی طرف دوڑائی جاتیں اور پھر اس خیال سے دل بیتاب کو تسلی دی جاتی کہ ابھی فاصلہ بہت ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔ آفتاب ہر روز نکلتا تھا اور نہایت آب و تاب سے چمکتا تھا۔ مگر اُسکی نمود کا جیسا انتظار آج کیا گیا اور اُسکی روشنی کا جس طرح آج استقبال کیا گیا یہ بالکل نئی بات تھی۔ اب ہر اُس شے پر جو دور سے نظر کے مقابل آجاتی گمان ہونے لگتا کہ گوہر مراد یہی ہے اور جب وہ شے قریب آجاتی اور معلوم ہوتا کہ کوئی درخت ٹیکری یا پتھروں کا ڈھیر ہے تو مایوس نہ ہونے والی آنکھیں پھر کسی دوسری شے پر نگاہ اُمید جما دیتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گذر گیا۔ بالآخر دور سے مسجد شریف کے میناروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور میں شغدف سے کود کر درود شریف اور دیگر ادعیہ پڑھتا ہوا پا برہنہ شغدف کے قریب قریب گنبد خضرا کی تمنائے زیارت میں سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ میں نے توقف کر کے ضروری دعائیں پڑھیں اور پھر روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ کے قریب جس قسم کی پہاڑیاں ہیں بعینہ ویسا ہی پُر پیچ و خم یہ بقیہ راستہ نظر آیا کہ ہر موڑ کے بعد خیال ہوتا تھا کہ اب مدینۃ الرسول کی زیارت نصیب ہوگی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم عرصہ تک چلنے کے بعد جب ایک مقام پر ریل کی پٹری عبور کی تو معلوم ہوا کہ اب منزل مقصود بالکل قریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باغیچوں اور اُجڑی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور کہیں کہیں عبا پوش انسان بھی ملنے لگے۔ آگے بڑھے تو ان عبا پوش اصحاب کا ایک معقول مجمع نظر آیا۔ جنہوں نے نہایت خندہ پیشانی

اور خوش خلقی سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مزوروں کے کارکن ہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد اپنے مزور صاحب کو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اپنے تئیں اُن کا کارندہ بتایا۔ دوپہر کے قریب مدینہ منورہ کی فصیل سے ملحق ایک میدان میں جسکو مناخہ کہتے ہیں شغدف اُتارا گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ میر عبدالعزیز صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے اونٹ ہمراہ نہیں ہیں۔ پہلے تو کچھ دور تک میں نے اُنکو تلاش کیا مگر جب اُن کا پتہ نہ چلا تو میں نے اپنا شغدف مع سامان کے وہیں جمال کے پاس چھوڑا۔ اور اُن صاحب کے ہمراہ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا۔ جنہوں نے نہایت شفقت و کرم سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کا وعدہ فرمایا۔ مناخہ واپس آکر اپنا سامان اُٹھوا لایا۔ اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نماز ظہر کا وقت تھا اس لیے پہلے نماز ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضری سے مشرف ہوا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ اس وقت کی شادمانی و انبساط کا بیان ناممکن ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر باغ باغ تھا اور رواں رواں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس لطف عمیم پر شکرگزار کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو دربار رسالت میں جبہہ سائی کا افتخار بخشا گیا۔

حضورؐ کا روضۂ اطہر مسجد نبوی کے اندر شمالی و مشرقی کونہ پر واقع ہے۔ نماز کے بعد مزور صاحب کے عامل نے مجھے اور دیگر زائرین کو پہلے کچھ فاصلہ پر قبلہ رُخ کھڑا کیا اور ایک دعا پڑھی سب لوگ اُس کی تکرار آہستہ یا باواز کرتے رہے۔ بعد ازاں رُخ بدل کر روضۂ اطہر کی جانب متوجہ ہوئے اور بارگاہ والا میں سلام پڑھا۔ سلام پڑھ کر روضۂ اطہر کی جالی کے قریب حاضر ہوئے جس میں تین گول سوراخ اس اندازہ سے رکھے گئے ہیں کہ روضۂ اطہر کے غلاف پر جہاں سنہرے حروف میں حضور انورؐ کا اسم گرامی منقوش ہے ایک سوراخ اس مقام کے مقابل ہے اور بقیہ دو سوراخ ذرا ہٹ کر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی کے مقابل واقع ہیں۔ اکثر لوگ ان سوراخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اسوقت ہجوم بہت تھا۔ کیونکہ قافلہ کی تمام ٹکڑیاں اپنے اپنے مزورین کے ہمراہ سلام خوانی و زیارت کے لیے جمع تھیں۔ آستانۂ عالی پر صرف چند ساعت کے لیے قیام ہو سکتا تھا۔ لہذا جلدی جلدی لوگوں نے مصافحہ کیا، درود و سلام پڑھا یا دعائیں مانگیں اور گھوم کر شمالی جانب گئے جہاں دیوار پر ایک روشندان ہے جس کی راہ سے بتایا گیا کہ جبرئیل امین علیہ السلام

حجرۂ عائشہ یا مسجد نبوی میں حاضر ہوکر دہی سناتے تھے۔ یہاں بھی ایک دعا پڑھوائی گئی۔ پھر پائین روضۂ مبارک کی طرف بڑھے اور ایک دوسری جالی کے قریب کھڑے ہوکر جسکے اندر ملگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۂ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار بتایا گیا، سلام پڑھا۔ حضرت فاطمہؓ زہرا کی جاے دفن کے متعلق ارباب سیر میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جنۃ البقیع میں قبۂ اہلبیت کے نیچے آپ دفن کی گئیں تھیں اور بعض کے نزدیک حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائین روضہ آپ دفن ہوئیں۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ دونوں جگہ آپ کے نشانات مزار بنے ہوے ہیں جہاں زائرین حاضر ہوکر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صحن مسجد میں حضرت فاطمہؓ کی کیاری بنی ہوئی ہے اور اُسی سے ملحق ایک کنواں ہے جسکے پانی کو آب کوثر کا لقب ملا ہے۔

مزور صاحب کے عامل سید زین العابدین نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ عشا کے سوا جملہ نمازوں کے بعد وہ یا اُنکا کوئی مددگار روضۂ اطہر کے قریب سلام پڑھوانے کے لیے موجود رہے گا۔ اس لیے سب لوگ نماز پڑھ کر یکجا ہو جاتے اور سلام پڑھتے۔ مجھے لکھنؤ سے روانگی کے وقت ہدایت ہوئی تھی کہ روضۂ اطہر کے قرب میں مودب رہوں اور باواز بلند صلوٰۃ و سلام نہ پڑھوں، مگر جو طریقہ یہاں رائج ہے وہ اسکے بالکل منافی تھا۔ لیکہ نماز کے بعد جب زائرین کی مختلف ٹکڑیاں جمع ہوتی تھیں تو ان کے صلوٰۃ و سلام سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ بہرحال میں حتی المقدور اہتمام کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ البتہ ہجوم کی وجہ سے مجھے کسی قدر وحشت ہوتی تھی اور میں قافلہ کی واپسی کا بیصبری سے انتظار کر رہا تھا کہ سکون کے ساتھ روضۂ اطہر پر حاضری سے سعادت اندوز ہوسکوں۔ عصر کے بعد پھر مناخہ گیا۔ میر عبدالعزیز صاحب معہ دیگر ہمراہیوں کے اُسی وقت پہونچے اور اپنا سامان وغیرہ دیکھ بھال رہے تھے۔ میں سب کو ہمراہ لے آیا۔ اور نماز مغرب کے بعد مولوی سید احمد صاحب ایجنٹ علی جان کمپنی سے ملا اور حوالہ کا کاغذ دکھا کر روپیہ لیا۔

دوسرے روز جنۃ البقیع میں حاضر ہوکر سب ہمراہیوں کے ساتھ بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھا۔ تیسرے دن سب ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ سید زین العابدین کی معیت میں جبل احد پر جاکر سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھیں گے مگر میں نہ جا سکا۔ ساتھیوں کی واپسی سے قبل میں ڈاکخانہ گیا اور وہاں سے خطوط لایا۔ اور چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی روز ڈاک

جانے والی ہے اس لیے جلدی جلدی وطن کے خطوط لکھے اور عصر سے پہلے پوسٹ (ڈاک خانہ) کے حوالے کیے۔ منگل کو قافلہ پہونچا اور منیجر کو واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس قافلہ کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مدینہ منورہ میں اُس وقت تک حاضر رہوں گا کہ حج کے لیے وہاں سے آخری قافلہ روانہ ہو۔ اس لیے بے فکر تھا۔ مگر احباب اور ساتھیوں کو واپس جانا تھا اس لیے وہ لوگ جلد جلد زیارتوں سے فراغت کرکے تبرکات اور سفر کے لیے اشیا خوردنی وغیرہ کی خریداری میں مصروف تھے۔ جمعہ کو بعد نماز مغرب جنۃ البقیع میں فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا۔ عم مکرم منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور کی قبر یہیں ہے۔ پہلی بار چونکہ نشان دریافت نہیں کیا تھا اس لیے باوجود تلاش نہ ملی۔ اب کی مولوی عبدالباقی صاحب سے پوچھ کر آیا تو ملی کہ قبۂ اہلبیت کے بالکل پشت پر واقع ہے۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قبر کو دیکھتا رہا۔ قبر کی مرمت اور کتبہ میں سیاہی بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے چاہا کہ میں خود اس کا انتظام کر دوں پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیز از جان انور علی سلمہٗ بھی بعد ادائے حج یہاں پہونچیں گے اس خدمت کے وہی زیادہ مستحق ہیں۔

قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ہمارے معلم، ترجمان اور جمال سب کی خواہش پر میں نے ایک تحریر اپنے معلم کے نام اس مضمون کی لکھ دی کہ ان اصحاب کے طرز عمل سے شاکی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ میں نے برضا و رغبت اپنا اونٹ چھوڑ دیا ہے اور شغدف رکھ لیا ہے جو بعد واپسی مکہ معظمہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تمام ساتھی صبح کو شاخہ روانہ ہو گئے تھے میں بعد عصر وہاں اس غرض سے گیا کہ قافلہ روانہ ہو گیا ہوگا اپنا شغدف مکان پر اٹھوا لاؤں۔ مگر شغدف نہ ملا جس کی اطلاع سید زین العابدین کو کر دی۔ انھوں نے اطمینان دلایا کہ شغدف مل جائے گا۔

جب تک قافلہ اور ہمراہی موجود رہے مسجد نبوی میں ہجوم کی وجہ سے اطمینان کی حاضری نہ ہو سکی اور ہمراہیوں کی وجہ سے مدینہ منورہ کے مقیم اصحاب میں سے سوا مولوی سید احمد صاحب اور حافظ شبراتی صاحب کے کسی سے نہ مل سکا۔ مولوی صاحب تو گویا زائرین کے لیے بمنزلہ بنک کے ہیں اس لیے اُن سے ملے بغیر چارہ نہ تھا۔ حافظ صاحب قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے ہی روز آ کر ملے اور روز ملتے رہتے۔

قافلہ جا چکا تو حافظ شیرازی صاحب کی وساطت سے مولوی ضیاءالدین سیالکوٹی سے نیاز حاصل ہوا جو مسجد نبویؐ کے قریب ہی ایک رباط میں مقیم ہیں۔ رباط سے مراد وہ موقوفہ مکانات ہیں جو صاحبان خیر کی طرف سے ساکین، مسافرین اور درویشوں کے لیے بنا دیئے گئے ہیں۔ مولوی ضیاءالدین صاحب ایک نو عمر بزرگ ہیں جو وطن سے ہجرت کرکے یہاں مقیم ہیں۔ ہندوستان کے حالات سے آپ کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے جملہ ممالک اسلامیہ کے حالات سے آپ باخبر ہیں اس لیے آپ سے مل کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دوسرے روز مولوی عبدالباقی صاحب کے ہمراہ حضرت شیخ احمد شمس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی بہت مشہور ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ سے زائد کسی شخص کی عظمت نہیں کی جاتی حتیٰ کہ عہد ترکیہ سے والی مدینہ کے سوا صرف آپ ہی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی کھلوا کر روضۂ اطہر کے قریب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمام عرب اور بدوی قبائل آپ کا اس درجہ احترام کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو راہ میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ آپ کا قافلہ پانچوں وقت نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے راہ میں ٹھہرتا ہے۔ نیز یہ کہ عام راستوں کے علاوہ آپ کا قافلہ جس راستے سے جانا چاہے جاتا ہے۔

حضرت شمس مغربی الاصل ہیں اور شاذلی (قادری) سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اسّی برس کے قریب ہوگی اور ضعف اتنا ہوگیا ہے کہ آپ کا مکان اگرچہ مسجد نبویؐ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے مگر سوائے جمعہ کے آپ عام طور پر کسی روز مسجد نبویؐ میں حاضر نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا اور چونکہ آپ کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ واپس جانا چاہتا تھا اس لیے اسکی اجازت بھی حاصل کرنا تھی۔

میں ہندوستان میں بھی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر حضرت شمس کے حُسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ آپ مکان کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ صدر دروازہ پر اطلاع کرنے کے بعد ایک خادمہ نے ہم لوگوں کو اندر لیجا کر مجلس میں بٹھایا اور کہا کہ شیخ تشریف لاتے ہیں۔ چند لمحوں میں شیخ تشریف لائے تو چلتے نہایت تپاک سے مصافحہ فرمایا اور مزاج پرسی فرمائی۔ اسکے بعد ایک چھینکہ پر سے کھجوریں اتارے اور باصرار کھلائے گئے۔ پھر چائے پلائی گئی۔ اور جب اثنائے گفتگو میں مولوی

عبدالباقی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو یمنؔ کو بہت مسرت کا اظہار فرمایا کہ میں حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہوں۔ اور میری اس درخواست پر کہ مجھے ہمرکابی کی عزت بخشی جائے نہ صرف بخوشی اسے منظور فرمایا بلکہ وعدہ فرمایا کہ جب قصد روانگی ہوگا تو آپ کو اطلاع دیدی جائیگی۔ حضرت شیخ کے نصف چہرہ پر ایک سفید رومال پڑا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو یوں ہی آہستہ ہوتی ہے بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ آپ میری ہندوستانی نہیں سمجھتے اور میں آپ کی عربی نہیں سمجھتا البتہ لسان قلب سے اگر گفتگو ہو تو یہ دشواری رفع ہوجائے۔ اس جملہ سے بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک مختلف امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت حاصل کرتے وقت میں نے پھر حاضری کی اجازت چاہی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اوقات میں ہرج ہوگا تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ نہیں جب چاہو بے تکلف آؤ۔ چنانچہ اسکے بعد ایک بار تنہا اور ایکبار مولوی ضیاءالدین صاحب کے ہمراہ حاضری کی نوبت آئی اور ہر دفعہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ چلتے وقت دروازہ تک پہونچانے آتے۔

میرے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوج میں عطر کا بیوپار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی شیشیاں اپنے ہمراہ لائے تھے اور چلتے وقت میرے سپرد کر گئے تھے کہ کچھ روضۂ اطہر پر اور مسجد نبوی میں خاص خاص مقامات پر صرف کی جائیں اور بقیہ تقسیم کردی جائیں۔ میں نے اُنکی جانب سے جہاں اور بزرگوں کو دیں وہاں دو شیشیاں حضرت شمس کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ خوش ہو کر قبول فرمائیں اور دیر تک مجھے اور میر صاحب کو دعائیں دیتے رہے۔

قافلہ کی روانگی کے بعد مسجد نبوی میں ہجوم کم ہوگیا۔ صرف نماز کے اوقات میں مجمع ہوجاتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اب اطمینان سے نماز کے بعد ٹھہر کر تلاوت کرنے اور درود شریف پڑھنے کا موقع ملا۔ نیز سید زین العابدین کی وساطت سے خوجوں کے سردار سے اس بات کی بھی اجازت حاصل ہوگئی کہ رات کو بھی مسجد نبوی میں حاضر رہ سکوں۔ نماز عشاء کے بعد ہی حرم نبوی کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں اور جن چند آدمیوں کو رات کی حاضری کی اجازت ہوتی ہے اُنکے سوا کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ایسے تمام لوگ سنگین کٹہرے کے پیچھے جمع ہوجاتے ہیں جو منبر شریف سے تھوڑے فاصلہ پر قد آدم بلند بنا ہوا ہے۔ ہمارے قافلہ میں جنوبی امریکہ کے ایک میمن تاجر بھی تھے جنھوں نے زر کثیر صرف کرکے اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے اونٹ مدینہ منورہ میں روک لیے تھے۔ انھیں میں حکیم محمد قاسم سورتی بھی تھے جنھوں نے ازراہِ ہمدردی اسلامی ترآو میں رحمت شاہ کا علاج کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں بھُے اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہو گیا تھا۔ شب دو شنبہ کو جب میں نے پہلی بار حرم نبوی میں حاضری شبانہ کا ارادہ کیا اور نماز عشا کے بعد سب ہدایت کبہر کے نیچے جا کر بیٹھ گیا تو دو سیٹھ مع حکیم صاحب اور چند دیگر رفقا کے وہیں نظر آئے۔ اِنکے علاوہ ایک بدوی عرب بھی تھا۔ غرضکہ ہم سب نصف درجن آدمی تھے۔ مسجد نبوی کے دروازے بند ہوگئے تو ایک خوجہ صاحب نے مجھے اپنے ہمراہ لیجا کر حرم شریف کے مغربی دروازے متصل وضو خانہ اور استنجے خانہ دکھایا۔ اس اثنا میں اکثر جگہ سے روشنی رخصت ہوئی تھی صرف کہیں کہیں ایک ایک بتی رہ گئی تھی۔ روضہ مطہر کے اندر بھی صرف چند موم بتیاں رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب خوجے بھی چلے گئے جن میں سے بعض صحن مسجد میں بستر بچھا کر لیٹ رہے۔ صرف دو ایک مشغول عبادت تھے رہ گئے۔ اب حرم نبوی میں کامل سکون ہو گیا۔ جس کے ہم غلامان رسول مشتاق تھے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بارگاہِ رسالت پناہی کے قریب کوئی گوشہ منتخب کر لیا۔ کہ یہی ہماری کامرانیوں اور دلی مرادوں کا منتہائے عروج تھا۔ دوسروں کا حال مجھے کیا معلوم مگر میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی وہ تمام ساعتیں جو کسی قسم کی مسرت وانبساط میں گزری ہوں اس رات کے مقابلہ میں بے تکلف قربان کی جا سکتی تھیں۔ اور میں حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو بارگاہِ رسالت پناہی میں یہ سرافرازی نصیب ہوئی۔ شب کا حصہ وافر اسی عالم سکون میں بسر ہوا۔ اور غلس کے وقت حرم نبوی کا دروازہ کھلتے ہی جب نمازیوں کی آمد شروع ہو گئی تو میں بائیں جانب کے دالان میں جا کر تھوڑے وقفہ کے لیے لیٹ رہا۔ اور نماز فجر ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس آیا۔

مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ کے لیے بھی میرے پاس کچھ امانت اور خیرات کی رقوم تھیں۔ امانت کو بحفاظت پہونچا دینے میں تو بحمد اللہ جلد کامیابی ہو گئی مگر تقسیم خیرات کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ مکہ معظمہ میں بھی رقوم کے تقسیم ہو جانے کے بعد میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہاں جب اُسی طریقہ پر ابتدا کی گئی تو میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے تہیہ کیا کہ بقیہ چیزیں اور رقمیں خود مستحقین کو تلاش کر کے پہونچاؤں اس

نزمن کے لیے مدینہ منورہ کے فقرا و مساکین تک پہونچنے میں میرا بہت سا وقت صرف ہوا جس کی وجہ سے مسجد نبوی میں حلاف معمول اوقات نماز زیادہ وقت تک حاضری سے محروم رہا۔ قافلہ کی واپسی کے بعد سے تقریباً ہر روز صبح کو ظہر سے قبل تک اور کبھی کبھی سہ پہر یا رات کو بھی فقرا و مساکین کی تلاش میں وقت گزرتا۔

ایک روز نماز ظہر کے بعد سید زین العابدین صاحب مجھے اور مبین تاجر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کو حرم شریف سے باہر لائے اور شہداء عثمان حضرت ابو ایوب انصاری کا مکان، دیار حضرت حمزہ حضرت عبداللہ (حضور کے پدر) اور حضرت مالک ابن سنان علیہ اور حمزۂ احد کے مزارات کی زیارت کرائی۔

عشاء کے بعد ایک دفعہ حرم نبوی سے گھر جارہا تھا۔ طبیعت پر کسی قدر حزن طاری تھا۔ راہ میں ایک درویش صورت شخص سے ملاقات ہوئی جو حرم شریف میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے آتے تھے۔ میں نے اپنی قلبی کیفیت کا اُن سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ذکر کیا۔ پہلے وہ سمجھے نہیں بلکہ ایک مسافر خیال کرکے اپنے گھر لیجانے اور کھانا کھلانے پر آمادہ ہوئے۔ جب مزید گفتگو سے انھیں معلوم ہوا کہ طالب دنیا نہیں ہوں تو دوسری طرح پیش آئے۔ گھر ساتھ لیگئے۔ اور باوجودیکہ کھانا کھائے ہوئے تھا، اصرار و محبت اور تواضع خلائیوں سے میری ضیافت کی اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ انکا نام شیخ حسین ہے، فرقۂ شاذلیہ (ناصری) سے تعلق رکھتے ہیں اور فاز (مراکش) کے رہنے والے ہیں۔ جب میں گھر جانے کے لیے رخصت ہوا تو میری استدعا کے باوجود ہمراہ تشریف لائے اور میرے گھر کے قریب تک پہونچا گئے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہیں۔

دوسرے دن سید زین العابدین صاحب کی معیت میں مسجد قبا کی زیارت کرنے گیا۔ ایک درجن سے زیادہ عورتیں اور مرد ساتھ تھے۔ مسجد قبا شہر سے باہر تقریباً ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور چونکہ راہ غیر محفوظ ہے اسلیے حکومت کی طرف سے گاڑیوں کے ہمراہ مسلح بدو ساتھ گئے تھے۔ مسجد قبا کی زیارت کے بعد مسجد سیدنا عمرؓ سیدنا علیؓ و سیدنا ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی چکی کی زیارت کی اور وہاں سے ہر خاتم پر آکر پانی پیا جس میں حضور کی انگشتری مبارک گر گئی تھی۔ واپسی میں شہیکا ذرسیدنا عمرؓ حضرت بلالؓ اور سیدنا ابوبکرؓ کی مسجدوں کی زیارت کی۔ سیدنا علیؓ کی مسجد بند تھی اسلیے باہر ہی سے زیارت کرلیگئی۔ زیارت کے موقعوں پر ہر جگہ سید زین العابدین صاحب کچھ عابئی عربی زبان میں با آواز بلند پڑھتے تھے اور سب لوگ ان الفاظ کی تا امکان تکرار کرتے جاتے تھے۔ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا خاص ثواب ہے اسلیے وہاں جتنی دیر قیام ہوا میں نوافل پڑھتا رہا باقی اور سب مقامات پر بھی کم سے کم دو رکعت نفل ضرور پڑھ لی۔

مسجد قبا کا راستہ ناہموار تھا۔ بڑے بڑے گاڑیوں پر ہم لگ گئے تھے ان میں کمانیاں نہ تھیں۔ اسلئے آمد و رفت کی مسافت زیادہ نہ ہونے کے باوجود تکلیف اور تھکن بہت ہوئی۔ بعد ادائے نماز ظہر حسب وعدہ شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ فوراً قہوہ سے ضیافت کی اور تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ اور چلتے وقت میرے حزن کو دفع کرنے کی ترکیب بتائی۔

آج ایک بہار کے رہنے والے نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام حامد رسول ہے۔ اور یہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب جو طبی مشن لیگئے تھے اُسکے ایک رُکن تھے۔ اب ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔ اُن سے دیر تک عام حالات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ رات حرم شریف میں بسر ہوئی۔ الحمد للہ

چونکہ زیارت حرمین شریفین کے سلسلہ میں مجھے ایکی فکر بھی تھی کہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں بقیہ عمر گذارنے کی صورت پیدا ہو اسلئے مدینہ منورہ میں جن حضرات سے موقع ملتا اس بارہ میں گفتگو کی جاتی۔ مہاجرین میں سے جو اصحاب متوکلین میں ہیں اور حصول معاش کے لیے کوئی کام نہیں کرتے ایکی تابعیت ایک دنیا کے کتے سے نہیں ہوسکتی۔ اسلئے ایسے اصحاب کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو وہاں کسی قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب سے تو تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ مگر دیر تک مجمع ین کا ہجوم رہا اس بارہ میں گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب اُنکو فرصت تھی تو صبح ہی کو میں اُنکے یہاں حاضر ہوا اور دیر تک اس بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ خود متعدد قسم کی تجارتوں میں مشغول ہیں اور کافی تجربہ یہاں کی زندگی کا رکھتے ہیں۔ اسلئے اُن کی رایوں سے مجھے بہت مدد ملی۔

ظہر کے بعد شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ پہلے اُنھوں نے گرم گرم کبابوں اور عمدہ مکی بھوئی روٹی سے ضیافت کی۔ پھر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ رات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی تو مُنہ چھپائے ہوئے تھے اسلئے کچھ عرض نہ کرسکا۔ یہ گویا میرے حزن کے رفع نہ ہوسکنے کی طرف اشارہ تھا۔

حافظ شبراتی صاحب سے روزانہ کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی اور جب فرصت پڑتی تو وہ میرے ساتھ ہی اپنا وقت گذارتے۔ اُن کا قیام میاں مظہر کی رباط میں ہے۔ میاں مظہر صاحب حضرت مجدد سرہندیؒ کی اولاد میں ایک بزرگ کامل گزرے ہیں جن کا مدینہ منورہ میں غیر معمولی ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ جو رباط نہیں کی بنائی

وتی ہے اور اب اُنکے صاحبزادہ میاں احمد کے زیرِ اہتمام ہے۔ حافظ شبراتی صاحب نے از راہِ محبت میری
دعوت فرمائی۔ ایکبار پہلے انکی ہمراہی میں اُن کا جائے قیام دیکھ گیا تھا۔ اب دعوت کھانے اپنے میزبان
جناب مولوی عبدالباقی صاحب کے ہمراہ گیا۔ اور وہاں دیر تک ٹھہرا تو رباط کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ مرتبہ
ان قطع کی دو منزلہ عمارت ہے جس میں چاروں طرف برآمدہ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ٹھہرنے والوں کے
لیے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبا و مہاجرین رہتے ہیں۔ مکان کے ایک قطعہ میں خود میاں احمد صاحب کے
اہل وعیال رہتے ہیں۔ صاحب موصوف کے دو بیبیاں ہیں۔ ایک رباط میں رہتی ہیں اور دوسری حرم
نبوی کے قریب ایک مکان میں۔ اس رباط کے رہنے والوں کو آپ کے حلقہ میں بھی حاضری دینا ہوتی ہے۔ میرا
خیال تھا کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگ عموماً اور حضرات مجددین خصوصاً پیرزادگی کے عام طریقہ پر عمل پیرا
نہیں ہوتے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ خواص اور صاحبانِ دل تو ضرور ان باتوں سے بچتے ہیں ورنہ عام طور پر
اُن میں بھی وہی سب کمزوریاں موجود ہیں جو دیگر سلاسل وطرق میں پائی جاتی ہیں۔

میاں احمد صاحب اُسوقت موجود نہیں تھے اس لیے اُنکی قدمبوسی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ بلکہ ان سے
ملنے کے لیے ایک دن اُنکے بازار والے مکان پر حاضر ہونا پڑا۔

آج خبر ملی کہ ڈاک آئی ہے۔ ڈاک خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاک بازار میں تقسیم ہونے کو دی گئی ہے۔
رباط مظہری میں ایک طالبعلم یسین نامے رہتے ہیں جو مولوی عبدالباقی صاحب سے پڑھتے ہیں اور جن سے
تعرفیاً روزانہ آتے تھے۔ انکی زبانی معلوم ہوا ایک ہندوستانی عبدالرزاق نامی ہیں جو ڈاک نہ سے خطوط لاکر
تقسیم کرتے ہیں۔ اُنکی تلاش میں کئی بار گیا۔ شام کو اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ دوسرے روز
ڈاک دیکھکر بتائیں گے۔

رات مسجد نبوی ہی میں بسر ہوئی۔ آج شب جمعہ تھی اس لیے حرم شریف میں حاضر رہنے والوں کی
تعداد میں کچھ اضافہ ہوا اور ایک بخاری بزرگ سے جن کا اسم شریف محی الدین اور طریقہ نقشبندیہ تھا۔
ملاقات ہوئی۔ چونکہ فارسی میں گفتگو ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اُنکو جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اُنسے
اپنے حزن کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رفع حزن کی ایک ترکیب بتائی۔

دوسرے دن جمعہ تھا خبر ملی کہ شیخ شمس کا قافلہ دوشنبہ کو روانہ ہوگا۔ لہذا صبح کو بازار جاکر کھجور
خریدی۔ بعد نماز جمعہ مولوی ضیاء الدین کے ہمراہ رباطِ مغربی میں گیا جو حرم شریف سے قریب ہی واقع ہے اور

ناظر باستمر رباط سے کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر دار الضیافۃ میں جاکر مولوی فخر الدین بخاری کی قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عصر کے وقت شیخ حسین ناصری حرم شریف میں ملے تو فرمانے لگے کہ جب تک تمباکو مطلقاً ترک نہ کروگے تمہارا حزن دفع نہ ہوگا۔ نماز مغرب کے بعد حکیم ماد رسول کے ساتھ حزفا شومی کے یہاں گیا۔ یہی صاحب بادے مزدور ہیں۔ عرصے شدید علالت میں مبتلا ہیں اس وجہ سے سید زین العابدین صاحب کو اپنی طرف سے یہ خدمت سپرد کر رکھی ہے۔

سال میں دو دفعہ روضۂ اطہر کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل کی رات کو روضۂ اطہر پر حاضر ہوکر لوگ مرادیں مانگتے ہیں اور اس غرض کے لیے کہ غسل کرنے میں شرکت ہو جائے پاک کپڑے میں مراد صندل وغیرہ رکھکر اور پوٹلی بناکر روضۂ اطہر کی جالی میں ڈالدیتے ہیں اور غسل کے بعد غسل کا پانی تقسیم ہوتا ہے۔ میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میری حاضری کے زمانہ میں غسل ہونے والا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے وعدہ کیا کہ غسل کا پانی لادیں گے۔ دوسرے روز کہ یوم غسل تھا صبح کو میں دیر تک روضۂ اطہر پر حاضر رہا۔ اسی دن ایک صاحب جو ہندوستانی ہیں تشریف لاکر مجھ سے ملے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک خاتون کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ہمراہ لیجاؤں۔ مجھے اس میں تامل ہوا تو فرمانے لگے کہ کم سے کم کو معظمہ تک پہونچادینا۔ مجھے منظور کرنا پڑا۔

میرا شغدف بیرونی مناخہ سے اٹھ گیا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ مل جائیگا۔ اب جو واپسی کا زمانہ آیا تو مجھ کو اسکی فکر ہوئی۔ کئی بار سید زین العابدین صاحب سے کہا کبھی انھوں نے اپنے کسی کارکن کو میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی کبھی خود وعدہ کیا۔ بالآخر ایک دن میں انکی معیت میں اندرونی مناخہ گیا تو دیکھا کہ شغدف تو کھلا پڑا ہے اور چٹائی جو اوپر چڑھی تھی اور صراحیوں کی زنبیلیں وغیرہ غائب ہیں۔ غنیمت ہے کہ شغدف کا پتہ چل گیا۔

شام کو اسی طرف پھر نکلا۔ ایک جگہ تازہ انجیر فروخت ہو رہے تھے۔ دو قرش کے سولہ سترہ ملے خوش ذائقہ معلوم ہوے اور میں سب کھاگیا۔ دن میں اتفاق سے ایک جگہ بہت سے کباب اور ایک ہندوستانی مٹھائی والے کے یہاں سے کچھ مٹھائی لیکر کھائی تھی۔ ان بدعنوانیوں نے طبیعت خراب کردی۔ گرانی سر اور نزلہ پیدا ہوگیا۔ اور دوسرے دن بخار آگیا۔ اتفاق سے ایک شخص عبد الرحمن خیاط سے اس روز ملنے کا وعدہ تھا اسی حالت میں انکے یہاں چلا تو گیا مگر بخار کے کرب کی وجہ سے بہت بےچین رہا۔ اور ان غریب کو بھی کافی پریشانی

ہوئی۔ مغرب کے وقت تک تو خیر نماز کے لیے حرم شریف جاتا رہا مغرب کے بعد اس قدر الجھن بڑھی کہ حرم شریف جانے کا کیا ذکر نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ زیادہ رات گذرنے پر کچھ بخار میں کمی ہوئی تو نیند آئی۔ دوسرے دن اہلیہ مولوی عبد الباقی صاحب کے مشورہ سے ایک مسہل دوا جسکو شکو یا سنقوح کہتے ہیں، اسکے اثر سے دن بھر پتلے پتلے دست آتے رہے مگر دستوں کا سلسلہ شام تک بند نہ ہوا۔ نصف شب کے بعد کہیں جاکر دستوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ جس سے بہت ضعف پیدا ہو گیا۔

دستوں سے طبیعت مضمحل ہو رہی تھی، اسی حالت میں اطلاع ملی کہ حضرت شمس کا قافلہ دوسرے دن روانہ ہونے والا ہے۔ میں نے بھی سید زین العابدین کو اونٹ کا کرایہ دیدیا، اور حافظ شبراتی اور مولوی یٰسین کی معرفت ضروری چیزیں خریدی گئیں۔ حافظ شبراتی نے چونکہ ہمراہ چلنے کا تہیہ کیا اسلیے مجھے دوسرے ساتھی کی فکر بھی نہ رہی۔ راستہ بھی انشاء اللہ لطف سے کٹے گا۔ ظہر تک طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ ہمت کرکے لباس تبدیل کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے حرم شریف میں حاضر ہوا۔ اور عشا تک برابر احباب سے رخصتی ملاقاتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن سویرے ہی سے رختِ سفر درست کیا گیا۔ شغدف پر چٹائیاں اور کمل منڈھا صراحیوں کے لیے زنبیلیں بندھوائیں۔ اور سامان بھی تیار ہو رہا تھا کہ سید زین العابدین آئے اور یہ خبر سنائی کہ جس اونٹ کا کرایہ دیا گیا تھا وہ نہیں آیا۔ قافلہ باب الشبریہ پر پہونچ گیا تھا جو تبرز کا مقام معین کیا گیا تھا۔ لہذا دوڑتا ہوا وہاں گیا کہ کوئی دوسرا اونٹ خالی ہو تو اُسپر جانے کا انتظام کروں۔ وہاں پوچھکر پہلے تو کورا جواب ملا۔ پھر ایک صاحب نے اطلاع دی کہ ایک جگہ خالی ہے اگر تنہا جانا ہو تو کرایہ طے کرلو۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ حافظ شبراتی کو چھوڑ دوں، اسلیے ناچار تھکا ماندہ واپس آیا۔ مگر حضرت شمس کی ہمراہی میں نہ جاسکنے کا بہت رنج ہوا۔ اور جب سید زین العابدین سے سہ پہر کو ملاقات ہوئی تو غصہ کی وجہ سے بہت درشت گفتگو کی اور اُن سے صاف کہدیا کہ آپ کرایہ کا روپیہ واپس لادیں میں اب خود انتظام کروں گا۔ وہ شام کو روپیہ لانے کا وعدہ کرکے گئے مگر وقت معینہ پر نہ آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ دوڑا ہوا مولوی سید احمد کے پاس گیا اور اُنکے بھائی سید محمود کے مشورہ سے ایک درخواست عربی زبان میں لکھوا کر احمد بن منصور قائم مقام شریف کے پاس لے گیا۔ قائم مقام صاحب اپنے حوالی موالی سمیت بڑی بڑی لگنوں میں اُبلا ہوا پلاؤ اُڑا رہے تھے۔ جب کھانے سے فارغ ہوے تب مجھے باریابی کا موقع ملا۔ درخواست

لیکر رکھ لی اور دوسرے دن صبح کو مع مترجم کے حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ واپس آکر سب کیفیت
سید محمود سے بیان کی اور انھوں نے ازراہ محبت مترجم کا انتظام کردینے کا وعدہ کیا۔

صبح ہوئی تو سید محمود کے پاس پہنچ گیا اور وہیں سے مترجم کو لیکر قائم مقام صاحب کی بارگاہ میں
حاضر ہوا۔ یہ صاحب بدوی ہیں اور اپنی تمام قوم کی طرح جہالت کو باعث افتخار جانتے ہیں۔ شریف
مکہ نے چونکہ بدویوں ہی کے بل بوتے پر ترکی حکومت سے بغاوت کی اور انھیں کی قوت سے حجاز پر تسلط
حاصل کیا، اسلیے قائم مقامی یعنی گورنری جیسے ذمہ دار عہدہ پر بھی بدوہی مقرر کیے ہیں۔ قائم مقام
صاحب اپنے ملاقات کے کمرہ یا مجلس میں لیٹے ہوئے حقہ نوش فرمارہے تھے۔ میں حاضر ہوا تو آپ
نے میری درخواست ایک اردلی سے منگائی اور مترجم صاحب سے پڑھوا کر سنی۔ سید زین العابدین
پہلے ہی طلب کیے جا چکے تھے، تھوڑی دیر میں وہ بھی ہانپتے کانپتے پہونچے تو اُن سے کسی قدر
درشت لہجہ میں بازپرس کی گئی اور فوراً مجھے روپیہ دلا دیا گیا۔ ساتھ ہی مترجم کے ذریعہ سے مجھے
اطمینان دلایا گیا کہ حکومت کی طرف سے اونٹ کا بندوبست کردیا جائیگا۔ اور میں دوسرے قافلہ
کے ساتھ روانہ ہوسکوں گا۔ چنانچہ ایک بدو میرے ساتھ کیا گیا جو باب المصری کے باہر بلدیہ (میونسپلٹی)
کے دفتر میں مجھے لایا۔ یہاں میں نے کرایہ جمع کیا اور رسید حاصل کی۔ تب جان میں جان آئی،
ورنہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وقت پر مکہ معظمہ نہ پہونچا تو حج رہ جائیگا۔ عصر کے بعد پھر بلدیہ گیا اور
مقوم کو ساتھ لاکر اپنا مکان دکھایا تاکہ اونٹ یہیں بھیجا جائے۔ میرے ساتھ دو پیپے بھی تھے جنمیں
کھجور اور خاک شفا تھی۔ چاہتا تھا کہ مقوم کی معرفت مناسب کرایہ پر ان پیپوں کے ساتھ جانے کا
بندوبست ہوجائے مگر مقوم نے کرایہ بہت مانگا لہذا اس بارے میں بھی مولوی سید احمد صاحب
سے رجوع کرنا پڑا۔ اُنھوں نے ازراہ ہمدردی وعدہ کیا کہ پیپے اُن کے ذریعہ براہ راست جدہ
پہونچا دیے جائیں گے۔

حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر فاتحہ خوانی نہیں کرسکا تھا۔ اتفاق سے
ٹھہر گیا تو سید زین العابدین کے ہمراہ گاڑی پر سوار ہوکر اُس بارگاہ عالی میں حاضری دے آیا۔
وہاں سے واپس آیا تو جمّال کی صورت دکھائی دی اور معلوم ہوا کہ فوراً روانگی کا سامان کرنا چاہیے۔
وضو کرکے حرم شریف حاضر ہوا۔ اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک پر سلام
و دعائے وداع پڑھی اور چاشت کے وقت روانہ ہوا۔ اونٹ تھوڑی دور چل کر مسجد سیدنا حمزہ

کے سامنے رُکا اور شغدف وہیں اُتار دیا گیا۔ ظہر تک وہیں رہنا ہوا، ظہر کے بعد جمال اونٹ لیکر
آیا تو روانگی ہوئی۔ روانگی کے وقت سید زین العابدین اور اُنکے شرکاء سب رخصت کرنے کے لیے
موجود تھے۔ اُن کا حق مزدوری ۲ مجیدی تو پہلے ہی ادا کردیا گیا تھا۔ کچھ خدمت اسوقت بھی کی گئی
بلکہ اس خیال سے کہ اونٹ کے بارے میں اُن سے کافی ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا اُنکو اُنکی توقع سے
زائد ملا۔ جس سے وہ بہت خوش خوش رخصت ہوئے۔

مدینۂ منورہ میں کوئی بڑی آبادی نہیں ہے۔ لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت
کے زمانہ میں ساٹھ ستر ہزار کی آبادی تھی۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں حکومت نے مدینہ منورہ کو
جنگی مستقر قرار دیا۔ اور اس خیال سے کہ اہالی مدینہ منورہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو تمام شرفاء و
معززین کو حکومت کے خرچ سے ریل پر سوار کرکے دمشق بھیجدیا۔ حضرت شیخ احمد شمس سے بھی دمشق
تشریف لیجانے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے پہلے عذر کیا، جب اصرار زیادہ ہوا تو آپ نے آستانۂ نبوی
پر حاضر ہوکر استخارہ فرمایا۔ اور عامل مدینہ کو اطلاع دی کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں
ہے۔ مگر گورنر نے کچھ نہ سُنی اور آپ کو بجبر جانب دمشق روانہ کردیا۔ دمشق کے حاکم نے آپ کی بہت
تکریم کی اور پھر مدینہ منورہ واپس پہونچا دیا۔ مدینہ منورہ کی مستقل آبادی میں کچھ تو اس سبب سے
کمی ہوئی تھی، باقی جب شریف حسین کا یہاں تسلط ہوا تو بدوی فوج کے مظالم نے ہزاروں باشندوں
کو خانماں برباد کردیا۔ بہت سے لوگ جان و آبرو بچانے کے خیال سے بھاگ گئے۔ اب بمشکل
دس ہزار کی آبادی ہوگی۔ آبادی کی کمی کے ساتھ جو لوگ رہ گئے ہیں اُنکی مالی حالت بھی خراب
ہوگئی ہے۔ کیونکہ ترکی حکومت کی طرف سے جو وظیفے اور انعام ملتے تھے وہ سب بند ہوگئے۔
صرف زائرین ذریعۂ آمدنی رہ گئے۔ اور جنگ کے بعد سے انکی تعداد بھی بہت قلیل ہوگئی تھی۔ اب
صلح کے بعد سے خیر پھر یہ سلسلہ جاری ہوا ہے مگر ترکی کے دولتمند زائرین اب بھی نہیں آتے۔

آبادی کا بیشتر حصہ قدرۃً حرم نبوی کے اطراف میں آباد ہے۔ اسلیے یہاں آبادی گنجان ہے
شہرپناہ کے باہر جو مکانات بنے ہوئے ہیں وہ تو اب بالکل ہی غیر آباد رہتے ہیں۔ شہر کے اندر بھی
جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے، کچھ چہل پہل تھی، اُنکے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا معلوم
ہوتا تھا۔ حرم نبوی کے جنوبی دو پھاٹکوں کے سامنے دو رویہ بازار ہے۔ اصلی بازار باب السلام
کے سامنے ہے جہاں سے روضۂ مبارک کے پاس حاضر ہونے کا راستہ ہے۔ اس بازار کے ختم

باب المصری ہے جسکے باہر مدینہ کے مقابل غلہ، کھجور اور دیگر اشیائے خوردنی کا بازار ہے جب
ریل جاری تھی تو باب العنبریہ سے جہاں اسٹیشن بنا ہوا ہے ریل کی ایک پٹری حرم شریف کے قریب
تک بچھا دی گئی تھی - جو اب تک علیٰ حالہ ہے۔ ریل جنگ کے زمانہ میں بند ہو گئی تھی - مگر اب
پھر جاری ہونیوالی ہے - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے حصہ زیریں میں باب المکہ ہے جس میں داخل
ہوتے ہی داہنی جانب ایک مختصر سا قلعہ ہے - شریف علی حاکم مدینہ جب یہاں آتے ہیں تو اسی میں
رہتے ہیں۔ آجکل شریف علی یہاں نہیں ہیں - قلعہ کے مقابل پوستہ یعنی ڈاکخانہ ہے - اور
جوانب میں اندر اور باہر مسافرخانہ ہے جہاں قوافل آکر اترتے ہیں - باب المکہ سے جبل اُحد تک جسکے
دامن میں حضرت سید الشہداء کا مزار مبارک ہے کوئی ایک کوس کا فاصلہ ہوگا - مگر امن کا یہ عالم
ہے کہ سوائے چہار شنبہ کے جبکہ کثیر تعداد میں لوگ وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں یا ایسی صورت میں کہ
زائرین کی معقول تعداد ہو عام طور پر بغیر سرکاری محافظ کی ہمراہی کے کوئی شخص وہاں تک نہیں جا
سکتا - اسی راستہ میں ایک جانب ترکی حکومت کے زمانہ کا بے تار کی تار برقی کا اسٹیشن بنا ہوا ہے
جس پر اب شریف صاحب متصرف ہیں - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے بالائی حصہ میں ایک دروازہ
ہے جسکے باہر "جنۃ البقیع" ہے - یہ مشہور قبرستان بہت وسیع ہے - اس سے متصل ہی ایک نخلستان ہے
جہاں ایک جلیل القدر صحابی کا مزار مبارک ہے میں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے جانا چاہتا تھا مگر معلوم
ہوا کہ راستہ محفوظ نہیں ہے - حالانکہ یہ جگہ شہر پناہ سے غالباً دو فرلانگ بھی دور نہیں -

شریف علی جو یہاں کے مستقل گورنر ہیں عموماً یہاں رہتے نہیں، اسلیے قائم مقام صاحب ہی
کو یہاں کا گورنر یا عامل سمجھنا چاہیے - شریف حسین کو مدینہ منورہ سے کس قدر دلچسپی ہے، اسکا اندازہ
اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خاص حرم نبوی کے مجاوروں اور خدمتگاروں کو پندرہ پندرہ مہینے تنخواہ
نہیں ملتی - حرم نبوی کی تعمیر پر شاہان آل عثمان نے جس قدر بے دریغ روپیہ صرف کیا اُسکا اندازہ
ہر شخص حرم شریف کی زیارت کے بعد کر سکتا ہے - مگر آج یہ عالم ہے کہ حرم شریف کی شمالی دیوار
عین اُس مقام پر جسکے نیچے عورتوں کی جالی ہے شق ہو گئی ہے اور اُسکی مرمت نہیں ہو سکتی - مسجد
نبوی کے وسیع دالان کے عالیشان ستون، محرابیں، اور ساری چھت خوشنما پھول بوٹوں سے منقش ہے
مگر اب جہاں کہیں چونہ اُکھڑ گیا ہے اُسکی درستی نہیں کی جا سکتی - مسجد نبوی کے اندر جو چٹائی کا فرش
ہے کہیں کہیں وہ بھی شکستہ نظر آیا -

مسجد نبوی، حرم کعبۃ اللہ کے خلاف مستطیل بنی ہوئی ہے۔ وسیع دالان کے جنوبی گوشے پر حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اطہر ہے۔ جس کا سبز گنبد مسقف مسجد سے باہر نمایاں ہونے کی وجہ سے
زائرین کو دور سے زیارت کا موقع دیتا ہے۔ روضۂ مقدس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ممبر شریف ہے۔
اور درمیان میں وہ مبارک جگہ ہے جسے روضۃ من روضات الجنان کا لقب ملا ہے۔ روضۂ اطہر
کے گرد کسی وجاہت کی وسیع جالی لگی ہوئی ہے جس پر گنگا جمنی پھری ہے۔ اس جالی کے اندر
بائیں کی جانب ایک پردہ کی جالی ہے جسکے قریب ہی حضرت فاطمۂ زہرا کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔
جالی میں متعدد دروازے ہیں مگر مغربی سمت کے دروازہ سے عموماً افواطا یا خواجے صفائی اور روشنی
وغیرہ کے لیے اندر حاضر ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر رات کو عموماً برقی روشنی ہوتی ہے جو عشا کے
بعد بجھادی جاتی ہے البتہ روضۂ اطہر کے اندر رات بھر شمعیں روشن رہتی ہیں۔ روضۂ مبارک کی
جالی کے بائیں میں کچھ فاصلہ پر ایک چبوترہ خواجوں کی نشست کے لیے بنا ہوا ہے۔ اور اسکے بعد ایک
درجہ کا شمالی دالان ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس دالان کا اگلا حصہ تو کھلا ہوا ہے
مگر پیچھے نصف سے زائد دالان میں لکڑی کی جالی لگی ہوئی ہے۔ جنوبی دالان میں جب مجمع زیادہ
ہوتا ہے تو مرد نماز پڑھتے ہیں۔ مغربی دالان کی پشت پر طہارت خانہ اور وضو خانہ ہے اور دروازہ
سے متصل ایک مدرسہ ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ مسجد نبوی کے پانچ دروازے ہیں شمال و
جنوب میں بالمقابل دو دو اور ایک مغرب میں۔ مشرق میں ایک کھڑکی مین روضۂ اطہر کے مقابل ہے۔

مدینہ منورہ میں پانی بہ افراط ملتا ہے اور اس میں جتنی خوبیاں ہونا چاہیے سب موجود ہیں
میں نے اس سے قبل ایسا خوش ذائقہ پانی کہیں نہیں پیا۔ جو صراحی میں رکھنے کے تھوڑی ہی
دیر بعد ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور اس قدر سبک ہے کہ خواہ کتنی ہی مقدار میں پیا جائے کسی قسم کی گرانی
محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اُس پانی کی خصوصیت ہے جو نہر کے ذریعہ باہر سے آتا ہے۔ ورنہ کنوؤں
کا پانی عموماً کھاری ہے۔ البتہ مسجد نبوی کے کنوئیں کا پانی کھاری نہیں، گو تازہ پیا جائے تو
ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

یہاں علاوہ اشیائے خوردنی بھی بافراط ملتی ہیں اور بمقابلہ مکہ معظمہ کے اچھی اور ارزاں ہیں۔ عموماً
سب چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ ہر قسم کی ترکاریوں کے علاوہ خربوزے، تربوز، کھجور، انگور، انار،
اور انجیر وغیرہ افراط میں ہوتے ہیں۔ کھجور تو یہاں کا مشہور ہی ہے مگر میری حاضری کے زمانہ میں کھجور کی

فصل نہیں اسلیے تازہ پھل نہ ملے۔ اور رکھے ہوئے بھی نسبتاً گراں ملتے تھے ۔ دودھ، دہی وغیرہ بھی عمدہ اور ارزاں ملتا ہے۔ قہوہ خانوں کی کثرت ہے۔ اور کھانے کی دوکانیں بھی جگہ جگہ ہیں۔ اگرچہ زائرین کے رخصت ہو جانے پر ان میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص تنوری روٹی کھاتا ہے۔ جو لوگ بازار سے نہیں مول لیتے وہ اپنا آٹا بھیجکر پکوا لتے ہیں۔ یہاں کی روٹی ذائقہ میں مکہ معظمہ اور جدہ کی روٹیوں سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

یہاں کی آبادی ویسی مخلوط نہیں جیسی مکہ معظمہ کی۔ کچھ بخاری اور ہندوستانی ہیں اور باقی سب عرب۔ البتہ عربوں میں مغربی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مکہ معظمہ کی طرح یہاں بھی اصل باشندے بہت کم ہیں۔ بدووں کے سوا تقریباً سب بیرونی لوگ ہیں۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بھی عموماً وہی ہیں جو مکہ معظمہ میں برتے جاتے ہیں، مگر اخلاقی حیثیت سے یہاں کے لوگوں کا مرتبہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ایک نمایاں فرق تو لب و لہجہ کی نرمی اور شیریں گفتاری میں نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ میخواری اور دیگر فواحش بھی یہاں عام نہیں۔

تعلیم کی بہت کمی ہے۔ حرم شریف میں بعض علما درس دیتے ہیں یا اپنے گھروں پر کچھ لوگوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک کتب بھی ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے مگر یہ بالکل ناکافی ہے۔

مدینہ منورہ کوئی تجارتی منڈی نہیں۔ گو گرد و نواح کے قبائل یہیں سے احتیاج زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ینبوع کی راہ سے جملہ اشیاے ضرورت یہاں آتی ہیں۔ ترکی وظائف و انعامات کی بندش اور حکومت ہاشمیہ کی بے اعتنائی کے باعث ہر طرف غربت و افلاس کے آثار نظر آتے ہیں اور مخصوص طبقات کے سوا عام طور پر مذہبیت یہاں بھی زیادہ نمایاں نہیں۔ سب سے زیادہ اُن فقرا و مہاجرین کو دیکھ کر حسرت معلوم ہوتی ہے جو یہاں رہ کر طرح طرح کے جسمانی مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہیں مگر اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پانچوں وقت حرم نبوی میں نماز با جماعت ادا کریں۔ جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے مسجد اوقاتِ نماز میں بھری رہتی تھی نوافل کے جانے کے بعد جمعہ کے دن بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا تھا کہ صدر دالان پُر ہو سکے۔

ساتویں منزل

۸- جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلہ نے دوسری راہ اختیار کی - جب تک حوالیِ شہر کے قریب قافلہ رہا دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد منظر فروز ہوتا رہا تا آنکہ مغرب تک ایک ایک کرکے سب نشانات نظر سے اوجھل ہو گئے - جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شغدف میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا، لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا، لہذا نمازیں بھی شغدف ہی پر پڑھی گئیں - منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہو گئی اور عشا کے وقت بیر للاشی پہونچ گئے -

دو شنبہ ۹- جولائی

بیر الماشی کا پانی مدینۂ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی، جسکی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی - کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوئے تھے - بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہو گئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، تربوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا، قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا - سہ پہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا - اب راستہ ہموار اور ریتلا تھا - گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا - عصر کے وقت نماز کے لیے اُترا، عینک شغدف پر رکھدی تھی، اسلیے نماز کے بعد اپنے شغدف کو نہ پہچان سکا اور آگے نکل گیا، دور تک چلتا رہا اور ہر شغدف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہو گیا - ایک بدو سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے وہ پیچھے ہے - لہذا وہیں رُک گیا - کچھ دیر میں شغدف ملا تو اس پر سوار ہوا - خستگی سے حد درجہ طبیعت نڈھال ہو گئی تھی - مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے اس لیے عادت

کے خلاف قافلے کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو، جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے۔ جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ تھوڑی ہی رات سے ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی ہوا سرد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رضائی اوڑھنے پر بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف پہونچی۔ اور سردی سے بخار آگیا۔ قافلہ رات ہی میں تنائر پہونچ گیا تھا، جلدی جلدی شغدف اُتارا اور اوڑھ لپیٹ کر سو رہا۔ منزل پر کچھ سردی کم تھی۔ کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا اور تقریباً ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

شنبہ ۱۰ جولائی

صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب نے سارا کام خود ہی کر لیا۔ اور جب کھانا تیار کر چکے تو مجھے بھی اُٹھایا۔ میں نے پہلے تو تھوڑا سا خمیرہ بنفشہ کھایا۔ اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔ بیرالماشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے۔ عاز ے روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے۔ میں بہت ضعیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ عورتیں تک شغدفوں پر نہیں بٹھائی گئیں۔ آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے حجاج۔ تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ لاچار ہو کر جمّال نے ایک خالی اونٹ پر مجھے بٹھا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا، جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کر ڈالا تاکہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں۔ شتربان نے یہ حالت دکھا کر مجھ سے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبوراً مجکو پھر اُترنا پڑا۔ اونٹ پر چڑھتے وقت میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شغدف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے پتھریلی زمین تپ رہی تھی، ...... تلوے بھنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شغدف کے ہمراہ آگے جا چکے تھے۔ بہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُتار ختم ہو جانے اور ہموار راستہ آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے، یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے،

باعث گر پڑا۔ میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمال سے جا کر املان کا تب کہیں شغدف پر سوار ہونے کی نوبت آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے، خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی۔

چہارشنبہ ۱۱۔ جولائی

پیر الاشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا۔ پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شغدف کی آڑ میں لیٹا رہا۔ بیچارے حاجی شیرازی سارا کام کرتے رہے۔ پانی یہاں بھی نہایت اچھا تھا۔ اگرچہ غائر کی سی سردی نہ تھی۔ عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رکا رہا۔ میں شغدف سے اترا نہیں مگر بیٹھے لیٹے بدووں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رکا کھڑا ہے۔ کوئی معقول جواب تو ملا نہیں لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا انھیں میں سے کسی نے روکا ہوگا۔ اور جب انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ جاتے وقت معقول رقم دی جا چکی ہے، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا۔ راستہ میں رکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی پہونچتے پہونچتے آفتاب نکل آیا تھا۔

پنجشنبہ ۱۲ جولائی تا پنجشنبہ ۱۹۔ جولائی

بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے۔ جاتے وقت گرمی بہت تھی۔ مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں، جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہو گئی ہے ورنہ احرام بند ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی۔ طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزل پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شیرازی کیا کرتے۔ ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کر دی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کرتا تھا۔ شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مستورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر برساتی پانی جمع ہے وہیں سے مشکیزے بھر لاتے ہیں۔ اس پانی کی قیمت ضرور زائد تھی۔

مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں اور دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی پر اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا۔ موسم بھی نسبتاً خوشگوار تھا، اور باوجودیکہ حاجی شیرازی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔ ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تھا، منا سے عموماً شرارت

سبب پریشانی بنجاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بیچارہ
فوراً رفع شکایت کی کوشش کرتا۔ مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اس
سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب
ہیں۔ جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اس سے کہا گیا۔ اور اگرچہ اسکو اور اسکے لڑکے کو کپڑوں
کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوا ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ
غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا۔ اور جب اسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو
بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعاً کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت
اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے۔ جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ
و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر حلم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس تبدیلی کا باعث غالباً
حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جا سکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فوراً گرفتاری
ہو جاتی ہے۔

○

آٹھویں منزل

۱۹- جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قافلہ مدینہ منورہ سے واپس آئے اور شریف صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدوؤں نے لے لیا ہے، تو انھوں نے اکثر جمالوں کو بلا کر نصف رقم واپس دلا دی میرے لیے بھی روپیہ مجیدیاں وصول کر لی گئی تھیں جو مشفقی میر عبد العزیز صاحب سے مل گئیں۔ عبد الستار دہلوی کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آ گئے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ بجو صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہٗ خلف اصغر منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور بھی آ گئے ہیں - اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنے والے تھے، مگر بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور غیر بعد وطن سے روانہ ہوے - عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف و سعی سے فراغت کر کے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔ دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جا کر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی - بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا پھر عبد الستار عبد الجبار کی کوٹھی پر جا کر حاجی شیرانی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر جو وہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا - اور گھر آ کر اخبار ہمدم کے پرچے اور الناظر پڑھتا رہا - خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کر کے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر اودھ لکھنؤ آ گئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبد الرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان پر ٹھہرے ہوے تھے - اُنکی معیت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی اور وہاں سے رباطِ بھوپال جا کر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے لایا تھا، اُنکو دیا - پھر بجو صاحبہ کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا، اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے - شام کو بازار جا کر مجیدیاں وغیرہ کُنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا -

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پا گیا کہ ۲۳- جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا - تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کر سکیں -

نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آجائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کر سکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھ کر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکۂ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے اسلیے اونٹ جابجا رکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتاً آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دوڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریباً نصف مسافت شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چاردیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ حاجی علی جی شندت اتار کر اور سامان رکھ کر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبۂ شریف کے رخ پر جو دو درجہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج نے یہیں قیام کرنا پسند کیا اور جابجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کاروان سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانماز بچھاکر نماز ادا کر لی گئی۔ نماز سے فارغ ہوکر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دورویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اسوقت بازار زائد رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شیرازی، جو مکۂ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے میرا درعزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی جسکی وجہ سے انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کر سکتے تھے، مکۂ معظمہ سے میں نے انکو اپنے اونٹ پر بٹھالیا تھا تاکہ انھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے بعض دیگر حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

چونکہ دیر میں پہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ حجی صاحبہ وغیرہ کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہو گئی تھی اسلیے ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہو چکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں جا کر بیٹھ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہو گئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب بیداری مجھے از قبل حجاج یا منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور جبتک نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ پہونچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی سے تقریبًا چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔ قریب ہی بازار سجا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خور و نوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ جو مکۂ معظمہ میں ہے وہی منا اور عرفات میں بھی ہے۔ بلکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جا کر غسل بھی کیا۔

میر عبد العزیز صاحب کو مکۂ معظمہ ہی میں تپش کی کچھ خلش ہو گئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اور زیادتی ہو گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ بازار میں جا کر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں آ کے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی، اوپر سے تیز لو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔ نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ ادا کر کے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور یہیں اونٹ پر سوار ہو کر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لو کی تاب لا سکیں وہ پہلے ہی سے جا کر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلے سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا وہاں سے چلنے کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سالے یوسف اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دینا اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع کر دیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر پہونچ گئے۔ اور اُنکے پہونچتے ہی پہاڑی کے لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ یا امام سے قریب ہونے کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کر کے زمین پر چٹائی بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے
بھی خوب ذوق وشوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر
آنے لگی مگر صورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع
ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات
کے وسیع میدان میں جہاں صبح کو چاروں طرف خیمے، جھولداریاں اور شقدف نظر آرہے تھے اس وقت
سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شقدفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے
جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے جی۔ جی (چلو چلو) کا ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک
آفتاب غروب نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار درد انگی کے لیے
کہنا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع وخشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا جب
جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ دیا کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا، اور اپنا
آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب
آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس
ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہونچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شقدف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے
مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہوگا۔ اور راستہ اتنا وسیع وعریض ہے کہ چار چار پانچ پانچ
قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ بمشکل راستہ میں کچھ سجھائی
دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آگیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔
یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک
ہی سمت میں یعنی مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات
کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل
کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات
بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت
کر کے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھائی وغیرہ اور سلہ کے لیے لیتا آیا۔ حاجی
شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے۔ بازار سے واپسی میں اپنے
مقام تک پہونچنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جانب شقدفوں کی قطاریں تھیں۔ چاندنی رات
تھی۔ اس لیے شقدفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہر قافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شغدفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھاکر بالآخر ایک بار اپنے شغدفوں تک رسائی ہو گئی۔ شغدفوں کے آگے ہمنے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ اور سلسلہ سوکے تھے اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خرید کیا گیا تھا شغدف میں رکھکر میں بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اُٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوسکے تھے کہ جمال آگئے اور جلدی جلدی شغدف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منا کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد کے چلنے سے گرد بہت اُڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گرد و پیش کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دکانوں کا سامان اُٹھ نہیں چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے تھے۔ بائیں جانب گر ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں جا سکنے کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منا پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک چبوترہ پر شریف صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے قیام تھا اب بھی ہمارے شغدف وہیں اُتارے گئے۔ سامان خورد و نوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شغدف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرة العقبیٰ کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کرکے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منا کے بازار کی سڑک کے درمیان میں دو جمرے ہیں۔ مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں ایک جمرہ ہے جسکی صورت ایک بھدی لاٹ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہو گی اسکے گرد ذرا اونچی منڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چُنی تھیں انہی سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہو کر قربانی کے لیے مذبح کی جانب روانہ ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً چالیس دا س خرید کر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڑھے اس غرض سے کھدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں۔ مگر اسکی پابندی کم کی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ جانور خرید کرکے وہیں ذبح کردیتے ہیں اور غریب عربوں کی کثیر تعداد جو وہاں موجود رہتی ہے اور ہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے، ذبح شدہ جانور دیدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا باقی کُل راسوں کو ذبح کرکے وہیں تقسیم کردیا۔ جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ میں تین چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خرید کئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی۔ نماز ظہر کے وقت وہیں پانی لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی۔ جو غریب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد راسیں مانگ لیتے تھے اُنکے پاس عموماً چھریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھریوں سے جانور ذبح کیے گئے۔ بعض وقت یہ چھوکرے کسی جانور کو پسند کرکے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے۔ اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو دشواری پیش آتی تھی۔ کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا۔ اب کیا تھا وہ میرے ابھڑ گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دوں گا۔ میں نے ہر چند سمجھایا مگر نہ مانا۔ اور بالآخر ایک مسلح عرب کو جو غالباً فوجی تھا بُلا لایا۔ وہ مجکو اپنے ہمراہ ایک راؤٹی میں لگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے کو کچھ بخشش دیدو۔ میں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہوچکا ہے اور اگر اب بھی تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائیگاں جائے اُس لڑکے کو چوّنی دیکر اپنی جان چھڑائی۔

جن جانوروں کو بنواکر گوشت ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں مذبح میں کی گئی اور ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا۔ اُس نے صرف کھال اُتار کے آلائش نکالدی اور جانور ہمارے حوالہ کردیا۔ گوشت کے بنانے کی وہاں کسی کو فرصت نہیں اور دو تین روپے دیے جاتے تو شاید بنا دیتا۔

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسر پولیس کے یہاں

چیتی ہوئی۔ مگر اب تو کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کیے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راؤٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر ہو کر آرام سے سرمنڈایا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت شریف صاحب کی سواری مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جنکے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خشکی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کر کے حاجی برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہو کر باطمینان تمام طواف کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھانے یا قہوہ کی کھلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پا کر اُس گھر میں آیا جو کہ مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کر کے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دُنبہ جو ایک دن قبل ذبح کیا گیا تھا اسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرنا تھا میں نے ایک قربانی تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جا کر ایک عمدہ دنبہ مول لیا۔ قربانی کی اور گوشت بنوا کر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض ہیں وہ رمی کر کے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے اپنے

شغدفوں میں سوار ہوں - اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آگئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کر دیے گئے - اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پہ ٹھہر جائیں - مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا - اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھا کر شغدف پہ سوار ہو گیا -

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج کہ معظمہ واپس جا رہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا - اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوئے تھے مگر کہیں عصر کے وقت کہ معظمہ پہونچے - حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر نور سلمہ کو طواف و زیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا -

سہ ماہی مجلہ

جس میں

● علوم قرآن و حدیث ● فقہ ● کلام ● تصوف ● اسلامی تاریخ

● تعلیم و تدریس ● فلسفہ و سائنس ● ادبیات ● معاشیات ● عمرانیات

● سیاسیات ● ثقافت و تمدن ● قانون و اصول قانون

پر

اسلامی نقطۂ نظر سے مقالات شائع کیے جاتے ہیں

ادارۂ تحقیقات اسلامی

اسلام آباد (پاکستان)

سائنس اور مسلمان

○ مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

—— ○ شبیر احمد خاں غوری

○ تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

—— ○ ڈاکٹر فواد سیزگین

غوری صاحب کے مضامین خدابخش لائبریری کی
طرف سے کتابی شکل میں زیر اشاعت ہیں، ان میں سے
ایک مجلہ 'معارف' بابت جون ۱۹۶۵ء سے لیا گیا ہے۔
پیش خدمت ہے۔

دوسرا مضمون فواد سیزگین کے فاضلانہ سلسلہ مضامین
کی ایک اور کڑی ہے جو 'فکر و نظر' اسلام آباد' بابت
جنوری تا مارچ ۱۹۹۱ء سے لیا گیا ہے
ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ادارہ

جناب شبیر احمد خاں غوری
علی گڑھ

مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

مسلمانوں میں علم ہیئت کا آغاز مسلمانوں میں نجوم و ہیئت کی باقاعدہ ابتدا دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ ۔ ۱۵۸ھ) سے ہوئی۔ وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے منجمین کو تقرب بخشا، اس کا منجم خصوصی نوبخت تھا۔ نوبخت کے علاوہ دربار کے ہیئت دانوں میں دو اور مشہور شخص تھے: محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان کے علاوہ ایک اور مشہور نجومی بھی تھا جس کا نام ماشاء اللہ تھا نوبخت اور ماشاء اللہ ہی نے بغداد کی بنیاد ڈالنے کی صورت نکالی تھی بسنہ ۱۴۵ھ بیان اور بقول البیرونی ۱۵۴ھ میں) ہندوستان کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر منصور کے دربار میں حاضر ہوا، جسے اس کے حکم سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں منتقل کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں "السند ہند الکبیر" کے نام سے مشہور ہوا۔

منصور کے بعد مہدی (۱۵۸ھ ۔ ۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا۔ اس نے بھی نجوم و ہیئت کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس کا منجم خصوصی تھوفیل بن توما الرہاوی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور پھر ہارون (۱۷۰ھ ۔ ۱۹۳ھ) خلیفہ ہوا، ہارون کا عہد برامکہ

کا ماہر یہودی ... کے لیے مشہور ہے مامون کے حجاج بن مطر اور سلمان نے بطلیموس
کی کتاب المجسطی کا عربی میں ترجمہ کیا، مامون کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصد گاہ شہر جندی شاپور
میں قائم ہوئی۔ اس کا متولی احمد النہاوندی تھا، جس نے اپنے فلکی مشاہدات کو الزیج المشتمل میں
قلمبند کیا،

ہارون کے بعد پہلے امین تخت نشین ہوا مگر کچھ دن بعد چھوٹے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا اور
اسی خانہ جنگی کے نتیجہ میں تخت و تاج کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مامون اور اس کے جانشین امین کے بعد مامون (۱۹۸ھ۔۸۱۳ء) سریر آرائے خلافت ہوا
وہ بالطبع عقلیت کا دلدادہ تھا، اور قیام خراسان کے زمانہ ہی میں فضل بن سہل کے زیر اثر نجوم اور
جوتش کا معتقد ہو چکا تھا، اس نے یونانی علوم کے نشر و اشاعت پر خاص طور سے توجہ کی اور
اس تحریک کو منظم طور سے چلانے کے لیے ہارون کے "خزانۃ الحکمہ" کی "بیت الحکمۃ" کے نام سے
تجدید کی، علم الہیئت کی ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد اور دمشق کے نزدیک رصد گاہیں قائم
کرائیں، اس کی سرپرستی میں آلاتِ رصدیہ میں قابل قدر اصلاح ہوئی اور ان کی مدد سے اسکے
ہیئت دانوں نے آفتاب کے "میل کلی" (Ecliptic) "خروج مرکز"
(Eccentricity) اور "نقطہ اوج" (Apogee) کو متعین کیا لیکن
ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، اس سے پہلے صرف یونانی حکیم ایراتوستھنیس
نے شہر اسکندریہ میں تخمینی طور پر اسکا اندازہ لگایا تھا لیکن مامون نے اصلاح شدہ آلات اور ماہرین
ہیئت کی مدد سے اسے تحقیقی طور پر دریافت کرایا۔

عہد مامونی کے منجمین میں یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبدالملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری
اور سند بن علی زیادہ مشہور ہوئے لیکن ان سے بھی زیادہ مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی (بانی علم الجبر و المقابلہ)
ہے، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کے "السند ھند الکبیر" کو مختصر کر کے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

کی مدد سے اس نے ہیئتی نظام کی بنیاد ڈالی جو "السند ہند" کہلاتا ہے اور مسلم علم الہیئت کی اصل سمجھا جاتا ہے۔ اس نئے نظام میں اس نے "اوساط کواکب" کے باب میں "سدھانت" کا "تعدیل" کے باب میں "زیج شہریار" کا اور "میل آفتاب" کے باب میں "المجسطی" کا اتباع کیا اور عرصہ تک لوگ خوارزمی ہی کی زیچ پر اعتماد کرتے رہے۔

مامون کے بعد معتصم (سنہ ۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) پھر واثق اور اس کے بعد متوکل (سنہ ۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) خلیفہ ہوئے۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حبش الحاسب، الکندی اور بنو موسیٰ ہیں۔

حبش الحاسب اجرام فلکی کی گردش کے حساب میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ "الزیج الممتحن" کا مصنف ہے۔ اس کے علاوہ اس نے "زیج السند ہند" کی بھی اصلاح کی اور "جدول الدقائق" کے نام سے ایک مثلثاتی جدول" بھی مرتب کی تھی، جس میں "اوتار" (Chords) کے بجائے "جیوب" (Sines) پر عمل کیا ہے۔

الکندی دنیا کے بارہ عبقریوں میں سے ایک ہے۔ اس نے ریاضی و ہیئت پر سو کے قریب کتابیں لکھیں اور "متوسطات" (وہ کتابیں جو اصول اقلیدس اور المجسطی کے درمیان پڑھی جاتی ہیں) میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کی ایک نجی رصدگاہ بھی تھی، جہاں وہ اجرام فلکی اور مظاہر جو کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ۲۲۲ھ کے اس قسم کے ایک مشاہدے کو اس نے ایک مستقل رسالہ میں قلمبند کیا تھا۔ کندی عام حکما کے برخلاف عناصر کو تین مانتا تھا، اور آگ کے بارے عنصر ہونے کا منکر تھا۔

بنو موسیٰ نے سامرا میں ایک رصدگاہ قائم کی تھی جو رصدگاہ مامونی کے بعد اسلامی تاریخ کی دوسری مشہور رصدگاہ ہے۔ وہاں انھوں نے "آفتاب کے میل کلی" کے علاوہ سال شمسی کی مدت کو بھی دریافت کیا تھا اور اسی دریافت کی بنیاد پر "کتاب سنۃ الشمس" لکھی تھی۔ عام ہیئت دانوں کے برخلاف بنو موسیٰ نو کے بجائے آٹھ آسمان مانتے تھے۔

متوکل کو اس کے بیٹے منتصر کے ایما سے ترکوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد خلفا کا عزل و نصب ترکوں کے ہاتھ میں آگیا۔ مگر جب ۲۵۶ھ میں معتمد خلیفہ ہوا، تو اس کے بھائی الموفق نے بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا۔ معتمد کی وفات پر اس کا بھتیجا معتضد (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) خلیفہ ہوا اس نے اپنے حسن تدبیر سے خلافت کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھال لیا۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں ثابت بن قرۃ الحرانی، ابو معشر البلخی، النیریزی اور البتانی ہیں۔

ثابت بن قرہ نے "المجسطی" کا از سر نو ترجمہ کیا اور بعض مقالات کی شروح لکھیں۔ اس نے فلکیاتی مشاہدات پر بھی کئی کتابیں لکھیں، اور تاؤن الاسکندرانی سے جو کوتاہیاں ہوئی تھیں، ان کی اصلاح کی۔ (Trepidation) کا مفروضہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ "علم المثلثات الکرویہ" پر "کتاب فی الشکل الملقب بالقطاع" لکھی جو اس موضوع کی مہمات کتب میں محسوب ہوتی ہے۔

ابو معشر البلخی نجوم میں الکندی کا شاگرد تھا۔ وہ اس فن میں متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ اس نے ایران اور ہندوستان کے نجومی لٹریچر سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ وہ قدیم نجوم کی تاریخ کا مستند ماہر سمجھا جاتا ہے۔

ابو العباس النیریزی نے "المجسطی" کی شرح کے علاوہ "السند ہند" کے انداز پر بھی ایک زیج مرتب کی تھی، اس کے علاوہ ایک اور زیج (زیج معتضدی) معتضد باللہ کے نام پر معنون کی تھی جو البیرونی کے زمانہ تک اپنے فن کی معتمد علیہ تصنیف محسوب ہوتی تھی۔ اس نے "علم المثلثات الکرویہ" میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھیں۔

البتانی کا دنیا کے منتخب روزگار ہیئت دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے کہ میں تاریخ اسلام میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ارصاد کواکب کی تصحیح اور ان کی حرکات کے امتحان میں اس کے مرتبہ کو پہنچا ہو۔ البتانی نے ۲۶۴ھ سے ۳۰۶ھ تک مشاہدات

کیے۔ رویت ہلال، میل کلی، مدت سال، اختلافات قمری، کسوف و خسوف اور اختلاف المناظر کے حسابات کو اس نے بعد کے ہیئت دانوں سے زیادہ صحت و دقت نظر سے بیان کیا ہے۔ البتانی نے "اوتار" کے بجائے "جیوب" کو استعمال کیا اور مثلثاتی نسبتوں کو مقبول بنایا۔

اس عہد کے دیگر مشاہیر ماہرین علم ہیئت میں محمد بن علی نیشاپوری، الماہانی، محمد بن احمد ابن یوسف السمرقندی، سلیمان بن عصمہ اور ابو حنیفہ الدینوری قابل ذکر ہیں۔

محمد بن علی نیشاپوری مشہور رصدگاہ کا متولی تھا، جسے طاہری خاندان کے امیر طاہر بن عبداللہ نے قائم کرایا تھا۔ ابن یونس نے اس رصدگاہ کی ایک دریافت کا حوالہ دیا ہے: یہ ۲۳۰ھ میں "استوار خریفی" کے وقت کا تعین تھا، جو ۲۰ ربیع الاول کو دوپہر کے وقت واقع ہوا تھا۔

الماہانی ہندسہ کے ساتھ ہیئت میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ ابن یونس نے اس کے فلکی مشاہدات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے ۲۳۹ھ سے ۲۵۲ھ ہجری تک کیے تھے۔

محمد بن احمد بن یوسف السمرقندی رصدگاہ سمرقند کا متولی تھا، جہاں حسب تصریح ابن یونس اس نے ۲۵۱ھ میں "وسط شمس" کی تحقیق کی تھی۔

سلیمان بن عصمہ بلخ کی رصدگاہ کا متولی تھا، جہاں اس نے ۱۱۶۵ سکندری (مطابق ۲۵۲ھ) میں فلکی مشاہدات کرکے ان کو "زیج النیرین" میں مدون کیا تھا۔ اس نے علم المثلثات میں ساعۃ ذوات الزامی" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اور ایک رسالہ (اس نے یا شاید ابو جعفر الخازن نے) ان مسائل پر بھی تحریر کیا تھا، جو "حل تعدیلات" میں کام آتے تھا۔

ابو حنیفہ الدینوری: اپنے عہد کا بڑا فاضل تھا۔ ادب، مذہبیات، حساب اور ہندسہ وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ وہ عربوں کے دیسی علم النجوم کا ماہر خصوصی تھا اور اس موضوع پر اس کی کتاب الانواء" بقول عبدالرحمن الصوفی بڑی مستند سمجھی جاتی تھی۔ اس کی رصدگاہ اصفہان میں تھی، جہاں اگلی صدی میں عبدالرحمن الصوفی نے بویہی وزیر ابن العمید کی معیت میں اسے دیکھا تھا۔

معتضد باللہ کے جانشینوں کے زمانہ میں حکومت کا ضعف و انحلال بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ۳۳۴ھ میں عراق میں آل بویہ کا اقتدار قائم ہو گیا، اور خلفاء کی حیثیت محض وظیفہ خواروں کی سی رہ گئی۔

لیکن اس عہد زوال میں ایک مشہور ہیئت داں خاندان کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے، یہ خاندان بنو اماجور کا تھا، جنھوں نے ۲۷۲ھ سے ۳۲۱ھ تک فلکیاتی مشاہدات کیے تھے، اور انھیں اپنی زیچ میں قلمبند کیا، جس کا نام "بدیع" تھا۔

قرامطہ اور نجوم وہیئت کی ترقی | خلافت کے ضعف و انحلال میں سب سے زیادہ حصہ قرمطی یا باطنی تحریک نے لیا جس نے نصف صدی تک پوری اسلامی دنیا میں اپنے ظلم وستم اور قتل و غارت سے تہلکہ ڈال دیا تھا، بایں ہمہ اس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کو عموماً اور نجوم وہیئت کو خصوصاً غیر معمولی ترقی ہوئی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باطنیت ایک خفیہ تحریک تھی، جو اسلام کی بیخ کنی اور ایرانی سلطنت کے بحال کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، مگر اس میں اور بھی اسلام کے مخالف عناصر مثلاً یہود، صابئہ حران، اور فلاسفہ بھی شامل ہو گئے تھے، اس لیے شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، اس طرح ان کی آئیڈیالوجی فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہوتی رہی، چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبداللہ بن میمون القداح، محمد بن الحسین زیدان، حمدان قرمط اور ابو سعید الجنابی وغیرہم فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے۔

لیکن نجوم و ہیئت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف کا سبب یہ افواہیں تھیں کہ ستاروں کی پیشین گوئی کے مطابق اب (تیسری صدی ہجری کے خاتمہ پر) مسلمانوں کا دین اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والے ہیں، اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت اور مجوسی مذہب بحال ہوں گے۔ مجوسیت پسند نجومیوں نے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتایا تھا، اور یہی وہ وقت ہے جب معتضد کے نالائق جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم

توڑ رہی تھی، اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بےچینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ پہلے محمد بن الحسین زیدان کو اپنے متعلق مغالطہ رہا کہ وہ اس انقلاب کو برپا کرنے والا ہے، اس کے مرنے پر ابوسعید الجنابی اس خوش فہمی کا شکار ہوا۔ مگر سنہ ۱۵۰۰ھ خیر و خوشی گزر بھی گیا اور یہ پیشین گوئی نہ پوری ہونا تھی نہ پوری ہوئی۔

ان پیہم مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے۔ یا تو احکام نجوم کی اصابت سے یقین اٹھ جائے، یا ان مسلسل تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے، چنانچہ ایران کی نجوم پرست طبیعت نے اسے نجومی حساب کی غلطی پر محمول کیا، اور ہیئتی مشاہدات و حسابات میں صحت اور دقتِ نظر کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ اور اسی احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی علم ہیئت کا عہدِ زرین بنا دیا۔

اسلامی ہیئت کا عہدِ زرین — چوتھی صدی

چوتھی صدی کے سیاسی انتشار نے ایک بغداد کے متعدد "بغداد" بنا دیے تھے۔ اور ہر "بغداد" نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں سرگرم کار تھا:

۱۔ سامانیۂ خراسان (۲۵۹ھ۔۳۸۹ھ) اس دربار کے مشاہیر فضلائے ریاضی و ہیئت میں ابوجعفر الخازن اور محمد بن عبدالعزیز الہاشمی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابوجعفر الخازن (زمانہ قریب ۳۴۳ھ) "الزیج الصفائح" کا مصنف تھا، جو علم ہیئت کی مشہور اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس نے "المجسطی" کی شرح بھی لکھی تھی، اور علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھی۔ ممکن ہے حل تعدیلات پر بھی رسالہ لکھا ہو۔

محمد بن عبدالعزیز الہاشمی نے "زیج خوارزمی کی تعلیل" لکھی تھی۔

۲۔ بویہیۂ فارس۔ آل بویہ تین بھائی تھے، بڑا بھائی عماد الدولہ فارس میں تھا، اس نے مرتے وقت (۳۳۸ھ) اپنے بھتیجے عضد الدولہ کو اپنا جانشین بنایا، عضد الدولہ ۳۶۶ھ میں باپ کی وفات کے بعد بغداد پر بھی قابض ہو گیا، جہاں ۳۷۲ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔ وہ نجوم میں عبدالرحمٰن الصوفی اور ابن الاعلم کا شاگرد تھا۔ اس کے دربار کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

کوشیار بن لبان: "زیچ بالغ" "زیچ جامع" اور "مجمل الاصول" کا مصنف ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مشکل ستی کو اس نام سے موسوم کیا۔

احمد بن عبد الجلیل السجزی۔ مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جو بطلیموس کے ارض مرکزی نظریہ کے بالمقابل گردش ارضی کا قائل ہوا۔ اسی اصول پر اس نے اپنا "اصطرلاب زورقی" بنایا تھا۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس نے شکل قطاع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔

شریف ابن الاعلم: عضد الدولہ کا منجم خصوصی تھا، وہ اسی کے کہنے کے مطابق کام کرتا تھا اس کی زیچ ابن الشفقی (ملکہ قاضی زادہ رومی شارح چغمینی) کے زمانہ تک اس فن کا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔

عبدالرحمن الصوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) "صور الکواکب" کا مصنف ہے، جو آج بھی علم الثوابت کی مہمات کتب میں شمار ہوتی ہے۔

۲۔ بویہیہ بغداد۔ عضد الدولہ کے بعد پہلے اس کا بیٹا صمصام الدولہ اور پھر دوسرا شرف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب سبعہ کی سیر وگردش کا مشاہدہ کرنے کے لیے رصدگاہ ماموتی کے انداز پر بغداد میں ایک اور رصدگاہ بنوائی۔ رصدبندی کا کام ختم ہونے پر دو محضر تیار کرائے گئے جن پر ہیئت دانوں کے علاوہ اعیان دربار نے بھی دستخط ثبت کیے تھے۔ مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی: شرف الدولہ کی رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ تھا۔ علم ہیئت کے علاوہ وہ آلات رصدیہ کی تیاری سے بھی واقف تھا۔

ابو حامد الصاغانی: شرف الدولہ کی رصدگاہ میں جو آلات استعمال کیے گئے تھے ان میں سے اکثر ابو حامد صاغانی ہی کے بنائے ہوئے تھے۔ اس نے ربع مشرقی کی مدت دریافت کرکے اس کا ثبوت دیا تھا کہ اوج شمس متحرک رہتا ہے۔

ابو الوفا البوزجانی (المتوفی ۳۸۸ھ) علم ہیئت میں دنیا کے مشاہیر فضلا میں

شمار ہوتا ہے۔ قمر کے "اختلاف ثالث" کی دریافت جس کا شرف ٹیکو براہے کو دیا جاتا ہے، درحقیقت ابوالوفا ہی کا کارنامہ ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ متفقہ طور پر "شکل ظلی" کا موجد ہے۔ اور شاید "شکل مغنی" (Sine Theorem) بھی اسی کی دریافت ہے۔

۴۔ بویہیہ رے: رے کا پہلا بویہی تاجدار رکن الدولہ تھا، اس کے بیٹے اس کے جانشین ہوئے۔ ان میں خانہ جنگی ہوتی رہی تاآنکہ عضد الدولہ کی وفات پر فخر الدولہ یہاں کا بادشاہ ہوا۔ ہیئت و نجوم کی سرپرستی میں رے کا دربار بھی دوسرے درباروں سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے مشہور ہیئت داں یہ ہیں:

ابن العمید: پہلے بویہی تاجدار رکن الدولہ کا وزیر تھا۔ مختلف علوم کے ساتھ علم الہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا۔ جب تصریح البیرونی اس نے آفتاب کا میل کی دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔

ابومحمود الخجندی: فخر الدولہ کے دربار کا سب سے مشہور ہیئت دان تھا۔ اس نے "سدس فخری" نام کا ایک Sextant بنا کر فخر الدولہ کے نام پر معنون کیا تھا۔ علم المثلثات الکرۃ کے سلسلے میں اس نے امیر ابونصر بن عراق کی کوششوں سے واقف ہوئے بغیر "شکل مغنی" کو دریافت کیا تھا، اور اس کا نام "قانون الهیئة" رکھا تھا۔

۵۔ بویہیہ اصفہان: فخر الدولہ کی بیوی سیدہ نے اصفہان کی حکومت اپنے ماموں زاد بھائی ابوجعفر کاکویہ کو دی تھی، جو بڑا متعصب شعوبی تھا۔ اس میلان کی بنا پر شیخ بوعلی سینا جو اسمٰعیلی تحریک کا خاموش مگر سرگرم کارکن تھا، اس کے دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شیخ بوعلی سینا فلسفہ اور طب کے علاوہ ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، کتاب الشفا کے جزو ہیئت میں "اختلاف منظر" کی بحث میں اس نے دس شکلوں کا اضافہ کیا اور آخر فن میں ایسی چیزیں بڑھائیں جن کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ علاء الدولہ کے ایما سے اس نے اپنے شاگرد ابوعبیدہ جوزجانی کے زیر اہتمام ایک رصدگاہ بھی قائم کی

جن کے ذریعہ بہت سے نئے انکشافات کیے۔ مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصد گاہ جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے طول البلد دریافت کرنے کا ایک طریقہ بھی معلوم کیا تھا۔

۲۔ **شاہانِ خوارزم**: اس وقت خوارزم کے دو حصے تھے، مشرقی حصہ میں قدیم شاہی خاندان جو اس زمانہ میں آلِ عراق کہلاتا تھا، حکمراں تھا۔ مغربی حصہ کے حکمراں امیر کہلاتے تھے، مگر بعد میں وہ لوگ مشرقی حصہ پر بھی قابض ہو گئے اور یہاں کے فضلا جرجانیہ (مغربی خوارزم) ہی میں چلے گئے۔ ان میں دو فاضل بہت زیادہ مشہور ہیں:

امیر ابو نصر بن عراق، آلِ عراق کا شاہزادہ تھا۔ وہ مہندسین و منجمین اسلام میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابو نصر بن عراق البیرونی کا استاد تھا جس کے لیے اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اس کا مشہور کارنامہ "اکرمانالاؤس" کی اصلاح ہے۔ علم المثلثات اکرویہ میں اس کی سب سے درخشاں دریافت "شکل مغنی" ہے، جو عہد حاضر میں Sine Theorem کہلاتی ہے۔ ہیئت میں اس نے "المجسطی الشاہی" تصنیف کی تھی اور ابو جعفر الخازن کی "زیج الصفائح" کی تصحیح بھی کی تھی۔

ابو ریحان البیرونی: مسلمان ہیئت دانوں میں جو شہرت البیرونی کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی دوسرے کو ہوئی ہو۔ "کتاب الہند" کے علاوہ جو نویں دسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی مذہبی و معاشرتی اور علمی و فکری تاریخ کا واحد ماخذ ہے۔ وہ "قانون مسعودی" اور "کتاب التفہیم" کا بھی مصنف ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ البیرونی کی "قانون مسعودی" اسلامی علم الہیئت کا نمایندہ شاہکار ہے۔

البیرونی جوانی میں عبدالجلیل السجزی کے اصطرلاب سے متاثر ہو کر گردشِ ارضی کے نظریہ کی جانب میلان رکھتا تھا، مگر بعد میں اپنے استاد ابو نصر بن عراق کے رسالہ فی الفلکیہ کو پڑھ کر پھر ارض مرکزی نظریہ کی جانب رجوع کر لیا، جیسا کہ "قانون مسعودی" سے ظاہر ہوتا ہے۔

البیرونی ہی نے ہندوستان کی تاریخ میں سائنٹفک علم الہیئت کا آغاز کیا۔ اس نے

یہاں کے بہت سے شہروں کا طول البلد اور عرض البلد دریافت کیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم میدان الحسنی کی پیمائش ہے، جو سرزمین ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا اور دنیا میں تیسرا تجربہ تھا۔ (دوسرا تجربہ مامون الرشید نے کرایا تھا)

۷۔ اسمٰعیلیہ مصر: مصر کے اسماعیلی خلفا، بالطبع فلسفہ و حکمت بالخصوص نجوم و ہیئت کے دلدادہ تھے، چنانچہ العزیز باللہ کے ایما سے ابن یونس نے فلکیاتی مشاہدات کرنا شروع کئے اور اس کے بیٹے الحاکم بامر اللہ کے عہد میں انھیں ختم کر کے "الزیج الکبیر الحاکمی" کے نام سے مدون کیا جو دنیا کی مشہور ترین زیجوں میں سے ہے۔

اسی زمانہ میں مصر کا دوسرا مشہور ہیئت داں ابن الہیثم تھا۔ اس نے ہیئت اور اعمال رصد پر بھی متعدد کتابیں لکھیں مگر وہ علم المناظر کے لیے زیادہ مشہور ہے۔

۸۔ اندلس بھی علم و حکمت اور نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کے فضلائے ہیئت میں سب سے جلیل القدر مسلمہ بن احمد المجریطی تھا، جو بقول قاضی صاعد اندلسی اپنے وقت میں اندلس کے ریاضی دانوں کا امام اور فلکیات میں سرآمد فضلائے روزگار تھا۔ اس نے البتانی کی زیج کے ابواب متعلقہ تعدیل کواکب کا اختصار کیا تھا، اور خوارزمی کی زیج کو از سرِ نو مرتب کیا تھا، اور یہاں نے فارسی تاریخ کے عربی تاریخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے شاگردوں میں ابن السمح اور ابن الصفار مشہور تھے، یہ دونوں سدھانت (السند ہند) کے پیرو تھے۔

۹۔ لیکن نجوم و ہیئت کے اس عہد زریں میں صرف ایک دربار، اس علم کی سرپرستی سے خالی ملتا ہے، وہ محمود غزنوی کا دربار ہے، حالانکہ بقول ابن اثیر وہ علما و فضلا کو گھیر گھیر کر اپنے دربار میں لاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا سیاسی حزم و احتیاط تھا: نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتقاد قرامطہ کا مخصوص شعار تھا، جن کی تخریبی سرگرمیوں سے پورا عالم اسلام لرزہ براندام تھا، محمود بھی ان سے غافل نہ تھا۔ اس لیے وہ کس طرح ان گہواروں کی سرپرستی کر سکتا تھا جو قرمطی تخریب پسندوں کے مرکز تھے۔ محمود کی اسی قرامطہ بیزاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کو اس کی امید کے مطابق شاہنامہ

کا صلہ نہیں دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے البیرونی کو صیحح پیشین گوئی کرنے پر کوٹھے سے نیچے پھنکوا دیا۔ لیکن اس کی وفات پر اس کے بیٹے مسعود نے اس فن کی سرپرستی کی۔ چنانچہ البیرونی نے قانون مسعودی مسعود ہی کے نام پر معنون کی ہے۔

پانچویں صدی۔ عہد سلاجقہ | مسعودی کے آخری زمانہ میں سلاجقہ اس کے ملک کے اکثر خراسان پر قابض ہو گئے۔ ۴۳۴ھ میں انھوں نے بغداد پر بھی قبضہ کر لیا اور بویہی خاندان کو ختم کر کے خود امیر الامراء بن گئے۔ گو سلجوقیوں کو نہ تو ایرانیوں کی احیائیت پسندی (Renaissance) سے ہمدردی تھی اور نہ وہ اتنے متمدن تھے کہ علم ہیئت کی سرپرستی کرتے۔ با ایں ہمہ انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر انھیں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا کرنا پڑا۔

یہ ضرورت خراج کی ادائگی کے وقت تعین کی تھی۔ معتضد باللہ عباسی نے تیسری صدی کے آخر میں نوروز کی اصلاح کی تھی، جسے دو سو سال ہو رہے تھے۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ۴۶۷ھ میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے وزیر نظام الملک کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس میں ملک شاہ کے ماہرین ہیئت جمع ہوئے۔ مثلاً عمر خیام (جو بقول زکریا قزوینی اس رصدگاہ کا متولی تھا) ابوالمظفر اسفزاری، میمون بن نجیب الواسطی، ابوالعباس اللوکری، محمد بن احمد المعموری وغیرہم۔ اس رصدگاہ کا سب سے بڑا کام نوروز کا تعین تھا، جو ۴۷۱ھ میں ۱۰ رمضان کو واقع ہوا۔ اس کے علاوہ تقویم شمسی کی بھی اصلاح کی گئی اور اسی کی بنیاد پر ہندوستان میں عہد اکبری میں خراجی سال کا تعین کیا گیا۔

رصدگاہ ملک شاہی بقول ابن الاثیر ۴۸۵ھ میں ختم ہو گئی مگر ابھی عمر خیام اور ابوالمظفر اسفزاری وغیرہ زندہ تھے، ان کے فیض تربیت سے دوسرے لوگوں نے ہیئت و فلکیات کے کام کو بعد میں جاری رکھا۔ ان میں دو شخص زیادہ مشہور رہے۔

عبدالرحمٰن الخازن: جو اسکونیات کی مشہور کتاب "میزان الحکمۃ" کا مصنف ہے، علم ہیئت میں اس نے "زیک سنجری" تصنیف کی تھی۔

بہاء الدین ابو محمد خرقی: حسب تصریح بیہقی، اس نے علم ہیئت میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں "التبصرہ" زیادہ مشہور ہے۔

ساتویں صدی ہجری۔ یورش تاتار | ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا انتہائی پُر آشوب دور ہے۔ اس زمانہ میں تاتاریوں نے تنہا قصر خلافت ہی کو منہدم نہیں کیا، بلکہ علم و حکمت کے اس چراغ کو بھی بجھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو چھ سو سال سے جنوبی مغربی ایشیا میں روشن تھا۔

مگر اس ثقافت بیزاری کے باوجود تاتاریوں کو نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اور انکے خاندان میں منگو قاآن اس فن کا بڑا شائق تھا۔ اسے رصدگاہ قائم کرنے کا بھی شوق تھا، چنانچہ اس نے جمال الدین محمد بن طاہر بن محمد الراوندی کو بلا کر یہ کام سپرد کیا۔ مگر اس سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی، کچھ دن بعد خواجہ نصیر الدین طوسی کے فضل و کمال کی شہرت سنی، اس لیے جب اس نے ہلاکو کو الموت کی تسخیر کے لیے بھیجا تو اس سے خواہش کی کہ محقق طوسی کو رہا کرا کے دربار میں بھیجدے مگر ہلاکو نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب ۶۵۶ھ میں ہلاکو تسخیر بغداد سے فارغ ہوا تو محقق طوسی نے اسے مراغہ (تبریز) میں رصدگاہ قائم کرنے کی ترغیب دی اس کام کے لیے فضلائے مہندسین و ماہرین ہیئت جیسے موید الدین عرضی، نجم الدین کاتبی، فخر الدین مراغی، فخر الدین اخلاطی، محی الدین مغربی اور قطب الدین شیرازی وغیرہم بلائے گئے، اور شہر مراغہ کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصدگاہ قائم ہوئی۔

رصدگاہ کا کام ۶۵۷ھ میں شروع ہوا، طوسی کے مشورے سے ہلاکو نے اس رصدگاہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ لیکن ابھی کام مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ ہلاکو نے وفات پائی۔ (۶۶۳ھ)۔ اس کے بعد بھی کام جاری رہا تا آنکہ ۶۷۲ھ میں محقق طوسی نے بھی وفات پائی۔

مگر وہ زیج (زیج ایلخانی) کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر چکا تھا۔ زیج ایلخانی کے علاوہ اس نے "المجسطی" کو بھی "تحریر المجسطی" کے نام سے ایڈیٹ کیا۔ اور بھی کتابیں ہیئت میں لکھیں جن میں "تذکرہ" "رسالہ معینیہ" اور "بست باب" زیادہ مشہور ہیں۔

محقق طوسی کے رفقائے کار میں سب سے بڑے ماہر فن ان کے شاگرد قطب الدین شیرازی تھے، وہ بھی اس فن میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں، "نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" اور "تحفۂ شاہیہ"۔

اگلی دو صدیوں میں کوئی بڑا ہیئت داں پیدا نہیں ہوا، اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا باقی رہا، مگر یہ "تحریر المجسطی" اور "تذکرہ" کے شرح و تحشیہ تک محدود تھا۔ ان میں نظام الدین اعرج کی شرح مشہور ہے۔ البتہ اسی زمانہ میں محمود بن عمر الجغمینی نے "ملخص فی الہیئۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس کی شرح قاضی زادہ رومی نے کی، بعد میں یہ "شرح جغمینی" ہیئت کی درسی کتاب کی حیثیت سے عرصہ تک ہندوستان و ایران کے اندر متداول رہی۔

نویں صدی۔ رصدگاہ سمرقند | تاتاریوں کی طرح تیموری مغلوں کو بھی نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ تیمور (المتوفی سنہ ۸۰۷ھ) کا درباری منجم عبداللہ بن مولانا لسان الدین تھا، شاہرخ کے دربار میں استاد قوام الدین معمار نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے لیکن بذات خاص اس علم سے دلچسپی شاہرخ کے بیٹے الغ بیگ (م شستہ ۔ ۸۵۳ھ) کو تھی، اس نے اپنے زمانہ شاہزادگی ہی میں ۸۲۳ھ میں سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس رصدگاہ کا پہلا متولی اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو مقرر کیا، ان کی وفات پر قاضی زادہ رومی کو اس کی تولیت سپرد ہوئی، اور ان کے انتقال پر رصدگاہ کا انتظام بادشاہ نے اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشچی کے سپرد کیا،

رصدگاہ سمرقند کے مشاہدہ کو "زیج جدید سلطانی" (زیج الغ بیگ) میں مدون کیا گیا۔

غیاث الدین جمشید کاشی نے لکھا ہے کہ "خسوفات قمر کو ہم نے خود رصد کیا ہے۔ اور انہی مشاہدات کی بنا پر قمر کے اوساط و تعدیلات کی تصحیح کی ہے۔ باقی کواکب کے باب میں ہم نے محقق طوسی کی "زیج ایلخانی" پر اعتماد کیا ہے۔ جمشید کاشی نے "زیج جدید" کے علاوہ اصطرلاب پر بھی ایک رسالہ "طبق المناطق" لکھا جس کی بعد میں "نزاہۃ الحدائق" کے نام سے شرح کی۔

قاضی زادہ رومی کی شرح چغمینی کا ذکر اوپر آ چکا ہے جو اس صدی کے ثلث اول تک ہمارے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔

مولانا قوشجی نے رصدگاہ الغ بیگ کی تولیت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ "اشکال قمریہ" پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا۔ اور فن ہیئت میں ایک رسالہ بعنوان "رسالہ فتحیہ" لکھا، جو ہمارے ملک میں عرصہ تک "رسالہ قوشجیہ" کے نام سے داخل درس رہا ہے۔ اکثر علماء نے اس پر شروح لکھیں جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی کی شرح مشہور ہے۔

عہد آخر | عجم میں الغ بیگ کے بعد کسی بادشاہ نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کی اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں پیدا ہوا، صرف درسی طور پر ہیئت کا رواج رہا۔ یا بعض علماء نے پچھلی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ان شراح میں عبد العلی برجندی کا نام خاص طور سے مشہور ہے، انھوں نے "تحریر المجسطی"، "تذکرہ" اور "زیج الغ بیگ" کی شروح لکھیں۔ ان کے علاوہ "آلات رصدیہ" پر بھی ایک مبسوط رسالہ لکھا۔

گیارہویں صدی کے علمائے ایران میں شیخ بہاء الدین عاملی کا نام مشہور ہے، وہ ایک شیعی عالم تھے اور ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہیئت میں ایک مختصر رسالہ "تشریح الافلاک" کے عنوان سے لکھا، یہ رسالہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ بعد میں اسکے ساتھ ہندوستان میں خاصہ اعتنا کیا گیا۔

عجم میں تو ہیئت و فلکیات کی ترقی بند ہوگئی مگر ہندوستان میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک بڑی شان سے جاری رہی لیکن اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔

••

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
RECENT PUBLICATIONS

Title	Price
Collected Works of Prof. S. H. Askari	10 00
Amir Khusrau : as a Historian (Second Volume of Prof S H. Askari's collected works)	25·00
Islam & Muslims in Medieval Bihar (Third volume of Prof S. H. Askari's collected works)	25 00
Medieval Bihar—Sultanate and Mughal Period (Fourth Volume of Prof S. H Askari's collected works).	25 00
An Overview of Sufi Literature in the Sultanate Period by Dr. Bruce B Lawrence	10 00
Maktub and Malfuz Literature, as a Source of Socio-Political History . by Prof S H. Askari	10 00
The Hindu-Muslim Syndrome; Islam & the Modern World (Problems & Prospects) : by Badr-ud-Din Tyabji	10·00
Islamic Studies by Dr Md Zubayr Siddiqi	10 00
Muslim Thought in a Changing World : by Prof S Vahiduddin	10 00
The Middle East by Prof Asaf Ali Asghar Fyzee	10·00
Interfaith Dialogue by Dr A Roest Crollius S J	5·00
Islam and Indian Culture by Mr B N Pande	15·00
An Introduction to the Khuda Bakhsh Oriental Public Library by V C Scott O'connor	10 00
Khuda Bakhsh (Biography) : by Mr S. Khuda Bakhsh & Sir Jadunath Sarkar	10 00
Mughal Art of Miniature Painting, at its Climax : Reproduction of a few Paintings of Akbar's period (from Tarikh-i-Khandan-i-Timurya)	15·00
India's Rich and V[illegible]able Contribution to Persian Literature by Prof S A H. Abidi	10.00
Tolerance, Democracy & Economics in Islam ; by Prof Jamal Khwaja	20·00
Reconstruction of Islamic Chronology : by Dr Hashim Amir Ali	10 00
Book Publishing in India : by Mr Abul Hasan	10 00
Malfuz Literature as a Source of Political, Social & Cultural History Gujarat & Rajasthan in 15th Century ; by Dr Z A Desai	15·00
क़ौमी एकता की परम्पराएं : विशम्भर नाथ पाण्डे	5·00
औरंगज़ेब एक नई दृष्टि : ओम प्रकाश प्रसाद	15·00
राष्ट्रीय आन्दोलन और मौलाना आज़ाद : [illegible]	60 00
भारत के मुग़लकालीन कवि [illegible] के दोहे	10·00
18वीं शताब्दी के हिन्दुस्तानी मुहावरों का एक दुर्लभ कोष : [illegible] देहलवी	10·00
मोती लाल नेहरू का यू० पी० कांग्रेस में उद्घाटन भाषण 1907	15·00
मौलाना अबुल कलाम आज़ाद की याद में :	15·00

ڈاکٹر فواد سیزگین
ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

غالباً نادرست نہ ہو گا اگر ہم کہیں کہ تاریخ طب تاریخ علوم کا سب سے پرانا شعبہ ہے۔ چونکہ قدماء اور متأخرین سب یہ بات کہتے چلے آئے ہیں لہذا یہ ایک امر معروف ہے۔ تاہم تاریخ طب کی محض قدامت اس مفروضے کی صحت کی ضامن نہیں کہ تاریخ علوم میں یہ شعبہ صحت و انصاف کے بھی قریب تر رہا ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس کی قدامت ، حقیقت سے اور بھی انحراف نیز اس

شعبے میں پیدا ہونے والی غلطیوں کوتاہیوں اور تعصّبات کی تصحیح میں مشکلات کا باعث بنی ہے۔

تین اصول ایسے ہیں جو آغاز ہی سے تاریخ طب کو بنیادی رنگ فراہم کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے اثرات ہم آج تک محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱ ۔ دریافت میں اوّلیت کا اصول جسے یونانیوں نے πρώτης εὑρετής . کا نام دیا

۲ ۔ غلط تاریخ ، خواہ سہواً ہو یا ازروئے تعصّب ۔

۳ ۔ اسلاف سے نادرست احکام اخذ کرنا اور پھر اُن کی تکرار۔

پہلی صدی عیسوی میں یونانیوں کے ہاں آغاز سے ، نیز یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے اواخر تک، تاریخ طب کا یہی حال رہا ہے۔

علم طب کو تمام اقوام کی مشترک میراث تصور کرتے ہوئے اس کے ارتقاء سے متعلق اوّلین حقیقت پسندانہ اور بےلاگ موقف ساتویں صدی ھجری کے ابن ابی اصیبعہ کی ,,کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء ،، کی صورت میں ملتا ہے کہ اسی نے طب کے ماضی کا بنی نوع انسان کی عمومی تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا اور وضاحت سے کہا کہ طب وہ میراث ہے جو کل بنی آدم کی مطلوب و مقصود ہے اور ہر قوم کا اس میں حصہ ہے۔ (۱)

طب کی عمومی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا اس میراث میں جو حصہ طے کیا گیا ہے اسے قرین صواب و انصاف تصور نہیں کیا جا سکتا آج کی گفتگو میں اس سے زیادہ کچھ ممکن نہ ہو گا کہ ماضی میں مسلمانوں نے علم طب کے میدان میں جس قدر رسائی حاصل کی اس میں سے چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس

سے ایک تاثر ضرور مل سکے گا کہ مسلمانوں نے جس طرح دیگر سب علوم میں اپنا کردار ادا کیا اسی طرح اس میدان میں بھی ان کا کردار اہم رہا ۔

اس خطبے میں میری کوشش یہ ہو گی کہ پہلے ان کے بنیادی کام سامنے لاؤں اور پھر ان کے انجام دیئے ہوئے عمومی کاموں کی مثالیں پیش کروں جن کی فروع بہت وسیع ہیں ۔

مسلمانوں نے جب دیگر اقوام کے طبّی سرمایۂ علمی کو اخذ کرنا شروع کیا تو ابتدائی طور پر یہ صرف دو شعبوں تک محدود تھا : دوا سازی اور وہ عملی طب جو بحیرہ روم کے طاس کی حدود میں مہذب حلقوں میں رائج تھی کیونکہ اسلام کی آمد سے قبل نظری طب عمومی طور پر اپنا مقام کھو چکی تھی خصوصاً لاطینیوں کے ہاں ۔ اور یہ نتیجہ تھا عوامی اور اساطیری طب کے غالب آ جانے کا ۔

اس اعتبار سے ہمیں نظری طب کے احیاء کو قرون وسطیٰ کی تاریخ طب کا سب سے اہم مظہر تصور کرنا ہو گا ۔ کیونکہ نظری طب کا احیاء ۔ جو ایک طرف جالینوس کی کتابوں میں اور دوسری طرف بقراطی طریق علاج کو اپنانے کی صورت میں (جس کی اساس اس امر پر تھی کہ مریض کے بستر کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کیا جائے) ، نقطۂ عروج کو پہنچا ۔ میری رائے میں بذات خود ، تاریخ طب میں مسلمانوں کے لئے ایک باعزت مقام کے اعتراف کے لئے کافی تھاخواہ ان کا کام صرف اسی [احیــاء کے] مظہر تک محدود ہوتا ۔ تاہم منصۂ تاریخ پر جلوہ گر ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی قوم کے ہاں ایسے مظہر کا وجود ہی یہ بشارت دینے کے لئے کافی ہے کہ اگر وہ قوم فوری طور پر بعض تاریخی حوادث کا شکار نہ ہو گئی تو اس میدان میں اور بہت سے اہم نتائج بھی ظاہر ہو کر رہیں

گے ۔ میں سمجھتا ھوں کہ اس میدان کی اہم ترین کامیابی جسے مسلمانوں کے حق میں ریکارڈ پر آنا چاھئیے یہ ہے کہ وہ طب کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی شناخت کر سکے اور بہت جلد انہوں نے دونوں کے درمیان توازن کا ایک عنصر مقرر کر لیا اور پھر اس اصول کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا ۔

اس ضمن میں دوسری صدی ھجری کے اواخر کے ایک عرب طبیب کا یہ قول لائق توجّہ ہے :

,, دوا اسی وقت ممکن ہے جب مرض کو سمجھ لیا جائے ۔ مرض کی نشاندھی وہ اولین سبب مطلوب ہے ، جس کے حصول سے منتہائے مقصود یعنی شفائے امراض کا حصول ممکن ھوتا ہے اور یہی فن طب کی غرض ، غایت ہے ۔ اگرچہ طب ان فنون میں سے ہے جو علم کے ساتھ ساتھ عملی پہلو پر بھی مشتمل ہے ۔ اور جب کوئی فن ان دونوں پہلوؤں ۔ یعنی علمی و عملی پہلو ۔ پر مشتمل ھو تو لازم ہے کہ علمی پہلو عملی پہلو پر مقدّم ھو کیونکہ علم کے بغیر عمل ممکن نہیں ،، (۲)

یہ اہم اصول جو صرف طب تک محدود نہیں بلکہ دیگر علوم کو بھی محیط ہے تسلسل کے ساتھ نشوونما پاتا رھا اور ,,نظریہ اور تجربہ ،، کی ارتقاء پذیر اصطلاحات کے تحت علم طب کا ایک اساسی رکن بن گیا ۔ (۳)

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عرب اطباء ، اھل یونان کے سعادت مند شاگردوں سے زیادہ کچھ نہ تھے نیز یہ کہ یونانی اطبا کے رسوخ سے آزاد ھونا یا ان پر تنقید کی جسارت کرنا ان کے لئے ممکن نہ ھو سکا ۔

اس طرح کا حکم جو بار بار لگایا جاتا ہے نہ صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا جو تحریری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس کا تتبّع نہیں کیا گیا بلکہ ایک اہم اصول سے ناواقفیت کا بھی پتہ دیتا ہے جو تاریخ علوم میں بحثیت عمومی مسلمان اور عرب علماء کی وساطت سے متعارف ہوا ۔ یہ تنقید میں اخلاقی رویے کا اصول ہے۔ مراد یہ ہے کہ ارتقائے علوم کا واضح تصور رکھنے کے سبب وہ لوگ تنقید میں انصاف ، راست بازی اور احتیاط کے پابند رہے ۔

رہا تنقید کا وہ پہلو جو قدماء کی فروگزاشتوں کی تصحیح سے عبارت ہے سو وہ مسلمان علماء کے ہاں ، مختلف میدانوں میں ، دوسری صدی ہجری ہی سے نظر آتا ہے۔ یہاں میں طب کے میدان میں بعض مثالوں کی طرف اشارہ کروں گا ۔ ایک مثال وہ[تبصرہ] ہے جو دواؤں کی قوتوں کے سلسلے میں جالینوس کی مقرر کردہ ترتیب سے متعلق جابر بن حیان کے ہاں ملتا ہے۔

چنانچہ جابر نے کہا ہے کہ جالینوس کے ہاں دواؤں کی قوتوں کی ترتیب نامعتبر ہے۔ کیونکہ اس نے فقط حس پر بھروسہ کیا ہے جبکہ کیفیت غالبہ یا کمترین قوت کی تعیین محض احساس کے ذریعے ممکن نہیں ۔ خواہ تمام اعضائے حس اس سلسلے میں یکجا ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔ دواؤں کی قوتوں اور اثرات کو دقیق ریاضیاتی سطح پر ضبط میں لانا ضروری ہے ۔ (۴) مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں جالینوس اور دیگر علماء سے جابر بن حیان کی تنقید (۵) بعض اوقات ایسی شدت بھی اختیار کر جاتی ہے جس سے متأخرین نے پرہیز کیا ۔ جابر کے بعض اقوال یہ ہیں :

,,اور جالینوس نے اس سلسلے میں سخت غلطی کی ہے ،،

,,یہ سخت اور زبردست ناواقفیت کی بات ہے جیسا کہ

جالینوس نے اپنی کتاب ,,منافع الاعضاء " میں بیان کیا ہے ۔

,,جالینوس نے مسئلہ نفس پرایسی ھی رائے کا اطلاق کیا ہے۔
وہ التباس و تخلیط کا شکار ہے اور نہیں سمجھ سکا کہ اس
سلسلے میں کیا کہا جائے ۔ "

,,جالینوس نے اس مقام پر وہ غلطی کی ہے جو ضرب المثل
بن گئی ہے " (٦)

تقریباً ایک صدی بعد ھم دیکھتے ھیں کہ اسلوب تنقید نے ایک کامل ، پختہ اور معتدل صورت اختیار کر لی ہے اور مسلمانوں نے متعدد ایسی کتابیں تالیف کر لی ھیں جن کا عنوان ھی فلاں یا فلاں پر ,,شکوک" ہے۔ مثلاً الرازی کی ,,کتاب الشکوک " میں ھم جالینوس کے متعلق اس کا موقف دیکھ سکتے ھیں ۔ رازی طب کو ایک فلسفیانہ علم کی حیثیت دیتا ہے جس میں ۔ بالخصوص اساتذہ کی جانب سے ۔ محض اٹکل سے ثامک ٹوئیاں مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اخلاقی و فلسفیانہ آداب کا تقاضا یہ ہے کہ اساتذہ کے احترام کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات پر شک کا موقف بھی اختیار کیا جائے ۔ رازی ارسطو سے منسوب اُس قول سے استشہاد بھی کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ھمیں افلاطون اور حقیقت دونوں عزیز ھیں لیکن جہاں دونوں میں اختلاف پایا جائے وھاں حقیقت ھمیں عزیز تر ہے۔ رازی کہتا ہے کہ جہاں تک جالینوس کی غلطیوں کا تعلق ہے ، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض، بےاحتیاطی یا بھول چوک یا ظن و تخمین کے سبب سے ھوں ۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ھیں جنھیں قانون ارتقائے علوم کے باعث قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ اور جو شخص کسی نئی شے کا اضافہ کر سکتا ہے وھی اسلاف کی علمی رسائی سے مکمل واقفیت رکھتا ہے۔ (٧) اس سلسلے میں بہترین بات علی بن العبّاس

المجوسی نے اپنی کتاب ,,کامل الصناعۃ ،، کے مقدمہ میں کھی ہے جو اس کے ہاں قانون ارتقاء کے واضح تصور نیز ان توقعات سے متعلق ایک تاثر مہیا کرتی ہے جو اساتذہ سے وابستہ کی جانی چاھئیں ۔ وہ بقراط اور جالینوس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بقراط کی کتابیں ابہام کی حد تک مختصر ھیں اور جالینوس کی کتابوں میں اس کے برعکس طول کلام اور بہت زیادہ تکرار ہے ۔ بعد کے یونانیوں مثلاً اریباسیوس[Oribasius/Oriebasius] اور باولس [Paulus](8) کی کتب میں بہت کچھ نقص و خلل ملتا ہے ۔ رھیں رازی کی کتابیں جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب تھا وہ بھی اپنی کتاب ,,الحاوی ،، میں تکرار سے دامن نہیں بچا سکا ۔ یہ کتاب بحیثیت مجموعی عملی طب سے متعلق ہے اور جمع و تالیف سے عبارت ہے جس میں بسا اوقات ربط کا فقدان ہے ۔ الغرض علی بن العباس کی رائے میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ملتی جسے کامل کہہ سکیں اور اپنے دور تک اسے کہیں مناسب علمی طریق کار نظر نہیں آیا ۔

ان کے ھاں (۹) عمل ارتقاء کے سعور ، علم طب پر ان کے مسلسل کام ، اور اس کام میں صدیوں تک اطباء کی ایک بڑی تعداد کی سرکت کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے کئی بار علم طب کا تعارف پیش کیا ، اس کے مختلف شعبوں کی درجہ بندی کی اور ایسی حوالے کی کتابیں تالیف کیں جو اسلاف کی کتب سے بہتر تھیں ۔ یہاں قدرتی نتائج کی طرف بھی ایک اشارہ مناسب ھو گا جو انہوں نے اس میدان میں حاصل کئے مثلاً مکمل اور باقاعدہ شفاخانوں نیز فن دوا سازی کی تنظیمات کی تشکیل و ترویج جن کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاھوں گا ۔ اس وقت میں مسلمان اور عرب اطباء کے چند ایسے کارنامے پیش کرنا چاھوں گا جو تحقیق سے ثابت ھو چکے ھیں ۔

دوسری اقوام کے ہاں جو کچھ علم طب موجود تھا اسے اخذ کرنے کا عمل مسلمانوں کے ہاں پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا۔ ان کے اولین ترجمے طب عملی اور دواسازی سے متعلق تھے۔ دوسری صدی ہجری کے اواسط میں انہوں نے اہم طبی کتب مثلاً بقراط اور جالینوس وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا۔ عرب اطباء کی کتابوں کے مطالعے نیز دیگر مآخذ کی معلومات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ دیگر اقوام کے علم طب سے اخذ و اکتساب کا عمل تیسری صدی ہجری کے وسط تک مکمل ہو چکا تھا۔ اب ہمارے لئے یہ جاننا ممکن نہیں کہ اس دور میں عرب اطباء کو کس حد تک یہ احساس تھا کہ وہ اپنے یونانی اساتذہ کے بعد طب نظری میں کوئی نئی چیز پیش کرنے پر قادر ہیں۔ غالباً اس زمانے میں اس میدان میں ان کی تمام تر کوششیں قدماء کی کتابوں کی ترتیب و تلخیص، تنظیم اور انہیں بہتر انداز میں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ حنین بن اسحاق کی کتابیں اس عمل کی بہترین مثال تصور کی جاتی ہیں۔

آج نظری طب کے میدان میں مسلمانوں کے جو اہم تریـن اور واضح ترین اضافے ہمارے علم میں ہیں، جن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اطباء تازہ کار اور تعمیری کردار رکھنے والے تھے، وہ آنکھوں کے علاج سے متعلق ہیں۔

اس میدان میں دو تصورات جن کی بڑی اہمیت ہے ابوبکر رازی (وفات تقریباً ۳۰۰ ہجری) کے ہاں ملتے ہیں۔ رازی پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی نسبت سے سکڑتی اور پھیلتی ہے۔ اس سے بھی اہم اس کی یہ دریافت تھی کہ دیکھنے کا عمل کسی شعاع کے آنکھ سے نکل کر دیکھی جانے والی چیز کی طرف جانے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اصل

صورت حال اس کے عین برعکس ہے کیونکہ شعاع اس چیز سے آنکھ کی طرف آتی ہے۔ یہاں وہ اقلیدس [Euclid] کو رد کر رہا ہے (۱۰) طب کے میدان میں بصارت کے مسئلے پر آخری تصحیح جس میں جالینوس کے خیالات کو رد کیا گیا ، ابن سینا کے ہاں سامنے آئی ۔ تاہم وہ شخص جس نے بصارت کی ان جدید توضیحات کا فیزیائی سطح پر ثبوت فراہم کیا ، پانچویں صدی ھجری کے اوائل میں ، ابن الھیثم تھا۔

بینائی کے مسئلے کو سلجھانے کے ضمن میں مسلمانوں کے ہاں اس کے بعد جو پیش رفت ہوئی وہ بہت دور رس تھی ۔ خصوصاً ساتویں صدی ھجری میں کمال الدین الفارسی کے ہاں کیونکہ یہ شخص بینائی کے مسائل حل کرتے ہوئے بعض ایسے نتائج تک پہنچ گیا جن تک رسائی کہیں انیسویں صدی عیسوی میں آ کر ہوئی ہے۔

تاریخ طب پر بعض کام کرنے والے جو حقیقی تاریخی ادراک سے محروم ہیں ، تاریخ پر روایتی زاویہ نگاہ سے حکم لگاتے ہوئے ، عربوں کو یونانیوں کی تقلید کا الزام دیتے ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ عرب اطباء نے چار اخلاط پر قائم پیتھالوجی کے اصول کو برقرار رکھا ۔ یعنی سودا صفرا ، بلغم ، خون کی ہم آہنگی اور امتزاج ۔ یہ درست ہے کہ عرب اطباء نے یہ بقراطی نظام اخذ کیا اور اس پر قائم رہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئیے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان اطباء نے بہت سے امراض کی خصوصی توجیہات تک رسائی حاصل کر لی تو عملاً اس نظام کی اہمیت ختم ہو گئی ۔ یہاں میں اس کے شواھد کے طور پر چند حقائق پیش کرتا ہوں۔ ابو الحسن الطبری نے چوتھی صدی ھجری میں یہ دریافت کیا کہ خارش کا سبب خارش کا کیڑا ہوتا ہے۔ رازی چھوت سے لگنے والے فحمی بخار ,,ایرانی بخار،، (؟) سے واقف تھا اور اس نے اس ,,دود مدنی ،، (؟) کی مکمل طور

پر نشان دھی کی ہے جو جلد کی داخلی بافت پر قابض ہو جاتا ہے(۱۱)
ابن سینا کا قول تھا کہ مقامی سرطان ، جملہ اعضاء پر مسلط ہونے والے عام سرطان کا پتہ دیتا ہے۔ اس کی رائے تھی کہ تپ دق متعدی مرض ہے اور ممکن ہے کہ سورج کی شعاعیں تپ دق کے مریض کے لئے نقصان دہ ہوں۔ سوزش دماغ کے ضمن میں اس کا خاص نظریہ نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ وہ پوری صحت و وضاحت کے ساتھ سوزش دماغ کو سمجھتا ہے نیز اس میں اور دیگر سوزشوں میں فرق کرتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ابوالقاسم الزھراوی کے ہاں ہمیں دموی امراض کا ایک مفصّل بیان ملتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جوڑوں کی سوزش اور ریڑھ کی ھڈی کی دق پر بھی توجّہ دیتا ہے۔

آئندہ صدی یعنی پانچویں صدی ہجری میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالملک ابن زھر وضاحت کے ساتھ ان اورام سے واقفیت رکھتا ہے جو سینے کو تقسیم کرنے والے پردے (۱۲) کو لاحق ہوتے ہیں اسی طرح غلاف قلب کے اورام [Pericarditis] (۱۳) سے بھی اسے واقفیت ہے۔ ابن زھر پہلا طبیب تھا جس نے غذا کی نالی [Gullet] کے مفلوج ہو جانے کی صورت میں سانس کی نالی کو کھولنے نیز غذا کی نالی یا مبرز [Rectum] کی راہ سے مصنوعی طور پر غذا رسانی کی تجویز پیش کی۔ وہ بہت سے اور امراض کی بھی بڑی وضاحت سے نشان دھی کرتا ہے جن میں معدے کا سرطان بھی شامل ہے۔ (۱۴)

شاید پیتھالوجی یعنی علم اسباب الامراض میں سب سے اعلی مرحلہ جس تک عربوں نے رسائی حاصل کی چھوت کا قانون دریافت کرنے کا مرحلہ تھا ۔ اس ضمن میں لسان الدین ابن الخطیب (المتوفی ۷۷٦ھ) اپنی کتاب ,,مقنعة السائل عن المرض الهائل،،(۱۵) میں لکھتا ہے :

,,سو اگر کہا جائے کہ ہم چھوت کے دعوے کو کیونکر تسلیم کر لیں جبکہ شرع میں اس کی نفی آئی ہے تو ہم کہیں گے کہ چھوت کا وجود تجربہ ، استقراء ، حِس ، مشاہدہ اور مسلسل اطلاعات سے ثابت ہے اور ان سب پر اس دلیل کی بنیاد ہے۔جو کوئی اس مسئلے پر غور کرتا ہے یا اسے اس کا ادراک حاصل ہے اس سے مخفی نہیں رہتا کہ جو بھی اس مرض کے مریض سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے اکثر و بیشتر ہلاک ہو جاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ بچ جاتا ہے اسی طرح کسی کپڑے یا برتن کے سبب سے پورے گھر یا محلے میں مرض پھیل جاتا ہے حتی کہ کان کی بالی جس نے پہن لی اس نے اسے ختم کر دیا اور پورے گھر کا صفایا کر دیا اِسی طرح یہ کہ مرض کسی سہر کے ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اکا دکا ملنے جلنے والوں اور پھر ان کے پڑوسیوں میں پھیل جاتا ہے ... (۱۶)

ایسا ہی تاثر اس کے معاصر احمد بن علی بن خاتمہ نے قائم کیا۔ ابن الخطیب اس بات سے بھی واقف تھا کہ چھوت کے اثر نیز اس کی تیزی کا درجہ جسم انسانی کے احوال پر منحصر ہے۔

غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ چھوت کے اس قانون کی دریافت مسلمانوں کے ہاں عملاً اس یونانی پیتھالوجی کے مکمل زوال سے عبارت تھی جس کا انحصار تصور اخلاط پر تھا۔ K. Sudhoff نے یورپ میں وباء و طاعون کے مظاہر پر تحقیق کر کے جب یہ وضاحت کی کہ چھوت کا تصور یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے پھیلنا شروع ہوا تو بیسویں صدی کے اوائل سے مورّخین علمِ طب چھوت کے قانون کی دریافت کو تاریخ طب کا ایک اہم مرحلہ تصور کرنے لگے۔ یہاں اس بات پر حیرت نہ کرنی چاہئیے کہ تاریخ طب کا ایک

مؤرخ (۷۰) ۱۹۲۳ء میں اس موضوع کو پیش کرتے ہوئے اس بات سے کیونکر ناواقف ہے کہ مستشرق M. Müller نے ابن الخطیب کی کتاب کا ترجمہ کر کے ۱۸۶۳ ء میں شائع کر دیا تھا ۔ نیز یہ کہ یوروپین اطباء نے بلاشبہ یہ تصور اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا جیسا کہ اور بہت سے افکار اور معلومات کا حال ہے۔

اگر ہم چند الفاظ میں مسلمان اور عرب اطباء کے ھاں تشریح الاعضاء کے موضوع کا جائزہ لینا چاہیں تو ھمیں سب سے پہلے اس غلط رائے کا ذکر کرنا ہو گا جس کی رو سے اسلام نے انسانی بدن کی چیر پھاڑ کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور اس میدان میں مسلمان علماء نے جو کچھ پیش کیا وہ دیگر اقوام کے پیش روؤں سے ماخوذ تھا ، خود انہوں نے اس سلسلے میں کوئی نئی چیز پیش نہیں کی ۔ کئی ایک محققوں نے اس پُرانے موقف کا جو علم طب کے اکثر مورخین کے ھاں ملتا ہے ، جواب دیا ہے اور علم التشریح پر رازی ، علی بن العباس المجوسی ، اور ابن سینا وغیرہ کی تحریروں کی طرف بطور خاص اشارہ کیا ہے۔

معاصر محققین میں سے H. Shipperges کو ھی لیجئے ، اس نے ابوبکر رازی کی کتاب ,,الطب المنصوری ،، کو علم التشریح پر اوّلین مکمل کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا کئی بار ترجمہ ھوا اور کئی شرحیں لکھی گئیں اس کتاب کے بعد علی بن العبّاس المجوسی کی کتاب ,,کامل الصناعة ،، سامنے آتی ہے۔ اس میں علم التشریح پر سینتیس باب ھیں جن کی پیشکش انتہائی منظم و مرتب ہے۔ یہ کتاب حسن ترتیب نیز موضوع کے دائرے کی وسعت میں رازی کی کتاب پر فوقیت رکھتی ہے۔ علم التشریح پر علی بن العباس کی اس پیشکش سے قبل ابن سینا کی کتاب ,,القانون ،، میں بھی اس موضوع

پر کچھ مواد ملتا ہے سابق کی یہ سب کوششیں وہ بنیاد تصور کی
جاتی ھیں جس پر ابن النفیس نے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا ۔
کیونکہ وہ ,,القانون ،، کی شرح کرتے ہوئے کمال کو پہنچا اور
دوران خون صغیر [Lesser Circulation of Blood.] دریافت کر کے اس
نے چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ۔

وہ سارا قصہ تو یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ دمشق میں طویل
اقامت کے بعد اطالوی عالم Andreas Alpagus ابن النفیس کی شرح
کو پاڈوا [Padua] لے گیا اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ھسپانیہ کے
Michel Servetus نے اسی ترجمے پر انحصار کیا اور شہرت حاصل کی ۔
اس کی ,,دریافت ،، اسی مواد تک محدود تھی جو اسے ابن النفیس
کی کتاب میں ملا ۔ موجودہ صدی کے ربع اول کے اختتام سے لے کر
ربع ثالث تک صورت حال یہی رہی ۔

عبداللطیف البغدادی کو لیجئے جس کی وفات ٦٢٩ ھجری میں
ہوئی اور جس کا زمانہ ابن النفیس سے تقریباً نصف صدی پہلے کا ہے ۔
اس نے قاہرہ کے نواح میں استخوانی ڈھانچوں پر تحقیق میں شہرت
پائی ۔

یہ حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی کہ جالینوس اور دیگر اطبا
کا نچلے انسانی جبڑے کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دو
ٹکڑوں سے عبارت ہے ۔ یہ جبڑا ایک ھی ھڈی پر مشتمل ہے جس میں
کوئی جوڑ نہیں ۔ عبداللطیف بغدادی نے وضاحت کی ہے کہ اس نے
حقیقت حال کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے تقریباً دو ہزار کھوپڑیوں کا
معائنہ کیا ۔ اسی طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ کلائی کی اگلی ھڈی
ایک ھی ٹکڑے سے عبارت ہے اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ جالینوس
نے خیال ظاہر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جو دلائل ھم نے اپنے خاص اور

ذاتی ذرائع سے حاصل کئے ہیں وہ مشہور قدماء کے اقوال پر انحصار کرنے سے زیادہ شرح صدر کا باعث ہیں ۔

فطری سی بات تھی کہ علم التشریح میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام ، علم جراحت [Surgery] پر بھی ان کے عبور کی راہ ہموار کرتا ۔ اس شعبے میں بھی یونانی اطباء کی معلومات نیز ان کے ہاں مستعمل آلات کی تفصیل ان تک پہنچی ۔ لیکن مسلمان جرّاح و طبیب اس میدان میں طریق کار ، عملی تجربے ، نیز آلات کی تعداد ، اقسام اور ترقی کے اعتبار سے اپنے اساتذہ پر سبقت لے گئے ۔ ابو القاسم الزہراوی جس کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا ہے اپنے زمانے تک علم جراحت کے بلند ترین مرحلۂ ارتقاء کی نمائندگی کرتا ہے ، اگرچہ عمومی اعتبار سے وہ اس میدان میں مسلمانوں کے نقطۂ عروج کا نمائندہ نہیں تیس ابواب پر مشتمل اس کی کتاب ,,التصریف " کا تقریباً نصف حصہ جراحت سے مخصوص تھا ۔ یہ کتاب بارھویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی اور اس کا وہ حصہ جو جراحت سے خاص تھا وسعت پا کر ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر گیا ۔ اسی لاطینی ترجمے کی بنیاد پر عصر حاضر میں تاریخ طب کے لئے یہ معلوم کرنا ممکن ہو سکا کہ چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں طب کس اعلی سطح تک پہنچ چکی تھی ۔

تاریخ طب نے الزہراوی کی کتاب کے جو امتیازات قرار دئیے ہیں میں انہیں شمار نہیں کرنا چاھتا ۔ صرف یہی کہنے پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض اہم جراحی عمل جو بعض بڑے ڈاکٹروں سے منسوب کئے جاتے ہیں ، زہراوی کی کتاب میں موجود تھے ۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک ، بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا عمل ہے جس میں سولھویں صدی کے فرانسیسی جرّاح [Ambroise Pare] نے

شہرت پائی۔ اسی طرح فن تولید [Obstetrics]میں وہ طریقہ جو جرمن طبیب Walcher (المتوفی ۱۹۳۵ء) سے منسوب ہے اور ,,وضع والھر" Walcher Position کہلاتا ہے۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ وہ زخموں کی سلائی کے مختلف طریقوں سے واقف تھا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو طریقہ Freiedrich Trendelenburg (المتوفی ۱۹۲۴ء) کی نسبت سے ,,ٹرنڈلنبرگی" کہلاتا ہے وہ بھی ابوالقاسم الزّھراوی کے ھاں معروف تھا۔

یورپ کا پہلا نمایاں جرّاح جو یورپ میں زھراوی اور دیگر جرّاحوں کے پیرو کی حیثیت سے سامنے آیا اور وھاں عربی فن جراحت کو فروغ دیا ، Guy de Chauliac ہے جس کی وفات ۱۳۶۳ ع میں ھوئی۔ یہاں میں حود پر لازم سنجھتا ھوں کہ مختصراً جراحت چشم کے میدان میں مسلمان اور عرب اطباء کے مقام کی طرف اشارہ کروں کیونکہ ھمیں اکثر تاریخ طب میں ایک ایسی رائے سے سابقہ پڑتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ اور وہ یہ کہ عرب اطباء صرف جراحت چشم میں ترقی یافتہ تھے۔ یہاں غلط ھونے سے میری مراد بحیثیت مجموعی علم الجراحت میں عرب اطباء کے مقام کا اعتراف نہ کرنا ہے۔

جراحت چشم میں عرب اطباء کی مہارت نے جو شہرت پائی اس کا حقیقی سبب اس شعبے کی خوش نصیبی تھی کہ اسے Julius Hirschberg جیسا زبردست عالم میسر آ گیا جس کا شمار طب چشم کے مشہور ترین مورخین میں ھوتا ہے اور جس کو عربی/اسلامی طب کے اس شعبے کا مطالعہ گہرائی اور انصاف کے ساتھ کرنے کی توفیق نصیب ھوئی۔ پھر اس نے اس کا اھل یونان کی معلومات نیز آخری چند صدیوں میں طب کی اس شاخ کی کیفیت سے ٹھوس موازنہ کیا۔

Hirschberg نے جو اہم تحقیقات پیش کیں ان کی تفصیل میں جانا
یہاں ممکن نہ ہو گا۔ اسی پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض ایسی معلومات
کی طرف اشارہ کرتا چلوں جن تک چوتھی صدی ھجری کے عمّار
الموصلی نے رسائی پائی۔ Hirschberg کا کہنا ہے کہ : ,,عمّار کی کتاب
میں جو پہلو سب سے زیادہ قابل داد ہے وہ اس کے چھ مختصر
بیانات ہیں جو بڑے مکمل اور زندگی سے بھر پور انداز میں دیئے گئے
ہیں اور اس کے خاص جراحی تجربوں سے متعلق ہیں۔ یہ بہت بڑی
حد تک جدید قاری کی دل چسپی کا باعث بنتے ہیں۔ یونانی ورثے
میں ہمیں اس سے مشابہ کوئی شے قطعاً نہیں ملتی۔ بعد کی صدیوں
میں ایسے دل نشین بیانات جو کمال اہتمام اور باریکی کے ساتھ
عمل جراحی کا بیان فراہم کریں ، انیسویں صدی کی ابتداء سے قبل
کہیں نہیں ملتے ،، (۱۸) Hirschberg اس موقع پر ذکر کرتا ہے کہ عمّار
الموصلی ہمیں ایسے عمل ہائے حراجی کا بیان فراہم کرتا ہے جو اس
نے مختلف علاقوں میں انجام دیئے اور ان علاقوں میں امراض چشم کی
کیفیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ Hirschberg ، عمّار کے ان کارناموں کا ذکر
جغرافیہ کتا راکتیبه (۱۹) (Star — Geographic) مرتّب کرنے کی کوشش کے
دوران کرتا ہے۔

,,اہم ترین چیز جو ہمیں عمّار الموصلی کے ہاں ملتی ہے وہ دھات
کی بنی ہوئی اُس کی ایک خود ساختہ ، اندر سے خالی ، سوئی کے
ذریعے چوس پھینکنے کے طریقے سے موتیا بند کا مکمّل آپریشن ہے
اس کی کتاب میں ایک اور اہم بات ، بینائی کو محفوظ رکھتے ہوئے
قزحیّہ چشم [Iris] کو نکال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل یونان او
عمّار کے عرب پیش رو یہ آپریشن کر چکے تھے لیکن انہوں نے اس
خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا تھا ، بینائی کے ل

نہیں " ۔ Hirschberg عمّار کی شخصیت کی مدّاحی میں کہتا ہے کہ ,,وہ ان اطباء میں سے ایک تھا جن کی مثال تاریخ میں بہت کم پیدا ہوتی ہے " ۔

اب تک میری کوشش یہ رہی ہے کہ بعض شعبوں میں ، عالم اسلام کی سنہری تاریخ میں ، علم طب کا جو معیار رہا ہے اس کی چند مثالیں پیش کروں حفظان صحت کے شعبے نیز طب ، ادویہ اور مریضوں کی غذاؤں سے متعلق تصانیف میں عرب اطباء کے ہاں جو معیار ملتا ہے ، اس کی طرف یہاں اشارہ نہیں کیا گیا ۔ تاہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ پیش رفت عمومی نوعیت کی تھی اور طب کے تمام شعبوں میں تھی ، یہ مزید عرض کر دوں کہ مسلمانوں کے ہاں علمی پیش رفت صرف طب تک یا علم کی کسی اور شاخ تک محدود بھی نہ تھی بلکہ قانون ارتقائے علوم — یعنی یہ کہ علم کا کسی ایک معیّن شعبے میں ترقی کرنا ممکن نہیں جب تک کہ علوم کے دیگر شعبوں کی ترقی اس کے پہلو بہ پہلو جاری نہ ہو — کے مطابق علوم کے تمام گوشوں پر محیط تھی ۔

یہی وہ علم طب ہے جو بیزنطہ [Byzantium]، اٹلی اور سسلی ، کی راہ سے نیز باھمی انسانی روابط کے ذریعے چوتھی صدی ھجری سے لاطینی دنیا میں پہنچنا شروع ھوا ۔ عربی کتابیں لاطینی دنیا میں ترجموں اور سرقوں کے ذریعے نیز بعض حالات میں مشاھیر اھل یونان سے منسوب ھو کر ، پھیل گئیں ۔ اس کی بہت سی مثالیں ملتی ھیں چنانچہ حنین بن اسحاق کی ,,کتاب العین " ، اسحاق بن عمران کی ,,کتاب المالینخولیا " اور ابن الجزار کی ,,کتاب الباہ " وہ کتابیں ھیں جو صدیوں تک یورپ میں جالینوس روفوس اور سکندر طرالیسی [Alexander of Tralles] کی تصانیف کی حیثیت سے متداول رہیں ۔

تاریخ کی نیرنگیوں میں سے ایک یہ ہے کہ الجزائر کے ایک عرب تاجر نے طب کی عربی کتب کو لاطینی دنیا مین منتقل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ۔ یہ معروف شخص جس کا نام قسطنطین الافریقی تھا ، اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ عیسائی تھا یا اپنے راھب دوستوں کی مدد سے ستّر کے قریب طبّی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کرنے کے بعد عیسائی ہو گیا ۔

یہ وسیلہ گویا طبّ جدید کا سر چشمہ تھا جو اھل یورپ کے لئے پھوٹ پڑا ۔ اس کام کی تکمیل اٹلی کی ایک خانقاہ میں ھوئی جہاں بہت سی کتابوں کو جو عرب اطباء کی تالیف تھیں اھل یونان سے یا خود قسطنطین سے منسوب کر دیا گیا ۔

یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخ طب کا یہ مرحلہ شاید سب مراحل سے بڑھ کر تصحیح کا محتاج ہے ۔ یعنی یہ کہ طب کا جو مرحلہ ، مرحلۂ احیاء کہلاتا ہے وہ عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے عمل کو یونانی کتب کا ترجمہ قرار دینے کے علاوہ بہت سے تاریخی حقائق سے انکار اور چشم پوشی کا بھی مرتکب ھوتا ہے۔

اسی غلط تاریخ نویسی کی ایک مثال یہ ہے کہ مؤرخین طب تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی کی بعض شخصیات کو یورپ میں طب جدید کے اوّلین علمبردار خیال کرنے کے عادی ھو چکے ھیں حالانکہ درحقیقت یہ لوگ اپنے عرب پیش روؤں کے مقابلے میں کوئی بھی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر رھے ۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ بس اتنا تھا کہ موٹی موٹی نئی کتابیں تالیف کر دیں جن کا مواد انھوں نے عربی کتابوں کے ترجموں سے نکالا تھا ۔

مستشرقین میں سے بعض محقّقین نے اس حقیقت کا بیان ایک اصولی قدم کے طور پر کر دیا ہے۔ اب لازم ہے کہ عربی/ اسلامی

تہذیب سے نسبت رکھنے والے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کریں۔ تاہم یہ کام ایک بلند علمی اور معروضی سطح پر انجام دیا جانا چاہئے جو تعصّب اور سرسری پن سے پاک ہو۔

حواشی

۱۔ EDITH HEISCHKEL, Die Geschichte der Medizingeschichtsschreibung, in: W. ARTELT, Einführung in die Medizinhistorik, Stuttgart 1949, 205.

۲۔ کتاب السموم لجابر بن حیان ، ۱۹۵۸ء فیسبادن ، ۷۷/أ۔ ۷۷/ب۔

۳ H. SCHIPPERGES, Die arabische Medizin als Praxis und als Theorie, in: Sudhoffs Archiv 43/1953/ 317-328.

۴۔ مراجع کے لئے دیکھئے:
F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, Leiden 1970, 214-215.

۵۔ جابر بن حیان : کتاب البحث ۔ نسخہ جار اللہ ، ۹۷/ب۔

۶ P. KRAUS, Jabir b. Hayyan, Cairo 1943, II, 326-330.

۷ S. PINES, Razi critique de Galien, in: Actes du 7e Congres International d'Histoire des Sciences, Paris 1954, 480-487.

۸- "Paul of Aegina" مراد ہے (مترجم)

۹۔ یعنی مسلمانوں/عربوں کے ہاں (مترجم)

۱۰ F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums, III, Leiden 1970, 277.

۱۱۔ اصل عبارت یوں ہے ,,وکان الرازی یعرف الحُمّی الفحمیة المعدیة : الحمّی الفارسیة و عرف الدود المدنی الذی تسلط علی سمح الأئمة الدّاخلیّة تعریفا کاملا "۔ خاصی کوشش کے باوجود اس کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا ,,الحُمّی الفحمیة " سے مراد غالباً Anthrax ہے (مترجم)

۱۲۔ غالباً Diaphragm مراد ہے (مترجم)

۱۳۔ اصل خطبے میں جرمن اصطلاح "Herzbeutelentzündung" دی گئی ہے (مترجم)

١٤ - G. COLIN, Avenzoar, sa Vie et ses Œuvres, Paris 1911 (Bull. de corr. afr. 44).

نیز اس کا مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (بزبان المانوی) میں ج ٢ ، ص ٩٥٨ ، اور ابن زھریر R. Arnaldez کا مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (بزبان انگریزی) میں ج ٣ ، ٩٧٨ .

١٥ - اسے M. MULLER نے Sitzungsberichte der königlich-bayerischen Akademie der Wissenschaften, München. 2/1863/1-34.

میں شائع کیا ۔

١٦ - مرجع سابق ، ص ٦

وہ مزید کہتا ہے ۔

جو شخص چھوت کے دعوے کا اس بنیاد پر انکار کرتا ہے کہ مریضوں سے رابطہ رکھنے والے بہت سے لوگ باوجود یکہ بہت سے مریضوں سے ان کا قرب اور مستقل ساتھ رہا ، بچ گئے جبکہ کچھ اور لوگ جن کا مطلق رابطہ نہ تھا یا بہت کم رابطہ رہا ، ہلاک ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کو یہ معلوم نہیں کہ قدرت الٰہی کے تحت سلامتی یا ہلاکت کا سبب [مرض کی] استعداد کا ہونا یا نہ ہونا ہے ۔ چنانچہ لوگ اس سمیّت کی آگ کے قرب میں بتیوں کے مانند ہوتے ہیں جو سرکنڈوں میں جلتی ہوئی آگ کے قریب لائی جاتی ہیں ۔ جس بتی کا جلنے تیزی اور دھواں دینے سے تازہ تعلق ہوتا ہے اسے فی الفور آگ لگ جاتی ہے اور یہ اس شخص کی مثال ہے جس میں استعداد مرض وافر ہے ۔ جو بتی خشک ہوتی ہے اور آگ سے اس کا خاص قریب میں تعلق نہیں رہا ہوتا وہ پہلی بتی کی نسبت زیادہ وقت میں اثر دکھا کر کے آگ پکڑتی ہے ۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جس کے ہاں استعداد مرض کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اور جو بتی گیلی اور پانی کا اثر لئے ہوئے ہوتی ہے وہ بہت دیر میں جلتی ہے ۔

١٧ - P. DIEPGEN, Die Bedeutung des Mittelalters, in: Essays on the History of Medizine, London 1924, 108-112.

١٨ - دیکھئے :
SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, 331.

١٩ - ایضاً ، ص ٣٣٠

●●●

اردو ادب

○ اردو ادب کدھر؟

○ پروفیسر وہاب اشرفی

خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے، کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد ــــــ یا اظہاری، اقدامی، کیا ہے، کون اس کی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ کا پروفیسر وہاب اشرفی کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

ــــــ ادارہ

پروفیسر وہاب اشرفی
صدر شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی رانچی

اردو ادب کدھر؟

اردو ادب کدھر؟ میرے نزدیک اس سوال کے تین جواب ممکن ہیں۔ جمود کی طرف، زوال کی طرف، ارتقاء کی طرف۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ اردو ادب اپنی تمام صنفوں میں جامد و ساکت ہے، نئے خیالات، نئے تصورات، نئے تجربے اور نئی معنویت سے یکسر عاری ہے، تو پھر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوگا کہ اس کے مزاج میں تعطّل اور جمود کی کیفیت عیاں ہے۔ اگر اردو ادب زوال کی طرف مائل ہے تو اس کا یہ مفہوم ہوا کہ اس کی اکثر صنفیں نہ صرف یہ کہ اپنا معیار قائم نہ رکھ سکیں بلکہ ان سے متعلق فنکار ان کی رہی سہی ساکھ بھی اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ اس طرح کہ ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اردو ادب کی متعلقہ صنفیں یا ان صنفوں میں سے چند نہ صرف یہ کہ نئی اور تازہ بہ کار جہتوں سے آشنا ہو رہی ہیں بلکہ تخلیقی، فکری اور معنوی اعتبار سے ان کے اندر ایسی قوت پیدا ہو رہی ہے جو انھیں ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بحث کا ایک نکتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک صنف پامال ہو گئی ہے تو دوسری نئے کیف و کم کے ساتھ ابھر رہی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک فنکار تو بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز ہے لیکن مجموعی طور پر دوسرے افراد صرف خوشہ چینی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر نہ فکری بلندی ہے نہ تخلیقی قوت، نہ تجربے کا میلان۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو ادب مجموعی طور پر مائل بہ ارتقاء ہے۔ سوچ کی نئی لہریں ابھر رہی ہیں۔ تخلیقی سرچشموں میں وسعت آ رہی ہے۔ تجربات اپنی متنوع شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس طرح کہ اردو ادب کی کئی صنفیں آفاقی حیثیت حاصل کرنے کی طرف راجع ہیں۔ میری یہ رائے کسی Hypothesis پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ٹھوس دلائل دیے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے شعری روایات کو سامنے رکھا جائے۔ ہماری ممتاز صنف غزل کئی پہلوؤں سے اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ ترقی پسندوں نے غزل کو ایک نئی سمت ایک نیا 'Dimension' ضرور عطا کیا تھا۔ یہ وہ روایت تھی جو حالی اور اقبال کے توسط سے ترقی پسند شعرا کے یہاں آئی تھی۔ اب ہم یہ کہنے لگے تھے کہ غزل نے عمومی طور پر اپنی اس روایت سے ناطہ توڑ لیا ہے، اور محض عشق و عاشقی کے فرضی قصے اور تشبیہ و استعارے کے گھسے پٹے

اندازسے باہر نکل آئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تنقید بھی کی جاتی رہی کہ غزل پر خارجی کیف کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور یہ کہ ترقی پسند اپنے محور سے الگ نہیں ہوتے، دروں بینی ان کے یہاں خال خال ہے۔ جدلیاتی تصوران پر اتنا حاوی تھا کہ وہ تصورات جنھیں ہم ذاتی اور نجی کہہ سکتے ہیں غزل میں بار نہیں پاتے۔ ہر چند کہ ایسی تنقید یک طرفہ ہے اور حقیقت پرمبنی نہیں لیکن اتنا تو سبھی تسلیم کریں گے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ممتاز شعرا نے غزل کے دامن کو فکر و آگہی کے نئے سبق بھی دیے اور اس کے کینوس کو وسیع بھی کیا۔ میری باتیں اور بھی واضح ہو سکتی ہے اگر ہم فیض جیسے شاعر کی مثال سامنے رکھیں یا دوسری سطح پر پرویز شاہدی ہماری نگاہ میں ہوں۔ یہ دو نام میں نے یقینی دو سطح کے شاعروں سے Random samples کی طرح چن لیے ہیں۔ ایک طرف فیض احمد فیض ہیں، جن کی عظمت، شہرت اور رفعت کے بارے میں بہت کم اختلاف ہے تو دوسری طرف پرویز شاہدی ہیں، جن کے فن کی تحسین ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ یہاں ٹھہر کر ان دونوں شعرا کے کچھ اشعار دیکھ لیے جائیں تو بہتر ہے۔

فیض

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے — رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں — دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

نہ خیالِ وصل نہ عرضِ غم نہ شکایتیں نہ حکایتیں — ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی — بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

پرویز شاہدی

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے — "اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہیے — زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

ان اشعار کے مطالعے سے اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ فیض ہوں یا پرویز شاہدی لفظوں کو ان کے لغوی معنی میں استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس حد تک کہ ہر لفظ ایک تخلیقی عمل سے گذرا ہوا نیا سانچہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں شعرا نے یکسر روایت سے اپنے آپ کو الگ کر لیا ہے۔ بلکہ روایت اور انفرادیت کے ادغام سے ایک واضح شعری رویے کی تشکیل کی ہے۔ ممکن ہے کہ ان شعروں میں ذاتی آلام یا نجی انبساط کا مظاہرہ نہ کیا گیا ہو، لیکن ان میں ذاتی تجربے کی آنچ یقینی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ترقی پسند منشور کو سامنے رکھیں تو ان کی معنویت ایک رخ اختیار کر لے گی، پر اگر اس سے احتراز کریں تو پھر تفہیم کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کی پہچان بھی یہی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعری رویہ صرف ان دو شاعروں ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے ترقی پسند غزل گو شعرا مثلاً سردار جعفری، جذبی، مجروح، تاباں، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کی بھی یکساں میراث ہے۔ مجروح سلطانپوری کا یہ

خیال درست ہے کہ :

"ترقی پسندانہ تغزل ترقی پسند شاعری بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز تو نہیں ہے بلکہ جو ذمہ داریاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے دوسری اصناف ادب کے سلسلہ میں لے رکھی تھیں تقریباً وہی ذمہ داری اس شاعری کی بھی ہے جو ترقی پسند غزل لکھ رہا ہے۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں یہی بات تھی کہ وہ شعر جو ظلم کے خلاف احتجاج بلکہ کسی حد تک آویزش اور مظلوم کی طرفداری کے احساس اور شعور کے نتیجہ میں لکھا جائے، ترقی پسند شعری روایت کا حصہ ہوگا۔ یہ شعر نظم کا بھی ہو سکتا ہے اور غزل کا بھی۔ اگر نظم میں آرہا ہے تو نظم کے صنفی لوازمات کے ساتھ آنا چاہیے اور اگر غزل میں ہے تو غزل کی ایمائیت اور استعاراتی دروبست کے ساتھ۔ ترقی پسند تغزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔ کوئی ایسا موضوع کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ہے جو ترقی پسند غزل میں نہ آیا ہو۔"

اس کے بعد غزل گوئی کا جو منظر ہمارے سامنے ہے وہ کچھ دوسری کہانی سنا رہا ہے۔ جدید یا جدید تر غزل گویوں کا مطالعہ بعض حلقوں میں ایک خاص تعصب کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تعصب زیادہ تر روایت پسند اور محدود نظریے کے حامل بعض ترقی پسند اصحاب کی فکر کا نتیجہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جدید یا جدید تر غزل نے اس روایت کی توسیع کی ہے جو ترقی پسندوں کا حصہ تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور معنوی سطح پر ترقی پسند ایک Satiety کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے الفاظ کے دروبست تکرار کے باعث اپنی معنویت کھونے لگے تھے۔ یہ تکرار لفظی سطح پر بھی تھی اور فکری سطح پر بھی۔ لہٰذا اس حد سے دوسرے شاعروں کو آگے جانا ہی تھا ورنہ ان کا تخلیقی سوتا خشک ہو جاتا، اور نئے شعری رویے کی کوئی صورت ہی نہیں نکلتی۔ نئے زندگی کے نئے مطالبات سامنے تھے۔ یہ مطالبے فکری سطح کے بھی تھے اور تجرباتی حیثیت کے بھی۔ ایسے میں نئے سانچے کی تلاش ایک لازمی نتیجہ تھی۔ لیکن غزل کا سانچہ تو Fix تھا اب دو صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ شاعر غزلوں میں ان ہی استعاروں، پیکروں اور علامتوں سے کام لے جو ترقی پسندوں کے لیے مخصوص تھے یا ماضی کی طرف لوٹ جائے جہاں پہلے ہی سے یہ تمام شعری صورتیں اپنا دم خم Exploit کر چکی تھیں۔ نئے شاعروں کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہ ہوتی۔ یہ بھی تھا کہ نئے شاعروں کے اپنے غم تھے، اپنی آرزوئیں تھیں، اپنے کو پہچاننے کا بھی عمل تھا، اور زمانے نے انھیں جو کچھ دیا تھا اسے آئینہ بھی کرنا تھا۔ رشتے ناطوں کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی جو کبھی صالح قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اجتماعی منظر نامہ بے کیف ہو چکا تھا

معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تمدنی حقائق بدل چکے تھے۔ صنعتی اور مشینی دور نے مثبت قدروں کو پامال کر رکھا تھا Urbanization کا عمل تیز ہو چکا تھا۔ وقت کی رفتار وہ نہیں تھی جو پہلے تھی۔ ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعر فکر کے اعتبار سے الگ ہو اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے لفظوں کو ایک بار پھر نئی معنویت سے ہمکنار کرے۔ نئی غزل ان ہی امور سے عبارت ہے۔ اب جب الفاظ کو لسانی معنویت سے الگ کر دیے جائیں، استعارے کی نئی دوکان سجائی جائے، نئے تجربوں کو نئے محاوروں کی تلاش میں غلطاں کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ان کی تفہیم میں بھی ایسی آسانی نہ ہوگی جو یک لخت معنی کے سب در کھول دے۔ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا۔ اس حد تک کہ کہیں کہیں ابہام کا پردہ خاصا دبیز ہو گیا۔ ابہام کی اپنی منطق ہے، غزل کی ایمائیت تفہیم کے کڑے کو مرحلے کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غالب جب انفرادی امتیازات کے حصول میں سرگرداں تھے تو اپنے گنجینۂ معنی کو طلسم کی سرحدوں تک لے جانے میں غیر معمولی قوت تخلیق کا مظاہرہ کر رہے تھے، جدید اور جدید تر شاعروں کے لیے بھی ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنے امتیازات واضح کریں لہٰذا انھیں بھی اپنی قوت تخلیق کو امتحان کے مرحلے سے گزارنا تھا۔ اب جو نئی غزل سامنے آئی تو نئے نقوش کے ساتھ آئی، نئی سج دھج کے ساتھ۔ ایک طرف تو دروں بینی اس کا شیوہ بنی تو دوسری جانب خارجی امور کے احاطے کے لیے کچھ کھردرے انسلاکات بار پا گئے۔ نئی غزل نشانۂ ہدف انھیں کھردرے مظاہر کی بنا پر بنی اور رہتی ہے۔ یہ عام احساس ہے کہ کوئی بھی صنف شاعری کرختگی کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی بات سوچنے کی ہے کہ وہ احساسات جو سبک نہیں، نازک نہیں، ان کے لیے وہی لب و لہجہ اختیار کرنا پڑے گا جو ان کی حقیقی تصویر پیش کر دے۔ غالباً بعض شعرا کے یہاں کرخت لب و لہجے کا یہی جواز ہے۔ چند اشعار دیکھیے ؎

اتار پھینکوں بدن سے پھٹی پرانی قمیص	بدن قمیص سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں	(محمد علوی)
چاروں طرف بریکیں لگیں ہارن بج اٹھے	رستوں کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی	(بشیر بدر)
ہر لمحہ خوفناک ہے، ہر وقت حادثہ	ہم لوگ کر رہے ہیں سفر پائدان پر	(احمد تبسم)
چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کچھ بولتے نہیں	بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے	(عادل منصوری)
سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر	کسی چھت پر مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں	(محمد علوی)
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں	بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے	(پروین شاکر)
کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم	اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہو گئے	(شمس الرحمٰن فاروقی)
دیکھیں تو ہاتھ باندھے کھڑے تھے نماز میں	پوچھو تو دوسری ہی طرف اپنا دھیان تھا	(عادل منصوری)

یہ آوازیں محسوس نہیں ہیں۔ لہجے کا کھردرا پن نمایاں ہے۔ ایسے افراد جو غزل کی خاص نفگی پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کے لیے انھیں سہن کرنا آسان نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سماج نے جن پتھروں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے ان سے ہمیں ٹکرانا ہی ہے۔ چاہے اس میں نغمگی اور رومانی لوجمی موسیقی کو ضرب ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیکن نئی غزل کا یہ عمومی مزاج نہیں ہے۔ نہ ان اشعار سے نئی غزل کا پورا مزاج سامنے آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل کا دھیما اور نازک انداز آج بھی پایا جاتا ہے۔ نئی لفظیات کے ساتھ نئے Images کی صورت میں نئی ایمائیت کے حوالے سے ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید کچھ اشعار پیش کئے جائیں سے

بہت عجیب ہیں یہ درد و غم کے رشتے بھی — کہ جس کو دیکھئے اپنا دکھائی دیتا ہے (خورشید احمد جامی)

کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ نہ خواب — سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے (باقی)

جب نیند آچکی ہو صدائے جرس کو بھی — میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں (خلیل الرحمٰن اعظمی)

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے — اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے (عادل منصوری)

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انسان کا قرب — میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا (حسن نعیم)

کوئی ہے جو مجھے دو چار پل کو اپنا لے — زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے (شہریار)

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہ — کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا (وہاب دانش)

سماج کی ناہمواریوں کا ایسا احساس نئے تیور ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ نئی غزل محض کھردرے اور سخت لہجے سے عبارت ہے درست نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر دور نئے تقاضے لے کر آتا ہے۔ ان تقاضوں کو برتنے کے لیے نئے شعری نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جدید غزل کے شاعروں نے نیا لب و لہجہ بنانے کی کوشش کی ہے تو اسے سمجھنے کی ضرورت ہے نہ کہ پست اشعار کی مثالوں سے انھیں بیک قلم رد کرنے کی۔

نظم میں یہ صورت واقعہ اور بھی نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد نے ترقی پسند شاعری کے جائزے میں زیادہ تر ہئیت کی بنیاد پر اسے معمولی اور سطحی ٹھہرایا تھا۔ پھر انھیں ترقی پسند شعراء کے مرکزی اور بنیادی تصورات سے بھی اختلاف تھا۔ چنانچہ نظموں کے سلسلے میں عضویاتی تکمیل کے عنقا ہونے اور خیالات کی تکرار کی بنیاد پر بڑے ہی سخت لہجے میں ترقی پسند نظموں کی تنقید کی تھی حالانکہ فیض کی چند نظمیں ایسی تھیں جن میں غنائیت تجربے کی شدت کے ساتھ ساتھ ایک مربوط ہئیتی اور تکنیکی نظام بھی تھا۔ بہرحال وہ تو جارحیت کے اصولوں پر کاربند تھے۔ اور اچھی نظموں میں بھی کیڑے نکالنے کے درپے، لیکن ان کی تنقید سے اتنا کچھ ہوا کہ بعض نظم نگار قدرے سنبھلے۔ انھوں نے

اپنی نظموں میں عضویاتی تکمیل کا نہ صرف پاس رکھا بلکہ تجربوں کو تجریدی طریقے پر آراستہ کرنے کی بھی کوشش کی جدید اور جدید تر نظم نگار بڑی چابک دستی سے اظہار کے طریقے میں کھنگال رہے ہیں۔ اب ان پر تنقید خالص فکری انداز سے ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ موضوعی اعتبار سے ہماری نگاہ میں سماج کا جو ڈھانچہ ہے وہ سرتاسر ناہموار ہے۔ ایسی ناہمواری کو تجربے سے گذار کر ایک ساخت دینے میں نئے شعراء نے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ میں اپنی گفتگو معیاری نظموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کر رہا ہوں، اس لیے کہ نہ تو کسی شاعر کی ساری نظمیں تجربے اور فن کے اعتبار سے معیاری ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ہر تخلیق شاہکار ہو سکتی ہے۔ بہر حال چند اچھے نمونے پیش ہیں۔

۱۔ بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاش رزق میں نکلا ہوا یہ جم غفیر لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیل رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں ہر ایک اپنی ہی آواز پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں (نظم شب چراغ از محمود ایاز)

۲۔ سڑکوں پہ بے شمار گل خوں پڑے ہوئے پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی سب چھتوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں (نظم میں اور شہر از منیر نیازی)

۳۔ ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنی انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستان کی پر ہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔
منتظر مرگ انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سو دیکھ رہا ہے!
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے / بھوتوں کا جلنا دیکھے گا!
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے۔ (نظم کھنڈر، آسیب اور پھول از وحید اختر)

نئی تہذیب نے شہروں کی زندگی کو جو نیا روپ دیا ہے وہ ان نظموں کے پیکر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سڑکوں پہ بظاہر چلتے پھرتے انسان مردہ لاشوں کی مانند ہیں، احساسات و جذبات سے عاری، جیسے بس زندہ رہنے کے لیے زندہ ہوں۔ خوف پورے ماحول پہ طاری ہے اور ہر شخص اپنی ذات کے خول میں سمٹا ہوا ہے یا سمٹنا چاہ رہا ہے یہ احساسات

ایسے ہیں جن کا تجربہ ایک عام آدمی بھی کرتا ہے یا کرسکتا ہے۔ لیکن تجربوں کو تخلیقی عمل سے گذارنے میں جن وسیلوں کی ضرورت ہے، میرے خیال میں متعلقہ شعرائے انھیں اپنایا ہے اور اس طرح کے حالات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں قنوطیت کا جو پہلو ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ کسی رجائی ذہن کے مالک شخص کے لیے یہ سب باتیں پژمردہ ذہنیت کی عکاس ہو سکتی ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ صورت واقعہ یہی ہے۔ شہروں کے ہنگامے میں زندگی کی ساری مثبت قدریں جس طرح پامال ہو رہی ہیں، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یا تو فنکار ان سے آنکھیں موندلے یا پھر احتجاج کرے۔ میں ایسی شاعری کو احتجاج ہی سمجھتا ہوں لیکن یہ احتجاج نثری نہیں ہے، غیر تخلیقی نہیں ہے بلکہ غایت درجے کی تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ یہاں بہت سی باتیں سائنس ٹکنالوجی، مادہ پرستی، کرب، تنہائی، علیحدگی اور زندگی کی بے معنویت کے حوالے سے کہی جا سکتی ہیں، لیکن مجھے فی الحال ان امور سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی زندگی شاعر کے لیے ایک Feeding ground ہے۔ اس لیے بھی کہ اس سے تخلیق کار ہر لمحہ نبرد آزما ہے۔ ظاہر ہے نئے تجربوں کے لیے نئے استعارے کی ضرورت ہے۔ اگر شاعر اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بوطیقا کی تشکیل کرتا ہے تو یہ غیر ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے ایک جائز مطالبہ ہے۔

ان باتوں کو سمیٹتے ہوئے میں واضح طور پر اس کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ نئے شاعروں نے جس طرح اپنی بوطیقا کی تشکیل کی ہے وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ اس سے ایک طرف ہماری شاعری نئے رنگ و آہنگ سے دوچار ہوئی ہے تو دوسری طرف ہمارے وہ الفاظ جو تکرار استعمال سے اور اکہری معنویت سے کھوٹا سکہ بن گئے تھے، وہ نئے لسانی مظاہرے سے تازہ کار اور تازہ دم ہو چکے ہیں۔ یہ ایک واضح سمت ہے جس سے ہم پہلے ناآشنا تھے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری مجموعی طور پر نئے علاقے تلاش کرنے پر راجع ہے۔ یہاں کوئی شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ اینٹی غزل، آزاد نظم، ابہام اور اہمال سے شرابور جدید شاعری کس خانے میں رکھی جائے گی۔ میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ ہر وہ تجربہ جو حقیقی طور پر شعر میں ڈھل جائے وہ آج نہ سہی کل لائق ستائش ہوگا۔ یہاں تجربہ اور نقل تجربہ میں فرق کرنا چاہیے۔ جدت برائے جدت، ابہام برائے ابہام اور لایعنیت برائے لایعنیت کسی کے یہاں ہو کبھی نہ تو تنقید کی کسوٹی پر پوری اترے گی اور نہ ہی معیاری شاعری کی تخلیق کا سبب ہوگی۔ سچا تجربہ حقیقی تخلیقی کرب اپنی نکاس کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ فنکار اگر بے ریا ہے تو وہ نہ کسی منشور میں بند ہے اور نہ کوئی شعری ہیئت اس کے تجربے کے لیے حتمی بنتی ہے۔ ہر تجربہ اپنی ہیئت کے ساتھ وجود پذیر ہوتا ہے۔ نئے شاعروں کے یہاں جذبے کی شدت بھی ہے اور سچائی بھی۔ ان کے یہاں ہیئت کے تجربوں کو ان کے مخصوص

جذباتی کیف سے مربوط کرنے کے بعد یہاں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے فیشن پرستی میں جو شاعر بھی نیا بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کے تجربے مانگے کے ہیں جو محض توڑ پھوڑ کو خارجی طور پر برتنے پر کمربستہ ہے، اس کا کسی شعری فلسفے سے رشتہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ جدید شاعروں میں بھی بہت سارے ایسے ہیں جو جدیدیت اور روایت کو فیشن کے طور پر برتنا چاہتے ہیں۔ انھیں پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ میں نام گنوانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اردو شاعری پر بحث تو خاصی ہوتی آئی ہے، فکشن بھی آج کے نقادوں کے لیے ایک ایسی فضا ہے جس پر کثرت سے خیال آرائی کی جارہی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ افسانہ کون سا رخ اختیار کر رہا ہے۔ اس باب میں جو روایت بنی ہے، اس سے ہم ناآشنا نہیں ہیں۔ ترقی پسند روایات کے تحت افسانے نے یقینی نہایت ہی ارفع مقام حاصل کرلیا ہے۔ صنف افسانہ کی عظمت اور اس کے وقار کا جواب ہمارے مستند اور معروف افسانہ نگاروں کے یہاں مل جاتا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی اور بہت سارے دوسرے لکھنے والوں نے اس صنف کو معراج کمال تک پہنچانے میں جو سعی کی ہے اس پر خاک ڈالنے کی ہر کوشش تشدد پسندی کی مثال ہوگی، دانشوری کی نہیں۔ ابتدا میں اردو افسانہ سرکے بل کھڑا تھا۔ ترقی پسندوں نے اسے پاؤں پر کھڑا کیا۔ یہ ایک بہت بڑا فنی ریاض تھا جسے ہمارے معروف افسانہ نگاروں نے اختیار کیا اور عوام و خواص دونوں ہی کے دلوں میں عزت و احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صنف ارتقا کی کئی منزلیں طے کر گئی۔ یہ بھی ہوا کہ مختلف لکھنے والوں نے علم کے مختلف جہات کی طرف رخ کیا۔ معاشی، سیاسی اور جنسی افکار خاص طریقے پر افسانے کے خد و خال بنے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ صورتیں جنھیں ہم وقتی کہہ سکتے ہیں انھیں بھی ان افسانہ نگاروں نے برتنے کی کامیاب کوشش کی۔ فسادات پر لکھے جانے والے افسانے اس کی ایک مثال ہیں۔ تب افسانہ فنی لحاظ سے ایک خاص ڈگر پر گامزن تھا۔ ماجرا سازی اور دوسرے قیود سے بری نہ تھا، افسانہ نگار کہانی بن پر خاصا زور صرف کرتا تھا۔ اس طرح کہ ایک عام قاری بھی ان حقائق سے آشنا ہو جاتا تھا جن کا اظہار متعلقہ افسانہ نگار کا منشا ہوتا تھا۔ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ اپنے عظیم افسانہ نگاروں کی راہ پر چلیں یا موضوعات کے اعتبار سے ایسا سانچہ یا ہئیت اختیار کریں جس میں گریز کا پہلو بھی ہو اور اظہار کی نئی صورت بھی ابھرے۔ ان احساسات کو ایک صاحب نے یوں بیان کیا ہے :

"نیا افسانہ دراصل ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔ وہ ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے چور ہے۔ آزادی کے بعد جو نسل سامنے آئی

تھی۔ اس کے پاس روایات کی مقدس آگ بھی تھی اور عزم و ولولے کا وہ تیشہ بھی جو ریمیات کے ستونوں کو
کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ادب کی کائنات میں منظر نامہ تو آئے دن بدلا جا سکتا ہے لیکن مزاج کہیں صدیوں میں بدلا
کرتا ہے۔ آزادی کے بعد شاعری کی طرح افسانے میں بھی پرت پرت کھول کر دیکھنے، زندگی کے تمام مناظر میں رکھنے،
اس کے سیاہ و سفید پہلو کو پرکھنے اور خارجی اور باطنی تمام تقاضوں کو سمونے اور انسان کو ایک معنوی وحدت
ایک مرکز خیال اور ایک جہان آرزو کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اسلوب و اظہار کی
سطح پر لفظ کی معنیاتی کائنات، اس کے تہہ در تہہ رشتوں، علامتی تجریدی اور تمثیلی پہلوؤں اور منطقی معنی
سے قطع نظر معنی کے معنی اور ان کے معنیاتی انسلاکات کے تخلیقی امکان کی جستجو ذہنی سفر کا حصہ بن گئی، لیکن
اس زبردست ذہنی سفر نے بعض بنیادی سوال بھی پیدا کیے، یعنی نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ
ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے، کہانی نہیں ہے؟ یا جس
حد تک وہ کہانی ہے، وہ نئی نہیں ہے؟ کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کا رد لازم ہے؟
اس میں جو Rehtoric ہے اس کو منہا کرنے کے بعد یہی سوال سامنے آتا ہے کہ نئی کہانی کی شکست و
ریخت ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت کی گئی، یا فنی تقاضے کے طور پر۔ یہ بڑا اہم سوال ہے جس کے بغیر نئی کہانی کا کوئی
مطالعہ بھی سودمند نہیں۔ جسے فاضل نقاد نے فرسودہ ڈھانچہ کہا ہے کیا وہ واقعی اتنا فرسودہ ہو چکا تھا جس
میں نئے خیالات کی سمائی ممکن نہ تھی۔ میری رائے میں اس کا جواب اس طرح ہے کہ ہمارے مستند افسانہ نگار اپنی
حدوں میں وہ کام کر چکے تھے جس سے آگے نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ پھر مغرب میں افسانے کے نئے فنی تقاضے
کے تحت جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبر نئے افسانہ نگاروں کو مل چکی تھی۔ اتنا ہی نہیں بعض ایسے نئے پہلو بھی سامنے آچکے
تھے جن کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں کے ذہن پر خاصا گہرا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر نئے افسانہ نگاروں نے سب سے
پہلے وہ راستہ اپنایا جو ابہام و اجمال کی منزلوں کی طرف لے جاتا تھا۔ اس کی زد میں کہانی پن کی منطقی صورت بھی
آئی۔ علامتی لے تیز ہوئی اور افسانے کو شعر کی طرح برتنے کی کوشش کی گئی۔ اس عمل میں لازمی طور پر قاری سے اس کا
رشتہ ٹوٹ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس عمل میں سارے افسانہ نگار ناکامیاب ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض علامتی افسانے
خاصے کی چیز ہیں جن کی تحلیل ہونی چاہیے۔ لیکن علامت اور تجرید کے نام پر جس طرح رطب و یابس کا ڈھیر سامنے
آیا وہ بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کہانی اگر کہانی پن سے بنتی ہے تو اس سانچے کے اندر بھی علامتی افسانے
تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم سرریلزم اور دادا ازم کی روش اپنائیں، یا شعور کی رو اور

کو ذہنی خیال سے جو ساخت، فنی جہد العمل کا وسیلہ بن رہا تھا، لیکن عام طور سے ہوا یہ کہ مغرب کے Poison plot
کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور اس کے اثر کے تحت کہانی سے کہانی پن کو زبردستی نکال پھینکنے کی آرزو چھوٹے
سے چھوٹے نئے افسانہ نگار کے یہاں پیدا ہو گئی۔ یہ بھی ہوا کہ ہر علامتی افسانے کو تجریدی بھی کہا گیا حالانکہ دونوں
قسم کی تحریروں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ تجرید مصوری کی راہ سے نمایاں ہوتی ہے جب کہ علامت معنوی
تہہ داری سے عبارت ہے۔ ان امور کے باوجود اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم
کا tension ، Academic تھا اور Tension جب Academic: بن جاتا ہے تو اسے عوام سے الگ ہونا
ہی ہے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا کہ افسانہ نگار اور قاری کے درمیان تفہیم کے بارے میں کوئی رابطہ نہیں، اس لیے کہ تفہیم
کی الگ الگ سطحیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی بھی تخلیق کار یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی تخلیق کی ترسیل کے لیے ذہن کی کون سی سطح
سامنے رکھے۔ خالق کو ذہنی طور پر آزادی ہونی چاہیے کہ اپنے تجربے کو اپنے مزاج کے مطابق فن کی شکل دے نہ کہ وہ کسی
قاری کو ذہن میں رکھ کر تخلیقی عمل میں مصروف ہو۔

نئے افسانے کے رشتے سے قدروں کی شکست و ریخت، تنہائی، علیحدگی، بے سمتی اور لایعنیت
وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب موضوعی اور Thematic باتیں ہیں۔
بحث تو فنی اصول اور ضابطے کی ہونی چاہیے۔ میں نے یہ کہا کہ نئے افسانہ نگار نئے سانچوں کی تلاش میں نکلے تو ان کے
سامنے کچھ اسطوری سہارے تھے تو کچھ داستانی وسیلے تو کہیں کہیں فقہی حکایتی اور متصوفانہ ذرائع۔ جن افسانہ نگار
دانشوروں نے اپنے مخصوص تجربوں کو اعلیٰ فنی کارکردگی کے ساتھ اپنایا، وہ تو ڈوبنے سے بچے لیکن جبراً جن لوگوں نے
ان صورتوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو برتنے کی کوشش کی، وہ نامعتبر بھی ٹھہرے اور افسانوی دنیا میں
مقبول بھی نہ ہو سکے۔

افسانے میں نت نئے تجربے کی جو شدت اور آرزو تھی، وہ یقیناً اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے نئے افسانہ
نگاروں نے یہ محسوس کر لیا کہ اصل حقیقت تجربے کی سچائی بھی ہے اور اظہار کی سچائی بھی۔ نتیجے کے طور پر نئے افسانہ
نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم کے توازن کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے جدید افسانہ
نگاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ چند افسانہ نگار فکر اور ساخت دونوں ہی میں ارتقائی
منزلوں سے گذر رہے ہیں۔ میں اپنے ہی صوبے کی مثال دوں تو شاید کافی ہو۔ کلام حیدری ہوں کہ احمد یوسف
یا شوکت حیات، حسین الحق ہوں یا عبدالصمد ان سبھوں کے یہاں تخلیقی سطح پر وزن و وقار پہلے بھی تھا اور اب

بھی ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوکت حیات کی ہر دوسری کہانی معنوی فکری اور ہیئتی لحاظ سے ہر طرح جامع
ہوتی ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ ہر وہ افسانہ نگار جو فکر و آگہی کے نئے تناظر کو اپنے ہر پہلو تخلیقی جوہر کے
اظہار کی سطح پر لاتا ہے۔ وہ کامیاب بھی ہوتا ہے اور ہر سطح کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی۔ سارے نئے افسانہ
نگاروں یا نئی افسانہ نگاری کو ایک لاٹھی سے ہانکنا درست نہیں۔ عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ اپنے امکانات
کی توسیع کرتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اردو ناول نگاری کی سمت و رفتار کا جائزہ لیجیے تو ہندوستان کی حد تک ایک طرح کی مایوسی
کا اظہار ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جو کچھ اس ضمن میں کیا ہے وہ ہم سبھوں کے سامنے ہے۔ انھوں نے
اپنی بہترین تخلیقی قوت "آگ کا دریا" پر صرف کر دی۔ ان کے نئے ناول اس بلندی کو نہیں چھوتے۔ وہ
ورجینیا وولف کے اثرات سے وہ اب تک آزاد نہیں ہو سکی ہیں۔ انھوں نے انسائیکلوپیڈیائی ذہن پایا ہے
جس کا پرتو ان کی تخلیقی کاوشوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جس طرح پاکستان میں اچھے اور معیاری ناول لکھے جا رہے
ہیں، اس کی روایت معلوم نہیں کیوں ہندوستان میں بن نہیں پاتی۔ ہاں حیات اللہ انصاری، جیلانی بانو اور
ظفر پیامی کے ناول بس اس حد تک اہم ہیں کہ وہ ناول ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاریخی ناول لکھنے کے معاملے
میں قاضی عبدالستار کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب کئی لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے
اور ان کی تحریروں کو ادب عالیہ کا درجہ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ انھوں نے جن موضوعوں
کو اپنے ناولوں میں نشانہ بنایا ہے، وہ بھی اہم ہیں اور جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے
کم ہے۔ لیکن اس سے اردو ناولوں کے ارتقائی سفر کا حال پوری طرح روشن نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں پاکستان
میں نئے ناولوں کا اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ اس باب میں انتظار حسین کے ناول "بستی" "نشیب" اور
"تذکرہ"، انور سجاد کے "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ"، بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" اور ایوب
مرزا کے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر صلاح الدین پرویز کی ناولوں
کو زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں جن کا بیان یہاں ضروری نہیں۔ چونکہ میں ان کو
میں ناولٹ نگاروں کی صف میں رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ "کنیادان" اور "نمرتا" دونوں ہی ناولٹ ہیں ناول نہیں۔

تنقید و تحقیق کے سلسلے میں میرے دو طویل مضامین کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ایک "اردو تنقید
کی نئی صورت" اور دوسرا "اردو تحقیق کی نئی صورت"۔ ان دونوں مضامین میں میں نے تنقید و تحقیق کی

رفتار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان مباحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تنقید کے باب میں صرف اتنا
کہوں گا کہ ایک طرف تو نقادوں کا وہ گروہ ہے جو ترقی پسند کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ محمد حسن نے کوشش
یہ کی ہے کہ اپنی تنقید میں ان نئے افکار کو بھی پیش کریں جو کبھی ترقی پسندوں کے لیے گوارا نہ تھے۔ سید عقیل رضوی
اپنے موقف پر آج بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔ نئے ادب کی تفہیم کے سلسلے میں ان کے مضامین جدیدیت کے حامی نقادوں
کے یہاں سخت بحث و تمحیص کا دروازہ کھولتے ہیں۔ لیکن میں یہاں اس بات کو اصرار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے
موقف پر پوری طاقت سے، پوری توانائی سے ایک محاذ بنا کر قائم رہنا میرے نزدیک بذات خود ایک اہم بات ہے
اسی ڈگر پر چلنے والوں میں قمر رئیس اور اصغر علی انجینیر بھی ہیں۔ ہر چند کہ مجھے ترقی پسندوں کے افکار سے خاصا اختلاف
رہا ہے لیکن میں ان کی مساعی کی ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تنقیدی عمل میں نظریہ سازی
بھی کی ہے اور ایک Trend بھی Set کیا ہے۔ چونکہ ان کا علاقہ امریکہ کی نئی تنقید کے زمرے میں آتا ہے، اس لیے ان
کے ذہن کو سمجھنے کے لیے نئی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو سمجھنا پڑے گا، جس کی تفصیل میرے متذکرہ مضمون
میں آچکی ہے۔ چونکہ جدید تنقید پر ان کے اثرات خاصے گہرے اور دور رس ہیں، اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ جدید تنقید کا تناظر
میں ان کی جگہ محفوظ ہے۔ محمد حسن عسکری نے علامت نگاروں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور مشرق کی بازیافت میں
لگ گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی کے یہاں بھی یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ قدم بھی
مستحسن ہوگا۔ ظاہر ہے میں یہاں اردو تنقید کے ارتقا کا کوئی خاکہ پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اس لیے تمام تر نقادوں کی
تنقیدات کا جائزہ فی الحال میرے دائرہ عمل سے باہر ہے، لیکن اس سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ اردو
تنقید کے دو واضح اسکول اپنے امکانات کی تلاش میں پیہم لگے ہوئے ہیں۔

تحقیق کی رفتار بھی جامد و ساکت نہیں ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ قدیم ادب کی بعض ایسی
شخصیتیں جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا، ہمارے محققین کی کوششوں سے ابھر رہی ہیں۔ قاضی عبدالودود اور
دوسرے بڑے محققین نے جو راہیں استوار کی ہیں ان پر چل کر نئے محقق اپنا وقار قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سامنے
کی مثال رشید حسن خاں کی ہے جن کے یہاں معروضی تحقیق کے کتنے ہی پہلو ابھر رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے
سے ہی بعض دانشورانہ ادبی کام ہمارے سامنے آئے ہیں، جن کا تذکرہ ایک طولانی عمل ہے۔ صرف ایک مثال پر
اکتفا کرتا ہوں۔ "سب رس" کے سلسلے میں منظر اعظمی کی وقیع تحقیق سامنے آکر خراج تحسین وصول کر چکی
ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمثیل کے اجزا و عوامل پر بھی مغربی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ و تحلیل ان

کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

"سب رس" کا ذکر ہو تو دکنیات پر لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہن میں آ رہی ہے تو دکنی ادب کی تفہیم کا جو سلسلہ عبدالحق، زور اور سروری وغیرہ نے شروع کیا تھا اسے ہمارے نئے لکھنے والوں نے نہ صرف آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ وزن و وقار بھی عطا کیا ہے۔ تاہم اس لیے نہیں گنوا سا ہوں کہ یہ فہرست کبھی مکمل نہ ہو گی۔

آخر میں، میں لسانیات کے تعلق سے بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ادھر لسانی مباحث بڑی توانائی سے ہمارے ماہر لسانیات کی طرف سے سامنے آئے ہیں۔ اردو زبان کے ڈول اور گنڈے پر مسلسل لکھا جا رہا ہے، اور کافی عرق ریزی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ لسانیات کے نظری پہلو پر بھی روشنی ڈالی جا رہی ہے اور متعلقہ اصطلاحات کی کلی پور تعیین ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ ہمارے شعرا اور ادبا کو مجموعی لسانی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک بھرپور روایت تشکیل پا رہی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب مسلسل ارتقا کی طرف راجع ہے۔ فکری و دانشورانہ سطح پر بھی اور فنی اور تجرباتی لحاظ سے بھی۔

● ●

اردو دانشوری
آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری
پروفیسر محمد حسن
آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ
واثق جونپوری

خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا — اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟ کسی نے کہا دانشوری لمبی ہے! کسی نے کہا یہیں کے گھونسلے میں دانش کہاں۔ کسی نے غالب کی ترمیم کر کے کہا۔

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں — بے سبب ہوا دشمن سارا آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

ادارہ

پروفیسر محمد محسن
پٹنہ

آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری

کسی علمی یا ادبی اصطلاح کو بحث ومباحثہ کا موضوع قرار دینے سے پہلے اس کی تعریف کا تعین ضروری ہے یعنی اس کی وضاحت کہ وہ اصطلاح کس خاص معنی میں استعمال کی جارہی ہے تاکہ مباحثہ میں حصہ لینے والوں کے سامنے اس کا ایک مشترک اور متفقہ مفہوم ہو اور ہر شخص اسی مفہوم کی نسبت سے گفتگو کرے۔ یہ تعریف ایسی ہونی چاہئے کہ ہر اہل الرائے کو اس سے اتفاق ہو، اسی صورت میں یہ تعریف معروضی سمجھی جائے گی ورنہ اس کی حیثیت موضوعی ہو جائے گی اور بحث ومباحثہ کے نتیجے میں کوئی منصفانہ اور مفید فیصلہ نہیں ہو سکے گا جس کے بغیر بحث ومباحثہ کا حقیقی مقصد فوت ہو جائے گا میرے اس مختصر مضمون کی غرض وغایت یہی ہے۔

دانش کا مصدر دانستن ہے جس کا لغوی معنی "جاننا" ہے۔ اس اعتبار سے علم اور دانش مترادف الفاظ سمجھے جاسکتے ہیں لیکن دانش کا لغوی معنی صرف اتنا ہی نہیں ہے، اس میں عقلمندی، دانائی، سمجھ بوجھ جیسے مفہومات بھی شامل ہیں جس کی تصدیق دانشمند کے لفظ سے ہوتی ہے جس طرح ہر عالم کا دانشمند ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر عالم کا دانشور ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ لیکن ہر دانشمند کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے مگر ہر دانشور کو عالم ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں دانشور کی اصطلاح اتنی ہی بلیغ ہے اور تقریباً وہی مفہوم ادا کرتی ہے جو عہد قدیم میں عربی لفظ حکیم سے ادا ہوتا تھا۔ حکیم کا لغوی معنی بھی وہی ہے جو دانشور کا ہے یعنی عقلمند، دانا، اہل علم۔ اس کے علاوہ حکیم کا لفظ ایک وسیع معنی بھی رکھتا ہے، سب علموں کو جاننے والا۔ اس اعتبار سے فلاسفر کی مغربی اصطلاح کا مفہوم حکیم کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ بعض مستند لغات میں حکیم کے معنی فلاسفر بھی پایا جاتا ہے۔ فلاسفر کا ابتدائی معنی علم وعقلمندی کا متلاشی تھا۔ لیکن بعد میں فلاسفر کے لقب سے اسی کو سرفراز کیا جانے لگا جو اپنے عہد کے مروجہ علوم پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ انگریزی کا لفظ Intellectual جب دانشور کا مترادف سمجھا جاتا ہے تو اس کا مفہوم بھی محض عالم کے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

حکیم سے مراد سب علموں کا جاننے والا اسی وقت تک حقیقت پر مبنی تھا جب علم کے شعبے محدود تھے، ان کی شاخیں

بھی گنی چنی تھیں اور کسی ایک شخص کے لیے اپنے عہد کے علوم سے پوری آشنائی ممکن تھی، مثلاً بو علی سینا کو حکیم بو علی سینا صرف اس لیے نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ طب کا ماہر تھا۔ اس وقت کے سارے علوم منطق، فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم نجوم و ہیئت وغیرہ ان سب پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس عہد کے علوم کے اکثر شعبوں پر اس کی تصنیفات تھیں۔ یہی حال یونان کے فلسفیوں سقراط، افلاطون، ارسطو وغیرہ کا بھی تھا۔ یہ جب سب اپنے عہد کے علوم کے کم و بیش ہر شعبے پر اپنا انفرادی نقش چھوڑ گئے ہیں۔ عہد قدیم میں ماہر طب کو بھی اسی معنی میں حکیم کہتے تھے اور یہ روایت آج بھی باقی ہے۔ گو آج کا حکیم صرف طبیب ہوتا ہے۔ اس دور کا طبیب فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم نجوم و ہیئت، حیاتیات کی مختلف شاخوں سے کما حقہ آشنا ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی علمی، عقلی، تجربی اور تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر ان علوم کی سرحدوں کو آگے بڑھانے میں اپنا انفرادی رول بھی ادا کیا کرتا تھا۔ آج ہم اس کے کسی خصوصی وصف کی بدولت اسے اہل عقل و دانش یا دانشور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حکیم کی اصطلاح کی طرح فلسفی کی اصطلاح بھی ویسی ہی ہمہ گیر تھی۔ فلسفی صرف اسی کو نہیں کہا جاتا تھا جو محض فلسفہ یعنی مابعد الطبیعاتی مسائل کا علم اور ان کا بیان و تشریح، تجزیہ اور حل سے تعلق رکھتا تھا بلکہ طبیعات، علم کیمیا، علم ہندسہ اور دوسرے سائنسی علوم سے بھی اسے سروکار رہا کرتا تھا۔ فلسفی کی روایتی اصطلاح کا عکس آج بھی ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند میں قائم ہے۔ اس کی سند پانے کے لیے فلسفے کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ سائنس، طب، ادب، سماجیات، معاشیات یعنی علم کا شاید ہی کوئی شعبہ ہوگا جس کا فارغ التحصیل پی ایچ ڈی کی سند سے فائز ہونے کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔

دانشور، حکیم، فلسفی کے جس قدیم مفہوم کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے اس کا اطلاق آج کے دانشور پر نہیں کیا جا سکتا۔ حیوانی زندگی کا ارتقا اور علم کی ترقی ان دونوں میں گہری مماثلت ہے۔ علم آدمی کا طرۂ امتیاز ہے اور آدمی حیوانی تخلیق کا شاہکار۔ جس طرح حیوانی ارتقا یا اعضائے جسمانی کی انفرادی بالیدگی تشکیلی تفریق Differentiation of Structure اور تخصیص فعلیت Specialisation in Function کے اصول پر کاربند ہے، علوم کی ترقی میں بھی اسی اصول کی کارفرمائی ہے۔ ابتدا میں علم کی قسمیں ہی نہیں بلکہ ہر علم کی شاخیں بھی محدود تھیں۔ چنانچہ ایک شخص کا ہر علم پر دسترس رکھنا ممکن تھا لیکن جیسے جیسے علم کی ترقی ہوتی گئی صرف اس کے شعبے ہی نہیں بلکہ ہر ایک شعبے کی شاخیں بھی کثیر ہوتی چلی گئیں اور آج علم کا ہر شعبہ اس کی نت نئی شاخوں میں بٹ گیا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود علم کے کسی شعبے کی ہر شاخ پر قدرت رکھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج ہم کسی شخص کو اس معنی میں دانشور، حکیم یا فلسفی نہیں کہہ سکتے جس معنی میں یہ اصطلاحیں ابتدا میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس

کے باوجود جو شخص کسی ایک شعبۂ علم کی کسی ایک شاخ پر مکمل قدرت رکھتا ہو لیکن کسی دوسرے شعبۂ علم سے معمولی
کی بھی شناسائی نہ رکھتا ہو ایسے عالم کو ہم کبھی دانشور نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا دانشور موجودہ علوم اور ان کی
گوناگوں شاخوں سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہو سکتا پھر بھی اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسرے علوم کی کم از کم بنیادی
سے ایک گونہ آشنائی ضرور رکھتا ہوگا۔ اس کے بغیر اس کا ذہن کشادہ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ سمجھا
جائے گا اس کی تعریف انگریزی زبان میں اس طرح کی گئی ہے: One who knows everything of
something & something of everything. یعنی وہ جو ہر شے کے متعلق کچھ
نہ کچھ جانتا ہو اور کسی شے کی ساری کنہیات سے بخوبی واقف ہو۔ اسی طرح دانشور بھی وہی کہا جائے گا جو اپنے عہد کے دیگر
علوم سے کم از کم متعارف ہو اور ساتھ ہی کسی ایک علم کی کسی ایک شاخ پر اس کی پوری طرح دسترس ہو۔ انگریزی کی اصطلاح
Liberal Education سے متصف ہونا ایک دانشور کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر کسی کی ذہنی اور فکری
صلاحیتوں میں بالیدگی، لچک اور تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ فکر کی بلندی اور گیرائی، نظر کی وسعت اور دقت رسی دانشوری
کی اساس ہیں۔ کسی علم سے حقیقی وابستگی کا ثبوت اس شخص کے علمی کارناموں میں مل سکتا ہے جس کا اس علم کی ترقی و فروغ میں
کچھ نہ کچھ دخل رہا ہو۔ اس کے فکری اور استدلالی صلاحیتوں کی بلوغت اور بلاغت نہایت ضروری ہیں۔ اور یہی اس شخص
کی دانشوری کی صحیح علامت بھی ہوگی۔

دانشوری کی اس تشریح و تعریف کے پس منظر میں جب ہم آزادی کے بعد اردو علم و ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو
ہمیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک علمی تخلیقات اور کارناموں کا تعلق ہے ہمیں ان کا فقدان نظر آتا ہے۔ آزادی
کے بعد جاریہ علوم سے متعلق کوئی ایسی تخلیق شاید اردو میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکے گی جو کسی اہمیت کی حامل بھی جائے
خواہ وہ علوم سائنسی یا غیر سائنسی ہوں۔ ہندستان کی مختلف اردو اکیڈمیاں جن کتابوں پر انعام دیتی ہیں لیکن ان کتابوں
میں شاید ہی کوئی علمی کتاب بھی شامل ہوتی ہے۔ سب کے سب ادبی کارنامے۔ ہمارے بیشتر ادیبوں کا مبلغ علم صفر کے برابر ہوتا ہے
ان کا مطالعہ اس صنف ادب سے آگے نہیں بڑھتا جس سے انھیں شغف ہو گیا ہے۔ انھیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہنا بھی شاید
روا نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ انھیں دانشوروں کے زمرے میں داخل کیا جائے۔ ہمارے آج کے اردو ادب کے کارنامے عموماً چار صنفوں
میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ غزل، افسانہ، ادبی تحقیق اور ادبی تنقید۔ جہاں تک مروجہ غزل گوئی اور افسانہ نگاری کا تعلق ہے
ان میں دانشوری کا نشان ڈھونڈنے کی کوشش شاید رائگاں ثابت ہوگی۔ علم و دانش سے بہرہ مند ہوئے بغیر بھی محض
مشق اور لگن کے نتیجے میں ایک شخص کامیاب غزل گو اور افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید میں البتہ دانشوری کے

خدمات مل سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ تحقیق اور تخلیق سے زیادہ تنقید سب کے بس کی بات نہیں ہوتی، آج یونیورسٹیاں
اور کالجوں میں اردو کا ہر لکچرر تحقیق اور تنقید دونوں کی ہوس کا شکار ہے چنانچہ آج کے دور میں تحقیق اور تنقید کے میدان میں گھوڑے
دوڑانے والے کہاں تک اپنے وقت کے موجودہ علم سے دور کی بھی شناسائی رکھتے ہیں یہ خود ایک تحقیق کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور
بقیہ تخلیقی مسائل کی چھان بین میں ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اب رہیں اردو تخلیق کی دوسری صنفیں یعنی نظم گوئی اور ناول
نگاری ایک دانشور ناول نگار یا نظم کا شاعر وہی ہوگا جس نے موجودہ علوم سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہے اور ان کی کچھ نہ کچھ خوشہ چینی
کی ہے۔ وہ موجودہ سائنس کی چلتی پھرتی دنیا، نئے انکشافات اور معروف کارناموں، علم السانیات، سماجیات،
اقتصادیات، تاریخ وغیرہ کی مبادیات، اور ملکی اور غیر ملکی ادبی تخلیقات کے جواہر پاروں سے کم از کم متعارف ہے۔ آزادی
کے بعد اردو میں سیکڑوں ناول لکھے گئے ہوں گے اور کتنی نظمیں سپرد قلم کی گئی ہوں گی لیکن ان میں مشکل ہی سے دانشورانہ
سمجھ بوجھ اور دانائی، دقت رسی اور بصیرت، جدت طرازی اور انوکھا پن، ذاتی نظریۂ حیات اور انفرادی انداز فکر و نظر کے
نشان مل سکیں گے۔ آج اردو کا فن کار اور اردو کا قاری دونوں ہی کو علوم حاضرہ سے جیسے الرجی ہو گئی ہے۔ اس صورت
میں اردو میں دانشوری کا فقدان کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اردو کی دنیا آزادی کے بعد
دانشوروں سے خالی ہو گئی۔ کتنے ایسے دانشوروں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں جن کی پیدائش اور نشو و نما گو آزادی کے بہت
پہلے ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ دانشوری کی شمع سے ہمیں بصیرت افروز کرتے رہے۔ مثلاً ڈاکٹر عابد
حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر غلام السیدین، قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، کرشن چند
بیدی، فراق، فیض وغیرہ وغیرہ جو اب دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند ایسے دانشور آج بھی ہمارے درمیان
بقید حیات ہیں جن کی شخصیت اور کارنامے دانشوری کا جیتا جاگتا مفہوم واضح کرنے میں معاون ہوں گے۔ مثلاً آل احمد
سرور، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام، صباح الدین، عطاء اللہ پالوی، پروفیسر سید حسن ان کے علاوہ چند ایسے اور نام بھی گنوائے جا سکتے
ہیں جن سے یا تو میں ناواقف ہوں یا جس کی اس وقت بازیافت کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں لیکن انھوں نے بھی آزادی کے پہلے
سے ہی اپنی دانشوری کا چراغ جلانا شروع کر دیا تھا اور اب ان میں سے اکثر چراغ سحری کی طرح ہماری نئی نسل کو تادیر
بصیرت افروز نہ کر سکیں گے۔ البتہ مجھے کوئی ایسا دانشور نظر نہیں آتا جس نے آزادی کے بعد ہماری توجہ کا مرکز بننا شروع کر
دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب میری کم علمی اور شاید کم نظری ہو۔

جناب وامق جونپوری

کھجاڈن - جونپور - یو - پی

آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ

اس وسیع و عریض موضوع، گزشتہ ایک کم چالیس برس کی مدت میں راس کماری سے گلگت اور کراچی سے چاٹگام تک کے طول و عرض پر پھیلا ہوا ہے ان چند صفحات اور سیمینار کی قلیل مدت میں جائزہ لینا کافی دشوار کام ہے اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

یوں تو ہر مبصر کے ذہن میں کسی نہ کسی زاویہ سے اس کا نامکمل خاکہ ضرور موجود ہے تاہم جائزہ کی اصطلاح نے موضوع کو دشوار تر بنا دیا ہے۔ دوسری اصطلاح اردو دانشوری کی ہے جو تفصیلات میں جانے کے بعد اردو تک محدود نہیں رہ سکتی جائزہ لیتے ہوئے خود اس کے ماضی اور دوسری زبانوں سے اس کے رشتے کو توڑنا ممکن نہیں اردو کی دانشوری سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر آزادی کے سیاق و سباق پر نظر ڈالتے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دانشوری نے جس طرح ماقبل آزادی اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا ویسا مابعد آزادی نہ کر سکی۔ آپس کے نظریاتی یا ذاتی اختلافات پر اس نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں اور دانشوری کے دشمن عناصر سے متصادم ہونے سے گریز کیا۔ اور عصری تقاضوں سے شعوری یا لاشعوری طور پر بے اعتنائی برتی۔ اس لیے ہم آج intellectual thinking کے بہت کم ایسے نمونے پیش کر سکتے ہیں جن پر ملک و قوم فخر کرے۔ اس دور میں دانشوری برسر اقتدار قوتوں سے بچ بچا کر کام کر رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری صلاحیتیں بروئے کار نہ آ سکیں۔

ذیل میں اپنے حافظہ سے چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ عصری دانشوری کن کن حالات، تغیرات، ایجادات اور تحریکات سے متاثر ہوتی رہی ہے اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ میری نظر میں intellectual thinking اور creative thinking فکر کی دو مختلف سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اول الذکر اپنے پورے شعور اور علمی صلاحیتوں کا کام لیتی ہے جبکہ creative thinking میں شعور اور علمی صلاحیت کے علاوہ ایک تیسری صلاحیت ضروری ہے۔ جس کو عام فہم زبان میں Sixth sense یا وجدان کہا جا سکتا ہے جب کہ علمی صلاحیت محض عرفان تک محدود ہوتی ہے۔

حصول آزادی اور تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان کی قومی سرکاری زبان ہندی اور پاکستان کی اردو

فراہم ہوئی۔ یہی ناخوشگوار تبدیلی تھی جس نے عوام اور دانشور طبقے کے انہماک پر اپنا بہت گہرا اور دور رس اثر چھوڑا۔
نتیجہ میں ہر چند کہ ہندوستان میں اردو کو ایک علاقائی حیثیت دی گئی تھی بہت سے اردو دانشوروں نے
اردو کو ترک کر کے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تحریریں بالخصوص ہندی
کے مقابلہ میں اردو سے زیادہ قریب رہیں۔ ہندوستان کے لاتعداد خانوادے جن کی مادری زبان اردو
تھی روزی روٹی کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر اپنے بچوں کو ہندی کی تعلیم دلوانے لگے۔ اور اس طرح اب تک
دو نسلیں اردو سے نابلد ہو چکی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کا رسم الخط بھی بدل چکا ہے۔ دوسری طرف ان
خاندانوں نے جن کے یہاں نجی طور پر اردو کی تعلیم کی سہولتیں میسر تھیں، گھر والے بچوں کو اردو کی بھی تعلیم
دلوائی اور جنھوں نے اپنی روایات کی مدد سے اردو ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور چند نے نام بھی پیدا کیا۔
مگر زیادہ تر اردو والے اردو کا ساتھ نہ دے سکے جس سبب سے وہ اردو کے ادب عالیہ اور تخلیقی ادب کے فنی
اور ثقافتی نکات سے رفتہ رفتہ بے بہرہ ہوتے گئے، جس کا مظاہرہ مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں واضح طور
پر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اردو دانی کی سطح اس درجہ انحطاط کا شکار ہو چکی ہے کہ وہ دوسرے تیسرے درجہ کی مزاحیہ شاعری،
حکومت کو بھونڈے طرح کوسنے والی سیاسی نظموں یا ترنم سے پڑھی جانے والی ذلیل قافیہ غزلوں کی سطح سے اوپر
اٹھ نہیں سکتے۔ معیاری ادب جب الفاظ کے ترجموں کے ساتھ دیوناگری میں شائع ہوتا ہے تو کسی حد تک وہ
ان کے ڈھانچوں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندی کے لیکھک اردو ادب سے بہت زیادہ
دلچسپی رکھتے اور استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ عام فہم اردو غزل اس لیے بہت زیادہ popular ہوئی ہے کہ
اس کے اچھے گانے والے بھی پیدا ہو گئے ہیں جب کہ کلاسیکی موسیقی سے وہی لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جو اس فن
سے کچھ نہ کچھ واقف ہوتے ہیں۔ مگر اب حکومت اور ہندی دانشوروں کی طرف سے اردو کی تعلیم پر اس لیے
زور دیا جا رہا ہے کہ ملک و قوم کا وہ عظیم سرمایہ اور حسین روایت ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے جس نے جنگ
آزادی میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور جو ہمیشہ اچھے ہندی ساہتیہ کیلیے Freedom اور Tonic کا کام کرتی رہی ہے
دوسری طرف پاکستان کے چند دانشوروں نے اردو کو بھی تقسیم کر کے اس کو اسلامی اردو کا لقب دینا چاہا
جس کے سربراہ اردو کے مشہور نقاد اور بے مثل افسانہ کے خالق حسن عسکری تھے مگر ان کا یہ Racket
بہت دنوں تک نہ چل سکا۔ آج کے پاکستان میں اردو میں دوہے لکھے جا رہے ہیں اور ہائیکو کا زور ہے۔ جمیل الدین
عالی اور دوسرے پاکستانی شعرا کے دوہے جس زبان میں لکھے جا رہے ہیں اس کو ہندی، پوربی بولی اودھی

اور برج کے دوہے کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ کول کتنے سندر اور تخیل کے اعتبار سے یہ دوہے کتنے
معیاری ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبیر، تلسی، میر اور نظیر پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ اصلیت تو یہ ہے کہ تقسیم ملک سے
زبان نہیں تقسیم ہو سکتی۔ مثال کے طور پر عالی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

چھایا ملک میں پھول ماگے پنچھی سا مزدور — عالی تیری کویتا ایسی جیسے پیڑ کھجور
چھوٹی موٹی سا بجے سندر اور جبر خرنجو — مزدور اور کسان سے مل جا تیری کالا بوڑ
ان سے ناتا جوڑ کے رکھیو اتنا یاد — جھوٹ نے اب تک کیسے کیسے گھر برباد

پاکستان میں چند اچھے اردو دانشور صوبائی عصبیت Provincialism کے شکار ہوئے اور اردو ترک
کرکے اپنی اپنی صوبائی زبانوں میں ادب تخلیق کرنے لگے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ ضروری بھی ہے مگر
اردو سے یک لخت ناتا توڑ لینا ایک قسم کے جنون کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ پنجابی ادیبوں نے فیض احمد
فیض پر بھی زور ڈالا تھا کہ وہ پنجابی میں شاعری کیا کریں مگر ان کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔

ہندوستان کے چند اردو دانشوروں نے یہ تجربہ بھی کر دیکھا کہ اردو ادب کا دیوناگری میں ایک رسالہ
نکالا جائے جس کے محرک خواجہ احمد عباس تھے اور راقم الحروف بھی ان کے ہمنواؤں میں تھا مگر اس کوشش
کو دونوں ہندی اور اردو والوں نے ٹھکرا دیا باوجود اس ناکامی کے اب اردو ادب پہلے سے کہیں زیادہ
ہندی رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ یعنی پہلی بس چھوٹ جانے کے بعد دوسری تیسری بس میں کشمکش کے ساتھ
سفر کر رہے ہیں۔ یہیں پر بات ختم نہیں ہوتی۔ اردو کا تمام کلاسیکی اور مسلمانوں کا مذہبی ادب بڑی تیزی سے
دیوناگری میں منتقل ہو رہا ہے اور سکولوں میں اس سے استفادہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کام کو سب سے پہلے
سردار جعفری نے کیا تھا۔ دیوان غالب اور انتخاب میر آمنے سامنے فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں ایک
ساتھ شائع کروایا تھا۔ برخلاف اس کے سرکاری Media آکاش وانی نے ہندی اور اردو خبروں کی
زبانیں اتنی کلشٹ اور معرب اور مفرس کر دیں کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ دوری ہوتی گئی اور دونوں کے
عام سننے والوں کو اپنے جہل کا احساس ہونے لگا تھا۔ اردو خبروں کی زبان ابھی اسی ڈھرے پر چل رہی ہے جبکہ
ہندی خبروں میں باوجود سنسکرت کی آمیزش کے عربی اور فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں کثرت سے آنے لگی ہیں۔
آکاش وانی کو ہندی میں یہ تبدیلی اس لیے لانا پڑی کہ B.B.C. کی ہندی سروس ہندوستانی News اور Talks
کے لیے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

پاکستانی دانشوروں نے مشرقی پاکستان پر بجائے بنگلہ کے تھونپنا چاہا۔ نتیجہ میں پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ آج بنگلہ دیش ہے۔ ہندوستان کے جنوبی صوبوں میں اسی طرح ہندی کو عوامی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نتیجہ میں مدراس تامل ناڈو ہو گیا اور آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی بن گئی۔

پاکستان میں جوش کی نظموں کا پس منظر پہلے سے زیادہ دانشورانہ ہو گیا تھا۔ اب تک اردو کی سب سے اچھی خودنوشت جوش کی "یادوں کی برات" ہے مگر اس میں جب ان کا خالص پٹھانی انداز فکر سر اٹھاتا ہے تو وہ اپنے معاشقوں میں نہایت بھونڈے بازاری نمائش میں نظر آتے ہیں اور دوسروں کو ننگا کر دینے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے۔ اگر ان حصوں کو یادوں کی برات سے خارج کر کے دیکھا جائے تو اردو کی خودنوشتوں میں وہ ایک اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں نثری ادب کا کوئی قابل ذکر نمونہ کتابوں کی درآمد بند ہونے کی وجہ سے میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شاعری میں البتہ نظم میں کم اور غزل میں اچھے تجربے کیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیض کے بعد ابھرتے ہوئے شعری منظر میں افتخار عارف کا نام آجکل زبانوں پر ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "مہر دو نیم" اردو دانشوری میں ایک Break through کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شعر یاد ہے سن لیجیے ؎

یہی معیار تجارت ہے تو کل کا تاجر   برف کا باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آزادی کے بعد ہندوستان میں نثر کے کئی اچھے نمونے دیکھنے میں آئے۔ خواجہ غلام السیدین کی کتاب "آندھی میں چراغ" قرۃ العین کا ناول "آگ کا دریا" مولانا ابوالکلام آزاد کی جنگ آزادی کی دستاویزی تاریخ جو مدتوں صیغۂ راز میں رہی، ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "اردو ادب کا سماجی پس منظر" سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرۂ خون" کمال احمد صدیقی کی تلاش و تحقیق "بیاض غالب" ڈاکٹر مجاور حسین کی "قومی یکجہتی" کلام حیدری کی کتاب "ادب اور تصوف" ڈاکٹر عقیل کی "نئی علامتی شاعری" معصوم رضا راہی کا ناول "آدھا گاؤں" جس کو اردو میں تو کوئی جگہ نہ مل سکی البتہ اس کا شمار ہندی کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی کتاب "نظیر اکبرآبادی" ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور جگن ناتھ آزاد کے اقبال پر تحقیقی مقالے صالحہ عابد حسین کی کتاب "یادگار حالی" ڈاکٹر صبیحہ اختر کی "اردو میں خودنوشت سوانح حیات" ڈاکٹر روشن کاظمی کی کتاب "طویل نظم نگاری کی روایات اور ارتقاء" آزادی کے بعد سجاد ظہیر کا نثری شاعری کا پہلا مجموعہ "پگھلا نیلم" ہے اور معصوم رضا راہی کی غدر پر نظم "۱۸۵۷ء" اس عہد کی سب سے اچھی نظم ہے۔ طنز و مزاح میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کو حرف آخر سمان کر احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اس فن کو آگے بڑھایا۔

طویل نظموں کی کمی پانچ جگہ مسلم مگر مختصر میں اردو دانشوری نے غزلوں میں بہت اچھے تجربے کیے ہیں نئی علامتیں اور نئی اصطلاحات وضع کیں۔ اختراعات اور اجتہادات نے بھی قبول عام کی سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ چند دانشوروں نے غزل میں Neo-classicism کی بنیاد رکھی۔ عام طور پر اس دور میں غزلیں بہت کہی جا رہی ہیں۔ اور تین چار مصرعوں کی مختصر نظمیں بھی۔ اس کا سبب بھی تاریخی حقائق سے جڑا ہوا ہے۔ زندگی تیز رفتار ہو گئی ہے۔ آج جو ہے کل نہیں رہے گا۔ آج جو کہا جائے، وہ وقتی طور پر آج کے لیے بہت اہم ہے۔ کل نہ معلوم کیا ہو اس لیے آج کی بات آج کہ کر دل ہلکا کر لو۔ اور اس کے لیے غزل سے زیادہ مناسب ترسیل کا کوئی ذریعہ نہیں ایک شعر میں پوری بات مکمل ہو جاتی ہے۔ نظم کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اس کے لیے طویل مدت درکار ہے جو آج میسر نہیں۔ تاہم اس دور میں جو نظمیں منظر عام پر آئی ہیں ان کو بھی دانشوری کا افشردہ ہی کہنا چاہیے مثلاً جاں نثار اختر کی گھر آنگن، کیفی اعظمی کی نظموں کا مجموعہ "آوارہ سجدے" اور راقم الحروف کی نظمیں۔ نیلا پرچم۔ سرزمین۔ فن۔ وقت۔ سفر نامہ اور غزل در غزل۔ اس دور میں پرانے افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے وہ ان کے Pre-independence افسانوں پر کوئی نیا اضافہ نہیں کرتے ـــ نئے لکھنے والوں نے کافی تجربات کیے ہیں جن کی حیثیت کا تعین ابھی نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ جیلانی بانو نے حیدر آبادی کردار اور حیدر آبادی بولی (Dialect) سے پورا استفادہ کیا اور آج وہ نئے افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلوب بھی نیا ہے۔ مسائل پرانے ہیں مگر حیدر آبادی مسائل کی شکل اختیار کر کے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اردو کے انحطاط کے بعد دانشوروں کا وہ طبقہ جن کو Scientific thinkers کہنا چاہیے ہندوستان میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اردو میں فارسی رسم الخط کے حروف تہجی ہیں سے علم لسانیات اور صوتیات کے اعتبار سے زوائد کو خارج کر کے اردو رسم الخط کو سہل بنایا جائے تاکہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اس کا سیکھنا بیجا مشکلات سے چھٹکارا پا جائے۔ اردو میں چونکہ عربی کی طرح قرأت اور مخرج تو ہوتا نہیں اس لیے اردو کے ہم آواز حروف تہجی میں قطع و برید کی جائے مثلاً الف اور ع میں سے ع نکال دیا جائے۔ "ت اور ط" میں ت کافی ہے۔ "ث، س اور ص" میں سے ث اور ص خارج کر دیے جائیں۔ "ذ، ز، ض اور ظ" میں صرف ز باقی رکھی جائے۔ "ہائے ہوز اور حائے حطی" میں سے حطی نکال دینے سے کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ مزید یہ کہ اب اردو جاننے کے لیے عربی کون پڑھتا ہے اور کون پڑھاتا ہے۔ اور پوری لغت کو رٹنا آسان کام نہیں۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ زیادہ تر عربی کے حروف تہجی کے خارج کر دینے سے ہم آواز الفاظ کے معانی کا تعین کس طرح ہو سکے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم آواز "الفاظ کے معانی کا تعین سیاق

سیاق عبارت سے ہوگا۔ آخر ہم کس طرح جان جاتے ہیں کہ ایک جگہ "سیلاب" کا مطلب سمندر ہے اور دوسری جگہ سیلاب ایک ریگستان ہے۔ اردو میں اعراب بھی مشترک ہیں اس لیے ایک جگہ سمندر سے مراد خشکی کے ہر طرف پھیلے ہوئے گہرے پانی سے لی جاتی ہے اور دوسری جگہ سمندر کا مطلب آگ کے کیڑے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قلق، قُلق، مَرد، مُرد، دَور، دُور، دَوا، دُوا، سَیل، سِیل وغیرہ وغیرہ دوسری طرف تبدیل شدہ املا کے الفاظ کو دیکھیے "باز ایک شکاری پرندہ ہے۔ زائد الف سے (بعض) باز (حالتوں) ہائے ہوز سے (التوں) میں سختی سے کام لینا ہی پڑتا ہے

Science یا دانشوری اب پہلے سے زیادہ سائنٹفک ہو گئی ہے اور Intellectual thinking

Oriented بھی یعنی سائنسی حقائق پر بھی تحقیق اب پیدا ہو رہا ہے۔

جوہری توانائی اور خلائی سائنس نے دانشوری کا انداز فکر بدل دیا ہے۔ وہ ایک زیادہ ترقی یافتہ ثقافت اور فن کی طرف قدم اٹھا رہی ہے۔ نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاریوں سے اب ایک دانشور آن ہوا بازوں سے زیادہ واقف ہے جنھوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم گرائے تھے پہلے وہ زمین کو حقیر اور اسفل سمجھتا تھا اور اب وہ اس کے گیت گاتا ہے۔ پہلے دانشوری روایت پرستی کو سینے سے لگائے رکھتی تھی اور اب روایت شکنی اور اجتہاد پر زیادہ زور دیتی ہے۔ شکست و ریخت کا بھی سبق اس نے سائنسی تجربوں سے سیکھا ہے۔

آزادی کے بعد دانشوروں نے دانشوری کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف سمتوں میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ اقتدار، شہرت یا اپنی پوری ذہنی دیانت داری کے ساتھ خدمت قوم و وطن کی خاطر وہ عملی سیاست میں حصہ لینے گئے اور چند نے ان میں بحیثیت ماہر تعلیم، ماہر علوم یا بحیثیت بیورو کریٹس یا ڈپلومیٹس کافی نام بھی پیدا کیا مگر وہ یہ بھول گئے کہ قانون سازی، پالیسی میکنگ اور انتظامیہ کی نگرانی اور ان کا جائزہ اور مناسب دانشورانہ رہنمائی اور تنقید باہر سے کر کے بہتر نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ جب دانشوری کسی مشین کا پرزہ بن جائے گی تو اس کو خود بھی مشین کے ڈھانچے، رفتار، پالیسی اور اس کے کام کرنے کے انداز کا پابند ہو جانا پڑے گا۔ اور خود اس کی فطری صلاحیتیں عضو معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک مثال جس کو لطیفہ بھی کہا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو۔ مسز سروجنی نائیڈو مجھ کو بہت عزیز رکھتی تھیں اور میں بھی ان کی خدمت میں تہذیب کے دائرہ میں رہ کر ان سے گستاخ بھی تھا۔ ایک بار جب وہ لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر آرام کرسی میں بیٹھی ہوئی اپنی السیشین بچے سے گیند کھیل رہی تھیں تو میں مخل ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو گورنر بننے سے کیا حاصل ہوا۔ بس یہی کہ یہاں وہاں افتتاح کرتی پھرتی ہیں جس سے بلبل ہند کا گلا رُندھ کر رہ گیا ہے۔ تو محترمہ نے فرمایا تھا د

Young man that you are an idealist horrible, you have gone home with my دکھی بیگ. At this age I need only three things: Comfortable living, even more comfortable travelling and best medical aid in easy reach.

تقریباً یہی بات میں نے ماضی قریب میں اردو کے ایک بہت بڑے دانشور سے بھی کہی تھی جو خود
کراچی اور اسلام آباد میں اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کو عصری تقاضوں کی روشنی میں قرآن حکیم کا نیا اردو ترجمہ اور
نئی تفاسیر لکھنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر احمد علی کراچی اور اسلام آباد کے عظیم مستشرق ماکان بنی
ہوں کے اسما سر فہرست آتے ہیں۔

برصغیر میں آزادی کے بعد دانشوری تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو انسانوں کے اجتماعی حقوق
کے تحفظ اور فرائض کی ادائگی پر قلمی جد و جہد کو اپنی تخلیقات کی اساس سمجھتے رہے خواہ ارباب حل و عقد سے
تصادم ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ دوسرے گروہ نے اپنے دانشورانہ فرائض کو بھلا دیا اور ذاتی مفاد پرستی سے مفاہمت
کر لی۔ تیسرا گروہ جس نے فرد کو اجتماعیت پر ترجیح دی اور نتیجہ میں بجائے مشکلات اور مسائل کا اجتماعی طور پر مقابلہ
کر کے اس کو حل کرنے اور شکست دینے کے پوری طرح یاسیت کا شکار ہو گیا، اور اس میں لذت لینے لگا۔
شتر مرغ کی طرح اپنے کو خطرے سے بچانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے دیے۔ اور بجائے تعمیری
قوتوں سے دست و گریباں ہونے اور انحراف کرنے کے اپنے ہی سے منحرف ہو گیا۔ اور جھنجھن ٹوٹ ٹوٹ کر
بکھرنے لگا۔ یعنی خودکشی کر لی مگر خودکشی تو مسئلہ کا حل نہیں ہوا کرتی۔ جد و جہد میں بڑی طاقت ہے۔ ہو سکتا ہے
کہ کسی جد و جہد کا ماحصل مجاہد کو نہ ملے مگر آنے والی نسلیں تو اس کا صلہ ضرور پائیں گی۔ بزرگ باغ لگاتے ہیں اور
بیٹے پوتے اس کا پھل کھاتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے اندازِ فکر کو دانشوری نہیں کہا جا سکتا۔ ابابیلیں اڑانا دانشوری
نہیں ہے۔ بے سر و پا باتیں کرنی دانشوری نہیں ہے۔ اس طرح اپنی صلاحیتوں سے کھیلنے والوں کو Pseudo
Intellectual ہی کہا جائیگا۔ بقول پروفیسر ممتاز حسین کے۔ T.S.Eliot نے پوری ایک نسل کو بیوقوف
بنانے کے بعد اپنے رومن کیتھولک عقیدہ پر ایک طویل مقصدی نظم لکھ ڈالی۔

رہی لہجہ کی بات تو اس کا تعلق دانشورانہ Thinking سے نہیں ہے۔ لہجہ کا بدلتا رہنا زبان و ادب
کا ایک فطری اور ارتقائی خاصہ ہے جو وقت، مذاق اور ضرورتوں کے ساتھ بتدریج بدلتا رہتا ہے۔ اس کا تعلق
تاریخی حالات سے بھی ہے۔ آزادی کے بعد پوری زبان و ادب کا لہجہ بدلا۔ اور یوں ہی متواتر بدلتا رہے گا۔

[illegible] کی تحریک ہے سمجھا جائے تو زندگی دانشوری کا موضوع ہے اور یہی اس کا اسلوبی جامہ۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کا یہ سلسلہ بھی Post Independence Intellectual Thinking کا ایک شاندار نمونہ ہے Mass Communication Research Centre, Jamia, N.Delhi جو اس وقت Education through mass media پر کام اور تجربات کر رہا ہے Audio Visual science oriented way of Intellectual thinking ہے کھول رہا ہے اور تعلیم بذریعہ مراسلات بھی ضرورتِ وقت کی ایجادات اور آزادی کے بعد Intellectual thinking کے نتائج ہیں مگر ان کو مزید وسعت دینا اور عام بنانے کی ضرورت ہے۔ نوجوان دانش جویانِ قوم کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ابھی تک ان سب کی کھپت نہیں ہو سکی ہے۔

باوجود ان سب دانشورانہ مساعی کے ہم میں ایک دانشورانہ جہل بھی ہے اور جو کہنہ (Chronic) ہوتا جا رہا ہے۔ ہم من حیث القوم Make belief یعنی اپنے کو مکمل یقین دہانی کا عادی بنا چکے ہیں جس کے نتیجہ میں نہ ہم تنقید برداشت کر سکتے ہیں نہ نئی نسلوں کو صحت مند ترقی یافتہ انداز فکر کے راستہ پر لگا سکتے ہیں۔ مگر دانشوری کو اس بنیادی کمزوری سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اپنے مکان اپنے شہر اور اپنے وطن سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ یہ جبلی انداز فکر ہے مگر کیا باوجود وطن سے محبت ہونے کے موجودہ حالات میں اپنے وطن کو بہترین اور حرف آخر کہنا درست ہے۔ ہم کو اپنا گھر بہت پسند اور بہت عزیز ہے درانحالیکہ وہ کئی جگہ سے ٹپکتا ہے اور ہر موسم میں تکلیف دہ ہے۔ ہم کو اپنے شہر سے ایک قلبی لگاؤ ہے درآں حالیکہ وہ بہت گندہ ہے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور محلے سیلن سے تر رہتے ہیں۔ ہم کو اپنے ملک سے ایک جذباتی وابستگی ہے درانحالیکہ اس میں غربت، بیکاری اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، ملک کی دولت کی تقسیم بہت ناقص ہے اور لاقانونیت اپنے شباب پر ہے تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" آزادی سے پہلے Intellectual thinking غیر ملکی حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی تھی کہ تم نے ہمارے ملک کو برباد کر رکھا ہے تم یہاں سے چلے جاؤ اور اس کو جانا پڑا۔ آج آزادی کے تقریباً چالیس برس ہو رہے ہیں اور ہمارا آزاد ہندوستان کا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ہم کو برصغیر میں وہ دانشوری نہیں ملتی جو اسباب علل و معلول سے دوبدو یہ کہہ سکے کہ پراچین کال میں ہمارا پیارا وطن سارے جہاں سے اچھا رہا ہوگا مگر پہلے انگریزوں نے اور اب تم نے اسکو انگریزوں سے بھی زیادہ خراب بنا رکھا ہے۔ تم گوتم بدھ، اشوک، چشتی، گرو نانک اور گاندھی کے

حوالے دے کر ہماری جبین پہ پسینہ کو یاد دلا کر ہمالیہ کو دلہن کا سنہری گہنا اور ان سب کے گیت سنوا کر ہم کو تھپکیاں
دے کر خواب غفلت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔ ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش!
اس وقت کا خیال کرو اور ڈرو۔ محض دکھاوے کی لیپا پوتی سے وطن کے مصائب ختم نہیں ہو سکتے۔

ہم کو ایک عظیم اقتصادی۔ سماجی اور دانشورانہ انقلاب کی ابھی ابھی ضرورت ہے تا آخر اس تاخیر بیجا کا سبب کیا ہے؟
کس کے مفاد کے تحفظ کے لیے اس عظیم انقلاب کو صدیوں پر ٹالا جا رہا ہے۔ نصف صدی تو ہونے کو آئی۔ ہم
کب تک اس کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ایسے وقت ہم کو Quite flows the Don, Spartacus اور
For whom the bell tolls جیسے Powerful ناولوں کی ضرورت ہے۔ اقبال کی نظم "فرمانِ خدا"
جیسی شاعری کی ضرورت ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل کی تنقیدوں جیسی تنقید کی ضرورت ہے۔ پیبلو پکاسو کی گورنیکا جیسی مصوری
کی ضرورت ہے۔ پال روبسن کی موسیقی جیسی موسیقی کی ضرورت ہے۔ یعنی اس وقت برصغیر کو ایک Dynamic
Intellectual thinking یا متحرک اور جرأتمند دانشوری کی ضرورت ہے۔ آخر میں سمع خراشی کی
معذرت چاہتے ہوئے ایک نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مزید مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ Intellectual
thinking اور Computerised thinking کا مسئلہ ہے مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی دماغ
سے زیادہ مکمل اور بڑا کمپیوٹر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ Computer سے ضروری معلومات اور اعداد
و شمار تو بغیر وقت برباد کیے ہوئے حاصل کیے جا سکتے ہیں مگر کوئی تخلیقی کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس
وقت تو یہی صورت ہے آئندہ کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ تحقیقی کاموں میں اس مشین کی مدد سے کسی
اطلاع یا عدد کی صحت یا عدم صحت دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یوں تو دانشوروں نے Scientific
fiction میں یہاں تک Wishful intellectual thinking کی ہے کہ افسانوں کی دنیا میں Robots
کی صنعت قانوناً اس وقت ممنوع ہو جائے گی جب اس مشینی انسان میں محبت، نفرت، پیار، طیش کے جذبات اور
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکیں گی اور جس کو آسانی سے مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

نیوکلائی جنگ کے متعلق دانشوری کی بے اعتنائی کا احساس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کا عام آدمی سوچتا
ہے کہ مرگ انبوہ جشن دارد۔ مرنا تو ہے ہی وہ چاہے غربت کا شکار ہو کر مرے یا جنگ سے۔ نیوکلائی جنگ میں اس کو
تسکین بخش یہ پہلو نظر آتا ہے کہ اس کے ساتھ vested interest والا بھی فنا ہوگا۔ عوام کے اس جذبہ کو
دور کرنے کی کوئی وقیع کوشش اردو دانشوری نے اب تک نہیں کی ہے۔

●●

تازہ دانشوری
دکھ کا دودھ
ڈاکٹر سعید اختر درانی
صم
ضیا جالندھری

○

یہ دو نظمیں ہم احمد ندیم قاسمی کے شاندار رسالہ "فنون" کے تازہ نمبر بابت جنوری ۱۹۹۱ء سے نقل کر رہے ہیں۔

ادارہ

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

دُکھ کا دُودھ

مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری

ہے کوئی پینے والا ؟
دُکھ کے دُودھ کا امرت ، مورکھ

تیرے سارے سُوکھے پَودے
پھر سے کرے شاداب
تیری سوکھی دھرتی اُگلے
موتی موتی پھول چنبیلی
لعلوں لعل گُلاب
دُکھ کے رس سے سُوکھی مٹی
ہردے کی سیراب
دُکھ کے باج ہیں نَیناں اندھے
اور کُل جگ سُنسان
دُکھ کا امرت پی کر چھوٹیں
کوی کے مکھ سے سوتے

میٹھے میٹھے ، بیسے بیسے
دُکھ کا امرت پی کر جب وہ آنکھیں موند کے کھولے
دھنک کے ساتوں رنگ دکھائے چتر کار بِدوان
دُکھ سے پھوٹے گیان دھیان کی گنگا
دُکھ سے اس کے شوبھا گیان جوان

مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا ——
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں

میرے ہاتھوں جاری
ہے کوئی دُودھ آدھاری ؟
میں ہوں گوالا ، میں ہوں گوالا
ہے کوئی پینے والا ؟

••

جناب ضیا جالندھری

ہم

بچھی ہوئی ہے بساط کب سے
زمانہ شاطر ہے اور ہم
اس بساط کے زشت و خوب خانوں میں
دستِ نادیدہ کے اشاروں پہ چل رہے ہیں
بچھی ہوئی ہے بساط ازل سے
بچھی ہوئی ہے بساط جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے
بساط ایسا خلا ہے جو وسعتِ تصور سے ماورا ہے
کرشمۂ کائنات کیا ہے
بساط پر آتے جاتے مُہروں کا سلسلہ ہے

بساط ساکت ہے وقتِ مطلق

بساط بے جنبش اور بے حس ہے
اپنے مہروں سے لاتعلق ہے
اس کو اس سے غرض نہیں ہے
کہ کون جیتا ہے
اور کس نے شکست کھائی

وجود حادث، وجود مُہرے

بساطِ ساکت کی وسعتوں میں
زمین، اہلِ زمیں، افلاک، اہلِ افلاک
اپنی اپنی معینہ ساعتوں میں ایسے گزر رہے ہیں
کہ جیسے آنکھوں سے خواب گزریں

بساط پر جو بھی ہے
وہ ہونے کی علتوں میں اسیر
بہم بدل رہا ہے
وجود وہ قدرتِ رواں ہے
جو نت نئی ہیئتوں میں باقی ہے
اور اس کو فنا نہیں ہے

جہاں پہاڑوں کے آسماں بوس سلسلے ہیں
وہاں کبھی بحر موج زن تھے
جہاں بیاباں میں ریت اُڑتی ہے
بادِ سموم گونجتی ہے

وہاں کبھی سبزہ زار و گلگشت کا سماں تھا
بلند و بالا، حقیر و ہیچ
اِس شکست و تعمیر کے تسلسل میں بہہ گئے ہیں
شکست و تعمیر کے تسلسل میں تو ہے، میں ہوں

ہم ایسے مہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
یہ جن کی تزئین پر صدیں ہیں
جنھیں تمنا کے رنگ دِکھلا دیے گئے ہیں
مگر وسیلوں پہ قدغنیں ہیں
جنھیں محبت کے ڈھنگ سِکھلا دیے گئے ہیں
یہ دست و پا میں سلاسلِ نو بنو
تو گردن میں طوق پہنا دیے گئے ہیں

جو ہے جو اَب تک ہُوا ہے، جو ہو رہا ہے
اُس سے نکلے مَفَر ہے
کوئی جو چاہے
کہ عہدِ رفتہ سے ایک پَل پھر سے لوٹ آئے
کہا ہوا لفظ اَن کہا ہو سکے
تو اُس آرزو کا حاصل وہ جانتا ہے
بہت سہی اختیار و امکاں
مگر ہواؤں کے سامنے
برگ و خس کی تابِ مجال کیا ہے

تو نے غنچہ میں اُس کا اپنا کمال کیا ہے

تری نگاہوں میں تیرا فہم کرہ سے گراں تر ہے
تو سمجھتا ہے
تیرے سینے کے شُرخ ادوے سے
شہر و قریہ پھیل رہے ہیں
خزاں زمستاں تری اُداسی کے آئنے ہیں
تو مشتعل ہو تو زلزلوں سے زمین کانپے
تجھے گماں ہے
کہ گُل نکلے ہیں ترے تبسم کی پیروی میں

یہ پھول کو اختیار کب تھا
کہ کون سی شاخ پر نکھلے
کون کنج میں مسکرائے
اور کن فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیرے
نحیف شعلہ جمال کونپل
جو دستِ نازک کی نرم پوروں سے دھیرے دھیرے
دریچۂ شاخ کھول کر
صبح کی سپیدی میں جھانکتی ہے
یہ سوچتی ہے
کہ باغ سارا اُسی کے دم سے مہک رہا ہے
اُسی کے پرتو سے گوشہ گوشہ دمک رہا ہے
اُسی کے دیدار میں مگن

خوشبوؤں سے بوجھل ہواؤں میں
شوخ تتلیاں رقص کر رہی ہیں

وہ بے خبر ہے
کہ شاطرِ وقت کی نظر میں
کوئی اکائی
شجر حجر ہو کہ ذی نفس ہو
نظامِ کُل سے الگ نہیں ہے
وہ یہ نہیں جانتی کہ ہستی کے کارخانے میں
اس کا ہونا نہ ہونا بے نام حادثہ ہے
اور اس کے حصّے کا کُل اثاثہ
وہ چند لمحے، وہ چند سانسیں ہیں
جن میں وہ خواب دیکھتی ہے
سلیقۂ ذات سے چمن کو سنوارنے کا
بہارِ جاں کو نکھارنے کا

(۲)

بجا کہ ناپائدار ہے یہ وجود میرا
میں غیر فانی حیات کے سلسلے میں
اک بیچ کی کڑی ہوں
رہینِ گردش بھی، مرکزِ کائنات بھی ہوں
جو میں نے دیکھا ہے، وہ مرے خوں میں رچ
گیا ہے
جو میں نے سوچا ہے، مجھ میں زندہ ہے
اور جو کچھ سنا ہے مجھ میں سما گیا ہے
ہوا کی صورت ہر ایک احساس
میری سانسوں میں بج رہا ہے
ہر ایک منظر مرے تصوّر میں بس گیا ہے
میں ذاتِ محدود اپنی پہنائیوں میں
اک کائنات بھی ہوں

مری رگوں میں وہ جوششِ جاوداں رواں ہے
جو شاخ میں پھول کی نمو ہے
جو بحر میں موج کی تڑپ ہے
پرِ کبوتر میں تابِ پرواز ہے
ستاروں میں روشنی ہے
میں اپنے ہونے کے سب حوالوں میں رُونما ہوا
میں جا بجا صورتِ صبا ہوں
غزالِ خوش چشم کی کلیلوں میں کھیلتا ہوں
ہمکتے بچے کی مسکراہٹ ہوں
پیرِ شب خیز کی دُعا ہوں
میں لہر میں، ماہتاب میں ہوں
یہ کیسی چاہت ہے جس سے میں
ایک مستقل اضطراب میں ہوں
وہ کون سی منزلِ طلب تھی
کہ رانجھا رانجھا پکارتی ہیر

آپ ہی رانجھا ہو گئی تھی

فلک سے انوار
کوہ سے چشمے
شاخ سے پھول پھوٹتے ہیں
گر ہر اک پھول میں نمی بھی ہے روشنی بھی
زباں میں الفاظ،
آنکھ میں دید،
دل میں احساس رکھ دیے گئے ہیں
یہ لفظ، احساس، دید اک دوسرے کا پیوند ہو گئے ہیں
نمود و تخلیق کے عمل بار بار دہرائے جا رہے ہیں
جمالِ ارض و سما کی تکمیل ہو رہی ہے
محبت اعجازِ سرمدی ہے

تمہاری آنکھوں کی مسکراہٹ میں
میری چاہت کی روشنی ہے
یونہی تنکوں کے پاس بیٹھی رہو
شعاعوں کو عارض و لب سے کھیلنے دو
ہوا کے ہاتھوں کو اپنے گیسو بکھیرنے دو
بہار کی ساری خوشبوئیں
اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو
میرے چشم و دل کو یقیں دلاؤ
کہ تم فقط خواب ہی نہیں ہو

گزرتے بادل کا کوئی عکسِ رواں نہیں ہو
تم اک حقیقت ہو، محض وہم و گماں نہیں ہو
مرے قریب آؤ اور مری ذات کو مٹا دو
مجھے تم اپنے جمال کی ضو میں جذب کر لو
وصال میں فرد کی فنا ہے
وصال میں فرد کی بقا ہے
بہار کی دید عارضی ہے
بہارِ تجدید دائمی ہے

وداع کے وقت آنسوؤں میں
وہ سارے منظر جھلک رہے ہیں
جو شاخِ جاں پر گلوں کی صورت کھلے ہوئے تھے
وہ سارے امکاں جھلک رہے ہیں
جو کرچی کرچی بکھر گئے ہیں
بکھرنے والوں کو اپنے مرکز کی آرزو ہے

نہیں مجھے اس طرح نہ دیکھو
کہ جیسے نظروں میں روح تک اُڑی آ رہی ہو
یہ ہاتھ کچھ دیر اور رہنے دو میرے ہاتھوں میں
کچھ نہ بولو
کہ میں یہ نایاب لمحے آنکھوں میں جذب کر لوں
یہ ثانیے روح میں چھپا لوں
ہر ایک لمحہ اک ارمغاں ہے

تمہاری چاہت کا ارمغاں ہے
یہ ثانیے ایسے پھول ہیں
جو کھلتے رہتے ہیں دل ہی دل میں
شگفتہ رہتے ہیں رہتے دم تک

یہ چند لمحے کسی کسی کے نصیب میں ہیں
دگرنہ عمریں
غموں کے کانٹے نکالنے میں گزر گئی ہیں

(۳)

وہ شام ہوٹل میں اس طرح آئی
جیسے دشمن کی فوج اُترے
جگہ جگہ جست اور کانسی کے برتنوں جیسے چہرے
جھم جھم کھنک رہے تھے
تمام ہوٹل جگر جگر جگمگا رہا تھا
میں کنج تنہائی میں تحیّر سے دیکھتا تھا
کہ کیسے خوش باش ہیں جنھیں یہ خبر نہیں ہے
کہ ان کی بنیاد اکھڑ چکی ہے

ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں
شجر پھلوں سے لدے ہیں لیکن
جڑوں کا زہر ان پھلوں کے ریشوں تک آگیا ہے

جو حال اب ہے کبھی نہیں تھا
حیات خوار و زبوں تو تھی لیکن اتنی خوار و زبوں نہیں تھی

وہ دیر سے انتظار گہ میں
ہر آنے والے کو نظروں نظروں میں ناپتی تھی
لباس کی شوخی و جسارت
سنگھار کی جدّت و مہارت کے باوجود
اس کا گوشۂ چشم عمر کی چغلی کھا رہا تھا
نگاہ تو وارد اجنبی پر پڑی تو اس طرح مسکرا دی
کہ جیسے اُس کی ہی منتظر تھی
اُٹھی، قریب آئی اور بولی
میں ایک مدّت سے خدمتِ خلق کر رہی ہوں
دُکھے دلوں کا علاج کرتی ہوں
رنگ اور روشنی کے شہروں میں
شامِ تنہائی کی دل افسردگی سے واقف ہوں
آپ اکیلے ہیں تو کوئی انتظام کر دوں
یہاں سے میں دُور دُور ملکوں کو
ہر طبیعت کے گاہکوں کی پسند کا مال بھیجتی ہوں
وفا، محبّت پرانی باتیں ہیں اب انھیں کون پوچھتا ہے
بڑے بڑے اُونچے اُونچے لوگوں سے رات دن میرا واسطہ ہے
یہ صاحبانِ وقار و نخوت
خریدنا اور بیچنا خوب جانتے ہیں
یہ دام دیتے ہیں اور راحت خریدتے ہیں

بجا ہے یہ بھی کہ بے بسوں کی مناد حوت خریدتے ہیں
مگر جب آتے ہیں بیچنے پہ
تو بے تکلف ضمیر تک اپنا بیچ دیتے ہیں
جاہ و ثروت کی منڈیوں میں
میں کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو
آج کی رات کا کوئی انتظام کر دوں

وہ شام کے وقت خوں میں لت پت
سڑک کنارے پڑا ہوا تھا
گزرنے والوں سے کہہ رہا تھا
ہمیں ہمارے محافظوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ
وہ خواہش اقتدار و دولت میں
ہم کو نیلام کر رہے ہیں
اخوت و اتحاد کا درس دینے والے
خود اپنے بچوں کے خوں سے
حرص و ہوس کی شمعیں جلا رہے ہیں
ہماری اقدار
آج متروک فیشنوں کے لباس کی طرح
ان کی نظروں سے گر چکی ہیں
اب اُن کی اولاد اُن کی ریشہ دوانیوں سے پناہ
تازہ بتازہ نشوں میں ڈھونڈتی ہے
انھی کی شہ پا کے نسل نو

اپنی پیاس یک دوسرے کے خوں سے بجھا رہی ہے
یہ مقتل جشن مرگ انبوہ بے گناہاں منا رہی ہے
کوئی ہمیں ان عجیب صورت
درندوں، بے مہر کرگسوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ

یہ نغمہ کائنات کی بے سُری صدائیں ہیں
کوئی ان سے نجات کا راستہ بتاؤ

(۴)

ہم اپنے خوابوں میں جی رہے ہیں
ہم اپنے صبح و مسا سے تنگ آ کے
خواب بنتے ہیں اور خوابوں میں جی رہے ہیں

بساطِ ساکت سے کوئی شکوہ
نہ شاطرِ وقت سے گلہ ہے
ہمیں شکایت ہے آدمی سے
کہ آدمی آدمی کا دوزخ بنا ہوا ہے

عجب تضادات کا مرقع ہے آدمی بھی
یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں جمال بھی ہے
صداقت و حسن کا طلب گار بھی وہی ہے
بہیمیت اور وحشت و جبر کا پرستار بھی وہی ہے

زمیں پہ قابیل کے قبیلے کی رسمِ بیداد اوج پر ہے
مگر ہمارا عذاب اس سے بھی تلخ تر ہے
کہ ہم جو ہابیل کے حواری تھے
عہدِ ہابیل میں بھی زنجیری رہے ہیں
شباہتوں کے فریب خوردہ تھے، یہ نہ جانا
نقاب پوشوں میں کون کیا ہے
ہمیں تو غم تھا کہ نشۂ اقتدار
قابیل ہو کہ ہابیل
جس کسی کو چڑھا
وہ انسانیت کو تاراج کر گیا ہے

ہمارے خوابوں سے ڈر رہے ہیں
وہ ڈر رہے ہیں کہ خواب الفاظ میں ڈھلے تو
دروغ کے پردے چاک ہوں گے
اور ان کے چہروں کا غازہ اُترا
تو آئنے بھی عذاب ہوں گے

ہم ایسے ٹھہرے
جنہیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
ہمیں شکستیں ہوئیں مگر ہر شکست مہمیز ہو گئی ہے
ہمارے ساتھی گرے پہ رفتار اور کچھ تیز ہو گئی ہے

یہاں کی سنگین بے حسی میں
ہماری کوشش کا حال یہ ہے
کہ جس طرح کوئی تیتری
اک خزاں زدہ باغِ بے نمو میں
بھری بہاروں کی جستجو میں
تبسّمِ گل کی آرزو میں
شجر شجر شاخ شاخ بے تاب پھر رہی ہو

ہمارے ہوتے بہار آئے نہ آئے لیکن
ہمیں یہ تسکین ہے کہ ہم نے
حیاتِ ناپائدار کی ایک ایک ساعت
چمن کی ہیئت سنوارنے میں گزار دی ہے
فضائے ہستی نکھارنے میں گزار دی ہے

●●

بازیافت
○ مولانا مودودی کی دوسری قدیم ترین تحریر
———— حماد شہزاد

○

مودودی صاحب کی دو قدیم تحریریں آپ ملاحظ فرما چکے، ایک "جرنل نشٹ" میں اور دوسری "معیارِ تحقیق" نمبر ا میں۔ وہ دونوں ۱۹۱۹ء کی تحریریں تھیں۔

پیشِ نظر کتابچہ پر اکتوبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس تحریر کا بڑا حصہ ترجمہ ہے، لیکن یہ ملاحظہ فرمائیے کہ ترجمہ بھی کیسا اور کیسا لگتا ہے۔ آخری صفحہ خالص ان کی اپنی تصنیف / تحریر ہے۔

——— ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

مترجمہ

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیق واقعات مظالم کا نتیجہ ہے جو لوزین کی انجمن عثمانی نے شائع کی ہے

ناظم دار الاشاعت سیاسیات شرقیہ نے

بماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

عبد الحمید [illegible] نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر شائع کی

بار اول — قیمت [illegible]

باہتمام اشاعت

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

ذیل کی رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر
کردہ کمیشن کی تحقیقات واقعات مظالم کا نتیجہ ہے یہی وہ رپورٹ ہے جس کی
اشاعت کو برطانوی حکومت نے مناسب نہیں خیال کیا چنانچہ دارالعوام
میں جب ایک ممبر نے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا تو جواب دیا
خود مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے یہ کہا کہ سردست حکومت اس
کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھتی، کیونکہ اس کی اشاعت سے ترکی کے تصفیہ یا
مصالحت ممکن ہے کہ خطرہ میں پڑ جائے اور اس میں پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں
لیکن لوزین و مسٹر زینشہ کی انجمن عثمانی نے ترکی و اطالوی حکومت
کے ذریعہ سے اس کو حاصل کر کے یورپ میں شایع کر دیا ہے ہم جناب مولانا سید
سلیمان صاحب ندوی رکن اعلیٰ وفد خلافت کے ممنون ہیں کہ انکی عنایت و کرم
سے یہ رپورٹ ہمیں ہاتھ آئی،

ناظم دارالاشاعت سیاسیہ مشرقیہ دہلی

تحقیق نے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ التوائے جنگ کے بعد
سے ولایت سمرنا کے عیسائیوں کی حالت بالکل قابل اطمینان تھی اور انکی مذہبی و تمدنی زندگی کے

نے نئی حکومت میں کوئی خطرہ نہ تھا پس اگر اسی خطرہ کی بنا پر مجلس صلح نے سمرنا کو یونان کی مجسٹریٹ داری میں دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ایک غلطی تھی اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے یہ غلط واقعات مجلس تک پہنچائے ہیں،

۲۔ ان افسوسناک واقعات کی حقیقت مذہبی تعصب میں ڈھونڈی جا سکتی ہے، یونانی حکام نے ان لوگوں کی روک تھام میں کچھ نہیں کیا جو عام یونانیوں میں مذہبی جنون کو ترقی دیتے رہے ہیں بلکہ بہت جلد ان کے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کا قبضہ قیام امن کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنے زعم میں ایک صلیبی فاتح کی حیثیت سے سمرنا میں داخل ہوئے تھے

۳ جو واقعات شہر سمرنا میں ۱۵ اور ۱۶ مئی کو اور اس کے بعد دوسرے مقامات میں پیش آئے ان تمام کی ذمہ داری یونان کے سپہ سالار اور چند دیگر ذمہ دار فوجی افسروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے فرائض کی طرف سے پوری غفلت برتی خود یونانی حکومت نے اس ذمہ داری کو تسلیم کیا ہے،

کچھ تھوڑی سی ذمہ داری سمرنا کے ترک افسروں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے یونانی قبضہ سے پہلے ان قیدیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا جو قید خانوں سے بھاگ کر مسلح ہو گئے تھے۔

۴۔ سمرنا کی آبادی پر جو ہولناک مظالم ہوئے اور جنکی بدولت ساری ولایت کی سرزمین خون سے سرخ ہو رہی ہے اس کی پوری ذمہ داری حکومت یونان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ

(الف) اس نے مجلس صلح کی ان ہدایات پر عمل نہیں کیا جو اس کو بذریعہ تار بھیجی گئی تھیں،

(ب) اس نے اتحادی نمائندوں سے مشورہ کئے بغیر جن کو نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا اپنے سپہ سالار کو اجازت دیدی کہ ایدین، قصابہ اور برغمہ کی طرف فوجیں بھیجے، حالانکہ یہ علاقے اس رقبہ میں داخل نہیں جو یونان کی حکمرداری میں دیا گیا،

(ج) اس نے مقبوضات کی توسیع کے شوق میں باشندوں کی حفاظت اور آسایش کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں زبردست جوش پھیل گیا اور حاکمانہ قوت سے ٹکرا گیا،

۵۔ سمرنا کی یونانی گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام ان حرکات کے بھی ذمہ دار ہیں، جو مسلح یونانی عوام نے کی ہیں، کیونکہ انہوں نے ان عوام کو باقاعدہ فوج کی طرح استعمال کیا اور تمام ملک میں انہیں پھیلا دیا۔

۶۔ ولوی میندریس میں جو مصائب نازل ہوئے ان کی سب سے بڑی وجہ یونانیوں کا غیر منصفانہ قبضہ تھا، یونانی فوج کا ہر قدم جو آگے بڑھتا تھا خوفناک حوادث اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، صدیوں سے جو نفرت وعداوت یونانیوں اور ترکوں میں قایم ہے اس نے ظلم وستم کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے، لیکن انصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو صرف یونانی اس کے ذمہ دار نہیں ہیں [1] برغاموہ، منیسہ، اور یو دمیش کی بربادی کے بھی تقریباً یہی وجوہ ہیں،

---

[1] شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف یونانی ہی نہیں بلکہ اتحادی بھی ہیں،

۷ - گو صرف یونانی ہی (اور یونانی کمانڈر خصوصیت کے ساتھ) اینیمن کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں جو برغامو کے واقعات سے متاثر ہو کر یونانی فوجوں نے کیا ہے یونانی کمانڈر کا فرض تھا کہ برغامو کی مدافعت سے برافروختہ سپاہیوں کو اپنے قبضہ میں رکھتا، مگر اس نے انہیں بے لگام چھوڑ دیا،

۸ - اگرچہ موجودہ حالت نسبتاً ساکن ہے، لیکن ولایت ایدان میں ابھی تک امن قائم نہیں ہو سکا، سب سے زیادہ یہ بات کہ اندرون ملک سے تجارتی تعلقات بالکل منقطع رہیں،

یہ سب کچھ بلاشبہ نتیجہ ہے یونان کے فوجی تسلط کا اور اس حالت جنگ کا جو بے قاعدہ ترک سپاہیوں اور باقاعدہ یونانی افواج کے درمیان قایم ہے،

ارکان مجلس

برسٹل :- نمایندۂ امریکا
بناوسٹ :- نمایندۂ فرانس
ہیسر :- نمایندۂ برطانیہ
ڈال اولیو :- نمایندۂ اٹلی

کمیشن کی دوسری رپورٹ

اور اسکی تجاویز

ا ولایت سمرنا میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے، وہ حد سے زیادہ افسوسناک ہے۔ کیونکہ:۔

(الف) یونان کا عارضی قبضہ جس کا مقصد محض امن قایم کرنا تھا در اصل ایک دوامی الحاق کی سی شکل اختیار کر گیا ہے، یونانی حاکم اعلیٰ نے حکومت کی باگ کلیتہً اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ترک حکام سے تمام انتظامی و دفتری اختیارات لے لیے گئے ہیں۔ ان کے تعلقات قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے منقطع کر دیے گئے ہیں اور ترکی پولیس اور جندارمہ کو منتشر کر دینے کی وجہ سے وہ اب بالکل بے دست و پا ہو گئے ہیں،

(ب) سمرنا پر قبضہ قایم رکھنا یونان کے لیے بے شمار مالی و جانی قربانیوں کا باعث ہوگا جن کو اگر محض ایک غیر ملک میں امن قایم کرنے کے لیے وہ پیش کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کی بساط سے بہت زیادہ ہے اور اس کو اس قدر قربانیوں پر مجبور کرنا صریح ناانصافی ہے،

(ج) یونانی قبضہ اپنی موجودہ شکل میں امن قایم کرنے کی بجائے مقبوضہ باشندوں کے لیے ایک مصیبت ثابت ہو رہا ہے،

۲- پس ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ:-

(الف) اگر سمرنا پر یونانی فوجی قبضہ کا مقصد باشندوں کی حفاظت
و قیام امن ہی ہے، تو یہ کام یونانی فوج سے بہتر اتحادی افواج کر سکتی ہیں
پس مناسب ہوگا کہ اتحادی فوجیں ایشیائے کوچک میں انتظام کرنے کے لئے
یونان کی بجائے خود اپنی فوجیں بھیج دیں،

(ب) یونان کا قبضہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مجلس صلح سمرنا
کو یونان سے کامل طور پر ملحق کر دے،

(ج) مگر سمرنا کے دوامی الحاق کا فیصلہ حقوق قومیت کے مسلمہ اصول کے
خلاف ہوگا کیونکہ ساری ولایت میں سوائے شہر سمرنا اور ایوالیق کے ترکی آبادی کو
زبردست اکثریت حاصل ہے، ہم اس بات کو صاف طور سے ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتے
ہیں کہ ترک کبھی اس الحاق کو پسند نہ کریں گے وہ صرف ایک زبردست فوجی قوت
کے آگے سر تسلیم خم کر سکتے ہیں سو یہ ظاہر ہے کہ اتنی قوت مہیا کرنا یونان کے بس کی
بات نہیں،

(۳) ان حالات میں ہم حسب ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں،

(الف) جس قدر جلد ممکن ہو یونانی افواج سے سمرنا خالی کرا لیا جائے اور
انکی جگہ صرف اتنی افواج اتحادی افسروں کے ماتحت بھیجی جائیں جو انتظام کے لئے
کافی ہوں،

(ب) یونانیوں کی تسلی کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کے چند دستے رہنے
دیئے جائیں مگر ان کو سخت حکم ہو کہ ترکوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں،

(ج) اتحادی افواج کے ملک میں داخل ہوتے ہی قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اتحادی افسروں کے ماتحت اپنی جندارمہ کو دوبارہ مرتب کرے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ملکی انتظام اس جندارمہ کے ہاتھ میں دے کر اتحادی فوجیں واپس بلالی جائیں

(۴) ہر لر اناطولیہ نے بارہا اس کا اعلان کر دیا ہے کہ ہماری تحریک صرف یونانیوں کے مقابلہ میں ہے۔ پس انکی فوجی تیاریاں روکنے کے لیے ضروری ہے کہ انکی شکایات کو رفع کیا جائے اور سمرنا کو قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت کی جانب منتقل کر دیا جائے ورنہ بصورت دیگر خود اتحادی سمجھ سکتے ہیں کہ ترکی حکومت یا ترک لیڈروں کی خاموشی بلکہ اظہار وفاداری کی تہ میں کیا ہے۔

دستخط

برسٹل　　بناوسٹ

ہیمر　　ڈال اولیو

انجمن عثمانی کا نوٹ

اس سے پہلے دنیا سن چکی ہے کہ یونان کو ولایت سمرنا میں امن قایم کرنے کا مقدس کام سپرد کیا گیا تھا، جہاں صدیوں سے کہیں بدامنی کی معمولی علامتیں بھی نہیں دیکھی گئیں۔ اب ہم اس سے زیادہ ستم ظریفانہ ایک اور تجویز سن رہے ہیں جو دراصل شرافت اور کمینگی کی جنگ میں شرافت کی ہولناک شکست کا ایک مبین نتیجہ ہے۔ اس تجویز کا ماحصل یہ ہے کہ مجلس اقوام اناطولیہ کی "باغیانہ تحریک" کے استیصال پر یونان کو مامور کردے۔ اسکے صاف و صریح معنی یہ ہیں کہ یونان کی تمام سفاکیوں کی ناپاک ذمہ داری مجلس اقوام اپنے اوپر لے لے۔

جانتے ہو یہ "باغیانہ تحریک" کیا ہے؟ یہ وہ مقدس تحریک ہے جس کا مقصد ایک مظلوم قوم کے لیے اپنے حدود قومیت میں آزادی طلب کرنا ہے جسے ہر قوم کا جائز حق تسلیم کرلیا گیا ہے۔

اس غیر معقول تجویز کے متعلق لوزین کی انجمن عثمانی مہذب دنیا کے سامنے چند اہم پہلو روشن کردینا چاہتی ہے،

اول یونانیوں کی فوج کو ولایت سمرنا میں امن و سکون پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، مگر اس نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک اس کے برعکس کیا، اس نے آبادیوں کی آبادیاں جلاڈالیں خاندان کے خاندان تباہ کردیئے اور ساری ولایت میں ادھر سے ادھر تک خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم کردیا۔

اتحادیوں کی مجلس صلح نے ایک کمیشن اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ ان واقعات کی تحقیق کرے جو سمرنا کے متعلق مشہور ہیں۔ اس نے طویل تحقیقات کے بعد ان تمام واقعات کی تصدیق کی اور وینزلوس کی فوج کو ان کا ذمہ دار قرار دیا۔ ہم اس اپیل کے ساتھ اس رپورٹ کو بھی شایع کرتے ہیں، جو متحدہ کمیشن نے مرتب کی تھی،

۲۔ مجلس صلح نے اپنے متحدہ کمیشن کی سفارشوں پر عمل کرنے کی بجائے یونانیوں کے عارضی قبضہ کو قایم رہنے دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ یونانی سفاکیوں کی تصدیق کے بعد بھی اس نے وینزلوس کی اس تجویز کو ٹھنڈے دل سے سنا کہ جنوبی یورپ کے سفاکوں کو ایشیا میں اپنی خونریزیوں کا حلقہ وسیع کرنے کا موقع دیا جائے

۳۔ سمرنا کے اندوہناک واقعات کے بعد وینزلوس کے لیڈروں کو اندرون ملک میں بڑھنے کی اجازت دینا صاف طور سے یہ معنی رکھتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا وہ اتحادیوں کی مرضی سے ہوا اور اب وہ اس سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کس ظلم کا ایک انسان تصور کرسکتا ہے۔

۴۔ سمرنا کے "عارضی" قبضہ ہی سے ترکوں میں ایک زبردست قومی جوش پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر یونانی درندوں کو اس سے آگے بڑھنے کی اجازت دی گئی تو یقیناً ترک جان سے ہاتھ دھو کر تلوار نیام سے نکال لیں گے اور پھر یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گا کہ اس وقت کتنی خونریزی ہو گی،

۵۔ آج کل سارے عالم اسلامی میں ایک زبردست مذہبی جوش پیدا ہے جس کی وجہ محض ترکی کے مصائب ہیں پس اگر یونانیوں کی ہمت افزائی کرکے

ان کے مصائب کو اور زیادہ کیا گیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانان عالم کس شدر مشتعل ہو جائیں گے،

۶ - سمرنا میں یونانی فوج کا مسلسل قیام اور زیر تجویز ہوشیاری ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دے گی کہ ہمیشہ کے لیے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان صلح کا قیام ناممکن ہو جائے گا، جو دنیا کے امن کے لیے بہت مفید ہے

اگرچہ امید نہیں کہ مجلس صلح وینزلوس کی تجویز کو منظور کر لے گی [ا] تاہم موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہم اس تجویز کی شدید مخالفت کرتے ہیں، اور مجلس صلح کو پھر آگاہ کرتے ہیں کہ مشرق میں امن کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک تھریس اور سمرنا میں ایک ہی یونانی سپاہی موجود ہے،

ترکی قوم کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ جو چیز ہے وہ دولت برطانیہ کی وہ خفیہ اعانت ہے جو مسلمانوں کے جانی دشمن یونان کو دی جارہی ہے کیا یہ سچ نہیں کہ برطانی حکومت کی عظیم الشان عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے ان کا بڑا حصہ اسلامی ہے،

حسن علیچہ

معتمد انجمن عثمانی لوزین (سوئٹزرلینڈ)

[ا] اگرچہ مجلس اعلیٰ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا، لیکن اس معاملہ میں اپنی کامل غیر جانب داری کا اعلان کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اتحادی یونان اور ترکی کو ان کے خیال پر چھوڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ مظلوم کی بے بسی کو جانتے ہوئے ظالم کے حرکات سے چشم پوشی کرنا درحقیقت ظالم کی اعانت کرنا ہے

انگلستان کی مزدور پیشہ جماعت کے جذبات

ترکوں کو اسوقت ایسے بے رحم سرمایہ داروں کی جماعت نے گھیر لیا ہے جو اپنے زبردست حلقۂ استبداد کو عالمگیر وسعت دینے کے لیے جولانی قوتیں استعمال کر رہے ہیں، اس جماعت کی سرداری کا فخر برطانیۂ عظمی کو حاصل ہے جو ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں اور ڈیڑھ کروڑ مصریوں کو غلام بنانے کے بعد بھی شکم سیر نہیں ہوئی اور اب دولت کی بھوک اسے عراق و فلسطین کیطرف لیجا رہی ہے تاکہ اپنے اسیران بلا کی طویل فہرست میں ان کو بھی شامل کر دے۔

ضرورت نہیں کہ اس نہب و سلب کے زمرہ پر ہم کوئی بحث کریں دنیا کو معلوم ہے کہ انگریزوں نے "ہمدردی بنی نوع انسانی" سے مجبور ہو کر ملکوں اور قوموں کو مہذب بنانے کا مقدس کام اپنے ذمہ لیا ہے، امرتسر میں ڈائر کی گولیاں اور اسکندریہ میں انتہائی کے بڑھی خدمت کو انجام دے چکے ہیں، اب یہی سبق مشرق و مغرب کے دوسرے ملکوں کو بھی سکھانا ہے، وہاں مخدوم کے انصاف کو اصلی رنگ میں دیکھنا ہو تو اس فسانۂ خونیں کا مطالعہ کرو

مسلمانوں کو یونانی جس ہولناک طریقوں سے برباد کر رہے ہیں انکی

ذمہ داری انگلستان کی سرمایہ دارانہ ہوسناکی ہی پر عائد ہوتی ہے بلاشبہ کیونکر ممکن تھا وہی یونان جسکو بحری ناکہ بندی سے مجبور کرکے انگریزوں[۱] نے جرمنی کی طرفداری سے باز رکھا تھا آج اتحادی قوتوں کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے حصہ لیتا ہے اور ایشیائے کوچک کی ایک زرخیز سرزمین پر بلاوجہ اس کا حق تسلیم کرلیا جاتا ہے،

آج ہم پھر دنیا کو بتلانا چاہتے ہیں کہ اس "انصاف" سے مسلمانوں کو کیسے کیسے عظیم الشان فائدے حاصل ہوئے ہیں، سمرنا کے ساحل پر قدم رکھتے ہی یونانی عیسائی مسلمانوں کو مہذب بنانے کے مقدس کام میں مشغول ہوگئے کس طرح؟ گھروں کو لوٹ کر، اور لوٹنے کے بعد جلا کر، عورتوں کو بے حرمت کرکے اور بے حرمت کرنے کے بعد قتل کرکے، جہاں جہاں وہ گئے غارتگری کا بازار گرم کیا،

آبادیوں کے لیے مشکل تھا کہ انکی گولہ باری سے بچ جائیں، زمینداروں کی خوش قسمتی تھی اگر انکی کھیتیاں پامالی سے محفوظ رہیں. بوڑھوں اور بچوں کے لیئے ان کے قانون میں امان نہ تھی، اور مسجدیں اور خانقاہیں انکی نشانہ بازی کی مشق سے کسی طرح نہ بچ سکتی تھیں

---

[۱] اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے جس یونانی ڈویژن نے سمرنا پر قدم رکھا تھا وہی ڈویژن تھا جس نے جنگ کے زمانہ میں ایتھنز پایہ تخت یونان کے سامنے انگریزی اور فرنچ تحت البحر کشتیوں کو گولہ باری کرکے ڈبو دیا تھا،

ان حرکات کے مقابلہ میں اگر مسلمان بھی عیسائیوں کے ساتھ ایسے ہی وحشیانہ برتاؤ کریں تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں، مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

جنرل ٹاؤن شنڈ سے پوچھو کہ عراق کی جنگ میں جب وہ اور ان کے ساتھی گرفتار ہو گئے تھے تو ان کے ساتھ ترکوں نے کیسا سلوک کیا تھا

سمرنا کے انگریزوں سے دریافت کرو کہ جب سمرنا کی فضا میں ایک ترکی ہیرو طیارچی نے دو انگریزی ہوائی جہازوں کو گرا دیا تھا تو ترکوں نے ہوابازوں کا جنازہ کس شان سے نکالا تھا۔

مگر یہ اتحادی اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اب تک اگر حیوانیت سے اجتناب کیا ہے، تو یہ انکی بے وقوفی تھی، بنی نوع انسان کی ایک شریف ترین قوم پر ان وحشیانہ مظالم کے سلسلہ کو جاری رکھنا دنیا کے اشتراکیت کے لئے ایک بدنما داغ ہے جس کو جلد سے جلد مٹا دینا تمام اشتراکیوں کا فرض ہے خصوصاً برطانیہ عظمیٰ کی مزدور پیشہ جماعت پر اس ذمہ داری کا سب سے زیادہ بار ہے،

ہم کو معلوم ہے کہ ایک زبردست نظام تبلیغی کے ذریعہ مزدور پیشہ جماعت کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ترکوں نے آرمینیا میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے، اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب ان کے گناہوں کی سزا ہے مگر ہم تمام مزدوروں کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ وہ سب قصہ افسانہ تھا، جو کچھ اب تک دنیا کو سنایا گیا ہے، اب دنیا کو اسے بھول جانا چاہیئے، آرمینیا میں

اگر کبھی خونریزی ہوئی ہے تو اس کی تمام ذمہ داری نار کی قنات شدہ عادت پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنی مرکزیت کو مضبوط کرنے کے لئے خفیہ انجمنوں کے ذریعہ ایک طرف ارمنوں کو شورش اور اضطراب کی جانب مائل کیا اور دوسری جانب تمام ترکوں اور کردوں کو ارمنوں کے خلاف بھڑکایا۔ تاہم اگر غارتگری کی ذمہ داری ترکوں پر عائد کر دی جائے تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ ان کو غیر قوموں پر حکومت کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے،

ہم تمام ایسے لوگوں کو جو انسانیت کو حیوانی اثرات سے آلودہ نہیں دیکھنا چاہتے "دی گرین سپرالڈ لیگ" کی شرکت کے لئے دعوت دیتے ہیں جسکا مقصد اقوام عالم کو غلامی سے نجات دلانا ہے۔ عیسائیوں کے بنیادی اصولوں میں ایک زریں اصول یہ بھی ہے، کہ

"دوسروں کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو"

لیکن کیا یہ عیسائی (؟) پسند کریں گے کہ ان کو آگ میں جھونک دیا جائے ان کے بچے قتل کئے جائیں، اور انکی بیٹیوں کی عصمت دری کی جائے،

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب حرکات ان لوگوں سے سرزد ہوئی ہیں جن کے ایک ہاتھ میں بائبل ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تو ہم کو ایسے عیسائیوں کی ایمانی حالت پر سخت افسوس ہوتا ہے،

"برٹرینڈ ڈی کولونا"

مسلمانو

فرصت کی آخری گھڑیاں ہیں اور دنیا میں کچھ کر دکھانے کے لیے اللہ کی طرف سے تم کو چند گنی ہوئی ساعتیں دی گئی ہیں اگر انکو تم نے محض جلسہ بازی اور شور و شغب میں گذار دیا تو یقین رکھو کہ پھر تمہارے لیے دنیا میں زندگی کا کوئی حق باقی نہ رہیگا۔

ایشیائے کوچک میں اسلامی حمیت کی آخری نمایش ہے، اور ایک تھکا ہوا ہاتھ دین الٰہی کے مقدس علم کو سر بلند کیے ہوئے ہے اگر تم نے جلدی اس کی مدد نہ کی تو پھر تم کو اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھنا پڑے گا جس کا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم تصور ہی نہیں کر سکتے۔

پس وقت ہے کہ جہاد بالقلب و باللسان سے چند قدم آگے بڑھاؤ، دنیا کے تمام عیسائی یونانیوں کی مدد کر رہے ہیں، پھر یہ کیا بے غیرتی ہے کہ تم نے ترکوں کو تنہا چھوڑ رکھا ہے؟ اگر اپنی جانیں تم کو عزیز ہیں اور میدان شہادت سے بھاگتے ہو تو کم از کم اتنا تو کرو کہ ان کو روپیہ سے مدد دو اور انکے زخمیوں کے لیے آٹے ہی دو‌ بھیجو!

"ابوالاعلیٰ"

ﻠہ تمام چندہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کو ارسال فرمائیے۔ اور جو صاحب ملکی سیشن میں شریک ہوں ان کو بھی مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے خط و کتابت کرنی چاہیے۔

اہم رسائل کا اشاریہ

○ اقبالیات (سرینگر) کے مشتملات کا اشاریہ

○ جاوید اشرف

○

خدابخش لائبریری سے 'العصر' (الہ آباد)، 'ادب' (فیروز آباد)، 'ادیب' (لکھنؤ)، 'معیار' (پٹنہ)، 'زبان' (منگرول)، 'عصری ادب' (دہلی)، 'صبح امید' (لکھنؤ)، 'تحریر' (دہلی) کے اشاریے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس شمارے میں 'اقبالیات' (سرینگر) کا اشاریہ ملاحظہ فرمائیں، ساتھ ہی اقبالیات کے ان شماروں میں اقبال کے جو نوادر شائع ہوئے ہیں وہ بھی یکجا دیدیے گئے ہیں۔

○ ادارہ

جاوید اشرف
لائبریری اسسٹنٹ
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

اقبالیات (سرینگر) کے مقالات کا اشاریہ

۱۹۸۱ء —— ۱۹۸۹ء

اقبال شناسی کی تعلیم و تربیت، اقبال کی حیات اور فکر و فن پر تحقیق کے لیے ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (سرینگر) میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۸۱ء میں "اقبالیات" کا پہلا شمارہ زیر ادارت پروفیسر آل احمد سرور قائم ہوا، جس کے اب تک پانچ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنی نوعیت میں تخصیص اقبال تحقیق و تنقیدی مضامین پر مشتمل گرانقدر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی تین شماروں کی ادارت پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی، چوتھا یا پانچواں شمارہ پروفیسر امین احمد اندرابی کی ادارت میں شائع ہوا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال ۲۱ اپریل یعنی اقبال کے یوم وفات کے موقع پر خصوصی بزم مقالات کا اہتمام ہوتا ہے۔ اب تک اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب، اقبال کی شاعری اور شعریات، تشخص کی تلاش اور اقبال، جدیدیت کے متعلق اقبال کا رویہ، اقبال کی بہترین نظم یا غزل، جیسے عنوانات پر سیمینار ہو چکے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اقبالیات پر تحقیق کا کام بھی چل رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر چمن لال رینہ نے "اقبال اور گوتم بدھ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نیز سات اسکالروں کو اقبالیات پر ایم۔ فل۔ کی ڈگریاں بھی تفویض ہو چکی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

"اقبال اور ہیومنزم" (شفیقہ رسول) ۱۹۸۱ء، "اقبال کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ" (امین اندرابی) ۱۹۸۱ء، "حالی، اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری، تقابلی مطالعہ" (نصرت اندرابی) ۱۹۸۱ء، "اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ" (بلقیس سراج) ۱۹۸۱ء "اقبال پر غالب کے فکر و فن کا اثر" (زاہدہ پروین) ۱۹۸۲ء، "اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" (زرینہ بٹ) ۱۹۸۲ء۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ سے اب تک نصف درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "اقبال کے مطالعے کے تناظرات" (پروفیسر آل احمد سرور)، "اقبال اور تصوف" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغرب" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغربی فکر" (پروفیسر [illegible])، "اقبال مصلح قرن آخر" (علی شریعتی / ترجمہ کبیر احمد جائسی)، "اقبال کے شاعرانہ فلسفے کے چند پہلو" (پروفیسر عالم خوندمیری)، "ٹیگور، سری اروبندو اور اقبال" (اس۔ کے۔ گھوش)۔ ان مطبوعات کے علاوہ مزید گیارہ کتابیں زیر طبع ہیں جو مستقبل قریب میں منظر عام پر آجائیں گی۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اس مختصر مجلے "اقبالیات" ۸۹-۱۹۸۱ء کے مشمولات کا موضوع وار اشاریہ ترتیب دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ گو یہ اشاریہ مختصر ہے لیکن بلحاظ اہمیت و افادیت بیش قیمت ہے۔ اس اشاریے سے ایک اہم بات یہ بھی منکشف ہوتی ہے کہ ادارے نے اپنے مجلے کو محض اقبالیات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اقبال کے علاوہ جوش، حسرت، فانی اور فراق جیسے شعرا کے لیے بھی مجلہ اقبالیات میں ایک گوشہ رکھ چھوڑا ہے۔ یہ گوشۂ دیگراں ادارے کے وسعتِ ظرف، وسعتِ نظر اور وسعتِ فکر کا پتہ دیتا ہے جو اقبال کا خاصہ تھا۔

اقبالیات

ابلیس — اقبال اور گوئٹے کی نظر میں (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● احمد امین کے افکار پر اقبال کا اثر (بدرالدین بٹ) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اسلوبیات اقبال (گوپی چند نارنگ) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اداریہ/اقبالیات (آل احمد سرور) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● ایضاً (آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● ایضاً (محمد امین اندرابی) اقبالیات ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● ایضاً (محمد امین اندرابی) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال، استعارہ، امیج، علامت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کی رفتار (ادارہ) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات (ادارہ) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (ادارہ) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور آزاد (ریاض الرحمٰن شروانی) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور گوئٹے (مسعود حسین خاں) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور مذہبی حسیت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کا اسلوب بیان (اسلوب احمد انصاری) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط (مسعود حسین خان) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کا شعری لہجہ (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کا عروضی نظام (شمس الرحمٰن فاروقی) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نظریہ زبان (اکبر حیدری) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کا نعتیہ کلام (مرزا کمال الدین شیدا) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کا فن ایک عمومی جائزہ (آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نقش باز آفرینی (سید مہدی غزنوی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کی ایک تکنیک — مسجد قرطبہ کی روشنی میں (قاضی غلام محمد) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کی ایک غزل

● شعاع امید (نظم اقبال) (مسعود حسین) اقبالیات ۸ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شعر اقبال کی تفہیم میں ملحقہ فرہنگ کی اہمیت (وارث علوی) اقبالیات ۸ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ضرب کلیم کا اسلوب (آل احمد سرور) اقبالیات ۸ ستمبر ۱۹۸۱ء ● عصر حاضر کے ایران میں اقبال کی معنویت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۸ ۱۹۸۸ء ● کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۸ ۱۹۸۸ء ● محاورہ مابین خدا و انسان (غلام رسول ملک) اقبالیات ۸ اپریل ۱۹۸۸ء ● مسجد قرطبہ عالم نوندیری) اقبالیات ۸ ستمبر ۱۹۸۱ء ● مناظر فطرت اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۸ ستمبر ۱۹۸۱ء۔

۸۰۵ [illegible]

اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۹ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش شاعر یا صحافی (غلام رسول ملک) اقبالیات ۹ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شاعری (مظہر امام) اقبالیات ۹ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ۹ اپریل ۱۹۸۹ء۔

[illegible]

حسرت موہانی اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت، شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کا تصور عشق (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کی غزل کا نشان امتیاز (مظہر امام) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کے چند اشعار (قاضی غلام محمد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● متغزل حسرت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء۔

[illegible]
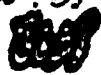
اکبر یا فانی (زبیر رضوی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۸۲ء ● فانی کا تخلیقی ذہن (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● فانی کا شعری کردار (شمیم حنفی) اقبالیات ۲ ۸۲ء ● فانی کی غزل گوئی ایک نفسیاتی مطالعہ (غلام رسول ملک) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء۔

[illegible]

روپ کی عشقیہ شاعری (شکیل الرحمن) اقبالیات ۲ اپریل ۱۹۸۸ء ● غیر متوازن، متوازن شاعر (فراق) (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۲ اپریل ۱۹۸۸ء ● فراق کا شعری ادراک (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۲ اپریل ۸۸ء ● فراق کی غزل (تسکین فاضل) اقبالیات ۲ اپریل ۸۸ء ● کچھ فراق کے بارے میں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۲ اپریل ۸۸ء ● مقام فراق (مسعود حسین خاں) اقبالیات ۲ اپریل ۱۹۸۸ء۔

اقبالیات سے ماخوذ نوادر - ۱

پروفیسر آل احمد سرور

علامہ اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط

اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ ہم پروفیسر منظور الامین صدر شعبۂ اسں کرپ کشمیر یونیورسٹی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ان خطوط کی نقلیں ہمیں مرحمت فرمائیں۔ پروفیسر منظور الامین جب دھارواڑ میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر تھے تو وہاں کے ایک کارکن نے اُن سے اُن خطوط کا ذکر کیا جو اقبال نے اُن کی والدہ کو لکھے تھے۔ منظور الامین صاحب اُن کے گھر گئے اور وہاں جا کر انہوں نے ان خطوں کو نقل کر لیا۔ وہ اصل خط بھی حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے یہ سوچا کہ یہ خط کسی قومی ادارے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہونے چاہئیں۔ نقلیں اُن کے پاس محفوظ رہیں اور انہوں نے اپنے پرانے کاغذات میں سے ہمارے لیے مہیا کی ہیں۔ ہم اس کے لیے بقول اقبال سراپا سپاس ہیں۔ خطوں کی صحت اور استناد کا ہمیں یقین ہے۔ ویسے ہم اصل خطوط حاصل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ دونوں خطوط بی بی آمنہ کے نام ہیں اور جمال الدین صاحب ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس بیجاپور کی معرفت بھیجے گئے ہیں۔ پہلے خط میں اقبال نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ رومی کا ترجمہ انگریزی میں منظوم کرنا چاہیے تھا۔ عام طور سے دوسری زبانوں کے ترجمے نثر میں بہتر ہوتے ہیں۔ اقبال نے نہایت انکسار سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انگریزی عروض کی ٹکنیک سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں حالانکہ وہ انگریزی ادب کے استاد رہ چکے تھے، خود بھی انگریزی لکھتے تھے اور انگریزی کے ادب عالیہ سے اُن کی واقفیت گہری تھی۔ ملٹن اور انگریزی کے رومانی شعرا خصوصاً ورڈس ورتھ سے انہوں نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ ایک اور اہم بات جو اس خط سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رومی کے شارحین کے مقابلے میں اقبال رومی کی روح سے زیادہ آشنا تھے اور اس وجہ سے وہ رومی کی ترجمانی ان شارحین سے مختلف کرتے تھے۔

دوسرا خط بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے صاف کہا ہے کہ وہ صوفی نہیں ہیں۔ پھر بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندستان میں جس روپ میں تصوف اس دور میں ملتا ہے اُس سے انہیں اختلاف ہے اور وہ اسے ہندستان میں اسلام کے اخلاقی زوال کے اسباب میں سے ایک خاص سبب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا اشارہ یہاں ان صوفیوں کی بے عملی اور مزاج خانقاہی کی طرف ہے۔ انہوں نے ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ جدید دور کی تشکیک اور دہریت کے زہر کا تریاق رومی کے یہاں مل جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اقبال رومی کا ایسا انتخاب چاہتے تھے جو جدید ذہن کو اپیل کر سکے۔ [دونوں خطوط کے عکس اگلے صفحات میں پیش ہیں۔]

A-Y

DR. SIR MOHD. IQBAL KT.
M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 23rd June 1934

Dear Madam,

Judging from what you say of the opportunities you have had of learning the English language your progress is indeed remarkable.

I fear however that it was a mistake to try a verse translation of Rumi I am very sorry to say that I cannot undertake to correct your work, partly because I am not very (well) acquainted with the technique of English verse, and partly because my health is indifferent and I have got a good deal of private literary work of my own to do. Moreover my understanding of Rumi is very much different to the interpretations of his commentators.

Yours Truly
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

DR. SIR MOHD. IQBAL KT. ١٧

M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 3rd July 1934

Dear Madam,

Thanks for your letter. I regret very much to say that I am not a Sufi and do not believe in the ways of modern Indian Sufism which I regard as one of the main causes of the moral decay of Indian Islam. But I do regard Rumi's Mathnavi as a kind of antidote to the poison of modern Scepticism and Atheism. For this reason I think the book should be made known to the modern educated Muslims. But the busy man of our times cannot manage a book which comprises 26000 verses. Selections will have to be made with due regard to the needs of our times, and notes will have to be added in the light of modern thought and enterprises. Selections of the Mathnavi have been made in all ages, but these are of no use or of very little use to us moderns. We shall have to make our own selections. To a certain extent this work has been done by Qazi Talamuz Husein M. A., of the Usmania University, Hyderabad in a book recently published and called Maratal Mathnavi. The Book, however, is of use only to the man who knows Rumi already. I have long cherished the desire of making a selection, but my health has gone down during the year so that, I shall have to abandon many of my projects now. I have told my clerk to send you a copy of my 'Javeed Nama' which I hope, will give you some idea of my attitude towards Rumi and to the bigger problems which confront modern Islam. I am only a Barrister and not a judge of the High Court. Please do not address me as such.

Bibi Amina Sahiba,
C/o Jamaluddin Sahib,
Retd. Sub-Inspector of Police
BIJAPUR
(Stamped 3rd July 1934) Naulakha

Yours Sincerely
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

پروفیسر مسعود حسین خاں

علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

علامہ اقبال کے شائع شدہ خطوط کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے لیکن پھر بھی اس سلسلے میں باب فتوح بند نہیں ہوئے ہیں۔ اینگلو عربک کالج دہلی (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے میرے ایک پرانے ساتھی سید خلیل احمد صاحب حال ہی میں سری نگر تشریف لائے تھے۔ حسن اتفاق سے ہماری اس ملاقات کے دوران ان سے کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی بات آگئی۔ "غالب ڈے" کا تذکرہ آگیا اور پھر اس دعوت نامے کا جو اس سلسلے میں علامہ اقبال کو بھیجا گیا تھا۔ اتفاق سے علامہ کا جواب ان کے پاس تبرک کے طور پر محفوظ رہ گیا تھا۔ میرے اصرار پر انہوں نے اس خط کی فوٹو کاپی بھیجنے کا وعدہ کیا اور پھر اسے ایفا کیا۔ یہ اب ہدیہ ناظرین "اقبالیات" ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

سید خلیل احمد

آنریری سیکریٹری باغ والا دالان

جامع مسجد۔ دہلی

۳۰ جولائی ۱۹۸۲ء

ڈیئر مسعود صاحب

السلام علیکم! مزاج گرامی

آپ کے علم میں ہے کہ اینگلو عربک کالج ادبی سوسائٹی کا آپ سب اشخاص نے مجھے وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا تھا۔ ہم لوگوں نے غالب ڈے شاندار منایا تھا۔ ہز ہائی نس سر آغا خان نے غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی تھی۔

مشاعرے کے لیے صدارت کی دعوت سر اقبال کو دی گئی تھی۔ چوں کہ موصوف علیل تھے اس لیے شرکت نہ کر سکے اور خط تحریر کیا تھا جس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ بعد میں خط و کتابت جاری رہی۔ چند خطوط مزید ہیں لیکن فائل جس میں سر اقبال کے علاوہ دیگر نامور اشخاص کے خطوط بھی ہیں اس وقت نہ مل سکی۔

فقط

خیر طلب

خلیل احمد عفی عنہ

اقبال ۱۹۲۵ء کے علی گڑھ میں

کرنل بشیر حسین زیدی کا خط سرور صاحب کے نام

۲۵، جون

آپ نے علامہ اقبال کے میرے یہاں دوپہر کے کھانے پر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔ ۲۲، نومبر ۱۹۲۹ کو وہ میرے یہاں تشریف لائے تھے۔ سر راس مسعود وائس چانسلر اور خواجہ غلام السیدین بھی کھانے پر شریک تھے باقی حضرات کے نام یاد نہیں۔

کھانے کے بعد میں نے اُن سے عرض کیا آپ جہاں جاتے ہیں لوگ آپ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے ہیں میری ایک مختلف درخواست ہے اور وہ یہ کہ آپ میرے اسکول میں تشریف لا کر میرے بچوں سے اپنا کلام سنیں۔ انھوں نے مسکرا کر اس درخواست کو قبول فرمایا۔ میں نے کئی دن تک بہت محنت کر کے چند لڑکوں کو علامہ کی کئی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھنا سکھائیں۔ ان میں مرثیہ مسلّی خاص طور قابلِ ذکر ہے، اس کی لے کچھ پُراثر اور دردناک تھی کہ علامہ اقبال روتے رہے۔ دیگر حاضرین پر بھی بہت اثر ہوا۔ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا...

پس نوشت!

آپ نے اور ملاقاتوں کے متعلق بھی پوچھا ہے۔ اقبال اور میں ۳۲ء کے آخر اور ۳۳ء کے شروع میں لندن میں مقیم تھے میں تھرڈ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں رامپور کے نمایندے کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ علامہ شام کو کئی مرتبہ تنہا ہوتے تھے میں بہت دفعہ انھیں اپنے ساتھ کسی تفریح کے مقام پر لے جایا کرتا تھا۔ راونڈ ٹیبل ختم ہوئی تو انھوں نے ایک دن فرمایا کہ میں اسپین جانا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ چلو۔ میں نے معذرت کی کہ نواب صاحب رامپور میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ وہاں جا کر مسجد قرطبہ لکھیں گے۔ آج تک افسوس ہے کہ نواب صاحب کی ذرا سی ناراضگی کا خیال کر کے میں نے سنہری موقع ضایع کر دیا۔

●●

اردو اکادمیاں

○ مہاراشٹر اردو اکادمی

مہاراشٹر اردو اکادمی

یہ اکادمی ملک کی بعض دوسری اکادمیوں کی طرح اردو زبان و ادب کی مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔ مرحوم خواجہ عبد الغفور اور مرحوم ن۔ الف۔ انصاری اپنے اپنے وقت میں اسے مضبوط کرتے ہوئے آگے بڑھاتے رہے۔ اب یوسف ناظم صاحب کی سکریٹری شپ میں یہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس اکادمی کا رسالہ "امکان" دہلی، بہار، بنگال، اڑیسہ، راجستھان، کشمیر، کرناٹک اور یوپی اردو اکادمیوں کے پرچوں کی مانند معیاری تحریریں پیش کرتا رہا ہے۔ یہ رسالہ سہ ماہی ہے، ۱۹۸۰ء میں نکلا۔ امکان میں شامل بعض تحریریں جو بہت اہم تھیں، باقی رہنے والی تھیں، اور مہاراشٹر سے نکلنے والے پرچے کی نمائندہ تحریریں تھیں، انھیں افادۂ مزید کی خاطر خدا بخش جرنل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

—— ادارہ

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی

ایک جائزہ

مہاراشٹر کے سرحدی علاقے دولت آباد پر علاء الدین خلجی کے کئی اثرات نمایاں ہوئے جو ان علاقوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر دور تک اثر انداز ہوئے اس کا ایک پہلو ان علاقوں کی بولی تھی جہاں پر علاء الدین کی زبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جو آگے چل کر دکنی کہلائی ۔۔۔ اس عہد کے مہاراشٹری صوفیوں اور سنتوں جیسے گیانیشور، تکا رام، سنت نام دیو، ایکناتھ، مکند راج، داس اور امرت رائے وغیرہ کی ملفوظات اور اشعار میں اردو الفاظ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

یہ چند نقوش ہیں جو ریاست مہاراشٹر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں معاون ثابت ہوئے مہاراشٹر اور اردو کا یہ خوبصورت اور تاریخی رشتہ آج بھی سرسبز و شاداب ہے آج ریاست میں مراٹھی کے بعد اردو بولی اور لکھی جانے والی دوسری بڑی زبان ہے اردو کے کئی سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے مہاراشٹر کو اپنا وطن ثانی بنایا اور یہاں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ فلم نے اس میں بڑا اہم بلکہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اس پس منظر میں مہاراشٹر اردو اکادمی کا قیام ریاست میں اردو کے مفاد تبلیغ اور اشاعت کے لئے ایک مثبت اور مفید اقدام تھا چنانچہ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند عالیجناب فخر الدین علی احمد کے دست مبارک سے اس کا افتتاح انجام پایا تقریب کی صدارت کے فرائض گورنر مہاراشٹر عالی جناب علی یاور جنگ مرحوم نے انجام دیئے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے پیش نظر اردو کے فروغ اور ترقی کے لئے باقاعدہ لائحہ عمل اور نصب العین ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے مگر چند اہم اور بنیادی مقاصد کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان کی ہمہ جہتی ترقی۔

تراجم اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ریاستی زبان مراٹھی اور اردو کے درمیان تخلیقی خیالات کے تبادلہ کا فروغ۔

اردو میں جرائد و رسائل اور کتب کی اشاعت کی ذمہ داری اور ایسے کاموں کی امداد۔

مہاراشٹر میں مقیم ادباء و شعراء کو بورڈ کی منظوری سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد۔

اردو کی ادبی تنظیموں اور ادبی سرگرمیوں کو مالی امداد۔

ریاست میں اردو کی حوصلہ افزائی کے لیے سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس، ورک شاپ اور نمائشوں کا انعقاد اور علمی سرگرمیوں کی امداد

لائبریریاں اور ریڈنگ روم کے لئے کتابوں اور رسالوں کی فراہمی

ریاست میں رہنے والے ادبا اور شعرا کو گزشتہ ادبی میدانوں میں اعلیٰ کارناموں پر ہر عنوان اور موضوعات پر شائع شدہ تخلیقات پر انعامات۔

بورڈ کی سرگرمیوں نیز اردو بولنے والوں کی ضروریات سے وقتاً فوقتاً حکومت کو آگاہ کرنا۔

اردو کے فروغ کے سلسلے میں پالیسیوں کی تشکیل میں حکومت کو مشورہ نیز ان پر عمل درآمد میں مدد۔

ان خطوط کی روشنی میں اب یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے آٹھ سالہ مختصر مدت اکادمی نے اُن تمام مقاصد پر مناسب عمل کیا ہے اور بہار اشٹر میں اردو کی فضا کو خوش گوار بنایا ہے۔

کتابوں خصوصاً ادبی کتابوں کی اشاعت ہمیشہ سے اردو قلم کاروں کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اس کی وجہ اردو میں ایسے پبلی کیشنز یا اداروں کی کمی ہے جو ادبی کتابوں کو اہتمام سے شائع کر سکیں۔ اس سلسلے میں مہاراشٹر اردو اکادمی نے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد دینے کی اسکیم مرتب کی ایک اندازے کے مطابق اب تک سودوں کو اشاعت کے لئے منتخب کیا گیا اور امداد دی گئی پہلے سال یعنی ۸۲-۱۹۸۱ء میں کل ۲۱ مسودوں کو ۵۷،۵۰۰/- کی مجموعی رقم سے نوازا گیا جن میں گیارہ مسودے تادم تحریر کتابی صورت میں شائع ہو چکے اور ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۱،۰۵،۸۰۰/- کی رقم ۲۳ مسودوں کی اشاعت کے لئے دی گئی۔

غیر اردو داں حلقوں میں اردو لکھنے پڑھنے کی کافی دلچسپی اور اشتیاق پایا جاتا ہے۔

سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران ۱۷ اداروں کو غیر اردو داں حضرات کے لئے کلاسوں کے لئے ۲۰،۴۰۰/- کی رقم منظور کی گئی جبکہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں مزید ۳۴ کلاسوں (3) کے لئے ۴۰،۰۰۰/- رقم منظور کی گئی اور ریڈر شپ اور قارئین کے دائرے کو وسعت دینے کے لئے اردو اکادمی نے مہاراشٹر کی منتخبہ لائبریریوں، کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابوں، رسالوں کی امداد دینا کی گئی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں حکومت کی منظور شدہ ۲۰۹ لائبریریوں کو کتابیں اور رسالے فراہم کئے گئے جبکہ اس سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۲۰۵ لائبریریوں کو خطیر رقم کی کتابیں اور رسالے دیئے گئے۔ اس کے علاوہ خانقاہ نقش بندی ٹرسٹ لائبریری بالاپور دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونہ، انجمن ترقی اردو (مراٹھواڑہ) انجمن اسلام کریمی لائبریری بمبئی نایاب مخطوطوں، قلمی کتابوں اور مسودوں کے تحفظ کے لئے مزید ایک لاکھ مہاراشٹر اردو اکادمی دیئے گئے۔ طلبا کی حوصلہ افزائی اور ان میں اردو کے شوق کو جگائے رکھنے کیلئے ادبی سرگرمیوں مثلاً مضمون نویسی، تقریری مقابلے، مشاعرے، نمائش اور دیگر اداروں کو ۵۰۰/- سے ۵۰۰۰/- تک کی رقم فراہم کی جاتی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں کل ۷۱ کالج سوسائٹی اور دوالی اداروں کو ۳۴،۰۰۰/- کی مالی امداد دی گئی اس کے ماسوا دھولیہ کی ایک اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو سیمینار کے انعقاد کے لئے ۵۰۰۰/- دیئے گئے۔

طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے ایس ایس سی ایچ ایس سی بی اے اور ایم اے کے اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبا کو مخصوص انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پونے ڈویژن اور نگ آباد ڈویژن، ناگپور ڈویژن کے علاوہ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، شری شیواجی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی، پونہ یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی کے طلبا کو انعامات سے نوازا

جاتا ہے۔ تعلیمی خدمات کے سلسلے میں یہ کہنا شاید مناسب ہو کہ اردو اکادمی کے مالی تعاون اور کوششوں سے بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کو تمام عظیم افسانہ نگار کرشن چندر سے منسوب چیئر کے طور پر عمل میں آچکا ہے۔ ریاست مہاراشٹر میں مقیم ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کی ادبی اہمیت اور حیثیت کے مطابق انعامات سے نوازا جاتا ہے انعامات کے لئے مختلف موضوعات مثلاً شاعری، ناول، افسانہ، کہانی، سائنس و ٹیکنیکل ادب، ترجمہ، تحقیق و تنقید، بچوں کا ادب اور صحافت کے تحت انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں اس کے سوا ممتاز ادبی شخصیتوں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر خصوصی اعزاز عطا کئے گئے ہیں اور مستحق، معذور، خستہ حال فن کاروں کو بھی خصوصی امداد دی جاتی ہے۔

اردو تھیٹر اور ڈرامہ آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھو تا گیا اس لئے اردو اکادمی نے اردو ڈراموں کے فروغ اور لوگوں میں اس کی دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے کل مہاراشٹر پیمانہ پر اردو ڈراموں کے انعامی مقابلے منعقد کئے گئے۔ جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں اور لوگوں میں اردو ڈراموں سے دلچسپی اور شوق بڑھتا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ ماہی رسالہ "امکان" شائع کیا جاتا ہے جس نے اپنے معیاری و ادبی مضامین اور انتخاب نظم و نثر کی وجہ سے بہت جلد اہل علم و ادب میں اپنا منفرد مقام بنا دیا ہے امکان کو ہند و پاک کے بیشتر ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہے اپنی شاندار خوبصورت طباعت کے لئے اسے دو بار صدر جمہوریہ کا انعام بھی مل چکا ہے۔

فی الحال علامہ اقبال کی بانگ درا کا مراٹھی ترجمہ اور مشہور مراٹھی مصنف سنت شیت کا دو جلد شائع ہو چکا ہے آئندہ کے پروگرام زیر غور ہیں مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے ریاست مہاراشٹر کے مختلف علاقوں میں سیمینار اور مشاعرے و دیگر پروگرام مثلاً ممتاز ادیبوں شاعروں کی برسی منانے اور استقبالیہ تقریب اور اعزازی نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں مخدوم محی الدین، جلیل مانکپوری، فانی بدایونی، آغا حشر کاشمیری، پریم چند، حسرت موہانی، اردو صحافت، تعلیمی کانفرنس، اردو کی ترویج میں اہل برار کا حصہ، اردو ادب میں طنز و مزاح، جنگ آزادی میں اردو کا حصہ اور برج نرائن چکبست کی شخصیت اور شاعری پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے مشہور اہل قلم نے اپنے مقالات سے سامعین کو نوازا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شہریار، کنہیا لال کپور، گوپی چند نارنگ، علی جواد زیدی، امداد صابری، انتظار حسین، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، رئیس امروہوی، احمد فراز اور شان الحق حقی کی بمبئی میں آمد پر استقبالیہ منعقد کئے گئے اردو اور مراٹھی کا لسانی و تہذیبی رشتہ، اردو بولنے اور سیکھنے والوں کو رسم الخط سکھانے کے مسائل اور ان کے حل، مراٹھواڑہ کا اردو کو فروغ دینے میں حصہ اور ایسے ہی دلچسپ موضوعات پر مزید سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔

اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی اردو اکادمی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ اور اس کی کارگزاریوں پر کما حقہ روشنی ڈالی جاسکے مگر اس چھوٹے سے خاکے کے ذریعہ جتنی اور جس قدر بھی روشنی پڑ سکتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مہاراشٹر اردو اکادمی ایک فعال اور سرگرم ادارہ ہے جو ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کا چراغ جلائے ہوئے ہے۔

سید یحییٰ نشیط

اردو مراٹھی کے مسلم شعرا کا ہندوی رجحان

سرزمین ہند میں اسلامی تمدن فاتح قوم کا تمدن تھا۔ اس شجرِ ہمہ گیر بار اور تمدن کی جڑیں عرب کے ریگستانوں میں گہری اتری ہوئی تھیں اور اس کی شاخیں سواحل روم و یونان سے لیکر مشرق الہند تک سایہ فگن تھیں، ان علاقوں کی تہذیبی فضاؤں میں پھل پھول رہی تھیں۔ ہمارے یہاں کی دیہاتی تہذیب کی پیوند کاری سے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں اور یہ درخت نہایت گھنا اور چھتنار ہو گیا۔ اس کے زیر سایہ ادب کی تخلیق کرنے والے ہندو مسلم شعرا کا اس ملی جلی تہذیب سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلم شعرا ہندو مت سے برابر متاثر ہوتے گئے اور اپنی تحریروں کے نادر نمونوں سے ہندو مذہبی ادب میں اضافہ کیا۔

ان شعرا نے گو کہ مذہب کی توسیع، ترویج اور تبلیغ کے حتمی دعوے نہیں کئے، لیکن مذہب کی تکریم و تبریک ہی کو وسیلۂ نجات تسلیم کیا اور عوام کے ذہن سے مطابقت رکھتے ہوئے مذہبی قصص و روایات کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا کہ عوام و خواص کے گرویدہ ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ رامائن و مہابھارت، مراٹھی، انیس اور داماں کے بھگتوں کو ایسے لوگ بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں، جن کا اس معاشرت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

برادرانِ وطن کی مذہب کو مسلم شعرا نے بنظرِ استحسان اور احترام و اکرام سے دیکھا ہے۔ انھوں نے دیوی دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے ترانے گا کر اپنی وسیع المشربی، صلح کل طبیعت اور کشادہ قلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اسلامی روایات و اصطلاحات کے علاوہ ہندو اساطیر و علامات اور تمثیلات و تلمیحات کا سہارا لیکر انھوں نے انسانیت کی اصلاح کی۔ اخلاق کا تصفیہ اور نفوس کا تزکیہ کیا۔ بہرنگی تعمیر باطن کی تطہیر، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کے لئے انھوں نے جو ادب پارے پیش کیے ان کا مرجع و مصدر مذہبی کتب ہی رہے ہیں۔

یہاں اردو اور مراٹھی کے چند ایسے مسلم شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کا جائزہ مقصود ہے جن کی تخلیقات میں ہندو مذہبی رجحان بہت گہرا ہے۔ اس اعتبار سے پہلا نام حسین عنبر خاں کا لیا جا سکتا ہے۔ مراٹھی کی قدیم صوفیانہ شاعری میں ان کی معتبر آواز ہے۔ ان کے والد یاقوت عنبر کو دولت آباد میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہتے ہوئے مشہور ہندو سنت جنار دن سوامی، ابا جی پنت اور چاند صاحب بودھلے کی مصاحبت نصیب ہوئی۔ جن کے زہد و عرفان اور روحانیت کا دور دور تک چرچا تھا۔ حسین عنبر خاں کی اسی ماحول میں نشو و نما ہوئی، ان حضرات ثلاثہ سے انھوں نے فیضان حاصل کیا۔ دینی تعلیم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور دھیرے دھیرے اُسی رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی لکھی ہوئی گیتا کی تفسیر गीता भावार्थ दीपिका مراٹھی کے مذہبی ادب میں معروف ہے۔ اس میں ۸۷۱ ابیات ہیں۔ وجہ تصنیف بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ——

[illegible] । [illegible] ।
[illegible] । [illegible] ॥

اپنی اس تصنیف کے لئے انھوں نے شنکر اچاریہ کے بھاشیہ اور شری دھر سوامی کے ویاکھیان سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

[illegible] । [illegible] ।
[illegible] । [illegible] ।

حسین عنبر خاں کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں جس سے ان کی زبان دانی، ہنرمندی اور فنی چابکدستی کا پتہ چلتا ہے۔ گیتا کے نویں ادھیائے کے پہلے شلوک کا یہ ترجمہ دیکھئے۔

" چونکہ تو نکتہ چینی نہیں کرتا۔ اس لئے میں نہایت خفیہ انسانی اور خدائی علم بتاتا ہوں۔ جسے جان لینے کے بعد تو برائی سے آزاد ہو جائے گا۔"

اس خیال کو حسین عنبر خاں یوں نظم کرتے ہیں۔

मिळा न कीर्तीया सुख । बोलतो हे अत्यंत सुख ।
[illegible] सहित आमराचा । ते [illegible] मुक्त होती ॥

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مراٹھی کے اس مسلم شاعر نے بھگوت گیتا ہی کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنایا تھا۔ وہ تاحین حیات اسی کی زمزمہ خوانی میں مشغول رہا۔

اسی عہد میں حسین عنبر خاں کے معاصر سید امین، "کشن گیتا" میں گیتا کو کر اردو میں گیتا کے ترجمے اور تفسیر کی بناڈالتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں سید امین کا سلسلہ ارادت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (م ۱۰۹۶ھ) کے سلاسل کے ایک بزرگ حضرت خواجہ عارف گنج بخش سے جوڑا ہے۔ یہ الکھواڑے کے باشندے تھے۔ زور مرحوم نے سید امین کی ایک کتاب "مجذوب السالکین" کا تذکرہ اردو مخطوطات کی فہرست میں کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندو۔ مسلمان سنتوں اور صوفیوں کے اقوال جمع کر دئے ہیں۔ کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

" میں چاہتا ہوں کہ مذکور کروں صوفیائے ہر دو قوم کا بیچ دکھنی زبان کے"۔۔۔
یوں ہر ایک قوم اپنی اپنی زبان میں علیحدہ علیحدہ ناؤں رکھے ہیں تو میرے جیو میں
آیا کہ مسلمانی ہور ہندوی مذہبی لفظاں جمع کر کر واسطے صوفیانِ ہر دو قوم کے
ایک رسالہ بناؤں تا کہ صاحب منصوں کے کام آوے۔"
(تذکرہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۲۱۹)

کتاب کے اختتام پر سید امین یوں گویا ہیں۔

" لیکن اگر مسلمانی ہور ہندوی کتابوں کا ہور بیدوں کا مذکور کرتا تو عبارت دراز ہوتی۔ اس واسطے اب مختصر چلا۔"

مجذوب السالکین میں درج شدہ ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سید امین کو برادرانِ وطن سے اور ان کے مذہب سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ زیر تذکرہ کتاب میں جگہ جگہ مراٹھی اقوال، دوہرے اور اشعار درج ہیں، جن میں اخلاقی و مذہبی درس دیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ امین کی کشن گیتا کے اقتباسات میں پیش نہیں کر سکا۔

آغا جمیل کاشمیری

آغا حشر اور بمبئی

انیسویں صدی کے اواخر میں ایک بیس سالہ سرو قد نوجوان جس کے کتابی چہرے میں بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں سے ایک میں ہلکی سی کجی تھی، بنارس سے آنے والی ٹرین سے بمبئی اسٹیشن پر وارد ہوا۔ یہ نووارد بنارس کے ایک کشمیری خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کی ولادت بنارس میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو ہوئی تھی۔ جس کا زائچہ خاندانی روایات کے بموجب مرزا محمد جبار نے ۱۰ ربیع الثانی کو مرتب کیا تھا۔ جس کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا تھا۔ جس نے ۱۵ برس کی عمر میں فارسی عربی ادبیات کے مشہور استاد مولوی حافظ عبدالصمد سے درس نظامی کی تکمیل کی تھی جو ۱۹ سپاروں کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ جے نرائن اسکول بنارس میں مڈل کے درجات تک انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کر چکا تھا۔ جو جے نرائن اسکول کے اردو فارسی اور عربی زبان کے استاد مولوی نجیب الدین کی عدم موجودگی میں ان کے حسب ہدایت اسکول کے مختلف درجات میں فارسی کا درس بھی دیا کرتا تھا۔ اور ان کی ایک شاگردہ لوریٹو اسکول کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ کی صاحبزادی اس نوجوان سے کبھی کبھی عربی صرف و نحو کا درس لیا کرتی تھیں۔ جس نے ملا غنی کشمیری کی فارسی غزلوں پر غزلیں کہی تھیں۔ اور مرزا محمد حسن فائز بنارسی سے جو مقامی مشن اسکول میں اردو کے استاد تھے اور بعد میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو کے صدر ہوئے، اپنے ابتدائی اردو کلام پر اصلاح لی تھی۔ جس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بنارس میں آئی ہوئی "بمبئی کمپنی" کی طرف سے طلبا کو رعایتی ٹکٹ نہ دیئے جانے پر مقامی روزنامے "رہبر الاخبار" میں کمپنی کے ڈراموں کے خلاف مضامین لکھ کر ہندوستانی ڈرامے پر تنقید کی ابتدا کی تھی۔ جس نے بمبئی کمپنی کے مشہور ڈرامہ نگار احسن لکھنوی سے بحث کے دوران ایک دن یہ کہا تھا کہ جیسا ڈرامہ آپ کہتے ہیں ویسا ڈراما میں ایک ہفتہ میں لکھ سکتا ہوں۔ اور اس دعوی کے عملی ثبوت کے طور پر صرف اٹھارہ برس کی عمر میں ان کے ڈرامے "چندراولی" کے مقابلے میں اپنا سب سے پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" لکھ کر ۱۸۹۷ء میں جواہر اکسیر بنارس سے شائع کرایا تھا۔

یہ وہی صاحب قلم تھا جس کے شاعرانہ ذوق اور ڈرامے لکھنے کے شوق نے اسے مزید تعلیمی مشاغل سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ وہی صاحب فکر و نظر تھا جس کو تعلیم سے بیگانہ دیکھ کر دکھے ہوئے والدین نے اسے بزنس کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ یہ وہی سرمستی حیات کا پیمانہ تھا جس نے میونسپلٹی کی ملازمت کے لیے والد کے دیئے زر ضمانت کی آدھی رقم راستے ہی میں دوستوں کی خاطر تواضع میں خرچ کر دی تھی اور والد کے اس مظاہرے کے بعد احساس ندامت و شرمندگی کے تحت اس کے قدم خود بخود گھر کی بجائے اسٹیشن کی جانب اٹھ گئے تھے۔ شاہراہ شعر و ادب کا یہ وہی غریب الوطن مسافر تھا جس نے بمبئی پہنچ کر اپنے ایک عزیز دوست عبداللہ بنارسی کے یہاں عافیت کا سانس لیا تھا۔ اور شہر میں وارد ہونے کے پہلے ہی دن ایک شعری نشست میں شرکت کے بعد "بمبئی پنچ" کے ایڈیٹر مولوی فرحت

نئی جنگ کی ابتدا کردی تھی ـــــ مشاعروں میں شرکت اور بمبئی پنچ میں شائع شدہ مضامین کی وساطت سے بمبئی کے ادبی حلقوں نے شروع ہی میں اس نووارد کو آغا محمد شاہ حشر کے نام سے جانا اور پہچانا۔ اور رفتہ رفتہ آغا حشر کے نام سے شہرت کے بام عروج کا چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔

فال مبارک ہوا ہے سرزمین بمبئی جہاں ایک دوست کی وساطت سے حشر کی کاؤس جی سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور دوستی کا جان کے نتیجے میں وہ ان کی الفریڈ کمپنی میں ۳۵ روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے۔ اس طرح ڈرامے کے انقلاب کے ہیرو کا ظہور ہوا جس کے اجتہادات سے اس فن کی بنا پائندہ ہوئی اور جس کی جنبش قلم سے نئے شاہکار وجود میں آئے۔ ۱۹۰۱ء میں حشر نے الفریڈ کمپنی کے لیے اپنا پہلا تجارتی ڈراما "مرید شک" لکھا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ شیکسپیر کے ڈرامے ونٹرس ٹیل (Winter's Tale) سے ماخوذ ہے۔ حشر نے "مرید شک" کے گانوں کے کتابچہ میں ناظرین کو یوں رجوع کیا ہے:۔

"آج میں آپ کی نکتہ بیں نگاہوں کے سامنے وہ ناچیز تصنیف پیش کرتا ہوں جس کا نام "مرید شک" ہے۔ یہ ڈراما بھی اس دریائی ساخت کے دل و دماغ کی کوشش کا مجموعہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کو اس یورپ الہامی فرشتے کا فکر پاک نتیجہ زندگی کی تشریح کہتے ہیں۔" اس عرق ریزی محنت میں وہ مزید فرماتے ہیں۔ "کاغذ کے سادہ صفحوں میں انسان اور انسان کے جذبات کی چلتی پھرتی تصویریں لا دے دو شرقی ہمرتی ہیں، اس کا پورا زور دکھانا اور اس میں وفا، جفا، الفت، نفرت، حیاداری، ریاکاری اخلاص، نفاق، مختلف اقسام کے رنگ بھر کر جان ڈال دینا شیکسپیر کے ہی دل و دماغ کا کام تھا۔ جس کی تحریر کے طرز پلاٹ کی خوبی، سبجکٹ کا التزام اور ان کے [illegible] ریزلٹ میں گوناگوں کر دینے والی کیفیات کا احساس اس بات کی گواہی دیکر ثابت کر رہا ہے کہ یہ نامور مصنف نیچرل کالج کا پاس شدہ گریجویٹ ہے۔ اور کتاب فطرت کو شروع سے لیکر آخر تک مطالعہ کر چکا ہے۔" جس نامور ارحن کے مریر قلم نے اس طرح اپنے دلوں پر فتح پا کر عزت اور شہرت کے ڈنکے بجا رکھے ہیں، اس کی کسی تحریر کو اپنی زبان میں لینا یا اس کے حسن مذاق اور کرافٹ معاشرت کو اپنے ملک کے طبائع و ضروریات زندگی کے ساتھ ایک پیچ پر رکھ کر دکھانا جس قدر اہم اور دشوار ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جنھوں نے کسی غیر زبان کے ترجمے میں دس پانچ دن اپنا خون پانی ایک کیا ہو — دو چار راتیں آرام کی خواہش اور جلتے ہوئے لیمپ کے سامنے آنکھوں کی روشنی کھو کر صبح کی ہو۔"

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ اس کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوا ہوں جس کو کامل ترجمہ کہتے ہیں مگر اس قدر کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ میں نے شاہد فرنگ کو ایشیائی لباس و ہندوستانی مذاق کے گہنوں سے ایک ایسی بنی بنا دیا ہے جو جلوہ افروزی کے وقت جاں ربا تو نہیں مگر دل ربا ضرور ثابت ہوگی۔"

پانچ ماہ بعد اسی کمپنی کے لیے حشر نے "مار آستین" لکھا۔ یہ ڈرامے بمبئی کے اسٹیج پر بہت کامیاب ہوئے اب حشر کی مانگ ایک ایک کمپنی کی طرف سے ہونے لگی آخرکار وہ نیو الفریڈ کمپنی میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے جہاں ۱۹۰۲ء میں انھوں نے "اسیر حرص" لکھا۔ اسیر حرص شریڈن کے ڈرامے پزارو (Pizarro) سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کی گانے کی کتاب میں حشر کا خود نوشتہ التماس بہت طویل ہے۔ اس کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"اگرچہ جاہلیت کے زمانے میں کالی داس نے اس فن پر بہت روشنی ڈالی مگر اس زمانے میں اس کا نشان صرف دیہو کے سوانگوں میں نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں اس فن کا پھول اول اول روما کے بت خانے سے پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ روما، ایران اور یونان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان میں اس کی خوشبو پھیل گئی۔ مگر یونان کی طرح انگلستان نے بھی ڈراما کے پاؤں میں مذہبی زنجیریں ڈال دیں۔ فرق اتنا تھا کہ وہاں ناٹک کے پردے میں دیوتاؤں کے بھجن گائے جاتے تھے۔ اور یہاں دین مسیح کے پیدا

بدحالی کرامات کے جلوے دکھاتے تھے۔ صدیوں تک ڈرامے کی یہی حالت رہی۔ رفتہ رفتہ زمانے کے ساتھ اس نے بھی پلٹا کھایا اور قید غلامی کی زنجیریں توڑ کر دنیاوی اسٹیج پر آزادی کی ہوا کھانے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۵۶۴ء میں ڈرامانویسی کا آفتاب عالم تاب [illegible] کے قصبہ اسٹریٹ فورڈ میں طلوع ہوا (شیکسپیئر پیدا ہوا) جس کے جادو نگار قلم نے انسان کے ہر پہلو کو جذباتِ انسانی و فلسفیانہ خیالات سے معمور کر کے سرمشقِ عالم بنایا۔ اگرچہ شیکسپیئر سے پہلے "جان للی" نے دل کش نثر اور جان بیل نے نظم کے نمونے پیدا کر دیے تھے۔ رابرٹ گرین نے کامیڈی اور کرسٹوفر مارلو نے ٹریجیڈی میں جان سی پھونک دی تھی مگر ملک الشعرا کے زمانے میں جس نے شاعری کو معراج کمال تک پہنچایا وہ ملک الشعرا شیکسپیئر کا قلم تھا۔" خود نوشتہ حالات میں حشر مزید فرماتے ہیں۔
"میں ۱۹۰۰ء میں الفریڈ کمپنی میں تھا۔ ڈائرکٹر مقرر ہوا تو مالک موصوف کے حسب الارشاد WINTER'S TALE کا ترجمہ کر کے اردو میں انگریزی ڈرامانویسی کی عمارت قائم کی جس کی بنیاد دی تھیٹر کے خود ساختہ پہلوان پی کے ٹی ڈی اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے۔ پا کا پیہ پر اس عمارت میں "مار آستین" کی ایک منزل اور زیادہ کی۔ شکر ہے کہ وہ تینوں چیزیں پبلک کو پسند آئیں اور ہندوستانی اور انگریزی اخبارات نے مبارک دے کر میرے حوصلے کو تقویت دی اور اس عمارت میں "اسیر حرص" کے نام سے ایک منزل اور اضافہ کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ بھی قدرداں پبلک سے قبولیت کا تمغہ حاصل کرے۔" یہ ڈراما پبلک میں بہت مقبول ہوا۔

حشر کی مقبولیت دیکھ کر کاؤس جی نے ان کو اپنی الفریڈ کمپنی میں ۲۰۰ روپے ماہانہ پر پھر واپس بلا لیا جہاں ۱۹۰۲ء میں انہوں نے شہید ناز لکھا جو شیکسپیئر کے Measure for Measure سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کے کتابی کتاب کی تمہید سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے اور اس بات کا اندازہ لگائیے کہ اس دور میں پبلک کا کیا مذاق تھا اور ڈراما کس کسمپرسی کے عالم میں تھا۔

"موجودہ زمانے کی اور حیرت انگیز ایجادوں میں سے ایک عجیب خیز ایجاد وہ برقی شعاعیں ہیں جن کو انگریزی میں ایکس رے کہتے ہیں۔ بجلی کی وساطت سے بند مکان کی تاریک سے تاریک کوٹھری میں رکھی ہوئی چیز کا عکس مکان کے باہر سے اتار لیا جاتا ہے۔"
آگے چل کر اسی تمہید میں حشر یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس آتا ہے کہ ڈرامے کی تاریک حالت پر اس نئی روشنی کی ایکس ریز بھی کچھ مدد نہ ڈال سکی۔ تصنیف و تالیف کے آسمان پر ستارۂ سحری کی ہلکی چمکیلی روشنی کی طرح چند! افسانوں اور ناولوں کی کہیں کہیں جھلک ضرور نظر آتی ہے مگر ڈرامے کی قسمت کا آفتاب جو افق مغرب سے طلوع ہوا تھا زمین مشرق میں بالکل قریب غروب پہنچ گیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس اہم فرض کا بوجھ کس پر ڈالا گیا۔ ناٹک کے منشیوں پر جن کو صدہا ناگفتہ بہ مشکلات کے ایک اور مشکل یہ بھی درپیش ہوتی ہے کہ ناسمجھ پبلک کے خوش کرنے کے لیے ہر سنجیدہ اور نتیجہ خیز مسئلے کو ایسے مذاق سے بدل دے کہ جس سے خواہ تماشے کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہو جائیں۔ مگر تماشائی ہو ہو راگ گاتے نکلیں کر پیسے وصول ہو گئے۔"

بمبئی کے قیام میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۹ء تک اڈلجی بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لیے ۱۹۰۶ء میں "سفید خون" اور ۱۹۰۸ء میں "صید ہوس"۔ سہراب جی اگرا کی کمپنی کے لیے ۱۹۰۸ء میں "خواب ہستی" اور ۱۹۰۹ء میں "خوبصورت بلا" لکھ کر حشر نے اپنی شہرت میں چار چاند لگائے۔

بمبئی کے دوران قیام میں حشر ڈرامانویسی کی مشغولیت کے باوجود دیگر اصناف ادب سے بے تعلق نہیں رہے اپنے قریب ترین دوست ڈائرکٹر امرت لعل کے انتقال پر جن کی وساطت سے وہ دوسری بار کاؤس جی سے ملنے گئے تھے انہوں نے فارسی زبان میں جو مرثیہ لکھا تھا وہ ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کے نقطۂ نظر سے آپ اپنی مثال ہے۔ یہ مرثیہ رسالہ

اکسیر میں ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ علمی ادبی نشستوں کی شرکت کے علاوہ مزید تحصیل علم کے شوق سے وہ بے پروا نہیں تھے۔
ایک لائبریری بمبئی کے لائبریرین نے ایک تقریر میں ان کے شوق کتب بینی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ آغا صاحب کا
شوقِ مطالعہ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ لائبریری کا شعبہ اردو، فارسی، انگریزی لٹریچر قریب قریب صرف آغا صاحب کی علمی تشنگی کی سیرابی
کے لیے بنائی گئی ہے۔

بمبئی کے قیام میں حشر انجمن ضیاء الاسلام کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ۸ فروری ۱۹۰۹ء کے جلسے کی صدارت عالی
جناب منشی محمد حسن صاحب تعبیہ جے۔ پی۔ رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے۔ حشر نے "معجزات القرآن" کے عنوان پر ایک مبسوط لکچر دیا۔
انجمن کی فضا میں فصاحت و بلاغت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سچائی، صدق، جوش اور تاثیر کے دریا بہہ رہے تھے۔ تقریر کے آخری
حصے نے حاضرین کے دلوں میں ہمدردی و فیاضی کو جنبش دی۔ لوگ انجمن کی امداد پر آمادہ ہوئے اور ایک معقول رقم چندے کی جمع ہو گئی۔
۷ فروری ۱۹۱۰ء کے جلسے میں جس کی صدارت عالی جناب سیٹھ عبد الحسین صاحب کے صاحبزادے سر آدم جی پیر بھائی کر رہے تھے۔ حشر نے
"مکارم اسلام" کے عنوان پر تقریر کی۔ تقریر کا آخری حصہ چندے کی تحریک تھی جس نے لوگوں میں عام جوش پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ مولانا
مولوی سجاد حسین صاحب احمد آبادی نے اپنا جبہ قیمتی جبہ اتارا اور بہ کہ سیرت محمد صلعم کہہ کر انجمن کو نذر کر دیا۔

۱۱ فروری ۱۹۰۶ء کے جلسے میں جس کی صدارت سیٹھ فضل بھائی کے صاحبزادے سر کریم بھائی ابراہیم صاحب رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے
حشر نے "اب ہم کو کیا کرنا چاہیے" کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ سکریٹری انجمن کے الفاظ میں "اس وقت کمال گویائی آپ
کی لطف آفرینی سے متعجب اور حیران ہو جاتا تھا۔" ۱۱ فروری ۱۹۰۸ء کے جلسے کی صدارت حشر نے کی اور سکریٹری جلسہ کے بقول "اپنی
صدارتی تقریر میں دیگر اصحاب کی تقریروں کی تائید و توضیح میں اپنی وسیع معلومات کے خزانے سے ایسے جواہر نگار رنگین کئے جن سے ان
تقریروں کے کمال کی پیشانی زیادہ آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگی۔" اسی سال ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان
کی ہندوستان میں تشریف آوری سے قبل انجمن ضیاء الاسلام نے ایک اور جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مولوی فصیح الدین احمد بیرسٹر
ایٹ لا نے کی تھی۔ اس جلسے میں آغا حشر نے جو تقریر کی تھی اس کی تعریف میں بجز اس کے سکریٹری انجمن اتنا ہی کہتا کافی ہے۔ "خاموشی از
ثنائے تو حدِ ثنائے تست"۔ جب ہز مجسٹی ہندوستان تشریف لائے تو ان کے استقبال میں حشر نے فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھا
جو ماہنامہ "البرید" کانپور میں شائع ہوا تھا اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

صبحدم چشم بیامد تازنینے مست و شوخ	خندہ برلب جام برکف جلوہ پاش و برقبار
ماہ روئے مشکموئے دلبرے جان پرورے	نوش لبے ولا گہر لبے ادا شیریں وقار
ناز پرور ناز گستر نازنیں ناز آفریں	گلبدن گل پیرہن گلگوں قبا گلگوں عذار
عنبریں مو یاسمین بو شعلہ خو آئینہ رو	جلوہ بخش شام غم صبح آفرین روزگار
غمزۂ بیباک او صد نخوتِ دارا شکن	عشوۂ چالاک او ہمچو کشتی اسفندیار
طرۂ عنبر فشاں زور آور نعد ور	خنجر چیں جنبش حرب زن افریشی گذار
جستم و در برکشیدم بوسہ دادم پے بہ پے	باز پرسیدم کہ اے جان در لبم بر تو نثار
گفتمش چوں آمدی؟ خندید و با صد ناز گفت	اے فصیح کاظمی اے شاعرِ معجز نثار
آمدم از شرق بہ مغرب نور افشانی کنم	آمدم اندر عالم ایجاد چوں شمس انتہار
از نسیم جود ما گلشن بہ داماں ہر فتن	از نسیم لطف ما فردوس در ہر کوہسار

آغا حشر نے مغربی ڈرامے کے پیکر کو ہندوستانی ملبوس پہنا کر زبان و بیان کے زیورات اور آتش نوا خطابت سے آراستہ

کر کے شائقین کو ڈرامے کی افادیت کی جانب متوجہ کر لیا تھا مگر وہ مقصدیت جس سے معاشرے میں زندگی، خیال میں وسعت اور روح میں بالیدگی پیدا ہو مالکان کمپنی کی بے جا مداخلت سے اس نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں تک حشر لے جانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ملازمت کی قید سے آزادی حاصل کر کے حیدرآباد کے ایک تعلقہ دار راجہ رگھو اندر راؤ کی شرکت میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی اور اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے ڈرامے کی زمین کو ہموار کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ کمپنی کے ساتھ اسی زمانے میں وہ بمبئی سے ترک سکونت کر کے حیدرآباد پہونچے جہاں انہوں نے "سلور کنگ عرف نیک پروین" ڈراما جو ہنری آرتھر جونس اور ہنری ہرمن کے "سلور کنگ" سے ماخوذ ہے لکھ کر ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کیا۔ ۱۹۱۰ء میں "یہودی کی لڑکی" لکھ کر ہندوستانیوں کے خوابیدہ ذہنوں کو حرکت و عمل کی طرف مائل کیا۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۱۲ء کو جب ان کی کمپنی [illegible] کا دورہ کرتی ہوئی لاہور پہنچ چکی تھی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی نظم "شکریہ یورپ" کے اس بند کو پڑھ کر ہندوستانی مسلمانوں کو ایشیا کے تصور سے آشنا کیا۔ یہ بند حکومت نے ضبط کر لیا تھا ؎

اے زمینِ یورپ! اے معراجِ پیرایہ نواز — اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیادِ الم کا شانہ ہے — تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے — خونچکاں روداد اقوام گریباں چاک ہے
حرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری — آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
خلقت دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے — دھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا — جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اُٹھ رہا ہے شورِ ماتم خاکسترِ پامال سے — کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

۱۹۱۳ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر اپنا پہلا ہندی ناٹک "بلوا منگل" پیش کر کے ہندو ناری کے وقار کو بلند کیا۔

۱۹۱۳ء میں کمپنی کے ساتھ ایک بار پھر انھیں لاہور جانا پڑا جہاں "انجمن حمایت اسلام" کے سالانہ جلسے میں انہوں نے اپنی نظم "موجِ زمزم" پڑھ کر ہندوستانیوں کو اتحاد کا جوہر کا انجکشن دیا فرماتے ہیں (اقتباس نظم موجِ زمزم) ؎

آسماں ہے محفلِ ہستی میں میخانہ مرا — کہکشاں میری صراحی چاند پیمانہ مرا
ہر نفس سے بربطِ گیتی پہ ہوں نغمہ فشاں — اضطرابِ برق ہے اک رقصِ مستانہ مرا
ساغرِ ہستی میں ہوں میں ارتعاشِ موجِ نور — جلوہ زارِ زندگی ہے مجھ سے میخانہ مرا
بارشِ مستی کے جلوؤں سے ہے فردوس آفریں — ہے خرابِ نور سے شاداب ویرانہ مرا
نکہتِ صہبائے مستی سے ہے تعمیرِ حیات — دہر میں اک موجِ رنگ و بو ہے کاشانہ مرا
دولتِ صبحِ قدم ہے مایۂ شامِ حدوث — گلشنِ جنت تو ہے رضواں ہے بیعانہ مرا
ہر رگِ جامِ مئے گلرنگ ہے ایک ایک حرف — بزم کو مست کر دیتا ہے افسانہ مرا

شعلہ آشامِ محبت زاتشِ دیرینہ ام
ساقی ام در مشرب و میخانہ اش در سینہ ام

اسی زمانے میں ان کی اہلیہ سخت علیل تھیں۔ اہلیہ کی مسلسل علالت سے حشر کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔[111]

جہاں ان کی اہلیہ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ دل برداشتہ ہو کر سیالکوٹ میں انھوں نے انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی بند کر دی اور بنارس واپس چلے آئے جہاں پی۔ ایف۔ مدن اور ایڈکر کی جانب سے ان کو دست جمع ملا اور وہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر کمپنیوں کے لئے ڈرامہ لکھنے لگے۔ وہاں انہوں نے ۱۹۲۶ء میں مدھر مرلی، بھارت رمنی، اور ۱۹۱۲ء میں جگت گنگا، ہندی ناٹک لکھ کر دست کے دنگ کر ہندوستانی سماج میں ایک نام پیدا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ہندی ڈرامے "پرہلاد اور ترکی بھارت" میں حشر نے بدھا شنکر کے ہندوستانی سماج سے بدلاو گزار دکھائی دیتے ہیں۔

پرمانند — "بیشک۔ دہلی کے پرانے ہنر اور پرانی کاریگریاں مٹ جانے کے کارن، ضرورت کی سب چیزیں مہنگی ہو جانے کے کارن، آج چاول کے بدلے دونوں وقت سوکھے چنے بھی نہ ملنے کے کارن، آج وہ بھارت جو پہلے سونے کا بھارت کہلاتا تھا، لاکھوں آدمی پیٹ کے لئے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ لیکن بھارت ماتا کے ان بچوں کو بھکاری بننے کے لئے کس نے مجبور کیا ——— تم امیروں نے! ان کو بھیک مانگنا کس نے سکھایا؟ دیش کے دکھ سے بے پروا تم دھنوانوں نے! ——— اگر تم امیر لوگ دیش کی پرانی کاریگری کی رکشا کرتے اور تم لوگ غیر ممالک کی کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے بدلے ملک کے کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو مول لینا اپنا دھرم سمجھتے۔ اگر تم اپنے روپئے زمین میں گاڑنے اور بینکوں میں جمع کرنے کے بدلے انھیں روپیوں سے آرٹ اسکول اور کارخانے کھول کر اپنے دیش کے بھوکے غریبوں کو کوئی ہنر یا دھندا سکھلاتے تو آج یہ سب دیش کی گلیوں میں بھیک مانگتے اور اسٹریلیا، فی جی، موریشس، کنڈا میں چنڈال پیٹ کے لئے بوٹ کی ٹھوکریں کھاتے کبھی نظر نہ آتے۔"

آغا حشر یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی اخلاقی، تہذیبی، تعلیمی و مذہبی مغربیت کی تنگ نظری سے آزاد ہو کر ملک و قوم کے سامنے اپنے اصل روپ اور رنگ میں آجائیں، مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ایک ایک کر دہی محسوسات کی دنیا میں اپنی اپنی شکل اختیار کر کے ہر فرد کے سامنے آئے اور اپنی اپنی کارکردگی سے خوابیدہ فطرت ہندوستانیوں کو بیدار کرے۔ ایسے اثرات تھیٹر ہال میں انسانی ذہن پر مکالمے اور اداکاری سے بالواسطہ پیدا ہوتے ہیں۔ حشر اپنے ڈرامے "ترکی حور" میں جو ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر کھیلا گیا تھا، ڈرامے کی افادیت کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبوں حالی کو رشیدہ کے ایک مکالمے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"ناٹک بھی سوتے ہوئے کو جگانے، اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش و جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لکچر سن کر برسوں میں پیدا ہوتا ہے، وہی جوش و جذبہ انسان کے اندر بہتر ناٹک صرف ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے۔"

اسی ڈرامے میں رشیدہ کے مکالمے سے وہ ہندوستانیوں کے مسائل حیات کی یوں نشان دہی کرتے ہیں۔

"ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا، اور سادے طور پر زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا۔ آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام، اور شراب کے نجس چھینٹوں کی مکھی بنا رہا ہے۔ امیر تو امیر، غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصہ چائے اور سگریٹ پر، اور دو حصے شام کے وقت شراب کی دکان پر

بینٹ چڑھا رہے ہیں ۔۔ مقبول عزتیں اور شراب خمار کی لہروں میں تندرستی، دولت، عزت سب کچھ تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔ ان برائیوں کا بیان بھی اس ناٹک کا مضمون ۔۔ اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف ملک کو توجہ دلانا بھی اس ناٹک کا مقصد ہے ۔۔"

کلکتہ میں۔ مڈنس اینڈ کو کے لئے ۱۹۲۰ء میں "ہیا پیارا مرت سندھر" ۱۹۲۲ء میں "جیسیم بنا" ۱۹۲۲ء میں "آنکھ کا نشہ" ہندی ناٹک لکھ کر حشر نے معاشرے کی پستی کو بار بار پیش کیا۔ آغا حشر کا وطن پرست دل اور ذہنِ رس شعور بار بار خفتہ ذہنوں کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ درخشاں ماضی کا آئینہ دار ہو جائے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے ہندی اردو ڈراموں میں اپنے آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی سے کرداروں کی تخلیق کی۔

۱۹۲۲ء میں حشر نے اپنی دوسری تھیٹریکل کمپنی (نیو تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ) کی بنیاد بنارس میں ڈالی۔ جو شہر در شہر کا دورہ کرتی ہوئی جب ۱۹۲۵ء میں پٹنہ پہنچی تو اس کمپنی کو مہاراجہ جو ہرکاری نے خرید لیا۔ اور حشر نے اپنا ہندی ناٹک "سیتا بن باس" جو بنارس میں ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا جو ہرکاری کے اسٹیج پر پیش کیا۔

حشر کی باشعور سیاسی بصیرت اس وقت اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ معاشرے میں کچھ بھی کا مفہوم اسی وقت معنی خیز ہو سکتا ہے جب ہندوستان میں اچھوتوں کا درجہ دوسرے ہندوستانیوں کے برابر ہو۔ "سیتا بن باس" میں شنبوک سے کلام کرتے ہوئے شری رامچندر جی کے مکالمے میں حشر کے خیالات کا یوں اظہار ہوتا ہے:-

> شری رامچندر جی ۔۔ " کیا برہمن، کشتری، ویش کے سمان شودر، پرش اور استری سے جنم نہیں لیتے ۔۔ منش سماج میں پل کر بڑے نہیں ہوتے ۔۔ منشیوں جیسا روپ، رنگ سبھاؤ، ہردے، بدھی، گیان، وویک نہیں رکھتے ۔۔ امیری، غریبی، مان، اپمان، امرت، وش، شراب اور آشیرواد کا بھید نہیں سمجھتے ۔۔ چھ رنگی اور شکتی کے ابھاؤ کے سوا ان میں، اور دوسرے منشیوں میں کیا بھید ہے ۔
> شنبوک جس کی جڑ کھوکھلی ہو وہ درخت۔ جس کے استھمب کمزور ہوں وہ چھت ۔۔ جس کی نیو ہل رہی ہو وہ گھر۔ جس کے نچلے بھاگ میں آگ لگی ہو وہ جہاز، اور جس پاؤں سے آدمیوں کو جیسے دھرتی میں جنم لینے کے کارن اپنے ماتر بھومی کے کروڑوں بچوں کو ہی جب لکھنا بھیا، ادھیکار ہیں، داس بنا کر سدا اپنے پیروں کے نیچے رکھنا چاہتے ہوں وہ دیش کبھی دیر تک سے تک سر اونچا کئے ہوئے، اپنی جگہ استھر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے شودروں کو بھی ساتھ کا پدوجیہ انگ جانو ۔۔ ان کے ساتھ نیائے کرو اور ان کی پکار کو بھی منشیہ کی پکار سمجھو ۔۔"

آغا حشر کی یہ قلمی تحریکیں جب اتنی کامیاب نہیں ہوئیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے تو ان کے ذہن میں ہندوستان کی عظمت کا جذبہ جاگ اٹھا ۔۔ یہ شرف اسی سرزمین بمبئی کو حاصل ہے۔ جہاں آغا حشر نے "امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی" کے اسٹیج پر ۱۹۲۹ء میں اپنا اردو ڈرامہ "رستم سہراب" پیش کیا۔ جس نے ہندوستانیوں کے ذہن میں خود اعتمادی کی ستح وطن کی اور گرد آفرید کے مکالموں کی للکار نے ان کے جذبات کو پیغامِ حریت دیا۔

> گرد آفرید ۔۔ " ایران کے دلیرو۔ یہ دوست نما منافق جس کے پاس مردانہ روح، شرم

ایماں کچھ نہیں ہے۔ ذاتی مفاد کی نگہداشت جس کا اصول، مطلب پرستی
جس کی زندگی کا معیار و معراج، اور دغا جس کا خمیر ہے، اپنی کمائی کی
دولت سے دل میں ہمت کے ابھرتے ہوئے جذبوں کو خشک کرکے تمہیں
بھی اپنی طرح مردود خلائق بنانا چاہتا ہے۔ خدا نے جسے اس مکروہ سازی و
غداری سے بچا لیا —— باؤلے۔ یہ اب اس دنیا میں دنیا سے کوئی علاقہ
نہیں —— وہ بھی تمہاری طرح اپنی زندگی کی مدت اور موت کے وقت
سے بے خبر ہے۔ اس لئے ٹیلے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی
طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو —— اٹھو۔ بڑھو —— مست ہاتھی کی طرح ہجوم کرو
آدمی کی طرح حملہ کرو۔ بادل کی طرح گرج کر، پھر بجلی کی طرح تلواریں
کھینچ کر حفاظت وطن کے لئے آگے بڑھو —— جہاں بزدلی ہے وہیں
شکست ہے —— اور جہاں جرأت ہے وہیں فتح ——

بمبئی سے کلکتہ واپس جانے کے بعد بھی حشر کلکتہ کے اسٹیج سے ۱۹۲۹ء میں "دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا" ۱۹۳۰ء میں "بھارتی بالک عرف سماج کا شکار"۔ ایسے ہندی ناٹکوں سے ہندوستانی ماحول کا تجزیہ کرنے میں ہندوستان کے کسی مصلح قوم سے پیچھے نہیں رہے اور ۱۹۳۱ء میں اپنا ہندی ناٹک "دل کی پیاس" لکھ کر انہوں نے اصلاح معاشرے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔

کلکتہ کی فلمی دنیا کو "شیریں فرہاد"، "عورت کا پیار"، "یہودی کی لڑکی"، ایسی شہرۂ آفاق ناطق فلمیں دینے کے بعد حشر بغرض علاج ۱۹۳۴ء میں لاہور گئے جہاں حکیم فقیر محمد چشتی نے ان کا علاج شروع کیا۔ مسلسل محنت نے حشر کی صحت کو خراب سے خراب تر کر دیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے لاہور میں ایک فلم کمپنی "حشر پکچرز" کی بنیاد ڈالی اور "بھیشم پتامہ" ڈرامے کی شوٹنگ میں منہمک ہو گئے۔ مرض میں افاقہ نہیں ہوا اور صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ آخر کار ڈراما نویسی کا وہ آفتاب عالم تاب جو [illegible] بمبئی سے ڈرامے کی دنیا میں طلوع ہوا تھا، اور اپنی ضو فشانی سے ہندوستانی اسٹیج کے ذرے ذرے کو درخشاں اور معاشرے کے ایک ایک ساتھی کو متحرک کر چکا تھا، لاہور میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو غروب ہو گیا۔ اور وہیں ۲۹ اپریل کو میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں مدفون ہوا۔ مگر اس کی ڈراما نگاری کا فن، اس کی خطابت، اور حقائق آشنا کردار شاہراہ تمثیل نگاری کے لئے، ماضی میں بھی مشعل راہ تھے، آج بھی ہیں، اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

یادِ رفتگاں: کرشن چندر

عظمت آدمی کے ساتھ دفن نہیں ہوتی لیکن —— واقعہ یہ ہے کہ ذہنی
روپ کے اس شہر میں کرشن ایک بھی ایسا پھیلا ہوا وجود نظر نہیں آتا جو مخالف
متضاد، رنگ برنگے چھوٹے بڑے ذہنوں کو ایک دوسرے کے نزدیک سمیٹ کر
بیٹھ جانے کو کہے کہ سب دیواریں اور سارے فاصلے ناپید ہو جایا کریں۔ یہ کمال
اس شخص میں تھا جس کی بڑائی تحریر و تصنیف کے علاوہ، حد درجہ خاکساری
اور وضعداری میں پوشیدہ تھی۔ ایک کرشن چندر کے اٹھ جانے سے ہماری روز
کی زندگی میں کیسی کمی ہو گئی ہے۔

عاشق آدمی تھے کرشن چندر۔ انھیں زندگی کی ہر ایک خوبصورتی سے عشق تھا،
خوبصورتی میں کہیں کہیں کانٹے بھی ضرور ہوا کرتے۔ بیچ زندگی ان ہی میں۔ مگر
شر انگیزیاں تو ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ عورتوں کے کانٹوں کی چبھن سے تو شاعری
بھری پڑی ہے۔ کسانوں کی سادہ زندگی کے حسن میں ان کی محرومی، افلاس اور
گھٹن کے علاوہ رسم و رواج کے گلے سڑے بندھن، شہر کے حسن میں دھاندلی، بے
ایمانی، ریاکاری اور نوع طرح کے جھمیلے۔ کرشن چندر حسن کو کانٹوں سمیت قبول کرتے
اور آہ، گناہ دونوں کو کبھی افسانوں اور ناولوں کی صورت میں، کبھی افسانہ نما
طنزیہ مضامین کی شکل میں ڈھال دیتے۔ جیسے یہ انفرادی تفریح تو ہوتی ہی ہے۔ کم و
بیش چالیس برس انھوں نے لکھا اور اس چالیس برس کی مدت میں ہماری قومی بلکہ
بین الاقوامی زندگی کا کون سا ایسا اہم واقعہ ہے جس کی لرزش ان کے قلم نے قبول نہ کی
ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ ایک اچھے مصنف تھے یا اپنے وقت کے بڑے
SEISMOLOGIS۔ کہ ان کی تحریروں نے لاکھوں بند ذہن خلا کے سوتے
ہوئے شعور کو جگایا اور جاگتے شعور کو حرکت و حرارت بخشی ہے

میں نے انھیں ۴۰ء میں پہلی بار دیکھا تھا، پستہ قد، موزوں ہاتھ پاؤں،
کشادہ پیشانی، ڈھلکی ذہین شرمیلی آنکھیں، بھرا بھرا سرخی مائل چہرہ، بے داغ،
نفیس مگر سادہ لباس۔ تب تک ان کی افسانہ نگاری کافی شہرت پا چکی [illegible]
نامور لوگوں میں شمار تھا، مگر وہ ادیبوں کے ایک جلسے میں آتے بھی تو [illegible]
اور سوائے چند ملاقاتیوں کے کسی کو ان کی موجودگی کا علم تک نہ ہوا۔ وہ دور چپ
رہے۔ اپنے منوانے کی ہر ایک کوشش سے بے نیاز تھے [illegible]
کبھی کسی پر مستعد ہوتے نہ دیکھا، نہ سنا، اور تو اور اپنے سے کمتر لوگوں [illegible]
کرنے میں وہ پہل کرتے اور ایسے دبکے لیے ہی بچھاتے، بھلاتے [illegible]
آپ جھیل جائے۔

میلے؟ بزدلی، اور گستاخی —— دونوں سے دل ہی دل میں ڈرتے تھا
ہم نے، مگر وہ ایک موقعوں کے سوا کبھی خفگی نہ برتی۔ میری [illegible]
انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ بعض اوقات اجنبی کے بے خبر نظر نے [illegible]
آدمی ایسی ہی، محالم محرک کرنے لگیں۔ کوئی میرے منہ پر زور زور سے [illegible]
لگے، ایسے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور میں وہاں سے [illegible]
کرتا ہوں یا پھر تماشے کی طرح گھس کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک بار دو واقعے [illegible]
سے کرشن چندر کے دو مختلف رخ دکھ گئے۔ واقعے یوں ہیں۔

غالباً ۱۹۵۹ء کی ایک شام تھی۔ میں ماسکو سے بمبئی آیا ہوا تھا۔ چند
روز کے لیے، اور دوسری شام کی پرواز سے باہر جا رہا تھا۔ اس روز کرشن چندر
نے اپنے چار بنگلے والے پرانے طرز کے بنگلے میں میری دعوت کی۔ ایک بڑے
عالم دین کی کار سے ڈرائیو لیے وہاں پہنچا۔ دس بارہ اہل علم موجود تھے اور
بدبخت فرقے کا دور چل رہا تھا۔ کھڑکیاں تک بند کر رکھی تھیں کہ کہیں شراب
بندی کے اخلاق سدھانے والوں کو بو نہ مل جائے۔ اندر سے دھواں اٹھتا اور
دھوئیں سے زیادہ جوش و خروش، ہنگامہ، [illegible]، پینا ایک تہذیب ہے۔
اور بد تہذیبی کا ایک بہانہ بھی، ہمارے قبیلے میں دونوں طرح کی مخلوق پائی

سید نعیم الدین

برار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء

اگر سلاطین دکن کے آبا و اجداد کا تعلق ایران و توران سے تھا اس لئے یہ فطری امر تھا کہ وہ اپنی موروثی ثقافتی زبان فارسی کو فروغ دیتے لیکن یہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ انہوں نے فارسی کے مقابلے میں بیشتر اپنے علاقے کی زبان یعنی دکنی اردو کو اہمیت دی اور خود بھی اس کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا اور اہلِ قلم کو بھی اس میں تخلیق و تصنیف کی ترغیب و تشویق کی ان کے علاوہ صوفیائے کرام کو بھی اپنا روحانی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے مقامی زبان سے بہتر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ غرض دونوں طبقوں کوششوں کے نتیجے میں دکن کے بعض مرکزی مقامات از قبیل بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی ہی میں قدیم اردو کے اہم مرکز بن گئے۔ برار دکن ہی کا جزو رہا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اٹھارھویں صدی سے ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

گو برار کی حالت ایک ادبی جزیرے کی سی تھی، تاہم برہانپور اور اورنگ آباد سے اس کے تعلقات تھے، اور شمالی ہند سے بھی اہلِ علم و ادب یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم برار کے مشہور شاعر غلام مصطفیٰ انسان شمالی ہند سے تشریف لائے تھے۔ ان کا انتقال ایلچپور ہی میں ۱۱۴۲/۱۷۲۹ میں ہوا۔ آزاد بلگرامی نے سروِ آزاد میں لکھا ہے کہ وہ علومِ ہندی سے اس قدر واقف تھے۔ کہ پنڈت اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ شعرِ ہندی (کبت اور دوہا) خوب کہتے تھے۔ (۱) انسان کے انتقال کے وقت دوسرے مشہور ایلچپوری شاعر آغا محمد امین وفا (پیدائش ۱۱۰۵/۱۶۹۳) تقریباً ۳۲ سال کے تھے۔ ان کی مدح میں تذکرہ گلشنِ گفتار بھی رقم ہوا۔ وفا کے معاصرین میں نورالدین حسین خان رنگین (م ۱۲۰۲) رسالہ ابوالمکارم (م ۱۱۴۵/ [illegible]) شاہ غلام حسین ایلچپوری اور دولت شاہ علی کے علاوہ سیوری، مہدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور ان میں غلام حسین کی سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غلام حسین کا زمانہ ولی کے بعد کا ہے جن کی تاریخ وفات ۱۱۳۳/۱۷۲۰ اور ۱۱۳۸/۱۷۲۵ کے درمیان مانی جاتی ہے (۲)

حضرت غلام حسین کا زمانۂ حیات ۱۱۲۹ – ۱۱۳۰/۱۷۱۶ – ۱۷۱۷ اور ۱۲۱۰/۱۷۹۵ء کے درمیان ہے۔ اس وقت شمالی ہند ہی میں نہیں دکن میں بھی سراج اورنگ آبادی (م ۱۱۷۷) اور عزلت (م ۱۱۹۰) کے ہاتھوں زبان نکھرنے لگی تھی، اور اس پر فارسی اسلوب حاوی ہونے لگا تھا، لیکن دیوانِ غلام حسین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے، کہ برار جیسے دور افتادہ علاقے

۱) آزاد بلگرامی 'سروِ آزاد' ۱۹۱۳ ص ۴۲، ۴۵ (۲) جمیل جالبی 'تاریخ ادب اردو' جلد اول ۱۹۷۷ء ص ۵۳۹

دل کو اپیل کرتا ہے۔ پچھیں سے فضا بھر بھر کر جانا، بادلوں کا چاند کو گھیر لینا، دیکھی کا اپنے آشنا کی طرف اُڑانا شام کے اندھیرے کا چھا جانا، یہ سب دیہاتی زندگی کی بڑی حسین اور موثر علامتیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی اور دوغزل گو فارسی غزل کے سانچے میں ڈھال چکے تھے، اور شمالی ہند میں میر، درد، وغیرہ فارسی رنگ میں رنگی ہوئی غزلیں پیش کر رہے تھے۔ اس زمانے میں طریقۂ اظہار کی آئینہ داری غزل ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے کہ دیوان غلام حسین کی دیگر غزلوں میں ایرانی اسلوب جاری ہے۔ کہیں کہیں سعدی، رومی اور حافظ کے اثرات جھلک اٹھے ہیں۔

غلام حسین نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں لگن نامہ ایک زمانے میں ایلچپور کی میلاد خوانوں کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھیں، یہ نہایت دلکش تمثیلی نظم ہے جس میں روح کو دلہن قرار دے کر اس کے اصل مقام یعنی عالم آخرت سے لو لگانے کی بات کی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

تم کو اے سہیلیاں بیٹھے بھی سناؤں
لگ کا ان دھر سنو تو پیو سو لہا سلاؤں

غلام حسین کی دوسری نادر نظم "یکجہتی نامہ" کا موضوع ہندو مسلم اتحاد ہے، یہ اس موضوع پر اردو کی سب سے قدیم نظم ہے۔ اس میں وہ کبیر کے انداز میں ظاہر پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی خبر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

مسلمان تسبیح لیں پھرا دیں
و ہندو بھی مالا بغل کے دکھائیں
دکھاتے ہیں لوگن کو ملنے پھرا کر
آپس من کا نہ پھیریں ہرا کر
بغل میں پھیرن کر کا لیکے دفتر
نہ جیہیں بہت چتر کا ایک انچھر

اس طرح کرشن کے دوست اودھو پر لکھی ہوئی ان کی نظم اودھو نامہ، اودھو پر مستقل حیثیت سے تصنیف سلسلہ پہلی اردو نظم ہے۔ غلام حسین نے ہندی کی مشہور صنف سخن جھولے کو بھی اپنایا ہے۔ شاعری اس کے اظہار کے لئے دوہے، چوپائی اور سورٹھے کے ساتھ ساتھ جھولن بھی کار آمد ہو جاتا ہے۔ چھاگال سنگھ کے نزدیک اس کی ۲۲ اور رفعت گجرال کے خیال میں اس کی ۲۰ ذیلیں ہوتی ہیں۔ اردو میں یہ صنف سخن بہت کم استعمال ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے غلام حسین کا جھولنا نامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ اعادہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ غلام حسین کی موضوع بحث غزل اور ان نظموں سے اکثر کو میں ۱۹۵۷ اور اس کے بعد کے "نوائے ادب" اور "اردو ادب" کے شماروں میں منظر عام پر لا چکا ہوں۔ اس وقت مولوی عبدل کی روضۃ الواصلین کا مختصراً تعارف کرا دوں۔ اس میں دوہرے اور اردو دوہے جیسی ہندی اصناف سخن تو ملتی ہی ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی نے ایک نظم "فی لسان الہند" لکھی ہے اور دوسری "بزبان گوالیاری" علاوہ ازیں انھوں نے ہندوستانی موسیقی کی طرز میں بھی کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ غرض روضۃ الواصلین کی بھی بڑی لسانی اہمیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایلچپور اور دیگر مقامات کے برادری حضرات نے قدیم اردو میں بڑی وقیع منظومات پیش کی ہیں۔ ہندی نرتے ہی سے منسوب انیسویں صدی ایلچپور کے نواب خاندان کے ایک فرد نواب حامد الدین خاں نے جرنیل کے تخلص کے ساتھ بڑی سادہ اور دلکش زبان میں شاعری کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں انگریز کے قدم جم چکے تھے۔ چنانچہ نواب اسی احساس کے تحت کہتے ہیں۔

اپنے تئیں متابعت دل منظور ہے
تم بھی چلے چلو جہاں انگریز نے چلے

جرنل کا دیوان ۱۲۳۱ھ میں مکمل ہوا۔ منشی حشمت رائے متخلص جانباز نے اس کی تاریخ تکمیل لکھی ہے (ورق ۱۴۳ ب) دیگر علاقوں کی طرح اس وقت برار کی بھی حالت اچھی نہیں تھی

وہ بیدے شاعر ہیں یعنی انہیں پڑھتے ہوئے بہت کچھ ذہن میں خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہو کو کبھی خدا نہ دکھائے وہ ساعتیں
دور روزِ زندگی کیلئے اشکبار ہوں
چمکتی ہے اگر اے باغباں تقدیر گلشن کی
جلائے بجلیاں برباد میرا آشیاں کر دیں

قیصر تمام عمر مصائب میں مبتلا رہے لیکن ان میں بڑی جرأت و جسارت تھی چنانچہ انھوں نے ستمگار پر غم ہونے کے باوجود غم گسار بننے کی بات کی:

ہجوم رنج میں بھی غم گسار ہو کے چلو
چلو جدھر کو نسیم بہار ہو کے چلو

قیصر کے مجموعہ کلام طوفان و ساحل (مطبوعہ دہلی ۱۹۵۰ء) کی تقریباً ہر نظم و غزل میں ان کی فنی دسترس کی شہادت ملتی ہے قیاس کہتا ہے کہ زبان و فن پر یہ قدرت قیصر کو اس زمانے کے مشہور شاعر و شاگرد حضرت حبیب الرحمٰن صدیقی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ موصوف نے مرہٹی زبان کے مشہور شاعر موریشن بھٹ کو اپنی زبان میں غزل لکھنے کا شوق بھی آپ ہی کی صحبتوں میں ہوا گورنمنٹ اردو ہائی اسکول امراوتی کی معلمی کے زمانے میں ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی آپ کے تربیت یافتہ اردو سخنوروں میں قیصر کے علاوہ رشید کیفی اور شارق نیازی کے اکثر اشعار ان کے لطافتِ احساس کا شاہکار ہیں بالخصوص موسیقیت کلام شارق کی بھی امتیازی خصوصیت ہے اس خوش لفظی نے ان کے یہاں خاص کر غم و اندوہ کی ترجمانی میں بڑا پرتاثیر حسن پیدا کر دیا ہے شارق کا یہ شعر ان کے احساس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ ان کی قدرتِ تخئیل پر دلالت کرتا ہے:

ہوا ہی اڑا گئی شارق پیام شوق کی بات
ہمارے کام نہ آئی صبا کی نامہ بری
(ص ۲۲، صبح کا ساقی، آکولہ ۱۹۶۹)

غرض کلام شارق میں جو کلاسیکی رچاؤ اور سوز ہے وہ انہیں کا حصہ ہے

ڈاکٹر منشا کا کلام بھی اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہے جب وہ "قوالے برل" سناتے ہیں یا "ذکر جاناں" کرتے ہیں تو شاعرانہ ہی چھا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب "ذکر جاناں" کے ہی نہیں "مکمل دیوان" کے بھی قائل ہیں اور یہ کام بھی انھوں نے نہایت مشاقانہ انداز میں انجام دیا ہے انکی "تضمینات اقبال" بھی طلب ہیں۔

دیگر شعرائے جدید جو جانے پہچانے نام ہیں۔ خورشید آرا بیگم، بلند اقبال بیگم، گل نیشاں بیر، افسر جیزدی، رشید الله خاں جوہر، مشرف امراوتی، سوا خاں، اثر بالاپوری، حفیظ خاں حمد، نانبا بالاپوری، مشکل انکاری، افسر آفاقی، میر عنایت علی، احمد کار بجمی، اللہ خاں فردوسی، سوز شوری، اسیر، شریف ایلچپوری، عبدالصمد جاوید، جوش ایلچپوری، بسمل آکلوی، طالب آکولوی، شاہ عقدی، فخر ایلچپوری، منظر احمد سبحانی، متین ایلچپوری، مشتاق نقوی، افسر، مہتاب شادانی، نعیم ناہی، بابائے عقل، آفتاب عرفی، حفیظ، صاحب رائی، مردان علی خاں رعنا، ذاکر صدیقی، ضیا صدیقی۔

ملک کی ملازمت پسندی کی تحریک کے زیر اثر دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تقریباً ۱۹۵۰ء سے شاعری نے نئی کروٹ لی اس رجحان کے مبلغین نے شاعری کو ایک مستقل مخترع فن کی حیثیت سے دیکھا اور برتا اور اپنے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی استعمال اور محسوس پیکروں پر زور دیا اس قبیل کی نئی شاعری کے ممتاز نمائندے مرتضیٰ رضا قاضی سلیم، ناگپور میں مدحت الاختر اور ہمارے علاقہ برار میں سید مصطفیٰ ہیں۔ نئے قسم کے گیت لکھنے والوں میں متین ایلچپوری اور نئی طرز کی غزل لکھنے میں ضیا صدیقی نے امتیاز پیدا کیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ برار میں شروع سے آج تک بہت سے شعر اردو کو سنوارنے والے موجود رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بمطابقت زمانہ قدیم و جدید، مسلکی، وطنی، ترقی پسند اور نئی ہر قسم کی شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ آج بھی یہ کارواں خدمت زبان و ادب کی غزل کو طرف رواں دواں ہے

ٹیسو کے پھول بسنتی ہے دیکھے ہیں کوئلے
آن جنوں میں آگ برہ کو لگا بسنت

ہولی میں عوام کے ساتھ ساتھ ہمارے شعرا نے بھی رنگ سے جھولی بھری ہے: حاتم کہتے ہیں۔

مہیا سب ہے اب اسباب ہولی
اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی

گلی پیچکاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے

کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری
کوئی چمپا برن عمروں میں تھوڑی

آبرو کے معاصر فائز (م ۱۷۳۸) نے یہاں کی جوگی اور تنبولن پر نظمیں کہیں اور پنگھٹ کی تصویر بڑے دلربایانہ انداز میں کھینچی۔ ہیں پنگھٹ پر گھڑا ان کو دیکھ کر ارسی، رجھا اور ادھکا یاد آجاتی ہیں۔

اسی زمانے میں دکن میں شاہ تراب چشتی، مولوی مہدوی ایلچوری اور غلام حسین ایلچوری نے برادران وطن کے بعض تصورات اپنے کلام میں جگہ دے کر ان سے ذہنی قربت کا احساس دلایا۔ شاہ تراب نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ ہندوی کے مذہبی اور فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم گیان سروپ میں اپنے وطن ترکال کے مندر کا ذکر کیا ہے اور من سمجھاون میں پانچ بانی اور مولانا عارف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں من سمجھاون سب سے مشہور ہے جسے ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے الگ الگ بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ من سمجھاون دراصل مراٹھی کے سنت کوی رامداس کی مناچے شلوک کا آزاد ترجمہ ہے۔ باہمی قربت کے لیے محض ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کافی نہیں بلکہ دوسرے کے مذہب و ثقافت سے کچھ الفاظ و اصطلاحات سے واقفیت بھی مطلوب ہے۔ اسی طرح صحیح معنوں میں رواداری کی ماہیت کشادہ ہوتی ہیں اور ہم میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم اصلی عام رواج سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سعدی کا نام و نشان نہیں چنانچہ غلام حسین اپنی نظم یک رنگ نامہ میں جسے میں ہندو مسلم دھرم پر اردو کی قدیم ترین نظم سمجھتا ہوں کہتے ہیں:

دیں سوں اس بھانت کیوں ہو سنہ آئے
بہیں آکے جھگڑا لڑائی کا سمجھا سئے

غلام حسین نے کبیر کے انداز میں ہندو مسلم دونوں کو ان کی ظاہرداری پر لعن طعن کیا ہے:

مسلمان اللہ کا نام بولیں
وہ ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں
زباں سوں کہیں دل سوں لپے نباریں
وہ حاضر کو غائب سمجھ کر پکاریں

اصل تہذیب تہذیب نفس اور تزکیہ باطن سے عبارت ہے:

ڈاکٹر شیخ فرید

اُردو صحافت اور تحریکِ آزادی

دنیا کی صبح ، محبت کی شام ہے اُردو
کہ اتحاد و وطن کا پیام ہے اُردو

اُردو زبان و ادب اور صحافت نے آزادی کی جنگ میں شروع سے حصہ لیا۔ تحریکِ آزادی کے فروغ، اشاعت اور کامیابی میں اِس زبان اور اس کے بولنے والوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ اِسی زبان نے

"انقلاب زندہ باد"

کا ولولہ خیز نعرہ دیا۔ ہماری زبان کے ادیبوں، شاعروں نے ۱۸۵۷ء کے پہلے، ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی آج تک رائے عامہ کی تربیت اور ہمدردی میں قومی اور ملی جذبات کو ابھارنے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہے۔ ہمارے صحافیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اپنے قلم سے لوہا لیا۔ ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ احتجاج کیا۔ ان کے غائر مطالعے سے آزادی کی کہانی اردو کی زبانی ، آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اِس موضوع پر جو کام ہوا ہے وہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔

عبدالرزاق قریشی کی "نوائے آزادی"
خلیق انجم کی مرتبہ — "ضبط شدہ نظمیں"

وغیرہ قابلِ ذکر ، اہم تصانیف ہیں۔ رسائل اور جرائد کے "جنگِ آزادی نمبر" بھی شائع ہوئے ہیں۔ "صحافت" پر کام کم ہوا ہے اور جو ہوا ہے وہ رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ مسودات کی شکل میں ہے۔

"جنگِ آزادی میں اُردو صحافت کا حصہ" صبر آزما اور وقت طلب موضوع ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے تمام اردو اخبارات کا مطالعہ فرصت اور عمر کا تقاضا کرتا ہے۔ اِس راہ میں جو "ہمت شکن" مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان سے اہلِ نظر واقف ہیں۔ جہاں اور جن کے قبضہ میں یہ متاع گراں مایہ ہے۔ وہ اُسے ہر نظر سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اداروں میں یہ سرمایہ اس طرح محفوظ ہے کہ اُسے سورج کی دھوپ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان سے کون کہے کہ "اس کو بچا بچا کے نہ رکھیں"۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ تمام سرمایہ یا سرمایہ کا بڑا حصہ کسی ایک جگہ دستیاب نہیں ہوتا۔

میرے مضمون کی ناکامی اور تشنگی میں ، ان موانعات کے علاوہ ، میری علمی بے بضاعتی اور محدود مطالعے کو بڑا دخل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اِس موضوع کے تفصیلی بیان کیلئے سفینہ درکار ہے۔ اور یہاں "علم" سینہ اور سفینہ دونوں میں نہیں ہے۔

صحافت ۔

صحافت کیا ہے؟ حقائق اور واقعات کے بیان اور آگاہی کا صحافت ہے ۔ صحافت زندگی کے حقائق کی ترجمان ہے ۔

ادب زندگی کا عکاس ہے ۔ ادب اور زندگی میں گہرے رشتے ہیں غالباً اسی تعبیر کے پیش نظر برنارڈ شا، نے کہا ہے ۔

ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM

• تمام اعلیٰ ادب صحافت ہے "

صحافت کا زندگی اور ادب سے جو گہرا تعلق ہے وہ ظاہر ہے ۔ زندگی اپنے ارد گرد کے واقعات سے ناتا جوڑے ہوئے ہے ۔ ان واقعات کے تانے بانے سے ادب بنتا ہے ۔ ادب کے ذریعہ انسانی جذبات اور احساسات ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔ یہ تمام عناصر صحافت کا مواد ہیں ۔

جمہوری دور میں، عصر جدید میں صحافت کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ صحافت میں زبردست قوت ہے ۔ اگر صحافت حق و عدل، خیر و فلاح کے لئے کام کرے تو انسانیت کے لئے ایک عظیم طاقت ہے ۔ وہ حاکم و محکوم کے درمیان ایک رابطہ ہے ۔ عوام و خواص کے درمیان ایک رشتہ ہے رائے عامہ کو ہموار اور متاثر کرنے کا مؤثر ادارہ ہے صحافت معاشرتی، عمرانی اور سیاسی آثار پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ ان کو بناتی ہے ۔ بدلتی ہے ۔ آزادئ رائے کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے ۔ قلم میں زبردست طاقت ہے ۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر ابو الفضل کے قلم سے ڈرتا تھا ۔

ولیم اسٹیڈ نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ • اخبار نویس کی صورت دیکھ کر شیطانوں کا باوا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے "

آخری زار روس نے کہا تھا ۔ ۔ ۔ • اے قلم، تو نہایت خوبصورت ہے لیکن میری سلطنت میں تو شیطان سے بھی بدتر ثابت ہوا "

جمہوریہ وینزولا (امریکہ) کے مسٹر کا قول ہے ۔ ۔ ۔ • اگر جہنم کا بھی پھاٹک کھلا دیکھوں تو آنا نہ ڈر سکوں گا جتنا اخبار نویس کے قلم سے ڈرتا ہوں "

صحافت اور پہلی جنگ آزادی ۔

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی لڑی گئی ۔ اس میں ناکامی نے عوام و خواص کو ایک نیا حوصلہ دیا ۔ ناکامیوں کی بنیادوں پر آزادی کی جد و جہد دوبارہ شروع کی گئی ۔ اس مہم نے قربانی ۔ ترک (تیاگ) اور اہنسا کے ذریعہ برطانوی سامراج کے روشن آفتاب کو " گھور اندھیارے " کے غار میں ڈھکیل دیا "

اس جد و جہد میں، سیاسی، سماجی، مذہبی، قومی رہنما شامل تھے، ابتدا میں بادشاہ دہلی بہ نفس نفیس جنگ میں شریک رہا ۔ ہر قسم کے پیشہ ور تھے ۔ معمولی کلرک سے لے کر اعلیٰ حاکم تک شریک تھے ۔ صحافی بھی

ص ۱ / ص ۲ / ص ۳ الہلال ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء ص ۱ (مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ)

میدان میں آگے رہے[1]
پہلی جنگ آزادی کے دوران صحافت ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ ملک میں مختلف پرچے جاری تھے۔ ان کا
مزاج — شعر وسخن۔ ادب۔ قانون۔ مزاح۔ ہزل۔ مذہبی مباحث۔ وغیرہ امور کے دائرہ میں محدود تھا
جدید علوم سے بے خبری تھی۔ اخبارات میں اداریئے ([illegible]) نہیں ہوتے تھے۔ مرقعوں کے
تحت، مختلف شہروں کی خبریں یک جا کر کے شائع کی جاتی تھیں[2]

اس عہد کے چند اخبارات یہ ہیں :-

دہلی کے اخبارات :- اردو اخبار ۱۸۳۶ء — مظہر الحق ۱۸۴۳ء — سید الاخبار ۱۸۴۳ء — صادق الاخبار
کریم الاخبار ۱۸۴۹ء۔

پنجاب کے اخبار :- کوہ نور ۱۸۵۰ء — دریائے نور — لاہور گزٹ ۱۸۵۵ء۔

سیالکوٹ کے اخبار :- ریاض الاخبار — چشمہ فیض ۱۸۵۲ء — خورشید عالم — ہمائے بے بہار (لاہور)
نور علی نور — وکٹوریہ پیپر ۱۸۵۳ء۔

ملتان کے اخبار :- ریاض نور ۱۸۵۲ء — شعاع الشمس ۱۸۵۴ء — گلزار پنجاب ۱۸۵۰ء۔
مطلع الانوار ۱۸۵۳ء۔

بنارس کے اخبار :- زائرین ہند — باغ وبہار — بنارس گزٹ — آفتاب۔

انیسویں صدی کے نمایاں اخبار :— مہذب لکھنؤ۔ ہندوستانی (لکھنؤ) قیصر الاخبار — احسن الاخبار (الہ آباد)
اکمل الاخبار (دہلی) پنجابی اخبار (لاہور) رفیق ہند — آفتاب پنجاب (لاہور)
کشف الاخبار (بمبئی) شمس الاخبار (مدراس)۔

دکن کے اخبار :— شمس الاخبار — جریدۂ روزگار — اخبار صبح — طلسم حیرت — عمدۃ الاخبار
یادگار زمانہ — ظہیر الاسلام — مظہر العجائب — تحفہ — احسن الجرائد — حدیقۂ شعراء
حاکم — مخبر دکن — نیر آصفی — آفتاب دکن۔

قاسم الاخبار — میسور اخبار — منشور محمدی — خورشید دکن — آصف الاخبار —
ہزار داستان — اخبار آصفی — دکن اخبار — افسر الاخبار — ملک وملت —

پنجاب :— اخبار عام — پیسہ اخبار — وکیل۔

۱؎ خطبات گارسن دتاسی۔ خطبہ نمبر ۹ ص ۴۱۸
۲؎ شولاپور کی ایک خبر ملاحظہ کیجیے گا۔

مذکورہ بالا اخبارات کے متعلق چند مختصر معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اردو اخبارات نے کیسا کردار ادا کیا۔ اور ان اخبارات کے ایڈیٹروں کو مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو اخبار (دہلی) کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ صادق الاخبار کے ایڈیٹر کو تین سال کی سزا ہوئی۔ کئی اخبارات نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی سلطنت کے زوال نے چند اشتہارات نکلوائے۔ بعض اخبارات میں فرقہ وارانہ مضامین شائع ہونے لگے۔ اس طرح اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اشتہارات نے تحریک کا ساتھ نہ چھوڑا۔
گلشن نوبہار پر مقدمہ چلا۔ پریس ضبط کر لیا گیا۔ ریاض الاخبار پر بھی یہی قیامت گذری۔ چند اخبارات بند ہو گئے کچھ نئے اخبار سامنے آئے۔

رفتہ رفتہ بغاوت کی آگ سرد ہوئی۔ حالات سنبھلنے لگے تو زبان کی سختی کم ہوئی۔ تو کئی اخبارات نکل آئے۔ ان میں سے بعض مشہور ہوئے۔

اس دور میں لکھنؤ ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اودھ اخبار، ہندوستانی اور اودھ پنچ — نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ان اخبارات نے ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی۔ اودھ پنچ مسلسل برطانوی حکومت سے برسرپیکار رہا۔ قومی تحریک میں اس کا خاص رول رہا ہے۔[1]

بعض اخبارات مثلاً کوہ نور، ہما (لاہور) سرکار کی وفاداری کے گیت گاتے رہے۔ ان کے عنوانات "مژدہ فتح دہلی" جیسے ہوتے تھے۔ دیکھئے! غلامی کا طوق کتنا حسین ہوتا ہے۔ جادوئے محمود سے ایاز کی بے بصر آنکھیں اسے "سازِ دہری" تصور کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ "اس دور کی صحافت میں کوئی سیاست نہ تھی"۔[2]

علامہ یوسف علی نے "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ اخبارات کی خبریں عموماً افواہوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ باغیوں کی ترتیب و تنظیم سے ان کو سروکار نہ تھا۔

اس کے برعکس "جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اخبار" ہی تھے "لکھنؤ کے سحر سامری" نے واجد علی شاہ کی معزولی کا ذکر بڑے حسرت ناک انداز میں کیا ہے۔

بقول احسن مارہروی — مصنف تاریخ نثر اردو — لکھنؤ کے "طلسم اخبار" نے واجد علی شاہ کے خلاف انگریزوں کی مفسدانہ حرکات کا پوست کندہ حال (بیان) شائع کیا ہے۔

صادق الاخبار برطانیہ کا کٹر مخالف تھا۔ اس اخبار نے شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئی — سلطنتِ برطانیہ کے ختم ہونے کی اطلاع — شائع کی تھی۔ اس کی اشاعت کی پاداش میں اسے تین سال کی سزا ہو گئی تھی۔

نوائے آزادی میں قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ

"دہلی اردو اخبار میں ہندوستانی ریاستوں اور دہلی کے دربار کی خبروں کے ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر گرانی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض

۱۔ مثالیں ضمیمہ میں دی گئی ہیں۔
۲۔ نگار ۱۹۲۵ء

سمجھتا تھا اس کے ذہن میں سیر اسفرپ ہندو مسلم اور سکھ کا امتیاز نہ تھا۔ ملا

اس اخبار میں انگریزوں کے ظلم و ستم کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ یا سازش ہوتی تھی مولانا امداد صابری نے لکھا ہے۔ کہ
"لاہور اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ کنور نہال سنگھ نے دوست محمد خان (والی افغانستان) کو لکھا ہے کہ تمہارے ساتھ ہو کے میں
مقابلہ سپاہ انگریز کا کروں اور فرزند خاں مذکور کو طلب کیا ہے۔ کہ میں انکو فوج سکھ کا سپہ سالار بناؤنگا۔ اور مشہور ہے کہ نیپالی لوگ
بھی اس سازش میں شامل ہو جائیں گے۔" ملا

ہندوستان کے علاوہ غیر ملکوں میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہو رہا تھا۔ اس قسم کی خبریں طلسم لکھنؤ
نمایاں طور پر شائع کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شولاپور میں ۱۸۵۶ء میں بغاوت کی خبر ملاحظہ کیجئے۔

"شولاپور۔ صاحب ناظر کو کسی نے خبر دی ہے۔ راقم نے اس کی یہ نقل کی ہے کہ جب سے لشکر انگریز مہم فارس کی طرف
روانہ ہوا ہے۔ یہاں ہر اشرار بر سر فساد ہے۔ رعایا کے روپیے تباہی ہوا ہے۔ خصوص قوم روہیلہ سرکشی سے روپیے
آزار ہے۔ قتل و غارت ان کا شعار ہے۔ اہل شہر کا خوف ...... سے برا حال ہے کہ گھروں کے ساتھ کمن نہ ہے۔ یہ خیال
ہے جب ۲۷ رجمنٹ نے کوچ کیا۔ غارتگروں نے موقع پاکر یہ امر پیش کیا کہ نواح شہر کے اکثر گاؤں اور قریہ کو لوٹا۔ وہاں
کے باشندوں پر تکلیف کا آسمان ٹوٹا۔ ۲۰ویں ماہ گذشتہ (۲۰ دسمبر ۱۸۵۶ء) کو جب ۲۵ رجمنٹ وہاں سے روانہ ہوئی۔
تعلقہ پور کا گاؤں لوٹا۔ ظلم کیا۔ کیا دہرا۔ تب بچے کے سوار گرفتاری کو بڑی تیاری اور سامان سے گئے۔ اور بہت
روہیلے اسیر ہوئے۔ پابہ زنجیر ہوئے۔ مگر اس پر مفسدوں کو دشواس نہ ہوا سیاست حاکم سے ہراس نہ ہوا۔ تھوڑے
دنوں کے بعد شیخ پور کے متصل موضع ۔۔ برسلو ۔۔ میں ڈاکہ زنی ۔" ملا

انیسویں صدی کے اواخر میں صحافت نے نیا موڑ اختیار کیا۔ انکار کی آزادی کی قدر فرمی۔ پنڈت گوپی ناتھ کے اخبار عالم
در گلرلوی محبوب عالم کے پیسہ اخبار اپنے مراد ، کی پیش کش اور معیار کے لحاظ سے مقبول ہو چکے۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس زمانہ میں کانگریس کے نصب العین ۔ آزادی ۔ کی حمایت کرنے والے ۔ اودھ پنچ
ہندوستان ۔ ایڈوکیٹ (لکھنؤ) اور قیصر الاخبار تھے۔

اودھ پنچ حکومت کے سخت خلاف تھا۔ حکومت پر سخت تنقید کرتا تھا۔ اس کے الفاظ سخت، تخاطب کا انداز بھی سخت
ہوتا تھا۔

گلیڈسٹون ۔۔ وزیر برائے ہند ۔۔ کو لکھا۔

"گلیڈسٹن ۔۔ مگر اب نیک نامی کا ذکر اتہار سے ہی سر ہے۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ اس کے مستحق تم ہی ہو میں نے
تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ رفاہ و اصلاح، آرائش و زیبائش ظاہری غیر تمام
اور بری ایپ پوٹ کے لئے تمہاری ذات مخصوص ہے۔ مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب
سے تم ایسے محروم ہو جیسے ہندوستانی جودت سے تم پولیٹیکل دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت
گار ہو۔ پکا پکایا کھانا اور تیار ہانڈی تم خوب چن سکتے ہو۔ مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول۔"

ملا نوائے آزادی ص۶ / تاریخ صحافت اردو ص۲۵

ملا تاریخ صحافت اردو ص۱۲۵ ملا اردو صحافت کی تاریخ ص۱۲۵

بھاجی کے پھول تم نہیں جانتے۔ کہ اس پالیسی کا مزہ فقرا اور مستین کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔

کہتے ہیں جو کڑوی بھی مزیدار لذت ہے۔ اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے۔ . . . .

تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کو تمہارے سپرد ہوں۔

مہاراجہ کشمیر کو تخت نشینی کے بعد ایک تہنیت خط لکھا۔

"مہاراجہ صاحب ـــ آپ کی طرح عالم میں پیدا ہوا ہے مورث کائنات میں وہ بیچ ہے کہ ہر شخص محتاج بندوں ما ناز نظر آتا ہے

مگر تم جانو

میری نگاہ بلند انوازی سے آج تک کبھی نیچی پڑی ہی نہیں۔ اور خاص کر جب عمل بر وقت دیکھتا تھا۔ اپنے مذہب میں آئی پر

چوکنا محافظ اور گناہ دونوں خیال کیا جاتا ہے۔ . . . .

آج کل ریذیڈینٹ کا تقرر بہتوں کو فکر میں ڈالے ہے۔ تمہاری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ بر محل کارروائی کرنے والے

لوگ کاٹ کے منتظر رہتے ہیں والیان ملک کچھ آتے دن تو رہتے نہیں۔

قابا لو اگر م ہے۔ پیٹا جائے۔ مگر میں تم کو ایک گر

بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کرنا مگر اوستان نہ کھونا

قیام ریذیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے"

یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب مہاراجہ کشمیر۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور ان کو ریذیڈینٹ

کے تقرر اور قیام کو منظور کرنا تھا۔

اودھ پنچ کے علاوہ دوسرا کون ان لفظوں میں مہاراجہ کو ہدایت کر سکتا تھا۔

زمانہ ۱۸۸۰ء کے مختلف شماروں میں "بھارت متر" کے ایڈیٹر ـــ بال مکند گپتا ـــ نے اودھ پنچ کے بارے میں

لکھا۔ کہ اس میں کئی خوبیاں تھیں۔ تین خاص خوبیاں یہ تھیں

(۱) آزادی سے لکھتا تھا۔ موقع کی دل لگی کرتا تھا

(۲) وہ جانتا تھا۔ کہ اس ملک کے لئے کس قسم کی پالیسی درکار ہے۔ رعایا کا طرفدار تھا

(۳) زبان صاف تھی۔

لکھنؤ کے ہندوستان کے بارے میں گپتا کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

"اس نے شروع ہی سے ملکی معاملات میں ہاتھ ڈالا

اور ملکی معاملات پر آرٹیکل لکھنا شروع کیا

"مدراس میں کانگریس ہوتے ہی پریسیڈینٹ گھوش

کی تقریر کا پورا ترجمہ ہندوستانی کے ایک ہی نمبر میں شائع کیا۔ . . . . . . وہ جو کچھ لکھتا تھا۔ بہت آزادی سے

نڈر ہو کر لکھتا تھا:

لاہور کے رفیق ہند کی بھی یہی پالیسی تھی۔

مدا شارب رودلوی۔ مقالہ۔ اودھ پنچ۔ ادیب علی گڑھ ص۳۰

بیسویں صدی سیاسی اعتبار سے تیز تر تھا اخبارات سے شروع ہوئی۔ زمیندار۔ الہلال۔ ہمدرد۔ ہندوستانی۔ ان میں نمایاں ہیں۔ وکیل (امرتسر)۔ وطن (لاہور)۔ اردوئے معلیٰ (حسرت) مدینہ (بجنور)۔ مسلم گزٹ (لکھنؤ) وغیرہ آزادی کے نقیب تھے۔

الہلال میں مولانا آزاد نے

— الجہاد فی سبیل الحریت —

کے عنوان سے جو مقالات قلمبند کئے۔ اس میں قوم کو انگریزوں کی شاطرانہ چال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"ہندو مسلمانوں کا سوال بھی

ایک بازیگر کا کھیل ہے"

مولانا جوہر نے فروری ۱۹۲۰ء کے کامریڈ میں لکھا کہ

"ہندو مسلم اتحاد کا جو مسئلہ ہندوستان کے اتحاد میں حائل ہے۔ ان شکوک اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں جو دونوں طرف سے اس لئے پیدا ہوئیں کہ ان لوگوں پر ایک جعلی قسم کی نوبت مسلط کرنے کی بے سود اور احمقانہ کوششیں کی گئیں"

حسرت کے اردوئے معلیٰ کا انداز ملاحظہ کیجئے۔

"ہم لوگوں کا فرض ہے کہ امر حق کے اظہار میں باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین کامل رکھتے ہوئے راہ حق میں جو مصائب آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے حاصل نہیں ہوا کرتی۔

یہ جو حکومت کی جبروت سے بظاہر تحریک حریت کو شکست فاش ہوئی ہے۔ اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

سردست ہمارے نزدیک ہر محب ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمت دفاعی یعنی Passive Resistance کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے۔ بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے"

اردوئے معلیٰ۔ مئی ۱۹۱۳ء صا

بیسویں صدی کے اوائل میں خصوصاً ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان پریس کے قوانین زیادہ سخت بنا دئے گئے تھے۔ کئی اخبارات قانون کی گرفت میں آگئے۔ خلافت تحریک نے کئی اخبارات — ہمدرد۔ اردوئے معلیٰ — زمیندار — خلافت — وغیرہ کی اشاعت میں اضافہ کر دیا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۴ء کا طویل ہنگامہ خیز دور ہے۔

"جنگ عظیم کے بعد صحافت" کے جائزہ کے پہلے اس لب و لہجہ کا اندازہ ضروری ہے جو ہمارے آزادی کے نقیب اخبارات کا خاصہ تھا۔ ملاحظہ کیجئے —

"اصلاحات کے سلسلے میں امید کی جاتی ہے کہ برٹش حکومت میں نوآبادیوں کو بھی حق دیا جائے گا۔ اور اگر اس میں

مطالعہ صحافت۔ پاک و ہند میں [illegible] خورشید الاسلام [illegible]

ہندوستان کے حقوق کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ تو اور بہت زیادہ بے چینی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان اس ذلت کو ہرگز برداشت نہ کریگا۔ کہ اس کی قسمت ایسے لوگوں کے تصرف میں آئے جو اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھیں "

خطیب جنوری [illegible]

"ہوم رول کے مطالبہ کا عام انکار ......

...... سارے ہندوستان میں غیظ و غضب

کی آگ بھڑکا دے گا "

خطیب مئی [illegible]

جنگ آزادی میں ہمارے صحافیوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ سیاسی طنز نگاروں میں مولانا آزاد ۔ قاضی عبد الغفار ۔ مولانا ظفر علی اور محمد علی جوہر ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ مولانا ظفر علی خاں سیاسی طنز کے بادشاہ تھے۔

یہ خوبی ان کو ورثہ میں اپنے والد بزرگوار ۔ مولوی سراج الدین احمد خان ۔ مالک و مدیر ۔ زمیندار ۔ سے ملی تھی۔ انھوں نے دلچسپ اور دلکش پیرایۂ ظرافت میں مختلف پولیٹکل اور سوشیل امور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضامین زرپال ؟ کے نام سے مختلف کتابچہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں ۔

ایک سادہ کسان کی دعا ۔

زمیندار ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۰۶ء

"اے میرے اچھے خدا! مجھے معلوم نہیں کہ تو کون ہے؟
کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ مگر مولوی صاحب بتلاتے
ہیں کہ تو ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تیرے ہونے میں شک نہیں...

اے اللہ میاں، میں نے کبھی کوئی قصور نہیں کیا اگر کبھی کچھ کیا ہے
تو مجبوری اور لاچاری سے کیا ہے ۔ میں نے نیل والے صاحب
کی بھینس چرائی ۔ مگر نیل والا صاحب جان بوجھ کر اس بھینس کو
میرے کھیت میں چھوڑ دیتا تھا۔ اور میری کھیتی کو برباد کرایا
کرتا تھا۔

اے خدا! انگریزی راج کے امن و آسائش اور ترقی نے
تمام ہندوستان حصہ لیا۔ اور سوا میرے تمام ملک کے فرقے
خوش حال اور فارغ البالی سے گذارہ کرتے ہیں ....

اے خدا! ایک سو کھا سڑا بنیا میرے گاؤں میں اگر کبھی تر از د

مارتاہے۔ کبھی دھوکہ بازی کرتاہے۔ کبھی نئی چال چلتی رقیب
دسیاکرتاہے۔ کبھی سودور سودے میرا الجھ جاتا ہے۔

دیسی ریاستوں کے متعلق ایک تجویز۔

زمیندار۔ یکم اپریل ۱۹۱۲ء

• جس طرح ہندوستان کے مختلف انتظامی شعبوں میں خرابیاں اور نقائص پائے جانے پر ہر ایک صیغہ کی اصلاح ودرستی کے لئے کمیشن مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی طرح دیسی ریاستوں کی حالت کی اصلاح کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور اس کو ہدایت کی جائے کہ جو خرابیاں دیسی ریاستوں میں بالفعل موجود ہیں ان پر ایک مفصل ومبسوط رپورٹ لکھ کر پیش کریں؟

اس کام کو جس خوبی سے دیوان سنگھ مفتون نے ریاست (ہفتہ وار) میں کیا۔ وہ ہماری صحافت کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

لارڈ مارلے کی آخری تجویز۔

یکم اپریل ۱۹۱۰ء

ہزاکسیلنسی لارڈ منٹو نے.....

کلکتہ کی روز افزوں آبادی کے مضرت سے متاثر ہوکر یہ فرمایا تھا۔ کہ گو یہ آبادی اسی طرح بڑھتی گئی۔ اور جیسے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پایہ تخت کلکتہ سے تبدیل کیا جائے تو میں رنگون یا کشمیر کے سوا کسی دوسری جگہ کی سفارش کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ خبر آج تک بالکل کانفیڈنشل رہی ہے اور تاحال کانفیڈنشل ہے اور کانفیڈنشل طور پر اس وقت وزیر ہند سے خط وکتابت شروع ہوگئی ہے۔"

صحافت۔ جنگ عظیم کے بعد

جنگ عظیم کے بعد ایک انقلابی اور ہنگامہ خیز سیاسی دور آیا۔ اس دور کے اثرات اور تقاضوں سے کئی اخبارات ــــ روزنامے، ہفتہ وار ــــ منصۂ شہود پر آئے حکومت کی پابندیوں اور سختیوں کے باوجود اخبارات کا سیلاب نہ رک سکا۔

اس دور میں اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ پریس چھین لئے گئے۔ ایڈیٹر قید وبند کی ابتلا میں پھنس گئے۔ مگر زبان اور قلم پر قدغن لگانا آسان نہ ہوا۔

۱۹۱۹ء کے بعد زمیندار نے ایک نئی کروٹ لی۔ مولانا ظفر علی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ پریس ضبط ہوا۔ اس کے شعلہ بیان ایڈیٹر ــــ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر تھے۔

۱۹۱۹ء کے بعد، لاہور سے سیاست نکلا۔ یہ اخبار تحریک خلافت اور ترک موالات کا ترجمان تھا۔ جلیانوالہ باغ کے سلسلے مورد عتاب ہو کر ضمانت اور پریس کھو بیٹھا۔ ایڈیٹر گرفتار ہوگئے۔

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے پیغام جاری کیا۔ اس اخبار نے تحریک خلافت اور ترک موالات کی زور دار ترجمانی کی۔ اس کے فلسفے کے تعلق سے معرکۃ الآراء مضامین اداریئے لکھے لوگوں کو عدم تشدد (اہنسا) کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔
حکیم اجمل خاں کی سرپرستی میں قاضی عبدالغفار نے دہلی سے صباح نکالا۔ حکومت کی سخت گیری کے بارے میں لکھا کہ

"گو میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ دفتری اقتدار کا پنجہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی اخباروں پر زیادہ آسانی سے چلایا جاتا ہے لیکن یہ بھی کچھ اپنے آزادگوں سے واقف ہو گئے ہیں کہ اگر ایک دفعہ ان کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔ تو پھر دوبارہ جنم لے ہوئے روپ میں جلوہ افروز ہو کر اپنے عزم و استقلال کا ثبوت دیئے بغیر نہیں رہتے" ۱

اس دور میں صحافت نے عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی۔ تحریک ترک موالات۔ تحریک ہجرت کی تبلیغ کی۔ ان کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا۔ جلیان والا باغ اور دیگر روح فرسا سانحات اور جگر خراش واقعات کی المناک پیرایہ میں تفصیلات بیان کیں۔
ڈاکٹر اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:-

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مسجد کانپور کی شہادت کے بیان میں اہل صحافت کے قلم نے جو خون کے آنسو روئے ہیں۔ ان کی سرخی سے ادب کا دامن آج تک تابناک ہے۔ شبلی کا پُر درد نوحہ اور سید سلمان کا المناک نثری مرثیہ — "یہ زمین پیاسی — (اہلال) ...... آج بھی ہماری نظروں کے سامنے اس قیامت خیز منظر کو پیش کر دیتا ہے۔
ان تحریروں اور بیانات نے عام ذہن میں انقلاب کی جوت جگا دی۔ رائے عامہ بدلتی گئی۔ اخبارات نے بے باکی اور بے خوفی سے قابل تحسین انداز میں اپنے فرض کو ادا کیا۔ قربانیاں دیں۔ اس عہد کی صحافت کی سب سے بڑی خدمت عوام کے دلوں سے حکومت کے خوف کا اخراج تھا۔
اخبارات کی تعداد میں روز افزوں اضافے ہوتے گئے ان کی مقبولیت کے دو ذریعے تھے۔

۱۔ بے خوفی ۔ بے باکی
۲۔ عوام کی ترجمانی

جن اخبارات نے صحافت کی آزادی کو برقرار رکھا۔ ان کو حکومت کے سخت قوانین اور دار و گیر کی وجہ سے قربانیاں دینا پڑیں۔ سیاسی اور صحافی حالاتِ حاضرہ پر منظومات پیش کی گئیں۔ زمیندار کے مزاحیہ کالم — "افکار و حوادث" — نے دھوم مچا دی — اس کے پہلے یہ کالم — "اپریل فول" — کے نام سے تھا۔
سیاست کے راز و نیاز "حریم حکومت کے پردے اٹھا دیئے" اور ہر کس نا شندہ "راز ہو گیا۔

---

۱ صحافت پاک و ہند میں ص ۴۱۱

وہ ے دل " را نے سرت کے سرایہ ہ " اور آنکھیں رموز سلطنت کی آئینہ دار ہو گئیں۔
۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۴ء تک صحافت کا انداز معمول رہا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک حقوق کے لئے جد وجہد شروع ہو گئی۔ زمیندار
اور ہمدرد کی پالیسی نمایاں تھی۔ الہلال (آزاد) نے ایوانِ حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ آزادی کے متعلق الہلال
کی تحریریں اپنا اثر کرتی رہیں۔ اس نے لکھا کہ

" جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس لئے بہتے دیکھتی ہے
کہ وہ آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے
یقیناً وہ آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی
۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

مدیر شاہد: فضل کے اقوال کے تحت۔

" ہمارا مطالبہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے
ہمارا مطالبہ صرف ایک لفظ ہے
" آزادی "
ستمبر ۱۹۲۲ء

۱ ستمبر ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں مرقوم ہے کہ

" انقلاب کا موجب نہ تنہا جماعتیں ہوتی ہیں نہ صرف
افراد۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں
اور ایک نئی فضا تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

الہلال کے مضامین اور طرز بیان کے عام سیاسی اثرات ونفوذ لطوالت کا باعث ہونگے۔

اس دور کے چند خاص اخبار یہ ہیں۔
انقلاب۔ احسان۔ سیاست۔ احرار۔ مجاہد۔ نیشنل کانگریس۔ زمزم۔ پاسبان۔ الجمیعت۔ ہمدم۔
پیام۔ مصر جدید۔ ہند۔ خلافت۔ ہلال۔ ہمدرد۔ الامان۔ وحدت۔ حق۔ سرفراز۔ شہباز۔ اجمل۔
مختلف روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات قومی مسائل پر متفق رہے بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ مگر تمام
اخبارات بدیسی راج کے خلاف آواز بلند کئے ہوئے تھے۔ آزادی کے خواہاں تھے۔
۔اس دور میں صحافت ایک دار العلوم کا درجہ رکھتی تھی۔ بغیر ساز وسامان کے بھی " صحافت کا سپاہی "
آزادی کی لڑائی لڑتا تھا۔

اجمل پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ اخبار ملت۔ دہلی نے لکھا تھا۔
اجمل کی زندگی اور کامیابی سے ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر
سرمایہ کے کوئی اخبار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے۔
کہ خلوص ونیک نیتی اور سچائی بھی کوئی سرمایہ ہے "

مختصر یہ بات یہ ہے کہ

"بلٹ کے کارکنوں کو بھی یہی دلی یقین ہے کہ اگر ہم ایماندار ی
فرض معاملی، خلوص اور نیک نیتی سے کام کریں گے تو
ہمارے کام کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی"

۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۰ء تک کی صحافت تمام سیاسی مسائل، حالات اور واقعات کی آئینہ دار ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس
کے نظریات نے مسلم اخبارات کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا۔ ۱۔ نیشنلسٹ
۲۔ مسلم لیگی

ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی، فسادات کے زور نے صحافت کی سطح کو بلند نہیں ہونے دیا۔ کوئی خاص ترقی نہیں
ہوئی۔

۱۹۳۵ء کے بعد ۱۹۳۹ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جنگ کے بعد سیاسی آزادی کے دور کے آنے کی امید تھی نئی
اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا۔
جوش نے کہا تھا کہ

نادان گر رہے ہیں کہ حاصل ہوا اتفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے۔

۱۹۴۲ء میں کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں کوئٹ انڈیا کا نعرہ بلند کیا۔ تمام لیڈر گرفتار ہوگئے۔
۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوگیا۔
اس دور میں صحافت کا معیار نہیں بدلا۔ گروہی صحافت کو عروج حاصل ہوا۔

مختصر یہ کہ
آزادی کی جدوجہد میں صحافت نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے اخبارات لب ولہجہ میں نرمی تھی
بعد میں تیزی پیدا ہوگئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس میں تندی آگئی۔ آزادی سے متعلق ایک ذخیرہ ہمارے پاس
جمع ہوگیا۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں ایسا مواد نہیں مل سکتا۔ جو عام و خاص ذہن کو بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کرسکے
اپنے مطالعہ کی بنا پر میں یہ بات یقین اور دعوی کے ساتھ کہتا ہوں / ہمارے صحافتی محاذ میں —

- جیل بھرو تحریک
- عدم تعاون کی تحریک
- خلافت تحریک
- بدیسی مال کا بائیکاٹ

وغیرہ تھے۔ اس ادبی تحریک کے زیرِ اثر عوامی تحریک پروان چڑھتی رہی برطانوی سامراج اور جاگیردارانہ تہذیب کی مسلط کی ہوئی
غلامانہ ذہنیت کا مقابلہ کیا گیا۔ ہماری صحافت نے قومی شعور کو بیدار کیا۔ نیشنل کانگریس وجود میں آئی تو اس کے نام الکلام سے
لوگوں کو آگاہ کیا۔
غیر ملکی حکومت سے ٹکر تھی۔ حاکم و محکوم کا پیچیدہ اور نازک رشتہ تھا۔ صحافت بے باک اور بے خوف رہی۔
نئے قوانین کے نفاذ کو بادی النظر میں محکوم قوم کے حق میں مفید سمجھا گیا۔ مگر یہ سب سیاسی داؤ پیچ تھے۔ حکومت

رن نے ان سے ہماری تہذیب پر، زندگی پر مہلک وار کئے۔ صحافت نے ان ضربوں کے نشانات بتلائے۔
ہم کو اپنی تہذیب سے محبت سکھائی ۔ اتحاد کا شعور پیدا کیا۔ ہمارے چند عمرانی، معاشرتی، اقتصادی
مسائل بھی تھے۔

ملک میں محنت کش طبقہ —— کسان مزدور
متوسط طبقہ
دولت مند طبقہ

نکر و نظر کے مختلف زاویے رکھتا تھا۔ ان کا اختلاف اور پریشانیاں آزادی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ ہمارے
اخبارات نے ان رکاوٹوں کو بڑی عمدگی سے دور کیا۔

۱۔ عوام کے احساس کو بیدار کیا
۲۔ ان کو مقابلہ کا شعور اور ہمت عطا کی۔

کر وہ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنی درماندگی، غربت کس مپرسی اور بدحالی کو دور کریں۔
ہمارے اخبارات نے جرأت سے کام لیکر عام سماجی برائیوں پر نشتر زنی کی۔ اور اس طرح سماجی تعمیر کی مستحسن خدمت
انجام دی۔ لوگوں کی گراں خوابی کو دور کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو مغربی سیاست کی شاطرانہ چالوں کی پول کھولنے پر آمادہ
کیا۔

عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اخبارات کا زیادہ حصہ ہے۔
متذکرہ امور پر مثالیں فراہم نہ ہو سکیں۔ ادھر ادھر سے چند اشارات دیے گئے ہیں۔
اس مضمون کو "اعلان بیداری" اور "اعلان آزادی" کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔
اخبارِ عالم —— ۱۰ر مارچ ۱۸۸۲ء

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستان! بڑھو!	آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں، بڑھو!
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو	کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو!
بیٹھے ہو، یا تھک کے کیوں کنجِ غم میں تم	دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں، بڑھو!
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے	چلاتا رہا ہے طوطیِ ہندوستان، بڑھو!

۱۹۴۷ء میں ۱۵ر اگست کو جب آفتابِ تازہ، "اپنی بغل میں صد گردشِ شمس و قمر لئے ہوئے"، "سامانِ صد ہزار بہاراں"
کے ساتھ طلوع ہوا، تو وجد نے "اہلِ نظر" کو یوں مبارک باد دی۔

گلشن کا، انقلاب نے نقشہ بدل دیا	شاہین شکارِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج
سب تاجرانِ طوق و سلاسل چلے گئے	اے وجد! لطفِ عرض تماشہ ہنر ہے آج

معین شاکر

تحریک آزادی میں حسرت کا رول

ہندوستان کی تحریک آزادی میں حسرت موہانی کا مطلب صد اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک ان کی تحریریں تقریریں اور عملی کارنامے جدید ہندوستان کی جدوجہد میں عام طور سے اور مسلمانوں کی سیاست میں خاص طور سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ انہوں نے خلافت تحریک کے زمانے میں یعنی ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس میں (احمد آباد) مکمل آزادی کی تجویز رکھی حالانکہ خلافت تحریک بہت پہلے اور ۱۹۲۱ء کے بعد بھی ان کی شخصیت کی چھاپ آزادی کی جدوجہد پر کافی گہری تھی لیکن اس کو حسرت موہانی کی بدقسمتی پر محمول کیجئے یا مسلمانوں کی کمزور سیاسی روش کا شاخسانہ، تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا۔ ان پر لکھنے والوں نے زیادہ تر توجہ ان کی شاعری پر کی، ان کی سیاست کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کچھ مضامین جو ان کی سیاست اور سیاسی رول کے بارے میں لکھے گئے ہیں وہ تشنہ اور سرسری نوعیت کے ہیں ان کو پڑھنے سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ حسرت ایسے تمام سیاستدانوں کے جو ہر ایک سے اختلاف کرتے تھے یا جھگڑا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں شاذ و نادر ہی ذکر ملتا ہے۔

آزادی ملنے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں آزادی کی جدوجہد کے بارے میں اچھا خاصا کام ہو رہا ہے۔ کچھ مغربی اور امریکی محققین نے بھی اس سلسلے میں اچھی تحقیق کی ہے۔ لیکن کسی نے اب تک آزادانہ طور پر حسرت کی سیاست کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کا ذکر عام طور پر ان کے ان ساتھیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی سوجھ بوجھ حسرت کے مقابلے میں یقیناً کم درجہ کی تھی۔ وہ کانگریس سے وابستہ رہے لیکن کانگریسیوں نے انہیں چھوڑ دیا، وہ مسلم لیگ میں رہے لیکن مسلم لیگیوں کو بھی ان سے کوئی محبت نہیں رہی (شاید اسی لئے پاکستانی مورخین بھی حسرت موہانی کا ذکر زیادہ نہیں کرتے)

حسرت موہانی کے رول کے ساتھ اس ناانصافی کے وجوہات کئی ہیں، کچھ بنیادی نوعیت کی ہیں اس لئے ان کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ ہندوستان میں ایسے مورخین اور سیاستدانوں کی کمی نہیں ہے جو مسلمانوں کے رول کو آزادی کی تحریک میں منفی اور فرقہ پرستانہ سمجھتے ہیں، یونیورسٹیوں میں اور یونیورسٹیوں سے باہر ایسے انٹلیکچول موجود ہیں جو اس واہمہ MYTH کو دہراتے رہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے انگریزوں کی مخالفت نہیں کی۔ کانگریس سے علیحدہ رہے۔ کانگریس کے اجلاسوں میں ان کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ علیحدگی پسند تحریک شروع کی اور پاکستان کا مطالبہ کیا۔ یہ سب نصف سچائیاں ہیں اور معاملہ اگر اتنا ہی سادہ ہے تو تاریخ اور تاریخ نگاری اور تاریخی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ مؤثر پروپیگنڈہ تو ہو سکتا ہے، صحیح تاریخ نہیں ہو سکتی۔ مؤثر پروپیگنڈہ اسی لئے کہ ابھی تک تحریک آزادی کا علاقائی اور طبقاتی نقطہ نظر سے بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے۔ اگر تحریک آزادی کو کچھ رہنماؤں اور افراد کی تاریخ سمجھا جائے گا تو نتائج بہر حال گمراہ کن ہوں گے۔ مسلکی طور پر لکھے جانے والی تاریخ میں حسرت کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ دوسری وجہ جو تحریک آزادی کا کردار اور اس کا تجزیہ ہے یہ پیچیدہ مسئلہ ہے پہلی بات تو یہ کہ تحریک آزادی کو کانگریس کی تاریخ سے جوڑ دیا جاتا ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں ۱۸۸۵ء سے پہلے ہونے والی ساری تحریکیں اور ساری قربانیوں کو تحریک آزادی سے الگ کر دینا پڑے گا دوسری غلط فہمی یہ بھی ہوتی ہے کہ کانگریس کا مسلک، قومیت اور کانگریس سے وفاداری لازم ملزوم ہے۔ یہ مشکل یہ بھی چلی آتی ہے کہ کانگریس میں

سامنے رکھا۔

جب ترکی کی سالمیت اور ادارۂ خلافت کے تحفظ کا سوال درپیش آیا حسرت موہانی خلافت تحریک میں شامل ہو گئے۔ یہ سچ ہے کہ خلافت تحریک میں کئی اعتدال پسند علماء اور مسلم رہنما شامل تھے اس کو گاندھی جی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف کانگریس کو کئی مسلم رہنما فراہم کئے بلکہ علاقائی رہنماؤں کو کل ہند سطح کا رہنما بھی بنادیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کی یہاں مثال دی جاسکتی ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خلافت تحریک میں کس رہنما نے کیا رول ادا کیا، اس کا تجزیہ بہت کم کیا گیا ہے اور شاید اسی لئے جو مقام حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کو ملنا چاہئے وہ نہیں ملا۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے رہنماؤں کے اختلافات کانگریس اور گاندھی جی کے بارے میں رویّہ، تشدد اور عدم تشدد کے اصول کے بارے میں مختلف رائے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کے وسائل وغیرہ کے سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

حسرت موہانی طبیعتاً گرم تھا اور اپنے اصولوں کی وجہ سے خلافت تحریک کو ہمیشہ زیادہ ایجیٹیشنل اور زیادہ پُرزور بنانا چاہتے تھے خلافت کا مسئلہ مذہبی تو تھا ہی لیکن حسرت موہانی اسے سراسر سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس تحریک کو مخالف سامراجی خطوط پر چلایا جائے اس کے لئے دستوری طریقے موثر نہیں ہوسکتے تھے اس لئے انہوں نے جارحانہ ([illegible]) طریقوں کو بڑھاوا دینے پر زور دیا۔ گاندھی جی سے اختلافات کی شروعات یہیں سے ہوئی سنہ ۱۹۱۹ء میں جب گاندھی جی سے حسرت موہانی، شردھانند اور شنکر لال بینکر نے کہا کہ خلافت کا مسئلہ کو پنجاب کے مارشل لاء سے بھی جوڑنا چاہئے تو گاندھی جی نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ پنجاب مارشل لاء ایک مقامی مسئلہ ہے جب حسرت موہانی نے کہا کہ اکثریت کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہوگا تو گاندھی جی نے دھمکی دی کہ وہ خلافت کی تحریک سے الگ ہو جائیں گے نومبر سنہ ۱۹۱۹ء میں دہلی کی خلافت کانفرنس میں حسرت موہانی نے برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویز رکھی گاندھی جی اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے لیکن بنگال خلافت کانفرنس (فروری ۱۹۲۰ء) نے جب اس تجویز کو مان لیا تو گاندھی جی نے مخالفت ترک کردی اسی طرح جون سنہ ۱۹۲۰ء میں حسرت نے اعلان کیا کہ اگر برطانوی تسلط کو ختم کرنے کے لئے افغان فوج ہندوستان میں آئے گی تو وہ اس میں شامل ہو جائیں گے، اس کی تائید شوکت علی، آزاد، سبحانی اور ظفر علی نے بھی کی، شاید یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی نے کھل کر سنہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی کے کھدر اور صبر کے اصول کی مخالفت کی۔

حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا اہم واقعہ سنہ ۱۹۲۱ء کا احمد آباد کا کانگریس اجلاس تھا اس کی سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی نے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس کا مقصد مناسب اور موثر طریقوں سے کامل آزادی ہونا چاہئے کامل آزادی کے بغیر خلافت کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوسکے گا حسرت موہانی نے یہ بھی کہا کہ اگر مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آتا ہے تو ہندوستانیوں کو بندوق کی گولیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے عدم تشدد اور ترک موالات کا اصول ناکارہ ثابت ہوگا۔ ضروری ہے کہ خود حفاظتی کے لئے تشدد کے اصول کو مان لیا جائے اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت گاندھی جی کی ان کے خیال میں جب تک ہندو مسلم اتحاد کا خواب حقیقت نہیں بن جاتا کامل آزادی کے تصور کو کانگریس کے لائحہ عمل میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرے لفظوں میں گاندھی نے یہ کہا کہ مکمل آزادی کے لئے ماحول سازگار نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "حسرت موہانی کی اس تجویز سے مجھے رنج ہوا کیونکہ اس سے احساس ذمہ داری کی کمی کا پتہ چلتا ہے"

گاندھی جی مخالفت کے باوجود حسرت موہانی نے یہ تجویز واپس نہیں لی اور اس کو کانگریس کے عام اجلاس میں پیش کردیا۔ یہی تجویز جب مسلم لیگ کی سبجکٹ کمیٹی کے سامنے آئی تو اس کی مخالفت

حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری اور سید رضا علی نے کی یہ تجویز ۲۶ کے مقابلے میں ۲۲ ووٹوں سے رد کر دی گئی لیکن اس کے بعد بھی حسرت نے کامل آزادی کے تصور اور بہ تشدد استعمار کی مخالفت کو ترک نہیں کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اعلانیہ اپنی تقریروں میں تشدد اور گوریلا طریقۂ جنگ کی تبلیغ کی مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ تقریر کی:

"یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو یونائیٹیڈ اسٹیٹس آف انڈیا کا اعلان کر دیا جائے۔ لیگ کے جو مقاصد ہیں وہی کانگریس اور خلافت کے بھی ہیں صرف مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت مسلم لیگ سے مخصوص ہے۔ چاہئیے یہ کہ اول سوراج حاصل کیا جائے اور اس کے بعد حقوق کی حفاظت ...... اگر گورنمنٹ خلافت اور پنجاب کے مسائل طے نہ کرے تو مسلم لیگ کا مقصد کامل آزادی سے بھی زیادہ ہونا چاہئیے۔"

۱۹۳۵ء کی اصلاحات سے قبل حسرت موہانی نے شیخ حسین قدوائی، آزاد سبحانی، سید ذاکر علی سید حسین، ریاض کے ساتھ مل کر ایک آزاد سیاسی پارٹی کی تشکیل کی۔ یہ کامل آزادی کے حصول کے لئے اور ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی یہ ایک مخلصانہ کوشش تھی۔

حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور سیاست کا ایک اہم پہلو انتہا پسندانہ سیاست پر یقین ہے وہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کئے جانے کو جائز سمجھتے تھے یہ ہندوستانی انتہا پسندی کی روایت رہی ہے بال گنگادھر تلک، آربندو گھوش اور بپن چندر پال نے مذہب کو سیاست کا جزو لاینفک بنایا قومی آزادی، اتحاد، وغیرہ کی تعبیر اور تشریح بھی مذہبی اصطلاحات میں کی۔ چونکہ انہیں اعتدال پسند گروہ سے اختلاف تھا اس لئے اپنی تحریک کو عوامی بنانے کے لئے مذہب کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے۔

حسرت موہانی شاید مسلم رہنماؤں میں تلک کے سب سے بڑے مداح تھے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہندو انتہا پسندی کے خلاف اردو اخباروں نے اور اعتدال پسند مسلمانوں نے جیسے امیر علی محسن الملک وغیرہ نے سخت تنقید کی لیکن حسرت موہانی کے خیالات پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔

"پالیٹکس میں ہم معتمدانہ وطن پرستان مسٹر تلک اور مسٹر گرو امراد بابو آربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازمی سمجھتے تھے چنانچہ اس حیثیت سے [illegible] کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی اپنی مسلم لیگ یا [illegible] کانگریس سے ہے اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق بجانب ہے۔"

تلک کی شخصیت ان کے لئے زیادہ پرکشش اس لئے تھی کہ وہ تلک کو حریت اور وطن پرستی کا سب سے بڑا نمائندہ مانتے تھے۔ تلک کی قربانیوں، حق گوئی اور اصول جمہوریت پر ایقان، حسرت کے نظریات سے میل کھاتا تھا اردوئے معلیٰ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"جو تلک اپنے ہم وطنوں کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ظاہری اور باطنی قابلیتوں پر اعتماد کر کے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی ضائع شدہ قوت و جبروت کو یقیناً دوبارہ حاصل کر لیں گے غرض کہ جن کی عمر کا ہر لحظہ اسی فکر میں گزرتا ہے کہ کسی طرح ہندوستان اور اہل ہندوستان کو آزادی نصیب ہو۔"

حسرت موہانی بھی تلک کی طرح دستوری طریقوں سے بے زار تھے کیونکہ بیرونی سامراجی حکومت میں دستوری اور حقوق کی بات بے معنی ہوتی ہے اس لئے انہوں نے سودیشی برطانوی مال کا بائیکاٹ

اور دفاعی مزاحمت کی حیثیت نہ تھی۔

"ہم نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ ان تمام تحریکوں کی اعانت
ہر حال اور ہر وقت اپنا فرض لازمی سمجھتے ہیں اگر تحریر کے ذریعے سے ممکن
نہ ہوگا تو تقریر کے ذریعے اور اس سے نہ ہو سکے گا تو عمل کا اعلان
تحریر و تقریر دونوں سے زیادہ مفید اور زیادہ ضروری ہے اس
سے ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" ۱۰

حسرت موہانی قانونی طریقوں کے کھلے مخالف تھے۔ لوگ واقف تھے اسی لیے کہتے تھے کہ قانون
برطانوی سامراج کی ہی حمایت اور حفاظت کرے گا اور اس کو نافذ کرنے والے اسے محکوموں کے خلاف
ہی استعمال کریں گے۔

جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ، پولیس کے ماتحت افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹوں
کو جس کی تردید کا (بعض ملزم کو کوئی موقع نہ ملتا ہے) نہ مل سکتا ہے بغیر مقدمہ سے قبل ہی کر دیا کریں گے
جب تک وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وارنٹ جاری کریں گے اور پھر خود ہی اس کا انصاف
کرنے بیٹھیں گے اس وقت تک مقدمات میں عموماً پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً انصاف پانے کی
امید کرنا اوّل درجے کی حماقت ہے کیونکہ پولیٹیکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی ہو جاتی ہے کہ
ملزم کو اکثر انگریزوں اور فرنگی حکومت کا دشمن کہا جاتا ہے اور اس خیال سے یورپین مجسٹریٹ کے دل میں
اس کی جانب سے بعض کدورت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اس کو الزام نہیں
دے سکتے۔" ۱۶

اس خیال کے پیش نظر حسرت نے کبھی تشدد کی بات کبھی گوریلا جنگ کی بات کی اور کبھی دفاعی
مزاحمت کی۔ دراصل دفاعی مزاحمت کا اصول شری آربندو نے پیش کیا تھا لیکن اس کی تائید میں
حسرت موہانی نے لکھا اس پر شری آربندو کو بھی رشک ہوگا۔

"حاکم سے محکوم اپنے ملکی حقوق کو تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں
اوّل درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دست طلب دراز کر کے جس کا بے کار ہونا
قطعی ثابت ہو چکا ہے دوسرے خون ریزی اور فساد کے ذریعے حاکم کو مغلوب
اور مجبور کر کے جس کی بنا بر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی پس ہمارے لئے
سوائے اس کے اور کوئی کارروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم
گداگری کی ذلت گوارا کریں جنگ و جدل کی آزمائش میں پڑیں بلکہ ان
دونوں سے علاحدہ رہ کر دفاعی مزاحمت کے درمیانی طریقے پر چلنا شروع کر دیں
جو مفید ہونے کے بجائے کبھی مضر ہو ہی نہیں سکتا اور یہی وہ بات ہے جس
کی بنا پر مزاحمت کی پالیسی کو طلب کی پالیسی پر صریحاً ترجیح حاصل
ہے کیونکہ بحالت ناکامی گداگر کی طبیعت مایوسی کے ایسے غار میں گر جاتی
ہے جس سے دوبارہ نکلنا اس کے لئے بالکل محال ہو جاتا ہے لیکن برخلاف
اس کے مزاحم اگر ناکام بھی رہے تو دوران مزاحمت میں ایسی قوت اور تجربہ
حاصل ہو جاتا ہے اس کا فائدہ کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔" ۱۸

گاندھی جی سے اختلاف کی وجہ یہی تھی کہ حسرت نے عدم تشدد کو اصول کے طور پر کبھی بھی نہیں
مانا انھوں نے بار دولی پروگرام کو صرف اس وجہ سے رد کر دیا کہ جب مذہب تشدد کی تلقین کرتا ہے

اقدام نظر دو کو کیسے مانا جا سکتا ہے۔ حسرت موہانی نے اسی عقیدت اور اسی خلوص کے ساتھ سودیشی کی حمایت کی "ایک سودیشی اسٹور کھول کر سطحیت کی رو سے" مصنفہ "کی ہے سے کر سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "نمرود کی ماں حسرت نے کبھی اولیٰ نظر گذاری کیونکہ وہ کمیل ولایتی" تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت موہانی کے نظریات پر تلک کے فلسفۂ سیاست کا اثر کتنا واضح تھا؟

حسرت موہانی نے تلک سے یہ بھی سیکھا کہ ہندستان کی آزادی دراصل یہاں کے محنت کش طبقوں کی آزادی ہوگی۔ ان کی فلاح و بہبود کے لئے یہاں کی قومی تحریک، سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو اس مقصد کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہی بات حسرت موہانی کو کمیونزم کی طرف کھینچ لائی۔ انقلاب روس کے بعد ہی حسرت موہانی نے ہندستان میں بھی ایسے نظام کے قیام کے لئے اپنی شاعری اور اپنی تقریروں میں تبلیغ شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں خلافت کانفرنس ہوئی، اس کی صدارت حسرت موہانی نے کی۔ اس میں حسرت موہانی نے بھی حصہ لیا۔ ان کی تقریر میں بالشویکی قسم کے پیش قدم کا رجحان نمایاں تھا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ہی حسرت موہانی کانپور میں ایک نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کانفرنس ہوئی اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حسرت موہانی تھے ان کے خطبۂ استقبالیہ کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بنا پر کمیونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے ہم لوگ عدم تشدد کو ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے ہو۔"[۲۳] کمیونزم کے پرچار کو وہ آزادی کی تحریک کا ایک جز سمجھتے تھے۔

"آزادی کامل کا کل جائز طریقوں سے قائم کرنا سوراج کی ہیئت سوویت ری پبلک کی طرح ہو جہاں کمیونزم کے اصولوں پر عمل کیا جائے۔ سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں، مزدوروں کی فلاح اور آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندستان کی سیاسی جماعت کے اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک یہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے۔ کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے۔"[۲۳]

حسرت کمیونزم کے روح کو سمجھتے تھے اس فلسفہ اور روح کی مذہب میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا اپنے خطبۂ استقبالیہ میں انہوں نے کہا کہ:-

"واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذہب کے بارے میں انتہا درجہ کی رواداری کو مناسب سمجھتے ہیں، جو شخص ہمارے اصولوں کو مانے وہ ہمارے فریق میں داخل ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی یا بودھ۔ مذہبی شخص ہو یا مذہب بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے

ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ حقیقت حال اس کے خلاف ہے مثلاً کم از کم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی سخت ہے اور فریضہ زکوٰۃ کا منشا بھی زیادہ تر یہی ہے کہ خلق خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مالداروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ پر ہی دیا گیا ہے"[۲۳]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حسرت موہانی نے نہ صرف مزدوروں کی بات ہی نہیں کی بلکہ انہیں منظم کرنے کے لئے کوششیں بھی کیں ان کی شکایات کو دور کرنے کے لئے سیاسی جماعتوں کو تیار بھی کیا اس کی ایک مثال کانپور کا یہ واقعہ ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"کانپور کا نگریس کا اجلاس مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو کی زیر صدارت ہوا۔ جب سب لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے میرے کان میں کہا "مولانا حسرت موہانی مزدوروں کے حامی ہو گئے ہیں اور یہاں آکر مزدوروں کی شکایتوں کے بارے میں کانگریس رہنماؤں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ انہیں دروازہ پر روک دیا گیا اور وہ دھمکی دے رہے ہیں کہ وہ دروازہ توڑ کر پنڈال میں آ جائیں گے، جواہر لال میں اور عزیز انصاری یہ دیکھنے کے لئے گئے کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور بڑی تعداد میں مزدور ہنگامہ کرتے پنڈال میں داخل ہو گئے تھے عزیز کے ہاتھ پر لاٹھی پڑی اور میرے سر پر بھی پڑی اور اس وقت تک کہ میں کچھ کہہ سکوں میں نے دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی پنڈال میں جا کر صدر سے بحث کر رہے تھے لیکن بات چیت سے مولانا مطمئن ہو گئے"[۲۹]

حسرت موہانی نے اپنی شاعری میں بھی کمیونزم کا اظہار کیا ہے [۳۰] حسرت موہانی مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن رہے اور اس کی مجلس عاملہ میں بھی برسہا برس شریک ہوتے رہے اور وہ ہمیشہ کامل آزادی کے طرفدار رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک وفاقی حکومت کا بھی تصور پیش کیا جس سے ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور سیاسی بصیرت کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے، اور اس کے بجائے وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں کی اقلیتوں کے مسائل کا وفاقی حکومت کے ذریعے حل ممکن ہے وہ ایسی وفاقی طرز حکومت چاہتے تھے جس کے صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں اگر مرکزی حکومت مسلمان کی اکثریت کے صوبوں کے مفاد کے خلاف نہ کرے تو یہ صوبے وفاق سے بالکل باہر نکل آتے ہیں اور اگر ہندو اکثریتی صوبے تو آزادانہ طرز حکومت پر قناعت کرلیں تو اسلامی اکثریت کے صوبے آزاد حکومت بنالیں گے[۳۱] ان کے خیال میں ہندوستان میں پانچ جمہوریتیں قائم ہوں!۔

مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان، مرکزی ہندوستان، جنوب و مشرقی ہندوستان، جنوب مغربی ہندوستان ان سب کو وفاقی حکومت کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیئے[۳۲]

بغور دیکھا جائے تو حسرت موہانی کا وفاقی حکومت کا تصور ہندو مسلم تنازعہ اقلیتوں کے مسائل اور قومیتوں کی ترقی کا بہترین حل معلوم ہوتا ہے حسرت موہانی کی سیاسی ڈائری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی اسکیم جناح، گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کے سامنے پیش کیں اور سی راج گوپال اچاری کو انہوں نے اپنا موافق بھی بنالیا تھا[۳۳]۔ گاندھی جی نے بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا تھا حسرت کے الفاظ میں "رات کو گاندھی جی کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا تھا"

خدائی خدمتگار جو غیر پنجابی اسٹیبلشمنٹ کا خیال ہی ان کی آبادی کا دشمن تھا اب بالکل پورا اچھا ہو گیا ہے ۲۰
لیکن برطانوی سامراج کو کچھ اور منظور تھا۔

حسرت موہانی کی سیاسی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی حق گوئی بیباکی اور غیر معمولی جرأت تھی ان کی زندگی سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جا سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیا وہ اپنے اصولوں کی قیمت دینا جانتے تھے انہوں نے کبھی برٹش حکام کے آگے سر جھکایا اور نہ ہندوستانی لیڈروں کی خوشامد کی ان کی طرز زندگی اس کا متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"مرحوم مسلمان اور ان کے مانند چند اور باصفا فقیر دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے ان کی نادانی یہ دولت و جاہ کے لئے خواہ کیسی ہی عجیب اور اہم کیوں نہ ہو مگر ہم سے آزاد فقیر دل کا اس سے مرعوب و مغلوب ہونا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے ۲۱"

اس طرح جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۸ء میں آگرہ میں ہوا تو مسجد کانپور کے واقعہ کے سلسلے میں ہارڈنگ کا شکریہ کا ریزولیوشن پیش کیا گیا۔ حسرت نے اس کو نہ صرف ناپسند کیا بلکہ مخالفت کی۔ ۱۹۲۰ء میں امرتسر میں کانگریس کے اجلاس کے بعد گاندھی جی مسٹر کھفور دہ کے مطابق مسلمانوں کا ایک وفد انہیں اتنے سے ملنے کے گئے۔" مگر رسمی عرض و جواب کے بعد وائسرائے نے ہاتھ ملانے کا اعزاز دیا تو حسرت پیچھے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے کرا کر اس طرح نکل آئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں ۲۲۔

جب بھی انہیں یہ احساس ہوا کہ گاندھی جی کی پالیسی بھی غلط ہے فوراً مخالفت کرنے کو تیار ہو جاتے یہی بات جناح کے ساتھ بھی جناح اپنی مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے مسلم لیگ کے مسلم رہنما انہیں خطابات انہیں سونپنا چاہتے تھے اجلاس (الہ آباد) میں تجویز ہوئے پاس ہر فرد کی بھی یہی خواہش تھی۔ حسرت موہانی تنہا اس تجویز کے خلاف تھے اس وقت تقریر کرنا بڑی بات تھا حسرت موہانی چند تھے اپنی تقریر میں کہا۔

"میں پاکستان کا موئد ہوں لیکن پاکستان کا دشمن کا قائل نہیں بلکہ پاکستان جمہوریت کا علمبردار ہوں اور یہی سبب ہے میرے اور قائداعظم کے درمیان خلیج پیدا کر رہا ہے ۲۳"

حسرت موہانی کا یہ رویہ آزادی کے بعد بھی قائم رہا ہندوستانی لیڈروں کا ایک طبقہ یہ چاہتا کہ ہندوستانی مسلمان اس ملک کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے پاکستان پر نکتہ چینی کرے، سردار پٹیل نے تو وفاداری کی شرط ہی لگا دی تھی حسرت موہانی خاموش رہے پاکستانی حکومت کی پالیسیوں کو ناقص سمجھنے کے باوجود کچھ نہیں کہا کیونکہ ہندوستانی حکومت کی خوشامد کی بو آتی تھی ۲۴"

حسرت موہانی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ اسمبلی کی کارروائیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے لیکن جب دستور میں مخصوص قسم کا وفاقی طرز حکومت کو قبول نہیں کیا گیا تو انہوں نے دستور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا دیسی ریاستوں کے بارے میں حکومت ہند کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے سردار پٹیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے وہی کیا جو ہسٹنگز، ڈلہوزی اور کلائیو نے کیا تھا، تم نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادی چھینی ہے، تمہارے محکمہ پر خدا کی لعنت ہو ۲۵"۔ حیدرآباد میں ہندوستانی افواج کی فتح پر مبارک باد دینے کے لئے یو پی اسمبلی میں تجویز پیش ہوئی تو اس کی مخالفت کرنے والے بھی تنہا حسرت تھے۔

۱۰ دسمبر [illegible] کو رہا کر کے آزاد ہوئے تھے:

"[illegible] میں برٹش گورنمنٹ کی سب بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداریٔ برطانیہ کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلا شرط وفاداری سکھلاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور تک محدود کر دینے رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" آزادی کے بعد جس طرح سے مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے جس حقیقت پسندی سے سوچا اسکی مثال ملنی مشکل ہے:

۱۶ ستمبر [illegible] ...... مسلمانوں کو اظہار مایوسی کی ضرورت نہیں اگر ضرورت ہو تو انہیں حکومتِ موجودہ کے خلاف گوریلا طریق جنگ اختیار کرنا چاہیے۔

"۱۰ دسمبر [illegible] .... فضل الحق بھی ملنے آئے وہ انڈیا کے مسلمانوں کی مدد کا جذبہ لے کر مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اور مخلص معلوم ہوتے ہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مگر انکار کر دیا کہ بحمد اللہ کم سے کم یو پی کے مسلمان اب لوگوں کی مدد کے بغیر بھی اپنی حفاظت کر لیں گے:

۱۵ اگست [illegible] "آج یوم آزادی کے سلسلے میں راجہ جی کے یہاں شب کی دعوت تھی میں بھی مدعو تھا مگر موٹر یا سواری کا انتظام نہ ہو سکا اس لئے نہ گیا علاوہ ازیں حاصل شدہ آزادی کو حقیقی آزادی سمجھنے کا ابھی میرے دل کو اطمینان نہیں ہے"[۲۶]

حسرت موہانی کے اس طرح کے کتنے ہی واقعات یہاں پیش کئے جا سکتے تھے۔ طوالت کے خیال سے اوپر بیان کئے گئے چند واقعات ان کی سیاسی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ حسرت موہانی تحریک آزادی کے سرفروش مجاہد تھے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد حسرت موہانی جیسے رہنما نایاب اگر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں وہ تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے ان کی سیاسی نظر بہت دور رس اور سیاسی فکر حقیقت پسندانہ اور سائنٹفک تھی، آزادی سے قبل کی ہندو اور مسلم سیاست میں شاید ہی کوئی ہو جس نے مسلسل اور پیہم کامل آزادی کی بات کی ہو۔ آزادی سے محبت اور سامراج سے نفرت کے پیچھے صرف جذبہ اور جوش کارفرما نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد ان کی سامراجیت کی گہری سوجھ بوجھ نو آبادیاتی ملکوں پر اس کے تباہ کن اثرات انصاف اور حقوق کی پامالی اور ذہنی اور تہذیبی غلامی کی لعنت تھی، برطانوی حکومت سے نفرت اور برطانوی حکام سے بیزاری جس شدت سے حسرت کی شاعری اور تقریروں اور تحریروں اور عمل میں ملتی ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کوئی ہو وہ بخوبی واقف تھے کہ عام ہندو اور عام مسلمان کامل آزادی چاہتا ہے لیکن رہنماؤں کی مصلحت اور بزدلی انہیں حقیقت پسند بننے سے روکتی ہے۔ احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں بھی انہیں یہی بات دکھائی دی۔ کانگریس کے پرچوں میں شاید اس کا ذکر نہ ملے لیکن یہ صحیح ہے کہ کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں انہیں ۲۵ فیصد اور عام اجلاس میں ایک تہائی اراکین ان کے حامی تھے۔

حسرت موہانی کا تعلق ہندوستان کی انتہا پسندانہ سیاست سے تھا مسلمانوں میں وہ اس روایت کے سب سے اچھے نمائندے ہیں، لیکن ہندو اور مسلم کی تخصیص کے بغیر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی ایمانداری کسی اور رہنما میں نہیں ملے گی، حسرت موہانی تلک کا بڑا احترام کرتے تھے ان سے بڑھ کر تعریف حسرت نے کسی لیڈر کی نہیں کی لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، سامراجیت کی تاریخ شاہد ہے کہ سامراجی حکام عام طور پر نو آبادیاتی ملکوں کے استحصال کرنے

والے طبقوں سے مل کر جو حکومت چلاتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں جاگیردارانہ سماج یا سرمایہ دارانہ نظام کے وجود میں آنے سے قبل کے استحصال کرنے والے طبقے ہیں زیادہ آسانی سے بیرونی حکام سے سمجھوتہ کرتے ہیں ان ہی طبقوں سے حسرت کی زبان میں "اہل ثروت و جاہ" کے افراد وقتی تحریک میں بھی شامل ہوجاتے ہیں اور مصالحت پسند بھی بن جاتے ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر بیرونی ملکیت یا سامراج دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی اور معاشی نظریات میں ملکی استحصال کرنے والوں کے حامی بنے رہتے ہیں زور ہما بھی جنہوں نے مکمل آزادی کی بات کی، ان کی نظر سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بربریت اوجھل رہی ماؤزے تنگ نے کومنتانگ کے زمینداروں (حکومت) اور سود خوروں کے مفاد میں تھا حسرت سے کبھی اس طرح کا سیاسی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ دوسرا فرق مذہب اور سیاست کے اتحاد کی نوعیت کا ہے جناح اور ان کے ساتھیوں نے سیاست کو اتنا مذہبی بنا دیا تھا کہ اس میں اقلیتوں کو اکثریت کے غلبہ کا گمان ہوتا تھا ان کے ہیرو اور تاریخی شخصیتیں، تاریخی حقائق سے بے نیاز ہوکر گمراہ کن توہم پرستوں کو فروغ دیے گئے تھے۔ حسرت نے کبھی ایسا نہیں کیا ان کے نزدیک سیاسی مقصد سب سے زیادہ اہم رہا مذہب کا استعمال رجعت پرست سیاست یا احیاء پسند ذہنیت کی تشکیل کے لیے کبھی نہیں کیا۔ انہوں نے مذہبی عمل اور رواداری کی ہی تلقین کی۔ ان کے اکثر ساتھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سماجی معاملات میں تنگ نظر رہے۔ حسرت موہانی چونکہ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں افادیت کے قائل تھے اس لیے وہ سماجی مسائل کے بارے میں کھلا ذہن رکھتے تھے۔

کمیونسٹ پروگرام اور کمیونزم کے فلسفے سے حسرت موہانی کی دلچسپی اتفاقیہ نہیں تھی سنہ ۱۹۰۶ء سے ہی وہ جن حالات کا اظہار کر رہے تھے اس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ کمیونزم کی سمت جھکاؤ تھا کمیونسٹ پارٹی کی دستاویزات کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ کانپور کی پہلی کمیونسٹ کل ہند کانفرنس سے قبل ہی حسرت موہانی نے ایک نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہی تھی، کانپور کانفرنس کے خطبۂ استقبالیہ میں جو باتیں انہوں نے کہیں اور کمیونسٹ پارٹی کو جو پالیسی اپنانے کی تلقین کی وہ کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی رہی۔ کمیونزم اور مذہب کے بارے میں ان کے تاثرات کئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئے ایسا لگتا ہے کہ مذہب کے بارے میں حسرت کا رویہ ہی زیادہ صحیح تھا، جو پروپیگنڈہ کمیونزم کے خلاف کیا جاتا رہا ہے وہ مذہب کو "افیون" سے تعبیر کرتا ہے، پوری طرح صحیح نہیں ہے خود مارکس نے جب یہ لکھا ہے اس مضمون میں وہ مذہب کو مصائب اور اضطراب کا علاج مذہب میں تلاش کرنا نہ صرف زندگی کے حقیقی مصائب کا اظہار ہے بلکہ ان کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ مذہب کچلے ہوئے انسان کی آہ، سفاک دنیا کا نرم دل اور بے روح حالات کی روح ہے۔ مذہب عوام کی افیون ہے۔

مذہب کو فریب حسرت سمجھ کر مٹانا حقیقی مسرت کا مطالبہ ہے موجودہ حالات کے تعلق سے فریب کے ترک کرنے کا مطالبہ دراصل اس بات کا مطالبہ ہے کہ ان حالات کو ختم کیا جائے جن کے لئے فریب ضروری ہے اس لئے مذہب کی تنقید مختصراً آنسوؤں کے سمندر کی تنقید ہے جن کا ہالہ مذہب ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کو ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا جاتا ہے اس پر الزام ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں "حد سے زیادہ مخلص" تھے۔ گاندھی جی پر ان کی تنقید اور کمیونزم اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات کی بنیاد جذباتیت کو ٹھہرایا جاتا ہے ۲۹۔ ان پر یہ الزام ہے کہ وہ جذباتی (ایماندار کمیونسٹ) تھے کیونکہ ان کا سیاسی شعور بغاوت کی منزل پر رک جاتا ہے اور ان کے بہترین لائحہ عمل نہ وضاحت پائی جاتی ہے اور نہ استقامت ۳۰ کہا ہے، دراصل مذہب کے بارے

جو لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ حسرت کا متعصب مذہب کے اس پہلو کو اجاگر کرنا تھا جو استحصال کرنے والوں کو پہنچ [illegible] الزام کرتا ہے ، لیکن اندر کا یہ کہ تحریر میں بھی حسرت مو ہانی کے نقطۂ نظر کی ہی تائید کرتا ہوں ، ہمارے خیال میں حسرت کی سیاست کے بارے میں اس طرح کا تنقیدی رویہ نامناسب ہے گاندھی اور قائد اعظم ان کی تنقید پر اس حق بجانب ہے اس طرح کی تنقید پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد سے بھی کی جا سکتی ہے ۔ جس شخص کی ساری زندگی غیر مصلحت پسندی اور غیر مصلحت کوشی سے عبارت ہو اس پر اس طرح کا الزام لگانا زیادتی ہے ہاں جو عام طور پر جو مفہوم کامیابی کا لیا جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے کامیابی حسرت کو نہیں ملی ۔ لیکن اپنی کامیابی سے ان کو کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی ، بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حسرت کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت کی کمی تھی ، صحیح نہیں ہے ۔ کیا ہندوستان تحریک آزادی کے کسی بھی رہنما کے لائحہ عمل میں ایسی وضاحت اور استقامت ملتی ہے ؟

دراصل یہ پوری بحث ہی لغو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وضاحت اور استقامت کا انحصار مختلف طبقات کے مفاد سے وابستہ رہتا ہے مثال کے طور پر ہر بڑے لیڈر جیسے گاندھی جی ، نہرو ، مولانا آزاد ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ نے پارلیمانی طرز حکومت کی سختی سے مذمت کی تھی لیکن آزادی کے بعد ان سب رہنماؤں نے اسے تسلیم کر لیا ، کیوں ؟ گاندھی جی پورے خلوص کے ساتھ اس ملک کے اقتدار کو کسانوں کے ہاتھ سونپنا چاہتے تھے لیکن ملک سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں گیا ، کیوں ؟ پنڈت نہرو پورے خلوص سے اشتراکیت کے طرف دار تھے ، لیکن ان کی ساری اقتصادی پالیسیوں نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا ۔ کیوں ؟ کسان کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت اور استقامت کی کمی تھی ؟

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے لکھا ہے کہ :

"مرگ حسرت کا ماتم کرنے والے دیار شوق کے باشندے ہوں گے نہ کہ سیاست کے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کو وجدانی طور پر اس کا احساس تھا کہ اگرچہ انہوں نے اپنی عمر سیاست کے پاپڑ بیلنے میں گذاری لیکن آئندہ نسلیں انہیں ان کے سیاسی کارناموں کے سبب سے یاد نہیں رکھیں گے "......

حسرت نے اپنے سیاسی عقائد کی خاطر مصیبتیں جھیلیں اور سیاست کی دیوی پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا ، لیکن سیاست بڑی حق ناشناس چڑیل ہے یہ دنیا کی طرح کبھی کسی کی ہوئی اور نہ ہوگی آج دیار سیاست میں حسرت کا نام لینے والا کوئی نہیں ۔[۳۹]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے :

"کیسی سچی بات کسی نے کہی کہ سیاست کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ اور منہ کالا ہوتا ہے ، سوائے حسرت کے "[۴۰]

دقت یہ ہے کہ حسرت سیاست کو بڑی حق ناشناس چڑیل سمجھتے تھے اور نہ کوئلہ کا کاروبار ، سیاست کو ہمیشہ انہوں نے میدان عمل اور اپنے عقیدے کی تشہیر کا مؤثر ذریعہ سمجھا ، حریت اور بغاوت ، انصاف اور مساوات ، جمہور کی خوشحالی اور بہبود ان کے نزدیک سیاست دانوں کے یا اہل ثروت وجاہ کے ذاتی مفاد کے فروغ دینے کے لئے برگشتہ نعرے نہیں تھے بلکہ ایسے اصول تھے جن کے حصول کے لئے بڑی سی بڑی قربانی دی جا سکتی ہے حسرت اپنے دوستوں کو بھی پہچانتے تھے اور دشمنوں کو بھی ، سیاست نے انہیں دوستوں سے محبت و خلوص اور دشمنوں سے نفرت سکھائی ۔

وقتی طور پر شاید حسرت کی سیاست اور سیاسی زندگی کو نظر انداز کر دیا جائے یا بھلا دیا جائے

سید آل رسول برکاتی مارہروی

فلسفۂ عشق کے علمبردار
شاہ برکت اللہ پیمی

ہندوستان ہر دور میں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا امین رہا ہے۔ تاریخ و تہذیب کے لمبے سفر میں ہندوستان نے کبھی اس کثرت کو قربان کرکے وحدت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہند کے فکر و فلسفے کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے۔ یہ بیت ت ایک ترقی پذیر اکائی رہا ہے جس نے ایک طرف خود یہاں کے باشندوں کے مختلف رنگوں کو یک رنگ بنانے اور دوسری طرف نئے عناصر کے اجنبی نظریات کو ہم آہنگی عطا کرنے کی کوشش کی۔

وحدت و کثرت کے اس صدیوں طویل سفر کے کسی موڑ پر وادیٔ سندھ کی تہذیب کا یہ دور آریوں کے ملن کے بعد تر ودینی میں ڈھل گیا۔ ایک رنگ دوسرے رنگ میں یوں ملا کر سب ایک رنگ ہوگیا۔ لطف یہ کہ ہر رنگ منفرد رہا۔ جغرافیائی اصطلاحات میں رنگوں کی یہ دھنک ہند کہلائی، ہندو، جو سنسکرت میں سندھو اور عربی (قرآن) میں سندس ہوا۔ پھر آئے ہندوستان کے مسلمان فاتحین، جو اس دھرتی پر بسنے کے بعد یہاں کے لئے اجنبی یا غیر ملکی نہ رہے۔ ہندوستان نے زندگی کے قومی فلسفے کے دائرے میں رہتے ہوئے بہت جلد ایک ایسے اعلیٰ قومی نظریئے کو فروغ دیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ اب یہ دونوں دھارے ایک ہوکر ہندی یا ہندوستانی کہلانے لگے۔ تاریخ ہند کا یہ کارواں ایکتا کی پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ وقت کی دھوپ چھاؤں کے ساتھ اس پگڈنڈی نے شاہراہ کا روپ لے لیا۔ ہندوستان نے اپنی یک جہتی کو نئی سمتیں، نئی تفسیریں اور کثرت میں وحدت کے اپنے قدیم روپ کو نت نئے زیور عطا کئے۔ ہندی یا ہندوستانی کا یہ نظریہ ہند کے باشندوں کے تمام طبقوں میں رچ بس گیا تھا۔ اسی تصور کے علمبردار تھے شاہ برکت اللہ جنہوں نے سترہویں صدی عیسوی میں صوبجات متحدہ یعنی موجودہ اترپردیش کے ضلع ایٹہ کو اپنے وجود سے مشرف فرمایا۔ یہی وہ ضلع ایٹہ ہے جس نے ہندوستان کو مہاکوی تلسی داس (مقام پیدائش سوروں) اور سلطان العاشقین امیر خسروؒ (مقام پیدائش، پٹیالی) جیسی عظیم ہستیاں عطا کیں۔

شاہ برکت اللہ کا تعلق سادات زیدیہ سے ہے جو عراق کے واسط شہر سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور بلگرام ضلع ہردوئی کو اپنا مسکن بنایا۔ شاہ برکت اللہ اپنے والد میر اویس کی وفات کے بعد بلگرام میں رہ نہ پائے۔ کالپی تشریف لے گئے اور وہاں سید فضل اللہ کالپوی سے بیعت ہوکر مارہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی) آئے۔ یہ گیارہویں صدی ہجری کے آخری دو چار برس کی بات ہے۔ آپ کے دادا میر عبدالجلیل کوئی چالیس پچاس سال پہلے مارہرہ کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ شاہ برکت اللہ نے اپنے دادا کی خانقاہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ لیکن گوندل نامی مقامی باشندوں کی شرارتوں سے تنگ آکر آپ دادا کی خانقاہ سے اٹھ آئے اور قصبے سے با

بھگتی کہتے ہیں کہ من یا نفس پارے کی طرح ہے جسے کسی کل قرار نہیں۔ اسے
بس کی مثال میں بند کر دو یعنی ریاضت اور تقویٰ کی قید میں ڈال دو پھر
اس میں علم اور عبادت کا رس گھول دو۔ اب اس مکسچر کو جتنی بار خدا کی
آنچ پہ تپاؤ۔ یہی نفس کندن ہوگا۔

فلسفۂ وحدت الوجود:۔

تو ہی، میں تو ایک ہیں، اور نہ دوجا کوئے
میں تو لیتا جب چھٹے، وہی رہا سب ہوئے

نظریہ اتحاد:

جل سرت جگت سے، بچھڑن نرگ سمان
بیگ سوس جانوئے، جن جھرد جیہ جان

جس طرح آفرت و آلشتی جنت ہے۔ الگ تھلگ رہنا۔ عداوت و منافرت
دوزخ کی طرح ہے۔ جس سے ہو سکے دل سے ملو، ٹوٹ کر ملو، ہی جان
سے ملو۔ ایسے ملو کہ پھر کبھی الگ نہ ہو۔ جب تک انسان ایک طرف انسان
کے ساتھ اور دوسری طرف خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار نہ کرے گا تب
تک اسے روحانی آسودگی نہیں مل سکتی۔

دیا ہوکے اور تاہیں، وہ جا ہوکے کھوہ نہیں
یا تیں سن ساہیں، جو رب ہو لریں اریں

—

ساہب جیسو چندرماں، سیوک دکھائی دیت
گوتکے بدھاں، بن گن کیس لریں لریں!

—

سیٹھ بڑی کی اپساں، ہمی کب کبوں انیسو!
کل میں نلبا ئی جان، سیٹھ کی تریا تریں

—

آنچی آمرا سائی، پائی ہے کہنا ئی
سائیں کیو سوسوں، کا ہے بولت بریں ہلیا

اس کبت میں بھگتی کہتے ہیں میرا مطلوب مجھ سے کیوں ناراض ہے؟
شائد اس لئے کہ میں نے سخاوت اور محبت سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔
اے میرے مالک! مجھے معاف کر دے کیونکہ تو ساری اچھائی اور سچائی
کا سرچشمہ ہے اور میں ان اوصاف سے محروم ہوں۔ میری کشتی کو ساحل
تک پہنچا دے کیوں کہ تو بڑی عظمت والا ہے۔ اور میں سراپا برائی
ہوں۔ اے میرے مالک! مجھ تک اپنی آواز پہنچا۔ تیری حق سچ ہے، تو
نیک ہے، تیری رس ہے۔

گیتا میں مکمل انسان کے چھ اوصاف بتائے گئے ہیں۔ یوگ
بھگتی اور گیان۔ شاہ برکت اللہ نے صدق، عدل، حیا اور علم کو شخص
کی شخصیت کی تکمیل کی بنیاد قرار دیا ہے۔

ست جو جائے تو رہے کیا، بہت گئے سب جائے
لیا بات گئی ہے، بن ہر یا نہ اگ سے

انسان میں صدق و صفا کے بنا کچھ نہیں رہ جاتا۔ نیت یعنی سچ
کے نہ رہنے سے سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ جس انسان میں شرم و حیا
نہیں ہوتی وہ بے شرم ہو جاتا ہے اور جو آدمی علم سے محروم
ہے وہ حیوان بن جاتا ہے۔

لا الٰہ اونچے کہو، نیچے الّا اللہ
آوا گون بچار کے دیکھو کے اُستاد

بھگتی یوگ کی مشق کی تلقین کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح
میں اسے ذکر نفی و اثبات کہا جاتا ہے۔ جب سانس چھوڑو تو ملیا
کی سبھی صورتوں کو دل سے نکال پھینکو اور جب سانس اندر کھینچو
رب واحد کو اپنے دل میں بٹھا لو۔ سچا یوگ یہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ، ایسیں تجھیو محیط
مالی تار جیوں پیرہن، تیوں جگ میں جگ بیت

بھگتی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ ہر جگہ
اسی ذات عظیم کا ظہور ہے جس طرح کپڑے میں تانے بانے کے روپ
روئی رہتی ہے اسی طرح کائنات میں اللہ کا جلوہ موجود ہے۔

تولا جیوں نینا کرو، باٹ بہم کے کھول
کر کچھو ناگیان سوں دوسن تک نت تول

بھگتی کہتے ہیں کہ اگر اپنے مطلوب کا دیدار کرنا ہے تو آنکھوں کو ترازو
بناؤ اور عشق حقیقی کو باٹ بناؤ اور جس طرح وزن کرنے والا ترازو
کے پلڑوں اور کانٹے پر ایک سی نگاہ رکھتا ہے اسی طرح تم بھی یکسوئی کے
ساتھ مراقبے میں ڈوب جاؤ تبھی دیدار کا تجربہ حاصل کر سکتے ہو۔

من اکھر تن پاتیا، جاہ جیم جیٹ سار
کرو سکھاوت دھیان سوں پنگت جوڑے اپار

دل کی مثال حرف جیسی ہے اور بدن تختی کی طرح ہے۔ یہ دونوں

یہ سفر نامہ آج سے تقریباً گیارہ سو برس قبل (۸۵۱ء میں) لکھا گیا۔ اس میں سلیمان نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ اور پہلو پر بحث کی ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ یہ چین سے کہیں بڑا ہے۔ یہاں کے دریاؤں کا پانی بہت اچھا ہے، بیماریوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا سمندر ہرکند (بحر ہند) ہے۔ سلیمان کے بعد دوسرے عرب سیاحوں نے بھی بحر ہند کو ہرکند[1] لکھا ہے۔ اصل میں ہرکند سمندر کے اس حصے کو کہتے تھے جو جنوبی ہند کے کناروں سے بنتا تھا۔

یہاں ہندو لباس کے بارے میں سلیمان لکھتا ہے کہ یہ لوگ دو چادریں پہنتے ہیں۔ یہ ایک موٹا دھاری دار معمولی قسم کا کپڑا ہوتا ہے جس کو کمر سے باندھ لیا جاتا ہے۔ یہاں کی عورتیں اور مرد دونوں زیور پہنتے ہیں اور سونے جواہرات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ہر صبح کو کھانے سے قبل غسل کرتے ہیں۔ جب مرد عبادت کرتے ہیں یا کوئی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں تو اپنی عورتوں سے علیحدہ رہتے ہیں بلکہ ان کو دروازے کے باہر رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی غذا کے متعلق سلیمان نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستان والے چاول کثرت سے کھاتے ہیں اور روٹی کا استعمال کم کرتے ہیں۔ گوشت بھی کھاتے ہیں لیکن جانوروں کو مسلمانوں کے طریقے سے ذبح نہیں کرتے بلکہ ان کے سر پر اتنی زور سے ضرب لگاتے ہیں کہ وہ مر جاتا ہے۔

یہ لوگ شراب کو برا سمجھتے ہیں بلکہ سرکے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی بادشاہ شراب پیتا ہے تو اس کی بادشاہت نہیں رہ سکتی کیوں کہ شراب پینے کے بعد وہ جنگ و جدال نہیں کر سکتا اور دوسرے امور سلطنت کو بھی بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

ہندوستانی شادیوں کے متعلق اس کی رائے ہے کہ یہ لوگ بالکل چینی طرز پر شادی کی رسوم انجام دیتے ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں نے اس طرز کو چینیوں سے لیا ہے یا چینیوں نے ہندوستانیوں سے۔ شادی کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں اور بڑے بڑے ڈھول بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ مرد بیک وقت جتنی بھی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔

سلیمان نے سرانذیپ کے راجہ کی وفات پر جو رسوم ادا کی گئیں ان کا چشم دید حال تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ کے جسم کو ایک چھوٹی گاڑی پر رکھ دیا گیا اس طرح کہ سر گاڑی کے پیچھے لٹک رہا تھا اور بال زمین کو چھو رہے تھے۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے اس جنازے کے ساتھ تھی جو جنازے پر گرد جھاڑتی جاتی تھی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی: "اے لوگو! یہ شخص کل تمہارا بادشاہ تھا۔ یہ تم پر حکومت کرتا تھا۔ تم اس کا کہنا مانتے تھے لیکن آج اس نے اس دنیا کو چھوڑ دیا۔ موت کے فرشتے نے اس کی روح نکال لی۔ تم ایسی زندگی کے فریب میں نہ آنا۔" تین روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس بادشاہ کے جسم کو صندل اور کافور ڈال کے جلا دیا گیا۔ پھر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ تقریباً سارے ہندوستان میں مردوں کو جلایا جاتا ہے۔ اکثر راجہ کی لاش کے ساتھ اس کی بیویاں بھی جل جاتی ہیں۔

ہندوستان کے طریقِ انصاف کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ملزم کی آزمائش مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کسی بات پر مجرم سمجھا جاتا ہے تو اس کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آزمائش دینی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ پر پان کے سات پتے رکھے جاتے ہیں جس پر ایک جلتا ہوا سرخ لوہا رکھا جاتا ہے جس کو وہ ہاتھ میں لیے آگے پیچھے چلتا ہے۔ پھر لوہے کو پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد ملزم کے ہاتھ پر ایک کپڑے کی تھیلی چڑھا دی جاتی ہے اور اسے بند کر کے بادشاہی مہر لگا دی جاتی ہے۔ تین دن کے بعد اس تھیلی کو کھولا جاتا ہے اور ملزم کو دھان کوٹنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اگر ملزم کے ہاتھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور اس آدمی کو جس نے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بے گناہ ملزم کو اس تکلیف کے عوض جو اسے پہنچی ہے سونا دے۔

---

[1] ہرکند دریائے ہند کے لیے پہلی بار سلیمان نے استعمال کیا تھا۔ ہرکند ہندی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ گو چونکہ سلیمان نے اپنے سفر نامے میں ہرکند اسی طرح تحریر کیا ہے اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ عرب اس وقت حرف "گ" استعمال کرتے تھے۔

ہندوستان کے لوگ مرنے کے بعد آگ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔
ایک مرتبہ ایک جوگی ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا جس کے نیچے آگ جل رہی تھی
اس نے اپنا چہرہ آگ کی طرف کیا اور آگ کو اپنا وطن کہا۔ اس نے اپنے لوگوں
سے کہا کہ اس دنیا کا مکمل نظم ... کی بڑی شکل ہے کہ وہ دنیا
پسند کرے گا۔ جسم ... بالکل جسم سے
الگ کر کے دوسرے جسم میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک جلاد کو بلا کر
اپنا سر کاٹنے کا حکم دیا۔ جلاد نے اس کا سر کاٹ دیا پھر اس کو جلا دیا۔
اس وقت ہر شخص کو یقین تھا کہ اس جوگی کی روح ضرور کسی خوب صورت
جسم میں داخل ہو گئی ہوگی۔

ہندوستان کے موسم پر بحث کرتے ہوئے ابو زید نے تحریر کیا
ہے کہ ہندوستان میں بارش کا موسم برسات کا زمانہ کہلاتا ہے یہ
تین ماہ تک رہتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں دن رات پانی برسا
کرتا ہے۔ جاڑوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ برسات آنے سے
پہلے یہاں کے لوگ گھاس کے مکان بنا لیتے ہیں اور جب برسات
شروع ہوتی ہے تو یہاں مکانوں کو بند کر کے ان کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔
پھر اپنے مکان سے باہر نہیں نکلتے جب تک کہ بہت سخت ضرورت
پیش نہ آئے۔ کاریگر اپنے گھروں میں کام کرتے ہیں۔

تیسرا جہاز ران سیاح بزرگ بن شہریار (۳۰۰ھ) تھا جو
عراق سے ہندوستان کے ساحل ہوتا ہوا چین تک اپنے جہاز لے جایا
کرتا تھا۔ اس جہاز ران نے ہندوستان کے کچھ علاقوں کو خود دیکھا
اور کچھ مقامات کے بارے میں دوسرے جہاز رانوں سے معلومات
حاصل کر کے ایک کتاب عجائب الہند لکھی۔ اس کتاب میں کشمیر،
زیریں پنجاب، جنوبی ہند اور گجرات کے مختلف مقامات اور واقعات
کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بزرگ بن شہریار کی کتاب فرانسیسی
ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۶ء میں لیڈن میں چھپی۔

چوتھا مشہور عرب سیاح، جغرافیہ نویس اور مورخ ابوالحسن المسعودی
تھا۔ اس کا زمانہ دسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ اس نے اپنی عمر کے
پچیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز اپنے
وطن بغداد سے ۳۰۳ھ (مطابق ۹۱۵ء) میں کیا۔ عراق، شام، ارمینیا،

روم، وسط ایشیا، ترکستان، افریقہ، سیلون، چین، تبت، ہندوستان اور
ملایا کی سیاحت کی۔ اس وقت المسعودی کی دو کتابیں کتاب التنبیہ
والاشراف اور مروج الذہب و معادن الجواہر موجود ہیں
جن کے ذریعے ہم اس کی زندگی کے حالات اور اس کے قلم بند کیے ہوئے
اس کے سفر کے حالات معلوم کر سکتے ہیں۔

المسعودی لکھتا ہے کہ ہندوستان زمین کا وہ حصہ ہے جس میں
سندھ اور افغانستان ایک عرصہ دراز سے رائج ہے۔ ہندوستان کے
لوگ ایک بادشاہ برہما کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس نے تین سو چھیاسٹھ
سال تک حکومت کی۔ اس قوم کے لوگ جو اس زمانے المسعودی کے
وقت تک موجود ہیں جن کو برہمن کہتے ہیں۔ اس قوم کے مرد اور عورتیں
زرد رنگ کا ایک تاگا اپنے گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔

المسعودی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج کل جہاز
کی کمپنیوں اور جہازوں کے نام الگ الگ ہوتے ہیں اسی طرح جہازوں
کے مالکوں کی نسبت سے اس زمانے میں ہندوستان میں جہازوں کے نام
بھی رکھے جاتے تھے۔ بیشتر صرف انہیں جہازوں کے ... جانے جاتے تھے
جو بحر ہند میں آتے جاتے تھے۔

ہندوستان کی زبانوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہاں بہت سی
بولیاں بولی جاتی ہیں اور یہاں مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنے
مذہب کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اپنے عقائد میں بڑے کٹر ہیں۔ ایک
مقام پر لکھتا ہے کہ سندھ کی زبان ہندوستانی زبان سے مختلف ہے۔ بحیرہ
کے رہنے والے، جو کہ لہراوی ریاست ہے، ... کیرباد کسبر ...
... کرہ کے علاقہ کی زبان کہلاتی ہے۔ سیمور، سوپارا اور تھانہ کے
علاقوں میں لاریہ زبان بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ
بادشاہت موروثی ہوتی ہے۔ اسی طرح وزارت بھی موروثی سمجھی
جاتی ہے اور قاضی کا عہدہ بھی موروثی ہوتا ہے۔ چالیس سال کی
عمر سے کم کا شہزادہ تخت پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔

المسعودی نے ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بادشا

مشرقی کتابخانے
کتب خانہ جامع القیروینّ
میمن عبدالعزیز
قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے
پیر حسام الدین راشدی
حرمین کے کتب خانے
نور احمد فریدی

مشرقی کتب خانہ خدا بخش جرنل میں وقتاً
فوقتاً وہ مواد بھی پیش کیا جاتا رہے گا، جو اب تک بکھرا
ہوا ہے۔
پیش نظر مقالوں میں 'کتب خانہ جامع القرویین'
معارف جولائی ۱۹۲۳ء سے، اور 'قاہرہ میوزیم میں چند
گمشدے' 'مخطوطے کے کتب خانے' 'الزبیر' کتب خانہ
نمبر ۱۹۶۷ء سے لیا گیا ہے۔
اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔
ادارہ

میمن عبدالعزیز صاحب
پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور

کتب خانۂ جامع القرویین (فاس)

پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہمارے مکرم جناب محمد شفیع صاحب ایم اے کے شغف علمی کی رہینِ منت ہے اکہ اب یہ مطبوعات کے لحاظ سے ہندوستان کی بڑی سے بڑی لائبریریوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہی ، اے کاش ان غیر معمولی مقدار کی جرمن و فرنچ مطبوعات کی جگہ عربی کتابیں ہوتیں کہ اس کے مستفیدین بہ نسبت اون کے کہیں زیادہ ہیں ، ان دنوں دو فہرستیں منگائی گئی ہیں برنامج جامع القرویین اور برنامج رباط الفتح - اول بسبب عربی ہونے کے زیادہ مفید ہو سکتی ہے اپنے ملک کو چونکہ بلادِ مغرب کے متعلقہ معارف سے عاری پاتا ہوں اس لیے ان مختصر سطور کو حوالۂ قلم کرنے کی جرأت کرتا ہوں ،

یہ جامع مسجد یا یونیورسٹی[1] جس میں صرف چند سال پیشتر (۲۰۰۰) طلبہ ، (۵۰۰) مدرس اور (۲۷) ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں اور اب بھی وہ (۵۰۰[2]) طلبہ اور (۱۶۴۱) کتابیں اپنے اندر رکھتی ہے ، دنیائے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے ، الجامع الازہر (مصر) جامع الزیتونہ (تونس) جامع بخاری جامع قرطبہ اور المستنصریہ (بغداد) وغیرہ سب اس سے متاخر ہیں ، اس لیے پہلے پہل یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کیا ہے ،

---

[1] معجم العمران ۲ ؍ ۱۸۰ ،

[2] مقدمہ برنامج جامع القرویین ،

بناے جامع

حسن اتفاق سے مغرب کی معتبر تاریخ الانیس المطرب القرطاس نے اخبار ملوک المغرب و مدینۃ فاس و ابن ابی زرع جو ۷۲۶ھ کے وقائع پر مشتمل ہے اس وقت پیش نظر ہے، مصنف نے ۲۰ سے ۲۳ تا ص۳۵ نہایت بسط سے اس کے عہد بعہد کی تاریخ تغیرات و تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرچشمہ کو بلاد مغرب کی تعلیم و تلقین، اور تہذیب و تمدن میں کس قدر دخل ہے، مراکش میں بہت سی جوامع ہیں مگر تقدیر کے دست استحقاق نے جو ناموری اسکے نصیب میں لکھی تھی، وہ اس کا عشر عشیر بھی اوروں کو نہ ملی،

الغرض ابن ابی زرع کی القرطاس سے جو مغربی[1] رسم الخط میں چھپی ہے، ہم تمام کچھ حصہ پڑھ کر قارئین کے پیش نظر کرتا ہوں،

امام[2] ادریس (بانی دولت ادارسہ) کے عہد میں جامع الشرفاء میں نماز جمعہ ہوا کرتی تھی پھر ادارسی حکمرانوں کے عہد میں بھی یہی معمول رہا، جامع القرویین کی جگہ بالکل میدان تھا اور کچھ درخت تھے جو ایک شخص کو اپنے والد سے ترکہ میں ملے تھے، جب امام ادریس کے ہاں اطراف واکناف کے وفود آنے لگے تو ازانجملہ ایک قیروان کا وفد بھی تھا، جس میں ایک مبارک اور نیک نہاد خاتون ام القاسم فاطمہ بنت محمد الفہری القیروانی بھی مع اپنے خاوند اور بہن وغیرہ کے تھی، یہ لوگ جامع مذکور کے قریب فرد کش ہوئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے، جب فاطمہ کا خاوند اور اسکی بہن مرگئی، تو اسکو ورثہ میں بڑی جلیل القدر دولت ملی جو ہر طرح حلال و طیب تھی، فاطمہ نے اسکو

۱؎ یہ ہمارے مشرقی رسم الخط سے بہت مختلف ہوتا ہے اور اپنے اصل یعنی کوفی رسم الخط سے بنہایت قریب،

۲؎ القرطاس مطبوعہ فاس (مراکش) ص ۲۲

وجود غیر میں صرف کر کے جا بجا زمین خرید لی اور ہفتہ بعد یکم رمضان ۲۴۵ھ میں اسکی بنا رکھی [illegible]

نہایت تندہی سے اوسکو تعمیر کرایا ، اور یہ کنوان جو جامع میں ہے اسی نے بزمانہ تعمیر بنوایا تھا ،

وہ اس طویل مدت میں روزہ رکھتی رہی ، اور پھر اتمام کے بعد پہلے پہل اسی نے دوگانہ شکر

ادا کیا ، اوس وقت اس میں چار صفیں اور ایک مختصر سا صحن تھا ، اور مغربی اور شرقی دیوارون

کے مابین ڈیڑھ سو بالشت کا فاصلہ تھا (ذکرہ ابو القاسم ابن حسنون فی تفسیرہ فی تاریخ مدینۃ

فاس ، بقول بعض یہ دو بہنیں تھیں ، فاطمہ ام البنین اور مریم دختران محمد الفہری - فاطمہ نے جامع

القرویین بنوائی ، اور مریم نے جامع اندلس ، پھر زناتہ (ایک بربری قبیلہ) نے اپنے عہد حکومت

میں اوسکو بہت وسعت دی جس کے حدود اب بھی نمایان ہیں مسجد خرفا میں گنجایش نہ تھی

اس لیے ۳۰۷ھ میں جمعہ کی نماز یہیں پڑھی جانے لگی ، اسکے پہلے خطیب شیخ صالح ابو محمد عبد اللہ

بن علے الفارسی تھے ، الخ

اس اقتباس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ قرویین منسوب بہ قیروان ہے جیسا کہ ہم اپنے

مضمون المعز اور ابن رشیق میں بھی اس سے پہلے لکھ چکے ہیں ،

اہل مراکش ، ان کے شیوخ ، علما ، اور صلحا ، اپنے شغف علمی اور حفظ و ذکا کے لیے بلاد مغرب

میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں ، شیخ عبد الحی الکتانی شیخ الطریقۃ الکتانیہ نے جو فرانسیسی حمایت سے

پہلے بھی جامع مذکور کے شیوخ اور ملک کے نامور علما میں شمار ہوتے تھے ، بہت تلاش و

جستجو کے بعد اس کتبخانہ کی فہرست مرتب کی ہے ، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب تک ہمارے

علما کو یہ اجنبی غاصب بیدار نہیں کرتے وہ با این ہمہ اہلیت کام سے جی چراتے ہیں ، اور زاویہ خمول

سے نہیں نکلتے تعجب ہے کہ حقیقی محنت تو وہ کریں اور نام ہو الفرید بل مندوب [illegible] افاضہ فکرہ اعلانا کا

۱؎ بروایت صاحب [illegible] بنوائی ۲۴۵ھ میں ہوئی ممکن ہے یہ سال اتمام ہو اور وہ سال آغاز

مراکش پر ہر چند سنت اللہ کے مطابق کئی حکومتوں کا دور دورہ رہا، مگر چونکہ سب اسلام کا
دم بھرتی تھیں اس لیے کسی نہ کسی شکل میں یہ کتبخانہ بھی باقی رہا، بلکہ اکثر بادشاہوں کے عہد میں کچھ
میں معقول اضافہ بھی ہوا، مثلاً سلطان ابو العباس منصور بن احمد الذہبی السعدی اور سلطان ابو
عبد اللہ سیدی محمد (موجودہ شریفی حکومت کے اسلاف میں سے) کے زمانہ میں، مگر چونکہ بہت سے
زمانوں میں اس کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا اس لیے جو علماء طلبہ کتابیں مستعار لیجاتے تھے
وہ بہت کم واپس کرتے، نیز حفاظت اور جلد بندی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اس لیے بہت
سی کتابیں کیڑوں کی نذر ہوگئیں، چنانچہ اسکی پرانی فہرست اس مدعا کی شاہد ہے، کیا اس سے
بھی بڑھکر کوئی ابتری ہوسکتی ہے کہ منتظم کتبخانہ کا مشاہرہ نصف ڈالر (ریال) ماہوار تھا،

مگر پچھلے زمانوں میں یہ حالت نہ تھی، ابن فرحون ابو العباس احمد بن العشر الخزرجی کے
حالات کے ضمن میں لکھتا ہے؎،

وتولى احكام مراكش والصلوٰة	وہ کچھ دنوں مراکش کے قاضی اور اسکی مسجد کے امام رہے
بمسجد جامعة ثم احكام بلنسية	پھر بلنسیہ کے قاضی بنے، مگر جب ابو یعقوب عبد المومن
فنعات بها قاضيا ولما صار الامر	کا عہد حکومت آیا تو انکو کتبخانہ عالیہ کی خدمت سپرد کی
الى ابي يعقوب عبد المؤمن الزمه	جہاں کے ان بڑے عہدے مناصب میں شمار ہوتی
خدمة الخزانة العالية وكانت	تھی اور جس کے لیے بہترین فضلا اور ماہرین چنے
عند هم من الخطط الجليلة التي	جاتے تھے۔ . . . . .
لا يلى بها الا علية اهل العلم واكابرهم	

؎ عجب تھیں تب اپنا حق ستانہ کبھو نہ ہے ہوا! بلکہ بنید حاد کے خیالات چھوڑ کر بامعنا ہو سلہ الدیباج المذہب [illegible]

گویا منصب ایک ہی کی نسبت سے ترقی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کتبخانہ ندکون کتابون سے بلند ہے۔

علم قرآن مین تفاسیر کے ضمن مین لکھا ہے کہ مکتبۃ السلطان مین ایک ہزار قلمی کتابین تھین

جو مولائی حسن (موجودہ دولت شریفیہ کے ایک سلطان) نے قرطبہ و غرناطہ کے کتبخانون سے نقل

کرائی تھین،

اب بھی اس شکست و ریخت کے باوجود یہان ایک بڑی مقدار مین وہ نوادر خطیات

پائی جاتی ہین کہ شاید ہی کہین اور ہون، نیز علما کے خطوط، بادشاہون کے طغرا وغیرہ۔ قدیم سے

قدیم تحریر چوتھی صدی کی ہے، پانچوین اور چھٹی صدی کی تحریرین تو بہت زیادہ ہین۔ مثلاً صحیح بخاری

کی ایک جلد ہے جسپر الطاہر بن مغوز کے ہاتھ کا اجازہ ۵۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ صحیح مسلم کا ایک نسخہ

ہے جو ایک ہی جلد مین ہے اور جو ایک زبردست ادیب کا نقل کیا ہوا ہے، اور جسکی ۵۷۳ھ مین

ابو بکر ابن الخیر الاندلسی نے تصحیح کی ہے۔ تفسیر ابن ابی زمنین کا نسخہ ۵۹۴ھ مین خود مصنف کے

سامنے پڑھا گیا ہے۔ اب مین اپنے استقرائے ناقص کی بنا پر اس کتبخانہ کی بعض اہم اور

نایاب کتابون کی مختصر سی فہرست دیتا ہون،

تفسیر

جامع احکام القرآن ابو عبد اللہ القرطبی متوفی سنہ ۶۷۱ھ یہ تفسیر ۸ جلدون مین ہے

البحر المحیط لابی حیان (چھپ گئی ہے) اس کے آٹھ قلمی نسخے ہین،

قانون التاویل لابی بکر بن العربی المالکی

تفسیر الماوردی

قرأت

الوقف والابتدا ابو بکر بن الانباری،

حدیث

شرح البخاری لابن بطال،

" " المہلب (۱)

القبس شرح موطا مالک بن انس } قاضی ابوبکر بن العربی،

المسالک شرح موطا مالک

محاذی موطا مالک (یعنی موطا مہدی ابن تومرت بانی دولت موحدیہ) یوری علاوہ ہے۔

الاحکام الصغری والکبری عبدالحق اشبیلی

مسند عبد بن حُمید،

کتاب الزہد والرقائق لعبداللہ بن المبارک مکتوبہ ۵۲۴ھ اسکی اہمیت بالکل ظاہر ہے،

البدایۃ والنہایۃ (مشہور محدثانہ اور نادر تاریخ ابن کثیر

کتاب الوہم والایہام لابن القطان۔ } صاحب برنامج نے انکو بذیل حدیث شاید اس لیے کہ انکے مصنفین محدث تھے درج کر دیا ہے

الاکمال للامیر ابن ماکولا،

تاریخ ابن ابی خیثمہ متوفی ۲۷۹ھ

جمہرۃ نسب قریش لمصعب الزبیری

نحو

شرح جُمل الزجاجی،

الافصاح شرح ایضاح ابی علی الفسوی،

الافعال لابن القطاع قدیم نسخہ، رامپور میں بھی اسکا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہے۔

اللہ معارف:- یہ کتاب چھپ گئی ہے، اور کتب خانہ دارالمصنفین میں پیرس سے خرید کرائی ہے۔ ملہ معارف ۔ یہ بھی چھپ گئی ہے۔

شرح اعراب شواہد المستقصی ابن فرحون اللغوی المصری ۔ اسکا ایک نسخہ کتب خانہ باد الفتح

مین بھی ہے،

المتبع لابن عصفور،

او سفر لابن ہشام الجیوسی جس سے سیوطی نے اشباہ ونظائر نحویہ مین بہت کچھ لیا

لغت

مختصر العین ، امام زبیدی کی مشہور روزگار قاموس،

دیوان الادب فارابی جو جوہری صاحب صحاح کے ماموں ہیں

تحفۃ الفاضل، سید مرتضیٰ بلگرامی خود انکے اپنے خط کا نسخہ،

کتاب الفرق فی اللغۃ، جاحظ

کتاب الالفاظ المعربۃ والالقاب المعربۃ، ابن قتیبہ

تاریخ

رحلۃ العلوی سنہ اتمام ۱۱۰۰ھ ہے۔

ادب

خریدۃ القصر عماد اصفہانی ، قسطنطنیہ مین بھی ہے،

شرح مقصورۃ حازم القرطاجنی،

شرح دیوان المتنبی للافلیلی جو اسکی بہترین شرح ہے مکتبۂ رباط مین بھی اسکا ایک نسخہ ہے،

الفصوص لصاعد اللغوی، یہ بے حد نادر اور جلیل القدر تصنیف ہے۔

طب

الاستقصاء والابرام فی علاج الجراحات، ابو محمد بن فرج القصر (کلاسرجری) جراحی کی نادر تصنیف

مراکش کی کے پہنچنے سے چند سال سے کتبخانہ بند تھا۔ اسنے حکومت کو اطلاع کی یا پھر
دولت علیہ کی طرف سے ایک باضابطہ ضابطہ مرتب کیا گیا جو علاوہ اس کتبخانہ کے کتبخانہ جامع
القرویین اور کتبخانہ جامع جدید پر بھی مشتمل تھا۔ اس ضابطہ میں حسب ذیل دفعات ہیں نمبر
خاص طلباء کے لئے جن مستند و دینی کتابوں کی باقاعدہ فہرستیں مرتب کی جائیں
جو کتابیں باہر مستعار جا چکی ہیں وہ واپس منگوائی جائیں یا انکی نقل یا قیمت
حاصل کیجائے ہر ہفتہ کے دوشنبہ اور پنجشنبہ کو سابق الذکر کتبخانہ اور ہر ہفتہ میں ایک بار باقی دو
کتبخانے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کھولے جائیں، وغیرہ وغیرہ۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ
ایک مدت تک مراکش کے کتبخانے بھی دوسرے متمدن ملکوں کے کتبخانوں کی طرح ایک باقاعدہ
نظام کے ماتحت آ رہے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی کتبخانوں کے مالکوں کو
اب تک یہ فکر نہیں کہ اپنے کتبخانوں کو انکا جزو بنا دیں تا کہ پبلک کو پورا استفادہ ہو،

واللہ ولی ذلک

پیر حسام الدین راشدی

قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے

میں چند روز پیشتر بھی قاہرہ کے اس عظیم الشان عجائب گھر کو دیکھ چکا تھا لیکن اس موقع پر میرے ساتھ پاکستان کا ثقافتی وفد بھی ساتھ تھا۔ یہ قوم آج بڑی بے پناہ ہے۔ لکھنے لکھانے کو تو یہ لوگ رات دن ہیں لیکن کتاب جس چیز کا نام ہے وہ نہیں پڑھتے ہیں اور شاید وہ اس لذت سے آشنا بھی نہیں۔ چنانچہ جب ہم پندرہ بیس آدمی سب ایک ساتھ ان کمروں میں پہنچے تو ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ جس طرح دیکھنا اور ان میں دلچسپی لینا تو غیر ضروری بات تھی ان کے نزدیک فقط کتابوں کی نمائش اور ان پر سونے چاندی کا کیا ہوا کام دیکھ کر پانی بھر آیا۔ سب نے پسند کیا اور دیکھا۔ ادھر بھاگے ادھر بھاگے۔ الغرض ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں ہی ضائع کر کے چلے گئے۔ بعض حضرات نے غیر معمولی دلچسپی دکھلانے اور اپنا شغف ظاہر کرنے کے لیے ساتھ میں کاغذ اور پنسل بھی لیا تھا کہ کچھ نوٹ کریں۔ اور ان کی تاریخی اہمیت لکھیں۔ لیکن جب کتابوں کے نام اور ان کے ہجے دیکھے۔ تو غالباً نوٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور پھر کسی نے کچھ نہ لکھا۔

میں چند دنوں کے بعد تنہا گیا تاکہ ایک دفعہ اچھی طرح اس بیش بہا ذخیرہ کو دیکھ لوں چنانچہ دروازہ پر رکھی ہوئی کتاب میں اپنا نام اور پتہ درج کیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پہلے تو دار الکتب کی شائع کردہ کتابیں خریدیں۔ اس کے بعد اطمینان کے ساتھ میوزیم میں پہنچ کر ایک ایک کتاب دیکھنی شروع کی۔ شیشہ کی بہت سی الماریاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خطاطی کے نمونے اور وصلیاں آویزاں تھیں۔ تصاویر بھی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔

میرے سامنے سیکڑوں نوادر کھلے ہوئے رکھے تھے۔ بعض کتابوں کے نوٹ لیے۔ اور پہلے تو بنگاہ غائر دیکھنا شروع کیا لیکن جب دیکھا کہ شاید وقت گزر جائے اور میں ایک بھی کمرہ ختم نہ کر سکوں گا۔ تو پھر میں نے سرسری جائزہ لینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ خاص خاص کتابوں کی فہرست بھی مرتب کرتا گیا۔ اس سرسری مطالعہ میں بھی میرے پانچ گھنٹے صرف ہوئے اور جب میں نیچے اترا تو اس وقت شام ہو چکی تھی کتب خانہ بند ہو رہا تھا۔ اور کلرک، کارندے اور افسر اپنا اپنا کام سمیٹ کر چکے تھے وہاں سے نیچے اتر رہے تھے۔

ان مصاحف کے علاوہ بہت سے مرقع کاری کے نمونے [illegible] بعض مصنفوں کو بھی اس میوزیم کے نوادرات کا حصہ بنایا جاتا ہے۔

مصحف:

(۱) بخط ابی سعید الحسن البصری (کتابت ۷۷ھ)۔ (۲) قرآن کا ایک مصحف سیدنا عثمانؓ (یہ بہت چھوٹی تقطیع کا ہے اس کے دو نسخے ہیں)، (۳) بخط [illegible] (کتابت [illegible]) (۴) بخط امام جعفر صادق (متوفی ۱۴۸ھ)، (۵) بخط [illegible] محمد الحسینی (کتابت ۱۰۹۰ھ)، (۶) بخط [illegible] نسخ فارسی (کتابت ۱۲۶۷ھ) (۷) بخط محمد بن [illegible] جعفر نسخ فارسی۔ سلطان فتح علی شاہ (قاچار کی خواہش پر لکھا) ۱۲۳۳ھ

بعض کلام مجید مطلا اور مذہب کام اور خوبصورت تقطیع کے نہایت ہی خوش نما شیشے کے کیس میں رکھے ہوئے ہیں جن کی کتابت کے سال یہ ہیں [illegible] ایک کلام پاک سلطان محمود شاہ کی ملکیت کا ہے نہایت ہی زیب رکھا ہوا تھا محمود شاہ کا انتقال ۷۰۰ھ میں ہوا ہے۔ بعض کی کتابت حسب ذیل سنین میں ہوئی تھی۔

۶۱۳ - ۸۶۳ - ۵۹۰ - ۹۱۲ - ۹۴۴ - ۱۰۶ - ۱۹۹ - ۸۴۵ - ۹۹۴ - ۸۶۹ھ،

لاہور کے ایک مشہور خطاط حافظ فتح اللہ کے لکھے ہوئے تین کلام مجید بھی رکھے ہوئے تھے بعض کی تقطیع بڑے سائز اور ایک کی بہت چھوٹی تقطیع تھی۔ حافظ کا پورا نام یوں لکھا ہوا تھا۔ حافظ فتح اللہ بن ملا محمد حسین لاہوری!

بعض کا خط موٹا اور بعض کا باریک لیکن نہایت دلکش اور دیدہ زیب تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں کتابت کے سال یہ تھے۔ ۱۱۰۷ - ۱۱۰۹ - ۱۱۰۸ھ

ایک کلام مجید بخط قطب الدین، ۱۱۹ھ بھی اس شوکیس میں رکھا ہوا ہے جس میں حافظ فتح اللہ کے کتابت شدہ کلام مجید رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تمام کلام مجید مختلف سائز اور مختلف قسم کے کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ خط کا حسن اور طلاکاری اور نقش سازی کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس یہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

ترک سلاطین کے کتب خانوں کے یا خاص ان کے مطالعہ کے کلام مجید بھی بڑی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بعض کے نام یہ ہیں:-

(۱) مصحف بخط یاقوت ۶۹۰ھ، (۲) مصحف بخط یاقوت ۶۸۹ھ (۳) مصحف بخط یاقوت۔ سنہ لکھا ہوا نہیں، (۴) مصحف بخط الیاس محمد بن الیاس — ۷۰۰ھ، (۵) مصحف بخط عبدالرحمٰن بن

بتفسیرِ وفا ہیم کمن کز آب چشم من — بخون آلودہ ہم تحریر و قاسیر و ید ازگل

گر از گردون طلے باشدت وحشی الا مکن — کہ عشق آمد دریں مشکل مدد ور حل مشکل

اسی کمرے کے بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کے دروازہ کا عنوان ہے "کمرۃ الاوراق البردیۃ" اس میں [illegible] پر لکھے ہوئے قدیم ترین خط اور مکاتیب شیشوں کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ بعض خط ثابت ہیں بعض بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ دوستانِ علم کی دلچسپی کے لیے ان خطوط کے سنین یہ ہیں:۔ [illegible] ۲۵۰، ۲۵۶ھ۔ ایک کتاب یہاں اور بھی نظر آئی ہے "الجامع الحدیث" تالیف ابی محمد عبداللہ بن وہب المصری القرشی۔ اس مصنف کی پیدائش سال ۱۲۴ھ—۱۲۵ھ میں ہوئی ہے۔ تیسری صدی کی ابتدا میں کتابت کیا گیا ہے۔ ایک خط ولید بن عبدالملک (۸۶۔۹۶ھ) کے زمانہ کا ہے اس کا متن یونانی اور عربی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ ایک اور خط بھی ولید کا ہے اس کے بھائی عبداللہ بن عبدالملک کے نام ہے جو اس وقت مصر کا گورنر تھا۔ ان خطوط کے متعلق دار الکتب المصریہ نے انگریزی زبان میں تین جلدوں کی ایک کتاب شائع کی ہے اور عربی زبان میں ایک ہی کتاب۔

بڑے کمرے میں جہاں کلام مجید کے قدیم نسخے اور مصنفوں کے اپنے ہاتھ کی لکھی کتابیں موجود ہیں وہاں چند شوکیس ایسے بھی ہیں جو ترک سلاطین کے کلام مجید دکھاتے ہیں اور ان میں ترکی زبان کے خطوط ہیں۔ میر علی شیر نوائی کے ترکی دیوان کے چند بہترین نسخے بھی شوکیسوں میں کھلے ہوئے اپنے حسن اور زینت کی بہار دکھا رہے ہیں۔

اسی کمرے کے ایک حصہ میں چند شوکیس رکھے ہوئے ہیں جن میں علامہ مرحوم تیمور پاشا کی ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ مثلاً قلمدان، فاؤنٹین پن، پیپر ویٹ، خورد بین، دوات، ہاتھ کی گھڑیاں، چائے کی پیالے، کھانے کی پلیٹیں وغیرہ وغیرہ۔ غالباً یہی قلم اور دوات ہوں گے جن کے ذریعہ اس عالم بے مثل نے عربی ادب اور تاریخ پر بیش بہا مضامین سپرد قرطاس کیے۔ علامہ تیمور پاشا کا کتب خانہ بھی دار الکتب کے سپرد کیا گیا ہے جس کی فہرست چھاپی جا رہی ہے اور "خزانہ تیموریہ" کے نام سے چار جلدیں اب تک چھپ بھی چکی ہیں۔

••

نور احمد فریدی

حرمین کے کتب خانے

۱۔ کتب خانہ مجیدیہ مکہ مکرمہ

حرم کی میں باب السلام کے اندر دائیں جانب ایک دروازے پر "مکتبۃ مکۃ" کا کتبہ نصب ہے۔ یہ کتب خانہ مجیدیہ کا داخلی دروازہ ہے۔ مکہ کرمہ کے قیام کے دوران حاجی لوگ نماز اور طواف کے بعد مکہ کرمہ کے بازاروں میں نکل جاتے ہیں اور خرید و فروخت کی گرم بازاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ باب الصفا کی طرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی والہانہ کیفیات سے ایمان تازہ کرتے ہیں۔ کچھ مصلیٰ حنفی میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اور جو علمی ذوق رکھتے ہیں ان کا اکثر وقت اس تاریخی کتب خانہ میں گذرتا ہے۔

پہلے یہ کتب خانہ مصلیٰ شافعی میں قائم تھا۔ ایک بار مکہ مکرمہ میں شدید بارش ہوئی اور حرم شریف سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اس سے کتب خانہ کو شدید نقصان پہنچا اور ہزاروں کتابیں ناکارہ ہوگئیں۔ اب بھی بہت سی کتابوں پر اس سیلاب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مقام خاصا اونچا ہے اور کتابیں اس جگہ مقابلتاً زیادہ محفوظ ہیں۔

اس کتب خانے کی اکثر کتابوں پر سلطان عبدالمجید خان ترکی شہنشاہ کی مہر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں شاہی کتب خانے سے یہاں منتقل ہوگئیں۔ اس لیے ابھی تک یہ نادر کتب خانہ سلطان مرحوم سے منسوب چلا آتا ہے۔

کتب خانہ کافی کشادہ اور ایک بڑے ہال پر مشتمل ہے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں استادہ ہیں۔ درمیان میں ڈیسک اور کرسیاں رکھی ہیں جن پر بیٹھ کر اہل ذوق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مصلیٰ حنفی کا دارالمطالعہ بھی اسی کتب خانہ سے وابستہ ہے۔ صبح کو یہاں سے قرآن مجید اور دینی کتب کے نسخے لیجا کر وہاں رکھوائے جاتے ہیں اور شام کو اٹھا لاتے ہیں۔ ایک ملازم سارا دن وہاں ان نسخوں کی دیکھ بھال کیلئے بیٹھا رہتا ہے۔ قرآن مجید کے نسخے یہاں دنیا بھر کے تمام رسم الخطوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کے سائز بھی غیر معمولی طور پر طویل و عریض ہوتے ہیں۔ کتب خانے کے ملازمین بڑے با اخلاق ہیں۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور چائے سے تواضع کرتے ہیں۔ کتب خانہ کا ایک ناظم اعلیٰ ہے اور ایک ان کا نائب ہے۔ دو تین ملازم ہیں یہ سب لوگ بڑی مستعدی سے مصروف کار رہتے ہیں۔

قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، فقہ، تصوف، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ پر یہاں ایسی مخطوطات ہیں جو مختلف لائبریریوں میں بڑی رہنمائی کرتے ہیں۔ اپنا اپنا مطالعہ کتابوں کے ہجوم کو کم کر دیتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں تاریخ کی چند کتابوں کے نسخے میں بلند پایہ کتابیں شامل ہیں۔ ابن خلدون کا وہ حصہ جو واقعات کربلا سے متعلق ہے کیونکہ ہمارے یہاں ابن خلدون کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں حضرت امام حسین کی شہادت کے واقعات تاریخ کامل سے لے کر دیئے گئے ہیں، بتایا جاتا ہے کہ اصل نسخے سے اوراق نکال لیے گئے تھے اور دوسرا واقعہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا ہے جو دوسری جگہوں میں ابن خلدون کے حوالے ملتا ہے۔ اس کتب خانہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنفین اور مؤلفین کے اپنے قلمی نسخے یہاں ملتے ہیں اور ان پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ مزید برآں بعض نسخے سلطان عبدالحمید کی مہر سے مزین ہیں۔ چند تاریخ کی بے شمار ایسی کتابیں یہاں ہیں جو افادیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں مگر ابھی تک طبع نہیں ہو سکیں اور اکثر تاریخیں حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ ہمارے یہاں خاص طور پر جو کتابیں نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ تحریف سے بچ نہیں سکیں اور ایسی حرکتوں سے ہی امت مسلمہ میں انتشار پیدا کیا گیا ہے۔

ہمارے علم دوست حضرات خاص کر مؤرخین اور مصنفین اگر ہمت کی یاوری سے ارض مقدس میں تشریف لے جائیں تو اس کتب خانہ سے ضرور استفادہ کریں اور متنازعہ مقامات کا ان نسخوں سے مقابلہ کریں جو دستبرد زمانہ سے تاحال محفوظ چلے آتے ہیں۔

۲۔ کتب خانہ شیخ الاسلام

یہ عظیم الشان کتب خانہ مسجد نبوی کے بالکل قریب ہے۔ باب جبرائیل سے نکل کر ایک تنگ گلی آتی ہے جس میں سنگ مرمر کا فرش کیا ہوا ہے۔ غالباً یہاں جنازے کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے جنوبی دروازے سے نکل کر سامنے گلی میں بائیں ہاتھ کو حضرت ابی ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان ہے جس پر "دار ابی ایوب انصاری" کا کتبہ نصب ہے۔ جب ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے حضور نے اسی تاریخی مکان میں قیام فرمایا تھا۔ عشاق رسالت یہاں کھڑے ہو کر روضۂ اطہر کی طرف منہ کر کے درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس مکان کے عین سامنے شیخ الاسلام کا عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ دراصل یہ مکان حضرت امام حسن کا ہے۔ ترکوں کے زمانے میں مدینہ طیبہ کا شیخ الاسلام اس عمارت میں رہتا ہوگا۔ آجکل کتب خانہ کا کام دے رہا ہے۔ مدینہ طیبہ کے قیام میں علمی ذوق رکھنے والے حجاج یہاں آتے اور ان نایاب کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جب راقم کو اس کتب خانے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی تو اس کے لائبریرین شیخ ابراہیم حمدانی تھے۔ اسی برس کے پیر مرد تھے۔ بہت خوش اخلاق اور فرض شناس بزرگ تھے۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے وہ اھلاً سہلاً کہتے ہوئے آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ اندر فرش پر خوشنما

مائل بچھے ہوئے تھے۔ دالان پر مختلف مسند بردار گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ شیخ نے ہمیں ان مسندوں پر بیٹھنے کا اشارہ
کیا۔ چند ماہ ہم سے پہلے بھی دو سیاح مسندوں پر بیٹھے کتابوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ مجھ سے پوچھا کہ آپ کون کون
سی کتابیں دیکھنا پسند کریں گے۔

میں نے انھیں عرض کیا کہ آپ اپنے کتب خانے کے عمدہ قلمی نسخے ہی دکھائیں۔ شیخ الماری کی طرف بڑھنے ہی والے
تھے کہ خادم جا کے لے آیا۔ ہم جاننا چاہتے تھے۔ لیکن ہماری نظریں کتب خانے کا جائزہ لے رہی تھیں بڑی الماریاں دیواروں کے ساتھ
ایستادہ تھیں اور کتابیں جزدانوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ جزدان لٹکے ہوئے تھے ایسی احتیاط آج تک کم از کم میری نظر سے کہیں نہیں گزری
تھی۔ شیخ چار پانچ جزدان اٹھا لائے۔ ایک جزدان سے قرآن مجید نکال کر آگے بڑھایا اور بتایا کہ یہ خلیفہ مامون الرشید کے اپنے ہاتھ
کا لکھا ہوا ہے۔ ایک اور جزدان سے دوسرا مصحف نکالا۔ فرمایا یہ سلطان مصطفیٰ خان شہنشاہ ترکی کی والدہ کا لکھا ہوا ہے
یہ مصاحف رسم الخط کے خوبصورت جدولوں کے درمیان بڑی ہنرمندی سے لکھے ہوئے تھے ان میں سے ایک مصحف حضرت
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہند کا بھی تھا جس کا عکسی نسخہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے طبع کرایا تھا۔ اسی طرح کئی نادر تاریخی
مصاحف شیخ نے دکھائے جن پر کاتبوں کے دستخط اور سنہ تحریر درج تھے۔ اس کے بعد شیخ نے تفاسیر، احادیث اور فقہ کے
نادر قلمی نسخے دکھائے ان میں سے بعض قلمی نسخے تھے جو آج تک طبع نہیں ہو سکے تھے۔ ان سب پر شارحین، محدثین اور فقہا کے
دستخط ثبت تھے۔ میں نے شیخ سے تاریخ اور سیر کی کتابیں طلب کیں حضرت شیخ اور ان کا ایک خادم برابر ہماری طرف متوجہ تھے شیخ
جزدان اٹھا کر لاتے اور کتابیں نکال کر آگے بڑھاتے جب ہم دیکھ چکتے تو ان کا خادم جزدان میں ڈال کر انھیں اصلی جگہ میں رکھ آتا۔

شیخ نے پہلے عربی کی کتابیں ایک ایک کر کے پیش کیں بعد ازاں فارسی کی تاریخیں دکھائیں ان میں سے اکثر بڑی پرانی ہو گئی تھیں خصوصیت یہ تھی کہ بعض
اصل نسخے تھے جو مصنفین اور مؤلفین نے خود اپنے قلم سے لکھ کر نذر کیے تھے۔ صوفیائے کرام کے تذکرے دیکھے "اخبار الاخیار" اور "سفینۃ الاولیاء" شیخ نے آگے بڑھائے اور لاکر
حضرت محدث دہلوی اور مولانا دارا شکوہ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے ان پر انکے اپنے دستخط موجود تھے۔ مثنوی مولانا رومؒ دیکھنے کا اشتیاق تھا کیونکہ
ہمارے ہاں مثنوی کے جو نسخے متداول ہیں جو بمبئی، لاہور اور نولکشور کے طبع شدہ ہیں ان پر خاص تحریف کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میرے ذہن میں تھا

چوں صحابہ حب دنیا داشتند — مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

مجھے یقین تھا کہ یہ الحاقی ہے۔ چنانچہ مثنوی کے قلمی نسخے کو جس پر حضرت مولانا رومؒ کے دستخط ثبت تھے کھول کر دیکھا تو اس میں یہ شعر نہ
آیا۔ اسی طرح چند اور اشعار بھی نظر نہ آئے جو ہمارے نسخوں میں ان بزرگوں کے لیے تضحیک کا موجب بنے ہیں۔

ہم کتابوں کے دیکھنے میں محو تھے کہ دفعۃً حرم سے اذان کی آواز آئی جس پر سب لوگ کتابیں چھوڑ سرعت سے باہر نکل آئے ہم نے شیخ نے بڑی
محبت سے ہمیں خدا حافظ کہا۔ اتنے میں خادم کمرے کو مقفل کر چکا تھا ہم نے کتب خانہ پر نگاہ واپسیں ڈالتے ہوئے حرم شریف کا رخ کیا ●●

مراسلات

- جرنل ۵۳ھ کے تسامحات
  - جناب عبدالرؤف خاں
- استاد احمد معمار کی ڈائری؟
  - جناب شبیر احمد خاں غوری
- "ہند عہد اورنگ زیب میں" کے بارے میں
  - جناب مصطفیٰ شروانی

جرنل کے بارے میں آپ کی تنقیدوں، فہمائشوں
اور مشوروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

ـــــــــــ ادارہ

مراسلات

جرنل ۵۳ کے مسامحات

جناب عبدالرؤف خاں
حمیدیہ لائبریری بھوپال

جرنل ۵۳ ص ۱۵۱ سطر ۸ پر حضرت اقدس میاں نعیم شاہؒ کا سنہ وفات ۱۲۷۳ھ رقم فرمایا ہے کہ ملاّ نے تاریخ "بر بہشت نعیم شاہ امام" ([illegible]) کے اعداد کا میزان ۱۲۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ مادہ بشکل قطعہ نعیمہ مذیلہ کے ساتھ نظم ہوا ہو۔ ص ۱۵۵ پر تصنیف "گلستانِ رحمت" (۱۲۸۰ھ) [illegible] اصل تاریخی نام ہے۔ جس کی طرف شاید صاحب مقالہ کی توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ مقالہ "[illegible]" ص ۱۱۱ سطر ۳ میں جناب مفتی کشمیری کے سفر کا سنہ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۱ء تسوید فرمایا ہے لیکن اس کی تائید میں جو فارسی عبارت تحریر فرمائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے سیاحت کا سال ۱۲۸۵ھ تھا: "در اوائل موسم برسات یک ہزار و دو صد ہشت و پنج ہجری..." (سطر ۲ "غو ایضاً") ظاہر ہے کہ کاتب کی کرشمہ سازی نے "بست" کو "ہشت" بنا دیا ہے۔ ص ۱۰ سطر ۴ پر "مقبول خرد (۱۲۲۵)" سے مطلوبہ اعداد برآمد نہیں ہوتے بلکہ ۱۲۲۵ کی بجائے صرف (۱۷۸+۴۰+۸۰۲) ۱۰۰۲ ہی مستخرج ہوتے ہیں چنانچہ اس میں "گردیدہ" کے اعداد ۲۲۳ کا اضافہ کرنا چاہئے تھا یعنی "مقبول خرد" کے بعد جس میں ۱۲۲۵ ثبت نہ ہونے کی بجائے "مقبول خرد گردیدہ" کے بعد (۱۲۲۵ھ) ہونا چاہئے۔ ص ۱۸۳ پر حضرت خواجہ بزرگ معین الدین سجزی علیہ الرحمہ کے سال ولادت، سن مبارک نیز سنہ وفات کے سلسلہ میں حسب ذیل قطعہ:

گو نہ بود وجودِ شریف دو عالم — شفیع یوم جزا آمد آں زرواں نشہ
حسب بآل عبا ہست ہم نسب بہ علی — وفات یافت چو لاریب ہم بحق پوشید

میں "بحق پوشید" (۳۲۲+۱۱۰) کے اعداد کا میزان ۴۳۲ ہوتا ہے۔ جبکہ قطعہ کی تشریح فرماتے ہوئے صاحب مقالہ رقمطراز ہیں: "اور "ہم بحق پیوست" سے تاریخ وفات شریف اخذ کیا ہے" اس فقرہ کے اعداد ۶۳۳ ہی ہوتے ہیں جو "آفتاب ملک ہند" (ص ۱۸۲ سطر ۱۸) کے اعداد کے مساوی ہیں اور یہی سال وفات اکثر محققین نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ یہ فقرہ قطعہ میں موجود نہیں۔ بہتر ہوتا کہ حضرت اجمیریؒ کی عمر شریف جو ۹۷، ۹۶ سال سے زیادہ ازروئے تحقیق جدید نہیں پہنچتی، ادارہ کی طرف سے فوٹ نوٹ ثبت فرما دیا جاتا کیونکہ مذکورہ قطعہ کی رو سے "بآل عبا" (۳+۳۳+۷۳) ۱۰۶ سال ہوتا ہے۔

● ص ۲۰۴ سطر ۱۸ پر "شیرازۂ جمعیت" (۵۲۳+۵۲۳) کے اعداد کی میزان بھی ۱۰۴۶ ہوتا ہے نہ کہ ۱۲۲۷ھ ص ۲۱۷ کی

جناب شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

استاد احمد معمار کی ڈائری؟

محترم ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے کسی پورین نکامیت میں "تاج محل کے معمار" کے مسئلہ کو حل کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں خود "معمار تاج" نادر العصر استاد احمد کی ڈائری سے استشہاد کیا ہے، جس کے لیے بجا طور پر مبارک باد دی جا سکتی ہے کہ

ع   ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس پہلو پر کوئی تبصرہ نہ تو مجھے دلچسپی ہے نہ دوسرے فنون لطیفہ سے۔ مجھے استاد احمد معمار سے صرف اس وجہ سے دلچسپی ہے کہ:

(۱) وہ ہندوستان کے ریاضی دانوں کے ایک عظیم المرتبت خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں جس نے کئی نسلوں تک بڑے جلیل القدر ریاضی داں پیدا کیے۔

(۲) وہ خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتے تھے، کیونکہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ مہندس کا ریاضی و ہیئت میں امتحان لینے کے لیے انھیں چوتھی صدی ہجری کے مشہور ہیئت داں عبدالرحمٰن الصوفی کی کتاب "صور الکواکب" کا (جو اپنے موضوع کی ادبیات عالیہ میں آج بھی محسوب ہوتی ہے) فارسی میں ترجمہ کا حکم دیا۔

(۳) ان کے پوتے امام الدین ریاضی نے "تذکرہ باغستان" میں لکھا ہے کہ "استاد احمد معمار کے مشہور ایرانی عالم ملا مرشد شیرازی سے (جسے بعد میں شاہجہاں نے حکومت خاں کے خطاب سے نوازا) مناظرے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر حق علاً احمد معمار کی طرف آتا تھا۔

یہ بھی عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ملا مرشد شیرازی وہ عبقری وقت تھا جس سے عہد شاہجہانی میں ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی تجدید ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مناظرے سنی شیعہ مناظرے ہی نہیں تھے بلکہ علمی تھے جن کی اگر آج تفصیل مل جائے تو اس سے عہد شاہجہانی میں علوم حکمیہ بالخصوص ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی کیفیت معلوم کرنے میں بڑی

قابلِ قدر مدد ملے گی۔

اس لیے مجھے یقینِ واثق ہے کہ استاد احمد معمار کی ڈائری میں جس سے محترم ڈیسائی صاحب نے تاریخ تعمیرات کے
ایک ممتاز ماخذ سمجھ کر اس جزو حل کرنے میں مدد دی ہے استاد احمد معمار کی طرزِ زندگی بالخصوص ریاضی و ہیئت سے متعلق
بھی بہت سے نکات و افادات مل جائیں گے۔

مجھے محترم ڈیسائی صاحب کی خدمت میں کوئی بار نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ کسی طرح آپ
کی وساطت یا کسی و سفارش سے اس چکر لگا کر بھی استاد احمد معمار کی ڈائری کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے۔

اگر وہ ڈائری ان کی ذاتی ملکیت ہے تو کسی طرح آپ ان سے اس دیرینہ نیاز مند کی خاطر اس کا زیراکس منگا لیں۔
اور اگر کسی لائبریری یا میوزیم کی ملکیت ہے تو بذریعہ نوازشِ کریمانہ وہاں سے اس کا زیراکس حاصل کر لیں۔

مجھے یقینِ واثق ہے کہ ؎

بر کریماں کارہا دشوار نیست

جناب مصطفیٰ الشروانی
حایت نگر حیدرآباد

ہند عہد اورنگ زیب میں کے بارے میں

"خدابخش لائبریری جرنل کا ضخیم شمارہ ۶۵ تا ۶۶ بمصداق "طول بود حکایت دراز ترگفتم" موصول ہو کر
بس وجہ سے بھی لائق تحسین وستائش ہوا کہ اس چھ نمبری شمارہ میں مختلف فنون ادب شعر وسخن مذہبیات تاریخ و
فلسفہ کو بے حد خوبی سے یکجا فرمایا گیا ہے۔

مرزا سمیع اللہ بیگ نواب مرزا یار جنگ بہادر مرحوم سابق چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ کی تحقیقی تصنیف
"ہند عہد اورنگ زیب میں" مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۲ کا عکسی نسخہ میرے پاس والد ماجد پروفیسر ہارون خاں
شروانی مرحوم مغفور کے خزینہ علمیہ سے موجود ہے۔ اس پر نواب مرزا یار جنگ مرحوم نے ۲۰ بہمن ۱۳۳۲ ف مطابق
۱۹۲۲ کو اپنے قلم سے والد ماجد مرحوم کی خدمت میں تصنیف پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے:۔

> جناب من تسلیم
>
> یہ کتاب دراصل برٹش انڈیا کے حالات کے لحاظ سے لکھی گئی ہے اور اسکی تفہیم
> برٹش انڈیا میں ہی زیادہ تر ہوگی حیدرآباد سے تعلق نہیں یہاں تو صرف چند احباب کی خدمت میں
> جو صاحب رائے ہیں بھیجونگا۔ مریض کا علاج اور پھر کسی قوم کے مرض کا علاج اس وقت تک نہیں
> ہو سکتا جب تک صحیح تشخیص نہ ہو۔ میں نے اس کتاب کے باب دہم میں تشخیص کرنے کی کوشش
> کی ہے مگر میں آپ کے قیمتی اور قابل قدر تجربہ و رائے سے مستفید ہونا چاہتا ہوں میری استدعا ذیل
> کے مطبوعہ خط میں ہے۔"
>
> نیازمند
> سمیع اللہ بیگ

خدابخش نوادر
باخرزی بخطِ قاضی عبدالودود
سعید نفیسی
باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر
رباعیات باخرزی: نسخۂ خدابخش کا عکس
رباعیات: تعارف اور متن
صلاح الدین خدابخش

○

تاثیر صاحب باخرزی پر گویا ایک انسائیکلوپیڈیا
مرتب کرنا چاہتے تھے، مگر ——— اس سانحۂ ارتحال
اس دنیا میں انھوں نے سید نفیسی کا پورا مقالہ اپنے
ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ یہ مقالہ مجلۂ دانشکدۂ ادبیات
سال ۲ شمارہ ۴، تیرماہ ۱۳۳۴ شمسی کو میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا مضمون بشیر الحق دسنوی کا ہے جو "معارف"
کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ملخص تلخیص ترجمہ
پیش کیا جا رہا ہے ——— اور ان تعارفات کے ساتھ
رباعیات باخرزی کے نسخۂ خدا بخش کا عکس بھی پیش کیا
جا رہا ہے۔
رباعیات باخرزی پر صلاح الدین خدا بخش کا مضمون
(انگریزی) Zeitschrift der Deutschen
Morgenlaendischen Gesellschaft
Neunundfu... Band Leipzig
1905 میں شائع ہوا تھا۔ اسکی اہمیت کے پیش نظر اسے
بھی شامل کیا جا رہا ہے۔
——— ادارہ

باخرزی بخط قاضی عبدالودود

سعید نفیسی

شیخ عالم سیف الدین ابوالمعالی سعید بن مطهر باخرزی از بزرگان مشایخ صوفیه
اواخر قرن ششم و اوائل قرن هفتم بوده و بسبب جلالت قدری که میان معاصران خود داشته او را
شیخ العالم میگفتند. در باب وی در کتابهای تاریخ و تصوف از آن جمله در حبیب السیر
و هفت اقلیم و نفحات الانس و طرائق الحقائق و سفینة الاولیاء و خزینة الاصفیا
و مجالس العشاق تالیف کمال الدین حسین گازرگاهی کما بیش ذکر وی هست. او را
معاصر فریدالدین عطار و نجم الدین کبری دانسته اند و از شاگردان نجم الدین کبری شمرده اند.
مولف حبیب السیر میگوید سیورقوقتی بیکی مادر منگوقاآن پادشاه مغول با کمال تمیز
بود در ایام دولت پسر خود هزار بالش نقره بشیخ عالم سیف الدین فرستاد تا مدرسه بسازد
و مستغلات خریده بر آن بقعه وقف کردند و تولیت آن مدرسه و موقوفات آن را
بوی داد.

برخی دیگر وی را معاصر سعدالدین حموی و نجم الدین رازی و رضی الدین علی لالا غزنوی
و مجدالدین بغدادی دانسته اند.

در باره وی کراماتی آورده اند از آن جمله خواندمیر در حبیب السیر و جامی در نفحات الانس
آورده اند که روزی بر سر جنازه درویشی حاضر شد، گفتند تلقینی بگوی. وی پیش روی
آن مرده بایستاد و این رباعی را خواند:

گر من گنه جمله جهان کردستم — عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم — عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

خدا بخش لائبریری جرنل کا آئندہ شمارہ

مخطوطات تصوّف

کے موضوع پر ہوگا

یہ مجلہ جنوبی ایشیائی تصوف سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔

—— :(جس میں): ——

تقریباً سو اہم مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے کتب خانوں میں محفوظ تصوف کے ایسے مخطوطات کی فہرستیں بھی شامل ہوں گی جو اب تک طبع نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ فہرستیں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

تعداد صفحات تقریباً ۷۰۰ —— آفسٹ کی معیاری طباعت

باذوق حضرات پیشگی آرڈر فرما کر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر

نیز رباعیاتش که معروف است در کتابخانه‌ها نسخه‌هایش هست. دارای ۱۰ رباعیات است بعضی از آنها به خیام منسوب
می‌باشد: دیگر از غالب این کلام باخرزی است نه کلام خیام. چنانکه مرحوم محمد شیر الحق بیدل دهلوی که دانش پژوهی
گمان می‌برد و آنها چنین اند

سیف الدین باخرزی

در عالم خاک دانه پاشیدم و رفت
صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با یک دو سه از ... کاری نیست
دارنده چنانکه خواست باشیدم و رفت

هرگز شب سیاه ما در نشود
تا معصیت از وجود ما در نشود
پر می نشود کاسهٔ سر ما از هوس
کاسه که سرنگون بود پر نشود

یک روز ز ایام نداریم خوشیم
گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته بما می‌رسد از مطبخ عشق
از کس طمع خام نداریم خوشیم

خیام

در عالم خاک خاک پاشیدم و رفت
صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با ... چرای تو مرا کاری نیست
چندانکه ... باشیدم و رفت

(نسخهٔ چاپی نولکشور، در نسخهٔ چاپی ... امرتسر ... سنستانی)

شب نیست که عقل در تحیر نشود
... پر از در نشود
پر می نشود کاسهٔ سر از سودا
کاسه که سرنگون بود پر نشود

(نسخهٔ چاپی نولکشور، در نسخهٔ چاپی روز ... امرتسر ... سنستانی)

یک جو غم ایام نداریم خوشیم
گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته بما می‌رسد از مطبخ غیب
از کس طمع خام نداریم خوشیم

(نسخهٔ چاپی امرتسر)

سیف الدین باخرزی

گردیکه بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست
انگشت وزیر یا سر سلطانیست

خیام

خاکی که بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست
انگشت وزیری و سر سلطانیست

(نسخهٔ دست نوشتهٔ خطی و نسخهٔ چاپی تصحیح سلیمان ندوی)

اصلاح بدم ز خلق پنهان میکن
دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

صعبهای جهان بر دلم آسان میکن
وافعال بدم ز خلق پنهان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

(ایضاً)

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

گر من گنه روی زمین کردستم
عفو تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

(نفحات الانس)

رضا قلی هدایت صاحب ریاض العارفین میگوید که تعداد رباعیاتی که مشترک اند ما بین ابوسعید ابوالخیر و باخرزی هیچ خطا کم از کم سی عدد نیست۔ مشتی نمونه از خروارے که تصدیق این قول کند اینست۔

رباعیات باخرزی

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت آشنا دمی خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن برگذرد
برگردم از آن حدیث دیوانه شوم

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت کنشت دمی خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن برگذرد
برگردم از آن حدیث دیوانه شوم

رباعیات باخرزی

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

ای ستر تو در سینهٔ هر صاحب راز
پیوسته در رحمت تو برهمه باز
هرکس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
دل بسته مرا ازین غم خسته و ریش
با ما کرس گفت بلا ای درویش
تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

با عشق تو عهد جان ما اشتاقیست
مائیم و غم عشق تو تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خون جگر مردم چشم ساقیست

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کشم و همه غمت نوش کنم
تا از پس من بکس نماند غم تو

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

گر من گنه روی زمین کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

ای ستر تو در سینهٔ هر صاحب راز
پیوسته در رحمت تو برهمه باز
هرکس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
در شرم گنه فگنده ام سر در پیش
آواز آمد که شاد باش ای درویش
تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

با عشق تو عهد جان ما اشتاقیست
مائیم ز درد عشق تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خون جگر مردم چشم ساقیست

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا نداند غم تو
دردی خورم و غمت همی نوش کنم
تا آنکه بکس دگر نماند غم تو

رباعیات باخرزی

بی علم و عمل بهشت و رضوان مطلب
بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود
آزار دل هیچ مسلمان مطلب

گر روز گناه جست و خواهد بود
آن یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی ز پل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

با محنت و اندوه قرینم کردی
محتاج بیک نان جوینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
آیا بچه خدمت این چنینم کردی

رباعیات ابوسعید ابو الخیر

از چرخ و فلک گردش یکسان مطلب
در دور زمانه عدل سلطان مطلب
روزی که بهیچ گر در جهان خواهی بود
آزار دل هیچ مسلمان مطلب

گویند بحشر گفتگو خواهد بود
وان یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی نآید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی ز پل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

با فاقه و فقر همنشینم کردی
محتاج بیک نان شبینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
یارب بچه خدمت این چنینم کردی

(ترجمہ از مقالات مطبوعہ مجلہ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۶۸ (۵) ... نومبر ۱۹۵۱ء)

••

رباعیات شیخ العالم

رباعیات باخرزی

نسخۂ خدابخش کا عکس

رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی
قدس الله تعالی سره العزیز روح ورحت

داخل کتب خانه نواب سید فدا حسن خان دام اقبالهم
گردید بست و نهم جنوری ۱۹۶۲
مطابق بست و سوم شعبان سنه ۱۳۸۱
کتبه حامی محمد فدا حسین عفی عنه
مقام لکھنؤ

5. Khoda Bakhsh, Saifuddin Bākharzi.

42.

افسوس که مرغ عشقرا دانهٔ نماند امید بهیچ خویش و بیگانه نماند
دردا و دریغا که درین مدت عمر از هر چه بگفتیم جز افسانه نماند

43.

آنست به حقیقت مثال دل نیست میدار بخاطر که مثال نیکوست
گر صدف بود نیان نگدارد ز تو هیچ ور تمره بود نیان بود هر چه دریست

44.

گر طلعت خود نقش کنم بر نانی وان نان بنهم پیش سگی بر جانی
آن سگ سالی گرسنه در کیدانی از ننگ بران نان نزند دندانی

45.

گفتم که ما از فقرائیم و نه ایم از راه روان پارسائیم نه ایم
آراسته ظاهریم و باطن نجنان افسوس چنانکه می نمائیم نه ایم

46.

این اسپ قلندری همه تاختنه نیست وین مهره آکمن همه باختنه نیست
گر دهر و مومنت بره پیش آید از روی نیاز با همه ساختنه نیست

47.

پیدا شده ای رفیق دوری که مپرس وز ناکس و کس رسید جوری که مپرس
پری که ازو توقع پرسش بود پرسید مرا ولی بطوری که مپرس

48.

عشق است که شیر نر زبون آید ازو کاریست که هر کار برون آید ازو
گه دوستی کند که جان افزاید گه دشمنی که بوی خون آید ازو

49.

آن خال بران روی دلافروز نگر بر هر چه مراد ایست فیروز نگر
مانند شب سیاه دل سوختگان سر بر زده از میانهٔ روز نگر

34.

دنیا گذرانست بهر بیش و کمی
خواهیش بشادی گذران خواه غمی
زین منزلت البته همی باید رفت
خواهی بهزار سال و خواهی بدمی

35.

در بدر حق نثار کردن چه خوشست
ور مردم بد کناره کردن چه خوشست
آن دل که درو مهر الهی نبود
آن دل بهزار پاره کردن چه خوشست

36.

نادان چو بمعروف رسد پستش گیر
آزاده اگر فرو فتد دستش گیر
مست از ادبی نمود هشیارش دان
هشیار که بی ادب بود مستش گیر

37.

ب دون بهمل مرور می باید بود
ب ملک دوکون عور می باید بود
گیرم که تو بیزار عالم شده
آخر نه بزیر گور می باید بود

38

... منشین که خوش زمانیست عزیز
خرم که براید از تو جانیست عزیز
عمریست که آمد است وخواهد رفتن
ضبع مکنش که میمانیست عزیز

39.

گرچه زگناه جست و جو خواهد بود
آن یار عزیز تندخو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی نآید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

40.

جانا اگرم هزار جان خواهد بود
فرمان تو بر جمله روان خواهد بود
نامردم اگر بهیچ شادی کردم
تا بوی تو در جهان خواهد بود

41.

مستوفی عشقت مینما روز نخست
تحصیل غمت بنام من کرد درست
آنگاه برات اشک بر وجهم راند
غم باقی کرد وگفت در عهدهٔ تست

8. Khuda Bakhsh, Saifuddin Bâkharzî.

26.

بی علم و عمل بهشت یزدان مطلب | بی خاتم دین ملک سلیمان
چون عاقبت کار فنا خواهد بود | آزار دل هیچ مسلمان مطلب

27.

گر رهبر تو شمع بدآموز بود | بدبختم اگر بخت تو فیروز بود
تو خفته نیز و شب عمرت کوتاه | ترسم که چو بیدار شوی روز بود

28.

افعال بدم ز خلق پنهان میکن | دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من | آنچه از کرم تو می سزد آن میکن

29.

یکچور ز ابلم نداریم خوشیم | گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته بما میرسد از مطبخ عشق | از کس طمع خام نداریم خوشیم

30

جان در تن مرد بی‌ادب ارزانست | گر زر بدهی ادب حری ارزانست
از بی ادبی کسی بجائی نرسید | حقاکه ادب تاج سر مردانست

31.

با عشق تو عهد جان ما مشتاقیست | سودیم و غم عشق تو تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله | می خون جگر مردم چشمم ساقیست

32.

دانی چه بود شرط خرابات نخست | اسپ و کمر و کلاه در بازی چست
چون مست شوی پایتو میگیرد سست | گویند نشین تتوز باقی بر تست

33.

که همدم یار نازنینم کردی | که با غم و درد همنشینم کردی
تا یافتم از گم شده خویش نشان | مشهور همه روی زمینم کردی

S. Khuda Bukhsh, Saifuddin Bâkharzi.

18.

دستار من و کفش من و جبهه بهم قیمت کردند یک درم چیزی کم
آوازهٔ من شنیده اند در عالم من خاکرهم زخاک ره چیزی کم

19.

هرگز شمعٔ سپاه ما تر نشود تا معصیت از وجود ما در نشود
بر می نشود کلمهٔ سر ما ز هوس کلمه که سر نگون بود پر نشود

20.

در عالم خاک و باد چاشیدم و رفت صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با نیک و بد زمانه ام کاری نیست دارنده چنانکه داشت باشیدم و رفت

21.

در گفتن ذکر حق زبان از همه به طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی که ز پل صراط آسان گذری نان ده بجهانیان که نان از همه به

22.

ردکردهٔ ما قبول کس کم یابد پذیرفته ما حیات سرمد یابد
هر کس که بما کند تولا روزی عیش و طرب و نشاط هردم یابد

23.

ای نه دله و دو دله هرزه پله کن صراف وجود شو و خود سره کن
هر صبح باخلاص بیا بر در ما مقصود تو بر نیابد وانگه گله کن

24.

زنجیر در سرای شاهی مائیم صراف جواهر الهی مائیم
از ماه نشسته تا بماهی مائیم با این همه نور در سیاهی مائیم

25.

ای دل اگر بعلی موافق باشی اندر ره دین مومن صادق باشی
یا مسلمان باش یا کافر صدق کافر باشی به که منافق باشی

8. [illegible]

10.

هر شب بمثال پاسبان کویت
میگردم گرد آستان کویت
باشد که برایدای صنم روز حساب
نامم ز جریدهٔ سگان کویت

11.

ای دل چه بود که ترک بیداد کنی
از منزل آخرت یکی یاد کنی
گر نامهٔ اعمال ترا بنمایند
یعنی و هزار آه و فریاد کنی

12.

ای دل تو دمی مطیع سبحان نشدی
از خوی بدت هیچ پشیمان نشدی
درویش شدی و زاهد و دانشمند
این جمله شدی ولی مسلمان نشدی

13.

فسق است و فساد ورد هر روزهٔ ما
پر شد ز حرام کاسه وکوزهٔ ما
می خندد روزگار و میگرید عمر
بر طاعت و بر نماز و بر روزهٔ ما

14.

عمرم بسر آمد و گنه می بینم
سر تا سر نامه‌را سیه می بینم
در مزرعه خود نکشته ام تخم نکو
کشتم بدرو رسید و که می بینم

15.

بگرفت بدست زلف چون شستش را
بشکست بمشت نرگس مستش را
امید من آنست بزودی نه بدیر
چشم تر او خشک کند دستش را

16.

دنیای خراب ما عمارت که کند
وین کرده گناه ما کفارت که کند
ما بر سر خاکها زیارت کردیم
تا بر سر خاک ما زیارت که کند

17.

گردی که بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست
انگشت وزیر یا سر سلطانیست

8. Khuda Bakhsh, Saifuddin Bākharzī.

2.

ای لطف عمیم تو خطاپوش همه — وی حلقه بندگیت در گوش همه

بر دار خدایا ز کرم بار گناه — در روز فروماندگی از دوش همه

3.

ای لطف تو امسال همان پار همان — در باغ تو گل همان بود خار همان

زان بر همه کس کشاده بادا در تو — تا مست همان آید و هشیار همان

4.

هر نقطه که در دایرهٔ قسمت ایست — بر حاشیه مایده نعمت ایست

در سینه هر ذره اگر بشکافند — دریا دریا جبان جبن رحمت ایست

5.

نستم بحضرت تو مشتی درویش — غرق گنه و امید رحمت در پیش

با ما سخنی گوی که چون گفته شود — آنرا سازی ببدنهٔ رحمت خویش

6.

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش — دل هست مرا ازین تپش خسته و ریش

با ما کرمش گفت هلا ای درویش — تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

7.

بر تخت وجود هر که صاحب جاهست — اورا سوی عالم حقیقت راهست

هر نور یقین که در دل آگاهست — از گفتن لا اله الا الله است

8.

سبحان الله شگرف کاری غم تو — بر خسته دلم عظیم باری غم تو

گفتی که غم منت چنین مجنون کرد — آری غم تو غم تو آری غم تو

9.

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو — بیگانه و آشنا چه داند غم تو

دم در کشم و همه غمت نوش کنم — تا از پس من بکس نماند غم تو

and whole-souled religious belief. Throughout the Rubāiyat there runs a deep religious undercurrent which is alike refreshing and invigorating. He was permeated through and through with the divine fire which glowed clear and bright in line and which has found a noble expression in the opening Rubāiyat.

Whether he rises to the lofty conceptions of Omar Khayyam or not is a question which need not be discussed or debated here but there will hardly be two opinions upon the intrinsic worth and value of his Rubāiyat.

He does not scoff at things divine nor regard life purely from the point of view of physical pleasure or sensual gratification. But, to our mind, that which ensures his immortality is that he, like a true prophet, saw with clearness and expressed with force, that religion consists not in the repetition of set formulae or in the exercise of ordained practises, but in single-hearted love and devotion to the Almighty and in honest and straightforward dealings with one's fellow-creatures. The poet, living in a century of storm and stress and finding himself surrounded by a flood of ungodliness arrives at the unwelcome conviction of the unreality and hollowness of life and takes upon himself to preach by precept and example that true nobility of soul is attained by self-abasement and true religious life reached by sincere and genuine beliefs and not by their counterfeits.

It is possible, though we have no clear proof of it, that he spent the later portion of his life in silence and solitude brooding over things divine or mourning over things temporal, watching the gathering storm slowly rising over the Muslim horizon and adorning the title of the Shaikh-ul-Alam which his contemporaries conferred upon him in recognition of his intellectual attainments and saintly virtues.

Might we not say with Swinburne:

> Shall he not win from latter days
> More than his own could yield of praise?

بسم الله الرحمن الرحیم

رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی قدس
الله تعالی سره العزیز ودرج روحه

I.

ای سر تو در سینه هر صاحب راز پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هرکس که بدرگاه تو آید به نیاز محروم ز درگاه تو کی گردد باز

S. Khuda Bakhsh, Saifuddin Bākharzī.

Our Ms. of Saifuddin's Rubāiyat is written in fine, clear nastaliq, within gold ruled columns, with an artistic heading at the beginning. It is not dated but it apparently belongs to the fifteenth century. Of the life of the author we possess the barest and vaguest outline. The notices in the biographies are provokingly short and unsatisfactory. It is all the more to be regretted as we should have liked to know the gradual growth of his intellectual power, the successive stages through which he passed bringing him ultimately into prominence, the political influence, if any, that he possessed or wielded. For the solution, however, of these questions we seek in vain in the meagre biography of our author which has floated down to us through the stream of ages. The biographers have contented themselves with recording that he was a celebrated personage of his time, that after the completion of his studies he became a disciple of Najmuddin Kubra who sent him as his *Khalifa* to Bukhara. So far we are upon solid ground in as much as the biographers are absolutely agreed upon these points but further and beyond we are in entire darkness. Even the very date of his death is differently given by different authors. According to some he died at Bukhara in 648 A. H. but according to others in 658 A. H. Suhaf (صحف Bankipur Ms. Folio 381 B) rejects both these dates and fixes 659 A. H. as the year of Saifuddin's death. We are, however, inclined to accept 658 A. H. as the correct date and the story related in Haft Iqlim (Folio 202 A, Bankipur Library) lends colour and support to this theory.[1]) It is there stated that Saifuddin was entrusted with the charge of the madrasah which the mother of Mangu Khan had founded and endowed at Bukhara.[2]) This fact, if correct, clearly indicates that our author was not altogether unknown to fame or fortune and that he must have possessed a personality strong and powerful enough to allure and attract and rivet the attention of a court neither very spiritual nor intellectual either.

Thus much we know of our author. The Rubāiyat numbering only fifty-one consist of either splendid invocations to the Almighty or solemn elegies upon the waning glory of Islam or dignified satires upon the pharisaic artificiality of the Muslims. They are too few indeed to give us a glimpse of the life of the author or warrant us to construct a biography out of them. Possibly Saifuddīn wrote many more which have perished. Some of the Tazkiras, indeed, quote Rubāiyat of Saifuddīn omitted in our Ms.

Whatever else Saifuddīn may have been there is one thing which his Rubāiyat amply demonstrate and it is his deep-seated

---

1) For further authorities see Jami's Nafhāt (نفحات الانس جامی) p. 495 Cal. Ed; Makhzan ul-Ghara'ib (مخزن الغرایب) Ms. p. 340.

2) Howorth, History of the Mongols Part I p. 188.

Saifuddīn Bākharzī.

By

S. Khuda Bakhsh, M. A., B. C. L.

Europe is familiar enough with the mystical muse of Jalal-uddin Rumi, the ripe and mellowed wisdom of Sadi, the passionate lyrics of Hafiz, the cynical and sceptical utterances of Omar Khayyam and other Persian poets of lesser note, but still there are many poets—singers of sweetest songs—whose works have not yet seen the light of day. The Khuda Bakhsh Oriental Public Library at Bankipur is perhaps the richest and finest in India in Divans. The Mss. are not merely exquisitely written and magnificently illuminated, but the Library can claim possession of some Divans which are all but unknown. This observation does not apply merely to the poetical collection but equally well to the historical and theological collections. We have already published an extract from the scarce and invaluable work of Ibn Ḥazm, entitled Jamharatu-n-Nasab and we now publish the Rubāiyat of Saifuddīn Bākharzī. We shall shortly be in possession of a complete Catalogue which is being done with great care and industry by Maulavi Muqtadir of Calcutta and the assistant Librarian Maulavi Shihābuddīn.

Before I pass on to the life of Saifuddīn, I might mention here some of the Divans and poetical works which, so far as we have been able to ascertain, are exceedingly rare.

1. Ghazaliyat of Salman of Sawa (d. 778 A. H.).
   our copy is dated 811 A. H.
2. Divan of Ruknuddin Ṣāin of Herat (d. 785). ركن الدين صائن
   our Ms. is dated 883 A. H.
3. Divan of Faṣīḥī (d. 1046) ديوان فصيحى هروى.
   This Ms. was written two years before the death of the author.
4. Divan of Mirza Kamrān (d. 964 A. H.) (Son of the Emperor Babar).
   This Ms. bears the autograph of some of the Mughal Emperors.
5. Kulliyat of Munir Lahauri (d. 1054 A. H.)

Amrik Singh

Shahidganj dispute

The Muslims claimed it (Gurdwara Shaheed Ganj in Lahore in the mid-30s) to be a mosque though it had been a gurdwara for about two centuries. The court turned down the Muslim contention and this led to a prolonged confrontation in which, as in the present case, a large number of valuable lives were lost. The British government however did not budge from the position upheld by the court.

The interesting thing is that even after 1947, when there is hardly anyone to visit the gurdwara, the character of that building has not been changed and it has not been converted into a mosque. If this can happen in Pakistan, which according to its Constitution is described as an Islamic state, can India which describes itself as a secular state act differently?

(Source Times of India Patna, dt.10/11/1990.)

difficult for Sir Sikandar to remain leader of the party.

As a last resort, the premier sought the governor's help who exercised his extraordinary powers and disallowed introduction of the bill.

In a memorable address to the assembly, the premier made three points firstly, he said that if today the Muslims got enacted a new law to get back Masjid Shahid Ganj then the Hindus too would demand restoration of their temples which had been seized during the Muslim rule; his second point was that the Muslims were in a minority in seven provinces out of the eleven in British India and if in Punjab they showed no consideration to the sentiments of non-Muslims their co-religionists in other provinces could not expect a better treatment; thirdly he said that it was not at all proper to nullify a decision of the highest court of the province on the strength of their majority in the legislature.

The Unionist Party had always been painted by the nationalist minded people as an organisation of toadies and decadent feudal lords. But looking back we find that the Unionist leaders represented a more healthier attitude on several socio-economic problems than the nationalists of those days. While making a comparison between the present-day controversy over Ram Janambhoomi in Ayodhya and that concerning the Shahid Ganj mosque in Lahore one cannot fail to notice that in accepting the high court verdict the Muslim leaders showed commendable restraint at that time.

It is also apt to remember that even after the partition nothing was done in Pakistan to reconert the Shahid Ganj monument into a mosque. There is a lesson for our present-day leaders if they care to recall the forgotten controversy of more than half a century.

(Source: The Times of India, Patna, dt. 18.6.90)

parts of Punjab. So important was the matter that Mr. Jinnah announced a special session of the Muslim League to consider ways of recovering the mosque. However, the city of Lahore did not witness any large scale rioting during the period in which the controversy raged over northern India. One person who acted with restraint in the matter was Mohammad Ali Jinnah, president of the Muslim League. It should be remembered here that Jinnah, in those days, was not too fond of agitations and defiance of authority. Being a man of secular tastes in his private life he was hardly touched emotionally by disputes involving mosques and temples. But as leader of the Muslim League he could not afford to remain indifferent if such a controversy.

In February 1936 he came to Lahore Had made it clear that he would intervene in the matter only if the Muslims of the city gave an undertaking that they would abide by his decision. During his stay in the city he first met the Punjab governor and tried for the release of Muslim agitators. The governor agreed to free them if the civil disobedience movement was stopped and nothing was done to break the law for recovery of the mosque. This was agreed and the agitators were released.

Later Jinnah met the Sikh leaders also and impressed upon them the need of communal amity. They received him well and also allowed any Muslim to go anywhere near the site. Before going back to Bombay Jinnah constituted a committee for settling the issue. The committee which they called Shahid Ganj Reconciliation Board had among its members people like Dr. Iqbal, Raja Narindernath, Sardar Ujal Singh, Sardar Sampooran Singh and Pandit Nanak Chand. Unfortunately the committee could not achieve much. However, Jinnah could certainly ease the tension.

After a year and half, the Muslim leaders of Lahore again requested Jinnah to come there since their appeal in the Lahore High Court had reached a crucial stage and his assistance was considered important to plead the Muslim case. But Jinnah did not agree with the suggestion. He said that he had earlier gone to Lahore as a mediator and it would look odd if he went there to plead the case of one party. He suggested the name of another barrister, an Englishmen, who was ultimately engaged.

Looking back on these events after more than half a century one feels some admiration for Jinnah who emerges as a dignified man of moderate views, not given to communal passions and breast-beating which were characteristic of most of the Muslim politicians. This is also in sharp contrast to the role played by some of the present-day Muslim politicians who have been spearheading the movement for the recovery of Babri Masjid in Ayodhaya.

Meanwhile some of the Muslim leaders got the idea that the mosque's recovery would become legally possible if the Legislative Assembly in Punjab passed a new act to exempt mosques from the law of limitation. At the instructions of Dr. Iqbal Malik Barkat Ali, a senior advocate and an ardent suporter of the Muslim League, prepared a draft of such a Bill to be introduced in the legislature. It was to be applied with retrospective effect to make possible recovery of Masjid Shahid Ganj.

The proposed bill was publicised in such a way that many Muslim members of the Unionist Party pledged their support to it. The premier, Sir Sikandar Hayat Khan, in any case, could not remain indifferent to the goings on in the camp of Dr. Iqbal. If the trend had continued there would have been a rift in the Unionist party on communal lines, making it

Som Anand

Shahidganj dispute

IT all happened nearly 54 years ago. In India people have almost forgotten the story but in Lahore echoes of it are still heard. There had been, during the British period, innumerable disputes relating to mosques and temples but the controversy which erupted in the capital of United Punjab in 1935 was unprecedented considering the anger it generated. Recalling the events of this Lahore temple-mosque dispute of 1935 one can vary well understand the anger and tension generated by the Babri Masjid-Ram Janambhoomi controversy.

This mosque was built by one of prince Dara Shikoh's employees. There was a Kotwali adjacent to the mosque. During the Mughal period, when the Sikhs were in revolt in Punjab, this kotwali was used as a place where Sikh dissidents were brought to be punished. Thus the kotwali was witness to a lot of bloodshed.

Among the dissidents who were thus tortured to death in this kotwali was one Bhai Taro Singh whom the Sikhs revered and when they came to rule over the city in later years they constructed his smadhi at the site of the kotwali. This is how the mosque, adjacent to it, acquired the name of Masjid Shahid Ganj.

This mosque, like many other in the city, was occupied by the Sikhs often decline of the Mughal rule. Even during the British period it was not restored to the Muslims. The Sikhs used it as a community kitchen (langar) and for various other purposes. In June 1935 Sikh 'jathas' started coming to a Lahore and it was rumoured that they wanted to demolish Masjid Shahid Ganj

It seems that the British administration of Punjab was quite willing to help them in this task. This is borne out of the fact that when the Sikhs actually started demolishing the mosque and a delegation of Muslim leaders went rushing to the governor, Sir Herbert Emerson, with the request that the demolition be stopped and the mosque be given to the custody of the Archaeological Department, the governor avoided the issue.

This inflamed Muslim sentiments. The agitation continued till the beginning of 1936. In the meantime a legal defence committee was formed for the recovery of the mosque and the dispute was brought to the court of Lahore's district judge, Mr. Sale. The Muslim claim rested on the contention that according to the tenets of Islam a mosque always remained a mosque, they should be allowed to offer their prayers in Masjid Shahid Ganj.

An appeal was then made against this decision to the Lahore High Court and a full bench of the Court heard this which also rejected the appeal.

The controversy over this mosque brought communal tension to a pitch not only in the capital but also in other

history, its culture, its rituals, its tradition, *Hadis*, its law, *sharia*, its jurisprudence, *fiqh*, one always finds a non-Muslim with no sympathy with the religion and indeed in most cases no real insight into the subject, ready with his 'learned findings'. The *Encyclopedia of Islam* is full of such fallacious and incorrect observations.

This has been going on for centuries, and represent a Second Crusade against Islam, this time by the pen and not by the sword. For the most part the Muslims' own incompetence, lethargy and internecine strife and dissension, gave a golden opportunity to these anti- Muslim orientalists, who were backed by the colonialists and imperialist exploiters.

I want to tell them that times have changed and they must change their attitudes too. The modern Muslim intelligentsia is not going to put up with this intellectual arrogance and is not going to lend a passive ear to the lecturing of so called western 'authorities' on their religion, their religious practices and the history and sources of their religion. The time has come when these practices must stop, and instead of lecturing the Muslims about their own religion these 'authorities' should seek knowledge from the real sources. Cheap jibes like 'What Islam?' and 'Which sources?' do not affect the argument. One could point out that questions like these can be asked of almost any religion - Christianity, Judaism, Buddhism, Hinduism and even communism. Where will you find a monolithic, indivisible religion or 'ism' in the world adaptable to a single, indisputable interpretation? Western scholars must change their attitude to Islam or leave it alone. Enough is enough.

OO

people of Persia and indeed the people of all the countries who have preceded the advent of the last of the prophets and about whom the *shara* is silent, we should have the same attitude and belief. And to label anyone as *kafir* without any reason should not be a matter to be taken lightly at all. And the reality of idol-worship of these [Hindus] is this, they [Hindus] have carved out their images and concentrate and meditate about some angels whom by Divine decree have influence over this world, or the spirits of some perfect saints, who after relinquishing this body, have influence in this world, or some friends [of God] who in their own imagination these people [the Hindus] consider immortal like *Khizr*, Peace Be Upon him. And because of the devotion and concentration, after a lapse of time, they form a sort of relationship with the person of that image. And because of this they satisfy some of their this-worldly and other worldly needs. And this conduct [of the Hindus]has a similarity with that of the Muslim sufis' practice of *Zikr-i-rabita* (remembrance and meditation connecting one with a spiritual guide). They [Muslim mystics] try to picture their *pir* (before their mental eye) and draw spiritual benefit from this. The only difference is that they do not carve out the image of their *pir*. And in this sense they [Hindus] are not similar to the infidels of Arabia who considered their idols themselves as capable of affecting things and not consider as media of the Divine; they considered these idols as Gods of earth, and God as the God of the heavens, and this is *shirk* in the Oneness of God. And their [the Hindus]prostration is a prostration of supplication and not of worship of the Divine - just as in their custom, instead of salutation, there is prostration before their mothers, fathers, teachers and religious guides; and they call it *dandot*. It does not follow from their belief in the transmigration of the soul that this is *Kufr*."

All this discussion makes it pretty clear that Dr. Robinson neither understood the problem nor sought guidance from the writings of the relevant authorities.

And at this point it seems appropriate to speak bluntly of a general feature of Western writing on Islam.

For the past several hundred years Muslims have been addressed by self-appointed Western authorities on Islam upon what Islam is. There is hardly any field of human learning concerning Islam and the Muslims, in which the 'authoritative opinions' of non-Muslims, mostly missionaries fired with crusading zeal have not been served up to the Muslim world. Be it Islam itself, the life of the Holy Prophet, Peace Be Upon him, its customs, its

among them (in the past).] وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ

[For each nation there is a messenger]
and other verses, to India too prophets and apostles were sent an their accounts in their books are clearly mentioned and fro whatever remains of these books it is evident that [the prophets Hindus] had attained to perfection and completeness.

And Universal Divine Mercy has not overlooked the reform His servants in this vast country. And it is well known that befo the coming of the Last Prophet Peace Be Upon him, prophets we sent to each nation. And obedience to and submission to these prophets was incumbent upon those people, and obedience and conformity to the prophets of other nations was not. And after the advent of our Prophet who is the last of the prophets, Peace Be Upon him, and is sent for the whole of humanity, and his religion cancels all the religions of East and West, no one has any ground for disobeying him till the last day. Thus from the time of his advent till this day, two thousand one hundred and eighty years have passed. Anyone who does not look to him [for salvation] is a *Kafir* while the people who preceded this period [his advent] were not *Kafir* according to holy verse: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

[We did a foretime send
Apostles before thee: of them
There are some whose story
We have related to thee,
And some whose story
We have not related to thee.. (S.XL, A.78)

[Allama Yusuf Ali in his note to this *ayah* says:
"God sends messengers of His Truth to every people. There are some whose names are known to us through the holy Quran, but there are a large number whose names are not made known to us through that medium. We must recognise the Truth wherever we find it."]

concerning most [former] prophets there is no comment; thus it is better for us to observe silence about them. Neither are we obliged to consider their followers as infidels nor are we obliged to bring about their destruction; nor we are obliged to cherish the belief of their deliverance, and it is well supported that one should think well of them and that bigotry should not enter into it. Concerning the

ised the principles of faith on that and they called the knowledge this process the laws of religions [*dharma shastra*] — in other ords the art of religous beliefs which is a sort of *Ilm-i-Kalam*. They assified the human race into four groups and deriving four fferent codes of conduct from that book they assigned each to a rticular group. And they based the details of conduct and behavior on it [*darma shastra*] and called this art as the laws of conduct [*Karma shastra*] — in other words laws governing behaviour which are like *fiqh*. They do not believe in the abrogation of religious laws, and since according to the dictates of reason and of men's temperaments changes in the man's conduct and behaviour during each period of time is inevitable, they divide the long life of the world into four periods. Each period is called *yug* and for each of the four *yug* the laws of human conduct and behaviours are deduced from these four volumes. Whatever interference and changes their predecessors have made, are without authority and without value. All their sects believe in the Unity of God [*tauhid*] and consider the world as His creation and as perishable. And they [Hindus] believe in the final annihilation of this world and in the resurrection of human beings and in the punishment and reward of bad and good actions. And these people [Hindus] have acquired an excellence in the learning of philosophical and traditional sciences, in ascetic practices and strivings and in the search for truth and reality and divine revelation, and their libraries are extant even today. And their custom of idolatry is not due to their belief in *shirk* [partnership in Divinity] but has another explanation.

The wise sages of these people [Hindus] have divided the whole span of human life into four parts. The first part is for acquiring knowledge and proper behaviour. The second is for earning a living and raising a family. The third is for learning right conduct and behaviour and for purification of the self. The fourth is for practising severance of worldly connections and leading a secluded and celibate life (which is the apogee of human achievement) and final deliverance which they call *maha mukti*. And the rules and regulations of their religion are fully codified. Thus we know that the religion was codified and now stands abrogated. And in the *shariat* [the Islamic law] no other abrogated religion is mentioned except the religions of the Christians and the Jews, though many religions are abrogated, and many religions were either confirmed or cancelled. And one should know that according to the holy verses:

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

[And there never was a people, without a warner having lived

such time as a man named *Vyas* was born, and at the instigation of *Satan* has completely destroyed their religion and made current idolatry and *shirk* [belief that others share in divine powers with God]. After that all the Hindus became *mushrik* [believers in *shirk*] and started worshipping the manifestations [of God] *surat parasti*. Indeed there have been different religious codes for different communities among them [castes] like Kayat [Kayasths] and Mahajan and Khatris, from ancient times. And a parallel could also be found in our ancient religious codes. For instance each branch of the Israelites adhered to a special set of commandments. Further in our own religious laws *(sharia')* Bani Hashim are entitled to *Khums* and forbidden to accept *zakat* or charity,and all the Quraish are distinguished by possession of the right of *Khilafat*; and there is no *jazia* for the *mushrikin* of the Arabs - Do not accept from them anything except (acceptance of) Islam or sword. In short the incarnations, *avatar*, of the Hindus were the manifestation of Divinity, whether it be manifested in a human being or a lion or a fish - like the staff of Hazrat Musa [Moses] or the camel of Hazrat Saleh. But the common folk among these people [Hindus]because of their lack of understanding did not distinguish between the manifestations [created beings] and the manifestor [the Creator] and made all of them the worshipped one [*ma'bud*] and thus fell into the abyss of perdition. And the same is the state of many groups of the Muslims like the people who construct *ta'zia* and the attendants at the tombs and (the followers of) *Jalaliyan* and *Madariyan*. Only God is the real knower of the truth. The End.

FATWA OF MIRZA MAZHARJAN-I-JANAN

It was asked whether the non-Muslims [*kuffar*] of India, like the Arabian *mushrik* have a baseless religion or whether they had a true religion which was abrogated; also what should be believed about their predecessors. On the basis of research and fair dealing [1] write concisely:

One should know that whatever is known from the ancient books of the Hindus is that at the time of the creation of the human race Divine Grace, for the reform and well being of their living [on this planet] and in life after death, sent a book named *Veda* in four volumes comprising decrees about right and wrong, permissible and forbidden things and information about the past and the future, through an angel named *Brahma* who is instrumental in the creation and destruction of the world. And their [the Hindus] religious guides [*mujtahid*] derived six religions from that book, and

Answer: The inference from the Quranic verse: وان من امة الا خلا فيها نذير (S.35,A.24)

[And there never was a people, without a warner, having lived among them (in the past)] is this, that to every people نذير (warner from evil) have been sent who deter people from vice and from violating [human] rights. such warners may have been prophets or learned people (*ulama*), or preachers, or saints, or gnostics (*'urafa*). And if one investigates the account of different [nations] such as Rum, Abyssinia and Turkistan and Khata and Khutan, one does not find any trace of prophets that may have been among them. On the other hand [the people of these nations] do not even understand the meaning of the word *nabi* (prophet). Belief in their [i.e. of the above-mentioned sages] greatness and the high esteem of their worship and in pious people and those who forsake the world and recluses, is quite firm in their hearts. God's dealing with each sect is different, depending upon its capacity to receive [what He sends] and upon their different sources of knowledge. In the Arab world, from Yemen to Syria and Egypt, Divine guidance was manifest in one manner. [God] appointed apostles and prophets, and bestowed upon them the power to work miracles, and gave them books. The 'knowledge of the unseen' علم غيب may have come to some of the people through some other people but because of the distance in time or in space, the people of these territories recognised the 'knowledge of the unseen' علم غيب only in this manner; a messenger comes and delivers the message verbally or brings a written espstile with him; and indeed these people demanded form the messenger a proof of the validity [of his claim]. And indeed among the present day nobles, kings, and *sultans* the same procedure is established. They despatch a *firman* or a royal decree by the hand of some trusted person and as a proof of its authenticity some things such as a palanquin, an elephant or an army accompany him. Thus for the people of these territories, that is the Arab world, the mode of guidance was established in this way. For the Hindus this mode was not a reliable one. But they reconginsed the manifestation of the Divinity in some things and also [its manifestation] in speech or words of the Divinity itself, and also in the performance of actions attributed to Divinity and miracles, and sovereignty over the population, as the viceregency of the Divinity among the people. [As such was the manner of the understanding of the Hindus] thus the dealings with them were also fashioned accordingly. Thus they were given instructions and for a long time their guidance depended on such a pattern, as is evident from the book of Yog Bashist and the Ramayan and Bhagavat [Gita] until

I have written a *tazkirah* of *Hazrat Sayyid Sahab* of *Bansvi* which was publish two or three years ago. In this, from page 275 for ten pages, under the caption of "The Saints of Former Times", I have discussed it in some detail (with reference) [in fact the whole chapter runs into more than twenty pages- KHQ].

To the best of my knowledge the following gentlemen in London possess a copy of "*Tazkirah Hazrat Sayyid Sahab Bansvi*" by me; if you wish to consult it yourself you may get in touch with any one of them:

1. Dr. Francis Robinson (Holloway College) 2. Prof. Ralph Russell 3. Mian Mahmud Abdul Bari Ansar (son of Maulana Jamal Mian Sahab)

I hope these few lines would be enough for your inquiry.

Are you related to Maulana Hamid Hasan Qadiri Sahab?.

Praying for you,

Mohammmad Raza Ansari

(This letter is undated but the PO stamp of Lucknow gives the date 11 Nov. 1988).

Since Maulana Raza Ansari referred me to the *Tazkirah*, I proceeded to obtain a copy, and after much effort got one by the courtesy of Mahmud Mian. In the chapter to which Maulana Raza Ansari referred he has fully and exhaustively dealt with the problem under discussion, and it was a matter of satisfaction to me that he has taken the same view as I hold. He has referred to two *fatwas* of two very eminent mystics and scholars of their times, Mirza Mazhar Jan-i-Janan and Shah Abdul Aziz Dihlavi. Their famous *fatwas* on the subject - the apostles of the Hindus - have always been known to Muslim scholars and frequently referred to, but they have never been translated fully even in Urdu. In view of their importance I give here these two *fatwas* in full in English translation.

FATWA OF SHAH ABDUL AZIZ

Question: Constant reports, accounts and indications make it abundantly clear that in India there have been many (*avatar*) incarnations of God whom some Hindus have regarded as the Creator and others as their guides. And there have also been kings of great power, glory and following. From the beginning of creation, what prophets have been sent to these people? And what book has been given for their guidance, either in an Indian language or any other language? Was such a book sent to (these people) or was it not? And if the answer is in the negative then what is the reason for it?

wrote:

"Hazrat Shri Krishan ji Peace Be Upon Him, the Prophet of India"

حضرت سری کرشن جی علیہ السلام پیغمبر ہندوستان

at another place he writes:

حضرت سری کرشن جی علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے...

[As regards to Hazrat Sri Krishan, Peace Be Upon Him, this *faqir* (Hasrat) follows the path of love of my *pir* and the *pir* of all *pirs*, Hazrat Sayyid Abdur Razzaq Bansvi...]

Can it not be deduced from all this that among all the prophets and apostles that God sent to India in ancient times, hundreds and thousands of years before the advent of Islam, according to him [Hasrat] Sri Krishanji's name is also included?

I request you kindly to give me the benefit of your august opinion.

Maulana Mufti Raza Ansari's reply:

Dear Mr. Qadiri,

Not only did the late Hasrat Mohani believe in the coming of prophets to India; every Muslim who believes in the Holy Quran does so. To every land of God an apostle or a prophet has been sent (and in this general principle the particular instance of India is also included).

In the *Quran-i-Sharif* the mention has been made numerous times of sending a *nazir* (warner) to "every hamlet" or "every nation" or"every town". After mentioning the Holy names of the glorious prophets of different lands the *Holy Quran* says:

"We have told you the names of some prophets but there are other prophets whose names we have not told you."

From these passages the only conclusion that can be drawn is that to India too, before the advent of the Last Prophet (Peace Be Upon Him and His Progeny and upon His companions), prophets and apostles were sent whose names we do not know. Elders of the *ummah* who were endowed with *kashf* (spiritual insight and revelation)and *Karamat* (non-prophetic miraculous powers) have even indicated the places where the prophets of India had their tombs, now obliterated. These include Hazrat Mujaddid Sahab, Alf-i-Sani, Maulana Shah Abdul Aziz Dihlavi, Hazrat Mirza Janjanan; and during our period, Shaikh-ul-Hadis Maulana Zakaria Sahab and Maulana Ashraf Ali Thanvi too,believed this.

Now some unkind but not unfounded observations. I may or may not be right, but I suspect that these "authorities" and "scholars" are allergic to the use of the expression the prophets of the Hindus. If some innocuous words like saint, holy person, spiritual guide or religious leader had been used for Sri Krishan instead of "prophet of India", I suspect that these susceptible "authorities" would not have raised their eye brows. They cannot reconcile their sentiments with the basic truth of the matter. If that is the case, so be it. Hasrat in his characteristic manner, without fear or favour, used just this expression, and moreover inspired readers of, and writers in, his magazine *Urdu-i-Mualla* to write a full length article using this very title. That was the measure of the strength of his conviction, a conviction which is sadly lacking in present-day 'scholars' and 'authorities'.

As the learned scholar, Dr. Robinson specifically mentioned Maulana Mufti Muhammad Raza Sahab Ansari Farangi Mahli's name and quoted his authority to 'refute' an irrefutable fact, I considered it only fair to consult the Maulana and to seek his opinion about it.

Without any previous acquaintance or introduction, I wrote a short letter simply asking the question. I must record my profound gratitude to him for very promptly replying to my letter.

Those who have had the unfortunate experience of contacting and consulting officials or scholars in South Asia will concur with me that this quality -- a prompt reply -- is not in the nature of the scholars or authorities of that part of the world. Even libraries, booksellers and publishers do not bother even to acknowledge the receipt of any letter, let alone reply to it. You direct an inquiry to them and wait until eternity, hoping for a response that never comes. Hence my gratitude to the Mufti Sahab.

I give a literal translation of both the letters here. The inquirer after the truth can make up his own mind. The truth of the matter remains unchanged; it is as I have stated it.

My letter to Maulana Mufti Raza Ansari Sahab (dated 29 Oct. 1988):

Dear Sir,

I apologise for any inconvenience and approach you with an inquiry on question of doctrine.

In connection with Maulana Sayyid Fazlul Hasan Hasrat Mohani, I have noticed in a few places in his own writings that he believed in the coming of prophets to India. For instance, at one place, while mentioning certain names in dedicating his *divan* he

certainly not only read these words but, we assume, appreciated Hasrat's verses too, because Hasrat always presented his compositions, writings and publications to his *pir khana* (the house of his spiritual guides). There is not a single word of Maulana Abdul Bari, either written or oral, expressing disapproval of Hasrat's views - either of Hasrt's own views regarding Sri Krishan or of his ascribing these views to Maulana Abdul Bari's father, Shah Abdul Wahab Sahab Farangi Mahli. Moreover, Hasrat's statement that Sri Krishan was a prophet of India and that his *pir* Shah Abdul Wahab Farangi Mahli and head of his mystic order, *pir of pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) also held the same view appeared in 1923; and in all the sixty six years that have elapsed since then not a single person (including the Farangi Mahlis) has dared to point an accusing finger at him.

To conclude: no authority, either in the west or in the east, can alter the fact that in the light of the clear verses of the Glorious Book, *Quran-i-Majid* Muslims believe that God did send His prophets to all nations and all lands. All the mystics in the Indian subcontinent also, undeniably, believe that God did send His prophets to India. The remarkable feature of Bansa Sharif and Farangi Mahlis' mystics has been that, while other mystics stop short of naming any of these prophets, these have clearly given Sri Krishan's name. Finally it is highly significant that not a single person, throughout this long period of history, either among the mystics of other orders or even among the *ulama*, who are supposed to be more rigid, inflexible and firm in all such matters, has ever raise any objection to Shri Krishan's name being mentioned in this connection or issued any *fatwa* censuring those who have done so.

If today any person disapproves of the linking of the name of Farangi Mahal or Bansa Sharif with such ideas then he should say clearly that he is not concerned with the views of the elders of either Bansa Sharif or Farangi Mahal and he himself does not share these views. But no-one has any authority whatsoever for saying that Hasrat, his *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) and his *pir of pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) did not consider Sri Krishan as *Nazir* (نذیر) sent to India.

This may or may not "transform our understanding [or misunderstanding ?] of the relationship between these representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in the eighteenth and nineteenth-century Awadh." But the truth is too sacrosanct to be tampered with to meet the wishes of any scholar.

groups or individuals may differ in this practice in their own limited way; but the general statement holds true, particularly in the school of *tariqat* and *shariat* to which Hasrat and his *pirs* belonged. Thus Hasrat not only used علیہ السلام indicating that Sri Krishan was a prophet but more emphatically and clearly added the words پیغمبر ہندوستان, i.e. prophet of India.

Then again in a short preface to his seventh *divan*, as I stated on page 18 of my book, he very clearly and unambiguously says:

حضرت سری کرشن علیہ السلام کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے۔

[Regarding Hazrat Shri Krishana (peace be upon him)
I am a follower of the path of love of my *pir* and *pir* of *pirs*
Hazrat Sayyid Abdul Razzaq Bansvi]

These two clear statements, taken together with other references elsewhere in his prose and poetry (to some of which I have made reference, with English translations), make Hasrat's position so clear that no discussion is needed on this point. Any statement or views, no matter how 'authoritative', that runs counter to it, is, so far as Hasrat's own views are concerned, valueless. No authority can challenge this statement of Hasrat's position. There are two more points to be taken into consideration.

Firstly Hasrat has clearly stated that his *pir* (Shah Abdul Wahab) held the same attitude towards Sri Krishan as Hasrat himself. His words can have no other meaning. How can anyone claim that Hasrat was misinformed about the opinions and attitudes of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli)? Hasrat does not content himself with speaking of the belief of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) but goes right to the top, to the leader of spiritual order; to the ".. *pir* of all the *pirs*, Hazrat Syed Abdul Razzaq Bansvi...". Will any `authority' dare to claim that Hasrat was either unawere of or was deliberately misquoting and misjudging the attitudes of the great spiritual guide of his own mystic order, Hazrat Shah Abdur Razzaq Sahab of Bansa Sharif? One may disagree with Hasrat's position and censure him for his beliefs about Sri Krishan but that is debatable and falls outside our scope of present discussion. Though we shall see that no-one has done it.

The second point is this: when Hasrat wrote these words in the preface of his seventh *divan* in 1923, the head of Farangi Mahlis at that time, the great spiritual leader and guide of this mystic order and the illustrious son of Shah Abdul Wahab Sahab Firangi Mahli, Maulana Abdul Bari Farangi Mahli was still alive. He most

that in the early twentieth century, Maulana Abdul Bari of Firangi Mahal wrote of Shah Abdur Razzaq of Bansa inspiring Hindu *faqirs* to the extent that they succeeded in meeting Krishna (*Fuyuz-i Hasrat-i Bansa*, Lucknow, 1345 A.H.,128), but that this was far from saying that the saint of Bansa believed that Krishna was prophet. Perhaps the author has evidence for his assertions, in which case he should refer to it. As matters stand, he would appear to be trying on his authority, and no other, to transform our understanding of the relationship between the representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in eighteenth and nineteenth-century Awadh. (*The Bulletin of the School of Oriental and African Studies*)

The whole problem has three facets, First is the basic question: what does Islam say about apostles being sent to India and the Indian people?

Secondly, what are Hasrat's views and what does he believe and profess?

Thirdly, what are the views of the saints of Bansa Sharif and the elders of Farangi Mahal; and indeed other saints and sufis?

The first question has been dealt with adequately in the first chapter of my book, where I have shown with reference to very clear verses of the Holy Quran that Islam clearly states that God has sent His prophets to all nations and all lands. India, obviously, is no exception. God's apostles were sent to India, and no authority can change or alter this fact. This is why sufis of all orders, without actually naming persons or places [as in the case of Hazrat Mujaddid Alf-i-Sani] have affirmed this. This point is so clear that it needs no elaboration or discussion, and is beyond dispute.

Now the second question, which is more closely relevant to our purpose. Hasrat, in his poetry and prose, has very clearly stated that he considers Sri Krishan as an apostle of God sent to India in pre-historic times, and that his (Sri Krishan's) message was that of LOVE.

In the dedication of his *divan* he has referred to Sri Krishan as

سری کرشن جی مہاراج علیہ السلام پیغمبر ہندستان

As everybody knows different phrases like رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ and so on, with slight variations, in essence mean the same thing and conventionally have come to be used for particular groups or categories of holy personages. Thus علیہ السلام conventionally and popularly is used only after the names of holy persons whom Muslims consider to be prophets of God. There may be exceptions, and minor

Ahmad Sirhindi, who is generally called the *Mujaddid Alf-i-Sani* (the Renewer of Islam at the beginning of the second millennium of the Islamic era) has written on this point. In a letter (number 259) addressed to Khwaja Muhammad Sa'id he says, '... Reviewing of the position of nations of the past, it seems evident there is hardly any land to which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which apparently lacks any such distinction, I feel that prophets have been sent here too.... And in certain cities of India it seems as if the light of the prophets gleams like a torch in the darkness of *shirk* [polytheism]; and if I wished I could name such cities...."

From this attitude the question naturally arises as to whether one should seek the prophets sent to India in the past among the figures of Indian mythology. On this point all except a few of the Muslim theologians of India are silent. They must have felt a natural reluctance to see Hindu demi-gods as prophets. But there have been some *Sahib-i-Kashf* (saints who have received spiritual illumination) who quite clearly believe that Krishna was one of the Indian apostles, and , moreover, very prominent among them.

But it seems that there are some who have failed to grasp the problem and to understand its full significance. Thus one learned scholar, an expert on Islam and its history in South Asia, Dr. Francis Robinson writes:

"There are unsupported assertions that are plain wrong. Take two examples. 'A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides', we are told on page 15, 'was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. 'If this were true, it would be of considerable significance, but there is no evidence for it in anything the *'ulama'* of Farangi Mahal have written or said. Again he asserts (p.16) that Saiyid Shah Razzaq of Bansa, to whom many Firangi Mahalis owed allegiance, held similar beliefs about Krishna and that there are several stories to this effect in his *malfuzat*, the *Manaqab-i Razzaqiyah* by Mulla Nizamuddin of Firangi Mahal (died 1748). But there is no mention of Krishna anywhere either in the original work or in the later editions of it. This understanding, moreover, is confirmed in a communication of 15 August 1986 from Mufti Muhammad Raza Ansari of Firangi Mahal, who is the leading expert on the sources for the Firangi Mahal and Bansa families, and who also goes on to say

The question of the prophets sent by God in historic and pre-historic times to the subcontinent of India has given rise some controversy, and to still more misunderstanding. The atter is adequately dealt with in Chapter I of my book, Hasrat ohani, Delhi, 1985. What I said there is as follows:

A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. The idea that God had sent His prophets to India long before the coming of the Muslims was not a new one. Muslim thinkers in India had struck by such verses of the Qur'an as the following:

> And the Unbelievers say:
> "Why is not a Sign sent down
> To him from his Lord?"
> But thou are truly
> A warner, and to every people
> A guide.[1]
>
> Never did We send
> A warner to a population
> But the wealthy ones among them
> Said: "We believe not
> In the (Messenger) with which
> Ye have been sent".[2]
>
> Never did We destroy
> A population, but had
> Its warners.[3]

These are only some of the verses to this effect. In the light of these verses no Muslim thinker could fail to see that a country with so vast a population as India could not have been without its true apostles. Thus the famous 16th-17th century mystic, scholar and religious philosopher, Shaikh

1. Sura XIII, Ayah7, trans. 'Abdullah Yusuf Ali. Lahore, n.d. pp. 604-5.
2. Sura XXXIV, Ayah34, trans. 'Abdullah Yusuf 'Ali, Lahore, n.d., p. 1145.
3. Sura XXVI, Ayah208, trans, 'Abdullah Yusuf' 'Ali, Lahore, n.d. p. 971.

THE PROPHETS OF INDIA

By
Dr.K.H. Qadiri,
London

Printer : Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi.

Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 650109, Telex: 22-430 KBL IN)

Editor : Dr. A. R. Bedar

Annual Subscription : Rs. 300/- (Inland) US$ 60 (Asian Countries) US$ 120 (Other Countries) Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-

CONTENTS

huda Bakhsh Library

JOURNAL

63——68

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA